للکار
Pakistanipoint
1
Waqar Azeem
طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

یہ ان دو دوستوں کی کہانی ہے جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف تھے۔ اور کسی حد تک ان کے مزاج بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے۔ مگر ان دونوں میں ایک قدر مشترک ایسی تھی جس نے انہیں یک جان دو قالب بنا دیا۔

وہ موت کے متلاشی تھے۔ بس مرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنا شروع کیا اور ان کے تیور دیکھ کر زندگی ان کو راستے دینے لگی۔ زندگی کا ہر رنگ ان کے سامنے آیا۔ عسرت، دکھ اور بدصورتی بھی۔ دولت، عشرت اور حسن و جمال بھی۔ وہ ہر راستے پر چلے، ہر منظر سے گزرے لیکن وہ اپنی بنیاد سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ ہر راستے پر چلے، ہر منظر سے گزرے، لیکن وہ اپنی بنیاد سے جدا نہیں ہوئے۔ اور بنیاد یہی تھی جہاں جس جگہ اور جب بھی موت ملے گی وہ اسے آگے بڑھ کر گلے لگائیں گے۔

ان کی اسی سوچ نے انہیں خطروں کا کھلاڑی بنا دیا۔ مصائب ان سے نظریں چرانے لگے۔ وہ دونوں دقیانوسیت اور جاہلیت کے ڈسے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس جاہلیت کو ہی اپنا اولین ہدف مانا۔ انہیں جہاں بھی کہنہ قدروں اور فرسودہ عقیدوں کی جھلک نظر آئی انہوں نے بے خوف للکار بلند کی اور ایک جنگ کا آغاز کر دیا۔

وہ جاہلیت کے خارزاروں میں روشن خیالی، جدت اور محبت کی علامت بن گئے۔ وہ اپنے سینوں میں گداز دل رکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں محبت کی شمعیں روشن تھیں اور محبت انسان کو ہی طاقت نہیں دیتی اُس کے آدرشوں کو بھی توانائیوں کی معراج پر لے جاتی ہے۔ یہ اسی معراج کی کہانی ہے۔ یہ انہی وحشی جذبوں کی رُوداد ہے جو سنگلاخ دیواروں میں در بناتے ہیں۔ امید ہے میرے دیگر سلسلوں کی طرح آپ اس سلسلے کو بھی پسند کریں گے۔

طاہر جاوید مغل

ثروت مجھ سے بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوگئی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سایہ سا لہرا گیا تھا۔ میں نے اپنا رُخ پھیر کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور چونک کر رہ گیا۔ وہ چار لڑکے اسنیک بار میں داخل ہو رہے تھے۔ لڑکوں میں ان کا سرغنہ واجد عرف واجی بھی شامل تھا۔ وہی کم ظرف امیر زادوں والا حلیہ، لمبے چمکیلے بال، گلے میں سونے کا لاکٹ اور کھلے گریبان والی امپورٹڈ شرٹ۔ وہ بڑی مستی سے چلتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک دراز قد لڑکا لوفر سے انڈین گانے کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کا حلیہ بھی واجی سے ملتا جلتا تھا۔

وہ چاروں ہم سے کچھ فاصلے پر ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ثروت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''چلو آؤ تابش! چلتے ہیں۔''

میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... اس طرح اُٹھنا ٹھیک نہیں۔ بس یہ جو دو گھونٹ چائے رہ گئی ہے، پی لو۔ پھر اُٹھتے ہیں۔''

ثروت کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اب اسے چائے میں کوئی دلچسپی رہی ہے اور نہ مجھ سے باتیں کرنے میں۔ اب یہاں جو بھی وقت گزرے گا، وہ سخت تکلیف میں رہے گی۔ میں نے کپ اُٹھا کر چائے کی چسکی لی تو مجھے لگا کہ ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اس لرزش کو ثروت کی نگاہ سے چھپانے کے لیے میں نے کپ پھر نیچے رکھ دیا۔

○......❖......○

''ثروت میری منگیتر تھی۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی۔ میں ایم ایس سی کے آخری سال میں تھا۔ ہم دونوں لاہور میں رہتے تھے اور رشتے دار بھی تھے۔ واجد نامی یہ لڑکا جو بھی اپنی ٹولی کے ساتھ اسنیک بار میں داخل ہوا، پچھلے کئی ماہ سے ثروت کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اس

بس اسٹاپ کے گرد چکراتا رہتا جہاں سے ثروت کالج جانے کے لیے سوار ہوتی تھی۔ وہ ثروت کا محلے دار بھی تھا۔ شروع میں تو وہ اخلاق کے دائرے کے اندر ہی رہا، بس ایک دو بار اس نے ثروت کو اپنی ڈبل سائلنسر ہنڈا موٹر سائیکل پر لفٹ دینے کی کوشش کی مگر جب ایک روز اس نے مجھے اور ثروت کو مال روڈ کے شیزان ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تو وہ کچھ جارحانہ موڈ میں آ گیا۔ وہ اب ثروت کے کالج کے متواتر چکر بھی لگا رہا تھا اور شیزان ریسٹورنٹ میں بھی دو بار ہمارے پیچھے آیا۔

ہم نے شیزان میں ملنا چھوڑ دیا۔ پچھلی بار ہم انارکلی کے ایک اسنیک بار میں ملے تھے۔ تب تو خیریت گزری تھی لیکن آج پھر واجد اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ یہاں آ دھمکا تھا۔

ہم جیسے تیسے چائے ختم کر کے اُٹھنا چاہ رہے تھے۔ میں نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا تھا لیکن وہ ابھی کاؤنٹر پر مصروف تھا۔ واجد نے ہمیں سنانے والے انداز میں زور سے کہا۔ ''یار شکیل! چائے پینے کے لیے تو یہ کافی سستی جگہ ہے۔''

شکیل بولا۔ ''بھئی جیب میں جتنے پیسے ہوں، ویسی ہی جگہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔''

واجد نے کہا۔ ''اتنا سوہنا مکھڑا ایسی جگہ پر ہو تو لگتا ہے کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا ہے۔''

''یا یہ کہہ لو کہ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند۔'' دراز قد لڑکے نے لقمہ دیا۔ اس کا نام قادر تھا۔

واجد میز پر ہلکا ہلکا طبلہ بجانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ گنگنا بھی رہا تھا۔ دل توڑنے والے دیکھ کے چل...... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں...... راہوں میں......

ثروت تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلو تابش!'' اس نے شولڈر بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ جی چاہتا تھا کہ ان خبیثوں کے منحوس چہرے نوچ لوں، حلیے بگاڑ دوں ان لوفروں کے۔ لیکن...... اس لیکن سے آگے کئی ایک سوالیہ نشان تھے؟

میں نے خود کو سنبھالا اور کاؤنٹر پر ہی ادائیگی کرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ ثروت مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔

ہمارے عقب میں کورس کی شکل میں آواز لگائی گئی۔ ''واک آؤٹ...... واک آؤٹ۔''

مجھے اندیشہ تھا کہ شاید یہ لوگ ہمارے پیچھے باہر آئیں گے اور سڑک پر بھی بدتمیزی کریں گے لیکن فوری طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم اسنیک بار کے عقب میں واقع پارکنگ میں

پہنچے۔ میں اپنی سوزوکی کار کی طرف بڑھا تو پتا چلا کہ اس کے عقب میں دو عدد دیوہیکل ہنڈا موٹر سائیکلیں پارک ہیں۔ ایک بار پھر رگوں میں لہو سنسنا کر رہ گیا۔ یہ واجی وغیرہ کی ہی شرارت تھی۔ ابھی ہم پارکنگ والے سے بات ہی کر رہے تھے کہ واجی اور اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔

پارک لاٹ والے لڑکے نے واجی سے کہا۔ ''سر جی! آپ کی موٹر سائیکل۔ انہوں نے اپنی گاڑی نکالنی ہے۔''

''اوہو ہو ہو۔'' واجی نے چونکنے کی اداکاری کی پھر شائستگی سے بولا۔ ''غلطی ہو گئی۔ میں سمجھا تھا کہ یہ کار دو تین گھنٹے یہاں رُکے گی۔ ابھی لو جی...... میں ہٹا لیتا ہوں موٹر سائیکل۔''

اس نے جیبیں ٹٹولیں مگر چابی نہیں ملی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔ وہ دراز قد قادر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہاں گئی یار! چابی تیرے پاس تو نہیں ہے؟''

''میرے پاس تو میری چابی ہے اور بس میرے تالے میں لگتی ہے۔'' قادر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ کچھ چابیاں ایک سے زیادہ تالوں میں لگتی ہیں؟''

''کیوں نہیں یار! ہوتی ہیں ایسی بھی۔ یہ چابیاں رنگ برنگے تالوں میں لگتی رہتی ہیں۔ ان کو ہرجائی چابیاں کہتے ہیں۔''

واجد عرف واجی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیوں بھرا جی! تمہارے پاس ہے کوئی ایسی چابی؟''

''کک...... کیا مطلب؟'' میں نے خود کو بمشکل سنبھالا۔

شکیل مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ کی شکل و صورت سے لگتا ہے کہ آپ کے پاس رنگ برنگے تالوں میں لگنے والی چابی ہے۔''

''یعنی ہرجائی چابی۔'' قادر نے لقمہ دیا۔

''تم تمیز سے بات کرو اور یہ موٹر سائیکل پیچھے ہٹاؤ۔'' ثروت سٹپٹا کر بولی۔

''چابی کے بغیر کیسے پیچھے ہٹا لوں مس صاحبہ؟'' شکیل نے کہا۔

میں نے بھنا کر موٹر سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھسیٹ کر پیچھے کرنا چاہا۔

''نو نو...... ڈونٹ ٹچ۔'' واجی نے خطرناک لہجے میں کہا۔

''تو پھر اسے پیچھے ہٹاؤ۔'' میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

''میں کہہ رہا ہوں ڈونٹ ٹچ اِٹ۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا اور اس کے ساتھ ہی مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے گیا۔

غصے اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ مجھے لگا کہ میرا دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بہتر ہوا کہ اس موقعے پر ثروت میرے آگے آگئی۔ وہ چلاتے ہوئے بولی۔

''نہیں تابش! ہمیں ان سے جھگڑا نہیں کرنا۔'' وہ مجھے دھکیلتی ہوئی چند قدم اور پیچھے لے گئی۔

میں سرتاپا لرز رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، ایک بار تو اس خبیث واجی پر ٹوٹ پڑوں۔ دوسری طرف واجی بپھرا ہوا شیر نظر آ رہا تھا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ میری کوئی پیش چلنے دے گا۔ بہتر ہوا کہ شکیل اور قادر نے اس کا راستہ روک لیا۔ شکیل، واجی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ ''چھوڑو یار! سنگل پسلی بندہ ہے۔ ضائع شائع نہ ہو جائے۔''

پتا نہیں...... میرے منہ میں کیا آیا اور میں نے کیا کہا۔ بہر طور یہ کوئی متاثر کن الفاظ نہیں تھے۔ میں اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر پیچھے ہٹ آیا۔ واجی کے دوستوں نے دونوں موٹرسائیکلیں پیچھے ہٹا دیں۔ واجی بدستور میری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ موٹرسائیکلوں پر بیٹھ کر چلے گئے تو ہم بھی گاڑی میں آ بیٹھے۔

گھر آ کر میں دیر تک اپنے کمرے میں بند رہا۔ کمرے کے اندر ہی بے قراری سے ٹہلتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ میں تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ والدین کا لاڈ پیار مجھ سے بہت زیادہ تھا۔ والد محکمہ آثارِ قدیمہ میں آفیسر تھے لیکن چونکہ ایمان دار آفیسر تھے اس لیے مشکل سے ہی گزر بسر ہوتی تھی۔ کوئی دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا تو اندیشہ تھا کہ ہم معاشی دباؤ میں آ جائیں گے لیکن والد صاحب کی دور اندیشی نے ہمیں سنبھال لیا۔ انہوں نے اچھے وقت میں ایک بڑی سڑک کے کنارے دو کنال زمین لی تھی۔ کچھ زمین خالی چھوڑ دی تھی۔ باقی میں گھر تعمیر کیا تھا مگر اس طرح کہ اگر ہم اوپر کی منزل پر شفٹ ہو جاتے تو گراؤنڈ فلور پر دس بارہ دکانیں تعمیر کر کے کرائے پر چڑھائی جا سکتی تھیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کی بیمہ پالیسی نے بھی ہمیں فائدہ دیا۔

میں بچپن میں جسمانی لحاظ سے خاصا کمزور واقع ہوا تھا۔ تاہم لڑکپن تک پہنچتے پہنچتے جسم پر تھوڑی بہت بوٹی آ گئی۔ اس کے باوجود ہم عصر لڑکوں میں مجھے سنگل پسلی ہی سمجھا جاتا تھا۔

لڑائی بھڑائی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر لڑکپن اور جوانی میں بارہا ایسے مواقع

آئے جب میرے لیے لڑنا ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر اکثر میری ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوتی تھی اور دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دھڑکنے لگتا۔ اپنی اس خامی پر قابو پانے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ آج کل پھر وہی صورتِ حال درپیش تھی۔ شومیِ قسمت ثروت کے محلے کا ہی یہ لڑکا اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کی ہمت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

اس دن کمرے میں بے قراری سے ٹہلتے ٹہلتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین ماہ کے لیے ثروت سے میل جول بالکل بند رکھوں گا اور ثروت سے بھی کہوں گا کہ وہ بس میں کالج جانے کے بجائے ناصر بھائی کے ساتھ موٹرسائیکل پر چلی جایا کرے۔

پچھلے دو چار سالوں میں مجھے جب بھی کہیں اپنی ناتوانی کے سبب ہزیمت اُٹھانا پڑی یا شرمندگی کا سامنا ہوا، میرے اندر ایک خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ میں خود کو جسمانی طور پر مضبوط کروں۔ کم از کم اتنا تو کر سکوں کہ اپنے جیسے کسی بندے کی زیادتی کا مناسب جواب دے سکوں۔ ان دنوں مارشل آرٹ کا کافی شور تھا، کراٹے کے کلب کھلے ہوئے تھے۔ میں بھی گاہے بگاہے اردو بازار کے قریب واقع ایک کلب میں جاتا رہا تھا اور ہاتھ پاؤں چلاتا رہا تھا۔ بہرحال میری اس مصروفیت میں مستقل مزاجی کی کمی تھی۔ عموماً دو چار ماہ تک کلب جانے کے بعد میری توجہ ہٹ جاتی تھی۔ دھیان کسی اور طرف چلا جاتا تھا۔ دھیان دوبارہ کلب کی طرف تب آتا تھا جب پھر کسی جگہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ جسمانی فٹنس علیحدہ چیز ہے جبکہ لڑائی بھڑائی والا مزاج رکھنا دیگر بات ہے۔

اسنیک بار والے واقعے کے بعد میں نے ایک بار پھر شدومد سے مارشل آرٹ کلب جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں ہمارا یہ کلب اردو بازار کے قریب سے تبدیل ہو کر انارکلی کی طرف چلا گیا تھا۔ مدثر عارف صاحب ہمارے استاد تھے۔ وہ بڑی محنت سے ہمیں داؤ پیچ سکھایا کرتے تھے۔ میں چھ سات ہفتے تک باقاعدگی سے گیا لیکن پھر انہی دنوں مجھے ٹائیفائڈ ہوا اور کلب جانے کا سلسلہ ایک بار پھر منقطع ہو گیا۔

میں جنوری کی وہ ٹھٹھری ہوئی سہ پہر کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لبرٹی مارکیٹ سے شاپنگ کر کے گھر واپس آیا تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔

دوسری طرف ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی۔ اس نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''بھائی

جان! باجی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ انہوں نے بارہ بجے آ جانا تھا۔ اب تین بج گئے ہیں۔ وہ کالج میں بھی نہیں ہیں۔''

میں سرتاپا لرز گیا۔ ''تو کہاں گئی وہ؟''

''ابو اور ناصر بھائی پولیس اسٹیشن گئے ہیں۔ کسی نے انہیں خبر دی ہے کہ باجی کو شاید...... باجی کو شاید......'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

اسی دوران میں ثروت کی پھپھو نے ریسیور تھام لیا۔ انہوں نے بھی روتے ہوئے کہا۔

''تابش بیٹا! جلدی سے تھانے جاؤ۔ پتا چلا ہے کہ گھر کے پاس والی سڑک سے کچھ لوگوں نے ثروت کو زبردستی گاڑی میں ڈالا ہے اور لے گئے ہیں۔''

میری نگاہوں کے سامنے زمین آسمان گھومنے لگے۔ ریسیور پھینک کر میں تیزی سے گیراج کی طرف بڑھا۔ امی آوازیں ہی دیتی رہ گئیں۔ ''کیا ہوا تابش؟''

''آ کر بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور لرزتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر آ گیا۔ میرا دھیان سیدھا واجی اور اس کے یاروں کی طرف جا رہا تھا۔ حالانکہ چند دن پہلے بھی میں نے فون پر ثروت سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ آج کل واجی نظر نہیں آ رہا۔ مجھے اس وقت بھی پوری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ مجھے پریشانی سے بچانا چاہتی ہے اور آج کے واقعے نے تو میرے بدترین اندیشوں کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔ میں سیدھا تھانے پہنچا۔ ثروت کے والد، خالو عثمان، ان کے دو محلے دار دوست اور ناصر بھائی تھانے میں ہی موجود تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے خالو عثمان اور تھانیدار میں تلخ کلامی ہوئی ہے۔ کشیدہ کشیدہ سے ماحول میں تھانیدار کچی رپورٹ لکھ رہا تھا۔

خالو عثمان بتا رہے تھے۔ ''یہ دو تین بندے تھے۔ ان میں سے ایک شاید اسٹیشن وین کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے چہرے مفلر وغیرہ میں چھپا رکھے تھے۔ انہوں نے میری بچی کو گھسیٹ کر وین میں پھینکا ہے۔ یہ دیکھیں...... موقعے سے اس کی یہ دو کتابیں ملی ہیں۔''

خالو عثمان نے لرزتے ہاتھوں سے دو کتابیں تھانیدار کی میز پر رکھیں۔

بے شک یہ ثروت ہی کی کتابیں تھیں۔

تھانیدار نے کتابیں بھی اپنی تحویل میں لے لیں۔

''نمبر پلیٹ پڑھی ہے کسی نے؟'' تھانیدار نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... پر گاڑی کا رنگ اور میک وغیرہ دو تین بندوں نے دیکھا ہے۔''

تھانیدار کے پوچھنے پر خالو عثمان کے دوست وہاب صاحب نے تفصیل سے گاڑی کے

بارے میں بتایا۔

تھانیدار کی ہدایت پر ایک اے ایس آئی، وائرلیس سیٹ پر پٹرولنگ گاڑیوں سے رابطے میں مصروف ہو گیا۔ خالو عثمان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں انہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے۔

میں نے ناصر بھائی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ انہی لڑکوں کا کام ہے۔''

''کون لڑکے؟''

''وہی...... واجی، شکیل اور قادر وغیرہ۔ میں نے آپ کو ان کے بارے میں بتایا تھا۔''

''نہیں تابش!'' ناصر بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ یہ ان کا کام ہے۔ جس وقت یہ معاملہ ہوا، واجی وغیرہ اپنے گھر کی چھت پر تھے۔ ویسے بھی لوگوں نے جن تین بندوں کے بارے میں بتایا ہے، وہ اپنے حلیے سے بڑی عمر کے لگتے تھے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ واجی وغیرہ نے کسی دوسرے سے یہ کام کروایا ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔ کرب کی شدت سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''ابھی کیا کہا جا سکتا ہے؟ ویسے واجی کے والد سراج صاحب تو خود رپورٹ درج کرانے ابو کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ یہ جو دائیں طرف کریم کلر کی شلوار قمیص میں ہیں۔'' ناصر بھائی نے ایک صحت مند شخص کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس والوں نے قاعدے کی کارروائی کر کے اور ہمیں تسلی تشفی دے کر واپس بھیج دیا۔ بس خالو وغیرہ کے ساتھ ہی ان کے گھر چلا گیا۔ گھر کا ماحول سخت افسردہ تھا۔ ثروت کی دادی سلسل مصلے پر تھیں اور سجدے میں گری ہوئی تھیں۔ خالہ صفیہ کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ وہ سی بھی امید افزا اطلاع کے لیے ٹیلی فون سے لگی بیٹھی تھیں۔ محلے کی دو تین عورتیں بھی وجود تھیں۔ میں نے خالہ صفیہ کو تسلی دی، وہ میرے گلے سے لگ کر سسکنے لگیں۔

پتا نہیں کیوں میرا دھیان بار بار واجی اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں ن سے ملنا اور بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر یہ خیال بھی ذہن میں آتا تھا کہ کہیں بگڑا ہوا معاملہ ر نہ بگڑ جائے۔ صرف شک کی بنیاد پر واجی وغیرہ پر اتنا بڑا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے فون کر کے والدہ اور چچی کو بھی خالہ صفیہ کے گھر ہی بلا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ن کے پاس رہیں اور دلاسہ دیں۔

وہ رات جس مشکل اور کرب میں گزری، میں ہی جانتا ہوں۔ میں گاڑی لے کر دیوانہ

وارسڑکوں، ہسپتالوں اور پولیس اسٹیشنوں پر گھومتا رہا۔ میرے کالج کے ایک دوست زبیر خان کے بھائی پولیس افسر تھے۔ زبیر خان سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ آ جاؤ۔ ابھی جا کر بھائی سے ملتے ہیں اور مشورہ کرتے ہیں۔

صبح کے پانچ بجے تھے۔ ابھی اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ میں خالہ کے گھر سے نکلا اور گاڑی پر زبیر کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی میں دو اندرونی سڑکوں سے نکل کر بڑی سڑک پر مڑنے ہی والا تھا کہ سامنے سے آنے والے ایک رکشے کی وجہ سے رفتار دھیمی کرنا پڑی۔ جگہ تھوڑی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ رکشہ آسانی سے گزر جائے۔ اچانک میری نگاہ رکشے کے اندر بیٹھی سواری پر پڑی اور میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ ثروت تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ تھا اور دوپٹے کے پلو نے دو تہائی چہرے کو نقاب کی طرح چھپایا ہوا تھا۔ میں نے ہی ثروت کو نہیں دیکھا، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے گاڑی روک لی۔ رکشہ بھی رک گیا۔ میں دروازہ کھول کر جلدی سے ثروت کے پاس گیا۔ وہ رکشے سے اُتر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دہک رہے تھے۔ صبح کے ان اولین لمحوں میں یہ اندرونی سڑک تقریباً سنسان ہی تھی۔ ثروت میرے کندھے سے چمٹ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

میں نے رکشے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور ثروت کو لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

''ثروت! تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

ایک دو راہگیر تعجب سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میری گاڑی کا رُخ بڑی سڑک کی طرف تھا۔ میں نے گاڑی کو اسی رُخ پر آگے بڑھایا اور تین چار منٹ ڈرائیو کرنے کے بعد ایک چلڈرن پارک کے عقب میں روک دیا۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ثروت آنکھیں بند کیے مسلسل سسک رہی تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''ثروت! تم زندہ سلامت ہمارے سامنے ہو... سے بڑی اور کوئی بات نہیں۔ باقی سب کچھ بے معنی ہے۔ مجھے بس اتنا بتا دو، وہ کون لوگ تھے جو تمہیں لے کر گئے تھے۔''

وہ بدستور روتی رہی۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ کچھ نہ بتاؤ۔ اگر تمہارے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے تو خاموش رہو۔ میرے لیے یہ خوشی ہی کم نہیں ہے کہ میں تمہیں صحیح سالم اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ خالہ، خالو بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔ ایک ایک سیکنڈ ان پر بھاری گزر رہا ہے۔ چلو گھر

چلتے ہیں۔''

مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

''کیا بات ہے ثروت! جو کہنا ہے بلا جھجک کہو۔''

اس نے آنسو پونچھ لیے اور قدرے حوصلے میں نظر آنے لگی۔ آنسوؤں کے چند گھونٹ بھر کر وہ بولی۔ ''مجھے لے جانے والے واجی اور اس کے دوست تھے۔''

یہ انکشاف دھماکہ خیز تھا۔

''لیکن...... میرا مطلب ہے ثروت! وہ خود تو موقعے پر موجود نہیں تھے۔ ناصر بھائی نے بتایا ہے کہ وہ......'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

''ہاں...... انہوں نے خود کچھ نہیں کیا۔ کسی سے کرایا ہے۔''

''مم...... مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ ثروت! شروع سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

اگلے پانچ دس منٹ میں ثروت نے اشک بار لہجے میں اور رُک رُک کر مجھے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

قریباً آٹھ دس روز پہلے ثروت کے بھائی ناصر کو کسی کام سے اسلام آباد جانا پڑا تھا۔ ان دنوں دو تین بار ثروت حسب سابق بس میں کالج گئی۔ ایک دن بس اسٹاپ پر واجی نے پھر ثروت سے بدتمیزی کی۔ اس نے دو تین شرمناک جملے کسے جس کے بعد ثروت بھی طیش میں آ گئی۔ اس نے اسے بُری طرح ڈانٹا، دھمکایا اور کہا کہ تم گندی نسل سے ہو۔

اس سے پہلے کہ لوگ اکٹھے ہو جاتے، واجی اپنی ڈبل سائلنسر موٹر سائیکل پر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ بہتر تھا کہ ثروت اس واقعے کے بارے میں گھر والوں کو یا پھر مجھے بتا دیتی لیکن وہ یہ سب کچھ پی گئی۔ اس نے اُمید کی کہ شاید اس واقعے کے بعد واجی کو عقل آ جائے گی اور وہ اس معاملے کو مزید خراب نہیں کرے گا۔

مگر یہ سب کچھ ''خیالِ خام'' ثابت ہوا۔ کل صبح ثروت کو پھر بس میں کالج جانا پڑا۔ شاید واجی اور اس کے ساتھی کسی ایسے ہی موقعے کی تاک میں تھے۔ جب وہ دوپہر کے وقت کالج سے واپس آ رہی تھی، اچانک دو ہٹے کٹے افراد نے اسے گھسیٹ کر اسٹیشن ویگن میں ڈال لیا۔ اس کے منہ پر ایک بدبودار رومال رکھا گیا۔ ثروت کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بالکل بیگانہ ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو شام ہونے والی تھی۔ وہ ایک نامعلوم کمرے میں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی رسّی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک فوم پڑا تھا اور کونے میں الماری رکھی تھی۔ ثروت کا سر بھاری ہو رہا تھا اور جی متلا رہا تھا۔ اس نے مدد کے لیے

پکارنا شروع کیا اور بند دروازے کو ٹھوکریں ماریں۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور واجی اندر آ گیا۔ اس نے ثروت کو دھکیل کر فوم پر پھینکا اور چاقو نکال کر اسے دھمکایا۔ اس کے ساتھ ہی بولا کہ وہ جتنا مرضی چلاّ لے، یہاں دور دور تک اس کی آواز سننے والا اور کوئی نہیں۔ ثروت کے ہاتھ رسّی کی سخت بندش سے نیلے ہو رہے تھے۔ واجی نے چاقو کی مدد سے رسّی کاٹ دی۔

ثروت نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے معافی مانگی۔ اس سے کہا کہ وہ اسے جانے دے۔ واجی نے جواب میں کہا کہ وہ ''گندی نسل'' کا ہے اور اس کا تھوڑا بہت ثبوت دیئے بغیر وہ اسے یہاں سے جانے نہیں دے گا۔

ثروت نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ بولا۔ ''میں بھی تو ایک سال سے تمہارے آگے پیچھے پھر رہا ہوں۔ تمہاری منت ترلا کر رہا ہوں لیکن تم ٹس سے مس نہیں ہوتی ہو۔ جس کے ساتھ گل چھرے اڑاتی ہو، اس میں کیا سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں جو ہم میں نہیں ہیں۔ باقی میں نے تمہیں یہاں رکھنا نہیں ہے۔ چھوڑ دینا ہے لیکن چھوڑنے سے پہلے تھوڑی سی سزا ضرور دینی ہے۔''

ان باتوں کے دوران میں ہی اچانک کہیں آس پاس پولیس گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ واجی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور نکلتے ہوئے دروازے کو باہر سے لاک کر گیا۔ تاہم وہ ثروت کے ہاتھ دوبارہ نہیں باندھ سکا تھا۔ کسی ساتھ والے کمرے سے اس کی آواز آئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ پھر وہ سارے افراتفری میں کہیں چلے گئے۔

ثروت مدد کے لیے زور زور سے چلاتی رہی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پولیس کی گاڑی اسے ڈھونڈے بغیر آگے نہ نکل جائے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ثروت کی مدد کے لیے کوئی نہیں آیا۔ گاڑی غالباً آگے نکل چکی تھی۔ ثروت کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ لاہور میں ہے یا لاہور سے باہر......اور یہ کون سی جگہ ہے۔

جب دروازہ پیٹ پیٹ کر اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور چلا چلا کر گلا بیٹھ گیا تو اس کو یوں لگنے لگا کہ شاید ارد گرد کوئی موجود نہیں مگر اس کی چھٹی حِس کہہ رہی تھی کہ کوئی موجود ہے۔ بس دم سادھے بیٹھا ہے۔ شدید پریشانی اور ہراس کے باوجود ثروت اپنا دماغ استعمال کرنے لگی تھی۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس کمرے سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے باہر آہنی گرل لگی تھی اور کسی اسٹور نما تاریک کمرے کی جھلک نظر آتی تھی۔ اٹیچ باتھ روم میں بھی ایک چھوٹی کھڑکی موجود تھی اور وہاں بھی مضبوط آہنی گرل لگی تھی۔

ثروت نے الماری کھولی۔ وہاں سے اسے چھوٹے دستے کی ایک ہتھوڑی مل گئی۔ وہ اس ہتھوڑی کے ساتھ کمرے کی کھڑکی کی گرل پر ضربیں لگانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس آہنی گرل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تاہم اسے اُمید تھی کہ اگر کوئی باہر موجود ہوا تو اس حرکت کے بعد سامنے ضرور آئے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ ثروت نے ہمت کی اور دروازے کے بالکل پاس کھڑی ہو گئی۔ ایک شلوار قمیص والا شخص رائفل بدست اندر داخل ہوا۔ ثروت نے اندھا دھند اس کے سر کے پچھلے حصے پر ہتھوڑی کی ضرب لگائی۔ اس ایک ضرب نے ہی جواں سال شخص کو زمین بوس کر دیا۔ یہ کوئی پٹھان چوکیدار تھا۔ ثروت اس کی طرف دیکھے بغیر باہر بھاگی۔ یہ ایک فیکٹری تھی۔ تین چار نامکمل بسیں یہاں وہاں کھڑی تھیں۔ ثروت کاٹھ کباڑ کے درمیان بھاگتی گیٹ تک پہنچی اور باہر نکل آئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ جی ٹی روڈ پر لاہور کے مضافات میں ہے۔ یہاں سے ایک خدا ترس کار والے نے اسے لفٹ دی اور راوی کے پل تک پہنچا دیا۔ وہاں سے رکشہ پکڑ کر وہ میرے پاس پہنچ گئی۔

میں نے ثروت کی یہ ساری رُوداد سنی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے، وہ اس نے من وعن مجھے بتا دیا ہے۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو رواں رہے۔ جب غنڈوں نے اسے اسٹیشن وین میں ڈالا تو ثروت کے جسم پر کئی خراشیں آئی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ اس کی یہ خونی خراشیں دیکھ کر میرا دل ہول گیا۔ میری نگاہوں میں واجد عرف واجی کا منحوس چہرہ گھومنے لگا۔ جی چاہا کہ میرے پاس پستول ہو اور میں اس کو گولیوں سے چھلنی کر دوں۔ شدید طیش کے عالم میں مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بدن لرزتا تھا اور سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹتے تھے۔ دماغ بہت کچھ کرنے کو چاہتا تھا مگر جسم ساتھ دینے سے انکار کر دیتا تھا۔

اس وقت بھی کچھ یہی عالم تھا۔ ہمیں گاڑی میں بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے واپس گھر کی طرف موڑ دی۔ دس منٹ بعد ہم گھر کے اندر تھے۔ ثروت کو دیکھ کر گھر میں تہلکہ مچ گیا۔ خالہ صفیہ نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا اور تشکر کے آنسوؤں سے بھگونے لگیں۔ باقی اہلِ خانہ بھی شدید حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں تھے۔ ثروت کو اندر کمرے میں پہنچایا گیا۔ اسے پانی وغیرہ پلایا گیا تا کہ وہ نارمل حالت میں آ سکے۔ کمرے میں ہجوم زیادہ ہو گیا تھا۔ خالو جان کے کہنے پر باقی افراد باہر نکل آئے۔ صرف خالہ صفیہ، نصرت، امی اور چچی وغیرہ وہاں رہ گئیں۔

ڈرائنگ روم میں جا کر میں نے خالو اور ناصر بھائی وغیرہ کو تفصیل بتائی کہ ثروت کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ کس طرح شاہدرے کے قریب ایک فیکٹری سے بھاگ کر یہاں پہنچی ہے۔ یہ انکشاف سب کے لیے تکلیف دہ تھا کہ یہ اسی محلے کے رہنے والے واجی اور قادر وغیرہ کا کام ہے۔

ناصر بھائی ایک دم آگ بگولا نظر آنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ اس بدمعاش کی طرف...... اسے لاش بنا کر ہی واپس آؤں گا۔''

وہ پستول لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ ہم سب نے انہیں بمشکل روکا۔ خالو جان نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ ہماری بچی صحیح سلامت واپس آگئی، اب ہمیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر معاملے کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ہم جو کریں گے قانون کے مطابق کریں گے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں تھانے جاتے ہیں۔''

خالو جان نے ایک دو جگہ فون کیے۔ میں نے بھی اپنے دوست زبیر کو بلا لیا۔ ہم تھانے پہنچے اور متعلقہ تھانیدار اشرف ساہی کو تفصیل کے ساتھ ساری بات بتائی۔ تھانیدار یہ سب کچھ ثروت کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ ثروت کا بیان لینے کے لیے وہ اسی وقت ہمارے ساتھ گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے۔ اسے سنبھلنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ اس دوران میں آپ اپنی کارروائی شروع کریں۔''

''آپ کی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ پر مجھے قانون قاعدے کے مطابق چلنا ہے۔ کارروائی مغویہ کے بیان کے بعد ہی شروع ہوگی۔''

مجبوراً ہمیں تھانیدار اشرف ساہی کو گھر لے جانا پڑا۔ میں اس کے پہنچنے سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی گھر پہنچ گیا اور ثروت کو بیان دینے کے لیے تیار کیا۔

تھانیدار کے آنے کے بعد بھی میں، خالو جان اور ناصر بھائی کمرے میں موجود رہے۔ بات کرتے ہوئے ثروت کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ بہرحال اس نے وہ سب کچھ تھانیدار اشرف کے گوش گزار کر دیا جو دو اڑھائی گھنٹے پہلے مجھے بتایا تھا۔

تھانیدار اشرف ساہی نے پوچھا۔ ''آپ نے واجد عرف واجی کو خود دیکھا ہے مگر اس کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟''

''میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں جی...... میں قادر اور ایک دوسرے لڑکے شکیل کی آواز اچھی طرح پہچانتی ہوں۔''

''تنگ تو آپ کو واجی کرتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی آوازیں آپ کیسے پہچانتی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! آپ وقت ضائع کرنے والے سوال کر رہے ہیں۔ وہ دونوں خبیث بھی واجی کے ساتھ ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ سب ایک ٹولی کی شکل میں تھے۔''

تھانیدار اشرف نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''تو جب یہ لوگ ان کو تنگ کرتے تھے آپ آس پاس ہی ہوتے تھے؟''

میں ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ایک دو بار ایسا ہوا ہے کہ ہم ریسٹورنٹ میں اکٹھے چائے پینے گئے اور یہ لوگ آدھمکے۔''

تھانیدار نے اپنے سوالات کا رُخ خوامخواہ میری اور ثروت کی طرف موڑ دیا۔ خالو عثمان اسے بمشکل واپس اصل موضوع پر لائے۔ بیان قلم بند کرنے کے فوراً بعد تھانیدار اشرف اپنے عملے کے ساتھ پیدل ہی واجی وغیرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک گلی چھوڑ کر یہ ایک دو منزلہ شاندار کوٹھی تھی۔ ہم نے ساتھ جانا چاہا مگر تھانیدار اشرف نے منع کر دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد پولیس کے اس چھاپے کا نتیجہ سامنے آ گیا اور یہ نتیجہ ہمارے خدشات کے عین مطابق تھا۔ گھر میں فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف تھانیدار اشرف ساہی خود تھا۔

اس نے خالو عثمان کو بلانے کا کہا۔ میں نے بتایا کہ وہ واش روم میں ہیں۔ تھانیدار اشرف نے کہا۔ ''چاروں لڑکے اپنے گھروں سے غائب ہیں۔ ہم انہیں ان کے دوسرے ٹھکانوں پر ڈھونڈ رہے ہیں۔ شام تک پوزیشن صاف ہو جائے گی۔''

''جو چوکیدار زخمی ہوا تھا، اس کا کچھ پتا نہیں چلا؟''

''ابھی تک نہیں۔ بہرحال ہم رابطے میں رہیں گے۔ جیسے ہی کوئی خبر ملی آپ لوگوں تک پہنچ جائے گی۔''

میں نے فون پر بات ختم کی ہی تھی کہ اندر سے خالہ صفیہ کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ میں اندر پہنچا۔ امی اور چچی کے علاوہ محلے کی ایک دو عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ خالہ صفیہ نے پوچھا۔ ''کس کا فون تھا؟''

''پولیس اسٹیشن سے تھا۔ انسپکٹر بتا رہا تھا کہ ہم لڑکوں کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

خالہ صفیہ نے اشک بار انداز میں کہا۔ ''تابش! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ پیسے والے بھی ہیں۔ ان سے دشمنی پڑ گئی تو جینا مشکل ہو جائے گا۔''

چچی کلثوم نے تنک کر کہا۔ ''ہائے ہائے...... کیسی بات کرتی ہو آپا! اب جس پر ظلم ہوا ہے وہ بولے بھی نہ۔ پھول سی بچی تھی ہماری۔''

''بچی تھی......'' کے لفظ چچی نے اس طرح ادا کیے کہ میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ایک محلے دار عورت بول پڑی۔ ''ایسے لوگوں پر تو کتے چھوڑ دینے چاہئیں۔ زندہ گاڑ دینا چاہیے۔ عورت کے پاس عزت آبرو کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ ہائے ظالموں کو ذرا ترس نہ آیا۔''

چچی نے بڑے تاسف سے ثروت کو سرتا پا دیکھا۔ ''بچی کو زخم زخم کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ ان بدمعاشوں کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی۔ اس جرم کی اتنی بڑی سزا؟ موت جوگوں نے ساری عمر کا رونا پلے باندھ دیا ہے۔''

ہمدردی کے اس انداز نے ثروت کو سر جھکا کر سسکنے پر مجبور کر دیا۔

ثروت کی چھوٹی بہن نصرت نے جھلا کر کہا۔ ''چچی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ آپا صحیح سلامت گھر واپس آ گئی ہیں۔ اللہ نے ہم پر کرم کیا ہے۔''

''اللہ کے کرم سے تو انکار نہیں ہے بیٹی! پر اپنے دل کو کیسے تسلی دوں؟ اس کی اُجڑی پجڑی صورت دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

میرا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ میں نے دبے دبے طیش سے کہا۔ ''چچی! آپ سب لوگ کچھ دیر کے لیے باہر بیٹھ جائیں۔ اسے ذرا آرام کرنے دیں۔''

چچی نے مجھے گھورا۔ میں پاؤں پٹختا ہوا باہر آ گیا۔

ان عورتوں کی باتیں میرے سینے میں تیروں کی طرح لگی تھیں۔ خاص طور سے چچی کی باتیں۔ میں چچی کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ چچی شروع سے ہی میرے اس رشتے کے خلاف تھیں۔ وہ میرے لیے اپنی سگی بھتیجی کو لانا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے درپردہ کوششیں بھی کی تھیں۔ اب یہ معاملہ ختم ہو چکا تھا مگر وہ بغض ابھی تک چچی کے دل میں موجود تھا۔ اب انہیں یہ موقع ملا تھا تو وہ اپنے اندر کی عداوت کو چھپا نہیں پا رہی تھیں۔ بظاہر انہوں نے ہمدردی کے بول بولے تھے مگر ان بولوں کے پیچھے جو دشمنی تھی، وہ زہرِ قاتل کی تاثیر رکھتی تھی۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ امی جان بھی ثروت کی واپسی کے بعد سے کچھ چپ چپ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک آدھ دن مزید یہاں رہیں گی اور ثروت کی دلجوئی کریں گی مگر وہ اگلے ہی روز طبیعت خراب ہونے کا کہہ کر گھر واپس چلی گئیں۔ کہنے

والوں نے درست کہا ہے کہ مارنے والوں کے ہاتھ پکڑے جا سکتے ہیں مگر بولنے والوں کی زبانیں نہیں۔ اگلے ایک دو روز میں مجھے صحیح معنوں میں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اگر کسی لڑکی کے ساتھ ثروت جیسی صورتِ حال پیش آ جائے تو اس پر کیا بیتتی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ ثروت جیسے گئی ویسے ہی واپس آ گئی تھی مگر ارد گرد کے لوگ یہ بات ماننے کے لیے دل سے تیار نہیں تھے۔

ثروت کے گھر میں اگلے روز میں نے پھر ایک عورت کو اس طرح کی بات کرتے سنا۔ یہ بھی کوئی محلے دار ہی تھی۔ شکل سے پڑھی لکھی لگتی تھی اور اپنی طرف سے اظہارِ ہمدردی کے لیے تشریف لائی تھی۔ اس نے رونی صورت بنا کر ثروت کو گلے سے لگایا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے کے بعد خالہ صفیہ سے بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں بہن کہ ظلم سہہ کر چپ رہنا بھی گناہ ہے۔ آپ اس معاملے کی پوری پیروی کریں۔ بچی کا ڈاکٹری معائنہ کرایا ہے آپ نے؟''

نصرت نے سٹپٹا کر کہا۔ ''آنٹی! ہم کیوں کرائیں ڈاکٹری معائنہ۔ کیوں اپنی بے عزتی کا اشتہار دیواروں پر لگائیں؟ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اللہ نے بڑا کرم ہے ہمارے اوپر۔''

''ہاں بیٹی! یہ تو بڑا کرم ہے کہ یہ زندہ سلامت واپس آ گئی ہے مگر ان بدمعاشوں نے جو کیا ہے اس کی سزا تو انہیں ملنی چاہیے نا۔ لڑکی ایک رات گھر سے باہر رہ آئے تو اس بیچاری کے پلے کیا رہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے، ڈیفنس میں ہماری برادری کی ایک لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ بیچاری یتیم تھی، پر اس کی ماں پوری ہمت کے ساتھ ڈٹ گئی۔ کہنے لگی کہ ہمارے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو گیا، پر اب ان غنڈوں کو پھانسی تک ضرور پہنچائیں گے۔ پتا نہیں اور کتنوں کا بھلا ہو جائے گا اس سے۔ اب وہ دونوں غنڈے جیل میں ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو سیشن کورٹ سے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔''

اس عورت کی گفتگو کے دوران میں ہی نصرت، ثروت کو لے کر باہر نکل گئی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید جھلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

دو روز بعد میں گھر گیا تو امی بجھی بجھی نظر آئیں۔

''کیا بات ہے امی! آپ چپ ہیں؟'' میں نے ناشتے کی میز پر پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس وہی...... ثروت کی طرف بار بار دھیان چلا جاتا ہے۔ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی لڑکی تھی۔''

''کوئی بات نہیں امی! پھر اسی طرح ہو جائے گی۔ ابھی تو شاک میں ہے نا۔''

"اسی طرح کہاں ہوا جاتا ہے تابش! جب اس طرح کی بات ہو جائے تو پوری زندگی پر اثر پڑتا ہے۔" امی نے طویل آہ بھر کر کہا۔

پھر وہ اُٹھیں اور الماری میں سے ایک دن پہلے کا اخبار نکالا۔ اخبار والے نے حسب روایت ثروت والی خبر کو خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کیا تھا۔ ثروت کی ایک پرانی تصویر بھی موجود تھی جو نہ جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس تین کالمی خبر کی سرخیاں پڑھ کر ہی میری رگوں میں انگارے سے بھر گئے۔ خبر نویس نے خبر کو دلچسپ اور سنسنی خیز بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ خبر کے آخر میں پولیس ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ مذکورہ فیکٹری کے ایک کمرے سے امپورٹڈ سگریٹ، انڈین شراب کی دو بوتلیں اور مووی کیمرہ وغیرہ بھی ملا ہے۔ ان شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاروں ملزمان مغویہ کی ویڈیو بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور ممکن ہے کہ یہ ویڈیو بنائی بھی گئی ہو۔ اس قسم کی اور بھی کئی باتیں خبر میں موجود تھیں۔

میں نے اخبار کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور ناشتہ کیے بغیر باہر نکل گیا۔ امی بھی میری کیفیت دیکھ کر گم صم کھڑی رہیں۔

○......❖......○

آج تھانیدار اشرف نے خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ کو مشورے کے لیے تھانے بلایا تھا۔ میں بھی اپنے دوست زبیر خان کو لے کر پہنچ گیا۔ تھانیدار اشرف سے کسی اچھی خبر کی توقع نہیں تھی اور ایسا ہی ہوا۔ پتا چلا کہ چاروں ملزمان میں سے ابھی تک کسی کا کھوج نہیں ملا ہے۔ دو تین پولیس پارٹیاں مختلف علاقوں کی طرف روانہ کی گئی تھیں جو ناکام واپس آئی تھیں۔ آخر میں تھانیدار اشرف نے سگریٹ سلگاتے ہوئے خالو عثمان سے کہا۔ "عثمان صاحب! کل ایک ایم این اے صاحب کا فون آیا ہوا تھا۔ ایم این اے مشتاق گورایا صاحب کا نام تو سنا ہوگا آپ نے؟"

خالو عثمان نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کا پریشان چہرہ کچھ مزید پریشان نظر آنے لگا۔ تھانیدار اشرف نے کہا۔ "ایم این اے صاحب کی خواہش ہے کہ یہ معاملہ مزید نہ بگڑے۔ وہ مانتے ہیں کہ لڑکوں سے ایک بڑا جرم ہوا ہے۔ اپنی بیوقوفی سے انہوں نے قانون کو پیچھے لگا لیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بچی صحیح سلامت گھر واپس پہنچ گئی ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی درمیانی راستہ نکال لیا جائے تو دونوں پارٹیوں کے لیے بہتر ہوگا۔"

ناصر بھائی نے چیخ کر کہا۔ "انسپکٹر صاحب! یہ کوئی زمین کے ٹکڑے کا جھگڑا نہیں جس میں دو پارٹیاں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ یہ اغوا کا سنگین ترین جرم ہے۔ ایم این اے صاحب

اس کا درمیانی راستہ کیا نکالیں گے۔ کیا ہمیں کوئی معاوضہ دیں گے؟ خدا کا خوف کرنا چاہیے انہیں۔ ہماری جو بدنامی ہوئی ہے اور ہم جس اذیت میں ہیں، اس کا مداوا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی تھوڑا بہت مداوا ہے تو یہی ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو۔ واجی اور اس کے یاروں کو ان کے کیے کی پوری سزا ملے۔"

تھانیدار اشرف کا گندمی چہرہ ایک دم سرخ ہوا پھر وہ ذرا تحمل سے بولا۔ "دیکھو برخوردار! مجھے تمہارے دُکھ کا احساس ہے لیکن مصیبت کے وقت عقلمندی اور حوصلے سے کام نہ لیا جائے تو مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانونی کارروائی تو ہو ہی رہی ہے، تم لوگ اپنے سامنے دوسرے راستے بھی کھلے رکھو۔ تمام راستے بند نہیں کرنے چاہئیں۔"

میں نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! اس طرح تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں لڑکے کہیں ایم این اے صاحب کے پاس ہی پناہ نہ لیے ہوئے ہوں۔"

"بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔" ناصر بھائی نے فوراً کہا۔ "اور لوگ اس طرح کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم ایم این اے صاحب سے بات چیت کریں گے تو بیوقوف ہی کہلائیں گے نا۔"

تھانیدار اشرف کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔ وہ خالو عثمان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو عثمان صاحب! آپ کے یہ لڑکے ہر بات کو اُلٹا لے رہے ہیں۔ آپ ان کو سمجھائیں ورنہ معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اس لیے یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔ سیٹھ سراج کو پتا ہے کہ ان کے بچے سے جرم ہوا ہے، اس لیے ان کی نظر نیچی ہے لیکن جب ان کو اپنے بچے کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی تو ان کا رویہ بدل جائے گا۔ وہ مثال تو آپ نے بھی سنی ہوگی کہ بلی کو جب اپنے بھاگنے کا کوئی رستہ نظر نہ آئے تو وہ گھیرنے والے کی آنکھوں کی طرف آتی ہے۔ میں خدانخواستہ آپ کو ڈرا نہیں رہا ہوں، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے کے ہر پہلو پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر خالو عثمان نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر منع کر دیا۔ یہ بات عیاں ہوتی جا رہی تھی کہ تھانیدار اشرف سا ہی مخالف پارٹی کا اثر قبول کر رہا ہے۔ یہ اثر دباؤ کی شکل میں ہو سکتا تھا اور لالچ کی شکل میں بھی۔

گھر میں بھی عجیب تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ یہ چوتھے یا پانچویں روز کی بات ہے۔ امی جان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میری چھوٹی بہن فرح کالج گئی ہوئی تھی۔ مجھ سے چھوٹا عاطف سویا ہوا تھا۔

امی جان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کہنے لگیں۔ "تابش بیٹا! پتا نہیں کیوں مجھے

لگتا ہے کہ ہم تیری خالہ صفیہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھا نہیں سکیں گے۔''

''آپ کس وعدے کی بات کر رہی ہیں؟''

امی نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔''دیکھو تابش! صفیہ رشتے میں میری بہن ہے مگر میں اسے سگی بہنوں کی طرح ہی سمجھتی ہوں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ثروت کو دلہن بنا کر اس گھر میں لاؤں۔''

میں نے لرز کر کہا۔''تو اب کیا ہو گیا ہے امی! کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟ ثروت اس گھر میں دلہن بن کر آئے گی اور ضرور آئے گی؟''

امی نے نفی میں سر ہلایا۔''تابش! تُو ابھی بچہ ہے، ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ دیکھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور ہم نے کون سا شامیانے لگا کر منگنی کی تھی۔ یا انگوٹھیاں پہنائی تھیں۔ بس ایک منہ زبانی بات ہی تھی نا۔''

''امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے منہ میں شاید چچی جان کی زبان آ گئی ہے۔ کیا...... منہ زبانی بات کوئی بات نہیں ہوتی؟ زبان پر تو لوگ جانیں دے دیتے ہیں۔ آپ کو اس طرح ہرگز نہیں سوچنا چاہیے۔''

''میں سوچنے پر مجبور ہو رہی ہوں تابش! ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم یہ رشتہ چھوڑ دیں۔ اب تُو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ۔ تیری چھوٹی بہن ہے، بھائی ہے۔ ہم نے اگلے ایک دو سالوں میں ان کے رشتے بھی ڈھونڈنے ہیں۔ ہم نے ثروت کا رشتہ کر لیا تو ثروت کے ساتھ ہی بدنامی بھی ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لے گی۔ پھر تیری بہن کے لیے یہاں کوئی رشتہ آئے گا اور نہ تیرے بھائی کو ڈھنگ کا رشتہ ملے گا۔''

''امی جان! خدا کے لیے...... خدا کے لیے یہ دقیانوسی باتیں نہ کریں۔ ثروت ویسی ہی ہے، جیسی دو ہفتے پہلے تھی۔ وہ پاک اور معصوم ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوا ہے امی! اور اگر خدانخواستہ کچھ ہو بھی جاتا تو اس کو معصوم ہی رہنا تھا۔ میں اسے بیاہنے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ آپ پلیز ایسی باتیں نہ کریں، میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔''

اسی دوران میں ایک ہمسائی ہمارے گھر میں داخل ہو گئی۔ وہ بھی غالباً ثروت والے واقعے پر ہمدردی جتانے کے لیے آئی تھی۔ مجھے اور امی کو خاموش ہونا پڑا۔

میں چکرایا ہوا سا اپنے کمرے میں آ گیا اور بے جان سا ہو کر بیڈ پر گر گیا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ امی جان کے رویے میں جو تبدیلی تھی وہی تبدیلی میں چھوٹے بھائی عاطف میں بھی دیکھ رہا تھا۔ ہاں چھوٹی بہن فرح کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ ثروت

سے بڑا پیار کرتی تھی۔ بہرحال، اس سانحے کے بعد سے وہ بھی کچھ چپ چاپ ہو گئی تھی۔ باقی رہے چچا، چچی اور ان کے بچے...... سو وہ کبھی اس رشتے کے حق میں ہوئے ہی نہیں تھے۔

مجھے اندیشہ تھا کہ اس طرح کی باتیں کہیں ثروت کے کانوں تک پہنچ گئیں تو وہ بہت زیادہ اثر لے گی۔ میرا دل چاہا کہ میں ایک بار اکیلے میں اس سے ملوں اور اسے ہر طرح اپنی غیر مشروط اور غیر متزلزل محبت کا یقین دلاؤں۔ یہ یقین ہی تھا جو اسے دُکھ اور مایوسی کے بھنور سے اُبھرنے میں مدد دے سکتا تھا۔

میں ابھی ثروت کی طرف جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر بیل ہوئی۔ چھوٹے بھائی عاطف نے باہر جا کر دیکھا اور مجھے بتایا کہ کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔

میں باہر پہنچا تو سات آٹھ معزز صورتوں والے افراد باہر گلی میں کھڑے تھے۔ میں نے ان سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔ ایک سفید ریش، بھاری تن و توش والے شخص نے کہا۔

''میرا نام حاجی فیروز ہے۔ شاہ عالمی بازار میں سیٹھ سراج میرا ہمسایہ ہے۔ یہ باقی لوگ بھی بازار کے ہی ہیں۔ ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

طوعاً و کرہاً میں نے ان حضرات کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ویسے بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ حضرات کس لیے تشریف لائے ہیں۔ جلد ہی مدعا حاجی فیروز کی زبان پر آ گیا۔ انھوں نے کہا۔''جو کچھ ہوا ہے، بہت بُرا ہوا ہے۔ ہم سب بہنوں، بیٹیوں والے ہیں۔ اس دُکھ کو بڑی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک طرف سے اللہ کا شکر بھی ہے کہ بچی صحیح سلامت گھر واپس آ گئی ہے۔''

میں نے کہا۔''حاجی صاحب! یہ بات ہم پہلے بھی بہت دفعہ سن چکے ہیں۔ آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف لفظوں میں کہیں لیکن اگر آپ یہ بات کہنے کے لیے آئے ہیں ہم سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے سے کسی طرح کی صلح صفائی کر لیں۔ تو یہ ایک نہ ہونے والی بات ہے۔ میں اس کے لیے آپ سے بہت بہت معذرت چاہتا ہوں۔''

حاجی فیروز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''دیکھو بیٹا! تم عثمان صاحب کے ہونے والے داماد ہو۔ اس گھر میں تمہاری بات سنی بھی جاتی ہے۔ عثمان صاحب اور دیگر گھر والے تو اس وقت زیادہ صدمے میں ہیں لیکن تم انہیں اس معاملے کی اونچ نیچ سمجھا سکتے ہو۔ اس طرح کے کیس جب کورٹ کچہری تک پہنچتے ہیں تو پھر جگ ہنسائی اور پریشانی کے بہت سارے موقعے نکلتے ہیں۔ پریس کا تو سب کو پتا ہی ہے، وہ ایسے معاملوں کو کس طرح اُچھالتا ہے۔

پھر عدالت میں جرح کے دوران عورت سے جس طرح کے سوال پوچھے جاتے ہیں وہ بھی سب جانتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ......''

''آپ اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی...... لیکن کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ شرمندگی اور جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے اس طرح کی ساری مظلوم لڑکیاں اپنی زبانوں کو تالے لگالیں اور ظلم کرنے والے سینہ تان کر دندناتے پھریں اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے لیے نئے نئے شکار ڈھونڈتے رہیں؟''

حاجی فیروز کے ساتھ آنے والے ایک معزز شخص نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔''تابش بیٹا! جرم کی سنگین نوعیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن سیٹھ سراج کا لڑکا عادی مجرم نہیں ہے۔ وہ بس بُری سوسائٹی کا شکار ہوا ہے۔ اگر اسے ایک بار سدھرنے کا موقع مل گیا تو وہ سدھر کر دکھا دے گا۔''

''سزا بھی تو سدھارنے کے لیے ہی ہوتی ہے چاچا جی!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''سزا تو بہت مل رہی ہے، اسے بھی اور اس کے گھر والوں کو بھی...... لیکن جس سزا کی تم بات کر رہے ہو، وہ کسی کو سدھارتی نہیں ہے بیٹا جی! جیل میں سے اچھے بھلے لوگ پکے مجرم بن کر باہر نکلتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم لوگ بہت بڑی نیکی کرو گے اگر ان لڑکوں کے لیے دل میں کسی طرح کی نرمی پیدا کر لو گے۔''

میں نے کہا۔''آپ سب مجھ سے زیادہ بڑے اور سمجھدار ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کے لیے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ہمارے زخم ہرے ہیں۔ آپ ان پر نمک نہ چھڑکیں تو بہتر ہے۔''

یہ بزرگ دس پندرہ منٹ تک مزید میرے پاس بیٹھے۔ وہ مجھے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ میں کم از کم ایک بار اپنے خالو عثمان اور سیٹھ سراج کی ملاقات کا اہتمام کر دوں۔ بہر حال، میں کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو رخصت کرنے میں کامیاب رہا۔

شام کو مجھے پتا چلا کہ یہ ''مصالحتی کمیٹی'' خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ سے بھی ملی ہے۔ تھوڑی محبت اور تھوڑے ڈراوے کے ساتھ انہوں نے خالو عثمان کو کیس کی پیروی سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

یہ بڑی تلخ صورتِ حال تھی۔ ایک گھرانے کو شدید ترین اذیت سے دوچار کرنے کے بعد اب اس کو دباؤ کا شکار بنایا جا رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کھول رہا تھا اور پورے جسم میں زہر بن کر پھیل جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ناانصافی کرنے والوں کی گردنوں تک اپنا ہاتھ

پہنچاؤں اور انہیں گھسیٹ کر چوراہوں میں لے آؤں لیکن ایسا کرنے کے لیے جو فطری ہمت اور توانائی درکار تھی، وہ میرے اندر نہیں تھی۔

اگلے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ میں ثروت سے ملنے خالو کے گھر پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ گھر میں نہیں ہوں گے۔ خالہ صفیہ کی اجازت سے میں ثروت کے ساتھ چند باتیں کر لوں گا۔

گم صم خالہ سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں ثروت کے کمرے میں پہنچا تو وہ چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ پر سرہانے کی طرف اس کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ یہ گھر کے پھولوں بھرے لان کا منظر تھا۔ وہ ہاف سلیو قمیص میں تھی اور واٹر پائپ کے ذریعے اپنے چھوٹے بھتیجے پر پانی پھینک رہی تھی۔ پانی کی پھوار کے پیچھے وہ خود کسی جل پری کی طرح نظر آتی تھی۔ ہوا سے اُڑتے بال، کلیوں جیسے دانت اور رخساروں پر ٹھہرے ہوئے پانی کے قطرے، جیسے گلاب پر شبنم کا بسیرا ہو۔ کتنی شوخی اور خوشی سمٹ آئی تھی اس ایک لمحے میں اس کے اندر۔ یہ میری پسندیدہ تصویر تھی اسی لیے ثروت نے اپنے بیڈ روم میں لگائی تھی۔

''ثروت!'' میں نے ہولے سے آواز دی۔

وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے چادر اپنے اوپر سے ہٹائی اور سوجی سوجی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تحیر نمودار ہوا اور وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے عقب میں پھولوں بھرے لان والی تصویر تھی۔ کتنا فرق تھا ان دونوں مناظر میں۔ ایک میں خوشی کا عروج، ایک میں مایوسی اور غم کی انتہا...... وہ دنوں میں ہی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔''کیسی ہو ثروت؟''

وہ سسکی اور منہ پھیر کر بولی۔''اب کوئی کسر رہ گئی ہے۔ جو تم نکالنے آئے ہو۔''

''کیوں...... کیا ہوا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جو کچھ ہوا ہے، تمہیں بھی ضرور پتا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری مرضی بھی اس میں شامل ہو۔''

''قسم سے ثروت! مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ کچھ بھی پتا نہیں۔''

''کل تمہاری امی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے امی سے پتا نہیں کیا باتیں کی ہیں وہ کل شام سے رو رہی ہیں۔ نہ کچھ کھایا پیا ہے، نہ کسی سے بات کرتی ہیں۔''

''لیکن پتا تو چلے ثروت! بات کیا ہوئی ہے؟''

''تم انجان بنو تو اور بات ہے۔ ورنہ تمہیں بھی اندازہ ہو گیا ہوگا؟''

ثروت نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنے گھٹنوں پر ماتھا ٹیکا اور چہرہ چھپا کر سسکیوں کے درمیان بولتی چلی گئی۔ ''میری طرف سے تم آزاد ہو تابش! میں تم پر کوئی روک نہیں لگاؤں گی۔ نہ گزرے دن یاد دلا کر تم سے کوئی شکوہ شکایت کروں گی۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ بس مجھے معاف کر دو۔ میں بدنصیب ہوں۔ خود کو تمہارے لائق نہ رکھ سکی۔ اب جو سزا مجھے ملنی ہے، وہ میں اچھی طرح جان گئی ہوں اور یہ بھی جان گئی ہوں کہ منت سماجت سے یہ سزا معاف نہیں ہونی۔ اس لیے میں قبول کرتی ہوں، سب کچھ قبول کرتی ہوں۔'' وہ روتی چلی گئی۔

میرا دل کٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ میں ثروت کی حساس طبع کے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ثروت! تم کسی کی باتوں پر نہ جاؤ۔ شادی میری اور تمہاری ہونی ہے اور یہ ضرور ہو گی۔ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ امی جان کو بھی وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

''میرے لیے کس کس سے لڑو گے؟ کس کس کی زبان بند کرو گے؟ میں تمہاری زندگی کو عذاب میں ڈالنا نہیں چاہتی تابش! تم وہی کرو جو تمہارے بڑے کہتے ہیں۔'' اس کا چہرہ بدستور گھٹنوں پر جھکا رہا۔

''ایسا نہیں ہوگا ثروت! اور نہ ہوتا ہے۔ ہاں...... یہ ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہونے میں تھوڑا سا وقت ضرور لگے گا۔ بس اس تھوڑے سے وقت کو ہم نے ہمت اور حوصلے سے گزارنا ہے تم دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میری طبیعت خراب ہے تابش! اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پلیز...... پلیز۔''

میری آنکھوں میں نمی تھی۔ میں اس کے ہاتھ کو تسلی بخش انداز میں تھپک کر باہر آ گیا۔ خالہ صفیہ اور نصرت وغیرہ میں سے کوئی میرے سامنے نہیں آیا اور نہ کوئی بات کی۔

میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آنے والا اس طرح کا واقعہ اس کی اور اس کے وارثوں کی زندگی میں اس طرح کا طوفان مچا سکتا ہے۔ میں بہت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ امی کچن میں تھیں۔ میرا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ ''کیا ہوا تابی؟'' انہوں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''یہ تو آپ بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں؟''

''آپ نے کل خالہ صفیہ کو فون کیا ہے۔ اس کے بعد سے ان کا رو رو کر برا حال ہے۔''

امی نے محبت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مجھے ایک طرف کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تابش! مجھ سے قسم لے لو جو میں نے کوئی ایسی ویسی بات کہی ہو۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں ابھی آ نہیں سکتی کیونکہ فرح کے پیپر ہو رہے ہیں۔ اس لیے مصروف ہوں۔''

''آپ ذرا خود سوچیں امی! جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے آپ صرف ایک دفعہ خالہ کے گھر گئی ہیں۔ فون بھی آپ نے بس ایک آدھ بار ہی کیا ہوگا۔ اگر اب خالہ صفیہ نے آنے کا کہا تھا تو آپ چلی جاتیں مگر آپ نے مصروفیت والی بات کہہ دی اور میں سمجھتا ہوں امی کہ بات سے بھی زیادہ وہ لہجہ اہم ہوتا ہے جس میں بات کہی جاتی ہے۔ آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ......''

''تابش! کوئی بات نہیں ہوئی۔'' امی نے تیزی سے میرا جملہ کاٹا۔ ''بس صفیہ محسوس زیادہ کر لیتی ہے۔''

''اگر آپ کو پتا ہے کہ وہ زیادہ محسوس کرتی ہیں تو پھر آپ کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ ان کی ذہنی حالت آج کل جیسی ہو رہی ہے آپ کو بھی پتا ہے۔''

امی خاموشی سے سبزی بناتی رہیں۔ ان کے چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''امی! آپ جو بھی سوچتی ہوں لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ میری مرضی کا خیال رکھیں گی۔ بچپن سے لے کر آج تک میرے لیے ہر چھوٹی بڑی چیز آپ نے ہی پسند کی ہے۔ ثروت کو بھی آپ نے ہی پسند کیا تھا۔ یہ آپ ہی کا دکھایا ہوا راستہ ہے جس پر میں چل رہا ہوں۔''

میں اُٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے بیڈ پر اخبار پڑا تھا۔ اس میں پھر سیٹھ سراج کے مفرور صاحبزادے اور ثروت کے بارے میں ایک مختصر خبر موجود تھی۔ خبر کے آغاز میں ہی یہ خیال آرائی موجود تھی کہ متاثرہ لڑکی ''ث'' کی دوستی ماضی میں واجد عرف واجی سے بھی ہے۔ میرا جی چاہا کہ اس اخبار کو جلا دوں اور اس کے ساتھ ہی اس دفتر کو بھی جہاں سے یہ اخبار شائع ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ کچھ نام نہاد صحافی شرفاء کی پگڑیاں اُچھالنے کے لیے اتنے مستعد کیوں ہوتے ہیں؟ میں سوچنے لگا کہ اگر اس اخبار والے کی اپنی بیٹی یا بہن کے ساتھ

اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہوتا تو کیا پھر بھی وہ اسی طرح کی سرخیاں جماتا؟

میں نے اخبار پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ امی جان تو ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ یقیناً یہ چچی یا چچا کا کام ہی تھا جو اتنے اہتمام سے یہ اخبار میرے بیڈ پر رکھا گیا تھا۔

کمرہ بند کر کے میں بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ ثروت کی ستی ہوئی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ چند ہی روز میں وہ کملایا ہوا پھول ہو گئی تھی۔ گزرے ہوئے دو سالوں کا ایک ایک لمحہ میرے تصور میں چمکنے لگا۔ پہلی دفعہ میں نے ثروت کو پورے دھیان سے شادی کی ایک تقریب میں ہی دیکھا تھا۔ اسی تقریب میں امی جان نے بھی اسے خاص نظروں سے دیکھا اور میرے لیے منتخب کر لیا۔ خالہ صفیہ اور پھر خالو عثمان وغیرہ سے بات ہوئی اور دونوں طرف سے ”ہاں“ ہو گئی۔ منگنی کی چھوٹی سی تقریب کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بہ وجوہ ٹلتا رہا۔ دراصل دونوں گھرانے ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ اس قسم کے کسی تکلف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

شروع میں ہمارے درمیان جھجک تھی۔ پھر عید کے موقعے پر میں نے ثروت کو ایک خوبصورت سا عید کارڈ بھیجا۔ ثروت نے بھی فرح کے ذریعے مجھے کارڈ ارسال کیا۔

اس کے بعد کبھی کبھی فون پر ہماری مختصر بات ہونے لگی۔ ثروت عام کالج گرلز کی طرح ایکسٹرا شوخ نہیں تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک طرح کا وقار اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کا یہی انداز مجھے زیادہ اچھا لگا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ دانائی اور سمجھ بوجھ رکھتی تھی۔ وہ خداداد ذہانت کی مالک تھی۔ انگلش اور اردو کی بے شمار شاعری اسے زبانی یاد تھی۔

دھیرے دھیرے فون پر ہماری گفتگو بے تکلف ہوتی گئی۔ پھر کبھی کبھی ہم گھر سے باہر بھی ملنے لگے۔ ہمارا ٹھکانا زیادہ تر شیزان ہوٹل یا شاہراہ قائداعظم کا ایک آئس کریم بار ہوتا تھا۔ ثروت ایک دھیمی لیکن مسلسل بارش کی طرح میری ذات میں سرایت کرتی چلی گئی۔ ہم نے سرما کی سنہری دوپہروں، بہار کی خوشبودار شاموں اور گرما کی چاندنی راتوں میں ایک ساتھ بہت سے خواب دیکھے۔ کبھی کبھی تو ہم مستقبل میں اس قدر کھو جاتے کہ اپنے گھر کا ڈیزائن اور اندرونی آرائش کی تفصیلات تک طے کرنے لگتے۔

یہ جیسے کل ہی کی آوازیں تھیں جو میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ہم ریسٹورنٹ کے پُرسکون ماحول میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ”مجھے ٹی وی لاؤنجز وغیرہ میں ذرا سا گہرا رنگ پسند ہے۔“

”اس معاملے میں میری پسند تھوڑی سی مختلف ہے۔ ٹی وی لاؤنج یا کامن روم میں مجھے

ایپل وائٹ بڑا اچھا لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہلکے سبز پردے ہوں اور فرنیچر میں بھی اس کلر کا ٹچ ہو۔“

”لیکن یار! یہ ہلکا رنگ گندا بڑی جلدی ہو جاتا ہے، خاص طور سے ٹی وی لاؤنج میں۔“

”تو بندہ ذرا احتیاط کر لے۔“ وہ چائے کی چسکی لے کر مسکرائی۔

”بندہ تو احتیاط کر لیتا ہے..... اور کرے گا بھی..... لیکن بچوں کا کیا کیا جائے۔ یہ تو چند ہفتوں بلکہ دنوں میں گلکاریاں کر دیتے ہیں۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرا گیا۔ اس نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”بچوں کو سکھایا جائے تو وہ سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ یہ بڑے ہی ہوتے ہیں جن کی عقل میں کوئی بات نہیں آتی۔“

”اگر بڑوں سے مراد میں ہوں، تو میں نے کون سی ایسی بے عقلی کی ہے؟“

”کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ ہر وقت تو ستاتے ہو۔“ وہ ہلکی سی شوخی سے بولی۔

میرے لہو میں میٹھا میٹھا درد جاگ اُٹھا۔ ”اچھا..... کوئی ایک بے عقلی تو بتاؤ۔“ میں نے لطف لینے والے انداز میں کہا۔

”ایک بے عقلی تو جناب اب بھی فرما رہے ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ ریسٹورنٹ میں آہستہ بولا کرو۔“

”زیادہ آہستہ بولنے سے بھی لوگ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا تو کام ہی شک کرنا ہے۔“

یہ اور اس طرح کی بہت سی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ پہلے والی ثروت کتنے عرصے میں واپس لوٹے گی اور لوٹے گی بھی یا نہیں..... میری رگوں میں اندھیرا سا اُترنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت حساس ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اس کے ارد گرد جو سرگوشیاں اُبھر رہی تھیں، وہ اسے مزید توڑ پھوڑ رہی تھیں۔

○.....❖.....○

واجی اور اس کے تینوں دوست ابھی تک لاپتا تھے۔ ان کا لاپتا ہونا بھی ہماری مایوسی میں اضافہ کر رہا تھا اور اس سے بھی بڑی مایوسی یہ تھی کہ مقامی پولیس کا رویہ حوصلہ شکن تھا۔ تھانیدار اشرف واضح طور پر ملزم پارٹی کی سائیڈ لے رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کل خالو عثمان اپنے دوست وہاب صاحب کے ساتھ تھانیدار اشرف سے ملنے گئے تو اس کے اے ایس آئی نے

ان سے درشت لہجے میں بات کی اور ڈیڑھ گھنٹہ باہر بٹھائے رکھا۔ بعد میں بتایا کہ اشرف صاحب ایک ضروری میٹنگ میں چلے گئے ہیں۔

میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا اور اپنی ہی سوچوں سے نبرد آزما رہا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے معاشرے میں کمزور آدمی کو انصاف حاصل کرنے کے لیے برف اور آگ کے سات سمندروں میں سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ وہ مظلوم و مضروب ہو کر بھی ڈرتا کیوں ہے؟ کیوں ہر دستک پر چونکتا ہے، کیوں ہر فون بیل پر اس کا دل ہولتا ہے؟ عدل کی زنجیر ہلانے سے پہلے اس کے ناتواں ہاتھ کیوں کانپ کانپ جاتے ہیں؟

اگلے روز میں ایک دفتر میں نوکری کے لیے انٹرویو دے کر واپس آ رہا تھا۔ گاڑی عاطف لے کر گیا ہوا تھا اس لیے میں پیدل ہی تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا، ہوٹل ذیشان کے سامنے سے نکلا تو ایک شخص نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ ”سنو بھائی جان!“

میں نے بائیں طرف دیکھا، ہوٹل کی پارکنگ میں ایک چمچماتی ہنڈا گاڑی کے قریب اس کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا۔ ”صاحب بلا رہے ہیں۔“ اس نے اپنے عقب میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ یہ سیٹھ سراج تھا۔ یہ سیاہ گاڑی بھی اسی کی تھی۔ سیٹھ سراج سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص میں تھا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا تاہم جسم کے مقابلے میں سر کافی چھوٹا تھا۔ گھنگریالے بالوں میں خوب تیل لگا کر رکھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ شخص چِٹا اَن پڑھ تھا۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بتیسی دکھا کر بولا۔ ”تمہارا نام تابش ہے نا؟“

”جی فرمایئے۔“ میں نے کہا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ اچھا اتفاق ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔“ وہ گلابی اردو میں بولا۔

”کہیے...... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”یہاں کھڑے کھڑے کیا خدمت ہو سکتی ہے، باؤ جی! تم سے ایک بہت ضروری گل کرنی تھی۔ اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو آؤ ذرا دو منٹ اندر بیٹھ جاتے ہیں۔“

”لیکن میں ذرا جلدی میں تھا۔ دراصل......“

”یار باؤ! یہ دراصل، لیکن، چنانچہ، اگر مگر سب بیکار کے لفظ ہیں۔ بس دو منٹ کی بات

ہے۔ چائے کا ایک کپ پیتے ہیں۔ پھر تم چلے جانا۔“

اس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر رکھ دیا۔ چاروناچار میں سیٹھ سراج کے ساتھ چلتا ہوا ہوٹل کے نیم گرم ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ اس ہوٹل کی اندرونی سجاوٹ گاؤں کے انداز کی تھی۔ یہاں جدید کھانوں کے علاوہ دیہات کے سارے پکوان بھی ملتے تھے۔ ہم رنگین پایوں والی نواڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ”جی کہیں...... آپ کو کیا کہنا ہے؟“

میری سنی اَن سنی کرتے ہوئے سیٹھ سراج نے بیرے کو بلایا اور کہا۔ ”بس وہی روز والا...... لیکن ڈبل۔“

بیرا ادب سے جھک کر واپس چلا گیا۔ سیٹھ سراج اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ وہ کام کی بات کی طرف آ جائے مگر وہ ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ کھانا آ گیا۔ کھانا کیا تھا، سات آٹھ آدمیوں کی خوراک تھی۔ چھوٹے پائے، روسٹ مچھلی، ہانڈی گوشت، کٹہ گوشت اور پتا نہیں کون کون سے گوشت۔ ساتھ میں نمکین لسی سے بھرا ہوا جگ اور تندوری پراٹھے وغیرہ۔

سیٹھ سراج کے بے حد اصرار پر میں نے چند لقمے لیے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس بھینسے کا لنچ جلد ختم ہو اور میں اس سے جان چھڑا کر باہر نکل سکوں۔ کھانے کے بعد نیپکن سے ہاتھ اور ٹھوڑی وغیرہ صاف کرنے کے بعد سراج نے دو طویل ڈکاریں لیں اور اچانک بولا۔ ”یار باؤ! تم شکل سے سمجھدار لگتے ہو۔ تم ہی اس معاملے کا کچھ کرو۔ منڈوں سے غلطی ہو گئی ہے، پر ہر غلطی کی کوئی مافی تلافی بھی تو ہوتی ہے نا۔ کورٹ کچہری میں جائیں گے تو ساروں کی بدنامی ہو گی اور لڑکی کی زیادہ ہو گی۔ وہ جیسے عثمان صاحب کی دھی ہے، ویسے ہی میری بھی دھی ہے۔ ہم اس بات کو اور بڑھانا نہیں چاہندے۔“

”بات تو اب بڑھ چکی ہے سیٹھ جی! جو بدنامی اب ہو رہی ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ہونی ہے۔ باقی رہی معافی تلافی والی بات تو اس کا آپ لڑکی کے وارثوں سے پوچھیں۔“

”پر تم اس گھر کے ایک اہم بندے ہو یار باؤ! تم کرنا چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔ اپنے خالو صاحب کو بہت کچھ سمجھا سکتے ہو۔ بدلے میں تم جو کام مجھ سے لینا چاہو میں حاضر ہوں۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے باؤ یار! وہ وڈے وڈیرے کہتے ہیں نا کہ ایک ہتھ دوسرے ہتھ کو دھوتا ہے۔“

میرا خون کھول اُٹھا لیکن میں بولا کچھ نہیں۔ سیٹھ سراج طاقت کے زعم میں مجھے اپنی را

پر لانا چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں سیٹھ کے ڈرائیور نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

''تہاڈی کال اے جی۔''

ان دنوں موبائل فون کم لوگوں کے پاس تھے۔ سیٹھ سراج نے کال اٹینڈ کی۔ ڈرائیور اٹین شین حالت میں پاس ہی کھڑا رہا۔ سیٹھ سراج کچھ دیر تک کال سنتا رہا اور ''ہوں ہوں'' کرتا رہا۔ آخر میں بولا۔ ''تم فکر نہ کرو ڈاکٹر صاحبہ! ہمارے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔''

فون بند کر کے اس نے ایک اور نمبر ملایا پھر بولا۔ ''ایم این اے صاحب سے بات کراؤ۔'' چند لمحے بعد ایم این اے مشتاق گورایا سے اس کی بات چیت شروع ہوئی۔ ''او جی کوئی سفارشی ٹٹو آگیا ہے گورایا صاحب! ڈاکٹرنی کی نوکری پکی ہوگئی تھی۔ اب اسے پیچھے ہٹا کر اپنی کسی پھوپھی چاچی کو آگے لانا چاہندا اے۔ آپ نے یہ کام نہیں ہونے دینا ہے کسی بھی طرح...... ٹھیک ہے...... ہاں جی ٹھیک ہے...... بالکل ٹھیک ہے۔ میں خود جاؤں گا۔ سلاماں لیکم۔''

گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے آدھا گلاس لسی پی اور مونچھیں صاف کر کے بولا۔ ''یہ اپنے گورایا صاحب بڑے کام کے بندے ہیں۔ اپنے شہر کی ساری نہیں تو آدھی نوکریوں پر ضرور ان کا زور چل جاتا ہے۔'' پھر وہ ذرا چونک کر خاموش ہوا اور بولا۔ ''ہاں...... مجھے ایک دن عثمان صاحب سے پتا چلا تھا کہ تم بھی نوکری شوکری ڈھونڈ رہے ہو؟''

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ ''آج کل گورایا صاحب کا ہتھ بہت اگے تک جا رہا ہے۔ اگر تم کہو تو میں آج ہی تمہارے بارے میں ان سے گل کرتا ہوں۔''

''مجھے ایسی سیاسی نوکری نہیں چاہیے جی جو اگلے الیکشن کے بعد چھوڑنی پڑے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ کھانے کے لیے بہت شکریہ۔'' میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یار باؤ! تم بڑے روکھے بولتے ہو۔''

''بس میں ایسا ہی ہوں۔ دراصل......''

''پھر وہی دراصل...... تمہیں کہا ہے نا یہ دراصل...... لیکن...... اگر...... مگر بولنے والے بندے مجھے زہر لگتے ہیں۔ سیدھی سیدھی گل کرنی چاہیے۔''

''کیا سیدھی سیدھی گل کروں؟''

''تم اس مالے میں کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟''

''جی نہیں۔''

''جی بھی...... اور نہیں بھی۔ تم دوغلی گل کر رہے ہو اور دوغلی گل کرنے والے بندے چنگے نہیں ہوتے۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ اس کی تیل سے چپڑی ہوئی تنگ پیشانی کے نیچے اس کی آنکھوں میں دو چنگاریاں سی چمکیں۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، وہ اپنے ڈرائیور سے بولا۔ ''چلو فتح محمد۔'' بیرے کو لمبی ٹپ دیتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں دوسرے دروازے سے بغلی سڑک پر آ گیا۔

سات آٹھ روز اسی طرح گزر گئے۔ صورتِ حال میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ جو دو افراد ثروت کو سڑک سے اُٹھانے والی کارروائی میں شریک تھے، ان کا پتا چل گیا۔ بادی النظر میں تو یہی پتا چلتا تھا کہ وہ کرائے کے غنڈے ہیں۔ انہیں اس کام کے لیے پندرہ ہزار روپے فی بندہ دیا گیا تھا۔ پانچ ہزار پیشگی، دس ہزار کام کے بعد ملا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انعام وغیرہ بھی تھا۔ ان دونوں افراد کے ساتھ تیسرا بندہ واجی کا یار ''قادر لمبا'' خود تھا۔

اسٹیشن وین بھی واجی وغیرہ نے ہی فراہم کی تھی۔ ان دونوں افراد کی نشان دہی پر پولیس نے واجی کے چوتھے ساتھی ابدال کو پکڑ لیا۔ پولیس نے ابدال کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات روزہ ریمانڈ لیا تھا لیکن ابھی تک اس سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا یا شاید پولیس نے نیک نیتی سے پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ابدال کا مؤقف تھا کہ وہ واجی وغیرہ کا دوست ضرور رہا ہے لیکن مذکورہ واردات میں اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔

ان سات آٹھ روز میں ثروت سے بھی میری ملاقات نہیں ہوسکی۔ ہمارے اپنے گھر میں بھی صورتِ حال کچھ کشیدہ سی تھی۔ امی اور فرح میرے لیے پریشان رہتی تھیں۔ ایک روز صبح سویرے گھنٹی بجی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ فون ثروت کے گھر سے ہے اور وہاں سے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

میرا اندیشہ درست نکلا۔ نصرت نے روتے ہوئے بتایا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں۔

یہ تشویشناک صورتِ حال تھی۔ خالو عثمان کو انجائنا کی ہلکی پھلکی تکلیف تو پہلے سے تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں انجیو گرافی کا مشورہ دیا ہوا تھا جسے وہ مسلسل نظرانداز کر رہے تھے۔

ہم بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے۔ اس وقت تک خالو عثمان اپنے خالقِ حقیقی سے مل چکے تھے۔ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ خالہ صفیہ بے ہوش تھیں۔ نصرت، ثروت اور ان کی پھوپھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ دیگر عزیز بھی اشک بار کھڑے تھے۔

ثروت کی پھوپھی جان زینب نے مجھے دیکھا تو روتے ہوئے کہا۔ ''میرے بھائی کو بچی کا دُکھ لے گیا۔ اللہ غارت کرے ان بدمعاشوں کو انہوں نے میرے بھائی کی جان لے لی۔ ہم کہاں انصاف مانگیں۔ کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔''

خالو عثمان کی تجہیز و تکفین کے دوران میں سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ خالو عثمان کو فجر کے وقت دل کی تکلیف شروع ہوئی تھی۔ وہ پہلے تو ہسپتال جانے سے کتراتے رہے پھر جب درد بڑھ گیا تو انہیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں پندرہ بیس منٹ کے اندر وہ ختم ہو گئے۔ میں نے خالہ صفیہ اور ناصر بھائی وغیرہ سے بہت پوچھا کہ کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ہوئی تھی جس کا خالو نے اثر لیا ہو۔ انہیں کوئی ایسی بات معلوم نہیں تھی۔ مگر میرے دل میں نہ جانے کیوں کھٹکا سا تھا کہ ثروت کے حوالے سے ہی کوئی خاص بات ہوئی ہے جس کا دُکھ انہیں پہنچا ہے۔ میرا دھیان بار بار تھانیدار اشرف ساہی اور سیٹھ سراج وغیرہ کی طرف ہی جاتا تھا۔

○……❖……○

خالو عثمان کی وفات کے بعد خالہ صفیہ بھی بستر سے لگ گئیں۔ انہیں مسلسل بخار ہو رہا تھا۔ یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ ناصر بھائی بینک میں ملازم تھے۔ اپنی ڈیوٹی میں سے وقت نکالنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ نصرت گھر کا کام کاج سنبھالتی تھی، ثروت خود بیمار ہونے کے باوجود ماں کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔ خالو عثمان ایک پرائیویٹ سروس کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چند سال پہلے تک وہ کیمیکلز کی فروخت کا کام بھی کرتے رہے تھے۔ ان کی تنخواہ آنی بند ہوئی تو گھر پر معاشی دباؤ بھی آ گیا۔ لیکن ان سارے مصائب سے بڑی وہ مصیبت تھی جو بدنامی کی صورت میں خالو مرحوم کے گھر پر مسلط ہو گئی تھی۔

ایک دن ناصر بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''یار تابش! کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ یہ گھر چھوڑ دیں۔ کہیں اور مکان لے لیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ مکان بیچ دیں؟''

''ہاں…… ایک گاہک بھی لگ رہا ہے۔ اچھے پیسے دے دے گا۔ میں اس جگہ سے کچھ الرجک سا ہو گیا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آتے جاتے سیٹھ سراج یا اس کے گھر کا کوئی اور فرد نظر آ جاتا ہے۔ ان لوگوں کو دیکھتا ہوں تو خون کھول جاتا ہے۔''

''سراج کی صورت تو مجھ سے بھی نہیں دیکھی جاتی۔ خالو کے جنازے پر آیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا، قبرستان میں ہی اسے پکڑ لوں اور مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں۔ میں تو کہتا ہوں یہی بندہ خالو کی موت کا ذمے دار ہے۔ یہ مسلسل انہیں ذہنی اذیت پہنچا رہا تھا۔''

''اب کس کس پر الزام دھریں۔ ایک طرف وہ ایس ایچ او اشرف ہے۔ وہ صاف طور پر ملزم پارٹی کی سائیڈ لے رہا ہے۔ پھر وہ ایم این اے گورایا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تینوں لڑکوں کو پناہ بھی اسی نے دی ہوئی ہے۔ کسی دن میں گھوم گیا تو پستول لے کر نکل جاؤں گا اور ایک ایک کو شوٹ کر دوں گا۔''

میں ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ شوٹ کرنے اور جان سے مارنے والی باتیں میں بھی کئی دفعہ سوچ چکا تھا لیکن ایسی سوچوں کو عملی جامہ پہنانا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور سے ہم جیسے لوگوں کے لیے۔ سوچ اور عمل کے درمیان بے شمار تاویلیں اور مصلحتیں آن کھڑی ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں ناصر بھائی اس معاملے میں مجھ سے بہتر تھے لیکن کوئی بڑا جھگڑا کھڑا کرنے یا کسی کو شوٹ کرنے کی حد تک وہ بھی نہیں جا سکتے تھے۔

ہم دونوں گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ہم بھاگتے ہوئے صحن میں پہنچے منظر دل دوز تھا۔ خالہ صفیہ سیڑھیوں کے قریب بے سدھ پڑی تھیں۔ ان کا سر ثروت کی گود میں تھا۔ ثروت مسلسل چلا رہی تھی۔ ''امی جی! آنکھیں کھولیں…… امی جی۔''

خالہ صفیہ کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور نچلا ہونٹ بری طرح پھٹ گیا تھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گری تھیں، قریب ہی صابن کی ٹکیہ اور چھوٹا تولیہ پڑا ہوا تھا۔

''انہیں ہسپتال لے جاؤ۔'' نصرت دل دوز آواز میں بولی۔

ہم نے خونچکاں خالہ صفیہ کو ہاتھوں میں اُٹھایا اور کسی نہ کسی طرح سوزوکی گاڑی تک پہنچایا، وہ گہری بے ہوشی میں تھیں۔ ثروت بھی والدہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے انہیں قریبی ہسپتال پہنچایا۔ راستے میں ثروت نے روتے ہوئے بتایا۔ ''نیچے کا ٹوائلٹ خالی نہیں تھا۔ وہ بخار کی حالت میں اوپر چلی گئیں اور واپس آتے ہوئے گر گئیں۔''

ثریا عظیم ہسپتال والوں نے کہا کہ ان کے سر پر چوٹ لگی ہے، انہیں فوراً جنرل ہسپتال لے جاؤ۔ وہاں ان کے سر کا سی ٹی اسکین وغیرہ ہو گا۔ ہم انہیں لے کر جنرل ہسپتال پہنچے۔

بہت بھاگ دوڑ کر کے سی ٹی اسکین ہوا۔ معلوم ہوا کہ دماغ میں خون کے دو لوتھڑے ہیں جو زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپریشن کی ضرورت ہے۔

اسی روز رات کو خالہ کا آپریشن ہو گیا لیکن وہ ہنوز بے ہوش تھیں۔ ثروت اور نصرت کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ ابھی باپ کی موت کا صدمہ تازہ تھا کہ یہ آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ خالہ صفیہ کی بے ہوشی طویل ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری پریشانیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ آخر ایک صبح ڈاکٹر نے یہ منحوس خبر سنائی کہ وہ قومہ میں چلی گئی ہیں۔

وہ اپنے اردگرد کے تمام دُکھوں اور مسائل سے پیچھا چھڑا کر بے ہوشی کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھتا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس عالم بے خبری میں بھی اپنی مصیبت زدہ بیٹی کے لیے دعاگو ہیں۔ ان کے لبوں کی خفیف لرزش کسی ایسی ہی دعا کی نشان دہی کرتی تھی۔

ہم بھی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان کی زندگی کے لیے، ان کی واپسی کے لیے......

ایک دن ناصر بھائی نے مجھے زبردستی گھر بھیجا تاکہ میں چند گھنٹے آرام کر لوں اور تازہ دم ہو جاؤں۔ شام کے وقت میں نے ناصر بھائی کو فون کیا اور پوچھا۔ ''میں کتنے بجے تک پہنچ جاؤں؟''

دوسری طرف سے چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ناصر بھائی پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

''وہ چلی گئیں تابش! وہ ہمیں چھوڑ گئیں۔''

میں پتھر کا بت بنا بیٹھا رہ گیا۔ تقریباً بارہ دن بے ہوش رہنے کے بعد وہ بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئی تھیں۔

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اس گھرانے پر دیکھتے ہی دیکھتے آفتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔ کسی وقت تو میں خود کو بھی بُری طرح ملامت کرنے لگتا۔ میں سوچتا کہ شاید آفتوں کے اس سلسلے کا سبب میں ہی بنا ہوں۔ میں نے گھر سے باہر ثروت سے ملنا جلنا شروع کیا۔ میں اسے ریسٹورنٹ میں بلاتا رہا۔ اس میل جول کی وجہ سے واجی بھی شیر ہوا اور شدت سے ثروت کے پیچھے پڑ گیا۔

میں ایک بار پھر ثروت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی جھیل سی آنکھوں کی چمک لوٹانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دُکھ بہت بڑے ہیں مگر میں دُکھوں کا یہ حصار توڑنا چاہتا تھا۔ دل کرتا تھا، میں اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بنا دوں۔ وہ میرے سینے میں چہرہ چھپا کر آنکھیں بند کر لے۔ میں اس کی طرف بڑھنے والے ہر رنج والم کا رُخ

موڑ دوں۔

خالہ صفیہ کے چالیسویں کے موقعے پر قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ امی تو قرآن خوانی کے بعد جلدی ہی واپس چلی گئیں، میں وہیں موجود رہا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح ثروت سے بات کرنے کا کوئی موقع مل جائے۔ فون تو وہ اُٹھاتی ہی نہیں تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں مَیں بیسیوں مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں گئی تو میں بھی کچھ دیر بعد اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ مصلے پر بیٹھی تھی اور سلام پھیر کر فارغ ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا چونک گئی۔ میں نے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ثروت! اگر میرا کوئی گناہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں ہر طرح کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''کسی کا کوئی گناہ نہیں۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' اس نے حسبِ سابق اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

''ثروت پلیز خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرو۔ ناصر بھائی بہت پریشان ہیں۔ اگر تم لوگ خود کو نہیں سنبھالو گے تو وہ بھی بکھر جائیں گے۔''

''میرے بس میں کچھ نہیں۔ اپنی جان لینا حرام ہے، ورنہ شاید ایسا کر لیتی۔''

''مایوسی بھی تو حرام ہے...... کفر ہے۔''

''پلیز تابش! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بھول جاؤ...... کہ کبھی کوئی ثروت تمہاری زندگی میں آئی تھی۔ اب ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے۔''

''لیکن ثروت......''

''پلیز...... خدا کے لیے...... خدا رسول کے لیے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میری تکلیف کو اور مت بڑھاؤ۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا خیال دل سے نکال دو جیسے تمہاری امی کہتی ہیں اور بڑے کہتے ہیں ویسا کر لو۔'' وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ اسی دوران میں نصرت کی آواز سنائی دی۔ وہ ''آپی...... آپی'' پکارتے ہوئے اوپر آ رہی تھی۔ میں آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات میں دیر تک دیوانوں کی طرح لاہور کی سڑکوں پر پھرتا رہا۔ میرے اندر ایک جوالا مکھی تھا۔ ایک جلتا ہوا لاوا تھا جو ہر قابلِ نفرت شے کو اپنے ساتھ بہا لے جانا چاہتا تھا۔ مگر میری جسمانی طاقت اور میری فطرت اس جوالا مکھی کی تاب نہ لا سکتی تھی اور نہ اس سے پھیلنے والی تباہی کی۔ اس رات سڑکوں پر گھومتے گھومتے میں نے کئی بار سیٹھ سراج کو قتل کیا۔ کئی بار

ایم این اے گورایا کی جان لی اور کئی بار تھانیدار اشرف کو بدترین انجام سے دو چار کیا۔ میرے جیسے لوگ ایسے حالات کا شکار ہو کر بھی کچھ کیا کرتے ہیں۔ اپنے تصورات کا سہارا لے کر دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کبھی سراب سے بھی پیاس بجھا کرتی ہے؟ اس سے تو ناتوانیوں کا دُکھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

کسی وقت دل چاہتا کہ خود فراموشی کا سہارا لوں۔ خود کو شراب میں یا کسی اور نشے میں غرق کرلوں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلے کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے یا پھر ویسے ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ کچھ عرصے کے لیے اردگرد سے ناتہ توڑ لوں۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل...... بس اس طرح کی لاتعداد سوچیں تھیں جو دماغ کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔

اسی دوران میں چند روز بعد مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مناسب جاب مل گئی۔ جاب ملنے سے جہاں خوشی ہوئی وہاں ایک طرح سے دُکھ نے بھی دل کو چیر ڈالا۔ ثروت کو میری جاب کا بڑا چاؤ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جب تم پہلے دن جاب پر جاؤ گے تو ہم اس موقعے کو سیلیبریٹ کریں گے۔ ریسٹورنٹ میں ہائی ٹی لیں گے اور پھر دریائے راوی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھیں گے۔

آج میری جاب کا پہلا دن تھا۔ مگر ریسٹورنٹ نہیں تھا، ہائی ٹی بھی نہیں تھی اور راوی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر بھی نہیں تھا۔ سب کچھ ایک دھندلکے میں گم ہو گیا تھا۔

اس شام میں اکیلا ہی شیزان ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ وہی میز تھی جہاں ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ دائیں طرف ایک گلدان رکھا تھا اور شفاف کھڑکی میں سے سڑک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ دل میں آس پیدا ہوئی۔ ''دلِ خوش فہم'' دور دراز کے امکانات کو ذہن میں لانے لگا۔ یقینی بات تھی کہ ناصر بھائی کے ذریعے ثروت کو بھی میری جاب کی خبر ہو چکی ہوگی۔ شاید اسے یہ بھی پتا ہو کہ آج میری ڈیوٹی کا پہلا دن تھا اور آج اس ریسٹورنٹ کی موسیقی بکھیرتی فضا میں...... ایک نیم تاریک گوشے میں ہم نے اکٹھے بیٹھنا تھا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے تھے اور ایک ساتھ مسکرانا تھا۔

میں سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ دیوانہ دل یہ سوچتا رہا۔ کیا پتا وہ آ جائے۔ اپنی گلابی پھولوں والی چادر کو سنبھالتی ہوئی، اپنے شولڈر بیگ کو بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے متوازن چال چلتی ہوئی۔ خزاں کے سارے رنگ ایک دم بہار کے رنگوں میں بدل جائیں۔

میری آنکھیں منتظر رہیں لیکن کوئی نہیں آیا۔ کسی کو آنا ہی نہیں تھا۔ جب فاصلے پیدا ہو

جائیں تو ایک گھر میں رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوتی۔ یہ تو پھر 60 لاکھ کی آبادی والا شہر تھا۔

میں نے اکیلے ہی چائے پی اور سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مایوسیوں کی دھند مجھے ڈھانپتی رہی۔

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ''السلام علیکم'' کسی نے دلکش آواز میں کہا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، سامنے آرسہ کھڑی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ آرسہ چچی سلطانہ کی وہی بھتیجی تھی جس کا رشتہ وہ ماضی میں مجھ سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ یہ لوگ پنڈی میں رہتے تھے۔ میں آرسہ کو یہاں دیکھنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''تم کب آئیں یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''آج ہی۔ جناب تو صبح کے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ اس لیے خبر کیسے ہوتی۔ ابو امی بھی ساتھ آئے ہیں۔ ابو کی چھٹیاں ہیں۔ اب ایک دو ہفتے آپ کے پاس رہیں گے اور آپ کا ناک میں دم کریں گے۔'' وہ چہکی۔

میرا واقعی ناک میں دم ہونے لگا۔ آرسہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم یہاں کیسے پہنچیں؟''

''میں فرح کے ساتھ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ اچانک ہماری نظر آپ کی گاڑی پر پڑ گئی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آپ یہاں بیٹھے ہوں گے۔'' اس نے بڑے ناز سے اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''فرح کہاں ہے؟''

''وہ سامنے رکشہ میں بیٹھی ہے۔'' اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں فرح اور آرسہ کو لے کر واپس گھر جا رہا تھا۔

آرسہ خوبصورت تھی لیکن اس کی خوبصورتی سورج کی طرح تھی۔ چمکیلی، بھڑکیلی اور کبھی کبھی جلاتی ہوئی۔ اس کا رنگ غیر معمولی سفید تھا۔ آنکھیں براؤن، بال شہد رنگ اور جسم منہ زور۔ وہ بڑی تیزی سے بولتی تھی۔

اس کا موازنہ ثروت سے کیا جاتا تو ثروت کی خوبصورتی کو چاندنی سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ بے شک چاندنی، دھوپ سے کم روشن ہوتی ہے لیکن اس کا ایک اپنا حُسن اور دھیما پن ہوتا ہے۔ ایک پُر وقار ٹھہراؤ، ایک ٹھنڈک اور ایک جذب ہو جانے والی صلاحیت۔ اس لیے آرسہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی اور اس کی یہ بے موقع آمد تو اور بھی بُری لگی۔

وہ پورے گھر میں دندنانے لگی۔ بلاوجہ میرے کمرے میں بھی آ جاتی تھی۔ خاص طور پر وہ آج کل والدہ کے اردگرد بہت گھوم رہی تھی۔ ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو میرا پورا کمرہ بڑی اچھی طرح سنورا سنبھالا ہوا تھا۔ آرسہ میرے ہی بیڈ پر اوندھی لیٹی انگلش میوزک پر ہولے ہولے پاؤں ہلا رہی تھی۔ اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔

میری چاپ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ کیا ہے آرسہ؟'' میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے ڈیئر! اور یہ میں ہوں۔'' وہ بستر پر نیم دراز ہو کر بولی۔

''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا آرسہ۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب میرے لباس سے ہے؟''

''میرا مطلب تمہاری ہر چیز سے ہے۔''

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرایا پھر وہ ڈھیٹ بن کر مسکرائی۔ ''پتا نہیں اس فقرے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

میں سٹپٹایا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ یونہی منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر باہر نکلا تو وہ جا چکی تھی۔

امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''یہ تُو کیا بول رہا تھا آرسہ سے؟''

''وہ میرے کمرے میں کیوں آ جاتی ہے؟''

''میں نے ہی کہا تھا اسے کہ ذرا تیرا کمرہ دیکھ لے۔'' امی نے کہا۔

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے امی کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

''امی! مجھے صاف صاف بتائیں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ کیوں باسی کڑی میں اُبال دے رہی ہیں؟ میں اتنا انجان نہیں ہوں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔''

''تابی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ وہ تو چند دن کے لیے یہاں آئی ہے پھر چلی جائے گی۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ اس کی طبیعت ذرا شوخ ہے۔ اگر اس نے......''

''مجھے ایسی شوخیاں نہیں چاہئیں امی!'' میں نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔

''پلیز......اسے کہہ دیں کہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ میں اس کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔''

''اچھا...... آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا۔ میں سمجھا دوں گی اسے لیکن آرسہ کے ابو امی کے پاس تو دو چار منٹ بیٹھ جایا کرو۔ وہ کیا کہیں گے کہ اچھے مہمان آئے ہیں۔''

''ان کے لیے چچی چچا کافی ہیں۔ میرے اپنے بہت سے مسئلے ہیں۔ کام کا بوجھ اتنا

زیادہ ہے کہ کئی دن سے خالہ صفیہ کے گھر بھی نہیں جا سکا۔ ان کا فون بھی نہیں ملتا ہے۔''

''فون تو میں نے بھی ایک دن کیا تھا۔ بس بیل ہوتی رہی۔''

''لیکن امی! کیا اگر فون نہیں ملے گا تو ہم ان کا اتا پتا ہی نہیں لیں گے؟ ہنستا بستا گھر تھا، ویران ہو گیا ہے۔ وہ تینوں بالکل بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ہمیں تو ہر گھڑی ان کی خبر رکھنی چاہیے اور...... آپ...... کہہ رہی ہیں کہ ایک دن فون کیا تھا۔''

ایک دم امی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ چپ سی ہو گئیں۔ پھر بولیں۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ کل ان کی طرف جائیں گے۔ فرح کو بھی لے جائیں گے۔''

''صرف جانے سے کچھ نہیں ہو گا امی! پہلے ہم سب اپنا ذہن صاف کر لیں۔ یہ بات اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھا لیں کہ ہمیں ان حالات میں ان لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑنا۔ ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو نبھانا ہے۔ ثروت وہی ہے جو آج سے چند ماہ پہلے تھی اور اگر خدانخواستہ اس واقعے میں اس کے ساتھ کچھ ہو بھی جاتا تو میرے لیے......'' میری آواز بھرا گئی اور میں فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

امی نے کہا۔ ''اچھا تُو دل چھوٹا نہ کر۔ ہم کل چلیں گے ان کی طرف۔''

''لیکن مجھے اس طرح نہیں جانا جس طرح ہم پہلے جاتے رہے ہیں۔ ہم ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں مزید گھبرا کر کے آ جاتے ہیں۔ جو کچھ اس بیچاری کے ساتھ ہوا ہے، وہ خدانخواستہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو کیا ہم اسے دھتکار پھٹکار کر ایک طرف رکھ دیں گے؟ اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے؟'' میرے سینے میں تپش تھی۔ میں بولتا چلا گیا۔

اس روز میرے اور امی کے درمیان آدھ پون گھنٹہ بات ہوئی۔ پتا نہیں کہ میں انہیں کس حد تک قائل کر سکا مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ ثروت کے ہاں خوش دلی سے جانے اور ان سے رابطہ برقرار رکھنے پر آمادہ ہو گئیں۔

اگلے روز گھر سے نکلنے سے پہلے فرح نے پھر ثروت کے گھر فون کیا۔ حسب سابق بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ ہم روانہ ہوئے۔ راستے سے ہم نے آئس کریم اور فروٹ وغیرہ لیا۔

ثروت کے گھر پہنچ کر دیر تک بیل دیتے رہے پھر گیٹ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔ ساتھ والے پڑوسی نے دروازہ کھولا۔ مجھے پہچان کر علیک سلیک کی پھر بتایا کہ ناصر صاحب اور ان کی فیملی تو یہاں سے جا چکے ہیں۔

"کہاں...... کب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تقریباً آٹھ دس دن ہو گئے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا؟ وہ تو کافی دن سے تیاری میں تھے۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"جرمنی...... غالباً فرینکفرٹ میں۔"

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ امی اور فرح بھی میرا منہ دیکھ رہی تھیں۔ سینے میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ پڑوسی نے کہا۔

"آپ آیئے نا...... ہماری طرف آ جایئے۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے کہا۔ "ان کا کوئی رابطہ نمبر وغیرہ؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ وہاں سے جا کر بھیج دیں گے لیکن ابھی تک تو نہیں آیا۔ آپ کونے والے پراپرٹی ڈیلر حاجی صاحب سے پوچھ لیجیے۔ شاید ان کا رابطہ ہوا ہو ناصر سے۔ کل ایک گاہک بھی آیا ہوا تھا حاجی صاحب کے پاس۔"

"کس چیز کا گاہک؟" میں نے پوچھا۔

"یہی ناصر صاحب کے گھر کا۔ وہ اس کی فروخت کے لیے حاجی صاحب ہی کو کہہ کر گئے ہیں۔"

"یعنی وہ مکان بھی بیچنا چاہ رہے ہیں؟" امی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی...... کچھ ایسا ہی سلسلہ لگ رہا ہے۔ شاید اب وہ جلدی واپس نہیں آئیں گے۔"

میں چکرا کر رہ گیا۔ میں نے پچھلے دنوں ایک دو بار ناصر بھائی کی زبانی یہ تو سنا تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑنا چاہ رہے ہیں لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہ ملک ہی چھوڑ جائیں گے اور وہ بھی اس طرح کہ کسی عزیز رشتے دار کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

ناصر بھائی سے چھوٹا حماس پچھلے تین چار سال سے جرمنی میں ہی مقیم تھا۔ وہ سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ ایک بار پہلے بھی ناصر بھائی سیر و تفریح کے لیے اس کے پاس جرمنی جا چکے تھے۔ والدہ کی وفات پر حماس جرمنی سے آیا تھا اور دس پندرہ روز رہ کر لوٹ گیا تھا۔ شاید انہی دنوں میں گھر کے اندر کوئی مشورہ وغیرہ ہوا تھا اور اب ناصر بھائی نے ثروت اور نصرت سمیت جرمنی کا رُخ کر لیا تھا۔

فرح نے پریشانی سے کہا۔ "مجھے تو یقین نہیں آ رہا بھائی! ایک دم...... بغیر کسی کو بتائے

ائے۔"

امی نے کہا۔ "یہ جو حاجی صاحب ہیں ان سے پوچھو۔ شاید کوئی اتا پتا دے گئے ں۔"

ہم نے حاجی صاحب سے پوچھا لیکن ان کے پاس بھی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی۔ م مایوسی کے عالم میں واپس ہوئے۔ گھر کے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچانک ری نظر گیٹ کے نچلے حصے کی درز میں گئی۔ اندر کی طرف ایک براؤن لفافہ سا پڑا ہوا تھا۔ ں نے گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گیٹ پر جا کر میں نے ہاتھ نیچے سے اندر گھسایا اور لفافہ نکال

گاڑی میں آ کر میں نے دیکھا، یہ کوئی عدالتی نوٹس تھا۔ ایڈریس میں مرحوم خالو عثمان کا م لکھا ہوا تھا۔ امی سے مشورے کے بعد میں نے لفافہ کھولا۔ یہ ایک سمن تھا...... تحریر سے پتہ لتا تھا کہ اس سے پہلے بھی دو نوٹس بھجوائے جا چکے ہیں جن کی تعمیل نہیں ہوئی ہے۔ سمن میں سی ایسے پلاٹ کا ذکر ملتا تھا جو خالو عثمان نے دکان کی تعمیر کے لیے حاصل کیا تھا لیکن عدازاں قانون شکنی کرتے ہوئے اسے فروخت کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ عدالت کے رُوبرو ھا۔

"پتا نہیں یہ کس پلاٹ کا ذکر ہے۔" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

امی نے تفصیل پوچھی۔ میں نے انہیں بتائی۔ امی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر جیسے انہیں یک دم کچھ یاد آیا۔ کہنے لگیں۔ "میرا خیال ہے کہ یہ...... وہ کیمیکل کی مارکیٹ والا پلاٹ ہو گا۔"

"کون سی مارکیٹ؟"

"دراصل یہ جھگڑا کوئی آٹھ دس سال پہلے شروع ہوا تھا۔ کیمیکل بیچنے والی دکانیں شہر ں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ گورنمنٹ نے کوئی سروے کیا تھا اور پھر ان سارے دکانداروں کو ام آبادی سے ہٹ کر ایک کھلی جگہ پر پلاٹ دیئے تھے۔"

"وہ کس لیے؟" فرح نے پوچھا۔

"تاکہ یہ خطرناک کام عام آبادیوں کے اندر نہ ہو بلکہ کسی کھلی جگہ پر کیا جائے۔ اس کام میں آگ وغیرہ لگنے کا خطرہ رہتا ہے نا۔" امی جان نے وضاحت کی۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے زیادہ تو پتا نہیں ایک بار یہ سنا تھا کہ عثمان کو بھی پلاٹ ملا تھا لیکن اس نے بعد میں

بیچ دیا۔ شاید یہ کوئی وہی چکر ہے۔''

ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ اس قسم کی بات میں نے بھی سنی تھی۔

وہیں پر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب ہم سڑک کا موڑ مڑ رہے تھے تو میں نے سیٹھ سراج کی سیاہ چمکیلی گاڑی دیکھی۔ وہ اپنے گھر کی طرف مڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پچھلی نشست پر اسی کی طرح کا ایک ہٹا کٹا شخص بیٹھا تھا۔ دونوں کسی بات پر کھل کر ہنس رہے تھے۔ سیٹھ نے مجھے نہیں دیکھا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ سینے میں ایک بار پھر وہی آتشیں لہر دوڑی جو میرے سراپا کو با[illegible]ر رکھ دیتی تھی۔

گھر آ کر میں دیر تک اس دردناک صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ ناصر بھائی جس طرح پاکستان چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ کسی سے رابطہ ہی رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ انہوں نے میرے کانوں میں بھی اپنی ''ہجرت'' کی بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی۔ شاید وہ یہاں سے اپنا ہر ناتا توڑنے کے خواہاں تھے۔

''کیا نہیں ایسا کرنا چاہیے تھا؟'' میں نے بہ زبان خاموشی خود سے کہا۔

اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔ ناصر بھائی کو کلی طور پر غلط بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہاں جس طرح جگ ہنسائی ہوئی تھی اور میڈیا نے جس طرح اس واقعے کو اچھالا تھا اور اس کے بعد قانونی کارروائی میں جس طرح کی دل شکنی ہو رہی تھی، ناصر بھائی کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا۔

تو کیا اب میں کبھی ثروت کو اپنا نہیں سکوں گا۔ اسے دیکھ نہیں سکوں گا؟ یہ سوال تیر کی طرح میرے سینے میں لگا اور نڈھال کر گیا۔

میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت میری نظر اس براؤن لفافے پر پڑی جو میں ناصر بھائی کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ میں نے لفافہ اُٹھا لیا اور سوچنے لگا کہ کیا جو پریشانیاں خالو عثمان کی بے وقت موت کا باعث بنیں، ان میں یہ پریشانی بھی شامل تھی؟

پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرنے لگا کہ اس پریشانی کا کچھ نہ کچھ تعلق ثروت والے واقعے سے بھی تھا۔ میں نے سمن کی تحریر کئی بار پڑھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ سارا کیا معاملہ ہے۔

اگلے روز میں ابو جان کے دوست وکیل سلیم جہانگیر صاحب سے ملا۔ انہوں نے میری پوری بات سننے کے بعد مجھے ایل ڈی اے کے ایک افسر صدیقی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ صدیقی کافی باخبر بندہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''گورنمنٹ نے کیمیکل کا کام کرنے والوں کو

علیحدہ پلاٹ الاٹ کیے تھے تاکہ وہ آبادیوں میں اپنا کام ختم کر دیں۔ ان لوگوں نے پلاٹ تو لے لیے مگر اپنی پرانی جگہوں پر کام بھی کرتے رہے۔ بعد ازاں کچھ لوگوں نے کیمیکل مارکیٹ کے وہ پلاٹ فروخت کر دیئے۔ ان میں یہ آپ کے خالو عثمان صاحب بھی شامل تھے۔''

''تو کیا ان پر کوئی کیس وغیرہ بن گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... کئی افراد پر کیس بنے۔ آپ کے خالو اور دو دیگر دکانداروں نے ایک مشترکہ وکیل کے ذریعے اپنا دفاع کیا۔ یہ معاملہ دب گیا اور پھر سرد خانے میں چلا گیا۔ مگر کچھ دن پہلے ایک صحافی صاحب نے اس معاملے کو پھر تازہ کر دیا۔ آپ کے خالو اور ان کے دونوں ساتھیوں کے خلاف انکوائری پھر شروع ہو گئی۔ میرے خیال میں یہ کام کسی نے بدنیتی اور دشمنی کی وجہ سے کیا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ صحافی کسی کے کہنے پر حرکت میں آیا تھا؟''

''میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔ آپ کل تشریف لائیں تو میں اس بارے میں آپ کو مزید تفصیل بتا سکوں گا۔''

اگلے روز میں صدیقی سے ملنے اس کے دفتر پہنچا۔ اس نے حسبِ وعدہ اس معاملے کی پوری تفصیل اکٹھی کر لی تھی۔ میرے بدترین خدشے حقیقت میں بدل گئے۔ اس سارے کام کے پیچھے ایم این اے گورایا کے ایک پی اے کا ہاتھ تھا۔ شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایم این اے گورایا کا تعلق سیٹھ سراج سے ثابت تھا اور سیٹھ سراج جس قسم کا شخص تھا، وہ میں دیکھ ہی چکا تھا۔ ذیشان ہوٹل میں اس نے مجھے جو زبردستی لنچ کرایا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکنے والی دو چنگاریاں بھی مجھے بھولی نہیں تھیں۔ وہ مجھ سے بڑے ٹھنڈے اور دوستانہ لہجے میں بات کرتا رہا تھا لیکن یہ چنگاریاں اس لب و لہجہ سے بالکل جدا تھیں۔ یہ چنگاریاں اپنے پیچھے ایک الاؤ کا پتا دیتی تھیں۔

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ نرم ڈپلومیسی میں ناکام ہونے کے بعد یہ لوگ خالو عثمان پر کسی ذریعے سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ آج اس دباؤ کا پتا چلا تھا اور یقیناً یہی دباؤ تھا جس نے آناً فاناً خالو عثمان کی زندگی چھینی تھی۔ نہ صرف ان کی زندگی بلکہ خالہ صفیہ کی بھی اور یہی نہیں بلکہ ایک ہنستے بستے گھر کو تالا بھی لگا دیا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے اَن گنت پریشانیوں کے ریلے میں بہہ کر تتر بتر ہو گئے تھے۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس پلاٹ والی اچانک پریشانی کے بارے میں خالو عثمان نے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

انہوں نے خود ہی سارا بوجھ اپنی جان پر لیا تھا اور اپنی حرکتِ قلب بند کر لی تھی۔

صدیقی کے انکشافات کے بعد میرے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ مجھے اپنے آپ سے اور اپنی ناتوانیوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ میں کیوں کچھ کر نہیں سکتا؟ جن لوگوں نے زیادتی کی ہے وہ میرے سامنے ہیں لیکن ان کے گریبانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے ہاتھ کانپ کر نیچے کیوں گر جاتے ہیں؟

یہ بہت سنگین موقع تو ضرور تھا لیکن ''پہلا'' نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بہت دفعہ ایسا ہوا تھا۔ مجھ سے ناانصافی ہوئی تھی لیکن میں قرار واقعی مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ مجھے بچپن کی دور کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی یاد تھیں جن کا نتیجہ اکثر میری شرمندگی اور پسپائی کی صورت میں ہی نکلا کرتا تھا۔ محلے کا ایک یونس ظفر نامی لڑکا اور اس کی ٹولی ابھی تک مجھے بھولی نہیں تھی۔ یہ لوگ گاہے بگاہے مجھ سے لڑائی مول لیتے تھے اور میری زندگی اجیرن کیے رہتے تھے۔ پھر سکول کے زمانے کے وہ چھوٹے بڑے واقعات جب عموماً مجھے اپنی فطری کم ہمتی کی وجہ سے ہی ندامت اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کالج کے دور میں مجھے اپنے وہ شریر پڑوسی بھی یاد تھے جو کرائے دار کے طور پر آئے تھے اور انہوں نے دوڈھائی سال تک ہمارا اور خاص طور سے میرا جینا حرام کیے رکھا تھا۔ بے شک لڑائی دنگا قابلِ تعریف بات نہیں ہے لیکن ایک عام شخص کی زندگی میں کئی موقعے ایسے آتے ہیں جب اس کی ساری ذہانت، سوجھ بوجھ اور فراست ایک طرف دھری رہ جاتی ہے۔ اس وقت اسے کسی تندخو کے ہاتھوں بے عزت ہونا پڑتا ہے یا پھر نگاہیں جھکا کر اور عرقِ ندامت میں ڈوب کر پسپا ہونا پڑتا ہے۔

میں نے اس سے پہلے جو مارشل آرٹ اور کراٹے کلب وغیرہ کا ذکر کیا تھا، اس کے پیچھے بھی میری یہی ناتوانیاں، محرومیاں اور ہزیمتیں وغیرہ عمل کرتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں جسمانی طور پر مضبوط ہو جاؤں گا تو میرے لیے نزاعی معاملات سے نمٹنا آسان ہو جائے گا اور موقع پڑنے پر میں کسی کے ''پنجۂ ستم'' کو مروڑ بھی سکوں گا۔ لیکن اب دھیرے دھیرے یہ بات میری سمجھ میں آئی تھی کہ مارشل آرٹ وغیرہ کی سرگرمیاں کسی لڑاکے کو تو مزید لڑاکا بنا سکتی ہیں لیکن کوئی ایسا شخص جس کی فطرت میں مار دھاڑ اور مارا ماری نہیں ہے، مارشل آرٹ کی اعلیٰ سندیں حاصل کر کے بھی ٹکراؤ اور مار کٹائی کی صورتِ حال سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

تازہ ترین مثال میرے سامنے تھی۔ موجودہ انکشافات کے بعد میرا دل چاہتا تھا کہ میں دندناتا ہوا سیٹھ سراج کے پلازہ پر پہنچ جاؤں۔ کچھ اور نہ بھی کروں تو کم از کم اسے گریبان سے ضرور پکڑوں، اسے جھنجھوڑوں اور پوچھوں کہ اس نے ظلم کے اوپر ظلم کیوں کیا؟ بیٹی کے اغوا

کے زخم نہیں بھرے تھے کہ اس نے باپ کی بھی موت کی سزا سنا دی۔

لیکن یہ کرنے کے لیے اور اس کے بعد کے دوسرے اقدام کرنے کے لیے جس ہمت اور سختی کی ضرورت تھی، وہ میرے اندر نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ میں سوچتا تھا اور اپنے ہی پسینے میں ڈوبنے لگتا تھا۔

اگلے روز میرے اندر کے طیش نے شدید ابال کی صورت اختیار کی اور میں سیٹھ سے بات کرنے کے لیے اس کے پلازے پر پہنچ گیا۔ میں اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا، نہ ہی کسی طرح کی مار کٹائی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میں اس سے اتنا ضرور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے خالو عثمان کے زخموں کا مداوا کرنے کے بجائے ان کی جان کیوں لے لی؟ اس بات میں اب شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ پلاٹ والا معاملہ صرف سیٹھ سراج کی وجہ سے ری اوپن ہوا ہے۔ بے شک اس پلاٹ والے معاملے میں چند سال پہلے خالو عثمان سے غلطی ہوئی تھی اور ایسی غلطی بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی غلطیاں تقریباً ہر شخص کی زندگی میں موجود ہوتی ہیں لیکن جو سزا خالو عثمان کو ملی تھی، وہ اس کے ہرگز حق دار نہیں تھے۔

میں نے اپنی گاڑی سیٹھ کے ''سراج پلازہ'' سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی اور سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح بات کروں اور بات کو کہاں تک محدود رکھوں کہ ہاتھا پائی تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

بے شک میں لڑنے کے لیے نہیں جا رہا تھا لیکن ایسے معاملات میں تلخ کلامی اور ہاتھا پائی کے درمیان بس ایک موہوم سی لکیر ہی ہوتی ہے۔ سیٹھ کے لیے میرے اندر جو طیش تھا، وہ میری جسمانی برداشت سے بہت بڑھ کر تھا۔ میں گاڑی کے اندر ہی اپنا لائحہ عمل مرتب کرتا رہا۔ جوں جوں میں سوچتا گیا، میرے طیش پر میرا اندرونی خوف غالب آتا گیا۔ بات بہت بڑھ گئی تو کیا ہوگا؟ تھانے کچہری تک چلی گئی تو کیا ہوگا؟ کیا میں سیٹھ کے رُوبرو ٹھیک سے بات کر پاؤں گا؟ کیا میرے اعصاب جواب تو نہیں دینے لگیں گے؟

میں جوں جوں سوچتا گیا، میری پیشانی پسینے سے تر ہوتی گئی۔ سینے میں دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں لرزش نمودار ہو چکی ہے اور اگر میں چل کر سیٹھ کی دکان کی طرف گیا تو لڑکھڑاتا ہوا جاؤں گا۔

یہ عجیب کیفیت تھی اور یہ ہمیشہ سے میرے ساتھ تھی۔ ''کیا بات ہے یار! کیا یہیں پر رات گزارنے کا ارادہ ہے؟'' کھڑکی میں سے آواز آئی اور میں چونک گیا۔

ایک درمیانی عمر کا شخص غصے اور طنز کی ملی جلی کیفیت سے گاڑی کی کھڑکی میں جھکا ہوا تھا

اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ''بھائی جی! کہاں پہنچے ہوئے ہو۔ گاڑی آگے کرو۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ عقب میں ہارن سنائی دے رہے ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میری گاڑی ذرا ترچھی کھڑی تھی اور عقب میں دو تین گاڑیاں راستہ ملنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''سس...... سوری جی۔'' میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے کر لی۔

جب میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے تو مجھے خود پتا چل جاتا تھا اور میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ اپنے تمام تر اندرونی طیش کے باوجود میں سیٹھ کا سامنا نہیں کر سکوں گا۔ اپنے ہی پسینے میں ڈوبا ہوا میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں نے بڑی تیز رفتاری سے گاڑی چلائی۔ کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ میرا مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ سخت کرب اور مایوسی کے عالم میں اپنی بند مٹھی پارک کے پتھریلے بنچ سے ٹکراتا رہا اور ہاتھ کی کھال چھیل لی۔ انگلیوں سے خون ٹپکنے لگا۔

تب ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھا اور آندھی طوفان کی طرح انارکلی پہنچ گیا۔ وہیں مارشل آرٹ کے کلب میں۔ دل و دماغ بڑی جذباتی بلکہ ہیجانی کیفیت میں تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ساری کم ہمتی اور ناتوانیوں کو اپنے اندر سے اُکھاڑ کر پھینک دوں۔ کچھ ایسا کروں کہ خود ختم ہو جاؤں یا پھر اپنی بے بسی کو ختم کر دوں۔ میں سوچنے لگا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو مارشل آرٹ میں فنا کر دوں؟ اتنی محنت کروں، اتنی اذیت جھیلوں کہ بس پتھرا جاؤں۔ پھر اس پتھر کو درد کا احساس رہے نہ کسی ہزیمت کا اندیشہ۔

میں گاڑی میں تھا اور جیسے فیصلے کی سولی پر لٹک رہا تھا۔ ان دنوں مجھے کلب چھوڑے ہوئے پھر تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ اب پھر کلب کا دروازہ میرے سامنے تھا اور میں اس کے اندر جانے کا تہیہ کر رہا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے تک یہ شدید جذباتی کیفیت جاری رہی پھر میں نے اپنے ہی خیال کو رد کرنا شروع کر دیا۔ ذہن نے معروضی انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے بھی تو کتنے موقعے آئے تھے جب میں نے پوری تن دہی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مارشل آرٹ سے ناتہ جوڑنے کا تہیہ کیا تھا۔ بڑے بڑے ارادے باندھے تھے لیکن ہوا کیا تھا؟ ہر بار جب کچھ وقت گزر گیا تھا، ذہن میں ہزیمت، طیش اور پسپائی وغیرہ کے اثرات مدھم پڑھے تھے۔

سارے ارادے اپنی طاقت کھونے لگے تھے اور آخر ختم ہو گئے تھے۔

''تو کیا اس بار بھی یہی ہوگا؟''

ذہن سے جواب آیا۔ ہاں...... اس بار بھی یہی ہوگا۔ تم وقتی طور پر فرار حاصل کر لو گے لیکن باقی کے سارے معاملات جوں کے توں رہیں گے۔ کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ میں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا تو مارشل آرٹ والی سوچ مجھے بچکانا لگنے لگی۔ تو پھر کیا کروں؟ میں نے بے زبان خاموشی خود سے پوچھا۔

O......❖......O

کوئی ایک گھنٹے بعد میں والد صاحب کے دوست ایڈووکیٹ سلیم جہانگیر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ کاغذات کا پلندا بھی تھا۔ سلیم جہانگیر کے ساتھ میری تفصیلی بات ہوئی۔ میں نے اس معاملے کے سارے قانونی پہلوؤں پر ڈسکس کیا۔ میں نے جہانگیر صاحب سے پوچھا کہ اگر ہم اس کیس کی تفتیش تبدیل کرانا چاہیں یا پھر واجی کے باپ پر کسی طرح کا مقدمہ کرنا چاہیں تو اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

ایڈووکیٹ جہانگیر صاحب نے جو طریقہ کار بتایا، وہ خاصا حوصلہ طلب تھا۔ اس میں وقت اور پیسہ دونوں کی وافر ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ جوابی کارروائی کے اندیشے بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ سیٹھ جیسا بندہ اپنے اوپر ہونے والے اٹیک کے بعد خاموش بیٹھا رہے گا۔

ایڈووکیٹ سلیم جہانگیر صاحب سے ملنے کے بعد جب میں گھر واپس پہنچا تو خود کو پہلے سے زیادہ نڈھال اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سیٹھ جیسے بندے کے خلاف قانونی چکروں میں پڑنا اور پھر ڈٹے رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ خاص طور سے اس صورت حال میں کہ مقدمے کے اصل مدعی بھی اب پاکستان میں نہیں تھے۔

رات کو کھانے کی میز پر سب ہی موجود تھے۔ آرسہ بھی آئی ہوئی تھی۔ ویسے تو وہ چچا چچی کی مہمان تھی لیکن کسی وقت فرح کے کہنے پر اوپر سے نیچے آ جاتی تھی۔ میرے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر امی بُری طرح چونکیں۔ ''یہ کیا ہوا تابش؟''

''کچھ نہیں امی! دفتر میں شیشہ لگ گیا تھا۔''

امی نے بیتابی سے ہاتھ دیکھا۔ ''لیکن ہاتھ تو سوجا ہوا ہے تمہارا؟''

''لگتا ہے کچھ چھپایا جا رہا ہے ہم سے۔'' آرسہ نے حسب عادت شوخ انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے گھور کر بیزار لہجے میں کہا۔

وہ مجھے نظر انداز کر کے امی سے بولی۔ ''آنٹی! لگتا ہے کہ تابش نے کہیں لڑائی شرائی کی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی دیکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

''واقعی کہیں لڑائی ہوئی ہے؟'' امی کی بے قراری بڑھ گئی۔ ''کہیں چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟''

''اوہو...... آپ پریشان نہ ہوں آنٹی! یہ مار کھا کر نہیں آئے، مار کر آئے ہیں۔ میرا تجربہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے مارا ہے کسی کو۔ جو مار کھا کر آتا ہے اس کی آنکھ یا ناک وغیرہ پر چوٹ لگتی ہے۔ جو مارتا ہے اس کے ہاتھ کے باہر کی طرف...... اب دیکھیں ذرا انہیں چوٹ کہاں لگی ہوئی ہے۔''

''تم بتاتے کیوں نہیں؟'' امی نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

آرسہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ''یہ میرے سامنے کچھ نہیں بتائیں گے اور ان کو غصہ بھی کافی آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ اُٹھ کر چلے جائیں، میں ہی چلی جاتی ہوں۔''

وہ فرح کو بائے کہتے ہوئے مڑی۔ وہ گھر میں بھی جینز پہنتی تھی۔ تراشیدہ بال شانوں پر لہراتے رہتے تھے۔

''امی! آپ اس کو کیوں بلاتی ہیں یہاں؟'' میں نے ترخ کر کہا۔

''میں نے بلایا تھا بھائی! غلطی ہوگئی، چلو معاف کر دو۔ ویسے بھی یہ لوگ منگل تک چلے جائیں گے۔'' فرح نے ایسی مسکینی سے کہا کہ میرا پارا کافی حد تک نیچے آ گیا۔

امی کی سوالیہ نظریں بدستور مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں اپنی چوٹ کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب رہا۔

یہ گہری مایوسی اور کرب کی گھڑیاں تھیں۔ میں رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ گھر کی چھت، راہداریوں اور بالکونیوں میں پھرتا رہا۔ سیٹھ کا تنومند چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آتا۔ اس کا تیل میں چپڑا ہوا سر، چھوٹی چھوٹی اجڈ آنکھیں اور آنکھوں میں دبی ہوئی دو چنگاریاں۔

اگلے روز میں اس امید پر ناصر بھائی کے سابقہ مکان پر گیا کہ شاید پراپرٹی ڈیلر حاجی صاحب کے پاس ناصر بھائی کی کوئی خبر ہو۔ ثروت کی دہلیز کے سامنے سے گزرا تو ایک عجیب سی اُداسی نے مجھے گھیر لیا۔ خالی مکانوں کو باہر سے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی مکین نہیں ہے اور...... در و دیوار ویرانیوں کے جالے ہیں۔ چھت اور بالکونیوں کی ویرانی دیکھ کر میرا دل ہولنے لگا۔ کبھی کوئی یہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا۔ چلمنوں کے پیچھے چھپتا تھا اور پھر ظاہر ہوتا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن، اس کی ہنسی، اس کی سرگوشیاں،

سب کچھ ان در و بام میں جذب تھا۔ مجھے لگا کہ یہ مکان بھی اپنے اچانک روٹھ جانے والے مکینوں کو میری طرح بے پناہ شدت سے یاد کر رہا ہے۔

میں حاجی صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کے پاس چند لوگ بیٹھے تھے۔ وہ چلے گئے تو میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔ ''ناصر بھائی کی کوئی خیر خبر آئی ہے۔''

''پرسوں ناصر کا فون آیا تھا۔'' حاجی صاحب نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بتا رہا تھا کہ وہ فرینکفرٹ کے پاس کسی قصبے میں ہے۔ اس کا بھائی بھی آج کل وہیں کسی فرم میں کام کر رہا ہے۔ اپنے گھر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک دو گاہک تو لگے ہیں لیکن ابھی پورے پیسے نہیں لگا رہے ہیں۔''

''اور کیا کہہ رہے تھے؟''

''بس کہہ رہا تھا کہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہاں کوئی چھوٹا فلیٹ خریدا ہے اس نے۔ اس کے پیسے دینے ہیں۔ اس کے علاوہ شاید اپنی بہن کی شادی وغیرہ بھی کر رہا ہے۔''

''شادی؟'' میرے سر پر جیسے ہزاروں وزنی بم پھٹ گیا۔

''ہاں...... ہاں...... وہاں کوئی پاکستانی فیملی ہے۔ بتا رہا تھا بڑے اچھے لوگ ہیں۔ کراچی کے رہنے والے ہیں۔'' وہ اپنی روانی میں بولتے چلے گئے۔

میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ان کی دو بہنیں ہیں نا...... کس کی بات کر رہے تھے؟''

''ابھی تو بڑی کی بات ہی کر رہے تھے لیکن...... بتا رہے تھے کہ بڑے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا رشتہ بھی ان کی طرف ہی ہو جائے۔ بڑے خوش تھے۔'' حاجی صاحب نے کہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولے۔ ''چلو اللہ نے کرم کیا ہے ان پر۔ یہاں تو ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہی ہے۔ نیک معصوم بچی کی خبریں اخباروں میں چھپ گئیں۔ مصیبتوں نے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ دو چار مہینوں میں گھرانا اُجڑ کر رہ گیا۔ اللہ پاک ہر ایک کو ایسی آفتوں سے بچائے۔''

حاجی صاحب بول رہے تھے اور ان کی آواز میرے کانوں تک جیسے کہیں بہت دور سے پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ ملک اب بھلے مانسوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ کسی کی پگڑی محفوظ نہیں۔ اللہ معاف کرے جس کسی کا ہسپتال یا تھانے کچہریوں سے واسطہ پڑتا ہے، اسے دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔''

وہ بول رہے تھے اور قرب و جوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ میں کب اپنی جگہ سے اُٹھا اور کب گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا، میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے اور ثروت کے درمیان فاصلہ پیدا ہوا پھر اس نے پاکستان چھوڑا اور اب ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے ہی نکل رہی تھی۔ یہ کس جرم کی سزا تھی جو مجھے مل رہی تھی۔ میں نے تو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ اسے اپنانے کے لیے میں ایک ایک دن گن کر گزار رہا تھا۔ اگر اچانک ایک ناگہانی واقعہ پیش آیا تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو اس کی خاطر پوری دنیا سے لڑنے کے لیے تیار تھا۔

پھر اس نے اتنی جلدی ہتھیار کیوں ڈال دیئے؟ کیوں اتنی سرعت کے ساتھ مجھ سے ہر ناتہ توڑ دیا...... مجھے ایک موقع بھی نہیں دیا۔ سزائے موت دینے سے پہلے مجھ سے آخری ملاقات بھی نہیں کی؟ اور ناصر بھائی...... اور دیگر لوگ...... وہ سب بھی پتھر ہو گئے؟

اگلے چوبیس گھنٹے میری زندگی کے مشکل ترین گھنٹے تھے۔ میں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب ڈوب گیا۔ امی میری حالت دیکھ کر سخت پریشان تھیں۔ وہ بار بار پوچھتی رہیں لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔

میری طبیعت کچھ سنبھلی تو تیسرے دن میں پھر حاجی صاحب کے پاس گیا۔ حاجی صاحب کو یہ تو پتا نہیں تھا کہ میں عثمان صاحب کی بیٹی کا منگیتر رہا ہوں۔ ہاں وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ناصر سے میری رشتے داری اور دوستی ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ حاجی صاحب کے پاس ناصر بھائی کا کوئی رابطہ نمبر آیا ہے یا نہیں؟

حاجی صاحب نے کہا۔ ''میں نے بہت پوچھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ کہتا تھا کہ میں خود ہی رابطہ کروں گا۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ اب یہاں سے ہر تعلق توڑ لینا چاہتا ہے۔ بس یہ مکان فروخت کرنے والی مجبوری ہے اس کے ساتھ ورنہ شاید وہ کبھی اپنی آواز بھی نہ سناتا۔''

''آپ کے فون پر ان کا نمبر نہیں آتا؟''

''نہیں...... بس انگریزی کا کوئی لفظ لکھا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کال سینٹر سے فون کرتا ہے۔''

''میں ان سے بس ایک بار بات کرنا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب! کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا ہے؟''

''میں اس سے بہت پوچھتا رہا ہوں کہ کب فون کرو گے۔ اس نے اس بارے میں بھی

کچھ نہیں بتایا اور میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہاری یا کسی اور عزیز رشتے دار کی آواز سن کر فون بند نہیں کرے گا۔ وہ تو مجھ سے یہاں تک یقین دہانی لیتا ہے کہ میں اس کی ''کالوں'' کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

''اگر مکان بک گیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟''

حاجی صاحب ذرا دیر کے لیے چپ رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ مجھے بتانا چاہیے یا نہیں پھر بولے۔ ''اللہ بخشے عثمان مجھ پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ ناصر بھی کرتا ہے۔ وہ مجھے مختار نامہ عام دے گیا ہے۔ میں اس کی جگہ پر کاغذ سائن کر سکتا ہوں۔ باقی رہی رقم کی بات تو وہ بینک کے ذریعے چلی جائے گی۔ وہ کوئی اکاؤنٹ نمبر بتائے گا۔ میں یہاں سے پے آرڈر بنوا دوں گا۔ یا پھر جیسے بھی وہ کہے گا۔''

اس روز حاجی صاحب کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ بات چیت ہوتی رہی۔ حاجی صاحب جہاندیدہ شخص تھے۔ وہ جلد ہی اس بات کی تہہ تک پہنچ گئے کہ میرے ساتھ عثمان صاحب کی بڑی بیٹی کی نسبت ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ اس صورتِ حال پر کچھ افسردہ بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھے کچھ سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کی۔ انہوں نے وہی کچھ کہا جو بزرگ ایسے موقعوں پر کہا کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی تقدیر کے دھارے میں بہنا پڑتا ہے۔ بندے کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں ڈھال لے۔

حاجی صاحب کے ساتھ گفتگو میں مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ثروت کی شادی غالباً ستمبر اکتوبر میں ہونی ہے۔

جو کچھ ہو رہا تھا بہت جلدی ہو رہا تھا۔ جیسے ایک تیز آندھی تھی جو ہر آس...... اُمید کو اُڑائے لیے چلی جا رہی تھی۔

دو دن میں...... میں بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ یوں لگتا کہ اندوہ کی شدت سے اب اس طرح بکھروں گا کہ کبھی جڑ ہی نہیں سکوں گا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ لوگ نشہ کیوں کرتے ہیں؟ کیوں خود فراموشی میں غرق ہو جاتے ہیں؟ اب ان سوالوں کا جواب مل رہا تھا۔ میں جو کبھی کسی نشے کے قریب نہیں گیا تھا، نشے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، کچھ ایسی شے ہو جو میرے احساس کی چھری کو کند کر کے مجھے دُکھ کے کچوکوں سے بچا لے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے سگریٹ کو ہاتھ لگایا اور ایک ہی رات میں کئی پیکٹ پھونک ڈالے۔ کچھ سکون بخش گولیاں بھی میرے پاس موجود تھیں۔ وہ میں نے اکٹھی

ہی تین چار کھالیں۔ بہت دیر تک بے قرار پھرتا رہا پھر رات آخری پہر نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دس گیارہ بج رہے تھے۔ لگتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ عاطف تو یقیناً کالج گیا ہوا تھا۔ امی اور فرح شاید بازار چلی گئی تھیں۔ میرا سر بھاری تھا اور حواس پر ابھی تک غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور آرسہ کی شکل نظر آئی۔ اس نے پتلون اور آدھے بازو کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ پیاز کے چھلکے کی طرح ہلکی پھلکی تھی اور ان پہناوؤں میں سے تھی جو جسم کو چھپانے کے بجائے نمایاں کرنے کا کام دیتے ہیں۔

میں نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ''آپ جناب کی آنکھ آخر کھل ہی گئی۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے بے رُخی سے کہا۔

''آپ کی امی جان آپ کو ساتھ لے جانا چاہتی تھیں لیکن پھر وہ اکیلی ہی چلی گئیں۔ فرح بھی ساتھ گئی ہے اور پھوپھی پھوپھا بھی۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''فوتیدگی ہوگئی ہے۔ شیخوپورہ میں آپ کی کوئی خالہ تھیں شاید۔ رشیداں نام تھا۔ کافی عرصے سے بیمار تھیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کن کا ذکر کر رہی ہے۔ انہیں امی بڑی آپا کہتی تھیں۔ وہ رشتے میں امی کی چچازاد تھیں۔ ''تو اب گھر میں کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس میں اور ممی! وہ بھی اوپر اے سی لگا کر اور لمبی تان کر سوئی ہوئی ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد گویا ہوئی۔

''آنٹی جاتے جاتے کہہ گئی تھیں، تابش سویا ہوا ہے جب جاگے تو اسے بتا دینا۔''

''اطلاع کا شکریہ۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''لیکن وہ کچھ اور بھی کہہ گئی تھیں۔ آپ کے کپڑے وہ استری کر گئی ہیں۔ اگر آپ کو ناشتہ واشتہ کرنا [illegible] میں تیار کر دیتی ہوں۔''

''نہیں...... میری طبیعت خراب ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔ میں اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ امی میرے نہ چاہنے کے باوجود اس آفت کو میرے سر پر مسلط کر دیتی تھیں۔

''اوہو...... کیا ہوا طبیعت کو؟'' وہ مزید اندر آتے ہوئے بولی۔

''سر میں درد ہے اور اب تم جاؤ پلیز۔'' میں نے سخت جھلاہٹ سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی واش روم کی طرف بڑھا۔

اچانک مجھے چکر سا آیا اور میں لڑکھڑا گیا۔ ایک کرسی سے ٹکرایا اور جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''اوہ گاڈ! کیا ہوا تابش؟'' آرسہ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر مجھے شانوں سے تھام لیا۔

''کچھ نہیں...... ذرا چکر سا آ گیا تھا۔'' میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر کو بلاؤں؟''

''نہیں...... نہیں...... ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' میں صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

وہ میرا سر دبانے لگی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر اس سے کہا کہ وہ جائے۔

''آپ آرام سے لیٹے رہو۔'' اس نے رعب سے کہا اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

ایک دم میرے جسم میں برقی لہر سی دوڑ گئی۔ میں سکتہ زدہ سا لیٹا رہا۔ حواس پر چھائی ہوئی غنودگی ایک سفید دھند کی طرح میرے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ آرسہ کے جوان جسم کی قربت نے جیسے ایک دم میرے دل و دماغ پر شب خون مارا۔ مجھے لگا کہ میں اندر سے ٹوٹ رہا ہوں، بکھر رہا ہوں۔ شاید مایوسی اور دُکھ کے بے پناہ بوجھ نے مجھے مسمار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری خاموشی نے آرسہ کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے میرا سر مزید اچھی طرح اپنے زانو پر لے لیا۔ وہ آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ میرے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ اس نے میری قمیص کے بٹن کھول دیئے اور میرے سینے کو بھی اپنے ہاتھ کے آتشیں لمس سے آشنا کیا۔ اس کی سانس میری سانسوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے کسمسا کر اپنا ہاتھ اس کے عریاں بازو پر رکھ دیا۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند گہری ہونے لگی۔ مرد اور عورت کی درمیانی کشش ایک آفاقی سچائی ہے۔ اس کشش کے سبب مرد و زن کی قربت اپنا راستہ خود تلاش کر لیتی ہے۔

تین چار منٹ بعد یہ صورتِ حال تھی کہ ہم دونوں صوفے کے قریب دبیز قالین پر ساتھ ساتھ لیٹے تھے۔ آرسہ نے مجھے بانہوں میں لیا ہوا تھا اور میرے ہونٹ اس کے تپتے چہرے پر بھٹک رہے تھے۔ ایک بار تکلف کے پردے اُٹھے اور جھجک کم ہوئی [illegible] تھی بکھرنے لگا۔ میں نے ''جوابی کارروائی'' کرتے ہوئے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ اسے بے طرح جھنجھوڑا اور بے ترتیب کر کے رکھ دیا۔ یہ محبت نہیں تھی۔ یہ مایوسی تھی۔ بدترین فرسٹریشن تھی۔ جب بندہ بکھرتا ہے تو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پستی میں گرنے لگتا ہے۔

میری اندھا دھند پیش قدمی دیکھ کر آرسہ سنبھلی اور مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''کوئی آ نہ جائے۔''

میں جیسے چونک کر رہ گیا، اس کے ساتھ ہی بہت خفت بھی محسوس ہوئی۔ وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلی گئی۔

ان لوگوں کو منگل کے روز واپس چلے جانا تھا مگر پھر ان کے قیام میں ایک ہفتے کا اضافہ ہوگیا۔ اب پتا نہیں کہ یہ اضافہ آرسہ کی خواہش پر ہوا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہر حال، چچی نے یہی بتایا کہ یہ لوگ اب اگلے سوموار کو واپس جائیں گے۔ میں مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا اور سکون بخش گولیاں بھی کھا رہا تھا۔ پہلے دن والے واقعے کے بعد آرسہ اکثر موقع دیکھ کر میرے کمرے میں چلی آتی تھی اور تھوڑی سی ''دھینگا مستی'' کر کے لوٹ جاتی تھی۔ زیادہ تر اسے دوپہر کو موقع ملتا تھا، جب فرح اور عاطف کالج میں ہوتے تھے اور امی سبزی وغیرہ لینے مارکیٹ جاتی تھیں۔

وہ میری ٹوٹ پھوٹ سے فائدہ اُٹھا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک آجاتی تھی۔ اس دن بھی وہ والدہ کے بازار جانے کے بعد میرے کمرے میں آگئی۔ میرے ذہن میں گولیوں کا غبار سا بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہو رہے تھے اور ہر طرح کے تفکرات دور کہیں کسی اوٹ میں چلے گئے تھے۔ وہ بڑے اشتعال انگیز لباس میں تھی۔ اب دس گیارہ بج چکے تھے لیکن اس نے ابھی تک ایک ہلکی سی میکسی پہنی ہوئی تھی۔ وسیع گریبان دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔

میں بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا پھر سگریٹ میرے ہونٹوں سے نکالتے ہوئے بولی۔ ''اچھے بچے سگریٹ نہیں پیتے۔''

''اچھے بچے کیا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھے بچے اپنی امی سے بات کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ وہ ساری پچھلی باتیں بھول بھال کر اب شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ میرے اوپر لدسی گئی۔

''لیکن اگر اچھے بچے شادی کرنا ہی نہ چاہیں تو؟''

''تو پھر ا[illegible] بچے پاس نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اس میں خطرے ہوتے ہیں۔'' وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔

میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''تو میں جاؤں؟''

''اس کا مطلب ہے آج تم جانے کے لیے آئی ہو؟''

''میں تو نہیں جا رہی..... آپ جناب مجھے بھیج رہے ہیں۔'' وہ ادا سے بولی۔

''میں کہاں بھیج رہا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی..... اسی وقت تم سے شادی کر

گزروں۔'' میں نے مخمور لہجے میں کہا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

تین چار منٹ ہم ایک دوسرے میں اُلجھے رہے۔ وہ ایک ماہر ''فنکار'' کی طرح آہستہ آہستہ میری پیاس بڑھاتی تھی اور پھر ایک دم سراب بن کر اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس کے قرب میں ایک آگ سی تھی۔ اس آگ میں جلتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے بار بار ثروت کی قربت یاد آجاتی تھی۔ ثروت کے لمس میں وہی چاندنی کی سی ٹھنڈک تھی جو دھیرے دھیرے دل پر اثر کرتی ہے اور روح میں اُتر جاتی ہے۔ وہ بے شک دھوپ جتنی روشن نہیں ہوتی مگر اس کا حُسن جدا تاثر رکھتا ہے۔ ثروت کے ساتھ تنہائی میں گزارے ہوئے وقت کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میری زندگی کا سرمایہ تھے۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ میں مزید ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ میں نے دفتر میں چھٹی کی درخواست بھیج دی تھی۔ اب پتا نہیں وہ منظور ہوئی تھی یا نہیں۔ میں سارا دن گھر میں پڑا اینٹھتا رہتا۔ اپنے لباس اور حلیے کی طرف سے بھی بالکل بے پروا ہو گیا تھا۔ کسی وقت فریج کھول کر کھانا شروع کر دیتا۔ گلے تک خوراک ٹھونس لیتا یا پھر کمرہ بند کر کے سی ڈی پلیئر پر اُلٹی سیدھی فلمیں دیکھتا رہتا۔ امی بہت پریشان تھیں۔ ایک روز ان کے اصرار پر میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہاں جرمنی میں عنقریب ثروت کی شادی ہونے والی ہے۔

یہ خبر سننے کے بعد امی مجھ سے نظر نہیں ملا سکی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اس میں ان کے رویے کا بھی عمل دخل ہے۔ وہ خود سے پشیمان دکھائی دیتی تھیں اور اندر سے بہت دُکھی بھی تھیں لیکن اب تو جو کچھ بھی تھا، کمان سے تیر نکل چکا تھا۔

ایک شام مجھے آرسہ کے قرب کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ عاطف کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ امی اور فرح بازار گئی ہوئی تھیں۔ اگر اس وقت وہ آجاتی تو کچھ وقت خود فراموشی میں گزارا جا سکتا تھا۔ درحقیقت ان دنوں میں ہوش و حواس سے بہت دور تھا اور اخلاقی حالت پست تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں آرسہ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر گیا۔ چچا چچی کی رہائش اس بالائی پورشن میں ہی تھی۔ سیڑھیوں کے درمیان ایک گیلری سی تھی۔ جب میں اس گیلری کے قریب سے گزرا تو اندر سے آرسہ کے بولنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ کسی سے موبائل پر مصروف گفتگو تھی۔ میں وہیں سیڑھیوں کی نیم تاریکی میں کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے کان لگا کر سننے لگا۔

وہ پنڈی میں اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں شوخی اور تمسخر تھا۔ وہ رازدارانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''جو کچھ ہوا ہے، پچھلے دس پندرہ دن میں ہوا ہے۔ یار! وہ کہتے

ہیں نا کہ جو شاخ جھکتی نہیں، وہ کڑچ کر کے ٹوٹ جاتی ہے۔''

کچھ دیر تک آرسہ دبی آواز میں ہنستی رہی پھر بولی۔''ہاں...... ہاں...... یار! پہلے تو یوں گردن اکڑا کر پاس سے گزرتا تھا جیسے شہزادہ چارلس سے بھی آگے کی شے ہو۔ پر اب ایک دم سیدھا ہوگیا ہے۔ دو دو گھنٹے کمرے میں میرا ویٹ کرتا ہے۔ جاتی ہوں تو پالتو بکرے کی طرح گردن جھکا کر سر میری گود میں رکھ دیتا ہے۔ ایک دم سرنڈر کر رہا ہے۔ ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... ابھی اور سیدھا کروں گی اسے۔ دو چار دن اور ہوں یہاں ایک دم PET بنا کر جاؤں گی۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ آرسہ سنتی رہی پھر جواب میں بولی۔''یار! تمہیں تو پتا ہی ہے۔ یاشر تو خود بھی فلرٹ کرتا رہا ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ قریباً دو مہینے سے تو ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے اس سے۔ اب تو سنا ہے کہ وہ بھی تیرے کاؤبوائے جمشید کی طرح انگلینڈ جا رہا ہے۔''

کچھ دیر تک آرسہ دبی دبی آواز میں ہنستی رہی۔ پھر شاید بیلنس ختم ہوگیا یا بیٹری جواب دے گئی۔ وہ ''ہیلو فریال...... ہیلو فریال......'' کہہ کر خاموش ہوگئی۔

میں جلدی سے سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ آرسہ کے الفاظ زہریلے تیروں کی طرح کانوں کو زخمی کر رہے تھے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اپنی دوست سے میرا ہی ذکرِ خیر کر رہی تھی۔ مجھے کبھی بھی یہ خوش فہمی نہیں ہوئی تھی کہ آرسہ میرے ساتھ شروع ہونے والے ''ہیجانی تعلق'' میں مخلص ہے۔ لیکن اب اپنے کانوں سے اس کی باتیں اور اس کا لب و لہجہ سن کر سینے میں آگ سی بھڑک گئی۔

جی چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو تو میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ ان دنوں میں جس شدید ہیجان اور اخلاقی گراوٹ کے دور سے گزر رہا تھا۔ میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس رات میں نے معمول سے زیادہ ٹیبلٹس لیں اور معمول سے زیادہ سگریٹ پھونکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شراب وغیرہ تک میری پہنچ نہیں تھی، نہ ہی کوئی اس طرح کا دوست تھا ورنہ ہو سکتا ہے کہ ان دنوں یہ ''خانہ خراب'' بھی میرے منہ کو لگ جاتی۔

اگلے روز دوپہر کو آرسہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس کا انداز ہمیشہ کی طرح بے باک تھا۔ وہ حسبِ معمول مجھے اپنے لمس سے آشنا کرتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھ پر زور دیتی رہی کہ میں اپنے گھر والوں سے بات کروں۔ وہ بھی اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرے گی اور یوں ''محبت میں ترسے ہوئے دل'' ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ میں خاموشی

سے اس کی منافقانہ باتیں سنتا رہا اور دل ہی دل میں کھولتا رہا۔

میرے ساتھ تنہائی میں اس کی حرکات و سکنات نہایت گھاگ لڑکیوں جیسی ہوتی تھیں۔ اس سے پہلے نہ جانے وہ کہاں کہاں منہ مار چکی تھی۔ کسی وقت تو میری چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگتی تھی کہ وہ ایک آبرو باختہ لڑکی ہے۔

اگلے روز وہ پھر آئی۔ جوں جوں اس کے جانے کا دن قریب آرہا تھا، وہ واشگاف ہوتی جارہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ مجھ سے شادی کے بارے میں کوئی پختہ عہد و پیمان لے لے۔ میں بھی اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے لگا۔ آج والدہ کو بازار سے مہینے بھر کی شاپنگ کرنا تھی، ہمارے پاس ٹائم بھی زیادہ تھا۔ ہم نے قربت کے سفر میں کئی مرحلے تیزی سے طے کیے۔ وہ مجھے ایک ایک سیڑھی چڑھنے کا موقع دیتی تھی اور ہر سیڑھی پر اپنی قدر و قیمت میں اضافے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس نہایت جذباتی و سنگین ملاقات میں ایک موقع ایسا آیا کہ وہ میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی حیثیت اختیار کرنے پر نیم آمادہ ہوگئی۔ ایسی کتاب جس کو میں جہاں سے اور جتنا چاہے پڑھ سکتا تھا لیکن اسی دوران میں بازار سے امی کا فون آگیا کہ سامان زیادہ ہے۔ میں گاڑی لے کر آجاؤں اور انہیں لے جاؤں۔ یہ بڑا ''بے موقع'' فون تھا۔ سارا ٹیمپو دھرا رہ گیا۔ ہمارے درمیان طے ہوا کہ ہم کل گیارہ بجے کے فوراً بعد پھر ملیں گے۔

انسان کے اپنے ارادے ہوتے ہیں اور قدرت کے اپنے...... اور ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ عجیب سی صورتِ حال رہی۔ رات تک تو مجھے اگلے دن کی ملاقات کا شدید انتظار رہا۔ جسم میں سنسناہٹ جاگتی رہی اور سفلی خیالات دل و دماغ کو اتھل پتھل کرتے رہے لیکن صبح جب میں سو کر اُٹھا تو اندرونی کیفیت کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی۔ اس تبدیلی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ علی الصبح میری نگاہ کیلنڈر پر پڑی۔ آج ثروت کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن کی نسبت سے ایک دم مجھے بہت کچھ یاد آیا اس کے ساتھ ہی ثروت کی پچھلی سالگرہ کا دن نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ہم اس روز دریائے راوی پر گئے تھے۔ عاطف، فرح اور ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بھی ہمارے ساتھ تھی۔ یہ چاندنی رات تھی۔ ہم نے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دور تک کشتی چلائی تھی۔ پھر ایک ریتلے کنارے پر ٹھہر گئے تھے۔ باقی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے تھے، ہم ان کی اٹھکیلیوں سے ذرا دور دریا کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔ دریا کے پس منظر میں چاند کے اُبھرنے کا منظر دلآویز تھا۔ ثروت نے ٹیپ ریکارڈر پر اپنا پسندیدہ گیت لگا دیا تھا۔

مجھے دل سے، نہ بھلانا..... چاہے روکے یہ زمانہ
تیرے بن میرا جیون کچھ نہیں ...... کچھ نہیں

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ بڑی نرمی سے میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا۔ اس کے لمبے خوشبودار بال گیلی ہوا سے اُڑ رہے تھے اور میرے چہرے کو چھو رہے تھے اس ماحول میں اس گیت نے جو اثر کیا وہ بیان سے باہر تھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، میری ہی طرح آج کے دن کو یاد کر رہی ہے۔ نم ریت، دریا کی لہریں اور اُبھرتے ہوئے چاند کی کرنیں اس کے تصور میں بھی چمک رہی ہیں اور شاید وہ گیت آج بھی اس کی زبان پر ہے۔ مجھے دل سے نہ بھلانا..... چاہے روکے یہ زمانہ۔

پُرحرارت سفلی جذبات کی جگہ میرے دل میں عجیب سا حزن آمیز گداز اُترنے لگا۔ آرسہ کی چمکیلی بھوری آنکھوں کی جگہ ثروت کی سیاہ جھیل آنکھیں، نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ ان آنکھوں کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے لگا میں بھٹک رہا ہوں۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا آرسہ سے نہیں ملنا چاہیے؟''

لیکن آرسہ سے نہ ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سفلی جذبات کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے اور جب پانی اتنا قریب ہو تو پیاس کا صحرا زیادہ دیر تک برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں جیسے ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ امی نے مجھے بیرونی دروازے کے قریب دیکھا اور گھبرا کر پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو تابی؟''

''ذرا کام ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''ناشتہ نہیں کرو گے...... اور...... ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو کیا باہر جانے والا حال ہے تمہارا؟''

''بس جو حال ہے، یہ آپ لوگوں نے ہی کیا ہوا ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور باہر نکل آیا۔

بازار میں کچھ آگے جانے کے بعد میں نے ایک جنرل اسٹور سے جوس لیا اور اس جوس کے ساتھ سکون بخش (Sedative) میڈیسن کی تین چار گولیاں نگل لیں۔ جنرل اسٹور کے ہی ایک آئینے میں میں نے اپنی صورت دیکھی۔ امی ٹھیک کہتی تھیں۔ واقعی میرا حلیہ بدترین تھا۔ آنکھیں سرخ، شیو بڑھی ہوئی، بال اُلجھے ہوئے اور لباس شکن شکن۔

میں گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ پارک پہلے کافی

وسیع تھا لیکن اب بے شمار دوسرے پارکوں کی طرح اسے بھی ایک طرف سے قبضہ گروپ کے عفریت نے نگلنا شروع کر دیا تھا۔ میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس طوفان کی لہروں میں سے اپنے دل کی کشتی کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا جس نے مجھے چاروں سے گھیر لیا تھا۔

گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ گیارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق آرسہ نے گیارہ بجے مجھ سے ملنے آنا تھا۔ اس ملاقات کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ بھی سمجھتی تھی۔ شاید وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مجھے اپنا اس قدر عادی بنا لینا چاہتی تھی کہ میں اس کی گرفت سے نکل ہی نہ سکوں۔ لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ کیا میں اس سے یہ رنگین سنگین ملاقات کر سکتا ہوں؟ یہ ایک جان لیوا کشمکش تھی۔ نفسانی لذت کی منزل بالکل سامنے تھی لیکن ''محبت'' ایک گہری دھند میں گھری ہوئی تھی اور بہت دور دراز کی چیز نظر آتی تھی۔

میں ایک دوراہے پر تھا اور اپنی ہی حدت سے پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ گھڑی کی متحرک سوئی گیارہ کے ہندسے پر پہنچ گئی مگر میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ سکون آور گولیوں کے اثر سے ہاتھ پاؤں بھاری ہو رہے تھے، ایک عجیب خود فراموشی کی سی کیفیت تھی۔ اچانک میں چونکا۔ پارک کے آخری سرے پر جہاں ایک پلازہ کے لیے کھدائی وغیرہ کا کام ہو رہا تھا، مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اُٹھا۔ یہ چوڑے تھوبڑے اور تنگ پیشانی والا ہٹا کٹا شخص سیٹھ سراج تھا۔

سیٹھ کے ساتھ دو بندے اور تھے۔ وہ بھی سفید کڑکڑاتی شلواروں قمیصوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نقشے تھے۔ کسی بات پر وہ تینوں گونج دار آوازوں میں ہنسے اور ایک شخص نے سیٹھ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

سیٹھ کو خود سے چند گز کے فاصلے پر دیکھنے کے بعد میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ مجھے زبردستی کا لنچ اور آنکھوں میں دبی ہوئی دو چنگاریاں یاد آ گئیں۔ پھر وہ سب کچھ یاد آیا جو ''ایل ڈی اے'' کے صدیقی نے بتایا تھا اور اس کے بعد خالو عثمان کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ نگاہوں میں گھوما۔ چھوٹی چھوٹی نیم سفید ڈاڑھی، بالکل زرد رنگت اور نیم وا آنکھیں۔ وہ جیسے حیران تھے کہ ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے انہیں موت کے سفر پر کیوں روانہ ہونا پڑا۔ عام حالات میں شاید میں پہلے ہی کی طرح اپنے اندر ہی اندر اُبل کر رہ جاتا لیکن فی الوقت کیفیت کچھ اور تھی۔ دل و دماغ پہلے ہی طوفان کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹرنکولائزر کا اثر بھی تھا۔

ایک دم میں طیش کے عالم میں اُٹھا اور سیٹھ سراج کی طرف بڑھا۔ میرا پورا جسم خشک

پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ سیٹھ کے سامنے جاتے ہی میرے اندر کی آگ شعلہ بن کر بھڑکی اور میں نے ایک زناٹے کا تھپڑ سیٹھ کے چوڑے چکلے منہ پر جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ سیٹھ ذرا سا لڑکھڑایا پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں حیرت اور غصے سے پھیل گئیں۔

''اوئے......اوئے۔'' اس نے عجیب بے ڈھنگے انداز میں کہا۔

جب تک میں دوبارہ اس پر جھپٹتا وہ سنبھل چکا تھا۔ اپنے گریبان کی طرف بڑھنے والے میرے ہاتھوں کو اس نے پکڑا اور پیچھے کی طرف جھٹک دیا۔

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے۔ میں تیری جان لے لوں۔ میں تجھے برباد کر دوں گا۔ تُو نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں تیری زندگی کو آگ لگا دوں گا۔'' میں پھر پوری شدت سے سیٹھ کی طرف بڑھا۔

تب تک سیٹھ کے ساتھی بھی حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھل چکے تھے۔ ایک شخص نے میرے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ دوسرے نے مجھے عقب سے دبوچ لیا۔ میں نے خود کو چھڑانا چاہا مگر سامنے سے پڑنے والے سیٹھ کے زوردار ہاتھ نے مجھے چکرا ڈالا۔ سیٹھ بھیانک آواز میں دھاڑا۔ ''ہتھ اُٹھاتا ہے حرامزادے...... تجھے گولیوں سے چھانی کر دوں گا۔ چھکو چھیک کر دوں گا تیرے پورے ٹبر (خاندان) کو۔''

وہ دیوانہ وار مجھ پر جھپٹ پڑا۔ کھدائی کی نگرانی کرنے والے کارندے بھی دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے چمٹ گئے۔ اس وقت مارشل آرٹ کی ساری تکنیکیں بے کار محسوس ہوئیں۔ میں نے اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلائے لیکن کوئی پیش نہیں گئی۔ مجھے زمین پر گرا لیا گیا اور بُری طرح مارا جانے لگا۔ مجھے بس یہی لگ رہا تھا کہ میں ہوا میں اُڑ اُڑ کر گر رہا ہوں۔ میری ہڈیاں چیخ رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی روشنیاں جل بجھ رہی ہیں۔

چند ہی لمحوں میں میری قمیص تار تار ہو گئی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میری پتلون میں سے جھٹکے کے ساتھ بیلٹ کھینچ لی گئی ہے اور مجھے اس سے پیٹا جانے لگا ہے۔ لوہے کا وزنی بکل میرے جسم کو لہولہان کرنے لگا۔ مجھ پر ٹھوکریں بھی برسائی جا رہی تھیں۔ میں گھاس پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ جلد ہی میرے ہونٹوں سے بے ساختہ آہ و بکا بلند ہونے لگی۔ مجھے شاید مجھے اسی جگہ قتل کر دیا جائے گا۔

اپنے اردگرد مجھے بے شمار لوگ دکھائی دے رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو آگے بڑھ کر مجھے چھڑا سکتا۔ ان میں سے بہت سے لوگ مجھے بچپن سے جانتے بھی ہوں

گے لیکن ان میں سے کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے سر پر پاؤں رکھ کر میرے چہرے کو گراؤنڈ کے کیچڑ میں لتھڑ دیا گیا۔ پھر مجھے ایک ٹانگ سے پکڑ کر بے دردی سے گھسیٹا گیا۔

سیٹھ کے ایک ساتھی کی غضبناک آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ''تھانے پہنچاؤ اس کتے کو۔''

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ''تھانے بھی پہنچا لیں گے۔ پہلے دو چار ہڈیاں برابر کر لیں۔''

ایک کارندہ لمبے دستے کی کسّی لے کر میری طرف بڑھا۔ غالباً وہ اُلٹی کسّی کی ضربیں لگا کر میری ٹانگوں کو بے کار کرنا چاہتا تھا۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، قریبی مسجد کے امام صاحب نے آگے بڑھ کر اسے روکا اور ملتجی لہجے میں کہا۔ ''جانے دو سیٹھ جی! بہت ہو گئی ہے اس کے ساتھ۔ اب باقی کسر تھانے جا کر پوری ہو جائے گی۔''

ایک اور دبی دبی آواز آئی۔ ''جانے دو جی...... بیوہ ماں کا پتر ہے۔ وہ تو مر جائے گی یہ سب دیکھ کر...... گندی اولاد ماں پیو کو بھی ذلیل کرتی ہے۔''

''ذلیل کرنا چاہیے ایسے ماں پیو کو...... بلکہ اولاد سے بڑھ کر ذلیل کرنا چاہیے۔ دوسروں کو سبق تو ملے۔'' سیٹھ کا ایک اور پالتو دھاڑا۔ ''حرامزادہ! راہ چلتوں کو بدمعاشی دکھاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میرے جسم پر ہتھوڑے جیسی ضربیں لگنی شروع ہو گئیں۔ اردگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ آوازیں دور افتادہ بھنبھناہٹ کی صورت کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک گاڑی قریب آئی اور مجھے سخت زمین پر گھسیٹ کر گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ یہ ایک اسٹیشن ویگن تھی۔ امام صاحب غالباً ابھی تک منت سماجت کر رہے تھے کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔

بہرحال، گاڑی مجھے لے کر روانہ ہو گئی۔ سر سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر چکا تھا۔ میں کسی جانور کی طرح دو نشستوں کے درمیان خلا میں ٹھنسا ہوا تھا۔

سیٹھ کے ایک ملازم کی آواز آئی۔ غالباً وہ سیٹھ کو مشورہ دے رہا تھا۔ ''گورایا صاحب ے گودام میں لے جاؤ جی اسے۔ آٹھ دس گھنٹے کے لیے اُلٹا لٹکاتے ہیں۔ ساری بدمعاشی ناک کے رستے باہر آ جائے گی۔''

جواب میں بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ شاید وہ لوگ کچھ مشورہ کر رہے تھے۔ مشورہ طویل

ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری جان بخشی کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ اسٹیشن وین ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ ان لوگوں نے مجھے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ میری چوٹوں اور زخموں کا معائنہ کیا۔ میری ٹھوڑی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ سیٹھ کا ایک ملازم گیا اور قریبی دکان سے بینڈیج کا سامان لے کر آ گیا۔ بیلٹ کا بکل لگنے سے ٹھوڑی کے نیچے شاید کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ اس زخم سے خون کا بہاؤ بند کیا گیا۔ سر پر بھی پٹی وغیرہ باندھی گئی۔ اس مرہم پٹی کے ساتھ ساتھ مجھے گالیوں سے بھی نوازا جا رہا تھا۔

میں اب قدرے ہوش میں آ گیا تھا۔ سیٹھ نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ سے میرا گریبان دبوچا اور پھنکارا۔ ”تجھے معافی دے رہے ہیں کاکا۔ اگر پھر ایسی حرکت کرے گا تو لاش کسی گٹر شٹر سے ملے گی اور ابھی پوری معافی بھی نہیں دے رہے ہیں۔ سمجھ تھوڑا سا وقفہ دے رہے ہیں۔“

مجھے گھسیٹ کر اُٹھایا گیا اور گاڑی سے باہر پھینک دیا گیا۔ یہ بازار سے ذرا ہٹ کر چند خالی پلاٹ تھے۔ اسٹیشن وین کا دروازہ بند کرنے سے پہلے سیٹھ نے پھر کہا۔ ”اگر پلس کے پاس جانے کا شوق ہے تو وہ بھی پورا کر لے۔ پر چنگا یہی ہے کہ مزید چھتر کھانے کا انتظام نہ کر۔“

پھر اسٹیشن وین کا سفید دروازہ سلائیڈ کر کے بند ہوا اور وین تیزی سے چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک دو راہگیر مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب پتلون میں سے جھٹکے کے ساتھ میری بیلٹ نکالی گئی تھی تو پتلون کا ہک بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اب پتلون میری کمر سے نیچے کھسک چکی تھی۔ انڈرویئر کے سبب میں برہنگی سے بچا رہا تھا۔ قمیص تو تار تار ہوگئی تھی لیکن بنیان ابھی جسم پر موجود تھی۔ ایک شخص نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ ”کیا بات ہے بھائی صاحب! کوئی جھگڑا وغیرہ ہوگیا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

ایک رکشہ والا اور ایک موٹر سائیکل سوار بھی میرے قریب رُک گئے۔ میں اب اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور پینٹ کو ایک طرف سے اُڑس لیا تھا۔ لوگ اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے؟

میں انہیں نظر انداز کرتا ہوا ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے قرب و جوار پر مطلق دھیان نہیں دے رہا تھا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ چپل میرے پاؤں سے نکل چکی ہے اور میں ننگے پاؤں

ہوں۔ لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن میں چلتا رہا۔ جسم پر کئی چوٹیں تھیں لیکن پتا نہیں کیوں تکلیف کا احساس زیادہ نہیں تھا۔ شاید اس احساس پر ذلت اور شرمندگی کا احساس غالب آ گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ ایک جیب میں ڈیڑھ سو روپے موجود تھے۔ بازار کے آخری سرے پر مجھے ایک شوز اسٹور نظر آیا۔ یہاں سے میں نے ہوائی چپل خریدی۔ اپنی چوٹوں کے بارے میں مَیں نے دکاندار کے سوالوں کے گول مول جواب دیئے اور خود کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

یہ مغل پورہ کا علاقہ تھا۔ سامنے ریلوے لائن نظر آ رہی تھی۔ ریلوے لائن کو دیکھ کر خیال گزرا کہ لوگ اس پر لیٹ کر خودکشی بھی تو کر لیا کرتے ہیں تو کیوں نہ میں بھی آج یہاں کسی بھاری بھرکم ٹرین کے سامنے لیٹ کر اپنی زندگی کو موت کے اندھیروں میں ڈبو دوں۔ بے شک موت ایک خوفناک چیز ہے لیکن کچھ دیر پہلے کی ذلت اور رسوائی جھیلنے کے بعد مجھے موت ایک عام سی چیز لگی تھی۔ ایک گہری تاریکی جو ہر قسم کے احساسات سے پیچھا چھڑا دے گی اور میں کسی ان دیکھے فاصلے پر چلا جاؤں گا۔

کچھ ہی فاصلے پر پولیس اسٹیشن کا سائن بورڈ دیکھ کر میں چند لمحے کے لیے رُک گیا۔ خیالات کا دھارا دوسری طرف مڑ گیا۔ کیا میں پولیس اسٹیشن چلا جاؤں؟ وہاں فریاد کروں اور انصاف مانگوں؟ لیکن کیا وہاں انصاف مل جائے گا؟ انصاف کو مجھ تک اور ثروت تک اور خالو عثمان تک پہنچنے دیا جائے گا؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی موٹی گردن اور چوڑے تھوبڑے والا سیٹھ سراج اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ میرے پردۂ تصور پر اُبھر آیا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اسی طرح کے گرانڈیل اور کڑکڑاتی شلواروں قمیصوں والے لوگ تھے۔ ان سب نے جیسے بہ یک زبان کہا۔ ”جتنا تڑپو پھڑکو گے کاکا...... اتنا ہی پھنستے جاؤ گے۔ پولیس کے پاس جانا ہے تو جاؤ۔ تمہیں پتا چل جائے گا، وہاں کیا بھاؤ بکتی ہے۔ ابھی تو صرف تمہاری مٹی پلید ہوئی ہے پھر بات تمہارے گھر تک پہنچے گی۔ تمہاری عورتوں کو بھی تھانے کچہری میں گھسیٹا جا سکتا ہے۔“

تھانے کا سائن بورڈ میری نگاہوں کے سامنے دھندلا گیا۔ میں نے ریلوے لائن پار کی اور دوسری طرف آ گیا۔ ایک طرف خستہ حال سا کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ اس میں بیٹھنے کے لیے سیمنٹ کی سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ میرے گھر تک یقیناً یہ خبر پہنچ چکی ہوگی۔ میرے گھر والوں نے اور محلے والوں نے اس واقعے کو کس طرح لیا ہوگا؟ تماشبین ٹائپ لوگوں نے اس خبر کو کیا کیا مرچ مسالے لگائے ہوں گے؟

ایک بار پھر دنیا کے دُکھوں سے چھٹکارا پا جانے کا خیال ذہن میں زور پکڑنے لگا۔ وہ جس کے ساتھ جینے کے ارادے تھے، وہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔ نوکری بھی آج کل میں چھوٹنے والی تھی۔ بدترین ذلتوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ تو پھر زندہ رہ کر کیا کرنا تھا۔ بس......ایک پُرسکون سا اندھیرا ہو جس میں ڈوب جاؤں اور ہمیشہ کے لیے ہر فکر سے آزاد ہو جاؤں۔

میں ریلوے لائن کو دیکھتا رہا۔ اپنی ہی سر کٹی لاش میرے تصور میں آئی۔ تڑپتی اور پھڑکتی ہوئی۔ ہچکولوں کے ساتھ خون اُگلتی ہوئی۔ کیا میں اس طرح خونچکاں ہو کر مر سکوں گا؟ پھر میرا دھیان دوسرے ذرائع کی طرف جانے لگا۔ میں بے انتہا سنجیدگی سے کسی ایسے طریقے کے بارے میں سوچنے لگا جو مجھے آسانی کے ساتھ اس دائمی اور پُرسکون اندھیرے میں پہنچا دے۔

کیا بہت ساری گولیاں پھانک کر لیٹ جاؤں اور کسی اور دنیا میں پہنچ جاؤں؟

یہ خیال بہتر محسوس ہوا۔ ابھی جیب میں کچھ روپے موجود تھے۔ میں اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا پھر ریلوے لائن کی طرف بڑھا۔ ریلوے لائن کراس کر کے ایک بار پھر بازار میں داخل ہو گیا۔ کچھ فاصلے پر دوائیوں کی ایک دکان نظر آئی۔ صاف ستھری دکان تھی۔ باہر گارڈ کھڑا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ میں نے ٹرنکولائزر مانگا۔ سیل مین نے مجھے سرتاپا دیکھا پھر مالک دکان کی طرف دیکھا۔ مالک دکان بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''نہیں ہے بھئی۔''

میں چند لمحے تذبذب میں رہا۔ پھر گندم میں رکھنے والی گولیوں کے بارے میں پوچھا۔

اس مرتبہ دکاندار کے چہرے پر واضح طور پر جھنجھلاہٹ اور غصہ نظر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر درشت لہجے میں کہا۔ ''نہیں......ہم نہیں رکھتے گولیاں۔''

مجھے لگا کہ میں نے کچھ اور پوچھا تو وہ مجھے دھکیل کر باہر نکالنے کی کوشش کرے گا۔ یقیناً میرا ابتر حلیہ ہر کسی کو چونکا رہا تھا۔

میں واپسی کے لیے مڑا۔ اس وقت میں نے اپنے عقب میں ایک شخص کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے کرکٹ گراؤنڈ کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر بھی دیکھا تھا۔ ایک بار شاید ہم دونوں کی نظر بھی ملی تھی۔

میں باہر نکلا تو وہ شخص بھی میرے پیچھے آیا۔ میں کسی اور دکان کی تلاش میں لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دو تین منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہ بدستور میرے پیچھے تھا۔ اب شبے کی گنجائش کم ہی تھی۔ وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ میں نے سوچا۔

پھر ایک دم میں نے سارے خیال ذہن سے جھٹک دیئے۔ میں کیوں اردگرد کے بارے میں سوچوں؟ جب میں ویسے ہی سب کچھ چھوڑ رہا ہوں، ہر شے سے دور جا رہا ہوں تو پھر کیوں اپنا دماغ کھپاؤں؟ اس وقت میرے ذہن میں بس ایک ہی بات تھی۔ میں جلد از جلد اس پُرسکون اندھیرے کی پناہ میں چلا جاؤں جو مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ میرا مرکزِ نگاہ وہ ''اندھیرا'' ہی تھا۔ باقی کی ہر شے نگاہوں میں دھندلائی ہوئی تھی۔ ہر منظر زرد زرد اور دور افتادہ نظر آتا تھا۔ آوازیں بھنبھناہٹ کی صورت میں تھیں۔ میرے اردگرد چلتے ہنستے مسکراتے اور باتیں کرتے لوگ جیسے کسی اور دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ قریباً میرا ہم عمر ہی تھا۔ عمر تئیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ چہرہ روشن آنکھیں چمکیلی اور شانے کافی چوڑے تھے۔ اس کے لبوں پر ایک ایسی الوہی مسکراہٹ تھی جو نظر نہیں آتی تھی، بس محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے تنک کر پوچھا۔

''تم سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ ہموار دلکش آواز میں بولا۔

''کہو۔''

''یہاں نہیں......تم تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ آؤ۔''

''میں کہیں نہیں جا سکتا۔'' میرا لہجہ مزید خشک ہو گیا۔

''میرا اندازہ تھا کہ تم یہی کچھ کہو گے۔ تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔ بلکہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر سرتاپا دیکھا اور گہری سانس لے کر فقرہ مکمل کیا۔ ''بلکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب بھی بتا دوں گا اگر تم میرے ساتھ چلو تو اور میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں کسی بھی کام سے روکوں گا نہیں اور نہ ہی تمہارا زیادہ وقت لوں گا۔ بس ایک آدھ گھنٹہ۔''

پتا نہیں کہ اس بندے کے لب و لہجے میں کیا بات تھی کہ میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ کوئی مقناطیسی کشش تھی جو مجھے دور نہیں ہٹنے دے رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ جلدی سے بولا۔ ''یار! ایک آدھ گھنٹہ کوئی زیادہ وقت تو نہیں ہوتا۔ اس کے بعد تم ہر کام کے لیے آزاد ہو گے۔ بلکہ تمہارے کسی بھی ارادے کو پورا کرنے میں مَیں تمہاری مدد بھی کروں گا۔''

میں چند لمحے شدید تذبذب میں رہا۔ وہ بڑی متاثر کن نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس

نے صاف ستھری پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سفید جوگرز تھے۔ وہ زندگی، اُمنگ اور ترنگ سے بھرپور نظر آتا تھا۔

اس میں کسی کو قائل کرنے کی صلاحیت تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''تم یہیں کسی چائے خانے میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہو؟''

''نہیں...... اس بات کے لیے ذرا پُرسکون ماحول کی ضرورت ہے۔ اگر تم کہو گے تو میں واپس تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔''

''کہاں جانا ہوگا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کمال بے تکلفی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رکشے والے کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ ''او بھائی رکشہ۔''

رکشہ والا رُک گیا۔ وہ مجھے لے کر رکشہ میں بیٹھ گیا۔ ''مینار پاکستان چلو۔'' اس نے کہا۔

اب دوپہر ہونے والی تھی، ہم ٹریفک کے اژدھام سے گزرتے، دھواں پھانکتے اور ہچکولے کھاتے تقریباً پون گھنٹے میں مینار پاکستان پہنچ گئے۔ راستے میں ہم تقریباً خاموش ہی رہے تھے۔ مینار پاکستان کو دیکھ کر وہ میری طرف جھکا اور مسکراتے ہوئے لہجے میں دبی آواز کے ساتھ بولا۔ ''ویسے خودکشی کرنے کے لیے یہ بھی اچھی جگہ ہے۔ یار لوگوں نے کافی فائدہ اُٹھایا ہے اس سے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بیزاری سے منہ پھیر لیا اور رکشہ سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ غالباً اپنے فقرے پر خود ہی مسکراتا رہا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ وہ نظر کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔

اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ میری ذہنی کیفیت سے آگاہ ہے اور میرے خطرناک ارادے سے بھی کلی طور پر بے خبر نہیں ہے۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ جب میں نے میڈیکل اسٹور میں جا کر بے ڈھنگے طریقے سے گولیاں وغیرہ مانگی تھیں، وہ میرے بالکل قریب موجود تھا اور میری بات سن رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ خستہ حال کرکٹ گراؤنڈ میں بھی میری حرکات وسکنات ملاحظہ کر چکا تھا۔ کہیں یہ کوئی خفیہ پولیس والا تو نہیں؟ میں نے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ خودکشی یا اقدام خودکشی جرم ہے اور قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ کہیں یہ بندہ مجھے تھانے وغیرہ تو نہیں لے جا رہا تھا۔

اسی دوران میں اس کی شیریں آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف جھکا اور مدھم لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے میری بات تمہیں بُری لگی ہے۔ معاف کر دو یار!

میں تو ایک جنرل بات کر رہا تھا۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''جا نہیں رہے، پہنچ گئے ہیں۔ وہ سامنے بجلی کا ٹرانسفارمر دیکھ رہے ہو، وہیں رُکنا ہے۔''

تب اس نے یہی بات رکشے والے کو بھی بتا دی۔ رکشہ سے اُتر کر اس نے کرایہ دیا۔ ساتھ میں بیس روپے ٹپ بھی دے دی۔ رکشہ والا اسلام کر کے رخصت ہوا۔ ہم راوی روڈ کے ایک بارونق علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں رہائشی مکانات تھے اور اِکا دُکا دکانیں بھی تھیں۔ یہاں میرے اس ساتھی کو کئی لوگ پہچانتے تھے۔ دو چار لڑکوں نے اسے ''ہیرو بھائی'' کہہ کر سلام کیا۔ دو تین دکانداروں سے بھی اس کی علیک سلیک ہوئی۔ لگتا تھا کہ وہ یہاں خاصا ہردلعزیز ہے۔ لوگ میرے حلیے کو بھی تعجب سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ پھر ایک تھڑے پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''ہیرو پتر! تیری ماسی یاد کر رہی تھی تجھے۔ ایک چکر گھر کا لگا آنا۔''

''ہاں چاچا! آؤں گا۔ میں زیتون کا تیل لایا ہوں ان کے لیے۔ ان کے گھٹنوں کو بڑا فائدہ دے گا۔''

چاچے کے قریب بیٹھے ایک نیم بہرے شخص نے کہا۔ ''خاتون کا تیل؟ یہ خاتون کا تیل کیا ہوتا ہے؟''

''خاتون کا نہیں زیتون کا تیل وڈے بھاجی۔'' میرے ساتھی نے وضاحت کی۔

چاچے نے مسکراتے ہوئے اپنے نیم بہرے دوست کو چھیڑا۔ ''دو خاتونوں کا تیل تو تم نکال چکے ہو۔ وہ دونوں بیچاری قبرستان میں ہیں۔ اب بھی تمہیں خاتون ہی سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ کچھ خدا کا خوف کر نذیرے۔''

میرا ساتھی مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ نے ایک بار پھر اپنے اردگرد چمکیلی شعاعیں سی بکھیر دیں۔ وہ نیم بہرے نذیرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''وڈے بھاجی کو خدا کا خوف ہے چاچا! اسی لیے تو وہ تیسری شادی کی بات کرتے ہیں۔ ورنہ لوگ آج کل کیا کیا گل نہیں کھلا رہے۔'' پھر اس نے نذیرے کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''وڈے بھا! آپ فکر نہ کریں۔ اگلے ہفتے آپ کو میو ہسپتال لے کر جاؤں گا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اپنا بڑا پکا واقف ہے۔ اس سے آپ کے دونوں کانوں کی اوور ہالنگ کراتے ہیں۔''

نذیرے کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ ''میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ تجھ سے یہ

بات کہوں گا، اب تم نے خود کہہ دیا ہے۔ اللہ تجھے حیاتی دے۔ تُو بڑا خیال رکھتا ہے ہم سب کا۔''

''لو وڈے بھا! اب آپ نے بیگانوں جیسی باتیں شروع کر دیں۔ بس میں چلا۔'' میرے ساتھی نے کہا اور میرا بازو تھام کر آگے بڑھ گیا۔

چھت پر کھڑے ایک لڑکے نے زور سے کہا۔ ''ہیرو بھائی! کیچ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک سیب اس کی طرف اُچھال دیا۔ اس نے سیب کیچ کیا اور اسے کچر کچر کھاتا ہوا ایک کوٹھی نما گھر کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ جیب سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا۔ گیراج میں ایک عجیب وضع کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ وہ مجھے برآمدے سے گزار کر اندر لے آیا۔ یہاں چاروں طرف بے ترتیبی تھی جسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس گھر میں عورت کا گزر نہیں ہے۔ بہرحال، گھر میں ساری سہولتیں موجود تھیں۔ یہ قریباً دس مرلے کا گھر تھا اور اچھا بنا ہوا تھا۔ اگر یہاں سلیقہ اور ترتیب ہوتی تو یہ خوبصورت نظر آتا۔ اسی دوران میں پڑوس کی طرف سے آواز آئی۔ کسی شخص نے دیوار کے اوپر سے ''ہیرو بھائی'' کہہ کر پکارا۔

وہ ''جی زاہد بھائی'' کہتا ہوا بغلی راہداری میں چلا گیا۔

پڑوسی نے پوچھا۔ ''یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟''

''اپنا دوست ہے زاہد بھائی! سمجھیں بچپن کا دوست۔''

''اسے ہوا کیا ہے؟ کافی چوٹیں لگی ہوئی ہیں۔''

''دراصل ابھی کچھ دیر پہلے ہی لاہور اسٹیشن پر ٹرین سے اُترا ہے۔ اسٹیشن کی سیڑھیوں سے پھسل کر گر گیا ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی۔'' ہیرو نے بڑی روانی سے کہا۔

''ڈاکٹر کو دکھایا ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔بینڈ ایج وغیرہ کروائی ہے۔''

کچھ دیر بعد ہیرو پھر میرے سامنے تھا، چہرے پر وہی مقناطیسی مسکراہٹ لیے۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔اب بتاؤ۔ کیا کہنا ہے تم نے۔''

''نہیں۔۔۔۔۔۔اس طرح نہیں۔ پہلے تمہیں اپنا حلیہ ٹھیک کرنا ہوگا۔ کپڑے بدلنے ہوں گے اور کچھ کھانا پینا ہوگا۔ میں تمہاری صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم نے ابھی تک ناشتہ بھی

نہیں کیا ہے۔''

''دیکھو مجھے ناشتے وغیرہ کی بالکل ضرورت نہیں تم

''اچھا۔۔۔۔۔۔چلو ٹھیک ہے لیکن ذرا اپنا حلیہ درست کر لو۔ دیکھو یہ تمہاری بنیان بھی اب خون سے داغی ہونے لگی ہے۔''

میں اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ صابن تولیا لے کر آ گیا۔ اس نے اصرار کے ساتھ میرا منہ دھلوایا۔ میری ٹھوڑی کی تازہ بینڈ ایج اپنے ہاتھ سے کی اور میرے ایک زخمی پاؤں پر بھی پٹی باندھی۔ پھر وہ میرے لیے اپنا ایک استری شدہ جوڑا لے آیا۔ پتلون کے اندر بیلٹ وغیرہ بھی موجود تھی۔ میرے انکار کی پروا کیے بغیر اس نے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ میں نے باتھ روم میں کپڑے بدلے۔ کپڑے بدلتے ہوئے جسم کے مختلف حصوں سے ٹیسیں اُٹھیں۔ چوٹیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ میں باہر آیا تو وہ میز پر کھانے پینے کی اشیاء سجائے بیٹھا تھا۔ پیزے کے ٹکڑے، چکن رول، گولڈ ٹی اور اورنج جوس وغیرہ۔ اس نے بہت اصرار کیا مگر اس بار میں نے اس کی نہیں مانی۔ میں اس قابل ہی نہیں تھا کہ منہ میں لقمہ رکھ سکتا۔ مجھے لگتا تھا کہ اُلٹی ہو جائے گی۔

''ہاں۔۔۔۔۔۔اب بتاؤ۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' میں نے بے حد رکھائی سے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟'' اس نے اُلٹا سوال کیا۔

میں نے خاموشی سے دانت پیسے اور گہری سانس لے کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم بس میرا اور اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی کام کی بات ہے اور نہ تم کرو گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب سیدھا سادہ ہے۔ تم نے مجھے میڈیکل اسٹور میں دیکھا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں گولیاں وغیرہ کھا کر ہسپتال پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اب تم خدائی فوج دار بن کر میرے سر پر مسلط ہو گئے ہو اور مجھے ایک لمبا چوڑا لیکچر پلانے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

''لیکچر؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں لیکچر۔۔۔۔۔۔تم پہلے مجھ سے میری پریشانیوں کا حال پوچھو گے پھر دُکھی چہرہ بنا کر میرے بدترین حالات پر افسوس کرو گے۔ اس کے بعد تم عبدالستار ایدھی بننے کی کوشش کرو گے۔ مجھے زندگی کی قدر و قیمت بتاؤ گے، جینے کے فائدے گنواؤ گے، موت کے نقصانات سے آگاہ کرو گے۔ پھر تم میرے اندر حوصلہ اور زندگی کی اُمنگ ترنگ پیدا کرنے کا جتن کرو گے اور میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں، تمہاری یہ ساری بیوقوفانہ کوششیں ناکام ہوں گی۔ ان سے

کچھ ہونے والا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے ان کی ضرورت ہے۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اپنے بارے میں کسی طرح کا کوئی خطرناک ارادہ نہیں رکھتے ہو؟''

''میں نہیں رکھتا ہوں اور اگر...... رکھوں بھی تو تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ یہ میری زندگی ہے۔ میں اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہوں۔ تم یہ اپنی فلمی سچویشن اپنے پاس رکھو۔ میں کسی بھی طرح کی تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میرے لہجے میں بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ مسکرایا۔ ''اگر تم تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہو تو میں بھی تقریر کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میرا شروع سے ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں تمہیں کسی بھی ارادے سے روکنے والا نہیں ہوں اور بالفرض محال تم خودکشی کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو تو میں تمہیں کیوں روکوں گا اس سے؟ میرے بھائی! میں تو خود مرنے کی حد تک بیزار ہوں اس زندگی سے اور سچ پوچھو تو میں خود...... خودکشی کا کوئی مناسب سا طریقہ ڈھونڈ رہا ہوں۔''

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدستور مقناطیسی روشنی تھی۔ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے۔

''ہاں...... ہاں مائی ڈیئر! میری ہنسی اور میری باتوں پر نہ جاؤ۔ یقین کرو، میں بھی تمہاری ہی کشتی کا سوار ہوں۔ بس اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ میری سوچ کا انداز تم سے ذرا مختلف ہے۔ میں مرنا تو چاہتا ہوں لیکن اپنی موت کی ذمے داری خود لینا نہیں چاہتا۔ میں مرنے کے لیے حالات کا سہارا لے رہا ہوں۔ ہاں...... ہاں حالات کا اور حالات تمہیں پتا ہی ہے، بڑے ہرجائی ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ مرنے نکلو تو ساتھ نہیں دیتے، جینے نکلو تو ساتھ نہیں دیتے۔ بس حالات کی وجہ سے مجھے فوت ہونے میں تھوڑی دیر ہو رہی ہے لیکن ناکام ہونے والا میں بھی نہیں ہوں۔''

''اگر تم خود کو اچھا مسخرہ سمجھتے ہو تو یہ بھی تمہاری بیوقوفی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یار! تم تو پھر ناراض ہو گئے اور دیکھو، کتنے مزے کی بات ہے میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا اور نہ اپنا بتایا ہے۔ چلو پہلے میں ہی اپنا بتا دیتا ہوں۔ میرا پورا نام عمران دانش ہے۔ یار لوگ پیار سے ''ہیرو'' کہتے ہیں لیکن میں خود کو ہیرو ویرو بالکل نہیں سمجھتا ہوں۔ ہیرو کا مطلب ہوتا ہے بہادر اور جو بندہ اپنی زندگی کو ہی نہ جیت سکے، وہ بہادر کیا ہوا...... اور تمہارا

نام؟'' اس نے میری طرف اُنگلی اُٹھائی۔

''تابش......'' میں نے بیزاری سے کہا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

اس نے پھرتی سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ ''نہیں...... نہیں یار جی! ایسا نہیں چلے گا۔ جس بات کے لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں، وہ تو تمہیں سننا ہی پڑے گی۔''

''تو سناؤ۔

اس نے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ ٹھوڑی میں ایک گڑھا تھا جو اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ تھوڑا سا غور کیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بڑا اچھا ہوا کہ آج ہفتہ ہے۔ میں تم سے کچھ زیادہ نہیں مانگوں گا۔ صرف دس بارہ گھنٹے۔ رات ڈیڑھ دو بجے کے بعد تم جہاں چاہو جا سکو گے۔''

''پہلے تم نے کہا کہ میں صرف بات کرنا چاہتا ہوں۔ اب تم دس بارہ گھنٹے کی بات کر رہے ہو۔'' میں نے قدرے ڈھیلے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی مرضی کے خلاف بات کرنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ اس کی نگاہ قائل کر لینے والی تھی۔

''بس...... میرے یار! جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہوں گا۔ رات دو بجے کے بعد تم اپنے راستے پر میں اپنے راستے پر۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر وہ تیزی سے چلتا چلا گیا۔ ''چلو...... چلو...... میرا ٹائم شروع ہو چکا ہے اور میں اپنے ٹائم میں گھاٹا کھانے والا نہیں ہوں۔ چلو ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس تھوڑی دور۔ تمہیں ایک دو ضروری چیزیں دکھانی ہیں۔''

''میں کچھ بھی دیکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میری بیزاری برقرار تھی۔

''یہ دیکھو یار! میں تمہارے ساتھ ہاتھ جوڑ تا دیتا ہوں۔ اب تم نے یہ وقت دیا ہے تو بس دے دو۔ کوئی سوال نہ پوچھو اور نہ کوئی اعتراض کرو۔ اگر کہتے ہو تو میں تمہارے پاؤں بھی پکڑ لیتا ہوں۔''

وہ میرے پاؤں کی طرف جھکا۔ میں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ وہ بہت چرب زبان تھا۔ ابھی میں نے اقرار نہیں کیا تھا کہ میں دس بارہ گھنٹے اس کے ساتھ رہوں گا لیکن وہ خود ہی یہ بات طے کر چکا تھا اور اب اس کے ''حوالے'' دے رہا تھا۔ میں غم کے شدید ترین

نرغے میں تھا۔ بدن سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن اس کے باوجود میں تذبذب محسوس کر رہا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس شخص کا ساتھ مجھے بُرا نہیں لگ رہا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ کوئی عجیب سی کشش تھی اس میں جو مجھے اپنے ساتھ باندھ رہی تھی۔

میں نے سوچا چلو یہاں سے تو نکلا جائے پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے؟ وہ مجھے کھینچتا ہوا گیراج کی طرف لے آیا۔ اسی دوران میں اس کی نظر میری قینچی چپل پر پڑ گئی۔ ''اوہو ہو ہو...... یہ کیا؟ اوپر انگلینڈ نیچے ایتھوپیا۔'' وہ جلدی سے واپس گیا اور میرے لیے ایک پالش شدہ پشاوری چپل لے آیا۔ یہ براؤن چپل پینٹ شرٹ کے ساتھ جچ گئی۔

اول جلول موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے میں اسے دو تین منٹ لگ گئے لیکن جب وہ ایک بار اسٹارٹ ہوئی تو پورے محلے کو پتا چل گیا کہ کچھ اسٹارٹ ہوا ہے۔ وہ موٹر سائیکل کو باہر لایا، دروازے کو تالا لگایا اور مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

موٹر سائیکل کے عقب نما گول آئینے میں مجھے اپنا سوچا سوچا چہرہ نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی ڈھائی تین گھنٹے پہلے کی وہ بے مثال توہین بھی یاد آگئی جو مجھے بڑی سنجیدگی کے ساتھ زندگی سے دور اور موت سے قریب لے آئی تھی۔ میرے اردگرد کے حالات اتنے گمبھیر ہو گئے تھے کہ مجھ جیسے کم ہمت شخص کو بھی مرنا آسان لگ رہا تھا۔ میں سیٹھ سراج کو بھرے بازار میں تھپڑ مار چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ اب اتنی آسانی سے نہیں رُکے گا۔

وہ مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر بازار سے باہر نکلا۔ اس کا ایک ہاتھ ہینڈل پر تھا، دوسرے سے علیک سلیک کرتا جا رہا تھا۔ جلد ہی ہم لوگ شاہراہ قائداعظم پر تھے۔ اب سہ پہر کا وقت تھا۔ سڑکوں پر رش بڑھ گیا تھا۔ عمران کی موٹر سائیکل دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ بریکیں لگا رہا تھا، کٹ مار رہا تھا اور پھر ایک دم موٹر سائیکل کو کمان سے نکلا ہوا تیر بنا دیتا تھا۔ اس کی رفتار کو تیز یا خطرناک کہنا کوئی کافی نہیں تھا۔ وہ بہت خوفناک رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے بیلٹ پہن رکھا تھا نہ میں نے۔

جب شاہراہ قائداعظم پر اس نے ایک نہایت تیز رفتار کار کے سامنے سے یوں موٹر سائیکل گزاری کہ کار کا بمپر موٹر سائیکل سے ٹکرانے میں انچوں کا فاصلہ رہ گیا تو میں چپ نہ رہ سکا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' میں نے جھلاہٹ سے کہا۔

''کیا ہوا؟'' وہ بھولپن سے بولا۔

''کہیں مار دو گے۔''

''تو کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا اور ٹھٹک گیا۔ بولنے کے لیے جو منہ کھولا تھا پھر بند کر لیا۔ ''تو کیا ہوا؟'' اس نے یہی کہا تھا۔ واقعی اگر موٹر سائیکل کسی گاڑی وغیرہ سے ٹکرا جاتی تو کیا ہوتا؟ کم از کم یہ سوال میرے لیے تو ہرگز موزوں نہیں تھا۔

اگلے ایک آدھ گھنٹے میں اس نے لاہور کی مختلف سڑکوں پر اتنی رفتار سے موٹر سائیکل دوڑائی کہ ہر گھڑی یہی لگا کہ شاید آخری وقت آ گیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل پُرسکون تھا۔ جیسے یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو۔ ایک دو جگہ ٹریفک کے سپاہیوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ جواب میں انہوں نے بھی اُلجھی اُلجھی سی مسکراہٹ اس کی طرف اُچھالی۔

اس نے شور مچاتی موٹر سائیکل لکشمی چوک کے قریب نگینہ سینما میں گھسا دی۔ یہاں شو شروع ہونے والا تھا۔ عام طور پر یہاں انگلش فلم لگتی تھی مگر اب ایک نوے کی دہائی کی پنجابی فلم لگی ہوئی تھی۔ ''یہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر وہی سوال۔'' اس نے مقناطیسی مسکراہٹ میری طرف اُچھالی۔ ''تمہیں کہا ہے نا یار تابش! میرے ٹائم کے اندر مجھ سے سوال نہ کرنا۔''

میں منہ بنا کر رہ گیا۔ دماغ پر ابھی تک سکون آور گولیوں کا غبار تھا۔ مجھے نہ اپنی سمجھ آ رہی تھی نہ اس شخص کی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت میں اضافہ ہوا کہ اس نے وہ سستا سا ٹکٹ لیا جسے عرف عام میں ''ون ایٹ'' کہا جاتا ہے۔ ٹکٹ کے بعد اس نے تلی ہوئی دال (مرغ دال) کی دو پڑیاں اور گنڈیریاں لیں۔ پھر مجھے لے کر ہال کی طرف بڑھا۔ میں مسلسل خاموش تھا۔ وہ رُک گیا۔ ''اوہو...... لگتا ہے پھر ناراض ہو گئے ہو۔ اچھا بابا! معافی دے دو۔'' اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''تم یہ مسخرہ پن ختم نہیں کر سکتے۔ آخر تم مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔''

''تو پھر یہ کیا ہے...... پھٹیچر سینما؟''

''دراصل بڑے دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ کسی نہایت فضول قسم کے سینما میں، نہایت فضول سیٹوں پر بیٹھ کر، نہایت ہی بور قسم کی فلم دیکھی جائے اور پرانی یادوں کو تازہ کیا جائے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو...... پروگرام تبدیل کر دیتے ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ میں کچھ بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن ادھر اُدھر گھومنے کے بجائے کسی چار دیواری میں بیٹھنا اور اپنے بے پناہ دُکھ میں ڈوبنا مجھے بہتر محسوس ہوا۔

میں ذرا چپ ہوا تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر سینما ہال کی طرف بڑھ گیا۔ درحقیقت وہ

اپنے مخاطب کو زیادہ سوچنے اور ردِعمل ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ سینما ہال میں گنڈیریاں لے جانا منع ہوتا ہے لیکن وہ بڑی آسانی سے گیٹ کیپر کی نگاہیں بچا کر لے گیا۔

کہتے ہیں کہ سینما ہال کا اندھیرا فلم بین کو کچھ دیر کے لیے باہر کی دنیا سے اور دنیا کے دُکھوں سے کاٹ دیتا ہے بور ترین فلم بھی ہو تو کچھ نہ کچھ تو اثر ہوتا ہی ہے۔

میں نے سکون آور دوا کی تین گولیاں سینما ہال میں ہی چبا کر نگل لیں اور اپنی آتشیں سوچوں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند گھنٹوں میں حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ آج صبح میں اس فیصلے کی سولی پر لٹک رہا تھا کہ مجھے آربہ سے ملاقات کرنی چاہیے یا نہیں اور اب میں اس فیصلے کی سولی پر تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مر جانا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید سینما ہال میں انٹرویل کے دوران یا فلم کے دوران میں عمران مجھ سے بات چیت کرے گا اور میرے حالات کو کریدنے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

فلم ختم ہوئی۔ عمران نے مجھے ایک بار پھر اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بٹھایا۔ تب میں نے پہلی بار دھیان سے موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ نمبر پلیٹ کے نیچے سیاہ پینٹ سے مُردے کی کھوپڑی بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا تھا...... کنگ آف اسپیڈ۔

کنگ آف اسپیڈ نے موٹر سائیکل کو ایک بار پھر ہوا میں اُڑانا شروع کیا۔ میں نے ایک بات محسوس کی۔ وہ بے انتہا تیز تو ضرور چلاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے حد مشاق بھی تھا۔ گاڑیوں کے درمیان سے ہوا کی طرح بائیک کو نکال کر لے جاتا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم مغل پورہ پہنچ گئے۔ یہاں شالامار باغ کے قریب ایک بڑا سرکس لگا ہوا تھا۔ اس معروف سرکس کمپنی کے اشتہارات اکثر اخبار اور ٹی وی پر دیکھے جاتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل سرکس میں گھسا دی۔ یہاں بھی اس کے بہت سے لوگ جاننے والے تھے۔ وہ اسے ہیرو بھائی اور عمران بھائی کہہ کر سلام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ چمکیلے لباس میں ملبوس ایک اسمارٹ بازی گر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب کون ہیں اور کیا ہوا انہیں؟''

''پرانے یار بیلی ہیں۔ آج سویرے لاہور اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے گر گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہڈی وغیرہ بچ گئی ہے۔''

وہ مجھے سیدھا سرکس کے اس حصے میں لے گیا جہاں سرکس کے فنکار شو سے پہلے مختلف

تیاریوں میں مصروف تھے۔ کوئی آہنی کڑے اُچھال رہا تھا، کوئی گیندوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک کوتاہ قد جوکر کندھے پر بندر کا بچہ بٹھائے ایک پہیے والی سائیکل چلا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ یہ عمران نامی عجوبہ جو پانچ گھنٹے سے مجھے اپنے ساتھ اُڑائے پھر رہا ہے، دراصل اس سرکس میں کام کرتا ہے۔ وہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ موٹر سائیکل کو چلانے کے بجائے ''اڑاتا'' کیوں تھا۔ اس نے شاید پورے لاہور شہر کو موت کا کنواں سمجھ رکھا تھا۔ وہ یہاں سرکس میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ سرکس کی چلبلی لڑکیاں اس سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں یہ لڑکیاں اصل سے زیادہ جاذب نظر محسوس ہوتی تھیں۔ میں اپنا دھیان بٹانے کی بہت کوشش کر رہا تھا لیکن جس طرح کالے بادلوں میں رہ رہ کر برق تڑپتی ہے یہ خیال بار بار ذہن میں آتا تھا کہ اس وقت میرے گھر کا منظر کیا ہوگا۔ والدہ اور بہن بھائی کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔

عمران نے اسسٹنٹ منیجر سے کہہ کر میرے سامنے فروٹ اور مشروبات وغیرہ کا انبار لگوایا۔ پھر کپڑے بدلنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے کھسکنے کے لیے یہ موقع مناسب ہے لیکن اسی دوران میں ایک لڑکی میرے قریب بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً جمناسٹ تھی۔ سرکس کی عام لڑکیوں کے برعکس اس نے زیادہ بھاری میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ نہایت چست لباس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اس لڑکی کو میری نگراں بنا کر چھوڑ گیا ہے۔ وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کے سوال پوچھنے لگی۔ اس نے میری چوٹوں کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ لڑکی کا نام شاہین تھا۔

اسی اثناء میں عمران ایک چمکیلا کاسٹیوم پہن کر واپس آ گیا۔ اس لباس میں اس کا کسرتی جسم جھلک دکھاتا تھا۔ شاہین نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ وہ بے باکی سے اس کی طرف جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ایسی نظروں سے مت دیکھا کرو جانِ من! کسی دن موٹر سائیکل سمیت سر کے بل گروں گا۔''

''تمہاری طرف تو دیکھنا بھی گناہ ہے۔'' وہ ہنسی۔

''اور یہ گناہ تم روز ہی کرتی ہو۔ وہ بھی عین اس وقت جب میری انٹری ہونے والی ہوتی ہے۔ کیوں اپنے ہونے والے بچوں پر ظلم کرتی ہو؟ فار گاڈ سیک! نہ کیا کرو ایسا۔''

عمران کے فقرے پر شاہین کا رنگ شہابی ہوا۔ وہ پہلے بے طرح شرمائی پھر کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل پکڑ کر بولی۔ ''میں سر توڑ دوں گی تمہارا۔''

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے۔ دل کے بعد اب سر کی باری ہی تو آنی ہے۔'' شاید وہ کچھ

اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں اس کی نظر ٹیبل کیلنڈر پر پڑ گئی۔ اس نے غور سے دیکھ کر تسلی کی اور بولا۔ ''آج ہفتہ ہی ہے نا...... چلو یہ بھی ٹھیک ہوا۔''

یہ ''ہفتے'' والا فقرہ اس نے پچھلے پانچ چھ گھنٹوں میں کم از کم چار دفعہ کہا تھا اور ہر بار اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔

سرکس کا پنڈال اور موت کا کنواں ایک دوسرے سے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع تھے۔ دونوں جگہوں سے تماشائیوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ گاہے بگاہے میوزک کی آواز بھی اُبھرتی تھی۔ ''میرا نیا کاسٹیوم تیار ہے؟'' عمران نے اسسٹنٹ منیجر عباس سے پوچھا۔

''ہاں عمران بھائی! ایک دم ریڈی۔ سرکس میں آپ کی انٹری ساڑھے نو بجے کے قریب ہے۔''

اسسٹنٹ منیجر اور عمران کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ عمران موت کے کنویں کے علاوہ سرکس کے جھولوں پر بھی کام کرتا ہے۔ اس کے جسم میں ایک اچھے جمناسٹر کی خصوصیات موجود تھیں اور نظر بھی آتی تھیں۔

ہم جس جگہ بیٹھے تھے، یہ ایک بڑا شامیانہ تھا۔ اس شامیانے ہی کے ایک حصے کو لکڑی کے پارٹیشن سے دفتر کی شکل دے دی گئی تھی۔ شامیانے میں مختلف فنکار وارم اپ ہونے میں مصروف تھے۔ موت کے کنویں کی طرف سے گاہے بگاہے تالیوں کی آواز بھی اُبھرنے لگی جس سے اندازہ ہوا کہ وہاں چھوٹا موٹا تماشہ شروع ہو چکا ہے۔ دو ملازم لڑکے عمران کی موٹر سائیکل چیک کرنے میں مصروف تھے۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور اپنے مخصوص مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''بیٹھو گے میرے ساتھ؟''

''نہیں......'' میں نے رکھائی سے جواب دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''چلو تماشہ تو دیکھو گے نا؟'' اس نے کہا پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک ہٹے کٹے شخص سے بولا۔ ''سینڈو...... تابش کو اندر لے جاؤ۔''

صفاچٹ سر والے سینڈو نے میری طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ آؤ جی میرے ساتھ، اپنے ہیرو بھائی کے کمالات دیکھو۔

شامیانے کے ایک جانب راستہ سا تھا۔ اس راستے کی دیواریں قناتوں سے بنی ہوئی تھیں۔ موت کے کنویں میں کرتب دکھانے والوں کو اسی راستے سے گزر کر کنویں میں داخل ہونا تھا۔ میں سینڈو کے ساتھ اندر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن چار و ناچار چلا گیا۔ اوپر سے موت

کے کنویں میں کئی بار جھانکا تھا لیکن آج میں کنویں کے اندر تھا۔ یہاں عین درمیان میں لوہے کی تین چار کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی چھوٹا سا ڈیک تھا جس سے اُبھرنے والی موسیقی تین بڑے اسپیکروں کے ذریعے کنویں میں اور کنویں سے باہر گونج رہی تھی۔ کنویں کے بالائی کنارے پر دو ڈھائی سو تماشائیوں کے نہایت مشتاق چہرے نظر آ رہے تھے۔ کنویں کے اندر دو لڑکیاں اور دو ہیجڑے بھی موجود تھے۔ انہوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا تھا۔ یہ سب اُلٹا سیدھا ڈانس کر رہے تھے۔ ڈیک پر گانا بج رہا تھا۔ سن وے بلوری اکھ والیا۔

مجھے لگا کہ کنویں کے اندر میں خود بھی ایک تماشا ہوں اور اَن گنت بلوری آنکھیں مجھے بھی گھور رہی ہیں۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر اتفاقاً ان تماشائیوں میں سے کوئی میرا شناسا بھی ہو تو مجھے اس حال میں اس کنویں کے اندر دیکھ کر کیا محسوس کرے گا۔ شاید وہ سمجھے کہ میں نے بھی موت کے کنویں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے اور میرے جسم پر جو چوٹیں نظر آ رہی ہیں، وہ اسی ''کام'' کے سلسلے میں لگی ہیں۔ ایک بار پھر جی میں آئی کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے کھسک جاؤں لیکن عمران نے میرا پکا انتظام کر کے ہی مجھے اندر بھیجا تھا۔ لڑکی شاہین کی طرح سینڈو بھی میرا میزبان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ نگران بھی تھا۔

لڑکیوں اور ہیجڑوں کو گانے کی دھن پر بیہودہ ڈانس کا اچھا رسپانس ملنے لگا۔ اوپر سے نوٹ پھینکے جانے لگے۔ اسی دوران میں عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ اس کی آواز نے قرب و جوار کی ہر خوبصورت و بدصورت آواز کو ڈھانپ لیا۔ تماشائیوں نے ابھی موٹر سائیکل کو دیکھا نہیں تھا مگر ان کے اندر جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ موسیقی بند ہو گئی اور ڈانسرز نے کنواں خالی کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد عمران کنویں میں داخل ہوا۔ لوگوں نے پُرجوش تالیاں بجائیں۔ اس نے ہاتھ لہرا کر جواب دیا پھر اس نے رفتار تیز کی اور اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

اگلے پانچ چھ منٹ میرے لیے بے حد تحیر خیز تھے۔ خاص طور سے آخری دو منٹ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ موت کے کنویں کا تماشہ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا بلکہ کنویں میں کاریں بھی چلتی دیکھی تھیں مگر عمران نے جو آئٹم پیش کیے وہ حیران کن تھے۔ پوری Swing میں چلتی ہوئی موٹر سائیکل پر اوندھا لیٹنا، اُلٹا بیٹھنا، گھٹنوں کے بل بیٹھنا، ایک گھٹنا ٹیک کر دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دینا۔ ہر گھڑی یہی لگا کہ وہ احمقانہ جوش کا مظاہرہ کر رہا ہے اور ابھی کسی حادثے کا شکار ہو کر نیچے گر جائے گا۔ اس کا گرنا اس کے لیے

ہی نہیں، کنویں کے اندر موجود تین چار افراد کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا جن میں مَیں بھی شامل تھا۔ موٹر سائیکلوں کے زور سے، لکڑی کا بنا ہوا پورا کنواں بُری طرح ہل رہا تھا۔

شو کے آخری حصے میں ایک اور موٹر سائیکل سوار بھی عمران کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دونوں سواروں نے اپنے پیچھے دو لڑکیاں بھی بٹھائیں۔ ان میں عمران کے پیچھے وہی ہلکی بھوری آنکھوں والی شاہین بیٹھی۔ بہرحال، تماشے کے اس آخری حصے میں بھی عمران کو ہی مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ تماشائیوں نے اس کی ہر خطرناک ادا پر دل کھول کر تالیاں بجائیں۔ آخر میں وہ چند سیکنڈ کے لیے میرے پاس رُکا۔ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ ''آ جاؤ یار! دو منٹ کے لیے تم بھی اس رائنڈ کا مزہ لے لو۔ سچ کہتا ہوں، نشہ ہو جائے گا۔''

''سوری......'' میں نے حتیٰ الامکان اپنے چہرے کو سخت رکھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی مقناطیسی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر ہولے سے بولا۔ ''جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے، جو مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا؟''

''تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں؟'' میں اُٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے ایک دم اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ ''ارے......نہیں بیٹھو بیٹھو۔ ایک تو تم غصے میں ایک دم آ جاتے ہو۔ اچھا......اب کچھ نہیں کہوں گا تمہاری مرضی کے خلاف۔ اب ایک آخری آئٹم ہے، اس کے بعد چلتے ہیں اور اگر......''

اسے بات کرتے کرتے اچانک رُکنا پڑا کیونکہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور ہولے سے بولا۔ ''ہاں جی......عمران اسپیکنگ۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو اس نے دھیان سے سنا پھر جواب میں بولا۔ ''پر ملک صاحب! ایس ایچ او سے تو ہمیشہ آپ ہی بات کرتے ہیں۔ ہمارا کام تو اندر کے معاملے سنبھالنا ہوتا ہے۔ جی ہاں......جی ہاں......آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن پچھلی بار ہی تو بات ہوئی تھی۔ دوسرے ہفتے میں پیسے بھی بڑھائے تھے آپ نے۔''

جواب میں پھر کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا اور آخر میں بولا۔ ''تو پھر کیا کیا جائے۔ ٹکٹ بڑھا دیا جائے؟ نہیں......نہیں......یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' بات کرتے کرتے وہ موٹر سائیکل سے اُترا اور کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ پھر فون کان سے لگائے لگائے وہ کنویں سے نکلا۔ وہ غالباً منیجر یا اسسٹنٹ منیجر کی طرف گیا تھا۔

اس نامعلوم فون کال کے بعد میں نے پہلی بار عمران کے چہرے پر تھوڑی سی سنجیدگی

دیکھی تھی۔ میرے قریب کھڑا اسینڈو اور دیگر افراد بھی قدرے سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس کہنے لگی کہ یہاں کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ اس تماشے کے ساتھ ساتھ یہاں کوئی زبردست قسم کا گھپلا ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ کوئی ایسا کام جسے کرنے سے پہلے یہاں کے اہم افراد تناؤ کی کیفیت میں ہیں۔ کیا یہ کوئی خطرناک کام ہے؟ کیا کوئی سنگین قسم کی قانون شکنی ہونے والی ہے؟ یا پھر......

میرے ذہن میں ایک بار پھر یہ بات آئی کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ میں کوئی ان کا قیدی نہیں تھا۔ میں اب تک صرف عمران کے اصرار کی وجہ سے یہاں رُکا ہوا تھا۔ سینڈو اور دیگر افراد آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے کھسکنے کا موقع مل سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا لیکن اسی وقت عمران پھر مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ بھی عجیب چیز تھی۔

○......❖......○

وہ اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور بے خوفی تھی۔ تب وہ ایک بار پھر کنویں کے اندر موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔ موٹر سائیکل کا شور بے پناہ تھا۔ عمران نے پوری رفتار سے چلتی موٹر سائیکل پر چند اور نہایت خطرناک کرتب دکھائے۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اعتماد کا شکار ہے اور اپنا کوئی نقصان کر بیٹھے گا۔ دیکھنے والوں کے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ تالیاں بھی پیٹ رہے تھے۔

آخر عمران کا تماشہ ختم ہوا اور وہ زبردست تالیوں کے شور میں نیچے آ گیا۔ اس کی موٹر سائیکل ملازمین نے سنبھال لیا اور وہ تماشائیوں کی طرف ہاتھ لہراتا ہوا، موت کے کنویں سے باہر نکل گیا۔ میں بھی ہٹے کٹے سینڈو کے ساتھ واپس شامیانے میں آ گیا۔

''کیسا لگا میرا تماشہ؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

میں رات دو بجے تک اس شخص کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر چکا تھا مگر اب یہ وعدہ نبھانا مجھے مشکل نظر آ رہا تھا۔ ایک تو میری جسمانی چوٹیں مجھے مسلسل تکلیف دے رہی تھیں، دوسرے میری ذہنی تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں کوئی خاموش جگہ ہو...... گہری، تاریک اور بالکل تنہا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر لوں۔ فیصلہ کر لوں کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ اگر مرنا ہے تو کس طریقے سے...... اور اگر زندہ رہنا ہے تو پھر کس طرف کا رُخ کرنا ہے...... یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میں پھر اپنے گھر کی طرف لوٹوں گا۔ ان سب لوگوں کا سامنا کروں گا جو میری بے مثال ذلت و

رسوائی کے شاہد تھے یا اس بارے میں جانتے تھے۔

عمران اپنے معمول کے کام بھی کر رہا تھا اور سائے کی طرح میرے ساتھ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹیوم بدلا اور کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک بار پھر سینڈو اور شاہین کے حوالے کر کے اپنی دوسری ''انٹری'' کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی یہ ''انٹری'' سرکس میں تھی۔ پنڈال کے اندر کافی تعداد میں تماشائی موجود تھے۔ کچھ پورشن تو کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ویک اینڈ کی شام تھی۔

اس مرتبہ عمران نے جھولوں پر اپنے کمالات دکھائے۔ اس کے ساتھ پانچ چھ مزید بازی گر بھی شامل تھے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں۔ یہاں بھی عمران کا ردِعمل اہم رہا۔ اسے اور ایک دوسرے بازی گر سلیمان عرف شہزادے کو خوب داد دی۔ یہ نہایت پُرخطر آئٹمز تھے۔ بہر حال، جان کے تحفظ کے لیے جھولوں کے نیچے جال وغیرہ موجود تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ شو ختم ہو گیا۔ تماشائی جوق در جوق پنڈال سے نکلنے لگے۔ شو میں حصہ لینے والے انسان اور جانور بھی سب روپوش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ سرکس کے ارد گرد موجود فالتو روشنیاں بجھا دی گئیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ''کھیل'' مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی یہاں کچھ باقی ہے اور جو باقی ہے، وہ اس سارے کھیل سے زیادہ اہم ہے۔ عمران، شہزادے اور اس کے دیگر ساتھیوں نے اسپیشل شامیانے میں پُرتکلف کھانا کھایا اور باداموں والی سبز چائے پی۔ عمران کے بے پناہ اصرار کے باوجود میں نے ایک لقمہ نہیں لیا۔ لے ہی نہیں سکا۔ میرے خونچکاں سینے میں تو کچھ اور طرح کی جنگ جاری تھی۔

ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ اِکا دُکا گاڑیاں آ کر سرکس کی پارکنگ میں رُکنے لگیں۔ یہ سب شاندار گاڑیاں تھیں۔ ہنڈا، ٹویوٹا اور پجارو وغیرہ۔ دوسری طرف اسسٹنٹ منیجر عباس اور انتظامیہ کے دیگر افراد سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور خاص انتظامات میں مشغول تھے۔ عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تابش یار! اب تمہیں ایک خاص تماشہ دکھاتے ہیں۔ ویسے تو اس تماشے کا ٹکٹ قریباً پندرہ بیس گنا ہے لیکن تمہارے لیے تو یہ پہلے کی طرح مفت ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی مزے کرو گے یار!'' اس نے میرا کندھا تھپکا۔

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بات بدل گیا۔ ''بس اب زیادہ دیر نہیں یار! پانچ دس منٹ کا انتظار رہ گیا ہے۔''

دس منٹ بعد ہم ایک بار پھر پنڈال میں تھے۔ اس بار پنڈال تقریباً خالی تھا۔ صرف اسپیشل کلاس میں جہاں قالین بچھے تھے اور صوفے وغیرہ رکھے تھے، تقریباً چالیس عدد تماشائی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی تعداد پچاس ساٹھ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے زیادہ تر نوجوان امیر زادے نظر آتے تھے جو ٹولیوں کی صورت میں آئے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو اپنے لباس اور چہروں سے بےفکرے ٹائپ کے دولت مند لگتے تھے۔ میں اسپیشل کلاس کی تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ سینڈو میری دائیں جانب اور شاہین بائیں جانب تھی۔ پھر میں نے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ جھولوں کے نیچے سے دونوں حفاظتی جال ہٹا لیے گئے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے شاہین سے پوچھا۔

''آپ دیکھتے رہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

بازی گر رسّی کی طویل سیڑھی کے ذریعے قریباً پچاس فٹ اوپر جھولوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان میں عمران اور شہزادہ سب سے آگے تھے۔ اس مرتبہ بازی گر لڑکیوں کے لباس بھی زیادہ ''بولڈ'' تھے۔ ان کی پوری ٹانگیں عریاں تھیں اور بالائی جسم پر بھی مختصر ترین لباس تھا۔ ہیجان خیز میوزک نے ماحول کو گرمانا شروع کر دیا۔ پنڈال کے اندر عجیب سی سنسنی محسوس ہونے لگی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس سرکس میں چوری چھپے غیر قانونی شو چلایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا تماشہ جس میں زندگی کا کوئی تحفظ نہیں تھا اور بلندی پر مظاہرہ کرنے والے بازی گر ہر گھڑی موت کے نشانے پر تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہی سنسنی اور ہیجان تھا جس کی خاطر کچھ لوگ بھاری معاوضہ دے کر تماشہ دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھے۔

تماشہ شروع ہوا تو پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ سوئی بھی گرے گی تو آواز آئے گی۔ بازی گروں کے چہروں پر بھی سخت تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جھولا چھوڑ کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اور دوسرا جھولا پکڑتے ہوئے، ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو اس کا مطلب ہوگا، بلندی سے زمین پر گرنا اور موت کے قریب تر چلے جانا۔ میں نے دیکھا کہ بازی گروں میں کسی کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ موجود تھی تو وہ عمران تھا۔ وہ نہ صرف بڑے سکون سے اپنے آئٹم پیش کر رہا تھا بلکہ ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔ جب بازی گر کوئی اسٹیپ مکمل کر لیتے تو تماشائیوں کا سکتہ ٹوٹتا، وہ شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے۔ ایک خطرناک فارمیشن مکمل کرتے ہوئے عمران کے ساتھی شہزادے کی ''ٹائمنگ'' ذرا سی غلط ہوئی۔ ہوا میں دو قلابازیاں کھا کر اس نے عمران کی ٹانگیں پکڑنا تھیں جو خود بھی جھول رہا تھا۔

شہزادے کے دونوں ہاتھ عمران کی ٹانگوں پر نہیں پڑ سکے۔ ایک ہاتھ پھسل گیا۔ بہر حال دوسرے ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ خود کو گرنے سے بچانے میں کامیاب رہا۔ اس دو سیکنڈ کی ہلچل نے تماشائیوں کو پنجوں پر کھڑا کر دیا۔ ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ ''اوہ'' کی مشترکہ آواز نکلی۔

یہ کھیل تقریباً تیس منٹ کا تھا۔ میری دھڑکنیں زیر و زبر ہوتی رہیں اور ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ ہر لحظہ یہی لگا کہ ابھی کوئی خوفناک حادثہ پیش آ جائے گا اور ہم سب خود سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھیں گے۔ یہ واقعی زبردست تھا۔

خدا خدا کر کے نہایت سنسنی خیز تماشہ ختم ہوا اور تالیوں کی گونج میں بازی گر رسّی کی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگے۔ مگر ابھی یہ کھیل مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا، بس اس کا ایک مرحلہ اختتام پذیر ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سرکس کے جوکر ٹائپ ملازمین پنڈال کے وسط میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے تماشائی حضرات کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں۔ تب وہ چند کرسیاں اُٹھا لائے اور انہیں ترتیب سے ایک اسٹیج پر رکھنے لگے۔ کرسیوں کے سامنے ایک میز رکھی گئی اور میز پر لکڑی کا ایک منقش باکس۔

سب سے پہلے شہزادہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور پھر متانت سے چلتا ہوا درمیان والی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے لکڑی کا باکس کھولا اور اس میں سے ایک سیاہ کولٹ ریوالور نکال لیا۔ باکس میں سے کچھ گولیاں نکال کر اس نے میز پر سجائیں۔ یہ اسٹیج پنڈال کے درمیان نہیں تھا بلکہ حاضرین کے بالکل سامنے تھا۔ بمشکل دس بارہ میٹر کا فاصلہ ہوگا۔ سلیمان عرف شہزادے نے ریوالور کے چیمبر میں ایک عدد گولی ڈالی اور چرخی کو تیزی سے گھما دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں ایک اور طرح کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ تماشائیوں میں موجود چند امیر زادے کچھ شرطیں لگا رہے تھے۔ ان شرطوں کا بھاؤ پہلے اوپر نیچے ہوتا رہا پھر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب یہ ایک کے مقابلے میں چھ تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے اپنے پہلو میں بیٹھی شاہین سے پوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں بولی تاہم دوسری طرف بیٹھے سینڈو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''یہ پہلی شرط ہے جی۔ ایک کے مقابلے میں چھ۔ شہزادہ صاحب اس ریوالور کی نال اپنے جسم پر رکھ کر گولی چلائیں گے۔ گولی نہ چلی تو شرط لگانے والوں کو پچاس ہزار روپیہ دینا ہوگا۔ اس میں سے پچیس ہزار شہزاد صاحب کو ملیں گے۔ گولی چل گئی تو شرط لگانے والے دو جے بندوں کو تین لاکھ دینا ہوگا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ اس قسم کے کھیلوں کے بارے میں مَیں نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن آج میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک جیتا جاگتا شخص تھا جو مجھ سے قریباً دس میٹر کی دوری پر اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ میں اتنی دور سے بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔

جب شرط پوری طرح بدل گئی تو شہزادے نے ایک بار پھر ریوالور کی چرخی گھمائی اور اس کی نال اپنے پیٹ پر پہلو کی طرف رکھ لی۔ ایک ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر نال کے مقام اور رخ کو چیک کیا۔ اس کے بعد شہزادے نے آنکھیں بند کیں اور اطمینان سے ٹریگر دبا دیا۔

''ٹرچ'' کی آواز اُبھری اور تماشائیوں میں سے کچھ افراد اُٹھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے گولی نہ چلنے پر شرط لگائی تھی۔ سلیمان عرف شہزادہ بھی ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کورنش بجایا۔ تب وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب شرط کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس میں ریوالور کے چیمبر میں دو گولیاں ڈالی گئیں۔ ایک بار پھر شرط باندھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پندرہ بیس نوجوانوں کی دو ٹولیاں تھیں جو آگے بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔ ان کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نئے نہیں ہیں، پہلے بھی اس پُرخطر کھیل کو انجوائے کرتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ شرط کا ریٹ سوا ایک اور تین کا تھا۔ جو شرطیں لگی تھی، ان کے مطابق گولی نہ چلنے کی صورت میں قریباً ایک لاکھ ادا کیے جاتے تھے اور چلنے کی صورت میں دو لاکھ چالیس ہزار۔ گولی نہ چلتی تو پھر لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے شہزادے کو مل جانے تھے۔ شہزادے نے دونوں گولیاں حاضرین کو دکھانے کے بعد چرخی کے خانوں میں آمنے سامنے ڈالی تھیں اور چرخی کو اچھی طرح گھما دیا تھا۔ سنسنی ایک بار پھر عروج پر پہنچ گئی۔ دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔ آخری عمل کرنے سے پہلے شہزادے نے حاضرین کی فرمائش پر اپنی قمیص اور بنیان اُتار دی۔ اس کا کسرتی جسم ٹیوب لائٹس کی روشنی میں دمکنے لگا۔ تاہم مجھے اس کے پہلو میں ایک گول سیاہ داغ بھی نظر آیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس کھیل کے دوران میں ایک بار پہلے گولی کا شکار ہو چکا ہے۔ حاضرین کی طرف بغور دیکھنے کے بعد شہزادے نے ریوالور کی نال کو اپنے پہلو میں مقررہ مقام پر رکھ دیا۔

''اگر اس کو گولی لگ گئی تو کیا ہوگا؟'' میں نے سرسراتی آواز میں سینڈو سے پوچھا۔

''یہاں ایک ڈاکٹر موجود ہے جی...... اور دوا دارو کا سامان بھی۔'' سینڈو نے سرگوشی کی۔

''گولی لگ گئی تو دوا دارو سے کیا ہوگا؟''

سینڈو کے بجائے شاہین بولی۔ ''یہاں اس کو فرسٹ ایڈ دیں گے۔ پھر گاڑی پر قریب کے ہسپتال لے جائیں گے۔ سارا انتظام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔''

پنڈال میں ایک بار پھر گہری خاموشی تھی۔ شہزادے نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور پھر آنکھیں بند کر کے دبا دیا۔ ایک بار پھر ٹرچ کی آواز اُبھری اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونج گیا۔

ٹریگر دبنے کے فوراً بعد ہی کیش وغیرہ کا تبادلہ کر لیا گیا۔ سلیمان عرف شہزادے کے حصے کی رقم فوراً ہی اس کو دے دی گئی۔

سرکس کا اسسٹنٹ منیجر عباس اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور حاضرین کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اناؤنسمنٹ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''ہمیشہ کی طرح آپ معزز حضرات میں سے بھی کوئی اگر اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو وہ یہاں آ سکتا ہے۔ کھیل کے اصول آپ سب جانتے ہی ہیں۔''

تماشائیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ قریباً ایک منٹ کی اضطرابی کیفیت کے بعد لمبے بالوں والا ایک نوجوان اسٹیج پر آ گیا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے ایک دو پرانے نشان اس کی گرم مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نے جینز اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے لباس اور شکل وصورت سے عیاں تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ وہ اطمینان سے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی حرکات وسکنات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھیل میں حصہ لے چکا ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ تھرل اور ڈرامے کے لیے تھا ورنہ ایسے نوجوانوں کو پیسے کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔

اس لڑکے نے بھی اپنے لیے دو گولی والا کھیل چنا۔ دو تین منٹ کے اندر ایک بار پھر شرط باندھنے والا عمل ہوا۔ اس مرتبہ بھی ریٹ تقریباً وہی تھا۔ جواریوں نے اپنی اپنی رقوم اسسٹنٹ منیجر عباس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیں۔ لمبے بالوں والے نوجوان نے چرخی گھما کر ریوالور کی نال قاعدے کے مطابق اپنے پہلو پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکے سے گولی چلی۔ حاضرین چلا اُٹھے۔ لمبے بالوں والے نوجوان کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور وہ اندھے منہ سامنے میز پر گرا۔ اس کی کراہ دور تک سنائی دی تھی۔ ملازمین جو پہلے سے تیار تھے دوڑ کر زخمی تک پہنچے۔ اسے اسٹریچر پر لٹایا اور اسٹریچر اُٹھا کر ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ زخمی، تکلیف کی شدت سے بل کھا رہا تھا۔ اس کے پہلو سے نکلنے والا خون اسٹیج پر ایک لکیر کی صورت میں دکھائی دینے لگا۔ سب حاضرین اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔

تاہم یہ سارا اضطراب صرف تین چار منٹ کے اندر ختم ہوگیا۔ اسٹیج پر خون کے دھبے تیزی سے صاف کر دیئے گئے۔ کچھ دیر بعد یوں لگنے لگا جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب میں نے دیکھا کہ عمران خود اسٹیج پر نمودار ہوا ہے۔ وہ ابھی تک بازی گری والے کاسٹیوم میں تھا اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ وہ میز کے پیچھے اسی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جہاں سے تین چار منٹ پہلے خونچکاں نوجوان کو اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ کتنی جلدی ہوا تھا وہ سب کچھ۔ صرف آٹھ دس منٹ پہلے وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تالیاں بجا رہا تھا اور ہلا گلا کر رہا تھا اور اب کوئی گاڑی اسے تیز رفتاری کے ساتھ ہسپتال کی طرف لے جا رہی تھی۔ جس کرسی سے وہ اُٹھ کر گیا تھا، وہاں اب مسکراتے چہرے والا عمران بیٹھا تھا۔

ایک بار پھر شرطیں باندھنے کا عمل شروع ہوا۔ اب اس عمل میں پہلے سے زیادہ سنسنی خیزی اور جوش پایا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اس اضافی جوش کی وجہ معلوم ہوگئی۔ سینڈو کے ذریعے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ عمران بھائی ''تین چھ کا کھیل'' کھیلیں گے۔ تین چھ کے کھیل سے مراد یہ تھی کہ تین خانے خالی، تین خانوں میں گولیاں، میں نے عمران کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور مجھے لگا کہ میں اسے مزید مسکراتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ یہ بیوقوفی کی حد تک دلیری کا مظاہرہ تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی موت کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے لیکن اس کی تلاش کا انداز ذرا مختلف ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی موت کا الزام اپنے سر لینے کا خواہشمند بھی نہیں ہے۔ اس نے یہ الفاظ غیر سنجیدگی سے کہے تھے۔ تاہم اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اتنے غیر سنجیدہ بھی نہیں تھے۔ حساب بالکل صاف تھا۔ عمران کے بچنے کا امکان پچاس فیصد اور گولی لگنے کا امکان بھی پچاس فیصد تھا۔ حاضرین آگے بڑھ بڑھ کر شرطیں لگا رہے تھے۔ ہر چہرہ سنسنی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری نظر عمران کی نظر سے ملی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ بتاؤ مزہ آ رہا ہے یا نہیں؟

اس کی دلی کیفیت کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اس کا چہرہ حسبِ معمول مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ریوالور ہاتھ میں لیے اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے شک تھا کہ شاید اس کھیل میں کوئی گھپلا وغیرہ کیا گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ریوالور میں نقلی گولیاں ہوں یا کھلاڑی نے اپنے لباس کے نیچے کوئی جیکٹ وغیرہ پہن رکھی ہو۔ مگر یہ دونوں شکوک ابھی تھوڑی دیر پہلے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ یہاں پر اصلی گولی چلی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے سلیمان عرف شہزادے نے اپنے کھیل میں اپنی قمیص بھی اُتار کر دکھا دی

تھی۔

شہزادے سے تو لوگوں نے قمیص اُتارنے کی فرمائش کی تھی مگر عمران نے بغیر فرمائش کے اپنا بالائی لباس اُتار دیا۔ اس کا نہایت مضبوط اور سڈول جسم دعوتِ نظارہ دینے لگا۔ شرطیں باندھنے کی گرما گرمی میں قریباً دس منٹ صرف ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عباس کے سامنے رکھی ٹیبل پر کرنسی نوٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔ یہ ساڑھے تین اور ڈھائی کا ریٹ تھا۔ گولی چلنے کی صورت میں قریباً سات لاکھ روپے ادا کیے جانے تھے جس میں سے اندازاً تین لاکھ روپے عمران کی جیب میں جانے تھے۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں پانچ لاکھ مخالف گروپ کو ادا کیے جانے تھے۔

قریباً تین لاکھ روپے کی خاطر عمران زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ اپنی جان کو اپنے ہاتھ سے داؤ پر لگا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح لوگ رقوم حاصل کرنے کے لیے اپنے جسمانی اعضاء گردے وغیرہ سرجنوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن ان معاملوں میں صرف ضرورت پیشِ نظر ہوتی ہے، یہاں تفریح اور سنسنی خیزی کا عمل دخل بھی تھا۔

مجھے لگا کہ میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہوگئی ہیں۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہو چکی تھی۔ ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر معائنہ کیا کہ عمران نے ریوالور کی نال اپنے پہلو میں درست مقام پر رکھی ہے یا نہیں۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈال میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پنڈال میں موجود ہر فرد پتھر کی طرح ساکت تھا۔ ریوالور کے تین خانوں میں گولیاں تھیں اور تین خانے خالی تھے۔ اب ''ہیمر'' کے سامنے کون سا خانہ تھا، یہ آنے والے لمحوں میں معلوم ہونا تھا۔ ایک زوردار دھماکا یا ٹرچ کی آواز۔

اور پھر عمران نے ٹریگر دبایا۔ بہت سے لوگ اُٹھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ ریوالور سے گولی نہیں چلی تھی۔ کئی افراد اسٹیج پر چڑھ گئے۔ انہوں نے عمران کو گلے لگایا اور اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ شرط ہارنے والے افراد بھی کچھ زیادہ مایوس نہیں تھے۔ ان کے لیے بھی شاید پیسے سے زیادہ سنسنی اور تحیر کا عنصر اہم تھا۔ عمران نے پستول کو چوم کر ہوا میں اُچھالا اور ایک ملازم نے اسے دبوچ لیا۔ عمران کے حق میں داؤ لگانے والے اب شدید تناؤ کے بعد خوشی میں مست دکھائی دیتے تھے۔

یہ ہلا گلا ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں سینڈو سے میری

تھوڑی بہت بات بھی ہوئی۔ اس گفتگو سے صرف اتنا پتا چلا کہ یہ تماشہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ویک اینڈ پر اس سرکس میں ہوتا ہے۔ میرے کئی سوالوں کے جواب سینڈو اور شاہین گول کر گئے۔ عمران اسٹیج سے اُتر چکا تھا تاہم تماشہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر عباس ایک بار پھر اسٹیج پر آیا اور بولا۔ ''آخر میں حسبِ دستور، میں ایک بار پھر دعوت دیتا ہوں کہ اگر معزز حاضرین میں سے کوئی اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو اسٹیج پر آ سکتا ہے۔ جوانمردی اور دلیری کا یہ کھیل ہم سب کے لیے ہے اور ہم اپنی ذمے داری پر اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے حاضرین کی طرف دیکھا۔ تماشہ سب کرنا چاہتے تھے لیکن ''تماشہ'' بننے کے لیے جو غیر معمولی ہمت درکار تھی، وہ کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

عباس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جی حضرات! آپ سب کے لیے موقع موجود ہے۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہر دلعزیز ساتھی ہیرو بھائی نے تین چھ کا کھیل کامیابی سے کھیلا ہے۔ پچھلے سے پچھلے ماہ بھی آپ نے دیکھا کہ وہ یہ کھیل کامیابی سے کھیل گئے۔ اگر ''تین چھ'' کھیلا جا سکتا ہے تو ایک چھ اور دو چھ کیوں نہیں کھیلا جا سکتا۔''

عباس کی اس تقریر کے نتیجے میں ایک اور نوجوان اسٹیج کی طرف بڑھا لیکن پھر ایک دوسرا شخص جو غالباً اس کا بڑا بھائی یا چچا وغیرہ تھا، اسے کھینچ کر واپس لے گیا۔

اسی دوران میں عمران میرے ساتھ والی نشست پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس نے چمکیلا کاسٹیوم اُتار دیا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں یہاں سرکس پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا گلاس تھا جس میں یقیناً بیئر تھی۔ اس کے لیے شاہین نے اپنی جگہ خالی کر دی تھی۔ تین چھ کے کھیل کی وجہ سے شاہین کا رنگ ابھی تک زرد تھا اور پیشانی پر ہلکا سا پسینہ نظر آ رہا تھا۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے عمران کو دیکھ رہی تھی۔ عمران اس کی طرف دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یار تابش! یہ جو گرل فرینڈز اور بیویاں ہوتی ہیں نا۔ یہی بندے کو اوپر لے جاتی ہیں اور نیچے بھی گراتی ہیں۔ اب تم ذرا سوچو اگر اپنے سکندرِ اعظم کی بیوی اس کی طرف ایسے دیکھتی جس طرح یہ میری طرف دیکھ رہی ہے تو کیا وہ آدھی دنیا فتح کر سکتا تھا؟ وہ تو مقدونیہ سے بھی باہر نہ نکل پاتا۔ کیوں...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا اور وہ اپنا جارج میلوری...... جس نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

شاہین نے مسکرا کر بات کاٹی۔ ''اس سے یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ سکندرِ اعظم اور جارج میلوری کی بیویوں کو انہیں روکنا چاہیے تھا۔ سکندرِ اعظم صرف 33 سال کی عمر میں مر گیا تھا اور میرے خیال میں ایورسٹ جارج نے سر نہیں کی تھی بلکہ سر کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش

میں 38 سال کی عمر میں اس کی جان چلی گئی۔ ہم نے تو کورس کی کتابوں میں یہی پڑھا ہے۔''

''بس تم ہر بات سے اپنے مطلب کی بات ثابت کر لیا کرو۔ اس طرح تو میں بھی تمہاری بات سے ایک بات ثابت کر سکتا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''تم نے خود کو کم از کم میری بیوی یا گرل فرینڈ تو مان لیا۔'' وہ بتیسی نکال کر مسکرایا۔

''تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ اپنے تراشیدہ بال جھلاتی ہوئی پچھلی نشستوں پر جا بیٹھی۔

عمران اپنے خاص انداز میں میری طرف جھکا اور میرا کندھا دبا کر بولا۔ ''یار! یہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں پر نہیں جانا چاہیے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سارے لڑکے اور نوجوان ایک جیسے نہیں ہوتے جیسے مابدولت۔ یعنی میں...... میں تمہیں بڑے پتے کی باتیں بتا سکتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ اسٹیج پر رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک ٹرائی تم بھی کرو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دیکھو...... گندم کی گولیوں سے تو ہنڈرڈ پرسنٹ اوپر کا ٹکٹ کٹ جاتا ہے۔ اس کھیل میں تو بہت سا چانس ہے۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میری بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔

''چلو...... زیادہ نہیں تو ''ایک چھ'' کھیل لو۔ قسم سے مزہ آ جائے گا۔ جیب علیحدہ گرم ہو گی۔ تھوڑی سی ہمت کرو یار۔'' اس نے پھر میرا کندھا دبایا۔

میں اسے کوئی سخت سا جواب دینے جا رہا تھا مگر اچانک میرے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ مجھے آج صبح پیش آنے والے سارے اذیت ناک واقعات یاد آئے اور مجھے لگا کہ میرے لیے عمران کی بات ماننا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ ایک خانے میں گولی...... پانچ خانے خالی۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا اور اگر چل بھی جاتی تو کیا ہوتا؟ اس ساری ناقابلِ برداشت صورتِ حال سے نجات مل جاتی۔ ساری نارسائیاں، مجبوریاں اور بے چارگیاں میرے ساتھ ہی ایک پُرسکون اندھیرے میں چھپ جاتیں۔ ایک پُرسکون اندھیرا جو زندگی کی سرحد سے آخری سرے پر مجھے آواز دے رہا تھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ کھیل کھیلنا میرے لیے

کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری ہمت بندھائی۔ مجھے اپنے جسم میں عجیب سی توانائی بھرتی محسوس ہوئی۔ سیٹھ سراج، اس کے کارندوں اور اس کے بیٹے واجی کے مکروہ چہرے میری نگاہوں میں گھومے اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے اس فیصلے پر تھوڑی دیر کے لیے عمران بھی حیران ہوا۔ وہ مجھے آمادہ تو کر رہا تھا لیکن حقیقت میں شاید اسے بھی یقین نہیں تھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں گا۔ حاضرین میں سے کئی ایک مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ایک عجیب سی کیفیت کے زیر اثر، اسٹیج پر موجود تھا۔ روشنی براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھی اور تماشائی نیم تاریکی میں نظر آتے تھے۔ ایک عدد اسپاٹ لائٹ عین میز کے اوپر تھی جہاں سیاہ پستول اور اس کی گولیاں رکھی تھیں۔ سینما ہال کے اندر میں نے جو سکون بخش گولیاں چبائی تھیں، ان کا اثر ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ میں ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔

شرطیں باندھنے کا عمل ایک بار پھر شروع ہوا۔ عباس کے سامنے رکھی میز پر کرنسی نوٹ حرکت کرنے لگے۔ شرط کا ریٹ سب سے پہلی شرط والا یعنی ایک چھ ہی رہا مگر رقم تھوڑی سی بڑھ گئی۔ یعنی گولی نہ چلنے کی صورت میں ساٹھ ہزار کی ادائیگی ہونی تھی جس میں سے تیس ہزار سیدھے میری جیب میں آنے تھے۔ گولی چلنے کی صورت میں مخالف پارٹی نے تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے دوسری پارٹی کو ادا کرنے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی تاہم حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں خود کو اذیت دینے کے لیے تیار تھا، چاہے یہ اذیت مجھے موت کے منہ میں ہی کیوں نہ لے جاتی۔ ایک چھوٹا سا کاغذ لایا گیا جس پر کچھ لکھا تھا اور مجھے دستخط کرنے تھے، تاہم عمران آڑے آیا اور اس نے کاغذ لانے والے کو اپنی ضمانت دے کر واپس بھیج دیا۔

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زبان تالو سے چپک رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے دل میں آیا کہ واپس چلا جاؤں مگر جہاں تک پہنچ گیا تھا وہاں سے واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے میز پر رکھی ایک گولی اُٹھائی اور اسے سب کے سامنے ریوالور کے چیمبر میں رکھ دیا۔ ریوالور کو بند کر کے میں نے اس کی چرخی کو تین چار بار زور سے گھمایا اور پھر اسے پیٹ کی دائیں سائیڈ پر رکھ دیا۔ ریفری نے آگے آ کر بیرل کی پوزیشن درست کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تماشہ دیکھنا اور بات ہوتی ہے، تماشہ بننا اور بات۔ بے شک چیمبر میں

صرف ایک گولی تھی، تاہم مجھے یہی لگ رہا تھا کہ یہ گولی "ہیمر" کے سامنے آئے گی اور ایک دھماکے سے میرے پیٹ میں چلی جائے گی۔ میں اس اذیت کو تصور میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جو گولی کے پیٹ میں گھسنے سے مجھے محسوس ہونے والی تھی۔

ایک بار پھر میں نے سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ اپنی نگاہوں کے سامنے کیا اور ہیجانی انداز میں ٹریگر دبا دیا۔ "ٹرچ" کی فرحت بخش آواز کانوں سے ٹکرائی اور مجھے قرب و جوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شرط جیتنے والے لوگ خوشی سے جھومنے لگے۔ ان میں سے دو چار کے بازوؤں میں کال گرل ٹائپ لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں بلکہ یہیں سے فراہم کی گئی تھیں۔ جیت کی خوشی میں ایک لڑکے نے اپنی ساتھی لڑکی کو آغوش میں بھینچ کر چٹا چٹ کئی بوسے لیے اور آوازے بلند کرنے لگا۔ اس کے ساتھی نے ڈانس شروع کر دیا اور پھر ڈانس کرتے کرتے اسٹیج پر آ کر مجھے تھپکی دی۔

قریباً دو منٹ کے اندر ہی پورے 30 ہزار روپے کے کرارے نوٹ میری جیب میں پہنچ گئے۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میری پیٹھ تھپکی۔ "ویل ڈن جگر! دیکھو تم ایک دم کماؤ پوت بن گئے ہو۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک بار پھر میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "بس...... یا اور کھیلو گے؟"

اس کے پوچھنے کا انداز بالکل رسمی تھا۔ یقیناً وہ جانتا تھا کہ میں اور نہیں کھیلوں گا۔ اسی لیے میں نے جو جواب اسے دیا، اس نے عمران کو ششدر کر دیا۔ میں نے کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو تو اور کھیل لیتا ہوں۔"

"کیا...... ارے کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔" میں نے بدستور مدھم لہجے میں کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو تو میں ایک بار "دو گولی" کے ساتھ کھیل لیتا ہوں۔"

"زبردست...... خوش کر دیا جانِ جگر۔" عمران کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اسسٹنٹ منیجر عباس بھی وہاں پہنچ گیا۔ عمران اور عباس کے درمیان چند سرگوشیاں ہوئیں اور پھر اناؤنسمنٹ ہوئی کہ میں ایک بار "دو چھ" کا کھیل کھیلوں گا۔

میرے دل و دماغ میں ایک دھند سی بھر گئی تھی۔ پہلی کامیابی نے میرے حوصلے کو ایک دم زبردست بڑھاوا دے دیا تھا۔ اس حوصلے کو میرے اندر کا غم و غصہ بھی مہمیز کر رہا تھا۔

ایک بار پھر شرطوں کا عمل شروع ہوا۔ ساتھ ساتھ بیئر کے چند گلاس بھی گردش کر رہے

تھے۔ سگریٹوں کا دھواں اور الکحل کی بُو میرے نتھنوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے ریوالور کھول کر اس میں ایک اور گولی ڈالی۔ کھیل کے ضابطے کے مطابق یہ گولی دو خانے خالی چھوڑ کر ڈالی گئی۔ یعنی دونوں گولیاں آمنے سامنے تھیں۔ چیمبر کو بند کر کے میں نے لرزتے ہاتھوں سے چرخی کو تین چار بار گھمایا اور تیار ہو گیا۔ اس مرتبہ شرط کی رقم ایک لاکھ پچاس ہزار تک پہنچی تھی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں مجھے اس میں سے قریباً 75 ہزار روپے ملنے تھے۔ مجھے رقم کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرا اصل مسئلہ میرے اندر کا شدید اضطراب اور انتشار تھا جس سے میں کسی صورت پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میری ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا تھا اور منہ ایک بار پھر خشک لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ دل کی رفتار بے حد تیز تھی۔ ریفری نما شخص کی ہدایت پر میں نے ریوالور کی نال کو پیٹ کی مقررہ جگہ پر رکھا اور انگلی ٹریگر پر جما دی۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

یہی وقت تھا جب اسسٹنٹ منیجر عباس مجھے غور سے دیکھتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ ’’حضرات! ہم یہاں حسبِ دستور کھیل میں تھوڑی سی مزید دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ تابش صاحب! چرخی کو گھما چکے ہیں، اب یہ دوبارہ نہیں گھما سکتے۔ کوئی بھی نہیں گھما سکتا۔ اس شرط میں سے تھوڑی دیر کے لیے باقی سب لوگ نکل جائیں گے۔ صرف کھلاڑی تابش اور عمر حیات صاحب رہ جائیں گے۔ عمر حیات صاحب ریوالور دیکھنے کے بعد تابش کو رضا کارانہ طور پر کچھ رقم آفر کریں گے۔ اس رقم کے بدلے تابش کو کھیل یہیں چھوڑنا ہوگا۔ اگر وہ کھیل نہیں چھوڑنا چاہے گا تو پھر پہلے والی شرط بحال ہو جائے گی۔ تو آیئے جناب عمر حیات صاحب۔‘‘

چالیس بیالیس سالہ ایک تنومند شخص اسٹیج پر چڑھ آیا۔ وہ کوئی خوشحال فیکٹری اونر ہی لگتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور واسکٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ عباس نے ریوالور میرے ہاتھ سے لیا اور بغیر دیکھے عمر حیات کی طرف بڑھا دیا۔ عمر حیات نے چشمہ لگا کر ریوالور کی چرخی کو چھیڑے بغیر اس کا معائنہ کیا اور عباس کو واپس دے دیا۔ عباس نے اسے میرے پیٹ سے لگایا اور دستہ مجھے تھما دیا۔

عمر حیات کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس صورتِ حال میں انجوائے کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ چہرے پر سرخی بھی تھی جو سنسنی کا نتیجہ تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ’’برخوردار! تم نئے آئے ہو اور کافی گھبرائے ہوئے بھی ہو۔ تمہاری جان بچانا میرا فرض ہے اور مجھے ہمیشہ یہ کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ پیسے میری اپنی جیب سے جاتے

ہیں۔ تو بیٹا جی! میں نے دیکھ لیا ہے۔ ریوالور کی نیت تمہارے بارے میں ایک دم خراب ہے۔ بہتر ہے کہ تم یہ کھیل یہیں پر چھوڑ دو۔ جیتنے کی صورت میں تمہیں 75 ہزار روپے ملنا تھے۔ میں تمہیں اپنی جیب سے دس ہزار روپے آفر کرتا ہوں۔‘‘

میں سمجھ گیا کہ اس طرح میرے اعصاب کو ٹیسٹ کیا جا رہا ہے۔ بے شک عمر حیات نے ریوالور کو دیکھا تھا اور ریوالور کی سائیڈ سے چرخی کو بغور دیکھا جائے تو گولیوں کی پوزیشن کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔ یہ سب کچھ صرف ’’تھرل‘‘ بڑھانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ’’نہیں...... میں کھیلنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’پندرہ ہزار۔‘‘ عمر حیات نے رضا کارانہ آفر کی۔

’’نہیں......‘‘

’’دیکھو برخوردار! لالچ اچھی چیز نہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ میری بات مان کر تم فائدے میں رہو گے۔ جنہوں نے تمہارے حق میں شرط لگائی ہے وہ بھی تمہیں دعا دیں گے۔‘‘

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بھی ہلا دیا۔

’’تمہاری قیمتی جان بچانے کے لیے بیس ہزار۔‘‘ عمر حیات نے بولی دینے والے انداز میں رقم بڑھائی۔ میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

’’مان جاؤ بچے! مان جاؤ۔ یہ کام تمہیں مہنگا پڑنے والا ہے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

جن لوگوں نے میرے حق میں شرط لگا رکھی تھی وہ کورس کی شکل میں مجھے مشورہ دینے لگے۔ ’’نہیں...... نہیں۔‘‘

عمر حیات مزہ لیتے ہوئے بولا۔ ’’اچھا...... تمہاری خوبصورت جوانی کی خاطر پانچ ہزار روپے مزید۔ پچیس ہزار روپے کم رقم نہیں ہے۔ ایک زبردست ڈنر...... ایک ولایتی بوتل اور ایک گرما گرم لڑکی۔ سب کچھ آ جائے گا اس میں۔‘‘

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’آپ میری زندگی بچانے میں جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ...... لیکن میں اپنی قسمت آزمانا چاہ رہا ہوں۔ پیسوں کی کمی بیشی میرے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔‘‘

درحقیقت میرا دل گھبرانا شروع ہو گیا تھا۔ اس شخص کا آنا اور اس کا سنسنی بڑھانے کا

انداز مجھے بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے بھئی اگر تم اپنی زندگی سے کھیلنا ہی چاہتے ہو اور تم نے ارادہ ہی کر رکھا ہے تو میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔ بہرحال، اس مصیبت سے بچانے کے لیے میں تمہیں ایک آخری آفر کر دیتا ہوں اور کھیل کے قاعدے کے مطابق میں اس سے زیادہ آفر کر بھی نہیں سکتا۔ پورے چالیس ہزار روپے۔ اگر تم چاہو تو چالیس ہزار لے کر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہو۔ دونوں طرف کے لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔''

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ خبر نہیں کہ وہ سچ رہا تھا یا جھوٹ؟ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر وہ سچا نہیں تھا تو پورے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ ان لمحوں میں وہ بھی ذرا تذبذب میں نظر آیا۔ یہ تذبذب تحیر اور تھرل تقریباً ہر چہرے پر نظر آ رہا تھا اور شاید یہی کیفیات تھیں جن کے حصول کے لیے یہ منچلے جواری اس سرکس کے ایسے پرائیویٹ شوز میں شرکت کرتے تھے۔

ایکا ایکی مجھے اپنے اندر کی ہیجان خیز توانائی کم ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا کہ ریوالور کے دستے پر میری گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میں اچانک جیسے ایک دوراہے پر آ گیا۔ یہ شخص بھی شاید یہی چاہتا تھا کہ میں دوراہے پر آ جاؤں۔ میرا تذبذب تماشائیوں کو لطف دے رہا تھا۔ تب میری نظر ایک بار پھر عمران پر پڑی۔ جونہی ہماری نظریں چار ہوئیں، عمران نے سر کے اشارے سے مجھے کھیل چھوڑنے کا عندیہ دیا۔ پتا نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن جو کچھ بھی تھا، اس کا یہ اشارہ میرے لیے مددگار ثابت ہوا۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ریوالور میز پر رکھ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کئی لوگوں کو کھیل چھوڑنے پر افسوس ہوا۔ کئی ایک نے تالیاں بجائیں۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میرا کندھا تھپکا۔ عمر حیات نے اسی وقت چالیس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر مجھے دیا جو میں نے عمران کو تھما دیا۔ عمر حیات نے اناؤنسمنٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''پیارے ساتھیو! اب ہم دیکھتے ہیں کہ برخوردار نے گھاٹے کا سودا کیا ہے یا فائدے کا؟ اسے 35 ہزار روپے مزید ملنے تھے یا 38 بور کی گولی ملنی تھی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور اُٹھایا اور اسے اسٹیج کے سامنے کی کچی زمین کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ''ٹرچ'' کی آواز کے بجائے ایک دھماکہ ہوا اور گولی زمین میں پیوست ہو گئی۔ میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ کچھ افراد نے تالیاں بجا کر اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ سکتہ

بند جواری افسردہ نظر آئے۔ عمران نے ایک بار پھر جوش سے میری پیٹھ تھپکی۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ حاضرین میں سے کوئی اور اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہے؟ لگتا تھا کہ اب کوئی نہیں اُٹھے گا۔ ویسے بھی گھڑی کی سوئیاں رات ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ عباس نے یہ محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''کیسا لگا یہ سب کچھ؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے ذہن میں ایک سوال تو ضرور اُبھر رہا ہو گا۔ فلموں وغیرہ میں جب ہم یہ ریوالور والا کھیل دیکھتے ہیں تو اس میں ریوالور کنپٹی پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں پیٹ پر رکھا جاتا ہے، آخری پسلی سے قریباً ایک انچ نیچے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اس کھیل کو تھوڑا سا کم خطرناک کیا ہے۔ گولی چلنے کے بعد بندے کے بچنے کا امکان موجود رہتا ہے۔ پچھلے چھ مہینے میں صرف تین بندوں کی جان گئی ہے۔ دس پندرہ ایسے ہیں جو گولی چلنے کے باوجود بچ گئے۔ اپنا یہ سلیمان عرف شہزادہ بھی ان میں شامل ہے۔ اسے پانچ مہینے پہلے گولی لگی تھی۔ اب یہ بھلا چنگا ہے اور سرکس میں اپنے سارے آئٹمز پورے کر رہا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تین بندوں کی جان چلی جانا معمولی بات ہے۔''

''موت تو ہر جگہ موجود رہتی ہے یار! راہ چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ لوگ مر رہے ہیں۔ دہشت گردی سے، ٹریفک حادثوں سے، لڑائی جھگڑوں سے، بیماریوں سے اور......خودکشیوں سے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر تک ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتا رہا پھر فون بند کر دیا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

''لو......آج لاہور شہر میں جو ڈیڑھ دو سو بندہ مختلف طریقوں سے مرنا تھا، ان میں ایک کی کمی واقع ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لڑکا جو یہاں گولی سے زخمی ہوا تھا، اب خطرے سے باہر ہے۔ امید ہے کہ وہ ایک آدھ دن میں زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔''

''اور اگر وہ نہ لوٹتا تو پھر؟ اس کا خون کس کے سر ہوتا؟''

''اگر مجھے یا تمہیں گولی لگ جاتی تو ہمارا خون کس کے سر پر ہوتا؟ ہمارے اپنے سر پر

ہی ہوتا۔ آج صبح یا کل کے اخبار میں چھوٹی سی خبر آتی کہ عمران ہیرو نام کا ایک لڑکا جو فلاں سرکس میں موٹر سائیکل کے کمالات دکھاتا تھا، اپنے ریوالور کی صفائی کرتے ہوئے گولی چلنے سے شدید زخمی ہوا اور فلاں پرائیویٹ ہسپتال میں ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔ بس حادثاتی موت...... نہ کوئی ایف آئی آر، نہ مدعی، نہ ملزم......''

''اگر ان تماشائیوں میں سے کوئی مخبری کر دے تو؟ یا ان تماشائیوں میں ہی کوئی اخباری رپورٹر وغیرہ موجود ہو؟''

''تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں سے بہت سے لوگوں کو منتھلیاں وغیرہ جاتی ہیں یار! اوپر تک سلسلہ ملا ہوتا ہے۔ اب جو جو رقمیں ہم نے جیتی ہیں یا کمائی ہیں، ان میں سے 20 فیصد ہمیں یہاں دینا ہوگا۔ اسپیشل شو کے اسپیشل ٹکٹ سے اکٹھی ہونے والی رقم علیحدہ ہے۔ میری جیب میں اس وقت تین لاکھ روپے آئے ہیں پنڈال چھوڑنے سے پہلے ساٹھ ہزار روپے مجھے یہاں جمع کرانے ہیں۔ اسی طرح تمہارے پاس ستر ہزار روپے آئے ہیں۔ اس میں سے چالیس ہزار کا چیک ہے۔ چیک کا حساب بعد میں ہو جائے گا، تیس ہزار میں سے چھ ہزار روپے تم ابھی یہاں جمع کرادو گے۔ یہ سب کچھ سسٹم کے ساتھ چلتا ہے۔''

کچھ دیر بعد ہم پھر موٹر سائیکل پر سوار تھے اور کھلی سنسان سڑک پر جا رہے تھے۔ میں جب اس سرکس میں آیا تھا تو میری جیب میں صرف آٹھ دس روپے تھے۔ اب میری جیب میں تقریباً چوبیس ہزار کے کرنسی نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ چالیس ہزار روپے کا اوپن چیک تھا۔ میرے دل و دماغ کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی قریباً ایک گھنٹہ پہلے میں اپنی مرضی کے ساتھ ایک نہایت خطرناک مرحلے سے گزرا ہوں۔ میں نے ایک ریوالور کے ذریعے اپنے جسم پر دو بار گولی چلانے کی کوشش کی ہے۔

عمران نے موٹر سائیکل کو پھر ہوائی جہاز بنا دیا تھا۔ اب تو لاہور کی سڑکیں بھی بالکل خالی تھیں۔ رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ ہر دم مچلتا اور شور مچاتا شہر تاریکی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ تیز ہوا میری جسمانی چوٹوں کو تکلیف دے رہی تھی مگر پتا نہیں کہ کیا بات تھی، جسمانی اذیت مجھے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ذہنی اذیت کو کم کرنے کے لیے میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے سکون بخش دوا کی دو گلابی ٹکیاں مزید نگل لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

''ہاں میرے یار! اب کیا پروگرام ہے؟ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق اب تم آزاد ہو۔ اگر جانا چاہو تو جہاں جی چاہے اُتر جاؤ لیکن اگر ابھی میرے ساتھ رہنا چاہو تو بسر و چشم۔ میرا گھر اور میرا دل تمہارے لیے حاضر ہیں۔''

ذرا دیر کے لیے تو دل چاہا کہ اسے رُکنے کے لیے کہوں اور یہیں گڑھی شاہو کے آس پاس کہیں اُتر جاؤں لیکن پھر ذہن میں آیا کہ اتنی رات گئے، ایسی حالت میں کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا؟ میں خاموش رہا۔ وہ چہکا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی ہے۔ زبردست...... بڑا اچھا فیصلہ ہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم آج رات کے لیے تو ضرور رُکو۔ کل اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ بندے نے جتنا بڑا فیصلہ کرنا ہو اس کے لیے اتنا ہی زیادہ وقت بھی استعمال کرنا چاہیے۔''

راوی روڈ کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک دم موٹر سائیکل ریلوے اسٹیشن کی طرف گھما دی۔ ''اِدھر کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تھوڑا سا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں سمجھا کہ وہ ٹوائلٹ وغیرہ کی بات کر رہا ہے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ اس نے اسٹیشن کے پاس اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے سامنے روکی۔ دو تین بار کال بیل بجائی پھر لوہے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص پاجامہ کرتہ پہنے باہر نکلا۔ عمران کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکیں۔ میں آٹھ دس قدم دور کھڑا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے مدھم لہجے میں کچھ کہا۔ جواب میں عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ یہ یقیناً کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ ادھیڑ عمر شخص کو نوٹ دکھائے بغیر عمران نے اس کے کرتے کی جیب میں ڈال دیئے۔ ادھیڑ عمر شخص حیران تھا اور بے حد خوش بھی۔ وہ عمران سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ عمران نے اسے بولنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر دوبارہ موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ قریباً دو کلومیٹر آگے آنے کے بعد عمران نے ایک اور حرکت کی۔ وہ ایک شاپنگ مارکیٹ کے سامنے رُکا۔ مارکیٹ کے برآمدوں میں بہت سے مزدور ٹائپ لوگ میلے کچیلے کمبل اور چادریں وغیرہ اوڑھے سو رہے تھے۔ تاہم یہاں دس پندرہ افراد ایسے بھی تھے جو ایک کونے میں الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے۔ یہ مزدور پیشہ لوگ جیسے یہاں عمران ہی کے انتظار میں تھے۔ جونہی عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی، وہ جوش کے عالم میں اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ عمران نے موٹر سائیکل ان کے بیچوں بیچ جا روکی۔ ''سلام ہیرو بھائی...... سلام بھائی جان! سلام جی۔'' بہت سی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

عمران نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالا۔ یہ پانچ سو والے نوٹ تھے۔ وہ بڑی تیزی سے ایک ایک نوٹ ہر شخص کے ہاتھ میں تھماتا چلا گیا۔ شور سن کر کچھ سوئے

ہوئے افراد بھی جاگ گئے اور بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے۔ دو تین منٹ کے اندر عمران نے پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں تیرہ چودہ ہزار روپے تقسیم کر دیئے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رُخ سیدھا گھر کی طرف تھا۔

''سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟'' اس نے موٹر سائیکل چلاتے چلاتے بلند آواز میں پوچھا۔

''کیوں...... کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''سلطانہ ڈاکو میرے پڑدادا کے چچیرے بھائی کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرے پڑنانا کی بہن کا دیور بھی لگتا تھا۔ سلطانہ ڈاکو امیروں سے مال لوٹ کر غریبوں میں بانٹتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اس سے ملتا جلتا کام کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ امیروں پر پستول تان کر ان کو لوٹتا تھا، میں خود پر پستول تان کر ان کو لوٹتا ہوں۔ بلکہ آج تو تم نے بھی اس سے ملتا جلتا کام کیا ہے۔ بھئی واہ...... میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم ''دو چھ'' کھیلنے کی ہامی بھر لو گے۔ جینا اسی کا نام ہے میری جان! آگے بڑھ کر جیو...... سانس تو سب ہی لیتے ہیں مگر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سانس لینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔''

وہ بے پَر کی اُڑا رہا تھا اور اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل اُڑ رہی تھی۔

جلد ہی ہم راوی روڈ کی گنجان آبادی میں داخل ہوئے۔ رات کے اس پہر بازار سنسان پڑا تھا۔ ایک چوکیدار اور دو تین آوارہ کتوں کے سوا کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ عمران نے حسبِ سابق چابی لگا کر گھر کا دروازہ کھولا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ بہر حال، اس نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ اپنی شور مچاتی موٹر سائیکل کو بازار میں ہی بند کر دیا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اڑوس پڑوس والے اس شور کو شورِ محشر سمجھتے ہوئے کلمہ پڑھ کر بیدار ہو جائیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نیم گرم کمرے میں کمبل اوڑھے اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ میں جاگ رہا تھا اور میرے ساتھ عمران بھی جاگ رہا تھا۔ یقیناً وہ میرے بارے میں اور میرے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے وہ مجھ پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے جیسے یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ بس ہم کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ بیدار ہوا تو دن چڑھ آیا تھا۔ گھر سے باہر مخصوص شور سنائی دے رہا تھا۔ اس چار دیواری سے باہر زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔

نتھنوں سے کھانے کی خوشبو ٹکرائی۔ دیکھا تو سامنے میز پر ایک بھرپور ناشتہ چنا ہوا تھا۔ ڈبل روٹی، مکھن، فرائی انڈے، حلوہ پوری، چنے اور دودھ وغیرہ۔ عمران میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اسی نے میرے شانے کو ہلا جلا کر مجھے جگایا تھا۔ میں اُٹھا تو بے ساختہ کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ کل جو کچھ میرے ساتھ اور میرے جسم کے ساتھ ہوا تھا، وہ اپنی موجودگی کا پورا پورا احساس دلا رہا تھا۔ ایک ٹانگ تو چوٹ کے سبب بالکل اکڑ گئی تھی۔ میں کل بھی سارا دن لنگڑاتا رہا تھا مگر آج یہ لنگڑاہٹ ضرورت سے زیادہ تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے والے گہرے کٹ سے بھی خون رِسا ہوا تھا۔ یہاں میری اپنی ہی بیلٹ کا آہنی بکل لگا تھا۔ اس بیلٹ نے میرے جسم پر کئی اور جگہ بھی گہرے نشان چھوڑے تھے۔ کل کے سارے واقعات ایک دم ذہن میں آئے اور سینے میں گاڑھا سیاہ دھواں بھر گیا۔ امی کیا سوچ رہی ہوں گی؟ عاطف میری تلاش میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا؟ فرح کا تو رو رو کر بُرا حال ہو گیا ہوگا۔ ان سب کا درد و کرب میرے تصور میں آیا اور دل خون کے آنسو رونے لگا۔

عمران کے بے حد اصرار پر میں نے منہ ہاتھ دھو کر چند لقمے زہر مار کیے اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

''میرا ایک کام کر دو۔'' میرا لہجہ کھویا کھویا تھا۔

''بس ایک کام؟ یار! تم ایک ہزار کام کہو تو میں ابھی کرنے کو تیار ہوں۔ تم کچھ بولو تو سہی۔''

''میں تمہیں ایک نمبر دیتا ہوں۔ یہ میرے گھر کا نمبر ہے۔ اس پر ایک فون کر دو۔ وہاں سے جو بھی بولے، اسے میرے بارے میں بتا دو کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دو دن میں ان سے رابطہ کروں گا۔ وہ پریشان نہ ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں بتانا، بس یہ اطلاع دے کر فون بند کر دینا۔''

''لیکن یار! یہ کام تم خود کر لو تو زیادہ اچھا نہیں؟''

''اس کا مطلب ہے کہ تم کرنا نہیں چاہتے؟''

''ارے...... تابی یار! ایک تو تم ناراض فٹافٹ ہو جاتے ہو۔ لو میں کر دیتا ہوں فون۔''

اس نے فوراً موبائل نکالا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے گھر کا نمبر بتایا۔ وہ کال ملانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ ''نہیں...... یہاں نہیں...... دوسرے کمرے میں جا کر کر لو لیکن ان سے کوئی اور سوال جواب نہیں کرنا۔ جو کچھ پوچھنا ہے۔ مجھ سے پوچھ لینا۔''

"واقعی؟" اس نے حیرت آمیز خوشی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا حوصلہ ایک دم اتنا ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے گھر والوں کا سامنا کرنا یا ان سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ عمران میرے سامنے ان کو کال کرے۔

دو تین منٹ بعد عمران واپس آیا۔ اس کے چہرے پر دُکھ کا تاثر تھا۔ "کس نے بات کی؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ تھیں۔ بس روئے جا رہی تھیں۔ خدا رسول کا واسطہ دے رہی تھیں کہ میں تم سے بات کرا دوں۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کتنی ہی دیر میں نے کوئی بات کی نہ عمران نے۔ آخر اس نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور بولا۔ "لگتا ہے کہ بہت دُکھی کر کے آئے ہو اپنے گھر والوں کو۔ تم شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔ کیا کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو گیا تھا؟"

اس کی آواز میں ہمدردی اور محبت کا ایسا رچاؤ تھا کہ میری آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "غم بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے۔ اگر مجھے کسی قابل سمجھتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

میں نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں عمران سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے اپنے بہت قریب لگ رہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی اس شخص میں۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں نے خود کو اس بات پر آمادہ پایا کہ اسے اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دوں۔

جب یہ موضوع شروع ہوا تو پھر باتیں کھلتی چلی گئیں۔ درمیان میں وہ مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ اس کا انداز اتنا اخلاص بھرا تھا کہ میں جو گوشے اس سے چھپانا چاہتا تھا وہ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا۔ قریباً دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد عمران میرے بیشتر حالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی اور ثروت کی محبت کے بارے میں بتایا۔ واجی اور اس کے غنڈا صفت یاروں کے بارے میں بتایا اور پھر ان حالات کے بارے میں بتایا جن کا شکار ہو کر ثروت اس کے بھائی اور بہن کو آناً فاناً بیرون ملک جانا پڑ گیا تھا۔

عمران میری ان جسمانی چوٹوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو چوبیس گھنٹے پہلے

میرے جسم پر آئی تھیں اور اس واقعے کے بارے میں جس نے مجھے مرنے کی حد تک مایوس کر دیا تھا۔ میں نے اسے اس بارے میں بھی بتا دیا۔ اپنے گھر کے قریب واقع پارک میں اچانک سیٹھ سراج سے میری مڈ بھیڑ، میرا سیٹھ سراج کو طمانچہ رسید کرنا اور سیٹھ سراج کے کارندوں کا مجھے مار مار کر نیم جان کر دینا۔ میں نے سبھی کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ وہ سنتا رہا اور اس کے چہرے پر عجیب سی سختی نمودار ہوتی رہی۔

میری روداد ختم ہوئی تو وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا ذہن بڑی برق رفتاری سے کچھ سوچ رہا ہے۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"یہ سراج جیسے لوگ ہی ہیں جنہوں نے زندگی کو سزا بنا رکھا ہے۔ یہ عام بندے کو جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ ان کے سامنے سر جھکاؤ تو یہ جھکے ہوئے سر کو اور جھکاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناک زمین پر رگڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اگر ان سے ٹکر لو تو پھر یہ اپنی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ ٹکر لینے والے کو دوسروں کے لیے عبرتناک مثال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر اوچھا ہتھکنڈا، ہر وحشی حربہ بروئے کار لاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کی گہری نظریں بدستور میرے چہرے پر رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟ ایک بار مزہ چکھا دیا جائے اس سیٹھ کو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اینٹ کا جواب کم از کم اینٹ سے تو ہم دے ہی سکتے ہیں۔ میرے پاس ایک دو بندے ایسے ہیں جو زہریلے مچھر کی طرح سیٹھ کی ناک میں گھس کر اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں۔"

"نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بڑا خبیث بندہ ہے۔ ہر حد تک جا سکتا ہے اور میری ماں ہے، بہن بھائی ہیں۔ میں ان کے لیے خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"اس کی بھی ماں ہو گی۔ ماں نہیں ہو گی گھر والے تو ہوں گے۔ بیوی بچے، بہن بھائی، کیا وہ اکیلا ہی دنیا میں ٹپکا ہوا ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے اپنی ٹھوڑی کی گیلی پٹی اُتارتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ نہ چاہ رہے ہو۔ جو کچھ سیٹھ نے تمہارے اور ثروت وغیرہ

کے ساتھ کیا ہے، اس کے بعد تو سیون ایم ایم کی تین چار گولیاں اس کے کھوپڑے میں ٹھونک دی جائیں تو یہ بھی کم ہوگا۔ اگر یہ نہیں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ سزا تو اسے ملنی ہی چاہیے۔ تم نہ بھی دو گے تو میں ضرور دوں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''سیٹھ کی تھوڑی سی دھلائی تھوڑی سی کھینچا کھینچی اور چھینٹا چھینٹی۔ لیکن گھبراؤ مت تم اس میں ملوث نہیں ہوگے۔ تم بس کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر تماشہ دیکھنا۔ اس سے تمہیں تھوڑا سا سکون ملے گا اور مجھے بھی۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔''

''نہیں...... میں تو صاف اور سیدھی بات کر رہا ہوں۔ سیٹھ نے جو کچھ کیا اس کی سزا تو کافی سنگین ہونی چاہیے لیکن چلو شروع میں چھوٹا سا ٹریلر ہی سہی۔ میرا جی چاہ رہا ہے جانِ من! سیٹھ کی اس جگہ درگت پٹائی ہو جہاں اس نے تم سے مارا ماری کی ہے۔ وہی لوگ اس کا تماشہ بھی دیکھیں جنہوں نے تمہارا تماشہ دیکھا تھا۔''

''اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس سے کیا ہوگا؟''

''بس میرا کلیجہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل علیحدہ معاملہ ہوگا۔ اس کو تمہارے معاملے سے بالکل بھی نتھی نہیں کیا جا سکے گا۔ سمجھو کہ ہم راہ چلتے سیٹھ سے جھگڑا مول لیں گے اور آناً فاناً اس کی درگت بنا دیں گے۔ تم دیکھنا، بڑی کلاسیکل سچویشن بنے گی۔''

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تمہیں کس سے دلچسپی ہے؟ بتاؤ...... کس سے دلچسپی ہے؟ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جسے انسان مضبوط ارادے کے ساتھ کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جا سکتے ہیں، دریاؤں کے رُخ موڑے جا سکتے ہیں اور چاند پر قدم رکھا جا سکتا ہے تو اور کون سا کام مشکل ہوگا؟ اگر ثروت بی بی کی یاد تمہارے دل کو زخمی کر رہی ہے تو اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ اسے بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ڈھونڈا جا سکتا ہے بلکہ اس سے قبول ہے، قبول ہے بھی کرایا جا سکتا ہے۔ دیکھو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے کام ممکن ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے تم اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی مایوسی کی دھند صاف کرو۔ زندگی کرکٹ کے کھیل کی طرح ہے پیارے! باؤلنگ کتنی بھی سخت ہو، پچ کتنی بھی خراب ہو لیکن وکٹ پر کھڑے رہنا بہرحال، آؤٹ ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔ بندہ وکٹ پر کھڑا رہے تو خوشیوں کا تھوڑا تھوڑا

اسکور خود ہی بننا شروع ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی ہٹیں نہ بھی لگ سکیں تو کہیں بائی کا اسکور ہو گیا تو کہیں نو بال یا وائیڈ بال کا رن مل گیا اور کچھ نہیں تو وکٹ کیپر نے ہی محبت کا ثبوت دیا اور بال چھوڑ کر پیچھے سے چوکا کرا دیا اور اگر......''

''یار! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن فی الحال میں ذرا تنہائی چاہ رہا ہوں۔ کچھ دیر اکیلے میں سوچنا چاہ رہا ہوں۔''

''مگر اکیلے بندے کے ساتھ تو شیطان ہوتا ہے اور تمہارا شیطان تو ہے بھی ذرا خطرناک قسم کا۔ گندم میں رکھنے والی گولیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔''

''نہیں...... میں اس طرح نہیں سوچوں گا۔'' میں نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''لیکن یار میرے...... سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پنجابی میں نہیں کہتے کہ سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ سوچنے کے بجائے کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرتے ہیں، وہی دنیا بدلتے ہیں اور اپنے حالات بھی۔''

وہ لسوڑے کی لیس کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ مسلسل باتیں کر رہا تھا اور واقعی میرے ذہن کو مایوسی اور پریشانی کی طرف جانے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جیسے خود ہی طے کر لیا تھا کہ میں نے کم از کم دو تین دن مزید تو یہاں ضرور رہنا ہے۔ اس حوالے سے اس نے اپنے پڑوسی زاہد بھائی کو بھی بتا دیا تھا اور اسے میری خیر خیریت سے بھی آگاہ کیا تھا۔ زاہد کو یہی پتا تھا کہ میں کل ریلوے اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے پھسل کر گرا ہوں جس کی وجہ سے مجھے چوٹیں آئی ہیں۔ عمران کی طرح اس کے پڑوسی زاہد نے بھی اسٹیشن کی سیڑھیوں اور سیڑھیاں بنانے والوں کو بے نقط سنائی تھیں۔ بلکہ ریلوے کا محکمہ، ریلوے منسٹر، موجودہ حکومت اور اس سے آگے امریکہ تک بھی شدید مذمت کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

میری ٹانگ میں رات بھر شدید درد ہوتا رہا۔ اگلے روز کچھ افاقہ ہو گیا۔ بہرحال، سہ پہر کے وقت عمران نے بہ اصرار مجھے ایک مہران گاڑی میں سوار کیا اور ڈاکٹر کو دکھانے لے چلا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا کوئی دوست آرتھوپیڈک ڈاکٹر ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ چوٹ ایسی شدید ہے کہ ہڈی کے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا جائے مگر عمران بضد رہا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے بہانے سے باہر لے کر آیا تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی سب سے ہیلو ہائے ہوئی۔ ایک تھڑے پر بیٹھے ہوئے چاچے نذیر کے قریب گاڑی روک کر عمران نے پوچھا۔ ''ہاں چاچا! ختم ہو گئی چائے کہ ہے؟''

بہرے نذیر نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''گائے؟ گائے کا دودھ آج کل کہاں ملتا۔

علیحدہ سے؟''

''گائے نہیں۔ چائے...... چائے۔'' عمران نے زور سے کہا۔ ''چائے ختم ہوگئی کہ ہے؟'' اس دفعہ نذیر نے جواب دیا کہ ختم ہوگئی۔ عمران نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا خشک چائے کا بڑا ڈبہ اُٹھا کر چاچے نذیر کو تھما دیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ دعائیں دینے لگا۔ گاڑی برق رفتاری سے بازار سے نکل کر بڑی سڑک پر آگئی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ بغور دیکھنے پر ہی باہر سے کچھ نظر آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ اگر کوئی شناسا اندر جھانکنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر؟

اس وقت میری بے چینی بڑھ گئی جب میں نے دیکھا کہ عمران کا رُخ میرے علاقے کی طرف ہے۔ ''یہ کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تمہیں...... تمہارے گھر والوں سے ملانے نہیں لے جا رہا ہوں یار! مجھے پتا ہے کہ تمہیں اختلاجِ قلب ہو جائے گا۔ ہمارا راستہ ہی یہ ہے۔''

دو تین منٹ بعد میری بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اس پارک کے قریب پہنچ رہا تھا جہاں دو دن پہلے میری زندگی کا اندوہناک ترین واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے کار کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''گاڑی روکو۔'' میرا لہجہ غصیلا تھا۔

وہ گاڑی روکتے روکتے بھی قریباً نصف فرلانگ آگے چلا گیا۔ یہاں سے وہ منحوس پارک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں دو دن پہلے سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں سے میری خوفناک مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہ زیرِتعمیر عمارت بھی نظر آ رہی تھی۔ جس کی تعمیر غالباً سیٹھ سراج خود کرا رہا تھا۔ یہ عمارت ایک طرح سے پارک کی زمین پر ہی بنائی جا رہی تھی۔ ''یہ تم کیا ڈرامہ کر رہے ہو؟'' میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

''ڈرامہ نہیں یار! چھوٹا سا چٹکلا ہے۔''

میں نے اپنی پی کیپ کو چہرے پر کچھ اور بھی جھکا لیا اور نیچے کھسک کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ میرے گھر سے ایک کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ میرا کوئی شناسا مجھے یہاں دیکھ لیتا۔ میں نے دل ہی دل میں عمران کو صلواتیں سنائیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ وہ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ ''کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ہمارے ارادے تو کچھ نہیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے، بس تھوڑا سا تماشہ دیکھیں گے۔''

''کیسا تماشہ؟ کیا تم...... سیٹھ سراج کے ساتھ کچھ کرنے لگے ہو؟'' میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

''سیٹھ سراج کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے یار! وہ کوئی چھیل چھبیلی لڑکی تو نہیں ہے اور اگر کچھ تھوڑا بہت ہونا بھی ہے تو وہ ہمیں نہیں کرنا۔ ہمارا کوئی تعلق نہیں اس معاملے سے۔''

''تم ایک دم حماقت کی باتیں کرتے ہو۔ میں یہاں رُکنا نہیں چاہتا۔'' میرے لہجے میں شدید جھلاہٹ تھی۔

''تو اُتر کر چلے جاؤ۔'' وہ مسکرایا۔

وہ جانتا تھا کہ میں یہاں جانے پہچانے لوگوں کے درمیان گاڑی سے اُترنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا مگر دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

ہماری اس گفتگو کے درمیان میں ہی میں نے عمران کو ذرا چونکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے پاس سے ایک سوزوکی پک اپ (ہائی روف) گزری مجھے شک ہوا کہ اس میں سیٹھ سراج تھا۔ ویسے تو وہ اپنی سیاہ چمکیلی ہنڈا میں سفر کرتا تھا تاہم اس کے علاوہ بھی وہ ایک دو گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ سفید پک اپ کے پیچھے ہی پیچھے ایک نیلی اسٹیشن وین تھی۔ پک اپ کا رُخ پارک کی طرف تھا۔ غالباً سیٹھ سراج شام سے پہلے زیرِتعمیر عمارت کا کام دیکھنے جا رہا تھا۔ ابھی وہ پارک سے دور ہی تھا کہ زوردار آواز آئی۔ پک اپ نے ہلکی سی بریک لگائی تھی۔ عقب میں آتی ہوئی نیلی اسٹیشن وین کے ڈرائیور نے دھماکے سے گاڑی پک اپ میں ٹھونک دی تھی۔

ایک دم بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دور سے ہی نظر آ رہا تھا کہ نئے ماڈل کی سوزوکی کا پچھلا حصہ پچک کر رہ گیا ہے اور پھر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ سوزوکی ہائی روف میں سیٹھ سراج ہی تھا۔ وہ اپنے چوڑے چکلے جسم کو ہچکولے دیتا ہوا سوزوکی کے اگلے بائیں دروازے سے برآمد ہوا۔ نیلی اسٹیشن وین میں سے بھی دو تین نوجوان نکل آئے۔ تنازعہ شروع ہو گیا۔ میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ عمران نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا تھا۔ جائے حادثہ پر شروع ہونے والا تنازعہ ایک دم ہی لڑائی میں بدل گیا۔ اسٹیشن وین میں سے برآمد ہونے والے چار پانچ نوجوان جو یقیناً عمران کے ساتھی ہی تھے، سیٹھ سراج اور اس کے دو کارندوں پر پل پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سرخ سپید پٹھان نما شخص کا زوردار جھانپڑ کھا کر سیٹھ سراج پشت کے بل پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے ایک کارندے نے شاید پک اپ کے اندر سے کوئی

ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش کی لیکن ایک دوسرے نوجوان نے اسے کمر سے پکڑا اور بے پناہ شدت سے گھما کر ایک الیکٹرک پول سے دے مارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پٹھان اور اس کا ایک ساتھی سیٹھ سے چمٹ گئے۔ انہوں نے اسے دوبارہ سڑک پر گرایا اور چند سیکنڈ میں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کے دونوں ہٹے کٹے کارندے بھی اسٹیشن وین سے نکلنے والے نوجوانوں کے ہاتھوں بُری طرح پٹ رہے تھے۔ یہ سین ذرا قریب سے دیکھنے کے لیے عمران گاڑی سے اُترا اور بھاگتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ چھڑانے والوں میں شامل ہو گیا۔ تاہم میں نے صاف دیکھا کہ وہ بظاہر تو سیٹھ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصل میں اپنے ساتھیوں کو مارا ماری کا مزید موقع دے رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن وین والے نوجوان واپس گاڑی میں بیٹھے اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دیکھنے والوں کو یہی لگا تھا کہ شاید وہ گاڑی کو سائیڈ پر لگانے لگے ہیں مگر وہ چند سیکنڈ میں اُڑن چھو ہو گئے۔ جب تک زیر تعمیر عمارت میں کام کرنے والوں کو اس ''درگت'' کی پوری طرح خبر ہوتی اور وہ دوڑتے ہوئے اپنے آقائے نامدار کی مدد کو پہنچتے، وہاں کچھ نہیں تھا۔ سیٹھ سراج کو سہارا دے کر تباہ حال سوزوکی میں بٹھایا جا رہا تھا۔ اس کا گریبان لہولہان تھا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر بلند آواز میں گالیاں بک رہا تھا مگر جن کے لیے یہ گالیاں تھیں، وہ کب کے اس کا تھوبڑا خون آلود کر کے ہوا ہو چکے تھے۔ سیٹھ کے ایک کارندے نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مترادف ایک دو ہوائی فائر بھی کیے۔ موٹر سائیکل پر سوار دو ٹریفک پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے مگر اب ان کا آنا بے سود تھا۔

اسی دوران میں عمران دوڑتا ہوا واپس کار میں آ گیا۔ ''بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''ذرا سی بات پر لوگ ایک دوسرے کا سر پھاڑنے لگتے ہیں۔ چچ...... چچ۔''

اس نے گیئر لگا کر کار آگے بڑھائی۔ ہم جائے حادثہ کے پاس سے گزرے۔ وہاں ہجوم کی وجہ سے رفتار خاصی کم تھی۔ میں نے اپنا چہرہ پی کیپ اور ہاتھ کی اوٹ میں چھپایا ہوا تھا۔ میری نظر سیٹھ سراج کی پھٹی ہوئی قمیص اور لہولہان ٹھوڑی پر پڑی۔ سینے میں نفرت آمیز خوشی کی ایک چھوٹی سی لہر دوڑ گئی۔ سیٹھ کے جرم کے مقابلے میں یہ سزا بہت چھوٹی تھی لیکن سزا تو تھی۔ وہ بھنائے ہوئے انداز میں کسی کو موبائل فون سے کال کر رہا تھا۔

سوزوکی پک اپ کا ''پچھا'' تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف سے چادر اندر گھس گئی تھی۔ سوزوکی میں تین چار بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں پھٹ گئی تھیں اور بوریوں کے اندر سے چاول وغیرہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ کار وہاں سے آگے بڑھ گئی تو میں نے

اطمینان کی سانس لی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''اسٹیشن وین کا نمبر نوٹ کر لیا گیا تو پھر؟''

''ہمیں کیا؟ اسٹیشن وین والے جانیں اور سوزوکی والے۔'' وہ بے پروائی سے بولا مگر میرے چہرے پر غصے کا تاثر دیکھ کر فوراً بولا ''اصل میں تم نے غور نہیں کیا۔ اسٹیشن وین کی نمبر پلیٹ کیچڑ کے چھینٹوں سے بالکل چھپی ہوئی تھی۔ اسے پڑھے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا گیا تھا۔''

''یعنی یہ سب کچھ پوری پلاننگ کے ساتھ ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔

''پلاننگ کے بغیر تو پاکستان میں بس حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ باقی ہر شے کے لیے تھوڑی بہت پلاننگ تو کرنی پڑتی ہے۔''

ہم ایک ڈیڑھ کلومیٹر آگے گئے تھے کہ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا کوئی ساتھی تھا۔ ''ونڈر فل...... سب ٹھیک رہا۔ ایک دم فائیو اسٹار...... دو تین دن تو ٹکور چلے گی۔'' دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں...... یہ چیز تو میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا۔ ہاں...... بالکل...... دونوں بوریاں اسی طرح تھیں۔ بڑی نظر ہے بھئی تمہاری بھی۔ بے شک...... بے شک...... مجھے بھی کوئی چکر لگتا ہے۔ ٹھیک ہے او کے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اس کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں نظر آئیں۔ میں کچھ دیر تو چپ رہا پھر میں نے پوچھا۔ ''بوریوں کی کیا بات کر رہے تھے؟''

''کچھ شک سا پڑا ہے مجھے اور اقبال کو۔'' اس نے اپنے ساتھی کا نام لیا۔

''کیسا شک؟''

''پک اپ میں جو دو بوریاں پھٹی تھیں، ان میں ایک عجیب چیز سامنے آئی ہے۔ بوریوں میں اوپر چاول تھے اور نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی۔ چاولوں کی تہ مشکل سے دو تین انچ ہو گی۔ گندم میں مٹی کی ملاوٹ تو سنی تھی لیکن چاولوں میں مٹی اور وہ بھی ننانوے فیصد؟'' عمران نے کندھے اُچکائے۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ مٹی نہ ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''دیکھنے میں تو مٹی ہی لگتی تھی یار! ہاں...... یہ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور ہو۔ ویسے یہ سیٹھ سراج جس طرح کا بندہ ہے اس سے کسی بھی قسم کی بُری توقع کی جا سکتی ہے۔ واقعی ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور چھپایا گیا ہو۔ کوئی اسلحہ وغیرہ یا پھر ہیروئن شروئن۔ میرا

تو دل چاہ رہا ہے کہ سیٹھ کی تھوڑی سی ''سی آئی ڈی'' کی جائے۔ میرے خیال میں تو ایسے بندے کو کسی مصیبت میں گرفتار کرانا بھی عین ثواب ہے۔''

میں خاموش رہا۔ سیٹھ سراج کو زدوکوب کیے جانے کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں سیٹھ سراج کو اتنی جلدی اپنی ہی طرح کسی کے ہاتھوں سے پٹتے ہوئے دیکھوں گا۔ اس کی گاڑی کا بھی اچھا خاصا نقصان ہوا تھا اور نقصان کے ساتھ وہ پھٹی ہوئی بوریاں۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ یہ بوریاں کہاں لے کر جا رہا تھا جن میں اوپر تھوڑے سے چاول اور نیچے مٹی بھری ہوئی تھی۔ دو بوریوں میں یہ صورت حال تھی تو یقیناً باقی بوریوں میں بھی یہی کچھ ہوگا۔

میں جلد ہی عمران کے ساتھ اس کے گھر واپس پہنچ گیا۔ وہ اپنے اس مشن کی کامیابی پر کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا تھا کہ سیٹھ نے اتنے بجے وہاں پہنچنا ہے؟''

''پتا تھا یار! اس کے لیے ہوم ورک کیا تھا باقاعدہ۔''

''اور اگر عمارت میں کام کرنے والی لیبر موقعے پر پہنچ جاتی تو کیا ہوتا؟''

''ہماری اسٹیشن وین میں تین چار بندے اور بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک دو تین بندوں پر بھاری ہے۔ اس کے بعد میں خود بھی تو تھا۔ تمہارا یہ یار تمہاری دعا سے پانچ چھ بندوں کو تو بآسانی آگے لگا سکتا ہے۔ بھئی، ایسے ہی تو ہیرو کا خطاب نہیں ملا ہوا ہے۔'' اس نے بازو کو موڑ کر قمیص کے اندر سے ہی اپنا مسل دکھایا۔

مجھے اس بات کی تسلی دی کہ سیٹھ کی ٹھکائی والے معاملے کو کوئی شخص بھی میرے والے معاملے سے نتھی نہیں کر سکے گا۔ ایکسیڈنٹ والا کام بڑی چابک دستی اور پلاننگ سے کیا گیا تھا اور یہ سارا واقعہ بالکل حادثاتی لگتا تھا۔

گھر والوں کی پریشانی کا خیال مجھے ہلکان کر رہا تھا۔ ان سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا مگر انہیں فون کرنے کی ہمت مجھ میں ہرگز نہیں تھی۔ خاص طور سے والدہ کا سامنا تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چچی کی مہربانی سے پوری فیملی میں نہ صرف میری گمشدگی کی اطلاع پھیل چکی ہوگی بلکہ پارک میں میری جو عزت افزائی ہوئی تھی، وہ بھی راز نہیں رہی ہوگی۔ پھر شعلہ بدن آرسہ کا خیال ذہن میں آیا اور سینے میں نفرت کی ایک بلند لہر محسوس ہوئی۔ یہ آرسہ کی نحوست ہی تھی جو مجھے گھر سے نکال کر پارک میں لائی اور وہاں سیٹھ سراج سے میرا آمنا سامنا

ہو گیا۔

میں جب یہ سارے واقعات سوچتا تو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ دم گھٹتا محسوس ہوتا اور میں ایک بار پھر خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتا۔ بہرحال حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا اور حقیقت یہی تھی کہ اب میرے اس خیال میں وہ پہلے دن کی سی شدت نہیں رہی تھی۔ اس تبدیلی میں اہم کردار عمران ہی کا تھا۔ وہ کسی لمحے بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔ یا تو باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا یا اپنا کوئی دلچسپ قصہ لے کر بیٹھ جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ماہرِ نفسیات کی طرح اپنی انگلیوں سے میرے ذہن کی سطح کو ٹٹولتا ہے اور اسے ہموار کرتا رہتا ہے۔ اس نے ابھی تک اپنے بارے میں مجھے کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ صرف اتنا پتا چلا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے لاہور میں مقیم ہے۔ اسے سرکس کی نوکری کرتے بھی تقریباً اتنا ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ اپنے اس سرکس کے ساتھ وہ اکثر پنجاب کے مختلف اضلاع میں سفر کرتا رہتا تھا۔

سرِ شام اس نے ایک بار پھر مجھے اپنی مہران کار میں بٹھایا اور سرکس پہنچ گیا۔ آج اس کے ساتھ میں تیسری مرتبہ سرکس آیا تھا۔ پہلے دن کے بعد یہاں کوئی ''اسپیشل شو'' نہیں ہوا تھا۔ اس بارے میں مَیں نے عمران سے کچھ تفصیل معلوم کی تھی۔ ایسے شوز ہر مہینے کے پہلے ہفتے کی رات ہوتے تھے۔ عمران نے یہ بتا کر حیران کیا کہ ان اسپیشل شوز کے علاوہ اس سرکس میں کبھی کبھی چار چھ مہینے بعد اسپیشل ترین شو بھی ہوتا ہے۔ اس میں بازی گری کے کچھ انتہائی خطرناک اور خاص الخاص تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریوالور والا کھیل بھی ہوتا ہے۔ اس شو میں کھیل کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ کھلاڑی ریوالور کو پیٹ یا جسم کے کسی اور حصے پر رکھنے کے بجائے، سیدھا کنپٹی پر رکھ کر چلاتے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ترین کھیل بس ایک دو کھلاڑی ہی کھیل پاتے ہیں۔ عمران نے مجھے یہ بتایا کر مزید حیران کیا کہ وہ خود بھی ایک بار ریوالور کنپٹی پر رکھ کر ''دوچھ'' کا کھیل کھیل چکا ہے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس میں اسے ایک باری میں پورے آٹھ لاکھ روپے ملے تھے۔ اس رقم سے اس نے یہ مہران کار خریدی تھی اور اپنے گھر کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔

جب ہم سرکس میں پہنچے تو موت کے کنویں میں زوروشور سے میوزک بج رہا تھا اور ہلکا پھلکا تماشہ شروع ہو چکا تھا۔

ایک گندمی رنگت والا دراز قد شخص عمران کے قریب آیا اور اس کے کان میں کھسر پھسر کی۔ عمران ''ہوں...... ہاں'' میں جواب دیتا رہا۔ پھر وہ رسٹ واچ دیکھتا ہوا میری طرف آیا

اور بولا۔’’آج ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہے۔ میں بس کنویں والا آئٹم کروں گا، اس کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔‘‘

’’کہاں جانا ہے؟‘‘

’’تمہاری دل لگی کا کچھ سامان ہے یار! تمہارا دل لگا رہے گا تو اُلٹی پلٹی باتیں نہیں سوچو گے۔‘‘

’’میں پوچھ رہا ہوں، جانا کہاں ہے؟‘‘

’’زیادہ دور نہیں۔ بس ساہیوال کے آس پاس۔ ڈھائی تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک خاص بندے سے ملانا ہے تمہیں۔‘‘

وہ ڈھائی تین گھنٹے کی بات یوں کر رہا تھا جیسے ڈھائی تین منٹ کی بات کر رہا ہو۔ ایک دم میرا دھیان پھر سیٹھ سراج کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس بوریوں والے معاملے کی طرف۔ کہیں یہ وہی چکر تو نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گیا۔ رات نو بجے کے قریب موت کے کنویں میں اپنا آئٹم ختم کرتے ہی وہ میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ وہ کار یا موٹر سائیکل چلاتا نہیں تھا بلکہ اُڑاتا تھا اور اُڑاتا بھی بہت ہائی اسپیڈ سے تھا۔ اتنی ہی اسپیڈ کے ساتھ وہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ ’’فائیو اسٹار‘‘ اور ’’بھوتنی کا‘‘ کے الفاظ وہ تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتا تھا اور خود بھی اپنے ان الفاظ سے محظوظ ہوتا تھا۔ کرکٹ سے اسے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ کافی عرصہ کرکٹ کھیلتا بھی رہا تھا۔ اس کی اکثر باتوں میں کرکٹ کے حوالے ملتے تھے۔ بہر حال اس نے ابھی تک مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اس کے اردگرد کے لوگ بھی اس کے ماضی کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے ہیں۔ اس تھوڑے سے اسرار کے باوجود وہ سب کا دوست تھا اور ہر دلعزیز تھا۔

لاہور سے ساہیوال تک کی سڑک اچھی حالت میں تھی۔ قریباً تین گھنٹے میں ہی ہم ساہیوال پہنچ گئے۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے وہاں سے روسٹ چکن اور روغنی نان لیے اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھ کر کھائے۔ ساہیوال کا بھرا پُرا شہر رات کے اس پہر قدرے سنسان نظر آ رہا تھا۔ سڑکوں پر ہر طرف کیلے کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ ان چھلکوں کو دیکھ کر دو باتوں کا پتا چلتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ساہیوال کے علاقے میں کیلے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہاں کے لوگ چھلکے پھینکنے کے سلسلے میں تھوڑے بے پروا بھی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا شہر لگتا تھا۔ رات کے اس پہر بھی چائے

خانوں اور چھوٹے موٹے ہوٹلوں پر لوگ موجود تھے اور کیبل پر اسٹیج ڈرامے دیکھ رہے تھے۔ میں ساہیوال پہلی بار دیکھ رہا تھا، تاہم ہماری منزل ساہیوال سے ذرا آگے ہڑپہ کا پُرانا شہر تھا۔

میں نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔’’یار! ایک تو تم ہر وقت بندے کو تجسس میں رکھتے ہو۔ بتا کیوں نہیں دیتے کہ ہم اتنی رات گئے ہڑپہ میں کس ذات شریف سے ملنے جا رہے ہیں؟‘‘

’’یار! اگر ہم کسی مشہور فلمی ایکٹر یا کھلاڑی وغیرہ سے ملنے جا رہے ہوتے تو میں بتا دیتا کہ فلاں بندہ ہے۔ جب تم اس بندے کو جانتے ہی نہیں تو میرے بتانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ بہر حال اتنا جان لو کہ بڑا دلچسپ بندہ ہے اور اس سے مل کر تمہیں خوشی ہو گی۔‘‘

’’مجھے اب بھی شک ہے کہ یہ سیٹھ سراج والا چکر ہے۔‘‘

’’شک کے معاملے میں تم بالکل کسی بیوی کی طرح ہو۔‘‘ اس نے مرغی کی ٹانگ پر دانت آزماتے ہوئے کہا۔

ہماری گاڑی ایک بار پھر روانہ ہو گئی۔ گاڑی کا ڈیک زور شور سے بج رہا تھا۔ نغمہ گونج رہا تھا۔’’ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے، مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے......‘‘

میرے خیالات دور دور تک بھٹکنے لگے۔ میں اپنے ذہن کو اردگرد کے مناظر کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساہیوال سے ہڑپہ جانے والی سڑک بھی شاندار تھی۔ گاڑی باآسانی 125 کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

’’بڑی فائیو اسٹار سڑک بنا دی ہے یار انہوں نے۔‘‘ عمران نے کہا۔

مگر اسی دوران میں ایک فائیو اسٹار کھڈا بھی آ گیا اور عمران نے گاڑی کو بمشکل کنٹرول کیا۔ ہڑپہ تک کا سفر قریباً 30 کلومیٹر تھا جو عمران نے پچیس منٹ میں طے کر لیا۔ جلد ہی ہم ایک دو ذیلی سڑکوں پر مڑے اور ہڑپہ کے قدیم شہر میں پہنچ گئے۔ یہ ویسا ہی قصبہ نما شہر تھا جیسا پنجاب کے عام علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ گلیاں، بازار اور چوراہے سو رہے تھے۔ ٹھنڈ نے ہر شے کو جامد کر رکھا تھا اور کھلی جگہوں پر ہلکی ہلکی دھند تھی۔ عمران نے موبائل پر اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اپنی منزل کی درست لوکیشن پوچھی اور پھر گاڑی ایک مکان کے سامنے روک دی۔

جلد ہی ہم ایک نیم گرم کمرے میں پکے کوئلوں کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے چائے اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ میزبان واقعی دلچسپ شخص تھا۔ وہ سانولی رنگت کا تھا اور غیر معمولی حد تک فربہ تھا۔ اس کا پیٹ اس کے آگے جیسے ایک بہت بڑے مٹکے کی صورت میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہنستا تھا تو اس کا پیٹ بھی اُچھل اُچھل کر ساتھ دیتا تھا۔ میزبان کی عمر پینتیس سال کے قریب ہو گی۔ اس کا نام امتیاز تھا اور وہ پانچ مرلے کے اس گھر

میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہڑپہ کا پرانا شہری تھا اور یہاں اس کی دو بکریاں تھیں۔ اپنی گفتگو سے وہ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

امتیاز نے سب سے پہلے میری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔

عمران نے وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے سوڈیڑھ سو افراد کو دے چکا تھا۔ ''یہ میرا پرانا سجن تابش ہے بھئی...... مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا، لاہور ریلوے اسٹیشن کی لعنتی سیڑھیوں سے گر گیا۔ شکر ہے کہ ہڈیاں وغیرہ بچ گئی ہیں۔''

عمران کا ایک ساتھی یہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وہ ''اقبال'' تھا جس سے موبائل فون پر دو دن پہلے عمران کی بات ہوئی تھی۔ یہ بھی مضبوط ہاتھ پیر کا چوبیس پچیس سالہ شخص تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی عمران نے اسی سے فون پر بات کی تھی۔ اسے یہاں عمران نے ہی کسی کام سے بھیجا ہوا تھا۔ اتفاقاً یہاں اقبال کا یہ دوست امتیاز بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہم سب یہاں امتیاز کے نیم گرم گھر میں موجود تھے۔ دو تین منٹ کی رسمی باتوں کے بعد عمران، اقبال اور امتیاز میں رمزیہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ گفتگو میرے لیے کافی حد تک ناقابلِ فہم تھی۔

عمران نے اپنے ساتھی اقبال سے پوچھا۔ ''اب کہاں ہے وہ؟''

''گھر کے اندر ہی ہے۔'' اقبال نے دبے دبے جوش سے جواب دیا۔ ''گاڑی باہر گلی میں کھڑی ہے۔''

''کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟'' عمران نے پوچھا۔

میرا اندازہ تو وہی ہے جو امتیاز بھائی کا ہے۔ بلکہ یہ تو پکی بات کر رہے ہیں کہ اس میں عورت کا چکر ہے۔ زلیخا نام ہے اس کا۔ خاوند بیمار رہتا ہے بلکہ چارپائی سے لگا ہوا ہے۔ گل چھرے اُڑا رہی ہے۔ سنا ہے کہ ایک دو اور یارانے بھی ہیں۔''

''خاوند کیا کرتا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

اقبال کے بجائے ہمارے میزبان امتیاز نے جواب دیا۔ ''بس جی! جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں۔ یہ چھیدا بھی کمال کرتا ہے۔ پہلے چاولوں کا کام کیا کرتا تھا، اب تو جو کچھ بھی کرتی ہے اس کی بیوی زلیخا ہی کرتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ہنسا۔ اس کا پیٹ پورا جسم بلکہ وہ چارپائی بھی ہنسنے لگی جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کی خوش مزاجی اور ہنسنے کی عادت کا اندازہ اس کے چہرے کی لکیروں سے بھی ہوتا تھا۔

عمران، اقبال اور امتیاز کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے میزبان کے محلے میں رہنے والی ایک جواں سال عورت زلیخا کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ اس کے

گھر کسی مرد کا آنا جانا ہے اور وہ مرد اب بھی زلیخا کے یہاں موجود ہے۔ اس کی گاڑی اب بھی زلیخا کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ باتوں کے دوران میں جب مجھے اس گاڑی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک سوزوکی ڈبا ہے تو ایک دم ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ میرا شک ایکا ایکی یقین میں بدلنے لگا۔ شاید یہ وہی سوزوکی ڈبا تھا جو دو تین دن پہلے سرِراہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا اور جس میں سے سیٹھ سراج نے نکل کر زبردست خواری کا سامنا کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں ہڑپہ میں بھی یہ ڈبا سیٹھ سراج کو ہی لے کر آیا تھا۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں کس رُخ پر سوچ رہا ہوں۔ اس کی معاملہ فہمی حیران کن تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے تابی! تمہارے اس سیٹھ سراج کے ستارے اور سیارے وغیرہ گردش میں آ گئے ہیں۔ دیکھو اب وہ اس دن کی فائیو اسٹار ذلالت کے بعد مزید بے عزت ہونے کے لیے یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ ایک ایسی عورت کے گھر میں گھسا ہوا ہے جو کچھ زیادہ نیک نام نہیں ہے۔'' پھر وہ میزبان امتیاز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیا یہ عورت کچھ زیادہ خوبصورت ہے۔''

''زیادہ کیا جی! کم خوبصورت بھی نہیں ہے۔ بس سمجھیں کہ رعایتی نمبروں سے پاس ہے لیکن عورت، عورت ہی ہوتی ہے جی۔ جب بندے کی ''مت'' مارنے پر آ جائے تو پھر ''مت'' کے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اب ہماری مثال ہی لیں۔ میرے جیسے ہینڈسم نوجوان کے لیے لڑکیوں کی بھلا کوئی کمی تھی لیکن جب دل آیا تو کس پر آ گیا۔''

چق کی دوسری طرف سے فربہ اندام امتیاز کی خوبرو بیوی نے شوخی سے کہا۔ ''آہو بھائی جی! ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے بارہ بارہ من کی دو تین دھوبنیں ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں، پر ان کی قسمت میرے ساتھ پھوٹ گئی۔''

''شادی سے پہلے میں اتنا موٹا نہیں تھا جی! اگر کچھ تھا بھی تو اس میں خوبصورتی تھی۔ اس بھلی لوک نے میری مارکیٹ ویلیو ڈاؤن کرنے کے لیے مجھے پراٹھے کھلا کھلا کر اتنا موٹا کیا ہے۔ اب بھگتے خود ہی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

چق کے آر پار میاں بیوی کی نوک جھونک کچھ دیر مزید چلتی رہی پھر امتیاز کی بیوی روتے بچے کو چپ کرانے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تخلیہ ہوا تو عمران نے دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم سے معافی چاہتا ہوں یار! اگر اس وقت تمہیں بتا دیتا کہ ہم سراج کے لیے یہاں آ رہے ہیں تو تم شاید آنے سے انکار کر دیتے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم سراج کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ہمیں ایسا کرنا

ہے۔بس یہ دیکھنا ہے کہ یہ بندہ دراصل ہے کس چکر میں۔اگر یہ کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے تو پھر بھی ہمیں اس سے کچھ نہیں کہنا۔زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ پولیس کو انفارم کر دیں گے اور وہ بھی سامنے آئے بغیر۔''

میں سٹپٹایا ہوا تھا۔بہر حال میں نے عمران سے کچھ کہا نہیں۔ویسے بھی دیگر لوگوں کے سامنے تلخ کلامی کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

عمران نے میزبان امتیاز سے سوال جواب شروع کر دیئے۔''امتیاز بھائی!تم نے بتایا ہے کہ یہ بندہ سراج جسے تم یہاں خواجہ کے نام سے جانتے ہو، ہفتے میں کم از کم دو تین بار ضرور آتا ہے؟''

''بالکل......اور خاص طور سے ہفتے کی شام کو تو ضرور آتا ہے۔''

''ہر دفعہ سوزوکی ہائی روف پر آتا ہے۔''

''میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔''

''یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں یا تم بتاؤ کہ تم کیا جانتے ہو؟''

امتیاز نے اپنے بے کراں پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔''مجھے تو یہی معلوم ہے کہ یہ بندہ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں کوئی اسٹور چلاتا ہے جہاں تھوک میں آٹا، دالیں اور چاول وغیرہ ملتے ہیں۔یہاں بظاہر زلیخا کے خاوند سے اور اصل میں خود زلیخا سے اس کی یاری دوستی ہے۔یہ یہاں سے آج کل چاول وغیرہ بھی لے کر جا رہا ہے۔شاید اپنے اسٹور پر فروخت کرتا ہے یا پھر کہیں اور بھی دیتا ہے۔''

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔''اور اگر میں یہ کہوں کہ جسے تم خواجہ کہہ رہے ہو، یہ لاہور کا سیٹھ سراج الدین ہے اور یہ رائے ونڈ میں کوئی چھوٹا موٹا اسٹور نہیں چلاتا بلکہ لاہور میں ایک بڑے پلازے کا مالک ہے اور ایک دوسرا پلازہ تعمیر کروا رہا ہے تو؟''

امتیاز بھاڑ جیسا منہ کھول کر حیرت سے عمران کی طرف دیکھنے لگا۔''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے کہا۔

''بالکل ایسے ہی ہے۔''عمران کا ساتھی اقبال بولا۔

''تم نے امتیاز بھائی کو ابھی وہ بوریوں والی بات تو نہیں بتائی؟''عمران نے اقبال سے دریافت کیا۔اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔عمران نے اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے خود کو کچھ اور بھی انگیٹھی کے قریب سمیٹا اور رازداری کے لہجے میں بولا۔''امتیاز بھائی!تمہاری یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ سراج کا اس زلیخا نام کی عورت سے کوئی ٹانکا ہے لیکن ہمیں

لگ رہا ہے کہ بات اس سے کچھ زیادہ بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔''

امتیاز نے حیرت اور تجسس سے عمران کی طرف دیکھا۔پھر اقبال کو دیکھنے لگا۔''آپ کو کس قسم کا شک ہے؟''امتیاز نے پوچھا۔

''ہمیں لگ رہا ہے کہ یہ سیٹھ سراج یہاں کوئی گڑبڑ گوٹالا کر رہا ہے۔صرف زلیخا ہی نہیں ہے جس کی خاطر یہ بندہ خواجہ کے روپ میں یہاں پہنچتا ہے اور راتیں گزارتا ہے۔اس شک کی ایک بڑی معقول وجہ یہ ہے جو کچھ ہی دن پہلے ہمارے سامنے آئی ہے۔بلکہ دو تین دن پہلے سامنے آئی ہے۔''

''یارو!تم نے تو مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔''امتیاز موٹے نے ایک بار پھر اپنی بے مثال توند کو سہلایا اور سوالیہ نظروں سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔

عمران نے کہا۔''پہلے مجھے یہ بتاؤ امتیاز بھائی کہ جس جگہ ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ جگہ ہڑپہ شہر میں آتی ہے یا اس کے مضافات میں؟''

''یہ مضافات میں ہی آتی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سرکاری زمین ہے۔اس پر لوگوں نے اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔اب یہاں کے مکینوں کے ساتھ گورنمنٹ کا تنازعہ چل رہا ہے۔یہ زمین ہڑپہ کے کھنڈرات سے بہت قریب ہے اور گورنمنٹ اسے واپس لینا چاہتی ہے لیکن گورنمنٹ جو معاوضہ دے رہی ہے، وہ یہاں رہنے والوں کو قبول نہیں ہے۔عدالتی چکر بھی چل رہا ہے۔''

''گورنمنٹ کو اس جگہ میں کیا دلچسپی ہے؟''

''بہت زیادہ دلچسپی ہے جی!اور ہونی بھی چاہیے۔شاید آپ کو پتا نہ ہو کہ پرانے کھنڈرات نکالنے کے لیے ہڑپہ کے جتنے بڑے حصے میں کھدائی ہوئی ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ابھی تقریباً ستر اسّی فیصد علاقہ ایسا ہے جس پر کھدائی وغیرہ شروع ہی نہیں کی گئی۔ماہر لوگوں کا خیال ہے کہ اس سارے علاقے کے نیچے بھی کھنڈر شنڈر موجود ہیں۔''

''تو پھر کھدائی کیوں نہیں کی جاتی؟''میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا پتا تو صاحب لوگوں کو ہوگا بھائی صاحب!کہا یہ جاتا ہے کہ صحیح طریقے سے کھدائی کرنے کے لیے بہت زیادہ پیسے اور ٹائم کی ضرورت ہے۔پھر شاید صاحب لوگ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اگر ان زمینوں کے نیچے سے واقعی کھنڈر وغیرہ نکل آئے تو ان کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔پہلے جو کھنڈر نکلے ہیں ان کی حالت بھی روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔

بارشیں پڑتی ہیں، آندھیاں آجاتی ہیں۔ ہر طرح کے موسم اثر ڈالتے ہیں۔ محکمے کے لوگ اور باہر سے آنے والے صاحب لوگ ان کھنڈرات کی حفاظت کے لیے کام شام تو کرتے رہتے ہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ تو نقصان ہوتا ہی ہے۔ شاید یہ لوگ سوچتے ہوں کہ جو کچھ ہزاروں سال سے زمین میں دبا ہوا ہے، وہ ابھی دبا ہی رہے تو بہتر ہے۔''

عمران نے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ یہ کچی پکی آبادیاں ایسی سرکاری زمین کے اوپر ہیں جن کی کھدائی وغیرہ ہونی ہے۔ آج نہیں تو کل...... اور کل نہیں تو دس پندرہ سال بعد؟''

امتیاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے کہا۔''اچھا...... ایک بات بتاؤ امتیاز بھائی! یہاں آبادی میں لوگ غیر قانونی طور پر تو کھدائی وغیرہ نہیں کرتے؟''

''نہیں جی! محکمہ اس بارے میں بڑا چوکس ہے اور سختی بھی کرتا ہے۔ محکمے کے چوکیدار اکثر علاقے میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور ارد گرد کی سن گن رکھتے ہیں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ ہو بھی جاتا ہے۔ کسی بنیاد یا قبر وغیرہ کی کھدائی کرتے ہوئے یا کسی کھیت شیت میں سے کوئی پرانی شے مل بھی جاتی ہے۔ کسی پرانے برتن کا ٹکڑا یا کسی مورتی کا کوئی حصہ وغیرہ؟''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ نگاہوں کے سامنے سوزوکی ڈبے کے ایکسیڈنٹ کا منظر آ گیا۔ عمران نے بتایا تھا کہ سوزوکی ڈبے کے اندر موجود بوریوں میں چاولوں کے بجائے مٹی بھری ہوئی تھی۔ تو کیا اس مٹی میں کچھ چھپایا گیا تھا...... یا پھر......

ابھی میری سوچ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ عمران نے یہی بات امتیاز سے کہہ دی۔ اس نے کہا۔''امتیاز بھائی! دو تین دن پہلے سراج کی سوزوکی کے ساتھ ہماری اسٹیشن وین کی جو ٹکر ہوئی تھی، اس کے بارے میں تو اقبال نے آپ کو بتایا ہی ہے۔ جس وقت ٹکر ہوئی، سراج کی سوزوکی میں چار بڑی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں ٹکر کی وجہ سے پھٹ گئیں۔ ان پھٹی ہوئی بوریوں میں جو کچھ تھا، اس نے ہم دونوں کو تھوڑا سا حیرت میں ڈال دیا۔ ان بوریوں کے اوپر تو چاولوں کی دو ڈھائی انچ موٹی تہ تھی لیکن نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس بات کا پتا میرے علاوہ اقبال کو بھی چلا۔ ہم دونوں شک میں پڑ گئے۔ اس شک کی وجہ سے ہی میں نے اقبال کو سراج کے پیچھے لگایا اور وہ یہاں ہڑپہ تک آ پہنچا۔''

بوری میں چاولوں کے نیچے مٹی والی بات سننے کے بعد امتیاز کا بھاری بھرکم چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس نے اس بات میں زبردست دلچسپی محسوس کی ہے۔ اس نے

اوپر تلے کئی سوال عمران اور اقبال سے پوچھے اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا کھڑا ہونا ایسے ہی تھا جیسے کسی لیٹے یا بیٹھے ہوئے ہاتھی کا کھڑا ہونا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔''مجھے پہلے ہی اس خواجے کے معاملے میں شک وشبہ لگ رہا تھا۔ اب یہ جو آپ نے بوریوں میں مٹی والی بات بتائی ہے، اس نے میرا شک بڑا پکا کر دیا ہے۔''

وہ لکڑی کی الماری میں سے اپنا موبائل فون اُٹھا لایا۔''یہ کیا کر رہے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''سعید کو فون کر رہا ہوں۔''

''یہ سعید کون ہے؟''

''یہاں ہیڈ چوکیدار ہے۔ میرا سالا بھی ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ اسے پکڑے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''جو کچھ آپ نے بتایا ہے اسے سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہاں زلیخا اور چھیدے کے گھر میں ناجائز طور پر کھدائی ہو رہی ہے۔ دراصل یہاں اگر کوئی چوری چھپے کھدائی کرتا ہے تو اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہوتا ہے کہ کھودی ہوئی مٹی کو چھپائے کہاں؟ پچھلے سال بھی یہاں ایک اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔ وہ ایک عیسائی فیملی تھی۔ انہوں نے گھر کے ایک کمرے میں کھدائی شروع کی اور وہاں سے نکلنے والی مٹی رات کے اندھیرے میں پاس کے چھپڑ میں پھینکنے لگے۔ ایک رات چوکیداروں نے انہیں دیکھ لیا اور وہ پکڑے گئے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی چکر ہے۔''

''جو لوگ پکڑے گئے تھے، ان سے کچھ برآمد بھی ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک دو مہریں برآمد ہوئی تھیں۔ باقی چیزیں وہ لوگ آگے نکال چکے تھے۔''

''پھر بہتر ہے کہ تم ابھی فون نہ کرو۔'' عمران نے مشورہ دیا۔

''کیا مطلب؟'' امتیاز نے پوچھا۔

''جلد بازی میں کام بگڑ جائے گا۔ پہلے ہم دیکھیں گے کہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں اور ان کے ساتھ اور کون سے کھلاڑی شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بس ایک دو لوگوں کا کام ہو اور ہو سکتا ہے کہ اس میں زیادہ لوگ شامل ہوں۔''

اس سلسلے میں ان تینوں کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی پھر عمران نے ایک دلیرانہ بلکہ حیران کن فیصلہ کیا۔ کم از کم میرے لیے تو یہ حیران کن ہی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اور

اقبال ابھی دیوار پھاند کر زلیخا اور چھیدے کے گھر میں داخل ہوں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک اس بارے میں مزید تبادلہ خیال ہوا۔ اس میں مَیں نے بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ کام کل پر چھوڑ دیا جائے۔ امتیاز کو معلوم تھا کہ سراج بس آج کی رات یہاں ٹھہرے گا اور کل زلیخا کے گھر میں زلیخا اور اس کے بیمار خاوند کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ زلیخا کا ایک بھانجا ہوگا، اس کا کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں تھا۔

ہم نے رات کا باقی حصہ امتیاز کے گھر میں ہی گزارا۔ امتیاز کی بیوی نے ہمارے لیے دو نئے لحاف نکال دیئے تھے۔ ہم سوئے تو صبح دس گیارہ بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلی۔ دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ امتیاز کے دونوں بچے صحن میں کھیل کود کر رہے تھے۔ باپ کی طرح وہ بھی خوب خوب فربہ تھے اور ہاتھی کے چھوٹے چھوٹے گول مٹول بچوں کی طرح تھے۔

کچھ دیر بعد ایک گرما گرم دیہاتی ناشتے نے ہمارا استقبال کیا۔ دیسی گھی کے بھاری بھرکم پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، سوجی کا باداموں والا حلوہ اور دودھ پتی چائے۔ ساتھ میں ریڈیو پر پنجابی گانے نشر ہو رہے تھے۔ امتیاز اور اس کی بیوی میں دلچسپ نوک جھونک بھی جاری تھی۔ عمران بھی گاہے بگاہے اپنی قہقہہ بار باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہا تھا۔ اس ماحول میں مجھے اپنی ذاتی تلخیاں کسی حد تک بھولی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی میں سکون بخش گولیاں باقاعدگی سے لے رہا تھا۔ ان کے سبب دماغ پر ایک غفلت آمیز دھند چھائی رہتی تھی اور اپنے بے پناہ غم کی دھار مجھے ہلکی محسوس ہوتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر عمران نے سب سے پہلے موبائل فون پر اپنے سرکس کے اسسٹنٹ منیجر عباس سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر ہے اس لیے آج شو میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ اس اطلاع کے بعد وہ کچھ ''ایزی'' نظر آنے لگا۔ اقبال، امتیاز اور عمران میں ایک بار پھر یہاں کی پُراسرار صورتِ حال کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

امتیاز نے بتایا کہ محکمہ آثار قدیمہ کا دفتر یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ موجودہ افسر خاصا ایماندار اور سخت گیر ہے۔ وہ کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ سے نوادرات کے متلاشی خوف زدہ رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو اگر ٹیلوں سے کبھی کبھار کوئی چیز مل جاتی ہے تو وہ خود جا کر دفتر میں جمع کرا دیتے ہیں۔

دوپہر کے وقت اقبال باہر کا جائزہ لینے کے لیے چلا گیا۔ دو تین بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''لو جناب! سراج واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔ گاڑی کو کپڑا وغیرہ مار رہا ہے۔''

''اب بھی کوئی بوری وغیرہ ہے گاڑی میں؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی...... پانچ بوریاں ہیں۔ میں نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے خود دیکھی ہیں۔''

اسی دوران میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی دور افتادہ آواز آئی۔ اندازہ ہوا کہ سراج روانہ ہو رہا ہے۔ دو تین منٹ بعد سراج کا سوزوکی ڈبا گلی میں سے گزرا۔ عمران کی طرح میں نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ سیٹھ کا ساتھی ڈرائیونگ کر رہا تھا اور سیٹھ ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا میں نے اسے صاف پہچانا۔ تاہم بوریاں وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ بوریاں رکھنے کے لیے ڈبے کی پچھلی نشستیں نکال دی گئی ہیں۔ گاڑی کے پچھلے حصے کے ڈینٹ وغیرہ نکلوائے جا چکے تھے، تاہم ابھی اس کی کافی مرمت ہونا باقی تھی۔ سیٹھ کا چہرہ دیکھتے ہی مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ میں کافی دیر بالکل گم صم رہا۔

وہ رات خاصی سنسنی خیز رہی۔ عمران کی کئی صلاحیتیں کھل کر میرے سامنے آئیں۔ اس کی غیر معمولی بے خوفی تو مجھ پر پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ کسی بھی خطرناک کام میں فوری طور پر کود پڑنے اور وقت کے مطابق نہایت تیزی سے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یقیناً اس کے دوست بھی اس کے مزاج کے مطابق ہی تھے۔

رات قریباً گیارہ بجے کے لگ بھگ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عمران گاڑی میں ایک پسٹل بھی رکھ کر لایا ہے۔ وہ پسٹل، باہر کھڑی گاڑی میں سے نکال کر اندر لے آیا اور اسے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ آٹھ دس اضافی گولیاں بھی اس نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس کے بعد وہ اور اقبال، زلیخا کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان دونوں نے اپنے چہرے کپڑے کے ڈھاٹوں میں اس طرح چھپا لیے کہ آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے اپنے جسم کے گرد ایک گرم چادر بھی لپیٹ لی۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے روکنے سے یہ لوگ رکنے والے نہیں ہیں۔ وہ تھرل اور غیر معمولی سنسنی کے متلاشی تھے اور یہ ان کے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ عمران میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ ''پریشان نہ ہونا جگر! یہ پستول کسی کو زخمی کرنے یا مارنے کے لیے نہیں ہے۔ بس اپنی

حفاظت کے لیے ہے۔''

میں نے بجھے لہجے میں کہا۔ ''پستول تو پستول ہی ہوتا ہے۔ بہر حال ایک بات ذہن میں رکھنا، میں یہاں ہونے والے کسی بھی معاملے کے لیے ذمے دار نہیں ہوں۔ تم مجھے کچھ بھی بتائے بغیر یہاں لائے ہو اور اب ان اُلٹے سیدھے کاموں میں پڑ گئے ہو۔ مجھے اس میں خطرے کی بُو آ رہی ہے۔''

وہ مسکراتی آواز میں بولا۔ ''رات کا وقت ہے۔ اسٹامپ پیپر مل نہیں سکتا، ورنہ میں ابھی تمہیں اقرار نامہ لکھ کر دے دیتا کہ تم ہر مسئلے سے بری الذمہ ہو۔''

''ایک اسٹامپ پیپر سے نہیں، دو سے کام چلے گا۔ تم مجھے کیوں بھول رہے ہو؟'' امتیاز نے کہا اور پھر ہنسنے لگا۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کا پورا جسم ہنستا تھا اور توند کے اندر تو تہلکہ سا مچ جاتا تھا۔ واقعی ہم اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اگر یہاں کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو وہ بھی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اور اقبال گھر سے باہر نکل کر تاریکی کا حصہ بن گئے۔ دیہات اور قصبات کی یخ بستہ راتوں میں سردی سے بچنے کے لیے اکثر لوگ اپنے چہرے گرم مفلروں اور ڈھاٹوں وغیرہ میں چھپا لیتے ہیں۔ اس چیز کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد میں بے چینی کا شکار رہا۔ امتیاز بھی کسی حد تک مضطرب تھا۔ تاہم وہ اپنا دل، مونگ پھلی اور ریڈیو سے بہلا رہا تھا۔ اس کی بیوی بچے دو گھنٹے پہلے ہی سو چکے تھے۔ چار دیواری سے باہر سرد ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ کھڑکی میں سے دور ہڑپہ کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر مدھم چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ امتیاز ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھولا۔ آنے والا عمران ہی تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا۔ اس نے منڈاسا کھولا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بڑے موڈ میں ہے۔ آتے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ تمہیں تماشا دکھاؤں۔ بڑے مزے کا سین ہے۔ ایک دم فائیو اسٹار۔''

''نہیں...... مجھے نہیں جانا۔ جو دیکھنا ہے تم خود ہی دیکھو۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''او ہو یار! کیا عورت بنے بیٹھے ہو۔ وہاں کوئی ڈر والی بات نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو میں تمہیں بلانے ہی نہ آتا۔ چلو اُٹھو۔ حیران رہ جاؤ گے تم۔''

''میں پہلے ہی بہت حیران ہوں۔ تم امتیاز بھائی کو لے جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

میں نے بے دلی سے کہا۔

اس نے میری ایک نہ سنی اور کھینچ کر مجھے اُٹھا دیا۔ کسی وقت وہ بالکل ایک تیز سیلابی ریلے کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسا محبت بھرا بہاؤ پیدا ہوتا تھا جس کے سامنے رُکے رہنا ممکن ہی نہیں رہتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد میں عمران کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم کے مختلف حصوں پر لگی۔ عمران نے ایک بڑا مفلر مجھے بھی اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ چہرے کا بس ایک چوتھائی حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ گلی میں گہری تاریکی تھی۔ آخری راتوں کا چاند کسی بدلی میں چھپا ہوا تھا۔ آوارہ کتوں کی لپیٹ سے بچتے ہم قریباً نصف فرلانگ چلے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ یہی چھیدے اور زلیخا کا گھر تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جس میں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ آگے ایک برآمدہ تھا جس پر سردی سے بچنے کے لیے چقیں ڈال دی گئی تھیں۔ غسل خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرہ تھا۔ جس میں بکری بندھی ہوئی تھی۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے پھر ایک کمرے کا آہنی دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

اندر بلب کی زرد روشنی تھی۔ اس روشنی میں نظر آنے والے منظر نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں کوئی ایسی صورتِ حال دیکھوں گا۔ چھبیس ستائیس سال کی ایک صحت مند عورت چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ دو آسن کی رسّی نے اسے کافی مضبوطی کے ساتھ چارپائی سے جکڑا ہوا تھا۔ عورت کے جسم پر عنابی رنگ کے شنیل کا نیا لباس تھا۔ کانوں میں سونے کے جھمکے چمک رہے تھے۔ وہ گدرائے ہوئے جسم کی تھی اور رنگ سفید تھا۔ یہ سفید رنگ ہی تھا جس کی وجہ سے اس کے ایک گال پر نیلگوں نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ نشان طمانچے کے لگتے تھے۔ اقبال پسٹل ہاتھ میں لیے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

دوسری چارپائی پر تیس پینتیس سال کا ایک کمزور شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور شکل سے ہی نظر آتا تھا کہ وہ عرصے سے بیمار ہے۔ یقیناً یہی چھیدا تھا۔ اسے باندھا نہیں گیا تھا، وہ اتنا سہما ہوا تھا کہ اسے باندھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

عمران نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھنا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے آگے جھک کر بڑی محبت سے عورت کے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''پتا نہیں تُو نیک ہے یا نہیں لیکن شکل سے بد بھی نہیں لگتی۔ میں تجھ سے کسی طرح کی تلخی کرنا نہیں چاہتا۔ میں پھر تجھ سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی بات چھپا مت۔ اس سے تیرا ہی نقصان ہونا ہے۔''

''میں سچ کہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں چھپا رہی۔ مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ تُو سب کچھ نہیں بتا رہی۔ بیچ بیچ میں سے چھپا رہی ہے اور جو کچھ چھپا رہی ہے وہی زیادہ ضروری ہے۔''

''میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں؟ میں کبھی لاہور نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے کبھی مجھے لاہور کے بارے میں بتایا ہے وہ یہی کہتا تھا کہ رائے ونڈ میں اس کی تھوک کی دکان ہے جہاں آلے دوالے کے دکاندار آٹا، چاول وغیرہ لے کر جاتے ہیں۔''

''تیرا بھانجا آج کہاں ہے؟ سنا ہے وہ تیرے ساتھ ہی یہاں رہتا ہے؟''

''وہ آج اپنے پنڈ گیا ہے۔ دو تین دن تک آئے گا۔''

''کیا اس کے دماغ میں بھی کبھی یہ نہیں آیا کہ خواجہ (سراج) جھوٹ بول سکتا ہے۔ یا اس نے سوچا ہو کہ رائے ونڈ جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے؟''

''نہیں...... وہ اتنے جوگا نہیں ہے۔ وہ تو بس وہی کرتا رہا ہے جو خواجہ اسے کہتا رہا۔''

''اور تم بھی وہی کرتی رہی ہو بلکہ وہی...... وہی کرتی رہی ہو۔'' عمران نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

زلیخا کے چہرے پر شرمندگی جھلکی۔ اس کا ہڈیوں کا ڈھانچا خاوند بھی دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اقبال نے کہا۔ ''ابھی تُو نے بتایا ہے کہ پچھلے چار مہینوں میں تُو نے سراج سے چالیس پچاس ہزار روپیہ لیا ہے۔ تیری الماری میں سے یہ ساڑھے تین ہزار نکلا ہے۔ باقی کہاں ہیں؟''

''باقی وہ کل لے گیا ہے نکال کر۔ بائیس ہزار روپیہ تھا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''دو چوڑیاں بھی تھیں سونے کی...... وہ بھی کھینچ کر لے گیا ہے۔ یہ دیکھو، مرن جوگے نے میری بانہیں چھیل دی ہیں۔'' اس نے اپنی سرخ کلائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

عمران نے غور سے اس کی کلائیاں دیکھیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

اس دوران میں زلیخا کا شوہر چھیدا کمزور آواز میں بولا۔ ''ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ خواجے نے جو کچھ کیا ہے، زبردستی کیا ہے۔ اس نے ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ کہتا تھا کہ اگر کسی کو پتا چلا تو سب کو ہتھکڑیاں لگیں گی۔''

عمران بولا۔ ''یہ جو پچاس ہزار روپیہ تیری بیوی نے اس سے لیا ہے، یہ بھی اس نے زبردستی دیا تھا؟ اور یہ سونے کے جھمکے...... یہ چوڑیاں...... اور یہ شنیل کا کامدار جوڑا؟ یہ سب

زبردستی تھا؟ تیری بیوی کی کوئی مرضی نہیں تھی اس میں؟''

چھیدا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ بس بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اقبال بولا۔ ''تم دونوں اس میں برابر کے شریک ہو اور جو کچھ ہوگا، وہ تم سب کے ساتھ ہوگا۔''

عمران نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ والے دروازے کے سامنے لے آیا۔ یہ دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں چکرا کر رہ گیا۔ کمرے میں فرش کی جگہ ایک بڑا کنواں تھا۔ بلب کی میلی سی زرد روشنی اس کنویں کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے بہت مدھم ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں کمرے کے اندر دو قدم بھی رکھتا تو اس کنویں نما گڑھے میں گر جاتا۔

''او خدایا...... یہ کیا ہے؟''

''اسی لیے تو کہا تھا جگر! کہ سین دیکھو گے تو مزہ آ جائے گا۔''

میں نے آگے بڑھ کر نظر دوڑائی۔ اس تقریباً آٹھ فٹ قطر کے کنویں کے اندر بانس کی ایک طویل سیڑھی لگی تھی۔ کنواں پچیس فٹ سے زیادہ گہرا تھا۔ ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ کنویں کے اندر دائیں اور بائیں طرف دو اور گڑھے بھی نظر آ رہے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ یہ کنویں کی دیواروں میں دو چھوٹی سرنگیں سی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے عمران؟'' میں نے تحیر میں ڈوب کر پوچھا۔

''سمجھو کہ یہ بھی موت کا کنواں ہے لیکن اس کی دیواریں کچی ہیں اس لیے ان میں موٹر سائیکل نہیں چل سکتی۔ یا شاید سیٹھ سراج کے پاس کوئی ایسی موٹر سائیکل ہو جو اس میں چل سکتی ہو۔''

''تو یہ سب سیٹھ سراج نے کیا ہے؟''

''تو اور کیا میں نے کیا ہے؟ وہ خبیث پچھلے تین چار مہینے سے صرف زلیخا کے لیے یہاں نہیں آ رہا، یہ کنواں بھی کھود رہا تھا مگر اندازہ یہی ہوا ہے کہ اس کے لالچ کی موٹر سائیکل ہڑپہ کے اس کچے کنویں میں چل نہیں سکی۔ یعنی اسے یہاں سے کچھ ملا نہیں۔ اسی لیے تو وہ بھنایا ہوا یہاں سے رخصت ہو گیا ہے اور جاتے جاتے اپنی زلیخا سے نقدی شقدی بھی چھین کر لے گیا ہے۔''

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔

''تمھیں اطمینان سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے اس کنویں کی سیر تو کر لو۔ نیچے اُترو گے؟'' اس نے پوچھا۔

"نہیں...... میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"اچھا...... تو یہ ٹارچ پکڑو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

میں نے ٹارچ پکڑ لی اور اس کا رُخ کنویں نما گڑھے میں کر دیا۔ وہ سیڑھی اُتر کر نیچے چلا گیا۔ تہ میں لمبے دستے والے دو کھرپے اور کڑاہیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کنویں کے اندر سے ہی آواز دے کر بولا۔ "یہ دیکھو...... یہ لوگ کسّی کے بجائے ان لمبے کھرپوں سے کھدائی کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ کسّی سے کھدائی کریں گے تو آواز پیدا ہوگی۔"

دائیں بائیں نظر آنے والے دونوں خلا افقی رُخ پر زیادہ گہرے نہیں تھے۔ یہ مشکل سے دس دس فٹ آگے گئے ہوں گے۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کارآمد چیزوں کی تلاش میں کھدائی کرتے ہوئے دائیں بائیں بھی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد عمران سیڑھی کے سہارے باہر نکل آیا۔ اس کے جوتے نم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کنویں کی تہ میں تھوڑا بہت کیچڑ تھا۔

"یہ تو بڑا عجیب چکر لگ رہا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"عجیب اور دلچسپ۔" عمران بھی دھیمی آواز میں بولا۔ "یہ بڑی غلط کار عورت ثابت ہوئی ہے۔" اس کا اشارہ زلیخا کی طرف تھا۔

"کیا کرتی رہی ہے؟"

"وہ سب کچھ جو ہم سوچ رہے تھے۔ یہ یہاں سراج کے ساتھ دادِ عیش بھی دیتی رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ کھدائی والا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ اس کے شوہر چھیدے کو بھی سب پتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ان لوگوں نے یہاں اسی کمرے میں کھدائی کیوں کی ہے؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ ساری باتیں ابھی تھوڑی دیر میں سامنے آجائیں گی تم دیکھتے رہو۔"

"کیا تم نے زلیخا کے ساتھ مار پیٹ کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ بس یہ ذرا اودھم مچا رہی تھی اس لیے اسے چارپائی سے باندھنا پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اقبال نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا۔ بہرحال اب یہ کافی حد تک شانت ہو چکی ہے۔"

"لیکن اس کے منہ پر تو نیل سے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ انگلیوں کے نشان ہیں اور اس کا ہونٹ بھی ایک طرف سے زخمی ہے۔"

"یہ مہربانی ہم نے نہیں، اس کے یار سراج نے کی ہے۔ کل ان لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔ سیٹھ سراج اور اس کا ساتھی شاید اب یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ جاتے جاتے یہاں سے بیس بائیس ہزار روپیہ لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ زلیخا کا کچھ زیور بھی۔ کم از کم زلیخا تو یہی کہہ رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کھدائی کے کام میں ان لوگوں کو مایوسی کے سوا کوئی خاص چیز نہیں ملی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جھگڑا وغیرہ بھی ہوا ہے۔"

ہم دونوں واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ یہاں صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ زلیخا ٹسوے بہا رہی تھی۔ عمران نے ایک بار پھر اس سے سوال جواب شروع کیے۔ "سراج سے تمہاری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جس کمرے میں کھدائی ہوئی ہے، وہاں سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ یہ پچھلی بارشوں کے بعد ہوا تھا۔ ہم نے دوبارہ فرش ڈالنے کے لیے پہلا فرش توڑا۔ ایک طرف چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔ اس گڑھے سے ہمیں ایک پرانا بھانڈا (برتن) ملا۔ یہ مٹی کی گڑوی جیسا تھا اور تین ٹوٹوں میں تھا۔ ہم نے اسے سیمنٹ سے جوڑا۔ میرے بھانجے جہانے نے یہ برتن عاشق مسیح کو دیا۔ عاشق مسیح کبھی کبھار ایسی چیزیں لے لیتا ہے۔ اس نے اس برتن کے جہانے کو ڈھائی ہزار روپے دیئے۔ جہانا ڈھائی ہزار روپے لے کر ہی بڑا خوش تھا۔ پر ہمیں پتا تھا کہ یہ برتن ڈھائی ہزار سے کہیں زیادہ رقم کا ہوگا۔ عاشق مسیح ایسی چیزیں لاہور لے جاتا ہے اور زیادہ پیسوں میں بیچ دیتا ہے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ یہ چیزیں خواجے کو دیتا ہے جسے تم لوگ سراج بتا رہے ہو۔"

"اس کا اصلی نام سراج ہی ہے۔ تم آگے بتاؤ۔" عمران نے کہا۔

"عاشق مسیح جب سراج کے پاس برتن لے کر گیا تو اسے دیکھ کر سراج وغیرہ کا شوق ایک دم بڑھ گیا۔ دراصل سراج کے ساتھ جو بندہ کل یہاں آیا تھا، وہ ان برتنوں اور مورتیوں وغیرہ کے بارے میں بڑا کچھ جانتا ہے۔ اس کا نام عارف خاں ہے۔ اسے خاں خاں کہتے ہیں۔ اسے ان پرانی چیزوں کی اصل قیمت کا بھی پتا ہے اور اصل میں یہی عارف خاں ہے جس نے خواجے کو لالچ دیا اور بتایا کہ جہاں سے یہ گڑوی ملی ہے، وہاں اور چیزیں بھی ہوں گی۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ عارف خود تمہارے پاس آیا یا سراج یہاں پہنچا؟"

"دونوں ہی یہاں آئے تھے۔ ان دنوں چھیدا ہسپتال میں تھا۔ گھر میں میرے اور میرے بھانجے جہانے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خواجے نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور کے قریب

رائے ونڈ میں کاروبار کرتا ہے۔ اس نے عارف خاں کو اپنا ملازم بتایا۔ اب پتا نہیں کہ خواجے کی طرح عارف خاں بھی اصلی نام ہے یا جھوٹا ہے۔ بہر حال ان دونوں نے کہا کہ جہاں سے گڑوی ملی ہے وہاں اگر اور کھدائی کی جائے تو اور چیزیں مل سکتی ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ غلط کام ہے۔ سرکاری بندے ہر وقت یہاں نظر رکھتے ہیں۔ چوکیدار بھی گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ خواجہ اور عارف خاں پہلے لالچ دیتے رہے پھر ڈرانے دھمکانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میرے بھانجے جہانے کو ہتھکڑی لگ سکتی ہے کیونکہ اس نے یہ گڑوی ناجائز طور پر نکالی ہے اور بیچی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بڑا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں ان کی بات مان لوں۔ میں اکیلی عورت ذات تھی اور یہ بات بھی صحیح تھی کہ جہاناں گڑوی بیچ چکا تھا۔ عاشق مسیح نے اس سے ڈھائی ہزار روپے کی وصولی پر انگوٹھا بھی لگوایا تھا۔ مجھے ان کی بات ماننی پڑی۔ اس کے بعد خواجے نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ عارف خاں بھی ہوتا تھا۔ چھیدا ہسپتال سے واپس آ گیا تھا۔ خواجے نے اس کو بھی ڈرایا دھمکایا اور پھر انہوں نے کھدائی کا کام شروع کر دیا۔''

''کھدائی کون کرتا تھا؟''

''عارف خاں اور جہاناں۔ سب سے بڑا مسئلہ مٹی چھپانے کا تھا۔ پہلے تو خواجہ تھوڑی بہت مٹی چھت پر ڈلواتا رہا اور ویہڑے کی بڑی کیاری میں پھنکواتا رہا۔ پھر اس نے رستہ ڈھونڈ لیا۔ وہ کھدائی سے نکلنے والی مٹی بوریوں میں بھر کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اب پتا نہیں لاہور لے جاتا تھا یا راستے میں کہیں پھینکتا تھا۔ بہر حال یہاں تو اپنی سفید گاڑی میں بھر کر لے جاتا تھا۔''

''محلے میں یا اڑوس پڑوس میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ تم لوگ کھدائی کر رہے ہو؟'' اقبال نے پوچھا۔

خواجہ کھرپوں سے کھدائی کرواتا تھا۔ یہ کام جب بھی ہوا، رات کو ہوا۔ دن کے وقت ہم اس کمرے کو تالا لگا چھوڑتے تھے۔''

عمران ٹارچ کی روشنی زلیخا کے گورے چٹے چہرے پر ڈال کر بولا۔ ''زلیخا بی بی! یہ بات ماننے والی ہرگز نہیں ہے کہ تم لوگوں نے اتنی کھدائی کر لی اور تمہیں یہاں سے ملا کچھ نہیں۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ گڑوی کے بعد یہاں سے ایک بھی کام کی شے نہیں ملی۔ خواجہ ہم سے کہتا تھا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ گڑوی بھی یہاں سے نہیں نکلی ہو گی۔ ہم نے کسی کی

چرائی ہے یا کہیں اور سے نکالی ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ کھدائی کرتے ہوئے یہاں سے کچھ نکلا ہو مگر ان لوگوں نے میرا مطلب ہے کہ سراج اور عارف نے تم سے چھپایا ہو؟''

''اللہ کی اللہ ہی جانے..... پر میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ جب بھی کھدائی ہوتی تھی، جہاناں ساتھ ہوتا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اسے پتا چل جاتا۔'' بات کرتے ہوئے زلیخا کے ایک گال پر چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا اور وہ قدرے خوبصورت نظر آنے لگتی تھی۔

''وہ عاشق مسیح اب کہاں ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''اس پر جھگڑے اور ناجائز اسلحے کا کوئی کیس بنا ہوا ہے۔ آج کل وہ گھر سے غائب ہے۔ تین چار مہینے سے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

اگلے ایک گھنٹے میں عمران اور اقبال اس زلیخا نامی عورت سے مسلسل سوال جواب کرتے رہے۔ اس ساری گفتگو سے جو کچھ معلوم ہوا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، وہ کچھ اس طرح تھا۔

زلیخا ہوشیار عورت تھی۔ وہ جو یہ بات کر رہی تھی کہ اس نے خوف زدہ ہو کر سراج وغیرہ کا ساتھ دیا۔ غلط تھی۔ ممکن ہے کہ اس پر تھوڑا بہت دباؤ بھی ہو مگر اس کے ملوث ہونے کی اصل وجہ اس کا لالچ اور اس کی عیش پسندی تھی۔ سیٹھ سراج نے زلیخا کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اسے بڑی ہوشیاری سے شیشے میں اُتارا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف یہاں زلیخا کے ساتھ اپنی راتوں کو گرما رہا تھا بلکہ نوادر کی تلاش میں کھدائی بھی کرواتا رہا تھا۔ زلیخا کو اپنے لاغر خاوند کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ اس کا گھر میں موجود ہونا یا نہ ہونا زلیخا کے لیے برابر تھا۔ بھانجا جہاناں بھی ایک نمبر کا بے غیرت تھا۔ اسے بھی پروا نہیں تھی کہ اس کی ماسی کیا کرتی ہے۔ اسے بس نشے پانی سے مطلب تھا اور یہ نشہ اسے وافر مل رہا تھا۔ اس کی جیب بھی سراج کی مہربانی سے ہمہ وقت گرم رہتی تھی۔ جب سراج اپنے سوزوکی ڈبے پر یہاں آتا تو اکثر عارف خاں بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ عارف اور جہاناں دونوں کھدائی میں مصروف رہتے تھے اور سراج علیحدہ کمرے میں زلیخا کے ساتھ مصروف وقت گزارتا تھا۔ اس نے زلیخا کو مٹھی میں رکھنے کے لیے سونے کی چوڑیاں دی تھیں اور ہر ہفتے نقد پیسے بھی دیتا تھا۔ زلیخا ان عورتوں میں سے تھی جنہیں سونے کی چمک دکھا کر اور نوٹوں کی کڑکڑاہٹ سنا کر کسی بھی کام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ سیٹھ جیسا امیر کبیر شخص اگر ہفتے میں دو بار لاہور سے چل کر یہاں پہنچتا تھا اور اس سارے معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا تھا تو پھر اسے

یہاں سے غیر معمولی فائدے کی بھی توقع رہی ہوگی۔ یہ فائدہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہوگا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے، سراج اور عارف خالی کمرے کے اندر کھدائی سے مایوس ہوتے گئے۔ انہیں کوئی خاص چیز نہیں مل سکی۔ اس کے بعد سراج، زلیخا کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آنے لگا۔ زلیخا کوئی ایسی حور پری نہیں تھی کہ وہ اس پر فدا ہو جاتا۔ وہ تو فقط اپنے مطلب کے لیے اس کے نازنخرے اُٹھا رہا تھا۔ آٹھ دس روز پہلے سراج نے عارف خاں کے ساتھ ساتھ زلیخا اور اس کے خاوند کو بھی صلواتیں سنائیں اور انہیں کہا کہ انہوں نے اس کا وقت برباد کیا ہے۔ کل یہ جھگڑا مزید بڑھا۔ زلیخا کے بیان کے مطابق اس کے خاوند کے ساہیوال کے ہسپتال میں دو تین ٹیسٹ ہونے تھے۔ اسے پھیپھڑوں میں پانی کی شکایت تھی۔ زلیخا نے سراج سے کچھ پیسے مانگے۔ وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے پہلے انکار کیا پھر جھلاہٹ میں زلیخا کو طمانچے مارے جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ بھی پھٹ گیا۔ اس نے زلیخا کی چوڑیاں بھی اُتروالیں اور اس کی الماری کے اندر کے خانے سے بیس بائیس ہزار روپے بھی نکال لیے۔ زلیخا نے بہت واویلا کیا کہ وہ اب کیا کرے گی۔ وہ جو اتنا بڑا گڑھا اس کے گھر میں کھود دیا گیا ہے، وہ کیسے بھرا جائے گا اور اگر گڑھا ایسے ہی رہا تو کب تک چھپا رہے گا اور اگر گھر کی بنیادوں کو کچھ ہوگیا تو کیا بنے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان ساری معلومات کے بعد اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ سیٹھ سراج اور عارف خاں وغیرہ نے یہاں جو کچھ کرنا تھا۔ وہ کر کے جا چکے ہیں اور جاتے جاتے زلیخا وغیرہ کو بھی سخت خفا کر کے گئے ہیں۔ عمران کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی وہ بڑی ''چابک دستی'' سے زلیخا اور چھیدے کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ ایک خفیہ اطلاع پر یہاں پہنچے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زلیخا اور خاص طور سے اس کا شوہر چھیدا بہت سہمے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ شروع میں زلیخا نے کچھ تن فن دکھائی ہو لیکن اب وہ بھی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول رہی تھی اور ہر سوال کا جواب فرفر دے رہی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے آنے سے پہلے عمران اور اقبال نے ان میاں بیوی کو اس معاملے میں معافی دینے کا تاثر دیا تھا۔

زلیخا تو کافی دیر سے ٹسوے بہا رہی تھی، اب مجھے چھیدے کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک سیاہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور پھر پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگتا تھا۔ زلیخا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم تینوں...... واقعی...... پولیس والے ہو تو

پھر تم عام کپڑوں میں کیوں آئے ہو؟ اور تم نے اپنے منہ بھی چھپائے ہوئے ہیں۔ اب ہمیں کیا پتا کہ تم واقعی پولیس والے ہو یا نہیں...... اگر ہم تمہاری وجہ سے...... کسی اور چکر میں پھنس گئے تو پھر؟''

''ہوشیار عورت ہو۔'' عمران نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر اس ہوشیاری میں سے کچھ ہوشیاری پہلے دکھائی ہوتی تو سراج کے جال میں نہ آتیں۔ لگتا ہے کہ اس وقت تمہاری ہوشیاری پر ٹھپا لگ گیا تھا اور آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔'' پھر وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دکھاؤ بھئی اس ہوشیار عورت کو اپنا کارڈ۔''

اقبال نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر زلیخا کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پتا نہیں کس محکمے کا کارڈ تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ زلیخا اور چھیدے کی خاک سمجھ میں آنا تھا۔ دونوں ہی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بی بی صاحبہ! اگر آپ کو تسلی نہیں ہو رہی تو پھر علاقہ انچارج سے فون پر آپ کی بات کرا دیتے ہیں یا پھر ایس پی صاحب سے کہتے ہیں کہ وہ خود یہاں آ کر آپ کے پاس حاضری لگوا جائیں۔''

''نن...... نہیں...... ہم آپ پر شک تو نہیں کر رہے جی...... بب...... بس اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ ہم پر کوئی اور مصیبت نہ آ جائے۔'' زلیخا کا شوہر چھیدا منمنایا۔

زلیخا نے عاجزی سے کہا۔ ''ہم بڑے وچارے لوگ ہیں بھرا جی! ہم میں تھانے کچہریوں کی ہمت نہیں ہے۔ آپ جو کہیں گے۔ ہم ویسا ہی کریں گے۔ بس ہم پر اس معاملے کا بوجھ نہ پڑے۔''

''ہم تو یہی چاہتے تھے۔ پر اب تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کہ تم لوگ خوار ہونے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یہ بڑا سخت کیس ہے بی بی! یہ جو تمہارا گھر شر ہے نا، یہ بس چار چھ مہینے میں بک جانا ہے اور یہ جو تیرے پنڈے پر چربی چڑھی ہوئی ہے نا، یہ بھی پگھل جانی ہے سنٹرل جیل میں۔'' عمران کا انداز جلالی تھا۔

''مم...... مجھے مافی دے دو صاحب جی! میں نے تو بس یونہی بات کی تھی۔ آ...... آپ جو کہیں گے، ہم ویسا ہی کریں گے۔ ہم تو خود چاہتے ہیں کہ خواجے اور اس کے یار کو ہتھکڑیاں لگیں۔ اللہ کرے...... اللہ کرے ان کے جنازے نکلیں جیل کے اندر سے۔ اس خواجے نے میرے ساتھ جو کیا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ کل جہانے اور چھیدے کے سامنے، مجھے ماں بہن کی گندی گالیاں دی ہیں۔ مجھے چیزیں ماری ہیں۔ میری قمیص پھاڑی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں وہ سامنے الماری میں پڑی ہوئی ہے۔'' وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی۔ اس کے آنسو

ہمدردی کے طالب تھے۔

عمران پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ روایتی تھانیداروں کی طرح اس کے انداز میں کوئی لچک نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً دل میں وہ اس صورتِ حال کو انجوائے بھی کر رہا تھا۔ اسے بے حرکت بیٹھتے دیکھ کر چھیدے نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''ماف کر دیں جی! اس نے غلط بات کہی ہے، اس کے لیے میں مافی مانگتا ہوں۔ ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے۔''

اب عمران نے تھوڑی سی نرمی دکھائی اور دوبارہ سوال جواب شروع کیے۔ اس نے زلیخا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو زلیخا! میں اس سارے معاملے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ یہاں سراج اور عارف خاں کے علاوہ اور کون کون آیا ہے؟ انہوں نے کیا کیا ہے؟ ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی رہی ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس بارے میں کوئی بھی چھوٹی بڑی بات چھپاؤ مت۔ کون سی بات ہمارے لیے ضروری ہے اور کون سی نہیں، یہ ہم خود طے کریں گے۔''

زلیخا نے ایک بار پھر تھوڑی سی منت سماجت کی کہ ان دونوں کو اور جہانے کو اس معاملے میں سے نکال لیا جائے۔ عمران نے اس بات پر نیم رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد زلیخا کو چارپائی سے کھول دیا گیا۔ اس کی گردن اور بازوؤں پر گہری خراشیں تھیں۔ یہ تازہ خراشیں آج ہی کی کھینچا تانی کا نتیجہ تھیں۔ جہاں جہاں رسّی کا بل آیا تھا، وہاں اس کے گورے جسم پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ وہ ان نشانوں کو سہلانے لگی۔ پھر اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص الماری میں سے نکال کر ہمیں دکھائی۔ عمران اور اقبال نے قمیص دیکھ کر ایک طرف رکھ دی۔ عمران کے کہنے پر وہ چادر اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر شروع سے اپنی روداد سنانے لگی۔ اس بار وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی بتا رہی تھی۔ شوہر کی موجودگی کی وجہ سے صرف اس روداد کا ''رومانی پہلو'' مختصر کر رہی تھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وارثی نام کا ایک بندہ بھی دو بار سیٹھ سراج کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر زخم کا ایک پرانا نشان تھا۔ اس نے بھی عارف خاں اور جہانے کے ساتھ کھدائی میں حصہ لیا تھا۔ ایک خاص بات جو زلیخا نے بتائی، وہ یہ تھی کہ سراج اور عارف خاں کی باتوں میں اکثر ''لال کوٹھیوں'' کا ذکر آتا تھا۔ ''لال کوٹھیاں'' لاہور میں ہی کوئی جگہ تھی۔ وہاں سراج کے علاوہ عارف اور وارثی وغیرہ بھی جاتے رہتے تھے۔ لال کوٹھیوں کے ساتھ کسی میڈم کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ میڈم یا تو لال کوٹھیوں والی جگہ پر رہتی تھی یا پھر اس کا بھی وہاں آنا جانا تھا۔

عمران نے زلیخا سے دریافت کیا۔ ''تم دونوں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ خاص طور سے تمہارے ساتھ تو وہ ہر طرح کی بات کرتا تھا اور بہت سارا وقت گزارتا تھا۔'' عمران کا لہجہ ایک بار پھر معنی خیز تھا۔

زلیخا کی گردن جھک گئی۔ ''نہیں جی...... میں سچ کہتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

عمران نے اقبال اور مجھ سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''ہاں بھئی...... تم دونوں نے کچھ سنا ہے لال کوٹھیوں کے بارے میں؟''

اقبال بولا۔ ''ہری کوٹھیوں کے بارے تو سنا ہے۔ اس جگہ کو ہری کوٹھیاں اسٹاپ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ سمن آباد لاہور میں ہے لیکن لال کوٹھیاں تو نہیں سنا۔''

عمران نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لال کوٹھی، پیلی کوٹھی، سفید کوٹھی...... اس طرح کے نام تو اکثر گلی محلوں میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ اس طرح تو رنگوں کے نام سے لاہور میں ہزاروں کوٹھیاں ہوں گی مگر یہاں ہمارے لیے تھوڑی سی آسانی موجود ہے۔ یہ ایک کوٹھی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔ یقیناً یہ کوٹھیاں ساتھ ساتھ ہوں گی اس لیے انہیں لال کوٹھیاں کہا جانے لگا ہے۔''

''ہاں...... ظاہر ہے کہ لال کوٹھی کا نام تو کسی بھی بڑے شہر میں بہت سی جگہوں کا ہو سکتا ہے مگر لال کوٹھیاں بہت زیادہ جگہوں کا نہیں ہوگا۔'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ترقی ضرور ہو جائے گی۔'' عمران نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔ ''اب تم نے دماغ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔''

وہ فقرہ چست کرنے سے کہیں بھی باز نہیں آتا تھا۔

زلیخا کا خاوند اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سب کچھ دیکھنے سننے لیکن خاموش رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا تو عمران نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

وہ پُرسوچ انداز میں منمنایا۔ ''کیا لاہور میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کبوتر وغیرہ اُڑانے پر پابندی ہے۔''

''کبوتر اُڑانے پر؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟'' اقبال نے کہا۔ ''ہم نے تو کبھی ایسا نہیں سنا اور اگر کوئی ایسی پابندی ہو بھی تو پورے شہر پر ہوتی ہے، کسی ایک جگہ تو نہیں۔''

''تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو؟'' عمران نے چھیدے سے پوچھا۔

''بس جی...... ویسے ہی۔ ایک دن عارف خاں یہاں موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ دوسرا بندہ لال کوٹھیوں میں تھا۔ وہ عارف کو بتا رہا تھا کہ یہاں کسی نے شکایت کر دی ہے کہ ہم نے کوٹھی میں کبوتر رکھے ہوئے ہیں۔ اب ناظم کا ٹیلی فون آ گیا ہے۔ کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔'' اقبال نے کہا۔ ''کچھ گلی محلوں یا کالونیوں میں علاقے کے لوگ خود ہی کبوتر اور پتنگ بازی وغیرہ پر پابندی لگا لیتے ہیں یا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

عمران کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ اس نے بڑے دھیان سے چھیدے کی طرف دیکھا۔ وہ چھیدے کی بات پر گہرائی سے غور کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے انگلی اُٹھائی اور بولا۔ ''میرے خیال میں ہمیں چھیدے کی اطلاع غور کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اقبال نے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق لاہور میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں ہوا میں پرندوں کی موجودگی کو پسند کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ سول ایوی ایشن والے دھیان رکھتے ہیں کہ اس علاقے کی فضا پرندوں، پتنگوں وغیرہ سے خالی رہے۔''

''سول ایوی ایشن اس میں کہاں سے آ گئی؟'' اقبال نے استفسار کیا۔

''تم شاید اخبار غور سے نہیں پڑھتے۔ ابھی پچھلے دنوں بھی اس طرح کی ایک خبر آئی تھی۔ انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ ہوائی اڈوں کے اردگرد کی فضا کو صاف رہنا چاہیے۔ دوسری صورت میں جہازوں کو لینڈنگ اور ٹیک آف کے وقت خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس خبر میں علاقے کے اندر صفائی ستھرائی کی ضرورت پر بھی خاص زور دیا گیا تھا۔ کیونکہ کوڑے کرکٹ کی وجہ سے پرندوں کی آمد بڑھ جاتی ہے۔''

''ہاں...... اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں۔'' میں نے تائید کی۔

''کبوتر بازی اور پتنگ بازی پر پابندی والی بات بھی میں نے کہیں سنی تھی۔ متعلقہ محکمے کے کسی عہدے دار نے کہا تھا کہ ایئر پورٹ کے اردگرد کے علاقے میں ایسے حفاظتی انتظامات کو یقینی بنایا جائے۔'' عمران نے وضاحت کی۔

چھیدے نے ایک بار پھر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اس روز عارف خاں نے موبائل پر جو گل کی تھی، وہ اسی طرح کی تھی۔ اس میں تھانے کی بات بھی ہوئی تھی کہ کہیں کبوتروں کی وجہ سے کوئی پرچہ وغیرہ نہ ہو جائے۔

عارف خاں نے گالی دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی کی شامت نہیں آئی ہے کہ ایسی چھوٹی سی بات پر ہم پر پرچہ کرائے۔''

کچھ دیر تک عمران، اقبال اور چھیدے میں اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ عمران کو لال کوٹھیوں والا ''کلیو'' اب خاصا اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہی اندازہ لگایا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں عمران نے زلیخا اور چھیدے کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر اس سنگین کیس میں وہ اپنے لیے کچھ نرمی چاہتے ہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا۔ انہیں اس سارے معاملے میں فی الحال بالکل خاموش رہنا تھا۔ یہاں تک کہ محکمے کے چوکیدار سعید سے بھی کوئی بات نہیں کرنا تھی۔ نہ ہی گھر کو تالا لگا کر کہیں غائب ہونا تھا۔ عمران نے ان کو تسلی دی کہ وہ انہیں اس معاملے سے نکالنے کی کوشش کرے گا، یا کم از کم سلطانی گواہ بنا دے گا۔ زلیخا اور چھیدے سے بات کرتے ہوئے عمران نے اپنا لب و لہجہ بالکل پولیس اہلکاروں جیسا بنا لیا تھا۔ وہ اپنا اور ہمارا تعلق خفیہ پولیس سے بتا رہا تھا اور ہم نے جو اپنے چہرے چھپا رکھے تھے، اس کی وجہ بھی یہی بیان کر رہا تھا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ ہم اپنے میزبان امتیاز کے گھر واپس آ گئے۔ وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس انتظار میں کئی کپ چائے کے علاوہ ڈیڑھ دو کلو مونگ پھلی بھی کھا چکا تھا۔

زلیخا اور چھیدے کے گھر میں جو کچھ نظر آیا تھا، اس نے عمران کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ وہ ایک دم پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پختہ ارادہ بن گیا تھا کہ وہ سیٹھ سراج سے تعلق رکھنے والے اس معاملے کی تہہ تک ضرور پہنچے گا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بازی گر سے زیادہ ایک جاسوس دکھائی دیا۔ سیٹھ سراج کے کالے کرتوت کو سامنے لانے کا سودا اس کے دماغ میں سما گیا تھا اور اب وہ پیچھے ہٹنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وہ یہ کام کر گزرے گا۔ اس تھوڑے ہی عرصے میں مَیں نے اس کے بہت سے گُن دیکھ لیے تھے اور مجھے اس پر اعتماد سا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس شخص کے اندر سے ہر وقت ایک توانائی سی پھوٹتی رہتی ہے اور یہ توانائی اس کے اردگرد کے لوگوں کو گرماتی ہے۔ ان میں حیران کن تبدیلیاں لاتی ہے۔ میں خود پر ہی غور کرتا تو ان تبدیلیوں کا ثبوت سامنے آ جاتا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند دن پہلے میں نے بیسیوں افراد کے سامنے ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ ریوالور کے چیمبر میں اصلی گولی رکھ کر اپنے جسم پر فائر کیا تھا۔ بے شک اس عمل میں میرے اندر کی سخت اضطرابی کیفیت نے بھی میری مدد کی تھی لیکن اس کے

لیے اصل حوصلہ مجھے عمران سے ہی ملا تھا۔ تالیوں کی وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو میرے ٹریگر دبانے کے بعد فضا میں اُبھری تھی اور اس واقعے سے صرف تیرہ چودہ گھنٹے پہلے میں اس قدر مایوس تھا کہ ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر اپنے جسم کو ٹکڑوں میں بدلنے کا سوچ رہا تھا۔

ہاں...... یہ شخص میرے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا، بڑی نرمی سے اور صفائی سے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ زلیخا اور چھیدے کے گھر لے گیا تھا۔ نہ بھی لے کر جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا لیکن وہ شاید میرے اندر دلچسپی اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

ہم علی الصباح بستی کے جاگنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہڑپہ کا قدیم شہر ابھی تاریکی اور دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہماری گاڑی ان ٹیلوں کے قریب سے گزری جن کے نیچے اور جن کے اردگرد قریباً ساڑھے چار ہزار سال پرانی تہذیب دم سادھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ان کھنڈرات کے ہیولوں کو اپنے بالکل قریب محسوس کیا اور سوچا کہ یہ کب سے یہاں موجود ہیں۔ بہت دیر سے...... بے شک بہت دیر سے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آئے اس وقت بھی یہ درو دیوار قریباً 2600 سال پرانے تھے۔

ہماری مہران کار اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتی ساہیوال کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اقبال اگلی نشست پر عمران کے ساتھ بیٹھا تھا، میں پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور کے گردونواح میں تھے۔ عمران ایک ٹریکٹر ٹرالی کو مسلسل ہارن دے رہا تھا مگر وہ راستہ نہیں دے رہی تھی۔ ایک دو بار عمران نے بائیں جانب سے نکلنے کی کوشش کی مگر ادھر سے بھی راستہ نہیں ملا۔ ٹرالی میں چارے کے گٹھے تھے اور چھ سات افراد سوار تھے۔ یہ نوجوان تھے اور مستی میں دکھائی دیتے تھے۔ ٹرالی کے ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے گانے بھی بج رہے تھے۔

تھوڑا سا رستہ ملا تو عمران نے کوشش کر کے اوورٹیک کرنا چاہا۔ اسی دوران میں ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو تھوڑا سا لہرایا اور ہماری کار کے پچھلے حصے پر ایک لمبی رگڑ آ گئی۔ ''الو کے پٹھے۔'' عمران نے دانت پیس کر کہا۔

آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی اور ہاتھ کے اشارے سے ٹرالی والوں کو بھی رُکنے کا کہا۔ کار سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ٹرالی بھی رُک گئی۔ اس میں سے لڑکے چھلانگیں لگا کر نیچے اُتر آئے۔ کار کے دونوں بائیں دروازوں پر اچھی خاصی رگڑ آئی تھی۔ ٹرالی والوں

سے تُو تکرار ہوئی۔ اگر وہ ذرا سی بھی شرمندگی ظاہر کرتے تو عمران نہیں جانے دیتا لیکن وہ ایک نمبر کے اجڈ ثابت ہوئے۔ غالباً ان کا ڈیرہ وغیرہ بھی قریب ہی تھا۔ جب انہوں نے بڑھ بڑھ کر باتیں کیں تو عمران کو بھی تاؤ آ گیا۔ وہ ایسے معاملات میں پیچھے ہٹنے والا کہاں تھا۔ اس نے پھولی ہوئی ناک والے ڈرائیور کا گریبان پکڑا اور ایک طوفانی ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ اُچھل کر کنارے کے کھیت میں جا گرا۔ ایک دوسرے شخص نے اسے عقب سے دبوچنا چاہا۔ وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور اپنے عقب والے شخص کو بھرپور طاقت سے ٹرالی کے ساتھ ٹکرا دیا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اسی جگہ کراہ کر ڈھیر ہو گیا۔ اسی دوران میں اقبال نے بھی ایک شخص پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ عمران کی طرح وہ بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر نظر آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ عمران اور اقبال کم از کم پانچ بندوں سے بھڑ گئے تھے۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کس بلا کا نام ہے۔ اس نے بے حد مہارت اور بڑی بے رحمی سے چند سیکنڈ کے اندر اندر دو افراد کو بے بس کر دیا۔ ایک اپنا چہرہ پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا، دوسرا ٹرالی سے ٹکرانے کے بعد بے حال ہو گیا۔ عمران کے ورزشی جسم میں وہی غیر معمولی پھرتی نظر آئی جو سرکس میں زمین سے قریباً چالیس فٹ کی بلندی پر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے نظر آتی تھی۔ اب اس پھرتی میں طیش کا عنصر بھی شامل تھا اس لیے اب یہ اور بھی قابلِ دید ہو گئی تھی۔ عمران اور اقبال کو یوں لڑتے اور غالب آتے دیکھ کر میرے اندر کا خوف بھی ماند پڑنے لگا۔ میں ابھی تک الگ کھڑا تھا اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی دوران میں عمران نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر نشست کے نیچے سے جیک کا آہنی راڈ نکال لیا۔ اس نے جیک کا راڈ میری طرف اُچھالا اور خود جیک کو ہتھیار کے طور پر سنبھال لیا۔

جیک کا راڈ میری طرف اُچھال کر اس نے ایک طرح سے مجھے اس لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ حالانکہ میں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ میرے شامل ہوئے بغیر بھی عمران اور اقبال آسانی سے نمٹ لیں گے ابھی میں تذبذب میں ہی تھا کہ کیا کروں۔ اچانک ٹرالی والوں میں سے ایک بندہ مجھ پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی مجھ پر چلائی۔ میں ایک طرف ہٹا۔ لاٹھی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی ٹرالی کو لگی۔ میں نے آہنی راڈ گھما کر مدِمقابل کی گردن پر رسید کیا اور حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی میں یہ ''پہلا وار'' تھا جو میں نے حقیقی لڑائی میں کسی پر کیا۔ ایک لمحے کے لیے میں خود دنگ رہ گیا کہ یہ میں نے کس طرح کر لیا۔ گردن پر راڈ کی ضرب کھا کر میرا مدِمقابل بُری طرح ڈگمگایا۔ میرا حوصلہ

بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، میں نے راڈ کی ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی۔ یہ زیادہ زوردار ضرب نہیں تھی پھر بھی مجھے تسلی ہوئی۔ مدِمقابل نے اپنا توازن درست کیا اور مجھ پر جوابی وار کرنے کے لیے تیار ہوا مگر یہی وقت تھا جب عمران عقاب کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ مدِمقابل کی لاٹھی اُٹھی رہ گئی اور وہ ڈکراتا ہوا گنے کے کھیت میں جا گرا۔

ٹرالی میں موجود دو ادھیڑ عمر افراد بیچ بچاؤ کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چند مزید افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں ایک اسٹیشن وین سے اُترنے والے افراد بھی تھے۔ یہ کسی ادارے کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کر بیچ بچاؤ کرایا۔ اقبال کا سر پھٹ گیا تھا اور عمران کے ہاتھ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔

اس جھگڑے کو ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ عمران کی گاڑی کا نقصان ہوا تھا، دوسری طرف ٹرالی والوں کو خاصی جسمانی ضربیں آئی تھیں۔ ایک لاچے کُرتے والے لڑکے کی تو کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ تھانے کچہری میں جانے کے بجائے معاملے کو وہیں نمٹا لیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک فون نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہ فون عمران نے لاہور سے کروایا تھا۔ فون کرنے والا ایک ایس ایس پی تھا۔

ہم دن گیارہ بجے کے لگ بھگ واپس عمران کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ اقبال کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عمران کو بھی ہاتھ پر ہلکی سی بینڈیج کرانا پڑی تھی۔ بہرحال وہ دونوں بالکل ہشاش بشاش تھے۔ ان کے لیے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ آج کا دن میرے لیے بہت...... بہت اہم رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو نگاہوں میں ایک بار پھر ٹرالی سواروں کے ساتھ ہونے والی لڑائی کے مناظر گھومنے لگے۔ مجھے اب بھی بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اس لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ پتا نہیں، وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں نے خود پر جھپٹنے والے پر آہنی راڈ کا وار کیا تھا اور یہ اکیلا وار نہیں تھا دو وار تھے۔ میری زندگی کے پہلے دو وار۔

جو کچھ آج میں نے کیا تھا، اس کی مجھے ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ اب تک کی زندگی میں بے شمار موقعے ایسے آئے تھے جب مجھے لڑنا چاہیے تھا لیکن میں لڑ نہیں سکا تھا۔ اپنی اس بے بسی کا بدلہ میں نے ہمیشہ خود ہی سے لیا تھا۔ اپنے اندر ہی جلتا کُڑھتا رہا تھا۔ اپنے آپ کو اذیت دی تھی یا پھر اپنا سارا غصہ کسی ہینڈ بیگ پر اُتارا تھا۔ مارشل آرٹ کی مہارت حاصل کرنے کا جنون بھی دراصل میری انہی محرومیوں و ناتوانیوں کا شاخسانہ تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو جگر؟'' عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی لیٹا ہوں۔''

''یار! اب یونہی نہیں لیٹنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ قدرت نے ہمیں ایک بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ ویسے تو ہم شاید سیٹھ سراج جیسے بندے سے ٹکر نہ لے سکتے لیکن اب حالات خود اس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے اپنے کرتوت ہی اس کی سزا کو آواز دے رہے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ اقبال دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ عمران پھیل کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''تم کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جو میں چاہ رہا ہوں، وہ تم بھی اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تمہاری منگیتر ثروت کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار سراج کا اوباش بیٹا واجی تھا۔ اس کے بعد ثروت کی فیملی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی ذمے داری سراسر اس خبیث سراج پر آتی ہے۔ ان باپ بیٹے نے تمہیں اُجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ تابش! یہ دونوں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ کم از کم میں تو انہیں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا۔''

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو عمران! سیٹھ اور اس کے بیٹے کو سزا ملنے سے مجھے وہ سب کچھ واپس مل جائے گا جو میں کھو رہا ہوں۔''

عمران نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارا اشارہ ثروت کی طرف ہے اور میں تمہارے دُکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس سلسلے میں بھی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ بلکہ ہار مانیں گے ہی نہیں۔ ہم سر دھڑ کی بازی لگائیں گے میرے شہزادے۔ کچے گھڑے پر تیر جائیں گے اور دریا ہی پار نہیں کریں گے بلکہ سمندر پار کریں گے۔ ہم ڈھونڈیں گے اس کو اور اتنی شدت سے ڈھونڈیں گے کہ اس کو ملنا ہی پڑے گا لیکن اب جو بات میں کر رہا ہوں، یہ بھی غیر اہم نہیں ہے۔ قدرت ہمیں سیٹھ سے بدلہ لینے کا ایک سنہری موقع فراہم کر رہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ آسانی سے گرفت میں آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ ہماری توقع سے زیادہ لمبے ہوں۔''

''لیکن ہم بھی تو اس پر نرم ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ نرم ہاتھ ڈالنا ہوتا تو وہ آج بھی سلاخوں کے پیچھے نظر آ سکتا تھا۔ کم از کم اس پر ایک عدد ''پرچہ'' تو ہو ہی سکتا تھا۔ اس کے لیے چھیدے اور زلیخا کے بیان کافی تھے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

"مجھے شک ہو رہا ہے کہ سیٹھ جو کچھ کر رہا ہے، اس کا دائرہ ہماری توقع سے زیادہ وسیع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی پڑتال کریں۔ چھیدے نے جو لال کوٹھیوں والی اطلاع دی ہے، یہ ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارے لیے یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔"

"لال کوٹھیوں والی جگہ مل گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

"پھر یہ پتا چلے گا کہ سراج اور عارف کی باتوں میں بار بار ان کوٹھیوں کا ذکر کیوں آتا رہا ہے۔ یہ میڈم صاحبہ کون ذات شریف ہیں اور کیا سیٹھ سراج جو کچھ ہڑپہ میں کرتا رہا ہے، اس کا تعلق ان لال کوٹھیوں سے بھی ہے؟"

میں ویسے تو اس سارے معاملے سے بیزاری ظاہر کر رہا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب میرے اندر بھی ایک لہر سی جاگی ہوئی تھی۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کے لیے میرے اندر چند روز پہلے جو بے پناہ نفرت پیدا ہوئی تھی اور جس نے مجھے خودکشی کی طرف مائل کر دیا تھا، اب ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو سزا کے شکنجے میں دیکھنا چاہ رہا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر جو تبدیلی واقع ہوئی تھی، اس کی بڑی وجہ خود عمران تھا۔ اس شخص کو عجیب و غریب کردار اور اس کا بے پایاں حوصلہ مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا آسان ہوگا؟"

"یہ ہوئی نا فائیو اسٹار بات۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "اب تم نے دلچسپی ظاہر کر دی ہے تو یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں ہوگا۔ یہ دیکھو، میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کام کیسے ہوگا۔" اس کے انداز میں شوخی تھی۔

اس نے الماری میں سے ایک اوورکوٹ نکال کر پہنا، سر پر پی کیپ جمائی اور ہاتھ میں پائپ کی جگہ بڑے اسٹائل سے ایک چمچ پکڑ لیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر وہ شرلاک ہومز کے اسٹائل میں بولا۔ "دیکھو ڈاکٹر واٹسن! میرا مطلب ہے ڈاکٹر تابش! کہ لاہور میں ایک جگہ ہے جو لال کوٹھیوں کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور کی آبادی ساٹھ ستر لاکھ ہو چکی ہے۔ اتنی بڑی آبادی میں سے یہ جگہ ڈھونڈنی مشکل تھی مگر اب ہمارے لیے کافی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جگہ ایک ایسے علاقے میں ہے جو لاہور ایئرپورٹ کے اردگرد ہے۔ اس طرح یہ کام کافی "شارٹ لسٹ" ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے کہ نہیں؟"

"بالکل ہو جاتا ہے۔" میرے بجائے ساتھ والے کمرے سے اقبال نے جواب دیا۔ وہ ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔

"ویری گڈ! میرا خیال ہے کہ کل تم جیلانی اور سرفراز کو لے کر علاقے کا سروے کرو۔ دو چار ڈاک خانوں میں جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ اس جگہ کا پتا چل جائے گا۔"

"جو حکم وڈے تھانیدار صاحب!" اقبال نے اسٹائل سے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

میں بدستور سنجیدہ رہا۔ ہنسنا اور مسکرانا تو میں جیسے بھول ہی چکا تھا۔ عمران نے بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار! ایک بار گھر فون کر لو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

وہ پچھلے دو تین روز میں کم از کم ایک درجن مرتبہ یہ مشورہ دے چکا تھا۔ شروع میں تو مجھے یہ مشورہ بالکل ناقابلِ عمل لگ رہا تھا مگر اب میرے ردِعمل میں تھوڑی سی تبدیلی آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں ایک بار واقعی گھر میں بات کر لوں تو گھر والوں کی پریشانی بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے مجھے والدہ کی بات سے فکر لاحق تھی۔ میری گمشدگی کی پریشانی انہیں کسی بڑی مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ میں نے دیر تک اس معاملے پر غور کیا اور پھر شدید تذبذب میں سے نکل آیا۔

میں نے عمران سے اس کا سیل فون لیا اور گھر کی چھت پر چلا گیا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے میں نے گھر کا نمبر ملایا۔ فون والدہ نے ہی اُٹھایا۔ انہوں نے میری آواز سنی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس رونے میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ "تم کہاں ہو تابی! خدا کے لیے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟ تم ٹھیک تو ہو نا۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو ہمارے ساتھ؟ تمہیں پتا ہے میں پورے دو دن ہسپتال رہ کر آئی ہوں۔ کیا تم میری جان لینا چاہتے ہو؟ کیا مارنا چاہتے ہو مجھے۔" وہ بغیر رُکے بولتی چلی گئیں۔

میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں۔

وہ فریاد کناں انداز میں بولیں۔ "تم کیوں واپس نہیں آ رہے ہو۔ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ اگر واجی اور اس کے باپ والا مسئلہ ہے تو ہم یہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تمہاری پھوپھی کے گھر سرگودھا چلے جائیں گے، تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ بس واپس آ جاؤ۔"

"مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے امی! بس ایک مجبوری ہے۔ میں آ کر آپ کو بتاؤں گا لیکن ابھی کچھ دن میں نہیں آ سکتا۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔"

"کتنے دن نہیں آ سکتے؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ اس طرح ہمیں انتظار کی سولی پر مت لٹکاؤ۔"

ابھی دوران میں فرح نے والدہ سے ریسیور لے لیا۔ وہ بھی رونے بلکنے لگی۔ "بھائی!

آپ کو میری قسم، آپ واپس آ جائیں۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

میں نے اس کو پچکارا اور تسلی دی۔ چھوٹے بھائی عاطف اور چچا وغیرہ سے بھی میری بات ہوئی۔ اس گفتگو سے یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ پارک میں سیٹھ سراج کے کارندوں نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کی خبر ہر ایک کو ہو چکی ہے۔ شروع میں تو میرے گھر والوں اور عزیزوں کو یہی اندیشہ تھا کہ مجھے پارک میں مارنے پیٹنے کے بعد سراج نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے، وہ تھانے جانا چاہتے تھے تاہم بعد میں علاقے کے ناظم نے سیٹھ کی طرف سے اس بات کی گارنٹی دی کہ میں سیٹھ کی تحویل میں نہیں ہوں۔ بعد میں میری طرف سے عمران نے میرے گھر فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کے بعد گھر والوں کو کچھ تسلی ہوگئی تھی۔

میں عمران کے گھر کی چھت پر ٹہلتا رہا اور ساتھ ساتھ گھر والوں سے بات بھی کرتا رہا۔ وہ رو رہے تھے اور میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ فی الحال میں انہیں تسلی تشفی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ والدہ مسلسل فریاد کناں تھیں۔ ''تابی! تُو تو ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا۔ بھوکے پیٹ نکل گیا تھا گھر سے۔ تیری جیب میں تو پیسے بھی نہیں تھے۔ بس ایک جوڑا تھا تیرے پاس۔ کیا پہنتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ میں لاہور میں ہی ہوں اور اپنے ایک قریبی دوست کے گھر میں ہوں۔ میری ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ دوبارہ فون کروں گا اور بات ختم کر دی۔ ہمارے گھر کے فون میں سی ایل آئی نہیں تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ عمران کا سیل نمبر گھر والوں کو معلوم نہیں ہوگا۔

گھر میں بات کر کے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ یوں لگا کہ سر پر رکھا ہوا ایک بہت بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس نے پچھلے چند روز سے میری گردن توڑ رکھی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا تاہم کچھ نہ کچھ ریلیف مجھے ضرور مل گیا تھا۔

میں جن حالات سے گزر رہا تھا، یہ بڑے تند و تیز تھے۔ عمران کی پارا صفت طبع نے انہیں مزید تند و تیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود ثروت کا دھیان کسی گھڑی بھی میرے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ وہ کہاں ہوگی۔ کیا کر رہی ہوگی؟ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس طرح کے بے شمار سوالات ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ میرے پاس ثروت یا ناصر بھائی سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان سے یوں اوجھل ہوئے تھے کہ اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ان کا واحد نشان ان کے محلے کے پراپرٹی ڈیلر وہ حاجی صاحب تھے جنہیں وہ اپنے مکان کی فروخت کا ذمے دار بنا گئے تھے۔ بعد ازاں حاجی صاحب نے مجھے

بتایا تھا کہ ناصر بھائی انہیں مکان کا مختار نامہ بھی دے گئے ہیں۔ سیٹھ سراج کے ساتھ لڑائی والا واقعہ پیش آنے سے پہلے میں دو تین دفعہ حاجی صاحب کے پاس گیا تھا لیکن وہ مجھے ناصر بھائی کا کوئی سراغ فراہم نہیں کر سکے تھے۔ بہرحال انہوں نے ہامی ضرور بھری تھی۔ ایک دو بار مجھے ایسے بھی لگا تھا کہ شاید وہ ناصر بھائی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دانستہ مجھے مکمل معلومات نہیں دے رہے۔

اس روز رات گئے عمران سرکس میں ڈیوٹی دے کر واپس آیا تو میں جاگ رہا تھا جبکہ اقبال سرِشام ہی کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ میری سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ اپنے مخصوص دل نشین انداز میں مسکرایا اور میری طرف جھک کر بولا۔ ''کیا بات ہے جگر! رونے دھونے کی پریکٹس تو نہیں کر رہے تھے؟''

''رونے سے کچھ ہو سکتا تو سارے شہر کو ڈبو دیتا۔'' میں نے آہ بھری۔

''ثروت یاد آ رہی ہے نا؟'' وہ قدرے شوخی سے بولا۔ پھر ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ ''چلو اُٹھو...... ابھی چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی ثروت سے ملنے چلتے ہیں اور کہاں؟ یہاں سے اسلام آباد پہنچتے ہیں۔ وہاں سے ویزا لگواتے ہیں۔ سیدھا جرمنی لینڈ کرتے ہیں۔ وہاں مسجدوں میں نہیں نہیں...... گرجا گھروں میں اعلان کرواتے ہیں کہ ایک اُجلے اُجلے مکھڑے کی سوہنی سوہنی لڑکی جس نے پاکستانی لباس پہن رکھا ہے اور اس کی آنکھوں میں کسی کا پیار بسا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان سے نکلی، ابھی تک واپس نہیں آئی اور نہ اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے...... لہٰذا......''

''یار! مسخری نہ کرو۔ میں ایسے موڈ میں نہیں ہوں۔''

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اچانک بولا۔ ''کیوں نہ کل ہی انہی حاجی صاحب کے پاس چلیں جن سے تمہارے ناصر بھائی کی بات ہوتی ہے؟''

یہ اس نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ دفعتاً میرے دل میں جھانک لیتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''وہاں جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ناصر بھائی اپنا اتا پتا تو حاجی صاحب کو بھی نہیں بتاتے۔''

وہ مسکرایا۔ ''حاجیوں میں سے کچھ حاجی بڑے پکے پیٹھے ہوتے ہیں۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ بڑی گہرائی ہوتی ہے ان کے اندر۔ ہو سکتا ہے یہ حاجی صاحب بھی اسی قسم کے

ہوں۔ بہرحال میں ساتھ ہوں گا تو ہم کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔''

ہمارا پروگرام بنا کہ اگلے روز شام کو ہم حاجی صاحب سے ملیں گے مگر شام سے پہلے ہی ایک ایسی بات ہوگئی کہ یہ پروگرام ملتوی ہوگیا اور ہم ایک دوسرے گمبھیر چکر میں اُلجھ گئے۔

قریباً چار بجے کا وقت تھا، عمران ابھی سو کر اُٹھا تھا اور اپنے ہاتھ کی مالش کر رہا تھا۔ یہ ہاتھ ٹرالی سواروں کے ساتھ لڑائی میں تھوڑا سا مڑ گیا تھا۔ بہرحال اب ٹھیک تھا اور عمران کو اُمید تھی کہ کل تک وہ سرکس میں موٹر سائیکل کے علاوہ جھولوں والے آئٹمز بھی پیش کر سکے گا۔ اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اقبال تھا۔ اس نے عمران کو کوئی من پسند خبر سنائی تھی اور اس خبر کی وجہ سے عمران کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔

دو تین منٹ تک اقبال سے بات کرنے کے بعد عمران نے موبائل جیب میں ڈالا اور میرے زانو پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔ ''مبارک ہو جگر! لال کوٹھیوں کا پتا چل گیا ہے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق یہ کوٹھیاں جس علاقے میں ہیں، وہ ایئرپورٹ سے زیادہ دور نہیں۔ اقبال نے بھی پورا ڈاکٹر واٹسن والا کام ہے۔ وہ کل سے اس چکر میں تھا۔''

اس کے بعد اس نے خود ہی اپنا کندھا تھپک کر خود کو شاباش دی اور مسرور نظر آنے لگا۔

''اور کیا کہہ رہا ہے اقبال؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے بتایا ہے کہ یہ ایک ہی ڈیزائن کی دو کوٹھیاں ہیں۔ دس پندرہ سال پہلے تین بھائیوں نے اپنی رہائش کے لیے بنائی تھیں۔ پھر ان میں ناچاقی ہوئی اور تینوں یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ دونوں کوٹھیاں کسی اور کی ملکیت ہیں۔ اقبال اس بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر رہا ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آ کر بتائے گا۔''

ہم بے چینی سے اقبال کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تھوڑی تاخیر سے آیا۔ بہرحال اس کا چہرہ دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ اس کے پاس دلچسپ اور اہم معلومات ہیں۔ اس نے بتایا۔

''ان دونوں کوٹھیوں میں اب دو بہنیں رہتی ہیں۔ بڑی بہن کا خاوند کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ اسٹیٹ ڈویلپر تھا اور اس کی بنائی ہوئی دو تین ہاؤسنگ اسکیمیں کامیابی سے فروخت ہوئی تھیں۔ اس کی وفات کے بعد اس کا کام اس کی بیوی نے سنبھال لیا تھا۔ آج کل وہ بھی ایک ہاؤسنگ اسکیم تیار کر رہی ہے۔ اسی جواں سال خاتون کو میڈم یا میڈم شیرازی کہا جاتا ہے۔ ساتھ والی کوٹھی میں اس کی چھوٹی بہن رہتی ہے۔ یہ ذرا پُراسرار قسم کی شے ہے۔ اسے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ باہر نکلے بھی تو رنگین شیشوں والی گاڑی میں ہوتی ہے۔ یہ اپنے انجینئر خاوند سے طلاق لے چکی ہے۔ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ یہ

بھی پتا نہیں چل سکا۔''

''اس کو بھی میڈم کہتے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کہنے نہ کہنے کا سوال تو تب ہے یار! جب یہ کسی سے ملتی ہو۔'' اقبال نے کہا۔ ''کم از کم جن دو چار بندوں سے میری بات ہوئی ہے، وہ میڈم شیرازی کو ہی جانتے ہیں اور اسی کے بارے میں بتا سکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر کوئی دوسرا نہیں بتا سکا تو ہم خود معلوم کر لیتے ہیں۔ ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں؟''

''پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے لیے۔'' اقبال نے ترنت جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا۔

''بھئی پھڈے تو ہوتے ہی ٹانگ اڑانے کے لیے ہیں۔ ہم نہیں اڑائیں گے تو کوئی اڑائے گا اور اگر کوئی غلط بندہ کسی غلط پھڈے میں ٹانگ اڑائے گا تو اسے اور غلط کر دے گا۔''

''غلط پھڈا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ پھڈا تو ہوتا ہی غلط ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''چلو تم بولے تو سہی۔ چاہے لفظ صحیح کرنے کے لیے بولے۔'' عمران چہکا۔

O......❖......O

اس رات عمران اور اقبال نے دیر تک لال کوٹھیوں کے بارے میں سرگوشیاں کیں۔ اب تک میں نے عمران کے مزاج کو جو سمجھا تھا، اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ ہر وقت کوئی بھی ضروری یا غیر ضروری خطرہ مول لینے کے لیے ایک دم تیار رہتا ہے۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال کو تفریح کے طور پر لیتا تھا اور اس تفریح میں ہر حد تک جانے کے لیے آمادہ ہوتا تھا۔ جہاں وہ سمجھتا تھا کہ کوئی زیادتی ہو رہی ہے یا ناجائز کام ہو رہا ہے، وہاں وہ خدائی فوجدار بن کر دخل در معقولات اور غیر معقولات کے لیے پر تولنے لگتا تھا۔

اب بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی تھی۔ سیٹھ سراج کو راہ چلتے تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے اپنے ساتھیوں کے ذریعے اس کا ایکسیڈنٹ کروایا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں اتفاقیہ طور پر بوریوں والا معاملہ سامنے آیا تھا اور اب بوریوں سے بات آگے بڑھ کر لال کوٹھیوں تک جا پہنچی تھی۔ زلیخا کے خاوند چھیدے نے کوٹھیوں کا ذکر کچھ ایسے بھید بھرے انداز میں کیا تھا کہ عمران کا تجسس پوری طرح جاگ اُٹھا تھا اور اب یہی تجسس اسے کوٹھیوں اور ان کے مکینوں کی طرف کشش کر رہا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اگلے روز بھی عمران اور اقبال لال کوٹھیوں کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے۔ یہ پروگرام رات کو گیارہ بجے کے لگ بھگ میرے سامنے آیا۔ سرکس سے واپس آتے ہی عمران اور اقبال نے کہیں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ عمران نے بڑی اپنائیت سے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

”لیکن پتا تو چلے کہ جانا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس ذرا لال کوٹھیوں تک۔“ عمران بولا۔

”مجھے اوکھلیوں میں سر دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”لیکن ہمیں تو ہے نا یار! تم بس یہ دیکھنا کہ اوکھلیاں کیسے چلتی ہیں اور ان میں سر کیسے دے کر کیسے نکالا جاتا ہے۔ تم کچھ نہ کرنا۔ بس ہمارے ساتھ چلو۔ بے شک گاڑی میں بیٹھے رہنا اور اگر دیکھو کہ ہمارا سر واقعی اوکھلیوں میں پھنس گیا ہے تو بلا جھجک واپس چلے آنا۔ ہم اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہوں گے۔“

”ویسے اندر کی بات ہے تابش بھائی! ایسی چھوٹی موٹی اوکھلیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔“ اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ عمران کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی اسی جیسا ہو گیا ہے۔

اس معاملے پر دس پندرہ منٹ بحث ہوئی۔ آخر عمران نے مجھے اس حد تک راضی کر لیا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں گا لیکن کوٹھیوں سے فاصلے پر کار کے اندر بیٹھا رہوں گا۔

مجھے اس حد تک راضی کر لینا بھی بس عمران ہی کا کام تھا۔ اگر یہ شخص ساتھ نہ ہوتا تو میں اس قسم کے کسی کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ شخص اپنے اندر سے پھوٹنے والی توانائی کے ذریعے مسلسل میری کیمسٹری تبدیل کر رہا تھا۔

ہم رات بارہ بجے کے قریب مہران کار میں بیٹھے اور راوی روڈ سے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تاریک آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ کسی وقت ہلکی پھوار پڑنی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم پینتالیس منٹ کے اندر ایئرپورٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک ہلکی سی لہر چلنی شروع ہو گئی تھی۔ ایسی ہی لہر میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب درجنوں تماشائیوں کے سامنے میں نے عمران کے اُکسانے پر ”دو...... چھ“ کا کھیل کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ گاڑی تاریک سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ عمران نے مجھے بتایا نہیں تھا مگر مجھے پتا تھا کہ اس کی جیکٹ کے اندر

سیاہ رنگ کا بریٹا پسٹل موجود ہے۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ دونوں سر پھرے لال کوٹھیوں پر جا کر کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ سیدھے طریقے سے ملاقات کے بہانے اندر جائیں گے؟ کیا وہ چوری چھپے اندر گھسیں گے۔ کیا وہ کسی کو یرغمال وغیرہ بنا کر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے؟ ذہن میں کئی سوال اُبھر رہے تھے لیکن میں ان سوالات کے جوابات حاصل کر کے خود کو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم ایک پوش رہائشی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں درختوں کی بھرمار تھی۔ دس مرلے اور ایک کنال کی بہت سی کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”دیکھ لو بھئی لال کوٹھیاں...... تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔“

یہ دونوں کوٹھیاں دومنزلہ تھیں۔ ایک کوٹھی کی کسی کسی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی لیکن دوسری یکسر تاریک تھی۔ شیشم، کچنار اور توت کے بلند و بالا درختوں نے دونوں کوٹھیوں کو گھیر رکھا تھا۔ عمران نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور کوٹھیوں کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ پچھواڑے کی چھوٹی سڑک بالکل سنسان تھی اور ایک طرف کے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ انہوں نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر گارڈینا کی ایک باڑ کے قریب پارک کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ آج دن کے وقت وہ اس جگہ کا پورا سروے کر چکے ہیں اور اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں۔ ان کی ساری حرکات نپی تلی تھیں۔

”تابش! تم ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔“ عمران نے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا۔

میں حسبِ پروگرام ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی اگنیشن میں ہی تھی۔ وہ میرا کندھا تھپک کر عجیب جوشیلے انداز میں بولا۔ ”فکر نہیں کرنا جگر! یہ بڑا فائیو اسٹار کھیل ہے۔ جوں جوں کھیلیں گے، مزہ بڑھتا جائے گا۔“

اور واقعی مجھے لگا کہ میرا خوف دب رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ سوچا کہ اگر یہ بندہ میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ان دونوں نے کرکٹ کی اننگ شروع کرنے والے بیٹسمینوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ سے ہاتھ ٹکرایا اور محتاط قدموں سے لال کوٹھی کی بیرونی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ اس عقبی دیوار میں ایک چھوٹے دروازے کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ دیوار کی اونچائی دس فٹ سے کم نہیں تھی۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر سے دیکھا، عقبی دیوار کے قریب پہنچ کر عمران کا ہیولا ہوا میں اُچھلا۔ یہ ویسی ہی جست تھی

جیسی وہ ایک جھولے سے دوسرے جھولے تک پہنچنے کے لیے لگاتا تھا۔ اس جست کے ساتھ اس نے باؤنڈری وال کا بالائی کنارہ تھام لیا اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ دیوار میں نظر آنے والا دروازہ بے آواز کھل گیا ہے۔ اقبال اس دروازے میں داخل ہوا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

اب میں تھا اور میرے دل کی زیروزبر ہوتی دھڑکنیں تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک خطرناک مہم جوئی میں شامل ہو چکا تھا۔ اب اس مہم جوئی سے متعلق سارے خطرے میرے لیے بھی تھے۔ میرے کان ہر گھڑی کسی اَن چاہی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ یہ آواز کسی کے چلانے کی ہوسکتی تھی، گولی چلنے کی ہوسکتی تھی یا پھر ملا جلا شور ہوسکتا تھا۔

اسٹیئرنگ پر جمی میری ہتھیلیوں پر پسینہ آنے لگا۔ بارش کی ہلکی پھوار ونڈ اسکرین کو دھندلاتی چلی جارہی تھی۔ اسی طرح قریباً پچیس منٹ گزر گئے۔ تاریک کوٹھی مسلسل تاریک تھی کہیں کسی حرکت کے آثار نہیں تھے۔ فقط ایک بالکونی میں دو تین سیکنڈ کے لیے روشنی نظر آنے کے بعد بجھ گئی تھی۔ اچانک ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا موبائل فون جاگ گیا۔ یہ فون اقبال میرے لیے ہی یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عمران خود تھا۔ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔ ”تابی! گھبرانے کی بات نہیں ہے لیکن یہاں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”کیا ہوا؟“

وہ مدھم آواز میں بولا۔ ”تمہاری مدد کی ضرورت ہے تمہیں بس دو تین منٹ کے لیے اندر آنا ہوگا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”یار! ایک دروازے کو باہر سے کنڈی لگ گئی ہے۔ اب وہ باہر سے ہی کھل سکتا ہے۔ جلدی آؤ ورنہ ہمارا سارا مشن بے ہوش ہو کر کومے میں چلا جائے گا۔“ وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

”دیکھو عمران! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں گاڑی سے باہر نہیں آؤں گا۔ تم نے.....“

”جگر! بات تو سنو۔“ اس نے تیزی سے قطع کلامی کی۔ ”میں تمہیں یہاں جوڈو کراٹے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ صرف دو منٹ کے لیے اندر آنا ہے۔ باؤنڈری وال والا دروازہ کھلا ہے۔ صحن کے آگے برآمدہ ہے۔ برآمدے میں بائیں طرف والا کمرہ ہے۔ بس باہر سے کنڈی

کھول کر واپس چلے جاؤ۔ یار! اتنی سی مدد تو کوئی راہ چلتا بھی کر دیتا ہے۔“

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ ”لیکن کنڈی لگی کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا لیکن یہ گارنٹی ہے کہ خطرہ کوئی نہیں ہے یہاں۔ ساری کوٹھی سنسان پڑی ہے۔ بس آجاؤ جلدی سے۔“ مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے بالکونی میں روشنی بھی ہوئی تھی۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس میں خوف کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس کا لب ولہجہ ایسا ہوتا تھا کہ میرے لیے اس کی بات ٹالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں نے اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کی اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمت بندھ گئی ہے۔ میں اپنے اندر جو غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا، شاید یہ ان کی ہی ایک کڑی تھی۔ سیٹھ کو تھپڑ مارنا پھر اپنی جان لینے کی نہایت سنجیدہ کوشش کرنا۔ پھر سرکس میں ریوالور کے کھیل میں خود پر گولی چلانا اور اس کے بعد ہڑپہ سے واپس آتے ہوئے راستے میں ٹرالی سواروں سے لڑنا اور ایک ٹرالی سوار پر اپنے ہاتھ سے وار کرنا۔ یہ سب ان تبدیلیوں کی ہی جھلکیاں تھیں۔

میں اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا گاڑی سے اُترا اور باؤنڈری وال کا دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا۔ یہ عقبی صحن تھا۔ قریباً تین چار مرلے میں ہوگا۔ ایک طرف گراسی لان تھا جس میں لوہے کی سفید کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایسی جگہوں پر رکھوالی کے کتے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اگر کتا ہوتا تو آدھ گھنٹہ پہلے ہی سامنے آ گیا ہوتا۔ برآمدہ تاریک تھا۔ میں نے موبائل فون مسلسل کان سے لگا رکھا تھا۔ ”اندر آ گئے ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہوں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”برآمدے میں بائیں طرف دیکھو۔ ایک چھوٹا دروازہ ہے، دوسرا بڑا ہے، گہرے پیلے رنگ کا نظر آ رہا ہے؟“ میں نے پھر ہنکارا بھرا۔

”دروازے کو باہر سے چٹخنی چڑھائی گئی ہے، اسے آرام سے گرا دو۔“

میں نے ہدایت پر عمل کیا اور لرزتے ہاتھوں سے پیلے رنگ کے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ دونوں سامنے ہی کھڑے تھے۔ عمران نے کندھا تھپک کر مجھے شاباش دی۔ ”جیتے رہو۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ تمہاری ہر دلی مراد پوری ہو۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی۔ ایسی ہی ٹارچ اقبال کے ہاتھ میں بھی نظر آ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران اور اقبال دونوں نے بڑے سائز کے گرم مفلروں کے ذریعے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پہلے ہی ”پی کیپس“ تھیں۔ لہٰذا اب ان کی آنکھوں اور

تھوڑی سی پیشانی کے علاوہ باقی چہرہ پوشیدہ تھا۔

''لو...... یہ ٹوپی پہن لو تم بھی۔'' عمران نے جیکٹ کی جیب سے ایک گرم ٹوپی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ یہ وہی ٹوپی تھی جس میں سے صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ سر، چہرہ اور گردن وغیرہ چھپ جاتے ہیں۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

میں اب واپس جانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ بھانپ کر عمران نے جلدی سے سرگوشی کی۔

''ایک چیز دیکھ لو پھر چلتے ہیں۔'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں کھینچا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ کوٹھی میں چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے پنسل ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کا چھوٹا سا دائرہ فرش کے قالین پر پڑنے لگا۔ عمران محتاط قدموں سے چلتا ہوا ایک بغلی دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ہم ایک مستطیل کمرے میں تھے۔ اس کمرے کی دیواروں پر بہت سی پینٹنگز نظر آ رہی تھیں۔ یہ نہایت قیمتی فریموں والی پرانی تصویریں تھیں۔ زیادہ تر وکٹوریہ دَور کے مناظر کو پیش کر رہی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ ان ساری تصویروں میں عریانی کا عنصر نمایاں تھا۔ چند تصویروں کو تو فحش بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان میں عورتوں کے علاوہ مرد بھی تھے۔ وکٹوریہ دور کے ایک دربار کی پینٹنگ نہایت بولڈ تھی۔ مصور نے دربار میں شراب نوشی، بدمستی اور عیش وعشرت کے مناظر پینٹ کیے تھے۔ بادشاہ اور درباری جام پر جام لنڈھا رہے تھے اور عورتوں کے عریاں جسموں سے کھیل رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

میں ان تصویروں پر نگاہ دوڑا رہا تھا لیکن میرا دھیان پیچھے کی طرف ہی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ یا کم از کم میں تو واپس گاڑی میں پہنچ جاؤں۔ بے شک کوٹھی میں مکمل سکوت تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ سکوت برقرار بھی رہے اور پھر سوچنے کی بات تھی کہ برآمدے والے دروازے کو باہر سے کنڈی کس نے لگائی تھی؟ آخر کوئی نہ کوئی تو یہاں جاگ رہا تھا۔ شاید اس نے یونہی دروازہ چیک کیا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر باہر سے چٹخنی چڑھا دی تھی۔ پھر میری نگاہوں میں سیٹھ سراج کا چہرہ گھوما۔ اس کا تعلق بھی تو ان کوٹھیوں سے بیان کیا جا رہا تھا۔ اگر سیٹھ سراج یا اس کے کسی کارندے سے یہاں ملاقات ہو جاتی تو میرا بھانڈا بُری طرح پھوٹ سکتا تھا۔ ان لمحوں میں مَیں نے محسوس کیا کہ مجھے عمران کی ''ٹوپی والی بات'' مان لینی چاہیے تھی۔ ٹوپی اس کی جیکٹ کی بائیں جیب میں تھی۔ میں نے یہ گرم ٹوپی نکالی اور ذرا سی جھجک کے ساتھ پہن لی۔

عمران کی ٹارچ کا دائرہ اب ایک سائیڈ بورڈ پر رینگ رہا تھا۔ اس نہایت دیدہ زیب سائیڈ بورڈ پر گندھارا آرٹ کے کچھ نمونے سجائے گئے تھے۔ تین چار منٹ مزید گزر گئے۔

''عمران! اب چلو یہاں سے۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، ایسا کچھ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں تو خیر اس سارے معاملے کی گہرائی سے ویسے ہی بے خبر تھا، عمران اور اقبال کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال یوں اچانک پلٹا کھائے گی۔ یہ تاریک مستطیل کمرہ اچانک چکا چوند روشنی سے بھر گیا۔ ایک نہایت تنومند شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول مَیں صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چنگھاڑنے والے انداز میں کچھ کہا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ عمران سے ایسے فوری اور انتہائی برق رفتار ردِعمل کی توقع مجھے نہیں تھی اور یقیناً اس گرانڈیل شخص کو بھی نہیں تھی جو اندر گھسا تھا۔ میں نے بس عمران کی لات کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کے بعد دوسرا منظر جو میری آنکھیں پکڑ سکیں، پستول کے ہوا میں اُڑنے اور کمرے کی منقش چھت سے ٹکرانے کا تھا۔

عمران ایک لحظہ ضائع کیے بغیر کسی عقاب کی طرح نو وارد پر جھپٹا۔ اس کا گھٹنا مدِمقابل کی ناف پر لگا پھر ایک ایسی ٹکر اس کے چہرے پر پڑی جو شاید پتھر میں بھی دراڑ ڈال سکتی تھی۔ گرانڈیل شخص ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ بے جان وار، عمران نے آسانی سے جھک کر بچایا اور تب اس کے سر کی دوسری شدید ترین ضرب مدِمقابل کے چہرے پر لگی۔ اس بار وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور تیورا کر ایک خوبصورت مرتبان پر گرا۔ مرتبان اور وہ دونوں زمین بوس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب دو مزید افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ وہ صورتوں سے اس عمارت کے پہرے دار ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے کی صورتِ حال کو دیکھ کر رائفل استعمال کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتا، اقبال دروازے کی اوٹ سے رائفل بردار پر جھپٹا اور ایک اندھا دھند جھٹکے کے ساتھ رائفل اس سے چھین لیا۔ دوسرے شخص نے اپنی سیاہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ یقیناً وہ بھی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا۔ ''خبردار'' عمران دھاڑا اور اپنے بریٹا پستول کی نال اس کے سینے کی طرف کر دی۔ یہ دونوں پہرے دار جہاں کے تہاں سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

یہ سارا ایکشن ناقابلِ یقین حد تک تیز رفتار تھا۔ مجھے اس بے پناہ مہارت کا احساس ہوا جو عمران اور اس کے ساتھی کو ایسے کاموں کے لیے حاصل تھی۔ سب سے زیادہ قابلِ دید وہ

پھرتی تھی جس کی مدد سے عمران نے گرانڈیل شخص کو صرف دو تین سکنڈ میں چاروں شانے چت کیا تھا۔ یہ اٹھائیس تیس سالہ خطرناک صورت شخص عمران سے قریباً ڈیڑھ گنا وزن تو رکھتا ہوگا۔ اس کے سانولے چہرے پر زخموں کے نشان اس کی جارحانہ طبع کی گواہی بھی دے رہے تھے لیکن فی الوقت وہ اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ مرتبان کے ٹکڑوں کے درمیان بے دست و پا پڑا تھا۔

عمران نے بعد میں آنے والے پہرے داروں کو بھی اس گرانڈیل شخص کے پاس کھڑا کر دیا اور ان تینوں کو ایک ساتھ رائفل کے نشانے پر لے لیا۔ یہ وہی آٹھ ایم ایم رائفل تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اقبال نے پہرے دار سے چھینی تھی۔ دھینگا مشتی میں عمران کے چہرے سے مفلر اُتر چکا تھا۔

گرانڈیل شخص کے ہاتھ سے نکلنے والا پسٹل اقبال نے قالین سے اُٹھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد باہر سے کسی عورت کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ اس نے چلانے کی ادھوری کوشش کی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ اُبھری اور اقبال ایک عورت کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ چالیس پینتالیس سال کی ایک فربہ اندام ملازمہ تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چربی دار جسم تھل تھل کر رہا تھا۔

''اسی بھینس نے باہر سے کنڈی لگائی تھی۔'' اقبال نے اس کی پشت پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ سخت حیران بھی تھی۔ میرا یہ اندازہ درست لگتا تھا کہ وہ دروازہ کھلا دیکھ کر بے دھیانی میں کنڈی چڑھا گئی ہے۔

آج میں عمران کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ ان لمحوں وہ خاصا بے رحم نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہ تھے کہ اگر ان تین افراد میں سے کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہ انہیں زخمی کرنے کے لیے بے دریغ گولی چلا دے گا۔ ظاہر ہے جو شخص ریوالور کے تین خانوں میں گولی رکھ کر خود پر فائر کر سکتا تھا، وہ دوسروں پر بھی کر سکتا تھا۔

''تم چاروں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کک...... کوئی نہیں۔'' لمبے قد والے پہرے دار نے جواب دیا۔

''اگر بات جھوٹ نکلی تو مرغا بننا پڑے گا۔'' اقبال نے وارننگ دی۔

پہرے دار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''اقبال! یہ سامنے والے باتھ روم کا دروازہ کھولو۔''

اقبال نے دروازہ کھولا۔ ''چلو تم دونوں گھس جاؤ باتھ روم میں۔ اگر گرم پانی آ رہا ہے تو نہا لو۔ اگر نہیں آ رہا تو انتظار کرو۔ چلو شاباش۔'' اس کا اشارہ بعد میں آنے والے دونوں گارڈز کی طرف تھا۔

وہ دونوں متحیر نظروں سے عمران کو دیکھتے رہے۔ ''میں فارسی میں نہیں بول رہا۔'' وہ پھنکارا۔ ''اندر گھس جاؤ اور اگر آواز وغیرہ نکالی تو پھر وہ آخری آواز ہوگی۔'' اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی اُتری ہوئی تھی۔

پہرے دار مرعوب تو یہی دیکھ کر ہو چکے تھے کہ ان کا پہلوان چند سیکنڈ میں لہولہان ہو کر زمین بوس ہو گیا تھا، اب رہی سہی کسر عمران کے انداز نے پوری کر دی۔ وہ رائفل کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھے۔ ''ٹھہرو'' عمران نے نیا حکم جاری کیا۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ عمران نے اقبال سے کہا کہ وہ ان کی تلاشی لے۔ کہیں ان کی جیبوں میں موبائل فون وغیرہ نہ ہو۔ اقبال نے بڑی احتیاط اور مہارت سے دونوں کی تلاشی لی۔ ایک کی جیب سے موبائل نکل آیا۔ اقبال نے دونوں کو باتھ روم میں دھکیل کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد گرانڈیل شخص اور فربہ اندام ملازمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ عمران اور اقبال نے تلاشی کے بعد ان دونوں کو دوسرے باتھ روم میں لاک کر دیا۔ گرانڈیل شخص میں ابھی تک کچھ دم خم موجود تھا۔ اس کی تلاشی لیتے ہوئے عمران نے یہ احتیاط کی تھی کہ اس کی جیکٹ ہی اُتروالی تھی۔

ابھی گرانڈیل شخص اور ملازمہ کو باتھ روم میں بند کیے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ ان پر ایک اور آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ آفت ایک لڑکی کی صورت میں تھی۔ بعین یہی لگا کہ یہ لڑکی اچانک زمین میں سے اُگ آئی ہے۔ وہ بغلی دروازے سے برآمد ہوئی اور عجیب انداز میں چلا کر عمران سے لپٹ گئی۔ وہ عقب سے آئی تھی۔ اس نے عمران کو رائفل سمیت اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اس کے بال مٹھی میں بھینچ لیے۔

عمران نے خود کو تیزی سے گھمایا اور لڑکی کی باہوں کا گھیرا توڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس سے پہلے کہ عالم وحشت میں وہ پھر عمران پر جھپٹتی، اقبال نے اسے چھاپ لیا۔ اقبال نے ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کے منہ پر جمایا اور ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے تھوڑا سا ہوا میں اُٹھا دیا۔ وہ ہوا میں ٹانگیں چلا کر رہ گئی۔ اس کی آواز اس کے منہ میں ہی دب گئی تھی۔ بس مشتعل ''غوں غاں'' سنائی دے رہی تھی۔

یہ تیئس چوبیس سالہ قبول صورت لڑکی تھی۔ سب سے حیران کن چیز لڑکی کا حلیہ تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ بالکل یہی لگا کہ کسی انگریزی یا نئی انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی کے جسم پر مختصر ترین لباس تھا۔ چند انچ کپڑا بالائی جسم پر اور اتنا ہی زیریں جسم پر۔ اس کا دودھیا جسم ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی میں دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی سوئمنگ پول سے نکل کر سیدھا یہاں آگئی ہے۔

اتنی رات گئے، ایسی سردی میں، ایسا لباس؟ یہ بات سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ کسی نیم گرم بیڈ روم سے نکل کر آئی تھی تو بھی اس کے قیامت خیز جسم پر سلیپنگ گاؤن وغیرہ تو ہونا چاہیے تھا۔ ''بس بے بی! بس'' اقبال نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں لے کر بُری طرح جھنجھوڑا تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے کی کوشش مسلسل کر رہی تھی۔

عمران نے اپنی جیب سے ایک چوڑی انگلش ٹیپ نکالی اور اس کے دو پیس بڑی مضبوطی اور صفائی کے ساتھ لڑکی کے ہونٹوں پر چپکا دیئے۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، ٹیپ چپکانے کے دوران میں ہی اس نے عمران کی ناف میں اپنے ننگے پاؤں کی ایک زوردار ضرب لگائی۔ عمران نے بمشکل اس ناگہانی ضرب کو برداشت کیا۔

دفعتاً نہ جانے کس طرح لڑکی نے خود کو اقبال کی گرفت سے چھڑایا اور ساتھ والے کمرے کی طرف دوڑی۔ عمران اور اقبال اس کے پیچھے گئے۔ پہلے اس نے اپنے منہ سے ٹیپ اُتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، پھر وہ بیڈ روم میں گھسی بڑی پھرتی سے اس نے ایک الماری کھولی۔ شاید وہ یہاں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اسے کوئی کامیابی ہوتی، عمران نے اسے دوبارہ دبوچ لیا۔ اس نے پلٹ کر عمران کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا۔ عمران نے گھما کر اسے بستر پر پٹخا اور اس کے دونوں بازو کھول کر دونوں طرف دبا لیے۔ وہ عمران کے نیچے بے بس نظر آنے لگی۔ دھینگا مشتی میں اس کی عریانی مزید عریانی میں بدل گئی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اب وہ کراہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ ہتھیار نکالنے کے لیے جو الماری اس نے کھولی تھی، اس میں شراب خانہ خراب کی بہت سی بوتلیں سجی ہوئی تھیں، ساتھ میں چمکیلے گلاس تھے۔

''اقبال! تم پہرے داروں کا دھیان رکھو۔'' عمران نے کہا۔

اقبال فوراً رائفل سنبھال کر باتھ رومز کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کی مزاحمت مزید کم کرنے

کے لیے عمران نے اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کیے تو وہ رونے لگی۔ وہ عمارت کے اس اندرونی کمرے میں شاید اپنی بے بسی کو پوری طرح محسوس کر چکی تھی۔ اب اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہی گھر کی مالکہ ہے۔ میڈم کی وہ چھوٹی بہن جو بہت کم گھر سے نکلتی ہے اور جس کے بارے میں اقبال نے پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہونے کی رپورٹ دی تھی۔ اس نے موقع دیکھ کر ایک بار پھر عمران کا منہ نوچنے کی کوشش کی تو عمران نے بے رحمی سے اسے اوندھا کر دیا اور اس کے دونوں بازو پیچھے موڑ دیئے۔ ''اس خبیث کو باندھو۔'' عمران نے مجھ سے کہا۔

میں نے عمران کا سرخ مفلر اس کے کندھوں سے اُتارا اور لڑکی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیئے۔ یہ کام کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر ایک عجیب سا تھرل اور حوصلہ محسوس کیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس مار دھاڑ کا حصہ بنا ہوا ہوں اور عمران کے کہنے پر وہ سب کچھ کر رہا ہوں جو اس سے پہلے صرف تصورات میں کر سکتا تھا۔

عمران نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ تکیے پر رگڑتے ہوئے پھنکارا۔ ''اب نچلی بیٹھ جا...... ورنہ بُری طرح پچھتائے گی۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تیرا حشر نشر شروع ہو گیا ہوتا۔ خدا کا شکر کر کہ تیرا واسطہ شریفوں سے پڑا ہے۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی ورنہ چند لمحے پہلے مجھے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید عمران مشتعل ہو کر کوئی غلط راستہ اختیار کرنے والا ہے۔ اسی دوران میں مَیں نے عمران کے چہرے پر کچھ اُلجھن دیکھی۔ وہ منقش چھت کے ایک گوشے کو دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور پھر مجھے بھی شک گزرا کہ یہاں کوئی وی ٹی آر کیمرا نصب ہے۔

اچانک ایک بندہ لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے پینٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ عمران اسے دیکھ کر چونکا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس شخص کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی چونکہ عمران کے نیچے اوندھی دبی ہوئی تھی، لہٰذا وہ اس شخص کی آمد کو دیکھ سکی اور نہ اشارے کو۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا کہ یہ شخص اس کوٹھی کے مکینوں میں سے ہے لیکن وہ عمران کو اشارہ کیوں کر رہا تھا اور کیا عمران اسے جانتا تھا؟

اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ عمران اس شخص کو جانتا ہے۔ اس

شخص کی طرف سے باہر آنے کا اشارہ ملنے کے فوراً بعد عمران نے لڑکی کی عریاں ٹانگوں کو ایک اسکارٹ نما سوتی کپڑے کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ اور پاؤں بندھنے کے بعد لڑکی اب پوری طرح بے بس تھی۔ وہ کسی لاچار پرندے کی طرح بس تھوڑا بہت پھڑپھڑا سکتی تھی۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔

لنگڑانے والا قبول صورت شخص کوریڈور میں عمران کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''خدا کا شکر کریں کہ میں یہاں موجود ہوں اور آپ کو خطرے کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ بس آپ یہاں سے نکل جائیں۔''

''لیکن کچھ پتا تو چلے۔''

''یہ دیکھیں ہیرو بھائی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' وہ سخت ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''آپ کو کچھ اندازہ نہیں۔ دیکھیں آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز ہیرو بھائی۔''

''کیا مطلب ہے، یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں؟''

''بالکل ہیں بھائی! یہ حرام زادی ڈراما کر رہی ہے۔ میں خود آ کر آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ ایک ایک بات بتاؤں گا۔ بس ابھی آپ نکل جائیں۔''

عمران کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لگ رہا تھا کہ وہ نووارد کی باتوں پر بھروسہ کر رہا ہے۔

''ادھر آئیں، میں دکھاؤں آپ کو۔'' اس نے ہیجانی انداز میں عمران کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کوریڈور میں چلا کر ایک گیلری نما کمرے میں لے گیا۔ یہاں بھی فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر غالیچے آویزاں تھے۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی گیلری میں داخل ہو گیا۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں دیواروں کے ساتھ ایک پینل پر پانچ چھ مانیٹر نظر آ رہے تھے۔ مانیٹرز کی اسکرینوں پر اس کوٹھی کے مختلف مناظر کلوز سرکٹ پر دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اسکرین پر وہ دیوار نظر آ رہی تھی جو ایک گھنٹہ پہلے عمران نے پھاندی تھی اور وہ دروازہ بھی جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ پھر ایک نیم روشن راہداری کا منظر تھا۔ ایک اور نہایت روشن منظر میں اقبال آٹھ ایم ایم رائفل تھامے باتھ رومز کے دروازوں پر پہرا دے رہا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں عمران اور گرانڈیل شخص کے درمیان طوفانی لیکن مختصر لڑائی ہوئی تھی۔

نووارد نے ایک بار پھر عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ کوریڈور میں پہلے والے مخصوص

مقام پر پہنچ کر وہ پھر سرگوشی میں بولا۔ ''یہ چھوٹی میڈم بڑی انوکھی اور خطرناک شے ہے۔ آپ کے اندر آنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی اس کو پتا چل گیا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا مگر اس وقت آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' نووارد کے لہجے میں التجا، محبت، ہمدردی بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔

''میرا ایڈریس معلوم ہے تمہیں؟''

''بالکل ہیرو بھائی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

صرف دو تین منٹ بعد ہم تینوں عقبی دروازے سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ عمران اور اقبال بھی اُلجھن میں تھے۔ تاہم لگتا تھا کہ عمران نے کسی حد تک صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ ہماری گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ایک ٹیک آف کرتا ہوا جہاز عین ہمارے سروں کے اوپر سے شور مچاتا گزر گیا۔ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا، ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم واپس گھر جا رہے تھے۔

○......❖......○

اگلے دن میں بے چین رہا۔ مجھے صورتِ حال سے سنگین اندیشوں کی بُو آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال کی ''خطرات پسندی'' بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ کل رات دروازے کو باہر سے کنڈی لگ جانے کے بعد عمران نے مجھے جان بوجھ کر اندر بلایا تھا۔ ورنہ وہ اس جگہ سے نکلنے کے لیے کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ پینٹنگز والے کمرے کے پاس سے ایک زینہ بھی تو اوپر جاتا تھا۔ شاید وہ اس طرح سے میرے اندر حوصلہ اُبھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہرحال یہ سارا معاملہ ہی پُر اندیش تھا۔

زلیخا اور چھیدے کے گھر میں جو کچھ سامنے آیا تھا۔ وہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ وہاں ایک گھر کی چار دیواری کے اندر بڑی راز داری سے ایک کنویں جیسا گڑھا کھودا گیا تھا اور قیمتی اشیاء نکالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ یہ پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا یا نہیں۔ اب یہ لال کوٹھیوں والا معاملہ شروع ہوا تھا اور دونوں معاملات کی کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ عمران اور اقبال ایک سنگین معاملے کو چھیڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ان دونوں کو جیسے کچھ پروا ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈٹ کر حلوہ پوری کا ناشتہ کیا تھا، دوپہر کو مٹن کڑاہی کھائی تھی۔ پھر عمران کی گرل فرینڈ شاہین کا فون آ گیا تھا۔ دونوں نوک جھونک کرتے رہے تھے۔ اب عمران اور اقبال آپس میں ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ ان میں کافی بے تکلفی تھی۔ گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ہاتھا پائی بھی کر گزرتے تھے۔ اب بھی میں دیکھ رہا تھا کہ رات والے واقعات ان دونوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ ہاں وہ انتظار ضرور کر رہے تھے اور یہ عمران کے اس شناسا کا انتظار تھا جس نے آج اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ عمران نے اس کا نام سلیم بتایا تھا اور اس کا کچھ غائبانہ تعارف بھی مجھ سے کرایا تھا۔

اس تعارف کے مطابق کچھ عرصہ پہلے تک سلیم اس کے ساتھ ہی سرکس میں کام کرتا تھا۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل سے گر کر اس کی ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ عمران نے اپنے خرچ پر اس کا علاج کرایا اور اس کی بیماری کے دوران میں اس کے بیوی بچوں کی بھرپور کفالت بھی کی۔ مگر صحت یاب ہونے کے بعد سلیم نے اس سے کچھ رقم اُدھار لی اور اس اُدھار کے حوالے سے عمران کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس واقعے کو قریباً ایک برس گزر چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ عمران نے ملاقات کی کوشش کی تھی۔

سلیم نے پانچ بجے تک آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کی آمد رات کے آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ حسبِ سابق ذرا لنگڑاتا ہوا داخل ہوا۔ وہ کل کی طرح بہت جذباتی نظر آتا تھا اور بار بار عقیدت کے انداز میں عمران کا ہاتھ تھام رہا تھا۔ رسمی گفتگو اور چائے کے دور کے بعد اصل بات شروع ہوئی۔ سلیم نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں ہیرو بھائی! کل رات آپ تینوں ایک بہت بڑے خطرے سے بچے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ وہاں کیوں آئے تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مگر وہ جو کچھ بھی تھا، بہت سخت مصیبت میں ڈالنے والا تھا۔ یہ لڑکی نادیہ ایوب جسے ہم چھوٹی میڈم بھی کہتے ہیں، بڑی عجیب وغریب شے ہے۔ ایک نمبر کی ڈرامے باز، مکار اور نشئی۔ اس کی کئی کہانیاں مشہور ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ دراصل یہ ایک بیمار لڑکی ہے۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال نے اس کے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیئے۔''

''اس کے بیمار ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''میں شاید آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہ سکوں۔ یہ ٹوٹل طور پر بے راہ رو لڑکی ہے۔ اپنے انجینئر شوہر سے طلاق کے بعد بالکل ہی آزاد ہو گئی ہے۔ ہر طرح کے مردوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ جنہیں پسند کرتی ہے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتی ہے۔ پھر انہیں ایک دم لات مار کر نکال دیتی ہے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔''

''نشہ کیا کرتی ہے؟''

''کوئی ایک نشہ ہو تو بتاؤں۔ شراب سے لے کر ہیروئن اور کوکین تک اس سے کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ بڑی بہن مجبور ہے۔ اسے خود اس کے لیے نشہ مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نشے کی حالت میں اپنے جسم پر کٹ لگا لیتی ہے اور ان میں مرچیں بھر کر سسکتی رہتی ہے۔ کبھی سخت سردی میں یخ بستہ پانی سے نہانا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے سارے شوق عجیب وغریب ہیں۔ شاید آپ نے گھر میں لگی ہوئی پینٹنگز دیکھی ہوں۔ یہ ساری پینٹنگز ننگی اور گندی ہیں۔

پتا نہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہے۔'' سلیم نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ کل جب آپ گھر میں گھسے اور گارڈز سے مارا ماری کی تو یہ کلوز سرکٹ پر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر جب آپ نے گارڈز اور ملازمہ آسیہ کو بے بس کر کے باتھ روموں میں بند کر دیا تو یہ اچانک آپ کے سامنے آئی تو سردی کے باوجود بالکل تھوڑے کپڑوں میں تھی۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر کپڑے تھے۔''

''ہاں...... یہ بات ذہن میں آتی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اس نے آپ کے پیٹ میں لات ماری پھر تھپڑ بھی مارا۔ اس کے پیچھے بھی وجہ تھی۔ وہ آپ کو غصہ دلانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد وہ بھاگی اور بیڈ روم میں آ گئی۔ یہاں اس نے الماری کھولی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے پستول وغیرہ نکالنا چاہ رہی ہو۔ پر مجھے پتا ہے کہ وہاں پستول تھا ہی نہیں۔ وہ دراصل صرف الماری کھولنا چاہ رہی تھی۔ آپ تینوں کو شراب کی بوتلیں دکھانا چاہ رہی تھی۔ آپ کو شاید میری ان باتوں پر یقین نہیں آئے گا لیکن میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ ایک بیمار عورت ہے۔ یہ چاہ رہی تھی کہ آپ...... اس سے زبردستی کریں۔ یہ آپ کو ''ریپ'' کی طرف لا رہی تھی۔ حالانکہ اپنے ہاتھ بندھنے سے پہلے وہ جب چاہتی، بیڈ پر لگا ہوا ایک نیلا بٹن دبا کر ساتھ والی کوٹھی سے ایک درجن گارڈز کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔''

ہم سب تعجب کے عالم میں سن رہے تھے۔ فضا میں سنسناہٹ سی تیرتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ واقعی ناقابلِ فہم لڑکی تھی اب سلیم کی باتوں سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی شک ہوا تھا کہ وہ ہمارے سامنے جان بوجھ کر مختصر ترین لباس میں آئی تھی اور پھر اس کی حرکات...... سب کچھ ایک خاص سمت میں اشارہ کرتا تھا۔

عمران نے سلیم سے نادیہ ایوب کی بڑی بہن کے بارے میں سوالات کیے۔ سلیم نے بتایا۔ ''اسے بڑی میڈم کہتے ہیں۔ اس کی عمر چھوٹی میڈم سے دو تین سال زیادہ ہو گی۔ وہ بھی خاصی اسمارٹ ہے۔ آج کل رئیل اسٹیٹ کا کام چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران نے کہا۔ ''اس کے علاوہ کے بعد چپ کیوں ہو گئے ہو؟ ہم تو وہی سننا چاہتے ہیں جو اس کے علاوہ ہے۔''

سلیم کے چہرے پر تردد کے آثار تھے۔ وہ اپنی پیشانی کی سلوٹوں کو بڑھاتے ہوئے

بولا۔ ''چھوٹی میڈم کی طرح بڑی میڈم کو بھی پرانی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ ان کے گھر میں بہت سی مورتیاں، تصویریں اور برتن وغیرہ سجے ہوئے ہیں۔ کسی اچھی چیز کے بارے میں انہیں جہاں سے بھی خبر ملتی ہے، وہ وہاں اپنا آدمی بھیجتی ہیں یا خود پہنچ جاتی ہیں۔ اپنے اس شوق پر پیسے خرچ کرنے میں وہ بالکل بھی دریغ نہیں کرتیں۔''

عمران نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو سلیم! ہم ایک دوسرے پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہاں جو بھی بات ہو گی، وہ ہم چاروں کے درمیان ہی رہے گی۔ اس بارے میں تم بالکل بےفکر رہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میڈم کو صرف پرانی چیزوں کا شوق ہے یا بات اس سے آگے بھی کچھ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے، ان چیزوں کو ملک سے باہر بھیجنا۔ اسمگلنگ وغیرہ۔''

''ہم...... میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہیرو بھائی! جہاں تک مجھے معلوم ہے، دو تین بار میڈم نے کچھ چیزیں باہر کے لیے بک تو کرائی تھیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ وہ قانونی طریقے سے بھیجی گئی تھیں یا نہیں......''

''آخر تم وہاں ملازمت کرتے ہو سلیم! اس چار دیواری کے اندر رہتے ہو۔ تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گا؟''

''اصل میں ہیرو بھائی! لال کوٹھیوں میں ہر کام بڑی پلاننگ سے ہوتا ہے۔ جس ملازم کا جو کام ہے، وہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔ ملازموں کا آپس میں میل جول بھی بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ تنخواہ تو اچھی دی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ سختی بھی بہت ہے۔ مثلاً اب مجھے ہی لیں، میری ڈیوٹی چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں ہے۔ پچھلے ایک سال میں مَیں ایک بار بھی دوسری کوٹھی میں نہیں گیا۔ چھوٹی میڈم کی طرف میری ڈیوٹی کچن میں ہے۔ میں بازار سے سودا سلف لاتا ہوں۔ کوئی پارٹی وغیرہ ہو تو اس کا انتظام بھی کرتا ہوں اور کبھی کبھی خانساماں کا ہاتھ بھی بٹاتا ہوں۔ ارد گرد کیا ہوتا ہے، مجھے اس کی کچھ زیادہ خبر نہیں۔ ہاں...... یہ بات ضرور ہے کہ بڑی میڈم سے کچھ انجانے لوگ ملنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی رات کے وقت کوئی ولز جیپ یا مرسڈیز گاڑی بھی نظر آتی ہے۔ ان میں اکثر پٹھان ٹائپ بندے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے قد کا دیہاتی سا شخص اکثر آتا رہتا ہے۔ کافی بڑی پگ ہوتی ہے اس کے سر پر۔ وہ چادر کی بکل مارتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ٹیکسلا یا حسن ابدال کی طرف کا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے علاقے سے ''اینٹیکس'' وغیرہ لاتا ہو۔''

"ہاں جی...... بالکل ہوسکتا ہے۔ اصل میں بڑی میڈم ایسی چیزوں کی منہ مانگی قیمت دیتی ہیں اس لیے بیچنے والے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کوئی اچھی چیز ہاتھ لگے تو اس کے سودے کی بات سب سے پہلے بڑی میڈم سے کی جائے۔"

ہمارے اور سلیم کے درمیان تقریباً دو گھنٹے گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں کھانے اور چائے سے بھی دو دو ہاتھ ہوئے۔ سلیم کی باتوں سے پتا چلا کہ کل رات ہمارے چلے آنے کے بعد میڈم نادیہ بڑی بے مزہ ہوئی تھی۔ اس نے ملازموں کو آوازیں دی تھیں۔ ان آوازوں کے جواب میں سب سے پہلے سلیم ہی وہاں پہنچا تھا۔ اس نے میڈم نادیہ کے ہاتھ کھولے تھے اور اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ اُتاری تھی۔

میڈم نادیہ حیران تھی کہ ہم اس طرح اچانک سب کچھ چھوڑ کر نکل کیوں گئے؟ کیا ہمیں کوئی خطرہ محسوس ہوا تھا یا ہم جس مقصد کے لیے گھر میں داخل ہوئے تھے وہ پورا نہیں ہوسکا تھا؟ ہمارا مقصد کیا تھا، یہ بھی میڈم اور اس کے گارڈز کو ٹھیک سے معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ بہر حال آزاد ہونے کے بعد میڈم نادیہ نے اپنے ذاتی گارڈز کو خوب خوب ڈانٹ پلائی تھی۔ خاص طور سے انچارج گارڈ شیرے کو۔ یہ شیرا وہی کسرتی جسم والا ہٹا کٹا شخص تھا جس کے ساتھ عمران نے سونی لسٹن والا سلوک کیا تھا۔ مشہور باکسر محمد علی نے ناقابلِ شکست سونی لسٹن کو پہلے ہی راؤنڈ میں آناً فاناً چت کر کے پوری دنیا میں تماشائیوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کل رات عمران نے بھی دو تین سیکنڈ کے اندر پہلوان نما شیرے کو دو ٹکروں میں ناک آؤٹ کر ڈالا تھا۔ اس نشست میں سلیم نے میڈم نادیہ کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں اور بھی کئی باتیں ہمارے گوش گزار کیں۔

رات گیارہ بجے کے قریب سلیم واپس جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے عمران سے وعدہ کیا کہ وہ اس سے رابطہ رکھے گا اور دونوں میڈم بہنوں کے بارے میں اسے جو کچھ بھی مزید معلوم ہوسکا، اس تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ عمران کے اس سوال کا جواب وہ یقین سے نہیں دے سکا تھا کہ بڑی میڈم صفورا اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہے یا نہیں۔ وقتِ رخصت سلیم نے عمران سے علیحدگی میں بھی مختصر ملاقات کی۔ اس ملاقات میں اس نے یقیناً عمران سے اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگی ہوگی۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ عمران کے احسانات کے بدلے سلیم نے اسے رقم کے معاملے میں دھوکا دیا تھا اور قریباً ایک سال تک اوجھل رہا تھا۔

سلیم کے جانے کے فوراً بعد عمران کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ اس نے اقبال سے

کہا۔ "اس کے پیچھے جاؤ اقبال! پتا کرو یہ کہاں جاتا ہے؟ لیکن ذرا احتیاط سے۔"

اقبال جیسے پہلے ہی سے کسی ایسے اشارے کا منتظر تھا۔ اس نے جلدی سے بوٹ پہنے اور پرس جیب میں رکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں حیران تھا اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اقبال کے باہر جانے کے بعد عمران نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "میں سلیم کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ میرے خیال میں اس نے بتایا کم اور چھپایا زیادہ ہے۔ شاید یہ کچھ ڈر بھی رہا ہے۔"

"اقبال اب کیا کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا پیچھا کرے گا۔ یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ یہ اب کہاں جاتا ہے۔ اگر اس کے گھر کے بارے میں پتا چل سکا تو یہ بھی اچھی بات ہوگی۔"

"اور اگر اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا پیچھا کیا گیا ہے تو؟"

"اقبال کچا کھلاڑی نہیں ہے۔ ایسے معاملوں کا بڑا فائیو اسٹار تجربہ ہے اسے۔ دو سال تک سیالکوٹ پولیس کا انفارمر رہ چکا ہے۔ اس سے پہلے ریڈیو پاکستان میں کام کر چکا ہے اور ہاں اس میں ایک بڑی مزے دار صلاحیت بھی ہے۔ آوازوں کی نقل بھی کر لیتا ہے۔ ہر فلمی اور سیاسی ایکٹر کی آواز نکال لیتا ہے اور......"

"یار! میں دوسری بات کر رہا ہوں۔ اگر سلیم کو پتا چل گیا کہ اقبال اس کے پیچھے آرہا ہے؟"

"میری جان! اس بارے میں بے فکر رہو۔ ویسے بھی وہ زیادہ دیر اس کے پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر معاملے نے طول کھینچا تو وہ اپنے کسی اور دوست کو اس کے پیچھے لگا دے گا اور یہ ایسا شخص ہوگا جس کے بارے میں سلیم کچھ نہیں جانتا ہوگا۔"

"فرض کرو کہ اگر کسی طرح سلیم کو پتا چل ہی گیا تو پھر؟ اس طرح تو تمہاری ٹکر سیدھی سیدھی چھوٹی اور بڑی میڈم سے ہوجائے گی۔ سیٹھ سراج سمیت ان سارے لوگوں کو تمہارے اس ٹھکانے کا پتا بھی چل جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" عمران نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "یار تابی! ایک تو پتا نہیں تم دور دراز کے اندیشوں میں کیوں کھو جاتے ہو۔ ایک دانشور نے کہا ہے کہ ہماری زندگی کی اسی فیصد پریشانیاں جھوٹے اندیشوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔"

میں پچھلے پہر سو گیا۔ اقبال سے میری ملاقات اگلے روز صبح نو دس بجے کے قریب

ہوئی۔ وہ ابھی ابھی اپنی مہم جوئی سے واپس لوٹا تھا اور مطمئن نظر آتا تھا۔ عمران اور وہ دونوں نہاری نان کا ناشتہ کر رہے تھے۔ ساتھ میں لسی کے دو بڑے بڑے گلاس تھے۔ ایک گلاس پلیٹ سے ڈھکا ہوا پاس ہی رکھا تھا۔ یقیناً یہ میرے لیے تھا۔ میرا ناشتہ بھی پلیٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتے میں شریک ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھئی اقبال! کیا رہا تمہاری جاسوسی کا؟''

''سلیم کے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ مسلم ٹاؤن کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ دس مرلے کی کوٹھی ہے۔ دس بارہ ہزار روپے کرایہ دے رہا ہے۔ موٹر سائیکل بھی رکھی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم اچھی تنخواہ دے رہی ہے۔''

''اس کے علاوہ دوسری خاص بات یہ پتا چلی ہے کہ سلیم کی علیک سلیک جنوبی لاہور کے ایک جانے پہچانے کن ٹٹے مجید مٹھو سے بھی ہے۔'' عمران نے کہا۔ وہ اس دوسری اطلاع کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔

''مجید مٹھو کا نام تو شاید میں نے بھی کہیں سنا ہوا ہے۔ شاید اخبار میں پڑھا تھا۔ لڑائی جھگڑے یا ڈکیتی وغیرہ کی کوئی واردات تھی۔'' میں نے بتایا۔

''ظاہر ہے یار! مجید مٹھو کا نام کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس کی خبر میں تو آنے سے رہا۔ یہ بیرون لاہور کے چند سکہ بند غنڈوں میں سے ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سلیم سیدھا اپنے گھر مسلم ٹاؤن گیا تھا لیکن راستے میں چند منٹ کے لیے وہ ثمن آباد کے علاقے میں بھی رُکا۔ یہ مجید مٹھو کا گھر تھا۔''

''تو کیا اب مجید مٹھو سے جھگڑا مول لینے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''توبہ...... توبہ۔'' عمران نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ہم ان کن ٹٹوں سے جھگڑ کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔ ہم تو اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر بس یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ جن میں خیر سے ہمارے محترم سیٹھ سراج صاحب بھی شامل ہیں، آخر کر کیا رہے ہیں۔ اس گورکھ دھندے کا کوئی سرا ہاتھ آ گیا تو ہم یہ سرا پولیس والوں کو تھما دیں گے اور خود ایک دم الگ ہو جائیں گے۔ ہمارا کام یہ نہیں پیارے ہمارا کام کچھ اور ہے۔''

''ہمارا کام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا کام ایک دکھیارے دل کی آواز سننا ہے۔ یہ دکھیارا دل خاموشی کی زبان میر فریاد کر رہا ہے، کسی کو پکار رہا ہے اور جس کو پکار رہا ہے، وہ پتا نہیں کہاں ہے۔ بس اس کر

ڈھونڈنا ہے۔'' عمران کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے حالات کی طرف اور ثروت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ثروت کا خیال ذہن میں آتے ہی ایک تیر سا دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک دبیز اندھیرے کی چادر کھلنے لگتی تھی۔ اس اندھیرے کی دوسری جانب سے وہ مجھے پکارتی تھی۔ ''تم کہاں ہو تابش! دیکھو وقت ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو رہی ہوں۔ کیا تم اسی طرح مجھے چلے جانے دو گے؟''

بارہ بجے کے قریب عمران اور اقبال دونوں باہر نکل گئے۔ وہ اقبال کی موٹر سائیکل پر گئے تھے۔ عمران نے مجھے کھل کر نہیں بتایا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ سلیم والے چکر میں ہی نکلے ہیں۔ کل رات انہیں معلوم ہوا تھا کہ سلیم اور مجید مٹھو نامی شخص کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ مزید جاننا چاہتے ہوں۔ میں جوں جوں عمران اور اقبال کو جان رہا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے۔ خاص طور سے عمران تو راہ جاتی مصیبت کو اپنے گلے ڈال کر دلی مسرت محسوس کرتا تھا۔ اپنی خیریت، سلامتی اور زندگی کے بارے میں وہ اتنا بے پروا ہو جاتا تھا کہ سخت حیرت ہوتی تھی۔ اس کے لیے شدید خطرے میں کودنا ایسے ہی تھا جیسے تفریح کے لیے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانا۔ یہ سلسلہ سیٹھ سراج کی وجہ سے شروع ہوا تھا اور سیٹھ کے بارے میں مَیں نے ہی عمران کو سب کچھ بتایا تھا۔ اب یہ سلسلہ خود بخود ہی ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے روکنے سے یہ سب کچھ رُکنے والا نہیں۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ میں اس ساری صورتِ حال سے الگ تھلگ ہو جاؤں۔ خاموشی سے کہیں نکل جاؤں۔ یہ نہ ہو کہ عمران جس آگ کو ہوا دے رہا ہے، اس کی تپش براہِ راست مجھ تک اور میرے گھر والوں تک پہنچنے لگے۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک میں عجیب تذبذب میں رہا۔ اسی دوران میں اقبال کے موبائل پر عمران کی کال آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ بڑا پُرجوش محسوس ہو رہا تھا۔ ''تابی یار! بڑا مزے کا کام ہوا ہے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''میں یہاں سمن آباد میں ہوں۔ تم بس فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے ایک بڑے کام کی شے ہے۔''

''کام کی شے...... میں سمجھا نہیں؟''

''یہاں آ کر سب سمجھ جاؤ گے۔ بس یہ سمجھو کہ اس بندے سے ہمیں ثروت کا کھوج مل سکتا ہے اور یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ اصل میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

ثروت کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے عمران سے تفصیل جاننا چاہی لیکن ایسے معاملوں میں وہ یکسر چکنا گھڑا ثابت ہوتا تھا۔ بہر حال اس کی بات نے میرے اندر بے پناہ تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میری کار کی چابی، سائیڈ ٹیبل کی اوپر والی دراز میں ہے۔ گاڑی لے کر فوراً نکل آؤ۔ سمن آباد کے دوسرے گول چکر سے دائیں طرف مڑنا ہے۔ آگے ایک گراؤنڈ آئے گا۔ اس کے بعد......'' وہ مجھے پورا ایڈریس سمجھاتا چلا گیا۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں چند سیکنڈ شدید اُلجھن میں رہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عمران ساتھ ہوتا تھا تو مجھے شہر میں گھومتے ہوئے کوئی خاص اندیشہ محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب میں اکیلا کہیں نکلنے کا سوچتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ باہر نکلتے ہی سیٹھ سراج کے کارندوں سے ملاقات ہو جائے گی اور میں کسی سخت مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

بہر طور عمران جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد میرا گھر سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ہر طرح تسلی دی تھی کہ وہاں موقعے پر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ایسی تسلیاں تو وہ خیر پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا اور یہ طفل تسلیاں ہی ثابت ہوئی تھیں۔ تاہم اب میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی طرح کا کوئی رسک ہو بھی تو عمران اس سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتا ہے۔

میں نے عمران کی کار نکالی اور اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف روانہ ہو گیا۔ بازار کے کئی دکانداروں نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ وہ اب مجھے اپنے ہیرو بھائی کے مہمان دوست کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ آج میں کئی روز کے بعد ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑکیں، ٹریفک اور لوگوں کی گہما گہمی سب کچھ عجیب عجیب لگ رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں مطلوبہ ایڈریس پر موجود تھا۔ یہ عام آبادی سے الگ تھلگ بنا ہوا ایک مکان تھا۔ اس کے پچھلی طرف قبرستان تھا۔ سامنے کسی سرکاری دفتر کی سرخی مائل دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ مٹھو نامی غنڈے کی رہائش گاہ تھی۔

اپنی گاڑی کا ہارن پہچانتے ہی عمران گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو۔ گاڑی لاک کر کے میں باہر آیا اور عمران کے ساتھ اندر چلا گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سات آٹھ مرلے کے اس مکان کا نیم پختہ صحن پار کر کے ہم برآمدے میں پہنچے۔ یہاں ایک کتا بندھا ہوا تھا۔ وہ شکل وصورت سے خاصا بیمار نظر آتا تھا۔ اس کے راتب پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ قریب ہی اقبال کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ ایک کونے میں شراب کی دو خالی بوتلیں اور مرغی کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مٹھو یا پھر جو کوئی بھی اس گھر

میں رہتا ہے، عورت کے بغیر رہتا ہے۔ یعنی یہاں کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو مستقل طور پر اس گھر میں رہتی اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ہو۔ عمران نے موٹر سائیکل کی ڈکی میں سے ایک مفلر نما کپڑا نکالا۔ یہ وہی مفلر نما شے تھی جو ہڑپہ میں اور پھر لال کوٹھی میں اپنے چہرے چھپانے کے لیے عمران اور اقبال نے استعمال کی تھی۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے عمران نے اس مفلر نما کپڑے کا ڈھاٹا میرے چہرے پر باندھنا شروع کر دیا۔

ایک منٹ کے اندر اس نے میرا سر اور چہرہ اس طرح چھپا دیا کہ آنکھوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ بولا۔ ''فی الحال تمہیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ اگر کوئی بات کرنا ہوئی تو مجھ سے مشورے کے بعد کرنا۔''

''لیکن یار! یہ کر کیا رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں رہا۔''

''یہاں ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنا نام رفیق بتا رہا ہے لیکن اس کے پاس سے جو شناختی کارڈ نکلا ہے، اس پر قادر نام لکھا ہوا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ لڑکا ان لڑکوں میں سے ہے جنہوں نے ثروت کو بس اسٹاپ سے اُٹھوایا اور بسوں کی فیکٹری میں لے کر گئے۔''

میری دھڑکن میں شدت آ گئی۔ منہ خشک ہوتا محسوس ہوا۔ میں عمران کے ساتھ گھر کے درمیانی کمرے میں پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹے دروازے سے دو ڈھائی فٹ چوڑی سیڑھیاں اُتر کر نیچے جاتی تھیں۔ یہ ایک تہ خانہ تھا۔ وہاں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے عین سامنے اقبال نظر آیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور اپنا سیاہ پسٹل اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے سنگل صوفے پر ایک دوسرا بندہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اپنا سارا خون سر میں چڑھتا محسوس ہوا۔ ایک دم ہی یوں لگا کہ پورے جسم میں انگارے دہک اُٹھے ہیں۔ میں اس لڑکے کو کیوں نہ پہچانتا؟ یہ واجی کا ساتھی قادر لمبا تھا۔ یہ اس چنڈال چوکڑی کا رکن تھا جس نے چند ماہ پہلے ثروت کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی۔ پھر یہ لوگ اس معاملے کو اس حد تک لے گئے تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان کی بدمعاشی نے نہ صرف ثروت کے والدین کی جان لی تھی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر اچھے امکان کو خاکستر کر دیا تھا۔ قادر لمبے کے چہرے پر ایک نیل نظر آ رہا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے عمران اور اقبال کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ قادر لمبے کو دیکھتے ہی میں طیش اور نفرت کے ایک تند و تیز ریلے میں بہہ گیا۔ عمران نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی شناخت چھپائے رکھوں اور بولنے کی کوشش

بھی نہ کروں لیکن قادر لمبے کو دیکھ کر میں یہ باتیں بھول گیا۔ میں چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ ''حرام زادے...... کتے...... خنزیر کی اولاد......'' میرے منہ میں جو آیا میں بولتا چلا گیا۔ میرے گھونسوں اور ٹھوکروں نے قادر لمبے کو صوفے سے اُچھال کر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ میں اسے مار رہا تھا اور پھنکار رہا تھا۔

''تم نے مجھے برباد کر دیا۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ ثروت کی زندگی تباہ کر دی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے! اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گا۔'' میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔

اقبال آگے بڑھا تا کہ قادر لمبے کو مجھ سے چھڑا سکے مگر عمران نے اسے راستے ہی میں روک لیا۔ شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اگر میرے ''ہاتھ پاؤں کھل رہے ہیں تو انہیں کھلنے دینا چاہیے۔'' چند سیکنڈ میں صورتِ حال یہ تھی کہ قادر لمبا دہشت کے عالم میں فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی تھا۔ میری ٹھوکریں تواتر سے اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔

آخر میں ہانپ کر ذرا رُکا تو اقبال مجھے اپنی بانہوں میں لے کر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ میرے چہرے کو ڈھانپنے والا مفلر نما کپڑا بھی جزوی طور پر کھل گیا تھا۔ اگر اب وہ مکمل طور پر کھل جاتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اب قادر لمبا مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے وہ کپڑا اُتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

عمران نے بالوں سے پکڑ کر قادر لمبے کو اُٹھایا اور دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ قادرے کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی جرسی پھٹ گئی تھی اور قمیص کی بھی بُری حالت تھی۔ اپنے خونچکاں چہرے کے ساتھ وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''تو میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ یہ حرامزادہ ان غنڈوں میں شامل تھا۔'' عمران نے اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ بدذات، ان سب سے زیادہ کمینہ تھا۔ اس کی ہلاشیری نے ہی اس کتے واجی کے حوصلے بڑھائے تھے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا۔'' میں ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

اس مرتبہ عمران نے میرا راستہ روکا اور بولا۔ ''یار! اس گدھ کا گلا مروڑنے سے تمہیں کون روکتا ہے۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ پہلے اس مکروہ کے سارے پر نوچیں، اس کے بعد اس کی گردن مروڑیں لیکن اس کارروائی سے پہلے اس کے منحوس منہ سے کچھ اُگلوا تو لیں۔ اگر

ہمیں واجی وغیرہ کے بارے میں یہ نہیں بتائے گا تو اور کون بتائے گا؟''

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ثروت اور اس کے گھر والوں پر قیامت توڑنے کے بعد جب بات تھانے کچہری تک پہنچی تھی تو واجی اور اس کے تینوں دوست اچانک نظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔ بعد ازاں ان میں سے صرف ایک سامنے آیا تھا مگر وہ لڑکا تھا جو ثروت کے اغوا میں براہِ راست شریک نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور ناصر بھائی وغیرہ کو پورا یقین تھا کہ باقی لڑکوں کو سیٹھ سراج نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید سیٹھ سراج کے سرپرست ایم این اے مشتاق گورایا نے انہیں کہیں اپنی زمینوں پر بھجوا دیا ہے لیکن اب یہ قادر لمبا یہاں سمن آباد کے اس تنہا مکان میں میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا اور بار بار فرش پر خون تھوک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ اقبال تو قادر کے سرہانے کھڑا رہا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک میز پر تاش کے پتے بکھرے تھے۔ سامنے والی دیوار پر پستول کا خالی ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ یہ جگہ واضح طور پر ایک بدمعاش کا ٹھکانا دکھائی دیتی تھی لیکن بدمعاش کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

قادر لمبے پر جھپٹنے اور اسے مارنے کے بعد میرا جسم اب ہولے ہولے لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں قادر پر پل پڑا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر بتدریج چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ شاید اس کی وجہ میرے سخت ترین حالات تھے اور شاید اس کی وجہ عمران بھی تھا۔ عمران کی موجودگی میں ایک دم اپنی اندرونی کمزوریوں پر غلبہ پالیتا تھا۔

عمران نے مدھم آواز میں کہا۔ ''میں نے تم سے گزارش بھی کی تھی کہ یہاں اپنی شناخت چھپانی ہے۔ اس لیے خاموش رہنا۔ تم نے سب کچھ اُلٹ کر دیا۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خبیث کیسے ملا ہے تمہیں؟ اس کے ساتھی کہاں ہیں؟''

''تمہارا دوسرا سوال وائیڈ بال کی طرح ہے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ تمہارے پہلے سوال کا جواب میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ میں اور اقبال کل سے اس چکر میں تھے کہ سلیم یہاں مجید مٹھو کے مکان میں کیا کرنے آیا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اقبال نے کافی پر چول کی ہے۔ اقبال کا ایک ساتھی کل سے اس مکان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج سویرے ہمیں پتا چلا کہ مجید مٹھو گھر کو تالا لگا کر اپنے ایک دوست کے ساتھ رکشے میں بیٹھا ہے اور بادامی باغ کے بس اڈے پہنچا ہے۔ وہاں سے وہ جہلم جانے والی بس پر سوار ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا

کہ مٹھو کا گھر اب خالی ہے اور جلد ہی مٹھو کے آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ دیر پہلے ہم یہاں آن پہنچے۔ پہلے ہم نے ایک ''ماسٹر کی'' سے بیرونی دروازے کا ہضمی تالا کھولنے کی کوشش کی لیکن گلی میں اِکا دُکا راہگیروں کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہم مکان کے پچھواڑے گئے اور قبرستان کی طرف سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، پچھلی دیوار درختوں سے گھری ہوئی ہے اس لیے ہمیں مشکل پیش نہیں آئی۔ پہلے تو ہمیں یہ گھر بالکل خالی لگا مگر پھر تہ خانے کا دروازہ نظر آ گیا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ اندر کوئی ہے۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم تمہارے اس بدبخت محلے دار قادرے تک پہنچ گئے۔ یہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔ پہلے اس نے بتایا کہ وہ مٹھو کا ملازم ہے پھر کہا کہ دوست ہے۔ اس نے اپنا نام رفیق بتایا لیکن کچھ دیر بعد اس کا شناختی کارڈ مل گیا۔ اس پر قادر ولد امانت علی لکھا ہوا ہے۔ تم نے ثروت کو اغوا کرنے والے جن لڑکوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے ایک نام قادر بھی تھا۔ مجھے شک ہو گیا۔ میں نے پوچھ تاچھ کی لیکن اس خبیث نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ پھر میں نے فون کر کے تمہیں بلا لیا۔''

میں نے کہا۔ ''تم بتا رہے ہو کہ گھر کی دیوار پھاند کر یہاں آئے ہو لیکن اب تو دروازہ کھلا ہوا ہے؟''

''وہ ہم نے بعد میں کھولا ہے یار! اس قادر کے پاس گیٹ کی دوسری چابی ہے۔'' عمران نے وضاحت کی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ قادرے کے سامنے آ کر میں کتنی بڑی غلطی کر چکا ہوں۔ میرے جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں قادر لمبے کے سامنے ہی نہیں آیا، سیٹھ سراج، انسپکٹر اشرف اور ایم این اے مشتاق وغیرہ کے سامنے بھی آ چکا ہوں۔ اب وہ سارے خطرات ایک دم زندہ ہو گئے تھے جن سے مجھے یا میرے گھر والوں کو واسطہ پڑ سکتا تھا۔

عمران نے میرا تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے حوصلہ دیا اور میرا شانہ تھپک کر بولا۔ ''چلو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اس معاملے کو دیکھ لیں گے لیکن پہلے ہمیں اس قادرے کو نچوڑنا پڑے گا۔''

''نچوڑنا پڑے گا۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ''یار! یہ اپنی خاص لینگویج ہے۔ نچوڑنے کا مطلب ہے کہ اس کے اندر سے باتیں اُگلوانی پڑیں گی۔''

''تو تم اس سے مار پیٹ کرو گے؟''

''مار پیٹ تو نہیں...... بس تھوڑا سا ڈرائیں دھمکائیں گے۔ وہ جیسے کرکٹ میں بلے باز کو بیک فٹ پر کرنے کے لیے باؤنسر وغیرہ مارے جاتے ہیں۔''

عمران اور اقبال اب بھی بالکل ایزی موڈ میں تھے جبکہ میں خاصا تناؤ محسوس کر رہا تھا۔ جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو اقبال ایک جگ میں سے پانی گرا گرا کر قادر کا منہ دھلوا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ناک سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

عمران نے قادر کے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کرسی سنبھال لی۔ اس کا چہرہ بدستور مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں عجیب سی سختی عود کر آئی تھی۔ وہ قادرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو قادر لمبا صاحب! بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے۔ تم واجی کے لنگوٹیے یار قادر ہو اور تم تین چار دوستوں نے مل کر تابش کی منگیتر کو اغوا کیا تھا۔ تمہاری اس بدمعاشی کے جو نتیجے نکلے، وہ سب کے سامنے ہیں۔ اب تم قانون سے بھاگے پھر رہے ہو اور اپنے خلاف کیس کو سخت سے سخت بنا رہے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بہت زیادہ خراب نہ ہو تو پھر تمہیں اپنے باقی دونوں یاروں کے بارے میں بتانا پڑے گا اور اگر......''

''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔'' وہ لرزتی آواز میں عمران کی بات کاٹ کر بولا۔

''یہ تم نے کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ ہر چور، ڈاکو، ذلیل و خوار ہونے سے پہلے ایسے ہی اقوالِ زریں دہراتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے بے گناہ پھنسایا گیا ہے، میں بے قصور ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر ان سنہری مقولوں پر اعتبار کر لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھوتنی کا چور ڈکیت پکڑا نہ جا سکے۔''

''یہ ایسے نہیں مانے گا یار جی! اس کو سیب کھلاؤ۔'' اقبال نے کہا۔

''ہاں...... لگتا ہے کہ سیب ہی کھلانا پڑے گا۔'' عمران نے تائید میں سر ہلایا۔

''سیب...... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی ہماری خاص لینگویج ہے ڈیئر۔'' عمران نے کہا اور پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے ایک سیب نکال لیا۔

گول مٹول سیب کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اس نے دوسری جیب میں سے چمکدار چاقو نکال کر کھولا اور بولا۔ ''یہ سیب میں تمہیں خود کاٹ کر کھلاؤں گا لیکن میرے کاٹنے کا انداز ذرا

دوسرا ہے۔"

قادر ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

عمران نے سیب اقبال کی طرف اُچھال دیا۔ اقبال، قادر کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے اچانک سیب قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے تیزی سے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ میری نگاہوں میں جیسے برق سی کوند گئی۔ عمران کے دائیں ہاتھ سے جدا ہونے والا لمبے پھل کا چاقو گولی کی رفتار سے قادر کے سر کی طرف گیا۔ چاقو سیب میں گھسا۔ پھر چاقو اور سیب دونوں عقبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد اقبال کے قدموں میں لڑھک گئے۔

یہ سارا عمل بس سیکنڈ کے نصف حصے میں مکمل ہو گیا تھا۔ ایسی رفتار تھی کہ قادر اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکا تھا۔ چاقو سمیت سیب کو زمین پر لڑھکتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ میں بھی ششدر کھڑا تھا۔ یہ عمل ناقابلِ یقین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سفاک بھی۔ نشانے کی ذراسی غلطی قادر کو جان لیوا طور پر زخمی کر سکتی تھی۔

میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بے رحمی سے مسکرا رہا تھا۔

اقبال نے جزوی طور پر کٹا ہوا سیب عمران کو تھما دیا۔ سیب کا جائزہ لینے کے بعد اس نے چاقو سیب میں سے کھینچا اور بولا۔ "اس پر ایک بار اور چاقو چلانا پڑے گا۔ چلو رکھو اسے دوبارہ قادر بیٹے کے سر پر۔"

قادر "بیٹے" کا بُرا حال تھا۔ جب اس نے دوبارہ اپنے سر پر سیب رکھے جانے کی خوشخبری سنی تو ایک دم اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "خبردار" اقبال اس پر پستول تان کر گرجا۔ "بیٹھ جاؤ۔ نیچے بیٹھ جاؤ۔" اقبال کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ قادر لرز کر بیٹھ گیا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اقبال نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگائی اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کو خالی خولی دھمکی مت سمجھنا شہزادے! ہم گولی چلانا بھی جانتے ہیں۔ اُٹھک بیٹھک کرو گے تو کنپٹی میں تین، آٹھ کا سوراخ ہو جائے گا اور اس سوراخ میں سے لال لال چیز بہنے لگے گی۔"

"خدا کے لیے...... ایسا مت کرو...... میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جو جانتا تھا تمہیں بتا دیا ہے۔"

"ہم بھی جو جانتے ہیں تمہیں بتا دیا ہے۔ جب اس پستول کا ٹریگر دبایا جائے گا تو تمہاری کھوپڑی شریف میں سوراخ ضرور ہوگا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔" اقبال نے کہا۔

عمران نے پھر چاقو اپنے ہاتھ میں تولا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ مجھ پر اس شخص

کے نئے نئے گن کھل رہے تھے۔ دو منٹ پہلے اس نے جس طرح قادر پر چاقو پھینکا تھا، وہ کوئی ماہر ترین چاقو باز ہی پھینک سکتا تھا۔ سرکس کے کھیل تماشوں میں خنجر زنی کے ایسے کرتب دکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی تماشہ نہیں تھا۔ یہ ایک جیتا جاگتا واقعہ تھا اور جس پر یہ واقعہ بیتا تھا، وہ ابھی تک عالم دہشت میں لرزاں تھا۔

اقبال نے بڑے اطمینان سے ادھ کٹا سیب دوبارہ قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے چاقو کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہاتھ میں جھلایا مگر اس مرتبہ قادر بیٹھے رہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ کنپٹی پر پستول ہونے کے باوجود وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"نہیں...... نہیں...... ایسا مت کرو۔" وہ گھگیایا۔

اقبال نے کھٹاک سے اس کے سر پر پستول کا آہنی دستہ رسید کیا۔ ضرب زوردار تھی، وہ کراہتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اقبال نے اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑی اور وحشیانہ جھٹکا دے کر بولا۔ "زیادہ پھڑکو گے تو پھر سیب کے بجائے تمہارے سر پر خوبانی یا آلو بخارا رکھیں گے۔ بالکل چپکے بیٹھے رہو۔"

"مم...... میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پچھلے ایک مہینے سے واجی اور اختر کو دیکھا تک نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ امیر باپوں کے بیٹے ہیں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ میں پھنس گیا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔ میں تو...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب اس طرح ہوگا۔ میں تو بس واجی کی باتوں میں آ گیا تھا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا قصور بس یہ ہے کہ میں واجی کا یار تھا۔" ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو جھڑے اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "وہ حرامزادہ واجی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے لیے بچاؤ کا راستہ نکل آیا ہے۔ جس کا کوئی قصور نہیں، اس کے گلے میں رسہ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہاں کا قانون ہے؟"

میرا دماغ گھومنے لگا۔ قادر لمبے کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کا یہ فقرہ تو بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا کہ میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔

وہ ثروت کی بات کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ کیا ثروت کسی وجہ سے زخمی ہو چکی تھی؟ یہ خیال ہی مجھے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ میں گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

عمران نے انگلی سے نفی کا اشارہ کیا اور آنکھوں آنکھوں میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ شاید مجھے یہ بتا رہا تھا کہ قادر لمبا اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر ہے۔

اگلے دو چار منٹ میں عمران کا یہ اندازہ درست محسوس ہونے لگا۔ قادر لمبا گڑگڑا رہا تھا اور بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ پولیس نے واجی کے وارثوں سے پیسے کھالیے ہیں اور اسے بے وجہ پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ ثروت کے حوالے سے بدترین اندیشے رکھتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوئی ہے۔

میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ قادر کی معلومات ناقص ہیں۔ اس کے باوجود یہ صورتِ حال اتنی گمبھیر تھی کہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس گورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت کسی نے جان بوجھ کر قادرے کو غلط اطلاعات دے رکھی ہیں اور اسے دہشت زدہ کر رکھا ہے۔

عمران نے اس سے مزید سوال جواب کیے۔ وہ بہت ڈر چکا تھا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اُگلنے لگا۔ عمران کا اہم سوال یہ تھا کہ وہ یہاں مجید مٹھو کے گھر میں کیسے پہنچا اور اس کے دیگر دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

قادر نے بتایا۔ ''میں پھر کہتا ہوں کہ واجی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرے ساتھ صرف شکیل تھا۔ ہمیں پولیس سے بچانے کے لیے انکل سراج نے لال کوٹھی بھجوا دیا تھا۔ لال کوٹھی میں ہم دونوں بڑی میڈم صفورا کے پاس تھے۔ انکل سراج کا خیال تھا کہ ہم پانچ چھ ہفتے یہاں رہیں۔ اس دوران میں مخالف پارٹی سے صلح صفائی کی بات ہو جائے گی۔ مگر پھر ایک دن پتا چلا کہ معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے۔ انکل سراج نے مجھے بتایا کہ تابش کی منگیتر نے اپنے گھر میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس نے خود کو آگ لگائی ہے۔ میو ہسپتال میں اپنے بیان میں اس نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے اور اسے بس اسٹاپ سے اُٹھا کر ویگن میں ڈالنے والوں میں سب سے آگے میں تھا۔ انکل گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ انکل نے مجھے بتایا کہ اب ہمارا بچنا بہت مشکل ہے۔ ہم پکڑے گئے تو بہت لمبی سزا ہونی ہے اور......اور ہوسکتا ہے کہ......'' قادر کی آواز بھرا گئی۔ وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

''اچھا......پھر کیا ہوا؟'' عمران نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''انکل سراج نے کہا کہ اب ہمارا لال کوٹھی میں رہنا ٹھیک نہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔''

''تو انکل سراج نے تجھے یہاں پارسل کر دیا۔ مجید مٹھو کے پاس؟''

''ہاں جی......اب میں پچھلے قریباً دو ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے اب شکیل کا بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ واجی کی طرح اس کا باپ بھی کھاتا پیتا ہے۔ ہوسکتا ہے، اس کے گھر والوں نے اسے کہیں دبئی یا ابوظہبی کی طرف نکال دیا ہو۔''

قادرے کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے۔ انسان جب کسی مصیبت کے شکنجے میں پھنستا ہے تو کتنا مختلف نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی قادرا تھا جس نے واجی کے ساتھ مل کر مجھے اور ثروت کو اسنیک بار کی پارکنگ میں ذلیل کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی بڑی بڑی موٹر سائیکلیں میری کار کے پیچھے پارک کر دی تھیں اور ہمیں دیر تک وہاں سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ تب کتنا پھنے خان نظر آتا تھا یہ قادر۔ اب بالکل ''عاجز بکری'' بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی زردی تھی اور رُخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔

اس سارے معاملے میں کوئی بعید نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی قادرے نے میو ہسپتال کا ذکر کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ثروت اور اس کے گھر والوں کو ابھی تک لاہور میں مقیم سمجھ رہا تھا جبکہ وہ ڈھائی تین ماہ پہلے جرمنی پہنچ چکے تھے۔

ابھی ہم قادرے سے بات چیت کر ہی رہے تھے کہ میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ قادر چونک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے کہا۔ ''کال ریسیو کرو مگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا۔''

اقبال بولا۔ ''ورنہ ہم سیب کی جگہ خرمانی بلکہ بیر رکھیں گے تمہارے سر پر۔''

''اور اسپیکر آن کر دو تاکہ ہمیں تمہاری گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔'' عمران نے دوسرا حکم دیا۔

قادرے نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کال اٹینڈ کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے ایک نرم لیکن بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو قادر! کیسے ہو؟''

''بس ٹھیک ہوں صدیقی صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں چکر لگاؤں گا جمعرات کو لیکن آپ آئے ہی نہیں۔''

''بس یار! تمہارے ہی کام میں پھنسا ہوا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ لڑکی کی گواہی ہمارے خلاف آ گئی تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا اور ابھی تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔''

''آپ اپنے کسی ساتھی کا ذکر کر رہے تھے۔''

”ہاں...... بیرسٹر فیروز خاں! وہ مجھ سے سینئر ہے اور دوست بھی ہے۔ میں اس سے بھی مشورہ کر رہا ہوں۔ ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اللہ رب العزت نے چاہا تو ہم تمہیں گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مصیبت فوراً آ جاتی ہے لیکن جاتے ہوئے کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔“

”بب...... بس...... اب آپ ہی کا آسرا ہے۔“

”نہیں...... نہیں...... آسرا بس اوپر والے کا ہوتا ہے۔ بندے کا کام تو کوشش کرنا ہے۔ کون سی کوشش کامیاب ہوگی اور کون سی نہیں، یہ بس اوپر والے کو پتا ہے۔ بہر حال تم فکر مند نہیں ہونا اور نہ والدہ اور کنول کو ہونے دینا ہے۔ فون پر بات ہو تو انہیں پوری تسلی دو اور ایک بار پھر کہوں گا۔ والدہ اور کنول کے سوا کسی سے بھول کر بھی رابطہ نہیں کرنا۔ پولیس ہر طرف تمہیں سونگھتی پھر رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے جی! جیسے آپ کہتے ہیں۔“

”میں ذرا جلدی میں ہوں۔ تمہارے ہی سلسلے میں جا رہا ہوں۔ ایک بڑے خاص بندے سے ملنا ہے۔ کل پھر رابطہ کروں گا۔ اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ جی۔“ قادر نے کہا اور بات ختم کر دی۔

”یہ ذات شریف کون ہیں؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ ابرار صدیقی صاحب بہت بڑے وکیل ہیں۔ بڑی میڈم صفورا کے جاننے والے ہیں۔ میڈم صفورا نے ان سے میری سفارش کر رکھی ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس طرح بھی ہوا، وہ مجھے اس کیس میں سے نکال لیں گے۔ تسلی تشفی کے فون بھی کرتے رہتے ہیں۔“

”اور یہ کنول؟“

”یہ...... میری بہن ہے۔“

”یہ صدیقی صاحب اس کا ذکر کیوں فرما رہے تھے؟“

”دراصل والدہ اور کنول ایک دو بار میرے کیس کے لیے صدیقی صاحب سے ملی ہیں۔ وہ میری والدہ کی بڑی عزت کرنے لگے ہیں۔ ویسے وہ خود بھی نیک بندے ہیں وکالت کے علاوہ دینی کاموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے کوئی فرم بنا رکھی ہے۔ جس میں بے سہارا لوگوں کو مفت قانونی مدد دی جاتی ہے۔“

”مفت قانونی مدد۔“ اقبال نے سر ہلایا۔ ”اس لفظ ”مفت“ میں بڑا جادو ہے بھئی۔

مفت زہر بھی ملے تو ہم لوگ فوراً پھانکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور جہاں تک صدیقی صاحب کے نیک ہونے کا سوال ہے، اس کے لیے یہ ثبوت ہی کافی ہے کہ وہ تیرے جیسے نیک بندے کا کیس فی سبیل اللہ لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

قادرے کے ساتھ عمران اور اقبال کی تفتیشی گفتگو جاری تھی اور میری پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جذبات کا شکار ہو کر قادرے کے سامنے آ گیا تھا اور اس کا صریح مطلب تھا کہ میں سیٹھ سراج اور دیگر لوگوں کے سامنے بھی آ گیا ہوں۔ اب میرے گھر والوں کے لیے کوئی بھی سنگین خطرہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

عمران میرے ساتھ پہلو کے کمرے میں آیا اور صورتِ حال کے بارے میں مشورہ کیا۔ عمران بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ قادر لمبے کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر اتا غفیل کیا جائے اور پھر گاڑی میں ڈال کر یہاں سے نکال لیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ بے ہوشی کا انجکشن اور سرنج وغیرہ اس کی گاڑی میں موجود ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں پہلے سے پتا تھا کہ کسی کو بے ہوش کرنا پڑے گا؟“

”دیکھو جگر! ہمارا بازی گری کا سارا کام ”جج منٹ“ پر ہوتا ہے۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگاتے ہوئے، موٹر سائیکل پر کرتب دکھاتے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر خنجر چلاتے ہوئے۔ سب کچھ جج منٹ پر ”ڈی پینڈ“ کرتا ہے۔ یہاں بھی بس ایک جج منٹ ہی تھی کہ شاید ایسا کچھ کرنا پڑے۔“

”لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہوگا۔ سیدھا سادا اغوا کا معاملہ بن جائے گا۔“

”میرے خیال میں تو یہ اغوا کا معاملہ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم ایک اغوا شدہ شخص کو بازیاب کرائیں گے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”ہمارے ساتھ رہو گے جگر تو سمجھنا بھی سیکھ جاؤ گے۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ اس بدبخت قادرے کے خلاف ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ کسی خاص مطلب کے لیے اس کو ثروت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صدیقی نام کا بندہ بھی سیٹھ سراج کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو۔ وہ قادرے کو اس کیس سے بچانے کا لالچ دے کر اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔“

”کہیں...... قادرے کی بہن ہی کا کوئی چکر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے صدیقی نے دو تین بار قادرے کی بہن کی بات بھی کی ہے۔“

''ان باتوں کا پتا تو وقت کے ساتھ ہی چل سکتا ہے۔ فی الحال تو فوری طور پر ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم قادرے کو یہاں چھوڑ جائیں یا پھر مہمان بنالیں، اپنے فائیو اسٹار گھر میں۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور...... مجھے پتا ہے کہ تم میری بات مانو گے بھی نہیں۔''

''دیکھا نا اب باتیں آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہوگئی ہیں۔'' وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔ پھر انگلی سے اپنی کنپٹی کھجا کر بولا۔ ''اچھا ایک کام کرو۔ دو منٹ کے لیے مجھے اور اقبال کو اکیلے میں مشورہ کرنے دو۔ اس دوران میں تم ذرا اس مصیبت کے پاس رُکو۔'' اس نے مجھے پستول دے دیا۔ میں نے روانی میں پستول تھام تو لیا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بڑی ہوشیاری سے مجھے اپنے نیک کاموں میں شریک کرتا چلا جا رہا ہے۔ آج سے چند روز پہلے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح ایک بھرا ہوا پستول تھام کر واجی کے ایک بدمعاش دوست کو گن پوائنٹ پر رکھوں گا اور وہ نظریں جھکائے میرے سامنے بیٹھا رہے گا۔

میں عمران کی ہدایت کے مطابق پستول بدست قادرے کے پاس رہا اور دوسرے کمرے میں عمران اور اقبال آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اپنے ہاتھ میں ایک سرنج لیے نمودار ہوا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ سرنج دیکھ کر قادرے کے زخمی چہرے پر بہت سے سوالیہ نشان اُبھر آئے۔

''یہ ٹیکا لگوالو۔ تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ درد ٹھیک ہو جائے گا اور انفیکشن بھی نہیں ہوگا۔'' عمران نے قادرے سے کہا۔

''نن...... نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک نہیں ہو بیٹا جی! دیکھو تمہارا رنگ بالکل پیلا ہو رہا ہے۔ اس سے تھوڑی سی طاقت بھی آئے گی اور تمہارا دماغ بھی اچھے طریقے سے کام کرنے لگے گا۔ اس ایک ٹیکے میں بہت کچھ ہے۔ تمہارے بہت سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ سمجھو ٹیکا نہیں جادو کی چھڑی ہے۔ چلو شاباش۔''

پستول بدستور اقبال کے ہاتھ میں تھا۔ قادر لمبا جانتا تھا کہ مزاحمت کرے گا تو سر پر پھر پستول کی تکلیف دہ ضرب سہنی پڑے گی۔ اقبال نے اس کی آستین چڑھائی اور عمران نے انجکشن دے دیا۔ دو چار منٹ میں ہی قادرے کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ کچھ دیر بڑبڑاتا رہا۔ پھر صوفے پر ایک طرف کو جھکتا جھکتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

سارا پروگرام جیسے عمران اور اقبال نے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ عمران نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی اور گھر کا گیٹ کھول کر اسے اندر لے آیا۔ بے ہوش قادرے کو اُٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر اس طرح لٹایا گیا کہ اس کا سر میری گود میں آ گیا۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا کمبل ڈال دیا گیا۔ اب دیکھنے میں بعینہٖ یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی بیمار کو ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مجید مٹھو کا گھر چھوڑنے سے پہلے عمران اور اقبال نے وہاں اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا دیئے۔ جن جگہوں پر فنگر پرنٹس کا اندیشہ تھا، وہاں کی صفائی کر دی۔ گھر کی ہلکی پھلکی تلاشی میں انڈین شراب کی چند بوتلیں، ہیروئن کی پڑیاں اور دو رائفلیں بھی نظر آئیں۔ بہرحال ان اشیاء کو جہاں کا تہاں رہنے دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مجید مٹھو کے گھر سے نکل رہے تھے۔ گلی میں اِکا دُکا افراد نے ہمیں دیکھا لیکن کسی نے بھی خصوصی توجہ نہیں دی۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد ہم راوی روڈ میں عمران کے گھر داخل ہو چکے تھے۔

شام کے بعد ہی قادرا مکمل طور پر ہوش میں آ سکا تھا۔ اس نے خود کو ایک اجنبی جگہ دیکھ کر واویلا کیا۔ وہ یہ بات جان گیا تھا کہ اسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر کے سمن آباد والے مکان سے نکال لیا گیا ہے۔

جب اس کے ہوش کچھ ٹھکانے پر آئے تو عمران نے اسے چائے پلوائی اور اس سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ عمران اس سے ابرار صدیقی نامی شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔ قادرے نے بھرائی ہوئی مسکین آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ صدیقی صاحب وکیل ہیں۔ ان کا کافی نام ہے۔ جب میں اور شکیل لال کوٹھی میں میڈم صفورا کے پاس تھے، یہ وہاں دو تین بار آئے تھے۔ انکل سراج سے بھی ان کی جان پہچان لی ہے۔ انہوں نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔''

''میڈم صفورا اور سیٹھ سراج سے اس بندے کا کیا تعلق ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں مگر لگتا ہے کہ میڈم صفورا کی طرح صدیقی صاحب کو بھی پرانی چیزوں کا تھوڑا بہت شوق ہے۔ یہی مورتیاں، پرانے برتن اور زیور وغیرہ۔''

''تمہاری والدہ سے صدیقی کی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟'' اقبال نے دریافت کیا۔

''میری والدہ اور بہن ایک دو بار لال کوٹھی آئی تھیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے شاید وہیں پر صدیقی صاحب نے انہیں دیکھا تھا۔''

''اب تم کہتے ہو کہ تمہاری والدہ سے صدیقی کی اچھی جان پہچان ہو چکی ہے۔''

''جی ہاں...... میرے خیال میں انکل سراج نے ہی والدہ کو بتایا تھا کہ صدیقی صاحب مجھے اس کیس سے نکالنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد والدہ اور کنول، صدیقی صاحب سے ملنے ان کے دفتر بھی گئی تھیں؟''

''وہ خود کیوں گئی تھیں؟ کیا اس کام کے لیے کوئی مرد نہیں تھا؟'' اقبال نے پوچھا۔

قادرے نے چونک کر اقبال کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''اور کون جاتا؟ ایک بھائی کے سوا میرا کوئی اور ایسا نہیں ہے جو یہ بھاگ دوڑ کر سکے۔ وہ بھائی بھی مسقط میں بیٹھا ہوا ہے۔''

عمران نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اس وقت تو یہی لگ رہا ہے کہ تم دنیا کے مظلوم ترین بندوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری آمدن اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تھانے کچہریوں کے خرچے برداشت کر سکو۔ تمہیں ناکردہ گناہ کی سزا سے بچانے کے لیے تمہاری بوڑھی والدہ اور جوان بہن کو خود ہی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ تم بھی شکیل کی طرح جان بچانے کے لیے پاکستان سے باہر جا سکو، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ساری باتیں تب تمہارے دماغ میں نہیں آئیں جب تم نے ایک غنڈے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ ایک شریف لڑکی کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور واجی کے ساتھ مل کر اسے اُٹھانے اور بے آبرو کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر اس وقت تم اپنی والدہ اور جوان بہن کا خیال کرتے جو اب تمہیں بچانے کے لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہی ہیں۔''

قادرے کی جھکی ہوئی گردن بدستور جھکی رہی۔ آج دوپہر والی چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ جگہ جگہ سے سوج گیا تھا اور سوزش کے سبب ایک آنکھ تقریباً بند تھی۔ اپنے حلیے کے سبب وہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

اقبال نے پوچھا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ یہ صدیقی کہاں رہتا ہے؟''

''نہیں...... گھر کا پتا نہیں۔ پر ان کا دفتر پرانی انارکلی کی طرف ہے۔ صدیقی لاء ایسوسی ایٹس کے نام سے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت وہ اپنے دفتر میں ہوگا؟''

قادرے نے وال کلاک پر نظر ڈالی، ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ وہ بولا۔ ''ہاں...... اگر وہ لاہور سے باہر نہیں گئے تو دفتر میں ہی ہوں گے۔''

یہی وقت تھا جب قادرے کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ موبائل فون اب عمران کی جیب میں تھا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین کا جائزہ لیا۔ اس پر ''کنول'' کا نام چمک رہا

تھا۔ یہ قادرے کی بہن کی کال تھی۔

عمران نے سرسراتے لہجے میں قادرے کو حکم دیا۔ ''چل، کال ریسیو کر...... اور خبردار کوئی ہوشیاری نہیں دکھانی۔ اسی طرح بات کر جس طرح مجید مٹھو کے گھر میں کرتا تھا اور اسپیکر آن کر لے۔''

قادرے کے چہرے پر پریشانی بڑھ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ ایک جوان نسوانی آواز کمرے میں گونجی۔ ''ہیلو......''

''ہیلو......'' قادرے نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

''السلام علیکم قادر بھائی۔'' کنول نے کہا۔

''وعلیکم السلام...... کیسی ہو۔''

''بس ٹھیک ہوں۔''

''کیا بات ہے، آج آپ کچھ سُست لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟''

''ہاں...... ہاں خیریت ہے بس سر میں ہلکا سا درد تھا۔''

''سر درد پریشانی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے بھائی! لیکن اب اللہ نے چاہا تو ہماری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اوپر والے نے صدیقی صاحب کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ وہ دوپہر کو پھر آئے ہوئے تھے۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا ہے۔ عصر کے بعد گئے ہیں۔ بڑی تسلی دے رہے تھے۔''

قادر خاموش رہا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہماری وجہ سے کہہ نہیں پا رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد کنول کی آواز دوبارہ اُبھری۔ ''بھائی! آپ میری طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ میں...... صدیقی صاحب...... کے ساتھ...... میرا مطلب ہے...... میں ان کے ساتھ...... خوش رہوں گی۔ میں...... ان کو بڑی حد تک جان گئی ہوں۔ وہ دل کے بہت...... بہت اچھے ہیں۔ امی نے چاچا امین کے ذریعے پتا کروایا ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ آٹھ دس سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ دو سال بعد ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اکیلے رہ رہے ہیں۔ بچہ بھی کوئی نہیں ہے۔ خداترس اور ہمدرد بندے ہیں۔ علاقے میں ان کی نیک نامی ہے۔''

قادر اب بھی خاموش رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ غالباً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فون بند کر دے مگر ہماری وجہ سے وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''ہیلو قادر بھائی! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''نن......نہیں۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کنول نے کہا۔''بھائی! امی بتا رہی تھیں کہ آپ عمر کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ صدیقی صاحب کی عمر تھوڑی زیادہ ہے۔ بھائی! یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں ہے۔ میری اور ان کی عمر میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔ ہمارے ہی خاندان میں دو تین شادیاں ایسی ہو چکی ہیں جن میں میاں بیوی کی عمر میں آٹھ دس سال کا فرق ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے بھائی کہ صدیقی صاحب نیک اور ہمدرد ہیں۔ ان کی طبیعت میں جو ہمدردی ہے وہ امی کو اور...... مجھے بہت پسند آئی ہے۔''

''اچھا......اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' قادر بولا۔

''کیا...... آپ کے پاس کوئی اور بھی ہے؟'' کنول نے پوچھا۔

''نہیں تو......بس ذرا درد ہو رہا ہے سر میں۔''

''اگر زیادہ ہو رہا ہے تو پھر ڈاکٹر کو دکھائیں۔'' کنول کے لہجے میں ایک بہن کی بیتاب محبت تھی۔ دونوں کے درمیان ایک دو جملوں کا مزید تبادلہ ہوا۔ اسی دوران میں قادرے کے فون کی بیٹری جواب دے گئی اور رابطہ ختم ہو گیا۔

صورتِ حال ایک دم ہی واضح تر ہو گئی تھی۔ ہمارا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ یہ صدیقی نام کا ایڈووکیٹ قادرے کی ماں بہن کے ساتھ جو والہانہ ہمدردی دکھا رہا تھا، اس کے پیچھے مقصد تھا اور یہ مقصد تھا قادرے کی بہن۔ قادرے کے نقوش بھی بُرے نہیں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بہن خوبصورت رہی ہوگی۔ اس کی یہی خوبصورتی اس صدیقی کو قادرے اور اس کے گھر والوں کے قریب لے آئی تھی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔

قادرا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ورم زدہ چہرے پر شرمندگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ بہن جو کچھ بھی کہہ رہی تھی، وہ اپنی جگہ تھا مگر اندر کی حقیقت قادرا بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کی بہن وہی کچھ کر رہی تھی جو حوا کی بیٹی ہمیشہ سے کرتی رہی ہے۔ قربانی دیتی رہی ہے۔ کبھی اپنے باپ اور بھائی کی عزت بچانے کے لیے، کبھی شوہر کو آفات سے نکالنے کے لیے اور کبھی اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے۔ اس کے جسم اور اس کی روح کو ناکردہ گناہوں کے کفارے میں ہمیشہ چھیدا گیا ہے۔ اسے ایسی جنگوں کی سزا دی گئی ہے جو اس نے چھیڑی ہی نہیں تھیں۔ اسے ان بداعمالیوں کے عوض قربان گاہوں پر لٹایا گیا ہے جو اس نے کی ہی نہیں

تھیں۔ اسے ایسی رسموں کی خاطر آگ میں زندہ جلایا گیا ہے جن کا مقصد صرف مرد کی عظمت کو ثابت کرنا تھا اور ان سارے مظالم کے حوالے سے عورت کا قصور صرف اور صرف اتنا رہا ہے کہ وہ کمزور تھی اور عورت تھی۔

عمران نے قادرے کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھی اور اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر اُٹھاتے ہوئے بولا۔''قادر بیٹا! شرمندہ ہونے کی کون سی بات ہے؟ زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں۔ تمہاری جان چھوٹ رہی ہے، اس کے بدلے تمہاری بہن کو ایک بڑی عمر کے عاشق سے شادی کرنی پڑ جائے گی۔ یہ نقصان کا سودا نہیں۔''

قادرے کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ بے عزتی کا احساس اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش کو اور بھی بگاڑنے لگا۔

''ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو دل سے نہیں لگایا کرتے قادرے صاحب۔'' اقبال نے بھی طنز کا زہریلا تیر چھوڑا۔ ''یہ ابرار صدیقی تیز طرار بندہ لگتا ہے۔ لمبے چکروں میں نہیں پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار مہینے پاس رکھ کر چھوڑ دے تمہاری بہن کو...... اور تم جیسوں کی مائیں بہنیں تو ہوتی ہی اس لیے ہیں۔ تمہارے کارناموں کے بدلے سب سے پہلے ان کو ہی گالی دی جاتی ہے اور کارنامہ جتنا بڑا ہوتا ہے، گالی بھی اتنی بڑی ہوتی ہے۔ تم نے ایک شریف لڑکی کو سڑک سے اُٹھایا تھا، اب تمہاری بہن کو بھی کوئی اُٹھا رہا ہے۔ بس طریقے کا فرق ہے۔''

قریباً ایک گھنٹے بعد قادرے کے موبائل کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ موبائل اس وقت چارجر پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ اس پر ''انکل'' کا نام آ رہا تھا۔ دھیان سیدھا سراج کی طرف گیا۔ عمران نے بھی اسکرین دیکھی اور پھر قادرے سے کہا کہ وہ پہلے کی طرح موبائل کا اسپیکر آن کر کے کال ریسیو کرے۔

قادرے نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے سیٹھ سراج کی منحوس آواز اُبھری۔''ہاں بھئی قادر! کیا حال چال ہے؟''

''ٹھیک ہوں جی۔''

''مٹھو کہاں ہے؟''

''وہ تو آج سویرے چلے گئے تھے۔ کہتے تھے ضروری کام ہے۔ کل شام تک آئیں گا؟''

''وہ اپنے صدیقی صاحب نے بھی چکر لگایا ہے یا نہیں ہے؟''

''نہیں...... آئے تو نہیں۔''

’’بس وہ تمہارے ہی کم میں پھسیا ہویا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ کل عدالت وچ بھی پیش ہویا تھا۔ نہ پیش ہوندا تو تم کو جج نے اشتہاری بنا دینا تھا۔ بہت چنگا اور بیبا بندہ ہے صدیقی۔ بغیر لالچ کے کم کرنے والے ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوندے ہیں۔‘‘

سیٹھ سراج نے دو چار منٹ صدیقی کی تعریفیں کرنے میں صرف کیے۔ وہ قادرے کو باور کرا رہا تھا کہ فی الوقت اس کا اور اس کے گھر والوں کا نجات دہندہ یہ صدیقی ہی ہے۔ سیٹھ کی آواز اسپیکر سے نکل کر کمرے میں گونج رہی تھی۔ اقبال اپنے موبائل پر اس کی آڈیو ریکارڈنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ابرار صدیقی کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی اپنے موبائل میں محفوظ کی تھی۔

سیٹھ سراج کی باتوں سے عیاں تھا کہ ابھی تک کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہے کہ قادرے کو مجید مٹھو کے سمن آباد والے مکان سے اُٹھایا جا چکا ہے۔

سیٹھ سراج سے قادرے کی بات ختم ہوئی تو عمران گہری سوچ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے قادرے سے پوچھا۔ ’’وہاں مٹھو کے مکان میں تمہارے پاس کون کون آتا رہا ہے؟‘‘

’’دو تین بار صدیقی صاحب آئے ہیں۔ پھر چھوٹی میڈم کا ایک ملازم سلیم بھی آتا رہا ہے۔‘‘

’’اور یہ تمہارا انکل سراج؟‘‘

’’یہ بھی ایک بار آیا تھا، سلیم کے ساتھ ہی۔‘‘

عمران کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اقبال کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’ابرار صدیقی سے بات کر لو گے؟‘‘

’’اگر تم چاہتے ہو تو ضرور کروں گا۔‘‘ اقبال بولا۔

عمران نے قادرے کے ہاتھ سے اس کا موبائل فون لیا۔ ہم تینوں قادرے کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اقبال نے اپنا موبائل میز پر رکھا اور اس میں ریکارڈ ہونے والی سیٹھ سراج کی آواز کو بغور سننے لگا۔ اس نے تین چار بار یہ ریکارڈنگ چلا کر سنی۔ اس کے بعد وہ سیٹھ کی آواز کی نقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ صرف ایک دو بار کی کوشش سے وہ کافی حد تک سیٹھ سراج کی آواز سے ملتی جلتی آواز نکالنے لگا۔ وہ اپنے لب و لہجے کو بھی سیٹھ کے لب و لہجے سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کسی اداکار کی طرح سیٹھ سراج کے بولے ہوئے فقرے چند بار دہرائے اور مجھے ششدر کر دیا۔ اسے اس کام میں ساٹھ ستر فیصد

کامیابی ہوئی تھی۔ آڈیو ریکارڈنگ سے تو اس کو مدد مل ہی رہی تھی، وہ ایکسیڈنٹ والی لڑائی میں سیٹھ کی Live آواز بھی سن چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمران کی ہدایت کے مطابق ابرار صدیقی کو فون کر رہا تھا۔ اس کال کے لیے وہ قادرے والا فون ہی استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ابرار صدیقی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ابرار کی آواز اُبھری۔ ’’ہیلو۔‘‘

’’ہیلو! صدیقی صیب! میں آپ کا خادم بول رہا ہوں جی، سراج احمد۔‘‘

’’اوہو...... سراج بھائی تم؟ یہ تو قادرے کا نمبر ہے۔‘‘

’’بس میں اِدھر آیا ہوا تھا قادرے کے پاس۔ میرے پاس بیلنس ختم ہے اس لیے قادرے کے فون سے کر رہا ہوں۔ ہور سناؤ جی! کیا حال چال ہے؟‘‘ اقبال نے کھانستے ہوئے کہا۔

’’کیا بات ہے سراج بھائی! تمہاری آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ زکام لگ گیا ہے؟‘‘

’’زکام اور کھانسی دونوں ہی۔ کل رات بس اچار گوشت کھا لیا تھا۔‘‘

’’کل؟ کل تو تم رات کو بھٹی صاحب کے بیٹے کے ولیمے پر تھے۔ وہاں تو ون ڈش تھی۔‘‘

اقبال ذرا گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ’’نہیں...... بعد میں گھر جا کر تھوڑا سا چکھ لیا تھا اور سناؤ جناب! کب تک انتظار کرواؤ گے۔ کوئی خوشخبری وغیرہ سنا دو جی ہم کو بھی۔‘‘ اقبال نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ غالباً اس نے کوشش کی تھی کہ ابرار صدیقی اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائے۔

ابرار صدیقی نے کہا۔ ’’یار! کیا بتاؤں تمہیں؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں فون کروں۔ تمہاری اس خوشخبری کو تو لاہور سے باہر لے جانا پڑا ہے۔ جہلم میں۔‘‘

’’وہ کیوں؟‘‘ اقبال نے پھر اندھیرے کا تیر چلایا۔

’’بس یہاں کچھ خطرہ لگ رہا تھا۔ رات کو کوٹھی کے آس پاس کچھ مشکوک بندے گھومتے دیکھے تھے۔ پھر اس کسٹم والے عابد شاہ کا فون آ گیا۔ اسے کسی نے مخبری کی تھی کہ میرے پاس ایک ’’پیس‘‘ آیا ہے۔ بڑی اسپیشل چیز ہے۔ میں نے سوچا کہ اب ’’مال‘‘ پر گندی نظریں پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس لیے اسے یہاں سے نکال لینا چاہیے۔‘‘

’’تو اب کہاں رکھا ہے؟‘‘ اقبال نے سیٹھ سراج کے لہجے میں ٹوہ لی۔

’’وہیں جہلم میں۔‘‘ ابرار صدیقی نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بولا۔

''تمہاری آواز صاف نہیں آرہی۔ کچھ گونج رہی ہے۔''

اقبال نے ایک بار پھر کھانسنا شروع کیا۔ ''بس طبیعت ذرا خراب ہے۔ اچھا ٹھیک ہے، کل پھر بات کریں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔''

''رب راکھا......'' اقبال نے سراج کے انداز میں کہا اور فون بند کر کے گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

عمران نے اسے انگوٹھا دکھا کر اشارہ کیا کہ اس نے اچھی ایکٹنگ اور صداکاری کی ہے۔

اقبال نے سراج کی آواز میں بات کرتے ہوئے خوشخبری کا ذکر کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس لفظ کو سن کر شاید صدیقی اپنی ''عاشقانہ مصروفیت'' کا کوئی ذکر کرے۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی کہ وہ قادرے کی بہن کنول میں دلچسپی لے رہا ہے۔ بہرحال صدیقی نے ''خوشخبری'' کے لفظ سے کوئی اور مطلب لے لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ خوشخبری تو اس نے لاہور سے جہلم پہنچا دی ہے کیونکہ یہاں کچھ لوگ اس کے بارے میں باخبر ہو چکے تھے۔

عمران نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''ہاں جگر! کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟''

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں خود کو خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنساتے چلے جا رہے ہو اور مجھے یہ کوئی چھوٹی مصیبت نہیں لگتی۔''

''مصیبت کوئی بھی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی یار! بندے کی سوچ اسے چھوٹا بڑا بناتی ہے۔ ذرا غور کرو، وہی بلے باز جو نوے تک آسانی سے اسکور بنا لیتا ہے۔ بعد کے دس اسکورز کو ایک بڑی مشکل سمجھنے لگتا ہے اور سنچری کا آخری اسکور تو اس کے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ حالانکہ وہی پچ ہوتی ہے، وہی باؤلر اور وہی سب کچھ۔ ثابت یہ ہوا کہ ہماری سوچ ہی کسی کام کو مشکل یا آسان بناتی ہے۔''

میں منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں...... تم بتاؤ۔ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟''

اقبال نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ صدیقی نوادر کی بات کر رہا تھا۔ ''پیس'' کا لفظ یہ لوگ عام طور پر نادر چیزوں کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شاید صدیقی کے پاس کوئی بہت خاص الخاص شے ہے جسے وہ بہت سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس شے کو حفاظت کی خاطر اس نے لاہور سے جہلم منتقل کر دیا ہے۔''

''ہاں...... بات تو سمجھ میں آرہی ہے۔ صدیقی، میڈم صفورا اور سراج سے ملتا ہے۔ یقیناً وہ بھی نوادرات میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تم نے خوشخبری کی بات کی تو اس کا دھیان فوراً اس نادر شے کی طرف کیوں چلا گیا؟''

''ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اس شے کو کسی بھاری قیمت پر فروخت کرنا چاہ رہے ہوں۔ صدیقی نے خوشخبری والی بات کو اسی بیک گراؤنڈ میں دیکھا ہو یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات ہو۔'' اقبال نے کہا۔

''یہاں مغز ماری کرنے کے بجائے کیوں نہ قادرے سے پوچھا جائے۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک بار پھر قادرے کے پاس پہنچے اور ان نئی معلومات کے حوالے سے اس سے سوال جواب کیے۔ وہ اس بارے میں تو کچھ نہیں بتا سکا تاہم اس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ جہلم میں فردوس پلازہ نامی بلڈنگ کے اندر صدیقی کا ایک شاندار فلیٹ ہے۔

صدیقی کے بارے میں عمران نے کرید کرید کر قادرے سے کچھ مزید معلومات بھی حاصل کیں۔ ان معلومات کا خلاصہ قادرے کے مطابق یہ تھا کہ ابرار صدیقی صاحب ایک نہایت دیندار، پرہیزگار اور ہمدرد انسان ہیں۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہیں اور انہوں نے بے سہارا لوگوں کو فی سبیل اللہ قانونی امداد فراہم کرنے کے لیے ایک باقاعدہ فرم بنا رکھی ہے۔

اس ابرار صدیقی کے بارے میں اب تک ہم اتنا سن چکے تھے کہ اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اپنی آواز اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ کافی دبنگ قسم کا شخص محسوس ہوتا تھا۔ ایسا شخص جو اپنی قوتِ گفتار سے کسی کو بھی قائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے دیکھا کہ عمران اور اقبال کہیں جانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ناشتہ کر چکے تھے اور میرا ناشتہ حسبِ معمول ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ تھرماس میں چائے موجود تھی۔

''کہاں کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جہلم......'' عمران نے ترت جواب دیا۔ ''آج اور کل کام سے (سرکس سے) چھٹی ہے۔ سوچا کہ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ تم ناشتہ کر لو۔''

''میں بعد میں کر لوں گا۔''

''بعد میں...... کیا مطلب؟ گاڑی میں کرو گے؟''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہم بھی کہیں نہیں جا رہے۔" عمران نے دھوپ کا چشمہ اور پی کیپ اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔

"کیا کوئی زبردستی ہے؟"

"بس یہی زبردستی ہے کہ ہم بھی نہیں جائیں گے۔ ہمارے نہ جانے سے سیٹھ سراج کا جتنا فائدہ ہوگا، اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے۔"

"مجھے سیٹھ کے فائدے نقصان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بھاڑ میں جائے وہ اور اس کے چیلے چانٹے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں صرف ثروت کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہاری بس اپنی دلچسپیاں ہیں۔ میں کسی ایسے کھیل کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔" میں نے کڑوے کسیلے لہجے میں کہا۔

"یار! ایک تو تم بدگمان بہت ہو۔ اگر تمہارے ساتھ میری تھوڑی سی بے تکلفی اور ہوتی نا تو میں نے تمہاری اس خوبصورت ناک پر گھونسہ مار دینا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بالکل بے خبر بیٹھا ہوا ہوں؟ مجھے تمہارے اندر کی حالت کا کچھ پتا نہیں؟"

"دیکھنے میں تو ایسے ہی لگتا ہے۔" میرا موڈ بدستور آف تھا۔

وہ فلم اسٹار محمد علی کے انداز میں بولا۔ "دیکھ لو دنیا والو۔ یہ ہے وفاؤں کا صلہ۔ یہ میرا دوست ہے۔ میری جان ہے۔ میرا جگر ہے اور آج...... آج اس بھری عدالت میں یہی مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا رہا ہے۔ مجھے اپنے دُکھ درد سے نا آشنا سمجھ رہا ہے۔ اتنے بڑے الزام کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود اپنی جان لے لوں۔ اپنی زندگی دے کر اپنی سچائی ثابت کر دوں۔ لانا یار اقبال! کہاں ہے میرا پستول؟"

اقبال نے مسکراتے ہوئے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور عمران کی طرف اُچھال دیا۔ عمران نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے کنپٹی سے لگایا۔ مگر پھر ٹریگر دبانے سے پہلے اس کا چیمبر کھول کر دیکھا اور غصے سے اقبال کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یار! بڑے بیوقوف ہو تم...... اس میں تو پوری گولیاں ہیں۔ کم از کم دو تین گولیاں تو نکال لو۔ کچھ نہ کچھ چانس تو باقی رہے۔ وہ شاہین بیچاری تو بے موت ماری جائے گی۔ پرسوں اس غریبنی کی سالگرہ ہے۔ ایسی خوشی کے موقعے پر اسے میرے قل پڑھنے پڑ گئے تو پھر؟"

"سرکس میں تم سے کہیں اچھے مسخرے موجود ہیں۔ اس فیلڈ میں کوشش نہ ہی کیا کرو تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھ لو دنیا والو۔ میری برباد زندگی کا تماشہ دیکھ لو۔ اب مجھے مسخرہ بھی کہا جا رہا ہے۔" عمران نے ادا سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

اقبال مسکراتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ "تابش یار! عمران تمہارے والے کام سے غافل نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ تمہارا کام بھی ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے میرا کام؟"

"بتاؤ عمران! کیا ہو رہا ہے کام؟" اقبال نے کہا۔

"نہیں یار! تم ہی بتاؤ۔ میں بولوں گا تو کہے گا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔" عمران مصنوعی ناراضی کے ساتھ بولا۔

اقبال نے کہا۔ "حاجی صاحب سے بات چیت ہو رہی ہے۔ عمران تمہیں بتائے بغیر دو دفعہ ان سے مل چکا ہے۔"

"کون حاجی صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"اماں یار! وہی پراپرٹی ڈیلر...... جن کو تمہارے ناصر بھائی اپنا مکان بیچنے کی ذمے داری دے گئے ہیں۔ یہ حاجی صاحب بھی عمران کے جاننے والے ہی نکل آئے ہیں۔ وہ اپنے بازار کا چاچا نذیر ہے نا جو اونچا سنتا ہے۔ وہ حاجی صاحب کا چچیرا بھائی ہے۔ حاجی صاحب کبھی کبھی اس کے پاس آتے ہیں۔ وہیں عمران سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اب حاجی صاحب نے عمران سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔"

"کیسا وعدہ؟"

"تمہارے ناصر بھائی کے مکان کا بیعانہ ہو گیا ہے۔ دو تین ہفتے میں مکان کی پے منٹ بھی ہو جانی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رقم کا پے آرڈر بنوا کر حاجی صاحب نے جرمنی بھیجنا ہے۔ پے آرڈر کے لیے کوئی اکاؤنٹ نمبر، ایڈریس وغیرہ تمہارے ناصر بھائی مہیا کریں گے۔ بس یہی ناصر بھائی کا سراغ ہوگا۔"

میرے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اُمید کی کرن پیدا ہوئی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "اگر تم حاجی صاحب سے ملے تھے تو پھر مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"یار! میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن تم ایک دم بے صبرے ہو۔" عمران کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

"چلو سمجھو کہ مجھے سرپرائز مل گیا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

عمران نے مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ یہ تفصیل حوصلہ افزا تھی۔ فون

کے سلسلے میں تو ناصر بھائی بے حد احتیاط کرتے تھے۔ اب تک حاجی صاحب کو ان کی جتنی بھی کالز آئی تھیں، وہ کسی نہ کسی پبلک بوتھ سے کی گئی تھیں مگر رقم منگوانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا کوئی پتا ٹھکانا فراہم کرتے۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بتاؤ اب ناشتہ کرنا ہے اور نکلنا ہے یا پھر ہم بھی رضائیاں لے کر لیٹ جائیں؟''

میں گہری سانس لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص کی مرضی کے خلاف چلنا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ان دونوں نے قادرے کو ایک اندرونی کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد عمران کا ایک ساتھی آصف یہاں آنے والا تھا جس نے ہماری غیر موجودگی میں یہاں رہنا تھا اور قادرے کی دیکھ بھال بھی کرنا تھی۔

○......❖......○

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم مہران کار پر سوار لاہور سے براستہ جی ٹی روڈ جہلم کی طرف جا رہے تھے۔ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ اقبال اس کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ میں پچھلی نشست پر نیم دراز تھا۔ ڈیک پر غزل کے بول گونج رہے تھے۔

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نبھاہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

میرے دل میں درد اُتر رہا تھا۔ ثروت کا مکان بک گیا تھا۔ وہ در و دیوار، وہ جھروکے اور وہ سارے دھوپ سائے بک گئے تھے جن میں میری اور ثروت کی محبت رچی بسی تھی۔ اس چار دیواری میں ہماری محبت نے جنم لیا تھا پھر وہ پروان چڑھی تھی۔ پھر وہ ہمارے روئیں روئیں میں سما گئی تھی۔ کتنی بیتابی تھی ہمارے اندر ایک دوسرے کے لیے۔ ہم اپنے ملن کے لیے ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہے تھے اور کئی دفعہ تو یہ بے قراری اتنی بڑھ جاتی تھی کہ ہم دنوں کے بجائے گھڑیاں گننے لگتے تھے۔ عجیب ہیجانی انداز میں اس دن کا انتظار کرنے لگتے تھے، جب شہنائیاں گونجنا تھیں۔ جب ڈولی سجنی تھی اور ایک حسین شب کی مانگ میں وصل کے ستارے جھلملانے تھے لیکن اب وہ سب کچھ بعید از قیاس لگتا تھا۔ ہر اچھا امکان ایک تاریک دھند کے پیچھے چھپ گیا تھا اور ناپید ہو گیا تھا۔

گاڑی جہلم کی طرف رواں دواں تھی۔ یہ موسم سرما کا آخری دور تھا۔ سنہری دھوپ نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھی۔ ''وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''فردوس پلازہ تلاش کریں گے پھر ابرار صدیقی کے فلیٹ پر پہنچیں گے۔ اس سے

چائے پئیں گے اور گرما گرم سموسے کھائیں گے، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ...... پھر واپس آ جائیں گے۔''

''اور اگر سموسے زیادہ گرم ہوئے تو پھر؟'' اقبال مسکرایا۔

''تو پھر...... تابش کو نہیں کھانے دیں گے۔ ہماری زبانیں تو گرم سرد کھا کھا کر کافی ڈھیٹ ہو چکی ہیں۔''

''دیکھو...... میں ایک بات تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ میں تمہارے ساتھ تو چل پڑا ہوں لیکن کسی بھی اُلٹے سیدھے کام میں شریک نہیں ہوگا۔''

عمران بولا۔ ''میرے خیال میں اُلٹے سیدھے کام سے تمہارا مطلب خطرناک کام ہے۔ اول تو یہ کام خطرناک نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت ہو بھی تو یار...... ''دو...... چھ' والے کھیل سے زیادہ خطرناک کیا ہوگا اور ''دو...... چھ'' تم آسانی سے کھیل چکے ہو۔''

وہ ہر ایسے موقعے پر۔ ''دو...... چھ'' کا حوالہ دیتا تھا اور مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں سٹپٹا کر کچھ کہنے والا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کی گرل فرینڈ شاہین تھی۔ وہ شاہین سے گپ شپ کرنے لگا۔ وہ اسے ڈنر پر چلنے کا کہہ رہی تھی اور وہ اسے ٹالنے کے لیے بے پرکی اُڑا رہا تھا۔ اس نے اسپیکر بھی آن کر دیا تھا تاکہ ہم بھی ان کی گپ شپ سن سکیں۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ آج شام مصروف ہے۔ اداکارہ ریما نے اسے اپنی فلم ''اندھی لڑکی'' میں ایک خاص الخاص رول دینے کے لیے اپنے گھر بلایا ہے۔''

شاہین کی آواز اُبھری۔ ''ویسے یہ ریما غضب کی آرٹسٹ ہے، اندھی لڑکی کا رول کرنے کے لیے اس نے واقعی اپنی آنکھیں نکلوا لیں۔ بھئی واہ...... بہت بڑی قربانی ہے فن کے لیے۔''

''آنکھیں کیوں نکلوائے گی وہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''لو...... اگر آنکھیں نہیں نکلوائیں تو پھر تمہیں کیوں کاسٹ کرے گی وہ؟ کیا کوئی اور ڈھنگ کا بندہ لاہور میں نہیں ہے؟''

''ڈھنگ کا بندہ ہوتا تو تم میرے بجائے اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھتیں اور موت کے کنوئیں میں داد وصول کرتیں۔ میرے جیسی بے ڈھنگی موٹر سائیکل پاکستان میں کوئی چلا سکتا ہے؟''

''اتنا بھی اترانے کی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے ''اسٹنٹ مین'' بھرے ہوئے ہیں فلم

انڈسٹری میں۔ وہاں تمہاری دال گلنے والی نہیں۔''

''مونگ کی دال گلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور ریما جی کو مونگ کی دال بڑی پسند ہے۔''

''لگتا ہے کہ تم بس میرا اور اپنا ٹائم ضائع کر رہے ہو۔''

''نہیں اپنا...... تمہارے پاس تو ٹائم ہی ٹائم ہے۔''

''اچھا...... بھاڑ میں جاؤ۔'' شاہین نے کال منقطع کر دی۔

وہ دلکش انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کے دانت خوبصورت تھے۔ ''اب دو تین دن روٹھی رہے گی۔ پھر ایک دن گھر سے کوئی اچھا سا کھانا پکا کر لائے گی۔ ایک پلیٹ میں ڈال کر سینڈو کے ہاتھ مجھے بھی بھجوائے گی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ ماننے کے لیے تیار ہے۔ میں جاؤں گا تو وہ مان جائے گی۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''روٹھتی بھی وہ ہے اور کھانا بھی وہ کھلاتی ہے۔''

''ہیرو بننے کے یہی تو فائدے ہوتے ہیں جگر۔'' وہ ادا سے بولا۔

میں نے نشست پر کشن کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم واقعی اس سے پیار کرتے ہو یا بس وقت گزاری ہے؟''

''سچ بتاؤں؟''

''چلو آج یہ کام بھی کر گزرو۔'' میں نے کہا۔

''وقت گزاری۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ان لمحوں میں پہلی بار مجھے اس کی دلکش آنکھوں میں عجیب سا کرب کروٹ لیتا محسوس ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کی ہنستی کھیلتی قہقہے بکھیرتی زندگی کے پیچھے ایک پردہ ہے اور اس پردے کے عقب میں ایک دردناک کہانی چھپی ہے۔

مگر عمران کی آنکھوں کا یہ تاثر بس چند لمحے ہی قائم رہا، اس کے بعد وہی شوخی ایک ریلے کی طرح اس کی آنکھوں میں بہنے لگی۔

جس وقت ہم جی ٹی روڈ سے اُتر کر جہلم شہر میں داخل ہوئے، دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ایک اچھے ہوٹل سے ہم نے لنچ کیا۔ وہیں سے ہمیں فردوس پلازہ کا پتا بھی چل گیا۔ عمران نے مجھے یقین دلایا تھا کہ فی الحال وہ صرف سروے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پلازہ دیکھیں گے اور ابرار صدیقی کے فلیٹ کا بیرونی جائزہ لے کر واپس آ جائیں گے۔ پھر بھی سابقہ تجربوں کی بنا پر میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں نے عمران سے کہا کہ میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا ہوں، وہ چکر لگا کر آ جائیں مگر وہ مجھے ساتھ لے جانے پر مُصر تھا۔

ہم شہر کے گنجان علاقے سے گزر کر نسبتاً کشادہ سڑکوں پر آ گئے۔ جلد ہی عمران کو فردوس پلازہ کی سبز عمارت نظر آ گئی۔ یہ پانچ منزلہ بلڈنگ یقیناً حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ نیچے دکانیں، اوپر دفاتر اور اس سے اوپر لگژری فلیٹس تھے۔ عمران نے کار پلازہ سے قریباً پچاس میٹر دور سڑک کے کنارے روکی۔ اس سے پہلے کہ مزید تحقیق شروع ہوتی، ایک منظر نے اگلی نشست پر بیٹھے اقبال کو بُری طرح چونکا دیا۔ وہ پلازہ سے نکلنے والے ایک سانولے سے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے بال گھنگریالے تھے۔ اپنی چرمی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ باہر نکلا اور ایک پرانے ماڈل کی سوزوکی کار میں آ بیٹھا۔

''یہ مجید مٹھو ہے۔'' اقبال نے پورے وثوق سے کہا۔

''دیکھ لو۔ کہیں دھوکا نہ ہو رہا ہو۔'' عمران بولا۔

''دیکھ لیا ہے یار! سو فیصد وہی ہے۔'' اقبال کی آواز میں جذباتی لرزش تھی۔

''پھر پیچھا کریں اس کا؟''

''بالکل کرنا چاہیے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

مجید مٹھو روانہ ہوا تو ہماری مہران کار اس کے پیچھے چل پڑی۔ یہ مجید مٹھو وہی کن ٹٹا تھا جس کے سمن آباد میں واقع گھر سے عمران اور اقبال نے قادر لمبے کو نکالا تھا۔ غالباً عمران اور اقبال کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہاں فردوس پلازہ پر پہنچتے ہی مجید مٹھو سے ملاقات ہو جائے گی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے جہلم کی مختلف سڑکوں سے گزرنے لگیں۔ یہاں ٹریفک زیادہ تھا اور سڑکوں کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ قریباً دس منٹ بعد مٹھو کی گاڑی ایک کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ ہم کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے سامنے سے گزر گئے۔ کوٹھی کا نمبر 100 تھا اور یہ کسی چودھری منصب علی کی ملکیت تھی۔ کچھ دور جا کر ہم نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چند دکانوں کے سامنے رُک گئے۔ اقبال قریبی شاپ سے الائچی سپاری پان لے کر آیا۔ ہم پان چباتے ہوئے صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ مجید مٹھو کے یہاں ہونے کا مطلب یہ تھا کہ صدیقی وغیرہ سے اس کا براہِ راست تعلق ہے۔ ممکن تھا کہ جو نادر شے لاہور سے یہاں جہلم پہنچائی گئی تھی، مجید مٹھو اسی کے سلسلے میں یہاں پہنچا ہو۔

اچانک مٹھو کی نیلی کار پھر کوٹھی سے نکلتی دکھائی دی۔ عمران کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ مٹھو اتنی جلدی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ اقبال نے ابھی پان والے سے بقایا پیسے بھی لینے تھے۔

تاہم یہ ستر اسّی روپے اس کو گفٹ کرتے ہوئے ہم پھر نیلی کار کے پیچھے روانہ ہوگئے۔ مٹھو نے ایک جگہ رُک کر گاڑی میں ''سی این جی'' ڈلوائی۔ ایک ورکشاپ کے اندر جا کر کسی سے ملا اور باہر آیا۔ یہ لکڑی کی ورکشاپ تھی۔ جب مٹھو ورکشاپ سے باہر آیا تو اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ نوجوان کا چہرہ افسردہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ مٹھو اسے سمجھانے والے انداز میں کچھ بول رہا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کا کندھا تھپکا اور اسے واپس ورکشاپ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ شہر کے جنوبی حصے کی طرف چل دیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے مختلف سڑکوں پر بھاگ رہی تھیں۔

اچانک عمران بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس باندر کو شک ہوگیا ہے۔''

''ہاں.....لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔'' اقبال نے تائید کی۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ مجید مٹھو کی گاڑی یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ وہ چند بغلی سڑکوں پر بھی مڑا۔ عمران نے درمیانی فاصلہ کافی بڑھا دیا مگر لگتا تھا کہ اب فاصلہ بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اقبال بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس خبیث نے ایک دم کہیں غائب ہو جانا ہے۔ تم اب اس کے قریب ہی رہو تو بہتر ہے۔''

عمران خود بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔ نیلی کار کی رفتار بھی ایک دم بڑھ گئی۔

دونوں گاڑیاں تیزی سے آگے پیچھے بھاگتی اور مختلف سڑکوں سے گزرتی مضافاتی علاقے میں آگئیں۔

''مجھے لگتا ہے یہ باندر وقت گزار رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے موبائل پر اپنے مددگار بلا لیے ہوں۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن ابھی تک کوئی نظر تو نہیں آیا۔'' اقبال نے عقب میں اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں مٹھو کی نیلی کار نے ایک شارپ ٹرن لیا اور جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر چڑھ گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ مٹھو کے ذہن میں کوئی خاص منزل ہے۔ شاید وہ ہمیں اس طرف لے جا رہا تھا جہاں اسے مدد مل سکتی تھی۔ اس امر کا امکان تھا کہ اس سڑک پر آگے جا کر مٹھو کے ساتھی موجود ہوں۔

عمران نے کار کی رفتار ایک دم بہت بڑھا دی اور مٹھو کی کار کے برابر آگیا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ پھیل رہی تھی اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہی ہو رہا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یہ

دونوں سر پھرے ایک بار پھر راہ جاتی مصیبت کو گلے کا ہار بنا رہے تھے اور میری بدقسمتی تھی کہ میں بھی ان کے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں ہوٹل کی نیم گرم لابی اور ٹی وی وغیرہ کو چھوڑ کر ان خدائی فوج داروں کے ساتھ چل پڑا تھا۔ عمران کی ہمیشہ مسکراتی آنکھوں میں اب وہی سرد جارحیت نظر آتی تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے ہڑپہ میں زلیخا کے ہاں اور پھر لاہور سمن آباد میں مٹھو کے مکان میں کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر اقبال نے مجید مٹھو کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے رفتار کم کرنے کے بجائے اور تیز کی تو اقبال نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے مٹھو کی کار کو سائیڈ ماری۔ مٹھو کی کار بُری طرح لہرائی اور سائیڈ کے کھیت میں جا کر تھوڑا سا گھوم گئی لیکن وہ پھر بھی رُکا نہیں۔ جس طرف کو گاڑی کا رُخ ہوگیا تھا، وہ اسی طرف کو بھگاتا چلا گیا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے گاڑی ناہموار کھیت میں ڈال دی۔ یہ تقریباً سنسان جگہ تھی۔ گہری ہوتی شام میں بس اِکا دُکا راہگیر نظر آتے تھے۔ دونوں گاڑیاں کھیت میں دوڑتی چلی گئیں۔

مٹھو کھیت میں سے نکل کر دوبارہ ایک چھوٹی سڑک پر آگیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کھیت سے نکل آئے۔ یہ ریس بڑی اندھا دھند ثابت ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ میں عمران کی زبردست مشاقی بھی مجھ پر کھل رہی تھی۔ میں خود بھی بڑی اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف تاریک پہاڑیاں تھیں، جہلم شہر کی روشنیاں دور عقب میں دکھائی دے رہی تھیں۔ عمران نے کئی خطرناک موڑ تیزی سے کاٹے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوا کہ گاڑی اس کے کنٹرول سے باہر ہوگی۔

جلد ہی اس نے پھر مٹھو کی گاڑی کو جا لیا۔ ''اس کا ٹائر پھاڑ دوں؟'' اقبال نے اپنے کولٹ پسٹل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......ابھی ویسے ہی کوشش کرتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

اب ایک بار پھر دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو دوڑ رہی تھیں۔ عمران نے اوورٹیک کرنے کے بجائے مٹھو کی گاڑی کو دبانا شروع کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ گاڑی کی رفتار کم کرنے اور اسے روکنے پر آمادہ ہو جائے لیکن مٹھو بھی شاید آخری حد تک مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بجائے اچانک ہماری گاڑی کو زوردار سائیڈ ماری۔ یہ بڑی اندھا دھند حرکت تھی۔ دونوں گاڑیوں کی سائیڈوں کے تصادم سے زوردار آواز پیدا

ہوئی۔ شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا اُبھرا۔ عمران تو کسی طرح گاڑی سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا لیکن جس نے ٹکر ماری تھی، وہ اپنی گاڑی سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ موڑ پر اس کی گاڑی بُری طرح لہرائی۔ کسی پتھر سے ٹکرا کر گھومی اور پھر نشیب کے کمزور درختوں کو توڑتی ہوئی تاریکی میں جا گری۔

یہ سنسنی خیز منظر تھا۔ چھوٹی سی بل کھاتی سڑک بالکل تاریک اور سنسان تھی۔ عمران نے گاڑی کو بریک لگائے اور وہ بیس تیس میٹر آگے جا کر رُک گئی۔ ہم تیزی سے باہر نکلے اور نشیب کی طرف لپکے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس شاید ٹوٹ چکی تھیں، صرف عقبی بتیوں کی مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ گاڑی تیس چالیس فٹ نیچے اُلٹی حالت میں پڑی ہے۔

عمران کے ہاتھ میں ٹارچ تھی، وہ سب سے پہلے نیچے اُترا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پسٹل میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ ''احتیاط سے عمران! ہو سکتا ہے وہ باہر نکل آیا ہو۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

میں اقبال کے بالکل پیچھے تھا۔ جس سڑک پر سے مٹھو کی گاڑی گری تھی، یہ کسی گاؤں کی طرف جانے والی پتلی سی سڑک تھی۔ دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم احتیاط سے چلتے آگے بڑھتے رہے اور گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ پیٹرول کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ سائیڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے تاہم اپنی جگہ پر موجود تھے۔ عمران نے ٹارچ روشن کی۔ مجید مٹھو اوندھی گاڑی میں اوندھا پڑا نظر آیا۔ وہ بے حرکت تھا۔ اقبال نے ایک پتھر کی مدد سے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو کھڑکی سے علیحدہ کیا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ مٹھو کو کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کام میں مَیں نے بھی مدد کی۔ وہ خاصا وزنی اور ٹھوس جسم والا تھا۔ بظاہر اس کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ہم اسے اُٹھا کر گاڑی سے تھوڑا دور لائے اور یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے برق سی چمک گئی۔ مجید مٹھو کے دائیں ہاتھ نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور جیکٹ کے نیچے گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔ اتفاقاً اس وقت میں ہی مجید مٹھو کے زیادہ قریب تھا۔ میں نے اضطراری طور پر ٹانگ چلائی۔ میرے وزنی بوٹ کی ضرب مجید مٹھو کے ہاتھ پر لگی۔ یہ بڑی کارگر ضرب تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ مجید مٹھو نے لیٹے لیٹے مجھے لات ماری۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گیا۔ اسی اثناء میں مٹھو نے اُٹھ کر دوڑ لگا دی۔ یقیناً اس سے پہلے وہ مکر رہا تھا۔

''رُک جاؤ...... گولی مار دوں گا'' اقبال دھاڑا۔

مگر وہ رُکا نہیں۔ عمران نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ ڈھلوان پر لمبی لمبی جستیں لگاتا ہوا تیزی سے مٹھو کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے اس کے سائے کو ہوا میں جست لگا کر مٹھو کے سائے پر گرتے دیکھا۔ اس نے قریباً پچاس میٹر نیچے مٹھو کو چھاپ لیا تھا۔ میں اور اقبال سنبھل سنبھل کر اُترے اور ان دونوں کے سر پر پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے مجید مٹھو اور عمران کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ مٹھو تکلیف سے بُری طرح کراہ رہا تھا اور عمران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا گریبان تار تار تھا۔

''باندھو اس کتے کو اسی کے مفلر سے۔'' عمران نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اقبال نے مٹھو کا گرا ہوا مفلر اُٹھایا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر مضبوطی سے کس دیئے۔ اس کے بعد وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے واپس گاڑی تک لے آئے۔ اقبال نے گاڑی کے اگنیشن میں سے چابی نکال لی اور اس کی عقبی روشنیاں آف کر دیں۔ گاڑی کی چھت اور ایک سائیڈ بُری طرح برباد ہو گئی تھی۔ پیٹرول ٹینکی سے بہہ نکلا تھا اور بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

مجید مٹھو دھمکیاں دینے لگا۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں برباد کر دوں گا تمہیں۔ تمہارے بچے مار ڈالوں گا۔''

عمران نے عقب سے اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ مارا۔ چٹاخ کی آواز اُبھری اور مٹھو اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ عمران پھنکارا۔ ''تمہیں یہ کس نے کہا ہے کہ ہم تمہیں جانتے نہیں۔ تمہیں جانتے ہیں، اسی لیے تو آج تیری آٹھ دس ہڈیاں توڑ کر کسی کھڈ میں پھینکنے والے ہیں۔''

''ایک ہڈی تو شاید اس کی ٹوٹ بھی گئی ہے۔'' اقبال نے مٹھو کے بازو کو کندھے کے نیچے سے ٹٹولا۔

مٹھو سخت جان ہونے کے باوجود کراہ اُٹھا۔ اس کے بازو کو واقعی نقصان پہنچ چکا تھا اور یہ کام حادثے کے وقت نہیں ہوا تھا، تب ہوا تھا جب عمران اور وہ اوپر نیچے پتھروں پر گرے تھے اور دور تک لڑھک گئے تھے۔ عمران نے اچھی طرح مجید مٹھو کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے کچھ کرنسی، چند رسیدیں، موبائل اور سگریٹ کا پیکٹ ملا۔ یہ ساری اشیاء مٹھو کے رومال میں باندھ کر ایک طرف رکھ دی گئیں۔ ٹارچ کی مدد سے اقبال نے مٹھو کا گرا ہوا پستول بھی ایک پتھر کے نیچے سے ڈھونڈ لیا۔

اس کے بعد عمران نے اُلٹی ہوئی گاڑی کی ڈکی کھولی۔ اس میں بڑے بڑے تین

شاپروں کے اندر بکرے کا بہت سارا گوشت اور ان کے سری پائے پڑے تھے۔ ''یہ اتنی ساری خوراک کس کے لیے لے جا رہا تھا مچھندر؟'' اقبال نے اسے ٹھوکا دے کر پوچھا۔

''تیری بہن کی برات کے لیے۔'' مٹھو ایک دم بھڑک کر بولا پھر اس نے اندھا دھند اقبال پر لات چلائی۔ وار خالی گیا اور مٹھو پھسل کر پشت کے بل گرا۔ عمران نے اسے دبوچ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور چلانے لگا۔ ''حرامزادو! چھوڑ دو مجھے۔ میں تمہاری جان لے لوں گا۔ کتے کی موت ماردوں گا۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے۔''

شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی یہ آہ و بکا اوپر سڑک تک پہنچ جائے اور وہاں سے اسے کوئی مدد مل جائے لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ گرد و پیش کے ٹیلوں کی طرح اوپر سڑک بھی یکسر تاریک اور خاموش تھی۔ اگر ڈرائیونگ کے دوران میں مٹھو نے اپنے کسی مددگار کو فون کیا بھی تھا تو ہمیں اس حوالے سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کھیت کراس کرنے کے بعد دونوں گاڑیاں مین روڈ سے ہٹ گئی تھیں اور اب ہم جہاں پہنچ گئے تھے، وہاں کسی کی رسائی خاصی مشکل تھی۔

ڈکی میں گوشت سے بھرے ہوئے شاپروں کے علاوہ کچھ اوزار اور ایک نائیلون کی رسّی بھی تھی۔ عمران نے رسّی نکالی۔ اس دوران میں اقبال نے کوشش کر کے مٹھو کے منہ میں گاڑی صاف کرنے والا کپڑا ٹھونس دیا تھا اور اس کے گلے کے لاؤڈ اسپیکر کو بے کار کر دیا تھا۔ اس کام میں مَیں نے بھی اقبال کی مدد کی۔ میرے اس تعاون پر عمران دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ٹانگ چلا کر مٹھو کے ہاتھ سے پسٹل چھڑایا تھا۔ میری اس کارکردگی کو بھی عمران نے بڑی تحسین کی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اس حوالے سے میری لمبی چوڑی تعریف بھی کرے گا۔

''باندھو ذرا اس باندر کو...... گاڑی سے۔'' عمران نے بڑے اطمینان سے کہا اور نائیلون کی رسّی اقبال کی طرف اُچھال دی۔

اقبال نے مٹھو کو گھسیٹ کر گاڑی کے قریب کیا پھر وہ دونوں مل کر اسے کار کے دونوں دروازوں کے درمیانی پلر سے باندھنے لگے۔ مٹھو طیش کے عالم میں واویلا کر رہا تھا مگر اب وہ گلے سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکال پا رہا تھا۔ جلد ہی ان دونوں نے اسے بیٹھی ہوئی حالت میں گاڑی کے ساتھ کس دیا۔ یہ سارا عمل بس ڈیڑھ دو منٹ میں مکمل ہو گیا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ مجید مٹھو اپنے علاقے کا نامی گرامی بدمعاش تھا مگر فی الوقت وہ ان دونوں ''سرپھروں'' کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی بے دردی کے ساتھ اس سے بدترین

سلوک روا رکھے ہوئے تھے۔ خاص طور سے عمران کے لیے یہ سب کچھ ایک دلچسپ کھیل کی طرح تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ جو لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتے ہیں، ان کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ ہیچ ہو جاتا ہے۔

چاروں طرف تاریک سناٹا تھا۔ دائیں طرف ٹیلوں سے آگے کئی میل کے فاصلے پر کچھ مدھم روشنیاں نظر آتی تھیں۔ یہ شاید دریائے جہلم کے کنارے آباد کوئی مچھیروں کی بستی تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی اس لیے موسم میں زیادہ خنکی بھی نہیں تھی۔ مجید مٹھو کی گاڑی کے اندر سے ہی ایک کمبل نما دھسا بھی ملا تھا۔ اسے اقبال نے ہموار جگہ پر بچھا دیا تاکہ اس پر بیٹھا جا سکے۔ مجید مٹھو کو باندھنے کے بعد عمران بڑے اطمینان سے ایک پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی۔

''ہاں بھئی...... میاں مٹھو! اب دو ٹوک بات ہو جائے۔'' عمران بولا۔ ''تم نے ہمیں کچھ بتایا ہے یا بس ٹیں ٹیں کی رٹ لگانی ہے۔''

''مجھے تو نہیں لگتا یار! کہ یہ آسانی سے کچھ بتائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے بھی سیب شیب کھلایا جائے یا پھر کوئی کڑوا بادام۔''

''کیوں نہ سگریٹ پلا دی جائے اسے؟'' عمران نے رائے دی۔

''ہاں...... یہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے سگریٹ کی کمی بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔''

''نکالو اس کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اور لائٹر...... لیکن یار ٹھہرو۔ کیوں نہ سگریٹ کے بجائے آج ان اسپیشل ڈے پر اس میاں مٹھو کو سگار پلایا جائے۔ وہاں ہماری گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھے ہیں دو سگار۔'' وہ دونوں اپنی اسپیشل لینگوئج میں بات کر رہے تھے۔

''او کے۔'' اقبال نے عمران کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

وہ چھلانگیں لگاتا ہوا چڑھائی کی طرف گیا۔ پہلے اس نے سڑک پر کھڑی اپنی مہران کار کو سڑک سے اُتار کر بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں کیا پھر سگار لے کر نیچے آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں بھی ''سیب کو سر پر رکھنے'' جیسا کوئی تماشہ ہونے والا ہے۔

عمران نے سگار کا کونا توڑ کر اسے لائٹر سے سلگایا۔ چند بڑے کش لیے اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ یکایک مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ٹینکی سے بہنے والے پیٹرول کی بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پتھریلی اور نیم پتھریلی زمین تھی۔ پیٹرول اس میں پوری طرح جذب نہیں ہوا تھا۔ وہ گاڑی کے اردگرد پھیلا

ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

عمران آگے بڑھا اور اس نے سلگتے ہوئے سگار کو مٹھو سے دو تین فٹ کے فاصلے پر بڑی احتیاط سے ایک اینٹ نما پتھر پر رکھ دیا۔ اس نے سگار اس طرح رکھا تھا کہ اس کا آدھا حصہ پتھر پر اور آدھا ہوا میں معلق تھا۔ پتھر پر وہ حصہ تھا جو سلگ رہا تھا۔ اب اگر یہ حصہ مسلسل سلگتا رہتا تھا تو چند منٹ میں ہلکا ہو جاتا اور سگار پتھر پر اپنا توازن کھو کر نیچے گر جاتا۔ سگار کے پتھر سے گرنے کے بعد جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ بالکل عیاں تھا۔ پلک جھپکتے میں یہ گاڑی اور گاڑی کے ساتھ بندھا ہوا مجید مٹھو آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔

یہ سب کچھ مجید مٹھو کی سمجھ میں بھی آ گیا تھا، لہٰذا وہ اسی طرح پھڑ پھڑانے لگا جیسے طوطا پنجرے کے سامنے بلی کو دیکھ کر پھڑ پھڑاتا ہے۔ اس نے اتنا زور لگایا کہ اُلٹی ہوئی گاڑی کا پورا ڈھانچا ہلنا شروع ہو گیا۔ بہرحال نائیلون کی رسی بہت مضبوط تھی۔ مجید مٹھو کچھ بولنے کی کوشش میں مسلسل غوں غاں کر رہا تھا۔ پھر چند سیکنڈ بعد وہ ایک دم شانت ہو گیا۔ یہ بات جیسے اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ تڑپنے پھڑکنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اگر وہ آنے والے چند منٹ میں ایک خوفناک صورتِ حال سے بچنا چاہتا ہے تو پھر اسے عمران وغیرہ کی ہدایت پر عمل کرنا ہو گا۔ اس کی تبدیل شدہ کیفیت دیکھ کر عمران نے اقبال کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مٹھو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ مٹھو تھوڑی دیر تو واویلا کرتا رہا۔ پھر قدرے پُرسکون ہو گیا۔ وہ واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ اگر اس نے وقت ضائع کیا تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔

عمران نے اس سے کہا۔ ”سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ یہ گوشت سے بھرے ہوئے شاپر کس خوشی میں لے کر جا رہے ہو؟“

”یہ مولانا صدیقی صاحب کے ہیں۔ انہوں نے یتیم خانے کے لیے بھیجے ہیں۔ وہیں دینے جا رہا تھا۔ وہ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو صدقہ وغیرہ بھیجتے ہیں۔“

”صدقہ وغیرہ؟“

”یہ تین کالے بکروں کا گوشت ہے جو یتیم خانے کے بچوں کے لیے ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ یقیناً اس کے بازو کی سنگین چوٹ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور تکلیف دے رہی تھی۔

”تمہیں یہ کب پتا چلا کہ ہم تمہارا پیچھا کر رہے ہیں؟“

”میں یتیم خانے والی سڑک پر مڑ رہا تھا مجھے شک ہوا تھا۔ اس کے بعد.....“

”ہاں.....اس کے بعد؟“

”اس کے بعد میں نے گاڑی کو اِدھر اُدھر گھمایا اور مجھے پتا چلا کہ تم لوگ پیچھے آ رہے

ہو۔“

”تم نے کسی کو اپنے تعاقب کی اطلاع دی؟“

”مم.....میں نے سوچا تو تھا پر اس کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ میں بڑی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔“

شاید مجید مٹھو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ابھی تک اس کے موبائل پر کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلایا ہوتا تو وہ اس کے گم ہو جانے کے بعد رابطہ ضرور کرتے۔

”صدیقی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”بس.....علیک سلیک ہے۔ کسی وقت وہ مجھ سے کوئی کام شام لے لیتے ہیں۔“

”کس طرح کا کام شام؟“

مجید مٹھو نے ڈری ہوئی نظروں سے سلگتے سگار کو دیکھا اور بولا۔ ”انہیں پُرانی چیزیں اکٹھی کرنے کا شوق ہے۔ اس کے لیے مردان، سوات اور ٹیکسلا وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔“

”اور میڈم صفورا سے کیا ناطہ ہے تمہارا؟“ عمران نے اچانک سوال کیا۔

مجید مٹھو ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ”دراصل.....میری جان پہچان میڈم صفورا سے ہی ہے۔ میڈم صفورا کو بھی پرانی چیزوں کا بہت زیادہ شوق ہے۔ میڈم صفورا کا ملنا جلنا صدیقی صاحب سے تھا۔ اس طرح صدیقی صاحب سے بھی علیک سلیک ہو گئی۔“

”دیکھ میاں مٹھو! تجھے ہر بات کھل کر بتانی پڑے گی۔ یہ سگار تجھے زیادہ ٹائم نہیں دے گا۔ یہ گر گیا تو پھر ہم بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”مم.....میں.....کچھ نہیں چھپا رہا تم سے۔“ وہ ٹپٹایا۔

”قادر لمبے کو اپنے گھر میں کیوں چھپایا ہوا ہے تم نے؟“ عمران نے پھر اچانک دھماکا خیز سوال کیا۔

اس مرتبہ مٹھو گھبرا گیا۔ ”کک.....کون.....قادر؟“ وہ ہکلایا۔

”وہی جس کو سیٹھ سراج نے پہلے میڈم صفورا کی کوٹھی میں چھپایا تھا پھر تمہارے حوالے کر دیا۔“

مجید مٹھو ایک دم خاموش ہو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بڑی اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کا واسطہ بڑے خطرناک

لوگوں سے پڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونٹ خود کو پہاڑ کے نیچے محسوس کر رہا تھا۔

''دیکھ میاں مٹھو! یہ بات بھول جا کہ بس ٹائیں ٹائیں کر کے اپنی جان بچا لے گا۔ اگر ٹھوس باتیں بتائے گا تو پھر تیرے بچنے کی کچھ امید پیدا ہو سکتی ہے۔ ورنہ پکی بات ہے کہ کل ٹی وی پر تیری خبر ضرور ملے گی۔ لاہور کے میاں مٹھو صاحب! تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جہلم کے پاس ایک کھائی میں گر گئے اور گاڑی کے ساتھ ہی جل کر بھسم ہو گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے فلاں فلاں کو چھوڑا ہے۔''

مجید مٹھو نے پھر خوف زدہ نظروں سے سگار کو دیکھا۔ وہ اینٹ نما پتھر پر رکھا تھا اور کسی ''بارودی فلیتے'' کی طرح مسلسل سلگ رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ سگار کے ہوا وغیرہ سے گرنے کے امکانات تو نہیں تھے مگر وہ ''اَن بیلنس'' ہو کر کسی بھی وقت گر سکتا تھا۔

مجید مٹھو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں، پر پہلے اسے یہاں سے ہٹاؤ۔'' اس کا اشارہ سگار کی طرف تھا۔

''اسے ہٹائیں گے تو تم بھی پٹڑی سے ہٹ جاؤ گے۔ ہاں...... یہ کر دیتے ہیں کہ اسے تھوڑا سا آگے کھسکا دیتے ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے سگار کو حرکت دی اور اسے تھوڑا سا مزید پتھر پر چڑھا دیا۔

میں عمران کی اس ''انوکھی ترکیب سازی'' پر حیران ہو رہا تھا۔ ایک عام سے سگار کو اس نے ''ٹائم بم'' کی شکل دے دی تھی اور یہ ٹائم بم مجید مٹھو جیسے بے رحم غنڈے کا پتا پانی کر رہا تھا۔ مجید مٹھو کی اس حالت میں کچھ عمل دخل اس کی جسمانی اذیت کا بھی تھا۔ اس کا دایاں بازو کہنی کے اوپر سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کی یہ تکلیف مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مٹھو صاحب! بس مختصر لفظوں میں یہ بتاؤ کہ پرانی چیزوں کی یہ اسمگلنگ کس طرح ہو رہی ہے اور اس میں اور کون کون شریک ہے؟''

''اسمگلنگ؟''

''ہاں...... ہاں...... اسمگلنگ...... ہمارے پاس اس سارے کالے دھندے کے ثبوت ہیں۔ بس، ہم تمہارے منہ سے سننا چاہ رہے ہیں۔''

مجید مٹھو نے پس و پیش کی۔ وہ انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سلگتی ہوئی موت بھی اس کے سامنے تھی۔ سگار کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ ٹینکی سے ہلکا ہلکا رساؤ جاری تھا اور مہلک بُو نتھنوں میں گھس کر شدید خطرے کا احساس دلاتی تھی۔

بالآخر مجید مٹھو نے ہتھیار ڈال دیئے اور عمران جو جو کچھ پوچھتا گیا، وہ بتاتا چلا گیا۔ اس

کی تیز رفتار گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

صدیقی جسے مٹھو نے ایک دو بار مولانا بھی کہا، میڈم صفورا ہی کی طرح نوادرات میں دلچسپی رکھتا تھا اور ان کا بیوپار بھی کرتا تھا۔ یہ لوگ نادر اشیاء کو منہ مانگی قیمتوں پر خریدتے تھے۔ اس کے بعد انہیں ملک سے باہر بھیجتے تھے یا پھر مقامی شوقینوں کو فروخت کرتے تھے۔ میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کے درمیان دوستی تھی لیکن وہ کاروباری حریف بھی تھے۔ کچھ دن پہلے ابرار صدیقی نے ٹیکسلا یا تخت بائی کی طرف سے کوئی نہایت نادر چیز خریدی تھی۔ میڈم صفورا بھی اس شے کی خرید میں دلچسپی رکھتی تھی لیکن اس معاملے میں ابرار صدیقی پہل کر گیا۔ وہ مقامی فروخت کنندہ سے ملا اور اس نے آناً فاناً یہ سودا کر لیا تھا۔ اب وہ شے صدیقی کی تحویل میں تھی۔ پہلے اس نے اسے لاہور میں رکھا تھا لیکن پھر وہاں کسی طرح کا خطرہ محسوس کر کے وہ اسے یہاں جہلم میں لے آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا کے علاوہ کوئی اور پارٹی بھی اس قدیم پیس آف آرٹ کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صدیقی نے صرف اس چیز کی اہمیت بڑھانے کے لیے اور میڈم صفورا کو زچ کرنے کے لیے یہ تیسری پارٹی والا شوشا چھوڑا ہو۔ میڈم صفورا نے سیٹھ سراج کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ وہ کسی طرح ابرار صدیقی سے اس ''پیس آف آرٹ'' کا سودا کرے۔ سیٹھ سراج پچھلے ڈھائی تین مہینے سے صدیقی کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح یہ ''پیس'' میڈم کو فروخت کر دے۔ اس نے میڈم کی طرف سے ''پیس'' کی خاصی قیمت بھی لگائی تھی مگر صدیقی رضامند نہیں ہوا تھا لیکن پھر انہی دنوں اس صورتِ حال میں ایک دلچسپ تبدیلی رُونما ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کا ذکر مجید مٹھو نے ان الفاظ میں کیا۔

ان دنوں قادر لمبا اور اس کا یار شکیل میڈم کی کوٹھی میں چھپے ہوئے تھے۔ لڑکی کے اغوا والے چکر میں انہیں گرفتاری کا ڈر تھا۔ قادر لمبے کی ماں، بیٹے کے لیے بڑی پریشان تھی۔ وہ چوری چھپے دو تین بار بیٹے سے ملنے میڈم کی کوٹھی میں آئی۔ اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کا نام کنول ہے۔ وہ کافی سوہنی ہے۔ ایک دن جب ماں بیٹی کوٹھی میں آئیں تو صدیقی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی نظر لڑکی پر پڑ گئی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ لڑکی ایک دم ان کو بڑی پسند آ گئی۔ سیٹھ سراج بھی اس ویلے وہیں پر تھا۔ سیٹھ کی نظر بھی بڑی تیز ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکی، صدیقی صاحب کے دل کو بھا گئی ہے۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کا سوچ لیا۔ وہ ویسے تو صدیقی صاحب کو خرید و فروخت پر راضی نہیں کر سکا تھا، وہ اس لڑکی کو بیچ میں لے آیا۔ اس نے صدیقی صاحب کو آفر دی کہ اگر وہ اپنی شے بیچنے پر تیار ہو جائیں تو وہ

اس لڑکی کا معاملہ ان کے ساتھ سیدھا کرا دے گا۔ صدیقی صاحب نے تھوڑی بہت رضامندی دکھائی تو سیٹھ اس کام میں لگ گیا۔ اس کو پتا تھا کہ قادر لمبا پولیس کیس سے جتنا زیادہ ڈرے گا، اس کے ماں بہن بھی اتنی ہی ڈرتی جائیں گی اور ان کو اپنے راستے پر لانا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔''

تباہ حال گاڑی کے سامنے مجید مٹھو سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد صورتِ حال کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئیں اور حالات کی ایک واضح تصویر اُبھرنے لگی۔

مجید مٹھو ابھی تک گاڑی سے بندھا ہوا تھا۔ تاہم اس کے راہِ راست پر آنے کے بعد عمران نے سلگتا ہوا سگار پتھر پر سے اُٹھا لیا تھا۔ آخری دس پندرہ منٹ کی گفتگو اس سگار کے بغیر ہی ہوئی تھی۔ تکلیف سے مجید مٹھو کا بُرا حال تھا۔ وہ اب باقاعدہ کراہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے جلد از جلد اس تباہ حال کار سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کی چوٹ کے لیے کچھ کیا جائے تاکہ اسے تکلیف سے نجات ملے۔

عمران نے کہا۔ ''بس پیارے! ایک دو آخری سوال۔ پھر تمہارے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔''

''میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن پہلے مجھے یہاں سے کھولو۔'' وہ کراہا۔

''یار! اتنے بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟ اب ہم نے کچھ زیادہ پوچھنا نہیں ہے۔ بس ایک دو سوال ہی دماغ میں اُبھر رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر سیٹھ سراج، صدیقی کے لیے کنول کو حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس کے لیے اسے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ماں بیٹی تو گھڑے کی مچھلی کی طرح تھیں۔ لال کوٹھی میں آتی تھیں۔ سیٹھ سراج کسی بھی وقت کنول کو بے بس کر کے صدیقی کے سامنے ڈال دیتا۔ سیٹھ جیسے خبیثوں کے لیے ایسے کام تو معمولی کیس ہوتے ہیں۔''

''لیکن صدیقی صاحب اس کام کو اور طرح کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ نماز روزے کے پابند ہیں۔ وہ کنول سے باقاعدہ نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ سیٹھ سراج بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وہ کنول اور اس کے وارثوں کو پریشر میں لا کر راضی کرنا چاہتا ہے۔''

''قادر لمبے کو یہ بات کس نے بتائی تھی کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر مرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ہسپتال میں زخمی پڑی ہے۔'' اقبال نے پوچھا۔

''یہ جھوٹ بھی سیٹھ نے ہی بولا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ قادرے اور اس کے گھر والوں کو

ڈرایا جائے۔ اسے لال کوٹھی سے میرے گھر لانے کی وجہ بھی یہی تھی۔''

''کیا تمہارے محترم صدیقی صاحب کو پتا ہے کہ ان کے لیے کنول کو اس طرح راضی کیا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شروع میں پتا نہیں تھا، پر اب لگ گیا ہے۔ سیٹھ سراج نے ان کی منت کی ہے کہ اب وہ اس معاملے میں خاموش رہیں کیونکہ اب اگر بات کھلی تو وہ سب جھوٹے ثابت ہو جائیں گے۔ سیٹھ نے صدیقی سے کہا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی ذمے داری پر کر رہا ہے اور اس کا کسی پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔''

''یہ تیرا صدیقی بڑی خرانٹ شے ہے میاں مٹھو۔'' عمران نے کہا۔ ''اس جیسے گھنے لوگ مذہب کو موم کی ناک بنا لیتے ہیں۔ جدھر چاہا موڑ لی۔ اس سے تو بڑی اچھی طرح سمجھیں گے ہم۔ شرط یہی ہے کہ بس ایک دفعہ ملاقات ہو جائے حضرت سے۔''

گاڑی سے پیٹرول رسنا اب بند ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹینکی خالی ہو چکی ہے۔ ڈھلوان سے اوپر پتلی سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا ٹریکٹر ٹرالی روشنی بکھیرتی گزرتی تھی اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ پیٹرول کی بُو ابھی تک خنک ہوا میں موجود تھی۔

ایک دم میرے ذہن میں اس افسردہ صورت لڑکے کا خیال آیا جس سے راستے میں مجید مٹھو کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لکڑی کی ورکشاپ میں سے مجید مٹھو کے ساتھ باہر نکلا تھا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے مٹھو سے کہا۔ ''وہ لڑکا کون تھا جس نے رونے والا منہ بنایا ہوا تھا اور تم نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے ورکشاپ میں واپس بھیجا تھا۔''

''وہ...... ایک جاننے والا تھا۔ روزگار کے لیے کویت جانا چاہتا ہے۔ وہاں ورکشاپ میں کارپینٹری سیکھ رہا ہے۔''

''صدیقی اور سیٹھ والے معاملے سے تو اس کا تعلق نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... یہ علیحدہ...... معاملہ ہے۔'' مجید مٹھو نے کراہتے ہوئے کہا۔

عمران، مٹھو کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کون تھا وہ لڑکا؟ نام کیا تھا اس کا؟''

''اکمل...... اکمل سلطان۔''

''رہتا کہاں ہے؟''

''لاہور میں۔''

''تو کام سیکھنے کے لیے یہاں جہلم میں کیوں آ گیا؟'' عمران نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ......بس......لاہور میں رہنا نہیں چاہتا۔ بھائیوں سے جھگڑا ہے۔"

"کہیں اس کے ساتھ بھی تو کوئی غنڈا گردی نہیں کر رہے ہو تم؟"

مجید مٹھو نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا مگر لگتا تھا کہ عمران کا شک برقرار ہے۔ اس نے مٹھو سے سوال جواب جاری رکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پریشر میں لانے کے لیے ایک بار پھر سگار سلگایا۔ سگار کی دہشت بڑی کارگر تھی۔ دوسری طرف بازو کی تکلیف بھی مٹھو کو بے حال کر رہی تھی۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے ایک دم ہتھیار ڈال دیئے۔ اپنے سر پر عمران کے بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر کھا کر مجید مٹھو نے یہ انکشاف کیا کہ اکمل دراصل قادر لمبے کا ماموں زاد بھائی ہے اور وہ قادر کی بہن کو پسند کرتا ہے۔

یہ چکرا دینے والا انکشاف تھا۔ عمران کے ایک سوال کے جواب میں مجید مٹھو نے اعتراف کیا کہ اس نے اکمل کا نام غلط بتایا ہے۔ اس کا اصل نام فیاض ہے۔ فیاض اور کنول ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اب فیاض پاکستان سے باہر جانا چاہ رہا ہے۔

عمران نے کہا۔ "تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ فیاض باہر جانا نہیں چاہ رہا بلکہ تم اسے بھیج رہے ہو۔ اپنا اور صدیقی کا رستہ صاف کرنے کے لیے۔"

جواب میں مجید مٹھو خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے بازو کی تکلیف برداشت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے سفاک لہجے میں اقبال سے کہا۔ "یہ لاتوں کا بھوت ہے...... لاتیں پڑتی رہیں گی تو بولتا رہے گا۔ سگار رکھو اس کے سامنے۔"

اس مرتبہ عمران کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجید مٹھو اندر تک ہل گیا۔ اپنے خشک ہونٹ تر کرنے کے لیے اس نے پانی مانگا۔ اقبال نے بوتل سے اسے پانی پلایا۔ اس کے بعد مٹھو نے درخواست کی کہ سگار اس کے سامنے سے اُٹھا لیا جائے۔ وہ فیاض کے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپائے گا۔ عمران نے سلگتا ہوا سگار جس کی حیثیت اب ٹائم بم سے کم نہیں تھی، مٹھو کے سامنے سے اُٹھوا لیا۔

"ہاں......اب بتاؤ۔ کہاں غائب کرنا چاہ رہے ہو لڑکے کو؟"

"غائب کرنے کی بات نہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں پاکستان سے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ورک ویزے پر بھجوا دیتا ہوں۔"

"اب لگے ہاتھ یہ بھی بتاؤ کہ وہ کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"تم تینوں سمجھ ہی گئے ہو۔ وہ کنول کو پسند کرتا ہے، پر اب کنول اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی۔ وہ سمجھ گئی ہے کہ اگر وہ اپنے بھائی کو بچانا چاہتی ہے تو پھر اس کو صدیقی صاحب

سے شادی کرنی پڑے گی۔ دو تین ہفتے پہلے کنول کے گھر میں فیاض اور کنول کی بات ہوئی تھی۔ دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ کنول نے کہا تھا کہ وہ بار بار ان کے گھر کے چکر نہ لگائے، اس طرح ان کی بدنامی ہوتی ہے۔ کنول کی ماں نے بھی فیاض کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل کنول اور فیاض قریباً ہم عمر ہی ہیں۔ کنول کی ماں نے فیاض سے کہا کہ کنول کی شادی کی عمر گزری جا رہی ہے اور ایک سال کے اندر اندر وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ابھی بے روزگار ہے۔ دو تین سال سے پہلے کمانے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کنول کا خیال چھوڑ دے۔ اس کے بعد سے فیاض بڑا بددل تھا۔ اُلٹی سیدھی باتیں سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ میں اس کام میں اس کی مدد کروں گا۔"

عمران نے کہا۔ "میاں مٹھو! میرے خیال میں اب بھی تم آدھا سچ بول رہے ہو۔ تم نے اس لڑکے کو سمجھایا نہیں بلکہ دھمکایا ہے۔ چلو وقت کے ساتھ یہ پول بھی کھل جائے گا۔"

"لڑکے کو لڑکی کے بدلے ہوئے رویے کی اصل وجہ کا پتا چلا ہے یا نہیں؟" اقبال نے سوال کیا۔

"بس اس کا یہی اندازہ ہے کہ کنول کی ماں اپنی بیٹی کی شادی کسی کھاتے پیتے بندے سے کرنا چاہ رہی ہے۔"

مٹھو سے کافی سوال جواب ہو چکے تھے۔ عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا۔ ہم تباہ حال گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے؟" عمران نے اقبال سے پوچھا۔ اس کا اشارہ مجید مٹھو کی طرف تھا۔

"اس نے ہماری گاڑی دیکھ لی ہے اور ممکن ہے نمبر وغیرہ بھی پڑھ لیا ہو۔ اب ہم اسے چھوڑیں گے تو مصیبت میں پڑیں گے۔ اس کے علاوہ سیٹھ اور صدیقی وغیرہ بھی ایک دم ہوشیار باش ہو جائیں گے۔" اقبال نے کہا۔ اس نے بڑے اسٹائل سے سگار ہونٹوں میں دبا رکھا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، لگاؤ اس کو بھی انجکشن اور گاڑی میں ڈال لو۔ چار پانچ گھنٹے تو انٹا غفیل رہے گا۔ اتنے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔"

"انجکشن ہے گاڑی میں؟" اقبال نے کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرے خیال میں ایک پڑا ہوا ہے۔ دیکھ لو نہیں تو پھر گولیوں سے کام چلائیں گے۔"

اقبال اوپر گاڑی کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ دور نیچے نشیب میں

کچھ ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں ایک دو روشنیاں شاید لالٹینوں کی تھیں، باقی ٹارچوں کی لگتی تھیں۔ یہ روشنیاں ڈھلوان پر قریباً ایک کلومیٹر دور ہوں گی۔ وہ سُست روی سے جائے حادثہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''لگتا ہے۔ کچھ لوگ اسی طرف آ رہے ہیں۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''تو پھر چلتے ہیں، اس کو انجکشن وغیرہ گاڑی میں ہی لگا لیں گے۔'' عمران نے سرگوشی کی۔

اقبال نے میرے ساتھ مل کر مجید مٹھو کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ عمران اپنی موجودگی کی دیگر نشانیاں ختم کرنے لگا۔ رسیاں کھل گئیں تو مجید مٹھو درد سے کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میرا بازو ٹوٹ رہا ہے۔ ہاتھ کھول دو۔''

واقعی وہ شدید اذیت میں تھا۔ ٹوٹے ہوئے بازو کو پیچھے موڑ کر باندھا گیا تھا جس کی وجہ سے بازو کی شکل عجیب ہو گئی تھی۔

اقبال نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور یہ غلطی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ہاتھ کھولنے سے پہلے ہی پستول اپنے ہاتھ میں کر لیتا۔ لیکن پستول ابھی تک اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ یہ مجید مٹھو والا بریٹا پستول ہی تھا۔ مجید مٹھو جو بالکل نڈھال بلکہ نیم جان تھا، موقع دیکھ کر ایک دم حرکت میں آیا۔ اس نے پھرتی سے پستول پر جھپٹا مارا۔ پستول تو اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس سے پہلے ایک اور کام ہو گیا اور اس کام کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ مجید مٹھو کو بھی نہیں تھی۔ اقبال کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار ہوا میں اُچھلا اور پیٹرول پر جا گرا۔ پستول چھیننے کے بعد مجید مٹھو ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا تھا اور گاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اچانک بھک بھک کی زوردار آوازوں سے آگ بڑھکی اور اس نے مجید مٹھو اور اقبال کو لپیٹ میں لے لیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم پتھرا کر رہ گئے۔ مٹھو گاڑی کے زیادہ قریب تھا اس لیے وہ پورے کا پورا آگ کی زد میں آیا۔ اقبال کا نچلا دھڑ بھی آگ میں تھا۔ اقبال چلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ عمران نے اس موقعے پر زبردست حاضر دماغی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے نیچے بچھا ہوا کمبل نما دھسا اُٹھایا اور اقبال پر پھینک دیا۔ شعلے پوری طرح بھڑکنے سے پہلے ہی دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر دوسری طرف کا منظر دیکھنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔

مجید مٹھو نے سرتاپا آگ پہن لی تھی اور بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔ وہ چند قدم مخالف

سمت میں دوڑا پھر ایک دم ٹھوکر کھا کر گرا اور کھائی میں لڑھک گیا۔ قریباً چالیس فٹ نیچے پتھریلی زمین سے اس کے ٹکرانے کی آواز بڑی لرزہ خیز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی مجید مٹھو کی کربناک آہ و بکا دم توڑ گئی تھی۔ پیٹرول، دھوئیں اور جلتے گوشت کی بُو نے فضا کو ایک دم مکدر کر دیا تھا۔

فوری طور پر ہم میں سے کوئی بھی ہمت نہ کر سکا کہ کنارے پر جا کر مجید مٹھو کا حشر دیکھ سکے۔ اقبال کی آگ بجھ گئی تھی تاہم وہ نڈھال سا زمین پر پڑا تھا اور یہی وقت تھا جب ایک خوفناک دھماکا ہوا اور پوری گاڑی آگ کا گولا بن گئی۔ اس کا گیس سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ گاڑی کے کئی جلتے ہوئے ٹکڑے اُڑ کر دور تک گئے۔ عمران نے ٹارچ تھامی اور دل کڑا کر کے نشیب میں اُترا۔ میں بھی چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے گیا۔ میں نے دس پندرہ قدم کی دوری سے دیکھا، مجید مٹھو کا سلگتا ہوا جسم پتھروں اور سرخی مائل مٹی کے درمیان بے حرکت پڑا تھا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں اس کا سر ایک طرف سے بالکل پچکا ہوا نظر آیا۔ وہ مر چکا تھا۔ ہاں وہ شخص جو فقط ایک ڈیڑھ منٹ پہلے زندہ تھا اور بول رہا تھا، اب مٹی کا خونچکاں ڈھیر بن چکا اور بہت دور جا چکا تھا۔ یہی حیات کی بوالعجبی ہے۔

ہم ڈرتے ہوئے واپس آئے۔ عمران نے مجید مٹھو کا کمبل نما دھسا اُٹھا کر شعلوں میں پھینکا پھر اس کا پستول بھی ٹھوکر مار کر آگ میں پھینک دیا۔ نشیب سے اوپر آتی ہوئی روشنیاں اب نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ یقیناً ان کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ آنے والے اب کسی بھی وقت موقعے پر پہنچ سکتے تھے۔ اقبال بغیر سہارے کے چلنے کے قابل تھا۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور دوڑتے ہوئے کار تک پہنچ گئے۔ چند ہی لمحے بعد ہماری گاڑی بل کھاتی پتلی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ہمارا رُخ واپس جہلم شہر کی طرف تھا۔

اقبال کی پتلون تقریباً نیکر کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ مجھے اس کی ٹانگوں پر جلنے کے سرخی مائل نشان نظر آئے۔ کہیں کہیں جلد چھل بھی گئی تھی۔ تاہم وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''سوری یار! جو کچھ ہوا بالکل اچانک ہوا۔'' اقبال بولا۔ ''میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ مجھے سگار منہ میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''مجھے بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس حالت میں ایسا کام کرے گا۔ بڑا ڈھیٹ پن دکھایا اس نے۔ لگتا ہے کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ سخت جان تھا۔'' عمران نے کہا۔ میری نگاہوں میں سگار گرنے اور پھر ایک دم آگ بھڑک اُٹھنے کے مناظر گھومنے لگے۔ مجید مٹھو کا پچکا ہوا سر اور پھر سرخی مائل مٹی کو مزید سرخ کرتا ہوا اس کا خون...... مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کے

ساتھ ہی یہ خوف دامن گیر ہوا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ ایک نہایت سنگین واقعے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ اگر پولیس تفتیش میں یہ حاشہ...... حاشہ نہ رہتا، قتل بن جاتا تو پھر میں بھی ملزمان کی فہرست میں آتا تھا۔

عمران کے اپنے چہرے پر بھی قدرے پریشانی کے آثار تھے لیکن جب اس نے مجھے پریشان دیکھا تو ایک دم اس نے اپنا مخصوص موڈ بحال کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ ''آج بہت خاص دن ہے۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات ہو رہے ہیں۔''

''مثلاً؟'' میں نے جل کر پوچھا۔

''اقبال کی پینٹ کا دیکھتے ہی دیکھتے نیکر بن جانا کوئی معمولی واقعہ ہے؟ اور پھر دیکھو یہ کیسی انہونی ہوئی ہے کہ تم جیسے دابو شخص نے بھی آج ببر شیر والا کام کر دیا۔ بروقت ٹانگ چلا کر مجید کے ہاتھ سے پستول چھڑا دیا۔ اس کے بعد جو دھڑا دھڑ انکشافات ہوئے ہیں ہم پر...... وہ بھی کوئی معمولی نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اب اگر پولیس پر بھی دھڑا دھڑ کچھ انکشافات ہو گئے تو پھر کیا ہو گا؟ تم نے مجید کو قریباً ڈیڑھ گھنٹہ رسیوں سے باندھے رکھا ہے۔ اگر اس کے جسم پر رسی کے نشان مل گئے تو اس سارے واقعے کا رُخ ہی بدل جائے گا اور پھر وہ لوگ جو نیچے کسی بستی سے موقعے کی طرف آ رہے تھے، وہ پتا نہیں کون تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بندہ پہلے اُلٹی ہوئی گاڑی کو دیکھ گیا ہو اور پھر نیچے سے بستی والوں کو لے کر اوپر آ رہا ہو۔ ایسے میں یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ہماری گاڑی اور اس کا نمبر بھی دیکھ لیا ہو۔''

عمران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دور سے تمہاری تصویریں بھی اُتار لی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خفیہ پولیس ہی کا کوئی بندہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے پھرتی دکھائی ہو اور ہماری اس مہران کے نیچے سگنل چھوڑنے والی کوئی ڈیوائس بھی لگا دی ہو۔ یار! ایک تو تم سب سے پہلے وہ بات سوچنے لگتے ہو جو سب سے بعد میں اور سب سے بُرے حالات میں سوچنی چاہیے۔ بالکل پُرسکون رہو۔ کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ سے اور اپنی پولیس کی طرف سے پُرامید رہو۔ ہماری پولیس تفتیش کرتے ہوئے غور و فکر کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے اور غور و فکر کے بغیر موقعے سے کچھ بھی ملنے والا نہیں۔''

''یارو! اب کچھ غور و فکر میری ٹانگوں پر بھی کر لو۔ تھوڑی تھوڑی جلن شروع ہو گئی ہے۔''

''ان کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

اب شہر کی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ عمران نے ایک ٹکا شاپ کے سامنے گاڑی روک

دی۔

''کیا میری ٹانگوں کو مزید روسٹ کرانا ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ سامنے گارمنٹس کی دکان ہے، وہاں سے تمہارے لیے پینٹ لیتے ہیں اور ساتھ ہی میڈیکل اسٹور ہے، وہاں سے دوا مل جائے گی۔ ایک دم فائیو اسٹار کام ہو جائے گا۔''

ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد عمران جینز کی ایک پتلون لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ میں وہ ''ڈرمازین'' مرہم بھی لایا تھا۔ مرہم فوری طور پر اقبال کی ٹانگوں پر لگایا گیا اور اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی پتلون بھی پہن لی۔ عمران گاڑی کو سیدھا ایک ہوٹل لے گیا۔ یہاں تین بیڈ کا ایک کمرہ بک کرانے اور شفٹ ہونے میں ہمیں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے دریائے جہلم کے پل کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔

ہم نے ٹی وی کھولا تو نیوز چینل پر تھوڑی ہی دیر بعد کار حادثے کی پٹی چلنی شروع ہو گئی۔ خبر کچھ اس طرح دی جا رہی تھی۔ برانچ روڈ پر کار کھائی میں گر گئی۔ گیس سلنڈر پھٹنے سے آگ لگ گئی۔ جانی نقصان کا اندازہ لگایا جا رہا ہے۔

چند منٹ بعد یہ خبر دی جانے لگی۔ کار سوار شخص موقع پر ہلاک۔ آگ حادثے کے کافی دیر بعد لگی، عینی شاہدین کا بیان۔ موقعے پر گوشت سے بھرے ہوئے تین بڑے شاپر بھی ملے ہیں۔

''بند کرو جگر اس کو...... خوامخواہ کی ٹینشن ہے۔'' عمران نے کہا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ عمران، اقبال کے لیے کھانے والی دوا لایا تھا، اس کے علاوہ ایک انجکشن بھی تھا۔ اس نے اقبال کو انجکشن دیا۔ جلد ہی اسے تکلیف میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ وہ دونوں یوں صورتِ حال پر تبصرہ کرنے میں مصروف ہو گئے جیسے کوئی خاص واقعہ رُونما ہی نہیں ہوا۔ پتا نہیں وہ کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

مجھے آج پھر سکون بخش گولیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ دو گولیاں اکٹھی نگل لیں اور اپنا دھیان دو گھنٹے پہلے رُونما ہونے والے واقعات سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹی وی کی خبروں سے امید تو پیدا ہو گئی تھی کہ شاید اس حادثے کو اتفاقیہ ہی سمجھا جائے گا۔ یہ ایک بالکل ویران سڑک کے کنارے ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ عمران نے بڑی ہوشیاری سے موقعے پر سے ساری شہادتیں ختم کر دی تھیں۔ تیسری حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اپنے تعاقب کے دوران میں مجید مٹھو کسی ساتھی سے رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔

جلد ہی میں سو گیا۔ اگلی صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی ذہن میں رات والے واقعات کی تشویش نے آ گھیرا۔ دل پر ایک دم بہت سا بوجھ پڑ گیا۔ اب کیا ہو گا؟ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ بتدریج ایک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ دن کے ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ سکون بخش گولیوں کا خمار ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ حسبِ معمول عمران اور اقبال ناشتہ کر چکے تھے بلکہ وہ چوتھا شخص بھی کر چکا تھا جو ان کے ساتھ ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے ہم نے کل شام لکڑی کی ورکشاپ سے مجید مٹھو کے ہمراہ نکلتے دیکھا تھا۔

مجھے جاگتے دیکھ کر عمران نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی لڑکے کا جائزہ لیتے ہوئے، عمران کے پیچھے ہوٹل کی بالکونی میں آ گیا۔ نیچے سڑک پر جہلم کا ٹریفک رواں دواں تھا۔ عمران مدھم آواز میں بولا۔ ''تم نے پہچان لیا ہو گا، یہ وہی فیاض ہے جس کے بارے میں کل رات مجید مٹھو نے بتایا تھا۔ یہ قادرے کی بہن کو پسند کرتا ہے۔''

''لیکن یہ یہاں کیسے پہنچا؟''

''میں سویرے اسے ورکشاپ سے نکال کر یہاں لایا ہوں۔ اس کے سامنے مجید مٹھو وغیرہ کی کوئی بات نہیں کرنی۔ میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں اور اس کی مدد کرنا چاہ رہے ہیں۔ پہلے تو وہ بہت ڈرا ہوا تھا، پر اب نارمل ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔''

''بس سوچ کا فرق ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ہم پھنس رہے ہیں لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ ہم پھنس نہیں رہے بلکہ کسی پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہیں۔ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سکون محسوس کر رہا ہوں اور تمہارے چہرے پر ساڑھے دس بجے ہی بارہ بج گئے ہیں۔''

''کس پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہو؟''

''اس فیاض کو۔ یار! یہ بڑا دُکھی بندہ ہے۔ اس کو پیار کا روگ لگا ہوا ہے اور تم...... تو خود

اسی کشتی کے سوار ہو۔ ایک عاشق کو تو دوسرے عاشق کا درد سمجھنا چاہیے۔ تم اس تکلیف کو محسوس نہیں کرو گے تو کیا ہم جیسے کریں گے جنہوں نے کبھی اس ''گلی'' میں قدم ہی نہیں رکھا۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور مسکرانے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ فیاض صوفے پر کندھے جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے خوبرو چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا، ہاتھ میں وہی کھردرا پن محسوس ہوا جو محنت مشقت کرنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

میرے جاگنے سے پہلے شاید وہ لوگ کنول کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اب یہ گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوئی۔

عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہاں...... کیا کہہ رہے ہو تم؟''

وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے سر جی! وہ بہت بدل گئی ہے۔ شاید وہ اب میرا ساتھ دینا ہی نہیں چاہتی۔''

''وہ بدلی نہیں۔ اسے بدلا گیا ہے۔ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں کافی کچھ پتا کیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ اس کا بھائی قادر اور والدہ کچھ بُرے لوگوں کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ بتا نہیں سکتی اس لیے بے وفائی کا الزام اپنے سر پر لے رہی ہے۔ آہستہ آہستہ ساری باتیں تم پر کھل جائیں گی۔ تم فی الحال ان باتوں کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ اپنے پھوپھی زاد قادرے کے بارے میں تمہیں کیا پتا ہے؟''

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر مرعوب لہجے میں بولا۔ ''سر جی! مجھے تو بس یہی پتا ہے کہ قادر بھائی کا اُٹھنا بیٹھنا کچھ خراب لڑکوں میں تھا۔ انہوں نے پھر محلے کی ایک لڑکی کو سڑک سے اُٹھایا۔ قادر بھائی بھی اس معاملے میں پھنس گیا۔ جن لڑکوں کا اصل قصور تھا، وہ تو امیر گھروں کے تھے۔ ان کے گھر والوں نے انہیں دائیں بائیں کر دیا۔ اب اس واردات کا بہت سارا بوجھ قادر بھائی پر آ رہا ہے۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے کہیں چھپا ہوا ہے۔ پولیس اس کے گھر والوں کو تنگ کرتی رہتی ہے۔ پھوپھی بہت پریشان ہے۔''

''اچھا...... مجید مٹھو سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟''

''میں ان دنوں بڑا پریشان تھا جی۔ مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ بچوں کے ایک پارک میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ مجید صاحب میرے پاس آ بیٹھے۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی

کی باتیں کیں۔ میری کہانی سنی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے حالات اچھے کرنے کے لیے کویت چلا جاؤں۔ انہوں نے اس سلسلے میں میری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی ہنر ہے؟ میں نے بتایا کہ ہنر تو کوئی نہیں۔ ایف اے کیا ہوا ہے، اب اپنے محلے میں ایک جنرل اسٹور چلاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں تین چار ہفتے لگا کر تھوڑی سی کارپینٹری سیکھ لوں۔ اس کے بعد وہ مجھے ورک ویزے پر باہر بھیج دیں گے۔ جو تھوڑے بہت پیسے میرے پاس تھے، وہ میں نے انہیں دے دیئے۔ انہوں نے کہا کہ باقی پیسے میں باہر جانے کے بعد بھیج دوں۔ مجھے مجید صاحب کے بارے میں زیادہ پتا نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کو مجھ سے ہمدردی ہے۔''

فیاض ''ہمدردی ہے'' کے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی تک مجید مٹھو کے المناک انجام سے بے خبر ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ کل رات اپنی ہی چالاکی کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا ہے۔

عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں مجید مٹھو سے کبھی ملا نہیں لیکن جہاں تک مجھے پتا ہے، اس کی شہرت ایک غنڈے کی ہے۔ ایسے لوگ بلاوجہ کسی سے ہمدردی نہیں جتاتے۔ تمہاری بات سننے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مجید بھی ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے جنہوں نے قادر اور اس کے گھر والوں کو اپنے چکر میں پھنسایا ہوا ہے۔ یہ لوگ صرف کنول کو شادی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کر رہے ہیں۔ تمہیں اگر باہر بھیجا جا رہا ہے تو اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تمہیں کنول اور قادر وغیرہ سے دور کرنا چاہتے ہیں۔''

فیاض کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے عمران کی باتوں پر یقین آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس یقین کے بعد اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی بیتابی کروٹیں لینے لگی تھی۔

''تم کب جا رہے تھے کویت؟'' اقبال نے پوچھا۔

''اگلے ہفتے جی...... پاسپورٹ بننے گیا ہوا ہے۔ میڈیکل بھی مجید صاحب نے کروا دیا تھا، اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا...... لیکن...... لیکن۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''کہو...... کہو۔'' عمران نے اسے حوصلہ دیا۔ ''تم ہم پر پورا اعتماد کر سکتے ہو۔ پورا اعتماد کرو گے تب ہی ہم تمہاری مدد کر سکیں گے۔''

''جو کچھ آپ بتا رہے ہیں جی...... اس کے بعد تو میں باہر جانے کا نہیں سوچوں گا۔ میں ایک بار پھر کنول سے ملنا چاہتا ہوں اور پھوپھی جان سے بھی۔''

''تمہیں ضرور ملنا چاہیے۔ بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں قادرے سے بھی ملاقات کرنی چاہیے۔''

''مگر قادر بھائی کا تو مجھے پتا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟'' فیاض نے کہا۔

''گھبراؤ مت، اس کو بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' عمران نے فیاض کا شانہ تھپکا۔

عمران کے اس انداز نے مجھے اس دن کی یاد دلا دی جب سیٹھ کے کارندوں نے مجھے مارا تھا اور میں بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کر ریلوے لائن پر سر رکھنے کا سوچ رہا تھا۔ تب بھی عمران ایسے ہی ایک پُرخلوص غم خوار کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر جو تھپکی دی تھی، اس نے میرے اندر زندگی کی توانائی پیدا کی تھی۔ آج ویسی ہی تھپکی وہ فیاض کو دے رہا تھا۔

O......❖......O

ہم نے اگلے چوبیس گھنٹے جہلم کے اسی ہوٹل میں گزارے۔ مجید مٹھو کا موبائل فون ابھی تک عمران کے پاس تھا لیکن اس نے اسے آف کر دیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ضائع کر دے مگر ابھی تک اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اقبال کو اپنی جلی ہوئی ٹانگوں کے سبب چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی تھی تاہم وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔ فیاض ہمارے ساتھ ہی تھا۔ وہ اس سازش سے کافی حد تک آگاہ ہو چکا تھا جو کنول کے گھر والوں کے ارد گرد بُنی جا رہی تھی اور جس سے خود فیاض بھی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگیں۔

ہم اگلے روز جہلم سے لاہور روانہ ہوئے اور قریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد راوی روڈ پر عمران کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں عمران کا ساتھی آصف موجود تھا۔ وہ تیس پینتیس کے پیٹے میں تھا اور درمیانے قد کا خوش باش سا شخص تھا۔ میں اسے عمران کے ساتھ سرکس میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں اس نے قادرے کی دیکھ بھال کی تھی۔ اس نے بتایا کہ قادر رات کو روتا گڑگڑاتا رہتا ہے۔ کل سے اسے تیز بخار بھی ہے۔ بہرحال گھر واپس پہنچتے ہی عمران نے آصف کو فارغ کر دیا اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی عمران نے فیاض کو بتا دیا تھا کہ وہ اس کی ملاقات ایک جانے پہچانے شخص سے کرانے والا ہے۔ اسے دیکھ کر فیاض کو خوشی ہو گی۔ فیاض کے چہرے پر تجسس نظر آ رہا تھا۔

عمران نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں قادر لبے کو رکھا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی قادر کی نظر سب سے پہلے اپنے ماموں زاد فیاض پر پڑی۔ قادر مجسم حیرت بن گیا۔ کچھ بھی

کیفیت فیاض کی بھی ہوئی۔ وہ کبھی قادر اور کبھی عمران کا چہرہ تکتا تھا۔ پھر قادر بھاگ کر آگے آیا اور فیاض سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ فیاض کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جب سے قادر پولیس کے ڈر سے روپوش ہوا ہے، آج پہلی بار فیاض اور وہ مل رہے ہیں۔

قادرا ابھی تک اسی لباس میں تھا جس میں ہم اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ دو دن پہلے میں نے طیش میں آ کر اس سے جو مار پیٹ کی تھی، اس کے آثار ابھی تک دو گہرے نیلوں کی صورت میں اس کے سرخ و سپید چہرے پر موجود تھے۔ ''قادر بھائی! تم کیسے ہو؟ ہم سب تمہارے لیے بڑے پریشان تھے۔'' فیاض نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''یہ سارے سوال جواب بعد میں ہو جائیں گے۔'' عمران نے تیزی سے کہا۔ ''فی الحال تمہیں اپنے گھر میں ایک فون کرنا ہے اور گھر والوں سے چار باتیں کرنی ہیں۔'' عمران کے لہجے میں تحکم تھا۔

''کیا کہنا ہے؟'' قادر ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔'' عمران نے کہا پھر وہ فیاض سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو یار! تم ذرا دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

فیاض اپنے پھوپھی زاد قادر پر ایک پریشان نظر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ قادر کی حالت دیکھ کر یقیناً فیاض جان گیا تھا کہ اسے یہاں زبردستی رکھا گیا ہے اور اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے جیب سے قادر والا سیل فون نکالا۔ یہی فون تھا جس پر دو دن پیشتر قادر کی بہن کنول کا فون آیا تھا اور بعد میں اسی فون سے اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز کی کامیاب نقل کرتے ہوئے صدیقی سے بات کی تھی۔ بعد ازاں عمران نے یہ فون آف کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

فون کو آن کرنے کے بعد عمران نے کہا۔ ''ہاں...... قادر بیٹا! فون پر کال کر کے تم نے اپنی بہن یا امی جان کو یہ بتانا ہے کہ......'' بات کرتے کرتے عمران ایک دم رُک گیا اور پُر سوچ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اسے رُکتے ہوئے پوچھا۔

''ایک منٹ...... میرے ساتھ آؤ'' اس نے کہا۔

ہم دونوں کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر کے برآمدے میں آ گئے۔ ''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یار جی! قادرے کے ساتھ کوئی بھی بھلائی کرنے سے پہلے تم سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اگر تم اسے معاف کرو گے تو میں بھی کر سکوں گا۔ ورنہ پھر بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ۔''

''تو تم اسے چھوڑنا چاہ رہے ہو؟''

''چھوڑیں گے...... تو اس کی بہن زبردستی کی شادی سے بچے گی نا۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آخری فیصلہ تمہارا ہونا ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ قادر کے سامنے آنے کے بعد سے میں نے اس پر جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی۔ اسے بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ گالیاں دی تھیں، ذلیل کیا تھا۔ وہ معافی تلافی کرتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ دہائی بھی دیتا رہا تھا کہ وہ واجی اور اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم اس کے موبائل فون کے ذریعے واجی اور شکیل وغیرہ کے نمبروں پر کال ملانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن وہ دونوں اپنی سم بدل چکے تھے۔ اب اس صورتِ حال میں قادرے کو مزید بند رکھنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں اسے اپنے کیے کی کافی سزا مل چکی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ اس کے گھر والے شدید معاشی بدحالی کا شکار تھے اور اس سارے چکر میں اس کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو رہی تھی۔

اگر بات صرف قادرے کی ہوتی تو شاید میرے دل میں اس کے لیے اتنی جلدی نرم گوشہ پیدا نہ ہوتا مگر یہاں ایک بے گناہ لڑکی کی زندگی اور عزت کا سوال بھی تھا۔ اسے بھائی کے جرم کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب میں کنول اور فیاض کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے اپنا اور ثروت کا دُکھ یاد آ جاتا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا تھا عمران نے...... اگر ایک دل فگار دوسرے دل فگار کے درد کو نہیں سمجھے گا تو اور کون سمجھے گا۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک دم میرا دل آنسوؤں سے بھر گیا۔ میں نے سوچا، میں ایک بے گناہ لڑکی کو برباد ہونے سے بچاؤں۔ شاید اس کے صلے میں قدرت مجھ پر اور ثروت پر بھی رحم کرے۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور عمران ایک بار پھر کمرے میں قادرے کے پاس تھے۔ وہ سکڑا سمٹا صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ عمران نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''تم نے ترس نہیں کھایا تھا لیکن ہم تم پر ترس کھ

رہے ہیں۔ تیری بہن کو بچانا چاہ رہے ہیں جو تیرے کرتوتوں کی سزا زبردستی کی شادی کی شکل میں بھگتنے والی ہے۔ تم بھی سب کچھ جانتے ہو مگر بے غیرت بنے ہوئے ہو۔ اپنی جان چھڑانے کے عوض اپنی بے قصور بہن کو دوزخ میں دھکیل رہے ہو۔ دھکیل رہے ہو یا نہیں؟''

قادرے کے چہرے پر بزدلی اور خوف کی زردی چھائی رہی اور اس کا سر جھکا رہا۔ ندامت کے آنسو اس کی گدلی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

''چل فون لگا اپنی والدہ کو اور ان کو بتا کہ فیاض ان سے ملنے آ رہا ہے۔ وہ ان کے لیے اچھی خبر لا رہا ہے۔ وہ ہر صورت اسے ملنے دیں۔''

''فیاض کو کیا کہنا ہے ان سے؟'' قادر نے دبی آواز میں پوچھا۔

''سوال کرے گا تو مجھے تاؤ آ جائے گا۔ جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کر۔ باقی باتیں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ چل شاباش۔''

قادرے نے عمران کی ہدایت کے مطابق اپنے گھر کال ملائی۔ اس کی بہن کنول نے ہی کال اٹینڈ کی۔ ''بھائی! آپ کہاں تھے؟ اتنی کالیں کی ہیں کہ انگلیاں دُکھنے لگی ہیں۔ آپ نے فون بند کیوں کیا ہوا تھا؟''

''چارجر نہیں مل رہا تھا۔ ابھی ملا ہے۔'' قادر نے بہانہ بنایا۔

''آپ کو پتا چلا ہے کہ کچھ مجید صاحب کے بارے میں؟'' کنول نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' قادر نے چونک کر پوچھا۔

''آپ کو واقعی اب تک پتا نہیں؟'' کنول کی آواز بھرا گئی۔ قادر نے نفی میں جواب دیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''جہلم کے قریب مجید صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ موقعے پر ہی ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے صدیقی صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہے۔''

''او گاڈ......'' قادر نے سر تھام لیا۔ پھر ڈری ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ عمران نے جھلائے انداز میں اشارہ کیا کہ وہ یہ باتیں چھوڑے اور وہ بات کرے جس کے لیے فون کیا ہے۔

اظہار حیرت اور اظہار افسوس کے چند جملوں کے بعد قادرے نے بہن کو بتایا کہ فیاض ایک بہت خاص کام کے لیے ان کے پاس آ رہا ہے اور اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔

''لیکن وہ کیوں آ رہا ہے؟'' کنول جز بز ہو گئی۔

''بس ایک اچھی خبر لا رہا ہے ہم سب کے لیے۔ باقی باتیں بعد میں بتاؤں گا۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ متعجب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ غالباً وہ عمران کے منہ سے اس بات کی تصدیق چاہتا تھا کہ مجید مٹھو واقعی راہی ملک عدم ہو چکا ہے لیکن عمران نے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی اور کمرے سے نکل آیا۔ اس گفتگو کے دوران میں قادر، عمران کی ہدایت پر کنول سے یہ بھی پوچھ چکا تھا کہ صدیقی صاحب تو گھر میں نہیں ہیں یا انہیں آنا تو نہیں ہے؟ کنول نے ان سوالوں کا جواب نفی میں دیا تھا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ عمران، کنول کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ کافی جلدی میں نظر آتا تھا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا مگر جو کچھ بھی تھا، وہ اسے جلد سے جلد نمٹا لینا چاہتا تھا۔ اقبال تو اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے پر قائل کر لیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، اب میں اس کی باتوں سے جلدی قائل ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ اس بھاگ دوڑ میں مجھے ذاتی دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جتنی دیر عمران کے ساتھ مصروفِ عمل رہتا، میرا دھیان اپنے جانکاہ دُکھ کی طرف سے ہٹا رہتا تھا۔

قادرے کا گھر رشید پارک کے علاقے میں تھا۔ پانچ چھ مرلے کا مکان تھا۔ متوسط آبادی تھی۔ قادرے نے بتایا تھا کہ یہ کرائے کا گھر ہے۔ گلی اتنی بڑی نہیں تھی کہ گاڑی پارک کی جا سکتی۔ ہم نے گاڑی سے باہر ہی کھڑی کی۔ فیاض نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے سہمی ہوئی نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔ ''کون؟''

''میں فیاض ہوں پھوپھی جی۔''

چند سیکنڈ بعد ایک پریشان چہرے والی چالیس پینتالیس سالہ عورت نے دروازہ کھول دیا۔ فیاض نے اسے سلام کیا جس کا جواب سپاٹ لہجے میں دیا گیا۔ فیاض نے کہا۔ ''پھوپھی جی! ذرا بیٹھک کا دروازہ کھول دیں۔ میرے ساتھ دو مہمان بھی ہیں۔''

ادھیڑ عمر عورت پہلے ہی تذبذب میں تھی۔ مہمانوں کا سن کر مزید متذبذب ہو گئی۔ اس نے سر تا پا ہمارا جائزہ لیا۔ پھر اُلجھی اُلجھی سی اندر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد گلی میں کھلنے والے ایک دوسرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ یقیناً یہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور ہم اندر چلے گئے۔

اسی دوران میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ قادرے والا فون تھا۔ عمران نے مجھے دیا تھا اور میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ فون اسکرین پر صدیقی صاحب کے الفاظ

چمک رہے تھے۔عمران نے بھی نام پڑھا۔پھر اشارے سے مجھے کہا کہ میں کال ریسیو کروں مگر خاموش رہوں۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے صدیقی کی پریشان آواز آئی۔

''کیا بات ہے قادر! ہیلو......کہاں ہو۔تم......ہیلو۔ میں دس منٹ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔بیل دے رہا ہوں۔ہیلو......ہیلو۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' عمران نے سرگوشی میں پوچھا۔

''لگتا ہے کہ وہ مجید مٹھو کے گھر کے باہر کھڑا ہے۔اس کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ قادر وہاں گھر کے تہ خانے میں ہے۔''

عمران نے کہا۔''ہمیں یہاں زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیے۔اگر ہو سکے تو......''

عمران کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ادھیڑ عمر عورت دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔اس کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا اور سانس تیز چل رہی تھی۔''پھوپھی جان!'' فیاض پکارا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالا۔پھر اس نے آواز دی۔''کنول......کنول۔''

ایک لڑکی چلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ فیاض کے ساتھ مل کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالنے لگی۔ہم نے بھی مدد کی اور عورت کو سنگل صوفے سے اُٹھا کر بڑے صوفے پر لٹا دیا۔

لڑکی پانی لے آئی۔اس نے اپنے ہاتھ سے ماں کو پانی پلایا۔پھر اسے زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی۔لڑکی جو یقیناً کنول تھی،شاید عام حالات میں ہمارے سامنے نہ آتی مگر شدید پریشانی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔وہ اچھی شکل صورت کی تھی۔کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور ناک میں چھوٹا سا کوکا چمک رہا تھا۔ماں کی حالت ذرا سنبھل گئی تو اس نے سر پر دوپٹہ لے لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

فیاض نے صوفے پر ایک طرف دو تکیے رکھ کر کنول کی والدہ کو نیم دراز کر دیا۔کنول نے اسے مزید دوا دی۔عورت کراہتے ہوئے بولی۔''فیاض! ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے۔کیوں ہم سب کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو ہماری جان۔''

وہ باقاعدہ رونے لگیں۔

عمران نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔''خالہ جان! یہ آپ نہیں،آپ کی مجبوریاں بول رہی ہیں اور ہمیں پتا ہے کہ آپ کی مجبوریاں کیا ہیں۔آپ فکر مند نہ ہوں۔اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آ......آپ لوگ کون ہیں؟'' کنول نے پوچھا۔اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

''تم ہمیں اپنے بھائی کا دوست سمجھ سکتی ہو لیکن وہ دوست نہیں جنہوں نے اسے تباہ

کرنے کی کوشش کی بلکہ وہ جو اسے تباہی سے بچانا چاہتے ہیں۔دوبارہ زندگی کی طرف لانا چاہتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''آپ......کچھ نہ کریں بھائی جان!'' کنول نے پھر جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔''ہم اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں۔اللہ نے چاہا تو آٹھ دس دن تک قادر بھائی گھر پہنچ جائیں گے۔'' بات کرتے ہوئے وہ بیچارگی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔اس کا لباس خستہ تھا اور کندھے سے قمیص کی سلائی اُدھڑی ہوئی تھی۔وہ اس کندھے کو بار بار دوپٹے سے ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی۔گھر کی حالت سے بھی غربت جھلک رہی تھی۔

عمران نے کہا۔''میری بہن! ٹھیک ہے کہ آپ دونوں قادر کو بچانے کی کوشش کرتی رہی ہیں لیکن وہ جس طرح کی کوشش تھی،اس کے بارے میں ہم اچھی طرح جان چکے ہیں اور آپ دونوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ اب کسی طرح کی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔وہ مجبوری اب ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے آپ دونوں کو بار بار ابرار صدیقی سے ملنا پڑ رہا تھا اور اس کی ہر ہاں میں ہاں ملانا پڑ رہی تھی۔''

ابرار صدیقی کے نام نے ماں بیٹی کے چہرے متغیر کر دیئے۔''پپ......پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' کنول ہکلائی۔

''تمہیں پتا ہے میری بہن۔'' عمران نے کہا۔''اور آپ دونوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ قادر کے لیے اب کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

قادر کی والدہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''اور اگر دیکھا جائے تو قادر کے لیے کبھی کوئی بڑا خطرہ تھا ہی نہیں۔بے شک اس نے جرم کیا ہے مگر کچھ لوگوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے اس جرم کا سارا بوجھ قادر پر ڈالا ہے۔قادر کو اور آپ دونوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کچھ سوچے سمجھے جھوٹ بولے گئے ہیں۔''

''جھوٹ بولے گئے ہیں؟'' کنول کی والدہ حیران تھیں۔

''آپ کو بتایا گیا ہے کہ جس لڑکی کو اُٹھایا گیا تھا،اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔وہ جل گئی ہے اور ہسپتال میں خطرناک حالت میں پڑی ہے۔اس نے بیان دیا ہے کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے اور اس کا بڑا مجرم قادر ہے،وغیرہ وغیرہ۔یہ ساری باتیں بس ایک ڈرامے کا حصہ ہیں اور ڈراما یہی ہے کہ آپ لوگوں کو اتنا دہشت زدہ کر دیا جائے کہ آپ ہر جائز ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔قادر بالکل خیر خیریت سے ہے اور ہمارے پاس ہے۔اب آپ لوگوں کو تھوڑی سی ہمت کرنا ہو گی اور ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ہو گا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ...... وہ لڑکی ہسپتال میں نہیں ہے اور اس کا بیان؟'' کنول نے حیران لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں ہے۔ یہ سب سیٹھ سراج کی چالبازی ہے۔ وہ بس ایڈووکیٹ صدیقی کے لیے راستہ صاف کر رہا ہے۔''

''پر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟'' کنول کے خوبرو چہرے پر اُلجھن تھی۔

اب عمران اسے کیا بتاتا اور اگر بتاتا بھی تو کنول اور اس کی ماں کی سمجھ میں کیا آنا تھا۔ درحقیقت تو یہ ٹیکسلا یا مردان کے کھنڈر سے نکلی ہوئی کسی ''نادر شے'' کا شاخسانہ تھا۔ وہ شے جو غالباً کسی گندھارن مورتی کی شکل میں تھی اور ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کے پاس تھی۔ اس گندھارن پیس آف آرٹ کو حاصل کرنے کے لیے سیٹھ سراج وغیرہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اس ایڑی چوٹی کے زور میں کنول کا کومل بدن اور اس کا شباب بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ بیچاری بے خبری میں ایک ایسے کھیل کا حصہ بن گئی تھی جو نادر اشیا کی نہایت منافع بخش نقل و حمل سے متعلق تھا۔ اسے رشوت کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اور وہ لاعلم تھی۔

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچی ہے۔ سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے سرِ راہ اس کی گاڑی کو ٹکر لگوائی تھی۔ اس ٹکر کے نتیجے میں گاڑی کے اندر رکھی ہوئی کچھ بوریاں پھٹ گئی تھیں اور ان میں سے چاولوں کے ساتھ مٹی برآمد ہوئی تھی۔ اس مٹی کے ڈانڈے بہت دور جا ملے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ عمران کے تیز رفتار ذہن نے رات کو ہی بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ کنول، اس کی والدہ اور قادر کو فوری طور پر لاہور سے ملتان بھجوانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لیے وہ کافی حد تک انتظام بھی کر چکا تھا۔ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر وہ ماں بیٹی کو پوری طرح قائل کر چکا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور وہ حالات کی اس حیران کن تبدیلی پر ششدر نظر آتی تھیں۔ فیاض کی کیفیت بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ اب ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بڑی اچھی طرح آ رہی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ مجید مٹھو اسے بیرون ملک بھجوانے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا، اس کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس نے یہ ساری بات اپنی پھوپھی اور پھوپھی زاد کنول کو بتائی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر کنول اور اس کی والدہ گھر کو تالا لگا کر ہمارے ساتھ روانہ ہو رہی تھیں۔ گھر میں کوئی ایسا قیمتی سامان تھا ہی نہیں جسے وہاں سے سمیٹا جاتا۔ بس ایک دو گہنے اور تھوڑی سی نقدی تھی۔ یہ چیزیں انہوں نے ساتھ لے لیں۔ ہم واپس راوی روڈ پر پہنچے۔ وہاں

سے قادر کو گاڑی میں بٹھایا گیا۔ قادر نے ماں اور بہن کے گلے لگ کر آنسو بہائے۔ تب اس نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور رو رو کر معافی مانگی۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے دل میں سوچا، میں معافی دینے یا نہ دینے والا کون ہوتا ہوں؟ معافی تو وہ دیں جن کے والدین کی جان اس جرم نے لے لی۔ جن کا گھر اجڑا...... جو دربدر ہوئے۔ قادر کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ ہونے کے باوجود میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عمران ان چاروں کو لے کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ ان چاروں میں قادر، کنول ان کی والدہ اور ماموں زاد فیاض شامل تھے۔ ان کو لاہور اسٹیشن سے ملتان جانے والی ایکسپریس ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ ملتان میں انہیں عمران کے دوست نے محفوظ ٹھکانے تک پہنچانا تھا۔ وقتِ رخصت میں نے کنول کی آنکھوں میں اُمید کی خوبصورت کرنیں دیکھیں۔ کچھ ایسی ہی کرنیں فیاض کی آنکھوں میں بھی تھیں۔

میں بستر پر لیٹا رہا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج قادر اور اس کے گھر والوں کا ملاپ دیکھ کر مجھے اپنے بچھڑے ہوئے بھی شدت سے یاد آنے لگے تھے۔ پتا نہیں کہ کتنا وقت گزر چکا تھا ان سے ملے ہوئے؟ اب تو میں دنوں کی گنتی بھی بھول چکا تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے والے چاند نے میری اُداسی کچھ اور بڑھا دی۔ مجھے لگا کہ ایک زمانہ بیت گیا ہے اپنی والدہ کی گود میں سر رکھے ہوئے اور اپنی بہن کا ماتھا چومے ہوئے اور اپنے بھائی کو گلے سے لگائے ہوئے۔

میری آنکھوں میں نمی جاگنے لگی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کیوں میں اپنے گھر والوں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا؟ اگر میں اپنے محلے میں نہیں جانا چاہتا تھا، اپنی جان پہچان والوں سے نہیں ملنا چاہتا تھا تو یہ اور بات تھی مگر اپنے گھر والوں سے ملنے کا کوئی راستہ تو مجھے نکالنا چاہیے تھا۔ میں دیر تک اس بارے میں غور کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو اقبال میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے ہی مجھے ہلا کر جگایا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یار! عمران ابھی تک نہیں آیا۔ اس کا فون بھی بند ہے۔''

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ ''اتنی دیر کیوں کر دی؟'' میں نے کہا۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک اسے آ جانا چاہیے تھا۔ گیارہ بجے ٹرین چلنی تھی۔''

"لیکن ہماری ٹرینیں لیٹ بھی ہوں تو گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے ہوتی ہیں۔"

"بھئی فون تو کر دیتا۔" اقبال نے کہا اور ایک بار پھر اسے کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"جیلانی یا کسی اور یار دوست کو کر کے دیکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"کیا ہے لیکن کسی کو پتا نہیں۔" اقبال بولا اور ایک بار پھر کسی کو کال ملانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اُٹھ کر چائے تیار کی اور اقبال کے ساتھ مل کر عمران کا انتظار کرنے لگا۔ یہ گھر بارونق علاقے میں تھا۔ سارا دن گلی محلے اور بازار کا شور سنائی دیتا رہتا تھا لیکن اب اس گھر کے اردگرد زندگی سوئی پڑی تھی۔ اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھیں۔ "کوئی بات نہیں یار! کہیں رُک گیا ہوگا۔" میں نے اقبال کو تسلی دی۔

"میں اس لیے پریشان ہوں کہ وہ ایسی غیر ذمے داری دکھاتا نہیں۔ اسے کہیں رُکنا ہوتا تو کسی بھی طرح فون پر اطلاع ضرور دیتا۔"

"ہوسکتا ہے کہ آناً فاناً کوئی کام پڑ گیا ہو۔ وہ خدائی فوجدار تو ہے ہی...... کسی کا مسئلہ حل کرنے میں لگ گیا ہوگا۔ پچھلے ہفتے بھی تو ہم لنچ پر اس کا انتظار کرتے رہے تھے اور وہ چاچے نذیر کو لے کر ہسپتال پہنچا ہوا تھا۔"

ہم باتیں کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کسی ایسی آواز یا آہٹ کے منتظر رہے جو عمران کی آمد کی نوید دیتی۔ بازار سے کوئی گاڑی گزرتی تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے لیکن جلد ہی اندازہ ہوتا کہ یہ عمران کی گاڑی کی آواز نہیں ہے۔

دن چڑھ گیا تھا لیکن عمران کی واپسی نہیں ہوئی۔ اقبال کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ایک تو وہ اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے تکلیف میں تھا، دوسرے عمران کی پریشانی اسے شدید متاثر کر رہی تھی۔ اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بازار کے شیر فروش غلام نبی کا ملازم لڑکا ایک ٹرے میں ہم تینوں کا بھاری بھرکم ناشتہ لیے کھڑا تھا۔ روزانہ یہی لڑکا ناشتہ لے کر آتا تھا۔ نہاری، نان، حلوہ اور زبردست قسم کی لسّی۔

میں ناشتہ لے کر اندر آ گیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ دس بج گئے مگر ہم دونوں میں سے کسی نے ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پریشانی بڑھ رہی تھی۔ عمران جس قسم کے روز و شب گزار رہا تھا، وہ میرے سامنے تھے۔ اس کی دوستیاں بہت تھیں تو دشمنیاں بھی بہت تھیں۔

ساڑھے دس بجے کے قریب جیلانی آ گیا۔ اس نے کہا۔ "ریلوے اسٹیشن سے ہو کر آ رہا ہوں۔ ملتان جانے والی ٹرین صرف پندرہ بیس منٹ کی تاخیر سے سوا گیارہ بجے روانہ ہوگئی تھی۔"

"کہیں اور بھی پتا کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میو ہسپتال اور گنگا رام کی ایمرجنسی دیکھ کر آیا ہوں۔ سرفراز سے کہا ہے کہ وہ آس پاس کے دو تین تھانوں میں پتا کر لے۔ مگر لگتا نہیں کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اگر ہیرو بھائی نے رابطہ کرنا ہوتا تو وہ کہیں سے بھی کر سکتے تھے۔ یا تو وہ کہیں بُری طرح پھنس گئے ہیں یا جان بوجھ کر رابطہ کرنا نہیں چاہ رہے۔"

"کہیں آزاد ہونے کے بعد اس قادر لمبے نے ہی کوئی چکر نہ چلا دیا ہو؟" جیلانی نے کہا۔

"لگتا تو نہیں ایسے۔" اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو بس اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کا اصل چہرہ بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔ وہ ان سے کہیں دور چلا جانا چاہتا ہے۔"

اگلے تین چار گھنٹے بھی شدید پریشانی میں گزرے۔ کہیں سے عمران کا فون آیا اور نہ اس کی گاڑی کا کوئی سراغ ملا۔ قادر کا موبائل بھی عمران ہی کے پاس تھا۔ اس نمبر پر بھی اقبال اور جیلانی نے بہت سی کالیں کیں مگر جواب ندارد۔ اسی دوران میں سرکس سے اسسٹنٹ منیجر عباس کا فون آ گیا۔ اسے عمران کی گمشدگی کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ بھی ازحد پریشان تھا۔ اپنے طور پر وہ بھی عمران کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

سرکس سے فون آیا تو میرا دھیان شاہین کی طرف چلا گیا۔ وہ عمران کی گرل فرینڈ تھی۔ کم از کم عمران کہتا تو یہی تھا۔ وہ اکثر سرکس میں اور پھر فون پر بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ وہ اسے اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کہتا تھا۔ اس نے بچوں کے نام اور پیشے وغیرہ بھی منتخب کر رکھے تھے۔ اس حوالے سے شاہین کے ساتھ اس کی دلچسپ نوک جھوک ہوتی تھی۔ میں نے اقبال سے کہا۔ "یار! کہیں وہ شاہین کے پاس ہی نہ چلا گیا ہو۔"

"نہیں یار! اس کے بارے میں وہ اتنا سنجیدہ نہیں کہ رات گزارنے اس کے پاس چلا جائے۔"

"مگر شاہین کا بھی تو کوئی فون نہیں آیا۔ اگر سرکس میں اس کے گم ہونے کا پتا چل گیا ہے تو شاہین کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔"

''لیکن ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ عباس نے جان بوجھ کر یہ خبر شاہین سے چھپائی ہو۔ وہ بڑی جلدی رونا دھونا شروع کر دیتی ہے۔''

پتا نہیں کیوں مجھے چند ہی گھنٹوں کے اندر اپنے اردگرد ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ عمران کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ اس کی غیر موجودگی کو نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ حواس پر چھا جاتا تھا۔ دل و دماغ میں سرایت کر جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا، ایک دن وہ تھا کہ ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے وہ مجھے سرِراہ ملا تھا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن وہ میرے مُردہ جسم کے ساتھ زندگی بن کر چمٹ گیا تھا۔ میں دو تین روز اس کوشش میں رہا تھا کہ موقع ملتے ہی اس کے پاس سے کہیں کھسک جاؤں لیکن آج یہ صورتِ حال تھی کہ اس کی غیر موجودگی مجھے اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنی تمام تر پریشانیوں کے ساتھ میں ایک دم اکیلا رہ گیا ہوں۔ کسی کی خوبصورت مسکراہٹ، کسی کی چوڑی چھاتی اور مضبوط بازوؤں نے میرے اردگرد حفاظت کا جو حصار سا بنا رکھا تھا، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ میں اسے دوبارہ دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

شام کے سات بجے تھے۔ جیلانی اور سرفراز، عمران کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ گھر میں اقبال اور میں تھے۔ کال بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا اور چونک گیا۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ یہ عمران کا وہی پرانا دوست تھا جس نے ایک رات ہمیں میڈم کی لال کوٹھی سے بروقت نکالا تھا اور ایک بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ بعد میں وہ یہاں عمران سے ملنے بھی آیا تھا۔ آج کافی دنوں بعد میں دوبارہ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ ''السلام علیکم'' اس نے کہا اور لنگڑاتا ہوا تیزی سے اندر آ گیا۔

''خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔ ''اقبال کہاں ہے؟'' میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کوئی اور تو نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں۔''

ہم دونوں کمرے میں اقبال کے پاس آ گئے۔ اقبال نے اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے نیکر پہن رکھی تھی اور کسی کو فون کر رہا تھا۔ سلیم کو اور اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر وہ بھی چونک گیا۔ سلیم نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''اقبال بھائی! اچھی خبر نہیں ہے۔ ہیرو بھائی کو میڈم کے گارڈز نے پکڑ لیا ہے اور کوٹھی لے گئے ہیں۔ میڈم کو بہت کچھ پتا چل گیا ہے۔''

یہ دھماکا خیز اطلاع تھی۔ اندیشے تو ہمارے ذہنوں میں بہت سے تھے لیکن یہ تو بدترین

اندیشہ تھا جو حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' اقبال نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے اقبال بھائی! عمران بھائی کی گاڑی بھی لال کوٹھی میں ہے۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک میرے اندازے کے مطابق گاڑی کے اندر سے نہیں ملی لیکن رجسٹریشن آفس سے تو ایڈریس کا پتا چل سکتا ہے۔ اگر رجسٹریشن میں یہاں کا ایڈریس ہی لکھا ہے تو میڈم کے بندے کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہیرو بھائی کے بعد اب آپ دونوں بھی سخت خطرے میں ہیں۔ آپ دونوں کو فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

''لیکن...... یہ سب ہوا کیسے؟''

''میں نے کہا ہے نا بھائی! یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ آپ بس فوراً یہاں سے نکلیں۔ میں خود کو سخت خطرے میں ڈال کر صرف آپ کی خاطر یہاں آیا ہوں۔''

''ہم کہاں جا سکتے ہیں؟''

''کہیں بھی...... لیکن یہاں سے تو فوراً نکلنا ہو گا۔''

''کیسے جائیں گے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''میں ایک دوست کی سوزوکی وین لایا ہوں۔ بازار کے کونے پر کھڑی ہے۔''

سلیم کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ واقعی پریشان ہے اور جو کہہ رہا ہے خلوص سے کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں نے آپس میں مختصر مشورہ کیا اور سلیم کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اقبال نے پتلون پہنی اور کچھ ضروری اشیاء ایک شولڈر بیگ میں رکھیں۔ ان میں کولٹ پسٹل اور اس کی قریباً پانچ درجن گولیاں بھی تھیں۔

سلیم نے کہا۔ ''اپنے باقی ساتھیوں کو بھی اطلاع دے دو کہ ان میں سے کوئی بھی اب یہاں نہیں آئے۔ وقتی طور پر یہ سارے لوگ اپنے ٹھکانوں سے اِدھر اُدھر ہو جائیں۔''

اقبال نے جیلانی کا نمبر ملایا اور اسے مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اسی دوران میں سلیم سوزوکی وین کو بالکل گھر کے دروازے کے پاس لے آیا۔ یہ اقبال کے لیے بہتر تھا۔ اپنی زخمی ٹانگوں کے ساتھ چلنا اس کے لیے کافی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد ہم گھر کو تالا لگا کے سوزوکی وین میں سوار ہو رہے تھے۔ میں سلیم کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اقبال پچھلی نشست پر چلا گیا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ بازار کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ دکانوں پر رش تھا۔ ٹی وی چل رہے تھے، قہقہے گونج رہے تھے۔ ایک تھڑے پر

چاچا نذیر، میاں اکبر اور ان کے دیگر عمر رسیدہ ہم جولی چائے پینے اور گپیں لگانے میں مصروف تھے۔ زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ اس کا موسم عموماً ایک ہی رہتا ہے۔ تاہم دیکھنے والی آنکھ کے لیے یہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کا تعلق انسان کے اپنے اندر کے موسم سے ہوتا ہے۔ ہمارے اندر دُکھ، پریشانی اور کسی حد تک خوف کا موسم تھا اور اس کیفیت کی وجہ سے ہمارے اردگرد موجود زندگی کی کیفیت بھی بدل گئی تھی۔

ڈبل ڈور وین سُست روی سے چلتی بازار سے گزری اور پھر بڑی سڑک پر آگئی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی جیسے سلیم کی شدید پریشانی ماند پڑنا شروع ہوگئی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اب تم دونوں کم از کم فوری مصیبت سے تو بچ گئے ہو۔ اب کسی بازار کے چائے خانے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر سوچ لو کہ اب کہاں جانا ہے۔''

''عمران! ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے اندرونی بیتابی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''تابش بھائی! میں آپ لوگوں کو جھوٹی تسلی دینا نہیں چاہتا۔ انہوں نے عمران بھائی سے مار پیٹ کی ہے لیکن...... یہ تو شروعات ہے۔ آگے کیا ہوگا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میڈم بہت زیادہ غصے میں نظر آتی ہے۔''

گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رُکی۔ یہ مینار پاکستان کا علاقہ تھا۔ منٹو پارک کی طرف جانے والی سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ ایک شخص دائیں طرف سے گاڑی کے قریب آیا۔ میں سمجھا کہ وہ مانگنے والا ہے یا پھر راستہ پوچھنے والا۔ اچانک اس نے گاڑی کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا اور اقبال کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عین اسی لمحے بائیں طرف والے دروازے پر بھی ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے ادھ کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر لاک ہٹایا اور دروازہ کھول کر اقبال کی بائیں طرف بیٹھ گیا۔

یہ اتنی تیزی اور صفائی سے ہوا کہ بھری پُری سڑک کے باوجود کسی کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ دیکھنے والوں کو بالکل یہی لگا ہوگا کہ اندر آنے والے ہمارے شناسا ہیں اور ہم نے شاید انہیں سرِ راہ لفٹ دی ہے۔ پہلے داخل ہونے والے شخص نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

''میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔''

اس کی آواز میں موجود سنگینی گواہ تھی کہ وہ صرف دھمکا نہیں رہا۔ میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ہاتھ بڑھا کر میری سائیڈ والے دروازے کو لاک کر دیا اور احتیاطاً اپنا ہاتھ لاک کے اوپر ہی رکھا تاکہ میں اچانک باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کے پاس سے الکحل اور

سگریٹ کی ملی جلی بُو آ رہی تھی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ منطقی طور پر پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے عمران پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، سلیم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ''خبردار سلیمے۔'' دائیں طرف والا شخص پھنکارا۔ ''اب کوئی چالاکی دکھائی تو یہیں پر ڈھیر کر دوں گا اور پستول پر سائلنسر چڑھا ہے، کسی کو آواز تک نہیں آئے گی۔ تیرا کھوپڑا ٹوٹنے کی۔''

بولنے والے کی آواز میں ایسی درندگی تھی کہ سلیم بے ساختہ اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہوگیا۔

''چل...... اشارہ کھل گیا ہے۔ بس چپ چاپ سیدھا چلتا جا۔ جہاں مڑنا ہوگا، تمہیں بتا دیں گے۔''

اب اس بات میں شبہ کم ہی رہ گیا تھا کہ یہ میڈم نادیہ یا صفورا کے پالتو غنڈے تھے۔ ممکن تھا کہ کسی شک کی بنا پر انہوں نے سلیم کا پیچھا کیا ہو اور یہاں تک پہنچ گئے ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد یہ ''پیچھے'' والی بات درست معلوم ہونے لگی۔ ایک ٹویوٹا جیپ مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ ہماری وین میں گھسنے والے دونوں افراد نے جیپ والوں کو ہاتھ سے چند اشارے بھی کیے۔ ہماری گاڑی میں گھسنے والے دونوں افراد صورتوں سے ہی بدمعاش نظر آتے تھے۔ وہ دونوں یقیناً اس جیپ سے ہی اُترے تھے۔ دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں لمبی نال کا پستول تھا جس کی ایک جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ یہ لمبی نال دراصل پستول کا سائلنسر تھا۔ دوسرے شخص نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ مجھے شک پڑ رہا تھا کہ اس کی چادر کے نیچے کوئی چھوٹے بیرل والی رائفل ہے۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ہوا۔

ایک جگہ سلیم نے گاڑی آہستہ کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا یا اس قسم کا کوئی اور کام ہو جائے گا۔ وہ کانپتی آواز میں گرم چادر والے کو مخاطب کر کے بولا۔ ''میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں بختیار صاحب۔''

''بکواس بند کرو۔'' عقب سے دھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ''چپ چاپ گاڑی چلاتے رہو۔ اب جو بات ہوگی، کوٹھی پہنچ کر ہی ہوگی۔''

''لیکن میں نے......''

''چپ ہو جا۔'' گرم چادر والا چنگھاڑا۔ ''نہیں تو ابھی گردن توڑ دوں گا۔'' میں نے

بولنے والے کی آواز اور لب و لہجے سے اندازہ لگایا کہ یہ ان گارڈز میں سے ایک ہے جن سے چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں عمران اور اقبال کی مار ماری ہوئی تھی۔ بعد ازاں عمران نے ان ہٹے کٹے گارڈز کو دو باتھ رومز میں بند کر دیا تھا۔

عقب میں بیٹھا ہوا چادر پوش ڈرائیونگ کے سلسلے میں سلیم کو ہدایات دیتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم شاہراہ قائداعظم پر آ گئے ہیں اور ایئر پورٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ ایئر پورٹ کی طرف جانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہمیں لال کوٹھیوں میں لے جایا جا رہا ہے۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ ہمیں کسی پولیس ناکے پر روک لیا جائے اور پولیس والوں کو علم ہو جائے کہ اس گاڑی میں کیا صورتِ حال ہے لیکن یہ تو تب ہوتا، جب پولیس اہلکار سرسری جائزہ لینے کے بجائے غور و فکر کرتے اور عمران نے صرف تین دن پہلے کہا تھا کہ ہماری پولیس غور و فکر کرنے کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم دو ناکوں پر سے گزرے اور خیر خیریت سے گزر گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ''خیر خیریت'' میڈم کے کارندوں کے نقطہ نظر سے تھی۔

یہ بڑا کٹھن سفر تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں پھانسی کا سزاوار ہوں اور پھانسی پانے کے لیے تختۂ دار کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں کیا ہوگا؟ وہ لوگ کس طرح پیش آئیں گے؟ کیا وہ جان چکے ہیں کہ ہم اس سے پہلے ایک دفعہ لال کوٹھی میں گھسے تھے؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ مجید مٹھو کی موت میں ہمارا ہاتھ ہے؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے جو ذہن میں اودھم مچا رہے تھے اور گاڑی بھاگتی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر تناؤ اور خاموشی کی ایک ایسی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں کل رات اپنے گھر والوں سے ملنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ مجھے آج یا پھر کل اس پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ والدہ، فرح اور عاطف کو گھر سے باہر کہیں بلانا تھا اور ان سے ملاقات کرنا تھی لیکن اب وہ ملاقات ایک دور دراز کا خیال محسوس ہوتی تھی۔ ایک بعید از قیاس سوچ۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں جن راستوں پر چل کر لال کوٹھیوں کی طرف جا رہا ہوں، ان راستوں کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ نہ ان در و دیوار کو نہ ان لوگوں کو، نہ اس شہر کی گہما گہمی کو۔ مجھے شاید گولی مار دی جائے گی اور لال کوٹھی کے اندر ہی کسی باغیچے وغیرہ میں گاڑ دیا جائے گا۔

پھر عمران کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے ایک دن کہا تھا۔ ''یار! ایک تو تم وہ بات سب سے پہلے سوچنے لگتے ہو جو سب سے آخر میں سوچنی چاہیے۔ تمہارے

ذہن میں ہر طرح کے اندیشے بجلی کی رفتار سے داخل ہوتے ہیں۔''

کیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا؟ میں خوف پیدا کرنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس طرح تکلیف دہ خیالات سے چھٹکارا کہاں ملتا ہے۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی رہائشی علاقے میں داخل ہوئیں اور پھر لال کوٹھیوں کے اندر چلی گئیں۔ اقبال تو شاید پہلے بھی اس طرح کے حالات سے گزرتا رہا تھا مگر میری حالت بُری تھی۔ لگتا تھا کہ دل سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہے اور پورے جسم میں سے خون نچڑ گیا ہے۔

میرے لیے سب سے تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ اگر یہاں لال کوٹھیوں میں میری ملاقات سیٹھ سراج یا اس کے کسی ایسے کارندے سے ہو گئی جو مجھے جانتا ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ ایسی صورت میں مَیں براہِ راست اس سارے معاملے میں ملوث ہوتا تھا۔ میرے ملوث ہونے کے بعد میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور یہی وہ خوف تھا جو پہلے دن سے آج تک ہر گھڑی میرا دامن گیر رہا تھا۔

گاڑی چھوٹی میڈم یعنی نادیہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر رُک گئی۔ اس کے پیچھے ٹویوٹا جیپ رُک گئی۔ گاڑی رُکتے ہی میڈم کے گارڈز نے سلیم کو کھینچ کر وین میں سے نکال لیا اور بُری طرح مارنا شروع کر دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ منت بھی کر رہا تھا۔ اس کا کوٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ لوگ اسے کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ عمران کی موجودگی میں میرے اندر جو خاص قسم کی توانائی پیدا ہو جاتی تھی، اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

بہر طور خیریت ہی گزری۔ فوری طور پر ہمارے ساتھ مار پیٹ نہیں کی گئی۔ ہمیں کوٹھی کے مہمان خانے میں لے جایا گیا۔ اس عمارت کے داخلی دروازے پر ''اینکسی'' کے الفاظ لکھے تھے۔ پہلے ہمیں ایک چوکور کمرے میں بٹھایا گیا۔ گرم چادر والا خطرناک صورت گارڈ مسلسل ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے چادر کے نیچے سے روسی ساخت کی چھوٹے بیرل والی رائفل نکال لی تھی۔ ایک گارڈ کمرے سے باہر بھی چوکس حالت میں موجود تھا۔ عمارت کے کسی قریبی کمرے سے رونے چلانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں ہمارے رونگٹے کھڑے کر رہی تھیں۔ بلاشبہ یہ سلیم کی آوازیں تھیں۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''انتظار کی تکلیف کے لیے تم دونوں

سے معافی چاہتے ہیں۔ تمہارے یار سلیم کو پھینٹی لگ رہی ہے۔ پانچ دس منٹ میں وہ فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر تمہاری باری آتی ہے۔"

میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ گارڈ بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میرے تاثرات نوٹ کرنے کے بعد بولا۔ "اگر سلیم صاحب والی عزت افزائی سے بچنا چاہتے ہوتو کچھ چھپا کر نہ رکھنا۔ بس یہی ایک قیمتی مشورہ ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی سلامتی اور زندگی کے حوالے سے میری بے قراری انتہا کو پہنچنے لگی۔ اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر میں نے دو گارڈز کے ساتھ ایک عورت کو آتے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اسے یہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقیناً اقبال کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔ یہ ہٹی کٹی عورت زلیخا تھی۔ وہی جس سے ہماری ملاقات ہڑپہ کے ایک مکان میں ہوئی تھی۔ اس دھند آلود سرد رات میں ہم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ زلیخا کے گھر کے ایک کمرے میں ایک کنواں نما گڑھا ہے۔ زلیخا کے ساتھ سراج کا ناجائز تعلق بھی ثابت ہوا تھا۔ بعدازاں زلیخا اور اس کے بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں گے مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے۔

زلیخا نے چادر کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ وہ آج بھی زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھی اور کانوں میں جگمگاتے جھمکے تھے۔ وہ بولی۔ "ہاں جی...... یہی ہیں وہ دونوں۔ یہ اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں۔"

"یہ کون سی خفیہ پولیس ہے بھئی جس کا پتا خفیہ پولیس کو بھی نہیں؟" گارڈز نے اقبال کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

اقبال کی ٹانگ پہلے ہی زخمی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

زلیخا سے ہماری شناخت پریڈ کرانے کے بعد اسے واپس بھیج دیا گیا۔ اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے بلند ہونے والی آہ و بکا ختم ہوگئی۔ شاید سلیم کی خلاصی ہوگئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے ایک بار پھر بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ غالباً اسے میرے چہرے پر کوئی ایسی بات نظر آئی جس نے اسے باور کرا دیا کہ مجھ سے پوچھ گچھ نسبتاً آسان ثابت ہوگی۔ اس نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اُٹھنے میں دیر کی تو دو افراد نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے لگے۔

اقبال نے پکار کر کہا۔ "دیکھو...... اسے کچھ پتا نہیں۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔ یہ بس ہمارے ساتھ تھا...... ہمارے کسی کام میں شامل نہیں تھا۔"

گارڈ بولا۔ "تم ذرا چھری کے نیچے سانس لو۔ تم سے بھی پورے سوال جواب کریں گے۔"

وہ مجھے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں تھیں اور دروازہ شیشم کی مضبوط لکڑی کا تھا۔ میرا رہا سہا خون بھی نچڑ گیا۔ چھت سے نائیلون کی ایک رسی لٹک رہی تھی۔ یہ یقیناً مطلوبہ معلومات کے لیے مطلوبہ شخص کو سیدھا یا اُلٹا لٹکانے کے لیے تھی۔ ایک تختہ نظر آ رہا تھا جس پر کسی کو لٹایا جاسکتا تھا اور اس کی کلائیوں اور ٹخنوں وغیرہ کو "اسٹریپس" سے باندھا بھی جاسکتا تھا۔ پانی کا ایک بڑا ٹب بھی پڑا تھا جس کا مقصد فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا دوست سلیم تھوڑی دیر پہلے یہیں موجود تھا۔ فرش پر لہو کے تازہ قطرے تھے۔ سلیم کی گرگابی اور اس کی ٹوٹی ہوئی گھڑی بھی وہیں فرش پر پڑی تھی۔ غالباً ان اشیاء کو میری اعصاب شکنی کے لیے قصداً وہاں پڑا رہنے دیا گیا تھا اور مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ میرے اعصاب واقعی ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ قرب و جوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی بھی وقت بے ہوشی کے اندھیرے میں کھو جاؤں گا۔ ہاں...... میں وہی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ہاتھ سے اپنے جسم پر گولی چلائی تھی لیکن تب کی اور اب کی کیفیت میں بہت فرق تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے چمک سی لہرا گئی۔ میں نے دیکھا کہ میڈم نادیہ ہوشربا چال چلتی میری طرف آ رہی ہے۔ وہ ایک سیاہ نیکر اور دو بڑے پھولوں والی سفید شرٹ میں تھی۔ شرٹ پر ایک رائل بنگلہ ٹائیگر کی شبیہہ پرنٹ تھی۔ یہ شیر نادیہ کے جسم سے لپٹا نظر آتا تھا۔ نادیہ کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا۔ اپنی اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی، وہ میرے عین سامنے کھڑی ہوئی تو کسی قیمتی پرفیوم کی مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ گرم چادر والے گارڈز کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "اوئے بختیار! کیا کرنے لگے ہو اس کے ساتھ۔ اس کو مارنا ہے؟ اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہے تم...... یہ اور ٹائپ کا ہے۔ پیار سے ہی سب کچھ بتا دے گا۔ کھول دو اسے۔"

میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میڈم نے سمجھا کہ مجھے باندھا گیا ہے۔ گارڈ بختیار بولا۔ "ابھی ہم نے اسے باندھا ہی نہیں ہے جی۔"

''ٹھیک ہے۔ اسے ایک مہمان کی طرح ڈرائنگ روم میں لاؤ۔ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے کر آؤ۔''

''اور وہ دوسرا میڈم؟'' بختیار کا اشارہ یقیناً اقبال کی طرف تھا۔

''دیکھو...... گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا کرتے۔ وہ خرانٹ ہے۔ اس سے دوسری طرح نمٹیں گے۔''

چند ہی سیکنڈ بعد میں اس ٹارچر روم سے نکل کر ایک سجے سجائے شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ میرے پاؤں دبیز پالین میں دھنس رہے تھے۔ دروازوں، کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے مخملی پردے لہراتے تھے اور دیواروں پر نایاب پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ تاہم ان پینٹنگز کا رنگ ڈھنگ وہی تھا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ عریانی، رنگینی اور فحاشی۔ کہنے کو تو یہ آرٹ تھا لیکن ایسی ہی چیزیں آرٹ کے نام پر بدنما دھبا ہوتی ہیں۔

میڈم نادیہ ہاتھ میں شیری کا گلاس لیے آئی اور بے تکلفی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مجھ سے تین چار فٹ کی دوری پر بیٹھ گئی۔ آڈیو سسٹم پر بہت مدھم آواز میں انگلش میوزک بج رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اچانک بولی۔ ''اس رات تم اچانک میرے گھر میں آئے اور پھر اچانک بھاگ بھی گئے...... ایسا کیوں کیا تم نے؟''

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ زبان منہ کے اندر چمڑے کا سوکھا ہوا سخت ٹکڑا بن گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شیری کے دو بڑے گھونٹ بھر کر بولی۔

''اچھا چھوڑو اس نازک ٹاپک کو۔ ہم اور بات کرتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ......'' یکایک اسے رُکنا پڑا۔ اس کے بیش قیمت موبائل فون کی بیل ہونے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ہاں...... ہاں...... میں نے آواز پہچان لی ہے سراج...... کیسے ہو؟ ہاں...... میں بھی فائن ہوں۔ کب آ رہے ہو تم؟ نہیں...... نہیں ابھی تو ضرورت نہیں۔ صبح آ جاؤ۔ دس بجے کے بعد آرام سے آ جانا۔ او کے...... بائے۔''

اس نے کال منقطع کر دی۔ تو وہی ہونے والا تھا جس کا اندیشہ میری جان مسلسل کھا رہا تھا۔ چند گھنٹے بعد یہاں سیٹھ سراج سے ملاقات ہونے والی تھی۔ دو ملازماؤں نے چائے اور اس کے بہت سے لوازمات لا کر سامنے خوبصورت میز پر سجا دیئے۔ میڈم نادیہ بڑی نرمی سے بولی۔

''دیکھو مسٹر تابش! اس ساری اسٹوری میں مجھے کچھ باتیں تو پہلے سے معلوم ہیں۔ یہ

باتیں تم سے سن کر میں تمہارا اور اپنا ٹائم ضائع نہیں کروں گی۔ تم مجھے صرف وہ باتیں بتاؤ جو مجھے اب تک معلوم نہیں ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ ہڑپہ پہنچنے سے پہلے کیا ہوا؟ اور مثلاً یہ کہ یہاں میرے گھر سے بھاگنے کے بعد کہانی میں کیا ٹرن آئے؟ اور مثلاً یہ کہ...... خیر چھوڑو۔ پہلے تو یہی بتا دو کہ تم لوگ سراج کے پیچھے لگے کیسے؟ وہ تو بڑا خرانٹ بندہ ہے۔ اس نے کہاں تمہیں گنجائش دی کہ تم اس کہانی میں گھس بیٹھے؟''

''دیکھیں میڈم! میں سچ کہتا ہوں۔ میرا اس سارے معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں تو......''

''مسٹر تابش۔'' میڈم نادیہ نے انگلی اُٹھا کر مجھے روکا۔ ''تمہاری حیثیت میرے گیسٹ کی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہارا یہ اسٹیٹس برقرار رہے۔ اس لیے ایک بار پھر بتا دیتی ہوں۔ مجھے وضاحت نہیں چاہیے۔ بس اپنے سوال کا جواب چاہیے اور سوال یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سیٹھ سراج جیسے سیانے کوے کے پیچھے کیونکر لگ گئے؟'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کل سویرے سیٹھ سراج کے یہاں پہنچنے کے بعد میرے بارے میں بہت سی باتیں میڈم نادیہ کو معلوم ہو جانی ہیں۔ تو کیوں نا میں خود ہی اپنے بارے میں بتا کر میڈم نادیہ کا اعتماد حاصل کروں۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ سیٹھ سراج نے اقبال کو بھی یقیناً پہچان لینا ہے۔ یہ اقبال ہی تھا جس نے سرِراہ سیٹھ سراج کی وین سے گاڑی ٹکرائی تھی اور پھر سیٹھ کی تسلی بخش ٹھکائی بھی کر دی تھی۔ تو پھر جب یہ سب کچھ سامنے آنے ہی والا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں اپنی زبان سے بتا دوں۔

میڈم نادیہ کا صوفے پر بیٹھنے کا انداز توبہ شکن تھا۔ وہ مخمور نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

O......❖......O

میں نے اس کے بدن سے نگاہیں چرا کر قالین پر گاڑ دیں۔ یوں اس کی شعلہ بدنی سے جدا ہو کر مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں نے اپنے خیالات مجتمع کیے اور کہا۔ ''میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں جو کچھ میرے علم میں ہے، میں آپ کو صاف صاف بتا دوں گا۔ آپ بھی وعدہ کریں کہ مجھ پر شک نہیں کریں گی۔''

میڈم نادیہ نشیلے انداز میں مسکرائی۔ ''مردوں پر شک نہ کرنا بہت بڑی بیوقوفی ہوتی ہے۔ بہرحال تم کہتے ہو تو یہ بیوقوفی کر لیتے ہیں۔''

''میں ثابت کر دوں گا کہ آپ نے بیوقوفی نہیں کی۔'' میں نے وثوق سے کہا اور پھر اپنی روداد کو بالکل شروع سے بیان کرنے لگا۔

میں نے میڈم نادیہ کو بتایا کہ کس طرح قریباً ڈیڑھ سال پہلے واجی اور اس کے اوباش دوست میری منگیتر ثروت کے پیچھے پڑے۔ کس طرح انہوں نے میرا اور ثروت کا جینا حرام کیا۔ پھر ثروت کے اغوا اور واپسی کی تفصیل بتانے کے بعد میں نے اس حوالے سے واجی کے باپ سیٹھ سراج کے منفی کردار کا ذکر کیا۔ بعدازاں سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں نے میرے گھر کے قریب مجھ پر جو بہیمانہ تشدد کیا، اس کی تفصیل بھی بیان کر دی۔

میڈم نادیہ دھیان سے سنتی رہی اور بیچ بیچ میں مجھ سے سوالات بھی کرتی رہی۔ میں نے میڈم سے کہا۔ ''میں سچ کہتا ہوں، میں سخت مایوس تھا۔ اپنی جان لینے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر عمران مجھے نہ ملتا تو شاید میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ عمران میری کہانی پر بہت دکھی ہوا۔ خاص طور سے سیٹھ نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کا اسے بہت صدمہ پہنچا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے سیٹھ صاحب کی گاڑی کو ایک وین نے ٹکر ماری تھی اور

بعد میں وہاں لڑائی بھی ہوئی تھی۔''

''ویری گڈ...... بہت خوب۔'' میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو وہ طے شدہ ایکسیڈنٹ تھا۔ ویری اسمارٹ۔''

''دراصل یہی ایکسیڈنٹ تھا میڈم جس کے بعد ہم سیٹھ سراج کے پیچھے لگے۔ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا۔ سیٹھ سراج کی گاڑی میں کچھ بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند بوریاں ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پھٹ گئیں۔'' اس کے بعد میں نے بوریوں کے بارے میں سارا ماجرا میڈم کے گوش گزار کر دیا اور بتایا کہ صرف ان بوریوں سے پیدا ہونے والا تجسس دور کرنے کے لیے ہم نے سیٹھ سراج کا پیچھا کیا اور ہڑپہ پہنچ گئے۔

آگے کی ساری روداد میڈم کو زلیخا اور اس کے شوہر سے معلوم ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ زلیخا اور اس کے شوہر کی زبان سے ہم نے لال کوٹھیوں کا ذکر سنا اور پھر اپنے ''تجسس کے گھوڑے'' پر بیٹھ کر دگڑ دگڑ کرتے لال کوٹھیوں تک پہنچ گئے۔

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، یہاں تک تو سب ٹھیک ہو گیا۔ تم لوگ اس شوق میں یہاں گھس آئے کہ شاید یہاں سے تمہیں بیش قیمت تحفے تحائف مل سکیں گے۔ کروڑ دو کروڑ کی مورتیاں، تین چار کروڑ کی تصویریں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، برتن، زیور وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ تم لوگ چاہتے تو روپوش ہو سکتے تھے۔ روپوش اور خاموش تو تم لوگ تب ہوتے جب یہاں سے کچھ لے جاتے۔ مگر تم تو خالی ہاتھ گئے تھے پھر تمہاری غیر حاضری کیوں لگ گئی؟''

''دراصل ہم ڈر گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں کچھ دیر خاموش رہنا چاہیے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ وی ٹی آر سسٹم میں ہماری تصویریں آگئی ہوں گی اور ہمیں پہچان لیا جائے گا۔''

''تمہاری یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔ میں تمہارے بارے میں تو ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن وہ تمہارا ہیرو بھائی بڑی خرانٹ شے ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی خاموش رہا ہوگا۔ اس کے دماغ میں کھجلی نہیں ہوئی ہوگی؟''

میڈم بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ واقعی خاموش نہیں بیٹھا رہا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' میڈم نے بڑی بے تکلفی سے میرے گال پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔

''یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اپنی بات کا یقین کس طرح دلاؤں۔''

''اچھا...... سلیم لنگڑے نے تم لوگوں سے کیا کہا تھا؟''

''اس نے ہمیں ڈرایا ہی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم نے لال کوٹھیوں میں گھس کر سخت غلطی کی ہے۔ ہم بہت بُری طرح پھنس سکتے تھے۔ ہمیں آئندہ اس طرح کی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔'' جواب دینے کے بعد میں نے میڈم نادیہ کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ میرے جوابات سے سو فیصد مطمئن تو نہیں تھی پھر بھی اس کا ذہن کچھ نہ کچھ صاف ضرور ہوا تھا۔

حوصلہ پا کر میں نے وہ سوال کیا جو دیر سے میرے اندر مچل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں آپ سے ہیرو بھائی کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟''

''پوچھو۔'' اس نے ادا سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تو اس کے جسمانی خطوط اور بھی ہوشربا ہونے لگے۔

''مم...... میرا مطلب ہے...... وہ خیریت سے تو ہے؟''

''بہت چاہتے ہو ہیرو بھائی کو؟'' میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ''ویسے وہ ہے بھی چاہے جانے کے قابل...... لیکن اکھڑ گھوڑے کی طرح ہے۔ اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''وہ تمہارا دوست ہے۔ تم ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔ تمہیں اس کے مزاج کی ہر سرد گرمی کا پتا ہوگا۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں چاہتی ہوں، وہ میرے بیڈ روم میں ہو۔ بالکل گرم...... جوش سے بھرا ہوا۔ وہ مجھے اور میں اسے جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔'' وہ بڑی بے باکی سے بولی۔ اس کی ہلکی بادامی آنکھوں میں عجیب سی تپش کروٹیں لے رہی تھی۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر میں نے نگاہ جھکالی۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو میرے دل میں ہوتا ہے، وہ میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں اور سچ یہی ہے کہ تمہارا یہ ہیرو بھائی میرے دل میں ٹھاہ کر کے لگا ہے اور جو چیز میرے دل کو بھا جاتی ہے پھر میں اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہتی۔ تم لوگ اچانک میرے گھر سے نکل گئے۔ ہیرو بھی نکل گیا، پر وہ باسٹرڈ میرے اندر سے نہیں نکل سکا۔ میں نے پچھلے

دنوں اس کے لیے بڑی بے چینی محسوس کی ہے اور اسے اپنے طور پر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی رہی ہوں۔ بس اسے میری ''لک'' سمجھ لو کہ کل رات میرے ملازموں کو اچانک اس کی گاڑی نظر آ گئی۔''

''کیا میں آپ سے......'' میں فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی خاموش ہو گیا۔

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ معاملہ فہم انداز میں بولی۔ ''میرے خیال میں تم پوچھنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے ہیرو بھائی کو میں نے کیسے کیچ کیا...... تو پوچھ لو۔''

''در...... اصل...... میرا ذہن صاف ہو جائے گا تو پھر میں بہتر طور پر سوچ سکوں گا اور آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں گا۔''

''آ جاؤ میرے ساتھ۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اس کے بدن سے نگاہیں چراتا اس کے وسیع بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس رات کے سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے جب ہم چوری چھپے یہاں گھسے تھے اور نادیہ کو باندھ کر بے بس کیا تھا۔ دائیں طرف وہ خوبصورت الماری تھی جو سلیم کے بقول میڈم نے صرف اس لیے کھولی تھی کہ ہمیں شراب کی بوتلیں دکھا سکے۔ سامنے ہی وہ جہازی سائز بیڈ تھا جس پر عمران اور میڈم نادیہ کی دھینگا مشتی ہوئی تھی اور عمران نے مشتعل ہو کر نیم عریاں نادیہ کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے۔ سلیم نے بتایا تھا کہ اس بیڈ روم کی ایک سائیڈ پر ایک نیلا بٹن ہے جسے دباتے ہی نادیہ درجن بھر گارڈز کو دوسری کوٹھی سے طلب کر سکتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' نادیہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں کسی معمول کی طرح بیش قیمت صوفے کے گداز میں دھنس گیا۔ وہ تکیے کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ سامنے دیوار پر ایک ٹی وی اسکرین نظر آ رہی تھی۔ نادیہ نے ریموٹ کنٹرول سے اسکرین روشن کی پھر کئی ایک بٹن دبائے۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر ''وی ٹی آر'' کی ایک پرانی فوٹیج چلنے لگی۔ یہ اس رات کے مناظر تھے جب میں، عمران اور اقبال یہاں داخل ہوئے تھے۔ ایک منظر میں اقبال رائفل بدست باتھ روم کے بند دروازوں کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ ایک منظر میں ہم پرچھائیوں کی طرح اس نیم تاریک گیلری میں گھوم رہے تھے جہاں نہایت نایاب پینٹنگز دیواروں پر سجی تھیں۔ پھر باؤنڈری وال کا منظر دکھائی دیا۔ باؤنڈری وال سے باہر عمران کی مہران گاڑی کھڑی تھی۔ غالباً میڈم نادیہ نے بٹن دبا کر گاڑی کی فوٹیج کو اسکرین پر ساکت کر دیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''میرے پاس تم لوگوں کا بس یہی سراغ تھا مگر تم دیکھ رہے ہو گاڑی کی پوزیشن ایسی ہے کہ نمبر پلیٹس نظر نہیں آ رہیں۔ اگر گاڑی کا نمبر نظر آ جاتا تو شاید دوسرے تیسرے روز ہی ہماری ملاقات ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہاں...... گاڑی کی ایک دو نشانیاں ضرور اس فوٹیج میں ریکارڈ ہو گئیں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ گاڑی کی چھت پر ''کیریئر'' لگا ہوا ہے۔ اب دوسری نشانی دیکھو۔'' نادیہ نے کہا اور اسکرین پر نظر آنے والی گاڑی کی شبیہہ کو کلوز کیا۔ گاڑی کی سائیڈ پر عمران نے یا اقبال نے ایک طویل اسٹیکر چپکایا ہوا تھا۔ یہ ایک جست لگاتے ہوئے چیتے کی شبیہہ تھی اور نیچے انگریزی کے چند حروف تھے۔ اسٹیکر جزوی طور پر اُتر چکا تھا اور حروف بھی مٹے مٹے تھے۔ بہرحال یہ سب کچھ فوٹیج میں دکھائی ضرور دے رہا تھا۔

نادیہ نے ٹی وی اسکرین کو آف کیا اور بولی۔ ''میرے ملازم اس گاڑی کی ٹوہ میں تھے۔ کل رات اتفاقاً میرے ایک ملازم شوکت کو یہ گاڑی ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس نے ساتھیوں کو فون کیا۔ تمہارے ہیرو بھائی کے آنے سے پہلے ہی گاڑی کو گھیرا جا چکا تھا۔ اب آگے کی بات تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔''

''وہ...... خیریت سے ہے نا؟ مم...... میرا مطلب ہے آپ نے اس سے مار پیٹ تو نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تو نہیں کی لیکن میرے گارڈز کو اس رات والے واقعے پر غصہ تھا۔ انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی دو چار ہاتھ لگا دیئے تھے اسے...... بہرحال پریشانی کی بات نہیں۔ وہ اب خیریت سے ہے۔''

یہ بات تو ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ گارڈز نے میڈم کی مرضی کے بغیر ہی عمران سے مار پیٹ کی ہو گی۔ وہ یقیناً تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ میرے تصور میں عمران کا زخمی چہرہ اور اس کا پھٹا ہوا لباس گھومنے لگا۔ میں نے بڑی بے چینی سے سوچا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گا؟ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آسانی سے بے بس ہونے والا نہیں ہے۔ یقیناً اس پر پلاننگ سے ہاتھ ڈالا گیا تھا۔

اب میرے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ سلیم کے بارے میں نادیہ کو شک کیونکر ہوا؟ یہ سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے ہم بھی پھنس گئے تھے۔ میں نے محتاط لفظوں میں اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ''لگتا ہے کہ تم اپنے ذہن کو پورا پورا کلیئر کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چلو بھئی۔ کر لو کلیئر۔''

اس نے ایک بار پھر ٹی وی اسکرین روشن کی اور وی ٹی آر میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ جلد

ہی مطلوبہ فوٹیج اسے مل گئی۔ یہ بھی اسی رات کی فوٹیج تھی جب ہم پہلی بار لال کوٹھی میں آئے تھے۔ پوشیدہ کیمرا ایک خالی راہداری کو دکھا رہا تھا۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ راہداری بالکل خالی نہیں ہے۔ راہداری کے نیم روشن فرش پر تین سائے نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک سایہ واضح طور پر سلیم کا اور دوسرا شاید عمران کا تھا۔ نادیہ نے فوٹیج کو ایک جگہ ''اسٹل'' کر دیا اور بولی ''غور کرو...... یہ کیا ہے؟''

میں خاموش رہا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ان میں سے درمیان والا تو سلیم لنگڑا ہے۔ دائیں طرف تمہارا ہیرو بھائی ہے اور بائیں طرف شاید تم ہو۔ تم تینوں راہداری سے باہر کھڑے ہو مگر تمہاری پرچھائیاں راہداری کے فرش پر پڑ رہی ہیں۔''

''آپ...... کیا بتانا چاہ رہی ہیں؟''

''میں سلیم کی ''بیڈ لک'' بتانا چاہ رہی ہوں۔ وہ بڑا ہوشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کوٹھی میں وی ٹی آر کیمرے کس کس جگہ کو فوکس کرتے ہیں اور کون کون سی جگہ ان کی پہنچ سے دور ہے۔ اس لیے جب اس نے تم دونوں سے راز داری کے ساتھ بات کی اور تمہیں کوٹھی سے نکل بھاگنے کا مشورہ دیا تو وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کیمرا تم تینوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی مائیکرو فون کوئی آواز کیچ کر سکتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ تم تینوں کے سائے راہداری میں پڑ رہے تھے اور راہداری کو کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس سایوں والی فوٹیج پر میری نظر بس دو تین دن پہلے ہی پڑی ہے۔ اس کے بعد میری ہدایت پر گارڈ بختیار نے سلیم پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب تمہیں ہیرو کی شامت کی اطلاع دینے راوی روڈ پہنچا تو تم دونوں بھی نظر میں آ گئے۔''

بات ختم کر کے نادیہ نے شیری کے چند اور گھونٹ بھرے اور اس کا چہرہ شراب کی حدت سے تمتمانے لگا۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب سی تپش تھی۔ جسم کا ہر حصہ انگڑائی لیتا محسوس ہوتا تھا۔ کہنے لگی۔ ''تم بہت سوال کر چکے ہو۔ اب میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔''

''جی کہیں۔''

''ہیرو عمران صاحب کو لڑکیاں پسند ہیں؟'' میڈم نادیہ نے اچانک سوال کیا۔

میں پہلے تو گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ مجھے اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ سرکس میں کام کرنے والی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ اس کا ہنسی مذاق ضرور ہے۔''

''کوئی پکی گرل فرینڈ؟''

"میرے علم میں تو نہیں۔"

"ڈرنک وغیرہ کرتا ہے۔"

"ایک دو بار بیئر پیتے دیکھا ہے۔"

"کوئی خفیہ شادی وغیرہ؟"

میں نے ایک بار پھر لاعلمی میں سر ہلایا۔ "دراصل عمران اپنے بارے میں اپنے دوستوں کو بھی بہت کم بتاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذرا مختلف ٹائپ کا ہے۔"

"نہیں رہے گا مختلف ٹائپ کا۔" میڈم نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ "سرکش گھوڑا ہے۔ بس ذرا اس کی سمجھ آ گئی تو ایک دم شانت ہو جائے گا۔ اشاروں پر چلے گا اور سرپٹ بھاگے گا۔"

اس کی بادامی آنکھوں میں ایک بار پھر نشہ تیرنے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی جیسے وہ تصور ہی تصور میں اسے اپنے اشاروں پر چلتا دیکھ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی راحت جھلکنے لگی۔ پھر وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ مت سمجھنا کہ ابھی وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں چاہوں تو وہ اب بھی سرپٹ بھاگ سکتا ہے۔ جیسے بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے انہیں انجکشن لگائے جاتے ہیں، اس طرح اڑیل گھوڑوں کو سرپٹ چلانے کے لیے بھی زبردست انجکشن ہوتے ہیں لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ کم از کم تمہارے ہیرو عمران کے حوالے سے مجھے یہ بناوٹ بالکل پسند نہیں آئے گی۔ ناٹ ایٹ آل۔ میں چاہوں گی کہ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنی شکست کو تسلیم کرے اور اسے محسوس بھی کرے۔"

شاید سلیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میڈم نادیہ ایک ایب نارمل لڑکی تھی۔ فی الوقت اس کی تمام توجہ کا مرکز عمران بنا ہوا تھا۔ وہ اسے تسخیر کرنے کے چکر میں تھی۔ شاید ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش کر بھی چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں نادیہ کا رویہ دیکھ کر مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے اور اقبال کو اندیشہ تھا کہ عمران کے پکڑے جانے کے پیچھے جہلم میں مجید مٹھو کی ہلاکت کا واقعہ ہے اور نوادرات والا معاملہ بھی اس ساری صورتِ حال کو گمبھیر بنا رہا ہے مگر میڈم نادیہ سے بات کر کے پتا چلا کہ صورتِ حال اتنی نازک نہیں جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ میڈم نادیہ نے صرف اس رات والے واقعے کو انا کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ وہ عمران کو شکار کرنا چاہ رہی تھی اور اگر اس سارے معاملے میں اسے کسی پر حقیقی غصہ تھا تو وہ سلیم پر تھا۔ وہ اسے غداری کا مرتکب سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک سلیم کا قصور ناقابلِ معافی تھا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف پہلی بار ہم تینوں لال کوٹھی سے بچ کر نکل گئے تھے بلکہ دوسری بار بھی اس نے مجھے اور اقبال کو بھگانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"مجھے میرے سرکش گھوڑے کے بارے میں کوئی ٹپ دو۔" وہ سگریٹ سلگا کر بولی۔ "اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"ہاں...... تم کیا کہہ سکتے ہو۔ تم گھوڑوں کے سائیس تو نہیں ہو...... لیکن...... لیکن تم گھوڑے تو ہو۔ ایک گھوڑا اپنے ساتھی گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ شروع میں میں کافی خوف زدہ تھا مگر اب نادیہ کا رویہ اور اس کا "نصب العین" جاننے کے بعد میں خود کو کافی ایزی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میڈم! میں کوئی نفسیات دان تو نہیں ہوں، نہ ہی مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں عمران کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ایک بات آپ کو بتا سکتا ہوں۔ وہ اپنے دوستوں کے بارے میں بہت پکّا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ سلیم کے بارے میں آپ کا رویہ بڑا سخت ہے۔ کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ کافی مار پیٹ ہو چکی ہے اور لگتا ہے کہ آپ اسے کوئی کڑی سزا دینے والی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ایسا کر کے غلط کریں گی۔ اپنے نکتہ نظر سے آپ صحیح ہیں لیکن اگر آپ اسے معاف کر سکیں تو اس کا عمران پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔"

"ویری گڈ! تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو راہِ راست پر لانے کے لیے سلیم کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں......"

"تو پھر کیوں نہ اس کو ذرا اچھے طریقے سے استعمال کیا جائے۔" نادیہ کا لہجہ بدل گیا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ہو سکتا ہے سلیم کو معافی دینے کا تمہارے ہیرو صاحب پر وہ اثر نہ ہو جو اسے سزا دینے کا ہو۔ سلیم کو سخت سزا سے بچانے کے لیے بھی تو وہ اپنی سرکشی ختم کر سکتا ہے اور پھر......" اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم بھی تو اس کے دوست ہی ہو۔ آج کل عمران کے دل میں تمہارے لیے خصوصی ہمدردی جاگی ہوئی ہے۔"

پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی سیدھی اور آسان نہیں جتنی نظر آ رہی ہے۔ اس کے لہجے میں میرے لیے ایک خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی۔

وہ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔ "نو نو...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں انگلش میں...... ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا۔

میں بھی یہی کروں گی۔ اگر میں نے استعمال کرنا ہوا نا تو سلیم لنگڑے کو ہی کروں گی۔ اس کو سزا بھی ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی سزا سے تمہارے ہیرو صاحب کی دولتیاں بھی ختم ہو جائیں۔''

میں اندر ہی اندر بُری طرح سٹپٹایا اور پچھتایا بھی کہ میں نے ایسی بات کیوں کہی۔ اس نے فوراً میری یہ بات پکڑ لی تھی کہ عمران اپنے دوستوں کے بارے میں بڑا پچی ہے۔

عمران کی مصیبت کے خیال نے مجھے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ بندہ جس کو ناقابلِ شکست سمجھتا ہے اور جس کی صلاحیتوں پر بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے، وہ اچانک کسی وجہ سے بے دست و پا نظر آئے تو دل کو شدید ٹھیس لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہو رہا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمران یہاں میڈم نادیہ کی گرفت میں آ چکا ہے اور اسے بے بس کر کے مارا پیٹا گیا ہے۔ عمران کو پریشانی اور بے بسی کی حالت میں دیکھنے کا تصور ہی مجھے ہلکان کر رہا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے نادیہ سے پوچھا۔ ''کیا میں عمران کو دیکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں...... ابھی لو۔''

اس نے بیڈ پر لیٹے لیٹے بڑے سائز کے ریموٹ کنٹرول پر دو تین بٹن پریس کیے۔

ایک دم اسکرین پر عمران میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اُچھل کر رہ گیا۔ وہ ایک قالین پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ یہ اُسی لال کوٹھی کا کوئی کمرہ نظر آتا تھا۔ عمران کے چہرے پر گہرے نیل تھے۔ دونوں آنکھیں درم زدہ تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا جس پر آہنی گرل تھی۔ گرل کے پاس ایک موٹی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس ملازمہ کو ہم پچھلی بار بھی دیکھ چکے تھے۔ یہی تھی جس نے ''روٹین'' میں کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا اور عمران نے مجھے باہر سے بلوا کر دروازہ کھلوایا تھا۔ اس کا نام آسیہ تھا۔ میں نے دیکھا، عمران کے چہرے پر تکلیف کا سایہ ہے اور وہ بیچارگی کے انداز میں ملازمہ آسیہ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ شاید وہ اس سے کسی طرح کی مدد طلب کر رہا تھا۔ عمران کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔

میڈم نادیہ نے کہا۔ ''آواز بھی سننا چاہتے ہو عمران صاحب کی؟''

پھر میرے جواب پر دینے سے پہلے ہی اس نے سائیڈ ٹیبل کے پاس سے کوئی بٹن پریس کیا اور اسکرین پر تصویر کے ساتھ آواز بھی اُبھرنے لگی۔ آواز زیادہ صاف نہیں تھی لیکن سنی جا سکتی تھی۔

عمران کہہ رہا تھا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں آسیہ جی! عورت کی خوبصورتی موٹے یا پتلے ہونے میں نہیں ہوتی، اس کے چہرے میں ہوتی ہے اور تمہارا چہرہ ایک سو ایک فیصد میری منگیتر روزینہ سے ملتا ہے۔ آج اگر روزینہ زندہ ہوتی تو ہو بہو تمہاری طرح ہوتی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں، میں مذاق نہیں کر رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ ہرے بھی اور لال سرخ بھی۔''

''لگتا ہے تمہیں بکواس کرنے کی عادت ہے۔'' قریب کھڑے ایک گارڈ نے جھڑک کر کہا۔

''عادت نہیں ہے یار! میں تو اتنا خاموش طبع ہوں کہ کبھی بولوں تو یار دوست سمجھتے ہیں شاید آج کوئی تہوار ہے۔ یہ تو آپ کی بہن کو دیکھ کر بولنا پڑ رہا ہے۔ یقین کرو میں تمہیں اپنی روزینہ کی تصویر دکھاؤں تو تم بھی ہکا بکا رہ جاؤ گے اور آسیہ جی تو سمجھیں گی کہ آئینہ دیکھ رہی ہیں۔''

گارڈ دانت پیس کر بولا۔ ''میں ایک بار میڈم سے اجازت لے لوں پھر تمہاری بولتی ایسے بند کروں گا کہ قیامت تک آواز نہیں نکلے گی۔''

''تو اب اور قیامت کیا ہو گی؟ میرے لیے تو قیامت آ چکی ہے میرے برادر۔'' اس نے یکسر فدا ہو جانے والی نظروں سے ملازمہ آسیہ کو دیکھا۔

آسیہ کے ہاتھ میں سفید روئی تھی اور شاید کوئی دوا تھی۔ وہ غالباً عمران کے چہرے کے زخم صاف کرنے کے لیے آئی تھی۔ جھنجھلا کر بولی۔ ''تمہیں دوا لگوانی ہے یا نہیں؟''

''تم اپنے ہاتھ سے لگاؤ گی تو کون کافر انکار کرے گا لیکن......''

ملازمہ نے سٹپٹا کر پلاسٹک کی بوتل اور روئی وغیرہ آہنی گرل کے راستے کمرے میں پھینکی اور اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی چلی گئی۔

میڈم نادیہ نے ریموٹ کے ذریعے اسکرین کو تاریک کر دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''یہ تمہارا ہیرو دلچسپ شے ہے۔ اتنی مار کھا کر بھی شرمندہ نہیں ہے۔''

میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔ دلی طور پر مجھے واقعی مسرت ہوئی تھی۔ بے شک عمران کو مارا پیٹا گیا تھا لیکن یہ مار پیٹ اس کے چہرے سے اس کی جادوئی مسکراہٹ چھیننے میں قطعاً ناکام رہی تھی۔ کہیں پڑھی ہوئی یہ بات یاد آنے لگی کہ جو انسان اپنا حوصلہ نہیں ہارتا، وہ کچھ بھی نہیں ہارتا۔ پتا نہیں کیوں عمران کو ہشاش بشاش دیکھنے کے بعد میں خود کو بھی ویسا ہی محسوس کرنے لگا۔

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نادیہ فون سننے کے لیے سائیڈ روم میں چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ سامنے شیشے کی نہایت نفیس تپائی پر انگریزی اخبار رکھا تھا۔ یہ آج کا ہی تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اندرونی صفحے پر ایک خبر میرے لیے قابلِ توجہ تھی۔ یہ تین دن پہلے جہلم میں پیش آنے والے واقعے سے ہی متعلق تھی۔ دو کالمی خبر کی سرخی تھی۔

''روڈ ایکسیڈنٹ میں مجید مٹھو کی ہلاکت اتفاقیہ نہیں تھی۔''

ذیلیوں میں درج تھا۔ ''پولیس تفتیش میں مجید مٹھو کی ہلاکت کے بارے میں کچھ نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کھائی میں گرنے سے پہلے مجید کی کار کسی اور گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ جائے حادثہ سے کچھ فاصلہ پر سڑک کے اوپر بھی تباہ ہونے والی گاڑی کے شیشے ملے ہیں اور ٹائروں کے نشان بھی ہیں۔ تفتیشی پولیس افسر کے مطابق دونوں طرح کے امکان موجود ہیں۔ یہ اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے اور کسی عداوت کا شاخسانہ بھی۔''

اسی دوران میں میڈم نادیہ اپنی عریاں ٹانگوں کو بڑے اسٹائل سے حرکت دیتی ہوئی واپس آ گئی۔ شاید فون پر کسی سے کوئی تلخ بات ہوئی تھی، وہ کچھ برہم نظر آتی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر نیم دراز ہو کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کوشش میں اس نے شیری کا ایک اور گلاس پیا۔ اس کے علاوہ امپورٹڈ سگریٹ کے چند گہرے کش بھی لیے، تب وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ملنا چاہو گے عمران سے؟''

''اگر آپ پسند کریں تو۔'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ایک بار پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمارت میں ہر جگہ کیمرے موجود ہیں اور ڈکٹا فون بھی لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ نادیدہ کان ہمیں سن رہے تھے اور نادیدہ آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس عمارت میں جگہ جگہ پینٹنگز اور نوادر کی سجاوٹ نظر آتی تھی۔ راہداریوں میں قیمتی قالین تھے اور یہ ساری جگہ سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ جلد ہی ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچ گئے۔ سامنے ہی وہ دیوار گیر آہنی گرل تھی جس کی دوسری طرف عمران موجود تھا۔ گرل کے ساتھ جالی نہیں تھی اس لیے چھوٹی موٹی اشیا گرل میں سے کمرے میں ''پاس'' کی جا سکتی تھیں۔ عمران غالباً سیال آیوڈین کے ذریعے اپنے چہرے کے زخم صاف کر رہا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنا بایاں ہاتھ استعمال کر رہا تھا، دایاں ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ زیادہ چونکا نہیں۔ یقیناً وہ یہاں ہماری آمد سے آگاہ ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ

کر اس نے مغموم چہرے کے ساتھ ایک لمبی آہ بھری۔ ''اچھا ہوا تابی! تم سے ملاقات ہو گئی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''مریں تمہارے دشمن۔'' نادیہ بولی۔

''کہتے سب ہیں، مرتا کوئی نہیں۔'' وہ ترت بولا۔

''یعنی میں تمہاری دشمن ہوں۔''

''میں نے یہ کب کہا؟ اپنا سب سے بڑا دشمن تو میں خود ہوں۔ عاشق خود ہی اپنا دشمن ہوتا ہے۔ مجنوں، رانجھا، فرہاد ان میں سے کون ایسا ہے جس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماری۔ عاشق کا شروع سے ایجنڈا ہی ہلاک ہونے کا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اب مجھے بھی مرنا ہے۔ اس موچھیل گارڈ کے ہاتھوں یا پھر اپنے تایا ابا کے ہاتھوں۔'' موچھیل گارڈ وہی تھا جس سے ذرا دیر پہلے عمران کی تلخی ہوئی تھی۔

''موچھیل گارڈ اور تایا ابا! یہ کیا بات ہوئی؟'' نادیہ نے عمران کی گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''گارڈ صاحب کے ہاتھوں مرنے کے امکانات یوں روشن ہیں کہ میں ان کی بہن سے عشق فرمانے سے باز نہیں آتا اور وہ مجھے شوٹ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں میں ایک جھڑپ بھی ہو چکی ہے اور تایا ابا والی بات یہ ہے کہ وہ ہرفن مولا ہونے کے علاوہ بڑے سخت قسم کے مذہبی ہیں۔ میں جب انہیں بتاؤں گا کہ میری مرحومہ منگیتر روزینہ، لال کوٹھی کی نہایت دلکش اور چربیلی ملازمہ آسیہ کی صورت میں واپس آ گئی ہے تو انہیں شدید جھٹکا لگے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ میں ''آواگون'' پر یقین کرنے لگا ہوں۔ بس اسی بات پر وہ مجھے قتل فی سبیل اللہ کر دیں گے۔''

''جب تمہیں مرنا ہی ہے تو پھر کسی کے کام کیوں نہیں آ جاتے باسٹرڈ۔'' نادیہ عجیب نشیلے انداز میں بولی۔

''کام تو میں اسی کے آ سکتا ہوں جس سے مجھے یہ آناً فاناً عشق ہوا ہے۔ اپنی اس چربیلی ملازمہ کو میرے حوالے کر دو۔ تین ساڑھے تین سال کے اندر ہی چار ہٹے کٹے بچے پیدا نہ کر دوں تو مجھے ہیرو نہ کہنا۔'' عمران بڑے یقین کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''تین ساڑھے تین سال میں چار بچے؟'' نادیہ نے بھنویں اُچکائیں۔

''بیس اووروں میں آج کل دو سو اسکور ہو رہا ہے تو ساڑھے تین سال میں چار بچے کیوں نہیں ہو سکتے؟ میرے خیال میں تو پانچ بھی ہو سکتے ہیں۔ جڑواں بچوں کا چانس بھی تو

ہوتا ہے۔‘‘

نادیہ نے عمران کو گھور کر دیکھا پھر اس کی بادامی آنکھوں میں ایک زہریلی چمک اُبھر آئی۔ وہ لمبی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ’’لگتا ہے کہ تمہیں کرکٹ سے کافی دلچسپی ہے۔ چلو ایک ٹوئنٹی ٹوئنٹی میچ تمہیں میں بھی دکھاتی ہوں۔‘‘

اس نے باوردی گارڈز کو کوئی اشارہ کیا۔ اچانک میری شریانوں میں ایک برفیلی لہر دوڑ گئی۔ دو صحت مند گارڈز تیزی سے میری طرف آئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہٹا کٹا شیرا برآمد ہو گیا۔ یہ وہی کرخت چہرہ گرانڈیل تھا جس سے پچھلی مرتبہ عمران کی خونی جھڑپ ہوئی تھی۔ عمران نے اس انچارج گارڈ کو دو خوفناک ٹکروں سے ’’ناک آؤٹ‘‘ کر کے سبھی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ شیرے کے ہاتھوں میں نائلون کی رسّی نظر آ رہی تھی۔

مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز کی گرفت بڑی سخت تھی۔ انہوں نے مجھے دھکیل کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ایسے مناظر اس سے پہلے میں نے کہانیوں میں پڑھے تھے یا فلموں اور ڈراموں میں دیکھے تھے۔ چند ماہ پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن خود میرے ساتھ یہ سب کچھ پیش آئے گا۔ جابر لوگوں کی سختی، اسلحے کی نوک اور موت کا لمس میں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کروں گا۔

میں نے خود کو چھڑانے کی اضطراری کوشش کی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ زرد ہو چکا ہے اور میری آنکھوں کی رنگت مجھے پکڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہے اور یہی وقت تھا جب میں نے عمران کی طرف بھی دیکھا۔ ان لمحوں میں مجھے عمران کا چہرہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ بظاہر چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جو میں نے پہلے بس ایک دو دفعہ ہی دیکھی تھی۔ یہ کیفیت اس کی معصوم صورت سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ اس میں آگ تھی، سفاکی تھی اور ایک پوشیدہ توانائی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عمران کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل نے یہ گواہی بھی دی کہ وہ جو کچھ کرنا چاہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ ہاں...... اگر میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا گیا تو وہ کر گزرے گا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ وہ کیا کرے گا؟ دروازہ مقفل تھا۔ کھڑکی پر آہنی گرل تھی۔ ہاں...... ایک گارڈ ضرور کھڑکی کے قریب موجود تھا۔ کیا وہ گرل میں سے ہاتھ گزار کر اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کرے گا؟ یا پھر کسی زوردار ضرب سے دروازے کا کھٹکا توڑنا چاہے گا؟ ابھی یہ سب کچھ میرے ذہن میں چل ہی رہا تھا کہ ایک اور

واقعہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کھڑے دو گارڈز ایک دم اٹین شین ہو گئے، ان میں شیرا بھی شامل تھا۔ مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز بھی بے حرکت ہو گئے۔ شاید انہوں نے مجھے تھامانہ ہوتا تو وہ بھی اٹین شین ہو جاتے۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور میں نے ایک جواں سال عورت کو اندر آتے دیکھا۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر یہی کوئی پچیس سال رہی ہو گی۔ اس نے چست پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ جرسی کے دونوں بازو واڑسے ہوئے تھے۔ بال بوائے کٹ تھے۔ وہ گداز جسم ہونے کے باوجود کسی یورپین کھلاڑی کی طرح چست اور توانا نظر آتی تھی۔

میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہی بڑی میڈم صفورا شیرازی ہے۔ اس کی صورت بھی یہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ میڈم نادیہ کی بڑی بہن ہے۔ اس نے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بولی۔ ’’ہیلو نادو! بھئی کیا چل رہا ہے یہاں؟‘‘

’’کچھ نہیں سسٹر! بس اس بندے سے چھوٹا سا انٹرویو کرنا تھا۔‘‘ نادیہ نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ اسے بڑی بہن کی آمد کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ دوسری طرف بڑی بہن نے بھی اس کی نہایت مختصر نیکر اور کھلے گریبان کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

’’اچھا...... یہ ہے وہ اسپائڈر مین جو یہاں گھسا تھا؟‘‘ صفورا نے عمران کا جائزہ لیا۔

’’ہاں سسٹر! یہ بھی...... اور یہ بھی۔‘‘ اس مرتبہ نادیہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ ’’ان کے علاوہ ایک تیسرا بھی ہے۔‘‘

’’اچھا...... ان میں سے شیرے کے ساتھ جھڑپ کس کی ہوئی تھی؟‘‘ میڈم صفورا کے لہجے میں تجسس اُبھرا۔

’’اس کی جو اندر بیٹھا ہے۔ عمران نام ہے۔ ہیرو ہیرو بھی کہتے ہیں۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے اور بازی گر کرتا ہے۔‘‘

’’زبردست۔‘‘ صفورا، عمران کے قریب چلی گئی اور یوں دیکھنے لگی جیسے پنجرے میں بند کسی خاص نسل کے جانور کو دیکھا جاتا ہے۔

نادیہ نے کھنکار کر بڑی بہن کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولی۔ ’’سلیم لنگڑے کے ساتھ اس کا پرانا یارانہ ہے۔ وہ بھی سرکس میں کام کرتا تھا۔ اسی کی وجہ سے یہ لوگ یہاں سے نکل بھاگے تھے۔‘‘

میڈم صفورا بڑی شان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نادیہ کے اشارے پر مجھے تھامنے والے

دونوں گارڈز نے مجھے چھوڑ دیا اور ذرا ہٹ کر اٹین شین کھڑے ہو گئے۔

میڈم صفورا نے مجھے دیکھا۔ اس کی کھوجی نظریں جیسے میرے سر کے اندر گھسنے لگیں اور دماغ کا ایکسرے کرنے لگیں۔ وہ نگاہیں واقعی ورمے جیسی تھیں۔ پھر یہ ورما صفت نگاہیں عمران کی طرف اُٹھ گئیں۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ ''نادو! ہمیں اس سارے معاملے کو ایزی نہیں لینا چاہیے۔ یہ صرف چور اچکے ہو سکتے ہیں اور اس سے بڑھ کر بھی۔ ان سے پوری پوچھ گچھ کرو۔ ان کی تلاشی وغیرہ ہو گئی ہے؟''

''ہاں سسٹر! ابھی تک کوئی خاص چیز تو نہیں ملی، سوائے ایک پستول کے۔''

''گاڑی کی تلاشی؟''

''نہیں...... وہ تو نہیں لی۔''

''جاؤ شیرا! گاڑی کو اچھی طرح دیکھو۔''

شیرا حکم کی تعمیل کے لیے تیزی سے باہر چلا گیا۔ عمران کی گاڑی کی چابی یقیناً اس کے پاس ہی تھی۔

شیرے کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں میڈم صفورا فون پر ہی کسی سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتیں رئیل اسٹیٹ کے کاروبار کے بارے میں تھیں۔ زمینوں کی قیمت، بلڈنگ میٹریل کے خرچے اور ٹیکسز...... بس اس طرح کی باتیں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر نامدار کی موت کے بعد اس کے کاروبار کو بخوبی سنبھال رہی ہے۔ دوسری طرف شاید کوئی پٹھان تھا۔ میڈم نے اسے خان خاناں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پھر بات کرتے کرتے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو شیرا بھی تلاشی لے کر واپس آ چکا تھا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے نکلنے والی اشیا اس نے گاڑی کے صفائی والے کپڑے میں باندھ رکھی تھیں۔ اس نے یہ کپڑا میڈم صفورا شیرازی کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھا اور گرہ کھول دی۔ گاڑی کے کاغذات تھے، چند کیسٹس تھیں ایک پیچ کس اور کچھ رسیدیں وغیرہ۔

میڈم صفورا ان چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کاغذات کو دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے عمران سے سوال کیا۔ ''ہیرو صاحب! تم جمعرات کے دن جہلم گئے تھے، جی ٹی روڈ کے ذریعے۔''

''جی ہاں......'' عمران نے مغموم لہجے میں کہا۔

میڈم صفورا کے ہاتھ میں دریائے چناب اور جہلم کے پلوں پر لیے گئے ٹول ٹیکس کی دو پرچیاں نظر آ رہی تھیں۔

''کیوں گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''دراصل میں ایک آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔ آرٹیکل کا موضوع یہ ہے کہ سوہنی اصل میں دریائے چناب میں نہیں ڈوبی تھی بلکہ دریائے جہلم میں ڈوب کر فوت ہوئی تھی۔''

''ونڈر فل...... زبردست...... بڑے اونچے خیالات ہیں لیکن تمہارے یہ خیالات پڑھے گا کون؟'' میڈم صفورا نے استفسار کیا۔

''پڑھے گا نہیں تو دیکھے گا ضرور۔ یہ دور ہی دیکھنے کا ہے۔ دراصل میرے تایا صاحب جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، ایک نیوز چینل بھی چلا رہے ہیں۔ میرے اس آرٹیکل کے ٹکڑے نیوز چینل پر چلیں گے اور ہزاروں لاکھوں لوگ پڑھیں گے۔ دراصل بات یہ ہے میڈم کہ آج کل خبروں کا کام کچھ مندا چل رہا ہے۔ خبروں کی پیاس میں تایا جی کی زبان باہر لٹکی ہوئی ہے بلکہ سب چینلز کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اب ایسے میں یہ سوہنی والی اطلاع بریکنگ نیوز ثابت ہو گی۔''

''اس پر یقین کون کرے گا؟''

''نہ کرے یقین۔ بحث تو چھڑ جائے گی نا۔ گجرات والے ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے کہ اتنا بڑا اعزاز دریائے چناب سے چھن جائے۔ وہ ہر صورت یہ ثابت کریں گے کہ سوہنی کو دریائے چناب نے ہی نگلا تھا۔ دوسری طرف جہلم والے اپنے دریا کی مشہوری چاہیں گے۔ چینلز والے اپنے اپنے بمبوکاٹ بلائیں گے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ان میں سے ہر کوئی ارسطو اور افلاطون کے کان کاٹتا ہے۔ یہ لوگ میزوں پر مکے مار مار کر اور چلا چلا کر اپنے اپنے مؤقف کے حق میں دلیلیں دیں گے۔ چند ہی دنوں میں سوہنی کی غرقابی والا مسئلہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ چینلز پر مشتہر کیا جائے گا، ایس ایم ایس کے ذریعے اپنی رائے دیں۔ آپشن نمبر ایک...... سوہنی دریائے چناب میں غرق ہوئی۔ آپس نمبر دو...... سوہنی دریائے جہلم میں غرق ہوئی۔ آپشن نمبر تین...... سوہنی غرق ہی نہیں ہوئی۔

شاہراہوں پر گاڑیاں روک روک کر لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ آپ کے خیال میں سوہنی کا رجحان دریائے چناب کی طرف زیادہ تھا یا دریائے جہلم کی طرف؟ اس کے علاوہ چینلز پر پٹیاں چل جائیں گی۔ اگر آپ کے پاس سوہنی کے غرق ہونے کی کوئی تصویر یا فوٹیج ہو تو ہمیں ارسال کریں اور ثواب دارین حاصل کریں۔ جی ہاں میڈم! آپ مسکرا رہی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔ چند ہی دنوں میں یہ اہم ترین ایشو بن جائے گا اور عین ممکن ہے کہ دونوں صوبوں میں سوہنی کی موت کا کریڈٹ لینے کے لیے کھینچا تانی شروع ہو جائے گی۔''

"دونوں صوبے؟ یہ گجرات اور جہلم تو دونوں ایک ہی صوبے میں ہیں۔" میڈم نے کہا۔

"میں لڑائی چھڑ جانے کے بعد کی بات کر رہا ہوں جی۔" عمران نے روانی سے کہا۔ "زیادہ نہیں تو ڈھائی تین ماہ یہ بحث چلے گی۔ اس کے بعد سوہنی واپس دریائے چناب میں آ بھی گئی تو ہم ان شاء اللہ کوئی اور شوشہ چھوڑ دیں گے۔ مثلاً یہ کہ ہیر زہر کھانے سے نہیں مری تھی بلکہ اس کی جان ایک اور صدمے نے لی تھی۔ رانجھے نے اپنا نیٹ ورک تبدیل کر لیا تھا اور اپنے نئے نمبر سے ہیر کو بے خبر رکھا تھا۔"

"ہیر اور نیٹ ورک؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"میڈم! بحث ہی چھیڑنی ہے نا۔" عمران نے کہا۔

"لیکن اطلاع کوئی ایسی ہونی چاہیے جس سے بحث چھڑ بھی سکے۔ میں تمہارے تایا کے نیوز چینل کے لیے تمہیں ایک بریکنگ نیوز دیتی ہوں۔" میڈم صفورا نے عجیب لہجے میں کہا۔

اس کے بدلے ہوئے لہجے نے مجھ سمیت سارے حاضرین کو چونکا دیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے عمران کے قریب پہنچی اور بولی۔ "میں ابھی پورچ میں تمہاری گاڑی دیکھ کر آ رہی ہوں۔ وہ ایک طرف سے پچکی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر کسی گاڑی کو سائیڈ ماری ہے تم نے یا کسی نے تمہیں ماری ہے۔"

"تو اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں آپ؟"

وہ عمران کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے تیسرے ساتھی کو بھی دیکھ کر آ رہی ہوں۔ اس کی دونوں ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور زخم دو تین دن پرانے ہیں۔ کہتا ہے کہ کیروسین کے چولہے سے آگ لگ گئی تھی، چائے بنا رہا تھا۔"

"وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ حالانکہ یہ شرم کی بات ہے کہ ایک بندہ شادی شدہ ہونے کے باوجود خود چائے بنائے۔"

اس بار بھی میڈم نے عمران کے مزاحیہ جملے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ اور آنکھوں میں عجیب سنسنی تھی۔ وہ سب کی موجودگی میں بھی جیسے کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ اس کی پُرتفکر نگاہیں عمران پر جمی تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں چھوٹی بہن نادیہ کی طرف مڑی اور گمبھیر لہجے میں بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا نادو! کہ اس معاملے کو ایزی نہ لو۔ یہ صرف چوری چکاری کا چکر نہیں ہے۔ جمعرات کے دن جس وقت مجید کو حادثہ

پیش آیا، یہ لوگ جہلم میں موجود تھے۔ نہ صرف جہلم میں موجود تھے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ موقعے پر بھی موجود تھے۔"

"موقعے پر؟" نادیہ نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں..... ان کی گاڑی کا جو سائیڈ ایکسیڈنٹ ہے وہی سائیڈ مجید کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس بات کا 95 فیصد امکان ہے کہ مجید کی گاڑی کو اسی گاڑی سے ٹکر مار کر کھائی میں گرایا گیا ہو۔" صفورا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اس کے جملے نے ہر چہرے پر سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں نادیہ کا چہرہ بھی تھا۔ صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ان کے تیسرے ساتھی کی ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ان ٹانگوں کو اسی آگ نے جلایا ہے جس نے مجید کو بھسم کیا ہے۔ کہو..... کیسی نیوز ہے۔"

کمرے میں کتنی ہی دیر تک خاموشی رہی پھر نادیہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے بھروسہ نہیں ہو رہا سسٹر کہ انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہو گا۔"

"لگتا ہے تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تم بس ایک ہی رُخ پر سوچتی ہو۔" میڈم صفورا جھنجھلا کر بولی۔ "الکحل لینا کچھ کم کر دو۔"

پھر وہ تیزی سے شیرے کی طرف مڑی۔ "شیرے! باندھو اس کو رسّی سے۔ یہ ابھی بتائیں گے سب کچھ۔"

شیرا تو جیسے حکم کا منتظر تھا۔ وہ میری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی نے نائلون کی رسّی اس کی طرف بڑھائی۔ دونوں گارڈز نے مجھے پھر بازوؤں سے دبوچ لیا۔ عمران گرج کر بولا۔

"ٹھہرو۔"

دونوں بہنوں سمیت سب لوگ عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ دیر پہلے کے عمران سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ "اگر میں کہوں میڈم صفورا کہ میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھوں گا تو پھر؟"

"تو پھر اس کو کھول دیں گے۔" میڈم روانی سے بولی۔ پھر اس نے دوبارہ میرے بارے میں حکم صادر کیا۔ "باندھو اس کو۔"

"ٹھہرو۔" عمران بھی دوبارہ گرجا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ گھن گرج کے ساتھ میڈم صفورا پر برس پڑے گا۔ تاہم اس نے اپنے لب و لہجے کو چیک کیا اور گہری سانس لے کر ہموار انداز میں بولا۔ "میڈم صفورا! یہ میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ تم میرے بارے میں جانتی نہیں ہو، اس لیے اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ حرف بہ حرف درست

ہے۔ میں اس معاملے کے حوالے سے تم سے ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے درمیان جو بات ہو، اچھے ماحول میں ہو۔ اگر تم اسے باندھ دو گی یا مار پیٹ کرو گی تو پھر اچھا ماحول باقی نہیں رہے گا۔''

میڈم چند سیکنڈ تک گہری نظروں سے عمران کا جائزہ لیتی رہی، تب اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ رسّی بردار شیرا مجھ سے دور چلا گیا۔ مجھے دبوچنے والے دونوں گارڈز بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میڈم کو بھی غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ اتنے افراد کی موجودگی میں مَیں کسی طرح کی مہم جوئی کا نہیں سوچ سکتا۔

عمران نے مجھے کسی بھی طرح کی سختی سے بچانے کے لیے بڑی تیزی سے فیصلہ کیا تھا۔ اس کی یہ تیزی میرے دل میں اس کا پیار کچھ اور بھی بڑھا گئی۔ میں نے خود کو اس کے اور زیادہ قریب محسوس کیا۔ میں نے گرل کے پار اس کی چوڑی چھاتی اور روشن آنکھیں دیکھیں اور مجھے فخر سا محسوس ہونے لگا کہ وہ میرا دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک جوش سا بھر گیا۔ مجھے لگا کہ آئندہ گھڑیوں میں مجھے کہیں اس کے شانے سے شانہ ملا کر لڑنا پڑا تو میں لڑ جاؤں گا۔ اس پر ثابت کر دوں گا کہ میں لڑ سکتا ہوں۔

میڈم نادیہ یکسر خاموش کھڑی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سب کے سامنے اسے بڑی بہن سے جو ڈانٹ پڑی تھی، وہ اسے بدمزہ کر گئی تھی۔ احتجاج کے طور پر اس نے میٹھی شراب کا ایک اور جام چڑھایا اور اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

میڈم صفورا نے بھی صوفہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد اس نے اشارے سے سب گارڈز کو باہر بھیج دیا۔ بس ایک گارڈ وہاں رہا، یہ شیرا تھا۔ میڈم صفورا کے ساتھ عمران کی بات چیت شروع ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عمران نے واقعی میڈم صفورا شیرازی کو الف سے ے تک ساری کہانی سنانی شروع کر دی۔ اس نے سچ مچ کچھ بھی میڈم سے نہیں چھپایا۔ اس نے تسلیم کیا کہ سیٹھ سراج کی گاڑی سے انہوں نے جان بوجھ کر گاڑی ٹکرائی تھی۔ پھر ہڑپہ اور لال کوٹھیوں کا کھوج۔ اس کے بعد سلیم کا ہمارے ہاں آنا اور ہمارا سلیم کا تعاقب کر کے مجید مٹھو تک پہنچنا۔ پھر مجید مٹھو کے ساتھ کار ریس لگاتے ہوئے مجید مٹھو کا کھائی میں گر جانا۔ سب کچھ عمران نے میڈم کے گوش گزار کر دیا۔ درمیان میں میڈم نے سوالات کیے جن کے جواب عمران نے وضاحت سے دیئے۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''میں نے آپ کو سچ اور صرف سچ بتایا ہے۔ میں آپ کو یہ بات بھی پوری سچائی کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا ارادہ مجید مٹھو کے بارے میں بُرا نہیں تھا۔ ہم صرف اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ بس تھوڑی سی پوچھ گچھ لیکن

جب وہ بھاگا تو ہمیں اس کا پیچھا کرنا پڑا۔ وہ بڑی بُری ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہم نے اسے سائیڈ نہیں ماری، اس نے ہمیں ماری اور پھر خود ہی اپنی گاڑی پر کنٹرول نہیں رکھ سکا۔ وہ معمولی زخمی ہوا تھا۔ ہم نے وہیں پر اس سے سوال جواب کیے۔ اس پر کسی طرح کا تشدد نہیں کیا۔ مجید کو جو نقصان پہنچا وہ اس کی اپنی غلطی سے پہنچا۔ وہ اقبال پر جھپٹ پڑا۔ اقبال کے منہ میں سگار تھا۔ یہ سگار اُچھل کر اس پیٹرول پر جا گرا جو گاڑی سے بہہ رہا تھا۔ اقبال اور مجید دونوں آگ کی لپیٹ میں آئے۔ مجید چونکہ گاڑی سے زیادہ قریب تھا، اس لیے اس کا زیادہ نقصان ہو گیا۔''

یہ پوری روداد سننے کے بعد میڈم صفورا کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔

دوسری طرف میڈم نادیہ، عمران کے بیان سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جو ایک دو سوالات کیے، وہ بھی خاصے تیکھے تھے۔

میڈم صفورا نے گہری سانس لی تو ٹی شرٹ میں اس کے جسمانی نشیب و فراز اور بھی نمایاں نظر آنے لگے۔ وہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھ کر حتمی لہجے میں بولی۔ ''نادو! میں ان تینوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا نا کہ یہ پیچیدہ معاملہ ہے۔ اب دیکھو، بات کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ نہ صرف ان کی وجہ سے مجید مٹھو کی جان گئی ہے بلکہ قادر بھی اب وہاں نہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔'' یہ آخری فقرہ میڈم صفورا نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس ساری روداد میں اسے جس اطلاع نے سب سے زیادہ پریشان کیا ہے، وہ یہی ہے کہ قادر اب اس کی دسترس میں نہیں ہے۔ اس پریشانی کی وجہ بھی کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ قادرے کے اوجھل ہونے کا مطلب تھا کہ قادرے کی خوبرو بہن کنول بھی اب ہاتھ سے نکل چکی ہے اور کنول کے ہاتھ سے نکلنے کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا کا صدیقی کے حوالے سے سارا پلان فلاپ ہو گیا ہے۔

میڈم صفورا نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ تو کیا میں ہوپ رکھوں کہ تم قادرے کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں بھی سچ کہو گے۔''

عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہاں میڈم! قادرے کے بارے میں بھی سچ کہوں گا اور قادرے کے بارے میں سچ یہ ہے کہ میں نے اسے اس کی فیملی سمیت یہاں سے

نکال دیا ہے۔''

''بہت خوب۔'' میڈم صفورا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ اس کی ورمے جیسی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ چھوٹی بہن کی طرف گھومی۔ ''دیکھ رہی ہو نادو! یہ ہوتے ہیں جلیبی کی طرح سیدھے سادے معاملے۔''

نادو یعنی نادیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی صفورا نے گارڈز کو حکم دیا کہ وہ عمران کو کمرے سے نکالیں اور اس کی رہائش گاہ پر پہنچائیں۔

نادیہ نے کہا۔ ''سسٹر! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ ایک دم ہتھ چھٹ ہے۔ اس کے لیے احتیاط کرنی ہوگی۔''

''مجھے یہ اتنا بیوقوف نہیں لگتا کہ دو تین رائفلوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایڈونچر کرے گا۔'' پھر صفورا، عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''کیوں مسٹر! ایسی بیوقوفی کا ارادہ ہے تمہارا؟''

''نو میڈم! ناٹ ایٹ آل۔'' عمران نے سعادت مندی سے کہا۔

''لیکن پھر بھی سسٹر! بہتر ہے کہ اس سے یہیں پوچھ گچھ کر لو۔ ہم نے بڑا رسک لے کر اُسے یہاں تک پہنچایا ہے۔''

''او ہو نادو! اب اسے اتنا بھی ہوا نہ بناؤ۔ اگر زیادہ ڈر ہے تو ہینڈ کف لگا لو دونوں کو۔''

اس کے ساتھ ہی صفورا نے موچھیل گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ بغلی دروازے میں داخل ہوا اور چند سیکنڈ بعد دو اسٹائلش ہینڈ کف لیے واپس آ گیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید اور ہلکی پھلکی قسم تھی۔ عمران نے خاص پس و پیش نہیں کیا۔

موچھیل گارڈ نے باہر کھڑے کھڑے ہینڈ کف کو گرل کے اندر سے گزارا اور پھر عمران کے ہاتھوں میں پہنا دیا۔ ایک ایسا ہی ہینڈ کف مجھے بھی پہنا دیا گیا۔ میں زندگی میں پہلی بار ہتھکڑی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ یہ توہین آمیز بے بسی کی عجیب سی کیفیت تھی۔

شیرے نے کمرے کا لاک کھول کر عمران کو باہر نکالا۔ عمران کو باہر نکالتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں عمران پر کوئی فقرہ کسا۔ جواب میں عمران نے بھی کچھ کہا۔ دونوں کے الفاظ مجھ تک نہیں پہنچے۔ تاہم میں نے شیرے کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا۔ وہ غضبناک ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر ایک زوردار دو ہتڑ عمران کی گردن پر مارا۔ عمران اس حملے کے لیے پوری طرح تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ پیچھے کی طرف بندھے ہوتے تو شاید چہرہ صوفے سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا۔ عمران کے گرتے ہی شیرا اور اس کے دو ساتھی چیلوں کی طرح اس پر جھپٹے اور پیٹنے لگے۔ عمران نے اپنے بندھے

ہوئے ہاتھوں سے ایک گارڈ کے چہرے پر نیچے سے ضرب لگائی، وہ اُچھل کر میڈم صفورا کے پاس گرا اور ایک قیمتی ڈیکوریشن پیس چکنا چور کر گیا۔ اس کے ساتھی نے جواباً عمران کے سر پر رائفل کا بٹ مارا۔

''رُک جاؤ...... رُک جاؤ۔'' میڈم صفورا گرجی۔

پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک گارڈ کے سر کے بال پکڑے اور اسے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ گارڈز میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میڈم صفورا کے حکم کو نظر انداز کر سکتے۔ وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ تاہم اب دو گارڈز نے اپنی رائفلیں عمران کی طرف سیدھی کر لی تھیں۔ عمران بھی صوفے کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میڈم صفورا، شیرے پر برسی۔ ''میرے ہوتے ہوئے تم ایسا کر رہے ہو تو آگے پیچھے کیا کرتے ہو گے؟''

''میڈم! اس نے گالی دی ہے۔'' شیرا بھاری آواز میں بولا۔

''کوئی گالی نہیں دی ہے اور پہل تم نے کی تھی۔'' صفورا نے جواب دیا۔

''اس کے منہ میں کتے کی زبان ہے میڈم!'' شیرا بولا۔

عمران نے کہا۔ ''اور تم سرتاپا کتے ہو، وہ بھی گندی نسل کے۔ بندھے ہوئے پر حملہ کرتے ہو۔ آزاد کے سامنے پوشل ٹانگوں میں دبا کر بھاگتے ہو۔''

''میڈم! اس کو بڑی غلط فہمی ہوگئی ہے اپنے بارے میں۔ اس کے ہاتھ کھول دیں اور مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی اکڑ فوں نکال سکوں۔''

''اچھا...... اچھا...... ابھی یہ ڈراما بند کرو۔'' میڈم صفورا پھر گرجی۔ ''ابھی اسے لے کر چلو میری طرف۔''

نادیہ کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بالکل خوش نہیں ہے۔ بہرطور وہ سب کے سامنے خاموش تھی۔ گارڈز نے ہمیں دھکیل کر کمرے سے باہر نکالا اور ایک طویل راہداری میں لے آئے۔ ہم نے کوٹھی سے نکل کر ایک وسیع گراسی لان طے کیا۔ اس میں فوارے لگے تھے اور پھولوں کی کیاریاں تھیں، تب ہم دوسری کوٹھی کے پورچ میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک شاندار لینڈ کروزر اور ایک ویلز جیپ کھڑی تھی۔ رہائشی عمارت کے مین دروازے کے پاس ایک بہت بڑا السیشین کتا سنہری زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گارڈز ہمیں لے کر اس دوسری کوٹھی کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیاں اُتار کر ایک کشادہ بیسمنٹ میں لے آئے۔ اس بیسمنٹ میں دو کمرے تھے اور ایک لاؤنج نما جگہ تھی جہاں ایک خوبصورت شیلف

پر ٹی وی اور آڈیو سسٹم وغیرہ موجود تھے۔ کمرے میں دائیں طرف ایک کھڑکی تھی جس میں ڈیزائن دار آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی کھڑکی تھی جیسی میں اس سے پہلے نادیہ کی رہائش گاہ پر دیکھ چکا تھا۔

عمران مجھے دیکھ کر مسکرایا تو اس کی سوجی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آنے لگیں۔ چہرہ نیلو نیل تھا۔ دائیں ہاتھ کی پٹی میں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دے کر بولا۔ ”جگر! یہ ہتھکڑیاں تو مردوں کا زیور ہوتی ہیں اور چوٹیں وغیرہ بناؤ سنگھار۔ ایسی باتوں کو دل سے نہیں لگانا چاہیے۔ بندہ دل کو لگا لے تو پھر گندم کی گولیاں ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے۔“

وہ اکثر گندم کی گولیوں کا حوالہ دیتا رہتا تھا اور یہ بات مجھے بہت بُری لگتی تھی مگر پہلی مرتبہ اس کی بات مجھے بُری نہیں لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت جب میں مایوسی کی انتہا کو چھو کر زہریلی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا، میں واقعی غلطی پر تھا۔ تب مجھے سرِعام زدوکوب کیا گیا تھا اور میں اس صورتِ حال کو اپنے لیے بے حد ذلت آمیز محسوس کر رہا تھا۔ آج عمران کو بھی تو زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر مجھ سے زیادہ چوٹیں آئی تھیں لیکن اس نے یہ سب کچھ ہنسی میں اُڑا دیا تھا۔ بالکل ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ شاید دُکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا سامنا کرنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔

”کس سوچ میں کھو گئے جگر؟“ اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

”تمہارے ساتھ کافی مار پیٹ ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس خبیث شیرے کا ہی کیا دھرا ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا جگر! ہمارے ساتھ رہو گے تو آہستہ آہستہ باتیں تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائیں گی۔ یہ واقعی شیرے ہی کی والہانہ محبت ہے۔ اس نے مجھ پر پرانا غصہ نکالا ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ اس کی باری آ گئی ہے تو ہماری بھی آ جائے گی مگر جب ہماری آئے گی تو ہم اسے باندھ کر نہیں ماریں گے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بتاؤ تم اس دعوتِ شیراز میں کیسے شریک ہو گئے ہو؟“

”دعوتِ شیراز میں؟“

”او یار! میں ذرا ادبی بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ تم یہاں کیسے آ پھنسے؟“

”تمہارا یار سلیم! تمہارے یہاں پکڑے جانے کی اطلاع لے کر ہمارے پاس آیا تھا، وہاں راوی روڈ۔“

”پھر؟“

”پھر ہم گھر سے نکلے اور نکلتے ہی پکڑے گئے۔ سلیم کی نگرانی ہو رہی تھی۔“

میں نے اپنے پھنسنے کی ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ وہ پریشانی کے بجائے دلچسپی سے سنتا رہا۔

اس دوران میں تہ خانے کا دروازہ کھلا اور ہمیں اقبال کی صورت نظر آئی۔ دو گارڈز اسے لے کر سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ اقبال نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تاہم گارڈز اسے ہمارے کمرے میں لانے کے بجائے ساتھ والے کمرے میں لے گئے اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

”کیا حال ہے شہزادے؟“ عمران نے بلند آواز میں اقبال سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں...... اور تم؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں یار! لیکن اب میری بات پر یقین کون کرے گا؟“ عمران نے دُکھی لہجے میں کہا۔ ”پوری رات میڈم صفورا کی ڈاکو بہن کے پاس رہا ہوں۔ بے شک میری عزت بچ رہی ہے مگر لوگوں کی زبانیں تو بند نہیں کی جا سکتیں نا۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں بنیں گی؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اب شاہین مجھے قبول بھی کرے گی یا نہیں؟“

”چلو قبول نہیں کرے گی تو میں شادی کر لوں گا۔“

”مجھ سے؟“

”نہیں یار! شاہین سے۔“

”لعنت ہے تیری دوستی پر۔ میرے دُکھ میں شریک ہونے کے بجائے زخموں پر مرچیں چھڑک رہا ہے۔ کم از کم تجھے تو میرا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں بالکل پاک ہوں۔ میڈم نادیہ نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تیرے سر کی قسم، میری عزت محفوظ ہے۔ تُو تو مجھے جانتا ہے میرے پیارے سہیلے! اگر میرے ساتھ کچھ ہوا ہوتا تو میں نے اب تک پنکھے سے لٹک کر آتما ہتھیا کر لی ہوتی۔“

ایک سینئر گارڈ دھاڑا۔ ”تم اپنی بکواس بند کر دو تو اچھا ہے۔“

”دیکھ لو دنیا والو! یہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ اب اگر ان کی ہمشیرہ کی شکل میری بچپن کی محبوبہ سے مل گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ عمران نے فریاد بلند کی۔

”تمہاری تو......“ سینئر گارڈ نے نازیبا الفاظ استعمال کیے اور کھڑکی کو زور سے بند کر

دیا۔اس کے بعد اس نے اقبال کے کمرے والی کھڑکی بھی بند کر دی۔

یہی وقت تھا جب ایک بار پھر اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ہم نے کھڑکی کی جھری میں سے جھانکا۔ میڈم صفورا بارعب چال چلتی ہوئی تہ خانے میں آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک گنجا شخص تھا جس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ میڈم صفورا ہماری طرف آئے گی۔ وہ اقبال والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میڈیکل باکس والا ڈاکٹر نما شخص بھی ادھر ہی گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اقبال کی زخمی ٹانگوں کو دیکھنے گیا تھا۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے۔ پھر گنجا شخص اپنے باکس سمیت ہمارے کمرے میں آ گیا تاہم میڈم صفورا، اقبال کے پاس ہی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پولیس والوں والا حربہ استعمال کر رہی ہے۔ ہمارے بیانات کی تصدیق کے لیے اقبال کو علیحدہ سے کرید رہی ہے۔ عمران کو پتا تھا کہ اقبال سے میڈم کا اہم ترین سوال یہی ہونا ہے کہ قادر اور اس کی بہن کہاں ہیں۔ اس حوالے سے عمران کو تسلی تھی۔ دراصل اقبال کو بھی صرف اتنا ہی پتا تھا کہ عمران نے قادر اور اس کی فیملی کو ملتان بھیجا ہے۔ کس کے پاس بھیجا ہے۔ کہاں بھیجا ہے، اس کے بارے میں وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

گنجا شخص واقعی ڈاکٹر تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گونگا ہے۔ جتنی دیر ہمارے پاس رہا، اس نے ''ہوں ہاں'' کے سوا کوئی بات نہیں کی۔ اس نے عمران کے چہرے کی مرہم پٹی کی۔ ہاتھ کی بینڈیج بھی کھول کر دیکھی۔ ہاتھ پشت کی طرف سے بُری طرح سوج گیا تھا۔ ڈاکٹر نے روئی وغیرہ رکھ کر دوبارہ پٹی باندھ دی۔ مسلح گارڈز بدستور دروازے پر موجود رہے۔ اسی دوران میں میڈم صفورا کی شکل بھی نظر آ گئی۔ وہ کمرے میں نہیں آئی تھی بلکہ اس نے کھڑکی کھول کر ہمیں اپنی صورت دکھائی تھی۔

''ہاں ڈوک! تمہارا کام مکمل ہو گیا؟'' میڈم نے پوچھا۔

''یس میڈم۔'' ڈاکٹر نے کہا تو ہمیں پتا چلا کہ وہ بھی منہ میں زبان رکھتا ہے۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ میڈم صفورا کھڑکی کے عین سامنے کرسی ڈلوا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور دانا نظر آتی تھی۔ وہ ذرا سی ''اوور ویٹ'' ضرور تھی تاہم نادیہ سے خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اپنی عقابی نگاہیں عمران کے چہرے پر گاڑے رکھیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تو تم قادر اور اس کی بہن کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے انہیں ان کی مرضی سے جانے دیا ہے۔ وہ کہاں

گئے، مجھے خود پتا نہیں۔''

''تمہارے نہ بتانے سے ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ ہے۔ صدیقی ایک بڑے خبطی شخص کا نام ہے۔ اس نے ایک بار ''نہ'' کہہ دی تو پھر کوئی طاقت اسے ہاں میں نہیں بدل سکے گی۔ ہم بڑی مشکل سے اسے اپنے راستے پر لائے ہیں۔ سراج کے ساتھ صدیقی کی ''کمٹمنٹ'' ہو چکی ہے۔ اگر وہ لڑکی کنول، ابرار صدیقی سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے تو وہ بھی ہماری بات مان لے گا اور وہ بہت حد تک راضی ہو بھی چکی تھی۔ تم لوگوں نے بیچ میں کود کر سارا معاملہ اپ سیٹ کیا ہے۔''

عمران بولا۔ ''میڈم! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس لڑکی کو کس طرح رضامند کیا جا رہا تھا۔ خیر آپ یہ باتیں چھوڑیں۔ آپ مجھے صرف ایک بات بتائیں۔ وہ ایسی کیا خاص شے ہے جس کو صدیقی سے حاصل کرنے کے لیے آپ اس قدر ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں؟ آپ کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک نادر شے موجود ہے۔ پھر کسی ایک شے کی خاطر اتنی زیادہ بے قراری؟''

''یہ تم نہیں سمجھ سکتے اور نہ میں سمجھا سکتی ہوں۔ ہاں...... کوئی میرا ہم ذوق ہو تو اور بات ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی ''ارج'' ہوتی ہے۔ ایک ایسی پیاس جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔'' اس کی بادامی آنکھوں میں واقعی ایک عجیب طرح کی پیاس اُمڈ آئی۔ وہ جیسے تصور میں اس نادر پیس آف آرٹ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے کاروباری رقیب ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جس کو پانے کے لیے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

''کیا وہ گندھارا آرٹ کا کوئی نمونہ ہے؟''

''تم یہی سمجھ لو۔'' میڈم نے مختصر جواب دیا۔

عمران نے بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ میڈم صفورا کھڑکی کے دوسری طرف تھی اور عمران کو گھور رہی تھی۔ اس بے بسی کی حالت میں بھی عمران کا اعتماد اور بے پناہ اطمینان اسے اُلجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا پالا کسی معمولی شخص سے نہیں پڑا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اب سختی کے بجائے نرمی اور حکمت سے کام لینا چاہ رہی تھی۔ اس میں مردم شناسی کی خاص صلاحیتیں نظر آتی تھیں۔

عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میڈم! آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو قادر اور اس کی بہن کی ضرورت ہے یا اس پیس آف آرٹ کی؟''

''ظاہر ہے، مجھے اس پیس آف آرٹ کی ضرورت ہے لیکن میں صدیقی سے بھی اپنا

تعلق خراب نہیں کرنا چاہتی۔''

''اگر میں کہوں کہ صدیقی سے آپ کا تعلق خراب نہیں ہوگا اور وہ پیس آف آرٹ بھی آپ کو مل جائے گا تو پھر؟''

''تمہارے پاس جادو کی چھڑی ہے؟''

''جادو کا ڈنڈا ہے اور ان شاء اللہ آپ خود بھی ڈنڈے کی معترف ہو جائیں گی۔ میڈم! گستاخی معاف، میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ کے پاس بندے ضرور ہیں اور وہ باصلاحیت بھی ہیں لیکن ان کا کیلیبر اتنا نہیں ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی بڑا کام کر سکیں۔ سیٹھ سراج اور عارف خان جیسے لوگ بس گزارہ کر سکتے ہیں، کوئی چمتکار نہیں دکھا سکتے۔ میں ایک مسکین بندہ ہوں لیکن...... معافی چاہتا ہوں...... آپ کے ان کرائے کے ٹٹوؤں سے بہت بہتر ہوں۔ اس کے علاوہ مار دھاڑ بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک میڈم نادیہ دیکھ چکی ہیں۔ ان کا ہیڈ گارڈ شیرا میرے ہاتھوں جس طرح ناک آؤٹ ہوا تھا، وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔''

''اچھا تو اس واقعے کی وجہ سے تم یہ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو؟ لیکن شیرے کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا ورنہ وہ تم جیسے دو تین بندوں کا بہ یک وقت بھرتا بنا سکتا ہے اور سچ پوچھو تو میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس روز اتفاقاً ہی اس کے ساتھ کچھ ہوا تھا۔''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں اب بھی بلکہ اسی وقت اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگوں کی تھوڑی سی تفریح بھی ہو جائے گی۔''

میڈم کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے جیسے اب بھی بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کہ عمران جیسا عام قد کاٹھ کا شخص شیرے جیسے نہایت خطرناک اور پہلوان نما فائٹر کو صرف دو تین سیکنڈ میں زمین چٹوا سکتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اگر میں نے بھی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ عمران کا قد بمشکل چھ فٹ تھا۔ شانے چوڑے لیکن جسم چھریرا تھا۔ خاص طور سے اپنی صورت کے اعتبار سے تو وہ بالکل بھی کرخت اور مار دھاڑ والا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شوخ سی معصومیت چھائی رہتی تھی۔ میڈم نے کھڑکی کے پاس آ کر عمران کو بغور دیکھا اور بولی۔

''تجویز تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اگر اس کھیل میں تم دونوں میں سے کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا؟''

''اگر آپ چاہتی ہیں تو ہڈی پسلی بھی نہیں ٹوٹے گی اور آپ کا پہلوان چت بھی ہو

جائے گا۔''

''خود پر اتنا بھروسہ ہے؟''

''بھروسہ تو اللہ پر ہے۔ میرا کام کوشش کرنا ہے۔'' اسی دوران میں میڈم کی نظر کا زاویہ تبدیل ہوا۔ غالباً اس کا دھیان عمران کے زخمی ہاتھ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ بولی۔ ''لیکن تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔ کیا اسی طرح لڑنا پسند کرو گے؟''

''میرے دونوں ہاتھ زخمی ہوتے تو بھی میں پسند کرتا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''سوچ لو۔''

''سوچ لیا۔''

میڈم صفورا کی آنکھوں میں دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے موبائل فون نکالا اور ایک نمبر پریس کرنے کے بعد بولی۔ ''شیرا! یہاں آجاؤ میرے پاس۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں بھی جان گیا کہ اب یہاں ہلچل ہو گی۔ میری دھڑکن بڑھ گئی۔ قریباً دو منٹ بعد شیرا تہ خانے میں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اسے کس لیے بلایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میڈم نادیہ بھی وہاں آدھمکی۔ اس کے ساتھ دو باوردی گارڈز بھی تھے۔ گارڈز کی ''اے کے 56'' رائفلیں خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نادیہ کی شکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بالکل ناقابلِ اعتبار تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عمران پر ''کاٹھی ڈالنے'' کے لیے میرے ساتھ بدسلوکی نہیں کرے گی لیکن اس وعدے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ مجھے کرسی سے باندھنے پر تل گئی تھی۔

دو گارڈز نے عمران کو کمرے سے باہر نکالا اور اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ شیرے نے اپنی جیکٹ میں سے تمام اشیاء نکال کر اپنے ایک ساتھی کو پکڑا دیں۔ ان میں ایک عدد ماؤزر بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اس نے گھڑی اُتاری اور وہ بھی ساتھی کے حوالے کر دی۔ عمران کی تلاشی تو پہلے بھی کئی بار ہو چکی تھی۔

''کوئی ہتھیار استعمال نہیں ہوگا۔'' میڈم صفورا نے شیرے اور عمران دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کسی بھی چیز سے کوئی ضرب نہیں لگائی جائے گی۔'' اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

احتیاط کے طور پر میڈم نے وہاں سے ہر شے ہٹوا دی جسے ضرب لگانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سب کے چہرے پر سنسنی نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید شیرا،

عمران کے زخمی ہاتھ کو دیکھے گا اور اس حوالے سے کوئی بات کرے گا لیکن وہ یہ اخلاقی جرأت نہیں کر سکا اور ایک طرح سے یوں اس نے خود کو اخلاقی طور پر کمزور ثابت کیا۔

باکسنگ گلوز وغیرہ پہن کر لڑنا اور بات ہوتی ہے۔ جب دو مشتعل افراد خالی مکوں سے لڑتے ہیں تو اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ چہرے پر گہرے زخم آئیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے عمران کے زخمی چہرے کو مزید زخمی دیکھا اور میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہ دو بدو لڑائی کسی طرح ٹل جائے۔

بہر حال ایسا نہیں ہوا۔ بیسمنٹ کے خالی حصے نے ''فائٹنگ رنگ'' کی شکل اختیار کر لی۔ عمران اور شیرا ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ شیرے کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ یقیناً وہ اس رات والی ہزیمت کا پورا پورا بدلہ عمران سے لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف عمران کو بھی ایک مناسب موقع ملا تھا۔ اسے یہاں لا کر باندھا گیا تھا اور شیرے نے اس کے ساتھ ''مکا، لات'' کی تھی۔ اب اس مکا، لات کا جواب دیا جا سکتا تھا۔

پہلا وار شیرے نے ہی کیا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ مکا ن عمران کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گیا۔ شیرے کا دوسرا مکا بھی اچٹتا ہوا سا پڑا۔ تاہم وہ اتنے جوش سے آگے آیا تھا کہ عمران اسے سنبھالتے سنبھالتے لڑکھڑا گیا اور گر پڑا۔ شیرا اس کے اوپر گرا اور مکے برسانے لگا۔ عمران نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ اس کی پسلیوں کو نشانے بنانے لگا۔ عمران نے بھی ایک دو ضربیں اس کے چہرے پر لگائیں۔

میڈم صفورا کے حکم پر دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بار پھر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ اس بار شیرے کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو کچھ عرصہ پہلے میڈم نادیہ کی رہائش گاہ پر ہو چکا تھا۔ وہ عالم جوش میں پچھلا سبق بھلا بیٹھا۔ اس نے اپنا چہرہ عمران کے سر کی خوفناک ٹکر کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ مجھے تو یہی لگا جیسے یہ اس پہلے سین کا ری پلے ہے۔ عمران کے سر کی دھواں دھار ضرب شیرے کے ماتھے پر لگی۔ ناریل چٹخنے کی سی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا، اس کے کھوپڑے کو عمران کے سر کی دوسری ضرب سہنا پڑی۔ اس ضرب نے اسے کئی فٹ پیچھے اُچھالا اور وہ میڈم صفورا کے قدموں میں جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے پوری ہمت مجتمع کر کے اُٹھنے کی کوشش کی مگر تیورائے ہوئے باکسر کی طرح ڈگمگا کر گھٹنوں کے اوپر گر گیا۔

''اسٹاپ......اسٹاپ اِٹ......'' میڈم صفورا چلائی۔

دو گارڈز عمران اور شیرے کے بیچ آ گئے۔ توہین اور تکلیف کے شدید اثر کے تحت شیرا

اُٹھا اور عمران کی طرف بڑھنا چاہا تاہم اب میڈم صفورا نے باقاعدہ اس کے سامنے آ کر اسے روک دیا۔

یہ لڑائی بمشکل دو تین منٹ جاری رہ سکی تھی۔ شاید حاضرین میں سے کسی کو بھی ایسے تیز رفتار اختتام کی توقع نہیں تھی۔

شیرا رُک گیا مگر بدستور احتجاج کرتا رہا۔ اس کے احتجاج میں کوئی جان نہیں تھی۔ وہاں موجود ہر فرد نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میڈم صفورا نے عقلمندی کا ثبوت دے کر شیرے کو بچا لیا ہے۔ وہ ایک بار پھر عمران کے سامنے آتا تو شاید بہت زیادہ نقصان اُٹھا لیتا۔ شیرے کے علاوہ شیرے کے دو تین قریبی ساتھی بھی عمران کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ تاہم ان نظروں میں خوف کی جھلکیاں بھی تھیں۔

میں کوئی مارشل آرٹ کا ماہر نہیں تھا کہ اس کی باریکیوں پر بہت زیادہ غور کر سکتا۔ تاہم میں نے کافی عرصے تک جوڈو کراٹے کی کلاسیں لی تھیں۔ میں دو بدو لڑائی کے بنیادی اصول جانتا تھا۔ میں نے بہترین لڑاکوں کو رِنگ میں لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن میں نے عمران کے انداز میں جو حیران کن جھپٹ دیکھی، وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑائی میں اس کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کے سر کی ضرب تھی۔ یہ وار وہ اس قدر اچانک اور اتنے بھرپور طریقے سے کرتا تھا کہ مدِ مقابل بھونچکا رہ جاتا تھا۔ یہ وار کرتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک عمران کا جسم ایک ایسا زاویہ اختیار کر جاتا تھا جس سے بے پناہ توانائی پیدا ہوتی تھی۔ اس توانائی کو پیدا کرنے میں اس کے پاؤں کی انگلیاں شاید سب سے اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ پھر یہ توانائی ایک شوریدہ لہر کی طرح اس کے سر تک جاتی تھی اور ایک خوفناک ضرب کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔

تہ خانے میں سب ہکا بکا تھے۔ جسمانی لحاظ سے عمران اور شیرے کا مقابلہ گھوڑے اور ہاتھی کا مقابلہ تھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اقبال نے بھی اس تیز رفتار مقابلے کو دیکھا تھا اور اندر سے ہی غالباً تالیاں بھی بجائی تھیں۔

میڈم صفورا کے اشارے پر شیرے کو باہر جانا پڑا۔ اس مقابلے کے بعد نادیہ کا منہ بھی بند ہو گیا تھا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔ میڈم صفورا نے اپنے گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے عمران کو واپس کمرے میں چلنے کو کہا۔ عمران، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر آپ کی تفریح ادھوری رہی ہے تو میں مزید تفریح مہیا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ اگر شیرا صاحب کے ایک دو ساتھی اکٹھے میرے ساتھ کشتی لڑنا چاہیں تو بھی میں حاضر ہوں۔''

''اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' میڈم صفورا سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''ابھی تم کمرے میں جاؤ۔''

میں نے شکر کیا کہ عمران کمرے میں واپس آ گیا۔ ورنہ ایک موقعے پر تو میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی بڑے ایڈونچر کی کوشش نہ کرے۔ اس کے اردگرد رائفل بردار گارڈز موجود تھے اور وہ ان میں سے کسی پر جھپٹنے کا سوچ سکتا تھا یا پھر ایسی ہی کوئی حرکت۔ کمرے میں واپس آنے سے پہلے عمران کو پھر ہینڈ کف پہنا دیئے گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمارے اردگرد سکون ہو گیا۔ بس تہ خانے کے دروازے پر دو باوردی گارڈز کھڑے رہے۔ ہم اپنے راوی روڈ والے گھر سے شام سات بجے کے قریب نکلے تھے، اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا اور جن حالات سے گزر رہے تھے، اس کے نتیجے میں بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بہر طور تھوڑی دیر بعد کھانے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ایک جواں سال ملازمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چکن بریانی، قورمہ، فرائی فش اور نان وغیرہ بہت سے لوازمات ٹرالی میں موجود تھے۔ اس میں سے کچھ کھانا اقبال کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ باقی ہمارے کمرے میں آ گیا۔ میڈم نے جاتے جاتے ہم پر واضح کر دیا تھا کہ اقبال ابھی دوسرے کمرے میں ہی رہے گا۔ اس نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ فی الحال ہم اس سے بات چیت کی کوشش نہ کریں ورنہ گارڈز کو مداخلت کرنا پڑے گی۔

''کھاؤ یار!'' عمران نے بائیں ہاتھ سے ایک بڑا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... بھوک نہیں۔'' میرا لہجہ آزردہ تھا۔

عمران نے بھی ہاتھ روک لیا۔ ''کیوں بھوک نہیں ہے۔''

''عمران! میں اسی وقت سے ڈرتا تھا۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنس چکے ہیں اور اگر صرف ہماری ہی بات ہوتی تو بھی خیر تھی۔ مگر اب میرے گھر والے بھی زد میں آ رہے ہیں۔''

''تم نے اپنے بارے میں چھوٹی میڈم کو کچھ بتایا ہے؟''

''سب کچھ بتایا ہے۔''

''کیا ضرورت تھی؟''

''نہ بتاتا تو چند گھنٹے بس اسے خود ہی معلوم ہو جانا تھا۔ وہ میرے سامنے فون پر سیٹھ سراج سے بات کر رہی تھی۔ سیٹھ نے صبح دس بجے یہاں آنا ہے۔''

عمران کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر منرل واٹر کے چند گھونٹ لے کر بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں یار! میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑی میڈم میرے ہاتھ پر بیعت ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! مریدنی بننے والی ہے اپنی۔ جو کچھ کہیں گے، مانے گی۔ نہ مانے گی تو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیں گے۔''

''ہر وقت پہیلیوں میں بات نہ کیا کرو۔'' میں نے منہ بنایا۔

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے چھوٹی میڈم کو اپنی سوانح حیات نہ سنائی ہوتی تو زیادہ آسانی ہوتی۔ ہم بڑی میڈم سے کہہ دیتے کہ وہ تمہیں سیٹھ سراج کے سامنے آنے ہی نہ دے لیکن اب اس سے فائدہ نہیں۔ اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میڈم سے کہنا ہو گا کہ وہ تمہارے گھر والوں کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ نادیہ یا سیٹھ سراج وغیرہ انہیں پریشان نہ کر سکیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بڑی میڈم انہیں پناہ دے...... بالکل بوگس خیال ہے تمہارا۔ یہ لوگ جس طرح کی پناہ دیتے ہیں، وہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ قادرے کو بھی تو بڑی میڈم نے پناہ دی تھی نا...... پھر کیا کیا اس کے ساتھ۔''

''کیا تمہیں قادرے اور مجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟''

''مجھے صرف ایک بات کا پتا ہے۔ تم مجھے اس لعنتی معاملے میں پھنساتے چلے جا رہے ہو۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے مر جانے دیتے اسی دن۔ قصہ پاک ہوتا۔ میری وجہ سے میرے گھر والوں پر تو آفت نہ آتی لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔ بس اپنے شغل میلوں میں لگے رہے ہو۔ تم بس اپنے ہی ڈھنگ سے چلنا جانتے ہو۔ تمہیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔'' میں بھنایا ہوا کھانے کے سامنے سے اُٹھا اور دوسری دیوار کے ساتھ جا بیٹھا۔

عمران نے بھی کھانا ایک طرف ہٹایا اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ میرے پاس بیٹھا۔ اس نے اپنا زخمی ہاتھ بڑی ملائمت سے میرے ہاتھ پر رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جو میں دیکھ رہا ہوں تابی! وہ تم نہیں دیکھ رہے۔ اگر مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسہ ہے۔ تو اس بات پر یقین رکھو کہ تمہارے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں تمہیں حلف دیتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میری بے قراری اچانک کم ہوگئی۔ جیسے کسی بھڑکتی ہوئی آگ پر بہت سارا ٹھنڈا پانی پھینک دیا گیا ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ ''بس یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام۔''

اور پتا نہیں کیا ہوا، میں واقعی ایک دم پُرسکون ہوگیا۔

''چلو...... اُٹھو اب کھانا کھاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں میرے لیے بلاوا آجائے۔''

''کہاں سے؟''

''کہیں سے بھی آسکتا ہے یار!'' اس نے کہا اور مجھے اُٹھا کر دسترخوان تک لے گیا۔ ہم بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ لقمے لینے لگے۔ یہ میری زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ لقمہ ایک ہاتھ سے لیا جاتا ہے لیکن جب ہاتھ بندھے ہوں تو خالی ہاتھ کو بھی نیچے اوپر حرکت دینا پڑتی ہے۔ کسی سے ہاتھ ملانا ہو، کہیں کھجلی کرنی ہو، کچھ لکھنا ہو تو بھی خالی ہاتھ بڑی بیچارگی سے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ جیسے وہ کوئی ایسا بچہ ہو جو پیدائشی طور پر اپنے بھائی بہن سے جڑا ہوا ہو۔ کھانے کے دوران میں ہی میرے ایک سوال کے جواب میں عمران نے سرگوشی میں بتایا کہ ریلوے اسٹیشن پر میڈم کے بندوں کے ہتھے چڑھتے ہی اس نے اپنا موبائل کچرے کے ایک ڈبے میں پھینک دیا تھا۔ یہ کام بڑی صفائی سے اس وقت ہوا تھا جب میڈم کے بندے اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ عمران کے پاس موبائل کی غیر موجودگی نے قادرے اور کنول وغیرہ کو زیادہ محفوظ کر دیا تھا۔

اسی دوران میں لمبی ناک اور تیکھے نقوش والا ایک آرٹسٹ ٹائپ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب آکر گارڈ سے بولا۔ ''مجاہد علی! کھولو اسے۔ میڈم نے بلایا ہے۔'' لمبی ناک والے کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

''تمہیں کہا تھا نا بلاوا آئے گا۔'' عمران نے سرگوشی کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' میں کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''مسئلہ ہوگا تو میں سرتاپا حل بن جاؤں گا۔ تم بےفکر رہو۔'' اس نے کہا اور نو وارد کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں گئے۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مختلف اندیشے بے پناہ رفتار سے میرے ذہن میں آتے اور

جاتے رہے۔ دیوہیکل السیشین کتے کی آواز پورچ کی طرف سے اُبھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں، اقبال اور سلیم کو دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں میری نظر سے دور تھے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ایک گارڈ کے ساتھ گپیں لگاتا ہوا واپس آرہا تھا۔ اس کی اُڑتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''میری بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ آسیہ واقعی میری منگیتر کی ہم شکل ہے۔ میرے سارے زخم ہرے ہوگئے ہیں شیر فتح۔''

''شیر فتح نہیں جی! فتح شیر۔'' گارڈز نے اپنے نام کی تصحیح کی۔

''شیر آگے ہو یا پیچھے، شیر ہی رہتا ہے یار۔'' عمران نے کہا۔ ''بلکہ پیچھے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

اب میں نے غور کیا تو عمران کے ہاتھوں میں ہینڈ کف بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

گارڈ نے میرے کمرے کو ان لاک کیا اور بڑی عزت سے مجھے باہر آنے کے لیے کہا۔ میرے ہینڈ کف بھی ایک لمبی چابی کے ذریعے کھول دیے گئے۔ اس کے بعد اقبال کی باری آئی۔ اسے کمرے سے نکالا گیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی آزاد تھے۔ بہرحال ٹانگوں کی تکلیف کے سبب وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ میں نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کی گئی ہو مگر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

ہمیں ایک راہداری میں لایا گیا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ گارڈز کا رویہ بدل چکا ہے۔ ان کی رائفلیں ایزی موڈ میں کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ''کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے مدھم آواز میں عمران سے پوچھا۔

''اس وقت بستر سے اچھی جگہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ بول بول کر میری تو ٹانگیں دُکھنے لگی ہیں۔''

''ٹانگیں؟''

''ہاں جگر! یہ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ بولنے سے ٹانگیں دُکھتی ہیں۔ زیادہ چلوں تو زبان کا مسل پل ہو جاتا ہے۔'' اس نے بے پر کی اُڑائی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس چھوٹی عمارت میں داخل ہو رہے تھے جو دونوں لال کوٹھیوں کے عقب میں واقع تھی۔ یہ یہاں کی انیکسی تھی۔ اسے چاروں طرف سے کچنار اور نیم کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر سے یہ جگہ خوب سجی سنوری تھی۔ ہمیں ایک نہایت آرام دہ بیڈروم میں

پہنچا دیا گیا۔ اس عالی شان کمرے میں تین لگژری بیڈ تھے۔ باتھ روم بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر جدید آسائش باتھ روم میں موجود تھی۔

جب ہم یہاں داخل ہو رہے تھے، ہم نے ایک ساتھ والے کمرے سے ایک ملازم کو کچھ سامان وغیرہ نکالتے دیکھا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ انچارج گارڈ شیرے کا سامان ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ یہاں رہائش رکھے ہوئے تھا، اب اسے یہاں سے شفٹ کیا جا رہا تھا۔ جلد ہی ہمیں شیرا بھی نظر آ گیا۔ عمران کی دو دھواں دھار ضربوں کی وجہ سے اس کا چہرہ متورم تھا۔ وہ اپنا بیگ اُٹھائے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ اس نے عجیب زہریلی نظروں سے ہمیں گھورا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

جلد ہی دو خوبرو ملازمائیں ہماری خدمت کے لیے حاضر ہو گئیں۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ ان کی مسکراہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر ہم چاہیں تو وہ ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھیں۔ سویٹرز بغیر آستین کے تھے اور قمیص آدھی آستین کی تھی۔ ان کی سڈول باہیں اور صراحی دار گردنیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے ایک وسیع وارڈ روب کھولی اور قریباً دو درجن مردانہ لباس، سویٹر، کوٹ وغیرہ ہینگرز پر لٹکا دیئے۔ ان میں سلیپنگ گاؤن وغیرہ بھی تھے۔ نفیس چپلیں اور جوتے وغیرہ پہلے ہی قطار اندر قطار اس وسیع وارڈ روب میں موجود تھے۔

قد آدم ریفریجریٹر پر کھانے پینے کے بہت سے لوازمات رکھے تھے۔ ان میں امپورٹڈ وہسکی کی چمکیلی بوتلیں نمایاں تھیں۔ بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹیلی ویژن پر کوئی انگریزی فلم دھیمی آواز میں چل رہی تھی۔ یہ غیر معمولی حد تک شاندار رہائش گاہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا ہمیں مرعوب کر دینا چاہتی ہے۔

''کوئی خدمت سر؟'' ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''نو تھینک یو۔ فی الحال ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن یار! آرام کرنے کے لیے تھکنا ضروری ہوتا ہے۔'' اقبال نے بھی معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ابھی تم اپنی ٹانگوں کو سنبھالو۔'' عمران نے سرزنش کی۔

''چلو پھر تھوڑا سا مساج ہی کرا دو۔ ہمیں کچھ، تو فائدہ ہو ان مہربان میزبانوں کا۔'' اقبال چہکا۔

عمران نے ایک لڑکی کو مساج کے لیے کہا۔ وہ تو پہلے سے اشارے کی منتظر تھی۔ اس

نے جھٹ ایک الماری میں سے دو تین امپورٹڈ آئلز نکال لیے۔ ''چلو جی چلیں۔'' اقبال اُٹھ کر بغلی کمرے کی طرف بڑھا۔

عمران نے اسے گردن سے دبوچ کر دوبارہ بستر پر ڈال دیا۔ ''جو کچھ کرانا ہے، یہیں پر کراؤ...... ہمارے سامنے۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''پھر کیا فائدہ؟'' اقبال نے ٹھنڈی سانس لی اور فلم اسٹار ندیم کی آواز میں بولا۔ ''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ٹیلی فون پر شادی کرنے کے بعد ٹیلی فون پر ہی سہاگ رات منانا۔ ٹھیک ہے بی بی! جاؤ تم۔ ابھی ہمارے ستارے آپس میں نہیں مل رہے۔'' اس نے آخری فقرہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ لڑکی اس کی آواز اور اسٹائل پر ششدر رہ گئی۔

عمران نے بڑی احتیاط سے ایک وسیع بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ پھر ایک کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا۔ لکھا تھا۔ ''ہمیں بات کرتے ہوئے بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں دیکھا اور سنا جا رہا ہو۔''

اس کے بعد یہی چٹ اس نے اقبال کو دکھائی۔

میں عمران سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میڈم صفورا سے اس کی کیا بات چیت ہوئی ہے اور میرے گھر والوں کے حوالے سے اس نے میڈم سے کیا تحفظ حاصل کیا ہے۔ عمران نے میرے تاثرات سے میرا ارادہ بھانپ لیا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا۔ ''ایک دم بے فکر ہو جاؤ۔ میڈم جی سے ساری بات ہو گئی ہے۔ نو پرابلم ایٹ آل۔''

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ دوسری طرف عمران اور اقبال بے فکری سے پڑے رہے۔ وہ جیسے اپنے ہی گھر میں سو رہے تھے۔ عجیب مزاج تھے ان کے۔ چند گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات کی فلم سی بار بار تصور کے پردے پر چلتی رہی اور میں بے قرار ہوتا رہا۔ سب سے اہم سوال میرے ذہن میں یہی اُبھر رہا تھا کہ صبح جب سیٹھ سراج کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو گا تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا؟

اگلے روز ہم دونوں نے بہترین باتھ رومز میں غسل کیا اور وارڈ روب میں سے اپنی پسند اور اپنے ناپ کے کپڑے نکال کر پہنے۔ اقبال اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے ان سہولتوں سے محروم رہا۔ ابھی ہم ایک پُرتعیش ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیٹھ سراج، شیرا اور ایک دراز قد شخص اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دراز قد شخص سیٹھ سراج کا ساتھی عارف خان تھا۔

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ آخر میرا اور سیٹھ کا سامنا ہو ہی گیا تھا۔ شیرا بھی

ساتھ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن عمران یہاں موجود تھا اور اس کے ہوتے مجھے کیا فکر ہو سکتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر سیٹھ سراج نے آگے بڑھ کر عمران اور اقبال سے ہاتھ ملایا اور پھر میری طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سراج سے مصافحہ کیا۔ سب لوگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں میڈم صفورا بھی تیز قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔ اس نے بھی سب سے ہاتھ ملایا۔ پھر سیٹھ سراج سے مخاطب ہو کر بولی۔

''سراج! یہ بات اب کلیئر ہے کہ عمران اور اس کے دونوں ساتھی اب ہمارے ساتھ شامل ہیں اور ہمارا ہی ایک حصہ ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے اپنے ہی ساتھیوں کا ایک دوسرے سے اختلاف رکھنا بالکل پسند نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے، اسے آپ سب لوگ بالکل بھول جائیں اور ایک نئے تعلق کی شروعات کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی میڈم......لیکن......''

''لیکن نہیں سراج! یہ لفظ ''لیکن'' مجھے زہر لگتا ہے۔ جو کچھ میں نے تم سے کہہ دیا ہے، اس میں ''لیکن'' کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''ٹھیک ہے میڈم!'' سیٹھ نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''تہاڈے سامنے ہن کیسے بولاں۔''

''تم نے بھی سن لیا ہے شیرے؟''

''ہاں جی میڈم۔''

''چلو اُٹھو......پھر ایک دوسرے سے گلے ملو۔''

سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا لیکن رسمی طور پر تو کشیدگی کم ہوتی نظر آتی تھی۔

سیٹھ سراج جب مجھ سے گلے مل کر پیچھے ہٹا تو ایک لمحے کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری آنکھیں ملیں۔ ایک بار پھر وہی چنگاری اس کی نگاہوں میں نظر آئی جو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی اور جس کی دید نے میرے دل میں اتھاہ خوف پیدا کیا تھا۔ کیا یہ چنگاری واقعی دوبارہ نظر آئی تھی یا بس میرا وہم تھا؟

کچھ ہی دیر بعد سیٹھ سراج، شیرا اور عارف خان واپس چلے گئے۔ سیٹھ سراج کا کیم شیم ڈولتا ہوا جسم میری نگاہوں سے اوجھل ہوا تو مجھے ایک گونا گوں اطمینان محسوس ہوا۔

صلح صفائی کی اس کارروائی سے عمران بھی کچھ زیادہ مطمئن دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کی وجہ عیاں تھی۔ چھوٹی میڈم نادیہ اس کارروائی میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میڈم صفورا نے اسے بلایا ہو لیکن وہ کسی بہانے سے کنی کترا گئی ہو۔ وہ ہر لحاظ سے من موجی اور

من مانی کرنے والی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ہینڈل کرنے میں میڈم صفورا کو بھی دشواری محسوس ہوتی ہے۔

کل رات میں نے نادیہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ میڈم صفورا کی مداخلت کے بعد نادیہ، عمران کو ایسی نظروں سے گھورتی رہی تھی جن میں حرص کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی گہری مایوسی بھی شامل تھی۔ جیسے کوئی بھوکا شکاری اپنے ہاتھ سے نکلنے والے لذیذ شکار کو دیکھتا ہے۔

رات کو عمران نے مزاحیہ لہجے میں مجھ سے کہا تھا کہ میڈم صفورا عنقریب اس کی مریدنی بننے والی ہے اور لگتا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی گرویدہ نظر آنے لگی تھی اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔

ہم انیکسی کے لان میں آ بیٹھے۔ یہ بڑی سرسبز جگہ تھی۔ اسے چاروں طرف سے گارڈینا کی سات آٹھ فٹ اونچی باڑ نے گھیر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں کسی قسم کے ڈکٹا فون یا ریکارڈنگ ڈیوائس کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''میرے گھر والوں کے بارے میں میڈم نے کیا کہا ہے؟''

''میڈم نے ہر طرح کی تسلی بلکہ گارنٹی دی ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ کی طرف سے تمہاری فیملی کو کسی طرح کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔ میڈم نے سیٹھ سراج اور عارف خان وغیرہ سے ساری بات کر لی ہے۔ اس کے باوجود میں نے مزید احتیاط کے طور پر انہیں کچھ روز کے لیے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے۔''

''کہاں؟''

''ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں۔ یہ میرے ایک دوست کی ملکیت ہے۔ میڈم اور اس کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ یہاں دو گارڈز بھی موجود رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے ایک گاڑی بھی ہے۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہاں ہمارے عزیز رشتے دار اور جاننے والے ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے کہ ہم اچانک ناصر بھائی کی طرح گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟''

''اچانک نہیں گئے یار! سب کچھ طریقے سے ہوا ہے۔ میں نے کل فون پر تمہاری والدہ سے کافی دیر بات کی تھی۔ میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ حفاظت کی غرض سے انہیں چند دن گھر سے دور رہنا ہوگا۔ اس دوران میں تمہارے سارے گھر کا رنگ روغن ہوگا اور مرمتیں وغیرہ

ہوں گی۔ کم از کم ایک ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جائے گا ان کاموں پر۔ یہ گھر سے باہر رہنے کی ایک معقول وجہ ہوگی اور ویسے بھی یار! عنقریب ثروت بی بی کے ساتھ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ گھر کا حلیہ تو ٹھیک کرنا ہی ہے نا۔'' اس نے آنکھ ماری۔

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور میرے خیال میں تمہیں بھی اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

''یار! اس میں غیر سنجیدگی والی کون سی بات ہے؟ تمہاری شادی ہونی ہے ثروت سے ہونی ہے، عنقریب ہونی ہے اور میں نے گواہوں کے خانے میں اپنا نام لکھوانا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں بھول گیا ہوں۔ ہر گھڑی تمہارے ماتھے پر سجنے والے سہرے کا خیال میرے ذہن میں رہتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میری اور میرے گھر والوں کی جمی جمائی زندگی تہس نہس ہو رہی ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ لوگ واقعی ڈیفنس چلے گئے ہیں تو پھر بھی انہوں نے رہنا تو یہیں لاہور میں ہے نا۔ میری بہن فرح کو کالج جانا ہوتا ہے۔ عاطف کو بھی جانا ہوتا ہے۔ وہ کیا گھر میں چھپ کر بیٹھے رہیں گے اور پڑھائی کا حرج کریں گے؟''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عاطف کے امتحان ہو چکے ہیں اور وہ آج کل فارغ ہے۔ سسٹر فرح کی کلاس بھی آج کل ہفتے میں بس دو روز ہوتی ہے۔ اگر اسے جانا بھی ہوا تو وہ گاڑی میں پوری حفاظت کے ساتھ جائے گی۔ تمہیں بتایا ہے نا، یہ ساری میری درد سری ہے۔ باقی والدہ اور گھر والے پوری طرح مطمئن ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں ان سے فون پر تمہاری بات بھی کرا دیتا ہوں۔''

ابھی ہماری بات جاری تھی کہ میڈم صفورا پھر وارد ہوگئی۔ اس کے ساتھ وہی کل والا گنجا ڈاکٹر تھا۔ میڈم صفورا نے اپنی نگرانی میں اقبال کی زخمی ٹانگیں چیک کروائیں۔ گنجے ڈاکٹر نے موبائل فون پر کسی دوسرے سینئر ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا۔ اس نے اپنے جدید موبائل کے ساتھ اقبال کی زخمی ٹانگوں کی کلرڈ تصویریں لیں اور انہیں سینئر ڈاکٹر کو ایم ایم ایس کیا۔ سینئر ڈاکٹر نے فون پر اقبال سے بات کی اور دوائیں تجویز کیں۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم صفورا ہماری دیکھ بھال میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر گراسی لان میں آ کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جاتی سردیوں کی نرم دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ایک خوبرو ملازمہ

ہمارے سامنے چھوٹی تپائی پر مالٹے اور سرخ انار کا جوس رکھ گئی۔ میں نے عمران سے پوچھا کہ یہ سارا کیا گورکھ دھندا ہے اور وہ میڈم صفورا جیسی دبنگ عورت کو کس طرح رام کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے میڈم کو قائل کیا کہ اسے ہماری ضرورت ہے۔ جب وہ مان گئی تو اس نے ہمارے لیے اپنے دل میں نرم رویہ ''ایجاد'' کر لیا۔''

''ہم اس کی کیا ضرورت پوری کر سکتے ہیں؟''

''وہی جو اس وقت اس کے دل کا روگ بنی ہوئی ہے۔ وہ نوادر کا کاروبار کرتی ہے۔ اس حوالے سے ہر طرح کے نوادر میں اس کی بے حد دلچسپی ہے۔ کوئی اچھا پیس آف آرٹ دیکھ کر اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو پانچ روز کے بھوکے کی گرما گرم روٹی اور چکن کڑاہی دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ اب یہ چکن کڑاہی اس سے دور ہے اور اس کی بھوک روز بروز اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔''

''وہ ہے کیا شے جس کے لیے اتنے لوگ دیوانے بنے ہوئے ہیں؟''

''بدھا کا ایک دو فٹ اونچا مجسمہ...... یہ فاقے کی حالت میں ہے۔ اسے ''فاسٹنگ بدھا'' کہا جاتا ہے۔ اس کی تخلیق میں بے پناہ فنکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ فاقہ زدہ بدھا کے پنجر اور اس کے رگ پٹھوں اور دھنسی ہوئی آنکھوں کو نمایاں کرنا ایک نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس طرح کے جتنے بھی مجسمے مختلف جگہوں سے برآمد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، ان میں عموماً کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے۔ صدیوں کا سفر طے کر کے جو شے ہم تک پہنچتی ہے، اس میں کچھ نہ کچھ ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ کہیں انگلیاں نہیں ہوتیں، کہیں ناک نہیں ہوتی اور کہیں سر علیحدہ اور دھڑ علیحدہ پایا جاتا ہے۔ ایسے مجسموں اور چھوٹی مورتیوں کو ماہرین بعد میں جوڑ کر مکمل کرتے ہیں۔ بہت کم پیس آف آرٹ ایسے ہوتے ہیں جو شاندار ہونے کے علاوہ مکمل بھی ہوتے ہیں۔ بدھا کا یہ مجسمہ ان میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈم اسے حاصل کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے اور میڈم کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی یہی کیفیت ہے۔''

''وہ اس کا کیا کرے گی؟''

''اس کا اپنا ایک پرائیویٹ میوزیم بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے خریدنا چاہتی ہو۔ یا پھر اس کا خیال ہو کہ وہ اپنے ذرائع سے اسے زیادہ مہنگے داموں فروخت کر سکتی ہے۔

آج کل جاپان اور تھائی لینڈ وغیرہ میں یہ کام زوروں پر ہے۔''

''تو کیا تم نے اس سے کہا ہے کہ تم وہ مجسمہ اسے لا دو گے؟''

''ہاں...... کچھ ایسی ہی حماقت کی ہے میں نے۔'' وہ مسکرایا۔

''اس حماقت کا نتیجہ کیا ہوگا؟''

''نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس کی ڈیمانڈ پوری کر دیں گے اور وہ خوشی سے نہال ہو کر ہم تینوں کی...... نہیں نہیں...... ہم میں سے کسی ایک کی زوجیت میں آ جائے گی۔'' وہ پھر پٹری سے اُترنے لگا۔

''یعنی تم وہ پیس آف آرٹ حاصل کر لو گے لیکن کیسے؟ یہ کام تو اتنا آسان تھا تو پھر یہ لوگ خود کیوں نہ کر سکتے؟''

''یہ لوگ اس لیے نہیں کر سکے کیونکہ یہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل نہیں چلا سکتے، نہ ہی پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر بغیر جال کے ہوا میں کرتب دکھا سکتے ہیں اور نہ پستول کے چیمبر میں تین گولیاں رکھ کر خود پر فائر کر سکتے ہیں۔'' وہ عجیب انداز میں بولا۔ اس کے اندر کی بے پناہ توانائی اس کی مسکراتی آنکھوں میں جھلک رہی تھی اور معصوم چہرے پر لہریں مار رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اس معاملے کو خطرناک سے خطرناک بناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم جو بھی کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک بندے کی جان ہماری وجہ سے جا چکی ہے۔ اب یہ نہ ہو کہ کوئی اور جان چلی جائے۔''

''میں نے کہا ہے نا...... جو اندیشہ سب سے آخر میں ذہن میں آنا چاہیے وہ سب سے پہلے تمہارے ذہن میں آتا ہے۔''

''مگر کرو گے کیا؟''

''بس دیکھتے جاؤ، جو کام ان کو پہاڑ نظر آ رہا ہے وہ ہم چٹکی بجاتے کریں گے۔ اس طرح سے......'' اس نے باقاعدہ چٹکی بجانے کی کوشش کی مگر ہاتھ زخمی تھا اس لیے کراہ کر رہ گیا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا پھر آ گئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی تھی۔ پینٹ شرٹ اور اونچی ایڑی والی جوتی کے ساتھ وہ خاصی اسمارٹ نظر آتی تھی۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس نے بیگ میں سے پانچ سو کے کرنسی نوٹوں والی چار گڈیاں نکالیں اور عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ خرچے وغیرہ کے لیے رکھ لو۔ شام تک ایک کریڈٹ کارڈ

بھی تمہیں مل جائے گا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے میڈم! جب ضرورت پڑے گی آپ سے خود مانگ لوں گا۔''

''نہیں...... نہیں یہ رکھو۔ اس سے مجھے تسلی رہے گی۔ بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ......''

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''جی فرمائیں۔ آپ رُک کیوں گئیں؟''

''میں تو چاہتی ہوں کہ چھوڑ دو یہ سرکس وغیرہ۔ جو وہاں سے کماتے ہو، اس سے چار پانچ گنا تم کہیں بھی کما سکتے ہو۔''

''میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے میڈم کہ سرکس میرا روزگار نہیں بلکہ شوق ہے اور میرے لیے اسے فی الحال چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں...... آپ کے حکم کے مطابق میں دس پندرہ روز کی چھٹی لے لیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں مزید سوچ بچار کر لو۔ میری طرف سے تمہارے لیے ہر طرح کی آفر موجود ہے۔''

ہمارے پاس کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد اور اپنایت کا اظہار کرنے کے بعد میڈم صفورا واپس چلی گئی۔ یہ ملاقات مکمل راز داری سے ہوئی تھی اور بات چیت کے دوران میں ہمارے ارد گرد کوئی ملازم یا گارڈ وغیرہ موجود نہیں تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مختصر وقت میں میڈم صفورا، عمران کو اپنے باقی تنخواہ داروں پر فوقیت دینے لگی ہے۔

اقبال نے کہا۔ ''یار ہیرو! میڈم کی یہ ''محبت'' ہمیں کہیں لے نہ ڈوبے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں سراج اور شیرے جیسے بہت سے رقیب پیدا ہونے والے ہیں۔''

''جو پیدا ہونے والا ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ نیچر کا اصول ہے۔''

''نیچر کے اور بھی بہت سے اصول ہیں۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''آگ سے کھیلیں گے تو وہ ہمیں ضرور جلائے گی اور تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ نہ صرف کھیل رہے ہو بلکہ آگے بڑھتے جا رہے ہو۔ میں اس معاملے میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اگر تم مجھے معافی دے دو تو بہتر ہے۔''

''ارے...... تم تو سنجیدہ ہو گئے ہو۔ بالکل اس بیٹسمین کی طرح لگ رہے ہو جو ڈپریشن میں اُلٹی سیدھی ہٹ لگا کر آؤٹ ہو جاتا ہے۔ پتا ہے اپنے آخری میچ میں ہمارے انضمام الحق نے بھی......''

''خدا کے لیے عمران! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔ ''میں اب اور

تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔''

عمران نے ایک دم میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور یاد دلایا کہ یہاں کیمرے اور مائیکروفون وغیرہ موجود ہیں۔

میں اُٹھا اور بھنایا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ گفتگو کے لیے یہ لان ہی مناسب تھا۔ عمران بھی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ ہم زرد گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

میں نے عمران سے دوٹوک لہجے میں کہا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اور جو کچھ کرنے جا رہا ہے وہ بالکل میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی عزت اور سلامتی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے لہٰذا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ سمجھے۔ میں اب ایک قدم بھی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوں اور اگر وہ مجھے چلنے پر مجبور کرے گا تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔

عمران نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں مجھے سمجھانے بجھانے اور قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر پتا نہیں آج کیا بات تھی کہ میں نے اس کی ہر دلیل کو رد کر دیا اور کہا کہ میں اپنا راستہ ابھی اور اسی وقت اس سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسوؤں کی نمی آ رہی تھی اور اپنے اہلِ خانہ کی پریشانیوں کا خیال میرا خون جلا رہا تھا۔ میں نے عمران سے بس ایک بات ہی کہی۔ میں نے کہا کہ وہ میڈم سے کہہ کر مجھے اس سارے چکر سے الگ کر دے۔ میں واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرے اہلِ خانہ بھی گھر واپس آ جائیں۔

''مگر تابی! سمجھنے کی کوشش کرو۔'' عمران بولا۔ ''جو بھی ہوا اور جس طرح بھی ہوا لیکن حقیقت اب یہی ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو۔ یہ لوگ اب کسی صورت تمہیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔''

''نہ رہنے دیں لیکن اگر ہمیں مرنا ہے تو اپنی مرضی سے مریں گے، تمہاری مرضی سے نہیں۔ تم جس طرح مجھے اس دلدل میں دھنساتے جا رہے ہو، مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہماری موت بھی بدترین قسم کی ہو جائے گی۔'' میرا لہجہ حتمی تھا۔

کافی دیر بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور ہارے ہوئے انداز میں بولا۔ ''تم پر میرا کوئی زور نہیں ہے جگر! میں نے تو اس پہلی رات کو ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم موٹر سائیکل سے اُتر کر جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ تم اس وقت اُتر جاتے تو بہتر ہوتا۔ بہرحال اب بھی میں تمہیں زبردستی نہیں روکوں گا۔ ہاں...... اتنا ضرور چاہوں گا کہ میری وجہ سے تمہارے اور

تمہارے گھر والوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو۔ مجھے بس تین چار دن کا وقت دو۔ میں سراج کے حوالے سے میڈم سے بات کروں گا۔ مجھے میڈم سے اس بات کی مکمل گارنٹی چاہیے کہ سراج یا مجید مٹھو کے چیلے چانٹے تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔''

''لیکن میں دو تین دن سے زیادہ کسی صورت یہاں نہیں رُکوں گا۔'' میرا لہجہ ایک بار پھر دوٹوک ہوتھا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' عمران نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''جہاں تک ثروت والا مسئلہ ہے اس میں مَیں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ ابھی پرسوں بھی حاجی صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مکان کی رقم مل گئی ہے۔ دو چار دن میں ناصر جرمنی سے وہ اکاؤنٹ نمبر بھیج دے گا جس میں ڈرافٹ جمع ہونا ہے۔ جیسے ہی اس کا سراغ لگا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے جو میری قسمت میں ہے، وہ ہو جائے گا۔ میں اپنے گھر والوں کی سلامتی داؤ پر لگا کر ثروت کو تلاش نہیں کر سکتا۔''

اس طویل گفتگو کے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ سہ پہر کو عمران مجھے بتائے بغیر ایک سرخ کار میں کہیں چلا گیا اور دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ وہ کار خود ڈرائیو کر کے گیا تھا۔ رات کو میں لگژری بیڈ پر لیٹا دیر تک سوچ بچار کرتا رہا۔ مجھے عمران اور میڈم کی گارنٹی کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ میرا مستقبل بھی ثروت اور ناصر بھائی کے مستقبل سے ملتا جلتا ہے۔ مجھے بھی اب ہجرت کرنا تھی۔ ہجرت جو صدیوں سے ظلم و جبر کے ردِعمل میں کی جاتی ہے۔ اس کے بہت سے درجے ہیں۔ کچھ عظیم ہجرتیں، عظیم مقاصد کے لیے کی گئیں۔ کچھ معمولی ہجرتیں، مجھ جیسے معمولی لوگوں نے معمولی مقاصد کے لیے کیں۔ اب یہ بات تو طے تھی کہ سیٹھ سراج کے ہاتھوں میرے زد و کوب ہونے والا واقعہ اب کبھی لوگوں کے ذہنوں سے مٹے گا اور نہ میرے اپنے ذہن سے۔ اس لیے اپنے گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اپنے ذہن میں جو منصوبہ بندی کر رہا تھا، وہ یہ تھی کہ عمران اور اس کی خطرناک مصروفیات سے پیچھا چھڑانے کے بعد میں اپنے گھر والوں کے ساتھ جنوبی پنجاب یا پھر سندھ کے کسی شہر میں منتقل ہو جاؤں گا۔ چار چھ ماہ تک خاموشی سے حالات کا جائزہ لوں گا اور اگر صورتِ حال سازگار نظر نہیں آئی تو مکان وغیرہ فروخت کر دوں گا۔ کرائے کا مکان کہیں بھی لیا جا سکتا تھا۔ عاطف اور فرح کی پڑھائی بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں تعلیمی ادارہ تبدیل کرنے میں دشواری ہوتی۔

دو دن میں اسی ڈگر پر سوچتا رہا اور مجھے اپنی منصوبہ بندی میں خاصا وزن محسوس ہوا مگر تیسری صبح ایک بار پھر اندیشے دل میں گھر بنانے لگے۔ عمران نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ میں اس سارے چکر میں ملوث ہو چکا ہوں۔ تو کیا میں ملوث ہونے کے باوجود ان خطرناک لوگوں سے دور رہنے میں کامیاب ہو سکوں گا؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں عمران کے بغیر تحفظ محسوس کر سکوں گا؟

میں اس شخص پر لاشعوری طور پر بے پناہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ کسی وقت مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ شخص ہر وہ کام کر سکتا ہے جسے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے۔ تو کیا ''کن فیکون'' جیسی خداداد صلاحیت رکھنے والے شخص کی پُرخلوص دوستی سے محروم ہونا دانشمندی تھی؟

صبح ناشتے پر میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اُداسی کی دھندلاہٹ تھی۔ اس نے ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا اور خلافِ معمول پھر سو گیا۔ عجیب جادو تھا اس شخص میں۔ وہ ہر کس و ناکس کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیتا تھا۔ شاید میں بھی اس کے دائرہ اثر میں آ چکا تھا۔ اس کی پُرخلوص محبت سے محروم ہونے کا سوچ کر مجھے اپنے دل کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ کیا تھا؟ کون تھا؟ کہاں سے آ دھمکا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رات کو میں نے فون پر والدہ، فرح اور عاطف سے بھی بات کی۔ میرے اندیشوں کے برخلاف والدہ اور فرح وغیرہ پریشان نہیں تھے بلکہ میں نے پہلی بار ان کے لب و لہجے میں طمانیت محسوس کی۔ والدہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ تین روز پہلے عمران خود انہیں نئے گھر میں چھوڑ کر گیا ہے۔ والدہ نے کہا کہ وہ یہاں زیادہ تحفظ اور اطمینان محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے عمران کی بہت تعریف کی اور کہا۔ ''ایسے دوست قسمت سے ملتے ہیں تابی! عمران کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں تمہاری پریشانیوں سے نکال لے گا۔ بڑا اعتماد ہے اس کے اندر۔ تم تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو لیکن اس نے کچھ باتیں بتائی ہیں۔''

اتنے میں فرح نے والدہ سے فون لے لیا اور بولی۔ ''تابش بھائی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں، عمران بھائی بڑے اچھے ہیں۔ انہوں نے یہاں ہماری ہر سہولت کا خیال رکھا ہے۔ سگے بھائیوں کی طرح میرا ماتھا چوم رہے تھے۔ لگتا ہے کہ ان کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔ ایسے لوگ سیٹھ سراج اور تھانیدار اشرف جیسے لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتے ہیں۔ ویسے وہ بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق ''خفیہ پولیس'' سے ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عمران نے خفیہ پولیس والا شوشہ یہاں بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری کلاسز کا کیا ہو گا؟''

''میں کل گئی تھی بھائی! اب اگلے ہفتے جاؤں گی۔''

''کیسے گئی تھیں؟''

''جانا تو ڈرائیور کے ساتھ تھا مگر اس وقت اتفاق سے عمران بھائی خود آ گئے۔ کہنے لگے چلو آج میں جاؤں گا اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ۔ راستے میں ''بک اسٹور'' سے ڈیڑھ دو ہزار کی چاکلیٹس لے دیں۔ کہنے لگے کہ واپسی پر ڈرائیور لینے آئے گا، ساتھ میں گارڈ بھی ہو گا مگر ان گارڈز کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا۔ یہ صرف تمہاری شان و شوکت بڑھانے کے لیے ہیں۔ تسلی دے رہے تھے کہ چھوٹی چھوٹی پریشانیاں ہیں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر ان گارڈز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے عجیب سی سیکیورٹی محسوس ہوتی ہے۔''

فرح نے عمران کے زخمی ہاتھ کے بارے میں بھی پوچھا کہ انہیں کیسے چوٹ لگی ہے؟ کیا انہوں نے کسی سے مار پٹائی کی ہے؟ میں نے بس گول مول جواب دیا۔ میں اسے کیا کیا بتاتا؟

اس موقعے پر والدہ نے ایک بار پھر میری بہن فرح سے فون لے لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں نے تیرے لیے بڑی دعائیں مانگی ہیں تابی! رو رو کر اللہ سے کہا ہے کہ وہ تیری مشکلیں آسان کرے۔ تیری مدد کرے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری دعائیں قبول ہوئی ہیں۔ تیرے اس دوست کی شکل میں اللہ نے تیرے لیے مدد بھیجی ہے۔ تم اس کی دوستی سے منہ نہ موڑنا۔ وہ تیرے بارے میں کچھ دُکھی سا لگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، تابی مجھ سے کچھ ناراض ہے۔ کیا تمہارے درمیان کوئی بات ہو گئی تھی؟'' والدہ نے بڑے درد سے پوچھا۔

''نن...... نہیں امی! بس یونہی کہہ دیا ہو گا اس نے۔''

''دیکھ تابی!'' والدہ نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''تیرے بارے میں میرے دل سے جو آواز آتی ہے نا، وہ کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔ میں نے بہت دفعہ آزمایا ہے۔ اب بھی میرے دل سے آواز آ رہی ہے کہ تیرا یہ دوست تیرے اور ہم سب کے لیے نیک شگون ثابت ہو گا۔ اس کی دوستی پر شک نہ کرنا۔''

میں حیران رہ گیا۔ والدہ نے ایک مختصر سی رفاقت کے بعد عمران کے بارے میں ایسا بیان دے دیا تھا۔ مجھے والدہ کے وجدان پر یقین تھا۔ وہ اس خاص لب و لہجے میں جب بھی کچھ کہا کرتی تھیں، وہ کسی نہ کسی شکل میں پورا ہو جاتا تھا۔

ٹیلی فون پر بات ختم کرنے کے بعد بھی میں دیر تک والدہ کے لہجے پر غور کرتا رہا۔ میرے اپنے اندر سے اُٹھنے والی آواز بھی والدہ کے خیال کی تائید کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عمران کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی بے لوث و بے لاگ دوستی ایک تیز اثر نشے کی طرح تھی اور یہ نشہ کچھ ہی عرصے میں میرے رگ و پے میں سرایت کر کے میری ''ناقابلِ مزاحمت ضرورت'' بن گیا تھا۔ بے لوث دوستی کا لفظ ہم ہزار ہا بار استعمال کرتے ہیں مگر اس لفظ کو اصل معنی عمران نے دیئے تھے۔ مجھے لگا کہ میں اس پہلی رات کی طرح آج بھی اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوں اور اب اس موٹر سائیکل سے کبھی اُتر نہیں سکوں گا۔

○......❖......○

اگلے روز میڈم نے لال کوٹھی کے شاندار بیسمنٹ میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس میں سیٹھ سراج، عارف خان، شیر محمد شیرا اور شیرے کا ساتھی بختیار بھی شامل تھا۔ یہ پارٹی ایک طرح سے اہم ملازمین کے درمیان ''کوآرڈی نیشن'' قائم کرنے کے لیے تھی۔ غیر متوقع طور پر اس میں چھوٹی میڈم یعنی نادیہ نے بھی شرکت کی۔ اس پارٹی میں میڈم صفورا نے پھر اپنی بات دہرائی۔ اس نے کہا کہ اب عمران اور اس کے دونوں ساتھی ہمارے اسکواڈ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اب اپنی ساری پرانی رنجشیں بھلا کر اور مل کر کام کرنا ہے۔ ہمیں اپنے گلے شکوے دور کر کے اپنے دل صاف کر لینے چاہئیں۔

میڈم نے خاص طور سے مجھے اور سیٹھ سراج کو ساتھ ساتھ بٹھایا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو تابش! جب نیا تعلق بنانا ہو تو پُرانی باتیں بھلانا پڑتی ہیں۔ مجید مٹھو، سراج کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کی موت جس طرح ہوئی، وہ ہم سب جان گئے ہیں۔ سراج کے لیے یہ ایک بڑا صدمہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح تمہارے لیے تمہاری منگیتر کا اغوا تھا۔ بے شک سراج کے صاحبزادے کی وہ ایک سنگین غلطی تھی اور اس غلطی کے اثرات دور تک گئے۔ بہر حال اب یہ غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کر دینے کا وقت ہے۔''

میڈم نے اس طرح کی اور بھی کئی باتیں کیں۔ اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ سراج کا بیٹا واجی پاکستان سے باہر جا چکا ہے اور وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ بھی ہے۔ آخر میں میڈم نے مجھے مجبور کیا کہ میں سیٹھ سراج سے ایک بار پھر خلوص دل سے گلے ملوں۔

میں نے ایسا کرنے سے پہلے ایک نگاہ عمران پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر موافق تاثرات تھے۔ میں نے سیٹھ سراج سے معانقہ کیا لیکن ایک بار پھر لگا کہ صرف سینے سے سینہ ملا ہے، دل سے دل نہیں۔

تین چار ملازم لڑکیاں تتلیوں کی طرح ہمارے اردگرد چکرا رہی تھیں۔ ان میں سے دو وہ بھی تھیں جو خاص ہماری خدمت پر مامور تھیں۔ ان میں سے ایک ملیح چہرے والی لڑکی کا نام سارہ تھا۔ وہ زیادہ تر عمران کے اردگرد ہی منڈلاتی رہتی تھی۔ اب بھی اس کم عمر لڑکی نے جسم کو نمایاں کرنے والا ہوش رُبا لباس پہنا ہوا تھا اور ہمارے اطراف میں چکرا رہی تھی۔ بیسمنٹ میں دبیز قالین بچھے تھے۔ ایک طرف بار تھا۔ چمکیلی بوتلیں اور شفاف گلاس گردش کر رہے تھے۔ بار کے سامنے رقص گاہ تھی۔ پس پردہ مدھم آواز میں میوزک چل رہا تھا اور فلور پر ایک لڑکی مسلسل اپنے پُر شباب جسم کو تھرکا رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے وہ تھرکتی تھرکتی نشست گاہ میں بھی آجاتی تھی اور حاضرین کو گلاس، سوڈا اور سگریٹ وغیرہ سرو کرتی تھی۔

یہ فائیو اسٹار سے کہیں اوپر کا ماحول تھا۔ میڈم نادیہ کچھ خاموش سی تھی۔ بہر حال تقریب میں حصہ لے رہی تھی۔ دیگر حاضرین کی طرح وہ بھی مسلسل پیگ لے رہی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں وہ سب سے آگے دکھائی دیتی تھی۔ عمران نے اس خوشگوار ماحول سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''

''بولو...... بولو۔ بغیر اجازت کے بول سکتے ہو۔'' صفورا نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ خوشی کا موقع ہے میڈم! ہم نے ایک دوسرے کی غلطیوں کو درگزر کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ کیوں نہ اس موقعے کی مناسبت سے سلیم کو بھی معاف کر دیا جائے۔''

میڈم صفورا نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً تنک کر بولی۔ ''دشمن اور غدار میں فرق ہوتا ہے اور سلیم لنگڑا غدار ہے۔''

''مگر میرے خیال میں اس کو کافی سزا مل چکی ہے میڈم نادیہ! ہم پرسوں بھی پورا ایک گھنٹہ اس کے چلانے کی آواز سنتے رہے ہیں۔''

''تم اپنے طور پر کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کافی سزا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ کچھ بھی نہ ہو۔'' نادیہ مخمور انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔

میڈم صفورا نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اس بارے میں پھر بات کریں گے مگر جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، سلیم سے کوئی مار پیٹ نہیں ہو گی۔ ٹھیک ہے نادو؟'' میڈم نے نادیہ سے تصدیق چاہی۔

وہ جز بز نظر آ رہی تھی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کھانا شاندار تھا۔ میں نے سیٹھ سراج کو ایک دفعہ پہلے بھی کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جیسے کھانے پر باقاعدہ حملہ کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ویسی ہی حریص چمک اُبھرتی تھی جیسی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر شراب کا دور چلا۔ اس دور میں عمران نے بھی بیئر کے ایک دو چھوٹے پیگ لیے۔ میڈم نادیہ بلانوشی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اندرونی اضطراب کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ اول فول بھی بول رہی تھی۔ بڑی بہن میڈم صفورا کسی کام کے لیے باہر گئی تو نادیہ اور بھی کھل گئی۔ وہ تھرکنے لگی اور گاہے بہ گاہے شرابیوں کے انداز میں ہاتھ لہرا لہرا کر بات کرنے لگی۔

اس نے میڈونا کے ایک جذبات انگیز انگلش گانے کے چند بول سنائے پھر ایک جوک سنایا جس کا تعلق سرکس کی گہما گہمی سے تھا۔ وہ عمران کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور اپنے سگریٹ کا دھواں جان بوجھ کر اس کی طرف چھوڑ رہی تھی۔ پھر وہ اپنا گلاس بھرنے کے لیے خود ہی اُٹھی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ گرتے ہوئے اس کا ہاتھ عمران کے کندھے سے ٹکرایا اور اس کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ عمران کی گردن پر بجھ گیا۔ عمران تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ عارف خان نے نادیہ کو سنبھال کر اُٹھایا۔

نادیہ نشے کی حالت میں افسوس کا اظہار کرنے لگی۔ ''اوہ سوری...... ویری ویری سوری۔ اوہ...... تمہاری تو گردن جل گئی۔'' وہ اس کی گردن پر پھونکیں مارنے لگی۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا اتفاقاً ہو گیا ہے۔

عمران کی گردن پر سرخ داغ نظر آ رہا تھا۔ نادیہ نے بہکے ہوئے انداز میں اپنے ٹشو پیپر سے اس داغ کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ''میں معافی مانگتی ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اوہ نو...... نہیں ہونا چاہیے تھا۔ واٹ کین آئی ڈو ناؤ؟ اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو بھی میں تیار ہوں۔ یہ لو...... یہ لو سگریٹ...... تم بھی مجھے سگریٹ لگا سکتے ہو۔ جہاں چاہے لگا سکتے ہو۔'' اس نے اپنی گردن آگے کر دی اور سگریٹ عمران کے ہاتھوں میں تھمانے کی ناکام کوشش کی۔

''اوہو...... پکڑو نا...... پلیز ہولڈ اٹ۔'' وہ بہکی آواز میں بولی۔ ''اچھا گردن پر نہیں لگانا چاہتے تو جہاں جی چاہے لگا لو۔'' اس نے اپنی ٹی شرٹ کے بٹن تیزی سے کھول دیئے۔ وہ واقعی دھت ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ادھ بجھا سگریٹ زبردستی عمران کے ہاتھ میں تھمانے اور اسے اپنے عریاں جسم سے لگانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ لگتا تھا کہ تقریب کے دیگر حاضرین نادیہ کی ایسی حرکتوں کے عادی تھے۔ ان میں سے اکثر کے لبوں

پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

پتا نہیں کہ یہ قضیہ کیا رنگ اختیار کرتا کہ اسی دوران میں میڈم صفورا لمبے ڈگ بھرتی اندر آ گئی۔ اس وقت نادیہ شرابی لہجے میں عمران کو مخاطب کر کے بول رہی تھی۔ ''بڑے مغرور ہو تم۔ کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو...... کیا میں تمہارا احسان اپنی طرف رکھ لوں گی؟ ہرگز نہیں، ناٹ ایٹ آل...... تم بھی مجھے سگریٹ لگاؤ۔ ابھی لگاؤ...... نہیں تو...... نہیں تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ اس طرح...... لائیک دیٹ۔'' اس نے شیمپین کی بڑی بوتل تڑاخ سے دیوار پر توڑ دی۔

''نادو! کیا کر رہی ہو؟ ہوش کرو۔'' میڈم صفورا چلائی۔

نادو جواب دوسری بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی، ذرا ٹھٹک کر رُک گئی۔ اس نے سرخ آنکھوں سے بڑی بہن کو دیکھا۔ تند و تیز لہجے میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ بولنے سے پہلے ہی بند کر لیا۔ میڈم دوبارہ گرجی۔ ''ختم کرو یہ تماشہ۔ کیوں اتنی شراب اُنڈیلتی ہو اپنے اندر...... کیوں بیڑا غرق کر رہی ہو اپنا؟''

نادیہ نے باغی نظروں سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔ تاہم کچھ کہے بغیر ہی پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی آدھ پون گھنٹے تک پارٹی چلتی رہی۔ سیٹھ سراج کی موجودگی مجھے سخت بے چین کر رہی تھی۔ بہر حال میں نے جیسے تیسے وقت گزار لیا۔ میرا ذہن مسلسل اُلجھا ہوا تھا۔ رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ایک بے نام تذبذب نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ عمران کا ساتھ چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف اس کی خطرناک مصروفیات کا ساتھ دینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔ رات دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں بستر پر لیٹا تھا۔ عمران اُٹھ کر میرے پاس آ گیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دو دن سے کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''تابی! لگتا ہے ابھی تک اُلجھن میں ہو؟''

مجھے لگا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک لیا ہے۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''کیسی اُلجھن؟''

''یہی اُلجھن کہ چلا جاؤں یا نہ جاؤں۔ میری حماقتوں کا ساتھ دینا مشکل نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف مجھ پر ترس بھی آ رہا ہے۔ ہے نا یہی بات؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ لبوں پر اُداس لیکن وہی مقناطیسی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

اس نے دو لمبے کش لے کر کہا۔ ''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ فال نکالتے ہیں۔ دیکھتے ہیں

کہ تمہارے چلے جانے کے حق میں فیصلہ آتا ہے یا نہ جانے کے حق میں۔''

''کیسی فال؟''

''بھئی ہم جس طرح کے ہیں، ہماری فال بھی ویسی ہی ہوگی۔ میں اکثر ریوالور سے ہی فال نکالا کرتا ہوں اور میری فال اکثر ٹھیک نکلتی ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ دس پندرہ فٹ کی دوری پر اقبال اپنے بیڈ پر درد کی دو گولیاں کھا کر سویا پڑا تھا۔

''یار! تمہاری پہیلیوں جیسی باتوں سے مجھے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔''

''اس میں پہیلی والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور کھلنڈرے انداز میں قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ یہ عمران کا اپنا ہی ریوالور تھا۔ کل ہی میڈم نے اسے واپس کیا تھا۔ ساتھ میں ایک موبائل بھی دیا تھا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے ریوالور کے چیمبر میں ایک گولی ڈالی اور مسکراتے ہوئے ریوالور کی نال اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لی۔ ایسا کرنے سے پہلے اس نے ریوالور کی چرخی کو دو تین بار گھما دیا تھا۔ ''گولی چل گئی تو چلے جانا۔ نہ چلی تو اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کرنا۔'' عمران نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا۔

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بہرحال گولی نہیں چلی اور عمران کا ہاتھ جو گولی چلنے کی صورت میں نہایت شدید طور پر زخمی ہو سکتا تھا محفوظ رہا۔

اس نے جادوئی نظر سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب کیا خیال ہے؟''

میں خاموش رہا۔ اس نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور ریوالور میری گود میں ڈال دیا۔ ہولے سے بولا۔ ''ویسے...... میں نے ریوالور میں جو گولی ڈالی، وہ اکیلی نہیں تھی۔''

''کیا مطلب؟''

وہ جواب دینے کے بجائے مسکراتا رہا اور نیا سگریٹ سلگا لیا۔ میں نے ریوالور کا چیمبر کھول کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ چرخی میں چار گولیاں موجود تھیں، بس دو خانے خالی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تین گولیاں پہلے سے ریوالور میں موجود تھیں۔

''کبھی کبھی مجھے تمہاری ذہنی حالت پر شک ہوتا ہے۔'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

''عقل اور عشق دو متضاد چیزیں ہیں جگر! جب غیبی اشارے لینے ہوں تو پھر عقل کے بجائے جنون سے کام لینا پڑتا ہے۔''

میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ رات کے ان خاموش لمحوں میں لگژری بیڈ روم میں کھڑکیوں سے باہر تیز ہوا چل رہی تھی، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھا کسی داستانی کردار کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وجدان کی روشنی تھی۔ ایسا وجدان جو بے حد پختہ یقین کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں میرے لیے فیصلہ کرنا بہت آسان ہو گیا اور میرا فیصلہ تھا کہ میں عمران کے ساتھ رہوں گا اور دیکھوں گا کہ پردۂ غیب سے میرے لیے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بہرحال اپنے اس فیصلے کے بارے میں مَیں نے عمران کو اگلی صبح ہی بتایا۔

وہ میرے فیصلے سے بہت خوش تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ اگر معروضی انداز سے دیکھا جاتا تو وہ میرے لیے ہر طرح سود مند تھا جبکہ میں اس کے لیے ہر طرح بے سود۔ پھر بھی وہ مجھے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

''یار عمران! اگر تم چاہتے ہو کہ میرا دماغ ٹھیک کام کرتا رہے اور میں نفسیاتی مریض نہ بن جاؤں تو پھر مجھے پہیلیوں میں نہ اُلجھایا کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو اور میڈم سے تمہاری کیا باتیں طے ہوئی ہیں؟''

ہم دونوں گراسی لان میں بیٹھے تھے۔ اقبال کو ہلکا بخار تھا اور وہ بیڈ روم میں ہی لیٹا ہوا تھا۔

''تمہیں کس بات کا کنفیوژن ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ بس کنفیوژن ہی کنفیوژن ہے۔ کوئی بات بھی ٹھیک سے میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ تم نے معاملات کو بہت اُلجھا دیا ہے۔''

''اچھا...... ایسے کرتے ہیں کہ تم مجھ سے ایک ایک بات پوچھتے جاؤ، میں بتاتا جاتا ہوں۔''

میں نے کہنیوں کے بل نرم گھاس پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''مجید مٹھو اگر میڈم صفورا کا بندہ تھا تو وہاں جہلم میں کیا کر رہا تھا؟''

''بے شک وہ میڈم کا بندہ تھا مگر اس نے بتایا ہی تھا کہ ابرار صدیقی سے بھی اس کی علیک سلیک ہو چکی ہے اور ابرار صدیقی اسے کبھی کبھار اپنے ساتھ ٹیکسلا اور مردان وغیرہ بھی لے کر جاتا تھا۔''

''وہاں جہلم میں مجید کیا کر رہا تھا؟''

''ابرار صدیقی آج کل جہلم میں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ وہیں پر صدیقی کا کوئی پیر طریقت

بھی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو پیر صاحب کے ہاں کوئی محفل ہوتی ہے جو ساری رات جاری رہتی ہے اور کبھی کبھی دوسری رات تک بھی چلتی ہے۔ ابرار صدیقی کو اس محفل میں شریک ہونا تھا۔ اس کا خاص ملازم سلطان فلیٹ کی حفاظت کرتا تھا۔ صدیقی کو اس بندے پر بے پناہ بھروسہ ہے مگر ہوا یہ کہ جس رات صدیقی کو محفل میں شریک ہونا تھا، اسی روز سلطان کو اپنے ایک ضروری کام کے لیے واپس لاہور آنا پڑ گیا۔ دراصل سلطان کی کمی پوری کرنے کے لیے ابرار صدیقی نے مجید مٹھو کو جہلم بلایا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ فردوس پلازا کے اس فلیٹ میں وہ خاص ''پیس'' موجود ہے اس لیے صدیقی فلیٹ کی خاص حفاظت کر رہا ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے لیکن یہاں ایک ڈبل گیم ہوا اور اس گیم کا پتا میڈم اور اس کے ایک دو خاص بندوں کے سوا اور کسی کو نہیں۔ مجید مٹھو نے اس فلیٹ میں تقریباً چھتیس گھنٹے گزارے اور اس دوران میں وہ فلیٹ میں مسلسل اس ''پیس'' کو تلاش کرتا رہا۔''

''کیوں؟''

''میڈم نے اسے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ دراصل میڈم اس پیس کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ بے شک وہ ساتھ ساتھ قادرے کی بہن کنول کا چکر بھی چلا رہی تھی مگر اسے اس چکر کے ناکام ہونے کا خدشہ بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے طور پر فلیٹ میں پیس تلاش کرانے کی کوشش کی مگر اس بھرپور کوشش میں ناکام ہوئی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پیس اس فلیٹ میں موجود نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نوے فیصد سے زیادہ امکان ہے کہ اسی فلیٹ میں موجود ہے مگر ابرار صدیقی نے اسے اپنے ڈھنگ سے کہیں چھپا رکھا ہے۔ مجید مٹھو سر توڑ کوشش کر کے بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکا۔''

''تو تم اسے کیسے ڈھونڈو گے؟''

''جادو کی چھڑی سے۔ اپنا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے شہزادے۔''

''پھر وہی بجھارتیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''دراصل ابھی خود میرے ذہن میں بھی بات واضح نہیں ہے۔ ایک آزمودہ طریقے کو پھر سے آزمانا چاہ رہا ہوں۔ یہ جو اپنا آئن فلیمنگ ہے نا جیمز بانڈ کا رائٹر، شاید اس نے اپنے کسی ناول میں اس طرح کا کام کیا تھا یا پھر شرلاک ہومز کی کوئی کہانی تھی۔ ہاں یاد آیا، یہ جو آئن فلیمنگ ہے نا یہ تایا جی کا بڑا گہرا یار رہا ہے۔ دونوں نے اکٹھے ہی فلمیں دیکھنی شروع کی

تھیں۔ پھر جب دونوں افغانستان میں تھے تو اکٹھے ہی روزانہ ساحل پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔''

''افغانستان میں سمندر؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں ہے؟ اوہ...... شاید پھر کسی اور ملک کی بات کی ہوگی انہوں نے یا پھر ہم سے چھپایا ہوگا۔ دراصل تائی جی کو تایا کا آئن فلیمنگ اور الفریڈ ہچکاک وغیرہ سے ملنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ تو دیوانی تھیں اپنے شوکت صدیقی اور ابن صفی کی۔ بلکہ ابن صفی کو تو انہوں نے اپنا منہ بولا بھائی بنایا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ نہیں بتانا تو نہ بتاؤ۔ خوامخواہ دماغ مت کھاؤ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرا کر پٹڑی پر واپس آ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''سوری یار! بات کرتے ہوئے زبان پھسل جاتی ہے۔ اصل میں ابھی خود میرے ذہن میں بھی کوئی واضح نقشہ نہیں بنا۔ میں کل تک تمہیں پوری تفصیل بتا دوں گا۔ پوری تفصیل بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لے جانا تو اقبال کو تھا لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو، وہ جہلم میں باؤنسر کھا کر ریٹائرڈ ہرٹ ہو چکا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دے سکو تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، یہ کوئی ایسا خطرناک کام نہیں ہے۔ جو کچھ ہوگا بڑے ہموار اور پُرامن طریقے سے ہوگا۔ میڈم نے پہلی شرط ہی یہ رکھی ہے کہ انہیں کسی طرح کا خون خرابا نہیں چاہیے۔ وہ اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم بھی ہاتھ بالکل صاف رکھ کر ہی کام کرتے ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم مجید مٹھو کی بات کر رہے ہو یار! کم از کم تم تو ایسی بات نہ کہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو کچھ ہوا، اس کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا۔ اس نے ہماری گاڑی کو سائیڈ ماری اور خود کھائی میں گرا پھر آگ بھی اس کی غلطی سے لگی۔''

''اچھا...... اب اس بحث کو چھیڑنے سے کیا فائدہ۔ میری سمجھ میں ایک اور بات نہیں آ رہی۔ ایک طرف تو میڈم یہ چاہتی ہے کہ ابرار صدیقی سے اس کا تعلق خراب نہ ہونے پائے، دوسری طرف ''پیس'' کے لیے بھرپور ٹرائیاں بھی مار رہی ہے؟''

''اسی کو تو لالچ کہتے ہیں جگر! بہرحال یہ کوشش جو ہم کرنے والے ہیں، اس سے میڈم کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہم اپنے طور پر کریں گے۔ میں نے اپنی طرف سے میڈم کو ضمانت دی

ہے کہ کوشش کامیاب ہو یا ناکام، دونوں صورتوں میں اس معاملے میں اس کا نام نہیں آئے گا۔“

”یہ ضمانت تم کیسے دے سکتے ہو؟ اگر اپنی کوشش کے دوران میں تم پکڑے گئے اور ابرار صدیقی کے لوگوں نے تمہیں مار مار کر دنبہ بنا دیا تو تمہیں سب کچھ بتانا ہی پڑے گا اور اگر تم نہ بتاؤ گے تو میں بتا دوں گا۔“

اس نے فوراً میرے دونوں گال کھینچ کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ ”چلو...... کم از کم ایک بات تو ثابت ہوئی کہ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ دوسری بات پکڑے جانے والی اور دنبہ بننے والی تو اس پر میں ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم دنیا کے جدید اور نہایت پیچیدہ قسم کے ڈپریشن کا شکار ہو۔ تمہارے ذہن میں یہ خداداد صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ تم معمولی قسم کے کاموں میں سے نہایت غیر معمولی قسم کے خطرات ڈھونڈ نکالتے ہو لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بالکل صحت مند ہو جاؤ گے۔“

”میں اب بھی صحت مند ہوں، تمہاری ذہنی حالت کا مسئلہ ہے۔ تم آگ میں چھلانگ لگاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔“

”میرے جگر! یہاں کوئی آگ ہے اور نہ ہم اس میں چھلانگ لگا رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ”پین“ والا معاملہ بالکل سیدھے سادے طریقے سے حل ہو جانا ہے۔“

”تمہارے سارے معاملے سیدھے سادے طریقے سے ہی حل ہوتے ہیں۔ تم بالکل سیدھے سادے طریقے سے لال کوٹھی میں گھسے...... بالکل سیدھے سادے طریقے سے مٹھو کا پیچھا کیا اور اب اسی سیدھے سادے طریقے سے یہاں پھنسے ہوئے ہو۔“

”جگر! تم کہانی کو درمیان سے دیکھ رہے ہو۔ جب تک کہانی مکمل نہیں ہو جاتی اس پر تبصرہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں تمہاری کہانی کا اینڈ بھی۔“ میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا اور گھاس پر چت لیٹ گیا۔ دھوپ میں نرمی تھی۔ دور اوپر گہرے نیلے آسمان پر چیلیں تیر رہی تھیں اور بلند پرواز کبوتر اپنی سفید جھلک دکھا کر غائب ہو رہے تھے۔ ایک بار میں نے ثروت سے پوچھا تھا۔ ”اگر خدانخواستہ ہمیں وقت نے جدا کر دیا تو کیا کرو گی؟“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔ ”کسی سنسان چھت پر چت لیٹ کر نیلے آسمان کو دیکھا کروں گی اور سوچا کروں گی کہ تم کہیں بھی ہو لیکن ہو تو اسی آسمان کے نیچے۔ اسی نیلی چھتری تلے کہیں موجود ہو

اور ایک دن مجھ سے آن ملو گے۔“

کیا وہ واقعی کہیں دور دیس میں اس آسمان کو دیکھتی تھی اور میرے بارے میں سوچتی تھی؟ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ میں اپنے اردگرد سے کٹ کر بہت دور، بہت اوپر چلا گیا۔ میں نے آسمان کی نیلاہٹ کو مخاطب کیا، پرندوں کو اور مغرب کی طرف بہنے والی ہوا کو پکارا اور کہا۔ میرا پیغام اس تک پہنچا دینا۔ میں اس کو بھولا نہیں ہوں۔ ہر پل یاد کرتا ہوں۔ ملن کی آس میرے دل میں مری نہیں ہے۔ اس سے کہنا کہ میرا انتظار کرے۔

○......❖......○

رات تاریک اور سرد تھی۔ میں اور عمران مہران گاڑی پر جہلم شہر کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ ہماری دائیں جانب جہلم کے پل کی روشنیاں تھیں جبکہ بائیں طرف جہلم شہر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ یہ رات کے نو ساڑھے نو بجے کا عمل تھا۔ تاہم تیز سرد ہوا اور بارش کے چھینٹوں کی وجہ سے سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نظر نہیں آتا تھا۔

بے شک عمران کئی بار کہہ چکا تھا کہ ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ عمران کے ہر کام میں خطرہ موجود ہوتا ہے۔ شاید وہ اور اقبال کوئی ایسا کام کرتے ہی نہیں تھے جس میں خطرہ نہ ہو۔

”کیا محسوس ہو رہا ہے؟“ عمران نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہی جو تم چاہتے ہو۔ دل کی دھڑکن تیز ہے۔ ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا ہے۔“

”جس کام میں دل کی دھڑکن تیز نہ ہو۔ ہتھیلیوں پر پسینہ نہ آئے اور خون جوش نہ مارے وہ بھی کوئی کام ہوتا ہے یار! یہ خطرے...... رسک اور مصائب ہی ہوتے ہیں جو ردِعمل کے طور پر بندے کی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ بے عمل زندگی روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ وہ کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ ایسی زندگی کے بارے میں ہی اپنے معظم علی صاحب فرما گئے ہیں نا کہ اس سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔“

”معظم علی کون؟“

”یار! وہی اپنے ٹیپو سلطان صاحب۔“

”ٹھیک ہے اب اپنے تایا جی کا شجرۂ نسب ٹیپو سلطان سے جوڑ دو۔“

”دیکھا نا اب تم ایک دم فائیو اسٹار ہوتے جا رہے ہو۔ باتیں تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہیں۔“

باتیں کرتے کرتے اس نے ایک دم گاڑی کو بائیں طرف نیم پختہ راستے پر موڑا اور

گاڑی شہر کی ایک نواحی بستی کی طرف بڑھنے لگی۔ جلد ہی ہم ایک متوسط درجے کی بستی میں داخل ہوئے۔ درختوں میں گھرے ہوئے ایک کشادہ مکان کے قریب جا کر عمران نے گاڑی روک لی۔ دروازے پر عنایت علی کے نام کی بوسیدہ نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ عمران اور میں گاڑی سے اُتر آئے۔ ہم دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر گول ٹوپیاں تھیں اور پاؤں میں پشاوری چپل۔ میں نے کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ عمران نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔

عمران نے کال بیل بجائی۔ تھوڑی دیر بعد پکی عمر کا ایک کوتاہ قد شخص برآمد ہوا۔ وہ اپنے حلیے سے پوٹھوہاری لگتا تھا۔ اس نے ہمیں سرتاپا گھورا اور محتاط لہجے میں بولا۔ ''ہاں بھئی کیا بات ہے؟''

''آپ ہی کا نام عنایت علی ہے؟'' عمران نے جہلمی لب و لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... میں ہی ہوں۔''

''آپ سے کچھ کام ہے جی۔''

''پر پتا تو چلے آپ آئے کہاں سے ہیں اور کس نے بھیجا ہے آپ کو؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں جی! ایک دو بار لاہور کے مجید مٹھو نے آپ کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ ...... گٹا وغیرہ خریدتے ہیں۔''

گٹا کا لفظ سن کر عنایت علی چونک گیا۔ اس نے ایک بار پھر عمران کو سرتاپا گھورا پھر ہم دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ عمران راستے میں ہی مجھے بتا چکا تھا کہ گٹا اور گڈی وغیرہ کے الفاظ یہ لوگ نوادر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عنایت علی کے گھر کا صحن کافی وسیع تھا۔ یہاں شہد کی مکھیوں کے بوسیدہ ڈبے پڑے تھے۔ ایک طرف دو تین سال پُرانے ماڈل کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ عنایت علی ہمیں کمرے میں لے آیا۔ بلب کی روشنی میں ایک شیشے کی الماری سب سے نمایاں دکھائی دی۔ اس میں بہت سی نایاب چیزیں پڑی تھیں۔ پُرانے سکے، بدھا کے سوکھے ہوئے ہیڈ، مہریں اور کچھ برتن وغیرہ۔ لگتا تھا کہ عنایت علی یہاں تنہا رہتا ہے۔ ابھی رات کے صرف دس ہی بجے تھے مگر اس چار دیواری میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عنایت علی نے دہکی ہوئی انگیٹھی ہمارے قریب کھسکا دی اور ہم سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ اس انٹرویو کے لیے عمران پہلے ہی تیار ہو کر آیا تھا۔ اس نے اپنا تعلق روہتاس کی ایک قریبی بستی ماگھی پورا سے بتایا۔ اس نے میرے بارے میں بتایا کہ میں اس کا

پھوپھی زاد شراکت احمد ہوں۔ مجھے دمے اور شدید سر درد کی شکایت ہے۔ مجھے سول ہسپتال میں دکھانے کے لیے جہلم شہر آیا تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر تو جانا ہی ہے، کیوں نہ کسی معقول بندے سے گٹے کی فروخت کی بات بھی کر لی جائے۔ اس کے پاس مجید مٹھو کا دیا ہوا ایڈریس موجود تھا اس لیے یہاں چلا آیا۔

پتا نہیں کہ یہ عنایت نامی بندہ عمران کی باتوں سے کس حد تک قائل ہوا؟ بہرحال اس کے لب و لہجے میں کچھ نرمی ضرور آ گئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ ''مجید مٹھو کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟''

عمران نے چہرے پر سوگواری طاری کر لی۔ ''ہاں جی...... بڑا دُکھ ہوا ہے۔ ہمارے علاقے میں اخبار وغیرہ تو جاتا نہیں، مجھے تیسرے چوتھے روز ایک بندے سے خبر ملی تھی۔ پتا نہیں کہ کیا ہوا مجید بھائی کے ساتھ۔ بہرحال یہ بات تو پکی ہے کہ وہ حادثہ شادثہ نہیں تھا۔ ان کو مارا ہے جی کسی نے......''

کچھ دیر مجید کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ عنایت نے بتایا کہ یہ اس کا بھتیجا ہے۔ اُبلے ہوئے انڈے کا نصف حصہ منہ میں رکھنے کے بعد عنایت علی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''کیا چیز ہے تمہارے پاس؟''

عمران نے بھی ''سڑڑ'' کی نامعقول آواز کے ساتھ چائے کی ایک طویل چسکی لی اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔ ''عنایت بھائی! میری بات کا غصہ نہ کرنا۔ دراصل میں چاہتا تھا اگر میری ملاقات بڑے بھائی صیب سے! میرا مطلب ہے کہ صدیقی صیب سے ہو جاتی تو اچھا تھا۔''

عنایت علی کی پیشانی پر ناگواری کی شکن اُبھری تاہم اس نے اپنا کاروباری لہجہ برقرار رکھا اور بولا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں میرے بارے میں مجید مٹھو نے بتایا تھا۔ اگر اس نے بتایا ہے تو پھر یہ بھی بتایا ہو گا کہ صدیقی صاحب کے لیے جو کچھ خریدتا ہوں، میں ہی خریدتا ہوں۔ وہ خود اتنے زیادہ مصروف ہیں کہ ایسے کاموں میں نہیں پڑ سکتے۔''

''دراصل مجھے پتا چلا تھا کہ وہ آج کل جہلم میں ہی رہ رہے ہیں اس لیے......''

''یار! تمہیں اپنی چیز بیچنی ہے یا صدیقی صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو اُتروانی ہے۔'' اس بار عنایت علی کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ فوٹو اُتروانے پر بھی تیار ہو جائیں۔'' عمران نے بتیسی نکالی۔ اس کے انداز میں غیر معمولی اعتماد تھا۔

اس انداز کی وجہ سے عنایت علی نے اپنی بڑی بڑی پُراسرار آنکھوں سے ایک بار پھر

عمران کا تنقیدی جائزہ لیا اور قدرے چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن پتا تو چلے تمہارے پاس مال کیا ہے؟''

''میں تو چاہتا تھا کہ مال بھی بڑے بھائی صیب کو ہی دکھاؤں لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ آپ بھی تو بھائی صیب ہی ہیں۔'' وہ دیہاتی انداز میں بولا۔

اس نے اپنی گرم چادر کے اندر ہی اندر رازداری سے ہاتھ گھمایا اور بغلی جیب میں سے ایک چیز نکال کر باہر رکھ دی۔ یہ بڑی احتیاط سے ایک فلالین کے کپڑے میں لپیٹی گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک آرٹ پیس تھا۔

دراصل یہاں آنے سے پہلے عمران نے جو تھوڑی سی تیاری کی تھی، اس میں دو تین چیزوں کا حصول بھی تھا۔ ایک تو یہی پیس آف گندھارا آرٹ تھا۔ یہ تقریباً نو انچ لمبا شیر کا خوبصورت مجسمہ تھا۔ اس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ دو چھوٹے نگینے تھے۔ شیر کی دُم کا آخری حصہ ''امتدادِ زمانہ'' نے توڑ ڈالا تھا پھر بھی یہ ایک خوبصورت پیس تھا۔ کل میڈم صفورا نے ہی یہ پیس عمران کو کہیں سے لا کر دیا تھا۔

عمران نے بڑی آہستگی سے فلالین کا نیلا کپڑا شیر کے مجسمے پر سے کھسکایا۔ جیسے شائقین کا اشتیاق بڑھانے کے لیے اسٹیج پر سے آہستہ آہستہ پردہ اُٹھایا جاتا ہے۔ بلب کی زرد روشنی میں شیر کا مجسمہ عیاں ہوا تو میں نے عنایت علی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اُبھرتے دیکھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہوئی اور میں نے اس کی انگلیوں کو بے ساختہ مجسمے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ایک قدرشناس نرمی کے ساتھ اس نے نو انچ لمبے مجسمے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس کی سانس کی لے چڑھ گئی ہے اور آنکھوں میں دبی دبی بیتابی کروٹ لے رہی ہے۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر قریب رکھا ٹیبل لیمپ آن کیا اور اس کی تیز روشنی میں ماہرانہ انداز میں پیس کا جائزہ لینے لگا۔

''کہاں کا ہے؟'' عنایت علی نے پوچھا۔

''تخت بائی کا۔ ایک مقامی بندے سے خریدا ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔

''کتنے میں چھوڑو گے؟''

''آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں جی۔ ایسا گٹا (پیس) بار بار سامنے نہیں آتا۔ آپ انصاف سے جو دیں گے، ہم لے لیں گے۔''

''پھر بھی کوئی آئیڈیا تو ہوتا ہے ناہر بندے کا۔''

''پچھلے سال ایسا ہی ایک گٹا میرے چاچے کے پتر ہاشم نواز نے بیچا تھا، لاہور کے ایک خاں صیب کو وہ پورے چالیس ہزار روپے میں گیا تھا۔''

''چالیس ہزار...... یہ تو بہت ہے یار!'' عنایت علی نے کاروباری لہجہ اختیار کیا۔

''بہت تو نہیں ہے جی! مسئلہ بس اتنا ہے کہ ہم اَن پڑھ لوگ ہیں۔ آگے تک نہیں جا سکتے۔ ہماری پہنچ بس آپ لوگوں تک ہوتی ہے۔ ورنہ اتنا تو ہمیں بھی پتا ہے کہ جو سودا آ ہزاروں میں اُٹھاتے ہیں، وہ آگے جا کر لاکھوں میں بلکہ کبھی کبھی کروڑوں تک بھی چلا جاتا ہے۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری صادق محمد۔'' عمران نے اسے اپنا نام یہی بتایا تھا۔ ''اب اتنی بھی لوٹ نہیں مچی ہوئی۔ ہمیں سو طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پولیس...... کسٹم اور ٹاؤٹ وغیرہ، پتا نہیں کس کس کی جیب گرم کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر چار پیسے ہاتھ آتے ہیں اور اگر کہیں پکڑ دھکڑ ہو جائے تو ساری اگلی پچھلی کمائی نکل جاتی ہے۔ تم لوگ تو گرم چادر لپیٹ کر آتے ہو اور جیب گرم کر کے نکل جاتے ہو۔ باقی ساری مصیبتیں تو ہماری ہوتی ہیں۔''

عنایت کے لہجے نے عمران کو بھی لہجہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ''ٹھیک ہے صیب جی! یہ تو من مرضی کا سودہ ہے۔ اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو رہنے دیں۔ ہم پھر بھی آپ کے خادم رہیں گے۔ جب کوئی شے ہاتھ لگے گی، آپ کو سلام کرنے آ جائیں گے۔''

''لیکن یار! اس اتنے سے گٹے کے لیے چالیس ہزار تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''میں نے چالیس ہزار کب کہا ہے صیب جی! میں نے تو آپ کو بتایا ہے کہ ایسا گٹا پچھلے سال چالیس میں بکا تھا۔ اب اگر آپ انصاف کی بات کریں تو اس کی قیمت پچاس سے کم نہیں ہے اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں، یہ ایک گٹا نہیں ہے۔ بالکل اسی سائز اور شکل کے آٹھ گٹے اور ہیں۔''

''آٹھ گٹے؟'' عنایت علی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اسی لیے تو سرکار! آپ سے کہا تھا کہ بڑی سرکار سے بات کرا دیں۔ یہ ساڑھے چار پانچ لاکھ کا سودا ہے۔ اگر ہم خوش ہو کر جائیں گے تو پھر بھی آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔''

''باقی گٹے کہاں ہیں؟'' عنایت نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''وہ تو پاس نہیں ہیں۔ یہ سیمپل آپ کے سامنے ہے۔ باقی بھی بالکل اسی طرح کے ہیں۔ بس چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ ہے سب میں۔''

عنایت علی چند سیکنڈ تک پُرسوچ انداز میں اپنا گھڑا سا سر ہلاتا رہا۔ وہ اب اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ”بڑی سرکار“ سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔

اس نے عمران سے دو تین سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون نکالا اور ابرار صدیقی کا نمبر ملایا۔ وہ ابرار سے بات کرنے لگا۔ اس نے ابرار کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا۔ ہمارے نام بتائے اور ہمارے مال کی تفصیل بتائی۔ ”جی ہاں...... جی جی...... کہتے ہیں آٹھ پیس اور ہیں۔ بالکل یہی سائز ہے ایک ہی ”سورس“ سے ملے ہیں...... جی جی...... قیمت زیادہ بتا رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

عنایت علی نے پندرہ بیس منٹ خاموش رہ کر دوسری طرف سے دی جانے والی ہدایات سنیں پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے جناب! میں لے آتا ہوں ان کو۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ او کے جی۔“

فون بند کر کے وہ بولا۔ ”صدیقی صاحب عام طور پر اس وقت ملتے نہیں ہیں لیکن آج جلدی گھر آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ ٹیکسی پکڑنے اور وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹہ تو لگ ہی جانا ہے۔“

کچھ ہی دیر بعد ہم عنایت علی کے گھر سے روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری کار عنایت علی کے دروازے سے بس پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی مگر ہم اس کے پاس سے بیگانوں کی طرح گزر گئے۔ عمران کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس بارے میں اس نے کچھ تو مجھے بتایا تھا اور کچھ ابھی تک نہیں بتایا تھا۔ میں اس کے بیمار پھوپھی زاد شراکت کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا۔ میری بیماری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اس نے میری ایک کلائی کی ورید میں ”کینولا“ بھی لگوا رکھا تھا۔ اسے ٹیپوں سے میری کلائی کے ساتھ چپکایا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مجھے ہسپتال میں انجکشن وغیرہ لگتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عمران کے پاس ایک تقریباً پانچ انچ لمبا اسٹائلش سا سگریٹ لائٹر بھی تھا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران بہت کم سگریٹ پیتا ہے اور مستقل طور پر لائٹر وغیرہ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ اب اگر یہ لائٹر اس کی جیب میں موجود تھا تو اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔

ہم تقریباً دو فرلانگ تک پیدل ہی چل کر شہر کی اس نواحی بستی سے نکل آئے اور سڑک پر سے ٹیکسی لے لی۔ اس ٹیکسی نے آدھ گھنٹے میں ہمیں ہمارے جانے پہچانے علاقے میں پہنچا دیا۔ یہ وہی فردوس پلازہ والا علاقہ تھا۔ ابرار صدیقی کا لگژری فلیٹ اسی پلازہ میں تھا۔ یہیں سے ہم نے صدیقی چند روز پہلے مجید مٹھو کا پیچھا کیا تھا۔ اس وقت ہم نے اس پلازہ کو صرف

دیکھا تھا، آج ہم اس کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔

اب رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ کڑکتی سرد میں سڑکیں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ عنایت علی ہمیں لے کر اس شاندار عمارت میں داخل ہوا اور بذریعہ لفٹ چوتھی منزل پر آ گیا۔ ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کا فلیٹ اسی فلور پر تھا۔

اس فلور پر داخل ہوتے ہی ہمیں ایک سیکیورٹی گارڈ کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے گارڈ سے فلیٹ کے آبنوسی دروازے کے سامنے ملاقات ہوئی۔ عنایت علی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اس کے باوجود ”میٹل ڈی ٹیکٹر“ کے ذریعے ہمیں چیک کیا گیا اور جیبیں وغیرہ ٹٹولی گئیں۔ آخر ہم تین بیڈ رومز والے اس وسیع فلیٹ میں داخل ہو گئے۔ کھڑی ناک اور عقابی آنکھوں والے ایک خطرناک صورت شخص نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھایا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہی صدیقی کا خاص کارندہ سلطاناں ہے۔ وہ بے حد چوکس اور تیز طرار شخص دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کے جسم سے عجیب طرح کی بُو نکلتی محسوس ہوئی، جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی جانور ہو۔ ہمارے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے ابرار صدیقی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہم اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ابرار صدیقی ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے ایک طرف مانگ نکال کر بال بنائے ہوئے تھے۔ تاہم ڈاڑھی خودرو دکھائی دیتی تھی اور خاصی لمبی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس سال رہی ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں نہایت چمکیلے دانوں والی ایک چھوٹی سی تسبیح بھی تھی جو اس نے ہم سے مصافحہ کرنے کے بعد سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔

عنایت علی نے بڑے مؤدب انداز میں ابرار صدیقی سے ہمارا مختصر تعارف کرایا۔ اس دوران میں ابرار صدیقی بس اپنا سر ہلاتا رہا۔ وہ کچھ چپ چپ دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں بھی سرخی مائل تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ وہ کنول پر فریفتہ تھا اور اس سے شادی کرنے کی پوری پلاننگ کر چکا تھا مگر اب اس کی یہ ساری پلاننگ ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا تھا۔ کنول اپنی والدہ سمیت روپوش ہو چکی تھی اور تو اور کنول کا بھائی قادر بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

تعارف ختم ہوا تو ابرار صدیقی نے اپنی گونج دار آواز میں ہم سے دو چار سوال پوچھے۔ عمران ان سوالوں کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ابرار کا اہم سوال یہی تھا کہ مجید مٹھو سے ہمارا رابطہ کب اور کہاں ہوا تھا؟ عمران نے اس کا تسلی بخش جواب دیا۔ ابرار نے ہمیں ”پیس“ دکھانے کے لیے کہا۔

عمران نے ایک بار پھر دبے دبے جوش کے ساتھ گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھ کو حرکت

دی اور جڑاؤ شیر کا مجسمہ، فلالین کے کپڑے سے نکال کر ابرار صدیقی کے سامنے کر دیا۔

ابرار نے بظاہر عام نظروں سے مجسمے کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر شوق کی ایک چمک اُبھری تھی، وہ پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ وہ ماہرانہ انداز میں ''پیس'' کے زیر و بم پر اپنی انگلیاں چلا کر دیکھتا رہا، تب جیب سے عینک نکالی اور اپنا رُخ روشنی کی طرف کر کے مزید باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ ہمارے لیے کسی طرح کا تکلف کرے گا۔ لہٰذا جب اس نے ملازم کو چائے کا کہا تو مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اس گٹے یا ''پیس'' کی اصل قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ عین ممکن تھا کہ جس چیز کا سودا ہم سے چالیس پینتالیس ہزار میں کیا جا رہا تھا، وہ آگے چل کر دس پندرہ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ کی قیمت پاتی۔

اسی دوران میں ابرار صدیقی کے بیش قیمت موبائل فون پر کال آ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور مدھم آواز میں بولا۔ ''جی حضرت......'' اس کا انداز مؤدبانہ تھا۔ قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ دوسری طرف ابرار صدیقی کا وہی پیرومرشد ہے جس کا تذکرہ مجید مٹھو نے اپنی موت سے قبل کیا تھا۔

ابرار صدیقی کہہ رہا تھا۔ ''جی حضرت! تلاش تو ہو رہی ہے جی...... پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ خصوصی دعا کیجیے گا۔ جی ہاں...... جی ہاں...... بھائی کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔ وہ سب اکٹھے ہی نکلے ہیں کہیں۔ نہیں حضرت! سراج یا میڈم خود تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کم از کم میری عقل تو یہی کہتی ہے یہ کوئی تیسری پارٹی ہے جی!'' پھر ابرار صدیقی بات کرتے کرتے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بولنے کی بس مدھم آواز ہم تک پہنچتی رہی۔ الفاظ اب سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار صدیقی صاحب اپنی گم گشتہ محبوبہ کا تذکرہ فرما رہے تھے اور دوسری طرف ان کے پیرومرشد صاحب تھے۔ لگتا تھا کہ اس پیرومرشد صاحب کو ابرار صدیقی کی زندگی میں خاص الخاص اہمیت حاصل ہے۔ نشست گاہ کی دیوار پر نہایت قیمتی فریم میں ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ لمبی ڈاڑھی تھی لیکن ساتھ ٹائی پن بھی لگا رکھی تھی۔ اس کی بھنویں غیر معمولی طور پر گھنی تھیں اور ان بھنوؤں کے نیچے لمبوتری آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

میں نے نہایت مدھم آواز میں عنایت علی سے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''حضرت صاحب ہیں۔ بڑے صاحب کے مرشد۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

حضرت صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا ایک نفیس سا کڑا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی کڑا ابھی میں نے ابرار صدیقی کی کلائی میں بھی دیکھا تھا۔

دو چار منٹ بعد ابرار صدیقی واپس آ گیا۔ وہ اب قدرے پُرسکون نظر آتا تھا۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ نو عدد گٹوں کے بارے میں ہم سے بات چیت شروع کی۔ عمران نے یہ کہہ کر ابرار صدیقی کی دلچسپی میں اضافہ کیا کہ اس کے پاس ایک قدیم اسٹوپا کا ٹوٹا ہوا حصہ بھی ہے۔ اس قریباً چار مربع فٹ کے ٹکڑے پر تصویریں کندہ ہیں اور وہ یہ ٹکڑا بھی نہایت مناسب قیمت پر اس کے حوالے کر سکتا ہے۔

چائے کے بعد ابرار صدیقی نے عنایت علی کو تو واپس روانہ کر دیا تاہم عمران کے ساتھ اس کی بے تکلف گفتگو جاری رہی۔ ابرار صدیقی جیسے نہایت گھاگ شخص کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر عمران یہ کام بخوبی کر رہا تھا۔ نو عدد گٹوں کی قیمت کے بارے میں بھی عمران نے تکرار کا انداز اختیار نہیں کیا اور بڑے کھلے دل سے یہ معاملہ ابرار صدیقی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس نے کہا۔ ''صیب جی! ہم غریب لوگ تو بس عزت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ آپ نے جو عزت دی ہے، اس سے پیسے پورے ہو گئے ہیں۔ باقی سودے میں چالیس پچاس ہزار اوپر نیچے ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

فرق پڑنا بھی کیا تھا؟ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نو گٹے موجود ہی نہیں ہیں۔ بس یہ ایک ہی گٹا تھا جو عمران نمونے کے طور پر یہاں لے کر آیا تھا اور یہ بھی ابرار صدیقی کو شیشے میں اُتارنے کا ایک حربہ تھا۔

جو پروگرام ہم طے کر کے نکلے تھے، اس کے مطابق ہمیں یہاں ابرار صدیقی کے شاندار اپارٹمنٹ میں رات گزارنے کی کوشش کرنا تھی۔ مجھے ایک مریض کی حیثیت سے اپنے ساتھ لانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ میرے لیے عمران کی ہدایت تھی کہ جب ہم یہاں سے جانے والے ہوں گے تو میری طبیعت اچانک خراب ہو جائے گی۔ سر شدت سے چکرانے لگے گا۔ مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت پڑے گی۔ اُمید تھی کہ اس موقعے پر ابرار صدیقی اخلاق کا مظاہرہ کرے گا اور ہمیں اتنی رات گئے جانے سے روک لے گا لیکن بیماری کے بہانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باتوں میں رات کے دو بج گئے۔ باہر موسم بھی سخت سرد اور ابر آلود تھا۔ گاہے بہ گاہے چھینٹے پڑنے لگتے تھے۔ ابرار صدیقی کو گوارا نہیں ہوا کہ ہم اتنے قیمتی گٹے کے ساتھ اتنی رات گئے واپس جائیں۔ اس نے رات کا باقی حصہ ہمیں فلیٹ میں ہی گزارنے کی آفر کی جو

عمران نے دوبارانکار کرنے کے بعد بڑی انکساری سے قبول کر لی۔

نشست گاہ کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ اس اپارٹمنٹ کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا۔ یہاں بھی قالین موجود تھا۔ ٹی وی، گیس ہیٹر، اٹیچ باتھ اور دیگر سہولتیں بھی مہیا تھیں۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر بھی حضرت جی کی بڑی سی پورٹریٹ آویزاں تھی۔ ایک ملازم نے ہمارے سونے کا انتظام کر دیا۔

ہم ڈبل بیڈ پر ایرانی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے مگر سونا کس کافر کو تھا۔ ہم یہاں جاگنے کے لیے آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اب اس مشن کا اہم ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ وہ نایاب ''فاسٹنگ بدھا'' اسی اپارٹمنٹ میں کہیں موجود تھا جس کے لیے بہت سے لوگ دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ دوفٹ طویل گٹا انہی در و دیوار میں کہیں چھپایا گیا تھا اور ایسے اچھے طریقے سے چھپایا گیا تھا کہ مجید مٹھو دو بار بھرپور کوشش کرنے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ مجید مٹھو ایسے معاملوں میں نہایت ماہر سمجھا جاتا تھا۔ عمران کو میڈم سے معلوم ہوا تھا کہ مجید ایک خاندانی نقب زن تھا۔ کسی چار دیواری میں گھس کر وہاں سے کسی شے کو نکال لانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اس اپارٹمنٹ میں خوب تگ و دو کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

رات آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر سرد ہوا کا شور تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا نہایت خطرناک رکھوالا سلطاناں ہمارے کمرے سے باہر موجود تھا اور جاگ رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ بوقتِ ضرورت وہ ہر بڑے سے بڑا قدم اُٹھا سکتا ہے۔ فضا میں سنسنی سی تیرنے لگی۔

میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ ''اب تو بتا دو کہ کیا کرنا ہے؟''

''بس تیار ہو جاؤ۔'' وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں مقامی فائر بریگیڈ کو فون کرنا ہے کہ فردوس پلازہ کے ٹاپ فلور پر رہائشی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔''

''یہ جھوٹ بولنے کا مقصد؟''

''یار! جھوٹ کون بول رہا ہے؟ سچی سچی بات کریں گے۔''

''مگر آگ کہاں ہے؟''

''آگ بھی لگ جائے گی یار! اتنے بیتاب کیوں ہو رہے ہو؟ اور یہ بھی کوئی ضروری تو نہیں ہوتا نا کہ آگ لگنے کے بعد ہی فائر بریگیڈ کو اطلاع دی جائے۔ اکثر فائر بریگیڈ والے لیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سیانے لوگ پہلے ہی فائر بریگیڈ کو کال کر لیتے ہیں۔''

عمران کی باتوں پر ہنسی تو نہیں آسکتی تھی تاہم مجھے اس بے پناہ اعتماد کا احساس ضرور ہوا

جو وہ نہایت پُرخطر لمحات میں بھی اپنے اندر موجود رکھتا تھا اور اس کا یہی غیر معمولی اعتماد تھا جو مجھ جیسے ماٹھے شخص کو بھی اب بتدریج ایک نئے سانچے میں ڈھال رہا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اب مجھے بھی اس سنسنی خیزی میں کچھ لطف آنے لگا تھا۔

اس نے مجھے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دیں۔ یہ ہدایات سن کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ بوقتِ ضرورت واقعی شاطر ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہ ایک نہایت بولڈ قدم اُٹھانے جا رہا تھا۔ میں نے پُراندیش لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لیکن عمران! یہاں ارد گرد بھی تو اپارٹمنٹ ہیں اگر کسی دوسرے اپارٹمنٹ کو نقصان پہنچا تو؟''

''یار! فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کے لیے آتے ہیں، کوئی لڈی ڈانس تو پیش نہیں کرنا ہوتا انہوں نے۔ پھر بھی اگر تھوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ اٹ از پارٹ آف دی گیم۔ ہاں...... کوئی جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے اور ان شاء اللہ ہم ہونے بھی نہیں دیں گے۔''

قریباً تین چار منٹ بعد ہم حرکت میں آگئے۔ سب سے پہلے عمران نے اپنے موبائل پہ مقامی فائر بریگیڈ کا نمبر ملایا اور انہیں گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی کہ فردوس پلازہ کے بالائی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ تاہم یہ اطلاع دیتے ہوئے عمران نے اپنا لہجہ اتنا بلند نہیں ہونے دیا تھا کہ آواز کمرے سے باہر جاتی۔

اس کے فوراً بعد اس نے دوسرا اسٹیپ لیا۔ گیس ہیٹر بند کر دیا لیکن گیس دوبارہ کھول دی۔ گیس کی بُو تیزی سے کمرے میں پھیلنے لگی۔ جب کافی گیس پھیل گئی تو ہم دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے نکلتے عمران نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنے لائٹر سے کھڑکی کے پردوں کو شعلہ دکھا دیا۔ بھک بھک کی آواز سے بیڈ روم نے آگ پکڑ لی۔ یہ ایک ہلا دینے والا منظر تھا۔

''آگ...... آگ۔'' ایک ملازم کے چلّانے کی آواز سنائی دی۔

پھر میں نے سلطان کا دھواں دھار چہرہ دیکھا۔ وہ پھٹی نظروں سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ تب وہ عجیب خوفزدہ انداز میں دھاڑا اور اس نے تڑپ کر ایک قریبی دیوار سے آگ بجھانے والا گیس سلنڈر اُتار لیا۔

''کیا ہوا سلطاناں؟'' کسی قریبی کمرے سے ابرار صدیقی کی چلّاتی ہوئی گونج دار آواز ابھری۔

''آگ صاحب جی!'' سلطاناں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

اس نے بڑی دلیری سے آگے بڑھ کر آگ پر گیس پھینکی تاہم آگ کا پھیلاؤ اس سلنڈر کی کارکردگی سے کہیں زیادہ تھا۔

اسی دوران میں مَیں نے دیکھا کہ عمران نے اپنے پانچ انچ لمبے لائٹر کو اس خاص انداز سے استعمال کیا جس کے بارے میں وہ مجھے بتا چکا تھا۔ ایک بٹن پش کر کے اس نے لائٹر کو کامن روم میں پھینک دیا۔ کامن روم میں آگ نہیں لگی مگر وہاں اتنی تیزی سے دھواں پھیلا کہ یہی لگا جیسے پورا اپارٹمنٹ آگ کی زد میں آ گیا ہے۔ یہ دھواں اس خاص قسم کے لائٹر سے برآمد ہو رہا تھا جیسا کہ عمران نے مجھے بتایا تھا، ایسے لائٹر سرکس میں شعبدے بازی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ایک دم تہلکہ مچ گیا۔

پلاننگ کے مطابق میں اور عمران ابرار صدیقی کی طرف بڑھے۔ وہ یقیناً سوتے میں اُٹھا تھا۔ اس کے بدن پر صرف شلوار اور بنیان تھی۔ بنیان میں اس کی موٹی لیکن ٹھوس توند نمایاں نظر آتی تھی۔ افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے یہ توند بُری طرح دہل رہی تھی۔

''آگ لگ گئی ہے صیب جی! آگ......'' عمران دہشت زدہ آواز میں چلاّیا۔

عمران کا یہ بے معنی فقرہ صرف دہشت بڑھانے کے لیے تھا، ورنہ اندھے کو بھی دکھائی دیتا تھا کہ اپارٹمنٹ آگ کی لپیٹ میں ہے۔

ابرار صدیقی عالم وحشت میں ناچ کر رہ گیا۔ پہلے اس نے موبائل پر غالباً فائر بریگیڈ کو کال کرنے کی کوشش کی پھر اس کو ادھورا چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف گیا۔ اب شعلے اس بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ابرار صدیقی بُری طرح کھانستا ہوا اپنے بیڈ پر چڑھ گیا۔ وہ دو بڑے کشن اوپر نیچے رکھ کر بیڈ پر کھڑا ہوا تو اس کا ہاتھ چھت کی اندرونی سیلنگ تک پہنچنے لگا۔ یہاں خانے دار ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ صدیقی نے ایک دو سیکنڈ تک ان خانوں کا جائزہ لیا جیسے مطلوبہ خانہ گن کر ڈھونڈ رہا ہو۔ تب اس نے ایک خانے کے ایک کونے کو مخصوص جھٹکے سے اوپر کی طرف دبایا۔ یہ تقریباً دو فٹ مربع کا خانہ باقی چھت سے علیحدہ ہو کر اوپر چلا گیا۔ صدیقی نے کھانستے ہوئے اندھا دھند اس خانے میں ہاتھ چلایا۔ کوئی چیز اس نے زور لگا کر باہر کھینچ لی، یہ پولیتھین میں لپٹی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وہی دو فٹ اونچا فاسٹنگ بدھا تھا۔ میڈم صفورا اور مجید مٹھو وغیرہ کے بقول ایک نایاب اور بے داغ پیس آف آرٹ۔

ابرار صدیقی نے اس نادر اینٹیک کو ہر آنکھ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کو اس کی ہوا

تک نہیں لگنے دے رہا تھا لیکن آج وہ ہمارے سامنے اس ''پیس'' کو اس کے خفیہ ٹھکانے سے نکال رہا تھا۔ وہ اور اس کا پیس بُری طرح دھوئیں میں لپٹے ہوئے تھے۔ بستر پر سے اُترنے سے پہلے اس نے یہ پیس بدست خود عمران کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''لایئے...... لایئے۔'' عمران نے خلوص دل سے کہا۔

صدیقی سے پیس لینے کے بعد عمران نے مجھے تھما دیا۔ وہ وزنی تھا مگر اتنا بھی نہیں جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بدھا کے اس مجسمے نے شاید آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ نیچے سے اس کا پھیلاؤ کافی زیادہ تھا۔

عمران نے صدیقی کو بیڈ سے اُترنے میں مدد دی۔ کھانس کھانس کر صدیقی کا بُرا حال تھا۔ ہم نے اپنے چہرے کپڑے میں لپیٹ رکھے تھے اس کے باوجود ہم بھی کھانس رہے تھے۔ میں نے ابرار صدیقی کو عمران کے سہارے ڈبل بیڈ سے اُترتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔ بظاہر یہی لگا کہ ابرار صدیقی تیورا کر اوندھے منہ گر گیا ہے شاید اسے ٹھوکر وغیرہ لگی ہے۔ تاہم یہ امکان بھی تھا کہ عمران نے اسے ضرب لگائی ہو اور مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اسے لمبا لٹا دیا ہو۔ اس بات کا اعتراف عمران نے پانچ چھ دن بعد کیا کہ اس نے ابرار صدیقی کی گردن پر ضرب لگائی تھی۔

''چلو۔'' صدیقی کے گرتے ہی عمران نے تیز سرگوشی کی اور پولیتھین میں لپٹا مجسمہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ دو ملازم کھانستے ہوئے ہماری طرف لپک رہے تھے۔ ''صیب جی کو دیکھو وہ گر گئے ہیں۔'' عمران نے بھرائی ہوئی آواز میں اور بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ آگ اب مہمان خانے سے نکل کر کامن روم تک پہنچ گئی تھی۔ فرنیچر دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت جی کی تصویر آگ کی زد میں آنے کے بعد اوندھے منہ سلگتے ایرانی قالین پر گری۔ سلطاناں Extiguisher کے ذریعے آگ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کسی قاسم نامی ساتھی کو مخاطب کر کے دھاڑ رہا تھا۔ ''قاسو...... قاسو! فون کر فائر بریگیڈ کو۔'' اس کی آواز خوف سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کا رُخ دوسری طرف تھا۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکلے۔ پورے پلازہ میں ہلچل مچ چکی تھی۔ بوکھلائے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ دو چوکیدار Extinguisher لیے متاثرہ اپارٹمنٹ کی طرف لپک رہے تھے۔ ہم ان کے پہلو سے گزر کر سیڑھیوں پر آ گئے۔ بکھرے بالوں والی ایک نوجوان لڑکی جو شاید کچھ دیر پہلے اپنے شوہر کے ساتھ بستر میں اچھا

وقت گزار رہی تھی، بستر کی چادر میں لپٹی سیڑھیوں پر موجود تھی۔ چادر سیڑھیوں کے جنگلے میں پھنس گئی تھی۔ وہ جھٹکے دے کر چادر کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے چادر پھٹ گئی اور لڑکی آزاد ہو کر قلانچیں بھرتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

اردگرد سے لوگوں کے چلانے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سیکنڈ فلور پر ہم نے ایک موٹی تازی خاتون کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی اور دو چھوٹے بچوں کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر سیڑھیاں اُترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ آگ سے بہت دور تھی مگر لگتا تھا کہ سب سے زیادہ خطرہ اسی کو ہے۔

''آپا جی کی مدد کرو یار!'' عمران نے کہا۔

میں نے خاتون کا ایک بچہ اُٹھا لیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم گراؤنڈ فلور پر تھے۔ یہی وقت تھا جب فائر بریگیڈ والوں کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئے تھے۔ ہم فردوس پلازہ سے باہر نکلے۔ بہت سی راہ چلتی گاڑیاں سڑک کے کناروں پر رُک چکی تھیں۔ اردگرد کی عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازہ کھل رہے تھے۔ ٹاپ فلور کے اپارٹمنٹ میں لگی ہوئی آگ کی جھلکیاں سڑک سے بھی نظر آتی تھیں۔

ہم نے ہلکی ہلکی پھوار میں تیزی سے دو سڑکیں کراس کیں اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ عمران پچھلی نشست پر تھا اور فاسٹنگ بدھا کا نادر مجسمہ اس کی گود میں تھا۔ ایک بھی گولی چلائے بغیر، کسی بھی شخص کو شدید زخمی کیے بغیر، بلا کسی بڑے جھگڑے کے یہ فاسٹنگ بدھا عمران نے حاصل کر لیا تھا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مسائل کو الگ طریقے سے دیکھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت اس میں موجود تھی۔ اس صلاحیت کو اس کی غیر معمولی بے خوفی سے مزید تقویت ملتی تھی۔

ٹیکسی نے ہمیں بیس منٹ میں واپس اسی رہائشی کالونی میں پہنچا دیا جہاں عنایت کے گھر کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ اسے ابھی فردوس پلازہ کی آتشزدگی کی خبر ہوئی تھی یا نہیں؟

عمران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بدھا کو بڑے احترام سے پچھلی نشست پر بٹھا کر اس پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ جیسے ساڑھے چار ہزار سال پہلے خاموش تھا، آج بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ابدی خاموشی...... جس میں زندگی، نروان اور کائنات کے ہزار ہا راز پوشیدہ تھے۔ بدھا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ آگے کو نہ گرے، عمران نے اس کے آگے دو کشن رکھ دیئے تھے۔

''ایک تو تمہاری چمڑی میں ڈر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گاڑی اس گھر سے اتنا قریب کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''آئندہ جب بھی مولانا ابرار صدیقی صاحب کے اپارٹمنٹ میں آگ لگانے کا پروگرام بنے گا، میں گاڑی ساتھ والی گلی میں کھڑی کیا کروں گا۔ اب خوش؟''

میں منہ بنا کر رہ گیا۔

ہمارے گوجرانوالہ تک پہنچتے پہنچتے اُجالا ہو گیا۔ یہ ایک ابر آلود صبح تھی۔ ہم نے کامونکی قصبے کے پاس ایک چھپر ہوٹل پر رُک کر ایک کڑک چائے پی اور بسکٹ وغیرہ کھائے، یہاں رُکنے کا ہمیں ایک اور فائدہ ہو گیا۔ فردوس پلازہ میں ہونے والی آتشزدگی کی مختصر خبر بھی ایک نیوز چینل پر مل گئی۔ اسکرین پر چلنے والی ایک پٹی کچھ یوں تھی۔

''جہلم شہر کے ایک پلازہ میں آتشزدگی...... ایک فلیٹ جل گیا۔ دوسرے کو جزوی نقصان پہنچا۔ فائر بریگیڈ نے وقت پر پہنچ کر آگ پر قابو پا لیا۔ کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔''

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یار! یہ ہمارے فائر بریگیڈ والوں کی کارکردگی کچھ اچھی نہیں ہوتی جا رہی؟''

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ قریب بیٹھے ایک پٹھان ٹرک ڈرائیور نے کہا۔ ''خود ام نے تو یہ دیکھا ہے کہ فائر بریگیڈ کی اپنی گاڑی کو بھی آگ لگ جائے تو گاڑی والے آگ بجھانے میں پانچ دس منٹ کا دیری ضرور کرتا ہے۔ خو، یہ پلازے کا مالک کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوگا۔''

سب ہنسنے لگے۔ عمران نے بھی اس ہنسی میں شرکت کی۔

ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ سیکیورٹی کے دو مرحلوں سے گزر کر لال کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ہم ابھی تک اسی دیہاتی لباس میں تھے۔ کوٹھی میں میڈم صفورا بہت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اسے اپنی آمد اور کامیابی کی اطلاع دے دی تھی۔

جب ہماری گاڑی پورچ میں رُکی تو میڈم صفورا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کی بیتاب نگاہ سب سے پہلے گاڑی کی پچھلی نشست کی طرف گئی جہاں کمبل نما کپڑے کے نیچے بدھا موجود تھا۔ اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ بدھا پر جھپٹے گی اور بیتاب ہو کر اسے اپنی گود میں اُٹھالے گی لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا اور اپنا رکھ رکھاؤ برقرار

رکھنے میں کامیاب رہی۔

اس نے دبے دبے جوشیلے انداز میں ہماری خیر خیریت دریافت کی۔ پھر اس کے اشارے پر دو ملازمین نے کمال احتیاط کے ساتھ بدھا کا دو فٹ اونچا مجسمہ کار میں سے نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف بڑھے۔ ہم بھی ساتھ ہی تھے۔ مجسمے کو لال کوٹھی کے ایک خاص کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں دو بڑی بڑی میزیں تھیں، ان پر کچھ بصری آلات پڑے تھے۔ ایک ایکسرے مشین جیسی چیز تھی۔ دو تین جدید اسٹل کیمرے تھے۔ فرش پر آسٹروٹرف جیسی شے بچھی تھی۔ بدھا کے مجسمے کو بے حد احتیاط کے ساتھ ایک میز پر رکھ دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ملازمین باہر چلے گئے۔ اب وہاں ہمارے اور میڈم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ''ویل ڈن عمران!'' میڈم نے ایک بار پھر دبے دبے جوش سے کہا۔ ''تم نے خوش کر دیا۔''

''تھینک یو میڈیم! اور دیکھ لیں، وعدے کے مطابق کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہوا ہوگا تو تھوڑا بہت مالی نقصان ہوا ہوگا۔''

''ہاں...... میں نے ابھی نیوز دیکھی ہے۔ ایک دوست سے بھی بات ہوئی ہے۔ فلیٹ کے دو کمرے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ صدیقی کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا تھا مگر طبی امداد کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے۔ گرنے سے اس کے چہرے پر تھوڑی بہت چوٹ آئی ہے۔''

''صدیقی وغیرہ کا عام تاثر کیا ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''ابھی یہ تو معلوم نہیں ہو سکا مگر سنا ہے کہ وہ مقامی تھانے میں نامعلوم افراد کے خلاف ڈکیتی یا چوری وغیرہ کا پرچہ درج کرانے کا سوچ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صدیقی کا دھیان اسی پارٹی کی طرف جا رہا ہے جن کی وجہ سے اسے اس مجسمے کو لاہور سے جہلم لے جانا پڑا تھا۔ یہ غنڈا ٹائپ لوگ ہیں۔ لاہور میں بھی یہ صدیقی کے گھر کے گرد منڈلاتے رہے ہیں۔'' میڈم کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک تھی۔

بات کرتے ہوئے بھی میڈم کی نظریں مسلسل بدھا کا طواف کر رہی تھیں۔ تب اس کے ہاتھ پُرشوق انداز میں پولیتھین کے کور کی طرف بڑھے۔ کور کو بڑے سلیقے سے پن وغیرہ لگائی گئی تھیں۔ میڈم نے ان پنوں کو خود اُتارا۔ نیچے سیلوفین کی کورنگ تھی۔ کورنگ کو قینچی سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ نیچے بدھا تھا۔ میں فائن آرٹ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ فنِ سنگ تراشی و مجسمہ سازی سے بھی کوئی خصوصی لگاؤ نہیں ہے مگر پتا نہیں کیا بات تھی، بدھا کے اس زبردست مجسمے نے مجھے بھی غیر معمولی طاقت سے اپنی طرف کشش کیا۔ وہ فاقہ زدہ بدھا

کی تصویر کشی کرتا ہوا، آرٹ کا ایک نہایت اعلیٰ و نفیس نمونہ تھا۔ جسم کا ہر نشیب و فراز، ہر رگ پٹھا اور ہڈی۔ ایک ایک تفصیل اپنی جگہ باکمال تھی۔ بے شک وہ ماہر ترین ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی اضافی خوبی یہ تھی کہ اس میں کہیں ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ یہ ایک دھاتی مجسمہ تھا۔

''ونڈرفل...... واٹ اے بیوٹی۔'' میڈم نے مسحور کن انداز میں اسے چھوا۔ اس کی آنکھوں میں پُراشتیاق چمک تھی۔

پھر اس نے ٹیبل کے گرد موجود چند روشنیاں آن کیں اور جدید کیمرے سے مجسمے کی کئی تصویریں کھٹا کھٹ اُتار لیں۔ وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

تب وہ شاہانہ انداز سے ایک لگژری صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک ایک بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال پیشانی پر بھی جھول رہے تھے اور خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً ایک بھرپور عورت تھی۔ اپنی جسمانی کشش اور پُروقار انداز کے سبب وہ نادیہ سے بڑی ہونے کے باوجود کسی بھی مرد کو بآسانی اپنی طرف کشش کر سکتی تھی۔ نادیہ ایک شور مچاتی پھلجھڑی کی طرح تھی۔ آنکھوں میں چبھنے والے عجیب و غریب رنگ چھوڑتی ہوئی لیکن میڈم صفورا ٹرمینل پر جلتی ہوئی ایک خاموش شمع کی طرح تھی۔ بہت دیر تک روشن رہنے والی گہری اور پُرسکون اس کے بے حرکت شعلے میں بھید پوشیدہ تھے۔

فرطِ جذبات سے میڈم صفورا کا چمکیلا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ کسی شہزادی کے سے انداز میں بولی۔ ''اس خوشی کے موقعے پر مانگو عمران! کیا مانگتے ہو؟''

میڈم صفورا کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ عمران سے کسی ایسی خواہش کی توقع کر رہی ہے جس سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہو مگر عمران نے جو کہا، وہ شاید میڈم صفورا کے گمان میں نہیں تھا۔ وہ انکساری سے بولا۔ ''آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کس چیز کی کمی ہے میڈم! لیکن آپ کی پیشکش سے فائدہ نہ اُٹھانا بھی بے ادبی ہوگی۔ میں آپ سے سلیم کے بارے میں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ بے شک اس کی غلطی بڑی ہے لیکن آپ اس کی جان بخشی کر دیجیے۔''

میڈم صفورا نے حیران کن نظروں سے عمران کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں بہت خیال ہے اپنے دوست کا؟''

''مجھے اپنے ہر دوست کا بہت خیال رہتا ہے میڈم!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''اچھی عادت ہے۔'' میڈم نے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ بے خیالی میں عمران کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر مسکرائی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے مین! سلیم

کو معاف کر دیا جائے گا......اور کچھ؟''

''بہت بہت شکریہ میڈم۔''

''اب ایک خواہش ہماری بھی ہے۔'' میڈم نے کہا۔

''جی فرمائیں۔''

''ٹھیک ہے، جمناسٹک اور سرکس وغیرہ تمہارا شوق ہے۔ تم اس شوق کو پورا کرو لیکن تمہارا باقی کا وقت ہمارا ہونا چاہیے۔ آج میں بہت خوش ہوئی ہوں تمہاری پرفارمنس سے۔''

''او کے......آپ کے بارے میں تفصیل سوچ لیں پھر جیسا آپ کہیں گی، ویسا کر لیں گے۔''

''سوچنا کیا ہے؟ شام کو سرکس میں تین گھنٹے تمہارے باقی سب ہمارے......اور یہ ڈیل تمہاری ہی شرائط پر۔''

''ہمارا کنکشن اوپن تو نہیں ہو سکتا۔''

''ظاہر ہے کہ فی الحال نہیں ہو سکتا۔ براہِ راست ہمارا تعلق نظر نہیں آئے گا لیکن ہم ہر وقت رابطے میں رہیں گے۔ جس طرح کی سہولتیں تمہیں درکار ہیں، مجھے بتا دو۔ یہاں کسی قریبی آبادی میں اچھی رہائش گاہ، ایک دو گاڑیاں، ملازم وغیرہ جو کچھ چاہو مہیا ہو سکتا ہے۔ ویسے تو میں مارا ماری اور لڑائی جھگڑے کی قائل نہیں ہوں مگر اپنا دفاع بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ چھوٹے اسلحے کے دو تین لائسنس میں تمہیں دو چار دن میں دلا سکتی ہوں۔''

اسی دوران میں میڈم صفورا کا موبائل جاگ اُٹھا۔ دوسری طرف کوئی ایسا شخص تھا جو عمر میں میڈم سے بڑا تھا اور وہ کسی حد تک اس کی عزت کرتی تھی۔ شاید وہ کوئی آر کیا لوجسٹ تھا۔ میڈم اس سے بات کرتے کرتے اس خاص کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو کافی جلدی میں تھی۔ اس نے ہم سے کہا کہ اب ہم جا کر آرام کر سکتے ہیں، وہ شام کی چائے پر پھر ہم سے ملاقات کرے گی۔

○......❖......○

ہم اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ خاصی تھکاوٹ ہو رہی تھی لیکن جن حالات سے گزر کر ہم واپس لاہور پہنچے تھے، وہ مسلسل ذہن میں اودھم مچا رہے تھے۔ ہم نے ایک پُر ہنگام رات گزاری تھی۔ اپارٹمنٹ میں آگ کا بھڑکنا اور پھر صدیقی کا افراتفری میں ''فاسٹنگ بدھا'' کو چھت کے خفیہ خانے سے نکالنا، اس کے بعد اس کا قالین پر بے دم ہو کر گر جانا۔ یہ مناظر ترتیب وار ذہن کے پردے پر حرکت کر رہے تھے۔

ہم نے اقبال کو کارگزاری سنائی۔ بہت مدھم لہجے میں بات کر رہے تھے ہم۔ بلکہ اس گفتگو کو سرگوشیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ شک بجا طور پر ہمارے ذہنوں میں موجود تھا کہ اس مہمان خانے میں ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''بے شک سلیم کی رہائی بھی اہم ہے لیکن میڈم بڑی فراخ دلی سے آفر کر رہی تھی۔ شاید وہ تمہیں کوئی اس سے بھی بڑا انعام دینا چاہتی تھی۔''

''یہ لوگ ہمیں کیا دے سکتے ہیں جگر! یہ تو خود بھیک منگے ہیں۔ لالچ کا کشکول لے کر دربدر پھر رہے ہیں۔'' عمران نے سرگوشی کی۔ ''میں نے وہی مانگا جو میرے دل نے کہا۔ بس یہی کافی ہے اور ویسے بھی آج میں اتنا خوش ہوں کہ خود ہزاروں لاکھوں لٹا سکتا ہوں۔ مجھے کسی سے کچھ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کس بات کی خوشی ہے؟''

''بتاؤں؟''

''تو کیا اس کے لیے ہمیں کوئی پرمٹ وغیرہ دکھانا پڑے گا؟'' اقبال نے کہا۔

''اس کا تعلق تم سے نہیں، لہٰذا تم اپنی چونچ بند رکھو۔'' عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو آؤ باہر۔''

اقبال کو جز بز چھوڑ کر ہم باہر لان میں آ گئے اور گیندے کے پھولوں سے گھری ہوئی ایک روش پر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ ایک دم ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''تمہاری ثروت بی بی کا پتا چل گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے حاجی صاحب کا فون آیا ہے۔ میں نے انہیں اپنا نیا نمبر دیا ہوا تھا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔

''وہی جو تم سن رہے ہو اور لال گلابی ہو رہے ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''تمہاری ثروت بی بی اب کوئی لاپتا شے نہیں ہے تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم اس کے شہر اور اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے سکتے ہیں۔''

میرے سینے میں جیسے ایک دم ہزاروں گلاب کھل اُٹھے۔ دل کے اُفق سے اُمید کی سنہری کرنیں پھوٹیں اور ان پھولوں کو منور کر گئیں لیکن ابھی ذہن سے شکوک کے بادل پوری طرح چھٹے نہیں تھے۔ میں نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے؟''

وہ فلمی انداز میں بولا۔ ''اگر تمہاری محبت مذاق ہے تو میں مذاق کر رہا ہوں۔ اگر رات کو سرہانے پر گرنے والے تمہارے آنسو مذاق ہیں تو میں مذاق کر رہا ہوں اور اگر تمہارا یہ سوکھے پتے جیسا چہرہ مذاق ہے تو ہاں...... میں مذاق کر رہا ہوں۔''

''کہاں رہتے ہیں وہ لوگ؟'' میں نے بیتابی سے پوچھا۔

''یہاں...... میرے دماغ میں۔'' اس نے انگلی سے اپنے سر کی طرف اشارہ کی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یار! تم نے فلم ''سونے کی تلاش'' نہیں دیکھی۔ اس میں گریگوری پیک نے یہی ڈائیلاگ بولا تھا تو اس کی جان بچی تھی۔ اس نے بدمعاشوں کو بتایا تھا کہ سونے تک پہنچنے کا نقشہ یہاں اس کے دماغ میں ہے۔ اسی طرح تمہاری ثروت بی بی تک پہنچنے کا نقشہ بھی یہاں میرے دماغ میں ہے۔ گریگوری پیک نے اپنی جان بچائی تھی اور میں اپنا اور تمہارا یارانہ بچانا چاہتا ہوں۔ تمہیں سب کچھ بتا دیا تو تم مجھے لات مار کر اکیلے ہی نکل جاؤ گے جرمنی اور چھاپ لو گے ثروت بی بی کو۔ تمہارا فائیو اسٹار ولیمہ کھانے کی حسرت مجھ بدنصیب کے دل میں ہی رہ جائے گی۔''

''یار عمران! بے پر کی نہ اُڑاؤ۔ مجھے بتاؤ کیا واقعی ہم اب ثروت اور ناصر بھائی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''ایک سو ایک فیصد۔'' وہ جادوئی انداز میں مسکرایا۔ ''بس یہاں جو تھوڑا سا کام رہ گیا

ہے، وہ کر لیں پھر نکل چلیں گے۔ ان لال کوٹھیوں کو ''بائی بائی'' اور بہن بہن کر کے۔''

''تھوڑا سا کام کیا؟''

''یار! بڑے بے مروت ہو۔ جو بندہ ہماری دوستی اور محبت کی وجہ سے یہاں پھنسا ہوا ہے، اسے نکالنا نہیں ہے یہاں سے؟''

''ہاں...... وہ تو ضروری ہے۔''

''تو بس...... اس کے بعد یہ دونوں میڈم جانیں اور پولیس جانے اور میرا تایا جانے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی ہم تینوں نے کوئی ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ان دونوں بہنوں کو جیل وغیرہ پہنچانے کا۔ ہمارے پاس جو ثبوت شبوت ہیں، وہ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ مزید چھان بین کرنا ان لوگوں کا کام ہوگا۔ اگر یہ دونوں میڈم میں اور صدیقی وغیرہ واقعی غیر قانونی کاموں میں ملوث ہیں تو پھر بچ نہیں سکیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے پولیس بڑی دیانتداری سے ان لوگوں کو پکڑ کر جیلوں میں ڈال دے گی؟''

''نہیں...... نہیں صرف پولیس یہ کام نہیں کر سکتی، ساتھ میں تایا جی بھی تو ہوں گے۔ تایا جی کا مطلب ہے میڈیا۔ تمہیں پتا ہے نا کہ تایا جی ایک نیوز چینل بھی چلاتے ہیں اور آج کل خبروں کی تلاش میں ان کی بُری حالت ہو رہی ہے۔''

عجب درویشانہ سوچ تھی اس کی۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے پیسے وغیرہ کا ذرہ بھر لالچ نہیں ہے۔ میڈم صفورا جس طرح اس کی مداح ہو رہی تھی، وہ اس سے کوئی بڑے سے بڑا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ بلکہ صرف ''فاسٹنگ بدھا'' کو صدیقی کے قبضے سے نکال کر یہاں لانے کے عوض بھی وہ کافی موٹی رقم لے سکتا تھا۔ میڈم جب صدیقی سے فاسٹنگ بدھا کا سودا کر رہی تھی تو یقیناً خطیر رقم اسے آفر کر رہی ہوگی۔ یہ خطیر رقم اب عمران کی جیب میں بھی آ سکتی تھی مگر اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ شاید اس نے یہ سب کچھ خوبرو کنول اور نیاض کی جان کا صدقہ سمجھ کر کر دیا تھا۔

رات گئے تک سلیم کی رہائی کے سلسلے میں کشمکش چلتی رہی۔ قرائن سے لگتا تھا کہ چھوٹی میڈم اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سلیم اس کا ملازم ہے اور اس کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں جو فیصلہ کرے گی وہ خود کرے گی۔ دوسری

طرف میڈم صفورا کو اپنے وعدے کا پاس تھا اور وہ چھوٹی بہن کو قائل کر رہی تھی۔ شاید وہ اسے بتا رہی تھی کہ بڑے فائدے حاصل کرنے کے لیے چھوٹے موٹے کمپرومائز کرنے پڑتے ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق سلیم کی حالت خاصی پتلی تھی۔ وہ لال کوٹھی کے تہ خانے میں تھا۔ اسے بُری طرح ٹارچر کیا گیا تھا۔ تفصیل کے مطابق چھوٹی میڈم نادیہ نے اسے عریاں کر کے بدست خود ربڑ کے ایک ایسے پائپ کے ذریعے پیٹا تھا جس کے گرد لوہے کا باریک تار لپٹا ہوا تھا۔ اس مار نے سلیم کا گوشت کئی جگہ سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ گرنے سے اس کی کنپٹی پر بھی چوٹ لگی تھی جس کے سبب اسے اپنا جسمانی توازن قائم رکھنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ بس ہمیں اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ یہ معاملہ کسی حد تک طے ہو گیا۔ میڈم صفورا نے انٹرکام پر عمران کو اطلاع دی کہ صبح سلیم ان کے پاس آ جائے گا۔

عمران کی خواہش تھی کہ سلیم ناشتے پر ہمارے ساتھ ہو لیکن نو دس بجے تک وہ انیکسی میں نہیں آیا۔ عمران نے میڈم صفورا کے فون پر رابطہ کر کے اس سے پوچھا۔ صفورا نے جواب دیا۔ ''میں تو اس وقت ایک پراپرٹی کے لیے رائے ونڈ روڈ پر آئی ہوئی ہوں۔ بہرحال سلیم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔''

ہم نے ناشتہ سلیم کے بغیر ہی کیا تاہم اس کے فوراً بعد وہ پہنچ گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ وہ پہلے ہی لنگڑا کر چلتا تھا، اب کچھ اور بھی ڈگمگا رہا تھا۔ دو گارڈز نے اسے دونوں طرف سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہم تینوں نے اسے بڑی آہستگی کے ساتھ گلے لگایا۔ گرم جوشی سے گلے لگاتے تو وہ یقیناً تکلیف سے کراہنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

''میں جانتا ہوں کہ مجھے آپ کی کوششوں کی وجہ سے چھوڑا گیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔'' وہ بولا۔

''یوں جوتے مارتے ہو یار!'' عمران بولا۔ ''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، ہماری وجہ سے ہوا۔ ہم تمہاری طرح آنکھوں میں آنسو لے کر ایک ہزار بار بھی تمہارا شکریہ ادا کریں تو یہ کم ہے۔ خیر...... ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب سب اچھا ہو گا۔''

ابھی عمران کی بات منہ میں تھی کہ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ پھر چھوٹی میڈم نادیہ کسی بگولے کی طرح انیکسی میں داخل ہوئی۔ پانچ گارڈز اس کے ہمراہ تھے۔ وہ نشے میں

دھت نظر آ رہی تھی۔

آتے ساتھ ہی اس نے چلاّ کر پوچھا۔ ''یہ کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟''

جو دو گارڈز سلیم کو لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک بولا۔ ''بڑی میڈم نے فون پر بولا تھا جی۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' وہ گرجی۔ ''بڑی میڈم نے بولنا ہوتا تو مجھ سے بولتی۔''

''بڑی میڈم کہتی تھیں جی کہ بات ہو گئی ہے۔ اس لیے......''

''کوئی بات نہیں ہوئی ابھی۔'' وہ پھر دھاڑی۔ ''کیا سمجھتے ہو تم لوگ...... اس باسٹرڈ کو میں ایسے ہی چھوڑ دوں گی؟ اس نے غداری کی ہے۔ ہماری پیٹھ میں چھرا مارا ہے۔'' پھر وہ پلٹ کر اپنے گارڈز سے بولی۔ ''لے چلو اس کتے کو۔''

''ٹھہرو۔'' عمران مشتعل گارڈز اور سلیم کے درمیان آ گیا۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ تمہیں بھی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ تم۔'' نادیہ چلائی اور اس نے شرابی انداز میں عمران کو پیچھے دھکیلا۔

نادیہ کے گارڈز نے سلیم کو کھینچا۔ عمران نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑ لیا۔ وہ بیچارہ عمران اور گارڈز کے درمیان بے بسی کی تصویر نظر آنے لگا۔ گارڈز نے اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ ان میں انچارج گارڈ شیرا بھی شامل تھا۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

عمران نے جیب سے موبائل نکالا اور بولا۔ ''اس طرح زور آزمائی کرو گے تو سب کا نقصان ہو گا۔ میں میڈم صفورا کو کال ملاتا ہوں۔''

''میڈم سے کال ملا کر بتا دینا اسے سب کچھ۔'' نادیہ زہریلے انداز میں پھنکاری۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ سلیم کو بیدردی سے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس موقعے پر میں نے دیکھا کہ اقبال کا بھی پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا مگر عمران نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ غالباً وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے میڈم صفورا سے بات کرنا چاہتا تھا اور یہ عین دانشمندی تھی۔

گارڈز سلیم کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔ سلیم کا چہرہ زرد تھا اور وہ بیچارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے پکار کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں سلیم! یہ ابھی چھوڑ دیں گے تمہیں۔'' وہ میڈم صفورا کو کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا اور ہم دونوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم سلیم کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ عمران کال ملا

رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سرخی اسے ایک بالکل مختلف روپ دے رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد میڈم صفورا سے کال مل گئی۔ ''ہیلو میڈم! آپ اب کہاں ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔ دوسری طرف سے میڈم نے جواب میں کچھ کہا۔ عمران گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میڈم! یہاں بہت زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ کی اجازت سے گارڈز، سلیم کو تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس لائے تھے۔ میڈم نادیہ اس کے پیچھے ہی پیچھے یہاں آ گئی ہیں۔ ان کے ساتھ چھ سات گارڈز بھی تھے۔ وہ سلیم کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ انہوں نے بدزبانی بھی کی ہے۔''

جواب میں کچھ کہا گیا جو عمران نے خاموشی سے سنا پھر بولا ''ٹھیک ہے میڈم! لیکن ایک بات آپ بھی ذہن میں رکھیے گا۔ میں نے آپ سے سلیم کے سوا اور کچھ نہیں مانگا تھا اور اس کی جو حالت ہو چکی ہے، وہ بھی میں نے دیکھ لی ہے۔ اس سے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔ لگتا ہے کہ میڈم نادیہ اپنے دل کی ساری بھڑاس اس پر نکال چکی ہیں۔ اب وہ اسے معاف کر دیں تو یہی بہتر ہے۔''

عمران کی آنکھیں سرخ تھیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت کوشش کر کے اپنے لہجے کو نارمل رکھے ہوئے ہے۔

اس نے فون بند کیا تو اقبال نے بے قراری سے پوچھا۔ ''کیا کہا میڈم نے؟''

''کہتی ہیں، میں دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں پھر بات کرتی ہوں نادیہ سے۔''

میڈم صفورا کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیدھی نادیہ والے پورشن میں پہنچی۔ دونوں بہنوں کی یہ ملاقات ہماری توقع سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ ہم بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔

قریباً دو گھنٹے بعد میڈم صفورا ہماری انیکسی کی طرف آئی۔ اس کا چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس کا ذاتی گارڈ اس کے ہمراہ تھا تاہم اس نے اسے باہر ہی چھوڑ دیا۔ وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا پھر سگریٹ سلگایا اور بولی۔ ''مسٹر عمران! ایک بات کی بالکل تسلی رکھو۔ جو پرامس میں نے تم سے کیا ہے، وہ ضرور پورا کروں گی۔ سلیم کو کچھ نہیں ہو گا اور وہ یہاں تمہارے پاس بھی پہنچے گا۔ اس میں تھوڑا سا ٹائم ضرور لگ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل تک معاملہ نمٹ جائے۔ میرے آنے سے پہلے نادو کا دماغ بہت گھوما ہوا تھا لیکن اب وہ میرے سمجھانے سے کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ اصل میں یہ بہت اُلجھی ہوئی

لڑکی ہے۔ بچپن سے ضدی ہے اور کسی وقت اس کی یہ عادت خطرناک حدوں کو چھو لیتی ہے۔''

''وہ آپ کی بہن ہے۔ آپ اس کے بارے میں زیادہ جانتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ڈھائی تین گھنٹے پہلے سلیم یہاں آیا تو آپ کی اجازت سے ہی تو آیا تھا۔'' عمران نے کہا۔

''میری بات ہوئی تھی نادو سے اور اس نے نیم رضامندی بھی ظاہر کی تھی۔ میں سمجھی کہ وہ مان گئی ہے لیکن کچھ کسر ابھی باقی تھی۔ خیر پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں ایک آدھ دن میں سنبھال لوں گی اسے۔''

''گستاخی معاف۔'' عمران نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ آپ بھی ان کے سامنے بے بسی محسوس کر رہی ہیں۔''

''نہیں...... ایسی بات نہیں۔ بس اس کی طبیعت سے ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا رویہ نفسیاتی مریضہ جیسا ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ ڈرنک کر لیتی ہے۔ ساتھ میں نشہ آور گولیاں کھا لیتی ہے۔ ایسے میں شور مچاتی ہے اور توڑ پھوڑ کرتی ہے۔ ایک دو مرتبہ زخمی حالت میں اسے ہسپتال لے جانا پڑا ہے۔''

''مگر میڈم! گستاخی معاف اس ڈر سے کہ وہ شور مچائیں گی اور توڑ پھوڑ کریں گی، ہم کسی جیتے جاگتے انسان کی زندگی تو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ہم نے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ سلیم کو کس بُری طرح مارا گیا ہے۔ ربڑ کے پائپ پر تار لپٹا ہوا تھا اور اس نے کئی جگہ سے سلیم کی چمڑی ادھیڑ دی ہے۔ اسے تو ہسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی مگر وہ اسے پھر اپنے ٹارچر سیل میں لے گئی ہیں۔''

''اس سے اب اور مار پیٹ نہیں ہو گی۔ میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ باقی میں نے ابھی خود اس کی بینڈیج وغیرہ کرائی ہے۔ وہ اس وقت سو رہا ہے۔''

میڈم نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ ''دراصل بندہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ تم لوگوں کی بھی ایسی کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہو گی۔ میری اور نادو کی عمر میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے لیکن میں نے اسے ہمیشہ بچوں کی طرح ہی سمجھا ہے۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اور لاڈلی تھی۔ والدین ایک حادثے میں ہم سے بچھڑ گئے، اس وقت نادو کی عمر بس آٹھ نو سال تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو، اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ خود

سر ہوتی چلی گئی۔ وہ میرے لیے ایک پرابلم چائلڈ بن گئی اور کسی حد تک اب بھی پرابلم چائلڈ ہی ہے۔ مگر کچھ بھی ہے، میرے اوپر بہت سی ذمے داریاں ہیں اور میں ان ذمے داریوں کو ''اون'' بھی کرتی ہوں۔ جب معاملہ کچھ ایسا ہو جائے کہ ایک طرف بہن کی محبت اور دوسری طرف ذمے داری ہو تو میرا جھکاؤ اپنی ذمے داری کی طرف ہی رہتا ہے۔ لہٰذا مائی ڈیئر! تم بےفکر رہو۔ تم نے میرے لیے ایک بڑا اہم کام بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اس کام کے بدلے تم نے جو کچھ مانگا ہے، وہ تمہیں ضرور ملے گا۔''

''آپ کی تعریف اور تسلی کا شکریہ۔'' عمران نے کہا۔

''صدیقی آج کل بہت پریشان ہے۔'' میڈم صفورا زیرلب مسکرائی۔ ''یقیناً اسے زیادہ دُکھ اس بات کا ہو گا کہ اس نے جو کچھ کیا اپنے ہاتھوں سے کیا۔ خود ہی مجسمے کو چھت کے خفیہ خانے سے نکالا اور خود ہی تمہارے حوالے کیا۔ اس نے وہاں قلعہ روہتاس کے اردگرد کافی تہلکہ مچایا ہے۔ جس بستی کا تم نے نام لیا تھا، وہاں سے پولیس نے کئی افراد کو پکڑا ہے اور پوچھ گچھ کی ہے۔ ایک دو لاکھ روپیہ پولیس والوں کو کھلایا ہے صدیقی نے۔ وہ ہر اس گاؤں پر چھاپہ مار رہا ہے جس پر صدیقی اور اس کے بندے تھوڑا سا بھی شک ظاہر کر رہے ہیں۔ کئی علاقوں میں اَنٹا بیچنے والوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔''

''آپ کی طرف تو دھیان نہیں گیا اس کا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''لگتا تو نہیں ہے اور اگر گیا بھی تو اس کے لیے ثبوت چاہیے ہو گا۔''

''وہ یہاں تو نہیں آ دھمکے گا۔'' عمران نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے اپنی بپتا سنانے کے لیے آ ہی دھمکے۔ مگر انیکسی کی طرف اس کا کوئی کام نہیں ہو گا۔ ہاں...... اگر وہ میرے پاس آیا تو میں تم لوگوں کو اطلاع کر دوں گی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے ہی رُکے گا۔ اس دوران میں تم لوگ انیکسی کے اندر ہی رہنا۔''

عمران بولا۔ ''میں تو چاہتا تھا کہ آج سلیم آ جائے تو کل ہم کسی وقت یہاں سے شفٹ ہو جائیں۔ یہاں کی نسبت کوئی بھی دوسری جگہ ہمارے لیے زیادہ محفوظ ہو گی۔''

''سوری! میں تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی۔ تمہیں یہاں لال کوٹھی میں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اس بارے میں بھی تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ ابھی چند روز تم سکون سے یہاں رہو۔ اس کے بعد دیکھ لیں گے کہ کیا سیٹ اپ بنانا ہے۔ میں تمہارے اس ساتھی اقبال کی ٹانگوں کے بارے میں بھی فکرمند ہوں۔ اس کا علاج جلدی اور اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔''

اقبال بولا۔ ''میڈم! ہمیں زیادہ پریشانی سلیم کے حوالے سے ہے۔ آپ یہ پریشانی ختم کر دیں۔ باقی پریشانیاں خود ہی ختم ہو جائیں گی۔''

''ڈونٹ وری۔'' میڈم صفورا اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

رات گیارہ بارہ بجے کا وقت تھا۔ اقبال سو چکا تھا، ہم اونگھ رہے تھے۔ اچانک عمران تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی کوشش کی۔ نادیہ والی لال کوٹھی کی طرف سے مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں لرز گیا۔ یہ سلیم کی آوازیں تھیں۔ دو تین بار زور سے چلایا پھر شاید کراہنے والے انداز میں باآواز بلند کچھ بولنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک اور مردانہ آواز اس کی آواز میں گڈمڈ ہوئی۔ کسی شے کے ٹوٹنے کی آواز اُبھری اور خاموشی چھا گئی۔

عمران بےچینی سے بیڈروم میں ٹہلنے لگا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر تفکرات کی لکیریں تھیں۔ اس نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا اور میڈم صفورا کو کال کرنے لگا۔ تیسری یا چوتھی کوشش پر رابطہ ہوا۔

دوسری طرف سے میڈم کی بھاری لیکن پُرکشش آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''میڈم! ابھی کوٹھی کی طرف سے سلیم کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس پر پھر تشدد کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ چھوٹی میڈم ہمارے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔''

''نہیں...... نہیں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ابھی فون کر کے پوچھتی ہوں بلکہ خود جاتی ہوں میں...... تم فون آن رکھنا۔ میں کال کروں گی۔''

تقریباً دس منٹ انتظار میں گزرے۔ اس دوران میں کوٹھی کی طرف سے کوئی مزید آواز بلند نہیں ہوئی۔ آخر میڈم صفورا کی کال آ گئی۔ ''ہیلو! میڈم صفورا اسپیکنگ'' اس نے اپنے مخصوص بارعب لہجے میں کہا۔

''جی میڈم۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ میں ابھی خود دیکھ کر آئی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس تیز بخار کی وجہ سے ہذیان بول رہا تھا۔ ایک چھوٹا فریج بھی نیچے گرا دیا ہے۔ اس کے اٹینڈنٹ نے دوا کھلائی ہے۔ اب سو رہا ہے۔ ڈونٹ وری۔ ہی از کوائٹ او کے۔'' میڈم نے کہا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ بخار والی بات بھی درست تھی۔ کل جب

سلیم ہمارے پاس آیا تھا تو اس کا چہرہ بخار سے تمتما رہا تھا۔ یہ بخار شاید ان زخموں کی وجہ سے تھا۔ جو تشدد کا نتیجہ تھے اور کئی دنوں سے اس کے جسم پر موجود تھے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے سوتے جاگتے ہی گزارا۔ یہ صبح تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ انیکسی کی طویل کھڑکیوں سے باہر وہ دونوں عمارتیں نظر آ رہی تھیں جنہیں لال کوٹھیاں کہا جاتا تھا۔ عمارتوں کا درمیانی سبزہ زار اور ہماری انیکسی کا چھوٹا سا باغیچہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ گاہے بہ گاہے دیوہیکل السیشن کتے کی آواز فضا میں اُبھرتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس کتے کی آواز میں ایک عجیب طرح کی ہولناک کیفیت موجود رہتی تھی۔ یہ آواز اس طرز کے دیگر کتوں سے مختلف تھی۔

یکلخت میں بُری طرح چونک گیا۔ مجھے لگا کہ نادیہ کی رہائش گاہ کی بالائی منزل سے کوئی پرچھائیں سی اُڑتی ہوئی زمین پر گری ہے۔ یہ ہرگز وہم نہیں تھا۔ پرچھائیں کے زمین سے ٹکرانے کی پُر زور آواز صبح کے سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ میرے ساتھ عمران نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔

''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے تحیر کے عالم میں نکلا۔

وہ ایک دم پلٹا اور باہر کی طرف دوڑا۔ میں اس کے عقب میں گیا۔ ہم باغیچے میں سے بھاگتے ہوئے گزرے۔ اسی دوران میں پہریداروں کی بلند آوازیں بھی سنائی دیں۔ اردگرد ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ سب سے پہلے میں اور عمران ہی موقع پر پہنچے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں اپنے سامنے دیکھتا چلا گیا۔ بالائی منزل کی کھڑکی سے پختہ فرش پر گرنے والا شخص سلیم تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سر کے بل گرا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا اور پورا جسم جان کنی کے عالم میں لرز رہا تھا۔ عمران نے جھپٹ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ''سلیم...... سلیم۔'' اس نے کربناک آواز میں پکارا۔

سلیم غالباً سننے اور جواب دینے کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔

ایک پٹھان گارڈ نے لرزاں لہجے میں کہا۔ ''اوخدایا! یہ کیا قیامت ہو گیا؟''

''گاڑی لاؤ۔'' عمران دھاڑا اور سلیم کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

ہم اسی حالت میں پورچ کی طرف بڑھے۔ ایک ڈرائیور بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف گیا اور اس کے دروازے کھولنے لگا۔ عمران نے سلیم کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نشست کا سفید غلاف خون سے سرخ ہو گیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ عمران ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ بے پناہ بے چینی جو اس کے

ہاتھ پاؤں میں دوڑ رہی تھی، یکلخت معدوم ہو گئی اور تب اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ ہمارا دوست و خیر خواہ سلیم آخری ہچکی لے چکا تھا۔ وہ اب ہم میں نہیں تھا۔

''لگتا ہے کہ ختم ہو گیا۔'' ایک گارڈ نے تاسف بھری آواز میں کہا۔

دوسرے نے تائید کی۔ میں نے عمران کا چہرہ دیکھا، وہ کسی سنگلاخ پتھر کی طرح سپاٹ اور بے حس نظر آ رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب نادیہ، سیٹھ سراج اور شیرا وغیرہ تیز قدموں سے پورچ کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ سیٹھ سراج کے ہاتھ میں کسی پلازے وغیرہ کا رول کیا ہوا نقشہ تھا۔ میڈم نادیہ نے سلیم کی خونچکاں لاش دیکھی اور کراہ کر بولی۔ ''اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟''

''خو، ام کو لگتا ہے جی! کہ یہ اوپر والا کھڑکی سے گرا ہے۔ وہ دیکھیں، کھڑکی اب بھی کھلا ہے۔'' پٹھان گارڈ نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ گرا نہیں...... اس نے چھلانگ لگائی ہے۔'' سراج نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''یہ رات کو بھی ایسی ہی باتیں کر رہا تھا۔''

''بکواس بند کرو۔'' اچانک عمران چنگھاڑا۔ وہ بے انتہا تیزی سے پلٹا اور چوڑے چکلے سراج پر جا پڑا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سیٹھ سراج کا کلف دار گریبان پکڑا پھر اسے دھکیلتا، رگیدتا اور گھسیٹتا چلا گیا۔ دونوں ایک دیوہیکل موٹر سائیکل پر گرے اور پھر پورچ کے فرش پر آ رہے۔ شیرا عقب سے آیا اور عمران سے لپٹ گیا۔ وہ شاید کسی ایسی صورتِ حال کے لیے پہلے سے چوکس تھا۔ اس نے عمران کو پیچھے سے پوری قوت کے ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ایک دم بہت سے افراد عمران پر پل پڑے۔ وہ شہد کی مکھیوں کی طرح عمران سے چمٹ گئے۔ اسی دوران میں سراج بھی عمران سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا گریبان ناف تک پھٹ چکا تھا۔ وہ بھی عمران کو مارنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں عقب سے سیٹھ سراج پر جھپٹا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس کے سر کے بال کسی جنگلی گھوڑے کے بالوں کی طرح سخت اور موٹے تھے۔ میں نے اسے اتنے زور سے کھینچا کہ وہ نہ صرف عمران سے جدا ہوا بلکہ پشت کے بل فرش پر گر بھی گیا۔

تاہم اسی دوران گارڈز نے مجھے بھی جکڑ لیا اور اوندھے منہ یخ بستہ فرش پر گرا دیا۔ نادیہ کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ گارڈ بختیار کو ہینڈ کف لانے کے لیے

کہہ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اور عمران کو اُلٹی ہتھکڑی لگائی جا چکی تھی۔ عمران کو ہتھکڑی لگانے کے لیے ان لوگوں کو بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ پانچ چھ تنومند گارڈ اس وقت تک عمران سے چمٹے رہے تھے جب تک ہینڈ کف لاک نہیں ہو گئے۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے دوران میں گارڈز اور میڈم کے پسینے چھوٹ گئے اور ان کی آنکھوں سے اُڑتا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اگر عمران اس چاردیواری میں اکیلا ہوتا تو اسے بے بس کرنا ان لوگوں کے لیے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ثابت ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ عمران کسی گارڈ سے رائفل چھین لیتا اور یہاں خون خرابا ہو جاتا۔ یقیناً یہ صرف میرا اور زخمی اقبال کا خیال تھا کہ عمران اس معاملے کو آخری حد تک نہیں لے گیا تھا۔

ہمیں رائفلوں سے دھکیل کر دوبارہ اسی تہ خانے میں لایا گیا جہاں ہم اس سے پہلے بند تھے۔ یعنی ہماری مہمانوں کی حیثیت ایک بار پھر ختم ہو چکی تھی۔ یہ میڈم صفورا کی رہائش گاہ والا وہی تہ خانہ تھا جہاں بیرکوں کی طرز پر دو تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے سامنے تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی۔ اسی جگہ میڈم صفورا نے عمران اور شیرے کی زور آزمائی بھی کرائی تھی۔

اس ساری مار دھاڑ اور دھینگا مشتی کے دوران میں عمران نے فقط ایک جملہ بولا تھا۔ جب اسے اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرایا گیا تو اس نے آتش فشاں لہجے میں کہا۔ ”تم نے سلیم کو مارا ہے۔ تمہیں اس کا حساب دینا پڑے گا۔“ اس کے بعد وہ خاموش تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس کی خاموشی اس کے بولنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ کسی بھی وقت کوئی ایسا قدم اُٹھا سکتا تھا جو سب کو حیران کر ڈالے۔

سلیم کا مُردہ چہرہ مسلسل میری نگاہوں میں بھی گھوم رہا تھا۔ کل تقریباً اسی وقت وہ ہم سے ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ چہرے پر اُمید کی روشنی لیے اس نے عمران کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ موت کے کتنا قریب پہنچ چکا ہے اور آج وہ مر چکا تھا۔ ابھی آٹھ دس گھنٹے بعد شاید اسے دفنا بھی دیا جانا تھا۔ کتنی ناپائیدار ہے زندگی اور کتنے غیر متوقع ہوتے ہیں راہِ حیات کے اندھے موڑ۔

کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اس سارے ہنگامے کے دوران میں نظر نہیں آئی تھی۔ یقیناً وہ کہیں باہر سے آ رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے ملازمین نے اسے یہاں پیش آنے والے خونی واقعے کی اطلاع دی ہو۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ دندناتی

ہوئی اس تہ خانے میں گھس آئی۔ اس کے ساتھ اس کے ایک درجن باوردی گارڈز بھی تھے۔ یہ سب لوگ مسلح اور الرٹ نظر آ رہے تھے۔ سیٹھ سراج اور شیرا بھی ساتھ تھے۔ سراج نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص چھپانے کے لیے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔

میڈم نے ہم دونوں کو بیرک نما کمرے میں دیکھا اور ہمارے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی دیکھیں۔ وہ گرج کر شیرے سے بولی۔ ”کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ ان کے ہاتھ کیوں باندھے ہیں تم نے؟ کس سے اجازت لی ہے تم نے؟“

سیٹھ سراج مؤدب انداز میں بولا۔ ”میڈم! انہوں نے بڑی تڑتھلی مچائی ہے جی۔ یہ دیکھیں جی میرا گریبان۔ اس نے میرے سارے کپڑے پھاڑ کر رکھ دتے ہیں۔“ اس نے میڈم کو دکھانے کے لیے گرم چادر آگے سے کھول دی۔

شیرا بولا۔ ”ہم مجبور ہو گئے تھے میڈم! اگر ان کو پکڑا نہ جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

سیٹھ سراج نے تائید کی۔ ”اس عمران صیب کا میٹر تو بالکل گھم گیا تھا جی! ذرا ڈھیل ملتی تو اس نے کسی گارڈ سے رائفل کھو لینی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہو جاندا، گھٹ تھا۔“

میڈم نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ کوئی صفائی پیش کرے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ جیسے ایک پُرشور طوفان گزر جانے کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔ میڈم نے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے سرزنش کا انداز جاری رکھا۔ وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے کہ ان کو صدمہ ہوا ہے اور وقتی طور پر انہوں نے ”ری ایکٹ“ بھی کیا ہوگا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انہیں دوبارہ اس طرح سے باندھ کر یہاں بیسمنٹ میں ڈال دیا جائے۔ چابی کہاں ہے؟“ اس نے آخر میں تحکم کے ساتھ پوچھا۔

شیرا آگے بڑھا اور اس نے کمرے کی چابی میڈم کی طرف بڑھا دی۔

”دوسری چابیاں بھی دو۔“ وہ پھر غصے سے بولی۔

شیرے نے ہینڈ کف کی دونوں چابیاں بھی میڈم کے سپرد کر دیں۔

وہ اندر آئی اور اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے ہینڈ کف کھولے۔

”ویری سوری عمران! ویری سوری۔“ وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ”جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے میرا دل دُکھ سے بھر گیا ہے۔“

عمران اب بھی کچھ نہیں بولا۔ میڈم نے تمام گارڈز کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے۔ سیٹھ سراج تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ ”آپ بھی سراج صاحب!“ میڈم

نے نہایت خشک لہجے میں کہا۔

سیٹھ باہر چلا گیا۔ عمران نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔ ''میڈم! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ایسا ہونے دیں گی۔ میں نے آپ کے قول پر بھروسہ کیا اور آپ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ نادیہ اور اس کے گارڈز، سلیم کو ہمارے پاس سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ ہم صرف اس لیے خاموش رہے کہ آپ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گی۔''

''مگر عمران! جو کچھ ہوا ہے بالکل حادثاتی ہے۔ یہ کسی کے گمان میں نہیں تھا کہ سلیم اس طرح اپنی جان لے لے گا۔ گارڈز نے خود دیکھا ہے کہ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے۔''

''یہ بالکل غلط ہے میڈم!'' عمران نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ ''گستاخی معاف...... سلیم کو آپ کی جنونی بہن نے کھڑکی سے دھکا دے کر مروایا ہے۔ اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

میڈم کے چہرے کا رنگ بدلا تاہم وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ''اس وقت تم شاک میں ہو عمران! ویسے بھی اتنی جلدی کسی فائنل نتیجے پر پہنچنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر تمہارے دماغ میں کسی طرح کا کوئی شک ہے تو ہم اس پر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو اس کو سزا ملے گی اور ملنی بھی چاہیے۔''

''کیا آپ اپنی لاڈلی بہن کو وہ سزا دے سکتی ہیں جس کی وہ حق دار ٹھہرے گی۔'' عمران نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

میڈم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''ہاں...... میں دے سکتی ہوں مگر پہلے یہ تو کلیئر ہو جائے کہ ذمے داری کس پر آتی ہے۔ مجھے تھوڑا سا ٹائم دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، کچھ بھی تم سے چھپاؤں گی نہیں۔''

میڈم نے تسلی تشفی کی کچھ اور باتیں کیں۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے کو وقتی طور پر ٹالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہمیں تہ خانے سے واپس انیکسی میں پہنچا دیا گیا۔ تاہم ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب انیکسی کے اردگرد گارڈز موجود ہیں اور وہ پوری طرح چوکس بھی ہیں۔ دیوہیکل السیشین کتا بھی انیکسی کے سامنے چکرا رہا تھا۔

سلیم کی موت نے اقبال کو بھی بہت دکھی کیا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی تکلیف اس دکھ میں جیسے دب کر رہ گئی تھی۔

وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے سلیم کی میت دیکھی ہے یار! وہ سر کے بل گرا ہے۔ اوپر سے خود چھلانگ لگانے والا کبھی ایسے نہیں گرتا۔ اس حرامزادی نے اسے قتل کیا ہے۔''

عمران نے اشارے سے اسے یاد دلایا کہ یہاں ان کی گفتگو سنی جاتی ہے۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''اقبال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے نیچے کی طرف آنے والی پرچھائیں دیکھی تھی۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح نیچے آیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ گرتے وقت وہ ہوش میں ہی نہ ہو۔''

''ان باتوں کا پتا تو پوسٹ مارٹم سے ہی چل سکتا ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''لیکن اس کا پوسٹ مارٹم کس نے ہونے دینا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میڈم صفورا، سلیم کے وارثوں کی طرف ہی گئی ہے۔ وہ ہمدردی جتا کر اور رقم وغیرہ دے کر ان کے منہ بند کر دے گی اور ہو سکتا ہے کہ اسے جلد سے جلد دفنانے کے لیے بھی دباؤ ڈالا جائے۔''

عمران کا اندازہ درست تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد میڈم صفورا، کالی عینک پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ سفید کپڑوں میں ایک دراز قد شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ شکل وصورت سے کوئی پولیس افسر یا ایجنسی کا آدمی لگتا تھا۔ وہ تو برآمدے کی طرف چلا گیا، میڈم سیدھی ہماری طرف آ گئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ ''اگر تم سلیم کے جنازے میں شریک ہونا چاہو تو گاڑی اور ڈرائیور باہر پورچ میں موجود ہیں۔ شام سات بجے اس کی آخری رسوم ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' عمران نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم جائیں گے۔''

''لیکن اقبال کو نہ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔ اسے چلنے میں دشواری ہو گی۔'' میڈم نے مشورہ دیا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اس معاملے کو سنبھالنے کے لیے کافی کوشش کرنا پڑی ہے۔ میں خود سلیم کے گھر گئی تھی۔ اس کی بیوی اور بھائی وغیرہ کو یہی بتایا ہے کہ چند دن پہلے کچھ لوگ سلیم کو زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ ان سے اس کا کوئی لین دین کا تنازع تھا۔ ہم اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے میں لگے رہے، آپ لوگوں کو بھی نہیں بتایا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ کل وہ لوگ اسے خود ہی بس اڈے پر چھوڑ گئے۔ انہوں نے سلیم پر تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر پر ضرب آئی۔ وہ ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ آج کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگا تھا کہ توازن کھو کر گر گیا۔''

عمران خاموش رہا۔ میڈم بھی ''گائیڈ لائن'' دے کر خاموش رہی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں ہمیں ہدایت دے رہی تھی کہ ہمیں اپنی زبانیں بند رکھنی ہیں اور سلیم کے وارثوں

سے وہی کچھ کہنا ہے جو وہ بتا رہی ہے۔

ہم مسلم ٹاؤن میں واقع سلیم کے گھر پہنچے۔ سلیم کی لمبی چوڑی رشتے داری نہیں تھی۔ لاہور میں ایک بھائی کے علاوہ بس اس کے دو چار عزیز ہی تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں عرفِ عام میں ''معمولی'' کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سلیم کی پُراسرار موت کے حوالے سے کسی طرح کا کوئی سوال اُٹھاتا۔

اندر سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سلیم سرکس میں ملازمت کرتا رہا تھا۔ لہٰذا سرکس سے تعلق رکھنے والے دو چار افراد بھی یہاں موجود تھے۔ یہ لوگ تعزیتی انداز میں عمران سے گلے ملے۔ ہم اندر گئے تو سلیم کی بیوی دھاڑیں مارتی ہوئی عمران سے لپٹ گئی۔

''ہیرو بھائی! میں برباد ہوگئی۔ میرا سب کچھ چھن گیا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟''

سلیم کا چھ سات سالہ معصوم صورت بچہ بھی آنکھوں میں آنسو لیے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''میرا ابو کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا مگر جب بھی آتا تھا تو خوش باش ہوتا تھا۔ آج وہ چپ چاپ کیوں لیٹا ہے؟''

عمران نے اس سہمے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے ساتھ لگایا۔

بیوہ نے عمران کی قمیص اپنی مٹھیوں میں لی اور اسے ہلاتے ہوئے بلکی۔ ''ہیرو بھائی! وہ آج کل آپ سے ملتے تھے، آپ کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کو کچھ تو بتایا ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کو کس کی طرف سے ڈر تھا؟ وہ بہت پریشان تھے۔ اب ان کے مالک کہہ رہے ہیں کہ ان کا کسی سے لین دین کا جھگڑا تھا۔ کیا یہ بات سچ ہے۔ یا کچھ اور ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے؟''

پھر روتے روتے اس پر بے ہوشی سی طاری ہوگئی۔ عمران نے اسے سہارا دے کر نیچے چٹائی پر بٹھا دیا۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک فریاد کناں عورت جو شاید سلیم کی بہن تھی، سلیم کا زخمی ماتھا چوم رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔ ''تیرے ساتھ کیا ہوگیا بھائی! تجھے کس کی نظر کھا گئی؟ تیری تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔''

میں نے دل میں سوچا۔ تیرا بھائی دشمنی کی وجہ سے نہیں، دوستی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔ ایک سیاہ رات کو اس نے لال کوٹھیوں میں اپنے پُرانے دوستوں کو دیکھا اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ بس اس کی یہی خطا اسے دھیرے دھیرے قبر کی تاریکی کی طرف لے گئی۔

موقع پر موجود سلیم کے رشتے دار چہ میگوئیاں کر رہے تھے مگر ڈرے ہوئے بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سلیم جن لوگوں کے لیے کام کرتا تھا، وہ بہت زور والے ہیں اور ممکن ہے کہ سلیم

ان کے لیے کوئی غیر قانونی ڈیوٹی بھی انجام دیتا ہو۔ اس معاملے کو کھنگال کر وہ اپنے لیے اور مرنے والے کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیا تھا؟ یہ وہی ناانصافی تھی جو ہمارے معاشرے میں ہر جگہ روا رکھی جا رہی ہے۔ طاقتور کمزور کو دباتا ہے، اس کے لیے جینے کے راستے بند کرتا ہے۔ وہ ظلم کرتا ہے اور مظلوم کا مضحکہ بھی اُڑاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں ''کامن مین'' کے لیے انصاف تک پہنچنے کا راستہ جوئے شیر لانے سے ہزار گنا زیادہ دشوار ہے۔ میری ثروت اور اس کے ہنستے بستے گھرانے کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ نے انصاف کے حصول کی معمولی سی کوشش کی اور انہیں موت و جلاوطنی کی کڑی سزائیں سنا دی گئیں۔

ثروت کے اہلِ خانہ کا المیہ کوئی چھوٹا المیہ نہیں تھا۔ یہ المیہ ایک بڑے گھاؤ کی صورت میرے سینے میں مستقل جگہ بنا چکا تھا۔ یہ تو عمران کا سیلانی مزاج تھا اور اس کی طوفانی رفتار تھی کہ میں اس کے ساتھ بہا چلا جا رہا تھا کہ مجھے دنوں میں ہلاک کر دیتا۔ اب بھی میں جس وقت سیٹھ سراج اور اس کے ساتھی عارف خان وغیرہ کو دیکھتا تھا، میرے اندر ایسی سخت ٹوٹ پھوٹ مچتی تھی کہ خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں نے سلیم کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ دیکھا۔ حالات کا سفر کتنا غیر متوقع ہوتا ہے۔ جس رات سلیم نے لال کوٹھی میں عمران کو پہچانا تھا اور اسے میڈم نادیہ کے خطرناک جنسی رویے سے بچا کر باہر نکال دیا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کی یہ حرکت دراصل اس کی موت کے سفر کا آغاز بننے والی ہے۔

ہم سلیم کو مسلم ٹاؤن کے ایک نیم تاریک قبرستان میں دفنا کر اور اس کی قبر کا چھڑکاؤ کر کے واپس آگئے لیکن وہ جیسے بدستور ہمارے پیچھے رہا۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا وہ ایک سوالیہ نشان کی طرح ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ ہم سے پوچھتا رہا۔ ''کیا تم میرے خون کا حساب نہیں لو گے؟ کیا تم بھی میری اذیت ناک موت کو بھول جاؤ گے؟ میرے دوستو! مجھے تمہارے ہاتھوں سے چھینا گیا اور بیدردی سے مارا گیا ہے۔ اس جنونی عورت نے بڑی سفاکی سے میری ایک ایک رگ سے جان کشید کی ہے۔ میری بدقسمتی کہ تم مجھے بچا نہیں سکے لیکن کیا اب تم میرے لیے انصاف بھی حاصل نہیں کر سکو گے؟''

تیسرے روز میڈم صفورا نے اس معاملے پر ہم دونوں سے لمبی چوڑی میٹنگ کی۔ وہ اکیلے میں عمران سے بات کرنا چاہتی تھی مگر عمران نے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا۔ بظاہر میرے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن وہ جان بوجھ کر مجھے ساتھ رکھتا تھا۔ جیسے ہر معاملے میں

میری تربیت کا خواہاں ہو۔ کم از کم میری سمجھ میں تو یہی بات آتی تھی۔

آج میڈم کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی کہ سلیم کی موت کیسے واقع ہوئی۔ وہ اس پر بھی اصرار نہیں کر رہی تھی کہ اس نے خود ہی چھلانگ لگائی ہے۔ وہ اس قضیے کو ایک طرف رکھ کر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب اس کی گہرائی میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بین السطور وہ ہمیں یہ بھی بتا رہی تھی کہ اسے نادیہ سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں ہے اور وہ اسے کسی بھی سچے یا جھوٹے الزام سے بچانے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قیمت دے سکتی ہے۔

اس نے کہا۔ ”عمران! جو کچھ بھی ہوا بہت بُرا ہوا۔ اگر ہم چاہیں تو بال کی کھال بھی اُتار سکتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ اس کے باوجود ہمیں کچھ بھی نہ ملے۔ میں نے اپنے طور پر پوری انویسٹی گیشن کی ہے۔ یہاں کسی چیز کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ سر کی چوٹ کے سبب سلیم ٹھیک طور سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی جان نہ لی ہو، وہ کھڑکی کے پاس گیا ہو۔ کسی کو پکارنا چاہتا ہو مگر توازن کھو کر گر گیا ہو۔ میں ”بریفلی“ یہ کہوں گی کہ کیوں نہ ہم ایک ایسا راستہ اختیار کریں جو سب کے لیے بہتر ہو۔ بے شک زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن مادی نقصانات کا مداوا تو کسی نہ کسی حد تک کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنی نئی اسکیم میں کنال کنال کے دو پلاٹ سلیم کی بیوہ کے نام کر دیئے ہیں۔ مارکیٹ میں ان کی قیمت اب بھی ڈیڑھ کروڑ سے کم نہیں۔ اسے 25 لاکھ روپیہ نقد دیا ہے اور ہاں...... کسی طرح کا شک ذہن میں نہ رکھنا۔ یہ سب کچھ حق حلال کی کمائی سے ہے۔ میں اور میرے مرحوم شوہر نے رئیل اسٹیٹ کے کام میں اپنا بہت سا خون پسینہ ایک کیا ہے۔“

عمران اب بھی خاموش تھا۔ اس کے بعد میڈم نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ کھولا اور بولی۔ ”دیکھو عمران! تمہارے دوست سلیم کی موت سے تم تینوں کا نقصان بھی تو ہوا ہے۔ میں ایک بار پھر کہتی ہوں کہ زندگی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے مگر Compenation تو ہوتی ہے نا اور میں یہ کرنا چاہتی ہوں۔“

اس نے چیک بک نکالی۔ اس میں سے ایک چیک سائن کیا اور یہ بلینک چیک عمران کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اُٹھی اور خاموشی سے چلی۔

عمران اور میں خالی خالی نظروں سے چیک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت مالدار عورت تھی۔ ہم اس چیک پر کوئی رقم بھی بھر لیتے، اُمید تھی کہ وہ کیش ہو جائے گی۔ ایک طرح

سے یہ چیک اس نہایت مشکل کام کا معاوضہ بھی تھا جو عمران نے میڈم صفورا کے لیے کیا تھا۔ یعنی فاسٹنگ بدھا کو صدیقی کی تحویل سے نکالنا۔

یہ چیک اگلے روز تک یونہی شیشے کی تپائی پر پڑا رہا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے اُسے اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ عمران نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی غم و غصے کی کیفیت ماند پڑنے لگی۔ اگلے روز اس نے کھانا بھی کھایا اور ہلکے پھلکے انداز میں دو چار باتیں بھی کیں لیکن کیا وہ اندر سے واقعی سنبھل رہا تھا؟ یہ سوال خاصا اہم تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے اس کی دلی کیفیت کے بارے میں جاننا اس کے نہایت قریبی ساتھیوں کے لیے بھی دشوار ہوتا تھا اور میرا تو اس کے ساتھ تعلق بھی بہت پُرانا نہیں تھا۔

میں نے اقبال سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کیا عمران نے واقعی یہ صدمہ سہہ لیا ہے؟“

”ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔“ اقبال نے بھی گول مول جواب دیا۔

میں اور اقبال باہر لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اقبال کی ٹانگوں کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر روزانہ اسے دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔

”کہیں وہ کوئی انتقامی کارروائی تو نہیں کرے گا؟“ میں نے اقبال سے پوچھا۔

”میرے خیال میں نہیں اور اس کی وجہ تم ہو۔“ اقبال نے جواب دیا۔

”میں؟“

”ہاں...... تم اس وقت ہمارے ساتھ ہو۔ عمران ہرگز نہیں چاہے گا کہ وہ اس کشیدہ معاملے کو اور زیادہ کشیدہ کر دے۔ کیونکہ ایسا ہو گا تو اس کا اثر تم پر اور تمہاری فیملی پر بھی پڑے گا۔ اس لحاظ سے میں تو سمجھتا ہوں کہ نادیہ اُلو کی پٹھی کی قسمت اچھی ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔ ورنہ ہم لنڈورے تو کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ہاں...... ایک بات کا امکان اب بھی ہے۔“ اقبال مدھم آواز میں بولا۔

”وہ کیا؟“

”وہ کسی اور طریقے سے اس کو قرار واقعی سزا دلا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔“ اقبال کا لہجہ معنی خیز تھا۔

اقبال کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے سیٹھ سراج کے ایکسیڈنٹ والی مثال میرے سامنے تھی۔ وہ ایک چھوٹے پیمانے کی کارروائی تھی مگر عمران نے اس طرح کی تھی کہ نہایت خوفزدہ و پریشان ہونے کے باوجود میں نے بھی دلچسپی محسوس کی تھی۔ کیا اب بھی وہ

ایسا ہی کچھ کرسکتا ہے؟ کیا واقعی اس کے پاس قابلِ اعتماد دوستوں کا کوئی ایسا سیٹ اپ موجود ہے جن کے ذریعے وہ بوقتِ ضرورت کسی بھی شخص کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے؟ کیا وہ یہاں بھی اس سیٹ اپ کو حرکت میں لانے کی ہمت کرے گا؟

اس آخری سوال کا جواب خاصا مشکل تھا۔ سیٹھ سراج کے خلاف ایک معمولی نوعیت کی کارروائی کی گئی تھی مگر یہاں لال کوٹھیوں میں ایک گمبھیر صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ چھوٹی میڈم نادیہ سفاکانہ طریقے سے ایک قتل کی مرتکب ہو چکی ہے۔ اب اگر نادیہ کو سزا دینے کی بات ہوتی تو پھر اس معاملے کو بہت آگے تک چلے جانا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ عمران اس موقعے پر اس طرح کا بڑا رسک لے گا۔

وہ آج صبح سے میڈم کی فراہم کردہ ٹویوٹا کار لے کر نکلا ہوا تھا۔ اس نے بتایا بھی نہیں تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ بس میرا اندازہ تھا کہ وہ ثروت اور ناصر بھائی کے ایڈریس کے سلسلے میں حاجی صاحب سے ملنے بھی جائے گا۔

شام کو میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ واپس آیا تو اس کے پاس وہ اکاؤنٹ نمبر اور ایڈریس موجود تھا جہاں حاجی صاحب نے قریباً ایک لاکھ یورو کا پے آرڈر ارسال کرنا تھا۔ یہ فرینکفرٹ جرمنی کا ایڈریس تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس بینک اکاؤنٹ سے ناصر بھائی کی قیام گاہ کا سراغ بھی لگایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ طویل عرصے بعد یہ پہلی حقیقی مسرت تھی جو مجھے حاصل ہوئی۔ حاجی صاحب کے ساتھ عمران کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا تھا کہ ثروت کی منگنی تو ہو چکی ہے مگر شادی کا پروگرام ابھی طے نہیں ہوا۔

عمران کا پاسپورٹ تو موجود تھا مگر مجھے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، تقریباً ہر چھوٹے بڑے محکمے میں عمران کی کوئی نہ کوئی واقفیت نکل ہی آتی تھی۔ وہ پاسپورٹ کے دفتر سے بھی ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس نے بتایا۔ ''کل ہم جائیں گے۔ ہمیں لائن میں لگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارے جانے تک فارم تقریباً تیار ہوگا اور پاسپورٹ فیس بھی جمع ہو چکی ہوگی۔ بس تمہارے شناختی کارڈ کی ضرورت ہے۔''

''مگر شناختی کارڈ تو گھر میں ہے۔''

''وہ بھی میں لیتا آیا ہوں یار! والدہ کی خیر خیریت بھی پوچھ آیا ہوں۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہیں بلکہ پورا گھر بیتاب ہے۔ کل پاسپورٹ آفس سے واپسی پر ان سے تمہاری ملاقات طے ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور بریانی وغیرہ کا لنچ بھی فائنل ہے۔'' اس نے شناختی کارڈ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کا ہر کام طوفانی انداز کا ہوتا تھا۔ برق رفتار اور اندھا دھند جیسے یہ دنیا ایک بہت بڑا کنواں تھی اور وہ ہر وقت اس میں موٹر سائیکل چلاتا تھا۔

اگلے روز ہم نے ارجنٹ پاسپورٹ اپلائی کیا ہے۔ خرچ کے لیے میرے پاس وافر پیسے موجود تھے یہ وہی ''دو...... چھ'' کے کھیل والی انعامی رقم تھی۔ پاسپورٹ آفس سے فارغ ہو کر ہم اس رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں عمران نے میرے اہلِ خانہ کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ یہ عمارت ڈیفنس میں واقع تھی۔ میری سانس تیز چل رہی تھی اور دھڑکنیں زیر وزبر ہونے لگی تھیں۔ آج کئی ماہ بعد آخر وہ دن آگیا تھا جب میں اپنے گھر والوں کے رُوبرو ہونے لگا تھا۔ محبت، خوشی، ندامت، دُکھ بہت سے جذبات میرے اندر گڈمڈ ہو رہے تھے۔ راستے بھر عمران نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں زیادہ ٹینس ہو جاؤں۔

ایک پُرسکون جگہ پر درختوں اور پھولوں میں گھری وہ ایک خوبصورت کوٹھی تھی۔ گیٹ پر باوردی گارڈ نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ عمران گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ پورچ میں بھی ایک سادہ پوش گارڈ موجود تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نے ذرا دھیان سے دیکھا تو یہ عمران کا وہی آصف نامی ساتھی تھا جس نے عمران کے گھر ہماری غیر موجودگی میں قادر لمبے کی حفاظت و نگرانی کی تھی۔

والدہ، فرح اور عاطف بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے میرا ملاپ ناقابلِ فراموش اور نہایت رقت آمیز تھا۔ اس ملاپ کی کیفیت میں شاید لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ فرح مجھ سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ والدہ مسلسل میری پیشانی پر بوسے دیتی جا رہی تھیں۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ جیسے پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں پھر بھی بہت سی ادھوری رہ گئیں۔ والدہ مجھے اور عمران کو ایک ساتھ دیکھ کر جیسے نہال ہو رہی تھیں۔ عمران چند ہی دنوں میں جیسے اس گھر کا ایک فرد نظر آنے لگا تھا۔ والدہ اسے بڑی روانی سے بیٹا اور فرح...... بھائی عمران کہہ کر پکار رہی تھی۔ یہ سب لوگ جیسے عمران کے سحر میں گرفتار تھے۔ مجھے ایک طرح کا حسد محسوس ہوا لیکن سچی بات ہے کہ اس حسد کے اندر خوشی بھی پوشیدہ تھی۔ عاطف، عمران کی چوٹوں کے بارے میں بار بار پوچھ رہا تھا۔ عاطف کے سوال کے جواب میں عمران نے کہا۔ ''یار! میرا تو کام ہی چوٹوں کا ہے۔ تمہیں کہا تو ہے کہ کسی دن سرکس آؤ اور تماشہ دیکھو۔ تمہیں پتا چلے گا کہ وہاں ہمارے لیے کیسی کیسی کلاسیکل چوٹوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کوئی بھی فنکار اس سہولت سے محروم نہیں ہے۔ کوئی موت کے کنویں میں اوندھے منہ گر

کر مزے لے سکتا ہے، کسی کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے آنے کی آس ہوتی ہے۔ کسی کو بپھرے ہوئے شیر سے جپھی ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔''

''مگر بھائی! آپ کو اتنی سخت جپھی کس نے ڈالی ہے؟'' فرح نے عمران کے چہرے کی خراشوں اور نیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ساری باتیں تمہیں یہیں بتا دوں گا تو پھر تم شو دیکھنے کیسے آؤ گی؟'' عمران نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بزرگانہ انداز میں کہا۔

والدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھامے۔ ''امی! کیوں گناہگار کر رہی ہیں۔''

''میں ہوں نا گناہگار مجھے پتا ہے کہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاید انہی غلطیوں کی سزا مجھے اور ہم سب کو ملی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تُو ثروت کو بھول سکتا ہے۔ وہ بھی اپنی علیحدہ زندگی شروع کر سکتی ہے۔ یہ میری غلطی تھی۔ کاش میں نے اس وقت تمہاری بات سمجھ لی ہوتی۔ پر اب بھی کوشش ہو سکتی ہے۔ عمران بیٹے نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ناصر جرمنی میں ہے۔ اس کا ایڈریس بھی پتا چل گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں ثروت کی بات وغیرہ تو طے ہو گئی ہے لیکن شادی کے بارے میں ابھی کوئی تاریخ طے نہیں ہو سکی۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تین چار مہینے اور لگ جائیں۔ تم مجھے کسی طرح ایک بار صرف ایک بار ناصر اور ثروت سے ملا دو۔ تیری خوشی کے لیے میں ان کے سامنے اپنی جھولی پھیلا دوں گی۔'' وہ بول رہی تھیں اور روتی چلی جا رہی تھیں۔

میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ ''امی! آپ بس دعا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مگر اب اس کام میں زیادہ دیر نہ کرو۔ میں نے عمران سے بھی یہی کہا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا بنتے ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ بس کسی طرح ایک بار فون پر ہی ناصر سے میری بات کروا دو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔''

میں نے والدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ بھائی بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیں۔ مجھے یوں لگا کہ دل کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ عمران مختصر طور پر میرے اہلِ خانہ کو بتا چکا تھا کہ سیٹھ سراج کے ساتھ میری کس طرح کی ٹینشن شروع ہوئی تھی اور اس ٹینشن کی وجہ سے میرا کچھ عرصہ گھر سے دور رہنا کیوں ضروری ہے۔ اہلِ خانہ عمران کی ہر وضاحت سے مطمئن نظر آتے تھے۔ وہ واقعی ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔

رخصت ہونے سے پہلے میری بہن فرح نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور نم ناک آنکھوں سے بولی۔ ''بھائی! پچھلے ماہ باجی ثروت کا ایک خط آیا تھا۔ اس لفافے پر بھیجنے والے کا ادھورا سا ایڈریس لکھا ہوا تھا اور یقیناً وہ بھی فرضی تھا۔ باجی نے اپنی مجبوریاں لکھی تھیں اور وہ حالات لکھے تھے جن کی وجہ سے انہیں اچانک جانا پڑا۔ اس لفافے میں ایک خط آپ کے نام بھی تھا۔'' فرح نے مٹھی میں دبا ہوا ایک تہ شدہ کاغذ مجھے تھما دیا۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اُٹھا۔ میں نے کھول کر دیکھا، یہ ثروت کی جانی پہچانی تحریر تھی۔ بے ساختہ میری نگاہیں الفاظ پر پھسلنے لگیں۔ ثروت نے لکھا تھا۔

''السلام علیکم...... تابی! میں جانتی ہوں کہ تمہیں بہت بڑا دُکھ دے کر گئی ہوں۔ بغیر تمہیں بتائے، بغیر الوداع کہے ہمیشہ کے لیے تمہیں چھوڑ گئی ہوں۔ اس دُکھ کے لیے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو اس محبت کے صلے میں مجھے معاف کر دینا۔ میرے بس میں کچھ نہیں تھا تابش! میں وہی کر سکتی تھی جو میں نے کیا اور ناصر بھائی بھی وہی کر سکتے تھے جو انہوں نے کیا۔ میری بدنامی کے اشتہاروں نے ہم سب کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔

یہاں بھائی نے میرے لیے لڑکا ڈھونڈ لیا ہے۔ اس کا نام یوسف ہے۔ راولپنڈی کا رہنے والا ہے۔ ہماری انگیج منٹ ہو گئی ہے۔ وہ بہت سادہ مزاج اور دل کا صاف ہے میں ڈرتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ جھوٹ کی زندگی نہ گزارنا پڑے۔ لیکن میں جن حالات سے گزری ہوں وہ اتنے سنگین ہیں کہ میں ان کے بارے میں یوسف کو بتا بھی نہیں سکتی۔ بہر حال کوئی اچھا وقت آیا تو ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت بتا بھی دوں۔ فی الوقت خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے نئے راستے پر چلنے کا حوصلہ اور ہمت بخشے۔

میں جانتی ہوں تابی! ابھی تمہارے زخم ہرے ہیں۔ بہت تکلیف ہو رہی ہو گی لیکن وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ جلد ہی دُکھ کی یہ شدت برقرار نہیں رہے گی اور پھر دیکھنا زندگی خود ہی جینے کا راستہ ڈھونڈ لے گی۔ مجھے پورا یقین ہے، تمہاری زندگی میں کوئی بہت...... بہت اچھی لڑکی آئے گی۔ وہ مجھ سے کہیں بڑھ کر تمہارا خیال رکھے گی۔ تمہارے سارے دُکھ اپنی پلکوں سے چن لے گی۔ میں نے تمہارے لیے اللہ سے رو رو کر مانگا ہے اور سب کہتے ہیں کہ وہ ٹوٹے

ہوئے دلوں کی دعا سنتا ہے۔

جو کچھ ہوا ہے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تابش! میری واپسی کی آس نہ رکھنا اور نہ مجھ بدقسمت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کو بس اپنی نیک تمناؤں میں یاد رکھیں گے۔ خدا حافظ۔''

O......❖......O

ہم لال کوٹھیوں میں تین دن مزید رہے۔ اس دوران میں عمران کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سلیم کی موت کا دُکھ وہ پی گیا ہے۔ میڈم صفورا نے نادیہ سے بھی ہم تینوں کی ملاقات کرا دی تھی۔ اس ملاقات میں نادیہ نے یہ تو ہرگز تسلیم نہیں کیا کہ وہ سلیم کے قتل کی ذمے دار ہے تاہم اس نے اس بات پر معذرت ضرور کی تھی کہ اس کی وجہ سے سلیم ناگہانی موت کا شکار ہوا۔ ایک موقع پر اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ عمران اسے سلیم کی موت کا ذمے دار سمجھتا ہے تو اس کے خلاف کیس درج کرا دے۔ وہ پولیس تفتیش میں پورا پورا تعاون کرے گی اور اس سلسلے میں ذرا سا رنج بھی دل میں نہیں رکھے گی۔

ظاہر تھا کہ یہ سب منہ زبانی باتیں تھیں اور یہ باتیں بھی وہ یقیناً میڈم صفورا کی ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔ آخر میں وہ بولی۔ ''جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے، میں اس کو بالکل تسلیم کرتی ہوں اور اس کے لیے آپ لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگتی ہوں۔ میرے کہنے پر سلیم کو مارا پیٹا گیا تھا اور یہ خاصی سخت مار پیٹ تھی۔ دراصل میرا رویہ سلیم کے ساتھ کوئی خاص نہیں تھا۔ میں اپنے ملازموں کو ویسے تو خوش رکھتی ہوں مگر ان کی دھوکا دہی سے مجھے ہمیشہ بہت چڑ رہی ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر یہ نہیں۔ بس جو کچھ ہوا اسی وجہ سے ہوا۔''

اس ملاقات میں عمران کا رویہ خاصا نرم رہا۔ اس نے نارمل انداز میں دونوں بہنوں سے باتیں کیں۔ اگلے تین روز میں حالات کافی حد تک معمول پر آ گئے۔

میڈم صفورا کو اندیشہ تھا کہ اس دوران میں شاید صدیقی بھی لال کوٹھیوں کا چکر لگائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ قدرتی طور پر حالات ایسے ہوئے تھے کہ صدیقی کا دھیان ''فاسٹنگ بدھا'' کی چوری کے سلسلے میں مکمل طور پر ایک دوسری پارٹی کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو لاہور میں بھی اسے پریشان کرتے رہے تھے۔ یہ کون تھے؟ ان کی تعداد کیا تھی اور ان کا رویہ کیسا تھا؟ اس بارے میں ابھی میڈم اور عمران کو بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔

اقبال کے زخموں کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ میڈم چاہتی تھی کہ اب ہم لال کوٹھیوں سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ وہ ہمیں رہائش وغیرہ کی بہترین سہولتیں فراہم کرنے کے لیے تیار تھی مگر عمران کا ارادہ واپس اپنے دس مرلے کے مکان میں جانے کا تھا جو راوی روڈ پر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں زیادہ اطمینان و سکون کے لمحات میسر ہوں گے۔

اس روز رات کو ہم لال کوٹھیوں سے واپس راوی روڈ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ جانے سے پہلے میڈم صفورا نے بڑی گرم جوشی سے ہمیں الوداعی ڈنر دیا۔ اس میں نادیہ اور سیٹھ سراج بھی موجود تھے۔ سیٹھ سراج کی صورت مجھے ہمیشہ اعصابی تناؤ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ ایک عیاش نو دولتیا تھا۔ ہڑپہ میں زلیخا کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق اب ہمارے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اور یہ تو فقط ایک مثال تھی۔ ایسی نہ جانے کتنی مثالیں اس کے کھاتے میں موجود تھیں۔ ایسے باپ کا بیٹا واجی جیسا ہی ہو سکتا تھا۔ اس الوداعی ڈنر میں مَیں نے پہلی بار نادیہ کو ہوش و حواس میں دیکھا۔ اس نے ڈرنک نہیں کی تھی۔ اس کا لباس بھی بیہودہ نہیں تھا۔ وہ عمران کے ساتھ لگاوٹ سے باتیں کرتی رہی۔

ہم راوی روڈ واپس آ گئے۔ میں عمران کو ثروت کے خط کے بارے میں تین روز پہلے ہی بتا چکا تھا۔ عمران نے بھی یہ خط پڑھا تھا اور اس کی سطروں میں کروٹ لیتے ہوئے بے پناہ درد کو محسوس کیا تھا۔ درحقیقت اس خط کو پڑھنے کے بعد میرے اندر ثروت کو ڈھونڈنے اور اس تک پہنچنے کا ارادہ مزید مضبوط ہوا تھا۔ عمران کے احساسات بھی ایسے ہی تھے۔ میں ثروت کے خط کو درجنوں بار پڑھ چکا تھا اور ہر بار خط مجھے ماضی کے دھندلکے میں لے گیا تھا۔ جب لاہور کے گلی کوچے، سبزہ زار اور ریستوران ہماری محبت کے گواہ تھے۔ ہم ایک دوسرے کی دید کی گھڑیاں گن گن کر گزارتے تھے۔ محبت کا موسم، خوش رنگ تہوار اور ملن کے دیگر مواقع محبت کے زینوں جیسے تھے۔ ہم ان زینوں پر پاؤں دھرتے اوپر اُٹھتے جا رہے تھے۔ ہماری باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی مگر ایک عید کے موقع پر بات پکی ہو گئی تھی۔ نشانی کے طور پر انگوٹھی وغیرہ بھی پہنائی گئی تھی۔ اندازاً ڈھائی سال بعد شادی طے ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے ثروت کو گن کر بتایا تھا کہ ڈھائی سال میں تقریباً 128 ہفتے ہوتے ہیں۔ یعنی ہماری شادی قریباً 128 ہفتے بعد ہو گی۔ اب یہ ''ہفتوں کی بات'' ہے۔ یہ بات ثروت کو دلچسپ لگی تھی۔ پھر ایک موقع پر میں نے اس کی ایک فائل دیکھی تو اس میں ایک صفحے پر بہت سی سرخ لکیریں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ سرخ لکیروں کو سبز بال پوائنٹ سے کاٹا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

'یہ کیا ہے؟''

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ یہ 128 ہفتوں کی لکیریں ہیں۔ ہر ہفتہ گزرنے کے بعد میں ایک لکیر کاٹ دیتی ہوں۔ اب صرف 55 لکیریں باقی رہ گئی ہیں۔

ہاں...... وہ ایسی ہی محبت بھری دیوانگی کے دن تھے۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہماری شادی کا درمیانی وقت ایک دم بھاپ بن کر اُڑ جائے اور ہم ملن کی گھڑی کو اپنے رُوبرو دیکھیں۔ وقت بھاپ بن کر تو نہیں اُڑا تھا مگر پل پل سرک رہا تھا اور ہم اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ پھر وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ چند اوباشوں نے اپنے شر کی چنگاریوں سے ایک ہنستی بستی خوشبودار بستی کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ سرخ لکیریں جو کوئی بڑے شوق کے ساتھ سبز روشنائی سے کاٹتا تھا، کینسر کے جرثوموں کی طرح ایک دم بڑھتی چلی گئیں اور اب انتظار کے کاغذ پر جدائی کی سرخی کے سوا کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔

اب تک کا وقت میں نے پتا نہیں کیسے گزار لیا تھا مگر اب جبکہ میں نے پاسپورٹ کے لیے اپلائی کر دیا تھا اور عمران ویزے کے حصول کی تیاری کر رہا تھا، ایک دم ہی میری اندرونی بے قراری بڑھنے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ درمیانی مراحل جلد سے جلد طے ہوں اور میں ثروت کی تلاش میں فرینکفرٹ پہنچ جاؤں۔

عمران کے ہاتھ کی چوٹ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود وہ شام کو سرکس چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمران نے موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا اور سینکڑوں افراد سے داد وصول کی۔ شاہین کے ساتھ عمران کی ملاقات بھی دلچسپ تھی۔ دونوں میں زبردست نوک جھوک ہوئی۔ شاہین کو شکوہ تھا کہ عمران اتنے روز اسے بتائے بغیر غائب رہا ہے اور اس کا سیل فون بھی بند رہا ہے۔ عمران نے ایک بار پھر بے پَر کی اُڑائی۔ ''تمہیں بتایا تو تھا ڈارلنگ کہ ریما جی کی پیشکش کو ٹھکرانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ انہوں نے اتنی محبت سے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی تھی کہ اگر میری عمر اسّی نوے سال بھی ہوتی تو بھی ایک بار تو میں ضرور سرگرم بلکہ سراسر گرم ہو جاتا۔''

''اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''بھئی...... وہی فلم کا کام۔ فلم اندھی لڑکی میں میرا رول کافی اہم ہے۔ ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی کام کر رہا ہوں۔ ایبٹ آباد میں سات آٹھ روز شوٹنگ ہوئی ہے۔ اب لاہور میں ریما جی کے گھر پر آٹھ دس روز کا ایک اسپیشل ہے۔ ریما جی تو کہتی ہیں کہ میں شوٹنگ کے دوران میں ان کے گھر ہی رہ لوں۔ آنے جانے میں جو وقت خرچ ہوتا ہے وہ بچے گا لیکن مجھے

یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔'' عمران نے مشورہ طلب نظروں سے شاہین کو دیکھا۔

''کیوں اچھا نہیں لگ رہا؟'' شاہین نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''فلم کے ہیرو صاحب جو کافی بزرگ ہیں، پہلے ہی مجھ سے کچھ خار کھا رہے ہیں۔ اگر میں مستقل طور پر ریما جی کا فائیو اسٹار مہمان بن گیا تو وہ غصے میں فلم ہی چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد مجھے پتا ہے کہ کیا ہوگا۔ ریما جی کہیں گی کہ میں ہی ہیرو کی جگہ لے لوں۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق آدھی فلم میں تو ریما جی کو موٹر سائیکل پر ہیرو کے پیچھے بیٹھے رہنا ہے اور وہ جس طرح سے چپک کر بیٹھتی ہیں۔ اللہ معافی...... اوپر سے بریکیں لگانے کی مصیبت۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ بریکیں لگانے سے میری بات سمجھ رہی ہو نا تم...... میں تو پرسوں ایبٹ آباد میں اسی وجہ سے ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' اسسٹنٹ عباس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ شاہین شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

''میں ہیرو صاحب کے ڈپلی کیٹ کے طور پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ ریما جی میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک آگے ایک گدھی آ گئی۔ میں نے اس ڈر سے بریک نہیں لگائے کہ ریما جی عقب سے میرے ساتھ چمٹ جائیں گی مگر جو کچھ ہوا وہ زیادہ بُرا تھا۔ موٹر سائیکل گدھی کی پچھلی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ ہم دونوں کچی زمین پر گرے۔ ریما جی نیچے میں اوپر۔ بالکل فلمی پوز تھا۔ میرے سر پر تھوڑی سی چوٹ بھی لگی۔ ریما جی تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی بڑی بے باک ہیں۔ کہنے لگیں۔ عمران! اس سے تو اچھا تھا کہ تم بریک ہی لگا لیتے۔''

''زبردست...... بہت فنی۔'' شاہین نے زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور شاہین ڈیئر! یہ بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں کہ سر پر چوٹ لگنے سے کبھی کبھی بندے کا حافظہ وقتی طور پر ختم شد ہو جاتا ہے۔ ایک دو منٹ کے لیے تو مجھے بھی یاد نہیں رہا کہ ریما جی کے اوپر سے اُٹھنا ہے۔ ریما جی کو بھی شاید یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تو ڈائریکٹر صاحب بھاگے ہوئے آئے اور انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ ہم موٹر سائیکل پر سے گر چکے ہیں۔''

شاہین تنک کر بولی۔ ''مجھے تو لگ رہا ہے کہ تمہارا حافظہ ابھی تک متاثر ہے۔ ریما وغیرہ تمہارے ساتھ تھی ہی نہیں، تم اکیلے ہی گدھی سے ٹکرائے اور گدھی کے اوپر ہی گرے اور اس گدھی کی بُو ابھی تک تمہارے کپڑوں سے اور تمہاری بیہودہ باتوں سے آ رہی ہے۔''

پھر وہ اسسٹنٹ منیجر عباس سے مخاطب ہوئی۔ ''عباس صاحب! کل سے میں ان کے

ساتھ موٹر سائیکل پر انٹری نہیں دوں گی۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔‘‘

اس کے بعد وہ گھومی اور پاؤں پٹختی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔ ’’او بات تو سنو یار..... ہیلو.....ہیلو۔‘‘ عمران اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

عباس بولا۔ ’’اب منانے اور ماننے میں آدھ پون گھنٹہ تو لگے گا ہی۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ روٹھنے کا جرمانہ بھی شاہین ہی دے گی۔ اسے کسی ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھلائے گی یا کافی شافی پلائے گی۔‘‘

’’یہ تو واقعی زیادتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’روٹھو تو جیب بھی اپنی ہلکی کرو۔‘‘

’’بس یہ ان دونوں کا اسٹائل ہے لیکن ویسے فراخ دل ہے ہیرو بھائی! شاہین کے گھر والوں کا پورا خیال رکھتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس کے چھوٹے بھائی کی موٹر سائیکل ’’جم‘‘ سے چور ہوگئی۔ عمران نے گھر میں خبر ہونے سے پہلے پہلے اسے نئی موٹر سائیکل لے دی۔‘‘

شاہین اور عمران کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ شاہین کی آنکھیں سرخ تھیں۔ غالباً وہ روئی ہوئی تھی اور اب پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی۔ عباس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عمران نے آتے ساتھ ہی اعلان کیا۔ ’’اُٹھو بھائی تابی! آج ڈنر گھر میں ہی کرنا ہے۔ شاہین ہمیں کھانا خود بنا کر کھلانے والی ہے۔ یہ دیکھو چکن بھی لے آئی ہے۔‘‘ اس نے شاہین کے پھولے ہوئے شولڈر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

گھر پہنچتے ہی شاہین نے کچن یوں سنبھالا جیسے وہ اس کا اپنا کچن ہو۔ اندازہ ہوا کہ وہ دو چار بار پہلے بھی یہ کچن استعمال کر چکی ہے۔ اس نے اپنے بال سمیٹ کر ایپرن باندھ لیا اور آستینیں اڑس لیں۔ عمران اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ تیزی سے کام کرتی ہوئی وہ دلکش نظر آتی تھی۔ یہ بات تو عیاں تھی کہ وہ عمران کو چاہتی ہے مگر عمران کی اندرونی پوزیشن کیا ہے، یہ وہ خود ہی بتا سکتا تھا۔

کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کو بھی سنبھال رہی تھی۔ بستروں کی چادریں درست کر رہی تھی۔ بکھرے ہوئے برتن کچن میں پہنچا رہی تھی اور باقی اُکھاڑ پچھاڑ کو درست کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ عمران کی گھریلو ملازمہ کو بھی سخت سُست کہتی جا رہی تھی۔

کھانا شاندار تھا۔ اس نے بلیک پیپر اور شاشلک بنایا تھا۔ ساتھ میں کنگ سائز کوک تھی۔ ریستوران کا سا مزہ آ گیا۔ جب ہم کھانا کھا رہے تھے، دروازے پر دستک ہوئی۔ ’’یہ کون بلا آ ٹپکی؟‘‘ عمران بڑبڑایا۔

آنے والی بلا ہی تھی۔ عمران نے دروازہ کھولا تو سامنے چھوٹی میڈم نادیہ کھڑی تھی۔

ایک سادہ پوش گارڈ اس کے ہمراہ تھا جو اسے دروازے تک چھوڑ کر اور سیلیوٹ کر کے گاڑی میں واپس چلا گیا۔ ہم نادیہ کو یہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ بہرحال وہ معقول حالت میں تھی۔ یعنی نشہ نہیں کیا ہوا تھا اور لباس بھی سلجھا ہوا تھا۔ اس نے ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے جھمکے تھے۔

’’دیکھو عمران! کیسے شاندار وقت میں تمہیں پکڑا ہے۔‘‘ وہ چہکی اور ناک سکیڑ کر کھانے کی خوشبو لی۔ پھر بولی۔ ’’لگتا ہے کہ ہنرمند ہاتھوں نے کھانا بنایا ہے۔‘‘

’’ہاں......اس سے ملو، یہ ہے شاہین! میرے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔‘‘

’’او ہو......تو یہ ہے شاہین۔‘‘ نادیہ نے ہونٹوں کو سکوڑ کر ’او ہو‘ کی طویل آواز نکالی۔

’’بھئی...... بڑی تعریف سنی ہے تمہاری۔‘‘ اس نے مصافحے کے لیے شاہین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

’’آیئے۔ آپ بھی کھانا کھایئے۔‘‘ شاہین نے مصافحہ کر کے دعوت دی۔

’’دعوت تم کس حیثیت سے دے رہی ہو؟ گھر والی کی حیثیت سے یا پھر...... گھر آئی ہوئی کی حیثیت سے؟‘‘

عمران چہکا۔ ’’ابھی تو گھر آئی ہوئی ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ دراصل کرکٹ کے میچ کی طرح، رومانس کے میچ میں بھی آخری بال تک......یعنی شادی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔‘‘

’’جوڑی تو اچھی ہے۔‘‘ نادیہ مسکرائی۔ تاہم اس مسکراہٹ کے پیچھے میں نے زہر کی لہر محسوس کی۔

’’چائنیز پسند کرتی ہیں آپ؟‘‘ شاہین نے جلدی سے پوچھا۔

’’بھئی تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو مجھے کچھ بھی کھانا اچھا لگے گا۔ ویسے جو آپ کھا رہے ہو یہ بھی ٹھیک ہے۔‘‘

’’یہ چائنیز ہی تو ہے۔‘‘ عمران نے کہا۔

’’اچھا...... یہ چائنیز ہے۔‘‘ نادیہ کے لہجے کی تہ میں گہرا طنز تھا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا۔ اس جیسی عام لڑکی ایسا ہی چائنیز بنا سکتی ہے۔

شاہین کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ پلیٹ لینے کے بہانے جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

نادیہ کی آمد سب کو ہی ناگوار گزری تھی۔ ایک بے تکلف محفل کھچے کھچے ماحول میں بدل گئی۔ نادیہ جتنی دیر موجود رہی، اس کی زہر میں بجھی ہوئی نگاہیں شاہین کا طواف کر رہی تھیں

لیکن لب و لہجے کے نیچے گہرائی میں تیز نشتر کی سی چبھن تھی۔

شاہین کو جلدی جانا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔ نادیہ بھی قریباً ایک گھنٹہ وہاں موجود رہی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ راستے میں مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی رنگ برنگی روشنیاں دیکھ کر آئی ہے۔ وہ شہر کے اس حصے کی طرف کبھی نہیں آئی۔ وہ ان جگہوں کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔

عمران نے کہا۔ ''اب تو بہت دیر ہو چکی ہے پھر کسی دن سہی۔''

''پھر کسی دن کیوں؟ کل کیوں نہیں؟''

''چلو ٹھیک ہے۔'' عمران نے ٹالنے کے لیے کہا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ آنے سے پہلے فون کرے گی اور وہ کوئی بہانہ بنا دے گا۔

مگر ہوا یہ کہ اگلے روز وہ بغیر اطلاع کے ہی آ دھمکی۔ عمرن ابھی شو سے واپس آیا ہی تھا اور نہا رہا تھا۔ آج بھی نادیہ نے نہایت قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہاف سلیوز میں سے اس کی بانہیں جگمگا رہی تھیں۔ عمران نے پس و پیش کیا لیکن وہ اڑی رہی۔ عمران کو جانا پڑا۔ اس کی واپسی رات کو قریباً ڈھائی بجے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ کھانا وغیرہ بھی کھا کر آئے تھے۔ کچھ کھانا وہ پیک کروا کر بھی لائی۔ وہ کسی اونچے چائنیز ہوٹل کا کھانا تھا۔ شاید وہ ہمیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ ہوتا ہے چائنیز۔ وہ بازار کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی اور عمران سے کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ اس گھٹن زدہ گرد آلود ماحول میں کیسے رہتے ہیں؟

تیسرے روز جب میں اور عمران پاسپورٹ لینے کے لیے مہران گاڑی پر نکلے تو بازار میں پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ بازار کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بڑی تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ عمران نے ایک تھڑے کے قریب جا کر کار آہستہ کی۔ یہاں چاچا نذیر، تایا رحمت، ماسٹر تاج دین اور اس عمر کے دیگر حضرات بیٹھے تھے۔

عمران نے ماسٹر تاج دین سے پوچھا۔ ''ماسٹر جی! مبارک ہو۔ سڑک شروع ہو گئی۔''

ماسٹر جی نے کہا۔ ''تمہاری ہی مہربانی ہے بیٹا! پرسوں تمہاری سیکرٹری نے بتا دیا تھا سب کچھ۔ وہ تمہاری ہی سیکرٹری ہے نا؟''

''کون سیکرٹری؟'' عمران نے کار سے اُترتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی...... وہی لال کار والی۔ مس نادیہ۔''

عمران ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''وہی جو تم نے کہا تھا۔ بول رہی تھی کہ عمران صاحب کی طرف سے خوشخبری ہے۔

پرسوں سے سڑک کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس وقت تو پورا یقین نہیں آیا تھا مگر اب آ گیا ہے۔ تمہارے بڑے احسان ہیں بیٹا ہم سب پر۔ اب کس کس کا شکریہ ادا کریں۔ ویسے تم نے کوئی دفتر وغیرہ کھولا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ سیکرٹری؟''

''ہاں جی...... کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے گول مول جواب دیا۔

''ہماری کالونی میں سیوریج کا کام کب شروع کراؤ گے پتر جی؟'' چاچے نذیر نے کہا۔

''بب...... بس جلد ہی۔'' عمران گڑبڑایا۔

''دو ہفتے کا وعدہ کیا ہے تیری سیکرٹری صاحبہ نے۔ پوری کالونی کا گندا پانی گلیوں میں چلتا ہے۔ تیرا یہ احسان تو ہم مرتے دم تک نہیں بھولیں گے۔ اللہ لمبی عمر کرے تیری اور تیری سیکرٹری شادیہ کی۔''

''نذیرے! شادیہ نہیں نادیہ! ایک تو تُو ہر لفظ کا حلیہ تباہ کر دیتا ہے۔'' رحمت نے کہا۔

''کون بیاہ کر لیتا ہے؟'' بہرے نذیر نے کان پر ہاتھ دھرا۔

ایک نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''پاؤں قبر میں چلے گئے مگر چاچے کو آواز ''بیاہ'' اور ''شادیہ'' وغیرہ ہی کی آئے گی۔''

سب ہنس پڑے۔ عمران بھی اس ہنسی میں شریک ہوا اور پھر اُلجھا اُلجھا سا گاڑی میں بیٹھ گیا چند اور افراد بھی موقع پر آ گئے اور عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا چکر چلا رہی ہے یہ اُلو کی پٹھی؟'' عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''لگتا ہے کہ تمہیں متاثر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ کل کلاں وہ علاقے کے لوگوں میں نقد پیسے بانٹنا بھی شروع کر دے۔''

عمران نے گہری سانس لی اور ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ ''چلو خلقِ خدا کا بھلا ہونا چاہیے۔ چاہے کسی طرح بھی ہو۔'' وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔

''مگر اس کے بدلے جب وہ تم سے بلا کی طرح چمٹ جائے گی تو پھر......''

''چلو...... یہ بھی ایک نیا تجربہ ہو گا کہ بلا کیسے چمٹتی ہے۔''

''اتنی خوش فہمی میں بھی نہ رہو۔ ایسی عورتیں جب کسی مرد کو جیتنے کے چکر میں پڑ جاتی ہیں تو بہت آگے نکل جاتی ہیں۔''

''کتنا آگے نکلے گی۔ بارڈر پار کر جائے گی؟''

''ایسی عورتوں کے نزدیک کوئی بارڈر شارڈر نہیں ہوتا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''خوشی بس اس بات کی ہے کہ میرے گونگے یار نے اب تھوڑا تھوڑا چہکنا شروع کر دیا

ہے۔ باقی...... نادیہ کے بارے میں پریشان ہونے کی کوشش نہ کر جگر! ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا۔''

اسی دوران میں عمران کے فون کی بیل ہوئی اور نادیہ کا فون آ گیا۔ عمران نے مجھے سنانے کے لیے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا۔ ''ہیلو ڈیئر! کیسے ہو؟'' نادیہ نے شیریں آواز میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''بس ذرا مارکیٹ تک۔''

''اور کون ہے ساتھ؟''

''کوئی نہیں۔''

''چائنیز فوڈ والی ہے تو بتا دو پھر فون کر لوں گی۔''

''اس سے صرف سرکس میں ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے چمٹی نہیں رہتی۔''

''تمہارے دماغ سے تو چمٹی رہتی ہے۔'' عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''ارے...... ناراض نہ ہو جانا سویٹ ہارٹ! میں تمہاری ناراضگی مول نہیں لے سکتی۔''

''تو پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''ویری سوری! کان پکڑتی ہوں بھئی اور ہاں آج اپنے گھر کے باہر کوئی تبدیلی محسوس کی تم نے؟''

''سڑک بن رہی ہے اور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ کام میں نے شروع کروایا ہے۔''

''تم نے ہی تو کروایا ہے ڈارلنگ! اور ابھی اور بہت کچھ کراؤ گے۔ تم میں سچ مچ میجک ہے۔ میرا بس چلے نا تو پتا ہے کیا کروں؟''

''کیا کرو؟''

''تمہاری ہر مسکراہٹ کا صدقہ اُتارنا شروع کر دوں۔ مسکراہٹ کا صدقہ ایک لاکھ روپیہ، لافٹر کا نذرانہ دو لاکھ۔ یوں دو چار ہفتوں میں ہی اپنی ساری پونجی تم پر لگا دوں۔ تم جو بات بات پر مجھے امیر کبیر ہونے کا طعنہ دیتے ہو تو یہ طعنے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد میں عام سے کپڑے پہن کر تمہارے پیچھے تمہاری پھٹیچر موٹر سائیکل پر بیٹھوں۔ گول گپے، آلو چنے اور سموسے کھاؤں۔ پورے شہر میں تمہارے ساتھ لور لور پھروں۔''

''ایسے شوق بڑی جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی بیوقوفی کا احساس ہوتا ہے۔''

''جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا ہے۔ سلیم کی موت ابھی تک تمہارے ذہن پر سوار ہے۔ میں اس کے لیے تمہارا دل کیسے صاف کر سکتی ہوں؟ مجھے بتاؤ پلیز مجھے بتاؤ۔ میں ہر کام کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہاری ان باتوں سے جانے والا لوٹ تو نہیں آئے گا۔ بہر حال جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کا ذکر نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔''

''اچھا نہیں چھیڑتی۔ بتاؤ آج شام کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ خاص نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں دس بجے تمہیں فون کروں گی۔''

''اوکے۔'' عمران نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''دو چہروں والی عورت۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

اسی دوران میں ایک اور کال آ گئی۔ اس مرتبہ دوسری طرف بڑی میڈم صفورا تھی۔ ''ہیلو عمران! کیسے ہو؟'' وہ باوقار انداز میں بولی۔

''بالکل ٹھیک میڈم! کوئی خدمت؟''

''نہیں...... ابھی چند دن آرام کرو۔ کھاؤ پیو اور توانائی بحال کرو۔ خاص طور سے اقبال کی صحت بہتر ہونی چاہیے۔''

''آپ کیسی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے اور آج کل خوش بھی ہوں۔ میں نادیہ میں کافی چینج محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ میل جول اس کے مزاج پر اچھا اثر ڈال رہا ہے۔ الکحل بھی کم لے رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم تھوڑا تھوڑا وقت اس کے لیے نکالتے رہو۔''

''جیسے آپ کا حکم میڈم؟''

''نہیں بھئی...... یہ حکم نہیں۔ یہ تو ایک دوستانہ درخواست ہے۔ مجھے مارچ میں ایک نمائش دیکھنے جاپان جانا ہے۔ ایک ہفتے کا ٹور ہوگا۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم اور نادیہ بھی پروگرام بناؤ اور میرے ساتھ چلو۔'' عمران نے خاموشی اختیار کی تو وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ بھی حکم نہیں ہے، درخواست ہے بھئی...... آرام سے سوچ لینا۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

رسمی گفتگو کے بعد میڈم نے عمران کو خدا حافظ کہا۔ عمران گم صم تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اس سے اگلی رات میں نے اور اقبال نے ایک عجیب تماشہ دیکھا۔ میڈم نادیہ شام

سات بجے ہی آ گئی تھی۔ اس روز عمران کی سرکس سے چھٹی تھی۔ نادیہ کا پروگرام تھا کہ وہ عمران کو کہیں باہر لے کر جائے گی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ بارش شروع ہو گئی۔ نادیہ وہیں گھر میں ہی ہمارے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس کا ڈرائیور اور گارڈ ایک سرخ ہنڈا کار میں تھے۔ یہ گاڑی بازار سے باہر بڑی سڑک پر کھڑی تھی۔ ان دونوں ''حکم کے غلاموں'' کو ساری رات بھی گاڑی میں گزارنا پڑتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

نادیہ بے تکلفی سے ہمارے ساتھ گپ شپ کرتی رہی۔ وہ اپنا خاص تکبرانہ انداز چھوڑ کر ہم سے گھل مل جانے کی خواہش رکھتی تھی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے درمیان شاہین کی جگہ لے سکے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ نادیہ لاکھ کوشش کرتی مگر اس کی باتوں سے تصنع کی بُو آتی تھی۔

اپنے اور عمران کے رومانس کے حوالے سے اب وہ ہم سے کھل کر بات کر رہی تھی۔ اس نئے بولڈ انداز میں بتایا کہ اس نے عمران کو اس پہلی رات میں ہی پسند کر لیا تھا جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا اور شیرے کے ساتھ اس کی طوفانی جھڑپ ہوئی۔ وہ اس سارے واقعے کی تفصیل مزے لے کر بیان کرتی رہی اور بتاتی رہی کہ وہ کس طرح کلوز سرکٹ ٹی وی پر وہ سارے منظر دیکھتی رہی تھی۔

بارش زور پکڑ گئی تو نادیہ نے آئیڈیا دیا کہ کارڈ کھیلے جائیں۔ ہم عمران کے کمرے میں کارڈ کھیلنے لگے۔ کارڈ کھیلنے کے دوران میں ہی انکشاف ہوا کہ آج اقبال کی سالگرہ ہے۔ نادیہ نے فوراً ڈرائیور کو اس کے سیل فون پر کال کی اور اسے کیک وغیرہ لانے کو کہا۔ آدھ پون گھنٹے بعد بارش میں بھیگا ہوا ڈرائیور بہت بڑا کیک اور بہت سارا باربی کیو لے کر پہنچ گیا۔ ہم نے اقبال کی 26 ویں سالگرہ کا کیک کاٹا اور ہلا گلا کیا۔ اس دوران میں نادیہ نے ایک چابی نکالی اور اقبال کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لیے سالگرہ کا تحفہ۔''

''یہ کیا ہے جی؟''

''نئی سوزوکی کار۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''دراصل یہ عمران کے لیے تھی۔ تمہاری اور تابش کی باری بعد میں آتی مگر اپنی برتھ ڈے کی وجہ سے تم نمبر لے گئے۔ اب عمران کے لیے اور آ جائے گی۔''

اس پانچ لاکھ کے تحفے پر ہم واقعی حیران ہوئے۔ اقبال نے رسمی احتجاج کیا مگر وہ تو ہم سب پر بالکل ریشہ خطمی ہو رہی تھی اور اس کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر عمران

کو متاثر کرنا چاہ رہی تھی۔ عمران کا حصول جیسے اس کے طوفانی مزاج کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔

دس بجے کے قریب بارش ایک دم شدت اختیار کر گئی۔ کھڑکیوں پر پانی کی تابڑ توڑ بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ اس صورتِ حال میں نادیہ کا پیدل چل کر دو فرلانگ دور کھڑی گاڑی تک جانا ممکن نہیں تھا اور وہ تو شاید خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت عمران کے ساتھ گزارنے کا موقع ملے۔

اقبال نے دو تین لمبی جماہیاں لیں پھر مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں اور اقبال اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ عمران اور نادیہ وہیں بیٹھے کارڈ کھیلتے رہے۔ بارش رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں بستر پر اونگھنے لگا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اقبال نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میری نظر وال کلاک پر گئی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ گرج چمک کے ساتھ بارش کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اقبال کا چہرہ دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

میں نے چپل پہنی اور اُٹھ کر دبے پاؤں اقبال کے پیچھے چل دیا۔ ہم بغلی دروازے سے نکلے اور گیراج میں آ گئے۔ وہاں گھوم کر گھر کی سائیڈ والی راہداری میں پہنچے اور بارش کی بوچھاڑوں سے بچتے ''بیک یارڈ'' میں پہنچ گئے۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور اقبال کی آنکھوں میں شرارت کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک کھڑکی کی باریک جھری سے آنکھ لگائی۔ کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹ گیا اور مجھے جھری میں سے دیکھنے کا موقع دیا۔ اندر کا منظر توجہ طلب تھا۔

لمبے صوفے پر نادیہ، عمران کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ عمران کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور زبردست رومانی موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صوفے سے پھسلی اور بڑی ادا سے قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے نیم دراز ہونے کے انداز میں صوفے کے نچلے حصے سے ٹیک لگا لی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟ اوپر بیٹھو۔'' عمران کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''نہیں...... مجھے ایسے ہی اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ بڑے ناز سے عمران کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر بولی۔

''یہ کیا ڈراما ہے بھئی؟''

''ڈراما نہیں۔ بس مجھے اچھا لگ رہا ہے۔''

''تو میں بھی نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔''

''اب تم ڈراما کر رہے ہو۔'' وہ اسے روکتے ہوئے بولی۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بڑے ہیجان خیز انداز میں اس کے گھٹنے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے تعلق میں سب سے نمایاں چیز ''ہیجان'' ہی نظر آتی تھی۔ وہ جدید تراش کی شلوار قمیص میں تھی۔ قمیص کا گریبان واہیات حد تک کشادہ تھا۔ وہ اپنے بیٹھنے کے انداز سے اس کشادگی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمران نے نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جما رکھی تھیں۔ تب میں نے ایک اور دلچسپ منظر دیکھا۔ نادیہ نے بڑی آہستگی سے عمران کی سفید چپل اس کے پاؤں سے علیحدہ کر دی اور بڑے محبت بھرے انداز میں ہولے ہولے اس کے پاؤں پر انگلیاں چلانے لگی، اس کے تلوؤں کو سہلانے لگی۔ عمران نے ایک بار پھر منع کرنے کی کوشش کی مگر اس نے مصنوعی غصے سے ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا۔

اس کا یہ رویہ تعجب خیز تھا۔ یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ لال کوٹھی کی چھوٹی میڈم تھی۔ درجنوں ملازم اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ کروڑوں کی مالک تھی اور بڑی بہن کی وجہ سے ہی سہی مگر اسے سوسائٹی میں ایک مقام حاصل تھا۔ آج اس بادو باراں کی شب میں وہ اس چھوٹے سے مکان میں بازی گر عمران دانش کے قدموں میں بیٹھی تھی اور فدویانہ انداز میں اس کے پاؤں سہلا رہی تھی۔ وہ کیا شے تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں نے کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر اقبال کے کان میں مدھم سرگوشی کی۔ ''دیکھو تم بھی...... دیکھنے والا سین ہے۔''

اب اقبال نے اپنی آنکھ کھڑکی کی جھری سے ٹکا دی۔ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''بہت بڑی ففے کٹنی ہے یہ...... باری تعالیٰ ہمیں اور ہمارے یار کو اس کے شر سے بچائے۔''

تب اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ اب دیکھنے کی باری میری ہے۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ اندر کا منظر بدلا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اب پھر صوفے پر عمران کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اس نے قمیص کے اوپر سے ہی عمران کا کندھا چوما پھر اس کے گریبان کے بٹن کھول کر اپنی ناک اس کے سینے پر رگڑنے لگی لیکن یہ بات عیاں تھی کہ اسے عمران کی طرف سے مناسب رسپانس نہیں مل رہا۔ جب وہ مزید آگے بڑھی تو عمران اپنا سگریٹ کیس لینے کے بہانے اُٹھ گیا۔

وہ گہری سانس لے کر صوفے پر پھیل گئی اور ناقدانہ نظروں سے عمران کا جائزہ لینے

لگی۔ وہ دوسری کھڑکی کے پاس کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ''کیا بات ہے ڈیئر! کچھ اُکھڑے ہوئے لگ رہے ہو؟''

''نہیں...... ایسی بات تو نہیں۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' اس نے ہوشربا انگڑائی لی۔ عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا۔ ''لگتا ہے شرم آ رہی ہے۔'' اس نے کہا اور ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ ایک دم کمرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر دیا تھا۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اقبال نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ قینچی چل گئی؟''

''میں سمجھا نہیں۔ کیا قینچی؟''

''یار! سین سنسر ہو گیا ہے نا۔'' اس نے کہا اور مجھے کھینچ کر واپس اپنے کمرے میں لے آیا۔ ہم وہاں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ عمران، نادیہ سے گریز کر رہا ہے مگر وہ مکمل گریز نہیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کچھ حوصلہ افزائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نادیہ کو اپنے آپ میں اُلجھا رہا ہے۔

صرف دو تین منٹ بعد عمران کے کمرے کی لائٹ دوبارہ آن ہو گئی۔ اقبال مسکرایا۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم کی دال گلی نہیں۔'' میں نے تائید کی۔

پانچ دس منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ نادیہ واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ عمران نے ایک پُرانی برساتی اس کے لیے مہیا کر دی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی تھی بلکہ ناراض لگتی تھی۔ اس نے ہم سے بھی مختصر سی بات کی۔ فون کر کے اس نے اپنے لحیم شحیم گارڈ کو بلا لیا۔ اس کے ساتھ وہ واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اقبال بولا۔ ''یار عمران! بڑے پرلے درجے کے کٹھور ہو تم۔ اس نے مجھے گاڑی کی چابی دی ہے۔ کم از کم آج تو اسے خوش کر کے بھیجنا تھا۔''

''کیسے خوش کرتا؟''

''کمرے کی بتی دو چار منٹ مزید بجھی رہنے دینی تھی۔''

''زیادہ دیر اندھیرے میں رہیں تو شیطان کھڑکی میں سے جھانکنے کے بجائے اندر کمرے میں آ جاتا ہے۔''

''بڑے پہنچے ہوئے ہو تم۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ شیطان کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔'' اقبال نے پوچھا۔

''دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے تو یہ جگا کر زبردستی لے گیا تھا یار۔'' میں نے دفاع کیا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ اتنی سی شیطانی تو تم دونوں کا حق ہے۔''

''اب کیا کرنے کا ارادہ ہے چھوٹی میڈم کے ساتھ؟ کوئی فلمی قسم کا انتقام تو نہیں لینا چاہتے؟'' میں نے پوچھا۔

عمران کا موڈ اب قدرے بحال تھا۔ خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''ارادہ تو ایسا ہی ہے۔ اس کے ساتھ شادی کروں گا۔ جب یہ لال جوڑا پہن کر ہاتھوں میں مہندی لگا کر گہنوں سے لدی پھندی، گٹھڑی سی بن کر پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوگی تو اندر آؤں گا اور کہوں گا...... نادیہ بیگم! یہ سہاگ رات نہیں ہے۔ یہ انتقام کی رات ہے۔ آج تمہارا گھونگھٹ کوئی نہیں اُٹھائے گا۔ تم اس کانٹوں کی سیج پر اکیلی ہی رات گزاروگی۔ آج کے بعد اس گھر میں تم صرف نام کی دلہن بن کر رہوگی۔ پل پل جیوگی، پل پل مروگی۔''

اقبال بولا۔ ''یار! ویسے اس مشہور فلمی سین میں جو بار بار فلمایا گیا ہے۔ کوئی لاجک نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو یہ مجبوری کا سین ہے۔ سنسر کا ڈر ہوتا ہے اس لیے دلہا صاحب اپنے انتقام کا رُخ موڑ کر تکیہ اُٹھاتے ہیں اور باہر صوفے پر جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ تماشائی بیچارے اس روکھے پھیکے شریفانہ انتقام پر کڑھتے رہ جاتے ہیں۔''

''تمہارے خیال میں یہ سین کیسے ہونا چاہیے؟'' عمران نے سگریٹ سلگایا۔

''میں ہوتا تو اس طرح بولتا۔'' وہ ہو بہو فلم اسٹار وحید مراد کے لب و لہجے میں بولنے لگا۔ ''شبانہ! یہ سہاگ کی رات نہیں ہے، انتقام کی رات ہے۔ ہم انتقام کا دور شروع کرنے والے ہیں لیکن جس طرح لمبی چھلانگ لگانے کے لیے پہلے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، اسی طرح میں بھی پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ آج کی رات ہم محبت کے ساتھ گزاریں گے۔ صبح ساڑھے سات بجے سے انتقام شروع کریں گے وغیرہ وغیرہ۔''

O......❖......O

میرا پاسپورٹ مل گیا تھا۔ ویزے کے انٹرویو کے لیے ہمیں ایمبیسی سے دس دن بعد کی اپائنٹ منٹ ملی تھی۔ یہ بھی عمران کی کوشش سے ہوا تھا ورنہ بیس دن بعد باری آ رہی تھی۔ اب یہ دس دن ہمیں جیسے تیسے گزارنے تھے۔ انٹرویو کے بعد ویزا لگنے میں بھی دس پندرہ روز لگنے تھے۔

دو روز بعد رات کو ہم نے پھر ایک سین دیکھا۔ یہ سین پہلے والے سین سے زیادہ تہلکہ

خیز تھا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ جس وقت نادیہ نے گھر کے دروازے پر دستک دی، صرف پانچ منٹ پہلے ہی شاہین ہمارے پاس سے اُٹھ کر گئی تھی۔ نادیہ کی آمد محسوس کر کے ہم نے فوراً شاہین کی موجودگی کے اہم آثار کمرے سے ختم کر دیئے۔ نادیہ آج بھی شاندار ساڑھی میں تھی۔ اس کا موڈ قدرے بہتر نظر آتا تھا مگر آج اس کے چہرے پر خاص قسم کی تمتماہٹ بھی موجود تھی۔ یہ تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے ایک دو پیگ لگا رکھے ہیں۔ اس نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ علاقے میں سڑک کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

آج جو شولڈر بیگ نادیہ کے کندھے سے جھول رہا تھا، وہ نسبتاً بڑا تھا۔ کچھ پھولا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ نادیہ نے اقبال سے پوچھا کہ اس نے اپنی نئی گاڑی ڈرائیو کر کے دیکھی ہے۔

''گاڑی میں بیٹھ کر تو دیکھا ہے مگر ابھی ڈرائیو نہیں کی۔'' اقبال نے کہا۔

''تو پھر جاؤ۔ ایک چکر لگا کر آؤ تم اور تابش۔''

غالباً وہ عمران کے ساتھ تنہائی چاہتی تھی۔

''جیسے آپ کا حکم۔'' اقبال نے کہا۔

میں اور اقبال باہر آ گئے۔ بلیو کلر کی نئی مہران باہر موجود تھی۔ ہم بازار سے نکل کر مارکیٹ کی طرف چلے گئے۔ میں نے کہا۔ ''یار! مجھے تو اس گاڑی میں بیٹھ کر کراہیت سی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ گاڑی نہیں ہے، کسی کی ہوس کاری کا پیشگی معاوضہ ہے اور اس کے علاوہ......شاید سلیم کے خون کی قیمت بھی ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی ایسے ہی رہا ہے مگر فی الحال مجبوری ہے۔'' اقبال نے کہا۔

ہم نادیہ کے عجیب و غریب کردار، اس کی شعلہ صفتی اور آتش پائی پر بات کرتے رہے۔ وہ ایک بگڑی تگڑی امیر زادی سے بھی آگے کی چیز تھی۔

ہم نے آئس کریم وغیرہ کھائی پھر آدھ پون گھنٹے میں واپس آ گئے۔ اقبال نے گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر پرسوں والی شریر چمک موجود تھی۔ اس کی جیب میں ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی۔ اس چابی سے اس نے آواز پیدا کیے بغیر چھوٹا گیٹ کھولا اور میرے ساتھ اندر چلا گیا۔

ابھی ہم برآمدے میں ہی پہنچے تھے کہ اندر سے بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں نادیہ کی آواز نمایاں تھی۔ وہ کسی بات پر عمران سے جھگڑ رہی تھی۔

''آج معاملہ گرم ہے بھئی۔'' اقبال نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر راہداری سے گزرا اور پھر اسی کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جہاں سے

پرسوں رات بھی ہم نے اندرونی منظر دیکھا تھا۔ اس کھڑکی میں یہ جھری اقبال جان بوجھ کر رکھتا تھا، اس بات کا پتا مجھے دو روز بعد چلا۔

کمرے سے اُبھرنے والی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔ نادیہ کہہ رہی تھی۔ ''تم مجھے ٹارچر کر رہے ہو۔ جان بوجھ کر کر رہے ہو۔ صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان ریلیشن نہیں ہو سکتا۔''

''تمہارے لیے ریلیشن کا بس ایک ہی مطلب کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ ریلیشن کے لیے ہم اکٹھے ایک بستر پر سوئیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح بھی رہ سکتے ہیں۔''

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں عمران۔'' وہ بھڑکے لہجے میں بولی۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے سلیم کے لیے معاف نہیں کیا ہے۔ تمہارے دل میں وہی گرہ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا دُکھ سینے میں لے کر بیٹھے ہوئے ہو تم۔ میری طرف دیکھتے ہو تو تمہاری آنکھوں میں نفرت چمک اُٹھتی ہے۔''

نادیہ کی آواز بہکی ہوئی تھی۔ بنارسی ساڑھی کا چمکیلا پلو اس کے کندھے سے ڈھلک گیا تھا۔ مختصر بلاؤز اس کے جسم کو نمایاں کر رہا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

''میں غلط نہیں سمجھ رہی۔ تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو اور مجھے بھی۔ میں نے تمہاری منت کی ہے عمران! ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگی ہے لیکن تم نے اپنا دل پتھر کیا ہوا ہے۔ شاید تم مجھے سزا ہی دینا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، دے لو مجھے سزا۔ تمہاری محبت کے لیے میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں۔ ٹھیک ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، میں نے سلیم کو مارا پیٹا۔ تو تم اس کا بدلہ لے لو مجھ سے...... میں دل سے کہتی ہوں مجھ سے بدلہ لے لو۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

وہ بڑے جذباتی انداز میں اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھی۔ اس کی زپ کھول کر اس نے اندر سے ایک چیز نکالی۔ پہلے تو مجھے سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ پھر پتا چلا کہ یہ موٹے ربڑ کے پائپ کا قریباً تین فٹ لمبا ٹکڑا ہے۔ اس پائپ کے گرد آہنی تار لپٹا ہوا تھا۔ اس نے یہ پائپ عمران کی گود میں پھینک دیا۔ اس نے اپنے بالائی جسم سے ساڑھی ہٹا دی۔ اب وہ مختصر بلاؤز میں تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل عمران کے سامنے گر گئی۔ ''لو...... مار لو مجھے۔ جس طرح میں نے اسے مارا تھا، تم مجھے مار لو۔ میں تمہیں دل سے اجازت دیتی ہوں۔ میں ہر تکلیف سہہ سکتی ہوں، پر تمہاری بے رُخی نہیں۔ پلیز...... پلیز......'' اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے بالوں

نے آگے کو پھسل کر اس کا چہرہ چھپا لیا۔

عمران نے پائپ گود سے اُٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''اس پائپ کی دو چوٹیں تمہاری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گی نادیہ! کئی ہفتوں تک بستر سے اُٹھ نہ سکو گی۔ تم نے کتنی چوٹیں لگائیں اس کو...... کس طرح سے زخم زخم کیا؟ تمہیں ذرا ترس نہ آیا؟''

''مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں مانتی ہوں اور اب اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ اور کیا چاہتے ہو؟''

عمران نے پائپ ایک طرف پھینک دیا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے اندر اتنی بے رحمی نہیں لا سکتا۔''

''کیوں نہیں لا سکتے؟ میں قسم کھاتی ہوں، تمہاری بے رُخی مجھے اس پائپ کی مار سے کہیں زیادہ تکلیف دے رہی ہے۔''

''تم مجھے جذباتی بلیک میل کر رہی ہو نادیہ! اس طرح دل نہیں جیتے جاتے۔''

''تو تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟''

وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اچانک اس کے چہرے کی تمتماہٹ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں شراب کی سرخی بھی نمایاں تر ہو گئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں پھنکاری۔ ''عمران! تم...... تم اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے مجھے ٹھکرا رہے ہو، مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ وہ...... وہ حرامزادی! خناس بن کر گھسی ہوئی ہے تمہارے دماغ میں۔''

''نادیہ...... اس کو بیچ میں مت لاؤ۔''

''کیوں نہ لاؤں؟ وہی چڑیل ہے جس نے تمہیں اپنے پنجرے میں طوطا بنایا ہوا ہے۔ تمہاری اس بے رُخی کی ایک وجہ وہ بھی ہے۔''

''نادیہ!'' عمران گرجا۔ ''میں اس کے بارے میں بکواس نہیں سنوں گا۔''

''کیوں نہیں سنو گے تم! میں سناؤں گی۔ حرامزادی، کسبی، کتیا۔'' نادیہ جنونی انداز میں دھاڑی۔ ''میں تمہیں...... میں تمہیں اس کے قابل ہی نہیں رہنے دوں گی۔ میں برباد کر دوں گی تمہیں...... برباد کر دوں گی۔'' ایک دم ہی اس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔

وہ لپک کر ٹیبل کی طرف گئی۔ وہاں بیئر کی بڑی بوتل پڑی تھی۔ نادیہ نے ٹیبل پر مار کر ایک چھناکے سے بوتل توڑ دی۔ وہ ٹوٹ کر ایک تیز دھار ہتھیار کی طرح ہو گئی۔ اب یہ ہتھیار

نادیہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں چلاتی ہوئی عمران پر جھپٹی۔ اس نے بے دریغ عمران کے چہرے کو نشانہ بنایا۔ عمران نے بروقت پیچھے ہٹ کر چہرہ بچایا اور اس کی بوتل والی کلائی پکڑ لی۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا۔ اب ہم بھی کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے۔ نادیہ بالکل دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ عمران پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی، اس پر ٹانگیں چلا رہی تھی۔ اسے اپنے کپڑوں کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا بالائی جسم تو نیم عریاں ہو ہی چکا تھا، اب لگتا تھا کہ اس کی ساڑھی، زیریں جسم سے بھی اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔

ہم نے مل کر اسے بمشکل سنبھالا۔ عمران نے اس کے منہ پر دو زوردار تھپڑ رسید کیے۔ وہ چکرا کر دیوار سے ٹکرائی اور گر گئی۔ اس کے باوجود وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلا رہی تھی۔ ہذیانی انداز میں پتا نہیں کیا کیا بول رہی تھی۔ اس کے نقوش بگڑ گئے تھے اور رنگت سیاہی مائل ہو گئی۔ وہ کراہنے لگی اور بڑبڑانے لگی۔ عمران نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے انجکشن لے آیا۔ یہ بے ہوشی کا وہی انجکشن تھا جو اس سے پہلے عمران اور اقبال نے سمن آباد میں کنول کے بھائی قادر کو دیا تھا۔ میں نے اور اقبال نے نادیہ کو دبوچا۔ اس کا جسم نرم تھا اور منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ وہ کسمسائی مگر عمران نے اس کے بازو میں دوا انجیکٹ کر دی۔

بے شک یہ گھر کا اندرونی کمرہ تھا مگر کچھ دیر پہلے نادیہ کے چلانے چنگھاڑنے کی آواز اتنی بلند تھی کہ قریبی گھروں تک بھی پہنچی تھی۔ پڑوسی زاہد دیوار پر سے آوازیں دے رہا تھا اور گھر کا بیرونی دروازہ بھی کھٹکھٹایا جانے لگا تھا۔ عمران کے اشارے پر اقبال باہر گیا اور پڑوسیوں کو مطمئن کر کے آیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس نے پڑوسیوں کو بتایا تھا کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہیں جن میں ایک لڑکی نفسیاتی مریضہ ہے۔

اقبال کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹی بہن کو اس حالت میں دیکھ کر میڈم صفورا کا پارا بھی چڑھ جائے گا اور وہ طوفان کھڑا کر دے گی۔ تاہم عمران مطمئن تھا۔ اس نے کہا۔ ’’گھبرانے کی بات نہیں یار! میں خود ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ جاؤں گا اور اسے چھوڑ کر آؤں گا۔‘‘

’’جب تک تم واپس نہیں آؤ گے، ہماری جان سولی پر لٹکی رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیے۔‘‘ اقبال نے تجویز پیش کی۔

’’پڑوسیوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں بلکہ آٹھ دس محلے دار بھی چلے جائیں تو بہتر ہے۔ میڈم صفورا کو بڑی مسرت ہو گی کہ اس کی بہن کو اتنے اہتمام کے ساتھ یہاں لایا گیا

ہے۔‘‘ عمران کے لہجے میں طنز تھا۔

اقبال منہ بنا کر رہ گیا۔

عمران نے نادیہ ہی کے سیل فون سے اس کے ڈرائیور اور گارڈ کو کال کیا۔ وہ دونوں پہنچ گئے۔ بے ہوش نادیہ کو پہلے مہران گاڑی میں ڈال کر بڑی سڑک تک پہنچایا گیا پھر وہاں سے ہنڈا کارڈ میں ڈال کر لال کوٹھیوں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ عمران ساتھ ہی گیا تھا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ عمران، سلیم کی دردناک موت کو بھولا نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں بڑی میڈم صفورا کی منافقت و بدنیتی اسے ہضم ہوئی ہے۔ سلیم کی موت کے بعد میڈم صفورا نے جس طرح عمران کو وافر پیسے کی چمک دکھا کر مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بھی ایک نہایت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

سلیم کی موت معمولی واقعہ نہیں تھی۔ کئی دن گزر گئے تھے مگر میں آج بھی محسوس کرتا تھا کہ جیسے اس رات سلیم قبرستان میں دفن ہونے کے باوجود ہمارے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ زخموں سے چُور، بے بسی کی تصویر بنا ہولے ہولے لنگڑاتا ہوا، ہم سے پوچھتا ہوا۔ ’’تم مجھے بچا نہ سکے لیکن کیا تم میرا...... بے رحم قتل بھی بھول جاؤ گے؟‘‘ وہ اب بھی اکثر مجھے اپنے عقب میں محسوس ہوتا تھا۔ اپنی نم آنکھوں میں یہی سوال لیے۔

○......❖......○

میرا اور اقبال کا خیال تھا کہ شاید اب نادیہ، عمران کے منہ نہیں لگے گی لیکن وہ عجیب فطرت کی لڑکی تھی۔ عمران کو تسخیر کرنا جیسے اس نے زندگی و موت کا مسئلہ بنا لیا تھا اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔ تیسرے چوتھے دن ہم نے پھر عمران اور نادیہ کو اکٹھے دیکھا۔ نادیہ شام کا شو دیکھنا چاہتی تھی۔ دونوں نارمل ہی نظر آتے تھے۔ عمران نے ہم سے اصرار کیا کہ ہم بھی ساتھ چلیں۔ عمران، نادیہ والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اور دو گارڈز بھی اس گاڑی میں موجود تھے۔ میں اور اقبال، عمران کی مہران میں روانہ ہوئے۔

آج میں کئی روز بعد پھر سرکس کا رُخ کر رہا تھا۔ سرکس تین دن پہلے لاہور کے نزدیکی قصبے شیخوپورہ میں ٹرانسفر ہوا تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں قریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ سرکس کی دنیا عجیب ہوتی ہے۔ انسان، جنگلی جانور اور مختلف مشینیں...... سب مل جل کر کام کرتے ہیں اور لوگوں کو تفریح مہیا کرتے ہیں۔ سرکس کے کام میں سنسنی خیزی، تھرل اور رسک کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک پُرجوش کام ہے۔ سینکڑوں لوگوں کے سامنے لائیو کام کرنے والے لوگ بلند حوصلہ، ہنرمند اور جسمانی طور پر بھی نہایت فٹ ہوتے ہیں۔ ان کا

رہن سہن اور رویہ انہیں عام لوگوں سے مختلف بناتا ہے۔ جس سرکس کا یہاں ذکر ہے وہ ویسے بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔

عمران کا موت کے کنویں والا آئٹم شروع ہونے والا تھا۔ کنویں کے اوپر موجود تماشائیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ عمران کی پرفارمنس کے سلسلے میں اسپیشل اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ شاہین بھی آج بہت نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چست لباس میں اس کا متناسب جسم دیکھنے والوں کو کشش کرتا تھا۔

وہ بڑی ادا سے عمران کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھی اور اسی لمحے میں نے نادیہ کی آنکھوں میں حسد کی لہر سی اُبھرتے دیکھی۔ بہرحال اس کے چہرے کی مسکراہٹ برقرار تھی۔ عمران کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے نادیہ اور اس کے باوردی گارڈز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے گئے۔ لوگ مڑ مڑ کر نادیہ کو دیکھ رہے تھے۔ نادیہ کا لباس اور اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی موجودگی لوگوں پر ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی خاص شخصیت ہے۔

موت کے کنویں میں اپنی بے خوف پرفارمنس سے عمران نے ایک بار پھر تماشائیوں کے دل موہ لیے۔ تالیاں پیٹ پیٹ کر ان کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔ شاہین بھی آج بڑی فارم میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لمبے بال موٹر سائیکل پر عمران کے پیچھے کسی پرچم کی طرح لہراتے تھے۔

موت کے کنویں کے بعد عمران کو پنڈال میں قریباً پچاس فٹ کی بلندی پر جمناسٹک وغیرہ کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس مظاہرے کے لیے عمران اور شاہین نے اپنے لباس تبدیل کر لیے۔ یہاں بھی عمران، شاہین اور سلمان عرف شہزادے وغیرہ نے حاضرین سے خوب خوب داد وصول کی۔ خاص طور سے عمران اور شاہین کی جوڑی کو سراہا گیا۔

یہی وقت تھا جب عمران پنڈال کے وسط سے نکل کر میرے قریب آیا اور میرے کان میں ایک سرگوشی کر کے سنسنی پھیلا دی۔ اس نے بس چھوٹا سا جملہ بولا۔ ''جگر! آج مہینے کا پہلا ہفتہ ہے۔''

میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ آج کافی عرصے بعد میں پھر سرکس کے اسپیشل شو کا نظارہ کرنے والا تھا۔ غالباً آج عمران اسی لیے اصرار کر کے ہمیں ساتھ لایا تھا۔

اور پھر رات بارہ بجے بعد اسپیشل شو کا آغاز ہوا۔ ایک بار پھر وہی اسرار انگیز منظر دیکھنے کو ملا۔ سرکس کا عام شو ختم ہو جانے کے قریباً آدھ گھنٹے بعد نئے ماڈل کی بڑی بڑی گاڑیوں کی آمد شروع ہوئی۔ کچھ منچلے نوجوان ہیوی موٹر سائیکل پر بھی آئے۔ یہ سب لوگ ہائی جینٹری سے

تعلق رکھتے تھے اور ان میں اکثریت جواں سال افراد کی تھی۔ ان میں چند ایک فیشن ایبل لڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ گاڑیوں میں گارڈز وغیرہ بھی موجود تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر ان لوگوں کی تعداد ستر اسی تک پہنچ گئی سرکس کی ساری بیرونی لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ بس پنڈال کے اندر گہما گہمی موجود رہی۔ یہاں وی آئی پی انکلوژر میں انگلش میوزک کی گونج تھی اور بیئر کی بوتلیں گردش کر رہی تھیں۔ نادیہ سب سے اگلی قطار میں بیٹھی تھی۔ اس سے پچھلی اگلی قطار میں اس کے دونوں مسلح گارڈز اور ڈرائیور موجود تھے۔

نئے آنے والے تماشائیوں میں نادیہ کو ایک واقف کار فیملی بھی مل گئی تھی۔ یہ تین کزن تھے جن میں نہایت باریک و چست پتلون والی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ لوگ یہاں نادیہ کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے اور اب اس کے ساتھ بیٹھے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔

مقررہ وقت پر حفاظتی جال، جھولوں کے نیچے سے ہٹا دیا گیا اور نہایت سنسنی خیز شو کا آغاز ہو گیا۔ پہلے ایک جانباز فنکار نے تنے ہوئے رسّے پر چند کرتب دکھائے اور سائیکل وغیرہ چلانے کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد جھولوں پر جمناسٹک شروع ہوئی۔ یہ دل کی دھڑکن روک دینے والا تماشہ تھا۔ فنکاروں کے چہروں پر بھی تناؤ کی کیفیت صاف محسوس ہوتی تھی۔

درحقیقت یہ اپنی ہنرمندی کا ایک جان لیوا دعویٰ تھا۔ ان حالات میں بھی اگر کسی فنکار کے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ باقی تھی تو وہ عمران کا چہرہ تھا۔ ایک دوسری لڑکی کے علاوہ شاہین بھی اس مظاہرے میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ غیر معمولی دلیری، مہارت اور اعتماد کے بغیر یہ سب کچھ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پچاس فٹ کی بلندی سے نیچے زمین پر گر جانے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور یہ لڑکیاں...... موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھیں۔

شاہین نے کئی بار بڑی مہارت سے لہراتے ہوئے جھولے کو چھوڑ کر ہوا میں قلابازی کھائی اور عمران کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو پکڑا۔ ہر بار واؤ...... زبردست...... ونڈرفل کے نعرے بلند ہوئے اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونجا۔ عمران اور شہزادے نے بھی شاندار کوآرڈی نیشن کے ساتھ سانس روک دینے والی فارمیشنز بنائیں۔

ایک چودھری نما شخص نے جذبات میں آ کر نعرہ لگایا۔ ''اوئے قربان جانواں تہاڈیاں پھرتیاں تے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی کھول کر ہوا میں اُچھال دی۔

ہر بار جب کسی خطرناک حرکت کا مظاہرہ ہوتا تھا، ہمارے آگے بیٹھی ہوئی ایک ماڈرن خاتون اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپتی اور چلاتی۔ ''اوہ گاڈ...... اوہ مائی گاڈ''

ہر بار اس کا گنجا شوہر زور سے ہنستا اور اس ہنسی کے پیچھے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کرتا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد یہ شدید سنسنی خیزی اختتام کو پہنچی اور اس اسپیشل شو کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دو تین جوکرز اسٹیج پر نمودار ہوئے، ان میں ایک بونا بھی تھا۔ انہوں نے مضحکہ خیز حرکات کے ذریعے لوگوں کا اعصابی تناؤ کم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے بعد ایک بڑی میز اور کرسی اسٹیج پر رکھ دی گئی۔ میز پر وہی منقش چوکور ڈبا موجود تھا جس میں ریوالور اور گولیاں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ جب یہ انتظامات ہو رہے تھے، عمران اور شاہین ہمارے پاس آ گئے۔ وہ پسینے سے شرابور اور ہانپے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں تھپکیاں دینے لگے۔ چند ایک نے عمران سے آٹو گراف لیے۔ میں نے کن انکھیوں سے نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اندر کی شدید ہلچل کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

چودھری نما شخص، عمران اور شاہین کے قریب آیا۔ اس نے ایک بار پھر پُرخلوص انداز میں شاہین کی تعریف کی۔ ''چنگی صورت تے دلیری کبھی کبھی ہی اکٹھن ہوندی ہیں جی۔ واہ واہ..... چنگی صورت تے دلیری..... شاباش بھئی ببر شیری، واہ واہ بھئی ببر شیری۔'' اس نے کچھ اور نوٹ شاہین پر وار کر ہوا میں اُچھال دیئے۔

نادیہ کھسیانے انداز میں بولی۔ ''بھئی واہ..... ویل ڈن شاہین! تمہاری اتنی عزت افزائی دیکھ کر تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں بازی گری سیکھنا شروع کر دوں۔''

شاہین مسکرائی۔ ''لیکن میم! اس کے لیے ایک خاص عمر درکار ہوتی ہے۔'' نادیہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شاہین جلدی سے بولی۔ ''ویسے اگر آپ اپنے اعصاب ٹیسٹ کرنا چاہیں تو یہاں اس کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ ابھی کچھ لوگ وہاں اس کرسی پر بیٹھ کر بھی داد وصول کریں گے۔'' شاہین کا اشارہ اسٹیج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں تین چار لڑکیاں آ گئیں۔ وہ عمران اور شاہین کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر اُتروانا چاہ رہی تھیں۔ یہ سب کچھ جیسے نادیہ کے سینے پر سانپ لوٹا رہا تھا۔ اندرونی تپش کی وجہ سے اس کے نقوش بگڑتے جا رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔

ایک مختصر وقفے کے بعد ریوالور والا خطرناک ترین کھیل شروع ہوا۔ منچلوں کی ٹولیاں گولی چلنے یا نہ چلنے کے حوالے سے بولی لگانے لگیں۔ دلوں کی دھڑکنیں بڑھ گئیں اور

پیشانیوں پر پسینہ چمکنے لگا۔ آج یہ کھیل اس طرح مزید سنسنی خیز ہو گیا کہ لطیف نامی سابقہ رِنگ ماسٹر نے کھیل کے آغاز میں ہی ''دو..... چھ'' کی بازی لگائی اور خود پر گولی چلائی۔ یہ گولی چل گئی اور وہ لہولہان ہو کر اسٹیج پر گر پڑا۔ اس کے تڑپتے ہوئے فربہ جسم کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کر بیک اسٹیج پر پہنچا دیا گیا۔

اگلی تین چار بازیوں میں خیر خیریت گزری۔ ان میں عمران نے بھی دو چھ کی ایک بازی کامیابی سے کھلی اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ جیتا۔ توقع تھی کہ پچھلی مرتبہ کی طرح اس بار بھی وہ اس میں سے بہت سارو پیہ مارکیٹوں کے برآمدوں میں سوئے ہوئے لوگوں میں بانٹ دے گا۔

ایک باوردی ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لیے اگلی قطار کے سامنے گھوم رہا تھا۔ نادیہ ویٹر کی ٹرے میں سے دو تین بار وِسکی کا پیگ اُٹھا چکی تھی اور اب نشے میں دکھائی دیتی تھی۔ اسی دوران میں دستور کے مطابق اسسٹنٹ منیجر عباس نے اناؤنسمنٹ کی۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہمیشہ کی طرح ہم آج بھی حاضرین میں سے باہمت افراد کو اسٹیج پر آنے اور قسمت آزمانے کی دعوت دیتے ہیں۔ کھیل کے اصول اور ضابطے آپ کو معلوم ہی ہیں۔''

تین چار منٹ کی اناؤنسمنٹ ختم ہوئی تو ایک ہٹا کٹا کلین شیو نوجوان اپنے دونوں کے لہراتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ حاضرین نے پُرجوش تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ریفری اسے قاعدے کے مطابق شرائط سے آگاہ کرنے لگا۔ عمران بھی قریب ہی موجود تھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے کن انکھیوں سے نادیہ کا چہرہ دیکھا اور میرے دل نے گواہی دی کہ آج نادیہ بھی ضرور اس کھیل میں شرکت کرے گی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد میرے دل کی گواہی حرف بہ حرف درست ثابت ہو گئی۔ جب حاضرین میں سے ایک نے ''ایک..... چھ'' اور دوسرے نے ''دو..... چھ'' کا کھیل کھیل لیا تو اس مرتبہ نادیہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ تالیوں کا بے پناہ شور اُٹھا اور اس شور میں وہ اسٹیج پر چڑھ آئی۔

عمران نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''وہی جو تم سب کو نظر آ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''نہیں..... نہیں..... تم صرف تماشائی ہو'' عمران نے اسے کرسی پر بیٹھنے سے روک دیا۔

''میں اپنی مرضی اور خوشی سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔'' وہ حتمی انداز

میں بولی۔

''بڑی میڈم ناراض ہوں گی۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' عمران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نادیہ کے گارڈز کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

گارڈز بھی اسٹیج پر پہنچ گئے مگران میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ وہ نادیہ کی مرضی کے بغیر اسے واپس لے جاسکتے۔

دو تین منٹ یہ تنازع جاری رہا مگر نادیہ نے ایک نہیں مانی۔ وہ کھیلنا چاہتی تھی۔ اسے ہلاشیری دینے والے تماشائی بھی مسلسل شور مچا رہے تھے۔ آخر گارڈز کو نیچے اُترنا پڑا۔ نادیہ نے چھپے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے پھر اعلان کیا کہ وہ بھی ''دو...... چھ'' کھیلے گی۔ یعنی دو خانوں میں گولی، چار خانے خالی۔ عمران اور اسسٹنٹ عباس نے اسے ایک بار پھر منع کیا۔ عمران نے کہا کہ اگر وہ کھیلنا ہی چاہتی ہے تو ''ایک...... چھ'' کھیل لے۔ اس معاملے پر ایک بار پھر بحث ہوئی۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طور پر راضی ہوگئی۔ شاید ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد اب وہ خود بھی موت کا لمس محسوس کر رہی تھی۔

بولی شروع ہوئی۔ پانچ دس منٹ کے شور شرابے کے بعد بولی ڈیڑھ چھ پر ختم ہوئی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں نادیہ کو ایک لاکھ بیس ہزار ملنے تھے، چلنے کی صورت میں مخالف گروپ کو چار لاکھ اسّی ہزار کی ادائیگی کی جانا تھی۔ عام طور پر یہ بولی ایک چھ کے ریشو پر ختم ہوتی تھی۔ مگر کچھ بھی تھا، نادیہ لڑکی تھی۔ اس لیے تماشائیوں نے اُسے رعایتی نمبر دے کر بولی کو ڈیڑھ چھ تک پہنچا دیا تھا۔

نادیہ نے ریوالور کا چیمبر کھولا اور اس میں اعشاریہ تین آٹھ کی چمکتی ہوئی گولی داخل کی۔ اس کے بعد چیمبر بند کر کے اس نے چرخی کو کئی بار گھمایا اور اپنے پہلو میں مقررہ جگہ پر رکھ لیا۔ ریفری نے حسبِ دستور آگے بڑھ کر ریوالور کی پوزیشن چیک کی اور تین چار قدم پیچھے ہٹ کر عمران کے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا۔ پنڈال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ نادیہ نے اپنی انگلی لبلبی پر رکھی۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے، چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ یقیناً الکحل کی حرارت بھی اس کے اندر موجود تھی جو اسے نتائج سے بے پروا کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبایا۔ پانچ خانے خالی تھے۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا۔ مگر امکان تو آخر امکان ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مکافاتِ عمل بھی بندے کو انوکھے انداز میں آواز دیتا ہے۔ کبھی کبھی مشکل آسانی میں ڈھل جاتی ہے اور آسانی نہایت سنگین مشکل میں بدل جاتی ہے۔ نادیہ نے ٹریگر دبایا تو دھماکے سے گولی چلی۔ میں نے نادیہ کو اُچھل کر کرسی سے گرتے دیکھا۔ سب

سے پہلے اس کا سر ہی زمین سے ٹکرایا تھا۔ پنڈال میں لوگ چلّا اُٹھے اور اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے۔ وہ اوندھے منہ گری تھی۔ اس کا ریوالور مخالف سمت میں گرا تھا۔ عمران نے ریوالور اُٹھایا اور پھر نادیہ کی طرف لپکا۔ ''نادیہ...... نادیہ۔'' وہ زور سے چلّایا۔

گارڈز بھی بھاگتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ آئے۔ نادیہ کو اُٹھا کر اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ اس کے پہلو سے...... پسلیوں سے ذرا نیچے، خون کا اخراج بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں لوگ اسے لے کر اسٹیج کے عقب میں اوجھل ہوگئے۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ میں بھی اقبال کے ساتھ اُٹھا اور پنڈال سے باہر آ گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ نادیہ کا اسٹریچر تیزی سے ایک اسٹیشن وین میں رکھا جا رہا تھا۔

O......❖......O

نادیہ مخدوش حالت میں تھی اور ایک بہت مہنگے پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ نادیہ کو گولی لگنے سے کچھ دیر پہلے جس سابقہ رِنگ ماسٹر کو ''دو...... چھ'' کے کھیل میں گولی لگی تھی، وہ رات پچھلے پہر چار بجے کے قریب جاں بحق ہوگیا تھا۔ اس کے بارے میں اگلے روز دوپہر کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر آئی اور یہی خبر متوقع تھی۔ ''رِنگ ماسٹر لطیف اپنے کام سے گھر واپس جا رہا تھا۔ مدینہ کالونی کی ایک تاریک گلی میں دو نامعلوم افراد نے اس سے موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کی۔ ناکامی پر اس کے پیٹ میں گولی ماری اور فرار ہوگئے۔ لطیف کو ہسپتال پہنچایا گیا مگر وہ زخموں سے جانبر نہ ہوسکا۔''

ہم نے فون پر عمران سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا۔ ''نادیہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اس کا آپریشن ہوگیا ہے اور آکسیجن لگی ہے۔''

اقبال نے پوچھا۔ ''کیا ہمیں ہسپتال آنا چاہیے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی نہیں۔ جب میں کہوں گا پھر آ جانا۔''

''ہر طرح سے خیریت تو ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''خیریت ہے۔ میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

بے شک نادیہ نے اپنی مرضی اور بے حد اصرار کے ساتھ ریوالور والے کھیل میں حصہ لیا تھا اور اس کے کئی ایک گواہ بھی تھے۔ تاہم میں اور اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ نادیہ کی مرضی کے پیچھے کسی اور کی مرضی بھی تھی۔ ہاں...... کوئی اور تھا جس نے بڑی ہوشیاری سے نادیہ جیسی چوکس و چنڈال لڑکی کو اس کرسی تک پہنچایا گیا جہاں سے لڑھک کر وہ سیدھی اسٹریچر پر آئی۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سلیم کی دردناک موت کا جواب عمران نے کل رات دیا تھا اور ایسے انداز سے دیا تھا کہ کوئی کوشش کے باوجود اس پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ بندے کی نفسیات میں گھسنا جانتا تھا اور یہاں وہ بڑی کامیابی سے نادیہ جیسی پیچیدہ عورت کی نفسیات میں گھسا تھا۔

میں نے اقبال سے پوچھا۔ ''تمہیں عمران نے اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں پتا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوگا؟''

''نہیں...... بس تمہاری طرح ایک اندازہ سا تھا کہ اگلے چند دن میں کچھ نہ کچھ ہوگا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ وہ سلیم کے قتل کو آسانی سے فراموش نہیں کرے گا۔''

''مگر کل رات جو کچھ ہوا، اس میں حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ اتفاق کو بھی تو دخل ہے۔''

''تم نادیہ کو گولی لگنے کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں...... وہ صرف ایک گولی ڈال کر کھیلی تھی اور وہی گولی اس کو لگ گئی۔''

''شاید اسی کو کرموں کا پھل کہتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کے شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نادیہ نے دوسرے کھلاڑیوں کی طرح اپنے ہاتھ سے ریوالور کھولا تھا۔ اپنے ہاتھ سے گولی ڈالی تھی۔'' اقبال نے کہا۔

''ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جب بُری گھڑی آئی ہو تو سارے اسباب خودبخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کل رات کوئی بیس خانوں والا ریوالور ہوتا تو بھی نادیہ کو گولی لگ جانی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلیم کی بیوہ اور بچوں کی آہیں بہت اوپر تک گئی ہیں۔''

شام کو عمران کا فون آیا کہ نادیہ کی حالت بدستور خراب ہے۔ اس نے کہا کہ ہم عیادت کے لیے ہسپتال آئیں۔

ہم گلبرگ کے ایک شاندار پرائیویٹ ہسپتال پہنچے۔ یہاں لابی میں میڈم کے کئی جاننے والے موجود تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر صدیقی موجود ہوا تو وہ مجھے یا عمران کو پہچان سکتا ہے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ اندیشہ عمران کے ذہن میں بھی ہوگا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ہمیں بلاتا ہی نہیں۔

میڈم صفورا کے تعلقات کافی وسیع تھے۔ ایم این اے گورایا کے علاوہ انتظامیہ کے چند افسر بھی ہسپتال کی لابی میں نظر آئے۔ میڈم صفورا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کچھ میڈیکل رپورٹس تھیں اور وہ سیل فون پر مسلسل کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

اسی دوران ایک سرجن صاحب آپریشن تھیٹر کی طرف سے نمودار ہوئے۔ سرجن کو دیکھ کر میڈم صفورا نے سیل فون پر بات ختم کر دی اور سرجن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سینئر سرجن اور میڈم کے درمیان انگلش میں جو بات چیت ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

''ہاں...... پروفیسر صاحب! اب کیا کہتے ہیں آپ؟''

''پیچیدگی بڑھ رہی ہے میڈم! گردے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے لیکن......''

''بات پوری کیجیے پروفیسر!'' میڈم کی آواز میں گرج تھی۔

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسے وقت میں پروفیسر اشفاق شاہ سے بہتر کوئی سرجن مل سکتا ہے۔ میری بے لاگ رائے ہے کہ کم از کم پاکستان میں ایسے آپریشن کا رسک صرف وہی لے سکتے ہیں۔''

''تو کہاں ہیں وہ؟ کتنی دیر میں یہاں پہنچ سکتے ہیں؟''

''وہ...... وہ شاید ایک ہفتے میں بھی نہ پہنچ سکیں۔ وہ مانٹریال میں ہیں۔ ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو پروفیسر کہ وہ شخص بہترین ہے؟'' میڈم نے آپ سے تم پر اُترتے ہوئے کہا۔

''یس میڈم! وہ بہترین ہیں۔''

''تو پھر اسے یہاں بلاؤ پروفیسر! کسی بھی طرح۔ کسی بھی قیمت پر۔ مجھے اپنی بہن کی زندگی چاہیے۔'' میڈم کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

پروفیسر سرجن نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر میڈم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ غالباً وہ اس نازک موضوع پر تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز رات نو بجے کے قریب ہمیں یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ سینئر پروفیسر سرجن اشفاق شاہ مانٹریال میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر پاکستان پہنچ گئے ہیں اور وہ آج رات نادیہ کا ایک بڑا آپریشن کریں گے۔

یہ پیسے کی اور تعلقات کی طاقت تھی۔ ایک مسیحا کو ہزاروں میل دور سے صرف ایک رات میں پاکستان بلا لیا گیا تھا۔ اتنا طویل سفر کر کے وہ یہاں آتے ساتھ ہی مسیحائی میں مصروف ہوگیا۔ میری اطلاع کے مطابق یہ نہایت مشکل آپریشن رات گیارہ بجے شروع ہوا اور صبح چار بجے تک جاری رہا۔ عمران بھی وہیں ہسپتال میں موجود تھا۔ اقبال گاہے بگاہے فون

کر کے معلومات حاصل کر لیتا تھا۔

آپریشن کامیابی سے ختم ہوگیا۔ سارا دن خیریت سے گزرا۔ تاہم اگلے روز شام کو پتا چلا کہ نادیہ کی حالت بدستور نازک ہے۔ اس کے نچلے دھڑ نے حرکت کرنا بند کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اس کے لیے پریشان تھے۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ عمران اور اقبال خبر گیری کے لیے پھر ہسپتال چلے گئے، میں گھر میں ہی رہا۔

میں نادیہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس جیسی سفاک عورت کے لیے میرے دل میں ہمدردی کا کوئی گوشہ نہیں تھا۔ میں دوسرے زاویے سے سوچ رہا تھا۔ سرکس کے اسپیشل شو میں اسے جس طرح گولی لگی تھی، وہ واقعہ حیران کن تھا۔ اسے گولی لگنے کا امکان بہت کم تھا لیکن اسے گولی لگ گئی۔ یہ ایک اتفاق تھا جو ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی...... بہرطور اس کے نہ ہونے کے امکان زیادہ تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس میں کسی انوکھے پن کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں اقبال سے بھی تبادلہ خیال کیا تھا۔ اس نے بھی فقط حیرانی ہی ظاہر کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر خوش بھی تھا کہ بہت کم چانس ہونے کے باوجود نادیہ کو قرار واقعی سزا ملی ہے۔

اقبال سے بات کر کے بھی مجھے یہی لگا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا اس رات نظر آیا ہے۔ اس میں کوئی چھوٹا موٹا پھیر ضرور ہے۔ شاید عمران اور اقبال وہ ''پھیر'' مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ میرا ذہن مختلف انداز میں اور مختلف اطراف میں سوچتا رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کھیل میں استعمال ہونے والے خاص ریوالور میں کوئی ٹمپرنگ کی گئی ہو یا ریوالور کی لوڈنگ میں کسی طرح کا کوئی چکر چلایا گیا ہو؟ مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کھیل کے دوران میں عمران اور عباس سمیت اس ریوالور کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسی ریوالور سے پہلے بھی چھ سات افراد کھیل چکے تھے۔ پھر نادیہ نے اپنے ہاتھ سے ریوالور میں گولی رکھی تھی۔ اسے خود چیک کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ریوالور کی چرخی کئی مرتبہ گھمائی تھی۔ سراج کے سوا اس معاملے میں کسی شخص نے کسی طرح کے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ صرف اس نے کہا تھا کہ جس ریوالور سے نادیہ کو گولی لگی، اسے چیک کرنا چاہیے۔ کہیں سرکس والوں نے اس میں تو کوئی گڑ بڑ نہیں کی۔ وہ سرکس والوں کی بات کر رہا تھا لیکن ظاہر تھا کہ اس کی مراد عمران سے ہے۔ بہرحال اس کی بات پر ابھی تک کسی نے کان نہیں دھرے تھے۔

میں سوچتا رہا اور کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اسی دوران میں لائٹ چلی گئی۔ سائیڈ ٹیبل پر ایک بڑے سائز کی موم بتی موجود تھی۔ میں نے اسے روشن کرنا چاہا مگر ماچس نہیں ملی۔ عمران کی

جیبوں میں اکثر لائٹر موجود رہتا تھا۔ میں نے وارڈ روب میں ٹٹول کر اس کی جیکٹ تلاش کی یہ بہت سے کپڑوں کے نیچے پڑی تھی۔ لائٹر کے لیے اس کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے اچانک میری اُنگلی ایک سوراخ کے اندر چلی گئی۔ یہ سوراخ اس کی قیمتی جیکٹ میں سامنے کی طرف موجود تھا۔ میں حیران ہوا۔ اسی دوران میں ایک جیب سے لائٹر اور سگریٹ کا پچکا ہوا پیکٹ بھی مل گیا۔ میں نے موم بتی روشن کی اور جیکٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جیکٹ جدید فیشن کی تھی۔ سامنے کی طرف چمکیلی اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے RING سے لگے ہوئے تھے۔ یہ سوراخ ایسے ہی ایک RING میں موجود تھا اور بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے سیاہ جیکٹ کو موم بتی کے بالکل قریب کیا اور دھیان سے دیکھنے لگا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ گولی کا سوراخ ہے۔ سوراخ کے کناروں پر جلنے کے آثار موجود تھے۔ یکا یک میری رگوں میں خون سنسنا اُٹھا۔ عمران آج کل یہی جیکٹ پہن رہا تھا مگر پچھلے دو دن سے یہ جیکٹ اس کے جسم پر نظر نہیں آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے جیکٹ آخری بار اسی رات پہنی تھی جب ہم اس کے ساتھ سرکس گئے تھے اور اسپیشل شو ہوا تھا۔ ایک دم ایک منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ یہ وہی اسپیشل شو کا منظر تھا۔ اسٹیج پر ریوالور والا گیم ہو رہا تھا۔ نادیہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ریفری اور عمران اس سے بس تین چار فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ عمران نے یہی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ہاں یہی جیکٹ۔ عمران کے دونوں ہاتھ حسبِ عادت جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔

''اوہ مائی گاڈ'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میری پھٹی پھٹی نظریں بدستور چرمی جیکٹ کی جیب کے سوراخ پر جمی تھیں۔ تو کیا۔ اس رات جیکٹ میں ریوالور موجود تھا اور اس ریوالور سے گولی چلائی گئی تھی؟ ایک ایسی گولی جس کا رُخ نادیہ کی طرف تھا۔

میرا گلا خشک ہوگیا۔ میں بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کی نظریں عقابی اور اس کا نشانہ بے خطا ہے۔ جو شخص چاقو سے بالکل ٹھیک نشانہ لگا سکتا تھا، اس کے لیے آتشیں اسلحے سے نشانہ لگانا کون سا مشکل تھا۔ تو کیا اس رات نادیہ کو اپنے ریوالور کی گولی نہیں لگی تھی؟

ایک بار پھر وہ سارے مناظر میرے تصور کے پردے پر نمایاں تر ہو گئے۔ دھماکے سے گولی چلی تھی۔ نادیہ اُلٹ کر فرش پر گری تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دوسری طرف گرا تھا۔ یہ ریوالور عمران نے ہی اُٹھایا تھا پھر وہ نادیہ کو سنبھالنے لپکا تھا۔

ایک دم واقعات کی کئی کڑیاں آپس میں ملنے لگیں۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ ہاں...... اس رات ضرور کچھ انوکھا ہوا تھا۔ شاید ایک شعبدہ جس نے بہت سے لوگوں کی نظر بندی کر دی تھی۔ ٹریگر نادیہ نے دبایا تھا لیکن گولی کہیں اور سے چلی تھی اور اس کام کی ٹائمنگ اتنی درست تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔ شاید ٹریگر دبانے والی کو بھی نہیں۔

میری ہتھیلیاں پسینے سے نم ہونے لگیں۔ میں نے لائٹر واپس جیکٹ کی جیب میں رکھا اور جیکٹ کو کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ اسی طرح جس طرح وہ پہلے پڑی تھی۔

میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اگر عمران نے واقعی ایسا کیا تھا تو بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں مختلف زاویوں سے سوچنے لگا۔ ان میں سے ایک زاویہ یہ بھی تھا کہ اگر فرضِ محال نادیہ والے ریوالور کی گولی بھی چلتی تو کیا ہوتا؟ کیا دو گولیاں نادیہ کو لگتیں؟ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اُلجھ رہا تھا لیکن میرا یہ شک بتدریج پختہ یقین میں بدل رہا تھا کہ اس رات ''ڈبل گیم'' ہوا تھا اور ایسا ڈبل گیم عمران جیسا شخص ہی کھیل سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے ایک عجیب طرح کا ہراس میرے اعصاب پر سوار ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اگر کسی طرح میڈم صفورا بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اسے پتا چل گیا کہ نادیہ کو موت کے منہ میں پہنچانے والے ہم ہیں تو وہ قیامت برپا کر دے گی۔ خود اقبال کا بھی یہی تجزیہ تھا کہ وہ اوپر سے جتنی دھیمی نظر آتی ہے، اندر سے اتنی ہی تلاطم خیز ہے۔ خاص طور سے اپنی چھوٹی بہن کے لیے تو وہ ہر حد تک جا سکتی ہے۔

نادیہ کی حالت بدستور نازک تھی۔ اس کے حوالے سے کسی بھی وقت کوئی اچھی بُری خبر آ سکتی تھی۔

مجھے اکیلے گھر میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ میں کمرے سے نکلا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر آ گیا۔ ہوا میں ہلکی خنکی موجود تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ یہ رات بارہ بجے کا عمل تھا۔ بستیاں اونگھ رہی تھیں اور سو رہی تھیں۔ دور فاصلے پر مینارِ پاکستان کی روشنی بھی جیسے کسی گمبھیر سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ عمران کو فون کروں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں چھت پر ٹہلتا رہا۔ ذہن پر صرف اور صرف عمران کی سیاہ جیکٹ چھائی ہوئی تھی۔ اَن گنت اندیشے دل و دماغ میں سر اُبھارنے لگے۔

اچانک مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ آہٹ گھر کی عقبی گلی سے اُبھری تھی۔ تب مجھے دو سائے دکھائی دیئے۔ وہ گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ حرکت کر کے اوجھل ہو گئے۔ یکا یک

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے سے پھٹنے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جو آہٹ سنائی دی، وہ گھر کے عقبی صحن سے اُبھری تھی اور یہ کسی کے صحن میں کودنے کی آواز تھی۔ کوئی گہری تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر صحن میں کودا تھا۔ میں نے اس کودنے والے کو بڑی تیزی سے برآمدے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ یہ گرانڈیل شخص کوئی اور نہیں شیرا ہے۔ تو کیا...... تو کیا وہی ہوا تھا جس کے بدترین اندیشے موجود تھے؟ میڈم اور اس کے ہرکاروں کو اصل معاملے کی ٹوہ لگ گئی تھی؟ دونوں طرف کی چھتیں کافی نیچی تھیں ورنہ میں ان میں سے کسی چھت پر کود جاتا۔ میں شدید خوف کے عالم میں خود کو بمشکل سنبھالتا ہوا زینوں سے اُترا اور پہلی منزل پر پہنچا۔ میرا گلا خشک ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ نچلی منزل کے نصف زینے طے کر کے میں اس قابل ہو گیا کہ گراؤنڈ فلور کے دو کمروں میں جھانک سکوں۔ ان میں سے ایک کمرہ وہ تھا جہاں میں کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ میری روشن کی ہوئی موم بتی ابھی تک سائیڈ ٹیبل پر روشن تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے مجھے لگا کہ شاید کمروں میں کوئی نہیں اور میرے اندیشوں نے مجھے کسی وہم کا شکار کیا ہے۔ تاہم کچھ دیر بعد یہ خوش فہمی مکمل طور پر دور ہو گئی۔ میں نے کمرے میں دو سائے دیکھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں یقیناً پسٹل تھا۔ وہ بڑے چوکس انداز میں دروازے کی طرف رُخ کیے کھڑا تھا۔ دوسرا سایہ الماری کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ مدھم روشنی میں مجھے اس کی حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ الماری میں سے کپڑے اور دیگر اشیاء اُٹھا اُٹھا کر قالین پر پھینک رہا تھا۔

اسی دوران میں گھر کے پہلو کی طرف سے بھی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ شاید ان کا تیسرا ساتھی گھر کی بغلی راہداری میں موجود تھا۔ مجھے اس کے بھاری قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے دوبارہ کمرے میں جھانکا تو ہر اندیشہ سچ کا روپ دھارنے لگا۔ اندر گھسنے والے ایک شخص کے ہاتھ میں وہی جیکٹ نظر آئی جو کچھ دیر پہلے میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ شخص جیکٹ کی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ تب شاید وہ جیب کے سوراخ تک پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر جیکٹ کو دیکھا اور پھر موم بتی کے بالکل پاس پہنچ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

میرے لیے وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سات آٹھ زینے چڑھ کر واپس پہلی منزل پر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس منزل کی ایک کھڑکی پڑوسی زاہد حسین کی چھت کی طرف کھلتی ہے۔ میں اس کھڑکی کے ذریعے اس چھت پر اُتر سکتا تھا۔

مجھے نہیں پتا میں کب کچن کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ کب میں نے کھڑکی کھولی اور کب میرے پاؤں ساتھ والے گھر کی چھت سے ٹکرائے۔ میں زینے اُتر کر زاہد کے گھر کی بغلی راہداری میں پہنچا۔ زاہد انڈین فلموں کا شوقین تھا۔ اندر کسی کمرے میں اس وقت بھی فلم لگی ہوئی تھی۔ ہیروئن کی آواز آ رہی تھی۔ کتنا حسین موسم ہے۔ کتنا سکون...... کتنی خوبصورتی۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ یہیں پر ٹھہر جائے۔

جواب میں غالباً ہیرو کی آواز اُبھری۔ یہ رات ایک دلہن جیسی ہے۔ مجھے تو تمہارے ساتھ ساتھ اس رات سے بھی پیار ہو رہا ہے۔

کتنا تضاد تھا اس فلمی مکالمے میں اور موجودہ صورتِ حال میں۔ میرے لیے یہ رات اور اس رات کی یہ گھڑیاں قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھیں۔ اردگرد کی ہر شے مجھے اپنی نگاہوں میں گھومتی محسوس ہوتی تھی اور سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ چند ساعتوں کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ زاہد کو مدد کے لیے پکاروں مگر پھر میں نے یہ ارادہ بدل دیا۔ میں جانتا تھا کہ گھر میں زاہد، اس کی بیوی اور ایک چھوٹے بچے کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا اور یہ تینوں اس قابل نہیں تھے کہ شیرے اور اس کے گماشتوں کے خلاف میری فوری مدد کر سکتے۔

میں راہداری سے گزرا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جاؤں۔ کچھ فاصلے پر جا کر ہی میں کسی کو مدد کے لیے کہہ سکتا تھا یا پھر عمران اور اقبال وغیرہ کو فون کر سکتا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ گلی میں کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا کہ یہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو گھر میں گھسے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف دیکھتا اور کسی شک میں پڑتا، میں نے نیچے جھک کر خود کو ایک گاڑی کی اوٹ میں کر لیا۔ یہ سوزوکی کا ''ہائی روف'' ڈبا تھا۔ گلی سنسان تھی، چھپنے کے لیے اردگرد کوئی جگہ موجود نہیں تھی اور وہ شخص کسی بھی لمحے مجھے گھوم کر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ڈبے کے اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس سوزوکی ڈبے کے اندر گھس گیا۔

تب میری نظر ایک اور شے پر پڑی اور میں حیران ہوا۔ سوزوکی ڈبے کی چابی اگنیشن میں ہی موجود تھی۔ یہی وقت تھا، جب گلی میں کھڑے سائے ایک سے دو ہو گئے۔ مجھے لگا کہ انہوں نے مجھے ڈبے میں گھستے دیکھ لیا ہے اور اگر نہیں دیکھا تو بھی شک میں ضرور مبتلا ہو گئے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا۔ میں نے نیچے جھکے جھکے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ میری

توقع پوری ہوئی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ مجھے یہ سب کچھ تائید غیبی کی طرف لگ رہا تھا۔ گاڑی کے دروازے کا کھلا ملنا، اگنیشن میں چابی موجود ہونا اور پہلے ہی سیلف میں انجن کا اسٹارٹ ہو جانا۔ یہ سب کچھ میری ہنگامی ضرورت کے مطابق تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گیئر لگا کر گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

مجھے اپنے پیچھے دونوں سایوں کی تیز حرکت دکھائی دی۔ وہ پہلے گاڑی کی طرف لپکے تھے پھر اسے پہنچ سے دور دیکھ کر رک گئے تھے۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان کا تعلق گھر میں گھسنے والوں میں سے تھا۔ رات کے وقت یہ اندرونی سڑک سنسان تھی۔ میں گاڑی کو تیزی سے بڑی سڑک پر لے آیا اور یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں ایک گاڑی کی تیز رفتار روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ گاڑی بھی اندرونی سڑک سے نکلی تھی اور اب بلا کی طرح میرے پیچھے آ رہی تھی۔

میری زندگی میں اب تک جو سب سے بُرا واقعہ پیش آیا، وہ سیٹھ سراج والا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس سے بھی بُری صورتِ حال کا شکار ہونے والا ہوں۔ وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کے اندیشے اب تک میرے ذہن میں کلبلاتے رہے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ عمران جو ان سارے حالات کا ذمے دار تھا اور جس کی وجہ سے میں اس مشکل ترین پچویشن میں پھنسا تھا، وہ بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں مجھے اس پر بہت طیش آیا۔ اس کی وہ دلیری و جرأت بھی قابلِ نفرت شے محسوس ہوئی جس کا میں اب تک معترف رہا تھا۔

گاڑی پوری رفتار سے میرے پیچھے آ رہی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ گاڑی کسی پولیس اسٹیشن میں گھسا دوں؟ یا پھر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں بہت سے لوگ موجود ہوں؟ وہاں جا کر دہائی مچاؤں کہ میری مدد کی جائے یا پھر......

کئی خیالات برق رفتاری سے ذہن میں آ اور جا رہے تھے مگر عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ عمران سے سیل فون پر رابطہ کروں۔ جیب پر ہاتھ مارا تو جیب خالی تھی۔ پتلون کی جیبیں بھی خالی تھیں۔ فون موجود ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو شاید اس صورتِ حال میں مَیں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ نمبر ڈائل نہ کر سکتا۔ پیچھے آنے والی گاڑی اب بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے آنے والی کار بھی سوزوکی مہران تھی۔ اس میں وہی چادر پوش شخص نظر آیا جو گلی میں ٹہل رہا تھا۔ خوف کے باوجود میرے اندر تھوڑا طیش بھی جمع ہو رہا تھا۔ جی چاہا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کو سائیڈ مار کر سڑک سے اُتارنے کی کوشش کروں۔ یہی وقت تھا جب ایک موڑ پر میری گاڑی کو زور دار جھٹکا لگا۔ گو کہ موڑ پر اسپیڈ بہت

تیز نہیں تھی مگر جھٹکا شدید تھا۔ گاڑی سائیڈ کے پختہ کنارے سے ٹکرائی تھی۔ مجھے جو آخری احساس ہوا، وہ یہ تھا کہ گاڑی اُلٹ رہی ہے اور میرا دل دایاں کندھا کھڑکی سے ٹکرایا ہے۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا۔ ایک گہرا اندھیرا تھا جس نے ہر طرف سے مجھے ڈھانپ لیا تھا۔ اس اندھیرے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔

○......❖......○

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سامنے کمرے کی سفید ڈیزائن دار چھت دکھائی دے رہی تھی۔ میں کسی بستر پر چت لیٹا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ کسی نے مجھے اُٹھنے سے روک دیا لیکن ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ تب مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ میں ایک سنگل بیڈ کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ میرے جسم کے گرد نائیلون کی زرد رسّی نظر آ رہی تھی۔

میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے ایکسیڈنٹ سے پہلے پہنا ہوا تھا۔ میرا دایاں کندھا اور بازو زخمی تھا، یہاں سے قمیص پھاڑ دی گئی تھی۔ کندھے اور بازو پر سے جلد بہت بُری طرح چھلی ہوئی تھی۔ ان زخموں پر کوئی مرہم لگایا گیا تھا۔ گھڑی پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی اور کھڑکیوں سے باہر دھوپ کے آثار تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں سولہ سترہ گھنٹے بعد میں ہوش میں آیا ہوں۔ یہ ایک متوسط درجے کا گھر تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر چند دوائیں اور انجکشن وغیرہ رکھے تھے۔

"کوئی ہے؟" میں نے پکار کر کہا۔ میرا گلا بالکل خشک تھا۔

ایک جواں سال عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ عام سے لباس میں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو اس کا دودھ پی رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوتے عورت نے بچے کو خود سے پیچھے ہٹا کر اپنی قمیص برابر کر لی۔ وہ شکل سے شریف نظر نہیں آتی تھی۔ جیسے کہ بعد میں پتا چلا، اس کا نام تابندہ تھا اور وہ بازاری عورت تھی۔

"کیہہ گل ہے؟" اس نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ مجھے باندھا کیوں گیا ہے؟"

"ان ساری باتوں کے جواب تو میرا بندہ ہی آ کر دے سکتا ہے۔ بس وہ آنے ہی والا ہے۔ باقی تُو نے کوئی پانی شانی پینا ہو تو مجھ کو بتا؟"

میں نے ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کی مگر رسّی کی بندشیں بڑی مضبوط تھیں۔ کئی جگہوں پر رسّی میرے جسم کے اندر گھس رہی تھی۔

"میرا قصور کیا ہے؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"تیرے قصوروں کا بھی میرے بندے کو ہی پتا ہے۔ مجھے تو بس ایک بات بتائی ہے انہوں نے تُو گاڑیاں شاڑیاں چوری کرتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کون چوری کرتا ہے گاڑیاں؟"

"پولیس جب چھتر مارے گی نا تو سب کچھ بتاؤ گے تم۔ ویسے شکل سے تو تم بھلے مانس لگتے ہو۔ پتلون بھی پہنی ہوئی ہے۔ عام بندہ دیکھے تو یقین نہ کرے کہ چور ہو۔"

میرا سر پہلے ہی بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اس عورت کی باتوں سے بالکل ہی گھومنے لگا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پانی مانگا۔ وہ پانی لینے چلی گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کو رسّی کی بندشوں کے اندر ہی ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ ہل رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہڈیاں سلامت ہیں۔ بس کندھے، بازو اور گردن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ یہ رگڑ کی چوٹیں تھیں۔ کل رات والے سارے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے ایک موڑ پر سوزوکی ڈبے کو تیزی سے بائیں طرف کاٹا تھا پھر جھٹکا لگا تھا اور مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

وہ پانی لے آئی اور تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے پلایا۔ اس کے جسم سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ اتنے میں کمرے سے باہر اس کا بچہ رونے لگا۔ اس نے محتاط نظروں سے میری رسّی کی بندشیں چیک کیں اور باہر چلی گئی۔ "سنو...... میری بات سنو۔" میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ تکلیف اور شدید پریشانی کے باوجود میرے ذہن پر غنودگی چھا رہی تھی۔ شاید یہ مجھے دی جانے والی دواؤں کا اثر تھا۔

میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں باندھنے والے لوگ کون ہیں؟ عمران اور اقبال کو میرے حالات کا علم ہوا ہے یا نہیں؟ اگر مجھے شیرے وغیرہ نے ہی یہاں تک پہنچایا ہے تو پھر ابھی تک کوئی شناسا صورت کیوں دکھائی نہیں دی؟ میں ارد گرد کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ غالباً یہ گھر کسی گنجان آبادی میں نہیں تھا۔ ہاں...... اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ یہ شہری علاقہ ہی ہے۔ کچھ فاصلے سے والز آئس کریم والے سائیکل سوار کا میوزک سنائی دیا۔ اس بے جا شور پر کسی کتے نے آئس کریم والے کو ڈانٹ پلائی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میرے سر کے چکروں میں اضافہ ہوتا گیا، آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ چھانے لگی۔ مجھ پر ایک بار پھر شدید غنودگی کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا سارا جسم آگ میں پھنک رہا ہے۔

اگلا کافی سارا وقت عجیب بے ہوشی یا غشی کی کیفیت میں گزرا۔ مجھے بس یہ احساس تھا کہ میں اسی کمرے میں موجود ہوں، میرے بدن کے کچھ حصوں پر نائیلون کی رسّی بُری طرح چبھ رہی ہے۔ میرے اردگرد کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ کمرے میں آتے اور جاتے ہیں۔ ان میں ایک بہت بھاری آواز والا شخص بھی ہے۔ میں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں اس بھاری آواز والے شخص سے کچھ کہا بھی۔ کیا کہا یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ پھر شاید میں نے اپنی والدہ کو پکارا۔ فرح کو آواز دی۔ اس کے بعد مجھے بازو پر سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے انجکشن لگایا جا رہا ہے۔ مجھے شاید بہت تیز بخار ہو چکا تھا۔ کسی نے میرا سر بھگو دیا۔ میں نے زور لگا کر رسیاں توڑنے کی کوشش کی۔ میں نے کسی کو گالی دی۔ تب مجھے لگا کہ میں ایک بار پھر کسی گہرے تاریک کنویں میں اُترتا جا رہا ہوں۔ اس پُرخوف تاریکی میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔ مجھے اندر سے بُری طرح توڑ پھوڑ رہے تھے۔ میں پتا نہیں کہ کب تک اس کنویں کی گہرائی میں زماں و مکاں کی قید سے آزاد پڑا رہا۔ تب ایک بار پھر میرے حواسِ خمسہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیانی خلا میں چکرانے لگے۔ یہ شاید دن کا وقت تھا، آنکھوں کی بند پلکوں پر سرخ روشنی پڑ رہی تھی۔ تب اس روشنی میں سے میری بے باک کزن آرسہ کا سراپا نمودار ہوا۔ وہ اپنی جوبن بھری اداؤں سے مجھے رجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ تم اس دن گیارہ بجے آئے کیوں نہیں تھے؟ تم آ جاتے تو میں تمہیں زندگی کا مفہوم سمجھا دیتی۔ تمہیں سر سے پاؤں تک سیراب کر دیتی۔ میں نے اسے سخت ڈانٹ پلائی۔ میں نے کہا کہ تم دھوکے باز ہو۔ تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔ تم ثروت کے پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو۔ میں نے تمہاری وہ ساری باتیں سنی تھیں جو تم اپنی کسی سہیلی سے کر رہی تھیں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے کردار پر۔ وہ ایک دم اوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنی پیاری بہن فرح کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''یہ کیا ہوا بھائی! آپ قاتل تو نہیں ہو سکتے۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔'' اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''نہیں میری بہن! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں ان دونوں کے ساتھ تھا۔''

فرح نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن اپنے بھائی پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

تب ایک دم میں ہڑپہ کے کھنڈرات پہنچ گیا۔ وہاں گرما کی ایک نہایت گرم و سنسان دوپہر تھی۔ دھول اُڑ رہی تھی، بگولے چکرا رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں ثروت کا ہاتھ تھا۔ ہم

بھاگ رہے تھے۔ جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ گہرے سانولے چہروں اور سرخ آنکھوں والے کچھ قدیم لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ پیاس سے میرے جسم میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ میری زبان خشک چمڑے کا ٹکڑا ہو کر رہ گئی تھی۔ میرے گلے میں زہریلے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پھر میرے کانوں سے وہی بھاری آواز ٹکرائی جو اس بے ہوشی و نیم بے ہوشی میں گاہے بہ گاہے میری سماعت میں داخل ہوتی تھی۔ یہ بھاری آواز کرخت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''منہ کھول...... منہ کھول۔''

میں نے لبوں کو حرکت دی۔ ٹھنڈا پانی...... آبِ حیات کی طرح میرے ہونٹوں، دانتوں اور زبان سے ٹکرایا۔ پھر گلے کے زہریلے کانٹوں کو اپنی ٹھنڈک سے ڈھانپنے لگا۔

''لگتا ہے کہ ہوش میں آ رہا ہے۔'' نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ شاید یہ وہی عورت تھی جس کے سینے سے میں نے شیر خوار بچے کو چمٹے دیکھا تھا۔

غنودگی اور بیداری کے ریلے سے آتے رہے۔ پھر میری بے ہوشی شاید نیند میں بدل گئی۔ میں اپنے اردگرد دیکھنے کے قابل ہوا تو کمرے میں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں نو بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میرے بازو پر گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ بڑی سُست رفتاری سے ایک ایک قطرہ گر رہا تھا۔ میرے گرد رسّیوں کی مضبوط بندشیں بدستور موجود تھیں۔ صرف وہ بازو آزاد تھا جس پر انجکشن وغیرہ دینے کے لیے ''کینولا'' لگایا گیا تھا۔

میں نے کسی کو پکارنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ٹھٹک گیا۔ مجھے ساتھ والے کمرے سے باتوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یقیناً یہ وہی طوائف نما عورت تھی جس سے پہلے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ غالباً وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں سو رہا ہوں یا نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوں۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف اس کی کوئی بے تکلف سہیلی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ہائے...... ہائے اب میں تجھ سے بھی چھپاؤں گی۔ اگر چار پیسے ہتھ آئے ہوتے تو سب سے پہلے تیرا کرجا (قرضہ) اُتارتی۔ نئیں...... نئیں تیرے سر کی قسم۔ میں تجھ سے بھلا جھوٹ بول سکدی ہوں۔ نئیں نئیں یہ تو ٹھیک ہے کہ آبادی میں سب سے کھاتا پیتا گھر وہی تھا، پر اندر سے کچھ ملا نئیں ہے۔ اوپر سے وہ گڈی والا مسلہ ہو گیا۔ ہاں ہاں رشید، ماجھو اور کالا اندر وڑے ہوئے تھے۔ گلجار اور جیرا باہر پہرا دے رہے تھے۔ وہ خبیث شاید چھت پر تھا۔ اس نے اوپر سے ہی دیکھ لیا کہ گھر میں لوگ وڑ آئے ہیں۔ اس نے ساتھ والی چھت پر چھال ماری اور وہاں سے باہر سڑک پر آ گیا۔ اب دیکھو اللہ کی مرجی...... وہ رشید والی گڈی میں ہی وڑ گیا۔ گڈی کی چابی بھی گڈی کے اندر ہی تھی۔ اس نے اسٹارٹ

کی اور گڈی تو ردی (چلا دی) گلجار اور جیرے نے جب دیکھا کہ اپنی ہی گڈی ہتھ سے نکلنے لگی ہے تو دوسری گڈی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دوڑے۔ بتی والے چوک سے تھوڑا پہلے وڈی باغیچی کے پاس اس خبیث نے گڈی اُلٹا دی۔ اس کے سر اور مونڈھے پر سخت چوٹیں آئی ہیں۔ گلجار اور جیرے کے دماک نے ٹھیک کام کیا۔ انہوں نے اپنی گڈی روک دی اور دو چار راہ گیروں کے ساتھ مل کر اس خبیث کو اپنی گڈی میں ڈال لیا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ وہ اسے یہاں لے آئے۔"

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔

تابندہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "رشیدے اور ماجھو کا کیا بنتا تھا۔ جب انہوں نے اندر سے دیکھا کہ اپنی دونوں گڈیوں نے ایک دم آگے پیچھے دوڑ لگا دی ہے تو وہ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ کوئی کھترا ہو گیا ہے۔ وہ بھی گھر سے نکل کر پچھلی آبادی کی طرف بھج (بھاگ) گئے۔"

تابندہ قریباً دس منٹ مزید باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ان میں سے رشید نام کا بندہ اس عورت کا رسمی یا اصلی خاوند ہے۔ باقی اس کے رسمی دیور بنے ہوئے ہیں۔ اس چرب زبان عورت کی اسی نوے فیصد باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان باتوں سے مجھ پر ایک حیران کن انکشاف ہوا اور وہ انکشاف یہ تھا میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہوا ہوں۔ اس رات ہمارے گھر میں گھسنے والے بندے صرف اور صرف وارداتیے تھے۔ ان کا میڈم صفورا یا سیٹھ سراج وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی ان میں شیرا یا بختیار وغیرہ شامل تھے۔ مجھے اپنے دل و دماغ میں درد کی ٹیسیں محسوس ہوئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ صرف میرے اندرونی اندیشے تھے جنہوں نے مجھے حالات کی ایک بالکل غلط تصویر دکھائی اور میں ان وارداتیوں کو میڈم کے ہرکارے سمجھ کر اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔ دوسرا غلط اتفاق یہ ہوا کہ میں نے موقع سے بھاگنے کے لیے انہی وارداتیوں کی گاڑی استعمال کر لی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی گاڑی کا پیچھا تو کرنا ہی تھا۔ ان کے پاس Cover کے طور پر دوسری گاڑی بھی موجود تھی۔ وہ اس پر میرے پیچھے آئے اور نتیجے کے طور پر میں یہاں زخمی حالت میں اس چار دیواری میں آ پھنسا۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ یہ سب کچھ اس طرح سے کیوں ہوا؟ کیوں میں نے اس سارے معاملے کو میڈم صفورا اور نادیہ وغیرہ سے نتھی کر دیا؟ اگر میں کچھ اور نہ بھی کرتا، بس پڑوسی زاہد حسین کو بتا دیتا اور وہ شور مچا کر محلے والوں کو جگا دیتا تو وارداتیوں نے راہِ فرار

اختیار کر لینی تھی اور ممکن تھا کہ ان میں سے ایک دو پکڑے بھی جاتے۔ مگر میری شدید غلط فہمی اور جلد بازی کی وجہ سے صورتِ حال کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ وہ مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کمرے میں ایک شخص کو عمران کی جیکٹ کا معائنہ کرتے دیکھا تھا اور میرے دماغ نے اس کے سوا اور کچھ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ میڈم صفورا کے لوگ ہیں اور انہیں نادیہ کے زخمی ہونے کی اصل وجوہات معلوم ہو چکی ہیں۔

تو عمران ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی اندرونی ناتوانیوں کے سبب حالات کا بدترین پہلو دیکھتے ہیں۔ دنیا جہاں کے اندیشے انتہائی برق رفتاری سے ان کے دماغ میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔

تابندہ سیل فون پر اپنی گفتگو ختم کر کے میرے والے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر تک ایک الماری میں سے کچھ تلاش کرتی رہی۔ میں آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ وہ میری طرف آئی اور میرے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلا کر بولی۔ "اوئے اُٹھ جا اب کب تک مُردے کی طرح بے سدھ پڑا رہے گا۔ جو چن تُو نے چڑھانا تھا وہ تو چڑھا دیا ہے۔"

میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھے ترس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"پانی پیئے گا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شاید گلوکوز کی وجہ سے پیاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"کچھ نہ کچھ پی لے۔ پھر تو شاید تیری قربانی ہو ہی جانی ہے۔" وہ کھڑکی کا پردہ درست کرتے ہوئے بولی۔ اس کا رُخ دوسری طرف تھا۔

پتا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ میری طرف مڑی تو میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا دیدے پاڑ پاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہہ دی ہے۔ تُو نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔ لگتا ہے کہ تجھے اور تیرے یاروں کو کسی پیر فقیر کی بددعا لگ گئی ہے۔"

"پپ..... پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔" میں نے نہایت نحیف آواز میں کہا۔ اپنی آواز خود مجھے بھی اجنبی لگ رہی تھی۔

وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تُو شکل سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے۔ پھر تُو ایسے کھترناک لوگوں کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟"

"کون لوگ؟" میں کراہا۔

"وہی جن کے تُو نام لے رہا تھا عمران اور پتا نہیں دوجا نام کیا تھا۔ کمال کہ اقبال۔"
میں چکرا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے کب ان کے نام لیے ہیں۔ اچانک مجھے لگا کہ شاید میں بخار کی بے ہوشی میں کچھ بڑبڑاتا رہا ہوں۔ تابندہ نامی یہ عورت بدستور مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں پھانسی کا مجرم ہوں اور مجھے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جانے والا ہے یا پھر میں ایک جاں بلب مریض ہوں اور کسی ایسے آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر کی طرف روانہ ہونے والا ہوں جس سے میرے بچنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تابندہ کے دیکھنے کے انداز نے مجھے انجانے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

اگلے دو چار منٹ میں میرے اور تابندہ کے درمیان جو بات ہوئی، اس نے مجھ پر ایک اور لرزہ خیز انکشاف کیا اور یہ انکشاف یہ تھا کہ میں شدید بخار کے دوران میں بڑبڑاتا رہا ہوں۔ میں نے بہت سارا ہذیان بولا ہے اور اس میں کچھ ایسی باتیں بھی شامل ہیں جو مجھے ہرگز ہرگز نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ میرے جسم کے ہر مسام میں سے پسینہ بہہ نکلا۔ مجھے محسوس ہوا، شاید میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔

تابندہ کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ گمبھیر انداز میں کہہ رہی تھی۔ "تیرے بکھار (بخار) کی بے ہوشی نے تیرے بہت سے پردے کھول دیے ہیں۔ تُو نے لال کوٹھیوں کی بات کی ہے اور کسی وڈی میڈم کی بات کی ہے۔ تُو نے قسمیں کھائی ہیں کہ تُو نے چھوٹی میڈم کو گولی نہیں ماری۔ تُو نے اس کا الجام اپنے یار عمران پر لگایا ہے اور کہا ہے کہ تجھے بھی اس گل کا پتا بعد میں چلا تھا۔ بس اسی طرح کی بکواس کی ہے تُو نے لگتا ہے کہ تُو نے رشید اور اس کے یاروں کو "لال کوٹھیوں والے" سمجھا ہے۔ انہیں دیکھ کر تُو جس طرح گھر سے نکلا ہے اور بھاگا ہے، اس سے بھی یہ شک پکا ہو گیا ہے کہ تُو نے اور تیرے یاروں نے ضرور کوئی کارنامہ کیا ہے اور کیا پتا قتل شتل ہی کر دیا ہو۔" میرا سر چکرانے لگا۔ یہ عورت کیا کہہ رہی تھی؟ کیا میں واقعی یہ سب کچھ اپنی زبان سے کہہ چکا تھا؟ میرا دل چاہا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں اور پھر کبھی ہوش میں نہ آؤں۔ شاید اسی لیے کچھ دیر پہلے اس تابندہ نام کی عورت نے کہا تھا کہ جو چن تُو نے چڑھانا تھا وہ چڑھا دیا ہے۔

تابندہ کی دل ہلا دینے والی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "لگتا ہے کہ تیرے بھیڑے نصیبوں پر ٹھپا لگ گیا ہے۔ جو کچھ تُو نے بکھار کی حالت میں کہا ہے، اس پر شاید میرا بندہ اور اس کے یار جیادہ گور (غور) نہ کرتے۔ پر میرے بندے رشید کے یاروں میں سے گلبجار اس چھوٹی وڈی میڈم کو جانتا ہے جس کی تُو نے بات کی ہے۔ اسے

یہ بھی پتا ہے کہ ان میں سے ایک میڈم کو گولی لگی ہے اور وہ ہسپتال میں پڑی ہے۔ اب سمجھ لے کہ تیری کتنی بھیڑی کمبختی آنے والی ہے۔" وہ مجھے ڈرا رہی تھی۔ اس کے انداز میں تھوڑا تھوڑا ترس تھا اور تھوڑا تھوڑا مزہ بھی۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ بولی۔ "ویسے یہ عمران اور کمال کون ہیں اور اب کہاں ہیں؟" وہ اقبال کو کمال کہہ رہی تھی۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ سر اور گردن کے پچھلے حصے میں شدید ٹیسیں اُٹھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں سے جلد بُری طرح چھلی ہوئی ہے۔

"دیکھ...... ابھی تھوڑی دیر میں سارا پتا تو چل ہی جانا ہے۔ اگر تُو اپنے منہ سے بتا دے گا تو شاید تیری کچھ بچت ہو جائے۔"

اسی دوران میں کسی ساتھ والے کمرے سے دھم کی آواز اور پھر ایک بچے نے یکبارگی رونا چلانا شروع کر دیا۔ یقیناً یہ تابندہ کا بچہ ہی تھا۔ وہ نیند میں بیڈ پر سے نیچے پکے فرش پر گر گیا تھا۔

"ہائے میں مری۔" تابندہ نے کہا اور اُٹھ کر تیزی سے بچے کی طرف چلی گئی۔ اس کی گود سے موبائل اور ایک تڑا مڑا سا کاغذ نیچے دری پر گر پڑا لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ یہ وہی موبائل تھا جس پر وہ ابھی کچھ دیر پہلے اپنی کسی سہیلی سے بے تکان باتیں کر رہی تھی۔ بچے کو شاید زیادہ چوٹ لگی تھی۔ وہ پورے زور سے چلاتا جا رہا تھا۔ "ہائے میں مرگئی۔ سارا ہوٹ (ہونٹ) پاٹ گیا ہے۔" اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

پھر وہ بچے کو لے کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ غالباً وہ اس کا خون بند کرنے کے چکر میں تھی۔ میری نظر نیچے دری پر پڑے سیل فون کی طرف گئی۔ میرا ایک بازو رسّی کی بے رحم بندشوں سے آزاد تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو میں اپنا ہاتھ اس سیل فون تک پہنچا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور زور لگا کر اپنا ہاتھ نیچے دری تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ہاتھ موبائل تک تو نہیں پہنچا تاہم مڑا تڑا کاغذ ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے سینے پر رکھ کر اسے کھولا۔ یہ شاید کوئی فون بل تھا۔ میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا اور دوبارہ موبائل فون کے لیے کوشش کرنے لگا۔ بندشیں بڑی سخت تھیں۔ جہاں تک میرا ہاتھ پہنچتا تھا، وہاں تک کوئی گرہ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے پوری طاقت لگا کر جسم کو دائیں بائیں ہلایا اور رسّی کے بل ذرا ڈھیلے کرنے کی کوشش کی۔ اس میں بہت تھوڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک بار پھر بازو لمبا کر کے فون سیٹ تک پہنچانا چاہا۔ اس

بار کامیاب ہوا۔فون سیٹ میری دوانگلیوں کے درمیان آگیا۔اس جان توڑ کوشش میں میری گردن اور کندھے کے زخموں پر جیسے قیامت گزر گئی تھی۔

برآمدے کی طرف سے جو آوازیں آ رہی تھیں،ان سے پتا چلتا تھا کہ تابندہ بچے کا منہ وغیرہ دھونے میں مصروف ہے۔وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے موبائل پر عمران کا نمبر پریس کیا۔موبائل کان سے لگایا،دوسری بیل پر ہی کال ریسیو ہوگئی۔عمران کی آواز آئی۔''ہیلو......کون؟''

''عمران!میں تابش بول رہا ہوں۔''میں نے تیز سرگوشی کی۔

''تابش!کہاں ہو تم......تم نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔تم خیریت سے تو ہو۔''

''عمران!میں خیریت سے نہیں ہوں اور یہاں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔یار!مجھے کچھ لوگ اُٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔مجھے رسیوں سے باندھا گیا ہے۔میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔''

''کون لوگ ہیں؟''عمران کے لہجے میں یکلخت شدید فکرمندی در آئی۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ان کے نام رشید،جیرا اور ظفر وغیرہ ہیں۔ایک بازاری عورت تابندہ بھی ان کے ساتھ ہے۔یہ کوئی عام [illegible] ہے۔''

''کچھ تھوڑا بہت اندازہ بھی نہیں کہ کون سی جگہ ہے؟''

اچانک میرا دھیان اس فون بل کی طرف چلا گیا جو زمین سے اُٹھایا تھا۔میں نے جلدی جلدی بل کھول کر دیکھا اور عمران کو بتایا کہ مجھے ایک فون بل ملا ہے اس پر مختصر سا ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔اب معلوم نہیں کہ یہ یہاں کا ایڈریس ہے یا کسی اور جگہ کا۔

''تم ایڈریس بتاؤ۔''عمران تیزی سے بولا۔

''[illegible] شیر۔مکان نمبر 18۔لالہ زار اسکیم۔نظامی روڈ۔''ساتھ ہی میں نے فون نمبر بھی لکھوا دیا۔

''وہاں اس وقت تمہارے آس پاس کتنے لوگ ہیں؟میرا مطلب ہے کہ اس چار دیواری میں؟''

''ابھی تو صرف ایک عورت اور اس کا بچہ ہیں۔کچھ دیر بعد کا پتا نہیں۔''میں نے سرگوشی کی۔

''تم بے فکر رہو۔میں پہنچ رہا ہوں۔''

''کوئی آ رہا ہے۔میں بند کر رہا ہوں۔''قدموں کی چاپ سن کر میں نے فون بند کیا اور ہاتھ لمبا کر کے دوبارہ دری پر رکھ دیا۔

تابندہ اپنے جسم کو ہلکورے دیتی تیزی سے آئی۔میری طرف دیکھے بغیر وہ الماری کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دراز کھول کر جلدی جلدی کچھ ڈھونڈنے لگی۔قریبی کمرے میں بچے کے رونے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔تابندہ ایک دوائی اور روئی لے کر پھر باہر نکل گئی۔

میں اپنی جگہ چت لیٹا رہا اور دل کی دھڑکنیں گنتا رہا۔آنے والے وقت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔عمران کو یہاں پہنچنے میں ناکامی ہوسکتی تھی۔اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی تابندہ کا شوہر اور اس کے ساتھی واپس آسکتے تھے اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ جو ایڈریس میں نے عمران کو لکھوایا ہے،وہ کسی اور جگہ کا ہو۔

تابندہ بچے کے چکر میں پڑ کر وقتی طور پر مجھ سے غافل ہوگئی تھی۔کمرے کے آخری گوشے میں لوہے کے ایک اسٹینڈ پر پی ٹی سی ایل کا فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔میں دور ہی سے دیکھ سکتا تھا کہ اس سیٹ پر سی آئی ایل نہیں ہے۔میں نے زور لگا کر اور بازو لمبا کر کے نیچے سے موبائل سیٹ دوبارہ اُٹھایا۔فون بل پر لکھا ہوا فون نمبر مجھے یاد تھا۔میں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پر وہی نمبر پریس کیا۔میرا''تجربہ''کامیاب ثابت ہوا۔کمرے کے گوشے میں رکھے ہوئے پی ٹی سی ایل کے فون پر بیل ہوئی۔ابھی آدھی بیل ہی ہوئی تھی کہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔اس کے ساتھ ہی میں نے موبائل سیٹ اور فون کا بل پھر سے دری پر پھینک دیئے۔اب مجھے اس بات کی تسلی ہوگئی تھی۔ہاں......کم از کم اس بات کی تسلی ہوگئی تھی کہ میں نے عمران کو جو ایڈریس دیا ہے وہ اسی چار دیواری کا ہے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں نے امید وبیم کی عجیب کیفیت میں گزارے۔بخار ایک بار پھر بڑھ رہا تھا۔پورا جسم پھکنا شروع ہوگیا تھا۔کیا میں ایک بار پھر بے ہوشی یا نیم بے ہوشی سے دوچار ہو جاؤں گا؟یہ سوال بڑا اہم تھا۔دل پر بہت بوجھ تھا جیسے کسی نے بڑے بھاری پتھر سینے پر رکھ دیئے ہوں اور یہ بوجھ انہی باتوں کا تھا جو ابھی تابندہ نے مجھے بتائی تھیں۔تابندہ کے منہ سے چھوٹی اور بڑی میڈم کا ذکر سننے کے بعد اس کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ میں اپنے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال وغیرہ کے لیے بھی ایک بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔

عمران کی آمد میری توقع سے پہلے ہوگئی۔گھر کی کال بیل سنائی دی،میرا دل بُری طرح

اُچھلا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ تابندہ کا مبینہ شوہر اور گلزار وغیرہ آ گئے ہیں۔ مگر پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تابندہ کسی کے لیے گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول رہی ہے۔ یہ دروازہ گلی کی طرف سے کھلتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ عمران تھا اور اس نے خود کو رشید کا دوست ظاہر کیا تھا۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی عمران نے تابندہ کو دبوچ لیا۔ جب وہ دونوں میرے سامنے آئے تو یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ عمران نے تابدہ کو عقب سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کی ایک ہتھیلی تابندہ کے ہونٹوں پر جمی تھی اور تابندہ کی آنکھیں خوف سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ وہ منہ سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکال پا رہی تھی۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ کمرے کے اندر آنے تک تابندہ کی مزاحمت بس دس پندرہ فیصد ہی رہ گئی تھی۔

عمران اسے باتھ روم میں لے گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر پستول کی نال رکھی اور پھنکارا۔ ''اپنی اور بچے کی خیریت چاہتی ہو تو آواز نہ نکالنا۔''

اس کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا۔ ساری تن فن جاتی رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور گھگیائی۔ ''مجھے اور کاکے کو کچھ نہ کہنا۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔''

''تو چپ چاپ یہاں کھڑی رہو۔'' عمران کا لہجہ سفاک تھا۔

''مم...... میرے بچے کو یہاں لا دو، وہ رو رہا ہے۔''

بچہ واقعی اپنے سینے کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی سانس رُک جائے گی۔

باتھ روم کو باہر سے کنڈی لگا کر عمران دوسرے کمرے میں چلا گیا اور روتے چلاتے بچے کو لے آیا۔ اس کا چہرہ زخمی تھا۔ عمران نے باتھ روم کی کنڈی کھول کر بچہ تابندہ کے حوالے کیا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ دہشت زدہ تابندہ نے ہمارے سامنے ہی قمیص اوپر کی اور بچے کو اپنے ساتھ لگا کر دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ پانچ دس سیکنڈ بعد دودھ اور بچے کا ملاپ ہو گیا اور اس کا رونا دھونا تھم گیا۔ عمران نے جیب سے چاقو نکالا اور بڑی پھرتی سے میری بندشیں کاٹ دیں۔ میں کھڑا ہوا تو مجھے چکر سے آنے لگے۔ عمران نے گلوکوز کی ڈرپ میرے جسم سے علیحدہ کی اور میرا جوتا ڈھونڈا۔

''جیبیں دیکھ لو۔ تمہارا کوئی سامان تو نہیں ہے یہاں؟''

میں نے پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میں نے باتھ روم میں کھڑی تابندہ سے پوچھا۔ ''میری چیزیں کدھر ہیں اور میرا موبائل؟''

''تت...... تمہاری جیب سے کچھ پیسے...... شناختی کارڈ اور ایک پین نکلا تھا، وہ ساری

چیجیں وہاں دراج میں پڑی ہیں۔'' اس نے سامنے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

''اور موبائل؟''

''موبائل نئیں تھا تمہارے پاس۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

مجھے یاد آیا کہ موبائل واقعی میرے پاس نہیں تھا۔ راستے میں جب گلزار وغیرہ نے مہران کار پر میرا پیچھا شروع کیا تو میں نے عمران سے رابطہ کرنے کا سوچا تھا مگر پھر پتا چلا تھا کہ موبائل تو میں گھر پر ہی کہیں چھوڑ آیا ہوں۔

میں نے دراز میں سے اپنی باقی چیزیں سمیٹیں۔ عمران نے تابندہ کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے کی تلقین کی اور باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میں قریباً 72 گھنٹے بستر پر رہا تھا۔ مثانے میں بہت سا پانی جمع ہو چکا تھا۔ میں ایک قریبی باتھ روم میں گیا۔ دو تین منٹ بعد ہم مکان سے باہر نکلے۔ یہ ایک درمیانے درجے کی زیر تعمیر آبادی تھی۔ اس مکان کے اردگرد کئی پلاٹ خالی اور ویران پڑے تھے۔ عمران اپنی مہران کار میں آیا تھا۔ ہم کار میں بیٹھے اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے دس کا عمل تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے کراہتی آواز میں عمران سے پوچھا۔

''گھر۔''

''گھر نہیں...... کہیں اور چلو۔ کسی ریسٹورنٹ میں۔'' میرا لہجہ اندیشوں سے لبریز تھا۔

عمران نے گاڑی بائیں جانب موڑ دی۔ ہم وحدت روڈ پر سے گزرے اور پھر ایک تکا شاپ پر جا بیٹھے۔ ''کچھ کھاؤ گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں...... مجھے بس کوئی جوس پلا دو۔'' میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

''تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ چلو پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' عمران نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''نہیں...... عمران نہیں۔ ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔ معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔'' میری آواز بیٹھ رہی تھی۔

''یار! کتنا بھی خراب ہے، ہم اسے ٹھیک کر لیں گے۔ تم پہلے خود کو ٹھیک کرو۔ مجھے تمہاری حالت اچھی نہیں لگ رہی۔''

میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ نادیہ کی حالت اب کیسی ہے؟''

عمران کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''وہ ہسپتال میں ہی ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ اس کا نچلا دھڑ کام نہیں کر رہا ہے۔ بے ہوشی بھی اسی طرح ہے۔''

''اس کی موت کا ذمے دار کون ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کک...... کیا مطلب؟''

''دیکھو عمران! اگر میری اور اپنی دوستی کا دم بھرتے ہو تو مجھے ایک سوال کا جواب سچ سچ دینا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ کیا میں توقع رکھوں کہ تم ایسا کرو گے؟''

اس نے پھر ایک طویل سانس لی اور تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ''پوچھو۔''

''اسپیشل شو میں نادیہ کو گولی کیسے لگی تھی؟'' میں نے بہت دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ ''تو تم نے میری وہ جیکٹ دیکھی ہے جس کی جیب میں سوراخ ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور گمبھیر آواز میں بولا۔ ''تابش! اس سوراخ سے کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔ کچھ بھی نہیں اور اس سوراخ کے علاوہ بھی کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔ بہرحال تم نے جو اندازہ لگایا ہے وہ درست ہے۔''

میرے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ میں نے کہنیاں میز پر ٹیک کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''عمران! تمہیں کچھ پتا نہیں۔ ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں۔'' میری آواز بھرا رہی تھی۔

اس نے میرا کندھا تھاما۔ ''اگر پھنس گئے ہیں تو نکل بھی جائیں گے لیکن پہلے تم خود کو سنبھالو اور مجھے آرام سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟ تمہارے جسم پر اتنی زیادہ چوٹیں کیسے آئیں؟ کیا کہیں ایکسیڈنٹ ہوا ہے تمہارا؟''

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور شروع سے ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں نے الماری میں اس کی جیکٹ دیکھی اور پھر پریشان ہو کر چھت پر چلا گیا۔ کیسے گھر میں وہ وارداتیے گھسے اور کس طرح ان سے بچنے کے لیے میں باہر گلی میں آ گیا۔ اس سے آگے کے سارے واقعات بھی میں نے عمران کے سامنے بیان کر دیئے۔ میں نے اپنی اس حماقت کا اعتراف کیا کہ میں رشید اور گلزار کو میڈم صفورا کے ساتھی سمجھا اور مجھے یہی لگا کہ وہ لوگ نادیہ کو گولی لگنے کے بارے میں سب

کچھ جان گئے ہیں۔ میں نے کہا۔

''جب وہ لوگ میرے پیچھے آئے تو میرا یہ یقین پکا ہوگیا کہ وہ عام وارداتیے نہیں بلکہ میڈم کے لوگ ہیں۔ اس وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں ان کی گاڑی میں ہی فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد بتی چوک کے قریب ایکسیڈنٹ ہوا اور مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں لالہ زار اسکیم کے اس گھر میں تھا۔''

عمران نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تابش! یہ سب کچھ تمہاری غلط فہمی کی وجہ سے ہوا لیکن شکر کا مقام یہ ہے کہ گاڑی اُلٹنے کے باوجود تم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے اور اس سے بھی زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ تم نے ہمت دکھائی اور اس عورت کے موبائل سے مجھے کال کر دی۔ اب تم محفوظ ہو۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تم چاہو گے تو ان لوگوں سے بھی بعد میں نمٹ لیں گے۔ ویسے گھر میں سے اقبال کی گھڑی اور میرے دس پندرہ ہزار روپے کے سوا کچھ گیا نہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ تمہارے زخموں کو توجہ کی ضرورت ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بخار بھی بڑھتا جا رہا ہے۔''

میں نے نہایت پریشانی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں عمران! تم نے ابھی اصل بات سنی نہیں ہے۔ میں...... تمہارے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔ تمہارے لیے بھی اور شاید اپنے لیے بھی۔ میں بہت بدقسمت ثابت ہوا ہوں تمہارے لیے۔''

عمران کی فراخ پیشانی پر سلوٹیں اُبھریں۔ اس نے پیار سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''تابی یار! پلیز خود کو کمپوز کرو۔ جو کچھ بھی ہوا ہے مجھے بتاؤ۔ میں سنوں گا اور میں سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ پلیز بتاؤ۔''

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ زخمی ہونے کے بعد اپنے شدید بخار کے بارے میں بھی اور غشی کی حالت میں کی جانے والی ان باتوں کے بارے میں بھی جنھوں نے رشید، گلزار اور جیرے وغیرہ کو بے طرح چونکایا تھا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ گلزار چھوٹی اور بڑی میڈم کو جانتا ہے اور اسے یہ بھی پتا ہے کہ میڈم نادیہ گولی لگنے سے شدید زخمی ہو چکی ہے۔ میری باتیں سننے کے بعد وہ تینوں شدید شک میں پڑ گئے ہیں۔ تابندہ نے مجھے خود بتایا ہے کہ رشیدا اور گلزار بڑی میڈم سے ملنے ایئر پورٹ کی طرف گئے ہیں۔ ایئر پورٹ سے ان کا مطلب ''لال کوٹھیاں'' ہی ہے۔ یہ کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔

عمران گم صم میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ہمیشہ مسکراتا چہرہ گہری سنجیدگی سے ڈھک گیا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی انگلیوں میں جکڑی اور آنکھوں کی نمی نمایاں تر ہوگئی۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''عمران! تم سے کہا تھا نا مجھ سے نہ چمٹو۔ مجھے دفع ہو جانے دو۔ میرا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا، یہی ہونا تھا۔ اب نہیں ہوتا تو کچھ دن بعد ہو جاتا۔ تم جس طرح کی زندگی جی رہے ہو اس میں میرے جیسے معمولی اور کم فہم بندے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا کہ کسی نہ کسی موقع پر میری وجہ سے تم شدید نقصان اُٹھاؤ گے اور تم نے اُٹھا لیا ہے۔ تم نے اُٹھا لیا ہے عمران! سیٹھ سراج جیسے لوگ تو میڈم صفورا کو پہلے ہی شک میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے، اب میرے اقبالی بیان کے بعد ان کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میڈم صفورا اب چپکی بیٹھی رہے گی۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ وہ تمہیں معاف نہیں کرے گی عمران۔''

عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شاید ہمارے ستارے گردش میں ہیں۔ ہم سے ایک اور غلطی ہو چکی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم مجھے راستے میں بتا دیتے تو ہم اس تکا شاپ میں نہیں آتے۔ چلو اُٹھو، جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ جلدی کرو۔'' وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ اس نے میرا بازو تھاما اور مجھے اُٹھایا۔

افراتفری کے عالم میں وہ مجھے لے کر اس ریسٹورنٹ سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ شاپ نادیہ کے سینئر گارڈ...... اس حرامزادے بختیار کی ہے۔'' وہ بولا۔

اس نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی کے عقب میں کوئی شخص سوزوکی ایف ایکس پارک کر گیا تھا۔ عمران نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور مسلسل بجاتا چلا گیا۔ ریسٹورنٹ کے اندر سے ایک ہٹا کٹا شخص سرعت سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لفافے تھے۔ اس نے ہماری طرف دیکھ کر معذرت کے انداز میں سر ہلایا۔ ''سوری'' بولا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے صرف ایک لفظ سوری کہہ کر اپنی جان چھڑائی تھی لیکن اس کی غلطی کی قیمت ہمیں کیا دینا تھی؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس شخص کے اندر بیٹھتے اور گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے وہ ہو گیا جس کا اندیشہ کم از کم میرے ذہن میں تو نہیں تھا۔ نیلی وردی والا ایک گارڈ بھاگتا ہوا ریسٹورنٹ کی بیرونی سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا پھر اس نے ہماری گاڑی کی طرف اُنگلی سیدھی کی۔ اس کے عقب میں دو افراد اور تھے۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔ وہ ہمیں پکارتے

ہوئے ہماری طرف دوڑے۔ ''رُکو...... رُکو......'' آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔

''کتے کے بچے۔'' عمران نے دانت پیس کر کہا اور گاڑی کو ریورس کرتا چلا گیا۔ عقب میں ایف ایکس والے نے ابھی اپنی گاڑی پوری طرح ہٹائی نہیں تھی۔ ہماری گاڑی کا پچھلا حصہ اس کی گاڑی کے عقب سے ٹکرایا اور وہ گھوم کر رہ گئی۔ عمران جیسے ایک دم ہی ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کی مہم جو اور خطر پسند فطرت ایک انگڑائی کے ساتھ بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے مہران کار کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ پہیوں نے رگڑ کھا کر طویل احتجاجی آواز نکالی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ریسٹورنٹ سے برآمد ہونے والے سادہ پوش افراد بڑی سرعت سے ایک جیپ میں بیٹھ رہے تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ بختیار وغیرہ کو اطلاع پہنچ گئی ہے۔'' عمران نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

عمران کے کہنے کا مطلب یقیناً یہی تھا کہ رشید اور گلزار وغیرہ میڈم صفورا تک جا پہنچے ہیں اور انہوں نے مرچ مسالے کے ساتھ سب کچھ میڈم کے گوش گزار کر دیا ہے۔ اس کے بعد میڈم اپنے ہرکاروں کو حرکت میں لے آئی ہے۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔'' عمران نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔

جیپ بڑی تیزی سے پیچھے آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہاتھ مسلسل ہارن پر رکھا ہوا تھا۔ عمران نے برق رفتاری سے گاڑی کو دو تین سڑکوں پر موڑا مگر جیپ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے عقب میں رہی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جیپ سوار اس قسم کی کارروائی کے ماہر ہیں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کہ جیپ کی سواریوں میں بختیار یا شیرا خود بھی شامل ہوں۔

عمران کچھ دیر تک تناؤ میں رہنے کے بعد ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ ہر قسم کے تفکرات کے بادل یکا یک اس کے ذہن سے چھٹ گئے ہیں۔ اس کی جگہ ایک عجیب سے جوش اور توانا انداز نے لے لی تھی۔

''گھبرانا نہیں جگر۔'' اس نے میرا شانہ تھپکا۔ ''دیکھنا کیا تگنی کا ناچ نچاتا ہوں ان بندروں کو۔''

اور واقعی اگلے تین چار منٹ میں اس نے کمال کی ڈرائیونگ کی۔ اب را[illegible]بج چکے تھے۔ سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا لیکن جہاں کہیں رش تھا، وہاں سے بھی عمران گولی کی رفتار سے گزر گیا۔ وہ موت کے کنویں کا کھلاڑی تھا۔ نہایت تیز لیکن محفوظ ڈرائیونگ اس کا

خاصہ تھی۔ چار پانچ منٹ بعد گاڑی کا عقب نما آئینہ جیپ کی عدم موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ ہم آندھی کی طرح راوی روڈ کے علاقے سے داتا دربار کے ایریا میں پہنچ چکے تھے۔ اپنے عقب سے مطمئن ہونے کے بعد عمران نے گاڑی ایک چھوٹی سڑک پر کھڑی کی۔

وہ جلد از جلد اقبال سے رابطہ کر کے اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اقبال کو کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران میں میری نگاہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھے اخبار پر پڑی۔ یہ شام کا اخبار تھا۔ ایک خبر نے میری توجہ کھینچ لی۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر یہ چھوٹی سی خبر تھی۔ ساتھ میں تصویر بھی تھی۔ دراصل یہ تصویر ہی تھی جس نے مجھے متوجہ کیا۔ یہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار صدیقی کی تصویر تھی۔ اس نے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ پھیلی ہوئی سیاہ ڈاڑھی کے نیچے سے سرخ ٹائی کی ناٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ خبر میں لکھا تھا۔ ''ایڈووکیٹ صدیقی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ پولیس کی تین ٹیمیں مصروف تفتیش ہیں۔ ڈی ایس پی جہانگیر۔''

نیچے خبر کے متن میں درج تھا۔ ''آج پانچ دن گزرنے کے باوجود ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کی پُراسرار گمشدگی کا معما حل نہیں ہوا۔ جہلم میں اپنے ایک گارڈ کی ہلاکت کے بعد ابرار صدیقی اپنے فلیٹ سے غائب پائے گئے تھے۔ یاد رہے کہ ابرار صدیقی ایک معروف قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ نوادرات میں زبردست دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں ''نوادر چوروں'' نے ہی نشانہ بنایا ہے۔ پولیس نے اس سلسلے میں معروف اسٹیٹ ڈویلپر میڈم صفورا شیرازی سے پوچھ گچھ کی ہے۔ مزید تفصیلات منظرِ عام پر آنے کا امکان ہے۔

اس خبر نے مجھے حیران کیا۔ عمران نے مجھے ابھی تک اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ شاید اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ چند دن پہلے عمران نے مجھے بے فکری سے نادیہ کی عیادت کے لیے کیوں بلا لیا تھا۔ اسے یہ خطرہ محسوس کیوں نہیں ہوا تھا کہ صدیقی مجھے یا اسے وہاں پہچان سکتا ہے۔ دراصل وہاں ہسپتال میں صدیقی کے موجود ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔

عمران سیل فون پر اقبال سے رابطہ قائم نہیں کر سکا۔ اس نے جھنجھلا کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

ہنجار عورت بول رہی ہے جس نے ایک خلقت کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب نہیں مل رہا۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔ مجھے تو لگتا ہے ٹی وی چینلز کی طرح یہ موبائل نیٹ ورک والے بھی وقفہ کرنے لگے ہیں۔ ملتے ہیں ایک چھوٹے سے

وقفے کے بعد۔ کہیں جایئے گا نہیں۔ ہمارے ساتھ رہیے گا۔ بس ایک چھوٹا سا بریک...... بس ایک چھوٹا سا۔ یار! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ہر ٹی وی چینل پر بھک منگے بیٹھے ہیں اور عوام سے ایک چھوٹے سے بریک کے لیے منتیں کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ اپنے تایا جی نیوز چینل چلاتے ہیں۔ وہ بھی اُٹھتے بیٹھتے بس چھوٹے سے بریک کے بارے میں سوچتے ہیں۔ بریک کیسے کیا جائے؟ کہاں کیا جائے؟ اور کتنی دیر کیا جائے؟ اپنے بیٹوں کو ہر وقت اسی موضوع پر لیکچر دیتے نظر آتے ہیں۔ بقر عید پر پتا ہے کیا ہوا؟''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ وقت گزاری کر رہا ہے۔

وہ بولا۔ ''تایا جی نے چالیس ہزار کا بکرا لیا۔ قربانی کے وقت بیٹوں نے بکرے کو گرا کر دبوچا۔ تایا جی نے چھری گردن پر رکھی۔ ذرا سی چھری چلائی اور ایک دم رُک گئے۔ بولے۔ تو یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک۔''

''وہ بکرے کو تڑپتا چھوڑ کر پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اطمینان سے چائے پینے لگے۔ بیٹے لے۔ ابا جی! بکرا تڑپ رہا ہے۔

فرمانے لگے۔ اسے تڑپنے دو۔ اس منظر کو غور سے دیکھو اور پروگرام میں ''بریک'' کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

سکون سے چائے پینے کے بعد انہوں نے دوبارہ چھری چلائی اور بکرے کی مشکل آسان ہوئی۔ بعد میں محلے کے مولوی صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے خوب لعنت ملامت کی اور تایا جی کو خوشخبری سنائی کہ ان کی قربانی ضائع ہوگئی ہے۔ اگر وہ......''

یکایک عمران ٹھٹک کر چپ ہوگیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور میرے جسم میں بھی سنسنی دوڑ گئی۔

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

للکار
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
2
طاہر جاوید مغل

اچانک ہی ایک گلی میں سے وہی منحوس جیپ برآمد ہوگئی۔ جس نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس مرتبہ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی جیپ کے ساتھ ہے۔

''لو جگر! تمہارے سسرالی پھر آگئے۔'' عمران نے کہا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا۔ ایک بغلی سڑک پر مڑتے ہوئے گاڑی کے ٹائروں نے تارکول سے رگڑ کھا کر زبردست شور مچایا۔ اردگرد کے لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک اندھا دھند ریس پھر شروع ہوگئی۔ عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے عمران کی آنکھوں میں عقابی چمک اُبھر آتی تھی۔ مینار پاکستان سے آگے نکل کر جب ہم راوی کے پل کی طرف بڑھ رہے تھے، یکا یک سائیڈ سے ایک اٹھانوے ماڈل مرسڈیز برآمد ہوئی۔ مرسڈیز والے نے بڑے خطرناک طریقے سے ہمارا راستہ روکنا چاہا۔ دونوں گاڑیاں لہراتی ہوئی کچے میں اُتر گئیں۔ ہر طرف دھول پھیل گئی۔ عمران نے مشاقی سے اپنی گاڑی کو نشیب میں لڑھکنے سے بچایا اور مرسڈیز کو چکمہ دے کر پھر پختہ سڑک پر آ گیا۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں میں فائر کی آواز گونجی۔ یہ فائر مرسڈیز سے کیا گیا تھا اور یقیناً ہمیں نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ گولی گاڑی کی باڈی میں کہیں لگی۔ پھر ایک اور فائر ہوا لیکن یہ بالکل خطا گیا۔ بغیر ٹول ٹیکس ادا کیے ہماری گاڑی طوفانی رفتار سے راوی کے پل سے گزری اور جی ٹی روڈ پر پہنچ گئی۔ تب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ جیپ سمیت کم از کم چار گاڑیاں ہمارے پیچھے آرہی ہیں۔ شاید تعاقب کرنے والوں نے سیلولر رابطے کے ذریعے شہر میں موجود اپنے مزید ساتھیوں کو تعاقب میں شامل کر لیا تھا۔ صورت حال ایک دم ہی نہایت خطرناک ہوگئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بدستور بے فکری رقصاں تھی۔

''معاملہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔
''کوئی بات نہیں۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' اس نے کہا اور ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

نغمہ گونجنے لگا۔ جیون چلنے کا نام، چلتے رہو صبح شام۔
''اگر انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تو؟'' میں نے پوچھا۔
''ہم انہیں پھول ماریں گے۔ دیکھنا وہ بڑے سخت پھول ہوں گے۔'' اس نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کپڑے میں لپٹا ہوا ماؤزر نکال کر گود میں رکھ لیا۔ ماؤزر کی جھلک نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میرا دل کہنے لگا کہ یہ ابر آلود رات بڑی سنگین ثابت ہونے والی ہے۔

میرا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ گردن اور سر کے پچھلے حصے سے شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ تاہم ان ٹیسوں کی تکلیف، حالات کی سنگینی میں دب سی گئی۔

عقب والی گاڑیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ہنڈا سب سے آگے تھی۔ یہ سرخ ہنڈا تھی۔ میں نے پہچان لیا، یہ وہی گاڑی تھی جس میں نادیہ ہمارے راوی روڈ والے گھر پر آتی رہی تھی۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہمارے عقب میں میڈم کے لوگ ہی تھے۔ تب اچانک عمران کے موبائل کی بیل ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اقبال نے ''کال بیک'' کیا ہے مگر دوسری طرف سے جو آواز اُبھری وہ سیٹھ سراج کی تھی۔ اس نے آتشیں لہجے میں کہا۔ ''عمران! گڈی روک دے بچے۔ نئیں تے نقصان ہووے گا تیرا۔ شاباش روک دے گڈی۔''

''گڈی نہیں رُکے گی چور چاچو! اگر تم نے واقعی اپنی امی کا دودھ پیا ہے تو کوشش کر کے دیکھ لو۔''

سرخ ہنڈا کار تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سراج اسی گاڑی سے بول رہا ہے۔ عمران نے اچانک گاڑی کو بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک پر اُتار دیا۔ عقب میں آنے والی دو گاڑیاں اپنی جھونک میں کچھ آگے نکل گئیں تاہم دو گاڑیوں کے بریک بروقت چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی ہمارے پیچھے آئیں۔ اس کے ساتھ ہی رائفل کا ایک فائر ہوا اور گولی چھناکے سے ہماری گاڑی کی پچھلی اسکرین کو توڑ کر ایک دروازے میں گھس گئی۔
''اپنا سر نیچے رکھو تابی۔'' عمران نے کہا اور خود بھی جھک گیا۔
اس کے بعد ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ماؤزر کھڑکی سے باہر نکالا اور

سائیڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے جیپ پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ بے مثال نشانہ تھا اور بڑے اعتماد سے لگایا گیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ جیپ کا اگلا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بُری طرح ڈگمگائیں پھر میں نے اسے کھیتوں میں اُترتے اور ایک سائیڈ پر اُلٹتے ہوئے دیکھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ کھیتوں کھلیانوں اور درختوں کے درمیان نیم پختہ راستوں پر ہماری گاڑی برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور اس کے عقب میں چار گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں میں ہمارے اندازے کے مطابق کم و بیش بیس بائیس مسلح افراد بھرے ہوئے تھے۔ راستے میں گاہے بگاہے فائرنگ بھی ہوتی رہی تھی۔ یہ سب کچھ کسی خوفناک ایکشن فلم جیسا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کا غیظ و غضب دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ ہسپتال میں نادیہ دم توڑ چکی ہے۔ راستے میں ہونے والی فائرنگ سے ہماری گاڑی کی دو کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے، پچھلی اسکرین بھی ناپید ہو گئی تھی۔ باڈی میں ڈیڑھ دو درجن سوراخ ہو چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ابھی تک کوئی ٹائر برسٹ نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عمران اپنے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو ایک خاص سمت میں لے کر جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں جیسے کوئی پلان تھا۔ اس نے راستے میں ایک بار اپنے کسی ساتھی کو مختصر فون بھی کیا تھا۔

ہم اینٹوں سے بنی ہوئی ایک نیم پختہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ گندم اور چارے کے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے موڑ پر عمران کا ایک اور نشانہ کارگر ثابت ہوا۔ آگے آنے والی سفید گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اس کے رُکنے سے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو بھی رُکنا پڑا۔ یوں ہمیں ایک سنہری موقع ملا کہ ہم پیچھے آنے والی گاڑیوں سے اپنا درمیانی فاصلہ بڑھا سکیں۔ عمران نے مہران کی رفتار کو حتیٰ الامکان حد تک پہنچا دیا۔ گاڑی ایک ایک فٹ اُچھل رہی تھی۔ میں نے خود کو مضبوطی سے نشست کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی اُچھلی تو ڈیش بورڈ کھل گیا اور اس میں سے کچھ کاغذ نیچے گرے۔ ان میں ایک ڈائری نما چیز بھی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید یہ کوئی ''پنج سورہ'' ہے۔ میں نے اسے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ آنے والے دنوں میں یہ ڈائری میرے لیے کتنی اہم ثابت ہونے والی تھی، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہم نے کھیتوں کے درمیان قریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ بڑی سرعت سے طے کیا اور ایک ڈیک نالے کے کنارے پہنچ گئے۔ عمران نے گاڑی کو عین کنارے پر روکا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ اس کی جانی پہچانی ہے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ صورتِ حال تسلی

بخش تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والی گاڑیاں اب بھی کم وبیش دو کلومیٹر دور تھیں۔ شیشم اور کیکر کے درختوں کے بیچ سے ان کی ڈگمگاتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی، سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈیک نالے میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی پہاڑی نالا ہو۔ میں نے بغور دیکھا۔ نالے کے قریباً 100 میٹر چوڑے پاٹ کے اوپر ڈیڑھ دو فٹ چوڑی پختہ پٹی ایک پل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جیسے ایک لکیری اس کنارے سے دوسرے کنارے تک چلی گئی ہو۔ اس کے نیچے قریباً بیس فٹ کی گہرائی میں ڈیک نالے کا پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ پٹی دراصل لوہے کے تین پائپ تھے جو ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ گیس یا پانی کی سپلائی ہے یا کوئی اور چیز۔ عمران نے گاڑی میں سے ماؤزر، گولیاں اور دو چار ضروری اشیاء نکالیں پھر کنارے سے اُتر کر اس آہنی پٹی پر پاؤں دھرا اور چند قدم چل کر دیکھا۔ اس کے بعد میرے پاس آیا اور بولا۔ ''چلو شہزادے! ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔''

''اس پر چل کر دوسری طرف جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل......لوگ یہاں سے اکثر گزر جاتے ہیں۔ یہ بالکل آسان ہے۔''

''مگر اندھیرا ہے یار! اور ہوا بھی......''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے جگر! بس تھوڑی سی ہمت۔ چلو پہلے میں جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ قدرے دونوں طرف پھیلا لیے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریباً پون فاصلہ طے کر گیا۔ تب وہ میری طرف مڑا اور پکار کر بولا۔ ''چلو آ جاؤ۔ بس سیدھا دیکھتے رہو۔ نیچے پانی کو نہیں دیکھنا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بیٹھ جانا۔ چلو شاباش۔''

دوسرے کنارے پر کسی گاڑی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمران ہی کا کوئی ساتھی ہے جو ہمیں ریسیو کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ عمران نے پھر مجھے پکارا۔ میں نے دل کڑا کر کے پائپوں پر قدم رکھا۔ میرا دل طوفانی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ سردی کے باوجود میں نے اپنی پیشانی پر پسینہ محسوس کیا۔ ایک دم میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ میں یہ پل صراط عبور نہیں کر سکوں گا اور میرے ایسا نہ کرنے سے آج یہاں کوئی بڑا سانحہ رُونما ہو جائے گا۔ عقب میں متعاقب گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی! جلدی کرو۔ وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔'' میں نے

ایک بار پھر اپنی ذہنی وجسمانی قوتوں کو جمع کیا۔ آگے بڑھنا چاہا مگر کچھ نہیں ہو سکا۔ جسم جیسے پتھرا کر رہ گیا تھا۔ عمران عجیب بیچارگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تب وہ واپس پلٹا۔ یہی وقت تھا جب عقب میں آنے والی ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹ ڈیک نالے کے کنارے کو روشن کرنے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی! وہ آ گئے ہیں۔ ہمت کرو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بس سیدھا دیکھتے رہو۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ مشکل نہیں ہے۔'' میں اپنے آپ کا کیا کرتا؟ گزرے ہوئے ماہ و سال میں، مَیں نے کہاں کہاں خود سے کہا تھا۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ یہ مشکل نہیں ہے تابش! تم یہ کر سکتے ہو۔ تھوڑی سی ہمت کرو۔ قدرت نے تمہیں بھی دو ہاتھ، دو پاؤں دیئے ہیں۔ صحت مند جسم دیا ہے۔ پھر تم وہ کیوں نہیں کر سکتے جو کرنا چاہتے ہو؟ کیوں ہر دشوار گھڑی میں پسپائی تمہارا مقدر ہوتی ہے؟ تم اپنا حق کیوں نہیں مانگ سکتے؟ کسی غاصب کا گریبان کیوں نہیں پکڑ سکتے؟ کسی جابر کا پنجہ کیوں نہیں مروڑ سکتے؟ تم آزمائشوں کے سامنے ہتھیار کیوں ڈال دیتے ہو؟ کتنی بار یہ سوال میں نے خود سے پوچھے تھے اور کتنی بار بیچارگی کے پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ آج اس پُرآشوب رات میں اس شور مچاتے پانی کے کنارے میں ایک بار پھر اسی بیچارگی و ناتوانی کا شکار تھا اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تھا ہی ایسا اور میں اکیلا نہیں تھا۔ شاید مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں بلکہ لاتعداد لوگ تھے جو غیر معمولی ہمت نہیں رکھتے تھے جو عام تھے اور شاید عام سے بھی کچھ کم۔ اس میں ان سب کا کیا قصور تھا؟ شاید وہ سب میری طرح خود کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے مگر بدل نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے اسیر تھے۔

''عمران! میں یہ نہیں کر سکتا۔'' میں کراہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

گاڑیاں بالکل کنارے پر پہنچ گئی تھیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس نالے کے ایک طرف کے کنارے کو روشن کر رہی تھیں۔ یہاں تیز ہوا میں لہلہاتے سرکنڈے بھوتوں کے رقص کا منظر پیش کرتے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کی وحشی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

عمران ایک جان لیوا دوراہے پر تھا۔ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اب واپس میری طرف آنا بھی اس کے لیے ازحد خطرناک تھا مگر وہ انوکھا تھا۔ اس کے سینے میں ایک فولادی دل دھڑکتا تھا اور اس فولادی دل میں محبت کا سمندر ہلکورے لیتا تھا۔ وہ واپس میری طرف آیا۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔

O......❖......O

سیٹھ سراج کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''وہ دیکھو......وہ ہے......وہ آ رہا ہے۔'' اس نے عمران کو دیکھ لیا تھا۔

میں بھی عمران کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر حتیٰ الامکان تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اب اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ مجھ تک پہنچے اور مجھے لے کر کنارے کے سرکنڈوں میں اوجھل ہو جائے۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں صاف دیکھا۔ ایک گولی عمران کے دائیں کندھے پر لگی۔ اس کا جسم ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا۔ وہ ایک دم لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ماؤزر سیدھا کیا۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا مگر یہاں مدِمقابل ایک یا دو نہیں تھے، وہ بہت سے تھے۔ عمران نے ایک فائر کیا اور اس کے جواب میں طاقتور آٹھ ایم ایک رائفل کا پورا ایک برسٹ اس کے سینے پر لگا۔ ہاں......اس رائفل کی ایک گولی بھی شاید انسانی جان لینے کے لیے کافی تھی اور یہ پورا برسٹ تھا۔ کم از کم پانچ چھ گولیاں۔ وہ اُچھلا اور سر کے بل ڈیک نالے کے تند و تیز پانی میں جا گرا۔ یہ اپنے یار کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔ اس کے بعد میں جیسے کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پُرآشوب رات میں، اس ڈیک نالے کے کنارے، ان سرکنڈوں میں عین اس وقت زمین کی گردش تھم گئی ہے اور کائنات ختم ہوگئی ہے۔ وہ ایسے جائے گا؟ اتنی جلدی......اتنا اچانک......ایسا غیر متوقع؟ میں کچھ دیر کے لیے شاید سکتے میں چلا گیا۔ جیسے دل سینے میں پھٹ جائے، نبضیں تھم جائیں اور آنکھیں پتھرا جائیں۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم کی ساری توانائی میری ٹانگوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ جسم میں موجود خون کا ہر قطرہ میرے پاؤں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہ شاید زندگی بچانے کی وہ فطری خواہش تھی جو قدرت نے ہر جاندار کی جبلت میں نصب کر رکھی ہے۔

ایک قیامت کا جھٹکا سہنے کے بعد میرے اندر بھی یہ خواہش جاگی اور میں اندھا دھند سرکنڈوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔

''وہ دیکھو......وہ جا رہا ہے۔'' ایک بار پھر سیٹھ کی منحوس آواز ہوا میں تیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز کم و بیش چالیس میٹر دور سے آئی تھی اور اس کا رُخ میری دائیں جانب تھا۔ مجھے لگا کہ کچھ لوگ للکارتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے ہیں۔ تب یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ ایک گولی بالکل میرے پاس سے گزری۔ میں نے اس مہلک سیسے کی قاتل سنسناہٹ اپنے سر کے عین اوپر سنی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگلی گولی میری کمر یا سر کے

پچھلے حصے میں کہیں لگے گی۔ گولی لگنے کا احساس کیا ہوگا؟ کیا میں وہ تکلیف سہہ سکوں گا؟ کیا میں فوراً گر پڑوں گا۔ کیا میری موت آناً فاناً ہو جائے گی؟ ایسے کئی سوال سیکنڈ کے مختصر وقفے میں میرے دماغ کے اندر چمکے اور اوجھل ہوئے۔

مجھے بس اتنا یاد ہے، میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ میرے راستے میں اونچے سرکنڈے تھے، خودرو جھاڑیاں تھیں اور کیچڑ تھا۔ میں گر رہا تھا، اُٹھ رہا تھا اور پھسل رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے اندازاً سو قدم کی دوری پر ہوں گے۔ دفعتاً مجھے لگا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شاخیں ٹوٹنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں ایک ساعت کے لیے یا شاید اس سے بھی کم وقت تک ہوا میں معلق رہا اور پھر کسی نیم ٹھوس جگہ پر گرا۔ میں کمر کے بل گرا تھا۔ میرے اوپر کچھ چیزیں گریں۔ جھٹکے کے سبب آنکھوں میں تارے سے ناچے اور ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ایک بلند لہر اُٹھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں جہاں گرا تھا، وہیں ساکت پڑا رہا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے؟ فی الحال کچھ بھی نتیجہ نکالنا مشکل تھا۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد میرے پیچھے آنے والے طوفانی رفتار سے میرے آس پاس سے گزرے۔ میں نے ان کی چنگھاڑتی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان میں شاید شیرے کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور بھاگتے ہوئے ایک دوسرے سے بات بھی کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی گڑھے میں ہوں اور میرے اوپر بہت سا جھاڑ جھنکاڑ گرا ہوا ہے۔ شاید یہی جھاڑ جھنکاڑ تھا جس نے مجھے تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد آوازیں مجھ سے دور چلی گئیں۔ رائفل کے تین چار فائر سنائی دیئے اور لوگوں کی دور افتادہ چنگھاڑیں کانوں میں پڑیں۔ میں بے حرکت پڑا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب عمران کو گولیاں لگنے کا منظر تھا۔ بلندی سے اس کا پانی میں گرتا ہوا جسم۔ میری آنکھوں میں نمی جاگی پھر یہ نمی گرم پانی کے دھاروں میں بدل گئی۔ میرا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور اپنے رونے کی آواز کو اپنے سینے کے اندر ہی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیسے ہو گیا تھا؟ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ......جو تھوڑے ہی عرصے میں میری رگ و جاں سے قریب ہو گیا تھا، میری زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا، اس طرح اچانک مجھ سے منہ موڑے گا، اس طرح آناً فاناً موت کے اندھیروں کی طرف جست لگا جائے گا؟ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے

لگیں۔ کہیں یہ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا۔ کہیں میرا تصور مجھے کوئی وحشت ناک دھوکا تو نہیں دے رہا تھا؟

میری کراہیں میرے ہونٹوں کی فصیل توڑنے لگیں۔ میں اوندھا ہو گیا۔ میں نے اپنا منہ گھاس اور کیچڑ میں دھنسا دیا۔ میرا پورا جسم ہچکیوں سے دہلنے لگا۔

''عمران...... عمران۔'' میرے دل نے پکار کر کہا۔ ''مجھے یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جا یار! یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ تُو تو مجھے زندگی کی طرف لا رہا تھا اور ابھی تو میں پوری طرح زندہ بھی نہیں ہوا اور تُو مجھے چھوڑ رہا ہے اور کیسے حالات میں چھوڑ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کر میری ناتوانیوں کی اتنی کڑی سزا نہ دے یار! میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو قدم نہیں چل سکتا۔ تُو واپس آ جا یار! نہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا......''

میں رو رہا تھا۔ میرے آتشیں آنسو گھاس میں اور کیچڑ میں جذب ہو رہے تھے۔ عمران کے جانکاہ دُکھ کے سوا ہر طرح کی جسمانی و ذہنی تکلیف جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ نہیں مرا...... وہ زندہ ہو گا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک صدا بلند ہوئی۔ وہ خطروں کا کھلاڑی ہے۔ وہ ہر رات موت کو جُل دیتا ہے، اس نے آج رات بھی جُل دیا ہو گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ گیا ہو گا۔ اس کی جادو کی پٹاری سے کوئی نہ کوئی شعبدہ ایسا ضرور نکلا ہو گا جس نے ''وقت'' کو حیران کر دیا ہو گا اور اب وہ کہیں کھڑا وقت کی حیرانی پر مسکرا رہا ہو گا۔ اس کی مسکراہٹ ناقابلِ شکست تھی۔ آج اتنی جلدی یہ مسکراہٹ شکست کھا کر پانی میں کیسے ڈوب گئی؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں...... یہ بعید از قیاس ہے۔ میں اپنے پارہ پارہ دل پر تسلیوں کا مرہم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

O......❖......O

وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ اب میری آنکھیں کسی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ یہ جگہ ایک رکھ (درختوں کا ذخیرہ) تھی۔ میں قریباً سات فٹ گہرے ایک مستطیل گڑھے میں تھا۔ اس جنگل میں یہ گڑھا انسانی ہاتھوں نے بنایا تھا اور اس کا مقصد غالباً کسی جانور کا شکار تھا۔ گڑھے کی بالائی سطح کو پتلی شاخوں، پتوں اور مٹی کے ساتھ اس طرح ڈھانپا گیا تھا کہ یہ ایک پھندا بن گیا تھا اور آج اس تاریک بارشی رات میں، ان خوفناک گھڑیوں میں، مَیں اس پھندے کا شکار ہوا تھا۔ یہ پھندا جو کسی جانور کے لیے موت بننے والا تھا، میرے لیے زندگی بنا تھا۔ گڑھے میں میرے گرنے کے بعد میرے اوپر شاخیں، پتے اور بھربھری مٹی گری تھی اور میں مکمل کیموفلاج ہو گیا تھا۔

ہاں...... وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ کچی زمین اور پتوں پر اس کے گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ مجھے تلاش کرنے والے میرے قریب نہیں تھے تاہم میرے اردگرد موجود تھے۔ گاہے بہ گاہے مجھے فاصلے سے فائر سنائی دے جاتا یا کسی کے بولنے کی دور افتادہ آواز کانوں میں پڑتی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ بارش کے باوجود مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی اور میرا منہ بالکل خشک ہے۔ شاید میرا ٹمپریچر پھر شوٹ اپ کر چکا تھا مگر ان حالات میں بخار اور جسمانی چوٹوں وغیرہ کی اہمیت میرے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔ کسی جانور یا سانپ بچھو وغیرہ کا خوف بھی دور پس منظر میں چلا گیا تھا۔ میں نیم مردہ کیفیت میں اپنی جگہ پڑا رہا اور میری آنکھوں سے آتشیں آنسو رستے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ لاہور کی تکا شاپ سے ہماری گاڑی کا تعاقب شروع ہونے کے بعد عمران نے اقبال سے کئی بار رابطے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا تو کیا اب اقبال بھی میڈم کے ہرکاروں کی گرفت میں آ چکا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر یہ میرے اہلِ خانہ کے لیے بھی ازحد خطرناک تھا۔ اقبال کو معلوم تھا کہ میرے گھر والے کہاں ہیں۔ اس کے موبائل میں آصف کا فون نمبر بھی موجود تھا اور یہ آصف ہی تھا جو ڈیفنس والی کوٹھی کی سکیورٹی کا ذمے دار تھا۔ کیا سیٹھ سراج اور اس کے مشتعل ساتھی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ جائیں گے؟ یہ سوال ایک آتشیں نیزے کی طرح میرے سینے میں دھنس گیا اور مجھے بے حال کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ نادیہ مر چکی ہے اور اس کی موت نے میڈم صفورا اور اس کے ساتھیوں کو شعلہ جوالا بنا دیا ہے۔ وہ سب کچھ خاکستر کر دینا چاہ رہے ہیں۔ خاص طور سے سیٹھ سراج کی آواز میں، مَیں نے جو درندگی محسوس کی وہ بیان سے باہر تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی آواز تھی جس کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔

اب بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جونہی میں سراج اور شیرے وغیرہ کو نظر آیا، میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ مجھے ایک سیکنڈ کی مہلت دیئے بغیر چھلنی کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میری لاش کو بھی چند برسٹ مارے جائیں۔ قبر تو میری پہلے ہی کھدی ہوئی تھی، اس پر بس مٹی ڈالنے کی کسر تھی۔

قریباً دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میری بہن، میرا بھائی اور والدہ شدید خطرے میں تھے۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر یہاں سے کیسے نکلتا؟ میرے گرد موت کا پہرا تھا۔ قاتل شکاری ابھی تک مجھے اس ''رکھ'' میں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں

ان کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے قریباً آدھ گھنٹے سے کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میرے اردگرد موجود نہیں ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ بھی ان کی چال ہو۔ وہ اپنے نہ ہونے کا تاثر دے کر مجھے میری پناہ گاہ سے نکالنا چاہتے ہوں۔ ڈیک نالا اور نالے کے کنارے کھڑی گاڑیاں یہاں سے بہت دور رہ گئی تھیں۔ اگر انہیں اسٹارٹ کیا جاتا تو شاید آواز مجھ تک نہ پہنچ سکتی۔

جلد ہی اندھیرے میں اُجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بڑھتی چلی گئی۔ میں نے خود کو کچھ اور بھی جھاڑ جھنکاڑ کے اندر چھپا لیا۔ رات ختم ہونے کے ساتھ ہی دل میں یہ خوفناک اندیشہ سر اُٹھانے لگا کہ اب مجھے دیکھ لیا جائے گا۔ اردگرد سے آوازیں اب معدوم ہو چکی تھیں مگر کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ میں وہیں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ رات کو گاہے بہ گاہے ہونے والی تیز بارش نے میرے قدموں کے نشان بہت حد تک ختم کر دیئے ہوں گے۔ یہ گڑھا یقیناً کسی جنگلی بلے، گیدڑ یا سور وغیرہ کو پکڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ گڑھا تیار کرنے والے یہاں پہنچ جائیں اور ان کی وجہ سے میں اپنا تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں میں آ جاؤں۔

O......❖......O

دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میرے اردگرد کوئی موجود نہیں اور اگر میں اس گڑھے سے نکلنا چاہوں تو نکل سکتا ہوں۔ مگر ایک بار پھر میرا فطری تذبذب مجھے ہلکان کرنے لگا۔ کیا دن کی روشنی میں میرا یہاں سے نکلنا ٹھیک ہوگا؟ کیا یہاں سے نکل کر میں درست سمت میں سفر کر سکوں گا؟ کیا اس رکھ کے چوکیدار وغیرہ تو مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر دیں گے؟

میں نے اس گڑھے میں تقریباً سات گھنٹے مزید گزار دیئے۔ پچھلے بیس گھنٹے سے میں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے جو توانائی میرے جسم میں پہنچی تھی وہ کب تک ساتھ دیتی۔ میرے کندھے اور گردن کے زخم آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ بخار کے سبب پورا جسم پھنک رہا تھا۔ گڑھے میں گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں، وہ اس کے علاوہ تھیں اور سب سے بڑی چوٹ جسمانی نہیں ذہنی تھی۔ کل رات عمران کے شوٹ ہونے کے منظر کو میں ایک لحظے کے لیے...... صرف ایک لحظے کے لیے بھی بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید میں اس کو لفظوں میں بیان نہ کر سکوں اور اگر کرنا بھی چاہوں تو ہزاروں لاکھوں لفظ لکھ کر بھی یکسر نا کام

رہوں۔ میں خود کو بس یہی دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے جو دیکھا، وہ بعینہٖ وہ نہیں تھا جو نظر آیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے خود کو گڑھے کے گدلے پانی اور کیچڑ سے اوپر اُٹھایا، جسم سے شاخیں اور پتے وغیرہ ہٹائے۔ میں بہ مشکل کھڑا ہو سکا۔ یہ بات تو اب تقریباً طے تھی کہ سیٹھ سراج اور اس کے ہرکارے اس جگہ سے جا چکے ہیں۔ اب مسئلہ یہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اُٹھائے تو وہ باآسانی گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے۔ تاہم گڑھے سے نکلنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ میرا زخمی جسم بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی کوشش اور کئی ایک تازہ خراشوں کے بعد میں باہر نکل سکا۔ یہی وقت تھا جب قریبی درختوں میں تیز آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو جلدی سے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چھپایا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے گڑھا کھودا ہے۔ میں چند سیکنڈ تک اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ کوئی جنگلی جانور تھا جو بڑی سرعت سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ میں بس اس کی پرچھائیں ہی دیکھ سکا۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بڑا جنگلی بلا، گیدڑ یا چھوٹے قد کا سور۔ عام حالات میں شاید یہ منظر مجھے سرتاپا لرزا دیتا مگر جب انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر ہلاکت خیز ہو جائیں تو پھر جانوروں کی دہشت ماند پڑ جاتی ہے۔

پانچ دس منٹ تک جھاڑیوں میں رُکنے کے بعد میں نے اندازے سے ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ڈیک نالے کی مخالف سمت میں جا رہا ہوں مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے ڈیک نالے کا منحوس شور سنا اور دل کے زخموں کے منہ پھر کھل گئے۔ تازہ خون رسنے لگا۔

اچانک انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے خود کو کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے پیچھے چھپایا۔ یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ اس پر بہت سی خشک ٹہنیاں اور درختوں کے چھوٹے تنے لدے ہوئے تھے۔ غالباً یہ سب کچھ ایندھن کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ایک اکیلا دیہاتی اس ٹریکٹر کو چلا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں دل کڑا کر کے اس کے سامنے چلا گیا۔ اس نے ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس میں مجھے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ میرا حلیہ کسی کو بھی ششدر کر سکتا تھا۔ پورا جسم کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔

''کون ہو؟'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

''مسافر ہوں بھائی! میری جیپ پیچھے درخت سے لگ کر اُلٹ گئی ہے۔ سخت تکلیف میں ہوں۔ مجھے کسی ڈاکٹر تک پہنچا سکتے ہو؟'' میں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔ وہ

ٹریکٹر سے اُترا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ ٹریکٹر پر بیٹھا تھا۔ اس کا نام رحمت علی تھا اور وہ ایک قریبی دیہہ روہی پور کا رہنے والا تھا۔ میں اس کے ساتھ گاؤں جانے کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ مجھے تلاش کرنے والوں نے اردگرد کے دیہات کو بھی کھنگالا ہو اور وہاں کے لوگ کسی ''مفرور'' شخص کے لیے الرٹ ہو چکے ہوں۔

بہرحال مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ رحمت علی اپنے گاؤں جانے کے بجائے اپنے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ اس کا ڈیرا اس رکھ کے پاس ہی ایک بارانی رقبے میں تھا۔

رحمت علی کا رویہ دوستانہ ہی لگ رہا تھا۔ ہم قریباً بیس منٹ میں ڈیرے پر پہنچ گئے۔ گندم ابھی چھوٹی اور ہری تھی۔ اس وسیع وعریض ہریالی کے درمیان رحمت علی کا ڈیرا بس تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک چھوٹا ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ دبلا پتلا رحمت علی اور اس کی فربہ اندام بیوی بالکل سادہ سے لوگ تھے۔ انہوں نے میری بات پر من وعن یقین کیا تھا۔ کسی طرح کے سوال جواب کیے بغیر انہوں نے پوچھا کہ وہ میری کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ ایک رات پہلے پیش آنے والے واقعات کا انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ فائرنگ کی دور افتادہ آواز انہوں نے ہو سکتا ہے سنی ہو مگر یہاں شکاری بھی گھومتے رہتے تھے۔ اس طرح کی آوازیں آتی ہی رہتی ہوں گی۔

رحمت علی نے میرے لیے نہانے کا انتظام کیا اور ایک شلوار قمیص بھی مجھے پہننے کے لیے دی۔ یہ میرے سائز کی تو نہیں تھی مگر شلوار کو ذرا نیچے باندھ کر اور جسم کے گرد گرم چادر لپیٹ کر گزارہ ہو گیا۔ مجھے شدید نقاہت تھی مگر میں ایک گلاس دودھ کے سوا کچھ نہ لے سکا۔ قریباً اٹھارہ گھنٹے کیچڑ اور جھاڑ جھنکاڑ میں رہنے کے بعد میرے زخموں کا بُرا حال تھا۔ بخار بھی برقرار تھا۔ بہرطور یہ جسمانی تکلیفیں میرے اندرونی کرب میں دب کر رہ گئی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو بتایا۔ ''میں فوری طور پر گھر جانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر والے میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ واپسی پر میں کچھ بندے بھی لے کر آؤں گا تاکہ اپنی گاڑی کو لاہور واپس لے جا سکوں۔''

میری جیب میں کچھ بھیگے ہوئے، کیچڑ آلود کرنسی نوٹ موجود تھے۔ میں نے یہ نوٹ رحمت علی کو دے کر اس سے دوسرے نوٹ حاصل کرنا چاہے لیکن وہ مجھ سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوا۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے چار پانچ سو روپے میری

جیب میں ڈال دیئے۔ میں اس کا یہ احسان رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وقت رخصت چند بھیگے نوٹ خاموشی سے بستر کی چادر کے نیچے رکھ دیئے۔ رحمت مجھے اپنے ٹریکٹر پر تقریباً چار کلومیٹر دور پختہ سڑک تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ یہاں اس نے اپنے کسی جاننے والے سے درخواست کی اور وہ مجھے اپنی موٹرسائیکل پر بٹھا کر جی ٹی روڈ تک لے آیا۔ جی روڈ سے مجھے بس پکڑنے اور لاہور پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

جب میں یادگار چوک میں اُترا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ وہی یادگار چوک تھا جہاں سے میں اور عمران درجنوں بار موٹرسائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے گزرے تھے۔ آج یہ یادگار چوک بلکہ یہ پورا شہر مجھے ایک ویرانہ لگ رہا تھا۔ ایک ایسا ویرانہ جو کسی جوان بیوہ کی طرح بال کھولے آہ وبکا کر رہا ہو۔ آہ...... کہاں تھا وہ شہریار...... کہاں تھا وہ خندہ جبیں؟ کہاں تھے اس کے قہقہے، اس کی باتیں؟ وہ ایک شخص پورے شہر کو کھنڈر کر گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے حالات کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عمران کو پیش آنے والے سانحے کی اطلاع اس کے دوستوں اور ساتھیوں کو ہو چکی ہے یا نہیں۔ اگر ہو چکی ہے تو ان کا ردِعمل کیا رہا ہے۔ راوی روڈ والے گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ شاہین کے گھر کا رُخ کروں لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر میں نے دل کڑا کیا اور براہِ راست ڈیفنس پہنچنے کا تہیہ کر لیا۔ میں پہلے ہی بہت تاخیر کر چکا تھا۔ اب مجھے جلد از جلد گھر والوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ میں جانتا تھا کہ عمران اور اقبال کے سوا میرے اہلِ خانہ کے ٹھکانے کا کسی کو علم نہیں۔ مجھے زیادہ اندیشہ بھی اقبال ہی کی طرف سے تھا۔ اگر عمران کی طرح وہ بھی سیٹھ سراج اور شیرے کے ہتھے چڑھ چکا تھا تو پھر اس کو بھی بدنصیب سلیم کی طرح تشدد کے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا۔ وہ ایسا تشدد تھا کہ پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا اور اگر اقبال جو پہلے ہی علیل تھا، بول پڑتا تو پھر سیٹھ سراج اور شیرے کی سفاکی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنی بے پناہ دھڑکنوں پر قابو پاتا ہوا، براستہ جیل روڈ ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیہاتی لباس میں میرا حلیہ ایسا مناسب نہیں تھا۔ راہ گیروں کی طرح ٹیکسی ڈرائیور نے بھی مجھے سرتاپا گھورا۔ مجھے اس چاردیواری کا پتا ذہن نشین تھا جہاں میں اپنی والدہ، بہن اور بھائی سے مل چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوا دی۔ خوبصورت کوٹھی کے برآمدے میں روشنی تھی، تاہم گیٹ پر نیلی وردی والا ریٹائرڈ فوجی گارڈ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ صحن میں تھا۔

مین گیٹ پر پہنچا تو گارڈ فوراً باہر آ گیا۔ اس نے مجھے بغور دیکھا اور پہچان لیا۔

''صاحب! آپ اس وقت یہاں؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں...... خیریت سے ہوں۔'' میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اندر عمران کا قریبی ساتھی آصف بھی موجود تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی عاطف سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ابھی تک حالات کی سنگین ترین کروٹ سے بے خبر ہیں۔ میرے دیہاتی حلیے کی وجہ سے عاطف کو بھی مجھے پہچاننے میں تین چار سیکنڈ لگ گئے۔ پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا اور بھائی جان کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ ''کیا ہوا بھائی جان؟'' اس نے کہا۔

میرے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میرے جسم پر زخم ہیں۔ ''اوہ...... سوری بھائی جان!'' وہ ہکلایا۔ ''آپ کو شاید چوٹ لگی ہوئی ہے...... اوہو...... آپ تو زخمی لگتے ہیں۔ کک...... کیا ہوا ہے بھائی جان! خیریت تو ہے نا اور عمران بھائی! وہ کہاں ہیں؟ کل دو تین بار اقبال صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ آپ کا اور عمران بھائی کا پوچھ رہے تھے۔ آپ دونوں کہاں تھے اور...... اور آپ کے یہ کپڑے؟''

اس نے حسبِ عادت ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لیے۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اب آصف بھی قریب آ گیا۔ اس نے مجھے سرتاپا دھیان سے دیکھا۔ اس کی معاملہ فہم نظر جان چکی تھی کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے ہولے سے کہا۔ ''اندر آ جائیں تابش صاحب!''

میں لڑکھڑاتے قدموں سے انٹرنس کی طرف بڑھا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں عاطف سے کہا۔ ''امی اور فرح کو میری چوٹوں کے بارے میں نہیں بتانا۔''

ہم اندر پہنچے۔ پہلی منزل پر والدہ سو رہی تھی تاہم فرح ابھی جاگ رہی تھی۔ وہ ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی اور ساتھ ساتھ سلائی مشین پر کچھ بنا رہی تھی۔ اس نے عاطف کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ایک دم تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی ''بھائی'' کہہ کر میرے گلے لگی اور مجھے ایک بار پھر درد کی شدید ٹیسیں برداشت کرنا پڑیں۔ کچھ دیر بعد والدہ بھی جاگ گئیں۔ ان کے چہرے پر شدید نقاہت تھی۔ پتا چلا کہ پرسوں سے ان کے کندھوں میں سخت درد ہے۔ وہ کافی عرصے سے ''فریزڈ شولڈرز'' کی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ سرد ہوا میں گھومنے پھرنے سے یہ تکلیف فوراً عود کر آتی تھی۔ ان کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر تین چار دوائیں بھی رکھی تھیں۔

بہرحال میری آمد کی خوشی میں وہ اپنی تکلیف بھول گئیں اور تکیے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کئی بار میرا ماتھا چوما۔ پھر میرے حلیے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کل عمران کے ساتھ ایک دیہاتی علاقے میں تھا۔ وہاں بارش اور کیچڑ کی وجہ سے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ عمران کے ایک مقامی دوست کے کپڑے پہننا پڑے۔ انہوں نے میرے چہرے کی خراشوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا اور ایک دو سوال پوچھے۔

والدہ کی نگاہیں مسلسل عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''لیکن وہ کہاں؟''

اس سوال کا جواب دنیا کا مشکل ترین جواب تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ''وہ ساتھ نہیں ہے امی جی۔''

فرح مسکرا کر بولی۔ ''وہ تو کہتے تھے کہ ہم جب آئیں گے، اکٹھے ہی آئیں گے۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کی دُم کی طرح ہیں۔ یہ دیکھیں میں نے ان کی شرٹ بھی ٹھیک کر دی ہے۔''

اس نے پُرانی شرٹ میرے سامنے پھیلائی۔ فرح نے شاید اس کو نئی سلائیاں لگائی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' والدہ نے پوچھا۔

''عمران بھائی کی شرٹ۔ پچھلی دفعہ مجھے دے کر گئے تھے۔ کہتے تھے کہ میں اسے ٹھیک ٹھاک کر دوں۔''

''ہائے۔'' والدہ نے کہا۔ ''اتنی پُرانی قمیص مرمت کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ کا کرم ہے، اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی ہے؟''

''امی جی! کچھ چیزیں پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتیں۔'' فرح مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس قمیص سے عمران بھائی کی کچھ بڑی اچھی اچھی یادیں جڑی ہوئی ہوں۔ ہم نے بھی تو ابھی تک ابو جی کی دو شیروانیاں سنبھالی ہوئی ہیں نا۔ ہاں...... شیروانی سے یاد آیا کہ عمران بھائی بھی شیروانی کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بچپن میں ان کی والدہ نے انہیں بھی شیروانی پہنائی تھی۔ وہ اتنی لمبی تھی کہ اس کے نیچے کچھ پہننے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بس ٹخنوں تک بٹن بند کرتے چلے جاؤ۔ دراصل عمران بھائی کی والدہ نے چالاکی دکھائی تھی۔ عمران بھائی ایک سیکنڈ بھی نچلے نہیں بیٹھتے تھے۔ ہر وقت بھاگ دوڑ کرتے تھے انہوں نے ایسی شیروانی پہنا دی کہ وہ بھاگ ہی نہ سکیں۔'' فرح ہنسنے لگی۔

والدہ بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ”کیا بات ہے تابش! تم...... کچھ...... چھپا رہے ہو...... تمہیں چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیا...... بات...... ہے۔ کہیں کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہے۔“

میں نے اپنا سر تھام کر جھکا لیا۔ آنسو ایک دم ہی گرم پانی کے آبشار کی طرح آنکھوں سے گرنے لگے۔ ”ہائے میں مرگئی۔“ والدہ نے کہا اور میرا چہرہ اوپر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”کیا بات ہے بھائی! عمران بھائی تو خیریت سے ہیں؟“ فرح نے بھی روہانسی آواز میں پوچھا۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ”ہاں...... سب خیریت سے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ لل...... لیکن یہاں اب آپ لوگوں کے لیے بہت خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلنا ہوگا۔ اسی وقت نکلنا ہوگا۔“ میری آواز بے طرح لرز رہی تھی۔

میرے انداز نے سب کو ایک دم ہراساں کر دیا۔

”مگر عمران بھائی آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟“ عاطف نے میرا شانہ تھاما۔ ”کل بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ آج آصف بھی سارا دن فون کرتا رہا ہے، پر ان کی طرف سے یا آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔“

”یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تفصیل آپ لوگوں کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے ہے۔“

”ہم...... کہاں جائیں گے تابی! پہلے ایک دم اپنے گھر سے نکلے، اب تم ایک دم یہاں سے نکلنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ کیا ہم اس طرح بھاگتے ہی رہیں گے؟“

”بس امی جی! حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے ہیں۔ مم...... مجھے عمران نے ہی بھیجا ہے وہ چاہتا ہے کہ ہم فوراً یہاں سے نکل جائیں۔“

”پر وہ تو کہتا تھا تابی! کہ یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہم دس سال بھی یہاں رہیں تو کوئی ڈر خطرہ نہیں۔“

”غیب کا علم تو کسی کو نہیں ہوتا نا امی! آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔“ میری آواز میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔

آصف مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”تابش بھائی! آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟“ میں نے آنسو چھپا کر ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”لیکن آپ یہاں سے جانے کی بات کیوں کر رہے ہیں؟ آپ اس طرح کیسے جا سکتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”ہیرو بھائی نے اس بارے میں ہمیں سختی سے ہدایت کی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس چار دیواری سے باہر ماں جی، عاطف اور فرح بی بی کے لیے خطرہ ہے۔“

”لیکن اب یہاں خطرہ زیادہ ہے آصف۔“

”گستاخی معاف تابش بھائی! اگر ایسی بات ہے تو پھر ہیرو بھائی کو خود بات کرنی چاہیے۔ ان کے پاس میرے اور گارڈ خادم حسین دونوں کے فون نمبرز ہیں۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے گھر والے یہاں یرغمال ہیں۔ وہ میری مرضی سے بھی کہیں نہیں جا سکتے؟“ میں نے جھڑک کر کہا۔

”نہیں...... نہیں تابش بھائی! آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں؟ ہماری اتنی جرأت ہے کہ ایسا سوچ سکیں۔ ہماری حیثیت تو آپ کے نوکروں کی ہے...... مگر......“

”مگر کچھ نہیں آصف!“ میں نے بڑے درد سے اس کا کندھا تھاما۔ ”میں اس وقت تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا لیکن حقیقت یہی ہے کہ عمران اس وقت فون نہیں کر سکتا اور ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہے۔ جتنی دیر ہوگی، خطرہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔“

آصف کے چہرے پر اُلجھن ہی اُلجھن تھی۔ وہ پیشانی کھجاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تابش صاحب! اقبال بھائی سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔“

”اور یہی زیادہ خطرناک بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ کوٹھی بڑی جلدی سراج وغیرہ کی نظر میں آنے والی ہے۔ اقبال کے سیل فون میں تمہارا نمبر بھی سیو ہے۔ تمہارے نمبر پر کوئی مشکوک کال تو نہیں آئی؟“

اس سے پہلے کہ آصف جواب میں کچھ کہتا، گراؤنڈ فلور سے سابق فوجی گارڈ کی آواز آئی۔ ”آصف بھائی! ذرا نیچے آنا۔“ اس کے لہجے میں عجلت تھی۔

”میں ابھی آیا۔“ آصف نے مجھ سے کہا اور تیزی سے زینے اُتر کر نیچے چلا گیا۔

میں ایک بار پھر والدہ اور فرح وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ اب پریشانیوں نے بھی ان کے چہرے پر ڈیرے جما لیے تھے۔ فرح بھی بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سمجھ گئے تھے کہ یہ رات ایک بار پھر ان کے لیے خانہ بدوشی کا اذن لے کر آئی ہے۔

اگلے پانچ منٹ میں، مَیں نے والدہ سمیت سب کو یہاں سے نکلنے کے لیے تیار کیا۔ فرح میری ہدایت کے مطابق جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگی۔ سامان تھا ہی کتنا؟ گھر سے نکلتے ہوئے والدہ نے فرح کے لیے بنایا ہوا کچھ زیور ساتھ لیا تھا، اس کے علاوہ تیس چالیس ہزار روپے نقد اور اتنے کے ہی ڈیفنس سرٹیفکیٹ تھے۔ باقی جو سامان تھا، وہ ہمارے ذاتی گھر میں پڑا ہوا تھا۔

ضروری کپڑے اور دیگر چیزیں فرح نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اٹیچی میں بند کر لیں۔ عاطف نے اپنی کتابیں، امی کی دوائیاں اور دیگر چھوٹا موٹا سامان ایک بڑے شولڈر بیگ میں رکھنا شروع کیا۔ میں اس کام میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ یہ اندیشہ ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھا کہ آصف ہمارے یہاں سے نکلنے میں کہیں رکاوٹ نہ ڈالے۔

اچانک مجھے زیریں منزل سے عجیب سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہو پھر کوئی وزنی چیز گری ہو۔ میں چونک کر کامن روم کی طرف آیا۔ یہاں میں نے جنگلے سے نیچے جھانکا تو میرا سر لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم الیکٹرک شاک کی زد میں ہے۔ شاید شب و روز ہی کچھ ایسے تھے۔ میری آنکھوں کی قسمت میں بدترین مناظر کی دیکھ لکھ دی گئی تھی۔

میں نے آصف کو دیکھا۔ وہ ٹی وی ٹرالی کے قریب گرا ہوا تھا۔ دو بندے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک نے پوری طاقت سے اس کا گلا دبایا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے منہ پر اندھا دھند گھونسے رسید کر رہا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ پُرہول منظر ایک اور تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے بالکل قریب براؤن فرشی ٹائلز پر گارڈ خادم حسین کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ گرا پڑا تھا اور بالکل بے حرکت تھا۔ اس کا بالائی دھڑ میری نظر سے اوجھل تھا، تاہم شواہد بتا رہے تھے کہ وہ شدید زخمی ہے یا مر چکا ہے۔ اس کے بالائی دھڑ کی طرف سے خون بہہ کر ٹانگوں کی طرف آ رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ کامن روم سے گزرنے کے بعد میں نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ یہ تھا کہ درمیانی دروازہ لاک کر دیا۔ اب کامن روم اور سیڑھیاں باقی کے پورشن سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر علیحدہ ہو گئے۔

میں چلّایا۔ ”عاطف! بھاگو یہاں سے۔ وہ آ گئے ہیں۔“ میری آواز دہشت سے بگڑی ہوئی تھی۔

”کون آ گئے؟“ عاطف نے بھی بلند آواز میں پوچھا۔

”میڈم کے لوگ۔ انہوں نے خادم حسین کو مار دیا ہے۔ وہ مار دیں گے سب کو......نکلو

یہاں سے۔“

والدہ کے چہرے کا جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اپنی کمر اور کندھوں کی تکلیف کے سبب وہ فوری طور پر اُٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ عاطف اٹیچی بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اٹیچی کو ٹھوکر ماری۔ ”عاطف! لعنت بھیجو اس پر۔ نکلو فرح کو لے کر نکلو۔“

عاطف، فرح کی طرف لپکا تو میں والدہ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کامن روم میں کھلنے والا دروازہ دھڑ دھڑ بجنا شروع ہو گیا۔ فرح کا چہرہ ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں پھر چلّایا۔ ”فرح! نکلو یہاں سے۔“

عاطف نے فرح کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ وہ ٹیرس کی چار فٹ اونچی ”سائیڈ وال“ کراس کر کے بآسانی ساتھ کی زیرِ تعمیر کوٹھی میں داخل ہو سکتے تھے۔ میں نے کراہتی ہوئی والدہ کو سہارا دے کر بمشکل بیڈ سے اُتارا۔ ابھی میں ان کے ساتھ بیڈ روم کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ باہر سے لگنے والے زوردار دھکوں سے دروازہ ٹوٹ گیا۔ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں والدہ کو لے کر ایک ساتھ والے دروازے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں گھسا ہوں۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ دروازہ بھی دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا اور پھر میرے کانوں میں چھوٹے سر اور موٹے جسم والے سیٹھ سراج کی منحوس آواز داخل ہوئی۔ ”دروازہ کھول دے کاکے! آج توں بچ نئیں سکدا۔“

اس کے ساتھ ہی دروازے کو زوردار دھکے مارے گئے۔

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں جس کمرے میں داخل ہوا ہوں، یہ چاروں طرف سے بالکل بند ہے۔ کوئی کھڑکی، کوئی روشندان موجود نہیں تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بھی لکڑی کے بجائے لوہے کی وزنی چادر کا تھا۔ یہاں شفاف لمبوتری میز پر دو تین کمپیوٹر پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی ایک اسکرین تھی اور اس کے سامنے آٹھ دس کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔

میں نے والدہ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور خود خوفزدہ نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے پر شاید رائفلوں کے بٹ برسائے جا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ سراج، شیرے اور ان کے ساتھیوں کے گرجنے برجنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ وہی ہوا ہے جس کا خطرہ تھا۔ اقبال پکڑا جا چکا ہے اور اس کے ذریعے میڈم کے لوگ اس کوٹھی

تک پہنچ گئے ہیں۔

والدہ نے میرا بازو تھاما اور کراہتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''اب کیا ہوگا تابی! یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں تم سے...... ان کے سروں پر تو خون سوار ہے۔ ہائے ربا! اب کیا ہوگا؟''

میں والدہ کو کیا تسلی دیتا۔ میں تو خود خوف کے ایک عمیق سمندر میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔

''تمہارے پاس موبائل نہیں ہے تابی! تم ون فائیو پر فون کرو یا پھر عمران کو بتاؤ۔''

''نہیں امی! فون نہیں ہے۔'' میری آواز بمشکل ہونٹوں سے نکل پائی۔

یوں لگتا تھا کہ والدہ کو کچھ ہو جائے گا۔ ان کی رنگت نیلی پڑتی جارہی تھی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔ ان کا سر چومنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی ایسا کرشمہ جس سے میری اور والدہ کی جان بچ جائے۔ ان بدترین حالات میں اگر مجھے تھوڑی سی تسلی تھی تو صرف اس بات کی کہ فرح اور عاطف یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر ابھی اس بارے میں بھی پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ٹیرس سے نکل کر ساتھ والی زیرِتعمیر کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ اگر سیٹھ سراج کے ساتھی اردگرد نظر رکھے ہوئے تھے تو پھر ان کے پکڑے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔

میں کسی پلاننگ کے تحت اس کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے اندر شاید محفوظ ترین کمرہ ہے۔ ایک دروازے کے سوا اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ دیوانہ وار دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام تھے۔ اب وہ ضربیں نہیں لگا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ اس طرح کا شور کسی قریبی کوٹھی کے مکینوں کو متوجہ کر سکتا ہے۔ وہ اب دروازے کو دھکیل رہے تھے اور کسی آہنی بار کے زور سے اس کا کھٹکا توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سراج کی غضب ناک وارننگ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ دھاڑ رہا تھا۔ ''دروازہ کھول دو۔ نہیں تو بڑی بھیڑی طرح پچھتاؤ گے۔ بڑا تڑفا کر ماروں گا تمہیں۔''

''گیس چھوڑ دیں جی کمرے میں۔ مرجائیں گے کتے یا باہر نکل آئیں گے۔''

پتا نہیں کہ وہ کس گیس کی بات کر رہا تھا؟ مگر ایک بات واضح تھی۔ یہ مضبوط دروازہ انہیں راستہ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کمرے میں اندھادھند ہاتھ چلا کر کوئی فون یا سیل فون ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دروازہ کتنا بھی مضبوط ہوا، بہت دیر تک ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں گے اور اس کے بعد...... اس کے بعد

ایک وحشت ناک تاریکی کے سوا کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تھا۔ والدہ نے نڈھال ہو کر کرسی کی لمبی نشست سے ٹیک لگائی۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''یا اللہ! میرے بچوں کو بچالے۔ یا اللہ! تُو ہی ان کا حافظ و ناصر ہے۔'' وہ بار بار یہی فقرہ بول رہی تھیں۔ میں نے ان کا لرزاں سر اپنے ساتھ لگایا۔ وہ کراہیں۔ ''اب اس دنیا میں کوئی کس پر بھروسہ کرے۔ اب، وہ تیرا یار کہتا تھا کہ ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا۔ ہمیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہ ہوگی۔ اب وہ کہاں ہے؟ اس کے گھر میں ہی ہم پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔'' ان کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''امی جی! اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ میں ہی مجرم ہوں آپ سب کا۔ جو کچھ ہوا ہے، میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں...... آپ سب کو لے ڈوبا ہوں۔''

اچانک سوئی گیس کی تیز بُو محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی پائپ سے گیس کے خارج ہونے کی تیز آواز بھی سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ آواز چھت کے قریب لگے چھوٹے سے ایگزاسٹ فین سے آرہی تھی۔ ان لوگوں نے سوئی گیس کا کوئی پائپ کاٹ کر وہاں تک پہنچایا تھا اور اب کمرے میں گیس داخل کر رہے تھے۔ والدہ بُری طرح کھانسنے لگیں۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا، میں نے ایگزاسٹ فین کا بٹن ڈھونڈ کر آن کر دیا۔ ایگزاسٹ فین بس ذرا سی حرکت کر کے رہ گیا۔ ان لوگوں نے اس میں کوئی چیز پھنسا کر اسے چلنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فین اتنی بلندی پر تھا کہ وہاں تک پہنچ کر اس کے خلا میں کوئی کپڑا وغیرہ بھی ٹھونسا نہیں جا سکتا تھا۔

دو منٹ کے اندر اندر ہمارے سانس اُکھڑنے لگے۔ میں نے بیتاب ہو کر والدہ کو اپنے ساتھ لگالیا۔ ان کی کمر سہلانے لگا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ ان کے چہرے وحشت سے بگڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ سراج نے ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جالگا۔ شیرے نے رائفل کی نال میرے سر سے لگادی۔ کم از کم چار مزید افراد اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میرے دروازہ کھولنے کے فوراً بعد ہی کمرے میں سوئی گیس کی آمد بند ہوگئی تھی۔ تاہم تیز بُو ابھی موجود تھی۔ والدہ بُری طرح کھانس رہی تھیں۔

ہمیں اس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں پہنچایا گیا۔ والدہ کو کھڑکی کے

پاس ایک صوفے پر پھینک دیا گیا۔ پھر سیٹھ سراج اور شیرے نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر والدہ کے قریب فرش پر پٹخ دیا۔ شیرے نے رائفل کا بٹ میرے سینے پر مارا۔ مجھے لگا کہ میری ایک آدھ پسلی چٹخ گئی ہے۔ جب اس نے دوسرا وار کرنا چاہا تو والدہ تڑپ کر میرے اوپر گر گئیں۔ ''نہیں...... خدا کے لیے نہیں...... میرے بچے کو کچھ نہ کہو۔ میری جان لے لو۔''

سیٹھ سراج نے والدہ کو گھسیٹ کر مجھ سے جدا کیا۔ ''تیری جان بھی ضرور لیں گے۔ پہلے تیرے اس بدمعاش پتر اور اس کے یاروں سے تو حساب کتاب برابر کر لیں۔''

''خدا کے لیے نہیں۔'' والدہ، سیٹھ کے پاؤں سے چمٹ گئیں۔

اس نے ایک ٹھوکر سے انہیں پیچھے کیا۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے سیٹھ سراج پر جھپٹنا چاہا لیکن راستے میں ہی شیرے کی رائفل کی زوردار ضرب میری گردن پر لگی اور میں اُلٹ کر ٹی وی کے اوپر جا گرا۔ ٹی وی نیچے گر کر چکنا چُور ہوا اور ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ میری اس جرأت کی سزا دینے کے لیے شیرا اور اس کے کئی ساتھ مجھ پر پل پڑے۔ میرا جسم جیسے ایک دم ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔ مجھے کچھ ویسا ہی احساس ہوا جیسا سیٹھ سراج سے پہلی مڈبھیڑ پر ہوا تھا۔ چلڈرن پارک میں، مَیں سیٹھ سراج پر جھپٹا تھا اور اس کے فوراً بعد سیٹھ کے ہرکاروں نے مجھے بیدردی سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب والدہ میرے پاس نہیں تھیں۔

آج وہ پاس تھیں اور ایک ماں کے لیے اس سے بڑا امتحان اور کیا ہو سکتا تھا؟ سفاک لوگ آنکھوں میں قاتلانہ چمک لیے اس کے بیٹے کو اس کے سامنے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ وہ بیٹا جسے انہوں نے خاص ناز و نعم سے پالا تھا۔ جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بچپن سے کمزور ہے اور اسے زیادہ توجہ و محبت کی ضرورت ہے۔ جس کی چھوٹی سی تکلیف پر وہ غیر معمولی بیتابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔

یکا یک سیٹھ سراج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے گماشتوں کو روک دیا۔ انہوں نے میرا خون آلود چہرہ فرش کی طرف کیا اور میرے ہاتھ پیچھے موڑ کر کس کر رسّی سے باندھ دیئے۔ تب مجھے گھسیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا گیا۔

والدہ صوفے پر تھیں اور ایک ہٹے کٹے غنڈے نے انہیں سر کے بالوں سے یوں جکڑ رکھا تھا کہ ان کی گردن ایک طرف مڑ گئی تھی اور وہ حرکت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

''میری ماں کو چھوڑ دو۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس حرامجادی کا یہ قصور کم ہے کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔'' سیٹھ سراج پھنکارا، تب اس نے ہم ماں بیٹے پر مشترکہ طور پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اسی دوران میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل آن کیا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''ہاں بختیارے! کیا بنا؟''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر سیٹھ سراج کا طیش بڑھ گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''اوئے کیا نامردوں جیسی گل کر رہا ہے؟ وہ تو ملوکڑی سی کڑی ہے اور ملوکڑا سا منڈا ہے۔ وہ تو زیادہ بھج (بھاگ) بھی نئیں سکدے۔ ادھر ہی کہیں آلے دوالے ہوں گے۔ ڈھونڈ وان کو۔''

واضح تھا کہ سیٹھ سراج، فرح اور عاطف کی بات کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے غالباً انہیں کوٹھے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے پیچھے لگ گئے تھے مگر شکر کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔

پھر سیٹھ سراج کے فون پر ایک اور کال آ گئی۔ وہ بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا موبائل کہاں ہے؟''

''موبائل نہیں ہے میرے پاس۔'' میں کراہا۔

اس کے اشارے پر شیرے نے بڑی سختی سے میری جامہ تلاشی لی۔ موبائل نہیں ملا۔ عمران والی ڈائری ابھی تک میری قمیص کی بغلی جیب میں تھی۔ شیرے نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ سیٹھ سراج نے اپنے ایک ساتھی سے موبائل فون لیا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تیری بھین اور بھائی میں سے کسی کے پاس تو موبائل ہوئے گا۔ چل کسی اک کا نمبر بتا۔ چل شاباش جلدی کر۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ فرح یا عاطف کے ساتھ میرے ذریعے رابطہ کر کے ان تک پہنچنا چاہ رہا تھا اور یہ نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔

میں نے خاموشی اختیار کی تو اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ شیرے نے ایک ''بریٹا پسٹل'' اپنی براؤن قمیص کے نیچے سے نکالا اور ماں جی کی گردن پر رکھ دیا۔ اس پسٹل پر آٹھ دس انچ لمبا سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ شاید نیچے خادم حسین کو اسی پسٹل سے گولی ماری گئی تھی۔ سراج پھنکارا۔ ''میں تجھ کو صرف پندرہ سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ یاں کو بچانا چاہندا ہے تو ان دونوں میں سے کسی کا نمبر بتا دے۔ میں پھر کہندا ہوں۔ پندرہ سیکنڈ ہیں تیرے پاس، گھڑی

کے مطابق۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی گھڑی دیکھنی شروع کر دی۔ پانچ سیکنڈ پورے ہوئے تو اس نے کہا۔ ''پانچ'' دس سیکنڈ پورے ہونے پر کہا۔ ''دس''

میرے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ محسوس ہوا کہ دل پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سراج بول رہا تھا۔ ''بارہ...... تیرہ...... چودہ۔''

''ٹھہرو...... ٹھہرو۔'' میں بلکا۔ ''ایسا مت کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں......''

''بکواس بند کر۔'' سیٹھ سراج نے بڑی وحشت سے میری بات کاٹی۔

شیرے نے ماں جی کو بازو سے کھینچا اور سیدھا بٹھا دیا۔ وہ چلا اُٹھیں۔ ''ہائے میرا مونڈھا۔''

''کیا ہوا ہے تیرے مونڈھے (کندھے) کو؟'' سیٹھ سراج نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''مم...... میرے مونڈھے درد کرتے ہیں۔ ہل نہیں سکتے۔'' ماں جی کربناک آواز میں بولیں۔

''ہم بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیندے ہیں تیرے مونڈھے کو۔'' سیٹھ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی شیرے کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

شیرے نے بریٹا پسٹل کا سائیلنسر بے رحمی سے ماں کے ''فروزن شولڈر'' پر رکھ دیا۔ سیٹھ سراج نے مجھ سے مخاطب ہو کر زہر اُگلا۔ ''بتا...... اپنی بے بے کے مونڈھے پر ٹیکا لگوانا ہے کہ اپنی بھین اور بھائی کا نمبر دینا ہے؟''

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بولنے کی سکت ہی نہیں رہ گئی۔ میں نے بے بسی کی انتہا کو چھو کر سیٹھ سراج کی طرف دیکھا۔ اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ بے مثال سفاکی کے ساتھ شیرے نے ٹریگر دبا دیا۔ سائیلنسر لگے پسٹل میں سے ٹھک کی مخصوص آواز برآمد ہوئی اور ماں جی کا کندھا ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ انہوں نے ماں جی کے کندھے میں گولی اُتار دی تھی۔

وہ تڑپ کر صوفے پر گریں اور کرب کی انتہا کو چھو کر رونے لگیں۔ وہ بے حس درندے تھے۔ ایسی ہی سفید بالوں اور نم آنکھوں والی مائیں ان کے گھروں میں بھی ہوں گی اور یہ ماں تو پہلے ہی بیمار تھی، درد سے بے حال تھی لیکن وہ سنگ دل ذرا پشیمان نہیں ہوئے۔ ماں جی کے زخمی کندھے سے خون بہہ کر نیلے صوفے پر گلکاریاں کرنے لگا۔

سیٹھ سراج کے اشارے پر شیرے نے پسٹل ماں جی کے دوسرے کندھے سے لگا دیا۔ سراج نے اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ پرور آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ''ہاں...... اب بتا کاکا! اپنی بے بے کے دوجے مونڈھے پر بھی ٹیکا لگوانا ہے کہ کچھ بکنا ہے؟''

میرے لیے جیسے زمین آسمان کے قلابے مل چکے تھے۔ ایک طرف تڑپتی ہوئی ماں تھی، دوسری طرف بہن اور بھائی...... لیکن بہن اور بھائی اوجھل تھے۔ ماں سامنے تھی اور جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، وہ زیادہ عذاب ناک ہوتا ہے۔

میرا منہ اتنا خشک تھا کہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ ایک شخص نے گلاس میں پانی دیا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے خود ہی چند گھونٹ پلائے اور بے رحم مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر چند قدم دور کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ سراج نے اپنے جوتے کی نوک سے میری ٹھوڑی اوپر کی اور اپنی زہریلی نگاہیں میری آنکھوں میں گاڑیں۔ اس کی ریچھ جیسی چمکیلی آنکھیں جیسے بزبان خاموشی کہہ رہی تھیں۔ تجھے کہا تھا نا مجھ سے متھا نہ لگا، نئیں تو بات بہت دور تک جائے گی۔ تو نے میرے منہ پر چپیڑ ماری تھی اور اس چپیڑ کے لیے میں نے تجھے پوری مافی نئیں دی تھی اب تیرے نال نال تیری ماں اور تیری جوان بھین کو بھی تیرے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

میں سیٹھ سراج کی وحشی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور نظریں جھکا لیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کاکا جی! زیادہ ٹائم نئیں ہے۔ جلدی بکواس کرو۔ نئیں تو دوجے کندھے میں دوجا ٹیکا لگ جائے گا اور پھر شاید تیسرا ٹیکا لگے گا اور یہ لگے گا بے بے جی کے سر کی ہانڈی میں۔ ہانڈی کے دو تین ٹوٹے ضرور ہو جائیں گے۔ چلو شاباش فون نمبر بولو۔''

میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، ماں جی کی سانس پھنس پھنس کر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گولی کندھے میں لگ کر پسلیوں کی طرف چلی گئی ہے۔ شیرے کی بے مہر اُنگلی پھر پسٹل کے ٹریگر پر تھی۔ کسی بھی وقت ''ٹھک'' کی منحوس آواز دوبارہ اُبھر سکتی تھی۔ میں ٹوٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں چھوٹے بھائی عاطف کا سیل نمبر بتایا اور اس کے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ نمبر اٹینڈ نہ ہو سکے۔

سراج نے فون نمبر موبائل سیٹ پر پریس کیا اور کال ملانے سے پہلے بولا۔ ''دیکھ کاکے! اپنے بھائی سے وہی بولنا پڑے گا جو تجھ کو بتا رہیا ہوں۔ اک لفظ بھی دائیں بائیں کرے گا نا تو بے بے کے دوجے مونڈھے میں ٹیکا لگ جائے گا۔ بھائی سے پوچھ وہ کتھے ہے۔ وہ جہاں کا بتائے، اس سے بول کہ وہ اوسے جگہ پر ٹھہر جائے۔ تو وہاں پہنچ رہیا ہے۔ گل سمجھ وچ آ گئی

نا۔ میں اک وار فیر کہندا ہوں۔ ایک لفظ بھی سچ کھیے کرے گا نا تے گولی چلے گی۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کال ملائی۔ میرا دل پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ عاطف کے فون پر بیل جا رہی تھی۔ سراج نے ہاتھ آگے بڑھا کر فون میرے کان سے لگا دیا۔ چوتھی، پانچویں بیل پر کال ریسیو ہو گئی۔ دوسری طرف سے عاطف کی سہمی اور ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

میں خاموش رہا۔

''کون بول رہا ہے؟'' عاطف نے پھر پوچھا۔

سراج نے مجھے فون کے ساتھ زور سے ٹھوکا دیا کہ میں بولوں۔ میں تو نہیں بولا لیکن سراج کے ٹھوکا دینے سے موبائل کا بٹن دب گیا اور کال ''ڈس کنیکٹ'' ہو گئی۔

سراج نے جھلا کر مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی گرانڈیل شیرے کا چہرہ بھی خون کے دباؤ سے سیاہی مائل ہو گیا۔ سراج بولا۔ ''یہ ایسے نئیں مانے گا۔ اس کی بے بے کی ہانڈی پر رکھ نالی اور اگر نہ بتائے تو توڑ دے کتیا کی ہانڈی۔''

یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ یہ ذلت کا ''عروج'' تھا، مجھے موت سہل لگ رہی تھی۔ اپنی سسکتی ہوئی خونچکاں ماں کو لاچاری کے ساتھ دیکھنا آنکھوں کا بدترین عذاب تھا۔ وہ درد کی انتہا سے گزر رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ ماں تھیں۔ اس حالت میں بھی انہیں اپنے بچوں کی سلامتی عزیز تھی۔ ان کی ماممتا آخری ہچکی تک اپنے بچوں کا تحفظ چاہتی تھی اور اس تحفظ کے لیے وہ اس سے دس گنا اذیت بھی جھیلنے کو تیار تھیں۔

سراج نے ایک بار پھر عاطف سے کال ملائی اور فون میرے کان سے لگا دیا۔

ماں جی نے لڑکھڑاتی آواز میں فریاد کی۔ ''نہیں تابی! مجھے مر جانے دینا۔ ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔ ان کو کچھ نہ بتانا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ نہ بتائے تو توڑ دو اس بڈھی کا کھوپڑا۔'' سراج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں میری بدقسمتی نے پھر زور مارا۔ عاطف سے کال مل گئی۔ اس مرتبہ عاطف کے فون پر فرح کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔ ''کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟''

فرح کی آواز سن کر سیٹھ سراج کی آنکھوں میں شیطانی چمک نمایاں ہو گئی۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بہ زبان خاموشی کہہ رہا تھا۔ ''بول نئیں تو تیری ماں جا رہی ہے۔''

میرے دل نے گواہی دی کہ وہ اور اس کے ساتھی ماں جی کو مار دیں گے اور اگلے چند سیکنڈ میں، مَیں اپنی ماں کی بے نور آنکھیں دیکھوں گا۔ ان کے ساکت ہونٹ جو پھر کبھی ہمارے لیے دعا کے لیے نہیں ہلیں گے اور ان کے منجمد ہاتھ جو کبھی ہمارے سر پر نہیں آئیں گے۔ نہیں...... میں اپنی ماں کو یوں نہیں جانے دوں گا۔ کسی قیمت پر نہیں۔ میرے اندر ایک عجیب سی توانائی لہر لینے لگی۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو...... فرح...... میں تابش۔''

''بھائی! آپ کہاں ہیں آپ...... آپ نکل آئے ہیں نا؟ امی کہاں ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں نا...... خدا کے لیے بتائیں آپ ٹھیک ہیں؟ خدا کے لیے......'' وہ بولتی چلی گئی۔

میرے ہونٹ لرزاں تھے لیکن میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ سراج نے فون کے ماؤتھ پورشن کو انگلی سے ڈھانپا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اس سے پوچھ وہ کہاں ہے۔ کس جگہ پر ہے۔ جلدی پوچھ...... جلدی۔''

میں جانتا تھا کہ سراج اور شیرے کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اب میں نہ بولا تو وہ ماں جی کو مار دیں گے۔ وہ اگلے چند سیکنڈ میں ان کی جان لے لیں گے۔ شیرے نے اب ایک ہاتھ ماں جی کے ہونٹوں پر بڑی مضبوطی سے جما دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی آہ و بکا موبائل فون کے ذریعے فرح اور عاطف تک پہنچ جائے۔ ماں جی کسمسا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کراہتی آواز میں کہا۔ ''ہیلو فرح...... میں ٹھیک ہوں...... تم...... تم......'' میں نے بہت کوشش کی مگر آواز گلے میں رُک رہی تھی۔ میں اتنا جگرا کہاں سے لاتا کہ فرح سے پوچھتا، وہ کہاں ہے؟

ماں جی کی سانس بند ہو رہی تھی۔ وہ بے طرح کھانس رہی تھیں پھر انہیں قے ہوئی۔ وہ کھانستے کھانستے اُٹھیں اور کھڑکی کی طرف مڑیں۔ دو تین سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ وہ شاید قے کرنا چاہ رہی ہیں مگر انہوں نے وہ کیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو قربان کر دیا۔ ہاں...... مر تو انہوں نے شاید ویسے بھی جانا تھا کہ وہ بُری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اپنی موت کو بروقت بنا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی جان کے خوف سے سیٹھ سراج کی ہدایت پر عمل کر گزرتا، ماں جی نے اپنی جان...... جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ وہ قریباً سترہ فٹ نیچے پختہ فرش پر گری تھیں۔ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگے۔ میں نے بھی نیچے دیکھا۔ وہاں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ میری ماں کا سر جسیم کے ایک بڑے گملے سے ٹکرایا تھا۔ شاید سر کی Frontal Bone ٹوٹ گئی تھی۔ خون کا ایک ریلا سا سیاہی مائل فرش پر رینگتا ہوا ایک کیاری کی طرف بڑھ رہا

تھا۔ یہ ماں تھی جو ابھی جینا چاہتی تھی۔ جس نے ابھی اپنے کسی بچے کی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ جو اپنی بیٹی کے بڑے پیار سے بنائے ہوئے زیور ایک اٹیچی میں لیے لیے پھر رہی تھی اور ان زیوروں جیسے سیکڑوں ممتا بھرے ارمان اس کے دل میں موجود تھے۔ ان ارمانوں سمیت کچھ ہی دیر پہلے تو وہ زندہ تھی۔ سانس لے رہی تھی، باتیں کر رہی تھی۔

میں مڑا اور اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنی ماں کا ٹوٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا پھر بھی جیسے دل میں آس تھی کہ ان میں جان باقی ہوگی۔ میں ان کے سر کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اپنی گود میں رکھوں گا اور ماتھے کو بوسہ دوں گا تو وہ پلکیں جھپکنے لگیں گی۔

''پکڑو...... بھاگ رہا ہے۔'' شیرا دھاڑا۔

میں زینوں پر پہنچا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لپکے۔ ''ماں جی...... ماں جی۔'' میں دودھ پیتے بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ میں نے چار پانچ زینے طے کیے تھے کہ کسی نے عقب سے میری گردن پر ضرب لگائی۔ میں لڑکھڑایا۔ ابھی میرے سامنے بارہ تیرہ زینے باقی تھے۔ میں ان زینوں پر سے اُڑتا ہوا سر کے بل سیاہی مائل فرش کی طرف گیا۔ فرش جس میں سفیدی مائل دھاریاں تھیں۔ جو بہت سخت تھا اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ میں اس فرش سے ٹکرانے والا تھا۔ بُری طرح ٹکرانے والا تھا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے پھر میں تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اپنی ساری کم ہمتی، لاچاری اور بدقسمتی سمیت۔ مجھے ہر طرف سے ایک سرد، سیاہ بے خبری نے ڈھانپ لیا۔

○......❖......○

میری آنکھ کھلی۔ میں چت لیٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا جسم پھوڑا بنا ہوا ہے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کنپٹی کے قریب چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ سر کے زخم سے بہنے والا خون تھا۔

میری دھندلائی ہوئی نگاہیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے سر پر کسی چھت کے بجائے درخت نظر آئے۔ یہ شاید شام کا وقت تھا۔ درختوں سے اوپر آسمان گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر زور سے بجلی چمکی۔ گڑگڑاہٹ ہوئی اور بوندیں برسنے لگیں۔ میں یہ سارے مناظر بالکل خالی خالی ذہن کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ پردۂ تصور خالی تھا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے ٹی وی اسکرین پر کوئی منظر ''فیڈ اِن'' ہوتا ہے، میرے پردۂ تصور پر بھی دھندلے مناظر کی شبیہ بننے لگی۔ یہ شبیہ بہت آہستہ آہستہ بنی لیکن بنتی چلی گئی۔ ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور بے ترتیب رنگوں نے موہوم شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ ہوا کی سائیں سائیں نے

آوازوں کا روپ دھارا۔ یہ آوازیں واضح ہوئیں۔ ان کے آہنگ، ان کے الفاظ باقاعدہ شکل اختیار کرنے لگے۔ ''پکڑو...... بھاگ رہا ہے۔''

''یہ کس کی آواز تھی؟''

موٹے جسم اور چھوٹے سر والا ایک شخص میری نگاہوں کے سامنے دھیرے دھیرے ایک وجود اختیار کرنے لگا۔ کون تھا یہ؟ سیٹھ سراج۔

ایک دم اپنی والدہ کی صورت دھند کی دبیز چادر کو چاک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آئی۔ ''نہیں تابی! مجھے مر جانے دینا۔ ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔''

مجھے لگا کہ میں نے یہ آواز بہت عرصہ پہلے کہیں سنی تھی۔ پھر اس آواز کے بعد کیا ہوا تھا؟ ایکا ایکی میری شریانوں میں تہلکہ مچ گیا۔ پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک پورے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ماں جی کا سر جپسم کے گملے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی بے نور آنکھیں، ٹیوب لائٹ کی روشنی میں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں۔

میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ''ماں جی...... ماں جی۔'' میں نے سینے کی پوری قوت سے پکارا اور اُٹھ بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا درخت تھے اور ان کے درمیان خودرو جھاڑیوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ بارش کی بوچھاڑوں کے سبب زمین پر کیچڑ بننا شروع ہو گیا تھا۔ میں پہلے تو چالیس پچاس قدم تک سیدھا بھاگا، پھر وہاں سے بائیں مڑ گیا پھر بائیں سے دائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ میں پکار رہا تھا۔ ''میری ماں کو مار دیا تم نے...... میری ماں کی جان لے لی۔ تم خونی ہو، قاتل ہو۔''

لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں جو میری سنتا اور کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ چاروں طرف درخت تھے اور بارش کی بوچھاڑیں تھیں۔ میں ہانپ کر رُک گیا۔ اردگرد دیکھنے لگا۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ پھر میری نگاہ اپنے لباس پر پڑی۔ لباس بھی اجنبی تھا۔ یہ ایک پاجامہ کُرتہ تھا۔ اس کے اوپر سوتی کپڑے کی ہی واسکٹ سی تھی۔ جوتی بھی اجنبی سی تھی۔ یہ مجھے کہاں پھینکا گیا تھا اور کیوں؟ مجھے ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی۔ درخت، ہوا، بارش اور خود اپنا آپ بھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ یہ سر سے بہنے والے خون کے سبب داغدار تھا۔ مجھے یوں لگا کہ غیر ماحول میں یہ ہاتھ بھی اجنبی سا ہو گیا ہے۔

''کوئی ہے...... کوئی ہے یہاں؟'' میں کرب کی انتہا کو چھو کر چلّانے لگا۔

میری آواز بارش کی صدا سے بغل گیر ہو کر دور تک گئی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے

سینے میں غم کا طوفان تھا۔ لگتا تھا کہ میں کھل کر نہ رویا تو کلیجا پھٹ جائے گا۔ مجھے پُرسا چاہیے تھا۔ میں ایک درخت سے لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ''میں یتیم ہو گیا۔ میری ماں مر گئی۔ میرا سب کچھ لٹ گیا۔'' میں رو رہا تھا اور درخت کے تنے سے اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا۔ یہ درخت میرا قریبی عزیز بن گیا۔ میرا غمگسار، میرا دوست، بھائی، سب کچھ۔

ایک دم مجھے عاطف کا خیال آیا۔ عاطف اور فرح کوٹھی سے نکل بھاگے تھے۔ کیا وہ بچنے میں کامیاب ہوئے؟ وہ کہاں تھے؟ کس حال میں؟ ایک دم بہت سے سوالوں نے ذہن پر یلغار کی۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں۔ چند گھڑیاں چند دن یا ہفتے۔ میری نگاہ کلائی کی گھڑی کی طرف گئی۔ وہاں رسٹ واچ موجود نہیں تھی۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے غمگسار درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی پتوں سے چھن چھن کر میرے سر پر پڑنے لگا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ میں کتنی دیر بے ہوش رہا اب کہاں تھا میں؟

ماں کا مرا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور میں ایک بار پھر بے قرار ہو کر اس بھیگے ہوئے جنگل میں بھاگنے لگا۔ آوازیں دینے لگا۔ کبھی اپنی ماں کو، کبھی چھوٹے بھائی کو اور فرح کو کبھی کسی کو مدد کے لیے بلانے لگا۔

میں روتا رہا اور بھاگتا رہا۔ بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد کے مناظر ہیولوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جیسے یہ ساری دنیا ایک ویرانے کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ بس کسی وقت مجھے اپنے اردگرد کسی چھوٹے موٹے جانور، گلہری، بلی، نیولے وغیرہ کی موجودگی کا احساس ہوتا یا گھونسلے میں دبا ہوا کوئی پرندہ مدھم آواز نکالتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں سمتوں کا تعین کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ اگر میری آنکھوں کے سامنے اُجالا...... اندھیرے میں نہ بدلا ہوتا تو شاید میں وقت کا تعین کرنے سے بھی قاصر رہتا۔

نہ جانے میں کب تک اسی طرح بھاگتا رہا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ بول بول کر گلا بیٹھ گیا اور آنسو خشک ہو گئے۔ میرے اردگرد خاموش نباتات اور مسلسل برستی بارش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بالآخر ایک نشیب میں مجھے ایک چھوٹی سی کھوہ نظر آئی، میں اس میں داخل ہو گیا۔ یہ کچی زمین میں ایک پندرہ بیس فٹ لمبا سوراخ سا تھا اور بُو بھی آ رہی تھی۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا جانور یہاں مرا تھا۔ بہرحال اس کھوہ میں داخل ہوتے ہی

میں بارش سے محفوظ ہو گیا۔

میں نے ایک دیوار سے ٹیک لگا لی اور اپنے اندرونی ہیجان کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں معروضی انداز میں سوچنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے لباس پر توجہ دی۔ جیبوں کو ٹٹولا۔ کُرتے کی بغلی جیب میں سے ایک رومال نکلا۔ کپڑے کی ایک چھوٹی سی ملائم تھیلی نکلی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا، اس میں بادام، چھوہارے اور مکھانے وغیرہ تھے۔ شادی بیاہ اور نکاح کے موقع پر ایسی تھیلیاں مہمانوں میں تقسیم کی جاتی ہیں پھر میری جیب سے سگریٹ کا ایک چھوٹا پیکٹ اور لائٹر نکلا۔ یہ دونوں اشیا پتا نہیں کس نے جیب میں رکھی تھیں، ورنہ میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا۔

میں نے لائٹر جلایا تو وہ جل گیا۔ چھوٹے سے زرد شعلے کی روشنی میں، مَیں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کھوہ کی کچی دیواروں سے کئی جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں کسی پرندے کے پر پڑے تھے۔ ایک طرف خشک ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے ان ٹہنیوں میں سے کچھ کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور تھوڑی سی کوشش سے آگ سلگانے میں کامیاب ہو گیا۔

آگ سے روشنی کے علاوہ حرارت بھی ملی۔ میں قدرے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں کہاں ہوں اور میرے جسم پر یہ بالکل اجنبی لباس کیوں ہے؟ میں ماں جی کو پکارتا ہوا زینوں کی طرف بھاگا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا؟ پھر وہ لوگ میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں نے چند زینے ہی طے کیے تھے کہ عقب سے کسی نے مجھے رائفل کا بٹ رسید کیا تھا۔ میں ہوا میں اُڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف گیا تھا۔ اس فرش میں سفید سفید دھاریاں تھیں۔ اس کے بعد یاد نہیں رہا تھا۔ سب کچھ ایک دور افتادہ ''سیاہ دھند'' میں چھپ گیا تھا۔ مجھے سیٹھ سراج، شیرے اور بختیار وغیرہ کے سفاک چہرے یاد آئے۔ بختیار تو فرح اور عاطف کے پیچھے تھا۔ باقی لوگ مجھے زندگی میں موت کا مزہ چکھا رہے تھے۔ دلیل تو یہی کہتی تھی کہ انہیں، مجھے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا لیکن اگر میں یہاں اس ویرانے میں موجود تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑا ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی کوئی چال تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب بھی کچھ لوگ میری بے خبری میں میرے اردگرد موجود ہوں۔ وہ میرے ذریعے کسی اور تک پہنچنا چاہتے ہوں۔ مثلاً فرح اور عاطف تک۔

لیکن ایسا ہوتا تو مجھے لاہور ہی میں کہیں چھوڑا جاتا، اس ویرانے میں چھوڑنے کی کیا وجہ تھی؟ میں غور کرنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ شیشم کے علاوہ دھریک اور تھوہر وغیرہ کے پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ لاہور کے اردگرد تو چھانگا مانگا

ہی ایسی جگہ تھی جہاں اس قسم کے مناظر دیکھے جاسکتے تھے۔ مگر مجھے یہ چھانگا مانگا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میرا دھیان اس ڈیک نالے اور اس ''رکھ'' کی طرف چلا گیا جہاں میں نے اپنی زندگی کا ایک دل دوز ترین منظر دیکھا تھا۔ جہاں میرا یار، سینے پر برسٹ کھا کر میری آنکھوں کے سامنے قاتل پانی میں گرا تھا۔ دل میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اُٹھیں اور سر چکرانے لگا۔ کیا یہ وہی گردوپیش تھے جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا؟ ذہن نے اس بات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔

بارش کچھ ہلکی ہوگئی تھی۔ میں کھوہ سے باہر نکلا اور کسی راہ گم کردہ بدحال مسافر کی طرح اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے میں ناقابلِ بیان دُکھ کا الاؤ تو موجود تھا۔ میں پھر دل دوز انداز میں پکارنے لگا۔ ''کوئی ہے..... کوئی ہے..... میری مدد کرو۔''

جواب میں جنگل کے مہیب سناٹے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پکار پکار کر میرا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اب تو آواز بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ میں بے دم ہو کر پھر کھوہ میں آ گیا اور بجھتی ہوئی آگ میں کچھ اور خشک ٹہنیاں ڈال کر قریب ہی لیٹ گیا۔ سر کے زخم سے شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے انگلیوں سے چھو کر دیکھا۔ زخم کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ زیادہ پُرانا نہیں ہے۔ تو کیا ڈیفنس کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات کو زیادہ دیر نہیں گزری؟ یہ ایک دو روز پہلے کی بات ہی ہے؟ مگر ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، چہرے پر چھ سات روز کی شیو تھی۔ مجھے یاد آیا کہ رشید اور گلزار وغیرہ کے ہتھے چڑھنے کے بعد میں نے دو تین روز تو لالہ زار سکیم کے گھر میں ہی گزارے تھے۔ وہاں میری شیو بڑھتی رہی تھی، اس کا مطلب تھا کہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہونے کے بعد مجھے چار پانچ دن مزید گزر گئے تھے۔

دماغ ایک بار پھر بُری طرح چکرانے لگا۔ خیالات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اپنی ماں جی کا مُردہ چہرہ دیکھے مجھے بس ایک دو دن ہی ہوئے ہیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس واقعے کو صدیاں بیت چکی ہیں۔ میں کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ والدہ اور عمران کے لیے آنکھوں سے تازہ آنسو اُبلنے لگے۔ میرے رُخسار پر رینگنے لگے اور میری ناک کے بانسے سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں دل ہی دل میں پکارا۔ ''میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں اپنے چاہنے والوں کے لیے ایک مجسم بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرا پیارا دوست، میری بزدلی اور حماقت کی وجہ سے گولیوں سے چھلنی ہوا۔ میری ماں کی جان میری آنکھوں کے سامنے گئی۔ میں ان کی موت کا ذمے دار ہوں اور جو ابھی زندہ ہیں۔ ان پر میری وجہ سے ابھی نہ جانے کیا قیامت گزرنی ہے۔'' میں بہ زبان خاموشی بلکنے لگا۔ ''اے خدا! تُو

نے مجھے ایسا کیوں بنایا؟ اور اگر ایسا بنایا تھا تو پھر اس طرح کے حالات سے کیوں دوچار کیا؟ میرا کیا قصور ہے میرے مالک! میں ہوں ہی ایسا۔ میں نے خود کو بدلنے کی ہزار کوششیں کیں مالک! جو کچھ میری سمجھ میں آیا، خلوصِ دل سے کیا اور کرتا رہا۔ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط بنانے کے بے شمار جتن کیے۔ ہر طرح کی بداخلاقیوں سے دور رہا۔ اپنے اندر چھپی ہوئی توانائیوں کو ڈھونڈنے کی سعی کرتا رہا۔ مگر جو کچھ میرے اندر تھا ہی نہیں جو تُو نے میرے اندر رکھا ہی نہیں تھا، میں اسے کیسے ڈھونڈ پاتا۔''

دُکھ کی انتہا کو چھو کر میں اپنے رب سے شکوہ کناں ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو، طوفانی دھاروں کی طرح اُبلنے لگے۔ ''اے میرے رب! ہم نے تو یہی سنا تھا، تُو اپنے بندے کو پیار کرتا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اے مالک! ماں تو اپنے ہر بچے کی کمزوریوں، خامیوں کو سمجھتی ہے۔ جو بچہ زیادہ کمزور ہوتا ہے، وہ اس کا اتنا ہی دھیان رکھتی ہے۔ اس کو کوئی کسر نہ لگ جائے، اس کی کوئی کمزوری اسے نقصان نہ پہنچائے، وہ ہر گھڑی اسی فکر میں رہتی ہے۔ تو اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے مالک! تُو نے مجھے کمزور و ناتواں پیدا کیا اور پھر میری طرف سے دھیان بھی ہٹا لیا۔ میں کہاں جاؤں مالک؟ میں کیا کروں؟ ماں کی ممتا تو اپنے بچوں میں سے کسی کو کوئی کمی نہیں ہونے دیتی۔ اگر کمی ہوئی بھی ہے تو اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔ اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے رب العزت! تُو نے مجھے کم ہمتی و ناتوانی دی اور اس کے بدلے میں بھی کچھ نہ دیا۔ کوئی تو صلاحیت رکھی ہوتی میرے اندر کوئی ہنر کوئی گن جس سے میں اپنی لاچاریوں کا ازالہ کر سکتا۔

میں بہت رو چکا مالک! بہت دُکھ سہہ چکا۔ اب تو ماں بھی نہیں رہی۔ اب اور ہمت نہیں ہے۔ اب یہ کھیل ختم کر دے۔ اب اپنی زندگی واپس لے لے۔'' میں نے اپنا چہرہ کچھ زمین میں دھنسا دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتے روتے نہ جانے کس وقت جسم و جاں پر نقاہت طاری ہوئی اور میں غنودگی میں جانے کے بعد سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں بدستور اُسی کھوہ میں تھا۔ آگ مدھم ہو چکی تھی مگر مکمل طور پر بجھی نہیں تھی۔ باہر تاریک فضا میں درختوں کے پتوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ میرا سر کسی نرم گداز چیز پر ہے۔ یہ شاید کسی زانو پر تھا۔ پھر مجھے اپنے ہونٹوں پر بھی کسی نرمی اور گرمی کا احساس ہوا۔ کسی کی سانس میرے رُخسار سے ٹکرائی۔ کسی کے ہونٹ مجھے بڑی نرمی سے بوسہ دے رہے تھے۔

میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ سر میں شدید ٹیس اُٹھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں رہ

گیا۔ میرے بالکل قریب ایک لڑکی موجود تھی۔ آگ کی مدھم سرخ روشنی میں اس کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ درمیانی شکل وصورت کی تھی، تاہم اس کے چوڑے رُخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کے بال بے حد گھنے اور لمبے تھے۔ چوڑی پیشانی پر ایک طرف زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دوپٹا بھی موجود تھا مگر وہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ دُکھی انداز میں بولی۔ ''میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈتی رہی ہوں تم کو۔ دیکھو میرے پاؤں بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کہیں......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''کک......کون ہو تم؟'' میں نے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرت اور پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''مذاخ (مذاق) کے لیے یہ وخت (وقت) اچھا نہیں ہے مہروج۔''

''مہروز......کون مہروز؟''

اس کی آنکھوں کی پریشانی فزوں تر ہوئی لیکن اس نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور ذرا مسکرا کر اور مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر ادا سے بولی۔ ''مہروج! میرا شوہر، میرا شریکِ حیات، میری زندگی کا واحد سہارا۔ جو کج ادا ہے۔ ستاتا ہے۔ رلاتا ہے پھر بھی اچھا لگتا ہے۔'' اس کے لب ولہجے میں حیدرآبادی آہنگ تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے ہوش وحواس سے بہت دور نظر آتی تھی۔ اس ویران جنگل میں اس مسلسل برستی بارش میں اس کا یہاں پایا جانا اتنا ہی حیرت ناک و ناقابلِ فہم تھا جتنی وہ خود تھی۔ اس کے لباس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی دنوں سے اس ویرانے میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی پھول دار قمیص دو تین جگہ سے پھٹی ہوئی تھی، کپڑوں پر سرخی مائل کیچڑ کے داغ بھی جابجا تھے۔ سب سے عجیب چیز اس کا لب ولہجہ تھا۔ اس قسم کی زبان میں نے ایک دفعہ انڈین حیدرآباد میں سنی تھی۔ وہاں میں، فرح اور عاطف ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ کئی برس پہلے کی بات تھی۔

وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لگاوٹ سے بولی۔ ''دیکھو...... میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم کو نیند آ رہی ہے، تم خود کو کسی کپڑے کے ساتھ درخت سے باندھ لو تو اچھا ہوئیں گا۔ مگر تم نے میری بات اِچ نہیں مانی۔ یہ تو شکر ہے درخت زیادہ اونچا نہیں تھا، ورنہ بہت چوٹ

آتی۔''

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی اور اسے مجھ پر کس شخص کا شبہ ہو رہا تھا۔ بہرحال میں خاموش رہا۔ اس نے میری کنپٹی پر بڑی ملائمت سے اُنگلیاں چلائیں اور بولی۔ ''میں نے پٹی کر دی ہے، خون بھی بند ہو گیا ہے۔ مگر لگتا ہے کہ ٹانکے لگنے کی ضرورت ہوئیں گا۔ اللہ کرے ہم کل کسی طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے خابل (قابل) ہو جائیں۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بول رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ جو کہہ رہی ہے، وہی درست ہے۔ اس کے قریب ہی ایک جھولا سا رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ کپڑے کے اس جھولے میں اس کا سفری سامان ہے۔ اس نے جھولے میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر گھمایا اور کسی پودے کی دو تین شاخیں باہر نکال لیں۔ ان شاخوں کے ساتھ لمبوترے پتے بھی لگے ہوئے تھے۔ اس نے پتے شاخوں سے علیحدہ کیے اور بولی۔ ''یہ ہے وہ بوٹا جسے ڈھونڈنے گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کہیں آس پاس اِچ ہوئیں گا لیکن کافی دور سے ملا۔ سینے کی جلن اور پیٹ درد کے لیے ایک دم اچھی چیز ہے۔ تم دیکھنا کتنی جلدی ٹھیک ہوتے ہو۔''

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس نے جھولے کے اندر سے ہی چھوٹی سی سل اور وٹا نکالا۔ ساتھ میں پلاسٹک کی بوتل بھی تھی جس میں پانی تھا۔ اس نے پتوں کو مروڑ کر سل پر رکھا اور وٹے سے انہیں پیسنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سارا جسم ہلکورے لینے لگا۔ بھیگے ہوئے لمبے بال آگے کو ڈھلک آئے اور زمین کو چھونے لگے۔ اس کی عمر تئیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ وہ مضبوط ہاتھ پیر کی صحت مند لڑکی تھی۔ نقوش ذرا موٹے تھے تاہم ان میں جاذبیت موجود تھی۔ لگتا تھا کہ ذرا سی مشقت سے اس کے عارض، انار کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔

سل پر چند رگڑے لگانے کے بعد وہ ایک دم چونکی۔ اس نے اپنا ہاتھ روک کر ناک سکوڑی اور کچھ سونگھنے لگی۔ یقیناً کھوہ میں سے اُٹھنے والی ہلکی بُو اُسے بھی تنگ کر رہی تھی۔ اس نے آگ میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اُٹھائی اور اس کی روشنی میں احتیاط سے کھوہ کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی وہ بُو کا ماخذ ڈھونڈنے میں کامیاب رہی۔ یہ بلی کا مُردہ بچہ تھا جسے شاید کسی نر نے ہی مار ڈالا تھا۔ اس کی انتڑیاں نکلی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے اس منظر پر افسوس کا اظہار کیا۔ بہرحال مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے کسی طرح کی کراہت کھائے بغیر بلونگڑے کی لاش کو دُم سے پکڑا اور کھوہ سے باہر نکال کر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے متاثرہ جگہ کو ایک گیلے کپڑے سے صاف کیا اور جھولے میں سے کوئی عطر قسم کی شے نکال کر کھوہ میں تین چار جگہ لگا دی۔ اس سے بھینی سی خوشبو پھیل گئی۔

میں نے اسے پہلی بار چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اس نے پاؤں میں کیچڑ آلود جوگرز ٹائپ جوتے پہن رکھے تھے۔ جب وہ بلونگڑے کو باہر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینکنے گئی تو بارش کی بوچھاڑوں سے اس کا لباس پھر بھیگ گیا۔ اس کی پھولدار قمیص اس کے جسمانی خدوخال کو نمایاں کرنے لگی۔ اس کا جسم غیر معمولی طور پر منہ زور تھا۔ جیسے ہر حرکت پر لباس سے برسرِ پیکار ہو رہا ہو۔ وہ ایک بار پھر دوزانو بیٹھ کر سل پر پتوں کو رگڑنے لگی۔ ''دیکھو...... تم نے کیا کیا؟'' وہ اپنی روانی میں بولی۔ ''میں تمہارے پیٹ درد کے لیے پریشان تھی اور تم نے اتنی بڑی چوٹ لگوالی اور چلو اگر چوٹ لگ اچ گئی تھی پھر وہیں تو رہتے۔ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہاری یہی باتاں پریشان کر دیتی ہیں۔ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بس اب گم ہو گئے تم۔ وہ تو شکر ہے کہ نجل خراب ہوتی یہاں پہنچی تو تھوڑی روشنی نظر آ گئی۔''

وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جنگل، یہ بارش اور یہ تاریک کھوہ جس میں آگ کی طلساتی روشنی تھی، کسی داستان کا منظر لگتا تھا۔ دل میں واہمہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ لڑکی واقعی وجود رکھتی ہے یا پھر کوئی بصری دھوکا ہے، آسیب ہے۔

میں جو کچھ بھی ہوں لیکن ٹھوس حقائق پر یقین رکھنے والا شخص ہوں۔ ہر چیز کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنے والا اور مافوق الفطرت تصورات سے دور رہنے والا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ گوشت پوست کی لڑکی ہے اور میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، جاگتی آنکھوں سے اور پورے ہوش و حواس میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی اُلجھن تھی تو وہ یہی تھی کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں میں موجود ہوں۔

لڑکی نے پتوں کو پیس کر بالکل باریک کر دیا پھر اسے ایک پیالے میں ڈالا۔ پلاسٹک کی بوتل سے اس میں تھوڑا سا پانی ملایا اور میری طرف بڑھایا تاکہ میں چند گھونٹ پی لوں۔ اس میں سے عجیب سی نباتاتی بو اُٹھ رہی تھی۔ میں نے پینے سے منع کر دیا۔ نہ جانے یہ مخبوط الحواس لڑکی کیا پلا رہی تھی۔

اس نے میرے انکار کا حتمی انداز دیکھا اور گہری سانس لے کر پیالا ایک طرف رکھ دیا۔ ''اچھا...... کوئی باتاں نہیں۔ ٹھہر کر پی لینا۔'' وہ بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں بھوک لگی ہو گی، کچھ کھا لو۔''

میں نے ایک بار پھر انکار کیا۔ وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ تب اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا اور قدرے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''میں تو تمہاری یہ چوٹ دیکھ کر ڈر اِچ گئی تھی۔'' اس نے کہا اور اچانک میرے گال کا بوسہ

لے کر پیچھے ہٹ گئی۔

میں اس کی اس حرکت پر ٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ آگ کے پاس ایک چٹائی بچھا کر نیم دراز ہو گئی۔ انداز وہی تھا جو تنہائی میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کے سامنے یا پھر محبوبہ کا اپنے چاہنے والے کے سامنے ہوتا ہے۔ بادل مسلسل پانی برسا رہے تھے۔ گاہے بہ گاہے گرج چمک بھی ہوتی تھی۔ یہ عجیب سا رومان انگیز افسانوی ماحول تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید دل میں کھد بد محسوس کرتا لیکن میرے لیے تو اس سے سوگنا زیادہ رومانیت بھی بے معنی تھی۔ میرے سینے میں دُکھ کا جو دریا بہہ رہا تھا، اس کی اذیت ناقابلِ بیان تھی۔ لگتا تھا کہ میری شریانیں ٹوٹ جائیں گی اور جسم کا ریشہ ریشہ جدا ہو جائے گا۔

میں نے ایک بار پھر اس لڑکی سے پوچھنا چاہا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ مگر تب مجھے احساس ہوا کہ وہ پھر وہی جواب دے گی جو پہلے دیا تھا۔ میں نے گفتگو کا انداز بدلا اور ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کہاں ہیں؟''

وہ میرے بولنے پر خوش ہوئی اور دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہم ٹھیک راستے پر آ گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے برس گرمیوں میں ''کچے'' کے پاس بہت سے درختوں میں آگ لگ گئی تھی۔ تین دن تک پیڑ جلتے رہے تھے۔ یاد ہے نا۔''

''ہاں...... ہاں۔'' میں نے کہا۔

''یہ جگہ ''نل پانی'' جانے والے راستے کی بالکل سیدھ میں ہے۔ ابھی شام سے پہلے مجھے نالے کے پار کچھ جلے ہوئے پیڑ نجر آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں ناک کی سیدھ میں جانا ہے۔''

''کتنی دیر میں پہنچیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''بارش رُک گئی تو بالکل سویرے اِچ نکل جائیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ سات آٹھ میل سے جیادہ کا سفر ہوئیں گا۔'' وہ اِچ کو 'ہی' کے معنوں میں استعمال کرتی تھی۔

میں نے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ آس پاس کوئی ہسپتال ہوتا تو اچھا تھا۔''

میرا خیال تھا کہ شاید اس کے جواب سے علاقے کے محل وقوع کا اندازہ ہو سکے لیکن وہ مسکرائی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''حکم جی کا بس چلے تو یہاں کوئی حکیم وید بھی دکھائی نہ دے۔ سب کچھ جنتر منتر سے کیا جائے۔ ہاں...... بس ایک ڈاکٹر ہو، اس کو ہمارے حکم جی نے اپنی تجوری میں بند رکھا ہو۔ اس کو بس اس وخت نکالا جائے جب حکم جی صاحب خود بیمار

ہوئیں یا ان کے خاندان کے کسی بندے کو جرورت پڑے۔''

پتا نہیں، وہ کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس اس کی اوٹ پٹانگ گفتگو سے اتنا پتا چلا کہ وہ میرے ساتھ (یعنی اپنے شوہر کے ساتھ) کسی ''نل پانی'' نامی جگہ پر جانا چاہ رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر وہ اور اس کا شوہر محفوظ ہو جائیں گے۔ حکم جی نام کا شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ جہاں سے آئی تھی، اس جگہ کا نام زرگاں تھا اور وہ وہاں سے بھاگ کر آئی تھی۔

اس کی گفتگو کے دوران میں ہی کچھ آہٹیں ہوئیں۔ وہ ایک دم چوکنا ہو گئی۔ اس کے انداز میں خوف کے بجائے ایک عجیب طرح کی حرارت اور چوکسی تھی۔ آہٹیں میں نے بھی سنی تھیں۔ بالکل یہی لگا تھا جیسے کئی افراد ہمارے بالکل آس پاس موجود ہوں۔ کھانسی سے ملتی جلتی صدا بھی کانوں میں پڑی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی نے اپنے جھولے میں سے ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی نکال لی۔ اپنے دستے اور پھل کی بناوٹ کے سبب کلہاڑی خوبصورت نظر آتی تھی۔

اس نے کلہاڑی میری طرف بڑھائی اور پھر ایسی ہی ایک اور کلہاڑی اپنے ہاتھوں میں سونت لی۔ اس کی عقابی نگاہیں کھوہ کے باہر کی تاریکی میں پیوست تھیں اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ سے پلاسٹک کی بوتل اُٹھائی اور اس کا پانی ادھ بجھی آگ پر ڈال کر اسے بالکل بجھا دیا۔ اس دوران میں اس کے کان باہر کی سن گن لیتے رہے۔ باہر اب بارش کی مدھم صدا کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ''کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''کھانسی کی آواز تو آئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''پر ہم یخین (یقین) سے تو نہیں کہہ سکتے نا کہ وہ کھانسی اچ کی آواج تھی۔ کبھی کبھی جناور کی آواج بھی تو ایسی ہوئے ہے۔''

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب کوئی مزید آہٹ، آواز سنائی نہیں دی تو وہ ہولے سے باہر نکلی اور کھوہ کے دہانے کے اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ بارش اب بوندا باندی کی شکل میں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی اور اس نے سردی سے بچنے کے لیے خشک لکڑیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ دوبارہ جلا لی۔

وہ میری طرف بڑی محبت سے دیکھ کر بولی۔ ''تم بہت جیادہ تھک گئے ہو۔ چوٹ میں درد بھی ہو رہا ہوئیں گا۔ تم یہاں آگ کے پاس لیٹ کر آرام کر لو۔ میں جاگتی ہوں۔ بعد میں، مَیں تھوڑی دیر کے لیے سو لوں گی۔''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

لیکن وہ اصرار کرتی رہی۔ میں آگ کے قریب لیٹ گیا۔ وہ کھوہ کی دوسری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی۔ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اس کے قریب رکھی تھی۔ میری والی کلہاڑی وہ واپس جھولے میں ڈال چکی تھی۔ میں لیٹ تو گیا تھا لیکن سو نہیں سکتا تھا۔ یہ مخبوط الحواس لڑکی کلہاڑی بدست میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ یہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور اندیشہ بھی سر اُٹھا رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس لڑکی کے پیچھے واقعی کچھ خطرناک لوگ ہوں۔ وہ اس کے پیچھے یہاں تک آ سکتے تھے اور نتیجے میں، مَیں بھی کسی غیر متعلقہ مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔ میرے سر پر پہلے ہی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے، اگر میں یہ کہوں کہ زندوں میں تھا نہ مُردوں میں تو بے جا نہ ہوگا۔

میں آگ کے قریب لیٹا رہا۔ میرے سینے میں آنسوؤں کا آبشار گرتا رہا۔ کھوہ سے باہر بارش ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ میں عجیب مخمصے میں تھا۔ مجھے یہ رات...... یہ کھوہ یہ لڑکی...... یہاں تک کہ اپنا وجود...... سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ بہت زور سے بجلی کڑکی۔ قرب و جوار لرز کر رہ گئے۔ لڑکی نے کچھ اور لکڑیاں آگ میں جھونک دیں اور میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

آگ کی حرارت اور مسلسل خاموشی نے میری آنکھوں میں دھیرے دھیرے غنودگی بھر دی۔ اپنے بے پناہ کرب سے لڑتے لڑتے میری آنکھ لگ گئی۔ اندازاً میں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو سینے پر بھاری بوجھ سا محسوس ہوا۔ کھوہ میں گہری تاریکی تھی۔ آگ کی راکھ میں بس چھوٹی موٹی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنے سینے کو ٹٹولا تو وہاں لڑکی کا سر رکھا ہوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے لائٹر جلایا۔ نیلگوں شعلے کی روشنی میں اردگرد کا منظر دکھائی دیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم میرے جسم سے چھو رہا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال میری گردن اور کندھوں پر بکھرے تھے۔

میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ وہ بھی بیدار ہو گئی۔ وہ چند سیکنڈ تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ تب اس نے اپنے سینے پر دوپٹا درست کیا اور بال سمیٹنے لگی۔ ''شاید میں بھی سو گئی تھی۔'' وہ ہولے سے بولی۔

اس نے آگ دوبارہ جلائی۔ آگ روشن ہوئی تو وہ بڑے دھیان سے میرے سر کی چوٹ کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے سر کی پٹی کو چھوا اور بولی۔ ''خدا کا شکر ہے خون رسنا بند ہو گیا ہے۔ کیا پتا کہ ٹانکوں کی جرورت اچ نہ پڑے۔''

کھوہ سے باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ بس کسی وقت بجلی چمک جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اچانک وہی آہٹ سنائی دی۔ جو میرے سونے سے پہلے سنائی دی تھی۔ اس مرتبہ یہ آہٹ دہانے کے بالکل پاس سے اُبھری تھی اور خاصی واضح تھی۔ یہ انسانی قدموں کی آواز لگتی تھی۔

لڑکی نے اپنی کلہاڑی کی تلاش میں تیزی سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ تھوڑی دور اس کے جھولے کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر کلہاڑی تک جاتی، یکا یک ایک شخص کھوہ کے دہانے پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یہ منظر اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے لڑکی بھی سکتہ زدہ رہ گئی۔ رائفل بردار کے سر پر بڑا سا پگڑا تھا۔ اس نے تہ بند، کُرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کڑیل دیہاتی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور غالباً اسے چلانے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ اس نے دانت نکوسے اور لڑکی کو مخاطب کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''حکم جی کی حد سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے سلطانہ! اتنی ہمت اور چالاکی دکھانے کے لیے تجھے دوسری، تیسری بار جنم لینا پڑے گا، پھر بھی جروری نہیں کہ تُو کامیاب اِچ ہو جائے۔''

لڑکی جسے سلطانہ کہا گیا تھا، اپنی جگہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رائفل کا رُخ اس کی طرف ہے اور اس کی کوئی بھی غلط حرکت اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ بولی۔

''میں چاہنے یا نہ چاہنے والا کون ہوتا ہوں۔ چاہنے والا تو وہی تمہارا عاشخ (عاشق) گورا صاحب ہے اور وہ تم کو اپنی جورو بنا کر اچ رہے گا۔ چلو شاباش، اُٹھو۔ اب تم کو واپس جانا ہوئیں گا۔''

''نہیں...... میں ہرگج نہیں جاؤں گی۔'' وہ سینہ تان کر بولی۔ ''ہر کسی کو پتا ہے کہ میں بیاہتا ہوں۔ بیاہتا پر حکم جی کا ادھکار ہے اور نہ ان کے کسی یار دوست کا۔''

''لیکن وہ تمہیں بیاہتا نہیں مانتے۔ پنڈت جی نے فیصلہ دے دیا ہے اور تم بھی اس فیصلے کو اچھی طرح جانتی ہو۔''

''میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتی کہ پنڈت نے اپنے دھرم کو موم کی ناک بنایا ہوا ہے۔ حکم جی کے اشارے پر وہ اس ناک کو جدھر چاہے موڑ لیتا ہے۔''

''بکواس بند کر۔ وہ تیری یہ گوری چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے۔ ایسی سجا دیں گے کہ مر کر بھی چین نہ پائے گی۔ اب بھی وخت ہے، جا کر حکم جی کے پاؤں میں گر جا

اور گڑگڑا کر مافی مانگ لے۔''

''ہارون! تُو جانتا ہے کہ میں کس ماں کی بیٹی ہوں۔ مر جاؤں گی پر عجت کے لٹیروں کے آگے سر نہ جھکاؤں گی۔ مجھے شرم آ رہی ہے تیرے کرتوتوں پر۔ کہنے کو تُو مسلمان ہے پر حکم جی کے پھینکے ہوئے، بے غیرتی کے ٹکڑے کھا کھا کر تیرا جمیر مر گیا ہے۔ جو بندوخ تُو نے میری طرف اُٹھائی ہوئی ہے، یہ ان لوگاں کی طرف اُٹھا جو تیری آنکھوں کے سامنے دن رات سکینہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں کی عجت کے جنازے نکال رہے ہیں۔''

''بکواس بند کر حرام جادی...... جبان کھینچ لوں گا۔''

یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوند گئی۔ اشتعال میں آ کر بندوق بردار تھوڑا سا آگے آیا تھا۔ لڑکی نے اس صورتِ حال کا فائدہ اُٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹی اور اس پر جا پڑی۔ بندوق بردار جس کا نام لڑکی نے ہارون لیا، اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دونوں اوپر نیچے گرے۔ لڑکی نے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر اُٹھا دی تھی۔ ہارون نامی وہ شخص فائر کرتا بھی تو گولی کھوہ کی چھت میں کہیں لگتی۔ بہرحال اس نے فائر نہیں کیا۔ شاید اسے موقع نہیں ملا یا پھر ہمت ہی نہیں ہو سکی۔ جلد ہی بندوق بردار سنبھل گیا۔ اس نے پلٹا کھا کر لڑکی کو اپنے نیچے کر لیا اور بندوق کو کسی لاٹھی کی طرح لڑکی کی گردن پر آڑھا رکھ کر اس کی گردن دبانے لگا۔ وہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ میں مزید اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ میں نے بندوق بردار کے کُرتے کا کالر عقب سے پکڑ لیا اور اُسے لڑکی پر سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خاصا زور آور تھا، ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا پگڑ کھل گیا تھا اور گلے میں پڑا تھا۔ میں نے ایک لکڑی سے اس کے سر پر چوٹ لگائی اور پھر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پوری طاقت سے پیچھے کی طرف کھینچا۔

یک دم اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بندوق کے چوبی دستے سے مجھے ضرب لگائی۔ یہ ضرب میرے چہرے پر لگتی مگر میرے پیچھے ہٹنے سے میرے کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا۔ وہ مجھ پر پل پڑا اور بندوق کے دستے سے مجھے اندھا دھند مارنے لگا۔ میں نے کچھ ضربیں اپنی کلائیوں پر روکیں، کچھ میری پسلیوں اور سر پر لگیں۔ سلطانہ نامی لڑکی نے جب یہ منظر دیکھا تو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بندوق بردار کی طرف آئی۔ وہ عقب سے اس سے چمٹ گئی۔ چلانے لگی۔ ''چھوڑ دو اس کو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔ کتے، حرام جادے۔'' وہ جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔ اس کے لمبے بال دائیں بائیں لہرا رہے تھے، اس کا توانا جسم ایک دم سرکش نظر آ رہا

تھا۔

بندوق بردار ہارون نے اس کی طرف مڑے بغیر اسے کہنی سے شدید ضرب لگائی۔ وہ اپنا منہ پکڑ کر کئی فٹ پیچھے جا گری۔ جہاں وہ گری، وہیں پر چھوٹے دستے کی کلہاڑی پڑی تھی۔ ایک لمحے میں لڑکی نے کلہاڑی پکڑی اور واپس بندوق بردار پر جھپٹی۔ اس مرتبہ اس نے بے دریغ بندوق بردار کے سر کو نشانہ بنایا۔ کلہاڑی اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگی۔ ہڈی اور لوہے کے تصادم کی آواز صاف سنائی دی۔ یکایک بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور میرے پہلو میں گرا۔ لڑکی دیوانہ وار اسے کلہاڑی سے ضربیں لگانے لگی۔ تاہم اب وہ کلہاڑی کو اُلٹی طرف سے استعمال کر رہی تھی۔ کند لوہے کی چوٹوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ہارون نامی اس حملہ آور کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ وہ ایک دم نیم مُردہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ روکا۔ وہ اب بھی بپھری ہوئی تھی۔ میں اسے پیچھے لے گیا۔ اسے کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شعلہ فشاں نظروں سے بے سدھ پڑے بندوق بردار کو دیکھتی رہی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ گہری بے ہوشی میں دکھائی دیتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی اور کھوہ کی دیوار کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ”جو تمہیں نخصان (نقصان) پہنچائے گا، میں اسے نخصان پہنچاؤں گی۔ میں......اس کی جان لے لوں گی۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تمہیں کچھ ہوئیں گا تو اس وخت ہوئیں گا۔ جب میری لاش گر چکی ہوئیں گی۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی اور ہچکیوں سے روتی جا رہی تھی۔

میں دم بخود کھڑا تھا۔ میں نے اس کا عجیب روپ دیکھا تھا۔ پھر میں جیسے چونک کر بندوق بردار کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے ایک دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ کاری زخم کلہاڑی کے بلیڈ سے آیا تھا جو سر کے پچھلے حصے پر تھا۔ وہاں سے کٹی ہوئی چربی کے اندر سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس شخص نے دیسی ساخت کی جوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا لباس بھی مجھے نامانوس سا لگا۔ لڑکی سلطانہ کی طرح ہارون نے بھی نامانوس حیدری آبادی لہجے میں بات کی تھی۔ ایک دو لفظ ہندی کے بھی بولے تھے۔ پھر کسی پنڈت جی کا ذکر بھی کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ہندو آباد ہیں۔ کئی جگہ ان کی پوری پوری بستیاں ہیں مگر میں سندھ میں تو نہیں تھا، پنجاب میں تھا۔ بلکہ مجھے لاہور کے گرد و نواح میں

کہیں ہونا چاہیے تھا۔ شروع میں، مَیں نے جب اپنے اردگرد گھنے درخت دیکھے تو سوچا تھا کہ شاید میں چھانگا مانگا یا شیخوپورہ کے علاقے میں کہیں ہوں۔ مگر اب یہ خیال باطل محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ویسا علاقہ ہرگز نہیں تھا۔ تو پھر کیا میں اندرونِ سندھ میں کہیں تھا؟

ہارون نامی شخص بالکل بے سدھ تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سانس لے رہا ہے۔ اس کی کمر سے گولیوں والی پیٹی بندھی تھی اور چھوٹی نال والی چینی ساخت کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔

سلطانہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو ایک بار پھر سمیٹا۔ ہارون کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی سوتی قمیص سامنے سے پھٹ گئی تھی اور دودھیا جسم جھانک رہا تھا۔ اس نے اس پھٹے ہوئے حصے کو گرہ لگا لی۔ ہارون پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

”مہرو! ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوئیں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس خبیث کے ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔“

”یہ ہوش میں بھی آ سکتا ہے۔“ میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

سلطانہ نے جلدی جلدی ہارون کی کمر سے گولیوں والی بیلٹ کھولی۔ پھر اس کی چھوٹی نال والی رائفل اُٹھائی اور اسے جھولے میں ڈال لیا لیکن یہ پہلے والا جھولا نہیں تھا۔ یہ دوسرا تھا۔ اس پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یہ کھوہ کی پچھلی دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔

”اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اس کی پیشانی پُرسوچ کی سلوٹ اُبھری۔ ”نہیں...... میرا خیال ہے کہ صرف ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”تمہیں پتا ہے ناوہاں چھوٹے گاؤں میں سریتا کے پتی راجندر کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ راجو نے اس کے پاؤں بھی بندھوا دیئے تھے، وہ تمہارے دوست مختار کی کوٹھڑی میں بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔“

پتا نہیں وہ کن لوگوں کی باتیں کر رہی تھی اور مجھے کیوں ان میں شامل کرتی جا رہی تھی۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی۔ شاید اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا تھا جس کے سبب اس نے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ اس صدمے کا تعلق اس کے مہروز نامی شوہر سے ہی ہوا۔ اپنے دیوانے پن میں شوہر کو تلاش کرتی ہوئی وہ دور نکل آئی ہو اور ہارون وغیرہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر پختہ دکھائی دیتی تھی کہ اس موقع پر اس کی باتوں کی تردید کرنا یا اس سے بحث میں اُلجھنا خطرناک ثابت ہو

سکتا تھا۔ میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

اس نے میرے ساتھ مل کر ہارون کے ہاتھ پشت پر موڑے اور انہیں اچھی طرح ایک ازار بند سے باندھا۔ یہ ازار بند اس کے جھولے سے ہی نکلا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہارون کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کُرتے کی بغلی جیب سے ایک رومال، ایک چھوٹا جیبی چاقو اور تھوڑی سی کرنسی نکلی۔ کرنسی دیکھ کر میں پھر چونکا۔ مجھے لگا کہ ان نوٹوں میں کچھ اجنبی نوٹ بھی شامل تھے۔ غالباً وہ انڈین تھے۔ انڈین کرنسی اس شخص کی جیب میں؟ یہ خاصا اہم سوال تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا کہ میں انڈین بارڈر کے آس پاس کہیں ہوں۔ سرحدی علاقوں میں اس قسم کے جنگلی رقبے بھی عام پائے جاتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ وغیرہ کا دھندا بھی ہوتا ہے۔ ہارون نامی اس شخص کی جیب سے غیر ملکی کرنسی کا نکلنا کئی امکانات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ان میں اسمگلنگ کا امکان بھی شامل تھا۔ ان لمحوں میں ایک دم عمران کی شبیہہ میری نگاہوں میں اُبھری اور سینے میں درد کی ایک شدید ٹیس، بے کراں کرب بن کر پھیل گئی۔

وہ اس وقت یہاں میرے ساتھ ہوتا تو اس کی متجسس فطرت یکا یک انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی۔ وہ خدائی فوجدار بن جاتا اور فوراً اس امر کی سراغ رسانی شروع کر دیتا ہے کہ اس موچھیل دیہاتی کی جیب میں انڈین کرنسی کیسے آئی ہے۔ عمران کے خیال کے ساتھ ہی میرے سینے میں موجزن دُکھ کا سمندر کچھ اور بھی بپھر گیا۔ آنسو آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلنے کو بیتاب ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم یہ تاریک کھوہ چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ بارش تھمی ہوئی تھی، بس کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ اُجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ سلطانہ نے چھوٹا جھولا میری طرف بڑھایا اور بڑا خود اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ وہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑنے کی خواہاں تھی۔

ہم کھوہ سے نکلے اور نم زمین پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے درختوں میں آگے بڑھنے لگے۔ ہوا چلتی تو شاخوں سے بہت سا پانی جھڑ کر ہمارے اوپر گرتا اور لگتا کہ بارش پھر شروع ہو گئی ہے۔ بھیگے ہوئے گھونسلوں میں پرندوں نے ہولے ہولے بولنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطانہ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکس نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے کے جھولے میں کلہاڑی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے فوراً باہر نکال سکتی تھی۔ میرے والے جھولے میں بھی کلہاڑی اسی انداز سے رکھی گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد اُجالا پھیل گیا۔ بادلوں کے اندر سے کہیں کہیں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔

رات بھر کی بارش سے سب کچھ اُجلا اور نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ دیوانی لڑکی نہ جانے مجھے کہاں لے جا رہی تھی؟ ''وہ دیکھو مہرو! وہاں سے جلے ہوئے درخت شروع ہو جاتے ہیں۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

مجھے جلے ہوئے خشک درختوں کے آثار نظر آئے۔ سلطانہ نے ایک چھوٹے سے کچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر ایک سمت کا تعین کر کے با اعتماد طریقے سے آگے بڑھنے لگی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے کہنا کچھ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوگا۔ اگر میں اس سے کچھ کہوں گا تو وہ اُلٹا مجھے مخبوط الحواس سمجھنے لگے گی اور عین ممکن ہے، یہ گمان کرنے لگے کہ سر پر چوٹ آنے کی وجہ سے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے پاس جانا چاہ رہی ہے، ان تک پہنچ جائے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ دوستانہ رویہ ظاہر کرتے اور میری مدد کو آمادہ ہو جاتے۔ ان کے ذریعے میں کسی معروف راستے پر پختہ سڑک تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک بار میں اس ویرانے سے نکل جاتا پھر سوچا جا سکتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ پولیس تک پہنچنا ہے؟ کسی عزیز رشتے دار کی مدد حاصل کرنی ہے یا خاموشی سے فرح اور عاطف کی کھوج لگانا ہے؟

دوسری سوچ یہ تھی کہ میں راستے میں ہی کسی مناسب جگہ پر اس لڑکی سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ اس کے ساتھ ''نل پانی'' نامی بستی میں جا کر میں کسی اور چکر میں پھنس جاتا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں مسلسل چلتا جا رہا تھا۔ اب ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔

''میرا خیال ہے کچھ کھا لینا چاہیے۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔'' لڑکی نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے خشک جگہ دیکھ کر کہا۔

وہ بھوک کی بات کر رہی تھی اور میرے اندر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے دو میتیں تھیں۔ ایک عمران کی دوسری والدہ کی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں شاید ہفتوں تک کوئی نوالہ گلے سے نیچے نہ اُتار سکوں۔ سلطانہ نامی وہ لڑکی درخت کے ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا جھولا کھولا۔ پلاسٹک کے ایک سبز برتن کے اندر گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑے تھے۔ خشک چنے اور میٹھی پھلیاں وغیرہ بھی تھیں۔ دو بوتلوں میں صاف پانی تھا۔ جھولے کے سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جہاں سے بھی نکلی ہے، پوری تیاری سے نکلی ہے۔ اس کے بے حد اصرار پر میں نے تھوڑے سے چنے کھائے اور پانی پیا۔ پانی کا ذائقہ بھی کچھ عجیب لگا۔ سلطانہ بڑی جلدی میں نظر آتی تھی۔ وہ جلدی جلدی لقمے لے رہی تھی۔ گاہے

بہ گاہے اس کی نگاہ بے ساختہ اپنے عقب میں اُٹھ جاتی تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آسکتا ہے۔

دن کی روشنی میں، مَیں اسے زیادہ وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ رُخسار چوڑے تھے اور ان کی ہڈیاں کچھ اُبھری ہوئی تھیں۔ بالکل سفید دانت ذرا سے اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے اور اس کی سخت جانی کو ظاہر کرتے تھے۔

وہ جلدی جلدی لقمہ چباتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا۔ کیا کر رہا ہوئیں گا؟ اس نے کچھ کھایا بھی ہوئیں گا کہ نہیں۔''

اس نے دوسری تیسری دفعہ کسی ''بالو'' کا ذکر کیا تھا۔ رات کو بھی جب ہم کھوہ میں تھے، زوردار بارش ہو رہی تھی اور بجلی کڑک رہی تھی تو اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ ''بڑی ٹھنڈ ہوگئی ہے۔ پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا؟''

وہ جھولا سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا۔ مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہم پھر چل دیئے۔ وہ مجھے گفتگو میں شریک کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ہاشم، بالو کو لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا ہوئیں گا نا؟''

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''ویسے وہ جے دار تو بہت ہے۔ اسے پتا ہے کہ میرے بغیر بالو کو سنبھالنا مشکل ہو جائیں گا۔ وہ ایک دم سب کو مصیبت میں ڈال دیں گا۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے کلہاڑی نکال لی تھی۔ جہاں کہیں جھاڑ جھنکاڑ زیادہ ہوتا، وہ اسے کاٹ کر آگے بڑھ جاتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی ویرانے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے اور اس جنگل کے نشیب و فراز اس کے لیے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کی چستی تھی۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر میں نے ایک اور بات محسوس کی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ واقعی شادی شدہ ہے اور اس کا سڈول جسم ''دودھ پلانے والی ماؤں'' جیسا ہے۔ مجھے اس کی سوتی قمیص پر سامنے کی طرف گیلاہٹ نظر آئی۔ ایسی گیلاہٹ کبھی کبھی ان ماؤں کے کپڑوں پر نظر آتی ہے، جن کے جسم میں قدرت نے بچے کی ''خوراک'' کی فراوانی رکھی ہوتی ہے۔ ہم جونہی ایک جھنڈ سے نکلے، سلطانہ کے چہرے پر خوشی کی چمک نظر آئی۔ اس نے ایک دم اپنی انگلی سے دور کہیں اشارہ کیا اور چہکی۔ ''وہ دیکھو مہرو! وہ ہے ڈیرا۔''

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ قریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر قدرے نشیب میں

کسی گھر کی چھت نظر آرہی تھی۔ اس کچے گھر کو چاروں طرف سے سبز درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلا احاطہ بھی نظر آتا تھا۔ اس کے گرد مٹی کی چاردیواری تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلی اچ جاتی ہوں۔'' سلطانہ نے کہا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ٹھیک......ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنا جھولا اُتار کر ایک درخت کی موٹی شاخ سے لٹکا دیا اور تیزی سے درختوں میں اوجھل ہوگئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے ذہن میں آیا کہ اکیلا ہی آگے بڑھ جاؤں۔ جس طرح اس ویران جنگل میں یہ چھوٹا سا ڈیرا نظر آیا تھا، عین ممکن تھا کہ آگے بھی کوئی گھر یا متنفس نظر آجاتا اور میں اس کی مدد حاصل کر سکتا لیکن اس میں رسک بھی تھا۔ میں راستہ کھو کر بھٹک سکتا تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سلطانہ کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی ہاشم نام کے بندے کی بات بھی کر رہی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ اسے لینے ہی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ تو سلطانہ کی طرح ذہنی بیمار نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ مجھے کچھ ٹھکانے کی باتیں بتا سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ یہ لڑکی اصل میں کون ہے اور اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔

میں وہیں درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنا جھولا کھول کر دیکھا۔ اس میں دو تین مردانہ جوڑے تھے۔ پانی سے بھری ہوئی ایک چھوٹی بوتل تھی۔ دو چار سیب، اچار کا ڈبہ اور خشک چنے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف کلہاڑی رکھی تھی۔ جو سب سے عجیب شے دکھائی دی، وہ ایک سرخ عروسی جوڑا تھا۔ گوٹے کناری والے اس جوڑے کو بڑی احتیاط سے تہ کر کے ایک دوسرے کپڑے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد میں اُٹھا۔ اردگرد دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کے شاخ سے لٹکے ہوئے جھولے میں تاکا جھانکی کی۔ زخمی ہارون کی تلاشی میں ملنے والے کرنسی نوٹ واقعی انڈین تھے۔ یہ کل ملا کر کوئی دو ڈھائی سو روپے بنتے تھے۔ ان میں پاکستانی نوٹ کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سلطانہ کے جھولے میں کچھ ایسا سامان بھی نظر آیا جو چھوٹے بچوں کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔ دو چار بالکل چھوٹے فراک، جانگیے اور بنیان وغیرہ۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کے ایک دو کھلونے بھی تھے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ بار بار جس ''بالو'' کا ذکر کر رہی تھی، وہ اس کا شیر خوار بچہ ہی ہے۔

بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح یہ سوال بھی ذہن میں سر اُٹھا رہا تھا کہ وہ بچہ سلطانہ کے ساتھ سفر کیوں نہیں کر رہا اور یہاں ڈیرے پر کیوں موجود ہے؟

میں وہیں بیٹھا خیالوں کے تانے بانے بُنتا رہا۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا، ہلکی تمازت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنے اردگرد سے چوکس تھا۔ کسی نامعلوم شخص یا اشخاص کے علاوہ مجھے کسی جنگلی جانور کی آمد سے بھی خطرہ تھا۔ یہ کوئی ''رکھ'' نہیں تھی، خالص جنگلی علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے دور نشیب میں کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ غالباً اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا۔ دھیرے دھیرے وہ دونوں قریب آ گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ سلطانہ کے بازوؤں میں ایک بچہ بھی ہے۔

گھنی جھاڑیوں سے نکل کر سلطانہ جب میرے سامنے آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ رُخسار بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے چٹا چٹ بچے کے کئی بوسے لیے اور اس کا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو...... تین چار روز میں ہی کیا حال ہو گیا ہے۔ ایک دم آدھا رہ گیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچی، اس وخت بھی رو رو کر آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے تھا۔''

بچے کی عمر مشکل سے پانچ چھ ماہ ہو گی۔ وہ خوش شکل تھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں پُنچھی ہو رہی تھیں۔

میں نے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ تھا۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس سال ہو گی۔ اس نے ہاتھ کو ماتھے پر لے جا کر مجھے سلام کیا اور خاموش کھڑا رہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر گول مٹول بچے کا منہ چوما، اسے سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر اسے میری بانہوں میں دیتے ہوئے بولی۔ ''چلو...... اب جاؤ اپنے ابا کے پاس۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔ ویسے مجھے اس سے کسی ایسی ہی حماقت کی توقع تھی۔

میں نے سلطانہ کے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل لاتعلق کھڑا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا، سنا ہی نہ ہو۔ وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے بڑا جھولا خود اُٹھا لیا اور چھوٹے جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''ہاشو! یہ تم اُٹھا لو۔'' زبان سے یہ الفاظ کہنے کے ساتھ ساتھ سلطانہ نے ہاتھوں سے بھی اشارے کیے تھے اور تب مجھے پتا چلا کہ سلطانہ کے ہمراہ آنے والا یہ ہاشم نامی شخص گونگا بہرا ہے۔ اس نے فرمانبرداری سے جھولا اُٹھایا اور ہمارے ساتھ چل دیا۔

بچہ میری گود میں تھا اور ماں کی طرف دیکھ کر ہمک رہا تھا۔ میں سٹپٹا گیا۔ زورا زوری کی بیوی کے ساتھ اب یہ زبردستی کا بچہ بھی گلے پڑ رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کی نگاہ بچا کر سوالیہ نظروں سے ہاشم عرف ہاشو کو دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا شے ہے؟

وہ جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں سکا اور بے ڈھنگے طریقے سے مسکرا کر رہ گیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہاشو کے آنے کے بعد اب ہاشو کی حیثیت راہبر کی ہو گئی تھی۔ میں اور سلطانہ اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ میں اب جلد از جلد ''نل پانی'' نامی آبادی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ فرح، عاطف، والدہ، عمران اور ثروت کے چہرے مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ سب میرے دل سے قریب ترین تھے۔ میرے اپنے تھے لیکن فی الوقت کوئی بھی میرے پاس نہیں تھا۔ کچھ مستقل طور پر بچھڑ گئے تھے، کچھ عارضی طور پر۔ جو عارضی طور پر بچھڑے ہوئے تھے، میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

بچہ میرے گلے سے لگا ہوا تھا۔ اس کی مستانی ماں میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ جھولے میں پڑی کلہاڑی کا رنگین دستہ اس کے ہاتھ سے بہت قریب تھا۔ اس کی تیز نگاہیں اردگرد کا جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ یقیناً کھوہ میں اس ہارون نامی شخص کی اچانک آمد اور وہاں ہونے والی سنگین مارکٹائی کے مناظر سلطانہ کے ذہن میں تازہ تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پھر کوئی ایسا واقعہ رُونما نہ ہو جائے۔

چلتے چلتے بچہ کسمسایا اور اس کا ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر لگا۔ مجھے لگا جیسے یہ جگہ سُن ہے۔ مجھے یاد آیا کہ لاہور میں بتی والے چوک کے قریب گاڑی اُلٹنے کے بعد میں زخمی ہوا تھا اور میرے سر کے علاوہ گردن پر بھی زخم آئے تھے لیکن اب بچے کا ہاتھ لگنے کے باوجود مجھے گردن کے پچھلے حصے پر تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے گردن کو ٹٹول کر دیکھا۔ محسوس ہوا کہ زخم مندمل ہو چکا ہے یا پھر...... اس پر کوئی ایسی چیز لیپ کر دی گئی ہے جس نے درد کا احساس ختم کر دیا ہے۔ آٹھ دس روز میں زخم کا اس طرح ٹھیک ہونا تو ممکن نہیں تھا، غالباً اس پر کوئی ایسی چیز لگا دی گئی تھی جس نے جلد کی سی شکل اختیار کر کے درد کا احساس ختم کر دیا تھا۔

ایک دم سلطانہ خوشی سے چلا اُٹھی۔ اس نے انگلی سے دور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ گھنے جنگل کے درمیان میں سے نیلے پانی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک خوبصورت قدرتی جھیل کی طرح تھی۔ اس جھیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''ہم پہنچ گئے۔ آخر ہم پہنچ اچ گئے۔'' وہ مسرور ہو کر بولی۔

ہم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ آخر بستی اور جھیل کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ نہایت گھنے جنگل کے درمیان یہ ایک قابلِ دید نظارہ تھا۔ جھیل کا ایک کنارہ پوری طرح آباد تھا اور یہ کوئی چھوٹی بستی نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اس قصبے میں کم از کم تین مندروں کے کلس اور دو مسجدوں کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی حویلی ٹائپ عمارت تھی۔ اس سے ذرا کم بلند اور بھی کئی حویلیاں تھیں اور اس بستی کے درمیان بڑی شان سے سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ کل رات کی بارش نے ہر شے کو بڑی اچھی طرح نکھار دیا تھا۔ جھیل کے کنارے سبز ڈھلوانوں پر کہیں کہیں گائے بھینسیں اور بکریاں وغیرہ چرتی نظر آ رہی تھیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے گھڑ سواروں کا ایک دستہ تیزی سے جاتا دکھائی دیا۔

میں اس بستی کے خدوخال دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ ہم کسی دیہاتی بستی یا چھوٹے سے دیہہ میں پہنچیں گے۔ یہاں کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

سلطانہ خوش تھی۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولی۔ ''کتنی پیاری جگہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ پہلے اسے ''نیلا پانی'' کہتے تھے لیکن پھر یہ نام بدلتے بدلتے ''نل پانی'' بن گیا۔ یہ پُرانے وختوں کی بات ہے۔ شاید حکم جی کے پڑدادا کے وخت کی یا پھر اس سے بھی پہلے کی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ میں بس صورتِ حال کو جوں کا توں رکھ کر اس بستی میں پہنچنا چاہتا تھا اور سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں آخر ہوں کس جگہ پر؟ کیا یہ واقعی اندرون سندھ کا کوئی علاقہ تھا؟ سانگھڑ، دادو وغیرہ...... لیکن یہ شاندار جھیل؟

خوشی کے عالم میں سلطانہ نے بچہ میرے ہاتھوں سے لیا اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگی۔ جلد ہی ہم درختوں سے نکل کر جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں مجھے کئی دیہاتی عورتیں اور مرد نظر آئے۔ عورتوں نے گھاگرے چولے پہن رکھے تھے۔ مردوں کا لباس دھوتی کُرتے اور بڑے پگڑ پر مشتمل تھا۔ کچھ جوان عورتیں سروں پر مٹکے رکھے ایک قطار میں جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دو بیل گاڑیوں کے بیل جھومتے اور گھنٹیاں بجاتے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے ہماری طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں دی۔

اگر ہم خشکی کے راستے بستی تک پہنچنا چاہتے تو کافی چکر پڑتا۔ اس کام کے لیے جھیل میں چھوٹی چھوٹی تین چار کشتیاں چل رہی تھیں۔ انہیں طویل بانسوں کے ذریعے دھکیلا جا رہا تھا۔ ہم بھی بچے سمیت ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ پندرہ سواریاں پوری ہو گئیں تو کشتی بان نے کشتی کھینی شروع کی۔ ساتھ ساتھ وہ سواریوں سے کرایہ بھی وصول کرتا جا رہا تھا۔ وہ نوجوان

لڑکا تھا۔

''کتنے پیسے بھائی؟'' سلطانہ نے کشتی بان سے پوچھا۔

''کتنی سواریں ہیں دیدی۔''

''تین......''

''تین روپے دے دو جی۔''

سلطانہ نے دوپٹے کی گرہ سے پیسے کھولے اور ایک نوٹ کشتی بان کو دیا۔ یہ پانچ کا نوٹ تھا اور انڈین تھا۔ کشتی بان نے جو دو روپے بقایا دیئے، وہ بھی انڈین تھے۔ کشتی میں تین چار عورتیں ایسی موجود تھیں جن کی مانگوں میں سیندور بھرا تھا۔ ایک دو لڑکیوں کے ماتھے پر بندیا نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ سارا ماحول ہی کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ اس ساری صورتِ حال میں کوئی خلا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی بہت بڑا خلا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کئی گنا بڑھی کہ باقی سواریوں نے بھی جو کرایہ دیا، وہ بھارتی کرنسی میں تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ یوں لگا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ تو کیا...... تو کیا میں اپنے ملک میں نہیں تھا؟ میں پاکستان میں نہیں تھا؟

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''کیا ہوا مہرو! خیریت تو ہے؟'' سلطانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہم...... کہاں...... ہیں؟'' میں نے ٹوٹی ہوئی آواز استفسار کیا۔

''نل پانی میں مہرو! اور کہاں؟''

''یہ نل پانی کہاں ہے؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''نل پانی کہاں ہوئیں گا۔ وہیں ہوئیں گا جہاں پر ہمیشہ سے ہے۔'' سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے پُرتشویش نظروں سے دیکھا۔

میرا جی چاہا کہ اسے تھپڑ دے ماروں مگر میں یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا سر پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔

اسی دوران میں کشتی کے اندر بیٹھی سواریوں میں سے ایک بڑھیا کے ہاتھ سے اس کا مرغا چھوٹ گیا اور کشتی میں اِدھر اُدھر پھدکنے لگا۔ لوگ اسے پکڑنے کی کوشش میں دائیں بائیں ہوئے تو کشتی بُری طرح ڈولنے لگی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ اُلٹ ہی جائے گی۔ پھر کشتی بان اور اس کے معاون کی ڈانٹ ڈپٹ سے لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور یہ خطرہ ٹلا۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچے۔ میرے دماغ میں مسلسل تند و تیز آندھیاں چل رہی

تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں جس مقام پر ہوں، یہ پاکستان میں نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ تو کیا میں انڈیا کے کسی سرحدی علاقے میں تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھے بارڈر کیسے کراس کرایا گیا تھا؟ اور بارڈر کراس کرانے والوں نے مجھے اس نامعلوم علاقے میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ میں اپنے اندازوں سے زیادہ دیر تک بے ہوش رہا ہوں۔ جلد ہی ہم ایک گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ سلطانہ نے اب اپنا چہرہ چھوٹے سے گھونگھٹ میں چھپا لیا تھا۔ وہ کچھ ہراساں بھی نظر آتی تھی۔ اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے مقامی شخص نے دروازہ کھولا۔ وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ تاہم اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور ماتھے پر محراب کا نشان ظاہر کرتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس نے دروازہ کھولنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ سلطانہ جلدی سے بولی۔ ''آپ چاچا غنی ہیں نا؟''

ادھیڑ عمر شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''میں سلطانہ ہوں جی۔ زرگاں سے.....''

ادھیڑ عمر غنی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر ہم تینوں کا جائزہ لیا اور ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔

یہ ایک درمیانے سائز کا دیہاتی گھر تھا۔ چھت لکڑی کی تھی۔ دیواریں اور فرش کچا تھا۔ تاہم بڑی اچھی طرح لیپا پوتی کی گئی تھی اور نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ غنی نامی اس شخص نے سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں اکیلا ہی ہوں، بچے کل سے اپنے ماموں کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ ویسے میرا خیال تھا کہ تم لوگ ایک دوروج بعد آؤ گے۔ رمجان نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔''

''بس جلدی آنا پڑ گیا جی! حالات اچ کچھ ایسے ہو گئے تھے۔'' سلطانہ منمنائی۔ وہ اب بھی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔

''یہ ہے تمہارا شوہر؟'' ادھیڑ عمر غنی نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''جی ہاں.....'' وہ ذرا سا شرمائی۔

''یہ چوٹ کیسے لگی بیٹا؟'' غنی نے مجھ سے پوچھا۔

میرے بولنے سے پہلے ہی سلطانہ بولی۔ ''کل شام کے وخت پیڑ سے گرے ہیں۔ کافی جیادہ چوٹ آئی ہے۔ میں نے پٹی تو کر دی ہے، پر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس لے

جانے کی جرورت پڑ جائے۔''

میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''غنی صاحب! آپ میری ایک بات سنیے۔''

ادھیڑ عمر غنی ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں جی......بس ذرا اکیلے میں آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

سلطانہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ گونگا بہرا ہاشم دروازے کے پاس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ ایک قریبی کمرے میں جا کر میں نے غنی صاحب سے کہا۔ ''میں سخت پریشان ہوں جی! سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟''

غنی صاحب حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟ یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟''

''نہیں جی! یہ میری بیوی نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ کل شام پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی دماغی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کل سے مسلسل اول فول بک رہی ہے۔''

''اور یہ بچہ جو ساتھ ہے؟''

''وہ بھی میرا نہیں۔ ان دونوں کے پیچھے کچھ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ کل رات تیز بارش میں ہم نے ایک جگہ پناہ لی تھی۔ وہاں بھی ایک بندوق والا آ پہنچا تھا۔ وہ اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پھر وہاں ہمارے درمیان لڑائی ہوئی اور وہ ہارون نام کا بندہ زخمی ہو کر گر گیا۔ اب وہ بندہ بھی وہیں جنگل میں بندھا پڑا ہے۔''

ادھیڑ عمر عبدالغنی کے چہرے پر اُلجھن آمیز تشویش نظر آنے لگی۔ انہوں نے مجھے سرتاپا گھور کر کہا۔ ''تو......تم کون ہو؟''

''میں دراصل......'' میں کہتے کہتے رُک گیا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں کہاں بے ہوش ہوا تھا اور کہاں ہوش میں آیا ہوں اور ممکن تھا کہ وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرتے۔

میں گہری سانس لیتے ہوئے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا۔ ''غنی صاحب! میں بڑے مشکل حالات سے دوچار ہوں۔ میں ان حالات کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ میں کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

غنی صاحب کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی ...... یہ نل پانی ہے۔ زرگاں کے بعد علاقے (علاقے) کی سب سے بڑی آبادی تو یہی ہے۔ اسے کون نہیں جانتا؟''

''اچھا...... یہاں کا سب سے قریبی شہر کون سا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بیٹا! تم کیسی باتاں کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی کچھ چکرائے ہوئے ہو۔''

''غنی صاحب! آپ بس میرے ایک دو سوالوں کے جواب دے دیں۔ پھر آپ جو پوچھیں گے میں بتاؤں گا۔'' میرے لہجے میں عاجزی تھی۔

''بھئی...... یہاں کا سب سے قریبی شہر تو جھانسی ہے۔ وہاں جانے میں بھی چار دن لگ جاتے ہیں۔''

''جھانسی...... جھانسی۔'' میں نے اپنے ذہن میں دو تین بار دہرایا۔ یقیناً یہ کوئی انڈین نام تھا۔ میرے ذہن میں تاریخ کے حوالے سے ''جھانسی کی رانی'' کے الفاظ چمکنے لگے۔ مگر ضروری بھی نہیں تھا کہ یہ وہی جھانسی ہو۔ کہاں لاہور میں ڈیفنس کا علاقہ اور کہاں یہ جھانسی۔ میں نے مزید وضاحت کے لیے پوچھا۔ ''جھانسی کے بعد کون سی جگہ آتی ہے؟''

غنی صاحب کے چہرے پر اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے بیزار انداز میں کہا۔

''جھانسی کے بعد الٰہ آباد ہے پھر لکھنؤ ہے۔''

میرے ذہن میں جیسے کئی دھماکے ہوئے۔ میرا حیرت ناک اندیشہ درست تھا۔ میں پاکستان میں نہیں انڈیا میں تھا اور انڈیا کا بھی یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا۔ یہ ''ڈیپ'' انڈیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر تھام لیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ میرا رنگ ہلدی ہو رہا ہے۔ ''غنی صاحب! مجھے یہ بتائیں، یہ لڑکی کون ہے؟ آپ سے اس کا تعلق کیسے ہوا ہے؟''

میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے غنی صاحب شروع میں تو ہچکچائے پھر انہوں نے جواب دیا لیکن صرف اتنا بتایا کہ سلطانہ اس علاقے کی دوسری بڑی بستی زرگاں کی رہنے والی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے یہ فوری طور پر زرگاں سے یہاں نل پانی میں آنا چاہتی تھی۔ زرگاں میں غنی صاحب کا کوئی دوست رمضان علی تھا۔ اس نے ایک پیغامبر کے ساتھ غنی صاحب کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ چند روز تک ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیج رہا ہے۔ لڑکی کے ساتھ اس کا شوہر اور بچہ بھی ہیں۔ یہ لوگ صرف دو تین دن ان کے پاس رہیں گے، پھر خود اپنے رہنے کا کوئی انتظام کر لیں گے۔ اس کے سوا عبدالغنی صاحب کو

معلوم نہیں تھا۔ یا شاید وہ ابھی بتانا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''غنی صاحب! آپ جن رمضان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں، اگر وہ واقعی آپ کے دوست ہیں تو پھر انہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ جس لڑکی کو آپ کے پاس بھیج رہے ہیں، وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں خود اس بات پر حیران ہوں۔ اگر لڑکی کا کوئی ایسا مسئلہ ہوتا تو رمجان نے مجھے ضرور بتانا تھا۔ پر اس نے تو کوئی بات نہیں کی۔''

''یہ جو اس کے ساتھ گونگا بندہ آیا ہے، یہ کون ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکی سلطانہ کا کوئی رشتے دار ہے۔ رمجان نے مجھے بتایا تھا کہ ہوسکتا ہے لڑکی پہلے اج زرگاں سے نکل پڑے، اس کا بچہ بعد میں کسی دوسرے کے ساتھ نکلے۔ اس طرح لڑکی کو زرگاں سے نکلنے میں آسانی ہوئیں گا۔ بعد میں کہیں راستے میں لڑکی اور بچہ آپس میں مل جائیں گے۔ میرے خیال میں ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ گونگا بچے کے ساتھ نکلا ہوئیں گا۔''

''میں آپ کو پھر بتا رہا ہوں، یہ لڑکی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ جو بندہ پیغام لے کر آیا تھا، وہ کہاں ہے؟''

''وہ تو شاید واپس چلا گیا تھا۔ ویسے زرگاں کے ایک دو بندے ہور یہاں ہیں لیکن سب سے پہلے میں اس گونگے سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔''

غنی صاحب اُٹھے اور اپنے چہرے پر اُلجھن لیے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی انہیں بھی سلطانہ کی مخبوط الحواسی کا علم ہو جائے گا۔ میرے سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور یہ یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں اپنے ملک میں نہیں، غیر ملک میں ہوں۔ فرح، عاطف اور اپنی ماں کی قبر سے سیکڑوں میل دور۔ پتا نہیں کہ میری ماں کو باقاعدہ قبر بھی نصیب ہوئی تھی یا نہیں۔ ان کی موت کو چھپا لینا سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ اس چار دیواری میں پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔ انہوں نے گارڈ خادم حسین کو مار دیا تھا۔ عمران کا دوست آصف بھی غالباً ان کے ہاتھوں سے جان گنوا بیٹھا تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کے لیے عین ممکن تھا کہ وہ ماں جی کی موت کو کوئی اور رنگ دے دیتے یا پھر ان کے جسدِ خاکی کو ویسے ہی کہیں غائب کر دیتے۔

میں جب ان سارے خونی مناظر کے بارے میں سوچتا تو مجھے لگتا تھا کہ یہ کوئی سات آٹھ یا دس پندرہ روز پہلے کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ان کو زمانہ گزر چکا ہے۔ اچانک مجھے قدموں

کی آہٹ سنائی دی۔غنی صاحب واپس آ گئے۔ان کے چہرے پر پہلے سے زیادہ اُلجھن تھی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ ہولے سے بند کیا اور مدھم آواز میں بولے۔''بچے نے پوٹی کی ہے۔لڑکی اس کی ٹانگیں وغیرہ دھو رہی ہے۔میں نے گونگے سے علیحدہ میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ پتا نہیں کیا کیا اشارے کر رہا ہے۔صحیح طرح میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ لڑکی کی طرف کی بات اچ کر رہا ہے۔''

''آپ اسے یہاں لائیں میرے پاس۔''

''نہیں......اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوئیں گا۔میں چوہان کو لے کر آتا ہوں۔وہ بھی زرگاں سے آیا ہے۔رمجان کے محلے میں ہی رہتا تھا۔پکی بات ہے کہ اس لڑکی کو بھی جانتا ہوئیں گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عبدالغنی صاحب تیزی سے باہر نکل گئے۔ان کے جانے کے چند سیکنڈ بعد سلطانہ آ دھمکی۔وہ خوش نظر آ رہی تھی۔اس نے میرے قریب بیٹھ کر جوشیلے انداز میں میرا ہاتھ دبایا اور بولی۔''مہرو! بالکل بے فکر ہو جاؤ۔اب کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گا۔ہم کل اچ چھوٹے سرکار سے ملیں گے۔وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔وہ ہم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔''اس نے بڑی محبت سے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا۔

پھر جیسے اسے ایک دم یاد آیا۔''ہائے میں مری......میں نے تمہاری چوٹ تو دیکھی اچ نہیں۔اب کیا حال ہے درد کا؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جلدی جلدی پٹی کھولنے لگی۔وہ اپنے جھولے میں سے صاف روئی اور مرہم لے کر آئی۔ہاشو سے اس نے نیم گرم پانی منگوایا اور بڑی توجہ سے میرے سر کے زخم کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔اس کی انگلیوں کے لمس میں انتہا درجے کی محبت آمیز ملائمت تھی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ خاص قسم کی جرأت بھی اس کے انداز میں موجود تھی جو سنگین چوٹوں کی مرہم پٹی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ایسی جرأت عام طور پر لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی۔یوں لگ رہا تھا کہ مہروز نام کا کوئی شخص واقعی موجود تھا اور وہ سلطانہ کا شوہر تھا۔اب اس شخص کے ساتھ پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ موجود نہیں تھا۔شاید کوئی المناک حادثہ......کوئی سنگین جرم......کوئی خونی واردات۔عین ممکن تھا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ زرگاں سے تل پانی تک کے راستے میں ہی پیش آیا ہو اور اس واقعے کے بعد سلطانہ نے ہوش و حواس کھو دیئے ہوں۔غالب امکان یہی تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ غنی صاحب کو سات آٹھ دن پہلے اپنے دوست رمضان کا پیغام ملا تھا اور اس نے کہا تھا

لڑکی اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ان کے پاس آ رہی ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟''وہ میری پٹی کرتے کرتے ذرا شرمیلے انداز میں بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''جب تم کہتے ہو کہ کچھ نہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ ہے۔''وہ پٹی کو آخری گرہ لگا کر میرے بازو سے لگ گئی اور میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرنے لگی۔''داڑھی بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا؟''

''اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو؟ پہلے کبھی نہیں بنائی میں نے۔شاید تم بھول گئے۔شروع شروع میں تو میں تمہیں نہلا بھی دیا کرتی تھی۔''وہ کہہ کر شرما گئی۔

یکا یک گھر کے بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔سلطانہ جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔میں نے اندازہ لگایا کہ غنی صاحب واپس آ گئے ہیں۔ان کے ساتھ بھاری آواز والا کوئی اور شخص بھی تھا۔یہ وہی چوہان نام کا بندہ تھا جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ذکر کیا تھا۔سلطانہ جلدی سے ان کے دونوں کے پاس باہر چلی گئی۔میں وہیں نیم تاریک کمرے میں بیٹھا رہا اور ادھ کھلے دروازے سے دوسرے کمرے کا منظر دیکھتا رہا۔چوہان سفید رنگت اور مسکراتے چہرے کا ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا۔وہ بھی مقامی لباس میں تھا۔اس نے سلطانہ کو پہچان لیا۔سلطانہ نے اسے''چوہان بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا۔چوہان نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور بچے کے گال گدگدائے۔

ان کو وہیں چھوڑ کر عبدالغنی صاحب میرے پاس کمرے میں آ گئے۔انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ان کے چہرے پر اب پہلے سے زیادہ اُلجھنیں موجود تھیں۔سفیدی مائل بالوں کی ایک لٹ ان کی شکن شکن پیشانی پر جھول رہی تھی۔میں غنی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے اپنا احترام کرانے لگتے ہیں۔اپنے چہرے مہرے سے وہ ایک دانا بینا اور ہمدرد انسان دکھائی دیتے تھے۔

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ان کے دیکھنے کے انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔''کیا بات ہے غنی صاحب! آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''میں نے پوچھا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور اُلجھے لہجے میں بولے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''کک...... کیا مطلب...... غنی صاحب؟''

''تمہیں غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''غلط بیانی...... میں کون سی غلط بیانی کر رہا ہوں؟'' میں ششدر تھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولے۔

''آپ کھل کر بات کریں۔''

''سلطانہ تمہاری بیوی ہے اور تم اس سے انکار کر رہے ہو۔ بالو بھی تمہارا اچ بچہ ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔'' غنی صاحب کا لہجہ حتمی تھا۔

میں نے ایک بار پھر ماتھا پکڑ لیا۔ مجھے لگا جیسے میں دیوانوں کے کسی گروہ میں گھر گیا ہوں اور اپنی شناخت کھو بیٹھا ہوں۔

غنی صاحب نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''دیکھو برخوردار! اگر تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس طرح......''

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور اپنے آپ میں سمٹتا چلا گیا۔

''یہ دیکھو...... یہ کیا ہے؟ کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے؟'' غنی صاحب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک تصویر تھی۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر دیکھی۔ یہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ اس میں کئی مرد و زن تھے۔ دو چار بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب لوگ مقامی دیہاتی لباس میں تھے۔ ایک سات آٹھ سالہ بچہ دولہے کے لباس میں تھا۔ اس نے سہرے میں سے اپنا چہرہ نکالا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے اردگرد کی ہر شے گھومنے لگی ہو۔ غنی صاحب کا چہرہ، ان کی کالی چھتری، رنگین نقش و نگار والی دیواریں، چٹائی کے پھول بوٹے۔ سب کچھ میری نظروں میں گھومنے لگا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غرق تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اس گروپ فوٹو میں ایک طرف میں خود بھی موجود تھا۔ میرے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ شاید چند ہفتے کا ہوگا۔ غالباً یہ بالو تھا۔ سلطانہ نے میرا بازو تھام رکھا تھا اور میرے کندھے سے چپکی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے تصویر پھینک دی۔ اپنا سر عقب سے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اپنے چہرے کو اپنے اوپر اُٹھے ہوئے گھٹنوں میں دھنساتا چلا گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ میں کہاں پھنس گیا تھا؟ کیا میں ڈیفنس والی کوٹھی میں بارہ تیرہ زینوں کے اوپر سے پرواز کر کے پختہ فرش پر گرنے کے بعد ابھی تک بے ہوش تھا؟ اور یہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، بے ہوشی کے عالم میں دیکھ رہا تھا؟ میں کیسے یقین کر سکتا تھا۔ میں ایسی باتوں پر کیسے یقین کر سکتا تھا؟ میں نے زندگی میں ٹھوس حقیقتوں کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہ میری فطرت میں ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر رکھے ہیں اور وہاں مطلق درد نہیں ہو رہا۔ لگتا تھا کہ وہ زخم بالکل مندمل ہو چکا ہے جو بتی والے چوک میں گاڑی کے اُلٹنے سے میری گردن پر آیا تھا اور جس نے رشید اور تابندہ کے گھر میں بھی مجھے سخت تکلیف میں رکھا تھا۔ ایک بار پھر میرے جسم میں سرد پھریریاں سی دوڑ گئیں۔ کیا واقعی یہ زخم مندمل ہو چکا تھا؟ میں نے دیوانوں کی طرح اس زخم پر ہاتھ چلایا۔ کوئی تکلیف نہیں تھی، کوئی کھرنڈ نہیں تھا۔ بالکل ملائم جلد تھی۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی ایکسیڈنٹ میں میری دائیں کہنی بھی تو زخمی ہوئی تھی۔ گاڑی کی کوئی نکیلی شے لگنے سے دو تین انچ لمبا زخم بن گیا تھا۔ میں نے تڑپ کر اپنا بازو موڑا اور سر گھما کر کہنی کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے ہیں۔ کہنی پر زخم کا بس بالکل مدھم سا نشان موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوٹ عرصہ پہلے ٹھیک ہو چکی ہے۔

''اوہ خدا...... اوہ خدایا...... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

غنی صاحب نے ایک بار پھر ملائم لہجے میں کہا۔ ''سنو مہروج! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ لیکن اس طرح کی باتاں نہ کرو۔ ان سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے اپنا سر بدستور ہاتھوں میں دبائے رکھا۔ ''میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو مجھے ایک آدھ گھنٹے کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ تمہیں آرام کی جرورت ہے۔ چلو میں دروازا بند کر دیتا ہوں، تم کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔'' غنی صاحب نے کہا۔ ان کا متین چہرہ بدستور اُلجھنوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ شاید وہ اب میری ذہنی صحت پر شک کرنے لگے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کا دھیان میرے سر کی شدید چوٹ کی طرف جا رہا ہو اور وہ خیال کر رہے ہوں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس وقتی طور پر مختل ہو گئے ہیں۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری نگاہ بار بار اپنی کہنی کی چوٹ پر پڑ رہی تھی۔ ہاں...... یہی چوٹ تھی۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور یہ چوٹ بالکل مندمل ہو چکی تھی۔ شاید ایک ڈیڑھ سال پہلے...... یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

اچانک میری نظر کمرے میں لگے ایک چھوٹے سے گول آئینے پر پڑی۔ یہ آئینہ کھڑکی کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ میں نے روشنی کے لیے کھڑکی ذرا سی کھولی اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ یہ ایک اور ذہنی جھٹکا تھا جو مجھے برداشت کرنا پڑا۔ مجھے اپنی شکل اجنبی لگ رہی تھی۔ بے شک یہ میرا ہی چہرہ تھا تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس چہرے کو مدتوں بعد دیکھ رہا ہوں۔ رنگ کچھ سنولایا ہوا تھا۔ رُخساروں کی ہڈیاں قدرے اُبھری ہوئی، آنکھوں کے نیچے ہلکے سے اُبھار۔ کچھ ضرور ہوا تھا، میرے ساتھ۔ کچھ انوکھا اور غیر معمولی۔ میرا دل و دماغ اب پوری طاقت سے گواہی دے رہا تھا کہ ڈیفنس لاہور میں پیش آنے والے خونی واقعات کو دو تین ہفتے نہیں گزرے، نہ ہی دو تین مہینے گزرے ہیں۔ انہیں ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ان واقعات میں اور یہاں اس جنگل میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان ایک ہے۔ ایک ایسا خلا جس کی طوالت اور گہرائی نامعلوم ہے۔ وہ خلا کیسے پیدا ہوا؟ اس خلا نے مجھے کیسے متاثر کیا؟ متاثر ہونے کے بعد میں کیا کرتا رہا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

ایکا ایکی میرے دل پر ایک زوردار گھونسہ لگا۔ اگر واقعی یہ خلا موجود تھا تو پھر میرے پیارے کہاں تھے؟ ان پر کیا بیتی تھی؟ فرح، عاطف اور...... ثروت...... ثروت کی شبیہہ نگاہوں میں گھومی اور سینے میں دھماکے سے ایک بہت بڑا الاؤ دہک گیا۔ میں تو ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔ اس کو حالات کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہ رہا تھا۔ مجھے جرمنی جانا تھا۔ میرا پاسپورٹ بن چکا تھا۔ ویزا لگنے والا تھا۔ میں دن نہیں، گھڑیاں گن رہا تھا، گھنٹے شمار کر رہا تھا۔

اوہ خدایا...... یہ کیا ہو گیا؟ کہیں میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ ایک دم میرے اندر کی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا۔ ''کیا واقعی بہت تاخیر ہو چکی ہے؟ کیا واقعی میں اپنی ثروت کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں؟'' میں نے

بار پھر دیوانوں کی طرح اپنی کہنی پر زخم کے پرانے نشان کو ٹٹولا۔ آئینے میں اپنا چہرہ ...ا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔ میری ...ہوں میں ثروت، فرح اور عاطف کی صورتیں گھومنے لگیں۔ میں نے کمرے کا عقبی دروازہ ...لا اور باہر نکل آیا۔ میں گلی میں کھڑا تھا۔ میں بھاگنے لگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ لوگ مڑ مڑ کر میری ...ف دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جنہوں نے ساڑھیوں کے علاوہ چولیاں ...گرے پہن رکھے تھے اور سانولے رنگ کے مرد بھی اور ننگ دھڑنگ بچے بھی۔

میں اس مسافر کی طرح بھاگ رہا تھا جو پلیٹ فارم پر اُتر کر ذرا دیر کے لیے غافل ہوا ہو ...اس کی گاڑی اس کے سارے مال اسباب سمیت آگے نکل گئی ہو۔

میں یوں تو بے سمت جا رہا تھا مگر اپنے تئیں ثروت کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی ...سی اور کی نہ ہوئی ہو۔ جیسے ابھی تک میری محبت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جانی باقی ...۔ وہ سرخ عروسی جوڑا پہنے بیٹھی ہو۔ ابھی قبول و ایجاب کے مراحل طے ہونا باقی ہوں۔ ...لگتا تھا کہ میں بھاگتا ہوا اس تک پہنچ جاؤں گا۔ پکار کر کہوں گا۔ میں آ گیا ہوں ثروت اب ...اقرار کو اپنے ہونٹوں کے اندر روک لو۔ یہ اقرار صرف میرے لیے ہے۔ لہٰذا یہ شادی ...ام نہیں پا سکتی۔ یہ محفل برخاست کرنا ہو گی۔ ایک نئی محفل سجانا ہو گی۔ جہاں سچا اقرار ہو گا ...ہاں سچی محبت کے سدا بہار پھول کھلیں گے۔

میں بھاگ رہا تھا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ارد گرد کے مناظر میری ...ہ میں دھندلائے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے درجنوں سکون بخش گولیاں ...ساتھ نگل لی ہیں اور اب میں دوڑنے کے بجائے ہوا کے سمندر میں تیر رہا ہوں۔

اب میرے ارد گرد سر سبز ڈھلوان تھی۔ یہاں گھنے درخت تھے۔ ان درختوں میں کہیں ...ہیں بکریاں چرتی نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک جگہ بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔

میں ضعیف العقیدہ نہیں تھا۔ مجھ میں بے شمار خامیاں تھیں مگر توہم پرستی اور فطرت سے ...ار کرنے جیسی کمزوریاں نہیں تھیں۔ میں نے ہمیشہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھا تھا اور یہی وجہ ...ی کہ اب میرا دماغ شدید ترین تناؤ کے سبب پھٹ رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان ...الات کے ڈانڈے فوراً ماوراء سے جوڑنے لگ جاتا۔ جادو ٹونا سحر، جن، بھوت، آسیب، ...زاد اور اس طرح کے نہ جانے کون کون سے تصورات اس کی سوچوں کو جکڑ لیتے اور شاید اس ...ہ سے وہ کسی حد تک ''ریلیکسڈ'' بھی ہو جاتا مگر میں وجہ تلاش کر رہا تھا۔ منطق ڈھونڈ رہا تھا۔ ...کوئی ''واہمہ'' مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی صورتِ حال کے لیے ٹھوس وضاحت چاہیے

تھی۔

اچانک مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بھاگتے قدموں کی چاپ تھی۔ میں نے
اُٹھا کر دیکھا۔ سلطانہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے گال قندھاری انار کی طرح سرخ
اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ عیاں تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی ہے۔ پھر مجھے اس کے
عقب میں کچھ فاصلے پر غنی صاحب اور وہ دوسرا شخص بھی دکھائی دیئے جس کا نام چوہان [illegible]
گیا تھا۔ سلطانہ نے آتے ساتھ ہی میرے دونوں کندھے تھام کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔
سسک کر بولی۔ ''تمہیں کیا ہوگیا ہے مہرو! ایسا کیوں کر رہے ہو تم؟ کیا میری جان لینا چاہ
ہو؟ تمہیں پتا ہے، تمہاری تکلیف دیکھ کر مجھ پر کیا گزرتی ہے؟''

اسی دوران میں غنی صاحب اور چوہان بھی میرے پاس آ گئے۔ چوہان نے بھی بڑی
ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں کیا ہوگیا ہے مہرو! ہوش کرو یار! نہیں تو بڑا
نقصان ہو جائے گا۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ دو تم لوگ۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لگایا۔ میں نے اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔ غنی
صاحب اور چوہان آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں سے کچھ الفاظ میرے
کانوں تک پہنچے۔ جیسے...... سر...... چوٹ...... پریشانی وغیرہ۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے سر
پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس چوٹ کی
وجہ سے میرے حواس گڑبڑا گئے ہیں۔

اسی دوران میں تین گھڑسوار نظر آئے۔ وہ گہری سبز وردیوں میں تھے۔ ان کے سروں
پر ہلکی سبز دھاری دار پگڑیاں تھیں۔ کندھوں پر رائفلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پر خاکی
غلاف چڑھے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے بارعب لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔
یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

سلطانہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا، غنی صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کوئی
خاص بات نہیں جی! یہ گھر کا معاملہ ہے۔''

''گھر کا معاملہ ہے تو گھر میں بیٹھ کر نمٹاؤ اور اس بندے کو چوٹ کیسے لگی ہے؟'' میری
طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا۔

''پیڑ سے گر گیا ہے جناب! کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔'' غنی صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے لیکن یہاں سے اُٹھ جاؤ۔'' اور تینوں گھوڑے آگے بڑھ

گئے۔

غنی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر التجا آمیز لہجے میں بولے۔ ''چلو اُٹھ جاؤ مہرو۔''

''میرا نام مہرو نہیں ہے۔ میں تابش ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔'' میری آواز اتنی بلند تھی
کہ آگے جاتے ہوئے گھڑسواروں تک پہنچ سکتی تھی۔

غنی اور چوہان بُری طرح گھبرا گئے۔ سلطانہ نے مجھے خاموش رکھنے کے لیے میرے
منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خدا کے لیے مہرو! ہوش کرو۔'' وہ کراہی۔

گھڑسواروں تک میری آواز نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ آگے نکل گئے تو غنی صاحب نے
دوبارہ ملتجی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم جو کہو گے ہم سنیں گے لیکن گھر جا کر۔ یہاں سے اُٹھ
جاؤ۔ اگر کوئی اور یہاں آ گیا تو ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوئیں گا۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ غنی صاحب کے گھر میں تھا۔ سلطانہ سمیت کوئی بھی مجھ
سے کسی طرح کی متنازع بات نہیں کر رہا تھا۔ کسی نے مجھے مہرو کہہ کر بھی نہیں پکارا تھا۔ بہرحال
وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

میں اون کی چٹائی پر دراز ہو گیا اور کچی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ سامنے والی دیوار پر دو تین
جانوروں کی کھالیں آویزاں تھیں۔ میں ان میں سے بس ایک کھال پہچان سکا۔ یہ کسی چھوٹے
چیتے کی تھی۔ گھر سے باہر گلی سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں
قریب ہی شاید بھجن گایا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں دھند سی بھری ہوئی تھی۔ میں جیسے ہوش اور
بے ہوشی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ میں تابش ولد اشفاق سکنہ لاہور،
ایک انوکھی و حیران کن صورتِ حال کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری زندگی کے تسلسل میں شب و
روز کا ایک طویل ٹکڑا غائب ہو چکا ہے۔ یہ بڑی فلمی اور داستانی سی صورتِ حال تھی۔ بچپن
سے فلموں، ڈراموں میں اس طرح کے مناظر دیکھے تھے۔ کوئی شخص کسی حادثے کا شکار ہو کر
اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ پھر کسی اور حادثے کے سبب اس کی یادداشت بحال ہو گئی۔ کیا میرے
ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد میں
ایک نامعلوم وقت تک کسی اور حیثیت سے زندہ رہا ہوں۔ اس نامعلوم عرصۂ حیات میں، مَیں
نے کیا کیا ہے؟ کن لوگوں سے ملا ہوں؟ کن لوگوں سے بچھڑا ہوں؟ کیا ٹھوکریں کھائی ہیں؟
کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

یہ لوگ غالباً سمجھ رہے تھے کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل ہو گئے ہیں۔
انہیں معلوم نہیں تھا۔ چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل نہیں، بحال ہوئے تھے۔ میرے زخم

نے مجھے مخبوط الحواس نہیں بنایا تھا، صحیح الدماغ کیا تھا۔ مگر حافظے کی یہ واپسی میرے لیے ایک ایسا عذاب بنی تھی جس کی شدت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دل و دماغ میں یہ احساس ایک نہایت کرب ناک لہر کی طرح موجزن تھا کہ میں نے دیر کر دی ہے۔ میں نے جہاں اور بہت کچھ کھویا ہے، وہاں ثروت کے معاملے میں بھی بہت دیر کر دی ہے۔

اسی دوران میں گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔ ان میں ایک بھاری اور پُرحکم آواز سب سے نمایاں تھی۔ گاہے بہ گاہے غنی صاحب بھی احتجاجی انداز میں کچھ کہہ رہے تھے۔

میں نے گھر کے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں، مَیں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہو سکا تاہم چند افراد کی ٹانگیں نظر آئیں۔ یہ وہی باوردی افراد تھے جو اس سے پہلے بستی سے باہر درختوں میں دکھائی دیئے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔ ان کا رویہ سخت تھا۔ بہرحال وہ کسی طرح کی بدتمیزی نہیں کر رہے تھے۔ غنی صاحب کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''دیکھو جناب! ہم تو خود ابھی تھوڑی دیر میں آپ کے پاس حاجر ہونے والے تھے۔ اس لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو خود سائل بن کر آئی ہے۔''

جواب میں بھاری آواز والے نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بزرگوار! ہم ابھی کسی کو اپرادھی تو نہیں کہہ رہے۔ بس اوپر کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔ جو کچھ بولنا چاہتی ہے، وہاں جا کر بول لے۔''

وردی والے ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ''اور اس کا پتی کدھر ہے؟''

''وہ بیمار ہے جی! دوسرے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔'' غنی صاحب کی آواز سنائی دی۔

چند سیکنڈ بعد دو تین افراد میرے والے کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سے بھاری آواز والا شخص وہی تھا جس سے کچھ دیر پہلے بستی سے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولا۔ ''تم ہی سلطانہ کے پتی ہو؟''

ایک دم ہی میرے اندر کی گھٹن اور بے قراری آواز بن گئی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''میں نہیں ہوں اس کا پتی! میرا اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''تو کون ہو تم؟'' بھاری آواز والے نے کہا۔

''میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ

زبردستی روک رہے ہیں۔''

سلطانہ تیزی سے اندر آئی۔ بھاری آواز والے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ کو بتایا ہے نا یہ بیمار ہیں۔ ان کو چوٹ لگی ہے سر میں...... اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ اُلٹی سیدھی باتاں کر رہے ہیں۔''

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے نہیں پتا یہ کیا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھی کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے چلا کر کہا۔

''خدا کے لیے مہروج! ایسی باتاں نہ کرو۔'' سلطانہ نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھاما۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایک دم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ لگتا تھا میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ چکر بڑھتے جا رہے تھے۔ دم گھٹ رہا تھا۔ میں گہری سانسیں لینے لگا۔ اردگرد کی آوازیں اب جیسے مجھے فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ بھاری آواز والا مقامی لب و لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سلطانہ اور غنی صاحب بھی بول رہے تھے۔ آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پلیز...... چلے جاؤ یہاں سے۔ میرا سر پھٹ رہا ہے۔''

میں اپنا سر گھٹنوں میں جھکاتا چلا جا رہا تھا۔

وہ لوگ باہر چلے گئے۔ اب ان کی گفتگو کی آواز دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا۔ باوردی افراد سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ سلطانہ نے بچہ گود میں اُٹھا لیا تھا اور اوڑھنی سر پر لے لی تھی۔ وہ پریشان اور دُکھی ضرور تھی مگر ہراساں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ سلطانہ کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔ گونگا ہاشم بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔

تین چار منٹ بعد غنی صاحب اندر آئے۔ میں چٹائی پر لیٹا گہرے سانس لے رہا تھا۔ غنی صاحب کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ لوگ سلطانہ کو لے گئے ہیں۔ اسے تمہاری مدد کی بہت جیادہ جرورت تھی مگر تم نے سب کچھ اُلٹ دیا ہے۔''

''میں نے کیا اُلٹا ہے اور میں کسی کی مدد کیا کروں گا؟ مجھے خود مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا مہروج! تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے جس کی وجہ سے تم وختی طور پر باتوں کو بھول رہے ہو۔ بہت جلد سب اچھا ہو جائے گا۔''

''آپ سمجھتے ہیں کہ چوٹ لگنے سے میرا حافظہ چلا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے با
اُلٹ ہے...... بالکل اُلٹ ہے۔ میں اپنے آپ کو پہچان رہا ہوں۔ اپنے حالات کو پہچان
ہوں۔ میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ میری دشمنی تھ
میرا ان سے جھگڑا ہوا۔ میں سیڑھیوں سے گرا......بس...... مجھے یہاں تک یاد ہے۔ اس۔
بعد کچھ یاد نہیں۔ سب کچھ کسی گہری دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند میں کچھ صاف دکھ
نہیں دیتا۔''

میں نے ایک بار پھر اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ لیا اور کرب کی انتہا سے گزرنے لگا۔ ''میر
مدد کریں غنی صاحب! مجھے بتائیں میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں کتنی دیر تک اپنے ہوش م
نہیں رہا ہوں اور مجھے یہ بھی بتائیں کہ میں یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ مجھے پہلے ہی بہا
دیر ہو چکی ہے۔ مجھے کہیں جانا تھا۔ کسی سے ملنا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے میرا انتظار کیا ہ
گا۔ وہ شاید آج بھی میری راہ تک رہی ہو۔ اوہ خدا! یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

میں بولتا جا رہا تھا اور غنی صاحب ہمدردانہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔
میری اس بات نے انہیں چونکایا تھا کہ میرا حافظہ گیا نہیں، واپس آیا ہے۔

میری بڑھتی ہوئی بے قراری دیکھ کر انہوں نے وہ بات ادھوری چھوڑ دی جو وہ کرنا چا
رہے تھے۔ انہوں نے سلطانہ کا ذکر دوبارہ نہیں کیا۔ مجھے روغنی مٹی کے گلاس میں پینے کے
لیے پانی دیا۔ پھر بولے۔ ''چلو تم کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔ اتنے میں چوہان بھی آ جاتا ہے
پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔''

میں واقعی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں۔ دنیا و مافیہا سے
بے خبر ہو جاؤں۔ شاید میرے دماغ پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹ جائے۔ ممکن ہے کہ میں
اپنے ماضی اور حال میں کوئی رابطہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

گلی میں سے کبھی کبھی کوئی گھوڑا دُلکی چال چلتا گزرتا تھا اور اس کی ٹاپوں کی مدھم آواز
سنائی دیتی تھی۔ پھر کبھی بھینسوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز گونجتی تھی۔ بچے شور
مچاتے تھے اور کوئی بھیک منگا صدا لگاتا تھا۔ کہیں کسی قریب کے گھر میں کوئی شخص بانسری جیسا
ساز پُر درد آواز میں بجا رہا تھا۔ ہوا بلند و بالا درختوں سے سائیں سائیں کرتی گزرتی تھی۔
میں یہ ساری آوازیں کمرے کے اندر سے سن رہا تھا اور اپنے ذہن میں ماحول کی ایک تصویر بنا
رہا تھا۔

یہ بستی، یہاں کے لوگ، یہاں کا رہن سہن آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو رہا تھا۔ پھر بھی

بے شمار سوال، جواب طلب تھے۔ غنی صاحب نے کہا تھا کہ اس علاقے کے قریبی شہر جھانسی
اور الٰہ آباد وغیرہ ہیں لیکن سلطانہ اور غنی صاحب جو بولی بول رہے تھے، اس میں دکنی رنگ تھا۔
یہ لب و لہجہ میں نے حیدر آباد میں سنا تھا اور جہاں تک مجھے پتا تھا، الٰہ آباد اور حیدر آباد وغیرہ
میں بہت فاصلہ تھا۔ کئی سوال مسلسل ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ
وردی افراد مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں؟ شاید میری حالت دیکھ کر انہوں نے مجھے ساتھ
لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جلد ہی مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ وہ مجھے چھوڑ ضرور گئے تھے مگر میری طرف
سے مکمل غافل نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کی درز سے دیکھا تو باہر گلی میں ایک باوردی
شخص ایک خوانچہ فروش کے پاس کھڑا نظر آیا۔ وہ خوانچے پر سے کوئی فالسے کی طرح کا پھل اُٹھا
اٹھا کر کھا رہا تھا۔ اس کی رائفل غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ شخص یہاں
میری نگرانی کے لیے موجود ہو۔

میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد میری غنودگی، نیند میں بدل گئی۔ جب ذہن بہت تھک
جائے اور اعصاب نڈھال ہو جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب میں سویا تو میرے اندازے
کے مطابق سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔
کمرے میں ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ میں چٹائی پر لیٹا تھا اور میرے سر کے نیچے غالباً غنی
صاحب نے ایک نرم سرہانہ رکھ دیا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ منظر حیران
کن تھا۔ جھیل کے خم کھاتے ہوئے کنارے کے ساتھ دور دور تک آبادی کی روشنیاں نظر آ
رہی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس جھیل کے ساکت پانی میں چمکتا تھا اور لگتا تھا کہ ہر طرف
ستارے روشن ہیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید یہ منظر مجھے کشش کرتا مگر اس وقت تو دل و دماغ میں طوفان
برپا تھا۔ جاگتے ساتھ ہی سارے کرب زیادہ شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلانے
لگے۔ ان میں سے سب سے جان لیوا کرب کا تعلق ثروت کے تصور سے تھا۔ یقینی بات تھی کہ
میں اسے کھو چکا ہوں۔ وقت کا ایک طویل ٹکڑا جو میرے دل و دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا، اسی
ٹکڑے کے دورانیے میں ثروت کہیں گم ہو چکی تھی۔ میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں کچھ دیر تو
برداشت کرتا رہا پھر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میرے یہ آنسو
ثروت کے لیے تھے۔ یہ اس جدائی کا ماتم تھا جو میری زندگی کا سب سے بڑا داغ بننے والی
تھی۔ میں روتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ میں نے کیا کیا سوچا تھا۔ اپنی اور ثروت کی جدائی کو ختم

کرنے کے لیے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ وہ سارا عزم، سارا جوش وخروش، انہونی کو ہو
کرنے کے وہ سارے حوصلے کیا ہوئے تھے؟ کسی بھی جدوجہد کے بغیر میں کس طرح ہار
تھا؟ یہ کیسی شکست تھی جس میں لڑنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ا
آنسوؤں میں فرح اور عاطف کے حصے کے آنسو بھی شامل ہونے لگے۔ میں ان کے لیے رو
اور بہت دیر تک رویا۔ ابھی مجھے اپنے حالات کا ٹھیک سے ادراک نہیں تھا مگر میرا دل اند
سے گواہی دے رہا تھا کہ مجھے کچھ کاموں کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔

کسی نے بہت ہولے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے جاگتے دیکھ کر اندر آ گیا۔ میر
خیال تھا کہ وہ غنی صاحب ہوں گے مگر وہ چوہان تھا۔ چوہان بے شک مقامی لباس میں ہی تھ
مگر وہ اپنی بول چال سے پڑھا لکھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے خدوخال بھی ظاہر کرتے تھے کہ و
کہیں باہر سے یہاں آیا ہے۔ وہ متناسب جسم کا مالک تھا۔ آنکھیں روشن اور ماتھا چوڑا تھا۔ (
میرے پاس بیٹھ گیا اور ملائمت سے بولا۔ ''بھوک لگی ہے تو کچھ تھوڑا بہت کھا لو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ میں ایک ا
بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ کچھ عرصہ الہ آباد میں پریکٹس بھی کر چکا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''میں تم سے جو کچھ کہوں گا، اپنی جانکاری کے مطابق سچ کہوں گا کیونکہ اس میں
میرا کوئی مفاد نہیں ہے اور نہ ہی کچھ لینا دینا ہے۔ میں آشا کرتا ہوں کہ تم بھی مجھے اپنا ہمدر
سمجھو گے۔''

''مجھے یہ بتاؤ، میں کس جگہ ہوں؟ کیسے پہنچا ہوں یہاں؟''

''کیسے پہنچے ہو، اس کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ تم میرے یہاں اس
اسٹیٹ میں آنے سے پہلے ہی موجود تھے لیکن......''

''اسٹیٹ؟ کیا یہ کوئی اسٹیٹ ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں...... یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے۔ اتر پردیش کی دور دراز اسٹیٹس میں سے ایک۔
قانونی طور پر تو انڈیا میں راجواڑے، ریاستیں اور جاگیریں ختم ہو چکی ہیں مگر دور افتادہ علاقوں
میں کسی نہ کسی طور ان کی حیثیت برقرار ہے۔''

''تم...... کب...... یہاں پہنچے تھے؟''

''آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے۔ بس میری کوئی مجبوری تھی جس کے سبب مجھے سب
کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آنا پڑا۔''

میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔ یہ چوہان نامی شخص ڈیڑھ سال پہلے یہاں پہنچا تھا اور تب بھی
میں یہاں اس جگہ موجود تھا؟

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں یہاں کن حالات میں آیا؟''

''تم آئے نہیں لائے گئے تھے اور جہاں تک میری جانکاری ہے، تم کو بڑے پنڈت
مہاراج جی کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ تم سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا جس کی سزا تمہیں یہاں بدھ
مندر میں بھگتنا تھی اور مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق خود کو پوتر کرنا تھا۔''

''بڑا جرم؟ میں نے کیا کیا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔''

''میرے خیال میں یہ کوئی چوری کا معاملہ تھا۔ بدھا کی ایک خاص مورتی کی چوری کا۔
تمہارے علاوہ بھی یہاں دو لوگوں کو سزا بھگتنا تھی۔ ان میں سے ایک عورت تھی۔ اس عورت کا
نام کورتی ہے۔ مقامی زبان میں کورتی، نیچ عورت کو کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم کورتی
سے مل بھی چکے ہو۔ تم اسے جانتے ہو۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔ ''جب تم لوگ ایسی باتیں کرتے ہو
تو میرے سر کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔
میں قسم کھاتا ہوں۔''

چوہان نے بڑی نرمی سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے ہولے ہولے سہلانے
لگا۔ اس کے لمس میں ایک ہمدرد دوست کا خلوص تھا۔ ''تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں۔ میں تمہاری اس کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے لیے اجنبی
نہیں ہو۔ میں تمہیں کئی ماہ تک وہاں زرگاں میں دیکھتا رہا ہوں۔ تمہارے مزاج کے اُتار
چڑھاؤ میری نگاہ میں رہے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ...... پلیز۔''

''اچھا...... تم میری طرف دیکھو۔ خوب غور سے۔'' چوہان نے اپنے ہاتھ سے میری
تھوڑی اوپر اُٹھائی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں ڈاکٹر چوہان ہوں۔ جب بدھ مندر
میں آگ لگی تو دو بھکشو آگ میں گھر گئے تھے۔ تم بھی ان کے ساتھ تھے۔ پھر میں اور سلطانہ
اندر آ گئے تھے۔ ہم نے تمہیں آگ سے نکالا تھا۔ یہ دیکھو اس وقت میرا بازو تھوڑا سا جل گیا
تھا۔'' چوہان نے قمیص کی آستین اُٹھا کر کلائی سے اوپر جلنے کا نشان دکھایا۔

میں خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ ''اس بات پر وشواس کرو کہ یہ سب
سچ ہے۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ادھوری آدھی بات تمہیں یاد آ

جائے۔"

میں نے چوہان کے کہنے پر کوشش کی مگر ایک سفید دھند کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ محسوس ہوا کہ دم گھٹ رہا ہے۔ میری کیفیت دیکھ کر چوہان نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں ذرا نارمل ہوا تو وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "تم سمجھ دار اور روشن خیال ہو۔ اپنی تکلیف کو کوئی آسیبی رنگ نہیں دے رہے۔ اسے معروضی طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ جب بندہ اپنی تکلیف کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس پر غلبہ پانے میں آسانی رہتی ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو...... میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

وہ اپنے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولا۔ "جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ڈیڑھ دو سال پہلے تم کہیں سے بُری طرح گرے ہو۔ کورتی بھی یہی بتاتی ہے کہ تم گرے ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ اس چوٹ کے بعد 'اے پیس آف ٹائم' یعنی وقت کا ایک ٹکڑا تمہاری یادداشت سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اسے ہم میڈیکل کی زبان میں Retrograde Amnesia کہتے ہیں۔ یہ Amnesia کی وہ قسم ہے جس میں کسی حادثے کی وجہ سے حادثے سے پہلے کے واقعات ذہن سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری جزوی بھی ہوتی ہے اور کلی بھی۔ جزوی بیماری میں کچھ باتیں یاد رہ جاتی ہیں، کچھ بھول جاتی ہیں۔ تمہارا معاملہ جزوی نہیں ہے۔ تمہاری یادداشت مکمل طور پر گئی تھی اور اب واپس آ گئی ہے۔ تاہم یہ سو فیصد واپسی نہیں ہے۔ تم غور کرو گے تو اب بھی ماضی کی کچھ باتیں تمہارے ذہن سے محو ہوں گی۔ بہرحال آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بلکہ مجھے وشواس ہے کہ اب اس نئی صورتِ حال میں تم جو پچھلے ڈیڑھ دو سال کی باتیں بھول رہے ہو، وہ بھی جلد ہی تمہارے ذہن میں تازہ ہونے لگیں گی۔"

اس نے چند لمحے توقف کر کے میری آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں۔ میرے سر کی چوٹوں کا بغور معائنہ کیا پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "کورپس کلوزم۔"

غالباً وہ میری تکلیف کا طبی نام لے رہا تھا۔

اس نے میرا کندھا تھپکا اور حوصلہ افزا انداز میں بولا۔ "پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بُرا وقت گزر چکا ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے مہروز۔"

میں جھنجھلا گیا۔ "تم بار بار مجھے اس نام سے کیوں پکار رہے ہو؟ یہ میرا نام نہیں ہے۔"

"سوری...... سوری...... مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم نے اپنا نام تابش بتایا ہے۔ میں آئندہ

تمہیں اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ ویری سوری۔"

"او کے۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔ "یہاں صورتِ حال یہ ہے مہروز...... میرا مطلب ہے تابش کہ سلطانہ کو تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اگر تم نے اس کی مدد نہ کی تو وہ بُری طرح پھنس جائے گی۔ اس کی عزت اور جان دونوں شدید خطرے میں پڑ جائیں گی۔"

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"سب سے پہلے تو تمہیں اپنا بیان تبدیل کرنا ہو گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے چھوٹے سرکار کے اہلکاروں کے سامنے جو کچھ کہا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم نے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کیا ہے اور یہی وہ انکار ہے جو جارج اور حکم جی وغیرہ کو ایک دم 'اپر ہینڈ' دے دے گا۔ وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حکم جی اور جارج کا تو پہلے ہی یہ کہنا ہے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس نے بس ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ حکم جی! چھوٹے سرکار، یہ سب لوگ کون ہیں۔ ان سے میرا کیا تعلق ہے؟"

ایک دم چوہان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ مجھے سلجھانے کے بجائے مزید اُلجھا رہا تھا۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ تمہیں آغاز سے بتاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ باتیں تمہارے ذہن میں بھی تازہ ہو جائیں۔"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ "جو کچھ میرے علم میں ہے، میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میری کسی بات پر شک کرو گے تو اپنی اُلجھنوں میں اضافہ کرو گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کہنے لگا۔ "یہ بھانڈیل اسٹیٹ دو بھائیوں کی ہے۔ دونوں کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ یہاں ہندو زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ بڑے بھائی کا نام رائے وشوا ناتھ ہے لیکن انہیں یہاں 'حکم جی' کہا جاتا ہے۔ ان کے حصے میں زرگاں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں چھ سات بڑے گاؤں ہیں جو اس جنگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آباد ہیں۔ چھوٹے بھائی کا نام اجیت رائے ہے اور وہ 'چھوٹے سرکار' کہلاتے ہیں۔ وہ یہاں نل پانی کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ نل پانی دراصل 'نیلے پانی' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ

ایک ہی بڑی بستی ہے جو تم اس جھیل کے کنارے آباد دیکھ رہے ہو۔ اس کے علاوہ جنگل میں کہیں کہیں کسانوں اور خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے ڈیرے ہیں جو ایسے قابلِ ذکر نہیں۔ میں جب اس بھانڈیل اسٹیٹ میں پہنچا تھا تو زرگاں میں اُترا تھا۔ مجھے پناہ کی ضرورت تھی اور زرگاں کے حکم جی نے مجھے پناہ دی تھی۔ وہاں پتا ہے میں نے سب سے پہلے تمہیں کہاں دیکھا تھا؟

ایک بار پھر کہوں گا کہ وشواس کرنا۔ میں تمہیں حقیقت بتانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا۔ میں نے تمہیں سب سے پہلے زرگاں کے بودھ مندر میں دیکھا تھا۔ یہاں اسے پگوڈا بھی کہتے ہیں۔ تم نے گیروا رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تمہارا سر منڈا ہوا تھا اور تم مندر کے صحن میں جھاڑو دے رہے تھے۔ کورتی بھی وہیں تھی۔ وہ بھی اسی حال میں تھی۔ تمہارا ایک تیسرا ساتھی بھی تھا مگر میں نے اسے نہیں دیکھا۔

پھر ایک روز میں نے تمہیں بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ تم دوپہر کے وقت ایک پیالہ لیے گھروں کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ تمہارے گلے میں زرد رنگ کی مالا تھی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤنیں۔ مجھے لگا کہ تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ شاید تمہیں ایسا بنایا گیا ہے، تمہیں ایک نیا روپ دیا گیا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں اپنے دوست رمضان سے پوچھا تھا۔ رمضان زرگاں کا مقامی ہے۔ اس نے بتایا کہ تم بڑے پنڈت مہاراج کے اپرادھی ہو اور یہاں اس بودھ مندر میں جیون قید کاٹ رہے ہو۔ رمضان نے مجھے وہی چوری والی بات بتائی اور کہا کہ تم نے کوئی مقدس مورتی چوری کی تھی۔ تمہارے ساتھ جو دو اور افراد شریک تھے، وہ بھی اسی بودھ مندر میں سزا بھگت رہے تھے۔ تم سارا دن بے تکان کام کرتے تھے۔ تمہیں فقط ایک وقت کا بھوجن ملتا تھا اور روزانہ شام کو مخصوص تعداد میں بید مارے جاتے تھے تاکہ تم مرنے سے پہلے پوتر ہو جاؤ۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ان بیدوں کے نشان شاید تمہاری کمر پر اب بھی موجود ہوں۔''

چوہان اُٹھا اور اس نے میری قمیص ہولے سے اوپر اُٹھائی۔ پہلے خود میری پشت پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میری پشت پر پھیرا۔ مجھے ہلکے ہلکے کئی اُبھار محسوس ہوئے۔ بہرحال ان میں کسی طرح کا درد نہیں تھا اور یہ پُرانی بات لگتی تھی۔

''ایک روز میں نے تمہیں اور بھی بُری حالت میں دیکھا۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے خواہ مخواہ تمہارا من خراب کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھو کہ تمہیں مارا پیٹا جا رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکم جی کی ایک بیوی اور اس کی سہیلیوں نے تمہارے ساتھ کوئی شرارت کی تھی۔ تم پر چھیڑ

چھاڑ کرنے کا الزام لگایا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام رتنا تھا۔ تم ذہن پر زور دو، شاید تمہیں کچھ یاد آئے۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ ہی تم بار بار مجھ سے یاد کرنے کو کہو۔ مجھے بس بتاتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے سخت مضطرب لہجے میں کہا۔

''انہی دنوں میں زرگاں سے ہجرت کر کے یہاں نل پانی میں آ گیا۔ مجھے وہاں زرگاں کے حالات کی زیادہ جانکاری نہیں رہی۔ پھر ایک روز اچانک مجھے پتا چلا کہ راجپوت مسلم گھرانے کی لڑکی سلطانہ نے تم سے شادی کر لی ہے اور اب تم اس کے گھر میں اس کے بوڑھے والد کے ساتھ ہی رہتے ہو۔ اس خبر نے جہان اور لوگوں کو حیران کیا ہوگا، وہاں میں بھی ششدر رہ گیا۔ تم تو پنڈت مہاراج کے قیدی اور معتوب تھے پھر تمہاری شادی سلطانہ سے کیسے ہوگئی؟ اس کی ٹھیک جانکاری مجھے آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ ہاں...... یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ یہ شادی آناً فاناً ہوئی۔ شاید تم سلطانہ کو پسند آ گئے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔ ہوسکتا ہے کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا ہو۔ بہرحال سلطانہ ایک دلیر لڑکی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی سے دبتی نہیں۔ حتیٰ کہ جارج جیسے شخص کو بھی وہ کبھی خاطر میں نہیں لائی۔ میرا خیال ہے کہ آگے بتانے سے پہلے میں تمہیں حکم جی، اس کے خاص دوست سر جاج اور سلطانہ کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتا دوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، حکم جی اس اسٹیٹ کے ایک بڑے علاقے زرگاں کا مالک و مختار ہے۔ حکم جی اور چھوٹے سرکار دونوں بھائی ہیں لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ حکم جی شروع سے رنگین طبیعت کا مالک ہے۔ اس کی محل سرا میں جسے عرفِ عام میں دیوان کہا جاتا ہے، دنیا کی بیشتر خرافات موجود ہیں۔ حکم جی کی پانچ باقاعدہ پتنیاں ہیں جن میں رتنا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی لونڈیاں، رکھیلیں وغیرہ بھی حکم جی اور ان کے دوستوں کی تفریحِ طبع کے لیے دیوان میں موجود رہتی ہیں۔ جارج جس کو یہاں سر جارج بھی کہا جاتا ہے، حکم جی کا سب سے قریبی دوست ہے۔ دونوں کی مشترکہ دلچسپیوں میں شراب، شکار اور شباب سرِفہرست ہیں۔ جارج درحقیقت آج سے دس بارہ سال پہلے انڈیا آیا تھا اور کوگر شیروں پر ریسرچ کرنے کے لیے ہی ان دشوار گزار جنگلات میں داخل ہوا تھا۔ اس نے یہاں بہت سی دستاویزی فلمیں بنائیں اور ڈیٹا وغیرہ اکٹھا کیا۔ پھر اس کا من ان جنگلوں میں ایسا لگا کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ان دنوں حکم جی اور چھوٹے سرکار کے

پتا جی رائے پرتاب بہادر بھی زندہ تھے۔ وہ بھی کوگر نسل کے شیروں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے کوگرز پال رکھے تھے۔ انہی کوگرز کی وجہ سے ہی کچھ عرصے بعد ان کی موت بھی ہوئی۔ بہرحال رائے پرتاب بہادر کے جیون میں ہی حکم جی اور جارج میں گہری دوستی ہو چکی تھی۔ دونوں کی طبیعت ملتی تھی اور دونوں کے لیے اس دور دراز اسٹیٹ میں ہر طرح کا ''شکار'' بھی موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد جارج کا دل کہیں اور نہیں لگ سکا۔ وہ ایک دو بار چند مہینوں کے لیے انگلینڈ گیا بھی لیکن پھر واپس آ گیا۔ اب وہ یہیں پر ہے۔ اس کے دو تین انگریز دوست بھی یہیں پکے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک برمنگھم کا سرجن ہے۔ اب میں تمہیں سلطانہ کے بارے میں کچھ بتا دوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پتا نہیں کیوں مجھے کسی وقت لگتا تھا کہ میں نے اس کہانی کے کچھ حصے کہیں سنے ہوئے ہیں۔ کہاں سنے ہیں؟ کس نے سنائے ہیں؟ واقعات کے یہ ٹکڑے کچھ شناسا سے کیوں لگتے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کے گرد ایک ناقابلِ عبور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

چوہان نے حسب عادت اپنے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ زرگاں میں اس کے والد مختار احمد کی تھوڑی سی زمین ہے۔ اس زمین سے ان کی گزر بسر ہوتی ہے۔ سلطانہ کا صرف ایک بھائی ہے۔ وہ کمر میں چوٹ لگنے سے معذور ہو گیا ہے اور کئی سال سے بستر پر ہی ہے۔ سلطانہ کی والدہ بڑی دلیر عورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تلوار چلانا جانتی تھی اور باقاعدہ مردوں سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کی موت بھی ایک بہادر راجپوت کی طرح ہوئی۔ یہ کوئی پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سلطانہ بمشکل آٹھ نو سال کی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ اچانک ماں بیٹی کو درختوں میں ہلچل محسوس ہوئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو دل دہلا دینے والا منظر نظر آیا۔ حکم جی جو اس وقت نوجوان تھا، زمین پر گرا ہوا تھا اور تین بھیڑیئے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ حکم جی کا خاص محافظ ایک طرف پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ سلطانہ کی والدہ اپنی بچی کو لے کر وہاں سے بھاگ جاتی یا شور مچا کر کسی کو مدد کے لیے بلانے کی کوشش کرتی، وہ ایک موٹی لکڑی کے ساتھ خود بھیڑیوں پر حملہ آور ہو گئی۔ اس نے انہیں زوردار چوٹیں لگائیں۔ پھر اس کی نظر محافظ کی رائفل پر پڑ گئی۔ اس نے رائفل کھینچی اور یکے بعد

دیگرے کئی فائر کر کے تینوں بھیڑیوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ تاہم اس شدید کشمکش میں وہ خود بھی زخمی ہو گئی اور قریباً ایک ماہ بعد ان زخموں کی وجہ سے ہی چل بسی۔ سلطانہ کی والدہ نے بھانڈیل اسٹیٹ کے ولی عہد کا جیون بچایا تھا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ سورگ باشی رائے پرتاب بہادر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے صلے میں سلطانہ کے والد مختار کو کچھ زمین دینا چاہی جس میں ایک بڑا باغ بھی تھا مگر وہ بھی بہت خوددار تھے۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت رائے پرتاب بہادر نے انہیں اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ یہ مہر دکھا کر وہ جب چاہے ان سے یا ان کی اولاد سے کچھ مانگ سکتے ہیں۔ اب پتا نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے لیکن بات ایسے ہی بیان کی جاتی ہے۔''

چوہان نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''اب میں دوبارہ سر جارج کی طرف آتا ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، جارج مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ چونکہ وہ حکم جی کا گہرا دوست ہے اس لیے حکم جی کسی نہ کسی طریقے سے اس کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق سر جارج کچھ عرصے سے سلطانہ کے چکر میں ہے۔ سلطانہ کوئی ایسی خوبصورت لڑکی نہیں ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہوگا، جارج کی فطرت کے لوگ اس شے کو حاصل کر کے زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں جسے حاصل کرنا زیادہ مشکل ہو۔ ممکن ہے کہ ماضی قریب میں کسی وقت جارج نے سلطانہ کی طرف پیش قدمی کی ہو مگر اسے ناکامی ہوئی ہو اور اس کے بعد اس نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہو۔ بہرحال اس طرح کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ سلطانہ کا بیاہ ہو چکا ہے مگر جارج پھر بھی اس کے پیچھے ہے کیونکہ حکم جی پر جارج کا ہولڈ ہے، اس لیے میرے اندازے کے مطابق سلطانہ کے لیے کوئی نہ کوئی مشکل کھڑی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جارج کے اثر کی وجہ سے حکم جی اور پنڈت مہاراج، سلطانہ کی شادی کو شادی ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صرف نام کی شادی ہے۔ وہ تم کو ایک سنکی شخص سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سلطانہ نے تمہیں صرف دکھاوے کا پتی بنایا ہوا ہے۔ اصل میں اس کے بچے کا باپ کوئی اور ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''کیا...... تم بھی...... یہی کہہ رہے ہو کہ...... میں سلطانہ کا شوہر ہوں؟'' میری آواز خوف آمیز حیرت کی شدت سے لرز رہی تھی۔

''کم از کم اس میں تو کوئی شک نہیں ہے مہروز! ام...... میرا مطلب ہے تابش! میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک شوہر کی حیثیت سے سلطانہ کے گھر میں رہتے دیکھا ہے۔''

''لیکن تم تو کہتے ہو کہ تم سلطانہ کی شادی سے پہلے ہی یہاں نل پانی میں آ گئے تھے؟''

"میں کچھ دن کے لیے عارضی طور پر وہاں گیا تھا۔ حکم جی کی ایک پتنی بیمار تھی۔ وہ اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرح سے یہ بھی حکم جی کی منافقت ہی کہلائے گی۔ وہ عام لوگوں کو تو جڑی بوٹیوں اور جھاڑ پھونک سے علاج کی تلقین کرتا ہے مگر جب اپنے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو پھر اسے انگریزی طریقہ علاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہرطور یہ حکم جی کی مجبوری تھی جس کی وجہ سے میں دوبارہ زرگاں جا سکا۔ یہ گروپ فوٹو جو ابھی چاچے غنی نے تمہیں دکھائی ہے، یہ میری موجودگی میں ہی اُتری تھی۔ ٹھاکر برادری کے ایک لڑکے کی شادی تھی۔ میں اور میری منہ بولی بہن بھی اس تصویر میں موجود ہیں۔ یہ دیکھو...... یہ اس طرف دلہے کے پیچھے ہم دونوں کھڑے ہیں۔

چوہان نے ایک بار پھر مجھے تصویر دکھائی۔ وہ واقعی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔ چوہان نے کہا۔ "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تابش! ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے تمہاری خاطر کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ایک باہمت لڑکی ہے تابش! تمہاری شریکِ حیات بننے کے بعد اس نے واقعی شریکِ حیات بن کر دکھایا ہے لیکن اب اس کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو گیا ہے اور یہ اضافہ...... میری بات کا بُرا نہ ماننا...... یہ اضافہ تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اہلکاروں کے سامنے تم نے جو کچھ اپنے اور سلطانہ کے بارے میں کہا ہے، وہ اس بیچاری کو سخت آفت میں ڈال دے گا۔ میری طرح وہ بھی یہاں چھوٹے سرکار کی پناہ میں آنے کے لیے آئی تھی مگر مجھے نہیں لگتا کہ اب اسے پناہ مل سکے گی۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ ایک دو دن میں ہی ہو جائے۔ حکم جی کے لوگ تمہیں اور سلطانہ کو یہاں سے گھسیٹ کر واپس لے جائیں گے۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہو سکتا ہے، اس کا تصور کرنا بھی سخت تکلیف دہ ہے۔ تمہیں کچھ کرنا پڑے گا مہروز! میرا مطلب ہے تابش! ورنہ تمہاری بیوی، تمہارا بچہ بلکہ پورا گھر سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔"

میرا دم پھر گھٹنے لگا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "تم اگر میرے دوست ہو تو پھر سمجھ لو مجھے ان لوگوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں۔ میں صرف یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے لوگوں میں جانا چاہتا ہوں۔"

چوہان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ "کیا تم اس لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ دو گے جو تمہاری خاطر زخم پر زخم کھاتی رہی ہے اور جواب صرف تمہارے کارن ایک بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے؟"

"میں نے کسی کو مصیبت میں نہیں پھنسایا۔ میں خود مصیبت میں ہوں۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے تابش! تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ تمہارے لیے جانا ممکن ہی نہیں ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا اور میرا خیال ہے کہ میں بتاؤں گا بھی تو تم وشواس نہیں کرو گے۔ یہ جگہ تمہارے لیے ایک جزیرے کی طرح ہے۔ تم اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کیا ہم کسی جزیرے میں ہیں؟"

"نہیں...... میں صرف ایک مثال دے رہا ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ تمہیں میری بہت سی باتوں پر وشواس نہیں ہو گا۔ جہاں تک میری جانکاری ہے۔ تم اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کر چکے ہو لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔"

"میں کوشش کر چکا ہوں؟"

"ہاں تم...... ایک مرتبہ کا تو میں گواہ بھی ہوں۔ جب تمہیں تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ پکڑ کر لائے تھے۔ تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا۔"

تیواری لال؟ ڈیوڈ؟ وہ پتا نہیں کن لوگوں کے نام لے رہا تھا اور کن واقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی ایسی باتوں سے میری کنپٹیاں پھٹنے لگی تھیں۔ اچانک جنگل کی طرف سے آنے والی ایک ہولناک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔

یہ چلاتی ہوئی آواز چار پانچ سو میٹر کی دوری سے آئی ہو گی۔ یقیناً یہ کوئی جنگلی جانور تھا۔ آواز ایک بار پھر سنائی دی، اس کے ساتھ ہی رائفل کے دو تین فائر ہوئے۔ لوگوں کے واویلا کرنے کی دور افتادہ آوازیں بھی کانوں میں پڑیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چوہان سے پوچھا۔

"یہ ہاتھی ہے۔ میرے خیال میں یہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ہے۔ کنور بابو چھوٹے سرکار جی کا چھوٹا بھائی ہے۔"

یقیناً یہ ہاتھی ہی تھا۔ ایک بار پھر اس کی زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ اب غالباً بستی کی

طرف آ رہا تھا۔

چوہان مجھے وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید یہ پالتو ہاتھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ راہگیروں میں کھلبلی نظر آ رہی تھی۔ وہ آواز کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ وہیں کونے کھدروں میں کھڑے ڈری ہوئی نظروں سے ہلچل کے مرکز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب تین چار سبز وردیوں والے گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے آواز کی سمت چلے گئے۔ ان میں سفید کپڑوں والا ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا تھا۔ اپنے گھوڑے اور لباس کے اعتبار سے وہ ان میں ممتاز دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کندھے سے ایک سنہری ہولسٹر جھول رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔

دو تین منٹ بعد میں نے کھڑکی میں سے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ پانچ چھ افراد نے ایک چارپائی اُٹھا رکھی تھی اور ایک طرف بھاگے جا رہے تھے۔ چارپائی پر سانولی رنگت والا ایک غریب صورت نوجوان تھا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں تھا۔ اس کی دھوتی خون سے سرخ نظر آئی۔ باقی جسم سے بھی خون رس رہا تھا۔ دو تین مشعل بردار بھی چارپائی کے ساتھ ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد سکون ہو گیا۔ ہاتھی کی آواز کافی فاصلے سے سنائی دینے لگی۔ اسی دوران میں چوہان بھی واپس آ گیا۔ اس نے بس اتنا بتایا کہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ''بادل'' اپنے مہاوت کی غلطی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک بندہ زخمی ہو گیا ہے۔ بہرحال اب ''بادل'' کو پکڑ لیا گیا ہے۔ جو فائر کیے گئے وہ صرف ہاتھی کو ڈرانے کے لیے تھے۔

O....❖....O

کچھ ہی دیر بعد ہماری گفتگو پھر وہیں سے شروع ہو گئی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ چوہان نے مجھے بتایا کہ اس کی معلومات اور عینی مشاہدے کے مطابق میں متعدد بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کی ایسی باتوں سے میرا دماغ سنسنا اُٹھتا۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور میرے اردگرد پھیلی دھند گہری ہوتی چلی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی کہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ آواز اُبھرتی کہ شاید ڈاکٹر چوہان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ماضی میں کہیں کچھ ایسا ہو چکا ہے۔

چوہان میرے تاثرات بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نل پانی کے چھوٹے سرکار اجیت رائے حالانکہ حکم جی کے سگے بھائی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، دونوں بھائیوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ چھوٹے سرکار عیش وعشرت کے اس طرح دلدادہ نہیں جس طرح حکم جی ہیں۔ چھوٹے سرکار انصاف پسند بھی ہیں، خاص طور سے مسلمانوں کے لیے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے اور ان کے ساتھ اپنی عملداری میں کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ کئی لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود ہندوانہ رسم ورواج کو خرافات سمجھتے ہیں اور دھرم کے کٹرپن کو برداشت نہیں کرتے۔

''کبھی کبھی کچھ لوگ حکم جی کی عملداری میں ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ چھوٹے سرکار کی عملداری کا رُخ کرتے ہیں اور نل پانی آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چھوٹے سرکار بڑی دلیری اور فراخ دلی سے پناہ دیتے ہیں لیکن شرط یہی ہوتی ہے کہ پناہ لینے والا اپرادھی نہ ہو اور اس نے کوئی بڑا جرم نہ کیا ہو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں خود بھی شروع میں زرگاں ہی آیا تھا مگر پھر یہاں نل پانی آ گیا۔ اسی طرح یہ لڑکی سلطانہ بھی اپنے بچے کو اور تمہیں لے کر یہاں پناہ لینے آئی ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کی دستبرد سے بچنا چاہ

رہی ہے۔ اسے یہاں بآسانی پناہ مل جاتی تھی مگر......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا پھر ذرا توقف سے بولا ''اب بیچاری سلطانہ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ حکم جی کی طرف سے تو اس پر پہلے ہی الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ آوارہ ہے اور اس کی گود میں جو بچہ ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے اہلکاروں کے سامنے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ جو لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں وہ یہاں تل پانی پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ عین ممکن ہے کہ چھوٹے سرکار اسے اور تمہیں گونگے ہاشو سمیت فوراً ہی حکم جی کے اہلکاروں کے حوالے کر دیں۔''

چوہان جو کچھ بھی بتا رہا تھا، وہ سب کافی حیرت ناک تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ تو کیا یہ سارا علاقہ کسی سخت حفاظتی حصار میں تھا جہاں سے میں نکل نہیں پایا تھا؟ اتنے وسیع و عریض علاقے کو کسی سخت حصار میں رکھا جانا کیسے ممکن تھا؟ کیا وہ مجھے صرف ڈرانے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا تاکہ میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کروں؟

وہ کہہ رہا تھا کہ سلطانہ نامی یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی ہے اور میری خاطر بہت تکلیفیں سہہ چکی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ سلطانہ کے رویے کی کچھ جھلکیاں تو میں پچھلے دو تین روز میں دیکھ چکا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، ماضی کا وہ حصہ جس میں بقول چوہان یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی تھی، میرے حافظے میں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وقت کے اس گمشدہ ٹکڑے میں جو کچھ ہوا تھا۔ میں کسی بھی طرح اس کا ذمے دار نہیں تھا۔ اپنے جسم کے مندمل زخم دیکھنے کے بعد میں اس حیرت ناک نتیجے پر تو بہرحال پہنچ گیا تھا کہ میرے ساتھ کچھ انوکھا ہو چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں چوہان کی باتوں کو مکمل طور پر رد نہیں کر سکتا تھا لیکن کچھ بھی تھا، سلطانہ کے ساتھ میری شناسائی صرف دو دن پرانی تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی طرح کی وابستگی محسوس نہیں کر سکتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اس کی مصیبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے ذہن میں تو صرف ثروت کا نام گونج رہا تھا اور دل میں اس کے غم کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اپنوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی بچا ہے یا نہیں۔

وہ رات بڑی مشکل سے کٹی تھی۔ میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا۔ غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی کہ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گر کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنے

ہوش و حواس میں واپس آیا ہوں لیکن اس دوران میں ناقابلِ یقین طور پر ڈیڑھ دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اب وہ عرصہ میری یادداشت میں موجود نہیں ہے۔

آخری پہر مجھے نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ نیلی جھیل کے کنارے اس وسیع و عریض بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ جھیل میں کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ ایک بڑا بجرا جو یقیناً بستی کے کسی متمول شخص کا رہا ہوگا، بادبانوں کی مدد سے ہولے ہولے جنگل کی سمت بہہ رہا تھا۔ اس میں دو تین پالکیاں دھری تھیں جن میں یقیناً پردہ پوش خواتین تھیں۔ کہیں کہیں جھیل کے کنارے سبز وردیوں والے گھڑ سوار بھی گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ دور فاصلے پر ایک عظیم الشان حویلی کے کلس اور گنبد سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان سے اوپر نیلگوں فلک پر پرندوں کی اُڑانیں تھیں۔ بقول چوہان اس عمارت کو دیوان کہا جاتا تھا۔

میں کسی داستانی بستی میں آگیا۔ اسی دوران میں غنی صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے بیوی بچے تا حال لوٹے نہیں تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر بے دلی سے ناشتہ کیا۔ وہ افسردہ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سلطانہ واپس نہیں آسکی۔ اس کا بچہ اور ہاشو بھی وہیں ہیں۔ میرے سر سے مسلسل ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی لیکن فی الوقت ڈاکٹر چوہان یہاں تھا اور نہ سلطانہ موجود تھی۔

ابھی بمشکل ہم فارغ ہوئے ہی تھے کہ وردیوں والے گھڑ سوار غنی صاحب کے دروازے پر نظر آئے۔ ان کی آمد متوقع تھی۔ غنی صاحب نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ ہم کو لینے آئے ہیں۔ شاید آج سلطانہ کا مقدمہ چھوٹے سرکار کے سامنے پیش ہوئیں گا۔''

غنی صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک مقامی طرز کی گھوڑا گاڑی پر سوار چھوٹے سرکار کی عظیم الشان حویلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ دو گھوڑوں والی گاڑی تھی اور اس کے دونوں پائدانوں پر دو مسلح باوردی اہلکار کھڑے تھے۔ چھوٹے سرکار کے اہلکار سلطانہ کے دونوں تھیلے نما جھولے کل ہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آج انہوں نے گونگے ہاشو کا مختصر سامان بھی گھوڑا گاڑی میں دھر لیا تھا۔

راستے میں مجھے حیران کن مناظر دیکھنے کو ملے۔ کاروبارِ زندگی جاری تھا۔ ہم ایک سبزی منڈی کے پاس سے گزرے پھر ایک زیرِ تعمیر مسجد میں بہت سے لوگوں کو مچانوں کے اوپر کام کرتے دیکھا۔ گھوڑا گاڑیوں کے علاوہ یہاں بیل گاڑیاں اور کہیں کہیں اونٹ گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ پختہ سڑک کہیں نہیں تھی، ہاں نیم پختہ راستے موجود تھے جن کے کنارے کثرت سے

درخت لگائے گئے تھے۔ ایک جگہ درختوں تلے دو خستہ حال جیپیں کھڑی دکھائی دیں۔ یہ جیپیں شاید استعمال کے قابل نہیں تھیں۔ مقامی لوگوں کا لباس زیادہ تر پاجامے اور لنگی پر مشتمل تھا۔ کہیں کہیں انگرکھے بھی نظر آتے تھے۔ عورتوں میں سے کچھ نے گھاگرے چولیاں پہن رکھی تھیں۔ عورتوں کے جسم پر چاندی کے زیور عام دکھائی دیتے تھے، خاص طور سے چوڑیاں۔ ہندو مسلم دونوں طرح کے لوگ یہاں نظر آ رہے تھے بلکہ مسلمان شاید کچھ زیادہ ہی تھے۔ جلد ہی ہم جھیل کے کنارے اس عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ گئے جو دور سے تو شاندار نظر آتی ہی تھی، قریب سے اور بھی پُرشکوہ تھی۔ ایک دیوہیکل چمکیلے گیٹ کے اندر سے گزر کر ہم ایک طویل روش پر آ گئے۔ یہ دیوان کا بیرونی حصہ تھا۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ دونوں طرف سبز گراسی میدان نظر آتے تھے اور پھول پودے کثرت سے تھے۔ جگہ جگہ مستعد گھڑسوار بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں پر کہنیوں تک سفید دستانے تھے اور ان کی نگاہیں اپنے سامنے غیر مرئی نکتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمیں چند شاندار گاڑیاں اور جیپیں بھی نظر آئیں جن میں ایک قیمتی رولز رائس بھی تھی۔

سفید ہاتھی کے بارے میں، مَیں نے اس سے پہلے فقط سنا تھا یہاں دیکھا بھی۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے سجا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ہودہ رکھا تھا اور چوکس مہاوت، ہاتھی کے اوپر ہی تھا۔ غالباً یہ کسی ایسے رئیس یا امیر کی سواری تھی جو یہاں چھوٹے سرکار سے ملنے آیا ہوا تھا۔

باوردی افراد نے مجھے اور غنی صاحب کو گاڑی سے اُتارا اور ایک جگہ عام لوگوں کے درمیان بٹھا دیا۔ یہاں مجھے دو چار ایسے افراد بھی نظر آئے جن کی مشکیں خاص قسم کی رسیوں سے کسی ہوئی تھیں۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ مختلف مقدمات میں پیش ہونے کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اس ہجوم میں چھ افراد کی ایک ٹولی کو اُٹھنے کا حکم دیا گیا اور دیوان کے اندرونی حصے کی طرف لے جایا گیا۔ اس ٹولی میں میرے اور غنی صاحب کے علاوہ ایک جواں سال عورت بھی شامل تھی وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کی گود میں اسی کی طرح کا ایک سانولا سلونا شیر خوار بچہ تھا۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک شاندار ہال میں پہنچے۔ یہاں مخمل و زربفت کے طویل پردے تھے۔ فانوس، غالیچے، خوبصورت نقش و نگار والے جھروکے جن میں زرنگار کرسیوں پر اس راجواڑے کے معزز افراد قیمتی پوشاکیں پہنے براجمان تھے۔ ان میں ہندو اور مسلم دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہ جگہ پُرانے زمانے کے کسی دربار سے مشابہ نظر آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں انگریزی لباس والے افراد بھی دکھائی دیتے

تھے۔ اس مقام پر دکھائی دینے والا اہم ترین شخص وہ جواں سال شخص تھا جو ایک دو ڈھائی فٹ اونچے چبوترے پر موجود تھا۔ اس نے بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ گلے میں قیمتی مالائیں اور سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی۔ وہ وکٹورین طرز کی شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے اردگرد درجنوں محافظ پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ چبوترے سے نیچے چھوٹی کرسیوں پر اس عدالت کے اہلکار یعنی کاتب، محرر، وکیل وغیرہ موجود تھے۔

مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ زرنگار وکٹورین کرسی پر بیٹھا ہوا بارعب شخص کون ہے۔ یقیناً یہی ''چھوٹے سرکار'' تھا جو اس نل پانی نامی جگہ کا کرتا دھرتا مختار کہلاتا تھا۔ غالباً کسی مقدمے کی سماعت اختتام پذیر ہوئی تھی۔ درمیانی عمر کے دو افراد جو اپنی صورتوں اور حلیے سے تاجر پیشہ نظر آتے تھے، جھک کر سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتے گئے اور پھر ایک بغلی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص جس کا آدھا سر، آدھی داڑھی، آدھی مونچھ اور ایک بھوں مونڈ دی گئی تھی، رو رو کر گڑگڑا رہا تھا۔ وہ چھوٹے سرکار سے اپنی سزا میں کمی کی درخواست کر رہا تھا۔ باوردی افراد نے اسے دبوچ لیا اور دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

اس کے بعد چھوٹے سرکار کی عدالت میں جو معاملہ پیش ہوا، وہ اسی روتی دھوتی عورت کا تھا جو ہمارے ساتھ اندر آئی تھی۔ اہلکاروں نے اسے چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ وہ اپنی فریاد پیش کرنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور گڑگڑا رہی تھی۔ ''چھوٹے سرکار! ہمرے ساتھ بڑا اجلم ہوا ہے جی۔ ہم کیا کریں۔ ہمرے بچے بھوکے مر جاویں گے جی، وہی تو کمانے والا تھا۔ وہ مہینوں کے لیے بستر پر پڑ گیا ہے۔ پتا ناہیں کہ اُٹھتا بھی ہے یا ناہیں۔ ہمری کھیتی اُجڑ جاوے گی۔ جو کچھ بویا ہے وہ بھی برباد ہو جاوے گا۔''

''حوصلہ رکھو۔ تمہارے ساتھ انصاف ہو گا۔'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز ہال میں گونجی۔ پھر وہ سرگوشیوں میں اپنے اردگرد کھڑے افراد سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے بلند آواز سے اپنے اہلکاروں کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کنور بابو کو یہاں لایا جاوے۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی ہاتھی والا معاملہ ہے جس کی کچھ جھلکیاں میں نے کمرے کے اندر سے دیکھی تھیں۔ یہ فریاد کناں عورت اس کھیت مزدور کی بیوی تھی جو بپھرے ہوئے ہاتھی کی زد میں آ کر زخمی ہوا تھا۔ وہ ہاتھی چھوٹے سرکار جیت رائے کے چھوٹے بھائی کنور بابو کا پالتو تھا۔

چند منٹ بعد ایک اور چونکا دینے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکے کو ہال کمرے میں لایا گیا۔ اس نے بھی بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ تاہم اس کے بال بکھرے بکھرے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی ناک کا بانسہ بھی چھوٹے سرکار کی طرح کافی اونچا تھا۔ چہرے کے باقی خدوخال بھی گواہی دے رہے تھے کہ وہ چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔ اس کی ایک کلائی میں ایک ریشمی رسی بندھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت مضبوط بندش نہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بس علامتی طور پر اسے یہ رسی باندھی گئی ہے۔

چھوٹے سرکار نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''اس عورت کو پہچانو۔ یہ اس بندے کی گھر والی ہے جس کو تمہارے بادل نے روندا ہے۔ یہ ہم سے اور تم سے اپنے پتی کا قصور پوچھت ہے۔ کیا تم اسے بتا سکتے ہو کہ کھیت میں کام کرتا ہوا اس کا پتی جو پورے پریوار کی روٹی چلاوت تھا، کیوں مہینوں کے لیے بستر پر جا گرا ہے؟''

کنور کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

چھوٹے سرکار کی آواز دوبارہ گونجی۔ ''تم ناہیں بتا سکتے لیکن ہم بتاتے ہیں۔ اس کا پتی اس لیے زخمی اور اپاہج ہوا ہے کہ ایک صاحب بہادر اپنے بدمست جانور کو سنبھال نہیں سکے۔ انہوں نے اپنے لاڈلے ہاتھی کو ہوا خوری کے لیے باغ میں نکالا۔ پھر اس کی طرف سے غافل ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی لگانے میں مصروف ہو گئے اور تو اور مہاوت کو بھی کسی کام سے بھیج دیا اور...... صاحب بہادر نے اس طرح کی حرکت پہلی دفعہ ناہیں کی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کی وجہ سے اسی انداز میں عام لوگن کا نقصان ہو چکا ہے۔ صاحب بہادر کا یہ ہاتھی ایک چھوٹے بچے کی جان لے چکا ہے۔ ایک بوڑھی عورت کی ٹانگ توڑ چکا ہے۔ گلاب محلے کی کئی جھونپڑیاں بھی اس کے کارن مسمار ہوئی تھیں۔ ہوئی تھیں یا ناہیں؟'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز گونجی۔

کنور بدستور سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک فربہ اندام شخص اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کنور بابو! آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہت ہیں؟''

''ناہیں۔'' کنور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ہم مانتے ہیں۔''

''آپ بہت عقلمند ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی سزا بھی خود ہی تجویز کر لیں۔'' چھوٹے سرکار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ جو سزا دیں گے، مجھے قبول ہے۔''

چھوٹے سرکار اور مصاحبین کے درمیان دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہوئی پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ ''گھائل ہونے والے کسان کی پتنی کو اپرادھی کی طرف سے دس ہزار روپیہ اور بیلوں کی جوڑی دی جائے گی۔ گھائل کے علاج معالجے کا سارا خرچہ بھی اپرادھی ہی برداشت کرے گا۔ اس کے علاوہ اپرادھی کو تین مہینے جیل کے اندر قیدِ تنہائی میں کاٹنا ہوں گے۔ بالکل عام قیدی کی حیثیت سے۔''

کنور کا چہرہ اُتر گیا۔ اس کا فربہ اندام وکیل بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں معافی چاہت ہوں۔ ایک عام اپرادھی کے لیے تو شاید یہ سزا مناسب ہو مگر کنور بابو آسائش میں رہن سہن کے عادی ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ سزا بہت کڑی ثابت ہووے گی۔ آپ جانت ہیں، وہ کافی دیر بعد میعادی بخار سے صحت یاب ہوئے ہیں۔ ان کے دوبارہ بیمار پڑنے کا خدشہ ہو گا۔''

چھوٹے سرکار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یہ دلیل بالکل بے کار ہے۔ اپنے رہن سہن کی وجہ سے کنور کو یہ سزا زیادہ کڑی محسوس ہووے گی تو ہونی بھی چاہیے۔ کیونکہ اسی رہن سہن اور مرتبے کی وجہ سے کنور پر زیادہ ذمے داری بھی لاگو ہوتی تھی۔ ایک عام بندہ چوری کرتا ہے تو اس کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے لیکن ایک پنڈت، پادری یا امام مسجد کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے۔''

اس موقع پر کسان کی اشک بار بیوی دو قدم آگے آئی۔ اس کے مفلس چہرے پر اب قدرے اطمینان دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''ہم آپ کے چاکر ہیں۔ آپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ ہمری ہر شے پر آپ کا ادھکار ہے۔ کنور بابو نے جان بوجھ کر تو کچھ نہیں کیا۔ جو ہوا وہی اللہ کو منجور تھا۔ میں آپ کے انصاپھ سے بہت کھس (خوش) ہوں جی۔ اس کے ساتھ ہی آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ کنور بابو کی جیل والی سجا معاپھ کر دی جائے۔ میں اور عبداللہ آپ کو دعائیں دیں گے جی۔''

عبداللہ اس عورت کے گھر والے کا نام تھا۔ عورت کی بات سن کر چھوٹے سرکار کے سرخی مائل چہرے پر ناگواری کا سایہ لہرا گیا۔ بہرحال جب وہ بولا تو اس کی آواز نارمل ہی تھی۔ اس نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم یہ سمجھت ہو کہ دس ہزار روپیہ اور بیلوں کی جوڑی دینا کنور بہادر کے لیے ایک بڑی سزا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اس سے پانچ دس گنا کا خسارہ بھی وہ آسانی سے برداشت کر سکت ہے۔ اس کی اصل سزا وہی ہے جسے تم معاف کرنے کا کہہ رہی ہو۔ یہ سزا اس کو ہر صورت جھیلنا پڑے گی۔''

عورت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر اظہار خیال کی جرأت نہ کر سکی۔

بہر طور سائلہ عورت کا دل رکھنے کے لیے چھوٹے سرکار نے کنور کی سزا میں دو ہفتے کی تخفیف کر دی۔ کنور کو باوردی اہلکار باہر لے گئے۔ عورت بھی اپنے بچے سمیت باہر چلی گئی۔

چند سیکنڈ بعد میں نے سلطانہ کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے عقب میں گونگا باشو تھا۔ دونوں کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔ جلد ہی سلطانہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا کا رنگ اُبھرا۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں اس کے حوالے سے اپنا بیان بدل لوں۔ سلطانہ کے ساتھ ہی تین افراد مزید اندر داخل ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ حکم جی کے لوگ تھے اور زرگاں سے سلطانہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی ٹھوڑی غیر معمولی طور پر چوڑی تھی اور وہ کافی غصے میں بھی نظر آتا تھا۔ جب اس کی نظر مجھ سے ملی تو اس نے مجھے گھورا اور بڑبڑانے والے انداز میں کچھ کہا۔ باقی دونوں افراد کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے لیکن میرے حافظے میں ان تینوں کے لیے کوئی شناخت موجود نہیں تھی۔

اہلکار میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے بھی چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو موقع پر موجود لوگوں نے زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ چھوٹے سرکار کی گہری سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس نے بڑے غور سے پہلے میری طرف اور پھر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اپنے سامنے تپائی پر رکھے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کیا۔ یقیناً یہ کاغذات ہمارے اس مقدمے کے حوالے سے ہی تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے کاغذات سے سر اُٹھایا اور چوڑی ٹھوڑی والے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''موہن کمار! تم اس معاملے کے بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

موہن کمار نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا ناہیں چاہت ہوں۔ یہ بالکل صاف سیدھا معاملہ ہے۔ سلطانہ نام کی یہ لڑکی اپرادھن ہے۔ اس نے آپ کے بڑے بھائی حکم جی کی پتنی اور آپ کی بھاوج رتنا دیوی کو گھائل کیا ہے۔ اس نے ان سے سخت بدتمیزی کی پھر جھگڑا کیا اور ہاتھ چلا کر ان کا جبڑا توڑ دیا۔ اب وہ کچھ بول سکت ہیں، نہ کھا پی سکت ہیں۔ شاید ان کو جان سے ہی مار ڈالتی مگر رتنا دیوی کی سکھیوں نے اسے روک لیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد یہ غائب ہوگئی۔ دو دن تک پتا ناہیں کہاں اور کس کے پاس رہی۔ پھر اپنے اس چھوٹے بچے کو لے کر یہاں نل پانی آ گئی ہے اور بات صرف اتنی ہی ناہیں ہے چھوٹے سرکار! وہاں زرگاں میں ہر کوئی جانت ہے کہ سلطانہ کا چال چلن ٹھیک ناہیں ہے۔ یہ مہروز کو

اپنا پتی کہتی ہے لیکن سب جانت ہیں کہ مہروز ایک مخبوط الحواس بندہ ہے۔ سلطانہ کے لیے بس یہ نام کا پتی ہے۔ اس نے یارانے پالے ہوئے ہیں۔ اس کے بچے کا پتا بھی نہ جانے کون ہے اور اگر......''

''چھوٹے سرکار! یہ مجھ پر جھوٹے الجام لگا رہے ہیں جی۔'' سلطانہ دلیری سے بات کاٹ کر بولی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ جارج گورا صاحب مجھ پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس کی نیت میرے بارے میں ٹھیک ناہیں ہے۔ شروع سے ٹھیک ناہیں ہے اور حکم جی صاحب! گورا صاحب کی ہر بات مانتا ہے۔ پنڈت مہاراج بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان لوگاں نے ہماری جندگی حرام کی ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جی کہ میں کل گورا صاحب کی بات مان لوں تو کل اج سب کچھ ٹھیک ہو جائیں گا۔ مجھ پر برا الجام ختم ہو جائیں گا۔ ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گا۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کی آہ و بکا کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا۔ وہ دھیان سے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چوڑے جبڑے والے موہن کمار نامی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''موہن کمار! ہم جانت ہیں کہ پندرہ سولہ برس پہلے اس لڑکی کی ماتا نے بڑی دلیری دکھاتے ہوئے، جنگل میں بڑے بھائی جی کی جیون رکھشا کی تھی۔ اس طرح سے اس پریوار کا ہمارے اوپر ایک احسان بھی ہے۔ ہمیں بہت نراشا ہو رہی ہے کہ اسی پریوار کی ایک لڑکی کے اوپر اتنے کٹھور الزامات لگ رہے ہیں۔''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! آپ بالکل ٹھیک کہوت ہیں لیکن یہ چھوری اپنی ماتا پر ناہیں گئی، اس کے بالکل اُلٹ گئی ہے۔ اس کو بہت برداشت کیا گیا، پر اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ یہ اسٹیٹ کی باغی بن چکی ہے۔ خود قانون توڑت ہے اور چاہت ہے کہ دوسرے بھی ایسا کریں۔ اس کو جو ڈھیل دی جاتی رہی، اس کا اس نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ حکم جی کی پتنی رتنا دیوی سے بھی ورودھ کرنے لگی بلکہ ان سے یدھ چھیڑ دیا۔''

چھوٹے سرکار اچانک میری طرف گھوما اور بارعب آواز میں بولا۔ ''تمہارے بارے میں کہا جاوت ہے کہ تم سلطانہ کے پتی ہو؟ کیا تم یہ بات مانت ہو؟''

میرا سر چکرا گیا۔ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ میں سیڑھیوں پر سے اُڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے آگے کچھ یاد نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس عدالت میں موجود ہر فرد میری طرف دیکھ رہا ہے۔ ان میں سلطانہ اور غنی صاحب بھی شامل تھے۔ غنی صاحب کی

آنکھوں میں بھی وہی ڈری ڈری التجا تھی جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی اور اس کے بچے کو اپنا بچہ مان لوں۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور زبان کو تالا سا لگ گیا۔ میں نے بے بسی سے چھوٹے سرکار کے بارعب چہرے کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں مجھے پھر عمران یاد آ گیا۔ کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا۔ وہ میری طرف سے بولتا۔ اس کے پاس تو ہر سوال کا بے مثال جواب موجود رہتا تھا۔ اس کے پاس تو ہر دلیل کا توڑ ہوتا تھا۔ وہ سچ بول کر تو قائل کرتا ہی تھا، جھوٹ بول کر بھی لاجواب کر دیتا تھا۔

موہن کمار نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ کچھ ناہیں بولے گا چھوٹے سرکار! یہ کچھ بولنے کے قابل ہوتا تو سلطانہ اس کو پتی ہی کیوں بناتی؟''

کچھ لوگ مسکرائے اور سرگوشیاں اُبھریں۔ چھوٹے سرکار نے ایک کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میڈم صفورا کون ہے؟ جسے بعد ازاں یہاں اسٹیٹ میں کورتی کا نام دیا گیا؟''

''جناب! اس کا جواب میرے یہ ساتھی گرو راکیش اور حافظ خدا بخش صاحب زیادہ اچھے طریقے سے دے سکت ہیں۔'' موہن نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

گیروا لباس والے گرو راکیش نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مؤدب انداز میں بولا۔

''چھوٹے سرکار! یہ صفورا نام کی ناری بھی اسی اپرادھ میں ملوث تھی جس میں یہ مہروز تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک تیسرا ساتھی ابرار احمد بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ تھوڑا بہت تو جانت ہی ہوں گے۔ یہ...... مہاتما بدھ کی مقدس مورتی کی چوری کا معاملہ تھا۔ کچھ لوگن نے بڑی بے دردی سے مورتی کو پرانے پگوڈا کے تہہ خانے سے اُکھاڑا اور یہاں سے نکال کر جھانسی پہنچایا۔ جھانسی سے یہ مورتی الٰہ آباد پہنچی اور پھر وہاں سے حیرت انگیز طور پر پاکستان پہنچا دی گئی۔ اس مورتی کو واپس لانے کے لیے ہمارے لوگن کو جو جو کچھ کرنا پڑا، وہ ایک لمبی کتھا ہے۔ اس میں ہمارے کئی لوگن کا جیون گیا۔ ورودھیوں میں سے بھی کئی مارے گئے۔ بڑے گرو کے حکم کے مطابق کچھ اپرادھیوں کو بندی بنا کر یہاں اسٹیٹ میں لایا جانا ضروری تھا۔ سو ہمارے لوگن نے سرتوڑ کوشش کی اور پانچ چھ کو لے آئے۔ یہ صفورا، ابرار احمد اور مہروز بھی ان میں شامل ہیں۔''

''مگر اس لڑکی سلطانہ اور تمہارے اس اپرادھی مہروز کا ملاپ کیسے ہوا؟'' چھوٹے سرکار کی طرف سے پوچھا گیا۔

''جناب! دستور کے مطابق مہروز کو بھی دوسرے قیدیوں کی طرح بڑے پگوڈا میں قید کی سزا کاٹنی تھی۔ یہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا۔ اس لڑکی سلطانہ کے چوبارے سے پگوڈا کا صحن نظر آوت تھا۔ یہ وہاں سے مہروز کو پگوڈا کا کام کاج کرتے دیکھتی رہوت تھی۔ پھر ایک روز پگوڈا کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ مہروز اور دو تین بندے اس آگ میں پھنس گئے۔ سلطانہ نے مہروز کو آگ سے نکالا تھا اور بعد میں اس کی مرہم پٹی بھی کرتی رہی تھی۔ پھر ایک دن بالکل اچانک زرگاں کے لوگن کو پتا چلا کہ مختار کی بیٹی سلطانہ نے پگوڈا کے جا کر مہروز سے بیاہ کر لیا ہے اور خود کو اس کی پتنی کہہ رہی ہے۔ میں نے سرکار کو بتایا ہے نا کہ اس چھوری نے ہمیشہ وہ کام کیا ہے جس کی وجہ سے کھلبلی مچی ہے اور لوگن نے دانتوں میں انگلیاں دابی ہیں۔ دراصل یہ اپنی اس حیثیت کا فائدہ اُٹھاتی رہی ہے جو سورگ باشی رائے پرتاب بہادر جی نے اسے اور اس کے خاندان کو دی تھی۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آتی، اس کو بھی ناہیں آئی ہے چھوٹے سرکار۔''

اس موقع پر سلطانہ نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر چھوٹے سرکار نے اُنگلی اُٹھا کر اسے فی الحال خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ موہن کمار اور گرو راکیش سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا۔ ''لیکن ہماری بدھی میں یہ بات ناہیں آئی کہ پگوڈا کے اپرادھی کی شادی کو بڑے بھائی صاحب اور دوسرے لوگن نے مان کیسے لیا؟''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! بھگوان ہزاروں ورش آپ کی رکھشا کرے۔ گرو راکیش نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اس چھوری نے ہمیشہ اس حیثیت کا فائدہ اُٹھایا ہے جو آپ کے پُرکھوں نے اس پریوار کو دی تھی۔ اس بیاہ کے موقع پر بھی اس چھوری نے ایسا ہی کیا۔ یہ جانت تھی کہ اس کے پاس ایک ٹرپ کا پتا موجود ہے۔ اس۔ نے دہ پتا پھینکا اور بازی اپنے نام کر لی۔''

''موہن کمار کھل کر بات کرو۔'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''چھوٹے سرکار! سب لوگ جانت ہیں کہ پندرہ سولہ سال پہلے ترائی کے جنگل میں سلطانہ کی ماتا نے حکم جی کا جیون بچایا تھا اور اس کے لیے اپنا بلیدان دے دیا تھا۔ ہمارے سورگ باشی مہاراج پرتاپ بہادر نے اس کے بدلے اس پریوار کو بہت کچھ دیا تھا پھر بھی شاید ان کے من میں تھا کہ ان کی طرف سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ان جیسا دیالو کسی کے احسان کا بوجھ اپنے سر پر کاہے کو اور کیسے رکھ سکتا تھا۔ شاید آپ بھی جانت ہوں کہ اس سمے مہاراج نے سلطانہ کے پتا مختار کو اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو یہ مہر دکھا کر جو

چاہے لے لینا۔''

چھوٹے سرکار نے قدرے چونک کر کہا۔ ''ہاں...... یہ بات ہم نے بھی سنی ہے۔''

موہن کمار تاسف سے بولا۔ ''اس چھوری سلطانہ نے مہاراج کی اس مہر کا استعمال کیا اور حکم جی سے اپنی اور مہروز کی جان بخشی کروانے میں کامیاب رہی۔ اس کے لیے حکم جی کو بہت کٹھنائی بھی اُٹھانا پڑی۔ بدھ مت کے ماننے والے بہت سے لوگن حکم جی کے خلاف ہو گئے۔ وہ ہرگز ناہیں چاہت تھے کہ ان کے اپرادھی کو اس طرح معاف کر دیا جائے اور ایک مسلم لڑکی ڈنکے کی چوٹ پر اس کو اپنا پتی بنا لے۔ ایسے لوگن کو رام کرنے کے لیے حکم جی کو بہت کوشش کرنا پڑی۔ بہرحال انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے پتا کا دیا ہوا وچن نبھا دیا۔''

اس موقع پر سلطانہ نے پھر بولنا چاہا مگر چھوٹے سرکار کی طرف سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ میرے بارے میں جو تفصیلی بات چیت ہو رہی تھی، اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت ذہن میں جھماکا سا ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ کوئی ٹوٹا پھوٹا منظر یا بکھری ہوئی سی کوئی آواز یاد آ رہی ہے۔ صفورا کے نام نے بھی میرے دماغ میں کھلبلی مچائی تھی اور میرا یہ شک درست ثابت ہوا تھا کہ جس قیدی عورت کا نام کورتی لیا جا رہا ہے، وہ میڈم صفورا ہو سکتی ہے۔

چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی بات جاری رکھو۔''

موہن کمار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ''چھوٹے سرکار! میں پھر وہی بات کہوں گا۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آئی۔ حکم جی اور ہم سب نے بہت کوشش کی کہ یہ لڑکی کسی طرح سنبھل جاوے۔ مگر یہ سنبھلنے کے بجائے اور بھی بگڑتی چلی گئی ہے۔ رتنا دیوی سے اس نے اپنا ورودھ اتنا بڑھا لیا ہے کہ ان کی ہوا پر بھی تلواریں چلاتی ہے۔ حکم جی کے سامنے اب اس کے سوا کوئی چارہ ناہیں کہ وہ اسے قانون کے مطابق سزا دیں۔ ہم آپ سے درخواست کرت ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کیا جاوے اور اس کے نمائشی پتی کو بھی تاکہ ہم انہیں حکم جی کے سامنے پیش کر سکیں۔''

میں نے دیکھا کہ سلطانہ کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ تاہم وہ چھوٹے سرکار کے حکم کی وجہ سے چپ تھی۔

چھوٹے سرکار اور ان کے ایک مصاحب نے ایک بار پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ تب چھوٹے سرکار نے گہری سانس لیتے ہوئے سلطانہ کو مخاطب کیا۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ تم اپنے گھر کے چوبارے سے پگوڈا کے صحن میں تاکا جھانکی کرتی رہتی

تھیں اور تم نے وہاں سزا کاٹتے ہوئے مہروز سے آنکھ لڑا رکھی تھی۔''

''یہ بالکل غلط ہے چھوٹے سرکار! ان لوگاں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ اس میں کچھ بھی سچ ناہیں۔'' وہ بے حد جوش سے بولی۔

چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔ ''ہم جو کچھ تم سے پوچھ رہے ہیں بس اس کا جواب دو۔ کیا بیاہ سے پہلے مہروز سے تمہارا کوئی ناتا تھا؟''

''ناہیں سرکار! میں بالکل سچ کہتی ہوں۔ میں اس کو اپنے گھر کی چھت پر سے دیکھتی جرور تھی اور میں کوئی اکیلی اچ ناہیں دیکھتی تھی اور بھی اڑوس پڑوس کے لوگاں دیکھتے تھے۔ اس کی اور دوسرے دو قیدیوں کی حالت بہت پتلی تھی۔ ان کے پاؤں میں رسّی کی بیڑیاں رہتی تھیں۔ یہ سارا دن پگوڈا کے کام کرتے تھے۔ جھاڑ پونچھ کرتے تھے، فرش دھوتے تھے، نالیاں صاف کرتے تھے۔ بڑے بھکشوؤں کی مٹھی چاپی اور خدمت بھی ان کا اچ کام تھا۔ ان کو بس دوپہر کے وخت کھانا ملتا تھا اور وہ بھی یہ مانگ کر لاتے تھے۔ شام سے جرا پہلے ان کو پگوڈا کی سیڑھیوں کے سامنے جہاں لوگاں کی کھڑانویں اور جوتیاں پڑی رہتی تھیں اوندھا لٹایا جاتا اور بید مارے جاتے تھے۔ دونوں مردوں کو دس دس، عورت کو چھ۔ چھوٹے سرکار! دوسروں کی طرح مجھے بھی ان تین لوگاں پر ترس آیا تھا۔ اس وخت مہروج مجھے اپنے ایک مسلمان بھائی کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا بھائی جو اپنے وطن سے دور ایک سخت مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔''

''لیکن پھر ایک دن تم نے اچانک اس سے شادی کر لی اور اس شادی کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا؟'' چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''چھوٹے سرکار! مجھے آپ کے انصاف پر پورا اعتبار ہے۔ لیکن سرکار! ابھی تک آپ کے سامنے اس تصویر کا بس ایک اچ رُخ ہے اور یہ بالکل غلط رُخ ہے۔ زرگاں میں جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے والد نے اچانک میری شادی مہروج سے کیوں کی؟ اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ اس کے پیچھے بس ایک اچ وجہ تھی چھوٹے سرکار! میرے گھر والے میری عجت بچانا چاہتے تھے۔''

موہن کمار بھڑک کر بولا۔ ''یہ معاملے کو اُلجھانے کی کوشش کرت ہے چھوٹے سرکار......''

''دیکھو موہن کمار! تمہاری پوری بات سنی گئی ہے۔ اب مجھے اس سے اپنے سوالوں کا جواب لینے دو۔'' چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو ٹوکا۔ پھر اس نے اشک بار سلطانہ کو بات جاری رکھنے کا کہا۔

سلطانہ بولی۔ ''یہ بات کوئی ڈھکی چھپی ناہیں ہے جی! جارج گورا اس راجواڑے کی عورتوں پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس نے تین چار برس پہلے مجھ پر بھی گندی نجر ڈالی اور اس کی یہ نجر اب بھی جوں کی توں ہے۔ آپ جانتے ہیں، وہ ہندی بول لیتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس کی پتنی بننے پر راجی ہو جاؤں تو وہ ہر طرح کے غلط کام ایک دم چھوڑ دے گا۔ میں جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس طرح کی بات اس نے اس سے پہلے بھی کئی عورتوں سے کہی ہوئے گی اور وہ عورتیں میری طرح عام نہیں ہوئیں گی، بڑی بڑی خوبصورت ہوئیں گی۔ یہ عورت باج (عورت باز) بندے تو ایسے اچ ہوتے ہیں۔''

''یہ ہز میجسٹی کی شان میں گستاخی کر رہی ہے چھوٹے سرکار!'' خدا بخش نے بھڑک کر کہا۔ ''یہ ثبوت کے بغیر الزام لگاوت ہے۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کو تنبیہ کی۔ ''تم غلط لفظ استعمال ناہیں کرو اور اپنے جواب کو صرف اس تک رکھو کہ تمہارا بیاہ اچانک مہروز سے کیوں ہوا؟''

سلطانہ نے اوڑھنی سے آنسو پونچھے اور بچے کو کندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔

''چھوٹے سرکار! میں نے گورا صاحب کو صاف انکار کر دیا تھا، پر اس نے کبھی بھی میرا پیچھا ناہیں چھوڑا۔ وہ حکم جی کو میرے خلاف بھڑکاتا رہا اور مجھے پانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکم جی بھی اس کی باتوں میں آ گئے۔ بلکہ پوری طرح اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ ساتویں کا جشن آنے والا تھا۔ آپ جانتے اچ ہیں، ساتویں کے جشن میں راج بھون کے اندر خاص انتجام کیے جاتے ہیں۔ پُرانے رواج کے مطابخ سات رنگوں کے لیے سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ ان کو فیریوں یا پریوں کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایک وخت تھا جی کہ جب کسی بھی لڑکی کے لیے پری بننا اور راج بھون میں جگہ حاصل کرنا بڑی عجت کی بات ہوتی تھی۔ اس کا جیون سنور جاتا تھا مگر اب وہ پہلے والی بات کہاں رہی ہے جی۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہونے لگا ہے۔ پھر بھی بے شمار لڑکیاں ہیں جو ''پری'' بن کر راج بھون میں جانے کے سپنے دیکھتی ہیں۔''

''تم اپنی بات کو صرف اپنے جواب کی حد تک رکھو۔'' چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔

''معافی چاہتی ہوں سرکار! میں ساتویں کے جشن کی بات کر رہی تھی۔ راج بھون کی کچھ عورتیں مجھے یہ خوشخبری سنانے آئیں کہ میرا نام اس سال چنی جانے والی سات لڑکیوں میں لیا جا رہا ہے۔ بہت آشا ہے کہ میں چن لی جاؤں گی۔ چھوٹے سرکار! میں جان گئی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں دُکھ کے سمندر میں ڈوب گئی۔ مجھے پتا چلا کہ مجھے صرف

اور صرف گورا صاحب کے لیے راج بھون میں لے جایا جا رہا ہے۔ میں وہاں صرف گورا صاحب کی رکھیل بن کر رہ جاؤں گی۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایسا ناہیں ہونے دیں گے۔ مجھے سات لڑکیوں میں چن لیا گیا۔ میرا رنگ ''لال'' تھا مگر جس رات حکم جی کے آدمیوں نے میرے ماتا پتا سے چناؤ کی رسمی اجاجت لینے کے لیے آنا تھا، دو پہر کے وخت میرے پتا نے مہروج سے میرا بیاہ کر دیا۔ یہ پہلے سے پتا جی کا منصوبہ ناہیں تھا، اس وخت کوئی بھی مسلمان لڑکا مل جاتا اور راجی ہو جاتا تو میرے پتا نے اس سے میرا نکاح پڑھوا دینا تھا۔ آپ جانتے اچ ہیں کہ بیاہتا لڑکی راج بھون کی پری ناہیں بن سکتی۔ میں بھی پری بننے سے بچ گئی لیکن اس کے بدلے میں حکم جی کا غصہ جھیلنا کوئی آسان کام ناہیں تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ بہت مشکل ہوئیں گا۔ تب پتا جی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مشکل وخت سے گجرنے کے لیے مہاراج پرتاپ بہادر جی کی دی ہوئی مہر سے کام لیں گے۔''

موہن کمار نے بے حد بے چینی سے اپنی چوڑی ٹھوڑی کو کھجایا اور بولا۔ ''گستاخی معاف چھوٹے سرکار! یہ چھوری اپنی چرب زبانی سے معاملے کو اُلجھانا چاہت ہے۔ یہ ہماری توجہ اصل صورتِ حال سے ہٹا رہی ہے۔ کوے کو سفید کہنے سے وہ سفید ناہیں ہو جاتا۔ سارا زرگاں جانت ہے کہ یہ ٹھیک عورت ناہیں ہے۔ اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لیے یہ دوسروں پر گھناؤنے الزام لگاتی ہے اور جب اس کا جواب دیا جاوت ہے تو مرنے مارنے پر اُتر آتی ہے۔ رتنا دیوی جی کے ساتھ بھی اس کا جھگڑا ایسے ہی شروع ہوا تھا۔ اس نے ان کے رتبے کا خیال کیے بغیر پہلے منہ ماری کی پھر ہاتھا پائی پر اُتر آئی......''

''یہ بھی بالکل جھوٹ ہے سرکار! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے رتنا دیوی سے کچھ ناہیں کہا۔ میرا اور ان کا بھلا کیا جوڑ؟ میں ایک نصیبوں ماری بے سہارا لڑکی، وہ راج بھون کی رانی۔ میں تو ان سے اپنی جان بچاتی پھرتی تھی۔ پر وہ کسی صورت مجھے شما کرنے کو تیار ناہیں تھیں۔ میں پنگھٹ پر پانی بھر رہی تھی۔ وہ وہاں اپنی سکھیوں کے ساتھ سیر کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی گندی بات کہی جو ان کی جبان کو ہرگج جیب ناہیں دیتی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ اتنے بڑے منہ سے اتنی چھوٹی بات مت کہیں۔ بس وہ اسی بات پر بھڑک گئیں اور پالکی چھوڑ کر مجھ پر کود پڑیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھا پائی کی اور پھر اپنے جور میں خود ہی پھسل کر پنگھٹ کی سیڑھیوں سے گریں۔ ان کو جو چوٹ آئی، وہ اپنی وجہ سے آئی۔ وہاں بہت سوں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ

اب کسی میں اتنی ہمت ناہیں ہوگی کہ وہ اس بات کی گواہی دے۔ آپ جانتے ہیں، یہاں کچھ
کا ساتھ کوئی ناہیں دیتا چھوٹے سرکار! وہ سچ بول کر بھی ہارتا ہے۔ جور والا جھوٹ بول کر بھی
جیت جاتا ہے......'' آخری الفاظ کہتے کہتے سلطانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے بچے کو کندھے
سے لگا کر سسکنے لگی۔ اس کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اس کی اوڑھنی سے نکل کر اس کے چہرے پر
جھول رہی تھیں۔

حافظ خدا بخش نے کہا۔ ''یہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈال رہی ہے جی! اصل میں اس نے
مہروز جیسے دیوانے سے بیاہ کیا ہی اس لیے تھا کہ یہ اپنے کرتوتوں کو چھپانا چاہت تھی۔ ہم
سب جانت ہیں کہ یہ ہرجائی ہے۔ اس کے کئی یارانے ہیں۔ باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ بھائی
بہت عرصے سے بیمار پڑا ہے۔ اس کو کسی کا ڈر خوف ناہیں ہے......''

''یہ جھوٹ ہے...... الجام ہے۔'' سلطانہ چلائی۔ ''میں ان سب لوگاں کو جانتی ہوں۔ یہ
حکم جی کے خاص بندے ہیں۔ ان کے منہ میں حکم جی کی جبان ہے......''

اس دوران میں غنی صاحب نے بھی دبے لہجے میں سلطانہ کی حمایت میں چند فقرے
بولے۔ انہوں نے کہا کہ ایک ایسی لڑکی پر جو ماں بھی ہے، کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسے سنگین
الزام نہیں لگائے جانے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس لڑکی کے گھرانے کو کسی حد تک
جانتے ہیں۔ وہ عزت دار، سچے اور نڈر لوگ ہیں۔ اگر ان کی لڑکی واقعی بدچلن ہوتی تو وہ بھی
چپکے نہ بیٹھے رہتے۔

چھوٹے سرکار نے دونوں طرف کا مؤقف وضاحت سے سنا اور چند مزید سوالات
کیے۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ تب تک میں فیصلہ کر چکا تھا۔ جب چھوٹے سرکار نے
مجھ سے پوچھا کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی تسلیم کرتا ہوں یا نہیں تو میں نے اس کا جواب اثبات
میں دیا اور کہا۔ ''میں اپنی غلط بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ کل میں پوری طرح اپنے حواس میں
نہیں تھا۔ سلطانہ کے ساتھ میرا بیاہ ہو چکا ہے۔ اس کی گود میں جو بچہ ہے، وہ میرا ہی ہے۔''

''اس بات کا پتا کیسے چلے گا کہ تم کل اپنے حواس میں ناہیں تھے یا آج حواس میں
ناہیں ہو؟'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، درست ہے چھوٹے سرکار! یہ میری بیوی ہے، یہ میرا بچہ ہے۔
میری بب...... بیوی پر جھوٹے الزام لگائے جا رہے ہیں۔ یہ گھر گرہستن ہے۔ یہ پوری طرح
میری وفادار ہے۔ یہ حکم جی اور ان کے دوست کی بدنیتی ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے
پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ظلم سے بچنے کے لیے ہم نے زرگاں چھوڑا ہے لیکن یہ لوگ یہاں

بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ اگر...... اگر آپ نے ہمیں ان کے حوالے کر دیا تو ہمیں بے عزت کر
کے مار دیا جائے گا چھوٹے سرکار......'' میں بولتا چلا گیا۔ حالانکہ میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ
زرگاں کہاں ہے؟ حکم جی کون ہے؟ میری شادی کب ہوئی تھی؟ لیکن میں خود کو ذہنی طور پر
باور کرا چکا تھا کہ زرگاں موجود ہے۔ حکم جی، گورا صاحب اور ان کی بدنیتی بھی موجود ہے اور
سلطانہ سے میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ میری یادداشت کے پردے پر موجود نہیں
تھا لیکن اس کے بارے میں اب اتنے ثبوت موجود تھے کہ میں اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں
نے اب اپنی یادداشت کے بجائے ان ثبوتوں پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''یہ صحیح الدماغ بندہ ناہیں ہے سرکار! اس کی کسی بات پر بھروسہ ناہیں کیا جا سکتا۔''
موہن کمار نے احتجاج کیا۔

چھوٹے سرکار نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ
کیا۔ میرے بیان کے مثبت اثرات چھوٹے سرکار کے چہرے پر نظر آنے لگے تھے۔ انہیں کم
از کم اتنا یقین تو ہو رہا تھا کہ میں سلطانہ کو بیوی مان رہا ہوں اور میرے نزدیک وہ وفادار ہے۔
اب تک کی سماعت کے دوران میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ چھوٹے سرکار کے دل میں سلطانہ اور
اس کے بچے کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور وہ انہیں پناہ دینا چاہتا ہے۔ تاہم اس کے لیے وہ
قانونی تقاضے بھی پورے کرنا چاہتا تھا۔ میرا بیان سننے کے بعد اس نے بڑی ذہانت سے
موہن کمار اور گرور اکیش سے چند ایسے سوال کیے جن سے ان کے بیانوں میں تضاد پیدا ہوا۔
جارج گورا کی ناپسندیدہ مصروفیات کے بارے میں بھی چھوٹے سرکار نے موہن کمار سے چند
چبھتے ہوئے سوالات کیے۔ اس موقع پر ایسا نظر آنے لگا کہ اس مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق
میں ہوگا اور ہمیں گونگے ہاشو سمیت نل پانی میں پناہ دے دی جائے گی۔ کم از کم عارضی پناہ تو
ضرور مل جائے گی جسے بعدازاں مستقل کیا جا سکے گا۔

لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ ایک فربہ
اندام شخص جو اپنے حلیے سے چوب دار نظر آتا تھا، داخل ہوا۔ اس نے چھوٹے سرکار کے قریب
جھک کر سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ چھوٹے سرکار کا چہرہ متغیر نظر آیا۔ انہوں نے گہری
نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ دھیمی آواز میں اپنے مصاحبین کے ساتھ چھوٹے سرکار کا
مختصر مکالمہ ہوا۔ اس کے بعد چھوٹے سرکار نے ایک باوردی اہلکار کو کچھ ہدایات دیں۔ وہ باہر
چلا گیا۔ وہ کوئی سینئر اہلکار تھا۔ اس کے ساتھ دو تین معزز افراد بھی باہر گئے۔ حاضرین مدھم
آوازوں میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ چار پانچ منٹ بعد سینئر اہلکار واپس آیا۔ اس کے ساتھ

عقب میں دو اور افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا، دوسرا نوجوان۔ یہ دونوں رو رہے تھے۔ ان کی پگڑیاں گلے میں پڑی تھیں۔ سینئر اہلکار نے چھوٹے سرکار کے رُوبرو تعظیم پیش کرنے کے بعد کہا۔ ''جناب! میں نے خود ملاحظہ کیا ہے۔ لاش قریباً دو دن پُرانی ہے۔ سر کے پچھلے حصے میں کلہاڑی کا گہرا گھاؤ آیا ہے۔ مقتول کے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر ایک پُرانے ازار بند سے باندھے گئے ہیں۔''

''لاش کہاں سے ملی ہے؟'' چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

''کچے کی دوسری طرف...... جہاں پچھلے سال جنگل میں آگ لگت تھی۔ وہاں ایک کھوہ سے نکلی ہے۔ مرنے والے کا نام ہارون بتایا جا رہا ہے۔ یہ حکم جی کے ان سپاہیوں میں شامل تھا جو سلطانہ کی تلاش میں اس کے پیچھے آئے تھے۔''

میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔ کھوہ میں ہونے والی لڑائی کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔

جب ہم کھوہ میں ہارون نامی اس رائفل بردار کو باندھ رہے تھے تو وہ بے ہوش تھا۔ لیکن اس کی بے ہوشی ایسی گہری نہیں تھی اور نہ ہی اس کا زخم اتنا سنگین تھا کہ فوری طور پر اس کی موت واقع ہو جاتی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا اور اب ہارون کے ساتھی اس کی لاش لے کر دہائی دیتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ایک باوردی اہلکار نے سلطانہ کے جھولے میں سے وہ رنگین دستے والی کلہاڑی نکال لی جس سے ہارون کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ صفاچٹ چہرے والے سینئر اہلکار نے اس کلہاڑی کو بغور دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''جی چھوٹے سرکار! میرے خیال میں یہی وہ کلہاڑی ہے جس سے مقتول کو چوٹ لگائی گئی ہے۔''

پھر اس سینئر اہلکار نے جھولے میں سے وہ رائفل بھی نکال لی جو لڑائی سے پہلے مقتول ہارون کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل کو دیکھتے ہی بوڑھا شخص پکار اُٹھا۔ ''جی ہاں سرکار! یہ میرے بیٹے کی ہی بندوق ہے۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ قاتلہ ہے۔ یہ ڈائن ہے۔ یہ میرے بیٹے کو کھا گئی ہے۔'' بوڑھا آہ و بکا کرنے لگا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں نے کسی کو نا ہیں مارا۔ میں نے تو صرف خود کو اور اپنے شوہر کو بچانا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی سرکار! اگر میں اس کو کلہاڑی سے چوٹ نہ لگاتی تو وہ مجھے اور مہروج کو بھون کر رکھ دیتا۔''

چھوٹے سرکار نے اس مرتبہ سلطانہ کی سنی اَن سنی کر دی۔ اس نے صفاچٹ سر والے اہلکار سے پوچھا۔ ''منوج! اس رائفل کے بارے میں سلطانہ نے اس سے پہلے کیا بیان دیا تھا؟''

اہلکار بولا۔ ''سرکار! یہ کہوت تھی کہ یہ اس کے پتاجی کی رائفل ہے۔ یہ اپنی رکھشا کے لیے ساتھ لائی ہے۔''

موہن کمار پکار کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا سرکار! کہ یہ پرلے درجے کی جھوٹی اور مکار ہے۔ یہ اپنی ڈگر پر اتنا آگے چلی گئی ہے کہ اس کے لیے واپس آنا ممکن نا ہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک ہو چکی ہے۔ سرکار۔'' موہن کمار کے لہجے میں نئی توانائی آ گئی تھی اور بات صرف موہن کمار ہی کی نہیں تھی۔ ان سب لوگوں کے چہرے دمکنے لگے تھے جو سلطانہ کے پیچھے یہاں آئے تھے۔

اس واقعے کے بعد صرف پانچ دس منٹ کے اندر اندر اس کیس کا فیصلہ ہو گیا۔ چھوٹے سرکار نے سلطانہ اور اس کے بچے کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا جو اسے لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ سلطانہ کے ساتھ ساتھ مجھے اور ہاشو کو بھی ان لوگوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہ فیصلہ سناتے ہوئے چھوٹے سرکار اجیت رائے کے لہجے میں افسردگی کی جھلک موجود تھی۔ اس جگہ موجود بیشتر مقامی لوگ بھی اس صورتِ حال سے مایوس تھے۔ اس فیصلے میں غنی صاحب اور ڈاکٹر چوہان کو سرزنش بھی کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ باہر سے آنے والے کسی بھی شخص کو پناہ دینے سے پہلے اس کے بارے میں چھان بین کریں۔

اب ہم واپس جا رہے تھے۔ انہی راستوں پر سفر کرتے ہوئے جن پر سفر کر کے یہاں نیلے پانی کی خوبصورت جھیل پر پہنچے تھے۔ ہمارا قافلہ قریباً بارہ افراد پر مشتمل تھا ان میں موہن کمار، گرو راکیش، مودان اور حافظ خدا بخش بھی شامل تھے۔ سب لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں، سلطانہ اور ہاشو بھی گھوڑوں پر تھے۔ ہم تینوں کے گھوڑوں کی لگامیں آپس میں باندھ دی گئی تھیں اور پھر انہیں ایک چوتھے گھوڑے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ یہ موہن کمار کا گھوڑا تھا۔

ہارون کی لاش لکڑی کے ایک سِیل بند تابوت میں رکھی گئی تھی۔ اس تابوت کو ایک توانا خچر کے پہلو سے باندھا گیا تھا۔ وزن برابر رکھنے کے لیے خچر کے دوسرے پہلو سے کچھ سامان وغیرہ باندھ دیا گیا تھا۔ ایک اور خچر پر بھی سامان لدا ہوا تھا۔ یہ کینوس کی تین چار چھولداریاں اور ان کے بانس وغیرہ تھے۔ گھنے درختوں میں ہمارا قافلہ سُست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ وغیرہ نہیں باندھے گئے مگر ہم پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی،

خاص طور سے سلطانہ پر۔ ایک رائفل بردار گھڑ سوار مسلسل اس کے پہلو میں چل رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ اسے خونخوار نظروں سے گھور بھی لیتا تھا۔ یہ ہلاک ہونے والے ہارون کا بھائی صادق لاکھی تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ نہ زیادہ گرمی نہ سردی مگر سفر تو پھر سفر ہوتا ہے۔ ہم تھک کر شام تک چُور ہو گئے۔ خاص طور سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے کبھی گھوڑے پر سفر نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم پھوڑا ہو گیا ہے۔ رکابوں میں پاؤں سوج گئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے گھنے جنگل میں ایک ہموار جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالا گیا۔ چار چھولداریاں لگا دی گئیں۔ ان میں ایک کافی بڑی تھی۔ اس میں موہن کمار، گرو راکیش اور خدا بخش نے قیام کرنا تھا۔ ہارون کی لاش والا تابوت بھی اسی چھولداری میں رکھ دیا گیا۔

ابھی چھولداریاں پوری طرح لگی نہیں تھیں، سلطانہ کا بچہ بالو مسلسل رو رہا تھا۔ وہ اسے دودھ پلانا چاہ رہی تھی۔ شاید اتنے مردوں کے سامنے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی مگر اس کا یوں جھاڑیوں کی طرف جانا موہن کمار وغیرہ کو پسند نہیں آیا۔ متوفی ہارون کا بھائی صادق بھڑک کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور زور سے بولا۔ ’’ادھر کہاں جا رہی ہو؟‘‘

’’بچے کو دودھ پلانا ہے۔‘‘

’’تو ہم تیری ’’دودھ پلائی‘‘ کی ویڈیو فلم بنا لیویں گے؟ حرام زادی، نخرے باز، چل واپس آ ادھر۔‘‘

’’دیکھو تم فضول میں گالی نکال رہے ہو۔ میں نے تم سے کچھ نا ہیں کہا۔‘‘

وہ ایک دم شعلہ جوالا بن گیا۔ ’’کتیا...... بدمعاش عورت...... ابھی تُو نے کچھ کہا ہی ناہیں۔ میرے بھائی کی جان لے لی۔ اسے قتل کر دیا اور کچھ کہا ہی ناہیں تُو نے۔ میں تو ہے مار ڈالوں گا۔ مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔‘‘

وہ دیوانہ وار سلطانہ پر جھپٹا۔ اس نے رائفل کا کندہ اس کے سینے پر مارا۔ وہ بالو سمیت اُچھل کر کئی فٹ پیچھے گری۔ وہ اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی مگر اپنے بچے کو اس نے اس طرح بانہوں میں چھپایا کہ اپنے جسم کو ڈھال بنا لیا۔

میں نے بیتاب ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا مگر ایک رائفل بردار میرے سر پر کھڑا تھا۔

’’خبردار...... اپنی جگہ پر بیٹھا رہ...... ورنہ بھیجا اُڑ جاوے گا۔‘‘ وہ پھنکارا۔

اسی دوران میں حافظ خدا بخش آگے بڑھا اور اس نے بپھرے ہوئے صادق لاکھی سے

سلطانہ کی جان چھڑائی۔ وہ مٹی میں لتھڑ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ دو تین دن پہلے کھوہ کے اندر مقتول ہارون سے ہونے والی لڑائی میں سلطانہ کی قمیص پھٹ گئی تھی اور اس نے کندھے پر گرہ لگا رکھی تھی۔ موجودہ مار پیٹ میں یہ قمیص پھر پھٹ گئی۔ سلطانہ بمشکل اپنی برہنگی چھپانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی نظر آتی تھی مگر یہ شیرنی فی الوقت مسلح افراد کے گھیرے میں تھی اور دھاڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے صادق کو بے نقط سنائیں۔ اسے شرابی، بدمعاش قرار دیا اور کہا کہ اسے کسی پتھر نے جنم دیا ہے۔ اگر اسے جنم دینے والی گوشت پوست کی ماں ہوتی تو آج وہ ایسی کمینگی کا مظاہرہ نہ کرتا۔

صادق جواب میں گرجا۔ ’’کتیا! میں تیری موت کو آسان بنانا ناہیں چاہت ہوں۔ ورنہ ابھی تجھے چیر کر چیل کووں کے لیے پھینک دیتا۔‘‘

چھولداریاں لگ چکی تھیں۔ موہن کمار اور مسلح افراد نے سلطانہ کو دھکیل دھکال کر ایک چھولداری میں داخل کر دیا۔ بالو رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا رہا تھا۔ چھولداری کے اندر سے بھی ایک دو منٹ تک اس کی پکار سنائی دیتی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں اور اس کی آہ و بکا کے درمیان اس کی ماں کا جسم حائل ہونے لگا۔ اس کی روتی بلکتی آواز مدھم پڑنے لگی اور پھر معدوم ہو گئی۔

اندھیرا ہوا تو مجھے اور ہاشو کو بھی سلطانہ والے خیمے میں پہنچا دیا گیا اور خیمے کے گرد چار افراد کا کڑا پہرا لگا دیا گیا۔ یہ ایک خالص جنگلی علاقہ تھا۔ جانوروں کا خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔ موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے چھولداریوں کے گرد پانچ چھوٹے الاؤ روشن کیے۔ یہ ایک طرح سے اس پڑاؤ کا حفاظتی دائرہ تھا۔

چھولداریوں کے اندر موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی میں سلطانہ کے چہرے پر دو گہرے نیل نظر آ رہے تھے۔ اس کے جسم پر بھی یقیناً ایسے ہی نیل ہوں گے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بُری طرح پھنس چکی ہے۔ زرگاں پہنچنے کے بعد وہ بدترین حالات کا شکار ہو سکتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی یا عورت ہوتی تو اس کی حالت پتلی ہو جانی تھی۔ مگر وہ اب بھی حوصلے میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن یہ طیش آمیز خوف تھا۔

اسے خود چوٹیں لگی ہوئی تھیں لیکن اسے خود سے زیادہ میرے سر کی چوٹ کی فکر تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی اوڑھنی سے ایک طویل پٹی پھاڑی۔ پانی سے میرے سر کے زخم کو دھویا اور روئی رکھ کر تازہ پٹی باندھ دی۔

ہم گاہے بہ گاہے، چھولداری کے چھوٹے چھوٹے روشن دانوں سے باہر جھانک لیتے

تھے۔ درختوں پر مشعلیں روشن تھیں اور پہرے دار گشت لگا رہے تھے۔ مشعلوں کا روغن جلنے کی بُو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہماری چھولداری میں بھی آ جاتی تھی۔ وہ لوگ گوشت بھون رہے تھے۔ راستے میں تین بڑے جل مرغ اور چند خرگوش شکار کیے گئے تھے۔ یقیناً یہی شکار پکایا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹی نسل کا ہرن زندہ پکڑا گیا تھا۔ وہ بھی ایک الاؤ کے قریب بندھا ہوا تھا۔ غالباً اسے کل کسی وقت استعمال کیا جانا تھا۔ یعنی ہماری طرح وہ ہرن بھی بتدریج راحت سے دور اور اذیت سے قریب ہو رہا تھا۔ اب یہ اذیت کیسی ہو گی، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فی الوقت تو ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مجھے بھی سلطانہ کے ساتھ برابر کا شریکِ جرم سمجھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہارون کے بھائی صادق نے سلطانہ سے کہا تھا کہ میں تیری موت کو آسان بنانا نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے آسانی سے مارا نہیں جائے گا۔ شاید اسے جارج گورا نامی شخص کے حوالے کر دیا جائے یا پھر اسٹیٹ کی جیل میں ڈال دیا جائے۔

ہمیں کھانا دیا گیا لیکن ہم تینوں نے کل ملا کر دس بارہ نوالے ہی لیے ہوں گے۔ سلطانہ نے خود پر جبر کر کے تھوڑا سا زیادہ کھایا۔ اس کے ساتھ اس کے شیر خوار کی خوراک بھی وابستہ تھی۔ چاند درختوں کی اوٹ سے جھلک دکھا رہا تھا۔ گونگا ہاشو کچھ دیر تک گم صم لیٹا رہا پھر سو گیا۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مدھم ہوا چھولداری کی دیواروں کو ہولے ہولے ہلا رہی تھی اور پاس ہی کہیں چکور کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سلطانہ نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی۔ ''تم پریشان ناہیں ہونا مہروج! ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کسی کا حق ناہیں مارا۔ اللہ ہمارے ساتھ جرور نرمی والا معاملہ کریں گا۔ تم دیکھنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئیں گا اور اگر اللہ کی مرجی نہ ہوئی اور راستہ نہ بھی نکلا تو تم دل چھوٹا نہ کرنا۔ ہم صبر سے اچھے وخت کا انتجار کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ شمع کی روشنی میں سلطانہ کی جلد شفاف اور چمکیلی نظر آتی تھی۔ اس کے بالوں کی طویل لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک سخت ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اگر یہی لڑکی کسی بڑے شہر میں ہوتی اور اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتیں تو وہ ''اچھی صورت'' کی قرار دی جا سکتی تھی۔ اب بھی دھیان سے دیکھنے پر اس میں ایک خاص طرح کی کشش محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں ''بے خبری کے دور میں'' اس لڑکی کے قریب رہا ہوں اور اس کی گود میں میرا بچہ ہے۔ کسی وقت میں سلطانہ کی طرف عجیب طرح کا کھنچاؤ محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ

وابستگی اسی قربت کا نتیجہ تھی جس کے بارے میں لوگ مجھے بتا رہے تھے اور خود سلطانہ بتا رہی تھی؟

سلطانہ نے ہولے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں مہروج! اور ماں جی نے بھی۔ مجھے یخین ہے تمہیں کچھ ناہیں ہوئیں گا۔ تم جندہ رہو گے اور خوش رہو گے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''مہروج! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے بھول تو نہ جاؤ گے۔ مجھے یاد رکھو گے نا۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔ تم خود ہی تو کہتی ہو کہ قدرت ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گی۔''

''ہاں...... امید پر دنیا قائم ہے لیکن...... یہ گورا صاحب بہت کمینہ بندہ ہے۔ پتا ناہیں کیوں اکثر میرا دل کہتا ہے کہ یہ میرے ہاتھوں مرے گا یا میں اس کے ہاتھوں مروں گی۔''

میں نے پوچھنا چاہا کہ گورا صاحب کی عمر کیا ہو گی مگر پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔

اب تک صرف ڈاکٹر چوہان کو معلوم تھا کہ میری یادداشت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ اس نے میری تکلیف کو Amnesia کا نام دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ میری یادداشت، لاہور میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد قریباً دو سال بعد واپس آئی ہے۔ مگر اب میں درمیانی دو سال کے واقعات یاد کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ شاید عام شخص اس پر یقین نہ کرتا اور ممکن تھا کہ سلطانہ بھی نہ کرتی۔

سلطانہ نے ٹانگیں سمیٹ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ لی تھی اور مبہوت سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''ایک بات پوچھوں...... سچ بتاؤ گے؟''

''پوچھو۔''

''سوال تو وہی پُرانا ہے لیکن موقع نیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہو سکتا ہے کہ ہم بچھڑ جائیں۔ پتا ناہیں کتنی دیر بچھڑے رہیں اور کیا پتا مہروج! پھر ملیں بھی یا ناہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ آج تم اس سوال کا صحیح جواب دے دو۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''کوئی ہے نا؟''

''کون؟''

''وہی...... جسے میں جانتی ناہیں۔ جو یہاں سے بہت دور ہے۔ جس کو تم یاد کرتے ہو۔ جس کی طرف کھنچتے ہو۔ بولو ہے نا۔''

''پتا نہیں تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی مہروج وہی۔'' وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''میرے بہت خریب ہوتے ہوئے بھی تم جس کے پاس رہتے ہو۔ جس تک پہنچنے کے لیے تمہارے پر پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتے رہتے ہیں۔ تم بار بار اُڑتے ہو اور راجواڑے کی حدوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ پکڑے جاتے ہو۔ پھر بھاگتے ہو بتاؤ کوئی ہے نا؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ ناک سرخ تھی۔ وہ عجیب جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو لیکن اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو پھر تم کیا کر سکتی ہو؟''

''ہاں...... میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں تو خود خیدی (قیدی) ہوں۔ لیکن مہروج! تم ایک بار مان تو لو کہ ہاں کوئی ہے۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہوسکتا ہے کوئی ہو۔ ہوسکتا ہے نہ ہو۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔''

وہ بدستور میری طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار بھاگے تھے، تم راجواڑے کی آخری حد تک جا پہنچے تھے۔ تمہیں ڈیوڈ وغیرہ نے پکڑا تھا۔ وہ تمہیں واپس زرگاں لائے تھے۔ تم نے کہا تھا۔ مجھے چھوڑ دو۔ بڑی سخت آندھی ہے۔ وہ آندھی میں اُڑ جائے گی۔ وہ گم ہو جائے گی۔ ڈاکٹر چوہان اور ریحان تم سے بار بار پوچھتے رہے تھے، کون آندھی میں اُڑ جائے گی۔ کون گم ہو جائے گی۔ تم کوئی جواب ناہیں دے سکے تھے۔ بس اپنا ماتھا مسلتے رہے تھے۔ تب ایک بار پھر بیتاب ہو کر اُٹھ گئے تھے اور بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں پکڑ کر گوڈا کے چھوٹے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔''

سلطانہ نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد سوالیہ لہجے میں بولی۔ ''کیا تمہیں دو سال کی مدت میں کبھی بھی یاد ناہیں آیا کہ وہ کون تھی؟ تمہارا اس کے ساتھ کیا سمبندھ تھا؟ وہ کیسے بچھڑی تھی تم سے؟''

میں سلطانہ کو اس بات کا بڑا واضح جواب دے سکتا تھا۔ دو سال قبل کی ہر بات میرے حافظے میں روشن تھی۔ اس روشنی میں روشن ترین چہرہ ثروت کا تھا۔ وہ جو میری رگِ جاں سے بھی قریب تھی۔ وہ جو میری دلہن بنتے بنتے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ ایک خبیث باپ

کے خبیث بیٹے کی شیطانیت نے ایک ہنستے بستے گھر کو اُجاڑا تھا اور ملاپ کے انتظار میں ایک ایک گھڑی گننے والے دو بیتاب دل قرنوں کے فاصلے پر چلے گئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس لڑکی کو جو میری بیوی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، بتا دوں کہ میں کسی کی لازوال محبت کا اسیر ہوں۔ اسے بتا دوں کہ وہ کون ہے جو لڑکپن سے میری سانسوں میں چلتی ہے، میرے لہو میں دوڑتی ہے اور میرے دل میں دھڑکتی ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ بتانے سے کوئی فائدہ تھا؟ شاید نہیں۔

اسی دوران میں اچانک چھولداری کے دروازے پر کھڑے ہو کر کوئی زور سے بولا۔

''پردہ ہٹاؤ۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے ڈوری کھول کر پردہ ہٹایا۔ ایک کرخت چہرے والے شخص نے اندر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ تھا۔ پتا نہیں اس نے کہاں سے حاصل کیا تھا شاید وہ کسی چھاگل وغیرہ میں اس کے پاس ہی تھا۔ ''یہ تمہارے بچے کے لیے اور موہن جی کا حکم ہے، جرا جلدی سو جاؤ۔ سویرے جلدی نکلنا ہووے گا اور فالتو خرچہ مت کرو۔ یہ موم بتیاں بجھا دو۔''

سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم نے موم بتیاں بجھا دیں اور ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ ہمارے رُخ ایک دوسرے کی طرف تھے اور درمیان میں بمشکل چند انچ کا فاصلہ ہوگا۔ بچہ ایک طرف سو رہا تھا۔ سلطانہ کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس میں جنگلی پھولوں کی سی باس تھی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''سلطانہ! کیا ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے؟''

''بھاگنے کے لیے کل کا دن بہت اچھا ہوسکتا ہے۔ مگر بھاگ کر بچ نکلنے کا امکان اتنا ہی ہے جتنا سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کے گزرنے کا۔'' وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ کل بھاگنے کا اچھا موقع ہوگا؟''

''ہم اس وقت اسٹیٹ کے بائیں کنارے کی طرف ہیں۔ کل جہاں ہمارا پڑاؤ ہوئیں گا، وہ جگہ کنارے کے اور بھی قریب ہے۔ مشکل سے سات آٹھ میل کا فاصلہ ہوئیں گا۔ ایک بار کوئی اسٹیٹ کی حد سے نکل جائے تو پھر اس کے لیے چھپنا آسان ہوسکتا ہے۔ وہاں جنگل میں کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں جن کو ''آویاں'' کہتے ہیں۔ لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم اسٹیٹ کی حد سے ناہیں نکل سکتے اور تم تو بالکل ناہیں نکل سکتے۔''

میں چونک گیا۔ یہ بات اس سے پہلے چوہان نے بھی کہی تھی کہ میں اسٹیٹ کی حدود

سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا کہ وہ میرے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟

وہ بولی۔ ''اتی بار ناکام ہو کر بھی اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات ناہیں آئی تو پھر کب آئے گی؟ اب تم کو بھی یہ بات مان لینی چاہیے کہ تم بے بس ہو۔ تم کو کیل دیا گیا ہے۔''

''کیل دیا گیا ہے؟ اس کا کیا مطلب؟''

''تم پر جادو ہے مہروج۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔ ''تم اس کے اثر سے باہر ناہیں نکل سکتے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہاں یہ ہوتا ہے مہروج! جن لوگاں کے بارے میں یہاں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ راجواڑے سے بھاگ جائیں گے، انہیں یہاں کیل دیا جاتا ہے۔ پھر چاہے وہ آجاد بھی پھر رہے ہوں، وہ راجواڑے سے باہر ناہیں جا سکتے۔ وہ پکڑے جاتے ہیں اور ایسا کوئی ایک بار ناہیں ہوا، بے شمار مرتبہ ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی دو چار بندے اور پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ ان میں سے دو کی موت بھی ایسے اچ ہوئی تھی۔ وہ کچے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ان کی دوسری کوشش تھی۔ جب وہ پکڑے جانے لگے تو ایک کھوہ میں گھس گئے۔ یہاں تیندوے کا ایک جوڑا تھا۔ یہ تیندوے ان دونوں پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تکا بوٹی کر ڈالی۔''

میرے ساتھ پکڑے جانے والے لوگ اور کون ہو سکتے تھے؟ میں ذہن پر زور دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں چوہان کی زبان سے میڈم صفورا کا نام سن چکا تھا۔ اس نام نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تو کیا صفورا کے علاوہ کوئی اور بھی میرے ساتھ پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا؟ کہیں وہ سیٹھ سراج یا عارف خان وغیرہ تو نہیں تھے یا پھر میرے اور عمران کے دوستوں میں سے کوئی؟ مثلاً اقبال یا جیلانی وغیرہ۔ سوال بے شمار تھے اور جواب نہیں مل رہے تھے۔ اگر کوئی جواب ملتا بھی تو اس کی جگہ دس سوال اور پیدا ہو جاتے تھے۔

میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ ''یہ ''کچا'' کیا ہے؟ اس سے پہلے بھی میں دو تین دفعہ یہ لفظ سن چکا ہوں۔ کیا یہ کوئی خاص علاقہ ہے؟''

''تم بھول رہے ہو مہروج! میں تمہیں ایک بار پہلے بھی تفصیل سے بتا چکی ہوں۔ ہمارا یہ راجواڑا تین طرف سے تو ایک بڑی ندی نے گھیر رکھا ہے۔ خشکی کی طرف سے باہر جانے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ہم کچا کہتے ہیں۔ اس رستے پر کئی جگہ چھوٹی چوکیاں بنی

ہوئی ہیں جہاں پہرے دار موجود ہوتے ہیں۔ کوئی اسٹیٹ سے باہر جا سکتا ہے، نہ باہر سے اسٹیٹ میں آ سکتا ہے۔ پہلے پہل کبھی کبھار پولیس یا فوج کے لوگ یہاں آتے تھے مگر ان کا یہاں کوئی جور ناہیں چلتا تھا۔ ویسے بھی یہ جنگل اتنے گھنے ہیں کہ یہاں گورنمنٹ کے لوگاں کا آنا اور اپنے کسی اپرادھی وغیرہ کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ اب بہت عرصہ ہو گیا، باہر کے لوگاں اس علاقے کو اس کے حال پر چھوڑ چکے ہیں۔''

ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے، پھر بھی باہر کھڑے پہریدار خبردار ہو گئے۔ ایک پہریدار نے چھولداری کے پاس آ کر زور سے کہا۔ ''اوئے! یہ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے۔ آرام سے سوتے ہو یا پھر تمہارا کوئی اور علاج کیا جاوے۔''

ہم چپ ہو گئے۔

وہ پھر گرجا۔ ''اب تمہاری آواج ناہیں آنی چاہیے۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر نکلنا ہے۔''

سلطانہ غصے میں ہڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور بڑی محبت سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے پاؤں میرے پاؤں سے چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں پازیب نہیں تھی۔ حالانکہ یہاں کی تمام عورتوں کے پاؤں میں، مَیں نے پازیبیں وغیرہ دیکھی تھیں اور بات صرف پازیب ہی کی نہیں تھی، یہاں کی معمولی سے معمولی عورت کے جسم پر بھی مختلف طرح کے زیورات نظر آتے تھے۔ سلطانہ شاید واحد عورت تھی جس کے جسم پر کسی طرح کی کوئی آرائش نہیں تھی۔ شاید وہ یہ سب پسند ہی نہیں کرتی تھی۔

وہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کی قربت میں ایک عجیب سی یاسیت تھی۔ دور کہیں جنگل میں گیدڑ چلا رہے تھے۔ جلد ہی میں سو گیا۔

○......❖......○

اگلے روز سفر پھر شروع ہوا۔ صادق لاکھی مسلسل سلطانہ کو گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید وہ اسے کچا چبا جاتا۔ کل والے واقعے کو مدِنظر رکھتے ہوئے قافلہ سالار موہن کمار نے صادق کو سلطانہ سے دور ہٹا دیا تھا۔ اب صادق کا چتکبرا گھوڑا سب سے پیچھے تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہم نے سارا دن سفر کیا۔ میں نے سرگوشی میں سلطانہ سے پوچھا کیا یہی وہ ندی ہے جس کا اس نے رات کو ذکر کیا تھا؟ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو بہت بڑی ہے۔ تیج بہاؤ ہے اس کا۔ تم دیکھو گے تو حیران اچ رہ جاؤ گے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

رات کو ہمارا پڑاؤ ایک بار پھر گھنے درختوں میں ہوا۔ ہاشو یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے موت کی زردی نے مستقل ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سلطانہ نے ہاشو کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ان کا پُرانا گھریلو ملازم ہے۔ پہلے یہ ٹھیک تھا لیکن پھر بیمار ہوا اور ایک روز اچانک اس کی زبان بند ہوگئی۔ وید نے بتایا ہے کہ اس کے سر کی کوئی نس پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بولنے سننے سے معذور ہوگیا ہے۔ شروع میں سلطانہ کے والد مختار صاحب کی مالی حالت اچھی تھی مگر جب حالت پتلی ہوگئی تو ہاشو نے کسی اور مسلم گھرانے کی ملازمت کرلی۔ بہرحال سلطانہ اور اس کے گھرانے کے ساتھ اس کی اٹوٹ وفاداری اب بھی برقرار تھی۔ اب یہ شخص سلطانہ ہی کی وجہ سے ایک بدترین مشکل کا شکار ہوگیا تھا۔

رات کو ہاشو پھر جلدی سوگیا۔ میں اور سلطانہ بالکل قریب قریب لیٹے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ ندی پار سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔ سلطانہ نے آج بچے کو اپنے اور میرے درمیان لٹایا تھا۔ وہ بار بار میرا ہاتھ بچے کے سینے پر رکھتی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تم اس بچے کے باپ ہو۔ اگر میں نہ ہوں گی تو تمہیں اس کا دھیان رکھنا ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

ہماری گفتگو کا رُخ ایک بار پھر ندی اور اس کے قرب وجوار کے علاقے کی طرف ہو گیا۔ سلطانہ نے بتایا کہ یہاں سے بائیں رُخ پر بس سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کرلیا جائے تو راجواڑے کی حدود سے نکلا جاسکتا ہے۔ میں نے اس سے دو چار باتیں اور بھی پوچھیں۔

میرے دل کی گہرائی میں کہیں یہ خیال اُبھر رہا تھا کہ میں یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش کروں۔ شاید سلطانہ ٹھیک ہی کہتی ہو کہ میں نے پہلے بھی یہاں سے نکلنے کی دو چار کوششیں کی ہوں لیکن مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اب میں اپنے پورے ہوش وحواس میں تھا۔ میرے سینے میں ایک آگ تھی اور یہ آگ میری کمزوریوں کو دبا کر مجھے توانا اور قدرے دلیر بنا رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا میں کبھی ثروت کو دوبارہ دیکھ سکوں گا؟ کیا میں کبھی سیٹھ سراج کی منحوس گردن پکڑ سکوں گا؟ بس یہ دو سوال تھے جو پچھلے چار پانچ دن میں سیکڑوں بار میرے ذہن میں اُبھرے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر مجھے ان دو سوالوں کے جواب مل جائیں اور میں یہ دونوں کام کرسکوں تو پھر مجھے مرنے کا بھی کوئی دُکھ نہ ہوگا۔ بس دو جواب...... بس دو خواہشیں۔ ثروت سے ملنا اور اپنی ماں کے قاتل سراج کو گردن سے پکڑنا۔

رات کسی وقت اچانک میری آنکھ کھلی۔ چھولدار کی دیواریں بے طرح ہل رہی تھیں۔

میں نے چھولداری کے روزن میں سے دیکھا۔ چاندنی غائب ہوچکی تھی اور جنگل گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہایت تیز ہوا میں درخت دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ سلطانہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آتی تھی۔ ننھا بالو اس کے پہلو میں تھا۔ ہاشو ہمارے پاؤں کی طرف سویا ہوا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چھولداری کے گرد موجود پہرے دار پناہ کے لیے کسی پاس کی چھولداری میں چلے گئے ہیں۔ درختوں پر لگی مشعلیں بھی بجھ چکی تھیں، صرف ایک روشن تھی اور وہ بھی بے طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی بجھ گئی۔

اچانک میرے دل میں یہاں سے بھاگنے کی دبی دبی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ جاگ گئی۔ میں نے فقط چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے تاریکی میں بیٹھے بیٹھے چھولداری کی اندرونی ڈوری کھولی۔ بیرونی پردہ واٹر پروف تھا۔ اس کی ڈوری کو بھی گرہ لگی ہوئی تھی۔ یہ دوسری ڈوری کھولنے کے بعد میں باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ تب اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرے کُرتے کا دامن کسی شے سے اٹکا ہوا ہے۔ میں نے ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لیا اور ٹٹول کر دیکھا۔ مجھے پتا چلا کہ سلطانہ نے میرے کُرتے کا دامن اپنی اوڑھنی سے باندھ رکھا ہے۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں یہ اندیشہ موجود تھا کہ میں اپنی ذہنی کیفیت کے زیراثر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا اندیشہ درست تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے گرہ کھولی اور اس کی اوڑھنی کو اپنے کُرتے سے جدا کیا، تب ہولے ہولے سرکتا دروازے سے باہر آ گیا۔ مجھے لگا کہ قدرت میری مدد پر آمادہ ہے۔ تیز بارش شروع ہوگئی تھی اور چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ مجھے بارش کی بوچھاڑوں میں بھیگتے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں جھک کر چلتا تیزی سے خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھا اور آگے نکل آیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں سے نکلنا میرے لیے اتنا آسان ثابت ہوگا۔ میں نکل آیا تھا مگر اب بھی اس صورتِ حال پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میرے پاؤں میں مقامی طرز کے سینڈل تھے۔ جسم پر وہی پاجامہ کُرتہ تھا جو پچھلے چار پانچ روز سے میرے ساتھ دربدر ہو رہا تھا۔ واسکٹ کا حال دیگر لباس سے ابتر تھا۔

یہ جنگل کی بارش تھی۔ ہر طرف ایک شور برپا تھا۔ دیوہیکل درخت جھوم رہے تھے۔ پانی سے پتوں کے ٹکرانے کی آواز ایک مہیب گونج کی طرح تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ حفاظت کی غرض سے سامنے کی طرف پھیلا رکھے تھے اور حتیٰ

الامکان تیزی سے آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ میں کئی جگہ گرا اور سنبھلا۔ مجھے چوٹیں اور خراشیں آئیں لیکن میں بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کل رات جنگل میں پکارتا ہوا چکور یاد آیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے خود میں اور اس چکور میں مشابہت محسوس ہوئی۔ وہ بھی تو کہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ اَن گنت زمانوں سے سفر کررہا تھا۔ اس کے پر پھڑپھڑاتے تھے اور اس کا بے قرار دل اسے محوِ پرواز رکھتا تھا۔ مجھے بھی کہیں پہنچنا تھا۔ کسی کے پاس جانا تھا۔ کچھ آنکھیں تھیں جن کا انتظار مجھے ختم کرنا تھا۔ وہ میرے پیاروں کی آنکھیں تھیں۔ وہ پتا نہیں کب سے میری راہوں میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا تھا۔ میرے لیے کس کس طرح روئی تھیں اور یہ کوئی دو چار دن کا واقعہ نہیں تھا، نہ ہی دو چار ہفتوں یا مہینوں کا۔ اسے دو سال گزر چکے تھے۔ پتا نہیں کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ خبر نہیں کہ اس بے کراں جنگل سے باہر کیا کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا۔ میرے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں جلد سے جلد ان تاریک درختوں کی حد سے گزر جاؤں۔ کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں مجھے جانے پہچانے منظر نظر آئیں۔ سڑکیں، گاڑیاں، لوگ، بازار......

بھاگتے ہوئے میں عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھا۔ عقب میں کوئی آواز نہیں تھی۔ کوئی روشنی نہیں تھی۔ بس شور مچاتے پانی کی نادیدہ چادر تھی جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی تھی اور جنگل دھاڑ رہا تھا۔ تاریک پانیوں میں میرے پاؤں چھپاچھپ چلتے تھے اور بھیگی ہوئی بیلیں میرے جسم سے الجھتی تھیں۔ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی روشنی دینے والی چیز۔ سلطانہ کی صرف اتنی بات مجھے یاد تھی کہ ندی سے بائیں طرف سفر کیا جائے تو آٹھ میل کی دوری پر ''کچا'' ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیٹ کی حد بھی۔ لیکن کیا اس سے آگے بھی ویرانی ہوگی یا کوئی ایسی آبادی نظر آئے گی جہاں مجھے کوئی مددگار مل سکے گا؟ مجھے لگ رہا تھا کہ آج کی رات شاید میرے فرار کے لیے ہی اس قطعہ زمین پر اُتری ہے۔ کسی حصار سے نکلنے کے لیے اس سے بہتر تاریکی اور کون ہو سکتی تھی۔ مجھے بس اپنا رُخ درست رکھنا تھا اور رُخ درست رکھنے کے لیے میں صرف اپنے وجدان پر بھروسہ کررہا تھا۔

میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ تم ٹھیک رُخ پر جارہے ہو۔ بارش کی بوچھاڑیں اور ہوا اب بھی تمہارے عقب میں ہے اور اس کا عین عقب میں ہونا ہی تمہارے رُخ کو درست قرار دے رہا ہے۔ ایک جگہ میں گرا تو میرے ہاتھ میں ایک لٹھ نما لکڑی آ گئی۔ میں نے یہ لکڑی اُٹھا لی۔ ہاتھ میں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تیز بارش میں جنگلی

جانوروں سے آمنا سامنا ہوتا ہے یا نہیں۔ ہاں...... یہ احساس ضرور تھا کہ عام رات کی نسبت اس طوفانی رات میں زیادہ محفوظ ہوں۔

میں بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رُک جاتا۔ سانس ذرا بحال ہوتی تو پھر دوڑنا یا تیز تیز چلنا شروع کر دیتا۔ جنگل گنجان تھا اور دوڑنے کا موقع بس کہیں کہیں دو چار سیکنڈ کے لیے ملتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری قمیص پھٹ چکی ہے۔ میرا چہرہ شاخوں کے لگنے سے لہولہان ہو چکا ہے اور پاؤں اور پنڈلیوں میں بہت سے کانٹے چبھے ہوئے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں، اذیت کا احساس کہیں نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اب اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ تاریکی، گھنا جنگل، طوفانی بارش۔ یہاں کون کسی کو ڈھونڈ سکتا تھا۔ کون میرے پیچھے آ سکتا تھا؟ میں تاریکی کے سمندر میں ایک تاریک نقطے کی طرح تھا۔ ناقابلِ شناخت، ناقابلِ گرفت۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اچانک اپنے سامنے ایک شخص کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے اور آسمان لاکھوں ٹن پانی سمیت ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ یہی وقت تھا جب زور سے بجلی چمکی۔ چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوئے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ بے شک وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک...... پھر تاریکی چھا گئی۔ بادل زور سے گرجے۔ وہ دوبارہ ہیولا بن گیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں سے دو اور ہیولے نمودار ہوئے۔ ٹارچیں روشن ہوئیں۔ ان کی دودھیا روشنی پانی کی چادر کو چیرتی ہوئی میرے چہرے پر پڑی۔ تب رائفل کاک ہونے کی آواز آئی۔ ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے بائیں جانب سے اُبھری۔ ''ہاتھ اوپر اُٹھاؤ اور زمین پر بیٹھ جاؤ۔''

میری ٹانگوں سے دم تو پہلے ہی نکل چکا تھا۔ میں جھکا اور دوزانو بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی میری ٹانگوں کے اوپر سے چل رہا تھا۔

''اس کا تلاشی لو۔ پاکٹ چیک کرو۔'' ایک اور آواز اُبھری۔ یوں لگا جیسے کوئی انگریز گلابی اردو بول رہا ہے۔

ایک کرخت ہاتھ نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور میری واسکٹ اور قمیص کی جیبیں ٹٹولیں۔ ان میں پانی اور مٹی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

''اس کے ہاتھ پیچھے باندھو۔'' گلابی اردو والے نے پھر کہا۔

میرا ذہن سائیں سائیں کررہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

سلطانہ نے کہا تھا یہ ''سحر کاری'' ہے۔ مجھے جادو کے زور پر پابند کیا گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے صرف ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا تاریکی کے اس سمندر میں مجھے یوں اچانک ڈھونڈ لیا جانا کسی سحر کاری کا نتیجہ ہے؟ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں کسی ایسے خیال کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔

جب ایک شخص نے مجھے اوندھا گرا کر میرے ہاتھ پشت پر موڑنے چاہے تو میرا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اُٹھی اور مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ پتا نہیں کہ میری کمزوری اتنی شدید تلخی اور حدت میں کیسے بدل گئی؟ میں نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور ایک بار پھر اُٹھ کر بھاگنا چاہا۔ میں اسے جرأت نہیں کہوں گا، اسے میری غفلت کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ کم از کم دو رائفلیں میری طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ کوئی گولی میرے جسم میں سوراخ کر سکتی ہے۔ میں نے بمشکل دو تین قدم ہی اُٹھائے تھے کہ ایک گرانڈیل شخص نے مجھے چھاپ لیا۔ میں اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور خود کو چھڑانے کی اندھا دھند کوشش کرنے لگا۔ میں مچھلی کی طرح پھسل کر اس کی گرفت سے نکلا لیکن اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک دوسرے شخص نے زیادہ سختی سے دبوچ لیا۔ میں آتشیں لہجے میں چلّانے لگا۔

''چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو کتو...... مجھے جانے دو...... مجھے میرے گھر والوں کے پاس جانے دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے مار دو ظالمو...... یا مجھے جانے دو۔''

میں جسم و جاں کی پوری قوت سے تڑپ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی سعی کر رہا تھا۔ ان لمحوں میں...... ہاں ان لمحوں میں مجھے لگا کہ شاید سلطانہ اور چوہان وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی اسی طرح یہاں سے نکلنے کی متعدد کوششیں کر چکا ہوں۔ کچھ دھندلے دھندلے سے ہیولے میرے ذہن میں بن رہے تھے۔ یہی تڑپ...... یہی بے قراری...... یہی پھڑ پھڑا کر پنجرہ توڑ دینے کی خواہش۔ کوئی اور وقت تھا۔ کوئی اور لوگ تھے لیکن شاید یہی جنگل تھا اور اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔

مجھے ایک بار پھر زمین پر گرایا گیا اور باندھ دیا گیا۔ میرے پاؤں میں ایک زنجیر ڈالی گئی تھی جس میں عجیب وضع کا تالا لگا ہوا تھا۔ اس تاریک گرجتے برستے اور دھاڑتے جنگل میں، مَیں نے پھر ایک طویل سفر کیا لیکن اس مرتبہ یہ سفر گھوڑے پر تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے کسی بوری کی طرح گھوڑے کی پشت پر اوندھا لٹایا گیا تھا۔ چار گھڑسوار میرے اردگرد تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تیواری لال تھا۔ اسے اس کے ساتھی تیواری بھائی یا تیواری جی

کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ایک دوسرے بندے کا نام ڈیوڈ تھا۔ یہ ایک سفید فام تھا اور گلابی اردو بولتا تھا۔ اس نے انگریزی لباس پہنا ہوا تھا اور برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی رائفل بھی برساتی کے اندر ہی تھی۔ اس کی عمر کوئی تیس پینتیس سال ہوگی۔

مجھے اندازہ ہو کہ مجھے پکڑ کر واپس اسی پڑاؤ میں لے جایا جا رہا ہے جہاں سے میں بھاگا تھا۔ میرے دل و دماغ میں اودھم سا مچا ہوا تھا۔ تیواری لال اور ڈیوڈ کے نام میں نے پہلے بھی سنے تھے۔ چوہان نے بتایا تھا کہ پہلے بھی ایک دفعہ جب میں بھاگا تھا تو مجھے تیواری اور ڈیوڈ پکڑ کر واپس لائے تھے۔ سزا کے طور پر مجھے ایک گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا اور طویل فاصلے تک ننگے پاؤں چلایا گیا تھا۔ آج بھی میں یہی دو نام تواتر سے سن رہا تھا۔ تو کیا مجھے پکڑنے کے لیے خاص طور سے یہی دونوں افراد مامور تھے؟ ڈیوڈ کے علاوہ باقی تینوں افراد مقامی لب و لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ان کی زیادہ تر گفتگو راستے اور موسم کے بارے میں تھی۔ میرا بھاگنا اور پھر انتہائی حیران کن انداز میں پکڑا جانا۔ ان کے لیے جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں تھی۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم واپس پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی مگر بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ تاریک جنگل ہوا کے شور سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے گھوڑے سے اُتارا گیا۔ موہن کمار مجھے دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے میرے منہ پر دو تھپڑ مارے اور پھنکارا۔

''میں حکم جی سے ضرور تیری سفارش کروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تیری دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دی جاویں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''

موہن کمار کی شہ پر مشتعل صادق بھی آگے بڑھا۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ سلطانہ فریاد کرتی ہوئی چھولداری سے نکل آئی۔ ''اس کا کوئی قصور ناہیں۔ یہ اپنے ہوش میں ناہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ تقریباً میرے اوپر گر گئی۔

موہن کمار زہریلے لہجے میں بولا۔ ''بہت پریم ہے تجھے اپنے پتی سے۔ بڑی گھر گرہستن ہے تُو۔ تیرے جیسی دو چار اور جنم لے لیں تو سارا سنسار سورگ بن جائے۔''

اس نے سلطانہ کو اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ ایک گھڑسوار بتیسی نکال کر بولا۔ ''حُسن حاجر ہے محبت کی سجا پانے کو۔ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔''

سلطانہ کو گھسیٹ کر چھولداری میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد مجھے بھی وہاں پھینک دیا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے موم بتی کی مدھم روشنی میں دیکھا، ہاشو سہما ہوا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں کیچڑ میں لت پت تھا، پورے جسم پر خراشیں تھیں۔ سلطانہ

نے خود کو سنبھالا اور اپنی اوڑھنی سے میرے چہرے کا لہو پونچھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اسی دوران میں ایک شخص لوہے کا ایک چھوٹا سا ڈبہ چھولداری میں پھینک گیا۔ اس میں مرہم پٹی کا مختصر سامان تھا میرے سر کا زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے بڑی احتیاط سے میری پٹی کھولی۔ دوا ملے پانی سے میرے زخم کو صاف کیا اور بڑی ہمت سے مرہم وغیرہ لگا کر پھر پٹی باندھ دی۔ تب ہاشو کے ساتھ مل کر اس نے میرے پاؤں اور پنڈلیوں سے کانٹے نکالے۔ کچھ پورے نکل آئے۔ دو چار ایسے بھی تھے جو اندر ہی ٹوٹ گئے۔ میری قمیص کی دھجیاں سلطانہ نے میرے جسم سے علیحدہ کیں۔ ان سے میرے لت پت جسم کو صاف کیا اور مجھے ایک صاف چادر میں لپیٹ دیا۔ اس نے مجھے جنگلی شہد اور ستو پانی میں گھول کر پلایا۔ میں نیم جان تھا۔ تکلیف اور دُکھ کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور میرے سر کے بالوں کو سہلانے لگی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ بالو کو تھپک رہی تھی۔ شاید سردی کے سبب وہ گاہے بہ گاہے کسمسانے لگتا تھا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے سلطانہ کو دیکھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس کے قندھاری رخسار زرد نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں وہی دُکھ تھا جو کسی لڑکی کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے محبوب یا شوہر سے بہت عرصے کے لیے بچھڑ رہی ہو۔

O......❖......O
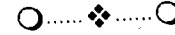
اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے ہی ہم زرگاں پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے نہایت گھنے درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک وسیع بستی تھی۔ یہ ایک ڈھلوان پر واقع تھی۔ اس کے دامن سے مٹیالے پانی والی وہی چھوٹی ندی گزرتی تھی جو ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھی۔ یہاں ہریالی اتنی گہری تھی کہ سیاہی مائل محسوس ہوتی تھی۔ زرگاں کا پھیلاؤ کسی طرح بھی نل پانی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بھی بلند کلسوں اور برجیوں والی کئی ایک شاندار عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک پُرانی طرز کی پُرشکوہ عمارت راج بھون کہلاتی تھی وہ ندی کے عین کنارے پر تھی۔ زرگاں میں مجھے مندروں اور بدھ مندروں کی کثرت نظر آئی۔ مسجدیں شاید دو تین ہی تھیں۔ بارش کے بعد ہلکی دھوپ نکل آئی تھی اور زرگاں میں زندگی رواں دواں تھی۔ بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں سرسبز ڈھلوانوں پر منہ مار رہی تھیں۔ ان کے پیچھے رنگ برنگی پگڑیوں والے لڑکے تھے۔ مال برداری والے جانور راستوں پر گامزن تھے۔ چھوٹے چھوٹے بازاروں میں پھل، سبزی اور دیگر ضروریات زندگی کی دکانیں تھیں۔ گلیوں میں مرغیاں اور بطخیں دوڑتی تھیں اور سانولے بچے شور مچاتے تھے۔

زرگاں پہنچتے ہی مجھے سلطانہ اور ہاشو سے جدا کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت سلطانہ کی بیتابی دیدنی تھی۔ وہ جیسے ساری زنجیریں توڑ کر مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لینا چاہتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان سنگین ترین لمحوں میں بھی اسے خود سے زیادہ میری فکر ہے۔ وہ مجھے تو نہیں چوم سکتی تھی، لیکن میری طرف دیکھ کر اپنے بچے کو چوم رہی تھی۔ آنسو موتیوں کی طرح اس کی شفاف آنکھوں سے گر رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں ڈال کر وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

نیم پختہ سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتی رہیں اور تقریباً دس منٹ بعد میں زرگاں کے سب سے بڑے پگوڈا میں تھا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے لیکن پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ مجھے سہارا دے کر اُتارا گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔ یہاں سنگِ مرمر کثرت سے استعمال ہوا تھا۔ سرخ لباسوں والے بھکشو ننگے پاؤں گھومتے نظر آتے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ احاطے کی ایک جانب مخروطی چھت والی ایک دوسری عمارت تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ مٹھ کی عمارت تھی۔ مٹھ میں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی اور نوعمر طالب علموں کو عبادات کا طریقہ بتایا جاتا تھا۔ احاطے میں موجود کئی لوگ مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کے انداز ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ تاہم میں ان میں سے کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

ایک سوجی سوجی آنکھوں والے بھکشو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہم جانتے تھے کہ تم ایک نہ ایک دن واپس جرور آؤ گے۔ کھس آمدید (خوش آمدید)۔''

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''تم کو عجت راس آ ہی ناہیں سکتی تھی۔ تم بدھا کے اپرادھی ہو۔ تم پر نحوست کی چھایا ہے۔''

مختلف طنزیہ فقروں کے درمیان چلتا میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک گھڑے، ایک پیالے اور مٹی کے دو برتنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچے فرش پر چٹائی بچھی تھی اور تکیے کی جگہ ملائم لکڑی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی میرا بسیرا ہے۔ دو فربہ اندام افراد کوٹھڑی میں آئے۔ یہ اس عبادت گاہ کے ملازم معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے لوہے کا ایک چپٹا کڑا میرے گلے میں ڈال دیا۔ ایک کھٹکے کے ذریعے یہ کڑا لاک ہو گیا۔

وہ رات میں نے اس کوٹھڑی میں تکلیف سے کراہتے ہوئے گزاری۔ اگلی صبح صفاچٹ سر اور چہرے والا ایک جواں سال بھکشو میرے پاس آیا۔ اس کا انداز قدرے دوستانہ تھا۔ اس نے رسمی کلمات ادا کیے۔ '' کیسے ہو مہروز! یار حوصلہ رکھو۔ جیون میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ یہ

سن کر بہت افسوس ہوا کہ سلطانہ کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا ہے۔ ویسے اسے یہاں سے بھاگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہاں رہ کر حالات کا سامنا کرتی۔''

میں اسے نہیں پہچان پا رہا تھا تاہم میں نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ میری چوٹوں پر اظہارِ افسوس کرتا رہا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔ جلد ہی مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں پگوڈا میں میرے ساتھ کافی وقت گزار چکا ہے۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری شکل سے لاگت ہے کہ تم بہت بھوکے ہو۔ ابھی کھانے میں بہت دیر ہے۔ یہ تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول ہیں، کھا لو۔''

اس نے اپنی گیروا چادر کے پلو میں سے مٹھی بھر چاول نکالے اور چپکے سے میری طرف بڑھا دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھکشو دوپہر سے پہلے کچھ نہیں کھاتے اور ابھی دوپہر ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں نے بھی نظر بچا کر تھوڑے سے چاول کھائے۔ گلا بند سا ہونے لگا۔ میں نے گھڑے میں سے پانی اُنڈیل کر پیا۔

ہمیش نے حیرانی سے کہا۔ ''کیا کرت ہو؟ پیالے پر کپڑا کیوں نا ہیں رکھا؟''

ایک دم مجھے یاد آیا۔ چوہان نے بتایا تھا کہ بھکشو پانی کو باریک کپڑے سے چھان کر پیتے ہیں۔

''اوہو...... بھول گیا۔'' میں نے بات بنائی۔

''لگتا ہے کہ تم بہت کچھ بھول رہے ہو۔ تمہاری دماغی صحت ٹھیک نا ہیں لگتی۔''

وہ میرے زخموں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس شخص سے میرے تعلقات کس طرح کے ہیں۔ مجھے کیا بتانا چاہیے اور کیا اس سے چھپانا چاہیے۔ میں گول مول باتیں کرتا رہا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا ہے جو یہاں انڈیا آنے سے پہلے مجھ پر بیتا ہے تو شاید وہ یقین کر لیتا لیکن اگر میں یہ بتاتا کہ اس نئی صورتِ حال میں پچھلے دو سال کی باتیں بھول گیا ہوں تو شاید وہ اسے ایک مذاق سمجھتا یا میرا مضحکہ اُڑانا شروع کر دیتا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود بھی ششدر تھا۔ مجھے بعینہٖ یہی لگ رہا تھا کہ میرے دماغ میں ایک بند دروازہ کھل گیا ہے اور اس دروازے کے کھلنے سے ایک دوسرا دروازہ بالکل بند ہو گیا ہے۔

اچانک ہمیش چونکا۔ وہ دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ''اوہ...... وہ آ رہی ہے۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔'' اس نے کہا۔

میں نے دیکھا۔ سامنے مٹھ کی طرف سے ایک عورت پگوڈا کے صحن میں داخل ہو رہی

تھی۔ اس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کون تھی؟ اور مجھے اس سے کیا ڈر تھا؟

ہمیش تیز سرگوشی میں بولا۔ ''میں جاتا ہوں۔ اگر وہ تم سے کوئی بدتمیزی کرے تو خود جواب نہ دینا۔ چھوٹے گرو جی کے استھان کی طرف چلے جانا۔''

اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا گرو کون ہے اور اس کا استھان کیا ہے؟

میں نامعلوم حالات میں جکڑا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف شناسا سا لوگ تھے لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے مزاج، ان کے رویے اور میرے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت۔ سب کچھ میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہ عجب صورتِ حال تھی۔

عورت تیزی سے چلتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لٹھ تھی۔ وہ غالباً میری یہاں موجودگی سے آگاہ تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے میرے ساتھ کوئی مار پیٹ کر چکی تھی اور ہمیش کو اندیشہ تھا کہ آج پھر اس طرح کا واقعہ ہو گا۔ میرے قریب پہنچ کر اس کی رفتار کچھ سست ہو گئی۔ وہ مجھے بغور دیکھنے لگی۔ اس کی گردن میں مالا کی جگہ لوہے کا ایک کڑا تھا۔ یہ ویسا ہی کڑا تھا جو کل مجھے پہنایا گیا تھا۔ وہ جواں سال عورت تھی اور مقامی بھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سکتہ زدہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اگر میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو وہ صفورا تھی۔ میڈم صفورا۔ وہی جواں سال دبنگ عورت جو لاہور ائرپورٹ کے قریب واقع لال کوٹھیوں میں مختارِ کل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بوائے کٹ بال اپنی مثال آپ تھے۔ وہ نہایت قیمتی پینٹ شرٹ پہنتی تھی اور اس کی چال میں ایک شاہانہ دبدبہ تھا لیکن آج یہاں پگوڈا کی اس عجیب و غریب عمارت میں وہ ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آ رہی تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طیش کی ہلکی ہلکی سرخی اُبھر آئی تھی۔ میں نے سوچا شاید ہمیش کا اندیشہ ٹھیک ہے۔ یہ مجھ پر حملہ کرنے جا رہی ہے۔ چند سیکنڈ تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ پھر بتدریج صفورا کی آنکھوں کی سرخی ماند پڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک طرح کی نمی نے لے لی۔

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ''تو آخر تم واپس آ ہی گئے۔''

میں خاموش رہا۔

وہ اندر کوٹھڑی میں چلی آئی اور چٹائی پر بیٹھ کر کھردری دیوار سے ٹیک لگا لی۔ میں کچھ

دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر میں بھی چٹائی کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ پر نگاہیں جمائے ہوئے بولی۔ ''تمہیں دیکھتی ہوں تو سینہ جل اُٹھتا ہے، خود پر بس نہیں رہتا...... حالانکہ جانتی ہوں تم...... نادیہ کی موت کے براہِ راست قصوروار نہیں ہو۔ اس کا اصل مجرم تو وہی خبیث بازی گر تھا۔''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں، تاہم بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ میرا یہ اندیشہ بالآخر درست ثابت ہوا تھا کہ نادیہ جانبر نہیں ہو سکی۔ وہ اس رات مرگئی تھی اور اس کی موت ہی تھی جس نے سیٹھ سراج، شیرے اور دیگر لوگوں کو شعلہ جوالا بنا کر ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس خوفناک تعاقب کا انجام بالآخر ڈیک نالے پر ہوا تھا جہاں عمران کو رائفل کا برسٹ لگا تھا اور وہ اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ لے کر تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ کتنی بھیانک تھی وہ رات......

ہاں...... نادیہ مرگئی تھی اور اس کی بہن جو اسے بے پناہ پیار کرتی تھی۔ آج یہاں اس پگوڈے کی کوٹھڑی میں گیروا لباس پہنے میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا بے پناہ غم کروٹیں لے رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟'' میڈم صفورا نے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نگاہیں جھکا لیں۔ وہ بولی۔ ''تمہارے یہاں پگوڈا سے جانے کے بعد کافی کچھ تبدیل ہوا ہے اور سچ پوچھتے ہو تو میں بھی اس ایک ڈیڑھ برس میں بہت بدل گئی ہوں۔ میرے اندر تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں نے اپنے غم اور غصے سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ پہروں اکیلی بیٹھی گزرے واقعات پر غور کرتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔ نادیہ کی موت کے حوالے سے میری بڑی غلطی شاید یہی تھی کہ میں نے سلیم کو نادیہ کے پاس رہنے دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نادیہ خطرناک حد تک ضدی ہے اور سلیم کی جان بھی لے سکتی ہے۔ سلیم کی موت کے بدلے میں نادیہ کو اپنی جان دینا پڑی اور نادیہ کے بدلے میں کچھ اور جانیں گئیں۔ ان میں سے مجھے تمہاری والدہ کی موت کا واقعی افسوس ہے۔ یہ سراسر سراج کا ذاتی فعل تھا۔ مجھے سراج کی طرف سے اندیشہ تھا۔ میں نے اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ تمہاری بیمار والدہ کے ساتھ کسی طرح کی سختی نہ کی جائے لیکن سراج اکثر اپنی من مانی کرتا تھا۔ کئی دفعہ وہ نادیہ کو بہکانے کا بھی سبب بنتا تھا۔ اس نے وہاں ڈیفنس کی کوٹھی میں بھی اپنی مرضی چلائی۔ بہرحال اب اپنے واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔''
صفورا نے آہ بھر کر چہرہ دروازے کی طرف پھیر لیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پگوڈا کے اندر لوبان سلگایا جا رہا تھا۔ اس کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہم تک پہنچنے لگی۔ صفورا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''اس شام میں نے تم سے بہت زیادتی کی۔ مجھے شاید ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں لگنے والی ان چوٹوں کے لیے مجھے رنج ہے۔''

میں کیا جواب دیتا۔ اس بارے میں میرے ذہن کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔ وہ کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی، تب اس کی آواز اُبھری۔ ''تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ کہو۔ شاید میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ تم جانتے ہو، ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہمارے دُکھ سانجھے ہیں۔''

''میڈم! آپ کو یہاں اس حالت میں دیکھ کر میرا دماغ سن ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے پچھلے دو سال میں پہلی بار میرا نام لیا ہے۔ کیا...... تم مجھے...... ٹھیک سے پہچان رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں میڈم! میں آپ کو پہچان رہا ہوں اور ان سارے حالات کو بھی جو یہاں پہنچنے سے پہلے پیش آئے تھے۔''

میڈم صفورا کے چہرے پر خوشی کی مدھم چمک نمودار ہوئی۔ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بغور میرے سر پر بندھی پٹی کو دیکھنے لگی۔ ''کیا تم کہیں سے گرے ہو؟ مم...... میرا مطلب ہے تمہارے سر پر پھر چوٹ لگی ہے؟''

''ہاں...... کچھ دن پہلے ایسا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ پچھلے چند روز میں کچھ عجیب صورتِ حال ہوئی ہے۔ دو سال پہلے کے سارے حالات مجھے بتدریج یاد آ رہے ہیں۔ میں اب پورے وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ میں کن حالات میں یہاں پہنچا۔

میڈم نے تصدیق کے لیے مجھ سے کئی ایک سوالات کیے اور اس کی حیرانی میں اضافہ ہو گیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ اس نئی صورتِ حال میں ماضی قریب کی باتیں میرے ذہن سے یکسر نکل گئی ہیں تو وہ مزید حیران ہوئی اور تعجب سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے آگاہ کیا کہ مجھے بتایا جا رہا ہے کہ میں پچھلے قریباً دو برس سے یہاں

ہوں لیکن اب یوں لگتا ہے کہ ان دو برسوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اس پردے کی دوسری طرف مجھے ایک دھندلی حرکت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

میرا خیال تھا کہ وہ یقین نہیں کرے گی لیکن وہ بڑے دھیان سے میری باتیں سنتی رہی اور میری عجیب ذہنی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہیں چند دن آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تم خود کو بہتر محسوس کرو گے۔''

''میں اب بھی خود کو بہتر محسوس کرتا ہوں۔ بس کسی وقت سر میں شدید درد ہوتا ہے اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگتی ہے۔''

میڈم صفورا کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلانے لگے تھے۔ ان سوالات میں سے کچھ کا تعلق پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے تھا اور کچھ کا یہاں کے حالات سے۔ مجھے ابھی تک صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ ہمیں کچھ نامعلوم لوگوں نے بدھا کے مجسمے کی چوری کی پاداش میں پکڑا تھا اور یہاں پہنچایا تھا اور یہ سب کچھ بطور سزا کیا گیا تھا مگر اس بارے میں تفصیلاً کچھ بھی میرے علم میں نہیں تھا۔ میں میڈم صفورا سے یہ سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ خاص طور سے پاکستان اور لاہور کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہاں میری بے ہوشی کے فوراً بعد کیا کچھ رُونما ہوا تھا۔ میرا بھائی اور بہن کہاں تھے؟ اقبال اور عارف پر کیا گزری تھی اور میرا دوست عمران، وہ یاروں کا یار وہ جاں نثار...... وہ غم خوار کیا ہوا تھا۔ کس تاریکی میں چھپ گیا تھا؟ پتا نہیں کیوں میں جب بھی عمران کے بارے میں سوچتا، میرے دل کے اندر کہیں گہرائی میں یہ انہونی آس ضرور جاگتی تھی کہ وہ ہر مشکل کو شکست دینے والا شاید اس رات موت کو بھی شکست دینے میں کامیاب رہا ہو۔

چھ بھکشو ایک جتھے کی صورت میں پگوڈا سے نکلے۔ ان کے آگے ایک تنومند گرو تھا۔ انہیں دیکھ کر میڈم صفورا ٹھٹکی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔ میں چھوٹے گرو سے کہوں گی کہ تمہیں کچھ دن تک خدمت سے چھٹی دی جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ میرے پاس بھی تمہارے اور سلطانہ کے لیے بہت سے سوال ہیں لیکن اس بات چیت کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ اچھا...... میں چلتی ہوں۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے بھکشوؤں کے جتھے کی طرف دیکھا پھر پگوڈا کے مرمریں احاطے میں بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی مٹھ کی عمارت کی طرف نکل گئی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہ گیا۔ نادیہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ میں کل ب اس کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں چند گھنٹے بعد میڈم صفورا ے میری ملاقات ہو گی اور اس کی زبانی مجھے نادیہ کی موت کی خبر ملے گی۔ حالات بڑی تیزی ے رُونما ہو رہے تھے۔

نادیہ کو میں نے آخری بار ہسپتال کے آئی سی یو میں دیکھا تھا۔ اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ وہ سفید بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس وقت وہ کروڑپتی میڈم صفورا کی لاڈلی بہن نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے جسم میں بجلیاں کوندتی تھیں، نہ ہی اس کی آنکھوں میں دعوے کے لشکارے تھے۔ وہ صرف ایک مریضہ تھی۔ دھیرے دھیرے موت کی طرف سرکتی ہوئی، اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہوئی اور آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے انجام تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مردوں کا شکار کرتی تھی لیکن اس نے جس آخری مرد کو شکار کرنا چاہا تھا، وہ اپنی فطرت میں انوکھا تھا۔ وہ اس کی حریص آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا گیا تھا اور شاید...... خود بھی بجھ گیا تھا۔

O......❖......O

بھکشو اور ان کا گرو ننگے پاؤں چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ گرو نے اپنی سوجی آنکھوں سے مجھے سرتاپا گھورا پھر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''سیڑھیوں پر چلو۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اپنی جگہ متحیر کھڑا رہا۔ ایک چیلا کرخت لہجے میں بولا۔ ''سنتے ناہیں، گروجی کیا کہوت ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اس خاص سمت میں جانے کو کہا جا رہا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے تیور دیکھے اور چل پڑا۔ پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی۔ مجھے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں بمشکل ڈیڑھ دو فٹ کا قدم ہی اُٹھا پا رہا تھا۔ وہ سب میرے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ جلد ہی ہم پگوڈا کی سفید سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ یہ قریباً چالیس سیڑھیاں تھیں جو پگوڈا کے صحن سے نیچے اُترتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر کئی بھک منگے بیٹھے تھے اور آتے جاتے زائرین سے خیرات وصول کر رہے تھے۔ مالائیں، پھول اور تبرکات بیچنے والے دیگر افراد بھی یہاں موجود تھے۔

مجھے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ کوئی تماشہ ہونے والا ہے۔ پھر ایک دم مجھے چوہان کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ مجھے اور چوری کے دیگر مجرموں کو سزا کے طور پر بلا ناغہ پگوڈا کی سیڑھیوں پر لٹایا جاتا ہے اور انہیں بید مارے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے گناہوں کو دھونے کا عمل ہے۔

بدھا کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ اس عمل سے چوری کا ارتکاب کرنے والوں کو جو جسمانی تکلیف پہنچے گی، وہ انہیں پوتر ہونے میں مدد دے گی۔

مجھے پگوڈا کی سیڑھیوں پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ میری پشت سے قمیص اُٹھا دی گئی۔ درجنوں نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ بے عزتی کے احساس سے مجھے پسینہ آ گیا۔ ایک شخص جو بھکشو نہیں تھا، ایک لکڑی تھامے برآمد ہوا۔ یہ بید کی لکڑی نہیں تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ برگد کی شاخ تھی جسے مقدس تیل میں بھگویا جاتا تھا۔

اس لکڑی سے میری کمر پر یکساں وقفوں سے دس ضربیں لگائی گئیں۔ یہ ہلکی ضربیں تھیں اور نہ شدید تھیں۔ ان ضربوں نے مجھے جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی اذیت دی۔ مجھے اُٹھا کر پھر سے خستہ حال کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ میری کمر پر جلن تھی اور زخمی پنڈلیوں اور پیروں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ سر کے زخم سے بھی لہو کا تھوڑا تھوڑا رساؤ جاری تھا۔ اپنی حالت پر مجھے خود ترس آنے لگا۔ ایک بھکشو نے مجھے مرہم پٹی کا کچھ سامان دیا اور بے اعتنائی سے منہ موڑ کر واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہمیش آ گیا۔ اس شخص کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔ وہ میرے لیے بھی گیروا لباس لے کر آیا تھا۔ یہ دو چادروں پر مشتمل تھا۔ اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کی اور لباس بدلنے میں بھی میری مدد کی۔ اس نے بتایا کہ بدھ کی دوپہر کو میرا سر بھی مونڈ دیا جائے گا۔

میرا حلیہ عجیب وغریب ہو گیا تھا لیکن پتا نہیں کہ وہ مجھے زیادہ عجیب نہیں لگ رہا تھا۔
شاید میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی اور مجھے یہاں کے حالات اور واقعات دھیرے دھیرے یاد آنا شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوپہر کو کھانا کھایا گیا۔ پھر پگوڈا کے وسیع صحن میں مختلف عبادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شام کو بڑے بڑے نقارے بجائے گئے اور سوتر پڑھے گئے۔ وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ رات کی تاریکی میں پگوڈا کا اندرونی منظر بڑا عجیب تھا۔ مخروطی دروازوں میں سے شمعوں کی روشنی چھلک چھلک کر باہر آتی تھی اور بھکشو پُراسرار سایوں کی طرح حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پگوڈا کے اندرونی دروازے کے سامنے میں نے ایک ننگ دھڑنگ سادھو کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور وہ گاہے بہ گاہے اس میں کچھ پھینکتا تھا جس سے آگ سے بہت سی چنگاریاں نکلتی تھیں۔ گیروا لباس والی ایک لڑکی ہولے ہولے اس آگ کے گرد چکر کاٹتی تھی۔

شاید یہ کوئی سحر کاری تھی۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر پرسوں رات کے تہلکہ خیز مناظر تازہ ہو گئے۔ نہایت گھنا اور تاریک جنگل، نہایت تیز بارش اور پھر کچھ لوگوں کا اچانک میرے سامنے آ جانا۔ مجھے ڈھونڈ لینا۔ جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کر لی جائے۔ کیا واقعی وہ کوئی جادو تھا؟ میرا ذہن یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

اگلی صبح پھر صفورا سے ملاقات ہو گئی۔ اس دور دراز مقام پر ان اجنبی در و دیوار میں میڈم صفورا کا مجھ سے ملنا جتنا حیرت ناک تھا، اتنا ہی ناقابلِ فہم بھی تھا۔ وہ کیا تھی اور کیا بن کر یہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اس جیسی دبنگ عورت کو اُٹھا کر یہاں پٹخا تھا۔ ابرار صدیقی کو یہاں پٹخا تھا اور مجھے بھی؟ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور شاید اس کی کیفیت بھی یہی تھی۔

صبح کی اولین گھڑیوں میں جب بھکشو اور ان کے گرو حضرات صبح کی مناجات کے بعد پھر سے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے، ہمیں وہ تنہائی میسر آ گئی جس کی ضرورت تھی۔ میں اور میڈم صفورا کوٹھڑی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میڈم صفورا کی آنکھوں میں غم واندوہ کے گہرے نشان جیسے نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ زندگی میں کبھی مسکرائی ہی نہیں ہے۔ وہ ایک دم اپنی اصل عمر سے دو تین سال بڑی لگنے لگی تھی۔ جب میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا، وہ قریباً پچیس کی لگتی تھی۔ اگر یہ انہونی ہو چکی تھی کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ دو سال ہو چکے تھے تو پھر صفورا کی عمر چھبیس ستائیس لگنی چاہیے تھی مگر وہ ایک دم تیس کی لگ رہی تھی۔ تاہم اس کا جسمانی دم خم اسی طرح موجود تھا اور گہرے سرخ ہونٹوں کی شادابی بھی مکمل اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ ”تابش! میں نے تم سے جو رویہ رکھا ہے اس کے لیے میں ایک بار پھر تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ میرا صدمہ بہت گہرا تھا، مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں تھا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اگر میں یہ کہوں کہ مجھے آپ کے رویے کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تو آپ یقین نہیں کریں گی لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”ہاں...... کل تم نے جو کچھ اپنے بارے میں بتایا ہے اس سے مجھے کافی باتوں کی سمجھ آئی ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر تمہاری یادداشت واپس آئی

ہے تو بہت جلد مکمل طور پر واپس آ جائے گی۔ تم اپنے اردگرد کی چیزوں اور چہروں پر غور کرو۔ انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے رہو، بہت جلد تمہیں باتیں یاد آنے لگیں گی۔''

میں نے اپنی پیشانی کو مسلا۔ میں ذہن پر زور دیتا تھا تو کنپٹیوں میں ٹیسیں سی اُٹھنے لگتی تھیں۔

میڈم صفورا نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا ہے، تم یہاں کیسے پہنچے تھے؟''

''نہیں...... مجھے معلوم نہیں۔ کچھ معلوم نہیں۔ پلیز میڈم! مجھے شروع سے بتائیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں لاہور سے یہاں انڈیا کے اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا؟ کن لوگوں نے پہنچایا؟ اور...... اور آپ کیسے پہنچیں یہاں؟ اور ابرار صدیقی؟ اتنا بڑا واقعہ کیسے ہوا میڈم؟''

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بے خیالی میں اپنے گلے کے آہنی کڑے کو سہلا رہی تھیں۔ اس کڑے پر سنسکرت یا اس سے ملتی جلتی زبان کے کچھ لفظ لکھے تھے۔

وہ گہری دُکھ بھری سانس لے کر بولی۔ ''نادیہ اپنے دوسرے آپریشن کے دوران میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ گولی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بُری طرح زخمی کیا تھا۔ تم جانتے ہی ہو، اس کا نچلا دھڑ بالکل بے حس ہو گیا تھا۔ تمہارے اس قاتل دوست نے میری زندگی کو جس طرح برباد کیا ہے، میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ وہ خبیث بہت زیادہ سازشی دماغ کا مالک تھا۔ اس نے گہری سازش کی۔ سرکس کے اسپیشل شو میں میری بہن کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری اور ظاہر یہ کیا کہ وہ خود اپنی گولی کا شکار ہوئی ہے۔ قدرت نے اس کا بھانڈا پھوڑا اور اس کے لیے تم ذریعہ بن گئے۔ تم نے رشید اور تابندہ وغیرہ کے گھر میں بخار کی حالت میں جو کچھ کہا، اس نے پول کھول دیا۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ اس کی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کے آگے ڈال سکتی۔ کاش میرے بس میں ہوتا۔''

میڈم صفورا کی آنکھوں سے جیسے لہو ٹپکنے لگا۔ اس کے ماتھے کی رگیں اُبھر آئیں۔ یوں لگا کہ ان لمحوں میں وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہی۔ اس نے میری طرف سے بھی نگاہیں پھیر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے نارمل ہوئی تو بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ہر بُرے سے بُرے کام میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ میں کچھ لوگوں کے جبر کا شکار ہو کر لاہور سے یہاں پہنچ گئی۔ یہ بہت بُرا ہوا لیکن اس میں شاید ایک نکتہ اچھائی کا بھی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اگر میں نادیہ کی موت کے بعد وہاں لاہور میں رہتی تو پتا نہیں کیا کچھ کر گزرتی۔ عین ممکن تھا کہ اس خونی (عمران) کے بعد اس کے گھر والے، اس کے بہن

بھائی بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔ میری ذہنی کیفیت ان دنوں کچھ ایسی ہی تھی۔ میں ان کو بالکل نہیں چھوڑتی۔'' میڈم صفورا کی سرخ آنکھوں میں اشکوں کی نمی چھلکنے لگی۔

اس کا طیش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس عبادت گاہ میں میڈم صفورا کا رویہ مجھ سے بہت تلخ رہا ہو گا اور عین ممکن ہے کہ شروع شروع میں اس نے میری جان لینے کی کوشش بھی کی ہو۔

وہ چادر کے پلو میں چہرہ چھپا کر خاموش آنسو بہانے لگی۔ میں چپکا بیٹھا رہا۔ سورج دھیرے دھیرے مٹھ (مدرسے) کی مخروطی چھت کے عقب سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنوں میں پگوڈا کے سنہری کلس اور کام دار دروازے چمک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میڈم صفورا کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے گیروا چادر کا پلو چہرے سے ہٹا لیا۔ میں نے اسے مٹی کے پیالے میں پینے کے لیے پانی دیا۔ اس نے پانی پیا اور ایک بار پھر کھردری سفید دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کے چہرے پر کرب آمیز تردد کی پرچھائیاں موجود تھیں۔

اس نے ہولے ہولے کہنا شروع کیا۔ ''دراصل ہم ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکے کہ بدھا کا وہ مجسمہ کچھ لوگوں کے لیے کتنا اہم ہے اور وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ اندازے کی بہت بڑی غلطی تھی، بہت بڑی غلطی......''

اس نے ایک آہ بھری اور جیسے کسی سوچ میں کھو گئی۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''وہ مجسمہ جو ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جسے بعد میں، مَیں نے تمہارے اس قاتل دوست کے ذریعے صدیقی کے فلیٹ سے نکلوایا تھا۔ کوئی عام مجسمہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تفصیل میں جاؤں گی تو بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ یہ شاندار مجسمہ برما سے یہاں پہنچا تھا۔ یہ کئی سو سال سے برما کے ایک شاہی خاندان کے پاس تھا۔ اس مجسمے کی شہرت یہ تھی کہ یہ اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ ماضی میں کئی طرح کے حادثات اس پر گزرے لیکن یہ ہمیشہ محفوظ ہی رہا۔ نہ صرف خود محفوظ رہا بلکہ اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی محفوظ رکھا۔ اس کی آخری مثال دوسری جنگِ عظیم میں سامنے آئی۔ برما کا وہ پہاڑی قصبہ بھی شدید جنگ کی زد میں تھا جہاں ایک بدھ مندر کے اندر یہ مجسمہ موجود تھا۔ علاقے کے لوگوں کو اس مجسمے کی کرامات پر اتنا یقین تھا کہ جاپانیوں کے کئی شدید حملوں کے باوجود لوگ قصبہ چھوڑ کر نہیں گئے اور بدھ مندر کے اردگرد پناہ گزیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے جب بھی قصبے پر ہلا بولنے کی کوشش کی، شدید طوفانی بارش یا خراب موسم کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ کر سکے اور ناکام واپس لوٹ گئے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ عین حملے کے موقع پر

ان پر برطانوی فوجیوں نے کسی اور طرف سے حملہ کر دیا اور قصبے کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلا۔ بعدازاں قصبے کے لوگ خود بھی قصبہ چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے گئے۔ جاپانی فوجیوں نے گولہ باری سے پورا قصبہ کھنڈر کر دیا۔ بدھ مندر بھی تہس نہس ہو گیا۔ اس کے اندر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی تباہی سے نہیں بچ سکی لیکن یہ مجسمہ جوں کا توں رہا۔ اسے خراش تک نہیں آئی۔ بعد میں اس قصبے پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ایک انگریز میجر اسٹیفن اس نادر روزگار مجسمے کو بڑی احتیاط سے انڈیا لے آیا۔ حکم جی کے دادا رائے سوم آنند بہادر سے مسٹر اسٹیفن کی گہری دوستی تھی۔ لہٰذا اس انوکھے مجسمے کو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے بڑے پگوڈا کی زینت بنا دیا گیا۔''

میڈم صفورا نے محتاط نظروں سے کوٹھڑی سے باہر جھانکا کہ کوئی اردگرد تو موجود نہیں پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج سے تین سال پہلے یہ مجسمہ یہاں زرگاں کے پگوڈا سے چوری ہوا۔ اس چوری نے بدھ مت کے پیروکاروں میں تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے تہیہ کیا کہ وہ مجسمے کو بہرصورت ڈھونڈیں گے اور واپس لائیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ مجسمہ جہاں بھی ہوگا، محفوظ ہوگا کیونکہ وہ برمی زبان کے مطابق ''آرا کوئے'' ہے۔ یعنی اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے سات ایسے افراد چنے جو اس مجسمے کو واپس لانے کے لیے اپنی جان لٹانے کو تیار تھے۔ ان کے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ کے پانچ نہایت خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈوز بھی شامل ہوئے۔ ان کمانڈوز کا سربراہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر رنجیت پانڈے تھا۔ رنجیت پانڈے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے عزرائیل کا دوسرا نام ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس پانڈے کی مطلوبہ رقم موجود ہے تو وہ پانڈے سے دنیا کے کسی بھی محفوظ ترین اور وی وی آئی پی شخص کو قتل کرا سکتا ہے۔ اسے ایک بلا کہا جاتا ہے۔ ایسی بلا جو بہت جلد خود ختم ہو جائے گی یا پھر اس کے ہاتھوں کئی اہم ترین لوگ ختم ہو جائیں گے۔ پانڈے کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ صرف بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔

ہماری بدقسمتی کہ جو لوگ گندھارا آرٹ کے اس مجسمے کو پاکستان سے واپس لانے کے لیے انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوئے، ان کا لیڈر یہی رنجیت پانڈے تھا۔ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے تیزی سے تفتیش کی اور صرف تین چار ہفتے کے اندر مجسمے کے آس پاس پہنچ گئے۔ یہ مجسمہ کم از کم چھ سات ہاتھوں سے ہو کر ابرار صدیقی تک آیا تھا اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ان سات آٹھ افراد میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ پیس یعنی مجسمہ کچھ لوگوں کے

لیے کتنا قیمتی ہے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا، ابرار صدیقی نے پہلے یہ ''پیس'' لاہور میں رکھا ہوا تھا۔ وہاں اسے شک ہوا کہ کچھ مشکوک لوگ اس کے اردگرد موجود ہیں۔ وہ پیس کو لاہور سے اُٹھا کر جہلم لے گیا اور بڑی راز داری سے اسے اپنے فردوس پلازہ والے فلیٹ میں چھپا دیا۔ اس فلیٹ سے یہ ''پیس'' تمہارے اس قاتل دوست عمران نے حاصل کر لیا اور میرے پاس لال کوٹھی میں لے آیا۔ ہم اپنی کامیابی پر خوش تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ اس کامیابی کے ساتھ ساتھ کتنی بڑی مصیبت ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے کمانڈوز نے ابرار صدیقی کے فلیٹ تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے ابرار کے ایک محافظ کو قتل اور دوسرے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ابرار صدیقی لاپتا ہو گیا تھا۔ دراصل وہ پانڈے کے خوفناک شکنجے میں تھا۔

نادیہ کی موت کا پانچواں روز تھا۔ جب رات کے وقت پانڈے اور بھانڈیل اسٹیٹ کے نہایت خطرناک کمانڈوز لال کوٹھی میں گھس آئے۔ ان کے ساتھ بدھ مت کے وہ چند جنونی پیروکار بھی تھے جنہوں نے مقدس مجسمے کے حصول کے لیے اپنی جان واقعی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ آگے کے حالات کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ ان لوگوں نے نہ صرف وہ پیس حاصل کیا بلکہ مجھ پر بھی رائفلیں تان لیں۔ اس رات کی شدید خونی کشمکش میں میرے تین باڈی گارڈز میری آنکھوں کے سامنے اپنی جان ہار گئے۔ عارف خان کو گولی لگی اور تین چار افراد شدید زخمی ہوئے۔ میری چلائی ہوئی ایک گولی ایک کمانڈو کی گردن سے پار ہو گئی لیکن وہ حیران کن طور پر زندہ رہا۔ وہ لوگ مجھے مجسمے سمیت لاہور ہی کی ایک نامعلوم چار دیواری میں لے گئے۔ یہ غالباً ماڈل ٹاؤن کی کوئی بہت پُرانی کوٹھی تھی۔ اس میں کسی انگریز میاں بیوی کی قبریں بھی تھیں۔ مجھے ایک تہہ خانے میں رکھا گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ وہاں ایڈووکیٹ ابرار صدیقی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کے جسم پر ابھی تک کالا کوٹ اور سفید پتلون تھی۔ وہ کوئی معمولی بندہ نہیں لیکن اس وقت بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔

مجھ پر بھی جسمانی تشدد کیا گیا۔ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جنہوں نے مقدس مجسمہ جہلم کے فلیٹ سے چرا کر میرے پاس پہنچایا تھا۔ میں نے انہیں سچ بتانے میں ہی بہتری سمجھی۔ نہ بھی بتاتی تو انہیں معلوم ہو ہی جانا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا، اقبال اور عمران وغیرہ کا نام بتا دیا۔'' میڈم بُری طرح کھانسنے لگی۔ مسلسل بولنے سے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

''میں ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دراصل تم...... سراج اور شیرے وغیرہ کے پاس تھے۔ تمہیں مجید مٹھو والے خالی مکان میں رکھا گیا تھا۔ چوٹ لگنے کے بعد تم اپنے حواس میں نہیں تھے۔ نہ کسی کو پہچانتے تھے نہ بات کرتے تھے۔ پانڈے کے لوگ اسی حالت میں تمہیں مجید مٹھو کے مکان سے پکڑ لائے اور ہمارے ساتھ ماڈل ٹاؤن کے تہہ خانے میں بند کر دیا۔''

میں نے ذہن پر زور دیا لیکن ایک دبیز دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کوئی ہلکا سا خیال بھی ذہن میں نہیں اُبھرتا۔''

''ہاں...... تمہاری چوٹ کافی شدید تھی۔ پورے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوج کر نیلی ہو چکی تھیں۔ دیکھ کر خوف آتا تھا۔''

میں نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ ''میڈم! آپ نے کہا ہے کہ ہم سب اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ کیا میں آپ سے امید رکھوں کہ آپ مجھے شدید ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے میرے ایک سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیں گی؟''

''ہاں...... پوچھو۔''

''میڈم! میری بہن اور بھائی کا کیا ہوا؟''

''میں جانتی تھی، تم یہی پوچھو گے۔ ان دونوں کے بارے میں میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تو بُری بھی نہیں۔ بلکہ تم اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اچھی خبر بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہاری والدہ والے واقعے کے چار پانچ روز بعد تک وہ دونوں سراج کے ہتھے نہیں چڑھے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ لاہور میں تھے ہی نہیں۔ شاید کراچی کی طرف نکل گئے تھے۔ پانچویں روز میں خود پانڈے وغیرہ کے ہاتھوں بے بس ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے کسی کے حالات کا کچھ پتا نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔''

''اور میری والدہ...... میرا مطلب ہے کہ ان کی میت؟'' میں نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔

''انہیں کوٹھی کے احاطے میں ہی دفنایا گیا تھا۔''

''دفنایا گیا تھا یا دبایا گیا تھا؟'' میں نے کربناک لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں تفصیل معلوم نہیں۔'' میڈم نے نظریں چرائیں۔

میرا دل دُکھ سے لبریز ہو گیا۔ تو کیا میری ماں کو کفن بھی نہیں مل سکا تھا کیا واقعی ایسا ہوا

تھا؟

میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ میڈم بھی خاموش رہی۔ گئے وقت کا کرب ایک مہیب لہر کی طرح ہم دونوں کے درمیان موجزن رہا۔ آخر میڈم صفورا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہارے ذہن میں یہ سوال اُبھر رہا ہوگا کہ پانڈے جیسے سفاک شخص نے ہمیں قتل کیوں نہ کیا؟ یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر وہیں کیوں نہ پھینک آیا؟ ہمیں اپنے ساتھ یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لایا؟''

یہ سوال واقعی بڑی شدت سے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ میں نے بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ایک دم چپ رہ گئی۔ پگوڈا کے مین دروازے سے تین افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں بھکشو کوئی نہیں تھا۔ دو مقامی تھے۔ ایک انگریز تھا۔ وہ درمیانی عمر اور اچھے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ اس نے بھی مقامی لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ پاجامے کُرتے اور انگرکھے پر مشتمل تھا۔ پگوڈا کے احترام میں وہ اور اس کے ساتھی ننگے پاؤں چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ قریب پہنچے تو مجھے سفید فام شخص کے چہرے پر نقش خباثت اور سفاکی دکھائی دی۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں یقیناً ایک جاہ طلب حریص شخص کی آنکھیں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جارج گورا ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوگیا۔

جارج نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا اور بولا۔ ''کورتی کے ساتھ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ کیا ایک بار پھر تم یہاں سے بھاگنا مانگتا ہے؟''

وہ حیران کن طور پر صاف اردو بول رہا تھا۔ بس لہجے کا فرق تھا۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جارج کا ساتھی، مقامی شخص بولا۔ ''صاحب! موہن کمار جی نے شاید ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دینی چاہئیں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

دوسرا شخص جو سانولی رنگت کا تھا، کرخت آواز میں بولا۔ ''اوئے! دیکھتے ناہیں ہو کہ صاحب بہادر آئے ہیں۔ کیسے گنواروں کی طرح پھسکڑا مارے بیٹھے ہو۔ کھڑے ہو جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔

میں کھڑا ہو گیا۔ سانولا شخص پھر گرجا۔ ''دیدے کیوں پھاڑت ہو؟ نیچے دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ بہت زوردار تو نہیں تھا لیکن شاید ہاتھ بھاری تھا یا کیا وجہ تھی۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور تیزی سے خون کے قطرے گرنے

لگے۔ جارج اور اس کے دونوں ساتھی مجھے مسلسل خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

پہلا شخص جارج کو بھڑکانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ اس حرافہ کے کرتوتوں میں برابر کا شریک ہے جی! اوپر سے گھنا بنا رہتا ہے۔ اندر سے سب کچھ جانت ہے۔''

جارج نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں مجھے اپنے لیے رقابت کی جھلک نظر آئی۔ غالباً اس رقابت کا سرچشمہ سلطانہ ہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق جارج، سلطانہ کے پیچھے تھا اور سلطانہ نے جارج کی جارحیت سے بچنے کے لیے آناً فاناً مجھے اپنا شوہر بنا لیا تھا۔ اب وہ میری بیوی تھی اور میں اس کے بچے کا باپ تھا۔ کہنے والے تو یہی کہہ رہے تھے اور یہی صورتِ حال تھی جس نے جارج کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ رقابت بھر دی تھی۔

یکا یک جارج اور اس کے ساتھی چونکے۔ ایک فربہ اندام گرو اچانک ہی کوٹھڑی کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے صفاچٹ چہرے پر جھریاں اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے دانوں والی بڑی مالائیں اس کے اونچے رُتبے کو ظاہر کرتی تھیں۔ وہ ہاتھ میں عصا لیے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو بھکشو ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

جارج نے گرو کو مقامی انداز میں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ گرو نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ تاہم گرو کے چہرے پر برہمی کے آثار موجود تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے ضعیف آواز میں دریافت کیا۔

''کچھ ناہیں گرو جی! یہ بدتمیزی کر رہا تھا۔'' گہرے سانولے رنگ والے شخص نے کہا۔

''تم نے اسے کیا مارا ہے؟'' گرو کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

''کچھ ناہیں گرو جی!'' اس مرتبہ جارج نے جواب دیا۔ ''یہ فضول بول رہا تھا۔ تیواری نے تھپڑ مارا ہے۔''

آج میں دن کی روشنی میں پہلی بار دھیان سے تیواری کی شکل دیکھ رہا تھا۔ گہری رنگت والا یہ شخص کسی شکاری کتے کی طرح چوکنا اور خبردار تھا۔ شاید اس کا کام ہی یہاں سے بھاگنے والوں کو پکڑنا تھا۔

گرو کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ جارج کے جواب سے بالکل مطمئن نہیں ہوا۔ وہ ناراض لہجے میں بولا۔ ''میں ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہوں کہ یہ بدھ مندر ہے۔ یہ پریم اور آشتی کا دوارا ہے۔ یہاں پر خون خرابا ہماری سکھشا کے خلاف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم ہاتھ میں ہتھوڑا لے کر بدھ مندر کی دیواریں گرانا شروع کر دیں۔ چھی چھی...... کتنے افسوس کی بات

ہے۔ ایک جیتے جاگتے بندے کا خون مندر کے فرش پر گرتا ہے اور ہم کھڑے دیکھت ہیں۔''

گرو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے ایک کپڑے سے فرش پر گرا خون صاف کرنا شروع کیا۔ دوسرے نے اپنا گیروا رومال میرے ہونٹوں پر رکھ دیا تاکہ مزید خون گر کر فرش کو داغ دار نہ کرے۔

گرو نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں سے بنتی کرتا ہوں کہ بدھ مندر کی سندرتا کو اس طرح داغ دار نہ کریں۔ اگر یہاں آپ کا کوئی اپرادھی ہے تو پھر اسے یہاں سے لے جائیں۔ اس کے ساتھ جو بھی خون خرابا کرنا چاہت ہیں، باہر جا کر کریں۔''

جارج ذرا ترش انداز میں بولا۔ ''بڑے گرو جی! آپ بار بار خون خرابے کا ورڈ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ یہاں کسی نے کسی پر تلوار ناہیں چلایا۔ ایک تھپڑ کو آپ خون خرابا کیوں کہہ رہا ہے۔''

''کیا یہ پہلی بار ہے کہ یہاں ایسا ہوا ہے؟'' بڑے گرو کی آواز میں دبی دبی آگ تھی۔

''میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب مجھ سے برداشت ناہیں ہوتا۔ ہم یہاں اس دوارے میں پریم، آشتی اور بلیدان کی سکھشا دیوت ہیں۔ اگر ہمارے کہنے اور کرنے میں اتنا فرق ہووے گا تو پھر سب کچھ برباد ہو جاوے گا۔''

''بڑے گرو! آپ خوامخواہ بات کو بڑھا رہا ہے۔ اٹ از ناٹ فیئر۔'' جارج بولا۔

''میں بات ناہیں بڑھا رہا۔ میں صرف یہ کہنا چاہت ہوں کہ اگر کوئی اپرادھی ہے اور آپ اسے سزا دینا چاہت ہیں تو پھر اسے یہاں سے لے جاویں۔ بس۔''

جارج کا چہرہ سرخ انگارہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں جیسے نیلا زہر بھر گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... ویسا ہی ہوگا جیسا بڑے گرو چاہیں گے۔''

اس کے بعد وہ مڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بڑے گرو نے مجھے قدرے ترحم کی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنے ساتھی بھکشوؤں سے کہا کہ وہ میرے ہونٹ کا خون بند کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی اور راکھ کا استعمال کریں۔ کچھ اور بھکشو بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ بڑے گرو کے سامنے ان کے سر تعظیم سے جھکے ہوئے تھے۔ بوڑھا گرو ان کے سامنے چلتا ہوا پگوڈے کے اندرونی حصے کی طرف واپس چلا گیا۔

سہ پہر ہوتے ہی ایک بار پھر مجھے عجیب طرح کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ ہم ''مجسمہ چوری'' کے لیے پگوڈا میں سزا بھگت رہے ہیں۔ ہماری سزاؤں میں

فاقہ کشی کے علاوہ مار پیٹ کی سزا بھی شامل ہے۔ ہمیں یعنی مجھے، میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کو ہر شام پگوڈا سے باہر نکالا جاتا ہے اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں پر اوندھا لٹایا جاتا ہے۔ پھر ہمیں زائرین کے سامنے مقررہ تعداد میں بید مارے جاتے ہیں۔ دو دن پہلے یہ سزا میں ایک بار تو بھگت چکا تھا، تاہم اس کے بعد ابھی تک کوئی ایسا واقعہ رُونما نہیں ہوا تھا۔ بہرحال میرے ذہن میں اندیشہ موجود تھا اور سہ پہر کے وقت یہ اندیشہ ایک دم بہت بڑھ جاتا تھا۔

میڈم صفورا سے میری ملاقات دوبارہ ہو چکی تھی لیکن اس کی سزا کے بارے میں، مَیں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا۔ بہرحال یہ شام بھی خیریت سے گزر گئی۔ میرے پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور مجھے بہت تنگ کر رہی تھی۔ میرے پاؤں آزادی چاہتے تھے۔ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہتا تھا اور یہ خواہش کسی وقت اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی جیسے یہ احساس ذہن کی گہرائیوں میں موجود رہتا کہ میرے پاؤں کے ساتھ ایک نہایت ناپسندیدہ بوجھ موجود ہے۔

سلطانہ کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں اندیشے موجود تھے۔ وقتِ رخصت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میرے تصور میں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کا بچے کو چومنا پھر الوداعی انداز سے مجھے دیکھنا۔ غنی صاحب، چوہان اور دیگر لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ میری بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ وہ اَن گنت موقعوں پر میرے لیے ڈھال بنی ہے اور اپنی زندگی خطرے میں ڈالی ہے۔ پتا نہیں کہ میں اس کا محبوب تھا یا نہیں لیکن اس کا شوہر ضرور تھا اور وہ ہر طرح سے شوہر پرست عورت لگتی تھی۔ وہ اپنا سرخ عروسی جوڑا اپنے جھولے میں ساتھ لیے پھرتی تھی اور یہ بات بھی یاد رکھنے والی تھی کہ بقول چوہان، سلطانہ نے مجھے تحفظ دینے کے لیے اپنا وہ قیمتی اثاثہ یعنی مہاراج بہادر کی دی ہوئی مہر بھی استعمال کر ڈالی تھی۔ حالانکہ وہ مہر سلطانہ اور اس کے گھرانے کو بڑے سے بڑا فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

اب سلطانہ خود خطرے میں تھی۔ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا۔ جارج گورا کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ میں نے اس کے کردار کے بارے میں جو سنا تھا وہ اس کے عین مطابق تھا۔ چہرے پر خباثت اور عورت کی بھوک اس کی آنکھوں میں نقش تھی۔ پھر میں بالو کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی میرا بچہ تھا...... میرا خون؟

اچانک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور صفورا اندر آ گئی۔ پچھلے دو برس میں وہ کافی کمزور ہو چکی تھی اور شاید یہی حال میرا تھا۔ یہ اس مسلسل فاقہ کشی کا نتیجہ تھا جو یہاں ہم سے زبردستی کرائی

جاتی تھی۔ اب بھی کل دوپہر سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھکشو ہمیش آیا تھا اور اس نے خاموشی سے تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول مجھے دیئے تھے، یہ چاول وہ حسبِ سابق اپنی چادر کے پلو میں باندھ کر لایا تھا۔

اندر آتے ہی میڈم صفورا نے پوچھا۔ ''کل جارج اور بڑے گرو جی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور صفورا کو اپنا زخمی ہونٹ دکھایا۔

وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بہت بُرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب جارج تمہیں پگوڈا سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جیل میں لے جایا جائے۔ ابھی حکم جی زرگاں سے باہر ہے۔ ایک دو روز میں وہ آ جائے گا۔ پھر تمہارا یہاں پگوڈا میں رہنا مشکل ہو گا۔''

''تو یہ جگہ بھی جیل سے کون سی کم ہے۔ جیل میں شاید کھانا تو ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... ایسی بات نہیں...... جو کچھ بھی ہے لیکن یہ ایک عبادت گاہ ہے۔ یہاں کچھ اصول اور قاعدے ہیں۔''

''سیڑھیوں پر لٹا کر لوگوں کے سامنے پیٹھ پر بید مارنا کون سا سنہری اصول ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''بید ہی مارے جاتے ہیں نا...... الٹا لٹکا کر چمڑی تو نہیں ادھیڑی جاتی۔ عورتوں کو بے عزت تو نہیں کیا جاتا اور اب یہ بید مارنے والی سزا بھی تو ختم ہو چکی ہے۔ سات آٹھ مہینے پہلے ہی میرے اور ابرار کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کم از کم ہمیں تو بید نہیں مارے جاتے۔''

''لیکن مجھے تو منگل کو بھی بید مارے گئے ہیں۔'' میں نے کہا اور وہ ساری تکلیف و توہین ذہن میں تازہ ہو گئی جو مجھے جھیلنا پڑی تھی۔

''لیکن منگل کے بعد تو ایسا کچھ نہیں ہوا نا اور میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی نہیں ہو گا لیکن اب یہ جو جارج اور بڑے گرو کی تکرار والا معاملہ ہے، یہ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ صدیقی کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔''

''ہاں...... مجھے صدیقی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ وہ کہاں ہے؟''

''اسے بھی بڑے گرو اور موہن کمار کی تکرار کے بعد جیل جانا پڑا تھا۔ سات آٹھ مہینے تک اسے جیل میں بہت ''ٹف ٹائم'' گزارنا پڑا ہے۔ بہرحال اب وہ دوسرے پگوڈا میں ہے

اور کسی حد تک سکون میں ہے۔"

کچھ بھکشو لڑکیاں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لے کر اندر جا رہی تھیں۔
ان کے پیچھے کچھ نوجوان بھکشو چاندی کے گول طشت اُٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ میری کوٹھڑی کے اردگرد مکمل سکوت تھا۔ میں نے میڈم صفورا سے کہا۔ "کل ہماری گفتگو کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ آپ مجھے یہ بتانے لگی تھیں کہ پانڈے جیسے بے رحم شخص نے ہمیں لاہور میں قتل کیوں نہ کر دیا یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر وہیں کیوں نہ پھینک دیا۔ چوری کے جرم میں ہمیں یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لے آیا؟"

میڈم صفورا نے کوٹھڑی کی کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"یہ صرف چوری کا معاملہ نہیں تھا۔ ایک "خاص" مجسمہ چوری ہوا تھا جو "مت" کو ماننے والوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مت کی تعلیمات کے مطابق اپرادھیوں کے لیے ایک کڑھی سزا مقرر تھی۔ اگر اپرادھی یعنی ہم اس سزا سے بچ جاتے تو اس کا وبال گروحضرات پر اور پورے مٹھ پر آتا۔ لہٰذا ہمیں سزا کے لیے یہاں زندہ لایا جانا ضروری تھا۔ کم از کم دو چار افراد کو تو یہاں ضرور پہنچنا چاہیے تھا اور اگر زیادہ لوگ پہنچ جاتے تو یہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں کی "ایکسٹرا پرفارمنس" تھی۔ اب ہم اسے اپنی خوش قسمتی کہہ لیں یا بدقسمتی...... کہ ہم پاکستان میں پانڈے کی یورش سے تو بچ گئے لیکن عمر قید بھگتنے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ ہم کُل پانچ افراد یہاں آئے تھے۔ تم، میں، ابرار صدیقی، عنایت علی اور کرامت سندھو۔ عنایت اور کرامت سندھو کو تم نہیں جانتے بلکہ میں بھی نہیں جانتی۔ بہرحال یہ بھی اس سلسلے میں شامل تھے اور مجسمہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر صدیقی تک پہنچا تھا۔ ان دونوں بندوں کو پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے بہاولپور سے پکڑا تھا۔ بہرحال یہ لوگ بعد میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش میں مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگل میں انہیں تیندوؤں نے مار دیا تھا۔ اب ہم تین یہاں باقی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ہمارا "اینڈ" کیا ہوتا ہے۔"

میرے اور صفورا کے درمیان تادیر گفتگو ہوتی رہی۔ میڈم صفورا نے تصدیق کی کہ میں نے سات آٹھ ماہ یہاں پگوڈا میں سزا کاٹی ہے۔ ہم سے جبری فاقے کرائے گئے ہیں، ہم نے ماریں کھائی ہیں، صفائیاں کی ہیں، غلاظت خانے دھوئے ہیں اور پتا نہیں کیا کچھ......

میڈم جب یہ باتیں کر رہی تھی، میرے ذہن میں دھندلے سے نقش بنتے اور بگڑتے تھے مگر کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ میڈم نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ میں یہاں سے فرار ہونے کی کئی کوششیں کر چکا ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! مجھے یہ بات غنی صاحب اور پھر چوہان نے بھی بتائی تھی مگر مجھے اس پر یقین نہیں ہوا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں خود اس تجربے سے گزر رہا ہوں۔ یہاں زرگاں پہنچنے سے ایک رات پہلے میں پڑاؤ سے بھاگ گیا تھا۔"

میں نے طوفانی بارش میں اپنے ناکام فرار کی ساری روداد میڈم صفورا کے گوش گزار کی اور یہ بھی بتایا کہ آخر میں مجھے کس طرح بالکل غیر متوقع طور پر پکڑ لیا گیا۔ بالکل جیسے تاریک زمین نے تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ کو اُگل دیا ہو اور وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ یہ لوگ وہاں اچانک کیسے نمودار ہو گئے۔ یہ سخت حیران کرنے والی بات ہے۔ میری جگہ کوئی اور بندہ ہوتا جسے جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین ہوتا تو فوراً اس کا دھیان ان چیزوں کی طرف چلا جاتا۔ مگر یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی سنی ہیں کہ پنڈت مہاراج کی آشیر باد سے حکم جی کو روحانی طاقت حاصل ہے اور اس طاقت کی وجہ سے حکم جی کا کوئی قیدی ان کی مرضی کے بغیر اس راجواڑے کی حد سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوشش کرے تو پکڑا جاتا ہے یا مارا جاتا ہے اور پچھلے کئی برس سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ کو اس بات پر یقین ہے؟"

"نہیں...... یقین تو نہیں...... لیکن...... جب بہت سے لوگ ایک ہی بات کہیں اور بار بار کہیں تو دماغ اُلجھ ضرور جاتا ہے۔ اب تم بھی ایک تجربہ بیان کر رہے ہو اور یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہے۔ ایسی باتوں سے لگتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ روحانی طاقت والی بات صرف قیدیوں کی حد تک ہی نہیں ہے، مقامی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "حکم جی" کئی ایسے کام کر سکتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں۔"

بات کرتے کرتے اچانک صفورا کا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ سب سے پہلے میری نظر تیواری لال کے گہرے سانولے چہرے پر ہی پڑی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا پگوڈا کے صحن میں داخل ہوا تھا اور اب میری کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ سبز وردیوں والے تین چار مسلح اہلکار بھی تھے۔ ان کی رائفلیں کینوس کے غلافوں میں بند تھیں اور وہ پگوڈا کے احترام میں ننگے پاؤں تھے۔

صفورا نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہی آئے ہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ سر پر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے ایک بوڑھا بھکشو لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ تیواری کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے صاف طور پر تپش اور حسد دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے بھکشو کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا تھا۔ اس نے صفورا کو مخاطب کر کے کہا۔

''کورتی! تم مٹھ میں واپس جاؤ۔ یہاں کیا کرت ہو؟ یہاں تمہارا کوئی کام ناہیں۔''

صفورا اُٹھی اور مایوس نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کوٹھڑی سے نکل گئی۔ بوڑھے بھکشو نے ایک چھوٹی چابی کی مدد سے میرے گلے کا آہنی کڑا کھول دیا۔ ایک دوسرا بھکشو آگے بڑھا اور اس نے پاؤں سے زنجیر علیحدہ کر دی۔

''چلو۔'' تیواری لال نے تحکم کہا۔

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک باوردی شخص نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے دیکھا، بوڑھے بھکشو کی آنکھوں میں میرے لیے ترحم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی تھی۔ وہ میرے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

باوردی اہلکار مجھے پگوڈا سے باہر لے آئے۔ یہاں سیڑھیوں پر ایک کوڑھی شخص کو بیدوں کی سزا دی جا رہی تھی۔ اردگرد کئی افراد کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ جونہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا، تیواری لال نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ باوردی افراد بھی مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد گاڑی ایک بہت بڑی پختہ عمارت میں داخل ہوئی۔ لگتا تھا کہ یہ انگریزی دور حکومت کا کوئی بہت بڑا دفتر ہے لیکن کچھ دیر بعد پتا چلا کہ یہ قدیم عمارت زرگاں کی جیل ہے۔ میں نے قیدیوں کو خاکی وردی میں ملبوس اِدھر سے اُدھر جاتے اور مشقت وغیرہ کرتے دیکھا۔ ان کی قمیصوں پر ہندی میں کچھ لکھا تھا اور نمبر لگے ہوئے تھے۔

مجھے گاڑی سے اُتار کر ایک دفتر میں پہنچایا گیا۔ یہاں نہایت کرخت شکل والا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کوائف لکھے پھر ایک رجسٹر پر دو تین جگہ میرا انگوٹھا لگوایا۔ مجھے نمبر الاٹ کیا گیا 412۔ اس کے بعد مجھے پاجامے کُرتے پر مشتمل خاکی وردی دی گئی۔ مجھے ایک غلیظ کمرے میں دھکیل دیا گیا تاکہ میں وردی پہن سکوں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان احکامات پر عمل کروں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب مجھے کسی بیرک میں

دھکیل دیا جائے گا جہاں نہایت واہیات قسم کے بدبودار لوگ بند ہوں گے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے ایک چھوٹے احاطے میں لے جا کر ایک دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اس گاڑی میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ باوردی افراد بدستور میرے ساتھ موجود تھے لیکن اب ''سیاہ چہرہ'' تیواری لال نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھوڑا گاڑی ایک چھوٹے دروازے سے باہر نکلی۔ غالباً یہ جیل کا کوئی عقبی دروازہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک سفر کرنے کے بعد ہم ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ میں گھوڑا گاڑی سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ راج بھون کی پُرشکوہ عمارت یہاں سے بس نصف فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ میں جس عمارت میں کھڑا تھا، یہ بھی کافی شاندار تھی۔ اس کے ادھ کھلے مین گیٹ میں سے ندی کا شفاف پانی جھلک دکھا رہا تھا، عمارت کے سرسبز لانوں میں سفید کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور کچھ لوگ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

تب ہی میری نظر جارج گورا پر پڑی۔ وہ عمارت کے اندرونی دروازے سے نکل کر آیا تھا۔ اس کی بغل میں ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ایک باوردی اہلکار نے سیلیوٹ مارنے کے بعد کہا۔ ''بندہ حاضر ہے سر!''

جارج گورا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ ابھی اسے سرونٹ کوارٹر مین لے جاؤ۔ باتھ وغیرہ کرواؤ۔ دوسرے کپڑے دو۔ پھر ہم اس کے بارے میں بتائیں گا۔''

مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوں۔ مجھے دھکیل کر سرونٹ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں دیگر ملازمین بھی موجود تھے۔ وہ میرے ابتر حلیے اور زخم زخم جسم کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے مجھ پر فقرے بھی کسے۔ مجھے ایک کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ہٹے کٹے جسم اور عقابی آنکھوں والا ایک ملہوترا نامی ملازم میرا روم میٹ تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ملہوترا یہاں گھوڑوں کا ٹرینر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکش سے سرکش گھوڑا بھی جب پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے تو اس کی آدھی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔

رات کو سونے سے پہلے ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ''سنا ہے کہ تمہیں بھاگنے کی بیماری ہے۔ یہاں اس بیماری سے دور ہی رہو گے تو اچھا ہووے گا۔ رات کو احاطے میں تین کتے کھلے چھوڑے جاوت ہیں اور ان میں سے ہر کتا تیندوے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ بندے کو پھاڑتے پہلے ہیں، اس کا نام بعد میں پوچھتے ہیں۔''

رات کو واقعی کوٹھی کے احاطے کی طرف سے دیوہیکل کتوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یقیناً یہاں کافی تعداد میں پہرے دار بھی موجود تھے۔ کوٹھی کے اندر کہیں مدھم آواز میں پیانو بج رہا تھا اور رقص کی دھن فضا میں بکھر رہی تھی۔ میں جب تک سو نہیں گیا، ملہوترا بھی جاگتا رہا اور بیڑی کے کش لیتا رہا۔ یقیناً وہ میرا روم میٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میرا نگران بھی تھا۔

صبح جاگنے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پھر اَن گنت اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ مجھے پگوڈا سے جیل لے جایا گیا تھا مگر وہاں بھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رکھا گیا تھا۔ اب یہاں میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہونے والا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد ملہوترا مجھے لے کر عمارت کے عقب میں گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا اصطبل تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو چھوٹے بڑے گھوڑے تو یہاں ہوں گے۔ خچروں کے لیے ایک بہت بڑا واڑا علیحدہ سے بنایا گیا تھا۔

ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں یہیں پر کام کرنا ہے۔ کچھ کام تو تمہیں آتے ہوں گے، کچھ کام تھوڑے سے تجربے کے بعد سیکھ جاؤ گے۔ گھوڑوں کی لید وغیرہ ڈھونے کے لیے کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت ناہیں ہووے ہے۔ ہاں...... ان کا کھریرا کرنا، ان کو دوا وغیرہ کھلانا۔ یہ کام ذرا مشکل ہوویں ہیں۔ یہ آٹھ دس دن میں سیکھ جاؤ گے۔ ناہیں سیکھو گے تو پھر میں سکھا دوں گا۔'' آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''دیکھو...... یہاں اس سے گندے گندے کام بھی موجود ہیں۔ اسے گورا صاحب کی مہربانی جانو کہ تمہیں اصطبل تک رکھا ہے۔ وہ دیکھو، وہاں کتوں کا واڑا ہے۔ اس سے آگے پالتو سور ہیں۔ سوروں کے گند میں رہ لو گے؟'' اس نے آخری الفاظ بڑی ''محبت'' سے کہے۔

اگلے تین چار دن میری مصروفیت بے حد کڑی اور ناپسندیدہ رہی۔ مجھے علی الصباح منہ اندھیرے اُٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے ایک الارم تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے ایک بہت تیز اور کریہہ آواز والا سائرن بھی سنا۔ پتا چلا کہ یہ خطرے کا سائرن ہے اور عموماً عمارت کے قریب کسی جنگلی جانور کی موجودگی کے وقت بجایا جاتا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اصطبل میں میرا کام شروع ہو جاتا تھا۔ اصطبل کے دروازے ساری رات بند رہتے تھے لہٰذا الصباح جانوروں کی جو بُو اندر سے اُٹھتی تھی وہ ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ اصطبل میں کم و بیش تیس ملازم تھے۔ ملہوترا ان کا سیکنڈ انچارج تھا۔ وہ سارا دن اصطبل کے طول و عرض میں دندناتا اور ملازموں کو ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا۔ مجھ پر وہ خاص شفقت فرماتا تھا۔

کسی چھوٹی سی غلطی کے لیے بالوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجوڑ دیتا تھا اور مقامی لہجے میں گالیاں دیتا تھا۔ وہ مجھے کسی ایک کام پر ٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ کبھی مالشیوں میں شامل کر دیتا تھا، کبھی گھوڑوں کو کھریاں لگانے والوں میں۔ کبھی چارے کا انتظام کرنے والوں میں۔ گاہے بہ گاہے وہ مجھے سخت طنز کا نشانہ بھی بناتا تھا۔

ایک دن میرے قریب سے گزرا تو ایک سینئر ملازم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے نادر! لید کی ٹوکری اس کے کندھے پر کیوں رکھوائی ہوئی ہے۔ تمہیں پتا ناہیں یہ سلطانہ راجپوت کا شوہر نامدار ہے۔ آخر کوئی عزت ہووے ہے شوہر نامدار کی۔''

سینئر ملازم نے فوراً ٹوکری میرے کندھے سے اُٹھا لی۔ ملہوترا بڑی محبت سے بولا۔ ''مہروز جی! آپ ان چار سفید گھوڑیوں کا کھر کھرا کر لیں۔ دوپہر کے بھوجن تک کے لیے یہ کام کافی ہے۔''

کھر کھرا یعنی کھریرا میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میں اس میں صرف پندرہ بیس فیصد مہارت ہی حاصل کر پایا تھا۔ ایک ملازم نے کھریرے والا برش مجھے پکڑا دیا۔ میں ڈرتے ڈرتے پہلی گھوڑی کے پاس گیا۔ وہ اُچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ میں نے دوسری کوشش کی تو اس نے ایک دم گھوم کر لات چلائی۔ میں الرٹ تھا اس لیے سنگین ضرب سے بچ گیا۔ اس کے باوجود لات میرے کندھے پر لگی اور میں اُلٹ کر کچی زمین پر جا گرا۔ یہ جگہ پیشاب اور لید سے لتھڑی ہوئی تھی۔ میرا ایک پہلو اور چہرے کی سائیڈ بُری طرح لتھڑ گئی۔ اردگرد موجود افراد ہنسنے لگے۔ جی چاہا کہ ان میں سے کسی ایک پر جھپٹ پڑوں اور دو چار گھونسے تو ضرور جڑوں لیکن پھر اس کے بعد کی صورتِ حال ذہن میں آئی اور دل مسوس کر رہ گیا۔

ملہوترا کے اشارے پر سینئر ملازم نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور بولا۔ ''تم سے پرسوں بھی کہا تھا۔ پیچھے سے ناہیں، سائڈ کی طرف سے آوت ہیں۔''

''اصل میں مہروز صاحب کے ساتھ یادداشت کا مسئلہ ہے بھئی۔'' ملہوترا نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ ''ان کی یادداشت کے ساتھ عجیب گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ ان کو دس دن کی باتیں یاد آتی ہیں تو پچھلے دس دن کا دروازہ بند ہو جاوت ہے۔ یہ اپنے ٹائپ کے بڑے انوکھے مریض ہیں۔ ان کو تو کسی میوزیم میں ہونا چاہیے جہاں لوگ انہیں دیکھنے آویں اور بھگوان کے چمتکار کا نظارہ کریں۔'' اس قسم کے مذاق میرے ساتھ اکثر کیے جاتے تھے۔

ایک دوپہر عجیب تماشہ ہوا۔ میرے علاوہ چھ سات ملازمین اصطبل میں موجود تھے۔ ہم

گھوڑوں کے لیے چارا بنا رہے تھے۔ خشک اور تر چارے کو علیحدہ علیحدہ کاٹنا اور پھر اسے مکس کر کے کھرلیوں میں ڈالنا ایک نہایت مشقت مطلب کام تھا۔ ہم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ اچانک ایک خوبصورت لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔ غالباً وہ یہ سمجھی تھی کہ اصطبل کے اس حصے میں کوئی موجود نہیں۔ اس نے اندر آ کر دروازہ تیزی سے بند کرنا چاہا مگر ایک شخص دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

لڑکی ہنستی اور بل کھاتی ہوئی اصطبل کے اندرونی حصے کی طرف بھاگی۔ اس کے پیچھے آنے والا مرد اسے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ کوئی اور نہیں یہاں کا کرتا دھرتا جارج گورا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر بس ایک پتلون تھی۔ وہ بڑے رومانی موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جلد ہی لڑکی کو پکڑ لیا اور گھاس کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا لیا۔ لڑکی کے جسم سے ہنسی فوارے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

ملہوترا تیزی سے سرگوشی میں بولا۔ ''چلو چلو...... باہر چلو۔'' وہ ملازمین سے مخاطب تھا۔

ملازمین نے شوخ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے باہر کھسک گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ جارج گورا اور لڑکی گھاس کی حرکت میں گم ہو چکے تھے۔

میں دنگ رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ عمارت جارج کی شکار گاہ ہے۔ وہ جہاں اور جب چاہتا ہے، شکار کرتا ہے۔ اپنی طلب کی شدت میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کے اردگرد کا ماحول کیا ہے۔ یہاں کے لوگ غالباً اس کے مزاج کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ موقع کے لحاظ سے اپنا ردِعمل ظاہر کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے اب کیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ ابھی تو مالک نشے میں تھا۔ کل وہ ہوش میں ہوتا تو جواب طلبی کرتا کہ جب وہ اتنے شدید رومانی موڈ میں تھا تو وہ لوگ موقع سے دفعان کیوں نہیں ہوئے تھے۔

ابھی تک میرے ساتھ سختی کا سلوک نہیں ہوا تھا، مطلب جسمانی تشدد سے ہے۔ ہاں...... اگر بارہ گھنٹے کی شدید مشقت کو دیکھا جائے تو اسے جسمانی تشدد بھی کہا جا سکتا تھا۔ ذہنی تشدد اس کے علاوہ تھا۔ یعنی طنزیہ انداز اور بعض اوقات گالم گلوچ۔ ذہن میں وہ جو ایک اندیشہ سا تھا کہ شاید مجھے اُلٹا لٹکایا جائے گا یا اس نوع کی کوئی اور کارروائی ہوگی، ابھی تک غلط نکلا تھا۔ لیکن پھر ایک روز ایسا کچھ ہوا جس نے ساری کسر نکال دی۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے کہ جسے اپنے خونی آنسوؤں سے تحریر کروں تو بھی حق ادا نہ ہو اور یہ ایسا واقعہ تھا جس نے مجھے بدلا، میری سوچ کو بدلا اور شاید زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ میں وہ

نہ رہا جو تھا اور وہ ہو گیا جو نہیں تھا۔ جو ہزار کوشش کے باوجود نہیں بن سکتا تھا۔ ہاں...... وہ ایسے ہی کایا پلٹ لمحے تھے۔

شام کے بعد کا وقت تھا۔ میں اصطبل کے کام سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بستر پر گرتے ہی سو جاؤں گا۔ میں نے سارے دن کی بدبو اور پسینے کی چپچپاہٹ کو صاف کرنے کے لیے غسل خانے کا رُخ کیا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی لیکن شیو کرنے کا سامان نہیں تھا۔ میں نے نیم ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد کپڑے بدلے اور کھانا کھایا۔ ابھی بستر پر لیٹنے ہی لگا تھا کہ ایک شخص کوارٹر میں داخل ہوا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں بڑے صاحب بہادر نے بلایا ہے۔''

''کیوں...... خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت کا پتا تو تمہیں وہاں جا کر ہی لگے گا۔ ویسے ڈرنے کی بات ناہیں۔ صاحب بہادر کا ذاتی ملازم اچانک چھٹی پر چلا گیا ہے۔ تمہیں ایک دن کے لیے اس کی جگہ لینی ہے۔''

''ابھی جانا ہوگا؟''

''ناہیں...... جانا تو دو تین روز بعد ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے ہی بتا دوں تاکہ آپ اپنے مصروف وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال سکیں۔'' سخت طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

میں اُٹھ کر اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے وسیع گراسی لان میں سے گزار کر عمارت کے رہائشی حصے میں لے گیا۔ یہ قدیم طرز کی عمارت شاہانہ ٹھاٹ باٹ رکھتی تھی۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، پتھر کے چکنے فرش، دبیز پردے، غالیچے اور نادر قالین۔ غرض وہ ہر شے یہاں دکھائی دیتی تھی جس کا تصور کسی بہترین رہائشی عمارت میں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں جنریٹرز کے ذریعے بجلی مہیا کی گئی تھی اور وہ ساری آسائشیں بھی موجود تھیں جن کے لیے بجلی ضروری ہوتی ہے۔ باوردی ملازمین بے آواز چلتے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ان میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ملازموں کی اس فوج ظفر موج کے ہوتے ہوئے میری خدمت کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اس میں کوئی چکر لگتا ہے۔ میں ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک شاندار بیڈ روم میں پہنچا۔ یہاں خوشبوؤں کا بسیرا تھا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے۔ سجاوٹ کی امپورٹڈ اشیا اور دیواروں پر سجی ہوئی ان جانوروں کی ٹرافیاں جو جارج گورا کے دستِ ستم کا شکار ہوئے تھے۔ بیکال رائفلوں کے ایک نہایت قیمتی جوڑے کے نیچے دیوار پر ایک رائل بنگلہ ٹائیگر کی کھال آویزاں تھی۔

میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے بیڈ روم کی جھاڑ پونچھ کا حکم دیا۔ کھڑکیوں کے

پردے تبدیل کیے جانے تھے اور پھر بیڈ شیٹ بدلنی تھی۔ ایک طرف بہت سے تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کو گلدانوں میں سجانا تھا اور واش روم پر بھی ایک نظر ڈالنی تھی۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں، مَیں نے یہ کام کر دیئے اور ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہاں لانے والا شخص اندر آیا۔ اس نے ناقدانہ نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ ایک دو نقص نکالے، میں نے وہ نقص دور کیے۔ وہ مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ عجیب وضع کا تھا۔ بالکل جیسے کوئی لفٹ ہو۔ لگتا تھا کہ یہ چھوٹا سا چوکور کمرہ سارے کا سارا دھات کا بنا ہوا ہے۔ اس کی پیمائش آٹھ فٹ ضرب دس فٹ ہو گی۔ یا شاید اس سے تھوڑی سی زیادہ۔ یہاں ایک طرف کی دیوار میں آہنی سلاخیں تھیں لیکن سلاخوں کی دوسری طرف بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سلاخوں سے آگے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر ایک بلائنڈ شیشہ تھا۔

ملازم نے مجھے اس کمرے میں دھکیل دیا۔ ''مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''قوالی۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور دروازہ لاک کر کے باہر چلا گیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سلطانہ اس وقت میرے آس پاس موجود ہے اور جلد ہی میری اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ کیا جارج مجھ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کرنے والا تھا یا اس کی رقابت مجھے کسی اذیت سے دوچار کرنے والی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے دونوں پاؤں پر کسی نے بڑے زور سے لٹھ رسید کی ہو۔ ٹانگیں جھنجھنا اُٹھیں بلکہ پورا جسم جھنجھنا گیا۔ میں تڑپ کر کرسی سے نیچے گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میرے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑے برس گئے تھے اور پھر ایک دم سب کچھ تھم گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے کرنٹ لگایا گیا ہے۔ میرے جسم میں غالباً صرف تین چار سیکنڈ کے لیے برقی لہر دوڑی تھی لیکن اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں کچھ دیر تک سکتہ زدہ وہیں پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر دوسرا حملہ ہوا اور یہ پہلے سے کچھ شدید تھا۔ میرا پورا جسم پھر برقی رو کی زد میں آ گیا۔ اس دفعہ میں اوندھے منہ آہنی فرش پر گرا اور ایک بار پھر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس مرتبہ میرے منہ سے بے ساختہ دردناک آوازیں نکلیں۔ میں چلا رہا تھا اور چلاتا جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ آخری وقت آ گیا ہے۔ بس وہ ایک قیامت تھی جس کی شدت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور تب ایک بار پھر اچانک سب کچھ تھم گیا۔ جیسے کسی عفریت نے مجھے نگلنے کے بعد دوبارہ اُگل دیا ہو۔

میں کراہنے لگا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا اور درد کی ٹیسیں بے حال کر رہی تھیں۔ ''یہ کیا

کر رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا جرم کیا ہے؟'' میں خوف زدہ ہو کر چلایا۔

یہ خوف بے پناہ شدت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا کہ ابھی اس دھاتی کمرے میں پھر کرنٹ چھوڑا جائے گا اور میں موت اور زندگی کے درمیان جھول جاؤں گا۔ سزا دینے والا سامنے ہو تو اور بات ہوتی ہے۔ یہاں سزا دینے والے کا پتا تھا، نہ سزا کی وجہ معلوم تھی۔ نہ یہ پتا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ یہ زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ دہشت سے میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں اس چوکور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسٹیل کا یہ سلائڈنگ ڈور لاک تھا۔ میں نے اس پر بے دریغ مکے برسائے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی نے میری آواز سنی۔ میں ننگے پاؤں تھا اور برقی رو کسی بھی وقت دوبارہ فرش میں اور دیواروں میں دوڑ سکتی تھی۔ ایک اضطراری حرکت کے تحت میں کرسی پر چڑھ گیا۔ اپنے دونوں پاؤں سمیٹ کر اوپر رکھ لیے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ بظاہر عام نظر آنے والی یہ کرسی بھی دھات کی ہے۔ اس مرتبہ کرنٹ لگا تو میں جیسے کرسی کے ساتھ ہی چپک کر رہ گیا۔ پورا جسم شدید ارتعاش کی زد میں آیا اور میرے حواس مختل ہونے لگے۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں، پھر شاید کبھی ہوش میں نہ آنے کے لیے۔ میری نگاہوں میں اپنے پیاروں کی شکلیں گھومیں۔ فرح، عاطف اور ثروت...... کیا انہیں بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ مجھ پر کیا گزری؟ میں کہاں اور کس حال میں شکار ہوا؟

میں مر رہا تھا۔ جب اچانک ایک بار پھر سب کچھ تھم گیا۔ مجھے لگا کہ میرے منہ سے رال گر رہی ہے اور ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اپنی ناک صاف کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو لگا کہ وہ منوں وزنی ہو گیا ہے۔ ان آخری برقی جھٹکوں کے دوران میں بُری طرح چلایا تھا اور میرے گلے کے اندر خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے بولنا چاہا تو بولا نہیں گیا۔ میری یہ حالت بس آٹھ دس منٹ کے اندر ہو گئی تھی۔

کیوں ہو رہا تھا میرے ساتھ یہ سب کچھ؟ کیا یہ صرف رقابت کی کارستانی تھی؟ مجھے جسمانی اذیت دے کر لطف لیا گیا تھا؟ لیکن یہاں تو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا تو کیا کسی ویڈیو کیمرے وغیرہ کے ذریعے مجھے دیکھا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہی منحوس شخص مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر آیا جو مجھے اس عقوبت خانے تک پہنچا کر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک تولیا دیا جس سے میں نے اپنا پسینہ پسینہ چہرہ پونچھا۔ اس کے ہاتھ میں ملک شیک کا گلاس تھا۔ اس نے مجھے ملک شیک پلایا۔ اس کے بعد مجھے تسلی دی کہ اب کچھ نہیں ہو گا۔ میں یہاں آرام کر سکتا ہوں۔ میں ایک سیکنڈ سے پہلے

یہاں سے نکلنے کا آرزومند تھا لیکن وہ مجھے یہاں رکھنے پر مُصر تھا۔ اس نے ایک کرسی کو اسٹریچ کر دیا۔ وہ آرام دہ کرسی بن گئی۔ وہ خود باہر چلا گیا۔

اگلے قریباً دو گھنٹے میں نے اسی لفٹ نما کمرے میں گزارے۔ میری حالت اب بہتر تھی لیکن وہ جو برقی رَو کا خوف سا دل میں جاگزیں ہو گیا تھا، وہ کسی طور نکل نہیں رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اچانک آہنی کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور ملازم نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ہم ایک خم کھاتے ہوئے کوریڈور سے گزر کر پھر اسی بیڈروم میں آ گئے جسے ڈھائی تین گھنٹے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔ مگر اب یہ بیڈروم خالی نہیں تھا۔ یہاں جارج گورا کے علاوہ جو چہرہ مجھے نظر آیا، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ سلطانہ تھی جسے میری بیوی بتایا جاتا تھا۔ سلطانہ کی نظر مجھ سے ملی اور ایک دم جھک گئی۔ مجھے اس میں وہ دم خم نظر نہیں آیا جو اب تک آتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور خاموشی سے ایک ٹی ٹرالی پر جھکی، چائے بنا رہی تھی۔ اس کا لباس بھی آج مختلف تھا۔ اس نے بروکیڈ کا چمکیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے سڈول بازو جھلک رہے تھے۔ اس کے لمبے بال ایک موٹی چوٹی کی صورت میں اس کی گود تک پہنچ رہے تھے۔ ہاں...... زیور نام کی کوئی شے آج بھی اس کے جسم پر نہیں تھی۔

''تم بھی چائے پیئں گا۔'' جارج نے گلابی اردو میں پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ''شاید تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جن کو دوسروں کی وائف کا بنایا ہوا چائے اچھا لگتا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اگر تم کسی دوسرے کی وائف کے ہاتھ کا چائے پینا مانگتا ہے تو اس کا انتظام بھی ہو جائیں گا آج کی رات۔ ویسے ہم تو آج کی رات تمہاری وائف کے ہاتھ کا چائے ہی پیئں گا۔''

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جارج کی ذومعنی گفتگو اس کے خطرناک ارادوں کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جیل کا انچارج بھی ہے۔ اس کے لیے سلطانہ کو جیل سے نکال کر یہاں اپنے عشرت کدے میں لے آنا کون سا مشکل کام تھا؟ لیکن مجھے حیرانی سلطانہ کا غیر مزاحمتی رویہ دیکھ کر ہو رہی تھی۔ اس نے جارج کی ذومعنی گفتگو اَن سنی کر دی تھی اور خاموشی سے چائے بنا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کی سمجھ بھی آ گئی۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میری نگاہ واش روم کے دروازے کے ساتھ ہی ایک سنہری چوکور شیشے پر پڑی۔ اس سے پہلے جب میں نے

اس کمرے کی صفائی کی تھی تو اس شیشے پر مخملی پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی بلائنڈ شیشہ تھا جسے میں نے اپنے آہنی عقوبت خانے میں سے دیکھا تھا۔ بیڈروم کی طرف سے یہ بلائنڈ نہیں تھا۔ یہاں سے عقوبت خانے کی آہنی سلاخیں اور سلاخوں کے پیچھے کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، وہ دونوں کرسیاں جن پر میں بیٹھا تھا اور وہ خالی گلاس بھی جس میں سے میں نے ملک شیک پیا تھا۔

میں چکرا گیا۔ تو کیا اس بیڈروم کے اندر سے کوئی میری اذیت کا تماشہ دیکھتا رہا ہے۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟

جارج اور سلطانہ ہی ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سلطانہ کی آنکھوں کی غم زدہ سرخی بھی سمجھ میں آ گئی۔ ''اوہ گاڈ'' تو یہاں یہ تماشہ ہوا تھا۔ عقوبت خانے کا آہنی کمرہ ساؤنڈ پروف تھا، لہٰذا باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ممکن تھا کہ میرے تڑپنے پھڑکنے کا منظر دیکھ کر سلطانہ نے واویلا مچایا ہو۔ داد فریاد کی ہو لیکن باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ اندھے شیشے کی وجہ سے میں باہر کا منظر دیکھنے سے بھی قاصر رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس سفید سور پر جھپٹ پڑوں۔ وہ سب کچھ کر گزروں جو کر سکتا ہوں لیکن دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سفید ہوتا جا رہا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' جارج نے میری آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' میں گڑبڑا گیا۔

''میں بتاتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟ سلطانہ تمہارا وائف ہے اور تم اپنی وائف کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ شاید تمہارا دل چاہ رہا ہے کہ مجھ پر جھپٹ پڑو۔ میرے ساتھ فائٹ کرو۔ ایک زبردست فائٹ جسے دیکھ کر تمہاری وائف کا ہارٹ خوش ہو جائے۔ پھر تم میرے ہی پسٹل سے مجھ کو شوٹ کر دو اور اپنی وائف کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ۔''

میں خاموش رہا۔ وہ بڑے زہریلے انداز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سب جانتا ہوں تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تم مجھے ایک بہت بڑا ولن سمجھ رہے ہو جس نے اپنے گارڈز کے زور سے تمہیں بے بس کیا ہے اور اب ایک کمزور عورت کو اپنی طاقت دکھانا چاہ رہا ہو۔ ایسا نہیں ہے مائی ڈیئر! بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے ولن بننا کبھی اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی مجھے ولن سمجھے۔ چلو، میں تمہیں ایک Heroic پیشکش کرتا

ہوں۔ تم سمجھو کہ تم قید نہیں آزاد ہو۔ تمہارے ارد گرد کوئی گارڈ نہیں۔ بس میں اور تم اکیلے ہیں۔'' اس نے ایک لحہ توقف کیا اور مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''اور دیکھا جائے تو تم مجھ سے کمزور نہیں ہو۔ قد بھی مجھ سے تھوڑا سا زیادہ ہی ہوئیں گا۔ تم اپنی وائف کو یہاں سے لے جانے کے لیے مجھ سے دوبدو مقابلہ کرسکتا ہے۔ یس، مین ٹو مین اور میں پرامس کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیر کرلیا تو تم سے کوئی بازپُرس نہیں ہوگی۔ تم پوری آزادی کے ساتھ اپنی وائف کو لے کر یہاں سے جاسکے گا۔ آئی پرامس یو۔''

میں سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ اس نے گلاس میں سے شراب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور اپنی قمیص کے نیچے سے کولٹ پسٹل نکال کر سامنے قالین پر پھینک دیا۔ پسٹل کا فاصلہ جارج سے قریباً پندرہ فٹ اور مجھ سے صرف سات آٹھ فٹ کے قریب تھا۔ وہ کھلنڈرے انداز میں بولا۔ ''پسٹل اُٹھاؤ اور کوشش کرو میری باڈی میں ایک ہول کرنے کی۔ چلو شاباش۔''

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ وہ دعوت دے رہا تھا۔ پستول کا فاصلہ مجھ سے بہت کم تھا۔ اگر میں تیزی سے لپکتا تو پستول اُٹھا سکتا تھا۔

لیکن پھر وہی تذبذب...... وہی کم ہمتی...... وہی ناتوانی۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ جونہی میں پستول کی طرف جھپٹوں گا، جارج بھی جھپٹے گا۔ وہ ایک گھاگ شکاری تھا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس اعتماد نے مجھے لرزہ براندام کردیا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ اسے شاید اس ڈرامائی صورتِ حال کی توقع نہیں تھی۔

قریباً ایک منٹ گزر گیا۔ میری پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ میں پستول کی طرف نہیں بڑھ سکا۔ جارج کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے پاؤں کی حرکت سے پسٹل کو کچھ اور بھی میری طرف کھسکا دیا۔ تب وہ دوبارہ پہلے والی جگہ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ ''اب کیا خیال ہے شوہر صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

پسٹل اب مجھ سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ لوڈڈ ہے۔ اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوا تھا۔ بس اس تک ہاتھ پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی ہمت نہیں کرپایا۔ میرے ہونٹ بالکل خشک ہوچکے تھے۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اگر میں پسٹل پکڑ کر گولی نہ چلا پایا تو کیا ہوگا۔ کیا جارج مجھے گولی ماردے گا؟ تب جارج آگے بڑھا اور اس نے پسٹل تقریباً میرے پاؤں میں رکھ دیا۔ ''شیر بنو! تھوڑی سی تو ہمت کرو۔'' وہ

بولا اور مجھ سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر جا کھڑا ہوا۔

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ پسٹل میرے پاؤں میں تھا۔ ایک دم میرے دماغ میں دھندسی بھرگئی۔ میں جھکا۔ میں نے کولٹ پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی لمحے تھے جب میں نے کسرتی جسم والے جارج کو بجلی کی طرح اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ شاید اس پھرتی کے پیچھے وہ گہرا اعتماد بھی تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پسٹل پکڑ کر پوری طرح سیدھا ہوپاتا، وہ مجھ پر آن پڑا۔

اس کا طوفانی مکا میرے جبڑے پر لگا، میں اُلٹ کر پیچھے گرا۔ جارج کا دوسرا ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر آیا تھا۔ اس ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اس نے میری اس کلائی کو اتنی زور سے مروڑا کہ پسٹل، پکے ہوئے پھل کی طرح میرے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہوگیا۔ اس نے میری ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا رسید کیا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گرانا چاہا لیکن وہ خاصا زور آور تھا۔ پُرتعیش زندگی گزارنے والے عام لوگوں کے برعکس اس کا جسم سڈول اور کافی حد تک پھرتیلا تھا۔ وہ گرنے سے بچ گیا اور میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر مجھے بے بس کردیا۔

سلطانہ اس دوران میں سکتہ زدہ بیٹھی رہی تھی۔ اس کا رنگ جو قندھاری اناروں کی طرح دہکتا تھا، زرد ہوچکا تھا۔ جارج نے میری گردن چھوڑی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر بڑے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ہونٹوں سے خون رسنا شروع ہوگیا تھا اور میں اس کا نمکین ذائقہ محسوس کررہا تھا۔ اس نے مجھے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے پسٹل اُٹھایا اور اس مرتبہ اسے میرے نیفے میں اڑس دیا۔ تب وہ ایک بار پھر دس بارہ فٹ دور جاکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نیلا زہر تھا اور چہرے پر اعتماد کی بے پناہ چمک۔ ہم دونوں آمنے سامنے اس کشادہ بیڈروم میں کھڑے تھے جس میں دنیا کی بہترین آرائشی چیزیں موجود تھیں اور یہ جارج کی شکارگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاید آج وہ یہاں پھر ایک شکار کھیلنے والا تھا اور اس کے نشانے پر وہ راجپوت مسلم لڑکی تھی جسے میری بیوی کہا جاتا تھا۔ اپنے عالیشان بیڈ روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا جارج گورا بڑے خباثت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ یقیناً یہ بات اس کی انا کی تسکین کا باعث تھی کہ میں نے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے آج اس کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ اسے چمکایا ہے اور پھولوں سے سجایا ہے۔ یہ بھی اذیت رسانی کی ایک قسم ہی تھی۔

وہ دونوں بازو اپنی دونوں جانب لٹکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاٹرائے کی پتلون اور

''ڈینم'' کی ہاف سلیو شرٹ میں سے اس کا ٹھوس جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''چلو برادر! ایک اور کوشش کرو۔ اب تو یہ اور بھی ایزی ہے۔ پسٹل تمہارے پاس ہے۔ چلو شاباش! مجھے وشواس ہے کہ تم کامیاب ہو جائیں گا۔''

میں ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی عقابی آنکھیں میری ہر حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ اپنے پچھلے پاؤں پر جھکے ہوئے کسی خطرناک تیندوے کی طرح ہی وہ مجھ پر جست لگانے کو بالکل تیار تھا۔ کہتے ہیں، خطرناک درندوں کی نظر ان کے شکار کو ہپناٹائز کر دیتی ہے۔ وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ بھاگ بھی نہیں پاتے۔ میں بھی شاید ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ جارج کے بے پناہ اعتماد نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ میں نے ایک اضطراری نگاہ سلطانہ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بیچارگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جیسے بڑی اچھی طرح جان چکی تھی کہ جارج کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

میں نے ایک بار پھر اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی۔ اپنے دل و دماغ پر لعنت ملامت کے تازیانے رسید کیے۔ خود کو سمجھایا کہ پسٹل تمہارے پاس ہے، تمہارے ہاتھ سے بمشکل ایک فٹ کی دوری پر ہے۔ تم اسے پلک جھپکتے نکال سکتے ہو۔ جارج کے جست لگانے سے پہلے بآسانی اس پر فائر کر سکتے ہو۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ سینے کے اندر جیسے ایک مشعل زور سے پھڑ پھڑانے کے بعد ایک دم بجھ گئی۔ میرے دل نے کہا۔ ''تم یہ نہیں کر سکتے تابی! یہ تمہارے بس میں نہیں۔''

یہ کچھ ویسی ہی کیفیت تھی جو لاہور کے نواح میں ڈیک نالے کے کنارے تاریکی میں لہلہاتے سرکنڈوں کے پاس، مجھ پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب عمران نے نالا پار کرنے کے لیے مجھے اپنی طرف بلایا تھا اور میں صد کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا تھا اور یہ کوئی ایک موقع تو نہیں تھا۔ ایسے نہ جانے کتنے مواقع میری زندگی میں آ چکے تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج کے سرخ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ زیادہ گہری اور زہریلی ہو گئی۔ وہ نپے تلے قدموں سے میری طرف آیا۔ اس نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پسٹل واپس لے لیا اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم انڈین فلمیں نہیں دیکھتا۔ ان فلموں میں تو ایسے موقعوں پر ہیرو ایک دم شیر ببر بن جاتا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ وہ سلطانہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''سلطانہ ڈیئر! یہ شاید ہیرو ہے ہی نہیں۔ تم نے اسے خوامخواہ ہیرو بنایا ہوا تھا۔ اس کا جگہ تو تمہارے پاؤں میں بھی نہیں بنتا اور تم نے پتا نہیں اسے کہاں تک اجازت دے رکھا تھا۔''

سلطانہ بھی خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی جنگلی پھولوں کی خوشبو نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔

جارج نے وہسکی کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف گھوم کر بولا۔ ''چلو باسٹرڈ! اب نکلو یہاں سے۔ اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔''

باسٹرڈ کی گالی میرے سینے پر گھونسے کی طرح لگی لیکن پچھلے تین چار گھنٹوں میں ایسے نہ جانے گھونسے میں سہہ چکا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''سلطانہ کا اگر کوئی قصور ہے تو اسے قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ تم اسے جیل سے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''یہاں اسے سزا دینے کے لیے نہیں محبت کرنے کے لیے لائے ہیں۔ مائی ڈیئر چھ ہے۔'' جارج نے دانت پیس کر گلابی اردو میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گریبان سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں چاندی کے ایک قیمتی گلدان پر گرا۔ گلدان نیچے لڑھک گیا۔ میں نے مزاحمتی نظروں سے جارج کو دیکھا۔ وہ ایک دم پھر آگ بگولا ہو گیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو باسٹرڈ! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

اس نے زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ پھر مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور دیوار پر دے مارا۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر پل پڑا تھا۔ سلطانہ چلاتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے میرا گریبان جارج کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ پھر مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میری حسمت (قسمت) میں یہی ہے۔ تم جاؤ۔''

اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے مجھے دروازے سے باہر دھکیلا۔ پھر دروازے کو ہولے سے بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے چہرے کی بیچارگی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ میرا پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ہٹا کٹا ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک گارڈ بھی تھا۔ عقب میں دو باوردی گارڈز مزید کھڑے تھے۔ ہٹے کٹے ملازم کی آنکھوں میں چھپا چھپا تمسخر تھا۔ ''چلو جی پتی دیو صاحب!'' اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے چلا۔

جلد ہی مجھے واپس کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ کوارٹر میں آج اتفاقاً میں اکیلا تھا۔ اصطبل کا

سیکنڈ انچارج اور میرا روم میٹ ملہوترا آج اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ سینے میں انگارے دہک رہے تھے۔ میں تصور کی نگاہ سے کچھ دل دوز منظر دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ، جارج کے پنجہ ستم میں تھی۔ اس چار دیواری میں اسی چھت کے نیچے۔ پھر مجھے بالو کا خیال آیا، وہ پتا نہیں کہاں تھا؟ وہ بھی تو اپنی ماں کے ساتھ ہی جیل گیا تھا۔ شاید وہ بھی اسی چار دیواری میں کہیں تھا۔

مجھے لگا کہ میرے سر کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہچکیوں سے رونے لگا۔ میں اتنا رویا کہ میرا بازو آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر طیش آ رہا تھا۔ خود کو مار لینے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے بلک کر فریاد کی۔ ''اے خدا! میری اس بے کار زندگی کو ختم کر دے۔ میں اور جینا نہیں چاہتا اور دُکھ سہنے کی ہمت نہیں۔ میں وہی رہوں گا جو ہوں۔ ایک بے کار، بزدل کمزور اور نحوستوں کا مارا انسان! میرے بخت میں تاریکیوں اور ذلتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں ہار گیا ہوں یا رب......''

آج میں اس قدر ٹوٹا ہوا تھا کہ خدائے بزرگ و برتر کو پکارتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تپش تھی۔ شاید یہ دعا نہیں تھی، شکوہ تھا۔ ایک ایک کر کے مجھے اپنے سارے کرتوت یاد آ رہے تھے۔ میں نے ثروت کو اپنی آنکھوں سے بربادی کی طرف جاتے دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ میری ماں میرے سامنے اذیتیں سہہ کر مر گئی۔ میرا یار، میرا غمگسار سراسر میری بزدلی کا شکار ہو کر تاریکیوں کا رزق ہو گیا اور آج ایک غیر ملکی بدکار نے میری مبینہ بیوی کی آنکھوں کے سامنے میری بے مثال ذلت کا انتظام کیا۔ اس نے مجھے مزاحمت کرنے کے دلیرانہ مواقع دیئے اور بار بار مجھے شرمناک پسپائی سے دوچار کیا۔

میں روتا رہا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو بہہ کر میرے رُخساروں پر چلتے رہے اور میری بے بسی کا نوحہ پڑھتے رہے۔

نہ جانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر کمرے میں روشن موم بتی پگھل پگھل کر ختم ہو گئی اور کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ کمرے سے باہر دیو ہیکل کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے اور گاہے بہ گاہے مسلح پہریداروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان پہریداروں میں دو گھڑ سوار بھی شامل تھے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چکر مکمل کرتے تھے۔

میں اس رات بہت رویا لیکن جتنا رویا، آنکھوں کی آگ اتنی ہی بھڑکتی گئی۔ میں نے

بڑی سنجیدگی سے سوچا کہ خود کو ختم کر لوں۔ کوارٹر کے باورچی خانے میں سبزی اور گوشت کاٹنے والی تیز چھری موجود تھی۔ میں اس سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ سکتا تھا اور موت کی آغوش میں پہنچنے کے لیے چارپائی پر چت لیٹ سکتا تھا۔ یا پھر الماری میں سے شراب کی وہ بوتلیں نکالتا جو ملہوترا نے اپنے استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اتنی زیادہ شراب اپنے معدے میں اُنڈیل لیتا کہ میری موت واقع ہو جاتی۔ اس طرح کے کچھ مزید جان لیوا خیال بھی ذہن میں آئے لیکن ان سب میں سے، چھری سے رگیں کاٹنے والا خیال غالب رہا۔

اس رات دل و دماغ کی کچھ ایسی کیفیت ہوگئی کہ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ شاید یہ وہی کیفیت تھی جو دو ڈھائی سال پہلے مجھ پر لاہور میں طاری ہوئی تھی۔ میں گندم کی گولیاں نگلنے کے لیے سو فیصد تیار ہو گیا تھا۔ اس وقت تو عمران کی صورت میں ایک ''روشن چہرہ'' فرشتہ آیا تھا اور مجھے میرے ارادے سے روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن آج یہاں کس نے آنا تھا؟ آج کسی نے نہیں آنا تھا۔

میں نہایت گہری تاریکی میں ٹٹولتا ہوا اُٹھا اور باورچی خانے میں سے نہایت تیز پھل والی چھری لے آیا۔ اندوہ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے یہ سب کچھ آسان لگنے لگا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ گہری تاریکی میں آنکھیں بند کر لیں۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنے قریب سے کہیں عمران کی آواز سنائی دی۔ ''کیا کر رہے ہو تابی؟''

میں چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ یہ صرف میرے تصور کا کرشمہ تھا۔

میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ عمران کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا۔ ''جگر! بھول گئے جو میں نے کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا؟'' میں نے اشک بار لہجے میں بہ زبان خاموش پوچھا۔

اس کے تصوراتی ہاتھ نے آگے بڑھ کر میری ناک کو چٹکی میں پکڑا اور بولا ''لکڑی کے باندر! تیرا بھیجا بھی ایک دم فائیو اسٹار ہے۔ میں نے ایک مرتبہ خودکشی کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے یاد رکھنا۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس جھماکے کے ساتھ ہی عمران کا تصور اوجھل ہو گیا۔ تاہم یہ تصور اوجھل ہوتے ہوتے ایک ایسا جملہ میرے دماغ کو تھما گیا جس نے مجھ سر تا پا ہلا یا اور میرے مُردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑائی۔

مجھے ان نہایت سنگین گھڑیوں میں عمران کا وہ بے مثال چمکیلا فقرہ یاد آیا جو اس نے مجھ

سے ملنے کے بعد لاہور میں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''اگر تمہیں خودکشی کرنی ہی ہے تو پھر اس کی ذمے داری خود پر نہ لو۔ بس اپنے آپ کو جان لیوا حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ جو قدرت کو منظور ہوگا وہ ہو جائے گا۔''

اس کا یہ بھولا بسرا فقرہ اتنی شدت سے میرے دماغ میں آیا کہ سوچ کے بے شمار بند کواڑوں کو ایک دھماکے سے کھول گیا۔ شاید کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں اور کچھ لفظ ایسا ہی ''کایا پلٹ'' اثر رکھتے ہیں۔ میں مبہوت رہ گیا۔ وہ منوں وزنی بوجھ جو میرے سینے کو کچل رہا تھا، اچانک میرے سینے سے ہٹ گیا۔ مجھے لگا کہ مجھے اپنی نجات کی راہ نظر آگئی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ یکا یک تبدیلی کی یہ کیسی ہوا چلی تھی میرے اندر؟ شاید یہ سب اس گریہ زاری کا صلہ تھا جو آج شب میں نے اپنے خدا کے حضور کی تھی اور ان بے شمار آنسوؤں کا اجر جو آج اس کمرے کی تیرگی میں، مَیں نے بہائے تھے۔ تو کیا قدرت نے بالآخر میری سن لی تھی؟ میں مرنا چاہتا تھا لیکن حرام موت مرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے راستہ نظر آ رہا تھا۔ وہی راستہ جو میرے یار نے مجھے ایک روز دکھایا تھا۔ آگے بڑھنے کا...... سنگین ترین خطرات سے ٹکرانے کا۔ موت کے پیچھے بھاگنے کا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا لیکن یہ خوف کا لرزہ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ باہر عمارت کے وسیع کمروں میں برقی روشنی تھی جو جنریٹرز سے مہیا ہوتی تھی۔ میرے کوارٹر سے چند گز کے فاصلے پر وہی ہٹا کٹا مسلح ملازم کھڑا تھا جو پانچ چھ گھنٹے پہلے مجھے کسی گائے بکری کی طرح ہانک کر عمارت کے اندرونی حصے میں لے گیا تھا اور ''عقوبت خانے'' کے حوالے کیا تھا۔ چھوٹی نال کی ایک رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ وہ ٹہلنے کے ساتھ ساتھ ٹرانزسٹر ریڈیو پر کچھ سن رہا تھا۔

وہ قطعی بے پروا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں عجیب ذہنی کیفیت میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں نے جوتی بھی پہنی ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے اردگرد موجود کوئی اور شخص دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ رکھوالی کے خوفناک کتے کہاں ہیں؟ چھت پر موجود مسلح پہریدار کی پوزیشن کیا ہے؟ اور میں ان باتوں کے بارے میں سوچتا بھی کیوں؟ میں تو موت کا راہی تھا۔ مجھے مرنا تھا یا مار دینا تھا اور جتنی جلدی یہ مرحلے طے ہو جاتے، اتنا ہی بہتر تھا۔ میں اپنی دلی کیفیت بالکل کھول کر بیان کر رہا ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ ان لمحوں میں مجھے اپنے اردگرد موجود تمام رکاوٹیں اور دیواریں یکسر حقیر نظر آئیں۔

میں اندھا دھند مسلح شخص کی طرف بھاگا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ میری طرف مڑا اور اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے اور یہ وہی تیز پھل والی چھری تھی۔ مجھے یوں اپنی طرف آتے دیکھ کر گوبندر نامی یہ ملازم گھبرایا۔

''اوئے...... اوئے۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ میں نے بایاں ہاتھ اس کے گریبان پر ڈالا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ''مہلک حرکت'' میں میری عمرِ رفتہ کی ساری بے کسی، بیچارگی اور اذیت ایک عجب لہر بن کر دوڑ رہی تھی۔ تیز دھار چھری قریباً آٹھ انچ تک گوبندر کے چربی دار پیٹ میں گھسی۔ گوشت اور لوہے کا تصادم...... گوشت کٹنے کی آواز، گوبندر کی کربناک آہ اور اپنے ہاتھ پر گرم خون کے چند چھینٹے۔ یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کیا۔

میں نے چھری کھینچی لیکن وہ نہیں نکلی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ کسی کو چھری ماری جائے تو وہ اس طرح پھنس بھی جاتی ہے۔ گوبندر پشت کے بل گرا۔ اس کی رائفل اس کے جسم سے علیحدہ ہوگئی۔ میں نے رائفل اُٹھائی۔ میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے گوبندر کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی۔ اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ایک دفعہ عمران نے بتایا تھا کہ سیفٹی کیچ کہاں ہوتا ہے اور کیسے ہٹایا جاتا ہے۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا اور مین گیٹ کی طرف دوڑا۔ ابھی مین گیٹ سے پندرہ بیس قدم دور تھا کہ دو دیوہیکل کتے میری طرف جھپٹے۔ یہ خوفناک منظر تھا لیکن موت سے بڑھ کر خوف اور کس چیز کا ہو سکتا ہے اور میں ان لمحوں میں اس خو پر غلبہ پا چکا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ دھماکوں کے ساتھ رائفل نے شعلے اُگلے۔ میں نے کم و بیش چھ فائر کیے۔ عمارت کے سناٹے تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اُٹھے۔ دونوں کتے مجھ سے دس پندرہ قدم کی دوری پر گر گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اب میرا رُخ گیٹ کی طرف تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمارت کے بیرونی گیٹ سے نکلنا میرے لیے اس قدر آسان ثابت ہوگا۔ یہاں تو خوفناک سرخ آنکھوں والے ڈشکرے چکراتے تھے اور ان کی رائفلوں پر چڑھی ہوئی سنگینیں لشکارے مارتی تھیں۔ رات کے اس پہر گیٹ پر صرف دو افراد موجود تھے۔ وہ سگریٹ پھونک رہے تھے اور ان کی رائفلیں چوبی کیبن کی دیوار کے ساتھ رکھی تھیں۔ انہوں نے دو تین سیکنڈ تو صورتِ حال کو سمجھنے میں لگا دیئے۔ پھر وہ رائفلوں کی طرف لپکے۔ ایک پہریدار ٹانگ پر گولی کھا کر راستے میں ہی گرا، دوسرا رُخ بدل کر باہر کی طرف بھاگا۔

میں دندناتا ہوا مین گیٹ سے باہر تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے رائفل پر جمے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں لہو تھا۔ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے دور درختوں میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ ''رُک جاؤ...... رُک جاؤ...... گولی مار دوں گا۔'' عقب سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ میں نہیں رُکا۔ اب مجھے نہیں رُکنا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عمارت میں بے شمار روشنیاں جل اُٹھی ہیں۔ ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہو گئے تھے۔

الارموں کی آواز بڑی تیز اور کریہہ تھی۔ جیسے کوئی بدبودار مکروہ جانور اپنے گروہ کو اکٹھا کرنے کے لیے چلا رہا ہو۔ یہ ڈوبتی اُبھرتی آواز عمارت کے مین گیٹ اور جنوب کی باؤنڈری وال کی طرف سے اُبھر رہی تھی۔ میری نگاہ گھوڑا گاڑی پر تھی۔ میں سیدھا گھوڑا گاڑی کی طرف گیا۔ گیس لیمپ کی مدھم روشنی میں گاڑی بان نے میرا حلیہ اور میرے تاثرات دیکھے تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر بھاگ نکلے گا۔ اگر وہ بھاگ نکلتا تو یہ گاڑی میرے لیے بیکار تھی۔ میں گھوڑوں کو ہانک نہیں سکتا تھا۔

میں نے رائفل گاڑی بان کی طرف سیدھی کی اور پھنکار کر کہا۔ ''خبردار...... نیچے نہ اُترنا...... گولی ماردوں گا۔''

زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اس انداز میں کسی کو دھمکایا تھا اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس شخص نے میری بات نہ مانی تو میں اسے گولی ماردوں گا اور یہی بات شاید درمیانی عمر کے اس گاڑی بان کو بھی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں جست لگا کر گاڑی کے اگلے حصے پر سوار ہوا اور بے دریغ رائفل کی نال گاڑی بان کی فربہ گردن پر رکھ دی۔

''گاڑی بھگاؤ۔'' میں نے نال اس کی گردن میں دھنساتے ہوئے کہا۔ غیظ و غضب کی شدت سے میری آواز اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں گئی۔

گاڑی بان نے ایک لمحے کے لیے تذبذب دکھایا۔ میں نے رائفل اس کے سر پر ماری۔ اس کی پگڑی اُچھل کر دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگیں تھام کر چابک دکھایا۔ گاڑی کے دونوں گھوڑے ایک جھٹکے سے آگے بڑھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے عمارت کے آہنی گیٹ پر ہلچل دیکھی۔ گارڈز افراتفری میں باہر آ رہے تھے۔ بوکھلاہٹ اور تاریکی کے سبب انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ پہلے انہوں نے اندھا دھند

ہوائی فائرنگ کی۔ پھر کسی نے تیزی سے درختوں میں اوجھل ہوتی ہوئی گھوڑا گاڑی کو دیکھا۔

''وہ دیکھو۔'' ایک پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اسی دوران میں گھوڑا گاڑی نے درختوں کے درمیان ایک موڑ مڑا اور بل کھاتے راستے پر سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔

مجھے پتا تھا کہ تعاقب کیا جائے گا۔ جلد ہی تعاقب کے آثار نظر آنے لگے۔ دور عقب میں تیزی سے حرکت کرتی مشعلیں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ وہ مسلح گھڑ سوار تھے جو جارج کی رہائش گاہ سے نکلے تھے اور تیزی سے میری طرف آ رہے تھے۔

''تیز چلاؤ۔'' میں نے گاڑی بان کے ننگے سر پر رائفل کے آہنی بیرل کی ٹھوکر لگائی۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگوں کو جھٹکے دیئے اور چابک لہرایا گھوڑوں کی گردنیں اوپر اُٹھیں اور رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

گھوڑوں اور گھوڑا گاڑی کی رفتار میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ ایک دو منٹ میں ہی گھڑ سوار نزدیک آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گولیاں چلائیں۔ دھماکوں سے شعلے لپکے۔ گولیوں کی شائیں شائیں ہمارے سروں سے کافی اوپر سنائی دی۔

یقیناً یہ فائرنگ مارنے کے لیے نہیں ڈرانے کے لیے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم گھوڑا گاڑی روک لیں۔ میں نے ایک بار پھر رائفل گاڑی بان کی گردن میں دھنسائی اور سرسراتی آواز میں کہا۔ ''گاڑی روکو گے تو اسی جگہ گولی ماردوں گا۔''

گاڑی بان بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

یہ گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا تاریک اور نیم پختہ راستہ تھا۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ گھوڑا گاڑی کسی تناور درخت سے ٹکرا جائے گی مگر گھوڑے ان نشیب و فراز کے شناور تھے۔ وہ اپنے مالک کے اشاروں پر سرپٹ بھاگے چلے جا رہے تھے اور پھر گھڑ سوار بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک گھڑ سوار نے للکار کر کہا۔ ''اوئے گاڑی روکو۔ نہیں تو مارے جاؤ گے۔''

گاڑی بان کی صورت دیدنی تھی۔ وہ دونوں طرف سے موت کی دھمکی سن رہا تھا۔ گہری تاریکی کے سبب اس کے تاثرات ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہے تھے تاہم اتنا پتا چلتا تھا کہ وہ دہشت زدہ ہے۔ اچانک سرپٹ بھاگتے گھوڑوں میں سے ایک کو ٹھوکر لگی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا گھوڑا بھی گرا۔ گاڑی جیسے ہوا میں معلق ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں پہلے اوپر اُٹھنے کے بعد اب تیزی سے نشیب کی طرف جا رہا ہوں۔ میں گھنی

جھاڑیوں میں گرا اور پتلی پتلی شاخوں کو توڑتا ہوا کچی زمین پر آیا۔ میں نے اپنے عقب میں گھوڑوں کی دردناک ہنہناہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ میں حیرت انگیز طور پر شدید چوٹوں سے محفوظ رہا تھا۔

میں اُٹھتے ساتھ ہی پھر دوڑا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا رُخ کس طرف ہے، میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں بس جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں مجھے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اردگرد کیکر، ناگ پھنی اور جنتر کے درخت تھے اور وہ ساری نباتات تھیں جو جنگلی علاقے میں نظر آتی ہیں۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ رائفل کے لمس نے میرے اعتماد میں اضافہ کیا۔ زندگی میں شاید پہلی بار مجھے ہتھیار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا تھا۔

O......❖......O

ہوا بہت تیز تھی اور میرے عقب سے چل رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ ہوا مجھے دھکیل رہی ہے اور میں بھاگنے کے بجائے اُڑتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ سب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ میں بہت سے خطروں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ درختوں سے ٹکرا کر زخمی ہونے کا خطرہ، کسی گڑھے میں گرنے کا خطرہ، عقب سے گولی چلنے کا خطرہ، کسی جنگلی جانور کا ڈر...... کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں بس نکلنا چاہتا تھا۔ نکل جانا چاہتا تھا اس سیاہی مائل جنگل کے حصار سے۔ میں اس منحوس نرغے کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ مجھے آزادی درکار تھی۔ بس آزادی...... اور میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے عقب میں دور افتادہ آوازیں سنیں۔ ان میں کتوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ آوارہ کتے تھے یا خاص بُو گیر کتے جو گھڑسواروں کے ساتھ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں دو کتوں کو عمارت کے احاطے میں مار چکا تھا۔ میں مزید کو بھی مار سکتا تھا۔ اگر میرا راستہ روکا جاتا تو میں نے اس رائفل میں موجود ایک گولی بھی بچا کر نہیں رکھنا تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل میں کتنی گولیاں ہیں۔ یہ برسٹ مارنے والی رائفل تھی اور ایک بار عمران یا شاید اقبال نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی رائفلوں میں عموماً بیس پچیس تک گولیاں موجود ہوتی ہیں۔ میں نے اب تک بمشکل سات آٹھ گولیاں ہی استعمال کی تھیں۔

میں اندھا دھند بھاگتا رہا۔ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر بھاگا۔ آٹھ دس منٹ یا بیس پچیس منٹ۔ بس مجھے یہ احساس تھا کہ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے اور میری ٹانگیں شل ہوتی جا رہی ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتے بھاگتے اچانک گر پڑوں گا اور تا دیر اٹھ نہیں سکوں گا۔ مگر میں پھر بھی ٹانگوں کو حرکت دیتا رہا۔ تسلی کی صرف ایک بات تھی۔ اب مجھے اپنے عقب میں تعاقب کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کتوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے

رہی تھی۔ تو کیا میں متعاقب افراد کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ اس سوال کا یقینی
جواب دینا تو ابھی مشکل تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہوا میرے عقب
سے چل رہی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اگر تیز ہوا اسی سمت میں چل رہی ہو جس سمت میں کتوں
کا ''شکار'' جا رہا ہو تو پھر کتوں کی حس شامہ کند ہو جاتی ہے۔ شاید یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔
میرے پیچھے آنے والے گھڑ سوار کسی اور جانب نکل گئے تھے۔

میری ٹانگیں اب کسی بھی وقت جواب دینے والی تھیں۔ میں ایک جگہ پر برگد کے
بڑے بڑے درختوں تلے بیٹھ گیا۔ درختوں کی جڑیں اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی تھیں اور
اندھیرے میں یوں لگتا تھا کہ درجنوں سانپ ہوا میں جھول رہے ہیں۔ موسم میں خنکی تھی پھر
بھی مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پنڈلیوں میں نئے کانٹے چبھ گئے تھے اور جسم پر تازہ
خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے آٹومیٹک رائفل گود میں رکھ لی اور درخت سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے
لگا۔ سلطانہ کی بے بسی کا خیال ذہن میں یوں آیا جیسے اندھیرے میں اچانک بجلی چمکتی ہے۔
اس کا مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دینے کا انداز دل کو لہولہو کرنے والا تھا۔ پتا نہیں آج رات
اس پر کیا بیتی تھی اور اب وہ کہاں تھی؟ اور وہ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں والا معصوم صورت
بالو...... جسے وہ میرا بچہ کہتی تھی۔ وہ سلطانہ کے ساتھ ہی جیل میں گیا تھا لیکن جارج کی چار
دیواری میں وہ سلطانہ کے ساتھ نہیں تھا۔ خبر نہیں وہ کہاں تھا؟ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ
سلطانہ جیسی نڈر لڑکی اگر جارج کے جال میں آئی تھی تو اس کی وجہ میں تھا۔ مجھے اذیت کے
ناقابلِ برداشت شکنجے میں دیکھ کر سلطانہ نے جارج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس
نے مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنے سے بہتر سمجھا تھا کہ وہ اپنی شوہر
پرستی کو ایک نیا رُخ دے دے اور اپنا آپ مجھ پر لٹا دے۔

اس منحوس دھاتی کمرے میں برقی رو کی ''اذیت رسانی'' میرے ذہن میں آئی
رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے تین بار چند سیکنڈ کے لیے کرنٹ دیا گیا تھا اور اب مجھے یوں لگ
رہا تھا کہ میں تین بار جان کنی کا عذاب سہہ کر اور موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔
جہاں جہاں سے کرنٹ میرے جسم میں داخل ہوا تھا، وہاں وہاں سے ابھی تک رگ پٹھے
پھوڑے کی طرح دُکھتے تھے اور سیاہی مائل داغ نظر آنے تھے۔

میں چار پانچ منٹ تک تاریکی میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ٹانگوں میر
قدرے جان آ گئی۔ میں پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ برگد کی لٹکی ہوئی جڑوں میں سے ایک جڑ میرے

کندھے پر آئی اور سینے کی طرف رینگ گئی۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا کہ ''جڑ'' واپس میرے
کندھے کی طرف آ رہی ہے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے کہا کہ یہ برگد کی
جڑ نہیں ہے۔ ایک تیز اضطراری حرکت کے تحت میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور پیچھے ہٹا۔ کئی
فٹ لمبا سانپ میرے جسم سے جدا ہو کر دھپ سے کچی زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پھنکار
سنی۔ تاریکی میں اس کا ہیولا دیکھا۔ وہ پھن پھیلائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے رائفل
سیدھی کی۔ انگلی ٹریگر پر رکھی لیکن پھر ایک دم دماغ نے کام کیا۔ اس سانپ سے زیادہ اس
رائفل کا فائر میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ گولی چلنے کی آواز میرے دشمنوں کو میری
طرف کھینچ سکتی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ اپنے شکار
کا پیچھا بھی کرتا ہے۔ دادی کہا کرتی تھیں کہ بھڑکا ہوا سانپ کبھی کبھی گھڑ سوار کو بھی جا لیتا ہے۔
میں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتا رہا اور میری نظریں سانپ کے ہیولے پر مرکوز رہیں۔ وہ پیچھے نہیں
آیا۔ میں نے رُخ پھیرا اور پھر ہوا کے رُخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں کچھ دن پہلے بھی اسی طرح ایک تاریک جنگل میں بھاگا تھا
اور خود کو بھانڈیل اسٹیٹ کے جنگل سے نکالنا چاہا تھا لیکن تب اور آج کی صورتِ حال میں
بہت فرق تھا۔ آج میرے ہاتھوں میں ایک مہلک ہتھیار تھا اور سینے میں اس ہتھیار کو چلانے
کی ہمت بھی تھی۔ آج میں بلا تردد کسی کو مار سکتا تھا اور مر بھی سکتا تھا۔ ہاں...... کچھ اوقات
ایسے ہی کایا پلٹ ہوتے ہیں اور کچھ فقروں کی بازگشت اور کچھ مناظر کی یاد ایسے ہی زندگیوں
کے رُخ بدلتی ہے۔ عمران کا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر میری نگاہوں میں آیا۔ بے شک اس نے
کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں
چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔''

میں بھاگتا رہا اور چلتا رہا اور دم لیتا رہا پھر بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار
ہونے لگا۔ رات بھر گھونسلوں میں دبکے رہنے والے پرندے بیدار ہوئے اور چہچہانے لگے۔
پہلے ان کی آوازیں مدھم تھیں پھر بلند ہوتی چلی گئیں۔ اندھیرے میں سفیدی گھلی اور پھر غالب
ہوتی چلی گئی۔ ہوا کا رُخ بھی بدل چکا تھا۔ اردگرد کے مناظر واضح ہونے لگے۔ پتوں سے اٹی
ہوئی زمین، جھاڑیاں، درخت اور درختوں کی بلند شاخوں کے پیچھے سے جھلک دکھاتا ہوا
نیلگوں آسمان۔ میں ایک یکسر ویران جنگل میں تھا۔ آثار سے تو یہی لگتا تھا کہ دور تک کسی آدم
زاد یا متنفس کا نشان نہیں۔ روشنی ذرا زیادہ ہوئی تو مجھے کہیں کہیں کچی زمین پر پنجوں اور کھروں
کے نشان دکھائی دیئے۔ میں جنگلی زندگی سے قطعی نا آشنا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کن

جانوروں کے قدموں کے نشانات ہو سکتے ہیں اور کہیں کہیں جو فضلہ بکھرا دکھائی دیتا ہے، وہ کن جانوروں کا ہے۔ رات گاہے بگاہے مجھے جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی رہی تھیں لیکن میں ان کے بارے میں بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

ایک جگہ بارشی پانی کا چھوٹا سا تالاب نظر آیا۔ اس کے گرد بھی پنجوں کے نشانات کثرت سے تھے۔ ایک طرف کسی ہرن سائز کے جانور کا ڈھانچا پڑا تھا۔ پانی نتھرا ہوا تھا۔ پیاس کی شدت زیادہ تھی اور دھوپ نکلنے کے بعد مزید بڑھ سکتی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے تھوڑا سا پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اپنے کُرتے کے گیلے دامن سے رائفل پر لگا ہوا کیچڑ صاف کیا۔ یہ روسی ساخت کی رائفل تھی۔ خم دار میگزین کافی لمبا تھا۔ میں میگزین علیحدہ کر کے گولیوں کی تعداد دیکھ سکتا تھا لیکن یہ تجسس مہنگا پڑ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں میگزین دوبارہ رائفل سے اٹیچ نہ کر پاتا۔

دس پندرہ منٹ وہاں سستانے اور اپنی چوٹوں کو سہلانے کے بعد میں پھر چل پڑا۔ گھوڑا گاڑی کے اُلٹنے سے کوئی زخم تو نہیں لگا تھا مگر جسم پر کئی جگہ نیل موجود تھے۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ان چوٹوں کا احساس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے بائیں بازو کو حرکت دینا دشوار لگ رہا تھا۔

اگلے تین چار گھنٹے میں مسلسل چلتا رہا۔ کبھی کبھی بھاگنا بھی شروع کر دیتا تھا۔ اس عرصے میں مجھے صرف ایک بھینس نما سیاہ جانور کی جھلک دکھائی دی یا پھر دو چیتل (نیل گائے) تھے جو تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ چاروں طرف درختوں کے لامتناہی سلسلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان درختوں میں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں بارشی پانی کے گڑھے تھے یا کسی تیز آندھی سے اُکھڑے ہوئے درختوں کے تنے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس رُوئے زمین پر اس گھنے جنگل کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ مجھے اپنوں کے پاس واپس جانا ہے۔ مجھے ہر صورت اس گھیرے کو توڑنا ہے۔ میں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔

شاید سلطانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ایک پھڑپھڑاتا ہوا پنچھی ہی تھا۔ یہ پنچھی ایک مدت سے اپنا پنجرہ توڑنا چاہ رہا تھا۔ کسی کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کسی کی خوبصورت آنکھیں اسے شب و روز بے کل رکھتی تھیں۔ وہ پنجرے کی سلاخوں سے ٹکراتا تھا۔ لہولہو ہو کر گر جاتا تھا۔ زخم مندمل ہوتے تھے تو وہ پھر پھڑپھڑانا اور ٹکرانا شروع کر دیتا تھا۔ ایک عرصے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

دو پہر ہو گئی تھی۔ دھوپ اب جسم میں چبھنے لگی تھی۔ مجھے درختوں کے درمیان ایک آبی گزرگاہ نظر آئی۔ اس کا پاٹ دس بارہ میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ کنارے کٹے پھٹے تھے اور ان پر کثرت سے داب اُگی ہوئی تھی۔ میں اس آبی گزرگاہ کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے اردگرد سیکڑوں میل تک کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ جنگل سائیں سائیں کرتا تھا اور تیز دھوپ کے سبب نباتات کی مہک فضا میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت یہاں کوئی سیاہ فام حبشی نظر آ جائے تو اس جگہ کا گویا تنزانیہ وغیرہ کا جنگل تصور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

میں وہاں بیٹھا رہا اور دو پہر ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ کسی نکیلی شاخ کے لگنے سے میری کلائی پر گہرا زخم آیا تھا۔ قریباً دو انچ جگہ سے کھال اُتر گئی تھی۔ اس تازہ زخم کی وجہ سے کلائی کے ایک بہت پُرانے زخم کا نشان بھی معدوم ہو گیا تھا۔ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ثروت اس طرح ٹوٹ کر یاد آ رہی تھی کہ دل کسی آہنی مٹھی میں آ گیا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ ہمارے والدین نے ہماری شادی کے وقت کا باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا تھا تاہم بین السطور یہ بات طے تھی کہ شادی کب اور کس موسم میں ہونی ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ ثروت نے اپنی فائل میں انتظار کے ماہ و سال کو دنوں میں تبدیل کر رکھا ہے اور ان دنوں کی تعداد کے مطابق کاغذ پر لکیریں لگا رکھی ہیں۔ وہ ہر صبح اُٹھ کر ان لکیروں میں سے ایک لکیر کاٹ دیتی تھی۔ اس روز ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ میری نظر ثروت کی فائل پر پڑی۔ وہاں لکیریں نظر آئیں تو میرا تجسس جاگ گیا۔ میں فائل دیکھنے کے لیے فائل پر جھپٹا تو ثروت نے فائل ایک دم اپنے پیچھے چھپا لی۔ میں نے اس سے فائل لینا چاہی۔ اسی دوران میں ثروت کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم، نب کی طرف سے میری بازو میں چبھ گیا۔ کلائی اور کہنی کے درمیان سے خون نکل آیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے قلم اور فائل دونوں پھینک دیے اور میرا بازو دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

زخم کا وہ نشان انگریزی کے حرف ''ایس'' سے ملتا جلتا تھا۔ میں یہ زخم دکھا کر اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔ کہتا تھا، دیکھو کتنی بے رحم ہو تم۔ لوگ درختوں کے تنوں کو چھیدتے ہیں، تم نے اپنے نام کے لیے میرے بازو کو چھیدا ہے۔ وہ شرمندہ ہو جاتی تھی اور پھر کئی دفعہ تلافی کے لیے میرے بازو کے نشان کو چوم لیتی تھی۔ ایک دن جب اس نے ایسا کیا تو میں نے شرارت سے کہا تھا۔ اچھا ہوتا اگر اس دن تمہارا قلم کلائی کے بجائے میرے ہونٹوں پر لگا ہوتا۔ اس نے فولڈر بیگ میرے سر پر دے مارا تھا۔ وہ ذرا سا چوک کر میری ناک پر لگا۔ ''ٹھہر جا...... تیری

تو۔'' میں اس کے پیچھے لپکا۔

وہ اٹھلاتی اور بل کھاتی ہوئی بھاگی اور اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر سیدھی چھت پر چلی گئی جہاں خالہ صفیہ اور پھوپھو سکینہ وغیرہ بیٹھی تھیں۔

وہ دن ایسی ہی خوبصورت یادوں اور شرارتوں سے عبارت تھے۔ آج کلائی کے اس تازہ زخم کے ساتھ اس پُرانے زخم کا نشان معدوم ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری کوئی نہایت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔

میں تھک گیا تھا۔ میرے چاروں طرف گنجان جنگل تھا۔ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اب تو مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ میں کئی ہفتے بھی یہاں بھٹکتا رہوں تو باہر نکلنے کی راہ نہ پاؤں گا۔ میں اس چھوٹی ندی کے ساتھ ساتھ پھر چل پڑا۔ اندھیرا ہونے تک چلتا رہا۔ ہریالی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔ شام ہوتے ہی پرندے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ جوں جوں تاریکی پھیلتی گئی، جنگل جاگتا گیا۔ گاہے بگاہے مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے وقت مجھے کسی درخت پر ہونا چاہیے مگر درخت پر بھی کیڑوں مکوڑوں اور دیگر حشرات کے خطرات موجود تھے۔ پھر مجھے معلوم تھا کہ تیندوے اور جنگلی بلے وغیرہ بھی جو از حد خطرناک ہوتے ہیں، درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں زیادہ خوف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ وہ طاقتور رائفل تھی جو میرے ہاتھ میں تھی اور ایک وجہ وہ انقلابی کیفیت بھی تھی جو کل نیم شب سے میرے سینے میں موجزن ہو چکی تھی۔

وہ رات جیسے تیسے میں نے شاہ بلوط کے ایک بلند درخت پر گزاری۔ میں ساری رات نیم غنودگی کی کیفیت میں رہا۔ چھوٹی نال والی روسی ساختہ رائفل ایک قیمتی اثاثے کی طرح میرے کندھے سے لٹکی رہی۔ جنگلی حیات کی موجودگی صرف آوازوں تک محدود تھی اور یہ آوازیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔

صبح میں ایک بار پھر اپنے خستہ جاں بدن کو سمیٹ کر چل پڑا۔ بھوک اب نقاہت بن کر جسم کے ہر ہر ریشے میں اُترنے لگی تھی۔ میں اس کٹی پھٹی گم راہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور سر چکرا رہا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نیم جان ہو کر پھر اس مدام چلنے والے پانی کے کنارے شیشم اور جنتر کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں ڈھونڈتا تو مجھے ان رنگ رنگ کے درختوں، پودوں اور جھاڑیوں میں کہیں نہ کہیں نباتاتی خوراک مل سکتی تھی لیکن میں ابھی تک تذبذب میں تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کیا کھا سکتا ہوں اور کیا نہیں۔

عجیب سی مایوسی مجھ پر طاری ہونے لگی۔

کیا میں کبھی یہاں سے نکل نہ سکوں گا؟

کیا میں پھر پکڑا جاؤں گا؟

کیا بھاگنے کے جرم میں اس بار میری گردن اُتار دی جائے گی۔

ذہن میں ایک بار پھر سوال ہجوم کرنے لگے۔

دفعتاً میری نگاہ داب اور کیچڑ میں پھنسی ہوئی ایک شے پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ براؤن شیشے کی ایک بوتل تھی۔ نہ جانے یہ کہاں سے بہتی ہوئی آئی تھی اور کب سے یہاں دو پتھروں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس پر کائی جم چکی تھی۔ میں نے یہ بوتل نکال لی۔ یہ اندر سے خالی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف پھینک دیا اور ایک بار پھر درخت سے ٹیک لگا لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں اسی گنجان جنگل میں ہمیشہ چکراتا رہوں گا۔ کبھی یہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔ یاسیت کے سبب دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ اپنے بچھڑے ہوئے شدت سے یاد آنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے دل میں پتا نہیں کیا آئی، میں نے بوتل پھر اُٹھا لی۔ اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ میرے بازو کے زخم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب سے ایک کرنسی نوٹ مل گیا۔ میں نے ایک پتلی سی شاخ ڈھونڈی جسے قلم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اپنے بازو کے زخم کو کرید کر میں نے اسے کچھ مزید خونچکاں کیا۔ شاخ کے قلم کو اس خون میں ڈبو کر کرنسی نوٹ پر لکھا۔

''میرے پیارو! میں زندہ ہوں۔ میرا انتظار کرنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا۔ تابش......'' اس سے آگے اپنا لاہور کا مختصر پتا لکھا۔

نوٹ کی دوسری طرف میں نے اپنے لہو سے تین نام لکھے۔ ''فرح...... عاطف...... ثروت۔'' پھر میں نے اس نوٹ کو کائی زدہ بوتل کے اندر رکھا۔ بوتل کا ڈھکن بند کیا اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اسے پانی میں بہا دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس بوتل کو کہیں نہیں پہنچنا۔ شاید وہ کچھ ہی آگے جا کر کہیں گھاس وغیرہ میں اٹک جائے گی یا پھر اس بے کراں جنگل کے اندر ہی کہیں کسی بارشی جھیل میں جا ٹھہرے گی۔ لیکن بوتل کو اس طرح بہتے پانی میں ڈالنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے خود کو کسی قدیم کہانی کے کردار کی طرح محسوس کیا۔ وہ کہانیاں جن میں انہونیوں کی اُمیدیں پالی جاتی ہیں۔ جن میں گہری تاریک راہوں پر آس اور انتظار کے دیپ جلائے جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں اپنوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے اور دور دراز

کے جزیروں میں سدا کے لیے محصور ہو جانے والے لوگ، ساحلوں پر بیٹھتے ہیں اور اُفق کے پار دیکھتے ہیں۔ وہ پانیوں کو پار کرنے کے لیے کبھی تنوں سے کشتیاں بناتے ہیں، کبھی درختوں کو آگ لگا کر دور دراز کے جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی نامے لکھ کر اور انہیں بوتلوں میں بند کر کے لہروں کے سپرد کرتے ہیں۔

میں نے بھی بوتل کو ندی کے بہاؤ میں بہا دیا۔ وہ تیرتی گئی اور مجھ سے دور ہوتی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا یہ دور دیس کے کسی ایسے پانی میں پہنچے گی جہاں کوئی کشتی ران، کوئی مچھیرا اسے نکالے گا اور میرے پیاروں تک پہنچا دے گا۔ میری نگاہیں بوتل پر جمی رہیں۔ وہ دور ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے ایک نکتہ بنی اور پھر معدوم ہوگئی۔

میں نے رُخ پھیر کر دیکھا۔ میرے سامنے چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں اور تیسرے کے ہاتھ میں خوفناک پھل کی کلہاڑی تھی۔ بالکل یہی لگا کہ وہ اچانک زمین کے اندر سے نمودار ہو گئے ہیں یا درختوں کے تنے چیر کر باہر نکل آئے ہیں۔ میں اپنی جگہ پتھرا کر رہ گیا۔ میری نگاہیں گہرے سانولے چہرے والے تیواری لال پر جمی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے اپنی بصارت پر بھروسہ نہیں ہوا۔ دل و دماغ کی کچھ وہی کیفیت ہوئی جو چند روز پہلے اس وقت ہوئی تھی جب بادو باراں کی رات میں ایک سنسان جنگل کے اندر اچانک ہی ان لوگوں نے مجھے آ دبوچا تھا لیکن تب میں اور آج میں ایک فرق تھا۔ ایک سنگین اور مہلک فرق اور یہ "فرق" آگ کی ایک دیو قامت لہر کی طرح میرے سینے میں موجزن تھا اور میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ میری رائفل مجھ سے تین چار فٹ دور گہری سبز گھاس پر پڑی تھی۔

تیواری لال کی زہریلی پھنکار میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "بڑا شوق ہے تجھے بھاگنے کا۔ میرا خیال ہے کہ اگر بھگوڑوں کا عالمی مقابلہ کرایا جائے تو تُو حرام جادہ پہلے نمبر پر تو آ ہی جاوے گا۔"

میں خاموش کھڑا تھا لیکن میرے جسم میں آج جو جدا قسم کی ہلچل تھی، اس سے تیواری اور اس کے ساتھی بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اذیت کی انتہا بالآخر بے خوفی میں بدل چکی ہے۔ درد کی بھٹی میں تپ تپ کر اور جل جل کر ایک خام دھات نے آخر کار اپنی شکل تبدیل کر لی ہے۔

"ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔" تیواری کے پہلو میں کھڑے شخص نے میرے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔

لڑائی ایک فن بھی ہے لیکن لڑائی ایک دیوانگی بھی ہے۔ یہ ایک آرٹ بھی ہے اور ایک ایسی سرکش لہر بھی ہے جو کسی ضابطے، قاعدے کو نہیں مانتی۔ ایسی سرکش لہر کو تجربہ درکار ہوتا ہے۔ نہ ماحول اور نہ حکمت عملی اور میں ایک ایسی ہی لہر کے زیر اثر تھا۔

مجھے ہاتھ اوپر اُٹھانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن میں اپنی رائفل کی طرف گیا۔ رائفل اُٹھانے کے لیے میرا تیزی سے جھکنا میری زندگی کا جواز بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک گولی میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں رائفل پر گرا۔ تب رائفل بردار نے دوسری گولی چلائی۔ یہ گولی میرے پہلو کے پاس سے [illegible] زمین میں لگی۔ تب تک میں بھی ٹریگر دبا چکا تھا۔ میں نے دو فائر کیے۔ ان میں سے ایک گولی سیدھی رائفل بردار کی گردن میں گھسی۔ وہ جھاڑیوں میں گرا۔ کلہاڑی بردار اور تیواری لال [illegible]۔ تیواری لال کا پاؤں پھسلا اور وہ الٹ کر نشیب میں چلا گیا۔ اس کی دھوتی کے اندر سے اس کی کالی سیاہ ٹانگیں دور تک نظر آئیں۔ دوسرا رائفل بردار ڈیوڈ تھا۔ اس نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی مگر اس کے چہرے پر شدید گھبراہٹ کے آثار تھے۔ [illegible] ساتھ رائفل کو جھٹک رہا تھا۔ اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ڈیوڈ نے مجھ پر گولی چلائی تھی مگر گولی چیمبر میں پھنس گئی تھی۔

ڈیوڈ برف کی طرح سفید پڑ [illegible] کے ساتھ ہی قدم پیچھے ہٹا پھر اچانک رُخ پھیر کر بھاگ نکلا۔ کلہاڑی بردار اس سے دو قدم آگے تھا۔ میں نے بے دریغ، ڈیوڈ نامی اس بندے پر فائر کیے۔ ایک گولی تو ضائع ہوگئی دوسری اس کی ٹانگ میں کہیں لگی لیکن وہ رُکا نہیں، لنگڑاتا ہوا بھاگتا رہا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں جنونی لہجے میں چلایا۔ "مجھے مارو...... مجھے مارو۔ بھاگتے کیوں ہو حرامزادو! مجھے جان سے مار دو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے کئی گولیاں چلائیں اور ان کے پیچھے لپکا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں میں اوجھل ہوگئے۔

میں جنونی انداز میں ان کے پیچھے دوڑتا رہا۔ میری آواز جنگل میں دور تک گونجتی رہی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں افراد گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں پاس سے کمک لینے گئے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بدحواس ہوگئے ہوں۔

اچانک مجھے تیواری لال کا خیال آیا۔ وہ بوکھلاہٹ میں پیچھے ہٹا تھا اور نشیب کی جھاڑیوں میں گرا تھا۔ میں رائفل سونت کر اس نشیب کی طرف بھاگا۔ مگر بیس پچیس میٹر آگے ہی گیا تھا کہ دائیں طرف سے مجھ پر دو فائر ہوئے۔ یہ پستول کے فائر تھے۔ ایک گولی میرے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ میں تلملا کر پلٹا۔ جھاڑیوں میں تیواری لال کی سفید دھوتی کی

جھلک نظر آئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ جنگل دھماکوں سے گونج اُٹھا۔ دھوتی جیسے زمین پر بچھ گئی۔ طیش کے سبب میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ تیواری کے پاس پستول ہے اور وہ اب بھی مجھ پر جوابی فائر کرسکتا ہے، میں بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے صرف ایک گولی لگی تھی لیکن یہی کام دکھا گئی تھی۔ یہ گولی اس کے پیٹ میں داخل ہو کر پسلیوں کی طرف سے نکل گئی تھی۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ سر پر خون کیسے سوار ہو جاتا ہے۔ کس طرح ایک قتل کے بعد دوسرے قتل بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں میں جنون دیکھ کر تیواری لال کا سانولا چہرہ کالا سیاہ ہو گیا۔

وہ گھگیایا۔ ''گولی مت چلانا...... مم...... میرا کوئی دوش ناہیں...... یہ گورا صاحب کا حکم تھا۔''

میں پھنکارا۔ ''گورا صاحب کے حکم پر ہی تُو سلطانہ کو زرگاں لایا تھا۔ اسی کے حکم پر تُو نے اسے جیل سے نکال کر اس کی کوٹھی میں پہنچایا ہوگا اور اسی کے حکم پر تُو نے کوٹھی کے باہر پہرا دیا ہوگا تا کہ وہ آسانی سے اس کی آبرو خراب کر سکے۔''

''ناہیں...... ناہیں۔'' تیواری نے کرب کے عالم میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''سلطانہ کو زرگاں لانے والا میں ناہیں، موہن کمار ہے۔ میں سوگند کھاوت ہوں۔''

میں نے صرف تین انچ کے فاصلے سے اس کے سر پر فائر کیا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ شاید میں مزید فائر بھی کر گزرتا لیکن ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ میرے پاس ایمونیشن کم ہے۔

تیواری کی منحوس، متلاشی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھانے کے بعد میں نڈھال سا ہو گیا۔ ہانپا ہوا سا میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا لی۔ چالیس پچاس فٹ آگے ندی کا کنارہ تھا اور وہاں دوسری لاش پڑی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

کیا ان دونوں جیتے جاگتے انسانوں کو میں نے مارا ہے؟ اپنے ہاتھوں سے مارا ہے؟

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن حقیقت سامنے تھی اور ابھی سینے میں آگ کی وہ دیو قامت لہر بھی بلندی میں کم نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ندی کے کنارے مرنے والے محافظ کی لاش چیک کی۔ گولی اس کی فربہ گردن کی ہڈی توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس شخص کی رائفل اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس رائفل میں بڑا میگزین لگا ہوا تھا اور یہ نسبتاً بڑی بھی تھی۔ میں نے یہ رائفل اُٹھا لی اور دوسری رکھ دی کیونکہ دونوں رائفلوں کو لے کر چلنا آسان نہیں تھا۔ یہ دوسری رائفل حاصل کرنے کا

ایک فائدہ مجھے یہ بھی ہوا کہ گولیوں کی ایک بیلٹ بھی ملی۔ یہ بیلٹ مرنے والے کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے بیلٹ کھول کر جیسے تیسے اپنی کمر سے باندھ لی۔ اپنی والی چھوٹی نال کی رائفل پانی میں پھینک دی۔ تیواری لال کے پاس پڑا ہوا پستول بھی میرے کام آ سکتا تھا۔ یہ پستول بھی میں نے اُٹھا لیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ڈیوڈ اور اس کا کلہاڑی بردار ساتھی کمک لے کر واپس آ سکتے تھے۔ تیواری لال کی جامہ تلاشی میں کچھ کرنسی، سگریٹ اور دیگر اشیاء بھی ملیں جو میں نے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد میں وہاں سے چل دیا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ڈیوڈ اور کلہاڑی بردار شخص گھوڑوں پر یہاں آئے تھے تو تیواری اور اس کا مرنے والا ساتھی بھی یقیناً گھوڑوں پر ہوں گے۔ ان کے گھوڑے بھی یہیں کہیں ہو سکتے تھے۔ میں تھوڑا آگے گیا اور دو گھوڑے درختوں میں بندھے ہوئے مل گئے۔ وہ بڑے انہماک سے ہری بھری گھاس پر منہ مار رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک گھوڑا منتخب کیا۔ میری گھڑ سواری صرف مری اور ایبٹ آباد وغیرہ تک محدود تھی۔ ہم اپنے والدین کے ساتھ ان ''ہل اسٹیشنز'' پر جاتے تھے اور کرائے کے گھوڑوں پر تھوڑی بہت سواری کر لیتے تھے۔ کچھ تجربہ یہاں جارج گورا کے وسیع وعریض اصطبل میں آ کر حاصل ہوا تھا۔ گھوڑوں کی عادات کا تھوڑا بہت پتا چلا تھا۔

میں نے ایک گھوڑا کھولا۔ اسے تھپکیاں دے کر ذرا شانت کیا اور پھر سوار ہو گیا۔ حقیقی معنوں میں یہ میری زندگی کی پہلی گھڑ سواری تھی۔ میں گھوڑے کو پہلے آہستہ چلاتا رہا پھر تھوڑی تھوڑی ایڑ لگانی شروع کی۔ میں نے ڈیوڈ اور اس کے ساتھی کو شمال کے رُخ پر بھاگتے دیکھا تھا، میں نے جنوب کا رُخ کیا۔

تجربے کے بغیر گھوڑے پر بیٹھنا اور گھنے درختوں میں ایک طویل سفر کرنا نہایت دشوار کام تھا مگر میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ جب مرنا تھا تو پھر ڈرنا کیا۔ بازو پر لگنے والی گولی نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہ ایک قابلِ برداشت زخم تھا۔

میں نے قریباً ایک گھنٹے تک گھوڑے پر سفر کیا۔ اس دوران میں کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا مگر میرا ذہن مسلسل سوچتا رہا اور تحیر کی لہریں مجھے اتھل پتھل کرتی رہیں۔ غنی صاحب نے سلطانہ نے اور پھر بھکشو ہمیش نے ملتی جلتی بات ہی کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے کسی سفلی عمل کے ذریعے اس راجواڑے کی حدود میں پابند کر دیا گیا ہے۔ میں ان گنجان جنگلوں کو پار

نہیں کر سکتا اور جب بھی کوشش کروں گا، پکڑا جاؤں گا اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میں ایسی کئی ایک ناکام کوششیں کر چکا ہوں۔ شروع میں مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر اب ذہن میں عجیب سی بے کلی تھی۔ چند دنوں کے اندر یہ دوسرا واقعہ ہوا تھا۔ اس گھنے ویران جنگل میں جہاں بیسیوں میل تک کسی آدم زاد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تیواری، ڈیوڈ اور ان کے ساتھی یوں وارد ہوئے تھے جیسے زمین سے نکل آئے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ کیونکر کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح مجھ تک آ پہنچے تھے اور سلطانہ نے بتایا تھا کہ یہ کچھ میرے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اسٹیٹ کے وہ خاص قیدی جنہیں بہرصورت یہاں رکھنا مقصود ہوتا ہے، اس ''سحر'' کے اثر میں لائے جاتے ہیں اور پھر وہ کبھی اس اسٹیٹ کو چھوڑ نہیں سکتے۔

میں اپنے ذہن کا کیا کرتا؟ میرا ذہن ایسی کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں گھوڑے پر محوِ سفر رہا۔ میرے لیے جو چیز سب سے زیادہ اطمینان کا باعث تھی، وہ یہ تھی کہ گھوڑے کے ساتھ خاکی کینوس کا ایک بڑا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا۔ خشک گوشت، بھنے ہوئے چنے، چاولوں کی پنجیری، کوئی ایک درجن سیب اور صاف پانی۔ یہ سامان میرے لیے کئی دن تک کافی تھا۔ میں نے دلکی چال چلتے گھوڑے پر ہی تھوڑی سی پیٹ پوجا کی اور سفر جاری رکھا۔

نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں جہاں بھی چلا جاؤں گا، جتنی بھی دور نکل جاؤں گا۔ میرا تعاقب کرنے والے وہاں پہنچ جائیں گے اور قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد یہی کچھ ہوا۔ ہانپتا ہوا گھوڑا، ایک ڈھلوان چڑھنے کے بعد بلندی پر آیا تو میری نگاہ اپنے عقب میں نشیب کی طرف اُٹھ گئی۔ یکایک میں چونک گیا۔ مجھے دور نیچے اندازاً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر درختوں کے درمیان متحرک چیزیں دکھائی دیں۔ یہ کچھ اور نہیں گھوڑے تھے۔ فاصلے سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا مگر وہ آٹھ دس سے کم ہرگز نہیں تھے۔ میں نے بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ لیا تھا، اب معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ میری رگوں میں لہو کی گردش پھر بڑھ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ گنجان درختوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دو گھنٹے کا مسلسل سفر بھی مجھے میرے دشمنوں سے دور نہیں لے جا سکا تھا۔

ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ مجھ پر طاری ہو گئی۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ ان سارے حالات سے چھٹکارا پانے کے لیے خود کو گولی مار لوں۔ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رائفل کی نال رکھ کر ٹریگر دبانا مجھے کوئی بہت زیادہ مشکل نظر نہیں آتا تھا لیکن تب ہی وہ ہمیشہ مسکراتا چہرہ پھر

میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ غیر مرئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''جگر! مرنا تو ہے لیکن اس کی ذمے داری خود پر نہیں لینی۔''

میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا، گھڑسوار تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ سیدھے میرے رُخ پر آ رہے تھے۔ حالانکہ میں نے راستے میں کئی بار اپنا رُخ تبدیل کیا تھا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور گھوڑے سے اُتر آیا۔ خوراک اور پانی والا تھیلا میں نے گھوڑے کی زین سے علیحدہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے گھوڑے کی پشت پر چند چھڑیاں رسید کیں۔ وہ گردن اُٹھا کر ہنہنایا اور دوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں جھاڑیوں سے اٹی ہوئی ایک دشوار ڈھلوان پر پاؤں جما جما کر اُترا اور بائیں رُخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔ اب رائفل کے علاوہ وزنی تھیلا بھی میرے پاس تھا۔ میں اپنی رفتار تیز نہیں رکھ سکتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر آگے جانے کے بعد راستہ مسدود نظر آیا۔ وہی آبی گزرگاہ میرا راستہ روکے کھڑی تھی جس کے ساتھ ساتھ میں نے پچھلے دو گھنٹے تک سفر کیا تھا۔ اب وہ خم کھاتی ہوئی جا رہی تھی اور اس کے کنارے کافی بلند تھے۔ اگر اب پھر میں اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتا تو گھڑسواروں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ میں اسے پار کر جاؤں۔ اسے پار کرنے کے لیے نہ جانے کب کسی نے ''لونگ پیپر'' کے درخت کا کٹا ہوا تنا اس کے پاٹ کے اوپر پھینک دیا تھا۔ ندی اس کے نیچے قریباً پندرہ بیس فٹ کی گہرائی میں بہہ رہی تھی۔ میں تین چار فٹ قطر کے اس تنے کے اوپر سے گزر کر ہی ندی پار کر سکتا تھا۔

میرے ذہن میں وہی ڈیک نالے والا منظر پھر تازہ ہو گیا۔ درد کی ایک لہر سی پورے جسم میں چل گئی۔ دو ڈھائی سال پہلے ایک ایسی ہی صورتِ حال میں تو عمران مجھ سے جدا ہوا تھا۔ کچھ ایسا ہی پانی تھا، کچھ ایسا ہی رستہ تھا اور تعاقب میں چلتے ہوئے کچھ ایسے ہی خطرات تھے۔ ''ہمت کرو تابی! تم یہ کر سکتے ہو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں۔'' عمران کی بے چین آواز تاریکی کا سینہ چیر کر مجھ تک پہنچی تھی۔

میں نہیں کر سکا تھا لیکن آج میں کر سکتا تھا۔ آج دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ بے رحم خزاؤں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر اندر کے موسم بدل چکے تھے اب کھونے کو کچھ باقی نہیں تھا اور جب کچھ نہ ہو تو ڈر بھی باقی نہیں رہتا۔ میں نے ایک ہاتھ میں رائفل، دوسرے میں بیگ تھاما۔ دونوں چیزوں کو دونوں کندھوں سے لٹکایا اور تنے پر پاؤں رکھ دیئے۔ میرے پاؤں مستحکم تھے۔ جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور نگاہیں دوسرے کنارے پر مرکوز تھیں۔ میں نیچے نہیں

دیکھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ گزر جاؤں گا۔ میں اگلے کنارے سے دس بارہ فٹ دور تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے ڈانواں ڈول کیا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن توازن بگڑ چکا تھا۔ کوشش کے باوجود میں سنبھل نہیں پایا۔ میں پھسلا۔ دایاں کندھا بُری طرح تنے سے ٹکرایا اور میں سر کے بل ندی کے پانی میں آیا۔ یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور بے خوفی کے عالم میں محسوس کیا۔ ڈر کے بجائے ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ مجھ پر طاری ہوئی۔ میں نے سرد پانی میں چند غوطے کھائے اور پھر سطح آب پر رہنے کے لیے ہاتھ چلانے شروع کر دیئے۔ تیز بہاؤ مجھے اپنے ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی رائفل کا خیال آیا وہ ابھی تک میرے کندھے پر تھی تاہم میرے ساتھ ہی پانی میں ڈبکیاں لے رہی تھی۔ کینوس کا بیگ کندھے سے اُتر کر ناپید ہو چکا تھا۔

میں بہت اچھا تیراک تو نہیں تھا تاہم ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سطح آب پر رکھ سکتا تھا۔ اگلے دس منٹ تک مٹیالے سرد پانی نے مجھے تیزی سے اپنے ساتھ بہایا۔ اس پانی میں درختوں کی پتلی شاخیں، زرد پتے، جنگلی پھولوں کے آثار اور پتا نہیں کیا کچھ میرے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دس منٹ بعد پانی کی رفتار قدرے کم ہوگئی۔ میں نے کوشش کی اور خود کو کنارے کی طرف لے آیا۔ یہاں کناروں کی بلندی بھی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں شرابور کپڑوں کے ساتھ باہر نکلا۔ عقب میں دیکھا، ایک بار پھر دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے دوڑنے لگتا تھا۔ میرا سامان کھو گیا تھا لیکن اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ رائفل بُری طرح بھیگ چکی تھی۔ اب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس طرح بھیگی ہوئی رائفل بہ وقتِ ضرورت کام کر سکتی ہے یا نہیں۔ میں ٹریگر دبا کر ہی اسے ٹیسٹ کر سکتا تھا لیکن اگر گولی چل جاتی تو اس کی آواز بھی خطرناک تھی۔ میرا تعاقب کرنے والے تو پہلے ہی مقناطیس کی طرح میری طرف کھنچتے چلے آتے تھے۔

میں اپنے زخم زخم جسم کو سمیٹے اسی طرح چلتا رہا۔ ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں دو تین جانور دکھائی دیئے۔ ان کی جسامت کتے کی طرح تھی۔ اس معاملے میں میری شناخت کی قابلیت صفر تھی۔ وہ بھیڑیے ہو سکتے تھے، لومڑ یا پھر جنگلی کتے جو اپنی جبلت میں بڑے خطرناک تصور کیے جاتے ہیں۔ بہرحال انہوں نے مجھے نظر انداز کیا اور میں نے انہیں۔ میں تھوڑا آگے گیا تھا کہ جھاڑ جھنکاڑ میں کوئی سیاہی مائل چیز نظر آئی۔ جیسے کوئی بڑا ریچھ یا سیاہ بھینسا چھپا بیٹھا ہو مگر دھیان سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوئی ذی روح نہیں۔ یہ دراصل کسی کھوہ کا دہانہ تھا۔

کچی زمین کے اندر ایک دراڑ کی سی شکل تھی جو نیچے سے پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس دراڑ میں گھس گیا۔ خطرہ کہاں نہیں تھا؟ خطرہ یہاں بھی تھا۔ سانپ، بچھو یا کوئی جانور۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا یہاں اور میری رائفل بھیگ چکی تھی۔ کہیں سنا تھا کہ کبھی کبھی انسان خونخوار درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہو جاتا ہے۔ آج یہ بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ درندہ تو صرف شدید بھوک میں ہی حملہ آور ہوتا ہے اور اس میں حکمتِ عملی کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ لیکن یہ جاندار جس کا نام انسان ہے، جب درندگی پر اُترتا ہے تو اس کے لیے سارے اوقات برابر ہو جاتے ہیں۔ اپنی خداداد صلاحیت سے وہ ایسی ایسی بھیانک چالیں سوچتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ یہ نیم تاریک دراڑ اتنی گہرائی تک جائے گی۔ میں چلتا گیا اور وہ مجھے راستہ دیتی گئی۔ میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ذرا گہرائی میں بھی اُتر رہا تھا۔ کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے۔ جانوروں کی مینگنیاں اور گوبر وغیرہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ دراڑ کی دیواریں کچی لیکن سخت مٹی کی تھیں۔ کافی آگے جا کر مجھے ایک جگہ تھوڑی سی راکھ اور کوئلے نظر آئے۔ یہاں آگ جلائی گئی تھی۔ اس واقعے کو کتنا عرصہ ہوا تھا، اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فی الحال یہ دراڑ بالکل سنسان نظر آتی تھی۔ کسی جگہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن کسی جگہ ہوا کی مدھم سی حرکت بھی محسوس ہوتی تھی۔ بھیگی ہوئی رائفل میں نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ آگے جا کر دراڑ دو شاخوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ میں دائیں شاخ میں داخل ہو گیا۔

''رُک جاؤ نا ہیں تو گولی مار دوں گا۔'' ایک للکارتی ہوئی آواز مجھے عقب سے سنائی دی۔

میں ایک بار پھر سکتہ زدہ رہ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ''بندوق پھینک کر ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔'' ایک بار پھر کرخت لہجے میں کہا گیا مگر اس بار آواز دوسری تھی۔ مطلب یہ تھا کہ یہاں ایک سے زیادہ افراد ہیں۔

''کون ہو تم؟'' میں نے رائفل پھینکے بغیر کہا۔

''سب کچھ بتا دیں گے۔ پہلے اپنی اس ماں کو نیچے پھینکو۔'' پہلے شخص نے گرج کر حکم دیا۔

میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ یہ لوگ کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو

تیار نہیں تھے۔

میں نے رائفل نیچے پھینک دی لیکن کسی بھی کارروائی کے لیے تیار رہا۔ کرتے پاجامے اور ٹوپی والا ایک مقامی شخص میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کا رُخ میری طرف رکھا اور رائفل اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے عقب میں دو تین اور ہیولے سے دکھائی دے رہے تھے۔ جونہی اس نے رائفل اُٹھانی چاہی، میں نتائج سے بے پروا اس پر جا پڑا۔ میری ٹانگ بڑے زور سے اس کے چہرے پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر اس سرنگ نما دراڑ کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی انگلی بے ساختہ ریوالور کے ٹریگر پر دب گئی تھی۔ دھماکے کے ساتھ شعلہ نکلا اور ایک دیوار کی طرف چلا گیا۔ رائفل کی نال میرے ہاتھ میں آ چلی تھی۔ میں نے اُسے لاٹھی کی طرح گھما کر ریوالور بردار کے ہاتھ پر مارا۔ نشانہ درست لگا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل گرا۔

یہی وقت تھا جب دو تین سائے مجھ پر جھپٹے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں پُرانی طرز کی تلواریں اور ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے مجھ پر آئے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ایک فائر کرنا چاہا لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بُری طرح بھیگی ہوئی کیچڑ آلود رائفل نے کام نہیں کیا۔ تلوار کا پہلا وار میں نے رائفل پر ہی روکا۔ پھر رائفل کو کسی لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میں حملہ آوروں سے بھڑ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا، میں کیا کر رہا ہوں؟ کیوں کر رہا ہوں؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بس میرے سینے میں آگ کی دیو قامت لہر تھی اور دماغ میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ لڑنے کے ساتھ ساتھ میں جنونی انداز میں دھاڑ رہا تھا۔ ''مار دو مجھے...... جان سے مار دو۔ میرے ٹکڑے کر دو......''

اور جن لوگوں کو میں یہ دعوت دے رہا تھا، وہ سخت بدحواس نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو سر پر شدید چوٹ کھانے کے بعد زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ سے تلوار نکل گئی تھی اور وہ چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ پر کہرام سا مچ گیا تھا۔ پھر بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک گرج دار آواز اُبھری۔ ''ٹھہرو...... یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ سلطانہ کا شوہر ہے۔''

میرے اردگرد ایک دم سکوت سا ہو گیا۔ تلوار بردار اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اب آواز کے ماخذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو تسلی دینے کے انداز میں ہلا رہا تھا اور میری طرف آ رہا تھا۔ ''رُک جاؤ تابش! یہ دوست ہیں۔'' اس نے پکار کر کہا۔

میں حیرت زدہ کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ اب بھی رائفل پر تھے۔ میں نے اسے نالی کی طرف سے بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ سانس دھونکنی ہو رہی تھی۔ میں لڑنے مرنے کو بالکل تیار تھا۔

چوہان نے آگے بڑھ کر رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ میرے شدید حملے سے زخمی ہونے والے دو افراد کو بھی دوسرے لوگوں نے سہارا دے کر اُٹھا لیا اور ایک طرف لے گئے۔ چوہان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔ ''ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ تمہیں یہاں دیکھیں گے۔ یہ تو ایک کرشمہ ہے۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ مجھے مارنے کی کوشش کی ہے۔''

''یہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ان کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو سب سے زیادہ دُکھ بھی ان لوگوں کو ہی ہوتا۔ یہ دشمن نہیں، دوست ہیں۔ تمہاری اور سلطانہ کی خاطر ہی یہاں اس جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ شاید تمہیں پتا نہیں وہاں زرگاں میں اس رات کیا کچھ ہوا ہے۔''

''تم کس رات کی بات کر رہے ہو؟''

''جب سلطانہ کو جیل سے نکال کر جارج گورے کی رہائش گاہ پہنچایا گیا اور تم جارج کے دو ملازموں کو زخمی کر کے وہاں سے بھاگے۔''

میں سوالیہ نظروں سے چوہان کا چہرہ تک رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''تمہیں پتا ہے، تم اب کس جگہ ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''تم ایک بار پھر نل پانی کے آس پاس پہنچ چکے ہو اور یہ ایک بڑی اچھی پناہ گاہ ہے جہاں تم آ گئے۔ یہ ایک زبردست اتفاق ہے۔ یہاں موجود لوگوں میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم از خود یہاں پہنچ جاؤ گے۔''

''تم اس رات کی بات کر رہے ہو۔ کیا ہوا تھا اس رات؟''

''میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس درست کر لو۔ تمہیں مرہم پٹی کی ضرورت بھی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے تم نہا لو۔''

میں ایک بار پھر شدید حیرت کی زد میں تھا۔ میں نے خود کو ایک تنکے کی طرح محسوس کیا جسے حالات کی ہوا اپنے ساتھ اُڑائے لیے پھر رہی تھی۔

یہاں نہانے کا انتظام موجود تھا۔ میرے لیے ایک مقامی لباس بھی فراہم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے اپنے ہاتھ سے میرے مختلف زخموں اور خراشوں وغیرہ کی مرہم پٹی کی۔ اس

دوران میں دیکھتا رہا کہ میرے اردگرد موجود لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی اور دوستی کی جھلک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کم وبیش چالیس افراد تھے۔ ان میں عورت کوئی نہیں تھی۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں اور لاٹھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ مجھے ان میں سے چند ایک کے چہرے اور جسم پر چوٹوں کے تازہ نشان بھی نظر آئے۔

یہ دراڑ یہاں آکر کئی شاخوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ کئی جگہ گہری تاریکی تھی جہاں مشعلیں وغیرہ جل رہی تھیں۔ کئی حصوں میں ہلکا اُجالا موجود تھا۔ ویسے بھی اب مجھے یہاں داخل ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری آنکھیں بتدریج نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ یہ جگہ زیرِ زمین ایک وسیع وعریض قدرتی غار کی طرح تھی۔ ایک تنہا گوشے میں چٹائی بچھی تھی اور دو موم بتیاں روشن تھیں۔ چوہان مجھے وہاں لے آیا۔ اس نے مجھے زبردستی تھوڑا سا پنیر کھلایا۔ ساتھ میں خشک گوشت کے ٹکڑے اور بھنے ہوئے چنے تھے۔ پانی پی کر قدرے میری جان میں جان آئی۔ میری نگاہوں میں وہ دو عدد لاشیں گھومنے لگیں جنہیں میں اپنے پیچھے آبی گزرگاہ کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو میں نے مارا تھا اور اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔

چوہان نے مجھ سے پوچھا۔ ''جہاں تک میں جانتا ہوں جو رائفل تمہارے پاس ہے، وہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے استعمال میں ہوتی ہے۔ یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس رات زرگاں میں کیا ہوا ہے؟''

''وہ کچھ جو بہت کم لوگوں نے سوچا تھا۔ دراصل جب عام لوگوں کے دلوں کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے تو پھر ایک روز اسے باہر تو نکلنا ہی ہوتا ہے۔ جبر، طاقت اور چالبازی سے ان جذبوں کو دبایا نہیں جاسکتا جو انسانوں کے اندر پلتے ہیں اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ پھلتے پھولتے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ حد ختم جائے تو پانی جیسی نرم رقیق شے بھی بڑے بڑے مضبوط بند بہا کر لے جاتی ہے۔ زرگاں میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہوتی جارہی ہے۔ اس تازہ واقعے نے لوگوں کو اور زیادہ بدظن کر دیا ہے۔ جارج گورا نے جو کچھ کیا، بڑی رازداری سے کیا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ جارج گورا زرگاں کی جیل کا انچارج بھی ہے۔ وہ بڑی رازداری سے سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکلوا کر اپنے گھر لے گیا تھا لیکن یہ بات راز نہیں رہ سکی۔ جیل کا ایک ملازم مظفر جو یوں تو جارج کا وفادار ہے لیکن اس زیادتی

کو برداشت نہ کرسکا۔ اس نے بڑی مسجد کے امام صاحب کو جا کر سارا واقعہ بتا دیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پورا زرگاں سویا پڑا تھا لیکن یہ ایسی خبر تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان آبادی میں پھیل گئی۔ اگلے روز صبح منہ اندھیرے سیکڑوں لوگ جارج کے گھر کے سامنے اکٹھے ہوگئے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا، یہ ہجوم بڑھتا گیا۔ لوگوں کے تیور دیکھ کر جارج نے بہت سے مسلح گارڈز بلا لیے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی لوگوں نے جارج کے گھر پر ہلا بول دیا۔ گارڈز نے پہلے تو لاٹھی چارج اور ہوائی فائرنگ کے ذریعے لوگوں کو ڈرانا چاہا۔ جب بس نہیں چلا تو سیدھی فائرنگ شروع کردی۔ وہاں بہت ہنگامہ ہوا مہروز...... میرا مطلب ہے تابش! کیا تمہیں اس کی کچھ خبر نہیں؟'' چوہان نے پوچھا۔

''نہیں...... مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اسی رات زرگاں سے نکل گیا تھا۔ میں نے یہ دو دن بالکل ویرانے میں گزارے ہیں۔'' میں نے کہا۔

چوہان نے بتایا۔ ''اس ہنگامے میں کم از کم آٹھ لوگوں کی جان گئی ہے۔ چھ بندے مظاہرہ کرنے والوں میں سے مرے ہیں۔ دو گارڈز بھی جان سے گئے ہیں۔ انہیں کلہاڑیوں اور چھریوں کے زخم لگے تھے۔ اسی دوران میں جارج اور اس کے دو قریبی ساتھی موقع دیکھ کر عقبی راستے سے کوٹھی سے نکل گئے۔ حکم جی تو زرگاں سے باہر ہے۔ اس کے قائم مقام نے گارڈز کی مزید نفری منگوائی اور بڑی مشکل سے اس ہنگامے پر کنٹرول کیا۔''

''سلطانہ کا کیا بنا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''لوگوں نے اسے اور تمہارے بچے بالو کو بھی کوٹھی سے نکال لیا۔''

''کہاں ہیں وہ؟''

چوہان نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اسے کہاں ہونا چاہیے؟''

''کیا...... وہ یہیں پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''لیکن اس کی حالت ایسی نہیں کہ تم فوری طور پر اس سے مل سکو۔ اس نے سارے حالات کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ یہاں ایک بندے کے پاس افیون تھی۔ میں نے وہ اسے دی ہے تاکہ وہ کچھ سکون سے رہ سکے۔'' چوہان کے چہرے پر دُکھ کے تاثرات تھے۔

میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہی دل دوز منظر گھوم گیا جب میں بے بسی کی حالت میں جارج کے کمرے سے باہر آرہا تھا اور سلطانہ دروازہ بند کر رہی تھی۔ یہ منظر جیسے میرے حافظے

سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری سانس تیزی سے چلنے لگی اور رگ پٹھوں میں تناؤ محسوس ہوا۔

''کیا بات ہے؟'' چوہان نے میرا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کہیں دور سے بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ بالو ہی تھا۔

''میں سلطانہ اور بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''لیکن اس سے سلطانہ اور ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔''

''اس نے جتنا ڈسٹرب ہونا تھا، ہو چکی ہے۔'' میں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھہرو...... ٹھہرو...... ایسے نہیں۔'' چوہان نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ ''پہلے مجھے سلطانہ کے پاس جا کر وہاں کی صورتِ حال دیکھنے دو۔''

وہ مجھے وہیں بٹھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ایک شخص دوستانہ انداز میں میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سلطانہ کا باپ اور بھائی زرگاں سے نکل نہیں سکے۔ اس بات کا سب کو بہت افسوس ہے۔ چند افراد ایک طرف چادریں بچھا کر نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ بھی لیتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی تھی لیکن اب پتا نہیں کیوں یہ ہمدردی مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ہمدردی کے ساتھ ساتھ مجھ پر ترس بھی کھا رہے ہیں اور مجھے اب ترس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اب میں جتنے ہفتے، دن یا گھنٹے زندہ رہوں، سر اُٹھا کر رہوں اور کوئی مجھے قابلِ رحم نہ سمجھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان چند دنوں کے اندر میری پوری کیمسٹری ہی بدل گئی ہے۔ ایک شخص دائیں طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا کراہ رہا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا اور اب ایک پٹی میں باندھا ہوا گلے میں جھول رہا تھا۔ یقیناً یہ بھی اس خونی ہنگامے کا زخمی تھا جو تین دن پہلے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ وہی جواں سال بھکشو جس سے پگوڈا میں پہلے ہی روز میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ محبت سے پیش آیا تھا۔ اس نے بھنے ہوئے چاولوں سے میری تواضع کی تھی۔ آج وہ یہاں اس مسلمان جتھے کے ساتھ موجود تھا جس نے حکم جی اور جارج وغیرہ کے خلاف بغاوت کا علم اُٹھایا تھا اور اب یہاں اس زیرِ زمین پناہ گاہ میں موجود تھا۔

میری آنکھیں ہمیش کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ہمیش کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں اُٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ''تم یہاں کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''میں کیوں ناہیں ہو سکتا؟''

''میرا مطلب ہے تم تو بودھی بھکشو ہو۔''

''بھکشو بھی تو انسان ہی ہووت ہے۔ ظلم زیادتی دیکھ کر اس کا سینہ بھی جلتا ہے اور پھر جس طرح کے ظلم حکم جی اور جارج وغیرہ کر رہے ہیں، یہ تو پتھر کو بھی رونے پر مجبور کر دیوت ہیں۔'' نوجوان بھکشو کی شفاف آنکھوں میں گہرا دُکھ پھیل گیا۔

''تو تم بھی جارج کے گھر گھسنے والوں میں شامل تھے؟''

''ہاں...... اور میرے دو اور دوست بھی تھے۔ جب ہمیں جانکاری ہوئی کہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکال کر جارج گورا کے گھر پہنچایا گیا ہے اور اب بہت سے لوگن جارج کے گھر کے سامنے جمع ہیں تو میں بھی نہ رہ سکا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں لوگن کے اندر آگ بھڑکت تھی اور وہ غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اچانک جارج کے غنڈوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا، وہ ڈاکٹر چوہان نے تمہیں بتایا ہی ہووے گا۔''

میں خاموش رہا۔ ہمیش بھی خاموشی سے اپنے ٹوٹے بازو کو سہلاتا رہا۔ آخر اس نے ہولے سے کہا۔ ''تم وہاں سے کب نکلے تھے؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا وچار ہے کہ وہ رات دو ڈھائی بجے کا ہووے گا۔ اس وقت ہم نے جارج کی کوٹھی کی طرف سے خطرے کے سائرن سنے تھے۔ پر اس وقت ہم کو بالکل پتا ناہیں تھا کہ یہ سائرن تمہارے کارن بجائے جا رہے ہیں۔ یہ تو اگلے روز پتا چلا کہ تم بھی جیل کے بجائے جارج کی کوٹھی پر ہی تھے اور رات کو جارج کے دو بندے زخمی کر کے وہاں سے بھاگ نکلے ہو۔ جس گھوڑا گاڑی پر تم بھاگے تھے، وہ آگے جنگل سے ملی تھی۔ بُری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ ایک گھوڑے کی ریڑھ ٹوٹی تھی اور وہ مر گیا تھا۔''

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس رات کے تہلکہ خیز مناظر ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ ہمیش میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تعریف کا مدھم سا عکس بھی تھا۔ جیسے بے زبان خاموشی کہہ رہا ہو۔ تم نے دلیری دکھائی ہے۔ تمہیں ایسے ہی کرنا چاہیے تھا بلکہ بہت پہلے سے ایسے کرنا چاہیے تھا۔

اسی دوران میں چوہان واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں اور چوہان پھر کونے میں بچھی چٹائی پر جا بیٹھے۔ چوہان نے کہا۔ ''تابش! ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ذہنی طور

پر بھی بُری طرح اپ سیٹ ہے۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ کم از کم کل تک۔''

''ہم یہاں کب تک رہیں گے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''ابھی کچھ پتا نہیں۔ ویسے نل پانی میں چھوٹے سرکار کو ساری بات معلوم ہو چکی ہے۔ وہ جلد ہی کوئی فیصلہ کر لیں گے۔ اگر انہوں نے اس بار تمہیں اور سلطانہ کو پناہ دے دی تو یہ بہت اچھا ہو گا اور میرا خیال ہے کہ اگر تمہیں پناہ ملی تو ان چالیس پینتالیس لوگوں کو بھی مل جائے گی جو تمہارے ساتھ یہاں موجود ہیں۔''

''اور اگر پناہ نہ ملی تو؟''

''پھر کافی مشکل ہو گی۔ یہ لوگ اس پناہ گاہ میں بہت دیر تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ پھر ان سب کو......'' وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

بہر طور اس کا ادھورا فقرہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پھر ان سب کو مرنا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ان سب میں سلطانہ اور میں بھی شامل تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ چھوٹے سرکار کب تک فیصلہ کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بارے میں وشواس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چھوٹے سرکار کے لیے یہ بہت کٹھن فیصلہ ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کی پوری طرح ٹھن جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ جھگڑا سنگین شکل اختیار کر جائے۔''

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ چھوٹے سرکار ہم لوگوں کی خیر خواہی میں اس حد تک چلے جائیں گے۔''

چوہان نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرائیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''بے شک دونوں بھائی ہیں اور کئی معاملوں میں ان کا مفاد ایک ہے۔ مثلاً دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اس راجواڑے میں باہر سے کوئی مداخلت نہ ہو۔ راجواڑے میں ایسے لوگوں کو سر نہ اُٹھانے دیا جائے جو کل کو راج پاٹ کے لیے خطرہ بن جائیں یا اس قسم کی دوسری باتیں۔ مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے سرکار میں حکم جی سے کہیں زیادہ رواداری اور انصاف پسندی ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی حکم جی کا جبر پسند نہیں کرتے اور جو لوگ اس جبر، ناانصافی کے ہاتھوں تنگ ہو کر نل پانی کا رُخ کرتے ہیں، انہیں پناہ دیتے ہیں۔ اب تمہارے اور سلطانہ کے معاملے میں بھی جو کچھ زرگاں میں ہوا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سلطانہ کا وہ خدشہ بالکل درست ثابت ہوا ہے جو اس نے مقدمے کی کارروائی میں چھوٹے سرکار کے سامنے بیان کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے موہن کمار وغیرہ

کے حوالے کر دیا گیا تو زرگاں میں اس کی آبرو اور جان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گی اور یہی کچھ ہوا ہے۔ اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بیسیوں لوگ گواہ ہیں۔ سلطانہ اور اس کا بچہ جارج کی رہائش گاہ سے برآمد ہوئے ہیں۔''

گہرے تاسف کے ساتھ چوہان خاموش ہو گیا۔ جلد ہی شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ اس زیرِ زمین پناہ گاہ کے اندر گہری تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی میں کہیں کہیں مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی تھی۔ جب دھوئیں سے گھٹن محسوس ہونے لگی تو مشعلیں بجھا دی گئیں اور لالٹینیں جلتی رہنے دی گئیں۔ ایک طرف سے شور اُٹھا۔ پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے کسی تاریک گوشے میں چھپے ہوئے ایک خطرناک جنگلی بلے کو مارا ہے۔ رات کو بھی اس پناہ گاہ میں موجود لوگوں نے خشک راشن ہی استعمال کیا۔ چوہان نے میری کیچڑ آلود رائفل کو ایک انور خاں نامی شخص کے حوالے کیا تھا۔ اس نے رائفل کے حصے بخرے کر کے اسے صاف کیا، پھر جوڑا اور تیل وغیرہ لگا کر چمکا دیا۔ گولیاں بھی بھیگی تھیں تاہم انور خاں کا خیال تھا کہ یہ قابلِ استعمال ہیں۔

رات کو لوگ، کھوہ کے مختلف حصوں میں چادریں وغیرہ بچھا کر سو گئے۔ کھوہ کے دہانے کی طرف انور خاں نے دو تین افراد کو مقرر کر دیا تھا۔ میں اور چوہان ساتھ ساتھ ہی لیٹے۔ چوہان کچھ دیر بعد سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ سینے میں مسلسل آگ سی روشن تھی۔ آدھی رات کے وقت مجھے پھر بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کراہا اور کچھ بولا۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ یہ سلطانہ کے سوا کس کی آواز ہو سکتی تھی۔

میں آہستگی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ نیم تاریکی میں احتیاط سے پاؤں رکھتا اور سوئے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا میں کھوہ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں سلطانہ اور اس کا بچہ موجود تھے۔ یہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں چٹائی پر ایک لڑکی نظر آئی۔ یہ سلطانہ تھی مگر یہ وہ سلطانہ تو نہیں تھی جسے چند روز پہلے میں نے دیکھا تھا۔ وہ دنوں میں ہی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا رنگ زرد تر نظر آ رہا تھا۔ رُخساروں کے قندھاری انار اس پژمردہ زردی میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ بال کھولے ایک گٹھڑی پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور بالو اس کے پہلو میں کسمسا رہا تھا۔

میری طرف دیکھنے کے بعد بھی اس نے جیسے مجھے پہچانا نہیں۔ چند لمحے خالی خالی

نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجیب تاثرات اُبھرے۔ کچھ دیر کے لیے تو ایسے لگا کہ وہ ایک دم کروٹ بدل کر اپنا چہرہ چھپا لے گی یا پھر ویسے ہی اُٹھ کر کسی طرف بھاگ جائے گی۔ مگر بتدریج اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ یہ آنسو موٹی موٹی بوندوں کی صورت اس کے زرد رُخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر پھیلا لی اور کسی شرمسار مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ میرا دل جیسے سینے میں کٹ کر سو ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ مجرم کون تھا؟ وہ تو نہیں تھی۔ اگر کوئی تھا تو پھر شاید میں تھا اور میرے حالات تھے۔

نہ جانے دل کی کیا کیفیت تھی کہ میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ روتا ہوا بالو اب چپ ہو گیا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے پُرحیرت انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنسو ابھی تک اس کی معصوم آنکھوں میں موجود تھے لیکن وہ انہیں یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے اس کا گال سہلایا۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ اس دردو کرب سے یکسر بے خبر تھا جو اس کی ماں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

''مہرو! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' سلطانہ کربناک انداز میں منمنائی اور اپنا سر اپنے گھٹنوں پر جھکا لیا۔

''کیوں چھوڑ دوں؟'' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ

اسے جیسے برقی رو چھو گئی۔ اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

''مجھے مت چھوؤ مہرو۔ میں تمہارے خابل ناہیں ہوں۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ خدا کے لیے۔''

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے سلطانہ! تم خود کو گناہگار کیوں سمجھ رہی ہو؟'' میں نے بڑے کرب سے کہا۔

وہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں جلد ہی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ ایک دم پلٹی اور اس نے اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ ''مجھے معاف کر دینا مہرو! میں بے بس ہو گئی تھی۔ وہ تمہیں مار دیتا، وہ بالو کو مار دیتا اور تم دونوں اچ دنیا میں ناہیں رہتے تو میرے جندہ رہنے کا کیا فائدہ تھا؟''

''سلطانہ...... سلطانہ......'' میں نے اسے اپنے پاؤں سے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ چمٹی رہی۔

''تم میرے سرتاج ہو مہرو! میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں لیکن اب مجھ میں اتنی

ہمت ناہیں کہ اپنی نحوست کو تمہاری جندگی کا روگ بنا کر رکھوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مہرو! کہیں چلے جاؤ اور ہو سکے تو بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے بال میرے پاؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کچھ فاصلے پر سوئے ہوئے دو تین افراد اُٹھ بیٹھے اور تعجب سے دیکھنے لگے۔ میں نے پھونک مار کر لالٹین بجھا دی۔ کھوہ کے اس حصے میں تاریکی پھیل گئی۔

میں نے سلطانہ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں سلطانہ! تم بالکل پاک صاف ہو۔ اسی طرح ہو جس طرح پہلے تھیں۔ تم خود کو......''

''ناہیں...... ناہیں مہرو۔'' سلطانہ نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''تم ناہیں جانتے، عورت کی عجت آبرو کا مالمہ کتنا ناجک ہوتا ہے۔ میرے منہ پر جو کالک مل گئی ہے، وہ اب مجھے کبھی چین سے ناہیں رہنے دے گی۔'' وہ رو رہی تھی اور مسلسل میرے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔

اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ تم ناہیں جانتے عورت کی عجت آبرو کا مالمہ کتنا ناجک ہوتا ہے۔

وہ غلط کہہ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ میں نے اس نزاکت اور اس نزاکت کی بے مہر سنگینی کو بھگتا ہوا تھا۔ ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ حالانکہ غنڈوں کے چنگل سے نکل کر بخیریت گھر آ گئی تھی لیکن ایک رات گھر سے باہر رہنے کی پاداش میں اس کے ساتھ اور اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ درد کا ناقابلِ فراموش ماجرا تھا اور سلطانہ؟ سلطانہ تو ''بخیریت'' بھی واپس نہیں آ سکی تھی۔ ہر جگہ اندوہ کی وہی کہانی تھی۔ شکاریوں کے وہی جال اور شکار ہونے والوں کی وہی بے چارگیاں۔ آسمانی کتابوں کے مطابق عورت نے غلطی کی۔ اس نے آدم کو بہکایا اور جنت سے نکلوایا۔ شاید اس غلطی کی سزا ہر بنت حوا آج تک بھگت رہی ہے۔

میں نے بمشکل سلطانہ کو اپنے پاؤں سے جدا کیا اور دیوار کے سہارے بٹھایا۔ تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہے۔

تاریکی کی وجہ سے بالو نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا تھا۔ سلطانہ اس سے قطعی بے پروا نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی کتراتی تھی۔ میں ان دونوں کے پاس سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ ایسی بے کار زندگی کا کیا فائدہ تھا؟ اسے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے پچھلے دو برس کے بارے میں کچھ یاد

نہیں تھا لیکن لوگ جو کچھ بتا رہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ جب میں ایک بار اس کا شوہر بن گیا تو پھر اس نے مجھے واقعی اپنا شوہر سمجھا اور ایک جاں نثار شریکِ حیات کی حیثیت سے میری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئی۔ ایک مرتبہ اس نے میری حفاظت کی خاطر اپنے گھرانے کی سب سے قیمتی متاع، راجا پرتاب بہادر کی بخشی ہوئی مہر داؤ پر لگائی اور اب اس نے میری زندگی کے لیے اپنا آپ ہی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کے بدلے میں نے کیا کیا؟

یہ سوال دہکی ہوئی آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔ دماغ میں چلتی ہوئی آندھی مزید تند و تیز ہو گئی۔ عمران نے ہی تو کہا تھا ایک بار...... جب مرنے کا ارادہ کر لو تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔ پیچھے دیکھنے سے زندگی کا کالا جادو چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر چوہان، ہمیش اور انور خاں وغیرہ سب اپنی اپنی جگہوں پر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ پھر انور خان کے پاس سے اس کی رائفل اُٹھائی اور ایک عجیب کیفیت کے زیر اثر وہاں سے چل پڑا۔ میرا رُخ اس طویل کھوہ کے دہانے کی طرف تھا۔

میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ فی الوقت بس ایک ہی خواہش تھی۔ سرخ و سپید چہرے والا جارج میرے سامنے ہو۔ میں رائفل اپنے اور اس کے درمیان پھینک دوں پھر چلا کر کہوں۔ ''چل کتے...... تُو مجھے مار دے یا میں تجھے مار دوں'' ایسی درندگی کے ساتھ اس پر جھپٹوں کے بس چند سیکنڈ میں میری یا اس کی موت کا فیصلہ ہو جائے۔

جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، کھوہ تاریک تر ہوتی گئی۔ مجھے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنا پڑا۔ بالآخر میں دہانے تک پہنچ گیا۔ یہاں تاریکی میں دو ہیولے نظر آئے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہیں انور خاں نے پہرے پر مقرر کیا تھا۔

میں پاس پہنچا تو ان میں سے ایک بولا۔ ''کون؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی۔

''کیا بات ہے؟ تم کہاں جاوت ہو؟'' ایک شخص نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے کوئی کام ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھنا چاہا۔

اس شخص نے میرا راستہ روکا۔ میں نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

''دیکھو...... تم ایسے ناہیں جا سکت ہو۔'' اس نے کہا اور دوبارہ میرے راستے میں آ گیا۔ اس مرتبہ دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' میں نے وحشت کے عالم میں اسے پھر دھکا دیا۔ اس مرتبہ وہ

لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔

وہ دوبارہ میرے سامنے آتا تو میں اس پر رائفل تان لیتا مگر اس سے پہلے کہ نوبت یہاں تک پہنچتی، کسی نے عقب سے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ ''نہیں تابش! ایسے نہیں کرنا۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

یہ چوہان کی آواز تھی۔ پتا نہیں وہ کب میرے پیچھے آن موجود ہوا تھا۔ میں نے زور مارا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔'' میں چنگھاڑا۔ میری آواز فرطِ طیش سے بگڑی ہوئی تھی۔ میرا اشارہ جارج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں دو اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک انور خاں تھا۔

''میں قتل کر دوں گا یا قتل ہو جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مرنے دو۔'' میں دھاڑ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہی آنسو جو بے بسی کی انتہا کو چھونے کے بعد بجنگ آمد کی کیفیت میں آنکھوں میں آتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہیجان میں کچھ کمی آئی چوہان نے نرمی کے ساتھ رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور انور خاں کو واپس کر دی۔ وہ لوگ مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کھوہ کے اندرونی حصے میں واپس لے آئے۔

چوہان نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ اس موقع پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہوگا۔ ہماری کسی بھی جلد بازی سے حکم جی اور جارج وغیرہ کو فائدہ پہنچے گا اور وہ پہلے ہی کچھ کم طاقتور نہیں ہیں۔ اس نے مجھے انور خاں کے بارے میں بھی بتایا۔ اس نے کہا۔

''انور خاں بڑا باکمال آدمی ہے۔ علاقے کے مسلمان باشندے اسے ایک ہیرو کی طرح مانتے ہیں۔ حکم جی وغیرہ کو بھی انور خاں کے ساتھ بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ انور خاں کسی بھی وقت مسلمان باشندوں کو بھڑکا بھی سکتا ہے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا بھی کر سکتا ہے۔ چند دن پہلے تک انور خاں کے تعلقات حکم جی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ٹھیک ہی تھے مگر اب سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ انور خاں نے سلطانہ کو جارج کے شکنجے سے چھڑانے میں باقاعدہ کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ لوگوں کو جارج کے گھر کے سامنے جمع ہونے اور پھر ہلا بولنے کی ہمت انور خاں کی وجہ سے ہی ہو پائی تھی۔''

چوہان نے مجھے انور خاں کے بارے میں کئی ایک باتیں بتائیں۔ میں سن تو رہا تھا مگر میرا دماغ کئی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جو سب سے پریشان کن خیال بار بار میرے ذہن سے ٹکرا رہا تھا، وہ یہی تھا کہ آخر میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جہاں جاتا ہوں، میرا

پیچھا کرنے والے وہاں پہنچ جاتے ہیں؟ اگر وہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے تو پھر یہاں بھی پہنچ سکتے تھے۔ میں نے اب تک پیش آنے والے سارے واقعات سے چوہان کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔

میں نے جب چوہان کو بتایا کہ حکم جی کا خاص ہرکارہ اپنے ایک ساتھی سمیت میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے تو چوہان ششدر رہ گیا۔

اس نے مجھ سے تفصیل پوچھی۔ میں نے اسے بتایا۔ ''وہ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں جنگل میں بہت آگے نکل گیا تھا مگر وہ پھر بھی مجھ تک پہنچ گئے۔ وہ گھوڑوں پر آئے تھے۔ ان کے ساتھ وہ غیر ملکی ڈیوڈ بھی تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑنا چاہا تو میں نے گولی چلا دی۔ ڈیوڈ اور اس کا ایک ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیواری اور ایک دوسرا بندہ وہیں مارے گئے۔ میں ان کی لاشیں ندی کے کنارے چھوڑ آیا ہوں۔''

''یہ بات اب آگے تک جائے گی۔'' چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ حکم جی کے لیے بڑے خاص لوگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت سی تبدیلیوں کا وقت ہے۔ یہاں کافی ہلچل مچنے والی ہے۔'' چوہان کی آنکھوں میں بدستور حیرت ناچ رہی تھی۔

اچانک ایک طرف سے پھر شور اُبھرا۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید پھر کہیں سے کوئی جانور نکل آیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ صورتِ حال مختلف تھی۔ دو افراد آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ گتھم گتھا تھے۔ دوسرے افراد انہیں چھڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ تک یہ ہنگامہ رہا پھر دونوں متصادم افراد کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نوجوان کا نام فیروز اور دوسرے کا نام اکبر ہے۔ اکبر درمیانی عمر کا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی بلند آواز سے بول رہا تھا۔

''میں پھر کہتا ہوں۔ یہ فیروز! ہم کو نقصان پہنچا دے گا۔ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔ اس کا دل اب بھی ان لوگوں کے ساتھ دھڑکتا ہے جن کا یہ نمک کھاتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' انور خاں زور سے دھاڑا۔ ''ثبوت کے بغیر کوئی بھی بات نہ کرے۔ جو بھی ثبوت کے بغیر بات کرے گا، میں اس کا گریبان پکڑوں گا۔''

اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر زیادہ بولنے والے شخص اکبر کو چپ کرا دیا۔ دونوں طرف سے لوگ بول رہے تھے۔ انور خاں پانچ چھ افراد کو لے کر ایک طرف چل گیا۔ کچھ دیر تک وہاں میٹنگ ہوتی رہی۔ پھر لگا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد میں دیکھ رہا تھا کہ فیروز اور اکبر نامی دونوں افراد آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ انہیں گلے ملانے والا انور خاں ہی تھا۔

''یہ کیا معاملہ تھا؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''بس غلط فہمی تھی جس کی وجہ سے جھگڑا ہو گیا لیکن اس جھگڑے کی وجہ سے ایک اہم انکشاف بھی ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ''دراصل فیروز نام کا یہ لڑکا جس سے اکبر علی نے جھگڑا کیا ہے، حکم جی کے ملازموں میں سے ہے۔ فیروز کی والدہ ہندو تھی مگر شادی کے وقت مسلمان ہو گئی۔ پر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پھر بھی ہندو ہی رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ فیروز سے بھی عناد رکھتے ہیں جبکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اب بھی اسی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔ اکبر نے فیروز پر الزام لگایا ہے کہ وہ جاسوسی کے لیے ان کے ساتھ موجود ہے۔ ورنہ وہ اب بھی حکم جی کے گھر میں اس کے پودوں کو پانی دے رہا ہوتا یا اس کی گاڑیاں صاف کر رہا ہوتا۔ جواب میں فیروز نے جو کچھ کہا ہے، اس نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ فیروز نے کہا ہے کہ وہ اس بندے کی موت کی وجہ سے حکم جی کا باغی ہوا ہے جو کچھ دن پہلے سلطانہ کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔''

''تم ہارون کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''فیروز نے انکشاف کیا ہے کہ ہارون اس وجہ سے نہیں مرا تھا کہ اسے سلطانہ نے کلہاڑی ماری اور پھر کھوہ میں اسے باندھ کر نل پانی چلی گئی۔ اس کی موت حکم جی کے اپنے بندوں کی وجہ سے ہوئی۔ اسے موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے مارا اور اس وجہ سے مارا کہ ہارون کی موت کو سلطانہ کے سر تھوپ کر اسے نل پانی سے واپس لایا جا سکے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ واقعی یہ سنسنی خیز انکشاف تھا۔ میں خود بھی کئی دن تک اُلجھن میں رہا تھا۔ بے شک سلطانہ کی کلہاڑی سے ہارون کے سر کے پچھلے حصے پر گہرا زخم آیا تھا لیکن یہ ایسا زخم نہیں تھا کہ اس کی فوری موت کا باعث بن جاتا۔ یقیناً یہ سازش ہی تھی۔ بندھے ہوئے ہارون کو کھوہ کے اندر موہن کمار نے مارا تھا پھر اس کی لاش لے کر دہائی دیتا ہوا نل پانی جا پہنچا تھا۔ اس کی دہائی کارگر رہی تھی اور چھوٹے سرکار نے مجھے اور سلطانہ کو پناہ دینے کے بجائے موہن کمار اور گرمودان وغیرہ کے سپرد کر دیا تھا۔

چوہان نے مدھم لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں یہ نوجوان فیروز اور ہارون ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ فیروز کو معلوم تھا کہ ہارون کی موت حقیقت میں

کس طرح ہوئی ہے۔ وہ اپنے دل میں غم چھپائے پھر رہا تھا۔ اس دوران میں یہ دوسرا واقعہ ہو گیا۔ پتا چلا کہ جارج نے سلطانہ کو جیل سے نکال کر اپنے گھر پہنچایا ہے۔ دیگر لوگوں کی طرح فیروز بھی اپنے غم و غصے کو دبا نہیں سکا۔''

''یہ تو بالکل نئی صورتِ حال سامنے آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... اور اس نئی صورتِ حال میں ہمارا کافی فائدہ ہوسکتا ہے۔ اب جب یہ ساری بات چھوٹے سرکار کے سامنے آئے گی تو مجھے پوری آشا ہے کہ ان کا رویہ بہت نرم ہو جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ موہن کمار وغیرہ کی یہ سازش بڑے اچھے وقت پر سامنے آئی ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد انور خاں اپنے ساتھ فیروز نامی اس لڑکے کو لے آیا۔ اس کی عمر بائیس تیئس سال تھی۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ ابھی تک یہاں ہونے والے جھگڑے کے اثرات سے نکلا نہیں تھا۔ انور خاں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بہت دلیری والا کام کیا ہے۔ اکبر علی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تمہارا قد ہم سب سے اونچا ہو گیا ہے۔''

چوہان نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں فیروز کہ تم کل میرے ساتھ چھوٹے سرکار کے پاس چلو۔ تمہاری گواہی ہمارے لیے بڑی فائدے مند ثابت ہو گی۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ اس بار چھوٹے سرکار کا فیصلہ تم لوگوں کے حق میں ہو گا۔''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دھیمی نہیں ہوئی۔ وہ انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو ضرور رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں شاید کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ غالباً اس کو ہندو ماں کا بیٹا ہونے کا جو طعنہ دیا گیا تھا، وہ اسے آگ بگولا کیے ہوئے تھا اور وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

اگلے سترہ اٹھارہ گھنٹے بھی کھوہ کے اندر ہی گزرے۔ کھوہ میں میرے اور سلطانہ سمیت قریباً پینتالیس افراد موجود تھے۔ انور خاں ان کا لیڈر تھا۔ ڈاکٹر چوہان ایک خیر خواہ اور مددگار کی حیثیت سے یہاں موجود تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ان پینتالیس لوگوں کو نل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پناہ مل جائے۔ اس سلسلے میں گفتگو اور پیغام رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی تک چوہان اور انور خاں وغیرہ خود اس کھوہ سے باہر نہیں نکلے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کھوہ سے باہر سب کے لیے خطرات موجود ہیں۔ سلطانہ بدستور نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ چوہان اسے محفوظ مقدار میں دوا دے رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر سوئی رہے اور اس کے ذہن کو نارمل ہونے کے لیے وقت ملے۔

آدھی رات کو جب سارے سوئے ہوئے تھے، ایک سایہ سا مجھ پر جھکا اور میرے شانے کو ہولے سے ہلایا۔ میں غنودگی میں تھا، جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے پہچان لیا۔ وہ کل اکبر نامی شخص کے ساتھ جھگڑنے والا فیروز ہی تھا۔ اس نے دوستانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں چند لمحے تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے کھوہ کی دو تین تنگ و تاریک شاخوں سے گزارنے کے بعد ایک حجرہ نما جگہ پر لے آیا۔ اس قدرتی حجرے میں ایک چھوٹی سی میلی کچیلی لالٹین روشن تھی۔ یقیناً یہ لالٹین اور اس طرح کا دیگر سامان چوہان اور اس کے ساتھی ہی یہاں لے کر آئے تھے ورنہ باقی لوگ تو افراتفری میں زرگاں سے بھاگے تھے۔ اس حجرہ نما جگہ پر پہلے سے دو نوجوان موجود تھے۔ ان کی عمریں بائیس چوبیس سال کے قریب رہی ہوں گی۔ ان دونوں کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصے کی سرخی نظر آتی تھی۔

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''میرا نام اسحاق ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اور میرا نام ماجد ہے۔ میں فیروز کا ماموں زاد بھی ہوں۔'' دوسرے نے بھی دھیمے لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

''اور مجھے تو تم جانتے ہی ہو۔ میں فیروز ہوں۔ حکم جی کے غنڈوں کے ہاتھوں بے موت مارے جانے والے ہارون کا دوست۔'' فیروز بولا۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آہستہ بولو۔'' فیروز نے سرگوشی کی۔ ''ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ہونے والی بات چیت کسی کے کانوں تک پہنچے۔''

اسحاق بولا۔ ''کل رات تمہارا جوش جذبہ دیکھا۔ تمہیں چوہان صاحب اور انور بھائی وغیرہ نے زور مار کر روک لیا ورنہ تم نے یہاں سے نکل جانا تھا۔ لگتا ہے کہ تم بھی اسی طرح سوچ رہے ہو جس طرح ہم سوچ رہے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہووت ہے اور وہ حد گزر چکی ہے۔ ہم تینوں نے آج رات ایک فیصلہ کیا ہے اور ہم چاہت ہیں کہ تم بھی اس فیصلے میں شامل ہو جاؤ۔''

''لیکن یہ تمہاری اپنی مرضی کی بات ہے، کوئی زور زبردستی نا ہیں ہے۔'' فیروز بولا۔

"تم کس فیصلے کی بات کرر ہے ہو؟"

میری رگوں میں لہو اُچھل گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے فیروز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چنگاریاں تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... اب صبر کی حد گزر چکی ہے۔ یہ سفید بھیڑیا ہماری عورتوں کو کھاوت ہے۔ ان کے جسم نوچت ہے۔ اس نے ہر طرف جال پھیلا رکھے ہیں۔ کہیں زور زبردستی کا جال، کہیں پیار محبت کا جال۔ اس کے پاس سو حیلے بہانے ہیں اور یہ اپنے شکار کو چھوڑتا ناہیں ہے۔ اب اس بدنصیب سلطانہ کو ہی دیکھو۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت ناہیں۔ ایک بچے کی ماں بھی ہے لیکن اس سفید سور نے اس کو بھی معاف ناہیں کیا۔ دو تین سال سے اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا اور کوشش میں لگا ہوا تھا۔ آخر کامیاب ہوا۔ اب ہم اس کی کامیابی کو آخری ناکامی میں بدل دیویں گے۔ اس کے ناپاک بستر کے اوپر ہی اس کے ٹکڑے کر دیویں گے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے فیروز کے لہجے میں عجیب سی گرج آ گئی۔ پیشانی کی رگیں اُبھر آئیں۔

"ہاں...... ہم جارج کو مار دیں گے یا خود مر جائیں گے۔" ماجد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

فیروز بولا۔ "ہم تینوں کل رات اس عہد کے ساتھ یہاں سے نکلیں گے کہ جارج گورے کو مار کر واپس آئیں گے یا کبھی واپس ناہیں آئیں گے۔" اس نے کچھ لمحے توقف کیا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس کام میں ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہت ہو؟"

بے بسی کا منظر ایک بار پھر نگاہوں میں چمکا۔ بڑی آن بان والی سلطانہ لاچاری کی تصویر تھی۔ وہ مجھے جارج کے بیڈروم سے باہر نکال کر دروازہ بند کر رہی تھی۔

رائفل پر میری گرفت مضبوط تر ہوگئی۔ سینے میں آگ کی دیوقامت لہر پھر حرکت میں آنے لگی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس سیکیورٹی کا کیا کرو گے جس نے جارج کے گھر کو گھیرا ہوا ہے؟ اب تو یہ سیکیورٹی اور بھی سخت ہوگی۔"

"مہروز بھائی! جب جان ہتھیلی پر رکھ لی جاوے تو پھر کوئی رکاوٹ بھی آگے بڑھنے والے کا راستہ ناہیں روک سکتی۔ اب تم خود کو ہی دیکھو۔ جب تم نے جان ہتھیلی پر رکھ لی تو تم جارج کے کتوں اور اس کے رکھوالوں کو لہولہان کر کے اس کے گھر سے نکل آئے۔ نکل آئے یا ناہیں؟" فیروز نے کہا۔

"کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... منصوبہ بھی ہے لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بات یہاں ہم چاروں کے درمیان ہوگی، اس کا پتا انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سمیت کسی کو ناہیں چلے گا۔" فیروز نے کہا۔

میں خاموش رہا۔ اسحاق بولا۔ "ایسی بات ناہیں کہ ہم انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سے علیحدہ سوچت ہیں۔ سوچ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس راجواڑے میں سے جارج گورا جیسے کتوں کا خاتمہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کام اور ڈھنگ سے کرنا چاہت ہیں لیکن ہم اور ڈھنگ سے کریں گے اور یہ حرامی جارج گورا والا کام تو بس چند پہروں کے اندر ہی ہوگا اور اگر ناہیں ہوگا تو پھر ہم ناہیں ہوں گے۔"

"لیکن ایک بات سوچنے کی ہے۔" میں نے کہا۔ "چوہان اور انور خاں وغیرہ کا خیال ہے کہ اس بار سلطانہ کو اور ہم سب کو نل پانی میں پناہ مل جائے گی۔ سب کو پتا ہے کہ جارج اور اس کے پشت پناہ حکم جی نے ظلم کیا ہے لیکن اگر ہماری طرف سے بھی کوئی کارروائی ہوگئی تو پھر کچھ لوگ اسے بھی ظلم قرار دیں گے۔ یوں یہ پناہ والا معاملہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

اسحاق نے کہا۔ "تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر جارج کی موت ایک ایسا واقعہ ہووے گی جس پر ناید حکم جی اور اس کے قریبی ساتھیوں کے سوا ہر کوئی خوش ہوگا۔ جارج جو کچھ کرتا ہے اس سے صرف مسلمان ہی متاثر ناہیں، ہر کوئی متاثر ہے اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ جارج مارا گیا تو حکم جی اور اس کے حواریوں کی کمر بھی ٹوٹ کر رہ جاوے گی۔ ایک دم سب کچھ اچھا ہو جاوے گا۔"

"مگر ایک دم سب بُرا بھی تو ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

فیروز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ "اب اس سے بُرا اور کیا ہووے گا۔ ہم جیتے جی دفن ہو رہے ہیں۔ اب اور برداشت کریں گے تو پھر ہم بھی مجرم ہوں گے۔ ناہیں...... اب ناہیں۔" اس کا جوش اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے یہاں کے حالات کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں، لہٰذا اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جارج کو مارنے کے لیے یہ ٹھیک موقع ہے تو پھر میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بلکہ میں ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"بہت اچھے۔" اسحاق نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ پھر وہ اُٹھا اور فیروز کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھا کر ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ ہم وہاں لالٹین کی مدھم روشنی میں بیٹھے رہ گئے۔ رات خاموش اور بھیدوں بھری تھی۔

میرے اندازے کے مطابق ہم زمین کے نیچے کم از کم سو فٹ کی گہرائی میں موجود تھے۔ سرنگوں کا ایک شاخ درشاخ سلسلہ تھا۔ میرے قیافے کے مطابق اس کی طوالت ڈیڑھ دو میل کے قریب تو ہوگی۔ حکم جی اور جارج گورا کے کم از کم پینتالیس باغی اس وقت اس زیر زمین پناہ گاہ میں موجود تھے اور ایک خونچکاں منصوبے کے تانے بانے بُن رہے تھے۔

میں نے فیروز سے پوچھا۔ ''اسحاق کہاں گیا ہے؟''

وہ سرگوشی میں بولا۔ ''اسحاق کے ذمے اسلحے کا انتظام ہے۔ وہ اسی کام کے لیے گیا ہے۔''

''رائفلیں تو تم سب کے پاس موجود ہیں اور میرے پاس بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ہمیں کچھ اور کی ضرورت بھی پڑے گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''یہ اسحاق زرگاں کا رہائشی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... اس کی سگی بہن بھی جارج گورا کا شکار ہوئی ہے۔ کوئی چار مہینے پہلے وہ بیمار ہو کر مرگئی تھی لیکن جاننے والے جانت ہیں کہ وہ مری ناہیں تھی، اس نے خود کو مارا تھا۔ کوئی زہریلی چیز کھالی تھی اس بدنصیب نے۔''

''کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟''

''اس کا معاملہ سلطانہ سے مختلف تھا۔ دراصل جارج جیسے شکاریوں کے پاس ہزار طرح کے جال ہوتے ہیں۔ جس رنگ کی زمین ہو، وہ اسی طرح کا جال بچھاوت ہیں۔ وہ لڑکی بڑی پیاری تھی، بالکل گڑیا کی طرح اور بہت ہنس مکھ بھی۔ روبینہ نام تھا۔ اس کی شادی اپنے ماموں زاد سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکا بے روزگار تھا۔ پھر ہیروئن اور گانجا وغیرہ بھی پینے لگا۔ اسی دوران میں کچی آبادی میں کہیں جارج کی نگاہ روبینہ پر پڑگئی۔ اس نے اسے اپنے شکار کے طور پر منتخب کرلیا۔ اس نے روبینہ کے شوہر باسط کو اپنے پاس ملازمت دی اور اس کے ساتھ ہی دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ہیروئن چھڑا کر اسے ایک کارآمد شخص بنا دیوے گا لیکن جو کچھ ہوا، وہ اس کے اُلٹ تھا۔ اس نے باسط کی ہیروئن تو چھڑا دی لیکن شراب کی پکی پکی لت لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا جارج کی مہربانی کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اسے قیمتی شراب درکار تھی اور عیاشی کا دیگر سامان بھی۔ یہ چیزیں اسے صرف اور صرف جارج کی جی حضوری سے ہی مل سکت تھیں۔ جارج نے باسط کو رہنے کے لیے ایک سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا تھا۔ اس کے بعد باسط کے ساتھ ساتھ روبینہ بھی جارج کی چار دیواری میں آگئی۔ اسے چار دیواری کے بجائے شکارگاہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ باسط نے خود نو بیاہتا بیوی کو مجبور کیا کہ وہ

ارج گورا کی خواہش کے سامنے اپنا سر جھکائے۔ وہ بے آسرا لڑکی تھی۔ ایک بھائی کے سوا ں کا آگے پیچھے کوئی ناہیں تھا اور بھائی بھی مزدوری کے لیے زرگاں سے بہت دور تھا۔ وہ کیا کرتی؟ اس نے ہچکچاہٹ دکھائی تو شوہر نے اسے مارا پیٹا۔ بالآخر وہ بیچاری اس غلاظت میں گرگئی جس میں اس کا شوہر اسے گرانا چاہت تھا۔ مگر اس کا دل اس کے ساتھ ناہیں تھا۔ وہ روز وز خود کو جارج کے بستر پر تاراج ہوتے ناہیں دیکھ سکت تھی۔ اس نے ایسے جنون سے موت بتر سمجھی۔ ایک رات اس نے کچھ لیا۔ اس کا دم اُلٹ گیا۔ اس کے گلے میں ایک پھندا سا لگ لیا۔ وہ تین روز تک اس طرح سانس لیتی رہی کہ اس کے سانس کی آواز پورے گھر میں گونجت تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور وہ بار بار بے ہوش ہووت تھی۔ آخر وہ مرگئی۔ ں کی عمر صرف اٹھارہ بیس سال تھی۔ یہ اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ سکھیوں کے ساتھ مل کر گیت گانے، میلوں ٹھیلوں میں جانے اور تہوار منانے کا وقت تھا اور وہ بیماری کا بہانہ کر کے نوں مٹی کے نیچے جا سوئی اسے کس جرم میں موت کی سزا ملی؟ اس کا کیا دوش تھا؟ شاید صرف یہی دوش تھا کہ بے سہارا عورت تھی اور ایک چالباز ہوس کار کی نگاہ میں آگئی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ایک راز داں سہیلی سے معلوم ہوا کہ روبینہ نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی ہے۔ پھر اس حکیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی جس نے روبینہ کا علاج کیا تھا۔ بعد میں ں حکیم کی بھی جارج کے ہاتھوں بہت شامت آئی۔ اسے جان کے لالے پڑ گئے اور اسے رگاں چھوڑنا پڑا۔ زور آور کے خلاف آواز اُٹھانا بہت مشکل ہووت ہے۔ جو چند ایک آوازیں اُٹھیں بھی، وہ جلد ہی دم توڑ گئیں۔''

اسی دوران میں اسحاق واپس آگیا اور اس کے آنے سے فیروز خاموش ہوگیا۔ اسحاق کے پاس ترپال کا بنا ہوا ایک سیاہ تھیلا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس تھیلے میں رائفلوں کا یمونیشن اور ہینڈ گرینیڈ وغیرہ تھے۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے ایک بار پھر سرگوشیوں میں ات چیت شروع کردی۔ اس بات چیت سے اندازہ ہوا کہ کل کا دن جارج گورا پر ایک کارگر ملہ کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ جارج گورا ہفتے کے دن شام کے وقت سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلتا تھا اور زرگاں کی پُرانی آبادی میں پُرانے پگوڈا کے سامنے لوگوں میں خوراک تقسیم کرتا تھا۔ بظاہر جارج اور خیرات دو متضاد چیزوں کی طرح نظر آتے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جارج اور حکم جی جیسے دنیا پرست لوگ اکثر عوام الناس کو دھوکا دینے کے لیے ایسے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ شاید وہ اپنے طور پر اپنی زندگی کے کھاتے میں اپنے گناہوں کو ''بیلنس'' کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر جیسے اَن گنت

جابر لوگوں کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں اس قسم کی ڈراما بازی موجود رہی ہے۔ غالباً یہ بھی ایسے ہی منافق رویے کا عکس تھا۔ جارج جیسا ظالم شخص ہر ہفتے ایک خاص دن میں غربا کی بستی میں پہنچتا تھا اور ان کے دُکھوں میں شریک ہونے کی نمائش کرتا تھا۔ وہ جس راستے سے گزر کر جاتا تھا، وہیں پر ایک خاص جگہ ایسی تھی جہاں اس کے مختصر قافلے پر گھات لگا کر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز وغیرہ اس حملے کے بارے میں ساری تفصیلات پہلے ہی بتا چکے تھے۔

○.....❖.....○

ابھی شام ہوئی نہیں تھی مگر گھنے درختوں کی وجہ سے نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ شام ہوتے ہی یہ جگہ گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوب جائے گی۔ ہم اپنی زیر زمین پناہ گاہ سے کل رات کو ہی نکل آئے تھے۔ ہم نے ساری رات اور تقریباً سارا دن سفر کیا تھا۔ اس سفر کے لیے فیروز اور اسحاق وغیرہ نے گھنے جنگل میں شارٹ کٹ راستے استعمال کیے تھے۔ یوں وہ اندازاً دس پندرہ میل کا سفر کم کرنے میں کامیاب رہے تھے اور اب ہم اس خاص مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمیں گھات لگانا تھی۔

یہاں اسحاق وغیرہ کو درختوں میں ایک ٹوٹی پھوٹی گھوڑا گاڑی بھی مل گئی۔ یہ چار پہیوں والی گاڑی تھی۔ اس کے اگلے بانس ٹوٹ چکے تھے۔ ایک پہیہ بھی علیحدہ پڑا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے مشورہ کیا اور اس گاڑی کو حملے میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسحاق اور فیروز تیزی سے گاڑی کا پہیہ جوڑنے میں مصروف ہو گئے۔

''اس گاڑی کا کیا کرو گے؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''اس کو راستہ روکنے کے لیے استعمال کریں گے۔'' فیروز نے جواب دیا اور مجھے لے کر ان گھنے درختوں میں آ گیا جہاں سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک کچا لیکن بالکل ہموار راستہ تھا۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ زرگاں کی نئی آبادی بائیں طرف تھی اور بلند درختوں کے اندر سے کہیں کہیں اس کے آثار نظر آتے تھے۔ عمارتوں کے سنہری اور سفید کلس اور مندروں کی چوٹیاں ڈوبتے سورج کی روشنی میں جھلک دکھا رہی تھیں۔ راستے تک ایک چھوٹی سی ڈھلوان جاتی تھی۔ فیروز نے ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب جارج کا قافلہ قریب آوے گا تو ہم اس چار پہیوں والی گاڑی کو ڈھلوان کی طرف دھکیل دیویں گے۔ وہ گاڑی دوسرے کنارے کے درختوں سے ٹکرائے گی اور راستے کے عین اوپر رک جاوے گی۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم دو طرف سے جارج کی گاڑی پر حملہ کریں گے۔ چھلنی کر دیویں گے حرامزادے کو اور اس کے ساتھیوں کو۔''

''اس کی گاڑی کی پہچان کیا ہے؟''

''سفید گھوڑوں والی لال گاڑی۔ وہ چار گاڑیوں کے قافلے میں سب سے الگ نظر آوے گی۔ اس کے آگے مسلح گارڈز کی گاڑی ہوگی۔ اس کے پیچھے والی گاڑی میں دو چار مصاحب بیٹھے ہوویں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خبیث موہن کمار بھی موجود ہو۔ آخری گاڑی میں بھی گارڈز کا دستہ ہوگا۔ ان لوگوں کے پاس جی تھری گن موجود ہوتی ہے۔ اس آخری گاڑی کے عقب میں دو گھڑ سوار ہوں گے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ ہوگا۔ تاہم یہ اسلحہ صرف نمائشی ہوتا ہے۔ یعنی تلوار، آرائشی رائفل اور خنجر وغیرہ۔''

مجھے موقع دکھانے کے بعد فیروز واپس گھنے درختوں کے تاریک جھنڈ میں لے آیا۔ وہاں ماجد اور اسحاق بھی بالکل تیار تھے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ رگ پٹھے تنے ہوئے تھے۔ ہم چاروں نے اپنی پوری پلاننگ پر ایک بار پھر غور کیا۔ یہ طے ہوا کہ پکڑے جانے کے بجائے ہم لڑتے ہوئے جان دینا بہتر سمجھیں گے اور اگر خدانخواستہ کسی شخص کی گرفتاری یقینی ہو جائے تو وہ خود اپنی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ یہ بے حد جذباتی صورت حال تھی اور جو باتیں ہم ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے، انہیں کہنے کے لیے لوہے کا جگر اور فولاد کا دل درکار تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ میں اس جانباز ٹولی کا حصہ ہوں اور آج اپنی جان محاورتاً نہیں حقیقتاً ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ ہاں آج میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو جھوٹ ہوگا کہ میرے دل میں زندگی کی خواہش نہیں تھی لیکن جس طرح کی ذلت آمیز زندگی میں گزار رہا تھا، اس سے موت بہتر نظر آتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں عمران کو یاد کیا اور کہا۔ ''دیکھو عمران! میں نے اب تمہارے بغیر زندہ رہنے اور مرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ میں اب وہی بنتا جا رہا ہوں جو تم چاہتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تمہاری کمی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کیا جانو، ان گزرے ماہ و سال میں، مَیں نے کس کس طرح تمہیں یاد کیا ہے۔ تم میری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے ہو میرے یار! میں ایک پل کے لیے بھی تمہیں بھول نہیں سکتا اور آج اس گھنے جنگل کی اس دھواں دھواں شام میں جب میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں اور آنے والے لمحوں میں میرے قدم کسی بھی سمت میں اُٹھ سکتے ہیں، میں ایک بار پھر تمہیں بڑی شدت سے

یاد کر رہا ہوں۔ دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کاش! اس وقت تم میرے ساتھ ہوتے۔ میرا کندھا تمہارے کندھے سے ملا ہوتا۔ ہم اس دھواں دھواں شام میں ایک ساتھ للکار بلند کرتے اور اپنے دشمن پر جا پڑتے۔''

میری آنکھوں میں آتشیں نمی تھی۔ میں ہر دلعزیز عمران کو یاد کر رہا تھا کہ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں فرح اور عاطف کو یاد کر رہا تھا کہ ان کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا اور میں ثروت کو یاد کر رہا تھا کہ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اپنے ملک سے، اپنے شہر سے ہزاروں میل دور اس دور دراز خطے میں اس دھواں دھواں شام میں، مَیں زندگی اور موت کی بازی لگانے جا رہا تھا۔ حالات کی ستم ظریفیوں نے میرے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔

ہم چاروں نے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر ''مرو یا مار دو'' والے عہد کو دہرایا اور اپنے اپنے کام کے لیے بالکل تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے چہرے صافہ کپڑوں میں چھپائے پھر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ فیروز اور میں راستے کے دائیں کنارے پر تھے جبکہ ماجد اور اسحاق بائیں کنارے پر۔ جارج کی آمد کے آثار دیکھ کر فیروز نے چار پہیوں والی گاڑی کو ڈھلوان پر دھکیلنا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھیل شروع ہو جانا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا، ہماری دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بار بار جارج کا مکروہ چہرہ نگاہوں کے سامنے لہرا رہا تھا تاکہ میرے اندر غیظ و غضب کی وہ بلند لہر رواں دواں رہے جس نے چند دن پہلے میرے سینے میں جنم لیا تھا اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس لہر کو رواں دواں رکھنے کے لیے مجھے کوئی خاص کوشش کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ لہر ایک عجیب سی زہرناک تلخی کے ساتھ گھل مل کر میرے لہو میں شامل ہو چکی تھی اور میری شریانوں میں مستقل بسیرا کر چکی تھی۔

شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ درختوں پر پرندوں کی چہکاریں تھیں۔ پچھلے ایک گھنٹے میں اس راستے پر سے چند گھوڑا گاڑیوں، چند گھڑ سواروں اور ایک عدد سیاہ جیپ کے سوا کوئی سواری نہیں گزری تھی۔ ہماری نگاہیں مغرب کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں کسی بھی وقت گرد و غبار اُٹھ سکتا تھا۔ یہ گرد و غبار جارج کے قافلے کی آمد کا اعلان ہوتا۔

شام گہری ہوتی گئی لیکن قافلے کے آثار نظر نہیں آئے۔ فیروز کے لیے یہ تاخیر بڑی تعجب خیز تھی۔ فیروز کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو معلوم تھا کہ جارج کے معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ پچھلے دو تین برسوں میں شاید ہی ایک آدھ بار ایسا ہوا ہو کہ وہ مقررہ وقت پر

رانے پگوڈا پر نہ پہنچا ہو۔ جب شام کا ملگجا تاریکی میں بدل گیا تو فیروز اور اس کے ساتھیوں کو ندازہ ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ فیروز مایوسی کے عالم میں بڑبڑایا۔ ''اتنی دیر تو پہلے بھی نا ہیں ہوئی۔''

اسی دوران میں اسحاق بھی راستہ پار کر کے ہماری طرف آ گیا۔ وہ بھی مایوس تھا۔ اس نے فیروز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''غور سے سنو...... ڈھول کی آواز آ رہی ہے۔''

فیروز نے بھی ہمہ تن متوجہ ہو کر سنا۔ چند لمحے بعد ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مدھم آواز ہماری سماعتوں تک پہنچی۔ یہ ڈھول نہیں تھا، غالباً کوئی بہت بڑا نقارہ تھا۔ اسے ایک خاص ردھم سے بجایا جا رہا تھا۔

اس آواز کو سننے کے بعد فیروز اور اس کے دونوں ساتھی بے دم سے ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''وہ حرامی کسی دوسرے راستے سے ہو کر پگوڈا پہنچ گیا ہے۔ یہ ڈھول کی آواز سنائی دے رہی ہے؟ یہ اس کی پگوڈا میں آمد کا اعلان ہے۔''

نقارے کی دور افتادہ تھرتھراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اندازاً یہ کوئی دو ڈھائی میل کے فاصلے سے آ رہی تھی۔ فیروز اور ماجد آپس میں جھگڑنا شروع ہو گئے۔ ماجد کا خیال تھا کہ انہوں نے یہاں گھات لگا کر غلطی کی تھی۔ انہیں قریباً ایک میل پیچھے گھات لگانی چاہیے تھی جہاں سے دوراہا پھوٹتا تھا۔

فیروز تڑخ کر بولا۔ ''مگر وہاں کون سی جگہ تھی چھپنے والی؟ کھلے میدان میں بیٹھتے تو اب تک دھر لیے گئے ہوتے۔''

اُس سے پہلے کہ فیروز اور ماجد کا یہ تنازع شدت اختیار کرتا، ایک آواز نے سب کو چونکایا۔ یہ گھوڑے کی ہنہناہٹ تھی اور ہمارے عقب سے اُبھری تھی۔ پھر ایک ساتھ ایسی کئی اور آوازیں اُبھریں۔

''میرا خیال ہے یہ حکم جی کے گارڈز ہیں۔'' فیروز نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''رائفلیں چھپا دو۔'' اسحاق نے فوراً تجویز پیش کی اور اپنی رائفل خشک پتوں کے ایک ڈھیر میں گھسیڑ دی۔ فیروز اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ماجد کی رائفل پہلے ہی جنگلی گھاس میں پڑی تھی اور تاریکی کے سبب نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل تھی۔ ہینڈ گرینیڈز اور گولیوں والا تھیلا بھی وہیں تھا۔ ہم چار پہیوں والی خستہ حال گھوڑا گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے گھوڑا گاڑی کو قابلِ استعمال بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد

چودہ پندرہ گھڑ سوار محافظ موقع پر آن موجود ہوئے۔ یہ سب باوردی اور مسلح تھے۔ ''کون ہو تم؟'' ایک فربہ جسم کے شرابی گھڑ سوار نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

''ٹھاکر کیدار ناتھ کے ملازم ہیں جی۔ اس گاڑی کو ٹھیک کر رہے تھے۔'' فیروز نے پتا نہیں کس ٹھاکر کا نام لیا تھا کہ گارڈز کے کڑے تیور ذرا نرمی اختیار کر گئے۔

''یہ کس کی گاڑی ہے؟'' انچارج گارڈ نے شرابی لہجے میں پوچھا۔

''ٹھاکر صاحب کے ایک دوست کشوری لال جی کی تھی۔ عرصے سے یہاں خراب پڑی ہے جی۔ ہم نے ان سے مانگ لی ہے۔ صبح سے اسے ٹھیک کر رہے تھے۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب کل آویں گے۔'' فیروز نے مسکین لب و لہجے میں کہا۔

اندازہ ہوا کہ فربہ اندام شرابی انچارج فیروز کے جواب سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سات آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ باقی پانچ چھ محافظ وہیں موجود رہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو ایک بارشی گڑھے میں سے پانی پلانے لگے۔ ایک دراز قد گارڈ یونہی گھوم پھر کر چار پہیوں والی مرمت طلب گھوڑا گاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی وہ بے پروائی سے گاڑی کے مختلف حصوں پر ڈال رہا تھا۔ گاڑی پر لگی ہوئی ایک زنگ آلود پلیٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ پلیٹ پر مرکوز کیا۔ پھر فیروز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم کیسے کہوت ہو کہ یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کے دوست کی گاڑی ہے؟''

یہی وقت تھا جب ایک گارڈ نے چلا کر کہا۔ ''یہاں گڑبڑ ہے جی۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ فیروز ہے جی، حکم جی کا ملازم۔'' اس کے ساتھ ہی چلانے والے نے اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ فیروز کے چہرے پر مرکوز کیا۔

دراز قد گارڈ بھی ٹھٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی تین چار رائفلیں ہماری طرف اُٹھ گئیں۔ ان میں دراز قد گارڈ کی اپنی رائفل بھی شامل تھی۔ وہ باقی گارڈز میں سے سینئر لگتا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنی جدید رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''خبردار...... اپنے ہاتھ اوپر اُٹھاؤ۔ جلدی کرو۔''

فیروز اور ماجد نے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ چند لمحے بعد میں نے اور اسحاق نے بھی تقلید کی۔ کم از کم تین ٹارچوں کے روشن دائرے ہمارے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ گارڈز کی انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اس شدید تناؤ کی کیفیت میں کسی لمحے بھی کچھ ہو سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ ہمارے درمیان طے تھا کہ پھنس جانے کی صورت میں ہم

گرفتاری نہیں دیں گے اور فی الحال ہم پھنس گئے تھے۔

''زمین پر لیٹ جاؤ اوندھے...... جلدی کرو۔'' دراز قد گارڈ دھاڑا۔

پہلے ماجد لیٹا، پھر فیروز اور آخر میں، مَیں اور اسحاق، ہم نے اپنے ہاتھ دونوں طرف پھیلا لیے تھے۔ لیٹتے ہوئے میں تھوڑا سا بائیں طرف ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے سے میں اپنی اس رائفل کے قریب تر ہو گیا جو خشک پتوں کے ڈھیر کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ میرے ہاتھ رائفل کے تقریباً اوپر تھے۔ میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ میں رائفل اُٹھاؤں اور کچھ کر گزروں۔ ایسا کام کرنے کے لیے جس قسم کی ہمت درکار تھی، وہ آج میں اپنے اندر موجود پا رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں یہ کر گزروں گا اور اگر نہ کر سکا تو کیا ہو گا؟ وہی کچھ ہو گا جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ تخت یا تختہ۔

میں نے زرد نرم پتوں کے نیچے رائفل کی سختی کو محسوس کیا۔ دراز قد گارڈ گالیاں بک رہا تھا۔ وہ رائفل سونتے ہوئے آگے بڑھا۔ غالباً وہ ہماری جامہ تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہمارے لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ ہو گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اوندھا لیٹنے کا حکم دے کر وہ خود مجھے میرے ہتھیار کے قریب پہنچا چکا ہے۔ وہ سامنے کی طرف سے آ رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے پانچ چھ قدم دور تھا کہ میں نے پتوں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی رائفل نکالی۔ اس کا سیفٹی کیچ پہلے سے ہٹا ہوا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لیے دراز قد گارڈ پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اُگلا۔ گولی دراز قد گارڈ کے سینے پر کہیں لگی۔ وہ اُچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے دوسرا فائر اس شخص پر کیا جو پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ''بیکال'' رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ میرا پہلا فائر خالی گیا۔ مدِمقابل نے گولی چلائی جو میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی عقب میں درخت کے تنے پر لگی۔ میں نے تیسری بار ٹریگر دبایا۔ اس مرتبہ گولی نے مدِمقابل کو زخمی کیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر جھکتا چلا گیا۔ اس کی کراہ دردناک تھی۔

اسی اثناء میں اسحاق، ماجد اور فیروز بھی پتوں میں سے رائفلیں برآمد کر چکے تھے۔ ماجد کو تو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے سکتا، بارہ بور کی ایک گولی اس کے جبڑے اور سر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تاہم میں اسحاق اور فیروز درختوں کے پیچھے پناہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ گارڈز بھی مختلف درختوں کے عقب میں پناہ لے چکے تھے۔ ان میں سے دو نے خستہ حال گھوڑا گاڑی کے پیچھے پوزیشن لی تھی۔ تقریباً ایک منٹ تک اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ دھماکوں سے جنگل گونج اُٹھا۔ تاریکی میں ہر

طرف شعلے لپکتے نظر آئے۔ یہ شعلے مخصوص آوازوں کے ساتھ درختوں کے تنوں میں پیوست ہو رہے تھے اور شاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں ایک تناور درخت کی اوٹ میں تھا۔ میں لڑائی کے داؤ پیچ سے زیادہ واقف نہیں تھا لیکن میرے اندر کی ہیجانی کیفیت مجھے راستہ دکھا رہی تھی۔ میں نے تناور درخت کی اوٹ چھوڑی اور تیزی سے بھاگ کر بارشی گڑھے میں کود گیا۔ ایسا کرنے سے میں ان دو افراد کو ٹارگٹ بنانے میں کامیاب ہو گیا جو گھوڑا گاڑی کے عقب سے گولی چلا رہے تھے۔ میری فائرنگ سے ان میں سے ایک شدید زخمی ہو کر گرا اور دوسرا پسپا ہو کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

''شاباش مہروز!'' فیروز کی پُر جوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

اسی دوران میں اسحاق بھی اپنی پوزیشن تبدیل کر کے کچھ آگے جا چکا تھا۔ اس کی رائفل برسٹ پر سیٹ تھی۔ اس کے چلائے ہوئے دو تین برسٹس نے گارڈز میں کھلبلی مچا دی۔ ہم نے انہیں تاریکی میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان کو بھاگتے دیکھ کر ہمارے حوصلے سوا ہوئے۔ ''مارو حرامزادوں کو۔'' اسحاق کی للکارتی ہوئی آواز تاریکی میں گونجی۔

ہم نے اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر جارج گورا کے رکھوالوں پر گولیاں چلائیں۔ اس فائرنگ سے ایک اور گارڈ نشانہ بنا، باقی تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

بارشی گڑھے میں کودنے سے میں سینے تک بھیگ چکا تھا۔ مجھے گڑھے کے پاس ہی ایک گارڈ کی ٹارچ پڑی نظر آئی۔ میں نے ٹارچ اُٹھا کر روشن کی۔ ہمارا ساتھی ماجد اپنا عہد نبھا چکا تھا۔ وہ پہلو کے بل کچی زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے آس پاس خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اسحاق نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے ساتھی کا ماتھا چوما اور گلوگیر آواز میں بولا۔

''گھبرا مت آج ہم جارج کو مار دیویں گے یا خود بھی تیرے پاس پہنچ جاویں گے۔''

سوگ منانے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں تقریباً دو منٹ تک لگا تار فائرنگ ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں ان گارڈز کے باقی ساتھیوں کو کسی بھی وقت یہاں کھینچ سکتی تھیں۔ یقیناً وہ بھی یہیں کہیں درختوں میں گشت کر رہے تھے۔ جس گارڈ پر میں نے پہلی گولی چلائی تھی، وہ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس کا لمبا جسم کسی گٹھڑیاں کی طرح جھاڑیوں میں مردہ پڑا تھا۔ جس گارڈ کے پیٹ میں گولی لگی تھی، وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور بے ہوش ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے گارڈ کی لاش بھی جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ اس گارڈ کی رائفل اور گولیوں والی بیلٹ فیروز نے اُٹھا لی۔ ''ہمیں یہاں زیادہ دیر ناہیں ٹھہرنا چاہیے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا اُٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ گارڈز کے تین چار

گھوڑے جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر چکرا رہے تھے۔ ہم انہیں نظرانداز کرتے ہوئے تاریکی میں لپکتے چلے گئے۔ ماجد کی موت نے اسحاق کو کچھ زیادہ ہی ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے قراری سے رائفل کو اپنے ہاتھوں میں حرکت دے رہا تھا۔ جیسے اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو مار دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' فیروز نے تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو کہوت ہوں، آج جارج کو ڈھونڈ نکالیں۔ اسے مار ڈالیں یا خود مر جاویں۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب اس تک پہنچنا بڑا مشکل ہووے گا۔ وہ بہت چوکس ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس حرامی نے گکوڈا تک جانے کے لیے بھی دوسرا راستہ استعمال کیا ہے اور اب یہاں ہونے والی فائرنگ کے بعد تو وہ اور بھی چوکنا ہو گیا ہووے گا۔''

''مگر ہم نے اسے مارنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' اسحاق بولا۔

''قسم تو کھا رکھی ہے اور اللہ کو منظور ہوا تو ہم اس کا قصہ تمام بھی کریں گے۔ لیکن اگر ہم نے جلد بازی کی تو ہماری جان ضائع چلی جاوے گی اور یہ ہم کو منظور ناہیں ہے۔'' فیروز نے کہا۔

''تو کیا ہم ماجد کو گنوا کر یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلے جاویں گے؟''

چلتے چلتے فیروز چند لمحے کے لیے رُک گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ناہیں...... ہم بالکل خالی ہاتھ واپس ناہیں جاویں گے۔ آج ہم جارج تک نہیں پہنچ سکے لیکن اپنے دوسرے ''بہترین نشانے'' پر ضرور پہنچیں گے۔''

''دوسرا بہترین نشانہ...... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ماریا تک پہنچیں گے۔ ماریا جارج کی سوتیلی بہن ہے لیکن ماں کی طرف سے سگی ہے اور وہ اس سے بہت محبت بھی کرتا ہے۔ ہم جارج کو ایسا زخم دیں گے جو اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیوے گا۔ مر سکے گا نہ جی سکے گا۔''

''وہ بدذات ہمیں کہاں ملے گی؟'' اسحاق نے دانت پیس کر پوچھا۔

''میں اچھی طرح جانت ہوں، وہ اس وقت کہاں ہووے گی۔ وہ اپنی ایک دوست کے گھر آئی ہوئی ہے۔ ٹھاکر کیدار ناتھ کی بیٹی کامنی دیوی کی سگائی کی رسم ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہاں بہت زیادہ لوگ ناہیں ہوں گے۔ حفاظت کا بھی کوئی خاص انتظام ناہیں ہووے گا۔ ہم اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر ماریا کو عدم آباد روانہ کر سکت ہیں۔ بالکل کر سکت ہیں۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو واقعی یہ بہت بڑی بات ہووے گی۔''

"یہ بات ہووے گی اور ابھی ہووے گی۔" فیروز کے لہجے میں سخت ہیجان تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان تیزی سے سفر کیا۔ ہمارے پاس ٹارچیں موجود تھیں لیکن ہم انہیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اسحاق اور فیروز یہاں کے راستوں کے شناور تھے۔ وہ بڑی مہارت سے محفوظ اور شارٹ کٹ راستے استعمال کر رہے تھے۔ ایک جگہ وہ ایک برساتی نالے کے اندر سے بھی گزرے۔ جب اس نالے سے باہر نکلے تو میں نے بالکل غیر متوقع طور پر خود کو اس خوشبودار نہر کے کنارے پایا جو زرگاں کے راج بھون کو تقریباً چھوتی ہوئی گزرتی تھی لیکن ہم راج بھون کے پاس نہیں تھے بلکہ بارونق آبادی کے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ زرگاں کا مضافاتی علاقہ نظر آتا تھا۔ ہم تینوں نے اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپا لیے۔ فیروز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز سرگوشی کی۔ "وہ دیکھو...... ان پیڑوں کے پیچھے جو نیلی روشنیاں نظر آ رہی ہیں، یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کی حویلی ہے۔ ٹھاکر ذرا عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کا عادی ہے۔ آج یہیں پر اس کی بیٹی کی رسم ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت ناہیں ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے فوراً کرنا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ سیدھے اندر گھس جاوت ہیں۔ جو بھی راستہ روکے گا، بھون ڈالیں گے اس حرامی کو۔"

کچھ دیر بعد اسحاق نے عجیب جذباتی انداز میں فیروز کا کندھا تھاما۔ "میں نے تمہاری بات مانی ہے فیروز! اب تم میری بھی ایک بات مانو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر وہ حرام کی جنی ماریا ہمارے ہاتھ آ گئی تو ہم اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس بارے میں، مَیں تمہیں پھر بتاؤں گا لیکن مجھ سے وعدہ کرو۔"

تاریکی میں فیروز نے چند لمحوں کے لیے اسحاق کو بغور دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

ہم شیشم، نیم اور کچنار کے پیڑوں میں سے نکل کر نیلی روشنیوں والی حویلی پر یوں حملہ آور ہوئے جیسے شکاری جانور اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ حویلی سے باہر سات آٹھ خوبصورت گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو تین موٹریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی بان، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ یہاں وہاں ٹہل رہے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک اس طرح کی افتاد ان کے سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ہم تینوں دندناتے ہوئے حویلی میں گھس گئے۔ صرف ایک ملازم نے برآمدے میں ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

فیروز نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری، وہ ڈکراتا ہوا نہانے والے تالاب میں جا گرا۔ اس حویلی کو جنریٹرز کی مدد سے جگمگایا گیا تھا۔ اندرونی حصے میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ ڈھولک کی تھپا تھپ گونج رہی تھی۔ پکوانوں کی خوشبو تھی۔ پہلے تو فائر کی آواز نے لوگوں کو چونکایا پھر جب ہم اسلحہ لہراتے ہوئے اچانک اندر گھس آئے تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ مرد و زن چلاتے شور مچاتے چاروں طرف بھاگے۔ کرسیاں اُلٹ گئیں۔ کھانوں کی بیش قیمت رکابیں فرش پر بکھرتی نظر آئیں۔ جس لڑکی کی سگائی تھی، وہ سرخ ساڑھی پہنے سولہ سنگھار کیے اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ اس کے گرد بھی خوش رنگ لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ یہ سب بھی حواس باختہ ہو کر اُٹھیں، ان میں سے دو تین سفید فام بھی تھیں۔ فیروز اور اسحاق نے ان میں سے اپنا شکار پہچان لیا تھا۔ یہ سرخی مائل بالوں والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ اس کی عمر تئیس چوبیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سفید فام ہونے کے باوجود اس نے مقامی لباس ہی پہن رکھا تھا۔ چمکیلی کام دار ساڑھی پر مشتمل تھا۔ لڑکی مضبوط جسم اور قوی اعصاب کی مالک نظر آتی تھی۔ اسٹیج پر سے اُترنے والیوں میں وہ سب سے آخر میں تھی اور وہ منہ پھیر کر بھاگی بھی نہیں تھی، اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ تاہم دیگر لوگوں کی طرح اس کے چہرے کا سارا خون بھی نچڑ چکا تھا۔

فیروز اور اسحاق عقابوں کی طرح اس پر جھپٹے اور پکڑ لیا۔ "ہیلپ...... ہیلپ۔" وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی لیکن فی الحال یہاں اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔

شاید لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہمارے سروں پر خون سوار ہے اور ان لمحوں میں ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اسحاق نے انگریز لڑکی کی پشت سے رائفل کی نال لگا دی تھی اور فیروز اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لا رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب دو تنومند افراد جو یقیناً گارڈز تھے، ہمارے سامنے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ حقِ نمک ادا کرنا چاہتے تھے مگر یہ کوشش انہیں مہنگی پڑی۔ اسحاق نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ دونوں افراد کے چہرے اور سینے پر گولیاں لگیں۔ وہ ٹریگر دبانے کی حسرت دل میں لیے مردہ چھپکلیوں کی طرح دہلیز پر جا گرے۔ ایک گولی ایک بھاگتی ہوئی فربہ اندام خاتون کی ٹانگ میں لگی۔ میں نے اسے برآمدے کے بڑے بڑے گول ستونوں کے پاس گرتے ہوئے دیکھا۔

ہم ماریا کو کھینچتے ہوئے حویلی کے لان میں پہنچے۔ ہر طرف وحشت کا عالم تھا۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپ گئے تھے اور وہیں سے واویلا کر رہے تھے۔ "ہوائی فائرنگ کرو۔" فیروز نے مجھے مشورہ دیا اور خود بھی رائفل کی نال اوپر اُٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔

تڑتڑ کی لرزہ خیز آوازوں نے ماحول کو مزید دہشت ناک کر دیا۔ میں نے بھی فیروز کی تقلید کی اور اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ''پہل'' کرنے کے فائدے کیا ہوتے ہیں اور کسی ماحول پر اچانک چھا جانے اور اسے تسخیر کر لینے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارے اردگرد کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ ٹھاکر تھے، رائے اور کنور تھے اور پتا نہیں کیا کچھ تھے لیکن اس وقت وہ جان بچانے کے لیے معمولی کیچوؤں کی طرح کونے کھدروں میں رینگ رہے تھے اور چھپ رہے تھے۔ ان کی بھاری پگڑیاں، قیمتی جوتیاں اور ان کے بلوری جام ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

جس وقت ہم ماریا کے ساتھ بیرونی گیٹ پر تھے، حویلی کی چھت سے ہم پر پھر ایک فائر ہوا لیکن اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس فائر کے جواب میں، مَیں نے چھت کے بائیں کنارے کی طرف تین چار فائر کیے اور فیروز وغیرہ کے ساتھ بھاگتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔

حویلی سے باہر ایک لینڈ روور جیپ موجود تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی موجود تھا اور ہمیں سکتہ زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم انگریز لڑکی کو کھینچتے ہوئے جیپ میں لے آئے۔ فیروز نے رائفل کی نال ڈرائیور کی طرف اُٹھائی اور پھنکارا۔ ''گاڑی اسٹارٹ کر۔''

ڈرائیور کسی معمول کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیب سے چابی نکال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ فیروز نے اسے بھاگنے کا حکم دیا۔ وہ اس حکم کو ماننے کے لیے ایک سو ایک فیصد تیار تھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر درختوں کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ فیروز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پلک جھپکتے میں جیپ کو نیلی روشنیوں والی حویلی سے دور لے آیا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں فیروز نے درختوں کے درمیان کچے راستوں پر طوفانی ڈرائیونگ کی۔ لڑکی کو اسحاق نے دبوچ رکھا تھا اور ٹرپل ٹو رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔ ہم جیپ کے ساتھ ہی فٹ فٹ بھر اوپر اُچھل رہے تھے اور ہمارے سر بار بار جیپ کی چھت سے ٹکراتے تھے۔ لڑکی سمجھ چکی تھی کہ اب شور مچانے اور مزاحمت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اُلٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فیروز کی ڈرائیونگ بھی اس کے لب و لہجے کی طرح سخت ہیجانی تھی۔ اس نے جیپ کو طوفانی انداز سے ایک برساتی نالے میں سے گزار دیا اور پھر ایک نہایت خطرناک ڈھلوان پر اندھا دھند دوڑاتا چلا گیا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ جنگل نہایت دشوار ہو گیا اور جیپ نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کا فرنٹ برباد ہو چکا تھا اور ایک طرف کے شیشے میں دراڑیں آ گئی تھیں۔

جب جیپ رُک گئی تو ہم اس میں سے نکلے اور لڑکی کو لے کر نہایت گھنے تاریک درختوں میں گھس گئے۔ ایک ٹارچ کی مدد سے راستہ دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ لڑکی کی ساڑھی اس کے بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور اس کے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ اسحاق نے اسے تیز دھار چاقو سے کاٹا اور پھر پھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔ اب لڑکی کی ساڑھی کا بالائی حصہ اس کے جسم پر موجود نہیں تھا۔ اسحاق نے اسے اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ کچھ آگے جا کر لڑکی پھسلی اور گر گئی۔ اسحاق نے اسے اُٹھانا چاہا لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور ہانپتی رہی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''ہام کا تمہارا کوئی دشمنی نہیں، تم ہام کے ساتھ ایسا کیوں کرتا؟ اگر تم کو منی چاہیے تو ہام تم کو دینے کو تیار ہے۔ آئی ایم شیور۔ مائیکل تمہارا ہر مطالبہ پورا کر دے گا۔''

''ہمیں تمہاری دولت نا ہیں چاہیے۔ کچھ اور چاہیے۔'' اسحاق سفاک لہجے میں بولا۔

''بتاؤ کیا چاہیے...... میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''بس یہی ہماری مجبوری ہے ہم تمہیں زندہ نا ہیں چھوڑ سکتے۔'' اسحاق نے اس کے سرخی مائل بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے اور پھر طیش کے عالم میں اس کا چہرہ گیلی زمین میں دھنسا دیا۔

وہ کچھ بول رہی تھی مگر اس کی آواز ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یقیناً وہ منت سماجت ہی کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مائیکل کا نام بھی لیا۔

''یہ مائیکل کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کتیا کا شوہر...... اور جارج حرامی کا یار...... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔''

چہرہ کیچڑ میں دھنس جانے کی وجہ سے ماریا کا سانس بند ہو رہا تھا۔ جب وہ ہاتھ پاؤں پھینکنے لگی تو اسحاق نے اس کی گردن پر سے دباؤ ہٹا دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ماریا کا چہرہ دہشت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کا کیچڑ صاف کیا اور ڈری ڈری آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ یہ وہی خوف تھا جو ہر اس جوان لڑکی کی آنکھوں میں نظر آ سکتا ہے جسے مسلح افراد نے اغوا کر لیا ہو اور کسی تنہا جگہ پر لے آئے ہوں۔ یہ اپنی آبرو کا خوف ہوتا ہے۔

ماریا بھی غالباً یہی سمجھ رہی تھی کہ آنے والے منٹوں یا گھنٹوں میں اس کے ساتھ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔

ہم نے جنگل میں قریباً ایک گھنٹہ مزید سفر کیا اور ایک ایسی جگہ پر آ گئے جو فیروز اور اسحاق کے خیال کے مطابق رُکنے کے لیے محفوظ تھی۔ یہ جگہ نباتات سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ تو

رات تھی، غالباً دن میں بھی یہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں گنجان درختوں کے درمیان تھوڑی سی خالی جگہ تھی۔ رات کے وقت ایسی جگہوں پر جنگلی جانوروں کا بہت ڈر ہوتا ہے اور آگ جلانا پڑتی ہے لیکن ہم آگ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اب تک ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ ہمیں صرف ٹارچ کی روشنی پر ہی اکتفا کرنا تھا۔

اسحاق کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی وہ جیسے انگریز لڑکی ماریا پر پل پڑا۔ اس نے ماریا کی ساڑھی کا وہ حصہ اپنی کمر سے کھولا جو پھاڑ کر علیحدہ کیا تھا۔ اس کی لمبائی دو ڈھائی میٹر رہی ہوگی۔ اس نے یہ کپڑا ایک رسّی کی طرح ماریا کے گلے میں ڈالا اور اسے گرہ دے دی۔ ماریا خوف سے چلانے لگی۔ ''ہیلپ...... ہیلپ! کوئی ہے؟''

یہاں کس نے ہونا تھا؟ کپڑے کا دوسرا سرا اسحاق کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں کوئی ایسی مناسب شاخ ڈھونڈ رہا تھا جس پر لٹکا کر سفید فام ماریا کو پھانسی دے سکے اور وہ یہ کام کرنے کے لیے سو فیصد تیار تھا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ پھنکارنے لگا۔ ''میری بہن جس طرح مری تھی، تجھے بھی اسی طرح مرنا ہوگا۔ بس اتنی رعایت تجھ سے ضرور کریں گے کہ تیری عزت خراب ناہیں کریں گے۔''

اس نے ساڑھی کے کپڑے کو زوردار جھٹکا دیا۔ سانس ماریا کے گلے میں اٹکنے لگی۔ وہ ہوا کے لیے تڑپنا شروع ہو گئی۔ ''ہاں..... اسی طرح..... اسی طرح۔'' اسحاق نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی ایسے ہی سانس کے لیے تڑپ تڑپ کر مری تھی۔ زہر کے سبب اس کا گلا اندر سے سوج گیا تھا۔ وہ ہوا کھینچ ناہیں سکتی تھی، آج تو بھی ناہیں کھینچ سکے گی۔''

اس نے شیشم کی ایک موٹی شاخ پکڑ کر نیچے جھکائی اور ساڑھی کے کپڑے کا دوسرا سرا شاخ کے اوپر سے گزار دیا۔ اب وہ زور لگا کر کسی بھی وقت ماریا کو ہوا میں لٹکا سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے اسحاق نے فیروز سے یہ وعدہ کیوں لیا تھا کہ جارج کی بہن کو زندہ پکڑنا ہے۔ وہ اسے اپنے طریقے سے قتل کرنا چاہتا تھا اور وہ آگ ٹھنڈی کرنے کا خواہاں تھا جو کئی ماہ سے اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

میں نے فیروز کی طرف دیکھا۔ فیروز تذبذب میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لڑکی کو مار دینا چاہیے یا نہیں۔

میں نے فیروز کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اپنا دل دماغ ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ یہ لڑکی ہمارے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ ایک طرح سے یہ جارج کی دُکھتی رگ ہے۔ وہ

اس لڑکی کو چھڑانے کے لیے ہماری کئی باتیں مان سکتا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔''

فیروز چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہووت ہے۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ ہووے گی تو ہمیں یہاں سے نکلنے میں آسانی ہووے گی اور اس کے بعد بھی ہم جارج کی ناک میں نتھ ڈال سکیں گے۔''

''تو پھر اسے روکو۔'' میں نے کہا۔

فیروز نے مجھے رائفل بدست لڑکی کے پاس کھڑا کیا اور خود اسحاق کو لے کر ایک طرف درختوں میں چلا گیا۔

میں لڑکی سے دو تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور اس کا روشن دائرہ لڑکی پر مرکوز تھا۔ وہ قابلِ رحم حالت میں تھی۔ چہرہ ایک طرف سے سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ گلے میں مضبوطی سے بندھے ہوئے کپڑے کی وجہ سے اس کے ماتھے کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ پاؤں سے ایک سینڈل غائب تھا۔ بالائی جسم پر فقط چولی رہ گئی تھی۔ ہاں وہ قابلِ رحم نظر آ رہی تھی مگر قابلِ رحم نہیں تھی۔ مجھے اس کی شکل میں جارج کی جھلکیاں نظر آئیں۔ وہی جارج جو اس بھانڈیل اسٹیٹ کی عورتوں کا دشمن تھا۔ نہ جانے مختلف حیلے بہانوں سے کتنی زندگیاں تباہ کر چکا تھا۔ یہ اسی کی بہن تھی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ اپنے جیسی عورتوں کو برباد ہوتے دیکھتی تھی اور اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ شاید وہ بھی ان سفید فاموں میں سے تھی جو دیگر رنگ و نسل کے لوگوں کو انسان کا درجہ ہی نہیں دیتے۔ آج وہ اپنے بھائی کے کرتوتوں کے سبب خود ایک سخت مصیبت میں تھی۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف فیروز اور اسحاق کا مکالمہ جاری تھا۔ کبھی ان کی آواز مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسحاق فوری طور پر بدلہ لینے پر تلا ہوا ہے وہ ماریا کی جان بخشی کے لیے تیار نہیں۔ یہ گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی پھر دونوں واپس آ گئے۔ ماریا نے ڈری ڈری نظروں سے اسحاق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی وحشت جوں کی توں تھی۔ بہرحال اس کی آنکھوں کی ہیجانی کیفیت کچھ ماند پڑی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ماریا کی گردن سے کپڑے کا پھندا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بُری طرح کھانس رہی تھی۔ فیروز نے پھندا کھولنے میں اسحاق کی مدد کی۔

پھندا کھل گیا تو اسحاق نے اسی کپڑے سے ماریا کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے۔ ماریا اب بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ جب اسحاق اس کے ہاتھ باندھ رہا تھا اور

ساتھ ساتھ اس پر لعن طعن کر رہا تھا، میں نے سرگوشی میں فیروز سے پوچھا۔ ''کیا فیصلہ ہوا؟''

فیروز بولا۔ ''بس وہ یہاں تک راضی ہوا ہے کہ راستے میں لڑکی کو کچھ ناہیں کہے گا۔''

''مطلب ہے کہ وہاں سرنگ میں جاکر مار دے گا۔''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر اپنے راستے پر رواں تھے۔ مجھے فیروز اور اسحاق کی مہارت کی داد دینا پڑ رہی تھی۔ وہ اس تاریک گھنے جنگل میں بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹارچ بھی بس وہ کہیں کہیں خاص ضرورت کے وقت ہی روشن کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اس دشوار گزار راستے کے نشیب وفراز کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتے ہیں۔ فیروز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ماریا، اس کے پیچھے اسحاق اور آخر میں، مَیں تھا۔ ماریا جہاں کہیں سُست پڑتی، اسحاق بے رحمی سے اسے رائفل کے بیرل سے ٹھوکا دیتا اور لعن طعن کرنے لگتا۔ اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ دور افتادہ آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ یہ آوازیں چونکا دینے والی تھیں۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا۔ جارج کی بہن اغوا ہوئی تھی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی بازیابی کے لیے جارج اور حکم جی نے اپنے ہرکارے جنگل میں پھیلا دیئے تھے۔ یہ لوگ ابھی کافی فاصلے پر تھے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ زیادہ دیر فاصلے پر نہیں رہیں گے۔

''امید ناہیں تھی کہ یہ لوگ اتنی جلدی ہماری راہ پر لگ جاویں گے۔'' اسحاق نے دانت پیسے۔

''اب اس حرامزادی کے زندہ ہونے کا فائدہ ہووے گا ہمیں۔'' فیروز نے بھی جلتی ہوئی سرگوشی کی۔

واقعی یہ لڑکی اب ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثے کی طرح ہوگئی تھی۔ فیروز کو یقین تھا کہ جارج اور اس کے ہرکارے کسی صورت بھی ماریا کی زندگی کا رسک نہیں لیں گے۔ اب ہم نے ٹارچ مستقل طور پر بجھا دی اور بہت احتیاط مگر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں فیروز اور اسحاق نے کئی موڑ مڑے اور شارٹ سرکٹ راستے استعمال کیے لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہم تعاقب کرنے والوں سے اپنا فاصلہ بڑھانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ وہ مسلسل ہمارے پیچھے آرہے تھے۔

اچانک فیروز رُک گیا۔ اس نے دھیان سے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک دم بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بظاہر یہی لگا کہ وہ ہانپ کر بیٹھا ہے لیکن میں اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ چکا تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

''کیا ہوا؟'' میں اس سے پوچھا۔

''کچھ ناہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کچھ تو ہے۔ شاید تم چھپا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ تاریکی میں اس کے تاثرات پوری طرح دکھائی نہیں دیتے تھے، تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم سخت پریشان ہوگیا ہے۔ اس نے ایک نظر اسحاق پر ڈالی۔ وہ رائفل ماریا کی پشت سے لگائے چوکس کھڑا تھا۔ اس نے ٹرپل ٹو رائفل ایک ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ ماریا کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی گرہ ڈال رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بجا طور پر یہ خطرہ موجود تھا کہ ماریا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ اس حوالے سے میرا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا تھا کہ ماریا ٹائپ کے سفید فام غیر ملکی زیر ہونے کے باوجود بھی زیر نہیں ہوتے اور اپنی ذہنی برتری کے زعم میں چالاکی دکھانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔

فیروز مجھے ایک طرف لے گیا اور ہولے سے بولا۔ ''کیا تمہیں اس بات پر وشواس ہے ہم عام طور پر تمہارے بارے میں اور کچھ دوسرے بندوں کے بارے میں کہی جاوت ہے؟''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ...... تم لوگن کہیں بھی اپنی مرضی سے ناہیں جا سکت ہو اور نہ ہی اس اسٹیٹ سے باہر نکل سکت ہو۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک سرد لہر سی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ لوگ میری وجہ سے ہمارے پیچھے آرہے ہیں؟'' میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ بس اسی طرح بے حرکت بیٹھا رہا اور ان دور افتادہ آوازوں کو سنتا رہا جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بہت مدھم صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اسحاق کو شاید ماریا کے ہاتھوں کی کمزور بندش کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ دوبارہ سے باندھنے میں مصروف تھا۔ فیروز نے کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بدستور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

''کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر وشواس رکھتے ہو؟''

''کیا تم رکھتے ہو؟'' میں نے جوابی سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''رکھتا بھی ہوں اور ناہیں بھی لیکن ایک بات سچ ہے۔ جو بات ہماری سمجھ میں ناہیں آتی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی انہونی وجہ تو ضرور ہووت ہے۔''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ روحانیت اور مادیت وغیرہ پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے پیچھے آتے ہوئے دشمن سے خطرہ تھا اور یہ خطرہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں دو مختلف اطراف سے آ رہی تھیں۔

فیروز خاموش تھا اور اس کی خاموشی گمبھیر تھی۔ آخر میں نے پوچھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو میں تم لوگوں سے علیحدہ ہو جاتا ہوں۔''

''ناہیں...... ناہیں۔ ایسی بات دماغ میں بھی نہ لانا۔ ہم ساتھ چلے ہیں۔ ہم نے اکٹھے جینے مرنے کا عہد کیا ہے اور یہ عہد پورا ہووے گا۔''

''لیکن یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ یہ عہد پورا کرتے کرتے ہم سارے ہی دھر لیے جائیں۔''

''ناہیں...... اس کا کوئی حل نکالتے ہیں۔'' وہ بیتابی سے بولا اور پھر اُٹھ کر اسحاق کے پاس چلا گیا۔

اسحاق اور وہ ایک طرف جا کر مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں ماریا کی نگرانی کے لیے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور بار بار میری رائفل کی طرف متوحش نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

اسحاق اور فیروز کا مکالمہ دو تین منٹ میں ختم ہو گیا۔ وہ دونوں جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اگر وہ اپنے اندیشوں کے پیش نظر مجھے خود سے علیحدہ ہونے کا کہتے تو میں فوراً ہو جاتا لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

فیروز بولا۔ ''ہم کالی مٹی والے راستے کی طرف سے جاویں گے۔ یہاں ندی بہت تیز چلت ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے پار کر گئے تو ہمارے بچنے کی آشا پیدا ہو جاوے گی۔''

''وہاں ندی پار کرنے کا کوئی انتظام ہے؟''

''ہاں...... انتظام تو ہے۔ اب اللہ کرے یہ انتظام ہمارے کسی کام آ سکے۔'' اسحاق نے کہا۔

ایک بار پھر بھیگی بھیگی سی تاریکی میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ اب سمت بدل گئی تھی۔ ہم قدرے ڈھلوان راستے پر بائیں طرف جا رہے تھے۔ یہاں درختوں اور خودرو جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے بار بار ہمارا راستہ مسدود ہو رہا تھا۔ کئی جگہ ہمیں درختوں کے درمیان سے بیٹھ کر اور رینگ کر گزرنا پڑا۔ کپڑے اُلجھ رہے تھے اور جسم کے عریاں حصوں پر گہری خراشیں آ رہی

تھیں۔ ماریا کے لیے سفر زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس کے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اب اسحاق نے اس پر سے رائفل ہٹا لی تھی اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ سہارا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے آوازوں کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے تک ہم نے یہ نہایت دشوار سفر ایک ڈھلوان پر طے کیا۔ یہ ڈھلوان غیر محسوس لیکن مسلسل تھی۔ ہم بوقتِ ضرورت صرف چند سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ایسے ہی اسحاق نے ٹارچ روشن کی تو ہمیں خود سے صرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دو نہایت چمکیلی آنکھیں نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی خطرے کا شدید احساس ہوا۔ یہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا کوئی جانور تھا۔

ہم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ ''تیندوا......'' فیروز کے منہ سے بے ساختہ سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

ہم اپنی جگہ پتھر بنے کھڑے تھے۔ تب فیروز نے پھرتی دکھائی۔ اس نے تیزی کے ساتھ رائفل پوزیشن کی اور فائر کر دیا۔ رائفل سے شعلہ نکلا اور جنگل دھماکے سے گونج اُٹھا۔ وہ تیندوا یا جو کچھ بھی تھا، جھٹکے سے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے گولی لگی تھی۔ ایک کربناک آواز بلند ہوئی اور روشن آنکھیں جو چھوٹے چھوٹے سرخ بلبوں کی طرح نظر آتی تھیں، تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئیں۔ کسی درندے کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

درست کہتے ہیں کہ بڑے خطرے کے وقت نسبتاً چھوٹے خطرے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ فیروز کو بھی معلوم تھا کہ فائر کی آواز ہمارے دشمنوں کو ہمارے مزید قریب لے آئے گی لیکن خونخوار جانور کو اپنے رُوبرو دیکھ کر وہ پیچھے آنے والے خطرے کو بھول گیا تھا اور اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب جانور تو زخمی ہو کر راہ فرار اختیار کر گیا تھا لیکن جو ''جانور'' ہمارے پیچھے آ رہے تھے ان کو واضح راہنمائی مل گئی تھی۔

''ندی کتنی دور ہے؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''بس اب پہنچنے ہی والے ہیں۔'' فیروز نے ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

واقعی لگ رہا تھا کہ ہم نباتات کے اس گھنے جال سے نکل کر کسی کھلی جگہ پر پہنچنے والے ہیں۔ ڈھلوان قدرے بڑھ گئی تھی۔ سامنے سے ہوا کی آمد بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ذرا آگے گئے تو پانی کا مدھم شور بھی سنائی دینے لگا۔ یقیناً یہ چوڑی پاٹ والی ایک تیز رفتار ندی تھی۔ ہمارے تھکے ہارے جسموں میں نئی توانائی آ گئی۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، پانی کا شور بلند

ہوتا گیا۔ آخر ہم لمبے سرکنڈوں میں سے گزر کر ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس تیز رفتار آبی گزرگاہ کا پاٹ خاصا وسیع نظر آتا تھا۔ کنارے دلدلی تھے اور یہاں بہت سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ یہاں دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور رکھوالی کا کتا تھا۔ کتے نے ہماری آمد محسوس کرتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا اور بے چینی سے اپنے کھونٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر ساتھ ساتھ تین کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا بڑی تھی اور اس پر ترپال تنی ہوئی تھی۔ یہ غالباً مچھلیاں پکڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ دو کشتیاں عام سائز کی تھیں۔

جلد ہی کتے کا شور شرابا رنگ لے آیا۔ جھونپڑی کا دروازہ کھولا اور ایک سایہ متحرک دکھائی دیا۔ فیروز نے ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی۔ یہ بڑھی ہوئی سفید شیو والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بدحال سی دیسی بندوق تھی۔ وہ فی الوقت صرف ایک لنگی میں دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہو بھئی؟'' وہ دھاڑ کر بولا۔

''بندوق نیچے کرلو۔ ناہیں تو اتنی گولیاں لگیں گی کہ شکل پہچاننا مشکل ہو جاوے گی۔''

فیروز بھی جواباً گرجا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دے کر میرے اور اسحاق کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی جدید رائفلوں کو ہائی لائٹ کیا۔

بات ادھیڑ عمر شخص کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بندوق کی نال نیچے جھکا لی۔ اس کا کتا مسلسل اُچھل اُچھل کر شور مچا رہا تھا۔ اچانک اس نے کھونٹا اُکھاڑ لیا اور تیر کی طرح ہماری طرف لپکا۔ یہ نمک حلالی اسے مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اپنی ٹرپل ٹو کا ٹریگر دبا دیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا نشانہ کافی اچھا ہے۔ پہلی گولی نے ہی کتے کو ڈھیر کر دیا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دولڑھکنیاں کھا کر بے سدھ ہو گیا۔ دھماکے سے جہاں قرب و جوار گونجے وہیں جھونپڑی کے اندر سے چلّانے کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جھونپڑی میں ایک یا ایک سے زائد عورتیں موجود ہیں۔

کتے کو گولی لگنے کا منظر ادھیڑ عمر شخص کو سکتہ زدہ کر گیا۔ فیروز پھر گرجا۔ ''بندوق نیچے پھینک، ناہیں تو آوت ہے گولی تیرے کھوپڑے میں.....'' فقرے کے آخر میں ایک زوردار گالی بھی تھی۔

اس مرتبہ ادھیڑ عمر شخص نے بندوق پھینک دی۔ فیروز نے اسے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جب وہ چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گیا تو فیروز نے اس کی بندوق اُٹھالی۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ ہم جھونپڑی کے پیچھے سیاہ جنگل میں چند جگنو سے چمکتے دیکھ سکتے تھے۔ یقیناً یہ ہمارے عقب میں آنے والوں کی ٹارچیں تھیں۔

فیروز مجھ سے مخاطب ہو کر تیزی سے بولا۔ ''مہروز! تم دیکھو جھونپڑی میں اور کون ہے۔ ہم کشتیوں کو دیکھت ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فیروز اور اسحاق تیز قدموں سے کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ماریا ان کے ساتھ تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ عقلمندی دکھا رہی تھی کہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ اسے اب تک اسحاق کی طرف سے کئی چوٹیں سہنا پڑ چکی ہوتیں۔

میں نے رائفل کے زور پر ادھیڑ عمر شخص کو اس کی جھونپڑی سے کچھ مزید پیچھے ہٹا دیا پھر جھونپڑی کے دروازے کو لات مار کر کھولا۔ یہ چوبی دروازہ تھا اور اس پر ٹین کا پتر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ جھونپڑی میں پھینکا تو اندر ایک سکڑی سمٹی مقامی لڑکی نظر آئی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور ایک گوشے میں دبکی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر واویلا کرنے لگی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور رات کے اس پہر رومانی موڈ میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا لیکن اس فرق کی وجہ جاننے اور تفصیل میں جانے کا وقت ہرگز نہیں تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے جھونپڑی کی تلاشی لی۔ وہاں اب ایک کلہاڑی کے سوا کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یہ عجیب سے پھل والی تیز دھار کلہاڑی تھی۔ میں نے یہ کلہاڑی بھی قبضے میں لے لی اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

ادھیڑ عمر شخص جو یقیناً کنارے پر کھڑی تینوں کشتیوں کا مالک تھا۔ حکم کا منتظر تھا۔ ہمارے لب و لہجے اور انداز نے اسے تقریباً دہشت زدہ کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو یہ شخص کمزور اعصاب کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس تیز رفتار ندی اور گھنے جنگل کے خطرناک سنگم پر ایک جھونپڑی مین اپنے کتے اور بندوق کے ساتھ تنہا رہنے والا شخص کمزور اعصاب کا مالک تو نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ طاقت کیا ہوتی ہے اور منہ زور رویوں کے سامنے اچھے بھلے لوگ کیسے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

ادھیڑ عمر شخص ڈگمگاتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا تو میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اپنی بیوی کے ساتھ لیٹ جاؤ اور پر چادر لے لے۔ خبردار جو تم دونوں میں سے کسی نے چادر سے

منہ باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ایسا ہوا تو تم دونوں کی لاشیں بھی کتے کے پاس پڑی نظر آئیں گی۔''

ان دونوں نے لیٹ کر چادر اپنے اوپر تان لی۔ میں جھونپڑی کا دروازہ باہر سے بند کر کے کنارے کی طرف آ گیا۔ میرے پہنچنے تک فیروز اور اسحاق نے دو چھوٹی کشتیوں کی رسیاں کاٹ کر انہیں پانی کے تیز بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ تیسری کشتی میں ہم خود سوار ہو گئے۔ اب دور دور تک اور کوئی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فیروز نے لمبے بانس نما چپو کی مدد سے کشتی کو تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف کھینا شروع کر دیا۔

رواں دواں بہاؤ کی وجہ سے ہم پلک جھپکتے میں جھونپڑی سے بہت دور نکل آئے۔ جھونپڑی کے ساتھ ساتھ درختوں میں چمکتے ہوئے جگنو بھی ہم سے بہت زیادہ دور رہ گئے۔ ہمیں ایسے تیز رفتار اور کامیاب فرار کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق صرف پانچ چھ منٹ میں ہم ملاح کی جھونپڑی اور اس کے گھاٹ سے قریباً دو میل آگے نکل آئے۔ کشتی بتدریج دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، تاہم کنارہ ہنوز بیس تیس میٹر دور تھا۔ کشتی کے اندر سے مچھلیوں کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ مچھلیاں پکڑنے کے جال اور دیگر لوازمات بھی کشتی میں نظر آ رہے تھے۔ کشتی کے پیندے کو مچھلیاں اسٹور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پیندے کو ایک چھوٹے سے تہہ خانے کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک گول سوراخ کے ذریعے اس چار پانچ فٹ گہرے تہہ خانے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ اسٹور نما تہہ خانہ فی الحال خالی تھا۔ اس میں مچھلیاں صاف کرنے اور انہیں نمک وغیرہ لگا کر محفوظ کرنے کا انتظام موجود تھا۔

فیروز نے بہت کوشش کر کے ندی کا دوسرا کنارہ پکڑا۔ ورنہ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ تاریک پانی کا سرکش بہاؤ ہمیں مزید کئی میل آگے لے جائے گا۔ اب کشتی کو روکنے کا مسئلہ تھا۔ وہ کافی وزن دار تھی اور اس کا مومینٹم تھا۔ ایک مناسب جگہ پر فیروز اور اسحاق چھلانگیں لگا کر کنارے پر پہنچے اور انہوں نے رسّوں کی مدد سے کشتی کو سنبھالا۔ اس دوران میں، مَیں رائفل بدست ماریا کے پاس موجود رہا۔

کشتی رُک گئی تو میں نے اور اسحاق نے ماریا کو سہارا دے کر نیچے اُتارا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ اوندھے منہ ریت پر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ میں بھی ماریا کے پیچھے کنارے پر اُتر جاتا، ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا کہ کشتی کے چھوٹے سے تہہ خانے میں کوئی موجود ہے۔

''کیا بات ہے۔ تم نیچے کیوں نا ہیں آ رہے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''ایک منٹ...... مجھے شک سا ہو رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی اور پلٹ کر تہہ خانے کے سوراخ کی طرف آیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔

تب دوسری مرتبہ آہٹ ہوئی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ تہہ خانے کے اندر اُتارا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں ہمت کر کے نیچے چلا گیا۔ یہاں بدبو تھی۔ لکڑی کا فرش گیلا ہو رہا تھا۔ اس تہہ خانے کی چھت اتنی نیچی تھی کہ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی ٹارچ کو دائیں بائیں گھمایاں اور اچانک سکتہ زدہ رہ گیا۔

لکڑی کے اس غلیظ تہہ خانے میں مچھلیاں پکڑنے والے جالوں، رسیوں اور مختلف اوزاروں کے درمیان ایک جیتا جاگتا شخص موجود تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹ تھا۔ اس کے عریاں جسم پر چند چھوٹے بڑے زخم موجود تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس جواں سال شخص کی ایک ٹانگ اور ایک بازو ندارد تھا۔ وہ چلنے کے لیے جس لکڑی کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتا تھا، وہ بھی پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔

تہہ خانے میں مچھلی کی ناگوار بُو کے علاوہ ایک اور بُو بھی موجود تھی۔ یہ شراب کی تھی۔ لکڑی کے فرش پر دو تین خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

جواب نہیں ملا۔ کیچوے کی طرح لیٹا ہوا شخص بالکل بے حرکت رہا۔ بس اس کی سوجی سوجی پلکوں میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ وہ شکل وصورت سے نیپال کی طرف کا لگتا تھا۔ جسم کمزور اور میلا کچیلا تھا۔ اسی دوران میں اسحاق بھی چھلانگ لگا کر واپس کشتی پر آ گیا۔ اس نے کشتی کے تہہ خانے میں جھانکا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں میرے تاثرات دیکھ کر اندر آ گیا۔

وہ بھی اس عجیب الخلقت ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ''کون ہے یہ؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''میں بھی دو تین بار پوچھ چکا ہوں۔ کچھ بتا نہیں رہا۔ ڈھیٹ بنا لیٹا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اسحاق نے آگے بڑھ کر ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے چہرے پر پھینکا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اوئے...... کون ہو تم؟ بولتے کاہے نا ہیں؟''

اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھول کر بے نیازی سے اسحاق کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر

لیں۔ اسحاق نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگائی۔ پھر دوسری ٹھوکر پھر تیسری۔

مجھے یوں لگا جیسے یہ شخص بلبلا اُٹھے گا مگر حیرت انگیز طور پر روٹس سے مس نہیں ہوا۔ شاید اس نے کچھ زیادہ تکلیف ہی محسوس نہیں کی تھی۔ کیا یہ نشے کی وجہ سے تھا یا کوئی اور بات تھی۔

''اُٹھ جاؤ۔'' اسحاق دھاڑا۔

اس مرتبہ عجیب الخلقت نے اپنے سیاہی مائل ہونٹ ہلائے اور انگریزی میں بولا ''دفع ہو جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کی آواز بھی اس کی طرح عجیب تھی۔

''تمہاری تو ایسی کم تیسی۔'' اسحاق نے دانت پیس کر رائفل سیدھی کر لی۔ ''اُٹھ جا حرامی! ناہیں تو میں گولی چلاوت ہوں۔''

حیرت انگیز طور پر اس بار بھی اجنبی شخص کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اسحاق دھاڑا۔ ''میں پانچ تک گنوں گا پھر گولی مار دوں گا۔''

اس نے گنتی شروع کی...... اور پھر ختم بھی کر دی۔ مدقوق شخص اسی طرح پڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا اکلوتا بازو پکڑا اور اسے سیدھا کر کے بٹھانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار تو بیٹھا لیکن پھر مٹی کے ڈھیر کی طرح ڈھے کر لیٹ گیا۔ اسحاق کا پیمانہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ اس پر جنونی کیفیت تو پہلے ہی طاری تھی۔ اجنبی شخص کے اڑیل پن نے اسے مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے اسے اکلوتے بازو سے پکڑا اور بے دردی سے کشتی کے ڈیک کی طرف کھینچنے لگا۔ اب اس ننگ دھڑنگ شخص نے مزاحمت کی اور تہہ خانہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ اب اسحاق کی مخالف سمت میں زور لگا رہا تھا۔ مدقوق ہونے کے باوجود اس کے جسم میں مناسب طاقت موجود تھی۔

اسحاق اسے کھینچنے کے ساتھ ساتھ ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اچانک ننگ دھڑنگ شخص نے بھنا کر اسحاق کو لات ماری۔ یہ لات اسحاق کی ناف میں لگی اور وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ بہرحال یہ جرأت ننگ دھڑنگ شخص کو کافی مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اس کی جسمانی حالت کی پروا کیے بغیر اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔ دو چار ٹھوکریں میں نے بھی رسید کیں۔ اتنا کچھ کسی صحت مند و توانا شخص کے ساتھ ہوا ہوتا تو وہ بھی تکلیف کے سبب دہائی دینے لگتا، مگر اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جسم گوشت پوست کے بجائے ربڑ یا پلاسٹک کا بنا ہوا ہے یا پھر وہ اس قدر نشے میں ہے کہ درد کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے۔

کشتی بُری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ باہر سے فیروز چلّا چلّا کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہو رہا ہے...... کون ہے یہ؟''

وہ ماریا کو اکیلا چھوڑ کر کشتی پر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے تہہ خانے میں سے سر باہر نکال کر فیروز کو تسلی دی اور بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے دوبارہ تہہ خانے میں دیکھا تو ننگ دھڑنگ شخص بالکل بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اسحاق نے رائفل کے وزنی کندے سے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے نیم جان کر ڈالا تھا۔

''مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا ناہیں۔'' اسحاق نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ وہ باہر نکل گیا۔ میں تذبذب میں کھڑا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کون تھا؟ اس کے ساتھ کیا گزری تھی اور یہ کشتی چھوڑنے سے کیوں انکار کر رہا تھا؟ اگر ہم اسے اس حالت میں یہاں چھوڑ کر چلے جاتے تو یہ مر بھی سکتا تھا۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ اجنبی کے چہرے پر تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس شخص کے چہرے میں کہیں اپنے یار عمران کے چہرے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ خاص طور سے اس کی پیشانی بھنویں اور رُخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں۔ بے شک یہ عمران نہیں تھا۔ اس کے بال گھنگریالے تھے، قد بھی ذرا چھوٹا تھا لیکن اپنے پیارے دوست کی ایک ہلکی سی جھلک بھی میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں جو نرم گوشہ شروع سے موجود تھا، کچھ اور وسیع ہو گیا۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ہم اسے یہاں اس حال میں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں۔

میں نے دیکھا، اس کے اکلوتے بازو پر انمٹ روشنائی سے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ کچھ عجیب سا نام تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

اسی دوران میں فیروز بھی کشتی میں آ گیا۔ وہ باہر اسحاق کو ماریا کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بھی دلچسپی سے اس ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھا۔

میں نے کہا، ''فیروز! یہ زخمی ہے۔ ہمیں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''لیکن ہمارے پاس وقت بالکل ناہیں ہے۔ ہم گھاٹ سے بہت زیادہ دور ناہیں آئے۔ وہ لوگ کسی بھی سمے یہاں پہنچ سکت ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ عمران نہیں تھا لیکن اس میں عمران کی ہلکی سی جھلک تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ میں نے پُر زور لہجے میں کہا۔ ''فیروز! شاید یہ مسلمان ہے۔ لگتا ہے کہ ہماری ہی طرح کسی مصیبت میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ حالت بھی حکم جی یا جارج وغیرہ کی وجہ سے ہوئی ہو۔ ہمیں اسے

اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

فیروز جزبز ہوگیا۔ ''لیکن ہم اسے لے جائیں گے کیسے؟''

''چلو...... یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے اُٹھالیتا ہوں۔ اس کا وزن ہی کتنا ہے۔''

فیروز نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً میرے تاثرات نے اسے سمجھا دیا کہ میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تم اسے لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ۔''

میں نے اپنی رائفل اور ٹارچ فیروز کو تھمائی۔ ایک کپڑا جلدی سے مدقوق شخص کے سر کے زخم پر باندھا اور اسے اُٹھا کر باہر لے آیا۔ کشتی سے اُتر کر میں نے اسے کندھے پر لادا تو وہ بالکل ہلکا محسوس ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے جسم میں ایک ٹانگ اور ایک بازو کا بوجھ شامل نہیں تھا۔

اسحاق کو بہت ناگوار گزرا کہ میں نے اس شخص کو کندھے پر لاد لیا ہے۔ وہ شاید مجھ سے بحث کرنا چاہ رہا تھا تاہم فیروز اسے ایک طرف لے گیا اور دانائی کے ساتھ سمجھا بجھا لیا۔

تاریک جنگل میں رات کا بسیرا تھا اور جنگلی جانوروں کی آوازیں تھیں۔ ہم ٹارچوں کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ اب ہمیں اپنے عقب سے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر فیروز نے اصرار کے ساتھ مدقوق شخص کا بوجھ اپنے کندھے پر اُٹھا لیا۔ میں نے اپنی رائفل کے ساتھ ساتھ اس کی رائفل بھی تھام لیا۔ جھونپڑی سے ملنے والی دیسی ساخت کی رائفل ہم نے راستے میں ایک بارشی جوہڑ کے اندر پھینک دی تھی۔ وہاں سے ملنے والی کلہاڑی جو بالکل چھوٹے دستے کی تھی۔ اسحاق کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس کے عجیب وضع کے پھل سے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے جھاڑ جھنکاڑ کو کاٹ رہا تھا۔ ہمارے قدموں میں ایک طرح کی تیزی تو اب بھی موجود تھی لیکن تعاقب کا شدید خطرہ معدوم ہو گیا تھا۔

○......❖......○

رات کا آخری پہر تھا جب ہم ایک جگہ رُک گئے۔ یہ درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے عین درمیان ایک اُبھری ہوئی جگہ تھی جیسے کوئی ٹیلا ہو۔ ہم اس چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اسحاق وغیرہ نے ذرا ستانے کے لیے اس ٹیلے کو منتخب کیا ہے لیکن معاملہ کچھ اور تھا۔ فیروز اور اسحاق میں ایک بار پھر کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ ماریا ایک لاچار قیدی کی طرح درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اکلوتی جوتی اُتار چکی تھی۔ اس کے پاؤں بُری طرح زخمی تھے۔ دشوار گزار سفر نے ہماری طرح اس کے چہرے پر بھی کئی خراشیں ڈال دی تھیں۔

ا کے کانوں میں ڈائمنڈ کے بڑے بڑے آویزے تھے۔ یہ راستے میں شاخوں سے اُلجھے ے تھے اور اس کے ایک کان سے خون رسنے لگا تھا۔

وہ منمنائی۔ ''ہام کو سخت پیاس لگا۔''

میں نے کہا۔ ''پیاس تو ہم کو بھی لگی ہے لیکن یہاں کہیں پانی نظر نہیں آتا۔''

''ڈھونڈو۔ شاید کہیں مل جائے۔'' وہ انگلش لہجے میں بولی۔ اس کی آواز میں التجا تھی۔

''کیا بکتی ہے یہ؟'' اسحاق نے دور سے پھنکار کر پوچھا۔

''پانی مانگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''پلاوت ہیں۔ ابھی پلاوت ہیں تجھے پانی۔ ہم بکری کو پانی پلائے بغیر ذبح نا ہیں کرتے۔'' اسحاق کی آواز میں زہر تھا۔

''یہ کیا کہتا؟'' ماریا نے مجھ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔

وہ ڈرے ڈرے انداز میں بولی۔ ''ہام کو لگتا کہ یہ ہام کو زندہ نا ہیں چھوڑے گا۔ یہ ہام کو مارنے کا پروگرام بنا رہا۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اسحاق اور فیروز کی سرگوشیاں دھیرے دھیرے بلند ہوتی چلی گئیں۔ اسحاق پھنکارا۔ ''مجھے سب پتا ہے فیروز! ہم وہاں انور بھائی کے پاس سرنگ میں چلے گئے تو کچھ نا ہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اس حرامزادی سے ابھی حساب برابر کرنا ہووے گا۔ ابھی اور اسی وقت۔''

فیروز بولا۔ ''دیکھ لو، میرے دماغ میں تو جو آوت تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ مشورے سے جو کام ہو، وہ اچھا ہوتا ہے۔''

''ہم مشورے سے ہی چلے تھے۔'' اسحاق تڑخ کر بولا۔ ''اور مشورہ یہ تھا کہ اس کتے جارج کو مار کر آویں گے یا خود بھی وہیں رہ جاویں گے۔ وہ حرامی تو بچ گیا۔ اب کم از کم اس سفید سورنی کی گردن تو توڑیں۔ کچھ نہ کچھ تو ٹھنڈک پڑے ہمارے کلیجے میں۔'' اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ فیروز ٹھیک کہتا تھا۔ اسحاق نے وقتی طور پر ماریا کی جان بخشی کی تھی۔ اب چونکہ ہم خطرناک حدود سے نکل آئے تھے اور اس زمین دوز دراڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جہاں انور خاں، چوہان اور دیگر پینتیس چالیس افراد موجود تھے۔ لہٰذا اسحاق چاہتا تھا کہ یہیں اسی جگہ پر ماریا کا کام تمام کر دیا جائے۔ ساڑھی کا وہ

کپڑا اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ اس سے پہلے رسّی کے طور پر استعمال کر چکا تھا۔ اب وہ پھر اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ماریا پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ اسے اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اس کے لیے میرے دل میں بھی کسی طرح کا رحم یا ترس موجود نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں وہی زہریلا خون دوڑ رہا تھا جو جارج کی رگوں میں تھا اور جارج کی درندگی میں اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس خبیث نے اپنے بیڈ روم میں سلطانہ کے سامنے مجھے دوبدو مقابلے کا موقع دیا تھا۔ اس نے بھرا ہوا پسٹل میرے پاؤں میں پھینک دیا تھا اور مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں ان لمحوں کو یاد کرتا تھا تو پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔ شاید وہی لمحے تھے۔ وہی وقت تھا جب میرے اندر تبدیلی کی داغ بیل پڑی تھی۔ میں پستی اور ہزیمت کی انتہا کو چھونے کے بعد اُبھرنا شروع ہو گیا تھا اور اب میں تہ دل سے محسوس کرتا تھا کہ میں اُبھر چکا ہوں۔ بدل چکا ہوں اور یہ کوئی عارضی تبدیلی نہیں تھی۔ میری کیمسٹری میں مستقل طور پر کوئی ردوبدل ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت سے سوچا۔ کاش ایک بار پھر ''وقت'' اسی طرح مجھے جارج کے رُوبرو کر دے۔ وہ پسٹل میرے سامنے پھینکے اور میری مزاحمت کو للکارے۔

میں سوچ رہا تھا اور اس چھوٹے سے ٹیلے پر وقت کا قلم، رات کے اس آخری صفحے پر کچھ انوکھا لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے مدقوق شخص کو بڑی احتیاط کے ساتھ گھاس پر دراز کر دیا تھا۔ اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل چکی تھی۔ اس کے منہ سے شراب کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ راستے میں فیروز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے گڑ کی شراب پی رکھی ہے جسے ''رِم'' کہا جاتا ہے۔ بے خبری کی حالت میں وہ گاہے بگاہے کراہ اُٹھتا تھا۔ اس طویل ہنگامہ خیز رات کے بطن سے نمودار ہونے والا یہ انوکھا کردار تھا۔ وہ اس بدبودار کشتی سے کسی جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھے اس کی سخت جانی یاد آئی۔ اس نے اسحاق کے تند و تیز حملے یوں جھیلے تھے جیسے نشانہ اس کا اپنا جسم نہ ہو کسی اور کا جسم ہو۔ اس کی شباہت میں کہیں عمران کی ہلکی سی جھلک موجود تھی اور یہ جھلک سیدھی میرے دل پر اثر انداز ہوئی تھی۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، محبوب چیزوں کی طرف تو انسان کا دل کھنچتا ہی ہے، ان سے ملتی جلتی چیزوں پر بھی پیار آ جاتا ہے۔ یہ دل کے معاملے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

یکایک اسحاق اور فیروز کے درمیان ہونے والا مکالمہ ختم ہو گیا اور اسحاق ایک بار پھر غصے سے بھرا ہوا ماریا کی طرف بڑھا۔ ''پلیز...... ایسا مت کرو...... پلیز۔'' ماریا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تیری تو......'' اسحاق پھنکارا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ گر گئی۔

اسحاق جیسے دیوانگی کے عالم میں اس کے اوپر چڑھ بیٹھا اور ساڑھی کے کپڑے کو اس کی لمبی گردن کے گرد ایک بل دینے کے بعد بھینچنے لگا۔ ماریا کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی۔ وہ بُری طرح مچل رہی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں تھی۔ فیروز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر اسحاق کو روکوں۔

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ اسحاق میری بات پر اتنا مشتعل نہیں ہوتا۔ میں نے آگے بڑھ کر ماریا کی گردن اسحاق کے ہاتھوں سے چھڑائی اور اسے ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ وہ اوندھی ہو گئی۔ بُری طرح کھانسنے اور اُبکائیاں لینے لگی۔

اسحاق نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ دھاڑا۔

''میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تمہارا جو جی چاہے کرنا۔''

''کیا کہتے ہو؟''

میں اسے ایک طرف لے گیا۔ ماریا نے اب بلند آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ہمت اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ میں نے اسحاق سے کہا۔ ''مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ ہم جارج کو مارنے کے لیے کیوں نکلے تھے اور یہ سب لوگ جو حکم جی کے مجرم بن کر اب سرنگ میں چھپے ہوئے ہیں، کیوں مجرم بنے ہیں؟''

''تم کیا کہنا چاہت ہو؟ یہ سامنے کی بات ہے۔ سلطانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد ہمارا صبر ختم ہو گیا ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ ہماری بہن ہے۔ ہم اس کے آنسو ناہیں دیکھ سکتے۔ ہم ان سارے سفید کتوں کو رونے چلانے پر مجبور کر دیویں گے۔''

''تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ ہم سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ اب ذرا غور کرو۔ کیا سلطانہ کی آنکھوں میں اس وقت آنسو نہیں آئیں گے جب اسے پتا چلے گا کہ اس کے بوڑھے باپ اور بیمار بھائی کو جارج نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ یا تکلیفیں دے دے کر جان سے مار دیا ہے۔''

اسحاق ذرا ٹھٹکا۔ ''تم کیا کہنا چاہت ہو؟''

''بالکل سامنے کی بات ہے۔ تم لوگ سلطانہ اور اس کے بچے کو تو زرگاں سے نکال لائے ہو لیکن اس کے گھر والے وہیں ہیں۔ پکی بات ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کے شکنجے میں آ چکے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے۔ ہم انہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم سب تو وہاں سے نکل آئے ہیں۔ اس لڑکی کی شکل میں ہمارے ہاتھ ایک بہت خاص پتا آ گیا

ہے۔"

اسحاق کی آنکھوں کے شعلے کچھ مدھم پڑ گئے تاہم چہرے کی سختی برقرار رہی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اسحاق! اور بات صرف سلطانہ کے گھر والوں ہی کی نہیں ہے۔ ہم اس لڑکی کے زور پر اور بھی کئی باتیں جارج اور حکم جی سے منوا سکتے ہیں۔ اس لڑکی کو فوری طور پر مار کر ہم بہت کچھ گنوا دیں گے۔"

ایسا لگا کہ میری بات اسحاق کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی ہے۔ اس کا تنا ہوا جسم ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ یہ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر فیروز بھی ہمارے پاس چلا آیا اور اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔

O....❖....O

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم زمین دوز دراڑ میں واپس پہنچ گئے۔ اس دراڑ کا دہانہ حیران کن حد تک پوشیدہ تھا۔ رات تو رات، دن کی روشنی میں بھی اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ دہانے کی سیاہی دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ریچھ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ ہم جس وقت دہانے پر پہنچے، سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جنگل سے جانوروں کی آوازیں معدوم ہو گئی تھیں اور اس کی جگہ پرندوں کی چہچہاہٹ لے رہی تھی۔

غیر متوقع طور پر دراڑ کے دہانے پر کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ کچھ عجیب سا لگا، کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے اور تب یہ انکشاف ہوا کہ سرنگ خالی ہے۔ ہم جن چالیس بیالیس ساتھیوں کو یہاں چھوڑ کر گئے تھے، وہ اب یہاں موجود نہیں تھے۔ ان کا سامان وغیرہ بھی ناپید تھا۔ شواہد سے پتا چلتا تھا کہ وہ شاید چند گھنٹے پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔ ایک طرف ٹوٹے ہوئے دستوں والی دو زنگ آلود تلواریں پڑی تھیں۔ ان کے پاس ہی زخموں سے اُتاری جانے والی کچھ خون آلود پٹیاں اور خوراک کے بچے کھچے حصے تھے۔ ہاں...... یہاں کے مکین یہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال خاص طور سے فیروز کے لیے مایوس کن تھی۔ اسے ہندو ماں کا طعنہ دینے والا اکبر بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ شاید فیروز، اکبر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں نے جان کی بازی لگائی ہے اور دشمن کے گھر میں گھس کر اسے گھاؤ لگایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟

ابھی ہم اسی ادھیڑ بُن میں تھے کہ ایک طرف سے آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے گرج دار آواز میں پوچھا۔"کون ہے؟"

فیروز نے یہ آواز پہچان لی۔ وہ زور سے بولا۔"ہم ہیں انور بھائی! کہیں گولی شولی نا ہیں چلا دینا۔"

چند سیکنڈ بعد انور خاں ہمارے سامنے آ گیا۔ فیروز نے ٹارچ کا روشن دائرہ انور خاں کی طرف کیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس کے پیچھے ہمیش بھی باہر آ گیا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ بھکشو ہمیش کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ یہ تئیس چوبیس سال کا نوجوان تھا اور ان پہرے داروں میں سے تھا جنہوں نے پرسوں مجھے دراڑ سے باہر نکلنے سے روکا تھا۔

"یہ سب کیا ہے انور بھائی! باقی سب لوگ کہاں گئے؟" فیروز نے پوچھا۔

"میں سب بتاتا ہوں لیکن پہلے میری حیرت دور کرو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟ یہ جارج گورے کی بہن ماریا ہی ہے نا؟"

"بالکل انور بھائی! یہ وہی ہے۔ اس حرامی نے ہماری مسلمان بہن سلطانہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد وہ کسی رُو رعایت کا حق دار نا ہیں ہے اور نہ یہ سفید کتیا ہے۔" اسحاق نے کہا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجھوڑا۔

"لل...... لیکن...... یہ تم نے کیا کس طرح؟ اور...... یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟"

"نتیجہ کچھ نا ہیں نکلے گا انور بھائی۔" اسحاق بولا۔"ہم نے یہ سب کچھ سامنے آئے بغیر کیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نا ہیں کہ اس میم کو اُٹھا کر لے جانے والے کون ہیں؟"

انور خاں کی حیرت برقرار تھی۔ وہ اسحاق کے جواب سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ایک ٹانگ اور ایک بازو والے مدقوق شخص پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔

"اور یہ کون ہے؟ اسے کہاں سے اُٹھا لائے ہو؟"

"یہ بھی ایک عجوبہ سا ہے جی! یہ راستے میں ملا ہے۔" فیروز نے جواب دیا اور مدقوق شخص کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

انور خاں اور ہمیش حیرت آمیز دلچسپی سے سن رہے تھے۔ انور خاں نے میرے ہاتھ سے ٹارچ لے لی تھی اور اس کی روشنی میں مدقوق شخص کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

مدقوق شخص اب مکمل ہوش میں آ رہا تھا۔ فیروز نے احتیاط کے طور پر اسے ایک گوشے میں لٹایا اور اس کی اکلوتی ٹانگ کو ایک زنجیر سے باندھ کر اس طرح موڑ دیا کہ وہ گھٹنے پر سے

مکمل طور پر مڑ گئی اور سیدھی ہونے سے قاصر ہو گئی۔ ہمارے اور انور خاں کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انور خاں اس بات پر ناراض تھا کہ ہم اسے بتائے بغیر یہاں سے نکل گئے۔

تاہم ماریا کی شکل میں جو ایک ہتھیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا، وہ اس پر خوش بھی تھا۔ اس موقع پر فیروز نے انور خاں کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ماجد بھی ہمارے ساتھ تھا اور وہ زندہ واپس نہیں آ سکا۔ انور خاں، ماجد کو لاپتا سمجھ رہا تھا۔

انور خاں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر کار چھوٹے سرکار نے ایک دلیری کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ انہوں نے سلطانہ، بالو اور مہروز سمیت سب لوگوں کو نل پانی میں پناہ دے دی ہے۔ آج رات دوسرے پہر وہ سب لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔“ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہیں بھی مبارک ہو مہروز! چھوٹے سرکار کسی کو پناہ دیتے ہیں تو پھر اس پناہ کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ اب تم ہر طرح محفوظ ہو اور جس وقت چاہو نل پانی جا سکتے ہو۔“

”لیکن..... تم کیوں نہیں گئے؟ اور ہمیش بھی یہیں ہے اور اس کے ساتھ یہ تیسرا بندہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں پناہ نہیں ملی۔“ انور خاں نے جواب دیا۔ ”اور میرے خیال میں چھوٹے سرکار کا یہ فیصلہ صحیح ہے۔ اگر وہ ہمیں بھی رکھ لیتے تو پھر معاملہ بہت زیادہ بگڑ جانا تھا۔“

ہمیش بولا۔ ”لوگ تو انور بھائی کے بغیر جانا ہی ناہیں چاہت تھے۔ انور بھائی نے بڑی مشکلوں سے انہیں رضامند کیا۔ یہ انور بھائی کی بڑائی ہے۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم تین بندوں کی وجہ سے باقی لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ میں نے ہمیش اور احمد سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میری رائے سے رائے ملائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا ہے۔“ انور خاں نے کہا۔

میں سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انور خاں نے میرے تجسس کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام احمد ہے۔ یہ مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہے۔ پہلے الہ آباد کا چیمپئن تھا، اب الہ آباد سے باہر بھی اس کو مانا جاتا ہے۔“

”اس کے یہاں رہنے کی وجہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس سمجھ لو کہ یہ بھی ہم دونوں کی طرح حکم جی کا خاص مجرم ہے۔ اس کا ناقابلِ معافی قصور میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ انور خاں نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹہ بات چیت ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل طے ہوا۔ اس لائحہ عمل میں میرے لیے یہ تجویز تھی کہ میں خود کو ملنے والے موقع کو ضائع نہ کروں اور فوراً

نل پانی کا رُخ کروں۔ انور خاں کا کہنا تھا کہ مجھے پناہ مل چکی ہے اور مجھے اپنی بیوی بچے کے پاس ہونا چاہیے۔

میرے اندر کچھ اور طرح کی آندھی چل رہی تھی۔ مجھے پناہ نہیں چاہیے تھی۔ مجھے راستہ چاہیے تھا۔ وہ راستہ جو مجھے اس راجواڑے کی حدوں سے نکال سکتا۔ میرے اندر اس قیدی پرندے کی روح تھی جو سدا پر پھڑپھڑاتا ہے اور اپنے دیس میں اپنے پیاروں میں واپس پہنچنا چاہتا ہے۔ مجھے سلطانہ کی حالت پر ترس تو آتا تھا اور میں اسے خطروں سے باہر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس سے یا اس کے بچے سے میری کوئی دلی وابستگی نہیں تھی۔ میری وابستگی تو میری زمین سے تھی۔ میرے گلی کوچوں سے۔ انہی گلی کوچوں میں میرا پیار بھی تھا اور میری نفرت بھی۔ ہاں..... میری نفرت بھی۔ انہی گلیوں کوچوں میں وہ بدذات شخص موجود تھا۔

”کس سوچ میں کھو گئے؟“ ہمیش نے اپنے صفاچٹ سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ وہ ابھی تک بھکشوؤں کے سرخی مائل لباس میں تھا۔

”میں نل پانی نہیں جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ ہم ہر مشکل کا مقابلہ اکٹھے کریں گے۔“

”یہ کیا بات کر رہے ہو؟“ انور خاں نے مجھے سرزنش کی۔ ”ہم تمہیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ہم نے تم میاں بیوی کو خطرے سے نکالنے کے لیے تو یہ سب کچھ کیا ہے۔“

”اگر تم میرے لیے خود کو خطرے میں ڈال سکتے ہو تو میرا بھی یہ فرض ہے کہ تمہارے خطروں میں حصے دار بنوں۔“

ہمارے درمیان چند منٹ تک بحث ہوئی۔ بہرحال میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ میری خود اعتمادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اب میں جو بات کرتا ہوں، اس پر مستحکم رہنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ انور خاں نے مجھے کچھ مزید سوچنے کا مشورہ دیا۔

اسحاق نے ماریا کے پاؤں میں زنجیر ڈالی اور اسے سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اس طرح مقید کر دیا کہ وہ کوئی چالاکی، ہوشیاری نہ دکھا سکے۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ انور خاں کا کہنا بھی یہی تھا کہ یہ بہت ہوشیار و شاطر لڑکی ہے۔ اس کی طرف سے بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہو گی۔ ہم تھکے ہوئے تھے لیکن سونا نہیں چاہتے تھے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ جب ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، دہانے کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم چوکس ہو گئے۔ امکان یہی تھا کہ یہ کوئی اپنا بندہ ہی ہو گا۔ یہ خیال درست نکلا۔ یہ چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو تھیلے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا

ان میں خوراک تھی اور ضرورت کی دیگر اشیاء تھیں۔

ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔ فیروز کو دیکھ کر چوہان کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ بولا۔ ''میں راستے میں دعا مانگتا آ رہا تھا کہ میں یہاں پہنچوں تو تم واپس آ چکے ہو۔ میری دعا قبول ہوئی ہے۔ وہاں نل پانی میں تمہاری بہت زیادہ ضرورت ہے لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟''

فیروز بولا۔ ''اس بارے میں بھی آپ کو سب کچھ بتاتے ہیں لیکن نل پانی میں میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟''

ڈاکٹر چوہان نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ دونوں طرف سے بڑے سخت بیان آ رہے ہیں۔ پچھلی بار سلطانہ کو پناہ اس لیے نہیں مل سکی تھی کہ اس پر گارڈ ہارون کی موت کا الزام آ گیا تھا۔ اب یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ ہارون کو خود حکم جی کے بندوں نے ہی قتل کیا تھا اور اس قتل کے اہم ترین گواہ تم ہو۔ تمہاری گواہی حکم جی اور ان کے ساتھیوں کے منہ بند کر کے رکھ دے گی۔''

''میں یہ گواہی ضرور دوں گا۔'' فیروز نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں ابھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

''لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟'' ڈاکٹر چوہان نے ایک بار پھر اپنا پُرتجسس سوال دہرایا۔

فیروز نے مختصر الفاظ میں چوہان کو اپنی مہم جوئی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جارج گورا کس طرح اپنے انجام تک پہنچنے سے بال بال بچا ہے۔

○.....❖.....○

چوہان یہ جان کر ششدر ہوا کہ جارج کی عالی مرتبت بہن ماریا فرگوسن اس وقت یہاں اس سرنگ میں موجود ہے۔ اس کی حیرت میں اندیشوں کی آمیزش بھی تھی۔ وہ سنسنی آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ خبر ابھی کچھ دیر پہلے ہی نل پانی پہنچی ہے کہ زرگاں میں کچھ نامعلوم لوگوں نے جارج گورا کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا ہے۔ اس واقعے میں دو تین بندوں کی ہلاکت کے بارے میں بھی بتایا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ اسے سلطانہ والے واقعے کی کڑی ہی قرار دے رہے ہیں۔ اب تم نے یہ بتا کر حیران کر دیا ہے کہ یہ کارروائی تم لوگوں نے ہی کی ہے۔'' چوہان واقعی ہکا بکا تھا۔

چوہان، ماریا کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اسحاق اور فیروز اسے لے کر ماریا کی طرف گئے۔ میں اور انور خاں بھی ان کے پیچھے گئے۔ ہم اس تاریک گوشے میں پہنچے جہاں اسحاق نے ماریا کو باندھا تھا۔ وہاں ایک شدید حیرت ہماری منتظر تھی۔ ماریا اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ ساڑھی کا وہ کپڑا جس سے ماریا کے ہاتھ باندھے گئے تھے، ایک طرف پڑا تھا۔ وہ زنجیر کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی جو اسحاق نے اس کی ٹانگ سے منسلک کی تھی۔ ''کہاں گئی وہ؟'' اسحاق نے ٹھٹک کر کہا۔

''اوہ خدایا.....'' انور خاں بھی سرسراتی آواز میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا، یہ بڑی تیز طرار عورت ہے۔''

''وہ یہیں کہیں ہوگی۔'' فیروز بولا۔ ''اگر وہ دہانے کی طرف جاتی تو ہماری نظروں میں ضرور آتی۔''

فیروز اور اسحاق بھاگ کر گئے اور اپنی رائفلیں اُٹھا لائے۔ میری رائفل پہلے ہی میرے پاس تھی۔ ہم نے ٹارچیں روشن کیں اور چاروں طرف پھیل گئے۔ اچانک تاریکی میں

سے فائر ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی میں نے فیروز کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر دہانے کی طرف بھاگا۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بڑا ہتھیار نہیں۔ شاید پستول یا ماؤزر ہے۔ وہ پلٹ کر مجھ پر گولی چلا سکتی تھی لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ابھی میں اس سے دس پندرہ قدم دور تھا کہ وہ حسبِ اندیشہ پلٹی۔ اس نے فائر کیا لیکن نشانہ چوک گیا۔ اسی دوران میں وہ کسی شے سے ٹکرا کر گری۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ پوری طرح میرے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ انور خاں اور احمد وغیرہ بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے عقب میں ڈاکٹر چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔

ماریا کو بے بس کر دیا گیا۔ وہ بُری طرح ہانپی ہوئی تھی اور ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ ”یو باسٹرڈ! تم کو پتا نہیں کہ تم کیا کر رہا ہے؟ تم کو بہت بُرا نتیجہ بھگتنا پڑیں گا۔ تم لائف اور ڈیتھ کے درمیان لٹک جائے گا۔“

اسحاق نے اسے چند تھپڑ مارے تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے ایک پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور جب وہ بھاگ رہی تھی تو وہ اس کے ساتھ ہی گھسٹ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے لنگڑا رہی تھی۔

اسحاق اور احمد اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے واپس مرکزی جگہ پر لائے۔ فیروز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں ٹانگ ران سے دبا رکھی تھی۔ گولی ران میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر اسحاق کا غصہ سوا ہو گیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا ماریا پر پل پڑا۔ اس نے اسے نیچے گرا دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہو گیا۔ وہ چلا رہی تھی، اور ”ہیلپ...... ہیلپ“ پکار رہی تھی۔ اسحاق اپنی ہیجانی کیفیت میں شاید اسے بالکل ہی برہنہ کر ڈالتا لیکن میں اور ڈاکٹر چوہان آڑے آئے۔ میں نے اسحاق کو تقریباً گھسیٹ کر ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ چوہان نے اسے جسم ڈھانپنے کے لیے چادر دی۔

میں نے کہا۔ ”اسحاق! اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو پھر ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا؟“

وہ غضبناک لہجے میں بولا۔ ”آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان ہے۔ یہ سفید ناگن کسی

رعایت کی حق دار نہیں ہے۔ اس کا سر یہیں کچل دینا چاہیے۔“

”دیکھو...... تم یہ بھول رہے ہو کہ ہم اس سے کیا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہم اسے زندہ رکھ کر جارج کو کہیں زیادہ تکلیف دے سکتے ہیں۔“

میں نے اسحاق کو بمشکل سنبھالا۔ اس سلسلے میں انور خاں اور احمد نے بھی میری مدد کی۔ ہم اسحاق کو ماریا سے دور لے گئے۔ چوہان، زخمی فیروز کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

اسحاق ذرا ٹھنڈا ہوا تو ہم ماریا کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے اس کے لیے لباس کا انتظام کیا گیا۔ زنانہ لباس ملنا تو یہاں مشکل تھا، مجبوراً مردانہ لباس سے ہی کام چلایا گیا۔ پاجامے کُرتے پر مشتمل یہ لباس اس سامان میں موجود تھا جو چوہان اپنے ساتھ لایا تھا۔ ماریا چونکہ لمبی تڑنگی تھی، یہ لباس اس کے جسم پر پورا آ گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ باندھ دیئے۔

ہاتھ پاؤں تو پہلے بھی باندھے گئے تھے لیکن ماریا نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس کے ہاتھ ساڑھی کے کپڑے سے باندھے گئے تھے۔ ماریا نے موم بتی کے شعلے سے اس کپڑے کو جلایا تھا اور ہاتھ آزاد کر لیے تھے۔ اس کوشش میں اس کی کلائیوں پر چند زخم بھی آئے تھے۔ بعدازاں اس نے پاؤں کی زنجیر ایک طرف سے کھول لی تھی۔ دراصل اس زنجیر کو لاک کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اسے رسّی کی طرح دو گرہیں دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ گرہیں ماریا نے کھول لیں۔ چھوٹے سائز کا پستول حیرت انگیز طور پر ماریا کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ لیڈی پستول اس کے لباس میں ہی چھپا ہوا تھا۔ جب ہم نے ماریا کو پکڑا تھا تو اس خیال سے اس کی تلاشی نہیں لی تھی کہ وہ منگنی میں ایک تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہاں اسلحے کا کیا کام تھا۔ ویسے بھی اس کے عورت ہونے کی وجہ سے ہم نے جامہ تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اب پتا چل رہا تھا کہ یہ غلطی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ اسحاق نے راستے میں ماریا سے کسی طرح کی رعایت نہیں کی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھے رکھے تھے، ورنہ کئی موقعے ایسے آئے تھے جب وہ بآسانی ہمیں اپنے اس ننھے منے لیکن طاقتور پسٹل سے شوٹ کر سکتی تھی۔

اب ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ یہ لڑکی ہماری توقع سے زیادہ خطرناک ہے۔ احمد نے زنجیر کے لیے ایک چھوٹے سے تالے کا انتظام کر لیا۔ اس کے علاوہ طے ہوا کہ ہم اس لڑکی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں گے۔

چوہان نے بڑی مہارت سے ایک تیز دھار خنجر سے نشتر کا کام لیا۔ فیروز نے بھی بہت

برداشت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی ران میں سے پسٹل کی گولی نکال لی گئی۔ کچھ ایلو پیتھک دوائیں چوہان کے چھوٹے سے بیگ میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کی مدد سے فیروز کی مرہم پٹی کر دی گئی۔

احمد نے کہا۔ ”فیروز بھائی! آپ کے بچنے سے دہری مسرت ہو رہی ہے۔ آپ بچ گئے اور آپ کی قیمتی گواہی بھی بچ گئی۔“

”اسی لیے کہتا ہوں کہ اس گواہی سے جتنی جلدی فائدہ اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو۔ اگر کوئی انتظام ہو جاوے تو میں ابھی چھوٹے سرکار کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔“

”خیر...... اب ایسی جلدی بھی نہیں۔ رات ہو لینے دو۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل چلیں گے۔“ چوہان نے کہا۔

”اور اگر اندھیرا ہونے سے پہلے میرے ساتھ کچھ اور ہو گیا تو؟“ فیروز نے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ چوہان نے اثبات میں سر ہلا کر فیروز کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”تمہیں اپنی جان کی نہیں اپنی گواہی کی فکر ہے۔ گھبراؤ مت۔ تمہاری جان اور گواہی دونوں اب سلامت رہیں گی۔“

”میں موہن کمار کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہت ہوں۔ ہارون کے قتل میں سب سے بڑا مجرم وہی بدذات ہے۔ اس نے بے رحمی کی انتہا کی ہے۔ ہارون، حکم جی کا وفادار تھا۔ ان کے لیے درجنوں بار اپنا جیون خطرے میں ڈال چکا تھا۔ اس کی قربانیوں کا موہن کمار کی طرف سے یہ صلہ ملا۔ جب وہ زخمی تھا، مرہم اور دوا کے لیے ترس رہا تھا اور اس کھوہ میں اپنے کسی ساتھی کا انتظار کر رہا تھا، موہن کمار نے اپنا رستہ سیدھا کرنے کے لیے اسے بے دردی سے قتل کر دیا اور یہ قاتل موہن کمار اب بھی حکم جی کی ناک کا بال ہے۔ اگر ہارون کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکت ہے تو حکم جی کے کسی وفادار کا جیون محفوظ ناہیں ہے......“ فیروز بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اسے اپنی گواہی کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور وہ جلد از جلد یہ گواہی چھوٹے سرکار کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ میرا اپنا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ اہم گواہی چھوٹے سرکار تک پہنچ گئی تو وہ ضرور اسے متاثر کرے گی۔ وہ ایک انصاف پسند شخص تھا اور یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عدالت میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کا بے لاگ رویہ مجھے یاد تھا۔

سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اسحاق اور انور خاں میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے ان کی آواز قدرے بلند بھی ہو جاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس بحث میں

میرا نام بھی بار بار آ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد فیروز اور چوہان بھی اس بحث میں شریک ہو گئے۔ اس خیال سے کہ الفاظ مجھ تک نہ پہنچیں، ان چاروں نے اپنی آوازوں کو دبا رکھا تھا۔ صرف اسحاق ہی تھا جو کسی وقت بھڑک کر بولتا تھا اور اس کے الفاظ مجھے سنائی دے جاتے تھے۔ اس نے فیروز کی کسی بات کے جواب میں تیز لہجے میں کہا تھا۔ ”ہم کو چاہیے کہ سچ کو سچ مان لیں اور اس کے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ اس وجہ سے ہم سب خطرے میں ہیں۔“

جواب میں چوہان نے کچھ کہا۔ اسحاق کی بھڑکیلی آواز پھر سنائی دی۔ ”آپ پڑھے لکھے لوگن ہو۔ ظاہر ہے آپ نے پڑھے لکھوں والی بات ہی کرنی ہے مگر جو کچھ سامنے نظر آ رہا ہے اس کو ہم کیسے جھٹلا دیں گے اور اگر جھٹلا دیں گے تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلاویں گے۔“

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی، اسی دوران میں عجیب الخلقت شخص اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر میں باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سرنگ کی ناہموار دیوار سے ٹیک لگا لی اور سوئی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب سی لاتعلقی اور ناراضی تھی۔ اس کے بازو پر انمٹ روشنائی سے لکھا ہوا نام ہمارے لیے اب بھی ناقابلِ فہم تھا۔ یہ باریدے یا بارودے پڑھا جاتا تھا۔ اس کے آگے انگریزی کا حرف جی یا پھر جے لکھا ہوا تھا۔

وہ انگریزی میں بولا۔ ”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے میرے گھر سے کیوں نکالا ہے؟ مجھے واپس لے جاؤ۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے واپس لے جاؤ۔“

چوہان بولا۔ ”ہم تمہیں کسی گھر سے نہیں لائے۔ کشتی میں سے لائے ہیں۔ تم اس بدبودار کشتی کو اپنا گھر کہہ رہے ہو؟“

”ہاں...... وہی میرا گھر ہے۔ مجھے وہاں لے جاؤ۔“ وہ کراہا پھر بُری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے بولا۔ ”میرا گلا بالکل خشک ہو گیا ہے۔ مجھے تھوڑی سی شراب دو۔“ اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔

چوہان نے احمد کو اشارہ کیا۔ وہ ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ عجیب الخلقت شخص نے ایک گھونٹ بھرا پھر کلی کر دی اور گلاس ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا بدبودار چیز لے آئے ہو۔ مجھے شراب دو۔ میری سانس رُک رہی ہے۔ جلدی کرو۔“

مجھے یاد آیا کہ کشتی میں جہاں ہم نے اس شخص کو پایا تھا، وہیں پر ’رم‘ کی بہت سی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ شخص شراب خانہ خراب کا زبردست رسیا ہے۔ نشہ ٹوٹنے کے

سبب اب اس کی بُری حالت ہو رہی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں شراب موجود نہیں تھی۔ یہاں پناہ لینے والے تقریباً سب ہی مسلمان تھے اور اس لت سے دور تھے۔ چند منٹ کے اندر ہی اس شخص کی بُری حالت ہوگئی۔ اس کا مدقوق جسم لرزنے لگا اور سانس جیسے اس کی ہڈیوں بھرے سینے میں اُلجھنے لگی۔ وہ بار بار بس ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ''میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔''

چوہان کے متعدد بار پوچھنے کے بعد اس نے فقط اتنا بتایا کہ اس کا نام بارونda ہے اور وہ طویل عرصے سے اس مچھلیاں پکڑنے والی کشتی کے اندر رہ رہا ہے۔ اس رہائش کے لیے اور شراب، خوراک وغیرہ کے لیے اس نے ادھیڑ عمر ملاح سیوک رام کو معقول معاوضہ دیا ہوا ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس حرامی سیوک نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھے کشتی سے نکالنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا ہے۔ تم سارے کرائے کے ٹٹو ہو۔ تم نے اس حرامی سیوک سے پیسے لیے ہیں۔''

اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بول رہا تھا اور بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کوشش اس کی بندھی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے ناکام ہو جاتی تھی۔

وہ اپنی ''گھر بدری'' کے لیے ملاح سیوک رام کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ سیوک رام تو خود گن پوائنٹ پر رہا ہے اور اسے اپنی تین کشتیوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ انور خاں ابھی تک اس بارونda نامی شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ انور خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چوہان کے توسط سے بارونda سے چند سوال پوچھے تاہم ان سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوا۔ انور خاں نے فیروز سے مخاطب ہو کر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے میں نے اس بندے کو زرگاں میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید راج بھون میں ہی دیکھا ہے۔ کوئی خاص موقع تھا شاید۔ ہو سکتا ہے کہ ساتویں کے جشن کا ہی ہلا گلا ہو۔''

بارونda نامی اس شخص کا شور شرابا جب زیادہ بڑھ گیا تو ڈاکٹر چوہان نے سلطانہ کی طرح اسے بھی معقول مقدار میں افیون کھلا دی اور لمبا لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ بارونda کو زبردستی افیون کی خوراک دینے کے لیے ڈاکٹر چوہان، اسحاق اور انور خاں کو کافی زور آزمائی کرنا پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شخص ننگی زمین پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ زور آزمائی کی وجہ سے اس کا لنگوٹ عریانی کی حد تک کھسک گیا تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے یہ لنگوٹ پوری طرح کھول کر دوبارہ سے اس کے مدقوق جسم پر باندھ دیا۔

بارونda والا یہ ہنگامہ ختم ہوا تو توجہ پھر اس بحث و مباحثے کی طرف چلی گئی جو کچھ دیر پہلے انور خاں اور اسحاق کی گفتگو سے شروع ہوئی تھی۔ چوہان کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ہم سرنگ کی اسی حجرہ نما جگہ پر جا بیٹھے جہاں تین دن پہلے فیروز اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جارج گورا کو جان سے مار دینے کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ کسی بھی طرح کی اہم گفتگو کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ یہاں چھوٹی سی لالٹین روشن تھی اور زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر میل کی ہلکی سی تہہ تھی۔

ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے چوہان سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میرے بارے میں کوئی خاص بات چیت ہوئی ہے۔''

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

''شاید اسحاق نے مجھ پر کچھ اعتراضات کیے ہیں۔''

چوہان نے میری سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بات بتاؤ مہروز! میرا مطلب ہے تابش! اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ جو حکم جی کے لوگ سائے کی طرح تمہارے پیچھے رہتے ہیں اور تم کسی بھی جگہ ان سے محفوظ نہیں ہو۔ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟''

کچھ دیر پہلے ہونے والی بحث کے موضوع کے بارے میں میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر چوہان! کیا میں یہ سمجھوں کہ اب تمہارے ذہن میں بھی جادو ٹونے والی باتیں آنا شروع ہوگئی ہیں؟''

''نہیں تابش! میں چاہوں بھی تو انداز سے نہیں سوچ سکتا لیکن...... کچھ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں اور اپنی جگہ شاید وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے اس کی وجہ سے اچھے بھلے بندے کا ذہن چکرا سکتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ذہنوں نے ایسی باتوں کو پہلے سے قبول کر رکھا ہو، وہ تو اور زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اب اس اسحاق ہی کو لو۔ یہ بندہ پہلے سے تعویذ گنڈے اور عملیات وغیرہ پر وشواس کھتا ہے۔ اب جب یہ تمہارے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل میں عجیب سے اندیشے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم یہاں اس سرنگ میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے کسی بھی وقت تمہارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ آپ سب لوگوں نے مجھے زبردستی روکا تھا۔''

"ہم اب بھی تمہیں زبردستی روکیں گے۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا لیکن بات یہ ہے تابش کہ ہمیں حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہیے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

چوہان خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن جیسے کسی دور دراز کے سفر پر روانہ تھا۔ چھوٹی لالٹین کی مدھم روشنی اس حجرہ نما جگہ کو نیم روشن کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر فیروز اور احمد وغیرہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کی آواز اس شاخ در شاخ سرنگ میں ہولے ہولے گونجتی تھی۔ اس سرنگ سے باہر دھیرے دھیرے شام اُتر رہی تھی اور شام کی سیاہی میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ سرنگ کو بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

چوہان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "کیا تم دو منٹ کے لیے اپنی قمیص اُتارو گے؟"

"کیا دیکھنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ تم قمیص تو اُتارو۔" چوہان لالٹین کو میرے بالکل پاس لاتے ہوئے بولا۔

میں نے قمیص اُتار دی۔ وہ اپنا چہرہ میرے سینے کے بالکل نزدیک لے آیا اور بہت غور سے کچھ دیکھنے لگا۔ وہ میری جلد پر ہاتھ پھیر رہا تھا، بڑے دھیان سے وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے پنڈلیوں پر سے میرے پاجامے کو اونچا کیا اور گھٹنوں سے اوپر تک معائنہ شروع کر دیا۔

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔" آخر میں نے زچ ہو کر کہا۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ "تابش! مجھے کئی دنوں سے ایک شک ہے۔ حکم جی اور جارج جیسے لوگوں سے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے جسم کے اندر کچھ چھپا دیا ہو۔ جس کی وجہ سے انہیں ہر جگہ تمہاری موجودگی کا پتا چل جاتا ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں پتا ہی ہو گا، جدید ٹیکنالوجی آج کل کیا کیا کرشمے دکھا رہی ہے۔ جنگلی اور سمندری حیات پر ریسرچ کرنے والے لوگ جانوروں کے جسم میں چھوٹی چھوٹی چپس رکھ دیتے ہیں۔ یہ چپس طاقتور سگنلز دیتی ہیں اور ان سگنلز کے ذریعے جانورں کو گھنے جنگل اور گہرے سمندر میں بھی دوبارہ کھوج لیا جاتا ہے۔"

میرے پورے جسم میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔ چوہان نے ایک انوکھا نکتہ بیان

کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے سوچا۔ تو کیا واقعی میں اپنے جسم میں کوئی "Chip" لیے پھرتا ہوں جو حکم جی کے اہلکاروں کو میری لوکیشن کی خبر دیتی رہتی ہیں؟

چوہان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ چپ چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے جانور کے جسم میں رکھی جاتی ہے یا پھر اسے ایک ایسا کالر پہنا دیا جاتا ہے جس میں چپ موجود ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ حکم جی اور جارج وغیرہ یہ طریقہ ان قیدیوں پر استعمال کرتے ہوں جنہیں وہ ہر صورت اس اسٹیٹ کی حدود میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے سنا ہے کہ ماریا کا شوہر سرجن ہے اور جارج کا گہرا دوست بھی ہے۔" اپنے لہجے میں حیرت کی لہر خود مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں...... میرا اپنا ذہن بھی اس رُخ پر سوچ رہا ہے۔" چوہان نے فوراً کہا۔ "یہ بات عین ممکن ہے کہ قیدیوں کے اندر چپ رکھی جاتی ہو اور یہ کام ماریا کا شوہر اسٹیل انجام دیتا ہو۔ میں نے اس سے پہلے بھی اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ یہاں اسٹیٹ میں بڑی رازداری سے مختلف کاموں کے لیے جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کام جارج اور اس کے دو چار ساتھیوں کے ذمے ہے لیکن مقامی لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے اور ان کی توہم پرستی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ایسے کاموں کا سہرا حکم جی کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔ مقامی لوگ چونکہ حکم جی کو روحانی پیشوا بھی مانتے ہیں اس لیے انہیں فوراً وشواس ہو جاتا ہے کہ فلاں کام حکم جی نے اپنی اندرونی شکتی کی مدد سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قیدیوں والا معاملہ ہی دیکھ لو۔ یہاں کے سادہ لوح لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان قیدیوں کو جادو کے ذریعے "کیل" دیا گیا ہے اور وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے۔"

میں نے پہلی بار اپنے جسم کو تحقیقی نظروں سے دیکھا۔ اگر واقعی میرے اندر کوئی "چپ" وغیرہ رکھی گئی تھی تو پھر اس کا کوئی نشان ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ چپ گہرائی میں نہیں تھی، بالائی جلد کے نیچے تھی تو پھر ٹٹولنے سے اسے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں چکر میں پڑ گیا۔

چوہان بولا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ وہاں موڑ پر کھڑا ہو کر میں یہ دھیان رکھوں گا کہ کوئی اس طرف نہ آنے پائے۔ تم اپنے سارے کپڑے اُتار لو اور بڑے دھیان سے دیکھو کہ کہیں کوئی کٹ وغیرہ کا نشان تو نہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوہان اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے خود کو بے لباس کیا اور جہاں جہاں تک میری نگاہ جاتی تھی، خوب اچھی طرح اپنی جلد کا جائزہ لیا۔ جسم کو ٹٹول کر اور دبا

کر بھی کسی چیز کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جسم پر جو چند یک زخم مندمل ہو چکے تھے۔ ان کے نیچے بھی کچھ چھپایا جا سکتا تھا لیکن ایسا ہوتا تو پھر ٹٹولنے ور دبانے سے کچھ نہ کچھ محسوس ہونا لازمی تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد چوہان واپس آ گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کٹ کا نشان تو کہیں نہیں۔ نہ ہی کہیں کوئی اسٹیچنگ وغیرہ ہے۔''

میں نے پاجامہ پہن لیا تھا لیکن بالائی جسم ابھی تک عریاں تھا۔ وہ باریک بینی سے ایک ار پھر میری کمر اور کندھوں وغیرہ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ اگر چوہان کی تھیوری درست ہے اور میرے جسم میں واقعی کوئی چیز رکھی گئی ہے تو پھر جسم پر سرجری کا نشان ونا چاہیے تھا۔ دو ڈھائی سال میں تو اس طرح کا نشان معدوم نہیں ہو سکتا۔

شام سے ذرا پہلے جب میں چٹائی پر لیٹا تھا اور اسی معاملے پر غور کر رہا تھا، اچانک یرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جسم میں ایک جگہ ایسی بھی ہوتی ہے جہاں سرجری کے ثان چھپ سکتے ہیں۔ اگر سر میں کسی جگہ کٹ لگایا جائے یا اسٹیچنگ کی جائے تو بعد ازاں بال سے مکمل طور پر ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے سر کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

''کیا بات ہے، سر درد کر رہا ہے؟'' میرے قریب لیٹے چوہان نے پوچھا۔

''نہیں...... میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیئے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی اَن سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک ٹارچ لے آیا تھا۔ حجرہ نما جگہ پر پہنچ کر میں نے ٹارچ چوہان کے ہاتھ میں تھمائی اور اس سے کہا کہ وہ میرے سر کا معائنہ کرے۔

چوہان نے ٹارچ کی تیز روشنی میں میرے سر کو دیکھنا شروع کیا۔ جب وہ گدی کی طرف آیا تو اس کی انگلیاں ایک دم ٹھٹک گئیں۔ گدی پر نیچے کی طرف جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، اسے کچھ نظر آیا تھا۔ ''اوہ گاڈ'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''یہاں کچھ ہے۔ ایک دو تین...... ہاں تین ٹانکے ہیں۔''

اس نے سر کے پیچھے اس نرم جگہ کو چند بار زور سے دبایا اور پھر لرزتے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے تابش! ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہاں گوشت کے نیچے کچھ ہے۔ کیا تمہیں محسوس ہو رہا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گدی کے پُر گوشت حصے پر رکھا اور میری انگلیوں کی پوروں کو کچھ محسوس کرانے کی کوشش کی۔ میں فوری طور پر تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ یہاں کچھ ہے۔

ٹارچ کی روشنی میں چار پانچ منٹ کے بغور معائنے کے بعد چوہان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہمارا اندازہ درست نکلا ہے تابش! یہاں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہ چیز تھوڑی سی گہرائی میں پلانٹ کی گئی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے آسانی سے نکالا نہ جا سکے۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اندیشے جھلک دکھانے لگے۔ اس جھلک نے مجھے بھی متاثر کیا۔ واقعی اگر کوئی شے یہاں موجود تھی اور ہم اسے آسانی سے نکال بھی نہیں سکتے تھے تو پھر مسئلہ گمبھیر تھا۔

''اب کیا ہو گا؟'' میں نے کہا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' چوہان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ''اگر یہ چیز یہاں تمہارے جسم کے اندر موجود ہے تو پھر ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے اہلکار اس چپ کے سگنل پکڑ کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا، میں نے کہا۔ ''ایک بات غور کرنے کی ہے ڈاکٹر چوہان! میں اس سرنگ میں کئی راتیں گزار چکا ہوں اور اب تک کا یہ سارا وقت بخیریت ہی گزرا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمین دوز سرنگ میں میرا پتا چلانا مشکل ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر میرے جسم میں واقعی کوئی چپ موجود ہے تو پھر زیر زمین اس کے سگنل کمزور بھی تو پڑ سکتے ہیں یا ویسے ہی ختم ہو سکتے ہیں۔''

چوہان کی آنکھیں چمک اُٹھیں، وہ بولا۔ ''تم نے پتے کی بات کی ہے۔ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، زمین کی سطح سے کم از کم سو فٹ نیچے ہے اور شاید...... یہی وجہ ہے کہ یہاں تمہارا کھوج نہیں لگایا جا سکا۔''

اس نے ایک بار پھر ٹارچ پکڑی اور مزید توجہ کے ساتھ میری گردن کے پچھلے حصے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تین چار منٹ کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ننانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ہم معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تمہارے اندر کوئی سگنل دینے والا ڈیوائس رکھا گیا ہے اور یہ ایک چپ ہی ہے۔''

''کیا ہم کسی طرح اسے نکال سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا یہ سوال غور طلب ہے۔ چھوٹا موٹا آپریشن تو میں خود کر سکتا ہوں لیکن اگر یہ چیز زیادہ گہرائی میں ہے اور ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی ہے تو پھر مشکلات ہو سکتی ہیں۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تم ابھی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... اتنی جلدی نہیں اور نہ ہی اتنی جلد کی ہمیں کوئی ضرورت ہے۔ یہ بات تو تقریباً کنفرم ہے کہ اس سرنگ میں تم محفوظ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم جی کے گارڈز بہت پہلے یہاں ہلا بول چکے ہوتے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فیروز بھی لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ اس نے کہا۔ ''اسحاق اب احمد اور انور بھائی کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تابش کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے اگر تابش کو چھوٹے سرکار نے نل پانی میں پناہ دے دی ہے تو پھر اسے فوراً وہاں چلے جانا چاہیے۔''

چوہان نے کہا۔ ''یہاں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں فیروز! اور یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس سرنگ میں ہم تابش کے ساتھ بھی بالکل محفوظ ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہت ہیں؟'' فیروز نے پوچھا۔

جواب میں چوہان نے فیروز کو سب کچھ بتا دیا۔ میرے جسم کے اندر کسی چپ کے بارے میں جان کر فیروز ششدر رہ گیا۔ پہلے تو اسے اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب ساری تفصیل اس کے سامنے آئی تو وہ ہماری باتوں کو اہمیت دینے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ باقی قیدی بھی جن کے بارے میں کہا جاوت ہے کہ وہ حکم جی کے سحر کے اثر میں ہیں، دراصل اسی طرح سے جکڑے گئے ہیں۔''

''اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''ان قیدیوں میں سے کوئی اگر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو سگنل پکڑنے والے آلے کے ذریعے اس کا پیچھا کیا جاتا

ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہو، دھر لیا جاتا ہے۔ تابش کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ یہ جب بھی زرگاں کی حدوں سے نکلا ہے، فوراً اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور یہ جہاں کہیں بھی گیا ہے اس کو گھیر لیا گیا ہے۔''

''ایک بات اور بھی سمجھ میں آ رہی ہے۔'' فیروز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''کسی بھاگنے والے کو جب بھی پکڑا جاوت تھا، پکڑنے والے تیواری لال اور ڈیوڈ ہی ہووت تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کی خاص طور پر تربیت دی گئی ہو۔ ڈیوڈ تو جارج گورا کا قریبی ساتھی ہے اور بہت ہنرمند بھی سمجھا جاوت ہے۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔'' چوہان نے تائید کی۔ ''عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کے پاس سگنل ریسیو کرنے والا ڈیوائس اور انٹینا وغیرہ ہوتا ہو۔ اس کی مدد سے وہ کسی بھی جگہ پر اپنے شکار کو ڈھونڈ لیتے ہوں۔''

''لیکن کیا دوسرے لوگن ان باتوں پر وشواس کر لیویں گے؟ جیسے یہ اسحاق ہے۔ اس کو پورا پورا یقین ہے کہ حکم جی جادو ٹونے اور عملیات کا ماہر ہے۔ وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو عام لوگن ناہیں کر سکتے۔ اس کے دل میں عجیب طرح کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے ناہیں لگتا کہ ہم آسانی سے اس خوف کو نکال سکیں گے۔''

''سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود کو منوا لیتا ہے۔ اگر ہم کوشش کریں گے اور حکم جی کی سازشوں کے مناسب ثبوت دیں گے تو لوگ بھی حقیقت کو تسلیم کرنا شروع کر دیں گے۔'' چوہان نے وثوق سے کہا۔

ابھی ہماری گفتگو تھی کہ سرنگ کے دہانے کی طرف کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو گئیں۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دہانے کی طرف لپکے۔ خطرے کا احساس میرے دل کو طوفانی رفتار سے دھڑکایا کرتا تھا لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ آج کل اس طوفانی دھڑکن کے بجائے سنسنی کی ایک لہر سی سراپا میں دوڑتی تھی اور دل میں مرنے یا مار دینے کی اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ہاں...... موسم بدل چکے تھے۔ حبس اور گھٹن کی ایک طویل رُت نے بالآخر دل و دماغ کو ایک آشوب سے آشنا کر دیا تھا۔

ہم قریباً دوڑتے ہوئے دہانے پر پہنچے۔ یہاں چند بکریاں نظر آئیں۔ وہ جیسے زبردستی اس قدرتی سرنگ میں گھس آئی تھیں۔ سانولے رنگ کا ایک ادھیڑ عمر چرواہا انہیں واپس لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ بکریوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں کی آواز پوری سرنگ میں گونج رہی تھی۔

چرواہے کو دیکھ کر چوہان ٹھٹک گیا اور بولا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق سے یہاں نہیں آیا۔ یہ کوئی چکر ہے۔''

احمد دہانے کی نگرانی پر موجود تھا۔ وہ چرواہے سے اُلجھ رہا تھا۔ چوہان تیزی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ادھیڑ عمر چرواہے نے چوہان کو دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ بھی اسے پہچانتا ہے لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ چوہان اور چرواہے میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ دونوں ایک گوشے میں چلے گئے۔ کم عمر لڑکا بکریوں کو سمیٹ کر دہانے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ چرواہے کا بیٹا ہے۔ دونوں کا لباس دھوتی، کُرتے اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ چوہان اور چرواہے کے درمیان پانچ دس منٹ بات ہوئی پھر چوہان، چرواہے کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ چرواہے نے اپنے کندھے سے ایک گٹھڑی سی لٹکا رکھی تھی۔

چوہان نے سنسنی آمیز لہجے میں چرواہے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام نریندر سنگھ ہے۔ یہ دراصل چھوٹے سرکار کے مصاحب خاص مراد شاہ صاحب کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر آیا ہے۔'' پھر چوہان نے اس چرواہے نریندر سنگھ سے کہا کہ وہ اپنی زبان سے سب کچھ بتائے۔

نریندر سنگھ کا رنگ سانولا تھا۔ اس نے سرمہ لگا رکھا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایسی مقامی زبان میں بولنا شروع کیا جس کے بہت کم الفاظ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہرحال فیروز، اسحاق اور انور خاں وغیرہ اس کی بات خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں انہوں نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''مراد شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہم جارج کی بہن ماریا کو اُٹھا کر یہاں سرنگ میں لے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارا یہ فعل کافی سخت ہے اور ہم اس کی مذمت کرنے پر مجبور ہیں لیکن وقت اور موقع محل کے لحاظ سے یہ فعل ٹھیک بھی ہے کیونکہ ماریا کی وجہ سے کسی حد تک جارج وغیرہ کو لگام ڈالی جا سکتی ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ ہم ماریا کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے ذریعے جارج وغیرہ سے کچھ باتیں منوانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہماری یہ کارروائی اس طرح ہونی چاہیے کہ یہ ہمارا اپنا ہی کام نظر آوے اور اس کا الزام نل پانی والوں پر بالکل دھرا نہ جا سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس کام میں بے آسرا ہوویں گے۔ ہمیں اندر خانے چھوٹے سرکار کی حمایت و ہمدردی حاصل رہے گی اور جس طرح ہو سکا، وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔''

یہ بڑی غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرطور اس سے چھوٹے سرکار کی فہم وفراست بھی سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے کھلم کھلا ٹکر لیے بغیر اس کی ناانصافی و من مانی کا زور توڑنا چاہ رہا تھا۔

چوہان نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹے سرکار حکم جی کی چالبازیوں کا مقابلہ حکمتِ عملی سے کرنا چاہ رہے ہیں اور اب بھی ان کی خواہش ہے کہ کھلم کھلا تصادم سے بچا جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی وقت انہیں ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ صرف دکھاوے کے لیے ہوگا اور ہمیں اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' احمد نے پوچھا۔ ''کیا چھوٹے سرکار بھی ماریا کو چھڑوانے کے لیے ہم پر کسی طرح کا دباؤ ڈالیں گے؟''

''ہاں...... کوئی اس قسم کی صورتِ حال ہو بھی سکتی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

چرواہے نریندر نے رازداری کے انداز میں دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے کندھے سے لٹکی ہوئی گٹھڑی ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس نے گٹھڑی کی گرہ کھولی۔ گٹھڑی کے اوپر جامن کے پتے، چوکر اور گڑ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں۔ ان پوٹلیوں کے نیچے دو تین بڑی خاص چیزیں تھیں۔ ایک فوجی طرز کی طاقتور دوربین تھی۔ ایک اسنائپر گن تھی جس کو کھول کر تین چار ٹکروں میں رکھا گیا تھا۔ اس پر بھی چھوٹی نیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ کچھ ایلو پیتھک اور دیسی دوائیں بھی بکس میں موجود تھیں۔

نریندر سنگھ نے مقامی زبان میں چوہان سے کچھ کہا۔ چوہان نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''نریندر بتا رہا ہے کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ہم اب ماریا کے اغوا کو راز میں نہ رکھیں اور اس کی ذمے داری قبول کر لیں۔''

''اس کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وجہ وہی ہے جو ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی۔ زرگاں میں حکم جی نے سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس وقت جارج کی جیل میں ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زرگاں کے مختلف علاقوں سے پچاس ساٹھ لوگ پکڑے گئے ہیں۔ ان پر جارج کے گھر کے سامنے مظاہرہ کرنے، گولی چلانے اور توڑ پھوڑ مچانے کا الزام ہے۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ ان میں انور خاں کے تین چار رشتے دار بھی شامل ہیں۔ اگر ہم ان سب لوگوں کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ ہم اعلان کر دیں

کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کی زندگی تب ہی محفوظ رہ سکتی ہے جب حراست میں لیے گئے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں حکم جی تک یہ پیغام پہنچانا ہوگا کہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور اس کا کوئی ثبوت بھی دینا ہوگا؟'' احمد نے کہا۔

''بالکل......اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔'' انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''پیغام کس طرح پہنچایا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے لیے کوئی بندہ ڈھونڈنا ہوگا جو پیغام رسانی کر سکے اور اس کی جان کو بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔'' انور خاں نے کہا۔

''کیا ہم اپنے اس ٹھکانے کو اب بھی خفیہ رکھیں گے؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''ہمیں ایسا کرنا تو چاہیے لیکن میرے خیال میں اب ہم کر نہیں سکیں گے۔'' چوہان بولا۔ ''جب پیغام رسانی شروع ہو گی تو پھر اس ٹھکانے کو چھپایا نہیں جا سکے گا۔ ویسے بھی چھوٹے سرکار اور مراد صاحب کی طرف سے اطلاع ہے کہ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے آس پاس پہنچ چکے ہیں اور چپے چپے پر ہماری تلاش ہو رہی ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت سرنگ کا کھوج لگا سکتے ہیں۔''

نریندر سنگھ اب جلدی جانے کی فکر میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بارشی جھیل ڈوبل کے کنارے پر رہتا ہے اور اسی علاقے میں بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے جیسے جیسے موقع ملے گا، وہ چھوٹے سرکار کا پیغام ان تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

وہ کافی تناؤ بھری اور پُر جوش رات تھی۔ ماریا کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسا ترُپ کا پتا آیا تھا جس سے ہم حکم جی جیسے شخص کے پسینے چھڑا سکتے تھے۔ چھوٹے سرکار اور مراد صاحب نے برملا ہمیں یقین دلایا تھا کہ زرگاں والے ماریا کی جان کا خطرہ کسی بھی صورت مول نہیں لیں گے۔ اب اسحاق کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ماریا کو مار ڈالتا تو یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ آدھی شب کے وقت لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ہم ساتوں کے درمیان پھر طویل گفتگو ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ حکم جی تک یہ پیغام کس طرح پہنچایا جائے کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کے بدلے میں ہمارے مطالبے یہ ہیں۔ احمد نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حکم جی اور جارج مجھے کوئی نقصان ناہیں پہنچائیں گے۔

میرے پیچھے میری برادری کا ہاتھ ہے اور سب جانتے ہیں کہ حکم جی کے سپاہیوں میں میری برادری کے لوگ کن خاص عہدوں پر ہیں۔''

''لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس پیغام رسانی کے لیے کوئی غیر جانبدار بندہ استعمال کیا جائے اور تم غیر جانبدار نہیں ہو۔'' چوہان نے کہا۔

''اس جنگل میں آپ کو ایسا غیر جانبدار کون ملے گا جو اچھی طرح سے ہمارا پیغام بھی پہنچا سکے؟''

اس سے پہلے کہ احمد اور چوہان میں تکرار شروع ہو جاتی، انور خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''پیغامبر چننے سے زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ پہلے ہم اپنا مورچا مضبوط کر لیں۔ ہمارے پاس اتنا انتظام ہونا چاہیے کہ ہم اس لڑکی کے ساتھ آٹھ دس یا پندرہ بیس روز بھی اس سرنگ میں گزار سکیں۔''

''ہمارے پاس پانی اور خشک لکڑیوں کی کمی ہے۔ باقی چیزیں تو گزارے مافق موجود ہیں۔'' چوہان نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ پانی اور لکڑی کا انتظام کیا جائے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہم دہانے کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اس جگہ کو ایک اچھے مورچے کی شکل دے دیں۔'' انور خاں نے کہا۔

کسی کو انور خاں کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔ اگلے دو تین گھنٹے اسی انتظام و انصرام میں گزارے گئے۔ کچھ برتنوں اور چند بڑے شاپرز میں کچھ پانی جمع کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرنگ کے دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے چند بڑے بڑے تنے رکھ کر ایک محفوظ آڑ بنائی گئی۔ اس آڑ میں کم از کم تین رائفل بردار پوزیشن لے سکتے تھے۔ یہاں سے نشیب میں بھی کافی آگے تک نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس سے پیچھے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور مورچا بنایا گیا۔ ہنگامی حالت میں اسے دوسری دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ دوربین کے بہتر استعمال کے لیے دہانے سے باہر ایک آڑ تلاش کر لی گئی۔ اس مورچا بندی میں انور خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اس کا تجربہ کافی وسیع لگتا تھا۔

رات آخری پہر ہم نے کچھ دیر کے لیے آرام کیا۔ ہم اپنے ساز و سامان سمیت اب دہانے کے قریب ہی قیام پذیر ہو گئے تھے۔ میں چوہان اور اسحاق سرنگ کی گہرائی میں تھے۔ میرے گہرائی میں رہنے کی وجہ وہی چپ والا معاملہ تھا۔ میری آنکھ ایک شور کی وجہ سے کھلی۔ یہ شور دہانے کی طرف سے سنائی دے رہا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں اور گھڑ سواروں کی بلند

آوازیں تھیں۔لگتا تھا کہ وہ دہانے سے باہر چاروں طرف چکرا رہے ہیں۔انور خاں دہانے کی طرف سے بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔اس نے آتے ساتھ ہی لالٹین بجھا دی اور ہیجانی لہجے میں بولا۔"یہ حکم جی کے لوگ ہی ہیں۔ میں نے آوازوں سے پہچان لیا ہے۔ان کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہیں ہے۔ یہ سب مسلح ہیں اور ان کے پاس بڑی ٹارچیں ہیں۔ نریندر سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ جنگل کا چپا چپا چھان رہے ہیں۔"

اسحاق بھڑک کر بولا۔"میں نے جو بات کہی تھی وہ آپ لوگن کی سمجھ میں ناہیں آئی تھی۔ اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ یہ لوگن یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"تم نے غلط کہا تھا اسحاق! اور تم اب بھی غلط کہہ رہے ہو۔" چوہان نے پُرزور لہجے میں کہا۔"ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کا تابش سے کوئی تعلق نہیں۔خود کو خوامخواہ واہموں کا شکار نہ کرو۔حکم جی کے کارندوں کی ٹولیاں ہر جگہ بھٹک رہی ہیں اس لیے یہاں بھی پہنچ گئی ہیں۔"

اسحاق نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر منہ بنا کر رہ گیا۔

دس پندرہ منٹ اسی طرح شدید تناؤ میں گزر گئے۔حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے دہانے تک نہیں پہنچ سکے لیکن وہ یہاں سے گئے بھی نہیں۔وہ اس علاقے کے بارے میں اپنی پوری تسلی کر رہے تھے۔آخر گھوڑوں کی بکھری بکھری ٹاپیں اور گھڑ سواروں کی آوازیں ایک جگہ جمع ہوئیں۔آثار سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اب آگے روانہ ہو رہے ہیں۔کچھ ہی دیر بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔گھوڑوں کی ٹاپیں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگیں۔چوہان نے سوالیہ نظروں انداز میں اسحاق کی طرف دیکھا۔جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا ہو۔اب کیا خیال ہے؟ حکم جی کے جادو کا زور ان گھڑ سواروں کو سرنگ کے اندر کیوں نہیں لایا؟

ظاہر ہے کہ اگر چوہان یہ سوال پوچھتا بھی تو اسحاق کے پاس اس کا جواب موجود نہیں تھا۔انور خاں نے تیز لہجے میں کہا۔"اب ہم کو فیصلہ کرنا ہے۔ہم ان کو اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں یا نہیں؟"

سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔یہ نازک فیصلہ تھا۔خود کو عافیت سے نکال کر شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔بلکہ ہم اس حوالے سے پیغامبر بھیجنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔جب تک ہم اپنے پاس ماریا کی موجودگی کا اعلان نہ کرتے حکم جی اور جارج سے کوئی مطالبہ کیسے منوا سکتے تھے؟ انور خاں بولا۔ "لگتا ہے کہ تم سب کے لیے یہ فیصلہ کافی مشکل ثابت ہو رہا ہے۔چلو اگر تم چاہتے ہو تو سب

کی طرف سے میں ہی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی انور خاں نے اپنی رائفل کا رُخ دور دہانے کی طرف کیا اور اوپر تلے تین چار فائر کر دیئے۔رات کے سناٹے میں دھماکوں کی آواز جنگل میں دور تک گونجی۔اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ یہ آواز گھڑ سواروں کے جتھے تک بھی پہنچی ہو گی۔

"چلو.....اب اپنی اپنی پوزیشن سنبھالو۔" انور خاں نے پکار کر کہا۔

ہم سب دہانے کی طرف دوڑے اور اپنی اپنی طے شدہ جگہ پر بیٹھ گئے۔فیروز چونکہ زخمی تھا اس لیے وہ اپنی رائفل کے ساتھ ماریا اور بارونڈا کے قریب موجود رہا۔ماریا کے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی شکار کیے ہوئے پرندے کی طرح کچی زمین پر پڑی تھی۔پچھلے بیالیس گھنٹوں میں وہ اپنی تمام شان و شوکت، نفاست اور نخوت سمیت عرش سے فرش پر آ گری تھی۔اس کے دمکتے چہرے پر کیچڑ سوکھ کر سفیدی مائل ہو چکا تھا اور اس کے نازک پاؤں زخم زخم تھے۔وہ یہ پاؤں ہلاتی بھی تھی تو سسک اُٹھتی تھی۔احمد نے اس کے نیچے چٹائی بچھانا چاہی تھی مگر اسحاق نے سختی سے منع کر دیا تھا۔وہ جارج کی اس خودسر بہن کو تھوڑی سی رعایت یا عزت دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

ہم دہانے پر پہنچے اور رائفلیں سونت کر تیار ہو گئے۔ہمارے اندازے کے عین مطابق گھڑ سوار رُک گئے تھے اور اب واپس آ رہے تھے۔جلد ہی ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کی اپنی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔"کون ہے یہاں.....کون ہے؟" ایک کڑک دار آواز گونجی۔

مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔یہ موہن کمار ہی کی آواز تھی۔وہ لوگ سرنگ کے اردگرد گھوم رہے تھے لیکن ابھی تک دہانہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔انور خاں نے دلیرانہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنی ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی دہانے کی طرف پھینکی۔ اب موہن کمار اور اس کے گھڑ سواروں کے لیے دہانے کا کھوج لگانا مشکل نہیں رہا۔وہ چاروں طرف سے سمٹ کر یوں دہانے کی طرف آئے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا چون آتا ہے۔ان گنت ٹارچیں سرنگ کے دہانے کے گرد چمکنے لگیں۔

موہن کمار گرجا۔"کون ہو تم لوگ؟"

انور خاں نے بڑے اطمینان سے کہا۔"کہنے کو تو ہم تمہارے باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ ہمیں شہنشاہ کہتے ہیں۔"

تاریکی میں سے موہن کمار کی آواز اُبھری۔"اگر میں غلطی ناہیں کر رہا تو تم انور خاں

ہو۔ میں یہاں اس کھوہ میں تمہاری آواز سن کر حیران ہوں۔''

''ابھی تمہیں اور حیران ہونا ہے موہن کمار! اتنی حیرت داخل ہونے والی ہے تمہارے دماغ کے اندر کہ تمہاری حیرت دانی ایک دم چوڑی ہو جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ پھٹ بھی جائے۔'' انور خاں ہر قسم کے تناؤ سے بالکل آزاد نظر آتا تھا۔ وہ دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے تنوں کے عقب میں کھڑا تھا جبکہ موہن کمار دہانے کے سامنے بیس تیس میٹر کی دوری پر تھا۔

''تم سامنے آؤ انور خاں اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟''

''میرے ساتھ بڑے خاص لوگ ہیں موہن کمار! وہ سامنے آئیں گے تو تمہاری سٹی گم ہو جائے گی۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ انور خاں! تم جانت ناہیں ہو کہ تم لوگن کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ تم نے غداری کی ہے، جس تھالی میں کھایا ہے اسی میں چھید کیا ہے۔ وہاں زرگاں میں جارج صاحب کی کوٹھی پر جو کچھ ہوا ہے، اس کے سب سے بڑے ذمے دار تم ہو۔ لیکن...... لیکن...... اگر تم خود کو قانون کے حوالے کر دو تو اب بھی تم سے رعایت ہو سکت ہے۔ حکم جی اب بھی تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کر سکت ہے۔''

''نرمی کا معاملہ تو تمہارے حکم کو کرنا ہی پڑے گا اور رعایتیں بھی دینی پڑیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تمہارے حکم جی اور جارج گورا کے ٹیٹوے ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ زیادہ زور لگائیں گے تو ان کی گردنیں کڑک ہو جائیں گی۔''

''تم کیا بک رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟'' موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''تمہارے گورا صاحب کی بہن ماریا اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا جیون بس اسی صورت میں محفوظ رہے گا جب گورا اور حکم ہمارے حکم کے مطابق چلیں گے اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے موہن کمار! ہم ماریا کو مارنے کے لیے اتنے ہی تیار ہیں جتنے تم اپنی اگلی سانس لینے کے لیے تیار ہو اور میں تمہیں بتا دوں، اس سلسلے میں ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔ ماریا کی لاش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا کچھ بھی نہیں۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے انور خاں کی آواز میں عجیب درندگی در آئی۔ دہانے سے باہر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ تاریکی میں ٹارچوں کی روشنیاں تو چمکتی رہیں لیکن کہیں کوئی حرکت نظر آئی اور نہ آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا موہن کمار! سکتے میں چلے گئے ہو یا دل کا دورہ پڑ گیا ہے؟''

موہن کمار کی لرزاں آواز اُبھری۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ماریا صاحبہ

نہارے پاس ہیں؟''

''کیا ثبوت چاہتے ہو؟ اس کا ہاتھ کاٹ کر بھیجوں، ناک کاٹوں یا کچھ اور؟''

''تم...... تم اپنے لہجے کو بدلو انور خاں۔'' موہن کمار نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اب لہجے نہیں بدل سکتے موہن کمار! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب حکم جی سے وراس کے پالتو کتوں سے ہماری کھلی جنگ ہے۔''

ایک بار پھر دہانے سے باہر سناٹا چھا گیا۔ اسحاق آگے آیا اور گرجا۔ ''موہن کمار! جا کر پنے آقا کو بتا دے کہ اس کے پاپوں کا گھڑا بھر چکا ہے۔ اب یہ گھڑا بیچ چوراہے پر ٹوٹے گا ورسارا سنسار دیکھے گا۔ اب اسے اور اس کے ٹولے کو بھاگنے کے لیے راستہ ناہیں ملے گا۔ ہم نہیں چن چن کر ماریں گے اور اس راجواڑے کو ان کے گندے وجود سے پاک کر دیویں گے۔''

''لگتا ہے کہ تم سب نشے میں ہو اور اسی نشے کی حالت میں مارے جاؤ گے۔''

''ہم ہوش میں ہیں اور اب تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا وقت ہے۔'' انور خاں گرجا۔ ''جو کچھ تم نے سلطانہ کے ساتھ کیا ہے، وہ ہم بھی جارج گورے کی بہن کے ساتھ کر سکتے تھے اور ایک بار نہیں بیسیوں بار کر سکتے تھے لیکن وہ بچی ہوئی ہے۔ ہاں...... اس کی جان شدید خطرے میں ہے اور یہ خطرہ تب ہی ٹل سکتا ہے جب حکم اور جارج غیر مشروط طور پر ہماری کچھ باتیں مانیں گے۔''

''تم بکواس کر رہے ہو۔ کہاں ہیں ماریا صاحبہ؟'' موہن کی آواز تاریکی میں اُبھری۔

انور خاں نے اسحاق کو اشارہ کیا۔ وہ بھرا ہوا گیا اور ماریا کو گھسیٹ کر دہانے کے قریب لے آیا۔ دہانے کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک خم دار خنجر کی تیز نوک اچانک ماریا کے بازو میں اُتار دی۔ اس کے عریاں بازو میں خنجر کا انجکشن کارگر رہا۔ وہ بُری طرح چلّائی اور ''ہیلپ...... ہیلپ'' پکارنے لگی۔ اس کی یہ آوازیں یقیناً باہر کھڑے گھڑسواروں تک بھی پہنچیں۔

انور خاں نے پکار کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اپنی میم صاحبہ کے پُرجوش نعرے تم نے اچھی طرح سن لیے ہوں گے۔ وہ یہاں بہت خوش ہیں اور اس طرح کے نعرے اکثر لگاتی رہتی ہیں، اگر تم چاہو تو اس طرح کے مزید نعرے بازی بھی تمہیں سنائی جا سکتی ہے۔''

چند لمحے تک گہرا سناٹا رہا پھر موہن کمار کے کسی ساتھی کی نہایت بوجھل آواز سنائی دی۔

''اگر یہ واقعی ماریا صاحبہ ہیں تو تم لوگن جانت ناہیں ہو کہ اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت

دے چکے ہو۔ تم لوگن کی بدنصیبی پر ترس آ رہا ہے۔''

''یہ واقعی تمہاری میم صاحبہ ہی ہے۔'' انور خاں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔ ''اور عنقریب ہم اسے زمین پر بکری کی طرح لٹا کر کند چھری سے ذبح کرنے والے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم ایک دفعہ اپنے والد صاحبان یعنی حکم جی اور جارج سے بات کر لو۔''

اسحاق نے ایک اور چرکہ ماریا کے بازو پر لگایا۔ وہ پھر دردناک انداز میں چلائی۔

''پلیز ہیلپ...... پلیز...... یہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

یہی وقت تھا جب دو افراد اپنی میم صاحبہ کے لیے بیتاب ہو کر دہانے کی طرف بڑھے۔ انور خاں نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ ان دونوں افراد کے قدموں کے آس پاس چنگاریاں بکھر گئیں۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ انور خاں بے رحم لہجے میں دھاڑا۔ ''کسی دھوکے میں نہ رہنا موہن! ہم مرنے اور مارنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اگر کوئی حماقت فرماؤ گے تو کل شام تلک تمہاری چتا کے پھول تیار ہو چکے ہوں گے۔''

''کک...... کیا چاہتے ہو تم؟'' موہن کمار کی مری مری آواز سنائی دی۔

''چاہتے تو بہت کچھ ہیں اور انسان کی چاہتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، لیکن فی الحال ہماری دو چار معصوم معصوم سی خواہشیں تمہارے حکم جی اور اس کے لعنتی چمچے جارج کو پوری کرنی ہوں گی۔''

''تم نے جو کچھ کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔'' موہن کمار کا نامعلوم ساتھی غصیلی آواز میں بولا۔

''سامنے بھی آ جائیں گے۔ فی الحال ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ ہمارے متھے نہ ہی لگو تو اچھا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح جو کہتے ہیں، وہ سنو اور اپنے دونوں والد صاحبان کو جا کر بتاؤ۔''

''جو بکواس کرنا چاہت ہو جلدی کرو۔'' موہن کمار نے کہا۔

''ہم تمہیں صرف دو دن دیتے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بھائی کو پوری حفاظت کے ساتھ نل پانی پہنچا دو۔ ہمارے پاس پچاس ناموں کی ایک فہرست ہے۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر جارج گورا کی جیل میں ہیں۔ ان کو فوراً رہا کر کے یہاں ہمارے پاس پہنچایا جائے۔ زرگاں کے راج بھون میں ہونے والی ساری شرمناک رسمیں، خاص طور سے جشن بہار اور ساتویں کا جشن ختم کرنے کا فی الفور اعلان کیا جائے۔ جارج گورا کو فوری طور پر جیلر کے

عہدے سے ہٹایا جائے۔''

''مجھے پھر شک ہو رہا ہے کہ تم نشے میں ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہ کر بات نہیں کر رہے ہو۔'' ایک بار پھر موہن کمار کی آواز اُبھری۔

''اپنی اپنی اوقات کا پتا ہم سب کو بہت جلد چلنے والا ہے۔ فی الحال تم بی بے بچے بنو اور جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے اپنے بزرگ تک پہنچاؤ۔ بڑوں کے معاملے میں چھوٹے بچے بولیں تو ان کو مرغا بنا دیا جاتا ہے۔''

''ناموں کی فہرست کہاں ہے؟'' موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں نے فہرست نکال کر ہماری طرف دیکھا۔ ''کون جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں جاؤں گا۔'' سب سے پہلے میں نے جواب دیا۔

اسحاق اور چوہان نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اپنا حوصلہ آزمانے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے کوئی نیا نیا اختیار ملا ہے اور میں اس اختیار کو عمل میں لا کر اپنی بے جگری کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے انور خاں کے ہاتھوں سے ناموں والی فہرست لی اور سرنگ کے دہانے سے باہر نکل آیا۔ ایک عجب سنسنی کا احساس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرف درجنوں رائفلیں اُٹھی ہوئی ہیں، بہت سی خونخوار نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں اور میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کے درمیان کی کیفیت بڑی مزیدار تھی۔ میری نگاہوں میں عمران کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی جب کوئی پُرخطر کام کرتا تھا، اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی لذت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں سینہ تان کر آگے بڑھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ تاریکی میں سے ایک سایہ نکل کر میرے رُوبرو آیا۔ اپنے ڈیل ڈول اور شکل سے یہ کافی خطرناک شخص لگتا تھا۔ اس نے بھی اپنی رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ میں نے ناموں کی فہرست والا کاغذ اسے تھمایا اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق کہا۔

''ہمارے چاروں مطالبے اس کاغذ کی پشت پر لکھے ہوئے ہیں۔''

اس شخص نے چھیننے والے انداز میں کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے انور خاں کی دی ہوئی ایک طلائی چوڑی اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ تمہاری میم صاحبہ کی نشانی ہے۔ جا کر اپنے بڑوں کو دکھا دینا۔''

اس شخص نے چوڑی مجھ سے لی اور ایک شعلہ فشاں نگاہ مجھ پر ڈال کر واپس چلا گیا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے دیکھنے کے بعد بے پناہ حیرت اُمڈ آئی تھی۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا اور اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں بھی انور خاں اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ اسی سرنگ میں

پایا جاؤں گا۔

موہن کمار نے تاریکی میں سے پکار کر کہا۔ ''انور خاں! تُو آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس سے تجھے ایک بُری موت کے سوا اور کچھ ناہیں ملے گا۔''

''ہم موت کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں موہن! سمجھ لے کہ اپنے کفن اپنے سروں سے باندھے ہوئے ہیں اور اپنا کہا سنا معاف کرایا ہوا ہے۔ اگر قبریں نصیب ہوگئیں تو ٹھیک ہے، نہ بھی ملیں تو کوئی پروا نہیں لیکن ایک بات پتھر پر لکیر ہے موہنے! مرنے سے پہلے ہم تمہاری اس میم صاحبہ کو ذبح ضرور کریں گے۔''

اسحاق نے کہا۔ ''اور یہ مت سمجھنا موہنے کہ ہم سودے بازی کر رہے ہیں۔ ہم تو اس میم کا سر اُتارنے سے پہلے صرف حجت پوری کر رہے ہیں۔ یاد رکھ اگر ہمارے ان مطالبوں میں سے کسی مطالبے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی تیرے حکم جی کو قبول ناہیں ہوا تو پھر یہ میم مرے گی اور یہ کوئی اچھی موت ناہیں ہووے گی۔''

اسحاق کے لہجے کی درندگی محسوس کر کے موہن کمار کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انور خاں بولا۔ ''چلو اب پھوٹ جاؤ یہاں سے۔ اس میم کو بچانے کے لیے تم لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور جاتے جاتے آخری بار سن لو۔ اگر زرگاں کی طرف سے یا نل پانی کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی تو ہم دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اس معاملے کو فوراً انجام تک پہنچا دیں گے۔''

انور خاں نے نل پانی کا نام جان بوجھ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ حکم جی وغیرہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ماریا فرگوسن کے اغوا والے معاملے سے چھوٹے سرکار یا اس کے ساتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ انگلش اور گلابی اردو میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ آمیز بیچارگی تھی اور کرب تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے قریب جا کر اس کی بات سنی اور واپس آکر انور خاں کو بتایا۔ ''وہ کہہ رہی ہے، میری ماں بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ موہن کمار وغیرہ میری ماں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے ٹوتھ پیسٹ، برش، صابن اور کپڑوں کا ایک جوڑا منگوانا چاہتی ہے۔''

اسحاق پھنکارا۔ ''کوئی ضرورت ناہیں حرامزادی کے لیے یہ چیزیں منگوانے کی۔ یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ ہاں...... ایک جوڑا منگوا سکتی ہے یہ۔''

انور خاں نے اسحاق کو نرمی سے سمجھایا۔ وہ نیم رضامند ہوگیا اور منہ بنا کر دوسری طرف

چلا گیا۔ انور خاں نے ماریا کا پیغام بلند آواز میں موہن کمار اور اس کے ساتھیوں تک پہنچا دیا۔

تاریکی میں موہن کمار اور اس کے تقریباً چار درجن ساتھیوں کا واضح ردعمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم پوری طرح چوکس تھے۔ لکڑی کے تنوں کے پیچھے ہم نے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا بھی ہمارے پاس رکھ دیا تھا۔ اس نے پانچ دس منٹ صرف کر کے مجھے بڑی اچھی طرح سمجھایا تھا کہ ہینڈ گرینیڈ کو کس طرح اور کس سچویشن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ میں بوقتِ ضرورت اچھے طریقے سے اس بارودی گولے کو پھینک سکتا ہوں۔ اسحاق خود رائفل بدست ماریا کے سر پر موجود تھا۔ مجھے پتا تھا کہ خطرے کے وقت وہ ماریا کو شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائے گا۔ بلکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ خطرے کے پوری طرح سامنے آنے سے پہلے ہی ماریا کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

وہ بڑے تناؤ کے لمحے تھے لیکن آخر وہ گزر گئے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ ان چار درجن گھڑسواروں میں سے دس پندرہ گھڑسوار یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ امکان تھا کہ موہن کمار بھی روانہ ہونے والوں میں شامل ہوگا۔ باقی افراد دہانے کے اردگرد پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ جنگل میں شب بیدار جانوروں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ دہانے کے اردگرد کے نشیب و فراز دھیرے دھیرے نمایاں ہو گئے۔ بظاہر دہانے کے اردگرد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہم جانتے تھے، دو تین درجن مسلح افراد یہاں موجود ہیں اور ان کی رائفلوں کے رُخ اس دہانے کی طرف ہیں۔ بہرحال اب ان مسلح افراد کی جانب سے اچانک ہلا بولے جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اگر انہوں نے ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اُجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کرتے۔

ماریا کراہنے لگی۔ ''ہام کو بہت تکلیف ہوتا۔ ہام کا ہاتھ کھول دو۔''

''تاکہ تمہارے شیطانی دماغ کو پھر کوئی چالاکی دکھانے کا موقع مل سکے۔'' اسحاق نے اس کی پشت پر ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ رونے لگی۔ انور خاں نے کہا۔ ''چلو اس کے ہاتھ آگے کی طرف باندھ دو۔ اس نے کھانا وانا بھی تو کھانا ہوگا۔''

اسحاق پہلے تو جز بز نظر آیا پھر اس نے ماریا کے ہاتھ پشت کی جانب سے کھول کر سامنے

کی طرف باندھ دیئے۔

''ہام کا منہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ ہام پیسٹ کرنا مانگتا۔'' وہ منمنائی۔

اسحاق پھنکارا۔ ''یہ تیرے پیو کا باتھ روم ناہیں ہے۔ یہ جنگل ہے۔ یہاں اگر ٹو نے پیسٹ کرنی ہے تو پھر وہی کرنی ہوگی جو زرگاں کی ساری غریب آبادی کرتی ہے۔''

پاس ہی چولہے کی راکھ پڑی تھی۔ اسحاق نے اس میں سے چند کوئلے نکالے۔ انہیں ماریا کے سامنے رکھا پھر انہیں رائفل کے دستے سے پیس کر باریک کیا اور بولا۔ ''یہ ہے وہ پیسٹ جو ہم لوگن کرت ہیں۔ آج تُو بھی یہی کر۔''

وہ تعجب سے اسحاق کو دیکھنے لگی۔

''ایسے دیدے کیا پھاڑت ہے۔ چل انگلی پر لگا اس کوئلے کو اور دانت صاف کر۔'' ماریا اپنی جگہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ اسحاق نے بھنا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ اس کی ایک انگلی کو پسے ہوئے کوئلے میں لتھڑا اور یہ انگلی زبردستی اس کے منہ میں گھسا دی۔ ''چل کر یہ پیسٹ...... چل کر...... ناہیں تو منہ پھاڑ ڈالوں گا تیرا۔''

ماریا چلانے لگی۔ انور خاں نے مداخلت کر کے اسحاق کو پیچھے ہٹایا اور اسے گھور کر بولا۔ ''تم ایک ٹھیک کام بھی غلط طریقے سے کرتے ہو اور وہ غلط لگنے لگتا ہے۔'' پھر وہ ماریا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میم صاحبہ! یہ کوئلہ بڑے کام کی چیز ہے، اس کا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا۔ ہر کالی چیز بُری نہیں ہوتی اور نہ ہر سفید چیز اچھی ہوتی ہے۔ آپ اس کو دانتوں پر مل کر دیکھیں۔ یہ آپ کی ولایتی ٹوتھ پیسٹ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا؟''

''دس کول؟ واٹ نان سینس۔'' ماریا نے تیوری چڑھائی۔

''یہ نان سینس نہیں ہے میم صاحبہ! اس سے تو ہم لوگ بڑے کام لیتے ہیں۔ اس سے ہماری عورتیں برتن مانجھتی ہیں۔ کہیں زخم لگ جائے تو اس کو پیس کر خون بند کیا جاتا ہے۔ اس سے دانت چمکائے جاتے ہیں۔ کئی طرح کی دواؤں میں ڈالا جاتا ہے۔''

انور خاں نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں کافی کوشش کی لیکن ماریا دانت صاف کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے پانی سے بس چند کلیاں کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پچھلے تقریباً بارہ پہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن فی الوقت ہمارے پاس کھانے کے لیے خشک چنوں، مکئی کے بھٹوں اور گڑ وغیرہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جب کھانے کے نام پر یہ چیزیں ماریا کے سامنے رکھی گئیں تو اس نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ انگلش اور چائنیز کھانے کھانے والی لڑکی اس خشک راشن پر کیسے منہ مار سکتی

تھی۔ ''اب کھاتی کا ہے ناہیں ہو؟'' اسحاق نے پھر آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''یہ ہام ناہیں کھا سکتا۔''

''تمہارا تو باپ بھی کھائے گا۔'' اسحاق نے کہا اور زبردستی مکئی کا بھٹا اس کے ہاتھ میں دیا۔

اس نے بھٹا دور پھینک دیا اور چلائی۔ ''ناہیں کھائے گا...... ناہیں کھائے گا۔ ہام کو اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔

چند لمحے کے لیے لگا کہ اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع کر دے گا مگر اسی دوران میں انور خاں نے معاملہ سنبھال لیا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیاء ماریا کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیں۔ ''میم صاحبہ! جب تم کو زیادہ بھوک لگے گی تو یہی چیزیں ڈبل روٹی، کیک، پیسٹری اور فرائی انڈے سے زیادہ مزیدار لگیں گی۔ اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لینا۔'' پھر انور خاں نے اسحاق کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ شانت رہے۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

عجیب الوضع بارونداابھی تک سرنگ کے اندرونی حصے میں موجود تھا۔ میں نے اندر جا کر اسے ناشتہ کرایا۔ اس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ مسلسل شراب کی ڈیمانڈ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جلد از جلد اس کہنہ سال کشتی میں بھی واپس جانا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جس طرح شراب کے لیے تڑپ رہا ہے، اسی طرح اس کشتی کے لیے بھی تڑپ رہا ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس کشتی سے اس کا کیا ناطہ ہے۔ اس کے ساتھ میری ہمدردی صرف اتنی تھی کہ مجھے اس میں اپنے بچھڑے یار عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے اسے یہاں لا کر غلطی تو نہیں کی؟ وہ ان شرابیوں میں سے لگتا تھا جو نشے کے بغیر جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اس کا ذمے دار میں ہوتا۔ وہ لاغر اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کی جلد سیاہی مائل ہو چکی تھی۔

بارونداکو ناشتہ کرانے کے بعد میں سرنگ کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھ گیا۔ میری بے چین روح پھر پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ مجھے میرے اپنے یاد آ رہے تھے۔ میرے گلی کوچے...... میری دھوپ چھاؤں...... میرے موسم اور وہ چہرہ جو شاید میرے اب تک زندہ رہنے کا جواز تھا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی گردن کے عقبی حصے کو سہلا رہا تھا۔ چوہان کو یقین تھا کہ مجھے قید کرنے والوں نے یہاں میرے جسم میں کچھ رکھا ہوا ہے۔ کچھ ایسا جو فوراً میری نشاندہی کرتا ہے اور میرے نگراں آندھی طوفان کی طرح مجھ تک آ پہنچتے ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی اب گواہی دینے لگا تھا۔ چوہان کے خیال کی تائید کرنے لگا تھا۔ ورنہ وہ سب کچھ کیسے ہو

سکتا تھا جواب تک ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میرے پاس کوئی تیز دھار چاقو ہو۔ میں ابھی اپنی گردن کے عقبی حصے کو چیر ڈالوں۔ وہ شے باہر نکال پھینکوں جو میرے پاؤں کی زنجیریں بنی ہوئی تھی۔ آزاد زمینوں تک پہنچنے تک کے لیے میری ہر کوشش کو ناکام کر دیتی تھی۔

ایک عجیب سی بے چینی کسی گاڑھے دھوئیں کی طرح میرے سینے میں بھرنے لگی اور میرا دم گھٹنے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے جواں سال بھکشو ہمیش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی مٹھی میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے مٹھی کھولی۔ اس میں چاندی کی ایک باریک سی زنجیر تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جاتے جاتے تمہاری بیوی سلطانہ نے دی تھی۔ کہتی تھی کہ میں تم تک پہنچا دوں۔''

ایک دم مجھے یاد آیا کہ چاندی کی یہ مہین سی زنجیر میں نے سلطانہ کے پاس دیکھی تھی۔ میں نے ہمیش سے پوچھا۔ ''وہ یہ مجھے کیوں دے گئی ہے؟''

''اس کا پتا تو تمہیں ہوگا۔'' ہمیش بولا۔ وہ کچھ دیر تک جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''وہ یہاں سے جاتے وقت بہت پریشان تھی۔ مسلسل رو رہی تھی اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی پوچھا لیکن میں کیا بتاتا۔ مجھے خود پتا نا ہیں تھا کہ تم، فیروز اور اسحاق وغیرہ اچانک کہاں نکل گئے ہو۔ اس نے مجھے یہ زنجیر دی اور کہا کہ میں تمہیں دے دوں۔''

میں نے خاموشی سے زنجیر کُرتے کی جیب میں ڈال لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس زنجیر سے میرے اور سلطانہ کے تعلق کی کوئی یاد وابستہ ہے لیکن کیا 'یاد' ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہمیش کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''وہ تمہیں بہت چاہت ہے مہروز! وہ ان عورتوں میں سے ہے جو جب شادی شدہ ہو جاوت ہیں تو پھر ان کا شوہر ہی ان کے لیے سب کچھ ہووت ہے۔ اس نے تمہاری رکھشا کے لیے بہت دُکھ جھیلے ہیں مہروز! اور اب بھی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہارے جیون کی رکھشا کرتے ہوئے ہی ہوا ہے۔ اب اسے تمہارے سہارے اور پریم کی سخت ضرورت تھی لیکن افسوس کہ اب تم اس کے ساتھ نا ہیں ہو۔''

''لیکن...... میں کیا کروں ہمیش! میں اس کے لیے ہمدردی تو رکھتا ہوں لیکن اسے اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔''

''مگر مہروز! اگر تم......''

''ایک منٹ ہمیش۔'' میں نے ہمیش کی بات کاٹی۔ ''مجھے میرے نام سے پکارو۔ میں مہروز نہیں تابش ہوں۔ اگر کوئی مہروز تھا بھی تو وہ بس ایک دھوکا تھا اور وہ دھوکا ختم ہو چکا ہے۔''

میرے حتمی لہجے کو محسوس کر کے ہمیش بجھ سا گیا۔ ''ٹھیک ہے مہروز! ام...... میرا مطلب ہے تابش! تم اپنے اندر کے حالات کو بہتر سمجھتے ہو۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ تم خود کرو گے، وہی اچھا ہوگا۔ میں نے تو بس ایک امانت تمہارے حوالے کرنی تھی۔''

اسی دوران میں دہانے کی طرف سے ماریا فرگوسن کے چلّانے چنگھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی بات پر اسحاق سے پھر اس کی تکرار ہو گئی تھی۔ وہ بڑے غصیلے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسحاق یا انور خاں کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ہمیش بولا۔ ''میرا خیال ہے، اب یہ جان گئی ہے کہ اس کی جان ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم اس کے ذریعے اپنی شرطیں منوانا چاہت ہیں۔ اس لیے فوری طور پر اس کی جان نا ہیں لیں گے۔ اسی لیے اب یہ ہر بات پر اڑ رہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، حکم جی اور جارج وغیرہ اس کی رہائی کے لیے ہماری شرطیں ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے؟''

''آشا تو ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ایک بہت بڑا کام ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ماریا کا یہاں پہنچ جانا۔ شاید تم لوگ جارج گورا کو مار بھی دیتے تو اسٹیٹ میں اتنا تہلکہ نا ہیں مچتا جتنا اب مچے گا۔ بہت کھلبلی مچی ہوگی اور ابھی اور مچے گی۔ یہ نہ صرف جارج کی بہن ہے بلکہ اسٹیل کی چہیتی بیوی بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماریا کی ماں لندن میں ایک بہت بڑی جائیداد کی مالک ہے۔ اس جائیداد کی وجہ سے بھی اسٹیل صاحب نے اپنی بیوی کو آنکھ کا تارا بنا رکھا ہے۔ اپنوں کی بہت زیادہ محبت اور توجہ نے اس لڑکی کو بہت خودسر بنا رکھا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہ خود کو زمین کے شے ہی نا ہیں سمجھتی۔ تمہیں وہ پگوڈا میں آگ لگنے والا واقعہ یاد ہے؟'' ہمیش نے کہا۔

''نہیں...... مجھ کو کچھ یاد نہیں۔''

''تم بہت خاص باتیں بھی بھول چکے ہو۔ اس واقعے میں تمہاری جان بڑی مشکل سے بچی تھی۔ سب لوگن جانت ہیں کہ وہ آگ ماریا کی وجہ سے ہی لگی تھی۔''

''ماریا کی وجہ سے؟''

''ہاں...... یہ میم صاحبہ ایک روز پگوڈا کی سیر کے لیے گئی تھیں۔ ان کے گارڈز نے ان

کی آمد کے وقت پگوڈا کو زبردستی عام لوگن سے خالی کرایا۔عبادت کرنے والے کئی گھنٹے تک پگوڈا سے باہر دھوپ میں کھڑے رہے۔ وہ عبادت کا خاص دن تھا۔تمام بڑے گرو حضرات عبادت میں مصروف تھے۔اس لیے جب ماریا پگوڈا میں آئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نہ آسکے۔ پگوڈا کے خادموں نے ماریا کی موجودگی میں ایک دو تلخ باتیں بھی کہہ دیں۔ ماریا نے ان سب کا بہت بُرا منایا اور پانچ دس منٹ کے اندر پگوڈا سے واپس چلی گئی۔اس واقعے کے صرف دو دن بعد رات کے وقت اچانک پگوڈا کی سیڑھیوں والے حصے کی طرف زبردست آگ بھڑک اُٹھی۔ بہت سے لوگوں کو پورا وشواس ہے کہ یہ آگ ماریا نے ہی لگوائی تھی۔اس کا کوئی کارندہ پجاری کے روپ میں اندر آیا تھا اور چراغوں کے تیل والے پیپے اُلٹ کر انہیں آگ دکھا دی تھی۔ اس آگ میں ہمارے ایک بہت پیارے گرو نروانی جل کر بھسم ہو گئے تھے۔تم دو بھکشوؤں سمیت آگ میں بُری طرح گھر گئے تھے۔ان دنوں تمہارے دونوں پاؤں رسّی کی ایک بیڑی میں رہتے تھے۔تم چل تو سکتے تھے لیکن بھاگ ناہیں سکتے تھے۔ تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں آوازیں دی تھیں اور کہا تھا کہ تم اپنا کمبل لپیٹو اور دوڑ کر آگ میں سے گزر جاؤ۔اس وقت میں بھول گیا تھا کہ تم دوڑ ناہیں سکو گے۔تمہیں یاد ہے؟''

''نہیں...... مجھے کچھ یاد نہیں اور تم مجھے یاد بھی نہ کراؤ۔ایسی باتیں سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ناہیں یاد کراتا لیکن میں تمہیں ماریا کی ہٹ دھرمی اور بے رحمی کے بارے میں بتا رہا ہوں۔اس لڑکی نے ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا میں پگوڈا کے ایک حصے کو جلا کر خاکستر کروا ڈالا تھا۔کئی قیمتی نوادرات ضائع ہوئے۔ ایک بزرگ پجاری کے پران چلے گئے اور تم سمیت تین بندوں کی جان شدید خطرے میں پڑ گئی۔ یہاں ایک بار پھر سلطانہ کی بات کرنی پڑ جاوت ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد سب لوگن پگوڈا سے بھاگ گئے تھے اور میں بھی وہاں ناہیں ٹھہر سکا تھا، سلطانہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔اس نے ایک کمبل بھگو کر اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔وہ آگ کے درمیان میں کھڑی تھی اور پکار رہی تھی۔''اندر لوگ ہیں۔ان کی مدد کرو۔ان کو بچاؤ۔'' پھر میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا تھا۔اس نے بھی ایسے ہی ایک بھیگا ہوا کمبل اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔سامنے والے دروازے کی طرف سے نکلنے والا راستہ آگ نے بالکل بند کر دیا تھا۔وہ دونوں آگ میں سے گزر کر پہلو والے دروازے تک پہنچے۔اس دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔انہوں نے یہ کنڈی کھولی۔ دونوں بھکشو تو دوڑتے ہوئے آگ میں سے گزر گئے لیکن تم دوڑ ناہیں سکتے

تھے۔تمہیں سلطانہ اور چوہان نے اپنے درمیان رکھا اور کمبلوں میں چھپا لیا۔چوہان کے کمبل کو آگ لگ گئی تھی۔وہ تمہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا لیکن سلطانہ تمہارے ساتھ چمٹی رہی اور تمہیں باہر نکال لائی۔ وہ ایک بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہے تابش! اس روز اس نے ثابت کیا تھا کہ حوصلہ مندی اور جی داری صرف مرد کا ورثہ ہی ناہیں ہووت ہے۔اس روز لوگن سلطانہ کی ہمت پر اش اش کر اُٹھے تھے۔''

ایک بار پھر سلطانہ کا اُجڑا اجڑا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔اس کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ جا چکی تھی اور جاتے جاتے اپنے گلے کی چین مجھے دے گئی تھی۔خبر نہیں کہ ایسا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔شاید یہ چین میں نے ہی اسے دی ہو اور اس کے ساتھ کوئی وعدہ منسلک ہو اور وہ جاتے جاتے یہ وعدہ ختم کر گئی ہو۔

بھکشو ہیمش نے ماریا کی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''یہ پورے زرگاں میں سب سے زیادہ نخرے والی میم مشہور ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطی پر اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آوت ہے۔ پچھلے سال اس نے اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ اس قدر مار پیٹ کروائی تھی کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ملازمہ کا دوش صرف اتنا تھا کہ اس نے غلطی سے میم صاحبہ کے بستر پر اَن دھلی چادر بچھا دی تھی اور اسی سال عید سے پہلے اس نے ایک ملازم لڑکے کو چھ دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا۔لڑکے کا دوش یہ تھا کہ اس نے ماریا کے پالتو افریقین طوطوں کو تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے ان کے پنجروں میں خوراک ڈالنا بھول گیا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ لڑکا بعد میں کبھی کچھ کھا پی ناہیں سکا اور چند ہفتے بیمار رہ کر مر گیا۔''

''اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اُٹھائی؟''

''اسحاق کی بہن بھی تو زہر کھا کر مر گئی تھی۔سب کو پتا تھا کہ وہ کیوں مری ہے۔اس کی موت پر بھی تو کسی نے آواز ناہیں اُٹھائی تھی لیکن جب آواز ناہیں اُٹھائی جاتی تو اس کا مطلب یہ تو ناہیں ہوتا نا کہ لوگن کے دلوں میں غم اور غصہ بھی ناہیں ہے۔یہ اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے، بڑھتا رہتا ہے اور پھر ایک روز اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاوت ہے کہ کوئی شے بھی اس کا راستہ ناہیں روک سکتی۔''

یہ اَن پڑھ بھکشو اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی فلسفیانہ بات کر رہا تھا۔اس کی بات میں بہت وزن تھا۔ میں اپنا تجزیہ کرتا تو میری صورتِ حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ

مختلف نہیں تھی۔ میں نے ایک عرصے تک بے پناہ دباؤ جھیلا تھا، بے پناہ جسمانی و ذہنی اذیت برداشت کی تھی۔ مجھے ذلت و شرمندگی کے پانی میں غرق کر دیا گیا تھا۔ میں اس پانی میں نیچے اور نیچے جاتا گیا لیکن آخر کار میرے پاؤں زمین سے چھو گئے اور میں اوپر اُبھرنا شروع ہو گیا۔ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے کمزور لوگوں کے پاؤں بھی اب شاید زمین سے لگ گئے تھے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اب وہ کہنہ قدروں کی دیواریں توڑ دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایسی دیواریں توڑنے کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور شاید یہ قربانیاں دینے اور تکلیفیں برداشت کرنے کا موسم ہی تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ اس کی نقرئی چین میری مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چین تپ گئی ہے اور میرے ہاتھ کو جلانے لگی ہے۔ میں نے چین پھر جیب میں ڈال لی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ انور خاں اور ڈاکٹر چوہان تھے۔ انور خاں نے بتایا۔ ''دہانے کے آس پاس چالیس سے کم بندے نہیں ہیں۔ انہوں نے پوزیشنیں لے رکھی ہیں اور پوری طرح چوکس ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' ہمیش نے پوچھا۔

''پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم فیروز کو جلد از جلد نل پانی پہنچانا چاہتے تھے تا کہ وہ چھوٹے سرکار کے سامنے موہن کمار وغیرہ کے خلاف گواہی دے سکے لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ یہ لوگ کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے اور اگر کوئی جائے گا بھی تو اسے یرغمال بنا لیں گے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''وقت کا انتظار۔'' انور خاں نے جواب دیا۔

''اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کسی طرح کی مدد کر سکتا ہوں تو میں تیار ہوں۔'' میں نے دل کی گہرائی سے پیشکش کی۔

انور خاں کا چہرہ چمک گیا۔ ''تمہارے اتنا کہنے سے ہی میرا حوصلہ ڈبل ہو گیا ہے لیکن ابھی کسی طرح کا رسک لینے کی ضرورت ہمیں نہیں ہے۔''

اچانک دہانے کی طرف سے ایک بار پھر ماریا کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ چوہان نے کہا۔ ''وہ کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے پریشان ہے۔ اب اس کے لیے یہاں کیڑے مار دوا کا انتظام کون کرے؟''

انور خاں یہ کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔ ''میں جا کر دیکھوں، کہیں اسحاق اس سے پھر مار پیٹ

شروع نہ کر دے۔''

رات کو ہم نے باری ٹھہرا لی۔ آدھی رات تک فیروز، اسحاق اور ہمیش نے دہانے کی پہریداری کرنا تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ شامل ہونا تھا۔ آدھی رات کے بعد ہم نے سو جانا تھا اور انور خاں، چوہان اور احمد نے پوزیشن سنبھال لینی تھی۔

پروگرام کے مطابق ہم آدھی رات تک جاگتے رہے۔ جنگل جانوروں کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ ان آوازوں میں گاہے بگاہے لیپارڈ یعنی تیندوے کی دور افتادہ آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ تاہم ہمیں ان آوازوں سے زیادہ انسانی آہٹوں سے خطرہ تھا۔ ہم پر شب خون مارا جانا خارج از امکان نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ حکم جی کے پاس خطرناک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی شامل تھا۔ بڑے پگوڈا میں میڈم صفورا نے مجھے اس شخص کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے جو پانچ نہایت خطرناک کمانڈوز بدھا کے نادر مجسمے کو پاکستان سے انڈیا واپس لانے کے لیے گئے تھے، ان کا سربراہ یہی رنجیت پانڈے تھا۔ وہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔

گاہے بگاہے دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی کوئی چاپ اُبھرتی تھی۔ کبھی کوئی رائفل کاک ہونے کی آواز کانوں میں پڑتی تھی۔ رات قریباً ایک بجے ہم نے انور، چوہان اور احمد کو جگا دیا۔ ان کی چٹائیوں پر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ماریا بھی ایک طرف بندھی پڑی تھی۔ خبر نہیں کہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ ہٹ کی پکی نکلی تھی۔ ابھی تک اس نے کچھ بھی کھایا نہیں تھا۔ وہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں تھکا ہوا تھا، کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔ میں کسی کے ہلانے سے جاگا۔ مجھے ہمیش نے جگایا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی اور اس حصے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ''کیا ہے؟'' میں نے ہمیش سے پوچھا۔

''وہ دیکھو...... میم صاحبہ کیا کر رہی ہے؟'' ہمیش نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ ماریا کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تاریکی میں رینگتی ہوئی اس تھیلے تک پہنچی تھی جس میں بھنے ہوئے چنے، گڑ اور بھٹے وغیرہ رکھے تھے۔ وہ تھیلے کو ٹٹول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چور نظروں سے دہانے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم نے آوازیں سنیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ چنے چبا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ بھوک انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اگلی صبح انور خاں نے کھانا پکانے کے لیے ایک چولہا تیار کرلیا تھا۔ روٹی پکانے والا ایک توا بھی چوہان دیگر سامان کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ انور خاں ایک ہرفن مولا شخص کی طرح تھا۔ وہ زبردست اسلحہ شناس تھا۔ اس نے میری کیچڑ زدہ بھیگی ہوئی رائفل کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ چرواہا نریندر سنگھ جو دور مار رائفل لے کر آیا تھا، وہ ٹکڑوں میں تھی۔ انور نے اسے بھی منٹوں میں جوڑ کر تیار کرلیا تھا۔ اس میں لیڈرشپ کی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کے جھگڑے نمٹانا جانتا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کھانا پکانے میں بھی زبردست مہارت حاصل ہے۔ ہمیش نے آٹا گوندھا۔ انور خاں نے آلو کا سالن تیار کیا اور ساتھ زبردست پراٹھے بنائے۔

یہ معقول کھانا ہمیں کئی دنوں بعد نصیب ہوا اور یہ انور خاں ہی کی مرہونِ منت تھا۔ انور خاں نے ایک پراٹھا کچھ سالن اور دودھ ماریا کے سامنے بھی رکھا۔ ماریا کی آنکھوں میں بھوک چمک رہی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتی، اسحاق اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے کھانا ماریا کے سامنے سے اُٹھالیا۔ ''ہم اس کی سیوا کرنے اور اس کے سامنے کھانے کی ٹرے سجانے کے لیے اسے یہاں ناہیں لائے۔ یہ اپنا کھانا خود پکاوے گی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ یہ پکاوے اور ہمیں بھی کھلاوے۔''

''چلو چھوڑو یار! ابھی تو کھانے دو اسے۔'' انور خاں نے پھر مداخلت کی۔

اسحاق جھنجلا گیا۔ ''انور بھائی! اگر تم نے اس طرح اس کتیا کے ناز نخرے دیکھنے ہیں تو پھر مجھ کو بولنا پڑے گا۔ میں یہ برداشت ناہیں کرسکتا۔ اس نے آج تک ہم کو اور ہماری عورتوں کو ذلیل وخوار کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اب تک اس کو لٹکا کر اس کی گردن کو دو فٹ لمبا کر چکے ہوتے لیکن اگر ہم نے یہ ناہیں کیا تو پھر ہم اس کی مہمان نوازی بھی ناہیں کریں گے۔''

''لیکن اسحاق......''

''ناہیں انور بھائی۔'' اسحاق نے تیزی سے انور کی بات کاٹی۔ ''میں سچ کہوت ہوں، مجھ سے یہ سب برداشت ناہیں ہوتا۔ میرے دل پر آرے چل جاوت ہیں۔ مجھے اپنی بہن کا مرنا یاد آ جاوت ہے۔ میں اس کو گولی مار دوں گا اور خود کو بھی مار لوں گا۔'' اسحاق کے لہجے میں تپش بڑھتی جارہی تھی۔

اس تپش کو محسوس کر کے انور خاں ایک دم مسکرا دیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی اور یہ بہت اچھی عادت تھی۔ جب صورتِ حال گمبھیر ہوتی تھی اور تناؤ بڑھ جاتا تھا تو وہ ایک دم مسکراتا تھا اور اپنا لب ولہجہ تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے لگتا تھا کہ پوری صورتِ حال اور

صورتِ حال کے سارے اسباب اچانک بدل گئے ہیں۔

انور خاں نے اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ماریا کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سامنے سے کھانا اُٹھائے جانے پر سخت بھنائی ہوئی تھی۔ انور خاں نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور بولا۔ ''چلو......اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ اپنا کھانا تم خود بنالو۔ کسی کا احسان لینا کون سی اچھی بات ہے۔''

احسان والی بات شاید ماریا کے دل کو لگی۔ ویسے بھی وہ پچھلے قریباً ساٹھ گھنٹے سے بھوکی تھی۔ رات کو اس نے تھوڑے سے چنے ضرور کھائے تھے لیکن یہ خشک چنے اس کے گلے میں پھنس گئے تھے اور وہ دیر تک کھانسنے کے بعد بے سدھ ہو کر لیٹ گئی تھی۔ اب نقاہت کے سبب اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں میں لرزش نظر آتی تھی۔ انور خاں نے اسے سہارا دے کر چولہے کے نزدیک پہنچایا اور گندھا ہوا آٹا اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ سخت جھنجلائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جیسے یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ وہ اتنی ناکارہ نہیں۔ اپنا کام خود کرسکتی ہے۔ انور خاں نے چولہے میں آگ جلادی۔ توا پہلے ہی اوپر رکھا ہوا تھا۔ ماریا اپنے لیے روٹی بنانے لگی۔ یہ عمل اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش میں وہ پہلی روٹی بھی توے پر نہیں ڈال سکی۔ اس کے ہاتھ لتھڑ گئے اور بہت سا آٹا ضائع ہوا۔ بالآخر جو ایک روٹی اس نے توے پر ڈالی تھی، وہ عجیب نقشے کی تھی اور وہ بھی توے سے چپک کر رہ گئی۔ ایک دم ماریا جھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے خشکے والی تھالی دور پھینک دی اور انگریزی میں سب کو صلواتیں سنانے لگی۔

اسحاق نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''حرامزادی! آج تک تُو پکی پکائی کھاتی رہی ہے۔ نوکروں کی فوج تیرے نخرے، چونچلے اُٹھانے کے لیے تیرے آگے پیچھے گھومتی رہی ہے۔ آج تجھے پتا چلا ہووے گا کہ تُو اس قابل ناہیں ہے کہ اپنے بل بوتے پر اپنا پیٹ بھی بھر سکے۔ لعنت ہے تیرے مال دولت پر۔''

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شاید چیزیں اُٹھا اُٹھا کر بھی پھینکنا شروع کر دیتی لیکن اب وہ اسحاق کی شعلہ مزاجی سے ڈرتی بھی تھی۔ انور خاں نے اسحاق کو سمجھا بجھا کر پیچھے ہٹایا اور خود ایک روٹی پکا کر ماریا کو دی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نہیں کھائے گی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ کھا رہی ہے۔ اس کے پاؤں بدستور زنجیر میں تھے۔

اسحاق تڑخ کر بولا۔ ''انور بھائی! آج تم نے اپنی من مانی کر لی ہے لیکن اس کے بعد ناہیں۔ یہ جب تک مرنے سے بچی ہوئی ہے، اپنا کام خود کرے گی۔ بلکہ اس کو ہمارے کام

بھی کرنے پڑیں گے۔ میں نے اس کی گردن کو ہمیشہ اکڑا ہوا دیکھا ہے۔ اگر یہ اب بھی اکڑی رہی تو پھر میں اس کو توڑ دوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں، توڑ دوں گا۔''

اگلے روز دوپہر سے کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ زرگاں سے کچھ لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں حکم جی کا خاص مشیر گرمودان اور جارج گورا کا بہنوئی یعنی ماریا کا شوہر اسٹیل بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھاری مقدار میں اسلحہ اور تازہ دم سپاہی بھی موقع پر پہنچائے گئے تھے۔ ہمیں دہانے کے اردگرد تازی گھوڑے، بوگیر کتے اور ایک عدد جیپ بھی نظر آئی۔ یہ جیپ نہایت دشوار راستوں سے گزر کر پتا نہیں کیسے یہاں پہنچائی گئی تھی۔

ایک شخص نے دہانے کے سامنے آ کر اعلان کیا کہ گرمودان اور اسٹیل صاحب بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے جو لوگ بات کرنا چاہتے ہیں، وہ باہر آ جائیں یا پھر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی جائے۔

انور خاں اور چوہان وغیرہ نے مشورہ کیا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ موجود تھا۔ بہتر تھا کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ سرنگ کے دہانے سے پندرہ بیس گز آگے درختوں کے درمیان بات چیت ہو اور اس گفتگو کے دوران میں دونوں طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ کرنے کا عہد کیا جائے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر شرائط طے ہو گئیں۔ فیصلہ ہوا کہ انور خاں یہیں سرنگ میں رہے گا جبکہ چوہان اور فیروز آگے جا کر بات کریں گے۔ فیروز زخمی تھا، اس کے باوجود وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے اندر جو آگ جل رہی تھی، اس نے اسے اضافی توانائی دے دی تھی۔

سہ پہر ہونے والی تھی۔ درختوں کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ چوہان اور فیروز اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باہر نکلے۔ دوسری طرف سے سرخ لباس میں گرمودان اور اسٹیل نمودار ہوئے۔ گرمودان چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا جبکہ اسٹیل چھریرے جسم اور نہایت اونچی ناک والا دراز قد انگریز تھا۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود اسٹیل کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ ان انگریزوں میں سے تھا جو جب تیسری دنیا کے ملکوں میں آتے ہیں تو نسلی برتری اور اپنی شان و شوکت کا احساس مستقل طور پر ان کے چہروں سے چپک جاتا ہے۔

وہ لوگ چند بلند قامت درختوں کے درمیان بیٹھ گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ دونوں طرف کے رائفل بردار گفتگو کرنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ انور خان اپنی پوزیشن پر بالکل چوکس تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور اسنائپر گن تھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔ وہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ایک ثانیے کے اندر ایکشن لے سکتا تھا۔ اسحاق مسلسل ماریا کے

سر پر موجود تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ اگر حکم جی کے کارندوں کی طرف سے کسی طرح کی کارروائی کی گئی تو ہم ماریا کو شوٹ کر دیں گے۔ انور خاں، احمد اور میں دہانے پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے صورتِ حال پر عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

درختوں کے نیچے ہونے والی گفتگو دس پندرہ منٹ ہی جاری رہ سکی۔ دونوں طرف برہمی نظر آ رہی تھی۔ اسٹیل بار بار ایک کاغذ چوہان کے سامنے لہرا رہا تھا اور بلند آواز میں بول رہا۔ دوسری طرف چوہان بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ یہ گفتگو تلخ کلامی پر ہی ختم ہوئی۔ جب چوہان اور فیروز واپس آنے لگے تو گرمودان نے ایک تھیلا چوہان کو دیا۔ اس تھیلے میں ماریا کی ضروریات کا سامان تھا۔

''کیا ہوا؟'' انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

''ابھی ان میں بہت اکڑفوں ہے۔ دماغ درست ہونے میں ابھی کچھ ٹائم لگے گا۔''

''کیا کہتے ہیں؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''وہ صرف ایک مطالبہ مان رہے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو حفاظت کے ساتھ نل پانی پہنچانے پر تیار ہیں۔''

''اور جو پچاس بندوں کی فہرست دی تھی؟''

''ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے بس پندرہ بیس ہمارے پاس موجود ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جن پر سنگین قسم کے کیس ہیں۔ انہیں اس طرح چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

''بکواس کرتے ہیں۔'' انور خاں پھنکارا۔ ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ پچاس کے پچاس لوگ حکم جی کے قبضے میں ہیں۔ ان کو اس وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو گا۔'' انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

''جارج گورا کو سزا دینے کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟''

''گرمودان کا کہنا ہے کہ جارج کے خلاف اگر ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت اور گواہی ہے تو پیش کی جائے۔ اس کے خلاف اسی طرح کارروائی ہو گی جس طرح اسٹیٹ کے کسی عام بندے کے خلاف ہو سکتی ہے اور اگر الزام ثابت ہوئے تو پھر سزا بھی ملے گی۔''

انور خاں نے دانت پیس کر حکم جی اور اس کے مشیروں کو ایک غائبانہ گالی دی اور بولا۔ ''جس عورت کی عزت خراب کی جاتی ہے اس کی گواہی سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر ایک دو نہیں، سیکڑوں لوگوں نے سلطانہ کو جارج کے گھر سے اُجڑی پجڑی حالت میں برآمد کیا ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو گی؟ لیکن یہ لوگ جانتے ہیں کہ قانون کے محافظ بھی اپنے

ہیں، عدالت بھی اپنی اور قاضی بھی اپنے۔ یہ دن دہاڑے ہزاروں لوگوں کے سامنے بھی کسی کو ناحق قتل کریں گے تو پھر بھی کسی نہ کسی شق کی وجہ سے بچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سینہ تان کر قانون کی بات کرتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ جب قانون، انصاف نہیں کرتا تو پھر کچھ اور راستے کھلتے ہیں، کچھ اور طرح کی عدالتیں لگتی ہیں اور شاید اب ایسی ہی عدالتیں لگیں گی۔'' انور خاں کی آواز طیش سے پھٹ رہی تھی۔

''تم نے آخر میں کیا کہا ہے؟'' اسحاق نے چوہان سے پوچھا۔

''میں نے انہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دی ہے اور میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہم ماریا کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکیں گے۔''

''اس بیگ میں کیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

چوہان نے کینوس کے بیگ کی زپ کھولی۔ یہ کافی بڑا بیگ تھا۔ اس میں ماریا کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ایک شال، کپڑوں کا ایک جوڑا۔ ٹوتھ پیسٹ، صابن، تولیہ، پرفیوم، شراب، بسکٹ، نیچے بچھانے کے لیے ایک خاص قسم کی میٹ اور اسی طرح کی دیگر اشیا۔

اسحاق نے بھی یہ چیزیں دیکھیں اور اس کا چہرہ سرخی مائل ہو گیا۔ ''میں اسے یہ سب کچھ استعمال ناہیں کرنے دوں گا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ وہی کھاوے گی جو ہم کھاویں گے۔ یہ آسمان سے ناہیں اُتری ہوئی۔ ہماری ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ سب کچھ جلا دوں گا۔ اس کے سامنے جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' وہ ایک دم بپھر گیا۔

اس نے تھیلا پکڑا اور جلتے ہوئے چولہے کی طرف بڑھا۔ انور خاں لپک کر گیا۔ ''کیا کرتے ہو اسحاق! کچھ ہوش کی بات کرو۔ یہ چیزیں کل ہمارے کام آ سکتی ہیں اور ان میں دوائیاں بھی ہیں۔ کیا پتا ہمیں اس لڑکی کے لیے ان دوائیوں کی ضرورت ہی پڑ جائے۔''

اس نے اسحاق کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا لیکن اسحاق نے نہیں چھوڑا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''پہلے تم کو وعدہ کرنا ہوگا انور بھائی! دواؤں کے علاوہ ان میں سے کوئی شے اس حرامزادی کے لیے استعمال ناہیں ہووے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔'' انور خاں نے کہا اور تھیلا اسحاق سے لے لیا۔

ماریا ایک گوشے میں بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ماحول میں سخت تناؤ پایا جا رہا تھا۔ دہانے سے باہر حکم جی کے اہلکاروں کی نفری بہت بڑھ گئی تھی۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم بھی زیادہ چوکسی کا مظاہرہ کریں۔

اچانک شور سنائی دیا لیکن یہ شور دہانے کی طرف سے نہیں اندرونی حصے کی طرف سے تھا۔ وہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں باروندا کے زخموں پر مرہم وغیرہ لگا کر آیا تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ کو انور نے دہرا کر کے زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ اب یہ ٹانگ کھل نہیں سکتی تھی۔ میں نے اس کی دبلی پتلی پنڈلی کے زخم پر دوا لگانے کے لیے اس کی زنجیر کو تھوڑا سا ڈھیلا کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تھوڑی سی ڈھیل اس شخص کے لیے کافی زیادہ ثابت ہوگی اور وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

ہم آوازوں کی سمت دوڑے۔ عجیب الخلقت باروندا ایک لکڑی کے سہارے تیزی سے ایک سمت دوڑا جا رہا تھا۔ احمد اس کے پیچھے تھا اور انگریزی میں پکار رہا تھا۔ ''رُک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رُک جاؤ۔''——

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے احمد نے باروندا کو دبوچ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب باروندا احمد کی گرفت میں بے بس ہو گیا ہے۔ احمد اسے آسانی سے سنبھال لے گا مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باروندا نے جنونی انداز میں چلاتے ہوئے زور مارا اور خود کو احمد کی گرفت سے چھڑا لیا۔ احمد لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور دوبارہ باروندا کی طرف بڑھا۔ تب باروندا نے اپنی بیساکھی کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور اس کی دھکیل سے ایک بار پھر احمد کو لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ احمد سے مقابلے پر آمادہ ہے۔ احمد کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پروفیشنل لڑاکا تھا۔ وہ کراٹے میں الٰہ آباد کا چیمپئن تھا اور کئی ایک اہم مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس کے لیے باروندا جیسے معذور مدقوق شخص پر غالب آنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ اس نے بھنا کر کھڑے کھڑے ایک زوردار لات باروندا کے منہ پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ یوں لگا کہ اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، مگر کچھ بھی تھا اس شخص کی سخت جانی ہم بدبودار کشتی میں دیکھ چکے تھے۔ میری اور اسحاق کی کئی سخت ضربات وہ بآسانی جھیل گیا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ چوٹ کھا کر مُردہ چھپکلی کی طرح گرا ضرور لیکن پھر اپنے اکلوتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں احمد سے اندازے کی غلطی ہوئی یا شاید اسے غلطی نہیں کہنا چاہیے۔ احمد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو باروندا جیسے لاغر مدقوق شخص کے سامنے اسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر باروندا کو گردن سے دبوچنا چاہا۔ باروندا نے اس کی ناف پر گھٹنے کی ضرب لگائی پھر اس کے جبڑے پر ایک کارگر مکا رسید کر کے دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا۔

احمد کے لیے یقیناً یہ صورت حال سبکی اور طیش کا باعث تھی۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر تھا۔ وہ اپنی طرف سے اب تک اس لاغر شخص کو رعایت دیتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر باروندا کو ایک

بار پھر دبوچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں میں زبردست جدوجہد شروع ہوگئی۔ آنے والے دو تین منٹ بے حد حیرت ناک تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ لاغر باروندا نے نہ صرف احمد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ آخر میں اچانک اس کا پلڑا بھاری ہوگیا۔ اس نے بڑی تیزی سے احمد کے دو تین وار بچائے، پھر دفعتاً کراٹے کے ہی انداز میں گھوم کر لات چلائی۔ اس کی ایڑی احمد کی کنپٹی کے آس پاس کہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ احمد اس ضرب سے سنبھل سکتا، اس کی بیساکھی نے ایک بار پھر لاٹھی کا کام کیا۔ اس کی بھرپور ضرب احمد کی پیشانی پر لگی، احمد پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔

اسحاق نے اپنی ٹرپل ٹو رائفل سیدھی کی اور صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے باروندا کو نشانے پر لے لیا۔ ''خبردار......شوٹ کردوں گا۔'' وہ چلّایا۔

میں نے بھی رائفل باروندا کی طرف سیدھی کر لی۔ اس موقع پر وہ مزید ''ایفی شینسی'' دکھانے کی کوشش کرتا تو ہم یقیناً اس پر گولی چلا دیتے۔ جان سے نہ بھی مارتے تو زخمی ضرور کر دیتے۔ وہ ایک دم بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر انگریزی میں دہائی دینے لگا۔

''مجھے شراب دو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ میری موت کی ذمے داری تم پر ہوگی۔'' پھر وہ سب کو مشترکہ گالیاں دینے لگا اور اس بات پر صلواتیں سنانے لگا کہ ہم اسے اس کے گھر سے نکال کر کیوں لائے ہیں۔

وہ اس خستہ حال سڑی ہوئی کشتی کو اپنا گھر قرار دے رہا تھا۔ انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی باروندا اور احمد کی لڑائی کے آخری مناظر دیکھ چکا تھا۔ ہم سب کی طرح اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ انور اردو میں بولا۔ ''یارو! اس کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوئی ہیں پھر بھی اس نے احمد کو لمبا لٹا دیا ہے۔ اگر یہ خدائی خوار صحت مند ہوتا تو کیا کرتا؟''

انور خاں اس بات پر مجھ سے تھوڑا سا خفا بھی ہوا کہ میں نے مرہم پٹی کے وقت اس کی زنجیر تھوڑی سی ڈھیلی کر دی تھی۔ میں نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا۔ باروندا کو دبوچ کر ہم نے ایک بار پھر اس کی اکلوتی ٹانگ کو دہرا کیا اور اسے زنجیر میں کسا۔ چونکہ ہم زیادہ تھے اس لیے باروندا کوئی خاص مزاحمت نہیں دکھا سکا۔ اسے دبوچتے وقت میں نے اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی عجیب سی سختی کو محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ اس کی ہڈیوں پر کسی انسان کی نہیں کسی بھینسے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سوکھی سڑی ہونے کے باوجود وہ جلد اپنے اندر عجیب سا کٹھور پن رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ بظاہر مدقوق و بیمار شخص کئی ایک سخت ضربات آسانی سے سہہ گیا تھا۔

احمد کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ کے پنجے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ، میں تمہاری بینڈ تج کر دوں۔''

احمد لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ بھی واضح طور پر حیران نظر آ رہا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چل دیا۔

''یار! یہ کیا بلا ہے؟'' چوہان نے پوچھا۔

''مجھے امید ناہیں تھی کہ یہ اتنا سخت جان نکلے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی وقت مارشل آرٹ کا ٹھیک ٹھاک کھلاڑی رہا ہے۔ دفاع اور حملے کی ہر باریکی کو سمجھتا ہے یہ۔'' احمد کے لہجے میں بدستور حیرت موجزن تھی۔

''وہاں کشتی میں بھی اسحاق نے اسے بُری طرح مارا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''دو چار ٹھوکریں میں نے بھی لگائی تھیں۔ لگتا تھا کہ ہم کسی جیتے جاگتے بندے کو نہیں، لکڑی کے پتلے کو مار رہے ہیں۔ اس وقت یہ سخت نشے میں تھا۔ ہم نے سمجھا تھا، شاید نشے کی وجہ سے یہ ساری چوٹیں جھیل گیا ہے۔''

''اس کا کوئی اتا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ پھر ہی کوئی جانکاری ہو سکتی ہے۔ اس کے بارے میں۔'' انور خاں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

انور خاں جب بھی باروندا کے بارے میں کوئی بات کرتا تھا یا اس کی طرف دیکھتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی باروندا کو کہیں دیکھ چکا تھا۔

ڈاکٹر چوہان نے احمد کی مرہم پٹی کر دی۔ احمد عجیب گومگو کی کیفیت میں تھا۔ ایک طرح کی شرمندگی بھی اسے محسوس ہو رہی تھی تاہم اس شرمندگی پر حیرت اور اُلجھن کے تاثرات غالب تھے۔

چوہان نے کہا۔ ''اپنی شکل وصورت اور لہجے سے یہ شخص نیپال کا لگتا ہے لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے۔ نیپالی تو مارشل آرٹس کے کوئی ایسے شوقین نہیں ہوتے۔''

''ڈاکٹر چوہان! مجھے آپ کی بات سے اتفاق ناہیں۔'' احمد نے کہا۔ ''کھٹمنڈو وغیرہ میں، مَیں نے خود کک باکسنگ اور کراٹے وغیرہ کے بڑے بڑے کلب دیکھے ہیں اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ جیکی جیسا خوفناک فائٹر جس نے یورپ تک تہلکہ مچایا تھا اور سٹریٹ فائٹنگ میں ایشیائی چمپئن مانا جاتا تھا، نیپال سے ہی تعلق رکھتا تھا۔''

مارشل آرٹس میں جیکی کا نام تو میں نے بھی سن رکھا تھا۔ لاہور میں جب گاہے بگاہے مجھ

پر مارشل آرٹ کا جنون سوار ہوتا تھا اور میں نئے سرے سے اپنے پرانے کلب میں جانا شروع کرتا تھا تو پھر مارشل آرٹ کی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت سی خبریں میرے کانوں تک بھی پہنچا کرتی تھیں۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، کون کون سے بڑے کھلاڑی اُبھر کر سامنے آ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مارشل آرٹس سے متعلق رسائل و جرائد بھی کلب میں آتے تھے جو معلومات میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک عجیب الخلقت بارونڈا کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر انور خاں نے ہمیں دہانے کی طرف بلالیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اپنے مورچے سے زیادہ دور نہ جائیں اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا، حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ احمد بھی اپنی پوزیشن پر میرے برابر آ کر بیٹھ گیا لیکن وہ چپ چپ تھا۔ وہ واضح طور پر ہزیمت محسوس کر رہا تھا۔ فنِ حرب اس کی شناخت تھا اور آج ایک لاغر شخص نے اس فن میں اسے نیچا دکھایا تھا۔

شام کے وقت میں سرنگ کے عقبی حصے میں گیا تو یہاں دھپ دھپ کی آوازیں آئیں۔ آگے جا کر دیکھا تو احمد پسینے میں شرابور مشق میں مصروف تھا۔ دو دن پہلے اس نے ایک بیگ میں ریتلی مٹی بھر کر اسے سرنگ کی چھت سے لٹکا دیا تھا اور صبح کے وقت اس پر طبع آزمائی کرتا تھا لیکن آج وہ چونکہ تناؤ میں تھا اس لیے شام کے وقت بھی لگا ہوا تھا، میں اس کو سینڈ بیگ پر ککس برساتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی ککس میں جان تھی۔ جو ضربات وہ سینڈ بیگ کو لگا رہا تھا، وہ واقعی ایک چیمپئن کی ضربات نظر آتی تھیں۔ اس کا اسٹیمنا بھی قابلِ تعریف تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بھی کراٹے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور لاہور میں کئی سال تک ایک کلب سے منسلک رہا ہوں۔ ہم جب باتیں کر رہے تھے، تھوڑے ہی فاصلے پر موجود بارونڈا نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ شکستہ آواز میں سب کو گالیاں دے رہا تھا اور اپنے لیے شراب طلب کر رہا تھا۔ انگریزی کے علاوہ وہ گاہے بگاہے نیپالی میں بھی بولنے لگتا تھا۔ اس کی نیپالی سننے کے بعد اب اس میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ نیپال سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ''اپنی یہ رائفل یہاں...... یہاں میرے دل پر رکھو اور گولی چلا دو۔ میں اب جلدی مرنا چاہتا ہوں۔ شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ تم سب کے سب اپنے بال بچوں سمیت جہنم میں جاؤ گے۔ کیونکہ تم نے ایک بندے کو جیتے جی جہنم میں ڈال دیا ہے۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ''تم تسلی رکھو۔ میں رات کو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن شور شرابا کرتے رہو گے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم شراب کی بات کر رہے ہو؟''

''کہا ہے نا آہستہ بولو۔'' میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کو پھر دوسرے پہر تک ہماری ڈیوٹی تھی۔ یعنی میں، فیروز، اسحاق اور ہمیش۔ ایک بجے کے قریب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میرے پہلو میں ہمیش جلد ہی سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں اُٹھا اور اس تاریک گوشے میں پہنچ گیا جہاں کینوس کا بڑا بیگ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں آج ماریا فرگوسن کے لیے ضروری اشیاء آئی تھیں۔ ان ضروری اشیاء میں، مَیں نے اعلیٰ درجے کی شراب کی دو بوتلیں بھی دیکھی تھیں۔ میں نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے ایک بوتل نکالی اور سرنگ کے اس عقبی حصے میں پہنچ گیا جہاں ایک چٹائی پر ایک بازو اور ایک ٹانگ والا بارونڈا دراز تھا۔ میرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس لالٹین کی روشنی میں بارونڈا کسی کیچوے کی طرح حقیر اور بے جان نظر آ رہا تھا لیکن اس کیچوے کے اندر جو بجلی چمکتی تھی اس کا مشاہدہ آج سہ پہر ہم نے کیا تھا۔

مجھے دیکھ کر بارونڈا کی نقاہت بھری آنکھیں چمک اُٹھیں۔ پھر جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑی بوتل پر پڑی تو وہ یوں اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے کسی طاقتور اسپرنگ نے دھکیلا ہو۔ میں جانتا تھا کہ وہ بلانوش ہے اور اگر میں نے بوتل اسے تھمائی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی اسے ختم کر ڈالے۔ ''مجھے دو۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''لیکن تمہیں صرف اتنی ہی پینی ہو گی جس سے تمہارا کام چل جائے۔ میرے پاس صرف ایک ہی بوتل ہے۔''

میں نے اسے گلاس میں ڈال کر دی۔ وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے غٹا غٹ چڑھا گیا اور ایک بار پھر کسی بھک منگے کی طرح میلا کچیلا گلاس میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دوبارہ اس کا گلاس بھرا۔ وہ یہ بھی سانس لیے بغیر پی گیا۔ تیسرے پیگ کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہو گئی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نشہ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا دایاں رُخ نظر آ رہا تھا۔ اسی رُخ میں عمران کے چہرے کی جھلک تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ مجھے عمران کی مسکراہٹ یاد آئی۔ اس کی آواز، اس کے بالوں کا اسٹائل، میرا دل دُکھ سے بھر گیا۔ وہ جا چکا تھا۔ اس

خونی رات میں ڈیک نالے کے قاتل پانی نے اسے نگل لیا تھا۔ کچھ دن پہلے پگوڈا میں میڈم صفورا نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یعنی وہ مجھے عمران کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں...... کسی وقت میرا دل پکار پکار کر یہ کہنے لگتا تھا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ کم از کم ایک بار ضرور دیکھوں گا۔ کہیں نہ کہیں...... کسی نہ کسی جگہ، کسی چمکیلی صبح کو، کسی سرمئی شام کو یا کسی ویسی ہی تاریک رات کو جب اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس خیال کی کوئی بھی وجہ نہیں تھی لیکن یہ ایک دیوانی آس بن کر میرے دل میں پیوست رہتا تھا۔ رات کے اس پہر جب چارسُو خاموشی تھی، اس سرنگ سے باہر جنگل میں جانوروں کی آوازیں گونجتی تھیں اور کبھی کبھی دہانے کی طرف آسمانی بجلی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میرے دل کی کیفیت عجیب ہوگئی اور یہ کیفیت اکثر طاری ہو جاتی تھی۔ بچھڑنے والے اتنی شدت سے یاد آتے تھے کہ دل کی رگیں ٹوٹنے لگتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ جانکاہ خیال دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں واپس لوٹنے میں بہت دیر کر چکا ہوں۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ میں نے مکمل بے خبری میں گزار دیا ہے، حالانکہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ میرے لیے بے حد قیمتی تھا۔

میں جاگتا رہا۔ میری بیتابی بڑھتی رہی۔ میں اُٹھ کر سرنگ میں ٹہلنے لگا۔ جسم جیسے بخار میں پھنک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ساری دیواریں توڑ کر سارے ناتوں سے منہ موڑ کر آندھی طوفان کی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ سامنے ہی وہ سینڈ بیگ جھول رہا تھا جس پر احمد ایکسر سائز کرتا تھا۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں اس سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ مارشل آرٹس کے حوالے سے میں نے جو کچھ سکھ رکھا تھا، وہ میرے اندر موجود تھا۔ بس اس پر وقت کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سینڈ بیگ پر طبع آزمائی شروع کی تو جیسے وقت کی پڑی ہوئی گرد صاف ہونے لگی۔ سب کچھ تازہ ہوگیا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ تازگی کچھ اور طرح کی ہے۔ گئے برسوں میں بھی میں سینڈ بیگ کے ساتھ بہت وقت گزار چکا تھا لیکن آج کی ملاقات کچھ اور طرح کی تھی۔ اس ملاقات میں وہ بے پناہ حرارت بھی شامل تھی جو پچھلے چند ہفتوں میں میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس حرارت کے کچھ ماخذ تھے۔ اپنی ماں کا مرا ہوا چہرہ...... عمران کے سینے پر لگتا ہوا رائفل کا برسٹ...... سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ...... اور پھر آخری منظر...... جو شاید اپنی تازگی کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف دیتا تھا۔ جارج گورا کے بیڈ روم کا بند ہوتا دروازہ اور اس کے پیچھے اوجھل ہوتا سلطانہ کا زرد چہرہ۔

میں سینڈ بیگ پر اندھا دھند مکے اور ٹھوکریں برساتا چلا گیا۔ میری لگائی ہوئی ضربات

کی آواز سرنگ میں دور تک جا رہی تھی لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ کچھ تو سو رہے تھے اور جو جاگ کر پہرا دے رہے تھے انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید احمد اپنی ورزش میں مصروف ہے۔ میں جب ہانپ جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رُک جاتا۔ سانس بحال ہوتی تو پھر زور آزمائی شروع کر دیتا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے قریب اندھیرے میں موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ بارونداتھا۔ وہ گھسٹتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”تم یہاں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں...... اگر تم مجھے اپنی بوتل میں سے ایک بڑا پیگ اور پلا دو تو میں تمہیں تمہارے اس مارشل آرٹ کے بارے میں ایک بڑے کام کی بات بتاؤں گا۔“ وہ انگریزی میں بولا۔

”پہلے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟“ میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کا ننگ دھڑنگ جسم دیکھا۔ اس کی ٹانگ بدستور زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔

”اس بات کو چھوڑو۔ پیاسا کنویں کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے۔“ شراب پینے کے بعد اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ کافی کم ہوگئی تھی اور وہ قدرے توانا بھی نظر آتا تھا۔

”تم مجھے کام کی بات کیا بتاؤ گے؟ کیا تمہارا تعلق فائٹنگ آرٹ سے رہا ہے؟“

”بس تھوڑا بہت۔ کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ تم مجھے چند گھونٹ دو، میں تمہیں کچھ شاندار ٹپس دوں گا۔“ وہ للچانے والے انداز میں بولا۔

پتا نہیں کیوں میں اس سے ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ عمران کی شباہت کی جھلک بھی ایک وجہ ہوسکتی تھی لیکن شاید اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

میں نے اسے ایک درمیانے سائز کا پیگ اور دیا۔ یہ پیگ اس نے ذرا تحمل سے پیا اور خاصا مسرور نظر آنے لگا۔ اس کے اندر کی بے پناہ تلخی اور جھلاہٹ بھی قدرے کم نظر آنے لگی۔ وہ اپنے لنگوٹ کے اندر اپنی دبلی پتلی رانوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو...... جب تم مکا چلاتے ہو تو اس میں صرف اپنے بازو اور کندھے کی طاقت استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تم اپنی طاقت کا صرف چوتھا پانچواں حصہ استعمال کرتے ہو۔ تمہارے مکے میں تمہارے پورے جسم کی طاقت استعمال ہونی چاہیے۔ پاؤں سے لے کر سر تک پورے جسم کی۔“

وہ خود کو زمین پر کھسکاتا ہوا سینڈ بیگ کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے مجھے سینڈ بیگ پر مکا کر دکھایا۔ ”اس طرح۔“ وہ بولا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا لیکن واقعی میں نے محسوس کیا کہ

اس کے مکے میں کوئی بات ہے۔

اس نے جیسے ہانپ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ ذرا دیر کھانستا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ماہرانہ انداز میں بولا۔ ''توازن...... فائٹنگ آرٹ میں توازن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جب تم ضرب لگاتے ہو تو یہ تصور کر لیتے ہو کہ یہ ضرب تمہارے مقابل کو ضرور لگے گی۔ سینڈ بیگ کی حد تک تو یہ سوچ درست ہے لیکن جب تمہارا مدِمقابل متحرک ہوتا ہے تو پھر کوئی ضرب اس کو لگتی ہے، کوئی نہیں لگتی۔ تم جس انداز میں ضرب لگاتے ہو، وہ خطا ہونے کی صورت میں تمہارے توازن کو بُری طرح بگاڑ دے گی اور ہوشیار مدِمقابل اس سے فوراً فائدہ اُٹھائے گا۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شراب ملنے کے بعد وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا کہ یہ بُری شے اس کے جسم میں پہنچ کر اثر دکھا رہی تھی۔ وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''اگر تم مقابلوں میں حصہ لیتے رہے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے سر کے پچھلے حصے اور دائیں کندھے پر ضرور سخت چوٹیں آئی ہوں گی اور اس کی وجہ یہی توازن کی کمی ہے۔''

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ باروندا نے یہ بات سو فیصد درست کہی تھی۔ کلب اور انٹر کلب مقابلوں میں اکثر میرے دائیں کندھے پر چوٹ لگ جاتی تھی۔ ایک ایسی ہی چوٹ کی وجہ سے ایک مرتبہ میں ایک فائنل مقابلے میں پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ یہ کئی برس پُرانی بات تھی۔

میں تعجب سے اس عجیب وضع مدقوق شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''تم کہتے ہو کہ تم کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کے مقابلے دیکھتے رہے ہو انہیں دیکھ دیکھ کر تمہیں خود بھی تو کھیلنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا؟''

''ہاں...... کسی وقت میں خود بھی کھیلتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''نیپال کے ایک کھلاڑی جیکی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔ ہمارے کلب میں ''انٹرنیشنل کراٹے پلیئرز'' کے ساتھ جیکی کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ کیا تم نے کبھی اس کو بھی دیکھا؟''

''ہاں...... ہاں...... جیکی! وہ تو نیپال کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس نے تھائی اور جاپانی فائٹرز کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ زبردست کھلاڑی...... زبردست کھلاڑی تھا'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب وہ نیپال چھوڑ چکا ہے۔ ویسے بھی اب وہ اس فیلڈ میں نہیں ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ مارشل آرٹ کو خیرباد کہہ چکا ہے؟''

''نہیں......'' اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھولنے لگے۔ ''جو شخص ایک بار سچے دل کے ساتھ مارشل آرٹ سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ پھر کبھی بھی اسے مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ناٹ ایٹ آل اور جیکی تو ایسا شخص ہے جس کے خون میں یہ آرٹ رچ بس چکا ہے۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑا انوکھا شخص ہے۔''

''اگر کوئی شخص اس سے ملنا چاہے تو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں...... میں تمہیں اس کا مکمل پتا بتا سکتا ہوں۔ یہ پتا...... یہ پتا شاید ہی کسی کو معلوم ہو لیکن اس کے لیے...... اس کے لیے...... تمہیں تھوڑی سی اور مہربانی کرنا پڑے گی۔'' اس نے دور کونے میں رکھی ہوئی واٹ 69 کی بوتل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں سے اس کے میلے دانت جھلک دکھانے لگے۔ میں نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ''تم حد کی بات کر رہے ہو...... اور حد تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی لیکن مجبوری ہے، تم دو ڈبل پیگ اور دے دو تو میرا گزارہ ہو جائے گا۔''

''اسپرٹ نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے اور پیو گے تو تمہاری ہڈیاں بھی کھوکھلی ہو کر ٹوٹنے لگیں گی۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں کہ یہ ہڈیاں جلد ٹوٹنا شروع ہو جائیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا پھر بُری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا۔ ''دیکھو...... میرا پہلا نشہ بھی غارت ہو رہا ہے۔ اگر میں دو پیگ اور لگالوں گا تو میرا پہلا نشہ بھی بچ جائے گا اور میری آخری راتوں کی یہ رات بھی تھوڑی سی خوبصورت ہو جائے گی اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بدلے میں تمہیں نیپال کے اکلوتے ''سپر اسٹار مارشل'' کا پتا بھی بتاؤں گا۔'' وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میں نے بوتل اُٹھائی اور قریباً نصف گلاس بھر کر اس کے سوکھے سڑے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ گلاس اس نے غٹاغٹ چڑھانے کے بجائے گھونٹ لے لے کر ۔اس کے نیم مُردہ چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ آتی جا رہی تھی۔ حسبِ وعدہ مجھے دوسرا گلاس

بھی دینا پڑا۔ اب بوتل میں فقط تین چار انچ شراب ہی باقی رہ گئی تھی۔ بوتل میں نے ایک طرف چھپا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام شرابیوں کی طرح ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی مانگے گا لیکن اس نے کچھ نہیں مانگا۔ شاید اس کی سانسوں کی ڈور بس شراب کے ساتھ ہی بندھی ہوئی تھی۔

وہ دوسرے گلاس میں سے نصف ''آگ'' اپنے اندر اُنڈیل چکا تو میں نے کہا۔ ''تم مجھے جیکی کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے۔''

''تم...... اس سے ملنا...... چاہتے ہو؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ایسا موقع آ ہی جائے۔''

وہ عجیب ترنگ آمیز آواز میں بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ تمہارے کلب میں جیکی کی تصویر لگی ہوئی تھی، کیا تم اس تصویر کو غور سے دیکھا کرتے تھے؟''

''ہاں...... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی جیکی تمہارے سامنے آئے تو تم اسے پہچان سکتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان سکتا ہوں۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ وقت کے ساتھ چہرے بہت بدل جاتے ہیں۔''

''تم...... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے بُری طرح چونک کر پوچھا۔

''میں کہتا ہوں کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ جیسے دوسرے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جیکی ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکتے۔'' لالٹین کی زرد روشنی میں وہ عجیب ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میرے بدن کا سارا خون تیز رفتاری سے میرے سر کی طرف دوڑ پڑا ہے۔ پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں ساکت نظروں سے بارونڈا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس کے لمبے بالوں اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ میں مجھے کچھ جانے پہچانے خدوخال نظر آئے۔

وہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پُر درد انداز میں مسکرایا۔ ''ہاں...... میرے بتائے بغیر ہی ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ جیکی تمہارے سامنے ہے۔ نیپال کا درخشندہ ستارہ، ایشیائی چیمپئن، انٹرنیشنل کراٹے سپر اسٹار، اسٹریٹ فائٹنگ کا بادشاہ۔ ہاں...... ہاں وہ سب کچھ میں ہی ہوں۔''

''لیکن...... ...... کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ جہاں حکم جی جیسے شیطان ہوں، جہاں جارج اور اسٹیل جیسے بھیڑیے ہوں، وہاں سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن تمہیں ان چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں...... بالکل ضرورت نہیں۔''

میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے وہ مناظر یاد آئے جب اسحاق اور میں اسے بدبودار کشتی میں بُری طرح پیٹ رہے تھے اور وہ ہماری ضربوں کو حیران کن آسانی سے جھیل رہا تھا اور پھر یہاں اس سرنگ میں آج صبح کا واقعہ نگاہوں میں تازہ ہوا۔ جواں سال صحت مند احمد اس لاغر معذور کو دست بدست لڑائی میں زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ نشے کی ترنگ میں بولا۔ ''اگر تم مجھ سے آٹو گراف لینا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہو گی۔ دراصل میں بائیں بازو سے لکھتا تھا اور میرا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ہاں...... اگر تم میرا انٹرویو لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ تم یہ انٹرویو کسی اخبار یا ٹی وی چینل کو دے کر بہت پیسے بنا سکتے ہو۔ جیکی کے آخری انٹرویو کے طور پر یہ بڑی شہرت پائے گا۔ ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

وہ ایک بار پھر کھانسنے لگا۔

میں نے اس کے برہنہ بازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تمہارے بازو پر تو تمہارا نام بارونڈا لکھا ہوا ہے۔''

''لیکن بارونڈا کے آگے ''جے'' بھی تو لکھا ہوا ہے۔ یہ جیکی کے لیے ہے۔ میرا پیدائشی نام بارونڈا ہے لیکن جس نام نے شہرت پائی وہ جیکی ہے۔''

میں حیرت آمیز تجسس سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مشہور و معروف شخص سے میری ملاقات بھانڈیل اسٹیٹ کے اس جنگل کی اس زمین دوز سرنگ میں ہو گی اور اس حال میں ہو گی۔ یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارا بازو اور ٹانگ کاٹے گئے تھے؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، میں نے شوقیہ انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا؟''

''لل...... لیکن...... میرا مطلب ہے کہ تم حکم اور جارج کا نام لے رہے ہو۔ کیا یہ کام انہوں نے کیا ہے؟''

''دیکھو دوست! میں نے دو پیگ کے بدلے میں تمہیں جو کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اگر تم کچھ اور پوچھنا چاہو گے تو پھر اس کے لیے تمہیں کچھ اور مہیا کرنی پڑے گی۔ ویسے بہتر تو یہی ہے کہ اس موضوع کو نہ چھیڑو۔ تمہارا دل دُکھے گا اور میرا تو بہت زیادہ دُکھے گا۔ دیکھو...... کتنی پیاری رات ہے، ہوا ٹھنڈی ہے۔ باہر سے جنگلی پھولوں کی

خوشبو بھی آ رہی ہے۔ یہ سنو...... یہ سنو...... کہیں دور شاید کوئی چیتا چہک رہا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ وہ خود ہی بولا۔ ''تم کہو گے، چیتا چہکتا نہیں، چلّاتا اور چنگھاڑتا ہے لیکن مجھے تو اس وقت چہکتا ہی لگ رہا ہے۔ ہر شے خوبصورت ہے۔ یہ سرنگ بھی اب اتنی بُری نہیں لگ رہی۔ میرا خیال ہے کہ باہر چاند بدلیوں میں سے جھانک رہا ہوگا۔ کاش! میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا، اپنی کشتی میں...... کیا تم کسی طرح اپنی کشتی تک جانے میں میری مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے اپنے سارے ساتھیوں میں سے بہتر لگے ہو۔ تم میری زبان بھی سمجھتے ہو۔ شاید میرے دل کی زبان بھی کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آ رہی ہو۔ میں اپنی کشتی میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی بھی وقت کام ختم ہو سکتا ہے۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے میری کشتی اور میری شراب تک پہنچا دو تو میں...... تو میں......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا لیکن پھر اسے خیال آیا ہوگا کہ ابھی وہ اپنی زندگی کے مختصر ترین ہونے کا ذکر کر چکا ہے۔

اچانک دہانے کی طرف سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ ان میں نمایاں آواز انور خاں کی تھی۔ وہ چلّانے والے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں نے باروندا کو وہیں سینڈ بیگ کے قریب چھوڑا۔ بوتل اور رائفل تھامی۔ قریباً پچاس ساٹھ میٹر کا فاصلہ طے کر کے میں تیزی سے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہاں صورتِ حال واقعی تشویشناک تھی۔ انور خاں ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ سرتاپا ایک جنگجو پٹھان تھا۔ اس نے ماریا کو سر کے بالوں سے بُری طرح جکڑا ہوا تھا اور اپنی رائفل کی نال اس کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ ماریا کو بالکل سرنگ کے دہانے پر لے آیا تھا۔ انور خاں اور ماریا دونوں کا رُخ باہر کی طرف تھا۔

انور خاں دھاڑ رہا تھا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ابھی ختم ہو جائے گا۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دہانے سے باہر حکم جی کے مسلح گارڈز نے پیش قدمی کی کوشش کی ہے۔ وہ دہانے کے عین سامنے قریباً پندرہ میٹر کی دوری پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لینے کی کوشش میں تھے۔

انور خاں نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ماریا کو دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فائر کی آواز سے ماریا چلّا کر رہ گئی۔ انور خاں گرجا۔ ''میں صرف پانچ تک گنوں گا تم لوگ

واپس نہیں گئے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہم تم سے بات کرنا چاہت ہیں۔''

''بات کرنا چاہتے ہو تو پہلے پیچھے جاؤ۔ ہم کوئی ہوشیاری نہیں چلنے دیں گے۔ میں پھر کہتا ہوں، ابھی تمہارے سامنے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔'' انور خاں کی آواز میں ایسی دھاڑ تھی کہ اردگرد کی ہر شے لرزتی محسوس ہوئی۔

ماریا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں پکاری۔ ''خدا کے لیے پیچھے چلے جاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا مگر انور خاں نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ بلند آواز میں وقفے وقفے سے بولا۔ ''ایک...... دو...... تین......''

ماریا پھر چلّائی۔ ''چلے جاؤ...... واپس چلے جاؤ۔''

ہم نے صاف دیکھا کہ پتھروں کے پیچھے سے مسلح گارڈز اُٹھے اور اُلٹے قدموں چلتے پیچھے ہٹنے لگے۔ مدھم چاندنی میں ان کی موومنٹ اور ان کے ہاتھوں کا جدید اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ جب تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے انور خاں، ماریا کو دبوچے اپنی جگہ بالکل الرٹ کھڑا رہا۔ اس کے عقب میں احمد تھا۔ شور سن کر اسحاق اور فیروز بھی اُٹھ کر آ گئے تھے۔ ان سب کی رائفلوں کا رُخ باہر کی طرف تھا۔

دو چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ انور خاں نے سب کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اسے اور چوہان کو درختوں کے پیچھے حرکت محسوس ہوئی اور کس طرح وہ الرٹ ہوئے۔ ماریا کو دہانے سے ہٹا کر دوبارہ اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ احمد پوری طرح چوکس اس کے سر پر کھڑا رہا۔

اس واقعے کے بعد کوئی بھی سونے کے لیے نہیں گیا۔ ڈاکٹر چوہان مسلسل ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اپنی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیش نے خشک دودھ سے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے ہم باتوں میں مصروف رہے۔ ایک زبردست تناؤ کے بعد سب کے اعصاب قدرے پُرسکون تھے۔ میں نے انور خاں اور چوہان کو بتایا کہ مدقوق نیپالی باروندا دراصل کون ہے۔

میرے انکشاف نے سب کو حیران کیا پھر ایک دم انور خاں کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ اس نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے لرزاں آواز

میں بولا۔ ''اوہ خدایا...... اسی لیے میں بار بار سوچ رہا تھا کہ اس بندے کی شکل اور آواز کی وجہ سے کچھ یاد کیوں آ رہا ہے۔ اب میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ سب کچھ جان گیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' چوہان نے پوچھا۔

''میں نے اس بندے کو دو سال تقریباً دو سال پہلے راج بھون میں دیکھا تھا۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بڑی چمک دار سیاہ جوتی تھی اور شاید ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ ہاں...... بہت اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ راج بھون کے بڑے ہال میں شاید کوئی پارٹی تھی۔ کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے وہاں اس بندے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے موہن کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک چمپئن فائٹر ہے۔ جوڈو کراٹے کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ ہاں...... مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔''

''اس کی راج بھون میں آمد کا مقصد کیا تھا؟'' چوہان نے ٹیلی اسکوپ سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے موہن کمار سے یہی سوال کیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا۔ بعد میں موہن کمار کے بھائی نے بتایا تھا کہ جارج گورا صاحب کی بہن کو مارشل آرٹ وغیرہ سیکھنے کا شوق ہے۔ اس بندے کو بھاری معاوضہ دے کر اسی کام کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔ یہ جارج گورا صاحب کی بہن کو ٹریننگ دینے کے علاوہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے دستے کو بھی ٹریننگ دے گا۔ اس ٹریننگ کے لیے حکم جی اپنے گارڈز کے دستے میں سے ایک سو بندے چنیں گے۔ مجھے وہ ساری باتیں اب اچھی طرح یاد آ رہی ہیں۔''

چوہان نے ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھتے ہوئے بے حد حیران لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ ماریا فرگوسن کو سکھشا دینے کے لیے یہاں آیا تھا؟''

''صرف ماریا کو سکھشا دینے کے لیے نہیں۔ حکم جی کے ذاتی گارڈز کو ٹرینڈ کرنے کے لیے بھی۔ اس بندے سے ان دونوں کاموں کا معاوضہ طے ہوا تھا۔ مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن اندازہ ہے کہ یہ بہت بھاری معاوضہ رہا ہوگا لیکن پھر......''

''پھر کیا؟'' چوہان نے پوچھا۔

''کچھ دن تو یہ بندہ راج بھون میں نظر آیا تھا پھر اچانک ہی اوجھل ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زیادہ بارشوں کی وجہ سے بڑی ندی کے دو بند ٹوٹ گئے تھے اور اسٹیٹ میں زبردست سیلاب آ گیا تھا۔ نل پانی میں بھی کافی نقصان ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے وقتی طور پر رنجشیں بھلا دی تھیں اور ایک دوسرے کے علاقے میں امدادی کاموں کے لیے رضا کار

بھیجے تھے۔ میں بھی ڈیڑھ دو ماہ تک دن رات مصروف رہا تھا۔ انہی دنوں میں یہ بندہ کہیں اوجھل ہوا تھا۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہو گئے تو میں نے ایک دو دفعہ موہن کمار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔''

چوہان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''لیکن وہ واپس نہیں گیا تھا۔ وہ یہیں پر تھا اور بُری حالت میں تھا۔''

''ہاں...... یہ گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔'' انور خاں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ انور کسی داستان گو کی طرح ہمارے درمیان بیٹھا تھا اور ہم ہمہ تن اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔''

انور خاں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک کھردری چٹائی پر ماریا پہلو کے بل پڑی تھی۔ رات کے وقت اسحاق اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر نائیلون کی رسّی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ اسے کسی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا اور اب ہم بھی سمجھ گئے تھے کہ ماریا رعایت کی مستحق نہیں ہے۔ فیروز کی ٹانگ پر گولی کا زخم اس کا ثبوت تھا۔ انور خاں میرے پہلو میں چلتے ہوئے بولا۔ ''اس بندے کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اسے پہلے سے جانتے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہو۔'' میں نے کہا۔

ہم اس جگہ پر پہنچے جہاں باروندا کسی کچھوے کی طرح سمٹ سمٹا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔

''اسے شراب کہاں سے ملی؟'' انور خاں نے پُر حیرت سرگوشی کی۔

''یہ وہ شراب ہے جو ماریا کے لیے آئی تھی۔'' میں نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا۔

لالٹین کی روشنی میں انور خاں نے قریب سے بغور باروندا کا چہرہ دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ انور کا مطلب تھا کہ یہ وہی ہے۔

ہم بغور اس کے کٹے ہوئے بازو اور ٹانگ کا جائزہ لیتے رہے۔ ٹانگ کو ران پر سے کاٹا گیا تھا۔ بمشکل چھ سات انچ ران، جسم کے ساتھ موجود تھی۔ بازو کہنی کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں زخم یقیناً ڈیڑھ دو سال پُرانے تھے۔ ٹانگ کا زخم تو بالکل مندمل ہو چکا تھا لیکن کہنی کے زخم کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ یہاں میلی کچیلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور کسی دوا کی بُو بھی آتی

تھی۔

ہم خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔ راستے میں انور خاں نے کہا۔ ''پتا چل رہا ہے کہ یہ حکم جی کے ظلم کا ایک اور شاہکار ہے۔ لیکن یہ اس حال تک پہنچا کیسے...... اور پچھلے دو سال میں رہا کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تھوڑا تھوڑا مجھ سے کھل رہا ہے۔ اگر کہیں سے شراب مل جائے تو میں اس سے سب کچھ اُگلوا سکتا ہوں۔''

''شراب کی ایک اور بوتل ماریا والے بیگ میں موجود ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے اتنی سے کام نہ چلے۔ یہ بلانوش ہے۔ پانی کی طرح پی جاتا ہے۔''

''یہ تو اس کی حالت سے ہی ظاہر ہے۔ بہرحال اگر اور کی ضرورت پڑے تو ہم باہر سے بھی منگوا سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ماریا کو چاہیے۔''

شام سے ذرا پہلے میں ایک بار پھر بارونڈا کے پاس جا بیٹھا۔ اس بار جانی واکر کی چم چم کرتی بوتل اور گلاس میرے پاس تھے۔ بارونڈا کا نشہ ٹوٹے اب کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ بوتل دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں اس کے لیے تھوڑا سا ہنٹر بیف بھی لایا تھا۔ یہ بیف بھی ماریا کے سامان میں ہی آیا تھا۔

کل والا عمل پھر شروع ہوا اور تین چار گلاس ''سیال آتش'' اپنے اندر انڈیلنے کے بعد بارونڈا جیکی پھر ترنگ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک مُردہ مرتے مرتے پھر زندہ ہو گیا ہے۔ وہ پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا اور میری منت کرنے لگا کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے واپس کشتی میں پہنچا دوں۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم اسے پکڑ کر یہاں کیوں لے آئے ہیں اور اس سے کیا چاہتے ہیں۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں کیونکہ اس کی صورت میں مجھے اپنے ایک بہت ''پیارے'' کی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اگر میں اسے یہ بتاتا تو وہ مجھے اپنی مصیبت کا ذمے دار قرار دے سکتا تھا۔ لہٰذا میں اس حوالے سے خاموش رہا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ حکم کے غیرملکی دوست جارج گورا نے ایک مسلمان لڑکی پہ ظلم کیا ہے۔ اس ظلم کے نتیجے میں زرگاں کے بہت سے لوگوں نے بغاوت کر دی ہے۔ ہم بھی ان باغیوں میں شامل ہیں اور پناہ کے لیے یہاں نل پانی کے نواح میں چھپے ہوئے ہیں۔

میری اس گفتگو کا بارونڈا پر اچھا اثر ہوا لیکن اگر میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ بولے گا تو یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنی کشتی اور کشتی میں رکھی ہوئی شراب

کے علاوہ کسی شے سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس کو ابھی تک اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ ہم اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

میں نے اسے بتایا۔ ''تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر لگا تھا کہ کہیں اس بے ہوشی میں تمہاری جان نہ چلی جائے۔ ہم وہاں رُک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمارے لیڈر انور خاں کو یہ مناسب محسوس ہوا کہ تمہیں ساتھ لے لیا جائے۔''

''بہت بُرا کیا۔ میں جتنی جلدی فارغ ہو جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔'' وہ فارغ کو مرنے کے معنی میں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

''لگتا ہے تمہیں بھی حکم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بہت اذیت اُٹھانی پڑی ہے۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

''نہیں...... کوئی اذیت نہیں۔'' وہ عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''تم نے وہ مقولہ نہیں سنا...... محبت میں گزاری ہوئی چند گھڑیاں، بے محبت زندگی کے سو برسوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ نہیں کوئی اذیت نہیں۔'' اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا تو اس کے بال چہرے پر جھولنے لگے۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ در تہ تھا۔ اس کے اندر جھانکنا آسان نہیں لگتا تھا۔ میں اسے گھیر گھار کر ایک پوائنٹ پر لایا لیکن وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ شراب کے نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''چھوڑو ان باتوں کو۔ ایسی باتیں تو تم کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ دیکھو...... تمہارے سامنے ایک چیمپئن بیٹھا ہوا ہے۔ ایک سپر اسٹار انٹرنیشنل فائٹر۔ تم مارشل آرٹ میں دلچسپی رکھتے ہو اور میں تمہیں جو کچھ بتا سکتا ہوں، رُوئے زمین پر اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہرگز نہیں بتا سکتا۔ مجھ سے فائدہ اُٹھا لو۔ میں اب زیادہ دیر رہنے والا نہیں ہوں۔''

وہ اپنے مرنے کی بات بڑے تواتر اور یقین سے کر رہا تھا۔

''تم اتنے مایوس کیوں ہو؟ تم اس قدر بیمار نہیں کہ زندگی کی طرف پلٹ ہی نہ سکو۔''

اس نے میری بات کو یکسر نظرانداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ سامنے سینڈ بیگ کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے کھڑا ہونے میں مدد دو گے۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹانگ انور خاں کی ہدایت کے مطابق بدستور زنجیر میں تھی اور گھٹنے سے مڑی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''میری یہ ٹانگ کھول دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے کسی کو نقصان پہنچے یا تمہیں شرمندگی ہو۔''

میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اگر یہ چند روز پہلے کی بات ہوتی تو شاید میں ایسا رسک کبھی نہ لیتا لیکن اب دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ مجھے خطرات ہیچ محسوس ہونے لگے تھے۔ اگر دل میں کوئی اندیشہ اُبھرتا بھی تھا تو میں خود کو سمجھاتا تھا۔ موت سے بڑھ کر تمہارے لیے کیا بُرا ہو گیا اور یاد رکھو کہ تم خود کو موت کے لیے آمادہ کر چکے ہو۔

میں نے جیکی کی زنجیر کھول دی۔ اس نے میرا سہارا چھوڑ دیا اور اپنی اکلوتی ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بیساکھی نما لکڑی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی بھینچی اور عجیب انداز میں بولا۔ ”طاقت اس مٹھی میں نہیں، یہاں ہوتی ہے یہاں...... دماغ کے اندر...... اگر دماغ میں طاقت نہیں تو پھر یہ مٹھی چاہے ایک پہلوان کے جسم کا حصہ ہو، وہ کمزور ہی رہتی ہے۔ دوسری صورت میں مجھ جیسا لاغر آدمی بھی سینڈ بیگ مار کر مکا پھاڑ سکتا ہے۔ سس سوری...... مکا مکار کر سینڈ بیگ پھاڑ سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

”دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔

اس نے آہستہ آہستہ مٹھی بھینچی۔ جیسے انگلی کے ایک ایک جوڑ کو علیحدہ علیحدہ موڑ رہا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر تک اپنے خیالات کو مرتکز کرتا رہا۔ تب اس نے اپنی بیساکھی اور ٹانگ پر اُچھلتے ہوئے سینڈ بیگ کو مکا رسید کیا۔ سینڈ بیگ پھٹا تو نہیں لیکن ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ دور تک گیا اور واپس آیا۔

”ونڈرفل۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”تمہاری جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضرب کافی زوردار ہے۔“

”یہ ضرب میں نے اپنے جسم کی طاقت سے نہیں، دماغ کی طاقت سے لگائی ہے۔ میری ساری ذہنی توانائی اس ضرب میں لگی ہے اور جب ذہنی توانائی لگتی ہے تو جسمانی توانائی خود بخود لگتی ہے۔ چلو اب تم خود کوشش کرو۔“

اگلے چار پانچ منٹ میں، مَیں نے بارونڈا جیکی کی ہدایات کے مطابق کچھ ضربیں لگائیں اور مجھے لگا کہ اس شخص کی باتوں میں وزن ہے۔

وہ بولا۔ ”آج میں تمہیں دو کام کی باتیں بتاتا ہوں۔ اگر تم ان کو یاد رکھو گے تو یہ عمر بھر تمہارے کام آئیں گی۔ بولو یاد رکھو گے؟“

”بالکل رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔ مجھے اس شخص سے اب واقعی عقیدت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ چند دن میں مرنے والا ہے اور میں نے ان آخری دنوں میں اسے ایک ویرانے میں بہترین شراب فراہم کر کے اس کو مسرور کیا تھا۔

وہ بولا۔ ”انسان کے بنیادی خوف دو ہی ہوتے ہیں۔ ذہنی تکلیف اور جسمانی تکلیف۔ تم کسی خطرناک غنڈے سے دو بدو لڑتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں ڈر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مارے گا۔ تم پر کوئی ہتھیار استعمال کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہو گی۔ دوسرا خوف ذہنی تکلیف کا ہے۔ اگر وہ تمہیں مارے گا یا تم سے گالم گلوچ کرے گا یا تمہیں تھرتھر کانپنے پر مجبور کر دے گا تو لوگ یہ منظر دیکھیں گے اور تم شدید شرمساری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اگر ہم ان دو بنیادی خوفوں پر کنٹرول کر لیں تو ہم کسی بھی بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ بس ہم یہ طے کر لیں کہ ہم جسمانی تکلیف کو جھیلیں گے اور اگر کہیں شرمندگی اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تو بھی جھیلیں گے۔“

”تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”اگر نہ لگیں گی تو یہ تمہارا ہی نقصان ہو گا۔“ وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔ ذرا توقف کر کے اس نے گلاس میں بچی کھچی شراب اپنے اندر اُنڈیلی اور بولا۔ ”اب میں تمہیں جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کا ایک خاص الخاص گُر بتاتا ہوں۔ اس گُر کو سمجھ لو گے تو دھیرے دھیرے جسمانی تکلیف تمہارے جسم سے دور ہو جائے گی۔ تمہیں درد نہیں ہو گا یا ہو گا تو بہت کم ہو گا۔ تم ایک نئے انسان بن جاؤ گے۔ ذرا سوچو اگر انسان کو درد نہ ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔“

ایک دم مجھے پھر وہ کشتی والا منظر یاد آ گیا۔ اسحاق نے جیکی کو دیوانہ وار مارا تھا اور اس نے بس ایک دو بار کراہنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا واقعی...... اسے بھی درد نہیں ہوتا؟ جیکی میں میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ جیکی نے جو دونوں باتیں کی تھیں، وہ میرے دل کو لگی تھیں اور اب اس کی یہ تیسری بات بھی جیسے دل میں کھب گئی تھی۔

وہ ابھی تک لنگوٹ میں تھا۔ مجھے اس کا سارا جسم لالٹین کی روشنی میں دکھائی دے رہا۔ اس کے رگ پٹھوں اور سوکھی سڑی جلد میں عجیب سی سختی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ”اگر میں نے تمہیں سب کچھ آج ہی بتا دیا تو تم کل کس تشریف میں شوق لاؤ گے۔“

”شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ کس شوق میں تشریف لاؤ گے؟“

”ہاں...... ہاں...... یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں فقرے میں لفظ اُلٹے بول جاتا ہوں۔ تم خود ہی ٹھیک کر لیا کرو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ باقی بات کل ہو گی اور اگر تم 69 ہی کی ایک بوتل لا سکو تو کیا بات ہے۔“

”چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل تمہارے لیے وہی لاؤں گا جو کہا ہے لیکن اپنی بات

ادھوری نہ چھوڑو۔ مجھے اُلجھن رہے گی۔''

''آہ ادھوری بات۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔'' باتیں تو کبھی مکمل نہیں ہوتیں اور کام مکمل ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری خواہش پھر تیسری۔ انسان کو کہیں نہ کہیں رُکنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جہاں سے آگے نہ جاسکے وہاں خوشی سے رُک جائے۔ باقی کی خواہشوں کو دل سے نکال دے۔''

میں نے کہا۔'' تم ایک چمپئن فائٹر ہو لیکن تمہاری باتیں فلاسفروں جیسی ہیں۔ لگتا ہے کہیں گہری چوٹ کھائی ہے تم نے۔''

''تم مجھے کریدنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں اور شراب کے بغیر تو بالکل بھی پسند نہیں۔'' وہ مسکرایا تو اس کے میلے دانت نمایاں ہو گئے۔

اس کا مطع نظر سمجھتے ہوئے میں نے بوتل کی باقی شراب بھی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے بوتل کو ندیدوں کی طرح اپنے سینے سے لگالیا۔ میں نے اس کی اکلوتی ٹانگ پھر سے زنجیر میں باندھ دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا تاہم میں انور خاں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

تھوڑی سی اور پی کر وہ پوری ترنگ میں آ گیا۔ میرے پوچھے بغیر ہی بولا۔'' مجھے اسی جرم کی سزا ملی ہے جو بہت عام ہے۔ جو ہمیشہ سے بہت عام رہا ہے۔ جس کو کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا۔ مجھے پیار ہو گیا تھا۔ ایک دم...... بہت تیزی سے...... بالکل طوفانی پیار......''

''کس سے؟''

''جس سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہی تو بات ہے۔ پیار وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔''

''کون لڑکی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ وہ سوال ہے جس کا جواب کوئی بھی سچا عاشق نہیں دیتا۔''

''حکم کے خانوادے سے تھی؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''وہی جو ہوتا آیا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن سنبھال نہیں سکا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ تم ایک ٹیچر کی حیثیت سے اس اسٹیٹ میں آئے ہو، تمہیں اس

کے لیے بہت معاوضہ دیا گیا ہے۔ عزت اور آسائش دی گئی ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ یہ لوگ جتنے مہربان ہیں، اتنے ہی سخت بھی ہیں۔ بہت ظالم بن جائیں گے لیکن تمہیں پتا ہے نا، ہونی ہو کر رہتی ہے۔''

''میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے اگر تم بُرا نہ مناؤ تو پوچھوں؟''

''تم نے شراب پلا کر میری رات کو رنگین کیا ہے۔ پوچھو۔''

''کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جسے تم سکھشا دینے کے لیے یہاں اسٹیٹ میں آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ جارج کی بہن ماریا فرگوسن؟''

''تم فاؤل پلے کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہے نا، کوئی بھی سچا پیار کرنے والا اپنے محبوب کا نام زبان پر نہیں لاتا۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا۔ لیکن تمہارا پیار کس قسم کا تھا؟''

''یہ وہ پیار تھا جو آندھی کی طرح اُٹھتا ہے اور طوفان کی طرح دماغ پر اور دل پر چھا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی طلب اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ پیار کرنے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا۔ کچھ سمجھنے میں نہیں آنے دیتا۔ ہم بھی راج بھون میں بس دو چار ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر قریب آ گئے تھے کہ لگتا تھا برسوں کے شناسا ہیں۔ چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔''

''وہ بہت خوبصورت تھی؟''

''مجھے اس کا پتا نہیں لیکن وہ میرے لیے دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی تھی اور میں اس کے لیے محبوب ترین شخص۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا ہونے والا شوہر اسے چاہتا تھا اور شاید وہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نا، یہ وہ تیز بہاؤ والا پیار تھا جو کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا۔ میں بھی راج بھون میں رہ رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کے بہت سے مواقع تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔'' ہمارا راز بہت جلدی کھل جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بہت بُرا ہوگا۔' مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک دن اس کے پتا نے ہمیں دیکھ لیا اور پھر پتا نہیں کس طرح یہ بات اور بھی کئی لوگوں تک پہنچ گئی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندو تھی اور جہاں تک میری جانکاری ہے انہی دو چار لوگوں کی فیملیاں راج بھون میں رہتی ہیں جو حکم کے قریبی مشیروں اور مصاحبوں میں شامل ہیں۔''

"تم مجھے شرلاک ہومز کا دیسی ایڈیشن لگ رہے ہو۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتیجے نکالتے ہو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے تھوڑا بہت بتا دو تا کہ مجھے نتیجے نکالنے کے لیے مغز ماری نہ کرنی پڑے۔"

"بتا تو رہا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ، وہ کون تھی؟"

"اب وہ کسی اور کی ہے، اس کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تم نے خود ہی کہا ہے کہ پھر یہ بات پھیل گئی تھی اور کئی لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی ایسا راز نہیں رہا۔"

"تم ہوشیار واقع ہوئے ہو۔ وکیلوں کی طرح بحث کر لیتے ہو۔ لیکن تم یہاں اس منحوس اسٹیٹ میں کیسے آ پھنسے ہو اور مجھے لگتا ہے کہ تم انڈین بھی نہیں ہو۔ کیا تم انڈین ہو؟"

"نہیں...... پاکستانی...... بس کچھ حادثات نے یہاں پہنچا دیا ہے۔"

"اوہ...... ونڈرفل...... پاکستانی۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"نیپال اور پاکستان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہم دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے "مالک" ہیں۔ ایورسٹ، کے ٹو، نانگا پربت، ملکہ پربت اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ہمارے ہاں دنیا کے بہترین قدرتی مناظر اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ ہم نے بہت اچھے کھلاڑی پیدا کیے ہیں اور پھر ایک اور بات ہم دونوں ملکوں کو ایک بڑا زبردست ہمسایہ بھی ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، بہت ہمدرد اور امن پسند ایسا ہمسایہ ہو تو پھر جنت میں جانے کے لیے مرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ دنیا ہی بہشت بن جاتی ہے۔" وہ حسب عادت طنزیہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس موضوع پر بات کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی تو اس کے سینے کی پسلیاں نمایاں تر ہو گئیں۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا سایہ سرنگ کی کھردری دیوار پر جھول رہا تھا، جیسے سائے نے جیکی سے بھی زیادہ پی رکھی ہو اور اسے بیٹھنا مشکل ہو رہا ہو۔ جیکی نے کہا۔ "تم وعدہ کرو کہ کم از کم میرے مرنے تک یہ بات اپنے تک ہی رکھو گے۔"

میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی بھی یہ بات کسی تک نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "وہ جارج کی بہن ماریا کی گہری سہیلی شکنتلا ہے۔ میری شاگرد تو ماریا تھی لیکن دھیرے دھیرے شکنتلا بھی مجھ سے سکھشا لینے لگی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، وہ ہمیشہ ساڑھی پہنتی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا۔ جوڈو کراٹے سیکھنے کے لیے ساڑھی سے اچھا لباس اور کوئی نہیں ہے۔ بس اس میں ایک خرابی ہے کہ ساڑھی والی پلیئر کراٹے کھیلتے ہوئے کسی کو کک نہیں مار سکتی، صرف فلائنگ کک مار سکتی ہے کیونکہ فلائنگ کک میں دونوں ٹانگیں اکٹھی ماری جاتی ہیں۔ میری بات سمجھ کر وہ بہت ہنسی۔ ہنستے ہوئے اس کے دانت یمن کے موتی دکھائی دیتے تھے۔ اگلے روز وہ ماریا کی طرح ٹراؤزر پہن کر آئی۔ وہ ماریا کی طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ بس شغل کے لیے آ جاتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا "لنک" بنا کہ باقی ساری باتیں، سارے لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ بس ہم دونوں رہ گئے اور ہماری پیاسی نظریں جو ہر پل ایک دوسرے کو تلاش کرتی تھیں۔ شکنتلا کے پتا اشوک ساہنی حکم جی کے خاص مشیر تھے۔ ایک دوسرے اہم مشیر رام گوپال کے ساتھ عرصے سے ان کی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اشوک ساہنی اس جنگ میں اپنے حریف کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا کہ وہ شکنتلا کو حکم جی سے بیاہ کر اس کے سسر بن جائیں۔ اشوک ساہنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ شکنتلا اپنے الہڑپن اور خوبصورتی کی وجہ سے حکم جی کو پسند تھی۔ درحقیقت اشوک ساہنی نے اپنے منصب اور رتبے کو بڑھانے کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ شکنتلا اپنے ہونے والے شوہر سے قریباً دس بارہ برس چھوٹی تھی اور اس سے پہلے بھی شوہر صاحب کی کئی بیویاں اور رکھیلیں وغیرہ تھیں جن میں اس کی چہیتی اور منہ چڑھی بیوی رتنا دیوی بھی شامل تھی۔"

بات کرتے کرتے جیکی کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا پورا ڈھانچا دہل کر رہ گیا۔ میں نے اسے پانی پلانا چاہا لیکن اس نے شراب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دو گھونٹ لے کر قدرے شانت ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا اور بولا۔ "مجھے یہ ماننا چاہیے کہ اس معاملے میں زیادہ پیش قدمی میری طرف سے ہی ہو رہی تھی۔ شکنتلا پہلے تو بچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہو گئی۔ یہ بڑی حیران کن کروٹ تھی۔ بے شک اس کی "بے جوڑ شادی" ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ حکم جی کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔ اپنے ماتا پتا کی پسند کو وہ اپنی پسند سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک حکم جی ایک روحانی شخصیت بھی تھے جن کی عزت، تکریم اور خوشی کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ بے پناہ طاقت سے میری محبت

کے مقناطیس کی طرف بھی کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر ہی ہوا تھا۔"

جیکی نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی نشیلی آنکھوں سے ماضی میں جھانکتے ہوئے بولا۔
"وہ چاندنی رات تھی۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں نے شکنتلا کو راج بھون کی چھت پر بلایا تھا۔ ہم سنگِ مرمر کی جالیوں والی ایک برساتی میں ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اس مہ جبیں پر جھکا ہوا تھا، اس کے لمبے بال سنگِ مرمر کے چبوترے پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کسی کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن اچانک ہم پر بجلی سی گر پڑی۔ ہم نے اشوک ساہنی صاحب کو دیکھا۔ اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئے پھر ایک دم گھومے اور خاموشی سے نیچے چلے گئے۔ شکنتلا کی بُری حالت تھی۔ وہ اپنی اوڑھنی کو درست کرتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس بات کا پتا ہمیں کئی دن بعد چلا کہ اشوک ساہنی صاحب کو آگاہ کرنے والی شکنتلا کی انگریز سہیلی ماریا ہی تھی۔ اس نے یار مار کا کردار ادا کیا تھا۔

شکنتلا پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ہمارے ملنے کے راستے بند ہو گئے۔ ہم جو چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزار سکتے تھے، ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارا ملنا ممکن نہیں اور اگر میں ایک ٹیچر اور ٹریز کی حیثیت سے یہیں اسٹیٹ میں رہا تو میری جان کے ساتھ ساتھ شکنتلا کی زندگی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور یہ مجھے ہرگز منظور نہیں تھا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلد ہی کسی طرح شکنتلا کو بھی اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ بہت روئی تھی۔ ان دنوں اس کا دودھیا گلابی رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ میں اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا اور شاید وہ بھی آخری بار ملنا چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک آخری ملاقات طے ہوئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ وہی کپڑے پہن کر آئے جن کپڑوں میں، مَیں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنی ایک سہیلی کی بیمار والدہ کی عیادت کے بہانے کوشلی چلی گئی۔ شاید تمہیں پتا ہی ہو کوشلی، زرگاں کی ایک نواحی آبادی ہے۔ یہاں سے جنگلی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"نہیں...... میں اس بارے میں نہیں جانتا۔"

"شکنتلا وہاں پہنچی اور میں بھی حکم جی کے "نائٹ، واچرز" سے بچ بچا کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یاد ہے، وہ پورے چاند کی رات تھی۔ چاند کبھی نکل آتا، کبھی بدلیوں میں چھپ جاتا تھا۔ ہم ایک باغیچے میں ملے تھے۔ وہاں مولسری اور رات کی رانی کے پھول تھے۔ کچنار اور نیم

کے گھنے پیڑوں میں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ وہ ٹوٹ کر روئی اور میری آنکھیں بھی تربتر ہو گئیں۔ اس نے کہا مجھے بھولنا نہیں۔ میں بھی جہاں ہوں گی، تمہیں یاد کروں گی۔ تمہارے لیے پرارتھنا کروں گی۔ صبح شام کے بدلتے رنگوں میں، نئے موسموں میں اور تہواروں میں تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ میں نے کہا۔ میں دل میں ایک کانٹا لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ زخم ہمیشہ رستا رہے گا۔ مجھے بہت خون رُلائے گا۔ بس یہ دعا کرنا کہ یہ ناسور بن کر مجھے زندہ درگور نہ کر دے۔

ہم نے وہ سب باتیں کیں جو جدا ہو جانے والے پریمی کسی آخری ملاقات میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہاں کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب شکنتلا آخری بار میرے گلے لگ کر چلی گئی اور میں بھی رُخ موڑ کر دوسری طرف روانہ ہو گیا، مجھے لگا کہ وہ رُک گئی ہے اور مڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن شک اتنا شدید تھا کہ مجھے دیکھنا پڑا۔ ہاں...... وہ واقعی رُک گئی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ کچنار، نیم اور مولسری کے پیڑوں کے درمیان وہ چاندنی میں نہائی ہوئی کھڑی تھی اور کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ کوئی اپسرا یا پھر کوئی داستانی شہزادی...... جس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پتھرا گئی تھی اور وہی نہیں میں بھی پتھرا گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور دوبارہ لپٹ گئے۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ بن گئی، میرے اندر پیوست ہو گئی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دلفگار لہجے میں کہا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا شاکن۔ وہ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی۔ تو پھر مجھے یہاں سے لے چلو۔ کہیں بہت دور...... جہاں کوئی میری خبر نہ پا سکے۔

اور پھر وہ ہوا جو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا، جو ہمارے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم جو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منہ موڑنے کے لیے آئے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس باغیچے سے نکل گئے۔ اسی حالت میں جس حالت میں تھے۔ ہم گھنے جنگل میں گھس گئے۔ اندھا دھند بھاگتے رہے اور چلتے رہے۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسی طرح دنیا کے دوسرے کنارے تک جا سکتے ہیں۔ میں جب شکنتلا سے ملنے کوشلی میں آیا تھا تو میں نے احتیاط کے طور پر ایک پسٹل اپنے کپڑوں میں رکھ لیا تھا۔ اب خطرناک جنگل میں یہی پسٹل ہمارے پاس واحد ہتھیار تھا۔ مگر عجیب بات تھی، کوئی خوف نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر بآسانی موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ پیار دیوانہ ہوتا ہے۔"

وہ خاموش ہوگیا۔اس کی ماضی میں جھانکتی ہوئی آنکھیں جیسے پیار کی دیوانگی کو دیکھنے لگیں۔ میلے کچیلے لنگوٹ میں وہ ننگ دھڑنگ بیٹھا تھا۔اس کے سر اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ بال اسے کسی تارک الدنیا سادھو کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ اب وہ شراب کے لیے زیادہ بیتابی بھی نہیں دکھا رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ پورے سرور میں ہے۔ دہانے کی طرف سے ماریا کے کھانسنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ باروندا جیکی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی کہانی کا ایک اہم کردار ماریا اسی سرنگ میں اس کے ساتھ موجود ہے۔

''کیا تمہارا پیچھا نہیں کیا گیا؟'' میں نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔''نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی جاتا تو دو چار آدمی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میرے پاس پسٹل تھا اور اس کی کوئی تین درجن گولیاں تھیں۔ میں نے بہت سا مارشل آرٹ گھول کر پیا ہوا تھا اور میرے بدن میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ میں دو چار بندوں کی ہڈیاں تو خالی ہاتھ بھی توڑ سکتا تھا۔ ہم آدھی رات تک جنگل میں بھاگتے رہے اور پھر اس ندی پر پہنچ گئے جو ''کیچ'' کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں گھاٹ پر بہت سی چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ایک نئی نکور کشتی مجھے اچھی لگی۔ اس کے اوپر سائبان تھا اور اس کا نیلا رنگ چمکیلا تھا۔ ملاح اور مچھیرے اپنی جھونپڑیوں میں سو رہے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا، اس خاموشی میں بس کبھی کبھی لہریں کشتیوں سے ٹکراتی تھیں اور مدھم آواز پیدا ہوتی تھی۔ کشتی کے اندر بہت سے پھل اور کھانے پینے کی اشیاء لدی ہوئی تھیں۔ کشتی کا مالک ایک اشرف نامی نوجوان تھا۔ وہ الصباح یہ سامان لے کر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اسے اسٹیٹ ہی کی ایک جاگیر زہرہ آباد تک جانا تھا۔ ہم نے نوجوان سے معقول کرایہ طے کیا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں بھی زہرہ آباد لے جائے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ابھی رات کے اندھیرے میں روانہ ہوگا۔ وہ مان گیا۔ ہم اس کے ساتھ ندی کے بہاؤ پر چل دیئے۔ نوجوان سمجھ گیا تھا کہ ہم پریمی جوڑا ہیں اور کہیں پناہ کے لیے گھوم رہے ہیں۔ اس نے ہمیں آفر کی کہ اگر ہم کچھ دن کے لیے اس کی اس کشتی میں رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اسے معقول کرایہ دے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ہم ابھی اور اسی وقت اس سے یہ کشتی خریدنا چاہیں تو پھر؟ پہلے تو وہ نہیں مانا لیکن جب میں نے اسے کشتی کی قیمت سے قریباً ڈھائی گنا زیادہ رقم آفر کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے کرنسی نوٹوں کو لالٹین کی روشنی میں ایک ایک کر کے بڑے دھیان سے دیکھا اور پھر ایک جگہ کشتی کے تالوں کی چابیاں ہمارے حوالے کر کے نیچے اُتر گیا۔ اس کا سارا سامان بھی کشتی کے اندر ہی رہا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صبح کے ملگجے اندھیرے میں کہیں گم ہوگیا۔

اب یہ خوبصورت کشتی ہماری تھی۔ ہم ایک بانس نما چپو کی مدد سے اسے جس طرف چاہے لے جا سکتے تھے اور ہم تاریک جنگل میں اسے بہت دور تک لے گئے۔ پھر ندی میں سے ایک اور شاخ پھوٹی۔ یہ شاخ ہمیں تیزی سے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی ایک نامعلوم مقام پر لے گئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں ہمارے اور جنگلی حیات کے سوا اور کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی کبھی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں پانی پر ہزار ہا کنول تیرتے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان آبی پرندوں کی مستیاں تھیں۔ جنگل سے موروں کی ''میں آؤں...... میں آؤں'' سنائی دیتی تھی اور شاخوں پر رنگ برنگے طوطے چہکتے تھے۔ ہم نے کشتی کو ایک خاموش کنارے پر ٹھہرا دیا۔''

ذرا توقف کر کے باروندا جیکی نے دو گھونٹ لیے۔ اس کی آنکھوں میں یادوں کے خوش رنگ جگنو چمک رہے تھے۔ وہ بولا۔''میں ان دنوں شراب نہیں پیتا تھا۔ ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا لیکن مجھے اتنا نشہ تھا جو اس واٹ 69 کی دس بوتلیں ایک ساتھ پی لینے سے بھی نہیں ہوسکتا۔ نہیں ہوسکتا اور اس نشے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں خوشبو تھی، آنسو تھے اور ان آنسوؤں کی نمی سے خوشبوؤں کی کلیاں چٹکتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جگہ قدرت نے روزِ ازل سے ہمارے لیے ریزرو کر رکھی تھی۔ ہماری محبت کے لیے...... ہمارے ملن کے لیے۔ ہم زمان و مکاں...... کے احساس سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ہجر کی بے رحم سختیوں نے طلب کی شدت کو انتہا پر پہنچایا تھا اور اب طلب کی اس انتہا نے سرشاری اور کیف کا ایک جہاں آباد کر دیا۔ ہم یوں ملے کہ پیار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ہاں میرے دوست! کبھی زمین اس طرح دیوانہ وار آسمان سے نہ ملی ہوگی، اور نہ کبھی تابڑ توڑ بارش نے اس طرح صحراؤں کو جل تھل کیا ہوگا۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ ان روز و شب کے بارے میں شاعری کروں...... اگر میں ایسا کر سکتا تو وہ شاعری بے مثال ہوتی۔ وقت اسے مٹا سکتا اور نہ بھلا سکتا۔''

باروندا جیکی کی گدلی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے ان روز و شب میں کھو گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک چیمپئن فائٹر کم اور ایک شاعر زیادہ نظر آیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ میں چاہتا تھا کہ نشہ اُترنے سے پہلے پہلے وہ اپنی کہانی ختم کر لے۔

اس نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔''ہم اس کشتی میں پورے سات روز رہے۔ شکنتلا کے شباب نے مجھے سیراب کر دیا اور میری انوکھی محبت کی شدت نے اسے ہر فکر بھلا دی۔ ہم نے کشتی کا کچھ سامان تو چرندوں پرندوں کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا

تھا اور کچھ کشتی کے ایک گوشے میں سمیٹ دیا تھا۔ ہم کشتی کے چھوٹے سے ڈیک کو سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور تیز بارش کے وقت بیسمنٹ میں چلے جاتے تھے۔ وہاں نیچر کے سوا ہمیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا اور کبھی کبھی لگتا تھا کہ نیچر بھی ہماری ہم مزاج ہو گئی ہے۔ ایک دن سرخ بالوں والا ایک بہت بڑا ریچھ ندی میں اُتر آیا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ میں نے پستول نکال لیا لیکن وہ کچھ دیر تک ہمارا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا۔ ایک رات پانی میں تیرنے والا ایک سانپ ہمارے ساتھ کشتی پر موجود رہا لیکن اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ خوراک کی خوشبو مختلف پرندوں کو ہمارے قریب لے آتی تھی اور ہم انہیں مایوس نہیں کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہم تادیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تلاش کرنے والے اس جنگل میں ہر طرف پھیلے ہوں گے اور وہ بہت جلد اس دور افتادہ گوشے تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شکنتلا بھی یہ جانتی تھی لیکن ہم ان باتوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ شکنتلا چاہتی تھی کہ اگر ایسا وقت آ گیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی مار دوں۔ لیکن میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا، زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بنا رکھا تھا اور میں نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر بُرا وقت آ گیا تو وہ میری ایک بات ضرور مانے گی۔

اور پھر ایک رات وہ بُرا وقت آ گیا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں لیٹے تھے۔ تاریک آسمان پر تاروں کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا اس کشتی کو چھوڑ کر جنگل میں راستہ بنانے کی کوشش کرنا ٹھیک رہے گا؟ اچانک کچھ آوازیں ہوا پر تیر کر ہم تک پہنچیں۔ یہ پانی پر چپو پڑنے کی آوازیں تھیں، کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے۔ پھر میں نے دور نیم تاریکی میں تین کشتیوں کو دیکھا۔ یہ لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کشتیوں کی بناوٹ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حکم جی کے لوگ ہیں اور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچے ہیں۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھے، میرے ذہن میں جو پلان تھا میں اس پر عمل کر سکتا تھا۔ اب شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہو لیکن میں تمہیں جو بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔‘‘

’’مجھے یقین ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ’’میں ایک دم شکنتلا پر پل پڑا۔ میں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے، اس کے منہ پر زوردار طمانچے مارے، اس کے جسم کو نوچ لیا۔ وہ گر پڑی۔ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ تھی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ پا رہی تھی جیکی...... جیکی...... میں نے اسے اوندھا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ چند دن پہلے جنگل میں

بھاگنے کے دوران میں اس کے بازوؤں پر زخم آئے تھے، یہ زخم پھر رسنے لگے۔ میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔ ’’شکنتلا! مجھے معاف کر دینا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ مجھے انکار نہ کرنا اور تم نے وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ انکار نہیں کرو گی۔‘‘

’’اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ’’وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔ ہم کو پکڑ لیا جائے گا۔ دونوں کو سزا ملنے سے بہتر ہے کہ کوئی ایک بچ جائے۔ میرا بچنا تو بہت مشکل ہے لیکن تم بچ سکتی ہو۔ میری خاطر شاکن...... صرف میری خاطر...... تم نے ان لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ تم اپنی مرضی کے ساتھ نہیں آئی ہو۔ میں تمہیں زبردستی لایا ہوں۔ پلیز شاکن! انکار نہ کرنا۔‘‘

وہ سرتاپا احتجاج بن گئی۔ وہ دلدوز انداز میں کراہی۔ ’’میں ایسا نہیں کر سکتی...... کبھی نہیں کر سکتی۔‘‘

’’میں نے اس کے خون آلود ہونٹوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ سختی سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ میں نے اسے اپنے سر کی قسم دی اور اسے لاچار کر دیا، ہاں...... میرے دوست! اسے لاچار کر دیا۔‘‘

جیکی کی آنکھوں میں اب مسرت کے جگنو بجھ چکے تھے، واقعے کی مناسبت سے اب اس کے چہرے سے گہرا اندوہ جھلک رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ’’ہمیں پکڑ لیا گیا۔ مجھے کشتی پر ہی گرا لیا گیا۔ وہ درجنوں لوگ تھے۔ میں جانتا تھا کہ مزاحمت بیکار ہے۔ انہوں نے میرا پسٹل چھین لیا۔ مجھے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ میری ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ میں وہیں کشتی پر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

ہوش آیا تو خود کو زرگاں کی بدنام جیل میں پایا۔ اس جیل کا انچارج جارج گورا جیسا سفاک شخص تھا۔ مجھے ایک زمین دوز کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا رابطہ فقط ایک شخص سے ہوتا تھا۔ یہ مجھے کھانا پہنچاتا تھا اور پھر خالی برتن لے جاتا تھا۔ میرے جسمانی زخم مجھے دن رات تڑپاتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ جارج گورا بہ نفسِ نفیس میری کوٹھڑی میں آیا۔ اس نے کہا۔ ’’موت کی سزا تیرے جرم کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ تجھے مر مر کر جینا ہوگا۔‘‘ جارج کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو آج کل ماریا کا شوہر ہے۔ سرجن اسٹیل بریرے۔ وہ کہنے کو سرجن ہے لیکن فطرت میں بے رحم قصاب ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا میڈیکل باکس بھی تھا۔ مجھے ایک انجکشن دیا گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میرا بایاں بازو اور دائیں

ٹانگ جسم کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعی یہ مر مر کر جینے جیسا تھا۔ میرا فن میری زندگی تھا اور مجھے اس فن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں اس کال کوٹھڑی میں چھ مہینے تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ مجھے اَن گنت جسمانی و ذہنی اذیتیں جھیلنا پڑیں۔ یہاں تک کہ میں جاں بلب ہو گیا۔ مجھے رات کے وقت انتہائی تیز بخار ہونے لگا، اس کے علاوہ میرے بازو کا زخم بھی ٹھیک ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک رات سخت بے ہوشی کی حالت میں مجھے جیل کے شفا خانے میں پہنچایا گیا۔ میں اس شفا خانے میں قریباً ایک ماہ رہا۔ یہاں سیکیورٹی کا وہ انتظام نہیں تھا جو جیل میں تھا۔ میرے پہرے پر صرف دو افراد ہوتے تھے۔ وہ دونوں ہندو تھے۔ وہ دیوالی کی رات تھی۔ زبردست آتش بازی کی وجہ سے کچھ ہوائیاں شفا خانے کے اندر آ گریں اور شفا خانے کے ایک حصے میں آگ بھڑک اُٹھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میرے دونوں پہریدار تہوار کی وجہ سے اندادھند پیئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی مدہوشی اور آتشزدگی کا فائدہ اُٹھایا اور ایک خطرناک کوشش کر کے شفا خانے سے نکل گیا۔''

اس نے ایک بار پھر توقف کر کے میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''اگر تفصیل میں جاؤں گا تو یہ روداد طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ فرار کے بعد میں تین ماہ تک ایک مہربان پارسی عورت کے گھر میں چھپا رہا۔ وہ گھر میں شراب تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ وہیں پر مجھے شراب کی لت بھی لگی۔ وہیں پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شکنتلا اب کس حال میں ہے۔ کیا تم جاننا چاہو گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

''کیوں نہیں۔''

''وہ حکم کی پتنی نہیں بن سکی لیکن پھر بھی حکم نے اسے چھوڑا نہیں۔ وہ حکم کی پسند تھی اور وہ اس کے ساتھ ''سونے'' کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

جیکی کے چہرے پر عجیب طنزیہ مسکراہ پھیل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''حکم جیسے لوگ ارادے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ وفاداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور یہ وفاداری ہوتی ہے اپنی حرص اور خواہش کے ساتھ۔ اپنے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسے لوگ وہ ہر نیک کام کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد حکم، شکنتلا کو اپنی پتنی کا درجہ تو نہیں دے سکتا تھا لیکن وہ اس کے پُرکشش جسم سے یکسر محروم ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی خوبصورتی اور اس کی بے مثال زلفوں کا اسیر تھا۔ اس نے

ایک درمیانی راستہ نکالا۔ شکنتلا کے ڈرے سہمے پتا اشوک ساہنی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو ''فیری'' بنا دے۔ فیری بننے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟''

''نہیں...... مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔''

''حکم اور اس کے حواریوں نے اپنے عوام کی دنیا اور عاقبت سنوارنے کے لیے بڑا اعلیٰ انتظام کیا ہوا ہے۔ شاید تم نے ساتویں کے جشن کے بارے میں سنا ہو؟ اس عالیشان جشن کے موقع پر راج بھون کے بڑے ''پاکیزہ'' قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ یہ انتظامات درحقیقت حکم اور اس کے درویش صفت دوستوں کی خوشی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ درویش صفت لوگ اسٹیٹ کی بہتری کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں، اپنا خون جلاتے ہیں۔ اگر یہ ساتویں کے جشن کے موقع پر آٹھ نو روز شراب وغیرہ پیتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ تفریح وغیرہ کر لیتے ہیں تو ایسا کیا بُرا کرتے ہیں؟ اور یہ سب کچھ بڑے شفاف طریقے سے ہوتا ہے بھئی۔ پرانے زمانے سے یہ ریت چلی آ رہی ہے۔ جشن کے موقع پر راجواڑے میں سے سات رنگوں کے مطابق سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ انہیں فیریاں یا اردو میں پریاں کہا جاتا ہے۔ یہ فیریاں پھر راج بھون کے اندر ہی رہتی ہیں۔ انہیں اُٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ فنون کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں ظاہر ہے کہ ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پُرانے زمانے کا تو پتا نہیں لیکن آج کل یہ فیریاں حکم کی رکھیلیں ہی سمجھی جاتی ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے یا اپنے قریبی دوستوں کے تصرف میں لا سکتا ہے۔ اب شکنتلا بھی ایک فیری کی حیثیت سے حکم کے حرم میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اس کی زندگی راج بھون کی اونچی دیواروں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے گم ہے۔''

اپنی اندرونی تلخی کو کم کرنے کے لیے اس نے تھوڑی سی مزید ''سیال آگ'' اپنے معدے میں اُتاری اور اپنا سر سرنگ کی کھردری دیوار سے ٹکا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم اس مچھیرے کی کشتی تک کیسے پہنچے؟ کہیں یہ وہی کشتی تو نہیں......''

''ہاں...... یہ وہی کشتی ہے۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''اسی کشتی میں، مَیں نے اپنی زندگی کے بہترین سات آٹھ روز گزارے تھے۔ یہ کشتی اب پُرانی ہو چکی ہے لیکن اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر، ہر ہر انچ پر میری محبت کی یادگاریں ہیں۔ اس کی حسین سرگوشیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے میں نے یہ کشتی ڈھونڈ لی ہے۔ میں اس کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا...... ایسا نہ ہو سکا دوست تو میں اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی راحت سے محروم ہو جاؤں گا یہ محرومی مجھے مر کر بھی چین سے نہیں رہنے دے

گی۔اسی لیے تو کہتا ہوں، میری مدد کرو۔ مجھے واپس پہنچا دو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز میں التجا کا رنگ آ گیا۔

میں نے پوچھا۔'' کیا تم نے کبھی اس اسٹیٹ سے بھاگ جانے کی کوشش نہیں کی؟''

'' مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں کے جغرافیے اور حالات سے زیادہ واقف نہیں ہو۔ اس اسٹیٹ کو تین طرف سے ایک چوڑے پاٹ والی بہت تیز رفتار ندی نے گھیر رکھا ہے۔اس ندی کے ساتھ ساتھ نگرانی کا سخت انتظام ہے۔ چوتھی طرف یہ جنگل ہے۔ اس طرف سے بھی اسٹیٹ کے بارڈر کو تقریباً ''سیل'' کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی میرے جسم کی حالت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔اس آدھے جسم کے ساتھ میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ جب میں پارسی عورت ہوشن کے پاس تھا، میرے دل میں کئی بار آئی کہ ہوشن کی پناہ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ ہوشن نے بڑا حوصلہ کر کے مجھے پناہ تو دے دی تھی لیکن وہ ڈرتی بھی رہتی تھی۔ اس کے ڈر کی وجہ یہ وہم ہی تھا کہ حکم جی کے خاص قیدی اس گرفت سے نہیں نکل سکتے اور وہ جہاں بھی چلے جائیں، ان کو کھوج لیا جاتا ہے۔شاید تم نے بھی یہ بات سنی ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی ان خاص قیدیوں میں سے ایک ہوں اور مجھے بھی ایک جدید ''جادو'' کے ذریعے اس اسٹیٹ کے اندر جکڑ لیا گیا ہے۔

باروندا جیکی نے کہا۔'' اسے حکم کے روحانی کرشموں میں سے ایک کرشمہ کہا جاتا ہے لیکن اس کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں۔ کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین رکھتے ہو؟''

'' رکھتا بھی ہوں...... اور نہیں بھی...... اس معاملے میں بہت سے لوگوں کی طرح درمیان درمیان میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

'' بہر حال میں تمہیں اپنی محسنہ ہوشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی تھی کہ کسی دن اس کے گھر کے دروازے پر حکم کے بے رحم ہرکاروں کی دستک ہو جائے گی۔ وہ بیچاری بیمار رہنے لگی تھی۔ پھر ایک روز میں نے بڑی خاموشی سے اس کا گھر چھوڑ دیا۔ میرے پاس دو تین ہفتوں کی خوراک موجود تھی اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی تھا۔ میں کئی روز تک جنگل میں چھپا رہا۔ پھر میری ملاقات چند مچھیروں سے ہوئی۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ میں نیپالی اور انگریزی کے سوا کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ یہ زبان نہیں سمجھتے تھے۔ بس اشاروں سے گزارہ ہوتا تھا۔ میں بیمار رہتا تھا۔ بازو کا زخم

مسلسل رہتا تھا۔شراب میری سخت ضرورت بن چکی تھی۔ بہر حال مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ میں سو سال زندہ رہ کر بھی شاید وہ کچھ حاصل نہ کر پاتا جو میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی زندگی میں حاصل کر لیا ہے۔ شکنتلا کے ساتھ گزارے ہوئے دن میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان دنوں کی خوبصورت یادوں کے سہارے میں جیتا رہا ہوں اور ان یادوں کے سہارے ہی اب مرنا بھی آسان لگ رہا ہے۔ ان مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش جاگی تھی کہ میں اس نیلی کشتی کو ڈھونڈوں جس میں، میں نے شکنتلا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مقامی شخص نے بھی میری مدد کی۔ آخر میں کامیاب ہوا۔ مجھے وہ کشتی مل گئی۔ مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میں کام بھی کیا کرتا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع تھی اور پستول بھی تھا۔ میں نے یہ سب کچھ کشتی کے موجودہ مالک ملاح سیوک رام کو دے دیا اور اس سے اجازت لے لی کہ میں جب تک زندہ ہوں، اس کشتی میں رہوں گا اور وہ مجھے کھانا اور شراب دیتا رہے گا۔ وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس نے اقرار کر لیا۔ تو یہ ہے میری کہانی......''

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے جیکی کی سانس پھول گئی اور آواز پھر سے لڑکھڑانا شروع ہو گئی۔ دراصل اب اس کا نشہ ذرا دھیما پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے بغیر اس کی وہی حالت ہو جاتی تھی جو کسی نارمل شخص کی نشے میں دھت ہو کر ہو سکتی ہے۔ وہ کسی لاغر کیچوے کی طرح پیوند زمین ہو جاتا تھا اور اس کی آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔

اس کی کہانی متاثر کن تھی۔ مجھے اس کہانی نے شاید اس لیے بھی زیادہ متاثر کیا کہ میں خود بھی دل کا روگی بن چکا تھا۔ ثروت میری محبت تھی اور وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سالوں میں پلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ یہاں سلطانہ مجھے اپنی بیوی بتاتی تھی۔ وہ ایک دلیر لڑکی تھی۔ اس میں کچھ انوکھی باتیں موجود تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ کبھی زیور نہیں پہنتی تھی۔ شاید وہ زیور کو عورت کے لیے غلامی و محکومی کی علامت سمجھتی تھی۔ وہ میری زندگی کی خاطر عارضی طور پر جارج گورا کے ہاتھوں بے بس تو ہو گئی تھی لیکن جہاں تک میں اسے سمجھا تھا، وہ ظلم سہہ کر بھول جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اسے جب بھی موقع ملے گا وہ کچھ کر کے رہے گی۔

چند منٹ تک میرے اور باروندا جیکی کے درمیان اس کی روداد کے بارے میں سوال جواب ہوئے۔ تب میں نے ایک بار پھر اسے سابقہ موضوع کی طرف لانا چاہا۔ میں نے اس کی جلد کو چھوتے ہوئے کہا۔'' جیکی! تم ایک مختلف شخص ہو۔ تمہارے جیسے چیمپئن فائٹر کو ایسا ہی

ہونا چاہیے تھا۔''

''تم......کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہارے اندر جسمانی تکلیف سہنے کی بے پناہ گنجائش ہے۔ اس بیمار حالت میں بھی تم برداشت کے معاملے میں بے مثال ہو۔ تم اس بارے میں مجھے بھی کچھ بتانے جا رہے تھے لیکن پھر درمیان میں تمہاری یہ دلچسپ روداد آ گئی۔''

اس نے نفی میں انگلی ہلائی۔ ''میں مرنے والا ضرور ہوں لیکن میری یادداشت زیادہ کمزور نہیں ہوئی۔ میں اب بھی تمہیں بتا سکتا ہوں کہ الزبتھ ٹیلر کے چوتھے شوہر کا نام کیا تھا اور پرل ہاربر کی بندرگاہ پر کس تاریخ کو حملہ ہوا تھا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بتانے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن آج نہیں کل...... کل تم پھر میرے لیے شراب اور ہنٹر بیف کا ایک ''پیس'' لاؤ گے۔ ہم یہاں اس سینڈ بیگ کے قریب اطمینان سے بیٹھیں گے اور مارشل آرٹ کے بارے میں بات کریں گے۔''

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز میری آنکھ دس گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک بار پھر ہنگامہ برپا تھا۔ انور خاں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف دہانے کے باہر سے کسی اور شخص کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ شخص حکم کے اہلکاروں میں سے تھا اور انور خاں سے زوردار مکالمہ کر رہا تھا۔

اس مکالمے سے پتا چلا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ نے ماریا کے وارثوں کو اٹھارہ گھنٹے کی جو دوسری مہلت دی تھی۔ وہ بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ انور خاں چنگھاڑ رہا تھا۔ ''ہم سمجھ گئے ہیں۔ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ تم ہمارے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں چھوڑ رہے کہ اس حرامزادی کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیں اور یہ بس اب ہونے ہی والا ہے۔''

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''میں تمہیں پھر پیشکش کرتا ہوں۔ تم مسٹر اسٹیل اور گرومودان کو اپنے پاس ضمانت کے طور پر رکھ لو لیکن میم صاحبہ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سارا معاملہ بات چیت کے ذریعے طے کر سکتے ہیں۔''

''ہم تمہارے کہنے سے پہلے ہی میم صاحبہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن یہ ایک ٹکڑے میں تمہارے پاس نہیں آئے گی۔ تھوڑی تھوڑی کر کے آئے گی۔'' انور خاں نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''پہلے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں آئیں گی۔ پھر پاؤں کی...... پھر کوئی

اور ٹکڑا۔''

''تم خود کو مسلمان کہتے ہو؟'' بھاری بھرکم آواز والے نے کہا۔

''ہاں...... ہم مسلمان ہیں...... اور اسی لیے اس کی عزت بچی رہی ہے۔ ورنہ یہ بھی مختار راجپوت کی بیٹی کی طرح تاراج ہو چکی ہوتی۔ باقی رہی اس کے ٹکڑوں کی بات...... تو انصاف تو یہی کہتا ہے۔ کان کے بدلے کان...... آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اس کتے جارج نے اپنی جیل میں کتنے لوگوں کو اعضاء کاٹ کر بے کار کیا ہے؟ آج اس کی بہن کو تھوڑا سا بدلہ چکانا ہو گا۔''

ماریا کے شوہر سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔ ''دیکھو...... تم لوگ اپنے لیے بدترین انجام کو Choose کر رہا ہے۔ ہم تمہارا ڈیمانڈ مان رہا ہے۔ سلطانہ کے بھائی اور فادر کو چھوڑا جا رہا ہے۔ ہام نے آج تمہارا یہ ڈیمانڈ بھی مانا کہ جن 50 لوگوں کا لسٹ تم نے دیا، اس میں سے 5 لوگوں کو ریلیز کر دیا جائیں گا لیکن باقی لوگوں میں سے کچھ تو ایسا ہے جو ہماری کسٹڈی میں نا ہیں اور دو چار ایسا ہے جن پر بہت سخت کیس ہے۔''

''کیس تو تم پر بھی بہت سخت ہے اسٹیل صاحب۔'' اسحاق بھر کر دھاڑا۔ ''ایسے کیسوں کے بدلے تمہاری اپنی پتنی کو دس بار بھی پھانسی دی جائے تو کم ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہ زیادہ دیر زندہ رہنے والی نا ہیں ہے۔ بس اب گھنٹوں کی نا ہیں، منٹوں کی بات ہے۔''

''پانڈے! میری بات سنو۔'' گرومودان نے اپنے کسی ساتھی کو پکارا۔

''آ رہا ہوں سر۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ یہ بھاری آواز والا وہی تھا جو انور سے مکالمہ کر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے یہ نام میڈم صفورا نے بتایا تھا۔ ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ رنجیت پانڈے، غالباً حکم کا وہی اہلکار تھا۔ جسے دشمنوں کے لیے عزرائیل کہا جاتا تھا اور وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔

O......❖......O

میں نے پانڈے کی بس ایک ہی جھلک دیکھی اور وہ بھی عقب سے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا اور چھلانگ لگا کر ایک نشیب میں اوجھل ہو گیا۔ وہ خاصا تنومند تھا۔ اس نے پینٹ اور چمک دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ غالباً گرومودان سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے نشیب میں اُترا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل بھی وہیں موجود ہو......

اس تبادلۂ خیال کا نتیجہ پانچ دس منٹ بعد سامنے آ گیا۔ پانڈے کی بھاری بھرکم کرخت آواز ایک بار پھر درختوں کے عقب سے اُبھری۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ''انور خاں! ہم ناہیں چاہت کہ تم کسی طرح کی حماقت کرو اور اس کے نتیجے میں سب کچھ برباد ہو جائے۔ گرومودان خون خرابے سے بچنے کے لئے ہر حد تک جانا چاہت ہیں۔ تم نے پچاس لوگن کی جولسٹ دی ہے، ان میں سے آدھے تو ہمارے پاس آ گئے ہیں لیکن باقیوں کا کچھ پتا ناہیں۔ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی مزید کوشش کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر کچھ لچک پیدا کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل دوپہر تک تم لوگن کو کوئی حتمی جواب دے سکیں گے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تم صرف وقت گزاری کر رہے ہو۔'' انور خاں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ''تمہاری فطرت دھوکا ہے پانڈے......اور تم اس کے خلاف نہیں چل سکتے ہو۔ مگر میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ ہمیں تو مرنا ہی ہے لیکن یہ میم صاحب بھی زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ میرا تم سے اور اسٹیل......مودان وغیرہ سے وعدہ ہے۔'' انور کی آواز میں حد درجے کی تپش تھی۔

سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔ ''ہام ماریا کا لائف بچانا چاہتا اور اس کے ساتھ تمہارا سب کا لائف بھی بچانا چاہتا۔ ہام ہوپ کرتا ہے کہ کچھ طے ہو جائے گا۔ ہام کی طرف

سے پرامس ہے کہ کل دوپہر تک کسی طرح کا کوئی کارروائی ناہیں ہوگا۔ تم لوگ بھی خود کو COOL رکھو۔''

انور خاں......سرجن اسٹیل اور پانڈے کے درمیان اس حوالے سے دو چار منٹ بات ہوئی پھر انور خاں کل دوپہر کا مزید وقت دینے کو تیار ہو گیا۔

یہ بڑی سخت قسم کی اعصابی جنگ تھی۔ ہر ہر پل جیسے سُولی پر گزر رہا تھا۔ دونوں طرف سخت تناؤ موجود تھا۔ ایسی صورتِ حال میں کامیاب فریق وہی ہوتا ہے جو اعصاب کو ٹوٹنے سے بچائے رکھتا ہے اور اندازہ ہوتا تھا کہ انور خاں اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی چل رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے کی بشاشت قائم رکھی ہوئی تھی۔ گفتگو کے آخر میں انور خاں نے ماریا کے لئے تین بوتل شراب کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ مطالبہ میرے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسی وقت شراب کی سربمہر بوتلیں اندر سرنگ میں بھجوا دیں۔

گفتگو ختم ہوئی تو میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ پانڈے وہی ہے جو انڈین سیکیورٹی فورس میں افسر تھا اور اب یہاں حکم کے لئے کام کرتا ہے؟''

''وہی ہے حرامی......'' انور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس کے یہاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم اور جارج وغیرہ دونوں راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت کا......اور کسی اچانک کارروائی کا بھی۔ پانڈے اور اس کے ساتھی ایسی اچانک کارروائی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور سے یہ پانڈے کسی لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خطرناک ہے۔ ہمیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔''

اسحاق نے کہا۔ ''میری تو رائے ہے کہ دستی بموں میں سے دو چار بم اس خبیث ماریا کی کمر سے بھی باندھ دیئے جائیں اور پانڈے وغیرہ کو بھی بتا دیا جائے کہ ماریا کس حال میں ہے۔''

''چلو اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔'' انور خاں نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''لیکن ماریا ہے کہاں؟''

اسحاق بولا۔ ''وہ اُدھر بیٹھی اپنی روٹی پکا رہی ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ یہاں ڈبل روٹی اور کیک پیسٹری ناہیں ملیں گی......روٹی ہی ملے گی اور یہ روٹی بھی اسے خود پکانا ہووے گی۔''

میں نے دیکھا کہ سرنگ کے خم پر جہاں عارضی باورچی خانہ بنایا گیا تھا، وہاں سے

دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے جا کر دیکھا اور یقین ہو گیا کہ بھوک انسان سے سب کچھ کروا سکتی ہے۔ سفید فام ماریا کے پاؤں زنجیر میں بندھے ہوئے تھے لیکن ہاتھ آزاد تھے۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور اوپر توا رکھا تھا۔ ماریا جس نے شاید کبھی تنکا پکڑ کر بھی دہرا نہیں کیا ہو گا، اپنے لئے روٹی پکا رہی تھی۔ پچھلے دو تین دن میں اسے کافی مشق ہو گئی تھی۔ توے پر ایک گول روٹی نظر آ رہی تھی۔

اسحاق میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میم جی کو کافی تجربہ ہو گیا ہے۔ اب ان پر کچھ اور ذمے داری ڈال دینی چاہئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی، یہ سارا دن بیٹھ کر ہمیں گھورنے کے سوا اور تو کچھ کرتی ناہیں۔ ہم چھ سات بندوں کے لئے اگر چودہ پندرہ روٹیاں اُتار دیا کرے گی تو کون سی قیامت آ جاوے گی؟ اس کی اپنی روٹی بھی ہضم ہو جایا کرے گی۔''

ماریا، اسحاق کی بات مکمل سمجھ گئی تھی لیکن سنی اَن سنی کر گئی۔ اس کے چہرے کی سرخی سے ظاہر تھا کہ اس کا پارا چڑھ رہا ہے لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور صحت مند جسم رکھتی تھی۔ کل باروندا جیکی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک وقت میں جوڈو کراٹے بھی سیکھتی رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ جوڈو کراٹے میں اسے مہارت تھی یا نہیں مگر اس کے ڈیل ڈول اور تاثرات سے دکھائی دیتا تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت سخت قسم کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ بہر حال، ابھی تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہوا تھا اور وہ خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

ہمیں اپنے قریب دیکھ کر وہ جھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے روٹی اُتار کر ایک طرف رکھی اور سالن گرم کرنے کے لئے توا اُتارنا چاہا۔ جب وہ توا اُتار رہی تھی، وہ ایک دم لڑھک گیا اور گھوم کر اس کے پاؤں پر آیا۔ وہ چلا اُٹھی...... اور پھر ''او گاڈ...... او گاڈ'' کی گردان کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ توے نے اس کے سفید گلابی پاؤں کو آتشیں بوسہ دیا تھا اور انگلیوں سے اوپر کی ساری جگہ سرخ نظر آ رہی تھی۔ ماریا کی آوازیں سن کر چوہان اور ہمیش بھی وہاں آ گئے۔

چوہان نے اس کا متاثرہ پاؤں دیکھ کر کہا۔ ''ماریا کے بیگ میں ایک دواؤں والا شاپر پڑا ہے، وہ لے کر آؤ۔''

ہمیش بیگ کی طرف بڑھا۔ ماریا ایک دم بھڑک کر انگریزی میں بولی۔ ''مجھے نہیں چاہئے دوا۔ مجھے نہیں چاہئے تمہاری ہمدردی۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے زہر کا کوئی انجکشن لگا دو

تا کہ میری جان چھوٹ جائے۔''

اسحاق پھنکارا۔ ''تم ابھی سے گھبرا گئی ہو میم جی! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی پورا پورا حساب کتاب ہونا ہے اور جو کچھ ہوا ہے یہ تو ''حساب'' کا عشرِ عشیر بھی ناہیں۔ بس ایک چھوٹی سی مثال سن لو۔ جس ملازم لڑکے کو تم نے طوطوں کو خوراک نہ دینے کی پاداش میں بھوکا مار دیا تھا، یہ اس کی ایک گھنٹے کی بھوک پیاس کا بدلہ بھی ناہیں ہے۔''

اس مرتبہ وہ گلابی اردو میں بولی۔ ''اسی لئے تو ہام تو م سے کہتا ہے کہ ہام کو مار ڈالو۔ تمہارا سارا ہی بدلہ ایک بار میں پورا ہو جائے۔''

''موت اتنی آسان ناہیں ہے میم جی۔'' اسحاق پھنکارا۔ ''میں نے اپنی بہن کو ایک ایک سانس کے لئے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ کیا تم نے کبھی ہانپی ہوئی پیاسی چڑیا کو دیکھا ہے؟ وہ اسی طرح سانس لیوت تھی اور وہ تھی بھی تو ایک چھوٹی سی چڑیا کی طرح...... تمہارے بھائی کی شکرہ آنکھوں نے اسے شکار کے لئے چنا...... اور پھر اس کے بے رحم پنجوں نے اس کے جسم کو لہولہو کر ڈالا۔ وہ اس کے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے جیون کی ریکھا ہی پار کر گئی۔ ہاں، میں نے اسے مرتے دیکھا ہے اور میں جانت ہوں کہ جان دینا آسان ناہیں۔''

اسحاق کے لہجے میں اتنی آگ تھی کہ چاروں طرف انگارے برستے محسوس ہوئے...... ماریا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اسحاق پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ وہاں کھڑا رہا تو طیش کے دریا میں بہہ جائے گا اور وہ اس طیش کی وجہ سے پٹ جائے گی۔

انور خاں آگے بڑا اور اس نے ماریا کو بہ مشکل آمادہ کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر دوا لگوا لے۔ وہ برے برے منہ بنا رہی تھی۔ میں اس کے قریب چوکس کھڑا تھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی اور میری انگلی ٹریگر کے آس پاس تھی۔ ماریا کے ہاتھ فی الحال کھلے ہوئے تھے اور یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ طیش کے عالم میں کسی پر جھپٹ پڑتی۔ پچھلے چند دن میں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کی طرف سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سرنگ کے دور افتادہ کونے سے باروندا جیکی کا واویلا سنائی دے رہا تھا۔ وہ نشے کے بغیر تڑپ رہا تھا اور اس کی وہی تلخی اور جھلاہٹ واپس آ چکی تھی جس کا مشاہدہ ہم نے کشتی میں کیا تھا۔

احمد نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''تابش بھائی! تمہارا یار بہت بے چین ہووت ہے۔ وہ کہوت ہے، میں مرنے والا ہوں۔ اگر میں پیاسا مر گیا تو تم سب جہنم میں جاؤ گے۔''

''وہ جس طرح کا پانی مانگ رہا ہے، وہ دے کر بھی تو ہم جہنم میں ہی جائیں گے۔'' چوہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انور خاں بولا۔ ''اس کی پیاس ذرا بڑھنے دو، پھر وہ اندر کی باتیں بتانے پر مجبور ہوگا۔''

میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ شام تک اس کی تڑپ ذرا بڑھ جائے تو پھر اسے ''مہیا'' کی جائے۔ اندر جیکی کا واویلا تھا اور باہر ان کتوں کی آوازیں تھیں جو پانڈے اور اسٹیل کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر بارونڈا جیکی کے پاس تھا۔ آج وہ خلاف معمول دراز ہونے کے بجائے ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دیتا تھا۔ ''جیکی!'' میں نے کہا۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور بے حرکت بیٹھا رہا۔

''جیکی...... جیکی!'' میں نے دہرایا لیکن صورتِ حال جوں کی توں رہی۔

یکا یک مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ عدم آباد ہی روانہ نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ وہ جیسے اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری جھلاہٹ اُبھری۔ وہ نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم کہاں سے آ گئے ہو؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟ دفع ہو جاؤ...... دفع ہو جاؤ۔''

''تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ میں تابش ہوں۔''

''تابش ہو تو میں کیا کروں؟'' اس پر بدستور جھلاہٹ سوار تھی۔

''دیکھو، میں یہ کیا لایا ہوں۔'' میں نے وہسکی کی چم چم کرتی بوتل لالٹین کے رخ پر رکھ کر اسے دکھائی۔ اس کی تلخی ایک دم کم ہو گئی۔

اس نے آنکھیں موند کر دو تین گہری سانسیں لیں پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بہت دور گیا ہوا تھا...... وہ میرے بہت پاس تھی۔ ہم اس خاموش پانی کے کنارے پر تھے اور وہاں سیکڑوں کنول کھلے ہوئے تھے۔ تم نے...... سارا طلسم توڑ دیا......'' شاید وہ مایوس لہجے میں کچھ اور بھی کہتا مگر پھر اس کی نظر بوتل پر پڑ گئی۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس نمایاں ہونے لگی۔

''تم کس طلسم کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''محبت کے طلسم کی!'' اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ ''جب میں بہت تنہا ہوتا ہوں...... دکھ کی آخری حدوں کو چھو رہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس چلی آتی ہے۔ اسی لباس میں جس میں، مَیں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا...... اور اسی لباس میں جس میں وہ سات آٹھ روز میرے ساتھ کشتی پر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور سرسبز جنگل میں پانی کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیتی ہے۔ ہنستی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنا وزن میری بانہوں پر ڈال کر لہراتی ہے۔ اس کے بال بہت لمبے ہیں...... وہ کسی سیاہ آنچل کی طرح ہوا میں جھومتے ہیں اور مچلتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر کرنیں موتی بکھیرتی ہیں اور اس کی شربتی آنکھوں میں پھولوں اور تتلیوں کے سارے رنگ اُتر آتے ہیں۔ وہاں فطرت کے سوا ہمیں کوئی نہیں دیکھتا اور فطرت بھی ہماری ہم مزاج ہو جاتی ہے۔ رات کی پھیلتی ہوئی چادر میں ہم اپنی کشتی کے اندر چلے جاتے ہیں اور اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ...... محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا......''

''مجھے افسوس ہے دوست کہ میں نے تمہیں تمہارے تصور سے دور کر دیا۔'' میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں۔ اس کو تصور مت کہو۔ یہ تو حقیقت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے جسم اور لباس کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتا ہوں...... جیسے اب۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔ میں اسے سونگھ رہا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنی سانس اندر کی طرف کھینچی۔

شاید وہ اس بارے میں کچھ دیر مزید بات کرتا لیکن اب شراب کو اپنے سامنے دیکھ کر اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہی روز والا عمل پھر شروع ہوا۔ میں وہ سیال آتش، گلاس میں بھر بھر کر اسے دیتا رہا اور وہ یہ تلخ بدبو اپنے گلے میں اُتارتا رہا۔ آخر اس کا نشہ پختہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ اور ناتوانی ختم ہونے لگی۔ مدقوق چہرے پر برسنے والی ازلی جھلاہٹ کی جگہ ایک طرح کے سکون نے لے لی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ایک بار پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اب یہاں کی صورتِ حال کو بھی کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم حکم اور جارج کے باغیوں کی حیثیت سے یہاں اس سرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

جلد ہی میں گفتگو کا رخ کل والے موضوع کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ

حقیقت ہے کہ مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نامور کھلاڑی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ ''ماسٹر کھلاڑی'' عام لوگوں کی طرح جسمانی تکنیک اور داؤ پیچ کے بجائے ذہنی کیفیت اور دماغی توانائی پر زور دیتا نظر آتا تھا۔

وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ سینڈ بیگ ہمارے سامنے تھا۔ وہ ایک بار پھر مختلف ٹپس دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے عملی مشق بھی کرا رہا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ مجھے وہ باتیں بتا رہا تھا جو آج تک کسی نے نہیں بتائی تھیں۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس شخص کی بے پناہ صلاحیتیں مجھ پر آشکار ہو رہی تھیں۔ یہ بظاہر لاغر و حقیر شخص میرے لئے دیکھتے ہی دیکھتے غیر معمولی ہو گیا اور میں خود کو اس کے سامنے ایک دم بونا محسوس کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جیکی! آپ نے کل ''درد'' کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ کیا طریقہ ہے جس سے ہم درد کو کم سے کم محسوس کر سکتے ہیں؟''

وہ ذرا ہانپ گیا تھا اور اسے ہلکی ہلکی کھانسی بھی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''درد بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ہمیں اتنا ہوتا نہیں جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسے سمجھنے کے لئے میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔ میڈیکل کی تعلیم یہ ثابت کرتی ہے کہ اگر کسی شخص کو بے ہوش کئے بغیر یا اسے سن کئے بغیر اس کا پیٹ چاک کر دیا جائے اور اس کی انتڑیاں وغیرہ اُٹھا کر باہر رکھ دی جائیں اور کچھ کو مہارت سے کاٹ واٹ بھی دیا جائے تو وہ شخص آسانی سے برداشت کر سکتا ہے...... اور اس کا درد ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا لیکن عملی طور پر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ جس شخص کے ساتھ ایسا ہو گا، وہ روئے چلائے گا اور نشتر کی ہر ہر حرکت پر آسمان سر پر اُٹھا لے گا اور عین ممکن ہے کہ بے ہوش ہی ہو جائے۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آتی ہے؟''

''...... کہ وہ درد کی وجہ سے نہیں، خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوتا ہے۔''

''ہاں، خوف کی وجہ سے اور اس غلط احساس کی وجہ سے کہ اسے بہت درد ہو رہا ہے...... ہماری عام زندگی میں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ حقیقت میں ہمیں درد اتنا نہیں ہو رہا ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟''

''ہاں...... کچھ کچھ۔''

''ہم عام طور پر جانوروں کو بہت سخت جان سمجھتے ہیں...... اور وہ ہوتے بھی ہیں۔ ہم

دیکھتے ہیں کہ ایک کتا ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ساتھ گلیوں میں پھرتا رہتا ہے۔ کسی شکاری جانور کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے اور ایک بڑا زخم بن جاتا ہے لیکن وہ اسی حال میں بھاگ دوڑ کرتا رہتا ہے۔ ایک مادہ ہرن کسی کی مدد کے بغیر بچے کو جنم دیتی ہے اور خود ہی کوشش کر کے اسے اپنے جسم سے علیحدہ بھی کرتی ہے۔ ان سب جانوروں کو بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ صرف اور صرف درد کو محسوس کرتے ہیں۔ ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ درد کے ساتھ اپنے خدشوں، واہموں اور ذاتی احساسات کو بھی نتھی کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آسانی سے بڑے سے بڑے درد کو جھیل لیتے ہیں۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ درد کو ذہن پر سوار نہ کیا جائے؟''

''نہیں...... میں اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ درد کی گہرائی میں اُترا جائے۔ اس کو پرکھا جائے کہ اصل میں وہ کتنا ہے۔ اس میں کیا دم خم ہے۔ اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ جب ہم یہ سب کچھ جان لیں گے تو آدھے سے زیادہ درد تو ویسے ہی ختم ہو جائے...... جو میں کہہ رہا ہوں تم اس کو فالو کر رہے ہو؟''

''ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

اچانک اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی بیساکھی نما لاٹھی زور سے میرے کندھے کے قریب دے ماری۔ میرا بازو جھنجھنا اُٹھا۔ میں تکلیف کی شدت سے ایک طرف کو جھک گیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا کندھا تھام لیا۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تم نے اس ضرب کو ویسے ہی لیا ہے جس طرح عام لوگ لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بڑے زور سے لاٹھی ماری گئی ہے اور انہیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاٹھی لگنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس سے ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اس نے چند لمحے کھانس کر گلا صاف کیا اور بات جلدی رکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو...... اب میں تمہیں دوبارہ چوٹ لگاتا ہوں۔ تم باقی ساری باتیں اپنے ذہن سے نکال دینا۔ پوری یکسوئی کے ساتھ صرف یہ محسوس کرنا کہ تمہیں تکلیف کتنی ہوئی ہے اور تمہارا دماغ اس تکلیف کو کس طرح محسوس کر رہا ہے۔ صرف اور صرف تکلیف پر دھیان رکھنا، باقی کسی چیز پر نہیں۔''

مجھے ہدایات دینے کے بعد اور ذہنی طور پر تیار کرنے کے بعد، اُس نے ایک بار پھر زور سے لاٹھی گھما کر میرے دوسرے بازو پر ماری۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ایک بار پھر درد کی لہر میرے بازو سے اُٹھ کر دماغ کی طرف گئی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اس

مرتبہ درد بہت کم ہوا اور میں اسے آسانی سے برداشت بھی کر گیا۔

''کیسا لگا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو ایک میجک کی طرح ہے۔''

''میجک تو تمہارے اندر ہی ہے۔ اس مرتبہ تم درد کی گہرائی میں اُترے ہو اور اسے اتنا ہی محسوس کیا ہے جتنا وہ اصل میں ہے۔'' جیکی نے کہا اور ایک بار پھر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس بندے میں کوئی بات تھی۔ وہ کوئی روحانی شخص تو نہیں تھا لیکن مارشل آرٹ کے حوالے سے اس میں کچھ نہ کچھ انوکھا پن پایا جاتا تھا۔

درد کی گہرائی میں اُتر کر اس کی حقیقی شدت کو پرکھنے والی بات میں نے پہلے بھی کہیں سنی یا پڑھی تھی۔ کسی پیرا سائیکولوجسٹ نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے دانت یا گردے وغیرہ کے درد پر اپنی سوچ کو مرکوز کر لے اور اس کی اصل کیفیت کو جانچنے کی کوشش کرے تو یہ درد کم ہونے لگتا ہے۔

درد پر غالب آنے کے موضوع پر باروندا جیکی نے مجھے کئی باتیں بتائیں۔ یہ باتیں دل میں کھب رہی تھیں اور دماغ انہیں قبول کر رہا تھا...... اور ان باتوں کی سچائی کی گواہی خود جیکی بھی تو تھا۔ میں نے اس کے جسم میں برداشت کی غیر معمولی کیفیت دیکھی تھی۔

وہ شراب کا تلخ گھونٹ بھر کر بولا۔ ''ان باتوں کو یاد رکھو گے تو یہ تمہاری زندگی کو تبدیل کر دیں گی۔ درد پر غلبہ پانے کی کوشش جاری رکھو گے تو آہستہ آہستہ یہ بالکل تسخیر ہو جائے گا۔ تمہیں عام لوگوں کے مقابلے میں دسواں حصہ درد ہو یا شاید اس سے بھی کم اور جب یہ ایسا ہو جائے گا، کئی نہایت مشکل کام تمہارے لئے مشکل نہیں رہیں گے۔''

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں کل بتایا تھا، جسمانی درد کے علاوہ بس ایک چیز اور ہوتی ہے جو ہمارے لئے لڑائی بھڑائی والے کاموں کو مشکل بناتی ہے...... اور وہ ہے بے عزتی کا احساس۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر مسابقت کے عمل میں ناکامی اور توہین ہمارے حصے میں آئی تو کیا ہو گا؟ اگر ہم کوشش کر کے اس دوسرے احساس پر بھی غلبہ پا لیں تو پھر ہم کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت...... بے خطر ہو کر مبارزت کے میدان میں کود سکتے ہیں۔''

وہ میرے لئے بڑی یادگار رات تھی۔ مارشل آرٹ کا انٹرنیشنل اسٹار باروندا جیکی میرے ساتھ تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میرے سلوک کی وجہ سے وہ

مجھ پر مہربان تھا۔ وہ مجھے کچھ خاص الخاص باتیں بتانا چاہ رہا تھا، سمجھانا چاہ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں اس کی ان باتوں سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکوں گا یا نہیں لیکن اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ دل کی باتیں دل ہی میں لے کر نہیں جا رہا۔

''درد'' کے حوالے سے باروندا جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اچھوتا اور انوکھا تھا۔ اس کی باتیں میرے دل و دماغ کے اندر گہرائی میں پیوست ہو رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی خاص چیز ہے جو جیکی مجھے بتا رہا ہے...... یا کوئی جادو، یا سحر یا کوئی ایسا نادر عمل جو زمین و آسمان کی وسعتیں میرے سامنے کھول سکتا ہے۔ وہ درد کی نفی چاہتا تھا اور جب درد کی نفی ہو جائے اور درد کامل یعنی موت کی نفی ہو جائے تو پھر اور کون سی چیز ہے جو بندے کا راستہ روک سکتی ہے۔

یہ بارشوں کا موسم تھا۔ سرنگ سے باہر شاید بارش ہو رہی تھی۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اندر تک آ رہی تھی اور اس خوشبو کے ساتھ ساتھ کبھی ہلکی سی گرج بھی سنائی دیتی تھی۔

جیکی رواں انگریزی میں بولا۔ ''بارش ہو رہی ہے...... یہی موسم ہوتا ہے پینے کا۔ کیا آج تم مجھے اجازت دو گے کہ میں یہ بوتل ختم کر لوں؟''

''میں آپ کے لئے بڑی مشکل سے مہیا کر رہا ہوں۔ اگر اسے آج ہی ختم کر لو گے تو کل کیا کرو گے؟''

''کل نہ ہی آئے تو کتنا اچھا ہے۔ سب کچھ آج ہی ختم ہو جائے...... اسی برستی بارش میں، اسی ہلکی ہلکی خنکی میں...... لیکن...... نہیں...... میں اپنی کشتی سے باہر مرنا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی زندگی کی آخری خوشی سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں مر کر بھی چین نہیں پا سکوں گا۔''

کشتی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر بے چین ہو گیا۔ اس کے اندر جیسے کچھ پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا اضطراب اس کے ہڈیوں بھرے چہرے سے عیاں تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے جیسی کیفیت سے ہی دوچار ہے۔ میرے ساتھ بھی تو اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک دم میرے سینے میں دھواں بھر جاتا تھا۔ میں اس راجواڑے سے نکل کر اپنی سرزمین پر، اپنی پسندیدہ فضاؤں میں پہنچنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔ شاید ہر پابند و مجبور شخص جب یادوں کے دھارے پر بہتا ہے تو ایسے ہی اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہے۔

وہ کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا پھر نیم دراز ہو گیا۔ خنکی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ اس کا جسم ہر قسم کی سختی کو سہہ سکتا

ہے۔اس نے آنکھیں بند کر لیں...... تب وہ اپنی ترنگ میں کچھ گنگنانے لگا۔ پہلے اس کی آواز بالکل مدھم تھی، کچھ دیر بعد قدرے بلند ہوگئی۔ یہ کوئی نیپالی گیت تھا۔ میری سمجھ میں الفاظ تو نہیں آرہے تھے لیکن طرز دلکش تھی۔ جیسے سوچ کی کرنوں سے ماضی کی برف پگھل رہی ہو اور یادوں کے جھرنے بہہ رہے ہوں۔

وہ گنگناتا رہا...... پھر اس کی آواز دوبارہ مدھم ہوگئی اور وہ دھیرے دھیرے سو گیا۔

اگلی صبح ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ انور خاں کی دی ہوئی ڈیڈ لائن ختم ہونے سے پہلے ہی رنجیت پانڈے درختوں کے جھنڈ میں پہنچا اور اس نے بہ آوازِ بلند پکار کر انور خاں سے کہا کہ وہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔

انور خاں نے کہا۔ ''بات چیت بہت ہو چکی ہے۔ اب ہمیں صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں مطالبات منظور ہیں یا نہیں؟''

''یہی بتانے کے لئے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔'' پانڈے کی پاٹ دار آواز آئی۔

''کون آیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''میں ہوں مراد شاہ...... نل پانی سے۔'' ایک گونجتی ہوئی آواز اُبھری۔

ایک دم میرے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ نام میں نے چرواہے نریندر سنگھ اور انور وغیرہ کی گفتگو میں سنا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ نل پانی میں، مَیں مراد شاہ کی حیثیت چھوٹے سرکار کے مشیر خاص اور دست راست کی ہے اور اب یہی مراد شاہ یہاں بات چیت کے لئے موجود تھا۔

''السلام علیکم شاہ صاحب! ہمیں امید نہیں تھی کہ ہم یہاں آپ کی آواز سنیں گے۔'' انور خاں نے بلند آواز میں کہا۔

''اور مجھے بھی امید نہیں تھی کہ مجھے یہاں آکر اس طرح تم سے بات کرنی پڑے گی۔''

''دیکھ لیں شاہ صاحب! یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی راج بھون کے ستم سے محفوظ نہیں رہا۔ وہاں نل پانی میں سلطانہ نے آپ کے سامنے دہائی دی تھی کہ اگر اسے واپس زرگاں بھیجا گیا تو اس کی جان اور عزت کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور دیکھ لیں شاہ صاحب...... ویسا ہی ہوا ہے۔''

''یہ تو تمہارا بیان ہے انور خاں! اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی سامنے آئے گی...... اگر واقعی کسی نے قانون توڑا ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہئے لیکن تم اور تمہارے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تم ایک بے گناہ لڑکی کو پکڑ کر یہاں لے

آئے ہو۔ اس کو اذیت دے رہے ہو۔ یہ صورتِ حال کسی کے لئے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس طریقے سے انصاف کرنے کی ریت چل پڑی تو پھر یاد رکھو کہ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں رہے گی۔'' مراد شاہ کا لہجہ سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے چرواہے نریندر کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ چھوٹے سرکار کو ہمارے خلاف رویہ اختیار کرنا پڑے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ انہوں نے واقعی سخت رویہ اپنا لیا ہے۔

انور خاں نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم نے انصاف اور قانون کا دروازہ بہت کھٹکھٹا لیا، اب ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔ اب پانی سر سے گزر گیا ہے جی۔ اب اینٹ کا جواب پتھر سے اور پتھر کا گولی سے ملے گا۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔''

''اگر تمہارا یہ فیصلہ ہے تو پھر ہمارا فیصلہ بھی سن لو۔'' مراد شاہ کی غصیلی آواز اُبھری۔ ''ہم کو اس معاملے میں حکم جی کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا اور اگر تم لوگ اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ہم نے جن لوگوں کو نل پانی میں پناہ دی ہے، وہ بھی ہماری پناہ میں نہیں رہیں گے۔''

''تو آپ بھی ظلم کے آگے جھکنا شروع ہو گئے ہیں...... میں اسے موقع پرستی کہوں یا کچھ اور؟''

''تم ہر حد توڑ رہے ہو انور خاں! تمہیں اس کے لئے پچھتانا پڑے گا۔''

''ہم تو یہ سمجھے تھے شاہ صاحب کہ آپ حق کا ساتھ دینے کے لئے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات سنیں گے اور دوسروں کو بھی سمجھائیں گے۔''

''میں اب بھی تمہاری بات سننے کو تیار ہوں لیکن اس کے لئے تمہیں پہلے مسز اسٹیل کو چھوڑنا ہوگا۔''

''آپ پہلے ہماری پوری بات سن لیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ نے ہمیں قائل کر لیا تو میں خود اور اپنے سارے ساتھیوں کی طرف سے بھی عہد کرتا ہوں کہ ہم اس لڑکی کو چھوڑ دیں گے۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی، پھر طے ہوا کہ مراد شاہ ہم سے بات کرنے کے لئے اور ماریا کو صحیح سلامت دیکھنے کے لئے سرنگ کے اندر آئے گا۔ رنجیت پانڈے، شاہ صاحب کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی بھیجنا چاہتا تھا لیکن انور خاں اور اسحاق نے سختی سے منع کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مراد شاہ اندر آ گیا۔ مراد شاہ درمیانہ قد اور درمیانی عمر کا بارعب...... شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں کچھ بال سفید بھی نظر آتے تھے۔ اس نے سفید شلوار قمیص اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر انور خاں کی آنکھوں میں معنی خیز چمک آ گئی۔ مراد شاہ کی آنکھوں میں بھی دوستانہ چمک تھی۔ بہرحال، ماریا بھی یہاں موجود تھی، اس کے سامنے شاید مراد شاہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سرنگ کے ایک علیحدہ گوشے میں انور خاں، فیروز، چوہان اور مراد شاہ کے درمیان بات چیت ہوئی۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ مراد شاہ نے کہا۔ ''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ سب سے پہلے وہ کام کرو جو سب سے ضروری ہے۔ اس گواہ کو یہاں لاؤ جو ہارون کے قتل کے سلسلے میں گواہی دینا چاہتا ہے۔''

انور خاں نے فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ ہے...... آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔''

مراد شاہ نے اپنی بھاری پلکیں اُٹھائیں اور غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سفید قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ نکال لیا۔ یقیناً یہ ٹیپ ریکارڈر، بیٹری سیل سے چلتا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ اب ساری پلاننگ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں آ کر مراد شاہ نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے۔ ایک تو سرجن اسٹیل وغیرہ کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ ماریا کے اغوا کو قابلِ مذمت سمجھتے ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ فیروز کا وہ بیان بھی لینا چاہ رہے تھے جو چھوٹے سرکار کے سامنے سلطانہ کو بے گناہ ثابت کر کے موہن کمار کو اپنے ہی دیرینہ ساتھی کا قاتل ثابت کر سکتا تھا۔

مراد شاہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور فیروز سے پوچھا۔ ''تم مقتول ہارون کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں اس کو نہ جانوں گا تو اور کس کو جانوں گا؟ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم اکٹھے جوان ہوئے، ہم نے اکٹھے ''حکم'' کی ملازمت کی۔ وہ گھڑ سوار محافظوں میں شامل تھا، میں راج بھون میں کام کرتا تھا لیکن ہم ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔ میں سوچ بھی ناہیں سکت تھا کہ ایک دن ہارون کو اس کے اپنے ہی ساتھی ''حکم'' کے کہنے پر جان سے مار ڈالیں گے۔ انہوں نے صرف سلطانہ کو پھنسانے کے لئے اتنا بڑا اپرادھ کیا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت اس حرامزادے موہن کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔''

''تم نے ہارون کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا؟''

''لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ تب تک میں حکم کا باغی ناہیں بنا تھا بلکہ حکم کے خاص ملازموں میں شامل تھا۔ جو لوگ ہارون کے قتل میں موہن کے ساتھ شامل تھے، میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں اور اس قتل کی ساری تفصیل جانی ہے۔''

زخمی فیروز اور مراد شاہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک سوال جواب ہوئے اور فیروز کا مکمل بیان ریکارڈ ہو گیا۔

مراد شاہ کے چہرے پر اطمینان کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''یہ بیان بڑا کارآمد ثابت ہو گا۔''

انور خاں نے کہا۔ ''آپ ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہم نے ان لوگوں کو آج دوپہر ایک بجے تک کا الٹی میٹم دیا ہے۔''

مراد شاہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات بنتی ہے تو مان لینی چاہئے۔ صورتِ حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ماریا عورت ذات ہے۔ اس کے یرغمال بنائے جانے کی وجہ سے تل پانی میں بھی کچھ لوگ تشویش ظاہر کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکم جی اور جارج کی حمایت بڑھ بھی سکتی ہے۔''

''لیکن لوگوں کو سلطانہ والا معاملہ بھی تو نظر آنا چاہئے...... اور اب تو فیروز کے بیان کے بعد بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سلطانہ کے معاملے میں سراسر ظلم ہوا ہے۔''

''وہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔'' مراد شاہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے بھی ایک عورت کو ہی یرغمال بنایا ہے اور یہ عورت...... سلطانہ والے معاملے میں نردوش ہے۔''

''مگر وہ بہت سے دوسرے معاملوں میں نردوش ناہیں ہے۔ ہرگز ناہیں ہے۔'' اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''یہ ظالم عورت ہے اور اس کا بھائی اس سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ میری بہن کا قاتل ہے اور اس طرح کے کئی ظلم اس گھرانے کے کھاتے ہیں۔ ہم اپنے کسی مطالبے سے پیچھے ناہیں ہٹیں گے۔ اگر یہ لوگ ناہیں مانیں گے تو پھر یہ میم قتل ہووے گی اور بہت برے طریقے سے ہووے گی۔''

''لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟'' مراد شاہ نے قدرے برہم انداز میں کہا۔ ''تم سب لوگوں کو تو مار ہی دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم سے رشتہ ناتا رکھنے والوں پر بھی بڑا سخت وقت آئے گا۔ بہت خون بہے گا۔''

انور خاں نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر وہی ہلکی سی آسودگی پھیل گئی جو ایک دم کشیدہ ماحول کو تبدیل کر دیتی تھی۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''لیکن میرا خیال ہے شاہ صاحب...... یہ لوگ ماریا کی موت کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیں گے۔ انہیں مطالبات ماننے ہی پڑیں گے۔''

''اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔'' مراد شاہ بولا۔ ''جارج اور اس کے بہنوئی اسٹیل اور ان کے ساتھیوں کو ماریا کی موت کسی طور بھی قبول نہیں ہوگی لیکن زرگاں میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک ماریا اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی وہ پچاس بندے رکھتے ہیں جن کو تم رہا کرانا چاہتے ہو۔ یہ لوگ کوئی بھی ایسی چال چل سکتے ہیں جس سے سب کچھ ختم ہو جائے۔''

انور خاں کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ بہرحال، وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟''

''میں گرومودان وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔'' مراد شاہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''گرومودان اور دیگر گرو اندر خانے جارج گورا سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور سے جب سے پگوڈا میں آگ والا واقعہ ہوا ہے۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ زرگاں میں پگوڈا کے بڑے پجاریوں اور جارج کے کارندوں میں چپقلش چلتی رہتی ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' انور خاں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرے نزدیک گرومودان اور رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی ایک خاص مطلب رکھتی ہے۔ جہاں تک گرومودان کو میں جانتا ہوں، وہ ایک بہت ہی گہرا بندہ ہے۔ اس کے اندر جھانکنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بندے کو شیشے میں اُتارنے کا فن جانتا ہے۔ رنجیت پانڈے سے بھی اس کی دوستی ہے اور رنجیت پانڈے تو ویسے بھی بکاؤ شخص ہے۔ جو اس کی مطلوبہ قیمت دے دے، وہ اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ گرومودان اور پانڈے یہاں کوئی اپنا کھیل کھیل سکتے ہیں؟'' فیروز نے پوچھا۔

''یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہاں اسٹیٹ کی سیاست میں سب کچھ چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے۔''

''لیکن...... شاہ صاحب...... ماریا کا شوہر اسٹیل یہاں خود موجود ہے۔ موہن کمار جیسے لوگ بھی ہیں۔ کیا وہ گرومودان کو کوئی چال چلنے دیں گے؟''

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ضرور ہی کوئی چال کھیلی جائے گی، میں صرف ایک امکان بتا رہا ہوں۔ فرض کرو اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی رنجیت پانڈے تو یہاں موجود ہے نا...... اور جہاں یہ خبیث موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی مار دھاڑ تو ضرور ہوتی ہے۔ اس بندے کے تو خمیر میں ہی خون اور بارود شامل ہے۔ اس کی عیاری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔''

مراد شاہ نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ''میری یہ بات ذہن میں رکھ لو...... جب تک پانڈے یہاں موجود ہے، تم کسی معاملے کو بھی آسان نہیں لے سکتے۔ تمہیں ہر سیکنڈ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑیں گی۔ یہ کوئی نہ کوئی کارستانی ضرور کرے گا۔''

''تو کر لے کارستانی۔ اس کی جو کارستانی بھی ہوگی، وہ میم کے جیون کی قیمت پر ہووے گی۔'' اسحاق آتش بار لہجے میں بولا۔

دو چار منٹ تک مراد شاہ سے ہماری بات چیت مزید جاری رہی۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس گفتگو کا اختتام اس امر پر ہوا کہ انور خاں نے اپنی دی ہوئی ڈیڈ لائن کل رات آٹھ بجے تک بڑھا دی۔

○......❖......○

مراد شاہ نے جو کچھ کہا تھا، اس نے ہمیں مزید چوکس کر دیا۔ رنجیت پانڈے کی عیاری اور سفاکی کی جو کہانیاں میں سن چکا تھا، اس کے بعد اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ عمران مجھے ہر بات پر یاد آتا تھا۔ پانڈے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی بار بار یاد آیا۔ پانڈے جیسے خطرناک ترین لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا عمران کا شوق تھا۔ اگر عمران یہاں ہوتا تو شاید وہ پانڈے کا بہترین حریف ثابت ہوتا۔ وہ رات میں نے پھر باروندا جیکی کے ساتھ گزاری۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرا روحانی استاد ہے۔ وہ مجھے مارشل آرٹ کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتا رہا تھا جو مجھے کسی کتاب میں نہیں مل سکتی تھیں، نہ کوئی شخص انہیں اپنے تجربے کا حصہ بتا سکتا تھا۔ خاص طور سے وہ مجھے جسمانی درد برداشت کرنے کے حوالے سے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ نایاب تھا۔

یہ اس رات دو ڈھائی بجے کی بات ہے۔ جیکی سے ملاقات کے بعد میں دہانے کے قریب واپس آ گیا تھا اور ہمیش کے برابر لیٹ گیا تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا، جب اچانک مجھے ایک نامانوس بو محسوس ہوئی۔ یہ اسپرٹ...... جیسی...... کوئی تیز اثر بو تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ایک اندیشہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتا ہوا میرے دماغ

میں گھس آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ الفاظ ذہن میں گونجے جو آج صبح مراد شاہ نے یہاں سرنگ میں ہمارے سامنے کہے تھے۔ اس نے رنجیت پانڈے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پانڈے یہاں موجود ہو اور وہ نچلا بیٹھا رہے۔ مراد شاہ نے وارننگ دی تھی کہ ہمیں اس کی طرف سے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور لالٹین کی لو اونچی کی۔ ہمیش بھی اُٹھ بیٹھا تھا اور نتھنے پھیلا کر بو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ کیسی بو ہے؟ کہیں کوئی گیس وغیرہ تو ناہیں؟“ وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”ماریا کہاں ہے؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

ماریا اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے رائفل اُٹھائی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ ذہن میں یہ خیال برق کی طرح کوندا تھا کہ کہیں سرنگ کے اندر کوئی گیس وغیرہ تو نہیں چھوڑی گئی۔ دہانے کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی پھر چوہان بھی رائفل بدست وہاں آن موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی۔

”یہ بو کیسی ہے؟“ اس نے بھی وہی سوال کیا۔

اسی دوران میں سرنگ کے ایک گوشے سے شوں شوں کی مدھم آواز آئی۔ اسحاق بھی جاگ گیا تھا۔ وہ اس تاریک گوشے کی طرف لپکا اور چند سیکنڈ بعد ماریا کو کھینچتا ہوا روشنی میں لے آیا۔ ”حرامزادی...... اُلو کی پٹھی...... تو خود چین سے رہوت ہے نہ ہمیں رہنے دیوت ہے۔“ اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

ماریا کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں میں ایک ٹن اسپرے تھا۔ اسپرے کی اسی بوتل سے نکلنے والے کیمیکل کی بو نے ہم سب کو بری طرح چونکایا تھا۔ یہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی صورتِ حال تھی۔ یہ ایک مچھر مار ٹائپ کا اسپرے تھا جو ماریا کے سامان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

”یہ کیا کر رہی تھی؟“ اسحاق نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

”ہام یہاں ناہیں رہ سکتا۔ یہاں بہت زیادہ کیڑا ہے۔ ہر طرح کا Insects ہے۔ ہام کا ہاتھ پاؤں سوج گیا۔“ وہ طیش میں بولی۔

”تم یہیں رہو گی جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ تم آسمان سے ناہیں اُتریں۔ ہماری ہی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی ہو۔“ اسحاق پھنکارا۔

”ہام سے ناہیں رہا جاتا۔“ وہ کراہی۔

”تم سے رہا جاوے گا۔ جس طرح تم کو روٹی پکانا آ گئی ہے، مٹی کے پیالے میں پانی پینا آ گیا ہے اور کوئلے سے دانت صاف کرنا آ گئے ہیں، اسی طرح تم کو رہنا بھی آ جاوے گا۔“ اسحاق نے مچھر مار اسپرے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینک دیا۔

”ہام یہاں ناہیں رہے گا۔ چاہے تو ہام کو شوٹ کر دے۔“ وہ دھاڑی اور اس نے سرنگ کے عقبی حصے میں جانے کی کوشش کی۔

اسحاق اور احمد نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اسحاق نے اسے دو طمانچے مارے اور گھسیٹتا ہوا واپس لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے گراری دار چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ وہ پھنکارا۔ ”اگر اپنے باپ کی ہے تو اب قدم اُٹھا کر دکھا۔ سیدھا تیرے جگر میں یہ چاقو نہ ڈال دیا تو میرا نام اسحاق ناہیں۔“

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی آتش تھی کہ ماریا کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

احمد بولا۔ ”بہتر تو یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں ڈھیل نہ چھوڑی جاوے۔ رات کے وقت پاؤں کس کر باندھ دیئے جاویں تاکہ یہ چل ناہیں سکے۔“

”اب کوئی حرکت کرے گی تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ اسحاق نے کہا۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ وہ اچھل رہی تھی۔ کبھی دائیں ہو رہی تھی، کبھی بائیں۔ اس کے پاؤں پر سے کوئی چھپکلی گزر گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے وہ ڈانس کرنے والی کیفیت میں نظر آئی۔ پھر وہ جیسے اچھل کر ایک پتھر پر چڑھ گئی۔ اس پتھر کے اردگرد تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے گی لیکن یہ پتھر چھوٹا سا تھا۔ اس پر بس کھڑا ہی ہوا جا سکتا تھا اور وہ کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں طیش آمیز بے بسی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ اسی طرح کھڑی رہو اور کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ۔“ اسحاق نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا دہانے کی طرف چلا گیا۔

وہ کھڑی رہی اور غصے میں بڑبڑاتی رہی۔ وہ نہایت قیمتی جینز اور شرٹ میں تھی۔ یہ لباس اس کے سامان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اب یہ کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جارج گورا کی بہن نے ڈیڑھ دو ہزار ڈالرز کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے بال جو اغوا کی رات ریشم کی طرح ملائم اور سلک کی طرح چمک رہے تھے، اب گھونسلے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور اس گھونسلے کے نیچے اس کی صورت بھی اجڑی بجڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل عام لڑکی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے عمران کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ ایک روز

میڈم کی چھوٹی بہن میڈم نادیہ کے نازنخرے دیکھ کر اس نے کہا تھا...... اس لڑکی کی چمک دمک میں پچھتر فیصد حصہ اس کی دولت اور حیثیت کا ہے۔ اگر یہی نادیہ کسی کھوتی ریڑھی پر بیٹھ کر جھگیوں میں سے نکلے تو اس کے مقابلے میں اس کی کھوتی زیادہ خوب صورت نظر آئے اور یہ کوئی نادیہ کی بات ہی نہیں ہے، اکثر امیر کبیر لڑکیاں خوب صورتی میں بس کھوتی کے آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا تھا...... بھئی، یہ تو امیر کبیر لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ جھٹ بولا تھا...... اور میں سمجھتا ہوں یہ کھوتیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ گدھا برادری اس کا برا مان سکتی ہے لیکن میں سب امیر لڑکیوں کی بات تو نہیں کر رہا۔ بس ایکسٹرا ماڈرن اور فیشن زدہ بیبیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

عمران کی کہی ہوئی باتیں ایسے ہی میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ جب بھی یاد آتا تھا، اپنے ساتھ میرے لئے ندامت و پشیمانی کا ایک بہت بڑا ریلا لاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کا قاتل ہوں اور ہزار ہا ملامتی نگاہیں میری طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔

صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دہانے سے کچھ فاصلے پر کتوں کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی کتے تھے جو حکم جی کے اہلکاروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ان کی آوازیں اکثر و بیشتر سنائی دیتی رہتی تھیں لیکن آج یہ آوازیں دہانے کے عین سامنے قریباً ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے آ رہی تھیں۔ انور خاں، احمد اور میں اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے انور خاں کو چونکتے دیکھا۔ اس کی نگاہ دور جنتر اور کیکر کے درختوں پر مرکوز تھی۔ ہم نے دیکھا، دیوہیکل بوگیر کتے تیزی سے کسی چیز کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کا رخ دہانے کی طرف ہی تھا۔ وہ جس چیز کا پیچھا کر رہے تھے، وہ کوئی چھوٹا جانور تھا جو تیزی سے پینترے بدل رہا تھا۔

دفعتاً ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کتے سیدھے سرنگ کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ ''اوہو...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انور خاں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اس کی انگلی ٹریگر پر تھی لیکن وہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ گولی چلائے یا نہیں اور جب انور خاں خود فیصلہ نہ کر سکا تو ہم کیسے کرتے؟ قریباً نصف درجن خوں خوار کتے سماعت شکن شور برپا کرتے سیدھے سرنگ میں گھس آئے۔ وہ جس چیز کا تعاقب کر رہے تھے، اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے دیکھی۔ وہ جنگلی ہرن کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ سیدھا سرنگ کے اس قدرتی چیمبر میں گھسا جہاں ہم نے بستر بچھا رکھے تھے۔ شکاری کتے اس پر جا پڑے، وہ بری طرح

زخمی ہوا۔ ہمیں اس کا پھٹا ہوا پیٹ نظر آیا۔ اس حالت میں وہ گھوما اور ہماری پوزیشنوں کی طرف آیا۔ اب ہمارے لئے بے حرکت رہنا مشکل تھا۔ میری اور انور خاں کی رائفلوں سے ایک ساتھ شعلے نکلے۔ دو کتے قلابازیاں کھا کر گرے۔ باقی کتوں نے ننھے سے جانور کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ ماریا چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ سرنگ میں ایک دم کہرام مچ گیا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب دہانے کے عین سامنے فائرنگ شروع ہو گئی۔ افراتفری کا فائدہ اُٹھا کر حکم کے مسلح اہلکاروں نے ہلا بول دیا تھا۔

''گولی چلاؤ۔'' انور دہانے کی طرف رخ کر کے دھاڑا۔

میں نے دیکھا، دو افراد جھک کر بھاگتے ہوئے دہانے کے عین سامنے پہنچ گئے تھے۔ وہ جدید رائفلوں سے فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ میں نے احمد کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ ایک دوسری گولی چوہان کے کندھے میں لگی اور رائفل اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یہاں انور خاں کی مہارت اور اس کے اعتماد کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس دوسرا موقع نہیں ہے۔ اگر اس کا نشانہ خطا گیا تو حملہ آور بھاگتے ہوئے سرنگ گھس آئیں گے۔ اس نے اپنی اسنائپر گن سے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ قریباً بیس میٹر کی دوری پر دونوں حملہ آوروں کے سروں میں گولیاں لگیں اور وہ اپنے ہلارے میں دور تک لڑھک گئے۔ یہ واقعی بڑے خطرناک لمحے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دونوں حملہ آوروں نے جدید بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ اگر ان کے سروں میں گولی نہ لگتی تو وہ اندر آنے میں کامیاب ہو جاتے۔

دو افراد کے گر جانے سے پیچھے آنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ انہوں نے سیدھا دہانے کی طرف آنے کے بجائے دائیں بائیں پوزیشن لے لی۔ فیروز زخمی ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ مل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ چند گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزریں تو اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کرنی چاہی۔ یہ فیصلہ غلط نکلا۔ دہانے کے عین سامنے سے وہ ''ہٹ'' ہو گیا۔ میں نے اسے سینے پر گولی کھا کر مردہ ہرن کے اوپر گرتے دیکھا۔ دو شکاری کتے تو سرنگ سے باہر نکل گئے تھے۔ دو تین سرنگ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے اور ان کی آوازوں سے ایک پُرہول گونج پیدا ہو رہی تھی۔

اسحاق نے ماریا کو زمین پر گرا کر رائفل کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے اسے شوٹ کر سکتا تھا لیکن پھر یہ ہنگامہ جس طرح اچانک شروع ہوا تھا، اسی طرح آناً فاناً

ختم ہوگیا۔ فائرنگ تھم گئی۔ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا کوئی آواز باقی نہ رہی۔

ہم اپنی پوزیشنوں پر پوری طرح چوکس تھے۔ ہم نے انگلیاں ٹریگر پر رکھی ہوئی تھیں اور دہانے کے سامنے ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کا نوٹس لے رہے تھے۔

اسحاق دھاڑا۔ ''یہ اس طرح ناہیں مانیں گے۔ اس حرامزادی کے ٹکڑے کر کے باہر بھیجنا شروع کرو اور پہلا ٹکڑا میں کرتا ہوں، ابھی کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا خوفناک پھل کا گراری دار چاقو نکال لیا۔

انور خاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن دو منٹ ٹھہر جاؤ۔

فائرنگ تھم گئی تھی پھر بھی خطرہ موجود تھا۔ میں اور ہمیش نیچے جھک کر دوڑتے ہوئے فیروز کے پاس پہنچے۔ گولی اس کی چھاتی پر بائیں طرف لگی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ہم نے اسے اُٹھا کر فائرنگ کی رینج سے ہٹایا اور ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ چوہان حالانکہ خود بھی زخمی تھا تاہم وہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ہم نے فیروز کو پانی پلایا جو اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔

''کچھ ہو سکتا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں چوہان سے پوچھا۔

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر شدید کرب تھا۔

فیروز کی نگاہیں ہم پر جمی تھیں۔ یہ نگاہیں زندہ تھیں لیکن بتدریج بے جان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ احمد کی طرف دیکھ کر بہت نحیف اور شکستہ آواز میں بولا۔ ''اگر...... کبھی...... اکبر سے ملاقات ہو تو...... اسے بتا دینا...... میری ماں مسلمان تھی...... میں مسلمان ماں کا بیٹا ہوں۔''

احمد نے اشک بہاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیروز کی آنکھیں تارا ہو گئیں۔ ہم نے اس کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا......

اسحاق قریباً تیس فٹ کے فاصلے سے فیروز کی موت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ چنگھاڑنے لگا اور ماریا کو زدوکوب کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسحاق کا ہاتھ کسی نے نہیں روکا۔ صدمے نے سب کو جکڑ رکھا تھا...... اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جاتا تو فیروز کی موت میں ماریا بھی حصے دار تھی۔ چند دن پہلے اس نے فیروز پر گولی چلائی تھی جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ آج لڑائی کے دوران میں اسی زخمی ٹانگ کی وجہ سے فیروز تیزی سے حرکت نہیں کر پایا تھا۔ بہرحال، یہ بات تو اٹل حقیقت تھی کہ آج اس کا وقت پورا ہو چکا

تھا۔ پندرہ منٹ پہلے جو ناشتا اس نے کیا تھا، وہ آخری تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور تیز رفتار تھا کہ کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا...... اور شاید ڈاکٹر چوہان کے علاوہ کوئی اس کا راستہ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ ماریا کے لئے اب کسی کے دل میں ہمدردی کی رمق موجود نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اسحاق نے بے رحمی سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت جڑ سے کاٹ ڈالی تھی۔ اب ماریا چلا رہی تھی اور اس کے ہاتھ کا زخم تیزی سے خون اُگل رہا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

اسحاق نے جنونی انداز میں کٹی ہوئی انگلی ماریا کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور پھنکارا۔ ...... ہاں یہی انگلی تھی نا جس سے تُو نے فیروز پر گولی چلائی تھی۔ یہی تھی نا؟ یہ انگلی ہے ہی کاٹے جانے کے قابل...... یہی ہم جیسے غریبوں پر گولی چلاوت ہے...... ہمیں اپنے اشاروں پر نچاوت ہے...... ہم...... ہم اب ایسی ساری انگلیوں کو کاٹ دیویں گے۔''

چلا چلا کر ماریا کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اس پر غشی طاری ہو گئی۔ پتا نہیں کہ ایسا تکلیف کے سبب ہوا تھا یا کٹی ہوئی انگلی دیکھنے کے بعد اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔

اسحاق نے کٹی ہوئی خون آلود انگلی انور خاں کے سامنے پھینکی۔ ''انور بھائی! یہ پہلا چھوٹا سا نذرانہ بھیجو اس حرامزادی کے پتی کو...... اور ساتھ ہی بتاؤ اس کو کہ یہ ایک چھوٹی سی جھلکی ہے اس فلم کی جو ابھی ان کو دیکھنی ہے۔'' اسحاق کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

میں نے انگلی کو دیکھا۔ جب یہ جسم کے ساتھ تھی تو خوب صورت لگتی ہو گی، اب علیحدہ ہو کر کریہہ المنظر ہو گئی تھی۔ جڑ کی طرف سے اس کے ساتھ تھوڑی سی کھال لٹک رہی تھی۔ ناخن لمبا تھا اور اس پر گلابی پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد ایک مکھی چکرا رہی تھی، شاید بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اسحاق نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ بااختیار اور طاقتور طبقے کی اسی انگلی نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ یہ انگلی ٹریگر دباتی ہے...... پورے پورے ملک...... اور پورے پورے خطے خاک و خون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ حالتِ امن میں بھی یہ انگلی ایک خوفناک دھمکی کی صورت ٹریگر پر دھری رہتی ہے اور خلقِ خدا کی ناتوانی سے خراج وصول کرتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر چوہان کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ تاہم اطمینان کی بات یہ تھی کہ گولی کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ چوہان نے اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا تاکہ خون کا زیادہ اخراج نہ ہو۔ احمد کو گولی کے بجائے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔ یہ چھرا اس کے بازو کے

اندر ہی تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر صاف نظر آتے تھے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دونوں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ اگر ان میں ماریا کو بھی شامل کر لیا جاتا تو زخمیوں کی تعداد تین تھی۔ فیروز کی چادر سے ڈھکی ہوئی لاش ہمارے سامنے تھی اور یہ لاش ہم سب کے ذہنوں میں چنگاریاں بکھیر رہی تھی۔ اب واقعی کچھ کر گزرنے کو دل چاہتا تھا۔

حکم کے جن دو گارڈز کو انور خاں نے دہانے کے عین سامنے اپنے باکمال نشانے سے ٹھنڈا کیا تھا، وہ وہیں ساکت پڑے تھے۔ انہیں انور نے قریباً بیس میٹر کی دوری سے نشانہ بنایا تھا لیکن وہ چونکہ برق رفتاری سے دہانے کی طرف آرہے تھے، اس لئے گولی کھانے کے بعد بھی وہ لڑھکتے تھے اور دہانے سے مزید قریب ہو گئے تھے۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کے پاس چھوٹے بیرل والی جدید رائفلیں تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ دونوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھیں ہیں۔

اسحاق اور ہمیش نے دونوں مردہ کتوں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر سرنگ کے عقبی حصے میں پھینک دیا۔ یہ ہاؤنڈ نسل کے قدآور کتے تھے اور میں انہیں زرگاں میں دیکھ چکا تھا...... ایسے ہی خوں خوار کتوں نے مجھ پر جارج گورا کی کوٹھی میں حملہ کیا تھا۔ کتوں کے ساتھ ساتھ ہرن کے بچے کا کٹا پھٹا جسم بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، یہ سارا واقعہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اگر انور خاں اپنی دور مار رائفل سے بروقت دو ٹھیک نشانے نہ لگاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس سارے واقعے کے دوران میں عجیب الخلقت بارونڈا جیکی ہم سے قریباً سو میٹر دور سرنگ کے عقبی حصے میں موجود رہا تھا اور اس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا...... وہ اس دوران میں سو رہا تھا۔

انور خاں کے کہنے پر اسحاق نے فوری طور پر ایک پرچہ لکھا۔ اس پرچے کا مختصر مضمون کچھ اس طرح تھا۔ ''لگتا ہے کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ پہلا تحفہ تم کو ارسال کر رہے ہیں۔ یہ تمہاری میم صاحبہ کی انگلی ہے۔ یہ سب سے چھوٹا ٹکڑا ہے جو تم وصول کر رہے ہو۔ اس کے بعد جو ٹکڑا بھی آئے گا، وہ اس سے بڑا ہوگا۔ تمہارے پاس ہمارے مطالبوں کی منظوری کے لئے فقط ایک گھنٹے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد میم صاحبہ کی باقی چار انگلیاں تمہارے پاس پہنچیں گی اور پھر پورا پنجہ پیش خدمت کیا جائے گا۔ تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ تم کسی رعایت کے حق دار نہیں ہو۔ اگر تم گولی کی زبان میں فیصلہ چاہتے ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔ اب ہمارے مطالبوں میں ایک مطالبہ اور شامل کر لو۔ ہم اب نل پانی جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں راجواڑے سے نکلنے کے لئے محفوظ راستہ چاہئے اور تمہاری یہ میم تب تک ہمارے ساتھ

رہے گی جب تک ہم راجواڑے سے نکل نہیں جاتے۔''

انور خاں نے ماریا کی انگلی ایک مومی کاغذ میں لپیٹی پھر اس کے ساتھ اسحاق کا لکھا ہوا پرچہ رکھا۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ ایک پتھر رکھنے کے بعد انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر اوپر سے باریک ڈوری باندھ دی۔

انور خاں نے اپنی پوزیشن کے عقب سے پانڈے کو بلند آواز میں پکارا اور کہا۔

''پانڈے! تیری منحوس صورت یہاں دیکھ کر ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اب میم زندہ نہیں بچے گی۔ تیری بدمعاشی کا تیرے انگریز دوستوں کو بڑا اچھا صلہ ملنے والا ہے۔ اپنی حماقت کا یہ پہلا انعام قبول کرو۔'' اس کے ساتھ ہی انور خاں نے پورے زور سے بازو گھما کر ڈوری میں بندا ہوا پارسل درختوں کے جھنڈ کی طرف پھینک دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' جھنڈ کے عقب سے پانڈے کی گرج دار آواز اُبھری۔

''کھول کر دیکھ لے۔ امید ہے، جو کچھ بھی ہے تجھے پسند آئے گا۔'' انور خاں نے کہا۔

کچھ دیر بعد درختوں کے عقب سے پانڈے کا ایک ساتھی برآمد ہوا۔ اس نے پہلے ہمیں اپنے خالی ہاتھ دکھائے اور پھر محتاط قدموں سے پارسل کی طرف بڑھا۔ پارسل اُٹھا کر وہ واپس گھنے درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ بہرحال، اب ہم مخالف فریق کو مزید رعایت دینے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ اسحاق بھی بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جو الٹی میٹم ہم نے دیا ہے، اس سے ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھنا چاہئے اور حقیقت یہی تھی کہ فیروز کی لاش اُٹھانے کے بعد اب ہمارے دلوں میں رحم کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ چوہان اور احمد زخمی ہو چکے تھے، اپنے ساتھی ماجد کی موت کا صدمہ ہم چند دن پہلے جھیل چکے تھے۔ اب اگر ہمارے ساتھ یہی سب کچھ ہونا تھا تو پھر جارج گورے کی اس گوری بہن کو بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ اب ہوش میں آ چکی تھی اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی انگلی کے زخم سے خون کا اخراج روکنے کے لیے چوہان نے وہاں خاص طریقے سے پٹی باندھ دی تھی...... پھر بھی خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ماریا نے بھی شاید اب محسوس کر لیا تھا کہ اس کے بچنے کا امکان کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف منجمد ہو گیا تھا اور اس کی ساری تن فن ایک خوف آمیز مایوسی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

الٹی میٹم کا ایک گھنٹا مکمل ہونے میں آٹھ دس منٹ باقی تھے جب جھنڈ کے عقب سے پھر پانڈے کی آواز اُبھری۔ وہ بیٹری سے چلنے والے میگا فون کے ذریعے بول رہا تھا۔ اس

نے کہا۔ ”اسٹیل اور موہن کمار تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمیں ہاں یا نہ میں جواب چاہئے۔“ انور خاں گرجا۔ ”اور ایک بات اچھی طرح دماغ میں بٹھا لو پانڈے! ہم یہاں مرنے کے لئے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کرو گے تو اس کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا...... ہم نے جو کہہ دیا ہے، وہ کہہ دیا ہے۔ اب ہم ایک سیکنڈ اور نہیں دیں گے۔ ٹھیک دس منٹ بعد اسٹیل کی پتنی کا دوسرا ٹکڑا اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد......“

اسحاق ایک تیز دھار تلوار نکال لایا تھا۔ اس نے صاف سیدھے لہجے ماریا فرگوسن کو بتا دیا کہ وہ اس کا ہاتھ لینا چاہتا ہے اور وہ خود کو اس کے لئے تیار کر لے۔

”توم ہام کو ایک ہی دفعہ مار کیوں ناہیں دیتے؟ ہام کو گولی مار دو۔“ وہ کربناک انداز میں چلائی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ موت اتنی آسانی سے ناہیں آوت ہے۔ ایک ایک سانس کے لئے تڑپنا پڑت ہے۔ جس طرح ململ کے گیلے کپڑے کو کانٹے دار جھاڑیوں پر ڈال کر کھینچا جائے تو وہ تار تار ہووت ہے...... اسی طرح نکلتی ہے جان۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے اپنی آنکھوں سے......“ وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا گیا۔

”آچھا...... ہام کو دہانے پر لے جاؤ...... ہام ایک آخری بار...... اپنے ہسبینڈ سے بات کرنا مانگتا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

اس نے اسحاق کی انگارہ آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگلے دو تین منٹ میں اس کا ہاتھ کلائی پر سے الگ ہونے والا ہے۔

اسحاق نے سوالیہ نظروں سے انور خاں کی طرف دیکھا۔ انور خاں نے سر کے اشارے سے اسحاق کو مشورہ دیا کہ وہ ماریا کی بات مان لے۔

چند منٹ بعد ماریا ایک بار پھر دہانے پر تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پاؤں میں بھی زنجیر تھی۔ اس زنجیر میں بس اتنی گنجائش تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا سکتی تھی۔ اس کے عین عقب میں اسحاق موجود تھا۔ اس کی ٹرپل ٹو رائفل کی نال دریا کی کمر سے بس ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر تھی۔

دہانے پر پہنچ کر ماریا نے دل فگار لہجے میں پکار بلند کی۔ وہ اب انگریزی میں بول رہی تھی۔ اس نے اسٹیل کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ لوگ میرا ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ اب تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا تم اس بات کے لئے تیار ہو گئے ہو کہ میں ٹکڑوں میں یہاں سے باہر

نکلوں؟“

”ایسا ہرگز نہیں ہے ماریا...... لیکن جو کچھ ہمارے بس میں نہیں، وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ جو بندے یہ مانگ رہے ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ ان بندوں کی جگہ کوئی تاوان وغیرہ لینا چاہیں تو ہم تیار ہیں...... لیکن وہ بندے کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ ہماری طرف سے چوہان نے گرج کر انگریزی میں کہا۔ ”یہ سب تمہاری سیاست ہے لیکن یہ سیاست تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ گرومودان وغیرہ کا تو کچھ نہیں جائے گا لیکن تم اپنی بیوی کو بچا نہیں سکو گے۔“

ماریا ایک بار پھر چلائی۔ ”اسٹیل! ان لوگوں کا ایک ساتھی مر گیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تو بھائی جارج کو یہاں بلا لو۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو شاید اب تک کوئی حل نکل آتا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے ماریا کی آواز شدتِ جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ دل دوز انداز میں رونے لگی۔

اسحاق اور ہمیش اسے کھینچتے ہوئے سرنگ میں واپس لے آئے۔ اس کے رونے کی آواز آخر تک سنائی دیتی رہی۔ اس واقعے کے فقط پانچ چھ منٹ بعد حالات نے ایک حیران کن پلٹا کھایا۔ اسحاق، ماریا کا ہاتھ کاٹنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے بظاہر اس سفاک عمل سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ فیروز کی بے گور و کفن لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی دید نے ہمارے سینوں میں انگارے رکھے تھے۔ یہ کھلی جنگ تھی اور جنگ میں سب کچھ روا ہوتا ہے اور ماریا تو ویسے بھی فیروز کی موت میں حصے دار تھی۔

اچانک میگافون پر سرجن اسٹیل کی آواز اُبھری۔ ”انور خاں! توم کہاں ہے؟“

انور اطمینان سے بولا۔ ”میں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور اپنے فیصلے پر بھی قائم ہوں۔“

”ٹھیک ہے انور خاں...... ہام تمہارے مطالبوں کو مان رہے ہیں۔ توم اب کسی طرح کا کارروائی ناہیں کرے گا۔“ اسٹیل کی آواز میں شکست خوردگی اور پسپائی نمایاں تھی۔

”اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بھی کوئی چال ناہیں ہے؟“ اسحاق کی آواز میں دھاڑ تھی۔ ”تم پھر کسی حیلے سے اپنے شکاری کتے ہماری طرف روانہ کر سکت ہو...... یا وہ تمہارا پالتو پانڈے کوئی اور حرکت کر سکت ہے۔“

”اب ایسا کچھ ناہیں ہوگا...... توم لوگوں کی تسلی کے لئے ہام اپنے گارڈز کو سو میٹر پیچھے لے جا رہے ہیں۔ ہام ہوپ کرتا کہ توم کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا مومنٹ ناہیں ہوگا۔“

اگلے ایک گھنٹے میں واقعی اس امر کے واضح ثبوت نظر آئے کہ مخالف فریق نے ہمت ہار دی ہے اور اب وہ ماریا فرگوسن کی بخیریت رہائی چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہم اس ساری کارروائی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر چکے تھے اور مشکل ترین مرحلہ وہی تھا جب پانڈے نے شکاری کتوں والی خوفناک چال چلی تھی۔ یقیناً ہرن کے بچے کو پلاننگ کے تحت دہانے کے سامنے چھوڑا گیا تھا۔ کتے ہرن کے پیچھے لپکے تھے۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ ہرن جان بچانے کے لئے بھاگے گا تو سرنگ کے دہانے کی طرف آئے گا۔ اگر وہ دائیں بائیں ہونے کی کوشش کرتا تو بھی "حکم" کے اہلکار اسے ڈرا کر اس کا رخ دہانے کی طرف کر سکتے تھے۔

بہر حال جو ہوا، وہ منصوبہ ساز کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔

پانڈے اور اس کے مسلح ساتھیوں نے دہانے کے اردگرد سے اپنی پوزیشنیں ہٹا لی تھیں۔ باقی لوگ بھی کافی فاصلے پر چلے گئے تھے۔ ان کے گھوڑے اور کتے وغیرہ بھی اب دہانے کے قریب دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دہانے کی طرف سے غافل ہو گئے ہوں۔ انہوں نے ہماری حرکات وسکنات پر مکمل نظر رکھی ہوئی تھی۔ کم از کم دو ٹیلی اسکوپس کے چمکتے ہوئے شیشے مجھے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ماریا کا درد سے برا حال تھا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں کانٹا چبھنے کو بھی باقاعدہ ایک تکلیف کا نام دیا جاتا ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کے لئے آپریشن تھیٹر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں اس کی پوری انگلی جڑ سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر چوہان نے اسے ایک پین کلر انجکشن دیا اور انفیکشن سے بچانے والا ایک کیپسول بھی کھلایا...... وہ پھر بھی مسلسل ہائے وائے کرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب ہمیں اپنا دوست چرواہا نریندر سنگھ دہانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر کا صافہ کھول رکھا تھا تاکہ ہم اسے دور ہی سے اچھی طرح پہچان لیں۔

دہانے کے عین سامنے آ کر وہ زور سے بولا۔ "آپ لوگوں کے لئے میرے پاس ایک چٹھی ہے، کیا میں آگے آ کر دے سکتا ہوں؟"

اس نے یہ الفاظ مقامی زبان میں ادا کئے تھے۔ انور خاں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے تو آ جاؤ۔ اگر ہتھیار ہے تو اسے وہیں رکھ دو......"

انور خاں نے بھی یہ الفاظ اسی علاقائی زبان میں کہے تھے۔ یہ زبان میری اور چوہان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے اپنی چھوٹی سی کلہاڑی کمر سے نکال کر وہیں ایک درخت کی جڑ میں رکھ دی اور آگے بڑھ آیا۔ وہ ہم سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے مخالف فریق کی طرف سے ہماری جانب روانہ کیا گیا ہے۔

اس نے ایک چٹھی نکال کر انور خاں کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ سرجن اسٹیل کی طرف سے تھی اور انگلش میں لکھی گئی تھی۔ چوہان نے چٹھی پڑھی۔ اس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

"...... ہم تمہارے مطالبات کو من وعن تسلیم کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اب تمہاری طرف سے ماریا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تمہارے مطلوبہ لوگوں کو لانے کے لئے آدمی زرگاں روانہ کئے جا چکے ہیں۔ وہ کل شام تک واپس آ جائیں گے۔ سلطانہ کا والد اور بھائی بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اگر تم لوگ انہیں یہاں بلوانا چاہتے ہو تو بتا دو...... لیکن اگر براہِ راست تل پانی پہنچانا چاہتے ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارا کوئی بندہ خود تل پانی جا کر اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر تم لوگ اسٹیٹ سے نکلنا چاہتے ہو تو بھی ہم تمہیں محفوظ راستہ دے رہے ہیں۔

اب ہمارے درمیان معاملات طے ہو چکے ہیں۔ اب ہم امید کرتے ہیں کہ تم ماریا کی صحت اور آرام کا پورا خیال رکھو گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہماری طرف سے ایک ڈاکٹر آ کر ماریا کی مرہم پٹی کر دے۔ اگر تم لوگوں کو خوراک، دوا یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں بتاؤ، ہم مہیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

...... حالات میں بہتری کا خواہاں اسٹیل بریے۔"

یہ خط خوش آئند تھا۔ سب کے چہرے چمک گئے۔ درحقیقت اب اس سارے معاملے کو سات آٹھ روز گزر چکے تھے۔ مسلسل تناؤ نے سبھی کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ ایسے حالات میں اتنا زیادہ وقت گزارنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ وہ تھکا نہیں اور اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تو وہ غلط کہے گا۔ دلیری سے موت کا سامنا کرنا اور بات ہے...... مسلسل موت اور زندگی کے درمیان معلق رہنا اور بات۔

انور نے نریندر سے پوچھا کہ چٹھی بھیجنے والوں سے اس کا رابطہ کیسے ہوا؟

اس نے بتایا کہ اس کے پاس ہمارے لئے ایک اور پیغام بھی ہے اور یہ مراد شاہ وغیرہ کی طرف سے ہے۔ وہ اس امید پر دہانے کے آس پاس موجود تھا کہ شاید اسے کوئی ایسا موقع مل جائے کہ وہ یہ پیغام ہم تک پہنچا سکے۔ یہ امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی...... لیکن پھر واہگرو کی طرف سے کرپا ہو گئی اور جو کام ناممکن نظر آتا تھا، ممکن ہو گیا۔ اسے درختوں میں

بکریاں چراتے دیکھ کر خود صاحب لوگوں نے اپنے پاس بلایا اور یہ چٹھی دے کر ہماری طرف روانہ کر دیا۔

نریندر سنگھ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پانڈے وغیرہ نریندر کو اندر بھیج کر شاید یہ بھی جاننا چاہ رہے تھے کہ اندر کا نقشہ کیا ہے اور دہانے کے آس پاس کتنے لوگ موجود ہیں۔

انور خاں نے نریندر سے پوچھا کہ مراد شاہ کا پیغام کیا ہے؟

نریندر کے تاثرات بدل گئے۔ محسوس ہوا کہ اس کے پاس ہمیں بتانے کے لئے کچھ خاص باتیں ہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں جلدی جلدی انور خاں کو مقامی زبان میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

...... ماریا کے اغوا نے پوری اسٹیٹ میں کھلبلی مچا دی ہے۔ ہر طرف بس اسی بارے میں بات ہو رہی ہے۔ زرگاں میں اونچے طبقے کے لوگوں میں سخت خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے جو انگریز یہاں موجود ہیں، وہ سخت خوف زدہ ہیں۔ ان کی عورتیں گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ گھروں پر بھی سخت پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں۔ عام لوگ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جارج گورا صاحب کی بہن اغوا ہو سکتی ہے تو اور کون محفوظ ہے۔

نریندر سنگھ نے بتایا کہ اس کے علاوہ وہ زرگاں میں ایک اور طرح کی چپقلش بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار ہے، وہ اندر خانے دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ کا تو خیال ہے کہ ماریا کی جان بچانے کے لئے انور خاں اور اس کے ساتھیوں کے سارے مطالبے مان لئے جائیں اور کسی طرح کا خطرہ مول نہ لیا جائے...... لیکن کچھ لوگ اسے بہت بڑی شکست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح باغی ذہن رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے۔ ویسے بھی چالیس پچاس خطرناک ترین لوگوں کو یوں چھوڑ دینا بہت نقصان کا کام ہوگا اور بعد میں اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔

''حکم کا اپنا رویہ کیا ہے؟'' انور نے نریندر سے پوچھا۔

نریندر نے مقامی زبان میں کہا۔ ''مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ حکم جی خود بھی بندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' پھر وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''مراد شاہ نے مجھے آپ لوگوں کے لئے یہ پیغام دیا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں جتنے نظر آ رہے ہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہیں۔ ظاہری طور پر شاید یہ لوگ کچھ نرمی دکھا رہے ہوں مگر اندرون خانہ ایک زبردست حملے کا پورا پروگرام بن چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حملے میں ماریا کے ساتھ ساتھ آپ سب لوگوں کو بھی ختم کر دیا جائے...... اس حملے کی تیاری کے لئے رنجیت پانڈے اور اس

کے تین درجن ساتھی یہاں موجود ہیں۔ انہیں تیاری کے لئے کچھ وقت چاہئے، اسی لئے وہ نرمی دکھا رہے ہیں اور یہ چٹھیاں وغیرہ بھیج رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ کے چہروں پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ واقعی یہ ایک تشویشناک اطلاع تھی۔

چوہان نے نریندر سنگھ سے پوچھا۔ ''مراد شاہ صاحب اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

جواب میں نریندر سنگھ بولا۔ ''شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کے بندوں نے زرگاں میں خفیہ طور پر جو جانکاریاں اکٹھی کی ہیں، ان سے پتا چلا ہے کہ پچاس بندوں کی لسٹ میں سے قریباً چالیس پینتالیس بندے ایسے ہیں جنہیں ''حکم جی'' کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس بارے میں آپ لوگوں کو جو کچھ بھی بتایا جا رہا ہے وہ صرف اور صرف وقت گزارنے کے لئے ہے۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کے جو زیادہ سے زیادہ مطالبے مانے جا سکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بیمار بھائی کو چھوڑ دیا جائے...... اور آپ لوگوں کو نل پانی جانے یا پھر اسٹیٹ سے نکلنے کے لئے راستہ دے دیا جائے۔ شاہ صاحب نے آپ لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی کو نل پانی بھجوا دیں اور خود اسٹیٹ سے نکلنے کا راستہ لے لیں۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں نے اور کچھ نہیں دینا...... چاہے اس کے لئے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔''

انور خاں نے نریندر سنگھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم اس بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور کوئی فیصلہ لیتے ہیں۔''

''اور اس چٹھی کا جواب؟'' نریندر نے پوچھا۔

''اس کا جواب بھی ہم کچھ دیر بعد دیں گے۔''

نریندر نے مقامی زبان میں انور خاں سے گفتگو جاری رکھی اور کہا۔ ''انہوں نے ڈاکٹر کے بارے میں خاص طور سے پوچھا ہے کہ کیا وہ میم جی کے لئے کوئی ڈاکٹر بھیج دیں؟''

اسحاق چہک کر بولا۔ ''کوئی ضرورت نا ہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ڈاکٹر ہمارے پاس موجود ہے...... بلکہ ہم سب ڈاکٹر ہیں اور اس کا بہت اچھا علاج کر سکت ہیں۔''

نریندر سنگھ ہم سے اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

یہ ایک بدلی ہوئی صورت حال تھی۔ ہمیں اندر کی رپورٹ ملی تھی اور یہ خاصی تشویشناک تھی۔ زرگاں کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک گروہ ماریا

کی زندگی کی پروا کیے بغیر مہم جوئی کر سکتا تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ آدھ پون گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اسحاق اور احمد وغیرہ تو اس پر تیار نہیں تھے کہ اپنے دوستوں کی رہائی کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائیں مگر ڈاکٹر چوہان اور انور خاں کا خیال تھا کہ بدلی ہوئی صورتِ حال میں حکمتِ عملی سے کام لینا پڑے گا۔ انور خاں موت سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا لیکن وہ مستقبل قریب کے حالات کو بھی ذہن میں رکھ رہا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اگر یہ معاملہ خون خرابے پر ختم ہوتا اور ماریا بھی ماری جاتی تو پھر زرگاں کے مسلمان رہائشیوں پر قیامت ٹوٹ پڑنا تھی۔ حکم جی وغیرہ اس واقعے کو بہانہ بنا کر بہت ظلم کر سکتے تھے۔

آخر میں انور خاں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یارو! ہم اس وقت جنگ جیسی حالت میں ہیں اور جنگ میں کبھی وقت کے مطابق تھوڑا سا پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شکست ہوگئی۔ میری رائے میں مراد شاہ صاحب نے جواندر کی رپورٹ ہم تک پہنچائی ہے، وہ بڑی اہم اور قیمتی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔''

''لیکن اگر ہم اپنے دوسرے مطالبوں سے پیچھے ہٹیں گے تو وہ لوگ اور بھی شیر ہو جاویں گے۔'' اسحاق نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا۔'' چوہان نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''بیچ میں مسئلہ تو ان پچاس بندوں کا ہی ہے جن کو ہم چھڑانا چاہتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ نہیں ہوگا تو پھر حکم جی ''ایکشن والا خطرہ'' کسی صورت مول نہیں لے گا۔ اس پر جارج گورا وغیرہ کی طرف سے بھی زبردست دباؤ پڑ جائے گا کہ اس معاملے کو خون خرابے کے بغیر حل کیا جائے۔''

''ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آوت ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''اگر ہم اپنے اس مطالبے کے پیچھے ہٹ جاوت ہیں..... اور پھر بھی حکم اور پانڈے وغیرہ کھون کھرابے کا سوچتے ہیں تو جارج اور اس کے سیکڑوں ساتھی ایک دم قیامت برپا کر دیویں گے۔''

اس موضوع پر پانچ دس منٹ مزید بات ہوئی۔ آخر ایک حتمی فیصلہ کر لیا گیا..... طے ہوا کہ اسٹیل وغیرہ کو ان کی چٹھی کا جواب دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ سب سے پہلے سلطانہ کے والد اور بھائی کو نل پانی پہنچائیں، اس کے بعد ہم بھی اپنی مانگوں پر نظرِ ثانی کریں گے۔ ان کو شروع میں یہ عندیہ دیا جائے کہ اگر پچاس کے پچاس لوگ رہا نہیں کیے جا سکتے تو ان میں سے جتنے لوگ جارج کی جیل میں موجود ہیں، ان کو چھوڑ دیا جائے اور یہاں پہنچایا جائے۔ اس فیصلے پر اسحاق سمیت سب نے اتفاق کیا۔ تاہم اسحاق کی رائے تھی کہ اسٹیل اور اس کے ساتھیوں نے کل شام تک سارے مطالبے ماننے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کے پورا

ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔

کچھ بحث وتمحیص کے بعد اسحاق کی یہ بات مان لی گئی۔ حالانکہ اس وعدے کے پورا ہونے کے امکانات کم ہی تھے۔ فیروز کو نہلائے بغیر ایک چادر میں لپیٹا گیا۔ انور خاں نے باقاعدہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر سرنگ کے اندر ہی اسے ایک نیم پتھریلی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ سب کی آنکھیں نمناک تھیں۔ دونوں کتوں کی لاشوں کو سرنگ کے عقبی حصے میں پہلے سے موجود ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی گئی۔ پانڈے کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا کر لے گئے۔

رات کو دہانے پر اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد میں پھر باروندا جیکی کے پاس پہنچا اور وہاں اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے گزارے۔ شراب پینے کے بعد اس کی توانائیاں عود کر آتی تھیں اور وہ کافی حد تک صحت مند دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بے حد مشکور بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے مجھے مارشل آرٹ کے داؤ پیچ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس کے اندر جیسے یہ شدید خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ بتائے اور میں اس کے بتائے ہوئے کو ''فالو'' بھی کروں۔ اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے اندر ایک آگ دیکھ رہا ہے اور اگر یہ آگ جلتی رہی تو میں کافی کچھ حاصل کر لوں گا اور وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا..... میں خود محسوس کرتا تھا کہ میرے اندر کچھ روشن ہو چکا ہے اور اس روشنی کی ابتدا اسی رات ہوئی تھی جس رات سلطانہ نے میرے لئے بہت کچھ دیا تھا۔

مجھے سکھلانے کے دوران میں جیکی چھوٹے چھوٹے وقفے بھی لیتا تھا۔ ان وقفوں میں وہ وسکی کے گھونٹ لیتا، کھانستا اور ہنٹر بیف چبانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پرانی یادیں بھی تازہ کرنے لگتا۔

جس رات کا میں ذکر رہا ہوں، اس رات جنگل میں خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے۔ بھیگی ہوئی نباتات کی خوشبو ہوا کے ساتھ سرنگ میں چکراتی رہتی۔ اس ماحول نے جیکی کا نشہ دوآتشہ کر دیا۔ وہ اپنا من پسند نیپالی گیت گنگنانے لگا۔

..... ہم نے اگلے روز شام تک سرجن اسٹیل اور پانڈے وغیرہ کا وعدہ ایفا ہونے کا انتظار کیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق ان لوگوں نے ایک بار پھر عذرِ لنگ کا سہارا لیا۔ پانڈے نے میگافون کے ذریعے ہمیں بتایا کہ بارش کی وجہ سے رات کو کافی راستے بند ہوگئے ہیں۔ جنگل میں سات آٹھ میل کا علاقہ ایسا ہے جہاں سفر ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا جیل سے یہاں پہنچنے والوں کی آمد میں ایک دو روز کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

بات کی تہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کی طرف سے جو اطلاعات ہم تک پہنچی تھیں، وہ بالکل درست ثابت ہو رہی تھیں۔ ہم سے وعدے کئے جا رہے تھے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جا رہا تھا۔

اسحاق اور احمد بہت برہم تھے۔ وہ ذہنی طور پر مرنے مارنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ خاص طور سے اسحاق تو یہی چاہتا تھا کہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا جائے۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

بہر حال، طے شدہ پروگرام کے مطابق اسحاق کو بھی ہماری بات ماننا پڑی۔ چوہان نے انگریزی میں خط لکھا...... اور اس میں اسٹیل وغیرہ کو یہ عندیہ دیا گیا کہ اگر وہ لوگ فوری طور پر سلطانہ کے والد اور بھائی کو گونگے ہاشم سمیت نل پانی پہنچا دیں...... تو ہم باقی کے مطالبات میں کچھ لچک پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ خط ایک بار پھر میں ہی لے کر گیا۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں انڈین سیکیورٹی فورسز کے سابق افسر رنجیت پانڈے کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ رنجیت پانڈے کی جگہ ایک سانولا سا فربہ اندام شخص خط لینے کے لئے آگے آیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ تھیں اور وہ حکم کے سپاہیوں کی مخصوص وردی میں تھا۔ میں نے نل پانی میں چھوٹے سرکار یعنی اجیت رائے کے محافظ بھی دیکھے تھے۔ ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔ جنگل میں یہ وردیاں جیسے سبز گرد و پیش کا حصہ ہی بن جاتی تھیں۔ حکم کے سپاہیوں کی وردیوں میں سبز اور خاکی رنگ تھا۔

خط دینے کے بعد میں واپس آ گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے پھر انتظار اور تناؤ کے تھے۔ دونوں طرف خاموشی تھی لیکن یہ ایسی خاموشی تھی جسے کسی بھی لمحے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خاموشی کی دھند میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی موجود تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب پانڈے نے ہی ہمیں میگافون کے ذریعے اطلاع دی کہ ہمارا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔ سلطانہ کے والد، بھائی اور ملازم ہاشو بخیریت نل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اگر ہم اس کی تصدیق کرنا چاہیں تو ہم میں سے کوئی ایک شخص نل پانی جا کر واپس آ سکتا ہے۔

انور خاں تصدیق کئے بغیر کیسے مان سکتا تھا؟ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اطلاع دینے والا پانڈے تھا۔

مشورے کے بعد طے ہوا کہ ہم میں سے احمد سرنگ سے باہر جائے گا اور تصدیق کر

کے ہمیں اطلاع دے گا۔ نل پانی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ احمد ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بہ آسانی واپس آ سکتا تھا۔ میرے دل میں آئی کہ میں بھی رضا کارانہ طور پر احمد کے ساتھ چلا جاؤں۔ اس طرح میں نل پانی میں سلطانہ سے مل سکتا تھا اور اس بچے سے بھی جسے میرا خون کہا جا رہا تھا۔ میں سلطانہ کو تسلی تشفی بھی دے سکتا تھا مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں جس منزل کا راہی نہیں تھا، اس منزل کی طرف جانے سے کیا حاصل تھا؟ مجھے سلطانہ کی طرف نہیں کسی اور کی طرف جانا تھا۔ وہ جو ایک روز، بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کہے، خاموشی سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی...... سمندر پار جا بیٹھی تھی...... ان گلی کوچوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئی تھی...... جہاں ایک چپے پر ہماری یادوں کے گلشن کھلے ہوئے تھے۔ ہاں، میری منزل وہی تھی۔ اس کے سوا کوئی بنت حوا میری زندگی میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر سلطانہ آئی تھی تو وہ میرے ہوش و حواس میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بیتا ہوا وقت میرے ذہن کی سلیٹ پر سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی قربانیوں کے بارے میں سنا تھا۔ ان جانکاریوں کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی تو موجود تھی لیکن کسی بھی درجے کی محبت نہیں تھی۔

احمد، انور خاں کی ضروری ہدایات کے ساتھ سرنگ سے روانہ ہو گیا۔ اس کے لئے پانڈے نے گھوڑا فراہم کیا اور ایک محافظ بھی ساتھ بھیجا۔ احمد کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے ہی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ مثبت خبر لایا ہے۔ اس نے آ کر بتایا۔

”سب ٹھیک ہے انور بھائی! میں سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ سلطانہ بی بی کے بیمار بھائی کو چارپائی اور گھوڑا گاڑی پر سفر کرا کے نل پانی پہنچایا گیا ہے۔“

”نل پانی مین کیا حالات ہیں؟“ چوہان نے پوچھا۔

”سلطانہ بی بی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجرموں کو ہر صورت سزا ملنی چاہئے۔ اگر حکم اور اس کے لوگن ناہیں دیتے تو پھر اس سزا کی ذمے داری چھوٹے سرکار کو لینی چاہئے۔“

انور خاں نے احمد سے سرنگ کے ارد گرد کے حالات دریافت کئے۔

احمد اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”باہر ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ لوگن موجود ہیں۔ میرے کھیال میں تو ان کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم ناہیں ہووے گی۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دوربینیں لے کر درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ان کے گھوڑے گھاس پر منہ مارتے نظر آوت ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ ہے۔ ٹیلوں کے

ساتھ ساتھ ان کی چھولداریاں ہیں اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے ہیں۔"

"ظاہر ہے کہ میم صاحبہ کا معاملہ ہے۔ اگر ساری فوج بھی یہاں بھیج دی جاتی تو حیرانی کی بات نہیں تھی۔" چوہان نے کہا۔

انور خاں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔"چلو، پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔"

"اب کیا کرنا ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"اب ان کو دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مزید یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ ہمارے مطلوبہ بندے یہاں پہنچادیں۔ اگر سارے نہیں آسکتے تو اتنے پہنچادیں جتنے کا انہوں نے اقرار کیا ہے...... یعنی پچیس افراد۔"

"لیکن وہ اتنے بھی نہیں پہنچائیں گے۔" بھکشو ہمیش نے کہا۔

"نہیں پہنچائیں گے لیکن کچھ نہ کچھ تو بتائیں گے نا۔ فی الوقت وہ جو بھی دیں، ہمیں مان لینا چاہئے...... کیا خیال ہے؟" آخری الفاظ کہتے ہوئے انور خاں نے چوہان کی طرف دیکھا۔

چوہان نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلادیا۔

اس بار خط لکھنے کے بجائے چوہان اور انور خاں نے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری طرف سے چوہان اور احمد باہر نکلے۔ ان کی طرف سے سرجن اسٹیل اور گرو مودان آئے۔ درختوں کے جھنڈ میں قریباً آدھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ ہماری توقع اور اندیشے کے عین مطابق وہ لوگ فوری طور پر صرف سات بندے دینے کے لئے آمادہ ہوئے۔ یہ زیادہ اہم بندے نہیں تھے۔ یہاں بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ صادق آرہا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ معاملہ طے ہوگیا۔ چوہان اور احمد واپس آگئے۔

چوہان نے بتایا۔"کل دوپہر تک سات بندے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ماریا سمیت یہاں سے نکل سکیں گے اور نل پانی کی طرف روانہ ہوں گے۔"

"ماریا آخر تک ہمارے ساتھ رہے گی؟" ہمیش نے پوچھا۔

"نہیں...... اسٹیٹ کی حدود سے دومیل پیچھے ماشی پور کے قریب ہمیں ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بدلے سرجن اسٹیل یا گرومودان میں سے کوئی ایک ہماری تحویل میں آجائے گا۔ وہ تب تک ہمارے ساتھ رہے گا، جب تک ہم کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے۔"

"یہ دھوکا ہے۔ کوئی چال ہے۔" اسحاق نے چیخ کر کہا۔"میں آپ سب کو بتادیوت

ہوں، ہم تب تک ہی بچے ہوئے ہیں جب تک یہ چھوکری ہمارے ساتھ ہے۔ جس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکلی، ہم مارے جاویں گے۔ میں کسی صورت ایسا ناہیں ہونے دوں گا۔ یہ تب ہی رہا ہووے گی جب ہم یہاں سے نکلیں گے۔" اسحاق کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

انور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔"دیکھو، ہم ماریا کے بدلے جو کچھ لے رہے ہیں، وہ بھی کچھ کم خاص نہیں ہے۔ سرجن اسٹیل یا پھر گرومودان۔ ماریا کی طرح ان دونوں کے جیون کا رسک لینا بھی ان لوگوں کے لئے آسان نہیں ہوگا......اور پھر تب تک ہم ویسے بھی اسٹیٹ سے تقریباً نکل چکے ہوں گے۔"

اسحاق بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا۔ بہرحال، انور خاں اور چوہان اسے سمجھانے میں لگے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسے بمشکل راضی کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

○......❖......○

سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ اب ہمیں کل دوپہر تک زرگاں سے رہا ہونے والے سات بندوں کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں سے نکلنے کی تیاری بھی کرنا تھی۔

احمد نل پانی سے ہو کر آیا تھا۔ میں اس سے سلطانہ اور بالو وغیرہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ احمد خود بھی بھانپ گیا کہ میں اس سے سلطانہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کھانے کے بعد ہم ایک الگ جگہ جا بیٹھے۔ احمد نے بتایا۔"وہ ابھی تک سخت صدمے میں ہے۔ کچھ کھاتی پیتی ناہیں۔ نہ ہی بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ بس گم صم بیٹھی رہوت ہے یا پھر رونا شروع کردیوت ہے۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر ایک ڈاکٹر اس کا علاج کررہا ہے۔ میں اس سے ملا ہوں۔ وہ بتارہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بہتر ہوجاوے گی۔"

"تم خود بھی اس سے ملے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں گیا تھا۔ وہ عبدالغنی کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ میاں بیوی اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رونے لگ گئی۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہاری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بہت تاکید کی کہ میں تمہارا بہت کھیال رکھوں...... اس کے دل میں تمہارے لئے وہی پریشانی ہے جو ایک بہت پیار کرنے والی بیوی کے دل میں ہوسکت ہے۔"

"اس نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟"

"ناہیں تابش بھائی! میرا کھیال ہے کہ وہ اپنا سارا دکھ درد اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔ جیسا ساگر اوپر سے شانت ہووے ہے، پر اندر طوفان پلے ہے۔ سلطانہ بی بی کے اندر

بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔اب پتا ناہیں،اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔“

”تم نے اسے بتایا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں؟“

”ناہیں، میں یہ بتاتا تو وہ زیادہ غمگین ہو جاتی۔ وہ اوپر اوپر سے کچھ بھی کہے لیکن کوئی بھی بیوی اس طرح اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لئے کھونا ناہیں چاہتی اور سلطانہ تو ایسی شوہر پرست بیوی ہے جس نے......“

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔شاید اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے۔

میں نے احمد سے مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا۔”تمہارا کیا خیال ہے......ایسا کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ جلد سے جلد نارمل ہو جائے؟ اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں؟“

اس سے پہلے کہ احمد جواب میں کچھ کہتا، اسحاق نے اشارے سے ہمیں اپنی طرف بلایا۔وہ ہمیں کوئی خاص چیز دکھانا چاہ رہا تھا۔

ہم اُٹھ کر اس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دہانے سے کچھ فاصلے پر اس جگہ لے آیا جہاں ہم سوتے تھے۔”یہ دیکھو۔“ اسحاق نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ماریا جو پچھلے تقریباً اٹھارہ گھنٹے سے پتھر پر چڑھی بیٹھی تھی تاکہ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے......اب تھک ہار کر زمین پر لیٹ گئی تھی اور سو رہی تھی۔

اسحاق زہریلے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔”حرامزادی کہوت تھی مجھے بیڈ چاہئے،گدا چاہئے۔اب دیکھو، پتھروں پر سو رہی ہے۔“

”سیانے ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ وقت سب کچھ سکھا دیوت ہے۔“ احمد نے تائید کی۔

”ایک دو ہفتے اور ہمارے ساتھ رہی تو اسے کانٹوں پر بھی سونا آ جاوے گا۔“ اسحاق نے کہا۔

واقعی یہ دیکھنے والا نظارہ تھا۔خوشبودار کمروں میں مچھر دانیاں لگا کر آرام دہ بستروں کا لطف لینے والی، سخت ناہموار زمین پر پڑی تھی۔ اس کا قیمتی لباس سرنگ کی مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔اپنے لباس کی طرح وہ خود بھی بے ترتیب تھی۔ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں تھا۔ میں نے دہانے کی طرف سے آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا، اس کی گوری چٹی پنڈلی پر ایک چھوٹا لال بیگ رینگ رہا تھا۔یہی زندگی اور زندگی کی بوالعجبی ہے۔

اگلے روز سہ پہر ڈھائی تین بجے کے قریب وہ ساتوں افراد زرگاں سے آ گئے جن کا ہم

انتظار کر رہے تھے۔ان کی عمریں بیس اور ستائیس اٹھائیس سال کے درمیان تھیں۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں، سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں تھے۔ان کی شکلوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بامشقت قید گزار کر آ رہے ہیں۔ان میں سے کئی ایک کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ انور خاں، احمد اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ملے۔کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔

ایک پارسی کے سوا یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ان میں سے صرف ایک شخص قتل کا مجرم تھا، باقی سب جرمِ بے گناہی کا شکار تھے۔ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے حکم یا جارج کی کسی زیادتی کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔کسی سرکاری اہلکار کے دستِ ستم کو روکنے کی کوشش کی تھی یا ایسا ہی کوئی اور گناہ کیا تھا۔انور خاں نے مجھ سے اور چوہان سے ان سب کا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک حجام تھا، دوسرا ایک ماہر قفل گر تھا۔ یہ سب افراد اپنی اس آزادی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے تھے اور قدرت کی نیرنگی پر حیران تھے۔

سب سے پہلے انہیں کھانا کھلایا گیا۔ ہمارے پاس بس گزارے لائق خوراک تھی۔ زیادہ تر خشک راشن یعنی چنے، بھٹے، ہنٹر بیف اور بسکٹ وغیرہ ہی تھے۔قیدیوں نے یہ چیزیں ندیدوں کی طرح کھائیں۔ اندازہ ہوا کہ اپنی طرف قید کے دوران میں وہ معقول خوراک سے یکسر محروم رہے ہیں۔

ان میں سے جو شخص حجام تھا، وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ زرگاں میں وہ میرے بال تراشتا رہا ہے۔اس کا کہنا تھا کہ اس کا حمام اسی محلے میں ہے جہاں مختار راجپوت اور ان کی بیٹی سلطانہ رہتے ہیں۔اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اکثر سلطانہ خود مجھے اپنے ساتھ لے کر آتی تھی اور جب تک میرے بال تراشے جاتے تھے، وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ میں چونکہ پوری طرح صحت مند اور چوکس نہیں تھا، وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔عبدالرحیم نامی یہ حجام اس بات پر ششدر بھی تھا کہ میں اسے کیوں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔ چوہان اسے ایک طرف لے گیا، غالباً صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا......

ان قیدیوں سے ہمیں اپنے اردگرد کے حالات کے بارے میں بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ہم رات تک تیاری میں لگے رہے۔خشک راشن تھیلوں میں رکھا گیا۔فالتو ایمونیشن کو پولیتھین میں لپیٹ کر کینوس کے دو بڑے بیگوں میں اس طرح سنبھالا گیا کہ وہ بارش وغیرہ سے محفوظ رہے۔رائفلوں کو صاف کر کے بالکل تیار کر لیا گیا۔مکمل ترتیب بنائی گئی کہ ہمیں کس

فارمیشن میں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہنگامی صورتِ حال سے کس طرح نمٹنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انور خاں میں یقیناً قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل وقت سے پہلے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس تنگ و تاریک سرنگ میں یہ ہماری آخری رات ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرح کی سنسنی بھی رگ و پے میں جاگی ہوئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد حالات ہمارے لئے ایک دم خطرناک ہو جائیں گے۔ آنے والے ایک دو روز میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ماضی قریب میں ایسے حالات مجھے اعصاب زدہ کر دیا کرتے تھے۔ میں خطرے کی آمد سے پہلے ہی اس کے بارے میں اتنا سوچتا تھا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ حالات کی سنگینی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس پُر جوش گروپ کا حصہ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی لڑنے مرنے کے لئے تیار تھا۔ میرا جوش یوں اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے تھے، وہ میری خواہش کے عین مطابق تھا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں کسی طرح اس ''جادونگری'' سے نکل جاؤں۔ بے شک اس راجواڑے نے ایک جادونگری ہی کی طرح مجھے کئی برسوں سے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ اب میرے لئے ایک سبب پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایک ایسی جماعت کا حصہ بن گیا تھا جو یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس جماعت کے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری طرف ہمیں روکنے والوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔

یہ بات اب ہر شک و شبے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ میرے جسم میں ایک الیکٹرانک چپ موجود ہے جو مجھے اس راجواڑے کی حدوں میں پابند رکھے ہوئے ہے۔ یہ چپ اب بھی میرے جسم میں موجود تھی۔ میرے صیادوں کو اب بھی فوراً معلوم ہو سکتا تھا کہ میں اس اسٹیٹ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں لیکن اب میں جس جماعت کا حصہ تھا، وہ اسے روک نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ روکتے تو پھر زبردست خون خرابے کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔

جو بات چیت ہوئی تھی، اس میں چوہان نے پانڈے وغیرہ سے تین خچر بھی طلب کئے تھے۔ ہمیں دو خچر اور ایک گھوڑا دیا گیا۔ یہ تینوں جانور رات آٹھ نو بجے ہی سرنگ میں پہنچ گئے۔ ہمیں ان کو سامان برداری کے لئے استعمال کرنا تھا۔ حسب معمول رات کے پہلے حصے میں جن افراد کی ڈیوٹی تھی...... ان میں، مَیں بھی شامل تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں نے دس پندرہ منٹ تک چٹائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کی اور پھر شراب کی نصف بوتل لے کر بارونداجیکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کے لئے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی اور لالٹین رکھ دی گئی

تھی۔ وہ تنہائی میں خوش رہتا تھا اور ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ علیحدہ رہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس میں شراب کی طلب بیدار ہو جاتی تھی اور یہ طلب شام تک بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شام کے بعد یہ طلب عروج پر پہنچ جاتی تھی اور وہ واویلا شروع کر دیتا تھا۔ ہمیں جہنمی ہونے کی بشارتیں سناتا...... خود کو کوستا اور ان حالات کو بھی جو اسے پیاسا مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم بارونداکو اس کی طلب کے مطابق شراب فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لئے تو اس سرنگ کے اندر ہی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں بارونداجیکی کے ٹھکانے پر پہنچا تو چونک گیا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سینڈ بیگ کی طرف دیکھا، وہ بھی اکیلا ہی جھول رہا تھا۔ لالٹین کی لو اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ شاید وہ کسی حاجت کے لئے کسی کونے کھدرے کی طرف رینگ گیا ہے۔

اگلے دو چار منٹ کے اندر میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر سے باندھ دی جاتی تھی اور صبح کے وقت ہی بس ایک دو گھنٹے کے لئے کھولی جاتی تھی...... یا پھر کسی وقت رات کو جب وہ مجھے فائٹنگ آرٹ کے داؤ پیچ سکھاتا تھا، میں کچھ دیر کے لئے اس کی ٹانگ کھول دیتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے میں خود ہی اسے کھانا دینے کے لئے یہاں آیا تھا، تب بھی اس کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی بندھی ہوئی ٹانگ کے ساتھ رینگ کر کہیں جاتا تو زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اسے دو چار آوازیں دیں پر اسے سرنگ کی ذیلی شاخوں میں ڈھونڈنا شروع کیا۔

میری آوازیں سن کر ہمیش اور احمد بھی ٹارچ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

''کیا ہوا تابش؟'' احمد نے پوچھا۔

''جیکی نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

وہ دونوں بھی میرے ساتھ تلاش میں شریک ہو گئے۔ ہم نے زمینی شہادت ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی۔ ایک دو جگہ ننگے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ بیساکھی نما لکڑی کا نشان بھی موجود تھا۔ تو کیا بارونداجیکی کسی طرح اپنی زنجیر کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ اپنے اکلوتے ہاتھ سے وہ کس طرح ایسا کر پایا تھا؟ جلد ہی دیگر ساتھیوں تک بھی یہ خبر پھیل گئی کہ جیکی غائب ہے۔

سب دہانے کے قریب اکٹھے ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ''یہ تو سوچا نہیں جا سکتا کہ وہ

باہر نکل گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ دہانے کی طرف سے ہی نکل سکتا تھا۔“

”مطلب ہے کہ وہ سرنگ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔“ اسحاق نے کہا۔

”ایک اور بات بھی تو ہوسکتی ہے۔“ انور خاں نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

”وہ کیا؟“ چوہان نے پوچھا۔

”سرنگ سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ...... جواب تک ہماری نظر سے اوجھل رہا ہو۔“

”یہ کیسے ہوسکت ہے انور بھائی۔“ اسحاق اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”تم جانت ہی ہو، یہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ہم نے چپا چپا دیکھ لیا تھا۔“

”لیکن ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر جگہ پہنچے تھے اور سو فیصد تسلی کر لی تھی۔“

کسی نے انور کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ ہاں ایک طرح کی سنسنی سب نے محسوس کی۔ اگر واقعی سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ موجود تھا تو پھر اس راستے سے سرنگ میں داخل بھی ہوا جا سکتا تھا اور یہاں ہمارے دشمنوں میں پانڈے جیسا نہایت عیار اور گھاگ شخص بھی موجود تھا۔

انور خاں، چوہان اور اسحاق تو اپنی پوزیشنوں پر موجود رہے اور باقی ایک بار پھر جیکی کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ میں اپنی جگہ کچھ ندامت بھی محسوس کر رہا تھا۔ جیکی سے زیادہ تر میرا ہی رابطہ رہتا تھا۔ اس کی بندش کو چیک کرنا بھی میری ہی ذمے داری تھی۔ اسحاق اور انور خاں وغیرہ کا خیال تو شروع میں یہ تھا کہ مجھے اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہئے تھا لیکن بعد میں جب انہیں جیکی کی مکمل کہانی معلوم ہوئی تھی، وہ بھی اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگے تھے۔

رات آخری پہر تک سرنگ کی بھول بھلیوں میں اس کی تلاش جاری رہی پھر ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری روانگی کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ انور خاں کا خیال تھا کہ ہم اجالا ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ جانوروں پر سامان رات کو ہی باندھ لیا گیا تھا۔ باقی تیاری بھی مکمل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہم جیکی کی مزید تلاش جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

O......❖......O
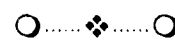
چھ بجے کے لگ بھگ ہم سرنگ سے نکل آئے۔ مطلع صاف تھا۔ گرد و پیش اوس میں نہائے ہوئے تھے۔ سرنگ چھوڑتے ہوئے میں نے الوداعی نظروں سے اس کے اندر جھانکا۔ یہاں گزارے ہوئے دن بڑے سنسنی خیز تھے...... تناؤ سے پُر اعصاب شکن۔ یہاں کئی ایک انوکھے واقعات ہوئے تھے جن میں شکاری کتوں کا اچانک سرنگ میں گھس آنا اور پھر اندھا دھند فائرنگ کا شروع ہو جانا بھی شامل تھا۔ ہم اپنے قریبی ساتھی فیروز کی قبر بھی اسی سرنگ کی

ویران تاریکی میں چھوڑے جا رہے تھے...... اور پھر سب سے بڑھ کر بارونا جیکی تھا۔ وہ ایک معمے کی طرح ہمارے سامنے آیا تھا اور ایک معمے کی طرح اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کا یوں اچانک اوجھل ہو جانا میرے دل و دماغ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس اب یہاں رکنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ جیکی کو ہم کسی صورت چھوڑ کر نہ جاتے۔ انور خاں کے نزدیک اب بھی نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ جیکی کہیں سرنگ کی بھول بھلیوں میں ہی موجود ہوگا۔ جونہی وہ اپنے اردگرد کے حالات بہتر دیکھے گا، یہاں سے نکل جائے گا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل چکا ہے لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو کیا وہ اس خطرناک جنگل کو پار کر کے واپس اس ندی تک پہنچ سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ نہتا تھا، معذور تھا اور نشے کے بغیر اتنا کمزور تھا کہ کسی بھی وقت، کسی حادثے کا شکار ہو سکتا تھا......

میرا دل اس کے لئے غم سے بھر گیا۔ عمران مجھ سے جدا ہوا تھا تو وہ شخص بھی جدا ہو گیا جس میں عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں اس قافلے کا حصہ بن گیا جو اس سرنگ سے نکل کر گھنے درختوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اس مختصر قافلے موجود افراد ایک خاص ترتیب سے باہر نکلے تھے اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق یہ ترتیب ہر صورت میں برقرار رکھی جانی تھی۔

سب سے آگے وہ گھوڑا تھا جس پر خوراک کا سامان لدا تھا۔ اس کے عقب میں چوہان، ہمیش اور احمد تھے۔ ان کے پیچھے ماریا تھی جس کے عین عقب میں اسحاق تھا۔ ماریا کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ اس کے پیچھے وہ باقی پانچوں افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں تھے جنہیں زرگاں سے رہا کرایا گیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار تو نہیں تھا تاہم انور خاں نے ان میں سے چار بندوں کو تلواروں سے مسلح کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے عقب میں انور خاں اور میں تھے۔ ہم دونوں نے دو سامان بردار خچروں کی رسیاں بھی تھام رکھی تھیں۔ ان خچروں پر چٹائیاں، برتن اور اضافی ایمونیشن وغیرہ بار کیا گیا تھا۔ ہر بندے کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہنگامی صورتِ حال میں انہیں کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہے، مایا اس مختصر قافلے کے عین درمیان میں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے جانے چاہئے تھے مگر انگلی کٹنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی تھا اس لئے انور نے تھوڑی سی رعایت کی تھی اور ہاتھ سامنے کی طرف بندھوائے تھے۔ اسحاق نے ایک بڑے سائز کی چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دی تھی۔ وہ اس چادر کے اندر ڈگمگاتی ہوئی سی چل رہی تھی۔

اس کے چہرے پر تلخی اور جھلاہٹ کے آثار صاف محسوس کئے جا سکتے تھے۔

ہم روانہ ہوئے تو حسب پروگرام اسٹیل، پانڈے اور ان کے دیگر ساتھی ہمارے پیچھے چل دیئے۔ اپنی ''کمٹمنٹ'' کے مطابق انہوں نے ہم سے کافی فاصلہ رکھا تھا۔ یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ یہ لوگ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گھڑسوار تھے۔ ان کی سبز اور براؤن وردیوں کی جھلک ہمیں چاروں طرف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی سو سے کم نہیں تھی۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ بھی موجود تھا۔ یہ لوگ چاہتے تو سیکنڈوں میں ہمیں بھون کر رکھ سکتے تھے لیکن ہمارے پاس ماریا ایک اہم مہرے کے طور پر موجود تھی۔ وہ اس اسٹیٹ میں ایک اہم ترین شخصیت تھی اور اس کی زندگی کے لئے رسک لینا آسان نہیں تھا۔

''ہمیں کتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا؟'' میں نے اپنے پہلو میں چلتے انور خاں سے پوچھا۔

''میلوں میں تو ٹھیک سے نہیں بتا سکوں گا لیکن اندازہ ہے کہ یہ دو دن کا سفر ہوگا۔ ہم پرسوں دوپہر تک اسٹیٹ کی حد سے نکل جائیں گے۔''

''اسٹیٹ کی حد سے نکلنے کے بعد ہماری پناہ گاہ کہاں ہوگی؟''

''اسٹیٹ سے باہر جو مقامی لوگ آباد ہیں، وہ حکم وغیرہ کے سخت خلاف ہیں۔ یہ زیادہ تر جاٹ اور راجپوت برادریاں ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو نیپالی علاقے سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ حکم اور چھوٹے سرکار کے گارڈز کے ساتھ اکثر ان کی جھڑپیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ہمیں فوراً پناہ دے دیں گے۔''

''کیا ہم انہیں مطمئن کر سکیں گے کہ ہم واقعی حکم کے باغی ہیں اور ہمیں پناہ دی جانی چاہیئے؟''

''یہ سب کچھ ڈاکٹر چوہان کرے گا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ہے۔ شاید تمہیں چوہان کی روداد کا پورا پتا نہیں ہے۔''

''پورا کیا، مجھے تھوڑا پتا بھی نہیں ہے۔ اس نے صرف اتنا بتا رکھا ہے کہ وہ الٰہ آباد میں رہتا ہے۔ وہاں حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اسے بھاگ کر اسٹیٹ میں آنا پڑا اور یہاں پناہ لینا پڑی۔''

انور بولا۔ ''حقیقت میں چوہان ایک دیہاتی کاشت کار کا بیٹا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر محنت مزدوری تک ہی محدود رہتے ہیں مگر چوہان قابل نکلا۔ نہ صرف یہ گاؤں سے شہر گیا بلکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ الٰہ آباد میں اس کا کلینک تھا اور مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ انہی

مریضوں میں چوالیس پینتالیس سال کی ایک ہندو عورت ہیما بھی تھی۔ یہ بیوہ تھی اور کافی پراپرٹی کی مالک تھی۔ اس کے بیٹے نافرمان تھے اور اس کوشش میں تھے کہ ماں سے پراپرٹی اپنے نام کروالیں۔ ہیما اپنے علاج کے دوران میں چوہان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے بیٹوں اور بہوؤں کے خوف سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات چوہان کے پاس رکھوا دیئے۔ یہ صورت حال ہیما کے بیٹوں کو کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر چوہان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہیما کی ایک بہو نے اپنی ساس پر بدچلنی کا الزام لگا دیا...... اور کہا کہ اس کی ساس اپنا دھرم بدل کر نوجوان ڈاکٹر سے بیاہ رچا لے گی۔ ہیما کے بیٹوں نے چوہان کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملے میں پولیس کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ چوہان کے خاندان برادری والے بھی بپھر گئے۔ خدشہ پیدا ہو گیا کہ لڑائی ہو جائے گی۔ چوہان نے سمجھ داری دکھائی اور لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لئے چپ چاپ اسٹیٹ میں آ گیا۔ اب یہ قریباً ڈھائی برس سے یہیں پر ہے۔''

چوہان کے بارے میں جاننے کی خواہش کافی دیر سے میرے دل میں تھی۔ آج انور خاں کے ذریعے یہ خواہش پوری ہوگئی تھی۔ میں نے اس روداد کے حوالے سے انور خاں سے کئی سوالات پوچھے۔ جو کچھ انور کو معلوم تھا، اس نے بتایا۔ ساتھ ساتھ ہمارا سفر بھی جاری رہا۔ میں نے انور سے پوچھا۔ ''اب چوہان اسٹیٹ سے باہر جا رہا ہے اور اپنے لوگوں میں واپس پہنچ رہا ہے۔ کیا اب اس کے لئے خطرہ نہیں ہوگا؟''

''اسٹیٹ سے باہر حالات کافی بدل گئے ہیں۔'' انور خاں نے جواب دیا۔ ''ہیما کے لالچی بیٹے ایک دوسرے سے ہی لڑ پڑے ہیں۔ ایک قتل ہو گیا ہے اور دوسرا جیل میں سڑ رہا ہے۔ ایک بہو اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے...... اور یہ وہی ہے جس نے اپنی ساس پر الزام لگایا تھا۔ سارا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہیما نے اپنی زیادہ تر پراپرٹی بیچ دی ہے اور گورکھ پور چلی گئی ہے۔''

ہم بظاہر تو باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے مگر اطراف پر ہماری گہری نظر تھی۔ ایک عجیب سی سنسنی بھی رگ و پے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اور انور خاں سب سے پیچھے تھے۔ اگر خدانخواستہ کسی طرح کی کوئی کارروائی ہوتی تو سب سے پہلے ہم ہی نشانہ بنتے۔ عقب سے قافلے کے تحفظ کی ذمے داری بھی ہم پر ہی تھی۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہمارے رکتے ہی ساتھ چلنے والے حکم کے دو ڈھائی سو اہلکار بھی رک گئے۔ ہم نے کھانا وغیرہ کھایا۔ چوہان نے اپنی اور

احمد کی مرہم پٹی کی۔ ہمیش کے ٹوٹے ہوئے بازو کی بھال بھی چوہان باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہم میں سے زیادہ تر زخمی تھے۔ اگر ڈاکٹر چوہان ساتھ نہ ہوتا تو ہماری حالت کافی ابتر ہوتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو ڈاکٹر چوہان اس قافلے کا اہم ترین بندہ تھا۔

ہمارا سفر گھنے جنگل کا تھا۔ کہیں کہیں راستہ زیادہ دشوار ہو جاتا تھا۔ ایسے میں تلوار بردار افراد آگے چلے جاتے تھے اور کہیں کہیں سے شاخوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے۔ تلواریں ایک سرلائے کے ساتھ شاخوں سے ٹکراتیں۔ ایسے ہی سرلائے ہمارے اردگرد بھی سنائی دیتے۔ یہ پانڈے اور اس کے ساتھی ہوتے تھے جو ہماری ہی طرح راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ جنگل میں شیشم، کیکر، جنتر اور کچنار کے درختوں کی بھرمار تھی اور جنگلی جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایک دو جگہ ایسے نشان بھی نظر آئے جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تیندوے کے ہیں۔ ان نشانوں کی وجہ سے قافلے میں سنسنی کی لہر محسوس کی گئی۔

چلتے چلتے ایک جگہ ماریا کو اچانک ٹھوکر لگی۔ اس کی بائیں جانب چلنے والے شخص نے بے ساختہ اسے تھاما اور گرنے سے بچایا۔ یہ وہی پارسی تھا جو سات افراد کے ہمراہ جارج کی جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ حالانکہ اس نے ماریا کی مدد کی تھی مگر ماریا نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ شاید اسے کوفت ہوئی تھی کہ ایک نیچ کالے نے اسے چھوا ہے۔

”ہام سے دور رہو۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”معافی چاہت ہوں میم جی۔“ پارسی گڑبڑا کر رہ گیا۔

”اب اس کو ہاتھ مت لگانا۔ چاہے گر کر اس کے تھوبڑے کا بھرتا بن جاوے۔“ اسحاق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ماریا اس رسی کی طرح تھی جو جل جاتی ہے لیکن اس کے بل نہیں جاتے۔ پچھلے چند دن میں وہ بہت خوار ہوئی تھی...... اس کے باوجود اس کی اکڑفوں برقرار تھی۔ اس کی نظروں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو حقارت سے دیکھ رہی ہے...... غالباً نسلی تعصب بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ درختوں کی گھنی شاخوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔ کسی وقت ہلکی سی تمازت بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک جگہ عجیب سا واقعہ ہوا۔ ہمیں اپنے اردگرد مختلف جنگلی جانوروں کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کم کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ بس کسی وقت ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

اردگرد کے درختوں پر بندر اور ان کے بچے بھی اچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی باریک آوازیں جنگل میں دور تک گونجتی تھیں۔ ایک بڑے چھتنار درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے دفعتاً ایک جسیم بندر ماریا پر آن گرا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک جاتی ہے۔ بس اتنا ہی دکھائی دیا کہ اس نے ماریا کے ہاتھوں سے کوئی شے چھینی ہے...... پھر وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس شاخوں پر چلا گیا۔ ماریا چلاتی ہوئی بائیں طرف ایک شخص پر گری۔ دونوں لڑھک کر ایک بارشی گڑھے میں چلے گئے۔ دو تین رائفلیں بندر کی طرف سیدھی ہوئیں مگر وہ زقند لگا کر شاخوں میں اوجھل ہو گیا۔ ماریا بدحواسی میں جس شخص سے ٹکرائی یہ وہی پارسی تھا جسے اس نے سہ پہر کے وقت برا بھلا کہا تھا۔ اب پارسی اوپر سے پھر پھسل کر میم صاحبہ کے اوپر جا گرا۔ اسحاق اور احمد نے اسے کھینچ کر اُٹھایا، پھر ماریا کو گڑھے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ پارسی ریان اور ماریا دونوں کیچڑ میں لت پت تھے۔

قافلہ رک گیا تھا۔ قافلے کے ساتھ ہی وہ دو ڈھائی سو افراد بھی رک گئے جن کی کمان پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے پاس تھی۔ پانڈے کے ایک ساتھی نے آگے آ کر استفسار کیا کہ کیا ہوا ہے۔ انور خاں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا۔ ماریا کے چہرے اور لباس سے کیچڑ وغیرہ صاف کیا گیا۔ وہ اپنے گھر میں ہوتی تو شاید اس طرح سڑے ہوئے کیچڑ میں لتھڑ جانے کے بعد کئی گھنٹے واش روم کے اندر ہی گزارتی لیکن یہاں اسے بس ایک بالٹی پانی ہی میسر آسکا۔ پارسی ریان کو اتنا بھی نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد جب قافلہ پھر روانہ ہوا تو ہم نے اس شریر بندر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ ایک شاہ بلوط کی بلند شاخوں پر بیٹھا بسکٹ کھا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ کا ڈبا تھا۔ وہ ماریا سے یہی چھین کر لے گیا تھا۔ مایا اب کچھ شرمندہ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے بھی احساس تھا کہ جس شخص کے صرف ہاتھ لگانے پر وہ برہم ہو گئی تھی، اس کے ساتھ اسے باقاعدہ بغل گیر ہونا پڑا تھا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے میم جی اب کچھ شرما رہی ہے۔“

انور خاں نے گہری سانس لے کر بولا۔ ”ان گوری چمڑی والوں کو شرم کم ہی ہوتی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے یا غیرت شیرت جاگتی ہے۔“

ہم مدھم آواز میں باتیں کرتے چلتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی انور خاں عقابی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حیثیت ٹیم کے اس کپتان کی سی تھی جو ہمہ وقت فیلڈ پر گہری نظر رکھتا ہے اور ہر نقل و حرکت کو نوٹ کرتا ہے۔

رات کو درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر ڈیرا ڈالا گیا۔ درختوں کی شاخوں سے لالٹینیں لٹکا دی گئیں۔ دو عارضی چولہے بنائے گئے۔ راستے میں شکار کیے گئے گوشت کو بھونا گیا۔ نہایت سنگین صورتِ حال کے باوجود اس قیام نے لطف دیا۔ جنگلی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی مداخلت سے محفوظ رہنے کے لئے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن کر دیئے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹا تو سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ایک دم مجھے باروندا جیکی پھر یاد آ گیا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بھی اتنی جلدی کھو جائے گا۔ اس خطرناک جنگل میں وہ اکیلا کس طرح ''سروائیو'' کرے گا؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست تھا۔

چند دنوں کے ساتھ میں جیکی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اور اس میں سب سے اہم، درد کے حوالے سے وہ فلسفہ تھا جس نے میرے دل کی گہرائی کو چھوا تھا۔ وہ درد کے ساتھ انوکھے طریقے سے نمٹنا جانتا تھا اور اس نے یہ جانکاری بڑے تفصیلی انداز میں مجھ تک پہنچائی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس معاملے میں بھی عمران نے ہی میری مدد کی ہے۔ اگر مجھے جیکی میں اپنے بچھڑے یار کی جھلک نظر نہ آتی تو میں اسے کشتی سے اُٹھا کر کہاں لاتا...... اور اگر وہ نہ آتا تو پھر...... اس کی باتیں بھی وہیں کشتی میں اس کے ساتھ رہ جاتیں......

مجھے لگا کہ مجھ سے بچھڑنے کے باوجود عمران قدم قدم پر میری مدد کر رہا ہے۔ کبھی کسی ڈھنگ سے، کبھی کسی روپ میں...... وہ ہمہ وقت میرے ساتھ تھا۔ اس کی معنی خیز باتیں، اس کی جاں بخش مسکراہٹ، اس کی جادوئی تھپکی...... سب کچھ میرے ساتھ تھا اور پھر اس کی آواز، اس کا وہ انقلاب آفریں جملہ جس نے میری ناتوانیوں و نامرادیوں کی راکھ میں سے ایک نئے انسان کو وجود دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لئے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔'' اور پھر اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا تھا۔ ''جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے اور مرنا ہے تو ڈرنا کیا۔''

وہ رات خیریت سے گزری۔ ہم نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے باری باری پہرا دیا اور آرام بھی کیا۔ اگلی صبح اجالا ہونے کے ساتھ ہی ہم پھر روانہ ہو گئے۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی ہمارے اردگرد موجود دو ڈھائی سو افراد بھی حرکت میں آ گئے۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ گرو مودان ان لوگوں میں موجود نہیں تاہم پانڈے، اسٹیل اور موہن کمار وغیرہ ساتھ ہی ہیں۔ جارج کی جیل سے رہا ہونے والے قیدیوں میں حجام عبدالرحیم بھی تھا۔ آج وہ میرے اور انور خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں زرگاں کی اس بدنام جیل کے بارے میں بتا رہا تھا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں حکم کے ایک سپاہی کو استرا مارنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ میرے استرے سے وہ بری طرح گھائل ہوا تھا۔ وہ میرے پاس ایک مسلمان بوڑھے کو لایا تھا۔ اس بوڑھے پر حکم کا کوئی افسر ناراض تھا۔ سپاہی نے مجھ سے کہا کہ میں بوڑھے کی داڑھی اور سر کے بال مونڈ دوں۔ میں نے انکار کیا۔ وہ سخت غصے میں آ گیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کی گردن پر استرا مارا اور بھاگ گیا۔ دو دن بعد مجھے نل پانی کے راستے میں پکڑ لیا گیا۔''

''کب سے جیل میں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تین سال سے اوپر ہو گئے تھے جی۔ مگر ایسے لگت ہے کہ تین صدیاں بیت گئی ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ پھانسی ہی دے دیتے۔ وہاں جیل میں بڑی کڑی مشقت لی جاوت ہے۔ بات بے بات ذلیل کیا جاوت ہے۔ جارج صاحب کے ہرکارے مار مار کر کھال ادھیڑ دیوت ہیں یہ ہرکارے قیدی عورتوں پر بھی ہر طرح کا ظلم ڈھاوت ہیں۔ وہاں کوئی کسی کی فریاد سننے والا ناہیں۔'' عبدالرحیم نے اپنی قمیص اُٹھا کر پشت دکھائی۔ یہاں ہنٹر کی مار کے انمٹ نشان موجود تھے۔ جس طرح گھوڑوں کی پیٹھ کو داغا جاتا ہے اسی طرح عبدالرحیم کی پیٹھ کو بھی داغا گیا تھا...... یہ عبدالرحیم کا نمبر تھا...... R88۔

عبدالرحیم، جارج کی جیل کے لرزہ خیز واقعات سناتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس جیل کے قیدیوں کی زندگی و موت کلی طور پر جارج اور اس کے اہلکاروں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر زرگاں میں کہیں قانون کا تھوڑا بہت گزر ہے بھی...... تو اس جیل میں نہیں۔

سہ پہر تک حبس رہا لیکن پھر ایک دم بادل گھر کر آ گئے۔ شمالی افق پر ایک کالی سیاہ گھٹا نظر آئی۔ آثار سے ظاہر تھا کہ زبردست بارش شروع ہونے والی ہے۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی چوکی نظر آ رہی تھی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں ہمیں جنگل میں کئی جگہ ملی تھیں۔ یہ دو تین کمروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان کی دیواریں موٹی اور کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان چوکیوں کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ وزنی شہتیر اور بالے وغیرہ کی۔ شہر میں اتنی مہنگی چھتیں ڈالنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ جنگل تھا، یہاں لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو دیواریں بھی اسی قیمتی لکڑی کی بنا سکتے تھے۔ ان چوکیوں میں سے اکثر چھتیں گر چکی تھیں اور اندر خودرو گھاس اُگی ہوئی تھی، تاہم دو چار چوکیاں سلامت بھی نظر آئی تھیں۔

انور خاں نے بتایا تھا کہ دس پندرہ سال پہلے تک بھانڈیل اسٹیٹ کی حد ان چوکیوں

تک ہی تھی لیکن بعد میں اسٹیٹ کی حد بڑھالی گئی اور نئے بارڈر پر نئی چوکیاں بنالی گئیں۔ یہ پرانی چوکیاں بے کار ہوگئیں یا ان کو گودام وغیرہ کی شکل دے دی گئی۔

ہمیں کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک بوسیدہ چوکی نظر آرہی تھی۔ انور خاں رک گیا۔ اس نے ساتھیوں کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا اور بولا ''ابھی پڑاؤ کا وقت تو نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے۔ اگر ہمیں کھلے میں بارش نے گھیر لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ پانڈے اور اس کے ہرکاروں کے پاس تو چھولداریاں وغیرہ ہیں، ہم کیا کریں گے؟''

چوہان نے بھی افق پر پھیلتی ہوئی تاریکی کو دیکھا اور بولا۔ ''اس چوکی کو اندر سے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ رات گزارنے کے قابل ہے تو یہاں رک جاتے ہیں۔''

دیگر ساتھیوں نے بھی تائید کی۔ ہم نے چوکی کا اندر سے جائزہ لیا، چھتیں سلامت تھیں۔ جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا لیکن اسے معمولی کوشش سے صاف کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے رکنے کا فیصلہ کرلیا۔

......ہمارا یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بارش شروع ہوگئی۔ سہ پہر چار بجے کا وقت تھا لیکن اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی اور بادل دہاڑنے لگے۔ ہمارے ساتھ اسٹیل...... پانڈے اور ان کے ساتھیوں کو بھی رکنا پڑا تھا۔ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑی تیزی سے چھولداریاں اور خیمے وغیرہ لگائے تھے۔

جنگل کی بارش کا آہنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ گردو پیش ایک تاریک دھندلکے میں چھپ جاتے ہیں اور آواز سے لگتا ہے کہ کہیں ایک بہت بڑا آبشار گر رہا ہے۔ چوکی کی چھت کہیں کہیں سے ٹپک رہی تھی، وہاں برتن رکھ دیئے گئے تا کہ زمین گیلی نہ ہو۔ کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دی گئیں۔ خنکی ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔ چوکی کے اندر سے ہی کاٹھ کباڑ جمع کر کے آگ روشن کر لی گئی۔ جانوروں کو چھت مہیا نہیں کی جاسکتی تھی لہٰذا ان پر سے سامان اُتار لیا گیا۔ پانڈے اور اس کے دو ڈھائی سو اہلکاروں نے چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

چوہان نے دونوں خچروں اور گھوڑے پر سے سامان اُتروایا۔ اس کی آواز آئی۔ ''انور خاں! صرف دو لالٹینیں ہیں۔ باقی دو لگتا ہے کہ راستے میں کہیں گر گئی ہیں۔''

''چلو جو ہیں انہیں تو روشن کراؤ۔'' انور خاں نے کہا۔

''ان میں سے بھی ایک میں بس تھوڑا سا تیل ہے۔ ایک دو گھنٹے ہی جلیں گی۔''

''ٹارچ وغیرہ سے کام چلالیں گے۔'' انور نے تسلی دی۔

ماریا تھک کر چُور ہوگئی تھی......اور سونا چاہتی تھی۔ چوہان نے اس کے زخمی ہاتھ کی پٹی بدلی اور ایک چھوٹے کمرے میں اس کے لئے چٹائی بچھا دی۔ حسبِ معمول اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا گیا۔ مزید احتیاط کے طور پر کمرے کو بھی باہر سے مقفل کر دیا گیا۔

چوکی میں داخل ہونے کا واحد راستہ سامنے کی طرف سے تھا۔ برآمدے میں چوکور ستونوں کی اوٹ میں دو رائفل برداروں کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ستونوں کے اندر باقاعدہ سوراخ تھے جن میں رائفل کو ''پوزیشن'' کیا جاسکتا تھا اور اردگرد نگاہ بھی رکھی جاسکتی تھی۔ ایک مورچا انور نے اور دوسرا اسحاق نے سنبھال لیا۔ اپنے سفر کے اس آخری مرحلے میں ہم کسی طرح کی کوتاہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بارش مسلسل جاری تھی۔ چوکی کے سامنے ایک چھوٹی سی آبی گزرگاہ بن گئی تھی جس میں تیز رفتار پانی بہہ رہا تھا۔ میرے اندر کی کیفیت پھر عجیب ہورہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جیکی ہو، سینڈ بیگ ہو اور رات کا وہ آخری پہر ہو۔ میں جیکی کی ہدایت کے مطابق سینڈ بیگ پر ننگے ہاتھوں سے حملہ کروں اور اس وقت تک مکے برساتا رہوں جب تک میرے ہاتھوں کی کھال چھل نہ جائے اور خون میری کہنیوں تک نہ پہنچنے لگے۔ پتا نہیں کیوں اب دھیرے دھیرے جسمانی چوٹیں مجھے تکلیف کے ساتھ ساتھ مزہ بھی دینے لگی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد تھکاوٹ نے اثر دکھایا اور جلد ہی سب سو گئے۔ صرف وہ جاگتے رہے جنہیں شروع رات میں ڈیوٹی دینی تھی۔ یعنی انور خاں اور اسحاق۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک لالٹین بجھ چکی تھی۔ صرف ایک لالٹین کی مدھم روشنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں نے کسی کو اُٹھ کر دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

پارسی ریان کی مدھم آواز آئی۔ ''میں ہوں۔ پیشاب کرنے جاوت ہوں۔''

میں نے پھر سر تکیے سے ٹکا دیا......اور سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے کی وجہ، پاؤں میں اُٹھنے والی ٹیس تھی۔ شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا تھا۔ میں نے اُٹھ کر پاؤں کو جھاڑا اور پھر لیٹ گیا۔ تب مجھے دوبارہ ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ''کون؟'' میں نے پھر استفسار کیا۔

یہ پارسی ریان ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گرم چادر لینے گیا تھا۔

بارش کے ساتھ اب تیز ہوا بھی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ پانی کی بوچھاڑیں کھڑکیوں کے چوبی تختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ موسم نے ایک دم کروٹ لے لی ہے اور ٹھنڈ شروع ہوگئی ہے۔ میں نے قریب لیٹے ڈاکٹر چوہان سے وقت پوچھا اور پھر سو گیا۔ ابھی

ہماری ڈیوٹی شروع ہونے میں قریباً دو گھنٹے باقی تھے۔

پتا نہیں کہ اس بار میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکایک مجھے لگا کہ چھت ایک دھماکے سے مجھ پر آن گری ہے اور ہر طرف قیامت برپا ہوگئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ چھت تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ میں نے چوہان، احمد اور ہمیش کو چلاتے ہوئے سنا۔ وہ بدحواسی میں برآمدے کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ ایک سیکنڈ کے لئے تاریک جنگل روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔ برستی بارش میں میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی، وہ ماریا تھی۔ وہ اندھا دھند چھولداریوں کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف شرٹ اور انڈرویئر تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں تیزی سے حرکت کررہی تھیں اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے یہ سارا منظر ایک سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھا۔

ایک سیکنڈ بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا مگر تب تک میں اپنی انگلی رائفل کے ٹریگر تک پہنچا چکا تھا۔ میں نے ماریا کی رخ پر یکے بعد دیگرے چار فائر کئے۔ ان میں سے کم از کم ایک گولی ضرور ماریا کو لگی۔ چالیس پچاس فٹ کی دوری سے مجھے اس کے چلانے کی آواز آئی۔ چوکی کے دروازے کی طرف بھی زبردست فائرنگ ہورہی تھی۔ سارا جنگل دھماکوں اور للکاروں سے گونج رہا تھا۔ احمد پکار رہا تھا۔ ''انور بھائی! میں چھت پر جارہا ہوں۔''

انور خاں نے اسحاق کو مخاطب کرکے بلند آواز میں کہا۔ ''اسحاق! کھڑکی کے پاس۔''

اسی دوران میں بجلی نے چمک کر پھر نشیب وفراز کو روشن کیا۔ مجھے ماریا کی فقط ایک جھلک نظر آئی۔ اسے کسی نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ تناور درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ میں نے رائفل کو کھڑکی میں رکھ کر پھر دو تین فائر کیے۔ ایک برسٹ سلاخ دار کھڑکی کے بالکل پاس دیوار سے ٹکرایا۔ اَن گنت چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ مجھے ایک دم نیچے جھکنا پڑا۔

صورتِ حال بڑی نازک ہوگئی تھی۔ وہ کام ہوگیا تھا جسے بدترین کہا جاسکتا تھا۔ ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کیسے نکلی تھی؟ کس وجہ سے نکلی تھی؟ یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا...... فی الحال تو ہم مسلح افراد کے گھیرے میں تھے اور اگلے چند منٹ میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

میں جھک کر چلتا ہوا دوسری کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں انور خاں کی ہدایت کے مطابق اسحاق موجود تھا اور مسلسل فائر کررہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح مورچا بند ہوکر کسی لڑائی میں حصہ لے رہا تھا...... ٹریگر پر

انگلی کو حرکت دینا، رائفل کے جھٹکے کو برداشت کرنا، مخالف سمت سے آنے والی گولی کے خطرے کو محسوس کرنا...... یہ سب کچھ میرے لئے نیا تھا۔

قریباً سات آٹھ منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ پھر ایک دم یہ سلسلہ ٹھہر گیا۔ غالباً ہمارے مخالفین کوئی حکمتِ عملی سوچ رہے تھے۔ وہ ہمیں مارنے یا زندہ پکڑنے کی بہترین پوزیشن میں تھے اور...... غالباً...... انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کس طرح کم سے کم جانی نقصان کرا کے ہمیں بے بس کرسکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہمیں بس ایک معمولی سا فائدہ حاصل تھا اور وہ یہ کہ ہمارے مخالفین کھلی جگہ پر تھے جبکہ ہم اس چوکی میں مورچا بند تھے لیکن یہ مورچا بندی ایک طرح سے نقصان دہ بھی تھی۔ یہ عمارت ہمارے لئے چوہے دان بن سکتی تھی۔ اگر یہ دو ڈھائی سو افراد ہم تیرہ چودہ بندوں کو مارنے پر ہی تل جاتے تو پھر وہ اس چوکی کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے تھے۔

''یہ ہوا کیسے؟'' میں نے لرزتی آواز میں اسحاق سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ...... اس حرامی کتے کی وجہ سے۔'' اسحاق نے کہا اور بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینکا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کھڑکی سے تیس چالیس فٹ کی دوری پر ایک لاش اوندھی پڑی نظر آئی۔ یقیناً یہ پارسی ریان کی لاش تھی۔ میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا۔

''یہ کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ اس حرامزادی کے ساتھ ہی بھاگ رہا تھا۔ انور بھائی نے اسے گولی ماری ہے۔''

''لیکن...... لیکن وہ تو دوسری طرف بھاگی ہے......؟''

''ہاں، یہ اس طرف آیا تھا...... وہ چھولداریوں کی طرف گئی تھی......''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا یار...... وہ تو تالے میں تھی۔ اس کے پاؤں میں بھی زنجیر تھی......؟''

''تالے کھولنے والا یہ کتا بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھا'' اسحاق نے نفرت سے کہا اور ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر ریان کی لاش کی طرف پھینکی۔

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ جب یہ ساتوں قیدی جارج کی جیل سے رہا ہوکر سرنگ میں آئے تھے تو انور خاں نے ان سب کا تعارف کرایا تھا۔ پارسی ریان کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک ماہر قفل ساز ہے۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ سانحہ اس پارسی ریان کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات میں نے دو بار اس کی مشکوک نقل و

حرکت بھی دیکھی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ریان نے ایسا کیا کیوں؟

میں نے یہی بات اسحاق سے پوچھی تو وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ ''ابھی ٹھیک سے تو پتا نا ہیں...... لیکن لگت ہے کہ اس کو روٹی گوشت کی خماری چڑھی ہے۔''

''روٹی گوشت کی خماری؟''

''ہاں، تین سال سے کنجر جیل میں پڑا ہوا تھا۔ اب پیٹ بھر کر کھانا ملا...... عورت دیکھی تو حرامی کے اندر کا جنگلی سور جاگ پڑا۔''

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اب بات پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اگلے دو چار منٹ میں سب کچھ کھل گیا کہ کیا ہوا ہے۔

اسحاق کے کہنے پر میں اس چھوٹے کمرے کی طرف گیا جہاں ماریا کو حفاظت کی غرض سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، کمرے کے دروازے کا آہنی قفل کھلا ہوا تھا۔ اندر وہ زنجیر بھی کھلی پڑی تھی جو رات کے وقت ماریا کے پاؤں میں ڈالی جاتی تھی۔ زنجیر کے چھوٹے لاک کو بھی ایک آہنی تار کے ذریعے کھولا گیا تھا۔ چٹائی پر ماریا کی نیلی جینز پڑی تھی اور بالائی جسم کا زیر جامہ پڑا تھا۔ کمرے کا یہ نقشہ وہ ساری کہانی سنا رہا تھا جو یہاں گہری تاریکی میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اسی دوران میں انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے موقع کا جائزہ لیا اور یقیناً اسے بھی وہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا جو مجھے آیا تھا۔ اس نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ریان کو غائبانہ صلواتیں سنائیں۔ میں نے انور خاں کو بتایا کہ رات پہلے پہر کس طرح ریان پیشاب کرنے اور چادر لینے کے بہانے حرکت کرتا نظر آیا تھا۔

انور خاں بولا۔ ''خبیث نے سب کچھ پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل شام جو دو لالٹینیں گم ہوئی تھیں، وہ بھی اسی نے کہیں گرائی ہوں گی...... یا آس پاس کہیں چھپا دی ہوں گی۔''

یقیناً یہاں جو کچھ ہوا تھا، ماریا اور ریان کی باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے ہوا تھا۔ انور خاں نے پرسوں جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کہا تھا...... ان گوری چمڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے......

تو کیا یہاں بھی اسی انتہا درجے کی 'بے شرمی' نے کام دکھایا تھا؟ آزادی حاصل کرنے کے لئے ماریا نے اپنا آپ اس شخص کے حوالے کر دیا تھا جس کے ساتھ چھو جانا بھی اسے کل

تک گوارا نہیں تھا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔ پارسی ریان نے یہاں سے نکلنے میں ماریا فرگوسن کی مدد کی تھی، تاہم اس مدد کی بھرپور قیمت بھی وصول کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اس وقت تک ماریا کے پاؤں ہی نہ کھولے ہوں جب تک اپنا مطلب پورا نہ کر لیا ہو۔ وہ ماسٹر قفل ساز و قفل شکن تھا اور اس نے جو دو ''آخری قفل'' کھولے تھے، انہوں نے اس پر مسرت کا در وا کیا تھا اور موت کا بھی۔

انور خاں کے ایک کان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی پوری سائیڈ نیلی ہو رہی تھی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جس وقت ماریا یہاں سے بھاگی، اس کے ہاتھ میں پختہ اینٹ تھی۔ اسحاق سو گیا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا لیکن میری ساری توجہ بھی باہر کی طرف تھی۔ یہ گمان ہی نہیں تھا کہ اندر سے بھی کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔'' انور نے کان کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے اور پھر ایک برسٹ چلا۔ قریبی سیڑھیوں سے کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور عین انور خاں کے قدموں میں گرا۔ یہ احمد تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے چھت پر پوزیشن سنبھالی تھی۔ اس کا کندھا خون سے سرخ نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پانچ دن پہلے دوطرفہ فائرنگ میں اسے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔

میں نے احمد کو سنبھالا، انور خاں دوڑتا ہوا اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ گیا اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ایک بار پھر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونج رہے تھے، ہر طرف شعلوں کا رقص تھا۔ میں، چوہان اور اسحاق بھی پوری توانائی سے اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف فریق کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری ایک گولی کے جواب میں درجنوں گولیاں آ رہی تھیں۔

انور خاں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔''

''لیکن انہوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔'' چوہان کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''گھیرا توڑ کر نکلنا ہو گا۔ ورنہ کچھ نہیں ہو سکے گا۔'' انور خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''ہاں، تخت یا تختہ اگر کچھ نا ہیں کریں گے تو بے موت مارے جاویں گے۔'' اسحاق نے اپنی رائفل سے ایک طویل برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیان سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اسحاق کے قدموں میں ایک بندے کی لاش پڑی تھی۔ یہ ان ساتوں افراد میں سے ایک تھا جو جیل سے رہا ہوئے تھے۔ یقیناً اسے دوطرفہ

فائرنگ میں گولی لگی تھی۔ یہ واقعی نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماریا کو اپنے ہاتھ سے کھونے کے بعد ہم ایک دم موت کے منہ میں آ گئے تھے۔ یہاں رہتے تو موت تھی، باہر نکلتے تو بھی موت تھی۔ بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔

تو کیا آخری وقت آ گیا ہے؟ میں نے بے حد درد سے سوچا۔ اس بارشی رات میں، اس گھنے جنگل کے کسی نامعلوم حصے میں...... ان تابڑ توڑ برستی گولیوں کے درمیان میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ کیا کبھی میرے پیاروں کو معلوم ہو سکے گا کہ میں کہاں اور کس حالت میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا؟ کیا کبھی کوئی میرے آخری لمحوں کے بارے میں جان سکے گا؟ چند لمحوں کے لئے...... صرف چند لمحوں کے لئے میرے اندر مایوسی اور ناتوانی اُبھری لیکن پھر فوراً ہی عمران کا تصور اندھیرے سے برآمد ہوا اور مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا، اس کی شبیہہ ان لمحوں میں بالکل واضح اور روشن تھی۔ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی دلکش ہڈیاں، اس کی ٹھوڑی کا گڑھا، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت، اس نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مخمور لہجے میں بولا۔ ‘‘آنکھیں بند کر کے کود جاؤ جگر...... زیادہ سے زیادہ موت ہی ملے گی نا اور موت تو ہماری محبوبہ ہے۔ وہ ہمارے آگے آگے بھاگتی ہے۔ ہم نے اس کے پیچھے بھاگنا سیکھ لیا ہے......’’

میرے رگ و پے میں نئی توانائی سی بھر گئی۔ میں نے وہ سارے لمحے یاد کئے جن میں، میں نے دل کی گہرائی سے خودکشی کا سوچا تھا...... یہاں جو کچھ بھی ہونے والا تھا، خودکشی سے تو بہتر ہی تھا۔

انور خاں اپنے ساتھیوں کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف آمیز دلیری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہا ہے، اس کی زندگی کے امکانات بہت کم ہیں...... لیکن اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسحاق نے ایک جھٹکے سے دستی بموں والا وہ تھیلا کھول دیا جو اب تک ہمارے سامان کا حصہ رہا تھا۔ انور خاں نے دو دستی بم اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لئے، ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دیگر ساتھیوں نے بھی ایک ایک، دو دو بم لے لئے۔ یہ عام دستی بموں کی طرح گول بم نہیں تھے، ان کی شکل لمبوتری تھی۔ یہ پرانی طرز کے لیکن بڑے طاقتور بم تھے۔ ان کی شکل ‘‘آئس کریم کون’’ سے ملتی جلتی تھی۔ انور خاں نے بتایا تھا کہ انہیں ‘‘اسٹک بم’’ کہا جاتا ہے...... چند روز پہلے انور خاں مجھے یہ بم استعمال کرنے کا طریقہ تفصیل سے بتا چکا تھا لیکن اس حوالے سے میری عملی مشق صفر تھی۔ بہرطور ایک دستی بم میں نے بھی لے لیا۔

انور خاں نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ‘‘میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے تم سب کے سامنے ہے۔ ہم بری طرح گھر چکے ہیں، جتنی دیر کریں گے اتنا ہی مزید پھنستے جائیں گے۔ ہم خود کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہیں۔ ہم چوکی کے عقبی دروازے کو ایک دم کھول کر نکلیں گے۔ سب سے آگے میں رہوں گا۔ ہم پوری رفتار سے دوڑیں گے اور گھنے درختوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں۔’’

اسحاق بولا۔ ‘‘ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوجے سے بچھڑ جاویں۔ کوئی ایسی جگہ ٹھہرا لو، جہاں ہم اکٹھے ہو سکیں۔’’

‘‘میرے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں۔’’ انور نے فوراً جواب دیا۔ ‘‘جو ساتھیوں سے علیحدہ ہو جائے، وہ اپنے طور پر جان بچانے کی کوشش کرے......’’

ابھی انور خاں کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور فرش پر رکھے ہوئے کھانے پینے کے برتین بھنے ہوئے چنوں کی طرح اچھل اچھل کر چاروں طرف بکھر گئے...... ہمارا گھوڑا اندھادھند بھاگتا ہوا برآمدے میں گھسا۔ پورے زور سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ اسے گولی لگ چکی تھی۔

‘‘لگت ہے کہ وہ لوگن قریب آ رہے ہیں۔’’ ہمیش نے کہا۔

انور خاں نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر اسنائپر گن سے دو فائر کئے اور بولا۔ ‘‘اب دیر نہیں کرنی چاہئے۔’’

ہم سب جھک کر دوڑتے ہوئے چوکی کے عقبی حصے میں پہنچے۔ یہاں ایک چھپر سا تھا جسے گولیوں کی بوچھاڑ سے آگ لگ گئی تھی۔ بارش کے سبب یہ آگ زیادہ پھیل نہیں پائی تھی۔ ہم عقبی دروازے کے ساتھ لگ گئے۔ انور خاں سب سے آگے تھا۔ موت کو خوش آمدید کہنے کے لئے اس کا سینہ تنا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں اسحاق تھا۔ پھر چوہان، پھر زخمی احمد، پھر میں اور آخر میں ہمیش۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے فقط چار ہمارے ساتھ آ سکے تھے۔ وہ چاروں ہماری قطار کے دائیں جانب تھے۔ یہ سائیڈ قدرے محفوظ تھی۔ عبدالرحیم بھی ان چاروں میں شامل تھا۔

‘‘بس دوڑنا ہے۔ رکنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں۔’’ انور نے آخری ہدایت دی اور دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ خصوصاً سامنے والے حصے کی طرف فائرنگ کا

زیادہ زور تھا۔ ہم نے الوداعی نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ انور خاں نے اپنے ہاتھ والے دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر نکالی اور ٹانگ مار کر دروازہ کھول دیا۔

''بھاگو۔'' انور خاں کی آخری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ہم اندھا دھند نکلے۔ بارش کی بوچھاڑیں اور درختوں کی شاخیں ہمارے چہروں سے ٹکرائیں۔ ہم نے اپنی رائفلوں کے منہ کھول دیئے اور جھک کر بھاگتے چلے گئے۔ سب سے پہلے انور خاں کے پھینکے ہوئے دستی بم کا دھماکا ہی سنائی دیا تھا۔ چکاچوند پیدا کرنے والے اس زوردار دھماکے نے ہر طرف سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ پھر کئی اور دھماکے ہوئے۔ ہم ان دھماکوں کا نتیجہ دیکھنے کے لئے رکے نہیں، بس شاخوں سے ٹکراتے دوڑتے چلے گئے۔ احمد میرے آگے دوڑ رہا تھا۔ بائیں جانب سے ایک برسٹ آیا...... جو اسے چھلنی کر گیا۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا اور ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے مڑ کر دیکھا بھی جا سکتا۔ اس برستی موت کا دوسرا شکار ہمیش تھا۔ وہ میرے عین پیچھے تھا۔ مجھے تو یہی لگا کہ اس نے میری طرف آنے والی موت اپنے جسم پر روکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب گولی جسم سے ٹکراتی ہے اور گوشت میں گھستی ہے تو اس سے ایک خاص آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس رات پہلی بار میں نے اپنے عین عقب میں یہ آواز سنی۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ اوندھے منہ گرا۔ غالباً گرنے سے پہلے وہ اپنے دستی بم کی سیفٹی پن ہٹا چکا تھا۔ اس کے گرنے کے تین چار سیکنڈ بعد ہی عین اس جگہ پر ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے سے پیدا ہونے والا ایئر پریشر مجھے اپنے پورے جسم پر محسوس ہوا تھا۔ میری خوش بختی کہ بم کا کوئی ٹکڑا مجھے نہیں لگا اور میں بالکل محفوظ رہا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔ ایک جگہ میں اوندھے منہ گرا۔ ایک جگہ بری طرح ایک درخت سے ٹکرایا...... لیکن رکا نہیں، بھاگتا چلا گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ٹرپل ٹو رائفل پر جما رکھے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے رائفل سے دوسرا میگزین اٹیچ کر لیا اور اطراف میں فائر کرتا رہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس دستی بم بھی تھا لیکن بھاگ دوڑ میں وہ دستی بم کہیں گر گیا تھا۔ کہاں گرا تھا، یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔

بھاگتے ہوئے مجھے اپنے سامنے صرف چوہان نظر آ رہا تھا اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ چوہان اور انور خاں کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔

فائرنگ کا زور اب ہماری بائیں جانب قریباً دو سو میٹر کی دوری پر تھا...... مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم موت کی زد سے اگر نکلے نہیں...... تو کم از کم دور ضرور چلے گئے ہیں۔

''گھاٹی کے ساتھ ساتھ بھاگو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس کی یہ واقفیت ہمیں ایک یقینی موت کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔

''تم ٹھیک ہو تابش!'' چوہان نے بھاگتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے بھی ہانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اور ہمیش؟''

میں چپ رہا۔ چوہان سمجھ گیا کہ میرا جواب کیا ہے۔

پھر مجھے عبدالرحیم اور اس کا ایک ساتھی نظر آیا۔ وہ دونوں دائیں طرف تھے اور ہمارے متوازی ہی بھاگ رہے تھے۔

ہم قریباً بیس منٹ تک انور خاں کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ہماری ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں لیکن زندہ رہنے کی فطری خواہش ہمیں بھگائے چلی جا رہی تھی۔ یہ گھنا جنگل تھا، تاریکی تھی اور ہلکی بارش بھی...... اس لئے ہماری یہ میراتھن دوڑ عجیب طرح کی تھی۔ درختوں سے ٹکرانا، پھسل کر گرنا اور گر کر اُٹھنا...... یہ سب، کچھ ہماری دوڑ میں شامل تھا۔ ایک بڑی ٹارچ ہمارے پاس موجود تھی لیکن ہم اسے روشن نہیں کر سکتے تھے۔ قریباً بیس منٹ بعد ہم نے ایک آبی گزرگاہ کو پار کیا۔ پانی ہمارے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ ہم نے اپنی گولیوں والی بیلٹس گردنوں سے لپیٹ لیں اور رائفلیں سروں سے بلند کر لیں۔ آبی گزرگاہ کو پار کرتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ اسحاق بھی زخمی حالت میں ہمارے ساتھ ہے۔ چوکی سے نکلتے وقت ہم کل دس افراد تھے...... لیکن اب صرف چھ نظر آ رہے تھے۔ چار مزید ساتھی گھیرا توڑنے کی کوشش میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ان میں سے احمد...... ہمیش اور عبدالرحیم کے ایک ساتھی کی موت تو یقینی تھی۔ عبدالرحیم کا ایک ساتھی بری طرح گھائل ہو کر گرا تھا اور شاید اسی حالت میں پکڑا گیا تھا۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک کی لاش تو ہم نے خود چوکی میں دیکھی تھی، دوسرے کے بارے میں بھی غالب امکان یہی تھا کہ وہ چوکی میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوا۔

آبی گزرگاہ کو پار کرنے کے بعد ہم نے قدرے ''ریلیف'' محسوس کیا۔ ہم اس قدر ہانپ گئے تھے کہ چند منٹ کے لئے ستانا ضروری ہو گیا تھا۔ ہم ایک جگہ، گیلی زمین پر درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ''ہمیش کا کیا بنا؟'' اسحاق نے پوچھا۔

"اسے گولی لگ گئی تھی۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔

عبدالرحیم روتے ہوئے بولا۔ "آپ لوگن نے ہمارے ساتھ کیا کیا...... اور ہم لوگن نے آپ کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ اس بدبخت ریان کی وجہ سے ہوا۔ کاش! ہم اسے اپنے ہاتھ سے مار دیتے۔"

ورا اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ "جو ہو چکا اس کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب اپنا سارا دھیان یہاں سے نکلنے کی طرف لگاؤ۔ ہم خطرے سے باہر نہیں۔ وہ لوگ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔"

ہم ایک بار پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور گرتے پڑتے آگے بڑھنے لگے۔ اپنے بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا غم تازہ تازہ تھا اور دل میں ٹیسیں ابھار رہا تھا۔ جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ صرف بیس تیس منٹ پہلے ہمارے ساتھ چوکی سے نکلنے والے لوگ اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ کل رات تک ہم چوکی میں ماریا کے علاوہ کل تیرہ افراد تھے...... اب صرف چھ بچے تھے۔

ہم صبح سات آٹھ بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ آخر تھک کر چُور ہو گئے۔ یوں لگا کہ اب چند قدم اُٹھانا بھی ممکن نہیں ہے۔ خاص طور سے زخمی چوہان سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی رائفل انور خاں نے اور گولیوں والا تھیلا میں نے اُٹھا رکھا تھا۔ نہایت گھنے اور لمبے سرکنڈوں کے درمیان یہ عارضی طور پر چھپنے کے لئے ایک مناسب جگہ تھی۔ حشرات الارض بشمول سانپوں وغیرہ کا ڈر تو تھا مگر جو حالات ہمارا تعاقب کر رہے تھے، وہ ان سے زیادہ خطرناک تھے۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ ایک طرف ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ جوں جوں دھوپ تیز ہوتی گئی، اس جوہڑ سے اُٹھنے والی بو باس بڑھتی گئی۔ جونکیں...... کیچوے...... کیڑے مکوڑے بہت کچھ پودوں میں رینگ رہا تھا اور ہمارے جسموں پر بھی۔

دوپہر تک ہمیں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جُل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے اردگرد تک کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسحاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "یوں لگت ہے کہ وہ لوگن پانی کی دوجی طرف رہ گئے ہیں...... ناہیں تو اب تلک کوئی ہلچل ضرور نظر آتی۔"

"پھر بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا...... اگلے ایک دو گھنٹے میں ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا۔" انور خاں نے کہا۔

وقت گزرتا رہا اور شام تک ہم خود کو کافی مطمئن محسوس کرنے لگے لیکن جلد ہی یہ اطمینان ایک بار پھر تشویش میں ڈھل گیا۔ ہمیں کچھ فاصلے سے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس فائر سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ ہمارے آس پاس کوئی موجود ہے۔ "وہ لوگن اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے ناہیں آ۔" اسحاق نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اپنی رائفل کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چوہان نے بھی اپنی رائفل انور خاں سے لے لی اور ٹیلی اسکوپ گلے میں لٹکا لی۔ چند گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے تاریکی میں بدل گئے اور سرکنڈوں میں لاتعداد جھینگروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مجھے دیر سے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے بعد میں جوہڑ کے کنارے کی طرف گیا۔ اچانک مدھم آوازوں نے میرے قدم پکڑ لئے۔ یہ اسحاق کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ڈاکٹر چوہان تھا۔ اسحاق کہہ رہا تھا۔ "...... یہ بات ناہیں کہ اس کے ساتھ ہمدردی ناہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھی ہے...... لیکن اس کا ساتھ ہمارے لئے مصیبت کھڑی کرے گا...... اور بہت بڑی مصیبت کھڑی کرے گا......" آخری الفاظ کہتے کہتے اسحاق کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

"آہستہ بولو۔" چوہان نے اسے تنبیہہ کی۔

اسحاق نے اپنی آواز تھوڑی سی مدھم کر لی لیکن لہجہ ویسا ہی تشویش ناک رہا۔ "چوہان بھائی! میں تم سے اس بحث میں ناہیں پڑتا کہ تابش پر کوئی جادوٹونے کا معاملہ ہے یا اس کے شریر (جسم) میں کوئی پرزہ وغیرہ لگایا گیا ہے...... لیکن جو کچھ بھی ہے، ہمارے لئے ہے خطرناک۔ یہ جہاں بھی جائے گا، وہ لوگن اس کا پیچھا کریں گے...... اور اس کے ساتھ ہم بھی......" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو کیا تم وشواس سے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں ہو گا تو ہم بچ جائیں گے؟"

چوہان کی سرگوشی اُبھری۔

"چلو ناہیں بچیں گے...... لیکن کچھ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع تو ملے گا نا۔"

میں بغیر آواز پیدا کئے آگے بڑھ گیا اور جوہڑ کی طرف چلا گیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

بے شک اسحاق جذباتی اور شعلہ مزاج تھا...... لیکن جو بات وہ کئی دن سے مسلسل کہہ رہا تھا، وہ ٹھیک تھی...... اور یقیناً یہ بات اسحاق کے علاوہ اور کئی ساتھیوں کے دل میں موجود ہو

گی۔ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں تھا۔ ایک نادیدہ بندش نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بندش کسی جادو ٹونے کی شکل میں ہے لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ اسٹیٹ کے کچھ اہم قیدیوں کی طرح میرے جسم میں بھی کوئی ایسی چیز رکھی گئی ہے جو میری Where Abouts کے بارے میں میرے دشمنوں کو آگاہ رکھتی ہے۔

اسحاق کی یہ بات بالکل درست تھی کہ یہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے کے معاملے میں، مَیں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میری موجودگی میرے ساتھیوں کے لئے ہر راستہ بند کر سکتی تھی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ مَیں نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اب میرے دل سے اس بات کی گواہی آنا شروع ہو گئی تھی کہ شاید میں اس منحوس جنگل کے حصار سے کبھی نکل نہیں سکوں گا...... اور اگر...... مجھے یہیں پر مرنا تھا تو پھر میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کے لئے خطرہ کیوں بنوں؟

کیوں نا میں اپنا اخلاقی فرض ادا کروں۔ اپنے ساتھیوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر خاموشی سے اکیلا ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اکیلا مرا جائے یا باجماعت......!

میں مردار کی بو والے کائی زدہ جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ میری رائفل، ایک چھوٹی ٹارچ، گولیوں والا بیگ اور ایک شکاری چاقو میرے پاس موجود تھے۔ اس کے علاوہ اور کیا چیز مجھے درکار تھی...... اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں۔

میں نے چند لمحے تک سوچا، پھر وہیں سے گہری تاریکی میں آگے بڑھ گیا۔

مجھے کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ بس ایک یہی سوچ تھی کہ میں یہاں سے آگے بڑھ جاؤں۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرلوں۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت ملی تو اسے گلے سے لگالوں گا...... زندگی ملی تو اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ عمران نے یہی تو سکھایا تھا مجھے۔

میں گہری تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور قریباً ایک گھنٹے میں دو تین کلو میٹر آگے نکل گیا۔ قدرتی طور پر میرا رخ اس آواز کی مخالف سمت میں تھا جو کچھ دیر پہلے ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ میرا مطلب فائر کی آواز سے ہے۔

چلتے چلتے میں سوچ رہا تھا کہ میری اچانک گمشدگی کے حوالے سے میرے ساتھیوں کا ردِعمل کیا رہا ہوگا؟ انہوں نے مجھے اردگرد تلاش کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ محتاط انداز میں آوازیں بھی دی ہوں۔ وہ ٹارچیں روشن کرنے کا رسک تو نہیں لے سکتے تھے، تاریکی میں ہی مجھے اور

میرے قدموں کے نشان ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے ذہن میں یہ شدید خدشہ پیدا ہوگا کہ کہیں میں کسی جنگلی جانور کا نشانہ تو نہیں بن گیا...... یا پھر ایسا تو نہیں کہ حکم کے اہلکار گھات لگا کر جوہڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں آگے بڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ گھنی جھاڑیوں میں کسی جنگلی جانور کی موجودگی کا متحرک احساس بھی ہوا لیکن ایسا کوئی خطرہ عملی طور پر میرے سامنے نہیں آیا۔ میں چل رہا تھا لیکن حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اسٹیٹ کی بیرونی حد کی طرف بڑھ رہا ہوں یا پھر بیرونی حد کے متوازی ہی چلتا جا رہا ہوں۔

رات کا آخری پہر تھا جب میں بے حد تھک گیا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن خطرات سے بھرے ہوئے اس سیاہ جنگل میں آرام کیسے کرتا؟ سب سے پہلے یہی بات ذہن میں آئی کہ اگر میں کچھ دیر رکنا چاہتا ہوں تو مجھے زمین کے بجائے کسی درخت پر ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے جب میں سلطانہ والی چوٹ کھا کر جارج کی رہائش گاہ سے بھاگا تھا تو دو روز جنگل میں بھٹکتا رہا تھا۔ تب بھی میں نے ایک شب ایک بلند درخت پر کاٹی تھی۔ آج کی شب مَیں نے پھر یہی کلیہ آزمایا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک ایسا درخت منتخب کرلیا جس پر چڑھا جا سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش اور چند تازہ خراشوں کے بعد میں درخت کے ایک مضبوط دوشاخے پر نشست جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اردگرد کی شاخوں کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ شکاری جانور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں جن میں خطرناک جنگلی بلے، تیندوے اور چیتے وغیرہ شامل ہیں۔

ان خطرات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔

آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ قرب و جوار روشن ہو چکے تھے۔ سبزے پر سے شبنم آہستہ آہستہ اوجھل ہو رہی تھی۔ میری انتڑیوں میں بھوک کی وجہ سے کہرام مچا ہوا تھا لیکن اس کہرام کے مداوے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ایک قریبی درخت پر خوبانی کے سائز کا ایک سبزی مائل پھل نظر آرہا تھا مگر مجھے انور خاں کی بتائی ہوئی باتیں یاد تھیں۔ اس نے کہا تھا...... جنگل سے خوراک صرف وہی بندہ حاصل کر سکتا ہے جو ''جنگل شناس'' ہو۔ دوسری صورت میں بندہ بھوک مٹانے کی کوشش میں خود بھی مٹ سکتا ہے۔ بہت سے پھل اور بیج وغیرہ زہریلے ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شکل یا ذائقے وغیرہ سے ان کے زہریلے ہونے کا بالکل پتا نہیں چلتا۔

میں درخت سے اُترا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی بیس تیس قدم ہی چلا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ میں تیندوے کے پاؤں کے نشانات اب بڑی اچھی طرح پہچاننے لگا

تھا۔ اب پھر مجھے وہی نشان نظر آئے۔ گیلی زمین پر یہ بالکل واضح تھے۔ ان نشانات کو بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ پرانے نہیں۔ غالباً رات کے وقت تیندوا میرے آس پاس موجود تھا۔ ٹرپل ٹو رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ میں مزید احتیاط سے چلنے لگا۔ میں اردگرد کے درختوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خطرناک جانور ''آسان درختوں'' پر چڑھ سکتا ہے اور پھر درخت کے اوپر سے ہی بے آواز، اپنے شکار پر چھلانگ لگا دیتا ہے...... اچانک مجھے اپنی رگوں میں لہو رکتا ہوا محسوس ہوا...... وہ میرے سامنے تھا۔ فقط پندرہ بیس فٹ کی دوری پر۔ زردی مائل جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ جھاڑیوں کا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں غفلت میں آٹھ دس قدم مزید اُٹھالیتا تو سیدھا اس کی زد میں آجاتا۔ اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ شاخوں کی اوٹ میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی دُم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دراز قد جوان جانور تھا۔ اُس کے جسم پر چیتے کی طرح داغ تھے۔ اس کا وزن اس کے پچھلے پاؤں پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ اگر میں نے دو قدم بھی اور بڑھائے تو وہ مجھ پر جست لگا سکتا ہے۔

میں پتھر کی طرح ساکت کھڑا ہوگیا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے سے پیوست تھا اور میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسا نہیں تھا لیکن میرے گولی نہ چلانے کی وجہ، اپنے نشانے پر ''میرا عدم اعتماد'' ہی نہیں تھا...... اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ گولی کی آواز میری نشان دہی کرسکتی تھی اور اگر دشمن آس پاس موجود تھا تو اس کے لئے بہت آسانی فراہم ہوسکتی تھی۔

قریباً نصف منٹ تک میں اور درندہ آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ ایک دوسرے کے عمل اور ردِعمل کو دیکھتے ہوئے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ میں اس جانور کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں کسی درندے کو اس طرح کھلی جگہ پر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس فٹ کے بے رکاوٹ فاصلے کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... یہ ایک ناقابلِ بیان احساس تھا۔

وہ تیس چالیس سیکنڈ تیس چالیس گھنٹوں کی طرح لگے۔ پھر اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ موڑا۔ مجھے اور میری ''ٹرپل ٹو'' کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے وہ بے پروائی سے چلتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ جیسے میرا اور اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو...... کوئی واسطہ کوئی بھی اچھا یا برا ناتا اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر

خطرناک ہے...... درست ہی کہتے ہیں۔ درندے اس وقت تک نقصان نہیں پہنچاتے جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا پھر جب تک ان کی زندگی میں جارحانہ مداخلت نہ کی جائے...... لیکن حضرتِ انسان جب شر پر اُترتا ہے تو کل وقتی اور سرتاپا مہلک ہوجاتا ہے۔ اپنی ہلاکت آفرینی کو عملی شکل دینے کے لئے وہ ہزارہا بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔

میں کچھ دیر وہیں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے تیندوے سے اپنی رُوبرو ملاقات کا اثر اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتا رہا...... تب ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ تیندوے کے پاؤں کے نشانات بدستور میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر اب یہ کچھ مدھم محسوس ہو رہے تھے۔ کئی جگہ یہ نشان چھوٹے بڑے دیگر جانوروں کے نقوشِ پا میں گڈمڈ ہوجاتے تھے...... ایک جگہ میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا اور پھر مجھے پاؤں کے بل بیٹھنا پڑا۔ بیٹھے بیٹھے ہی میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی اور رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ مجھے کچی زمین پر انسانی پاؤں کے نشان دکھائی دیئے تھے۔ یہ ننگا پاؤں تھا اور کئی جگہ اس کا نقش بہت واضح تھا۔ یہ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے لئے حد درجہ حیران ہونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ یہ صرف ایک پاؤں کا نشان تھا۔ دوسرا پاؤں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آتا تھا۔ جگہ جگہ نظر آنے والا یہ چھوٹا سا سوراخ کسی بیساکھی نما لکڑی کا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس جگہ اس قسم کی زمینی شہادت دیکھوں گا۔ میری نگاہوں میں بارونداجیکی کا دق زدہ چہرہ گھوم گیا۔ میں نے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہاں سے گزرا تھا...... یقیناً گزرا تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔

میں تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تیندوے اور دیگر جانوروں سے وابستہ خیالات ایک دم میرے ذہن سے محو ہوگئے تھے۔ میں ان نشانات کو ٹریس کرتا ہوا بے تابی سے آگے بڑھتا رہا۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد مجھے گھنے درختوں میں چھپی ہوئی ایک چاردیواری کے آثار نظر آگئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھنڈر تھا۔ اس پر نباتات اور خودرو بیلوں کی یورش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ گھاس پات کا ہی حصہ ہے۔ یہ دراصل ویسی ہی بے آباد چوکیوں میں سے ایک تھی جو اس ویرانے کہیں کہیں دکھائی پڑتی تھیں لیکن یہ چوکی تقریباً مسمار ہوچکی تھی۔ بس ایک کمرا اور برآمدے کا ایک حصہ موجود تھے۔ تاہم ان کی چوبی چھتیں بھی گری

ہوئی تھیں۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ بارونداجیکی اس کھنڈر میں ہی موجود [illegible] یہ دوسرا سوال تھا کہ وہ زندہ حالت میں ہے یا مردہ...... اور اکیلا ہے یا اس کے ساتھ بھی کوئی موجود ہے؟ میں پاؤں اور بیساکھی کے نشان دیکھتا ہوا احتیاط سے آگے بڑھا۔ نشان کھنڈر کی تاریکی میں داخل ہورہے تھے۔ میں کچھ دیر تک ایک دیوار کے ساتھ لگ کر سن گن لیتا رہا پھر میں نے محتاط انداز میں آواز دی۔ ''جیکی...... جیکی!''

جواب ندارد...... میں نے دو مرتبہ مزید پکارا پھر ٹارچ روشن کر کے اندر چلا گیا۔ کمرے کی چھت نے گر کر جھونپڑی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس جھونپڑی میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ اس جھونپڑی کے سامنے ہی ایک چھوٹے چیتل کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ غالباً چند گھنٹے پہلے یہ چیتل کسی تیندوے یا بھیڑیے وغیرہ کا شکار ہوا ہوگا۔ اس کے جسم پر بہت کم گوشت باقی بچا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے ٹارچ کی روشنی کو حرکت دی۔ بارونداجیکی مجھے سامنے ہی بے حرکت پڑا نظر آ گیا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ختم ہو چکا ہے لیکن پھر میری نگاہ اس کے سینے کے مدھم زیر و بم پر پڑی۔ وہ زندہ تھا۔ تب مجھے ایک شے نظر آئی۔ یہ شراب کی بوتلیں تھیں۔ مٹی میں لتھڑی ہوئی۔ یہ پانچ عدد بوتلیں جیکی کے قریب ہی پڑی تھیں۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب لگتی تھی۔ ان بوتلوں میں سے دو خالی ہو چکی تھیں۔ ایک میں سے تھوڑی سی پی گئی تھی، باقی دو بھری ہوئی تھیں۔ بوتلوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصہ مٹی میں دبی رہی ہیں۔ انہیں جیکی نے کھود کر نکالا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف کچی زمین میں ایک دو ڈھائی فٹ گہرا گڑھا موجود تھا۔ جیکی نشے کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے اکلوتے ہاتھ پر خون جم کر سوکھ گیا تھا تاہم مجھے لگا کہ یہ جیکی کا اپنا خون نہیں ہے۔ اس کے اپنے جسم میں خون تھا ہی کہاں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت چیز رگوں میں حرکت کرتی بھی ہوگی تو وہ شراب ہی ہوگی...... یہ شاید چیتل ہی کا خون تھا۔

میں نے کچھ دیر تک اردگرد کا جائزہ لیا پھر جھنجوڑ جھنجوڑ کر جیکی کو جگا دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور مجھے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ تب شاید اس نے مجھے پہچان لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں اُبھرا تھا۔ اس نے کسمسا کر انگڑائی لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں پھر بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولا۔ ''میں سمجھا تھا کہ میں جب مر کر اُٹھوں گا تو خود کو جنت میں پاؤں گا لیکن...... تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ دوزخ ہی ہے...... اور

سناؤ...... تمہارے ساتھ اور کون کون ہے یہاں؟''

''خوش قسمتی سے آپ مرے نہیں، ابھی زندہ ہو۔''

اس نے پھر ایک مخمور انگڑائی لی۔ ''تم اسے خوش قسمتی کہتے ہو۔ تم سے بڑا بھانڈ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کچی کلیجی کھانے سے میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہے ورنہ میں تمہاری اس بات پر خوب ہنستا...... بلکہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا۔''

''کچی کلیجی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تو اور کیا۔ یہاں میری نانی بیٹھی ہے جو پکا کر کھلاتی۔ بھوک کی وجہ سے میری آنتیں بریک ڈانس کر رہی تھیں...... اس لئے، چبا چبا کر ویسے ہی کھالی۔''

''کس کی کلیجی تھی؟''

''حکم جی کی۔'' وہ مسکرایا۔ ''وہ دیکھو، وہ سامنے پڑا ہے۔'' جیکی نے کٹے پھٹے چیتل کی طرف اشارہ کیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ ہاتھ پر خشک خون کیوں لگا تھا۔ وہ چیتل کے سینے میں سے کلیجی نکال لایا تھا اور اسے شراب کے آتشیں گھونٹوں کے ساتھ گلے سے نیچے اُتارا تھا۔ سچ ہے کہ بھوک انسان سے سب کچھ کراتی ہے......

''اس چیتل کو مارا کس نے؟''

''چیتل نہیں یار...... حکم جی...... اور حکم جی کو عوام کے سوا اور کون مارے گا؟ یہ عوام ہی ہیں جو بھوک سے بے بس ہو کر تیندوے کا روپ دھار لیتے ہیں اور حکم جی جیسے زور آور لوگ ان کے لئے چیتل اور ہرن بن جاتے ہیں۔ کل رات یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک عوام نے ایک حکم جی پر حملہ کیا۔ بڑی محبت سے اس پر جھپٹا مارا اور بڑی عقیدت سے اس کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ حکم جی ڈری ڈری آوازیں نکالتا رہا، اس کی دُم پھڑکتی رہی اور وہ عوام کے پنجے سے نکلنے کے لئے زور لگاتا رہا لیکن عوام کی بھینچی میں اتنی گرم جوشی تھی کہ وہ نکل نہیں سکا۔ ہاں دوست! ہر حکم جی ایک دن چیتل ضرور بنتا ہے...... اور ہر مظلوم ایک دن تیندوے کا روپ ضرور دھارتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لے کر ٹارچ بجھا دی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ رات کسی وقت تیندوے نے چیتل مارا تھا اور اس کھنڈر کے سامنے بیٹھ کر اس کا گوشت کھایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھوکا جیکی گھسٹتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور اس نے بھی اس شکار میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے کچھ کلیجی نکالی تھی اور اس کا نرم گوشت چبایا تھا۔ یقیناً یہ وہی تیندوا تھا

جو اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا اس سے سامنا بھی ہوا تھا۔ وہ تازہ شکار کی وجہ سے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ تھا لہٰذا اس نے مجھ سے بھی کوئی خاص تعرض نہیں کیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے جیکی! آپ مجھے بتاؤ کہ آپ کس طرح یہاں پہنچے؟ کیا وہاں سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی تھا؟"

"بالکل تھا...... لیکن وہاں سے شاید میں ہی نکل سکتا تھا...... کوئی اور نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

جیکی نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے کر روشن کی اور اس کا رخ اپنے جسم کی طرف کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ننگ دھڑنگ تھا۔ ایک تہ در تہ لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنے جسم کی گہری خراشیں دکھائیں۔ یہ خراشیں اس کے کانوں، اس کے سینے اور کمر پر خاصی گہری تھیں اور سیاہ نشان سے بن چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بہت سخت شے کے ساتھ بہت زیادہ رگڑ کھا کر گزرا ہے۔ "یہ سب کیا ہے؟" میں نے اس کی نہایت سخت جلد پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہاں اس سرنگ میں آگے جا کر نکلنے کا ایک راستہ موجود تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا کہ مجھ جیسے پہلوان کو بھی بہت زور لگا کر اس میں سے گزرنا پڑا۔ بس اس وقت مجھے یہ کلیہ یاد رہا کہ جہاں سے بندے کا سر گزر سکتا ہے، وہاں سے پورا جسم بھی گزر سکتا ہے۔"

وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ حیران کن تھا لیکن یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا کیونکہ بار وندا جیکی میرے سامنے موجود تھا...... اور وہ جس قسم کے ڈھیٹ جسم کا مالک تھا، وہ اس طرح کی مہم جوئی کر بھی سکتا تھا۔

"تم نے زنجیر کیسے کھولی؟"

"جیسے ہمیشہ سے کھولی جاتی ہے۔ زنجیر کھولنے، توڑنے اور پگھلانے کے لئے ہمیشہ سے حوصلے کی ضرورت رہی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"جیکی! آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح نکل جاؤ گے تو مجھ پر الزام آئے گا...... اسے میری غفلت سمجھا جائے گا۔"

وہ ہنسا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بلکہ کسی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ میں سرنگ کی جس دراڑ میں سے نکلا ہوں، وہاں سے کوئی اور نکل کے دکھا دے تو میں مانوں۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم یہاں کیسے نازل ہوئے ہو؟ مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔"

"مجھے بھی نہیں ہو رہا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں آپ کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھ سکوں گا۔"

میں نے بار وندا جیکی کو مختصراً وہ سارے واقعات بتا دیئے جو اس کے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ میں نے اسے ماریا فرگوسن کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے اپنے تحفظ کے لئے اسے یرغمال بنا رکھا تھا۔ سرنگ سے نکلنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ بھی میں نے جیکی کے گوش گزار کر دیا۔ جب میں روداد کے اس حصے پر پہنچا جہاں چالباز ماریا پارسی ریان کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کر کے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھی...... جیکی کے چہرے پر عجب زہرناک تاثرات پھیل گئے۔ وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولا۔ "تم لوگوں کے چنگل سے رہائی تو ماریا کے لئے بہت بڑی بات تھی، اس طرح کی یورپین لڑکیاں تو کبھی کبھی ایک وقت کے کھانے کے لئے بھی خوشی خوشی کسی کے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ ان کا جسم ان کے لئے ایک فائدہ بخش پرپرٹی کی طرح ہوتا ہے جسے یہ کسی بھی وقت رینٹ پر دے سکتی ہیں...... خیر، چھوڑو اس بات کو...... اس کے بعد کیا ہوا؟"

میں نے جیکی کو اس خونی ہنگامے کی پوری تفصیل بتائی جو چوکی کے آس پاس برپا ہوا تھا اور جس میں پارسی ریان کے علاوہ ماریا کو بھی گولی لگی تھی۔

ماریا کو گولی لگنے کا سن کر جیکی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔ وہ بولا۔ "زندہ ہے یا مر گئی؟"

میں نے کہا۔ "یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال، زخمی ضرور ہوئی ہے۔"

"چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ اگر وہ صاف بچ جاتی تو یہ میرے لئے ایک بری خبر ہوتی...... اور اپنی زندگی کے ان آخری دنوں میں، مَیں بری خبریں سننا نہیں چاہتا۔"

"اس ماریا کے لئے آپ کے دل میں بہت رنج ہے؟"

"ہاں، اس نے صرف مجھے دکھ دیا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے شکنتلا کو دکھ دیا۔ اس کی گہری سہیلی ہو کر بھی اس نے دغابازی کی اور ہماری ملاقاتوں کے بارے میں شکنتلا کے پتا کو بتایا۔ پتا نہیں کہ تم نے اچھا کیا ہے یا برا کہ مجھے سرنگ میں ماریا کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا...... ورنہ اس کے لئے میری "بے پایاں محبت" نے جوش ضرور مارنا تھا۔ میں اس کی جتنی بھی عزت افزائی کر سکتا، ضرور کرنی تھی۔ اگر اس عزت افزائی سے اس

کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جاتیں تو مجھے دلی راحت ہوتی...... بہر حال جو ہوا ٹھیک ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے زندگی دے اور مصیبت والی زندگی دے۔ اسے کچھ تو دوسروں کے درد کا احساس ہو۔''

جیکی اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا اور اپنا نشہ بحال رکھنے کے لئے شراب کے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں اس کھنڈر میں سے اس نے یہ سیال آگ کیسے ڈھونڈ نکالی ہے؟

وہ بولا۔ ''شراب جہاں بھی ہوتی ہے، مجھے بلا لیتی ہے۔ کسی مستانی محبوبہ کی طرح مجھے دیکھ کر آنکھ مارتی ہے، سیٹی بجاتی ہے...... اور جب لڑکی خود سیٹی مارے تو پھر عاشق کا تو فرض بن جاتا ہے کہ وہ اس کو گود میں بھرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہاں شراب موجود ہے؟''

''شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس کھنڈر میں گھستے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کہیں شراب موجود ہے۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تمہاری کھوپڑی میں نہیں آئیں گی۔ اس کے لئے ریاضت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ورنہ میں اس حوالے سے بھی تمہیں کئی گُر بتا جاتا۔''

''میں ایسے گُر نہ سیکھنے کے لئے پیشگی معذرت چاہتا ہوں......''

''دیکھو کچھ اور نہ کہنا میری دوسری محبوبہ (شراب) کے بارے میں۔ ورنہ یہ توہین محبت ہو جائے گی اور یہ توہین عدالت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اپنی شاگردی سے عاق بھی کر سکتا ہوں......''

وہ گول مول باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوتلیں شاید کسی جرائم پیشہ شخص یا اشخاص نے یہاں دبائی تھیں لیکن ان بوتلوں میں سے کچھ شراب رستی تھی۔ اس کی بدبو دار نمی، مٹی میں جذب ہوتی رہتی تھی اور اسی مخصوص بدبو یا ہلکی سی باس نے جیکی کو اس شراب کا سراغ دیا تھا۔

شام ہونے کے بعد میری بھوک انتہا کو پہنچ گئی۔ شاید اس وقت مجھے بھی کوئی کلیجی قسم کی چیز ملتی تو میں بھی اسے کچا چبانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کل رات کی تیز بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ پیٹ خالی ہو تو سردی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا لیکن یہ مدقوق جسم والا جیکی تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سردی گرمی کی مطلق پروا نہیں تھی

لیکن کچھ بھی تھا، شراب نے اس بے مثال بندے کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اس کا ایک ثبوت شام کے فوراً بعد اس وقت ملا جب جیکی کو شدید کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کے دوران میں ہی اس کے منہ سے خون رسنے لگا...... اس نے کئی بار خون تھوکا اور اسے ڈھانپنے کے لئے اس پر مٹی ڈالی۔ وہ ایک دم گم صم نظر آنے لگا۔

وہ آرزدہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ تم میری مدد کر سکو۔''

''دل چھوٹا مت کرو...... آپ ٹھیک ہو جاؤ گے...... اور مدد کی بات آپ کس حوالے سے کر رہے ہو؟''

''میری آخری خواہش پوری کر دو۔ مجھے کسی طرح میری کشتی پر لے جاؤ۔ ہم وہاں سے بہت دور نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دن کا سفر ہمیں واپس وہاں پہنچا دے گا۔ تمہارے پاس رائفل ہے...... دو ٹانگیں ہیں...... تم صحت مند ہو...... مجھے میری منزل تک پہنچا سکتے ہو۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی یاسیت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کا گرم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے جیکی...... آپ اپنی یادوں میں گم ہو کر رہ گئے ہو۔ آپ آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ راستہ یہاں ختم نہیں ہوا...... ابھی آگے بہت کچھ ہے۔''

''میرے لئے کچھ نہیں ہے...... میرے لئے سب کچھ وہیں ختم ہو گیا تھا جب اُس رات کشتی پر میرا ہاتھ شکنتلا کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ حکم کے محافظوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے...... اس سے جدا ہونا میرے لئے کیسا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ بے مثال ہے دوست...... میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس کی مسکراہٹ میں کھونے کے بعد دوبارہ اُبھر نہ سکتا...... اس کی زلفوں میں اُلجھنے کے بعد پھر رہائی نہ پا سکتا۔ کاش! میں شاعر ہوتا، میں کھل کر بتا سکتا کہ وہ کیا تھی اور......''

وہ بات کرتے کرتے ایک دم رک گیا جیسے کوئی نیا خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس خیال کو مجھ پر ظاہر کرے یا نہیں۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ توقف سے بولا۔ ''کہنا تو نہیں، کچھ دکھانا چاہ رہا ہوں تمہیں...... لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ غلط نہ ہو...... وہ اس پر ناراض نہ ہو جائے...... جب وہ ناراض ہو جاتی ہے تو کئی کئی

دن تک میرے تصور میں نہیں آتی۔ مجھے تڑپاتی ہے اور خود بھی تڑپتی رہتی ہے۔"

"کیا آپ مجھے اس کی کوئی چیز دکھانا چاہ رہے ہو؟"

"ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔" اس نے کہا...... پھر ذرا سوچ کر بولا۔ "لیکن تم وعدہ کرو کہ اس کو پاک صاف نظروں سے دیکھو گے۔ اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں لاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا...... اور میں خود کو بہت گناہ گار محسوس کروں گا۔"

"کیا آپ مجھے اس کی کوئی تصویر دکھانا چاہ رہے ہو؟" میں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ویسا ہی ہو گا جیسا وہ چاہتا ہے۔ ساتھ ساتھ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ یہ تصویر اگر واقعی موجود ہے تو اس نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔ میں نے تو اسے اب تک اس میلے کچیلے لنگوٹ میں ہی دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جیکی نے اپنے تہ در تہ لنگوٹ کی گرہ کھولی اور اس کی ایک بالائی تہ میں بڑی احتیاط سے لپیٹی گئی کارڈ سائز کی تصویر نکال لی۔ اسے پہلے پولی تھین میں پھر ایک رومال میں لپیٹا گیا تھا۔ جیکی نے اسے اپنے اکلوتے ہاتھ سے رومال کی گرہ کھولی پھر پولی تھین کو ہٹایا۔ وہ تصویر کو یوں برآمد کر رہا تھا جیسے کسی عبادت گاہ میں ہو اور کسی مقدس شے کو منظرِ عام پر لا رہا ہو۔

یہ ایک نہیں تین تصویریں تھیں۔ مسلسل جیکی کے پاس رہنے سے ان پر تھوڑی بہت سلوٹیں بھی آ چکی تھیں۔ جیکی نے پہلی تصویر مجھے دکھائی۔ یہ راج بھون کے کسی عالی شان ہال کمرے میں اُتاری گئی تھی۔ اس میں سات لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان ساتوں نے مختلف رنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ یہ سارے لباس گھاگرے چولی پر مشتمل تھے۔ لڑکیوں کے کندھوں پر خوبصورت آرائشی پر لگے ہوئے تھے۔ یہ پر بھی لباس کے رنگ کے ہی تھے۔ ایک لڑکی پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہی شکنتلا ہے۔ میں نے اس سے پہلے جیکی سے سنا تھا کہ شکنتلا جب ساتویں کے جشن کی پری بنی تو اس کو سبز رنگ ملا تھا۔ وہ واقعی حسین و جمیل تھی۔ اس کی صورت میں موجود ایک خاص قسم کی دلکشی، نگاہ کو کشش کرتی تھی۔

"پہچانا کہ وہ کون ہے؟" جیکی نے مغموم لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے سبز لباس والی پر انگلی رکھی۔

جیکی کا چہرہ چمک اُٹھا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو گے...... ستاروں میں سے چاند کو پہچاننا کون سا مشکل ہوتا ہے۔"

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ ساتوں لڑکیاں ایک کرسی کے پیچھے قطار میں کھڑی تھیں۔ زرنگار کرسی پر کوئی شخص تمکنت سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا قدرے فربہ اندام شخص لگتا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ نہایت قیمتی شیروانی پہن رکھی تھی۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں تھیں مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ چہرے پر کسی نے سیاہ روشنائی والے قلم سے اتنی لکیریں لگائی تھیں کہ چہرہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

"کیا کرسی پر حکم جی بیٹھا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، تم اسے حکم جی بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ زیادہ دیر حکم جی نہیں رہے گا۔ بہت جلد چیتل بن جائے گا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"حکم جی" کو دیکھنے کی آرزو میرے دل میں تھی لیکن یہ آرزو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

جیکی نے دوسری تصویر دکھائی۔ اس میں سبز لباس والی شکنتلا پنجوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی اور اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے چرن چھو رہی ہے۔ یقیناً یہ حکم جی کے پاؤں ہی تھے لیکن یہاں بھی اس کے پاؤں اور پنڈلیوں پر بے تحاشا سیاہ لکیریں لگا دی گئی تھیں اور پاؤں نظر نہیں آتے تھے۔ شکنتلا کی زلفیں واقعی بہت دراز تھیں۔ اس کی بھاری چوٹی، جیسے قالین پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے جسم کی ساری غیر معمولی رعنائی اور کشش اس پوز میں نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک دل آویز جسم کی مالک تھی۔ اس تصویر میں ایک دیوار پر بدھا کے اس نادر روزگار مجسمے کی پینٹنگ بھی نظر آ رہی تھی جو مقامی لوگوں نے نزدیک ناقابلِ شکست تھا اور جسے چوری کرنے کی پاداش میں، مَیں اور میڈم صفورا وغیرہ اس راجواڑے میں موجود تھے۔

تیسری تصویر کلاسیکل رقص کی تھی۔ یہ بھی گروپ فوٹو تھا۔ اس میں ساتوں "پریاں" پاؤں میں گھنگھرو باندھے رقص کر رہی تھیں۔ ان کے پس منظر میں پگڑیوں والے سازندے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی شکنتلا نمایاں تھی۔ اس کا سراپا ایک تصویر تھا اور اس تصویر نے جیکی کے ساتھ ایک کشتی میں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیل کے اندر سات روز گزارے تھے۔ اگر باروندا جیکی اس حوالے سے خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا تو شاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔

"یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں؟" میں نے جیکی سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر کھانستے رہنے کے بعد بولا۔ "بس، یہ میری خوش قسمتیوں میں سے ایک خوش قسمتی ہے۔ میں ان دنوں جیل سے بھاگ آیا تھا اور اپنی محسنہ ہوشن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہوشن سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح مجھے ساتویں کے جشن کی کچھ تصویریں لا دے۔ ساتویں کے جشن کی تصویریں اُتاری جاتی ہیں اور یہ جشن کے میلے میں فروخت بھی ہوتی ہیں لیکن میلا چونکہ ختم ہو چکا تھا، اس لئے جشن کے پکچر کارڈز کا ملنا بڑا مشکل تھا۔ پھر بھی ہوشن نے کسی طرح جشن کے آٹھ دس پکچر کارڈز حاصل کر لئے۔ ان میں سے ان تین کارڈز میں شکنتلا نظر آ رہی تھی...... اور یہ تین کارڈز میرے لئے ایک بہت بڑے سرمائے کی طرح تھے۔"

"تصویروں پر یہ لکیریں...... آپ نے لگائی ہیں؟"

"ہاں...... حکم جی کے چہرے پر خوب صورتی اور نیکی کی چمک ہی اتنی ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ پھر کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "دیکھو، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تم سے التجا کر رہا تھا کہ تم مجھے کسی طرح میری کشتی تک پہنچا دو۔ تم مجھے استاد کہتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اپنے استاد پر تمہارا یہ ایک بہت عظیم احسان ہو گا۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، مجھے ایک نامانوس آہٹ سنائی دی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرا کہ یہ کسی "پمپ ایکشن رائفل" کے کاک ہونے کی آواز ہے۔ میں نے ٹارچ فوراً بجھا دی اور رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ لگتا تھا کہ جیکی نے بھی یہ آواز سنی ہے اور وہ تھوڑا سا چونکا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تاہم میرے لئے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ دھڑکن کی اس تیزی میں خوف کا عنصر شامل نہیں ہے۔ میں جھک کر چلتا ہوا محتاط قدموں سے دروازے کی طرف آیا۔ چپتل کے ڈھانچے کے قریب پہنچ کر میں نے آنکھیں سکیڑیں اور اردگرد نگاہ دوڑائی۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔

یہاں دشمن موجود تھا...... اور وہ ایک نہیں تھا۔ نہ ہی دو تین یا چار کی تعداد میں تھا۔ وہ درجنوں میں تھا۔ شاید ہر جھاڑی کے پیچھے...... ہر درخت کی اوٹ میں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ نہایت خاموشی...... نہایت ہوشیاری سے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں رنجیت پانڈے کا نام گونجا۔

تو کیا وہ وقت پہنچ گیا تھا جس کا انتظار تھا؟

کیا آج یہاں مجھے اپنا حوصلہ آزمانا تھا؟ آگے بڑھنا تھا، لڑنا تھا...... اور مرنا تھا؟

مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ صرف چند سیکنڈ میں ہی میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورت حال کے لئے تقریباً تیار ہو گیا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا...... وہاں عمران کھڑا تھا۔ یہ اس کا تصور تھا لیکن حقیقت کی طرح واضح اور روشن لگا۔ اس نے میرے کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جادوئی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا...... جگر! ڈرنا ہے تو مرنا ہے...... اور جو مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ کاش! وہ جیتی جاگتی حالت میں میرے ساتھ ہوتا...... بہر حال...... اس کا تصور بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

یکا یک فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی...... سیٹیاں بجاتی ہوئی چوکی کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ میں نے اپنی رائفل سے چند جوابی فائر کئے۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا، نہ ہی مجھے ایسی شوٹنگ کے داؤ پیچ آتے تھے...... میرے لئے اطمینان اور راحت کی بس ایک بات تھی۔ اس طرح درجنوں دشمنوں میں گھر کر اور موت کو اپنے رُوبرو دیکھ کر بھی میرے جسم اور دل و دماغ کو لرزہ طاری نہیں ہوا تھا۔ آج میں اس شخص سے بہت...... بہت زیادہ مختلف تھا جس نے اپنے گھر کے سامنے چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج کے غنڈوں سے مار کھائی تھی اور پھر اپنے ہر جاننے والے سے منہ چھپاتا پھرا تھا۔ آج میں اپنے اندر مرنے کا حوصلہ پا رہا تھا اور یہ حوصلہ بھی پا رہا تھا کہ مرنے سے پہلے اپنے دس بیس دشمنوں کو موت کا مزہ چکھا دوں۔

ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ تڑتڑ کی زبردست آوازوں کے ساتھ چند برسٹ بھی چلے۔ گولیاں کھنڈر کی دیواروں سے ٹکرائیں اور ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ کسی درخت پر گھونسلے میں دبکا ہوا کوئی پرندہ گولی کھا کر "دھپ" سے میرے سامنے تاریکی میں گرا اور پھڑ پھڑا کر ساکت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میگا فون پر ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔ اس آواز کو سن کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ہمیں گھیرنے والوں میں رنجیت پانڈے بھی شامل ہے۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں پکار کر کہا۔ "تم لوگن کے بچنے کا کوئی چانس نا ہیں ہے۔ بہتر ہے کہ باہر آ کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں وچن دیوت ہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نا ہیں ہووے گی اور قانون کے مطابق سلوک ہووے گا۔"

میں خاموش رہا۔ قریباً ایک منٹ بعد میگا فون پر پانڈے کی آواز دوبارہ ابھری۔ "تم

جواب کیوں ناہیں دیوت ہو؟ اگر تم جواب ناہیں دو گے تو ہم سمجھیں گے کہ تمہیں یہ آفر منظور ناہیں ہے۔ ہم حملہ کرنے پر مجبور ہو جاویں گے......''

پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چوکی کی اندرونی صورتِ حال سے باخبر نہیں ہے، صرف اندازے سے کام لے رہا ہے۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اندر زیادہ تعداد میں افراد موجود ہیں۔ اگر میں خود اس سے مکالمہ کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ میں سے کوئی یہاں نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں پانڈے اور اس کے درجنوں ساتھیوں کا حوصلہ مزید بڑھ جاتا۔

میری خاموشی طویل ہوئی تو درختوں میں یکے بعد دیگر کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ ان ٹارچوں کی روشنی نے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی کہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے اس کھنڈر چوکی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ ایک ساتھ درجنوں ٹارچیں روشن ہونے کی وجہ سے کھنڈر کی اطراف روشن ہو گئی تھیں۔ کوئی اس کھنڈر میں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو فوراً نظر میں آ جاتا۔

شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ انسان حالات سے سبق سیکھتا ہے، اس سے پہلے ہونے والے معرکے میں ماریا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر ہی اپنی پناہ گاہ سے بھاگ نکلے تھے۔ پانڈے جیسا شخص یہ غلطی دوسری بار نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کھنڈر کے قرب و جوار کو حتی المقدور روشن کر دیا تھا۔

میگا فون پر پانڈے کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ''ہم تمہیں دس منٹ کا وقت دیوت ہیں۔ اگر تم لوگن اس سمے کے اندر باہر ناہیں نکلے تو ہم فائر کھول دیویں گے۔ یاد رکھو، تم میں سے کوئی زندہ ناہیں بچے گا۔'' اس بار پانڈے کے لہجے میں مخصوص تپش موجود تھی۔ یہ تپش اس کے اندر کی بے پناہ سفاکی کو ظاہر کرتی تھی۔

میں بے آواز کھسکتا ہوا پیچھے آیا۔ جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی واحد ٹانگ سامنے کی طرف پھیلا رکھی تھی۔ بوتل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس میں سے مزید کافی ساری شراب اپنے اندر انڈیل چکا تھا۔ صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بہت اچھی طرح آ چکی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ حکم اور جارج کے لوگوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ ''جیکی! میں آپ کے لئے مصیبتوں کی وجہ بنا ہوں۔ میں آپ کا کھوج لگاتا ہوا اس کھنڈر میں نہ آتا تو شاید آپ بچ جاتے۔''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ شاید بُری چیز ہے۔ اس لفظ کو اپنی باتوں میں آنے ہی نہیں دینا چاہئے۔ اگر اس لفظ کا ہی سہارا لینا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شاید تم میری وجہ سے پھنسے ہو۔ شاید میں جارج کی بہن کو مارشل آرٹ سکھانے اس اسٹیٹ میں نہ آتا تو اب تک بھلا چنگا ہوتا...... اور شاید میں اور شکنتلا ایک دوسرے کی نظر کا شکار نہ ہوتے اور جارج کی بہن ہماری مخبری نہ کرتی تو میں اس وقت اسٹیٹ کی فوج کا کمانڈر انچیف ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح تو بہت کچھ سوچا جا سکتا ہے دوست...... لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم میرے لئے مصیبتوں کی وجہ بنے ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم نے میرے لئے کوئی مصیبت کھڑی کی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''...... میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا جیکی...... آپ کو آپ کی کشتی سے نکال کر اس جنگل میں لانے کا ذمے دار کوئی اور نہیں صرف میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جس کی وجہ سے آپ یہاں موجود ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

''میرے ساتھی تو آپ کو اس کشتی میں چھوڑ کر آ گئے تھے لیکن میں آپ کو وہاں نہ چھوڑ سکا...... اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو آپ بے ہوش تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اسی طرح دم نہ توڑ جاؤ...... لیکن زیادہ اہم وجہ دوسری تھی۔ مجھے آپ کی شکل و صورت میں اپنے بہت پیارے دوست کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ وہی دوست ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام عمران تھا۔ اس نے مجھے نئی زندگی دی اور تھوڑے ہی وقت میں مجھے اتنا عزیز ہو گیا کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا اور اگر بیان کروں گا تو شاید حق ادا نہ کر پاؤں گا۔''

میں نے اس بارے میں اسے تھوڑی سی تفصیل مزید بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''جو بھی ہوا اسے اب دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں...... اور نہ ہی اسے دہرانے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے۔ بہرحال، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم لوگ مجھے وہاں مرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوتا۔''

''میں اس کے لئے شرمندہ ہوں جیکی!''

''چلو...... تم نے سچ تو بولا...... اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ نیپالی میں ایک کہاوت ہے کہ سچ بولنے والے کی زندگی کا آخری مرحلہ آسان ہو جاتا ہے......''

میں نے دیکھا کھنڈر سے باہر ٹارچوں کے روشن دائرے اب پہلے سے بڑھ گئے تھے۔

موت کا گھیرا مکمل تھا۔ میں نے کہا۔ ''جیکی! ابھی میگافون پر ان لوگوں نے جو اعلان کیا ہے، آپ نے سنا ہے؟''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''شاید تم بھول رہے ہو کہ میں اردو اور ہندی نہیں سمجھتا۔''

''اوہ سوری۔'' میں نے کہا۔ ''یہ حکم اور جارج کا سب سے خطرناک ہرکارہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ ہمیں پیشکش کر رہا تھا کہ اگر ہم ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں تو ہمیں شوٹ نہیں کیا جائے گا اور ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔''

جیکی نے بوتل میں سے دو بڑے گھونٹ لئے اور ایک بار پھر زخمی انداز میں مسکرایا۔

''اس پانڈے کو میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ کسی بہت نیک ماں کا بچہ ہے۔ وہ خدا کی بندی ایسے تین چار پانڈے اور پیدا کر دیتی تو پورا انڈیا شاید اس دنیا میں ہی ہورگ بن جاتا۔ وہ میگافون پر جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیں بالکل شوٹ نہیں کریں گے اور ہمارے ساتھ سلوک بھی قانون کے عین مطابق ہوگا...... لیکن یہاں کا قانون کیا ہے؟ یہ شاید تم نہیں جانتے۔''

''کیا قانون ہے؟''

''یہ تو طے ہے کہ میری اور تمہاری کم سے کم سزا موت ہوگی اور موت یہاں بڑے برے طریق سے دی جاتی ہے۔ تمہیں پھانسی چڑھنے...... اور سولی چڑھنے کا فرق معلوم ہے؟''

میں خاموش رہا۔

وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''پھانسی میں گلے میں رسا ڈال کر لٹکایا جاتا ہے اور سولی میں مجرم کو لکڑی کے کراس پر کیل ٹھونک کر ٹانک دیا جاتا ہے...... یوں کر کے۔'' اس نے اپنا اکلوتا بازو پھیلا کر کراس کی شکل بنانے کی ادھوری کوشش کی۔ پھر شراب کا ایک طویل گھونٹ بھر کر بولا۔ ''میں نے جارج کی جیل میں لوگوں کو سولی چڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی وہیں پر سولی چڑھایا جائے گا۔ وہ مرنے کے لئے بہت بُری جگہ ہے اور وہ طریقہ بھی بہت برا ہے...... بہت ہی برا ہے۔''

اس نے ذرا توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''پرانے طریقے کے مطابق جلاد پہلے مجرم کے جسم کے جوڑ توڑتا ہے۔ یہاں سے...... یہاں سے...... اور یہاں سے......'' اس نے اپنے ٹخنے، گھٹنے، کولھے اور کہنی وغیرہ کے جوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر اس بدنصیب کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور بعض اوقات کان بھی کاٹ لئے جاتے

ہیں۔ تب اسے لکڑی کے کراس پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھوں میں چھ لمبی میخیں گاڑی جاتی ہیں...... اور اسے کھلی جگہ پر آخری سانسیں لینے کے لئے لٹکا دیا جاتا ہے۔''

جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، اس قسم کی بات میں نے دورانِ سفر حجام عبدالرحیم سے بھی سنی تھی۔ اس نے جارج کی جیل کا احوال سناتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں مجرموں کو بہت بُرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کے لئے عبرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے ایسی تمام سفاکانہ سزائیں سرِعام دی جاتی ہیں۔

''تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' میں نے باروندا جیکی سے پوچھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ اب حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے...... اور جب موت کشتی میں نہیں آنی تو پھر کہیں بھی آ جائے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو آپ گرفتاری دینا نہیں چاہتے؟''

''ہرگز نہیں، اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو کر لو لیکن اس سے پہلے اپنی یہ رائفل مجھے دے دینا...... تاکہ میں ان حرامیوں میں سے دو چار کو شوٹ کر کے خود کو گولی مار سکوں۔''

''میرے خیال میں، میں بھی لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کروں گا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔

اسی دوران میں میگافون پر منحوس آواز پھر سنائی دینے لگی۔ اس مرتبہ آواز میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔ پانڈے نے کہا۔ ''دس منٹ پورے ہو چکے ہیں۔ ہم تمہیں آخری بار باہر آنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔''

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''پانڈے! تم سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میرا ارادہ تھا کہ پانڈے کے سامنے آتے ہی دو چار گولیاں اس کے سینے میں ٹھونک دوں پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہونا ہے، ہو جائے۔

''تم کون ہو؟'' پانڈے نے پوچھا۔

''تم مجھے مہروز کے نام سے جانتے ہو۔ میں مختار راجپوت کا داماد ہوں۔''

چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ میری سمت حرکت کر آیا۔ پانڈے کی آواز گونجی۔ ''تم اپنی رائفل پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ پھر تم سے بات ہو سکتی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ پانڈے جیسا گھاگ شخص اتنی آسانی سے خود پر حملے کا موقع نہیں دے گا۔ عین ممکن تھا کہ میرے سامنے آتے ہی مجھے شوٹ کر دیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی کھنڈر پر ہلا بول دیا جاتا۔

میں نے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جو کر سکتا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آواز کے رخ پر گولی چلائی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی یہ امید کی کہ ایک آدھ گولی رنجیت پانڈے کو لگ گئی ہوگی۔

میری فائرنگ کے ساتھ ہی جیسے کسی طوفان کا بند ٹوٹ گیا۔ گولیاں مینہ کی طرح کھنڈر کے در و دیوار پر برسنے لگیں۔ میں ایک محفوظ آڑ میں تھا، جم کر جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ سچ کہتے ہیں کہ لڑائی کا انتظار لڑائی سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ ایک بار جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو پھر وہ اتنی خوفناک اور تکلیف دہ نہیں رہتی۔ میں نے اپنی فائرنگ کے جواب میں ایک کرب ناک آواز سنی۔ یہ میرے مدِمقابلوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی، جسے گولی لگی تھی۔ اس آواز نے میرے اندر چنگاریاں بھر دیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اس طرح کی مزید آوازیں سنوں۔

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ میرے حریفوں نے جتنی بار پیش قدمی کرنی چاہی، میں نے انہیں روک دیا۔ میرا نشانہ، بہت اچھا نہیں تھا۔ اس کے باوجود دو تین افراد میری فائرنگ سے ''ہٹ'' ہوئے۔ اس دوران میں، میں نے تیزی سے پوزیشنیں بدلیں، رائفل کے میگزین تبدیل کیے اور جیکی سے گفتگو بھی جاری رکھی۔ وہ میرے لئے میگزین بھر رہا تھا۔ میگزین کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر وہ اس میں اپنے اکلوتے ہاتھ سے گولیاں ٹھونس سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اور اس کا اندازہ اس کی باتوں سے ہو رہا تھا۔ فائرنگ کے ساعت شکن شور میں وہ پکار کر بولا۔ ''شاباش......لڑتے ہوئے مرنا ہے، ڈرتے ہوئے نہیں مرنا۔''

''آپ بے فکر رہو۔ آخری گولی تک لڑوں گا۔'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں......نہیں۔ آخری گولی تک نہیں۔'' جیکی کی آواز ابھری۔

''کیا مطلب؟''

''آخری دو گولیاں بچا کر رکھنی ہیں۔ ایک میرے لئے...... اور ایک، چاہو تو اپنے لئے۔''

یکا یک ایک ساعت شکن دھماکا ہو۔ مجھے جیسے کسی مست ہاتھی نے ٹکر دے ماری تھی۔

میں اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ ٹرپل ٹو رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میرا سر بڑے زور سے پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ آنکھوں میں نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا، مجھے دستی بم سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اضطراری عمل کے تحت میں نے اپنے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ صرف ایک ران میں سے خون رِس رہا تھا۔ بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسی۔

''جیکی! آپ ٹھیک ہو؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بُری طرح کھانسنے لگا۔ لگتا تھا کہ اس کی سانس رک رہی ہے۔

میں نے گھپ اندھیرے میں رائفل کے لئے دیوانہ وار ہاتھ چلائے۔ وہ مجھے چیتل کی لاش سے پانچ چھ فٹ کی دوری پر ملی۔ میں لیٹے لیٹے پیچھے کی طرف کھسک آیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی دیواروں اور درختوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ گولیاں میرا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتیں یا شاید کسی بھی شخص کی موت ان گولیوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ ان گولیوں کا خوف دل و دماغ سے بالکل نکل گیا تھا۔ ہاں......اس کی جگہ دستی بم کے خوف نے لے لی تھی۔ مجھے پتا تھا، دستی بم ہوا میں قوس بناتا ہوا آئے گا اور کھنڈر کے اندر تک نقصان پہنچائے گا۔ میں اپنی رائفل کے ساتھ کچھ اور پیچھے ہٹ آیا اور تب مجھے دوسرا شدید ذہنی دھچکا لگا۔ میری ٹرپل ٹو رائفل استعمال کے قابل نہیں رہی تھی اور ایسا دستی بم کے زوردار دھماکے کے بعد ہوا تھا۔ دھماکے کے بعد رائفل کی لبلبی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور اپنی جگہ سے ایک ''ملی'' بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔

''فائر کیوں نہیں کر رہے ہو؟'' جیکی نے چلا کر پوچھا اور ایک بھرا ہوا میگزین میری طرف اچھالا۔

میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ سارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ ٹارچوں کی چند ایک روشنیاں کھنڈر کے عین سامنے پہنچ گئی تھیں۔ وہ لوگ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پانڈے کے کچھ کمانڈوز نے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی ہیں۔ یہ خطرناک کمانڈوز کسی بھی لمحے ''چارج'' کر کے اندر گھس سکتے تھے۔

کچھ دیر پہلے جیکی نے مجھ سے کہا تھا کہ دو گولیاں بچا کر رکھنا۔ گولیاں تو بہت سی بچی ہوئی تھیں لیکن انہیں چلانے والا ہتھیار بیکار ہو چکا تھا۔

تو پھر اب کیا کرنا ہوگا؟ میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

میرا دھیان اپنے شکاری چاقو کی طرف چلا گیا۔ تو کیا اس چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دیوانہ وار اس کھنڈر سے نکلوں اور رائفل برداروں پر جا پڑوں۔ کسی کو مار تو شاید نہ سکوں لیکن اپنے مرنے کا حق تو ادا کر دوں؟ پھر ذہن جیکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا کیا بنے گا؟ کیا وہ زندہ پانڈے کے ہتھے چڑھ جائے گا؟ کیا اسے اس انجام سے بچانے کے لئے میں اسے اپنے اس چاقو سے قتل کر سکتا ہوں؟ بے شک...... بے شک میں بہت تبدیل چکا تھا لیکن ابھی اتنا تبدیل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جان سے مار سکوں جس کی میں دل سے عزت کرنے لگا تھا...... اور جان سے مارنے کا کام مجھے کرنا بھی چاقو سے تھا۔

مجھے اپنی ہمت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیکی بھی بھانپ چکا تھا کہ میرے فائرنگ نہ کرنے کا سبب کوئی گڑ بڑ ہے۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟ وہ لوگ...... وہ لوگ اندر گھسنے والے ہیں۔“

جیکی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی سفاک آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے رائفل پھینک کر چاقو نکال لیا اور آخری لمحات کے لئے تیار ہو گیا۔ میری ران سے رِستا ہوا خون میرے پاؤں تک پہنچ رہا تھا اور اس کی نمی مجھے اپنی جوتی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یکا یک فائرنگ دھیمی ہوئی اور پھر تھم گئی۔ مجھے کچھ دور افتادہ آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ شیشم، سفیدے اور بلوط کے دیو قامت گھنے درختوں میں چند افراد چلا چلا کر باتیں کر رہے ہیں۔

تب ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ کھنڈر سے باہر ہر طرف شعلے رقص کرنے لگے۔ در و دیوار کی کرچیاں اڑنے لگیں اور شاخیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اب فائرنگ کا آہنگ اور ہے۔ اب فائرنگ کا سارا زور ہماری دائیں جانب تھا...... اور یوں لگ رہا تھا کہ دائیں جانب سے جوابی فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔ چاروں طرف یک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ جیکی کی آواز سنائی دی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔“ دھماکوں کے بے پناہ شور میں جیکی کی

لڑکھڑاتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔

میرے دل میں ایک دم نقارہ سا بجا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہمارے ساتھی یہاں موقع پر پہنچ گئے ہوں؟ مگر پھر فوراً میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ ہمارے ساتھی باقی ہی کتنے بچے تھے۔ انور خاں، چوہان، اسحاق اور جیل سے رہائی پانے والے دو بندے...... یعنی کُل پانچ افراد! مگر یہاں جس طرح کی فائرنگ ہو رہی تھی، لگتا تھا کہ یکا یک دو ڈھائی سو افراد پوری طاقت کے ساتھ ایک دوجے سے بھڑ گئے ہیں۔ ہر طرف للکارے گونج رہے تھے اور ہتھیاروں کی کھٹا کھٹ سنائی دیتی تھی۔ زخمیوں کی پکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گولیوں کے سرلائے اور دستی بموں کے دھماکے...... میدانِ جنگ کا سا منظر تھا۔ دستی بم کے ایک ساعت شکن دھماکے کے بعد ایک جسم اڑتا ہوا سا ہمارے جھونپڑے نما کمرے کے سامنے آن گرا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ششدر رہ گیا۔ یہ شخص سبز وردی میں تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر سے صاف اڑ گیا تھا اور گردن پر سے مٹھی بھر گوشت غائب تھا۔ غالباً وہ یہاں گرنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

جیکی نے بھی سبز وردی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ پکار کر بولا۔ ”یہ تو نل پانی کے لوگ ہیں۔“

”اور کافی تعداد میں ہیں۔“ میں نے اس کے فقرے میں اضافہ کیا۔

میرے لئے سب سے خوش آئند چیز وہ رائفل تھی جو سبز وردی والے کے ساتھ ہی چیتل کی لاش کے پاس گری تھی۔ میں نے رائفل پکڑی اور سرکتا ہوا پیچھے آ گیا۔ یہ رائفل میرے لئے بالکل اجنبی تھی لیکن تیار حالت میں تھی۔ میں نے ٹریگر دبایا تو زبردست تڑتڑاہٹ سے ایک برسٹ، لکڑی کی بوسیدہ چھت میں جا لگا اور بہت سی مٹی ہمارے اوپر گری۔

میرے رگ و پے میں اعتماد اور جوش کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے رائفل پر گرفت مضبوط کر دی اور ایک دیوار کی اوٹ لے کر چوکس بیٹھ گیا۔

دو تین پکارتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ ان میں سے ایک منحوس آواز پانڈے کی بھی تھی۔ وہ سخت طیش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ غالباً میری فائرنگ اسے شدید نقصان پہنچانے سے قاصر رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں دو تین مختصر وقفوں کے سوا زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے پستول سے لے کر برسٹ مارنے والی بڑی رائفلوں تک ہر طرح کا

ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ چوٹ برابر کی ہے بلکہ ٹل پانی سے آنے والوں کو کچھ برتری حاصل ہے...... مگر ایک جگہ ایسی تھی جہاں سے پانڈے کے دو تین ساتھی بڑی موثر فائرنگ کر رہے تھے اور مخالف فریق میں سے کسی کو آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ یہ جگہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہاں تین افراد جی تھری گن کے ساتھ موجود تھے۔

جیکی کا خیال بھی یہی تھا کہ جب تک پانڈے کے بندے ٹیلے والی جگہ پر موجود ہیں، ان کا پلڑا بھاری رہے گا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں آئی کہ میں یہاں اس کھنڈر کی پناہ گاہ کو چھوڑ کر نکلوں اور بھاگتا ہوا اس ٹیلے پر پہنچ جاؤں۔ اندھا دھند گولیاں برساؤں اور اپنے سامنے آنے والے ہر ذی روح کو چھلنی کر دوں۔ پھر ٹل پانی والوں کو میری لاش ٹیلے کی بلندی پر سے ملے۔ میرے جسم پر گولیوں کے ان گنت زخم ہوں۔ وہ لوگ میری لاش کو ٹل پانی لے جائیں...... اور...... میرے کردار پر لگے ہوئے بزدلی و کم ہمتی کے سارے داغ میرے لہو سے دھل جائیں۔

سوچنے اور عمل کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا لیکن عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے اندر انقلاب ضرور آیا تھا مگر ابھی یہ انقلاب اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ میں ایسا بڑا قدم اٹھا سکتا۔

اچانک فائرنگ دھیمی پڑ گئی اور یوں لگا کہ فائرنگ کا آہنگ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ درختوں میں حرکت کرتی ہوئی روشنیاں تیزی سے بائیں طرف ہٹنے لگیں۔ جیکی نے پکار کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پانڈے کے لوگ بھاگ رہے ہیں۔"

کچھ دیر بعد مجھے بھی لگا کہ جیکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے دو گھوڑوں کو برق رفتاری کے ساتھ اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ ان پر سبز اور خاکی وردیوں کی جھلک نظر آئی۔ دائیں طرف سے ہونے والی فائرنگ ایک دم زور پکڑ گئی تھی۔ جو فائرنگ بائیں جانب سے ہو رہی تھی، وہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ دور بھی چلی گئی تھی۔

یکایک کھنڈر کے بالکل سامنے سے ایک گرجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"تابش...... تابش! تم کہاں ہو؟"

میری رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک جوش کی ایک لہر چلی اور پھیل گئی۔

یہ ہمارے یار غار...... شیر دل انور خاں کی آواز تھی۔

میں نے پکارا۔ "میں یہاں ہوں انور بھائی۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔

انور خاں اور اسحاق عقابوں کی طرح جھپٹتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ سبز وردیوں والے چار پانچ مسلح افراد بھی تھے۔ انور خاں کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ سرتاپا ایک جنگجو پٹھان نظر آتا تھا۔ ہم بغل گیر ہو گئے۔ وہ میرا ماتھا چوم کر بولا۔ "یار! ایک دم کہاں چلے گئے تھے تم؟ بڑا پریشان کیا تم نے۔"

اسحاق بھی مجھ سے بغل گیر ہوا۔

تفصیلی بات کا وقت نہیں تھا۔ اِکا دُکا فائر ابھی تک ہو رہے تھے۔

دو مسلح افراد جیکی کے پاس رک گئے۔ ہم کھنڈر سے باہر نکل آئے۔ مجھے سامنے ہی درختوں کے نیچے پانچ چھ افراد کی لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے زیادہ تر زرگاں کے تھے۔ ایک بارشی گڑھے میں ایک گھوڑا بھی مردہ پڑا تھا۔ ٹیلے کے اردگرد بھی جانی نقصان ہوا تھا...... دو تین لاشیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ سبز وردیوں والے افراد زخمیوں کو اُٹھا رہے تھے اور یہاں وہاں بکھرے ہتھیار اور پگڑیاں وغیرہ اکٹھی کر رہے تھے۔ ایک شخص جھکا اور اس نے خودرو گھاس میں سے، دھات کی بنی ہوئی کوئی چیز اُٹھائی۔ انور خاں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھی۔ یہ ایک آہنی راڈ تھا۔ اس پر افقی رخ پر تین چار چھوٹے راڈ لگے ہوئے تھے۔ عقب میں ایک گول جالی سی تھی۔ دیکھنے میں یہ ٹی وی انٹینا جیسا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بھاگنے والے دیگر کئی چیزوں کی طرح یہ آلہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔

اسی دوران میں کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ یہ زبردست دوستانہ گرفت تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ اس کا زخمی کندھا پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ فائرنگ ختم ہو چکی تھی لیکن ایک گرم ماؤزر ابھی تک چوہان کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ سب کیا ہے چوہان؟ اتنے سارے لوگ تمہارے ساتھ؟ ہم تو صرف چھ بندے باقی بچے تھے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہم چھ نہیں، صرف پانچ بچے تھے۔ تم تو جوہڑ کے کنارے پیشاب کرنے کے بہانے نکل گئے تھے اور جس وجہ سے نکلے تھے، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں...... بہرحال...... یہ جو کچھ ہوا ہے، تم اسے اللہ کی مدد کہہ سکتے ہو۔ حالات ایک دم بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ابھی تمہیں تفصیل بتاتے ہیں۔" چوہان نے کہا۔ اس کی آواز میں

ایک جوشیلی لرزش تھی۔

انور خاں اور دیگر افراد ٹیلے پر چڑھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ یہاں اب نل پانی کے مسلح سپاہیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ٹیلے پر دو تناور درختوں کی اوٹ میں گولیوں کے بے شمار خول پڑے تھے اور ایک بڑی گن تھی۔ انور خاں نے بتایا کہ یہ جی تھری ہے۔ یہاں اس منظر میں موجود سب سے اہم چیز دو انسانی لاشیں تھیں۔ یہ دونوں پانڈے کے ساتھی تھے۔ ان کی سبز اور خاکی وردیاں لہو رنگ تھیں۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ ان کے جسم پر گولیاں نہیں لگیں بلکہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیے گئے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جی تھری گن چلانے والے ان دو افراد کی ہلاکت کے بعد ہی لڑائی ختم ہو سکی ہے۔ انور خاں نے یہ شاندار گن اور اس کا سارا فالتو ایمونیشن اپنے قبضے میں لے لیا۔ دونوں افراد کی خونچکاں لاشیں وہاں سے اُٹھوا دی گئیں۔

جلد ہی ہم باروندا جیکی کے پاس چوکی کے کھنڈر میں واپس آگئے۔ یہاں اب بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب نل پانی کے سپاہی تھے۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ رنگ تھا۔ وہ جیکی میں بہت دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ جیکی نشے میں اوٹ پٹانگ بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے چوہان سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ نل پانی کے سپاہی تو اس معاملے میں غیر جانب دار تھے۔ وہ اس لڑائی میں کیسے آگئے؟''

''بس آگئے...... بلکہ کود پڑے...... اور علی الاعلان کود پڑے۔'' چوہان کی آواز میں چھپا ہوا جوش نمایاں ہو گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

اس نے میرا کندھا دبایا۔ گرفت میں جذباتی کیفیت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''نل پانی والے میدان میں آگئے ہیں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں تین جگہ زبردست ٹاکرا ہوا ہے۔''

اس دوران میں انور خاں نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''تابش! آؤ تمہیں اپنے اس ساتھی سے ملواؤں جس کی وجہ سے ہم حکم کے کتوں کو یہاں سے بھگانے میں کامیاب ہوئے۔''

''کون ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو اپنی جان سخت خطرے میں ڈال کر ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے جی تھری چلانے والے دو سپاہیوں پر تلوار کے وار کیے اور ان کا قصہ پاک کیا۔''

انور خاں اور چوہان مجھے لے کر گھنے درختوں میں گھسے۔ یہاں ابھی تک دھواں اور بارود کی بو تھی۔ ایک جگہ خشک جھاڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یقیناً ایسا کسی دستی بم کے دھماکے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے قریب ہی زمین پر دو تین زخمی پڑے ہوئے تھے۔ انور خاں نے مجھے، چادر میں لپٹے ہوئے ایک زخمی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ایک نوجوان لڑکا اس زخمی کے پاؤں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ زخمی کوئی عورت ہے۔ اچانک وہ عورت حرکت میں آئی...... اور میرے قدموں میں گر پڑی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کی آواز نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ وہ کوئی اور نہیں سلطانہ تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھانا چاہا لیکن وہ میرے پاؤں سے لپٹی رہی۔

''مجھے معاف کر دو مہروج...... مجھے معاف کر دو۔'' وہ بس یہی کہتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا منہ سر لپیٹ لیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اپنی شکل بھی دکھانا نہیں چاہ رہی تھی۔ چوہان نے نوعمر لڑکے کے ساتھ مل کر اسے بمشکل میرے قدموں سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلو کے بل ایک طرف جا پڑی۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں پوشیدہ تھا۔

انور خاں مجھے دلاسا دیتے ہوئے ایک طرف لے گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کیا ہے؟''

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

لالکار
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
3
طاہر جاوید مغل

انور خاں نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تابی! ہمارے بعد نل پانی اور زرگاں میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ اس حرام زادی ماریا کے ہمارے ہاتھ سے نکلنے کے بعد حکم اور جارج ایک دم شیر ہو گئے ہیں۔ وہ بڑے جوش میں ہیں اور جوش میں بندے سے بے وقوفیاں بھی ہوتی ہیں۔ حکم جی نے کل دوپہر پورے بیس بندوں کو زرگاں کی جیل سے نکال کر سرِ عام سولی چڑھا دیا ہے۔ ان پر بغاوت اور غداری کے الزام لگائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے پچھلے بدھ کی صبح جارج کی رہائش گاہ پر حملہ کیا اور وہاں سے سلطانہ اور اس کے بچے کو نکالا۔''

''یہ تو واقعی ظلم ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''اس ظلم نے پوری اسٹیٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ نے اب تک بہت تحمل سے کام لیا ہے...... لیکن اب حالات کو سنبھالنا ان کے بس میں بھی نہیں رہا۔ کل سہ پہر حکم جی کے کچھ سپاہی نل پانی کی ایک قریبی بستی میں گھس گئے۔ وہ وہاں اپنے دو مزدور قیدیوں کو پکڑنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مراد شاہ کا ہم زلف بھی ہے۔ اس واقعے کے بعد حکم جی اور چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں جھڑپ ہو گئی۔ یہ پہلی براہِ راست جھڑپ تھی اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے زوردار لڑائی میں بدل گئی۔ وہاں دونوں طرف کے کم از کم چالیس بندے مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو زبردست جھڑپیں اور ہوئی ہیں جن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے والی جھڑپ بھی شامل ہے۔''

یہ اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ سلطانہ آپ کو کہاں ملی؟''

''مراد شاہ کے حکم پر کچھ لوگ نل پانی سے ہمیں تلاش کرنے کے لئے نکلے تھے۔ سلطانہ

بھی اصرار کر کے ان میں شامل ہوگئی۔ ساتھ میں جو نوعمر لڑکا ہے، وہ اس کا بھتیجا طلال ہے ان لوگوں سے ہماری ملاقات وہیں جوہڑ کے کنارے پر ہوگئی جہاں سے تم پرسوں رات چکر ہوئے تھے۔ سلطانہ کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ تم ہمارے ساتھ موجود نہیں ہو۔ ہم بھی تمہارے لئے پریشان تھے۔ ہم کل رات تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ پھر ہمیں خبر ملی کہ پانڈے اور اس کے ساتھ ستر ساتھی پرانی چوکی پر موجود ہیں۔ انہوں نے چوکی کے گرد گھیرا ڈالا ہو ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پانڈے نے جس شخص کو گھیر رکھا ہے، وہ تم ہی ہو۔ جیکی کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ یہاں پہنچ گئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھا ہی ہے۔''

''بہت وقت پر پہنچے تم لوگ۔ میں تقریباً بے بس ہو چکا تھا۔ تم نے میری رائفل دیکھی ہی ہے، اس کا بیرل ہی بیکار ہو گیا تھا۔''

''شاید ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر لگتی لیکن یہاں پہلے سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ نے ہمیں راستہ دکھایا۔''

''سلطانہ کیسے زخمی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے ایک بہادر سپاہی ہوتا ہے۔'' انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑی انوکھی لڑکی ہے تابش! اور اس کا انوکھا پن پچھلے دو تین سالوں میں بہت دفعہ ثابت ہوا ہے۔ تم تو بہت سی باتیں بھول چکے ہو لیکن حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔''

''سلطانہ نے لڑائی میں حصہ لیا ہے؟''

''حصہ ہی نہیں لیا، لڑائی جیتی بھی ہے۔'' وہ بہت جذباتی انداز میں بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''یقیناً تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ جی تھری اور اس کو چلانے والوں کو سلطانہ نے ہی ٹھنڈا کیا ہے۔ لڑائی کے دوران میں پتا نہیں وہ کس وقت پیچھے سے آئی اور اپنے بھتیجے طلال راجپوت کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئی۔ دونوں کے پاس خاندانی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جی تھری چلانے والوں کو چیر کر رکھ دیا۔ پھر ہمیں آوازیں دیں کہ ہم ٹیلے پر آجائیں۔''

میں سناٹے میں تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''وہ زیادتی زخمی تو نہیں؟''

''نہیں، پاؤں اور ٹانگ پر ایک دو زخم آئے ہیں۔ چوہان اسے سنبھال لے گا۔''

''اور بچہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ وہیں نل پانی میں...... چاچا عبدالغنی کے پاس۔ سنا ہے کہ وہ اسے اپنا دودھ نہیں

پلاتی۔ وہ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اب ایک اور عورت اسے دودھ پلا رہی ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ انور خاں بھی خاموش رہا۔ کوئی زخمی بلند آواز سے چلا رہا تھا۔ پس منظر میں گھوڑوں کی مضطرب ہنہناہٹ سنائی دیتی تھی۔ نل پانی کے باوردی سپاہی پوری طرح چوکس تھے۔ ان میں سے بیشتر کی رائفلیں ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھیں۔

انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اسے تمہاری بہت زیادہ ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ جو زخم اسے لگا ہے اسے صرف تم ہی بھر سکتے ہو۔''

''میں کیا کروں؟''

''میں اس بارے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ سلطانہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنے شوہر کو زبانی کلامی نہیں، واقعی مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ تم اگر ٹھان لو کہ تم نے اسے نارمل کرنا ہے تو یہ ناممکن نہیں ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، سیٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بار بار ابھر رہی تھی۔ پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ ایک باوردی شخص نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی پر ہلکے پیلے رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں اعلیٰ عہدہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی انٹینا نما شے تھی جو ٹیلے کے پاس جھاڑیوں سے ملی تھی۔ سیٹی یا بیپ کی آواز اسی میں سے آرہی تھی۔ اس باوردی شخص نے انور خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بھائی! اس میں سے یہ آواز آرہی ہے۔ شاید اس کا کوئی کھٹکا دب گیا ہے۔''

آواز کے ساتھ ساتھ انٹینا پر ایک ننھا سا بلب بھی اسپارک کر رہا تھا۔ اسی دوران میں چوہان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انٹینے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چوہان نے باوردی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اجے! انٹینے کو لے کر ٹیلے کی طرف جاؤ۔''

اجے نامی وہ شخص انٹینے کے ساتھ ٹیلے کی طرف بڑھا۔ جب وہ پچاس ساٹھ قدم چلا گیا تو چوہان نے پکار کر پوچھا۔ ''سیٹی کی آواز کم ہوئی؟''

''ہاں...... لگتا ہے کہ ذرا کم ہوگئی ہے۔'' اجے نے بھی پکار کر کہا۔

''اب اور آگے جاؤ۔''

اجے پھر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد چوہان نے پھر بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ اس بار بھی اجے کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں...... کچھ اور کم ہوئی ہے۔''

چوہان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ '' کچھ سمجھ میں آیا؟''

میرے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ ایک دم میرا ذہن اصل صورتِ حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو یہی وہ ریسیور تھا جس کے ذریعے میرا کھوج لگایا جاتا تھا...... اور یہی ریسیور پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو مقناطیس کی طرح یہاں اس کھنڈر چوکی تک کھینچ لایا تھا۔ اردگرد اور لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر اس بارے میں تبصرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اور چوہان ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

میرا بھوک سے برا حال تھا۔ دیکھا جاتا تو پچھلے تقریباً 48 گھنٹے سے میرے منہ میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں گیا تھا...... انور خاں نے میری صورت سے ہی میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے فوری طور پر میرے لئے خشک گوشت اور پانی کا انتظام کیا۔ نمکین گوشت کے چند ٹکڑے کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر میرے جسم میں جیسے جان آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ بھوک اور ذائقے کا آپس میں کتنا گہرا اور حیرت انگیز تعلق ہے۔ بھوک نہ ہو تو فائیو اسٹار ہوٹل کا بوفے بھی بیکار اور بھوک ہو تو روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھی ہفت رنگ دسترخوان کی طرح۔

اُجالا ہونے سے پہلے ہی ہم نل پانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیکی بھی ایک گھوڑے پر سوار ہمارے ساتھ تھا۔ پانڈے کے ساتھیوں میں سے تین افراد زخمی حالت میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی مشکیں کس کے انہیں اوندھے منہ گھوڑوں پر لاد دیا گیا تھا۔ اس خوں ریز لڑائی میں پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے چودہ ساتھی ہلاک ہوئے تھے۔ اجے اور انور خاں کے ساتھیوں میں سے آٹھ نو بندوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو بعد ازاں چھکڑوں کے ذریعے وہاں سے ہٹایا جانا تھا۔ نو دس بجے کے قریب ہم نل پانی میں داخل ہو گئے۔ پہلی بار میں چند ہفتے پہلے سلطانہ اور رستم کے ساتھ اس خوب صورت بستی میں داخل ہوا تھا۔ اس بار بھی سلطانہ میرے ساتھ تھی لیکن کسی اجنبی کی طرح۔ راستے میں بھی وہ بالکل الگ تھلگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور منہ سر لپیٹے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ وہ بس اپنے بھتیجے طلال سے تھوڑی بہت بات کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں عجیب سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔

نیلی جھیل کے کنارے نل پانی کی بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ نیم پختہ راستوں پر گھوڑا گاڑیاں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ گھاگرے چولی والی عورتیں اور رنگ برنگی پگڑیوں والے مرد روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ سرسبز ڈھلوانوں پر بکریوں اور گائے بھینسوں کے

ریوڑ چر رہے تھے۔ جھیل پر تیرتی کشتیوں کے پس منظر میں پُرشکوہ عمارتوں کے کلس سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ یہ واقعی ایک دلکش بستی تھی۔

نل پانی میں مجھے دو نئی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو ہر چہرے پر ایک جوش سا تھا۔ دوسرے میں نے کئی نوجوانوں کے کندھوں پر رائفلیں دیکھیں۔ مجھے لگا ایسا موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ ہم بستی کے بارونق علاقے میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔ کچھ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور نعرے لگائے۔ ایک چوک میں کچھ جوشیلے جوانوں نے اجے کو گھیر لیا اور اس کے ساتھ انور خاں کو بھی۔ پھر ان دونوں کو کندھوں پر اُٹھا لیا گیا۔ صورتِ حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج رات کھنڈر کے سامنے والی جھڑپ اور جیت کی خبر عام لوگوں تک پہنچ چکی ہے۔

ہمیں سیدھا دیوان میں لے جایا گیا۔ دیوان کے صدر دروازے پر ہم نے جھومتے ہوئے ہاتھی دیکھے۔ دیوان، وہی وسیع و عریض عمارت تھی جس کے اندرونی حصے میں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ وغیرہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں، میں نے چھوٹے سرکار کی عدالتی کارروائی بھی دیکھی تھی۔ چوہان مجھے لے کر تین چار کمروں کی ایک خوبصورت رہائش گاہ میں آ گیا۔

''سلطانہ کہاں ہے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''یہیں پر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''لیکن مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ چاچا عبدالغنی کے گھر میں ہے؟''

''حالات خراب ہو گئے ہیں۔ عبدالغنی کے گھر میں اسے خطرہ ہو سکتا تھا۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر اسے یہاں لایا گیا ہے۔''

''اور بچہ؟''

اس سے پہلے کہ چوہان جواب میں کچھ کہتا، بچے نے خود ہی جواب دے دیا۔ اس کے رونے کی آواز آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک ملازمہ بچے کو گلے سے لگائے اس کی پیٹھ تھپکتی ہوئی برآمدے میں سے گزری۔

''یہی مسلمان عورت ہے جو تمہارے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ میرے خیال میں صفیہ نام ہے اس کا۔ اس کا اپنا بچہ بھی یہیں پر ہے۔''

اسی دوران میں عقبی کمرے سے سلطانہ کے کراہنے کی آواز آئی۔ چوہان مدھم آواز میں

بولا ''سلطانہ کو معمول پر لانے کے لئے تمہارے پاس یہ بہترین موقع ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اسے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ تمہاری ہمدردی اس کے لئے مرہم کا کام دے گی۔ تمہاری خاطر اس نے بڑے دکھ اُٹھائے ہیں تابش! اب وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ سمجھو کہ نیم مردہ ہوگئی ہے۔ تم اسے سہارا دو گے تو پھر سے جی اُٹھے گی۔''

چوہان نے اپنے بیگ میں سے چند دوائیں نکال کر مجھے دے دیں۔

بارونداجیکی کو بھی دیوان کے اندر ہی ایک دوسری جگہ رکھا گیا تھا۔ چوہان نے مجھے اس کے بارے میں تسلی دی کہ وہ بالکل خیریت سے اور محفوظ جگہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اسے وافر مقدار میں شراب بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ چوکی کے کھنڈر میں جیکی کے ساتھ اپنی ڈرامائی ملاقات کی تفصیل میں انور خاں اور چوہان کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔

اس گھر میں میرے، سلطانہ اور بالو کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔ ایک تو وہی صفیہ نامی عورت جو بالو کو دودھ پلا رہی تھی۔ دوسرا گونگا ملازم ہاشم اور تیسرا سلطانہ کا جواں سال بھتیجا طلال۔ طلال کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم کھلے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے وہ دو چار سال بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ اُجلا اور آنکھوں میں دلیرانہ چمک تھی۔ وہ سلطانہ کو بڑی محبت سے چچی جی کہتا تھا۔ میں نے اسے بس دو چار دفعہ ہی بولتے سنا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں خاموشی سے سلطانہ کے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس چوہان کا دیا ہوا مرہم اور پٹی وغیرہ تھی۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ فرش پر کپاس کی پھول دار چٹائی بچھی تھی اور اس کے پھول لالٹین کی زرد روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے سرہانے دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ رہی تھی۔ اس کا زخمی پاؤں جس پر پٹی بندھی تھی، کمبل سے باہر تھا۔ میں نے پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے زخمی پاؤں کو چھوا۔ وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف، گریز، شرمندگی، بہت کچھ یکجا ہوگیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''مہروج ...... یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارے پاؤں پر دوا لگانے لگا ہوں۔''

''خدا کے لئے ناہیں ...... ایسا مت کرو ...... مجھے گناہ گار نہ کرو۔'' اس نے اپنا پاؤں سمیٹ کر کمبل میں کر لیا۔

''اس میں گناہ والی کیا بات ہے؟''

''ناہیں ...... تم میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگاؤ۔ اس سے مجھے گناہ لگے گا۔''

''کیوں؟ کیا اس لئے کہ میں تمہارا شوہر ہوں؟''

اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''تو اگر میں تمہارا شوہر ہوں تو تم مجھ سے دور کیوں ہو...... میری بات کیوں نہیں مان رہیں؟''

''میں نے تمہیں کہا ہے نا، میں تمہارے قابل ناہیں۔ میری ناپاکی تمہیں بھی ناپاک کر دے گی۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں مہروج! میرے بچے کو لے کر مجھ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ میں ناہیں چاہتی کہ میری چھایا بھی تم دونوں پر پڑے۔''

''دیکھو سلطانہ! جو کچھ ہوا، وہ برا تھا لیکن جو کچھ تم اب کر رہی ہو یہ بہت ہی برا ہے۔ ایک طرف تم مجھے اپنا شوہر کہتی ہو، دوسری طرف تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میں دوا لگانے کے لئے ہی تمہارے جسم کو ہاتھ لگاؤں۔ تم اس معصوم بچے کو بھی بھوکا مار رہی ہو جس کی خوراک اللہ نے تمہارے جسم کے اندر رکھی ہے۔ تم دنیا میں کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کے ساتھ اس طرح کا ظلم ہوا ہے۔ بے شک وہ تکلیف دہ حادثہ تھا لیکن ایسے حادثوں کے بعد بھی لوگ سنبھلتے ہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہیں اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اب تک قصوروار نہیں سمجھا لیکن اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گی تو میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

اس نے سر جھکایا اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ کتنا فرق تھا اس سلطانہ میں اور اس سلطانہ میں جو کل رات کھنڈر کے سامنے اچانک اپنی خاندانی تلوار سونت کر نکلی تھی اور ٹیلے پر چڑھ گئی تھی۔ اس نے وہ کیا تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکا تھا۔ وہ واقعی انوکھی تھی۔

میں نے ذرا تحکم سے کہا۔ ''اپنا پاؤں باہر نکالو۔'' وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ''میں نے کہا ہے، پاؤں باہر نکالو۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

اس مرتبہ اس نے پاؤں سرکا کر کمبل سے باہر نکال دیا۔ میں نے اس کی وہ پٹی کھولی جو علی الصباح جنگل میں باندھی گئی تھی۔ اس کے پاؤں پر اوپر کی طرف زخم آیا تھا۔ غالباً دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا یہاں۔ میں نے چوہان کی ہدایت کے مطابق زخم کو روئی سے صاف کر کے مرہم لگایا اور تازہ پٹی باندھ دی۔ اس کی پیشانی اور رخساروں پر بھی نیل موجود تھے۔ دوسرا زخم اس کی کہنی پر تھا۔ میں نے یہاں بھی دوا لگائی اور پٹی باندھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ میں نے کچھ عرصے پہلے جب اسے پہلی بار ایک نیم تاریک کھوہ میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک نہایت مضبوط اور باہمت لڑکی نظر آئی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ شاید اس لڑکی کی آنکھ میں کبھی آنسو نہیں آیا ہوگا اور شاید اس نے کبھی آہ بھی نہ بھری ہوگی ...... اور ۔ نے

والے دنوں میں وہ واقعی ایسی ہی نکلی تھی۔ میں نے اسے کئی مشکلوں کا سامنا مردانہ وار کرتے دیکھا تھا لیکن یہ جو آخری آفت اس پر ٹوٹی تھی، اس نے اسے واقعی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے حصے میں آنے والے تمام آنسو انہی دو چار دنوں میں بہا دینا چاہتی ہے۔ کچھ احساسات پر انسان کا بس نہیں ہوتا، شاید سلطانہ بھی ایسے ہی احساسات کی زد میں تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھا رہا اور اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اس حوالے سے اس پر اپنی احسان مندی ظاہر کی کہ وہ کل رات میرے لئے بہت نیک شگون ثابت ہوئی ہے...... اور حقیقت بھی یہی تھی کہ کل رات کھنڈر کے سامنے ہونے والی خونی لڑائی میں سلطانہ کا انوکھا کردار پوری طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ اگر اپنے بھتیجے طلال کے ہمراہ دیوانہ وار ٹیلے پر نہ پہنچتی اور جی تھری چلانے والوں پر ٹوٹ نہ پڑتی تو شاید...... صورتِ حال کیا سے کیا ہو جاتی...... اور شاید میں بھی اس وقت یہاں اس آرام دہ کمرے میں زندہ سلامت موجود نہ ہوتا۔

وہ سب کچھ سنتی رہی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ بس اس کے کان سن رہے ہیں۔ اس کا باقی سارا جسم میرے الفاظ کی نرمی، شیرینی اور محبت سے لاتعلق ہے۔ وہ بس میری فرماں برداری کر رہی تھی کہ میرے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں چھ سات ماہ کے بالو نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا بلند ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ ترس آنے لگا۔ جواں سال عورت صفیہ اسے شاید دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی...... وہ چند سیکنڈ کے لئے چپ ہوتا تھا پھر آہ و پکار شروع کر دیتا تھا۔

''یہ آواز سن کر تمہارا دل نہیں کانپتا سلطانہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے اِچ تو تمہاری منت کرتی ہوں کہ اسے مجھ سے کہیں دور لے جاؤ۔ جن بچوں کی مائیں ان کے جنم کے وخت اِچ مر جاتی ہیں، وہ بھی تو جندہ رہتے ہیں اور پل جاتے ہیں۔ یہ تو پھر چھ سات ماہ کا ہے۔''

''تم اتنی پتھر کیوں ہو گئی ہو سلطانہ! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔''

''میں کیا کروں مہروج! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے اپنے جسم سے گھن آتی ہے۔ میں اس قابل نا ہیں ہوں مہروج کہ اپنے بچے کو اپنی گود میں لے کر پیار کروں۔''

''تم ہو...... تم ہی اس قابل۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''اور تمہیں ایسا کرنا پڑے گا...... اگر نہیں کرو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم میری بیوی نہیں ہو اور نہ میں تمہارا شوہر

ہوں۔''

میرے لب و لہجے نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے عقب میں سرخ انگارہ تھیں۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں جا کر بالو کو لے آیا۔ اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا لیکن ننھا سا سینہ مسلسل ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔

میں نے اسے زبردستی سلطانہ کی گود میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لئے تو لگا کہ وہ اُٹھ کر بھاگ جائے گی لیکن پھر اس نے پتا نہیں کس طرح ضبط کیا۔ میری نافرمانی کے خوف سے اس نے اسے بانہوں میں لے لیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ اس کے اناروں جیسے رخسار زرد ہو چکے تھے۔ ہونٹ سفید تھے اور جسم کی لرزش کچھ اس طرح تھی جیسے اسے تپ لرزہ ہو گیا ہو۔

بالو اس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنی گول گول پیاری آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا گیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ جیسے کہہ رہا ہو...... 'مجھ سے دور کیوں ہو گئی ہو؟ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔'

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بالو کو دودھ پلائے لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کر سکے گی یا نہیں۔ میں اس پر ایک دم زیادہ دباؤ بھی ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اور بچے کو ایک ساتھ چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو بالو ایک بار پھر زور و شور سے رو رہا تھا۔ اس وقت اس کے رونے میں ایک طرح کا درد بھی لہریں لے رہا تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر اُٹھ کر سلطانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ بالو اور سلطانہ دونوں بستر پر موجود نہیں تھے۔ جواں سال ملازمہ صفیہ کمرے کے وسط میں پریشان کھڑی تھی۔

بالو کے رونے کی آواز غسل خانے سے آ رہی تھی۔ میں غسل خانے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سلطانہ بالو کو نیم گرم پانی سے نہلا رہی تھی۔ وہ بالکل عریاں تھا اور اس کا سارا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سلطانہ ایک پتھر سے جسے جھانواں بھی کہا جاتا ہے، بالو کے نازک جسم کو رگڑ رہی تھی۔ وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں گرجا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے بالو کو اس کے صابن لگے ہاتھوں سے چھین لیا۔ وہ

بیٹھ گئی اور دیوار سے سر ٹکا کر پھر رونے لگی۔

اس نے بالو کو اتنے زور سے رگڑا تھا کہ کئی جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ ''تم اپنے ہوش میں تو ہو...... یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

''مہروج! تم نے بہت غلط کیا۔ اس کو میری گود میں ڈال دیا...... تم کیوں اسے بھی میری طرح گلیچ کر دینا چاہتے ہو؟''

میں نے سلطانہ کو چند جھڑکیاں دیں اور بالو کو تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا۔ سلطانہ نے غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ملازمہ صفیہ نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس نے نہیں کھولا۔ پہلے تو مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھے مگر پھر پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی نہا رہی ہے۔

ملازمہ صفیہ نے بچے کو اپنا دودھ پلایا اور میں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ میری نگاہ بار بار اس کے معصوم چہرے پر ٹک جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا یہ واقعی میرا بچہ ہے...... میرا خون؟

سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے کوئی خاص لگاوٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ جس طرح معصوم بچے نگاہوں کو پیارے لگتے ہیں، یہ بھی مجھے پیارا لگتا تھا۔ بس...... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

سلطانہ کا غسل طویل ہوتا جا رہا تھا۔ شاید وہ خود بھی کھرچ کھرچ کر نہا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ صفیہ کے آوازیں دینے پر ہی باہر نکلی۔ اس نے اپنا منہ سر اوڑھنی میں لپیٹ رکھا تھا۔ گیلے بال کمر پر جھول رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھے بغیر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ جب وہ کمبل اوڑھ رہی تھی، میں نے اس کے دونوں ہاتھ دیکھے۔ اس نے اپنے بدن کے ساتھ بھی بالو والی سختی روا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بازو جھانوے کی رگڑوں سے سرخ ہو رہے تھے۔ یقیناً یہی صورتِ حال اس کے پورے جسم کی رہی ہو گی۔ میرے ذہن میں پھر چنگاریاں سی بھر گئیں۔ جارج گورا کی منحوس صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ پتا نہیں اس رات اس خبیث نے سلطانہ کے جسم اور روح پر کتنے زخم لگائے تھے۔ یقیناً یہ اس رات کی تلخ یادیں ہی تھیں جنہوں نے اسے نیم دیوانہ کیا ہوا تھا۔

وہ لیٹ گئی تو میں نے بالو کو پھر اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ بس کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے دونوں ماں بیٹے پر کمبل اچھی طرح ڈال دیا۔ سلطانہ کے پاؤں کی پٹی بھیگ کر اُتر چکی تھی۔ میں نے سلطانہ کے منع کرنے کے باوجود تازہ

پٹی باندھی اور کہنی کی پٹی بھی بدل دی۔

اب صبح ہونے والی تھی۔ میں بستر پر چت لیٹا رہا اور سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے رویے میں تھوڑی سی نرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اگلے دو چار دن میں وہ خود کو مزید سنبھال لے۔ تاہم ڈاکٹر چوہان نے کہا تھا کہ سلطانہ کو مکمل طور پر نارمل کرنے کے لئے مجھے بہت تعاون کرنا ہو گا۔

ہماری میزبانی میں یہاں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی جا رہی تھی۔ بہترین رہائش اور کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ شام کو میری ملاقات اپنے سابقہ میزبان چاچا عبدالغنی سے بھی ہوئی۔ ان سے اسٹیٹ کے ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملیں۔ کئی جگہ نل پانی اور زرگاں کے سپاہیوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں اور اب کسی بڑی لڑائی کی توقع کی جا رہی تھی۔ عبدالغنی نے یہ بھی بتایا کہ زرگاں میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے لوگوں کو موقع ملتا ہے، وہ زرگاں کو اور حکم جی کو چھوڑ کر نل پانی کی طرف آ جاتے ہیں۔

عبدالغنی صاحب سلطانہ کے بارے میں بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ ایک خوددار اور غیور خاندان سے ہے۔ جارج گورا اس کی انا اور پندار کا دشمن تھا۔ آخرکار وہ اس کو رسوا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس وانعے (واقعے) نے سلطانہ کے دل پر ایک بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ مجھے نا ہیں لگتا کہ یہ گھاؤ کبھی بھر سکیں گے۔''

میں سلطانہ کے والد اور بھائی سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ان دونوں سے تو فوری طور پر ملاقات نہیں ہو سکی تاہم رات کے کھانے کے فوراً بعد حجام عبدالرحیم ملنے کے لئے آ گیا۔ ماریا کے بدلے کُل سات افراد کو جارج کی جیل سے رہائی ملی تھی۔ ان سات میں سے صرف دو افراد جان بچا کر نل پانی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے اور عبدالرحیم ان دو خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔

چوہان نے عبدالرحیم کو وہ سب بتا دیا تھا جو میری یادداشت کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں، میں پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں فراموش کر چکا تھا۔ عبدالرحیم کو اس کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا تھا...... کیا میں یہ بات بھی بھولا ہوا ہوں؟ کیا مجھے یہ واقعہ بھی یاد نہیں ہے؟ وہ مجھے میرے پرانے نام ''مہروز'' سے ہی مخاطب کرتا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ ''مہروز بھائی! وہ دن مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سلطانہ بی بی بہت خوش نظر آوت تھی۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہت تھی۔ اسے ڈر رہت تھا کہ تم کہیں گم نہ ہو جاؤ...... یا پھر جارج گورا صاحب کے کارندوں

میں سے کوئی تم کو نقصان نہ پہنچا دے۔ تم بولتے بھی تو بہت کم تھے۔ ہر وقت بس کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر بات، سنی اَن سنی کر دیتے ہو۔ ایک دن سلطانہ بڑی گھبرائی ہوئی میری دکان میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ رحیم بھائی! آپ نے مہروز کو تو نا ہیں دیکھا؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ اور بھی گھبرا گئی۔ بالکل جیسے تم کوئی چھوٹے سے بچے ہو اور اس سے اپنی انگلی چھڑا کر بھاگ گئے ہو۔ وہ اس روز دیوانوں کی طرح تم کو ڈھونڈتی رہی۔ میں، طلال، ہاشم اور مختار صاحب بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ آخر تم دوپہر کے وقت ایک باغ سے ملے۔ تمہاری جھولی میں گیندے اور موتیے کے بہت سارے پھول تھے۔ تم نے یہ پھول سلطانہ کو دے دیئے اور محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سلطانہ تمہیں دیکھ کر رونے لگت تھی۔ بعد میں پتا ہے اس نے کیا کیا تھا؟''

''کیا کیا تھا؟''

''اس نے ان سارے پھولوں کو دھاگے میں پرو دیا تھا۔ اس کے گجرے، بُندے اور ہار وغیرہ بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے یہ زیور پہنا تھا۔ اس نے کبھی کوئی زیور نا ہیں پہنا۔ وہ پہلا زیور تھا جو اس نے تمہاری وجہ سے پہنا...... اور بعد میں بھی وہ کبھی کبھی گیندے اور موتیے کا زیور پہنتی رہی۔''

مجھے یاد آیا کہ جب میں سلطانہ سے پہلی بار نیم تاریک کھوہ میں ملا تھا، تب بھی مجھے اس کے بالوں کے جُوڑے میں موتیے اور گیندے کے پھول نظر آئے تھے۔

عبدالرحیم جذباتی انداز میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں پوجنے کی حد تک پیار کرنے لگت تھی۔ اس کو تمہارے علاوہ جیسے کوئی کام ہی نا ہیں تھا۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا، تمہیں وقت پر دوا دینا بلکہ تمہیں نہلانا دھلانا تک اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جو کچھ تمہیں پسند ہووت تھا وہ خود بھی آنکھیں بند کر کے اسے پسند کرنے لگت تھی۔ لوگن کہوت ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد عورت کا پریم دو خانوں میں بٹ جاوت ہے لیکن ہم سب جانت ہیں کہ کم از کم سلطانہ بی بی کے معاملے میں تو ایسا نا ہیں ہوا۔ ایسا لگت تھا اور اب بھی لگت ہے کہ اس کا جینا مرنا صرف اور صرف تمہارے لئے ہے......''

عبدالرحیم باتیں کر رہا تھا مگر میں ابھی تک گیندے اور موتیے کے پھولوں میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے کچھ بہت پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ لاہور یاد آ رہا تھا، باغِ جناح یاد آ رہا تھا اور ثروت یاد آ رہی تھی۔ گیندے اور موتیے کے پھول تو ثروت کو بھی پسند تھے۔ وہ ان کی مشترکہ خوشبو سے مدہوش ہو جایا کرتی تھی۔ یہ دونوں پھول اس پر علیحدہ علیحدہ تو کچھ خاص اثر نہیں

کرتے تھے لیکن ان کی ''اشتراکی'' باس اس کے دل کی گہرائی میں اُتر جاتی تھی۔ میں اس کے لئے جب بھی پھول لیتا تھا، وہ یہی دونوں ہوتے تھے...... تو کیا میں دو ڈھائی سال کے عالم بے خبری میں بھی کچھ ایسے کام کرتا رہا ہوں جن کا تعلق ثروت اور اس کی محبت سے تھا؟

رات بھیگ رہی تھی۔ عبدالرحیم واپس اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ نل پانی کی گلیوں میں گاہے بگاہے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آتی تھیں اور کچھ ایسے نعرے گونجتے تھے جن پر جنگی للکاروں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کی موجودہ کشیدہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ میں جیکی سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ بے شک یہاں پہنچتے ہی اسے وافر مقدار میں شراب مل گئی تھی اور اس حوالے سے وہ میرا محتاج نہیں رہا تھا...... پھر بھی ہم دونوں کے درمیان ایک تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے سلطانہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ حسبِ معمول سر لپیٹے لیٹی ہوئی تھی، تاہم یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ بالو اس کے پہلو میں تھا۔ میں بارونداجیکی کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا محلِ وقوع مجھے ڈاکٹر چوہان نے بتا دیا تھا۔ وہ دیوان خانے کے اندر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ایک باغیچے کی روش پر سے گزرا۔ یہاں چاندنی رات میں فواروں کا پانی چمک رہا تھا اور مصنوعی جھرنوں کی قلقل تھی۔ پھولوں کے تختوں کے آس پاس پتھریلی کرسیوں پر خوش لباس مرد و زن بیٹھے تھے۔ تاہم ہر چہرے پر سنجیدگی نظر آتی تھی۔ ایک دم میں چونکا۔ مجھے موتیے کی مسحور کن مہک محسوس ہوئی۔ میں نے ایک کیاری میں سے کچھ پھول توڑ لئے۔ ایک باوردی ملازم نے ادب سے پوچھا۔ ''میں جناب کی کچھ خدمت کر سکت ہوں؟''

''یہاں کہیں گیندے کے پھول بھی ہوں گے؟''

''یہاں تو نا ہیں سرکار! ساتھ والی بڑی باغیچی میں ہوں گے۔ میں ابھی لا دیتا ہوں۔''

اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ دو منٹ بعد وہ ایک گول طشت میں تازہ پھول لے آیا۔ میں نے اس طشت میں موتیے کے پھول بھی رکھے اور واپس جا کر خاموشی سے انہیں سلطانہ کے سرہانے رکھ دیا۔ وہ بے حرکت لیٹی رہی۔ تاہم چند سیکنڈ بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ایک لحظے کے لئے اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی لیکن پھر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ گڑبڑا گئی اور اخلاقی انداز میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

''نہیں......نہیں......تم لیٹی رہو۔ میں ویسے ہی آ گیا تھا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے چلنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو رہی تھی۔ ران کے زخم میں غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے درد ہو رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں باروندا جیکی کے رُوبرو اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جیکی بدستور اپنے تہ در تہ لنگوٹ میں تھا۔ حالانکہ میزبانوں نے اس کے پاس ہی ایک صاف ستھرا لباس بھی رکھ دیا تھا۔ رات کا جو شاندار کھانا اسے پہنچایا گیا تھا، وہ بھی تقریباً جوں کا توں ایک طرف رکھا تھا۔ اس میں سے غالباً دو چار کباب لئے گئے تھے۔ جیکی شراب کی بوتلوں کے درمیان یوں بیٹھا تھا جیسے راجا اندر حسین و جمیل عورتوں کے درمیان بیٹھتا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر ایک دم اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ''تو آخر تم آ گئے؟'' وہ شستہ انگریزی میں گویا ہوا۔

''مجھے تو کل ہی آ جانا چاہئے تھا مگر پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا گیا ہے۔''

''یہ لوگ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں چڑیا گھر میں بند کوئی جانور ہوں...... چھوٹے سرکار کے افسروں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ پلپلا کر دیا ہے......تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم نے کتنے دن جارج کی بہن کو سکھشا دی تھی؟ تمہیں کیسے غائب کیا گیا؟ تم کیسے رہا ہوئے وغیرہ وغیرہ۔'' بات کرتے کرتے وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کوئی دوا وغیرہ بھی دی گئی ہے آپ کو یا نہیں؟''

وہ بولا۔ ''دوا کیا یہاں تو معالجوں کی پوری ٹیم آئی تھی۔ وہ میرا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے پھر سے بھلا چنگا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید انہیں پتا نہیں کہ مرض الموت کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوا مجھے تھوڑا بہت افاقہ دے سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔'' اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ''یہ دوا نہیں زہر ہے اور اسی نے آپ جناب کو اس حال تک پہنچایا ہے......اور دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ آپ ہر وقت مرنے کی بات کیوں کرتے ہو؟ آپ زندگی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے اپنے اندر جینے کی خواہش پیدا کر لو گے تو پھر حالات بھی بدلنا شروع ہو جائیں گے۔ حالات بدل سکتے ہیں۔''

اس نے ایک بار پھر سنی اَن سنی کر دی جیسے میری بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔ اس نے آتشیں سیال کا ایک طویل گھونٹ لیا اور اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

تب میری نظر پہلی بار ایک نیڈ بیگ پر پڑی۔ یہ نیڈ بیگ اس آرام دہ کمرے کے ایک گوشے میں جھول رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں حیران رہ گیا۔

''نیڈ بیگ کو تم نیڈ بیگ ہی کہو گے۔'' پیراشوٹ یا ہیلی کاپٹر تو نہیں کہو گے۔''

''لیکن یہ یہاں کیسے آیا؟''

''میں نے منگوایا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم آج نہیں تو کل ضرور آؤ گے اور ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔''

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا معما تھا۔

یوں لگتا تھا کہ جس طرح میرے اندر یہ طلب پیدا ہو چکی ہے کہ میں جیکی سے زیادہ سے زیادہ سیکھوں، اس میں بھی یہ خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تھوڑے سے وقت میں مجھے بہت کچھ سکھا دے۔

میں نے کہا۔ ''کیا آپ میرا انتظار کر رہے تھے؟''

''بالکل......ادھورے کام سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں نے اور تم نے شروع کیا ہے، وہ پورا ہو۔''

''میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کا شاگرد کہلاؤں۔ کیا آپ ایسا سمجھتے ہو؟''

''سچی بات یہ ہے کہ میں بھی ایسا نہیں سمجھتا......لیکن تمہارے اندر ایک تڑپ ضرور ہے اور اسی تڑپ نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ تمہاری یہ تڑپ آنے والے دنوں میں تمہارے بہت کام آ سکتی ہے۔ اس کو اپنے اندر مرنے نہ دینا۔''

''آپ کس تڑپ کی بات کر رہے ہو؟ میری سب سے بڑی تڑپ تو یہی ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن اس تڑپ کے پیچھے بھی تو کوئی وجہ ہے۔ وہی لڑکی جو تمہارے قریب آتے آتے تم سے بہت دور چلی گئی ہے۔ جس کو تم کھو چکے ہو لیکن بھولے نہیں ہو۔ شاید کبھی بھول بھی نہیں سکو گے۔''

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ ثروت اپنی تمام تر محبوبیت کے ساتھ میرے تصور میں آ گئی۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... یہ تو ہے لیکن......ڈھائی برس بیت چکے ہیں کہ اس کا کچھ پتا نہیں۔ اپنے آخری خط میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں جرمنی میں ایک یوسف نامی لڑکے سے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے......اب تک تو

شاید......اب تک تو شاید......''

میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک گولا سا میرے گلے میں اٹک گیا۔ ثروت کے لئے اس طرح کی بات سوچنا بھی میرے لئے مشکل ہے۔

''میں تمہارے احساس کو سمجھتا ہوں۔ ان مرحلوں سے میں بھی گزرا ہوں۔ میری اور تمہاری کہانی میں فرق یہ ہے کہ...... تمہاری کہانی میں، کنول جھیل میں گزرے ہوئے وہ سات دن نہیں ہیں۔ ہاں......وہ سات دن جن پر سات زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔''

''لیکن میں نے......''

''اچھا، یہ باتیں چھوڑو۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''اس وقت میں بہت سرور میں ہوں پھر یہ سرور غنودگی میں بدلنے لگے گا۔''

وہ میرا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لے کر نیڈ بیگ کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ریت سے بھرا ہوا تھیلا ہمارے درمیان تھا۔ بلب کی روشنی میں شفاف دیوار پر اس سارے منظر کا سایہ بن رہا تھا۔ اس ''دیوان'' نامی پوری عمارت میں جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی۔

''درد کیا ہے؟'' جیکی نے مسرور آواز میں کہا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے...... یہاں۔'' اس نے انگلی سے اپنے سر کو ٹونکا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے الفاظ کو دہراؤ۔ پوری توجہ اور پورے یقین کے ساتھ۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ''درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔''

وہ آنکھیں بند کئے بولا۔ ''درد کے ساتھ اندیشے اور واہمے شامل کر لئے جائیں تو درد بڑھ جاتا ہے...... خالص درد کی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی اور اگر خالص درد کی گہرائی میں ڈوب کر اس کی اصلیت محسوس کی جائے تو یہ اور بھی کم ہونے لگتا ہے۔''

''جی۔'' میں نے کہا۔

''صرف ''جی'' نہیں۔ ان الفاظ کو دہراؤ۔ میری طرح۔ آنکھیں بند کرلو۔'' اس نے حکم دیا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے الفاظ دہرائے۔ وہ جب اس انداز میں سکھاتا تھا تو عجیب موڈ میں آجاتا تھا۔ وہ ایک ماسٹر فائٹر سے زیادہ ایک سائیکاٹسٹ دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس روز بارونداجیکی نے مجھے نیڈ بیگ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت مشق کرائی۔ اتنی مشق جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی کھال چھل گئی۔ خون رسنے لگا اور قطرے سنگِ مرمر کے فرش پر گرنے لگے۔ میں ذرا سُست پڑتا تو وہ مجھے جھڑکتا اور بیساکھی سے میرے سر یا پیٹھ پر ضرب لگاتا۔ وہ جنونی موڈ میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا جنون برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ جنون جیسے میرے جنون سے ہم آہنگ ہوگیا تھا۔ یہ ایک تند و تیز لہر کی طرح مجھے اپنے ساتھ بہائے لئے چلا جارہا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تکلیف میرے لئے مزہ بنتی جارہی تھی...... نشہ بنتی جارہی تھی۔ میں جیکی کی ہدایات پر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ بالکل بے جان ہوکر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اگلی صبح سلطانہ کے بھائی اور والد سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ صبح سویرے سلطانہ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میں جاگا تو وہ جانے کے لئے تیار تھے لیکن جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ہماری ملاقات میرے کمرے میں ہوئی۔ سلطانہ کے والد مختار راجپوت کی عمر پچپن ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ کسی وقت وہ خاصے صحت مند رہے ہوں گے لیکن اب جیسے زندگی کے بوجھ نے انہیں نڈھال سا کر رکھا تھا۔ سلطانہ کا بھائی کافی کمزور تھا۔ جواں سالی میں ہی اس کے ہاتھ میں بیساکھی آگئی تھی۔ کمر کی تکلیف کے سبب وہ بہ مشکل چلتا پھرتا تھا۔

سلطانہ کے والد نے میرے سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور اسی گرم جوشی سے ملے جس سے کسی قریبی عزیز کو ملا جاتا ہے...... جبکہ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

مختار صاحب نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''مہروج! مجھے پورا یخین (یقین) ہے۔ اگر کوئی سلطانہ کو پھر سے سلطانہ بنا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ وہ تمہاری بڑی سے بڑی بات مان سکتی ہے...... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مان بھی رہی ہے۔ اب وہ پہلے سے کچھ اچھی نجر آرہی ہے۔ خدا کے بعد اب تم اِج ہمارا سہارا ہو مہروج!''

''میں اپنی کوشش کررہا ہوں۔''

''لیکن...... لیکن تم الگ کمرے میں کیوں سو رہے ہو؟ تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اسے تمہاری جرورت ہے مہروج...... بہت جیادہ جرورت ہے۔''

میں اب اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں اس کا شوہر ہونے کے باوجود شوہر نہیں ہوں۔ میں نے اسے اپنے ہوش وحواس میں قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنی مرضی

سے اس کے ساتھ کوئی ازدواجی تعلق رکھا ہے۔ وہ جو کچھ تھا، ایک عالم بے خبری کا دروانیہ تھا۔
دونوں باپ بیٹا بہت دکھی تھے۔ میں اس موقع پر کوئی ایسی ویسی بات کر کے انہیں مزید دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکے نبیل نے میرے ہاتھوں کی چھلی ہوئی کھال دیکھی اور بے تکلفی سے بولا۔ ''مہروج بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں، گر گیا تھا۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''آپ...... آپ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں مہروج بائی! چاچا غنی بتا رہے تھے کہ آپ پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں بھول چکے ہیں۔ یخین ناہیں آتا۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

مجھے ایسی باتوں سے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔ میرے چہرے پر اُلجھن دیکھ کر ہی شاید مختار صاحب نے جلدی سے مداخلت کی اور بولے۔ ''کوئی بات ناہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائیں گا۔ بس تم سے ایک ہی درخواست کرنی ہے...... بلکہ ہاتھ جوڑ کر کرنی ہے۔''
انہوں نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''تم سلطانہ کا خیال رکھنا۔ اسے تمہاری بہت سخت جرورت ہے۔''

ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ سلطانہ کو میری ضرورت ہے اور میں خود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے سنبھالنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہوں...... لیکن میں کیا کرتا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا میں ایک شوہر کی طرح اس کے قریب جا سکتا تھا؟ اسے پیار دے سکتا تھا؟

جب میں اس طرح سوچتا تھا تو ایک دم ثروت ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہتی تھی۔ 'بس تابی! اتنی ہی طاقت تھی میرے پیار میں؟ یہی تھا ہمارا اٹوٹ بندھن؟ یہی تھا تمہارا ختم نہ ہونے والا انتظار؟'

میں ایک دوراہے پر تھا۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ میں جسمانی طور پر سلطانہ کے قریب جائے بغیر بھی تو اسے سہارا دے سکتا تھا۔ جسمانی قربت تو میاں بیوی کی محبت کا آخری درجہ ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو کئی مدارج ہوتے ہیں۔ محبت سے بات چیت کرنا، اکٹھے کھانا پینا، دکھ سکھ بانٹنا۔

اس شام میں پھر سلطانہ کے لئے باغیچے سے گیندے اور موتیے کے تازہ پھول لے کر آیا...... میں نے ایک باوردی باغبان سے کہا اور اس نے وہیں پر مجھے ایک گجرا بنا دیا۔ میں سلطانہ کے پاس واپس آ رہا تھا جب میری ملاقات اسحاق اور عبدالرحیم سے ہو گئی۔ اسحاق ہمیشہ کی طرح بہت سنجیدہ بلکہ مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے اشتعال کی وجہ ماریا فرگوسن ہی تھی۔ اس نے غم زدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ ''وہ حرام زادی بچ گئی ہے۔ تمہاری چلائی ہوئی گولی سے

س کی پنڈلی پر معمولی زخم آیا تھا۔ ابھی زرگاں سے آنے والے ایک بندے نے بتایا ہے کہ ہارج گورا نے ماریا کے باڈی گارڈ کو گولی سے اُڑا دیا ہے۔ یہ باڈی گارڈ اس گھر میں موجود غا جہاں سے ہم نے ماریا کو اُٹھایا تھا۔''

''زرگاں کی عام صورت حال کیا ہے؟'' میں نے اسحاق سے پوچھا۔

''حکم اور جارج گورا غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہووے گا کہ حکم نے یس بے گناہ لوگن کو سرِ عام سولی پر چڑھایا ہے۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے جارج کی وہ خبیث ہن خود بھی موقع پر موجود تھی۔ جارج نے سب لوگن کے سامنے اپنی بہن سے وعدہ کیا ہے کہ س کی ایک انگلی کے بدلے جب تک وہ انگلی کاٹنے والوں کے سر ناہیں کاٹے گا، چین سے اہیں بیٹھے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا کوئی بڑی لڑائی ہو گی؟''

''ضرور ہو گی۔'' اسحاق نے یقین سے کہا۔ ''دونوں بھائی اب کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ زرگاں میں عام لوگن کو بھی اسلحہ دے کر لڑنے کے لئے تیار کیا جا .ہا ہے۔ چھوٹے سرکار نے آج دوپہر کو اعلان کیا ہے کہ اگر ہم پر حملہ ہوا تو پوری طاقت سے نواب دیویں گے۔ مراد شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جن لوگن کو ہم نے پناہ دی ہے، ان کی غافظت جان پر کھیل کر بھی کی جاوے گی۔''

گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک بڑا دستہ دیوان خانے کے سامنے سے گزرا۔ ان کے علم یرونی دیوار کے اوپر سے دکھائی دیئے۔

میں نے اسحاق سے کہا کہ وہ ذرا جا کر بارونداجیکی کی خبر لے لے۔ میں ابھی کچھ دیر بں اس کے پاس آؤں گا۔

عبدالرحیم نے کہا۔ ''وہ سہ پہر کے وقت بہت شور مچاوت تھا۔ اسے پھر اپنی کشتی میں اپس جانے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ بلند آواز میں چلا رہا تھا...... پھر چلاتے چلاتے ہی سو گیا۔''

''میں نے تو ایک اور بات سنی ہے۔'' اسحاق نے قدرے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا؟''

''زرگاں سے بھاگ کر یہاں آنے والے لوگن میں راج بھون کی کچھ کنیزیں بھی نامل ہیں اور ان میں اشوک ساہنی کی بیٹی بھی ہے۔''

''کون اشوک ساہنی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی شکنتلا کا پتا...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں پہنچنے والی عورتوں میں شکنتلا بھی

ہے۔"

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ شکنتلا کے بارے میں، میں نے جیکی سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اسے دیکھے بغیر بھی میں اسے جاننے پہچاننے لگا تھا۔

"کیا...... تم یقین سے...... کہہ سکتے ہو کہ ان میں شکنتلا بھی ہے؟"

"پورے یقین سے تو ناہیں...... لیکن سنا یہی ہے۔"

میں نے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ "ایک کام کرو اسحاق...... پتا کرو کہ واقعی ایسا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ یہاں آگئی ہے؟"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہ ہو لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔"

اسحاق نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا۔

جیکی کی ساری کہانی اور اس کی ساری ذہنی کیفیت مجھے معلوم تھی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اب شکنتلا سے اس کی ملاقات دوبارہ ہوگی...... لیکن اگر وہ واقعی یہاں آگئی تھی تو پھر ایسا ہو بھی سکتا تھا...... اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ بارونداجیکی کے لئے انتہائی سنسنی خیز واقعہ ہوتا۔ شکنتلا اور جیکی کے بارے میں سوچتا ہوا ہی میں واپس اپنی آرام دہ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

سلطانہ پھر غسل خانے میں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ روزانہ نہا رہی تھی اور اس کا غسل طویل تر ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے باہر آنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور بازو پتھر کی رگڑ سے سرخ نظر آرہے تھے۔

بالو رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے گود میں تو نہیں اُٹھایا تاہم اتنی مہربانی کی کہ اسے دیکھنے لگی۔

"دودھ پلایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے مزید تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس نے دودھ نہیں پلایا تھا۔ وہ ابھی صفیہ کا دودھ ہی پی رہا تھا۔ میں ابھی اس صورتِ حال کو نظرانداز کرنا چاہتا تھا۔

"ہاتھ آگے کرو سلطانہ۔" میں نے کہا۔

وہ ہاتھ کو بس تھوڑی سی حرکت دے کر رہ گئی۔

میں نے اس کا بھیگا ہوا سرخ ہاتھ پکڑا اور گجرا اس کی کلائی میں باندھ دیا۔ اس کا جسم پھر

لرزنا شروع ہو گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی تھی یہ۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر لادا گیا ہو...... اور اس بوجھ کے ساتھ اسے اونچے نیچے راستے پر چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اس کی "سوچ کی کمر" کانپ رہی ہو، بل کھا رہی ہو۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے سے اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو گرے مگر ان آنسوؤں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کمزور نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھوری چٹان کی سی سختی اور خاموشی تھی۔ اس سختی اور خاموشی کے پیچھے کیا پوشیدہ تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔ بالو بھی اُٹھ گیا اور اس کی گود میں بیٹھ کر ہمکنے لگا۔ سلطانہ کا چہرہ زرد ہونے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اسے دھکیل کر پیچھے نہ ہٹا دے۔ میں نے بالو کو اپنی گود میں لے لیا۔

سامنے ایک منقش پلیٹ میں پھل رکھے تھے۔ چھری بھی پڑی تھی۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ "ایک سیب کاٹو۔"

وہ شدید تذبذب میں نظر آئی لیکن جب میں نے دوبارہ کہا تو وہ لرزاں ہاتھوں سے سیب چھیلنے لگی۔ ایک دم تیز دھار چھری اس کی انگلی میں لگ گئی۔ خون بہنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی کو اپنے انگوٹھے سے دبا دیا۔ خون کا اخراج ذرا کم ہوا تو میں نے پٹی باندھ دی۔

"مہروج! مجھ کو معاف کرنا۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

رات کو میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھر بارونداجیکی کے پاس رہا۔ ہم نے مارشل آرٹ پر بہت سی باتیں کیں اور عملی مشق بھی کی۔ میرے کل کے زخموں کی وجہ سے جیکی نے آج مجھ پر زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ اگر ایک دن بہت سخت مشق ہو جاتی تھی تو اگلے روز ہاتھ تھوڑا سا ہلکا رکھتا تھا۔ آج وہ اپنی کشتی کے بارے میں واقعی بہت دکھی نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا بات ہے، آج کشتی بہت یاد آرہی ہے؟"

"ہاں، جب کسی چیز کے دوبارہ ملنے کی امید کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس کی یاد زیادہ کٹھور ہونے لگتی ہے۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو جیکی؟"

"زرگاں اور نل پانی میں ٹھن گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں پھر زرگاں کی طرف جا

سکوں گا اور کشتی تک پہنچ سکوں گا۔‘‘

’’کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اس کشتی سے بڑھ کر آپ کو کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں، کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’کشتی والی بھی نہیں؟‘‘ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس کے ہڈیوں بھرے چہرے پر کرب اور اداسی کے گہرے سائے پھیل گئے۔ وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ ’’اس کی بات کیوں کرتے ہو؟ اس کی چاہت تو ہر پیمانے اور موازنے سے جدا چیز ہے۔ وہ تو ایک ایسی ہستی ہے جس نے مجھے تھوڑے سے وقت میں ہزار ہا برس کی پُر بہار زندگی کی راحتیں دیں اور جواب مجھے مرنے کا حوصلہ بھی بخش رہی ہے۔ اس کی بات مت کرو۔‘‘

’’آپ اسے ایک بار دوبارہ دیکھنے کی چاہت تو رکھتے ہوں گے؟‘‘

’’آج تم بے معنی سوال کر رہے ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہوا سے پوچھے کہ کیا تم چلنے کی چاہت رکھتی ہو۔ پانی سے پوچھے تم بہنے کی چاہت رکھتے ہو اور سرما کی طویل رات، گھونسلے میں گزارنے والے پرندے سے پوچھے...... کیا تمہیں صبح کا انتظار ہے؟‘‘

’’ہاں، کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ واقعی شاعری کر سکتے ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی یادوں کو کچھ یادگار نغموں میں ڈھال دو۔‘‘

’’یہ ایک اور بے معنی بات۔‘‘ وہ زچ ہو کر بولا۔ ’’میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تو کشتی پر واپس پہنچنے کی آس بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب تو میں کسی بھی وقت...... کہیں سے بھی عالم بالا کی طرف رخصت ہو سکتا ہوں...... یوں کر کے۔‘‘ اس نے اپنے ہاتھ سے ہوائی جہاز کی طرح اڑنے کا اشارہ دیا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مارشل آرٹ کے آسمان کا تابندہ ستارہ تھا...... اب آہستہ آہستہ مجھے اس کے بارے میں اور بھی کئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ تین چار سال پہلے اس نے ہانگ کانگ میں بنی ہوئی کسی فلم میں کام بھی کیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ عنقریب ہالی وڈ کی کسی بڑی فلم میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ غالباً کسی انگلش آرٹیکل میں، میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ فائٹ کے وقت جیکی کا جسم ہی نہیں، اس کی اسپرٹ بھی مقابلے میں حصہ لیتی ہے۔ وہ اپنے مدِمقابل کو مسمرائز کر دیتا ہے۔ اس کے ایک معروف برطانوی حریف نے اعتراف کیا تھا کہ وہ جب بھی جیکی سے مقابلہ کرتا ہے، اسے اپنی توانائی میں غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ایک جاپانی

فائٹر نے لکھا تھا...... حریف کو چوٹ لگا کر بھی اگر آپ اسے درد میں مبتلا نہیں کر پاتے تو آپ کا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے اور جیکی کے ساتھ لڑتے ہوئے یہی حوصلہ شکنی اعصاب کو جکڑ لیتی ہے۔ وہ چوٹ کو حیران کن صلاحیت سے جھیل لیتا ہے اور اگر اس نے اپنی یہ صلاحیت مزید پروان چڑھا لی تو بہت جلد...... کوئی اس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا......

یہ...... اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں کہی جا رہی تھیں لیکن پھر اچانک یہ ابھرتا ہوا ستارہ مارشل آرٹ کے اُفق سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس تیز رفتار دور میں کسی کو تا دیر کہاں یاد رکھا جاتا ہے۔ یقیناً جیکی کے بارے میں بھی چند ماہ تک مختلف خبریں گردش کرتی رہیں ہوں گی۔ ایسی دو چار اُڑتی اُڑتی خبریں ہم نے بھی سنی تھیں۔ کسی نے کہا کہ جیکی کو اس کے مخالفوں نے ہنگری کے کسی نائٹ کلب میں قتل کر ڈالا ہے۔ ایک دفعہ یہ سنا کہ وہ شو بز اور فائٹنگ آرٹ سے بالکل کنارہ کش ہو کر بدھ مت کا پیروکار بن گیا ہے اور کسی اسٹوپا میں رہتا ہے...... وغیرہ...... وغیرہ......

آج ماضی کا وہ معروف کردار یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دیوان خانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے ساتھ طوفانی عشق کی ایک حیران کن داستان نتھی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں وقت کی مہیب لہریں اس سے یوں ٹکراتی ہوئی گزری تھیں کہ وہ جسمانی اور روحانی طور پر تہ و بالا ہو کر ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔

’’کس سوچ میں کھو گئے ہو؟‘‘ جیکی نے مجھے چونکایا۔

’’آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’ماضی کے بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مستقبل کے بارے میں سوچو۔ میں اتنی بُری حالت میں بھی، تم پر محنت کر رہا ہوں۔ اس محنت کا چالیس پچاس فیصد تو تم میں ظاہر ہونا چاہئے۔ اگر نہیں ہو گا تو میری روح بے چین رہے گی۔‘‘

میں ابھی جیکی کو شکنتلا کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس بات کا انتظار کرنا تھا کہ اسحاق، شکنتلا کے بارے میں اصل صورتِ حال معلوم کر لے۔

اس رات جیکی پھر نشے کی حالت میں اپنا پسندیدہ نیپالی نغمہ گاتا رہا۔ اسے آج کافی تیز بخار بھی تھا۔ بخار کی مدہوشی، شراب کے نشے سے مل کر دو آتشہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لنگوٹ کی تہوں میں سے، کاغذ میں لپٹی ہوئی شکنتلا کی تصویریں نکال لیں۔ انہیں اَن گنت بوسے دیئے اور پھر انہیں دوبارہ لنگوٹ کی تہوں میں محفوظ کر کے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو ڈاکٹر چوہان آیا۔ اس نے بتایا کہ چھوٹے سرکار مجھ سے ملنا چاہتے

ہیں۔انہوں نے مجھے دیوان کے مہمان خانے میں طلب کیا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں اس محل نما عمارت کے وسیع احاطے سے گزرا۔ یہاں مجھے شان دار ہاتھی ''بادل'' بھی نظر آیا۔ یہی بادل نامی ہاتھی تھا جس نے ایک مسلمان مزدور کو زخمی کیا تھا اور جس کی پاداش میں ہاتھی کا مالک یعنی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی آج کل باقاعدہ عمر قید کاٹ رہا تھا۔ میں عمارت کے عالی شان مہمان خانے میں پہنچا۔ ایک بلند و بالا محرابی دروازے سے گزر کر اور مخملی قالینوں پر پاؤں دھرتا ہوا میں ایک خوب صورت ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں وکٹوریہ طرز کی ایک شان دار کرسی پر چھوٹے سرکار اجیت رائے موجود تھا۔ وہ حسبِ سابق بند گلے کے کوٹ اور سفید پتلون میں تھا۔ سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی اور گلے میں بیش قیمت مالائیں۔ اس کی بارعب شخصیت نے جیسے اس سارے کمرے کو چکا چوند سے بھر دیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چند اور کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کرسیوں پر انور خاں اور کپتان اجے بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونا کسی مہاراجا کے دربار میں داخل ہونے کی طرح سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف شیشے کی اٹالین تپائی پر چند جدید رائفلیں اور ان کے لوازمات رکھے تھے۔ شاید میرے یہاں آنے سے پہلے اس اسلحے پر ڈسکشن ہو رہی تھی۔

میں نے ادب سے سلام کیا۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں قدرے جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد چھوٹے سرکار نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔ ''ہمیں مراد شاہ اور ڈاکٹر چوہان سے تمہارے بارے میں کافی جان کاری مل چکی ہے۔ تمہاری روداد کافی انوکھی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ مختار راجپوت کی بیٹی نے زرگاں میں تمہاری جیون بچانے کے لئے وہ انگوٹھی استعمال کی تھی جو ہمارے سورگ باشی پتا نے اس کے پریوار کو بخشی تھی۔ یہ ایک بڑا بلیدان ہے۔ اس لڑکی نے دوسرا بلیدان کچھ ہی دن پہلے دیا ہے۔ اسے جارج کے ستم کا شکار ہونا پڑا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کے لئے ہم بھی ذمے دار ہیں۔ ہمارا دوش یہ ہے کہ ہم نے اس لڑکی کی فریاد کے باوجود اسے اور تمہیں زرگاں واپس بھیج دیا...... ہم اس کے لئے شرمندہ ہیں۔''

میں چونک کر چھوٹے سرکار کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی شرمساری نظر آ رہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ اس دور میں کوئی چھوٹا موٹا افسر یا زمیندار وغیرہ بھی اپنی انا کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے۔ چھوٹے سرکار ایک وسیع اسٹیٹ کا مختار کل تھا اور وہ مجھ جیسے ادنیٰ شخص کے سامنے شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ ایسا کہہ رہے

ہیں لیکن ہم آپ کو دوشی کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہئے تھا۔ اس وقت تو موہن کمار وغیرہ نے آپ کے سامنے ثابت کر دیا تھا کہ سلطانہ ہی ہارون کی قاتلہ ہے۔''

''پھر بھی ہم سمجھت ہیں کہ ہم سے جلد بازی ہوئی۔ اس کے لئے ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ تمہاری پتنی کو صحت دیوے اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں سپل ہو جاوے۔ ہم نے یہاں اجے کو ہدایت دے دی ہے کہ تمہارے سمیت مختار راجپوت کی فیملی کی سیکیورٹی کا پورا انتظام کیا جاوے۔ ہم نے مختار کے بیٹے کے علاج کے لئے بھی خاص ہدایات دی ہیں۔''

''بہت شکریہ، چھوٹے سرکار!'' میں نے کہا۔

اجیت رائے کچھ دیر تک بغور میری طرف دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت و چمک تھی۔ اس کے تیکھے خدوخال والے چہرے پر ناک کا اونچا بانسہ بے حد نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولا۔ ''مجھے انور خاں اور چوہان نے بتایا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں تم بہت زیادہ بدل گئے ہو۔ تم نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالا ہے اور رائفل اُٹھانا سیکھ لیا ہے۔'' میں جواب میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ سنسار کمزور کو دباتا چلا جادت ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے ساتھ زمین کر دیوت ہے۔ سر اُٹھا کر جینا ہی جینا ہے اور اس کے لئے بلیدان دینے پڑتے ہیں۔''

انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے سرکار! تابش کے لئے جارج گورا کی قید کایا پلٹ ثابت ہوئی ہے۔ یہ بڑی دلیری کے ساتھ جارج کے گھر سے نکلا ہے۔ کئی لوگوں کو اب بھی یقین نہیں کہ یہ کسی کی مدد کے بغیر جارج کا کڑا پہرا توڑ کر آیا تھا۔ بعد میں یہ ان تین لڑکوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے جارج کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ بھی بڑی جرأت والی کارروائی تھی۔ ان چار لڑکوں میں سے صرف دو زندہ بچے ہیں۔ بے شک یہ لڑکے ناکام ہوئے سرکار! مگر یہ جارج کی خود سر بہن کو سخت حفاظت کے باوجود اُٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔''

چھوٹے سرکار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''پتا چلا ہے کہ تم ایک ایسے نیپالی کو اپنے ساتھ لائے ہو جس کا ایک بازو اور پاؤں کٹا ہوا ہے اور یہ وہی ہے جو کچھ برس پہلے زرگاں میں جارج کی بہن کا ٹیچر بن کر آیا تھا؟''

''جی سرکار! یہ وہی ہے...... بارونداجیکی...... زرگاں میں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تین ماہ

اسٹیٹ میں رہ کر واپس چلا گیا تا لیکن وہ جارج گورا کی حبس بے جا میں تھا۔ پھر وہاں سے فرار ہوا اور گارڈز سے بچ کر چھوٹی ندی کے کنارے ایک جنگل میں چھپا رہا۔''

''وہاں اس نے بہت سا عرصہ ایک فش بوٹ میں گزارا ہے سرکار! تابش وغیرہ نے اس فش بوٹ میں ہی اسے دیکھا تھا۔'' انور خاں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹے سرکار نے زرنگار کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی شفاف ٹھوڑی کھجائی اور بولا۔ ''کیا واقعی...... یہ شخص اشوک ساہنی کی بیٹی کے عشق میں گرفتار تھا؟''

''بے شک چھوٹے سرکار! ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ وہ اب بھی گرفتار ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ وہ بہت بیمار ہے۔ کسی بھی وقت ختم ہوسکتا ہے لیکن اسے اپنی موت کا بھی کوئی غم نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے عشق نے اس کے لئے مرنا بھی آسان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ......''

ایک دم مجھے شکنتلا والی بات یاد آئی اور میں خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے سرکار! اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''پوچھو۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بولنے کا پڑھا لکھا انداز اسے متاثر کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔

''سرکار! مجھے پتا چلا ہے کہ زرگاں کے راج بھون سے کچھ لوگ بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ ان میں ساہنی صاحب کی بیٹی شکنتلا بھی ہے؟''

چھوٹے سرکار نے کہا۔ ''ہاں، کسی نے مجھے یہ بات بتائی تو تھی۔ بعد میں ہم نے اس لڑکی کو پیش کرنے کا حکم دیا لیکن وہ ملی ناہیں۔ اس کے ساتھ راج بھون سے آنے والی تین چار اور عورتیں بھی ناہیں تھیں۔ دراصل زرگاں سے آنے والے لوگن جانت ہیں کہ ٹل پانی میں زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ اس لئے وہ یہاں آ کر اِدھر اُدھر روپوش ہو جانا بہتر سمجھت ہیں۔''

باوردی اجے نے چھوٹے سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب! اگر آپ حکم دیویں تو میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرت ہوں؟''

''ہاں ضرور کرو...... بلکہ ہم تو چاہت ہیں کہ اگر وہ مل جاوے تو اسے خاص حفاظت میں رکھا جاوے۔ وہ راج بھون کی فیریز (پریوں) میں سے ہے...... اور بھائی صاحب (حکم جی) کے جاسوس اس کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں گے۔''

ہماری بات چیت کے دوران میں ہی فوجی افسروں اور انتظامی عہدے داروں کا ایک وفد چھوٹے سرکار سے ملنے پہنچ گیا۔ میں اور انور خاں چھوٹے سرکار سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔

O......❖......O

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ حالات میں کوئی خاص تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔ دونوں طرف جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میری اور باروندا جیکی کی ملاقات روز ہو رہی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھ پر فائٹنگ آرٹ کے نئے عقدے کھل رہے تھے۔ حقیقت ہے کہ میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص محسوس کر رہا تھا...... میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بھی شاید نہ کر سکوں۔

سلطانہ کی کیفیت میں بھی معمولی تبدیلی آئی تھی۔ تاہم وہ اب بھی بالکل الگ تھلگ اور گم صم رہتی تھی۔ کوئی اس سے اظہارِ ہمدردی کی کوشش کرتا تو وہ غصے سے پھٹ پڑتی لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ بہت نرم اور اطاعت گزاری والا ہوتا تھا۔ وہ الگ کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس نے ابھی بالو کو اپنا دودھ پلانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

ایک رات میں اسے دیکھنے اس کے کمرے میں گیا تو وہ ریشمی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے پر تھیں۔ بالو اس کے پہلو میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر ایک صحت مند و توانا کشش تھی۔ جیسے کوئی خودرو پودا یا جنگلی پھول۔ اور وہ میری بیوی تھی۔ میں قریباً ڈیڑھ سال تک اس کے قریب رہا تھا اور ہماری قربت کی نشانی یہ بچہ تھا۔

مجھے سلطانہ کے ریشمی تکیے کے نیچے ایک ابھار سا محسوس ہوا۔ میں نے آگے جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ ایک چھوٹی تلوار کا دستہ تھا۔ یہی وہ تلوار تھی جس سے سلطانہ نے چند دن پہلے مردانہ وار کام لیا تھا۔ اس نے ٹیلے پر ''جی تھری'' چلانے والوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے اور یہ تلوار وہ اب بھی تکیے کے نیچے رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔

میں نے بہت آہستگی کے ساتھ یہ چھوٹی تلوار اس کے تکیے کے نیچے سے نکال لی...... میری احتیاط کے باوجود وہ جاگ گئی۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر رکھ لی۔

''یہ تلوار نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

"بب......بس یونہی۔" وہ ہکلائی۔

"تمہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے......شاید صرف ایک لمحے کے لئے ہم دونوں کی نگاہوں میں وہ ناقابلِ فراموش منظر گھوم گیا جب جارج گورا نے میرے گلے میں ذلت کا ہار پہنایا تھا اور سلطانہ میری بے مثال بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔

پھر سلطانہ نے نگاہ جھکالی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ! میں جانتا ہوں کہ میرے اوپر تمہارے کچھ قرض ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں اتارنا آسان نہیں ہے......لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اس رات کے بعد میں بتدریج تبدیل ہوا ہوں۔ میرے اندر بہت کچھ بدلا ہے سلطانہ......جس طرح جارج کا نام تمہارے ذہن میں گڑا ہوا ہے، میرے ذہن میں بھی گڑا ہے۔"

وہ دل دوز انداز میں سر جھکا کر رہ گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سوئے ہوئے بالو کا ماتھا چوما اور تلوار سمیت باہر آ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ریشمی پردے والے جھروکے میں سے آتش بازی کے مناظر دکھائی دیئے۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور چھوٹے بڑے پٹاخے چل رہے تھے۔ اسی دوران میں حجام عبدالرحیم بھی آ گیا۔ میں نے اس سے آتش بازی کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ "اس کی ایک ناہیں دو وجہ ہیں مہروز بھائی......مم......میرا مطلب ہے تابش بھائی۔"

"وہ کون سی؟"

"پہلی وجہ تو شب برأت کا تہوار ہے۔ کل یہاں اسٹیٹ کے مسلمان شب برأت منائیں گے۔ دوسری وجہ کا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا ہے۔ نل پانی اور زرگاں کے درمیان لڑائی وقتی طور پر ٹل گئی ہے۔ ہمری جان کاری کے مطابق کل نل پانی اور زرگاں کے خاص خاص لوگن میں بات چیت ہوئی ہے جس میں دونوں طرف سے تھوڑی اور سوچ وچار کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

میں اور عبدالرحیم جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر آتش بازی کا نظارہ کرتے رہے......

نل پانی کا کافی بڑا حصہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ جھیل کا ایک حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے کی آبادی میں سے گاہے بگاہے ہوائیاں چھوٹتی تھیں اور ان کے رنگ آسمان پر بکھرنے کے ساتھ ساتھ جھیل میں بھی منعکس ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ خوب صورت لگتا تھا۔

عبدالرحیم نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ "تابش بھائی! کیا واقی......تم کو......کچھ یاد ناہیں؟ پچھلی شب برأت کی کوئی بات بھی تمہارے دماغ میں ناہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے تمہارے گھر میں کھانا کھایا تھا۔ سلطانہ بی بی نے بڑے پیارے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر مہندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے یہ مہندی تم نے ہی لگائی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی کہ تم نے اسے مہندی لگائی ہے۔ بے ڈھنگی سی مہندی تھی، پر وہ اتنی خوش تھی کہ کچھ ناہیں پوچھو......اور پھر ہم اوپر چھت پر چلے گئے تھے۔ آتش بازی دیکھتے رہے تھے......اور تم نے سلطانہ بی بی کے ساتھ مل کر درجنوں موم بتیاں روشن کی تھیں......کچھ تو یاد ہوگا تمہیں؟"

مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ "نہیں......مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے رحیم نے بھی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

تاہم اس کے جانے کے بعد میں اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ کل شب برأت کا تہوار تھا۔ اس موقع کو سلطانہ کو نارمل کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز سلطانہ کو مجبور کیا کہ وہ نیا لباس پہنے۔ میں اس کے لئے گیندے اور موتیے کے بہت سے پھول اور گجرے لایا۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ آج مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلائے۔ میری اس فرمائش نے اس کا چہرہ زرد کر دیا۔ بہرحال، میرے اصرار کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ وہ جھلمل کپڑوں میں ملبوس پہلی بار گھر کے باورچی خانے میں گئی تو ملازمائیں اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ خوش گوار ٹھنڈک والی ایک خوشبودار شام تھی۔ سلطانہ نے لکھنوی طرز کے چاول بنائے اور بادام کشمش والا زعفرانی حلوہ پکایا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر پہلی بار ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جھروکوں سے باہر تاروں بھرا آسمان تھا اور آتش بازی کے رنگ تھے۔ کہتے ہیں کہ ننھے بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک نادیدہ رابطہ ہوتا ہے۔ بالو کی آنکھوں میں بھی آج مسکراہٹ تھی۔ اس شام مجھے

پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے حادثے کے بعد سلطانہ نارمل زندگی کی طرف آ سکتی ہے اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے زہرناک مایوسی کے بادل چھٹ سکتے ہیں۔

لیکن میں غلط تھا۔ جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ ہونے والا نہیں تھا...... اور وہ ہونے وا تھا جو اس شام میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں نے سلطانہ اور بالو کو کمرے میں چھوڑا اور اپ کمرے میں واپس آ کر سو گیا۔

میری آنکھ صبح سویرے ایک تیز آواز سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ملازمہ صفیہ برآمدے میں کھڑی چلا رہی تھی۔ ''سلطانہ بی بی...... سلطانہ بی بی......!''

پھر وہ میری طرف مڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مالک! سلطانہ بی بی کمرے میں ناہیں ہیں۔ وہ کہیں بھی ناہیں ہیں۔''

''غسل خانے میں دیکھا؟''

''جی مالک......''

میں صفیہ کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ کل رات میرے اصرار پر جو لباس سلطانہ نے پہنا تھا، وہ ایک طرف فرش پر پڑا تھا۔ پھولوں کے سارے گہنے بھی ٹوٹے پھوٹے ایک طرف دھرے تھے۔ بالو بستر کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ باقی بستر پر بہت کم سلوٹیں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ سلطانہ اس پر تھوڑی دیر کے لئے ہی لیٹی ہے۔

''کہاں جا سکتی ہے؟'' میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

''کچھ پتا ناہیں جی! بی بی کا بھتیجا طلال بھی ناہیں ہے۔ لگت ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئی ہیں۔''

ایک دم میرا دھیان اس چھوٹی تلوار کی طرف گیا جو میں نے ایک دن پہلے سلطانہ کے تکیے کے نیچے سے نکالی تھی۔ میں نے وہ ساتھ والے اسٹور نما کمرے کی الماری میں رکھی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ تلوار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

میں تیزی کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے باہر آیا۔ میں نے باوردی پہرے داروں سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان سلطانہ بی بی اپنے نوعمر بھتیجے طلال کے ساتھ یہاں سے گزری تھی۔ اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی اور چہرہ بھی نصف چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شدید بخار میں ہے اور چھوٹے سرکار نے اس سے کہہ رکھا ہے کہ وہ

جب چاہے، ان کے ذاتی معالج کو دکھا سکتی ہے۔

میں پہرے داروں سے بات کر ہی رہا تھا جب چوہان اور رحیم بھی وہاں آ گئے۔ ہم فوراً چھوٹے سرکار کے ذاتی معالج حکیم خدا بخش کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حکیم صاحب دیوان کے اندر ہی ایک رہائشی حصے میں رہتے تھے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو میرے دل میں چھپا ہوا اندیشہ درست نکلا۔ سلطانہ اور طلال رات کو یہاں آئے ہی نہیں تھے......

چوہان نے کہا۔ ''وہ دیوان کے شمالی گیٹ کی طرف گئے ہوں گے۔''

ہم شمالی گیٹ پر پہنچے۔ ابھی رات کی ڈیوٹی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہی پہرے دار موجود تھے جنہوں نے رات بھر اس گیٹ کی نگہبانی کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس راستے سے کوئی باہر نہیں گیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ابھی دیوان کی چار دیواری میں ہی ہیں۔'' رحیم نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔'' چوہان پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''اس کی نگاہیں دور ایک سرخ رنگ کے بند پھاٹک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ نل پانی کے سرکاری اصطبل کا پھاٹک تھا اور یہ اصطبل دیوان خانے کے اندر ہی تھا۔ پھاٹک کے سامنے ایک دو گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''اگر وہ دونوں، رات کو حکیم خدا بخش صاحب کی طرف نہیں گئے اور نہ ہی اس گیٹ سے باہر نکلے ہیں تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اصطبل کی طرف گئے ہوں۔''

''مطلب؟''

چوہان نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے انچارج پہرے دار سے پوچھا۔ ''رات کو یہاں سے گھوڑا گاڑیاں گزرتی رہی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' پہرے دار نے جواب دیا۔ ''تین چار گزری ہیں۔ چھوٹے سرکار کے کچھ مہمان تھے جو آدھی رات کے بعد واپس گئے۔ ایک دودھ لانے والی گاڑی تھی...... ایک شاید اور تھی۔''

''تم اندر آنے والی گاڑیوں کو ہی چیک کرتے ہو یا باہر جانے والی گاڑیوں کو بھی؟''

''اندر آنے والیوں کو ہی چیک کیا جاتا ہے جی...... یا پھر کوئی خاص آرڈر ہو تو......''

چوہان نے ایک گہری سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے

تابش...... سلطانہ اب ہمیں یہاں نہیں ملے گی۔ پھر بھی ہم تسلی کے لئے چیک کر لیتے ہیں۔''

...... چوہان نے بالکل درست کہا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا...... سلطانہ کے غائب ہونے کی خبر پورے دیوان میں پھیل چکی تھی۔ ہر جگہ ہلچل نظر آ رہی تھی۔ سلطانہ دیوان کی عمارت میں کہیں نہیں تھی۔

اب اس کی تلاش کا سلسلہ دیوار کی عالی شان عمارت سے باہر شروع ہوا۔ مراد شاہ کے فوری حکم کے تحت گھڑ سواروں کی ٹولیاں اردگرد کے علاقے میں پھیل گئیں اور خاص و عام سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔

میں شدید شاک کی کیفیت میں تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ کل رات تک وہ بہت نارمل نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہتری کی طرف اس کا سفر شروع ہو جائے گا لیکن اب وہ منظر سے اوجھل تھی۔ اس کے اوجھل ہونے کا انداز ذہن میں مزید اندیشے ابھارتا تھا۔

چوہان کے ذہن میں بھی ایسے ہی اندیشے تھے۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''تابش مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے خطرے پیدا کرے گی۔''

''دوسروں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جارج گورا اور اس کے قریبی ساتھی...... وہ جارج گورا کو معاف نہیں کر سکی۔ وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ آن پر مرمٹنے والے لوگ ہیں۔ حاکم لوگ پیار سے ان کی جان بھی لے لیں تو دے دیتے ہیں مگر ان کو سر جھکا کر جینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ راجپوت برادری کی وہ لڑکی ہے جو انگریزوں کے دور میں حیدر آباد دکن سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ فن سپاہ گری میں ہمیشہ سے تاک ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں بھی تلوار کی دھنی ہوتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اور طلال یہاں سے نکل کر زرگاں کی طرف گئے ہوں گے؟''

''یہ ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عزت کے لٹیرے کے لئے سرتاپا قہر ہے۔ ایسے میں وہ راستے کی مشکلوں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچے گی۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہئے۔ اسے پتا ہو گا کہ عام حالات میں بھی جارج گورا کے گرد سخت حفاظتی حصار ہوتا ہے۔ ان حالات میں تو اس کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہو گی۔ وہ اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پائے گی۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ فوری طور پر زرگاں کی طرف نہ جائے۔ ابھی یہیں کہیں نل پانی میں چھپ کر لائحہ عمل بنائے...... طلال اس کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی برادری کے کچھ اور افراد کی مدد لینے کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہے۔''

''ایسی سوچ بچار تو ٹھنڈے دل و دماغ سے کی جا سکتی ہے تابش! وہ جس طرح یہاں سے گئی ہے، لگتا ہے کہ اس کے اندر ایک آگ ہے۔ وہ آگ اسے شاید ہی کہیں رکنے دے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق مراد شاہ صاحب نے راستے کی چوکیوں کو خبردار کر دیا ہے۔ اگر وہ زرگاں کے رخ پر گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اسے راستے میں کہیں ٹریس کر لیا جائے۔''

''یہ بات وہ بھی تو سوچ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ فوری طور پر زرگاں کا رخ نہ کرے......''

اسی دوران میں اجے تیز قدموں پر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے دو باوردی ماتحت تھے۔ ماتحت دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ اجے نے اندر آ کر ہمیں بتایا۔ ''اندرونِ شہر سے اطلاع ملی ہے کہ اسلحے کی ایک دکان پر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو ایک اکیلا لڑکا تھا۔ وہ ایک رائفل، ایک پستول اور کچھ ایمونیشن لوٹ کر لے گیا ہے...... دکان دار کے بازو پر تلوار کا زخم آیا ہے۔ تفتیش کرنے والے تھانے دار نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ لڑکا، سلطانہ بی بی کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال، اس حوالے سے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

یہ اہم اطلاع تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور فوراً اجے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی میں ہم دیوان کی عالی شان عمارت سے نکلے اور اندرون شہر کی طرف چل دیئے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ نل پانی کے گلی کوچوں میں زندگی معمول کے مطابق رواں تھی۔ جنگی تناؤ وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا اور اس تبدیلی کے آثار لوگوں کے چہروں پر بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ بازاروں میں خریداروں کا رش تھا۔ باغوں اور دیگر تفریح گاہوں میں بھی رونق تھی۔ بہرحال، لوگوں کے ذہنوں میں یہ شک بھی موجود تھا کہ اس صورتِ حال کے پیچھے زرگاں والوں کی کوئی سازش نہ ہو۔

گھوڑا گاڑی ایک ایسی آبادی میں پہنچی جہاں پرانی طرز کی دو تین منزلہ گنجان عمارتیں تھیں۔ یہاں گلیاں تنگ اور راستے پیچ دار تھے۔ ایک جگہ گاڑی سے اُترنے کے بعد ہم پیدل ہی ایک بازار میں داخل ہوئے۔ ایک دکان کے سامنے پولیس کے باوردی سپاہی موجود تھے۔ پولیس کی وردی یہاں، انڈیا کی عام پولیس سے ملتی جلتی تھی۔ بس پگڑی کا اضافہ تھا۔

پولیس والوں نے اجے کو فوجی افسر کا پروٹوکول دیا۔ اسے سیلیوٹ کیا گیا اور بڑے احترام سے موقع واردات پر پہنچایا گیا۔ زخمی دکان دار مدن لال دکان میں ہی موجود تھا۔ اس کے بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور فربہ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

تھانے دار کے اشارے پر اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ ”جناب! دوپہر کے سمے گاہک وغیرہ کی آشا کم ہی ہووت ہے۔ بھوجن کے بعد میں ذرا آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا...... ملازم لڑکا سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے ہی سویا تھا کہ ایک دم آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ پر کالا نقاب اور ہاتھ میں دو فٹ لمبی تلوار تھی۔ اس نے تلوار یہاں...... میری گردن پر رکھ دی اور کہا کہ میں بولا تو وہ گلا کاٹ دیوے گا۔ اس نے مجھ سے شوکیس کی چابی مانگی۔ میں چابی لینے کے بہانے تھوڑا سا آگے گیا اور پھر میں نے جلدی سے باہر نکلنا چاہا۔ وہ میرے وچار سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے تلوار چلا کر میرا بازو گھائل کر دیا...... میں یہاں گر پڑا، اس کرسی کے پاس۔ یہ دکان کا پچھلا کمرا ہے۔ بازار سے گزرنے والے کسی بندے کو پتا بھی ناہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ اس نے شوکیس کی چابی مجھ سے لی۔ بڑے سکون کے ساتھ شوکیس کھولا۔ اس میں سے ایک سات ایم ایم رائفل اور ایک کولٹ پسٹل نکال لیا۔ رائفل کے کوئی دو سیکڑے راؤنڈ بھی وہ خبیث اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے جاتے جاتے ہم کو دھمکی دی کہ اگر ہم نے زبان کھولی تو وہ پھر آوے گا اور تب ہماری ہتھیا کئے بنا ناہیں جاوے گا......“

دکان دار نے اپنی ساری بپتا ایک ہی سانس میں کہہ ڈالی۔

”جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، تمہارا ملازم کہاں تھا؟“ اجے نے پوچھا۔

”اس غریب کو اس نے یہ سامنے والے غسل خانے میں بند کر چھوڑا تھا جی۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے آواز تک ناہیں نکالی۔“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”وہ ذرا کمزور دل کا ہے جی۔“ تھانے دار نے کہا۔ ”اس کو بے ہوشی ہو رہی تھی۔ اسے ساتھ والے اسپتال میں بھرتی کرایا ہے۔“

ہمارے یہاں آنے سے پہلے تھانے دار محمود نے تفتیش کا کچھ کام کیا تھا۔ اس نے فوجی افسر اجے کو اس تفتیش سے آگاہ کیا۔ اجے اور تھانے دار محمود کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ یہاں گھوڑوں کے بھی نمبر ہوتے ہیں اور یہ نمبر ان کی پیٹھ پر بڑے اہتمام سے داغے جاتے ہیں۔ ان نمبروں کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو عام جگہوں پر گاڑیوں کے نمبروں

وغیرہ کی ہوتی ہے۔ ایک قریبی دکان دار نے بتایا تھا کہ واردات کرنے والا گھوڑے پر آیا تھا۔ اس گھوڑے کی پیٹ پر داغا ہوا نمبر بھی اس دکان دار کو کسی حد تک یاد تھا۔ اجے نے اس دکان دار کو طلب کیا۔ وہ مزید گواہوں کے بیان بھی سننا چاہتا تھا۔ میں اس طویل تفتیشی کارروائی سے اُکتا کر گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ سلطانہ اور اس کا بھتیجا کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ایک آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

فوجی گاڑی اندر سے بہت آرام دہ تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مخملی پردے پڑے ہوئے تھے۔ تاہم ان پردوں کی جھریوں میں سے باہر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ بازار کی گہما گہمی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تئیس چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے ایک ڈبی دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ایک ٹھیلے والے کے عقب میں کھڑا وہ کھوجی نظروں سے فوجی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز مشکوک تھا لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا، وہ اس کی صورت تھی۔ میری نگاہوں میں وہ مناظر گھوم گئے جب اپنے ہوش و حواس میں واپس آنے کے بعد میں نے پہلی بار اسٹیٹ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ مجھے جنگل سے پکڑ کر واپس لائے تھے۔ ان واقعات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے ان سب لوگوں کے چہرے یاد تھے۔ یہ شخص بھی ان میں سے تھا...... میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی لیکن یہ شخص زرگاں سے کوسوں دور یہاں تل پانی کے اس بازار میں کیسے موجود تھا؟ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ مضطرب نظر آتا تھا۔

میں گھوڑا گاڑی سے باہر آ گیا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ مجھے دیکھ کر وہ گہرا سانولا شخص بری طرح بدکا اور ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مڑا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ واضح طور پر بوکھلا گیا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے بھی رفتار تیز کر دی۔ یہ گنجان بازار تھا۔ وہ کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میں مسلسل اس کے پیچھے ہوں تو وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس بازار میں زیادہ تر خواتین ہی خریداری کر رہی تھیں۔ کپڑوں، چوڑیوں اور گہنوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف برقعے یا رنگ دار چادریں دکھائی دیتی تھیں۔ میں دوڑا تو مرد و زن سے میرا تصادم شروع ہو گیا۔ کئی خواتین میرا دھکا لگنے

سے گریں اور چلائیں۔ ایک فربہ اندام قلفی فروش میری ٹکر لگنے سے آرائشی سامان کی ایک دکان میں جا گرا اور وہاں کھلبلی مچ گئی۔ مجھے اردگرد کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہ بس بھاگنے والے شخص پر تھی اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک جگہ وہ ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا کر گرا اور پھر فوراً اُٹھ کر ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں گیا۔ یہ کوئی مرچ مسالے کا بازار تھا۔ ہر طرف مسالوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

''پکڑو...... پکڑو۔'' میں نے پکارنا شروع کیا۔

میری پکار پر کسی نے فوری عمل تو نہیں کیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مجھے ہجوم میں سے بھاگنے کے لئے نسبتاً آسانی سے راستہ ملنے لگا۔

......اگلے دو منٹ میں اندرونِ شہر کی ان بھری پُری گلیوں میں یہ اندھا دھند تعاقب جاری رہا۔ اس دوران میں کئی خوانچے الٹے اور کئی مرد وزن کو چوٹیں وغیرہ سہنا پڑیں۔ وہ شخص بھاگتا بھاگتا ایک سہ منزلہ پرانی عمارت میں داخل ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ بعد میں بھی عمارت کے اندر تھا۔ ایک عجیب سی تلخ، جھلاہٹ مجھ پر سوار تھی۔ اس کے علاوہ ایک ترنگ سی بھی تھی۔ یہ ترنگ کیا تھی؟ شاید خود کے اندر ہونے والی اہم تبدیلیوں کے بعد میں لاشعوری طور پر کہیں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا تھا۔ کسی سے ٹکرانا چاہتا تھا، نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

......اور اس عمارت میں گھسنے کے بعد یہ موقع مجھے مل گیا بلکہ اتنی شدت سے ملا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔

دو ہٹے کٹے افراد تیزی سے میرے سامنے آئے۔ وہ بھی سانولے تھے اور صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندو ہیں۔

''اوئے......کون ہو؟'' ان میں سے ایک نے ہراساں آواز میں کہا پھر وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔

میں نے ایک کے چہرے پر کہنی کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر گرا اور وہاں رکھے تاش کے پتے چاروں طرف بکھر گئے۔

میں نے دوسرے شخص کی ناف میں گھٹنا مارا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔

اسی دوران میں دو افراد سیڑھیوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کا پیچھا کر کے میں یہاں پہنچا تھا۔ اب اس شخص کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کا خوفناک پھل چمک رہا تھا مگر وہ مجھے کسی کھلونے کی طرح لگی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کلہاڑی مجھے خراش تک نہیں پہنچا سکتی۔ شاید یہی وہ اعتماد تھا جسے میں

آج تک تلاش کرتا رہا تھا......اور یہی وہ اعتماد تھا جس کے بارے میں بارونداجیکی کہتا تھا کہ جب یہ بندے کے پاس ہو تو پھر اسے لڑنے اور جیتنے کے لئے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی۔

کلہاڑی کا اندھا دھند وار جو میرے سر پر کیا تھا، میں نے آسانی سے بچایا اور کلہاڑی بردار کے جبڑے پر ٹانگ رسید کی۔ جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح اور شفاف تھی۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب اس گھر کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے کھلا۔ اس مرتبہ اندر داخل ہونے والے میرے ہی ساتھی تھے...... چوہان اور کپتان اجے وغیرہ......

اجے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے عقب میں اس کے باوردی سپاہی تھے۔

''خبردار......خبردار!'' اجے گرجا۔ ''گولی مار دوں گا۔''

یکایک ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے پاس سے سرگوشی کرتی گزر گئی۔ یہ فائر زمین پر گرے ہوئے اسی بندے نے کیا تھا جس کا اندھا دھند تعاقب مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کلہاڑی کی جگہ پستول نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری مرتبہ مجھے نشانہ بناتا، اجے کی چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اُتر گئی۔

گولی لگنے سے اس کے جسم نے جھٹکا کھایا مگر اس نے پستول پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ تڑپ کر اس نے پستول کا رخ اجے کی طرف کیا۔ تب اجے نے پھر ٹریگر دبایا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اُگلا اور یہ دوسری گولی اس شخص کے جسم کے اسی حصے میں لگی جو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یعنی اس کا جبڑا۔ وہ ایک کربناک کراہ کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

اجے کے سپاہیوں نے رائفلیں سونت لی تھیں۔ ان کے خطرناک تیور دیکھ کر باقی افراد ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ ان کے رنگ اُڑ گئے اور جانیں بچانے کے لئے انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر دیئے۔ شوٹ ہونے والے شخص کا خون تیزی سے اس کی ڈبی دار چادر کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔

عمارت سے باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ ہجوم ہر لمحے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز نے اس گنجان علاقے میں ہر طرف سنسنی پھیلا دی تھی۔

چوہان نے مجھے ٹٹولا اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا تابش؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان اور اجے وغیرہ کس چڑھی ہوئی سانسیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ میرے پیچھے

ہی پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

اجے کے سپاہیوں نے مرنے والے کے ساتھیوں کو ایک قطار میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ سپاہی عمارت میں پھیل گئے اور دیگر افراد کو تلاش کرنے لگے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' اجے نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''باقیوں کا تو پتا نہیں...... مگر اس بندے کو میں کسی حد تک جانتا ہوں۔'' میں نے ٹائل دار فرش پر مردہ پڑے گہرے سانولے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''کون ہے یہ؟'' اس مرتبہ چوہان نے پوچھا۔

''حکم کا ایک قریبی ساتھی۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو گا لیکن تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ جب مجھے اور سلطانہ کو یہاں نل پانی سے واپس زرگاں بھجوایا گیا تو یہ شخص موہن کمارے کے ساتھیوں میں شامل تھا......''

چوہان نے چونک کر مردہ شخص کا خونچکاں چہرہ دیکھا۔ پھر شاید اس نے بھی کسی حد تک اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ ''تم نے اسے کہاں دیکھا؟'' چوہان نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل بتا دی۔ اس دوران میں اجے کے ماتحت افراد عمارت کے مختلف حصوں سے قریباً پانچ مزید افراد کو ہانک کر گراؤنڈ فلور پر لے آئے تھے۔ یہ سارے افراد کٹر ہندو لگتے تھے۔ یہ سب کے سب جواں سال تھے۔ اس عمارت کی مختلف دیواروں پر تلواریں، کلہاڑیاں اور رائفلیں آویزاں تھیں۔ بجرنگ بلی، ہنومان اور کالی ماتا کی مورتیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک دو جگہ ہندی کے کچھ پوسٹر بھی نظر آئے۔ پوسٹروں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ یہ عسکری نوعیت کے ہیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جگہ جوشیلے ہندو نوجوانوں کی ایک بیٹھک ہے۔ اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک بڑا جمنازیم تھا۔ وہاں جسمانی کسرت کی جاتی تھی اور لڑائی بھڑائی کے گُر بھی سیکھے جاتے تھے۔ عمارت میں موجود پوسٹرز سے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ مسلمان مخالف پروپیگنڈے کا اڈا بنی ہوئی ہے۔

کپتان اجے کی ہدایت پر تھانے دار محمود نے مرنے والے شخص کی لاش کو قبضے میں لے لیا اور عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کر لیا۔ امید تھی کہ گرفتار ہونے والوں کے ذریعے مزید انکشافات ہوں گے۔

''تمہاری پنڈلی پر چوٹ آئی ہے۔'' چوہان کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے دیکھا، واقعی پنڈلی پر ایک گہرا کٹ آیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں کوئی آہنی شے لگی تھی۔ خون بہہ کر ٹخنے تک جا رہا تھا مگر یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ اس چوٹ نے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں دی تھی۔ اپنا بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھے پریشانی کے بجائے عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ شاید جیکی کی تربیت نے مجھ پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کر دیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم دیوان میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں سلطانہ اور اس کے بھتیجے کی گمشدگی سب سے اہم موضوع تھی۔ ہر کوئی اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اجے کو امید تھی کہ اگلے چوبیس گھنٹے میں کوئی نہ کوئی کھوج ہاتھ آ جائے گا۔ یہ بات تو اب تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ آج سہ پہر اسلحے کی دکان پر واردات کرنے والا سلطانہ کا بھتیجا طلال ہی تھا۔ یہاں گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر سامنے آیا تھا۔ اجے کو یقین تھا کہ اس نمبر کے ذریعے پیش رفت ہو گی۔

رات کو باروندا جیکی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے اسے تیز بخار بھی ہو جاتا تھا لیکن وہ اپنا ہر دکھ درد شراب میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی خوش طبعی بھی برقرار رہتی تھی۔

میں نے اسے سہ پہر والی کارکردگی بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یہ ہندو اکھاڑے کے لوگ تھے۔ یہ تو کافی سخت جان ہوتے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ پرانے ہتھیار چلانے کی بھی انہیں مہارت ہوتی ہے۔ اگر تم نے انہیں نیچا دکھایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میری محنت بالکل ہی بیکار نہیں جا رہی۔''

''بالکل ہی بیکار نہیں جا رہی...... سے کیا مطلب؟ کیا آپ میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو؟''

''مطمئن تو ہوں لیکن پوری طرح نہیں۔'' اس نے کہا پھر میری پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا باندھ رکھا ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا، یہاں چوٹ لگی ہے۔ کافی خون بہا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ تم چوٹ کو چوٹ سمجھ رہے ہو۔ تم اس سے خوف زدہ ہو۔ تم نے اسے چھپا دیا ہے، باندھ دیا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی جنگلی جانور شیر، چیتے، ٹائیگر وغیرہ کے بارے میں بھی سنا ہے کہ اس نے زخم پر پٹی باندھی، دوا لگائی؟ حالانکہ انہیں زخم لگتے ہی رہتے ہیں اور ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت خود سب سے بڑا مرہم ہے۔''

"میں سمجھا نہیں۔"

"اگر سمجھنا چاہتے ہو تو آہستہ آہستہ سمجھ میں بھی آنے لگے گا۔" اس نے کہا اور میری پنڈلی کی پٹی اپنے ہاتھ سے کھول دی۔

اس دن مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ زخمی پنڈلی کے ساتھ ہی میں نے اور جیکی نے سخت ترین مشق کی۔ میرے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔ میرا پاؤں لہو رنگ ہو گیا۔ زخم پر لگنے والی پہلی ایک دو ضربوں نے مجھے تکلیف دی لیکن پھر یہ تکلیف ایک طرح کی توانائی میں بدلنے لگی۔ ہر بار جب زخم پر چوٹ لگتی تو میرے اندر ایک ہیجان سا پیدا ہوتا۔ ایک تلخ لہر ابھرتی اور آتش بن کر میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔ میں درد اور برداشت کے نئے پہلوؤں سے آشنا ہو رہا تھا۔

اس رات باروندا جیکی کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ یوں لگا کہ اس کی سانس رک جائے گی۔ اس کا ہڈیوں کا بھرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ جیکی تک وہ اطلاع پہنچا دوں جو میں نے کئی دن سے خود تک محدود رکھی ہوئی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جیکی کو اضافی دکھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی تک کپتان اجے کو نل پانی میں شکنتلا کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ بہرحال، وہ تن دہی سے اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

......اگلے تین دن تک سلطانہ اور طلال راجپوت کی تلاش شد و مد سے جاری رہی مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ گھوڑے پر داغے ہوئے نمبر سے بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں تین مختلف افراد مشکوک قرار دیئے گئے تھے اور ان سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

اکھاڑے سے جو نوجوان پکڑے گئے، انہوں نے کئی انکشافات کئے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور جارج وغیرہ کو نل پانی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہم آہنگی ایک آنکھ نہیں بھا رہی۔ نل پانی میں مسلمان اکثریت میں تھے، اس کے باوجود وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری سے رہ رہے تھے۔ اس رواداری اور ہم آہنگی کو ختم کرنے کے لئے حکم نے اپنے سازشی عناصر یہاں چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک مثال چار دن پہلے اکھاڑے میں ہلاک ہونے والا شخص ستیش آنند تھا۔ یہ شخص ہندو نوجوانوں میں مراد شاہ وغیرہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مراد شاہ اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار پر حاوی ہو چکے ہیں اور وہ عنقریب اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان عالموں کے

پاس بیٹھتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں دن بہ دن مسلمانوں کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سلطانہ کی گمشدگی نے مجھے ازحد مضطرب کر رکھا تھا۔ مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اچانک اس کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر آ جائے گی۔ اس کی تلاش میں چھوٹے سرکار کے ہرکارے دور دور کی خاک چھان رہے تھے۔ میں خود بھی دیوان سے باہر نکل کر اس تلاش میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن چوہان نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "تم ایک بات بھول رہے ہو تابش! تم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو۔ تمہارے اندر "چپ" موجود ہے اور یہاں نل پانی میں حکم کے بہت سے جاسوس موجود ہیں۔ وہ تمہیں کسی بھی وقت ٹریس کر سکتے ہیں۔" اس نے مجھے انٹینا والی بات بھی یاد دلائی اور کہا کہ اب مجھے اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

وہ تو اس بات پر بھی ناخوش تھا کہ میں نے تین چار دن پہلے بازار میں اچانک ستیش کو دیکھ کر اس کا اندھا دھند تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سیکیورٹی کے بغیر بالکل دیوان کی عمارت سے باہر نہ نکلوں۔

ننھا بالو بھی آج کل بہت مضطرب تھا۔ ماں کی دوری اکثر اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز رکھتی تھی۔ وہ اسے بانہوں میں نہیں لیتی تھی، اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی لیکن اس کے قریب تو رہتی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں لیٹنے کی اجازت تو دیتی تھی مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کی گود میں بلکتا رہتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کچھ کر رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز سن کر میں اس کے پاس چلا گیا۔ صفیہ اسے بانہوں میں لئے برآمدے میں چکرا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ لاڈ بھرے انداز میں اسے پچکار رہی تھی۔ "کاکے کی امی جان آئے گی...... کاکے کو گانا سنائے گی...... کاکے کو جھولا جھلائے گی...... کاکے کو دودھ پلائے گی...... کاکے کی امی آئے گی۔"

وہ واقعی چپ ہو گیا۔ اپنی اشک بار معصوم آنکھوں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی ساری بات سمجھ رہا ہو۔ اس دوران میں صفیہ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے اپنی اوڑھنی درست کرنے لگی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بالو کو اٹھا لیا۔ مجھے اس سے انس محسوس ہوا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے، اس کا نم گال چوما۔ اس کا ننھا سینہ اب بھی چھوٹی چھوٹی ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کی ہر ہچکی میں ممتا کی تلاش تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چوہان تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ''خیریت ہے چوہان؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولا۔ ''پرانے شہر سے ایک لاش ملی ہے۔''

''کس کی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ایک جواں سال عورت ہے۔ چہرہ بُری طرح مسخ ہے...... پہچانا نہیں جا رہا۔ اجے کو شک ہے کہ......'' چوہان کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ادھورے فقرے کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے دہل کر کہا۔ ''وہ کوئی اور ہو گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ تم شناخت میں مدد دے سکتے ہو۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے بچہ واپس صفیہ کی گود میں دیا اور ڈاکٹر چوہان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جب میں نے سلطانہ کو آخری بار دیکھا تو اس نے کون سے کپڑے پہن رکھے تھے...... اس کی جوتی کون سی تھی؟ وہ زیور تو سرے سے پہنتی ہی نہیں تھی۔ اسے لباس وغیرہ سے ہی شناخت کیا جا سکتا تھا۔

ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور شہر کے بارونق راستوں سے گزرتے ہوئے پرانی آبادی میں پہنچ گئے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ گھروں میں چراغ، لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں کسی خوش حال فیملی کی چار دیواری میں جنریٹر کی برقی روشنی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں بائیسکلوں پر لیمپ روشن کرنے کا رواج تھا۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں وغیرہ کی دونوں سائیڈز پر بھی کیروسین آئل کے لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔

ہم ایک تین چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچے۔ بالکونیوں اور محرابی دروازوں والی اس عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کے سپاہی اس ہجوم کو موقع واردات سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اجے بھی یہیں موجود ہے۔

میں چوہان کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر ایک لاش سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ چادر پر سر کی طرف خون کے بڑے بڑے داغ نظر آ رہے تھے۔ میری رگوں میں خون کی گردش عروج پر پہنچ گئی۔ کیا اس چادر کے نیچے سلطانہ تھی؟

اجے کے حکم پر باقی افراد کمرے سے باہر نکل گئے...... تھانے دار محمود بھی چلا گیا۔ اب صرف ڈاکٹر چوہان، اجے اور میں کمرے میں تھے۔ اجے کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''چہرہ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ شاید کلہاڑی کے وار کیے گئے ہیں...... دل کڑا کر کے دیکھنا پڑے گا۔''

چوہان نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اجے نے لاش کے چہرے پر سے خون آلود چادر ہٹائی اور اسے کندھوں تک کھسکا دیا۔ واقعی کچھ نظارے آنکھوں کے لئے سخت اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ میں اندر تک لرز گیا۔ قاتل نے بڑی بے رحمی سے چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ اس نے کلہاڑی وغیرہ سے پے در پے وار کر کے سر اور چہرے کی ہڈیاں چُور چُور کر ڈالی تھیں۔

کپتان اجے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''نہیں۔ چہرے سے تو کوئی اندازہ نہیں ہو رہا۔'' میں نے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

چوہان نے بھی میری تائید کی۔

''کپڑوں سے کچھ پتا چل رہا ہے؟'' اجے نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، کپڑوں سے بھی نہیں۔''

''لیکن یہ اسی طرح کے کپڑے ہیں جیسے سلطانہ بی بی پہنتی تھی۔'' اجے بولا۔ اس نے لاش کا چہرہ تو ڈھکا رہنے دیا لیکن پہلو سے چادر ہٹا کر ایک بار پھر مقتولہ کے خون آلود کپڑے ہمیں دکھائے۔

میں نے کپڑوں کو دھیان سے دیکھا۔ یہ اسی طرح کی چیک دار...... فراک نما قمیص تھی جو سلطانہ پہنتی تھی۔ زیریں جسم پر تنگ موری کا پاجامہ تھا۔ میں نے ہاتھوں اور بازوؤں کی ساخت دیکھی لیکن ایک بار پھر کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اجے بولا۔ ''ابھی تھوڑے سمے پہلے سلطانہ بی بی کے پتا مختار صاحب بھی یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چند سیکنڈ سے زیادہ دیکھ ناہیں سکے۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ ویسے انہوں نے بھی پہچان ناہیں ہے۔''

چوہان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے تابش...... کہ سلطانہ تمہاری بیوی ہے۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ سب سے

نزدیکی ہوتا ہے۔ایک شوہر کی حیثیت سے تم اسے اس کی کسی جسمانی نشانی کی وجہ سے بھی پہچان سکتے ہو۔'' چوہان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ یوں تو ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے بھی معلوم تھا کہ میرا کیس کتنا مختلف ہے۔ پچھلے دو ڈھائی سال کا عرصہ میرے ذہن میں ایک بالکل صاف سلیٹ کی طرح تھا۔اس پر کوئی نقش کوئی یاد موجود نہیں تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں بے طرح چونک گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اجے یا چوہان کے ذہن میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید سلطانہ کے والد کے ذہن میں۔کبھی کبھی یوں ہو جاتا ہے۔کسی واقعے پر غور کرتے ہوئے نہایت دانا بینا لوگ بھی بالکل سامنے کے نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں۔

میں نے چوہان سے کہا۔''میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔آؤ میرے ساتھ۔''

ہم واپس کمرے میں پہنچے جہاں مسخ لاش رکھی تھی۔ دراصل مجھے کچھ روز پہلے کا وہ خون ریز واقعہ یاد آ گیا تھا جب تل پانی کے نواحی جنگل میں ''کھنڈر چوکی'' پر پانڈے اور اجے کے بندوں میں زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ سلطانہ نے بھی اس لڑائی میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اور ٹیلے پر چڑھائی کرتے ہوئے اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہو چکا تھا۔ یہاں دستی بم کا کوئی چھوٹا ٹکڑا لگا تھا۔

اب یہی زخم سلطانہ کی شناخت بن سکتا تھا۔ میں لکڑی کے بوسیدہ تخت پر پڑی لاش کی طرف بڑھا تو میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ یہ بڑا جگر پاش مرحلہ ہوتا ہے۔چادر اُٹھا کر لاش شناخت کرتے ہوئے دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور سینے پھٹ جاتے ہیں۔کیا اگلے چند سیکنڈ میں، میں اس اندوہناک خبر سے آگاہ ہونے والا تھا کہ میری مبینہ بیوی اور بالو کی ماں کبھی ہمارے درمیان واپس نہ آنے کے لئے جا چکی ہے۔

میں نے لاش کے خون آلود پاؤں پر سے چادر ہٹائی۔ میری نگاہ دھندلا گئی۔ اس دھندلائی ہوئی نگاہ نے دیکھا کہ لاش کے پاؤں پر زخم نہیں تھا۔ یہ سلطانہ کی لاش نہیں تھی۔

''نہیں چوہان۔'' میں نے بدنصیب مقتولہ کے پاؤں دوبارہ چادر سے ڈھک دیئے۔ ''یہ سلطانہ نہیں ہے۔''

چوہان اطمینان کی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ خود بھی اس بات پر بھونچکا رہ گیا کہ یہ بنیادی بات اس کے اور اجے کے ذہن میں کیوں نہیں آ سکی۔

''شدید تشویش میں اس طرح کی غلطیاں ہو جاوت ہیں۔'' اجے نے کہا۔

میں نے تائید کی اور پوچھا۔''یہ لاش ملی کیسے؟''

اجے نے بتایا۔''یہ مکان کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ مالک مکان نئے شہر میں جا چکا ہے۔آج دوپہر کو بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ان کی گیند ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے اندر چلی گئی۔دو بچے گیند لینے کے لئے اندر گئے تو انہیں یہ تازہ لاش نظر آئی۔انہوں نے شور مچا دیا۔''

''یہ کسی مسلمان لڑکی کی لاش ہے۔'' چوہان نے کہا۔''اور خاص بات یہ ہے کہ یہ جگہ اس گلی سے زیادہ دور نہیں جہاں تین چار دن پہلے ہندو اکھاڑے میں ستیش آنند کو گولی لگی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس قتل کا تعلق اکھاڑے والے واقعے سے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میں لاش والے کمرے سے باہر نکل آیا۔دل کی دھڑکنیں ابھی تک زیروزبر تھیں۔اگر یہ سلطانہ کی لاش ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس کا جواب کافی تکلیف دہ تھا......تو کیا میں لاشعوری طور پر سلطانہ سے وابستگی محسوس کرنے لگا تھا؟ اس کی زندگی اور موت میرے لئے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی؟

لاش میں سے ایک ہلکی ہلکی بو اُٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اس بو سے گھبرا کر باہر گلی میں نکل آیا۔

ایک گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔اس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ اجے کے ماتحتوں میں سے تھا۔یقیناً اس کے پاس اجے کے لئے کوئی خاص خبر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اجے کے پاس پہنچ گیا۔اس ماتحت نے سیلیوٹ کرنے کے بعد کپتان اجے کو اطلاع دی۔''جناب! شہر کے شمالی برج کے پاس ایک لڑکی کا کھوج لگا ہے۔ وہ ایک چھوٹی بگھی پر سوار تھی اور اسے خود ہی چلا رہی تھی۔اسے ایک ناکے پر روکا گیا لیکن وہ رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔وہ گنجان علاقے میں چلی گئی اور پھر بگھی چھوڑ کر ایک گودام میں گھس گئی۔ وہ اب بھی اسی تین منزلہ گودام میں ہے۔ہمرے ساتھیوں نے گودام کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

''تو اس کو پکڑا کیوں ناہیں؟'' کپتان اجے نے چیخ کر پوچھا۔

''اس گودام میں بہت سا آتش گیر مادہ پڑا ہے جی۔ گندھک اور سلفر وغیرہ۔اگر لڑکی کے پاس کوئی ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلا دی تو بڑا مسئلہ ہو جاوے گا......''

''وہ اکیلی ہے؟'' اجے نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ہمرے سامنے تو اکیلی ہی اندر گھی ہے۔ اگر اندر پہلے سے اس کا کوئی ساتھی وغیرہ ہوتو کہا ناہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔'' اجے نے کہا۔

تھانے دار محمود کو لاش کے حوالے سے ضروری ہدایات اور مشورے دینے کے بعد اجے میرے اور چوہان کے ساتھ فوجی گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم تیز رفتاری سے نل پانی کے شمالی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ زیادہ تر گلیاں اور سڑکیں نیم تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

کہاں تو سلطانہ کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی اور کہاں اب اوپر نیچے اطلاعات مل رہی تھیں۔ راستے میں اجے نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ ''تم نے لڑکی دیکھی ہے؟''

''جی جناب! لیکن بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑی تھی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔ نقاب میں سے بس آنکھیں ہی نظر آوت تھیں۔ وہ کافی ہوشیار اور دلیر لگت ہے جی۔ اس نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے کوئی تین میل تک دوڑایا ہے......''

اسی گفتگو کے دوران میں ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ نسبتاً کشادہ علاقہ تھا۔ یہاں درخت وغیرہ بھی تھے۔ دائیں طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ یقیناً اس طرف نل پانی کی بڑی جھیل تھی۔ یہاں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک سراسیمگی سی پائی جا رہی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں نے گودام کی عمارت کو گھیرا ڈالا تھا۔ تماشائی دور گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں پر موجود تھے۔

اجے نے بڑی بڑی مونچھوں والے اس پولیس افسر سے بات کی جس نے لڑکی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس نے دور کونے میں کھڑی ایک چھوٹی بگھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس پر آئی تھی جی۔ ہم نے روکا تو یہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ اس نے کالے رنگ کا برقع پہنا ہوا ہے......اور بالکل نڈر لگت ہے۔''

''تمہیں یہ کیسے شبہ ہوا کہ یہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ ہوسکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سلطانہ بی بی کے ساتھ اس کا نوعمر بھتیجا بھی ہے۔ ہمرے خیال میں اس بگھی میں بھی ایک لڑکا موجود تھا لیکن وہ راستے میں کہیں اُترا اور تنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔''

''کسی نے اس لڑکے کو دیکھا؟'' کپتان اجے نے پوچھا۔

''ناہیں، صاف تو ناہیں دیکھ سکے...... بس کشمیری دروازے کے پاس اس کی ایک جھلک دیکھی گئی ہے......''

کچھ دیر صلاح مشورہ ہوا۔ میں نے اجے سے کہا۔ ''اگر اندر سلطانہ ہی ہے تو پھر اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ میں اندر جاؤں......اور اکیلا ہی جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنی بات سننے پر مجبور کرلوں گا۔''

''اس کام میں بہت احتیاط کرنا پڑے گی جی۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''وہ کسی کی بات ناہیں سن رہی۔ آتما ہتھیا کی دھمکیاں بھی دے رہی ہے۔''

''کیا کوئی اس سے پہلے گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

موچھیل پولیس افسر نے ایک پٹھان چوکیدار کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ درمیان عمر کے اس شخص کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ بھی نظر آ رہا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہی لڑکی گودام کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''بی بی اوپر کی منزل پر دائیں طرف والے کمرے میں ہے جی۔ اس کمرے کا ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتا ہے۔ ام اوپر گیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ام سے کہا کہ اگر ام آگے آیا تو وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا دے گا۔ ام ذرا سا اور آگے گیا تو اس نے اپنا پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کودنے کے لئے ایک دم تیار ہو گیا......وہ بہت خطرناک نظر آ رہا ہے جی۔''

''کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہے اس کے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''ام بھروسے سے کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔''

میں نے اجے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں اندر جاتا ہوں۔''

اس معاملے پر تھوڑی سی بحث ہوئی پھر اجے اور چوہان نیم رضامند ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے، اسے سب سے پہلے یہ بتا دو کہ یہاں بہت سا آتش گیر سامان پڑا ہے۔ اگر اس کے پاس ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلانے کی غلطی کی تو سب کچھ دھماکے سے اُڑ جائے گا......''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وہی میٹھی میٹھی لہر جو اب مجھے خطرے سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ گودام میں گہری تاریکی تھی۔ بس ایک دو کمروں میں لالٹین یا گیس لیمپ کی روشنی موجود تھی۔ میں صرف ایک ٹارچ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ایک پستول بھی

میرے لباس میں موجود تھا لیکن یہ پستول مجھے صرف اسی وقت استعمال کرنا تھا جب کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہتا۔

گودام کے اندر گھستے ہی مجھے ایک ہال کمرے میں لکڑی کی بہت سی پیٹیاں نظر آئیں...... یہاں گندھک کی بو صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں تاریک سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی اور پھر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے آواز دی۔ ''سلطانہ...... سلطانہ...... کہاں ہو تم؟''

جواب ندارد۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ چند آخری سیڑھیوں پر رک کر میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں پھینکا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں، یہاں سے کسی طرح نکلنے میں تو کامیاب نہیں ہوگئی۔ میں نے پھر آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ جو تم کہوگی ویسا ہی ہوگا لیکن پتا تو چلے کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم کہاں ہو؟''

اس بار بھی جواب میں مکمل خاموشی رہی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں پر اور گردآلود فرش پر پھینکا۔ زنانہ قدموں کے نشان واضح طور پر نظر آئے۔ ان نشانات کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جس کا ذکر پٹھان چوکیدار نے کیا تھا۔ مجھے چوہان والی بات یاد آئی اور میں نے بہ آواز بلند پکار کر کہا۔ ''دیکھو...... تم جو کوئی بھی ہو...... ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہاں ان کمروں میں بہت سا بارود پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی گولی وغیرہ چلی یا اس طرح کی کوئی اور بے احتیاطی ہوئی تو سب کچھ ختم ہوسکتا ہے۔ میں بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ تم میرے سامنے آؤ اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟''

نیم روشن کمرے میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں...... بس مجھے یہاں سے چلے جانے دو۔ خدا کے لئے......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ یہ سلطانہ کی آواز نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھی لیکن ابھی میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں آواز دوبارہ سننا چاہتا تھا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تم سامنے تو آؤ۔''

''مم...... میں...... سامنے آنا ناہیں چاہتی۔ کچھ لوگن کی طرف سے...... میرے جیون کو خطرہ ہے...... وہ مجھے مار دیویں گے۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ وہ سلطانہ نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھ کو جانے دو۔ میں بالکل نردوش ہوں۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں......''

میں نے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑے ہوکر دیکھا۔ کمرے میں اس کا ہیولا نظر آیا۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ وہ ادھ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور کسی سہمے ہوئے جانور کی طرح لگتی تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا رویہ جارحانہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس خوف زدہ تھی اور اس خوف کی وجہ سے خودکشی کی دھمکی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز سن کر مجھے لگا کہ وہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا جو وہ خود کو سپاہیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی جان دینا زیادہ آسان محسوس کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں تمہیں ہر طرح کی تسلی دیتا ہوں۔ اگر تم بغیر کچھ بتائے یہاں سے جانا چاہتی ہو تو بھی جاسکتی ہو لیکن اگر تم اپنا کوئی مسئلہ بتانا چاہتی ہو تو ہم اس کے لئے بھی حاضر ہیں۔ میں تمہاری مدد کے لئے کسی زنانہ پولیس افسر کو بلا لیتا ہوں......''

''ناہیں، میں کسی سے کچھ کہنا ناہیں چاہتی۔ میں بس یہاں سے جانا چاہت ہوں۔''

میں ذرا آگے بڑھا تو وہ ایک دم کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کا سراپا یکسر دھمکی آمیز دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک لڑکی کے عقب میں واقع ایک کھڑکی کے شیشے زوردار چھناکے سے ٹوٹے اور ایک پرچھائیں برق رفتاری سے لڑکی پر جھپٹی۔ لڑکی بلند آواز سے چلائی۔ دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ شومئی قسمت، گرتے وقت لڑکی پر جھپٹنے والے شخص کا سر دیوار سے ٹکرایا، اس کی گرفت ایک سیکنڈ کے لئے لڑکی پر کمزور پڑی۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔ وہ اندھا دھند کھڑکی کی طرف بڑھی۔ انداز سے عیاں تھا کہ وہ نتیجے سے بے پرواہ ہوکر چھلانگ لگا دے گی۔ میں اس سے قریباً پانچ میٹر کی دوری پر تھا۔ یہ حتی الامکان تیزی سے حرکت میں آنے کا وقت تھا...... اور میں نے حرکت کی۔ اپنی ٹانگوں کی پوری طاقت میں نے لڑکی کی طرف ''رش'' کیا۔ یہ سیکنڈ کے ایک مختصر ترین حصے کا کھیل تھا۔ وہ جب کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ چکی تھی، میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا اور پھر پلٹ کر کمرے میں پھینک دیا۔ اس کے برقعے کا بالائی حصہ اُتر کر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار سے لٹکی ہوئی لالٹین بھی فرش پر لڑھک گئی۔ لالٹین سے اچھلنے والے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی۔ دو کرسیاں دھڑا دھڑ جلنا شروع ہوگئیں۔ یہ سنگین ترین صورت حال تھی۔ ہم بارود کے ڈھیر پر تھے اور چنگاری کے بجائے پورا الاؤ روشن ہوگیا تھا۔ اس الاؤ کی روشنی میں مجھے دو چہرے نظر آئے۔ ایک تو اس

شخص کا چہرہ جو کھڑکی توڑ کر لڑکی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ کپتان اجے تھا۔ دوسرا لڑکی کا چہرہ۔ د
میری گرفت میں تھی۔ بالائی برقع اُترنے سے اس کے بال کھل چکے تھے۔ یہ بہت لمبے بال
تھے...... غیر معمولی حد تک لمبے۔ میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں
تھی...... ہرگز نہیں تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے اس حسین لڑکی کی تصویر
دیکھی ہوئی تھی۔ اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ شکنتلا تھی۔ بارونداجیکی کی گمشدہ محبوبہ۔
وہ بہت حد تک میری دیکھی ہوئی تصویر سے مل رہی تھی۔

اس بارے میں زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

''دروازہ بند کر دو اجے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اجے خود بھی محسوس کر چکا تھا کہ آگ کو محدود رکھنے کے لئے دروازہ بند کرنا ضروری ہے۔ اس نے لپک کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور دونوں جلتی ہوئی کرساں یکے بعد دیگرے کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دیں۔ اس کا یہ اقدام اس کی حاضر دماغی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ آگ ایک دم سمٹ گئی۔ اگلے چند سکنڈ میں اجے نے اسے مکمل طور پر بجھا دیا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بم کا سلگتا ہوا فیتہ کاٹ کر اسے پھٹنے سے روک دیا جائے۔ اجے کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

لڑکی ابھی تک میرے بازوؤں میں دبی ہوئی تھی اور خود کو چھڑانے کے لئے اندھا دھند زور لگا رہی تھی۔ اجے کے جوان دندناتے ہوئے سیڑیوں پر نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھ سے برسرِ پیکار ماہ جبیں کو سنبھال لیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لمبے ریشمی بال بار بار چہرے کو چھپا رہے تھے۔ وہ چلا رہی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے...... مر جانے دو مجھے......''

میں حالات کی دھما چوکڑی پر حیران ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سلطانہ کے شبے میں پہنچے تھے۔ یہ خیال تو ذہن میں موجود تھا کہ جو لڑکی یہاں موجود ہے، شاید وہ سلطانہ نہ ہو...... لیکن یہ خیال ہرگز ذہن میں نہیں تھا کہ سلطانہ کی تلاش تو ناکام رہے گی لیکن ایک اور تلاش کامیاب ہو جائے گی۔ اجے اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار کے حکم پر کئی روز سے شکنتلا کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے اور اب وہ کسی حد تک مایوس بھی ہو چکے تھے...... لیکن آج شب اس گودام میں بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی لڑکی سامنے آ گئی تھی جو میرے اندازے کے مطابق شکنتلا ہی تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبے بال اس کی شناخت کو معتبر کر رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ اہم ترین اندازہ درست ثابت ہو گیا کہ آج رات اس گودام میں ہم اتفاقیہ طور پر شکنتلا کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ

شکنتلا ساہنی ہے۔

وہ واقعی حسین تھی۔ اس کی خوبرو پیشانی پر پسینا موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بند کمرے میں میرے، اجے اور چوہان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ ''میں تمہاری منت کرت ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں جانت ہوں، چھوٹے سرکار اگر مجھ سے ملنا چاہت ہیں تو میری بھلائی کے لئے ہی چاہت ہوں گے...... لیکن میں یہ بھی جانت ہوں کہ ان کی یہ کرپا مجھ کو مہنگی پڑے گی۔''

''کیوں مہنگی پڑے گی؟ کیا آپ کو چھوٹے سرکار پر اور ہم سب پر وشواس ناہیں ہے؟'' اجے نے تنک کر پوچھا۔

''میں وشواس کی بات ناہیں کرتی...... لیکن میں یہ بھی ناہیں چاہتی کہ آپ لوگن کو میرے کارن کسی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ سب جانت ہیں کہ نل پانی میں بھی حکم جی اور جارج کے جاسوس موجود ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکت ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' اجے نے رعب سے کہا۔ ''آپ کو چھوٹے سرکار کی خاص حفاظت میں دیوان کے اندر رکھا جاوے گا۔''

''کچھ لوگن تو یہ کہت ہیں کہ دیوان کے اندر بھی حکم جی کے بندے موجود ہیں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔ وہ واضح طور پر بہت خوف زدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ نل پانی میں گمنام رہے۔

''آپ کو ضرورت سے زیادہ ڈرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے افسوس ہے کہ آپ دیوان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔'' اجے نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم شکنتلا کو خاص فوجی گھوڑا گاڑی میں سوار کر کے دیوان کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میری نگاہیں اس کے سراپا پر اور اس کے سیاہ آبشار جیسے طویل بالوں پر جمی تھیں...... تو یہ زرگاں کے شاہی محل کا وہ نومیدہ پھول تھا جس نے بارونداجیکی جیسے مضبوط شخص کو عشق میں دیوانہ کیا تھا...... اور کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ میری نگاہوں میں بارونداجیکی کا چہرہ گھومنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں اسے شکنتلا کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دوں گا تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ کہیں وہ شادیٔ مرگ کا شکار تو نہیں ہو جائے گا؟

راستے میں شکنتلا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ نل پانی میں آنے کے بعد وہ جان جوکرا و جھل ہوئی ہے۔ وہ یہاں ایک متوسط آبادی میں اپنی ایک پرانی سہیلی کی ملازمہ کے پاس قیام پذیر تھی۔ نوران نامی یہ لڑکی اور اس کا خاوند چینی کے برتنوں پر نقش نگاری کا کام

کرتے تھے۔ آج وہ دونوں میاں بیوی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کچھ کام کر رکھا تھا جو بازار میں دے کر آنا ضروری تھا۔ مجبوراً شکنتلا نے نوراں کے ملازم کو ساتھ لیا اور بازار میں برتن دے کر آئی۔ واپسی پر پولیس والے پیچھے لگ گئے۔ شکنتلا ہرگز ان پر اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے اس نے بگھی دوڑا دی۔ راستے میں جو بندہ خوف زدہ ہو کر بگھی سے اُترا، وہ نوراں کا ملازم تھا۔ وہ بھی چینی کے برتنوں پر پھول بوٹے بنانے کا کام کرتا تھا۔ میں نے شکنتلا کی باتوں میں حکم کے خطرناک ہرکارے رنجیت پانڈے کا نام بھی سنا۔ وہ اس شخص سے خاص طور پر خوف زدہ نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔

O......❖......O

رات کا وقت تھا۔ میں باروندا جیکی کے پاس اس کے کمرے میں موجود تھا۔ جھروکوں سے باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ دیوان کے کسی اندرونی حصے میں کوئی ستار نواز بڑے بیٹھے سُروں میں ستار بجا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سنگت میں ہارمونیم کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔

جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا۔ ''کیا خیال ہے، آج آرام نہ کریں؟'' جیکی نے کہا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اس طرح کی بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو چھوٹی سی بات پر آگ بگولا ہو جاتا تھا اور اپنا پسندیدہ فقرہ دہراتا تھا...... وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ تم ہڈحرامی دکھاؤ گے تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

''کیا بات ہے جیکی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ایک دم فرسٹ کلاس ہوں۔ بس دوپہر کو بخار نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی تھی اور ایک سو دو سے ایک سو چار پر چلا گیا تھا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں تو یہ میرے ساتھ کرتا ہی رہتا ہے۔ شام کو کھانے کے بعد کھانسی کا دورہ پڑا اور ناک سے تھوڑا سا خون بھی آیا۔ لگتا ہے کہ خون کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے میرے اندر۔'' وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولا۔

''آپ دوا بھی تو نہیں کھاتے ہو۔ حالانکہ......''

''چھوڑو دوست!'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''جب دوا کھا کر بھی مرنا ہے تو پھر کیوں نہ دوا کے بغیر ہی یہ گھاٹی پار کر لی جائے۔''

آج وہ واقعی تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا۔ ''آپ مرنے کی باتیں نہیں

چھوڑ دو گے اور ہم آپ کو مرنے کے لئے نہیں چھوڑیں گے...... آپ جو مرضی کر لو، ہم آپ کو کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئیں گے۔''

''بہت مشکل ہے۔''

''آپ خود ہی تو کہتے ہو، مشکل کو آسان کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ میں نے کل ہی انور خاں اور مراد شاہ صاحب سے بات کی ہے۔ ہم آپ کے لئے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس جاپانی ڈاکٹر کو مقامی لوگ بہت مان رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ کو اسٹیٹ سے باہر بھی بھجوائیں گے۔''

''اسٹیٹ سے باہر جا کر کیا کرنا ہے؟ میری روح اسٹیٹ کے اندر ہے۔ میں یہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔''

اس نے آتشیں سیال کے کئی تلخ گھونٹ بھرے اور ترنگ میں آ گیا۔ تکیہ اپنی کمر کے ساتھ رکھ کر وہ نیم دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا پسندیدہ نیپالی گیت گانے لگا۔

اس کی آواز دل سوز تھی۔ اس میں درد لہریں لیتا تھا اور ''سوچ کی گہری نیلی جھیلوں'' میں سنہری دھوپ کے اندر یادوں کی کشتیاں ڈولتی تھیں۔

وہ گاتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''جیکی! آپ جس کو دن رات یاد کرتے ہو...... وہ آپ کے سامنے آ جائے تو پھر؟''

''کس طرح؟'' اس نے آنکھیں بند کئے پوچھا۔

''جس طرح کوئی انہونی ہوتی ہے...... جس طرح کالی سیاہ رات کے اندر سے سورج نکلتا ہے...... جس طرح دم گھونٹنے والا حبس، بارشوں کو کھینچ کر لاتا ہے...... جیسے تپتی ریت کے اندر سے چشمہ پھوٹتا ہے۔''

اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور مجھے قدرے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ''آج تو تم بھی شاعری کر رہے ہو۔''

''آپ کی صحبت کا اثر ہے جیکی...... لیکن...... آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اگر آپ کی شکنتلا ایک بار پھر آپ کے سامنے آ جائے تو......''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن سے میرا درد بڑھ کر ناقابلِ برداشت ہو جائے۔''

''میں صرف بات نہیں کر رہا۔ میں آپ سے ایک سنجیدہ سوال پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم بُری طرح چونک گیا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ وہ چند سیکنڈ تک تحیر کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا پھر لرزاں ہونٹوں کے ساتھ بولا۔

''کیا......تم نے......اسے کہیں دیکھا ہے؟''

میں نے اس کا کلوتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور دبے دبے جوش سے کہا۔

''ہاں، میرے محترم استاد! میں نے اسے دیکھا ہے...... اور دیکھا ہی نہیں...... وہ میرے ساتھ ہے......اسی چار دیواری میں......اسی چھت کے نیچے۔''

فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں......وہ ہکلایا...... ''دیکھو......ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔''

''میں آپ سے مذاق کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر...... یہ کیا ہے؟''

''آپ کی طلب کا صلہ۔ آپ کے دکھ درد کا مداوا۔ آپ کے انتظار میں اتنی شدت تھی کہ کوئی کھچ کر آپ کی طرف آ گیا۔ ہاں جیکی......وہ یہاں ہے۔ ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ آپ کی شکنتلا ہی ہے۔ وہ کئی دوسری عورتوں کے ساتھ زرگاں کے راج بھون سے بھاگ نکلی ہے......''

جیکی پر واقعی شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے راکھ کے ڈھیر تھے۔ اب وہاں عجب سی چمک نظر آنے لگی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیساکھی اپنی بغل کے نیچے رکھ لی۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انتہائی اضطراب سے بولا۔ ''وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ......وہ کہاں ہے؟''

''یہیں پر ہے۔ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔''

''تم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہے؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''نہیں، ابھی کچھ نہیں۔''

''وہ شکنتلا ہی ہے نا؟ میرا مطلب ہے، تم نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے نا؟''

''ایک سو ایک فیصد۔''

''مم...... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں......میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے تابی کی انتہا کو چھونے لگا۔

اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

دروازے تک پہنچ کر وہ یک لخت رک گیا۔ اس کے اندر کی چکاچوند جیسے ایک دم تاریکی میں بدل گئی۔ کوئی چیز بجھ گئی اس کے اندر۔ میں نے محسوس کیا کہ دیکھتے دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا، تب بے دم سا ہو کر وہیں دہلیز کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ایک کندھا آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ٹیک دیا۔ ''کیا ہوا جیکی؟'' میں نے اس کا دوسرا کندھا تھام کر پوچھا۔

اس کا سر گھٹنوں کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے یہ جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔ تب وہ نقاہت بھری دل دوز آواز میں بولا۔ ''نہیں...... تابش...... اگر وہ واقعی یہاں ہے تو بھی...... میں اس سے مل نہیں سکتا۔ میں ایسی بُری حالت میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ ہم نے بہت اچھے دن دیکھے ہیں...... جب دونوں خوب صورت تھے۔ دونوں کے چہرے گلاب تھے۔ اب نہیں...... اب نہیں...... میں اسے اپنی بدبودار...... برباد زندگی کا تماشا نہیں دکھا سکتا۔'' اس کی آواز بھیگتی چلی جا رہی تھی۔

''آپ ایسا کیوں کہتے ہو جیکی...... جو کچھ بھی ہے لیکن آپ جیکی ہو۔ جس طرح آپ نے اسے چاہا ہے، اس نے بھی چاہا ہے اور جو چاہتے ہیں وہ ظاہری حالت پر نہیں جاتے۔ وہ جا ہی نہیں سکتے۔''

''نہیں تابش، نہیں۔'' اس نے سر جھکائے رکھا اور اسے مسلسل نفی میں ہلاتا رہا۔ اس کے لمبے جھاڑ جھنکاڑ بال اس کے چہرے پر جھولتے رہے۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ بلب کی روشنی میں جیسے ہر جان دار و بے جان شے محوِ حیرت دکھائی دیتی تھی۔ جھروکوں سے باہر سرو اور سفیدے کے بلند درختوں پر چاندنی اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ دیوان کی بلند و بالا بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جیکی کے سراپا میں ایک نئی طرح کی ترنگ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا گرد آلود سر اُٹھایا اور میرا بازو تھام کر بولا۔ ''تابش! میں نے تمہیں آج تک جو کچھ دیا ہے اس کے بدلے میں تم سے ایک چیز......صرف ایک چیز مانگتا ہوں۔ کیا تم......دو گے؟''

''آپ نے جو کچھ دیا ہے جیکی......وہ اَن مول ہے۔ پلیز! آپ اس کو بیچ میں نہ لاؤ۔ آپ صرف یہ کہو کہ آپ کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

اس نے کانپتے ہاتھ اور ہانپتی سانسوں کے ساتھ وہسکی کے دو بڑے گھونٹ لئے۔ وہسکی

کے قطرے اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں چمکنے لگے۔ وہ نم ناک لہجے میں بولا۔ ''تابش! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں...... لیکن...... لیکن اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔''

''مگر جیکی آپ......''

''نہیں تابش! اب کچھ نہیں کہنا۔ میں نے یہی چیز تم سے مانگی ہے، یہ مجھے ویسے ہی دے دو، جیسے میں چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ نہ کوئی دلیل دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کی۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکا۔ وہ عجیب موڈ میں تھا۔ اس کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش طاری تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی کہ شکنتلا سے میری ملاقات کیسے اور کیونکر ہوئی۔ میں نے اسے کافی کچھ بتا دیا...... پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ شکنتلا کو کہاں اور کیسے دیکھے گا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات کو تفصیل میں جا کر سوچ رہا تھا اور اپنی سوچ میں مجھے بھی شریک کر رہا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں سب کچھ طے ہوگیا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی سوچ بھی انوکھی تھی۔

پروگرام کے مطابق مجھے کل شام کے وقت جیکی کو اس کمرے میں لے جانا تھا جہاں میں سوتا تھا۔ یہ کمرا سلطانہ کے کمرے کے ساتھ واقع تھا۔ شکنتلا چونکہ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی، لہٰذا جیکی کے لئے ممکن تھا کہ وہ میرے کمرے سے اسے تسلی کے ساتھ دیکھ سکے۔ پروگرام کے مطابق میرے کمرے میں بالکل تاریکی رہنی تھی اور دونوں کمروں کی ایک درمیانی جالی دار کھڑکی کو میں نے تھوڑا سا کھول دینا تھا۔ جیکی کو گاہے بگاہے کھانسی بھی ہونے لگتی تھی۔ اگر کہیں ایسا کچھ ہوجاتا تو وہ کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں گھس سکتا تھا۔

اگلی صبح شکنتلا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب کافی حد تک نارمل تھی۔ ایک وحشت زدہ ہرنی کی سی کیفیت جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی، اب معدوم ہو چکی تھی۔ چھوٹے سرکار سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی اور اس نے اپنی گفتگو سے شکنتلا کی تشویش کافی حد تک دور کر دی تھی۔ صفیہ سمیت تین ملازمائیں ہمہ وقت شکنتلا کی خدمت پر مامور کر دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ شکنتلا کی اضافی تسلی کے لئے قیام گاہ کے باہر گارڈ بھی بٹھا دیا گیا تھا۔

شکنتلا نہایت نفیس مزاج کی مالک تھی۔ لباس اور خوشبو وغیرہ کے معاملے میں اس کا انتخاب بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں وہ شاہانہ رکھ رکھاؤ تھا جس کا تعلق یقیناً راج بھون کے ماحول سے تھا۔

شکنتلا میرے بارے میں فقط اتنا جانتی تھی کہ میں ان افراد میں سے ہوں جو ماضی میں بدھا کا مقدس مجسمہ چوری کرنے کے الزام میں پاکستان سے پکڑ کر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں لائے گئے تھے...... اور بعد میں مختار راجپوت کی بیٹی نے خود کو 'راج بھون کی فیری' بننے سے بچانے کے لئے مجھ سے شادی کرلی تھی۔

وہ پاکستان کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی۔ خاص طور سے کھلاڑیوں اور اداکاروں کے بارے میں۔ اس نے مجھ سے لاہور، انارکلی، کلفٹن اور موہنجوداڑو جیسی جگہوں کے متعلق دلچسپی سے سوالات کئے۔ اپنی ہندی میں وہ انگریزی کے الفاظ بھی روانی سے استعمال کرجاتی تھی۔

وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھی۔ اس کی سفید رنگت میں گلابی پن کی آمیزش تھی اور خدوخال سے خاندانی نجابت جھلکتی تھی۔ راج بھون میں یقیناً اسے حکم جی کی دراز دستیوں اور من مانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس اکھاڑ پچھاڑ نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کچھ زیادہ گہنایا نہیں تھا۔

وہ ذرا کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ ''مجھے ایک بات بتاؤ تابش! کیا رات کو یہاں کوئی گا رہا تھا؟''

میں چونک گیا۔ تاہم اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''مہمان خانے کی طرف ہارمونیم بج رہا تھا لیکن گانے کا تو پتا نہیں۔''

''ہارمونیم تو میں نے بھی سنا تھا لیکن...... یہ اور آواز تھی اور یہ زیادہ دور سے بھی نہیں آ رہی تھی۔''

''کس طرح کی آواز تھی؟'' میں نے تفصیل چاہی۔

اس کے چہرے پر شدید اُلجھن نظر آئی۔ وہ در و دیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی بہت مدھم آواز میں گا رہا تھا۔ پتا نہیں کون سی زبان تھی لیکن...... طرز...... کچھ سنی ہوئی سی لگتی تھی۔''

''یہاں بہت سے گانے والے ہیں۔ چھوٹے سرکار خود بھی اچھی موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔ شام کے بعد اکثر راگ رنگ کی محفل جمتی ہے۔''

''ناہیں، یہ محفل والا میوزک ناہیں تھا۔'' وہ بدستور اُلجھن زدہ تھی۔

میں کچھ دیر تک شکنتلا کے ساتھ موجود رہا۔ ملازمہ صفیہ بھی بالو کو لے کر وہاں آگئی۔ شکنتلا نے بالو کو اُٹھا کر پیار کیا۔ وہ سلطانہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے سلطانہ کی ساری روداد معلوم ہو چکی تھی۔ وہ بھی اس خبر پر پریشان تھی کہ سلطانہ کسی خطرناک ارادے کے ساتھ دیوان

کو چھوڑ چکی ہے۔ شکنتلا کا دھیان بھی سیدھا جارج کی ستم ظریفیوں کی طرف ہی جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سلطانہ، جارج سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گی اور یہ کوشش خود سلطانہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

وہ بالو کو پیار کرتی رہی۔ مجھ سے سلطانہ کی تلاش کے بارے میں باتیں بھی کرتی رہی اور صفیہ کو چھوٹی موٹی ہدایات بھی دیتی رہی لیکن اس کے چہرے پر اُلجھن کی لکیریں موجود رہیں۔

اس کی اُلجھن کی وجہ تک پہنچنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس نے کل رات جیکی کو گاتے سنا تھا۔ یقیناً وہ نیپالی گیت پہلے بھی کبھی اس کے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ اب وہ آواز اس کے دل و دماغ میں ماضی کا کوئی نقشہ کھینچ رہی تھی۔ یہ تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ جیکی زندہ حالت میں یہاں اس چار دیواری میں موجود ہوگا...... مگر بھولی بسری آواز نے اسے پریشان ضرور کیا تھا۔

شام کو میں نے ایک بار پھر شکنتلا کو اُلجھن زدہ حالت میں دیکھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ ایک اندرونی روش پر ٹہل رہی تھی۔ وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دو جملے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ صفیہ سے پوچھ رہی تھی۔ ''دیوان کے اس رہائشی حصے میں کتنے گھر ہیں؟''

''دس بارہ تو ہوں گے جی۔ ایک دو بڑی کوٹھیاں بھی ہیں۔''

''یہاں کون کون رہتا ہے؟''

''زیادہ تر تو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ جی کے مہمان ہی ہووت ہیں۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جو زرگاں سے آپ کی طرح جیون بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔'' وہ دونوں باتیں کرتے کرتے آگے نکل گئیں۔

صفیہ اور دیگر ملازموں کو جیکی کے بارے میں کچھ خاص معلوم نہیں تھا۔ انہیں بس یہ پتا تھا کہ کوئی سخت بیمار، شرابی شخص یہاں آیا ہے۔ کسی لڑائی میں اس کی ایک ٹانگ اور بازو جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔

......وہ شام میرے لئے ایفائے وعدہ کی شام تھی۔ آج میں نے اپنے محسن باروندا جیکی کے لئے کچھ ایسا انتظام کرنا تھا کہ وہ اپنی گمشدہ محبت کو جی بھر کر دیکھ سکے...... پوری تسلی کے ساتھ اس چہرے کا دیدار کر سکے جس کی یاد وہ کئی موسموں سے اپنے فگار سینے میں چھپائے پھرتا ہے۔ شکنتلا مجھ سے وہ ساری روداد پوچھنا چاہتی تھی جب میں جارج گورا کے محل نما گھر

سے نکلا تھا اور چھپتا چھپاتا انور خاں وغیرہ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام کو اس کے پاس آؤں گا اور سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ میرے اس وعدے کے پیچھے دراصل باروندا جیکی سے کیا ہوا وعدہ ہی تھا۔

شام کے بعد میں تھوڑے سے تناؤ میں تھا لیکن سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہی ہوا۔ میں جیکی کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں پہنچا چکا تھا۔ شکنتلا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ باتیں تو میرے ساتھ کر رہی ہے لیکن اسے دیکھ کوئی اور رہا ہے۔ اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ، اس کے اُٹھنے بیٹھنے کا انداز سب کچھ کسی کی بے حد مشتاق نگاہوں کے گھیرے میں تھا۔ آج وہ کچھ زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ شام کچھ زیادہ حسین تھی یا پھر اس کی اپنی ذات کی وجہ سے شام کا حسن بڑھ گیا تھا۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے گلابی آنچل کے نیچے اس کے طلائی جھمکے دمکتے تھے اور اس کی صراحی دار گردن کے پس منظر میں اس کے لمبے بالوں کا آبشار نظر آتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ دو آنکھیں اس کے سراپا کو پلکوں سے چوم رہی ہیں۔

ہاں...... وہ بڑی رومانی شام تھی لیکن اس شام میں جس طرح کا رومان ہو رہا تھا، وہ عام ڈگر سے بہت مختلف تھا۔ کوئی سراپا شوق تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کوئی سراپا غفلت تھا اور اسے دیکھا جا رہا تھا۔

ہماری نشست ختم ہونے کے قریب تھی جب قریبی کمرے سے کھانسی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یہ جیکی کی آواز ہی تھی۔ کھانسی شروع ہونے کے فوراً بعد اس نے شاید اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' شکنتلا نے قدرے چونک کر پوچھا۔ اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

''کوئی ملازم ہے شاید۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کر جالی دار کھڑکی کا اَدھ کھلا پٹ بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں شکنتلا سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

O......❖......O

جیکی اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ جیکی ہی کا کمرا تھا۔ جیکی کے بیمار جسم کی ہلکی سی باس کمرے میں رچی بسی تھی۔ جیکی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان آنکھوں میں تشکر، خوشی، حسرت اور ممنونیت کے جذبات گڈمڈ تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ اب میرے لئے مرنا اور آسان ہو گیا۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

''آپ پھر وہی بات کر رہے ہو...... اب تو آپ کو جینے کی بات کرنی چاہئے اور آپ کو کرنی پڑے گی۔ بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے، اب آپ کو بھی تبدیل ہونا پڑے گا۔ ہم نے اب آپ کو بھلا چنگا کر کے چھوڑنا ہے۔ کل بہت اچھے ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔''

اس نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو چھت کی طرف اُٹھایا اور کھانستے ہوئے بولا۔

''میں بہت سا سفر طے کر چکا ہوں۔ اب مجھے واپس بلانے کی باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔''

''اب آپ کو واپس آنا پڑے گا جناب...... کیونکہ اب واپسی کی نہایت خوب صورت اور شان دار وجوہات موجود ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اب ایسا نہیں ہو سکے گا تابش! اب تو زندگی کی شام گہری ہو چکی ہے۔''

''یہ شام نہیں تھی جناب! بس بادل تھے جن کی وجہ سے آپ نے دوپہر کو شام سمجھ لیا تھا۔ بہت جلد آپ کی زندگی کا سورج نصف النہار پر چمکے گا۔''

وہ نفی میں سر ہلاتا رہا پھر بولا۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں غلطی سے بھی شاکن (شکنتلا) کو میرے سامنے مت لانا۔ یہ میرے لئے اتنا ہی سخت ہوگا جتنا ایک ہزار بار جان کنی کے عذاب میں سے گزرنا۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری اپنی سوچ جو بھی ہو، میں وعدے کی پابندی کروں گا۔ اس کی مرضی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس رات جیکی نے معمول سے زیادہ پی۔ اس کی گندی خود رو داڑھی تر بتر ہوگئی۔ وہ اپنی آنکھیں بہت کم کھول رہا تھا۔ جیسے وہ شکنتلا کے دیدار کی راحت کو اپنی پلکوں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ مجھے اس کی باتوں سے شک ہو رہا تھا کہ وہ اب کسی طرح یہاں سے نکل جانے کا سوچ رہا ہے...... اس کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ موسم میں اب کافی خنکی آ چکی تھی۔ غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ میں کمبل لینے کے لئے الماری کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نظر کھڑکی سے گزر کر اس رہائشی پورشن کی طرف گئی جہاں جیکی قیام پذیر تھا۔ یہ پورشن باقی حصے سے علیحدہ تھا اور وہاں تک جانے کے لئے، ایک خم دار گلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ مجھے جیکی کے کمرے کی طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ یہ خلاف معمول تھا۔ وہ تاریکی میں سونا پسند کرتا تھا۔ میں کمرے سے نکلا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ بس کہیں کہیں بوجھل آنکھوں والے پہرے دار منڈلا رہے تھے۔ میں خم دار گلی سے گزر کر جیکی کے کمرے تک پہنچا۔ یہ دیکھ

کر مجھے شاک پہنچا کہ جیکی کے کمرے کا تالا کھلا ہوا ہے۔ اندر نیلگوں بلب کی ہلکی سی روشنی تھی۔ میں دروازہ کھولنے کے بجائے کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کے ایک نیم وا پٹ میں سے میں کمرے کا وسطی منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ اس منظر نے میرے پاؤں زمین میں گاڑ دیئے اور میں جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ میں نے کمرے کی خاموش نیلی روشنی میں شکنتلا کو دیکھا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کے بال اس کی گود میں کنڈلی مارے ہوئے تھے۔ شکنتلا کے سامنے جیکی تھا۔ وہ گہرے نشے میں بے سدھ پڑا تھا۔ بس اس کی سانس کی آمد و رفت سے پتا چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے سنولائے ہوئے جسم پر بس وہی ایک لنگوٹ تھا۔ اس کی ایک ایک پسلی اور ہڈی علیحدہ سے گنی جا سکتی تھی۔ اس کا چہرہ خستہ جانی کی بدترین مثال تھا۔

شکنتلا یک ٹک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں سے تواتر کے ساتھ پانی کے موتی گر رہے تھے۔ میں تحیر کے عالم میں دیکھتا چلا گیا۔ شکنتلا کے چہرے پر محبت کسی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ اس کے نازک نتھنے جذبات کی شدت سے بے ساختہ پھڑک رہے تھے۔ پھر میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ جیکی کی حالت اور بدبو کی پروا کئے بغیر وہ آگے بڑھی۔ جیکی کے سرہانے کی طرف بیٹھ کر اس نے جیکی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ ''جیکی...... جیکی......!'' شب کے جادوئی سناٹے میں اس کی جذباتی سرگوشی گونجی۔ یہ سرگوشی محبت کے اس عظیم رشتے کی گواہ تھی جو بظاہر کچے دھاگے سے بھی کمزور ہوتا ہے لیکن جس کی طاقت دو انسانوں کو اس طرح باندھتی ہے کہ جبر و ستم کی سخت ترین آندھیاں بھی انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ حکم اور جارج گورا جیسے ہزار ہا لوگ اس نازک دھاگے کو توڑنے کے لئے ہر زمینی حربہ آزماتے رہے ہیں لیکن ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ بے شک وہ پیار کرنے والوں کو مارنے میں کامیاب ہوئے لیکن پیار کو نہ مار سکے۔ ہاں...... یہ وہی پیار بھری سرگوشی تھی۔

اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے اس کے گرد آلود بال سہلائے، اس کے گال تھپتھپائے۔ اسے کئی بار ہولے ہولے جھنجوڑا۔ ''جیکی...... جیکی...... آنکھیں کھولو۔'' اس نے اس کا سر اپنی بانہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی گھنی زلفوں نے بکھر کر جیکی کا سر اور کندھے ڈھانپ لئے۔ وہ اسے چومنے لگی، ہولے ہولے پکارنے لگی۔ پھر میں نے جیکی کے جسم میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا بیدار ہو رہا تھا......

شکنتلا نے اسے خود سے جدا کیا۔ تر بتر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھنے

لگا۔ بالکل خالی خالی نگاہوں سے...... جیسے اس منظر کو اپنے کسی حسین سپنے کا حصہ سمجھ رہا ہو۔ پھر ہولے ہولے جیکی کے ہڈیوں بھرے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے اور پھیلتے چلے گئے۔ شکنتلا نے ایک بار پھر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ ''جیکی! یہ کیا ہو گیا؟ تم کیا سے کیا بن گئے...... جیکی! یہ سب میرے کارن ہوا ہے نا؟ میں ہی تمہاری دوشی ہوں نا؟ جیکی! مجھے بتاؤ، میں ہی دوشی ہوں نا؟''

جیکی خاموش تھا۔ بس کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اُسے جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک حقیقی منظر دیکھ رہا ہے۔ میں کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔ میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ حسن و عشق کی جو ملاقات آج میں نے دیکھی تھی، وہ کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی۔

یہ بات سمجھنا اب میرے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا کہ مضطرب شکنتلا رات کو ان در و دیوار میں چکراتی رہی تھی اور آخر جیکی کے کمرے تک جا پہنچی تھی۔

......قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ جا کر کھڑکی سے آنکھ لگائی۔ وہ اسی طرح اس کے بدبودار جسم کو اپنی خوشبودار ریشمی آغوش میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کے لئے وقت کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ جیکی کا اکلوتا ہاتھ شکنتلا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ منظر دیگر لوگ بھی دیکھیں۔ میں نے اس پورشن کی طرف آنے والے تمام دروازے مقفل کرا دیئے۔

صبح کے وقت میں نے محسوس کیا کہ جیکی کی سانس رک رک کر آ رہی ہے۔ درحقیقت اس کی طبیعت کل رات سے ہی مسلسل بگڑ رہی تھی۔ اسے فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت تھی اور جاپانی ڈاکٹر کو دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچنا تھا۔

میں ڈاکٹر چوہان کے پاس پہنچا۔ اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی تفصیل جان کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ آیا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے اور جیکی کو بہ مشکل شکنتلا سے علیحدہ کیا۔ پھر بھی وہ مکمل طور پر علیحدہ نہیں ہوئی۔ اس نے جیکی کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چوہان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کئے۔ اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو چکا تھا اور نبض ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

جیکی کی حالت کے پیشِ نظر جاپانی ڈاکٹر لی وان نو بجے ہی دیوان میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اسسٹنٹ اور ایک بڑا میڈیکل باکس بھی لایا تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک جاپانی ڈاکٹر لی وان، جیکی کی حالت کے ساتھ نبرد آزما رہا...... اس کی مسیحائی سے جیکی کی حالت سنبھلنا شروع ہوگئی۔ اس کی سانس میں بھی قدرے روانی آ گئی لیکن

ڈاکٹر لی وان ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ مریض ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ خاص طور سے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔

رات بارہ ایک بجے کے قریب جیکی کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ شکنتلا نے اسے مسلسل اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ اس کا سر شکنتلا کی گود میں تھا۔ وہی اسے دوا وغیرہ بھی کھلا رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ جیکی شراب کے سوا کسی اور شے کے لئے منہ کھول ہی نہیں سکتا اور دوا کے لئے منہ کھولنا تو اچھے بھلے لوگوں کے لئے کافی مشکل ہوتا ہے۔ شکنتلا کے کہنے پر جیکی نہ صرف دوا کے لئے منہ کھول رہا تھا بلکہ دوا کو نگل بھی رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر شکنتلا اس کے منہ میں جلتا ہوا انگارہ بھی رکھ دے گی تو وہ بغیر آہ کئے اسے گلے میں اتار لے گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی مگر جیکی کی حالت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ چوہان ہی کی ہدایت پر دو تین بار شکنتلا نے تھوڑی تھوڑی شراب بھی جیکی کو پلائی مگر لگتا تھا کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ یا تو وہ اتنی کم مقدار میں تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا...... یا پھر اس کی طبیعت ابتر تھی۔

دوپہر کو چوہان اور میں نے شکنتلا کی بہت منت سماجت کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لے اور کچھ کھا پی لے لیکن وہ تو اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ شام کو جاپانی ڈاکٹر لی وان نے جیکی کو گلوکوز کی ڈرپ لگائی اور ڈرپ میں کچھ دوائیں بھی انجیکٹ کیں۔ اس سے یہ ہوا کہ جیکی غنودگی میں چلا گیا۔ اس کی سانس بھی کچھ ہموار ہوگئی۔ رات کو ہم نے پھر زور لگایا اور شکنتلا کو ایک دو گھنٹے آرام کے لئے آمادہ کر لیا لیکن وہ کہیں گئی نہیں۔ وہیں جیکی کے کمرے میں ایک گوشے میں سمٹ کر لیٹی رہی۔

میں نے جیکی کا سر اپنے زانو پر لے لیا۔ آج سردی خاصی زیادہ تھی۔ کھڑکیوں کی درزوں میں سے سرد ہوا سرسراتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ جیکی حسبِ معمول ایک لنگوٹ میں تھا۔ میں نے اس پر ایک کمبل ڈالنا چاہا۔ اس نے اضطراب کا اظہار کیا اور کمبل پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا کہ میں اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی سرگوشی میں بولا۔ ''تم...... بھی...... اپنا کمبل اتار پھینکو۔''

میں نے کمبل نہیں لیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جیکی علامتی یا رمزیہ بات کر رہا ہے۔ مجھے بتا رہا ہے کہ میں بھی جسمانی راحتوں کے حوالے سے اپنا وطیرہ بدلوں۔ وہ پہلے بھی مجھ

سے اس موضوع پر بات کرتا رہا تھا۔ آج پھر اس نے اسی موضوع پر چند سرگوشیاں کیں۔ اس نے اٹک اٹک کر بے حد لڑکھڑاتی آواز میں جو کچھ کہا، وہ اس طرح تھا ''......تن آسانی ہمیں کمزور کرتی ہے۔ ہم جتنی زیادہ جسمانی سختیاں جھیلتے ہیں، اتنے ہی مضبوط اور زورآور ہوتے ہیں۔ افریقا کے ریگستانوں میں جہاں دوپہر کے وقت ریت انگاروں کی طرح دہکتی ہے، جان دار زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح جمی ہوئی برف کے اندر بھی آبی مخلوق سانس لیتی ہے...... تو پھر ہم کیوں موسموں کا جبر نہیں جھیل سکتے؟ ہم کیوں...... بھوک پیاس...... تھکن اور درد سے نہیں لڑ سکتے...... ایسا ہو سکتا ہے...... اور جو لوگ ایسا کرنا سیکھ جاتے ہیں...... کوئی ان سے جیت نہیں سکتا۔''

بات کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اس کی پیشانی سہلائی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سرگوشی جاری رہی۔ ''جو درد، تکلیف اور سختی کا سامنا کرتے ہیں، وہی راحت، خوشی اور فتح کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ بڑا ہی سادہ فارمولا ہے...... جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی...... جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ کامیابی......''

وہ دھیرے دھیرے بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کی باتیں میرے دل کے اندرونی تاروں کو چھیڑتی تھیں۔

''کچھ'' تھا اس میں جو وہ مجھے دینا چاہتا تھا...... اور جو کچھ وہ دینا چاہتا تھا اس کے لئے میرے اندر ایک خلا موجود تھا۔

صبح سے کچھ دیر پہلے اس کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ شکنتلا پھر بے چین ہو کر اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اس نے اس کا سر پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔

شکنتلا کا لمس پاتے ہی جیکی جیسے پھر سے جی اُٹھتا تھا۔ امید پیدا ہونے لگتی تھی کہ وہ بے شمار دیگر مقابلوں کی طرح موت سے یہ مقابلہ بھی جیت جائے گا۔

صبح سویرے ڈاکٹر لی وان بھی آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خاص انجکشن لایا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ انجکشن جیکی کی طبیعت سنبھالنے میں بہت مدد دیں گے۔ اپنی دواؤں میں سے ان انجکشنز کا مل جانا لی وان ایک کرشمہ سمجھ رہا تھا۔

یہ انجکشنز بھی گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے ہی جیکی کی ورید میں انجیکٹ کیے جانے تھے۔ ڈاکٹر لی وان ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ شکنتلا کو موقع سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن وہ تو جیسے جیکی کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کسی صورت جدا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ ابھی ڈاکٹر نے جیکی

کو ڈرپ لگائی نہیں تھی کہ اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا مدقوق چہرہ بالکل زرد پڑ گیا اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ ڈاکٹر لی وان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کیے اور وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ٹمپریچر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ فی الحال ڈرپ نہیں لگائی جا سکتی۔''

''بلڈ پریشر کیا ہے؟'' ڈاکٹر چوہان نے پوچھا۔

''وہ بھی بڑھا ہوا ہے۔'' ڈاکٹر لی وان کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا ''اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ یہاں مشکل ہو جائے گی۔ آپ لوگ گاڑی کا انتظام کریں۔ اگر کار وغیرہ ہو جائے تو بہتر ہے۔''

چوہان بھاگتا ہوا باہر گیا اور دو چار منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کار تو نہیں ملی لیکن گھوڑا گاڑی آ گئی ہے۔

ہم نے ہلکے پھلکے بارونداجیکی کو احتیاط سے اُٹھایا اور گاڑی میں پہنچا دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ادھورے جسم کا وزن بیس پچیس کلو سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک آرام دہ فوجی گاڑی تھی۔ چار نہایت توانا گھوڑے اسے کھینچ رہے تھے۔ ہم برق رفتاری سے ڈاکٹر لی وان کے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ اب سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھیں۔ بلند عمارتوں کے خوب صورت چوبارے اور عبادت گاہوں کے گنبد و کلس اس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آرام دہ گاڑی حتی الامکان رفتار سے جا رہی تھی۔ جیکی کا سر شکنتلا کے زانو پر تھا۔ اس نے خود کو پوری طرح جیکی پر جھکا رکھا تھا۔ یکایک جیکی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ بل کھا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر چوہان اور شکنتلا نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔ شکنتلا نے بہ مشکل اسے ایک گھونٹ پانی پلایا۔ اس نے جیکی کو اپنے سہارے بٹھایا ہوا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور خالی خالی نظروں سے گھوڑا گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر نل پانی کے باغات نظر آ رہے تھے۔ ہم اب آبادی کے مضافات میں تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ جیکی کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹ نیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر شکنتلا کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر شکنتلا نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بہت مدھم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شکنتلا بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر شکنتلا نے ڈاکٹر چوہان سے مخاطب ہو کر دل فگار آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر! گاڑی رکوایئے۔''

چوہان چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے شاہی کوچبان سے کہا کہ وہ گاڑی روک دے۔ گاڑی رک گئی۔ جہاں گاڑی رکی، وہاں سرسبز کھیتوں کے درمیان دور تک شفاف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس پانی پر عجیب سی نیلاہٹ تھی۔ یہ نیلاہٹ دراصل کنول کے بے شمار پھولوں کی تھی۔ جیکی نے شاید اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر ہی گاڑی رکوائی تھی۔ شکنتلا اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے کوچبان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا گاڑی اس پانی میں جا سکتی ہے؟

کوچبان نے آگے جا کر پانی کا جائزہ لیا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب وہ روتے ہوئے بولی۔ ''گاڑی کو پانی میں لے جاؤ۔''

ہم سب جان گئے تھے کہ یہ جیکی کی خواہش ہے اور شاید یہ خواہش آخری خواہش کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ بس تھوڑی دیر کا مہمان تھا اور لگتا تھا کہ جاپانی ڈاکٹر لی وان نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے جیکی کی اس انوکھی خواہش کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اُتر گئے۔ صرف جیکی اور شکنتلا موجود رہے۔ وہاں زمین پر پانی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ کوچبان گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہانکتا ہوا آگے تک لے گیا۔ وہاں چاروں طرف سنہری دھوپ تھی اور کنول کے ہزار ہا پھول سرما کے اوّلین جھونکوں میں ہولے ہولے رقص کر رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی سفید بطخ یا مرغابی کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ کوچبان گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتا ہوا واپس آ گیا۔

سب کی آنکھیں نم تھیں۔ چمکیلی منقش گاڑی کنول کے اَن گنت پھولوں کے درمیان ساکت کھڑی تھی اور اس گاڑی میں شکنتلا اور جیکی کے ہیولے نظر آ رہے تھے...... جیکی کو وہ کشتی اور وہ جھیل تو نہیں مل سکی تھی جو اس کی سنہری یادوں کا حصہ تھی لیکن اس سے ملتا جلتا منظر ضرور مل گیا تھا...... اور پھر اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ شکنتلا کی بانہوں میں تھا۔ ایسا تو شاید کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ ایک عظیم نیپالی فائٹر تھا لیکن اس کے چٹانی جسم کے اندر ایک شاعر کا سا گداز بھی موجود تھا اور یہ شاعر ایک آئیڈیل موت چاہتا تھا۔ ایک خوب صورت الوداعی منظر...... اور یہ سب کچھ اسے مل گیا۔

ہونی ہو کر رہتی ہے اور قدرت کے اصول آسانی سے نہیں بدلتے۔ سورج نصف النہار کے قریب تھا جب جیکی مر گیا۔ چمکیلے پانی کے درمیان اور ہزار ہا پھولوں کے بیچ۔ اس کی آخری ہچکی شکنتلا کی ریشمی گود میں جذب ہوئی۔ شکنتلا کے رونے کی آوازوں سے ہمیں پتا چلا کہ کھیل

ختم ہو چکا ہے۔ ہم کنارے سے پانی میں چلے گئے۔ وہ گھوڑا گاڑی کی ایک آرام دہ نشست پر ساکت لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی تھی اور نقوش گواہی دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہموار طریقے سے زندگی کی سرحد پار کر گیا ہے۔ چوہان نے اس کا جسم ایک کمبل سے ڈھانپ دیا۔ گاڑی کے اندر سے یہی لگ رہا تھا کہ یہ کوئی جھیل ہے اور ہم کشتی میں بیٹھے ہیں۔

ہم گھوڑا گاڑی کو اس پانی سے باہر لائے۔ شکنتلا اب بھی جیکی کے ساتھ پیوست تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اس نے اپنے جھمکے اتار دیئے۔ قیمتی ہار بھی اتار پھینکا۔ اس کے بعد اس نے کسی بیوہ کی طرح اپنی چوڑیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر مار کر توڑ ڈالیں اور ایک سفید چادر سے اپنا سراپا ڈھانپ لیا۔

دِل دریا سمندروں ڈونگے، کون دِلاں دیاں جانے ہُو

O……❖……O
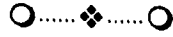
جیکی کی موت نے مجھے گہری افسردگی کا شکار کر دیا۔ میں اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا جہاں میں اور جیکی مشق کیا کرتے تھے...... میں چھت سے جھولتے ہوئے سینڈ بیگ کو دیکھتا رہتا اور وہ سارے مناظر میری نگاہوں کے سامنے آتے جن میں جیکی میرے ساتھ تھا...... شکنتلا بھی بے پناہ غم کے گھیرے میں تھی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ صفیہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار بہ مشکل اس کو تھوڑا بہت کھلا دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر بعین یہی لگتا تھا کہ وہ ایک جوان بیوہ ہے۔

ایک دن چوہان میرے پاس آن بیٹھا۔ وہ اجے کے ساتھ مل کر سلطانہ کی تلاش سرگرمی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ ہم کچھ دیر تک سلطانہ کے بارے میں بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ حسبِ معمول جیکی اور شکنتلا کی طرف مڑ گیا۔

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''کاش! ہم کسی طرح جیکی کو بچا سکتے۔''

چوہان بولا۔ ''ہم نے اپنی سی کوشش تو کی ہے تابش! اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو بڑی تیزی سے خرچ کیا...... شاید وہ خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ وقت ایک بار پھر اسے شکنتلا کے رُوبرو لائے گا تو وہ موت کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا۔'' میں نے کہا۔

''مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم آنے والے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہی نظامِ قدرت ہے۔ بہرحال...... اس بات کا تو اطمینان ہے کہ جیکی کا آخری وقت نسبتاً آسان ہو

گیا۔اس نے اس ہستی کی بانہوں میں جان دی جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔''

میں تصور کی نگاہ سے جیکی کا وقتِ رخصت دیکھنے لگا۔آخری لمحوں میں جیکی کی خواہش پر ہم نے گھوڑا گاڑی کنول کے پھولوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیسے جان دی۔ مگر میرا خیال تھا کہ شگفتلا آخری وقت تک اسے چومتی رہی ہو گی۔ اسے اپنی بانہوں کا گداز دیتی رہی ہو گی۔

چوہان بولا۔''چلو آؤ، باہر چلتے ہیں۔ آج کئی دن بعد دھوپ نکلی ہے۔ ذرا گھومیں پھریں گے۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''تمہارا غم ذرا ہلکا ہو گا۔جیکی کی طرف سے دھیان ہٹے گا۔''

''لیکن میں دھیان ہٹانا نہیں چاہتا۔ میں اسے یاد رکھنا چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ یاد رکھنا چاہتا ہوں جو وہ مجھ سے کہہ گیا ہے...... اور وہ بھی جو وہ کہہ نہیں سکا۔''

''کیا کہہ نہیں سکا؟''

''وہ جو اس کی جسمانی حالت کہتی تھی۔ اس کی اجاڑ آنکھیں کہتی تھیں...... وہ بھی ہماری طرح حکم جی اور جارج کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ زبان سے نہیں کہتا تھا لیکن جارج کی بے رحمی کے لگائے ہوئے چرکے اس کے سینے میں تو تھے نا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' چوہان نے سرد آہ بھری۔

''میں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا ہوں چوہان۔'' میں نے گمشدہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں جارج گورا سے رُوبرو ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بہت سارے قرض ہیں مجھ پر۔''

''تم جذباتی باتیں کر رہے ہو تابش! جارج کوئی پہلوان نہیں ہے جسے تم للکارو گے تو وہ کشتی لڑنے کے لئے تمہارے سامنے آجائے گا۔''

''وہ ہے پہلوان...... چوہان! ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ فلموں کا کوئی روایتی ولن نہیں ہے جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف اپنے چمچوں کے زور پر داداگیری کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر یورپین کی طرح خود کو بہت اسمارٹ سمجھتا ہے اور اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ بھی ہے۔ میں اس کے اس گھمنڈ کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سامنے پستول پھینکا تھا اور مجھے دعوت دی تھی کہ میں یہ پستول اُٹھا کر اس پر چلاؤں...... تب میں ایسا نہیں کر سکا تھا لیکن

اب میرا دل کہتا ہے کہ میں ایسا کر سکوں گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا دل سچ کہہ رہا ہے یا پھر اب بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔''

''جلد بازی نہ کرو تابش! تمہیں خود کو آزمانے کے بڑے موقع ملنے والے ہیں۔'' چوہان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''لڑائی ختم نہیں ہوئی، صرف ٹلی ہے۔ کوئی بھی نیا واقعہ کسی بھی وقت اس آگ کو بھڑکا سکتا ہے۔ تمہیں پرسوں رات والی خبر ملی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔''ابھی یہ خبر پوری طرح پھیلی نہیں لیکن چند گھنٹوں میں ہر ایک کی زبان پر ہو گی۔ کل رات زرگاں میں تین بندے قتل ہوئے ہیں۔ یہ تینوں زرگاں کی جیل کے افسر ہیں اور جارج کے ماتحت۔ ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ جگہوں پر قتل کیا گیا ہے۔ دو کو گھر میں اور ایک کو عیاشی کے اڈے پر۔ ان تینوں بندوں کو بڑی بے دردی سے تیز دھار آلے کے وار کر کے مارا گیا ہے۔ شہر میں سخت خوف و ہراس پایا جا رہا ہے۔''

''کس کا کام ہو سکتا ہے؟''

''زرگاں میں تو عام خیال یہ ہے کہ قاتل وہی ہیں جنہوں نے کچھ دن پہلے جارج کی بہن ماریا کو اغوا کیا اور پھر اپنے مطالبے منوانے کی کوشش کی...... لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ماریا کو اغوا کرنے والوں میں تمہارے اور اسحاق کے علاوہ فیروز اور احمد تھے۔ وہ دونوں تو ختم ہو چکے ہیں اور تم دونوں یہاں نل پانی میں ہو۔''

''تو پھر کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں برق سی کوند گئی۔ دھیان سیدھا سلطانہ اور اس کی دو فٹ لمبی تلوار کی طرف گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھیں یاد آئیں...... اور ان آنکھوں میں خاموشی سے کوندتی ہوئی وہ بجلی جو خون کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی تھی۔

میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔''تم صاف کیوں نہیں بتاتے...... یہ کس نے کیا ہے؟''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔''ابھی وشواس سے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جو شک تمہارے ذہن میں آیا ہے، وہ میرے ذہن میں بھی ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے

ذہن میں بھی آئے گا۔ ابھی تک جو اطلاع پہنچی ہے اس کے مطابق ان تینوں وارداتوں کا کوئی چشم دید گواہ تو نہیں لیکن شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو افراد کا کام ہے...... اور انہوں نے خاص قسم کی تلواریں استعمال کی ہیں۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سلطانہ واقعی وہاں پہنچ چکی ہو؟''

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔'' چوہان نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہو چکا ہے......''

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح چوہان کا دماغ بھی گھڑ دوڑ کا میدان بن چکا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا چوہان؟ اگر وہ واقعی زرگاں میں ہے تو پھر وہ لوگ اسے اور طلال کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔''

''ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے تابش! ابھی تو ان لوگوں کو اپنی پڑی ہو گی...... تین اہم ترین بندے قتل ہوئے ہیں۔ وشوا ناتھ نام کا جو اسسٹنٹ اپنے گھر کے کمرے میں مارا گیا ہے، وہ پرلے درجے کا عیاش مشہور تھا۔ زرگاں کے بازارِ حسن میں جو بھی خوب صورت طوائف پیشہ شروع کرتی تھی، اسے پہلے وشوا ناتھ کے پاس حاضری لگوانی پڑتی تھی۔ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والی طوائف اور اس کے وارثوں پر سخت مصیبت نازل ہوتی تھی۔ کل رات بھی وشوا ناتھ اپنے بیڈروم میں ایک نئی لڑکی کو پیشے کا ''اجازت نامہ'' دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اتفاقاً اس کے دونوں ملازم نشے میں مدہوش پڑے تھے، اُٹھ نہیں سکے۔ وشوا ناتھ نے پہلے ملازموں کو گالیاں دیں پھر دستک دینے والے کی ایسی کی تیسی کرتا ہوا باہر نکلا۔ نوجوان طوائف زادی کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو وہ ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ اسے گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے ہی وشوا ناتھ منہ کے بل پڑا نظر آیا۔ اس کے فربہ جسم پر درجنوں زخم تھے۔ لگتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی تیز دھار آلے کے وار کیے گئے ہیں۔ اس کا پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا ملا ہے۔ شاید آخری وقت میں اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی روتی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دوسری واردات جارج گورا کے گھر کے بالکل پاس ہوئی ہے۔ یہاں بھی جیل کے ایک بڑے افسر ارون لال کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ غسل خانے میں قتل ہوا ہے۔ اس کا گلا پہلے اس کے ازار بند سے گھونٹا گیا پھر تیز دھار آلے کے پے در پے وار کیے گئے۔ ارون کی پتنی ساتھ والے کمرے میں بے خبر سوتی رہی۔ تیسرے قتل کے بارے میں ابھی تفصیل سامنے نہیں آئی

ہے۔''

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اگر ہمارا شک درست تھا اور ان واقعات کے پیچھے واقعی سلطانہ اور طلال تھے تو پھر آنے والے دنوں میں حالات کوئی بھی سنگین رخ اختیار کر سکتے تھے۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح زرگاں چلا جاؤں؟''

''لگتا ہے کہ تمہاری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ تم جارج تک پہنچنا چاہتے ہو۔''

''اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے چوہان...... سلطانہ زرگاں میں ہے۔ وہ جارج کو نشانہ بنانا چاہ رہی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ اس کوشش میں اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ تو کیا مجھے اس کی مدد نہیں کرنی چاہیے؟ یہاں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ اپنی جان گنوا لے یا کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو جائے؟''

چوہان مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ابھی تو یہ سب مفروضے ہی ہیں تابش! ہم ابھی وشواس سے نہیں کہہ سکتے کہ زرگاں میں درحقیقت کیا ہوا ہے...... اور جو کچھ ہوا ہے، اس میں سچ مچ سلطانہ اور طلال ملوث ہیں بھی یا نہیں۔'' اس نے دو لمحے توقف کر کے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ''تابش! میرے خیال میں فی الوقت سوچنے والی جو سب سے اہم بات ہے، وہ کچھ اور ہے۔''

''کھل کر بات کرو۔''

''ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اس نظر نہ آنے والی زنجیر کو کیسے کھول سکتے ہیں جو حکم اور جارج نے تمہارے پاؤں میں ڈال رکھی ہے...... میرا مطلب اس مائیکرو چپ سے ہے جو تمہارے جسم میں رکھی گئی ہے۔''

میرے اندر ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کسی وقت میں واقعی اس اہم ترین نکتے کو بھول جاتا تھا کہ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، کچھ نادیدہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں گی اور میری ہر جدوجہد کو ناکام کر دیں گی۔

''تم چاہتے ہو کہ میں آپریشن کے ذریعے وہ چپ اپنے جسم سے نکلواؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، یہ بے حد ضروری ہے۔ آئندہ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے تابش، اس کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ تم واقعی آزاد ہو یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم اس اسٹیٹ سے نکلنا ہی چاہو تو بھی تمہارے اندر کی یہی چپ تمہارے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بنے گی...... تم ہمیشہ کی طرح لاچار ہو کر رہ جاؤ گے۔''

''لیکن اب تو صورت حال بدل چکی ہے، میں یہاں نل پانی میں ہوں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن چکی ہے۔ اگر میں چھوٹے سرکار سے یہ درخواست کروں گا وہ مجھے یہاں سے نکلنے دیں تو کیا وہ میری درخواست کو رد کر دیں گے؟''

''بات درخواست کی نہیں ہے تابش! شاید تمہیں اس بات کی جانکاری نہیں کہ اسٹیٹ سے باہر جانے والے راستوں پر چھوٹے سرکار اور حکم کی مشترکہ نگرانی ہے اور یہ بڑی سخت نگرانی ہے۔ نکاسی کے راستوں پر موجود ان ساری چوکیوں پر نل پانی کے ساتھ ساتھ زرگاں کی سیکیورٹی فورس بھی موجود رہتی ہے۔ دونوں طرف کے اہلکاروں کی مکمل اجازت اور تسلی کے بغیر کوئی شخص سرحد پار نہیں کر سکتا......''

چوہان نے اس حوالے سے مجھے مزید تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ جنگل میں اپنی بھاگ دوڑ کے دوران میں، میں جابجا پرانی حفاظتی چوکیاں اور مچانیں وغیرہ دیکھ چکا تھا۔ انور خاں نے بھی مجھے اس راجواڑے کی سرحدی نگرانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر چوہان نے کہا۔ ''میری رائے تو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ڈاکٹر لی وان سے رابطہ کریں اور انہیں اس بارے میں پوری تفصیل بتائیں۔ وہ ایک اچھے سرجن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ تمہارا آپریشن کریں تو وہ کامیاب رہے گا۔''

...... ہم اسی روز رات کو ڈاکٹر لی وان سے ملے۔ اس کا چھوٹا سا اسپتال نل پانی کے مضافات میں ایک خوش گوار آب و ہوا والی جگہ پر تھا۔ لی وان کو چھوٹے سرکار اور دیوان کے خصوصی معالج کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ وہ بہت کم لیکن کارآمد بات کرتا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ''مجھے باروندا جیکی کی موت کا بہت دکھ ہے۔ درحقیقت اس میں کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔ ہاں...... اگر وہ چار چھ مہینے پہلے ہمارے پاس آجاتا تو شاید ہم کچھ کر سکتے۔''

''آپ کو پتا ہے کہ وہ اصل میں کون تھا؟'' چوہان نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے چھوٹے سرکار اجیت رائے نے بتایا ہے اور یہ سب جان کر میرے دکھ میں اضافہ ہوا ہے۔ جاپان میں، مارشل آرٹ کی قدر دیگر ملکوں سے زیادہ ہے۔ نیپالی فائٹر جیکی کا نام وہاں بھی بہت سنا جاتا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نامور ہیرو کبھی ایک لاغر مریض

کی شکل میں میرے سامنے آئے گا اور لاغر بھی ایسا کہ اس پر حسرت کی نظریں ڈالنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کیا جا سکے گا۔''

ہم نے کچھ دیر تک جیکی یاد کیا...... پھر چوہان اصل موضوع پر آگیا۔ اس نے ڈاکٹر لی وان کو میرے انوکھے مسئلے کے بارے میں بتایا۔ حسبِ توقع ڈاکٹر لی وان بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ چوہان کے کہنے پر اس نے میرے سر کے عقبی حصے کو ٹٹول کر دیکھا اور ان اسٹچز کا معائنہ بھی کیا جو میری گدی پر موجود تھے۔ ڈاکٹر چوہان اور ڈاکٹر لی وان انگریزی میں بات کرتے رہے۔ ان کی گفتگو میں میڈیکل کی مشکل اصطلاحات بھی آ رہی تھیں۔

ابتدائی معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا۔ یہاں ایک چھوٹی ایکسرے مشین اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر نے میرے دو تین ٹیسٹ لئے...... اس نے فوری طور پر تو کچھ نہیں بتایا تاہم ہمیں ایک دن بعد دوبارہ آنے کے لئے کہا۔

...... میں اور چوہان تیسرے روز دوپہر کے وقت پھر لی وان کے شفاخانے پہنچے۔ وہ کچھ خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر چوہان کو الٹرا ساؤنڈ کے پرنٹس دکھائے۔ ایکسرے پر غور و خوض ہوا۔ ایکسرے میں چمکتی ہوئی مائیکرو چپ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ سے دو چار سوال پوچھنے کے بعد چوہان اور لی وان دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے دس پندرہ منٹ مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد وہ باہر آئے اور ڈاکٹر چوہان نے مجھے چلنے کے لئے کہا۔

ڈاکٹر لی وان نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔''

راستے میں گھوڑا گاڑی کے اندر چوہان نے مجھے بتایا۔ ''لی وان کا خیال ہے کہ یہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بہتر سہولتوں کی ضرورت ہے۔''

''کیوں؟''

''وہی بات جس کا ہمیں بھی ڈر تھا۔ تم نے بھی ایکسرے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسٹیل وغیرہ نے چپ پلانٹ کرتے ہوئے پوری پوری خباثت دکھائی ہے۔ یہ چپ تمہاری ریڑھ کے بالائی حصے سے بالکل اٹیچ ہے...... اور تمہیں پتا ہی ہوگا کہ ریڑھ میں 'اسپائنل میرو' ہوتا ہے جو جسم کا بہت نازک حصہ ہے۔''

''تو پھر؟''

"لی وان کا کہنا ہے کہ چپ کو نکالنا ناممکن نہیں ہے مگر اس کے لئے ایک اچھے نیورو سرجن اور جدید آپریشن تھیٹر کی ضرورت ہے۔"

میں نے لمبی سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ ڈھاک کے وہی تین پات۔ چپ نکلوانے کے لئے ضروری ہے کہ میں اسٹیٹ سے باہر جاؤں اور باہر جانے کے لئے ضروری ہے کہ میں چپ نکلواؤں۔"

"فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر لی وان رسک لینا نہیں چاہ رہا۔ ورنہ وہ خود بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ ایک اچھا سرجن ہے۔ اگر اس کام میں خطرہ محسوس کر رہا ہے تو پھر یقیناً خطرہ ہو گا۔"

"لیکن اگر میں خطرہ مول لینا چاہوں تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں لی وان سے ہی آپریشن کرانا چاہوں تو؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ لی وان مانے گا۔ ایسے لوگ اپنے پروفیشن سے بڑے کمٹڈ ہوتے ہیں۔ انہیں ایسے معاملوں میں گائیڈ نہیں کیا جا سکتا۔"

گھوڑا گاڑی اب شہر کی گنجان آباد میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ نیلگوں جھیل پر کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کنارے کے لاتعداد مکانوں میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں اور ان روشنیوں کے عکس پانی میں جھلملا رہے تھے۔ کنارے کے سبزہ زاروں میں بچے چہک رہے تھے اور خوش پوش لوگ ہنس کھیل رہے تھے...... یہ دلکش مناظر تھے لیکن میرے سینے میں عجیب سی یاسیت بھرتی جا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اتر پردیش کے جنگلات میں واقع بھانڈیل اسٹیٹ نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی جیل ہے اور میں اس جیل کی بلند و بالا دیواروں کو کبھی پار نہیں کر سکوں گا۔

یہ بڑے عجیب دن تھے۔ مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن میرے جسم پر اب بھی گرمیوں والا لباس ہی رہتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ میں رات کو کمبل یا لحاف بھی نہ لیتا۔ اسی طرح پڑا رہتا۔ یوں لگتا کہ میں جان بوجھ کر اپنے جسم کو اذیت دینا چاہتا ہوں۔ اذیت کا حصول میرے لئے ایک مشغلہ بنتا جا رہا تھا۔ میں بند کمرے میں گھنٹوں سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور خود کو سخت ترین ورزشوں میں غرق کر دیتا۔ میرے پاؤں سُوج جاتے، ناخنوں سے خون رسنے لگتا۔ مجھے لگتا کہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں

لیکن میں رکتا نہیں۔ میرے کانوں میں جیکی کی سرگوشیاں گونجتیں۔ اس نے کہا تھا۔"...... جہاں برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں سے کچھ حاصل کرنے کی حد شروع ہوتی ہے۔" میں دیوانوں کی طرح اپنا کام جاری رکھتا پھر نیم جان ہو کر یا چکرا کر گر جاتا۔

میرے جسم پر کوئی زخم لگ جاتا تو میں دوا لگانے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ اگر چوہان زبردستی اس پر کچھ باندھ دیتا تو میں موقع ملتے ہی اتار پھینکتا۔ اپنے زخم کو مزید زخمی کرنا بھی مجھے اب اچھا لگتا تھا۔ میرے اندر کچھ زبردست تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ میرا جسم بتدریج تکلیف سہنے کا عادی ہو رہا تھا۔ اب چوٹ میری ہمت کو توڑتی نہیں تھی، میرے اندر کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے کسی دشمن کا سامنا کروں۔ کوئی ہو جو اپنی تمام تر نفرت کے ساتھ میرے سامنے آئے۔ میں اسے ماروں اور وہ مجھے مار دے۔ کوئی بھی ہو۔ انگلینڈ کا جارج گورا ہو جس نے مجھے خود میری نظروں میں گرایا تھا، زرگاں کا حکم جی ہو جو ایک آسیب کی طرح اسٹیٹ کے باشندوں کے ذہنوں پر سوار تھا یا پاکستان کا سیٹھ سراج ہو جس کے ہاتھوں پر میری مقتول ماں کا خون تھا...... ہاں، کوئی بھی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس کو جواب دوں۔ اسے پتا چلے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور مجھے پتا چلے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

سلطانہ کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ ایک ہی رات میں قتل کی تین وارداتوں کے بعد کوئی نیا واقعہ بھی نہیں ہوا تھا۔ حالات میں ایک پُراسراری خاموشی تھی۔

ایک دن سردی زیادہ تھی۔ بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کمروں میں انگیٹھیاں روشن تھیں اور مرد و زن گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کے لئے کھلی جگہ پر چلا آیا۔ بارش کی سرد بوچھاڑوں نے مجھے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ میں نے بالائی جسم پر فقط ایک پتلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ میرے جسم سے چپک گئی۔ میں چلتا ہوا دیوان کی عمارت سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر بھی میں رکا نہیں اور جھیل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سخت سردی اور بارش کے سبب ہر طرف سناٹا تھا۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یوں، پانی کی یخ بستہ بوچھاڑوں میں بھاگنا مجھے اچھا لگا۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنی برداشت کو آزمانا چاہتا تھا، اپنا دم خم پرکھنا چاہتا تھا۔ اکثر شام کے وقت میں جھیل کے کنارے کنارے تین چار میل تک بھاگتا تھا لیکن آج کا بھاگنا مجھے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ جس نے مجھے دیکھا حیرت سے دیکھا۔ میں بھاگتا بھاگتا درختوں

کی طرف نکل آیا۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی اور یہی کیفیت میرے دل کو بھاتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ چند گھڑسوار میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ کوئی اور نہیں دیوان کے ہی محافظ تھے۔ جب میں باہر نکلتا تھا، یہ حفاظت کی غرض سے اکثر میرے آس پاس رہتے تھے اور آج تو میں کچھ زیادہ آگے نکل آیا تھا۔

میں گھنے درختوں میں داخل ہوا تھا تو گھڑسوار میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ کپتان اجے کے ہی ماتحت تھے۔ ایک حوالدار نے آگے آ کر کہا۔ ''جناب! آپ زیادہ آگے نہ جائیں۔ موسم بھی ٹھیک نا ہیں ہے۔''

''میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

''لیکن آپ کی حفاظت ہمری ذمے داری ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی یہ لعنتی ذمے داری پوری کرتے رہو۔'' میں نے کہا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ گیلا جوتا میرے پاؤں سے نکل گیا۔ میں نے دوسرا بھی اتار پھینکا۔ اب میں ننگے پاؤں تھا۔ میرے تلوے راہوں کی سختی سے آشنا ہو رہے تھے۔ میں انہیں مزید آشنا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر خواہش جاگتی تھی کہ میرے پاؤں میں کانٹے ٹوٹیں اور میں دوڑتا رہوں۔

دوڑتے دوڑتے میری سانس ٹوٹ گئی اور ٹانگیں یکسر جواب دے گئیں۔ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ میں نے اپنا رخ تابڑ توڑ پانی برساتے آسمان کی طرف کر لیا۔ اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا دیئے۔ کڑکتی سردی میں برفیلے پانی کی ساری سختی اپنے سراپا پر جھیلنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میرے نگراں گھڑسوار مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئے ہوں گے اور وہیں میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن مجھے اُٹھنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں وہیں لیٹا رہا۔ بارونداجیکی کے فلسفے کے مطابق درد میں ڈوب کر درد کی حقیقت معلوم کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے درد، اذیت اور بے سکونی کا احساس کم ہوتا گیا...... یخ بستہ پانی میرے جسم پر اپنا اثر کھونے لگا۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزری۔ تب اچانک مجھے لگا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں نے بوجھل پلکیں اُٹھائیں۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں وہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اجے کے باوردی حوالدار رب نواز نے اس کے اوپر ایک بڑی چھتری تان رکھی تھی۔ چوہان بولا۔ ''تابش! یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو؟ تم اپنے دشمن آپ بنے

ئے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے، ایسے موسم میں اس طرح باہر نکلنے کا؟''

''کیا ہوگا؟ مر ہی جاؤں گا نا؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''اپنا نہیں تو ان لوگوں کا خیال ہی کرو جو تم سے وابستہ ہیں۔''

''کون لوگ؟''

''سلطانہ...... تمہارا بچہ......''

''سلطانہ جا چکی ہے...... اور جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ بھی تو پل جاتے ہیں۔''

''سلطانہ جا تو چکی ہے...... لیکن زندہ ہے۔ اسے کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں تازہ اطلاع شاید تم نے نہیں سنی۔''

''کیسی اطلاع؟'' میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند ذرا کم ہوئی۔

''زرگاں والوں نے کھوج لگا لیا ہے کہ جارج کے تین ماتحتوں کو قتل کرنے والی سلطانہ ہی ہے۔''

''کیسا کھوج؟''

''ایک مقتول کی ہاتھوں کی انگلیوں سے کچھ لمبے بال ملے ہیں۔ اس کے علاوہ زرگاں کے ایک بیل گاڑی والے نے گواہی دی ہے کہ واردات کی شام ایک عورت اور ایک لڑکے نے اس کی گاڑی میں سفر کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ عورت، مختار راجپوت کی بیٹی ہی تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''اس سے یہ فرق پڑے گا کہ سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس کی رکھشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''اب تک سوچ ہی تو رہے ہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

چوہان نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور واپس دیوان میں آ گیا۔ راستے میں وہ مجھے مسلسل سمجھاتا رہا۔ میرے طرزِ زندگی کو حماقت قرار دیتا رہا اور میانہ روی کے مشوروں سے نوازتا رہا۔ اس کی باتیں مجھ پر بے اثر تھیں۔ میں کسی اور ہی رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا۔ قریب المرگ بارونداجیکی کچھ بیج بو گیا تھا میرے اندر اور یہ بیج اب لہلہاتے پودے بن رہے تھے۔

قیام گاہ پر واپس پہنچ کر میں نے چوہان کے بے حد اصرار پر کپڑے بدلے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہم دونوں نے چائے پی اور لکھنوی طرز کے کباب کھائے۔ رات نو دس بجے کے قریب چوہان واپس چلا گیا۔ میں نے آتش دان بجھا دیا۔ مجھے ہر طرح کی آسائش سے

نفرت ہوتی جارہی تھی۔

کچھ دیر تک کھڑکی میں بیٹھ کر رم جھم برستی بارش کا نظارہ کرنے کے بعد میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ میں بے چینی کے اس احساس کو کوئی نام تو نہیں دے سکا تاہم بستر پر دراز ہوگیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے میں ایک چھوٹا بلب روشن رہنے دیا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی روشنی آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔

اچانک وہ بندہ اسٹور روم کے دروازے سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس کا سیاہی مائل چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے سگریٹ سلگایا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ میرا پستول ہولسٹر میں تھا اور یہ ہولسٹر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر اس کی سرسراتی سرگوشی نے میرے قدم روک دیئے۔ ''ناہیں، میرے پو صاحب! جیادہ پھرتی دکھانے کی جرورت ناہیں۔ پستول بہت دور ہے۔ اس سے بہت پہلے آپ کی کھوپڑیا اڑ جائے گی۔'' وہ پھنکارا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ رنجیت پانڈے تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔ اس سے پہلے سرنگ کے دہانے پر میں نے اس کی ادھوری سی جھلک دیکھی تھی۔ آج وہ پورے کا پورا میرے سامنے تھا۔ وہ کسی گینڈے کی طرح ٹھوس تھا۔ گہری سانولی رنگت کے ساتھ براؤن آنکھیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں لیکن اس کی آنکھیں براؤن تھیں اور ان میں دنیا بھر کی خباثت جمع تھی۔ یہ ایک نہایت عیار و سفاک شخص کی آنکھیں تھیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''تو تم ہو پانڈے؟''

''جی پو صاحب! مجھ کھاکسار (خاکسار) کو ہی پانڈے کہوت ہیں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر زہریلے انداز میں کہا۔

''تم یہاں کیسے آئے؟''

اس نے ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ ''آپ جناب نے بڑا مجے دار سوال پوچھا ہے۔ اس کا جواب تو کئی میٹر لمبا ہے...... مختصر یہ کہوں گا کہ ایسا کبھی ہوا ناہیں ہے کہ آپ کے اس کھاکسار نے کہیں پہنچنا ہو...... اور پہنچ نہ سکا ہو۔ بس یہ دروازے اور دیواریں اسے کھد بہ کھد رستہ دیتے چلے جاتے ہیں۔''

اس کے کالے ماتھے پر ایک چھوٹا قشقہ تھا جو اس کے کٹر ہندو ہونے کی نشانی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کچھ کرنے کا سوچا لیکن اس کی سانپ جیسی نظریں ایک ساتھ اس پورے کمرے اور کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پھر پھنکارا۔ ''ناہیں پو صاحب! آپ

حرکت کریں گے تو گولی چلانا پڑے گی اور آپ کی بدقسمتی یہ ہووے گی کہ میرا نشانہ کبھی کھتا (خطا) ناہیں جاتا۔''

میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے موت ہے اور وہ مجھے ویسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے پستول اپنی پتلون میں سامنے کی طرف اڑسا ہوا تھا۔ یہ اس کا بے پناہ اعتماد تھا کہ اس نے پستول اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ درجنوں پہرے داروں کی موجودگی میں نہ صرف دیوان کی عمارت کے اندر پہنچا بلکہ میرے کمرے تک بھی پہنچ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔

میں نے اسے نگاہوں نگاہوں میں تولا۔ میرے جسم میں عجیب میٹھا میٹھا سا درد ہونے لگا۔ ایک لہر سی سر کی طرف سے چلی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میرا سینہ ہلکے ہلکے جوش سے دھڑکنے لگا۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت جاگ اُٹھی۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''آپ کے گھر مہمان آیا ہے یہ کمی کمین بندہ۔ کوئی کھاطر تواجع ناہیں کریں گے؟''

''کس قسم کی خاطر تواضع چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ لگا کہ ہنسا۔ ''اجی کوئی شراب یا لونڈیا تو ناہیں مانگ رہا۔ بس ہنس کر بات کر دیجئے۔ یہی ہمری کھاطر ہو جاوے گی۔''

''سیدھی بات کرو۔ چاہتے کیا ہو؟'' میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اس نے میری سنجیدگی محسوس کر کے سگریٹ کے وہ دو طویل کش لئے اور دھوئیں کے گاڑھے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''پو صاحب! یہ کھاکسار آپ کو لینے آیا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہووے گا۔''

''کہاں؟''

''زرگاں۔ حکم جی کے پاس۔''

''کیوں؟''

''اس کیوں کے دو تین جواب ہیں پو جی...... لیکن سب سے کھاص جواب یہ ہے کہ آپ کی پتنی کی ناک میں کوئی بہت زہریلا مچھر گھس گیا ہے۔ اس نے ڈنک مار مار کر اس کے بھیجے میں آگ لگا دی ہے۔ اب وہ ہر ایک پر جھپٹے مارتی پھرتی ہے۔ اس جھانسی کی رانی کے گلے میں پٹا ڈالنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آوت ہے۔ آپ جناب کو اپنا مہمان بنا لیا جاوے اور ہم جیسے کمینے دن رات آپ کی سیوا میں مصروف ہو جاویں۔ جب اسے آپ کی سیوا

کی سماچار ملے گی تو یقیناً وہ سوچنے پر مجبور ہو جاوے گی۔''

اس کی بک بک اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جوشیلی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا پپو صاحب...... کہ میں بہت کھاص قسم کا حرامی ہوں۔ بھگوان نے میری آنکھ میں ایک بہت پلید جانور کا بال رکھا ہوا ہے۔ یہ کبھی ہوا ناہیں کہ میں نے آپ جیسے کسی پپو کو مہمان بنانا چاہا ہو اور وہ بن نہ سکا ہو۔ ہاں جی، یہ کبھی ہوا ناہیں۔'' اس نے حیرت انگیز سکون سے دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں اور بے پروائی سے رانیں کھجانے لگا۔

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی ایک مسئلہ ہو تو آپ جناب کو بتاؤں بھی۔ یہاں تو اب مسئلوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور سب سے منحوس مسئلہ تو تمہارا یہ مراد شاہ صاحب ہی ہے۔ خبر ناہیں یہ کس لاپتا بندے کا نطفہ ہے۔ میں تو اس کی حرام کاریوں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہووت ہوں۔ یہ کچھ برس پہلے اسٹیٹ کی فوج میں ایک معمولی کپتان تھا۔ آج سیاہ سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اس کی ہوس کسی طرح کھتم ہونے میں ناہیں آتی۔ آج یہ راج گدی پر بیٹھنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہ سپنے بس اسی صورت میں پورے ہو سکت ہیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے کھون کے پیاسے بن جاویں اور پھر لڑ لڑ کر سورگ باشی ہو جاویں...... اور وہ حرامی جو کچھ کر رہا ہے اسی کارن کر رہا ہے۔''

''تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میں مراد شاہ صاحب کے خلاف اب ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔''

''اوہو، گلتی ہو گئی پپو صاحب! مجھے شما کر دیجئے۔ مجھے ایسا ناہیں کہنا چاہئے تھا۔ بے شک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ مراد شاہ کی شان بیان کرنے کے لئے بالکل بھی کافی ناہیں ہے لیکن کچھ بھی ہے، وہ آپ کا میج بان ہے۔ آپ کی دُم پر تو پاؤں آئے گا ہی۔'' آخری الفاظ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہے تھے تاہم میرے کانوں تک پہنچ گئے۔

''کیا کہا تم نے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ ناہیں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ شاہ صاحب نے نل پانی کی راج گدی حاصل کرنے کے لئے جو راستہ چنا ہے، وہ کچھ جیادہ ٹھیک ناہیں۔ شاید وہ اپنا دھیرج کھو بیٹھے ہیں اور دونوں بھائیوں کو لڑانے پر تُل گئے ہیں۔ لڑائی ہوئی تو بہت جیادہ کھون بہے گا۔ بہت سارے لوگن مریں گے۔ بس چند ایک ہی جندہ بچیں گے۔ چند ایک پر حکومت کرنے کا کیا

کھاک مجا آوے گا اپنے شاہ صاحب کو...... وہ جس راستے پر پہلے چل رہے تھے، وہ جیادہ اچھا تھا۔''

''تم کس راستے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

''شاہ صاحب کا راستہ آپ کو ناہیں پتا پپو صاحب! یہ تو بڑا سیدھا سادہ راستہ ہے۔ ایک دم فنٹاسٹک...... جو بھی نجر آوے اس کو پکڑ کر مسلمان بنا دو...... نہ بنے تو لالچ اور دھونس سے کام لو...... پھر بھی نہ مانے تو اس کا جینا حرام کر دو۔ یہاں نل پانی میں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ لوگن کو پکڑ پکڑ کر مُسلا بنایا جا رہا ہے اور تو اور سنا ہے کہ اپنے چھوٹے سرکار بھی اپنے دھرم کو دغا دینے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہو سکت ہے کہ ان سے یہ راج گدی چھن جاوے۔ پھر اس گدی پر اپنی تشریف کا ٹوکرا رکھیں گے اپنے یہی شاہ صاحب...... اور پھر اس کے بعد پتا ہے کیا ہو گا......؟''

میں سوالیہ نظروں سے پانڈے کا سانولا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''اس کے بعد شاہ صاحب کی نجریں جمیں گی زرگاں پر۔ وہ زرگاں کو سومنات سمجھ لیوے گا اور محمود گجنوی بن کر بار بار اس کو ڈھانے کی کوشش فرماوے گا۔ بڑا فتور ہے سالے کی نیت میں...... بڑا فتور ہے......''

میں پانڈے کی صورت دیکھ رہا تھا اور میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ وہ کش لے کر بولا۔ ''باہر برکھا ہو رہی ہے۔ کھاصی سردی ہے۔ تم کوئی چادر وغیرہ لے لو۔ ہم کو کافی لمبا سفر کرنا ہے۔''

میرے اندر کی جلن میں گھلا ہوا میٹھا درد فزوں تر ہو گیا۔ کہیں گہرائی میں ایک انگڑائی سی بیدار ہونے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پانڈے! میں جانتا ہوں کہ تُو کمزور شخص نہیں ہے...... اور نا کام بھی نہیں ہے لیکن آج کی رات کو بڑا بدقسمت ثابت ہوا ہے۔''

''کیا مطلب پپو صاحب؟''

''آج تُو ایک غلط وقت پر، غلط جگہ پر، غلط شخص کے سامنے ہے۔ کاش! تیرے ساتھ ایسا نہ ہوا ہوتا۔''

اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ میرے منہ سے ایسی بات سنے گا۔

سگریٹ کی راکھ کباب والی پلیٹ میں جھاڑ کر اس نے طویل کش لیا۔ ''پپو صاحب!

آپ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نشہ وشہ تو ناہیں کیا ہوا...... یا پھر آپ اس کھاکسار کے بارے میں جیادہ جانت ناہیں ہیں۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں نیلا زہر اُتر آیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے پتلون کی بیلٹ میں سے اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ وہ کسی شیش ناگ کی طرح پھنکارا۔ "میں صرف دھمکاتا ناہیں ہوں پپو...... گولی مارتا ہوں اور میرا نشانہ کھتا ناہیں جاتا۔"

ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ میرے اندر کا سرکش ریلا اچھل گیا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ میرے پاؤں کی ضرب بالکل نشانے پر لگی۔ میرے پاؤں کی "اَپر پام" نے پانڈے کے پسٹل اور پسٹل والے ہاتھ کو ایک ساتھ نشانہ بنایا۔ کولٹ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور ایک الماری کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میں اندھا دھند پانڈے پر جا پڑا۔ میرا سر پوری شدت کے ساتھ اس کے سینے پر لگا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرا مدِمقابل کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس کے سیاہ جسم میں گوشت پوست کے بجائے جیسے فولاد بھرا ہوا تھا۔ میرے سر کی ضرب سے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گیا اور اس کی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ بعین یہی محسوس ہوا کہ دیوار میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے ٹکرایا تھا، اس سے کئی گنا تیزی سے واپس میری طرف آیا۔ اس کا فولادی ہاتھ میرے جبڑے پر پڑا اور آنکھوں میں ستارے سے رقص کر گئے۔ یکایک وہ کسی مشتعل جانور کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے ہتھوڑے پکڑے ہوئے ہیں۔ چند سیکنڈ میں مجھے درجنوں تہلکہ خیز ضربیں اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ میں کئی بار سنگ سرخ کی دیواروں سے ٹکرایا، گرا اور اُٹھا...... اور پھر میرا داؤ چل گیا۔ میں نے اسے ایک ایسی چوٹ لگائی جو کسی فائٹنگ مقابلے میں تو سراسر فاؤل ہوتی لیکن اس دوبدو لڑائی میں بالکل برمحل تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اس کی رانوں کے عین درمیان ٹھوکر ماری۔ وہ تڑپ کر پیچھے کی طرف گیا۔ مجھے اُٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اگلے تین چار منٹ تک ہم دونوں کے درمیان ایک خطرناک معرکہ ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور ہو گئے، فرنیچر ٹوٹ گیا اور قیمتی ڈیکوریشن پیسز کمروں کے فرش پر بکھرے دکھائی دیئے۔

یہ ایسا پُرزور ہنگامہ تھا کہ اردگرد موجود ہر شخص ہڑبڑا کر اُٹھا اور موقع کی طرف لپکا۔ ان میں کئی مسلح پہرے دار بھی تھے۔ وہ رنجیت پانڈے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے مگر میں نے دہاڑتے ہوئے انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ میں پانڈے سے دوبدو لڑنا چاہتا تھا۔ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا

اور پھر میں نے دیکھا کہ میری وحشت نے پانڈے جیسے خطرناک مدِمقابل کو بھی ٹھٹکا دیا ہے۔ وہ جو مجھے "پپو پپو" کہہ کر اپنے اندر کے گھمنڈ کا اظہار کر رہا تھا، اب چونکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی گرے پتلون کی جیب میں سے چمک دار پھل کا چاقو نکال لیا۔ اس کے چاقو کے دو جان لیوا وار میں نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر روکے۔ اس کے بعد اس کرسی سے اسے اندھا دھند دھکیلتا ہوا برآمدے میں جا گرا۔ میں دہاڑ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے خالی ہاتھوں سے پانڈے کو پھاڑ کر رکھ دوں لیکن فولاد کو ہاتھوں سے پھاڑنا بھی تو ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ایک سخت جان فائٹر تھا۔ میری ضربیں سہہ رہا تھا اور ان سے بچنے کی کامیاب کوشش بھی کر رہا تھ۔ اچانک پانڈے کا داؤ چل گیا۔ اپنے سینے پر میری ٹانگ کھا کر وہ برآمدے کی ایک دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہاں دیوار پر بجلی کا "ڈی پی" لگا ہوا تھا۔ مین سوئچ بھی موجود تھا۔ اس نے پھرتی سے مین سوئچ آف کر دیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

"دیکھو...... پکڑو" ایک دم بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

پھر کوئی پہرے دار کرب ناک انداز میں چلایا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی نے ہوائی فائر کیئے۔ کوئی ٹارچ لینے کے لئے بھاگا۔ "تم کہاں ہو تابش؟" چوہان کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ٹٹولتا ہوا مین سوئچ کی طرف گیا اور اسے آن کر دیا۔ ایک دم قرب و جوار روشن ہو گئے۔ بیرونی دروازے کے پاس ایک پہرے دار تڑپ رہا تھا۔ چاقو کے وار نے اس کے پیٹ کو اس طرح چاک کیا تھا کہ انتڑیاں باہر آ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس شخص نے بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا اور تاریکی میں اندازے سے پانڈے پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ زبردست سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ پانڈے کی تلاش میں پہرے دار ہر طرف دوڑے پھر رہے تھے۔ دیوان کے بیرونی گیٹ کے پاس ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ رکھوالی کے کتوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

اجے کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے مخاطب تھا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی اندر ہی ہو۔ باہر نکلنے کے رستے "سیل" کر دو۔"

انور خاں بولا۔ "بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ کچھ بھی کر جائے گا۔"

اجے کی ہدایت پر دو بڑے گھڑ سوار دستے تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف گئے۔ انہیں

آس پاس کی آبادی کا محاصرہ کرنا تھا۔ یہ احساس ہر چہرے کو وحشت زدہ کر رہا تھا کہ پانڈے جیسا خطرناک بندہ اس وقت دیوان کے آس پاس یا دیوان کے اندر موجود ہے۔

میرے منہ سے خون رس رہا تھا۔ ایک پاؤں پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے مجھے ٹٹول کر دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور الماری کے پیچھے گرا ہوا رنجیت پانڈے کا سرکاری پستول نکال لیا اور پھر وہ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ پانڈے موقع سے غائب ہو گیا تھا مگر جاتے جاتے اپنی سفاکی کا انمٹ ثبوت دے گیا تھا۔ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ چوہان اور میں لڑکھڑا کر رہ گئے۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو اُڑ کر برآمدے میں گرتے دیکھا۔ بارود کی بُو ناقابلِ برداشت تھی۔ ہر طرف سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں نسوانی آوازیں بھی تھیں اور یقیناً شکنتلا اور ملازمہ صفیہ کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں۔

''یہ کیا ہوا چوہان؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے خیال میں بم بلاسٹ ہے۔'' چوہان کی آواز جیسے کہیں دور سے میرے سیٹیاں بجاتے کانوں میں پڑی۔

ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ یہاں دل دوز مناظر تھے۔ اجے کے کم از کم پانچ ماتحت لاشوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ کسی کا بازو غائب تھا، کسی کی ٹانگ۔ کئی افراد شدید زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ آہ و بکا کر رہے تھے۔ لاشوں میں مجھے اجے کا ماتحت حوالدار رب نواز بھی نظر آیا۔ اس کے سر کا ایک حصہ صاف اُڑ چکا تھا۔

''اوہ خدایا...... یہ کیا ہو گیا؟'' چوہان نے لرزاں آواز میں کہا۔

''یہ اسی حرامزادے کا کارنامہ ہے۔ وہ جاتے جاتے یہاں کوئی ٹائم ڈیوائس رکھ گیا ہے۔'' اجے پھنکارا۔

''اگر یہاں ایک ڈیوائس ہے تو اور بھی ہو سکتی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

چوہان کے اس فقرے نے سراسیمگی میں اضافہ کر دیا۔ اہلکار خوفزدہ نظروں سے اردگرد دیکھنے لگے۔ زخمیوں کو نکال کر سب اس جگہ سے دور ہٹ گئے۔ میرے جسم میں آگ روشن تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ حکم اور جارج کے سفاک اہلکار پانڈے نے ان تین عہدے داروں کی موت کا انتقام لیا ہے جنہیں چند روز قبل زرگاں میں قتل کیا گیا تھا...... تو کیا آگ، خون اور بدلے کا کھیل شروع ہو چکا تھا؟

O....❖....O

اگلے تین چار گھنٹے میں سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس بات کا شبہ تو ہر ذہن میں موجود تھا کہ نل پانی میں اور دیوان کی عمارت کے اندر بھی زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ آج یہ بات پوری طرح ثابت ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے نہ صرف دیوان میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک سنگین واردات کے بعد صاف نکلنے میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ پانڈے کے ساتھ ہی دیوان کے دو اہم ترین پہرے دار بھی غائب تھے۔ ان میں سے ایک ہندو اور دوسرا مسلمان تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ پانڈے انہی دو افراد کی مدد سے دیوان میں داخل ہوا اور بعدازاں صاف بچنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

میرے رہائشی پورشن کے اسٹور میں سے ایک دراز قد عورت کا سیاہ برقع بھی ملا۔ معلوم ہوا کہ دیوان میں داخل ہوتے وقت پانڈے اسی برقعے میں تھا۔ اس کے علاوہ اسٹور میں ہی پلاسٹک کی ایک دستی ٹوکری بھی ملی جس میں چند کیلے اور سیب وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پانڈے، دھماکا خیز مواد اس ٹوکری میں رکھ کر اندر لایا تھا۔ صورتِ حال واضح ہونے کے بعد دیوان میں فوری طور پر کئی گرفتاریاں ہوئیں اور بہت سے لوگوں کو شاملِ تفتیش کیا گیا۔ عام لوگوں میں سخت غم وغصہ پایا جا رہا تھا۔ اکثر کا تاثر یہی تھا کہ جارج گورا اور حکم نے ان تین ہلاکتوں کا جواب دیا ہے جو زرگاں میں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی سیکیورٹی انتظامات کو ناکام بنا کر دیوان میں گھس سکتے ہیں اور لوگوں کو مار سکتے ہیں۔

میری اور پانڈے کی لڑائی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں نے ٹانگ چلا کر اس کے ہاتھ سے کولٹ پسٹل چھڑایا تھا۔ یہ بڑا زوردار وار تھا اور اس وار کا بہت سا صدمہ میرے پاؤں کو جھیلنا پڑا تھا۔ پسٹل اور پاؤں کے تصادم سے پاؤں کا بالائی حصہ سوج گیا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا۔

اگلے روز صبح تک پورا پاؤں سُوج گیا اور چلنا مشکل ہو گیا۔ صبح سویرے چوہان اور انور خاں میرے پاس آئے۔ انور خاں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''برادر! تم تو راتوں رات مشہور ہو گئے ہو۔ ہر زبان پر تمہارا نام ہے۔ پانڈے اس اسٹیٹ میں دہشت کی علامت ہے۔ تم نے نہ صرف اس سے دوبدو مقابلہ کیا ہے بلکہ اسے بھگانے میں بھی کامیاب رہے ہو۔''

''لیکن وہ جاتے جاتے ایک زبردست چوٹ تو ہمیں دے گیا نا۔ چھ بے گناہ لوگوں کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

انور بولا۔ ''اس کا صدمہ تو ہر ایک کو ہے لیکن اس بات کی خوشی بھی ہے کہ پانڈے جیسا شخص جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں سے چوٹیں کھا کر گیا ہے اور یہ چوٹیں ایسے بندے

نے لگائی ہیں جو چند مہینے پہلے تک کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ پانڈے کو لگنے والی ان چوٹوں کا اثر آئندہ حالات پر پڑے گا۔ چھوٹے سرکار بھی تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کل رات مجھے بلایا تھا اور تمہارے سارے کوائف معلوم کیے تھے......''

مجھ پر عجیب سی بیزاری طاری تھی۔ میں انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو رہا تھا لیکن مجھے ان میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ دونوں جلد یہاں سے چلے جائیں گے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں گے۔ مجھے اکیلا رہنا اچھا لگتا تھا۔ شاید میں آدم بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

چوہان میرے پاؤں کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھا۔ اس نے کوئی وینٹوجین قسم کی دوا میرے پاؤں پر لگائی اور بڑی احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ اس نے مجھے گرم پانی کی ٹکور کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ میں پاؤں لٹکا کر نہ بیٹھوں۔ اس نے مجھے کھانے کے لئے چند گولیاں دیں اور بتایا کہ یہ پین کلر ہیں۔

چوہان کے جانے کے بعد میں نے پین کلر گولیوں کو ہتھیلی پر رکھا...... یہ گولیاں درد کو افاقہ دیتی تھیں لیکن ''بتانے والا'' مجھے بتا گیا تھا کہ درد سے افاقہ گولیاں کھانے سے نہیں ملتا، درد کا سامنا کرنے سے ملتا ہے۔ میں نے وہی کیا جو کرنا تھا۔ میں نے گولیاں پھینک دیں اور تھوڑی دیر بعد وہ پٹی بھی اتار پھینکی جو چوہان باندھ گیا تھا۔ میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں میرا اسینڈ بیگ جھول رہا تھا۔ مضروب پاؤں جیسے منوں بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے درد کا علاج درد سے ہی کرانا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ دانتوں پر دانت جمائے۔ پھر مضروب پاؤں سے ایک ضرب سینڈ بیگ پر لگائی۔ بے ساختہ ایک دردناک کراہ ہونٹوں سے نکل گئی۔ پورا جسم اذیت سے جھنجھنا اٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ میں دیوانہ وار، زخمی پاؤں سے سینڈ بیگ پر ضربیں لگاتا چلا گیا۔

...... رات کو چوہان میرے پاؤں پر پھر پٹی باندھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ''اپنے دیوانے پن میں تم خود کو تباہ کر لو گے۔''

''تباہ تو ہونا ہی ہے۔ کیا تم مجھے اپنی مرضی سے تباہ بھی نہیں ہونے دو گے؟'' میں نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

''تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں۔''

''کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے بھی مرنے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا تھا، اب بھی ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''بہرحال، ایک بات میں تمہیں پھر بتا دینا چاہتا ہوں۔ دوبارہ اس قسم کی حماقت کرو گے تو پاؤں کی ہڈی میں کوئی فریکچر بھی ہو سکتا ہے...... اور ممکن ہے کہ پہلے سے کوئی ہیئر لائن فریکچر موجود ہو جو مزید خراب ہو جائے۔''

اس دفعہ اس نے پٹی باندھتے ہوئے بہت ساری کاٹن بھی پاؤں پر رکھی تھی۔ پٹی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ بلاسٹ میں مرنے والے ایک اور شخص کی آخری رسوم آج ادا کی گئی ہیں۔ لوگوں میں بہت طیش پایا جا رہا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں میں...... کیونکہ مرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ اس نے کہا کہ نئی آبادی میں لوگوں نے آج ایک ٹھاکر کی حویلی کو آگ لگا دی ہے۔ ٹھاکر اور اس کے گھر والے غائب ہیں۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ دیوان میں گھسنے سے پہلے رنجیت پانڈے نے اس ٹھاکر کی حویلی میں چند گھنٹے گزارے تھے۔

چوہان پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب انور خاں اور اسحاق تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لائے ہیں۔

انور خاں نے آتے ہی کہا۔ ''حکم کا دست راست موہن کمار قتل ہو گیا۔ رات کو کسی نے اسے سوتے میں ذبح کر دیا۔''

''کب...... کیسے؟'' چوہان نے پوچھا۔

''پرسوں رات...... لیکن یہاں آج خبر پہنچی ہے۔ قتل کرنے والے نے اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا اور اس کے پاؤں کی طرف رکھ دیا۔ زرگاں میں سخت خوف پایا جاتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی سلطانہ اور اس کے بھتیجے کا کام ہے۔ اس بار واردات کی جگہ پر لوگوں نے انہیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس کوشش میں تین چار بندے سخت زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ اسے گولی کا زخم آیا ہے۔''

''اوہ خدایا! اب کیا ہو گا؟'' چوہان نے کہا۔

''حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کہا جا رہا ہے کہ وہ اس خونی واردات کے بعد قریبی جنگل میں گھسی ہے۔ حکم کے سیکڑوں سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔''

جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا اندیشہ ہمارے ذہنوں میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ سلطانہ جس انداز میں یہاں سے غائب ہوئی تھی، اس سے کوئی اور مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور اب نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔ موہن کمار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ شخص حکم کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ یہی شخص تھا جو مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں کی نحوست میں لے گیا تھا۔

اسحاق نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آج ہمارے ساتھی فیروز کی روح کو سکون ملا ہووے گا۔ وہ زندہ ہوتا تو آج اپنے دوست ہارون کے قاتل کا انجام جان کر ضرور جشن مناتا۔''

یہ مکافاتِ عمل کی ایک جھلک تھی۔ چند ماہ پہلے چوڑے جبڑوں والے کرخت چہرہ موہن کمار نے اپنے ایک وفادار ماتحت کو قتل کر کے ڈرامار چایا تھا۔ مقتول ہارون کی موت کا الزام سلطانہ پر دھر کر وہ اسے زرگاں واپس لے گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کارنامے کے بدلے حکم جی اس پر ترقی اور منزلت کے نئے دروازے کھول دے گا لیکن اس سے پہلے ہی اس پر موت کا دروازہ کھل گیا تھا اور وہ اپنے ادھورے ایجنڈے سمیت اس میں داخل ہو گیا تھا۔

......اسی دوران میں ایک باوردی سپاہی اندر آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد انور خاں کو بتایا کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ اسے یاد کر رہے ہیں۔ انور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی خاص قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔''

یہ واقعی خاص گفتگو تھی۔ اس کے موضوع کا پتا مجھے شام کے بعد چلا۔ شکنتلا کو ہلکا بخار تھا۔ میں اس کی مزاج پُرسی کے لئے اس کے رہائشی پورشن میں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک سفید ساڑھی میں غم اور الم کی تصویر بنی لیٹی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے، وہ کسی وقت ہنس بول بھی لیتی تھی لیکن اس کے اندر جو چوٹ آئی تھی، وہ دکھ بن کر اس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر ہلکان ہو جاتی تھی کہ جیکی اس کی وجہ سے برباد ہوا۔ چند دن کی خوشیوں کے عوض وہ جاں گسل مصائب کا شکار ہوا اور پھر جواں عمری میں ہی خاک کے نیچے جا سویا۔

میں شکنتلا کا دل بہلانے کے لئے اس سے باتیں کر رہا تھا جب چوہان اندر داخل ہوا۔ اس نے نئی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حکم اور جارج کے لوگوں نے سلطانہ کو ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا ہے۔ طلال بھی سلطانہ کے ساتھ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہیں۔''

یہ پریشان کن خبر تھی۔ میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

چوہان کو جو کچھ پتا تھا، اس نے بتا دیا۔ وہ بولا۔ ''موہن کمار کے قتل کے بعد جب سلطانہ اور طلال نے بھاگنا چاہا تو پہرے داروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ طلال نے فائرنگ کی۔ اس میں دو بندے زخمی ہوئے۔ ایک کو معمولی اور دوسرے کو شدید زخم آیا۔ پھر طلال کے پستول میں گولی پھنس گئی۔ سلطانہ اور طلال نے اپنی چھوٹی تلواریں نکال لیں اور خود کو گھیرنے والوں کو بے دریغ زخم لگائے۔ اس افراتفری میں وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے۔ موہن کمار کے پہرے داروں اور عام لوگوں نے گھوڑوں پر ان کا پیچھا کیا۔ ایک رات پہلے بارش ہوئی تھی اس لئے جنگل میں سلطانہ اور طلال کا کھرا ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ قریباً آٹھ گھنٹے کے تعاقب کے بعد ان دونوں کو انگریزوں کے زمانے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا گیا ہے......''

چوہان کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ سلطانہ اور طلال سخت مصیبت میں ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں طویل تبادلہ خیال ہوا۔ اسی دوران میں اسحاق، انور خاں اور اجے بھی آ گئے۔ یہ کمرا ایک کانفرنس روم کی شکل اختیار کر گیا۔

اجے نے بتایا۔ ''چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب پل پل کی صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سلطانہ اور طلال کی مدد کرنا چاہت ہیں لیکن یہ ایک بڑا قدم ہووے گا۔ یہ قدم اُٹھانے سے پہلے وہ اپنے مشیروں اور ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہیں گے۔ ہو سکت ہے کہ کل چھوٹے سرکار ایک بڑی میٹنگ بلائیں جس میں طریقہ طے کیا جاوے۔''

''لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ سلطانہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ کل یا پرسوں تک حکم کے درجنوں لوگوں کو خود سے دور رکھ سکے گی؟''

''ہاں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔'' اجے نے کہا۔ ''لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ایک بڑا قدم ہووے گا۔ اس کے بعد یقیناً نل پانی اور زرگاں میں لڑائی چھڑ سکت ہے۔ یہ چھوٹے سرکار کی مجبوری ہے کہ وہ ایسی کسی کارروائی سے پہلے ذمے دار لوگن کو اعتماد میں لیں۔''

انور خاں نے اجے سے پوچھا۔ ''برادر! تمہارے خیال میں چھوٹے سرکار کے ذہن میں کیا چل رہا ہے...... وہ کیا کارروائی کر سکتے ہیں؟''

''ان کے ذہن میں دو تین تجویزیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بڑے دستے کے ساتھ ان لوگن پر حملہ کیا جاوے جنہوں نے ریسٹ ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ انہیں تتر

بتر کر دیا جاوے اور یوں سلطانہ اور طلال کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاوے۔ سلطانہ اور طلال کے پاس وہی سات ایم ایم کی طاقتور رائفل ہے جو طلال نے مدن لال کے اسلحہ اسٹور سے لوٹی تھی۔ یہ رائفل ان کے بہت کام آسکت ہے......"

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میرا دل اور دماغ گواہی دے رہے تھے کہ سلطانہ کو فوری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر قاعدے ضابطے کی کارروائیوں میں وقت ضائع کر دیا جاتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میٹنگ برخاست ہوئی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ رات کے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ ٹھنڈ پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ بلندی پر سے نل پانی کی روشنیاں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ جھیل میں ان روشنیوں کا جھلملاتا ہوا عکس یوں دکھائی دیتا تھا جیسے چمکیلے پیراہن والی جل پریاں رقص کر رہی ہوں۔ جھیل کی تاریک سطح پر کہیں کہیں روشنی کے ہنڈولے سے متحرک تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے وغیرہ تھے۔ سرِ شام تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اب بھی یہ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

میں دیوان سے نکل آیا۔ اپنے اندر کی بے قراری کو کم کرنے کے لئے میں حسب معمول جھیل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ شروع میں ہوا سرد لگی لیکن پھر جسم گرم ہوتا چلا گیا اور پسینا آنے لگا۔ سانس تیزی سے چلنے لگی۔ یہ مشقت مجھے لطف دینے لگی۔ دیوان سے نکلتے ہی کچھ لوگ میرے پیچھے ہو لئے تھے۔ یہ چھ عدد گھڑ سواروں کا وہی نگران دستہ تھا جو دیوان خانے سے باہر میرے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ پہلے اس دستے کا سالار حوالدار رب نواز ہوتا تھا۔ اب وہ تو دیوان میں ہونے والے بم دھماکے کا شکار ہو چکا تھا، لمبے قد کے ایک اور حوالدار نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

یہ نگرانی مجھے ہمیشہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی تھی اور آج یہ جھنجلاہٹ ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میرے دماغ میں کچھ اور طرح کی ہلچل تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نل پانی سے نکلنا چاہتا ہوں اور کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچنا چاہتا ہوں تو اس کے لئے مجھے سب سے پہلے ایک صحت مند و توانا گھوڑے کی ضرورت ہے۔ دیوان کے اندر بے شمار گھوڑے تھے۔ اصطبل ہر قسم کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا مگر میں دیوان کے اندر سے گھوڑا لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہتا تو فوراً چھوٹے سرکار یا مراد شاہ صاحب کو خبر کر دی جاتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں دیوان سے باہر آنے کے بعد کسی گھڑ سوار کا گھوڑا چھینوں...... یا پھر کسی گھوڑا فروش یا سائیس سے گھوڑا خریدوں۔ یہاں اسٹیٹ میں انڈین کرنسی ہی چلتی تھی۔ میرے پاس

معقول رقم موجود تھی۔ یہ چھوٹے سرکار نے بذریعہ اجے مجھے جیب خرچ کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ رقم میرے لئے کوئی بھی اچھا جانور فوری طور پر خریدنے کے کام آسکتی تھی۔

مجھے اسحاق سے معلوم ہوا تھا کہ پرانے اور نئے شہر کے سنگم پر "فیروزہ دروازے" کے سامنے ایک بڑا مویشی خانہ ہے جو دن رات کھلا رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی شخص کسی بھی وقت رقم دے کر جانور حاصل کر سکتا ہے۔

میں فیروزہ دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن نگران دستہ کراماً کاتبین کی طرح میرے ساتھ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے قریباً 100 میٹر کا فاصلہ رکھتے تھے۔ تاہم ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی وقت مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ آج میں ان کی یہ کوشش ناکام بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے فیروزہ دروازے کی طرف جانا تھا اور کسی بھی نگران کے بغیر جانا تھا۔

جھیل کے ایک نواحی راستے پر بھاگتا بھاگتا میں دفعتاً گنجان آبادی کی طرف مڑ گیا۔ بازار ابھی کھلے تھے۔ بیشتر دکانیں گیس لیمپس اور جنریٹرز کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں...... آج ہندو برادری کا کوئی تہوار بھی تھا۔ اکثر جگہوں پر دیے روشن تھے اور پرشاد وغیرہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بھی نظر آتی تھیں۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑ سوار دستے نے مجھ سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کر دیا تھا۔ جب میں زیادہ بارونق علاقے میں داخل ہوا تو حوالدار اور اس کے دو ساتھی گھوڑوں سے اُتر آئے اور پیدل ہی میرے پیچھے چل دیئے۔ مجھے ان کے اس طرح پیچھے آنے سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ایک بار تو جی چاہا کہ واپس پلٹوں اور ان کے منہ توڑ دوں۔ انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ وہ اپنی منحوس نظریں مجھ پر جمائے رکھیں۔ مگر یہ اضطراری سوچ تھی۔ وہ حکم کے بندے تھے اور انہیں وہی کرنا تھا جو انہیں کہا گیا تھا۔

سیدھا چلتے چلتے میں تیزی سے ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوا اور اپنے نگرانوں کو چکمہ دینے میں کامیاب رہا۔ یہ کپڑے کی دکانوں کا ایک تنگ سا بازار تھا۔ کچھ دکانیں بند ہو رہی تھیں، کچھ ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ خوش لباس مرد و زن خریداری میں مصروف تھے۔ میں اس تنگ بازار سے گزر کر دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مٹھائی اور کھلونوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف گھوڑا گاڑیاں کھڑی کرنے کا بہت بڑا احاطہ تھا۔ سو دو سو قدم چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اپنی "نگرانی" سے واقعی پیچھا چھڑا لیا ہے۔

میں نے ایک ادھیڑ عمر عطر فروش سے مقامی لب و لہجے میں پوچھا۔ "جناب! آپ مجھے

فیروزہ دروازے جانے کا راستہ بتا سکت ہیں؟''

عطر فروش نے جو اپنے لباس سے مسلمان نظر آتا تھا، اُگال دان میں پان کی پیک تھوکی اور رومال سے ہونٹ صاف کر کے بولا۔ ''اجی سیدھا چلتے جایئے۔ پہلے چوراہے سے دائیں طرف مڑ جایئے۔ آگے دو مینار والی مسجد آوے گی۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا، وہ بتا دیوے گا۔''

میں شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ بازار بارونق تھا۔ کہیں پاس سے کبابوں کی زبردست خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ انڈیا کے کئی علاقوں کی طرح اس راجواڑے کے لوگ بھی چٹ پٹے پکوانوں اور تہواروں میلوں کے شوقین ہیں۔ میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔ میں نے اپنے سامنے صرف بیس پچیس قدم کے فاصلے پر اپنے نگران حوالدار کو دیکھا۔ اپنے دراز قد کی وجہ سے وہ مجھے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے بچنے کے لئے میں تیزی سے ایک مندر کے ادھ کھلے دروازے میں گھس گیا۔

یہ ایک بڑا مندر تھا۔ تہوار کی وجہ سے اندر کافی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے وغیرہ بھی تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں، خوشبوئیں سلگ رہی تھیں اور پرشاد تقسیم ہو رہا تھا۔ میں ہجوم میں چلا گیا۔

''یہ تم کیا کرت ہو بھائی؟'' ایک خشک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ مندر کا ایک چاکر خشمگیں نظروں سے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے دھیانی میں، مَیں جوتوں سمیت اندر آ گیا تھا۔ ''اوہو...... شما چاہتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور احاطے کے کنارے پر جوتے اتار دیئے۔

چاکر بدستور اُلجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ سر پر رومال رکھا اور پرارتھنا کرنے والے انداز میں دُرگا دیوی کی مورتی کے سامنے جا بیٹھا۔ جونہی میں نے پرارتھنا کا انداز اختیار کیا، میری دائیں جانب بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص بُری طرح چونک گیا۔ وہ اپنے حلیے سے سکہ بند کٹر ہندو نظر آتا تھا۔ ماتھے پر قشقہ تھا اور سر پر بالوں کی ایک بڑھی ہوئی لٹ بھی تھی جسے بودی کہا جاتا ہے۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے چونکنے اور دیکھنے کے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شاید وہ مجھے پہچانتا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ چالیس پینتالیس سال کی ایک عورت، ایک بڑھیا اور ایک جواں سال عورت بھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ بھی مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے پرارتھنا کا صحیح طور طریقہ تو معلوم نہیں تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی

ایک دو بار ماتھا ٹیکا اور اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ میرے اُٹھتے ہی ادھیڑ عمر شخص اور اس کے گھر والے بھی اٹھ گئے۔ بس بڑھیا اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ادھیڑ عمر شخص میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اندیشے کلبلانے لگے۔ اگر وہ مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے پہچانتا تھا تو اس بھرے پُرے مندر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہارا شبھ نام بیٹا؟''

''گو...... گوپال۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ بدستور میرے کندھے پر دھرا رہا۔ وہ بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہمری ماتا جی ہیں اور یہ ہمری دھرم پتنی ہیں شانتی، اور یہ بہو ہے مالا۔''

دونوں عورتوں نے بڑی عقیدت سے مجھے پرنام کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔

ادھیڑ عمر شخص بولا۔ ''میرا نام رام پرشاد ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''کیا ہم کہیں دو گھڑی بیٹھ کر بات کر سکت ہیں؟''

''در...... دراصل میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ...... کیا کہنا چاہت ہیں؟''

اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ میرا کندھا دبایا اور بولا۔ ''اگر بھگوان نے ہمیں یہاں، اس پوجا کے کمرے میں بلایا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے...... بہت خاص وجہ ہے۔''

رام پرشاد کی پتنی بولی۔ ''ہاں بیٹا! یہ بڑی شبھ گھڑی ہے کہ تم ہمیں یہاں ملے ہو۔ بھگوان نے چاہا تو اس میل کے کارن بہت بھلائی کا کام ہووے گا۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ فرش پر بیٹھی بوڑھی عورت بھی اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مسلسل دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے پاس جھکا تو اس نے میرا سر چوما اور کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ [illegible] کے انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

''تمرے ساتھ کوئی اور تو ناہیں ہے؟'' رام پرشاد نے پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ''چلو پھر آؤ ہمرے ساتھ۔ گھر جا کر سکون سے بات کرت ہیں۔''

وہ مجھے لے کر مندر کے بغلی دروازے کی طرف آ گیا۔ اس کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ اسی پچاسی سال کی بڑھیا کو رام پرشاد کی بہو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ بغلی دروازے کے سامنے ہی ایک بڑی شاندار گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ سفید وردی والا کوچبان گاڑی کے

پاس ہی موجود تھا۔ رام پرشاد اور اس کی فیملی کو دیکھ کر وہ ایک دم مؤدب ہوگیا۔

میں نے سوچا، یہاں آس پاس حوالدار اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ مجھے کم از کم یہاں سے تو نکلنا چاہئے۔ میں رام پرشاد اور اس کی فیملی کے ساتھ اس شاندار گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے اور نشستیں کسی مرسیڈیز کی طرح آرام دہ تھیں۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نا ہیں۔'' رام پرشاد نے کہا۔ ''واپسی پر تم جہاں کہو گے، یہ گاڑی بان تم کو چھوڑ آوے گا۔''

گاڑی کے اندر بھی ایک سنہری طاق میں لکشمی دیوی، دُرگا دیوی اور رام کرشن وغیرہ کی مورتیاں موجود تھیں۔ رام پرشاد کی پتنی نے پرارتھنا کے انداز میں کئی بار مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بیٹا! ہم کو پوری آشا تھی کہ تم آؤ گے۔ جو کام صرف تم کر سکت ہو، وہ کوئی اور بھلا کیسے کرتا۔ بھگوان کے ہر کام میں کوئی بھید ہووت ہے۔''

اب مجھے اس معاملے میں کچھ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو پرانی کہانیوں کے اس کردار کی طرح محسوس کیا جو اتفاقاً صبح سویرے سب سے پہلے کسی شہر کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے اور شہر کے لوگ اسے پکڑ کر کوئی خاص ذمے داری سونپ دیتے ہیں، کیونکہ انہوں نے یہی طے کر رکھا ہوتا ہے۔

گاڑی دھیمی رفتار سے شہر کے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ مجھے ایک جگہ ایک گھڑسوار فوجی نظر آیا۔ میں نے پہچان لیا، یہ حوالدار کے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بالکل سامنے سے گزرنے والی شاندار گاڑی کے اندر اس کا ''مطلوب'' موجود ہے۔ جلد ہی گاڑی کھلے راستوں پر آ گئی اور اس کی رفتار تیز ہوگئی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

''زیادہ دور نا ہیں۔ ہمرا گھر پاس ہی ہے۔''

''لیکن...... میں آپ کے کیا کام آ سکت ہوں؟'' میں نے مقامی لہجے میں پوچھا۔

رام پرشاد کے بجائے اس کی پتنی شانتی بولی۔ ''تم ہمرا نا ہیں بھگوان کا کام کرو گے۔ اس کام کے لئے بھگوان نے ہی تمہیں چنا ہے۔''

اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے لہجے میں مذہبی جوش و خروش تھا اور بات صرف شانتی ہی کی نہیں تھی، لگتا تھا کہ یہ پوری فیملی ہی کٹر قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد گھوڑا گاڑی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک حویلی کے اندر چلی گئی۔ کوچبان نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نیچے اُتر آیا۔ رام پرشاد کی والدہ کو سہارا دے کر نیچے اتارا گیا۔ وہ اپنی بہو اور پوتے کی بیوی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ میں اور رام پرشاد حویلی کی نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر کا ماحول وہی تھا جو ہندی فلموں میں ہوتا ہے اور خالص ہندووانہ رہن سہن کی عکاسی کرتا ہے۔ طاقوں میں جا بجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں اور دیے روشن تھے۔ دیواروں پر آویزاں پینٹنگز میں بھی یہی رنگ ڈھنگ تھا۔ ہندومت میں لاتعداد دیوی دیوتا ہیں۔ کسی وقت تو ایسا لگتا ہے کہ ہر جاندار و بے جان چیز کو دیوی دیوتا کا روپ دے دیا گیا ہے۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک پنڈت جی آ موجود ہوئے۔ ان کی عمر ساٹھ ستر کے قریب تھی۔ ایک چرمی بیگ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بھی مجھے توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ میرا شانہ تھپکا۔ میرا نام، تاریخ پیدائش اور وقت وغیرہ پوچھا۔ یہ سب کچھ ایک کاغذ پر لکھا اور باہر چلے گئے۔

میری اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس صورتِ حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر رام پرشاد صورتِ حال پر کوئی بات کرنے کے بجائے میری خاطر تواضع میں لگ گیا۔ پہلے پھلوں اور مربہ جات سے تواضع کی گئی پھر بھوجن پر اصرار کیا جانے لگا۔ میں بہ مشکل انہیں روک پایا۔ میں نے کہا۔ ''انکل...... ! سب سے پہلے میری اُلجھن دور کیجئے۔ آپ مجھے اس طرح یہاں کیوں لائے ہیں؟''

رام پرشاد نے کہا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتاوت ہوں لیکن اس سے پہلے ایک دو میرے سوال بھی ہیں۔''

''جی پوچھئے۔''

اس نے میرے کوائف دریافت کئے۔ یعنی میں کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ بیاہتا ہوں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سوالوں کے جواب ذہن میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنی رہائش چاچا عبدالغنی والے محلے میں بتائی۔ میں نے اسے بتایا کہ فیروزہ دروازے کے پاس میری کپڑے کی دکان ہے۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔

وہ میرے جوابات سے کافی حد تک مطمئن ہوگیا۔ اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''گوپال پتر! اس سنسار میں دھرم سے بڑی کوئی شے نا ہیں اور

دھرم کا پالن ہم سب کا فرض ہے۔ جب دھرم وردھی لوگن کوئی غلط کام کرت ہیں تو پھر یہ دھرم پریمیوں کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ ان کا سامنا کریں اور دھرم کی رکھشا کریں۔ میں لمبی چوڑی تمہید باندھنا ناہیں چاہت ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ہمرے راجواڑے میں کچھ لوگن دھرم کو نشٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل بھگوان سے یدھ چھیڑنے جیسا ہے۔ یہ لوگن ایک ایسے اپرادھی کو جیون دے رہے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ ہم تو دھرم کے ادنیٰ چاکر ہیں۔ ہمری سمجھ بوجھ معمولی ہے لیکن بڑے پنڈت مہاراج تو جو دیکھتے ہیں، ٹھیک ہی دیکھتے ہیں نا...... انہوں نے جو کنڈلیاں نکالی ہیں، اس کے مطابق اگر اس اپرادھی کو شما کر کے اسے جیون دیا گیا تو یہ پوری ہندو جاتی پر ایک بڑا ظلم ہووے گا۔ اور اس کی سزا ہر اس منش کو بھگتنا ہووے گی جو اس ظلم کو روکنے کی شکتی رکھتا تھا۔''

''آپ کس اپرادھ کی بات کر رہے ہیں، انکل پرشاد؟'' میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

''ایک ناری نے ایک برہمن کی ہتھیا کی ہے۔ اس کو بے دردی سے مارا ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ پرارتھنا میں مصروف تھا۔ یہ برہمن اس راجواڑے کے سب سے پوتر پریوار کا فرد تھا۔ اوتاروں کی لڑی میں سے تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس پلید ناری کو وہیں ٹکڑے کر دیا جاتا اور اس کا ماس کتوں کو کھلا دیا جاتا لیکن اب کچھ لوگن اسے جیون دینے کا سوچ رہے ہیں۔ اسے زندہ رکھنا چاہت ہیں تاکہ وہ اس دھرتی پر چلے، اس ہوا میں سانس لے اور کھائے پیئے۔''

میرے ذہن میں کھد بد شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''انکل! آپ کس ناری کی بات کر رہے ہیں؟''

''ہے ایک نیچ ذات کی ہتھیارن۔'' وہ مبہم انداز میں بولا۔

''وہ مسلمان تو ناہیں؟''

''ہاں...... مسلمان ہی ہے۔'' رام پرشاد کے چہرے پر بہت سی نفرت یلغار کر آئی۔

ایک دم میرے ذہن میں دروازہ سا کھل گیا۔ لہو کی گردش رگوں میں تیز ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''انکل پرشاد! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کی بات کر رہے ہیں۔''

رام پرشاد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''ہاں گوپال! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے...... یہ وہی ہے جس نے کچھ دن پہلے موہن کمار جی کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا۔ اس کتیا نے ان کا سر کاٹ کر شریر سے علیحدہ کر دیا اور ان کے

چرنوں میں رکھ دیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ یہ سب کس کے ساتھ کر رہی ہے۔ تم جانت ہو کہ موہن کمار کون تھے؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ناہیں، مجھے ٹھیک سے پتا ناہیں۔''

رام پرشاد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''موہن کمار اوتاروں کی لڑی میں سے ہیں۔ یہ زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج کے داماد بھی تھے۔ کہا جاوت ہے کہ دو ہزار سالوں سے اس لڑی (نسل) کے لوگن کا سر بھگوان کے سوا کسی کے سامنے ناہیں جھکا لیکن اس پلید عورت نے یہ سر موہن کمار کے شریر سے کاٹ کر علیحدہ کر لیا اور پھر انہی کے چرنوں میں رکھ دیا۔ ایک طرح سے اس خبیث ناری نے یہ بتایا کہ جو سر جھکتا ناہیں تھا، وہ اپنے ہی چرنوں میں گرا پڑا ہے۔'' بولتے بولتے رام پرشاد کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

میں اس عجیب اتفاق پر حیران ہو رہا تھا۔ میں جو آج دیوان کی عمارت سے اس لئے نکلا تھا کہ کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچ سکوں، ایک ایسے کٹر ہندو سے آن ملا تھا جس کا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا اور جو پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھ سے مسلسل سلطانہ کے بارے میں بات کر رہا تھا لیکن بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''انکل! میں نے تو سنا ہے کہ موہن کمار جی کی ہتھیا کے بعد سلطانہ کو جنگل میں گھیر لیا گیا ہے اور اب وہ اور اس کا بھتیجا بچ ناہیں سکیں گے۔''

رام پرشاد کے چہرے پر پھر عجیب سا رنگ لہرا گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھنے کے بعد بولا۔ ''پرنتو! یہی تو بھید ہے اس میں۔ وہ حرامزادی مرے گی ناہیں۔ بالکل ناہیں مرے گی۔ اسے زندہ پکڑا جاوے گا۔''

''آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟''

''اس لئے کہ ہم کو اندر خانے کی جانکاری ہے۔ ہم سب جانت ہیں۔ کچھ لوگن ہیں جو سلطانہ کو زندہ حالت میں زرگاں لے جانا چاہت ہیں۔ ان لوگن کا دھرم سے کوئی واسطہ ناہیں اور نہ ہی ان کو بھگوان کا کوئی خوف ہے۔ ان کو جانکاری ناہیں کہ ان کی یہ من مرضی راجواڑے کے باشندوں پر کتنی بھاری پڑے گی۔ کنڈلیاں سب کچھ بتا رہی ہیں مگر یہ گوری چمڑی والے کنڈلیوں وغیرہ کو مانتے ہی کب ہیں......''

ایک دم میرا دھیان جارج گورا اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے رام پرشاد کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انکل! کہیں آپ جارج گورا صاحب کی بات تو ناہیں کر رہے؟''

"اس کا نام اتنی عزت سے مت لو۔ وہ اس قابل نا ہیں ہے۔ وہ اپنے مطلب کا بندا ہے۔ وہ بدلے کی آگ میں جل رہا ہے اور اسے بس اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی فکر ہے۔ اگر وہ حکم جی کا سچا دوست ہوتا تو کبھی ایسا سوچتا بھی نا ہیں۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہت ہیں کہ جارج گورا، سلطانہ اور اس کے پریوار سے بدلہ لینے کے لئے اسے زندہ اپنے پاس منگوانا چاہت ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سلطانہ کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے...... وہ کوئی ایسا چکر چلائے گا کہ عام لوگن یہی سمجھیں گے کہ وہ مرگئی یا جیل سے بھاگ نکلی مگر وہ رہے گی جارج گورے کے پاس ہی...... جارج گورا کی طرح کے بندے کسی کو آسانی سے شما نا ہیں کرتے ہیں۔"

"کنڈلیاں کیا کہتی ہیں؟" میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

"اس ناری کا مرنا بہت ضروری ہے، ورنہ کوئی بہت سخت آفت آوے گی۔ کوئی ایسی بیماری جس میں راجواڑے کے بہت زیادہ لوگن مر جاویں یا پھر کوئی باڑ...... یا آپس کی لڑائی جس میں بے شمار بے گناہوں کی ہتھیا ہو جاوے لیکن کچھ نہ کچھ ہووے گا ضرور۔ یہی پنڈت مہاراج کا دچار ہے اور ان کا دچار کبھی غلط نا ہیں ہوتا۔"

"پنڈت مہاراج کیا چاہت ہیں؟"

"ان کی خواہش ہے کہ اس ناری کو زندہ نا ہیں رہنا چاہئے اور اگر اسے ایک خاص منش (بندہ) خاص ڈھنگ سے مارے گا تو ٹھیک پرائشچت ہووے گا اور بلائل جاوے گی۔"

"میں سمجھا نا ہیں، خاص منش کون؟"

رام پرشاد نے پھر منہ میں کوئی اشلوک پڑھا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"ہمرا اندازہ ہے کہ وہ منش تم ہو۔ بہرحال، ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ کھل کر سامنے آ جاوے گا۔ پنڈت بھگوان داس تمہاری کنڈلی بنا رہے ہیں۔"

"کنڈلی بنا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کنڈلی سے پتا چل جاوے گا کہ وہ منش تم ہی ہو جس کی طرف ایشور نے پنڈت مہاراج کو اشارہ دیا ہے، یا کوئی اور ہے۔"

"کیا پنڈت مہاراج نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نا ہیں، انہوں نے بس نشانی بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم چوتھی تاریخ کو چاند ڈوبنے کے فوراً بعد کالی کے مندر میں پوجا شروع کر دیں۔ پوجا کے دوران میں جو پجاری

ہمارے پریوار کے دائیں طرف آ کر بیٹھے گا، وہی اصل منش ہووے گا۔ اسی کے ہاتھوں وہ اپرادھن قتل ہووے گی تو ایشور خوش ہوں گے اور ٹھیک پرائشچت بھی ہو جاوے گا۔"

"میں...... میرا مطلب ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کسی کے پران لوں گا؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

رام پرشاد نے تسلی بخش انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بلغم زدہ کھانسی کی آواز سنائی دی اور پنڈت بھگوان داس ایک لمبا چوڑا زائچہ لے کر آ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "گوپال سنہا! تمہاری کنڈلی میں کچھ گڑبڑ نظر آوت ہے۔ کیا تمہارا پورا نام یہی ہے؟"

میں نے تصدیق کی۔ وہ کچھ دیر لفظوں اور ہندسوں میں الجھتا رہا۔ آخر بولا۔ "پھر ہوسکتا ہے کہ تم نے اپنا جنم دن ٹھیک نہ بتایا ہو کیونکہ اس کنڈلی میں بہت سے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں...... بلکہ ایک دو لوگ تو ایسے ہیں جو تمہاری کنڈلی میں ہو ہی نا ہیں سکتے۔ اس کے علاوہ......"

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس پنڈت کو نہیں مانتا تھا اور نہ اس کی کنڈلی کو...... لیکن اس کا یوں مخمصے میں پڑ جانا مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"اپنے جنم دن کے بارے میں مجھے پورا وشواس نا ہیں ہے۔ میری ماتا ایک تاریخ بتاوت ہیں اور پتا کو دوسری تاریخ پر بھروسا ہے۔"

پنڈت کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اپنی چندیا کھجا کر بولا۔ "یہ ہوئی نا بات۔ میری کنڈلی کے حساب سے بھی تمہارا جنم دن منگل وار کے بجائے بدھ وار بنتا ہے اور چاند کی اٹھائیس تاریخ۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پنڈت بھگوان داس نے جلدی جلدی کنڈلی میں کچھ تبدیلیاں کیں اور مطمئن لہجے میں رام پرشاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھیں، سب کچھ ٹھیک بیٹھ گیا جی...... یہی وہ منش ہے جس کی طرف پنڈت مہاراج نے اشارہ کیا تھا۔ بھگوان نے چاہا تو وہ اپرادھن مرے گی اور اسی کے ہاتھوں مرے گی۔" پھر وہ میری طرف گھوم کر بولا۔ "تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں ایشور نے ایک بڑے کام کے لئے چنا ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نا ہیں رہا۔" میں نے پھر گھبراہٹ ظاہر کی۔

سوکھے سڑے پنڈت نے کچھ بولنا چاہا مگر رام پرشاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مجھ سے کہا۔ "گوپال پتر! گھبرانے کی کوئی بات نا ہیں ہے۔ ہم تمہیں کسی مصیبت

میں ناہیں ڈالیں گے۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔"

پنڈت اُٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گھرانے کے باقی افراد کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے گیا ہے کہ وہ کالی کے مندر سے مطلوبہ بندے کو ہی لے کر آئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے رونے گڑگڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ ہی تھی۔ وہ شاید کسی مورتی کے سامنے پرارتھنا کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بہو اور بہو کی بہو کے سہارے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے میرا سر چوما اور کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔

اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی حویلی کے پورچ میں آ کر رکی۔ رام پرشاد نے کھڑکی سے جھانکا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مسرور لہجے میں بولا۔ "ستیش آیا ہے میرا بیٹا۔ تم سے مل کر بہت خوش ہووے گا۔"

ایک دو منٹ بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ جسم نہایت ورزشی اور چہرے سے سختی ٹپکتی تھی۔ عام برہمن زادوں کی طرح اس کے ماتھے پر بھی سفید قشقہ تھا۔ وہ بگولے کی طرح اندر آیا۔ سب کو پرنام کیا۔ اس نے اپنی دادی کے چرن چھوئے اور ذرا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسے پرنام کیا اور مؤدب کھڑا رہا۔ رام پرشاد اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور چند باتیں کیں۔ یقیناً یہ سب کچھ میرے تعارف کے سلسلے میں ہی تھیں۔ نوجوان واپس پلٹا اور دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جیسے نظروں نظروں میں مجھے اور میرے قد کاٹھ کو تول رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ اس نے میرے دونوں کندھے تھامے اور انہیں ہلکے ہلکے جوش سے ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "اب تم نے یہیں رہنا ہے۔ ہاں، جب تک کام ناہیں ہو جاتا، تم یہیں رہو گے ہمارے مہمان بن کر۔ تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو اطلاع دے سکت ہو بلکہ چاہو تو انہیں بھی یہیں بلا سکت ہو۔"

"ناہیں جی! مجھے ان کی طرف سے کوئی ایسی خاص پریشانی ناہیں۔ میں کام کے سلسلے میں نکلا تھا اور مجھے ایک دو دن گھر سے باہر ہی رہنا تھا۔"

"بہت خوب۔" ستیش نے اپنا بڑا سا سر اوپر نیچے ہلایا۔

......میرے اگلے چوبیس گھنٹے اس حویلی کے شاندار مہمان خانے میں گزرے۔ میری ہر طرح خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ ایک ملازم نند لال ہر وقت میری خدمت کے لئے موجود تھا۔ نند لال سے میری تھوڑی بہت بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ حویلی کی

ساری صورتِ حال بھی میرے سامنے تھی۔ میں نے جو نتیجے اخذ کئے، وہ اس طرح تھے۔ یہ نل پانی کے کٹر ہندو گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ رام پرشاد تھا تاہم اس کی بوڑھی ماتا کی بھی بہت مانی جاتی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی ماتا، پتنی، بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ نل پانی میں ان لوگوں کا ایک کارخانہ تھا جہاں کشتیاں اور تفریحی بجرے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ یہ چیزیں پورے راجواڑے میں سپلائی ہوتی تھیں لیکن دس بارہ سال پہلے رام پرشاد کی فیملی نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ان کی توہم پرستی اور مذہبی جنونیت کی وجہ سے تھا۔ رام پرشاد کی فیملی میں ایک موت ہو گئی جس کے بعد رام پرشاد کی بوڑھی ماتا نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسا ہمارے کاروبار کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ منحوس کاروبار ہے۔

دراصل پرانے خیال کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ بہت پختہ تھا کہ پانی کا سفر پاپ ہے۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ کشتیاں وغیرہ بنانے کا کام دراصل پانی کے سفر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے گھریلو فرنیچر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کاروبار رام پرشاد ہی سنبھالتا تھا۔ اس کے بیٹے ستیش کی مصروفیات کچھ اور طرح کی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اب بھی وہ دس پندرہ روز بعد گھر لوٹا تھا۔ پرسوں اسے پھر چلے جانا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ستیش کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ وہ شاید کسی تشدد پسند ہندو تنظیم کا کارکن تھا۔ اس کے جو ایک دو دوست اس سے ملنے گھر آئے، وہ بھی خطرناک صورتوں والے ہی تھے۔ یہ کچھ اس قسم کے لوگ تھے جن سے چند دن پہلے میری اندرونِ شہر کے ایک ڈیرے پر مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ورزشی جسم، کڑے تیور اور سانولی پیشانیوں پر سفید قشقے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں میں کوئی نقص تھا اور آواز بہت بھدی تھی۔

دوسری رات نو بجے کے قریب میں نے گھر کے ایک کمرے میں ستیش اور اس کے دو دوستوں کی تھوڑی سی بات چیت سنی۔ وہ بڑے پُرجوش تھے اس لئے بلند آواز میں بول رہے تھے۔ شاید انہوں نے کسی طرح کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ ان کی یہ گفتگو سلطانہ کے بارے میں تھی۔

میں نے ایک مالا توڑی اور پھر اس کے باریک دانے اکٹھے کرنے کے بہانے دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ دروازے کی دوسری جانب ستیش کہہ رہا تھا۔ "آج چوتھا دن ہے۔ میرا وشواس ہے کہ وہ دونوں بس ایک دو دن اور نکالیں گے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس میں کھانے کا اناج کا ایک دانہ ناہیں۔ پانی بھی بند ہے۔ مٹی کھا کر تو گزارہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہاں، میرا وچار بھی یہی ہے۔" ایک دوسری آواز آئی۔ "حکم جی کے اہلکار کچھ نہ بھی

کریں، صرف اپنا گھیرا ہی قائم رکھیں تو ایک دو دن کے اندر اس حرامزادی کو زندہ پکڑا جا سکت ہے۔ جب بھوجن ہی ناہیں ہووے گا تو کتنے روز اکڑے رہیں گے چچی بھتیجا؟ مگر بلرام رائے کی اپنی سوچ ہے۔ آخر وہ اس آپریشن کا انچارج ہے۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانا چاہت ہے۔ ہوسکت ہے کہ اسے یہ ڈر بھی ہو کہ لاچار ہو کر سلطانہ اور اس کا بھتیجا آتما ہتھیا کی کوشش نہ کریں۔''

''تو پھر کیا...... وہ اندر گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''ناہیں۔ مجھے ایک اور طرح کی جانکاری ملی ہے اور میرا وچار ہے کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ نل پانی کا ایک مُسلا ہے چاچا عبدالغنی۔ سلطانہ اس کے گھر میں بھی رہتی رہی ہے اور اس پر بڑا وشواس کرت ہے۔ وہ اس کے لئے بھوجن لے کر اندر ریسٹ ہاؤس میں جاوے گا۔ اس بھوجن میں بے ہوشی کی دوا ملی ہووے گی۔''

''لیکن وہ غنی ہوگا تو مُسلا۔ اندر جا کر اس نے بھوجن کا بھید کھول دیا تو؟'' ستیش نے پوچھا۔

''وہ ناہیں کھولے گا یار۔'' اس کے دوست کی آواز آئی۔ ''وہ خود بھی یہ چاہے گا کہ کہیں سلطانہ بالکل نراش ہو کر آتما ہتھیا وغیرہ کی کوشش نہ کرے۔ پرنتو عارضی طور پر ہی سہی لیکن اس کا جیون بچ جائے...... مجھے وشواس ہے کہ عبدالغنی وہی کرے گا جو بلرام وغیرہ اس سے کہہ رہے ہیں۔''

ستیش کے ایک دوست نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''یار! ویسے ایک بات ہے۔ یہ جارج گورا صاحب ہے بڑی اونچی شے۔ سچویشن جو بھی ہو، یہ اپنی دل پشوری کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ ڈھونڈ ہی لیوت ہے۔ اب دیکھو، کیسے ہاتھ دھو کر اس سلطانہ راجپوت کے پیچھے پڑا ہے۔''

''ناری بھی تو زوردار ہے۔'' دوسرے دوست نے لوفر لہجے میں کہا۔

پہلا بولا۔ ''ہاں، ناری گورا صاحب کی کمزوری ہے۔ خاص طور سے مسلمان ناریاں۔''

''میں تمہاری اس بات سے اتفاق ناہیں کرتا۔'' ستیش نے کہا۔ ''ناری اس کے لئے ناری ہی ہے۔ ہندو ہو، چاہے مسلم ہو...... یا کوئی اور...... تم یہ کہہ سکت ہو کہ وہ مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ اگر وہ ایک حد تک رہا تو ٹھیک ہے، اگر اس نے حد پار کی تو پھر اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔ حکم جی کو بھی اپنی آشیرباد بس اس سمے تک اس کے ساتھ رکھنی چاہئے جب تک وہ اپنی سیما (حد) کو پار ناہیں کرتا۔''

آہٹ ہوئی اور میں دروازے کے سامنے سے اُٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ سلطانہ مصیبت میں تھی...... تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ریسٹ ہاؤس کو پوری طرح گھیر لیا گیا تھا مگر فوجی افسر بلرام چاہتا تا کہ سلطانہ اور طلال کو زندہ پکڑ کر جارج کے پاس لے جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ لوگ ہر حربہ آزما رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ سلطانہ اپنے سابقہ میزبان عبدالغنی پر بھروسا کرے گی۔ وہ اس کے ذریعے اسے بے بس کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔

صبح سویرے ہی بھجن کی آواز حویلی میں گونجنا شروع کر دیتی تھی اور پوجا کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ مہمان خانے کے اندر بھی پوجا کا کمرا موجود تھا۔ میں اکیلے پوجا پاٹ کا ڈھونگ رچا لیتا تھا۔ اگر مجھے یہ ڈھونگ سب کے سامنے رچانا پڑتا تو بہت دشواری ہوتی۔ مجھے پوجا کے ابتدائی طور طریقے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھے۔ میں نے ہندووانہ رہن سہن میں ایک دو غلطیاں بھی کیں تاہم وہ خوش قسمتی سے کسی کی نظر میں نہیں آ سکیں۔

اگلے روز رات کو ستیش واپس چلا گیا۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے مجھ سے اپنے کمرے میں ملاقات کی۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک لمبی ناک والا درمیانی عمر کا شخص بھی تھا۔ وہ بالکل کلین شیو تھا۔ سر بھی منڈا ہوا تھا۔ ستیش نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کچھ باتیں بتائیں۔ یہ باتیں سلطانہ سے ہی متعلق تھیں۔ وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''ہم اس اپرادھن کو زندہ سلامت زرگاں میں ناہیں جانے دیں گے۔ اس سلسلے میں پوری پلاننگ ہو چکی ہے۔ جب بلرام اور اس کے ساتھ سلطانہ کو ریسٹ ہاؤس سے پکڑ لیں گے اور واپس زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کو راستے میں روکیں گے اور بھگوان نے چاہا تو کامیابی سے روکیں گے۔''

''کیا ان کے قافلے پر ہلا بولا جاوے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ ایسا ہی سمجھ لو......'' اس نے گول مول بات کی۔

شاید وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر ستیش سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایسا حساس تو نہیں تھا کہ میری خاموشی اسے پریشان کرتی لیکن شاید جو کچھ وہ مجھ سے کرانا چاہتا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ میری باخبری اور پوری رضامندی اس میں شامل ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر کچھ لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''یہ دیکھو گوپال! یہ ہے وہ ریسٹ ہاؤس

جہاں سلطانہ اور اس کا بھتیجا سپاہیوں کے گھیرے میں ہیں۔ پکڑے جانے کے بعد وہ اس راستے سے زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے...... یہ دیکھو...... یہ ریکھا جو نیچے کی طرف جا رہی ہے، اس راستے کو ظاہر کرت ہے...... یہاں دیکھو، یہ ریکھا اس بیلے کے درختوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ ٹیلے کے ساتھ ساتھ ایک موڑ ہے......'' اس نے ایک قوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک دبی دبی سی زہریلی ہنسی اس کے سانولے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اس نے معنی خیز انداز میں لمبی ناک والے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس موڑ پر ہم سلطانہ اور اس کے بھتیجے کو باقی قافلے سے علیحدہ کر لیویں گے اور بھگوان نے چاہا تو یہ کام بڑی صفائی سے ہووے گا۔''

''الگ کر لیویں گے؟ میں کچھ سمجھا ناہیں۔'' میں نے کہا۔

ایک دفعہ پھر ایک غیر محسوس لیکن زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ وہ بولا۔

''جب گاڑیوں اور گھوڑوں کا قافلہ اس موڑ پر سے تیزی سے مڑ رہا ہو گا...... سلطانہ والی گاڑی سیدھی نکلتی چلی جاوے گی...... قریباً سو گز دور ٹیلوں کے اندر یہ تنگ درّہ سا ہے۔ گاڑی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی جاوے گی...... اور پھر یہ درّہ بند کر دیا جاوے گا۔''

''یہ کیسے ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے بندے اس درے کا راستہ روک لیویں گے۔ جو اس راستے کو کھولنے کی کوشش کرے گا، چھلنی ہو جاوے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ستیش کی آنکھوں میں پھر چنگاریاں دکھائی دینے لگیں۔

''بات سمجھ میں آ رہی ہے جی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جناب! سلطانہ والی گھوڑا گاڑی باقی قافلے سے الگ کیسے ہووے گی؟''

''پرنتو! یہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس سوال کا جواب تمہارے سامنے ہی بیٹھا ہے۔'' ستیش نے معنی خیز انداز میں کہا اور لمبی ناک والے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنی بھید بھری آنکھوں کے ساتھ بالکل خاموش تھا۔

''میں اب بھی سمجھ ناہیں سکا۔'' میں نے کہا۔

ستیش اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''یہ اس سرکاری گاڑی کا گاڑی بان ہے۔ جس میں سلطانہ اور طلال کو لے جایا جائے گا۔ یہ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے کیونکہ یہ دھرم کی رکھشا کا مطلب سمجھت ہے۔ اسے پتا ہے کہ اس شبھ کام میں اگر اس کے پران بھی چلے گئے تو یہ گھاٹے کا سودا ناہیں۔''

لمبی ناک والے کی لمبوتری آنکھوں میں وہی جنونیت نظر آئی جو ستیش کی آنکھوں کا جزو خاص تھی۔ ستیش نے بتایا کہ لمبی ناک والے کا نام بھولا ناتھ ہے۔ جو نقشہ ستیش دکھا رہا تھا اور جس طرح کی پلاننگ کی بات کر رہا تھا، وہ سب کچھ واقعی متاثر کن تھا۔ ٹیلوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا درّہ نما تھا۔ اس کی دونوں جانب چھپنے اور گھات لگانے کے لئے بہت سی جگہیں تھیں۔ اگر کوئی اس درّے میں سے گزرنے کی کوشش کرتا تو اسے بہ آسانی روکا جا سکتا تھا اور نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ ستیش اس ساری صورت حال کے بارے میں بہت پُر امید اور پُر جوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ مختار راجپوت کی اپرادھن بیٹی مرے گی اور اسی طرح مرے گی جس طرح بڑے پنڈت مہاراج کی خواہش ہے۔

ستیش کے جانے کے بعد میری پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں اس حویلی میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ رام پرشاد ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کام مکمل ہونے تک میں حویلی سے باہر قدم نکالوں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس حوالے سے ہر گھڑی میری نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ مجھے باہر کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتائے بغیر اچانک ہی دیوان کی عمارت سے نکلا تھا اور اب مجھے دیوان سے لاپتا ہوئے کم و بیش تین روز ہو چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری گمشدگی نے وہاں کھلبلی مچائی ہو گی۔ خاص طور سے چوہان اور انور خاں تو بہت پریشان ہوں گے۔ چند دن پہلے رنجیت پانڈے سے میری زبردست ٹکر ہوئی تھی۔ انور خاں اور چوہان یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میری گمشدگی کی وجہ رنجیت پانڈے ہی ہو۔ اس غلط فہمی سے دیگر مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

سلطانہ اور طلال کے موجودہ حالات کا علم بھی مجھے نہیں ہو رہا تھا...... میرے ایک دو بار پوچھنے پر رام پرشاد نے بس یہی کہا تھا کہ بڑی جلدی اچھی سماچار سننے کو ملے گی۔ وہ جس اچھی سماچار یعنی خبر کی بات کر رہا تھا، اس کی تفصیل مجھے ستیش بتا ہی چکا تھا۔ وہ لوگ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے لیکن کسی اچھی نیت سے نہیں بلکہ بدترین انجام سے دوچار کرنے کے لئے۔ خطرہ اس بات کا بھی تھا کہ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں سے چھیننے کی کوشش میں ہی کوئی المیہ نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں سلطانہ اور طلال کو شدید نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں حویلی کے گراسی لان میں بیٹھا تھا جب برآمدے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا، پندرہ سولہ سال کی ایک بالکل دبلی پتلی لڑکی دو موٹی تازی ملازماؤں کی گرفت میں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ

وہ اس کے بال کاٹنا چاہ رہی ہیں۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ میں قینچی تھی۔ لڑکی کے شہد رنگ بال گھنے اور خوب صورت تھے۔

لڑکی رو رہی تھی۔ اس کے تاثرات برملا کہہ رہے تھے کہ وہ بال کٹوانا نہیں چاہتی۔ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ کرسی پر بیٹھی تھی اور زور زور سے بول رہی تھی۔ ''کلموہی! ہم تیرے فائدے کی بات ہی کرت ہیں۔ تجھے پاپ سے بچانا چاہت ہیں۔ نرگ کی اگنی بڑی سخت ہے۔ تجھے اس پر وشواس ہو تو کبھی اس طرح کی بات نہ کرے۔''

رام پرشاد کی نوجوان بہو بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ بولی۔ ''بڑی ماتا! آپ زبردستی نہ کریں۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ اس بے چاری کو تھوڑا سا سمے دیں۔''

''تو بیچ میں مت بول۔'' بوڑھی عورت چلا کر بولی۔ ''تو ہمیشہ دھرم ورودھی بات کرت ہے۔ یہ میرا گھر ہے...... میرا پریوار ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، یہاں میرا ادھکار رہے گا اور میرا حکم چلے گا۔''

''لیکن ماتا جی! یہ ہماری زرخرید داسی ناہیں ہے۔ یہ ملازمہ ہے۔ اس کی بھی اپنی مرضی ہے اور دھرم ''مرضی'' کا نام ہے، جور زبردستی کا نام ناہیں...... بھگوان کے لئے ماتا جی...... آپ دھرم کے نام پر اپنی مرضی نہ چلائیں۔''

''تو اپنی زبان کو لگام دے مالا۔'' بڑھیا کانپتی آواز میں بولی۔ ''بھگوان کا خوف کر۔ یہ ودھوا ہے...... اگر یہ بیاہتا بن کر پھرتی رہے گی تو یہ کلنک ہووے گا۔ اس کی نحوست ہم سب کو لے ڈوبے گی...... اور سب سے پہلے یہ نحوست پڑے گی تجھ پر...... دفع ہو جا یہاں سے...... میں جو کرتی ہوں، مجھے کرنے دے۔'' آخری الفاظ بڑھیا نے بہت زور دے کر کہے۔

نوجوان لڑکی مالا نے ایک دم رخ بدلا اور پاؤں پٹختی ہوئی لان کی طرف آ گئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور طیش بھرے انداز میں کسی بچے کا سویٹر بننے لگی۔ وہ اچھی صورت کی تھی اور اپنی بول چال سے پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ ایک امیر کبیر گھرانے کی برہمن بہو ہونے کے باوجود اس میں تکلیف اور بناوٹ نہیں تھی۔ ایک دو بار وہ مجھ سے بات بھی کر چکی تھی۔

برآمدے میں، دیکھتے ہی دیکھتے ملازماؤں نے نوعمر لڑکی کے بال قینچی سے کاٹ دیئے۔ وہ اتنے بے ڈھنگے طریقے سے کاٹے گئے تھے کہ ترس آنے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی آنسو بہاتی

رہی۔ اس کے کمزور چہرے کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بعدازاں وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ لڑکی کے کٹے ہوئے بالوں کو غالباً جلانے کے لئے یا کسی اور رسم کی ادائیگی کے لئے ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ لیا گیا۔

مالا چپ بیٹھی رہی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے سلائیوں پر حرکت کرتی رہیں۔ اردگرد کوئی نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''مالا بہن! یہ کیا جھگڑا تھا؟''

وہ جیسے ایک دم بھڑک اٹھی۔ ''تم لوگن کو کبھی سمجھ ناہیں آئے گی کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ دھرم تو شانتی اور پریم کا نام ہے، تم لوگن نے اسے یدھ بنا رکھا ہے۔ ایک ڈراؤنا تماشا بنا رکھا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی، ہم اب بھی پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں...... شوہروں کے ساتھ ان کی پتنیوں کو زندہ جلانا چاہت ہیں۔ ذات پات پر مر رہے ہیں۔ کالی رسموں کی آڑ میں ایک دوجے کا جیون تباہ کر رہے ہیں......'' وہ طیش میں بولتی چلی گئی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے بھی رام پرشاد اور ستیش وغیرہ کے مذہبی جنون کا ایک حصہ سمجھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''بہن! لیکن یہاں ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا ہے...... ماتا جی اپنے لئے سورگ کا ٹکٹ پکا کر رہی ہیں۔ یہ لڑکی تم نے دیکھی ہی ہووے گی۔ مشکل سے سترہ سال عمر ہے اس کی۔ یہ حویلی کی پکی ملازمہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی ناہیں ہوئی تھی۔ اس کا پتی چھوٹے سرکار کی سینا میں سپاہی تھا۔ پچھلے دنوں زرگاں والوں کے ساتھ جو جھڑپیں ہوئی ہیں، ان میں وہ گھائل ہوا اور تین دن بعد اس کا دیہانت ہو گیا۔ اب یہ لڑکی ودھوا ہے اور اسے زندہ درگور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ماتا جی نے اسے ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر چھوڑا ہے۔ اسے دن میں بس ایک بار روکھا سوکھا بھوجن دیا جاوت ہے۔ یہ کھدر کے سفید کپڑے پہنتے ہے اور زمین پر سووت ہے۔ اس کا جیون شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ جتنا عرصہ جئے گی، اسی طرح جئے گی۔ یہ ہے ہمارے ''دھرم پریمیوں'' کی بدھی (سمجھ بوجھ) اور ان کا چلن اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تم بھی سب جانت ہو جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔''

ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ مالا ٹھٹک گئی۔ کوئی پچاس قدم دور حویلی کے مین گیٹ سے ایک گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کالے رنگ کی یہ وہی گھوڑا گاڑی تھی جس پر کچھ دن پہلے تند مزاج ستیش حویلی میں آیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دیکھتے ہی مالا مجھ سے بے تعلق ہو گئی اور اپنی ساری توجہ سویٹر بننے میں پر مرکوز کر دی۔ گھوڑا گاڑی سے ستیش برآمد ہوا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی

نظر آنے لگی تھی۔ ان لمحوں میں اس نے اپنی پتنی کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے نمستے کیا۔ مالا نے آگے بڑھ کر اس کے چرن چھوئے۔ ستیش نے مالا کی طرف توجہ دیئے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لیتا ہوا مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ستیش کی بائیں کلائی پر چھوٹا سا تازہ زخم نظر آ رہا ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ستیش نے جوش سے میرے کندھے دبائے اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''گوپال! ہم سپھل (کامیاب) رہے۔ ہم نے وہ حاصل کر لیا جو چاہت تھے۔ مختار راجپوت کی بیٹی اب ہمارے پاس ہے......''

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر محسوس ہوئی۔ تاہم اپنے اندرونی تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے بھی ستیش کے سامنے مسرت کا اظہار کیا اور اس سے پوچھا کہ سلطانہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ''میں تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لئے ہی تو آیا ہوں۔''

''اور اس کا بھتیجا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ حرامی بھی ساتھ ہے۔''

''کیا سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہوا؟''

''ایک سو ایک فیصد۔'' وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ ''اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ حکم جی کے بندے زیادہ زور ناہیں مار سکے۔ انہوں نے سلطانہ والی گاڑی کے پیچھے آنے کی کوشش کی مگر ہم نے درّے پر روک لیا۔ بس تین چار منٹ کی فائرنگ کے بعد ہی وہ لوگن بھاگ گئے۔ کچھ ایسا جانی نقصان بھی ناہیں ہوا۔ دو بندے ان کی طرف سے مرے، تین چار گھائل ہوئے۔ ہماری طرف سے صرف دو بندے گھائل ہوئے ہیں......'' اس نے جلدی جلدی مجھے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا ہاتھ کیسے گھائل ہوا؟''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''جتنی بڑی سپھلتا (کامیابی) ملی ہے اس کے سامنے ایسے چھوٹے زخم کچھ بھی ناہیں ہیں۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرا لگا ہے۔ گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھوڑا سا گھائل ہوا ہے۔''

اسی دوران میں رام پرشاد بھی آتا دکھائی دیا۔ اس کی سفید دھوتی بھی جیسے شادمانی سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے سے

لگایا اور ماتھا چوما۔ ''شاباش! تم لوگن نے وہ کر دکھایا جس کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ میں بھاگ وان ہوں کہ تم میرے پتر ہو۔''

بڑھیا بھی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آ گئی اور پوتے کی بلائیں لینے لگی۔ پھر یہ سارا گھرانا پوجا کے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک پرارتھنا کرنے اور آرتی اتارنے کے بعد یہ لوگ باہر نکلے تو فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ رام پرشاد نے چاکروں کو آوازیں دیں۔ ''ساجن، مہندر امری......جلدی آؤ یہاں۔''

کئی نوکر دوڑتے ہوئے پہنچ گئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ''بہت سا پرشاد بنواؤ اور تقسیم کرو......نل پانی کے سارے بڑے مندروں اور استھانوں کے لئے چڑھاوے تیار کرو۔''

بڑھیا نے گنگا جل منگوایا۔ پوتے کو پلوایا اور بیٹے کو بھی۔ پھر وہ ایک لمبی مالا لے کر بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھ گئی اور کوئی جاپ کرنے لگی۔ اس نے حکم دیا کہ پچھلی دروازہ بند کر دیا جائے اور کوئی فرد بھی اس دروازے سے پوجا کے کمرے میں داخل نہ ہو۔ اُس کا خیال تھا کہ اس شبھ گھڑی میں پچھلی دروازے سے پوجا کے کمرے میں آنا اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ سال خوردہ بوڑھی عورت پتا نہیں کون کون سے توہمات اپنے دماغ میں بسائے بیٹھی تھی اور دوسروں کو بھی ان توہمات میں شریک دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بہو مالا کو مخاطب کر کے بولی۔ ''دیکھ رہی ہے مورکھ! ہم پاپ کے ایک کام سے بچے ہیں تو ایشور نے کتنی کامیابی دی ہے تیرے پتی کو۔ وہ کلموہی اب اپنے کرموں کا پھل پاوے گی۔ اس نے ایک دھرم اوتار کی ہتھیا کی تھی۔ اوتار کی آتما کو شانتی دینے کے لئے اس کلموہی کا مرنا ضروری تھا۔''

بہو مالا برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی دادی ساس کس پاپ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ بیوہ ملازمہ کا سر مونڈ کر اور اسے بے چارگی کی تصویر بنا کر انہوں نے دھرم کا پالن کیا ہے اس لئے ایشور نے انہیں فوری طور پر ایک اچھی خبر سنائی ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ستیش مجھے حویلی سے لے کر جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیگ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وقتِ رخصت رام پرشاد کی توہم پرست والدہ ایک چودہ پندرہ سال کے خوبرو لڑکے کے ساتھ آئی۔ لڑکے نے بیچ میں سے مانگ نکال رکھی تھی۔ ماتھے پر قشقہ تھا۔ حلیہ سادھو سنتوں جیسا تھا۔ بڑھیا کی ہدایت پر لڑکے نے میرے سر پر ایک نامعلوم خوشبو والا تیل ڈالا اور مجھے گنگا جل کے چند گھونٹ پلائے۔ اس کے بعد نیلگوں

پتھروں کی ایک مالا سی میرے گلے میں ڈال دی۔ بڑھیا نے میرے اور ستیش کے ماتھوں پر تلک لگائے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ستیش کے ساتھ اس کی شان دار گھوڑا گاڑی میں حویلی سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی تیزی کے ساتھ نل پانی کے مختلف بازاروں سے گزرتی رہی اور مضافات میں آ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ میں سلطانہ کے پاس ہی جا رہا ہوں لیکن سلطانہ کو میں کس حال میں دیکھوں گا اور مجھے سلطانہ کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی بات ضرور سمجھ میں آ رہی تھی کہ کچھ انوکھا اور خطرناک ہونے والا ہے۔

کچھ آگے جا کر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ستیش کے ہاتھ میں ایک سیاہ پٹی نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ''گوپال! میں تم سے شما چاہت ہوں لیکن یہ ہمری مجبوری ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ پٹی تمہاری آنکھوں پر باندھنا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا۔

ستیش نے پٹی باندھ دی...... گاڑی قریباً ایک گھنٹے تک مزید ہچکولے کھاتی رہی۔ وہ ایک نیم پختہ راستے پر چلنے کے بعد کچے راستے پر آ گئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ جنگلی گلاب اور دیگر نباتات کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک طویل چڑھائی چڑھنے کے بعد گھوڑا گاڑی رک گئی۔ ستیش نے مجھے اسی حالت میں گاڑی سے اتارا اور سہارا دے کر کسی چار دیواری میں لے گیا۔ میری پٹی کھول دی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں جس جگہ پر موجود تھا وہ کسی کھنڈر سے مشابہ تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کسی پرانے استھان کی باقیات ہیں۔ ایک طرف کسی قدیم تالاب کے آثار تھے، دوسری طرف چند پختہ روشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس جگہ خوشبو بہت زیادہ تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی تھی اس لئے ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ گھوڑا گاڑی خوشبو کے ایک بڑے ڈھیر میں سے گزر کر یہاں پہنچی ہے اور وہ جس خوشبودار جگہ سے گزری تھی، وہاں شاید بہت سے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ غالباً یہ کوئی بڑی پھلواری تھی۔

ستیش اور گاڑی کا کوچبان مجھے لے کر آگے بڑھے۔ ہم ایک تنگ سے سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلاستر جھڑ چکا تھا، جا بجا اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ جا کر یوں لگا کہ سرنگ ختم ہو گئی ہے۔

یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا۔ سرخ پتھر کی چند ٹوٹی پھوٹی سلیں بھی یہاں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سلیں استھان کے کھنڈر کا حصہ ہی ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ ایسی ہی دو سلوں کے درمیان چھوٹا سا راستہ موجود ہے جسے جھاڑ جھنکاڑ سے چھپا دیا گیا ہے۔ کوچبان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ستیش نے بیگ میں سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ دائیں طرف اس سرنگ کی نیم پختہ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ سے تھے جن سے مدھم ہوا اور روشنی اندر آتی تھی۔

مجھے اپنے سامنے لامتناہی سیڑھیوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ یہ سیڑھیاں سرنگ کے پتھریلے فرش کو کود کر بنائی گئی تھیں۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔

''ابھی ہمیں کتنا جانا ہے؟'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بس پانچ دس منٹ۔'' ستیش نے جواب دیا۔

اتنے میں سامنے سے بھی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ تین بندے نظر آئے۔ انہوں نے قریب پہنچ کر ستیش کو پرنام کیا۔ ستیش نے جواب دیا۔ آنے والے دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو میں نے پہچان لیا۔ حویلی میں جو دوست ستیش سے ملنے آئے تھے، ان میں یہ بھی شامل تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور ہونٹ بہت موٹے تھے۔ یہ چیک دار شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

ستیش نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں مہندر! کدھر جا رہے ہو؟''

''بس ذرا نالے تک...... ابھی آ جاوت ہیں۔'' اس کے ہاتھ میں ایک جال تھا۔ لگتا تھا کہ شاید یہ افراد کہیں مچھلی وغیرہ پکڑنے جا رہے ہیں۔

''حالات ٹھیک ناہیں...... ذرا خیال رکھنا۔'' ستیش نے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

ستیش اور مہندر کے درمیان دو تین فقروں کا تبادلہ ہوا پھر ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ گئے۔

کہیں قریب ہی پانی کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پانی کسی اونچی جگہ سے نشیب میں پتھریلی جگہ پر گر رہا ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، یہ شور نمایاں ہوتا گیا۔ پھر ایک جگہ ہمیں اس پانی کی جھلک نظر آ گئی۔ یہ پانی کسی نامعلوم سمت سے آ کر ایک چھوٹے آبشار کی صورت میں پتھروں پر گرتا تھا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ایک تالاب کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ سفید جھاگ اڑاتے اس پانی کے اندر ایک بہت بڑا مجسمہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ اوندھی حالت میں تھا۔ اس کی لمبائی تیس چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کا ایک بازو ندارد

تھا۔ چونکہ وہ اوندھی حالت میں تھا اس لئے صورت نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ وہ ہندو دھرم کے کسی دیوی دیوتا کا بت ہے جو استبداد زمانہ کے سبب بلندی سے اس پانی میں گرا ہے اور نامعلوم عرصے سے یہیں پڑا ہوا ہے۔ جس جگہ سے یہ بُت گرا تھا وہ آبشار کے قریب تھی اور مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ہم پتھر میں کھدی ہوئی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ سرنگ پھر تنگ ہونے لگی۔ اب دائیں دیوار پر نظر آنے والے روزن نما سوراخ بھی نہیں تھے اس لئے قدرے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ سو ڈیڑھ سو قدم آگے آکر مجھے ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ میں اس شور کو کوئی واضح معنی نہیں دے سکا، بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ آس پاس کچھ لوگ موجود ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں...... چل پھر رہے ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر کوچبان نے ہاتھ بڑھایا اور ایک زنگ آلود آہنی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میں چکرا سا گیا۔ میں جیسے ایک دم ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی سے نکل کر ایک وسیع و عریض اسٹیڈیم میں آ گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا زمین دوز ہال تھا۔ یہاں ستونوں کی دو قطاریں تھیں جنہوں نے بہت بڑی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور نانک چندی اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ ستون اور ستونوں کے نیچے پتھریلا فرش بھی خستہ حال تھا۔ دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگین شبیہیں دھندلی پڑ چکی تھیں یا یکسر مٹ چکی تھیں۔ چند ایک...... شکستہ مورتیاں بھی نظر آتی تھیں۔ شاید کسی وقت یہ وسیع ہال اس استھان کا ایک اہم حصہ رہا ہو گا لیکن اب یہ ایک کھنڈر تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ یہ کھنڈر بالکل صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اسے ایک آباد جگہ کی شکل دے رکھی تھی۔ مجھے ایک ادھیڑ عمر کا فربہ اندام شخص نظر آیا۔ عام ہندوؤں کے برعکس اس کی داڑھی تھی اور سر پر لمبی جٹائیں تھیں۔ وہ پنڈت کے بجائے کوئی سادھو سنت نظر آتا تھا۔ اس کی صورت میں عجیب سی کرختگی تھی۔ اس شخص کے علاوہ یہاں پندرہ بیس جوان لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب ہٹے کٹے اور ورزشی جسموں والے تھے۔ ان میں سے دو چار کے کندھوں پر رائفلیں بھی جھول رہی تھیں۔ ایک طرف سات آٹھ لڑکے اوندھے لیٹے تھے اور ایک شخص سے رائفل چلانے اور نشانہ باندھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ دیواروں پر کلہاڑیاں، لاٹھیاں اور خنجر وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ جگہ ایک تربیتی اکھاڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستیش کو دیکھ کر سب نے اپنی مصروفیات روک دیں اور ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے خاص دلچسپی سے دیکھا جا رہا تھا۔

ستیش ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند نوجوان بھی ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ یقیناً یہ گفتگو میرے بارے میں ہی ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے مجھ پر طائرانہ نظر بھی ڈال لی جاتی تھی۔

میں گاڑی کے کوچبان کے ساتھ ایک ہموار پتھریلے فرش پر کھڑا تھا اور آٹھ دس فٹ نیچے ہال کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ذہن میں کئی اندیشے کلبلانے لگے۔ یہ کسی تشدد پسند گروہ کا ٹھکانا تھا۔ ایک ایسا ہی ٹھکانا (جو کافی چھوٹا تھا) میں نے نل پانی کی اندرونی آبادی میں بھی دیکھا تھا۔ وہاں فائرنگ میں کپتان اجے کے ہاتھوں سے آنند نامی بندہ ہلاک ہوا تھا اور کئی لڑکے پکڑے گئے تھے۔ اگر ان لڑکوں میں سے کوئی ایک اس جگہ موجود ہوتا تو کیا ہوتا؟ مجھے فوراً پہچان لیا جاتا اور ستیش کو بھی پتا چل جاتا کہ میں گوپال نہیں ہوں...... ایک مُسلا ہوں اور اس سے پہلے آنند جیسے شخص کے قتل میں ملوث رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد ستیش میری طرف مڑا اور مجھے لے کر ہال کمرے میں آ گیا۔ یہاں خستہ حال دیواروں میں پرانی لکڑی کے تین چار دروازے موجود تھے۔ ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے اور ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ایک کوٹھڑی نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بستر موجود تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اور دو کرسیاں بھی تھیں جن کے آگے تین ٹانگوں والی گول میز رکھی تھی۔ یہاں بھی رادھا، کرشن، لکشمی اور کالی ماتا وغیرہ کی چھوٹی بڑی مورتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا ترشول پڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ہندو دیو مالا کے کسی قدیم منظر میں داخل ہو گیا ہوں۔

میں نے ستیش سے پوچھا۔ ”مختار راجپوت کی بیٹی یہیں پر ہے؟“

”ہاں...... بہت جلد تم اسے دیکھ سکو گے۔“

”کب تک؟“

”اس کا اصل سے تو مہا گرو ہی بتا دیں گے لیکن میرا وچار ہے کہ یہ ملاقات آج رات یا کل شام تک ہو جاوے گی۔“

”یہ مہا گرو کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے ابھی ان کو دیکھا تو ہے۔ وہ داڑھی والے جٹا دھاری، جنہوں نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ اسی سادھو نما شخص کی بات کر رہا ہے جس نے یہاں آتے ہی ستیش سے سوال جواب کئے تھے۔

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے ستیش سے کہا۔ ''میں بہت اُلجھن میں ہوں جی۔ پتا ناہیں کہ آپ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنا چاہت ہیں...... اور اس میں میرا کیا پارٹ ہووے گا؟''

''شاید تم ڈر رہے ہو کہ تمہیں اس اپرادھن کا خون کرنا پڑے گا۔ ایسی کوئی بات ناہیں ہے۔ ماتا جی نے کہا تھا نا کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ ناہیں کرنا۔ اگر کچھ کرنا ہوا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہووے گا کہ تمہیں ایک اگنی جلانا ہووے گی...... بس۔''

''میں چاہت ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جاوے تا کہ میں واپس جا سکوں۔'' میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہووے گا۔ اب تم کچھ کھا پی کر سفر کی تھکاوٹ اتار لو۔ جب سے آوے گا، میں تمہیں خود بلا لوں گا۔''

''نہیں، مجھے کوئی ایسی تھکاوٹ ناہیں اور نہ ہی بھوک ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''میں تم میں کئی انوکھی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ اتنی سردی میں بھی تم نے عام سے کپڑے پہن رکھے ہیں اور تم سردی کو کچھ زیادہ محسوس بھی ناہیں کر رہے ہو۔ تم باقاعدگی سے بھوجن بھی ناہیں لیتے ہو۔ شاید کبھی کبھی سارا دن فاقے سے بھی گزار دیت ہو۔ میں نے ایک دن تمہیں ٹھنڈے یخ پانی سے اشنان کرتے دیکھا ہے۔ کسی وقت تو لگت ہے کہ تم نے اپنے شریر کو تکلیف اور دکھ میں رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے......''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات ناہیں۔ بس میرا رہن سہن ہی کچھ اس طرح کا ہے۔''

''ایسا کب سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا ناہیں ستیش صاحب!''

''کسی وقت تو لگتا ہے جیسے تم کوئی چلہ کاٹ رہے ہو۔'' وہ ہولے سے مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ میں چلہ ہی کاٹ رہا ہوں۔ ایک ایسا چلہ جو اب شاید میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔ مجھے کوئی ایسا ملا تھا جو درد کو میرا اوڑھنا بچھونا بنا گیا تھا۔ وہ مجھے بتا گیا تھا کہ درد کے ساتھ زندہ رہنا کیا ہوتا ہے اور درد کے پانیوں میں ڈوب کر راحت کے موتی کیسے نکالے جاتے ہیں۔ میں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہا تھا۔ اس راہ پر کانٹے تھے جو میرے پاؤں میں ٹوٹتے تھے لیکن اب ان کانٹوں کے ٹوٹنے میں ایک مزہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں بدل رہا تھا۔ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک شخص بڑا سا طشت لے آیا۔ اس میں مٹھائی، خشک میوہ جات اور گرم دودھ وغیرہ تھے۔ موسم اب سرد ہو چلا تھا۔ میں نے تھوڑی سی پیٹ پوجا کی۔ ساتھ ساتھ میں خود کو آنے والے حالات کے لئے تیار کرتا جا رہا تھا...... میں جانتا تھا کہ میں ایک نہایت سنگین صورت حال میں داخل ہو چکا ہوں۔ یہاں سلطانہ راجپوت موجود تھی...... اور وہ میری بیوی تھی۔ وہ بے رحم حالات کی زد میں تھی اور خود بھی بے رحم ہو چکی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو ایک بچے کی ماں بھی ہے، یکا یک زندگی اور زندگی کے سارے تقاضوں سے اتنی دور جا سکتی ہے۔ وہ زنداں میں تھی۔ اس نے پے در پے قتل کئے تھے اور آسیب بن کر لوگوں کے حواس پر چھا گئی تھی۔ صرف چند ہفتوں میں ہی اس کا نام راجواڑے کے ہر باشندے کی زبان پر آ گیا تھا...... خاص طور پر موہن کمار کے قتل کے بعد تو اس کے نام کے حوالے سے تہلکہ مچ گیا تھا...... لیکن وہ تہلکے اور سنسنی کا یہ سلسلہ تادیر برقرار نہیں رکھ سکی۔ بے شک لوگوں کو توقع تھی کہ وہ کسی روز کسی آسیب کی طرح جارج گورا یا سرجن اسٹیل وغیرہ کو بھی دبوچ لے گی مگر ایسا نہیں ہو پایا۔ موہن کمار کے قتل کے بعد وہ گھیرے میں آ گئی تھی اور اب اپنے نو عمر بھتیجے طلال راجپوت سمیت ان انتہا پسند کٹر ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ وہ اسے اپنے دھرم کے مطابق قرار واقعی سزا دینے کے لئے بے تاب تھے۔ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا کہ اس قرار واقعی سزا میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے میں خود بھی گوپال کے روپ میں یہاں موجود تھا۔

میں پچھلے تین چار روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے سلطانہ کے لئے کیا کرنا ہے؟ اسے کس طرح بچانا ہے؟ کیسے اس کی اور طلال کی زندگی کو محفوظ کرنا ہے اور پھر کسی سلامتی والی جگہ تک رسائی حاصل کرنی ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تو تب ہی طے کیا جا سکتا تھا جب مجھے اصل حالات کا علم ہوتا۔ مجھے ابھی تک تاریکی میں رکھا گیا تھا۔ کچھ بھی کھل کر نہیں بتایا گیا تھا اور اب جبکہ ڈراپ سین ہونے میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا، میں بدستور اندھیرے میں تھا۔

تو کیا اس اندھیرے کا مطلب یہ تھا کہ میں کچھ نہ کروں گا اور سلطانہ و طلال کو کسی بدترین انجام سے دوچار ہونے دوں گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کم از کم آسانی سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہاں موجود تھا اور اب ایسا لاچار بھی نہیں تھا کہ بھرپور تگ و دو نہ کر سکتا۔ میں اب اپنے اندر مرنے اور مار دینے کی ہمت رکھتا تھا اور اس ہمت کے ساتھ ساتھ میرے اندر کچھ اور بھی موجود تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بارونداجیکی نے دیا تھا...... اس کی باتوں نے، اس کے فن نے، اس کے فلسفے نے۔ وہ راہِ عشق کا خیالی مسافر، وہ صبح کا تارا، وہ ٹمٹماتا ہوا

چراغ...... وہ اپنی بجھتی ہوئی لَو سے میرے سینے میں ایک دیا روشن کر چکا تھا۔ اس دیے کی روشنی دھیرے دھیرے میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہاں، ان لوگوں کے لئے اب سلطانہ راجپوت کو مارنا آسان نہیں تھا۔ اگر یہاں سلطانہ کی لاش گرتی تو پھر اور بھی بہت سی لاشیں گرتیں۔

شام کا وقت تھا جب سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھجن کی گونج سنائی دینے لگی۔

کچھ دیر بعد میرے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی فربہ اندام سادھو اندر آ گیا جسے میں نے باہر کھڑے میں دیکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی اور بنیان تھی۔ چہرے پر بھبوت اور گلے میں مالائیں تھیں۔ یہ یہاں کا مہا گرو تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پرنام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی آگیا دی۔ وہ بولا۔ ''تم خوش قسمت ہو...... تمہیں ایشور نے ایک پوتر کام کے لئے چنا ہے۔ تم نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی بڑا پن کیا ہووے گا۔''

میں نے مؤدب انداز میں سر جھکائے رکھا۔

وہ اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا دھرم آشتی اور پریم کا دھرم ہے...... لیکن کبھی کبھی کچھ مورکھ اس آشتی کو تباہ کر دینے پر کمر باندھ لیوت ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن ناہیں رہتا کہ آشتی اور پریم کا دامن تھام کر رکھا جاوے۔ پھر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ لڑکی سلطانہ ہے۔ ناری ذات کمزور ہووت ہے۔ اس کے خلاف کوئی کٹھور فیصلہ کرتے ہوئے دکھ بھی ہووت ہے لیکن اب ہمری مجبوری ہے کہ اسے اس کے کئے کی سزا دیویں اور فوراً دیویں۔ ایسا نہ ہوا تو ہم سب پر سختی آوے گی۔''

''کیا ایسا ہو سکت ہے گرو جی کہ اس لڑکی کو موت کے علاوہ کوئی اور کڑی سزا دے دی جاوے؟''

''ناہیں۔'' گرو نے فوراً اپنا سر نفی میں ہلایا اور اس کی آنکھوں سے نفرت چھلکنے لگی۔ وہ بولا۔ ''یہ لڑکی ابھاگیہ ہے۔ اس سے پے در پے اپرادھ ہوئے ہیں اور ہر اپرادھ ایسا تھا جس پر اسے موت کی سزا دی جا سکت تھی۔ اس کا سب سے پہلا اپرادھ یہ تھا کہ اس نے مقامی رواج کے مطابق حکم جی کی پری بننے سے انکار کیا۔ اس کے باپو نے چالاکی دکھائی اور اس کا بیاہ راتوں رات ایک ایسے مُسلے سے کر دیا جو اپنے ہوش حواس میں ہی ناہیں تھا...... بیاہتا ہونے کی وجہ سے یہ پری بننے سے رہ گئی۔ اس کا دوسرا بڑا دوش یہ تھا کہ اس نے ہاتھا پائی کر کے حکم جی کی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کا جبڑا توڑا اور پناہ کے لئے بھاگ کر یہاں چھوٹے سرکار اور مراد

شاہ کے پاس آ گئی۔ اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دھیرے دھیرے حالات خراب تر ہو گئے ہیں اور اب زرگاں اور نل پانی میں یدھ کی نوبت آ گئی ہے۔ اس یدھ میں پتا ناہیں کتنی لاشیں گریں گی۔ اس لڑکی کا آخری اپرادھ تو کسی صورت معافی کے قابل ناہیں ہے۔ اس نے مہاتما پیڑھی کے ایک دھرم اوتار کو بیدردی سے قتل کیا ہے اور ان کا سر کاٹا ہے...... زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج نے اس کے لئے جو سزا تجویز کی ہے، وہ دھرم کا پالن تو کرے گی ہی...... اس اپرادھن کے لئے بھی وہ سزا چھٹکارے کا سبب بنے گی۔ اس کے سارے پاپ اس سزا سے ڈھل جائیں گے۔ اس کی آتما کو شانتی ملے گی......''

''یہ سزا کیا ہے مہا گرو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ناگ پھنی کی خشک لکڑی سے چتا تیار کی جاوے گی اور اس میں اسے جلایا جاوے گا۔''

''زندہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو گی تو زندہ ہی لیکن اپنے ہوش حواس میں ناہیں ہو گی۔ اسے افیم کا ست پلایا جاوے گا پھر اگنی میں رکھا جاوے گا۔''

میں اندر سے لرز گیا۔ اندھے عقیدے انسان کو کیسے کیسے کاموں پر مجبور کر دیتے ہیں۔ توہم پرستی دھرم کا لبادہ اوڑھ کر کسی آسیب کی طرح انسان سے چمٹتی ہے اور اسے کائنات کی سب سے ناقص العقل شے بنا دیتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''مہا گرو! اس سارے عمل میں میرا کردار کیا ہووے گا؟''

''وہی جو بڑے پنڈت مہاراج نے تمہارے لئے چنا ہے۔ چاند کی چوتھی رات کو تم کالی کے مندر میں داخل ہوئے اور وہ پہلے منش بنے جو رام پرشاد کے پریوار کے ساتھ پوجا کے لئے بیٹھا۔ تم اب اگارش بنو گے۔''

''یہ اگارش کیا ہووت ہے مہا گرو؟''

''جو کسی بُری آتما کو پاپوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے اس کی مدد کرت ہے۔ تم سلطانہ کی چتا کو اگنی دکھاؤ گے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں سلطانہ کو زندہ جلایا جانے والا تھا۔ یہ کام ایک خاص شخص کے ہاتھوں ہونا ضروری تھا...... اور پتا نہیں کیسے وہ خاص آدمی میں بن گیا تھا۔ جب کالی کے مندر کے پاس بھرے بازار میں اجے کے حوالدار کی نظر سے بچنے کے لئے میں مندر میں گھسا تھا، مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ میرا یہ اقدام مجھے لے کر کس راستے پر چل نکلے گا۔

مہا گرو نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پرنتو! کیا تم اس کام کے لئے تیار ناہیں ہو؟''

''اگر یہ بڑے پنڈت مہاراج کا حکم ہے تو پھر انکار کی کوئی گنجائش ہی ناہیں ہے گرو جی لیکن......''

''لیکن......کیا؟'' گرو نے پوچھا۔

''میں سلطانہ کے بھتیجے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس کا کیا کیا جاوے گا؟''

''وہ ابھی یہاں ہمرے پاس ہی رہے گا۔ اس کے بارے میں پنڈت مہاراج بعد میں فیصلہ کریں گے۔''

میرے اور مہا گرو کے درمیان چند منٹ مزید بات چیت ہوئی پھر وہ مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر واپس چلا گیا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو زندہ جلانے کی بات کرنا اور چیز ہے لیکن سچ مچ ایک جیتے جاگتے سانس لیتے وجود کو رسیوں سے باندھ کر آگ میں بھسم کر دینا اور بات۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس زمین دوز ہال میں اور اس سے ملحقہ کوٹھڑیوں اور راہداریوں میں کم و بیش ایک سو افراد موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک ان میں کوئی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ یہ اپنے چہروں مہروں سے ہی شدت پسند لوگ نظر آتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے چہروں پر بھبوت مل رکھا تھا اور گیروا کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں کا کرتا دھرتا تو ایک جگ جیت نامی شخص تھا جو مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا تاہم ستیش کو بھی یہاں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

میں سلطانہ اور طلال کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان لیتے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی یہ پہچان ظاہر بھی کر دیتا۔ ایسی صورت میں میرا بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور کمرے میں اندر آ گیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ یہ بھدی آواز والا وہی شخص تھا جو ذرا لنگڑا کر چلتا تھا اور جسے میں حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔

عیار آنکھوں والا یہ شخص بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والوں میں سے تھا۔ اس نے سب سے پہلی اطلاع تو مجھے یہ دی کہ مختار راجپوت کی اپرادھن بیٹی کو پنڈت مہاراج کے حکم کے مطابق موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل آج نہیں ہوگا اس میں تھوڑی سی تاخیر ہے۔

اس کی یہ اطلاع میرے لئے سکون کا باعث بنی۔ تاہم ابھی مجھے اس اطلاع پر پوری طرح یقین نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ستیش یا مہا گرو مجھے خود آ کر بتائیں مگر ستیش نہ جانے کن مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کی بات چیت میں بھدی آواز والا یہ ارجن نامی شخص مجھ سے مزید بے تکلیف ہو گیا۔ وہ انتہا پسندی کی ہر تعریف پر پورا اُترتا تھا۔ مسلمانوں کے لئے اس میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا، خاص طور سے مراد شاہ اور ان کے حواریوں کے لئے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ چھوٹے سرکار کو اپنا دھرم تبدیل کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور دھیرے دھیرے تل پانی کی راج گدی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے منہ سے جیسے چنگاریاں چھوٹتی تھیں۔

وہ بولا۔ ''ہم نے بہت سہہ لیا ہے۔ اب ہم اینٹ کا جواب پتھر سے بلکہ گولی سے دیویں گے۔ اپنے ایک بالک کے بدلے میں ان کے دس بالکوں کی ہتھیا کریں گے۔ اپنی ایک عورت کے بدلے میں ان کی دس عورتوں سے بلادکار کریں گے۔ اب ہمارے ہاتھ کوئی ناہیں روک سکتا۔ اب ہمیں چپ ناہیں رہنا چاہئے۔ ہم میں سے کسی کو بھی چپ ناہیں رہنا چاہئے۔ میں تو تم کو بھی مشورہ دوں گا گوپال......اب کنارے پر رہنے کا ناہیں، طوفان میں کودنے کا وقت ہے۔ جو کنارے سے تماشا دیکھیں گے، وہ پاپ کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو کسی جتھے میں شامل کر لو۔ ضروری ناہیں کہ یہ ہمارا ہی جتھا ہو۔ بھگوان کی کرپا سے اب اور بھی بہت سے لوگن یہ کام کر رہے ہیں......'' وہ جوش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارجن نے گفتگو کا رخ ایک اور جانب موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت چمکنے لگی اور مسکراتے لہجے میں زہر سرایت کر گیا۔ اس نے مجھے ایک اور مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا جو یہاں موجود تھی اور جسے اس کے کرموں کی قرار واقعی سزا مل رہی تھی۔

میں یہ سن کر لرز گیا کہ اس بے بس لڑکی کو یہاں موجود انتہا پسند ڈشکرے کئی روز سے زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

ارجن نے ایک آنکھ میچ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''اگر چاہو تو تم بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکت ہو۔''

''میں سمجھا ناہیں۔''

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''سیانے کہتے ہیں جو چیز بے کار جا رہی ہو، اسے بے کار جانے سے پہلے استعمال کر لینا چاہئے۔ اس چھوکری کو بھی ایک دو دن میں مکت (ختم) ہو جانا ہے تو پھر کیوں نہ یہ کسی کے کام آ جاوے۔''

''تمہارا...... مطلب...... بلاد کار سے ہے؟''

''بلاد کار ناہیں...... انصاف...... انصاف...... نیائے......'' ارجن کے لہجے میں پھر بے پناہ زہر اُتر آیا۔''اس حرامزادی کے بھائی نے ایک برہمن لڑکی کے ساتھ زیادتی کی...... بیاہ کا جھانسا دے کر اسے اغوا کیا۔ کئی روز تک ایک کرائے کے مکان میں بند رکھا۔ خود اس کے ساتھ سوتا رہا، اپنے دوستوں کو بھی سلاتا رہا۔ اس ''پن کام'' میں اس حرامزادے کی بہن بھی پوری طرح شریک تھی۔ وچولی بنی ہوئی تھی...... ملاقاتیں کراتی تھی۔''

میں حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔''اب کہاں ہے وہ لڑکا؟'' میں نے پوچھا۔

''بھاگ گیا کتا، احمد آباد کی طرف...... لیکن ہمارے بندے پیچھے ہیں۔ ایک نہ ایک روز دھرلیں گے اسے۔''

''اور یہ لڑکی وہی ہے اس کی بہن...... ملاقاتیں کرانے والی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ناہیں، یہ وہ ناہیں۔ اس بدذات کو تو ہمرے جتھے کے جوانوں نے وہیں مار ڈالا تھا، اس کے گھر میں۔ مار مار بھرتا بنا دیا تھا اس حرامزادی کے تھوبڑے کا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ زندہ ہاتھ آ گئی تھی گھر کے پچھلے کمرے سے۔ وہاں ایک بڑے جستی صندوق میں چھپ گئی تھی۔''

میری نگاہوں میں اس لاش کا منظر گھوم گیا جو چند دن پہلے ہم نے شہر کے ایک اندرونی محلے میں دیکھی تھی۔ تھانے دار محمود اور کپتان اجے وغیرہ کو شک ہوا تھا کہ یہ شاید سلطانہ کی لاش ہے۔ مجھے لاش کا مسخ چہرہ یاد آیا اور جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ارجن نامی غنڈا اسی بدقسمت لڑکی کا ذکر کر رہا ہے......

اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھاما اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔''میں رات کو دس گیارہ بجے کے قریب آؤں گا۔ ستیش بابو سے ان باتوں کا ذکر ناہیں کرنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ابن آدم جب پستی میں گرتا ہے تو کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض لوگ انتہا پسندی کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ تو ہم پرستی کے خمیر سے جنم لینے والے انتہا پسند ہر مذہب، ہر قوم میں پائے جاتے ہیں...... اس کی ایک ناقابل تردید کربناک مثال میرے سامنے تھی۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو انتہا پسندوں سے بھی آگے کی شے نظر آ رہے تھے۔ وہ بداخلاقی اور سفاکی کی ہر حد سے گزرے ہوئے تھے۔

مقررہ وقت پر ارجن میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے کسی شے کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تاڑی تھی۔ وہ ایک راہداری سے گزار کر مجھے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں سات آٹھ بندے موجود تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ لحافوں میں لیٹے سگریٹ پھونک رہے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ ان سب نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چپکے چپکے مسکرائے بھی۔

شیشے کی ایک لمبی بوتل تاڑی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ارجن نے مجھے پینے کی پیشکش کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

ہم گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ ارجن کوشش کر رہا تھا کہ میں باقی افراد سے بھی بے تکلف ہو جاؤں۔ وہ سب صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ کئی ایک کے چہرے پر نئے و پرانے زخموں کے نشان موجود تھے۔ وہ مراد شاہ کے بارے میں اور اس کے ایک ہم زُلف کے بارے میں نہایت نازیبا گفتگو کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ننگی گالیاں ہی بک رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بینگن کے پکوڑے کھائے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کمرے کا ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا شخص تاڑی کے نشے میں ڈولتا اور اپنی قمیص درست کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ گنگنا رہا تھا...... رام تیری گنگا میلی ہو گئی...... ہو رام تیری گنگا میلی ہو گئی......

اس نے دو تین پکوڑے کھائے اور پھر دھپ سے ایک چارپائی پر گر گیا۔ ارجن نے چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھا پھر ایک آنکھ بھینچی اور مجھے ادھ کھلے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس صورتِ حال کو اب کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ سجائی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ارجن نے مسرور لہجے میں کہا۔''بجرنگ بلی کی جے...... ہبر شیر لگے ہو بھئی۔'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔''کچھ اور ناہیں تو یہی لے جاؤ۔''

میں نے پیکٹ ہوا میں دبوچ لیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر لالٹین کی مدھم سی زرد روشنی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک پلنگ پر بوسیدہ سے لحاف کے نیچے مجھے بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آئی۔ یہ ایک بیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کے روکھے پھیکے بال منتشر اور چہرہ لالٹین کی روشنی ہی کی طرح زرد اور بیمار تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں چپ چپی ہو

چکی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہی مائل ہو چکے تھے۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح اپنے اردگرد سے لاتعلق پڑی تھی۔ رخسار پر ایک دو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

اس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ شرم نہ خوف، نہ غصہ نہ بیزاری۔ وہ بس اسی طرح پھول دار لحاف کے نیچے بے لباس پڑی رہی۔ روندی مسلی ہوئی، کچلی ہوئی اجاڑی ہوئی۔ وہ جیسے صدیوں سے ایسے ہی پڑی تھی۔ آدم کے بیٹوں سے پوچھ رہی تھی۔ میں کائنات کا حسن ہوں۔ میں نازک ترین جذبوں کی کہکشاں ہوں۔ میں محبت کی خوشبو اور زندگی کی روح ہوں۔ میرے بے لوث جذبوں نے زندگی کو زندگی بنایا ہے۔ تو پھر...... میں زندگی کو زندگی بنانے والی...... زندگی سے اس قدر دور کیوں کر دی جاتی ہوں؟ کیوں مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے؟ کیوں ہر ظلم وستم کا رخ کسی نہ کسی طور میری طرف موڑ دیا جاتا ہے؟ مجھے کچل مسل کر ناقابلِ شناخت بنا دیا جاتا ہے؟ جیسے میں اب تمہارے سامنے پڑی ہوں۔ شاید تم بھول رہے ہو، میرے گرم ہونٹوں پر گلاب کھلا کرتے ہیں۔ میرے دل آویز جسم میں خوشبودار محبت کے چشمے بہا کرتے ہیں۔ میری بانہوں میں سما کر تم مرد و زن کی محبت کا ناقابلِ فراموش لمس حاصل کر سکتے تھے...... لیکن اب تم کیا حاصل کرو گے؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پانے سے پہلے ہی تم مجھے کھو چکے ہو۔ تم ایک سرد باسی گوشت پر جھپٹے مارو گے۔ بالآخر تمہارے حصے میں کراہت، ندامت اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ کچھ بھی نہیں۔

میں لحاف کے نیچے پڑی اس لڑکی کی خاموش آواز سنتا رہا۔ یہ آواز میرے رگ و پے میں سماتی رہی۔ وہ جو کہہ رہی تھی، ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں ہولے سے اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی۔ اسے جیسے توقع نہیں تھی کہ میں بستر کے بجائے کرسی کی طرف بڑھوں گا۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ وہ میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہر سلوک کے لئے تیار تھی لیکن اس سلوک کے لئے تیار نہیں تھی جو میں اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ میں نے لحاف کا کونا اوپر کی طرف کھینچا اور لڑکی کا عریاں کندھا اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے لباس پہننے کا کہوں لیکن میرے ایسا کرنے سے ارجن اور اس کے ساتھی چونک سکتے تھے...... اور مجھے اپنا بہروپ برقرار رکھنا تھا۔

میں نے اس کے بوسیدہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہلکے سے بخار میں تھی۔ میرا نرم رویہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔ ’’کب سے ہو یہاں؟‘‘

’’کچھ یاد ناہیں۔‘‘ وہ سسکی۔

’’کیا واقعی تمہارے بھائی نے کسی لڑکی کو اُٹھایا تھا...... اور اپنے پاس رکھا تھا؟‘‘

’’میں...... اس بارے میں کچھ ناہیں کہنا چاہتی...... اور یہ سب کچھ بتانے سے...... کچھ حاصل بھی ناہیں ہے...... ہونا وہی ہے جو پہلے ہوتا آیا ہے۔ تم بھی وہی کرو گے اور چلے جاؤ گے۔‘‘ اس نے بیزاری سے اپنا منہ پھیر لیا۔

’’ناہیں...... میں وہ ناہیں کروں گا جو ہوتا آیا ہے...... میں تمہیں سوگند دیتا ہوں۔‘‘

اس نے ایک بار پھر مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔

میں اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی طرح پھول دار لحاف میں سمٹی رہی، میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھائی بے قصور تھا۔ وہ برہمن لڑکی خود ہی اس کے بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہر صورت اس سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ جب کوئی راستہ باقی نہ رہا تو وہ دونوں گھر چھوڑ گئے۔ بعد میں انہیں پکڑ لیا گیا اور اس کے بھائی پر بے شمار جھوٹے الزامات لگا دیئے گئے۔ اس کی بڑی بہن کو اس الزام میں مار دیا گیا کہ وہ اس برہمن لڑکی کی ملاقاتیں بھائی سے کرواتی تھی۔ وہ لوگ اسے اُٹھا کر یہاں لے آئے اور اب وہ آٹھ دس دن سے یہیں پر بند تھی۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔

یہاں سے اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا۔ وہ بدمست خطرناک غنڈوں کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی اور چند ہی دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے گی۔ اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ خودکشی کر سکتی ورنہ کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔

کمرے کے ایک کونے میں اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ طاق دان میں لالٹین کے ساتھ کھانسی اور بخار وغیرہ کی دوا رکھی تھی۔ یہیں پر ایک کونے میں، میں نے ایک بیلچہ پڑا دیکھا جس کے دستے پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے...... اور کسی دیوی غالباً کالی ماتا کی شبیہ کھدی ہوئی تھی۔ بیلچے کے پھل کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور زرد لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ میں نے بیلچے کی طرف اشارہ کیا۔

’’یہ کالی ماتا کا بیلچہ ہے۔‘‘ وہ نحیف آواز میں بولی۔

’’کالی ماتا کا بیلچہ؟ یہ یہاں کیوں رکھا ہے؟‘‘

’’میں اس سے مٹی کھودتی ہوں۔‘‘ وہ منمنائی۔ ’’وہ کہوت ہیں کہ میں تلسی کے پودے کے نیچے سے مٹی کھودوں گی تو مجھے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر ملے گی اور اگر چار دن کے

اندر مجھے یہ مہر مل گئی تو پھر وہ مجھے چھوڑ دیویں گے......لیکن...... میں اب جینا ناہیں چاہتی۔ تم لوگن مجھے مار ہی دو تو اچھا ہے۔" وہ واقعی زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف تو تھا مگر زندگی کا خوف شاید اس سے زیادہ تھا۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کے لئے اپنا ہاتھ لحاف سے باہر نکالا تو مجھے اس کی ہتھیلی پر چھالے نظر آئے۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ چھالے بیلچہ چلانے کی وجہ سے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "شکیلہ! اگر تم زندگی سے اتنی ہی بیزار ہو چکی ہو تو پھر ان لوگن کے کہنے پر بیلچہ کیوں چلاوت ہو؟"

"یہاں کچھ بھی میری مرضی سے ناہیں ہوتا۔" وہ سسکی۔ "کل میں نے مٹی کھودنے سے انکار کیا تھا، میری قمیص پھاڑ دی گئی اور مجھے مارا گیا۔"

میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک طرف ایک الماری پر تہ شدہ جائے نماز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کس کی جائے نماز ہے؟"

"میری...... میں اس پر نماز پڑھت ہوں۔"

"کیا یہ لوگن تمہیں پڑھنے دیوت ہیں؟"

"ہاں، ان کو اعتراض ناہیں۔ رات ہونے سے پہلے میں جو کچھ چاہوں کر سکت ہوں۔" وہ دردناک لہجے میں بولی۔

میں اس صورتِ حال پر ششدر تھا۔ شیوا جی کی مہر والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ بھی کسی کنڈلی کی وجہ سے کیا جا رہا تھا؟

میں نے اس شکیلہ نامی بدحال لڑکی سے سلطانہ کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا نہیں کیونکہ اسے بہت کم اس کمرے سے باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ہاں دو دن پہلے رات کے وقت بجرنگ بلی اور ہنومان کی جے کے زوردار نعرے سنائی دیئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں کو کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ اس وقت اس نے گرو جی کی دھرم پتنی رادھا جی کو ایک ملازم سے باتیں کرتے سنا تھا۔ ملازم گرو کی پتنی کو بتا رہا تھا کہ کسی لڑکی کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا ہے۔ وہ دیوی دیوتاؤں کو بُرے ناموں سے پکار رہی ہے اس لئے اس کے منہ میں مٹی بھر کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا گیا ہے۔

"کیا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ یہاں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"شاید کسی لڑکے کی بات بھی ہو رہی تھی۔" شکیلہ نے تصدیق کی۔

میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک شکیلہ کے پاس رہا۔ اس دوران میں، میں نے دو تین سگریٹ

بھی پھونکے۔ میں شکیلہ سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جانتی ہے کہ وہ بچ نہیں سکتی اس لئے مرنے کے لئے تیار ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر مزاحمت کا حق ادا کر چکی تھی اور اب اس نے خود کو کلی طور پر بدترین حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اس سے رخصت ہو کر باہر آ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔

میں اپنے سینے پر ایک بہت بڑا بوجھ لے کر اس کمرے سے نکلا۔ ارجن اور اس کے ساتھیوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے باہر آتے ہی ارجن کے ایک اور ساتھی نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور لڑکی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا رہا۔ میرے اندر آگ سی روشن تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس کڑاکے کی سردی میں تیز بارش ہو۔ میں برہنہ جسم کسی منجمد جھیل کے کنارے، سرد ہواؤں کو چیرتا ہوا بھاگتا چلا جاؤں۔ میرا سینہ اتنا ہانپ جائے کہ پھٹنے لگے، میرے پاؤں خون اگلنے لگیں۔ پھر میرے سامنے میرا کوئی بپھرا ہوا دشمن آ جائے۔ اس کی آنکھوں میں قاتل سرخی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس پر ٹوٹ پڑوں۔

میری سانس تیزی سے چلنے لگی۔ رگ پٹھے تن گئے۔ میں اُٹھ کر اس مختصر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ باہر ہال کمرے میں شور تھا۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ہلا گلا کر رہے ہیں۔ میں نے ایک میز پر چڑھ کر ایک روزن میں سے ہال کمرے میں جھانکا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ ایک طرف فرش پر لمبی چٹائی بچھی تھی۔ اس پر تین چار افراد بیٹھے کچھ گھوٹ رہے تھے۔ لکڑی کے رنگین ڈنڈوں پر گھنگرو چڑھے ہوئے تھے۔ پیالوں میں بھر بھر کر کچھ پیا بھی جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھنگ کا دور چل رہا ہے۔ ایک ہٹا کٹا شخص جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں گہرا سرمہ لگایا ہوا تھا، مجمعے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین نوک والا نیزہ تھا جسے ترشول کہا جاتا ہے۔ وہ شیو جی کے نام کے نعرے لگا رہا تھا اور کچھ افراد اس کے گرد رقص کر رہے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میری تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر شے گردش میں آ گئی ہے اور میں زمین سے اُٹھ کر فضائے بسیط میں معلق ہو گیا

ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پھر غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ تصور یا تخیل نہیں تھا...... ایک جیتا جاگتا منظر تھا...... مجھے عمران دکھائی دیا۔ ہال کی دھواں دھواں فضا میں چہروں کے ہجوم میں، میں نے اس کا روشن چہرہ صاف اور واضح دیکھا۔ اس کے گلے میں ایک گلابی رومال تھا، وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ بس ایک یا دو سیکنڈ کے لئے۔ پھر ایکا ایکی وہ چہروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

''عمران...... عمران!'' میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔

تب میں جست لگا کر میز سے اُترا۔ ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور راہداری میں آ گیا۔ اندھا دھند بھاگتا ہوا میں ہال کمرے میں دھواں دھواں فضا میں پہنچا اور اس مقام کی طرف لپکا جہاں میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں خاکستری رنگ کے گول ستون کے پاس وہ موجود نہیں تھا۔ ''عمران...... عمران......!'' میں ایک بار پھر چلایا۔

کئی لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ تب مجھے پتھریلی سیڑھیوں کے پاس جہاں ہاتھی کا ایک شکستہ مجسمہ موجود تھا، پھر گلابی رومال کی جھلک نظر آئی۔ میں لوگوں کو چیرتا اور مختلف اشیاء سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھا۔ تاہم میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے گلابی رومال اوجھل ہو چکا تھا۔

''کیا بات ہے...... کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟'' ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ہر آواز کو نظر انداز کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ دونوں طرف طویل برآمدے تھے اور شکستہ ستونوں کی قطاریں تھیں۔ یہاں بہت سی کوٹھڑیاں بھی موجود تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح مختلف کوٹھڑیوں میں جھانکتا رہا...... لیکن کچھ نہیں ملا۔

میں وہاں ایک سیڑھی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیا میری نظر دھوکا کھا رہی تھی؟ کیا میرا تصور مجھے فریب دے رہا تھا؟ اس کا تصور اکثر و بیشتر میرے حواس پر چھا جاتا تھا اور میں اسے اپنے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ تصور اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ تصور اور حقیقت میں تمیز مشکل ہو گئی تھی......؟

''کیا ہوا گوپال؟'' ستیش کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک گیا۔

ستیش میرے سر پر کھڑا تھا۔ چند دیگر افراد آٹھ دس قدم دور کھڑے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا کسی جان پہچان والے کو دیکھا ہے تم نے؟'' ستیش نے پوچھا۔

''ہاں...... نن...... نا ہیں۔ بس مجھے شک سا ہوا تھا۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

''کون تھا؟''

''بس...... تھا ایک پرانا دوست لیکن...... وہ یہاں کیسے ہو سکت ہے؟ وہم ہی ہوا ہے۔''

کچھ دیر بعد میں اس ہنگامے سے نکل کر پھر اپنے کمرے میں تھا۔ جسم میں سنسناہٹ تھی اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو شدت سے چاہا جاتا ہے، وہ جدائی کے بعد بھی ہیولوں کی صورت میں ہمارے اردگرد موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چہروں میں ان کی جھلک نظر آتی ہے اور آوازوں پر ان کی آواز کا شبہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے باروندا جیکی کی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے اس کے چہرے میں عمران کی جھلک ڈھونڈ لی تھی...... حالانکہ یہ جھلک کچھ ایسی نمایاں بھی نہیں تھی۔

تو کیا اب مجھے کسی اور چہرے میں اپنے بچھڑے یار کی صورت دکھائی دی تھی؟ میں سوچتا رہا اور سر میں ٹیسیں سی اُٹھنے لگیں۔ نہ جانے میں کب تک اس عجیب ذہنی کیفیت میں رہا۔ ہال کمرے سے دھیما شور اب بھی ابھر رہا تھا۔ میں اس شور کو سنتے سنتے سو گیا۔

O...... ❖ ......O

اگلے روز شام تک بے چینی کی کیفیت رہی۔ اس بے چینی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ جھلک جو میں نے کل رات دھواں دھواں ہال کمرے میں دیکھی تھی۔ یہ میرا تصور ہرگز نہیں تھا اور اگر یہ چہروں کی مشابہت تھی تو بھی حیرت انگیز تھی۔ پریشانی کی دوسری وجہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تھے جو میں نے کل شب لٹی پٹی شکیلہ کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کھنڈر میں رائفلوں کے سائے تلے اور بارود کے گھیرے میں وہ بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ اگر میں سلطانہ کے لئے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر ضروری تھا کہ شکیلہ کے لئے بھی ایسا ہی ارادہ رکھوں۔

میری مہمان نوازی کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کٹر ہندو ہونے کے باوجود ارجن نے مجھے چپکے چپکے یہ آفر بھی کر دی کہ اگر میں ماس یعنی گوشت کھانا چاہوں تو وہ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ سہ پہر کے وقت مجھے راہداری میں گرو جی کی پتنی کی ایک جھلک بھی نظر آئی۔ وہ گرو سے خاصی کم عمر تھی اور خوب صورت بھی تھی...... اس کی مانگ میں سیندور تھا اور وہ نہایت چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دو داسیاں مؤدب انداز میں اس کے اردگرد موجود تھیں۔ تاہم مجھے گرو کی یہ جواں سال دھرم پتنی کچھ بجھی بجھی سی نظر آئی۔

شام کے فوراً بعد ہال کمرے میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ آج رات یہاں کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ بھجن مسلسل پڑھے جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے سنکھ کی

آواز سنائی دیتی تھی اور پھر ایک نقارہ سا پیٹا جانے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ ہال کمرے میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر روزن میں سے دیکھنا چاہتا تھا مگر میں نے جو تپائی روزن تک پہنچنے کے لئے استعمال کی تھی، وہ کسی ضرورت کے تحت باہر لے جائی جا چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا...... چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سلطانہ سے عنقریب میری ملاقات ہونے والی ہے اور نہایت سنگین حالات میں ہونے والی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے فضا میں تھوڑی سی حدت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

رات نو بجے کا وقت ہو گا جب شور و غل میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ نقارہ اور زور سے پیٹا جانے لگا اور اس کی آواز سے در و دیوار گونجنے لگے۔ اچانک دروازہ کھلا اور مجھے ستیش کی صورت نظر آئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔ اندر آتے ساتھ ہی اس نے میرے گلے میں جھولنے والی نیلگوں پتھروں کی مالا کا معائنہ کیا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بعد میرے سر میں وہی عجیب خوشبو والا تیل ڈالا گیا جو حویلی میں ڈالا گیا تھا۔

ستیش اور اس کے ساتھی مجھے لے کر راہداری میں آئے تو ہال کمرے کا شور و غل زیادہ واضح سنائی دینے لگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں وسیع و عریض ہال میں تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ایک اور چھوٹا ہال نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر اس پر نہیں پڑی تھی یا شاید کسی بڑے پردے کے ذریعے سے اس چھوٹے ہال یا چیمبر کو چھپایا گیا تھا۔ اس گول ہال کا فرش بڑے ہال کے فرش سے قدرے نیچا تھا۔ گنبد نما چھت میں ایک بڑا سوراخ چمنی کی طرح موجود تھا۔ میں نے اس گول ہال یا چیمبر کا منظر دیکھا اور خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ یہاں ایک بڑی چتا تیار تھی۔ شاید یہ ناگ پھنی کی لکڑی ہی تھی۔ قریب ہی بڑے بڑے دو روغنی مٹکوں میں چتا کا تیل رکھا تھا۔ چتا کے قرب و جوار کو زرد پھولوں اور چمکیلے کاغذوں کی مدد سے سجایا گیا تھا۔ چتا کے اندر لکڑی کے مستطیل تختے پر جو لڑکی بے سدھ پڑی تھی، وہ سلطانہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ وہ نیم بے ہوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک سرخی مائل چادر تھی جس کے نیچے سے اس کے جسمانی نشیب و فراز دکھائی دیتے تھے۔ اس کے بالوں کو ایک طرف سمیٹ کر کنپٹی کے قریب جُوڑا سا باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ سانس لے رہی ہے۔ اس کی رگوں میں زندگی رواں ہے...... لیکن اس زندگی کو بھڑکتے شعلوں میں بھسم کرنے کی پوری تیاری کی جا چکی تھی۔

وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ نشان ان سختیوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ جو پچھلے چند دنوں میں اس نے جھیلی تھیں۔

پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر پہلی بار میرے سینے میں عجیب سی ٹیسیں اُٹھیں۔ میں نے خود کو اس کے بہت قریب محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ میری زندگی کا ایک جز ہے۔ میں نے اس لمحے میں ان سارے احسانات کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کیا جو وہ ایک بیوی کی حیثیت سے مجھ پر کرتی رہی تھی...... اور ان ساری قربانیوں کا بوجھ بھی جو وہ میری بے خبری میں میرے لئے دیتی رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ دیوانہ وار پگوڈا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھسی تھی اور اپنی جان پر کھیل کر مجھے باہر لائی تھی اور پھر اس کے بعد میری سلامتی کے لئے اس کی جدوجہد کا طویل دور شروع ہوا تھا۔ آج وہ خود شعلوں کی زد میں تھی۔ میں تو پھر بھی پگوڈا میں اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا، وہ تو آج ہوش و خرد سے بیگانہ بالکل لاچار پڑی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے عجیب سی چاہت محسوس کی۔

چتا کے اردگرد برپا شور و غل عروج پر پہنچ گیا۔ بہت سے جوشیلے نوجوانوں کے ہاتھ میں ترشول تھے۔ ان میں سے کچھ نے بھبوت رما رکھا تھا یا اپنے چہروں پر رنگوں سے مختلف نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایک خاص رسم کی ادائیگی کے لئے بالکل تیار ہیں......

چتا کے بالکل سامنے لکڑی کی ایک اونچی چوکی پر مہا گرو فقط ایک دھوتی پہنے، آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے مالا جپ رہا تھا اور گاہے بگاہے اشلوک بھی پڑھتا تھا۔ ایک بوڑھا پجاری آگے بڑھا اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک مشعل نما چیز تھما دی۔ میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی...... تو بدترین لمحے پہنچ گئے؟ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں چتا پر تیل انڈیلا جانے والا ہے اور اس منحوس لکڑی کو روشن کیا جانے والا ہے تاکہ میں چتا کو اگنی دکھانے کا اعزاز حاصل کر سکوں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میرے سامنے بس ایک ہی راستہ ہے۔ اپنے اردگرد موجود درجنوں رائفل برداروں میں سے میں کسی ایک کی رائفل چھین لوں اور اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دوں۔ مار دوں...... مر جاؤں یا پھر کسی طرح سلطانہ کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کامیابی کا امکان معدوم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ''بہت کچھ'' ختم ہونے والا ہے اور اس ''بہت کچھ'' میں سلطانہ اور میں بھی شامل ہیں۔ ایک نوجوان جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، آنکھوں میں رنگ لگایا ہوا تھا اور فقط ایک دھوتی پہن رکھی تھی، ہو میرے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس بوتل میں سے اس نے میرے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی پر تھوڑا

سا تیل ڈالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پرنتو! تم تیار ہو؟''

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ ''مجھ کو لگت ہے کہ تم کچھ کھوئے کھوئے ہو۔ کیا کسی کو ڈھونڈت ہو؟'' شور میں اس کی آواز بہ مشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس لئے وہ زور سے بول رہا تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ ''تم کیا کہنا چاہت ہو؟''

جواب میں اس نے رازدارانہ انداز میں جو کچھ کہا، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ بولا۔ ''پرنتو! میں جانت ہوں...... تم اپنے کسی بچھڑے سنگی کو دیکھ رہے ہو۔ تمہارے من میں آشا ہے کہ شاید ان کٹھن گھڑیوں میں وہ تمہیں کہیں آس پاس مل جائے۔''

''تت...... تم...... کس کی بات کرت ہو؟''

''عمران کی۔'' اس نے دوسرا دھماکا کیا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے جیسے ایک دم مل گئے۔ میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔

''تت...... تم...... اس کو کیسے جانت ہو؟'' میں نے دھندلائی نظروں سے اسے سرتاپا دیکھا۔

وہ مسکرایا۔ مجھے اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا نظر آیا۔ اس کے ابھرے ہوئے رخسار دکھائی دیئے۔ بھبوت سے لتھڑے ہوئے چہرے میں سے ایک اور چہرہ ابھرا۔ وہ میری زندگی کے سب سے حیرت ناک لمحے تھے۔ مجھے لگا کہ میں چکرا کر گر جاؤں گا۔ وہ اپنی اصل آواز میں بولا۔ ''اتنی جلدی بھول گئے جگر! تمہاری یادداشت میں واقعی کوئی گڑبڑ گوٹالا ہو چکا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میری والدہ میرے کانوں میں بلکہ جسم کے دیگر سوراخوں میں بھی بادام روغن ڈال دیا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے میرا حافظہ اب تک بہت اچھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہاری نگہداشت اس طرح سے نہیں ہوئی......''

میں اردگرد سے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا......

O......❖......O

مجھے لگا جیسے میں ایک بہت خوبصورت سپنا دیکھ رہا ہوں...... لیکن یہ سپنا نہیں تھا۔ عمران جیتی جاگتی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔ بھبوت سے لتھڑے ہوئے چہرے کے اندر سے عمران کا جانا پہچانا چہرہ جھانک رہا تھا۔ قریباً تین برس پہلے کی اُس تاریک و پُرآشوب رات کو میں نے نالے کے پُل پر اسے آخری بار دیکھا تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں مجھے وہ ایک تیز رفتار پانی پر ایک پُل صراط جیسے راستے پر کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے پھر اس کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا۔ وہ ڈگمگایا اور اجل کے پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔

میری تمام تر حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگا کہ حیرت اور خوشی کے سبب میرا دل سینے میں پھٹ جائے گا اور میں یہیں تیورا کر گر جاؤں گا۔

بے پناہ شور کے درمیان میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ''تم...... زندہ ہو...... عمران؟''

''عجیب بے وقوفی کا سوال ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ سانس لے رہا ہوں، بول رہا ہوں، اس کے باوجود تمہیں شبہ ہو رہا ہے کہ میں بقیدِ حیات نہیں ہوں۔ اگر مُردے ایسے ہوتے ہیں تو پھر زندہ لوگ تو یقیناً قبروں میں آرام کر رہے ہوں گے...... اور دوسری بات یہ ہے جگر کہ اس طرح ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر مجھے نہ دیکھو، ان لوگوں کو شک ہو جائے گا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بالکل سنجیدہ ہو جاؤ۔ تمہارے ہاتھ والی لکڑی میں میں نے تیل ڈال دیا ہے۔ اس کو آگ دکھاؤ اور چتا جلانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

میرا دل چاہا کہ دوڑ کر عمران سے لپٹ جاؤں۔ اس کو اپنے بازوؤں میں کس لوں اور دھاڑیں مار مار کر روتا چلا جاؤں۔ میرا سر بدستور چکرا رہا تھا۔ عمران کا چہرہ میری آنکھوں کے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ سینے میں ایک دم ہی سیکڑوں سوال مچلنے لگے تھے لیکن ابھی سوال و جواب کا وقت کہاں تھا۔ ابھی تو ہم ایک نہایت سنگین مقام پر کھڑے تھے۔ یہاں ایک جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا۔ جنونیوں کا گروہ کسی وحشی قبیلے کے لوگوں کی طرح دیوانہ وار چتا کے گرد ناچ رہا تھا، سنکھ بجا رہا تھا اور نقارے پیٹ رہا تھا۔ جس جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا، وہ سلطانہ تھی...... میری بیوی تھی۔

ایک دم مجھے لگا کہ میرے جسم میں توانائی کا ایک نیا سمندر لہریں لینے لگا ہے۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میرے رگ و پے میں ایک بے نام حرارت اُترتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ اب کوئی مشکل...... مشکل نہیں رہی۔ اب کوئی دیوار میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اب میں اکیلا نہیں تھا...... اب کوئی میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا تھا اور یہ ''وہ'' تھا جس کے دلیرانہ ساتھ کے لئے میں ایک مدت تک ترسا تھا۔ پُر آشوب گھڑیوں میں، میں نے پل پل جس کی توانا مسکراہٹوں کا انتظار کیا تھا؟ وہ آ گیا تھا...... وہ میرے سامنے کھڑا تھا...... اس کی روشن آنکھیں، اس کا چوڑا سینہ، اس کے توانا بازو سب کچھ وہی کا وہی تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا......

''اوئے باندر! میں پھر کہتا ہوں، ایسے مت گھورو۔ ان لوگوں کو شک ہو گا۔ دائیں طرف جو پہلا دیا جل رہا ہے، اس سے یہ لکڑی روشن کر لو۔'' عمران کی آواز میرے کانوں میں ٹکرائی۔

''عمران!'' میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ جو چتا میں لیٹی ہے، وہ میری بیوی ہے......''

''تو ایک شوہر کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔ نہ مقدمہ، نہ عدالت، نہ سزا...... ایسی سچویشن کے انتظار میں تو شوہر لوگ اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔''

''عمران...... اسے مذاق مت سمجھو...... یہ میری بیوی ہے۔ میرے بچے کی ماں ہے۔ یہ سخت مصیبت میں ہے۔''

''تو میں اس مصیبت کو کون سا بڑھا رہا ہوں؟ میں اسے آگ لگانے کو تو نہیں کہہ رہا۔ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ آگ لگانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اسے آگ نہیں لگے گی۔ کم از کم آج تو نہیں لگے گی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔'' میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''تمہاری سمجھ میں پہلے میری کوئی بات آئی تھی جو اب آئے گی؟'' اس نے کہا اور محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ تاڑی کے نشے میں وہ سب لوگ بُری طرح اچھل کود رہے تھے۔ ترشول لہرا رہے تھے اور اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ ہر آنکھ میں اس بے بس لڑکی کے لئے نفرت و انتقام کی چنگاریاں تھیں جو چتا کے اندر بے حس و حرکت لکڑی کے تختے پر لیٹی تھی اور جن آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں، ان میں بے حسی تھی۔

عمران نے مالا جپتے ہوئے مہا گرو کی طرف اشارہ کیا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا پیٹ کسی براؤن غبارے کی طرح پھولا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے کان کے قریب آ کر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''چتا کو آگ دکھانے کی آگیا (اجازت) مہا گرو صاحب کو دینی ہے اور وہ آگیا تب دیں گے جب شبھ گھڑی آ جائے گی...... اور شبھ گھڑی آج نہیں آئے گی۔''

''تت...... تمہیں کیسے پتا؟''

''مجھے اس لئے پتا ہے کہ مہا گرو میرے قبضے میں ہے۔''

''تمہارے قبضے میں ہے؟ کیا مطلب؟''

''بھئی میں نے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں کوئی زندہ انسان تھوڑی ہوں۔ میں تو ایک روح ہوں جو اس رات اپنے پیکر خاکی سے نکل آئی تھی جس رات مجھے سینے پر گولیاں لگی تھیں۔ اب میں ایک بدروح ہوں یا سلیس لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک چڑیلا ہوں...... یعنی چڑیل کا مذکر...... بڑی فائیو اسٹار شخصیت ہے میری۔''

میں نے یونہی نیچے دیکھا تو وہ فٹ بولا۔ ''شاید تم میرے پاؤں ملاحظہ کر رہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ پاؤں چڑیل کے الٹے ہوتے ہیں، چڑیلے کے نہیں۔ چڑیل کے جسم کے ایک دو اور پارٹ الٹے ہوتے ہیں جو میں فی الحال تمہیں دکھا نہیں سکتا......'' وہ بے پر کی اڑا رہا تھا۔

اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آج کوئی نہ کوئی کرشمہ ہو جائے گا۔ شاید یہ المیہ آج ٹل جائے جس کی پوری پوری تیاری کی جا چکی ہے۔

میں حیرت کا بت بنا کھڑا رہا اور عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ تھا۔ آنکھوں کے گرد رنگ لگایا گیا تھا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا شان دار کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ مہا گرو آنکھیں بند کر کے مالا جپتا رہا اور آگے پیچھے جھولتا رہا...... عمران کے اشارے پر میں نے اپنے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی کو آگ دکھا دی اور ساکت کھڑا ہو گیا۔

مہا گرو کی مراقبہ ٹائپ کیفیت طویل ہوتی جا رہی تھی۔ نقارے مسلسل بج رہے تھے۔ قریباً تین چار منٹ مزید اسی تناؤ بھری صورتِ حال میں گزرے پھر اچانک مہا گرو نے اپنا مالا والا ہاتھ اُٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

نقارے رک گئے۔ بھجن اور اشلوکوں کی آواز بھی تھم گئی۔ سب مہا گرو کی طرف دیکھنے لگے۔ مہا گرو بجھے بجھے انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا۔ ''یوگ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ شبھ گھڑی ناہیں مل رہی۔ اس رسم کو پوری طرح سے ادا کرنے کے لئے ایک خاص سمے کی ضرورت ہے، جواب ہمارے پاس ناہیں ہے۔ اب اس خاص سمے کی آشا تین دن بعد ہی کی جا سکت ہے۔''

وسیع ہال کمرے کے نادر سناٹا سا چھا گیا۔ چند افراد کی ٹولی ایک بار پھر اشلوک پڑھنے لگی لیکن اب ان اشلوکوں میں جوش اور ہیجان کی جگہ ایک طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ یہ مذہبی شعراب طبع میں اچھال پیدا کرنے کے بجائے ہمواری پیدا کر رہے تھے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یہ روح کی کارستانی ہے اور روح تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ اگر تفصیل پوچھنا ہو تو وہ بھی تمہیں بتاؤں گا...... مجھے تمہارے کمرے کا پتا ہے، میں آج آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی...... میرا مطلب ہے آؤں گا۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ میں چڑیل نہیں بلکہ چڑیلا ہوں...... انسان تھا تو اچھی بھلی یادداشت تھی۔ اب تو ان لوگوں جیسا ہو گیا ہوں جنہوں نے بینکوں سے قرض لے رکھا ہے۔ اچھا، چلتا ہوں۔ لگتا ہے کہ گرو صاحب میری طرف ہی آ رہے ہیں۔'' وہ چبوترے سے اُترا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ میری نگاہیں مسلسل اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ پھر کہیں گم نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لپک جاتا، ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ستیش میرے پیچھے کھڑا تھا، وہ بولا۔

''یہ وقتی نراشا ہے۔ گرو جی نے کہا ہے کہ دو دن میں سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ دو دن بعد ایک بار پھر یہ محفل سجے گی اور یہ اپرادھن لڑکی اپنے انجام کو پہنچے گی۔''

ستیش نے مشعل نما لکڑی میرے ہاتھ سے لے کر پانی کے برتن میں بجھا دی اور مجھے لے کر چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ سلطانہ اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں چتا کی لکڑیوں پر پڑی تھی۔ میں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بیوی تھی لیکن دوسروں کی دسترس میں تھی۔ میں اسے چھونے کا مجاز نہیں تھا۔

O......❖......O

رات ایک بجے کا وقت تھا، جب دروازہ کھلا اور عمران میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اب وہ معقول لباس میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک عام سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سفید بھبوت بھی نہیں تھا۔ قمیص کے اوپر ایک نیلا سویٹر تھا۔ ہونٹوں پر وہی پیاری مسکراہٹ تھی جو اسے عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور ہم بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ آنسو میری آنکھوں سے گرم آبشاروں کی طرح بہہ رہے تھے۔

''تم کہاں چلے گئے تھے یار! تمہیں کیا پتا میں نے یہ وقت تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے؟'' میں نے سسک کر کہا۔

کوئی مزاحیہ فقرہ اچھالنے کے بجائے وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جذباتی کیفیت میں ہے۔

میں آنسوؤں کے درمیان بولتا چلا گیا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں۔ مجھے کسی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی تھی۔ میڈم صفورا بھی یہیں اس اسٹیٹ میں موجود ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ تم اس رات گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے...... میں نے...... میں نے اس رات خود تمہیں گولیاں لگتے دیکھی تھیں پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں اس ڈیک نالے کے کنارے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھ کچھ معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا تھا۔ کیا تمہیں پانی سے نکال لیا گیا تھا؟ میرا مطلب ہے...... میرا مطلب ہے......'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

اس کی شوخی طبع پلٹ آئی۔ وہ میرے گلے سے لگے لگے بولا۔ ''میں پانی میں کہاں گرا تھا یار! میں تو آسمان کی طرف اُٹھ گیا تھا...... سیدھا اوپر بالکل راکٹ کی طرح۔ وہ جب میں قطبی ستارے کے قریب پہنچا تو بہت سی ارواحِ خبیثہ سے میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے زبردستی مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔ یہ عقل دشمن ارواحِ خبیثہ آج کل امن اور آشتی کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قطبی ستارے کے پاس ہی ایک ٹی وی چینل بھی قائم کر رکھا ہے۔ اس کا نام ہے ''فساد پلس'' اور اس کا سلوگن ہے...... ایک ہی رستہ ایک ہی منزل...... افراتفری افراتفری۔ اس چینل میں ملازمت ملنے کی سب سے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ بندے نے جاہلیت میں ڈبل ایم اے کیا ہو اور کم سے کم دس

جگہ سے دھکے دے کر ملازمت سے نکالا جا چکا ہو۔ سو میرے یار! آج کل میں اسی ''فساد پلس'' کا نمائندہ ہوں اور قریہ قریہ گھوم کر خبریں اکٹھی کر رہا ہوں۔''

میری آنکھوں سے مسلسل آنسو رِس رہے تھے۔ میری کیفیت دیکھ کر اسے بھی کچھ سنجیدہ ہونا پڑا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ بید کی کرسیوں پر آ بیٹھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری یہ حیرت بجا ہے تابی! سینے پر براہِ راست برسٹ کھا کر زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔ جب ہم لاہور سے باہر گاڑی بھگا رہے تھے اور سیٹھ سراج اپنے ہرکاروں سمیت ہمارے پیچھے تھا، تم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ میں پہلے سے کچھ صحت مند لگ رہا ہوں۔ میری صحت مندی یعنی موٹے پن کا راز وہ امریکن بلٹ پروف جیکٹ تھی جو میں نے قمیص کے نیچے پہن رکھی تھی۔ یہی جیکٹ میری زندگی کا بہانہ بنی۔''

عمران نے اپنا سویٹر اوپر اُٹھایا اور قمیص و بنیان کے نیچے سے اپنے پیٹ پر گولی کے دو زخم دکھائے۔ ایک گولی تو شاید پہلو کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی، دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہ بولا۔ ''بس یہی دو گولیاں تھیں جو مجھے لگیں، باقی کی جیکٹ نے بلاک کر لیں۔''

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرا۔ پانی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ میں غوطے کھاتا ہوا کافی آگے نکل گیا پھر سرکس کی ٹریننگ کام آئی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلائے اور کسی طرح کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ایک نوجوان زمیندار ریاست علی مجھے اپنی ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال کر اسپتال تک لے گیا...... پوری روداد کافی لمبی ہے۔ اگر اس کو مختصر نہیں کروں گا تو باقی رات اسی میں گزر جائے گی...... اور تمہاری بھابی پوچھے گی...... چن کتھاں گزاری آئی رات وے......''

''بھابی...... کیا مطلب؟''

''تو یار کیا تم اکیلے ہی رستم زماں ہو جو آناً فاناً شادی کھڑکا سکتے ہو؟ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بڑی بڑی مصیبتوں کو دعوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔''

''کیا کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے تم نے؟''

''دیکھو، اگر اس فقرے میں تم نے شادی پر زور دیا ہے تو اور بات ہے لیکن اگر لڑکی پر زور دیا ہے تو تمہارا سوال اور بھی مذاقیہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے، شادی لڑکی سے ہی ہو گی لیکن شادی بھی کیا ضروری ہے؟ یہ نیا دور ہے یار! اس میں شادی تو اس وقت کی جاتی ہے جب

بچے کہتے ہیں...... سویٹ پاپا ممی، اب شادی کر لیں اور پھر شادی کے بعد تو ویسے بھی رومانس کو ایک دم فل اسٹاپ لگ جاتا ہے اور ہم تو بھئی رومانس کے بندے ہیں۔ ایک پیارا سا چہرہ مل گیا ہے یہاں بھی۔ ہو سکا تو دو چار روز میں تمہیں ملواؤں گا اس سے۔ بڑی اونچی شے ہے۔ کتھک ناچ ناچتی ہے اور ناچ ناچ کر اس نے جسم ایسا شیشے جیسا کر لیا ہے کہ کیا بتاؤں...... اُف۔''

وہ بے تکان بول رہا تھا۔ حالات کی سنگینی اور میری بے پناہ حیرتوں کا جیسے اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے کہ ابھی دماغ کو ایک جھٹکا سا لگے گا اور سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا...... مجھے بتاؤ عمران! تم یہاں کب اور کیسے پہنچے؟ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں یہاں ہوں؟ اور تم نے وہاں ہال کمرے میں بھیس کیوں بدل رکھا تھا؟ کیا تم اس گروہ میں شامل ہو؟ اور......''

''بس بس۔'' وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''ایک ہی سانس میں تم نے اتنے سوال کر دیئے ہیں کہ تمہارا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آ سکتا ہے لیکن وہاں بھی تو سفارش اور تعلقات چلتے ہیں۔ دیکھو، میری بات سنو۔ ان سوالوں جوابوں کے لئے ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔ فی الحال ہم صرف وہ باتیں کریں گے جو کرنا بہت ضروری ہیں۔ ابھی تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں صرف تمہارے لئے یہاں موجود ہوں۔ اس گروہ کے لوگوں میں مجھے امیت کمار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک میں ایک اسمگلر ہوں اور انڈین ''بی ایس ایف'' سے جان چھڑاتا ہوا اس راجواڑے میں گھس آیا ہوں۔ فی الحال یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی رہیں گے۔ کسی طرح کی کوئی شناسائی بھی ہم دونوں کے لئے سخت ترین مشکلیں پیدا کر سکتی ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو تمہیں ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

''مجھے صرف ایک بات بتا دو، کیا سلطانہ بچ جائے گی؟''

''تم بھی مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چہرے کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ اس نے ہولے سے پوچھا۔ ''اور وہ، تمہارا جنون...... ثروت؟''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''عمران! جس طرح میرے سوالوں کے جواب بہت لمبے ہیں، اسی طرح تمہارے اس سوال کا جواب بھی

بہت طویل ہے لیکن مجھے ابھی صرف اتنا بتادو کہ ثروت کہاں ہے؟''

''میری آخری معلومات کے مطابق وہ جرمنی میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ سال پہل کی بات ہے۔''

''اور اس کی شادی؟''

''مجھے اس بارے میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اور عاطف اور میری بہن فرح؟''

دروازے سے باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ عمران ایک دم چوکنا ہوگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ لالٹین کی گول ناب پر رکھ دیا۔ غالباً وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اگر خطرہ زیادہ محسوس ہو تو لالٹین بجھا دے۔ بہر طور خیریت گزری۔ قدموں کی چاپیں آگے نکل گئیں۔

عمران بولا۔ ''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطانہ خطرے سے دور ہے لیکن وقتی طور پر۔ ہم نے یہاں کے مہا گرو کی پتنی رادھا دیوی کو اپنا ''مہمان'' بنا رکھا ہے۔ اسی ''مہمان نوازی'' کا دباؤ ہے جس کے سبب گرو کو شبھ گھڑی نہیں مل سکی اور اس نے چتا جلانے کی رسم دو دن کے لئے ملتوی کر دی ہے۔ وہ سب کچھ اس نے مجبوری کے سبب کیا ہے لیکن اپنی پتنی کو مصیبت سے بچانے کے لئے وہ دیر تک اس منحوس رسم کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے پتلون کی جیب احتیاط سے ٹٹولی اور بولا۔ ''جس طرح کچھ جنات کی جان طوطے میں ہوتی ہے، اسی طرح گرو کی دھرم پتنی کی جان بھی ایک طوطے میں ہے اور یہ طوطا میرے قبضے میں ہے۔ میں جب چاہوں، اس طوطے کی گردن شریف موڑ کر گرو کی پتنی کو جہان بالا کی سیر کرا سکتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو گرو کی پتنی خود بھی ایک طوطے کی طرح ہے اور گرو کی جان اس دوسرے طوطے میں ہے۔ اگر پتنی جہانِ بالا کو گئی تو ہو سکتا ہے کہ گرو خود بھی اس کے پیچھے نکل جائے۔ اسے ادھیڑ عمری میں اور اتنی معمولی شکل صورت کے ساتھ اتنی جوان اور سندر پتنی ملی ہے، وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔ پتنی کو جہانِ بالا کی سیر سے بچانے کے لئے وہ اپنی پوری پوری کوشش کرے گا۔''

''تم میری الجھنوں کو اور بڑھا رہے ہو عمران...... تم جنوں اور طوطوں کی باتیں کر رہے

ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟''

اس نے ایک بار پھر پتلون کی جیب ٹٹولی اور اس میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹا سا برقی آلہ نکال لیا۔ اس کی صورت چھوٹے موبائل فون جیسی تھی لیکن موبائل فون کے کی بورڈ کی طرح اس پر زیادہ بٹن نہیں تھے۔ صرف تین بٹن نظر آ رہے تھے۔ ایک سرخ اور دو سفید۔ یہ برقی آلہ سبز رنگ کا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''یہ دیکھو، اس کا رنگ ہرا ہے۔ اسی لئے تو میں اسے طوطا کہتا ہوں۔ گرو کی پتنی کی جان اس میں ہے...... خاص طور سے اس بٹن میں۔'' وہ سرخ بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں اس کے بظاہر معصوم چہرے پر وہی جارحیت نظر آنے لگی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ادھر یہ بٹن دبے گا، ادھر رادھا دیوی کی پتلی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ دھماکے سے اڑ جائے گی اور محبوب کی کمر چاہے کتنی بھی پتلی ہو لیکن ہونی تو چاہئے نا یار...... اور میرے خیال میں مہا گرو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی خوفناک بات کہہ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ دھیما، سادہ، ہنس مکھ...... اور کبھی اس کے ساتھ ساتھ بہت بھیانک بھی۔ اب اگر مہا گرو کی پتنی کی کمر کے ساتھ واقعی کوئی بارودی بیلٹ بندھی ہوئی تھی تو سوچنے کی بات تھی کہ یہ بیلٹ عمران کو کہاں سے ملی تھی؟ اس بیلٹ اور بیلٹ کے ریموٹ کنٹرول کی ایکروسی کیا تھی؟ اور یہ بیلٹ کس طرح رادھا کی کمر تک پہنچی تھی؟ میں یہ سب کچھ عمران سے پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک سوال کا معقول جواب بھی مجھے نہیں ملے گا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا...... اور میں چونک گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے کہ ''ہم'' نے گرو کی پتنی کو اپنا مہمان بنا رکھا ہے۔ ''ہم'' سے کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''پچھلے تین سالوں میں کافی ہوشیار ہو گئے ہو تم اور کافی بدل بھی گئے ہو۔'' اس نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں تعریف کی جھلک تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہلکا سا مکا مارا پھر دائیں بائیں دیکھ کر رازداری کے انداز میں بولا۔ ''تم جانتے ہو کہ اقبال میرا دُم چھلا ہے۔ اور دُم جہاں ہوگی، چھلا بھی وہیں ہوگا۔ وہ مہا گرو کی قیام گاہ پر سیوک کے طور پر موجود ہے، یعنی خادم کے طور پر...... اور گرو کی پتنی کی ''سیوا'' کر رہا ہے۔ وہ پرسوں سے ذرا بیمار ہے

نا۔'' عمران نے آنکھ دبا کر کہا۔

مجھے یاد آیا کہ کل جب میں نے گرو کی پتنی رادھا کو داسیوں کے ساتھ راہداری سے گزرتے دیکھا تھا تو وہ کچھ گم صم نظر آئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر عجیب سی زردی تھی۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال یہاں موجود تھے۔ کیسے موجود تھے، اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ ان دونوں نے یہاں مہا گرو کی پتنی کو آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ وہ غالباً دھما کا خیز مواد کے نشانے پر تھی اور یہ مواد ریموٹ کنٹرول تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی اور سنسنی میرے رگ و پے میں اُترنے لگی اور ایک عجیب سی ترنگ سینے میں جاگ گئی لیکن ابھی تک بہت کچھ اندھیرے میں تھا۔ میں عمران سے درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے ایک بار پھر تاکید کی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یا اقبال نے جب مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا تو وہ خود ہی کریں گے۔

جانے سے پہلے وہ تھوڑا سا جذباتی ہوگیا۔ ہم ایک بار پھر پُر جوش انداز میں گلے ملے۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''سب کچھ بتاؤں گا...... سب کچھ۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے شہزادے، تھوڑا سا اور کرلو۔''

اس کے جانے کے بعد میں جیسے ایک طوفان کی زد میں رہا۔ راجواڑے کے اس دور دراز کھنڈر میں عمران یوں میرے سامنے آئے گا اور حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کریں گے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اگلا سارا دن بھی عجیب کشمکش اور سوچ بچار میں گزرا۔ شکیلہ سے بھی دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ پتا نہیں کہ وہ کسی حال میں تھی۔ اس کی بے چارگی بار بار میرے تصور کو کچوکے لگاتی تھی۔ اس کے ساتھ یہاں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا اور اب پچھلے تین چار روز سے اس سے مٹی بھی کھدوائی جا رہی تھی۔ اس مشقت کا مقصد معلوم نہیں تھا...... مجھے شکیلہ کی ستی ہوئی صورت یاد آئی، اس کے ہاتھوں کے چھالے یاد آئے اور دل اس کے لئے درد سے بھر گیا۔

اگلی رات پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس زیر زمین کھنڈر میں مکمل سناٹا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ شاید وہی دو چار افراد جاگ رہے ہوں جو پہرے پر تھے۔ کسی قریبی کمرے میں ارجن اور اس کے بدقماش دوست بھی غالباً شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے ہولے سے ہلایا......

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

دوسری طرف عمران تھا۔ اس کی مدھم آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔

''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔ ''تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا، ورنہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔''

''لیکن تم تو کہتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہئے۔''

''مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ کم از کم آج کی رات تو بالکل نہیں۔ اقبال زخمی ہوگیا ہے۔''

''کیسے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔ خود ہی دیکھ لینا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلدی کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے...... میں سیدھا چلتا جاؤں گا تم آٹھ دس قدم چھوڑ کر میرے پیچھے آنا۔ میں جس دروازے میں گھسوں، تم بھی گھس جانا مگر احتیاط کرنا کہ کوئی تمہیں گھستے ہوئے دیکھے نہیں۔''

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ صورتِ حال واقعی سنگین ہے۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کمرے کی لالٹین میں نے بجھا دی تھی اور دروازہ اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کھنڈراستھان کا یہ زیرزمین حصہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ راہداریاں خالی تھیں۔ لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنیاں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ ہم بڑے ہال کمرے کے قریب سے گزرے۔ وہاں بھی بڑے آتش دان میں کوئلے سلگ رہے تھے۔ ان کوئلوں کے قریب بہت سے افراد چٹائیوں اور نمدوں پر بے سدھ پڑے تھے۔ ہال کمرے سے نکلنے والی ایک راہداری میں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً یہ یہاں کے پہرے دار تھے۔ میں رات کو اکثر ان لوگوں کی آوازیں سنتا تھا۔ یہ بلند آواز میں قہقہے لگاتے تھے اور خود کو بیدار رکھنے کے لئے ایک دوسرے سے دھول دھپا بھی کرتے رہتے تھے۔ ہم اس راہداری کے سامنے سے گزر گئے لیکن اس میں داخل نہیں ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا رخ اسی طرف ہے جس طرف سے ہم یعنی میں اور ستیش وغیرہ چار پانچ دن پہلے یہاں داخل ہوئے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ جلد ہی پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم اسی آبشار کے سامنے پہنچ گئے جو پتھروں پر گرتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس حوض یا چھوٹی سی جھیل میں پتھر کا ایک بڑا مجسمہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ یہاں ایک طرف حوض کے کنارے کچھ دروازے نظر آئے۔ عمران ان دروازوں کے

سامنے سے گزرتا ہوا اچانک ایک دروازے میں داخل ہوگیا۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں نے اردگرد دیکھا۔ دور فاصلے پر کسی شخص کا متحرک سایہ نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی دھرمی پھیرے دار پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ تاہم وہ اتنی دور تھا کہ مجھے اس کی طرف سے دیکھے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ میں عمران کے پیچھے دروازے میں داخل ہوگیا۔

اندر داخل ہوتے ہی پتا چل گیا کہ یہ مہا گرو کی رہائش گاہ ہے۔ طاقوں میں جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں تھیں۔ ایک دیوار پر جاپ کرنے کے لئے بہت سی مالائیں جھول رہی تھیں۔

گرو کی رہائش گاہ کے دو حصے تھے۔ ایک کو مردانہ اور دوسرے کو زنانہ کہا جا سکتا تھا۔ ہم مردانے حصے میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم گرو صاحب یہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک الماری میں گرو صاحب کے مختلف لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی جوتیاں اور کھڑانویں وغیرہ پڑی تھیں۔ خشک میوے اور بیسن کا بہت سارا حلوہ ایک تھال میں ڈھکا رکھا تھا۔ عمران نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بولا۔ ''میں یہاں گرو کا ذاتی خدمت گار ہوں۔ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ یہ حاجت خانے میں جاتا ہے تو لوٹا بھی مجھے پکڑنا پڑتا ہے۔ کسی وقت تو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے طہارت بھی مجھے ہی نہ کرانی پڑے۔''

''اب کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''پانی میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ ہر سنیچر کی رات کو یہ جاپ اسے کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں گھر واپس آ جائے گا۔ آؤ، میں تمہیں اس کی سندر پتنی سے ملواؤں۔''

عمران مجھے لے کر ایک دروازے سے گزرا۔ ہم گھر کے مردانے حصے سے زنانے حصے میں داخل ہوگئے۔ یہاں بھی در و دیوار پر خوب گاڑھا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں بہت سے ساز پڑے تھے۔ یہ غالباً بھجن گانے میں استعمال ہوتے تھے۔ کتھک ناچنے والوں کی ایک بڑی تصویر بھی اس کمرے میں آویزاں تھی۔ مجھے ایک دروازے کے عقب سے کچھ دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کراہ رہی ہے اور اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

''یہاں کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تیرہ من کی دھوبن، کیونکہ ایک من کے تو یہ زیور ہی پہنتی ہے۔ پچھلے جنم میں یہ یقیناً کوئی بھینس یا ہتھنی وغیرہ رہی ہے۔ اس جنم میں بھگوان نے اسے گرو کی دھرم پتنی کی داسی بنایا

ہے۔ ایک نمبر کی خرانٹ عورت ہے۔ اقبال اسی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔''

عمران نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر مجھے کراہنے والی عورت کی جھلک دکھائی۔ وہ واقعی کسی سومو پہلوان کی طرح صحت مند تھی۔ اس نے چاندی اور پتھر کے بہت سے کڑے پہن رکھے تھے۔ ان کڑوں نے اس کے بازو کہنیوں تک چھپائے ہوئے تھے اور نصف پنڈلیاں بھی اوجھل نظر آ رہی تھیں۔ وہ کسی بھینس ہی کی طرح نائیلون کی رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ غوں غاں کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر نیل تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں وہ سخت سردی محسوس کر رہی تھی اور اس کی بے چینی کا سبب بھی یہی تھا۔ عمران نے ایک طرف پڑا ہوا ایک لحاف اُٹھا کر اس پر ڈال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے زخمی اقبال کو بھی دیکھ لیا۔ عمران نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہاں اقبال کا نام راج ہے اور میں گرو کی پتنی کے سامنے اقبال سے شناسائی ظاہر نہ کروں۔ آج میں ایک طویل عرصے بعد اقبال کو دیکھ رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ ذرا سا فربہ ضرور ہوا تھا مگر اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششدر کیا، وہ اقبال کی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اتنی سوج چکی تھیں کہ پپوٹوں کے درمیان بس ایک درز سی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل پانی بھی رِس رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی شدید تکلیف کے باعث مشکل سے ہی دیکھ پا رہا ہے۔ وہ ایک غالیچے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہی ایک مسہری پر گرو کی سُندر پتنی رادھا کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کے سرہانے ہومیو پیتھک ادویہ کی کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں وہ ایک دم مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔

اقبال نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے...... ہمارے دل چاہ رہے تھے کہ بھاگ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جائیں مگر عمران کی ہدایات آڑے تھیں۔ ہمارے چہروں نے ہمارے جذبات کی عکاسی کی......

•

عمران نے اقبال یعنی راج سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''راج! یہ ہے گوپال...... سمجھو کہ یہ ہمارا نیا ساتھی ہے اور گوپال! یہ راج ہے۔ اس خبیث موٹی نے راج کی آنکھوں میں سرخ مرچیں پھینکی ہیں اور صرف مرچیں ہی نہیں تھیں ان میں کچھ اور الا بلا بھی تھا۔ پپوٹوں کے نیچے سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رِستا ہے۔ اس کی آنکھوں کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے...... اس کی جگہ اب تمہیں چار پانچ گھنٹوں کے لئے رادھا

دیوی کے پاس رہنا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں......''

''کیوں؟ تم بھی تو یہیں ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، مجھے ابھی تین چار گھنٹوں کے لئے یہاں سے جانا ہے۔ تالاب پر جا کر گرو جی کی سیوا کرنی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میں اور گرو جی اکٹھے ہی واپس آئیں گے...... ہر سنیچر کی رات کو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

گرو کی پتنی بالکل ساکت لیٹی تھی۔ ذرا سی جنبش بھی نہیں کر رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے جسم کو ہلایا تو کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ پھٹ جائے گی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو پھانسی گھاٹ کی طرف چل کر جانے والے مجرم کے چہرے پر ہوتی ہے...... موت کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر بہت گہری تھیں۔

عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا کہ اگر ہم چاہیں تو ساتھ والے کمرے میں جا کر ایک دوسرے سے مل سکتے اور دو چار منٹ گزار سکتے ہیں۔ پہلے اقبال اُٹھ کر گیا پھر میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہم نے وہ سارے فقرے بولے جو بہت دیر سے بچھڑے ہوئے بے تکلف دوست دوبارہ مل کر بولتے ہیں اور خود کو خوشی کے دریا میں بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میں نے اقبال سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں کے ساتھ یہ معاملہ کیونکر ہوا ہے۔ اس نے مختصر لفظوں میں جو کچھ بتایا وہ یوں تھا۔

گرو کی پتنی والا چکر پچھلے تین چار روز سے چل رہا تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ ایک بارودی بیلٹ موجود تھی جس کا ریموٹ کنٹرول عمران یا پھر اقبال کے پاس موجود رہتا تھا۔ عمران اور اقبال مہا گرو کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ سلطانہ کی جان بچانے میں مدد کرے۔ وہ شکیلہ کی بے بسی کے بارے میں بھی سب کچھ جانتے تھے اور اس کی بھی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مہا گرو ایک کٹر مذہبی شخص تھا اور منہ زور گھوڑے کی طرح تھا۔ اگر اس کی جوان سندر پتنی عمران اور اقبال کے ہتھے نہ چڑھتی اور وہ بارودی بیلٹ کی مدد سے اسے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تو گرو کے منہ میں ہرگز لگام نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ گرو نے اور اس کی پتنی نے اپنے ساتھ ہونے والے اس سنگین معاملے کو ہر کسی سے چھپایا تھا بلکہ انہیں چھپانا پڑا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ہر وقت عمران یا اقبال کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ کسی بھی وقت گرو کی چہیتی بیوی کو ٹکڑوں اور لوتھڑوں میں تبدیل کر سکتے تھے۔ گھر کے اندر آنے اور ملنے جلنے والوں کو یہی پتا تھا کہ رادھا دیوی کی کمر میں شدید درد ہے اور وہ آج کل زیادہ وقت بستر پر ہی گزار رہی ہے۔

راج یعنی اقبال یہاں رادھا کے معالج کے طور پر موجود تھا۔ اقبال یوں تو عمران ہی کی طرح

یہاں مہا گرو کا سیوک تھا، تاہم اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہومیو پیتھک دواؤں کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتا ہے۔ وہ ہر دو تین گھنٹے بعد رادھا کو کوئی نہ کوئی دوا کھلا رہا تھا اور دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ وہ گرو کی پتنی کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔ رادھا کی خاص داسی بھی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ وہی پہلوان نما عورت تھی جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ایک چھوٹے کمرے میں بندھا پایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ داسیاں رادھا کی خدمت کے لئے یہاں آتی جاتی تھیں مگر انہیں اصل صورتِ حال کا کچھ علم نہیں تھا۔ صرف پہلوان نما داسی بھاگ متی جانتی تھی کہ یہاں کیا چکر چل چکا ہے اور مالک و مالکن کتنی بڑی مصیبت میں ہیں۔

آج رات پہلے پہر پہلوان نما بھاگ متی نے نمک حلالی کی ایک زبردست کوشش کی تھی اور اقبال پر اس وقت حملہ کر دیا تھا جب وہ رادھا کی مسہری کے قریب چٹائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ایک دم اقبال پر جھپٹی تھی اور اس کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچوں اور کسی تیز کیمیکل سے بنایا گیا سفوف ڈال دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو اقبال جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے عمران کو پکارا تھا۔ عمران اس وقت گرو کا حلوہ تیار کر رہا تھا۔ وہ غیر معمولی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے اقبال کو ''پہلوان داسی'' کے چنگل سے نکالا۔ اسے چند سیکنڈ کی دیر بھی ہوئی ہوتی تو پہلوان داسی بھاگ متی نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دینا تھا۔ وہ ریموٹ کنٹرول اقبال سے چھین چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک ٹانگ ابھی تک اقبال کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھاگ نہیں پا رہی تھی۔ عمران پہنچ گیا اور اس نے بھاگ متی کو اپنی گرفت میں جکڑا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے اقبال شدید کرب میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مسلسل خنجر گھونپے جا رہے تھے۔

اقبال نے مجھے اپنی مختصر روداد سنائی اور وہیں بے دم سا ہو کر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے بتایا کہ آنکھیں بند کر لینے سے اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالنے سے اسے قدرے سکون ملتا ہے۔ میں باہر آیا تو عمران جانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سفید بٹن ایکٹیویشن کا ہے۔ اس وقت یہ آن ہے۔ یہ دوسرا بٹن لاک کا ہے۔ اس کو میں نے کھول دیا ہے۔ اب اس سرخ بٹن پر ذرا سا دباؤ بھی پڑے گا تو رادھا دیوی کا دھماکا ہو جائے گا۔ بھگوان کی کرپا سے دس پندرہ ٹکڑے تو ضرور ہوں گے۔ اس لئے احتیاط سے رہنا اور چوکس بھی...... رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اب بے فکر رہو۔ باہر سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

''اور اگر آیا تو؟''

"فرض محال آیا تو دروازہ نہیں کھولنا۔ لالٹین کی لو بالکل نیچی کر دو۔"

میں نے لو نیچی کر دی۔ کمرا نیم تاریک ہو گیا۔ عمران نے ریموٹ احتیاط سے میرے سامنے ایک تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ رادھا بھی لیٹی لیٹی اونگھنے لگی تھی۔ اس کے کالے گھنگریالے بالوں کی ایک لٹ اس کے زرد رخسار پر جھول رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ آج کل کچھ کھا پی نہیں رہی۔ اس کے ہونٹ سوکھ کر سانولے ہو چکے تھے۔ پتا نہیں وہ کیسے اس فربہ اندام ادھیڑ عمر گرو کی بیوی بن گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل دخل لالچ کا بھی رہا ہو۔ گرو کی اس رہائش گاہ اور رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی خوش حال ہے۔ استھان میں جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور نذر نیاز پیش کی جاتی تھی، اس کا بڑا حصہ یقیناً اس مہا گرو کے پاس آتا تھا۔ یہاں کے ریشمی پردے، غالیچے، قیمتی ساز و سامان اور خود رادھا کا لباس بھی گواہی دیتے تھے کہ اس جگہ خوش حالی کا دور دورہ ہے۔

کچھ دیر بعد رادھا نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ میری کمر میں بہت زیادہ چبھ رہا ہے، کیا تم اسے تھوڑا سا ڈھیلا کر سکت ہو۔" اس کا اشارہ اپنی کمر کی بارودی بیلٹ کی طرف تھا۔

میں نے کمبل ہٹایا پھر رادھا کی قمیص اوپر اٹھائی۔ ریشمی قمیص کے نیچے اس کی دبلی پتلی ریشمی کمر تھی اور کمر کے ساتھ براؤن رنگ کی وہ خوفناک بیلٹ ایک انچ چوڑے اسٹریپس کے ذریعے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ "اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہے تو میں اسے ڈھیلا کر سکتا ہوں لیکن اس میں خطرہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری نہیں ہے۔"

خطرے کا لفظ سن کر رادھا کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں رہنے دو...... رہنے دو۔"

میں نے کہا۔ "اس کو ڈھیلا کرنے کا کام امیت زیادہ اچھے طریقے کر سکے گا۔"

"لیکن اس کو تو گرو جی کے ساتھ ہی واپس آنا ہے اور ان کے آنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔" وہ ذرا کراہ کر بولی۔ وہ پتی کو گرو جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ناراض لہجے میں بولی۔ "تم دھرمی ہو کر بھگوان کے سیوک اور اس کی دھرم پتنی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کر رہے ہو۔ تمہیں ذرا خوف نا ہیں کہ تمہارے اس اپرادھ کا انجام کیا ہووے گا؟"

میں نے کہا۔ "یہی تو مشکل ہے دیوی جی! یہاں پاپ اور پُن کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک ناری کو یہاں زندہ جلایا جانے والا ہے، کچھ لوگ اسے بہت بڑا پُن کہہ رہے ہیں اور بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جن کے نزدیک یہ مہا پاپ ہے۔"

"ایسے فیصلے میں اور تم نا ہیں کر سکتے۔ ایسے فیصلوں کے لئے ہی گرو جی اور ان جیسے دوسرے گیانی دھیانی لوگن ہوتے ہیں۔ ہم جیسے عام منشوں کو ان کے فیصلے ماننا پڑتے ہیں۔ اس لڑکی کے لئے یہ سزا بہت زیادہ نظر آوت ہے مگر اس کا اپرادھ بھی تو چھوٹا نا ہیں ہے۔ اس نے اوتار لڑی کے ایک منش کو بے دردی سے قتل کیا ہے۔ جو سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے، وہ اس کا بھی بھلا کرے گی۔ اس کے پاپ ڈھل جاویں گے، اس کا اگلا جنم کسی بہت اچھے روپ میں ہووے گا۔"

وہ دیر تک بولتی رہی۔ میرے اور میرے دونوں ساتھیوں کی غداری کو بدترین انجام سے جوڑتی رہی۔ آخر میں اس نے اپنا لہجہ نرم کیا اور مجھے سمجھانے بجھانے کی کمزور کوششیں کرنے لگی۔ وہ بولی۔ "ایک بات یاد رکھو، گرو جی اپنے دھرم کے خلاف کچھ نا ہیں کریں گے۔ وہ جانت ہیں کہ ایسا کرنے کا انجام کتنا برا ہووے گا۔ نرگ کی اگنی کے سامنے اس سنسار کی ساری سزائیں بالکل معمولی ہیں۔ گرو جی میری ہتھیا قبول کر لیویں گے، اپنی ہتھیا بھی قبول کر لیویں گے...... لیکن سوچو، اس کے بعد کیا ہووے گا؟ کیا یہاں کے لوگن تمہیں زندہ چھوڑیں گے؟ کبھی نا ہیں۔ اس لئے میں اب بھی کہتی ہوں کہ کوئی اور راستہ اختیار کر لو۔ اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ یہ سب کو بہت مہنگی پڑے گی۔"

"ضد چھوڑنا ہی تو مشکل ہے۔ کیا تمہارا پتی اور اس کے ساتھی اپنی ضد چھوڑ رہے ہیں؟"

"وہ ضد نا ہیں ہے۔ وہ تو دھرم ہے۔ بھگوان کی اکھشا ہے اور اس کے خلاف چلنا مہا پاپ ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں دیوی جی! مہا پاپ اور مہا پُن کا فیصلہ ہی تو ہم سے ہو نہیں رہا۔ ہم اپنے جھوٹے عقیدوں اور واہموں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔"

اس نے لرز کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور پھر پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "ایشور تمہیں شما کرے۔ تم اپنی نا سمجھی میں بہت غلط باتیں کہہ رہے ہو۔"

"یہ غلط باتیں نہیں ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ......"

"بس بس، اب چپ ہو جاؤ۔" وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ "جن باتوں کی

تمہیں جانکاری ناہیں، ان کے بارے میں بول کر اپنا انجام خراب مت کرو...... بس چپ ہو جاؤ۔“

بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے خوف زدہ نظروں سے سبز رنگ کے ریموٹ کنٹرول کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ ریموٹ کنٹرول ایک طوطے کی طرح تھا اور اس میں گرو کی پتنی کی جان تھی۔

اس دوران میں اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ غوں غاں کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پہلوان نما داسی شاید پھر مضطرب ہو رہی تھی۔ جس طرح بندھی ہوئی گائے بھینسیں ذبح ہونے سے پہلے ٹانگیں چلاتی ہیں، وہ بھی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو میں نے جا کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک ننھی سی چیز تیزی سے باہر نکل گئی۔ یہ ایک چوہا تھا۔ داسی بھاگ متی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت کتنی بھی دلیر ہو، چوہا، چھپکلی، کاکروچ اور اس نوع کے دیگر جان دار اس کی کمزوری رہے ہیں۔ اگر عمران یہاں موجود ہوتا تو اس سچویشن پر چند دلچسپ فقرے ضرور چست کرتا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور واپس رادھا کے پاس آ گیا۔ اس نے صورتِ حال پوچھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی نوکرانی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ رادھا گاہے بگاہے عجیب انداز سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ آخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم نے اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی بس یہ قمیص پہن رکھی ہے۔ تمہیں سردی ناہیں لگتی؟“

”نہیں لگتی۔ یا یوں سمجھ لو کہ لگتی ہے لیکن میں محسوس نہیں کرتا۔“

”کیا مطلب؟“

”بس یہ عقیدے عقیدے کی بات ہے۔ مجھے سردی جھیلنے میں مزہ آتا ہے، بالکل جیسے تمہارے پتی دیو کو سنیچر کی رات ٹھنڈے پانی میں جاپ کر کے مزہ آتا ہوگا۔“

”لل...... لیکن وہ پانی ٹھنڈا تو ناہیں ہوتا۔“

”تم نے ابھی خود بتایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ کرماتے ہیں۔ امیت بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”وہ پانی اس لحاظ سے ٹھنڈا ہووت ہے کہ اسے آگ پر گرم ناہیں کیا جاتا۔“ وہ لیٹے لیٹے بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”یہ دھرم کی باتیں ہیں۔ میری تمہاری بدھی (عقل) میں ناہیں آسکتیں۔“

”لیکن اتنی بات تو ایک بالک کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ پانی کو آگ سے ہی گرم کیا جاسکتا ہے یا پھر دھوپ میں رکھ کر اس کی ٹھار ماری جاسکتی ہے...... مگر آدھی رات کو تمہارے پتی دیو کو دھوپ کہاں ملتی ہوگی؟“

”آگ آگ میں فرق ہووت ہے۔“ رادھا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”گرو جی کہوت ہیں کہ سنیچر کی رات والے پانی کو ایسے آدھ بجھے کوئلوں سے گرم کیا جاسکت ہے جن میں اگنی کی لپک نہ ہو۔ وہ تانبے کے جس حوض میں بیٹھ کر جاپ کرت ہیں، اس کے گرداگرد ملازم اُدھ بجھے کوئلے ڈالتا رہتا ہے۔“

رادھا نے اس بارے میں کچھ مزید تفصیل بتائی۔ وہ جیسے خود بھی باتیں کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا دھیان اپنی بیلٹ اور ریموٹ کنٹرول وغیرہ سے ہٹا رہے۔ وہ کسی حد تک سادہ بھی تھی۔ اپنے شوہر یعنی گرو جی کے کمالات کا بہت سارا رعب اس کے دل و دماغ پر موجود تھا۔ میں دل ہی دل میں گرو کی چالاکی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ایسی سخت سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر بیٹھ کر جاپ کرنے میں کوئی گھپلا ہوگا۔ اب یہ گھپلا سامنے آگیا تھا۔ گرو جی جیسے لوگوں کے پاس حیلے بہانے اور تاویلیں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ پانی کو گرم کرنے کے لئے اس نے یہ تاویل ڈھونڈ لی تھی کہ پانی کو آگ سے گرم نہیں کیا جاسکتا لیکن آدھ بجھا انگارہ جس میں شعلہ نہ ہو، آگ نہیں کہلائے گا...... واہ! کیا سچائی تھی؟

میں دوسرے کمرے میں جا کر گاہے بگاہے اقبال کی مزاج پرسی کرتا رہا۔ رادھا سے باتیں بھی کرتا رہا اور عمران کا انتظار بھی۔ رادھا کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ جو شخص رات بھر اُدھ بجھے انگارے گرو کے حوض کے لئے مہیا کرتا رہتا ہے، وہ امیت یعنی عمران ہی ہے۔ وہ آدھی شب سے لے کر آخری پہر تک لکڑیوں کے ایک ڈھیر سے نبرد آزما رہتا ہے۔ تین بڑے چولہے جلتے رہتے ہیں اور تانبے کے حوض کو اُدھ بجھے انگاروں کی سپلائی جاری رہتی ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کا وقت کٹا اور دروازے سے باہر گرو اور عمران کی آمد ہوئی۔ یہ دروازہ مردانے حصے کی طرف تھا۔ میں درمیانی دروازے میں سے گزر کر مردانے میں پہنچا اور دروازہ کھولا۔ گرو نے خود کو ایک بھاری کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ عمران مؤدب انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک اس نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا جو ابھی ابھی دھویا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو مزید افراد بھی تھے۔ یہ نوجوان پجاری تھے۔ گرو کی طرح ان

کے بال بھی بھیگے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے گرد کمبل لپیٹ رکھے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی گرو کے ساتھ ہی پانی میں پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں۔ ان دونوں افراد کو گرو نے کچھ پرشاد دیا اور تھوڑی سی گفتگو بھی کی۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔ جب تک وہ موجود رہے، عمران کا رویہ گرو کے ساتھ بہت مؤدب رہا لیکن اس کے فوراً بعد وہ اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اس نے گرو کو زنانے میں چلنے کو کہا۔ انداز حکم دینے والا ہی تھا۔ گرو چار و ناچار اپنی توند مٹکاتا ہوا زنانے میں آ گیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ یہاں رادھا مسہری پر اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ میاں بیوی نے بے چارگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

گرو کو سردی لگ رہی تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بھاگ متی نے انگیٹھی ناہیں جلائی؟''

عمران نے اطمینان سے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بھاگ متی نے انگیٹھی تو نہیں جلائی لیکن اس نے تمہارے جانے کے بعد ایک اور طرح کی آگ لگانے کی کوشش فرمائی تھی۔ اس ناکام کوشش کے نتیجے میں اب وہ چھوٹے کمرے میں بندھی پڑی ہے۔''

''کیا کہنا چاہت ہو؟'' گرو بوکھلا گیا۔

''اس نے راج کی آنکھوں میں مرچیں جھونکیں اور اس سے طوطا (کنٹرول) چھیننے کی کوشش فرمائی اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی مرچیں بھاگ متی کو تم نے ہی سپلائی کی ہوں گی۔''

گرو کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ''ناہیں...... میں نے ایسا کچھ ناہیں کیا۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں۔''

گرو کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور بھاگ متی نے جو کچھ کیا ہے، اپنے طور پر کیا ہے...... مگر عمران نے گرو پر دباؤ برقرار رکھا اور اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کافی غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے گرو کو دوسرے کمرے میں لے جا کر اقبال کی حالت دکھائی اور پھر اسے دھکیلتا ہوا واپس رادھا کے پاس لے آیا۔ اس نے دوٹوک لہجے میں گرو سے کہا۔ ''میں اب تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم نے جو فیصلہ کرنا ہے، ابھی کرو اور زیادہ سے زیادہ کل تک اس پر عمل ہو جانا چاہئے۔''

گرو نے اپنے موٹے بھدے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے دم سا ہو کر لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چند لمبی سانسیں لیں اور جیسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو امیت!

بھگوان کی کتنی بڑی کرپا ہے کہ اس نے تمہیں ایک ہندو گھرانے میں پیدا کیا۔ انسان کے بھیس میں پیدا کیا اور سنسار کی ساری نعمتیں تم کو دیں۔ تم کسی مُسلے یا عیسائی کے گھر میں بھی پیدا ہو سکتے تھے...... تمہاری جون انسان کے بجائے کسی کتے بلی کی بھی ہو سکتی تھی۔ ہم دن رات بھگوان کا شکر ادا کرتے رہیں تو بھی کم ہے۔ ہم شکر ادا ناہیں کر سکتے لیکن کم از کم اس طرح کا مہا پاپ تو نہیں کریں۔ اس ناری کا چتا میں جلنا اس کے لئے ہی ناہیں، ہم سب کے لئے بھی چھٹکارے کا سبب بنے گا۔ اس کے اپرادھ کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی ناہیں اور اگر......''

''تم یہ بکواس بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔'' عمران نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں یہ سب کچھ بہت دفعہ سن چکا ہوں۔ اب دوٹوک بات کرنی ہو گی۔ ہاں یا نہ......''

''مگر امیت......''

''بس گرو...... ہاں یا نہ۔'' عمران نے بے لچک لہجے میں کہا۔

اس دفعہ رادھا بولی۔ ''اتنی جلدی مت کرو امیت...... چلو، ہمیں دوپہر تک کا سمے اور دے دو۔''

''تاکہ تمہارے کسی چہیتے کو سرخ مرچوں جیسی چالاکی دکھانے کا ایک موقع اور مل جائے۔'' عمران نے ترت جواب دیا۔

''میں تمہیں وچن دیتا ہوں امیت، اب ایسا کچھ ناہیں ہو گا...... اور میرا وشواس کرو، جو کچھ ہوا ہے اس میں بھی میرا یا رادھا کا دوش بالکل ناہیں۔''

''نہیں گرو۔'' عمران کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ''تمہیں جو کچھ کرنا ہے کل کرنا ہو گا، ورنہ اپنی اس چہیتی پتنی کے دس پندرہ ٹکڑے اُٹھانا ہوں گے، چتا کے پھول تیار کرنے کے لئے......''

عمران کے انداز نے گرو کا تاریک چہرہ تاریک تر کر دیا...... وہ اپنے تھر تھر کانپتے جسم کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''رادھا کو مارنے کے بعد تم تینوں بھی تو زندہ ناہیں رہ سکو گے۔ یہ کبھی ہو ناہیں سکتا کہ ستیش اور بڑے گرو تم کو یہاں سے زندہ جانے دیں...... اور سلطانہ کو تو پھر بھی مرنا ہی مرنا ہے۔ جیون بڑی پیاری چیز ہے امیت! یہ بھگوان کا تحفہ ہے...... اسے یوں کھونا بدھی کی بات ناہیں ہے۔''

''تم ہمیں موت سے نہ ڈراؤ گرو...... ہم موت کے آگے نہیں، پیچھے بھاگنے والے لوگ ہیں۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہی جانی پہچانی سچائی تھی جس نے مجھے دیوانہ بنایا تھا۔ یہ اس شخص کا لہجہ تھا جو واقعی جان ہتھیلی پر لے کر پھرتا تھا۔ موت اس کی محبوبہ تھی

اور وہ اس سے بغلگیر ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار تھا۔

گرو نے ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ عمران نے بڑے انداز سے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا ریوالور نکال لیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھولا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ عمران نے اس میں سے چار گولیاں نکال لیں۔ پھر چرخی کو دو تین بار گھما کر ریوالور گرو کی گود میں پھینک دیا۔ گرو حیران سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں عمران کے اس پرانے کھیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

عمران بولا۔ ''چلو، سب کچھ بھگوان پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی تم پانی کے اندر بڑی لمبی پرارتھنا کر کے نکلے ہو۔ بہت سے آشیرباد تمہارے ساتھ ہوں گے۔ چلو، مجھ پر گولی چلاؤ...... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟''

''کک...... کیا مطلب؟''

''گولی چلانے کا مطلب گولی چلانا ہی ہوتا ہے، پرشاد کھانا نہیں۔ مجھ پر گولی چلاؤ، میری ٹانگ کا نشانہ لو۔ اگر گولی مجھے لگ گئی تو ہم تمہاری پتنی کی کمر سے پیٹی اتار لیں گے اور تمہیں بغیر کچھ کہے یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر گولی نہ چلی تو پھر ایسے ہی چرخی گھما کر میں تم پر گولی چلاؤں گا۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ بھگوان کی طرف سے کیا اشارہ ملتا ہے۔''

ریوالور گرو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے لئے محسوس ہوا کہ شاید وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے...... لیکن پھر جلد ہی اس کے تاثرات نارمل ہو گئے اور وہی خوف آمیز بے بسی اس کے فربہ چہرے کو ڈھانپنے لگی جس کا مشاہدہ میں اب تک کر رہا تھا۔ اس نے ریوالور اُٹھا کر دوبارہ عمران کے پاس رکھ دیا۔ ''تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نا ہیں آ رہی۔'' وہ کراہ کر بولا۔

''لیکن مجھے تمہاری ساری سمجھ آ رہی ہے...... تم صرف سمے ضائع کر رہے ہو اور کسی چمتکار کے انتظار میں ہو لیکن ہم کب تک چمتکار کا انتظار کریں گے؟ کیوں نہ ہم خود ہی چمتکار کے پاس پہنچ جائیں۔''

''کیا مطلب؟'' گرو نے کہا۔

''مہاتما صاحب! یہ چمتکار ہی تو ہے۔'' عمران نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گولی لگ گئی تو چمتکار...... تمہیں نہ لگی تو بھی چمتکار...... چلو اگر تم میں اتنی شکتی نہیں تو میں خود ہی گھوڑا دبا دیتا ہوں۔ پہلے خود پر ٹرائی کرتا ہوں...... پھر تم پر......'' عمران نے بڑے اعتماد سے ریوالور کی سیاہ نال اپنی دائیں ران پر رکھ لی۔

گرو اور رادھا کے چہرے دیدنی تھے۔ خاص طور سے گرو کا چہرہ تو بالکل تاریک ہو گیا۔ عمران نے شہادت کی انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ عمران کے اس کھیل میں عمران کا اعتماد ہی سب کچھ تھا اور یہ اعتماد ساون کی منہ زور بارش کی طرح تابڑ توڑ اس کے چہرے پر برس رہا تھا۔ ریوالور کی چرخی میں دو گولیاں موجود تھیں۔

چند ہی سیکنڈ بعد گرو کی ہمت جواب دے گئی۔ ''ٹھہرو۔'' وہ کراہا۔ ''ایسا مت کرو۔ اس طرح کی شرطیں باندھنا دھرم میں پاپ ہے۔ تمہارے دماغ کو خون چڑھا ہوا ہے، تم شاید ابھی کوئی بات سوچ ہی نا ہیں سکت ہو۔''

''تمہارے دماغ کو تو خون نہیں چڑھا ہوا، پھر تم اس نردوش لڑکی کو زندہ جلانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟'' عمران پھنکارا۔

''میں یہاں کا کارِمختار نا ہیں ہوں۔ مجھ سے تو بس رائے مانگی جاوت ہے۔ اصل حکم تو بڑے گرو کا ہی چلتا ہے یا پھر ستیش کا۔''

''لیکن دھرم کے ٹھیکیدار تو تم ہو، بڑا گرو نوے سال کا بڈھا کھوسٹ ہو چکا ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یہاں کوئی تمہاری رائے کے خلاف نہیں چل سکتا۔''

''جتنا دھرم کو میں جانت ہوں، اتنا وہ بھی جانت ہیں۔ میں کوئی غلط بات کہوں گا تو بھگوان کا دوشی ٹھہروں گا اور ساتھ ساتھ یہاں کے سب لوگ مجھ کو دوشی ٹھہرائیں گے۔''

''لیکن تم گرو اور استاد ہو...... استادی ہوتی ہی یہ ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے اور درمیانی راستے تو ہر وقت تمہاری مٹھی میں رہتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا یہ [illegible] کی رات والا اشنان ہے۔ تم گرم پانی میں بیٹھ کر جاپ کرتے ہو اور کوئی تمہیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔ اس کی ایک مثال تمہاری یہ پتنی ہے۔ یہ تم سے دس پندرہ سال تو چھوٹی ضرور ہے اور سندر بھی ہے۔ تمہارے جیسے گرو تو اکثر برہم چاری ہوتے ہیں لیکن تم دونوں مزے لے رہے ہو۔ گرو گھنٹال بھی بنے ہوئے ہو اور اپنا بستر بھی گرما گرم رکھتے ہو۔ یقیناً اپنے لئے یہ رعایت بھی تم نے کسی نہ کسی پوتھی (کتاب) سے ڈھونڈ ہی نکالی ہو گی۔''

گرو کی بولتی بند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اپنے ساتھی کے زخمی ہونے کے بعد امیت (یعنی عمران) فیصلہ کن موڈ میں ہے۔

اس نے کچھ دیر تک مزید آئیں بائیں شائیں کی پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران سے اجازت لے کر اس نے تھوڑی دیر تک پوجا پاٹ کی اور اپنی آنکھوں کو نم ناک کیا پھر کچھ پرانی پوتھیاں لے کر بیٹھ گیا اور ان کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔ جہاں تک میں نے اس کا تجزیہ کیا تھا، وہ

ڈرامے باز گرو نہیں تھا۔ اس کے دل میں دھرم کا خوف اور اپنے عقیدے کا پختہ پن بھی موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اور اپنی پتنی کی جان بھی پیاری تھی۔

اسی دوران میں عمران نے انگیٹھی دہکا کر گرو کے قریب رکھ دی تا کہ وہ پوری یکسوئی سے اپنے ''مطلب'' کی کوئی تحریر ڈھونڈ سکے۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ مونگ پھلی نکال کر مجھے دی اور خود بھی ٹھکور ٹھکور کر کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں اقبال کی خبر گیری کے لئے چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گرو پوتھیوں کی ورق گردانی سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دوسری ہتھیائیں تو کسی نہ کسی طرح شما ہو سکت ہیں لیکن موہن کمار کی ہتھیا ایک ایسا مہا پاپ ہے جس کی چھوٹ کسی طور بھی نا ہیں ہے......''

''تو پھر؟'' عمران نے معنی خیز انداز میں سبز رنگ کی ڈیوائس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بس ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں وچار کیا جا سکت ہے۔'' اس نے ایک بوسیدہ کتاب میں سے ایک نشانی لگے صفحے کو سامنے کیا اور اس پر لکھے ہوئے سنسکرت کے اشلوک زیر لب پڑھنے لگا۔

میری اور عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گرو توضیح کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی بھی مندر، دھرم استھان یا دھرم شالہ میں انسانی خون کا گرایا جانا سخت پاپ ہے۔ اگر اس بات کا وشواس ہو جائے کہ ہمارے کسی کرم کے کارن خون بہے گا تو پھر اس کرم سے رک جانا ضروری ہے......''

''اور تمہیں پورا وشواس کر لینا چاہئے کہ اگر تم ہماری بات نہیں مانو گے تو خون بہے گا اور بہت زیادہ بہے گا۔''

گرو نے چند لمحوں کے لئے مسہری پر دراز اپنی خوب صورت بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا گورا رنگ، بھرا بھرا جسم، اس کے ریشمی بال...... سب کچھ ان لمحوں میں برق کی طرح اس کی آنکھوں میں لہرا گیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی وہ ساری چاشنی، حرارت اور رنگا رنگی بھی جس کا تجربہ وہ اس استھان کے ایک مکھیا فرد کی حیثیت سے کر رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ دھرم اور استھان کے پالن کی خاطر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں اس پوتر جگہ کو ہتھیا کے خون سے گندا نا ہیں ہونے دوں گا۔''

عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مدد کے طریقۂ کار پر کوئی بات نہیں

کی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ طریقۂ کار پر پہلے بات ہو چکی ہے اور اب جو کچھ ہو گا، اس کے مطابق ہو گا۔

عمران نے قریب رکھی پلیٹ میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور دوسرا ٹکڑا گرو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اپنا اور اپنی پتنی کا نیا جیون مبارک ہو۔''

گرو نے مجبوراً مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مٹھائی نہیں، کونین کی گولی کھا رہا ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ عمران نے گرو سے جس ''مدد'' کی بات کی تھی، اس کا طریقۂ کار پہلے بھی زیر بحث آ چکا تھا۔ استھان کی پہرے داری بیس بائیس افراد کے ذمے تھی۔ یہ لوگ رات نو بجے کے بعد اپنی ڈیوی پر آتے تھے اور صبح کا اجالا نمودار ہونے تک رہتے تھے۔ ایک دوسرا جتھا دن کے وقت پہرے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چند دن کے وقفے سے یہ ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ دن کے پہرے دار رات کی شفٹ میں چلے جاتے تھے اور رات والے دن کی شفٹ میں۔ ان بیس بائیس افراد میں سے آٹھ کے قریب تو استھان کے اندر ہی مختلف جگہوں پر ہوتے تھے، باقی نکاسی کے راستوں پر۔ ان کی ساری تفصیل عمران کو معلوم تھی۔ ان کی جسمانی حالت، ان کے ہتھیاروں کی تعداد، ان کی صلاحیت، سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے یہاں موجود ہے...... اور یقیناً اقبال بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

رات کے بھوجن کے بعد سب لوگ تاڑی سے شغل کرتے تھے۔ عام لوگ تو دل کھول کر پیتے تھے لیکن پہرے دار بھی اس ''نیک کام'' میں کسی حد تک شریک رہتے تھے۔ یہ خاص قسم کی تاڑی تھی جس میں بھنگ کا نشہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ ایک طرح سے یہ ان لوگوں کا الٰہی مشروب تھا جس کے پینے میں پاپ کے اندیشے کے بجائے ثواب کی توقع رکھی جاتی تھی۔ اس مشروب کے سربمہر مٹکے گرو کی تحویل میں رہتے تھے۔ گرو کے لئے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ اس تاڑی میں کوئی ایسی چیز شامل کر دیتا جس سے پینے والے مکمل طور پر اما ڈلیل ہو جاتے...... اقبال کی آنکھوں کا کباڑا کرنے والی خاص سرخ مرچوں جیسی کچھ اور جڑی بوٹیاں بھی گرو کے پاس موجود تھیں...... اور انہی چیزوں میں دھتورے کا وہ کشتہ بھی تھا جسے تاڑی میں ملائے جانے کا پروگرام تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے اپنے ٹھکانے پر واپس جانا چاہئے تا کہ کسی کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ سب اچھا ہونے والا ہے اور وہ موقع دیکھ کر کل کسی

بھی وقت مجھ سے ملاقات کرے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی طرح سلطانہ کی خیر خیریت دریافت کرے اور مجھے بتائے، اس کے علاوہ شکیلہ کے بارے میں بھی باخبر رہے۔ میں نے انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اسے شکیلہ کی حالتِ زار کے بارے میں بتایا۔ وہ اس بارے میں پہلے سے نہیں جانتا تھا، تاہم اسے شک ضرور تھا کہ اس مسلمان لڑکی کو یہاں ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے تین دن پہلے جو کچھ شکیلہ کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا، وہ عمران کے گوش گزار کیا۔ عمران کی آنکھوں کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ گرو اور رادھا کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ہماری باتیں سمجھ نہیں پا رہے۔

میں عمران سے بہت کچھ...... بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ابھی ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ عمران مجھے گرو کی رہائش گاہ سے لے کر نکلا اور واپس میرے ٹھکانے کی طرف لے کر چل دیا۔ آدھے راستے سے میں نے اسے واپس بھیج دیا کیونکہ میں اب اپنے کمرے تک جا سکتا تھا۔

ابھی میں کمرے سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے رات کے سناٹے میں دھپ دھپ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی بیلچے یا کسّی سے مٹی کھود رہا ہو۔ فوراً میرا دھیان شکیلہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے بھی تو کالی ماتا کے بیلچے اور مٹی کھودنے کی بات کی تھی۔ میں محتاط قدموں سے آواز کی سمت بڑھا۔ کمروں کی عقبی دیوار کے ساتھ کچے احاطے میں جہاں بہت سی خشک لکڑیاں پڑی تھیں اور تین بڑے بڑے چولہے بنے ہوئے تھے، مجھے دو تین سائے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چولہے ہیں جن کا ذکر کچھ دیر پہلے گرو کی سادہ لوح پتنی رادھا نے کیا تھا۔ ان چولہوں میں گرو کے جل جاپ یعنی پانی کی پوجا کے لئے اَدھ بجھے انگارے تیار کئے جاتے تھے۔ یعنی جو پانی 10 کلو لکڑی سے گرم ہو سکتا تھا، اس کے لئے ڈیڑھ دو من لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ایک چولہے میں ابھی تک مدھم آگ روشن تھی۔ میں تین سایوں کی حرکت اسی روشنی میں دیکھ سکا تھا۔

ان میں سے ایک یقیناً لڑکی تھی۔ وہ کندھوں تک ایک گڑھے میں تھی، اس کے بازوؤں کی حرکت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات کے اس یخ بستہ سناٹے میں مٹی کھود رہی ہے۔ جانے یہ کیا معما تھا۔ اس رات شکیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تلسی کے پودے کے نیچے اس لئے مٹی کھود رہی تھی تاکہ اسے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر مل سکے، اگر ایسا ہو گیا تو یہ لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ ارجن وغیرہ کا ڈھونگ ہی لگا تھا۔

میں شاید کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرتا اور کچھ ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں ایک

آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تنومند پہرے دار کی آواز تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ چمک رہی تھی۔ ''مہاشے! یہاں کیا کر رہے ہو آپ؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور چونکی ہوئی آواز میں بولا۔
''گوپال صاحب! آپ یہاں...... اس وقت...... خیریت تو ہے؟''

''بس ذرا سینے میں جلن ہو رہی تھی اس لئے ٹہل رہا ہوں۔''

''اگر طبیعت خراب ہے تو بتایئے۔ یہاں دوا دارو کا انتظام بھی ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شکیلہ کی صورت تادیر نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اس کا قصور کچھ نہیں تھا، اگر کوئی قصور تھا تو وہ اس کے بھائی کا تھا...... اور وہ بھی بس اتنا کہ وہ ایک برہمن زادی کے دل میں سما گیا تھا۔ اس قصور کی پاداش میں اس کی ایک بہن قتل ہو چکی تھی اور وہ خود زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اسے اس دردناک صورتِ حال سے نکالنے کے لئے آخری حد تک کوشش کروں گا۔ اگر میرے علم میں یہ بات نہ آئی ہوتی تو اور بات تھی، اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر فراموش کر دینا ممکن نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف عمران تھا۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ تھا کہ اقبال کی حالت اب بہتر ہے اور وہ ریموٹ کنٹرول کے ساتھ رادھا دیوی کے سرہانے موجود ہے۔ میرا یہ خیال درست نکلا۔ عمران نے کہا۔ ''اس کی آنکھوں کی سوجن تو کم نہیں ہوئی لیکن جلن اب ٹھیک ہے۔ وہ اب رادھا دیوی کو سنبھال سکتا ہے۔''

''اسے کسی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔''

''لیکن جگر! یہاں سب مریض ہیں...... نفسیاتی مریض، روحانی مریض...... جنونی اور پتا نہیں کیا کیا...... میں ان کو کیا لعن طعن کروں، میں خود ایک چڑیلا ہوں۔''

پھر اچانک عمران کی نظر میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ ریت کے تھیلے کے ساتھ میں گھنٹوں تک جو طبع آزمائی کرتا تھا، اس نے میری انگلیوں کی گانٹھوں کو سیاہ کر دیا تھا اور یہاں سے جلد سخت چمڑے جیسی ہو گئی تھی۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ میں کسی دروازے کے موٹے سے موٹے تختے کو مکا مار کر توڑ سکتا ہوں۔ میں گاہے بگاہے اپنی ضرب کی سختی کو جانچتا رہتا تھا اور مجھے روز افزوں بہتری کا احساس ہوتا تھا۔ عمران نے

حیرت آمیز انداز میں میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے انگوٹھے سے میرے ہاتھ کی پشت کو سہلایا...... پھر میرے دوسرے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔

''یہ سب کیا ہے تابی؟ میں تم میں بہت زیادہ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔''

''اچھی یا بُری؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھی...... بلکہ شاید بہت اچھی...... تم ایک...... بدلے ہوئے شخص ہو اور یہ نشان جو تمہاری جلد پر ہیں، یہ بھی کوئی نئی کہانی سنا رہے ہیں۔ کہیں کوئی فائٹنگ شائننگ کا آرٹ تو نہیں سیکھ رہے ہو تم؟''

''فائٹنگ کا آرٹ تو نہیں...... ہاں تم جینے کا آرٹ کہہ سکتے ہو۔'' میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''کوئی باکمال استاد ہی لگتا ہے بھئی۔'' عمران نے آنکھیں نچائیں۔ ''کون ذات شریف ہے؟''

''ہے نہیں...... تھا۔''

''کون؟''

میں نے گہری سانس لی اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ ''وہ بہت انوکھا تھا عمران...... بہت جدا...... جب میں تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور مجھے ہر چہرے میں تمہارا چہرہ نظر آتا تھا تو ایک روز اچانک وہ میری زندگی میں آ گیا...... تمہارا بدل بن کر...... تمہارے مداوے کی طرح...... وہ مجھے ایک پرانی کشتی میں ملا۔ وہ عشق کے راستے کا تباہ حال مسافر تھا...... ایک کمزور اپاہج اور حقیر سا شخص لیکن وہ جو نظر آتا تھا، وہ نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک بڑا انسان چھپا ہوا تھا۔ ایک بہت طاقتور، دلیر اور دانا شخص۔ وہ مارشل آرٹ کا ایک انٹرنیشنل سپر اسٹار تھا۔ بارونداجیکی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟''

''ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہا ہے۔ شاید اس نے کسی فلم میں بھی کام کیا تھا۔'' عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''فلم اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ زندہ رہتا تو شاید فلموں کی ضرورت بن جاتا...... وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ساتھ کوئی خدائی تحفہ لے کر دنیا میں آتے ہیں۔''

''تو کیا وہ زندہ نہیں؟''

''ہاں عمران، وہ مر گیا...... لیکن مرنے سے پہلے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا گیا۔ جو کمی تم نے رہنے دی تھی، وہ اس نے پوری کر دی۔ اس لئے تو کہتا ہوں کہ وہ تمہارا بدل بن کر مجھے ملا

تھا۔''

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟''

''وہی جو پیار کرنے والوں اور اس پر قائم رہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ دنیا نے اسے محبت کی سزا دی اور اس نے ہنستے ہنستے قبول کر لی۔'' میری آنکھوں کے کنارے پھر جل اُٹھے۔

''یہ تو کوئی لمبی کہانی لگتی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کہانی نے تمہیں بہت دکھی کیا ہے۔''

''ہاں، میرے بارے میں تمہارے اکثر اندازے بالکل درست ثابت ہوتے ہیں عمران۔ اس کی جدائی نے مجھے بُری طرح توڑا پھوڑا ہے...... لیکن میں قدرت کی کرشمہ سازی پر حیران ہوں۔ جب میں تمہارا خلا بُری طرح محسوس کر رہا تھا تو اسے پُر کرنے کے لئے بارونداجیکی آ گیا اور جب بارونداجیکی کے بعد مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا...... مجھے پھر سے تم مل گئے۔ میں سچ کہتا ہوں عمران...... مجھے ابھی تک اپنے حواس پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ تم کہاں چھپ گئے تھے؟ اور اب یہاں انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں یہاں انتہا پسندوں کے اس ٹھکانے پر؟ یہ سب کچھ اتنا ڈرامائی ہے کہ بس ایک خیال کی طرح لگتا ہے۔''

''میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ تمہیں سب کچھ بتاؤں گا اور پوری تفصیل کے ساتھ۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ چند سیکنڈ کے لئے وہ جذباتی نظر آیا مگر پھر اس کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ وہ میرے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔

''زبردست۔ اب یہ ہاتھ مردوں والے ہاتھ لگتے ہیں۔ اب تو تمہارے باروندا کے بارے میں مزید جاننے کو دل چاہتا ہے۔''

''میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ میں تو خود بھی اسے زیادہ نہیں جان سکا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے اب تو......'' وہ ایک دم کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی ساری دلکشی، شگفتگی اچانک اندوہ میں ڈھل گئی۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے تیر گئے۔

''کیا بات ہے...... تم کچھ کہنے لگے تھے؟''

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کنپٹی کھجائی اور گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن اب بُری خبر ملی ہے۔''

میں ٹھٹک گیا۔ ''سلطانہ تو ٹھیک ہے؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''سلطانہ تو ٹھیک ہے......لیکن شکیلہ......''

''کیا ہوا شکیلہ کو؟''

''وہ......نہیں......رہی۔''

''نہیں رہی......کیا مطلب؟''

عمران کے لہجے میں عجیب سی آتش بھڑک گئی۔ ''انہوں نے مار دیا اسے۔ آج صبح سویرے تمہارے یہاں واپس آنے کے کچھ ہی دیر بعد۔''

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج گئیں......نگاہوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جو آج سحری کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ کمروں کے پچھواڑے کچے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس کچھ سائے حرکت کر رہے تھے۔

''اوہ خدایا۔'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے عمران کہ ایسا ہو گیا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، آج صبح سویرے اس کے سر پر چوٹ لگا کر اسے مار دیا گیا......پھر اس کی اپنی کھودی ہوئی قبر میں ہی دفن کر دیا گیا۔''

''اپنی کھودی ہوئی قبر؟''

''یہ درندگی کی ایک اور یادگار مثال ہے۔ وہ بے چاری پچھلے چار پانچ روز سے خود ہی تھوڑی تھوڑی کر کے اپنی قبر کھود رہی تھی۔ یہ بھی یہاں کی منحوس رسموں میں سے ایک رسم ہے۔ دھرم دشمنی کے جرم میں قتل کیا جانے والا کوئی شخص اگر اپنی قبر خود کھودتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے خون کا بوجھ، خون کرنے والوں پر کم سے کم ہو جائے گا۔ گرو سوبھاش صاحب فرما رہے تھے کہ کوئی ایک ہزار سال پہلے یہ استھان ایک رانی گلاب کماری صاحبہ نے بنوایا تھا۔ وہ بہت اونچے درجے کی پجارن تھیں۔ انہوں نے جیون بھر کنوارہ رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا......لیکن پھر ایک رات وہی کچھ ہوا......جو آج کل کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ایک طوفانی رات میں ایک مسافر اس استھان میں آ کر ٹھہرا۔ انسانی تقاضوں کے ریلے کے سامنے صبر و تحمل کی ساری ریتلی دیواریں بہہ گئی تھیں۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رانی صاحبہ نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا......اور یہ سزا موت تھی۔ کوئی انہیں موت کی سزا دینے کو تیار نہیں تھا۔ رانی صاحبہ کا رتبہ اور مرتبہ ہر کسی کو ڈرا رہا تھا۔ تب رانی صاحبہ نے خود اپنے لئے ایک گڑھا کھودا اور اپنے ایک وفادار سیوک کے ذریعے خود کو اس میں زندہ دفن کر لیا۔ تاہم کچھ روایتوں میں کہا جا رہا ہے کہ رانی گلاب کماری کا یہ بلیدان ان کی

موت کے بغیر ہی قبول ہو گیا اور اگلے روز جب لوگوں نے مٹی ہٹائی تو رانی صاحبہ کا شریر وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ حالت میں بنارس پہنچ چکی تھیں۔''

عمران کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ جلالی روپ پیش کر رہا تھا۔ اس کا یہی روپ تھا جو اس کی خوش مزاجی اور کھلنڈرے پن سے بالکل علیحدہ تھا......اور جو دیکھنے والے کو مسمرائز کر ڈالتا تھا۔

اس نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی اور آج رات کے لئے تیار رہنے کی ہدایت دی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب مزید انتظار بالکل کرنا نہیں چاہتا۔ شاید میری طرح اس کے دل میں بھی یہ اندیشہ آن موجود ہوا تھا کہ شکیلہ کی طرح کہیں سلطانہ کے معاملے میں بھی تاخیر نہ ہو جائے۔ یہ بے حد خطرناک لوگ تھے۔ جنون کی حد تک کٹر اور انتہا پسند۔ وہ کسی لمحے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

عمران نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تم سب کچھ روزانہ کے مطابق ہی کرنا۔ رات کا کھانا کھا کر لیٹ جانا اور لالٹین بجھا دینا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اقبال کو بھیجوں، وہ آ کر تمہیں لے جائے گا۔''

اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا پسٹل نکالا۔ اسے رومال میں لپیٹا گیا تھا۔

''یہ رکھ لو......لوڈڈ ہے۔ کل تمہیں اس کے مزید راؤنڈز دوں گا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ بڑی فائیو اسٹار چیز ہے۔''

میں نے پسٹل لے کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں عمران سے ثروت......عاطف اور فرح کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔

عمران کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ شکیلہ نام کی اس لاچار لڑکی سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ وہ مرنے کے لئے بالکل تیار تھی اور وہ مر گئی تھی۔ ایک سفاک انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ عجیب سے پچھتاوے نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب چند گھنٹے پہلے میں نے تاریکی میں پچھواڑے کے احاطے میں متحرک سائے دیکھے تھے۔ یقیناً یہ وہی وقت تھا جب شکیلہ کو قتل کیا جا رہا تھا۔ ایک ہانپی اور تھکی ہوئی زرد رو لڑکی کی تصور میں آئی۔ وہ بے خبری میں اپنی قبر خود کھود رہی تھی اور مشقت سے کراہ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کس طرح مارا گیا تھا؟ وہ جلدی مر گئی تھی یا تکلیف سے؟ آہ......انسان کسی وقت جانوروں اور درندوں سے کتنی سبقت لے جاتا ہے۔

نل پانی کی شکیلہ لاچاری کی ایک ایسی ناقابلِ فراموش تصویر بن کر میرے ذہن سے چپک گئی جسے اب مدت تک خیالوں سے محو نہیں ہونا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس پہرے دار کو کوسنے لگا جو سحری کے وقت وہاں آ گیا تھا اور جس کی وجہ سے میں جلد کمرے میں جانے پر مجبور ہوا تھا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور کھڑا رہتا تو شاید یہ بات میری سمجھ میں آ جاتی کہ شکیلہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میں اسے بچانے کے لئے کچھ کر سکتا۔ یہ ''شاید'' کا لفظ بھی بہت عجیب ہے۔ کوئی غیب داں کوئی پیشین گو یا بڑے سے بڑا عالم بھی اس لفظ کا معما حل نہیں کر سکا۔ بارونداجیکی نے ایک دن اس لفظ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ میرے دماغ میں گھومنے لگا۔

......جوں جوں رات قریب آ رہی تھی، میرے جسم میں سنسنی کی لہریں ابھرتی اور پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ دھیرے دھیرے ایک ہنگامے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اس قسم کی تناؤ والی صورتِ حال مجھے تین چار سال قبل توڑ پھوڑ دیا کرتی تھی۔ میں اتنا اعصاب زدہ ہو جایا کرتا تھا کہ اپنے آپ پر ترس آنے لگتا تھا......لیکن اب موسم بدل چکے تھے۔ میں وہ نہیں رہا تھا جو کبھی تھا اور اب تو میں اور بھی طاقتور ہو چکا تھا کیونکہ عمران میرے آس پاس موجود تھا۔

قدیم استھان کے اس زیرِ زمین حصے میں روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔ کہیں پاس ہی کسی جگہ پر پٹاخے سے چھوٹ رہے تھے۔ یہ دراصل رائفل شوٹنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لئے مصنوعی ٹارگٹ اور ربڑ کی گولیاں استعمال ہوتی تھیں۔ گاہے گاہے سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا پھر پوجا کی گھنٹیاں در و دیوار میں گونجنے لگتی تھیں۔ مذہب کے نام پر ان لوگوں نے اپنا ہی ناٹک رچا رکھا تھا۔ سفاکی اور منتقم المزاجی اس ناٹک کے اہم ترین عناصر تھے۔ عمران نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس سے پتا چلا تھا کہ یہ استھان گھنے جنگل میں واقع ہے......اس کے اوپر ایک بہت بڑی پھلواری ہے۔ اس پھلواری کو بالکل صاف پانی سے سینچا جاتا ہے اور اس کے پھول نل پانی کے سارے مندروں اور استھانوں وغیرہ کو بھیجے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس پھلواری کے نیچے پرانے استھان میں انتہا پسندوں کا اڈا قائم ہے اور پھلواری میں کام کرنے والے بیسیوں مزدور درحقیقت خطرناک دہشت گرد ہیں۔

مجھے یہاں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لایا گیا تھا تاہم خوشبو کی وہ تیز لہریں میں نے ضرور محسوس کی تھیں جو یقیناً پھلواری کے اندر سے اُٹھ رہی تھیں۔ یعنی اوپر خوشبو تھی اور نیچے بدبو بدصورتی۔

رات کے دس بجے تک آوازیں دھیرے دھیرے معدوم ہو گئیں اور استھان خاموشی اور تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اب بس کہیں کہیں لالٹینوں یا مٹی کے تیل والے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لکڑی کے قدیم دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ستیش تھا۔ اس کے ماتھے کا سفید قشقہ اور آنکھوں کا سرخی مائل رنگ لالٹین کی روشنی میں نمایاں تھا۔ ''کہو گوپال! خیریت سے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں......کوئی تکلیف ناہیں......لیکن انتظار کچھ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔''

''میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ پرنتو کٹھن سے گزر گیا ہے۔ گرو جی کا کہنا ہے کہ ستاروں کی چال اچھی ہے۔ کل دوپہر تک سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ وہ شام کو شبھ گھڑی نکالیں گے اور رات آٹھ نو بجے تک تمہارا کام مکمل ہو جاوے گا۔''

''یہ آپ نے اچھی جانکاری دی ہے۔'' میں نے مؤدب انداز میں کہا۔

''ماتا جی نے تمہیں پیار بھیجا ہے......اور اب تک جو تکلیف تمہیں اُٹھانا پڑی ہے، اس کے لئے پتا جی نے شکریہ ادا کیا ہے۔''

''ستیش جی! آپ کیسی بات کرت ہیں۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے۔ آپ کے پریوار کی وجہ سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں ایک ادھرم ناری کو اپنے ہاتھ سے انجام تک پہنچاؤں۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز کا کام ہے۔''

''مجھے وشواس ہے، ایشور تمہیں اس کا بدل دے گا......''

جس وقت میں برہمن زادے ستیش سے باتیں کر رہا تھا، میں نے اقبال کو دیکھا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ مجھے اور ستیش کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ یقیناً وہ ستیش کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ ستیش کے جانے کے بعد چار پانچ منٹ کے اندر دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقبال ہی ہے۔ میرا خیال درست نکلا۔ اقبال نے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی، اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ ہاں، کل کے مقابلے میں افاقہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں تو پہلے ہی تیار تھا۔ ستیش کی فراہم کردہ کپڑے کی جیکٹ پہن چکا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے پاس چمڑے کی جیکٹ یا جوتی نہیں دیکھی تھی۔ غالباً اپنے کٹرپن کی وجہ سے وہ چمڑے کا استعمال پاپ سمجھتے تھے۔

عمران نے کل رات مجھے جو پسٹل دیا تھا، وہ بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اقبال اور میں آگے پیچھے چلتے ہوئے گرو کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے

اپنے درمیان پندرہ بیس قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ یہ قدیم استھان حسبِ سابق شب کے سناٹے میں اونگھ رہا تھا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے، کچھ سونے کی تیاری میں تھے۔ آبشار گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ آواز نمایاں ہوتی گئی۔ پانی کے قدرتی تالاب کے اندر اوندھا پڑا مجسمہ دکھاء دیا اور پھر گرو کی رہائش گاہ کے دروازے کی جھلک نظر آئی۔ اس اوندھے پڑے مجسمے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک علامت ہے، فرسودہ عقیدوں اور کہنہ رسموں کے زوال کی۔ یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ شاید سوچنے والوں کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ انہیں وقت کے جدید تقاضوں کی طرف بلا رہا تھا۔

ہم گرو کے گھر میں داخل ہوئے۔ زنانے میں اس کی جوان پتنی ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کل ہی کی طرح ہلدی تھا۔ اس کے قریب عمران فرشتۂ اجل کی صورت موجود تھا۔ ''ہرا طوطا'' اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرو بھی ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ جو نئی چیز نظر آئی، وہ بھاگ متی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہولے ہولے پان چبا رہی تھی۔ اس کا ایک رخسار ابھی تک گہرا نیلا تھا۔ فضا کا تناؤ بتا رہا تھا کہ نازک ترین گھڑیاں آن پہنچی ہیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ اقبال بولا۔ ''ہال کمرے میں تو خاموشی ہے۔ شاید ایک آدھ بندہ ہی جاگ رہا ہو۔ درمیانی ہال کی طرف سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں مگر زیادہ روشنی وہاں بھی نہیں تھی۔''

عمران بولا۔ ''مجھے زیادہ خطرہ بس اس کیدو کی طرف سے ہے۔ وہ خانہ خراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ ایک دو پیالوں سے تو اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی طرف سے تسلی کرنا ہوگی۔ آج اس کی ڈیوٹی کس طرف ہے؟''

''میرے حساب سے تو یہ سیڑھیوں والے دروازے پر ہوگا۔ ارون، پٹیل اور گاڑی بان بھولا ناتھ وغیرہ بھی وہیں پر ہیں۔''

عمران اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک چکر ادھر کا لگا آؤں۔ خاص طور سے اس کیدو کو دیکھ لوں۔'' کیدو سے اس کی مراد ارجن تھی۔

''پانچ دس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔'' اقبال نے رائے دی۔

ان باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ گرو سو بھاش نے اپنا کام کر دیا ہے۔ بھنگ اور دھتورا ملی ہوئی تاڑی پہرے داروں کو پلائی جا چکی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران اور اقبال پوری طرح تیار ہیں۔ عمران کے قریب ہی ایک سیون ایم ایم رائفل رکھی تھی۔ عمران کی جیکٹ کی جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں بھی

رائفل کے فالتو راؤنڈز اور میگزین موجود تھے۔ اقبال کی جیکٹ بھی اسی طرح بھاری بھرکم نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار چیک کئے اور مجھے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں کیا اور کس طرح کرنا ہے۔

گرو کی پُرزور درخواست اور گارنٹی پر پہلوان نما ملازمہ کو کل رات ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ بھاگ متی نے ہی آج کسی طرح سلطانہ سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ تیار رہے، آج رات اسے اور اس کے بھتیجے کو یہاں سے نکال لیا جائے گا۔

جو کارروائی یہاں ہونے والی تھی، اس کے بارے میں ضروری ہدایات بھی بھاگ متی نے ہی سلطانہ تک پہنچائی تھیں۔ سلطانہ بڑے گرو کی ذاتی تحویل میں تھی اور اسے ایک ایسی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا جس میں لوہے کا بس ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

اس سے پہلے کہ عمران گھر سے باہر نکلتا، کچھ فاصلے سے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کوئی شخص آہ و بکا کرتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں فوراً چھپا دیں۔ اقبال نے مردانے میں جا کر باہر جھانکا اور پھر پریشان آواز میں بولا۔ ''یہ تو وہی لنگڑا ارجن ہے۔''

''اوہ گاڈ۔'' عمران نے بے ساختہ کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ارجن کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔ ''گرو جی...... دروازہ کھولیں...... گرو جی۔''

گرو کے چہرے پر کچھ مزید ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عمران نے گرو کو اشارہ کیا کہ وہ خود دروازہ کھولے۔

گرو نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ارجن لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا اندر آیا۔ گرو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالا۔ وہ بدمست آواز میں بولا۔ ''گرو جی! غضب ہو گیا ہے۔ کسی نے تاڑی میں کچھ ملا دیا ہے۔ سب بے ہوش ہو گئے ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے...... کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔'' ارجن خود بھی جھوم رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو جائے گا۔

عمران کے اشارے پر گرو اسے جلدی سے زنان خانے میں لے آیا۔ ارجن پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھدی آواز میں بولا۔ ''جلدی سے کچھ کریں گرو جی! مجھے تو لگتا ہے کہ شاید حکم جی کے لوگن یہاں گھس آئے ہیں۔''

گرو نے تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ارجن ایک

ایسے شخص کے پاس فریاد لے کر پہنچا تھا جو خود ساری صورت حال کا ذمے دار تھا۔ عمران کے اشارے پر گروسو بھاش، ارجن کو اس چھوٹے کمرے میں لے گیا جہاں دو دن پہلے تک فربہ اندام داسی بھاگ متی بندھی تھی۔ عمران نے ارجن کو زور سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس ایک آدھ منٹ میں وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح انٹا غفیل ہو جائے گا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر عمران نے چادر کی بکل ماری اور رائفل اُٹھا لی۔ یہ چھوٹے بیرل والی اسمارٹ سی رائفل تھی۔ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ عمران مسلح ہے، کچھ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ عمران نے مجھے ایک مفلر نما گرم کپڑا دیا اور کہا کہ میں اس سے اپنا چہرہ ڈھانپ لوں۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بعد میں اپنی بیوی سے منہ دکھائی وصول کر سکو گے۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی تھی کہ سلطانہ مجھے گرو اور رادھا وغیرہ کے سامنے نہ پہچانے۔

''چلو گرو جی۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔ ''اور تم بھی شریمتی جی۔'' عمران نے رادھا کی طرف اشارہ کیا۔

رادھا کسی معمول کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بوٹے سے قد کی متناسب جسم والی لڑکی تھی لیکن کمر میں بندھی ہوئی بیلٹ کی وجہ سے اس کا پیٹ بھاری نظر آ رہا تھا۔ بادی النظر میں وہ حاملہ لگتی تھی۔ گرو پہلے سے کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمران سے سوال کیا۔ ''سلطانہ تمہارے حوالے ہو جاوے گی تو پھر تم رادھا کی کمر سے پٹی اُتار لو گے اور ہمیں واپس آنے دو گے؟''

''میرے خیال میں یہ بات میں تم سے دس پندرہ دفعہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں...... اور شاید اتنی ہی دفعہ راج (اقبال) نے بھی کہی ہے۔ اب صرف اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا لگانے کی کسر رہ گئی ہے۔''

گروسو باش ایک دم خجل نظر آنے لگا۔ ہم آگے پیچھے گرو کی رہائش گاہ سے نکلے۔ گرو کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گڑوی تھی اور لکڑی کے موٹے دانوں کی مالا بھی۔ ایسی ہی مالا رادھا کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اس کے صراحی دار گلے میں رات کی رانی کے پھولوں کا ہار بھی تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ وہ دونوں کسی خاص پوجا کے لئے بڑے ہال کمرے کی طرف جا رہے

ہیں۔ آبشار کے پاس سے گزر کر ہم استھان کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر ہم بڑے گرو کی قیام گاہ کی طرف آ گئے۔ یہاں دیواروں پر مذہبی انتہا پسندی سے متعلق نعرے درج تھے اور دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ایک پتھریلی دیوار کے قریب کم از کم پانچ افراد بے سدھ پڑے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی ان کے پاس ہی تھیں۔ چار افراد ایک جگہ تھے، پانچواں کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ گرا ہے جس کی وجہ سے اسے چوٹ لگی ہے لیکن بعدازاں یہ قیافہ غلط ثابت ہوا۔ منہ سے خون رسنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

گروسو بھاش نے اس زخمی پہرے دار کی جیبیں ٹٹولیں اور پیتل کی دو لمبی چابیاں نکال لیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ موٹی دیواروں والی وہی کال کوٹھڑی تھی جہاں سلطانہ کو رکھا گیا تھا۔ گرو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے بیضوی قفل میں چابی گھمائی۔ وزنی دروازہ مدھم آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر لالٹین کی زرد روشنی میں مجھے سلطانہ اور پندرہ سولہ سالہ طلال نظر آئے۔ وہ دونوں دروازہ کھلنے کے انتظار میں ہی تھے۔ دونوں خستہ حال اور مدقوق دکھائی دیتے تھے۔ سلطانہ کی طرح طلال کے چہرے پر بھی چوٹوں کے نئے پرانے نشان تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ سلطانہ کو کسی جانور کی طرح ایک زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ یہ زنگ آلود زنجیر اس کے دونوں پاؤں کو جکڑے ہوئے تھی۔ طلال زنجیر کے بغیر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سلطانہ ان لوگوں کے نزدیک زیادہ خطرناک قیدی ہے یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس نے قید کی حالت میں بھی مزاحمت جاری رکھی ہو۔ دوسری چابی سے گرو نے سلطانہ کی زنجیر کا قفل کھولا اور اس کے زخمی پاؤں آزاد کئے۔ سلطانہ نے مجھے دیکھا لیکن دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے اپنے گرد ایک پھول دار گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ طلال ایک بوسیدہ سے کوٹ میں تھا۔

ہم ان دونوں کو لے کر واپس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب ساتھ والے حجرہ نما کمرے کا دروازہ کھلا اور بالکل سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والا ایک نہایت بوڑھا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ لاٹھی کے سہارے بہ مشکل کھڑا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے باہر کا سارا منظر دیکھا۔ اس کا رعشہ زدہ سر کانپتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پوپلے منہ کے ساتھ گروسو بھاش سے کچھ کہا۔

گروسو بھاش نے آگے جا کر اپنا منہ بوڑھے گرو کے کان کے ساتھ لگایا اور قدرے

بلند آواز میں کہا۔ ”مہاراج...... اپنے بستر پر واپس جاؤ، سب ٹھیک ہے۔“

جواب میں بوڑھے گرو نے کچھ کہنا چاہا لیکن گروسوبھاش نے اسے تقریباً دھکیل کر واپس کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

گروسوبھاش کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑا گرو اب بس نام کا ہی گرو رہ گیا ہے، ورنہ اب یہاں اس کی کوئی سنتا نہیں ہے۔

ہم سلطانہ اور طلال کو لے کر واپس چل دیئے مگر یہی وقت تھا جب ہم پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ارجن کسی طرح اس کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا ہے جہاں ہم اسے بند کر آئے تھے۔ وہ آفت کا پرکالا گرو کے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آبشار کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سینے کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔

ہم سے اس کا فاصلہ بس چالیس پچاس قدم ہی ہوگا۔ دو افراد بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے اور اسے سنبھالا۔ ان میں سے ایک طلال کی عمر کا ایک بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی اس استھان میں رضا کارانہ خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مختلف کمروں میں پھول سجاتے اور کھانا لاتے دیکھا تھا۔ دوسرا پکی عمر کا شخص تھا۔ ارجن نے ان دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔ ”گروجی ان لوگن کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انہوں نے پہرے والوں کو زہریلی تاڑی پلا دی ہے...... کچھ کرو، جلدی کچھ کرو......“

میں نے دیکھا کہ عمران کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے۔ ”کتے کا بچہ۔“ وہ پھنکارا۔ اس کی یہ گالی یقیناً ارجن کے لئے تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار پھینکی۔ چھوٹی نال والی رائفل سیدھی کی۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ قریباً 40 میٹر کی دوری پر گولی ارجن کے پیٹ میں کہیں لگی مگر اس گولی نے اتنا ہی نقصان کیا جتنا سر پر لگنے والی گولی کرتی۔ ارجن پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، گولی کھا کر سیدھا تالاب کی گہرائی میں گیا۔ میں نے دیکھا، اس کا سر پانی میں اوندھے پڑے پتھریلے مجسمے کے دیوہیکل کندھے سے ٹکرایا اور یقیناً کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

عمران کا دوسرا نشانہ ارجن کے قریب کھڑا دراز قد پہرے دار تھا۔ یہ گولی سر میں لگی اور بھیجا پھاڑ کر نکل گئی۔ نوعمر رضا کار لڑکا اندھا دھند بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ عمران نے اس کی طرف رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں آیا کہ عمران اسے نشانہ نہ بنائے مگر میری سوچ کے مکمل ہونے تک وہ نشانہ بن چکا تھا۔ اسے پشت پر دو گولیاں لگیں اور وہ بھاگتے بھاگتے دو تین قلابازیاں کھا گیا۔

یہ سب کچھ بس دو یا تین سیکنڈ کے اندر رہا۔ استھان میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ لوگ ہڑبڑا کر اُٹھے اور دھماکوں کے ماخذ کی طرف بڑھے۔ کچھ رائفلیں بھی لہراتی ہوئی نظر آئیں۔

ہم سلطانہ، طلال اور گرو وغیرہ سمیت الٹے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ سیڑھیاں ہمیں بالائی منزل کی اس راہداری کی طرف لے جا سکتی تھیں جو نکاسی کے راستے کی طرف جاتی تھی۔

یکا یک ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ...... یہیں رک جاؤ۔ میں گولی چلا دوں گا۔“

میں نے دیکھا، ایک دیوار کی اوٹ میں نیم سرخ آنکھوں والا ستیش موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید رائفل تھی۔

ستیش کی اس للکار نے اردگرد موجود ہر شخص کو چوکس کر دیا۔ کئی رائفلیں نظر آئیں اور رائفل بردار ہماری سمت بڑھے۔ اب فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عمران کی طرح اقبال نے بھی چادر اتار پھینکی اور رائفل سیدھی کر لی۔ میں پہلے ہی کولٹ پسٹل جیب سے برآمد کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر میں نے پسٹل کی نال گروسوبھاش کی کنپٹی سے لگا دی۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں مخالفین پر تان رکھی تھیں اور اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی ایک گولی بھی چل جاتی تو پھر خون ریزی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ستیش کا نشانہ لے رکھا تھا اور ستیش نے شاید عمران کا۔ عمران کی جانی پہچانی گرج میرے کانوں تک پہنچی۔ ”ستیش! ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے گرو کی لاش گرے گی...... پھر اس کی پتنی پندرہ بیس ٹکڑوں میں تبدیل ہوگی۔ ہم نے اس کی کمر سے ٹی این ٹی باندھ رکھا ہے۔ بس...... یہ ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔“ عمران نے گرین رنگ کا ریموٹ کنٹرول ہوا میں لہرایا۔

عمران کی طراری اب سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کی سوچ ہمیشہ سے بڑی تیز رفتار رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے ارجن سمیت تین افراد کو گولی سے اُڑایا تھا تو اس عمل میں تھوڑی سی سفاکی نظر آئی تھی، خاص طور سے نوعمر لڑکے کے قتل میں...... لیکن اس کا یہ اقدام بلا وجہ نہیں تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی بچتا تو گروسوبھاش کی وہ حیثیت نہ رہتی جو اب تھی۔

اب وہ استھان کا غدار نہیں تھا۔ زہریلی تاڑی سے اس کا تعلق صیغۂ راز میں تھا۔ اب اس کی

جان کی پروا کی جاسکتی تھی...... اور ستیش اور اس کے رائفل برداروں کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ پروا کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

عمران نے اشارہ کیا۔ ہم سب الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ جوں جوں ہم پیچھے ہٹتے گئے، ستیش اور اس کے ساتھی آگے بڑھتے گئے۔ ان میں گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھا۔ اس کی اونچی ناک کے دونوں طرف اس کی عقابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے ہٹنے والے ہر قدم کے بدلے ستیش اور اس کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے لیکن گولی چلانے کی ہمت ابھی تک کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

ہم سیڑھیوں پر پہنچے تو ستیش نے ایک بار پھر خونی لہجے میں دھمکی دی۔ ''ہم تم لوگن کو اس طرح یہاں سے نکلنے ناہیں دیں گے۔ ہمیں گولی چلانا پڑے گی۔''

گروسوبھاش گڑگڑایا۔ ''ستیش! انہوں نے رادھا کی کمر سے بارودی پیٹی باندھ رکھی ہے، یہ بٹن دبا دیں گے۔''

گرو کی آواز میں دل دوز فریاد چھپی تھی۔ وہ ستیش سے اپنی اور اپنی پتنی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ دوسری طرف ستیش اور پٹیل وغیرہ کو شرمناک شکست نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جس مجرمہ کو جان ہتھیلی پر رکھ کر حکم جی کے ہرکاروں سے چھین کر لائے تھے، وہ ان کے ہاتھوں سے بھی چھن رہی تھی۔ اپنی قرار واقعی سزا کے قریب پہنچ کر وہ صاف بچ رہی تھی۔

ستیش نے پھر کہا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اتنا بڑا پاپ نہ کرو۔ یہ تم کو ہضم ناہیں ہووے گا اور نہ ہم ہونے دیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، چلاؤ گولی اور دیکھو تماشا۔'' اقبال نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔ عمران اور اقبال کا یہی اعتماد تھا جو حریفوں کو لرزہ براندام کر دیتا تھا۔

ہم قدم قدم پیچھے ہٹتے گئے...... ستیش اور اس کے ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے گئے۔

اب ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے تھے اور اس طویل راہداری میں تھے جس کی دونوں جانب ہوا کی آمدورفت کے لئے روزن سے بنے ہوئے تھے۔ سب سے آگے عمران اور اقبال تھے۔ دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں گرو، رادھا اور میں تھے۔ میں نے پسٹل کی نال گرو کے گنجے سر سے لگائی ہوئی تھی۔ آخر میں سلطانہ اور طلال تھے۔ درحقیقت اس استھان کے اصل رکھوالے تو وہی بیس بائیس پہرے دار ہی تھے جو تاڑی کی وجہ سے مدہوش پڑے تھے۔ یہ جو دوسرے لوگ تھے، ان میں ستیش اور اس کے ایک دو ساتھیوں کے علاوہ کسی میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ پورے جی جان سے ہمارے مقابل آ سکتا۔

یکا یک ستیش کے چہرے پر شدید اضطراب کے آثار نظر آئے، شاید اس نے کچھ بھانپ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر پاتا، عمران اور اقبال جیسے کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق تیزی سے دائیں بائیں ہٹے اور انہوں نے راہداری کا ایک آہنی دروازہ بڑی پھرتی سے بند کر دیا۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے تین چار گولیاں چلیں لیکن انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک گولی اقبال کے سر کے اوپر سے گزر گئی، دو دروازے کے آہنی تختوں سے ٹکرائیں۔ عمران اور اقبال نے تیزی سے دروازے کا آہنی کھٹکا چڑھا دیا۔

''بھاگو۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

ہم سب پلٹ کر دوڑے۔ دوسری طرف دروازے کو اندھا دھند دھکے دیئے جا رہے تھے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی ٹینک کو پستول کی گولی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ بہت وزنی دروازہ تھا۔ گروسوبھاش کو ہمارے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا لیکن یہ کام اس کے لئے جتنا مشکل تھا، اتنا ہی مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کی توند بُری طرح ہل رہی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اپنی توند کے بوجھ کی وجہ سے اوندھے منہ گر جائے گا۔ ہم نے ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور جھاڑ جھنکاڑ سے بند راستے کو کھول کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ یہاں دو گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑی بان اندر ہی کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

عمران نے ایک گاڑی میں گھس کر گاڑی بان کو رائفل کے ٹھوکے سے جگایا۔ وہ سکھ تھا۔ وہ ششدر نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گروسوبھاش کو پہچان لیا۔

عمران نے کہا۔ ''سردار! گرو جی کے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ ان کو محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔ گاڑی ہانکو اور جتنی رفتار سے چل سکتے ہو چل پڑو۔''

سکھ گاڑی بان نے کہا۔ ''گرو جی کے لئے تو جان بھی حاضر ہے جی...... پر وہ ہے کون جو گرو جی کا دشمن ہو رہا ہے......؟''

''اس کا تو ابھی ٹھیک سے ہم کو بھی پتا نہیں۔'' اقبال نے کہا۔

اس دوران میں عمران نے دوسری گھوڑا گاڑی کے دونوں گھوڑے کھول دیئے اور انہیں چھمڑیاں مار کر بھگا دیا۔ اب کوئی اس دوسری گاڑی پر ہمارا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سب سلطانہ اور طلال سمیت گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گرو ابھی تک تذبذب میں کھڑا تھا۔ عمران نے تحکم سے کہا تو وہ اور اس کی پتنی بھی سوار ہو گئے۔ عمران کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ابھی میاں بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ گرو اور رادھا کے سوار ہوتے ہی گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ ہم کچھ دیر تک ایک ڈھلوان راستے پر اُترتے رہے۔ خوشبو کی زبردست لپٹیں ہمارے نتھنوں تک

پہنچیں۔ میں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ہم واقعی ایک بہت بڑی پھلواری سے گزر رہے تھے۔ تاروں کی روشنی میں دور تک پھول دار پودوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ دن کے وقت یہ منظر واقعی قابلِ دید ہوگا۔ ہم استھان سے دور آ گئے تھے مگر ابھی تک خطرے سے دور نہیں تھے۔ عمران اور اقبال پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نگاہیں عقب میں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا۔ جب تاڑی کے کڑک نشے میں ڈگمگاتا ہوا ارجن پیٹ میں گولی کھا کر تالاب نما پانی میں گرا تھا اور اس کا سر بت کے شانے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا تھا۔ شکیلہ کا کم از کم ایک قاتل تو میری نگاہوں کے سامنے اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

O.....❖.....O

جب دن کا اُجالا پھیلا، ہم اس قدیم استھان کی مہلک تاریکی سے قریباً تیس میل دور آ چکے تھے۔ یہ کٹا پھٹا جنگلی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں راستہ مسدود ہو جاتا اور ہمیں چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ راستے میں دو تین جگہ گھوڑوں کو آرام بھی دینا پڑا۔ اب ہم جنتر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک نشیبی علاقے میں تھے اور خود کو کافی محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ گھوڑے بُری طرح تھک گئے تھے۔ ہمارے انجر پنجر بھی ہل گئے تھے۔ عمران نے گاڑی ایک ایسی ہموار جگہ پر رکوائی جہاں درخت جھنڈ کی صورت میں موجود تھے اور پانی بھی تھا۔

گھوڑے پانی پر لپک پڑے۔ ہم بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے نیچے اُتر آئے۔ عمران کے چہرے سے خشونت رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک بار پھر شگفتگی کا ڈیرا تھا۔ ہم نے راستے میں بہت کم بات کی تھی اور میں تو تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ وہ مفلر نما گرم کپڑا بھی میں نے چہرے پر لپیٹ رکھا تھا جو عمران نے استھان میں مجھے دیا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ نیم تاریکی میں ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ دوسروں کے برعکس میں صرف ایک ہلکی پھلکی قمیص میں تھا۔ سردی گرمی کو برداشت کرنا مجھے اچھا لگتا تھا اور اب میرا جسم اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ میری جیکٹ گاڑی میں موجود تھی لیکن میں اسے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

عمران نے گرو کو گاڑی سے باہر بلایا اور کہا۔ ''جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شکیلہ نام کی لڑکی کی موت کے بدلے تم دونوں کو یہاں کسی کیچڑ والے گڑھے میں زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ تم قیامت تک سردی سے ٹھٹھرتے رہو۔ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟''

گرو نے پرنام کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں امیت...... میں استھان کا کارمختار ناہیں ہوں۔ مجھ سے صرف رائے لی جاوت ہے جو میں

پوتھیوں (کتابوں) کے مطابق دے دیوت ہوں۔ میں کسی کو بچا سکتا ہوں نہ مار سکتا ہوں۔''

''تو پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟ کیا تم استھان میں واپس جانا چاہتے ہو؟'' اقبال نے پوچھا۔

گرو کا جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب میرے لئے وہاں بھی بہت خطرہ ہووے گا۔ مجھے اب وشواس ناہیں کہ تاڑی میں دھتورا ملانے والی بات زیادہ سے چھپی رہ سکے گی۔ لوگن یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی اور پتنی کی جان بچانے کے لئے اپنے ہی ساتھیوں کی جان لی ہے۔''

''تم نے کس کی جان لی ہے؟ تمہارا دوش تو صرف اتنا ہے کہ تم نے پہرے داروں کو دھتورے والی تاڑی پلائی ہے۔''

''میرے وچار میں بات اس سے بڑھ کر ہے۔ تاڑی نے پہرے داروں کو صرف بے ہوش ناہیں کیا۔''

''کیا مطلب؟''

''ان میں سے کئی مر گئے ہیں۔'' گرو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ''میں نے جب پہرے دار کی جیب سے چابیاں نکالی تھیں، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا...... اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے پہرے دار کو بھی میں نے اسی حالت میں دیکھا ہے۔''

ہم سناٹے میں رہ گئے۔ پتھریلی دیوار کے پاس پہرے دار جس طرح گرے پڑے تھے، وہ منظر واقعی تشویش ناک تھا...... مگر ان میں سے کچھ یکسر ختم ہو چکے تھے، یہ بات اب گرو سے پتا چل رہی تھی...... گرو کراہتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ جو تین لوگن تمہاری گولیوں سے مرے ہیں، ان کی موت کا کارن بھی تو میں ہی ٹھہرتا ہوں...... مجھے ناہیں لگتا کہ اب میں اور رادھا واپس استھان جا سکت ہیں۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ سمجھ میں ناہیں آتا۔ مم...... میں برباد ہو کر رہ گیا ہوں۔'' گرو بے دم سا ہو کر ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گیا۔ عمران کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ گرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اتنی ٹھنڈی ٹھار زمین پر دھرنا دو گے تو تمہاری تشریف سن ہو جائے گی۔ دماغ تو تمہارا پہلے ہی سن ہو چکا ہے، اوپر نیچے سے مفلوج ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے۔ تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے۔ تمہارے جیسے برباد حال اور بے ٹھکانا لوگوں کے لئے ایک بڑی اچھی جگہ ہے میرے پاس۔ نیوز چینل ''فساد پلس۔'' میں وہاں تمہیں ملازمت دلا سکتا ہوں۔ دماغ تو تمہارا آل

ریڈی سن ہے، تم بڑی آسانی سے اینکر پرسن بن سکو گے۔ اینکر پرسن سمجھتے ہونا تم؟ وہی شخص جو تین چار افراد کو سامنے بٹھا کر سوال پوچھتا ہے اور کسی کو جواب نہیں دینے دیتا اور جب کوئی جواب دینے لگتا ہے تو بریک لے لیتا ہے۔''

''اور اس کی بیوی کا کیا بنے گا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''گرو صاحب کی توند دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے اچھے کھانے پکا لیتی ہوگی۔ اس لئے اسے آسانی سے کسی کھیلوں کے پروگرام کی میزبان بنایا جاسکتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کھیلوں کی میزبان؟'' اقبال نے حیرت ظاہر کی۔ ''اگر وہ اچھے کھانے پکاتی ہے تو پھر اسے کسی کوکنگ پروگرام کی میزبان ہونا چاہئے۔''

''اوئے باندر! کوکنگ پروگرام کی میزبان تو بنے گی کوئی کھلاڑی۔ ان ٹی وی چینلز میں کوئی کام ڈھنگ سے ہو جائے تو پھر یہ انتظامیہ کی بہت بڑی نالائقی سمجھی جاتی ہے۔ منتظم افراد کو دقیانوس اور نامعقول گردانا جاتا ہے۔ وہ شرم سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ گرو جی! آپ فرمائیں کیا پروگرام ہے؟''

گرو نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ ''میری سمجھ میں کچھ ناہیں آرہا۔ جو کچھ ہم دونوں کے ساتھ ہونے والا ہے...... اس سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیں گولی ہی مار دو۔''

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ بولا۔ ''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' وہ جلدی سے گھوڑا گاڑی میں گیا اور رادھا کو لے کر باہر نکل آیا۔ وہ ساڑھی میں تھی۔ اوپر سے اس نے ایک گرم شال لے رکھی تھی۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی باہر آئی۔ استھان میں چلنے والی گولیوں اور ان سے ہلاک ہونے والے تین افراد کی موت کا منظر جیسے اب تک اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ عمران کے کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل کو بے حد ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''یہ کیا کرنے لگے ہو اقبال؟'' عمران نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''گرو جی کو قتل کرنے لگا ہوں۔''

''لیکن یہ تو گرو کی پتنی ہے؟'' عمران نے کہا۔

''اسی میں تو گرو کی جان ہے یار! اسے ماروں گا تو گرو خود بخود عالم بالا کی سیر کو نکل جائے گا۔''

عمران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ گرو اور رادھا دونوں کے رنگ ہلدی کی طرح نظر آنے لگے۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے۔ عمران نے رادھا کو کچھ فاصلے پر اس طرح بٹھا دیا کہ اس کی

ٹیک ایک درخت کے ساتھ لگ گئی۔ اقبال نے سبز ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے لیا۔ رادھا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک بڈھے، بے ڈھنگے شوہر کی وجہ سے اسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے گھگیائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً بھگوان کا واسطہ دیا کہ اس کی جان بخش دی جائے...... عمران اور اقبال نے بالکل کان نہیں دھرے۔

عمران نے کہا۔ ''میرے خیال میں سلطانہ کو بھی یہ منظر دکھانا چاہئے۔ وہ کہاں ہے؟''

اقبال نے آگے جا کر گاڑی میں جھانکا اور بتایا کہ وہ سو رہی ہے۔

وہ راستے میں بھی اونگھتی رہی تھی اور اب گاڑی کے اندر ہی سوئی ہوئی تھی۔ اب یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ واقعی سوئی ہوئی ہے یا اردگرد سے ناتا توڑنے کے لئے ایسا ظاہر کر رہی ہے۔ راستے میں طلال نے عمران کو چپکے سے بتایا تھا کہ اس کی خالہ کو وہاں استھان میں کوئی ایسی شے کھلائی جاتی رہی ہے جس وہ زیادہ تر اونگھتی رہی ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کال کوٹھڑی میں بھی اپنی مزاحمت جاری رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی اور اسے کوئی نشہ آور دوا بھی دی جاتی رہی......

سکھ گاڑی بان نے عمران کی ہدایت پر خشک لکڑیاں جمع کر کے الاؤ بھڑکا دیا تھا اور اب عمران بڑے سکون سے اس الاؤ کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور جیکٹ کی جیب سے چنے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے ابھی چند گھنٹے پہلے تین افراد کو جان سے مارا ہے۔ وہ گرو کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یار اقبال! مجھے نہیں لگتا کہ یہ اپنی پتنی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد یہ خود بخود مر جائے گا۔''

''نہیں مرے گا تو کیا ہوگا۔ ایک گولی ہی اور ضائع کرنا پڑے گی۔''

عمران نے پہلی بار اقبال کو اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام سن کر گرو سوبھاش کو پتا چل گیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کے مردہ چہرے پر ذرا سی زندگی جھلکی۔ وہ آخری کوشش کے طور پر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں ایک بار پھر کہتا ہوں، میں بالکل نردوش ہوں۔ وہاں استھان میں مجھ سے صرف رائے لی جاتی تھی جو میں پوتھیوں میں سے پڑھ کر دے دیتا تھا۔ میں اور کچھ ناہیں کرتا تھا۔''

''تم سب کچھ کرتے تھے اور کر سکتے تھے۔'' عمران نے ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ ''جب تم میاں بیوی کو اپنی جان کا خطرہ پڑا تو تم نے دھرم کو موم کی ناک بنا لیا۔ جو شبھ گھڑی تم نے پانچ منٹ میں ڈھونڈ لینی تھی، وہ تمہیں دو گھنٹے بعد بھی نہیں ملی۔ پھر تم نے پوتھیوں کے اندر سے ہی

یہ مسئلہ بھی ڈھونڈ لیا کہ اگر استھان میں خون ریزی کا خطرہ ہو تو...... جناب عالی...... تاڑی میں دھتورے والی بھنگ ملائی جاسکتی ہے اور یہ تو بس ایک دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں، ایسی پتا نہیں کتنی قلابازیاں تم اپنی مرضی سے لگاتے رہتے ہو اور اسے مقدس پوتھیوں کے سر تھوپتے رہتے ہو۔''

گرو لاجواب ہو گیا مگر اس نے اپنی دادفریاد جاری رکھی۔ وہ پھر گھگیایا۔ ''دیکھو پرنتو! تم لوگن اس وقت غصے میں ہو اور غصہ بدھی کو کھا جاتا ہے۔ میں سچ کہوت ہوں، میرا اِدھکار وہاں زیادہ ناہیں تھا۔ تم شبھ گھڑی کی بات کر رہے ہو، اگر میں وہاں دوسری بار بھی شبھ گھڑی نہ نکالتا تو پھر مجھے کیول ایک موقع اور دیا جاتا۔ اس میں بھی شبھ گھڑی نہ نکلتی تو ستیش وغیرہ بڑے گرو کی طرف سے خود ہی شبھ گھڑی نکال لیتے اور لڑکی کو جلا دیتے۔ میں سچ کہوت ہوں۔'' گرو کی آواز زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس نے اشک بار آنکھوں سے اپنی جوان پتنی کی طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، جوانی اور خوب صورتی میں طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی جان بچانے کے لئے کچھ کہو، شاید ان لوگوں کے دل پسیج جائیں۔

لڑکی سسک کر بولی۔ ''تم لوگن مسلمان ہو اور میں نے سنا تھا کہ مسلمان اپنے قیدی سے اچھا برتاؤ کرت ہیں۔ بے شک ہم دونوں تمہارے اپرادھی ہیں مگر اپنے کرموں پر تم سے شرمندہ ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر تم سے جیون کی بھیک مانگت ہیں۔'' وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''قیدی تو وہ بدنصیب شکیلہ بھی تھی۔ وہ بھی رو رو کر زندگی کی بھیک مانگتی رہی ہوگی۔''

گرو بلک کر بولا۔ ''میں بڑی سے بڑی سوگند کھانے کو تیار ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے ستیش، پٹیل اور ارجن وغیرہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے ستیش کی بات چلتی ہے اور ستیش وہی کچھ کرت ہے جو اس کی ماتا کہوت ہے۔ وہ بڑھیا بڑی کٹھور عورت ہے۔''

عمران بولا۔ ''تم موت کو سامنے دیکھ کر خود کو اس کٹھور پن سے علیحدہ کر رہے ہو...... ورنہ تم بھی اس بے رحمی کا اٹوٹ انگ ہو۔ تمہاری منت سماجت پر تمہاری سزا تو معاف نہیں ہو سکتی۔ ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ پہنچائیں اور جلدی سے تمہارے پرانوں کو تمہارے شریر (جسم) سے مکتی دلا دیں۔'' عمران نے ریموٹ کنٹرول اقبال کے ہاتھ سے لے لیا۔

گرو جیسے مرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ فریادی انداز میں زمین پر گر پڑا اور دُہائی دینے لگا۔ ''میرا جیون بخش دو۔ میں سوگند کھاوت ہوں، جیون بھر تمہارا داس بن کر رہوں گا۔ تمہاری

غلامی کروں گا۔'' وہ جانتا تھا کہ اگر عمران کہہ رہا ہے تو مار بھی دے گا۔ وہ استھان میں عمران کے ہاتھوں تین افراد کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

عمران اور اقبال لطف لے رہے تھے۔ عمران نے گرو کو حکم دیا کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھے۔

وہ اپنی توند سے مٹی جھاڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ استھان میں سانڈ کی طرح دندنانے والا گرو یہاں اس ویرانے میں کیچوے سے زیادہ حقیر نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''میں نیوز چینل فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میں نے اپنی فیلڈ میں بڑے بڑے مطلبی لوگ دیکھے ہیں لیکن تم تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ ابھی تم نے فرمایا ہے کہ...... میرا جیون بخش دو...... یعنی اب تم اپنی دادفریاد میں سے اپنی پتنی کو بھی خارج کر دیا ہے۔ صرف خود کو بچانا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فقرہ سنہری حرفوں میں لکھا جانے کے قابل ہے...... بھئی واہ۔''

''ناہیں...... ناہیں...... وہ تو بے دھیانی میں کہہ دیا...... ہم دونوں تم سے جیون کی بھکشا مانگت ہیں۔'' گرو کراہا۔

رادھا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اقبال نے آگ کے پاس بیٹھتے ہوئے، رائفل گود میں رکھی اور بولا۔ ''تم نے لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ دھرم کو جدھر چاہا اپنی مرضی سے موڑ لیتے ہو۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ کرنا ہے۔ بتاؤ، اس معاملے میں تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟''

گرو کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس لرزش کی وجہ سے اس کی گرد آلود توند میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے اپنی ناک سے بہنے والا رقیق مادہ، اپنی چادر کے پلو سے صاف کیا اور پھر نہایت ندامت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیوں کرتے تھے ایسا؟'' اقبال نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ اقبال نے زیادہ کرخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو وہ کراہا۔ ''میری عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ شریر میں اتنی شکتی ناہیں اس لئے...... ایسا کرنا پڑا......'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''تمہاری عمر زیادہ ہو گئی ہے، شریر میں طاقت نہیں اس کے باوجود تم نے ایک نوعمر لڑکی کو پتنی بنایا ہوا ہے...... اس کا مطلب ہے جب تم اور زیادہ بوڑھے ہو جاؤ گے تو تین چار پتنیوں کے بغیر تو تمہارا گزارا ہی نہیں ہوگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تمہیں زیادہ بوڑھا ہونے ہی نہ دیا جائے۔ کیا خیال ہے عمران؟''

''بالکل بجا ارشاد فرماتے ہو تم۔'' عمران نے تائید کی اور ریموٹ کنٹرول کو 'ایکٹی ویٹ' کر دیا۔ ایک ننھا سا سرخ بلب جل اُٹھا۔ گرو کی گھگی بندھ گئی۔ رادھا کا رہا سہا لہو بھی نچڑ گیا۔

بالکل آخری کوشش کے طور پر گرو نے ایک بار پھر وہی انداز اختیار کیا اور ٹھنڈی جگہ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ عمران کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔ وہ زندگی کے لئے گڑگڑایا۔ ''ہمیں شما کر دو۔ میں تمہیں وچن دیوت ہوں، ہم دونوں جیون بھر تمہارے ادنیٰ سیوک بن کر رہیں گے۔ جو تم کہو گے وہ کریں گے۔ اپنی غلطیوں کا پرائشچت کریں گے۔ بس ہمیں ایک موقع دے دو......''

رادھا نے بھی اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا تھا اور گٹھڑی سی بن کر روتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ عمران ان دونوں کو چھوڑے گا یا نہیں لیکن کم از کم رادھا کے لئے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھا، پھر اقبال کی طرف۔ کچھ دیر تک لرزاں و ترساں میاں بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ تب گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم دونوں کو کچھ شرطیں ماننا ہوں گی......''

وہ دونوں جیسے بلک پڑے۔ یقیناً انہیں ایسے ہی محسوس ہوا تھا جیسے تختۂ دار پر عین آخری وقت میں زندگی کی نوید مل گئی ہو۔ گرو سوبھاش گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہمیں ہر شرط منظور ہے۔ بغیر سنے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ ہم جیون بھر تمہاری غلامی کریں گے۔''

عمران نے ریموٹ کنٹرول کو ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا۔ اس نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے رادھا کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے کمر عریاں کرنے کو کہا۔ رادھا نے پہلے شال اتاری پھر ساڑھی کا پلو گرا کر کمر عریاں کر دی۔ اب مختصر چولی سے ساڑھی کی بیلٹ تک اس کا تراشا ہوا جسم دن کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اقبال نے عمران کو آنکھ ماری پھر بڑی احتیاط سے بیلٹ کے اسٹریپس کھولنے شروع کئے۔ وہ کافی کس کر باندھی گئی تھی۔ کھولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ رادھا سی سی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بالکل ساکت تھی۔ اس اندیشے سے شاید سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

یہ لمحے بڑے نازک محسوس ہو رہے تھے۔ گرو نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اقبال نے ذرا زور لگایا تو ایک اسٹریپ جھٹکے سے ٹوٹ گیا...... رادھا بے ساختہ چلا اٹھی۔ ساتھ ساتھ وہ زیر لب اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال رادھا کی کمر سے بیلٹ علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک سنسنی خیز صورتِ حال کا اچھا دی اینڈ تھا۔ الاؤ کی آگ اب کافی بھڑک اٹھی تھی اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو راحت پہنچا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں قرب و جوار واضح دکھائی

دے رہے تھے۔ یہ علاقہ جنتر اور کیکر کے خودرو درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ پتوں پر اوس چمک رہی تھی اور یہ اتنی زیادہ تھی کہ زمین بھی نم نظر آتی تھی۔ ہلکی دھند سردی کے احساس میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب عمران نے گھوم کر کچھ دیکھا اور پکارا۔ ''پکڑو۔''

اقبال گھوڑا گاڑی کے قریب تھا۔ وہ عمران کی آواز سن کر پلٹا اور دوڑا۔ تب مجھے پتا چلا کہ اقبال کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ بھاگنے والے سلطانہ اور طلال تھے۔ وہ نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکلے تھے...... وہ اندھا دھند گھنے درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سکھ گاڑی بان ہوشیار سنگھ لکڑیاں اکٹھی کر کے مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو سلطانہ اور طلال کو روکنے کے لئے ان کے راستے میں آیا۔ یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ سلطانہ نے بھاگتے بھاگتے پوری قوت سے ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ کلہاڑی ہوشیار سنگھ کی تھی اور اس نے گاڑی کی اگلی نشستوں کے نیچے چھپا رکھی تھی، سلطانہ نے وہاں سے نکال لی تھی۔ الٹی کلہاڑی کا وار ہوشیار سنگھ کی گردن پر لگا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور خشک لکڑیاں اس کے ہاتھوں سے نکل کر چاروں طرف بکھر گئیں۔

میں اور عمران بھی ایک ساتھ الاؤ کے پاس سے اٹھے اور اقبال کے پیچھے لپکے......

''رک جاؤ...... گولی مار دوں گا۔'' اقبال بھاگتے بھاگتے دھاڑا۔

وہ دونوں نہیں رکے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بیس تیس قدم آگے جا کر طلال بری طرح پھسلا اور ایک آٹھ دس فٹ گہرے بارشی گڑھے میں جا گرا۔ اس گڑھے کی تہ میں دو تین فٹ تک کیچڑ کھڑا تھا۔ کچھ آگے جا کر اقبال نے سلطانہ کو چھاپ لیا۔ سلطانہ نے گھوم کر بے دریغ سیدھی کلہاڑی کا وار کیا لیکن مقابل بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ اقبال نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا۔ سلطانہ نے چلا کر دوسری مرتبہ کلہاڑی گھمائی۔ تاہم اس بار اقبال نے شروع میں ہی اس کی کلائی جکڑ لی۔ سلطانہ کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ اس نے زور مارا اور اقبال جیسا شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں اوپر نیچے جنگلی گھاس میں گرے۔ سلطانہ اوپر تھی اور کسی صورت کلہاڑی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار زور لگا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال کی انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر دب گئی۔ دھماکے سے گولی چلی اور گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا بری طرح اچھل کود کرنے لگا۔

میں سلطانہ کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی تندی تیزی اور بے خوفی کے

بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ آج میرے سامنے تھا۔ وہ ایک جنگجو راجپوت نظر آتی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے تو یہی لگا کہ شاید وہ اقبال کو بُری طرح گھائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اپنا صافہ نما کپڑا چہرے سے پھینکا تھا۔ ''سلطانہ...... سلطانہ۔'' میں نے پکار کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں لگا کہ اس نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا لیکن پھر یکایک وہ بُری طرح ٹھٹکی۔ اقبال نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔ ''سلطانہ! ہوش کرو، میں ہوں......''

چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جیسے اس حیران کن صورتِ حال کا تجزیہ کر رہی تھی۔ تب اس کے چہرے پر ایک بار پھر خشونت نظر آئی۔ اس نے اپنا جسم چرایا اور کراہ کر بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو...... میں کسی کی ناہیں...... میرا کوئی ناہیں...... مجھے جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔''

''ہوش کرو سلطانہ...... میں مہروز ہوں...... تمہارا شوہر۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' میں نے اس کے شانوں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

''میرا کوئی ناہیں...... مجھے چھوڑ دو......'' اس نے ایک دم اپنے شانے چھڑائے اور اُٹھنا چاہا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا پھر اُلٹے ہاتھ کا دوسرا تھپڑ۔ اس کے ریشمی بال اچھل کر رہ گئے۔ اس نے چند سیکنڈ کے لئے ششدر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے تھپڑوں نے اس کی ہسٹریائی کیفیت کو ایک دم کنٹرول کیا۔ اس کے جذبات کی شدت نے دفعتاً رخ بدلا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھاس میں اس کے قریب ہی بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دل دوز آواز میں روتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ روتے روتے سسکنے لگی۔ ''میں اس کتے کو جندہ ناہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے مار دوں گی...... یا خود مر جاؤں گی۔''

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ اسی شخص کی بات کر رہی تھی جو میرے

دل کا بھی داغ تھا۔ وہ شیطان صفت جارج گورا کی بات کر رہی تھی۔

○......❖......○

میں نے ایک بار سلطانہ کو اپنے ساتھ لگایا تو پھر خود سے جدا نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے اسے میں گھوڑا گاڑی کی نیم گرم فضا میں لے آیا۔ اس کا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ میرے سینے سے پیوست تھا۔ طلال کو کیچڑ آلود گڑھے سے نکالا جا چکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔ اقبال اور سلطانہ کی دھینگامشتی میں جو ایک گولی اتفاقاً چل گئی تھی، اس نے ہوشیار سنگھ کے ایک گھوڑے کو زخمی کر دیا تھا۔ تاہم یہ زخم بھی سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گولی، چتکبرے گھوڑے کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ گرو سو بھاش اور رادھا اسی طرح الاؤ کے گرد سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کی کیفیت عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے زخموں سے چُور جسم میں جتنا بھی پانی ہے، وہ آج آنکھوں کے رستے بہا دے گی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی گرم دھاریں میری گردن سے ہو کر میرے سینے تک جا رہی تھیں۔ وہ دل گیر آواز میں بولی۔ ''میں اپنا بدلہ لوں گی مہروز...... میں اس سفید سور کو یونہی ناہیں چھوڑوں گی۔'' اس کا لہجہ غیر معمولی تھا اور اس کا جذبہ بھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تم ایسی بات نہ کرو۔ اس شیطان کو میں اس کے انجام تک پہنچاؤں گا...... اگر میں نہ رہا تو پھر تمہارا جو جی چاہے کرنا۔''

اس نے میرے سینے سے سر اُٹھایا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں حیرت، خوشی، بے یقینی، بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے جو الفاظ سنے ہیں، وہ میں نے کہے ہیں۔

میں نے اس کا سر دوبارہ اپنے ساتھ لگا لیا۔ پچھلے چند مہینوں میں سلطانہ نے مجھے بتدریج بدلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ مجھے بہت زیادہ مختلف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ''سلطانہ ڈیڑھ دو سال پہلے تم نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ کوئی اور تھا۔ اب جو شخص تمہارے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہے یہ اور ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ تم دیکھنا، قدرت کی مدد شاملِ حال ہو گی۔ اس شخص کا انجام تمہاری توقع سے زیادہ برا ہو گا۔''

''میں تمہارے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی...... یہ میرے بس میں ہی ناہیں ہے۔'' وہ کراہی۔

"تو تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے لئے خطرہ مول لے لوں؟"

"میری بات چھوڑو مہروج...... میں اب مجرمہ بن چکی ہوں۔ میں نے چار بندوں کو قتل کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اب یہ لوگن مجھے جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر جب میں نے مرنا اچ ہوئیں گا تو پھر کیوں نہ میں اس کتے کو مار کر مروں۔"

میں نے پُرعزم انداز میں اس کا شانہ دبایا۔ "کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا سلطانہ۔ تم نے جو دکھ سہنے تھے، وہ سہہ چکی ہو۔ اب کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔ میں تمہاری طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔"

اس نے ایک بار پھر میرے سینے سے سر اُٹھایا اور حیرت آمیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ گھنے بال نصف چہرے کو ڈھانپ رہے تھے اور نصف کو نمایاں کر رہے تھے۔ وہ دھوپ چھاؤں کا عجیب امتزاج تھی۔ کہیں آگ تھی، کہیں شبنم، کہیں ریشم تھی، کہیں فولاد...... میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہاں گھوڑا گاڑی کی اس نیم گرم فضا میں میرے اور سلطانہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ ننھے بالو کا ذکر بھی بار بار آیا۔ سلطانہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اس منحوس استھان میں کب اور کس طرح پہنچا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہ روداد بتائی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں ایک ہندو گوپال کی حیثیت سے اس استھان میں موجود رہا ہوں۔ سلطانہ نے طلال کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ طلال کی پنڈلی پر چوٹ آئی تھی جہاں اقبال نے پٹی وغیرہ باندھ دی تھی۔ وہ خاموش آنکھوں والا ایک ناراض اور بہت گہرا لڑکا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا لیکن جتنی کرتا تھا، وہ بہت وزنی ہوتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنی خالہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار باحیثیت افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے مگر جب اس کی خاموش آنکھوں میں کوندتی ہوئی نفرت میں جھانکا جاتا تو یقین آنے لگتا تھا۔ اس کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں لیکن چھاتی چوڑی اور قویٰ اسٹیل کی طرح سخت تھے۔ اسے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ حکم کے بندوں نے ریسٹ ہاؤس سے ان دونوں کو پکڑنے کے بعد اس کی خالہ کو بُری طرح مارا پیٹا تھا اور وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہاں اسے خود جو چوٹیں لگی تھیں ان کی پروا اسے نہیں تھی۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہم کھانا کھانے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ کھانا ہم کو چاچا عبدالغنی نے دیا تھا۔ ہم کو جرا بھی شک ناہیں تھا کہ اس میں کچھ ملا

ہوئیں گا۔ اگر ہم ہوش میں ہوتے تو حکم کے لوگن ہمیں ہاتھ بھی نہ لگا سکتے۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ استھان میں حراست کے دوران میں کچھ لوگ اسے ترغیب دیتے رہے ہیں کہ اگر وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے تو وہ اس کی جان بخشی کر دیں گے۔

اسی دوران میں کہیں پاس سے فائر کی آواز آئی۔ یہ گن فائر تھا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ میں نے گھوڑا گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا، فائر کی آواز یقیناً عمران نے بھی سنی تھی لیکن وہ مطمئن بیٹھا تھا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" میں نے کھڑکی سے سر نکال کر عمران سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ اقبال نے کوئی شیر وغیرہ مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، بہت دن ہو گئے ہیں شیر کے کباب کھائے ہوئے۔"

اقبال اردگرد موجود نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فائر اس نے کیا ہو گا۔ جلد ہی صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ اقبال اور سردار ہوشیار سنگھ ایک مادہ ہرن کو اُٹھائے ہوئے جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ اس میں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ عمران ایک دم خوش نظر آنے لگا۔ وہ پکار کر بولا۔ "بھابی! باہر آ جاؤ...... مجھے لگتا ہے کہ ابھی تک تمہارا ولیمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس فرض سے سبکدوش ہونے کا۔"

میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ گھوڑا گاڑی میں آ کر خود مجھے اور سلطانہ کو باہر لے گیا۔ اس کی نگاہوں میں سلطانہ کے لئے محبت تھی۔ اس نے اسے آگ کے قریب بٹھایا اور اس کے شانوں پر گرم چادر رکھی۔ پھر چہکا۔ "بھابی! اب میں آ گیا ہوں۔ اب تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے اس نامعقول بندے کو میں تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔ سمجھو کٹھ پتلی بن جائے گا، جس طرح چاہو نچا لینا...... لیکن اس کے لئے تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ یہ دیکھو...... میں تمہارے پاؤں پکڑ لیتا ہوں۔ انکار نہ کرنا......"

اس نے واقعی شتابی سے سلطانہ کے پاؤں تھام لئے۔ سلطانہ نے گھبرا کر چھڑانا چاہا تو اس نے اقبال کو بھی اشارہ کر دیا۔ اس نے بھی جھٹ سلطانہ کے پاؤں تھام لئے...... اقبال ارا سا مسکرا رہا تھا۔ عمران نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر پر جھانپڑ رسید کیا اور بولا۔ "کھوتے کے پتر! رونی صورت بناؤ۔ آنکھوں میں تھوڑی سی نمی لاؤ۔ بھابی کو منانا ہے، کوئی گوڈا پکڑائی وصول نہیں کرنی ہے۔"

اقبال نے فٹ رونی صورت بنا لی۔ عمران کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ "خدا

کے لئے بھابی! بس ایک بات ماننی ہے۔ پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا ہے۔ جو کچھ ہوا، جیسا ہوا، سمجھو وہ بس ایک برا خیال تھا۔ گزر گیا، فنا ہو گیا۔ اگر اسے یاد رکھنا ہے تو ہم رکھیں گے۔ ہم تیرے بھائی...... تیرے نامعقول شوہر کے معقول یار...... ہاں، ہم وہ سب کچھ یاد رکھیں گے اور یاد رکھنے کا حق بھی ادا کریں گے۔ تیرا کلیجا ایسے ٹھنڈا کریں گے بھابی کہ انڈیا کا بچہ بچہ مدتوں تک یاد رکھے گا...... لیکن تمہیں ہماری بات ماننی ہے اور سب کچھ بھول جانا ہے......''

سلطانہ حیرت سے گنگ تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی عمران اور اقبال کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پالا کیسے لوگوں سے پڑا ہے۔ میں اسے کیا بتاتا۔ مجھے خود آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

''میرے پاؤں چھوڑیں۔'' سلطانہ نے کراہ کر کہا۔

''چھوڑ دیتے ہیں بھابی! لیکن پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر فوری طور پر وعدہ نہیں کر سکتی ہو تو کم از کم ہمیں امید ضرور دلانا پڑے گی۔'' عمران نے کہا۔

''اور امید دلانے کا طریقہ یہ ہے کہ تمہیں ایک بار...... مسکرا کر دکھانا ہوگا۔'' اقبال نے لقمہ دیا۔

وہ روہانسی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔ ''میں نا ہیں مسکرا سکتی۔'' وہ دلدوز انداز میں بولی۔

''بالکل...... بالکل غلط۔ بلکہ یہ فقرہ ہی غلط ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''خاص طور سے ایک مسلمان تو ایسا فقرہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ تم آج نہیں مسکرا سکتی ہو لیکن کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم کل یا پرسوں بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ اگلی جمعرات یا اگلے مہینے کی پندرہ بیس تاریخ تک بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ یہ تو غیب دانی کا دعویٰ ہے اور ایسے دعوے اس گرو سوبھاش جیسے لوگ تو کر سکتے ہیں، ہم نہیں۔''

''تم نے بالکل غلط فقرہ کہا ہے بھابی! اب تو ہم تمہارے پاؤں بالکل نہیں چھوڑیں گے۔'' اقبال نے کہا۔

''اور مجھے رو کر نہ دکھانا'' عمران نے لقمہ دیا۔ ''میں تم سے زیادہ رو سکتا ہوں اور اگر میں ایک بار رو پڑوں تو پھر مجھے چپ کرانا آٹھ دس بندوں کا کام نہیں ہوتا۔ ہاتھوں سے نکل نکل جاتا ہوں...... پچھاڑیں کھاتا ہوں۔ محلوں کے محلے اکٹھے کر لیتا ہوں...... اور کئی بار تو روتے روتے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا ہوں۔''

سلطانہ نے ایک بار پھر۔ بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

''اس نامعقول کی طرف نہ دیکھو بھابی!'' عمران نے اس کا چہرہ پھیر دیا۔ ''جو کچھ کرنا ہے، ہمیں کرنا ہے۔ تمہارے پاؤں چھوڑنے نہ چھوڑنے اور رو رو کر خود کو ہلکان کرنے جیسی ساری اتھارٹی ہمارے پاس ہے۔ تمہیں مسکرانا پڑے گا۔ اگر نقد و نقد نہیں...... مسکرا سکتی ہو تو ارادہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ ارادے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بھابی! آدھا ثواب تو ارادے سے ہی مل جاتا ہے۔ ہمیں بس تاریخ دے دو کہ کس دن مسکراؤ گی؟ ہم اسی سے مطمئن ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کچھ بھی کہہ نہ پا رہی تھی۔ اقبال نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بھابی! چلو اتنا بتا دو کہ آج کی تاریخ میں مسکراؤ گی یا پھر کسی دن؟''

سلطانہ کی آنکھیں مسلسل رستی رہیں اور وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ عمران نے کہا۔ ''میں اس کو تھوڑا سا اور آسان کر دیتا ہوں۔ آخر باڈی لینگویج بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھابی! اگر تم...... اگر تم اپنا بایاں پاؤں ہلاؤ گی تو اس کا مطلب ہوگا کہ آج ہی کسی وقت ہمیں اپنی مسکراہٹ سے نوازو گی۔ اگر دایاں پاؤں ہلاؤ گی تو مطلب ہوگا کہ کسی اور دن۔ یعنی ٹوٹل انکار نہیں، ٹھیک ہے؟''

چند سیکنڈ بعد شاید سلطانہ کا پاؤں بے ساختہ ہی ہل گیا تھا۔ عمران چہکا۔ ''زبردست...... زبردست...... یو آر گریٹ بھابی! تم نے ہمارا مان رکھ لیا۔ چلو دایاں پاؤں ہلایا لیکن ہلایا تو سہی۔ کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری مسکراہٹ دیکھنے کے لئے دو چار دن اور انتظار کر لیں گے۔ شکریہ، تھینکس، دھنیواد۔ اب تم کہو گی کہ شکریہ کس بات کا؟ نہیں بھابی! یہ سب تکلف کی باتیں ہیں۔ اتنے بڑے حالات میں بھی تم نے مسکرانے کا وعدہ کیا، یہ کوئی معمولی بات نہیں...... سچ، میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں اور میں صرف محاورتاً نہیں کہہ رہا۔ میں لگا بھی سکتا ہوں، یہ تو میرا پروفیشن ہے۔ اگر تم کہو بھابی تو میں لگا کے بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ سلطانہ کوئی ردعمل ظاہر کرتی، وہ طلال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''خاموشی کا مطلب ہے نیم رضامندی...... یہ دیکھو۔''

وہ بیٹھے بیٹھے کسی طاقت اسپرنگ کی طرح اچھلا اور ہوا میں دو الٹی سمر سالٹ لگا کر عین اسی جگہ لینڈ کر گیا جہاں سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس کی مہارت قابلِ دید تھی۔ میرے اور اقبال کے سوا سبھی دنگ رہ گئے۔ گرو کا چہرہ حیرت کی تصویر نظر آنے لگا۔ ہوشیار سنگھ جو اپنی سوجی ہوئی گردن پر ٹکور کر رہا تھا، آنکھیں پھاڑ کر عمران کو دیکھتا چلا گیا۔ ''واہ...... واہ۔ ایسا کام تو روسی سرکس والے کرتے ہیں یہاں انڈیا کے وڈے وڈے شہروں میں۔ یا پھر جمنا سٹک

والے کھلاڑی ہوتے ہیں۔''

''میں تمہیں کیا لگتا ہوں...... کھلاڑی یا سرکس والا؟''

وہ مسکرایا۔''میری مت نہیں ماری ہوئی کہ آپ کو سرکس والا کہہ کر آپ سے جھانپڑ کھاؤں۔ میرے خیال میں تو آپ کھلاڑی ہی ہیں۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ تم پکے سردار ہی نہیں ہو کیونکہ میں نے سنا تھا کہ سردار چغد ہوتے ہیں۔''

ہوشیار سنگھ بولا۔''شاید تھوڑا بہت نام کا اثر ہے جی۔ ورنہ کام تو میرے بھی اکثر بڑے ہائی کلاس ہوتے ہیں۔'' اس نے خاموش بیٹھی سلطانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔''اب یہی دیکھ لیں۔ بی بی کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی لیکن مجھے دور سے یہ لگا کہ یہ ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوئی ہے۔ یہ تو بھلا ہو میری بھین کا کہ انہوں نے الٹی ڈوئی...... میرا مطلب ہے کلہاڑی ماری ورنہ میرا تو جھٹکا ہو جانا تھا کھڑے کھڑے۔''

''حیرت ہے، تمہیں ڈوئی اور کلہاڑی کے فرق کا پتا نہیں چلا۔ حالانکہ وہ ٹائم بھی کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔'' اقبال نے کہا۔

''میں سمجھ گیا جی! آپ بارہ بجے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن اب وہ بات پرانی ہو گئی ہے۔ اب ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، گلوبل ولیج اور اس ولیج میں کہیں نہ کہیں تو بارہ بجے ہی رہتے ہیں...... ہو ہو ہو۔'' وہ خود ہی منہ کھول کر ہنس دیا۔

اقبال نے جیب سے شکاری چاقو برآمد کیا اور تیزی سے ہرن کی کھال اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ ہوشیار سنگھ عارضی انگیٹھی بنانے کے لئے دو تین پتھر اُٹھا لایا۔

''مسئلہ نمک مرچ کا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

عمران فٹ بولا۔''تو میں یہاں کس لئے ہوں، فساد پلس کا نمائندہ میرا تو کام ہی نمک مرچ لگانا ہے۔ میں تو چودہ دن کے باسی آلو مٹر کو ایسا تڑکا لگا سکتا ہوں کہ وہ تر و تازہ تندوری چرغا بن جائے۔ یہ تو پھر ہرن ہے یار۔''

''تو پھر کرو اس کو نمکین؟'' اقبال نے کہا۔

''تم اس کی کھال تو اتارو۔ تمہیں پتا ہی ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''تم بھی کچھ مدد فرماؤ نا۔ کھال ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اقبال بولا۔

''مجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں چینل کا نمائندہ ہوں۔ چھوٹے موٹے کاموں سے میری توہین نہ کرو یار! کسی بال کی کھال اتارنی ہو یا کوئی اس سے بھی باریک شے ہو تو میرا

احسان لینا۔ میں تمہارے لئے نمک کا انتظام کرتا ہوں۔''

وہ اُٹھ کر گھوڑا گاڑی میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک کاغذ میں، مناسب مقدار میں نمک لے کر آ گیا۔ میری طرح ہوشیار سنگھ بھی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ نمک کہاں سے برآمد ہو گیا ہے۔ ہاں، اقبال کو حیرانی نہیں ہوئی۔

الاؤ اب خوب اچھی طرح بھڑک رہا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے گوشت بھوننے کے لئے کافی سارے کوئلے بنا لئے تھے۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے پوچھا۔''یہ نمک کہاں سے آ گیا؟''

''یار! جادو برحق ہے۔''

''مذاق نہیں۔ یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

وہ مسکرایا۔''سچ بتاؤں؟''

''جی تو چاہتا ہے کہ کبھی یہ انہونی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک ابھری۔ وہ سرگوشی میں بولا۔''بارودی بیلٹ میں سے نکالا۔''

''بارودی بیلٹ؟ جو رھادا کی کمر سے اتاری ہے؟''

''ہاں۔''

''بارودی بیلٹ میں نمک بھی رکھا ہوا تھا؟''

''یار...... بس نمک ہی تو رکھا ہوا تھا۔'' وہ ایک آنکھ میچ کر بولا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''یار! خود ہی تو سچ بولنے کو کہتے ہو پھر ککے ہو جاتے ہو۔ اب یہ اپنا بھاڑ جیسا منہ بند کرو۔ مکھی گھس جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ گرو کو بھی شک ہو جائے۔ اگر اس کو پتا چل گیا کہ بیلٹ میں بارود اتنا بھی نہیں تھا، جتنا ہمارے سیاست دانوں میں خوفِ خدا ہوتا ہے تو پھر اس کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے، اسے لگے گا کہ اس کا تمام رونا دھونا بیکار گیا ہے...... ہمیں اس طرح کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہئے۔''

''اور وہ ریموٹ کنٹرول؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! تم نے اس ہرے طوطے کو غور سے نہیں دیکھا۔ وہ تو ''اڈاپٹر'' ہے ایک واکی ٹاکی...... یونہی اقبال کو کہیں سے مل گیا تھا۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''مطلب کہ یہ سارا دھوکا تھا؟''

''دھوکا نہیں، تم اسے ڈراوا کہہ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ استھان میں ہماری بے بے تو نہیں

بیٹھی ہوئی تھی، ہمارے لئے بارودی بیلٹس اور ریموٹ کنٹرول لے کر۔ جو کچھ آس پاس سے ملا، ہم نے اس سے کام چلایا۔''

میں بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ''عمران! تم کب سے ہو یہاں؟''

''ایک بار پھر سچ بتاؤں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''مجھے اور اقبال کو یہاں تقریباً ایک برس ہو چکا ہے۔ زبردست روداد ہے۔ سفرنامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' اور اس طرح کی دوسری کارگزاریاں تو کوئی شے ہی نہیں ہیں۔ بہت جگہ کی خاک چھانی ہے تمہارے لئے جگر! آج رات کو ساری تفصیل بتاؤں گا۔''

اگلے دو تین گھنٹے ہم کافی مصروف رہے۔ بغیر مناسب ساز و سامان کے شکار شدہ ہرن کو کوئلوں پر بھونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے سات آٹھ بڑے پارچے بنائے گئے۔ ان میں کٹ وغیرہ دے کر نمک لگایا گیا اور پھر بڑی احتیاط سے بھونا گیا۔ یہ ایک مزے دار کھانا ثابت ہوا۔ عمران اسے چپکے چپکے میرے ولیمے کا نام دے رہا تھا اور اس حوالے سے معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ گرو سو بھاش اور رادھا نے گوشت نہیں کھایا اور بس بیٹھے تھوک نگلتے رہے۔ میری اور عمران کی کوشش کے باوجود سلطانہ نے بھی ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لئے۔ وہ بدستور گھمبیر کیفیت میں تھی۔ اس نے مجھ سے بس اتنا کہا۔ ''کوچبان سے کہیں مجھے معاف کر دے۔ میں نے اسے کلہاڑی مار کر زخمی کر دیا ہے۔''

میں نے اس حوالے سے اسے تسلی دی۔ کھانے کے بعد سردار ہوشیار سنگھ پھر درختوں کی طرف نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ خشک لکڑیوں کے ساتھ ساتھ خوبانی کی طرح کا ایک جنگلی پھل بھی لے کر آیا۔ یہ پھل ایک دفعہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر بھوک کے باوجود کھانے کا رسک نہیں لیا تھا۔ یہ نیم میٹھا اور کسیلا پھل گرو اور رادھا کی پیٹ پوجا کے کام آ سکتا تھا لیکن ابھی تک وہ صدمے میں تھے اس لئے کھانے سے انکار کر دیا۔

سب موجودہ صورتِ حال سے مطمئن تھے۔ ہوشیار سنگھ کا بھی یہ خیال تھا کہ ہم استھان اور پھلواری سے کافی دور آ چکے ہیں اور گھنے درختوں سے گھری ہوئی اس ٹاپو نما جگہ پر بالکل محفوظ ہیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کسی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں گی اور زرگاں کے اَن گنت گھڑسوار ہمیں گھیر لیں گے۔ یہاں میرے خوف کی وجہ میرے سوا اور کون جان سکتا تھا؟ ایک منحوس الیکٹرانک چپ میرے جسم میں موجود تھی اور ہر جگہ میرے دشمنوں کو میری لوکیشن کا سراغ دے رہی تھی۔ وہ جلد یا بدیر مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔

میں عمران کو جلد از جلد اس صورتِ حال کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے اکیلے میں اطمینان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سردیوں کا چھوٹا سا دن جلد ہی مغربی افق کے پیچھے اوجھل ہو گیا اور اس ویران جگہ کو کہر آلود اندھیرے نے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ویرانے میں رات بسر کرنے کے حوالے سے ہوشیار سنگھ کافی ہوشیار اور تجربہ کار لگتا تھا۔ اس نے گھوڑا گاڑی کے چاروں طرف درختوں سے تین چار مشعلیں باندھ دیں اور دو تین الاؤ بھی دہکا دیئے۔ یوں گھوڑا گاڑی کی اندرونی فضا زیادہ گرم ہو گئی اور جنگلی جانوروں کی مداخلت کا خطرہ بھی کم سے کم ہو گیا۔ ہوشیار سنگھ ساری صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم گرو سو بھاش کو کسی سے بچانے کے لئے استھان سے نہیں بھاگے تھے بلکہ گرو کو لے کر بھاگے تھے اور اس لئے لے کر بھاگے تھے کہ گرو کا ''بیش بہا علم'' ایک بے قصور لڑکی کو واجب القتل ٹھہرانے والا تھا۔ مکمل صورتِ حال جاننے کے بعد اب ہوشیار سنگھ کی ساری ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئی تھیں اور وہ ایک ساتھی ہی کی طرح ہمارے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ وہ خاصا زندہ دل شخص تھا۔

عمران مسلسل اس کوشش میں تھا کہ سلطانہ اور طلال اپنی افسردہ کیفیت میں سے نکل آئیں۔ اس نے اقبال کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت بھیانک آواز میں گا سکتا ہے۔ اگر یہ گانا شروع کر دے تو رات بھر کوئی جنگلی جانور ہمارے قریب نہیں پھٹکے گا۔''

پھر وہ ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا۔ ''ایک بار ہم ضلع شیخوپورہ میں سور کے شکار پر تھے۔ ہمارے سرکس کے مالک چودھری اشفاق، اسسٹنٹ منیجر عباس گوجرانوالہ کے ڈی پی او اور کچھ دیگر لوگ بھی ساتھ تھے۔ ہم اپنا شوق پورا کرنے کے لئے گھوڑوں پر سوار تھے۔ رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ جنگلی سوروں کے حملے کا ڈر تھا۔ رات کو اقبال کی ڈیوٹی لگی۔ یہ ایک خالی ٹین بجاتا اور ساتھ ساتھ اپنی کرخت آواز میں گاتا رہا۔ اس کی آواز کے سبب جانور تو دور ہی رہے، ہمارے اپنے گھوڑوں میں سے بھی تین ڈر کر بھاگ گئے۔''

عمران اور اقبال کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک شروع ہو گئی۔ طلال ان پُرمزاح باتوں میں تھوڑی تھوڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ سونے کے لئے گھوڑا گاڑی میں چلے گئے۔ میں، اقبال اور عمران آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ میں نے الاؤ کے شعلوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں تم دونوں کو ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن تم کچھ خاص باتیں سننا بھی تو چاہتے ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''اب فیصلہ کر لو، پہلے خاص باتیں سناؤ گے یا سنو گے؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، پہلے تم سنا لو پھر میں بتاتا ہوں۔“

عمران نے کسی کہانی گو کی طرح ایک درخت سے ٹیک لگائی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ سرد ہوا میں اُڑتی ہوئی چنگاریاں ماحول کو گرما رہی تھیں۔ ثروت، عاطف اور فرح کے بارے میں تفصیل جاننے کے لئے میری بے تابی پھر بڑھتی چلی گئی۔

عمران نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”وہ بڑے دردناک دن تھے تابی! جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے درد سے بھرے ہوئے۔ میں اسپتال میں تھا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیفنس والی کوٹھی میں تمہاری والدہ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ تمہارا بھائی اور بہن فرح دونوں اوجھل تھے۔ ان کے بارے میں امید تھی کہ وہ نکل جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ میں سب سے پہلے انہیں تلاش کر کے کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف چھوٹی میڈم نادیہ اسپتال میں دم توڑ چکی تھی اور میڈم صفورا کا غم وغصہ پورے عروج پر تھا۔ میں زخمی حالت میں ہی اسپتال سے نکل آیا تھا۔ تین چار دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں اور اقبال عاطف کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ گوجرانوالہ میں تھا۔ میں نے عاطف اور فرح کو فوراً راولپنڈی پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈھونڈنے اور سیٹھ سراج سے حساب برابر کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ میرے ایک خاص بندے نے مجھے اطلاع دی کہ سیٹھ سراج اور شیرا زیر زمین جا چکے ہیں اور اب چند مہینوں تک سامنے نہیں آئیں گے۔ میڈم صفورا کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے غائب تھی۔ اس کے بااعتماد ملازم بھی کچھ بتا نہیں پا رہے تھے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ کچھ پُراسرار لوگ میڈم صفورا کے اردگرد دیکھے گئے ہیں...... اور ان لوگوں کا تعلق بدھا کے اس مجسمے سے ہے جو پہلے ابرار صدیقی کے پاس تھا اور اب میڈم صفورا کے پاس آیا ہے۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ میڈم صفورا ہی نہیں، وہ خاص بدھا بھی غائب ہے جسے میڈم نے بڑی کوشش سے میرے ذریعے حاصل کیا تھا۔ کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ بدھا کے ساتھ ساتھ میڈم صفورا اور مولانا ابرار صدیقی کو بھی انڈیا پہنچایا جا چکا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات لگ رہی تھی......“

ہماری گفتگو جاری تھی۔ اچانک میں بری طرح چونک پڑا۔ اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے تو میں نے انجن کی مدھم آواز سنی تھی۔ یہ آواز ہوا کے کسی آوارہ جھونکے پر تیر کر آئی تھی اور یقیناً عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ میں نے عمران کو بھی چونکتے دیکھا...... عمران نے اپنا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھا دیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی اور چوکنا نظر آنے

لگا اور یہی وقت تھا جب آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ یہ کوئی جیپ نما گاڑی تھی جو ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

”اس ویرانے میں یہ کون ہو سکتا ہے؟“ اقبال نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں موجود تمام تر اندیشے ابھر کر سامنے آگئے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ”تم سے کہا تھا ناکہ پہلے میری خاص بات سن لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔“

”اب یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں۔ اب پہلے یہ دیکھو کہ یہ آنے والے کون ہیں؟“ اس دوران میں درختوں کے درمیان سے ہیڈ لائٹس کی مدھم سی جھلک نظر آئی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ جھلک اوجھل ہوگئی۔ انجن کی آواز بدستور آ رہی تھی اور اب مزید قریب آگئی تھی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ گاڑی والوں نے ہیڈ لائٹس بجھا دی ہیں۔“ عمران نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ دال میں کافی زیادہ کالا موجود ہے۔“ اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ کوئی بھٹکے ہوئے مسافر ہوں...... یا پھر شکاری......؟“ عمران نے جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ اتفاقاً یہاں پہنچے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں لیکن اگر یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں تو پھر ان کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے تھی، کم از کم بیس تیس لوگ ہوتے...... پانچ چھ گاڑیاں ہوتیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ باقی لوگ پیچھے ہوں۔“ میں نے اختلاف کیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑی اب تاریکی میں رک گئی ہے۔ ہیڈ لائٹس بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ گاڑی والوں کا یہ انداز انہیں اور زیادہ مشکوک بنا رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”عمران! ہمیں انہیں دیکھنا ہوگا۔“

عمران میرے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا اور اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم یہیں رکو گھوڑا گاڑی کے پاس، ہم دونوں جاتے ہیں۔“

”یس باس۔“ اقبال نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

میں اور عمران جھاڑیوں کے درمیان احتیاط سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل اور میرے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ رگوں میں خون لہریں لے رہا تھا۔ کچھ کرنے اور اپنا حوصلہ آزمانے کو دل چاہ رہا تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں جھاڑیوں کے درمیان ایک سیاہ ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بند جیپ تھی۔ اس کی چھت پر کچھ لدا ہوا تھا۔ شاید یہ چھولداری تھی۔ اچانک میرا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور میں سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گر پڑا۔ میرے گرنے سے دھپ کی آواز پیدا ہوئی اور پسٹل کھٹاک سے کسی تنے کے ساتھ ٹکرایا۔

''کون...... کون ہے؟'' کہیں پاس سے ایک ٹھٹکی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

ہماری موجودگی راز نہیں رہی تھی۔ یکا یک بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ قدم ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ پھر دو سائے تیزی سے جیپ میں داخل ہوئے...... اور جیپ آناً فاناً اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آ گئی۔ وہ جو بھی تھے، بھاگ رہے تھے۔

''ان کو پکڑو۔'' میں نے زمین سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

میں اور عمران ایک ساتھ جیپ کی طرف دوڑے۔ وہ گھوم چکی تھی اور اب ہمیں اس کی سرچ ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھی۔ ''رک جاؤ۔'' عمران دھاڑا۔

اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''رک جاؤ۔'' عمران نے پھر کہا اور بھاگتے بھاگتے سیون ایم ایم رائفل سے دو فائر کیے۔ ایک گولی جیپ کے پچھلے ٹائر میں لگی اور اسے برسٹ کر گئی۔ جیپ کنٹرول سے باہر ہو کر لہرائی اور پھر سائیڈ کی طرف سے بری طرح ایک درخت سے ٹکرائی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیپ کا دایاں اگلا پہیا ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ جیپ میں سے دو سائے نکل کر بھاگے۔ ایک کا رخ دائیں طرف اور ایک کا بائیں طرف تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ ان میں کوئی ایک تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک کے پیچھے میں بھاگا، دوسرے کے پیچھے عمران لپکا۔ میرے والا کچھ زیادہ پھرتیلا تھا اور وہ غیر مسلح بھی نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے قریب پہنچ رہا ہوں، اس نے ایک دم پلٹ کر مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے سے ایک شعلہ نکلا اور گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا یا میں جوابی گولی چلاتا، اسے بری طرح ٹھوکر لگی اور وہ دور تک رپٹتا چلا گیا۔

میں نے اسے چھاپ لیا لیکن وہ آسان مدِ مقابل نہیں تھا۔ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر لیٹے لیٹے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر ضرب لگا دی۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچے اور وہ میری گرفت سے نکل گیا۔ اس نے مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر اس کی دوسری ٹانگ کھینچ کر اسے اپنے برابر کر لیا۔ اس کا پستول اس کے

ہاتھ سے نکل چکا تھا مگر میرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس پر گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پستول کی ضرب اس کے بھاری بھرکم تھوبڑے پر لگائی تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ لمبی جنگلی گھاس پر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر میں نے اس کا سارا دم خم نکال دیا۔ وہ دہائی دینے لگا۔ ''ہم کو مت مارو، ہمرے پاس زیادہ کچھ نا ہیں ہے۔ جو کچھ ہے، وہ تم لے لو......''

میں نے عمران کو آوازیں دیں۔ میری تیسری چوتھی آواز پر وہ بھی ایک شخص کو آگے لگائے ہوئے نمودار ہوا۔ تاروں کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ مقامی لوگ ہی ہیں۔ انہوں نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان لگتے تھے۔ ایک کے گلے میں امپورٹڈ دوربین لٹک رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' عمران نے ایک کو سر کے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''شکار کے لئے نکلے ہیں بھائی، ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نا ہیں۔ نہ ہی کسی سے کوئی دشمنی ہے۔ میرا نام راہول ہے، یہ میرا چچازاد بھائی دلیپ ہے۔ ہم اکثر ہفتے کی رات کو نکلتے ہیں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''بوہرا سے۔ ہمارا وہاں ڈیری فارم ہے۔''

''تم ہمیں دیکھ کر بھاگے کیوں تھے؟''

''سچی بات یہ ہے کہ...... ہمیں خطرہ محسوس ہوا تھا کہ آپ ہم سے ہمارا سامان وغیرہ چھین لیویں گے۔ پچھلے دو تین مہینے میں کئی شکاریوں کے ساتھ اس طرح کی درگھٹنا ہوئی ہے۔''

''تم نے ہماری جلائی ہوئی آگ دیکھی اور پھر دور ہی گاڑی بند کر کے کھڑے ہو گئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہم شش و پنج میں تھے۔ جاننا چاہ رہے تھے کہ آپ کون لوگن ہیں۔ بغیر تصدیق کے کے ہم آپ لوگن کے پاس جانا نا ہیں چاہت تھے۔''

میں نے ہٹے کٹے شخص کا گریبان پکڑتے ہوئے عمران کو بتایا۔ ''اس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری ہے۔''

''میں بہت بہت شما چاہت ہوں۔ مجھے پتا نا ہیں تھا کہ آپ کون لوگن ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے آپ پر گولی نہ چلائی تو آپ مجھ پر گولی چلا دیویں گے۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟'' عمران نے ہٹے کٹے شخص سے پوچھا۔

''نا ہیں۔ ہم دونوں ہی ہیں۔ ہمارے دو اور دوستوں نے آج دوپہر ہمارے ساتھ

شامل ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ آ نا ہیں سکے۔ ہم بہت تھک چکے تھے، یہاں کہیں چھولداری لگانے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ آپ لوگن کی جلائی ہوئی اگنی پر نظر پڑ گئی......'' ہٹے کٹے دلیپ نے جواب دیا۔

اندھیرے میں سے بہ مشکل دلیپ کا گرا ہوا پستول ڈھونڈا گیا۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ ہم ان دونوں کے ساتھ جیپ کی طرف واپس آئے۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ لائٹس بھی آن تھیں۔ ایک طرف کی کھڑکیوں کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی میں ہم نے دیکھا۔ یہ دونوں کزن تجربہ کار شکاری لگتے تھے۔ جیپ کی نشستوں کے پیچھے ہموار جگہ پر کوئی دو درجن شکار کئے ہوئے چھوٹے بڑے پرندے موجود تھے۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی خرگوش اور ایک بڑے سائز کا چیتل بھی تھا۔

دونوں افراد سے گفتگو کے بعد ہم کسی حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ ہم نے مل کر جیپ کے اگلے پہئے کو لکڑی کے تنے پر سے اتارا اور پھر برسٹ ٹائر کے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ کر پڑاؤ میں واپس آ گئے۔ گولی چلنے کی آواز اقبال نے بھی سن لی تھی اور وہ پریشان نظر آتا تھا۔ بہر حال ہمیں بہ خیریت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ہم نے اقبال کو بھی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے مل کر گاڑی کا ٹائر بھی تبدیل کر دیا۔

یہ دونوں افراد خوش حال گھرانے سے لگتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے۔ اپنی گفتگو میں گاہے بگاہے انگریزی کے الفاظ بھی بولتے تھے۔ ان کی لینڈ روور جیپ بھی تقریباً نئی ہی تھی۔ ایک اسٹائلش واکی ٹاکی اور مہنگے سگریٹوں کے پیکٹ ڈیش بورڈ پر رکھے تھے۔

عمران نے راہول سے پوچھا۔ ''اس واکی ٹاکی سے پرندوں کو کال کرتے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''ناہیں جی...... آپ کو دوسری پارٹی کا بتایا ہے نا۔ انہوں نے ہمیں جوائن کرنا تھا۔ ان سے رابطے کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔ ویسے بھی شکاری مہم کے دوران میں ایسی چیزوں کا فائدہ ہوتا ہے۔''

پھر راہول نے ذرا جھجکتے ہوئے ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا۔ عمران نے انہیں بتایا کہ شادی کی ایک تقریب میں شریک ہونے کے لئے زرگاں جا رہے ہیں۔

اسی دوران میں ہوشیار سنگھ بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ وہ ذرا تعجب سے ان دو نئے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کی گاڑی کو بھی۔ وہ اپنی گردن کی چوٹ کی وجہ سے ذرا تکلیف میں نظر آتا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی گردن دیکھ کر دلیپ نے پوچھا۔ ''اس سردار کو کیا ہوا ہے؟''

عمران بولا۔ ''وہی ہوا ہے جس کا تم دونوں کو ڈر پڑ گیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''یہاں سفر کرنے والوں کو ڈاکوؤں کا ڈر تو اکثر رہتا ہے۔ ہمیں بھی ڈر تھا۔ ہمارا ڈر صحیح نکلا۔ پیچھے بوہر اندی کے پاس تین چار گھڑ سواروں نے ہمارا راستہ روکا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نہتے ہیں۔ تھوڑی سی مارا ماری ہوئی پھر جب ہم نے رائفلیں نکالیں تو وہ تیر ہو گئے۔''

دلیپ ہنسا۔ ''یعنی جن کو ہم ڈاکو سمجھے تھے وہ خود ڈاکوؤں کے ڈسے ہوئے ہیں۔''

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

راہول نے کہا۔ ''ویسے یہ علاقہ آج کل پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ہوا ہے۔ شاید تمہیں پتا ہو، ایک مسلمان، راجپوت لڑکی کے لئے بڑی کشمکش چل رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر زرگاں میں کئی بندوں کی ہتھیا کی ہے۔ اب اسے کسی اور گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ زرگاں والے اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بڑی مارا ماری چل رہی ہے۔''

''چھوڑو یار!'' اقبال نے کہا۔ ''یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اکیلی ہی سب کچھ کرتی رہی ہے۔ بس پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا اس کے ساتھ ہے۔''

''ہاں، یہ بات بھی کہی جاوت ہے۔'' راہول نے تسلیم کیا۔ ''وہ کوئی معمولی لڑکی ناہیں ہے۔ اس کی ماں نے حکم جی کی جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں حکم کے پتا رائے پرتاپ بہادر نے اس راجپوت پریوار کو بہت کچھ دیا تھا لیکن سچ کہوت ہیں، اچھوں سے برے اور بروں سے اچھے جنم لیوت ہیں۔ یہ لڑکی نڈر اور دلیر تو بہت ہے لیکن غلط رستے پر چل نکلی ہے۔ اس نے پہلے ایک دم شادی کی اور راج بھون کی پری بننے سے انکار کیا، اب موہن جی جیسے بندے کی ہتھیا کر کے اس نے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔''

دلیپ نے کہا۔ ''پچھلے دنوں میں زرگاں گیا تھا۔ وہاں لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ کچھ تو یہ سمجھت ہیں کہ اس میں کوئی بُری آتما گھسی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک کمزور لڑکی اس طرح زرگاں میں دندنا سکت ہے؟ اور خون خرابا کر سکت ہے؟ بڑے پنڈت مہاراج کا وچار تو یہ ہے کہ ایسی اپرادھن ناری کو زندہ جلا دینا چاہئے تا کہ اس کی نحوست سے راجواڑے کو چھٹکارا مل جائے۔ مگر......''

''مگر کیا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''لگت ہے کہ جارج گورا صاحب، اسٹیل صاحب اور اس جیسے دوسرے لوگن اسے

زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جو کچھ کیا جائے قانون کے مطابق ہو۔اس پر زرگاں میں چوہرے قتل کا مقدمہ چلے۔''

''اچھا یار! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔تمہیں کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ۔''

دلیپ نے کہا۔''بھوک تو بے شک لگی ہے لیکن ہم آپ لوگن کو تکلیف نا ہیں دیں گے۔ جو کچھ کریں گے خود ہی کریں گے۔ہمارے پاس روسٹ کرنے کا پورا سامان موجود ہے۔بس آگ کی کمی تھی، وہ آپ لوگن نے جلائی ہوئی ہے...... بلکہ آپ بتائیں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''

عمران چہکا۔''میں نے کچھ چیزیں زندگی میں کبھی نہیں کھائیں یا اگر کھائی ہیں تو مجھے پتا نہیں چلا۔مثلاً مچھلی تو بہت کھائی ہے لیکن کبھی مچھلا نہیں کھایا۔بڑا مزے دار خرگوش اور کبوتر کھایا ہے لیکن بڑی مزے دار خرگوشنی یا کبوتری کبھی نہیں کھائی...... تم لوگوں نے جل مرغ تو شکار کر رکھا ہے۔اگر کوئی جل مرغی بھی ہے تو میں ضرور کھانا پسند کروں گا۔''

دلیپ مسکرایا۔''آپ دلچسپ بندے ہیں۔اس پہلو سے تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ویسے یہ کافی تحقیق طلب اور مشکل کام ہے۔''

''پرندے یا جانور کی دُم اُٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔بس ہم نے طے کر رکھا ہے کہ ہر مچھلی مؤنث اور ہر خرگوش مذکر ہوتا ہے۔''ایک قہقہہ پڑا۔

دلیپ اُٹھ کر اپنی جیپ کی طرف گیا اور جیپ کی اندرونی لائٹ جلا کر شکار شدہ پرندوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔اس کا انداز ماہرانہ تھا۔وہ روسٹ کرنے کے لئے شکار منتخب کر رہا تھا۔میں بھی یونہی ٹہلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔وہ اپنے کام میں مگن تھا۔خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کے نیچے اچانک میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔اپنے جسم کا سارا خون مجھے اپنے سر کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔جو چمکتی ہوئی شے میں نے دیکھی، وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔

میں دلیپ سے پوچھے بغیر آگے بڑھا۔میں نے خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کو دائیں بائیں ہٹایا اور اس چمکیلی شے کو وضاحت سے دیکھا۔میں نے پوری طرح پہچان لیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔یہ وہی انٹینا تھا جو میں اس سے پہلے رنجیت پانڈے کے لوگوں کے پاس دیکھ چکا تھا۔ٹیلے کے قریب جب ہمارے اور پانڈے کے درمیان گھمسان کا رن پڑا تھا اور پانڈے کو بھاگنا پڑا تھا تو یہ منحوس انٹینا ہمیں دیگر سامان کے ساتھ پڑا ملا تھا۔یہ وہی سگنل وصول کرنے والی ڈیوائس تھی جس کے ذریعے پانڈے اپنے خوں خوار ساتھیوں کے

ساتھ میرے اور جیکی تک پہنچا تھا۔

دلیپ نے بھی دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا دیکھا ہے۔اس کے چہرے نے ایک دم رنگ بدلا۔وہ پلٹا اور تیزی سے بھاگا۔یوں لگتا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں جتنی طاقت ہے، وہ ساری استعمال کر کے نکل جانا چاہتا ہے۔میں نے پستول نکالا اور اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس پر دو فائر کیئے۔میرا ایک فائر اس کے سر میں عین گردن کے بالائی حصے پر لگا۔وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا اور ساکت ہو گیا۔یہ منظر دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی بھی جو اپنا نام راہول بتا رہا تھا، اُٹھ کر اندھا دھند دوڑا۔اس کی جانب درخت قریب ہی تھے۔وہ ان میں گھس گیا۔عمران تو لپکتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، اس دوسرے شخص کا پیچھا ہوشیار سنگھ نے کیا۔ہوشیار سنگھ اس پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ اسے سنبھال نہیں سکا۔اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا پھٹ کر ہوشیار سنگھ کے ہاتھ میں رہ گیا اور وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا تاریک درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

یہ سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔شور وغل اور فائرنگ کی آوازوں نے گھوڑا گاڑی میں موجود افراد کو بھی جگا دیا۔طلال، گرو سو بھاش اور سلطانہ وغیرہ بھونچکے سے باہر نکل آئے۔

''یہ کیا ہوا ہے تابی؟''عمران نے مجھ سے پوچھا۔

''ہم سب خطرے میں ہیں عمران! ہمیں کسی بھی وقت گھیرا جا سکتا ہے۔ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔ابھی...... اسی وقت......''

''لیکن پتا تو چلے۔''

''میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکا اور بتاؤں گا بھی تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔بس یہ سمجھو کہ یہ دونوں حرامزادے، حکم کے ہرکارے ہیں۔میرے اندازے کے مطابق وہ واکی ٹاکی کے ذریعے حکم کے گارڈز کو ہمارے بارے میں اطلاع دے چکے ہیں۔وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں؟''

اسی دوران میں اقبال شکار شدہ پرندوں کے نیچے سے وہ چمکیلا انٹینا نکال چکا تھا......

''یہ کیا ہے تابش؟''اس نے پوچھا۔

''اس کے بارے میں بھی بعد میں بتاؤں گا۔فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہئے۔''

میرے لب ولہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے عمران نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اُٹھا

کر بڑے الاؤ پر ڈال دی۔ پھر ایک ایک کر کے مشعلیں بھی بجھا دیں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں صرف تاروں کی روشنی باقی رہ گئی۔ اس روشنی میں حکم کے جواں سال ہرکارے کی لاش اوندھے منہ گھوڑا گاڑی کے پہیے کے پاس پڑی تھی۔ شکاریوں کے بھیس میں یہ لوگ حکم کے کھوجی تھے اور وہ کھوج لگاتے ہوئے ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ اب یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں مثلاً رنجیت پانڈے...... یا بلرام رائے وغیرہ کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے چکے ہوں۔ مرنے والے کے سر کے عقبی حصے سے بہنے والا خون زمین پر ایک سیاہ نقشہ سا بنا رہا تھا۔ صرف دو منٹ پہلے یہ خون اس شخص کی رگوں میں تھا اور یہ ایک پُرلطف ڈنر کا انتظار کر رہا تھا۔

ہم نے پوری سرعت سے اپنا سامان سمیٹا اور گھوڑا گاڑی میں رکھ دیا۔ عمران نے جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے اندر سے ایک برانڈی کی بوتل، ایک شاٹ گن، ایک واکی ٹاکی اور کچھ دیگر اشیاء ملیں۔ جیپ کے اندر کافی مقدار میں فیول موجود تھا۔

عمران نے کہا۔ ''ہم جیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آگے جا کر فیصلہ کرلیں گے کہ اسے چھوڑنا ہے یا گھوڑا گاڑی کو۔''

میں نے اور اقبال نے اس رائے کی تائید کی۔ تاہم میں نے یہ کہا کہ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر رکھیں گے۔

زخمی گھوڑے کو بھی گاڑی میں جوت دیا گیا۔ مردہ شخص کی لاش کو جوں کا توں چھوڑ کر ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں عمران کے ساتھ جیپ میں تھا۔ جیپ عمران ڈرائیور کر رہا تھا۔ وہ پوری طرح ایکشن میں تھا اور کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار۔

''یار! کچھ اشارہ تو دو۔'' وہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے پیچھے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

''اشارہ یہ ہے کہ حکم کے کتے ہر جگہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہ جدید دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو تابی!'' عمران کے لہجے میں بے چینی تھی۔ جیپ کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے سرد ہوا فراٹے بھرتی اندر آرہی تھی اور عمران کے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ میں نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور اُٹھا کر اپنے سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ میں نے اس کی انگلیوں کی دو پوروں کو اس خاص جگہ سے ٹچ کیا

جہاں میں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پوروں کو تھوڑی سی حرکت دی۔ ''کچھ محسوس کیا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ایک ابھار سا ہے۔''

''یہی ابھار ہے جس نے میرے لئے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ جہاں پہنچتا ہوں، میری مصیبتیں میرے ساتھ وہاں پہنچ جاتی ہیں...... اور اسی کی وجہ سے پچھلے تین سال سے میں بے شمار کوششوں کے باوجود اس منحوس اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں پایا۔''

''یہ...... ہے کیا؟''

''ایک الیکٹرانک چپ...... جو میرے اسپائنل کینال کے اوپری سرے کے ساتھ پلانٹ کی گئی ہے۔ یہ سگنل نشر کرتی ہے۔ یہ وہی تکنیک ہے جو ریسرچ، جانوروں پر استعمال کرتے ہیں۔ انہیں چپ یا کالر لگا کر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن وہ آزاد نہیں ہوتے۔ وہ جہاں بھی ہوں، انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔''

''اوہ گاڈ۔'' عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولا۔ ''کچھ عرصے پہلے میں نے ایک خاص بندے سے اس سے ملتی جلتی بات سنی تو تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حکم جی اور جارج گورا اپنے خاص قیدیوں کو کہیں بھاگنے نہیں دیتے۔ سادہ لوح لوگوں کا خیال ہے کہ حکم جی اپنی روحانی شکتی سے ہر وقت ان پر نظر رکھتا ہے مگر پڑھے لکھے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی جدید طریقے سے اپنی نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔''

''بس یہی ہے وہ نگرانی...... اور اس نگرانی کا انچارج جارج گورا کا بہنوئی ڈاکٹر اسٹیل ہے۔ وہی یہ خاص چپ باڈی میں پلانٹ کرتا ہے۔ یہ پیچھے جو انٹینا پڑا ہے، اس کا تعلق اسی چپ سے ہے۔''

''کیا تمہارے ذہن میں کبھی اسے نکلوانے کا خیال آیا؟'' عمران نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

''یہ تو ان لوگوں کی اصل خباثت ہے عمران! تم نے نل پانی کے جاپانی سرجن ڈاکٹر لی وان کا نام سنا ہے؟'' عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''وہ بڑا قابل بندہ ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر دوست مجھے اس تک لے گیا تھا۔ اس نے چند ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ یہ چپ نکالنے کے لئے زیادہ سہولتیں درکار ہیں اور یہ یہاں اسٹیٹ میں نہیں ہیں۔ چپ نکالتے ہوئے اسپائنل میرو کو نقصان پہنچ سکتا ہے جو زندگی کے لئے خطرناک ہے۔''

گھوڑا گاڑی ہمارے آگے جا رہی تھی۔ اس میں سلطانہ اور طلال کے علاوہ گرو سوبھاش اور اس کی سندر پتنی رادھا بھی موجود تھی۔ ان کی حفاظت و نگرانی کے لئے اقبال سیون ایم ایم رائفل کے ساتھ گھوڑا گاڑی کے اندر تھا۔ تاروں کی روشنی میں اونچے نیچے راستوں پر گھوڑا گاڑی درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ اس کے پیچھے تھی۔

”کچھ پتا ہے ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمارا رخ کچے کی طرف ہے اگر ہم......“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جیپ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے تک آئینے میں دیکھتا رہا، پھر اس نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ جنتر، کیکر اور جنگلی بیریوں کی گھنی قطاروں کے عقب میں کچھ روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ ساکت نہیں متحرک روشنیاں تھیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ لگانا فی الحال مشکل تھا۔ ”کون ہو سکتے ہیں یہ؟“ عمران نے متحکم لہجے میں پوچھا۔

”نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ حکم جی کے بندے۔“

عمران خاموش رہا۔ میں بھی خاموش رہا۔ ہم اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بڑی سنگین سچویشن تھی۔ مجھے لگا کہ میرے سینے میں دھڑکن کسی نقارے کی طرح گونج رہی ہے...... کسی جنگی نقارے کی طرح۔ یہ جان کر مجھے دلی راحت ہوئی کہ میرے اندر خوف نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت ہے بھی تو وہ ایک بیٹھے بیٹھے جوش کی لہروں میں دبا ہوا ہے۔ یہ تو شاید میرے سپنوں کی رات تھی...... ایک گھنا جنگل...... ایک سرد اندھیری رات۔ اس رات میں سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے خطرات کے سائے...... ہر پیڑ کے عقب میں موت کی گھات، ہر موڑ پر آسیبی پرچھائیاں...... اور میرے ساتھ عمران جیسا دوست، میرے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے۔ وہی عمران جو سنگین ترین اندیشوں کو سینے سے لگانے کا فن جانتا تھا۔ جو جان لیوا خطرات کو قہقہوں میں اڑاتا تھا اور جس کا کفن ہر وقت ایک چمکیلی دستار کی طرح اس کے سر سے بندھا رہتا تھا۔ ہاں، یہ میرے پسندیدہ ترین تصورات کی رات تھی۔

اس سے پہلے لاہور کے گلی کوچوں میں بھی کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب میں اور عمران ایک ساتھ کسی خطرے میں گھرے تھے مگر تب کی بات اور تھی۔ تب میں ایک اپاہج کی طرح عمران کے ساتھ گھسٹتا تھا...... یا شاید وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتا تھا۔ آج میں اپنے پاؤں

پر کھڑا تھا۔ عمران کا ساتھ دینے کا حق ادا کر سکتا تھا۔

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ واقعی حکم جی کے لوگ ہیں اور الیکٹرانک چپ کے بارے میں جو کچھ تم نے کہا ہے، وہ بھی صحیح ہے تو پھر ایک بات طے ہے۔ ہم جس طرف بھی جائیں گے، یہ لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے...... لیکن ایک بات ہے...... اس سے پہلے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک زمین دوز سرنگ میں تھا۔ وہاں اس چپ نے کام نہیں کیا تھا۔“

”لیکن ایسی سرنگ اب کہاں ڈھونڈیں گے؟ یا پھر ایک اور طریقہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

سنگین صورت حال کے باوجود عمران کا کھلنڈرا پن لوٹ آیا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا۔ ”سرنگ بنا لیتے ہیں...... اوس کی وجہ سے زمین نرم ہو رہی ہے۔ گھوڑا گاڑی میں ایک بیلچہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ دو تین چاقو بھی ہیں ہمارے پاس۔“

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ہمیں یہ تصدیق کرنی چاہئے کہ یہ حکم کے لوگ ہی ہیں اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اگلے آدھ پون گھنٹے میں ایک دو بار اپنا رخ بدلیں۔“

”تم اب چھینا جھپٹی بھی کرنے لگے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔“

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ مدھم آوازیں ہم تک پہنچیں۔ یقیناً یہ بوگیر کتوں کی آوازیں تھیں۔ یہ جنگلی کتوں کی آوازوں سے بالکل مختلف تھیں۔ میں اب انہیں پہچاننے لگا تھا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ جیسے کوئی زبردست چال اس کے ذہن میں آ رہی ہو۔

O......❖......O

اس نے جیپ کی رفتار تھوڑی سی بڑھائی اور اسے گھوڑا گاڑی کے برابر لے آیا۔ ہوشیار سنگھ بڑی چابک دستی سے دونوں گھوڑوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگین چابک تھا۔ وہ تن کر اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''ہوشیار سنگھ! اب تم ہمارے پیچھے آؤ۔ ہم اپنا راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔''

''کیا کہا جی؟ رستا تبدیل کر رہے ہیں؟'' وہ ہماری طرف جھک کر بلند آواز میں بولا۔

''نہیں یار! راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔ میں اب تمہارے آگے چلتا ہوں۔ اس کو پنجابی میں کہیں گے...... ہن میں تیرے اگے اگے چلاں گا۔''

ہوشیار سنگھ نے بتیسی نکالی اور اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے لینڈ روور کو گھوڑا گاڑی کے آگے لگا دیا۔ ہم بائیں رخ پر مڑ گئے۔ کہیں دور گھنے جنگل میں تیندوے کی مخصوص آواز ابھری اور سنسناہٹ بن کر دور تک پھیل گئی۔ ابھی ہم اس آواز کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک اور آواز نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے کی آواز تھی اور یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ کوئی جنتر کے درختوں میں ہمارے نزدیک موجود تھا...... اور کرب کے عالم میں آہ و بکا کر رہا تھا۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی......

عمران نے بھی تاریکی سے ابھرنے والی یہ روتی چلاتی آواز سن لی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر عمران نے اپنی رائفل کا سیفٹی لاک ہٹایا اور جیپ کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔

جیپ کو یوں رکتے دیکھ کر گاڑی بان ہوشیار سنگھ نے بھی گاڑی روک لی۔ عمران کے پیچھے پیچھے میں بھی جیپ سے باہر آ گیا۔ تاریک جنگل میں کھلی جگہ پر ہونے کا احساس بھی بڑا

عجیب ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آپ ہر طرف سے اندیشوں کے گھیرے میں ہیں۔ کسی وقت، کسی بھی طرف سے کوئی جان دار شے آپ پر جھپٹ پڑے گی یا پھر کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا آپ کو مصیبت میں ڈال دے گا۔ موجودہ صورتِ حال تو مزید تشویش ناک تھی کیونکہ چند لمحے قبل ہم نے تاریک درختوں میں کسی شخص کی کرب ناک آواز سنی تھی۔ ایک سیکنڈ کے لئے میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ ہمیں روکنے کے لئے کوئی چال تو نہیں مگر پھر فوراً ہی مجھے اپنے اس خیال کو رد کرنا پڑا۔ آواز دوبارہ ابھری، اس کی دردناکی گواہی دے رہی تھی کہ کوئی شخص سخت مصیبت میں ہے۔ اس بار ہم آواز کے رخ کا صحیح تعین کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ ہماری دائیں جانب جنتر کے کوتاہ قد درخت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ اتنے گھنے تھے کہ ان میں سے بس پیدل شخص ہی گزر سکتا تھا۔ ان درختوں کے عقب میں زمین کا ایک گہرا کٹاؤ تھا۔ ہم نے پچھلے آٹھ دس منٹ میں اس کٹاؤ کے ساتھ ساتھ ہی سفر کیا تھا۔ اس سطح مرتفع جیسے علاقے میں ایسے کٹاؤ کافی موجود تھے۔ ہموار زمین پر چلتے چلتے بندے کو ایک دم پتا چلتا ہے کہ وہ ایک گہری کھائی کے کنارے کھڑا ہے۔ یہ کھائی نہیں ہوتی، دراصل ایک اور سطح زمین ہوتی ہے جو گہرائی میں واقع ہوتی ہے۔

جو کرب ناک آوازیں ہم سن رہے تھے، وہ جنتر کے درختوں اور گہرائی کے درمیان سے ابھر رہی تھیں۔ ہم ٹارچ روشن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اس لئے تاریکی میں ہی راستہ بناتے آواز کی سمت بڑھے۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی جانور ہے۔'' میں نے مدھم آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہم گولی نہیں چلا سکتے۔'' عمران نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔

ایک دم انسانی آواز معدوم ہو گئی۔ جانور کی پھنکاریں سنائی دیتی رہیں۔ ہم نے چند قدم مزید اُٹھائے تو ایک سنسنی خیز منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک تنومند جانور کسی شخص کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ یہ ایک سرخی مائل ریچھ تھا۔ اس علاقے میں سرخی مائل ریچھ پائے جاتے تھے اور میں نے ان کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا۔ آج میں ایک ایسے ہی جانور کو اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک لرزا دینے والا تجربہ تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی، تاہم عمران کی ہدایت بھی مجھے یاد تھی کہ گولی نہیں چلانی۔ ایک لمحے میں ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ زمین پر پڑا شخص مر چکا ہے یا بے ہوش ہو گیا ہے۔

میں نے ایک اور تحیر خیز منظر دیکھا۔ ایسا کام عمران ہی کر سکتا تھا۔ اس نے رائفل کو

بیرل کی طرف سے پکڑا اور اسے لاٹھی کی طرح استعمال کرتا ہوا جانور پر جھپٹا۔ اس نے اس کی کمر پر ایک زوردار ضرب لگائی اور ساتھ ہی ''ہو ہو'' کی بلند آواز نکالی۔

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ مشتعل جانور نے اپنے نامعلوم شکار کو چھوڑا اور غضب ناک آواز کے ساتھ عمران کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھیں دو گول بٹنوں کی طرح تھیں اور چمک رہی تھیں۔ میں بے ساختہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور رائفل پر گرفت مضبوط کر لی۔

گھوڑا گاڑی پر سے ہوشیار سنگھ نے ڈری ہوئی آواز میں پکارا۔ ''بھائی جی! یہ حملہ کرے گا۔ گولی مار دو۔''

عمران کا انداز بالکل مختلف تھا۔ مجھے اس کی بے پناہ اعصابی توانائی کا اندازہ ہوا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ کھلے جنگل میں ایک خطرناک درندے کے سامنے نہیں بلکہ سرکس کے پنڈال میں ہے اور کوئی سنسنی خیز کرتب دکھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان لمحوں میں وہ اس حقیقت سے بھی بالکل بے پروا ہو گیا کہ کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں اور ان کی طرف سے ہمیں شدید خطرہ ہے۔

ریچھ کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ عمران کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور عمران رائفل کے ڈراوے سے اسے خود سے دور رکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک رائفل کو لاٹھی کے انداز میں ہی پکڑا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ منہ سے ''ہو...... ہا'' کی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ جانور اس صورتِ حال سے ڈر کر پسپائی اختیار کر جائے گا مگر ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔

پھر میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا ''مان جا...... بڑے بھائی مان جا...... تجھے اپنی پیاری ریچھنی کا واسطہ...... اپنے بزرگوں کا واسطہ......''

ریچھ نے ایک بار پھر جھپٹنے کا انداز اختیار کیا اور غضب ناک آواز نکالی۔

''غصہ حرام ہوتا ہے یار...... کیوں اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو۔ جاؤ شاباش۔ اچھے ریچھ بنو...... شاباش...... شاباش۔''

اس شاباشی کا الٹا اثر ہوا۔ ریچھ ایک بار پھر خطرناک انداز میں جھپٹا......

گھوڑا گاڑی کے اندر سے چلانے کی آواز آئی۔ یہ گرو کی سندر دھرم پتنی رادھا تھی۔ عمران پوری طرح تماشا دکھانے کے موڈ میں تھا۔ وہ جیسے رنگ میں تھا اور ایک رنگ ماسٹر کی طرح خطرناک درندے سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ اس کی خطرات پسندی کبھی کبھی حد سے تجاوز کرنے لگتی تھی۔ یکا یک صورتِ حال سنگین تر ہو گئی۔ ریچھ نے ایک زوردار جھپٹا مارا اور مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل عمران کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔

عمران ایک دم پلٹ کر دوڑا۔ جانور بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ وہ پورے طیش سے عمران کے پیچھے لپکا۔ میں نے ان دونوں کو آگے پیچھے درختوں میں گھستے دیکھا...... ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ عمران مہم جوئی کے شوق میں ایک سنگین غلطی کر چکا ہے۔ شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا...... ہوشیار سنگھ اور اقبال بھی افراتفری کے عالم میں گھوڑا گاڑی سے اُتر آئے۔ ہم عمران کو آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے۔

اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ عمران کی آواز نہ جانور کی چنگھاڑیں۔ بس درختوں پر پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے تھے جنہیں ہمارے شور وغل نے نیند سے بیدار کر دیا تھا...... رسک کے باوجود اقبال نے ٹارچ روشن کر لی۔ وہ چلا کر بولا۔ ''عمران! کہاں ہو...... کہاں ہو؟''

''اس کو گانے والے انداز میں کہو تو اچھا لگے گا۔ کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں یہ بہاریں یہ سماں۔'' عمران کی آواز نے ہمیں ہلا دیا۔ یہ چہکتی ہوئی جاں فزا آواز ہمارے سروں کے اوپر سے آئی تھی۔

اقبال نے ٹارچ کا روشن دائرہ گھمایا۔ وہ ایک کیکر کی شاخ سے بندر کی طرح جھول رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے جسم کو دو تین ہلکورے دیئے اور گھوم کر شاخ کے اوپر بیٹھ گیا۔ یہ بالکل وہی انداز تھا جو وہ سرکس میں کرتب کے جھولوں پر اختیار کرتا تھا۔ وہ جس درخت پر چڑھا بیٹھا تھا، وہ اس کھائی کے بالکل کنارے پر تھا جو ہمیں تاروں کی روشنی میں دور تک دکھائی دے رہی تھی۔

وہ جست لگا کر درخت سے اُترا اور اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنے یاروں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں نے وہی کچھ کیا ہے جو انڈیانا جونز اور اس جیسی دوسری ایکشن فلموں میں اکثر ہیرو لوگ کرتے ہیں۔ ''ٹریمر'' میں تو ایک بالکل اس سے ملتا جلتا سین موجود تھا۔ ہیرو صاحب نے چکمہ دے کر ایک موذی جانور کو گہری کھائی میں گرا دیا تھا۔''

''تت...... تمہارا مطلب ہے......'' اقبال ہکلایا۔ وہ گہرائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بالکل یہی مطلب ہے لیکن سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوا جیسا تم سوچ رہے ہو۔''

''مگر......''

''اگر مگر بعد میں۔ پہلے اس بے چارے کو تو دیکھو کہ زندہ ہے یا گزر گیا۔''

ہم لپکتے ہوئے واپس اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے مشتعل ریچھ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ خشک

پتوں سے اٹی ہوئی نم زمین پر وہ زخمی شخص بالکل ساکت پڑا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا کندھا اُدھڑا ہوا نظر آیا۔ کندھے پر سے لباس کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ عمران اور اقبال نے اسے الٹ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سامنے آیا تو ہم بھونچکے رہ گئے۔ مجھے اس کی آواز یونہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ یہ وہ دوسرا شخص تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے لینڈ روور جیپ سے نکل کر راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اپنا نام راہول بتایا تھا۔ اس کے ساتھی نے خود کو دلیپ کے نام سے متعارف کرایا تھا اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے پستول کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی لاش ابھی تک وہیں کہیں درختوں میں پڑی تھی۔ ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ ہم اس کے دوسرے مفرور ساتھی کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھیں گے اور وہ بھی ایسی حالت میں۔

ہم نے اس زخمی کو فوراً اُٹھا کر گھوڑا گاڑی میں پہنچایا۔ اقبال اس کے کندھے کا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس راہول نامی شخص کو حیرت انگیز طور پر کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کندھے کے بڑے زخم کے سوا اس کے جسم پر کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ بس چند چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ اس شخص کے بے ہوش ہونے میں شاید چوٹ سے زیادہ ذہنی صدمے کو دخل تھا۔

اس راہول نامی شخص کی طرف سے مطمئن ہو کر میں، عمران اور ہوشیار سنگھ پھر اس جگہ پر آئے جہاں عمران سرکس کے تماشے کی طرح درخت کی شاخ سے جھولتا نظر آیا تھا۔ عمران نے ٹارچ کا روشن دائرہ نیچے گہرائی میں پھینکا اور بولا۔ ”یہ ریچھ بھائی بڑے خوش قسمت نکلے ہیں۔ لگتا ہے کہ ریچھنی بھابی نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھ کر شکار کے لئے بھیجا تھا۔“

”پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میں نے بیزار لہجے میں کہا۔

اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ ایک بار پھر گہرائی میں پھینکا اور مجھے کچھ دکھانے کی کوشش کی۔ یہ گہرائی کی عمودی ڈھلوان پر اُگی ہوئی دو جڑواں جھاڑیاں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ نیم اُفقی رخ پر اُگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں پر کچھ ایسے نشانات دکھائی دیئے جنہیں خون کے نشانات کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال تیس چالیس فٹ کی گہرائی میں ٹھیک سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بھائی ریچھ صاحب بچ گئے ہیں۔ وہ کسی میزائل کی طرح اندھا دھند میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں تو کنارے پر پہنچ کر شاخ سے جھول گیا اور وہ نیچے تشریف لے گئے لیکن قسمت اچھی تھی جو تحت الثریٰ میں جانے کے بجائے ان جھاڑیوں

میں گرے اور پھر یہاں سے سنبھل سنبھل کر نیچے اُتر گئے۔ میرے خیال میں اگر ہمارے پاس سرچ لائٹ ہوتی تو ہم انہیں نیچے کہیں حرکت کرتے دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سے......“ عمران نے لنگڑاہٹ کے ساتھ تھوڑا سا چل کر دکھایا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ ”پھر ہمیں اتنی تسلی سے یہاں کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ بھائیا ریچھ صاحب دائیں بائیں سے چکر کاٹ کر پھر ہمارے پاس پہنچ جائیں۔“

عمران مجھ سے مخاطب ہو کر چہکا۔ ”جگر! اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ نہ دیکھو کہ کس نے بات کہی ہے، یہ دیکھو کہ کیا بات کہی ہے۔ سردار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب ہمیں یہاں سے کھسکنا چاہئے۔ ویسے بھی ہمارے سسرالی اب قریب آتے جا رہے ہیں۔“ عمران نے دور نیچے درختوں میں حرکت کرتی روشنیوں کو دیکھ کر کہا۔

یہ ریچھ اور راہول والا سارے کا سارا واقعہ بہ مشکل چھ سات منٹ میں مکمل ہو گیا تھا...... یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے۔ اس دوران میں ہمارا تعاقب کرنے والی روشنیاں زیادہ واضح دکھائی دینے لگی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ روشنیاں بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔

ہمارے واپس آنے تک گھوڑا گاڑی کے اندر اقبال نے راہول کے کندھے سے بہنے والا خون بند کر کے وہاں پٹی باندھ دی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک شدید صدمے اور نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے لباس اور چہرے پر ریچھ کے سرخی مائل بال چمٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ راہول کو دیکھنے کے بعد میں جیپ میں واپس آ گیا۔ ہم پھر روانہ ہو گئے۔ اب جیپ آگے تھی اور گھوڑا گاڑی اس کی راہنمائی میں چل رہی تھی۔ ہم اپنے عقب سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے گھوم کر اس انٹینا کو دیکھا جو شکار شدہ پرندوں کے ساتھ ہی جیپ کی عقبی نشست پر پڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! کہیں ہمارا یہ اندازہ غلط تو نہیں کہ ہمارے پیچھے حکم جی کے لوگ ہیں؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”جو انٹینا سگنل وصول کرتا ہے، وہ ہمارے پاس ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس کوئی دوسرا انٹینا نہیں ہے تو وہ ہمارے پیچھے کیسے آ سکتے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس دوسرا انٹینا ہو۔“

”یہ تو ایک قیاس ہی ہے نا۔“

”چلو ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل جاتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

میرا تجربہ ہے کہ بندہ بعض اوقات ایک چیز کے بارے میں قیاس کرتا ہے پھر اس کا قیاس پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور حالات کے سارے اشارے قیاس کو مضبوط کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ آخر میں وہ قیاس بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارے پیچھے حکم جی کے لوگ آ رہے ہیں۔ راہول اور دلیپ کے انٹینا سمیت پکڑے جانے کی وجہ سے ہمارے اندر ایک اندیشہ پیدا ہوا تھا اور اب یہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ حالانکہ یہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ ستیش اور اس کے ساتھی ہوں جو استھان سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہوں یا پھر ڈکیتوں کا کوئی گروہ ہو، جیسا کہ دلیپ اور راہول نے بتایا تھا کہ یہاں ایسے جتھے گھومتے رہتے ہیں...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بالکل ہی غیر متعلق لوگ ہوں جو بس اپنے کام سے کام رکھتے ہوں اور اپنی راہ پر چلے جا رہے ہوں۔

ہم آگے بڑھتے رہے، روشنیاں ہمارے پیچھے رہیں۔ گھنے درختوں کے درمیان سے ہمیں گاہے بگاہے ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی، تاہم ہم مکمل اندھیرے میں سفر کر رہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہماری رفتار بھی کم تھی۔ عقبی روشنیاں ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں مگر پھر ایک موقع ایسا آیا جب ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں...... ہمارے پیچھے آنے والی روشنیاں واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئیں۔ کچھ روشنیاں تو ہماری سیدھ میں سفر کرتی رہیں اور کچھ ایک نیم دائرے کی شکل میں بائیں رخ پر نکل گئیں۔ یہ لوگ جیسے دو مختلف اطراف میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ انداز بتاتا تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں لیکن جسے تلاش کر رہے ہیں، اس کی سمت کا ٹھیک پتا انہیں بھی نہیں ہے۔

''اب کیا خیال ہے تمہارا؟'' عمران نے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاید یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ بات تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ یہ لوگ سیدھے ہمارے پیچھے نہیں آ رہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ حکم کے ہرکارے ہی ہوں مگر ان کے پاس سگنل وصول کرنے والا انٹینا نہ ہو...... ابھی تم نے یہی بات کہی ہے نا؟''

''تمہاری بات درست ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''لیکن ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے۔ اگر یہ حکم کے لوگ ہی ہیں اور دلیپ وغیرہ نے واکی ٹاکی پر انہیں ہمارے بارے میں اطلاع دی ہے تو پھر ابھی تک یہ واکی ٹاکی خاموش کیوں ہے؟''

''اب تمہاری عقل، کچھ کچھ کام کرنا شروع ہو گئی ہے۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

واکی ٹاکی ابھی تک چالو حالت میں تھا اور ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔ اس کی رینج اتنی تو ضرور رہی ہو گی کہ چار پانچ میل کے دائرے میں کام کر سکے اور اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس پر کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ تو ہونی ہی چاہئے تھی۔

ہم نے سفر جاری رکھا۔ جو ٹولی ہماری سیدھ میں آ رہی تھی، اس کا فاصلہ اب ہم سے قریباً نصف کلومیٹر رہ گیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ شاید دو چار ٹارچیں بھی ہوں۔ مشعلوں کی سرخ روشنی ٹارچوں کی روشنی سے بالکل مختلف دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو ٹولی ہمارے پیچھے آ رہی ہے، اس کے پاس کتے نہیں ہیں۔ کتوں کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہماری کوئی نیکی ہمارے کام آنے والی ہے۔'' عمران نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، لگ تو مجھے بھی رہا ہے۔''

''اور واقعی صورت حال میں اچھی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے پیچھے آنے والی ٹولی ہمارے پیچھے آنے کے بجائے تھوڑا سا بھٹکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

درختوں کا ایک گھنا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لئے ان درختوں کے پیچھے رک جائیں؟''

''دیکھ لو، ان معاملوں میں تمہارا تجربہ کہیں زیادہ ہے۔''

''صرف ان معاملوں کی بات نہیں، میرا تجربہ ویسے بھی زیادہ ہے۔'' اس نے کہا اور گاڑی روک دی۔

ہمارے عقب میں گھوڑا گاڑی بھی رک گئی۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ ان کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ عمران جیپ کو آہستہ روی سے چلا کر جھنڈ کے پیچھے لے گیا۔ ہوشیار سنگھ بھی گاڑی وہیں لے آیا۔ ''کیوں جی، رک کیوں گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

عمران بولا۔ ''اسے رکنا نہیں، بریک لینا کہتے ہیں اور یہ بریک ایسی چیز ہے جس کے بغیر آج کل کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ٹی وی چینل تو چلتے ہی بریک لینے کے لئے ہیں۔ بس بریکوں کے درمیان کہیں کہیں پروگراموں کی جھلک نظر آتی ہے اور غور کرو، کتنی برکت ہے ان بریکوں میں۔ اب ہر طرف چینل ہی چینل اور بریکیں ہی بریکیں نظر آتی ہیں۔''

''تو آپ بھی بریک کے لئے رکے ہیں؟'' ہوشیار سنگھ نے پوچھا۔

''بے شک، کبھی کبھی حرکت نہ کرنے میں بھی برکت ہوتی ہے۔'' عمران نے کہا اور عقب میں متحرک روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والے ہماری دائیں جانب کوئی دو تین سو میٹر کے فاصلے سے گزر جائیں گے۔ ہم اپنی جگہ دم سادھے بیٹھے رہے اور ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ روشنیاں قریب آتی گئیں۔ قریب آنے کے بعد ان کا رخ ایک بار پھر تبدیل ہونے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ سیدھا اس جھنڈ کی طرف ہی آ جائیں گے۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہمارے ذہنوں میں موجود تمام تر اندیشے ایک بار پھر جاگ گئے۔ کہیں واقعی ہمیں کسی ذریعے سے ٹریس تو نہیں کیا جا رہا تھا؟

اگر ایسا تھا تو پھر ہمارا یہاں رکنا واقعی بہت بڑی غلطی تھی۔ یہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ مناسب طریقے سے مورچا بندی کی جا سکتی۔ بہر طور ہم نے اپنی رائفلیں وغیرہ تیار کر لیں اور ہر طرح کی صورتِ حال کے لئے الرٹ ہو گئے۔

متحرک روشنیاں ہمارے سامنے سے صرف ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے گزر گئیں۔ یہ قریباً پچاس کے قریب گھڑ سوار تھے۔ ان کی مشعلوں کی روشنی تاریک جنگل میں عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ آپس میں بلند آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے بجرنگ بلی کا زوردار نعرہ لگایا اور جواب میں جے جے کار سنائی دی۔ انہیں دیکھنے اور سننے کے بعد ہمیں اس بات میں ذرا سا شائبہ بھی نہیں رہا کہ یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ استھان سے ہمارے پیچھے آئے تھے۔ یقیناً ان میں ستیش، مہندر، بھولا ناتھ اور ان کے بہت سے جنونی ساتھی بھی شامل تھے۔ یہ لوگ غصے میں بپھرے ہوئے تھے۔ ہم نے استھان میں ان کے کم از کم تین بندوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی نہیں، ہم مہا گرو اور اس کی پتنی کو یرغمال بنانے کے قصوروار بھی تھے...... اور اس کے علاوہ ہمارا ایک بڑا پاپ یہ تھا کہ ہم نے سلطانہ جیسی ''اپرادھن'' کو قرار واقعی سزا سے بچایا تھا اور اسے استھان میں سے لے کر صاف نکل آئے تھے۔

یہ غضب ناک ٹولہ ہمارے قریب سے گزرتا رہا ہم جھنڈ کے پیچھے ساکت و جامد موجود رہے۔ اس موقع پر ہمارے گھوڑوں میں سے کوئی ہنہنانا یا پھنکارنا شروع کر دیتا تو بھی ہمارے لئے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ بہر طور یہ وقت بہ خیریت گزر گیا۔ روشنیاں ہم سے دور ہوتی چلی گئیں اور پھر دھیرے دھیرے تاریک درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔ اب بس کبھی کبھی ان کی جھلک سی دکھائی دیتی تھی۔ ہم ایک نہایت نازک صورتِ حال سے بہ خیریت گزر

گئے تھے اور ایسا صرف صبر و تحمل اور عمران کے مضبوط اعصاب کی وجہ سے ہو سکا تھا۔ اقبال، ہوشیار سنگھ اور طلال وغیرہ بھی گھوڑا گاڑی سے اُتر آئے تھے۔

ہوشیار سنگھ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں جی۔ کبھی کبھی واقعی حرکت نہ کرنے میں بھی برکت ہوتی ہے۔''

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوا لیکن اس مرتبہ رخ تھوڑا سا مختلف تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''ہم کہیں جا رہے ہیں یا بس یونہی سفر کرتے چلے جا رہے ہیں؟''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''ہم سب کے سب کہیں جا رہے ہیں۔ راستے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ ایک دن ہم سب نے ایک تاریک اندھیرے میں گم ہو جانا ہے۔''

''وہ تو ہو ہی جانا ہے لیکن میں اب کی بات کر رہا ہوں۔''

''اب ہم ایک ڈراما کرنے جا رہے ہیں۔'' عمران روانی سے بولا۔

''مجھے بھی ڈرامے میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے جی۔'' ہوشیار سنگھ نے کہا۔ ''ادھر ہم انڈین پنجاب میں پاکستانی ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور سے اسٹیج ڈرامے۔ ہنس ہنس کر ہماری تو پسلیاں پیڑ کرنے لگتی ہیں۔''

''لیکن یہ اور طرح کا ڈراما ہے۔ یہ ہم جن کے لئے کر رہے ہیں، ان کو ہنسی نہیں آئے گی۔ رونا آ جائے تو اور بات ہے۔''

ہوشیار سنگھ نے عمران کو تھوڑا سا کریدنا چاہا مگر جب وہ مجھے بتا کر نہیں دے رہا تھا تو ہوشیار سنگھ کو کیسے بتا دیتا؟ اِدھر اُدھر کی ہانک کر اس نے ہوشیار سنگھ کو خاموش کر دیا۔

ہم نے مناسب رفتار سے تقریباً پانچ کلومیٹر تک سفر کیا۔ یہاں تک کہ ایک پتھریلی ڈھلوان کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ وسیع ڈھلوان نیچے بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی...... خاکستری پتھروں والی یہ ''ڈھلوان سطح'' دراصل اسی کھائی کا ایک حصہ تھی جہاں ہم کچھ دیر پہلے رکے تھے اور جہاں عمران نے بڑے ڈرامائی انداز سے ایک خطرناک جنگلی ریچھ سے پیچھا چھڑایا تھا۔ ا مناظر ابھی تک ہم سب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔

ڈھلوان کے عین کنارے پہنچ کر ہمارا مختصر سا قافلہ رک گیا۔ ایسا عمران کی ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔ عمران تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا ہے لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سب کچھ اس کے ذہن میں پہلے سے طے ہے۔

ذرا دیر بعد اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور جیپ کو ڈھلوان میں اتارنے کے بجائے

دائیں رخ پر موڑ دیا۔ گھوڑا گاڑی بھی ہمارے پیچھے آئی۔ صرف سوڈیڑھ سو میٹر چلنے کے بعد ہم پھر رک گئے۔ اس مرتبہ ہمارے سامنے ایک آبی گزرگاہ تھی جو شیشم، جنتر اور یوکلپٹس کے گھنے درختوں میں آہستہ روی سے بہتی ہوئی جنوب کی سمت جا رہی تھی۔ یہاں کناروں پر جنگلی گھاس تھی اور نیم تاریکی میں پانی کی مدھم قلقل سنائی دیتی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جھاڑو پھیرنا ہے اور تھوڑی سی جھاڑ پونچھ کرنی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں اجلاس ہونا ہے درختوں کے نیچے۔ دراصل امریکی ریاست ہونولولو میں ہمارے نیوز چینل فساد پلس کے فوٹوگرافر کا کیمرا توڑا گیا ہے اور لیڈی رپورٹر کے بال کھینچے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر احتجاج کا پروگرام ہے۔ بہت سی چڑیلیں اور چڑیلے یہاں جمع ہونے والے ہیں......''

مجھے یقین تھا کہ عمران جھاڑو دینے والی بات مذاق میں کر رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی جب دس پندرہ منٹ بعد عمران اور اقبال واقعی صفائی پر کمربستہ نظر آئے...... انہوں نے چھوٹے دستے والی کلہاڑی کی مدد سے درختوں سے کئی ایک شاخیں توڑیں۔ ان شاخوں کے ساتھ پتے بھی موجود تھے اور وہ دیکھنے میں جھاڑوؤں کی طرح لگتی تھیں۔ عمران نے میرے علاوہ ہوشیار سنگھ، طلال اور گرو سو بھاش وغیرہ کو بھی یہ جاڑو نما شاخیں تھما دیں۔

اگلے پندرہ بیس منٹ تک ہم کافی مصروف رہے۔ پختہ ڈھلوان سے واپس مڑ کر ہم نے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس کچے راستے پر جیپ اور گھوڑا گاڑی کے پہیوں نے جو بھی ہلکے پھلکے نشانات بنائے تھے، وہ ہم نے شاخوں کی مدد سے یکسر ناپید کر دیئے۔ یہاں خشک پتوں کی بہتات تھی۔ نشانات ختم کرنے میں ان پتوں نے بھی کافی مدد کی۔ عمران اور اقبال نے پہلی بار ٹارچیں جلائیں اور مختلف جگہوں سے جائزہ لے کر اس بات کا اطمینان کیا کہ نشانات واقعی اوجھل ہو چکے ہیں۔

اب ہم ایک بار پھر گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ عمران نے بلاتردد جیپ آبی گزرگاہ میں اتار دی۔ یہاں پانی اتھلا تھا کئی جگہوں پر تو گہرائی ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ جہاں زیادہ تھی، وہاں بھی تین فٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہم بہاؤ کے رخ پر جیپ چلاتے آگے بڑھتے رہے۔ گھوڑا گاڑی کے گھوڑے پھنکارتے اور ہانپتے ہوئے ہمارے عقب میں رہے۔ اب میرے لئے یہ جاننا دشوار نہیں تھا کہ عمران نے اپنے سفر کے نقوش مٹانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر کچھ لوگ ہماری گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات کے ذریعے ہمارا پیچھا

کرتے تو سو فیصد بھٹک جاتے۔ وہ پتھریلی ڈھلوان تک پہنچتے اور یہی سمجھتے کہ ہم ڈھلوان پر اُتر گئے ہیں...... کیونکہ اس کے بعد انہیں اردگرد کہیں بھی ہمارے سفر کے نقوش نظر نہیں آتے۔

ہم نے پایاب پانی میں بہاؤ کے رخ پر قریباً آٹھ کلومیٹر تک سفر کیا۔ اس سفر کی رفتار تو سُست رہی لیکن ہمیں کہیں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ صرف ایک دو جگہ ایسا ہوا کہ گھوڑا گاڑی کے پہیئے پانی کے اندر کسی کھڈے میں اٹکے اور ہمیں اپنی پتلونیں اور پاجامے اڑس کر یخ پانی میں اُتر کر اسے دھکا لگانا پڑا۔

بالآخر باریک سنگریزوں کے اوپر پانی کا یہ سفر ختم ہوا اور ہم اس آبی گزرگاہ سے باہر نکل آئے۔ اس سفر کے دوران میں عمران کی دلچسپ گفتگو جاری رہی تھی۔ اس نے کہا کہ آج جس طرح اس نے آٹھ نو کلومیٹر تک ندی میں جیپ چلائی ہے، اسی طرح وہ عنقریب سڑک پر کشتی چلا کر دکھائے گا اور ملک و ملت کا نام روشن کرے گا۔ اس بات پر ہوشیار سنگھ خوب ہنسا تھا۔

سفر میں لگنے والے مسلسل ہچکولوں کے سبب گھوڑا گاڑی میں زخمی راہول کو تکلیف ہوتی رہی تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہی کراہتا رہا تھا۔ اس کی کراہیں بار بار ہمارے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ ان کراہوں کی تکلیف کے ساتھ ساتھ دہشت کا عنصر بھی شامل تھا۔ دہشت کی وجہ یقیناً وہ لرزہ خیز واقعہ ہی تھا جو اس شخص کے ساتھ تاریک درختوں میں پیش آیا تھا۔ جنگلی ریچھ کی وحشت، اس کا راہول کو چھوڑ کر عمران پر حملہ آور ہونا اور پھر خطرناک انداز میں اچھلنا اور جھپٹنا...... سب کچھ میری نگاہوں میں آیا اور سنسنی جگا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ اس وقت عمران کی جگہ میں ہوتا، ریچھ اس کے بجائے میرا پیچھا کرتا اور عمران کے بجائے میں اس سے نمٹتا۔

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''کچھ بتاؤ بھی کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟''

''یار! بتایا تو ہے کہ وہاں جانا ہے جہاں سب جاتے ہیں...... اور کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ زندگی سفر اور منزل موت...... یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ شیلے نے کہا تھا......''

''شیلے گیا بھاڑ میں۔ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں واقعی تپ گیا۔

''اچھا...... اچھا...... اب ہم فتح پور جا رہے ہیں...... واقعی فتح پور جا رہے ہیں۔ یہ کچے کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ یہاں سے گھومتی ندی کی ایک بڑی شاخ گزرتی ہے۔ بہت ساری مچھلی پائی جاتی ہے اس پانی میں۔ یہاں کے لوگ مچھلی پکڑتے ہیں اور مزے

کرتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر لوگ میرے رشتے دار ہیں۔‘‘

’’رشتے دار ہیں؟‘‘

’’ہاں، میں نے یہاں کئی ایک شادیاں کرلی ہیں۔آٹھ دس تو میرے سسرالی گھر ہیں۔ آگے ان کی رشتے داریاں ہیں۔لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔‘‘

’’کیا ہانک رہے ہو؟‘‘

’’مذاق نہیں کر رہا جگر! یہاں آ کر میں نے جلال الدین اکبر اعظم کی یاد تازہ کر دی ہے۔اس شخص کو بھی باہمی رواداری اور امن محبت قائم رکھنے کا ایک بڑا اچھا گر ہاتھ آیا ہوا تھا۔ اس نے ہر مذہب،فرقے اور ذات کی نیک بیبیوں سے شادیاں کرلی تھیں۔انجوائے منٹ کی انجوائے منٹ اور امن کا امن۔ جہاں کہیں بغاوت پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا تھا، مغل اعظم صاحب دولہا بن کر پہنچ جاتے تھے اور مستقبل کے باغی ان کے قریبی رشتے دار بن کر ان کی عنایتوں سے فائدہ اُٹھانا شروع کر دیتے تھے۔اسی طرح بغاوتیں کچل کچل کر جناب چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کر گئے۔ میں نے بھی فتح پور میں اس طریقۂ حکومت کو چھوٹے پیمانے پر آزمانے کی کوشش کی ہے۔‘‘

’’اکبر اعظم نے تو اپنا دین بھی بنا لیا تھا۔تم نے کون سا شوشا چھوڑا ہے؟‘‘ میں نے اس کی گپ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

’’اب تم آ گئے ہو تو شوشا چھوڑنے میں کون سی دشواری ہے۔مل بیٹھ کر کچھ کر لیں گے۔‘‘

وہ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا لیکن اس بات کا صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ایک طے شدہ راستے پہ جا رہا ہے۔

قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہمارے اردگرد درختوں کی بہتات دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ پھر سرکنڈے اور جھاڑیاں نظر آنی شروع ہوئیں۔ یہ مناظر اس بات کی علامت تھے کہ ہم کسی جھیل یا ندی کے قریب ہیں۔جلد ہی ہمیں ایک چھوٹی سی بستی کے آثار نظر آئے۔ کسی کسی گھر میں لالٹین کی مدھم روشنی موجود تھی۔بستی کے بیچوں بیچ ایک پرانے مندر کی مخروطی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مسجد کا مینار بھی تھا۔ رات کا اندھیرا اب دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں مدغم ہو رہا تھا۔نیم تاریک آسمان پر صبح کا تارا بہت روشن نظر آتا تھا۔یہ چھوٹی سی بستی رات بھر کی نیند کے بعد جیسے ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ ہمارے بستی تک پہنچتے پہنچتے کافی روشنی ہو گئی۔بستی کی کچی زمین اوس سے نم تھی، دھند

کے ریلے گلی کوچوں میں گشت کر رہے تھے۔جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لئے لوگوں نے گھروں کے اردگرد باڑیں بنا رکھی تھیں۔بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی عمران نے جیپ ایک جگہ گھنے سرکنڈوں کے اندر کھڑی کر دی۔شکار کا گوشت اور انٹینا وغیرہ جیپ سے نکال لیا گیا۔اس انٹینا کو راستے میں ہی عمران نے ناکارہ کر دیا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ دوبارہ کسی کے ہتھے چڑھے اور ہمارے لئے مصیبت کا باعث بنے۔ہم پیدل ہی آگے بڑھے۔گھوڑا گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ بستی میں داخل ہوئی۔دو نوجوان مویشیوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف لے جا رہے تھے۔انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اور اس کے سکھ کوچبان کو ذرا تعجب سے دیکھا۔پھر ان کی نگاہ میرے پہلو میں چلتے عمران پر پڑی اور ان کے چہروں سے تردد دور ہو گیا۔ایک نوجوان نے دور ہی سے ہاتھ اُٹھا کر ہانک لگائی۔’’سلام عمران بھیا۔‘‘ دوسرے نے کہا۔’’نمستے عمران بھائی۔‘‘

عمران نے دونوں کے سلام کا جواب خوش دلی سے دیا۔

کچھ آگے گئے تو ایک بڑھیا نے عمران کی بلائیں لیں۔لگتا تھا کہ وہ ہر جگہ کی طرح اس بستی میں بھی کافی مقبول ہے۔چھوٹے بڑے اس سے بے تکلف دکھائی دے رہے تھے۔ عمران کو دیکھ کر ان کے چہروں پر عجیب سی خوشی چمک جاتی تھی۔

ہم مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد مندر کے پچھواڑے واقع ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچے۔عمران نے لکڑی کے بند دروازے پر دستک دی۔دوسری دستک پر اندر سے کسی بڑی عمر کے شخص نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا۔’’کون ہے؟‘‘

’’میں ہوں تایا۔‘‘ عمران نے جواب دیا۔

اندر والے کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔اس نے اپنا سوال دہرایا۔عمران نے بھی جواب دہرایا۔مزید تصدیق کے لئے کسی نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا......اور آخر کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔سامنے پچاس پچپن سال کا ایک کمزور شخص کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں مضبوط لاٹھی تھی۔

عمران نے اسے ’’سلام تاؤ‘‘ کہا۔

وہ بھی گھوڑا گاڑی کو دیکھ کر حیران ہوا۔’’اس میں کون ہے؟‘‘ اس شخص نے پھر ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔

’’اپنے ہی لوگ ہیں تاؤ۔ڈرنے کی بات نہیں۔بڑی دور سے آئے ہیں۔کچھ کھانے دانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔‘‘

اسی دوران میں مہا گرو سوباش، اس کی پتنی رادھا، طلال، سلطانہ اور اقبال وغیرہ بھی گاڑی سے اُتر آئے۔ راہول ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کے اردگرد تین رائفلیں موجود تھیں اور وہ جانتا تھا کہ بھاگنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ گھر کا مالک اقبال اور عمران کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔ ہم سب عمران اور اقبال کے ساتھ اندر آ گئے۔ گھر کا صحن کشادہ تھا۔ ایک برآمدہ اور اس کے عقب میں تین چار نیم پختہ کمرے تھے۔ ایک طرف سرکنڈوں کے چھپر کے نیچے دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچے صحن میں مرغیاں بھاگتی پھرتی تھیں۔ گھر کی حالت سے گھر والوں کی کمزور مالی حالت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک کمرے کی کھڑکی کے پیچھے تھوڑی سی ہلچل نظر آئی جس سے اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی پردہ دار عورت یا عورتیں موجود ہیں۔

عمران نے ادھیڑ عمر شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ تاؤ افضل ہیں...... یہ یہاں کے پرانے چوکیدار ہیں۔ کچھ دن پہلے ان کی بیوی فوت ہوئی ہے۔ تب سے یہ چوکیداری چھوڑ چکے ہیں اور گھر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں بھی ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کھڑکی کے بوسیدہ پردے کے پیچھے جو ہلچل نظر آئی تھی، وہ ان کی بیٹیوں کی ہوگی۔

تاؤ افضل اتنے سارے مہمانوں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ عمران نے زخمی راہول کو اقبال کی نگرانی میں دے دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے۔ راستے میں راہول نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ حکم جی کے لئے ہی کام کرتا ہے اور اپنے ساتھی دلیپ کے ساتھ مجھے ٹریس کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ تاہم اس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ میری یہاں موجودگی کا علم ابھی اس کے کسی ساتھی کو نہیں ہوا۔ اس کے تقریباً دو درجن مسلح ساتھی سات آٹھ میل کی دوری پر ایک زرعی گودام میں موجود تھے۔ یہ لوگ رنجیت پانڈے کی کمان میں تھے۔ میرے ٹریس ہو جانے کے بعد دلیپ اور راہول اپنے کمان دار رنجیت پانڈے سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ واکی ٹاکی پر کوشش کر رہے تھے لیکن اسی دوران میں وہ سگنل وصول کرتے ہوئے ہمارے زیادہ قریب چلے آئے اور ہمارے ساتھ ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔

عمران نے سلطانہ اور رادھا کو تو افضل کی بیٹیوں کے پاس کمرے میں بھیج دیا اور ہمیں لے کر ایک دوسرے کشادہ کمرے میں آ گیا۔ جب سلطانہ اور رادھا کمرے میں جا رہی تھیں،

میں نے دیکھا کہ افضل کی نظر سلطانہ پر پڑی ہے اور وہ کچھ چونکا ہے۔ اس کے بعد اس کے چہرے کی پریشانی میں ایک طرح کا تجسس شامل ہو گیا۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ عمران کو کندھے سے پکڑ کر برآمدے کی طرف لے گیا۔

عمران کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں گھر کے اندر سے تلے ہوئے انڈوں اور حلوے وغیرہ کی دھیمی خوشبو آنے لگی تھی۔ حلوے کی خوشبو محسوس کرنے کے بعد مہا گرو کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک نمودار ہوئی۔

سرد موسم میں بھوک زیادہ لگتی ہے جبکہ گرو اور رادھا نے قریباً چھتیس گھنٹے سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

کسی قریبی کمرے سے برتنوں کی کھن کھن اور چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دیتی رہی اور پھر کھانا ہمارے سامنے آ گیا۔ دو بڑے چنگیروں میں پیٹ بھرنے کے مناسب لوازمات موجود تھے۔

کھانے کے دوران میں، میں نے اقبال سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''لگتا ہے کہ تم اس گھر میں رہتے رہے ہو؟''

''رہتے رہے ہو...... سے کیا مطلب...... ہم یہاں اسٹیٹ میں آنے کے بعد زیادہ دیر رہے ہی یہاں پر ہیں۔'' اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''یہ تاؤ افضل کچھ ڈرا ہوا سا بندہ لگتا ہے۔''

''بس حالات نے اسے ڈرایا ہوا ہے، ورنہ یہ دلیر شخص تھا۔ جو بندہ کالی راتوں میں جاگ کر بستی کا پہرا دیتا ہو اور یہاں رہنے والوں کی حفاظت کرتا ہو، وہ ڈرپوک تو نہیں ہوتا۔''

''حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مدھم آواز میں پوچھا۔

اقبال نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''بے چارہ دوسروں کی چوکیداری کرتا رہا اور اس کے اپنے گھر میں چوری ہو گئی بلکہ ڈاکا پڑ گیا۔''

''کون لوگ تھے؟''

''وہی جن کے جان مال کی زیادہ حفاظت کرتا تھا تاؤ افضل۔ بستی کے مکھیا رشید احمد کا بیٹا سلمان اور اس کے یار دوست۔ وہ رات کو افضل کے گھر میں گھس آئے۔ اس کی جوان بیٹیوں سے زیادتی کرنا چاہی۔ نشے میں دھت ہو کر ان کے کپڑے پھاڑ دیئے۔ ان کے جسم نوچ

لئے۔ان کی والدہ آڑے نہ آتی تو وہ سب کچھ کر گزرتے۔کمزور عورت نے اپنی جان دے کر بیٹیوں کی عزت بچائی۔''

''اوہ......تمہارا مطلب ہے افضل کی بیوی؟''

اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔''افضل کو بیوی سے بڑا پیار تھا۔اس کی موت کا غم اسے لے بیٹھا۔کبھی کبھی تو خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔تین تین دن فاقے سے گزار دیتا ہے۔رات کو باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا ہے اور بیٹیوں کا پہرا دیتا ہے۔خبطیوں کی طرح ان کی نگرانی کرتا ہے۔ابھی تم نے دیکھا ہی ہوگا، جب ہم آئے تب بھی وہ لٹھ لئے دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔''

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور اقبال کچے صحن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھے۔یہاں دھوپ تھی جو ہمارے رات بھر کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو سکون دے رہی تھی۔دیہات کی مخصوص خوشبو جس میں کچی مٹی، گوبر اور نباتات کی باس ہوتی ہے، اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔اقبال نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔''افضل اور اس کی بیٹیوں کی کہانی کچھ مختلف نہیں ہے۔ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا ہے جو طاقتوروں کی طرف سے کمزوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔اگر عمران یہاں آ کر افضل اور اس کی بیٹیوں کا سہارا نہ بنتا تو اب تک یہ دونوں لڑکیاں کھیا کے اوباش بیٹوں کے ہتھے چڑھ چکی ہوتیں۔''

میں نے کہا۔''عمران تو ڈھنگ سے کچھ بتا نہیں رہا۔تم ہی بتاؤ کب سے ہو یہاں اور کیا کرتے رہے ہو؟''

''بس تمہیں ڈھونڈتے رہے ہیں اور کیا؟''

''لیکن تم یہاں پہنچے کیسے؟''

''میرے خیال میں یہ ساری تفصیل عمران ہی بتائے تو زیادہ اچھا ہے۔''

''اچھا اتنا بتا دو کہ یہاں تم کب سے ہو؟ میرا مطلب ہے فتح پور میں؟''

''پچھلے قریباً سات مہینوں سے۔اب تو یہ ہمیں اپنی ہی بستی لگنے لگی ہے۔عمران کا تو تمہیں پتا ہی ہے، جہاں جاتا ہے اپنے چاہنے والے پیدا کر لیتا ہے۔لوگ بہت پیار کرنے لگتے ہیں اس سے اور اس نے واقعی لوگوں کی مدد بھی کی ہے۔سب سے بڑی مدد تو یہی ہے کہ اس نے رشید اور اس کے بیٹوں کو لگام ڈالی ہے۔انہوں نے اپنی من مانیوں سے بستی والوں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔اس کے علاوہ بھی اس نے بستی والوں کے لئے کئی چھوٹے بڑے کام کئے ہیں۔اب ہم پانچ چھ ہفتے بعد بستی واپس آئے ہیں۔تم دیکھ لینا، تھوڑی دیر میں بہت سے لوگ

یہاں ہماری خیر خیریت پوچھنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ تاؤ افضل اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا میری طرف آ گیا۔میرے قریب بیٹھ کر غور سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔''میری نظر کمزور ہو گئی ہے لیکن اتنی نہیں کہ میں تمہیں پہچان ہی نہ سکوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سمجھا تو میں بھی نہیں کہ تم انجان کیوں بن رہے ہو۔میں تاؤ افضل ہوں......زرگاں میں تمہارے پڑوسی لوہار عبدالمجید کا بھائی۔میں نے تمہاری بیوی سلطانہ کو بھی پہچان لیا ہے۔''

ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔مجھے لگا کہ جیسے میں نے واقعی لمبی ٹھوڑی والے اس ادھیڑ عمر شخص کو کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں اور کب؟ میں ٹھیک سے تعین نہ کر سکا۔میں سمجھ گیا کہ یہ پھر وہی یادداشت والا معاملہ آ گیا ہے۔کئی دوسرے لوگوں کی طرح یہ شخص بھی مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا لیکن میرے لئے یہ اجنبی تھا۔

میں نے یونہی کہا۔''مجھے تھوڑا تھوڑا یاد تو آ رہا ہے۔''

''مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ تمہیں تھوڑا تھوڑا یاد آ رہا ہے۔مجھے تو ان دنوں کی ایک ایک بات یاد ہے۔کہیں تم جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہے؟''

''نہیں، جان بوجھ کر تو نہیں کر رہا۔''

''میں پورے پانچ مہینے وہاں تمہارے پڑوس میں رہا تھا۔عبدالمجید بیمار تھا۔میں اس کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکا تھا۔یاد آ رہا ہے؟''

''ہاں ہاں......میں سمجھ گیا۔''میں نے ایک بار پھر یونہی بات بنائی۔

افضل کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔''تمہاری ہچکی کا کیا بنا پھر؟''اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''ہچکی......وہ......تو......کون سی ہچکی؟''

''یار! تم تو واقعی بڑے بھلکڑ ہو۔ان دنوں کھانا کھاتے ہی تمہیں ہچکی شروع ہو جاوت تھی۔تین تین گھنٹے رکتی نا ہیں تھی۔کتنے کمزور ہو گئے تھے تم۔بخار تو ٹوٹتا ہی نا ہیں تھا تمہارا۔''

''ہاں، اس بخار نے تو واقعی بڑا پریشان کیا تھا۔''میں نے گول مول بات کی۔

''تم اسے پریشانی کہوت ہو۔میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہارے بچنے کی کوئی آشا ہی نا ہیں تھی۔یہ تو تمہاری بیوی کی ہمت اور کوشش ہے جس کی وجہ سے اوپر والے کو بھی ترس آ گیا۔وید جی نہ آتے تو پتا نا ہیں کیا ہو جاتا۔''

''ہاں...... وید واقعی قابل بندہ تھا۔''

''مگر جتنا قابل تھا، اتنا ہی مہنگا بھی تھا...... بلکہ شاید یہ کہنا چاہئے کہ اتنا ہی لالچی بھی تھا۔ میں اندر خانے کی ساری بات جانت ہوں۔ اس نے تمہیں ٹھیک تو بے شک کر دیا لیکن اس کے بدلے تمہاری بیوی کا ایک ایک گہنا اُتروالیا۔ میں نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ویسے بھی سلطانہ بٹی مجھ سے کچھ چھپاتی ناہیں تھی۔''

مجھے اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر گول مول بات کرتے ہوئے کہا۔ ''زیور تو اس نے واقعی کوئی نہیں چھوڑا تھا۔''

''اور وہ رقم بھول گئے جو نقد لی تھی اس نے؟''

''ہاں...... رقم بھی تو تھی۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بھولا بسرا دھندلا سا منظر نگاہوں میں چمک گیا۔ جیسے کوئی فربہ ہاتھوں والا شخص کرنسی نوٹ گن رہا ہو اور سلطانہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے قریب کھڑی ہو۔

تاؤ افضل کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''بہت بڑا دل ہے سلطانہ کا۔ ایک ایک پائی جوڑ رکھی تھی اس نے بھائی کے علاج کے لئے۔''

''بھائی کے علاج کے لئے؟''

تاؤ افضل کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔ ''ارے...... تمہیں ناہیں پتا وہ رقم کس لئے تھی؟''

''نن...... نہیں...... میں تو یہ بات...... آج آپ کے منہ سے سن رہا ہوں۔''

تاؤ افضل کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت بڑھ گئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ''شاید تم مذاق کر رہے ہو۔''

''نہیں تاؤ...... میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

تاؤ افضل چند لمحے تک مجھے بغور دیکھنے کے بعد بولا۔ ''اب پتا ناہیں کہ مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہئے یا ناہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ سلطانہ نے وید جی کو زیوروں کے علاوہ جو پندرہ ہزار روپے نقد دیئے تھے، وہ اس نے اپنے اپاہج بھائی کے علاج کے لئے جمع کئے تھے، سچ مچ ایک ایک پائی جوڑ کر۔ وہ ساری رقم اس نے تمہارے علاج کے لئے وید جی کو دے دی۔''

میں خاموشی سے تاؤ افضل کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ تاؤ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ایک اچھی بیوی

اللہ کی سب سے خاص نعمت ہے۔ جس کو یہ نعمت ملے، وہ خوش بخت ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم خوش بخت ہو۔'' اس نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ ''سلطانہ کے بھائی کا اب کیا حال ہے؟''

''ابھی تو ویسا ہی ہے۔'' میں نے کہا اور یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے مجھے سچ مچ بے پناہ افسردگی محسوس ہوئی۔

میں نے چند دن پہلے سلطانہ کے بیمار اور اپاہج بھائی نبیل کو نل پانی کے دیوان میں دیکھا تھا۔ وہ کمر کی تکلیف کی وجہ سے لاچاری کی تصویر تھا۔ جو کچھ مجھے آج یہ تاؤ افضل نامی شخص بتا رہا تھا، وہ واقعی درست تھا تو پھر نبیل راجپوت کی حالتِ زار کی ذمے داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔ تاؤ افضل کی باتوں نے میرے ذہن میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ اپنے لئے سلطانہ کی قربانیوں کے بارے میں، میں پہلے بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ آج ایک اور قربانی میرے سامنے آ رہی تھی۔

میں نے وہیں دھوپ میں بچھی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے، تاؤ افضل سے اس بارے میں کچھ مزید باتیں پوچھیں۔ اس مختصر گفتگو سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا، وہ کچھ اس طرح تھا...... آج سے قریباً ایک سال پہلے میں شدید بیمار ہو گیا تھا۔ میرا بخار اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں بستر سے یوں لگا تھا کہ صحت مند ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ رہی سہی کسر نہ رکنے والی ہچکی نے پوری کر دی تھی۔ یہ ہچکی کئی کئی گھنٹے میرے کمزور جسم کو ہچکولے دیتی رہتی تھی۔ میرے سر کے بال جھڑ گئے تھے اور ہونٹ سوکھ کر سیاہ ہو گئے تھے۔

زرگاں کے دو بڑے معالج مجھے لاعلاج قرار دے چکے تھے مگر انہی دنوں ایک خاص وید زرگاں آیا اور اس نے مجھے صحت یاب کرنے کی ضمانت دے کر گراں قدر رقم کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ علاج کے شروع میں تیسرا حصہ معاوضہ وصول کرے گا۔ ڈیڑھ ماہ بعد پھر تیسرا حصہ اور ڈیڑھ ماہ بعد آخری تیسرا حصہ۔ سلطانہ نے اپنی ساری جمع پونجی تین چار قسطوں میں وید کے حوالے کر دی اور واقعی میں ٹھیک ہو گیا۔ وہ میری جان بچانے میں کامیاب رہی۔ سلطانہ کی جمع پونجی میں وہ پندرہ ہزار روپے بھی شامل تھے جو وہ نبیل کے علاج کے لئے جمع کرتی رہی تھی۔

یہ ساری معلومات میرے لئے بہت حیران کن تھیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ سلطانہ زیور نہیں پہنتی۔ میں یہ سمجھتا رہا تھا کہ شاید ایسا اس کے مزاج کی وجہ سے ہے لیکن آج کچھ اور بات سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے تمام زیورات ایک جان لیوا بیماری کی نذر کر چکی تھی اور یہ

میری بیماری تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے نبیل کا بیمار جسم گھوم گیا۔ بہن کے لئے بھائی کی اہمیت کیا ہوتی ہے، میں اچھی طرح جانتا تھا اور نبیل تو پھر اکلوتا بھائی تھا۔

میں سوچتا رہا اور ناقابلِ فہم سلطانہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پتا نہیں کیا کیا کرتی رہی تھی میرے لئے۔ کچھ باتوں کا وہ خود تو کچھ بھی بتاتی نہیں تھی۔ وہ وفا کی پتلی، ایثار کی پیکر...... بڑی خاموشی سے ایک شمع کی طرح جلتی رہی اور میرے لئے روشنی فراہم کرتی رہی تھی۔ اب وہ پگھل کر کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ان گنت دشمن اس کے پیچھے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس ٹمٹماتی شمع کے گرد اپنے ہاتھوں کا ہالہ بنا دوں۔ اپنے تن من سے اس طرح اسے ڈھانپوں کہ زمانے کی ساری سرد گرم ہوائیں اس تک پہنچنے میں ناکام ہوجائیں۔ میرا دل بے ساختہ اس کی طرف کھچنے لگا۔

میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دن پہلے تک وہ مجھے اپنے جسم کو چھونے نہیں دیتی تھی...... لیکن کل والے واقعے کے بعد کم از کم اتنی تبدیلی تو آئی تھی کہ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر روئی تھی۔ اس نے میری بانہوں میں اپنا چہرہ چھپایا تھا۔

تاؤ افضل کے ساتھ میری گفتگو کے دوران میں ہی عمران اور اقبال بھی وہاں موجود رہے تھے۔ انہیں بھی میری بیماری کے بارے میں معلوم ہوا تھا اور یہ پتا بھی چلا تھا کہ مجھے صحت یاب کرنے کے لئے سلطانہ نے کس طرح تگ و دو کی تھی۔

رات کو مجھے سلطانہ سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ موقع بھی عمران نے ہی فراہم کیا۔ وہ چائے کا پیالہ لئے ہوئے میرے پاس آیا۔ آنکھوں میں حسبِ معمول ایک خوبصورت سی شوخی تھی۔ چائے کا لمبا گھونٹ لے کر بولا۔ ''تم نے کہاں سونا ہے؟''

''جہاں تم نے سونا ہے۔''

''جگر! ہم کنوارے ہیں۔ تم شادی شدہ ہو۔ تم اوپر والے کمرے میں سوجانا۔''

میں نے اس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تو اطلاع دی تھی کہ تم اکبر اعظم کے نقشِ قدم پر چل کر یہاں فتح پور میں کئی شادیاں رچا چکے ہو۔''

''لیکن یار! میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں نے یہ شادیاں لڑکیوں یا عورتوں سے کی ہیں۔''

''تو پھر کس سے کی ہیں؟''

''ان لوگوں کے مسائل سے کی ہیں، ان کی مشکلوں سے، ان کی پریشانیوں سے۔ شادی کا مطلب مصیبتوں کو گلے لگانا ہوتا ہے، سو میں نے لگایا ہے۔ بہرحال، اس بارے میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال میں تم سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ تم اوپر والے کمرے میں سوجانا۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''بہت فرق پڑے گا۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ یعنی دو میاں بیوی اور نو بچے۔ تاہم اس کے لئے تنہائی اور یکسوئی وغیرہ ضروری ہے۔''

''تم فضول باتیں کررہے ہو۔ سلطانہ کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایک کمرے میں سکون سے رہ سکے۔ اگر تم نے اسے ٹھیک کرنا ہے تو بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا۔''

''تو یار میں کب کہہ رہا ہوں کہ ایک ہی رات میں نو بچے پیدا کرلو لیکن تھوڑا بہت قدم بڑھاؤ گے تو سفر طے ہوگا نا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے...... وہ میرے کمرے میں چلی آئے گی؟''

''کیوں نہیں آئے گی بھائی! سر کے بل آئے گی۔ جس دیور سے اس کا پالا پڑا ہے، وہ کوئی معمولی شے نہیں ہے۔''

''کیا کہا ہے تم نے اس سے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

کچھ خاص نہیں۔ بس یہی بتایا ہے کہ تمہیں کل سے ہلکا بخار ہے اور...... کبھی کبھی ہچکی بھی آتی ہے۔ وہ فوراً تمہیں دیکھنا چاہ رہی ہے...... بلکہ شام کو ہی تمہارے پاس آنا چاہ رہی تھی۔''

''تم نے اسے کیوں پریشان کیا ہے...... کیا پہلے کم پریشانیاں ہیں؟'' میں نے بیزار لہجے میں کہا۔

''یار! تم خود ہی تو باروندا جیکی کا سنہری قول دہراتے ہو۔ پریشانیوں کے اندر سے ہی خوشی اور سکون کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم اوپر کمرے میں چلو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سرکار کچے دھاگے سے بندھی تمہارے پاس چلی آئیں گی...... لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے میرا گھٹنا دباتے ہوئے کہا۔ ''یار! میرا بھرم رکھ لینا۔ دو چار بار ہچکی لے کر دکھا دینا اسے۔''

''سوری، میں تمہاری بونگیوں میں شامل نہیں ہوسکتا۔''

''اچھا چلو، ایسا کرتے ہیں، میں تمہارے کمرے میں تمہارے پلنگ کے نیچے گھس جاتا ہوں۔ تم بس منہ پر ہاتھ رکھنا، پلنگ کے نیچے سے ہچکی کی آواز میں نکال دوں گا۔''

میں برا سا منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔

وہ شرارت سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا، یہ اسکیم زیادہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ تم کافی دنوں بعد سلطانہ بھابی سے ملو گے۔ میں پلنگ کے نیچے رہوں گا تو پھر کیا خاک ملاقات ہوگی۔''

''تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ اتنی جلدی کچھ نہیں ہوسکتا...... وہ آہستہ آہستہ ہی اپنے صدمے سے نکلے گی۔''

''خیر یہ سب کچھ اتنی جلدی بھی نہیں ہے جگر! رخصتی وغیرہ تو رہی ایک طرف...... کل ایک ہرن اپنی جان پر کھیل کر تمہارے ولیمے کا سامان بھی کر چکا ہے۔ اچھے بچے شادی شدہ ہونے کے بعد اس طرح کچھوے کی رفتار سے نہیں چلتے۔''

وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا پھر اس نے مجھے اوپر کمرے میں بھیج دیا۔ یہ زیادہ بڑا کمرا نہیں تھا۔ دو پلنگ نما چارپائیاں تھیں۔ ایک طرف لکڑی کی الماری تھی۔ الماری کے اوپر لالٹین رکھی تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ نیم پختہ فرش پر ایک بوسیدہ نمدہ بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں مٹی کی انگیٹھی تھی جس میں انگارے سلگ رہے تھے۔ میں پلنگ نما چارپائی پر دراز ہوگیا۔ چہرے کی بڑھی ہوئی شیو کو کھجانے لگا...... 60 گھنٹے پہلے کے واقعات کسی فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ارجن کا زخمی ہوکر تالاب کی گہرائی میں گرنا اور پتھریلے مجسمے سے ٹکرا کر اس کا سر پاش پاش ہونا۔ دو اندھا دھند بھاگتے ہوئے پجاریوں کو گولیاں لگنا اور ان کا سنگی فرش پر لڑھکنیاں کھانا...... پھر ستیش اور اس کے ساتھیوں کا ہم پر اسلحہ تاننا اور ہمارا قدم قدم پیچھے ہٹتے چلے جانا۔ تناؤ کی وہ شدید ترین کیفیت جس میں کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہوسکتی تھی اور لاشیں گر سکتی تھیں۔ وہ سب کچھ میرے تصور میں آیا اور میں نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں محسوس کیں۔

مجھے پلنگ پر دراز ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ قدموں کی چاپ نے میرا دل دھڑکایا، پھر دروازہ کھلا اور سلطانہ اندر آگئی۔ اس کے گندمی چہرے پر پریشانی کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''لیٹے رہو...... لیٹے رہو۔''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تم ٹھیک ناہیں ہو۔'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ''تمہارا دوست کہہ رہا تھا کہ تمہیں ہچکی بھی آ رہی ہے۔ کیا تمہیں ہچکی آ رہی ہے؟''

''نہیں۔''

''تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ مجھے تسلی دینا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں بخار بھی ہے؟'' اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

''تم خود ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔''

وہ ذرا سا جھجکی پھر اس نے میرے بازو کو چھوا۔ ''بخار تو ناہیں ہے لیکن...... ہچکی تو آ رہی ہے نا...... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے...... کہیں تم پھر بیمار تو نہیں ہو رہے۔ اللہ رحم کرے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔'' وہ سرتاپا لرز سی گئی۔

اس کے چہرے اور ہاتھوں پر چوٹوں کے نشان اس بات کے گواہ تھے کہ وہ پچھلے چند دنوں میں بڑے سخت حالات سے گزری ہے لیکن اس وقت وہ اپنی ساری سختیاں بھول کر میرے لئے پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! تم خواہ مخواہ ہی خود کو فکرمند نہ کرو۔ میرے دوست نے ایسے ہی مذاق کیا ہے۔''

''اس طرح کا مذاق میری جان لے سکتا ہے۔'' وہ آبدیدہ ہوگئی۔

''کیوں...... ہچکی آ جانا کوئی بات خطرناک بات ہے؟''

''ہاں مہروج! تمہارے لئے خطرناک ہے...... پتا ناہیں کہ تمہیں یاد ہے یا ناہیں۔ تم بہت جیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ اتنے جیادہ کہ بس کیا بتاؤں۔ تمہیں جب کبھی بخار ہوتا ہے، میرے دماغ میں وہی باتیں آ جاتی ہیں۔''

''لگتا ہے کہ تم بہت واہمی ہو۔''

''ہاں...... تمہارے بارے میں شاید واہمی اِچ ہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں دھیان سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پچھلے ایک دو ہفتے میں نہایت کٹھن صورتِ حال سے گزری تھی۔ اس کے شفاف رخساروں پر ابھی تک چوٹوں کے مدھم نشان موجود تھے۔ مجموعی طور پر اس کے چہرے میں ایک خاص طرح کی سادگی اور کشش تھی۔ خاص طور

سے اس کے چوڑے رخساروں کی قدرے ابھری ہوئی ہڈیاں اور اس کی چوڑی پیشانی، نگاہ کو جذب کرتی تھیں۔ اس کے شانے کشادہ اور جسم چھریرا تھا۔ وہ بولی۔ ''دیکھو، کتنی عجیب بات ہے مہروج! آج یہاں کتنے عرصے بعد تاؤ انجل سے ہماری ملاخات (ملاقات) ہوگئی۔ تم نے تاؤ کو پہچان لیا ہے نا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا غلط۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات تو بتاؤ سلطانہ! یہاں کی تقریباً تمام عورتیں ہلکے پھلکے زیور پہنتی ہیں لیکن میں نے کبھی تمہیں زیور پہنے نہیں دیکھا؟''

''بس شروع سے ہی ایسا ہے۔ مجھے شوق ناہیں۔''

میں نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور اس کا چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں شوق نہیں یا تمہارے پاس زیور ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا چونکی۔

''کچھ نہیں، بس یونہی کہہ رہا تھا۔''

''بالو کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا اور اس کے ملیح چہرے پر ممتا کا گہرا دکھ جھلکنے لگا۔

''وہ بالکل خیریت سے ہے۔ دیوان میں صفیہ اور ہاشو اس کی بڑی اچھی دیکھ بھال کر رہے ہیں لیکن تمہاری کمی وہ بہت زیادہ شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی رو رو کر ہلکان ہو جاتا ہے۔'' میں نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑا۔

''تم اس کا بہت خیال رکھو مہروج!'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ دنیا کے جرموں کی سزا اپنے بچے کو مت دو۔ وہ تمہارے بغیر بہت دکھ اُٹھا رہا ہے۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ عاجز نظر آ رہی تھی۔

''تم کچھ نہ کرو۔ تم بس ایک ماں بن جاؤ...... اور ایک بیوی بن جاؤ۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اب وہ پہلے والا مہروز نہیں ہوں سلطانہ...... میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہوں اور تمہارے بدلے بھی چکا سکتا ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

اس نے سسک کر اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس کے گھنے بالوں کی عجیب سی دہقانی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ تھاما، اسے موڑا اور ہتھیلی کا رخ اپنے ہونٹوں کی طرف کر کے ہتھیلی کو چوم لیا۔ اس کے گرم ہونٹوں کے ریشمی لمس نے

میرے پورے بازو اور جسم میں پھریری سی دوڑا دی۔

''یہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ پھر اوپر اُٹھایا۔ ''بتاتی کیوں نہیں ہو...... کیوں چوما میرا ہاتھ؟''

اس نے پلکیں اُٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے اس کی بھیگی آنکھوں میں پہلی بار ایک ہلکی سی چمک یا مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ اپنے بائیں رخسار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس لئے۔''

''کیا مطلب؟''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، میں نے غور سے اس کے رخسار کو دیکھا۔ وہاں ابھی تک اس طمانچے کا مدھم نشان موجود تھا جو میں نے پرسوں اس کے رخسار پر مارا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تو تم اس لئے میری ہتھیلی چوم رہی ہو کہ میں نے تمہیں طمانچے مارے؟''

''کوئی اپنا سمجھ کر ہی ڈانٹتا اور مارتا ہے نا۔'' وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی۔

''اگر تم بھی مجھے اپنا سمجھتی ہو تو پھر...... مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ جو کچھ ہوا، سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اپنے دل و دماغ کی ٹھنڈا رکھو گو......''

''میں جانتی ہوں مہروج! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو لیکن...... مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وکھت دو۔ ابھی میرا دل ٹھکانے پر ناہیں ہے۔ اس میں تھوڑا وکھت لگیں گا۔''

''جتنا مرضی وقت لے لو۔ مگر سلطانہ! اتنا وعدہ تو کرو کہ مجھ سے مشورہ کئے بغیر اب کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اُٹھاؤ گی۔ تمہارے، دیوان سے اچانک گم ہو جانے کا جتنا صدمہ مجھے ہوا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں، چوہان اور انور خاں تمہیں دیوانوں کی طرح نل پانی کی گلیوں میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔''

''مجھے بہت دکھ ہے کہ میں نے ایسا کیا لیکن کیا کروں مہروج! کچھ بھی میرے بس میں ناہیں ہے۔ مجھے جب وہ سب کچھ یاد آتا ہے تو میرا دل جندہ رہنے کو ناہیں چاہتا۔''

''تمہیں اپنے بالو کے لئے زندہ رہنا ہوگا اور میرے لئے رہنا ہی ہوگا۔'' میں نے اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔ بالوں سے اُٹھنے والی دہقانی خوشبو فزوں تر ہو گئی۔ میں نے اس سیدھی سادی عام سی لڑکی کے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی۔ مجھے لگا کہ

اگر میں اس لڑکی سے دور رہوں گا، اسے ایک شوہر کی محبت نہ دے سکوں گا تو بہت بڑا جرم کروں گا۔ ایک ایسا جرم جس کے لئے قدرت مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میں نے اپنی انگلیاں بہت آہستہ سے اس کے بالوں میں چلائیں۔ اس کے شفاف رخسار کو چھونے کے لئے اپنے ہونٹوں کو آگے بڑھایا لیکن...... عین اس وقت جیسے ایک روشنی سی سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹی اور اس کے پورے سراپا کو ایک نامعلوم گریز نے ڈھانپ لیا۔

’’کیا ہوا سلطانہ؟‘‘

’’کچھ ناہیں۔‘‘ اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔ اس کی سانس قدرے تیزی سے چل رہی تھی۔ میں ٹھیک سے نہیں جان سکا کہ سانسوں کی یہ تیزی جذبات کے سبب ہے یا گریز کے سبب۔

تاہم مجھے ان سانسوں کی خوشبو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ جیسے یہ سانسیں کسی وقت میرے بہت قریب رہی ہیں۔ میرے کانوں میں سرسراتی رہی ہیں اور میرے رخساروں سے لپٹتی رہی ہیں۔ کب ہوا تھا ایسے؟ اور کب تک ہوتا رہا تھا؟ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ ایک دُھندلا سا پردہ تھا جس کے پیچھے سب کچھ چھپا ہوا تھا۔ یہ پردہ پہلے سے کچھ ہلکا ضرور گیا تھا لیکن اب بھی مجھے اس کے پار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ’’سلطانہ! ایسا کیوں کرتی ہو؟ میں تمہارا شوہر ہوں، تمہارے بچے کا باپ ہوں۔‘‘

اس کا سر جھکا رہا۔ دو موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر اس کی جھولی میں جذب ہو گئے۔ اس کے جسم میں وہی ہلکی سی لرزش نمودار ہو چکی تھی جو میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دیوان میں جب میں نے بالو کو زبردستی اس کی گود میں دیا تھا اور پھر اسے دودھ پلانے کے لئے کہا تھا تو وہ اسی طرح سرتاپا کانپنے لگی تھی۔

’’سلطانہ! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔‘‘ میں نے اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

’’مجھے معاف کر دو مہروج! بس مجھے معاف کر دو۔‘‘ اس نے تیزی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ کمرا خالی ہو گیا تھا۔

میں اپنی جگہ حیران بیٹھا رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کا ردِعمل ظاہر کرے گی لیکن وہ ریشم کی طرح نرم تھی تو کہیں فولاد کی طرح سخت بھی۔ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا تھا، اتنا ہی الجھ جاتا تھا۔

وہ رات عجیب سی بے چینی میں گزری۔ بس پچھلے پہر تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگی۔ میں اُٹھا تو ایک حیران کن منظر دیکھنے کو ملا۔ مہا گرو سوبھاش میرے لئے ایک ٹرے میں چائے لے کر آ رہا تھا۔ ساتھ میں گھر کے بنے ہوئے بسکٹ اور رس وغیرہ تھے۔ کچھ مٹھائی اور دودھ بھی تھا۔ چلتے ہوئے مہا گرو کی توند ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں تھا۔ بالائی جسم پر ایک ڈبی دار کمبل لپٹا ہوا تھا۔ گرو کے عقب میں گھاگھرے اور چولی والی ایک تیز تیکھی عورت تھی۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ اس نے ایک ہاتھ میں بالٹی اور دوسرے میں ایک بڑا سا لوٹا پکڑ رکھا تھا۔

میں نے مہا گرو کو دیکھ کر کہا۔ ’’یہ سب کیا ہے گرو جی؟‘‘

’’تمہارا ناشتا ہے۔‘‘

’’لیکن یہ آپ کیوں لے کر آئے ہیں؟‘‘

گھاگرے چولی والی کھنک دار آواز میں بولی۔ ’’یہ آپ کا سیوک ہے جی۔ آپ کی خاطر داری کرے گا۔ اس نے یہ کام اپنی مرضی سے چنا ہے۔ اس کی پتنی ادھر دوسری طرف عورتوں کی خاطر داری کرے گی۔‘‘

’’یہ تو زیادتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’زیادتی تو تب ہوتی جب یہ کام کرنے میں ان کی اپنی مرضی ناہیں ہوتی۔‘‘ گھاگرے چولی والی نے کمر لچکا کر کہا۔

میں نے گرو کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے نما چنگیر لے لی اور اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

’’ناہیں، میں کھڑا ہی ٹھیک ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔

وہ بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ عمران اور اقبال نے اسے یہاں یہ رول ادا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ پرسوں صبح سویرے گرو اور رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ زندہ رہنے کے لئے بلکتے رہے تھے...... گرو اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا تھا اور عمران کے قدموں پر سر رکھ کر کہا تھا کہ اگر اس کا جیون بخش دیا جائے تو وہ عمر بھر غلام بن کر رہے گا۔

اور آج وہ واقعی غلام دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے میرے دل میں گرو کے لئے ترس کا جذبہ ابھرا...... لیکن پھر فوراً ہی ایک چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور یہ جذبہ معدوم

ہو گی۔ یہ شکیلہ کا اجڑا بجڑا چہرہ تھا۔ ہونٹوں پر پڑیاں جمی ہوئی، آنکھوں میں کھنڈروں کی
ویرانی...... جسم پامال۔ وہ اسی گرو کے استھان میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتی رہی تھی اور پھر
خود اپنی قبر کھود کر اس میں دفن ہو گئی تھی۔ یہ نام نہاد گرو کتنا بھی انکار کرتا لیکن وہ خود کو اس
انسانیت سوز جرم سے علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیز طرار لڑکی نے گرو کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے موٹے! چل
منہ ہاتھ دُھلا بابو جی کا۔'' لڑکی نے کھلے منہ والی بالٹی چارپائی کے سامنے رکھ دی اور گرم پانی
والا لوٹا گرو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

گرو لوٹا لے کر میری طرف جھک گیا۔ میرے دل میں عجیب سی بیزاری پیدا ہوئی۔ میں
نے لوٹا گرو کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''تم جاؤ یہاں سے۔ تمہاری
صورت دیکھتا ہوں تو تمہارا ظلم یاد آتا ہے۔''

لڑکی نے چمک کر کہا۔ ''اوئی ماں...... بابو جی! تم تو بڑا اچھا ڈائیلاگ بولتا ہے۔ بالکل
امیتابھ بچن کی طرح۔''

''تم کون ہو؟'' میرے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔

''میرا نام نوری ہے جی۔ میں عمران بابو کی نوکرانی ہوں...... بلکہ آپ مجھ کو ان کی لونڈی
بھی کہہ سکت ہیں۔''

''لونڈی؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''ہاں جی، عمران بابو نے مجھے پیسے دے کر خریدا ہے۔ کھیا کے بڑے بیٹے سلمان
سے...... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ عمران بابو بڑے نیک بندے ہیں۔ بالکل فرشتہ ہیں فرشتہ۔
کبھی میلی نظر سے ناہیں دیکھا مجھے اور نہ کسی دوسرے کو دیکھنے دیوت ہیں۔ کہتے ہیں کوئی اچھا
سا بر دیکھ کر تیرا بیاہ کروں گا۔ وہ ہر کسی کا بھلا سوچت ہیں۔ میرے جیسی نیچ کمینی کے لئے بھی
ان کی سوچ ایسی ہی ہے۔'' وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

''اچھا ابھی تم جاؤ۔ میں ناشتا کر لوں گا تو برتن لے جانا۔''

''آپ اکیلے ہی ناشتا کریں گے؟''

''تو کیا تجھے ساتھ بٹھا کر کروں گا؟'' میں نے تپ کر کہا۔

''اوئی ماں! آپ تو غصے بھی ہوتے ہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اتنا سارا ناشتا آپ اکیلے
کیسے کریں گے؟''

میں نے غور کیا، واقعی ناشتا زیادہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ عمران اور اقبال بھی آنے والے

''اس لئے کہ آپ نئے آئے ہیں۔''

عمران جھٹ بولا۔ ''اور تم نے وہ گانا تو سنا ہی ہوگا۔ بمبئی سے آیا میرا دوست...... دوستو
سلام کرو۔''

''لیکن میں بمبئی سے نہیں آیا اور نہ مجھے فضول بکواس پسند ہے۔''

''یار! دیکھو تم نے پھر ایک لفظ ضائع کر دیا۔'' عمران نے اعتراض کیا۔ ''بکواس تو ہوتی
ی فضول ہے...... اس کے ساتھ فضول لگانے سے مطلب؟''

حلوہ میرے سامنے رکھتے ہوئے نوری گھٹنوں کے بل جھک گئی تھی۔ گردن سے نیچے
س کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔

''چلو، جاؤ تم۔'' اقبال نے نوری سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

وہ اُٹھی اور ''اوئی ماں'' کہتی ہوئی ایک دم لڑکھڑا گئی۔ سہارے کے لئے اس کا ہاتھ بے
ساختہ میرے کندھے پر آیا۔ اس کے بال لہرا کر میرے چہرے سے ٹکرائے۔ ان میں چنبیلی
کے تیل کی خوشبو تھی۔

''مم...... ماف کر دیں جی...... پھسل گئی تھی۔''

''تمہارا پھسلنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب جاؤ۔'' اقبال نے پھر تحکم سے کہا۔

وہ مجھ پر ترچھی نظر ڈالتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔ ''یہاں کا کھیا رشید احمد بڑا جابر قسم کا شخص ہے۔
اس کے دو بیٹے ہیں سلمان اور مستان عرف مانی۔ یہ دونوں بھی اوّل درجے کے تلنگے اور
بدمعاش ہیں۔ یہ لڑکی نوری دراصل سلمان کی رکھیل تھی۔ اس نے خانہ بدوشوں کو پیسے دے کر
اسے خریدا تھا۔ یہ وہاں رشید کی حویلی میں گناہ کی زندگی گزار رہی تھی لیکن اس کے دل میں ہر
عورت کی طرح یہ خواہش موجود تھی کہ یہ اپنا گھر بسائے۔ یہ خواہش صرف اس صورت میں
پوری ہو سکتی تھی جب یہ سلمان کی غلامی سے نکلتی۔ میں نے کوشش کی اور بیس ہزار روپے نقد
دے کر اسے سلمان سے حاصل کر لیا۔''

''لیکن رابن ہڈ صاحب! یہ بیس ہزار روپے تمہیں ملے کہاں سے؟''

''یہ تم نے بہت بونگا سوال پوچھا ہے۔ تمہیں پتا ہونا چاہئے کہ جہاں عمران موجود ہو،
وہاں پیسا خود بخود پہنچ جاتا ہے۔ یعنی دولت مابدولت کے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی۔'' وہ
سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

اقبال نے شوخی سے کہا۔ ''مزے کی بات یہ ہے کہ عمران نے کھیا کے بیٹے سے لڑکی کو

ہیں۔ اسی دوران میں وہ دونوں دروازے پر نمودار ہو گئے۔ نوری ذرا شوخی سے بولی۔ ''لو جی، ناشتے میں آپ کے ساجھے دار آ گئے۔ اب میں جاوت ہوں۔'' وہ کمر لچکاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''کیسے ہو جگر؟'' عمران نے میرے سر کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''یہ بلا کون تھی؟'' میں نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''اچھی بھلی خوب صورت لڑکی کو بلا کہہ رہے ہو۔ کیا تم نے خدا کو جان نہیں دینی؟'' عمران بولا۔

''میں نے تو خدا کو جان دینی ہے لیکن تم نے کس کو دینی ہے جو یہاں فتح پور میں لڑکیاں خریدتے پھرتے ہو۔''

''میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ مجھ سے ایسی بات مت کرو۔ ہر خبر کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر خبر بے مطلب ہوتی ہے۔ تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہے کہ میں نے اس کو خریدا ہے لیکن کیسے خریدا ہے اور کیوں؟ اس بات کا پتا چلے گا تو تمہاری رائے بدل جائے گی۔''

خیر، یہ تو مجھے پتا ہے کہ تم رابن ہڈ کی نسل سے ہو لیکن رابن ہڈ بھی تو انسان ہی تھا اور انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ایسی خطرۂ ایمان لڑکی کو خریدو گے اور وہ داسی بن کر تمہارے آس پاس رہے گی تو پھر کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

ایک دم اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ اپنے خوب صورت دانتوں کی نمائش کر کے بولا۔ ''ہمارے ساتھ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے جگر! اب اور کچھ نہیں ہو گا اور اگر ہو گا تو بس مذاق ہو گا۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک بار پھر دل نے گواہی دی کہ عمران اپنے اندر کوئی سربستہ راز چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی درد بھری کہانی۔ کوئی انوکھی کتھا، کوئی المیہ یا حادثہ......!

اسی دوران میں نوری نامی وہ لڑکی پھر کمر لچکاتی وہاں پہنچ گئی۔ وہ کچھ تازہ بہ تازہ پراٹھے اور انڈوں کا حلوہ لائی تھی۔ وہ انڈوں کا حلوہ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''تابش بابو! یہ خاص آپ کے لئے ہے۔''

''خاص میرے لئے کیوں؟'' میں نے بھویں اچکائیں۔

چھڑانے کے لئے کھیا سے ہی پیسے دلوائے ہیں۔ یعنی وہ بیس ہزار روپیا کھیا کی گرہ سے ہی نکلا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جیسے اس طرح کے بہت سے دوسرے کام ہمارے ہیرو صاحب نے کئے ہیں۔ آخر اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہا جاتا۔''

پھر اس نے تفصیل بتائی۔ پتا چلا کہ یہاں اس بستی میں تماشا دکھانے والے کچھ بازی گر آئے تھے جنہیں یہاں نٹ کہا جاتا ہے۔ وہ تنے ہوئے رسے پر چل کر دو چار کرتب دکھاتے تھے...... کھیا اور اس کے یار دوست ایک بازی گر کے کرتب دیکھ کر واہ واہ کر رہے تھے۔ عمران نے کہا کہ وہ بھی ایسا کر کے دکھا سکتا ہے۔ کھیا نہ مانا۔ تکرار ہوئی اور شرط لگ گئی۔ کھیا کو پتا نہ تھا کہ عمران پیشہ ور جمناسٹر ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر مہارت دکھا سکتا ہے۔ عمران نے رسے پر چل کر دکھایا اور سیکڑوں لوگوں کے سامنے پچیس ہزار روپے کی شرط جیت لی۔ بعد میں اس نے جیتی ہوئی رقم میں سے بیس ہزار روپے دے کر لڑکی کو آزاد کرایا۔

سارا دن مجھے سلطانہ کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ ڈر تھا کہ وہ اپنی جذباتی کیفیت میں پھر کوئی الٹی پلٹی حرکت نہ کر بیٹھے۔ عمران مجھ سے رات کی ملاقات کا احوال پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مختصر لفظوں میں بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ اس نے میرے لتے لینے شروع کر دیئے۔ مجھے نکما، گاؤدی، ہونق اور پتا نہیں کیا کیا قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سلطانہ کے سامنے خود کو بیمار ظاہر نہ کر کے غلطی کی ہے۔ اگر میں اس کی ہدایت کے مطابق سلطانہ کو ہچکیاں وغیرہ لے کر دکھاتا تو سلطانہ کا ردِ عمل یکسر مختلف ہونا تھا۔

میری اور عمران کی گفتگو کے دوران میں ہی ہمیں طلال اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے شکن شکن پاجامہ کرتہ پہن رکھا تھا، اوپر سویٹر تھا اور کمبل کی بکل مار رکھی تھی...... اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ لڑکا سلطانہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار اہم افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ طلال کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے طلال؟'' میں نے محبت سے پوچھا۔

''خالہ صبح سے رو رہی ہے۔ اس نے کھانا بھی ناہیں کھایا۔''

''کیا کہتی ہے؟''

''کچھ بھی ناہیں۔'' طلال سادگی سے بولا۔

"چلو آؤ میرے ساتھ۔" میں نے کہا اور طلال کو لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

تاؤ افضل بیرونی دروازے کے پاس لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں لاٹھی تھی۔ میں اور طلال ایک اندرونی کمرے میں پہنچے۔ سلطانہ کے ساتھ تاؤ افضل کی دونوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ وہ پردہ کرتی تھیں۔ میری آمد کا جان کر وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ طلال بھی کمرے سے باہر ہی رک گیا۔ سلطانہ کروٹ لئے چارپائی پر لیٹی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں ٹخنے زخمی تھے اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ پٹیاں استھان میں ہونے والے ظلم کی ایک نشانی تھیں۔ استھان میں سلطانہ کی حیثیت ایک خطرناک قیدی کی تھی۔ اسے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر رکھا گیا تھا۔ زنجیروں کی رگڑ نے اس کے ٹخنوں کو مجروح کر دیا تھا۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟" میں نے گہرے سنجیدہ لہجے میں سوال پوچھا۔

"وہ......بس......دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔"

"تم خود کو تماشا بنا رہی ہو اور اس کے ساتھ مجھے بھی۔" میرے لہجے میں غصہ در آیا۔

وہ کانپ گئی۔ "ایسا نہ کہو مہروج! اللہ نہ کرے میری وجہ سے آپ تماشا بنیں۔ آپ کی محبت کے لئے تو میں جان دے سکتی ہوں۔"

"طلال!" میں نے آواز دی۔

"جی خالو۔" اس نے مجھے نئے خطاب سے نوازا اور جلدی سے اندر آ گیا۔

"کھانا منگواؤ۔" میں نے کہا۔

وہ "جی اچھا" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ سلطانہ اپنی جگہ بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔ اس کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک راجپوت تھی۔ اس کے خانوادے کی رگوں میں ایک جوشیلا خون تھا اور اس خون میں ایک خاص قسم کی آن بان تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ کسی طور بھی اس کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد نوری اپنی چوڑیاں چھنکاتی اور کمر لچکاتی اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی چنگیر نما ٹرے تھی۔ میرے اشارے پر اس نے کھانا سلطانہ کے سامنے رکھا اور بولی۔ "لو جی، اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور نوری جو کچھ کرت ہے، جی جان سے کرت ہے۔"

میں نے تحکمانہ انداز میں سلطانہ کو کھانے کا کہا تو وہ لقمہ توڑنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے بھی اس کا تھوڑا سا ساتھ دیا۔ اسی دوران میں نوری پھر وارد ہو گئی۔ وہ پانی لے کر آئی تھی۔

بڑے انداز سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "بابو جی! یہ سالن بھی ذرا چکھ کر دیکھو۔ میں نے خود بنایا ہے۔ یہ ڈولا مچھلی ہے۔ مچھلی تو بہت ساری ہووت ہیں لیکن ڈولے کی تو بات ہی اور ہووت ہے جی۔ اس کو کاٹ ڈالو، تب بھی اس کی بوٹیاں پھڑکتی رہتی ہیں۔ وہ کہاوت تو آپ نے سنی ہی ہووے گی۔ ڈولا جب مچھیرے کے جال میں آ جاوت ہے تو اپنی ماں سے کہوت ہے کہ ہانڈی میں پکنے تک میرے واپس آنے کی امید رکھنا۔"

"اچھا، اب تم جاؤ۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"لیکن آپ ایک نوالہ میرے سامنے لے لو جی۔ مجھے پتا چل جاوے گا کہ میں نے کیسا پکایا ہے۔"

میں نے نوالہ لیا اور کہا۔ "بہت اچھا ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "بھوک کے ساتھ تو سب ہی کھالیوت ہیں لیکن اگر عورت کے ہاتھ میں کرامات ہو تو پھر مرد بھوک کے بغیر بھی کھاوت ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ عورت اپنی ہوشیاری سے اسے بھوک لگا دیوت ہے۔" وہ پتا نہیں کس بھوک کی بات کر رہی تھی۔

"اچھا، اب تم جاؤ۔" میں نے طیش بھرے انداز میں کہا۔

"اوئی ماں! آپ تو بڑی جلدی غصہ ہو جاوت ہیں۔"

"میں بڑی جلدی ہاتھ بھی اُٹھا لیتا ہوں۔"

"اُف ماں! آپ تو واقعی بڑے کڑک ہیں۔" اس نے پھر معنی خیز انداز اختیار کیا اور مجھ پر ترچھی نظر ڈال کر باہر چلی گئی۔ سلطانہ ذرا چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

کچھ دیر بعد میں واپس جانے کے لئے برآمدے سے گزرا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گرو کی سندر پتنی رادھا ایک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ اسے اور گرو کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ جس بارودی بیلٹ کے ڈراوے میں آ کر وہ اور گرو در بدر ہوئے ہیں اور ایک بڑی آفت میں پھنسے ہیں، اس بیلٹ میں پسے ہوئے نمک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں عمران اور اقبال کے پاس پہنچا تو وہ کمرے میں انگیٹھی دہکائے بیٹھے تھے۔ پرسوں راستے میں جیپ سے پکڑا جانے والا راہول بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بڑی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ کراہ کر بات کر رہا تھا۔ وہ طاقتور واکی ٹاکی بھی اس کے قریب رکھا تھا جو ہمیں جیپ میں سے ملا تھا۔ واکی ٹاکی آن تھا لیکن پرسوں رات کی طرح آج بھی اس سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال کل بھی کوشش کرتے رہے تھے مگر اس واکی ٹاکی کے ذریعے کسی سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔

عمران نے راہول سے کہا۔ ''دیکھو، سچ بولو گے تو تمہاری نسل آگے چلے گی، ورنہ آج اسی جگہ وہ سارے بچے اور ان کے بچے بھی ختم ہو جائیں گے جنہوں نے تمہاری وجہ سے پیدا ہونا ہے...... ہنسنا کھیلنا ہے اور زندگی کے مزے لینے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کی تھوڑی سی جھلک راہول کو دکھائی اور اسے یہ بھی باور کرایا کہ اس نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی ہے۔

راہول نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''میں سچ کہوت ہوں، پانڈے صاحب اور دوسرے لوگن کے پاس دوسرا انٹینا نا ہیں ہے۔ بس ایک یہی انٹینا تھا جو ہم نے جیپ میں رکھا ہوا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوگن ابھی تک یہاں نا ہیں پہنچے۔ اگر وہ سگنل ریسیو کر رہے ہوتے تو کب کے آپ سب کو گھیر چکے ہوتے۔''

''اچھا، یہ واکی ٹاکی اب تک خاموش کیوں ہے؟'' اقبال نے راہول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی دو وجہ ہو سکت ہیں۔ یا تو پانڈے صاحب اور دوجے لوگن ہم سے پندرہ بیس کلو میٹر سے زیادہ کی دوری پر ہیں یا پھر ان کے واکی ٹاکی کی بیٹری ختم ہو چکی ہے۔''

''اگر تمہارے والے سیٹ کی بیٹری ابھی ختم نہیں ہوئی تو اس کی کیسے ہو سکتی ہے؟'' اقبال نے سوال اُٹھایا۔

''اس سیٹ کی بیٹری میں پہلے بھی مسئلہ تھا۔'' راہول نے کہا۔

''اگر واقعی بیٹری ختم ہو چکی ہے تو کیا پانڈے وغیرہ اسے دوبارہ چارج کر سکتے ہیں؟''

''ہاں...... میرا اوچار ہے کہ وہ کوشش کر رہے ہوں گے۔ پانڈے صاحب کے ساتھیوں میں کشور نام کا ایک الیکٹریشن بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے گاڑی کے چارجر کے ساتھ کچھ تار لگا کر واکی ٹاکی چارج کر لیا تھا۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک کرشمہ ہو گیا۔ اچانک لونگ رینج کے اس واکی ٹاکی پر ایک سرخ بلب روشن ہوا اور اس کے اسپیکر میں کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے تیز شائیں شائیں سنائی دیتی رہی پھر اقبال نے ایک ناب کو دائیں بائیں گھمایا تو واضح انسانی آواز ابھر کر ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''ہیلو...... ہیلو...... کہاں ہو تم لوگ...... ہیلو۔''

میں اس آواز کو بہ آسانی پہچان گیا۔ یہ منحوس لب و لہجہ پانڈے کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔

آواز پھر ابھری۔ ''ہیلو راہول...... ہیلو دلیپ...... ہیلو، میں پانڈے بول رہا ہوں۔ تم

میری آواج سن رہے ہو نا؟''

مجھے دوسرا شاک لگا جب راہول کے بجائے اقبال نے پانڈے کے سوال کا جواب دیا لیکن یہ آواز ہو بہو راہول کی تھی۔ اقبال نے کہا۔ ''ہاں پانڈے صاحب! میں راہول بات کر رہا ہوں۔''

''یار! کہاں مر گئے تھے تم۔ ہم تمہارے انتجار میں سوکھ کر لکڑی ہو گئے ہیں۔ ماں قسم اتنا انتجار فلمسٹار جی نت امان کا کیا ہوتا تو وہ بھی اپنے بستر میں گھس آتی۔ پورے چھتیس گھنٹے ہو گئے ہیں تمہاری جان کو روتے ہوئے۔''

''بس ملاقات ہوتی ہے تو ساری ڈیٹیل آپ کو بتاتے ہیں۔ یہاں بڑا اپلڑا ہو گیا ہے۔''

''کیا چھوٹے سرکار راجیت صاحب کی بہن نے بکری کا بچہ جن دیا ہے جنگل میں؟''

''بس ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔'' اقبال نے ہو بہو راہول کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

یہ تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اقبال مختلف آوازوں کی شاندار نقل کرتا ہے۔ اس نے لاہور میں بھی سیٹھ سراج کی آواز کی زبردست نقل کی تھی اور جب ہم عمران کے گھر میں تھے تو اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز میں مولانا ابرار کو فون کر کے اس سے اہم معلومات حاصل کی تھیں لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح واکی ٹاکی کے اچانک جاگنے پر وہ فوراً ہی راہول کی آواز میں گفتگو شروع کر دے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اور اقبال نے اس کے لئے پہلے سے تیاری اور ریہرسل وغیرہ کر رکھی تھی۔ راہول کی آواز سن کر اس کی کاپی کرنے میں اقبال کو دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔

''یار! کچھ منہ سے پھوٹو گے یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے؟'' پانڈے نے ذرا کرخت آواز میں کہا۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ کس جگہ پر ہیں؟'' اقبال نے راہول کی آواز میں پوچھا۔

پانڈے نے کہا۔ ''ہم نے لکڑی کی چھوٹی پلیا پر سے ندی پار کر لی ہے۔ سامنے جو دو بڑے ٹیلے نجر آ رہے تھے، ان کے بالکل پاس ہیں۔ کل رات بھی اسی جگہ پر گزاری ہے، تم دونوں کے نام کی مالا جپتے جپتے...... اب تم بتاؤ کچھ کھوج کھرا ملا اس پاکستانی پو کا؟''

''لگتا ہے کہ پو کی قسمت اچھی ہے پانڈے صاحب...... بس شکنجے میں آتے آتے نکل گیا ہے۔ کل صبح تک ہم کو بڑے اچھے سگنل مل رہے تھے۔ وہ کچے کی طرف جا رہا تھا۔ شام کے وقت سگنل بالکل کمزور پڑے اور پھر بند ہو گئے۔ رات پچھلے پہر پھر ایک آدھ گھنٹے کے لئے سگنل ملے، اب پھر کوئی پتا نا ہیں چل رہا۔ اب جیپ کا ڈیزل بھی ختم ہونے کو ہے۔ میرا

خیال ہے، ہم اور آگے ناہیں جا سکیں گے۔“

”کوئی اچھی جانکاری نہ دینے کی تو شاید تم نے سوگند کھا رکھی ہے۔“ پانڈے کی آواز میں بیزاری تھی۔ پھر وہ کچھ بڑبڑایا۔ شاید اس نے موجودہ صورتِ حال کو کوئی غلیظ گالی دی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ یہ گفتگو میرے بارے میں ہو رہی ہے۔ وہ میرے لئے بڑی حقارت سے پپو کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ حالانکہ یہ پپو اسے دیوان میں ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔

پانڈے نے اپنے کسی ساتھی سے بات کی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکے۔ تب وہ راہول سے مخاطب ہو کر مائیک میں بولا۔ ”راہولے! اس پپو نے ہم کو چیلنج مارا ہے۔ جب تک اسے ننگا کر کے الٹا نہ لٹکاؤں گا، مجھے بھوجن ہضم ناہیں ہووے گا اور نہ ہی حاجت ہووے گی۔ جیسے بھی ہو، ہم نے اس کتے کو پکڑنا ہے اور اس کے جسم کے کسی ناجک حصے کو دبوچ کر اسے کھینچتے ہوئے یہاں لانا ہے۔“

”لیکن اس کے لئے ہم کو تھوڑا سا دھیرج کرنا پڑے گا پانڈے صاحب! معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”پہلے آپ ذرا جلدی سے مجھے یہ بتائیں کہ آپ سے رابطہ کیوں ناہیں ہو پا رہا تھا؟“ اقبال نے راہول کی آواز میں پوچھا۔

”وہی بھوتنی کی بیٹری ٹھس ہو گئی تھی۔ پہلے ہر ایک گھنٹے بعد پاؤں بھاری ہو جاتا تھا پھر بالکل لمبی ہی لیٹ گئی۔ بڑی کوشش سے ٹھیک کیا ہے کشور نے...... اب پتا ناہیں پھر کب حاملہ ہو جائے۔“ پانڈے نے بیٹری پر غصہ نکالتے ہوئے کہا۔

اقبال نے راہول کی آواز میں کہا۔ ”پانڈے صاحب! ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے نل پانی کے دو مُسلے سپاہی پکڑ ہیں۔ پہلے تو وہ کچھ بتاوت ناہیں تھے۔ اب دس پندرہ منٹ پیٹھ پر جوتوں کی ٹکور کرانے کے بعد انہوں نے زبان کا تالا کھولا ہے۔ آپ اس وقت سخت خطرے میں ہو جی۔ ہمارا وچار ہے کہ آپ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاویں، اتنا ہی اچھا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں سے روانہ ہونے کے لئے آپ کے پاس آدھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت ناہیں ہے۔“

”یار! کیا بک رہے ہو؟“

”میں تفصیل آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کو جانکاری مل گئی ہے کہ آپ چھوٹی پلیا کے آس پاس موجود ہیں۔ آپ کو گھیرے میں لینے کے لئے ایک بڑا جتھا

آپ کی طرف آ رہا ہے۔ پکڑے جانے والے دونوں لڑکوں نے بتایا ہے کہ یہ کم از کم ڈیڑھ سو گھڑ سوار ہیں۔ تین چار جیپیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ چھوٹے سرکار یہ سمجھتا ہے کہ مختار راجپوت کی لونڈیا اب بھی ہمارے پاس ہے۔ وہ اسے ہم سے چھڑانا چاہت ہے۔“

”تم...... تم اس سمے ہو کہاں؟“ پانڈے کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”میں اس سمے اپنی لوکیشن کے بارے میں ٹھیک سے کچھ کہہ ناہیں سکتا۔ بس چاروں طرف درخت ہی درخت ہیں۔“ اقبال بڑے اعتماد سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

”یعنی تم اس سمے بالکل کھلی جگہ پر ہو؟“

”جی ہاں۔“

”کوئی آبادی کوئی مکان وغیرہ دکھائی ناہیں دیتا؟“

”ناہیں...... اور میں آپ کو پھر کہہ رہا ہوں، آپ باتوں میں سمے ضائع نہیں کریں۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، زرگاں کی طرف رخ کر لیں۔“

”اور تم دونوں؟“

”ہماری زیادہ چنتا ناہیں کریں۔ ہم بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جاویں گے۔“

”جو دونوں لڑکے تم نے پکڑے ہیں، کیا ان سے ایک منٹ میری بات کرا سکت ہو؟“

”ٹھیک ہے میں کرا دیتا ہوں لیکن آپ کے پاس ٹائم......“ اس کے ساتھ ہی اقبال نے بٹن دبا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ چونکہ فقرے کے درمیان منقطع ہوا تھا، دوسری طرف یقیناً یہی سمجھا گیا ہو گا کہ کسی وجہ سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے اس کے سینے پر ہلکا سا گھونسا جما کر اسے داد دی۔ یقیناً وہ تعریف کے قابل تھا۔ خود راہول بھی اس کی کامیاب نقالی پر حیران نظر آ رہا تھا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، فقروں کی بناوٹ، لفظوں کا چناؤ...... سب کچھ پرفیکٹ تھا۔

راہول کو باہر بھیج دیا گیا۔ عمران کافی حد تک مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ”چلو، اس دوسری بلا سے بھی جان چھوٹی۔“

”وقتی طور پر۔“ اقبال نے فقرہ مکمل کیا۔

”اور پہلی بلا سے کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! اتنی جلدی بھول گئے۔ استھان کے وہ سارے جنونی بلاؤں سے کم تو نہیں تھے۔

اگر پرسوں رات جنگل میں ان سے ٹاکرا ہو جاتا تو پانی پت کی تیسری لڑائی ہو جانی تھی۔''

''لیکن وہ جنونی ابھی ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ہم تک پہنچیں گے نہیں۔'' عمران نے وثوق سے کہا۔''ابھی تم دو چار دن آرام فرماؤ۔ ہماری بھابی کے ہاتھ کی گرم گرم روٹیاں کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔'' آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

رنجیت پانڈے کی منحوس آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی...... عمران نے میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔''یار! یہ پانڈے کیا شے ہے؟ بڑا چرچا سنا ہے اس کا۔ کہتے ہیں کہ حکم جی کی مونچھ کا بال کہلاتا ہے۔''

''اقبال بولا۔''ظاہر ہے بھائی! جو شخص میڈم صفورا اور مولانا ابرار جیسے بندوں کو مرغیوں کی طرح دبوچ کر پاکستان سے انڈیا لا سکتا ہے، وہ معمولی چیز تو نہیں ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تابی نے اتنی محبت کیوں ہے اسے۔ بڑی شفقت سے اس کا نام لے رہا تھا۔''

''میرا اندازہ ہے کہ ماضی قریب میں کہیں تابی نے اس کی دُم پر پاؤں رکھا ہے یا شاید دُم اکھاڑنے کی کوشش ہی کی ہو۔''

عمران اور اقبال سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

میں نے انہیں مختصر الفاظ میں اس زوردار جھڑپ کے بارے میں بتایا جو نل پانی کے دیوان میں میرے اور پانڈے کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جھڑپ میں تو پانڈے کو کامیابی نہیں ملی تھی لیکن وہ جاتے جاتے ایک بڑا نقصان پہنچا گیا تھا۔ اس کے رکھے ہوئے بم نے پھٹ کر دیوان میں کئی افراد کی جان لے لی تھی۔

عمران اور اقبال نے بڑی دلچسپی اور حیرت سے یہ روداد سنی۔ عمران نے میرے بازوؤں کے مسل تھپتھپاتے ہوئے کہا۔''اقبال! میں تجھ سے کہتا تھا نا، اپنے تابی کی جون بدل چکی ہے۔ اب یہ ہم سے دو ہاتھ آگے ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمیں اس کی شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔ پہلوانی کے سارے داؤ پیچ اس سے سیکھنے پڑیں گے پھر جب کہیں کوئی دنگل ہوگا تو پوسٹرز پر میرا اور تمہارا نام اس طرح لکھا جائے گا۔ اقبال پٹھا عمران، پٹھا تابش، پٹھا باروندا جیکی نیپال والا، پٹھا فلاں فلاں۔''

اقبال مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔''مذاق تو رہا ایک طرف، ویسے یار تابش! تم بہت

تبدیل ہوئے ہو۔ میں سچ مچ حیران ہوتا ہوں...... اب بھی تم نے سخت سردی میں صرف یہ ایک قمیص پہن رکھی ہے۔ آج صبح تم نے ٹھنڈے پانی سے ہی نہانا شروع کر دیا تھا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ جس تابش سے ہم لاہور میں ملے تھے، وہ کوئی اور تھا...... اب جو تابش ہمارے سامنے ہے، وہ کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر بھٹکنے والا کوئی درویش ہے جو دن رات چلہ کشی کی تکلیفیں اُٹھانے میں سکون محسوس کر رہا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اب تکلیف میں راحت ملنا شروع ہو گئی ہے۔ میں بڑ نہیں مار رہا ہوں۔ مجھے اب سردی محسوس ہی کم ہوتی ہے۔''

اقبال نے میرے ہاتھ تھامے اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھوں کی رنگت گندمی ہو چکی تھی۔ ہاتھوں کی گانٹھوں پر چنڈیاں سی پڑ گئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی کھال بتدریج سخت اور موٹی ہو گئی تھی۔ سینڈ بیگ پر میں نے اتنی زیادہ مشق کی تھی کہ اب ٹھوس دیوار پر بھی مکا چلا سکتا تھا۔

اقبال بولا۔''جو کچھ بھی ہے، میں تمہارے اس فلسفے سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں کر پا رہا۔ اگر قدرت نے ہمیں کچھ آسانیاں دی ہوئی ہیں تو ہمیں ان سے فائدہ اُٹھانا چاہئے...... زندگی جینے کے لئے ہے، خود کو مسلسل تکلیف میں ڈالے رکھنے کے لئے نہیں۔''

''لیکن یہ بات تو ہے نا کہ کچھ بھی مسلسل نہیں رہتا...... تکلیف نہ خوشی۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مسئلہ تو صرف یہ ہے کہ ہم کتنی خوشی پانے کے لئے کتنی تکلیف اُٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم کچھ زیادہ ہی کتابی باتیں نہیں کرنے لگے ہو۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''یار اقبال! یہ اپنا جگر بڑی گہری بات کر رہا ہے۔'' عمران نے مداخلت کی۔''کسی وقت دھوپ میں بیٹھ کر، سگریٹ سلگا کر اور سامنے کڑک چائے رکھ کر اس کی بات پر غور کریں گے۔''

اسی دوران میں ایک قریبی کمرے میں رونے کی آواز آئی۔ یہ مردانہ آواز تھی۔''میرا خیال ہے کہ یہ گرو ہے۔'' عمران نے کہا۔

ہم اُٹھ کر گرو کے پاس پہنچے۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں منہ دیئے کھڑا تھا اور ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ ہر ہچکی کے ساتھ اس کی توند ہلتی تھی اور توند کے ساتھ پورا جسم بھی دہل جاتا تھا۔ اس کی پتنی رادھا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ اپنے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ اپنے پتی کو دلاسا دینے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ نوری بھی وہیں موجود تھی۔

"کیا ہوا ہے تمہارے گرو کو؟" عمران نے رادھا سے پوچھا۔

وہ بس منہ میں منمنا کر رہ گئی۔ اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

نوری بولی۔ "میں بتاتی ہوں جی...... اس موٹے کو رلانے کا کارنامہ میں نے انجام دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" عمران نے پوچھا۔

"دراصل جی، ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا ناہیں تھا کہ یہ خبر اس طرح ٹھاہ کر کے اس موٹے کی چھاتی پر لگے گی اور یہ یوں بھوں بھوں رونا شروع کر دیوے گا۔ خبر یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بستی میں اطلاع پھیلی ہے کہ نل پانی کی بڑی پھلواری کے پاس کسی پرانے استھان میں دُرگھٹنا ہوگئی ہے۔ مندر کے بارہ سیوکوں کو کسی نے زہر دے کر مار دیا ہے اور کچھ لوگن کو اغوا بھی کر لیا ہے۔"

میں، عمران اور اقبال چونک گئے۔ عمران نے پوچھا۔ "یہ خبر پہنچائی کس نے ہے؟"

"ٹھیک سے تو پتا ناہیں عمران بابو کسی مسافر نے ہی پہنچائی ہوگی۔ بس اتنی جانکاری ہوئی ہے کہ قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لئے استھان کے بہت سے لوگن جنگل میں گھوم رہے ہیں اور کچے کے آس پاس والی بستیوں کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

عمران اشک بار گرو کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور اس کی توند کو ٹھوکا دے کر بولا۔ "یہ کیا تماشا لگا رہے ہو؟ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب تمہارے رونے دھونے سے کیا فائدہ ہو گا؟"

گرو آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ بولا۔ "تم لوگن نے مجھے برباد کر دیا۔ میرے ہاتھوں سے بارہ ہتھیائیں ہوگئیں۔ بھگوان کے اتنے سارے سیوک مارے گئے۔ اب میرا کیا ہووے گا۔ یہ لوگن مجھے جینے دیں گے نہ مرنے۔"

عمران نے گرو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ تم نے خود ہی تو اس دن اشلوک پڑھا تھا کہ بندے کے ہر کام کو اس کی نیت سے جانچا جاتا ہے۔ تمہاری نیت کسی کو مارنے کی نہیں تھی۔ تم ان لوگوں کو صرف بے ہوش کرنا چاہتے تھے...... اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ایک بے گناہ لڑکی کو زندہ جلنے سے بچایا جا سکے۔ ان لوگوں کا جیون پورا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کرموں کا حساب دینے کے لئے بھگوان کے پاس پہنچ گئے اور جس طرح کے ان کے کرم تھے، ان کا حساب جلدی ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔"

گرو بولا۔ "دوش ہے یا نہیں لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ اگر ستیش اور اس کے ساتھی کسی طرح اس گاؤں میں پہنچ گئے تو مجھے اور رادھا کو زندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ وہ اب تک بات کی تہ تک پہنچ چکے ہوں گے۔ بڑے گرو نے انہیں میرے خلاف اور بھڑکا دیا ہووے گا۔"

"اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس بستی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ ہم اس گھمبیرا بستی میں ہیں۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ کچے کے آس پاس رہے گی۔" عمران نے پورے وثوق سے کہا۔

"پرنتو، ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کل کی جانکاری تو ایشور کے سوا اور کسی کو ناہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر تمہارے پیٹ میں مروڑ کیوں اُٹھ رہے ہیں؟ خواہ مخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔ دیکھو، تمہاری پتنی جوان ہے۔ اسے زندگی کی زیادہ ضرورت ہے لیکن یہ پھر بھی حوصلے میں ہے۔ تم تو سارے مزے لوٹ چکے ہو۔ پتا نہیں کتنی داسیوں کے ساتھ خفیہ اور اعلانیہ بیاہ رچا چکے ہو۔ ہزاروں من حلوہ تو تمہارے پیٹ میں اُتر ہی چکا ہوگا...... اس کے علاوہ دیسی گھی کے پراٹھے، باداموں والی بھنگ کے بڑے بڑے کنستر اور پتا ناہیں کیا کچھ جا چکا ہے تمہارے اندر۔"

رادھا لجاجت سے بولی۔ "لیکن یہ گرو ہیں۔ ان کو کچھ ہو گیا تو یہ ہم سب کے لئے مہا پاپ ہووے گا۔ میں ان کی جیون رکھشا کے لئے آپ کی بنتی کرت ہوں۔"

"دیکھ لے موٹے۔" اقبال نے کہا۔ "یہ سیدھی سادی لڑکی اب بھی تیرے بارے میں سوچ رہی ہے جبکہ تُو صرف اپنے بارے میں فکر مند ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ گرو ہونے کے باوجود اپنے دھرم پر تیرا وشواس اس لڑکی سے کم ہے۔"

رادھا لرز گئی۔ "ناہیں جی! ایسا مت کہیں۔ مجھ کو پاپ لگے گا۔ ہم سب کو پاپ لگے گا۔" اس نے جلدی سے نیچے بیٹھ کر گرو کے قدموں کو انگلیوں سے چھوا اور پھر یہی انگلیاں اپنی مانگ میں پھیریں۔

اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ دھرم کی خاطر اپنا تن من پورے یقین سے گرو کے سپرد کر چکی ہے اور ادھیڑ عمر گرو اس کی خود سپردگی اور سادگی سے "خاطر خواہ" فائدہ اُٹھاتا ہے۔

عمران نے رادھا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنے اس گرو پتی کو میری طرف سے پوری تسلی دے۔ یہ اگر ہمارا سیوک بن گیا ہے تو پھر یہ ہماری حفاظت میں آ گیا ہے۔ اوپر والے نے چاہا تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا لیکن اسے سیوا پوری کرنی پڑے گی، تب ہی اس کے اور تمہارے گناہ دھل سکیں گے۔"

رادھا نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

نوری سارا دن میرے آگے پیچھے ہی رہی۔ اس کا جسم مچلتے پارے کی طرح تھا۔ وہ اس پارے کے اشکارے دکھاتی پھرتی تھی۔ عمران اور اقبال نے اسے کھیا کے حوالے سے مظلوم بتایا تھا مگر فی الحال مجھے تو اس میں مظلومیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ چوڑیاں چھنکاتی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے کبھی کوئی معنی خیز فقرہ اچھال دیتی، کبھی مسکراہٹ کی چمک دکھاتی، کبھی چائے یا قہوے کی بے وقت پیشکش کرتی۔ شام کو جب میں کمرے سے نکل رہا تھا، وہ دفعتاً اپنے پورے جسمانی گداز کے ساتھ مجھ سے آٹکرائی۔ اس کے ہاتھوں سے پیتل کی تھالی نکل کر دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑا گئی۔ ''اوئی ماں!'' وہ اپنے کندھے کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''بابو جی! آپ تو ایک دم لوہا ہو۔ مجھ غریبنی کی چولیں ہلا ڈالیں۔''

''زیادہ تو نہیں لگی؟'' میں نے رسماً پوچھا۔

وہ تو شاید کسی ایسے ہی سوال کی تلاش میں تھی۔ سسکاری لے کر بولی۔ ''لگی تو زیادہ ہی ہے جی۔ پر کوئی بات نہیں۔ آپ نے ہی لگائی ہے نا۔''

''تم کیا شے ہو؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''یہی سوال اگر آپ سے کروں تو؟ میرا مطلب ہے جی، آپ کی کچھ سمجھ ناہیں آوت ہے۔ نہ آپ کو سردی لگت ہے نہ گرمی، آپ ٹھنڈے پانی سے نہا لیوت ہیں۔ آپ کا پنڈا لوہے کی مافق سخت ہے۔ لگتا ہے کہ آپ پہلوانی کرت ہیں۔ لیکن پہلوان تو بہت موٹے موٹے ہوت ہیں گرو کی طرح۔ آپ تو دبلے پتلے ہیں۔'' اس نے پھر دُزدیدہ نظروں سے میرا سراپا دیکھا۔

''تم باتیں بہت کرتی ہو اور جتنی بھی کرتی ہو، وہ فضول ہوتی ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھو۔'' میں نے سخت خشک لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس وقت مجھے سامنے کھڑکی کے پیچھے ہلچل سی نظر آئی، جیسے کوئی ہمیں وہاں سے دیکھ رہا ہو اور پھر پردہ برابر کر کے چلا گیا ہو۔ یہ تاؤ افضل کی بیٹیاں ہو سکتی تھیں...... اور سلطانہ تھی۔ اگر یہ سلطانہ تھی تو پھر میرے لئے تشویش کی بات تھی۔ وہ نوری سے میری بات چیت کا کوئی غلط مطلب بھی لے سکتی تھی۔

مجھے شک تھا کہ نوری جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی ہے۔ تاہم یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے واقعی حیرانی ہو رہی تھی کہ عمران نے یہ کیا شے پالی ہوئی ہے۔

میں سارا دن سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اپنی تمام تر سادگی، خاموشی اور وفاکشی کے ساتھ میرے حواس پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے گریز کر رہی تھی اور اس کا گریز مجھے اس کی طرف کشش کر رہا تھا۔ میں اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ جارج گورا کے ہاتھوں اس کا جسم ہی نہیں، اس کی روح بھی زخمی ہوئی تھی۔ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھ رہی تھی کہ میری بیوی اور بالو کی ماں کہلاتی۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ یکسر غلط تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ آج بھی ویسی ہے جیسی اس بے مہر رات سے پہلے تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ میرے نزدیک پہلے سے زیادہ عزیز اور محترم تھی۔ اس کے جذبہ قربانی اور ایثار نے میری نظروں میں اسے گرانے کے بجائے اور ابھارا تھا۔

رات کو میں اوپر کمرے میں بستر پر لیٹا اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ نوری کچے کوئلوں کی انگیٹھی دہکا کر کمرے میں لے آئی۔ وہ حسبِ معمول بے باک لباس میں تھی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنی چنری شاید جان بوجھ کر سرکا دی تھی۔ اب وہ گلابی چنری ایک بے مصرف شے کی طرح اس کے کندھے پر پڑی تھی۔ انگیٹھی کی لو سے اس کا چہرہ بھی دہکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

وہ انگیٹھی میرے بستر کے بالکل قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو سردی ناہیں لگتی لیکن مہمان نوازی تو ہمارا فرض ہے نا جی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ نیچے دری پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

''چلو فرض پورا ہو گیا ہے۔ اب جاؤ۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''تابش بابو! آپ تو بہت روکھے ہو جی۔''

''روکھا ہی نہیں ہوں...... مار پیٹ بھی کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ڈرے بغیر بولی۔ ''یہ تو میں نے آج دوپہر دیکھ ہی لیا ہے۔ اتنی زور سے مارا ہے کہ...... اُف...... ہاتھ بھی نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب؟''

اس نے اپنا کندھا دوسرے ہاتھ سے دبایا اور سسکاری لے کر 'اوئی اللہ' کہا پھر بے تکلفی سے بولی۔ ''اتنی زور سے ٹکر ماری ہے جی کہ مجھ غریبنی کے کندھے پر نیل پڑ گیا ہے۔''

''اچھا، اب تم یہاں سے جاؤ۔ تمہیں مزید نیل پڑ سکتے ہیں۔''

''زہے قسمت۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ پھر میرے تیور دیکھ کر ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا جی، میں جاوت ہوں۔'' اس نے کہا۔

وہ دروازے کی طرف مڑی مگر دو قدم چل کر رک گئی۔ تب پلٹی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر گویا ہوئی۔ ''غصہ نہ کرنا جی...... ایک بات کہوں آپ سے...... آپ ہی کے فائدے کی ہے۔''

''کہو۔'' میرے تیور بدستور خراب تھے۔

''آپ کی گھر والی شاید آپ سے ناراض ہیں۔ اگر آپ نے انہیں منانے کے لئے کوئی پیغام شیغام دینا ہے تو مجھے بتائیں۔ میں ان تک پہنچا دوں گی۔''

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ آنکھوں میں شوخی تھی۔

''کیا تم اس سے بات کر لیتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں ناہیں جی۔ بات بھی کر لیوت ہوں اور ہنسی مذاق بھی۔ آپ فرمائیں، آپ نے کہنا کیا ہے؟'' وہ بے تکلفی سے مسہری کے بازو پر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا حرکت ہے...... کھڑی ہو جاؤ۔'' میں کہا۔

وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور جز بز نظر آنے لگی۔ ''چلو ادھر بیٹھو انگیٹھی کے پاس۔'' میں نے نیچے اشارہ کیا۔

وہ دوزانو ہو کر دری پر انگیٹھی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''آپ بڑے سخت ہو جی۔'' اس نے کہا۔

''کیا سختی کی ہے میں نے؟''

''یہ دوپہر والی سختی کیا کم ہے؟'' وہ بولی۔

پھر اس نے اپنا کندھا عریاں کر کے مجھے دکھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے انتہائی بے باکی سے اپنی چولی کندھے سے نیچے تک کھسکا دی۔ اس کا شفاف کندھا اور سامنے سے جسم نیم عریاں ہو گیا۔ اس کے کندھے پر ہلکا سا نیل نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں سچ مچ تپ گیا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''یہ بے ہودگی ناہیں جی...... چوٹ ہے...... اور ایسی ہی چوٹ میرے دل پر بھی آئی ہے۔ آپ حکم دیویں تو یہ دوسری چوٹ بھی دکھاؤں۔'' اس نے دلیری سے چولی کے دوسرے مونڈھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حد پار کر رہی تھی۔ ''چولی اوپر کرو۔'' میں گرجا۔

مجھے تعجب ہوا جب وہ ڈری نہیں۔ بس اتنا ہوا کہ اس نے چولی کو بائیں جانب سے نہیں اتارا۔ وہ لجاجت سے بولی۔ ''آپ بڑے ظالم ہو جی۔ مارتے بھی ہو اور چوٹ بھی نہیں دکھانے دیتے۔''

''تم بکواس بند کرو اور نکلو یہاں سے۔ نہیں تو میں اُٹھا کر پھینک دوں گا۔''

''چلو حضور، کسی بہانے اس داسی کو اُٹھائیں گے تو سہی۔'' وہ بولی اور میرے مزید غصے سے بچنے کے لئے عریاں کندھا ڈھانپ لیا۔

''میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں۔ شرافت سے نکل جاؤ...... نہیں تو۔''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سلطانہ اندر داخل ہوئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بالکل نظر انداز کرتے ہوئے نوری کی طرف دیکھا اور اس کی طرف بڑھی۔ نوری گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی چنری سر پر رکھ لی۔ سلطانہ نے بے دریغ اسے چوٹی سے پکڑا اور جھٹکا دے کر کمرے کے وسط میں پہنچا دیا۔ وہ انگیٹھی کے اوپر گرتے گرتے بچی۔ ''حرامجادی، کلموہی...... تجھے اتنی آگ لگی ہے تو بتا اپنے مالک کو۔ وہ کسی سے تیرے دو بول پڑھا دے۔''

''میں تو...... میں تو جی۔'' نوری ہکلا کر رہ گئی۔

سلطانہ نے اسے پھر چوٹی سے دبوچا۔ میں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ نوری کے گال پر پڑنے والا طمانچہ میں نے اپنے ہاتھ پر روکا۔ سلطانہ پھنکاری۔ ''مجھے چھوڑو۔ میں اس کی جان لے لوں گی۔ یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔''

میں نے بہ مشکل سلطانہ کو سنبھالا اور نوری کو دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس کشمکش میں نوری کی کئی چوڑیاں ٹوٹیں۔ سلطانہ کو نوری کے پیچھے جانے سے روکنے کے لئے میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ طیش سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ گھنے بالوں کی لٹیں چہرے پر تھیں۔ میں نے اس کے کندھے تھامے۔ ''چھوڑو سلطانہ! ایسی دو ٹکے کی عورت کے لئے خود کو کیوں طیش میں لا رہی ہو؟ اسے اس کی بے شرمی کا بڑا اچھا جواب مل گیا ہے۔''

''اس کی نجر اچ خراب ہے۔ مجھے کل اِچ اندا جا ہو گیا تھا۔ اس حرامجادی کمینی کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تمہارے کمرے میں آئی۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔''

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مدھم مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میرے دونوں ہاتھ سلطانہ کے کندھوں پر تھے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! اگر تم برا نہ مانو تو تمہاری بات کا جواب دوں؟''

''کس بات کا مہروج؟''

"یہی کہ اس کمینی کو جرأت کیسے ہوئی کہ میرے کمرے میں آئی؟"

وہ اپنی بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "اسے یہ جرأت اس لئے ہوئی کہ تم یہاں میرے پاس نہیں تھیں۔"

وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ پھر اس نے اپنا جسم چرایا اور اپنے کندھے میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکال لئے۔ میری پلنگ نما چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور اپنی اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اس کی غم زدہ سادگی میں ایک خاص طرح کی کشش تھی۔ نوری اور نوری جیسی دوسری گوری چٹی چھم چھم کرتی تیز تیکھی لڑکیوں میں ایسی کشش کم ہی ہوتی ہے۔ میں ناقدانہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے شانے چوڑے تھے اور شانوں کے مقابلے میں کمر نہایت دبلی پتلی اور چست تھی۔ غالباً اس کے جسم کی زیادہ تر کشش اس کی کمر کی وجہ سے ہی تھی۔ یہ کمر اب کسی کمان کی طرح مڑی ہوئی تھی اور سلطانہ اپنی اوڑھنی آنکھوں پر رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے مہروج! میں اِچ بدحسمت (بدقسمت) ہوں۔ تمہارے خریب ہوتے ہوئے بھی خریب نا ہیں ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ کچھ بھی میرے بس میں نا ہیں۔ بس خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ وہ میرے دل کو سکون دے دے یا پھر موت دے دے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے اندر جیسے ایک زبردست کشمکش تھی۔ کشمکش کے اس آشوب میں اس کا لرزاں جسم کسی کشتی کی طرح ڈولتا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ کمرے کی طرح میرا دل بھی ایک دم خالی ہو گیا...... میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ بستی کے گلی کوچوں میں سرد ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی...... میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ جارج گورا کی صورت بار بار نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ یہ وہی تھا جس نے پہاڑی جھرنوں جیسی صاف شفاف چمکیلی سلطانہ کو اپنی ہوس سے داغ دار کیا تھا اور اسے زندگی اور زندگی کی ساری رعنائیوں سے بہت دور کر دیا تھا۔ دوسری طرف جارج گورا بھی اپنی قرار واقعی سزا سے بہت دور تھا۔ اپنے حفاظتی حصار میں معمول کی زندگی جی رہا تھا۔ سلطانہ نے اپنے طور پر اس سخت حصار کو توڑنے کی کوشش تو کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ میں جب تک سلطانہ کے ادھورے کام کو مکمل نہ کروں گا، وہ کبھی نارمل زندگی کی طرف نہیں آ سکے گی۔ اس پر عملاً ظلم ہوا تھا۔ اسے عملی دادرسی کی ضرورت تھی۔ زبانی باتوں سے اس کے زخم مندمل ہونے والے نہیں تھے۔

رات کو انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر الائچی والا قہوہ پیتے ہوئے عمران اور اقبال کے درمیان اہم گفتگو ہوئی۔ عمران کی رائے تھی کہ ہم اگلے کم از کم پندرہ بیس دن بڑی خاموشی کے ساتھ گزاریں اور حالات کا جائزہ لیں۔ اس نے کہا۔ "اس وقت یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے۔ ہم دوطرفہ مصیبت میں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے اور استھان کا جنونی ٹولہ دونوں ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب ہوا تیز ہو تو لچک دار شاخیں جھک جاتی ہیں اور ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں۔"

"لیکن یہ مثال ہم پر صادق نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "اور ویسے بھی کبھی کبھی خاموشی گناہ بن جاتی ہے۔ جارج گورا اور حکم جی وغیرہ جو کچھ ہمارے ساتھ کر چکے ہیں، اس کے بعد ہماری خاموشی بزدلی اور نامردی کہلائے گی۔"

"میں عارضی خاموشی کی بات کر رہا ہوں جگر! بڑے بڑے بہادر جنگجو بھی میدانِ جنگ میں حکمتِ عملی کے تحت پسپا ہوتے ہیں۔"

"تم چاہتے ہو کہ ہم کچھ دن کے لئے چپ سادھ لیں۔ مگر تم ایک بات بھول رہے ہو، ہم چپ بھی نہیں سادھ سکتے۔ کم از کم میری موجودگی میں تو تم دونوں ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیا مطلب؟" اقبال نے پوچھا۔

"میں اس کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" عمران بولا۔ "یہ چپ کی بات کر رہا ہے...... چپ اس کے اندر موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری نشاندہی بھی کر سکتی ہے۔ کیوں، یہی بات ہے نا؟" اس نے آخری جملہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تو کیا یہ غلط ہے؟" میں نے پوچھا۔

"درست ہے لیکن اس کا انتظام بھی کر چکا ہوں۔ بلکہ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اس کے بارے میں سوچ چکا ہوں۔ وہ مندر دیکھ رہے ہو؟" عمران نے کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تاؤ افضل کے گھر کے بالکل عقب میں مندر کی مخروطی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ "مندر میں کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"مندر میں نہیں ہے، مندر کے نیچے ہے۔" عمران بولا۔ "اس مندر کے نیچے تین منزلہ تہ خانہ ہے۔ یعنی تہ خانہ پھر اس کا تہ خانہ پھر اس کا تہ خانہ۔ کچھ نہیں تو پچاس فٹ گہرائی تو ہو گی۔ ہم کل تک اس مندر کے سب سے نچلے تہ خانے میں شفٹ ہو جائیں گے اور اگلے کم از کم تین ہفتے وہیں گزاریں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی گہرائی میں تمہاری مخبر چپ کسی طرح کے سگنل چھوڑ سکے گی۔"

"یہ تہ خانوں والی بات تم مذاق سے کہہ رہے ہو یا واقعی ایسا ہے؟"

"مذاق کی بات پر ہنسی آتی ہے۔ کیا اس تہ خانوں والی بات پر تمہاری ہنسی چھوٹی ہے؟" عمران نے الٹا سوال جڑ دیا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "واقعی اس مندر کے نیچے ایک سہ منزلہ تہ خانہ موجود ہے۔ یہ تہ خانہ اور مندر قریباً چھ سو سال پرانے ہیں...... تہ خانہ مندر کا حصہ تو نہیں مگر اس کے ساتھ اٹیچ ہے۔ پرانے دور میں بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کے لئے فتح پور کے خاص خاص باشندے اپنے بال بچوں سمیت ان تہ خانوں میں اُتر جایا کرتے تھے۔ اب یہ تہ خانے مدت سے بند پڑے ہیں مگر یہاں کے ایک خاص بندے کو ان میں اُترنے کا راستہ معلوم ہے اور راستے کی چابی بھی اس کے پاس ہے۔"

"کہیں کسی چوہے دان میں نہ پھنسا دینا۔" میں نے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ جب تم سرے سے چوہے ہی نہیں ہو تو چوہے دان میں کیسے پھنسو گے۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ توقع رکھتا ہے۔"

عمران اور اقبال دیر تک انگیٹھی کے سامنے بیٹھنا چاہتے تھے اور گپ شپ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن میرا دھیان اوپر کمرے کی طرف تھا۔ دل میں یہ آس سی موجود تھی کہ شاید آج سلطانہ کے خیالات میں کچھ تبدیلی واقع ہو جائے اور وہ کمرے کا رخ کر لے۔ وہ شدید تذبذب میں نظر آتی تھی۔ شاید اس تذبذب کا نتیجہ مثبت نکل آتا۔

میں نو بجے کے قریب کمرے میں چلا گیا اور اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرنے لگا۔ نوری کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ سلطانہ کے طیش کا شکار ہونے کے بعد وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ میں سلطانہ کا انتظار کرتا رہا۔ میں حکم دیتا تو وہ فوراً آ جاتی لیکن میں اپنا اختیار استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے آئے۔ بستی کے نیم گرم مکانوں سے باہر ایک دھند آمیز سرد رات آہستہ خرامی سے گلی کوچوں میں سرسراتی رہی۔ دور جنگل سے رات کو گشت لگانے والے جنگلی جانوروں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، کمرے کی ادھ بجھی انگیٹھی میں انگارے سلگتے رہے اور دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہوتے رہے۔ میری نظر گاہے بگاہے دروازے کی طرف اُٹھتی رہی اور ناکام لوٹتی رہی۔

نصف شب گزر گئی تو ایک عجیب سی تپش میرے رگ و پے کو جھلسانے لگی۔ میں اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر خاموشی سے دروازہ کھول کر چھت پر چلا گیا۔ سرد یخ ہوا میری ہلکی پھلکی قمیص سے گزر کر میرے جسم سے ٹکرائی، میری ہڈیوں میں اُتری، درد کی ٹیسیں اُٹھیں اور

میرے بدن میں پھیل گئیں۔ باروندا جیکی مجھے جینے کے کئی ڈھنگ سکھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا...... جب دل کا درد یعنی اندر کا درد حد سے گزر جائے اور بہت بے چین کر دے تو اسے جسمانی درد میں تبدیل کر دو...... خود کو کسی بڑی مشقت میں غرق کر دو......

وہاں چھت پر ایک چارپائی کی ٹوٹی ہوئی ادوائن پڑی تھی۔ میں نے ادوائن کو ایک رسّے کی طرح استعمال کیا اور رسا پھلانگنے لگا۔ میں پنجوں کے بل بے آواز اچھلتا رہا اور رسا میرے پاؤں کے نیچے سے گزرتا رہا۔ رسا پھلانگنا دوڑ لگانے ہی کی طرح پُرمشقت تھا۔ پانچ دس منٹ کے اندر ہی میرے جسم کا ہر مسام پسینا اگلنے لگا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ یہ کیفیت انتہا کو پہنچ گئی تو لگا کہ سینہ پھٹ جائے گا اور دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بس یہی کیفیت مجھے درکار ہوتی تھی۔ میں اسی کو جھیلنے اور بڑھاوا دینے کی عادت ڈال رہا تھا۔

جب ٹانگیں جواب دینے لگیں اور مجھے لگا کہ میں بے دم ہو کر گر جاؤں گا تو میں نے رسا ایک طرف پھینک دیا اور ٹھنڈی یخ چھت پر چت لیٹ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ مجھے سینڈ بیگ کی ضرورت تھی جس پر میں اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلا سکتا...... اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو خون اگلنے پر مجبور کر سکتا...... یا پھر میرا کوئی مدِمقابل رُوبرو ہوتا۔ میں پوری بیدردی سے اسے مارتا اور وہ مجھے مارتا...... اور اگر یہ مدِمقابل جارج گورا ہوتا تو پھر کیا ہی بات تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ میرے سامنے آ جائے تو میں ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر دیوانہ وار اس سے ٹکرا جاؤں۔ اس وقت تک اس سے لڑتا رہوں جب تک وہ مجھے مار دے یا میں اسے مار ڈالوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی چھت کے اندھیرے میں میرے پاس موجود ہے۔ سلطانہ......؟ میرے ذہن میں یہ جاں افزا سوال برق کی طرح لہرایا۔

"کون؟" میں نے سیڑھیوں کے قریب ایک ہیولے کو دیکھ کر کہا۔

میرے سوال کے جواب میں ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اقبال تھا۔ "تم نے تو ڈرا ہی دیا۔" وہ میرے قریب آ کر بولا۔ "مجھے کھانسی ہو رہی تھی۔ اس لئے جاگ رہا تھا۔ اوپر سے دھم دھم کی مسلسل آوازیں آئیں تو دیکھنے کے لئے چلا آیا۔ یہ کیا کر رہے ہو یار تم؟"

"تم دیکھ تو رہے ہو۔"

"یار! برا نہ منانا۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کوئی ٹین ایجر لڑکا مارشل آرٹ کی کسی جاپانی فلم سے متاثر ہو گیا ہے اور بروس لی بننے کی کوشش میں اونگی بونگی حرکتیں کر رہا ہے۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''تم جو بھی سمجھو لیکن میں کسی کو دکھانے کے لئے کچھ نہیں کر رہا۔ یہ میری اپنی Feelings ہیں۔ غلط ہیں یا صحیح، میں اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔''

''مجھے تو ڈر ہے کہ تم خود کو بیمار کر بیٹھو گے۔ تم اپنے رہن سہن کو جس تیزی سے تبدیل کر رہے ہو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہاری سوچ یہ ہے کہ تم اس طرح خود کو بہت سخت جان بنا لو گے یا مارشل آرٹ کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت حاصل کر لو گے تو یہ جذباتی سوچ ہی ہو سکتی ہے۔ ایسے کاموں اور تبدیلیوں کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے یار...... مستقل مزاجی سے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اقبال! مستقل مزاجی تو ہے یہاں...... لیکن میں آہستہ آہستہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ جب کہیں آگ لگی ہو تو اسے بجھانے کے لئے آہستہ آہستہ پانی نہیں لایا جاتا۔ سب کچھ تیز رفتاری سے کرنا پڑتا ہے۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ اپنا لہجہ خود مجھے بھی عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

''تم کس آگ کی بات کر رہے ہو؟'' وہ میرے قریب ایک چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''وہی آگ جو سیٹھ سراج اور جارج گورا جیسے لوگوں نے میرے اندر لگائی ہے۔ میں اس آگ کو اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔ میری ماں کی موت جن حالات میں ہوئی فرح، ثروت اور عاطف کو جس طرح مجھ سے چھینا گیا، وہ سب کچھ تم لوگوں کو معلوم ہی ہے...... اور اب یہاں صرف میری کم ہمتی اور کمزوری کی وجہ سے جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہوا ہے، وہ بھولے جانے کے قابل نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو اسے نہیں بھول سکتا۔ اب میں آہستہ آہستہ نہیں چل سکتا اقبال...... مجھے کچھ کرنا ہے یا پھر مرنا ہے۔''

''تُو ایسی باتیں کرتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تُو ہمیں اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا۔ تُو اکیلا نہیں ہے تابی...... جو کچھ گزری ہے، ہم سب پر گزری ہے۔ جو مری ہے، وہ ہم تینوں کی ماں تھی...... جو بچھڑے ہیں، وہ ہم تینوں کے بہن بھائی تھے اور یہاں جو واقعہ سلطانہ کے ساتھ ہوا ہے، اس کا زخم ہم تینوں کے سینوں پر لگا ہے اور اس کا بدلہ بھی ہم تینوں چکائیں گے۔''

''تم اس طرح بات کرتے ہو تو میرا حوصلہ پہاڑ ہو جاتا ہے لیکن یار! مجھے ایک سچی بات کہنے دو۔ میں نے آج تک تم دونوں سے لیا ہی لیا ہے، دیا کچھ نہیں۔ میں اپنی ساری کمزوریوں سمیت تم دونوں پر بوجھ ہی بنا رہا ہوں۔ تمہارے لئے مصیبتیں ہی کھڑی کرتا رہا ہوں۔ میں اب مزید بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ تمہاری دوستی سے بڑھ کر قیمتی شے میرے لئے اور کوئی نہیں لیکن میں اس دوستی کو اپنی بیساکھی بنانا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے کندھے سے کندھا

ملا کر چلنا چاہتا ہوں بلکہ شاید مصیبت کی گھڑی میں تم سے دو قدم آگے رہنا چاہتا ہوں۔''

''اور دو قدم آگے رہنے کے لئے تم اس وقت اس ٹھنڈی ٹھار چھت پر چت لیٹے ہوئے ہو؟''

''میں اپنے طریقے سے جو کچھ کر رہا ہوں، مجھے کرنے دو۔ یہ طریقہ جیسا بھی ہے لیکن مجھے اس میں حوصلہ اور جوش مل رہا ہے...... اور اس کے ساتھ ساتھ سکون بھی۔ اگر میں اس میں ناکام بھی ہوا تو یہ میری ناکامی ہوگی۔ کسی دوسرے پر اس کا الزام نہیں آئے گا۔''

''نہیں یار! یہ بات نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ تم، ہم سے بھی دور ہوتے جا رہے ہو۔ اپنی الگ دنیا بسا رہے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یا کسی طرح ہمیں قائل کر لو یا خود قائل ہو جاؤ۔''

''یہ قائل کرنے یا ہونے کی بات نہیں ہے اقبال۔'' میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''یہ تو دیوانہ پن ہے...... اور ہر شخص کا اپنا اپنا دیوانہ پن ہوتا ہے۔''

''تم قائل کرنے کی کوشش تو کرو۔ مجھے سمجھاؤ تو سہی کہ سخت سردی برداشت کر کے، کھردرے فرش پر سو کر، گھنٹوں تلک اندھادھند بھاگ کر اور خود کو تکلیف دہ زخم دے کر میں کیا معراج پا سکتا ہوں۔''

میں مسکرایا۔ ''میں تمہیں کیسے قائل کروں...... تم اس عجیب الخلقت شخص سے ملے ہی نہیں جسے بارونداجیکی کہا جاتا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ کسی کھوہ میں سردیوں کی سخت ترین راتیں نہیں گزاریں...... اس کی باتیں نہیں سنیں...... اس کے ہنر نہیں دیکھے اور نہ اس آگ کو محسوس کیا ہے جو اس کے انجر پنجر کے اندر دہکتی تھی۔'' میں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر طویل سانس لے کر کہا۔ ''اقبال! وہ انوکھا شخص تھا۔ اسے اچانک عشق کا روگ نہ لگ جاتا اور وہ چند برس اور زندہ سلامت رہتا تو وہ بہت اوپر تک جاتا۔ ہم نے فائٹنگ آرٹ میں انوکی، بروس لی، محمد علی اور سونی لسٹن وغیرہ کے نام سنے ہیں۔ وہ ان سے کم پائے کا شخص نہیں تھا۔ اور کیا پتا کہ وہ ان سے بھی کچھ آگے جاتا کیونکہ وہ صرف ایک فائٹر ہی نہیں تھا، ایک روحانی شخص بھی تھا۔ اس کا فن اس شگوفے کی طرح ہے جو پوری طرح کھلنے سے پہلے مرجھا جاتا ہے۔ میں خود پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس شخص کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔''

اقبال ہار ماننے والے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور قدرے مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''اچھا جی باروندا ثانی صاحب! اپنے گرو کی ساری تعلیمات پر آج ہی عمل کرنے کے بجائے ایک دو اسباق کل کے لئے بھی چھوڑ دیں۔ آج ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہے۔ چلیں، نیچے تشریف لے

چلیں۔''

اگلے روز صبح سویرے نوری نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں اُٹھا تو وہ بولی۔ ''بابو جی! آپ کو تازہ خبر ملی ہے؟''

''کیا ہوا؟''

''وہ مشٹنڈا...... موٹا گرو بھاگ گیا۔ رات کسی وقت چپکے سے کہیں نکل گیا۔ وہ بستی میں اور آس پاس کہیں بھی نا ہیں ہے۔ اس کی پتنی رو رو کر بے حال ہو رہی ہے۔''

میں چپل پہن کر اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر عمران اور اقبال کے کے پاس پہنچا۔ عمران ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ اقبال ادھیڑ عمر تاؤ افضل کے سر کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون تاؤ کی نیم سفید داڑھی تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے، ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

میرے پوچھنے پر عمران نے بتایا۔ ''لگتا ہے کہ وہ خبیث کہیں دور نکل گیا ہے۔ تاؤ نے بھی یہی بتایا ہے کہ اسے نکلے تین چار گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔''

''تاؤ کو کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تاؤ رات کو باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا ہے۔ رات کو بھی یہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس موٹے نے نمک مرچ پیسنے والے ڈنڈے سے تاؤ کے سر پر چوٹ لگائی ہے۔ تاؤ بالکل بے ہوش ہو گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔''

اندر سے رونے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سلطانہ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ گرو کی اشک بار پتنی کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی کمرے میں چلا گیا۔ رادھا سوگوار انداز میں چٹائی پر بیٹھی تھی۔ سلطانہ نے اسے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ رادھا سسکی۔ ''مجھ کو بہت بڑا پاپ لگے گا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر ناراض نہ ہوتے تو مجھے بھی اپنے سنگ لے کر جاتے۔''

اتنے میں اقبال اندر داخل ہوا اور طنز سے بولا۔ ''وہ بھگوڑا تجھ سے ناراض نہیں ہوا، وہ اس لئے تجھے ساتھ نہیں لے جا سکا کہ اسے صرف اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ تُو اس کمرے میں باقی عورتوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ تجھے جگانے کے لئے وہ یہاں آتا تو اس کا ''فراری پروگرام'' گڑبڑ ہو جاتا۔''

''ان کو ایسا مت کہو...... ان کو بھگوڑا نا ہیں کہو۔'' رادھا کانپ کر بولی۔

''تو کیا اس کو شیر افگن کا خطاب دوں؟ تین روز سے بدبخت کو صرف اپنی جان کی پڑی

ہوئی تھی۔ تمہارا تو نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ ایسے پتی پر رونے سے کہیں بہتر ہے کہ آلو کریلے پکاؤ، ساتھ میں حلوہ بناؤ۔ خود کھاؤ، ہمیں بھی کھلاؤ۔ اس موٹے سے چھٹکارے کا جشن مناؤ......''

رادھا اور زور زور سے رونے لگی۔ عمران نے اقبال کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خیر، یہ جشن کا موقع بھی نہیں ہے۔ گرو کے یہاں سے نکلنے میں ہمارے لئے بھی خطرے چھپے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ آ جاتا ہے تو پھر یہاں اس گاؤں میں ہماری موجودگی کا بھانڈا بھی پھوٹ سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟ ہم بھی اس لڑکی کے ساتھ رونا شروع کر دیں؟'' اقبال نے اعتراض کیا۔

اقبال اور عمران کے مکالمے کے دوران میں ایک دو بار سلطانہ سے میری نظر ملی...... میں اس کے انداز میں تذبذب اور جھجک صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ جیسے میری دلی کیفیت کو جانتی تھی اور اس حوالے سے پشیمان بھی تھی لیکن اس کے مداوے کے لئے کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

اس دن بہت سے لوگ عمران سے ملنے کے لئے آئے۔ ان میں بوڑھے، بچے جوان سب ہی شامل تھے۔ سب اسے عمران بیٹا یا عمران بھیا کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ اس کی مسحور کن شخصیت کے اسیر تھے، اس کی دل نواز مسکراہٹوں کے شیدائی تھے۔ وہ ان کا ہمدرد و غم گسار تھا۔ وہ کسی کی بیماری کا علاج اپنی گرہ سے کرا رہا تھا۔ کسی کے جھگڑے نمٹانے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ کسی بڑھیا کی لاٹھی بنا ہوا تھا۔ نوری جیسی ایک دو اور لڑکیاں بھی تھیں جن کے ہاتھ پیلے کرنے کا بیڑا اس نے اُٹھا رکھا تھا۔ وہ جس نوجوان مچھیرے سے نوری کا بیاہ کرنا چاہ رہا تھا، وہ بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ وہ کھلے ہڈ پیر والا ایک سادہ سا نوجوان تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عمران نے اسے ایک چھوٹا جال خرید کر دیا تھا۔ اس جال کی مدد سے انور نامی اس نوجوان نے معقول پیسے بنا لئے تھے اور اب ایک پرانی کشتی خریدنے اور اسے مرمت کر کے قابلِ استعمال بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ عمران کے ملنے والوں میں سے ہی ایک بیوہ عورت ایسی تھی جو اپنی ضروریات کے لئے مرحوم شوہر کی دو کشتیاں بیچنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ عمران نے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی خوش اسلوبی سے ان دونوں افراد کا مسئلہ حل کرا دیا۔ بیوہ عورت اپنی ایک کشتی بیچ کر از حد خوش ہوئی اور انور کشتی خرید کر۔

عمران نے میری طرف دیکھا اور اپنی مخصوص پُرکشش مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''کیسی

رہی ڈیل؟''

''اچھی تھی۔''

''اچھی نہیں، بہت اچھی تھی۔ دراصل جگر! ہمارے اردگرد لوگ اپنے اپنے مسئلے اور اس کے حل کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ پرابلم صرف یہ ہوتا ہے کہ حل کسی کے پاس اور مسئلہ کسی دوسرے کے پاس ہوتا ہے۔ کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان دونوں افراد کو خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملا دیا جائے۔ ملانے والا خواہ مخواہ میں نیک نامی کما لیتا ہے اور جب لوگ اس پر بہت زیادہ اعتماد بھی کرنے لگتے ہیں تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔''

کچھ دیر بعد جب گھر کے صحن میں سے عمران کے پرستاروں کا مجمع چھٹا تو میں نے عمران سے کہا۔ ''یار! تم نوری والے معاملے میں اس انور نامی لڑکے سے کچھ زیادتی نہیں کر رہے ہو؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟ وضاحت فرماؤ۔''

''نوری جس قماش کی ہے، تم نے دیکھا ہی ہوگا اور میں نے بھی تھوڑا بہت دیکھا ہے۔ تم اس سیدھے سادے لڑکے کو ایک آفت کے حوالے کر دو گے۔ اس بے چارے کی زندگی خراب ہو جائے گی۔''

''بھئی زندگی خراب ہوگی تو خبر بنے گی نا اور ہم فسادپلس کے نمائندوں کو خبریں ہی تو درکار ہوتی ہیں۔ ہم صبح سویرے اُٹھتے ہی دعا مانگتے ہیں، یا اللہ ہماری روزی میں برکت ڈال، ہم پر اپنی رحمت کا سایہ رکھ...... اور باقی سب پر سے یہ سایہ اُٹھا لے۔''

''ہم لٹھ لے کر خبر نویسوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، حالانکہ وہ صرف آئینہ دکھاتے ہیں۔''

''آئینہ تو دکھاتے ہیں لیکن عام طور پر یہ شکلیں بگاڑنے والا آئینہ ہوتا ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ نوری جیسی واہیات کو اس لڑکے کے پلے کیوں باندھ رہے ہو؟''

''بھئی ہو سکتا ہے کہ یہ اتنی واہیات نہ ہو جتنی تمہیں نظر آتی ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔''

''تو تمہارے خیال میں وہ نیک بی بی ہے؟''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہا لیکن...... چلو...... اس بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔'' وہ ایک دم بات ٹال گیا۔

''ہر بات کے بارے میں تم یہی کہتے ہو کہ بعد میں بتاؤں گا...... تمہاری یہ 'بعد' کب آئے گی؟''

''آئے گی...... آئے گی...... آئے گی۔ ایک دن یہ 'بعد' ضرور آئے گی۔'' وہ انڈین گانے کا حلیہ بگاڑتے ہوئے بولا۔

اسی دوران میں گرو کی تلاش میں گئے ہوئے کچھ لوگ منہ لٹکا کر آ گئے۔ عمران ان سے مصروف گفتگو ہو گیا۔

اگلے روز آدھی رات کو عمران نے ہی مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ عمران کے چہرے سے گہری سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ وہ تیزی سے بولا۔ ''تابی! ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''وہ اُلو کا پٹھا گرو سوبھاش پکڑا گیا ہے۔ استھان کے لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''ایک بھروسے والا بندہ ہے۔ ہمارے پاس اب اور کوئی راستہ نہیں۔ ہمیں فوری طور پر یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔''

میں نے دیکھا، سارے گھر کے اندر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے جیکٹ پہنی اور گرم چادر کی بکل ماری۔ بھرا ہوا پستول بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ نیچے پہنچا تو اقبال اور طلال وغیرہ بھی روانگی کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ تاؤ افضل کی دونوں بیٹیاں برقعے پہنے ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔ ڈرا ہوا تاؤ افضل بھی اپنی لٹھ سمیت ان کے پاس موجود تھا۔

اسی دوران میں سلطانہ گرم چادر میں لپٹی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''مہروج! یہ تمہارے دوست کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ وہ گرو پکڑا گیا ہے۔ استھان والے اس کو لے کر بڑی جلدی یہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا سچ مچ ایسا ہوئیں گا؟''

''ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔''

''لیکن مہروج! اتنی اندھیری رات میں اور ایسی سردی میں ہم گھر سے نکل کر کہاں جائیں گے؟''

"مجھے خود پتا نہیں لیکن عمران پر پورا بھروسا ہے۔ وہ جو کرے گا ٹھیک ہی کرے گا۔"

"لیکن وہ تو کوئی سیدھی بات اِچ نا ہیں کرتا۔"

"اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

پانچ دس منٹ کے اندر اندر ہم آدھی رات کے وقت یہ گھر چھوڑنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ تاؤ افضل کے ہاتھ میں لوہے کا بڑا تالا نظر آ رہا تھا۔ یہ تالا وہ گھر کے بیرونی دروازے کو لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر کو بالکل خالی کیا جا رہا ہے۔ رنجیت پانڈے کے ساتھی زخمی راہول کو بھی عمران نے ساتھ لے لیا تھا۔ احتیاطاً اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اوپر سے ایک سوتی کھیس لپیٹ دیا گیا تھا۔ گرو کی پتنی، سکڑی سمٹی رادھا بھی عمران کے پاس ہی کھڑی تھی۔ حالات کی سنگینی کا احساس اسے تھر تھر کانپنے پر مجبور کر رہا تھا۔

رات واقعی خوفناک حد تک سرد تھی۔ دھند کی ایک دبیز چادر نے بستی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ رات کے اس پہر یہ بستی سکوت اور سناٹے کی مکمل تصویر تھی اور تو اور کسی چوکیدار کی "جاگتے رہو" بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس اندھیری رات میں یوں عمران کا اس گھرے سے نکل آنا میری سمجھ سے بالا تھا۔ ہم اس چار دیواری اور اس بستی سے نکل کر ایک خطرے سے تو بچ رہے تھے مگر بے شمار دوسرے خطروں کو دعوت دے رہے تھے۔ ان میں رات کو گشت لگانے والے جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی شامل تھا۔

ہم گھر سے نکلے تو گلی سنسان تھی۔ شاید تاؤ افضل کے بعد اس بستی کو کوئی پاسبان میسر نہیں آیا تھا لیکن یہ اندازہ غلط تھا۔ ابھی ہم دس پندرہ قدم ہی گئے تھے کہ ایک دراز قد شخص اپنے جسم کے گرد کمبل لپیٹے سامنے آ گیا۔ ایک طرف کونے میں اس نے اُپلوں کی تھوڑی سی آگ جلا رکھی تھی۔ "کون ہے بھائی؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ عمران کے چہرے پر پھینکا اور اسے پہچان لیا۔ "عمران بھائی آپ ہیں۔"

اسی دوران میں ایک قریبی گھر کی کھڑکی بھی کھلی اور کسی نے باہر جھانکا۔ "کون ہے؟" کھڑکی کی دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"عمران بھائی ہیں۔" دراز قد چوکیدار نے بلند آواز میں کھڑکی والے کو بتایا۔

ایک دو مزید کھڑکیاں کھل گئیں۔ "عمران بیٹا! اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" کسی بوڑھے شخص نے کھانستے ہوئے دریافت کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی افراد گلی میں نکل آئے۔ دو تین لالٹینیں بھی ہمارے گرد چکرانے

لگیں۔ عمران اور تاؤ افضل کو یوں کوچ کرتے دیکھ کر سب پریشان نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے جھانکنے والا بوڑھا بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا نیچے اُتر آیا تھا۔ عمران اس بوڑھے کے علاوہ دراز قد چوکیدار اور ایک فربہ اندام سکھ کو ایک طرف لے گیا اور ان سے تین چار منٹ تک کھسر پھسر کرنے کے بعد واپس آ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے ان لوگوں کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کچھ جنونیوں کے ساتھ ٹکراؤ سے بچنے کے لئے بستی سے نکل رہا ہے۔ اس حوالے سے اس نے بستی والوں کو یقیناً کچھ مزید ہدایات بھی دی تھیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہم عجلت میں آگے بڑھ گئے۔ جانے سے پہلے عمران نے دراز قد چوکیدار آفتاب خاں کو ایک بار پھر اپنے پاس بلایا تھا اور اس سے کوئی بات کی تھی۔ سخت سردی اور دھند آلود تاریکی میں ہم نے اونچے نیچے راستوں پر قریباً تین میل تک سفر کیا اور نہایت گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ یہاں خطرات منہ کھولے کھڑے تھے۔ کسی بھی وقت کسی موذی جنگلی جانور سے سامنا ہو سکتا تھا۔ سب کے دل میں ڈر تھا کہ لیکن زخمی راہول کا خاص طور سے برا حال تھا۔ یقیناً اسے چار دن پہلے والا بھیانک تجربہ یاد آ رہا تھا۔ سرخی مائل ریچھ نے اسے عدم آباد کا ٹکٹ تھما دیا تھا، یہ تو عمران کی ہوشیاری تھی کہ اس نے بروقت یہ ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر "ریچھ بھائی" کو اپنے پیچھے لگا لیا اور پھر گہرائی میں لڑھکا دیا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر ہم اسی طرح اس گھنے جنگل میں آگے بڑھتے رہے تو ریچھ کی طرز والا کوئی اور واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس سفر کے دوران میں ایک جگہ مجھے ذرا سی ہچکی آئی تو میرے پہلو میں چلتی ہوئی سلطانہ بری طرح چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈر اُتر آیا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ یہ کوئی خاص ہچکی نہیں ہے۔ یوں لگتا تھا کہ میری ہچکی والی تکلیف کے حوالے سے اس کے دل میں خوف بیٹھ چکا ہے...... ہمارا سفر جاری رہا۔

ہمارے ہاتھوں میں اسلحہ تھا اور ہم کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر عمران رک گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے رک گئے۔ ہوشیار سنگھ نے پوچھا۔

"کیا بات ہے جی...... آگے کوئی خطرہ ہے؟"

"ہاں خطرہ ہی ہے۔ پانچ منٹ کے فاصلے پر۔" عمران نے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "گیارہ بج کر پچپن منٹ ہو چکے ہیں۔ جونہی بارہ بجیں گے، تم کوئی فائیو اسٹار قسم کی حماقت کر ڈالو گے۔ اس لئے رک گیا ہوں۔"

"بارہ بجے کا وقت تو یونہی بدنام ہو گیا ہے جی۔ سچا خالصہ کسی بھی وقت کام دکھا سکتا ہے۔ جیسا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دکھایا ہے۔"

"کیا کیا ہے؟"

"وہاں پیچھے جھاڑیوں میں ذرا رک کر پیشاب کیا ہے۔ شلوار اتار لی ہے لیکن یہ یاد ہی نہیں رہا کہ نیچے باریک پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ سارا بھیگ گیا ہے۔" ہوشیار سنگھ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ یہ بہت برا شگون ہے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب سفر کے دوران میں اچانک کسی سردار کی پگڑی گر جائے تو سفر روک کر واپس پلٹ جانا چاہئے۔" عمران نے کہا۔

"کیا مطلب جی...... میری پگڑی کہاں گری ہے؟" ہوشیار سنگھ حیران ہوا۔

"تم واقعی بے وقوف ہو۔ بات کی تہ تک نہیں پہنچ رہے۔ اب تمہارا پاجامہ پیشاب سے گیلا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد تمہاری ٹانگوں میں خارش شروع ہو گی۔ تم ہماری عورتوں کے سامنے بار بار ٹانگیں اور رانیں کھجاؤ گے تو ہمیں غصہ آئے گا۔ خاص طور سے تابی بالکل برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی اس کی جوان گھر والی کے سامنے اس طرح بے شرمی سے ٹانگیں کھجائے۔ وہ یقیناً تمہیں تھپڑ دے مارے گا اور اس کا تھپڑ تو تم نے دیکھا ہی ہے۔ تمہاری پگڑی گرے ہی گرے۔"

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران واقعی واپس پلٹ رہا ہے۔ اس نے سب کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ اقبال کے سوا سب ہی حیران تھے۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔

"عمران! یہ کیا بے وقوفی ہے۔ پہلے تم نے اتنے خراب موسم میں ہمیں کمروں سے نکالا، اب واپس چلنے کا کہہ رہے ہو۔ تم اور اقبال خود ہی کوئی فیصلہ کر لیتے ہو اور پھر ہم سے پہیلیاں بجھواتے رہتے ہو۔"

"تم کون سا کوئی پہیلی بوجھ لیتے ہو...... چلو یہی پہیلی بوجھو کہ ہم واپس کیوں جا رہے ہیں؟" وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔ اب وہ بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"واپس فتح پور۔ گرما گرم کمرے ہمارا انتظار کر رہے ہیں اور اُبلے ہوئے انڈے، زبردست دودھ پتی اور باداموں والا گڑ۔ ہم بڑی خاموشی سے فتح پور میں داخل ہوں گے اور سیدھے اپنے اپنے لحافوں میں گھس جائیں گے...... اتنی سردی میں لحافوں کا ذکر مزے دار لگ رہا ہے نا؟"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ عمران نے یہ کیا چکر چلایا

ہے۔ وہ استھان کے جنوبی ٹولے کے بستی میں پہنچنے سے پہلے ہی بستی چھوڑ آیا تھا لیکن یہ سب کچھ شاید دکھاوے کے لئے تھا۔ اب وہ بڑی خاموشی سے واپس بستی میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی چالیں ایسی ہی دماغ چکرا دینے والی ہوتی تھیں۔ میں نے تصدیق کے لئے عمران سے پوچھا کہ کیا اس نے ستیش اور اس کے مشتعل ساتھیوں کو چکمہ دینے کے لئے ایسا کیا ہے؟ اس نے میری بات کی تصدیق کی۔

ایسی بے مہر رات میں دربدر بھٹکنے کے بجائے، دوبارہ کسی نیم گرم کمرے میں ہونے کے خیال نے لطف دیا...... اور اندیشے ہوا ہونے لگے۔ عمران نے بتایا کہ اب ان کی واپسی تاؤ افضل کے گھر میں نہیں کسی اور جگہ ہو گی۔

"اب پھر معمے حل کروا رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ کہاں جانا ہے؟" میں نے پھنکار کر کہا۔

"یار! تم تو ٹی وی ٹاک شوز کے شرکا کی طرح منہ سے آگ نکالنے لگتے ہو۔ میں نے تمہیں اشاروں کنائیوں میں بتا تو دیا تھا مگر تم نے غور ہی نہیں فرمایا۔ ہم اب مندر کے تین منزلہ تہ خانے میں اُتریں گے...... اور اللہ کو منظور ہوا تو دو چار دن کے لئے چین کی بانسری بجائیں گے۔ بانسری بجانی آتی ہے نا تمہیں؟"

میں نے اسے کڑی نظروں سے گھورا تو وہ جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اچھا نہیں بجانی آتی تو کچھ اور بجا لینا لیکن جگر! اس طرح تو نہ گھورو...... میرے پیٹ میں گڑگڑ ہونے لگتی ہے۔"

ہم چین کی بانسری کی بات کر رہے تھے مگر جس چیز کی آواز آئی وہ بانسری سے بالکل مختلف تھی۔ ہم سب ہل کر رہ گئے۔ یہ رائفل چلنے کی آواز تھی۔ گولی ہمارے سروں کے اوپر سے سنسناتی اور پتوں، شاخوں سے ٹکراتی گزر گئی۔ ہم ایک دم نیچے جھکے۔ "لیٹ جاؤ۔" عمران نے چلا کر کہا۔

یکے بعد دیگرے ہم سب اوندھے منہ زمین پر گر گئے۔ دو گولیاں مزید چلیں...... دھماکوں سے جنگل گونج اُٹھا۔ ہمیں نشانہ نہیں بنایا جا رہا تھا، صرف ڈرایا جا رہا تھا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔ پھر کسی قریبی درخت پر سے گرج دار آواز سنائی دی۔ کسی نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی ہتھیار پاس ہے تو خود سے دور پھینک دو، ورنہ بُری طرح پچھتاؤ گے۔"

"یہ رانی خاں کا سالا کون ہے؟" عمران نے اقبال سے پوچھا۔

"ظاہر ہے کوئی انسان ہی ہے۔ جنگلی جانور تو انسانی آواز میں بات نہیں کر سکتا۔"

آواز پھر گونجی۔ "تم سب کے سب نشانے پر ہو۔ اگلی گولیاں تمہارے کھوپڑوں میں گھس جاویں گی۔"

وہ جو کوئی بھی تھا، ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ویسے بھی بلندی پر تھا۔ ہم اس کے لئے بالکل آسان نشانہ تھے۔

سلطانہ اور رادھا نے خود کو ایک تناور درخت کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ نوری زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ عمران نے دبی آواز میں کہا۔ "رانی خاں کا سالا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے ستارے عروج پر ہیں۔ یہ ہمیں نشانہ بنا سکتا ہے۔ ہتھیار پھینک دینے چاہئیں۔"

سب سے پہلے عمران نے ہی اپنی رائفل خود سے دور پھینکی۔ اس کے بعد اقبال نے رائفل پھینکی۔ آخر میں، میں نے بھی پستول نکالنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میرا پستول دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے جیب سے تو نکال لیا مگر ہاتھ میں نہیں لیا۔

کسی درخت کے اوپر سے کرخت آواز پھر گونجی۔ "ہیرے جاؤ۔ ان کی بندوقڑیاں اُٹھا لاؤ۔"

سامنے والے چھتاور درخت سے ایک پرچھائیں جست کرتے ہوئے نیچے آئی اور ہماری طرف بڑھی۔ یہ ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ یہ شخص قد میں چھوٹا لیکن چوڑائی میں بہت زیادہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جتنا لمبا ہے، اتنا ہی چوڑا بھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں جدید پمپ ایکشن رائفل تھی۔ اس نے ایک بڑی ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینک کر تیز نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پھر اس کی ٹارچ کا دائرہ درخت کے پیچھے دبکی ہوئی سلطانہ اور رادھا پر جم کر رہ گیا۔ اس روشن دائرے نے ان کے سراپا پر اوپر سے نیچے تک حرکت کی، تب چوڑے جسم والے شخص کی جوشیلی آواز ابھری۔ "استاد! دو لونڈیا بھی ہیں...... ناہیں ناہیں، تین ہیں۔ ایک وہ نیچے زمین پر پڑی ہے۔" اس نے ٹارچ کی روشنی نوری پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ارے ذرا غور سے دیکھ۔ لونڈیا اور تین تین۔ کہیں مردوں نے تو زنانے کپڑے ناہیں پہنے ہوئے؟"

"ناہیں استاد! ایک دم چچل لونڈیا ہیں۔ یہ دیکھو، سارا سامان پورا ہے۔" اس نے ایک بار پھر ٹارچ کا دائرہ رادھا کے جسم پر دوڑایا۔

اقبال نے اپنی جگہ سے ذرا سر اُٹھانے کی کوشش کی تو درخت پر بیٹھا شخص گرجا۔ "خبردار! بھیجا پھاڑ دوں گا۔ چپ چاپ لیٹے رہو اپنی جگہ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک

اور فائر کیا۔ یہ بھی ڈراوے والا فائر تھا۔ گولی اقبال کے آس پاس سے گزر کر کچی زمین میں دھنس گئی۔

تاہم اس گولی نے ایک خاص کام کیا۔ دھماکے کے ساتھ جب شعلہ نکلا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ چوڑے چکلے جسم والے ہیرے نے بڑی احتیاط سے ہمارا جائزہ لیا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ ہمارے پاس کوئی اور ہتھیار تو نہیں ہے۔ اسے ہوشیار سنگھ پر شک ہوا۔ اس نے اسے کھڑا کر کے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور اس کی قمیص کے نیچے سے کرپان برآمد کر لی۔ خوش قسمتی سے میرا پستول میرے پیٹ کے نیچے دبا رہا۔ ہیرا دونوں رائفلیں اور کرپان وغیرہ سمیٹ کر واپس اس درخت کے پاس چلا گیا جہاں سے جست لگا کر نیچے اُترا تھا۔

اندازے کے مطابق ہمارا واسطہ راہزنوں سے پڑا تھا جو اس علاقے میں عام پائے جاتے تھے۔ ان کی تعداد ہمارے قیافے کے مطابق دو یا تین تھی اور یہ ہمیں شوٹ کرنے کے لئے بڑی شان دار پوزیشن میں تھے۔ عمران اس صورتِ حال سے پریشان ہونے کے بجائے شاید انجوائے کر رہا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بہ آسانی نکل سکتا ہے لیکن میرے دل میں ایک اور طرح کی امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اپنا حوصلہ آزمانے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے کہا۔ "مجھے کچھ کرنے دو۔"

"کیوں؟"

"بس میرا دل چاہتا ہے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ بھابی کے سامنے نمبر بنانا چاہتے ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے سنجیدگی کہا۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرنا سیکھے۔"

"لیکن یہ تمہارے لئے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"خطرناک کا لفظ عمران عرف ہیرو کے منہ سے کچھ اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

ایک اور وارننگ فائر ہوا۔ گولی ہمارے اوپر سے گزر کر کسی درخت کے تنے میں لگی۔ اقبال سب سے آگے لیٹا تھا۔ درخت کے اوپر سے ایک رسی اچھلتی ہوئی آئی اور اقبال کے قریب گری۔ اس کے بعد رسی کے ایسے ہی دو ٹکڑے مزید اس کے پاس گرے۔

"یہ کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

کرخت آواز ابھری۔ "تجھے بھی نظر آ رہا ہووے گا۔ یہ رسیاں ہیں۔ اُٹھو اور ان سے اپنے ان یاروں کے ہاتھ ان کی پیٹھ پر باندھو۔ چلو جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ سمے ناہیں

ہے۔چلوشاباش۔''

''کیا بولتے ہو...... میں جاؤں؟'' میں نے دوبارہ عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

عمران نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے مخصوص دلیرانہ انداز میں بولا۔''او کے...... وش یو گڈ لک۔''

میں نے سرگوشی میں کہا۔''پستول میرے پیٹ کے نیچے ہے۔ میں اسے یہیں چھوڑ رہا ہوں۔تمہارے کام آئے گا۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں زمین سے اُٹھا اور دوزانو بیٹھ کر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔''کیا بات ہے......؟'' درخت کے اوپر سے کرخت آواز ابھری۔''لیٹ جا ورنہ کھوپڑا پھوڑ دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی عین میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

ثابت ہوتا تھا کہ درخت پر چڑھے ہوئے شخص کا نشانہ شاندار ہے۔

میں بدستور بیٹھا رہا اور پکارنے والے انداز میں بولا۔''استاد جی! میری بات سنو۔اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ میں ان حرام جادوں کا ساتھی ناہیں ہوں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاوت ہوں۔''

درخت پر چند لمحے سناٹا رہا، تب چوڑے چکلے جسم والے ہیرے نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی اور بڑے دھیان سے میرا جائزہ لیا۔ میں نے درخت والے کو مخاطب کر کے کہا۔

''استاد جی! آپ ان حرام جادوں کو اکیلا مت سمجھیں۔ان کتوں کے ساتھ پندرہ بیس کتے اور بھی یہاں ہیں۔ وہ آپ کو گھیر لیویں گے۔آپ مجھے پاس آنے دیں، میں آپ کو سب کچھ بتاوت ہوں۔''

ایک بار خاموشی کا ایک متذبذب وقفہ آیا۔تب درخت والے نے ہیرے کو حکم دیا۔

''اس کی پھر تلاشی لو اور اسے آگے لاؤ۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ چوڑا چکلا ہیرا محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے میری کیچڑ آلود جیکٹ کی جیبیں اچھی طرح ٹٹولیں۔تھوڑی بہت نقدی تھی جو اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لی۔ اس کے بعد میری کلائی سے گھڑی اُتروائی۔ پستول زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی کیچڑ آلود تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہیرے کی نظر میں نہیں آئے گا۔ میری یہ امید پوری ہوئی۔ ہیرے نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا۔ ہیرا الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ خوفناک بیرل والی پمپ ایکشن بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ کسی ذراسی غلط فہمی کے سبب بھی وہ فائر کر سکتا تھا۔

عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے شاید سلطانہ یا رادھا میں کوئی بے چینی دیکھی تھی۔ اس نے پکار کر کہا۔''اپنی جگہ بیٹھی رہو۔ کچھ نہیں ہوگا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں اس درخت کے عین نیچے پہنچ گیا جہاں وہ استاد نامی شخص گھات لگائے بیٹھا تھا اور ہم سب اس کے نشانے پر تھے۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ پہلے سے یہاں موجود تھے یا انہوں نے ہمیں ان گھنے درختوں میں گھستے دیکھا تھا اور پوزیشن لی تھی۔ ہم یہاں جنگلی جانوروں کی وجہ سے خوف محسوس کر رہے تھے مگر یہ خوف انسان نما جانوروں کے روپ میں سامنے آ گیا تھا۔ یہ اتر پردیش کے کم آباد علاقوں میں گھومنے والے وہی راہزن یا ڈکیت تھے جن کے بارے میں بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بنائی گئی ہیں...... ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنی گفتگو میں سلطانہ اور رادھا کا ذکر جس انداز سے کیا تھا، اس سے صاف پتا چلتا تا کہ اگر کہیں یہ لوگ ہم پر حاوی ہو گئے تو واقعی ان لڑکیوں کے لئے جنگلی جانور بن جائیں گے۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کی تعداد دو سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک شخص اوپر درخت پر چڑھا ہوا تھا اور دوسرا پمپ ایکشن گن کے ساتھ ہمارے سروں پر مسلط تھا...... اور یہ بات باعثِ حیرت تھی۔ تعداد میں صرف دو ہونے کے باوجود انہوں نے بڑی دیدہ دلیری سے ہمارا راستہ روکا تھا اور ہمیں نشانے پر رکھ لیا تھا۔ اسے ان کی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی بھی کہا جا سکتا تھا۔

''کیا کہنا چاہتا ہے تُو؟'' اوپر سے کرخت آواز میں پوچھا گیا۔

''میں ان کے سامنے ناہیں بتا سکتا۔ آپ نیچے آ جاویں یا مجھے اوپر آنے دیں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی ہوشیاری تو دکھانا ناہیں چاہ رہے ہو؟''

''میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کے پاس اسلحہ ہے۔''

''تم نے جو کچھ کہنا ہے ہیرے سے کہو۔ یہ مجھے بتا دیوے گا۔''

''لیکن......''

''بس جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔'' اوپر سے کرخت آواز میں کہا گیا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر پاٹ دار آواز سے لگتا تھا کہ کافی تحیم شحیم شخص ہے۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، فائر ہوا۔ یہ 0.38 کے پستول کا فائر تھا...... اور یہ وہی پستول تھا جو میں عمران کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ عمران کمال کا نشانے باز تھا۔ سرکس

کے خطرناک کرتبوں میں، میں اس کی مہارت دیکھ چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نشانے پر لگی۔ درخت میں چھپا ہوا نامعلوم شخص ایک کراہ کے ساتھ شاخوں سے ٹکرایا اور پھر دھم سے زمین پر گرا۔ اس نے گرنے کے بعد بھی اپنے حواس برقرار رکھے اور اوپر تلے دو فائر کئے۔ ایک گولی میرے اور نوری کے اوپر سے گزری اور کسی درخت کے تنے میں لگی۔ دوسری گولی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس نے اقبال کے قریب لیٹے زخمی راہول کو ہٹ کیا۔ اس کے منہ پر لگ کر یہ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔

پہلے فائر کے ساتھ ہی میں چوڑے چکلے ہیرے پر جھپٹا تھا۔ میں نے اس کی پمپ ایکشن پر ہاتھ ڈالا اور اس کا رخ اوپر کی طرف موڑ دیا۔ اسی دوران میں ہیرے نامی اس شخص نے ٹریگر دبا دیا۔ نہایت گرج دار آواز کے ساتھ فائر ہوا اور چھرے اوپر کی طرف نکل گئے۔ میں اور ہیرا گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ عجیب جسمانی ساخت کا شخص تھا۔ اس کے جسم میں کسی بریڈ فورڈ ٹرک جیسی طاقت تھی۔ میں اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے پیٹ پر ٹانگ مار کر مجھے دور پھینک دیا۔ خوش قسمتی یہ رہی کہ میں اس کے ہاتھ سے پمپ ایکشن نکالنے میں کامیاب رہا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ کسی کے ہاتھ میں بھی نہ رہی۔ اچھل کر تاریکی میں کہیں جا گری۔ گرتے ہوئے میرا چہرہ کسی تنے سے ٹکرایا اور گردن کے پچھلے حصے پر بھی چوٹ آئی۔ ان چوٹوں کو خاطر میں لائے بغیر میں تیزی سے اُٹھا۔ میں اور چوڑا چکلا ہیرا آمنے سامنے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ مجھے میری مرضی کا مدِمقابل ملا ہے۔ میں اور وہ، پوری طاقت سے بھڑ گئے۔ اس تصادم سے تین چار سیکنڈ پہلے عمران نے میرے، پستول سے اوپر تلے دو فائر کئے تھے اور زمین پر گرے پڑے استاد کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

ہیرا ان علاقوں میں گردش کرنے والا ایک روایتی ڈاکو تھا۔ بھوری چٹان کی طرح سخت اور بپھرے ہوئے جانور کی طرح خطرناک۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے حملہ کیا۔ اس کا طوفانی مکا میری ٹھوڑی پر پڑا اور میں لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس مکے نے میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دیں لیکن ان چنگاریوں نے مجھ پر کچھ اور طرح کا اثر کیا۔ بجائے اس کے کہ میں دیوانہ وار مدِمقابل پر ٹوٹ پڑتا، میرے اندر ایک غضب ناک ضد سی پیدا ہوئی۔ میں نے مدِمقابل کو خود پر مزید حملے کرنے کا موقع دیا اور خود کو ان حملوں سے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہیرے نے کم از کم تین طوفانی مکے میرے جبڑے پر رسید کئے جنہیں میں نے حیران کن طور پر جھیلا۔ تیسرا مکا کھانے کے بعد میں نے بھی پوری طاقت

سے ہیرے کے جبڑے پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ قوی ہیکل ہونے کے باوجود لڑکھڑایا۔ اس کے بعد جیسے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پھنکار کر مجھے مکا رسید کرتا، میں اسے اپنے چہرے پر لگنے دیتا اور پھر اسے جوابی مکا مارتا جسے وہ بھی چہرے پر لگنے دیتا۔ چند ہی سیکنڈ کے اندر یہ ضد، انا اور برداشت کی لڑائی بن گئی تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ہم اب خطرے سے باہر آ گئے ہیں۔ میرا اور اس گوریلا نما شخص کا تصادم اب ایک تماشے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا...... لیکن یہ ایک سنگین تماشا تھا۔ عمران اور اقبال سمیت سارے افراد اس سنگین تماشے کے تماشائی تھے۔ ہیرا نامی یہ شخص جسمانی طور پر مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس کے بہت بڑے تھوبڑے پر زخموں کے کئی پرانے نشان تھے جو اس کی جنگجو فطرت کو ظاہر کرتے تھے۔ اگر میں اس کے مکوں کی تاب لا رہا تھا اور بدستور اپنے پاؤں پر کھڑا تھا تو یہ میری وہ قوتِ برداشت ہی تھی جو پچھلے کچھ عرصے میں، میں نے اپنے اندر پیدا کی تھی۔ آج یہاں اس تاریک جنگل میں اس برداشت کا مظاہرہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عمران مجھے دیکھ رہا تھا...... اور سلطانہ بھی۔

میری ٹھوڑی پر ایک دو گہری چوٹیں لگی تھیں۔ منہ میں نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا اور ناک سے بھی خون رِس رہا تھا۔ دوسری طرف مدِمقابل کا تھوبڑا بھی لہولہان تھا۔ یہ لڑائی جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک ہی ختم ہو گئی۔ میرا ایک زوردار پنچ کھا کر مدِمقابل گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر پہلو کے بل کیچڑ میں گر گیا۔

عمران کسی ریفری کی طرح میرے اور مدِمقابل کے درمیان آ گیا۔ عمران کے روکنے پر میں رک گیا۔ اقبال نے آگے بڑھ کر دو زوردار ٹھوکریں اس شخص کے سر پر رسید کیں اور اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس شخص نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب ہمارے رحم و کرم پر ہے لیکن یہ ہماری توقع سے زیادہ آتش مزاج اور خطرناک نکلا۔ اچانک اس نے اپنے میلے کچیلے لباس کے اندر سے ہوشیار سنگھ والی خم دار کرپان برآمد کی اور ایک چنگھاڑ کے ساتھ اقبال پر جھپٹا۔ اقبال کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی دیر بھی ہوتی تو اس کا پیٹ چاک ہو جاتا اور انتڑیاں باہر آ جاتیں۔ تیز دھار کرپان کی نوک اس کی جیکٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ عمران نے بے دریغ پستول کا فائر کیا جو سیدھا اس کی کنپٹی پر لگا...... وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹاخ سے کیچڑ میں گرا اور دوبارہ اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے گرد آلود سر سے بہنے والا خون اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے شانوں کی چوڑائی غیر معمولی تھی۔ اگر میرے پاس ناپنے والا فیتہ ہوتا تو میں ضرور اس

چوڑائی کو ناپتا۔ اس کے ایک شانے پر ابھی تک گولیوں والی بیلٹ موجود تھی۔ یہ ان اونچی نیچی گھاٹیوں میں گھومنے والا وہ روایتی ڈکیت تھا جس کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے تمام طمطراق کے ساتھ زندہ تھا، اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

اس کا ساتھی جو عمران کے شان دار نشانے کا شکار ہو کر درخت سے نیچے گرا تھا، اب ساکت و جامد پڑا تھا۔ تین چار منٹ پہلے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ یہ بھی کافی لحیم شحیم شخص تھا۔ عمر کوئی پینتیس چالیس سال رہی ہو گی۔ گرانڈیل ہیرے نے اسے استاد کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہ بھی شکل وصورت سے خطرناک قاتل نظر آتا تھا۔ اس کے پاس جدید ''اے کے 56'' رائفل تھی۔ گولیوں والی بیلٹ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک قریبی درخت پر ایک چھوٹی سی مچان بھی موجود ہے اس مچان تک پہنچنے کے لئے سن کے رسّے کی ایک سیڑھی بھی بنی ہوئی تھی۔ اقبال نے اوپر چڑھ کر اس خستہ حال مچان کی تلاشی لی...... یہاں سے تاڑی کی دو بوتلیں، سگریٹوں کے پیکٹ اور کچھ نقدی وغیرہ برآمد ہوئی۔ سری دیوی اور مادھوری ڈکشٹ کی نیم عریاں تصویریں بھی اس سامان کا حصہ تھیں۔

میری گردن کے پچھلے حصے سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ یہاں درخت کی کوئی ٹوٹی ہوئی شاخ لگی تھی۔ میرے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر سلطانہ بے چین ہوئی۔ ایسے موقعوں پر عورت کی اوڑھنی ہی کام آتی ہے۔ سلطانہ نے بھی اوڑھنی پھاڑی اور میرا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

حکم کا ہرکارہ راہول بھی ایک جھاڑی میں مردہ پڑا تھا۔ ''اے کے 56'' رائفل کی گولی اس کا سر پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے تھے اور منظر کو حسرت ناک بنا رہے تھے۔ عمران نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ہاتھ سے بند کر دیں۔ یہ شخص چار دن پہلے جنگلی جانور کے حملے سے تو بچ گیا تھا لیکن آج ''جنگلی ڈاکو'' کے حملے سے نہ بچ سکا۔

تینوں لاشوں کو گھسیٹ کر ایک گڑھے میں رکھا گیا اور ان کے اوپر گھاس پھوس اور پتے وغیرہ ڈال دیئے گئے۔ دونوں ڈاکوؤں کی قیمتی رائفلیں اور ایمونیشن ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یقیناً ان چیزوں پر ہمارا حق تھا۔ عین ممکن تھا کہ عام رواج کے مطابق ان لوگوں کے سر کی قیمت وغیرہ بھی مقرر کی گئی ہو۔ ہم وہ قیمت تو حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ قیمتی رائفلیں

تو ہمیں انعام میں مل سکتی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ''ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ یہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ اگر ان کے کچھ ساتھی آس پاس موجود ہیں تو وہ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ہم فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ عمران نے میرا پستول میرے حوالے کر دیا اور پمپ ایکشن بھی مجھے تھما دی۔ ''یہ تمہارا انعام ہے جگر! تمہاری پہلی ٹرافی۔'' وہ میرا شانہ تھپک کر بولا۔ اقبال بھی مجھے قدرے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اس حوالے سے کچھ بولا نہیں۔ میں واقعی اپنے اندر فخر وانبساط محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آج پر خود کو آزمایا تھا اور اس آزمائش سے مطمئن ہوا تھا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کل کلاں میرا سامنا جارج گورا یا اس جیسے کسی اور بدمعاش سے بھی ہوا تو میں مزاحمت کا حق ادا کر سکوں گا۔

سلطانہ میرے پہلو میں چل رہی تھی اور بار بار میری خونچکاں گردن کو دیکھ رہی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اب میں کیا کروں؟ چوٹ بھی ایسی جگہ لگی ہے جہاں پٹی بھی نا ہیں باندھی جا سکتی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بڑی ٹھنڈ ہے۔ تھوڑی دیر میں خون کا رسنا خود ہی بند ہو جائے گا۔''

''لیکن چوٹ تو اپنی جگہ پر ہے نا۔ تمہیں مرہم پٹی کی جرورت ہے۔'' اس کے لہجے میں فکرمندی کے ساتھ ساتھ گونا گوں حیرت بھی تھی۔ وہ بار بار تعجب سے میری طرف دیکھنے لگتی تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک خطرناک ڈکیت سے دوبدو مقابلہ کیا ہے اور اس خونی مقابلے کو کھیل تماشے کی سی حیثیت دی ہے۔

عمران بھی گاہے بگاہے کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، کیوں کیا ہے۔ وہ میری اس کارروائی کو بجا طور پر سلطانہ کے ساتھ نتھی کر رہا تھا۔ وہ میرے بارے میں سلطانہ کی فکرمندی بڑھانے کے لئے بولا...... ''گردن کے پچھلے حصے پر لگنے والی چوٹ اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں مکمل آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ہم جتنی جلدی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''مگر ہم نے جانا کہاں ہے؟'' سلطانہ نے پوچھا۔

''وہیں پر جہاں سے آئے ہیں بھابی...... ٹھکانے پر پہنچ کر تابی آپ کو سب کچھ بتا دے گا۔''

نوری اور رادھا بالکل گم صم تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تین بندے موت کے

گھاٹ اُترے تھے، اس واقعے نے انہیں دم بخود کر رکھا تھا۔ خاص طور سے رادھا تو بالکل نیم جان ہو رہی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی ہمت بندھانے میں لگا ہوا تھا۔

ہم قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے یخ بستہ سفر کے بعد واپس فتح پور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اب رات کا چوتھا پہر شروع ہونے والا تھا۔ فتح پور تاریکی اور سناٹے کی لپیٹ میں تھا۔ بس کسی کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ یہ روشنی بھی دھند کی چادر میں لپٹ کر مدھم تر ہو جاتی تھی۔

ہم بستی کے قبرستان کے قریب ایک جھنڈ میں پہنچ کر رک گئے۔ صرف عمران آگے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو وہی دراز قد چوکیدار اس کے ساتھ تھا جس کا نام ہمیں آفتاب خاں معلوم ہوا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس ساری صورتِ حال میں یہ شخص عمران اور اقبال کا رازدار ہے۔

آفتاب خاں نے عمران اور اقبال کے ساتھ تھوڑی دیر تک کھسر پھسر کی پھر وہ ہم سب کو لے کر ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کی دونوں طرف گھروں کے دروازے بند تھے۔ کہیں کوئی حرکت یا روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم اس طویل بل کھاتی گلی میں دراز قد آفتاب کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' سلطانہ مسلسل اُلجھن میں تھی۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سلطانہ کو جواب مل گیا...... اور مجھے بھی۔ بل کھاتی گلی اچانک ہی ختم ہو گئی اور ہمیں اپنے سامنے مندر نظر آ گیا۔ مندر کے ساتھ ہی تاؤ افضل کا گھر تھا مگر ہم گھر کی طرف نہیں، مندر کی طرف نمودار ہوئے تھے۔ یہ مندر کا پچھواڑہ تھا۔ رات کے اس پہر دھند میں لپٹا ہوا یہ مندر عجیب پُراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ نانک چندی اینٹوں کی خستہ حال سیڑھی ہمارے سامنے تھی۔ ان سیڑھیوں کے بالائی سرے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر ایک بلی کسی ہڈی کو چچوڑنے میں مصروف تھی۔ ہڈی کے ساتھ اس کے دانتوں کے ٹکرانے کی آواز سناٹے میں واضح سنائی دیتی تھی۔

دراز قد آفتاب سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے سامنے پہنچا اور چابی کے ذریعے بڑی خاموشی سے دروازے کا قفل کھولا۔ اس کے اشارے پر ہم سب نے وہ سات آٹھ سیڑھیاں طے کیں اور ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اندر عجیب سی بو باس تھی...... یہ جگہ جیسے ایک طویل عرصے سے بند پڑی تھی۔ لکڑی کی گھسی ہوئی سیڑیاں بل کھاتی نیچے اُتر رہی تھیں۔ کہیں کہیں جالے بھی لگے ہوئے تھے۔ آفتاب خاں کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ ہم اس کی روشنی میں بہت سنبھل سنبھل کر نیچے اُتر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ خطرناک سیڑھیاں

تحت الثریٰ تک یونہی چلتی جائیں گی۔ خدا خدا کر کے ہم ایک ہموار جگہ پر پہنچے۔ یہاں قدیم طرز کے تین چار کمرے تھے۔ ان کمروں میں لکڑی کے پلنگ، الماریاں، نمدے اور اس طرح کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ طاق دانوں میں مٹی کے دیے موجود تھے جنہیں آفتاب نے بہ آسانی روشن کر دیا۔ ایک لالٹین ہماری...... آمد سے پہلے ہی ان کمروں میں ہلکی روشنی بکھیر رہی تھی۔

عمران نے چاروں طرف گھوم کر ناقدانہ نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ یہ تہ خانہ کافی پرانا ہے اور سیلاب کے وقت لوگوں نے اس میں پناہ لی تھی۔''

اقبال بولا۔ ''سیلاب میں لوگ پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، تہ خانوں میں نہیں اُترتے۔''

''کافر لوگ تہ خانوں میں ہی اُترتے ہیں۔ عذاب دیکھ کر ان کی مت ماری جاتی ہے۔'' عمران نے فلسفہ بگھارا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم اس ساتھ والے کمرے میں لیٹ جاؤ۔ آفتاب خاں تمہارے لئے مرہم پٹی کا انتظام کرتا ہے۔''

''ان کا خون بند ہو جائیں گا نا؟'' سلطانہ پریشانی سے بولی۔

''خون تو شاید بند ہو جائے مگر اسے بہت زیادہ آرام اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اسے کروٹ کے بل لیٹنا پڑے گا۔ رات کو بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ کہیں چت نہ ہو جائے۔ زخم کو ٹانکے تو لگ نہیں سکتے، احتیاط سے ہی ٹھیک ہوگا۔'' عمران نے کہا۔

آفتاب خاں بولا۔ ''یہاں سے ہلدی اور چونا وغیرہ مل جائے گا۔ خون بند کرنے کے لئے راکھ بھی ہوگی۔ بس یہاں تو یہی کچھ ہو سکے گا۔''

''چلو جو کچھ ہے جلدی سے لے آؤ۔'' عمران نے ضرورت سے زیادہ فکرمندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے میری اس چوٹ کے بارے میں ہی گفتگو کی۔ اس چوٹ کے حوالے سے ایسے ایسے میڈیکل اور نان میڈیکل نکتے پیش کئے کہ مجھے خود بھی محسوس ہونے لگا کہ موت کے منہ میں ہوں اور اب کوئی کرشمہ ہی مجھے زندگی کی طرف واپس لا سکتا ہے...... میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ فالج، لقوہ اور برین ہیمرج جیسے کئی موٹے موٹے امراض نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ دوسری طرف اس نے سلطانہ کو بھی اس بات پر تقریباً قائل کر لیا کہ اگر میرے صحت یاب ہونے کا تھوڑا بہت چانس ہے تو وہ اسی صورت میں ہے کہ وہ دن رات مجھ سے چمٹی رہے اور میری تیمارداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے۔

پھر وہ لاہور کا ایک واقعہ بیان کرنے بیٹھ گیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اس کے ایک ساتھی کو گردن کے پچھلے حصے پر چوٹ لگی تھی اور کس طرح اس کی بیوی کی غفلت کی وجہ سے وہ دوبارہ غسل خانے میں پھسل گیا تھا اور اس کی چوٹ کا زہر اس کے پورے بدن میں پھیل گیا تھا۔ اس زہر کو عمران نے ایسا لمبا چوڑا میڈیکل نام دیا کہ سلطانہ تھرا کر رہ گئی۔ اقبال مکمل طور پر عمران کا چمچہ بنا ہوا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں مِلا رہا تھا۔

مجھے چوٹ تو واقعی لگی تھی اور گردن بھی کچھ اکڑی اکڑی لگ رہی تھی مگر صورتِ حال ایسی بھی نہیں تھی جیسی عمران بتا رہا تھا۔ بہرحال، اس کی چرب زبانی کا خاطر خواہ اثر ہوا...... سلطانہ پوری دل جمعی سے میری تیمارداری اور دلجوئی میں لگ گئی۔

اس نے مجھے ہلدی ملا دودھ پلایا۔ میرے چہرے کی چوٹوں پر ٹکور کرنے کے لئے نمک کی تھیلی گرم کی۔ میری مرہم پٹی کے بعد اس نے مجھے لحاف اوڑھایا اور میرے سرہانے بیٹھ کر میرے کندھے دبانے میں مصروف ہوگئی۔ ساتھ ساتھ وہ بڑی فکرمندی سے اپنے بچے بالو کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔

اب صبح ہونے والی تھی مگر اس سہ منزلہ تہ خانے میں دن اور رات کا مطلق پتا نہیں چلتا تھا۔ تہ خانے کی حالت دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ اسے ہماری رہائش کے لئے پہلے سے تیار کیا جا چکا ہے۔ یہاں صفائی ستھرائی کی گئی تھی، بستر بچھائے گئے تھے۔ دس پندرہ افراد کے لئے دو تین ہفتوں کا راشن یہاں اکٹھا کرلیا گیا تھا۔ آفتاب خاں نے عمران اور تاؤ افضل کو بتایا تھا کہ وہ بس رات کو دوسرے پہر کے بعد ہی یہاں آ جا سکے گا۔

آفتاب خاں کی آمد اگلی رات کو بارہ بجے کے بعد ہوئی۔ عمران اس کی آمد کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ آفتاب کا چہرہ دیکھ کر ہی ظاہر ہوگیا کہ وہ کوئی خاص خبر لایا ہے۔ اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران بھائی! ام سب کو خدا کا بہت بہت شکر کرنا چاہئے...... خو تم نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ تم سب بال بال بچ گیا ہے...... اگر تم ابھی تک تاؤ کے گھر میں ہوتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ کچھ لوگ آئے ہیں؟''

''آئے ہیں جی، بالکل آئے ہیں اور دس بیس نہیں...... سو ڈیڑھ سو بندہ آیا ہے۔ یہ سب لوگ بڑا کٹر قسم کا ہندو ہے بلکہ ام تو سمجھتا ہے کہ ان کو ہندو بھی نہیں کہنا چاہئے...... یہ جنونی لوگ ہے۔ کسی کا بھی دوست نہیں۔ ان کے چہرے ہی بتاتے ہیں کہ یہ خونی اور قاتل

ہیں۔ وہ موٹا گرو بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کا کئی ایک نشان ہے۔ لگتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ وہی ان لوگوں کو لے کر یہاں آیا ہے۔''

''کب پہنچے تھے وہ لوگ؟''

''کوئی آٹھ نو گھنٹے پہلے۔ عصر کی اذان کے وقت۔ سب سے پہلے انہوں نے تاؤ کے گھر پر ہلا بولا۔ دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ تاؤ کے پڑوسیوں کو پکڑ لیا۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ آپ سب لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ لوگ کل رات کو ہی گاؤں چھوڑ کر جا چکا ہے...... پھر ان لوگوں نے مکھیا رشید اور اس کے بیٹوں کو بلا لیا۔ مکھیا رشید خانہ خراب کا بچہ کمینگی پر اُتر آیا ہے۔ وہ آپ لوگوں کو ڈھونڈنے میں استھان والوں کی پوری پوری مدد کر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے تاؤ افضل کے دو تین رشتے داروں کو بری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔''

تاؤ افضل کا چہرہ پریشانی کی آماج گاہ بن گیا۔ اس کی دونوں باپردہ بیٹیاں بھی سکڑ سمٹ سی گئیں۔

اقبال نے پوچھا۔ ''اب وہ لوگ کہاں ہیں؟''

آفتاب بولا۔ ''بیس بیس بندوں کی دو تین ٹولیاں آپ لوگوں کی تلاش میں نکلی ہیں۔ باقی لوگ مکھیا کے مکان میں ہے۔ وہ سب خبیث لوگ ایک دم تھانے دار بنا ہوا ہے۔ جس کسی پر شک ہو رہا ہے، اسے مکھیا کے گھر بلا رہا ہے اور بے عزت کر رہا ہے۔ شام کے بعد ام کو بھی بلا کر زمین پر بٹھایا تھا اور پولیس والوں کی طرح ام سے سوال جواب کیا تھا۔ امارا خون کھول رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ام کو کوئی گالی مالی نہیں نکالا، ورنہ ام سے برداشت نہیں ہونا تھا۔''

''نہیں نہیں، کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو برداشت کرنی ہے۔ ہم سب کی خاطر برداشت کرنی ہے...... اور اس بات کا بھی یقین رکھنا ہے کہ ہم بعد میں اس کا پورا پورا حساب چکائیں گے۔''

عمران کا فیصلہ حیران کن حد تک درست ثابت ہوا تھا۔ ہم اس تہ خانے میں موجود تھے اور بستی میں ایک شخص کے سوا کسی کو پتا نہیں تھا کہ ہم یہاں ہیں۔

عمران نے آفتاب خاں کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور واپس بھیج دیا۔ میری گردن کے پچھلے حصے میں واقعی تکلیف تھی۔ پٹھے اکڑ سے گئے تھے مگر ایسی تکلیفوں کو جھیلنا اور جھیلنے کے لئے ان کی گہرائی میں اُترنا، اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ سلطانہ میرے ساتھ تھی۔ اس کی موجودگی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ آفتاب خاں کچھ پھول لے کر آیا تھا۔ ان میں دو چار پھول موتیے اور

گیندے کے بھی تھے۔ میں نے وہ پھول نکال کر سامنے تپائی پر رکھ دیئے۔ ان پھولوں کی موجودگی نے سلطانہ کے مزاج پر اچھا اثر کیا۔ سلطانہ رات آخری پہر تک جاگتی رہی اور میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ میں بھی سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو گردن کے پچھلے حصے اور کمر پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نیند کی حالت میں چت لیٹ گیا تھا اور زخم پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے خون پھر جاری ہو گیا تھا۔ یہ مسلسل رستے رہنے والا خون اب گیلے پن کا احساس دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا، اڑتالیس گھنٹے کی تھکی ہاری سلطانہ میرے بستر کے قریب ہی دری پر سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ اس نے ایک پھول دار لحاف اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے اسے جگانا چاہا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔

گیلی قمیص میں نے اتار کر پھینک دی۔ دوسری قمیص پاس ہی پڑی تھی لیکن اسے پہننے سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنی کمر صاف کر لوں۔ ایک کپڑے سے میں نے کوشش کی مگر پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں اچانک نوری اندر آ گئی۔ شاید وہ کھڑکی میں سے میرا مسئلہ دیکھ رہی تھی۔

اپنے مخصوص انداز میں بولے سے بولی۔ ''ناراض نہ ہونا بابو جی۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کی کمر صاف کر دیوت ہوں۔''

مجھے ذرا تذبذب ہوا پر میں نے کپڑا نوری کو تھما دیا۔ وہ گھوم کر میرے عقب میں آ گئی اور بستر پر بیٹھ کر بڑی ملائمت سے میری کمر صاف کرنے لگی۔ اس کی چوڑیاں میرے کانوں کے قریب چھنچھنا رہی تھیں۔ گاہے بگاہے وہ میرے کندھوں پر ہاتھ بھی پھیر رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو۔ جلدی کرو۔'' میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

''بابو جی! صاف ہی کر رہی ہوں۔ آپ کے کندھوں کے بال بھی تو لتھڑے ہوئے ہیں...... اوئی ماں۔ دیکھیں پھر خون رِسنے لگا ہے۔'' وہ ایک بار پھر گڑبڑ کر رہی تھی۔ اس کا انداز لبھانے اور رجھانے والا تھا۔ اس کا جسم عقب سے بار بار میری پشت سے چھو جاتا تھا۔

''چلو چھوڑو۔ ٹھیک ہے۔'' میں ذرا بھنا سا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹتی، اس کا پاؤں نیچے رکھے ہوئے ایک جگ سے ٹکرایا اور اسٹیل کا یہ جگ فرش پر لڑھک گیا۔ آواز پیدا ہوئی اور سلطانہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا مہروج؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

پھر اس کی نظر میرے عقب میں بستر پر براجمان نوری پر پڑی اور اس کی آنکھیں کھلی رہ

گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے کا دریا امڈ پڑا ہے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ پھنکاری۔

''مم...... میں...... جی...... وہ بابو جی نے ہی بلایا تھا۔ دیکھیں ان کا پنڈا پیچھے سے لہولہان ہو گیا ہے۔'' اس نے ہوشیاری سے سلطانہ کی توجہ میری کمر کی طرف مبذول کروائی۔

سلطانہ کمر کی طرف متوجہ ہوئی تو نوری خاموشی سے کھسک گئی۔

''یہ کیا کیا تم نے مہروج! زخم کا منہ پھر کھل گیا ہے۔'' وہ بڑے درد سے بولی۔

اس نے کپڑا گیلا کیا اور میرا پنڈا پونچھنے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پنڈا صاف کرنے اور زخم سے خون کا رساؤ بند کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اس نے خفا لہجے میں کہا۔

''مہروج! یہ کمینی کیوں آئی تھی یہاں؟''

میں نے چونک کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کی نمی تھی اور آنکھوں میں طیش اور رقابت کی سرخی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے نوری کے بارے میں عمران کی بات یاد آئی۔ عمران نے معنی خیز انداز میں کہا تھا...... ہوسکتا ہے کہ یہ لڑکی ویسی نہ ہو جیسی نظر آ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نوری نے جان بوجھ کر جگ کو اپنے پاؤں سے گرایا ہے تاکہ آواز پیدا ہو اور سلطانہ جاگ جائے...... تو کیا وہ جان بوجھ کر سلطانہ کے دل میں حسد اور رقابت کے جذبے کو جگا رہی تھی؟ کہیں وہ...... عمران کی ہدایت پر تو ایسا نہیں کر رہی تھی؟ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ بالائی تہ خانے کی سیڑھیوں سے کسی کے دھڑ دھڑ اُترنے کی آواز آئی۔ پھر دراز قد آفتاب خاں دھواں دھواں چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ باہر سے کوئی بری خبر لایا تھا......

O......❖......O

آفتاب خاں سیڑھیاں اُتر کر سیدھا میری طرف آیا اور ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ماف کرنا جی! ام نے آپ کو پریشان کیا۔ دراصل ام عمران بھائی کو ڈھونڈ رہا ہے۔''

''وہ ابھی کچھ دیر پہلے سویا ہے۔ پچھلے کمرے میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''باہر حالات کچھ اچھا نہیں ہے جی۔ ام کو خون خرابے کا بُو آ رہا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''استھان کے لوگوں نے جنگل میں سے وہ تینوں لاشیں ڈھونڈ لیا ہے جن کو آپ گڑھے میں چھپا آیا تھا۔ اب ان کو یقین ہو گیا ہے کہ آپ فتح پور کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فتح پور کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہو...... کیونکہ ایک دو جگہ سے ایسا کھرا ملا ہے جن سے ان کو اندازہ ہوا ہے کہ جنگل والی فائرنگ کے بعد آپ پھر فتح پور کی طرف پلٹا ہے۔''

''فتح پور کے آس پاس تو ہمارا کھرا نہیں ملا؟''

''نہیں جی...... لیکن وہ لوگ شک میں ضرور پڑ گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہوا ہے کہ استھان والوں کو پتا چل گیا ہے کہ آپ تینوں ہندو نہیں، مسلمان ہیں۔ عمران بھائی اور اقبال بھائی کے بارے میں تو بستی والوں نے بتا دیا ہے اور آپ کے بارے میں اس خبیث موٹے نے گواہی دی ہے۔ اس نے استھان والوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کے اور سلطانہ بی بی کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ یہ بات جان کر کہ آپ تینوں مسلمان ہیں، وہ لوگ بہت بپھرا ہوا ہے۔ فتح پور کے سارے مسلمانوں کا کم بختی آ گیا ہے۔ ان کو بُری طرح مارا پیٹا جا رہا ہے۔ افسوس کا بات یہ ہے کہ مکھیا رشید مسلمان ہونے کے باوجود استھان والوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ اپنا بدلہ چکانے کی فکر میں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''عمران بھائی نے یہاں فتح پور میں اس کی بدمعاشی کا راستہ روکا تھا اور تاؤ افضل کو خاص طور سے سہارا دیا تھا۔ اب رشید اور اس کے بیٹوں کا سارا غصہ تاؤ افضل کے رشتے داروں پر اُتر رہا ہے۔ تاؤ افضل کا چچیرا بھائی حسن دین ساتھ والی بستی میں رہتا ہے۔ مکھیا کے لوگ اس کو پکڑنے گئے تھے۔ وہ تو نہیں ملا، مکھیا کے لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔ ان میں تاؤ افضل کی دو بہوئیں، ایک بیٹی اور تین چھوٹے بچے بھی شامل ہیں۔ ان سب کو مکھیا کی حویلی میں رکھا گیا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوگا۔''

اس قسم کے اندیشے پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا۔ ''تاؤ افضل یا اس کی بیٹیوں کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی...... ام نہیں بتائے گا...... لیکن...... امارا خون مسلسل ابال کھا رہا ہے جی۔ ام کو ڈر ہے کہ ام غصے میں کچھ کر نہ بیٹھے۔ ام کو سب سے زیادہ طیش اس حرامی مکھیا پر آ رہا ہے۔ وہ کافروں سے بڑھ کر کافر ہو گیا ہے۔ مکھیا کا کام تو اپنے لوگوں کا حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ وہ باہر والے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کا دشمن بن گیا ہے۔''

میں نے آفتاب خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، عمران بھائی نے کل بھی تم سے یہی کہا تھا نا کہ برداشت کرنا ہے۔ ایسے موقع پر تمہاری کوئی بھی غلطی تمہیں اور ہم سب کو سخت مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ اس وقت بہادری یہی ہے کہ اپنے غصے کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا جائے۔''

آفتاب خاں نے کہا۔ ''دوپہر سے ایک بڑھیا بھی یہاں آئی ہوئی ہے۔ اس نے الگ ناٹک رچا رکھا ہے۔ گاؤں کے سارے ہندوؤں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کے سامنے واویلا کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ جس لڑکی کو استھان سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے، وہ بہت بڑی اپرادھن ہے۔ اس کا اپرادھ اتنا بڑا ہے کہ وہ اب لڑکی نہیں رہی، بدآتما بن گئی ہے۔ وہ اگر آزاد رہے گی تو اس پورے علاقے پر بہت بڑا آفت آئے گا اور جو شخص اس بدآتما کی مدد کرنے یا اس پر ترس کھانے کا پاپ کرے گا، اس کا جیون اس دنیا میں ہی نرگ کا نمونہ بن جائے گا۔ اس بڑھیا کے ساتھ ایک بوگس پنڈت بھی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ اس نے دو کبوتر چھوڑ رکھا ہے اور وہ دونوں مسلسل گاؤں کے اوپر چکر کاٹ رہا ہے۔ پنڈت کا کہنا ہے کہ ان کبوتروں کی وجہ سے وہ اپرادھن کھچ کر گاؤں کی طرف چلی آئے گی اور

اگر گاؤں میں ہے تو سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گی۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے آفتاب خاں سے بڑھیا کا حلیہ وغیرہ پوچھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بڑھیا کون ہو سکتی ہے۔ یہ انتہا پسند ستیش کی وہی سخت گیر کٹر دادی تھی جس سے میری ملاقات نل پانی میں ہوئی تھی۔ یہ عمر رسیدہ دقیانوسی عورت اپنے فرسودہ عقیدوں کو پوری شدت سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے گھرانے پر بھی کڑی نظر رکھتی تھی اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی جرأت نہیں تھی۔ مجھے اس کی بہو مالا یاد آئی جو روشن خیال تھی اور اپنی دادی ساس سے اختلاف رکھتی تھی۔

''یہ بڑھیا یہاں کیسے آن پہنچی ہے؟'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''کیا آپ اس کو جانتا ہے؟'' آفتاب خاں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟''

''ہاں جی، بیٹا ہے جس کا نام رام پرشاد ہے۔ اس کا عمر بھی پچاس پچپن تو ہوگا ہی۔ ساتھ میں اس کا بہو ہے اور ایک دو بچہ لوگ بھی ہے۔ یہ سب لوگ رات کو مندر میں پوجا پاٹ کرتا رہا ہے...... اور رو رو کر اشلوک پڑھتا رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ادھر دھن لڑکی کے بھاگ جانے کی وجہ سے یہ سب لوگ پاپی بلکہ مہا پاپی ہو گیا ہے۔''

''مہا پاپی تو یہ لوگ ہیں ہی لیکن کسی اور معنی میں۔'' میں نے کہا۔

میری بات آفتاب خاں کی سمجھ میں نہیں آئی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور چوکس ہو کر حالات کا جائزہ لیتا رہے۔ کچھ دیر وہاں رک کر آفتاب خاں جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے پوری تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں اور فتح پور میں کسی کے سان گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ مندر کے نیچے تہ خانوں میں کوئی چھپ سکتا ہے۔ جاتے جاتے آفتاب خاں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن ہم سب پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔

آفتاب خاں ایک سیدھا سادہ غیور پٹھان تھا۔ جی داری کے حوالے سے دیکھا جاتا تو وہ کسی طرح بھی انور خاں سے کم نہیں تھا۔ میری سوچ کا رخ انور خاں اور چوہان وغیرہ کی طرف ہو گیا۔ میں کئی روز پہلے انہیں بغیر کچھ بتائے نل پانی کے دیوان سے نکل آیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میری گمشدگی سے بہت پریشان ہوں گے۔ میں کسی بھی طرح انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے جیکی کی سوگوار محبوبہ شکنتلا کے بارے

میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ یقیناً حکم جی کے جاسوسوں اور ہرکاروں سے جس طرح مجھے اور سلطانہ کو خطرہ تھا، اسی طرح شکنتلا کو بھی خطرات لاحق تھے۔

میری اور آفتاب خاں کی گفتگو کے دوران میں سلطانہ ایک گوشے میں سمٹی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے سر پر اوڑھنی تھی اور چہرہ نیم وا تھا۔ یقیناً اس نے بھی وہ ساری باتیں سنی تھیں جو آفتاب خاں نے کہی تھیں۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ ہولے سے بولی۔ ''مہروج! میں تم سے ٹھیک اِچ کہتی ہوں نا کہ یہ لوگن اب مجھے چھوڑیں گے ناہیں۔ بڑے پنڈت کے داماد موہن کمار کو مار کر میں نے اپنے بہت سے دشمن بنا لئے ہیں۔ اب دیکھو، کچھ لوگن مجھے بد آتما کہہ رہے ہیں اور مجھے ڈھونڈنے کے لئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔''

''جو لوگ تمہیں ایسا کہہ رہے ہیں وہ خود جنونی بدروحیں ہیں۔ وہ اپنی آگ میں خود جلیں گے۔ تمہیں ان کی وجہ سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور جہاں تک تم اپنے دشمنوں کی بات کر رہی ہو تو وہ اکیلے تمہارے ہی دشمن نہیں ہیں، میرے بھی ہیں۔ ہم دونوں کو ایک ہی طرح کے خطرے لاحق ہیں لیکن ان خطروں کا سامنا کرنے کی بات کی جائے تو پھر میرا حق زیادہ ہے کیونکہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اور اللہ کے فضل سے اب اتنا حوصلہ بھی ہے کہ ان خطروں کا منہ موڑ سکوں۔''

''تم...... کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟''

میں نے اس کے کندھے پر ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں سلطانہ کہ تم اب کسی بھی صورت، کوئی ایسا کام نہیں کرو گی جس سے تم کسی مشکل میں پڑو۔ ایک اچھی بیوی کی طرح تم میری دی ہوئی محفوظ چار دیواری میں رہو گی اور چار دیواری سے باہر کے سارے معاملے مجھے نمٹانے دو گی۔ ہاں اگر...... خدانخواستہ...... خدانخواستہ میں ناکام ہوا اور تمہارے لئے زندہ نہ رہا تو پھر تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو گی۔''

اس نے بے تاب ہو کر اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ''خدا کے لئے ایسا مت بولو مہروج۔ آپ میرے مجازی خدا ہو۔ آپ نہ ہوں گے تو پھر میں بھی نہ ہوں گی۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے گھما کر اپنے ہونٹ ہاتھ کی پشت سے لگا دیئے۔ وہ سر تا پا لرز گئی۔ اس نے سر جھکایا اور اس کے گندمی چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی نظر آنے لگی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔ وہ اب جس طرح سکڑی سمٹی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی، کوئی اسے دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ زرگاں میں چار افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار چکی ہے لیکن اس نے یہ سب کیا تھا۔ بے شک جواں سال

طلال بھی اس کے ساتھ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان خونی واقعات میں زیادہ اہم کردار سلطانہ کا ہی رہا ہے۔ چند ہفتے پہلے وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح نل پانی سے نکلی تھی اور تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر دیوانہ وار زرگاں میں گھس گئی تھی۔ وہ بہادر راجپوت ماں کی بے خوف بیٹی تھی۔ اس کی ماں نے سنگین ترین صورتِ حال میں حکم جی کی جان بچائی تھی اور اب کئی برس بعد سلطانہ نے ثابت کیا تھا کہ جو لوگ وفاداری نبھانے کے لئے جان بچا سکتے ہیں اور جان دے سکتے ہیں، وہ وقت پڑنے پر جان لے بھی سکتے ہیں۔

سلطانہ کے چہرے پر حیا کی سرخی موجود رہی۔ پھر اس کا دھیان ایک دم اس صورت حال کی طرف چلا گیا جو آفتاب خاں کے آنے سے پہلے یہاں موجود تھی۔ اس نے اس ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے نوری کھسک کر غائب ہوئی تھی۔ حیا کی سرخی کی جگہ غصے کی ہلکی سی سرخی نے لے لی۔ وہ بولی۔ ''مہروج! مجھے لگتا ہے...... یہ کمینی...... کسی دن میرے ہاتھوں سے بری طرح پٹے گی۔ میں بہت برداشت کر چکی ہوں اسے۔''

''برداشت تو میں بھی بہت کر چکا ہوں۔ دراصل اس طرح کی خبیث عورتیں کسی ''گنجائش'' کے چکر میں رہتی ہیں۔''

''تم...... کس گنجائش کی بات کر رہے ہو مہروج؟''

''میری اور تمہاری دوری۔ نوری کو پتا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ناراضی ہے۔ وہ اسی ناراضی اور دوری کے درمیان گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھی، میں آپ اور آپ کی بیوی کے درمیان صلح کرا سکتی ہوں۔ ایسی صلح کرانے والیاں صلح کراتے کراتے خود ہی کچھ بن بیٹھتی ہیں۔'' میں نے سخت بیزار لہجہ بنا کر کہا۔

سلطانہ کا چہرہ تمتما گیا اور سانس کی آمد ورفت تیز ہو گئی۔ اگر واقعی عمران نے ہی نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا تو پھر اس کی عقل کو داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ واقعی ایک تیز طرار دیور کا کردار ادا کر رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ شیطان کو یاد کیا جائے تو وہ آن موجود ہوتا ہے۔ دروازہ کھلا اور عمران سوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں حلوے کی پلیٹ تھی اور وہ اس میں سے کھاتا ہوا آ رہا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں بھابی! میں نے آپ دونوں کو ڈسٹرب کیا۔ دراصل مجھے باتوں کی آواز آ رہی تھی اس لئے سمجھ گیا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟''

''ناہیں...... ایسی بات ناہیں۔'' سلطانہ نارمل لہجے میں بولی۔

''دراصل آج کل وقت بے وقت بھوک لگ جاتی ہے۔ یہ تھوڑا سا حلوہ پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا اسی سے کام چلا لیتا ہوں۔ ویسے یار! یہ نوری جیسی بھی اوٹ پٹانگ ہے لیکن حلوہ خوب پکاتی ہے۔ کل تم اس کی تعریف ٹھیک ہی کر رہے تھے۔''

''میں تعریف کر رہا تھا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

عمران نے فوراً سلطانہ کی نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ ''ہاں...... کل دوپہر جب ہم کھانا کھا رہے تھے اور کھانے کی تعریف کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ تم تو پریشان ہو گئے ہو...... بھابی آپ بھی چکھ کر دیکھیں۔''

''ناہیں...... اس وقت ناہیں۔'' سلطانہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے عمران کو غصیلی نظروں سے گھورا...... پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ لکڑی کی قدیم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے تہ خانے میں آ گئے۔ ''یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو تم؟'' میں نے اس سے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہاری مدد کر رہا ہوں، تم اسے حماقت کہہ رہے ہو؟''

''خاک مدد کر رہے ہو۔ وہ پہلے ہی غصے سے بھری بیٹھی ہے، تم اوپر سے اسے یہ بتا رہے ہو کہ میں نوری کے کھانے کی تعریفیں کر رہا تھا۔''

''یار! کبھی کبھی مریض کا درد دور کرنے کے لئے اسے تھوڑا سا اور درد دینا پڑتا ہے۔ انجکشن لگانا پڑتا ہے۔ تم اسے انجکشن ہی کہہ سکتے ہو۔''

''تم اپنی یہ ڈاکٹریاں اپنے پاس رکھو تو زیادہ اچھا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے...... اور ہاں...... ایک بات مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ۔ یہ نوری والا چکر تم نے ہی چلایا ہوا ہے نا؟''

''کیا مطلب؟''

''ڈرامے مت کرو۔ تم کہہ رہے تھے کہ یہ نوری ویسی نہیں ہے جیسی نظر آ رہی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے تم نے ہی میرے پیچھے لگایا ہوا ہے۔''

عمران کے ہونٹوں کے گوشوں پر بے ساختہ ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً سنجیدگی میں چھپا لیا۔ ''دیکھو جگر! اب تم الزام تراشیاں کر رہے ہو اور یہ بھی نہیں سوچ رہے کہ ایسی الزام تراشیوں سے خود تمہاری ہی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو گی۔''

''مارکیٹ ویلیو؟''

''ہاں بھئی...... اب دیکھو نا، نوری تمہارے آگے پیچھے پھرتی ہے تو سب تمہیں رشک کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دل ہی دل میں تمہاری کشش اور مردانہ وجاہت کے معترف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھابی بھی ضرور متاثر ہوتی ہوں گی۔ اب جب تم یہ کہو گے کہ کسی نے زبردستی نوری جیسی حسینہ کو تمہارے پیچھے لگایا ہوا ہے تو پھر ویلیو تو ڈاؤن ہو گی نا۔ فتح پور کی اور بہت سی لڑکیاں جنہوں نے ابھی تم پر عاشق ہونا ہے اور تمہارے لئے ٹھنڈی آہیں بھرنی ہیں، وہ سب کی سب اپنے ارادے بدل لیں گی۔"

"تم بکواس نہ کرو۔ میں سب سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا چاہ رہے ہو۔ تمہارے دماغ میں گھسا ہوا ہے کہ نوری اس طرح میرے آگے پیچھے رہے گی تو سلطانہ میں جلاپا پیدا ہوگا اور وہ میرے قریب آجائے گی...... لیکن وہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ تمہاری اس حماقت سے کوئی الٹا اثر بھی لے سکتی ہے۔"

"تم صنفِ نازک کے بارے میں میرے تجربے اور علم کی توہین کر رہے ہو۔ میں نے عرق النسا نکالا ہوا ہے شہزادے۔ نفسیات الخواتین کے اندر اتنی گہرائی میں اُترا ہوا ہوں کہ اب کچھ بھی میرے لئے راز نہیں۔ تم دیکھنا، دو چار دن کے اندر بھابی سلطانہ میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آئیں گی۔"

"تو تم یہ تسلیم کر رہے ہو کہ نوری کو تم نے ہی میرے پیچھے چھوڑا ہے؟"

"وہ بڑی بھلی مانس لڑکی ہے یار...... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"اسے شیطان ثابت کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ تم اسے بھلا مانس کہہ رہے ہو۔"

"دیکھو، تم نیوز چینل والے سے متھا لگا رہے ہو اور شاید تمہیں پتا نہیں کہ ہمارا کیمرا واش روم تک بندے کا پیچھا کرتا ہے۔"

ہمارے درمیان یہ نوک جھونک شاید کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں جھکی جھکی کمر والا تاؤ افضل وہاں آ گیا۔ عمران بولا۔ "اب ہم یہاں لیتے ہیں چھوٹا سا بریک۔" تاؤ افضل کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح نادیدہ خوف کے سائے تھے۔ لٹھ حسبِ معمول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں نم تھیں۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے دوسرے لوگن کو نقصان پہنچ جاوے۔ کھیا رشید دل کا بڑا کھوٹا ہے۔ وہ میرے رشتے داروں کی جان عذاب میں ڈال سکت ہے۔"

میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا ایک چچیرا بھائی مصیبت میں آ گیا ہے۔

عمران نے تاؤ افضل کو تسلی تشفی دی۔ ابھی تاؤ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا کہ گرو کی

نی رادھا بھی وہاں آ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے محترم شوہر کے لئے پریشان تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور خوبصورت آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے شوہر سے محبت نہیں ہے۔ وہ صرف ڈر کی وجہ سے اس کے ساتھ نتھی ہے یا یوں کہا جائے کہ صرف دھرم کا پالن کر رہی ہے۔ اسے یہ خوف ہے کہ اگر اس کی وجہ سے اس کے پتی دیو پر کوئی مصیبت آئی تو بھگوان بھی اس سے ناراض ہو جائے گا...... اور وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

وہ عمران سے جاننا چاہتی تھی کہ اس کے پتی دیو کہاں اور کس حال میں ہیں۔

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو رادھا! تمہیں اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ہے، خود گیا ہے اور جس حال میں بھی ہے، اپنی مرضی سے پہنچا ہے۔ اس کے لئے تم کچھ کر سکتی ہو نہ ہم کر سکتے ہیں۔ بس پرارتھنا کی جا سکتی ہے اور وہ یقیناً تم کر رہی ہو گی۔"

"لیکن سب کچھ میری وجہ سے ہی شروع ہوا تھا نا۔ تم لوگن نے میری کمر سے بارود باندھا۔ میرا جیون بچانے کے لئے ہی گرو جی نے تاڑی میں بے ہوشی کی دوا ملائی۔ اچھا ہوتا کہ انہوں نے میری ہتھیا ہو جانے دی ہوتی۔ مر جانے دیا ہوتا مجھ ابھاگن کو۔"

"اب اس نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ تمہیں مرنے کے لئے یہاں چھوڑ گیا ہے صرف اپنی جان بچا کر بھاگا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم زندہ ہو اور وہ بھگوان کی پکڑ میں آ گیا ہے۔"

عمران کی اس بات نے رادھا کو خاموش کرا دیا مگر اس کے شفاف رخساروں پر آنسو بدستور پھسلتے رہے۔ وہ ہولے سے بولی۔ "اس کے پیچھے بھی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہووے گی۔ کوئی کارن ہووے گا۔ گرو جی کا کوئی کرم بھگوان کی منشا سے خالی نا ہیں ہوتا۔"

"ہاں، کوئی نہ کوئی بہانہ تو اس کے پاس ضرور ہوگا۔ اس کے دماغ میں بہانہ ساز فیکٹری لگی ہوئی ہے اور مزہ یہ ہے کہ ہر بہانہ دھرم کے عین مطابق بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی بہانے سے تاڑی پی لیتا ہے۔ کسی بہانے تم جیسی لڑکی سے بیاہ رچا لیتا ہے۔ کسی بہانے جاپ کے ٹھنڈے پانی کو گرم کر لیتا ہے۔ بڑا کمال کا بندہ ہے تمہارا پتی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

رادھا نے کانپ کر نفی میں سر ہلایا اور سسکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کی ملائم شفاف کمر پر ابھی تک بیلٹ کے فیتوں کے نیلگوں نشان موجود تھے۔ وہ واقعی نازک اندام اور معصوم تھی۔

گرواس کی معصومیت سے خاطر خواہ ''خراج'' وصول کرتا رہا تھا۔

رادھا اور تاؤ افضل کے جانے کے بعد میں نے عمران کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے آفتاب خاں کیا کچھ بتا کر گیا ہے۔ تاؤ افضل کے چچیرے بھائی کی مصیبت کا سن کر عمران کے ماتھے پر بھی شکن آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے بستی والوں سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ ان کا دکھ سکھ اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔ یہ جان کر کہ بستی میں مسلم گھرانوں پر مصیبت آئی ہوئی ہے، وہ بے چین سا نظر آنے لگا۔ تاہم میری طرح وہ بھی جانتا تھا کہ بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے اس چھوٹی مصیبت کو برداشت کرنا ضروری ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب میں سلطانہ کے پاس بیٹھا تھا اور بالو کی باتیں کر کے اس کی ممتا کو مزید ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک بالائی سیڑھیوں پر آفتاب نمودار ہوا۔ وہ رات کے وقت آتا تھا۔ اس کا سہ پہر کے وقت آنا خلافِ معمول تھا۔ میں اور عمران سب سے نچلے تہ خانے میں قیام پذیر تھے۔ آفتاب سیدھا ہمارے پاس ہی آیا۔ وہ سرگوشیوں میں عمران سے باتیں کرنے لگا۔ میں بھی ان دونوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بڑا عجیب سین ہے جی۔ ام تو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ وہ لوگ ایسے رو رہا ہے اور بین کر رہا ہے جیسے ان کا پورا فیملی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔''

''وہ بڑھیا بھی ہے؟''

''جی ہاں، وہی کھوسٹ تو سب سے زیادہ واویلا کرتا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ کبھی دیوی کے قدموں میں سر رکھ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا ادھیڑ عمر بیٹا اور بہو بھی ساتھ ہیں۔ ساتھ میں چودہ پندرہ سال کا ایک بچہ بھی ہے جس نے سادھوؤں جیسا حلیہ بنایا ہوا ہے۔''

''بچہ کون ہے؟''

''امارے اندازے کے مطابق یہ بھی بڑھیا کا نواسا ہے۔ یہ سب لوگ کل ایک ساتھ ہی نل پانی سے یہاں آیا ہے۔''

بچے کا سن کر میرے ذہن میں فوراً وہ لڑکا آ گیا جس نے رام پرشاد کے گھر سے مجھے نیلے پتھروں والا ہار پہنا کر اور خوشبو لگا کر رخصت کیا تھا۔

آفتاب خاں سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اگر آپ لوگ یہ تماشا دیکھنا چاہتا ہے تو ام آپ کو دکھا سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہاں اوپر والے تہ خانے کی بغل سے ایک تنگ زینہ اوپر مندر تک جاتا ہے۔ اس کا کچھ سیڑھیاں گر چکا ہے لیکن پھر بھی ام تھوڑا سا کوشش کر کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ مندر میں کالی کی مورتی کے پیچھے دیوار میں ایک چھوٹا سا ہوادان ہے۔ یہ ہوادان فرش سے بس ڈیڑھ دو فٹ اونچا ہے۔ اس میں لال پتھر کا جالی لگا ہوا ہے۔ ام اس جالی میں سے پوجا والے کمرے کا نظارہ کر سکتا ہے۔''

ہمارے اور آفتاب کے درمیان اس بارے میں تھوڑی سی بات چیت مزید ہوئی پھر ہم آفتاب کے ساتھ ان تاریک، تنگ زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ آفتاب کی ہدایت پر ہم نے اپنے چہروں کے گرد کپڑے لپیٹ لئے۔ آفتاب نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ خود کو چھپانے کے لئے نہیں تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ یہ تنگ زینے نامعلوم عرصے سے بند پڑے تھے اور گرد آلود جالوں سے اَٹے ہوئے تھے۔ چہروں کو ڈھانپنے کی وجہ سے ہم ان جالوں سے محفوظ ہو گئے۔

آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور وہ سب سے آگے تھا۔ اس نے لالٹین اس طریقے سے پکڑ رکھی تھی کہ ہمیں بھی روشنی مہیا ہوتی رہے۔ نانک چندی اینٹوں کے زینے دو تین جگہوں پر بالکل مسمار ہو چکے تھے۔ ہمیں یہاں احتیاط سے اوپر چڑھنا پڑا۔

ایک موڑ کاٹنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی۔ ذرا دیر بعد ہم ایک مستطیل روشن دان کے سامنے تھے۔ آفتاب نے اسے ہوادان کا نام دیا تھا۔ اس کی چوڑائی بہ مشکل ڈھائی تین فٹ اور اونچائی ڈیڑھ فٹ ہو گی۔ اس میں سرخ پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ ہم تاریکی میں تھے لیکن جالی کی دوسری طرف شمع دانوں اور چراغوں وغیرہ کی روشنی تھی۔ ایک طرف لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ ہمیں پوجا پاٹ کے ایک وسیع کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا اور یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ مجھے اس منظر میں کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ سب سے اہم چہرہ تو سرخ آنکھوں اور کھڑی ناک والے برہمن زادے ستیش کا تھا۔ ستیش مجھے استھان میں لے کر گیا تھا اور ستیش سے میری آخری ملاقات بھی استھان کے ہنگامے میں ہوئی تھی۔ تب وہ رائفل تانے قدم قدم ہماری طرف بڑھ رہا تھا...... اور ہم قدم قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اب وہی ستیش سر جھکائے پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ اس کے پہلو میں اس کا پتا یعنی گھر کا سربراہ رام پرشاد اپنی فربہ بیوی سمیت نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف ستیش کی عمر رسیدہ دادی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ایک بڑی مالا پکڑ رکھی تھی اور جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں گرو کی پہلوان نما

ملازمہ بھاگ متی موجود تھی۔اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے نہایت وزنی کڑے موی شمعوں کی روشنی میں دمک رہے تھے۔سب کے چہروں سے گریہ زاری ظاہر ہو رہی تھی۔رام پرشاد کی جواں سال بہو بھی مجھے وہیں پر نظر آئی۔تاہم وہ سب سے پیچھے بیٹھی تھی اور اس گریہ زاری کے ماحول سے قدرے الگ دکھائی دیتی تھی۔

بہت سے اور لوگ بھی اس کمرے میں موجود تھے اور اپنے اپنے انداز سے پرارتھنا کر رہے تھے۔پوجا کے کمرے کے ماحول میں عجیب سی سوگواری اور گھمبیرتا رچی ہوئی تھی۔اتنی بوجھل فضا تھی کہ اس کے بوجھ کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔''ام کو تو یہ لوگ عام ہندوؤں سے بھی مختلف لگتا ہے۔یہ دیکھو، اس بڑھیا نے اور اس کے بیٹے نے کس طرح اپنا ماتھا رنگا ہوا ہے۔ام کو تو یہ خون لگتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے بھی جوابی سرگوشی کی۔

''پتا نہیں کیوں امارے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ یہ لوگ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ان کا نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

شاید آفتاب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔پوجا کے کمرے کا ماحول سخت گھمبیر ہونے کے ساتھ ساتھ پُراسرار بھی تھا۔غالباً پوجا کے اس کمرے میں اس بستی کا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔یہ سب لوگ باہر سے ہی آئے ہوئے تھے اور ان میں زیادہ تر استھان ہی کے تھے۔ان میں سے سات آٹھ چہروں کو تو میں اچھی طرح پہچان رہا تھا۔عقابی آنکھوں والا گاڑی بان بھولا ناتھ، امری اور پٹیل جس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی لوگ۔ایک طرف کونے میں مجھے وہ لڑکا بھی نظر آیا جس کے بارے میں آفتاب نے ابھی بتایا تھا کہ وہ رام پرشاد کا بیٹا اور ستیش کا چھوٹا بھائی ہے۔تاہم ستیش کا ایک خاص ساتھی مہندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آیا۔

رام پرشاد کی لرزتی کانپتی ہوئی آواز اُبھری اور پوجا کے کمرے میں پھیل گئی۔

''بھگوان! ہمرا اور امتحان نہ لو، ہمیں شما کر دو، بس ہمیں شما کر دو۔ہمیں دکھا دو کہ تم نے ہمری پرارتھنا سویکار کی ہے۔ہمیں دکھا دو بھگوان۔''

''ہمیں دکھا دو بھگوان...... دکھا دو۔'' کئی گڑگڑاتی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

''ہم نے پرائشچت کیا ہے بھگوان لیکن ہم کمزور ہیں۔ہمرا پرائشچت بھی کمزور ہے مگر جیسا بھی ہے تُو اسے قبول کر لے۔ہم پر سے اپنا قہر ہٹا لے۔'' رام پرشاد کی آواز دوبارہ اُبھری۔

''ہم پر سے قہر ہٹا لے۔'' باقی آوازوں نے تائید کی۔

کچھ دیر تک رونے گڑگڑانے کا سلسلہ جاری رہا پھر رام پرشاد کے گھر نظر آنے والا سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس اپنی جگہ سے اُٹھا اور دھوتی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔تھوڑی دیر بعد وہ پوجا کے کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا سا پیالہ تھا۔پیالے کو اوپر سے ایک تھالی کے ساتھ ڈھکا گیا تھا۔پنڈت بھگوان داس نے یہ پیالہ بڑی احتیاط سے دیوی کے قدموں کے پاس ایک چھوٹے چبوترے پر رکھ دیا۔یہاں کئی دیے پہلے سے روشن تھے۔

رام پرشاد نے اپنی عمر رسیدہ ماں کو سہارا دے کر اُٹھایا اور پیالے کے قریب لے آیا۔اس نے پیالہ اُٹھا کر بڑھیا کے پاس کیا۔پیالے میں یقیناً کوئی سیال تھا۔بڑھیا نے یہ چلّو بھر سیال لیا اور دیوی کے قدموں میں چھڑک دیا۔ہم دنگ رہ گئے۔یہ سیال کچھ اور نہیں، خون تھا...... بڑھیا کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی۔خون چھڑک کر وہ لرزتی کانپتی پیچھے ہٹ گئی اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

اس کے بعد بڑھیا کے بیٹے رام پرشاد نے یہی عمل کیا پھر جواں سال ستیش کی باری آئی۔خاندان کے سبھی افراد نے باری باری یہ رسم پوری کی۔آخر میں رام پرشاد کی بہو مالا کی باری تھی۔وہ اپنی جگہ سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔رام پرشاد ہاتھ میں پیتل کا پیالہ لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔بڑھیا نے قہر آلود نظروں سے مالا کو گھورا اور پھر مالا کے شوہر ستیش سے کچھ کہا۔

ستیش کے چہرے پر بھی طیش تھا۔اس نے غصیلے لہجے میں مالا کو پکارا۔''اُٹھو، اِدھر آؤ۔''

وہ جیسے تھرا کر رہ گئی۔ستیش نے دوبارہ کہا تو وہ چار و ناچار اُٹھی اور پیالے کی طرف بڑھی۔اس کے چہرے پر سخت ناگواری تھی اور وہ پیالے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے لرز رہی تھی۔بڑی کراہت کے ساتھ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو ذرا سا تر کیا اور دیوی کے قدموں پر جھٹک دیا۔

اس کا انداز دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ عام خون نہیں ہے اس میں کوئی خاص بات ہے۔

''کہیں یہ کسی انسان کا خون تو نہیں تھا؟'' یہ سوال تیزی سے میرے ذہن میں اُبھرا اور سنسنی بن کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

میں نے کنکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے پر بھی سنسنی آمیز اُلجھن کے آثار تھے۔

سوچنے کی بات تھی...... اگر یہ کسی انسان کا خون ہے تو پھر کس کا ہے؟ کیا اس کے جیتے جاگتے جسم سے یہ خون کشید کیا گیا ہے یا پھر اسے مار ہی ڈالا گیا ہے...... اَن گنت سوال ذہن میں کھلبلی مچانے لگے۔ اندر کی فضا مزید بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے صاف دیکھا کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس جاتے ہوئے سسکیوں کے ساتھ رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد بڑھیا اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کی بیوی اور بہو مالا بھی اُٹھ گئیں۔ وہ چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھی اُٹھ گیا جس کا نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔ تیرہ من کی دھوبن بھاگ متی بھی ان سب کے پیچھے جھومتی اور ڈگمگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے بازوؤں کے کڑے کھڑکھڑا رہے تھے اور ماحول کی پُراسراریت میں اضافہ کر رہے تھے۔

اب پوجا کے وسیع و عریض کمرے میں صرف مرد رہ گئے۔ سوکھے سڑے پنڈت کے دو تین ساتھیوں نے بلند آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیئے۔ رام پرشاد جیسے وجد کے عالم میں تھا اور پیتل کی ایک بڑی گھنٹی کو مسلسل حرکت دیتا چلا جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز در و دیوار میں سرایت کر رہی تھی۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی چلی گئی۔ اشلوک بھی ہیجان خیز ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت پہلے کی طرح اُٹھا اور باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پنڈت واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا گول تھال تھا۔ اس تھال میں کوئی تربوز جیسی شے اروی کے پتوں سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھال کے کناروں پر پھول سجائے گئے تھے۔ پنڈت نے یہ تھال بہ مشکل اُٹھا رکھا تھا۔

چند قدم آگے بڑھ کر پنڈت نے یہ تھال دیوی کے قدموں میں رکھ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ رام پرشاد عجیب انداز میں گھنٹی کو حرکت دیتا چلا گیا۔ اشلوکوں کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ہر چہرہ مجسم ہیجان تھا۔ پنڈت نے آگے بڑھ کر اپنا منحنی جسم پیتل کے تھال پر جھکایا اور تربوز نما شے کے اوپر سے اروی کے بڑے بڑے پتے جدا کر دیئے۔ شمع دانوں اور چراغوں کی مدھم روشنی میں جو منظر ہمیں دکھائی دیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔

سب کچھ ہمارے سامنے تھا مگر ہمیں اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ پیتل کے گول تھال میں ایک خون آلود انسانی سر رکھا تھا...... اور...... یہ گرو سوبھاش کا سر تھا۔ ہاں، یہ گرو سوبھاش ہی تھا۔ اس کا منڈا ہوا سر، اس کا صفا چٹ چہرہ، اس کی پھولی ہوئی ناک سب

کچھ ہمارے سامنے تھا۔ گرو کی گردن، ٹھوڑی کے بالکل پاس سے کاٹی گئی تھی اور گردن کے زخم کو پتوں سے ڈھکا رہنے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ منظر سینہ شق کر دینے والا تھا۔

''اوہ خدایا!'' آفتاب خاں نے سرسراتی سرگوشی کی۔ ''یہ تو وہی موٹا ہے جو راتوں رات یہاں سے بھاگ گیا تھا۔''

''ہاں وہی ہے۔'' عمران نے نہایت تاسف سے تائید کی۔

''میرا خیال ہے کہ پیالے میں لہو بھی گرو ہی کا تھا۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہم سب سناٹے میں تھے۔ اندر پوجا کا منظر قابلِ دید تھا۔ سب اوندھے لیٹ گئے تھے اور گریہ زاری کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ نہایت سنگ دل لوگ تھے۔ پھر بھی ان میں سے کئی ایسے تھے جو یہ دلدوز منظر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ پیتل کے تھال میں رکھا ہوا انسانی سر جس کے گرد پھولوں کا گھیرا تھا، فربہ چہرہ خون آلود تھا اور نقوش پر آخری وقت کی دہشت اور اذیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ گرو کی نیچے لٹکی ہوئی ٹھوڑی اور ایک رخسار پر چوٹوں کے نشان تھے جو اس امر کے گواہ تھے کہ گرو پر اس کے اپنے ہی لوگوں نے تشدد بھی کیا ہے۔

رام پرشاد نے فرش پر اوندھے لیٹے لیٹے بلند آواز میں کہا۔ ''دیوی! یہ بلیدان سوئیکار کرو۔ ہمیں آنے والی آفت سے بچا لو۔ ہمیں شما کر دو۔''

اسی طرح کی گریہ زاری دوسرے لوگ بھی کر رہے تھے۔ مندر میں ان کی پوجا کا انداز بالکل جدا تھا۔ یہ عمومی نہیں بلکہ ایک خاص فرقے کا انداز تھا۔

مہا گرو استھان کے تیرہ سیوکوں کا قاتل تھا۔ ہم نے اس کی سزائے موت کا منظر اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر چشم تصور سے یہ منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گرو کو جان بہت پیاری تھی۔ یقیناً اس نے زندہ رہنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ اپنے ساتھیوں کو من گھڑت دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آخری وقت میں زور آزمائی بھی کی ہو۔ ذبح ہونے والے جانور کی طرح تڑپا پھڑکا بھی ہو لیکن اس کی کوئی پیش نہیں چلی تھی۔

اس کے انجام پر کچھ ترس تو آ رہا تھا لیکن وہ قابلِ ترس ہرگز نہیں تھا۔ اسی کی زیرِ ہدایت و نگرانی میں شکیلہ جیسی بے گناہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا...... کچھ دیر بعد یہ خصوصی پوجا ختم ہو گئی اور خون آلود سر کو دوبارہ پتوں سے ڈھانپ کر دیوی کے سامنے سے اُٹھا لیا گیا۔

ہم بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اُتر کر زیریں تہ خانے میں واپس پہنچ گئے۔ سب خاموش تھے۔ واقعے کی سنگینی نے چہروں کو گھمبیر کر رکھا تھا۔ رادھا اپنے کمرے میں نوری کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے پتی دیو کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ جتنی دیر تک بے خبر رہتی، اتنا ہی اچھا تھا۔

''خس کم جہاں پاک۔'' آخر اقبال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجایا اور ہلکی سی انگڑائی لے کر بولا۔ ''محاورہ تھوڑا سا غلط ہو گیا ہے۔ خس تنکے کو کہا جاتا ہے اور گرو تو کافی بھاری بھرکم چیز کا نام تھا۔''

میں نے کہا۔ ''جتنا بھاری بھرکم تھا، اتنا ہی خطرناک بھی تھا۔ جو لوگ اپنے مذہب کو اپنی من مانیوں کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ گولہ بارود چلانے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔''

''لیکن گرو کو مارنے والے شاید گرو سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ جو لوگ اپنے ایک ساتھی کو اتنی بے دردی سے قتل کر سکتے ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔''

''بات تو بالکل ٹھیک ہے۔'' اقبال نے عمران کی تائید کی۔

آفتاب خاں پہلی بار تھوڑا سا نروس نظر آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آفتاب تمہارا یوں بار بار یہاں تہ خانے میں آنا جانا کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔''

آفتاب بولا۔ ''ام کو اپنا فکر نہیں ہے جی۔ ام تو اکیلا ہے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ام کو آپ کی طرف سے ڈر لگتا ہے۔ آپ کے ساتھ پانچ جوان عورتیں بھی ہیں اور یہ کھیا وغیرہ بڑا ذلیل ہے۔ عورتوں کے لئے ایک دم خطرناک ہے۔'' پھر اس نے اپنی آواز کچھ مزید دھیمی کر لی اور بولا۔ ''ام نے رات کو تاؤ کے چچا زاد بھائی کے بارے میں بتایا تھا نا۔ یہ ذلیل لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر یہاں لایا ہے۔ آج سویرے باقی عورتوں کو تو چھوڑ دیا ہے مگر ایک گورا چٹا جوان لڑکی ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس بے چاری کا عزت بچا رہے گا۔''

آفتاب خاں نے ہمیں کلثوم نامی اس لڑکی کے بارے میں تفصیل بتائی۔ اس نے کہا کہ کل شام لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس جرم میں کھیا نے اسے بری طرح مارا پیٹا بھی تھا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکی بہت کچھ جانتی ہے اسی لئے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔

آفتاب خاں نے کہا۔ ''آپ سچ پوچھتا ہے تو مجھے تو یہ استھان والا لوگ ایک دم دیوانہ

لگتا ہے۔ اتنا غصہ ہے ان لوگوں میں کہ ام آپ کو کیا بتائے۔ آپس میں بھی لڑ جھگڑ رہا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ یہاں آ کر دو دھڑوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک تو وہ کھڑی ناک والا ستیش ہے جس کو ابھی ام نے مندر میں دیکھا ہے۔ دوسرا اس کا ساتھی مہندر ہے۔ ام کو لگتا ہے جیسے گرو کو مارنے کے بارے میں بھی ان دونوں میں جھگڑا رہا ہے۔ ستیش شاید گرو کو مار دینا چاہتا تھا اور مہندر اس کا چیلا ہونے کی وجہ سے اس سے تھوڑا بہت رعایت کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ مندر میں مہندر نام کا وہ بندہ پرارتھنا میں موجود نہیں تھا۔ ام کو گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔''

ہمارے درمیان کافی دیر گفتگو ہوئی۔ آفتاب خاں ہمارے لئے بڑا کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ وہ باہر کی ساری صورتِ حال کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مہندر اور گرو کے چار پانچ چیلے مستقل طور پر کھیا رشید کی حویلی میں ہیں جبکہ ستیش، اس کا پتا رام پرشاد، دادی اور چند ساتھی ایک دوسرے زمیندار کے گھر میں قیام پذیر ہیں۔

جو خوفناک واقعہ ہم نے مندر میں دیکھا، اس کے بارے میں اپنے دیگر ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا۔ تاؤ افضل، رادھا، نوری، سلطانہ اور طلال وغیرہ اس واقعے سے بالکل بے خبر رہے۔

سلطانہ کے حوالے سے میں شام تک سخت کشمکش میں تھا۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تاہم شام کے بعد کچھ بہتری کے آثار نظر آئے اور مجھے لگا کہ سلطانہ کے بارے میں عمران جو ''ماہرانہ'' پیش گوئیاں کر رہا ہے، وہ شاید درست ہیں۔ شام کے وقت سلطانہ کا موڈ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ آج اس کے بال کچھ سنورے ہوئے ہیں۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا تھا۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل بھی لگایا تھا۔ اس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ اچھی بھلی دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو اس میں ایک پلیٹ ڈھکی ہوئی بھی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حلوہ...... تمہارے لئے مہروج!''

میں نے دیکھا، یہ سوجی کا حلوہ تھا۔ اس پر تھوڑا سا خشک میوہ بھی ڈالا گیا تھا۔ یہ اسی طرز کا حلوہ تھا جو نوری نے بنایا تھا۔

''یہ تم نے بنایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

میں نے حلوہ چکھا۔ وہ واقعی نوری کے حلوے سے کہیں بہتر تھا۔ بہر حال میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''کیسا ہے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس...... ٹھیک ہے۔'' میں نے عام لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرا گیا اور وہ ایک دم چپ ہوگئی۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زبردست سلطانہ...... تم نے واقعی کمال کا بنایا ہے۔''

وہ جیسے اندر سے کھِل اُٹھی پھر اپنے تاثرات چھپانے کے لئے پانی لینے کے بہانے اندر چلی گئی۔

کتنا فرق تھا اس کی شخصیت کے دو رُخوں میں۔ وہ ایک خونی قاتلہ کے روپ میں سامنے آئی تھی لیکن اب بھی اس کے اندر ایک عورت مکمل طور پر مری نہیں تھی...... وہی عورت جو اپنے شریکِ حیات کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر نہال ہوتی ہے۔ اپنے شیرخوار کو اپنے سینے پر لٹا کر اس سے اٹھکیلیاں کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ ہاں، ابھی وہ عورت کسی نہ کسی درجے میں زندہ تھی اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس زخم زخم عورت کو زندہ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔

رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی۔ میرے پاس بیٹھی اپنے بالو کی باتیں کرتی رہی۔ اس کی ممتا بیدار ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد بالو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی چھاتی سے لپٹانا چاہتی تھی۔ یہ صورتِ حال امید افزا تھی۔ اگر ممتا اس کے اندر زندہ ہوگئی تھی تو پھر امید تھی کہ مکمل عورت بھی زندہ ہو جائے گی جس کی آنکھوں میں حسرتوں کے قبرستان نہیں ہوں گے۔ جو میرے چھونے سے سرتاپا لرزے گی نہیں۔

جب ہم اپنے اپنے بستر پر سونے کے لئے لیٹے تو میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ہولے ہولے اس کے بالوں میں چلاتا رہا۔ بالوں کا یہ لمس میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ماضی میں، مَیں ان بالوں کے اندر چہرہ چھپاتا رہا ہوں۔ ان کی خوشبو اپنی سانسوں میں اُتارتا رہا ہوں...... دھندلی سی گواہی تھی مگر موجود تھی۔ میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ وہ اپنے تمام تر پیار بھرے ایثار کے ساتھ میرے دل میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں رات کی اس تنہائی میں اس کی طرف بڑھتا تو شاید...... شاید وہ مجھے راستہ دینے پر آمادہ ہو جاتی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی

آزادی اور رضا بھی اس کی زندگی ہی کی طرح عزیز تھی۔ میں نے اپنی ذات کا دروازہ اس کے لئے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پوری آزادی اور پوری عزتِ نفس کے ساتھ اس دروازے میں خود قدم رکھے۔

وہ سو گئی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی دو موٹی لٹیں اس کے گندمی چہرے پر تھیں۔ مجھے اس کے چہرے پر جارج گورا کے گندے ہاتھوں کا کوئی ہلکا سا نشان بھی نظر نہیں آیا۔ وہ چاندنی، شبنم اور سورج کی روپہلی کرنوں کی طرح شفاف اور پاک تھی۔

سلطانہ کو دیکھتے دیکھتے میرا دھیان اس کلثوم نامی لڑکی کی طرف چلا گیا جو بقول آفتاب خاں اس وقت اپنی آبرو کے خطرے سے دوچار تھی...... میں سہ پہر سے اس لڑکی کے بارے میں کئی بار سوچ چکا تھا۔ کیا ایک اور سلطانہ ایک اور جارج گورا کے پنجۂ ہوس میں جکڑی جانے والی تھی؟ کیا اس مرتبہ بھی میں کچھ نہیں کر سکوں گا یا پھر اس مرتبہ بھی مجھے تاخیر ہو جائے گی...... جیسے شکیلہ والے معاملے میں ہوگئی تھی؟ استھان میں اپنی آبرو کے بعد وہ اپنی زندگی بھی نہیں بچا سکی تھی اور اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفن ہوگئی تھی۔ میں اور عمران سوچتے ہی رہ گئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ عمران بھی اس کلثوم نامی لڑکی کے سلسلے میں بے چین ہے لیکن میری بے چینی شاید اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس بے چینی میں میرے اندر کی بے چینی اور وحشت بھی شامل ہوگئی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا...... کسی مشکل سے ٹکرانا چاہتا تھا...... خود کو کسی بے پناہ صورتِ حال کے رُوبرو کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ مجھے درد درکار تھا، اذیت چاہئے تھی۔ میری سہی ہوئی اذیت سے اگر کچھ لوگوں کے لئے آسانیوں کے در کھل جاتے تو یہ اور بھی اچھی بات تھی۔

میں نے سلطانہ کو سوتے چھوڑا اور بے چین سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ آفتاب خاں باہر کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے یہاں آئے گا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے اپنا پسٹل جیکٹ کے نیچے لگایا اور خاموشی سے زینوں کی طرف آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کچھ دیر کے لئے سو گیا ہے اور اقبال اوپر والے تہ خانے پر تاؤ افضل اور رادھا کی دل جوئی میں مصروف ہے۔ میں خاموشی سے زینے چڑھ کر بالائی تہ خانے پر آ گیا۔ یہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور تاریکی تھی۔ میں خاموشی سے لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے گرد آلود بینچ پر بیرونی دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ چار پانچ دن پہلے ہم اسی دروازے سے گزر کر ان تہ خانوں میں داخل ہوئے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر عمران وغیرہ کو معلوم ہوتا کہ میں باہر جانا چاہ رہا

ہوں تو وہ مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ ان کی سب سے وزنی دلیل یہی ہوتی کہ اگر خدانخواستہ میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا۔ وہ لوگ مجھے تشدد کے شکنجے میں جکڑیں گے اور مندر کے تہ خانوں تک پہنچ جائیں گے۔ یہ بہت وزنی دلیل تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اذیت برداشت کرنے کے حوالے سے میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ ناقابلِ برداشت اذیت کو جھیلنا میری فطرت بنتا جا رہا ہے۔ برداشت کی حد آتی تھی تو میں رک جاتا تھا اور اگلی دفعہ اس حد کو بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔

دروازے سے باہر مدھم آہٹیں سنائی دیں۔ پھر تالا کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اور آفتاب خاں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آفتاب خاں مجھے وہاں تاریکی میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہم نہایت مدھم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ آفتاب خاں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ میں اس وقت مندر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تابش بھائی! ام کو آپ کا بات سمجھ میں نہیں آ رہا۔ باہر آپ کے لئے بہت خطرہ ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو......“

”دیکھو، میں جو بات کہہ رہا ہوں، پوری طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے بُرے بھلے کا ذمے دار ہوں اور تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی دوسرے پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔“

”مگر......“

”آفتاب! میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تم بس یہ کرو کہ مجھے کھیا رشید کے گھر کے دروازے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام......“

”مگر......مگر وہاں آپ کرے گا کیا؟“

”یہ سب کچھ میں تمہیں واپس آ کر بتاؤں گا......کل رات۔“

”کیا مطلب؟ آپ آج واپس نہیں آئے گا؟“

”میں تو ان شاء اللہ آ جاؤں گا مگر تم آج نیچے نہیں جاؤ گے۔ تم سے ہماری ملاقات اب کل رات ہی ہو گی۔“

”اماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ ام کو ذرا تفصیل سے بتائیں، شاید ہمارے کھوپڑے میں کچھ آ جائے۔“ آفتاب کی آواز بھرا گئی۔

اگلے چار پانچ منٹ میں وہیں سیڑھیوں کی تاریکی میں سب کچھ طے ہو گیا۔ پروگرام

کے مطابق مجھے اور آفتاب خاں کو آگے پیچھے مندر میں سے نکلنا تھا۔ ہمارے درمیان کم و بیش تیس قدم کا فاصلہ رہنا تھا۔ آفتاب نے مجھے کھیا کے مکان تک پہنچانا تھا اور پھر سیدھا آگے نکل جانا تھا۔ اس نے مجھے کھیا کے مکان کا سارا حدود اربعہ بھی بتا دیا اور اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ وہاں اندازاً کتنے لوگ اور کہاں کہاں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے آخر میں آفتاب خاں کی سمجھ میں یہ بات تقریباً آ گئی کہ میں کھیا کے گھر سے اس کلثوم نامی لڑکی کو نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اس ارادے نے اسے حیران تو بہت کیا تاہم اس نے اس حوالے سے کوئی تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔

باہر نکل کر آفتاب نے پہلے ارد گرد کا جائزہ لیا پھر میں بھی باہر آ گیا۔ آفتاب نے میری ہدایت کے مطابق دروازہ بند کیا اور تالا دوبارہ لگا دیا۔ اس نے تالے کو بند نہیں کیا لیکن بظاہر وہ بند ہی نظر آتا تھا۔ رات بہت ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے، مدھم ہوا چل رہی تھی۔ میں اور آفتاب آگے پیچھے گاؤں کی گلیوں میں جا رہے تھے۔ آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین اور لاٹھی تھی۔ ایک پرانا ماؤزر بھی اس کے لباس کے اندر موجود تھا۔ چلتے چلتے وہ گاہے بگاہے آواز بلند کر دیتا تھا۔ ”جاگتے رہو۔“

وہ کہہ تو رہا تھا کہ ”جاگتے رہو“ لیکن فی الوقت وہ خواہش یہی کر رہا تھا کہ ”سوتے رہو“ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو ہونے دو۔ گلیوں میں آوارہ کتوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ جنگلی جانوروں سے تحفظ کے لئے اکثر گھروں کے گرد کانٹوں اور جھاڑیوں کی باڑیں لگائی گئی تھیں۔ میرے سینے میں عجیب سا جوش بھر گیا تھا اور اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

چھوٹے بڑے گھروں کے درمیان مجھے ایک نیم پختہ اور کشادہ مکان نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی کھیا کا گھر ہے۔ گھر کا احاطہ وسیع تھا۔ پھاٹک سے باہر دو تین خالی چھکڑے کھڑے تھے۔ یہاں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آفتاب نے بتایا تھا کہ کھیا کے مویشی اور گھوڑے وغیرہ احاطے کے اندر ہی ایک اصطبل میں ہوتے ہیں۔ حسبِ پروگرام کھیا کے گھر کی نشاندہی کرنے کے بعد آفتاب سیدھا نکلتا چلا گیا۔

آفتاب نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ کھیا کے مکان کی دیوار کہاں سے بہ آسانی پھاندی جا سکتی ہے اور کس طرف سے احاطہ پار کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں نے آفتاب کی ہدایت کے مطابق ایک جگہ سے چھ فٹ اونچی کچی دیوار پھاندی اور احاطے میں چلا گیا۔ مجھے ایک طویل برآمدے میں داخل ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ یہاں چقیں لگی تھیں

اور دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ ہلکی بُو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں خشک مچھلی ہے۔ ایک دم مجھے رکنا پڑا۔ کسی قریبی گوشے سے بھاری آواز میں گانے کی مدھم صدا اُبھر رہی تھی۔ کوئی شخص بھرائی ہوئی نشہ زدہ آواز میں بار بار یہ بول رہا تھا۔ نند لالا پن گھٹ پر چھیڑ گیو رے...... میری چولی کے بخیے ادھیڑ گیو رے...... میری چولی...... میری چولی ......

میں کچھ دیر تک یہ بھونڈی آواز سنتا رہا اور سمت کا تعین کرتا رہا پھر پستول نکال کر ایک تنگ راہداری کی طرف بڑھا۔ لالٹن کی بہت مدھم روشنی میں ایک ہٹا کٹا شخص فرش کی دری پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس دیسی بوتل کی ساخت سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں تاڑی ہے۔ ویسے بھی اب میں تاڑی کی بُو اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ یہ شخص دری پر اینٹھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ خمار کے عالم میں گاتا جا رہا تھا۔ نند لالا پن گھٹ پر...... نند لالا......

مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں اپنے سائے کا دھیان نہیں رکھ سکا۔ سامنے دیوار پر میرے سائے کی مدھم حرکت دیکھ کر ہٹا کٹا شخص بری طرح چونک گیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس پر جھپٹ پڑوں۔ میں نے ڈیڑھ کلو وزنی پستول کا دستہ پورے زور سے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ کراہ کر ایک تکیے پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر چلاتا اور کسی کو اپنی مدد کے لئے بلاتا، میں اس پر سوار ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کا منہ ہی ڈھانپا۔ اس کی آواز اس کے گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ وہ خاصا زور آور تھا۔ غالباً نشے نے اس کے زور میں مزید اضافہ کیا تھا۔ اس نے غیر معمولی طاقت کے ساتھ ہاتھ پاؤں چلائے اور میری گرفت سے نکل جانا چاہا۔ اس کی مزاحمت توڑنے کے لئے میں نے اس کی زخمی کنپٹی پر پستول کا ایک اور وار کیا۔ وہ نڈھال سا ہو گیا۔ میں نے اس کے ادھ کھلے منہ میں ایک کپڑا ٹھونسا اور پھر اس کپڑے کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ غالباً اس مکان کے مکین بند کمروں میں لحاف اور کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

میں نڈھال شخص کو بے آواز گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔ برآمدے کے آخری سرے پر جہاں بہت سی چار پائیاں اُفقی رخ پر کھڑی تھیں، ایک چھوٹا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں اس وزنی شخص کو گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا اس دروازے تک لے آیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا، اس میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرا مکان کے وسیع احاطے میں تھا۔ اس کے دو دروازے

تھے، ایک برآمدے میں اور دوسرا احاطے میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر میں اپنے شکار سمیت کمرے میں آ گیا اور دونوں دروازے اندر سے بند کر دیئے۔ یہ میری خوش قسمتی رہی تھی کہ اس ساری کارروائی کے دوران میں گھر کے باقی مکین بے خبر رہے تھے۔

میں نے جیکٹ سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی اور روشنی اپنے شکار کے چہرے پر پھینکی۔ اس کی کنپٹی لہولہان تھی اور وہ ناک کے راستے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ بہرحال، وہ ہوش میں تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہو گی۔ وہ اسی بستی کا رہائشی لگتا تھا۔ تاڑی کے نشے سے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے پستول اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم جتنا بھی سوچ رہے ہو، میں اس سے زیادہ بے رحم ہوں۔ تمہاری گردن توڑ کر تمہیں اس پرالی کے ڈھیر میں پھینک جاؤں گا، کل کا سورج نہیں دیکھ سکو گے......''

وہ دیکھ چکا تھا کہ میں نے کتنی بے دردی سے اسے پستول کی دو شاندار چوٹیں لگائی تھیں۔ وہ سخت جان نہ ہوتا تو شاید یہ چوٹیں ہی اسے عدم آباد روانہ کر دیتیں۔ وہ میری جسمانی مضبوطی کا بھی اندازہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی اندھا دھند مزاحمت کو بے اثر کر دیا تھا اور اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ حالانکہ میری گردن کے عقب میں گہرا زخم بھی موجود تھا۔ اس زور آزمائی کی وجہ سے یہ زخم پھر کھل گیا تھا اور میں ایک بار پھر اپنی پشت پر لہو کی ہلکی سی نمی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم واویلا نہ کرو اور میرے دو تین سوالوں کے جواب دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ میں سے کپڑا نکال سکتا ہوں۔''

اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پستول کی نال اس کی چوڑی پیشانی پر رکھے رکھے اس کی جامہ تلاشی لی...... اس کے کوٹ کی جیبوں سے کچھ نقدی، سگریٹ کا پیکٹ اور چھوٹی موٹی اشیاء نکلیں...... یہ اشیاء میں نے دوبارہ اس کی جیبوں میں ٹھونس دیں۔ ایک چیز میرے علم میں نہیں آ سکی اور وہ اس شخص کی قمیص کے نیچے رہی۔

میں نے اس کے منہ میں بری طرح ٹھنسا ہوا کپڑا نکال لیا اور اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پہلے تو یہ بتاؤ تم کون ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''شاید تم عمران اور اقبال کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آئے تھے۔''

''میں تمہارے سوال کا جواب ہاں میں دیتا ہوں...... اور دیکھو، یہ آخری سوال ہے اور اس کو آخری ہی رہنا چاہئے۔ نہیں تو گولی دماغ میں جائے گی اور تمہارا یہ گندا بھیجا ناک کے راستے باہر آجائے گا۔'' میں نے پستول کا دباؤ اس کی پیشانی پر اتنا بڑھایا کہ وہاں گہری خراش آگئی اور خون رسنے لگا۔

''پ...... پوچھو۔''

''تمہارا نام؟''

''س...... سلمان...... سلو۔''

''او...... ہو...... تو تم کھیا عبدالرشید کے نور چشم ہو؟''

ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''پھر سوال۔ میں نے کہا تھا نا کہ سوال نہیں پوچھنا۔'' میں نے پستول کا بے رحم دباؤ پیشانی پر بڑھا دیا۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے میں غور سے اس کا صحت مند چہرہ دیکھا تو یہ تھا وہ عیاش چودھری زادہ جس نے نوری کو رکھیل کی حیثیت سے رکھا ہوا تھا اور اسی نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر تاؤ افضل کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آج رات اس طرح اچانک اس شخص سے ملاقات ہو جائے گی۔ بہرحال، میں یہاں اس کے جرائم اور گناہوں کا حساب کتاب کرنے نہیں آیا تھا، میرا مقصد کچھ اور تھا اور میری خواہش تھی کہ میں فی الحال اسی مقصد تک محدود رہوں۔

میں نے سلمان سلو نامی اس جواں سال شخص سے پوچھا کہ وہ لڑکی کلثوم کہاں ہے جسے اس گھر میں بند کیا گیا ہے اور مارا پیٹا جا رہا ہے۔

اس نے صاف انکار کر دیا کہ یہاں کوئی لڑکی موجود ہے۔ اس نے کہا کہ تاؤ کی رشتے دار ساری عورتوں کو کل ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا اور اسے کہا کہ میں صرف دس تک گنوں گا، اس کے بعد ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر گولی چلا دوں گا۔

اس نے میرے لہجے کی بے پناہ تپش محسوس کی اور اس کی تاڑی زدہ آنکھوں میں خوف جم گیا۔ میں نے چھ تک ہی گنا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا...... پسینے سے تر پیشانی کے ساتھ بولا۔ ''میں تم سے جھوٹ ناہیں بول رہا۔ وہ لونڈیا یہاں ناہیں ہے۔

میں قسم کھاوت ہوں۔''

''تو پھر کہاں ہے؟''

''وہ...... وہ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کے پاس ہے۔ وہ اسے آج ہی ہمارے گھر سے گئے تھے۔''

''پھر جھوٹ؟''

''میں قسم کھاوت ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ستیش اسے خود لینے کے لئے آیا تھا۔ اس کی پتنی مالا بھی اس کے ساتھ تھی۔''

''وہ کیوں لے گئے تھے؟''

''مجھے...... ٹھ...... ٹھیک سے تو پتا ناہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کو ڈر تھا۔ خاص طور سے ستیش کی پتنی مالا کو ڈر تھا۔''

''کیسا ڈر؟''

''شاید...... وہ سمجھت تھی کہ یہاں اس لونڈیا کے ساتھ اچھا برتاؤ ناہیں ہووے گا۔ وہ کہوت تھی کہ ہم خود اس سے پوچھ گچھ کر لیویں گے۔''

یہ میرے لئے انکشاف تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے سلمان کو دیکھا...... شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اب وہ کہاں ہے؟''

''ہمارے...... ساتھ والے تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں۔ زمیندار پردیپ کے مکان میں۔ ستیش اور اس کے گھر والے بھی وہیں ہیں۔ عورتیں زنانے میں ہیں، مرد دوسرے حصے میں۔''

میں نے تھوڑی سی مزید تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں زنانہ حصہ مکان کی بالائی منزل پر ہے...... اور امکان ہے کہ لڑکی کلثوم ستیش کی پتنی مالا کے ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں ہوگی...... یہ تفصیل میرے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے مکان کا حدود اربعہ بھی سلمان سے دریافت کیا اور وہاں پہرے وغیرہ کی صورت حال بھی دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں داخل ہونے کے لئے مجھے کھیا کے مکان میں سے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں اگر کوشش کروں تو چھتوں کے اوپر سے ہی اس چھت پر پہنچ سکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ ''تم نے مجھے سب کچھ بتایا ہے لیکن یہ ابھی تک نہیں بتایا کہ مجھے دائیں طرف والے تین گھر چھوڑنے ہیں یا بائیں طرف والے؟''

''دائیں طرف والے۔'' سلمان نے ہکلا کر کہا۔

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں کمینگی کی جھلک نظر آئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید وہ مجھے غلط معلومات فراہم کر رہا ہے لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ دوسرا معاملہ ہے اور میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک بھی۔

سلمان کی قمیص کے نیچے ایک تیز دھار چاقو موجود تھا۔ یہ چاقو اس نے چمڑے کی بیلٹ کے ذریعے پیٹ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جو تلاشی لی تھی، اس میں یہ چاقو میرے علم میں نہیں آسکا تھا۔ غیر محسوس طور پر سلمان سلو اپنے ہاتھ کو کھسکاتا ہوا اس چاقو تک پہنچ چکا تھا۔ یکایک وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔ یہ اتنا برق رفتار وار تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ چاقو سیدھا میری گردن کی طرف آیا۔ یہ میری اضطراری حرکت ہی تھی جس نے میری گردن کو چاقو کی مہلک نوک سے بچایا۔ موت جیسے مجھے چھو کر نکل گئی تھی۔ میں نے اندھا دھند ایک طوفانی مکا مدِمقابل کے سر پر رسید کیا۔ سینڈ بیگ کے ساتھ جیکی نے مجھے جو لگاتار مشقیں کرائی تھیں، انہوں نے میرے ہاتھوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ خاص طور سے ہاتھ کی ہڈیوں، کلائی اور کہنی کے جوڑ میں غیر معمولی سختی پیدا ہو چکی تھی۔ سلمان سلو نامی اس بدمعاش کے سر پر میں نے جو مکا رسید کیا، اس سے پہلی مرتبہ مجھے اپنے وار کی اصلی طاقت اور اثر کا اندازہ ہوا۔ اس وار نے جیسے مدِمقابل کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر ایک اور زوردار ضرب اس کے سر پر لگائی۔ ایک دم اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ تیسری ضرب کے لئے میں نے ہاتھ اُٹھائے لیکن ضرب لگائی نہیں۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ تیسری ضرب کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک خفیف جھرجھری کے ساتھ مدِمقابل کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور آنکھیں بے جان ہو گئیں۔ چاقو ابھی تک اس کے ادھ کھلے ہاتھ میں تھا۔ میں نے چاقو اس کے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ اگر سلمان یہ اچانک حملے والی حرکت نہ کرتا تو میں اسے زندہ چھوڑتا یا نہیں۔ بہرحال اپنی اس حرکت سے اس نے میری ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ میں نے اپنے دفاع میں اس پر حملہ کیا تھا اور اس حملے میں لگنے والی چوٹ سے اس کی جان چلی گئی تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ ایک چھپر تلے دو بلیاں گتھم گتھا تھیں اور چلا رہی تھیں چھپر کے پاس ہی ایک چھوٹا کنواں نظر آ رہا تھا۔ اس

کے اوپر پانی نکالنے کے لئے لکڑی کی چرخی لگی ہوئی تھی۔ غالباً یہ کنواں خشک تھا۔ ایسے کنوئیں کو دیہات میں ''کھوئی'' کہا جاتا ہے۔ پنجاب میں تو جہاں زیرِ زمین پانی کی سطح بلند ہے، ایسی کھوئیاں عام نظر آتی ہیں۔

میں نے تیزی سے سوچا اور واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے سلمان قالین نما دری پر لیٹا تاڑی پی رہا تھا اور رنند لالا...... گنگنا رہا تھا۔ تاڑی کی نصف بوتل ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ میں نے بوتل اُٹھائی اور جا کر کنوئیں میں پھینک دی۔ بوتل کے گرنے سے اندازہ ہوا کہ کنواں واقعی خشک ہے۔ بوتل کے بعد میں نے سلمان کی لاش بھی کنوئیں میں دھکیل دی۔ یہ قدرے گونج دار آواز سے گری۔ میں تھوڑی دیر تک ایک تاریک گوشے میں رک کر ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ حسبِ توقع ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے بھوسے والے کمرے میں جا کر چھوٹی ٹارچ روشن کی اور تین چار منٹ کے اندر وہ سارے آثار مٹا دیئے جن سے یہاں کسی کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد میں سیڑھیاں چڑھ کر مکھیا کے مکان کی چھت پر آ گیا۔

سلمان سلو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دائیں طرف کچھ چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ یہاں سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم میں چبھن رہی تھی اور یہ چبھن مجھے مزہ دے رہی تھی۔ گردن کے زخم سے اُٹھنے والی ٹیسیں بھی اسی مزے دار کیفیت کا ایک حصہ تھیں۔ آہستہ آہستہ درد، دوا بنتا جا رہا تھا اور یہ میرے اندر کی بڑی انقلاب آفریں کیفیت تھی۔

مجھے چھتیں پھلانگنے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی۔ ایک منڈیر پر میں پھسلتے پھسلتے بچا، تاہم تین چار منٹ کے اندر میں زمیندار پردیپ کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے اردگرد سے پوری طرح باخبر تھا۔ چار پانچ سیڑھیاں اُتر کر میں اس دروازے کے سامنے پہنچ گیا جس کی نشاندہی مکھیا کے بیٹے سلمان سلو نے کی تھی۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر مجھے چند مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کان دروازے سے لگا دیا۔ کوئی لڑکی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ پھر نیند میں ڈوبی ہوئی سی ایک اور نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''اچھا، میں تمہارے لئے کچھ لاتی ہوں۔''

''مم...... مجھے اکیلا ناہیں چھوڑو دیدی۔'' وہ کراہتی ہوئی آواز نے کہا۔

''یہاں کوئی ناہیں آسکتا۔ بالکل بے فکر رہو۔ میں بس دو منٹ میں آوت ہوں۔'' دوسری آواز اُبھری۔

میں جلدی سے ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے کی چٹخنی گری

اور ایک سایہ نظر آیا۔ میں ایک لحظ میں پہچان گیا۔ یہ رام پرشاد کی بہو اور ستیش کی پتنی مالا تھی۔ وہ حسبِ سابق امیرانہ لباس میں تھی۔ کانوں میں طلائی جھمکوں کی چمک بھی نظر آئی۔ وہ اپنی گرم چادر سنبھالتی ہوئی سیڑھیاں اُتر گئی۔ اندر سے ہولے ہولے کراہنے کی آواز بدستور آتی رہی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کمرے میں اب ایک لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دو پلنگ، لکڑی کی الماری اور جستی صندوق وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ ایک کونے میں ادھ بجھی انگیٹھی بھی سلگ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک لڑکی بستر پر اوندھی پڑی ہے۔ اس کا بالائی جسم یکسر عریاں تھا۔ شاید انگیٹھی کی حرارت کے سبب وہ لحاف کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کی سفید شفاف کمر پر چھڑیوں کے کئی نیلگوں نشان تھے۔ کہیں کہیں سے خون بھی رِس آیا تھا۔ ان نشانات پر کوئی دوا لگائی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ کان پر رکھا ہوا تھا اور کراہ رہی تھی۔

یقیناً میرے اندر داخل ہونے سے مدھم آہٹ پیدا ہوئی ہو گی مگر لڑکی چونکی نہیں اور نہ ہی اس نے بستر پر سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ غالباً وہ یہی سمجھی تھی کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس آ گئی ہے۔

میں نے قریب پہنچ کر اچانک لڑکی کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ وہ بری طرح مچلی مگر میں نے اسے اپنے بوجھ تلے دبا لیا تھا۔ میری سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود آواز نہ نکال سکی۔ اس کا منہ میری ہتھیلی سے پوری طرح ڈھک چکا تھا۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ’’کلثوم! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تاؤ افضل نے بھیجا ہے۔ میں یہاں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔‘‘

اس نے ایک بار پھر تڑپ پھڑک دکھائی اور غوں غاں کی آوازیں نکالیں۔ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا لیا اور نرمی سے کہا۔ ’’دیکھو...... اگر شور کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ میں پکڑا جاؤں گا اور تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔‘‘

اس کا جسم قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ اب وہ چہرہ گھما کر مجھے دیکھنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور کہا۔ ’’اگر تم وعدہ کرو کہ شور نہیں مچاؤ گی تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں اور...... تمہیں بتاتا ہوں کہ ہمیں یہاں سے کیسے نکلنا ہے۔‘‘

اسے پُرسکون کرنے کے لئے مجھے دو تین فقرے مزید بولنے پڑے۔ آخر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔

میں نے ہاتھ ہٹایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزی سے پلٹے گی اور میرا چہرہ دیکھے گی لیکن وہ اوندھی پڑی رہی۔ اس نے فقط اپنا چہرہ گھمانے پر اکتفا کیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس اور بے یقینی کی کیفیت موجود تھی تاہم شکر کا مقام تھا کہ اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔

’’کک...... کون ہو تم؟‘‘ وہ بری طرح ہکلائی۔

’’فی الحال تم صرف اتنا جانو کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں اور مجھے تاؤ افضل نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔ باقی ساری باتیں ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کریں گے۔‘‘

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ اس نے خود کو سمٹا رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی بے لباسی کی وجہ سے سیدھی نہیں ہو رہی۔ میں نے اسے ایک گرم چادر دی تا کہ وہ اپنا جسم ڈھانپ لے۔ وہ چادر لپیٹ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور سفید رنگ بالکل لٹھے کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اکیس بائیس سال رہی ہو گی۔ وہ اچھے نین نقش کی ایک غریب دیہاتن نظر آتی تھی۔ شاید عام حالات میں اسے خوبصورت بھی کہا جا سکتا ہو مگر فی الوقت دہشت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

’’تت...... تاؤ...... خود کہاں ہیں؟‘‘

’’اگر تم مجھ پر بھروسا کرو اور میرے کہنے کے مطابق چلو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے آدھ گھنٹے میں تم اپنے تاؤ اور تاؤ زاد بہنوں سے مل سکو گی۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

اس کے چہرے کا تناؤ ایک دم کم ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بھروسے کی طرف آ رہی ہے۔

’’لیکن...... تم نکلو گے کیسے؟‘‘ وہ منمنائی۔

’’یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس یہ کرو کہ قمیص اور جوتی وغیرہ پہن لو۔‘‘

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آئیں۔ کلثوم کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ’’میرا خیال ہے...... دیدی آ رہی ہے۔‘‘ وہ بولی۔

میں نے آوازوں پر بغور کان لگائے۔ کوئی واقعی سیڑھیوں کے پاس موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ اب باہر نکلنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر مجھے چھپنا تھا تو کمرے کے اندر ہی چھپنا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بہترین جگہ الماری کا عقبی خلا تھا۔ اب قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر سنائی دے رہی تھی۔ میں کلثوم کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیزی سے الماری کے پیچھے چلا گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور مالا اندر آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز اُبھری۔ ''یہ دیکھو، سرسوں کے تیل میں لہسن کی پھلی جلا کر لائی ہوں۔ یہ بہترین دوا ہے کان کے درد کے لئے۔''

کلثوم اب بھی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ اسی طرح اوندھی لیٹی تھی جیسے میرے آنے سے قبل تھی۔ مالا اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل یا تانبے کی چھوٹی سی پیالی اور چمچ تھا۔ اس نے چمچ کی مدد سے تھوڑا سا گرم تیل کلثوم کے کان میں انڈیلا اور پھر کان کو ہاتھ سے ہولے ہولے ہلانے لگی۔ کلثوم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

''دیکھنا، ابھی پانچ دس منٹ میں آرام آ جاوے گا۔ یہ بڑا پرانا نسخہ ہے۔'' وہ غنودگی بھری آواز میں بولی۔

اس کے حلیے سے پتا چلتا تھا کہ کلثوم کی کراہیں وغیرہ سن کر وہ نیند سے بیدار ہوئی ہے۔

وہ دو چار منٹ کلثوم کے سرہانے بیٹھی رہی۔ پھر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ کلثوم بھی اسی طرح آنکھیں بند کئے اوندھی لیٹی رہی۔ لالٹین کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رخسار ہلکا نیلا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مار پیٹ کے دوران میں اسے زوردار تھپڑ مارا گیا ہے۔ غالباً اسی تھپڑ کے سبب اس کے کان میں ہوا بھر گئی تھی اور درد شروع ہو گیا تھا۔

کلثوم کی حالت دیکھ کر وہ تمام اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے جو ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ اسے یہ لوگ جسمانی تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے...... پہلے وہ مہندر پٹیل اور کھیا وغیرہ کے پاس تھی۔ اب یہاں آ گئی تھی مگر یہاں بھی کون سے فرشتے تھے۔ ستیش، بھولا ناتھ اور ارون وغیرہ بے رحم انتہا پسند تھے۔ وہ کسی بھی وقت اس لڑکی کو بدترین حالات سے دوچار کر سکتے تھے۔ اکیلی مالا کہاں تک اس کے آگے ڈھال بن سکتی تھی۔ غالباً اس صورتِ حال کو کلثوم بھی سمجھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب تک مالا کو میری موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں الماری کے عقب میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ میری گردن کے زخم سے درد کی ٹیسیں اُٹھتی رہیں۔ بارونداجیکی کہتا تھا...... درد اتنا نہیں ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ ہم درد کے ساتھ اپنی طرف سے بہت کچھ شامل کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ درد کے اصل حجم اور شدت کو سمجھنا چاہئے......اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔

چند منٹ بعد مالا نے نیند بھری آواز میں کلثوم سے پوچھا۔ ''کچھ فرق پڑا؟''

''ہوں، کچھ پڑا ہے۔'' کلثوم نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مالا اپنے پلنگ پر سو چکی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور بغیر آواز پیدا کئے کلثوم تک پہنچ گیا۔ تب تک کلثوم قمیص پہن کر گرم چادر اپنے گرد لپیٹ چکی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک پلنگ پر ہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر تذبذب میں نظر آئی مگر جب میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ڈری ہوئی نظروں سے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس کی آمادگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مالا کی موجودگی کے باوجود وہ باقی لوگوں سے سخت خوفزدہ ہے۔

سب سے مشکل مرحلہ یہ لگ رہا تھا کہ بغیر آواز پیدا کئے چٹخنی گرائی جا سکے اور دروازہ کھولا جا سکے۔ میں نے پستول پھر ہاتھ میں لے لیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ میں نے چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھولا تو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ مالا ذرا کسمسائی مگر بیدار نہیں ہوئی۔ میں کلثوم کو لے کر کمرے سے باہر آیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

اگلا آدھ گھنٹہ کافی سنسنی خیز تھا۔ اس آدھ گھنٹے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے احاطے میں اُترنے کے بجائے چھتوں کے راستے واپس جانا مناسب سمجھا۔ دو چھتیں پار کرنے کے بعد وہی خطرناک منڈیر آ گئی جہاں سے میں پھسلتے پھسلتے بچا تھا مگر میں اس مرحلے کو طے کرنے کا لائحہ عمل پہلے سے سوچ چکا تھا۔ یہاں پچھواڑے کی طرف گلی میں پرالی کا ایک بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ پہلے میں نے کلثوم کو چھلانگ لگانے پر آمادہ کیا۔ وہ قریباً چھ فٹ نیچے پرالی پر بے آواز گری۔ میں نے بھی کلثوم کے پیچھے چھلانگ لگائی۔ کہیں قریب موجود دو پہرے داروں کو کچھ شبہ ہوا، وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے پرالی کے ڈھیر کے پاس پہنچے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر چکراتے رہے اور ایک ٹارچ کو حرکت دیتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہم پرالی کے ڈھیرے سے نکلے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے مندر کی طرف بڑھ گئے۔

○......❖......○

آدھ گھنٹے بعد میں کلثوم کے ساتھ مندر کے سب سے نچلے تہ خانے کی خوشگوار حرارت میں موجود تھا۔ عمران، اقبال، تاؤ افضل، سلطانہ سب ہمارے گرد جمع تھے۔ تمام چہرے حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں، مَیں نے جو کچھ کیا تھا...... وہ میری توقع

سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ سب کچھ جذباتی اور کسی حد تک غیر دانش مندانہ بھی تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا، کامیابی سے ہو گیا تھا اور کامیابی ایک ایسی دلیل ہے جو ہر بڑی سے بڑی دلیل پر حاوی آ جاتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فتح اور کامرانی کو منطق درکار نہیں ہوتی۔

تاؤ افضل نے کلثوم کو اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا اور مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ تاؤ افضل کو بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوتا رہا ہے۔ پہلے کھیا اور مہندر وغیرہ نے اس سے بری طرح مار پیٹ کی تھی۔ پھر اسے ستیش اور ارون وغیرہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں بھی اس سے سخت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ طیش میں آ کر ستیش نے اسے زوردار تھپڑ بھی رسید کیا تھا جس سے اس کا کان اب تک سُن تھا اور اندر سے درد بھی کر رہا تھا۔

کلثوم نے تاؤ کو بتایا۔ ”یہ لوگن مجھ سے آپ کے بارے میں اور آپ کے مہمانوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اس بارے میں جانت ہوں کیونکہ میں نے کھیا کے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟“ تاؤ نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کی گردن جھک گئی۔ وہ دکھ آمیز شرم کے ساتھ بولی۔ ”کھیا بہت برا بندہ ہے۔ مجھ کو اس سے ڈر لگت تھا۔ وہ شراب پی کر مجھ کو لال لال آنکھوں سے دیکھت تھا۔ بے شرمی کی باتیں کرت تھا۔“

عمران اور اقبال یہ جاننے کے لئے بے تاب تھے کہ میں کس طرح مندر سے نکلا اور کیسے کلثوم کو استھان والوں کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں نے انہیں تفصیل بتائی۔ بہرحال، اس تفصیل میں، مَیں نے سلمان سلو کی موت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات میں عمران کو اکیلے میں بتانا چاہتا تھا۔ عمران مجھے مصنوعی ناراضی سے گھورتا رہا۔ اس کے گھورنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے میری اس دیدہ دلیری پر خوش بھی ہے...... اس نے کہا۔ ”کام تو تم نے دلیری کا کیا ہے اور بڑا فائیو سٹار کیا ہے...... لیکن تہ خانے سے نکلتے ہوئے تم شاید اپنی ”چیپ“ کے بارے میں بھول گئے تھے۔“

”نہیں...... یہ نحوست مجھے یاد تھی مگر میں زیادہ دیر باہر نہیں رہا ہوں۔“

”پھر بھی رسک تو رسک ہی ہوتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”تم نے کئی دفعہ تین گولیاں ریوالور میں رکھ کر اپنے اوپر ٹریگر دبایا ہے۔ اس سے تو کم

رسک ہی تھا۔“

”اچھا، اکیلے میں تم سے بات کروں گا۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

میری کارروائی کے حوالے سے سلطانہ کی حیرت سب سے زیادہ تھی۔ وہ ماضی میں مجھے ایسی حالت میں دیکھتی رہی تھی جب میں اپنا بوجھ بھی سہار نہیں سکتا تھا...... لیکن اب میں بدترین حالات میں بڑی بے خوفی سے دوسروں کا سہارا بن رہا تھا۔

وہ میری قمیص پر گردن کے پاس خون کے داغ بھی دیکھ چکی تھی۔ ان نشانات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میرا زخم پھر خون اُگلنے لگا ہے۔ وہ بے چین تھی کہ میں اپنی بات چیت ختم کروں تو وہ مجھے کمرے میں لے جائے اور میرا زخم دیکھے۔

عمران نے بھی میرے زخم سے خون کا رساؤ دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں جانے اور قمیص بدلنے کا کہا...... رات آخری پہر تک سلطانہ میری دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ وہ اندر سے خوش بھی تھی۔ وہ مجھ سے اس سارے واقعے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل پوچھ رہی تھی۔ آخر میں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تم نے بہت خطرناک کام کیا ہے مہروج! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو پھر......؟“

”تو کیا تمہاری دعا میرے ساتھ نہیں تھی؟“

”وہ تو ساتھ ہی ہوتی ہے۔“

”کیا آئندہ بھی ساتھ رہے گی؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟“

”جب میں جارج گورا کو لاش کی شکل دینے کے لئے اس کی طرف جاؤں گا...... اس وقت بھی تمہاری دعا میرے ساتھ ہو گی نا؟“

وہ سسک کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میرے ہاتھ اس کے کشادہ شانوں پر متحرک تھے۔ یہ شانے...... یہ شانے میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ میں انہیں جانتا تھا۔ بہت اچھی طرح، بہت قریب سے...... اور ان شانوں کو ہی نہیں، شاید اس پورے جسم کو جانتا تھا۔ ہاں، یہ ایک بے پناہ جسم تھا۔ یہ اپنی ساری رعنائی اور پُرجوش محبت کے ساتھ میرے بہت قریب رہا تھا۔ مجھے اس جسم کے تمام تر لمس یاد آ رہے تھے۔ یہ کسی گمشدہ خزانے کی طرح تھا۔ مجھے لگا کہ اس جسم کے لئے، ان شناسا شانوں کے لئے، اس نہایت چمکیلی اور پتلی کمر کے لئے اور ان گھنے بالوں کے لئے میرے اندر ایک بہت بڑا خلا موجود ہے...... مجھے یہ سب درکار تھا۔ پوری شدت اور چاہت سے درکار تھا۔ مجھے لگا

کہ میں سلطانہ سے محبت کرنے لگا ہوں...... کیا یہ محبت اب شروع ہوئی تھی یا پھر بہت پہلے سے شروع تھی جب وہ اس جسم کے ساتھ میری خلوتوں کی ساتھی بنی تھی؟

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کا شفاف رخسار چوما تو...... پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا۔ کوئی شے جیسے ایک چھناکے سے سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ اس کے جسم میں لرزش نمودار ہوئی اور وہ اپنا آپ سمیٹنے لگی۔ اس کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکل گئے۔ جیسے سوکھی ریت مٹھی سے نکل جاتی ہے۔ اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

میں ایک دم اکیلا ہو گیا۔ میرے قریب ہونے کے باوجود قریب نہ رہی۔ پھر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ میرے قریب آتے آتے دور چلی جاتی تھی۔ پتا نہیں، یہ کیسی دیوار تھی جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو سلطانہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے اپنے اردگرد نہ پا کر مجھے شاک سا محسوس ہوتا تھا۔ یہ خوف برق کی طرح ذہن میں لہراتا تھا کہ کہیں وہ پھر تو کسی طرف رخ نہیں کر گئی۔

''سلطانہ...... سلطانہ۔'' میں اسے پکارتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف گیا...... وہ نانک چندی اینٹوں کے بنے ہوئے قدیم غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔ لگتا تھا کہ آج وہ پھر اس کیفیت سے دوچار ہوئی ہے جس سے نل پانی میں ہوتی رہی تھی۔ وہ پہروں تک نہاتی تھی اور پتھر سے اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر سرخ کر لیتی تھی۔ میں نے دیکھا، آج بھی اس کی کلائیاں، ہاتھ اور گردن وغیرہ پتھر کی رگڑ سے سرخ دکھائی دے رہے تھے...... میرا دل رو دیا۔ اس کا ذہنی صدمہ اس کے اندر بہت گہرائی تک اُتر گیا تھا۔ وہ کسی طور اس سے چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔ کوشش کرتی تھی مگر ناکام ہو جاتی تھی۔ دو تین دن پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ خود کو بدل رہی ہے مگر اب پھر صورتِ حال جوں کی توں تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ سلطانہ کو اس کی نارمل زندگی کی طرف واپس لانا آسان نہیں ہے۔ میرے اندر سے طیش کی ایک لہر اُٹھی۔ یہ لہر ہر اس شخص کے لئے تھی، جو کسی مجبور عورت کو اپنے مردانہ اختیار تلے روندتا ہے۔ تھوڑی دیر کی عشرت کے لئے اس کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا داغ لگا دیتا ہے...... اور وہ عشرت بھی کیا عشرت ہوتی ہے۔ وہ کھوکھلی خوشی اکثر مہیب پچھتاووں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ میرے اندر جارج گورا کے لئے بھڑکنے والی آگ کچھ اور بھی شعلہ فشاں ہو گئی۔

اگلے روز میں نے عمران کو اس سنگین ترین واقعے کے بارے میں بتا دیا جو کھیا عبدالرشید کے مکان میں پیش آیا تھا۔ کھیا کا بیٹا سلمان سلو اتفاقیہ مجھ سے ملا تھا اور پھر جہنم واصل ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش احاطے کے خشک کنوئیں میں پھینک دی تھی۔

ہم سارا دن اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ اصل حالات کا علم تو آفتاب خاں کی آمد کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس موت نے فتح پور میں زبردست ہلچل مچائی ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس واقعے کو کوئی خاص رخ دیا جا رہا ہو۔ آفتاب خاں کی آمد رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہی ہو گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ آج بھی اس کے پاس ہمارے لئے اہم خبریں موجود ہیں۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ فتح پور میں زبردست ہلچل تو ہے مگر یہ ہلچل سلمان سلو کی موت کی وجہ سے نہیں، لڑکی کلثوم کی وجہ سے ہے۔ آفتاب خاں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''خو، سلو کی موت کو سب نے اتفاقیہ ہی سمجھا ہے جی۔ سب کا خیال ہے کہ وہ تاڑی کے زوردار نشے میں تھا۔ باہر نکلا اور کنوئیں میں گر گیا۔ اس کا بوتل بھی کنوئیں سے ہی ملا ہے۔''

پھر آفتاب میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ کیا کہتا ہے تابش بھائی! یہ اتفاقیہ تھا یا پھر......؟''

''تمہارے سوال کا جواب وہی ہے جو تمہارے ذہن میں بھی ہے۔'' عمران نے معنی خیز انداز میں کہا۔

آفتاب خاں نے تفہیم میں سر ہلایا اور کچھ مزید پُرجوش نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''عمران بھائی! آپ سب کے لئے ایک اچھا اطلاع ہے۔ کلثوم بی بی کے غائب ہو جانے کی وجہ سے استھان والا آپس میں جھگڑا مگڑا کر رہا ہے۔ مرنے مارنے پر آ گیا ہے۔ بڑا زوردار تماشا لگا ہوا ہے۔''

''کیسا تماشا؟'' عمران نے پوچھا۔

''مہندر اور کھیا وغیرہ نے رام پرشاد پر الزام لگایا ہے کہ اس کی بہو مالا نے لڑکی کو جان بوجھ کر بھگا دیا ہے۔ اس طرح اس نے دھرم کو بری طرح نشٹ کیا ہے۔ وہ اس کو سزا دینے کا بات کر رہا ہے۔''

یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ عمران نے کہا۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

آفتاب بولا۔ ''ام نے اندازہ لگایا ہے جی کہ یہ سب جنونی لوگ ہے۔ ذرا ذرا سی بات

پران کی آنکھوں سے شعلہ نکلنے لگتا ہے۔ پرسوں رام پرشاد کا بہو مالا اور بیٹا ستیش اس لڑکی کلثوم کو مکھیا کے پاس سے لے آیا تھا۔ دراصل یہ سب مالا کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ یہ لڑکی مکھیا اور مہندر وغیرہ کے پاس رہا تو اس کا عزت خراب ہو جائے گا۔ مکھیا اور مہندر نے سب کے کہنے پر کلثوم کو بھیج تو دیا تھا، پر ان کو یہ سب بہت برا لگا تھا۔ گرو کی موت کی وجہ سے بھی ان لوگوں میں تھوڑا بہت چپقلش موجود تھا۔ کل سویرے جب یہ پتا چلا کہ کلثوم زمیندار پردیپ کمار کے گھر سے غائب ہے تو مہندر اور ان کا ساتھی لوگ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ انہوں نے رائفلیں اور تلواریں تان لیا اور کوئی ایک سو بندہ پردیپ کمار کے گھر کے سامنے جمع ہو گیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ رام پرشاد کی بہو مالا مجرم ہے۔ اس نے لڑکی کو بھگا دیا ہے، حالانکہ وہ لڑکی اپنے تاؤ اور سلطانہ وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔''

''رام پرشاد کیا کہہ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اپنی بہو کو بالکل بے گناہ بتا رہا ہے۔ ستیش بھی یہی کہتا ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اس کی بیوی کو کچھ پتا نہیں۔ وہ کلثوم کے ساتھ اوپر والے کمرے میں سو رہی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر پہرے دار تھے۔ گھر کی نگرانی ان پہرے داروں کا ذمے داری تھا، میری بیوی کا نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کسی نے سلو کے مرنے اور کلثوم کے غائب ہونے والے معاملے کو آپس میں جوڑا تو نہیں؟''

''ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا جی۔ کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا اور امارا خیال ہے کہ جائے گا بھی نہیں۔''

''اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟'' اقبال بولا۔

''کون سا اونٹ جی؟'' آفتاب خاں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اب صورتِ حال کس طرف جاتی نظر آتی ہے؟

''ام ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا جی...... معاملہ گڑبڑ ہے۔ دونوں طرف سے بہت سخت باتیں ہو رہا ہے...... ام نے سنا ہے کہ کل کچھ اور لوگ بھی یہاں پہنچ رہا ہے۔ مکھیا کی حویلی پر کوئی بہت بڑا پنچایت ہو گا۔ اگر اس پنچایت میں فیصلہ نہ ہو سکا تو پھر جھگڑا اور بڑھ سکتا ہے۔ اب بھی دو چار لوگ ایسا ہے جو غصے میں جھگڑا بڑھانے والا باتیں کر رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ام نے ابھی شام کو سنا ہے۔ مہندر کا ایک ساتھی چوپال میں کہہ رہا تھا کہ اگر رام پرشاد کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ مہندر صاحب کے پاس اس لڑکی کا عزت محفوظ نہیں تھا تو ام بھی رام

پرشاد اور اس کے بیٹے پر اس طرح کا شک کر سکتا ہے۔ کیا پتا وہاں زمیندار کے گھر میں اس لڑکی کا عزت لوٹا گیا ہو اور اسے مار کر کہیں گاڑ دیا گیا ہو۔ بس جی اس طرح کا بہت سا باتیں گاؤں میں چکرا رہا ہے۔''

یہ بالکل نئی صورتِ حال سامنے آئی تھی۔ دنیا بھر کے انتہا پسندوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ روز بروز محدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے بے لچک رویوں کی وجہ سے وہ گروہ در گروہ تقسیم ہوتے ہیں۔ ان میں فرسٹریشن بڑھتی ہے اور وہ زیادہ سفاک اور بداخلاق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لگتا تھا کہ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے عجیب کشمکش و بے چینی میں گزرے۔ ہمیں دیکھنا تھا کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ گرو کے بے رحمانہ قتل کے بعد تو ان لوگوں کی سفاکی میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ آفتاب خاں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اردگرد سے اور بہت سے لوگ بھی یہاں فتح پور میں جمع ہو رہے ہیں...... وہ ہر صورت اپرادھن یعنی سلطانہ کو اس کے انجام تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس علاقے میں جاہلیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا...... اور اب یہ جادو دھیرے دھیرے اس مچھیرا بستی کو اپنے پنجوں میں جکڑ رہا تھا۔

میں سلطانہ کی طرف سے بھی بہت پریشان تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک حصہ میری طرف آنا چاہتا ہے اور اپنے شیر خوار بچے کی طرف۔ دوسرا حصہ اسے ہم دونوں سے دور لے جا رہا ہے۔ اس حصے کو زرگاں کشش کر رہا ہے۔ زرگاں جہاں اس کی عزت کا قاتل جارج گورا اپنی پوری نحوست اور نجاست کے ساتھ موجود ہے۔ ہر طرح کی من مانیاں کرتا ہوا اور اپنی من پسند لڑکیوں میں گھرا ہوا۔ جنہیں وہ اور حکم پتا نہیں کس ناتے سے پریاں قرار دیتے تھے۔

اب پچھلے تقریباً چھتیس گھنٹے سے سلطانہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہیں رہی تھی۔ رات کو میری ناراضی کے ڈر سے اس نے چند لقمے لئے اور کلثوم کے ساتھ تھوڑی بہت باتیں کیں۔ رات کو ہم اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے مگر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اندھیری رات ہے یا چاندنی۔ بارش ہو رہی ہے یا کڑاکے کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارے رابطے کا واحد ذریعہ آفتاب تھا اور اسے آج پتا نہیں آنا تھا یا نہیں۔

میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ ''مہروج!'' اچانک سلطانہ کی مدھم آواز میرے کانوں

میں پڑی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح اپنے بستر پر چت لیٹی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مہروج!'' وہ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

''ہاں ہاں...... کہو۔''

''مہروج! میں تمہیں بہت دکھ دے رہی ہوں نا؟ تمہیں رات دن پریشان کر رہی ہوں۔''

''میں صرف اس وجہ سے دکھی ہوں کہ تم دکھی ہو۔ تم خود کو سنبھال نہیں پا رہی ہو۔''

''مہروج! کیا تم مجھے ماف ناہیں کر سکتے؟''

''کیا مطلب؟''

''مہروج! تم مجھ کو بھول جاؤ۔ سمجھو...... کہ...... میں نل پانی سے جانے کے بعد دوبارہ تمہیں ملی اچ ناہیں تھی۔''

''اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو بہتر ہے کہ سو جاؤ۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''مہروج! میں جانتی ہوں کہ تم کسی سے پیار کرتے تھے، بہت جیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ تم سے دور چلی گئی اور میں تم دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ شاید یہ اسی کی سجا ہے جو مجھے ملی ہے۔''

''یہ تم کیا باتیں لے بیٹھی ہو؟'' میں جھلا گیا۔

''مہروج! جن دنوں تم اپنے ہوش میں ناہیں تھے، تم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس کا نام پکارتے تھے۔ تم آج بھی اس کو پریم کرتے ہو مہروج! اور شاید وہ بھی کہیں پر بیٹھی تمہاری راہ دیکھتی ہوئیں گی۔ کیا ایسا ناہیں ہو سکتا مہروج کہ وہ پھر تم کو مل جائے۔ تم اس راجواڑے سے نکلنے کے بعد اسے ڈھونڈو۔ مہروج! مجھے یکین (یقین) ہے کہ وہ جرور تمہیں ملے گی، جرور ملے گی۔ وہ تمہاری جندگی کی ہر کمی کو پورا کر دے گی۔ تم میرے بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا مہروج! بالو کو اس کی گود میں ڈال دینا۔ مجھے یکین ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی بہت اچھی ہوئیں گی۔ وہ میرے بچے کو اپنے بچوں کی طرح پیار دے گی۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو مہروج؟''

میرا دماغ ہنڈی کی طرح اُبل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ سلطانہ کو اس کے شانوں سے پکڑوں اور بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔ پھر دھکا دے کر دور گرا دوں یا پھر یہاں سے اُٹھوں اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جاؤں...... کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔

وہ اپنے جذباتی دھارے میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک اُٹھ کر اس نے اپنا سر میرے پاؤں میں رکھ دیا اور سسک کر بولی۔ ''مہروج! مجھے تم سے کوئی گلہ ناہیں ہوئیں گا۔ تم تو مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ میری جندگی کا کوئی پتا ناہیں لیکن جب تک جندہ رہوں گی تم کو یاد رکھوں گی۔ تمہارے لئے دعائیں کرتی رہوں گی۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی ملے گی کہ تم جہاں کہیں ہو، آباد ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بچہ بھی آباد ہے۔ میری خاطر مہروج! میری خاطر...... میری یہ بات مان لو۔ سمجھو کہ میں تم سے جندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہی ہوں۔''

میں بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے چھڑائے اور چارپائی سے اُتر کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی سسکتی رہی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی نے بستر پر کنڈلی مار رکھی تھی۔

میں نے اس کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! بدقسمتی سے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، وہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر تمہارا کوئی بس نہیں تھا مگر اب تم جو کچھ کر رہی ہو، یہ اُس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ جو دکھ تم اب دے رہی ہو، یہ بالکل ہی برداشت سے باہر ہے۔ تم مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دو گی۔ ساری اُمنگیں ترنگیں جو مجھ میں پیدا ہوئی تھیں، میرے اندر ہی مر جائیں گی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ شاید ماں سے پہلے باپ کا سایہ بالو کے سر پر سے اُٹھے گا۔''

''خدا کے لئے مہروج! ایسی بات مت کرو۔'' اس نے بے تاب ہو کر میرا بازو تھام لیا۔

میں نے بازو چھڑایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نل پانی کی نیلی جھیل ہو۔ یخ بستہ ہوائیں بدن کو چیر رہی ہوں۔ میں جھیل کے کنارے بھاگتا چلا جاؤں، ہانپتا چلا جاؤں یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں لیکن جھیل تھی نہ کنارہ، نہ یخ بستہ ہوائیں۔ میں اپنے ساتھیوں سمیت اس تین منزلہ تہ خانے کا اسیر تھا۔ میں اس قبر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

میں بالائی تہ خانے میں آ گیا اور بے قراری سے ایک برآمدہ نما مستطیل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر مدھم آہٹیں اُبھریں۔ یقیناً آفتاب خاں آیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت میرے سامنے تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ ''بہت خاص خبریں ہیں تابش بھائی۔ عمران بھائی کدھر ہے؟''

میں آفتاب کو لے کر سیڑھیاں اُترا اور زیریں تہ خانے میں آ گیا۔ عمران اور اقبال میری

ایک آواز پر ہی کمرے سے نکل آئے۔ یقیناً وہ بھی آفتاب کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔
آفتاب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''امارا تو مت مارا گیا ہے جی۔ ام نے سنا تھا کہ کچھ لوگ اپنے دین دھرم کے لئے بالکل جنونی ہو جاتا ہے۔ یہ ادھر استھان والا لوگ بھی ایک دیوانہ پن دکھا رہا ہے۔ آج سارا دن گاؤں میں خوب تماشا لگا ہے۔''

پھر آفتاب نے اپنی گول ٹوپی اُتار کر ایک طرف رکھی اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''جھگڑا بہت لمبا ہو گیا ہے جی۔ آج سارا دن چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ فتح پور میں آتا رہا ہے۔ اب یہاں ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب لوگ جمع ہو چکا ہے۔ آج دوپہر مکھیا کے مکان پر بہت بڑا پنچایت ہوا ہے۔ اس پنچایت میں مہندر اور اس کے ساتھیوں نے یہ الزام دہرایا ہے کہ رام پرشاد کی بہو نے لڑکی کلثوم کو بھگایا ہے اور ایک ایسا اپرادھ کیا ہے جس کا سخت سے سخت سزا ملنا چاہئے۔ دوسری طرف رام پرشاد اور اس کے بیٹے ستیش نے اس الزام کو ماننے سے صاف انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑکی موقع دیکھ کر خود فرار ہوا ہے...... ان کا صفائی ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ خود مہندر اور اس کے سیکڑوں ساتھیوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر ستیش کی پتنی مالا سچا ہے تو پھر وہ پرکھشا دے۔''

''پرکھشا سے کیا مطلب؟'' اقبال نے پوچھا۔

''وہ اس کا آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی بہت پرانی رسم کا بات کر رہا ہے۔ اس میں ستیش کی پتنی کو بہت نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔''

''کیسا نقصان؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ لوگ کہتا ہے کہ اگر ستیش کا بیوی یعنی رام پرشاد کا بہو سچا ہے تو وہ مندر میں جا کر اپنا سچ ثابت کرے۔ وہ ابلتے ہوئے تیل کی کڑاہی کا بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ستیش کی پتنی سچا ہے تو تیل میں اپنا ہاتھ ڈال کر ثابت کرے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ ''یہ میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔ دراصل ہندوؤں کی دیومالا میں یہ واقعہ موجود ہے۔ جب رانی سیتا جی پر بہتان لگا تھا تو اس نے تیل کی ابلتی ہوئی کڑاہی میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے اس کے ہاتھ جلنے سے بچ گئے تھے۔ کچھ خبطی لوگ اس واقعے کو اب تک لے کر چل رہے ہیں۔ جب کسی بڑے جرم میں کسی کو اپنی صفائی پیش کرنی ہوتی ہے تو اس کو اس آزمائش سے گزرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔''

''یہ تو بڑی جاہلیت کی بات ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''مکر و فریب کے اس دور میں ایسی آزمائش کا مطلب بھی مکر و فریب ہی ہے۔''

''لیکن جناب! سیانا لوگ سچ کہتا ہے کہ بندہ جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔'' آفتاب خاں نے مونچھیں سہلا کر کہا۔ ''اب بات یہ ہے کہ ستیش کا دادی وہ کھوسٹ بڑھیا بھی ایک دو موقع پر ایسے ہی دوسرے لوگوں کو یہ آزمائش دینے پر مجبور کر چکا ہے۔ اب اس کا مخالف لوگ یہی بات پکڑ رہا ہے...... وہ کہتا ہے کہ اگر تب ایسا آزمائش کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا تو اب کیوں نہیں۔ اس بڑھیا کی وجہ سے اب اس کا بیٹا رام پرشاد اور اس کا پھیملی (فیملی) پھنس گیا ہے۔ یا تو اب رام پرشاد کی بہو کو یہ آزمائش دینا پڑے گا یا اس کو مجرم ٹھہرا دیا جائے گا۔''

یہ واقعی دلچسپ اور سنگین صورتِ حال تھی۔ ان لوگوں کا بے پناہ کٹر پن اور ان کے اندر کی سفاکی تو اب ثابت ہو ہی چکی تھی۔ یہ لوگ جس طرح سلطانہ کو زندہ جلانے پر تل گئے تھے اور پھر جس طرح انہوں نے اپنے ہی ''محترم گرو'' کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور اس کا کٹا ہوا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے عقیدے کی پیروی میں ہر حد تک جا سکتے ہیں۔

عمران نے پوچھا۔ ''اب پنچایت کس نتیجے پر ختم ہوئی ہے؟''

آفتاب بولا۔ ''خو، پورا نتیجہ تو اب تک کوئی نہیں نکلا ہے جی۔ جب شور بہت بڑھ گیا اور پنچوں نے فیصلہ دیا کہ ستیش کی پتنی کو آزمائش دینا پڑے گی تو ستیش ایک دم طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ہاتھ جلانے ہی ہیں تو پھر میں اپنے ہاتھ جلاؤں گا۔ بڑے پنچ نے کہا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو وشواس ہے کہ تمہارا پتنی سچا ہے تو پھر تم اس کے نام پر آزمائش دے سکتا ہے۔ اگر تمہارا پتنی سچا ہے تو بھگوان تمہارا رکھشا کرے گا۔''

''ستیش کی پتنی کیا کہتی ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''وہ تو مسلسل رو رہا ہے جی۔ ایک ہی بات کہہ رہا ہے کہ اگر وہ دوشی ہوتا تو فوراً اپنا دوش مان لیتا، اس نے یہ سب نہیں کیا ہے۔ کلثوم خود وہاں سے نکلا ہے۔ کس طرح نکلا ہے، اسے کچھ پتا نہیں۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ مہندر اور گرو کے چیلوں نے گرو کا قتل ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا ہے۔ اب انہیں رام پرشاد کی بہو کے خلاف اپنا اندرونی غصہ نکالنے کا موقع مل رہا ہے اور وہ اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

آفتاب خاں باہر کی خبریں دے کر چلا گیا۔ ہم پھر انتظار کی سُولی پر لٹک گئے۔ تہ خانوں کے اندر فضا بہت بوجھل اور یاسیت سے بھری ہوئی تھی۔ میرے اور سلطانہ کے درمیان بول چال تقریباً ختم تھی۔ ایک ہی کمرے میں ہوتے ہوئے ہم جیسے ایک دوسرے سے طویل فاصلے پر تھے۔ یہ فاصلہ اس رات کی سیاہی سے بھرا ہوا تھا۔ جب بے بسی کی انتہا کو چُھو کر سلطانہ نے مجھے جارج گورا کے کمرے سے نکالا تھا اور خود کو اس فاتح کے حوالے کرنے کے لئے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی تھی۔

گرو کی پتنی رادھا ہر وقت پرارتھنا کرتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے پتی کے سفاکانہ قتل سے بے خبر تھی۔ وہ اس کی طرف سے پریشان رہتی تھی اور اس سے بڑھ کر پریشانی اسے اس بات کی تھی کہ کہیں اس کے گرو پتی کو پہنچنے والے کسی نقصان کی وجہ سے بھگوان اس سے ناراض نہ ہو جائیں۔ آفتاب جب بھی آتا تھا، وہ اس سے گرو کے بارے میں پوچھتی تھی۔ آفتاب خاں اسے گول مول جواب دے کر مطمئن کر دیتا تھا۔

اگلے روز کی ساری خبریں چونکا دینے والی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی بات چونکانے والی تھی کہ آفتاب خاں آدھی رات کو آنے کے بجائے شام کو ہی آ گیا تھا۔ دن کے وقت اسے مندر میں آنے کے لئے خصوصی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔

اس نے اطلاع دی کہ باہر ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ رام پرشاد نے کہا ہے کہ اسے اپنے بیٹے ستیش اور بہو مالا پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جو کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں اور سانچ کو آنچ نہیں۔ لہٰذا اپنے بیٹے ستیش کی جگہ وہ خود پرکھشا دے گا۔ پنچوں نے پنڈت بھگوان داس سے مشورہ کرنے کے بعد اس کی یہ پیشکش قبول کر لی ہے۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ کل شام کے بعد پہلے پہر کی دوسری گھڑی میں اسی مندر کے اندر خاص خاص پجاریوں اور پنڈتوں کے رُوبرو رام پرشاد از خود اپنی بہو اور بیٹے کی سچائی کے لئے آزمائش دے گا۔

"یہ سب تو پرانے زمانے کی کہانیوں جیسا لگ رہا ہے۔" اقبال نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ "لیکن یہاں انڈیا میں کچھ لوگ اب بھی پرانے زمانے کی طرح ہی رہ رہے ہیں۔ کئی علاقے تو ایسے ہیں جہاں اب تک بڑی باقاعدگی سے دیوی دیوتاؤں کو زندہ بچے بچیوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ اس بلیدان کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق کئی نام دیئے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں سنا تھا کہ راجستھان میں ایک ایسی ہی خونی رسم کو پوارشا کہا جاتا ہے۔"

آفتاب بولا۔ "رام پرشاد بہت کٹر قسم کا بندہ ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر ضرور عمل

کرے گا۔ اس کو پورا یقین ہے کہ اس کا بہو اور بیٹا سچا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر بھگوان ضرور بہ ضرور اس کا مدد کرے گا۔ اس نے آج شام سے آٹھ پہر کا بھرت رکھ لیا ہے اور پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا ہے۔ اس نے کسی خاص پنڈت سے اپنے ماتھے پر قشقہ لگوایا ہے اور کسی تیرتھ سے آنے والا سفید لباس پہنا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کڑاہے میں ڈالنے کے لئے ایک دم تیار ہے۔"

"وہ بڑھیا کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ پہلے تو چپ رہا ہے لیکن اب اس نے رام پرشاد کو ہلاشیری دینا شروع کر دیا ہے۔ رام پرشاد کی طرح بڑھیا نے بھی بھرت رکھا ہے۔ اس نے رام پرشاد کو نیلے پتھروں والا ایک مالا پہنایا ہے اور اسے وشواس دلایا ہے کہ وہ اپنی آزمائش میں ضرور کامیاب ہو گا۔"

نیلے پتھروں والی مالا سے یاد آیا کہ مجھے بھی رام پرشاد کے گھر میں اس کی بوڑھی ماتا نے ایسی ہی مالا پہنائی تھی۔ یہ بوڑھی عورت کہنہ رسموں رواجوں کی ایسی گٹھڑیوں میں سے تھی جن کی گرہیں کھولنا بڑے بڑے دانشوروں اور نفسیات دانوں کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ گٹھڑیاں اپنی بوسیدگی سمیت جل جاتی ہیں، مٹی میں دفن ہو جاتی ہیں لیکن کھلتی نہیں ہیں۔ اب رام پرشاد اور اس بڑھیا کا اندھا عقیدہ انہیں ایک خاص صورتِ حال کی طرف لے جا رہا تھا۔

آفتاب خاں بولا۔ "ام بھی وہیں پنچایت والی جگہ پر موجود تھا جی۔ رام پرشاد بڑے غصے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ایشور کے بنائے ہوئے اصول کسی ایک زمانے کے لئے نہیں ہوتے۔ ہر زمانے کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر سچ کی پرکھشا دینے والے لوگ پرانے زمانے میں جلتے تیل سے بچ سکتے ہیں تو آج بھی بچ سکتے ہیں۔ بات صرف پکے وشواس کی ہے اور من کی شکتی کی ہے...... اور وہ یہ سب کچھ کر کے دکھا دے گا۔ اس موقع پر رام پرشاد کا بیٹا ستیش پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ یہ مہندر اور اس کا ساتھی لوگ ام سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ رام پرشاد بیٹے پر بھی بگڑ گیا۔ اس نے اسے بری طرح جھڑکا اور کہا کہ بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تم آزمائش دینے سے پہلے ہی ہارے ہوئے ہو۔ اس لئے کہ تم ایشور کے چمتکاروں (معجزوں) پر پورا وشواس نہیں رکھتے اور یہ سارا کھیل ہی وشواس کا ہے۔ بڑھیا نے بھی بیٹے رام پرشاد کا حمایت ہی کیا اور پوتے کو یقین دلایا اور کہا کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ رام پرشاد کے ہاتھ جلنے سے بچ جائیں گے۔"

"کچھ نہ کچھ سے بڑھیا کا کیا مطلب ہے؟" عمران نے سوال کیا۔

"جہاں تک اماری عقل میں آیا ہے جی...... بڑھیا کا خیال ہے کہ اگر رام پرشاد اور وہ

خود اپنے ارادے پر قائم رہے تو آزمائش سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آزمائش ٹل جائے اور اگر نہ بھی ٹلا اور رام پرشاد کو اپنے ہاتھ تیل میں ڈالنا ہی پڑا تو دیوی مدد کرے گا۔ رام پرشاد کا ہاتھ کسی خاص نقصان سے بچا رہے گا۔ پنچایت کے بعد بڑھیا نے ایک دو ایسا مثالیں بھی دیا جن میں کسی سچے شخص نے پورے وشواس کے ساتھ اپنا دونوں ہاتھ ابلتے تیل میں ڈالا اور ہاتھوں پر بس معمولی سا نشان ہی پڑ سکا اور یہ چھوٹا موٹا نشان بھی چند دن تک گنگا جل لگانے سے ٹھیک ہو گیا۔''

یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ یہ بات تو ہرگز یقین کرنے والی نہیں تھی کہ رام پرشاد ابلتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالے گا اور ہاتھ جل بھن کر کباب ہونے سے بچ جائیں گے۔ ہاں، اس میں کوئی شعبدہ بازی ضرور ہوسکتی تھی۔ کوئی کیمیکل یا کوئی ایسی شے ہاتھوں اور بازوؤں پر لگائی جاسکتی تھی جو چند سیکنڈ کے لئے ہاتھوں کو تیل کی بے پناہ حدت سے بچا لیتی ۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا مخالف ٹولہ اس قسم کی شعبدہ بازی چلنے دے گا؟ وہ کوئی سیدھے سادے دیہاتی نہیں تھے، رام پرشاد اور ستیش کے ساتھی ہی تھے اور استھان کے سارے اچھے برے بھیدوں سے آگاہ تھے۔

آفتاب خاں نے کہا کہ اگر کل شام کے بعد واقعی مندر میں یہ تماشا لگا تو پھر وہ ہمیں یہ تماشا دکھانے کے لئے پہلے کی طرح اوپر لے جائے گا اور ہوادان کے سوراخوں میں سے ہال کمرے کا منظر دکھائے گا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے تجسس میں گزرے۔ اقبال کا خیال یہی تھا کہ اس آزمائش سے پہلے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا اور رام پرشاد کو کھولتے تیل میں ہاتھ نہیں ڈالنا پڑیں گے۔ تاہم ہوشیار سنگھ کی رائے مختلف تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''بارہ صرف سکھوں کے ہی نہیں بجتے۔ کسی نہ کسی موقع پر کسی نہ کسی ڈھنگ سے ساری قوموں کے بارہ بجتے ہیں۔ آپ لوگ دیکھنا، یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ واہگرو کی کرپا سے برا ہی نکلنا ہے۔ یہ لوگ ہندو دھرم سے زیادہ ہٹ دھرم کو ماننے والے ہیں۔ یہ اپنی اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

ہوشیار سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہی آفتاب خاں نمودار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''ام آپ کو لینے آیا ہے جی۔ ادھر اوپر بس تماشا شروع ہونے ہی والا ہے۔ آپ ذرا غور سے سنیں۔ ڈھول کا آواز یہاں تک بھی سنائی دے رہا ہے۔''

ہم نے کان لگا کر سنا۔ واقعی کسی بہت بڑے ڈھول کی مدھم گونج ان تہ خانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ پہلے کی طرح ہم آفتاب خاں کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جانے

والوں میں، مَیں، عمران، اقبال اور ہوشیار سنگھ شامل تھے۔ طلال کو سلطانہ کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ کل رات سے اسے بخار تھا اور وہ گاہے بگاہے شدید سردی بھی محسوس کر رہی تھی۔ غالباً یہ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ وہ اس دن دیر تک ٹھنڈے پانی سے نہاتی رہی تھی۔

حسبِ سابق ہم ان تنگ و تاریک زینوں میں پہنچے جہاں سے بمشکل ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ گرد و غبار اور جالوں سے بچنے کے لئے ہم نے اپنے چہرے ایک بار پھر کپڑوں میں لپیٹ لئے تھے۔ عمران کے پاس رائفل تھی۔ میں اور اقبال بھی مسلح تھے۔ زینوں میں داخل ہوتے ہی ہمیں ڈھول کی دھمادھم صاف سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سنکھ بھی بجائے جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم اوپر گئے، یہ آوازیں مزید بلند ہوتی گئیں۔ زینوں کا ایک چوبی دروازہ کھولنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی اور اشاروں سے ہمیں سمجھا دیا کہ اب ہمیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی پوجا کے ہال کمرے کا بے پناہ شور ہمارے کانوں سے ٹکرایا۔ یہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جلد ہی ہم اس قابل ہو گئے کہ اپنی آنکھیں ہوادان کی پتھریلی جالی سے لگا سکیں۔ ہال نما کمرے کا منظر دیدنی تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو افراد یہاں موجود تھے...... اور اس سے کئی گنا افراد شاید باہر موجود تھے۔ ان سب کا شور بھی ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہال کمرے میں موجود افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ ان کے عقب میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بھی درجنوں افراد کھڑے تھے۔ بہت سے افراد کے ہاتھ میں لاٹھیاں اور بھالے تھے۔ کسی کسی کی کمر سے تلوار بھی بندھی ہوئی تھی۔ زیادہ تر کے سروں پر رنگ دار پگڑ نظر آ رہے تھے۔ پجاری حضرات اور چیلے وغیرہ اپنے مخصوص لباسوں میں تھے۔ اس اجتماع میں عورتیں بھی موجود تھیں تاہم ان کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں مجھے رام پرشاد کی فربہ اندام بیوی بی نظر آئی۔ تاہم رام پرشاد کی بہو مالا اور بیٹا ستیش کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہال کمرے میں موجود ہر فرد کے چہرے پر بے پناہ تناؤ نظر آ رہا تھا۔ بہت بڑے ڈھول کی دھنادھن سے دیواریں لرز رہی تھیں۔

ہال کمرے میں دیوی کی مورتی کے سامنے قریباً بیس مربع فٹ جگہ خالی تھی۔ یہاں لوہے کے ایک بڑے چولہے پر تیل کی کڑاہی دھری تھی۔ چولہے میں سرخ انگارے دہک رہے تھے اور آگ کی لپک پیدا ہو رہی تھی جو اس امر کی شاہد تھی کہ تیل میں کوئی بھی چیز ڈالی گئی تو وہ سیکنڈوں میں روسٹ ہو جائے گی۔

''وہ فساد کی جڑ بڑھیا کہاں ہے؟'' عمران نے سرگوشی میں آفتاب سے پوچھا۔

''امارا خیال ہے کہ وہ رام پرشاد کے ساتھ ہی اندر آئے گا۔'' آفتاب نے جواب دیا۔

"اور وہ کب آئے گا؟"

"بس آنے ہی والا ہے۔ وہ دیکھیں، جی، مہندر اور اس کا ساتھی لوگ اندر آ رہا ہے۔" آفتاب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے بھی لمبوتری شکل والے دراز قد مہندر کو پہچان لیا۔ وہ اپنے قریباً ایک درجن ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور پہلے سے مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پستول ہولسٹر میں بند اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس کے ساتھ گہرے سیاہ رنگ والا ایک فربہ اندام شخص تھا۔ اس نے رنگ دار پگڑ باندھ رکھا تھا، یہ شخص بھی پستول سے مسلح تھا۔

"یہ کالے منہ والا کون ہے؟" میں نے آفتاب سے پوچھا۔

"یہی کھیا رشید ہے۔" آفتاب کے بجائے عمران نے جواب دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ مجھے اس شخص کی صورت میں سلمان سلو کی تھوڑی بہت جھلک نظر آئی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے...... ہال کمرے میں بے چینی کی لہر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر لوگ مڑ مڑ کر داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "کہیں رام پرشاد اُڑن چُھو تو نہیں ہو گیا؟" اقبال نے سرگوشی کی۔

عمران بولا۔ "میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ وہ واقعی اُڑن چُھو ہو جائے اور اس کی جگہ یار لوگ اس بڑیا کو پرکھشا دینے پر مجبور کر دیں۔ سارے فسادوں کی بنیاد تو وہی ہے۔"

"ایسے لوگ اپنا امتحان کبھی نہیں دیتے، بس دوسروں کو آگے کرتے ہیں۔ یہ جتنے بوڑھے ہوتے ہیں، ان کو زندگی اتنی ہی پیاری ہوتی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"بلکہ ان میں سے زیادہ تر تو بوڑھے ہی نہیں ہوتے۔" عمران نے کہا۔ "دل ہی دل میں یہی الاپتے رہتے ہیں، ابھی تو میں جوان ہوں......"

یکا یک ڈھول کی دھنا دھن مزید بلند ہو گئی۔ لگاتار کئی سنکھ بجنے لگے۔ پھر ڈھول کی سماعت شکن آواز میں گھنٹیوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ داخلی دروازے سے پانچ چھ افراد والہانہ رقص کرتے اور جھومتے ہوئے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے عقب میں پچاس پچپن سالہ رام پرشاد تھا۔ اس نے ایک لمبا سفید چولا پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر قشقہ اور گلے میں نیلے پتھروں والی لمبی مالا تھی۔ رام پرشاد کے دونوں ہاتھوں میں پیتل کی گھنٹیاں تھیں جنہیں وہ زور و زور سے بجا رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ رام

پرشاد کے عقب میں اس کی بوڑھی ماتا تھی۔ وہ زرد ساڑھی میں تھی۔ اس کے چہرے پر بھی وجدانی کیفیت تھی اور اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لکڑی اور پتھر کی دو تین مالائیں اس کے گلے میں بھی جھول رہی تھیں۔ ان دونوں کے عقب میں سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس تھا۔ وہ رام پرشاد اور اس کی ماتا پر کوئی چیز چھڑکتا چلا آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی مندر کا اندرونی منظر مزید ڈرامائی اور سنسنی خیز ہو گیا۔ ہمیں یہی لگ رہا تھا کہ ہم پندرہویں صدی کے جدید دور میں نہیں، کسی قدیم زمانے میں بیٹھے ہیں۔ رام پرشاد کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گھنٹیوں کو زور و زور سے بجا رہا تھا اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گھنٹیوں کی آواز میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جوں جوں گھنٹیوں کی لے بلند ہوئی، رام پرشاد کے گرد رقص کرنے والے افراد کے رقص میں بھی تیزی آتی گئی۔ رام پرشاد خود بھی جھومنے والے انداز میں اپنے سر کو آگے پیچھے حرکت دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور کچھ یہی کیفیت بڑھیا کے چہرے کی بھی تھی۔ گھنٹیاں بجاتے بجاتے اور اپنے سر کو حرکت دیتے دیتے رام پرشاد نے صرف ایک دو سیکنڈ کے لئے آنکھیں کھولیں۔ شمع دانوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ نظر آئیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ سرخی اس کے اندرونی جذبات کے سبب تھی یا اس نے خود کو ایک خاص کیفیت میں لانے کے لئے بھنگ آمیز مشروب پیا تھا۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ بظاہر اس کے ہاتھوں پر کوئی بھی چیز لگی نظر نہیں آئی۔

ڈھول تاشوں اور سنکھوں کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ رام پرشاد کڑاہی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اب وہ کسی بھی وقت خود کو پرکھشا کے عمل سے گزار سکتا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تاخیر کر رہا ہے یا شاید اسے تاخیر کرنے کے لئے کہا گیا تھا...... اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ عین موقع پر مخالف گروہ آزمائش کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائے۔

تین چار منٹ مزید گزر گئے۔ مہندر اور اس کے قریبی ساتھیوں کے چٹانی چہروں پر کسی طرح کی نرمی نمودار نہیں ہوئی۔

رقص کرنے والوں نے جوش میں آ کر ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ سوکھے سڑے پنڈت بھگوان داس نے آگے بڑھ کر رام پرشاد کا کندھا مخصوص انداز میں دبایا۔ رام پرشاد نے مزید زور سے گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پر وجدانی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت بے پناہ وشواس اور جذبے میں لتھڑی ہوئی تھی۔ رام پرشاد جانتا تھا کہ اس کی بہو اور بیٹے پر غلط

الزام لگایا جا رہا ہے، وہ سچا ہے......اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب سے بڑی چیز وشواس اور جذبہ ہی ہے اور اب یہ ثابت کرنے کی گھڑی آ گئی تھی۔

وہ ایک ہیجانی منظر تھا۔ شور سے کانوں کے پردے شق ہو رہے تھے۔ رام پرشاد نے دونوں گھنٹیوں کو پورے زور سے آخری بار حرکت دی اور پھر انہیں دونوں طرف پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پُر جوش نعرہ بلند کیا۔ جذبے میں لتھڑے ہوئے اس زوردار نعرے کے ساتھ ہی وہ کڑاہی کی طرف جھکا۔ ہم نے وہ منظر دیکھا جسے دیکھنے کے لئے مضبوط دل گُردے کی ضرورت تھی۔ رام پرشاد نے اپنے دونوں ہاتھ تقریباً کہنیوں تک ابلتے ہوئے تیل میں جھونک دیئے۔

......اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بے حد لرزہ خیز تھا۔ ہال کمرے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ گرم تیل کی بلند چڑچڑاہٹ سنائی دی......اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کرب ناک انداز میں چلایا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ کڑاہی میں سے کھینچے، ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کڑاہی کے کنارے سے رگڑ کھائی۔ وہ ایک دل دوز منظر تھا۔ اس کے بازوؤں کی گندمی کھال اُتر گئی اور نیچے سے سرخ سرخ گوشت جھانکنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک بے طرح جل چکے تھے۔ وہ فرش پر گر پڑا اور تکلیف سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

یہ سب کچھ ہم سے فقط چھ سات فٹ کی دوری پر ہو رہا تھا۔ ہوادان کی پتھریلی جالی کے سوراخوں میں سے ہم سب کچھ بالکل واضح دیکھ رہے تھے۔ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے سے رام پرشاد کے ہاتھوں اور بازوؤں کی جلی ہوئی کھال کئی اور جگہ سے بھی اُتر گئی...... جلے ہوئے گوشت کی مکروہ بُو ہمارے نتھنوں تک پہنچی۔

اس وقت میری نگاہ روتی چلاتی ہوئی بڑھیا پر پڑی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اسے جیسے اپنی نگاہ پر یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یکا یک مہندر اور اس کے ساتھیوں نے گرج دار نعرہ بلند کیا۔ "جے ماتا کی" آواز بڑی شدت سے در و دیوار میں گونجی۔ بہت سی لاٹھیاں اور بلم وغیرہ فضا میں بلند ہوئے۔ وہ سب لوگ جو رام پرشاد اور اس کے بچوں کو جھوٹا سمجھ رہے تھے، ایک دم بپھرے ہوئے نظر آئے۔ وہ للکارے مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے تمتما گئے اور آنکھوں میں جنون نظر آیا۔ یوں لگا کہ آزمائش میں ناکام ہونے کے بعد وہ رام پرشاد کو واجب القتل سمجھ رہے ہیں۔

اس کے بعد جو منظر ہم نے دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ مہندر آگے آیا اور پکار کر بولا۔

"پھیسلہ (فیصلہ) ہو گیا...... بھگوان کا پھیسلہ ہو گیا۔" اس کی آواز میں بلا درجے کی درندگی تھی۔

یکا یک بہت سے لوگ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے رام پرشاد پر جھپٹے۔ ایک بٹے کٹے شخص نے اس طرح کھینچ کر تلوار چلائی کہ وہ تقریباً ایک فٹ تک رام پرشاد کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد کئی افراد اس پر پل پڑے۔ رام پرشاد کی آخری کرب ناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ وہ مشتعل ہجوم کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھے تھے۔ مکھیا کی گرج دار آواز ہجوم کے شور میں سے اُبھری۔

"اس حرامی کا بیٹا اور بہو کہاں ہیں۔ وہ اصل دوشی ہیں۔ ان کو پکڑو......

ایک اور للکار اُبھری۔ "اس کی بہو پاپی ہے۔ اس کتیا کو جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ جان سے ماردیں گے۔"

"......ہاں جان سے ماردیں گے۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

ہجوم میں ایک لہر سی دوڑی۔ کچھ لوگ باہر کی طرف لپکے۔ جونہی ہاتھ جلنے کے بعد رام پرشاد فرش پر گرا تھا اور مخالفین نے فلک شگاف نعرے بلند کئے تھے، رام پرشاد کے حمایتی وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے تھے۔ اب مندر کے اندر مہندر اور اس کے ساتھیوں کا غلبہ تھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

"لگتا ہے کہ اب مالا کی جان کو بھی خطرہ ہے۔" ہوشیار سنگھ لرزاں آواز میں بولا۔

ہجوم کے درمیان سے ہمیں اب رام پرشاد کی خونچکاں لاش سیاہی مائل فرش پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا سفید براق چولا خوں رنگ تھا۔ لوگ اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس کے پاس ہی مندر کا بہت بڑا ڈھول اوندھا پڑا تھا۔

"لو، وہ بھی آ گئی۔" عمران نے سنسناتی سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا، کچھ مشتعل لوگ مالا کو کھینچتے ہوئے مندر میں لا رہے تھے۔ ان مشتعل لوگوں میں لمبی ناک اور عقابی آنکھوں والا گاڑی بان بھولا ناتھ سب سے آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مالا کے بال تھے اور دوسرے میں ایک چھوٹی تلوار تھی۔ کئی دوسرے لوگوں نے بھی مالا کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ دہشت سے چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ایک بلند دھاڑ سنائی دی۔ یہ برہمن زادہ ستیش تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا سیاہ پستول تھا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہوت ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔" وہ چنگھاڑا

اوراس نے مندر کے اندر ہی کئی ہوائی فائر کیئے۔

لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے۔ چند لمحوں کے لئے لگا کہ ستیش آگے بڑھ کر اپنی پتنی کو چھڑانے اور شاید یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر پھر اچانک دوافراد نے جھپٹ کرستیش کو عقب سے دبوچ لیا۔ستیش نے فائر کیا تاہم پستول کا رخ اب زمین کی طرف تھا۔ دھماکے سے گولی چلی اور کسی کے پاؤں میں پیوست ہوگئی۔ پکڑنے والوں نے ستیش کو اوندھے منہ پکے فرش پر گرا دیا اور جکڑ لیا۔تب وہ لوگ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے مندر سے باہر لے گئے۔اسی دوران میں مالا کی نگاہ فرش پر پڑی۔ وہاں اپنے سسر کی خونچکاں لاش دیکھ کر وہ کرب ناک انداز میں چلانے لگی۔''پتا جی...... پتا جی۔''

اسے پکڑنے والوں نے اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔اس کے بازو پیچھے موڑ کر اس کے ہاتھ ایک رسّی سے باندھ دیئے گئے۔ پاؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔اس کی ساڑھی بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور بالائی جسم نیم عریاں ہو رہا تھا۔اس کی عریانی تو رہی ایک طرف،اس کی جان کی پروا بھی کسی کو نہیں تھی۔ وہ لوگ بے دردی سے اسے اِدھر اُدھر گھسیٹ رہے تھے۔فرش پر اوندھا گرنے سے اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ وہ چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ دہشت کے پہلے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب اس کے چہرے پر عجیب طرح کا طیش بھی پایا جا رہا تھا۔

وہ مہندر کی طرف منہ کر کے اشکبار انداز میں پکاری۔''تم جانور ہو،تم ہتھیارے ہو۔تم بھگوان کے نام پر راکھشس کے پجاری ہو۔تمہارا انجام بہت برا ہووے گا...... بہت برا ہووے گا۔''

بھولا ناتھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔اس نے تلوار سونتی اور خطرناک انداز میں مالا کی طرف بڑھا۔ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''ناہیں...... ناہیں، یہ ٹھیک ناہیں۔''

''کیوں ٹھیک ناہیں؟'' مہندر کا ساتھی پٹیل گرج کر بولا۔''یہ نڑکی دھرم دشمن ہے۔ یہ ہمیشہ سے دھرم دشمن رہی ہے۔ہم تو سمجھت ہیں کہ...... رام پرشاد کی جان لینے والی بھی یہی ہے۔اسے دہری سزا ملنی چاہئے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔حرامزادی کے ٹکڑے کر دو یہیں پر لٹا کر......'' ایک اور کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔''یا پھر اسے کڑاہے میں ڈال دو۔''

یوں لگا جیسے کئی افراد مالا کی طرف بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ایک دم ہجوم میں شدید ہلچل نظر آئی۔

ہوشیار سنگھ نے لرزاں آواز میں کہا۔''یہ لوگ اس لڑکی کو مار دیں گے جی۔کڑاہے میں پھینک دیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ پرکھشا ناکام ہو تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔''

بپھرا ہوا ہجوم اب بالکل آگ بگولا دکھائی دے رہا تھا۔تیوریاں چڑھی ہوئی،آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹتی ہوئیں۔وہ سب کے سب ہوش وحواس سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہجوم کی نفسیات ایک اکیلے شخص کی نفسیات سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ہجوم میں موجود شخص ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جن کا انفرادی طور پر وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہجوم کے اندر منفی اور مثبت دونوں طرح کی کیفیات انتہائی عروج پر پہنچ سکتی ہیں۔ جیسے بہادری، ہمت، ایثار اور جواں مردی یا پھر نفرت، انتقام، خوں خواری اور درندگی۔

یہاں اس ہال کمرے میں بھی اچانک درندگی اپنے عروج پر پہنچی نظر آئی۔ وحشت کی لہر نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اب پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ تیل کی کڑاہی اتنی بڑی کیوں تھی۔کھولتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالنے کے لئے تو چھوٹی سی کڑاہی بھی کام دے سکتی تھی۔ یہ شاید کوئی قدیم کڑاہا تھا جو خاص اسی رسم کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔اس کا کھلنڈرا انداز اس کے اندر کہیں بہت دور گہرائی میں جا چھپا تھا۔

کچھ مشتعل لوگوں نے بندھی ہوئی مالا کو اُٹھایا اور بلاتردد تیل کے کڑاہے کی طرف بڑھے۔ان میں مہندر بھی شامل تھا۔وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب آٹھ دس افراد کا ایک ٹولہ زبردستی ہال کمرے میں گھس آیا۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میں نے پہچان لیا۔یہ ستیش کے دوستوں میں سے تھے۔

ان میں سے ایک گرجا۔''مالا بہن کو چھوڑ دو۔ ناہیں تو گولی چلے گی۔''

''چلاؤ گولی...... چلاؤ۔'' مہندر زہرناک انداز میں دھاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مالا کو اس کے پاؤں پر کھڑا کیا اور پستول کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔اس کا چہرہ ایک انتہا پسند کا چہرہ تھا۔اَن گنت صدیوں سے یہ چہرہ مذہب کے نام پر سفاکی اور درندگی کی بدترین مثالیں قائم کرتا رہا ہے۔اب دونوں طرف سے رائفلیں تان لی گئی

تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مہندر کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ماحول گواہی دے رہا تھا کہ یہ فساد اب روکنے سے رکے گا نہیں۔ میں نے دیکھا، عمران نے اپنی رائفل کی نال جالی کے ایک سوراخ میں رکھ دی ہے اور کسی ماہر نشانہ باز کی طرح رائفل کا کندا اپنے شانے سے لگا کر نشانہ باندھ رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایک نہایت خطرناک نشانہ لگانے جا رہا ہے۔ یہ نشانہ خطا جاتا یا پوری طرح کارگر نہ ہوتا تو مالا کی جان جا سکتی تھی۔ وہ مالا کے عقب میں مہندر کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا اور مالا کے پیچھے مہندر کے چہرے کا ایک تہائی حصہ ہی نظر آ پا رہا تھا۔ اسے اندازاً دو انچ چوڑے اور چھ انچ لمبے ٹارگٹ کو نشانہ بنانا تھا...... مگر یہ بھی عیاں تھا کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ مجھے وہ تماشا یاد آ گیا جو عمران اور اقبال نے لاہور میں مجید مٹھو کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے سر پر سیب رکھ کر عمران نے حیران کن مہارت سے نشانہ لگایا تھا۔ شاید آج پھر وہی مہارت استعمال ہونے والی تھی۔

اوپر پھر دھماکا ہوا۔ میں نے مالا کے پیچھے مہندر کی پیشانی پر ایک داغ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے پختہ فرش پر گرا۔ عمران کے بے مثال نشانے کا دوسرا شکار مہندر کا قریبی ساتھی پٹیل تھا۔ اس کی کنپٹی نشانہ بنی اور وہ پہلی گولی چلانے کی حسرت دل میں لئے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔ ان دونوں فائرز کے درمیان بمشکل ایک سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ اتنے مختصر وقت میں دوسری مرتبہ اتنا صاف نشانہ لینا حیرت ناک تھا۔

میں نے مالا کو مہندر کے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے بعد جیسے یکا یک قیامت برپا ہو گئی۔ دھماکوں اور شعلوں نے ہال کمرے کو ڈھانپ لیا۔ کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ستیش کا ایک ساتھی مالا کو بچانے کے لئے مالا کے اوپر گر گیا تھا۔ تب ہم نے دیکھا کہ ستیش کے دو ساتھی مالا کو چکنے فرش پر گھسیٹتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے اور وہ اندھی گولیوں کی زد سے بچ گئی...... اور ہم فی الوقت یہی چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے خوں ریز مناظر تھے۔ آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ نہایت نزدیک سے ایک دوسرے پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں بھی نکل آئی تھیں۔ جس ہوادان سے ہم جھانک رہے تھے، اس کے عین سامنے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر کھیا رشید نے ایک شخص کی گردن پر تلوار ماری اور اس کی شہ رگ کاٹ کر رکھ دی۔ دفعتاً وہ کچھ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ کوئی اندھی گولی اس بڑے شمع دان کے رسّے سے ٹکرائی جو تیل کے کڑاہے کے عین اوپر جھول رہا تھا...... پیتل کا شمع دان اپنی قریباً دو درجن موم بتیوں سمیت

ابلتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں گرا۔ ابلتا ہوا تیل اچھلا۔ کئی افراد کرب سے بے تاب ہو کر چلائے۔ اس کے ساتھ ہی تیل نے آگ پکڑ لی۔ ہم نے ایک شخص کو آگ کی لپیٹ میں آ کر بگولے کی طرح بیرونی دروازے کی طرف دوڑتے اور پھر راستے میں ہی گرتے دیکھا۔ کڑاہا الٹ چکا تھا۔ اس کا تیل جہاں جہاں گیا، اپنے ساتھ آگ کا ریلا سا لے گیا۔ چند سیکنڈ پہلے جو جنونی ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، اب اپنی جانیں بچانے کے لئے بیرونی دروازوں کی طرف دوڑے۔ دروازے صرف دو تھے اور نکلنے والے درجنوں۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ سیاہ گاڑھا دھواں ہر شے کو ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ یہ دھواں ہوادان کے اندر سے ہماری طرف بھی آ رہا تھا۔ اب ہمارا یہاں رکنا خطرناک تھا۔

''نیچے چلیں جی۔'' آفتاب خاں پکار کر بولا۔

ہم آگے پیچھے تنگ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ چند زینے اُتر کر ہم نے وہ دروازہ بند کر دیا جسے کھول کر اوپر آئے تھے۔ اس دروازے کے بند ہونے سے عارضی طور پر سیڑھیاں دھوئیں سے محفوظ ہو گئیں۔ جن کپڑوں سے ہم نے چہرے لپیٹے تھے، وہ ابھی تک ہمارے پاس تھے۔ ہم نے ان میں سے دو تین کپڑے دروازے کی درزوں میں ٹھونس دیئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیریں تہ خانے میں موجود تھے۔

''کیا ہوا؟'' سب سے پہلے رادھا نے ہراساں ہو کر پوچھا۔ اسے ہر وقت اپنے شوہر نامدار کی پڑی رہتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شوہر صاحب کو سورگ باشی ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں اور اب اس کی وفات سے کہیں زیادہ اہم خبریں موجود ہیں۔

مندر میں جو آگ بھڑکی تھی، وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم یہاں ان تہ خانوں کے اندر سے کچھ دیکھ نہیں سکتے تھے مگر تصور کی نگاہ ہمیں سب کچھ دکھا رہی تھی۔ قدیم مندر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شعلے اس کے دروازوں سے نکل کر باہر تک جا رہے تھے۔ تاریکی میں ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔

''گولیاں چل رہی ہیں۔'' عمران نے بیرونی آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ غور سے سننے پر فائرنگ کی بہت مدھم آواز یہاں بھی نوٹ کی جا سکتی تھی۔

''اگر آگ یہاں لکڑی کے زینے تک پہنچ گئی تو؟'' اقبال نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

''تو ہم گانا گائیں گے۔ خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے زینے میں۔'' عمران نے

حسب عادت بات کو مذاق میں اُڑا دیا۔

لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ آگ جس طرح بھڑکی تھی، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تہ خانے بھسم ہو سکتے تھے۔ اگر آگ مندر کے اس بیرونی دروازے تک ہی پہنچ جاتی جس میں سے گزر کر آفتاب خاں ہر رات یہاں ہمارے پاس آتا تھا تو بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

"کیا خیال ہے آفتاب خاں؟" میں نے پوچھا۔ "آگ نیچے تو نہیں آ جائے گی؟"

"بس جی، آپ سب کی طرح ام بھی دعا ہی کر سکتا ہے۔ خطرہ تو ہر صورت میں موجود ہے۔ اگر آگ یہاں تک نہ پہنچا لیکن دھواں بھر گیا تو بھی ام سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔"

آفتاب خاں درست کہہ رہا تھا۔ ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہلکا ہلکا دھواں سیڑھیوں سے اُتر بھی رہا تھا مگر یہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ ہم فی الحال خطرے سے باہر تھے۔ تہ خانوں میں گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران اور میں، آفتاب کے ہمراہ ایک بار پھر تنگ زینوں پر چڑھے اور اس دروازے کو ائر ٹائٹ کرنے کی کوشش کی جہاں سے دھواں اندر آ رہا تھا۔ اس کوشش میں ہم بری طرح کھانسنے لگے اور آنسو بہاتے ہوئے واپس آئے۔ بہرطور یہ کوشش فائدہ مند ہوئی اور دھوئیں کی آمد کم ہو گئی۔

......اگلا تقریباً ایک گھنٹہ سخت تشویش میں گزرا۔ پھر صورتِ حال بہتر ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں بھی اب معدوم ہو چکی تھیں...... فائرنگ کے علاوہ اور کسی طرح کا شور یہاں پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب رات کے قریباً دس بجنے والے تھے۔ ہمیں اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ باہر آگ بجھائی جا چکی ہے لیکن باقی حالات کیا ہیں، اس کے بارے میں آفتاب خاں ہی کوئی خبر لا سکتا تھا...... اور آفتاب ابھی تک ہمارے پاس موجود تھا۔ رات قریباً ایک بجے کے لگ بھگ وہ بالائی دروازے تک گیا اور سن گُن لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ اب مندر کے اردگرد خاموشی ہے۔ وہ باہر نکلنے کا چانس لے سکتا ہے۔ عمران نے اسے تھوڑی دیر مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ ابھی کچھ دیر مزید انتظار کرے۔ آخر رات تین بجے کے لگ بھگ آفتاب باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی اور لالٹین سنبھال لی۔ بستی سے غیر حاضری کے لیے اس کے پاس ایک نہایت معقول جواز موجود تھا۔ اس کے ایک دوست کی بیوی سخت بیمار تھی۔ شام کو اس نے مکھیا سے اجازت لی تھی کہ وہ ایک دو گھنٹوں کے لیے اپنے دوست کی طرف جائے گا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا کہ اسے وہاں دیر ہو گئی ہے۔

اب آفتاب کو کل رات ہی کسی وقت آنا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل رات بھی نہ آ سکتا۔ اس کی واپسی تک ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا۔ مندر کے خونی مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ خاص طور سے جو کچھ مالا کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی اس کو سزا دی جا رہی تھی۔ کھینچا تانی کے دوران میں وہ نیم عریاں ہو گئی تھی۔ اس کے جسمانی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حاملہ بھی ہے۔ اگر اسے سچ مچ تیل کے کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈال دیا جاتا تو آناً فاناً دو زندگیاں ختم ہو جاتیں۔

......اگلے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ سلطانہ اوپر والے تہ خانے میں کلثوم اور نوری کے پاس تھی۔ کلثوم کے کان کا درد ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا، وہ تکلیف میں تھی۔ اس کی کمر کو بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ میں رات کا جاگا ہوا بستر پر لیٹا تو نیند آ گئی۔ اچانک کسی آہٹ کے سبب میں جاگ گیا۔ تہ خانوں میں رات دن برابر تھے۔ کمروں میں شمعیں یا لالٹینیں جلتی رہتی تھیں۔ میرے کمرے میں لالٹین بجھی ہوئی تھی اس لیے تاریکی تھی۔ مجھے کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ سلطانہ تو ہرگز نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ بے حرکت لیٹا دیکھتا رہا۔ ہیولا اس کھونٹی کی طرف بڑھا جہاں جیکٹ کے نیچے میرا پستول لٹک رہا تھا۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ پندرہ سالہ طلال تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ میرے پستول تک رسائی حاصل کی اور اسے ہولسٹر سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"طلال" میں اچانک بلند آواز میں کہا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ہولسٹر جلدی سے کھونٹی پر لٹکا دیا...... میں نے ماچس جلا کر موم بتی روشن کی۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ایک دم پریشان نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے تھا؟" میں نے تحکم سے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔ میں وہ...... دراصل...... آپ کا پستول دیکھنا چاہ رہا تھا۔"

"دیکھنا چاہ رہے تھے یا لے جانا چاہ رہے تھے؟"

"ناہیں جی۔ میں بس دیکھنے لگا تھا۔"

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "طلال! مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟"

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ اس کے تاثرات دیکھ کے مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ واقعی اس لڑکے نے سلطانہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار

سنگین وارداتیں کی ہیں۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجب سی سرد مہری تھی۔

''طلال! اُدھر بیٹھ جاؤ۔'' میں نے سامنے نشست کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہچکچاتا ہوا بیٹھ گیا۔''مجھے سچ بتاؤ طلال! تم نے ایسا کیوں کیا؟...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تم کچھ چھپاؤ گے نہیں تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مدد بھی کروں گا۔'' اچانک میں چونک گیا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں طلال کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوئی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''طلال! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

وہ اشک بار ہوگیا۔گلوگیر آواز میں بولا۔''میری خالہ مرجائے گی۔ وہ اپنی جان دے دے گی۔ میں اسے مرتا ہوا نا ہیں دیکھ سکتا۔ اس سے پہلے میں مرجانا چاہتا ہوں یا پھر اس کتے کو مار دینا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے جانے دیں...... خدا کے لیے جانے دیں۔'' اس نے زاروقطار رونا شروع کردیا۔اس کے آنسوؤں میں آگ اور زہر تھا۔

''کیا تم جارج گورا کی بات کررہے ہو؟''

''اور کس کی کرسکتا ہوں۔ وہی ہے جس نے میری خالہ کو برباد کیا۔اسے جندوں میں چھوڑا نہ مُردوں میں۔ ہر جگہ اس کو بدنام کردیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ فیصلہ کرچکی ہے۔ وہ ایک دو دن میں چپ کرکے یہاں سے نکل جائے گی۔ وہ جارج گورا سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔اس بدلے کے بغیر وہ جندہ نا ہیں رہ سکتی......اور میں نا ہیں چاہتا کہ وہ یہ خطرناک کام کرنے کے لئے جائے۔ وہ عورت جات ہے۔ وہ اسے بہت تکلیف دے کر ماریں گے۔ یہ کام میں کروں گا۔ میں جارج کو قتل کروں گا......اس کا سر لاکر خالہ کے خدموں (قدموں) میں ڈالوں گا...... یا پھر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔''

میں طلال کی باتوں اور اس کے انداز پر ششدر تھا۔ میں نے پوچھا۔تم کیسے جانتے ہو کہ وہ ایک دو دن میں یہاں سے چلی جائے گی؟''

''مجھے سب پتا ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہا ہوں۔ وہ میری بہن بھی ہے، ماں بھی اور خالہ بھی۔ میں سب جانتا ہوں کہ وہ کب کیا کریں گی۔ ان کے پاس زہر کی پڑیا ہے۔ جب وہ نل پانی سے گئی تھیں تو یہ پڑیا انہوں نے اپنے بالوں میں چھپائی ہوئی تھی۔ بعد میں جب ہم یہاں آئے تو میں نے وہ پڑیا ان سے چھین لی تھی اور چھپالی تھی۔ وہ پڑیا پھر غائب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پڑیا پھر انہوں نے لے لی ہے۔ان کی باتیں بھی مجھے بھی

سمجھا رہی ہیں کہ انہوں نے بس ایک دو روز میں اِچ یہاں سے نکل جانا ہے۔''

میں سناٹے کی سی کیفیت میں طلال کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا اور وہ باتیں بھی بڑی ہی کررہا تھا۔

ایک دم مجھے لگا کہ میں مجرم ہوں۔ میں سلطانہ کا ہی نہیں ان سب لوگوں کا مجرم ہوں جو سلطانہ کے قریبی ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں طلال بھی شامل تھا۔ سلطانہ کا بوڑھا والد مختار راجپوت بھی اور اس کا اپاہج بھائی بھی۔ جس نے میری صحت کے بدلے میں ایک تکلیف دہ بیماری گلے لگائی ہوئی تھی اور اب اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ میں سلطانہ سمیت ان سب لوگوں کا مقروض تھا۔ان کے بے پایاں احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ ان احسانوں کے بے پناہ بوجھ سے نکلنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ میں کسی طرح...... کسی طرح سلطانہ کو پھر سے زندہ کرسکتا اور اسی جگہ، اسی گھڑی...... وہیں اس تنہا اشک بار لڑکے کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں نے یہ تہیہ کیا کہ میں یہ کام کروں گا......اور اس کے کرنے میں مزید تاخیر نہیں کروں گا۔ اندازہ تو مجھے پہلے ہی تھا، آج کامل یقین بھی ہوگیا تھا کہ سلطانہ کے مردہ تن میں جان ڈالنے کی کوشش ایک ہی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ اس کی کچلی مسلی زخمی روح کو انصاف دیا جائے۔

میں نے کہا۔''طلال! تم بے وقوفی کی باتیں کررہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اس طرح میرا پستول لے کر یہاں سے نکل جاؤ گے اور زرگاں پہنچ کر جارج کو گولی ماردو گے؟ تم اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کروگے۔ وہ ایک آسان دشمن نہیں ہے۔ وہ تمہیں کسی بازار میں گھومتا ہوا نہیں مل جائے گا۔ اس نے اپنی حفاظت کا مضبوط گھیرا بنا رکھا ہے۔ کیا تمہیں پہلے تجربہ نہیں ہوا کہ یہ گھیرا کتنا مضبوط ہے؟''

وہ خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سسکی لے کر بولا۔''مجھے بتائیں میں کیا کروں...... میں کیا کرسکتا ہوں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔تم اپنی خالہ کے بہت قریب ہو۔ اسے میرے بارے میں بتاؤ کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہوں جو وہ خود کرنا چاہتی ہے اور میں یہ سب کروں گا بھی۔ جارج گورا اب زیادہ دن سانس نہیں لے پائے گا۔ یہ تمہاری خالہ سے میرا وعدہ ہے۔''

طلال نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔''طلال! میں کوئی ہوائی بات نہیں کررہا۔ میں اب وہ ''مہروج'' نہیں رہا جو کبھی تھا۔ کیا تمہیں مجھ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں

آتی؟'' وہ اب بھی خاموش رہا۔ تاہم اس کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ میری بات سے اختلاف نہیں کر رہا۔ وہ اتنا بھی نا سمجھ نہیں تھا۔ وہ بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں رنجیت پانڈے کی جو درگت بنی تھی وہ تو اس کی اور سلطانہ کی نگاہوں سے اوجھل رہی تھی لیکن ابھی پانچ دن پہلے کا واقعہ تو اس نے دیکھا تھا۔ میں تن تنہا مندر سے نکلا تھا اور کلثوم کو چھڑا کر یہاں لے آیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔ میرے اس کام پر اعتراض تو کئے گئے تھے لیکن اندر سے سب معترف ہوئے تھے۔

طلال روہانسی آواز میں بولا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں کہ میں انہیں سمجھاؤں۔ میں انہیں کیا سمجھاؤں گا؟ میں کس گنتی میں آتا ہوں۔ وہ تو آپ کے سمجھانے سے بھی نا ہیں سمجھ رہیں اور جتنا کہا وہ آپ کا مانتی ہیں، کسی اور کا نہیں مان سکتیں۔ وہ آپ سے جتنا پیار کرتی ہیں کچھ میں اِچ (ہی) جانتا ہوں۔ یہ وہ آپ کو بہت چاہتی ہیں خالو! بہت اِچ جیادہ۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ وہ نہیں چاہتی۔''

''لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ آپ کو کیا سمجھتی ہیں...... وہاں استھان میں بھی وہ دن رات آپ کا نام لیتی رہتی تھیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''آپ نے دیکھا اِچ ہوئیں گا کہ وہاں خالہ کو زنجیریں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ خالہ کو یقین ہو چکا تھا کہ استھان والے موہن کمار کے ختل کے بدلے میں ان کو جندہ جلا دیں گے۔ ان کو وہ دن بھی بتایا گیا تھا جب ان کو جندہ جلایا جانا تھا۔ اس سے ایک رات پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا...... طلال! تم جندہ رہو گے اور ایک نہ ایک دن اپنے خالو سے جرور ملو گے۔ جب بھی ملو، ان سے کہنا میری خالہ آپ سے بہت پریم کرتی تھی۔ اتنا جیادہ جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ آپ ان کو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر پیارے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر اللہ میاں نے بندوں کی پوجا کی اجاجت دی ہوتی تو وہ آپ کی پوجا کرتیں۔ پھر انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔''

''وہ کیوں؟''

''کہنے لگی تھیں۔ یہ دیکھو...... جس طرح میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں، اسی طرح میری طرف سے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا اور کہنا کہ وہ میری گلتیوں کے لئے مجھے ماف کر دیں۔''

طلال نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''جس روج ان کو چتا میں جلایا جانا تھا، اس روج شام سے پہلے انہیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔ اب دوبارہ ہوش میں نا ہیں آؤں گی، میری باتیں یاد رکھنا۔ بے ہوش ہوتے ہوتے انہوں نے بس ایک دو بار بالو کا نام لیا، اس کے بعد آپ ہی کا نام لیتی رہیں اور نام لیتے لیتے ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔''

شاید میری اور طلال کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں لکڑی کے زینوں پر سلطانہ کی جانی پہچانی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہی تھی...... ہم خاموش ہو گئے۔

رات تک ہمیں بے چینی سے آفتاب کا انتظار رہا۔ خدا خدا کر کے گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر یکجا ہوئیں۔ دس پندرہ منٹ بعد سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور آفتاب خاں اپنی لاٹھی اور لالٹین کے ساتھ اندر آ گیا۔ میں اس وقت کپڑے بدل رہا تھا۔ کپڑے بدل کر میں درمیانی تہ خانے میں پہنچا تو آفتاب خاں عمران کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہ رہے ہیں لیکن جب میں نے عمران سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''یار! ہر جگہ ناک کیوں گھساتے ہو۔ ہر بندے کی پرائیویسی ہوتی ہے، میری بھی ہے۔''

''کس طرح کی پرائیویسی؟'' میں نے پوچھا۔

''دو ٹانگوں والی۔ عمر کوئی تئیس چوبیس سال۔ نین نقشہ اچھا ہے۔ ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔''

''کس کی؟''

''بھئی پرائیویسی کی...... اگر تم شادی شدہ نہ ہوتے تو تمہارا عشق پیچاں چھوٹی سے لگوایا جا سکتا تھا۔ مقامی حسن کا بے مثال نمونہ ہے وہ بھی۔''

''یار! کیا ہانک رہے ہو؟''

''ہانک نہیں رہا جگر! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں ایک لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر اس لڑکی کو کچھ کچھ ہوتا ہے...... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو دیکھ کر لڑکی کے ابا جی کے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جہاں کہیں میری شکل دیکھتے ہیں، ہوا میں لٹھ گھمانا شروع کر دیتے ہیں...... آفتاب یہی بتا رہا تھا کہ اس کے ابا جی یہاں فتح پور میں دیکھے گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ غصہ رفع کرنے کے لئے تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔''

اسی دوران میں اقبال بھی آ گیا۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی آفتاب پر سوالات کی

بوچھاڑ کر دی۔ میری طرح وہ بھی یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ اوپر کے حالات کیا ہیں۔

آفتاب نے اپنے مخصوص پٹھانی لب و لہجے میں جو انکشافات کئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ مندر کی آگ بجھ چکی تھی۔ سیکڑوں افراد نے قریبی جوہڑ سے پانی بھر بھر کر آگ پر پھینکا تھا اور اسے پوری طرح پھیلنے سے روک لیا تھا۔ تاہم اس دوران میں مندر کا قریباً ایک تہائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا تھا اور کہیں کہیں سے یہ راکھ ابھی تک سلگ رہی تھی۔ اس آگ میں اور آگ سے پہلے ہونے والی لڑائی میں تقریباً نو افراد کی جانیں گئی تھیں۔ زخمیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ قریباً ایک سو افراد زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے دس پندرہ افراد کو آگ یا تیل سے جلنے کے زخم آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کی حالت تشویشناک تھی۔ مکھیا عبدالرشید بھی آگ میں جھلس کر شدید زخمی ہوا تھا۔ اسے نل پانی لے جانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مہندر، اس کا دوست پٹیل اور اس کے دو اور ساتھی موقع پر ہی مارے گئے تھے۔

اچھی خبر یہ تھی کہ مالا اور ستیش جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زوردار ہنگامے کے دوران میں ہی ستیش اپنی فیملی کے ساتھ فتح پور سے نکل گیا تھا۔ اس کے پتا کی لاش ساری رات مندر کے اندر پڑی رہی اور جل کر بری طرح مسخ ہو گئی۔

عمران نے پوچھا۔ ''اب اس کے پتا اور مہندر وغیرہ کی لاشیں کہاں ہیں؟''

''آج صبح علاقے کا بہت سا معزز لوگ فتح پور میں جمع ہوا ہے جی۔ ان میں پنچایت والا بڑا لوگ بھی شامل ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ جب تک گاؤں میں پورا امن نہیں ہو جاتا، وہ لوگ یہاں رہے گا اور نگرانی کرے گا۔ ان لوگوں نے دونوں طرف کا لاشیں بھی ان کے وارثوں کے حوالے کیا ہے۔ شام کے وقت وہ لوگ اپنا اپنا لاشیں لے کر چلا گیا ہے۔ باہر کا جو پندرہ بیس لوگ ابھی تک گاؤں میں موجود ہے، ان سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ صبح تک گاؤں چھوڑ دے۔ ان لوگوں سے ہتھیار وغیرہ لے لیا گیا ہے۔ جب یہ لوگ گاؤں چھوڑے گا تو انہیں ہتھیار واپس دے دیا جائے گا۔''

میں آفتاب خاں کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں عجیب سا دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ جاہلیت اور توہم پرستی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ وہ اندھے عقیدوں کا غلام بن جاتا ہے۔ ان عقیدوں کا نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے، اپنے خیالات پر اس کا یقین پختہ سے پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتہا پسندی کی وجہ سے یہ لوگ اپنے ہی دشمن ہونے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں۔ ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو دین دھرم سے خارج قرار دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ انتہا پسندی کی وجہ سے موہن کمار کی قاتلہ

(یعنی سلطانہ) کو بے دردی سے زندہ جلانے کی سزا دی گئی تھی۔ اسی انتہا پسندی نے ایک اور خود ساختہ فیصلہ کیا اور تیرہ سیوکوں کی ہتھیا کرنے کے الزام میں اپنے ہی ساتھی گرو سوبھاش کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اس کا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا۔ اس سفاکی کا ردِعمل یہ ہوا کہ اب مہندر، پٹیل اور خود رام پرشاد موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے اور ابھی یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ دونوں طرف کے مرنے والے خود کو رتبۂ شہادت پر فائز سمجھ رہے تھے۔ بڑھیا کی دقیانوسیت اپنے پچاس پچپن سالہ صحت مند بیٹے کی جان لے چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اس خونی حماقت کو بھی ایشور کا کوئی بھید قرار دے رہی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب اندھے وشواس کے ساتھ رام پرشاد اپنے ہاتھ تیل کی کڑاہی میں ڈال رہا تھا۔ ایک جھرجھری سی آ گئی۔

یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا تہ خانوں میں زیادہ تر افراد سو چکے تھے، شاید تاؤ افضل جاگ رہا ہو۔ عمران اور اقبال والے کمرے میں بھی خاموشی تھی۔ سلطانہ میرے ساتھ والے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں کچھ اُبھری ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے کی سادگی میں ایک کشش تھی۔ جسمانی موزونیت اور اس کشش نے مل کر اس کی شخصیت کو پُر اثر بنا دیا تھا۔ کسی وقت جب وہ ہلکا سا سنگھار کر لیتی تھی تو مزید قابلِ توجہ ہو جاتی تھی۔

مجھے لگا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ثروت مجھ سے دور ہو جا چکی تھی۔ ثروت کے بے پناہ خلا کو پُر کرنے کے لئے سلطانہ میری زندگی میں آئی تھی...... اور اس نے آنے کا حق ادا کیا تھا۔ کچھ باتیں میرے علم میں تھیں اور کچھ نہیں تھیں۔ ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے، محبت اور ناکامی میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ محبت میں ناکامی کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ کچھ لوگ تو سچی محبت ہی اس کو کہتے ہیں جو ناکام ہو۔ مرد جب محبت میں ناکام ہوتا ہے تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ زندگی گزارنا دنیا کا دشوار ترین کام لگنے لگتا ہے۔ ایسے میں ایک ''دوسری عورت'' اس کی زندگی میں آتی ہے۔ یہ دوسری عورت تائیدِ غیبی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ مرد کی زندگی کے مسمار کھنڈر میں سے ایک نئی عمارت کے خدوخال ابھارتی ہے۔ خداداد صلاحیتوں، جذبوں اور خوبصورتیوں کی مدد سے مرد کی زندگی کو پھر سے زندگی بناتی ہے۔ پہلی عورت بے شک پہلی ہوتی ہے لیکن یہ دوسری بھی قدرت کی صناعیوں اور عنایتوں کا بے مثل نمونہ ہے۔ یہ دوسری چارہ گر عورت نہ ہوتی تو شاید ناکام محبت کا عفریت اَن گنت بدنصیبوں کو نگل چکا ہوتا۔

یہ بات کہنے کے بعد ہمارے استاد محترم نے کلاس میں بیٹھی ہوئی ایک گم صم لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا تھا...... ہاں اس ''دوسری عورت'' کی طرح ایک دوسرا مرد بھی ہوتا ہے۔ قدرت نے مرد و زن میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔

میں سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ آج میں اس ''دوسری عورت'' کو دیکھ رہا ہوں۔ جب میں نے ثروت کو کھویا تھا تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، زخم زخم ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے مہلک زخموں کا مداوا کرنے والی وہ دوسری عورت لاہور سے ہزاروں میل دور اتر پردیش کے اس دور دراز راجواڑے کے ایک چھوٹے سے گھر میں موجود ہے اور میری تقدیر مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔

نیند کی حالت میں سلطانہ کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھے تھے۔ یہی وہ ہاتھ تھے جن سے اس نے مجھے کبھی جلتے ہوئے پگوڈا کے اندر سے نکالا تھا۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا، پھر نگاہوں سے اس کی پیشانی کو الوداعی بوسہ دیا اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہاں، میں جانے کے لئے تیار تھا۔ میرے اندر کے بے پناہ اضطراب کا علاج اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا کہ میں سارے اندیشوں اور خطروں کو ایک دیوانی ٹھوکر مار کر یہاں سے نکل جاؤں۔ زرگاں کا رخ کروں اور سلطانہ کی عزت کے ہتھیارے سے قرار واقعی انتقام لے لوں۔ میں نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس بارے میں بہت سوچ بچار کی تھی۔ ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور کیا تھا۔ اس وقت میرے کپڑے کی جیکٹ کی جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا۔ پسٹل کے دو فالتو میگزین اور قریباً سو راؤنڈ بھی میرے پاس تھے۔ اس کے علاوہ ایک شکاری چاقو اور ٹارچ بھی تھی۔ تھوڑا سا خشک راشن بھی میں نے لے لیا تھا۔

کل دوپہر جب سلطانہ میری گردن کے زخم کی پٹی کرنے کے بعد اوپر کلثوم اور رادھا کے پاس چلی گئی تھی، میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا اور طلال کے ساتھ مل کر کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ ایک دراز میں بچھے ہوئے موٹے کپڑے کے نیچے سے مجھے پولی تھین کی وہ چھوٹی سی پڑیا مل گئی جس کا ذکر طلال نے کیا تھا۔ اس پڑیا میں نیلے تھوتھے جیسا کوئی مہلک سفوف موجود تھا۔ طلال اپنی عمر سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر سمجھا دیا تھا کہ میں کہاں جانے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اور طلال کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ میرے جانے کے بعد وہ سلطانہ اور عمران وغیرہ کو بتا دے گا کہ میں کہاں گیا ہوں...... اور میری طرف سے سلطانہ کو پوری تسلی بھی دے گا کہ میں تین چار

دن کے اندر اندر یہاں واپس پہنچ جاؤں گا۔

نصف شب کی ان گھڑیوں میں، میں نے خود کو ریاست کپل وستو کے راجا سدھارت کی طرح محسوس کیا، جو آدھی رات کو اپنی محبوب بیوی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا تھا اور نامعلوم منزلوں کا راہی ہو گیا۔ میں بھی یہاں سے نکل رہا تھا لیکن...... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں زیادہ دور نہیں جا سکوں گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے ساتھ کچھ ایسا ہو گا جو میرے پروگرام میں بالکل شامل نہیں۔

پروگرام یہی تھا کہ میں پہلے کی طرح مندر سے نکلوں گا۔ مجھے سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کے کمرے میں جانا تھا جہاں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ امید تھی کہ بارہ سوا بارہ کے قریب آفتاب یہاں آئے گا...... مجھے دروازے پر سے ہی ساتھ لے کر باہر نکل جانا تھا اور اسے پابند کر دینا تھا کہ وہ آج رات واپس مندر میں، عمران وغیرہ کے پاس نہیں آئے گا۔

حسبِ پروگرام میں خاموشی سے لکڑی کی کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر سب سے اوپر والے تہ خانے میں پہنچا اور پھر کاٹھ کباڑ والے تاریک کمرے میں چلا گیا۔ آفتاب کی آمد میں اب پندرہ بیس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ آج کہیں ناغہ نہ کر لے۔ میرے کان باہر کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ آوارہ کتوں کی مدھم آوازوں کے علاوہ باہر مکمل خاموشی تھی۔

اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ باہر سے نہیں تاریک کمرے کے اندر سے ہی آئی تھی۔ یہ عمران تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''جگر! چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔ یہ تو آدھی رات ہے...... بھئی یہ تو آدھی رات ہے۔''

وہ بلی کی چال چلتا ہوا اتنی صفائی و مہارت سے مجھ تک پہنچا تھا کہ میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ مجھ سے فقط دو تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔

''تت...... تم یہاں؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے...... یہ تو آدھی رات ہے......'' اس نے پھر مصرع پڑھا۔

''میں آفتاب کا انتظار کر رہا تھا۔''

''کس لئے؟''

''بتانا ضروری ہے؟'' میں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

''نہیں...... کیونکہ مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے میری جیکٹ کے اُبھرے ہوئے حصے کو ٹٹولا۔ یہاں پسٹل کے فالتو راؤنڈ موجود تھے۔ میں بھنا گیا۔ کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارا؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''مسئلہ تو تمہارا ہے جو اس طرح بغیر کسی کو بتائے آفتاب کے ساتھ باہر نکل جاتے ہو اور میرا اندازہ ہے کہ اس مرتبہ تمہارا ارادہ کہیں آس پاس جانے کا نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے میں جا رہا تھا...... بلکہ میں جا رہا ہوں۔ میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں کہ کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے تم سے اجازت لوں۔''

''جگر! یہاں کوئی ماتحت اور باس نہیں ہے لیکن ہمارا نفع نقصان تو ایک ہے نا۔ ہم میں سے کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے کا نقصان ہو۔''

''میرے جانے سے بھی کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اپنی جان دے دوں گا لیکن تم لوگوں کے بارے میں ایک لفظ...... ہاں، ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گا۔''

''واہ...... یہ بات تم نے اچھی کہی ہے۔ کیا تمہارے جان دے دینے سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا؟ گدھے! ہم تو جیتے جی مر جائیں گے۔ کم از کم میں تو ضرور وفات پا جاؤں گا۔''

''مسخرہ پن نہ کرو عمران...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے مجھے یہاں سے جانا ہے۔''

''جارج گورا کی طرف؟'' اس نے ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، جارج گورا کی طرف۔'' میں نے سینہ تان کر کہا۔

وہ چند لمحے تک میرے پُرتپش، باغی لہجے پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ ''جارج گورا کی طرف ہم دونوں جائیں گے لیکن اس وقت جب جانا مناسب ہوگا۔''

''مناسب اور نامناسب کا فیصلہ تم مت کرو۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ اس معاملہ سے میں ہی نمٹوں گا۔''

''یہاں کسی کا کوئی معاملہ ذاتی نہیں ہے۔'' عمران کے لہجے میں پہلی بار ترشی آئی۔ ''ہم سب کی قسمت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھانا جس سے دوسروں کے لئے مصیبت ہو۔''

''میں نے کہا ہے نا میری وجہ سے تم لوگوں کو......''

''پلیز تابی، پلیز...... سمجھنے کی کوشش کرو...... ہمارا دشمن بہت خطرناک ہے۔ ہماری جلد بازی اسے اور خطرناک بنا سکتی ہے...... ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''انتظار...... انتظار...... میں نہیں کر سکتا اب انتظار۔ وہ مر جائے گی۔ وہ مر رہی ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔''

اسی دوران میں بیرونی دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد آفتاب اپنے ٹریڈ مارک لالٹین اور لاٹھی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت سرد ہوا کا جھونکا بھی اندر آیا۔ آفتاب کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی جس میں راشن وغیرہ تھا۔ ہم دونوں کو تناؤ کی حالت میں وہاں کھڑے دیکھا تو...... حیران رہ گیا۔

میرے اندر عجیب سا اشتعال پیدا ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں بے جھجک دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روکا۔ ''کیا کرتے ہو تابی! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟''

''ہاں...... اور تم بھی ہوش کرو...... آقا بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر رہا ہوں۔''

''تم سوچ سمجھ کر نہیں کر رہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ ادھر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' اس نے میرا بازو پکڑا اور اس کے ساتھ ہی آفتاب کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ آفتاب نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔

''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہاری آنکھیں کھولوں۔''

عمران نے کہا۔ میرا بازو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

''تم جو مرضی کر لو عمران...... لیکن میں آج رکوں گا نہیں۔''

''پہلے میری بات سن لو پھر فیصلہ کرنا۔''

عمران مجھے لے کر بالائی تہ خانے میں آ گیا۔ اس نے آفتاب کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایک کمرے میں آ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ یہاں ایک بڑی لالٹین روشن تھی اور فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ عمران نے مجھے اور آفتاب کو چٹائی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''تمہیں خطرے کا اتنا احساس نہیں جتنا ہونا چاہئے۔ تمہیں یاد ہے، کل میں آفتاب سے باتیں کر رہا تھا اور تمہیں دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا، کیا باتیں ہو رہی ہیں۔''

''اور تم نے ہمیشہ کی طرح بات کو مذاق میں ٹال دیا تھا۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''اس مذاق کی کوئی وجہ تھی۔ اگر میں وجہ بتا دیتا تو شاید تمہارا اب تک وقت بڑی پریشانی میں گزرتا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''چھ سات دن پہلے تم نے اپنی من مانی کی اور باہر چلے گئے۔ ٹھیک ہے کہ اس من مانی کا نتیجہ اچھا نکلا اور تم کلثوم کو ستیش اور مہندر وغیرہ سے بچا کر یہاں لے آئے لیکن اس کا ایک نتیجہ برا بھی نکلا ہے۔ بے شک تم تھوڑی دیر کے لئے تہ خانے سے باہر رہے ہو مگر یہ تھوڑی دیر بھی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ آفتاب خاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم بتاؤ خاں!''

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ''تابش برادر! منگل کے روز صبح سویرے کچھ لوگ ایک جیپ پر سوار ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس وقت گاؤں کا سب لوگ سو رہا تھا۔ ان جیپ والوں نے ام کو بتایا کہ وہ شکاری ہے اور ایک ایسے بندے کو ڈھونڈ رہا ہے جو ان کا دو انگلش رائفلیں اور بہت سا کارتوس لے کر بھاگ گیا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک تصویر دکھایا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر ایک دم حیران رہ گیا۔ وہ آپ کا تصویر تھا۔ لگتا تھا کہ آپ جیل میں کھڑا ہے...... شاید زرگاں کے جیل میں۔ آپ نے جیل کے قیدیوں والا وردی بھی پہنا ہوا تھا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر حیران تو بہت ہوا لیکن ام نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ام نے کہا کہ کچھ مہمان وغیرہ تو گاؤں میں ضرور آیا ہوا ہے لیکن ام ان سب کو جانتا ہے۔ ان میں یہ بندہ تو نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ام کو آپ کا دو فوٹو اور بھی دکھایا لیکن ام نے ماننے سے صاف انکار کیا۔''

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ''ان لوگوں کے پاس جیپ میں ایک انٹینا قسم کا چیز بھی رکھا تھا۔ وہ اس انٹینا کو لے کر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مکھیا کے گھر کی طرف بھی گیا پھر مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس نے جاتے جاتے ام کو پانچ سوے روپیہ بخشش دیا اور بولا۔ ''خان! امارے آنے کے بارے میں تم کسی کو بتائے گا نہیں۔ اس شکل کے بندے کا دھیان رکھنا۔ ام کچھ دن بعد پھر یہاں کا چکر لگائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ چلا گیا۔''

عمران نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تابی! اس رات تم اور ہم سب اس لئے حکم کے لوگوں سے بچے رہے کہ تم سب سے نیچے والے تہ خانے میں تھے۔ اگر تم اوپر

والے تہ خانے میں ہی ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ منحوس انٹینا تمہاری چپ کے سگنل پکڑ لیتا...... وہ لوگ دفان نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس علاقے میں تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب تم کلثوم کی مدد کرنے کے لئے اوپر بستی میں گئے تو ان لوگوں نے تمہارے سگنل پکڑے۔ تمہارے باہر نکلنے کا مطلب پکڑے جانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔''

''یا خدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ایک گاڑھا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ مجھے لگا جیسے میں آزاد نہیں ہوں۔ ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہوں۔ اتنی تنگ کوٹھڑی ہے کہ میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اور اب سے نہیں لاتعداد زمانوں سے اس کوٹھڑی میں ہوں۔ بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بھاگ نہیں سکتا۔

میری فرسٹریشن انتہا کو پہنچ گئی۔ شدید جھنجلاہٹ اور تپش کے زیر اثر میں نے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر زوردار مکا مارا۔ موٹی لکڑی کی یہ تپائی ٹوٹ گئی...... میرے بازو میں ہاتھ سے لے کر کندھے تک درد کی ٹیس اُٹھی لیکن ایسی ٹیسیں مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔

آفتاب حیرت سے کبھی میری طرف اور کبھی ٹوٹی ہوئی تپائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران بھی کچھ دیر بھونچکا رہا۔ پھر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ ''حوصلہ رکھو تابی! سب ٹھیک ہو جائے گا مگر...... ہمیں طریقے سے چلنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہم اس منحوس ''چپ'' سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم یہاں سے نکلنے اور کچھ کرنے کے قابل ہو سکیں گے...... تم دیکھنا......''

''کچھ نہیں ہوگا...... کچھ نہیں۔'' میں نے تیزی سے عمران کی بات کاٹی اور پاؤں پٹختا ہوا نچلے تہ خانے کی طرف چلا گیا۔

میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا ابھی جیکٹ سے شکاری چاقو نکالوں اور آئینے کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو جاؤں۔ پھر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی گردن کا پچھلا حصہ چیر ڈالوں اور اس منحوس دھاتی ٹکڑے کو اکھاڑ کر پھینک دوں جس نے کئی برس سے مجھے اس ''اسٹیٹ'' میں زنجیر کر رکھا ہے۔ میرے اس دیوانے ''آپریشن'' کا نتیجہ کچھ بھی ہو مگر میں یہ کام کر گزروں۔

میرے ہاتھ سے تھوڑا سا خون رِسنے لگا تھا۔ میں نے روئی سے اسے صاف کیا۔ سلطانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے ملیح چہرے پر وہی کرب تھا جو بیداری میں اسے گھیرے رکھتا تھا۔ اس کرب اور بے قراری کی وجہ وہ بے پناہ زخم تھا جو سلطانہ

کے جسم سے لے کر اس کی روح تک اُترا ہوا تھا۔ مجھے اس زخم کا مرہم تو معلوم ہو گیا تھا مگر مرہم تک رسائی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔

طلال ابھی جاگ رہا تھا۔ اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور اسے بتایا کہ میری روانگی ملتوی ہو گئی ہے۔ کم از کم میں آج رات تو نہیں جا رہا۔

''کیوں جی؟''

''بس کوئی وجہ ہے...... تم ابھی اپنی خالہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اس نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

میں نے طلال سے پوچھا۔ ''تمہاری خالہ کو اب تک پڑیا کا پتا تو نہیں چلا؟''

''نہیں جی۔ ابھی تک تو نہیں۔''

''کوئی اور بات کی ہے انہوں نے؟''

''نہیں جی...... لیکن کل دوپہر جب آپ اوپر عمران بھائی اور تاؤ افضل کے ساتھ بیٹھے تھے، وہ نوری سے کچھ بات چیت کر رہی تھیں۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں نے سنا تو کچھ ناہیں جی...... پر میں نے نوری کو خالہ کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ ایک دم گم صم نجر آ رہی تھی۔''

میرے اور طلال کے درمیان دو چار منٹ مزید بات ہوئی پھر وہ سونے کے لئے چلا گیا۔

میں نے بے حد مایوسی کے عالم میں اپنا پسٹل، ٹارچ اور فالتو راؤنڈز وغیرہ جیکٹ سے نکال کر پھر سے الماری میں رکھ دیئے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دفعتاً دھیان نوری کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھے بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ سلطانہ سے زبردست جھاڑیں کھانے کے بعد وہ جیسے ایک دم اوجھل ہو گئی تھی۔ آج بند کمرے میں سلطانہ اس سے نہ جانے کیا بات کرتی رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں سیڑھیاں چڑھا اور درمیانی تہ خانے میں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات کو دیر سے سوتی ہے اور پھر دن چڑھے تک پڑی رہتی ہے۔ شاید اس کی یہ عادت کھیا کی حویلی میں پختہ ہوئی تھی جہاں وہ سلمان سلو کی رکھیل تھی۔ یقیناً سلمان سلو کے ساتھ ساتھ اسے اس کے یار دوستوں کی میزبانی بھی کرنا پڑتی ہو گی اور ایسی میزبانیاں عموماً

رات کو ہی ہوتی ہیں۔

میں نوری کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اندر لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی گنگنانے کی نہایت مدھم آواز بھی سنائی دی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ نوری ابھی جاگ رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں نوری کے ساتھ پہلے گرو کی چیتی رادھا بھی سوتی تھی لیکن رادھا پکی دھرمی لڑکی تھی۔ ایک مسلمان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اس کے دھرم کو تلپٹ کرتا تھا اس لئے اسے اوپر والے تہ خانے میں نسبتاً بڑا کمرا دے دیا گیا تھا جہاں پوجا کے لئے بہت سی مورتیاں موجود تھیں۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور ایک کھڑکی میں ایک باریک سی جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ کمرے کا ایک تہائی منظر نظر آ سکا اس منظر میں نوری بھی شامل تھی۔ وہ حسبِ معمول گھاگرا چولی میں تھی تاہم سر پر چنری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ پر مہندی لگائی ہوئی تھی اور دائیں ہاتھ سے اپنے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لالی لگا رہی تھی۔ اس کے سامنے پرانی طرز کا ایک بیضوی آئینہ تھا۔

لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان تاثرات میں انتظار، امید، خواہش سب کچھ شامل تھا۔ شاید یہ امید اور خواہش وہی تھی جو ہر لڑکی کے دل میں اس کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور پھر ایک روز شدید تمنا کا روپ دھار لیتی ہے...... ایک شوہر، ایک گھر اور پھر ایک ہمکارتے ہوئے بچے کی آمد۔ خوش رنگ شام، کسی کے قدموں کی چاپ کا انتظار...... اور پھر پھولوں بھرے آنگن میں زندگی کی کھٹی میٹھی خوشیاں۔ نوری کوئی کنواری دوشیزہ نہیں تھی۔ اس کے جسم پر نہ جانے کتنے گندے ہاتھوں کے نشان تھے لیکن پھول تو سڑے ہوئے کیچڑ میں بھی اُگتے ہیں۔ آرزوؤں پر کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔ عمران نے نوری کو ایک اچھی زندگی کی آس دلائی تھی اور شاید وہ اس وقت آئینے میں اسی آس کے نقش دیکھ رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا...... اور پھر اندر چلا گیا۔ نوری نے مجھے گھوم کر دیکھا اور ایک دم ٹھٹک گئی۔ اس نے چنری کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ وہ سامنے کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ وہ اسے لینے کے لئے لپکی۔ مہندی والی تھالی پر اس کا پاؤں پڑا اور بری طرح رپٹ گیا۔ وہ گر گئی۔ ''اوئی اللہ جی۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اسے اُٹھانا چاہا مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بری طرح سمٹی ہوئی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے چنری کھونٹی سے اُتاری اور اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیا۔

وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ ''بابو جی! آپ یہاں کیسے؟'' وہ ہکلائی۔

''یونہی روشنی دیکھ کر آ گیا ہوں۔ پر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''کچھ ناہیں جی۔ آپ کی ''وہ'' بڑی سخت ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو میرا حشر نشر کر دیویں گی۔ آپ کا تو کچھ ناہیں جاوے گا، پر ان کی مار سے مجھ غریبنی کی ساری چولیں ہل جاویں گی۔'' وہ بار بار سینے پر دوپٹا درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے اس حوالے سے اسے خاص ہدایات دے رکھی ہیں۔

میں نے کہا۔ ''زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ اس وقت کمرے میں ہے اور سو رہی ہے۔ اس کے ادھر آنے کا چانس بالکل نہیں۔''

''لیکن...... بب...... بابو جی...... میں...... دراصل...... اس طرح کی لڑکی ناہیں ہوں۔ وہ تو آپ کو پتا لگ ہی گیا ہوگا۔ مجھے عمران بابو نے کہا تھا کہ آپ سے ذرا ہنس کھیل کر بات کروں۔ وہ چاہت تھے کہ آپ میاں بیوی میں ذرا جلدی سے صلح ہو جاوے۔ اس کے علاوہ کوئی بات ناہیں تھی جی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے سب پتا ہے۔ تمہیں صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھی۔ ''میں تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کل دوپہر سلطانہ نے تمہیں کیوں بلایا تھا...... کچھ کہا تھا اس نے؟''

''کوئی خاص بات تو ناہیں تھی جی۔ بس وہی باتیں تھیں جو وہ پہلے بھی دو تین بار کر چکی ہیں...... وہ آپ سے بہت زیادہ پریم کرتی ہیں جی۔ جتنا آپ کو بتاتی ہیں، شاید اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔ وہ آپ کے پاس میرا سایہ بھی دیکھنا ناہیں چاہتیں بلکہ شاید کسی لڑکی کا سایہ بھی ناہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے مجھے بس چھوڑا ہے، معاف نہیں کیا اور اگر آئندہ مجھ سے اس بارے میں کوئی چھوٹی سی غلطی بھی ہوئی تو وہ ایسا کچھ کر گزریں گی کہ میں سوچ بھی ناہیں سکتی۔ انہوں نے مجھ سے کہلوایا کہ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھت ہوں۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ ناہیں ہے جی۔ میں نے بتایا ہے نا، میں نے جو کچھ کیا......''

''ہاں ہاں، مجھے پتا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا عمران کے کہنے پر کیا۔ میں صرف یہی پوچھنے آیا تھا کہ تمہارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟''

''باتیں تو بس یہی ہوئی تھیں جی...... بس مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے...... کہیں چلے جانا ہے اور وہ سوچ رہی ہیں کہ ان کے جانے کے بعد بھی میں کوئی ایسی ویسی غلطی نہ

کروں...... یا پھر شاید وہ ویسے ہی بہت زیادہ وہمی ہو گئی ہیں۔'' نوری نے اپنے کشادہ گریبان پر پھر آنچل درست کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا کہ اسے کہیں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جی، یونہی۔ ایویں میرے دل میں بات آ رہی تھی۔ وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ بندہ، بندوں سے تو چھپ سکت ہے لیکن خدا سے ناہیں چھپ سکت۔ یہ بات کبھی ناہیں سوچنی چاہئے کہ جھوٹ چھپا رہے گا۔ جلدی یا دیر سے اس کا پتا ضرور چل جاوت ہے۔ بس اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔''

ایک دم سیڑھیوں کی طرف آہٹ ہوئی۔ نوری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس نے آنچل کو مضبوطی سے سینے پر تھاما اور ڈری ڈری آواز میں بولی۔ ''کوئی آ رہا ہے۔''

میں نے دروازے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ کوئی سیڑھیوں پر تھا مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے میں نے سیڑھیوں کی اونچی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اور اپنا جسم آگے کو جھکایا تا کہ نیچے دیکھ سکوں۔ اس کے لئے مجھے گردن کو پورا خم دینا پڑا۔ گردن کے پچھلے حصے میں سر کے نیچے، زخم میں ٹیس سی اُٹھی۔ بہرحال میں دیکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ تاؤ افضل تھا۔ ہاتھ میں چوکیداری والی لٹھ لئے وہ ڈگمگاتا ہوا دو تین زینے چڑھا پھر ایک زینے پر بیٹھ گیا۔ میں نے رات کو اسے اکثر اسی زینے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ زینہ اس دروازے کے عین سامنے تھا جہاں اس کی دونوں بیٹیاں کلثوم کے ساتھ سوتی تھیں۔ وہ اس تہ خانے میں بھی ان کا پہرا دیتا تھا۔ اس کا دل شاید یہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹیاں چند لمحوں کے لئے بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں۔ وہ فتح پور کا نگہبان تھا۔ کالی راتوں میں وہ اپنے گھر کو بھول کر دوسروں کے گھروں کا پہرا دیتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کے اپنے ہی گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ اس کی بیوی جان سے چلی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا زخم تھا جس نے فتح پور کے اس نگہبان کو نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ اب وہ صرف اپنی جوان بیٹیوں کا نگہبان تھا۔ ان کی طرف سے آنکھ جھپکنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

میں واپس مڑا۔ نوری سے چند منٹ اور گفتگو کی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی اس لئے میں نے زیادہ دیر اس کے کمرے میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نوری سے گفتگو کے دوران میں بھی میری گردن سے ٹیسیں اُٹھتی رہیں لیکن میں نے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ گردن کے اس زخم کا مناسب علاج نہیں ہو سکا تھا اس لئے ذرا سے کھچاؤ کے سبب زخم سے خون رسنا شروع ہو جاتا تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور آئینے میں دیکھ کر خود ہی خون کا رساؤ روکا۔ تازہ پٹی باندھ کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ درد میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گردن کا سارا پچھلا حصہ اور کندھے وغیرہ سن ہو رہے ہیں...... میں درد برداشت کرنے میں ماہر ہو گیا تھا۔ میں درد کی لہروں میں ڈوب جاتا تھا اور جس طرح دھند کے اندر چلے جانے سے دھند اوجھل ہونے لگتی ہے، میرا درد بھی شدت کھونے لگتا تھا۔ مگر آج معاملہ کچھ مختلف تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی، درد کی شدت بڑھتی گئی۔ یہی کیفیت میں نے کچھ دیر کے لئے کل رات بھی محسوس کی تھی مگر آج تو حد ہو رہی تھی۔

میں درد سے لڑتا رہا۔ بارونداجیکی اس حوالے سے مجھے بہت کچھ سونپ گیا تھا اور وہ جو کچھ سونپ گیا تھا، میں اسے بروئے کار لا رہا تھا۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ میں ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لگایا تو وہ پسینے سے تر تھی۔ گردن ہی نہیں پورے جسم میں درد کی شدت سے اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ بے پناہ درد سے لڑتے لڑتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے درد کے حوالے سے میرا سارا فلسفہ بے کار ہے۔ تکلیف، تکلیف ہی ہوتی ہے...... اسے کب تک اور کس حد تک سہا جا سکتا ہے مگر پھر فوراً ہی اپنے اس خیال کو...... رد بھی کیا۔ رات تین بجے کے قریب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا...... تاہم میں نے سلطانہ کو جگایا اور نہ کسی دوسرے کو مدد کے لئے پکارا۔ میرے اور درد کے درمیان ایک جنگ جاری تھی اور ہم میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ضد سی میرے اندر پروان چڑھتی جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں گا لیکن کسی کو مدد کے لئے نہیں بلاؤں گا۔

اور تب واقعی مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ میرے کندھے اور ریڑھ کی ہڈی سن ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے بری طرح چونکا گیا۔ میری گردن کا یہ تازہ زخم اس جگہ کے بالکل قریب تھا جہاں زرگاں کے سرجن اسٹیل نے میرے اندر ''چپ'' پلانٹ کر رکھی تھی۔ کہیں میرا یہ زخم اس ''چپ'' کو تو افیکٹ نہیں کر رہا تھا؟

یہ خیال کسی دہکی ہوئی سلاخ کی طرح میرے سینے میں لگا۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا تھا کہ وہ چپ بڑی نازک جگہ پر پلانٹ کی گئی ہے۔ اسے نکالتے ہوئے میرے عصبی نظام کو بھی گزند پہنچ سکتی ہے...... کیا میرے ساتھ کچھ اسی طرح کا معاملہ تو نہیں ہونے والا تھا؟

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کرب کی شدت

سے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھانے لگی۔

''کیا بات ہے مہروج؟'' سلطانہ کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشویش سمٹ آئی تھی......

درد کی ٹیسیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بس زخم میں تھوڑا سا درد ہے۔'' کوشش کے باوجود میری آواز بھرا گئی۔

سلطانہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس کے چہرے کی تشویش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اب چھوٹی موٹی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ میری غیر معمولی جسمانی قوتِ برداشت کی بھی قائل ہو چکی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ سمجھ گئی کہ اگر اتنی برداشت کے باوجود میرے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں اور میں نے درد کی بات کی ہے تو پھر یہ کوئی معمولی درد نہیں ہے۔

وہ پلٹ کر میرے عقب میں آئی۔ اس نے میری گردن پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ مجھے ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری گردن اور شاید پورا جسم ہی بری طرح تپ رہا ہے۔ اس نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی اور سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''مہروج! لگتا ہے کہ زخم خراب ہو رہا ہے۔ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔ سوجن بھی جیادہ ہو گئی ہے...... میں عمران کو بلا کر لاتی ہوں۔''

میرے روکتے روکتے وہ باہر نکل گئی۔ ذرا دیر بعد عمران اور اقبال بھی میرے کمرے میں تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں بے پناہ تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ عمران نے بھی میرے زخم کا معائنہ کیا۔ بے شک زخم کی حالت اچھی نہیں تھی لیکن میرا درد زخم کی نوعیت سے زیادہ تھا۔

جلد ہی عمران بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں پہنچا تھا۔ وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔ ''یہ معاملہ کچھ اور لگ رہا ہے......''

سلطانہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ وضاحت چاہ رہی تھی لیکن عمران نے وضاحت نہیں کی۔ اس نے ایک طرف جا کر اقبال سے کچھ کہا۔ اقبال کمرے سے باہر گیا اور چند ہومیو پیتھک دوائیں لے کر آیا۔ یہ وہی دوائیں تھیں جو وہ استھان میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے ستیش اور گرو سوبھاش وغیرہ کے سامنے خود کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر ظاہر کیا ہوا تھا اور اس طرح گرو سوبھاش کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کر رکھی تھی۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور

ہومیوپیتھی کے بارے میں بھی معمولی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ان دواؤں میں ایک دو درد کش ادویات موجود تھیں۔ عمران اور اقبال نے ان دواؤں کے ذریعے میرا درد کم کرنے کی کوشش کی۔ کچھ فرق نہیں پڑا۔ میرا بالائی دھڑ سُن ہوتا جا رہا تھا۔ سلطانہ کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اگر درد کوئی چھین لینے والی چیز ہوتی تو وہ کسی کو خاطر میں لائے بغیر اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے یہ درد مجھ سے چھین لیتی اور کسی صورت واپس نہ کرتی۔

بے پناہ درد اور میری قوتِ برداشت کے درمیان پانی پت کی لڑائی جاری رہی۔ ہم میں سے کوئی بھی ہارا نہیں۔ میں نے اپنی ہر کراہ کو اپنے ہونٹوں کے اندر محصور رکھا پھر قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہوش سے بے ہوشی کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا ہے اور کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ سلطانہ میرے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور کرب ناک انداز میں کچھ کہہ رہی ہے۔ عمران کی آواز بھی مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

......دوبارہ ہوش آیا تو میں کروٹ لئے بستر پر لیٹا تھا۔ سر بھاری تھا اور ہلکا سا خمار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے بیٹھے اقبال پر پڑی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''اب طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میرا دھیان فوراً اپنی گردن کے درد کی طرف گیا۔ درد کی لہریں اب بھی اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی جس کے سبب میں ان لہروں کو زیادہ شدت سے محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تاؤ افضل نے تمہیں افیم کھلانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ کامیاب رہا ہے۔ تم پچھلے آٹھ پہر اطمینان سے سوئے رہے ہو۔'' اقبال نے اطلاع دی۔

میں حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں اپنی صورتِ حال سے بے خبر رہا ہوں۔ متلی کی سی کیفیت محسوس ہوئی، اس کے علاوہ مثانے پر بوجھ بھی محسوس ہوا۔

''سلطانہ کدھر ہے؟'' میں نے اقبال سے دریافت کیا۔

اقبال نے انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، سلطانہ ایک گوشے میں گدیلے پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نڈھال ہو کر سوئی ہے۔

اقبال نے بتایا۔ ''بھابی، کل رات پچھلے پہر سے مسلسل جاگ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ ایسے تو آپ خود بیمار ہو جاؤ گی۔ بڑی مشکل سے کہہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے لٹایا ہے۔''

''عمران کہاں ہے؟''

''وہ کہیں گیا ہے۔ کل صبح سویرے نکل گیا تھا۔''

''اب کیا وقت ہوا ہے؟''

''صبح کے چار بجنے والے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو نکلے تقریباً چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں...... اس نے بتایا نہیں کہ کدھر جا رہا ہے؟'' میرے لہجے میں تشویش داخل ہو گئی۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے، اس سے کچھ پوچھنا کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے لئے ہی گیا ہے۔ شاید کوئی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ ڈھونڈنے کے لئے۔''

ہم بہت مدھم آواز میں بات کر رہے تھے لیکن جب بات کرتے کرتے میں کھانسا تو سلطانہ ذرا سا کسمسائی۔ چند لمحے کے لئے لگا کہ وہ جاگ جائے گی مگر پھر کمبل اپنے جسم پر درست کرتے ہوئے دوبارہ بے حرکت ہو گئی۔

میرا گلا خشک ہو رہا تھا اور جسم کی حدت بتا رہی تھی کہ بخار بھی جوں کا توں موجود ہے۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی مگر پانی پینے سے پہلے میں اس پانی کا بوجھ کم کرنا چاہتا تھا جو میرے مثانے میں موجود تھا۔ میں بستر سے اُٹھا تو یوں لگا جیسے گردن کے عقبی حصے پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ ایک بار پھر کندھے سن ہونا شروع ہو گئے۔ اقبال نے سہارا دینا چاہا مگر میں جیسے تیسے خود ہی غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو درد کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی۔ کتنی ہی دیر تک درد سے لڑتا رہا۔ اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا رہا اور اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے آنکھیں پھر بوجھل ہو گئیں، احساس کند ہونے لگا۔ میں پھر سو گیا یا شاید نیم بے ہوش ہو گیا۔

O......❖......O

دوبارہ آنکھ کھلی تو سلطانہ میرے پاس موجود تھی۔ غالباً اس نے ہولے ہولے آواز دے کر مجھے جگایا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ یہ کپڑے وہ نہیں تھے جو میں نے پہلے پہن رکھے تھے۔ ''میرے کپڑے کس نے بدلے؟'' میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

''میں نے...... آپ کے زخم کو صاف کر کے نئی پٹی کی تھی۔ کپڑوں کو خون وغیرہ لگ گیا تھا۔'' سلطانہ نے سادگی سے جواب دیا۔

زرگاں کے حجام عبدالرحیم نے کچھ عرصے پہلے مجھے سلطانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ماضی میں جب میں پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں نہیں

تھا، وہ بچوں کی طرح میری دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ میرا منہ ہاتھ دھلاتی تھی، غسل کراتی تھی، میرے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا دھیان رکھتی تھی۔ شاید آج اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے بند کمرے میں میرا پورا لباس تبدیل کیا تھا۔ وہ اکثر بہت سنجیدہ رہتی تھی لیکن جب وہ کسی بات پر شرماتی تھی تو اس کے چہرے پر عجیب سے دلکش رنگ بکھر جاتے تھے۔ ان رنگوں کو چھپانے کے لئے وہ دائیں بائیں ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس نے یہی کیا۔ ''میں تمہارے لئے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسی دوران میں آفتاب خاں کمرے میں داخل ہو گیا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''اب آپ کا حالت پہلے سے کچھ اچھا لگتا ہے۔'' اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کچھ فرق تو ہے۔''

''اصل میں کل شام آپ کی بی بی نے اقبال بھائی کے ساتھ مل کر آپ کا زخم اچھی طرح صاف کیا ہے اور پٹی وغیرہ بھی باندھا ہے۔''

''عمران واپس آیا یا نہیں؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''آ گیا جی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔''

''کہاں ہے ڈاکٹر؟''

آفتاب خاں چند سیکنڈ تک چپ رہا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''اگر آپ اُٹھ کر آ سکتا ہے تو آئیں...... ام آپ کو دکھاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خو، زیادہ دور نہیں۔ بس عمران بھائی کے کمرے تک۔''

میں اُٹھا اور آفتاب کے ساتھ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر عمران کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ آفتاب خاں مجھے ایک جانب سے گھما کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف لے گیا۔ اس نے ادھ کھلے پٹ میں سے مجھے اندر کا منظر دکھایا۔ منظر دیکھنے سے پہلے ہی مدھم آوازیں میرے کانوں میں پڑنا شروع ہو گئیں۔ ان میں سے عمران کی آواز کو میں نے بہ آسانی پہچان لیا۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک جانے پہچانے

چہرے پر پڑی۔ یہ ڈاکٹر لی وان تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے جاپانی خد و خال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے کھچڑی بالوں کا ہم رنگ تھا۔ وہ اپنے دبلے پتلے جسم کے ساتھ کرسی پر تن کر بیٹھا تھا۔ طیش کے سبب اس کی آنکھوں سے شرارے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

''تم علاج کی بات کرتے ہو، میں تم لوگوں کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم لوگ مجھے زبردستی لے کر آئے ہو۔ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کیا ہے تم لوگوں نے۔ میں تمہارے خلاف مقدمہ کروں گا۔ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔'' وہ غصے کے سبب کرسی سے اچھل پڑ رہا تھا۔

عمران نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں ڈاکٹر! لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ آپ میری بات سمجھ نہیں پا رہے تھے اور میرے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ یقین کریں ڈاکٹر......''

''میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر لی وان دھاڑا...... ''تم میری آنکھوں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ...... میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔'' ڈاکٹر نے طیش میں سالن سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اُٹھا کر عمران کو دے ماری۔ عمران نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر خود کو پلیٹ کی زد سے بچایا۔

عمران کے بچ جانے سے ڈاکٹر کے طیش میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے ٹرے میں سے دو تین برتن اُٹھا کر عمران پر کھینچ مارے، آخر میں اسٹیل کی وزنی ٹرے بھی عمران کی طرف روانہ کر دی۔ عمران نے اچھل کود کر یہ سارے وار بچائے۔ عمران پر چیزیں پھینکنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر چلا بھی رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ...... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

عمران کو نشانہ بنانے کی کوششوں میں ناکام ہو کر ڈاکٹر نے دیوار پر سے کالے رنگ کا چھاتا اُتار لیا۔ اس چھاتے کو چھڑی کی طرح پکڑ کر وہ عمران پر پل پڑا...... وہ عمران جیسے برق رفتار کو کیسے نشانہ بنا سکتا تھا...... یہ عمران کی مہربانی تھی کہ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دو چار چوٹیں ڈاکٹر سے کھا لیں۔ اس سے ڈاکٹر کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس مارا ماری میں چھاتا بھی ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پھنکارتے ہوئے چھاتا ایک طرف پھینکا اور پھر نیم جان سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا سینہ بری طرح پھول پچک رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ۔'' وہ ایک بار پھر چنگھاڑا اور اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ عمران اور اقبال پر نہ پڑے۔ سرہانے کی طرف ڈاکٹر کا جہازی سائز میڈیکل باکس بھی نظر آ رہا تھا۔

چھاتے کی چوٹیں عمران کے کندھوں پر لگی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کندھوں کو ذرا سا سہلایا پھر اس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک ڈاکٹر کے مزید ردِعمل کا انتظار کیا پھر ہولے سے اس کے پاؤں کی طرف چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بدستور آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا...... عمران نے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبانا شروع کر دیئے۔ غیر متوقع طور پر ڈاکٹر نے کوئی خاص ری ایکشن نہیں دکھایا۔ موقع بہتر جان کر عمران نے اقبال کو بھی آنکھ سے اشارہ کیا۔ اقبال بھی خاموشی سے ڈاکٹر کے سرہانے بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کے کندھے دبانے لگا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''عمران بھائی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی کو گولی مار دے گا یا پھر اپنے آپ کو شوٹ فرما لے گا۔''

تین چار منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ڈاکٹر لی وان چارپائی پر چت لیٹا رہا اور عمران اور اقبال خشوع و خضوع سے اس کی مٹھی چاپی کرتے رہے۔ آخر ڈاکٹر لی وان کی بھرائی ہوئی ناراض آواز سنائی دی۔ ''کہاں ہے تمہارا مریض؟''

عمران بولا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔ یہ دیکھیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اور سچے دل سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے جوڑ دیئے۔

ڈاکٹر نے منہ پھیر لیا۔ عمران اُٹھ کر گیا اور قریبی دیوار سے ایک اور چھاتا اُتار کر لے آیا اور ڈاکٹر کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کا غصہ کم نہیں ہوا تو مزید مار لیں لیکن پلیز آخر میں معاف ضرور کر دیں۔''

اس نے اتنی مسکین صورت بنا رکھی تھی کہ ڈاکٹر کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا...... اس نے گہری سانس لی اور اُٹھ کر چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ قدرے نرم آواز میں بولا۔ ''اب خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ مریض کہاں ہے؟''

عمران نے بڑے جذباتی انداز میں ''تھینک یو ڈاکٹر'' کہا پھر اسے بتایا کہ مریض یہاں پاس ہی ایک کمرے میں ہے۔

میں اور آفتاب کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور تیزی کے ساتھ واپس کمرے میں پہنچ گئے۔ سلطانہ گرم دودھ لئے میری چارپائی کے قریب کھڑی تھی اور کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

میں اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ نقل و حرکت کی وجہ سے گردن میں اُٹھنے والی ٹیسیں شدید تر ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی چند سیکنڈ میں اس راجواڑے کا قابل ترین ڈاکٹر کمرے میں قدم رکھنے والا ہے۔ میں اس کے لئے نیا مریض نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی نل پانی کے مضافات میں اپنے اسپتال کے اندر میرا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر چوہان بھی میرے ساتھ تھا۔ میرے معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان نے یہ حتمی رائے دی تھی کہ راجواڑے میں سہولتیں ناکافی ہیں۔ ان ناکافی سہولتوں کے ساتھ میرا آپریشن ایک بہت بڑا رسک ہو گا۔

سوچنے کی بات تھی کہ کیا اب یہاں ڈاکٹر لی وان اپنی رائے تبدیل کر سکے گا جبکہ یہاں اتنی سہولتیں بھی نہیں تھیں جتنی نل پانی کے اسپتال میں تھیں۔

میں نے سلطانہ کو دودھ سمیت کمرے سے باہر بھیج دیا۔ حسبِ توقع چند سیکنڈ بعد عمران اور اقبال ڈاکٹر لی وان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی تفصیلی روداد میں عمران کے سامنے ڈاکٹر لی وان کا ذکر تو کیا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا کہ عمران اور اقبال اس امر سے بے خبر ہیں کہ یہی وہ ڈاکٹر ہے جس کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔

مجھے بغور دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اپنی عینک درست کی اور ایک بار عمران کی طرف دیکھنے کے بعد دوبارہ مجھ پر نظر جما دی۔ ''تو یہ ہے مریض؟'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا...... اور ڈاکٹر کا میڈیکل باکس تپائی پر رکھ دیا۔

''ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہارا نام تابش ہے نا...... جیکی کی ڈیتھ کے بعد تم ڈاکٹر چوہان کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ٹھیک پہچانا ہے ڈاکٹر۔''

''تمہیں یہاں اتنی دور دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے۔ بہرحال، یہ باتیں تو بعد میں بھی پوچھی جا سکتی ہیں۔ فی الحال تمہارا فوری مسئلہ کیا ہے؟''

میں نے گردن گھماتے ہوئے کہا۔ ''چند روز پہلے یہاں پیچھے کی طرف مجھے زخم آیا تھا۔ یہ زخم اب بہت تکلیف دینے لگا ہے...... بہت زیادہ۔''

ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل باکس میں سے ایک ٹارچ اور دو چار اوزار نکالے۔ اس کے بعد بڑی توجہ سے میرا زخم دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سیٹی کی سی

آواز نکلی اور وہ میرے زخم پر کچھ اور بھی جھک گیا۔ ''یہ تو بہت سیریس معاملہ ہے۔'' چند سیکنڈ بعد جاپانی ڈاکٹر نے لرزاں آواز میں کہا۔

''اسی لئے تو آپ کو یہاں لائے ہیں۔'' عمران نے گہرے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

ڈاکٹر نے سنسنی خیز نظروں سے پہلے مجھے اور پھر عمران کو دیکھا۔ تب عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''ہم بہت قریبی دوست ہیں۔''

''اپنے قریبی دوست کے بارے میں تم کیا کچھ جانتے ہو؟ خاص طور سے اس کے اس زخم کے بارے میں؟''

''آپ کس حوالے سے پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ڈاکٹر لی وان ہی وہ ڈاکٹر ہیں جن کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسپتال میں میرے ٹیسٹ لئے تھے اور تفصیلی معائنہ بھی کیا تھا۔ اتفاق ہے کہ آج تم ڈاکٹر لی وان کو ہی میری مدد کے لئے لائے ہو۔''

عمران نے ہونٹ سکیڑے اور ایک بار پھر غور سے لی وان کو دیکھنے لگا۔ یقیناً اسے اور اقبال کو وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو میں نے انہیں اس ماہر ڈاکٹر کے بارے میں بتائی تھیں۔

آخر عمران نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہمیں اب ڈاکٹر صاحب کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''ہاں، تمہیں زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور نہ ہی مجھے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔'' ڈاکٹر کا لہجہ ایک بار پھر ترش ہو گیا۔

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک بار پھر ٹارچ روشن کی اور میری گردن کے عقبی حصے کا بغور معائنہ کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اوزار وغیرہ واپس میڈیکل باکس میں رکھ دیئے اور گھمبیر انداز میں بولا۔ ''میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ اس مریض کا جلد سے جلد اسٹیٹ سے باہر جانا ضروری ہے تاکہ الہ آباد یا جھانسی وغیرہ میں اس کا آپریشن ہو سکے۔ اب تم لوگوں نے معاملہ بہت خراب کر لیا ہے۔''

''آپ...... کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟'' ڈاکٹر لی وان نے پوچھا۔

''ہم جنگل سے گزر رہے تھے۔ ڈکیتوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے ساتھ لڑائی ہوئی جس میں یہ چوٹ لگی۔'' میں نے سچ بتا دیا۔

''یہ چوٹ تمہیں ایسی جگہ لگی ہے جہاں ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہئے تھی۔ تمہارا اندر کا نظام گڑبڑ ہو گیا ہے۔''

''آپ چپ کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے تاسف سے اثبات میں سر ہلایا۔

''چپ کے اردگرد کا ایریا متاثر ہو گیا ہے...... تمہارے کندھے اور کمر کا اوپر والا حصہ تو سن نہیں ہو رہا ہے؟''

''ہاں، ایسا تو اب بھی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر لی وان کے نہایت تجربہ کار چہرے کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ وہ عمران اور اقبال کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ ان کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں ناقابلِ برداشت درد سے میری طویل جنگ جاری رہی۔ ڈاکٹر کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ عمران اور اقبال کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یار! یہ رسمی باتیں مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟''

وہ چند لمحے تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹر کہتا ہے کہ معاملہ اور بگڑ سکتا ہے۔ فوری آپریشن ضروری ہے...... اور یہ آپریشن یہاں کسی صورت نہیں ہو سکتا۔''

''...... اور اس کے لئے اسٹیٹ سے باہر جانا ہو گا۔'' میں نے عمران کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اب وہ یہ نہیں کہہ رہا۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم کسی طرح نل پانی پہنچ سکیں تو وہ وہاں اپنے اسپتال میں یہ آپریشن کر دے گا...... لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے پوچھا۔

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ

خطرہ تو ہے۔"

میں جانتا تھا کہ عمران صورتِ حال کی سنگینی کو بہت کم کر کے بیان کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر نے پہلے کی طرح اس آپریشن کے سلسلے میں خاصے خدشات کا اظہار کیا ہوگا۔

"پھر کیا خیال ہے؟" میں نے اپنی کراہیں سینے کے اندر ہی گھونٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا پڑے گا اور جلد ہی نکالنا پڑے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں تکلیف بہت زیادہ ہے۔"

عمران بہت کم پریشان نظر آتا تھا مگر اس وقت وہ پریشان تھا۔ کچھ یہی کیفیت اقبال کی بھی تھی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ اگر ہم اس تین منزلہ تہ خانے سے نکل کر نل پانی پہنچنے کی کوشش کرتے تو زیادہ دور نہ جاسکتے۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ حکم کے لوگ اردگرد موجود ہیں اور پوری جاں فشانی سے چپ کے سگنل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس تہ خانے کے اندر رہتے تو بھی نتیجہ سامنے تھا...... میری تکلیف ہر گھڑی بڑھتی جارہی تھی۔

ابھی ہم تینوں کی بات چیت جاری تھی کہ آفتاب خان اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اندر آگیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "عمران بائی! آپ یہ کیا چیز پکڑ لایا ہے۔ آپ اس کو ڈاکٹر کہتا ہے لیکن ام کو تو یہ خود مریض لگتا ہے۔ ایسا چڑچڑا بندہ تو ام نے پورے انڈیا میں نہیں دیکھا۔"

"ایسے بندے انڈیا میں نہیں جاپان میں ہوتے ہیں لیکن ہوا کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"بس ایک دم آگ بگولا ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ام کو واپس چھوڑ کر آؤ۔ ام ایک منٹ یہاں نہیں رکے گا۔ ام اس کا دل بہلانے کے لئے چائے لے کر گیا لیکن اس نے چائے کا پیالی ام پر پھینک دیا۔ یہ دیکھیں، سارا کپڑا خراب ہو گیا امارا۔ یہ آپ کا لحاظ ہے کہ ام چپ رہا۔ ورنہ ایسے چڑی جیسے بندے کو تو ایک دم مسل کر رکھ دے۔"

"خبردار! کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔" عمران نے اسے جھاڑا۔ "اس کے چڑی جیسے جسم پر نہ جاؤ...... وہ ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور اس وقت ہمیں اس کی بہت سخت ضرورت بھی ہے۔ اس کی ہر بات برداشت کرنی ہوگی۔"

"ن...... نہیں جی...... ام نے اس کے سامنے تو کوئی بات نہیں کہی۔ صرف آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ اب وہ مسلسل آپ کو بلا رہا ہے۔ اب کیا کہوں اس سے؟"

"ٹھیک ہے، میں خود دیکھتا ہوں۔" عمران نے کہا اور اُٹھ کر ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔

دوپہر تک میری حالت مزید بگڑ گئی۔ بخار 104 تک چلا گیا اور کمر کا بالائی حصہ بالکل سُن ہونے لگا۔ سلطانہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ گیلا کپڑا میرے پورے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر بھی پھیر دیتی تھی۔ عمران نے ڈاکٹر لی وان کی ہدایت کے مطابق مجھے کچھ پین کلرز دی تھیں، تاہم محسوس ہوتا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر ختم ہوتا جارہا ہے...... اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں طویل سفر کے قابل ہی نہیں رہا...... اگر عمران وغیرہ مجھے نل پانی لے جانا چاہیں تو میں جا نہیں پاؤں گا۔ مجھے گاہے بگاہے غشی کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی اور یہ میری تکلیف کے لئے خطرناک علامت تھی۔

سہ پہر کے وقت جب میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو عمران اور ڈاکٹر ایک بار پھر میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے دوبارہ میرے زخم کا معائنہ کیا...... تب وہ دونوں بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اقبال اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر امید کی ہلکی سی کرن تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا...... ڈاکٹر لی وان آپریشن کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہیں پر...... وہ کہتا ہے کہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تیاری کر لیتا ہوں۔ پھر "لوکل انستھیسیا" دے کر آپریٹ کر دوں گا۔ ابھی اس نے تمہارے زخم کو اچھی طرح دیکھا ہے...... اس نے امید دلائی ہے کہ وہ چپ علیحدہ کر لے گا۔"

اقبال میرے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سلطانہ کو حوصلہ دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ وہ اصل صورتِ حال بتا نہیں سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ اصل صورتِ حال کہیں زیادہ سنگین ہے۔

ڈاکٹر لی وان تو نل پانی میں بھی آپریشن کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس تہ خانے کے نامناسب ترین حالات میں کیسے تیار ہو گیا؟ اس سوال کا ایک ہی جواب تھا...... اور وہ یہ کہ میری جان خطرے میں تھی۔ تاخیر کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ "کوشش" کے بغیر ہی مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے۔

عمران اور جیکی جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد میں بہت بدل چکا تھا۔ میری کم ہمتی ایک خاص قسم کی بے خوفی اور دلیری میں ڈھل چکی تھی۔ مگر زندگی کی خواہش تو انسان بلکہ ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔ میں بھی یوں مرنا نہیں چاہتا تھا...... میں ابھی زندہ رہنا چاہتا

تھا۔ ابھی میرے کندھوں پر کچھ ''بوجھ'' تھے۔ اگر میں یہ بوجھ لے کر راہیِ ملکِ عدم ہو جاتا تو شاید مر کر بھی میری روح بے قرار بھٹکتی رہتی۔

کچھ دیر بعد مجھے کسی قریبی کمرے میں طبی اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اسپرٹ اور پائیوڈین وغیرہ کی بُو بھی نتھنوں میں گھسنے لگی۔ غالباً میرے آپریشن کی تیاری ہو رہی تھی۔

کمرے میں، مَیں اور میرا درد تنہا تھے۔ اگر کوئی اور تھا تو وہ سلطانہ تھی۔ وہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ دیوانوں کی طرح میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ کبھی میرا سر تکیے پر رکھتی۔ کبھی آغوش میں لے لیتی۔ کبھی گیلے کپڑے سے میرے چہرے اور ہتھیلیوں کو تر کرنے میں مصروف ہو جاتی۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو...... میں ایک شکوہ اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو مہروج!'' وہ سسک پڑی اور میرا سر آغوش میں دبا لیا۔

میں نے کہا۔ ''پوچھو گی نہیں، کیا شکوہ ہے؟''

''تم کیا کہہ رہے ہو مہروج؟''

''میں تمہاری من مانی کی بات کر رہا ہوں سلطانہ...... میں نے تمہاری منت کی تھی کہ آئندہ مجھے اس طرح کا دکھ نہ دینا جیسا نالے پانی میں دیا تھا۔ مجھے بتائے بغیر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اُٹھانا......لیکن تم نے بڑی بے حسی کے ساتھ میری بات رد کی......'' تکلیف اور دکھ کے بوجھ سے میری آواز بھرا گئی۔

''میں نے ایسا نا ہیں کیا مہروج! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہوئیں گی۔ کیا میں اس جگہ سے باہر کہیں گئی ہوں؟''

''تم نہیں گئیں......لیکن جانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں اور مجھے پتا ہے تم نے چلے جانا تھا۔''

''نا ہیں مہروج! میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم خود کو خواہ مخواہ کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' وہ مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔

میں نے درد کی بے پناہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اب تم مجھے دہرا دکھ دے رہی ہو۔ مجھ سے جھوٹ بھی بول رہی ہو۔ تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی ہو اور یہ دیکھو اس کا ثبوت۔'' میں نے اپنی جیب سے نیلے تھوتھے والی پڑیا نکال کر سلطانہ کو دکھائی۔

اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ''یہ...... یہ تمہیں کہاں سے ملی؟''

''جہاں تم نے چھپائی تھی۔''

میں نے طلال کے حوالے سے ساری باتیں اسے بتائیں اور دو تین منٹ کے اندر لاجواب کر دیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو جاؤں۔ کیا آج بھی تم میرا شکوہ دور نہیں کرو گی؟''

ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ناک سرخ ہو گئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''ایسی باتیں مت کرو مہروج! میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہوں......''

''تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

وہ سرتاپا لرز گئی۔ اس نے ڈری ڈری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ایک دو لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا ہاتھ میرے سر پر سے کھینچنا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا اور نڈھال لہجے میں بولی۔ ''کہو مہروج! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھ سے وعدہ کرو سلطانہ! میری زندگی میں، تم میری مرضی کے بغیر، میری چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالو گی اور جارج گورا والا معاملہ مکمل طور پر......مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دو گی۔''

وہ کچھ دیر آنسو بہاتی رہی۔ پھر دل دوز آواز میں بولی۔ ''ٹھیک ہے مہروج! میں وعدہ کرتی ہوں۔''

''اس طرح نہیں سلطانہ! یہ سارے الفاظ دہرا کر وعدہ کرو۔''

وہ کچھ دیر جھجکتی رہی پھر اس نے میرے کہے ہوئے تمام الفاظ دہرا دیئے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے ذرا جھک کر اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔ اس نے اپنا ''سر'' نہیں جیسے اپنا دکھ میرے سینے پر رکھا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اس انداز سے روئی تھی۔ وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ''وہ شیطان جندہ رہنے کے خابل نا ہیں ہے مہروج! اسے ماف نہ کرنا...... اسے ماف نہ کرنا۔''

......ایک گھنٹے کے اندر اندر میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فالج کس طرح اور کس انداز میں حملہ آور ہوتا ہے مگر لگ یہی رہا تھا کہ میرا بالائی دھڑ مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں ڈاکٹر لی وان کی ''آپریشن ٹیبل'' پر تھا۔ یہ آپریشن ٹیبل بھی عجیب تھی...... لکڑی کا ایک بوسیدہ تخت تھا جس کے نیچے کچھ اینٹیں رکھ کر آفتاب خاں نے اسے کچھ اونچا کر دیا تھا۔ روشنی بڑھانے کے لئے اقبال نے ان تہ خانوں کی تقریباً ساری لالٹینیں اس کمرے

میں جمع کر دی تھیں۔ اسٹیل کی ایک دیگچی میں ڈاکٹر لی وان کے چند سرجیکل آلات ابل رہے تھے۔ عمران، ڈاکٹر لی وان کے معاون کا کردار ادا کر رہا تھا۔ عمران کی موجودگی سے مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ مل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی جسے میں کبھی سمجھ نہیں سکا اور نہ بیان کر سکا...... اور شاید اس طرح کی حوصلہ بخش کیفیت ہر وہ شخص محسوس کرتا جو اس کے ارد گرد موجود ہوتا تھا اور اس سے محبت کا تعلق رکھتا تھا......

شروع میں آگ بگولا ہونے کے بعد ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر پُرسکون تھا۔ آپریشن پر رضامند ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کر لی۔ وہ اور عمران آپس میں گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن دے کر اوپر والے حصے کو سن کیا جا سکتا ہے...... لیکن اس میں تھوڑا بہت خطرہ موجود رہے گا۔ میرے ذہن میں آ رہا ہے کہ کیوں نہ انجکشن کے بغیر ہی کام چلایا جائے۔''

''یہ زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''تکلیف تو ہوگی...... لیکن تمہارا یہ دوست اس حوالے سے کافی ہمت دکھا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ برداشت کر لے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ پچھلے تین دن سے یہ بغیر کسی خاص پین کلر کے اتنی تکلیف جھیل رہا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کی برداشت دیکھ کر مجھے امید ہے کہ یہ بغیر انجکشن کے بھی آپریشن کروا لے گا۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری رائے لی۔

میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔

آپریشن کا عمل شروع ہوا۔ میرے جسم کو زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہاں زخم تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ بس ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل کٹر سے اس زخم کو تھوڑا کشادہ اور گہرا کر لیا۔ اصل مسئلہ چپ کی ''سیپریشن'' کا تھا۔ جب ڈاکٹر لی وان کے باریک نشتر نے چپ کو چھونا شروع کیا تو میری گردن کے پچھلے حصے اور دونوں کندھوں میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ میں درد کے ایک نئے بھنور میں گھر گیا۔

اس نئے درد سے لڑنے کے لئے میں نے اپنے پردۂ تصور پر بارونداجیکی کی شبیہہ کو نمایاں کیا۔ وہ برداشت کا پیکر...... درد کا خوگر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ اپنے فلسفے کے حوالے سے بڑی وزنی دلیلیں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا...... جب ہمارے جسم کے کسی سنگین زخم کو مرہم پٹی کے لئے چھیڑا جاتا ہے تو ہم

شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں مگر اس تکلیف میں سے پچھتر فیصد تکلیف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم اپنے زخم کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا کم از کم اس کی نوعیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہی زخم ہماری نظر کے سامنے نہ ہو اور نہ ہی ہمیں اس کی نوعیت کا پتا ہو تو یہ تکلیف صرف پچیس فیصد رہ جائے گی یا شاید اس سے بھی کم۔

میں نے بھی اپنا دھیان اپنے زخم کی طرف سے ہٹا لیا۔ تمام واہمے، خدشات اور اندیشے ذہن سے نکال دیئے۔ ڈاکٹر لی وان ایک ماہر ترین سرجن تھا اور سرجن کا بیشتر کمال اس کے ہاتھوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک مصور یا ہیرا تراش کے ہاتھوں کی معمولی سی لرزش اس کے کام کو تباہ کر سکتی ہے، سرجن کے ہاتھ کی لرزش بھی اس کے مریض کو زیر زمین پہنچا سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کی بے پایاں مہارت ہی تھی کہ وہ لالٹینوں کی روشنی میں بغیر کسی تھیٹر کے یہ نازک آپریشن کرنے پر تیار ہو گیا۔

''او گاڈ...... او مائی گاڈ'' ڈاکٹر نے لرزاں لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ روک لئے۔

''کیا ہوا؟'' عمران نے ٹھٹک کر پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے چہرے سے ماسک ہٹایا۔ اپنی عینک اُتاری اور ایک جانب رکھی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ماتھا پکڑ لیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر؟'' عمران نے پھر پوچھا۔

''یہ بہت خبیث لوگوں کا کام ہے۔ بہت عیار اور...... بے رحم۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''ہم یہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔'' ڈاکٹر لی وان نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں کروٹ لے کر لکڑی کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا سردی کے باوجود ڈاکٹر کے ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

''آپ کچھ وضاحت تو کریں۔'' عمران نے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے میرے سامنے اپنی مشکل بیان کرنی چاہئے یا نہیں۔ پھر اس نے وہی فیصلہ کیا جو آج کل عام معالج کرتے ہیں...... یعنی مریض کو اندھیرے میں نہ رکھنے کا فیصلہ۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس نے دوبارہ عینک لگائی اور ماسک چڑھایا پھر عمران کے ساتھ میرے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ اس نے کسی اوزار کی مدد سے

میرے جسم میں لگی ہوئی چپ کو آہستہ سے چھوا۔ ایک بار پھر پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑنے لگیں۔

ڈاکٹر نے نہایت بے بسی سے بتایا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اگر ہم نے اس چپ کو اسپائنل کینال کی ہڈی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت خطرناک ہے۔'' عمران نے زیرلب کہا۔

ڈاکٹر اور عمران پھر نشستوں پر جا بیٹھے۔ میں بھی چند تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پورے کمرے میں اسپرٹ اور دیگر ادویات کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل شیطان صفت بندہ ہے۔ میرے خیال میں تو ایسے شخص کے نام کے ساتھ ڈاکٹر یا سرجن وغیرہ کے الفاظ لگانا ہی گناہ ہے۔ یہ قاتل شخص ہے۔ طب کے شعبے پر ایک بدنما دھبا ہے۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ چپ اسی شخص نے پلانٹ کی ہے۔ اس قسم کا گھناؤنا کام وہی کرسکتا ہے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' عمران نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اب ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتے کہ زخم کو صاف کریں اور ٹانکے لگا کر بند کردیں۔ باقی خدا پر چھوڑ دیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے سے مایوسی اور نقاہت جھلک رہی تھی۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود ہی کہا تھا کہ فوری آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے نکالنا اس قدر خطرناک تھا۔'' ڈاکٹر نے جھلائی ہوئی بلند آواز میں کہا۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی عمران کا حوصلہ برقرار تھا۔ اس نے تسلی بخش انداز میں میرا شانہ دبایا اور ڈاکٹر کے پیچھے باہر نکل گیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ ڈاکٹر اسٹیل، جارج گورا اور اس کی بہن ماریا وغیرہ کے منحوس چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ماریا، ڈاکٹر اسٹیل کی بیوی تھی۔ یہ وہی ماریا تھی جس کی انگلی اسحاق نے کاٹی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی بے رحمی و بے حسی میں یکتا تھے۔ آج ڈاکٹر لی وان نے جو انکشاف کیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔ اسٹیل نے میرے سر کے پچھلے حصے میں جو چپ ڈال رکھی تھی، وہ پھٹ سکتی تھی اور اس کے پھٹنے سے میرا اسپائنل میرو یعنی حرام مغز ختم ہوسکتا تھا۔ حرام مغز ختم ہونے کا مطلب فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

کسی قریبی کمرے سے بحث وتکرار کی مدھم آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ بحث اور تکرار یقیناً عمران اور ڈاکٹر لی وان کے درمیان ہورہی تھی۔ ڈاکٹر کسی وقت بہت بلند آواز میں بولتا تھا اور اس کے لہجے سے غصہ چھلکا پڑتا تھا۔

پین کلرز کا اثر کم ہورہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پھر بلند ہونے لگیں۔ بہت ضبط کے باوجود میں ایک بار پھر ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی دوران میں ادھ کھلے دروازے سے میری نگاہ سلطانہ پر پڑی۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں کمرے میں جھانکا۔ اس کے گداز ہونٹ خشک تھے اور دنیا جہان کے اندیشے اس کی سیاہ آنکھوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ اسے دروازے میں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ عمران کی آواز آئی۔ وہ سلطانہ کو بلا رہا تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر کو قائل کرنے کے لئے سلطانہ کی مدد بھی چاہتا تھا۔

میرے حواس پر ایک بار پھر غشی کی دھند چھانے لگی۔ اردگرد کے مناظر مدھم ہونے لگے، آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کتنا وقت اسی کیفیت میں گزرا۔ شاید پچیس تیس منٹ...... یا شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ عمران اور ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر میرے قریب موجود ہیں۔ وہ دونوں ایک بار پھر میری زخمی گردن پر جھکے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک دو انجکشن بھی دیئے گئے۔ ان انجکشنز کے بعد میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند قدرے چھٹ گئی اور درد میں بھی عارضی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! جو بھی کرنا ہے جلدی کرو......''

ڈاکٹر نے میرے کندھے پر تھپکی دی مگر کہا کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل کیمرا دیکھا۔ اس جدید کیمرے سے ڈاکٹر نے میری گردن کے عقبی حصے کی کئی تصویریں اُتاریں۔ یہ کیمرا ان تصویروں کو بیس تیس گنا بڑا کرکے دکھا سکتا تھا۔ ان تصویروں میں، مَیں نے پہلی بار وہ منحوس چپ دیکھی جس نے ایک طویل عرصے سے مجھے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا۔ کیمرا اپنی اسکرین پر اس چپ کو کئی گنا بڑا کرکے دکھا رہا تھا اور اس کی سنہری مائل سطح کی ساری جزئیات نظر آرہی تھیں۔

''پلیز ڈاکٹر! آپ رسک لیں۔ اگر میری زندگی ہے تو کچھ نہیں ہوگا اور اگر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔''

ڈاکٹر ایک بار پھر بڑی باریک بینی سے چپ کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ یہ معائنہ ڈیجیٹل تصویروں کے ذریعے کررہا تھا۔ وہ ماہر ترین سرجن تھا۔ نہ جانے کتنے نازک مرحلوں سے گزر چکا تھا...... اس کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ بالآخر فیصلہ کن مرحلہ آ گیا۔

ڈاکٹر لی وان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک حوصلہ مند شخص ہو مسٹر تابش! میں نے تم سے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا پڑ رہا ہے، یہ میرا جاب نہیں ہے۔ میں ایک سرجن ہوں لیکن یہاں مجھے سرجری کے ساتھ ساتھ دوسری کارروائی بھی کرنا پڑ رہی ہے۔ اب یہ سراسر قسمت کا کھیل بن گیا ہے، اس میں کسی طرح کی مہارت یا صلاحیت کو عمل دخل نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر! آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں۔ میں ہر صورت میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی طرح کی تحریری اجازت چاہئے تو وہ بھی میری طرف سے عمران آپ کو دے سکتا ہے یا میری بیوی دے سکتی ہے۔''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے دستانے پہننے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی نصف درجن لالٹینیں میرے اردگرد روشن تھیں۔ عمران کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ بھی تھی جو اسے بوقتِ ضرورت روشن کرنا تھی۔ اس بند کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ تاہم اس کمرے سے باہر جس طرح کی ہلچل مچی ہوئی تھی، وہ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ سلطانہ اور میرے سارے ساتھی یقیناً میرے لئے دست بہ دعا تھے اور بڑی بے قراری سے اس انوکھے آپریشن کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہنگامی آپریشن کا نتیجہ کیا نکلنا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

پھر ایک اور اندیشہ میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس چپ کو ہلانے یا نکالنے کے سبب دوبارہ میری یادداشت کے ساتھ کوئی معاملہ ہو جائے۔ میں ایک بار پھر اپنے اردگرد کو فراموش کر کے کسی بے نام تاریکی میں کھو جاؤں۔

'' ڈاکٹر اور عمران میری گردن کے زخم کے ساتھ مصروف ہو گئے، میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے پیاروں کے چہرے تصور میں بسا لئے۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ آخر عمران کی گھمبیر آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہمت کریں ڈاکٹر! جو سمجھ میں آتا ہے کر گزریں۔''

یکا یک میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ میری پائنتی کی طرف اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے دستانہ پوش ہاتھوں میں ایک سرجیکل قینچی تھی مگر ابھی تک ڈاکٹر یہ کام کر نہیں سکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر نظر آیا۔ آنکھیں زرد ہو رہی تھیں۔

''یہ گیمبلنگ ہے۔ یہ میں نہیں کر سکوں گا۔ بہت بڑا رسک ہے یہ۔'' ڈاکٹر عجیب اضطراب کے عالم میں بولا۔

یکا یک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کمرے میں ایک اور شخص موجود تھا جو بڑے بڑے رسک لے سکتا تھا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا، تقدیر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر کا چہرہ تک رہا تھا......

میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! میری ایک خواہش ہے...... میں چاہتا ہوں کہ یہ کام، میرا یہ دوست کرے۔''

عمران اور ڈاکٹر نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا۔ ''...... ہاں ڈاکٹر! مجھے یقین ہے...... یہ جو کرے گا میرے لئے بہت اچھا ہو گا۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' عمران نے حیران ہو کر کہا۔

''کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟''

''لیکن......''

''پلیز عمران! تم یہ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب تمہاری مدد کریں گے۔''

ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

''کیا تم ایسا کرو گے؟'' ڈاکٹر نے عمران سے پوچھا۔

''ہاں، یہ کرے گا۔'' عمران کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ''آپ دستانے، سرجیکل اوزار اس کو دے دیں۔''

میرے لہجے میں چھپے ہوئے یقین کو محسوس کرنے کے بعد عمران کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے لیکن پھر وہ ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''یار! کیوں مروانا ہے مجھے۔ اگر میں ناکام ہو گیا تو......''

''مذاق نہیں عمران! تم یہ کام کرو...... اور جلدی کرو۔''

''بڑی بھاری ذمے داری ڈال رہے ہو۔'' عمران کا لہجہ پھر گھمبیر ہو گیا۔

''کسی نہ کسی کو تو یہ ذمے داری اُٹھانی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اُٹھاؤ۔''

...... کچھ ہی دیر بعد عمران میڈیکل باکس میں سے سرجیکل دستانے نکال کر پہن رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ عمران اور ڈاکٹر میری پشت پر آن کھڑے ہوئے۔ لالٹینوں کی لو اونچی کر دی گئی۔ بڑی ٹارچ اب ڈاکٹر لی وان کے پاس تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے عمران کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دائیں ہاتھ میں قینچی لے کر عمران میری گردن پر جھک گیا۔ میرے اردگرد ایک اذیت ناک دھند تھی۔ میں نے غنودگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ مشکل نہیں عمران! تم پہلے بھی بہت

دفعہ کر چکے ہو...... دو خانے میں گولی...... چار خانے خالی......" عمران نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

عمران کا حوصلہ اکثر "دو...... چار" کے کھیل میں جیت جاتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ اس مرتبہ بھی جیت جائے گا؟

"او گاڈ!" ڈاکٹر لی وان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس آواز میں اطمینان اور خوشی کی لہر تھی۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میرے عقب میں عمران اور ڈاکٹر بغلگیر ہو گئے ہیں۔ عمران نے جھک کر میرے سر کو بوسہ دیا اور کندھا تھپکا۔ پھر مقامی لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ "وشواس ناہیں ہووت ہے کہ میں نے اس منحوس چپ کو اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے۔ یہ تو چمتکار ہے۔ نیا جیون مبارک۔"

ڈاکٹر لی وان نے ہلکے ہلکے جوش کے ساتھ کہا۔ "اچھا مسٹر عمران! اب تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ مجھے باقی کا کام کرنے دو۔ اب مجھے چپ کو ٹشوز سے علیحدہ کرنا ہے اور یہ بھی مشکل کام ہے۔"

اگلے دس منٹ تک ڈاکٹر لی وان بڑے انہماک سے اس کام میں مصروف رہا۔ اس کام میں کچھ وقفے شدید درد کے بھی آئے، بالآخر عمران نے اسٹیل کا باؤل آگے کیا اور اس میں "ٹن" کی آواز سے چپ گری۔ "تمہیں مبارک ہو مسٹر تابش! تم اب ایک آزاد شخص ہو۔"

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ ابھی مجھے لیٹے رہنا ہے۔ میرے زخم کو ٹھیک سے صاف کر کے اسٹیچز لگائے گئے اور پٹی باندھ دی گئی۔

میں نے واقعی خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی اس تین منزلہ تہ خانے کی گہرائی میں سے نکلوں اور کھلی جگہ پر پہنچ جاؤں۔ پوری آزادی سے سانس لوں اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر کھیتوں کھلیانوں میں اور آبی گزرگاہوں کے کناروں پر بھاگوں دوڑوں۔ خوشی سے چلاؤں...... آج میں آزاد ہوں۔ آج مجھے اپنے ہر ارادے کو پورا کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ اب میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ سلطانہ کے لئے، اپنی کچلی مسلی ہوئی عزتِ نفس کے لئے اور پھر اس اسٹیٹ کی حدوں سے پار نکلنے کے لئے بھی۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹیل کے باؤل میں اس چھوٹے سے دھاتی ٹکڑے کو دیکھا جس نے ماضی قریب میں مجھے اَن گنت زخموں سے دوچار کیا تھا۔ سلطانہ، چوہان اور دیگر لوگ مجھے بتاتے تھے کہ میں اس اسٹیٹ سے نکل جانے کے لئے اَن تھک کوششیں کرتا رہا ہوں اور ناکامیاں جھیلتا رہا ہوں۔ بہت دنوں بعد مجھے ثروت کی یاد بھی آئی۔ وہ کہاں تھی؟

کس حال میں تھی؟ عمران کی مبہم باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید اس کی شادی ہو چکی ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی آباد ہو چکی تھی اور خوش تھی تو پھر اسے اچھے طریقے سے خیر باد کہنا چاہتا تھا۔

ایک دم میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ آپریشن سے پہلے وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں دنیا جہان کے اندیشے سمٹے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کے خشک ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ "وہ بہت پریشان ہوگی۔ اسے بتا دو اور اقبال کو بھی......"

عمران چہکا۔ "اقبال کا نام تو تم بس یونہی لے رہے ہو۔ اصل میں تو سلطانہ بھابی کو اطلاع دینا چاہ رہے ہو۔ ویسے یہ بیویاں اتنی پریشان ہوتی نہیں جتنی نظر آتی ہیں۔"

"کیوں، تمہارا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایک تجربہ ہے...... میں تو اس پر پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے چینل فساد پلس پر اس حوالے سے پچاس پچاس منٹ کے کوئی دس پروگرام پیش کئے ہیں۔ پروگرام کا عنوان تھا 'بیویوں کے اصل چہرے......' اس پروگرام کو دیکھ کر بیویاں اتنا سٹپٹائیں کہ انہوں نے چینل کے دفتر پر چڑھائی کر دی۔ پروگرام کے پروڈیوسر صاحب ایک باتھ روم میں سے زندہ پکڑ لئے گئے۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ انہیں دفتر کے سامنے گولی مار دی جائے لیکن مظاہرین کی لیڈر آنسہ شاہ زوری نے کہا کہ مار دینا کوئی سزا نہیں۔ آج کل پروڈیوسر صاحب شاہ زوری صاحبہ کے شوہر ہیں......"

"اس چپ کا اب کیا کرنا ہے؟" ڈاکٹر لی وان نے باؤل میں پڑی خون آلود چپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی زبان پھر متحرک کر دی۔ "دل تو چاہتا ہے کہ یہ چپ کسی نیولے کے جسم میں رکھ دی جائے۔ وہ سارے جنگل میں بھاگتا پھرے اور حکم کے کارندے اس کے پیچھے ہلکان ہوتے رہیں۔ کتنا مزہ آئے کہ جب دو تین مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد نیولا پکڑا جائے تو حکم کے کارندے فرطِ حیرت سے بے ہوش جائیں اور پھر نیا محاورہ وجود میں آئے...... کھودا پہاڑ نکلا نیولا۔"

ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ "واقعی کوئی ایسا کام کیا تو جا سکتا ہے جس سے اس بدمعاش سرجن اسٹیل کو عبرت حاصل ہو۔"

چپ نکلتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری گردن اور کندھوں میں کبھی درد ہوا

ہی نہیں، جسم کے اس حصے میں فالج کا سا احساس بھی ناپید ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد سب میرے ارد گرد جمع تھے۔ سلطانہ، اقبال، ہوشیار سنگھ، تاؤ افضل اور شکیلہ وغیرہ۔ سب خوش تھے۔ ڈاکٹر لی وان کا خیال تھا کہ ابھی مجھے آرام اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس کے کہنے پر عمران نے ایک ایک کر کے سب کو باہر بھیج دیا۔ آخر میں وہ اور سلطانہ رہ گئے۔ سلطانہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایک اور فرشتہ یہاں تمہارے پاس بھی تو کھڑا ہے۔''

وہ حیرت سے عمران کو دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اس نے دوسری مرتبہ میری جان بچائی ہے۔ آج اس نے آپریشن میں ڈاکٹر کی مدد کی ہے۔ اس کی مدد کے بغیر شاید یہ آپریشن مکمل نہ ہو سکتا اور آج سے کچھ سال پہلے بھی اس نے ایسا ہی ایک کام کیا تھا۔ تب میں اپنی جان کا خود دشمن بنا ہوا تھا۔ خودکشی کی حرام موت مرنے کے لئے گندم کی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور واپس جینے کے راستے پر کھینچ لایا تھا۔''

عمران بولا۔ ''اب مجھے اوتار ہی نہ بنا دینا۔ یہ نہ ہو کل یہاں کے لوگ میرا مجسمہ بنا کر پوجنا شروع کر دیں...... اور مجسمہ بنانے کے سلسلے میں یہ لوگ بڑے بے صبرے ہیں۔ بعض اوقات زندہ اوتار کو ہی گردن توڑ کر مار دیتے ہیں اور پھر مسالے وغیرہ لگا کر اس کا مجسمہ بنا دیتے ہیں۔'' وہ ہنستا ہوا اور ہمیں خدا حافظ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں خالی خالی نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ سلطانہ بولی۔ ''عمران بھائی بہت اچھے ہیں، پر ان کے بارے میں مجھے جیادہ پتا ناہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں...... کون ہیں؟ آپ دونوں کا ملنا کیسے ہوا؟''

''مجھے ابھی تک خود اس کے بارے میں زیادہ پتا نہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

''اچھا مہروج! ابھی تم جیادہ باتیں ناہیں کرو۔ ڈاکٹر جی نے آرام کا کہا ہے...... لیکن یہ گندم کی گولیوں والی کیا بات تھی؟''

''زبردست۔ ایک طرف باتیں نہ کرنے کا کہہ رہی ہو اور دوسری طرف اتنی لمبی چوڑی داستان بھی پوچھ رہی ہو؟''

''کتنی لمبی ہوئیں گی؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''جتنی لمبی تمہاری، نیلے تھوتھے کی پڑیا والی داستان ہے۔'' وہ ایک دم خجل سی ہو گئی۔

وہ تھوڑی دیر سر جھکا کر بیٹھی رہی پھر میرے گھٹنے کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''مجھے ماف کر دینا

مہروج! میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے۔ اب ایسا ناہیں ہوئیں گا۔ میرے من پر جو کچھ بھی بیتے، پر میں اپنا وعدہ ناہیں توڑوں گی۔''

''ایک وعدہ میں نے بھی تم سے کیا ہے اور میں بھی وہ نہیں توڑوں گا۔ جب تک جارج گورا سے بدلہ نہیں لے لیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

وقتِ رخصت ڈاکٹر لی وان کے گلے شکوے کافی حد تک دور ہو چکے تھے۔ عمران نے اس سے دست بستہ معافی مانگ لی تھی اور ڈاکٹر نے اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کے مطابق عمران نے ڈاکٹر تک پہنچنے کے لئے نل پانی کے نواح تک سفر کیا تھا۔ ہوشیار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کھیت مزدوروں کے روپ میں نکلے تھے۔ ان کے پاس ایک ایسا چھکڑا تھا جس پر ترپال ڈالی گئی تھی اور ترپال کے نیچے سبزیاں تھیں۔ پُرخطر سفر کے بعد عمران نے ڈاکٹر کو اس کے بیڈروم میں جا پکڑا تھا۔ ڈاکٹر اپنے اصولوں کا پابند تھا۔ کسی صورت اسپتال سے جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً عمران کو دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے گن پوائنٹ پر ڈاکٹر کو زبردستی چھکڑے میں بٹھایا۔ عمران اور ہوشیار سنگھ ویران لیکن دشوار راستوں پر سفر کرتے ہوئے بصد مشکل یہاں تک پہنچے۔ کم از کم دو مقامات ایسے تھے جہاں ان کی مڈبھیڑ حکم کے کارندوں سے ہوتے ہوتے رہی۔ چھکڑا ہوشیار سنگھ نے ہانکا تھا۔ عمران اور ریوالور سمیت ڈاکٹر لی وان کے ساتھ موجود رہا تھا۔ فتح پور پہنچنے سے کافی پہلے ہی ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

اب یہ سب کچھ ماضی قریب کا حصہ بن چکا تھا۔ میرے آپریشن کو دو روز ہو چکے تھے۔ اس کامیاب آپریشن کے بعد ڈاکٹر لی وان اب نل پانی واپس جا رہا تھا۔

ڈاکٹر کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس علاقے میں اور کس مقام پر ہے اور اس نے پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اب پروگرام یہ تھا کہ عمران پہلے کی طرح ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھے گا اور اسے چھکڑے کے ذریعے قریباً پندرہ میل دور ایک ایسی جگہ تک چھوڑ آئے گا جہاں سے اسے آگے جانے کے لئے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی یا پھر وہ معقول معاوضہ دے کر کسی کسان کو اپنے ساتھ سفر کرنے پر تیار کر لے گا۔

عمران نے انگلش میں کہا۔ ''ڈاکٹر! آپ کو ہمارے لئے جو تکلیف اُٹھانا پڑی ہے اس کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر بھی ہم سب چاہتے ہیں کہ......''

''نہیں مسٹر آمران! اس سے آگے ایک لفظ نہیں بولنا۔ ورنہ ہمارے درمیان پھر دشمنی شروع ہو جائے گی۔ اگر تم مجھے کچھ دینا چاہتے ہو تو بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ مجھے افسوس

ہے کہ میں اس نیپالی بارونڈا کے لئے کچھ نہ کر سکا...... مگر خوشی ہے کہ میں یہاں بارونڈا اور ڈاکٹر چوہان کے اس ساتھی کی مدد کر سکا ہوں۔“

”لیکن ڈاکٹر......“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ ڈاکٹر کا لہجہ حتمی تھا۔ ”جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔“

عمران نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے ڈاکٹر! لیکن کم از کم اتنے پیسے تو لے لیں کہ آپ کو آگے سفر کرنے میں آسانی ہو اور خدانخواستہ راستے میں کوئی دشواری ہو تو اس کا سامنا کیا جا سکے۔“

اس کے ساتھ ہی عمران نے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی ڈاکٹر لی وان کے سامنے کر دی۔ ڈاکٹر نے اس میں سے صرف چار پانچ نوٹ اُٹھائے اور جیب میں رکھ لئے۔

ڈاکٹر لی وان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر تابش! کیا تمہارے دوستوں، ڈاکٹر چوہان وغیرہ کو پتا ہے کہ تم کہاں اور کن لوگوں کے ساتھ ہو؟“

”نہیں ڈاکٹر! انہیں ابھی پتا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری وجہ سے انہیں بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ وہ مجھے ڈھونڈتے رہے ہوں گے اور شاید اب بھی ڈھونڈ رہے ہوں گے لیکن اب میں زیادہ دیر انہیں اس پریشانی میں نہیں رکھوں گا۔ بہت جلد ان سے رابطہ کروں گا۔“

”کیا تم ان تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتے ہو؟“

”میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ انہیں براہِ راست کوئی پیغام دیں۔ اس طرح آپ کے لئے مشکل ہو سکتی ہے۔ ہاں، اگر آپ کسی گمنام ذریعے سے انہیں میری خیر خیریت سے آگاہ کر دیں تو اور بات ہے۔“

ڈاکٹر لی وان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جیکی کی حسین بیوی شکنتلا بیمار ہے اور وہ ایک دن مشورے کے لئے اس کے پاس آئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر لی وان کے سامنے وضاحت کی کہ وہ جیکی کی بیوی نہیں۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا اور یہ اتنا قریبی تعلق تھا کہ شکنتلا نے جیکی کی موت کو ایک بیوی ہی کی طرح محسوس کیا۔

روانگی کے وقت عمران نے بڑی معذرت کے ساتھ ڈاکٹر لی وان کی آنکھوں پر پٹی باندھی پھر وہ عمران اور ہوشیار سنگھ کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

O......❖......O

میرے آپریشن کو دس روز گزر چکے تھے۔ اب میں خود کو بالکل صحت مند اور چوکس محسوس

کرتا تھا۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ تاریک اور یخ بستہ۔ میں اور عمران قدیم مندر کے عقبی دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے سرد تازہ ہوا کو اپنے جسم پر محسوس کیا اور ایک ماہ بعد سہ منزلہ تہ خانوں سے نکلا تھا۔ مجھے لگا کہ میں زمانوں بعد کھلی فضا میں پہنچا ہوں۔ میں نے تاروں بھرے آسمان کو دیکھا، درختوں کو دیکھا، فتح پور کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا اور یہ سب کچھ بالکل نیا لگا...... شاید یہ اس لئے بھی نیا تھا کہ آج میں آزاد تھا۔ اپنی مرضی سے بلاخوف جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ نادیدہ نگاہیں میرا تعاقب نہیں کر سکتی تھیں۔

”یہ دیکھو جگر!“ عمران نے [illegible] طرف اشارہ کیا۔ مجھے قدیم مندر کا جلا ہوا حصہ نظر آیا۔ کوئلہ، شہتیر، جلی ہوئی لکڑیاں اور ملبہ وغیرہ ابھی تک ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس ڈھیر کو دیکھ کر وہ سارے پُر ہنگام منظر میری نگاہوں میں گھوم گئے جو چند ہفتے پہلے ہم نے اس مندر میں دیکھے تھے۔ ان میں [illegible] پرشاد کی موت کا منظر سب سے دردناک تھا۔

آفتاب خاں کی ہدایت کے مطابق ہم [illegible] پر کھڑے ہو کر اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ لیا پھر [illegible] سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے۔ اس طرف آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک بڑا جوہڑ تھا اور اس کے کنارے [illegible] اور کائی بھی موجود تھی۔ ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک سایہ سا ایک دیواری اوٹ سے نکلا اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ یہ آفتاب خاں تھا۔ حسبِ معمول اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی تھی۔ ہمارے اور آفتاب خاں کے درمیان قریباً تیس قدم کا فاصلہ تھا۔

ہم آفتاب کے پیچھے چلتے چلتے دو تین سنسان گلیوں سے گزرے اور خالی احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس احاطے کے چاروں طرف چھ سات فٹ اونچی کچی دیواریں تھیں۔ شاید یہ جگہ مویشیوں کو باندھنے کے لئے استعمال ہوتی تھی مگر سردی کی وجہ سے اسے وقتی طور پر ترک کر دیا گیا تھا۔ یہاں ایک ٹوٹے پھوٹے چھپر کے نیچے ایک چھکڑا کھڑا تھا۔ چھکڑے کو ترپال سے اچھی طرح ڈھانپ دیا گیا تھا۔ چھکڑے کے آگے دو تازہ دم گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ عمران نے ترپال اُٹھا کر ٹارچ جلائی اور چھکڑے کے اندر جھانکنے کے بعد مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

عمران نے ابھی تک مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ چھکڑے میں تازہ سبزیاں ہیں اور ہم انہیں زرگاں لے کر جائیں گے۔ اس چھکڑے اور سبزیوں وغیرہ کا سارا انتظام آفتاب خاں نے ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے اسی آرام دہ چھکڑے پر عمران، ڈاکٹر لی وان کو یہاں لانے کے لئے نل پانی بھی جا چکا تھا۔

وقتِ رخصت عمران نے آفتاب خاں کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر ہم دونوں آفتاب خاں سے گلے ملے اور چھکڑے میں آ بیٹھے۔ ہم دونوں دیہاتی لباس میں تھے۔ سروں پر بڑے بڑے پگڑ تھے۔ ہم دونوں کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ سخت سردی سے بچنے کے لئے ہم نے چادروں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں۔ مقامی رواج کے مطابق بکل اس طرح ماری جاتی تھی کہ اس میں سر کے علاوہ دو تہائی چہرہ بھی چھپ کر رہ جاتا تھا۔

چھکڑے میں نہایت اعلیٰ قسم کے لیموں اور صحت مند قسم کی سبز مرچیں لدی ہوئی تھیں۔ عمران نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں لیموں، سبز مرچوں اور لہسن کی بڑی شاندار فصل ہوتی ہے۔ خاص طور سے لیموں اور سبز مرچوں کی فصل منڈی تک پہنچتی ہی نہیں۔ اردگرد کے زمیندار اور کھاتے پیتے لوگ فصل تیار ہونے کے انتظار میں رہتے ہیں اور منہ مانگے داموں خرید لیتے ہیں۔ اس چھکڑے میں ہم قریباً ایک من نہایت اعلیٰ قسم کی سبز مرچ اور قریباً اتنے ہی لیموں لے کر زرگاں جا رہے تھے۔ یہ سوغات مختلف مرحلوں سے گزر کر حکم جی کے راج بھون تک پہنچتی تھی۔

عمران نے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ آفتاب نے احاطے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اپنے طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔

لیموں زبردست خوشبو دے رہے تھے، مرچوں کی بھی اپنی ایک مہک ہوتی ہے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''اتنے زیادہ لیموؤں کا حکم کرے گا کیا؟''

''بھئی، اس کے بہت سے استعمال ہیں۔ سنا ہے کہ حکم کی پانچ پتنیاں اور کافی رکھیلیں وغیرہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے دو چار کو ہر وقت کھٹائی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہو۔''

''بس تمہارا ذہن تو ہر وقت اسی طرح کی باتیں سوچتا ہے؟''

''اور تمہارا ذہن کیا سوچتا ہے اس بارے میں؟''

''میرا تو خیال ہے کہ ان دونوں چیزوں کا اچار بنایا جاتا ہوگا اور بڑے بڑے مرتبانوں میں سنبھال لیا جاتا ہوگا۔''

''جب تم خود اتنے سمجھدار ہو تو خواہ مخواہ اپنے سوال ضائع کیوں کرتے ہو؟ یہ چیزیں واقعی اچار بنانے میں استعمال ہوں گی۔ دنیا کے ہر خطے کی طرح یہاں بھی بہترین چیزوں پر طاقتور لوگوں اور حکمرانوں کا حق ہی ہے۔ ہر اچھی چیز کا رخ ان لوگوں کے گھروں کی طرف رہتا ہے۔ بہترین خوراک، شراب، عورتیں، معالج، ہنرمند سب کچھ ایک ہی سمت میں دوڑتا چلا جاتا ہے۔''

''یہ تو ناانصافی ہے۔''

''ہے تو ناانصافی لیکن قدرت کبھی کبھی حساب برابر بھی کر دیتی ہے۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بری چیزیں بھی ان لوگوں کے گھروں کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔''

''بری چیزیں؟ کیا مطلب؟''

''یار! ہم کوئی اچھی چیزیں ہیں؟ اور جس ارادے سے ہم تشریف لے جا رہے ہیں وہ بھی خاصا خراب ہے۔ اللہ ہمیں اس خراب ارادے میں کامیاب کرے اور اس خرابی میں اتنا اضافہ کر دے کہ یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں۔ بلکہ اگر کسی نے کسی سے کہنا ہو کہ تمہیں عبرت ناک سزا ملے گی تو یہ کہے کہ تمہیں 'جارج ناک' سزا ملے گی۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''ہم کب تک پہنچ جائیں گے زرگاں؟''

''اگر حالات ہمارے حق میں رہے اور کالی بلیوں نے رستہ نہ کاٹا تو کل رات کسی وقت۔''

''اگر کالی بلیوں نے راستہ کاٹا تو پھر؟'' کالی بلیوں سے مراد حکم کے ہرکارے تھے۔

''پھر ان سے وہی کچھ کہنا ہے جو طے کیا ہے...... وہی پہلے والے فرضی نام ہیں ہمارے۔ میرا نام امیت اور تمہارا گوپال۔ ہم کھیا عبدالرشید کی طرف سے یہ سامان لے کر زرگاں کے راج بھون جا رہے ہیں۔''

ہم نے اپنا اسلحہ اور ایمونیشن سبزی کے اندر اس طرح چھپایا تھا کہ سخت کوشش کے بعد ہی اسے تلاش کیا جا سکتا تھا لیکن اگر ہم چاہتے تو دو تین سیکنڈ کے اندر ان اشیاء تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

عمران کے ساتھ نے میرے اندر ایک عجیب سا جوش بھر دیا تھا۔ کل شام جب ہم اس کارروائی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو عمران نے کہا تھا۔ ''بے شک یہ خطرناک کام ہے لیکن ہمیں اس کے تناؤ اور خطرناکی کو خاطر میں لائے بغیر اسے انجوائے کرنا ہے۔'' اور واقعی آج یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی خطرناک مشن پر نہیں، سیر و تفریح کے لئے جا رہے ہیں۔ عمران گاہے بگاہے کوئی فلمی گانا گنگنانے لگتا تھا یا پھر اپنی کسی فرضی محبوبہ کو یاد کر کے آہیں بھرنے لگتا۔ پیاز کی طرح اس کے اوپر تہ در تہ چھلکے تھے۔ اس کے اندر کیا ہے؟ کچھ خبر نہیں ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''بس مجھے ایک ہی فکر ہے عمران! ہماری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ آفتاب کا تہ خانوں میں آنا جانا کہیں بھانڈا نہ پھوڑ

دے۔''

''لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ میں نے آفتاب کو منع کر دیا ہے۔ وہ ہماری واپسی تک تہ خانوں میں نہیں جائے گا۔''

''تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''بس یونہی۔ جب تم مجھ سے سوال پوچھتے ہو تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ میں خود کو باس باس محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تمہارے دماغ میں کیڑا ہے۔ تم دوسروں کو اُلجھن میں رکھ کر خوشی محسوس کرتے ہو۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ میں دوسروں کو بے خبر رکھ کر انہیں پریشانیوں سے بچاتا ہوں۔ اب یہی دیکھو۔ نالا پار کرنے کے بعد پچھلے ایک گھنٹے تک ہم سخت خطرے میں رہے ہیں لیکن تم مزے سے جماہیاں لیتے رہے ہو اور میرے گانے سنتے رہے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''نالا پار کرتے ہی ''کلرے'' کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں کے سرکنڈوں میں بے تحاشا سانپ ہیں۔ ہوشیار سنگھ نے بھی کہا تھا کہ یہ چار پانچ میل کا راستہ ہمارے سفر کا سب سے خطرناک حصہ ہے۔ سانپ گھوڑا گاڑیوں میں گھس آتے ہیں اور سواری کے جانوروں کو ڈس لیتے ہیں۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا تو اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہونا تھا کہ پچھلا ایک گھنٹا تم بھی سخت ٹینشن میں گزارتے۔''

''لیکن اس سے میرا اعتماد تو گڑبڑ ہوا ہے نا۔ اب آئندہ بھی تم مجھ سے پتا نہیں کیا کیا چھپاؤ گے۔''

''نہیں...... باقی سب کچھ تمہارے علم میں ہے۔ سوائے ایک بات کے۔'' اس نے آخری الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے۔ اس کے لہجے میں یہ عجب پن بس تین چار سیکنڈ پہلے ہی آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، اس نے بیٹھے بیٹھے جست لگائی اور سبزیوں کے اوپر جا گرا۔ میں نے گھبرا کر ٹارچ جلائی اور یہ دیکھ کر سکتے میں رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ میں ایک سانپ کی گردن ہے۔ یہ درمیانے سائز کا سانپ تھا اور اس کے جسم پر گول داغ سے تھے۔

سانپوں کے بارے میں میرا علم زیادہ نہیں تھا۔ بس یہی سنا تھا کہ ایسے سانپ کو ''کوڑی والا'' سانپ کہا جاتا ہے اور یہ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ گردن پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے سانپ کا منہ پورا کھل گیا تھا اور اس کے نکیلے دانت دکھائی دینے لگے...... عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر سبزیوں کے نیچے سے موٹے کینوس کا وہ چھوٹا بیگ نکالا جس میں ریوالورز کے راؤنڈز رکھے تھے۔ عمران کے اشارے پر میں نے بیگ کو الٹا کر خالی کیا۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے سانپ کو بیگ میں ڈال کر اوپر سے زپ کھینچ دی۔

اب ہمیں شک ہو گیا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور سانپ بھی نہ ہو۔ ہم نے گاڑی روک دی اور ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح تلاشی لی۔ سبزیوں کو بھی الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔

''لگتا ہے کہ یہ اکیلا ہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم اتنے یقین سے ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ اکیلا تھا۔''

''کیا مطلب...... گاڑی کا ایک ایک انچ تو دیکھ لیا ہے۔''

''تم ایک ایک ملی میٹر بھی دیکھ لو تو یہ نہیں کہہ سکتے۔''

''بھئی، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یار! ہو سکتا ہے کہ یہ اکیلا نہ ہو بلکہ اکیلی ہو۔ ہم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نر ہی ہے۔ اس کے لئے تو دن کی روشنی میں تفصیلی معائنے کی ضرورت پڑے گی اور اگر یہ سانپ نہیں سانپنی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ہم مردوں سے معائنہ کرانے سے ہی انکار کر دے۔ آخر ''ناگنی حقوق'' بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔''

''ناگنی حقوق؟''

''بھئی جس طرح انسانی حقوق ہوتے ہیں......''

وہ پٹری سے اُتر گیا تھا پھر بولتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چھکڑا بھی چلتا رہا۔ دور جنگل کی گہرائی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔

O......❖......O

یہ اگلی رات، گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا۔ ایک طویل اور پُر خطر سفر طے کر کے ہم زرگاں کی بھری پُری آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔ زرگاں میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں کم از کم تین جگہ روکا گیا تھا اور باقاعدہ سوال جواب کئے گئے تھے۔ چھکڑے میں رکھی سبزیوں کا بھی سرسری معائنہ ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ فتح پور اور اس کے گرد و نواح سے اس طرح کی سوغاتیں اکثر راج بھون کے لئے آتی رہتی ہیں۔ زرگاں کے مسلح محافظوں نے ہمیں زیادہ شک و شبہے کا

نشانہ نہیں بنایا۔ بہرحال، اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم اسی طرح چھکڑا ہانکتے ہانکتے راج بھون میں داخل ہو جائیں گے تو یہ ہماری غلط فہمی تھی۔ راج بھون سے کچھ فاصلے پر ہی مسلح محافظوں نے ہمیں روک لیا اور چھکڑا ایک طرف لگانے کا حکم دیا...... یہاں پہلے سے کئی چھکڑے، گھوڑا گاڑیاں اور لوڈر وغیرہ کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر پر وہ سامان خورد و نوش تھا جو راج بھون میں جانا تھا۔ سبزیاں، دودھ، پھل اور اس قسم کی دیگر اشیاء۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گھوڑا گاڑی میں شراب کی بہت سی بوتلیں لدی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ خوبرو طوائفیں اور ان کے سازندے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب لوگ منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ راج بھون میں جانا چاہتے ہیں مگر انہیں اس کی اجازت نہیں مل سکی۔ راج بھون کی شاندار عمارتیں ایک اونچی فصیل نما دیوار کے اندر محفوظ تھیں۔ میں یہ دیوار پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن اب یہ پہلے سے زیادہ اونچی نظر آ رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں ہونے والے پے در پے خونی واقعات کے بعد ہی اس دیوار کو مزید بلند کیا گیا ہے۔ اس طرح کے اضافی حفاظتی انتظامات ہر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ سامان خورد و نوش والی گاڑیاں اب براہِ راست راج بھون کی حدود میں نہیں جا سکتی تھیں۔ یہ سارا سامان اب یہاں سے خاص شاہی گھوڑا گاڑیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا اور ان گاڑیوں کو راج بھون کے باوردی کوچبان چلا رہے تھے۔

راج بھون کی قریباً ایک درجن عمارتوں میں وہ عمارت بھی شامل تھی جہاں جارج گورا آج کل رہتا تھا۔ اس سے پہلے جارج گورا، راج بھون کی حدود سے باہر رہائش پذیر تھا مگر جب سے سلطانہ والا واقعہ ہوا تھا اور بپھرے ہوئے لوگوں نے اس کی رہائش گاہ پر دیوانہ وار چڑھائی کی تھی، وہ اپنی رہائش راج بھون کی حدود کے اندر لے آیا تھا۔ وہ آہنی رکاوٹوں، بلند دیواروں اور مسلح محافظوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ ہمیں یہ سارے گھیرے توڑ کر اس تک پہنچنا تھا۔ مارنا تھا یا مر جانا تھا۔

''تم نے ایک خاص چیز نوٹ کی؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دونوں اپنے چھکڑے کے قریب ہی کھڑے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''راج بھون میں ضرورت سے زیادہ روشنی نظر آ رہی ہے۔''

''اور میرے خیال میں آتش بازی بھی ہو رہی ہے...... وہ دیکھو ایک اور ہوائی گئی۔'' میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے، کوئی جشن وغیرہ ہے۔''

عمران نے قریب کھڑے ایک گاڑی بان سے پوچھا تو اس نے مقامی لب و لہجے میں بتایا۔ ''آج بڑا شبھ دن ہے۔ بھگوان نے ہمیں خوشی دکھائی ہے۔ حکم جی کے ہاں بیٹے نے جنم لیا ہے......''

دو اور گاڑی بان بھی وہاں آ گئے اور اس پُر مسرت موقع کے حوالے سے باتیں کرنے لگے۔ عمران نے مجھے ٹہوکا دیا اور ہم اپنے چھکڑے میں چلے آئے۔ سب سے پہلے ہم نے سبزیوں کے نیچے سے اپنا اسلحہ نکالا۔ یہ دو ریوالوروں اور دو عدد شکاری چاقوؤں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ گولیاں وغیرہ تھیں۔ یہ سب کچھ ہم نے موٹے پولیتھین میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا تاکہ بارش یا پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ ایک ریوالور، ایک چاقو اور تھوڑا سا ایمونیشن میں نے اپنے لباس میں رکھ لیا اور اوپر سے گرم چادر کی بکل مار لی۔ باقی اشیاء عمران نے سنبھال لیں۔ ان میں وہ کینوس بیگ بھی تھا جس میں ایک آوارہ سانپ استراحت فرما رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''اس چھکڑے کے ساتھ راج بھون میں گھسنے کی امید تو ختم ہو گئی ہے۔ اب دوسرے آپشن پر عمل کرنا ہوگا۔ دوسرا آپشن پتا ہے نا؟''

''اتنا ہی پتا ہے جتنا تم نے بتایا تھا۔ راج بھون کی شمالی دیوار کی طرف ایک جھیل ہے جس میں سے گزر کر دیوار تک پہنچا جا سکتا ہے۔''

''بندے کو جتنا تھوڑا پتا ہوتا ہے، وہ اتنا ہی سکون میں رہتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں یہ بتا دیتا کہ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس میں سے گزرتے ہوئے ہمیں دیوار پر سے دیکھا جا سکتا ہے اور ہم پر چاند ماری ہو سکتی ہے...... اور جھیل پار کرنے کے بعد ہمیں بغیر کسی سیڑھی کے قریباً پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا ہوگا تو یقیناً تمہاری صحت پر بہت بُرے اثرات پڑتے۔''

''میری صحت کا اتنا خیال رکھنے کا بہت شکریہ...... ٹھنڈے پانی اور چاند ماری کی زیادہ فکر نہیں۔ جو کچھ ہوگا، دونوں کے ساتھ ہوگا لیکن یہ جو دیوار کی بات کر رہے ہو، اس کا کیا کریں گے......؟''

''یہ بڑا اور یجنل سوال ہے اور اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تم بالغ ہو گئے ہو۔ اب تم وہ ساری فلمیں دیکھ سکتے ہو...... جو پہلے بھی دیکھ لیتے تھے...... اور جن میں قابلِ اعتراض بات صرف یہی ہوتی تھی کہ ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں

تمہارے اس اوریجنل سوال کا جواب دیتے ہوئے بہت مسرت محسوس کر رہا ہوں۔''

''فرماؤ...... کیا جواب ہے؟''

''اوئے گھامڑ! تمہارے ساتھ سرکس کی دنیا کا نمبرون جمناسٹر موجود ہے...... یہ دیوار پینتیس فٹ کے بجائے پینتیس میٹر بلند بھی ہوتی تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری معلومات کے مطابق یہاں ہمارے لئے ایک بونس سہولت بھی موجود ہے۔ ایک رسّی اس دیوار پر چڑھنے کے لئے پہلے سے لٹک رہی ہے اور امید ہے کہ وہ اب تک لٹک رہی ہو گی۔''

''کس نے لٹکائی ہے؟''

''جادو برحق ہے یار۔'' اس نے بات کو گول کیا اور مجھے لیتا ہوا چھکڑے سے باہر آ گیا۔

راج بھون کے اردگرد رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کھا پی رہے تھے اور ہلا گلا کر رہے تھے۔ کہیں سے طربیہ ساز بجنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون کے اردگرد بھی آتش بازی شروع ہو گئی۔ ہم راج بھون کی بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک طویل چکر کاٹ کر شمال کی جانب آ گئے۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ روشنیاں بھی بس کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، خاموشی مزید گہری ہوتی گئی۔ یہاں دور تک برفیلی جھیل کا پانی چمک رہا تھا۔ قریباً دو سو میٹر چوڑی جھیل کے آخری سرے پر راج بھون کی بلند فصیل تھی اور فصیل کے اندر چراغاں اور آتش بازی کی روشنی تھی۔ فصیل نما دیوار کے اوپر بھی کہیں کہیں مشعلیں اور قندیلیں روشن نظر آتی تھیں۔ ہم دونوں نے خود کو زمانہ قدیم کے جنگجوؤں کی طرح محسوس کیا جو دشمن کے کسی اہم قلعے پر شب خون مارنے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک پُرخطر تاریکی میں اُترے تھے۔

ہمارے ہتھیار موٹے پولیتھین میں لپٹے تھے اور بالکل محفوظ تھے۔ ہم نے میچ کا آغاز کرنے والے پُرجوش کھلاڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور یخ بستہ پانی میں اُتر گئے۔ اس پانی کو صرف یخ بستہ کہنا کافی نہیں تھا۔ یہ سیال برف تھی جو ہمارے جسم سے ٹکرائی اور اپنی ٹھنڈک کو ہماری ہڈیوں تک لے گئی۔ پانی ہماری کمر تک پہنچ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سینے تک چلا گیا پھر ہم تیرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ جہاں جھیل ختم ہو گی اور دیوار شروع ہو گی، وہاں اِکا دُکا محافظ موجود ہوں گے۔ ہماری خواہش یہی تھی کہ پانی کی گہرائی جلد از جلد کم ہو جائے تاکہ ہم تیرنے کے بجائے چل سکیں۔ تیرنے سے شور پیدا

ہوتا تھا اور یہ ہمارے لئے خطرناک تھا۔

جلد ہی ہماری پریشانی اطمینان میں بدل گئی۔ ہمارے پاؤں پھر سے زمین سے لگنا شروع ہو گئے۔ اب پانی پر ہاتھ پاؤں چلنے کی آواز معدوم ہو گئی اور ہم خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے صرف سر ہی پانی سے باہر تھے۔ اب ہمیں فصیل کے اندر کا بلند و بالا شور بھی ایک بھنبھناہٹ کی صورت سنائی دینے لگا تھا۔ گاہے بگاہے تاریک آسمان پر آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور ان کا مدھم عکس جھیل کے پانی پر جھلک دکھاتا تھا۔

ابھی ہم پانی کے اندر ہی تھے کہ ہمیں دیوار نما فصیل کے پاس پہرے داروں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ ایک کیبن نما جگہ پر ہلکی سی روشنی دکھائی دی اور قہقہوں کی آواز آئی۔ کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا، اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں تین چار افراد موجود ہوں گے۔ عمران اور میں انتہائی خاموشی کے ساتھ پانی سے باہر نکلے اور یخ بستہ ریت پر اوندھے لیٹ گئے۔ تیز ہوا ہمارے تربتر کپڑوں سے ٹکرائی اور یوں لگا کہ جھیل سے باہر کی سردی جھیل کی سردی سے زیادہ ہے۔ عمران نے کمال مہارت کے ساتھ لکڑی کے کیبن کی طرف رینگنا شروع کیا۔ میں نے بھی جیسے تیسے اس کی تقلید کی۔ ہم ہر طرح کے خطرے اور مار دھاڑ کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ہم کیبن کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے جب اچانک لکڑی کا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ ایک ہٹا کٹا پہرے دار جو واضح طور پر نشے میں تھا، کندھے سے رائفل لٹکائے باہر نکلا۔ ہمیں دیکھے بغیر وہ ہم سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور ایک پتھر کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگا۔ اس کی حاجت ابھی آخری مراحل میں تھی کہ عمران کسی عفریت کی طرح اس پر جا پڑا۔ یہ ایک پرفیکٹ حملہ تھا۔ ہٹا کٹا پہرے دار ہلکی سی آواز بھی نہیں نکال سکا۔ فقط اس کے گرنے سے مدھم آواز پیدا ہوئی...... عمران نے اس کا سر اتنی شدت کے ساتھ پتھر سے ٹکرایا کہ اس نے ایک لمحے میں ہاتھ پاؤں پھینک دیئے۔ عمران نے پھرتی سے اس کی رائفل کندھے سے اُتار لی۔

ہٹے کٹے پہرے دار کے گرنے سے جو مدھم آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے کیبن تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''کانتے! یہ کیا آواج ہے بھائی؟''

عمران نے تیزی کے ساتھ بے ہوش پہرے دار کو گھسیٹ کر پتھر کی اوٹ میں کیا۔ اسی دوران میں کیبن کا دروازہ پھر چرچرایا۔ دوسرا پہرے دار باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں بوتل پکڑ رکھی تھی۔ اس نے کھوجی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور ایک بار پھر اپنے ساتھی کانتے کو آواز دی۔

میں تاریکی میں، مَیں کیبن کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ میرا ریوالور والا بازو اس کی گردن سے لپٹ گیا اور خالی ہاتھ سے میں نے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خاردار مونچھیں میری ہتھیلی پر چبھیں۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ بارونداجیکی نے مجھے انسانی گردن کے ان نازک حصوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا جن پر خاص انداز میں دباؤ ڈالنے سے انسان ہوش وحواس سے بیگانہ ہوسکتا ہے۔ میں نے اس تربیت کو آزمانے کی کوشش کی لیکن صرف جزوی کامیابی حاصل ہوسکی۔ میرے شکار کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور نرم ریت پر گری۔ میں نے تب تک اس کی گردن پوری طاقت سے دبائے رکھی جب تک وہ میرے ہاتھوں میں چھپکلی کی طرح جھول نہیں گیا۔ میں نے اسے آرام سے ریت پر لٹا دیا۔ عمران نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دونوں انگوٹھے اوپر اُٹھا کر ''ویلڈن'' کا اشارہ دیا۔

اندر فقط ایک اور پہرے دار موجود تھا مگر اس کے خلاف کسی طرح کی کارروائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ شراب کے نشے میں اتنا ٹُن تھا کہ بس نیم مردہ ہی نظر آتا تھا...... ایک آہنی انگیٹھی کے قریب وہ بے سدھ پڑا تھا۔

عمران نے اس باوردی پہرے دار کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم کے گھر بلا پیدا ہونے کی خوشی میں یہ فوت ہو چکا ہے یا صبح تک ہو جائے گا۔''

کیبن میں سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے اور یہاں وہاں تاش کے پتے پڑے تھے۔ کیبن کی کھونٹیوں پر پہرے داروں کی تین چار وردیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں مزید افراد بھی متعین ہیں لیکن فی الحال وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ گشت پر ہوں یا پھر راج بھون کے جشن طرب میں شریک ہونے کے لئے فصیل کے اندر چلے گئے ہوں۔

ہمارے کپڑے بُری طرح بھیگ چکے تھے۔ سرد ہوا کے سبب عمران جیسا شخص بھی کپکپانے پر مجبور ہو رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس سردی کو خوش دلی سے برداشت کر رہا ہوں۔

میں نے کیبن کی کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑائی۔ دور جھیل کے کنارے پر ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یقیناً یہ بھی کوئی ایسا ہی کیبن تھا۔ بہرحال، وہ ہم سے خاصی دوری پر واقع تھا۔ میں نے دیکھا کہ عمران وردیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک وردی میری طرف

بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جسم پر فٹ آئے گی۔''

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی کوئی ڈھونڈ لیتا ہوں یار۔'' اس نے کہا۔

کیبن میں نظر دوڑانے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پتھر کے قریب بے ہوش پڑے شخص کے جسم سے وردی اُتار رہا ہے۔

صرف چار پانچ منٹ بعد وہ نئے روپ میں میرے سامنے آ گیا۔ اب وہ وردی اور سرخ پگڑی کے ساتھ حکم کا ایک چوکس محافظ نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی عمران کی تقلید کی اور باہر تاریکی میں جا کر کپڑے تبدیل کر آیا۔ ایک ایک رائفل بھی ہم نے اپنے کندھوں سے لٹکا لی۔

یہ بات ہمیں بڑی اچھی طرح معلوم تھی کہ اس جانب سے راج بھون کی فصیل میں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس حوالے سے عمران نے بس ہلکا سا اشارہ دیا تھا کہ کوئی رسّی یہاں لٹک رہی ہے جس کے ذریعے بتیس پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا ہے۔ ہم کیبن سے نکلے اور فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ رسّی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا...... ہمیں وہ رسّی نظر آ گئی۔

O......❖......O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

راج بھون کی فصیل اور جھیل کے درمیان ریت کی ایک تنگ پٹی سی تھی۔ کہیں یہ پٹی دس پندرہ فٹ چوڑی تھی اور کہیں دو تین فٹ رہ جاتی تھی۔ کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں یہ پٹی موجود ہی نہیں تھی اور جھیل کا پانی فصیل نما دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہ رسّی ایک ایسی ہی جگہ پر جھول رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چمڑے کی ایک مضبوط بیلٹ ہے۔ اس کے بالائی سرے پر لکڑی کی ایک بڑی چرخی تھی اور نچلے سرے سے ربڑ کا ایک تھیلا سا بندھا ہوا تھا۔ کھلے منہ والے اس لچکیلے تھیلے کو عام طور پر ''بوکا'' کہا جاتا ہے اور اس سے کنوئیں کے اندر سے پانی کھینچا جاتا ہے۔

اب ساری صورتِ حال سمجھ میں آ رہی تھی۔ فصیل کے اوپر لگی ہوئی چرخی کے ذریعے جھیل میں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ یہ انتظام کرنے والوں نے شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اس طرف سے برفاب جھیل کو پار کرے گا اور اس چرخی اور رسّی کو کمند کے طور پر استعمال کرنے کا پروگرام بنائے گا۔

رات کے اس پہر فصیل کا یہ حصہ بالکل تاریک اور بڑی حد تک خاموش نظر آتا تھا...... چرخی کے اردگرد کسی طرح کی نقل و حرکت کے آثار نہیں تھے۔

''میں کیسے چڑھوں گا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''تم چڑھو گے نہیں، چڑھائے جاؤ گے۔'' وہ ترت بولا۔

اس کے بعد اس نے اپنے کندھے سے رائفل اُتار کر ربڑ کے بوکے میں رکھ دی اور مجھے بھی ایسا کرنے کی ہدایت کی۔ پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ''میں اوپر جا رہا ہوں۔ اوپر پہنچ جاؤں تو تم بوکے میں بیٹھ جانا۔ میں چرخی گھما کر تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔''

وہ اتنے اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے تیس پینتیس فٹ اونچی فصیل پر نہیں، کسی گھر کی

قدِ آدم باؤنڈری وال پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے...... اور وہ ایسا انداز اختیار کر بھی سکتا تھا۔ کودنا، پھلانگنا اور چڑھنا اُترنا اس کے پیشے کا حصہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر اوپر جاتے جاتے تم زیادہ اوپر چلے گئے تو؟''

''تو تم میری ساری بیویوں سے شادی کر لینا...... اور میرا لاہور والا مکان بیچ کر میرے حلقے کے ایم این اے کو دے دینا۔ بے چارہ بڑا غریب سیٹھ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی مہارت سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ فقط ایک منٹ میں وہ فصیل پر تھا۔

اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق میں ربڑ کے بوکے میں بیٹھ گیا۔ عمران نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ فصیل پر کھڑے ہو کر میں نے راج بھون کی وسعت میں جھانکا تو وہاں رنگ و نور کا سیلاب نظر آیا۔ کچھ رنگین ہوائیاں ہمارے سروں کے اوپر سے اُڑتی ہوئی گئیں اور جھیل کے پانی میں گم ہو گئیں۔

عمران ہانپ رہا تھا۔ ''یار! تمہاری باتوں میں تو اتنا وزن نہیں لیکن خود کافی وزنی ہو۔''

''اور تم دونوں طرف سے ہلکے ہو۔''

''تمہیں بھی زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں، اگلے آدھ پون گھنٹے میں تمہاری بولتی ضرور بند ہو جائے گی۔''

''بے فکر رہو۔ اگر ہو گی تو دونوں کی ہو گی۔

''لو...... لگ رہا ہے کہ کام شروع ہونے والا ہے۔'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ دو پہرے دار چوڑی فصیل پر چلتے ہوئے سیدھا ہماری طرف آ رہے تھے۔ ہم دونوں نے چہرے ایک دوسرے کی طرف کر لئے اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پہرے دار ہماری طرف توجہ دیئے بغیر گزر جاتے۔

یقیناً گزر جاتے مگر یہاں ہم سے ایک غلطی ہوئی جس کا پتا ہمیں بعد میں چلا۔ ان پہرے داروں کی سرخ پگڑیوں میں ایک نیلی دھاری تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ ہم سے سینئر ہیں۔ مروجہ اصول کے مطابق ہمیں ان کو نمسے کرنا چاہئے تھا۔ ہمارے خاموش رہنے کے سبب وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور پھر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینکی۔ ''تمہاری ڈیوٹی کہاں ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح چونکا۔ غالباً وہ یہاں موجود پہرے داروں کو صورتوں سے پہچانتا تھا میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے...... وہ نہیں

جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت اس کی موت پر مہرِ تصدیق لگا چکی ہے۔ عمران کی بھرپور لات اس کے سینے پر پڑی۔ پیچھے کی طرف لڑکھڑانے کے لئے اس کے پاس ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ وہ پیچھے گیا اور پھر دیوار پر سے جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔ دیوار یعنی فصیل کی موٹائی نیچے سے زیادہ تھی۔ وہاں ایک کنارہ سا بن گیا تھا۔ بدقسمت شخص پہلے اس کنارے سے ٹکرایا پھر جھیل کے برفاب میں چلا گیا۔ دوسرا شخص کافی قوی ہیکل تھا۔ اس نے مجھ پر اندھا دھند ہاتھ چلایا...... وزنی مکا میری ٹھوڑی پر لگا۔ گردن کو لگنے والے دھچکے کے سبب میرے نیم مندمل زخم میں ٹیسیں اُٹھیں اور دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اس ہٹے کٹے شخص کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا اور اس کے سر پر ایک زوردار جوابی مکا رسید کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے اندھا دھند دو اور مکے اس کے کھوپڑے پر ہی رسید کئے۔ وہ پٹ سے گرا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ میرے زوردار مکوں کا یہ وہی نتیجہ نکلا تھا جو اس سے پہلے مکھیا عبدالرشید کی حویلی میں نکلا تھا۔ میں نے پورے طیش سے سلمان سلو کے سر پر دو تین ضربیں لگائی تھیں اور اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک قریبی برجی کے پیچھے سے ایک نہایت جوشیلا پہرے دار نکل کر عمران پر جھپٹا۔ غالباً اس کے جوش و خروش میں کچھ حصہ شراب نوشی کا بھی تھا۔ وہ بھی یہ بات فراموش کر گیا کہ اگر اس کا وار خالی گیا تو انجام کیا ہو گا۔ عمران نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر خود کو اس کی اندھی زد سے بچایا۔ وہ رپٹ کر گرا۔ ایک سیکنڈ کے لئے فصیل کے کنارے پر نظر آیا۔ پھڑ پھڑاتا اور ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔

''بچہ ابھی سیکھ رہا تھا۔'' عمران نے گہرائی میں دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔ پھر گھوم کر ٹارچ کی روشنی اس پہرے دار کے چہرے پر پھینکی جو ابھی تک دیوار کے اوپر ہی تھا۔

اس کا سامنا مجھ سے ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ کر اس کی گھنی مونچھوں کو بھگو رہا تھا۔ ''زندہ ہے یا مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر کی ہڈی ٹوٹ کر مغز میں گھس جائے تو اکثر لوگ زندہ رہنا پسند نہیں کرتے۔''

عمران نے کہا اور مجھے ذرا حیرت سے دیکھ کر ٹارچ بجھا دی۔

یہ فصیل قریباً تین فٹ چوڑی تھی۔ کہیں کہیں باقاعدہ برجیاں تھیں اور وہاں اس کی چوڑائی چھ سے آٹھ فٹ تک تھی۔ ہم دونوں نے مُردہ پہرے دار کی لاش گھسیٹ کر پینتیس فٹ نیچے یخ بستہ جھیل میں پھینک دی اور محافظوں کے انداز میں اکڑ کر چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں طے کیں اور ایک کھلے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہاں راج

بھون کے بیسیوں ملازم اور محافظ وغیرہ جمع تھے۔ کچھ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ کچھ ساز بجا رہے تھے۔ یہاں وہاں مٹھائی بھی تقسیم ہو رہی تھی۔ عمران نے سرگوشی میں کہا۔

''ایک نئے آقا کے نئے ظلم سہنے کا کتنا چاؤ ہے ان لوگوں کو۔''

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ظالم ابن ظالم اور مظلوم ابن مظلوم کی روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی سی مٹھائی لی اور ہلا گلا کرتے لوگوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا رُخ سنہری کلسوں والی اس بلند و بالا عمارت کی طرف تھا جو جنریٹرز کی روشنی سے پوری طرح جگمگا رہی تھی۔ سیکڑوں رنگ برنگے قمقمے تھے اور ابھی مزید لگائے جا رہے تھے۔ یہی عمارت اس اسٹیٹ کے طاقتور فرماں روا رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی کی جائے رہائش تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق سفید چمڑی والے جارج کا عشرت کدہ بھی اسی عمارت کے ساتھ تھا۔

یہاں آ کر میں نے اور عمران نے نوٹ کیا کہ جن پہریداروں کی پگڑیوں میں دھاریاں تھیں، وہ سینئر تھے اور عام پہرے دار پاس سے گزرتے ہوئے انہیں باقاعدہ سر جھکا کر تعظیم پیش کرتے تھے۔ ہم نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا باوردی افراد کے ساتھ کم سے کم ہو۔ فصیل کے عظیم الشان مین دروازے سے وہ خاص خاص مہمان اندر داخل ہو رہے تھے جنہیں اس پُرمسرت موقع پر اندر آنے کی اجازت ملی تھی۔ ان معزز مہمانوں کی شان دار گاڑیاں اور بگھیاں باہر ہی روک لی گئی تھیں۔ وہ پیدل اندر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ بیگمات بھی تھیں...... کچھ مقامی طوائفیں سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر رقص کر رہی تھیں۔ ان کا لباس، رقص سے بڑھ کر اور رقص، لباس سے بڑھ کر ہیجان خیز تھا۔ وہ گانا بھی گا رہی تھیں۔ یما یماں...... یما یماں...... بس آج کی رات ہے زندگی۔ کل ہم کہاں تم کہاں...... کچھ اس طرح کا گیت تھا۔

گیت کی لہریں، موسیقی، پھڑکتے جسم اور آتش بازی...... یہ سب مل جل کر عجیب سماں باندھ رہے تھے اور اس صورتِ حال میں...... ہم دونوں ایک نہایت خطرناک ارادے کے ساتھ دھیرے دھیرے حکم جی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''وہ دیکھو، ادھر ہجوم ہے۔'' عمران نے ایک جانب اشارہ کیا۔

یہ جگہ حکم جی کی عالی شان رہائش گاہ کے عین سامنے تھی۔ ہم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس ہجوم کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک جگہ رنگ برنگے فواروں کے درمیان کھلے احاطے میں پُرجوش لوگوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، ملازم پیشہ افراد

بھی اور محافظ بھی۔ کسی مقامی رسم کے مطابق یہ لوگ ایک دوسرے پر چینی پھینک رہے تھے اور چہروں پر رنگ مل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہولی کے بغیر ہی ہولی منائی جا رہی ہے۔

عمران نے آگے بڑھ کر ایک محافظ کے چہرے پر رنگ ملا تو جواباً اس نے بھی بہت سا رنگ عمران کو مل دیا۔ عمران نے گیلے رنگ کی مٹھی بھری اور میرا چہرہ بھی رنگ دیا۔ اس کوشش میں ہم دونوں کی مخصوص پگڑیاں گر گئی تھیں۔ ہم نے یہ پگڑیاں پھر سروں پر رکھیں۔ پہلے تو میں نے عمران کی اس حرکت کو صرف اس کی شوخی سمجھا تھا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ اس ''شوخی'' کی آڑ میں ہم دونوں کافی حد تک اپنی شناخت چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ ان میں راج بھون کے گارڈز اور سپاہی بھی شامل تھے۔ عمران نے بھی پگڑی اُتار کر لہرانی شروع کر دی۔ کسی طرف سے نعرہ بلند ہوا۔ ''ہمارے حکم جی کی......'' سیکڑوں لوگوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''جے۔''

''ہمارے ولی عہد کی......''

سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ ''جے۔''

ہم بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے اور قدم قدم آگے بھی بڑھتے رہے۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''لو...... آج حکم جی کو بھی دیکھ لو۔''

''کہاں؟''

''وہ دائیں طرف دیکھو، بالکونی میں۔''

اور پھر واقعی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ مجھے پہلی بار نظر آیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں جو تصور قائم کر رکھا تھا، وہ اس سے زیادہ بارعب اور اونچا لمبا تھا۔ اس کے قد و قامت میں کچھ عمل دخل شاید اس چمک دار پگڑی کا بھی تھا جو اس نے بڑے شاہانہ ٹھاٹ سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کافی دوری پر تھا۔ اس کے گلے کی نہایت قیمتی مالائیں اور انگشتریاں وغیرہ پھر بھی چمک دکھا رہی تھیں۔ بالکونی میں اس کے ساتھ شاہی خاندان کے اور بھی کئی مرد و زن موجود تھے۔ ان میں زرق برق لباسوں والی چار رانیاں بھی موجود تھیں۔ تاہم مہارانی رتنا دیوی یقیناً ان میں نہیں تھی کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق بچہ اسی کو تولد ہوا تھا۔

یکا یک مجھے لگا کہ میرے جسم کا سارا لہو میرے سر کو چڑھ رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ لگا، پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بالکونی میں معزز افراد کے درمیان میری نگاہ شیطانِ اعظم جارج گورا پر پڑی۔ اپنے

نہایت سرخ وسپید چہرے اور نمایاں قد کاٹھ کے سبب وہ علیحدہ پہچانا جارہا تھا۔ ہاں، یہی تھا وہ شخص جس کے خون کی پیاس روز وشب میرے اندر بڑھتی اور پھیلتی جارہی تھی۔ اسی نے میری سلطانہ کو روندا تھا، اسی نے اسے توڑ پھوڑ کر ناقابلِ شناخت بنایا تھا۔ اسے کوئی حق نہیں تھا مسکرانے کا، شاہی بالکونی میں کھڑے ہوکر چہکنے کا...... سانس لینے کا اور زندہ رہنے کا...... ہاں، کوئی حق نہیں تھا۔

عمران نے بھی جارج گورا کو بالکونی میں دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نگاہ ملائی اور اس بے پناہ حرارت کو محسوس کیا جو گورا کی شکل دیکھنے کے بعد ہمارے رگ وپے میں دوڑی تھی لیکن ہمارے اور اس شیطان کے درمیان بہت فاصلہ تھا، بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ بالکونی خاصی بلندی پر تھی اور بالکونی کے آگے ایک وسیع رقبے کو بالکل خالی رکھا گیا تھا۔ اس رقبے کے گرد آہنی باڑوں اور محافظوں کی دُہری تہری قطاروں نے حد بندی کر رکھی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بس ایک حد تک ہی آگے جاسکیں گے۔ زیادہ آگے گئے تو مشکوک قرار پائیں گے......

پھر بھی ہم کوشش کرنا چاہتے تھے، شاید کوئی راہ مل جاتی اور شاید ہم کسی ایسی جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے جہاں سے جارج گورا پر رائفل کا فائر کیا جاسکتا۔ حالانکہ کسی ایسی کوشش کی کامیابی کا امکان بہت کم اور پکڑے جانے کا اندیشہ بہت زیادہ تھا۔ تب میری نظر جارج گورا کے ساتھ کھڑے دو دوسرے افراد پر پڑی۔ ان میں سے ایک مرد تھا اور دوسری عورت۔ اس عورت کو بھی میں سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ یقیناً یہ ماریا تھی۔ اسے ہم نے اپنی شرائط منوانے کے لئے اغوا کیا تھا لیکن یہ ہمارے گروپ کے ایک غدار کو ''ایک رشوت'' پیش کر کے فرار ہوگئی تھی۔ ماریا کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا، وہ بھی میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ سرجن اسٹیل تھا، ماریا کا شوہر نامدار...... اسی نے میرے جسم میں وہ منحوس چپ رکھی تھی جس نے ایک طویل عرصے تک مجھے پابندِ سلاسل کیا اور میں مسلسل کوششوں کے باوجود اس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہ سکا۔

ہم آگے کو کھسکتے رہے لیکن پھر ایک جگہ ہمیں رکنا پڑا۔ ہمیں لگا کہ اب اس سے آگے نہیں جاسکیں گے۔ یہاں طوائفیں اور راج بھون کی خدمت گار عورتیں بھی ہجوم میں گھسی ہوئی تھیں۔ بدمست مرد ان سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ کہیں کہیں یہ چھیڑ خانیاں دست درازیوں میں بدل چکی تھیں، تاہم خوشی کے اس موقع پر یہ عورتیں کچھ زیادہ معترض نہیں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس صورتِ حال کو نظرانداز کر رہی تھیں۔

اس سے پہلے میں نے حکم جی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ صرف ایک مرتبہ بارونداجیکی کے پاس چند تصویریں دیکھی تھیں۔ یہ تصویریں دراصل جیکی کی محبوبہ شکنتلا کی تھیں۔ ان میں حکم جی بھی موجود تھا، تاہم جیکی نے اظہارِ نفرت کے طور پر حکم جی کے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر سیاہی پھیر دی تھی...... آج حکم میرے سامنے تھا۔ بے شک وہ آج بھی کافی فاصلے پر تھا مگر میں کم از کم اسے دیکھ تو سکتا تھا۔ اسے حکمراں کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی راہنما کا درجہ بھی دیا جاتا تھا...... اور میں دیکھ رہا تھا کہ بالکونی میں اس کا انداز مذہبی راہنماؤں جیسا ہی ہے۔ ایک زرنگار چوغہ اس کے کندھوں پر تھا اور وہ گاہے بگاہے بڑے ''برگزیدہ'' انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اس سے آگے نہیں جاسکیں گے۔'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''اور ہمارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''جھیل کے کنارے بے ہوش پڑے پہرے داروں کو کسی بھی وقت دیکھا جاسکتا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''چڑی بے چاری کی کرے...... ٹھنڈا پانی پی مرے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ بالکونی میں کھڑے شاہی افراد کی سخاوت اور دریا دلی نے جوش مارا۔ حکم جی نے وہی کچھ کیا جو قدیم زمانوں سے پُرشکوہ حکمران اپنی ''نیچ'' رعایا کو خوش کرنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر کچھ چیزیں نیچے نچھاور کرنا شروع کر دیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ان میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ سونے چاندی کے سکے اور قیمتی پتھر وغیرہ بھی شامل تھے۔ حکم جی کے ساتھ ہی ان کی رانیاں اور دو چار دیگر افراد بھی اس شاہانہ سخاوت میں شریک ہوئے۔ جب بالکونی کے سامنے خالی احاطے میں قیمتی اشیاء کی غیر متوقع بارش ہوئی تو کوئی رُکاوٹ رُکاوٹ نہ رہی۔ لوگ ایک سیلاب کی طرح امڈے اور ان اشیاء پر جھپٹے۔ باڑیں اکھڑ گئیں، محافظوں کا حصار تتر بتر ہو گیا......

یہ ایک نادر موقع تھا...... ''چلو۔'' عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم بھی اس انسانی ریلے کا حصہ بن گئے جو احاطے کی طرف لپک رہا تھا۔ اس اچانک بھگدڑ کے سبب کئی لوگ گر گئے تھے۔ دوسرے انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے...... میں نے دیکھا کہ باوردی محافظ بھی اپنے اہم فریضے کو لات مار کر قیمتی اشیاء پر جھپٹنا شروع ہو

گئے ہیں۔ یہ منظر دیدنی تھا۔ میں اور عمران باڑیں پھلانگتے ہوئے احاطے میں پہنچے...... کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ لوگ بھوکے جانوروں کی طرح قیمتی سِکوں پر جھپٹ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے اور چلا رہے تھے۔

ہم نے بھی چند اشیاء اُٹھائیں اور جھک کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب ہم نے بھری ہوئی رائفلیں اپنے ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم بالکونی کے عین سامنے تھے۔ یہ سنگِ سرخ کی شاندار بالکونی زمین سے کم وبیش تیس فٹ بلند تھی۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف سے اوپر جانے کا راستہ تھا ہی نہیں...... فقط ایک جانب ایک چھوٹی سی گلی نظر آ رہی تھی...... یہ گلی غالباً محل کے اندرونی حصوں کی طرف جانے کے لئے تھی۔ تاہم اس گلی کے سامنے حکم جی کے خصوصی محافظوں کا دستہ چوکس کھڑا تھا۔

''کیا کریں؟'' میں نے قریباً چلا کر عمران سے پوچھا۔

''یہیں سے فائر کرو۔'' اس نے ہانپتی آواز میں کہا۔

ہمیں بالکونی میں حکم، جارج گورا، سرجن اسٹیل اور ماریا وغیرہ کے بس بالائی دھڑ نظر آ رہے تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم نے رائفلیں سیدھی کیں۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی ٹریگر دباتا، لوٹ مار میں مصروف ایک ہٹا کٹا شخص توپ کے گولے کی طرح عمران سے ٹکرایا۔ عمران لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی رائفل کا میگزین علیحدہ ہو کر دور جا گرا۔

میں نے ایک سیکنڈ کے نصف حصے میں یہ سب کچھ دیکھا اور سمجھ گیا کہ اب عمران فائر نہیں کر سکے گا۔ میں نے رائفل اندازے سے جارج گورا کی طرف سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ رائفل میڈیم برسٹ پر سیٹ تھی۔ خوفناک تڑتڑاہٹ سے فضا گونجی اور بالکونی کی ریلنگ کے آس پاس چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ میں نے فوراً ہی دوسرا برسٹ مارا۔ بالکونی میں نظر آنے والی چمکیلی پگڑیاں اور رنگین آنچل ایک دم ہی اوجھل ہو گئے۔ میں لوگوں سے ٹکراتا اور انہیں پھلانگتا ہوا واپس پلٹا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دور ہٹ کر بالکونی پر مزید برسٹ ماروں لیکن پھر میری نظر ایک چہرے پر پڑی اور میرا جسم سنسنا گیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ مجھ سے قریباً بیس میٹر کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔

''پکڑو...... پکڑو......'' وہ میری طرف اُنگلی اُٹھا کر دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی برق رفتاری سے میری طرف آیا۔

اب رکنا فضول تھا۔ میں اور عمران پلٹ کر دوڑے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس جگہ

یہ نہایت خطرناک شخص ہمیں نظر آئے گا۔ وہ نہ صرف نظر آیا تھا بلکہ اب پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھی آ رہا تھا۔ عمران نے ابھی تک رنجیت پانڈے کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لئے اسے علم نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے کون سی بلا لگ گئی ہے۔

ہم شاہی بالکونی کے سامنے جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے، وہ کر چکے تھے۔ اب ہمیں یہاں سے کسی طرح بھاگنے کی کوشش کرنا تھی۔ ہم باڑیں پھلانگ کر واپس بڑے ہجوم کے اندر گھس گئے۔ یہاں ابھی تک بیشتر لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ بالکونی کے سامنے کیا ہوا ہے...... فائرنگ کی تڑتڑ آتش بازی کی آوازوں میں گم ہو گئی تھی اور ہلچل تو ویسے بھی ہر طرف مچی ہوئی تھی۔ ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے فصیل کے جنوبی دروازے کی طرف بڑھے مگر جب اُدھر سے بھی گارڈز کو حرکت کر کے اپنی طرف آتے دیکھا تو رخ بدل لیا۔ سامنے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا، ہم اس میں گھس گئے۔ یہ راج بھون کا وسیع وعریض باورچی خانہ تھا۔ ایک قطار میں درجنوں دیگیں آگ پر دھری تھیں۔ ہم ان دیگوں کو پھلانگتے ہوئے ایک بڑے ہال کمرے میں گھس گئے۔ یہاں بہت سی عورتیں دو رویہ بیٹھی تھیں، ان کے سامنے قالینوں پر بڑے بڑے تھال تھے۔ وہ پکوانوں میں ڈالنے کے لئے خشک میوہ جات کاٹ رہی تھیں۔ ہم تندبگولوں کی طرح ان کے درمیان سے گزر گئے، وہ چلاتی اور ہڑبڑاتی رہ گئیں۔ ایک طویل برآمدے میں سفید وردیوں والے درجنوں خانساماؤں نے ہمیں حیرت اور خوف کے عالم میں دیکھا۔ عمران کا دھکا لگنے سے ایک گیم شیم باورچی اوندھے منہ ایک بڑے دیگچے میں گرا اور ہمیں صرف اس کی اوپر اُٹھی ہوئی ٹانگیں نظر آئیں۔

ہمارے عقب میں ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی اور رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آندھی کی طرح اُڑا چلا آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پانڈے مجھے پہچان نہیں سکا ہوگا۔ میرے چہرے پر رنگ ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے صرف فائرنگ کرتے دیکھا تھا اور مجھے پکڑنے کے لئے جھپٹ پڑا تھا۔ اس حوالے سے اس کی تیز نگاہی کی داد دینا پڑتی تھی۔ اندرونی دروازے سے بیس تیس قدم پہلے تین چار گارڈز ہمارے راستے میں آئے مگر وہ شدید تذبذب میں تھے۔ جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں روکنا ہے یا کسی اور کو روکنا ہے۔ ایک گارڈ نے عمران کا راستہ روکا تو عمران نے اس کے چہرے پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگائی۔ ایک دوسرے گارڈ کو میں نے دھکا دے کر دور پھینکا...... کچھ فاصلے پر ایک لوڈر حرکت کرتا ہوا فصیل کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں ترپال تنی ہوئی تھی۔ عمران مجھ سے آگے تھا، وہ دوڑتا ہوا لوڈر کے بائیں طرف والے دروازے سے اندر داخل ہو

گیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں نے لوڈر کے ڈرائیور کو اچھل کر دوسرے دروازے سے باہر گرتے دیکھا۔ یقیناً عمران ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بھی عمران کے ساتھ جا کر بیٹھ سکتا۔ میں نے جست لگائی اور چلتے ہوئے لوڈر کے عقب میں سوار ہو گیا۔ تاہم اس کوشش کے دوران میں میری رائفل گر گئی۔

عمران نے مجھے سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گیئر بدلا اور یکا یک لوڈر کی رفتار بڑھا دی۔ مجھے درمیانی شیشے میں سے ونڈ اسکرین دکھائی دے رہی تھی۔ بیرونی دروازے پر بیریئر تھا اور مسلح گارڈز تھے۔ عمران ایک دھماکے سے بیریئر کو توڑتا ہوا نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نصف درجن گارڈز ہکا بکا رہ گئے۔ ان میں سے شاید ایک دو گارڈز نے گولی چلائی ہو گی لیکن تب تک ہم مین راستے پر آ چکے تھے۔ یہاں بھی بہت سی گھوڑا گاڑیاں اور چھکڑے وغیرہ موجود تھے۔ عمران ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

''ٹھیک ہو؟'' اس نے لوڈر کے کیبن میں سے ہانک لگائی۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔ پر رائفل گر گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... اللہ اور دے گا۔''

''لگتا ہے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔'' میں نے اطلاع دی۔

''کون ہے؟''

''یہ وہی ذلیل رنجیت پانڈے ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ واقعی کسی بلا کی طرح ہمارے پیچھے تھا۔ وہ پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ میری رائفل گر گئی ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ میں اس پر فائر کر سکتا ہوں۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوڈر کی رفتار تیز ہونے سے پہلے وہ چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو جائے۔ لوڈر سے اس کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میں نے وردی کے نیچے سے اپنا لوڈڈ ریوالور نکال لیا۔ میں مکمل تاریکی میں تھا۔ آندھی کی طرح لوڈر کے پیچھے آتا ہوا رنجیت پانڈے میری حرکات و سکنات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ریوالور دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پانڈے کا نشانہ لے لیا لیکن پھر پتا نہیں کیوں...... میں نے اس پر گولی نہیں چلائی...... میں نے اسے جست کر کے لوڈر پر چڑھنے دیا۔

وہ کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ چنگھاڑتا ہوا میرے اوپر آ پڑا۔ تاریکی میں مجھے بس اس کی آنکھیں ہی چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ غالباً اس کے چہرے پر بھی کسی نے تھوڑا سا

رنگ مل دیا تھا۔ ہم اوپر نیچے لوڈر کے دھاتی فرش پر گرے۔ گرتے گرتے پانڈے نے میری ٹھوڑی پر زوردار ٹکر رسید کی اور اپنی طبع کے مطابق ایک غلیظ گالی دی...... اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سرکاری پستول نکال کر میری کنپٹی پر رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے راستے میں ہی اس کی کلائی پکڑ لی اور پوری طاقت سے مروڑ کر جوابی ٹکر اس کے تھوبڑے پر رسید کی۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اسے ٹانگوں پر اچھال کر لوڈر کی سائیڈ سے دے مارا۔ جب وہ گھوما تو اس کی کلائی بدستور میری گرفت میں تھی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح سنائی دی۔ پانڈے کی کراہ کرب ناک تھی۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ اس نے تلملا کر میرے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ دیوان کی طرح ایک بار پھر مجھے اس کی بے پناہ جسمانی قوت کا اندازہ ہوا۔ یہ ایک گھونسا کسی بھی شخص کو ہوش و حواس سے بیگانہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ میری برداشت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے اس مہلک گھونسے کو برداشت کرتے ہوئے جوابی وار کیا...... اور یہ کوئی معمولی وار نہیں تھا۔ یہ پانڈے جیسے خطرناک غنڈے اور قاتل کے شایانِ شان تھا۔ یہ اس دس انچ لمبے پھل والے شکاری چاقو کا وار تھا جو میں نے دو تین سیکنڈ پہلے اپنی پنڈلی میں سے کھینچا تھا۔ یہ چاقو پورے کا پورا پانڈے کے پہلو میں گیا۔ وہ بڑے دردناک انداز میں چلایا۔ اس کی آنکھیں تکلیف اور حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے بے رحمی سے چاقو کو اوپر کی طرف کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ پانڈے کا پیٹ کئی انچ تک پھٹ گیا۔

آخری کوشش کے طور پر اس نے میرا چاقو والا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اب اس کے فولادی جسم کی طاقت نصف بھی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوسرا وار اس کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ میں کیا۔ چاقو پھر اس کی انتڑیوں میں چلا گیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس نے بائیں ہاتھ سے میری آنکھیں نوچنے کی کوشش کی۔ وہ نزع کے عالم میں داخل ہو گیا تھا...... بی ایس ایف کا درندہ صفت افسر، دہشت و بربریت کا نشان، حکم جی کی مونچھ کا بال...... اس تیز رفتار لوڈر کی تیرگی میں آناً فاناً اپنے سارے منافع بخش عہدوں سے ''مستعفی'' ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ موت کے رُوبرو تھا۔ میں نے پے در پے تین اور وار اس کے پیٹ اور سینے پر کئے...... اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا...... اچانک لوڈر کو ایک شدید ترین جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ لوڈر کی بائیں جانب والی دیوار نے ایک مقناطیس کی طرح مجھے اپنے ساتھ چپکا لیا ہے۔ لوڈر الٹ رہا تھا۔ تب ایک خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ میں نے پانڈے کے جسم کو اچھل کر چھت سے ٹکراتے دیکھا۔ خود میں بھی

اسی طرح چھت سے ٹکرایا...... تب کئی لڑھکنیاں کھا کر کسی نرم چیز پر گرا۔ میرے چاروں طرف نیم تاریکی تھی اور گرد و غبار تھا۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ لوڈر کسی گھر کی دیوار توڑ کر کسی کمرے میں گھسا ہے۔ جونہی میں گرا تھا، میرے کانوں سے کسی کے چلانے کی سُریلی آواز بھی ٹکرائی تھی۔ یہ آواز میرے نیچے سے بلند ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ میں ایک قالین پر گرا تھا اور میرے نیچے ایک جواں سال لڑکی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو ذرا ہاتھ پاؤں چلا کر میرے نیچے سے نکل جاتی مگر وہ اتنی وحشت زدہ تھی کہ مسلسل چلانے کے سوا کچھ بھی کر نہیں پا رہی تھی۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس وقت میں نے عمران کو بھی سڑک کے کنارے سے اُٹھتے دیکھا۔ لوڈر ایک طرف اُلٹا پڑا تھا۔ اس کے شیشے چکنا چُور ہو چکے تھے، ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ جونہی میں پیچھے ہٹا، لڑکی اُٹھ کر کسی نامعلوم سمت میں بھاگ گئی۔ تب میں نے ایک فربہ اندام ہندو عورت کو بھی ملبے سے نکل کر بھاگتے اور تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ میں نے نیم تاریکی میں دائیں بائیں ہاتھ چلایا اور خوش قسمتی سے اپنا ریوالور ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

یہ دراصل سڑک کے بالکل کنارے پر ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ لوڈر اس کی بیرونی دیوار توڑتا ہوا اندر گھس گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ چائے خانہ ایک ہندو بیوہ اور اس کی بیٹی کا تھا اور وہ بند چائے خانے کے اندر ہی سو رہی تھیں۔

''وہ آ رہے ہیں؟'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

راج بھون سے ہمارے پیچھے لگنے والی گھوڑا گاڑیاں سرپٹ بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ ہمارے پاس صرف چند سیکنڈ کا وقت تھا۔ ہم ملبے میں سے نکلے اور جس طرف رخ تھا، اسی طرف دوڑ نکلے۔ ہمارے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ عمران بھی اپنی ناکارہ رائفل راج بھون میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

''پکڑو...... پکڑو۔'' کئی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرائیں۔

ہم نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے نہر کا چوبی پل پار کیا اور ایک آبادی میں گھس گئے۔ ہمارے عقب میں فائرنگ بھی ہوئی لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ ایک بھری پُری آبادی تھی لیکن اس وقت گلیاں سو رہی تھیں اور ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم ایک طویل خم دار گلی میں دوڑتے چلے گئے۔ ہمارے عقب میں بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔

''مارے گئے۔'' عمران کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آگے گلی بند تھی۔ ہم واپس پلٹے۔ وہ بڑے نازک لمحے تھے۔ عمران کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ اس نے دو تین قریبی دروازوں کو اپنے کندھے سے زوردار ضربیں لگائیں۔ جس تیسرے دروازے کو اس نے کندھے سے ضرب لگائی، اس کے اندر کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ ہم پلک جھپکتے میں اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں تاریکی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ایک بڑا گملا نظر آیا۔ عمران نے اور میں نے گملا گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کر دیا۔ یوں چٹخنی نہ ہونے کے باوجود دروازہ بند ہو گیا۔

کوئی بڑی عمر کا شخص زور سے کھانسا۔ کسی قریبی کمرے سے اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے بھیا؟''

تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ اُبھری، وہ ڈیوڑھی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے دائیں جانب والے ایک دروازے کو دھکیلا، وہ کھل گیا۔ ہم ایک نیم گرم کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک جواں سال لڑکی ریشمی بستر پر نظر آئی۔ یقیناً چند سیکنڈ پہلے وہ سو رہی تھی۔ اب آوازیں سن کر جاگ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے حیرت سے آنکھیں کھولیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چلاتی اور کسی کو مدد کے لئے بلاتی، میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہونٹ پوری سختی سے بند کر دیئے تھے۔ وہ میری گرفت میں بس تڑپ پھڑک کر رہ گئی۔ جب میں نے اس کی نازک گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھایا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اگر وہ زیادہ مزاحمت کرے گی تو اس کی کوئی ہڈی چٹخ جائے گی۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس دوران میں عمران کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔ پھر اس نے لالٹین بھی بجھا دی۔

''کون ہے بھیا۔'' گھر کے مالک کی بھرائی ہوئی آواز پھر اُبھری۔

جواب میں خاموشی تھی۔ وہ شخص ڈیوڑھی تک آیا۔ چند سیکنڈ تک سن گن لیتا رہا۔ غالباً تاریک ڈیوڑھی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ عمران نے خوفناک پھل والا شکاری چاقو نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اگر شور مچاؤ گی تو ایک سیکنڈ میں اس چاقو سے شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔ اگر چپ رہو گی تو وعدہ کرتا ہوں تمہیں خراش تک نہیں آئے گی...... ہاتھ تک نہیں لگائیں گے تمہیں۔''

دھیرے دھیرے اب ہماری آنکھیں کمرے میں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ یہ درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا بغلی دروازہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی اسٹور نما جگہ تھی۔ ایک طرف طاق میں مورتیاں وغیرہ سجی ہوئی تھیں۔ ہم ایک ہندو گھر میں

داخل ہوئے تھے۔

لڑکی ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمجھدار ہے۔ صورتِ حال کو سمجھ گئی ہے اور ہمارے ساتھ، کم از کم وقتی طور پر تعاون کرنے کو تیار ہے۔ عمران نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھی اور میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ گھگیائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم کو کچھ ناہیں کہنا...... جو جی چاہتا ہے یہاں سے لے لو......اور چلے جاؤ......بھگوان کے لئے......'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''چلے جاتے ہیں......لیکن تھوڑی دیر بعد......اس سے پہلے اگر تم نے کوئی حرکت کی تو تمہارا جیون تو جائے گا ہی......باقیوں کے لئے بھی بہت بُرا ہوگا۔''

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ ناہیں بولوں گی۔''

''آہستہ بولو۔'' عمران پھنکارا۔

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ ناہیں بولوں گی۔'' اس نے اتنی باریک آواز میں اپنے الفاظ دہرائے کہ ایسے گھمبیر موقع پر بھی صورتِ حال میں مزاح کی جھلک محسوس ہوئی۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور کہا۔ ''چلو......اس چھوٹے کمرے میں چلو۔''

وہ پہلے تو جھجکی لیکن جب عمران نے تحکم سے کہا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی ہمارے ساتھ چھوٹے دروازے میں داخل ہوگئی۔ میرے اندازے کے عین مطابق یہ ایک بالکل چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ عمران نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی۔ یہ اسٹور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ہلکی پھلکی گھریلو ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ لڑکی نے ہمارے جسموں پر سرکاری وردی دیکھی اور اس کا زرد چہرہ کچھ اور زرد ہوگیا۔ اس کی حیرت کی وجہ یہ بات بھی تھی کہ ہمارے چہرے رنگ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ لوڈر الٹنے سے ہمارے جسم پر خراشیں بھی آئی تھیں۔ ایسی ہی ایک بڑی خراش عمران کے بازو پر تھی۔ وہاں سے جرسی پھٹ گئی تھی اور خون رِس رہا تھا۔ میری وردی پر پانڈے کے خون کے دھبے تھے۔

''تمہارا نام؟'' عمران نے پوچھا۔

''و......وجنتی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اس گھر میں تمہارے علاوہ اور کون کون ہے؟''

''میرے ماتا پتا اور چھوٹا بھائی جگدیش۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

اسی دوران میں باہر گلی سے شور شرابا بلند ہونے لگا۔ دروازے کھٹکھٹائے جا رہے تھے اور گرجتی برستی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

اب عمران کے ہاتھ میں شکاری چاقو کی جگہ ریوالور نظر آ رہا تھا۔ ایسا یقیناً اس نے وجنتی نامی اس لڑکی پر دباؤ ڈالنے کے لئے کیا تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''دیکھو، کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ وہ جب تک یہاں آس پاس ہیں، ہم تمہارے گھر میں رہیں گے، اس کمرے میں۔ تم اپنے گھر والوں کو بھی ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ اگر تم نے ہمیں چھپالیا تو ہم وچن دیتے ہیں کہ تمہیں کچھ بھی کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''مم......میں کسی کو کچھ ناہیں بتاؤں گی۔'' وہ ایک بار پھر گھگیائی۔

''اور تم سارا وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گی۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔'' عمران نے ریوالور کو ہاتھ میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''ناہیں نکلوں گی۔ وچن دیوت ہوں، ناہیں نکلوں گی۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''ہم یہاں اس اسٹور روم میں رہیں گے۔ تم اس ریوالور کے نشانے پر رہو گی......اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ تم چالاکی دکھا رہی ہو تو میں گولی چلا دوں گا۔ ہم دو خون ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکے ہیں، تیسرا اور چوتھا کرنے میں بھی ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' عمران کے آخری الفاظ نے لڑکی پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بالکل زرد نظر آنے لگی۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے پھر قدموں کی چاپ اُبھری۔ وجنتی کا پتا اب پھر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اس نے بھی گلی سے اُبھرنے والا شور سن لیا تھا۔ ڈیوڑھی کی طرف والے دروازے کی نچلی درز سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اب بوڑھے کے ہاتھ میں لالٹین ہے۔ کچھ دیر بعد بوڑھے کے بڑبڑانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً اس نے دیکھ لیا تھا کہ بیرونی دروازے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی ہے اور دروازے کو بند کرنے کے لئے اس کے آگے گملا رکھا گیا ہے۔

عمران نے تیز سرگوشی میں لڑکی سے کہا۔ ''دروازے کے آگے گملا ہم نے رکھا ہے۔ اگر تمہارا پتا پوچھے تو اس سے کہنا کہ یہ تم نے رکھا ہے کیونکہ دروازے کی چٹخنی خراب ہوگئی ہے۔''

لڑکی زود فہم تھی۔ فوراً ہی عمران کی بات سمجھ گئی۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ''جی پتا جی۔'' لڑکی وجنتی نے نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''دروازے پر گملا تم نے رکھا تھا؟''

''ہاں پتا جی......کواڑ ناہیں لگ رہے تھے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' بڑی عمر کے شخص کی آواز آئی۔

اسی دوران میں دروازے کے عین سامنے کچھ لوگوں کے بولنے کی بھاری آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً یہ راج بھون کے گارڈز تھے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ کھولا۔ ایک کرخت آواز نے پوچھا۔ ''تم لوگن خیریت سے ہو؟''

''جج......جی ہاں۔''

''دو خطرناک بندے یہاں کہیں آس پاس چھپے ہوئے ہیں۔ پوری طرح چوکس رہو۔ اگر کوئی شک ہو تو فوراً اطلاع کرو۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وجنتی کے پتا نے پریشان آواز میں کہا۔

بھاری آوازوں والے افراد آگے چلے گئے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد وجنتی کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عمران نے وجنتی کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وجنتی نے بڑے کمرے میں جا کر دروازہ کھولا۔ ہم چھوٹے سے اسٹور میں موجود رہے۔ وجنتی کا پتا لالٹین تھامے اندر آ گیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا پچاس ساٹھ سالہ شخص تھا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا اور گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ ہراساں لہجے میں بولا۔ ''محلے میں کوئی ڈکیت گھس آئے ہیں۔ سپاہی آئے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے ہیں، سب کو ہوشیار رہنا چاہئے۔''

اتنے میں باہر کے کسی کمرے سے کسی عورت کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے جگدیش کے پتا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ ناہیں......سو جاؤ۔'' بوڑھے نے وہیں سے کہا۔

اپنے لب و لہجے سے یہ شخص ذرا سخت مزاج دکھائی دیتا تھا۔ اس نے وجنتی سے کہا۔ ''آ جاؤ......تم ہمارے کمرے میں آ جاؤ۔''

''نن......ناہیں پتا جی......کوئی بات ناہیں۔'' وجنتی بولی۔

''اچھا پھر دروازہ اندر سے بند کر لو۔'' اس کے پتا نے کہا۔

وجنتی نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ باہر ڈیوڑھی میں کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وجنتی کا پتا ہتھوڑی کے ساتھ، اکھڑی ہوئی چٹخنی کو پھر سے اس کی جگہ پر جما رہا تھا۔ گلی میں گاہے بگاہے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگتی تھیں اور اہلکاروں کی بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس علاقے کو گھیرے ہوئے ہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد قدرے سکون ہو گیا۔ وجنتی کا پتا چٹخنی مرمت کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ گلی میں بھی نسبتاً خاموشی تھی، ہاں کچھ دوری سے مدھم آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ غالباً یہ آوازیں جائے حادثہ سے آ رہی تھیں۔ یعنی جس جگہ لوڈر الٹا تھا۔

عمران کی ہدایت پر لڑکی وجنتی نے لالٹین پھر سے روشن کر دی تاہم اس کی لو اتنی دھیمی رکھی کہ کمرے میں ہلکی سی روشنی ہی پھیل سکی۔ عمران نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ ''لوڈر پر کون چڑھا تھا؟''

''وہی پانڈے تھا اور کون؟''

''مار دیا؟''

''پتا نہیں۔ زخمی تو اچھا خاصا ہوا ہے۔''

''تم کچھ زیادہ ہی کھلتے جا رہے ہو۔'' عمران نے ناراضی سے کہا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مصنوعی ناراضی ہے اور اندر سے وہ خوش ہے۔

''اور تم نے لوڈر کی قلابازی کیوں لگوائی؟'' میں نے پوچھا۔

''آگے دو بندے آ گئے تھے، انہیں بچانے کی کوشش کی۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔

وجنتی انگریزی نہیں جانتی تھی۔ وہ منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال، وہ اب پہلے سے کچھ کم خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ بھی تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آ گئی۔

میں نے وجنتی سے پوچھا۔ ''تمہارا پتا کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ لکڑی کا کام کرت ہیں۔''

''لکڑی کا کیا کام؟'' عمران نے ذرا تلخی سے وضاحت چاہی۔

''بندوقوں کے دستے وغیرہ بناوت ہیں۔ اس سے پہلے......'' وہ رک گئی۔

''اس سے پہلے......کیا؟''

''پہلے وہ راج بھون کی فوج میں تھے۔ دو سال پہلے ہی ان کی ملازمت پوری ہوئی ہے۔ ملازمت ختم ہونے پر راج بھون سے پیسا ملتا ہے، اسی سے پتا جی نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔''

گھر کی ظاہری حالت اچھی تھی۔ عمران نے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم جی رحم دل واقع ہوا ہے۔ ملازموں کو کافی پیسا دیتا ہے۔''

''آپ بھی تو فوجی ہو۔ کیا آپ کو پتا ناہیں؟'' وہ ہمیں ذہین نظروں سے سرتا پا دیکھ کر

بولی۔

عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اگر ہم کہیں کہ ہم فوجی نہیں ہیں تو پھر؟“

”مم...... مجھے پہلے ہی لگ رہا ہے جی کہ...... آپ وہ ناہیں ہو جو نظر آوت ہو۔“

یہ بات تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟“ عمران نے پوچھا۔

”اس لئے کہ آپ کو راج بھون کے فوجی ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”ہم باغی فوجی بھی تو ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پر آپ کی بولی اور طرح کی ہے۔ آپ کے پاس جو پپ...... پستول ہیں، وہ بھی اور طرح کے ہیں۔“

”بچی سیانی ہے بھئی۔“ عمران نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

میں نے اسے پھر دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، اگر تم ہمارے کہنے پر چلو گی تو ہم کسی کو بغیر کوئی نقصان پہنچائے یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم سے ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ خود کو پُرسکون رکھو۔“

”مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا لیکن اب کم لگ رہا ہے۔“ وہ صاف گوئی کے انداز میں بولی۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لئے کہ آپ حکم جی کے سپاہی ناہیں ہو۔“

”تو تم حکم کے سپاہیوں سے ڈرتی ہو؟“

”ہر کوئی ڈرتا ہے۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خاص معاملہ ہے۔“ عمران نے کھوجنے والے لہجے میں پوچھا۔

”نن...... ناہیں۔ ایسی تو کوئی بات ناہیں۔“

”اگر ہے تو بتا دو۔ ہو سکتا ہے ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہم ایک آدھ دن کے لئے تمہارے اس اسٹور میں محفوظ ہیں؟“

”پتا جی اور جگدیش کی تو خیر ہے...... لیکن ماتا جی کسی کام سے اسٹور میں آسکت ہیں۔“

”تو پھر؟“

”یا پھر میں دروازے کو تالا لگا دوں گی اور کہوں گی کہ چابی گم ہو گئی ہے۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔

”کیا ہم تمہیں شکلوں سے اتنے ہی بے وقوف نظر آتے ہیں کہ تمہیں تالا لگانے دیں گے؟“ عمران نے کہا۔

وہ شپٹا گئی۔ ”نن...... ناہیں۔ میرا یہ مطلب ناہیں تھا۔ میں...... میں ماتا جی کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گی۔“

اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ عمران نے کہا۔ ”اگر تم تھوڑی دیر کے لئے سونا چاہو تو بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ہم یہاں اسٹور میں رہیں گے۔“

وہ تذبذب میں تھی۔ کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ تو گئی لیکن اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں۔ عمران کی جادوئی شخصیت کی وجہ سے اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا تھا مگر اب وہ اتنی بھی بے خوف نہیں ہوئی تھی کہ ہماری موجودگی میں آرام کرنے کے بارے میں سوچتی۔

ہم اسٹور میں موجود رہے۔ یہاں دیگر چیزوں کے ساتھ بندوقوں کے کئی مکمل اور نامکمل دستے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک دیوار پر ایک پرانی تصویر بھی لگی تھی جس میں وجنتی کا پتا فوجی وردی میں تھا اور باقاعدہ حکم جی کی قدم بوسی کر رہا تھا۔ حکم نے کسی مذہبی پیشوا کی طرح اس کے سر پر اپنے ہاتھ کا سایہ کیا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ستیش کے پتا آنجہانی رام پرشاد کی طرح یہ شخص بھی ایک کٹر مذہبی شخص ہے۔ ایک عیاش حکمران سے اس طرح کی عقیدت دقیانوسیت ہی کہلا سکتی تھی۔

میں اور عمران بیٹھے رہے، ہم دونوں کے ذہنوں میں راج بھون میں پیش آنے والے ہنگامہ خیز واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے...... میں نے بالکونی کی طرف دو برست چلائے تھے۔ تاہم ان برستوں کا رزلٹ مجھے معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کھڑکیوں سے مدھم روشنی نظر آنے لگی۔ ایک پُر ہنگامہ شب کی صبح ہونے والی تھی۔ تاہم اس صبح میں بھی اَن گنت اندیشے تھے۔ وجنتی کا پتا جاگ گیا تھا...... اور صحن میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا...... پھر وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے وجنتی سے پوچھا تو اس نے مدھم آواز میں بتایا کہ پتا جی اس وقت دودھ لینے جاوت ہیں۔ پھر وہ بولی۔ ”اگر ماتا جی یہاں آ گئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی تک یہاں کیوں بیٹھی ہوں اور باہر نکل کر منہ ہاتھ کیوں ناہیں دھوتی؟“

”لحاف اوڑھ کر لیٹی رہو۔ ان سے کہنا میری طبیعت خراب ہے۔“

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ ریوالور مسلسل عمران کے ہاتھ میں تھا اور وہ وجنتی کو باور کرا رہا تھا کہ کسی بھی ایسی ویسی حرکت کا نتیجہ خطرناک نکلے گا۔

وجنتی کے پتا نے گھر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے زور زور سے وجنتی کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ وجنتی نے لحاف سے نکل کر دروازہ کھولا۔ وجنتی کے پتا نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے بیٹا! رات کو راج بھون میں زبردست گولی چلی ہے۔ بڑے ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی صاحب مارے گئے ہیں۔ ایک دو بندے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ چھوٹا پانڈے بھی بہت زیادہ زخمی ہے۔ کہوت ہیں کہ وہ بچ نا ہیں پائے گا۔''

''ہائے رام۔'' وجنتی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اسی دوران میں وجنتی کی فربہ اندام ماتا بھی اندر آ گئی۔ اس نے بھی اپنے پتی کی بات سن لی تھی اور اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ''ہائے بھگوان! یہ کیا کلجگ ہوا ہے، کیا واقعی بڑے ڈاکٹر صاحب......؟''

''ہاں بھاگوان! وہ دو راکھشس تھے۔ پتا نا ہیں کس طرح راج بھون میں گھس گئے۔ نہ صرف گھس گئے بلکہ اس جگہ تک بھی پہنچ گئے جہاں حکم جی رانیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بالک کے جنم کی خوشی میں دان کر رہے تھے۔ ان دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس سرکاری رائفلیں بھی تھیں۔ انہی رائفلوں سے انہوں نے فائرنگ کی ہے۔''

''وشواس نا ہیں ہو رہا......'' وجنتی کی ماں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''وہاں تو اتنا کڑا پہرا ہووت ہے۔ چڑیا بھی پر نا ہیں مارتی۔''

''کچھ لوگن کہتے ہیں کہ وہ دو یا تین بندے تھے اور راج بھون کے پچھواڑے جھیل کی طرف سے اندر گھسے ہیں۔ وہاں جھیل کے کنارے بھی ایک سپاہی کی ہتھیا ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہوا ہے۔ راج بھون کی باہری دیوار کے اوپر سے بھی دو سینکوں کو نیچے گرا کر مارا گیا ہے...... باہر ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔''

''یہ کون ہو سکت ہیں؟'' فربہ اندام عورت نے کہا۔

''یہ مختار راجپوت کی لونڈیا کے ساتھی بھی ہو سکت ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حمیدہ کے دیور کو پھانسی سے بچانے کے لئے کوئی کوشش کرنا چاہت ہوں۔''

وجنتی کی ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''ہائے رام! اب کیا ہووے گا؟ حالات دن بدن بگڑتے چلے جاوت ہیں۔ ہم جیسے لوگن تو کسی گنتی میں نا ہیں آتے، اب تو راج بھون بھی

ان سے بچا ہوا نا ہیں ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ وہ دونوں بدمعاش رات کو ہماری گلی تک بھی پہنچے ہیں...... اور کیا پتا کہ اب تک یہاں کسی گھر میں ہی چھپے ہوئے ہوں۔''

وجنتی کی ماں رام رام کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وجنتی کے پتا نے وجنتی سے کہا۔ ''آج بالکل گھر سے قدم باہر نا ہیں نکالنا۔ تم کل کہہ رہی تھیں کہ بازار جانا ہے۔''

''نا ہیں پتا جی...... ویسے بھی طبیعت ذرا خراب ہے۔ ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

''بس ٹھیک ہے۔ شانتی سے لیٹی رہو۔ آج سردی ہے بھی بہت۔''

سخت نقوش والا ادھیڑ عمر شخص باہر چلا گیا۔ ہم یہ سارا منظر اسٹور روم کی گہری تاریکی میں سے دیکھتے رہے تھے۔ عمران نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا تاہم اس میں ایک دو انچ کی جھری رہنے دی تھی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کی ماں پھر آئی اور بیٹی کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا اس لئے وہ ناشتا بھی نہیں کرے گی۔ اس کی ماں باتیں کرتی کرتی اسٹور روم کی طرف آئی۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ شاید اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے لگا ہے لیکن پھر وہ دہلیز سے ہو کر واپس چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کا چھوٹا بھائی جگدیش ناشتا کر کے اسکول چلا گیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی وجنتی کا پتا بھی باہر نکل گیا۔ اب گھر میں وجنتی اور اس کی ادھیڑ عمر والدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ والدہ نے ایک بار کمرے میں جھانکا اور یہ دیکھ کر کہ بیٹی لحاف اوڑھے سو رہی ہے، سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ غالباً وہاں سے صفائی ستھرائی کرنا تھی۔ اس کے جانے کے بعد عمران کی ہدایت پر وجنتی نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگا لی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر دبا دبا ہراس نظر آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''تو آپ دونوں نے بڑے ڈاکٹر کے بھائی کو مارا ہے اور پانڈے صاحب کو بھی؟''

''اس کے علاوہ دو تین گارڈز کو بھی جہنم واصل کیا ہے۔ کیا تم نے اپنے پتا سے سنا نہیں؟''

''ہائے رام...... یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ راج بھون والے آپ لوگن کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی نکال لیویں گے۔'' اس کے چہرے پر خوف کم اور پریشانی زیادہ تھی۔

''کیا تم ہمارے لئے پریشان ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے صاف سیدھے انداز میں کہا۔

''کیوں؟ ہم نے تو تم پر ریوالور تانا ہوا ہے...... تمہیں یرغمال بنایا ہوا ہے؟''

''میں جانت ہوں۔ مجھ سے آپ کی کوئی دشمنی نا ہیں۔ آپ حکم جی کے سپاہیوں سے بچنا چاہت ہیں اور واقعی آپ کو بچنا چاہیئے۔ یہ بہت کٹھور لوگ ہیں۔ بہت ہی پتھر دل......''

''اچھا، ابھی تمہارے پتا نے کسی کی پھانسی کا ذکر کیا ہے، وہ کون ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

''ہے ایک بدقسمت۔''

''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''اسے تو نا ہیں لیکن اس کی بھابی کو جانت ہوں...... وہ...... وہ......'' وجنتی کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ اس کی آواز میں گہرا درد اُتر آیا تھا۔

''لگتا ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو۔ تم بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ ہم تمہاری مدد کرسکیں یا کوئی مفید مشورہ ہی دے سکیں۔'' عمران نے اپنے مخصوص پُراثر لہجے میں کہا۔

ایک دم وجنتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب اس کے چہرے پر ہمارے حوالے سے خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ہم حکم اور جارج وغیرہ کے دشمن ہیں۔ شاید اس ناتے سے وہ ہمیں اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔

''بتاؤ وجنتی...... تم ہمیں بتا کر کسی طرح کا نقصان نہیں اُٹھاؤ گی، ہوسکتا ہے کہ کوئی فائدہ ہو جائے۔'' عمران نے شفقت آمیز محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ سسک کر بولی۔ ''آپ لوگن کون ہیں؟ آپ نے ابھی تک مجھے اپنے بارے میں کچھ نا ہیں بتایا۔''

''اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید تم مزید الجھ جاؤ۔ بس اتنا جان لو کہ ہم انسان دوست ہیں اور حکم جیسے انسان دشمنوں کے ساتھ ٹکر لینے کے لئے کفن باندھ کر نکلے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ہم تمہیں وچن دیتے ہیں کہ جو تم کہو گی، وہ صرف اور صرف ہم تک ہی رہے گا۔ ہم وچن پر جان دینے والے لوگ ہیں۔''

چند منٹ کی مزید کشمکش کے بعد وجنتی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''کل جس بندے کو راج بھون کے سامنے چوک میں سرِ عام پھانسی دی جارہی ہے، اس کی بھابی حمیدہ میری گہری سہیلی ہے۔ وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہے لیکن ہم نے بچپن اور لڑکپن اکٹھے ہی گزارا ہے۔ آج کل

میری یہ سہیلی بڑی مشکل میں ہے...... بھگوان اس پر اپنی کرپا کرے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' عمران نے بات آگے بڑھانے کے لئے کہا۔

''حمیدہ خوبصورت ہے۔ ایک سال پہلے اس کا پتی فوت ہوگیا تھا۔ اب وہ راج بھون میں ہے...... اور جارج گورا صاحب کے پاس ہے۔ وہ اس سے بیاہ کرنا چاہت ہے...... زبردستی اسے پتنی بنانے پر تلا ہوا ہے۔''

''کیا علاقے کے لوگ اور خاص طور سے مسلمان اندھے بہرے ہیں...... کیا انہیں یہ زبردستی نظر نہیں آ رہی؟''

''آ تو سب کو رہی ہے جی...... پر اصل میں...... حمیدہ کے دیور سے بھی ایک دوش ہوا ہے۔ پتا نا ہیں یہ دوش ہے بھی یا نا ہیں لیکن بہت سے لوگن اسے دوش ہی کہتے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے حمیدہ کے دیور نے اپنے کچھ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ مل کر گورا صاحب کی بہن ماریا کو اغوا کرلیا تھا۔ وہ اسے نل پانی کی طرف لے جانا چاہت تھے۔ انہوں نے اسے ایک سرنگ میں رکھا تھا اور وہاں اس کی انگلی بھی کاٹ ڈالی تھی۔ بعض لوگ یہ الزام بھی لگاوت ہیں کہ...... ان لوگن نے ماریا کے ساتھ...... ماریا کے ساتھ...... بُرا سلوک کیا تھا۔ بعد میں ماریا کسی طرح جان بچا کر ان لوگن کی قید سے بھاگ نکلی تھی......''

عمران اور میں وجنتی کی باتیں سن کر سناٹے میں رہ گئے۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''جارج گورا صاحب نے اسی کا بدلہ لیتے ہوئے حمیدہ کو گھر سے اُٹھوایا ہے اور راج بھون میں رکھا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ اگر آنکھ کے بدلے آنکھ کے قانون پر عمل کیا جاوے تو پھر یہ قانون بھی بنایا جاسکتا ہے کہ اغوا اور زیادتی کے بدلے اغوا اور زیادتی ہو لیکن وہ ایسا نا ہیں کر رہے۔ انہوں نے حمیدہ کو اغوا نا ہیں کیا، بس اپنے پاس اپنی حفاظت میں رکھا ہے۔ اگر حمیدہ کا کوئی پیارا اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہت ہے تو وہ اپنے بازو کے زور پر ایسا کرسکت ہے۔''

''بازو کے زور پر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی...... آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگے گی لیکن ہمارے اس راجواڑے میں ایسی اور بھی بہت سی عجیب باتیں ہیں۔ ہم بچپن سے بہت کچھ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔''

''اچھا، ایک منٹ۔'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ پھانسی کس کو دی جارہی ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا نام؟''

''اس کا نام اسحاق ہے جی۔ وہ بڑا دیور ہے حمیدہ کا۔''

میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔ اسحاق میرا، انور خاں اور چوہان کا ساتھی تھا۔ ہم نے مل کر بہت سی مصیبتیں اُٹھائی تھیں۔ نل پانی کی طرف سفر کرتے ہوئے بے شمار سختیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ میں جب سلطانہ کی مدد کے لئے چوری چھپے نل پانی سے نکلا تا تو اسحاق اس وقت انور اور چوہان وغیرہ کے ساتھ دیوان میں ہی تھا۔ وہ کب وہاں سے نکلا، کب یہاں پہنچا اور اب کن حالات میں تھا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی اور اب یہ وجنتی نامی لڑکی اسحاق کے حوالے سے ایک خوفناک بات بتا رہی تھی۔

عمران بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ''کیا یہ تمہارے ساتھیوں میں سے ہے؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ہاں، یہ وہی ہے جس نے ماریا کی انگلی کاٹی تھی۔'' میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا پھر وجنتی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا اسحاق نام کے اس بندے کو پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے؟''

''ناہیں جی...... وہ خود آیا تھا...... مجبور ہو کر۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ گورا صاحب نے کیا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ حمیدہ کا جو دعوے دار اسے چھڑانا چاہت ہے، وہ آئے اور اسے چھڑا کر لے جائے۔ بس اسے گورا صاحب کے ساتھ سامبر کرنا پڑے گا...... اور یہ پورے انصاف کے ساتھ ہو گا۔''

''یہ سامبر کیا ہے؟''

''یہ بھی سویمبر کی طرح ایک رسم ہے جی۔ سویمبر میں تو کسی ناری کا چاہنے والا ہی اس کے لئے لڑتا ہے لیکن سامبر میں ناری کا کوئی بھی ہمدرد اس کو کسی کے قبضے سے نکالنے کے لئے کوشش کر سکت ہے۔ اس کا پتا، بھائی یا بیٹا وغیرہ بھی......''

میں نے پوچھا۔ ''تو تمہارا مطلب ہے کہ یہ جو اسحاق نام کا بندہ یہاں پکڑا گیا ہے، وہ اپنی بھابی حمیدہ کو چھڑانے کے لئے یہاں آیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اسے دھوکے سے پکڑ لیا گیا؟''

''ناہیں جی...... یہ جارج گورا صاحب ایسے معاملوں میں دھوکا ناہیں کرت ہے۔ وہ جو کہتا ہے، وہی ہووت ہے۔ سامبر کی اس رسم کے مطابق اگر کوئی بندہ کسی سے لڑنا چاہت ہے تو پھر ایک کا مقابلہ ایک سے ہووت ہے۔ باہر سے کوئی لڑنے والوں کی مدد ناہیں کر سکتا اور

گورا صاحب بھی ایسا ہی کرت ہے۔ اس کو اپنے اوپر بہت وشواس ہے جی۔ اب پتا ناہیں کہ اس کو بہادری یا جواں مردی کہنا چاہئے یا ناہیں، پر سچ یہی ہے کہ گورا صاحب ایسے کاموں کے لئے خود کو خطرے میں ڈالنے کے لئے ہر سمے تیار ہووت ہے۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہو کر بھی اپنے ساتھ سامبر کرنے والے کسی بھی منش کو پورا پورا موقع دیوت ہے۔''

''تو اس نے اسحاق کے ساتھ لڑائی کی؟''

''جی ہاں، اس نے اعلان کروایا تھا کہ اگر اس مہینے کی دس تاریخ تک کوئی سامبر کے لئے آنا چاہت ہے تو آ جاوے۔ نو تاریخ کو حمیدہ کا دیور یہاں پہنچ گیا تھا۔ سنا ہے کہ گورا صاحب نے اس سے صاف کہا تھا کہ وہ اس کی بہن ماریا کے اغوا کا ذمے دار ہے لیکن اگر وہ سامبر جیت گیا تو وہ اسے کچھ ناہیں کہے گا بلکہ وہ اپنی بھاوج کو بھی یہاں سے لے جا سکے گا۔ دوسری صورت میں اس کو پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا موت سے کم ناہیں ہووے گی۔ اسحاق کو یہ شرطیں ماننا پڑی تھیں......''

''تو وہ ہار گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

وجنتی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے تھے۔

''کس قسم کا مقابلہ ہوا تھا؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ ہار گیا تھا۔ گورا صاحب سے جیتنا کوئی آسان کام ناہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ سخت جان ہے۔ پھر لڑنے والے پر لڑنے سے پہلے ہی اس کا بہت رعب پڑ جاتا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کے بہت سے مقابلے کر چکا ہے اور کبھی ہارا ناہیں۔ وہ تلوار بازی بھی کر لیوت ہے، خالی ہاتھوں سے بھی لڑتا ہے۔ کبھی کسی کے سامنے چاقو یا پستول پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے اس سے پہلے اُٹھا کر دکھائے اور وار کرے......''

میری آنکھوں کے سامنے ماضی قریب کا وہ دردناک نقشہ گھوم گیا۔ جارج نے اس رات میرے سامنے بھی تو پستول پھینکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیلنے لگی۔ میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور وجنتی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یعنی اسحاق ہار گیا ہے اور اب اسے پھانسی دی جا رہی ہے؟''

وجنتی نے گردن جھکا کر ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کی جھولی میں گرے۔ وہ سسک کر بولی۔ ''اس پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ کل پتا جی بتا رہے تھے کہ اس کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ اس طرح سے اس

سے گورا صاحب کی بہن ماریا کی انگلی کا بدلہ لیا گیا ہے۔کل یہاں چھٹی کا دن ہے۔کل راج بھون کے سامنے چوک میں اس کی ہتھیا کردی جاوے گی۔"

"اورتمہاری سہیلی حمیدہ؟" عمران نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

"وہ جارج گورا صاحب کے پاس ہی ہے۔"

"ابھی اس سے بیاہ نہیں کیا گیا؟"

"ناہیں...... گورا صاحب کہتے ہیں کہ وہ ابھی اس کے وارثوں کو ایک اور موقع دینا چاہت ہیں۔"

یہ سب کچھ دل دہلا دینے والا تھا۔خاص طور سے میرے رگ وپے میں آگ سی بہنے لگی تھی۔سارے زخم تازہ ہوگئے تھے۔

وجنتی اپنی سہیلی کے لئے مسلسل آنسو بہارہی تھی۔عمران نے اس سے کچھ مزید تفصیلات پوچھیں۔کہیں کہیں میں نے بھی سوالات کئے۔آخر میں عمران نے بڑی نرمی سے وجنتی کے شانے پر ہاتھ رکھا اوراپنے مخصوص پُراثر لہجے میں بولا۔"وجنتی! ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ تم سے کوئی وعدہ کرسکیں لیکن اتنی تسلی ضرور دیتے ہیں کہ ہم ابھی یہاں زرگاں میں ہی ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ ہوسکا،ضرور کریں گے۔"

"مم...... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔کہیں اس معاملے میں میرا نام آ گیا تو ہمارے پریوار کے لئے بڑی مصیبت ہوجاوے گی۔حکم جی کے کچھ لوگن کو میں پہلے ہی بہت بُری لگ رہی ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"جس دن حکم جی کے سپاہی حمیدہ کو اس کے گھر سے لینے کے لئے آئے، میں بھی اس کے پاس ہی تھی۔ وہ حمیدہ کو زبردستی لے جانے لگے تو میں نے اور اس کی ساس نے انہیں روکا۔ میں سپاہیوں سے جھگڑ پڑی۔ میں نے ایک کی وردی پھاڑ دی۔ انہوں نے مجھے دھکے مارے اور دھمکیاں دیں۔اب اگر پھر کہیں میرا نام اس معاملے میں آ گیا تو وہ لوگن میرے پیچھے پڑ جاویں گے۔"

عمران نے پھر محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔"اس بارے میں بےفکر رہو۔ ہم نے تم سے کہا ہے نا کہ ہم وچن توڑنے والے نہیں، جان دینے والے لوگ ہیں۔"

"میں بھی آپ کو وچن دیوت ہوں کہ اس گھر میں جو کچھ ہوسکا آپ کے لئے کروں گی۔"

میں نے عمران کی طرف اور عمران نے میری طرف دیکھا۔وجنتی کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ بہت حد تک دلیر اور سمجھدار بھی تھی۔اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"ٹھیک ہے وجنتی! اگر تم چاہو تو ضرورت پڑنے پر اس کمرے سے باہر جا سکتی ہو...... ہم امید کرتے ہیں کہ تم ہمارے وشواس پر پوری اُترو گی۔" اس کے ساتھ ہی عمران نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو ہم جلدی سے تاریک اسٹور روم میں چلے گئے۔وجنتی کی فربہ اندام والدہ کمرے کی طرف آرہی تھی۔اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وجنتی نے دروازے کی چٹخنی اُتار دی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔وجنتی کی والدہ نے اس کا احوال دریافت کیا پھر اس سے کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھو لے اور تھوڑا سا کھا پی لے۔

اس مرتبہ وجنتی نے انکار نہیں کیا اور ماں کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ہم نے وجنتی کو باہر بھیج کر بےشک رسک لیا تھا لیکن ہم جس راستے پر چلے تھے، اس پر خطرات، اندیشوں اور خدشوں سے واسطہ تو قدم قدم پر پڑتا تھا۔ہم اسٹور روم کے اندر ہی رہے۔ہم نے اپنے رنگین چہرے گیلے کپڑے سے رگڑ کر اچھی طرح صاف کر لئے تھے۔ عمران کے بازو پر گہری خراش آئی تھی۔اس نے وہیں اسٹور روم سے ایک پٹی لے کر بازو پر باندھ لی تھی۔ درحقیقت کل شام سے اب تک ہم نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بھاگ دوڑ بھی بہت ہوئی تھی، نہایت سرد پانی میں تیرنا پڑا تا...... اب بھوک اور نقاہت محسوس ہورہی تھی۔ بھوک کا تھوڑا سا ذکر عمران نے وجنتی سے بھی کیا تھا۔اس بات کی امید تھی کہ شاید وہ کچھ کھانے کو لے آئے۔اسے واپس آنے میں تاخیر ہورہی تھی۔تاخیر سے پریشانی تو تھی لیکن نہ جانے کیوں یقین سا تھا کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔

کل رات کے واقعات ایک بار پھر ہماری نگاہوں میں گھومنے لگے۔کئی سال پہلے جب لاہور میں اس طرح کی ہنگامہ آرائیاں ہوئی تھیں تو میں نے خود کو عمران کے ساتھ ایک عضو معطل کی طرح محسوس کیا تھا...... لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میں نے ہر جگہ عمران کے شانے سے شانہ ملائے رکھا تھا اور ایک دو موقعوں کے سوا کہیں بھی اس سے پیچھے نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔"لاہور میں، مَیں نے تمہاری زبردست ڈرائیونگ دیکھی تھی۔کل مجھے توقع نہیں تھی کہ تم لوڈر کو الٹا دو گے۔"

وہ مسکرایا۔"اپنی ڈرائیوری کو بےداغ رکھنے کے لئے میں دو بےگناہوں کی جان لے لیتا تو تم نے ہی مجھے لعنت ملامت شروع کردینی تھی...... ویسے اس موقع پر کام تم نے بھی کمال

کا کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں تو تمہیں پرہیزگار سمجھتا تھا، تم بڑی تیز نظر رکھتے ہو۔“

”کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔“

”لوڈرا لٹنے کے بعد گرے بھی تو ایک جوان لڑکی پر...... حالانکہ وہاں گرنے کے لئے کئی اور جگہیں بھی تھیں اور اگر کسی نرم نرم جگہ پر ہی گرنا تھا تو لڑکی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی تو وہیں تھی۔ مجھے وہ محاورہ یاد آ رہا ہے کہ بنیا اگر گرتا ہے تو کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔“

”چلو اگر پھر ایسا موقع آیا تو تم اپنی من پسند جگہ پر گر لینا۔ میں بعد میں گر لوں گا۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”ہاں ہاں بھئی! آہستہ آہستہ زبان لگ رہی ہے تمہیں اور مجھے لگ رہا ہے کہ اندر سے تم کافی کھوچل بھی ہو۔ سلطانہ بھابی کے سامنے تو یونہی سائیں چپ شاہ بنے رہتے ہو۔ بہرحال، کچھ بھی ہے میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ سچی کھری بات کرنے سے باز نہیں رہوں گا۔ میں کنوارا ہوں اور تم شادی شدہ ہو۔ میری موجودگی میں تم نے ایک جوان لڑکی کے اوپر گر کر میرا استحقاق مجروح کیا ہے۔ کچھ مک مکا کر لو ورنہ میں اس معاملے کو اوپر تک لے جاؤں گا۔“

”کیا کرو گے؟“

”سب کچھ سلطانہ بھابی کو بتاؤں گا۔ فساد کرا دوں گا۔ چھ گنجے دانشور اسٹوڈیو میں بلاؤں گا۔ تین تمہاری طرف سے، تین سلطانہ بھابی کی طرف سے۔ انہیں اتنا لڑاؤں گا...... کہ باقی سارے قومی اور بین الاقوامی معاملات اس ”اہم موضوع“ کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔“

”لیکن یہ سب تو تب ہوگا جب ہم یہاں سے زندہ نکل سکیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، یہ مسئلہ تو بہرحال ہے۔“ اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم الرٹ ہو گئے۔ عمران نے ریوالور پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اندر آنے والی وجنتی ہی تھی۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ کسی رومال وغیرہ میں کوئی چیز چھپا کر لائے گی لیکن وہ تو باقاعدہ ٹرے اُٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اس میں پراٹھے اور انڈوں کا نمکین آملیٹ نظر آ رہا تھا۔

وہ اسٹور میں چلی آئی۔ ”تمہاری ماں جی نے نہیں دیکھا؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھا ہے بلکہ انہوں نے ہی بنا کر دیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات کہنا چاہت ہوں۔“

ہم دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے ماں جی کو سب بتا دیا ہے۔ آپ نے بالکل بھی فکر ناہیں کرنا۔ میرے اور ماں کے بیچ کوئی بھی بات چھپی ناہیں ہوتی۔ وہ وہی کریں گی جو میں کہوں گی۔“

”لو کر لو تماشا۔“ عمران نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں جی؟“ وجنتی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں لیکن کہیں ماں جی کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”اگر میں ماں جی کو نہ بتاتی، تب گڑبڑ ہونے کا ڈر تھا۔ اب ہم اس معاملے کو سنبھال لیویں گے۔“ وجنتی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر میں صرف اپنے والد سے ڈرتی ہے اور اسے اب یہ خوف ہے کہ کہیں اس کے گھر میں ہونے والی خطرناک گڑبڑ کا پتا اس کے والد کو نہ لگ جائے۔ ہمیں یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ راج بھون سے ریٹائرمنٹ کے باوجود وجنتی کے پتا کی ہمدردیاں راج بھون اور حکم جی سے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جو راج بھون میں ہونے والے ہر کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی تلاش کر ہی لیتے ہیں۔

وجنتی نے کہا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں اپنی ماتا کو ان سے ملانے کے لئے یہاں لائے گی۔

کھانے کے دوران میں ہم بالکل خاموش رہے۔ وجنتی کی آمد سے پہلے عمران نے کچھ ہلکی پھلکی باتیں کر کے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی تاہم میں جانتا تھا کہ میری طرح اس کا دماغ بھی مسلسل مصیبت زدہ اسحاق اور اس کی بھابی حمیدہ میں الجھا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے عمران کہ اس کمینے جارج نے اسحاق کی بھاوج کو ایک چارے کے طور پر استعمال کیا ہے...... اور شاید وہ آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے...... اس نے اس عورت کے خیر خواہوں کو مزید قسمت آزمانے کا موقع دیا ہے۔“

وجنتی بولی۔ ”میرا وچار ہے کہ آپ ٹھیک کہوت ہو۔ میں نے سنا ہے کہ اسحاق کے ایک اور دوست نے گورا صاحب کے سامنے آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا نام انور خاں ہے...... ہم سب جانت ہیں کہ وہ بہت دلیر شخص ہے۔ زرگاں کے مسلمان اسے بہت مانتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے جب مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ جیل کے بجائے گورا

صاحب کے گھر میں ہے تو علاقے کے مسلمان ایک دم بھڑک اُٹھے تھے۔ انہوں نے گورا صاحب کے گھر پر چڑھائی کر دی تھی۔ اس وقت انور خاں نے بہت ہمت دکھائی تھی۔ اب وہ کچھ عرصے سے نل پانی میں ہے۔ سنا ہے کہ وہ گورا صاحب کی سامبر رچنا میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کئی لوگن کا خیال ہے کہ شاید انور خاں وہ اکیلا شخص ہے جس کی گورا صاحب کے مقابلے میں جیتنے کی تھوڑی بہت امید کی جاسکت ہے۔"

یہ نئی اطلاع بھی سنسنی خیز تھی۔ وجنتی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ جس سلطانہ کی بات کر رہی ہے، میں اس کا شوہر ہوں اور انور خاں میرا قریبی ساتھی ہے۔ میں انور خاں کے بارے میں عمران کو بہت کچھ بتا چکا تھا۔ وجنتی سے انور کا ذکر سن کر عمران کے چہرے پر بھی سنسنی نظر آنے لگی۔

ہماری غیر موجودگی میں یہ جارج گورا نے انوکھا کھیل کھیلا تھا۔ اس کی کمینگی اور عیاری کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ اس نے واقعی حمیدہ کو چارے کے طور پر استعمال کر کے اسحاق کی غیرت کو جگایا اور اسے یہاں بلانے میں کامیاب رہا تھا۔ اب وہ اسے موت کے گھاٹ اُتارنے والا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ انور خاں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا......

جو کچھ بھی تھا لیکن ایک بات تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ سیکڑوں جنگجو افراد کا کمان دار ہونے کے باوجود جارج گورا بوقتِ ضرورت خود میدان میں اُترتا تھا اور اپنے مقابل کو نیچا دکھاتا تھا۔ اس نفساتی برتری کے بعد وہ اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد ہو جاتا تھا۔ جو رہی سہی کسر تھی، وہ حکم جی کی معاونت سے پوری ہو جاتی تھی۔

میرے سینے میں ایک عجیب سی آگ دہکنے لگی۔ مجھے لگا کہ ایک طویل عرصے سے میں جس "ٹاکرے" کا انتظار کر رہا تھا، اس کے لئے اسٹیج خود بخود تیار ہو رہا ہے۔ میرے پٹھے تن گئے۔ سینے کی دھڑکن میں ایک نامانوس اضافہ ہو گیا۔

وجنتی کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "کیا آپ دونوں میری سہیلی کے لئے کچھ کر سکت ہیں؟"

عمران نے کہا۔ "سہیلی سے پہلے تو اس کے دیور کی بات کرنی چاہئے جس کے بارے میں تم کہہ رہی ہو کہ اسے کل پھانسی یا سُولی دی جانے والی ہے......"

"اس کے لئے اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ بے حد مایوسی سے بولی۔ "اس کے لئے کچھ کرنے کا سمے اب گزر چکا ہے لیکن حمیدہ کے بچاؤ کے لئے تو ابھی کافی سمے ہے۔ شاید کسی

بڑی سفارش سے کوئی فائدہ ہو جائے...... یا پھر اسے راج بھون سے نکالنے کی ہی کوئی کوشش کی جا سکے۔" بات کرتے ہوئے وجنتی کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔

○......❖......○

وہ سرد رات ہم نے اسی تاریک اسٹور روم میں گزاری۔ وجنتی کی ماتا واقعی اس کے کہے کے مطابق چلتی تھی۔ شام کا کھانا ہمارے لئے وہی لے کر آئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور ہاتھ جوڑ کر بس ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ اگر یہاں سے نکلنے کے بعد خدانخواستہ ہم پکڑے جائیں تو اس گھر کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ وجنتی کی طرح ہم نے اس کی ماتا کو بھی یہ حلف دیا تھا۔ وجنتی کی ماتا سے ہمیں ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی...... اس نے بتایا کہ پانڈے کی جان نہیں بچائی جاسکی اور آج سہ پہر شاہی اسپتال میں اس کا دیہانت ہو گیا ہے۔

اب رات کی اس تیرگی میں میرے ذہن میں بار بار وہ مناظر گھوم رہے تھے جب تیز رفتاری سے بھاگتی لوڈر میں، مَیں نے پانڈے کو جان لیوا طور پر گھائل کیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں پانڈے جیسے موذی کو جہنم واصل کر چکا ہوں۔ اس نے دیوان میں بم بلاسٹ کر کے بڑی سفاکی سے بے گناہ لوگوں کے چیتھڑے اُڑائے تھے۔ آج ان لوگوں کو انصاف مل گیا تھا۔

رات کو گلی میں مسلسل گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی رہیں۔ گاہے بگاہے کچھ للکارے بھی سنائی دیتے رہے۔ پتا چلتا تھا کہ ہماری تلاش جاری ہے...... صبح اپنے پتا اور چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد وجنتی ہمارے لئے ناشتا لے کر آئی...... اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ آج سہ پہر حمیدہ کے دیور اسحاق کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ وہ پھانسی کا لفظ استعمال کر رہی تھی لیکن ہمیں معلوم تھا کہ یہاں پھانسی کے بجائے سُولی چڑھایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بغاوت کے جرم میں جن افراد کو جیل کے اندر سزائے موت دی گئی، انہیں بھی سُولی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس کی لرزہ خیز تفصیلات ہمیں دوسرے لوگوں سے پتا چلی تھیں۔ وجنتی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کل رات ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی کا کریا کرم ہو گیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد پانڈے کی آخری رسوم بھی ادا کی جائیں گی۔ پورے زرگاں میں سوگ کی فضا ہے۔

جب ہم دہی کلچے اور چنے کا ناشتا کر رہے تھے، وجنتی نے پوچھا۔ "دوپہر کو آپ کیا کھائیں گے؟"

''جو مرضی بنالو۔'' عمران نے کہا۔

''آپ...... ابھی...... یہاں رہیں گے نا؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں...... اسی لئے تو کہا ہے جو مرضی بنالو۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش، بے یقینی، اطمینان، سب کچھ گھل مل گیا تھا۔ ''اپنی بہن کو بہت زیادہ تکلیف دی ہے ہم نے...... اب اور نہیں دیں گے...... اور جو کچھ کہا ہے، وہ بھی یاد رکھیں گے...... حمیدہ کے لئے جو کچھ ہو سکا ضرور کریں گے۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم بھی کچھ کہو۔''

''سب کچھ تو تم خود کہہ دیتے ہو۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''باہر آپ کے لئے گھمبیر خطرہ ہوگا یا پھر...... آپ آج کی رات اور رک جاویں......''

''نہیں، تمہارا بہت امتحان لے لیا ہے ہم نے...... تمہارا بہت بہت دھنیواد۔'' عمران نے کہا۔

''اور تمہارا یہ احسان یاد بھی رکھیں گے۔'' میں نے اضافہ کیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ عمران نے کہا۔ ''بس ایک آخری چھوٹی سی تکلیف تمہیں دینی ہے۔ کسی طرح ہمارے لئے دو جوڑوں کا انتظام کر دو تاکہ ہم یہ منحوس وردیاں اُتار سکیں۔''

...... اور اب یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہم وجنتی کے گھر سے باہر آ چکے تھے۔ سردی عروج پر تھی۔ باہر آ کر ہمیں پتا چلا کہ گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور تیز ہوا بھی چل رہی ہے...... ہم مقامی لباس دھوتی کُرتے میں تھے۔ سروں پر رنگ دار پگڑیاں تھیں اور ہم نے گرم چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ ہمارا اسلحہ ان چادروں میں چھپا ہوا تھا۔ سردی کے سبب مقامی لوگ اکثر اپنی پگڑیوں کو منڈاسے کی صورت باندھ لیتے تھے، اس سے چہرہ بھی کافی حد تک چھپ جاتا تھا۔ آج تو پھر یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے اپنی پگڑیوں اور گرم چادروں کو اپنا آپ چھپانے کے لئے استعمال کیا اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس بہت بڑے ہجوم میں داخل ہو گئے جو راج بھون سے کچھ فاصلے پر ایک چوک میں جمع تھا اور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں نکلتے تھے اور اس جم غفیر میں شامل ہو جاتے تھے۔ راج بھون کے ایک عظیم الشان دروازے کے باہر ایک پتھریلا چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر باوردی افراد چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے تین عدد بہت بڑے بڑے

کراس بھی یہاں نصب تھے۔ یہ وہ سُولیاں تھیں جن پر حکم کے معتوبین کو لٹکایا جاتا تھا۔

ہم ہجوم میں گھستے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہ وہی انداز تھا جو ہم نے دو دن پہلے راج بھون میں اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج یہ سب کچھ راج بھون کی چاردیواری سے باہر ہو رہا تھا اور ہجوم میں امنگ ترنگ کی جگہ غم وغصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ لوگ ایک شخص کی اذیت ناک موت دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ غصیلے نعرے لگاتے ہوئے وہ مکے لہرا رہے تھے۔

چبوترے کے اوپر ہلچل میں اضافہ ہو گیا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم دیکھ سکتے تھے۔ کچھ افسران ٹائپ لوگ چبوترے پر دکھائی دیئے۔ ان کی پگڑیاں اونچی اور بھاری تھیں۔ تیز یخ بستہ ہوا میں ان پگڑیوں کے شملے لہرا رہے تھے...... چبوترے کے گرد بے شمار مسلح محافظ اور سپاہی موجود تھے۔ کچھ اونچی جگہوں پر بھی محافظوں کی پوزیشنیں تھیں۔ غالباً یہ اضافی حفاظتی انتظامات پرسوں رات پیش آنے والے واقعات کے بعد کئے گئے تھے۔ شاید وجنتی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب اس آخری وقت میں اسحاق کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کیا کرنا چاہتے تھے؟ یہ خود ہمارے ذہنوں میں بھی واضح نہیں تھا۔

ایک طویل انتظار کے بعد بالآخر اس تماشے کا کلائمیکس شروع ہو گیا۔ دور چبوترے پر ہم نے ایک زرد رنگ چہرہ دیکھا۔ یہ شخص سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اسے دو افراد نے سہارا دے رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور ہجوم میں اضطراب کی بلند لہریں پیدا ہوئیں۔

''یہ ہے اسحاق؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں۔'' درد و کرب کے سبب میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

وہ ہزاروں افراد میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اس کا دوست نہیں تھا، سب دشمن تھے اور اس کے خون کے پیاسے تھے۔ ہم ہجوم میں داخل ہو کے آگے بڑھتے رہے۔ آخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے مسلح محافظوں کا دُہرا حصار شروع ہوتا تھا۔ اگر ہم اس جگہ تھوڑی سی ہلچل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ کامیابی کا امکان بہت کم تھا لیکن ہم چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ہم حتی الامکان حد تک آگے پہنچ گئے۔ کینوس کا وہ سفید بیگ ابھی تک عمران کے کندھے سے جھول رہا تھا جس میں فالتو ایمونیشن رکھا جاتا ہے لیکن اس وقت بیگ میں ایمونیشن نہیں تھا۔ ایک زہریلا سانپ تھا جسے ہم نے زرگاں کے راستے میں جنگل سے پکڑا تھا

اور اپنا ہم سفر بنا لیا تھا۔ میں اور عمران اس سانپ کو یہاں ہجوم میں چھوڑنے اور خوف و ہراس پیدا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عمران نے گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ کینوس بیگ کھولنے جا رہا تھا لیکن اچانک ایسا ہوا کہ عمران کے اندر کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ چادر کے اندر اس نے اپنے ہاتھ بھی روک لئے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ دیکھو'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

محافظوں کی قطاروں کے درمیان تھوڑی سی جگہ خالی نظر آ رہی تھی۔ یہاں سے خاردار تاروں کے قریباً پانچ فٹ اونچے بڑے بڑے چھلے نظر آئے۔ چھلوں سے بنی ہوئی اس ناقابلِ عبور باڑ نے چبوترے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ''اوہ گاڈ!'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''ہم یہ کسی صورت پار نہیں کر سکیں گے۔'' عمران کی آواز میں مایوسی تھی۔

بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہم نے اس ڈھلتی سہ پہر میں اس چبوترے کے سامنے...... ان سیکڑوں لوگوں کے درمیان ...... بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔

ایک دم ہمیں لگا کہ ہم ہار گئے ہیں۔ کم از کم آج کا دن کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ وقت بہت کم تھا اور ہم کسی بھی طرح ان لاتعداد محافظوں اور اس مخصوص خاردار باڑ سے گزر کر اسحاق تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب ہماری حیثیت بھی تماشائیوں سے زیادہ نہیں رہی تھی اور تماشا تقریباً شروع ہو چکا تھا۔ یہاں قریباً چودہ پندرہ ہزار کا مجمع تھا اور ہر نگاہ حکم اور جارج کے گناہ گار پر جمی تھی۔ وہ غالباً کسی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور خود کو جلادوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا، اس کا ایک ہاتھ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی ہاتھ تھا جس کی انگلیاں پرسوں کاٹ دی گئی تھیں۔ اسحاق کے چہرے پر بھی مار پیٹ کے گہرے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ دو تین افراد نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ لکڑی کے ایک کراس کو آٹھ دس افراد نے مل کر چبوترے پر لٹایا پھر اس کراس پر اسحاق کو لٹا دیا گیا۔ ایک پہلوان نما جلاد کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھوڑا نظر آیا۔ تب وہ کارروائی شروع ہوئی جو میرے سینے میں دل کو ٹکڑوں میں بدل گئی۔ یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لئے لوہے کا دل درکار تھا۔ اسحاق کی ہتھیلیوں اور ٹانگوں پر ٹخنوں کے قریب لمبی آہنی کیلیں ٹھونکی جانے لگیں ہم کافی دوری پر ہونے کے باوجود اس کی کرب ناک آوازیں سن سکتے تھے۔

اس وقت میں نے سوچا کہ اگر ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے تو وہاں آئے ہی نہ ہوتے اور یقیناً عمران بھی ایسا سوچ رہا تھا۔ ہم ہزاروں پُرجوش تماشائیوں کے درمیان ساکت کھڑے تھے۔ پھر درجن بھر افراد نے مل کر لکڑی کے کراس کو کھڑا کر دیا۔ اسحاق اس صلیب پر ٹنگا ہوا تھا۔ چلا چلا کر وہ شاید نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے بہتے ہوئے خون کی سرخی ہم اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔

وہ ہمارے گروپ کا سب سے جوشیلا رکن تھا۔ تھوڑا سا غصیلا بھی تھا لیکن اس کا غصہ بے وجہ نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس کے غصے کی جڑیں اس کے ماضی سے پیوست تھیں۔ اس کی جوان بہن پر مقامی عورتوں کے بدنام رسیا (جارج) نے رال ٹپکائی تھی...... جارج کے ہاتھوں سے محفوظ رہنے کے لئے اس لڑکی نے زہر کھایا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو گئے تھے اور وہ سانس کو ترستے ترستے راہی عدم ہو گئی تھی۔ اب اس کے خاندان کی ایک اور عورت ایسی ہی صورتِ حال کا شکار ہوئی تھی اور وہ اسے بچانے کی کوشش کرتے کرتے اس سُولی تک آ پہنچا تھا۔

پہلوان نما جلاد آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ہتھوڑا نظر آیا جس سے اس نے اسحاق کے جسم میں میخیں ٹھونکی تھیں۔ اس مرتبہ جلاد نے اس ہتھوڑے کو ایک اور طرح کی سفاکی کے لئے استعمال کیا۔ ہتھوڑے کی زوردار ضرب اسحاق کی پنڈلی پر لگائی گئی۔ یقیناً پنڈلی کی ہڈی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہو گی۔ یہاں کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں لگا ہوا تھا، پھر بھی اسحاق کے چلانے کی دردناک آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ایسا ہی سلوک اسحاق کی دوسری پنڈلی سے کیا گیا۔ پھر بازوؤں کی باری آئی۔ ہر بار جب ضرب لگتی تھی اور مرتا ہوا اسحاق چلاتا تھا تو جواب میں جوشیلے نعرے بلند ہوتے تھے۔ کبھی کبھی انسان کتنا سنگ دل ہو جاتا ہے...... ہجوم کی نفسیات اس سنگ دلی کو انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔

ہمارے لئے اب وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے دم توڑتے اسحاق کو دیکھا...... اور دل ہی دل میں کہا۔ ''اے دوست! ہم نے وہ سب دیکھا جو ان دشمنوں کے درمیان تجھ پر بیتا۔ ہاں، ہم نے سب دیکھا...... اور سب ہمارے دل پر نقش ہوا اور ہم وعدہ کرتے ہیں تجھ سے کہ ہم تیری تکلیف اور بے بسی کو بھولیں گے نہیں۔ تیرے خون کا حساب لیں گے...... اور اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش بھی کریں گے جس کی خاطر تُو نے اس اجنبی جگہ پر...... بے مہر لوگوں کے درمیان ...... بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی

ہے......''

اب ایک دوسرا جلاد آگے بڑھ رہا تھا، اسے اسحاق کے کولہوں کی ہڈیاں توڑنا تھیں لیکن کھیل تو شاید اس سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ سُولی پر ٹنگا ہوا اسحاق تقریباً بے جان نظر آ رہا تھا۔ عمران نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ تابش......'' اس کی آواز میں انتہا درجے کا دکھ تھا۔

ہم ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے واپس چل دیئے۔ جب ہم ایک ایک قدم کھسکتے ہوئے نسبتاً کشادہ جگہ پر پہنچے، مشتعل ہجوم نے فلک شگاف نعرے لگا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا...... پتا چلا کہ مصلوب کے سینے میں خنجر گاڑ کر اس کا قصہ تمام کر دیا گیا ہے۔

ہم نکلتے چلے گئے۔ ہمارے سینوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ چوک سے باہر نکل کر ہم چھوٹی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ سرد ہوا کی کاٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اچانک ہم ٹھٹک گئے۔ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آ رہا تھا۔ آنے جانے والوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ایک سخت گیر افسر ایک راہ گیر پر گرج برس رہا تھا۔ اس نے اسے کوٹ اُتار کر تلاشی دینے کا حکم دیا پھر کسی بات پر مشتعل ہو کر اسے تھپڑ دے مارا۔ میں اس افسر کو دیکھ کر سکتہ زدہ رہ گیا...... نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ کیا مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔

O......❖......O

ہمارے اور رنجیت کے درمیان کم و بیش پچاس میٹر کا فاصلہ تھا۔ رنجیت کا دھیان ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے عمران کا بازو دبایا۔ ہم رک گئے اور پھر جلدی سے ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔

میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' عمران نے چلتے چلتے پوچھا۔
''تم نے اس افسر کو دیکھا جو ناکے پر تلاشی لے رہا تھا؟''
''ہاں...... وہی بینگن کی رنگت والا......''
''وہ رنجیت پانڈے ہے۔''
''کون سا پانڈے؟''
''رنجیت پانڈے...... جسے پرسوں میں نے چاقو مارے تھے...... اور جس کے بارے میں وجنتی نے بھی بتایا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔''
''تو یہ کوئی اور ہو گا۔ اس کا ہم شکل...... اس کا پارٹ ٹو۔'' عمران نے ہلکے پھلکے انداز

میں کہا۔
''نہیں یار! وہ سو فیصد وہی ہے۔ میں نے اسے دھیان سے دیکھا ہے۔ اس کی آواز سنی ہے۔ یہ وہی بدبخت ہے۔'' میری آواز کانپ رہی تھی۔
''تو پھر جسے تم نے اس روز لوڈر میں مارا، وہ کوئی اور ہو گا۔ وہاں تو بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔''
میری آنکھوں کے سامنے لوڈر کے تہلکہ خیز مناظر گھومنے لگے۔ وہ دوڑ کر لوڈر پر چڑھ آیا تھا اور آتے ساتھ ہی مجھ پر جھپٹ پڑا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا...... اور شاید اس کے چہرے پر کچھ رنگ بھی ملا ہوا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا...... تو کیا میں اب تک اس غلط فہمی کا شکار رہا ہوں کہ میں نے رنجیت پانڈے کو مار دیا ہے؟
ذہن میں بہت سے سوال اُبھر رہے تھے لیکن ابھی ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ ابھی ہمیں کسی سے ملنا تھا...... بلکہ مجھے کسی سے ملنا تھا اور اس ملاقات کا پروگرام ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ ہمارا رخ زرگاں کے عظیم الشان پگوڈا کی طرف تھا۔ میری معلومات کے مطابق میڈم صفورا اسی پگوڈا میں تھی اور مجھے گرو سوبھاش سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اب اسے پگوڈا میں کچھ آزادیاں حاصل ہو گئی ہیں اور وہ پگوڈا میں آنے والے سفید فام لوگوں سے راہ و رسم بھی بڑھا رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میڈم صفورا جارج گورا تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔ اس نے خود بھی تو کہا تھا کہ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور یہاں راجواڑے میں ہمارا فائدہ نقصان ایک ہے لیکن میڈم صفورا سے ملنے میں ایک گھمبیر مسئلہ بھی تھا اور وہ یہ کہ عمران میرے ساتھ تھا۔ پچھلی ملاقات میں صفورا نے عمران کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھے۔ وہ عمران کو مسلسل شیطان اور قاتل جیسے القابات سے نوازتی رہی تھی۔ اس نے کہا تھا...... اس کی بہن نادیہ کا قاتل ہے اور وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔
بے شک عمران کے حوالے سے اس کا رویہ بڑا سخت تھا لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی پچھلے تین چار برس میں میڈم صفورا کے غم و غصے میں خاطر خواہ کمی بھی واقع ہوئی تھی۔ حالات کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد اس کے دل میں نرمی پیدا ہوئی تھی اور اس کے مزاج کے چڑھے ہوئے دریا کو ہموار انداز میں بہنا آ گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں اچھے طریقے سے اس کے ساتھ بات کرتا اور اسے یہ سمجھاتا کہ موجودہ حالات میں عمران ہمارا کس قدر مددگار ثابت ہو سکتا ہے تو وہ اس کے بارے میں بھی نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔ ہمارا پروگرام

یہی تھا کہ میں اکیلا پگوڈا میں جاؤں اور عمران باہر کہیں مناسب جگہ پر میرا انتظار کرے گا۔

شام کے سائے لمبے ہو کر جھٹ پٹے میں اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا تیز تھی اور یخ بستہ ٹھنڈ، شام کے شانہ بہ شانہ زرگاں کے گلی کوچوں میں اُتر رہی تھی۔ ہم نے مقامی انداز میں اپنے چہرے پگڑیوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ اسحاق کی موت کا بے پناہ غم اور پانڈے کی دید کی زبردست حیرت سینے میں چھپائے ہم ندی کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ مٹیالے پانی والی وہی ندی تھی جو راج بھون کی دیواروں کو چھوتے ہوئے گزرتی تھی۔ اس کے کنارے تفریحی باغ بنے ہوئے تھے۔ اچھے موسم میں یہاں شام کے وقت یقیناً اہلِ زرگاں کی بھیڑ ہوتی ہوگی لیکن اس نہایت سرد شام میں بس اِکا دُکا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جانب ایک قہوہ خانہ نظر آ رہا تھا۔ یہ نیم گرم جگہ بیٹھنے اور انتظار کرنے کے لئے مناسب تھی۔ عمران قہوہ خانے میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں اندازاً کتنا وقت لے گا؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جلدی بھی آ سکتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں رات گئے تک انتظار کرنا پڑے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں قہوہ خانے میں یا اس کے آس پاس ہی ملوں گا۔''

عمران سے رخصت ہو کر میں پگوڈا کی طرف بڑھ گیا۔ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک باغ کے درختوں کے عقب سے پگوڈا کی مخروطی چھت کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں تنگ گلیوں سے گزر کر آگے بڑھتا رہا۔ راج بھون کے سامنے خونی تماشا دیکھ کر واپس آنے والوں کی ٹولیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر لوٹ رہے تھے۔

جلد ہی میں پگوڈا کی وسیع و عریض سیڑھیوں کے سامنے تھا۔ اس سرد شام میں یہاں بھی کم کم لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ گرد و پیش کو دیکھ کر میری نگاہوں میں کئی بھولے بسرے مناظر تازہ ہو گئے۔ مجھے اور سلطانہ کو جب نل پانی سے پکڑ کر زرگاں لایا گیا تو میں سب سے پہلے اسی بودھ مندر میں آیا تھا۔ یہاں میری حیثیت ایک خدمت گار قیدی کی سی تھی۔ ایک بار مجھے انہی سیڑھیوں پر الٹا لٹا کر بید بھی مارے گئے تھے۔ اب بھی ان سیڑھیوں پر ایک درمیانی عمر کا شخص اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اسے بیدزنی کی سزا دی گئی ہے۔ ایک طرف دو تین کوڑھی افراد پھٹے پرانے کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ گیروا کپڑوں والے بھکشو اندر باہر آ جا رہے تھے۔ عام لوگ بھی سیڑھیاں اُترتے چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جوتے اُتارے اور اسی طرح پگڑی لپیٹے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے وہ کوٹھری نظر آئی جو میرا مسکن

لمی اور پھر ہمیش یاد آیا۔ وہ جواں سال بھکشو جو ہمارا ہم سفر بنا تھا اور نل پانی کے راستے میں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا تھا۔

صفورا کو یہاں کورتی کہا جاتا تھا۔ میں نے پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے میں اس امید پر نگاہ دوڑائی کہ شاید کہیں کورتی یعنی صفورا گھومتی پھرتی دکھائی دے جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نہایت ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتا، مٹھ کی طرف بڑھا۔ صفورا کی رہائش اسی مٹھ (مدرسے) کی طرف تھی۔ نوجوان بھکشوؤں کی ایک ٹولی تھالیوں میں پھول سجائے پگڈوا کے اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اندر سے ڈھول بجنے کی مدھم آواز باہر آ رہی تھی۔ مٹھ کے مین سامنے برآمدے میں مجھے ایک بوڑھا شخص بیٹھا نظر آیا۔ اس نے کمبل لپیٹ رکھا تھا اور ماحول کی لئے پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو یہاں پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ نابینا تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔

میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ''باباجی! میں کورتی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

بوڑھے نے اپنا بے نور آنکھوں والا چہرہ میری طرف پھیرا اور قدرے حیرت سے بولا۔ ''کون ہو تم؟''

''میرا نام دلجیت ہے جی۔ فتح پور سے آیا ہوں۔ پچھلی بار جب میں آیا تھا تو کورتی نے مجھ سے انگلیوں کی خارش کی دوا منگوائی تھی......''

''لیکن وہ تو یہاں سے چلی گئی ہے......'' بوڑھا روانی سے بولا۔

''کہاں؟'' میں نے بھی ترت پوچھا۔

''لال بھون میں......''

''لال بھون میں؟''

''ہاں، وہ گوری چمڑی والے لے گئے ہیں اسے۔ وہاں بڑی موجیں ہیں اس کی۔ پر وہ بدھا کی گناہ گار ہے۔ وقتی طور پر سکھ شانتی حاصل بھی کر لیوے گی تو انجام بُرا ہی ہونا ہے......''

شاید میں کچھ دیر مزید اس بوڑھے کے پاس بیٹھتا اور اسے کریدنے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں دور سے دو منڈے ہوئے سروں والے بھکشو بوڑھے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ میں اپنی بات مختصر کر کے بوڑھے کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

لال بھون کا نام میں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ تاہم بوڑھے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی مشہور عمارت رہی ہوگی۔ میں اس کا کھوج لگا سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے سے باہر نکل کر میں نے

جس پہلے راہ گیر سے لال بھون کے بارے میں پوچھا، اس نے انگلی سے اشارہ کر کے کچھ فاصلے پر ایک سرخی مائل عمارت کی نشان دہی کر دی۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہو گا۔ اب شہر کی روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں پر بھی لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ گلیوں کی رہی سہی رونق بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں لال بھون کے سامنے کھڑا تھا۔ پرانی طرزِ تعمیر کی یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ یہاں بھی جنریٹرز کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ گیٹ کے پاس برقی قمقمے روشن تھے اور اندر ہی کچھ کھڑکیوں میں برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔

میں ہر خطرے سے بے نیاز لال بھون کی سرخی مائل عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اور شکاری چاقو موجود تھا۔ جونہی میں گیٹ کے سامنے پہنچا، ایک باوردی پاسبان سامنے آیا۔ اس کی رنگین پگڑی کا شملہ دو فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ سخت سردی کے سبب اس کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے سر تا پا گھور کر پوچھا۔

''مجھے کورتی صاحبہ سے ملنا ہے۔ فتح پور سے آیا ہوں۔ وہ مجھے جانت ہیں۔''

''کون کورتی؟'' نہایت کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میڈم صفورا کے لئے کورتی کا لقب پگوڈا میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہ کوئی اچھا لقب نہیں تھا۔ اس کا مطلب شاید گناہ گار عورت تھی۔ اب صفورا پگوڈا میں نہیں تھی۔ اس پر کچھ غیر مقامی لوگوں کی نظرِ کرم ہوئی تھی اور وہ اب اس عالی شان عمارت تھی۔

میں نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پاسبان سے کہا۔ ''میں اس خاتون صاحبہ سے ملنا چاہت ہوں جو پاکستانی ہیں اور اس سے پہلے پگوڈا میں سیوا کرت تھیں......''

''تم میڈم صفورا جی کی بات کرت ہو؟'' پاسبان نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟ اور سب سے پہلے یہ چادر اُتار کر ایک طرف رکھو۔'' پاسبان کا انداز سخت ہوتا جا رہا تھا۔

اسی دوران میں دو اور محافظ نما شخص بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ مسلح تھے۔ میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میڈم مجھے بڑی اچھی طرح جانت ہیں۔ آپ بس ان تک میرا پیغام پہنچا دیں۔ ان کے آنے سے پہلے میں آپ کو کچھ ناہیں بتاؤں گا اور اگر آپ لوگن زبردستی پوچھنے کی کوشش کریں گے تو میڈم بہت ناراض ہوں گی۔''

''ان کی راضی اور ناراضی کی پروانہ کرو تم...... یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم یہ چادر اور پگڑی اُتار دو...... چلو شاباش، جلدی کرو۔''

''تم اپنے ساتھ ساتھ میڈم جی کا بھی نقصان کر رہے ہو۔'' میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان تکرار شروع ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تکرار زیادہ سنگین شکل اختیار کرتی اور مجھے زبردستی عمارت میں گھسنا پڑتا، ایک شان دار گھوڑا گاڑی گیٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ دو گھوڑوں والی اس چمکیلی گاڑی کو دیکھتے ہی محافظ تن کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سلام کے انداز میں اپنے ہاتھ اپنے ماتھوں سے لگا دیئے۔ تاہم ایک موچھیل محافظ نے مجھے بازو سے تھامے رکھا۔

گھوڑا گاڑی کی کھڑکی کا پردہ سرکا۔ مجھے میڈم صفورا کی شکل نظر آئی...... آخری بار میں نے اسے بڑی خستہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور جسم پر چیتھڑے تھے لیکن آج وہ اپنے مخصوص بوائے کٹ اسٹائل میں نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ تقریباً وہی روپ تھا جو ہم لاوہر کی لال کوٹھیوں میں دیکھا کرت تھے۔ ایک اسمارٹ جواں سال اور دبنگ عورت۔

صفورا نے محافظوں کے چہروں پر ہیجان کے آثار دیکھ لئے تھے۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔

''یہ بندہ زبردستی اندر گھسنا چاہت ہے جی۔ تلاشی بھی ناہیں دے رہا۔''

''پگڑی ہٹاؤ۔'' میڈم صفورا کرخت لہجے میں بولی۔

''آپ مجھے اچھی طرح جانت ہیں میڈم...... لیکن میں ان کے سامنے پگڑی ہٹانا ناہیں چاہتا۔''

میری آواز سن کر صفورا ذرا چونکی مگر اس کا ذہن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا...... میں نے اسے اشارہ دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نادیہ کی موت کا بہت افسوس ہے میڈم۔ میں اسی بارے میں بات کرنا چاہت ہوں۔''

ایک لمحے میں صفورا نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑا...... اس نے موچھیل محافظ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چھوڑ دو انہیں۔''

محافظ ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میڈم صفورا نے مجھے گاڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں شان دار گاڑی کی نیم گرم فضا میں آ گیا۔ گاڑی طویل ڈرائیو وے کو طے کر کے

عمارت کے پورچ میں رکی۔ جلد ہی میں میڈم صفورا کے ساتھ لال بھون کے اندر تھا۔

یہ عمارت باہر سے تو درمیانی حالت کی نظر آتی تھی لیکن اس کا ''اندر'' دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، دبیز قالین، خوبصورت غالیچے اور بڑے بڑے فانوس...... باوردی ملازم اور ملازمائیں ننگے پاؤں، بے آواز چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی حصے سے موسیقی کی آواز اُبھر رہی تھی اور شوخ لڑکیوں کے سریلے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے...... در و دیوار سے رنگ و بُو کے غیر مرئی سوتے پھوٹ رہے تھے۔ ایک فوارے اور شان دار حوض کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم ایک شاندار کمرے میں داخل ہو گئے۔

میڈم صفورا نے انگریزوں کی طرح پتلون قمیص اور جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں میں جوگر ٹائپ جوتے تھے۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ میں نے پگڑی اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ ''اوہ تابش! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں پھر اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ اِٹ اِز ریئلی ونڈرفل۔'' اس نے مجھے چھوتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ پچھلی بار ہماری دونوں ملاقاتیں بڑے بُرے حالات میں ہوئی تھیں۔ ہم دونوں کی گردنوں میں آہنی کڑے تھے۔ آپ کا سر منڈا ہوا تھا اور باقی کا حلیہ بھی قابلِ رحم تھا لیکن اب...... اب تو آپ وہی لاہور والی میڈم صفورا نظر آ رہی ہیں......''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی تبدیلی آئی ہے، اس کے لئے کافی محنت کرنا پڑی ہے مجھے۔ تفصیل بتاؤں گی تو تم حیران رہ جاؤ گے لیکن...... یہ سب باتیں تو بعد کی ہیں۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ پہنچے؟ مجھے تو تمہارے بارے میں بُری بُری خبریں مل رہی تھیں۔''

''خبریں تو اب بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں میڈم...... آپ کو پتا چل ہی گیا ہو گا کہ جارج گورا نے سلطانہ کے ساتھ اپنے گھر میں کیا کیا تھا؟''

''ہاں تابش! وہ واقعہ تو واقعی افسوس ناک تھا۔ وہ اسے جیل سے نکال کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس ساری بات کا پتا تو اس وقت چلا جب اس کے گھر پر حملہ ہوا...... اور جارج کے محافظوں نے لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔''

''اس واقعے کے بعد بھی واقعات کا ایک سلسلہ میڈم...... جارج نے اپنے پاپوں کا گھڑا بھر لیا ہے، اب اس گھڑے کو ہر صورت پھوٹنا ہی پھوٹنا ہے۔''

میڈم صفورا گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر طویل سانس لے کر بولی۔

''میں نے سنا تھا کہ تم میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب تم وہ پہلے والے تابش نہیں رہے

ہو۔ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا لیکن اب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔''

''بس میڈم! ایسی تبدیلیاں یونہی تو نہیں آتیں۔ ان کے پیچھے حالات کا لمبا جبر ہوتا ہے...... اگر موقع ملا تو میں آپ کو یہ طویل کہانی ضرور سناؤں گا۔''

میڈم کی عقابی نگاہیں جیسے میرے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ اس نے میری گرم چادر کے نیچے اسلحے کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور شاید اس آگ کو بھی دیکھ لیا تھا جو میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ''تو تم جارج گورا کے لئے یہاں آئے ہو؟''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں میڈم۔''

''اکیلے ہو یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟''

''ایک ساتھی بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''یہیں زرگاں میں۔ ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر آیا ہوں اسے۔''

میڈم نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور قیمتی لائٹر سے سلگا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''تابش! بہت خطرناک اور مشکل کام کا ارادہ لے کر پہنچے ہو یہاں...... بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔''

''آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔''

''میں کیا ڈراؤں گی...... سچ پوچھو تو میں خود ڈری ہوئی ہوں۔ یہ بہت سفاک لوگ ہیں اور آج کل ایک دم ہائی الرٹ بھی ہیں۔ جارج گورا تک پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے تابش! آج کل اس کے کسی ادنیٰ افسر تک رسائی بھی مشکل ہے۔''

میں نے عجیب اعتماد سے کہا۔ ''میڈم! آپ نے خود کہا ہے کہ یہ وہ تابش نہیں ہے جسے آپ جانتی تھیں اور میڈم...... یہ نیا تابش آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف جارج گورا تک پہنچے گا بلکہ اس کے دس بیس ٹکڑے بھی کرے گا اور صرف یہی نہیں میڈم...... ہم اس منحوس جگہ سے نکلیں گے...... اپنی آزاد دنیا میں واپس پہنچیں گے۔ اپنے پاکستان، اپنے لاہور، اپنے جانے پہچانے گلی کوچوں میں۔ بہت جلد میڈم۔''

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر بند کر لیا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولی۔ ''وہ دوسرا بندہ کون ہے جو تمہارے ساتھ آیا ہے؟''

''میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتاتا ہوں لیکن پلیز پہلے تھوڑا سا اپنے بارے میں

بتا دیجئے۔ میرا کنفیوژن دور ہو گا۔ آپ پگوڈا کی مصیبت سے نکل کر اس شاندار لال بھون میں کیسے پہنچیں؟''

''تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ میں یہاں ہوں؟'' میڈم نے جواب سوال کیا۔

''میں پہلے پگوڈا میں ہی گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا۔ میں سیدھا یہاں آ گیا۔''

''یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑ جاتی تو پھر؟''

''کیا مطلب میڈم؟''

''گارڈز سے تمہاری تکرار ہو رہی تھی۔ وہ تمہاری پگڑی اُتروا دیتے تو عین ممکن تھا کہ تمہیں پہچان لیتے اور پھر تم نے چادر کے نیچے اسلحہ بھی لگایا ہوا ہے۔''

''میڈم! اردو کا وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا، جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ سچ پوچھیں تو میں کشتیاں جلا کر یہاں آیا ہوں۔ جارج نام کے اس پھوڑے کو جڑوں سے کاٹوں گا یا پھر خود ختم ہو جاؤں گا۔''

میرے پُرتپش لب و لہجے نے میڈم صفورا کو ایک بار پھر چونکایا۔ وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میرے اور صفورا کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی، پھر صفورا نے مجھے بتایا کہ وہ پگوڈا سے یہاں کیسے پہنچی۔ وہ بولی۔ ''میرے خیال میں میرے یہاں پہنچنے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ میں انگلش میں روانی سے بول لیتی ہوں۔ پگوڈا میں جارج گورا کے ساتھی سرجن اسٹیل نے ایک بار مجھ سے تھوڑی سی بات چیت کی اور پھر ہمارے درمیان اکثر بات ہونے لگی۔ اسٹیل نے ہی جارج سے میری سفارش کی اور کہا کہ میں کافی سزا کاٹ چکی ہوں، اب میرے ساتھ کچھ رعایت کی جائے۔ یہ اس سفارش کا ہی نتیجہ تھا کہ مجھے پگوڈا سے نکال کر یہاں پہنچا دیا گیا...... تم ٹھیک کہتے ہو، یہ واقعی پازیٹو چینج ہے۔ یہاں مجھے ہر طرح کا سکون آرام حاصل ہے۔ میری حیثیت حکم جی کی معمولی ملازمہ کی سی ہے۔ پھر بھی جاب اچھا اور انٹرسٹنگ ہے۔''

''کیسا جاب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''یہ آوازیں سن رہے ہو تم؟''

میں نے کان دھرے۔ لال بھون کے کسی دور افتادہ حصے سے لڑکیوں کے گانے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید کورس کی شکل میں کوئی طربیہ نغمہ گا رہی تھیں یا گانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''یہ گانے کی آوازیں ہیں۔''

''ہاں، یہاں مجھے کچھ لڑکیوں کی نگہبانی سونپی گئی ہے اور یہ کوئی عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ ان چالیس لڑکیوں کو پورے راجواڑے میں سے چنا گیا ہے۔ ان کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ مسلمان ہیں، باقی ساری ہندو ہیں۔ میرا کام یہاں ان لڑکیوں کو بنانا سنوارنا اور ادب و آداب سکھانا ہے۔ میری مدد کے لئے کچھ اور لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ ہندی ڈانس کی تربیت دینے والی گیتا مکھی، ایک ماسٹر ہندو گائیک، ایک جڑی بوٹیوں کا ماہر وید اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔''

''ان لڑکیوں کا کیا کیا جائے گا؟''

''میرے خیال میں تم نے بھی ساتویں کے جشن کا سنا ہو گا۔ یہ اس راجواڑے کا سب سے بڑا فیسٹیول ہوتا ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس فیسٹیول میں راج بھون کے لئے جو سات پریاں چنی جاتی ہیں، وہ انہی لڑکیوں میں سے چنی جائیں گی۔ ان میں سے زیادہ تر سادہ اور گم صم ٹائپ کی ہیں۔ انہیں بنانا سنوارنا اور راج بھون کے ادب و آداب سکھانا سب کچھ یہیں لال بھون میں ہوتا ہے۔''

میں نے ساتویں کے جشن اور سات رنگوں کی پریوں کے بارے میں پہلے بھی کافی کچھ سنا تھا۔ یہ سب کچھ بہت داستانی لگتا تھا مگر یہاں اس اسٹیٹ میں یہ ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں موجود تھا۔ یہ قدیم رسم پورے اہتمام کے ساتھ یہاں جاری ساری تھی...... بلکہ خود سلطانہ پر بھی ایک بڑا الزام یہ تھا کہ اس نے خود کو پری بننے کے اعزاز سے جان بوجھ کر محروم کیا...... اور پریوں کے چناؤ سے پہلے ہی آناً فاناً شادی کر لی۔

میری اور میڈم صفورا کی گفتگو جاری تھی کہ اچانک دروازے پر عجلت آمیز دستک ہوئی۔

''کون؟'' میڈم نے بارعب آواز میں پوچھا۔

''میڈم! میں ہوں ثمرین۔'' روتی ہوئی سی آواز اُبھری۔

''او گاڈ۔'' میڈم نے سٹپٹائے لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میں ایک منٹ میں آئی۔''

اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ مجھے روتی سسکتی لڑکی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ میڈم ساتھ والے لاؤنج میں ایک خوبرو لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک مختصر سا چمکیلا لباس تھا۔ وہ روتے ہوئے بیل۔ ''یہ دیکھیں میڈم! یہ کپڑے پہننے کو کہہ رہی ہے مجھے گیتا دیدی۔ یہ مجھ سے نا ہیں ہو گا۔''

یہ لباس کپڑے کے دو نہایت مختصر ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ لڑکی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

میڈم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے جھڑک کر بولی۔ ''اچھا، ہر بات پر رونا دھونا نہ شروع کر دیا کرو۔ پہلے مجھے بتایا تو کرو کہ پرابلم کیا ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ......'' وہ خوش شکل لڑکی کے ساتھ ایک راہداری میں اوجھل ہو گئی۔

اسی دوران میں دو اور خوبصورت لڑکیاں لٹک مٹک کر چلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے سے گزریں۔ انہوں نے بہ عین وہی مختصر لباس پہن رکھا تھا جو ابھی ثمرین نامی لڑکی نے میڈم کو دکھایا تھا۔

میں کھڑکی بند کر کے واپس اپنی جگہ آ بیٹھا اور میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی میں چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

''کون تھی یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ تمہاری ایک دور کی رشتے دار تھی تو پھر؟'' میں چونک کر میڈم کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔ ''یونہی مذاق کر رہی تھی۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، وہ سگریٹ کا ایک چھوٹا کش لے کر بولی۔ ''جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر وہ واقعی صحیح ہے تو پھر...... تم بڑے سنگین وقت پر اور بڑے سنگین ارادوں سے یہاں آئے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے کیا کہوں۔''

''آپ کچھ بھی نہ کہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جو کچھ آپ کہنا چاہ رہی ہیں، وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس حوالے سے ہم بعد میں تفصیل سے بات بھی کر سکتے ہیں۔''

وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر ایک اور کش لے کر بولی۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو تابش؟''

میں نے کہا۔ ''میڈم! چاہتا تو بہت کچھ ہوں اور جو چاہوں گا وہ ہم سب کے بھلے میں ہو گا لیکن فی الوقت تو ہمیں بس دو تین روز کا ٹھکانا دے دیجیے۔''

''او کے...... مل گیا۔''

''میں اپنے ساتھی کو بلا سکتا ہوں؟''

''بلا لو۔ کون ہے وہ؟''

میں نے نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! اب تک آپ نے جو سوال

پوچھے ہیں، ان میں یہ سوال سب سے ٹیڑھا ہے...... لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی فہم و فراست اور محبت اس سوال کو اور اس کے جواب کو اتنا ٹیڑھا نہیں رہنے دے گی۔''

''کھل کر بات کرو تابش!''

کھڑکیوں سے باہر ایک سرد رات نے پنجے گاڑ لئے تھے...... یہ پوری عمارت قالینوں غالیچوں کی وجہ سے گرم تھی پھر بھی کمرے میں ہلکی خنکی محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں نے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا اور پھر میڈم صفورا کو دھیرے دھیرے عمران کے بارے میں سب بتا دیا۔ میڈم کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ سب سے پہلے تو اسے اسی بات کا یقین نہیں آیا کہ عمران تا حال زندہ ہے۔ دوسری بڑی حیرت یہ تھی کہ وہ یہاں اس اسٹیٹ میں، اس شہر میں موجود ہے اور اس گھر سے ایک ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک قہوہ خانے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔

ایک طویل سکتے کی سی کیفیت سے نکلنے کے بعد میڈم صفورا بولی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سراج اور شیرے وغیرہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے سینے پر گولیاں لگی تھیں اور وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔''

''بے شک میڈم! یہ سب کچھ ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی بچا رہا۔ اس کے جسم پر بس ایک دو گولیاں ہی لگ سکیں اور اس کے نشان اس کے جسم پر موجود ہیں۔''

میں نے میڈم صفورا کو امریکن بلٹ پروف جیکٹ کے بارے میں بتایا اور وہ باقی باتیں بھی بتائیں جو عمران نے میرے گوش گزار کی تھیں۔ میں نے دیکھا، صفورا کی پیشانی پر پسینا ہے۔ اس کی آنکھوں کے اندر گہرائی میں وہ سارے پرانے کرب جاگ گئے تھے جن کا تعلق لاہور والے واقعات سے اور پھر چھوٹی میڈم نادیہ کی موت سے تھا۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ ''میڈم! وقت کے ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ میں تبدیل ہوا ہوں، آپ ہوئی ہیں...... ہمارے حالات، ہمارا گرد و پیش سب کچھ بدل گیا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا، اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میڈم! بے شک وہ صدمہ شدید تھا جو آپ کو پہنچا۔ اس جیسے کم شدت کے اور بھی کئی صدمے ہیں جن کا تعلق ان دنوں سے ہے۔ کتنا اچھا ہو میڈم...... اگر ہم ان صدموں کو بھلا کر اپنی موجودہ مصیبت سے نکلنے کے لئے کوئی مشترکہ کوشش کر سکیں۔''

میڈم خاموش رہی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ لگتا تھا، وہ بڑی مشکل سے اپنے آتشیں آنسوؤں کو روکے ہوئے ہے۔ میں نے

کہا۔ ''میڈم! میں بڑے مان سے آپ کے پاس آیا ہوں اور وہ مان یہ ہے کہ جس طرح آپ نے مجھے معاف کیا ہے، اسی طرح عمران کو بھی کر دیں گی...... بے شک جرم بہت بڑا ہے لیکن مجھے آپ کے ظرف کا آسرا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا ظرف آپ کے غم و غصے سے کہیں زیادہ ہے...... پلیز میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، ہم آپ کی دی ہوئی معافی کا حق ادا کر دیں گے۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ لیں گے۔ اللہ نے چاہا تو اس راجواڑے کی اونچی دیواریں اب زیادہ دیر ہمارا راستہ نہیں روک سکیں گی......''

میں جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی گہرائی سے کہہ رہا تھا اور کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے...... میں نرم و گداز لہجے میں بولتا رہا اور میڈم خاموشی سے سنتی رہی...... کبھی اس کے چہرے پر گہرا کرب جھلکتا، کبھی وہ ایک طویل آہ بھر کر رہ جاتی...... میری گفتگو کے دوران میں اس نے ایک دو سخت جملے بھی کہے تاہم میں نے ان جملوں کا توڑ کیا...... اور عمران کے حوالے سے میڈم صفورا کا غم و غصہ دور کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کوشش کا نتیجہ مثبت نکلا۔ بالآخر میڈم نے عمران کو یہاں لانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ تاہم اس نے کہا۔ ''وہ فی الحال میرے سامنے نہیں آئے۔ میں ایک دو دن میں خود ہی اس سے ملاقات کروں گی۔ اس دوران میں مجھے خود کو سنبھالنے میں مدد ملے گی۔''

''آپ جیسا کہتی ہیں، ویسا ہی ہوگا میڈم! جو کچھ ہوا اس کا افسوس اور دکھ اسے بھی بے چین رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب تک آپ سے معافی نہیں مانگے گا اور آپ اسے معاف نہیں کریں گی، وہ ذہنی سکون سے دور رہے گا۔'' میں نے اپنی طرف سے بات بناتے ہوئے کہا۔

میڈم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے نم کناروں کو صاف کیا اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں پھیر کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اُٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ''میں اپنے منیجر مدن کو بھیجتی ہوں، وہ تمہیں میری گاڑی میں لے جائے گا۔''

کچھ دیر بعد ایک ہٹا کٹا خرانٹ سا شخص آن موجود ہوا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر رہی ہوگی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام مدن ہے۔ میں نے مقامی طرز کی پگڑی پھر سر اور چہرے پر لپیٹ لی۔ بہرحال، مدن نے مجھے سلطانہ کے شوہر مہروز کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ ہم باہر نکل کر اسی شان دار گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھے جس میں صفورا یہاں پہنچی تھی۔ یہ بالکل بند گھوڑا گاڑی تھی۔ یخ بستہ ہوا اور سردی کے اثرات سے کافی حد تک محفوظ۔ ہم اس گھوڑا

گاڑی پر دھند آلود ندی کے کنارے کنارے چلتے مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔ میں گھوڑا گاڑی کے اندر ہی رہا اور منیجر مدن قہوہ خانے کے اندر سے عمران کو لے آیا۔ ہم نے واپسی کا سفر مکمل خاموشی سے طے کیا...... منیجر مدن نے بات چیت کرنے کی کوشش کی تاہم میں نے مختصر جواب دے کر اسے خاموش کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لال بھون کے ایک نہایت آرام دہ بیڈ روم میں موجود تھے۔ یہاں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ شیشے کی الماری میں شراب کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور خوبصورت تپائی پر بسکٹ، پیسٹری، کاجو اور اس طرح کے دیگر لوازمات موجود تھے۔

ہم نے اپنی چادریں اور پگڑیاں وغیرہ اُتار دیں اور ایزی موڈ میں ہو گئے۔ توقع کے مطابق میڈم صفورا دوبارہ نظر نہیں آئی، تاہم کھانا پُرتکلف تھا۔ بعد میں سبز چائے سے تواضع کی گئی۔ کھانے کے دوران میں ہم دھیمے لہجے میں بات کرتے رہے اور میں نے عمران کو اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس عمارت میں ہونے والی سرگرمیوں کی روداد نے عمران کو بھی حیران کیا۔ وہ بولا۔ ''جگر! یہ تو میرے فساد پلس کے لئے بڑی زبردست اسٹوری ہے۔ اس کا عنوان ہو سکتا ہے...... چالیس لڑکیاں چالیس کہانیاں بلکہ اکتالیس کہانیاں۔ میڈم صفورا خود بھی تو ایک کہانی ہے۔ اب اندازہ لگاؤ، اکتالیس کہانیوں کو فی کہانی پچاس منٹ کے دورانیے میں بنایا جائے اور ہر دورانیے میں پچاس بریک ہوں تو یہ بن گئے تقریباً دو ہزار بریک۔ ہر بریک میں آج کل شریف سے شریف چینل بھی چودہ پندرہ اشتہار تو چلا ہی دیتا ہے۔ تو یہ ہو گئے تقریباً تیس ہزار اشتہار...... اور مجھے تو لگتا ہے کہ اتنی زبردست لڑکیوں...... میرا مطلب ہے اسٹوریوں کے لئے یہ تیس ہزار اشتہار بھی کم رہیں گے۔''

''یہاں سے زندہ بچ کر نکلو گے تو اشتہار چلاؤ گے نا۔'' میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''جگر! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرایا کرو۔ ہمارا تو کام ہی ہے پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا۔''

''جو کچھ تم لوگ ''جھپٹ'' کر پلٹتے ہو اس کا بھی سب کو پتا ہے۔''

''خبردار، ہم پر رشوت کا الزام نہ لگانا۔ ورنہ بریکنگ نیوز میں جگہ پا جاؤ گے۔ ہم شاہین صفت لوگ ہیں۔''

''لیکن ہم نے تو دیکھا ہے کہ جہاں واقعی خطرہ ہو، وہاں پولیس والوں کی طرح تم لوگ بھی پلٹ کر پلٹتے اور پلٹتے ہی پلٹتے چلے جاتے ہو۔''

''میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ شاہین صفت لوگوں سے یوں طنزیہ لہجے میں بات نہیں کرتے اور یہ وہ اقبال والا شاہین نہیں ہے۔''

''یہ کون سا ہے؟''

''یہ لاہور کا مشہور رس فروش ہے۔ گنے کا رس بیچتا ہے۔ اس نے ایسا ڈبل ایکشن بیلنا بنوایا ہے جو خشک سے خشک گنے سے بھی دو چار گلاس رس نکال کر دکھا دیتا ہے...... بلکہ اس کا تو کہنا ہے کہ کسی بھی پلاسٹک یا لکڑی وغیرہ کے ٹکڑے پر ''گنا'' لکھ دیا جائے تو وہ اس میں سے بھی رس نکال کر دکھا دے گا۔''

''اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنا بستر درست کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی جس طرح شاہین رس فروش، سوکھے سڑے گنے سے بھی رس نکال لیتا ہے، ہم بھی نہایت پُرسکون حالات اور لوگوں کے اندر سے تہلکہ خیز خبریں نکال سکتے ہیں......'' اس نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔

اسحاق کی دردناک موت نے میرا دل بوجھل کر رکھا تھا اور یقیناً ایسا ہی بوجھ عمران کے دل و دماغ پر بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری اور اپنی توجہ اس گھمبیر دکھ سے ہٹانے کے لئے یہ اوٹ پٹانگ گفتگو کر رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ بیچ وہ کچھ سنجیدہ باتیں بھی کر جاتا تھا۔ ان باتوں کا تعلق اس لال بھون اور یہاں کی کرتا دھرتا میڈم صفوار کے حوالے سے عمران کے ذہن میں ابھی خدشات موجود تھے۔ یہ خدشات اسی وقت دور ہو سکتے تھے جب عمران اور صفورا میں آمنے سامنے بات ہوتی اور وہ دونوں ماضی کو بھلا کر آگے کی طرف دیکھنے کا فیصلہ کرتے۔

میں عمران کے خدشات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ خدشات بدترین صورت میں صحیح ثابت ہونے والے ہیں اور بہت جلد۔

ہم کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے اردگرد ہر چیز دھندلائی ہوئی سی نظر آئی۔ سر پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ کئی سیکنڈ مجھے یہ سمجھنے میں ہی گزر گئے کہ میں کہاں اور کس حالت میں ہوں۔

ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''حرامزادے...... تم کیا سمجھتے تھے...... میری میزبانی انجوائے کرو گے۔ میری چھت تلے بیٹھ کر میری روٹیاں توڑو گے...... میں اتنی جلدی بھول جاؤں گی اپنی بہن کے قاتل کو...... اتنی جلدی معاف کر دوں گی......''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور تب میں نے محسوس کیا کہ میرے

ہاتھ اور پاؤں بڑی سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنے سامنے صفورا کو دیکھا۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر...... پر رکھے عمران سے مخاطب تھی۔ غنودگی کے سبب میں یہ سارا منظر بہ مشکل دیکھ پا رہا تھا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں کے گرد نائیلون کی سرخ رسی کی مضبوط بندش ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے شاید اسے مارا بھی گیا تھا۔ وہ بستر کے بجائے قالین پر نظر آ رہا تھا اور اس کے ہونٹ خون آلود تھے۔

میرا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل میڈم صفورا کو پکارا۔ ''میڈم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے تو وعدہ کیا تھا......''

''خاموش۔'' ایک بھاری مردانہ آواز نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میری پسلیوں پر ایک بے رحم ٹھوکر لگی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔

ٹھوکر زوردار تھی تاہم اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میرے دماغ پر چھائی ہوئی گہری دھند چھٹنا شروع ہو گئی۔ میں نے کوشش کی اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمران قالین پر تھا اور اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ازلی اطمینان تھا جو بدترین حالات میں بھی اس کے چہرے سے جدا نہیں ہوتا تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور زوردار جھٹکے دے کر بولی۔ ''یو باسٹرڈ! تم نے تین چار سال کو کافی عرصہ سمجھا...... شاید تمہیں پتا نہیں، تئیں چالیس سال بھی گزر جاتے تو مجھے تمہاری شکل بھولنا تھی اور نہ تمہارا جرم...... تم نے میری بہن کو مارا ہے۔ اس کے بدلے تمہیں اپنی جان دینا پڑے گی...... اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا...... تم تمنا کرو گے کہ کاش تم اسی رات ڈیک نالے پر مر گئے ہوتے۔'' صفورا کے لہجے میں آگ تھی اور جنون تھا۔ وہ اس عورت سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جسے چند ماہ پہلے میں نے پگوڈا میں فرش کی صفائی کرتے دیکھا تھا...... اور اس عورت سے بھی جس سے کل شام میں نے اسی عمارت میں ڈیڑھ دو گھنٹے بات چیت کی تھی۔ میں نے اپنے ڈولتے ذہن کو سنبھالا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''میڈم! آپ جلد بازی کر رہی ہیں۔ آپ جانتی نہیں کہ ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

''شٹ اَپ!'' میڈم گرجی۔ ''تم اپنی عقل دانش اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر تم میں عقل ہوتی تو تم اسے یہاں لے کر ہی نہ آتے۔ تم کیا سمجھتے تھے، میں اتنی ہی کمزور اور بھلکڑ ہوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ واقعی مجھ سے اندازے کی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ حالات کی بے رحم چکی میں پسنے کے بعد میڈم کی کیمسٹری میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں لیکن میں بھول گیا تھا کہ عورت کو داناؤں نے ہمیشہ ایک پہیلی قرار دیا ہے اور میڈم صفورا جیسی عورت تو ویسے بھی ''بھید بھری'' ہوتی ہے۔

ہمیں یقیناً کھانے میں بے ہوشی کی زود اثر دوا دی گئی تھی۔ مجھے کھانے کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم کھانا کھاتے کھاتے ہی سو گئے تھے اور پھر یہ نیند گہری بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً یہ گہری بے ہوشی ہی تھی کہ عمران جیسا شخص بھی کچھ نہیں کر پایا تھا اور اب میری ہی طرح بندھا ہوا پڑا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی اور میری حیرانی میں اضافہ ہو گیا۔ اب صبح کے چار بجنے والے تھے۔ یعنی ہم تقریباً چھ گھنٹے بعد ہوش میں آئے تھے۔ عمران غالباً مجھ سے پہلے ہوش میں آ گیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو عمران کے ساتھ میڈم صفورا کا غصیلا مکالمہ جاری تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے پہلو میں جوگر بوٹ کی زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھنکاری۔

''بتا، کیا قصور تھا میری بہن کا؟ بس یہی نا کہ وہ تجھ سے دوستی کر بیٹھی تھی۔ اتنے سے جرم کی اتنی سخت سزا دے دی تُو نے اسے......''

''میڈم! وہ آپ کی بہن تھی۔ آپ کو اس کا کوئی قصور نظر نہیں آئے گا لیکن اگر کوئی انصاف سے اس کے قصور لکھنے بیٹھے تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ اس پوری کتاب کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور اس کا صرف ایک جرم ہی دیکھا جائے تو وہ بھی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ بے گناہ سلیم کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا میڈم...... لیکن ہم ان باتوں میں پڑیں گے تو یہ بحث کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔'' عمران بولا۔

''گھبراؤ مت۔ میں تمہیں بحث کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑوں گی۔'' میڈم پھنکاری۔ ''تمہیں صرف اپنی جان کی دہائی دینے کے سوا کوئی خیال ہی نہیں آئے گا۔''

ایک دم عمران اپنے مخصوص ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا اور بولا۔ ''میڈم! شاید آپ کو کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ غصے میں زیادہ خوبصورت نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر دو منٹ بعد گرجنے برسنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔''

''میرا اندازہ ہے کہ تم بھی روتے چلاتے اور مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے کافی اچھے لگتے ہو گے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ خوفناک انداز میں بولی۔

''یہ دیکھیں...... جوں جوں آپ کا غصہ بڑھ رہا ہے، آپ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ اگلے دو چار منٹ میں ضرور قلوپطرہ بن جائیں گی۔''

''اگلے دو چار منٹ میں اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک مسخرہ اپنی چوکڑی بھول کر کس طرح روتا چلاتا ہے اور زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔'' میڈم نے کہا۔

''آپ مستقبل کی بات اتنے یقین سے کیوں کرتی ہیں میڈم۔ گلوکار مکیش صاحب کہہ گئے ہیں...... آگے بھی جانے نہ تُو، پیچھے بھی جانے نہ تُو، جو کچھ ہے بس یہی ایک پل ہے۔''

میڈم صفورا بغیر کچھ کہے، لکڑی کی الماری کی طرف گھومی۔ اس نے الماری کھولی اور اندر سے ایک سرنج اور انجکشن نکال لیا۔ میڈم کے چہرے پر انتہا درجے کی بے رحمی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی میڈم تھی جسے ہم نے ایک عرصے پہلے لال کوٹھیوں میں دیکھا تھا...... اس کے رعب داب سے اردگرد کی ہر شے سہمی ہوئی سی رہتی تھی۔ اس کے طور اطوار میں کسی شعلہ مزاج ملکہ کی جھلکیاں تھیں۔

''یہ کس چیز کا انجکشن ہے میڈم؟'' عمران نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ بولتی بند کرنے کے لئے ہے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔

''تو پھر یہ آپ خود کو کیوں نہیں لگا لیتیں؟ مجھے تو ڈر ہے کہ آپ اسی طرح بولتی رہیں اور آپ کا غصہ شریف بڑھتا رہا تو آپ قلوپطرہ سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل جائیں گی۔ اتنا زیادہ حسن ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ خاص طور سے مجھ سے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں یہ رسیاں توڑ کر دھڑام سے آپ کے اوپر آ گروں اور یہیں اس قالین پر عشق کی انتہا ہو جائے۔''

میڈم نے اس مرتبہ جواب میں کچھ نہیں کہا۔ غالباً وہ عمران کی خوش گفتاری کا عملی جواب دینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے انجکشن کے وائل کو شیک کیا اور پھر اسے اوپر اُٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کر دیا۔ یہ ہلکے سبز رنگ کا انجکشن تھا۔ اچانک مجھے جارج گورا کی جیل کے قیدی عبدالرحیم کی بات یاد آ گئی۔ اس نے جارج کی جیل میں ستم گری کے ہتھکنڈوں کا ذکر کرتے ہوئے خاص قسم کے انجکشن کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ منحوس انجکشن جارج کے بہنوئی سرجن اسٹیل کا ایجاد کردہ ہے۔ یہ معتوب قیدی کو لگایا جاتا ہے

اور وہ کم از کم بارہ گھنٹے کے لئے زندگی اور موت کے درمیان لٹک جاتا ہے۔ پورے جسم پر سرخ نشان نمودار ہو جاتے ہیں اور اتنا شدید درد ہوتا ہے کہ قیدی بلک بلک کر موت کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ سخت سے سخت جان قیدی بھی اس طرح کے زیادہ سے زیادہ تین انجکشن برداشت کر پاتا ہے اور چھتیس گھنٹے بعد موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ آہنی دروازے والے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں عمران بھی اس مہلک ترین انجکشن کا شکار ہونے والا ہے۔ مجھے اس انجکشن کا نام یاد نہیں آ رہا تھا تاہم عبدالرحیم نے اس کا رنگ سبزی مائل بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ انجکشن کی سزا کو سُولی کے بعد دوسری بدترین سزا سمجھا جاتا ہے۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اتنی بات تو یقیناً وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ میڈم صفورا اس سرنج کے ذریعے کوئی مہلک دوا داخل کرنے والی ہے جو اسے شدید ترین تکلیف میں مبتلا کر دے گی یا پھر ہو سکتا ہے کہ موت سے ہی ہم کنار کر دے۔

سرنج بھرنے کے بعد میڈم صفورا نے دراز قد گارڈ کو اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی تھی۔ دراز قد گارڈ آگے بڑھا اور عمران کو الٹا کرنے کے لئے نیچے جھکا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنا خطرناک کام کرنے جا رہا ہے...... اور ہم میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا...... اچانک میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ عمران نے اپنی بندھی ہوئی ٹانگیں پورے زور سے گارڈ کے سینے پر ماریں...... وہ اچھلتا ہوا اس میز سے ٹکرایا جس پر ہمارا ذاتی سامان پڑا تھا۔ میز ٹوٹ گئی اور گارڈ کراہتا ہوا فرش بوس ہوا۔

تب ایک اور حیران کن منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی نائلون کی رسّی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ کم از کم تین جگہ سے ٹوٹی تھی، اس کے بل ایک دم کھلتے چلے گئے۔ عمران اچھل کر کھڑا ہوا۔ میڈم تانبے کے ایک وزنی گل دان کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ عمران نے جھک کر بہ آسانی یہ وار بچایا۔ اپنی پشت پر ٹانگ کی شدید ضرب کھا کر میڈم لڑکھڑاتی ہوئی آتش دان کے قریب گری۔ اس دوران میں دراز قد گارڈ سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ ہولسٹر کی صرف بڑھا رہا تھا جب عمران نے اس پر وار کیا۔ یہ ایک بے مثال وار تھا۔ مجھے اب فائٹنگ آرٹ کی کافی سمجھ بوجھ آ چکی تھی۔ میں عمران کے اس وار کی ٹائمنگ، ایکوریسی اور طاقت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ عمران نے پوری طاقت سے اپنی ٹانگ گھما کر گارڈ کے چہرے پر رسید کی تھی۔ میں نے جبڑا ٹوٹنے کی آواز بالکل صاف سنی۔ گارڈ کا سر بڑی شدت کے ساتھ آہنی دروازے سے ٹکرایا اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح قالین پر لڑھک گیا۔

میڈم جھپٹتی ہوئی اس ساؤنڈ پروف کمرے کے شمالی گوشے کی طرف گئی۔ یہ ایک طرح سے اس طویل کمرے کا دوسرا پورشن تھا، اسے نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میڈم کے یوں اس حصے کی طرف جھپٹنے کی وجہ چند لمحے بعد سمجھ میں آئی۔ جس وقت گارڈ چوٹ کھا کر گرا، پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرتے وقت پستول ہاتھ سے پھسلا اور نشست گاہ کی طرف چلا گیا تھا۔

جونہی عمران نے محسوس کیا کہ میڈم پستول پر جھپٹی ہے، عمران نے بھی جست لگائی اور ٹوٹی ہوئی میز کے قریب گرا۔ یہاں ہماری ذاتی اشیاء بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عمران کا ریوالور بھی شامل تھا۔ عمران اپنے ریوالور تک پہنچ گیا...... لیکن اس سے پہلے میڈم پستول تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے عمران پر دو فائر کئے۔ عمران پھرتی سے لیٹ گیا۔ یہاں اس کی بے مثال "لک" نے بھی کام کیا۔ دونوں گولیاں عقب میں آہنی دروازے پر لگیں۔ عمران کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کسی پیراک کی طرح جست لگائی اور ہوا میں اُڑتا ہوا وزنی چوبی الماری کے پیچھے گرا۔ یہ وہی الماری تھی جس میں سے کچھ دیر پہلے میڈم نے انجکشن نکالا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا، وہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ عمران کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں کو اس نے زور لگا کر اس طرح موڑ لیا کہ وہ الماری کے عقب سے میڈم پر فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میڈم نشست گاہ میں تھی اور وہاں کی نیم تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غالباً وہ بھی کسی چیز کے پیچھے پوزیشن لے چکی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر کم از کم تین تین فائر کئے۔ دھاکوں سے یہ کمرا گونج اُٹھا۔ میں بغیر کسی آڑ کے بستر پر پڑا تھا۔ کوئی آوارہ گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ میرے محفوظ رہنے سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ میڈم کے سارے غیظ و غضب کا رخ عمران کی طرف تھا اور وہ مجھے بخشنے پر آمادہ تھی۔

وہ فائر کرنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑ بھی رہی تھی۔ "حرامزادے...... کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے بڑی بری موت دوں گی۔"

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو اس طرح مردانہ وار للکارتے اور باقاعدہ گولی چلاتے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ پستول استعمال کرنے میں مہارت بھی رکھتی تھی۔

دفعتاً عمران کے ریوالور سے "ٹرچ" کی آواز نکلی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ یقیناً یہ آواز میڈم کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرا ریوالور بھی کمرے میں موجود تھا مگر وہ خاصے فاصلے پر

تھا۔عمران الماری کے عقب سے نکل کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یقیناً میڈم صفورا کی گولی کا شکار ہو جاتا لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کا ہم میں سے کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ایک بالکل ڈرامائی واقعہ تھا۔ گارڈ سمیت اس کمرے میں ہم کل چار ذی روح موجود تھے لیکن ہم ایک کو بھولے ہوئے تھے۔

اچانک میں نے میڈم کی کرب ناک آواز سنی۔ بالکل یہی لگا جیسے کسی نے اچانک اس پر خنجر چلا دیا ہو۔ وہ نہ صرف چلائی بلکہ لڑکھڑا کر کسی چیز پر گری۔ ''او گاڈ...... او گاڈ'' وہ دہشت سے پکارتی جا رہی تھی۔

عمران چند سیکنڈ تک الماری کے عقب میں رہا۔ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میڈم کوئی چال تو نہیں چل رہی۔ تاہم میڈم کا لہجہ گواہی دینے لگا کہ وہ تکلیف اور دہشت کے سخت گھیرے میں ہے۔ عمران الماری کے عقب سے نکل کر میڈم کی طرف بڑھا...... میں نے بھی بہ مشکل خود کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور تب میری نگاہ سانپ پر پڑی۔ وہی گول داغوں والا مہلک ترین جان دار جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ڈسا پانی طلب نہیں کرتا۔ ہم نے اسے زرگاں کے راستے میں ایک دلدلی علاقے سے پکڑا تھا اور یہ اب تک ایک کینوس کے تھیلے میں ہمارے ساتھ تھا۔ کمرے میں ہونے والی دھینگا مشتی کے دوران میں ہماری ساری اشیاء یہاں وہاں بکھر گئی تھی۔ یقیناً ان میں یہ کینوس کا تھیلا بھی شامل تھا۔ خبر نہیں کہ یہ کب تھیلے میں سے نکلا اور کب کسی کونے کھدرے میں رینگ گیا۔ اب وہ میری طرف آ رہا تھا۔ اس کی ''آمد'' کا نظارہ ایک دل خراش تجربہ تھا۔ عمران نے میڈم کا گرا ہوا پستول اُٹھایا اور تاک کر فائر کیا۔ پہلے فائر میں ہی سانپ کی کھوپڑی صاف اُڑ گئی۔ خون کے چھینٹے صوفے کے سفید غلاف کو رنگین کر گئے۔

میڈم نے اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی اور تکلیف کی شدت سے صوفے پر دُہری ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً سخت جان تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ عمران اور میں پشت جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ عمران نے پھرتی سے میرے ہاتھ کھول دیئے، میں نے عمران کے کھولے۔ عمران میڈم کی طرف لپکا۔ وہ زبردست برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی تاہم تکلیف اس کے چہرے پر اور پورے جسم سے ظاہر تھی۔ اس کے صاف شفاف رنگ میں ہلکی سی نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ کراہی۔

''مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔''

اس کی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہی عورت کچھ دیر پہلے

یرنی کی طرح گرج رہی تھی۔

سانپ نے اپنے دانت میڈم صفورا کے ٹخنے میں ذرا اوپر گاڑے تھے۔ نیلی جراب کے نیچے سے خون رِس رہا تھا۔ اپنا ''جوگر'' وہ پہلے ہی اُتار چکی تھی۔ عمران نے اس کی جراب بھی کھینچ دی۔ ''اس کا مفلر دینا مجھے۔'' عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بے سدھ پڑے شخص کے گلے سے مفلر کھینچ کر عمران کو دیا۔ عمران نے یہ مفلر کس کر زخم سے ذرا اوپر باندھ دیا۔

سریع الاثر زہر کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر آج پہلی بار آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ زخم کے اردگرد صفورا کی جلد تیزی سے نیلی پڑتی جا رہی تھی......

''چابی کہاں ہے؟'' عمران نے خشک لہجے میں صفورا سے پوچھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ گارڈ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ شاید وہ دم توڑ چکا ہے۔ صرف سانس کی مدھم حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بقید حیات ہے۔

میں اپنے پاؤں کھول چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر گارڈ کی جیبیں ٹٹولیں اور کمرے کی چابی برآمد کر لی۔ یہ ڈھائی تین انچ لمبی اسٹیل کی خاص چابی تھی۔ میں نے اور عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کیا پھر میں دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا اور تب میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ جس بیضوی قفل کے سوراخ میں، مَیں نے چابی گھمانی تھی، وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کے دوران میں گولیاں اس اسٹیل کے دروازے سے ٹکرائی تھیں اور قفل کا سوراخ ناکارہ ہو گیا تھا۔

''چابی اندر نہیں جا رہی۔'' میں نے عمران کو اطلاع دی۔

''چابی اندر نہیں جائے گی تو اس کی جان باہر آ جائے گی۔'' عمران نے کہا۔

اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تکلیف، صفورا کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ زخم کے اردگرد کی جلد کا رنگ بدل رہا تھا۔ عمران نے میرے ساتھ مل کر دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش یکسر ناکام ہوئی۔ ہم نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا اور صفورا کے ملازمین کو پکارنا شروع کیا۔ جلد ہی اس آہنی دروازے سے باہر لوگ جمع ہو گئے۔ وہ باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم اندر سے لگے رہے مگر یہ دروازہ ''مستقبل قریب'' میں کھلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ کمرے میں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی،

روشن دان، بغلی دروازہ، کوئی شے نہیں تھی۔ کمرے کے اندر اور باہر ایک دم ہی تہلکہ سا
گیا۔ دونوں طرف سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی...... وہ ٹس سے مس نہیں ہو
تھا۔ عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''شاید اسی موقع کے لئے کہا جاتا ہے...... لو آپ ا
دام میں صیاد آ گیا۔''

وہ پلٹ کر میڈم صفورا کی طرف بڑھا اور اس کے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر میں
ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرا یہ یار واقعی انوکھا تھا۔ سب سے منفرد، سب سے جدا۔ وہ یونہی
دلوں میں جگہ نہیں بناتا تھا، یونہی تو وہ رگِ جاں میں سما کر دھڑکنوں کا حصہ نہیں بن جاتا تھا۔
اگر وقت پڑنے پر فولاد تھا تو وقت پڑنے پر ریشم کی طرح نرم اور چاندنی کی طرح گداز
تھا۔ میں عمران کی بات کر رہا ہوں...... جو میری توانائیوں کا سرچشمہ تھا اور میرے لئے زند
کا دوسرا نام بن چکا تھا۔ اس نے میڈم صفورا کی پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور پھر ا
کے نہایت خطرناک زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ اپنے ہونٹوں کی پوری طاقت سے زخم
مواد چوس چوس کر ایک گلاس میں تھوکنے لگا۔

''عمران یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں بے تاب ہو کر بولا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا کام جاری رکھا۔ گلاس میں خون جمع
ہو رہا تھا اور اسی خون سے عمران کے خوب صورت ہونٹ بھی لتھڑے ہوئے تھے۔ بظاہر
صرف خون تھا لیکن اس میں یقیناً سانپ کا سریع الاثر زہر بھی شامل تھا۔ جب زخم سے نکلنے
والا مواد کم ہو گیا تو عمران نے شکاری چاقو کی مدد سے زخم کے گرد دو اور گہرے کٹ لگائے او
وہاں سے بھی sucking شروع کی۔ میڈم پر اب غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

کمرے میں رکھے ایک انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ باہر سے میڈم صفورا کے منیجر مدن کی
بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اندر کیا ہو گیا ہے...... دروازہ کیوں نا ہیں کھل رہا؟''

''میڈم شدید زخمی ہو گئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت
ہے۔ کسی بھی طرح دروازہ کھولو۔ نہیں کھلتا تو توڑ دو۔'' میں نے کہا۔

صرف چند سیکنڈ بعد آہنی دروازے پر باہر سے وزنی ہتھوڑے کی زوردار ضربیں لگائی
جانے لگیں۔ یہ ضربیں ہضمی قفل کی جگہ پر لگائی جا رہی تھیں۔ ضربوں سے پیدا ہونے والا شور
قیامت خیز تھا۔ مُردے بھی قبروں میں جاگ سکتے تھے اور گارڈ مرا نہیں، صرف بے ہوش ہو
تھا۔ وہ کسمسانے اور کراہنے لگا۔ میں اس کی طرف سے چوکس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی
مقامی طرز کی رنگین پگڑی میں، مَیں نے اپنا منہ پھر لپیٹ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لال بھون

کے عام ملازمین میری صورت دیکھیں۔ اسی دوران میں آہنی دروازہ ایک دھماکے سے کھل
گیا۔ صفورا کے درجنوں ملازمین بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ
یہاں کیا ہوا ہے۔ کسمساتا ہوا زخمی گارڈ...... سانپ کی لاش...... عمران کا خون آلود منہ......
سارے مناظر انہیں مزید ششدر کر رہے تھے۔

عمران گرجا۔ ''جلدی کرو۔ میڈم کو اسپتال لے جانا ہے۔''

کئی افراد میڈم پر جھک گئے اور اسے ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔

○......❖......○

میڈم کو اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں لال بھون میں ڈاکٹر اسٹیل
ایک تجربہ کار معاون پہنچ گیا۔ اس نے میڈم کو ایک دو انجکشن دیئے، ڈرپ لگائی اور میڈم کی
طبیعت بحال ہونا شروع ہو گئی۔ درحقیقت عمران کے بروقت اور دلیرانہ اقدام نے میڈم کو
شدید خطرے سے دوچار ہونے سے بچا لیا تھا۔

لیکن عمران کو بھی اس کا کچھ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ رات کو عمران کا منہ سوج گیا اور یہ
سوجن باہر ہی نہیں، منہ کے اندر بھی تھی۔ اسے زبان ہلانے میں بھی دشواری ہونے لگی......
علی الصباح میں نے میڈم کے منیجر مدن کو بتایا۔ اس کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ عمران
نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر میڈم کے زخم پر منہ رکھا تھا اور اس کا زہر نکالا تھا...... عمران
کے اس دلیرانہ ایثار نے ڈاکٹر کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان میں مدن بھی
شامل تھا...... وہ خود ہی ڈاکٹر کے پاس گیا اور عمران کی کیفیت بتا کر دوا لے آیا۔ ڈاکٹر نے
تسلی دی کہ اگر مریض کے منہ کے اندر کوئی تازہ زخم نہیں تو پریشانی کی بات نہیں...... ایک
دو دن میں اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ میں نے ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح عمران
کے منہ کا اندرونی معائنہ کیا۔ کوئی زخم نظر نہیں آیا۔ رات کو عمران کو تھوڑا سا بخار بھی ہو گیا
لیکن مجموعی طور پر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں ہوئی۔ دوسری طرف میڈم کی حالت
تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔

اگلی صبح میں میڈم کی خبرگیری کے لئے اس پورشن کی طرف گیا جہاں میڈم کی رہائش
تھی۔ میڈم تک پہنچنے میں منیجر مدن نے میری مدد کی۔ ہم ایک ایسی راہداری میں سے گئے تھے
جہاں کسی ملازم یا گارڈ سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے ایک گرم
ٹوپی اور مفلر سے اپنا دوتہائی چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ایک بلند و بالا دروازے سے گزر کر ہم ایک
شاندار بیڈروم میں پہنچے۔ یہاں ایرانی قالین بچھے تھے اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول

رہے تھے...... میڈم سفید اُجلے بستر پر لیٹی تھی۔ اسے ابھی تک ڈرپ لگی تھی۔ پاؤں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی۔ آنکھیں بھی بالکل بے تاثر تھیں۔ اگر میرا خیال تھا کہ میڈم کے انداز میں نرمی یا احسان مندی نظر آئے گی تو مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے مختصر جواب دیئے۔ میں کئی منٹ اس کے پاس رکا۔ اس دوران میں، مَیں منتظر رہا کہ شاید وہ عمران کے بارے میں کچھ پوچھے...... مگر ایسا نہیں ہوا...... بالآخر میں اس سے اجازت لے کر واپس ہو گیا۔ منیجر مدن بھی میرے ساتھ تھا۔ جب ہم کمرے کے دروازے پر پہنچے تو میڈم صفورا نے مجھے آواز دی۔ ”تابش!“

”جی میڈم!“ میں نے پلٹ کر کہا۔

”تمہارے دوست کا حال اب کیسا ہے؟“

”جی...... میڈم! کل شام تک تو ٹھیک نہیں تھا، اب تھوڑا سا بہتر ہے۔“

”مدن لال!“ میڈم نے منیجر کو مخاطب کیا۔

”جی میڈم!“ اس نے ادب سے جھک کر کہا۔

”ناشتے کے بعد ڈاکٹر کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اس کے دوست کو اچھی طرح دیکھے اور میڈیسن تجویز کرے۔“

میڈم کے لہجے میں مثبت تبدیلی محسوس کر کے مجھے عجیب سے اطمینان اور خوشی کا احساس ہوا۔ عمران دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی یہ صلاحیت جادو جیسی لگتی تھی۔ شاید یہاں بھی اس جادوگری نے کام دکھایا تھا۔

...... یہ چار روز بعد کی بات ہے۔ میں، عمران اور میڈم صفورا ایک بند کمرے میں بیٹھے تھے اور صورتِ حال پر کھل کر بات کر رہے تھے۔ میڈم صفورا اور عمران کے تعلقات میں حیرت انگیز تبدیلی رُونما ہو چکی تھی۔ اس تبدیلی کا محور و منبع پانچ چھ روز پہلے کا وہی ڈرامائی واقعہ تھا جس نے میڈم اور عمران دونوں کو جان کے لالے ڈال دیئے تھے...... میڈم صفورا نے ہمیں یہ بات بتا کر حیران کیا کہ پانچ چھ روز پہلے جب لال بھون کے مین گیٹ پر میرے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تو وہ چوراہے میں اسحاق کی سُولی کا منظر دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے بتایا کہ اسحاق ہمارے ساتھیوں میں سے تھا اور اس کی دردناک موت نے ہمیں شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ میڈم نے بھی اسحاق کی موت کے حوالے سے وہی روداد سنائی جو اس سے پہلے ہم ریٹائرڈ فوجی کی بیٹی وجنتی سے سن چکے تھے۔ اپنی بہن ماریا کے اغوا کا بدلہ لینے کے لئے جارج گورا نے اسحاق کی بھاوج کو اُٹھوایا تھا اور اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا

کہ کوئی اس عورت کو چھڑوانا چاہے تو اس کے لئے میدان کھلا ہے۔ وہ آئے اور اس سے دو دو ہاتھ کر کے عورت کو چھڑوا لے۔ دوسری صورت میں اس عورت پر اس کا پورا حق ہو گا اور وہ اپنی سوچ کے مطابق اس کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔

یہ تقریباً ویسا ہی ہتھکنڈا تھا جو پولیس والے یا دوسرے بااثر لوگ اپنے مفرور مجرموں کو پکڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان کے اہلِ خانہ کو دھر لیتے ہیں...... اور اپنے اہلِ خانہ کو بچانے کے لئے مجرم یا ملزم کو سامنے آنا پڑتا ہے۔ میڈم نے بتایا کہ اسحاق، جارج گورا سے دوبدو مقابلے کے لئے آیا تھا اور یہ مقابلہ اسے کرنا پڑا۔ حالانکہ اس میں اسحاق کی کامیابی کا امکان دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ سب تو جنگل کے قانون جیسا لگتا ہے۔ جس میں زور ہو، وہ اپنی مرضی کا فیصلہ ٹھونسنے کے لئے آزاد ہو جائے۔“

”بس کچھ ایسا ہی ہے۔“ میڈم نے کہا۔ ”اس رسم کو یہاں سامبر کہا جاتا ہے اور یہ پتا نہیں کب سے چلی آ رہی ہے۔“

”کب ہوئی تھی یہ زور آزمائی؟“ عمران نے پوچھا۔

”پچھلے بدھ کو اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سامبر کے اصول کے مطابق حمیدہ کے دیور اسحاق کو پورا پورا موقع دیا گیا تھا۔ دونوں میں تلوار بازی ہوئی تھی۔ یہاں چھوٹے سائز کی قریباً دو فٹ لمبی تلوار استعمال ہوتی ہے جسے کٹار یا کٹاری کہا جاتا ہے۔ جارج ایسے مقابلوں میں بہت مہارت حاصل کر چکا ہے اور کسی کو ایسے ”باؤٹس“ میں اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس نے لڑائی شروع ہونے کے ڈیڑھ دو منٹ بعد ہی اسحاق کی کٹار گرا دی تھی اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر پھر اس نے اسحاق کو ایک اور موقع دیا۔ اس مرتبہ بھی وہ دو منٹ سے زیادہ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ اس کی ران پر زخم لگا اور وہ گر گیا۔ جارج نے کٹار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس مقابلے میں پہلے ہی جارج نے واضح کر دیا تھا کہ اگر سامبر میں اس کے مقابلے میں آنے والا مقابلہ ہار گیا تو اسے ماریا کے اغوا کی پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا حمیدہ کے دیور کو دی گئی۔ مقابلے کے فوراً بعد جارج نے اس کے ہاتھ کی انگلیاں کٹار سے کاٹ ڈالی تھیں۔ بعد میں اسے سُولی چڑھا دیا گیا۔“

عمران نے پوچھا۔ ”اب اس لڑکی حمیدہ کے حوالے سے صورتِ حال کیا ہے؟“

میڈم صفورا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”انور خاں یہاں زرگاں کا ایک دلیر مسلمان ہے۔ سنا ہے کہ حمیدہ کو چھڑانے کے لئے اس نے جارج کے سامنے آنے کا

''اناؤنس'' کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین روز کے اندر زرگاں میں ایک اور خونی واقعہ ہو جائے۔''

''کیا انور خاں یہاں زرگاں میں آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ اسے یہیں آنا پڑے گا۔''

''کیا اس مقابلے سے پہلے ہی ہم کسی طرح اس ''لڑاکے مرغے'' کا سر قلم نہیں کر سکتے؟'' عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

''سوچا تو بہت کچھ جا سکتا ہے لیکن تھیوری اور پریکٹیکل میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' میڈم نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔

''کیا آپ کی رسائی جارج تک نہیں ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے یہاں آئے تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار جارج سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی یہاں نہیں راج بھون میں۔ آج کل یہ سارے لوگ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت چوکس ہیں۔ خاص طور سے حکم جی، جارج اور سرجن اسٹیل، ماریا وغیرہ...... ایک ہفتے پہلے بھی ایک خونی واقعہ ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے راج بھون کے اندر گھس کر کارروائی کی ہے۔ ساری سیکیورٹی کو درہم برہم کر کے وہ راج بھون کے اندر پہنچے، گارڈز سے رائفلیں چھینیں اور اندھا دھند فائرنگ کی۔ سرجن اسٹیل کے بھائی کے علاوہ کئی گارڈز بھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ......''

ایک دم میڈم صفورا بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ اس نے جیسے چونک کر ہم دونوں کو دیکھا۔ پھر ٹھٹکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم دونوں بھی زرگاں دو تاریخ کو ہی پہنچے تھے نا؟'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ واقعہ بھی اسی دن ہوا۔ کہیں...... میرا مطلب ہے...... کہیں......'' وہ کھوجی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی جا رہی تھی۔

عمران نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف نگاہ دوڑائی۔

میڈم بولی۔ ''کہیں تم دونوں کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو؟''

عمران نے میڈم کی اجازت سے اس کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ لیا اور بولا۔ ''میڈم! ہم چھپا رہے تھے لیکن اب چھپانا نہیں چاہتے۔ ہمیں قدرت نے ایک ہی راستے پر لا کھڑا کیا ہے اور اب ہمیں ایک ہی رخ پر جانا ہے......''

اس کے بعد میں نے اور عمران نے اپنی کہانی کا وہ حصہ بھی میڈم کے گوش گزار کر دیا جو

اب تک اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ جان کر ششدر ہوئی کہ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے اس رات راج بھون میں تہلکہ مچایا تھا...... اور پھر صاف بچ کر نکل گئے تھے۔ میڈم کے ساتھ اس گفتگو میں ہم پر ایک اور انکشاف بھی ہوا اور وہ یہ کہ اس رات میں نے سرپٹ بھاگتی...... گاڑی کے اندر جس شخص کو جہنم واصل کیا، وہ رنجیت پانڈے نہیں اس کا چچازاد گرومیت پانڈے تھا۔ دونوں کی شکل اور قد کاٹھ کافی حد تک ملتے جلتے تھے۔ ان کو قریب سے نہ جاننے والے اکثر دھوکا کھا جاتے تھے۔ مجھے وجنتی کے پتا کا وہ فقرہ بھی یاد آیا جو اس نے پانڈے کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے بولا تھا۔ اس نے ''چھوٹے پانڈے'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔

ہمارے اور میڈم کے درمیان ہونے والی یہ طویل گفتگو کئی لحاظ سے کارآمد رہی۔ کئی طرح سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اسی گفتگو میں میڈم کے ایک سوال کے جواب میں عمران نے یہ بھی بتایا کہ جب بے ہوشی کی حالت میں میڈم نے اس کے اور میرے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے تھے تو وہ اچانک اپنے پاؤں کی رسّی توڑنے میں کامیاب کیسے ہوگیا تھا۔ عمران نے بتایا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس رسّی کو ایک میز کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ساتھ رگڑتا رہا تھا اور اسے کمزور کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ ایڈووکیٹ...... ابرار صدیقی کی بھی بقایا سزا معاف ہونے کی امید ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بھی چار پانچ روز میں ایک قریبی پگوڈے سے یہاں لال بھون میں پہنچ جائے۔ یہاں لال بھون کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کئی انکشافات ہوئے۔ میں، عمران اور میڈم سر جوڑ کر بیٹھے اور پہلی بار مشترکہ طور پر سوچا کہ ہم اس راجواڑے کی تاریکی سے نکل کر کس طرح آزاد فضاؤں میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اہم ترین مقصد بھی زیر بحث آیا جس کے لئے ہم یہاں پہنچے تھے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی...... یعنی جارج گورے کی موت......

یہ دوسرے روز کی بات ہے، عمران لان کی طرف چہل قدمی کے لئے گیا تھا۔ میں کمرے میں تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے میں نے ایک دن کے لئے بھی ورزش نہیں چھوڑی تھی۔ یہاں اور جس وقت موقع ملتا، میں دن میں کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹا اپنی جسمانی فٹنس کو ضرور دیتا تھا۔ اب بھی میں کمرے کے اندر ہی اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ مارشل آرٹ اور باکسنگ وغیرہ میں ایک لفظ ''شیڈو فائٹ'' استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کھلاڑی کا بغیر کسی حریف کے خیالی لڑائی لڑنا اور اس طرح خود کو چست رکھنا۔ کچھ دیر تک شیڈو فائٹ کرنے کے بعد میں ڈپس لگانے میں مصروف ہوگیا۔ یہ کوئی دس بیس یا سو پچاس ڈپس نہیں تھے بلکہ میں گنتی کرتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار شروع ہوتا تھا تو پھر جب تک بازو بے دم نہیں ہو جاتے تھے، لگا

رہتا تھا۔ جیکی یہی کہا کرتا تھا۔ جہاں ہمت جواب دے جاتی ہے، وہیں سے غیر معمولی ''امپروومنٹ'' کا آغاز ہوتا ہے۔

اس دن میں اپنے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی سختی کر گیا۔ ورزش ختم کی تو پیٹ کے بالائی حصے میں اینٹھن شروع ہوگئی۔ میں قالین پر لیٹ گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر لان کا منظر نظر آ رہا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی مگر سرما کی دھوپ میں ابھی تک کوئی دم خم نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا دور ایک روش پر عمران اکڑوں بیٹھا ہوا میڈم صفور کے چھوٹے ریشمیں کتے کو پچکار رہا تھا۔ میڈم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ کتے کو غالباً کوئی چوٹ آئی تھی۔ عمران اس کی چوٹ پر دوا لگانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ میڈم سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے جب کسی کو رام کرنا ہوتا تھا تو اس کی خوش گفتاری عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ میڈم سنجیدہ نظر آتی تھی۔ وہ بس عمران کی کسی کسی بات کا ہی جواب دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میڈم کا ملازم کتے کو گود میں اُٹھا کر میڈم کے پیچھے پیچھے درختوں میں اوجھل ہوگیا، عمران واپس کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ کمرے میں پہنچا اور میرے تاثرات دیکھ کر چونک گیا...... ''جگر! کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''کچھ نہیں...... پیٹ میں ذرا درد ہو رہا ہے۔''

''ذرا نہیں ہو رہا۔ تم تو پیلے پڑے ہوئے ہو لیکن یہ ہوا کیوں...... مجھے تو لگتا ہے، تم نے اندھا دھند ورزش فرمائی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بہت جلد درست نتیجے پر پہنچ گیا۔

میں خاموش رہا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کبھی کبھی تم جنون کی حد تک چلے جاتے ہو۔ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے لگتے ہو۔ نقصان اُٹھاؤ گے۔''

پھر وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے پیٹ کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ''کہاں ہے درد؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے خود پتا نہیں چل رہا۔'' میں زبردستی مسکرایا۔

''میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے اسے روک دیا۔ ''خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ اب میں پہلے سے بہتر ہوں۔''

تھوڑی سی کوشش کر کے میں نے اسے قائل کر لیا کہ درد نا قابلِ برداشت نہیں اور اب

کم ہوتا جا رہا ہے۔

حقیقت میں ایسا نہیں تھا...... درد شدید تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب اپنی کسی بھی تکلیف کے لئے مجھے دوا کا سہارا لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں تکلیف کو دوا کے بغیر برداشت کرتا تھا اور اکثر یہ بُرا وقت گزر ہی جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ آدھ پون گھنٹے تک درد نے زور مارا پھر دھیرے دھیرے کم ہو کر ختم ہو گیا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی اور میڈم اندر آ گئی۔ وہ نسبتاً اچھے موڈ میں تھی۔ سانپ کے ڈسنے کے اثرات اب اس پر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ ہمارے کمرے کے آہنی دروازے کی مرمت ہو چکی تھی اور بے ہوش ہو جانے والا دراز قد گارڈ بھی اب روبہ صحت تھا۔ میڈم نے سگریٹ سلگایا اور ہمیں بھی پیشکش کی۔ عمران نے یہ پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ میڈم بولی۔ ''آج کل یہاں زرگاں میں ایک اور بات گردش کر رہی ہے۔ لوح یا تختی والی بات۔ تم نے کچھ سنا ہے اس بارے میں؟''

''نہیں میڈم۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ تو تمہیں پتا ہی ہے ناکہ حکم جی کے خاص قیدی اگر جیل وغیرہ میں نہ بھی ہوں تو اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں سکتے۔ انہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے حکم جی کی روحانی طاقت کا کرشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب کچھ لوگ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ جس میجک کے ذریعے ان قیدیوں کو اسیر کیا جاتا ہے، وہ کسی لوح یا تختی پر لکھا جاتا ہے اور پھر یہ چھوٹی سی لوح قیدی کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ اس لوح کی شکتی ہے کہ وہ قیدی جہاں بھی جاتا ہے، حکم جی کی نظروں میں رہتا ہے......''

عمران زیرلب مسکرایا اور بولا۔ ''اس بارے میں آپ کا کیا آئیڈیا ہے میڈم؟''

میڈم سگریٹ کا طویل کش لے کر بولی۔ ''اسٹیٹ کے عام لوگ تو اسی میجک اور لوح والی بات کو درست سمجھتے ہیں لیکن چند پڑھے لکھے ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو میجک یا لوح اور نقش وغیرہ کہا جاتا ہے، وہ شاید کوئی جدید ڈیوائس ہے...... کوئی الیکٹرانک چپ وغیرہ......''

کچھ دیر کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ نے مجھ سے ابھی تک یہ اہم سوال نہیں پوچھا کہ میں زرگاں سے فرار ہونے کے بعد حکم کے ہرکاروں کی نگاہ سے کئی ہفتے تک کیسے بچا رہا اور کیسے پھر چوری چھپے یہاں زرگاں پہنچ گیا؟''

''بے شک یہ سوال میرے ذہن میں آتا رہا ہے۔'' میڈم نے کہا۔

"آپ نے جو تختی والی بات کہی ہے میڈم...... وہ بالکل درست ہے اور میں اب تک اسی لئے بچا رہا ہوں کہ میں اپنے اندر اس تختی کی موجودگی سے باخبر ہو گیا تھا۔"

"باخبر ہو گیا تھا؟"

"جی میڈم! اور مجھے پتا چل گیا تھا کہ مجھے اس کا توڑ کیسے کرنا ہے۔"

میڈم نے پہلے میری طرف پھر عمران کی طرف اور تب دوبارہ میری طرف دیکھا۔ "کیا تم اس کی وضاحت کرنا پسند کرو گے؟" اس نے کہا۔ تختی والی بات اسے ششدر کر رہی تھی۔

ہمیں میڈم کا اعتماد اور بھروسا درکار تھا اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب ہمارے درمیان کم سے کم پردہ باقی رہے۔ میں نے میڈم کو چپ کے حوالے سے تقریباً سبھی کچھ بتا دیا...... اور یہ بھی بتا دیا کہ بالآخر یہ چپ کیسے اور کیونکر میرے جسم سے نکل سکی ہے۔ میڈم یہ ساری روداد بہت حیرت کے عالم میں سنتی رہی، بیچ بیچ میں کہیں کہیں اس نے سوالات بھی کئے۔ میں نے میڈم کو اس نہایت خطرناک آپریشن کا نشان دکھایا اور دیگر تفصیلات بتائیں۔

اس کے بعد میڈم ہی کے کہنے پر میں نے میڈم کے سر کے پچھلے حصے کا معائنہ بھی کیا۔ میرے ذہن میں اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان موجود تھا کہ میڈم صفورا اور...... ابرار صدیقی کے جسم میں بھی چپ رکھی ہو گی مگر کم از کم میڈم کے جسم میں چپ کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔ ہماری یہ سنسنی خیز گفتگو جاری تھی کہ کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ شاید کسی کو ڈانٹ رہی تھی اور مار بھی رہی تھی۔ پھر جس کو مارا جا رہا تھا، اس کے چلانے کی آواز بھی اُبھری۔ یہ اسی دن والی ثمرین نامی لڑکی کی آواز تھی۔

"اوہ گاڈ! یہ پھر تماشا لگ گیا ہے۔" میڈم نے بیزار لہجے میں کہا۔ ہم سے معذرت کر کے وہ باہر چلی گئی۔

اسے باہر کا معاملہ سنبھالنے اور واپس آنے میں قریباً دس منٹ لگ گئے۔

"اس لڑکی کا کیا مسئلہ ہے میڈم؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں جو لڑکیاں تربیت کے لئے اور پالش وغیرہ ہونے کے لئے آتی ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جن کی اپنی مرضی بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ وہ راج بھون کی رنگینیوں اور وہاں کے آرام و آسائش میں جانے کا شوق دل میں رکھتی ہیں لیکن کچھ کو یہ سب کچھ مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے اور وہ دل ہی دل میں یہ خواہش رکھتی ہیں کہ وہ "فیری سلیکشن" سے بچ جائیں تو اچھا ہے۔ اب ان میں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو چپ رہتی ہیں اور دوسری وہ جو تھوڑی بہت مزاحمت کرتی ہیں۔ یہ ثمرین نامی لڑکی بھی مزاحمت

کرنے والیوں میں ہے۔ یہ اکثر کسی بات پر اڑ جاتی ہے اور پھر مار پیٹ کا شکار ہوتی ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ تمہاری بیوی سلطانہ کے گھرانے سے بھی اس کا تھوڑا بہت تعلق ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میڈم چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔ "یہ سلطانہ کی رشتے دار ہے۔ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی نبیل سے ہونے والی تھی لیکن پھر نبیل کمر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے مفلوج ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ پہلے امید تھی کہ شاید وہ علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ پھر وہ لوگ ویسے ہی زرگاں چھوڑ کرنل پانی چلے گئے...... اب یہ لڑکی نظر میں آ گئی ہے۔"

"نظر میں آ گئی...... کیا مطلب؟" عمران نے پوچھا۔

"ساتویں کا جشن شروع ہونے سے قریباً چھ مہینے پہلے راج بھون کے خاص اہلکاروں کی ٹیم جن میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، دوشیزاؤں کی تلاش میں نکلتی ہے۔ جو لڑکیاں سلیکٹ ہوتی ہیں ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ "نظر" میں آئی ہیں۔ اس "تلاش" میں وہ سیکڑوں عورتیں بھی مدد کرتی ہیں جو مقامی آبادی میں موجود ہوتی ہیں اور ان کے رابطے راج بھون سے ہوتے ہیں۔"

"تو آپ کا مطلب ہے کہ اس ثمرین نامی لڑکی کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہونے والی تھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بالکل ایسا ہی تھا اور ان لڑکیوں میں آٹھ دس اور بھی ایسی ہیں جو بالکل ناخوش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت کو کوستی ہوں جب وہ کسی وجہ سے نظر میں آئیں۔"

میرے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ میں نے میڈم سے اس بارے میں دو چار سوال مزید پوچھے۔ میڈم نے بتایا کہ اس ثمرین نامی لڑکی نے اسے خود یہ ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ اس لڑکے کی یاد اب بھی دل میں بسائے ہوئے ہے۔

مجھے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو تاؤ افضل نے مجھے سلطانہ اور اس کے بھائی کے بارے میں بتائی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ سلطانہ اپنے بھائی کا علاج کرانے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔ اس نے محنت مزدوری کر کے پندرہ ہزار روپے کی رقم جمع کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ رقم نبیل کے کام آتی، میں خود بیمار پڑ گیا تھا۔ میرا بخار اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ایک ہچکی ہر وقت میرا سینہ دہلاتی رہتی تھی۔ سلطانہ نے اپنی جمع پونجی بشمول اپنے زیورات، بے دریغ

میرے علاج پر خرچ کر دی تھی۔ پتا نہیں کہ خاموشی اور راز داری کے ساتھ اس لڑکی نے کتنے احسان لادے ہوئے تھے میرے سر پر۔ میں جدھر رخ کرتا تھا، مجھے اس کے بے مثال ایثار کے نشان نظر آتے تھے۔ اس ایثار کی وجہ سے وہ خود مشکلوں کا شکار ہوئی تھی اور اس کے قریبی بھی۔

جواں سال نبیل کا بیمار اور مایوس چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں اس کی بربادیوں میں اہم حصے دار ہوں۔ میری وجہ سے وہ اپنی صحت سے دور ہوا اور شاید اپنی محبت سے بھی۔

''کن خیالوں میں کھو گئے ہو؟'' میڈم کی آواز نے مجھے چونکایا۔

''میں اس لڑکی سے مل سکتا ہوں؟''

''مل کر کیا کرو گے؟''

''میں اس سے تھوڑی سی بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کر لینا، اس میں کون سی رکاوٹ ہے۔ ابھی وہ ذرا رو دھو رہی ہے۔ گیتا مکھی سے آج پھر اس کی لڑائی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی نے اپنے سر کے بال سامنے سے کٹوانے تھے۔ اس نے ثمرین سے کہا۔ بال تھوڑے سے زیادہ کٹ گئے۔ بناؤ سنگھار والی ٹیچر نے گیتا کو بتایا۔ گیتا نے ثمرین کو ڈانٹا ڈپٹا ہے۔ جس کے بال کٹے ہیں اس کی تو اچھی درگت بنی ہے۔ چھڑی سے مار پڑی ہے اسے۔ یہاں ایسے معاملوں کی بڑی سختی ہے۔ انتخاب کے لئے نظر میں آنے والی لڑکیوں کو لگے بندھے اصولوں کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ خلاف ورزی پر جان تک کے لالے پڑ سکتے ہیں۔''

اس بارے میں ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے میڈم نے بتایا۔ ''حکم جی کو یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تربیت پانے والی لڑکیوں کو بتایا جاتا ہے کہ اوتار اور اس کے خاص مصاحبوں کی خوشی کا خیال رکھ کے وہ ہر جنم میں اعلیٰ رتبہ پا سکتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ان کی قسمت جاگے اور حکم جی یا ان کا کوئی مصاحب ان کی طرف خاص انداز کی ''پیش قدمی'' کرے تو انہیں کس طرح خوش آمدید کہنا ہے اور ان کو ریجھانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کرنے ہیں، گیتا مکھی اس تربیت کی ماہر ہے اور گیتا مکھی سے اکثر ثمرین کی چپقلش ہو جاتی ہے۔'' یہ ساری باتیں تن بدن میں آگ لگا دینے والی تھیں۔ حکم جی اور اس کے حواریوں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا۔

ان باتوں سے تصدیق ہوئی تھی کہ جیکی کی حسین محبوبہ شکنتلا والی کہانی بھی بالکل سچ

تھی۔ شکنتلا کی ''پریم کہانی'' کی وجہ سے حکم جی اسے اپنی پتنی تو نہ بنا سکا لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے اس نے شکنتلا کو فیری یا پری کا درجہ دے دیا۔ اس کے لئے سبز رنگ کا چناؤ کیا گیا اور وہ راج بھون کی سبز پری کے طور پر حکم جی کے گھڑے کی مچھلی بن گئی۔ ایسی نہ جانے کتنی شکنتلائیں اور ثمرینیں حکم جی اور جارج گورا وغیرہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں اور ابھی چڑھنے والی تھیں۔

میڈم کے جانے کے بعد بھی وہ اور عمران ثمرین کے بارے میں بات کرتے رہے۔ عمران کو بھی اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''اس کا معاملہ بھی تمہاری ثروت جیسا ہی لگتا ہے...... وہ کیا کہتے ہیں، ٹوٹی کہاں کمند۔ مجھے ایک وظیفہ یاد آ رہا ہے جو ایسی لڑکیوں کو مصیبت سے بچانے کے لئے پڑھتا جاتا ہے۔ اگر وہ پورا یاد آ گیا تو شاید ہم اس کو بچا لیں۔'' وہ ایسی ہی گول مول باتیں کرتا تھا۔

اس رات میں سونے کے لئے لیٹا تو دیر تک باروندا جیکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا، اپنے کٹے پھٹے جسم کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آگ اور ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ مجھے بھولنا نہیں۔ مجھے یاد رکھنا اور میری بے بسی کو بھی اور اپنا حوصلہ بلند رکھنا۔ میں نے تمہیں کمزور نہیں رہنے دیا ہے۔ اپنی ساری آگ تمہیں سونپ دی ہے اور اپنے دشمن کے بارے میں بھی بتا دیا ہے......

پھر میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میں اسے مندر کے تہ خانوں میں چھوڑ آیا تھا اور کہہ آیا تھا کہ میں وہ کام پورا کر کے آؤں گا جس کے لئے وہ اپنا سر ہتھیلی پر لے کر پھرتی رہی ہے۔ میرا نشانہ جارج گورا تھا اور میں جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں جوں جوں جارج گورا کے بارے میں زیادہ جان رہا تھا اور اس کی خصلت کو زیادہ پہچان رہا تھا، میرے دل میں اس کے لئے نفرت اور انتقام کا بہاؤ تیز تر ہو رہا تھا۔ وہ گورا، جھڑی والا یہاں کے لوگوں کو شاید انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ زرگاں اس کے لئے شکار گاہ تھی۔ یہاں کے مرد و زن اس کے لئے پُر گوشت چوپایوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے مقامی خواتین اس کا من پسند شکار تھیں اور وہ اس حوالے سے کسی طرح کی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ برملا کہتا تھا...... مجھے مقامی عورتیں بھاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل میں انہیں حاصل کرنے کی خواہش جاگتی ہے۔ میں اس حوالے سے کمزور ہوں۔ ہوا اور پانی کے بغیر تو میں شاید زندہ رہ جاؤں لیکن خوش شکل نمکین عورتوں کے بغیر نہیں۔

یہ عورت باز شخص میری سلطانہ کو داغ دار کر چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکا لگا چکا تھا۔ وہ راجپوت خاندان کی طرح دار بیٹی تھی۔ جارج نے اس کا پندار توڑا تھا، اس کی آن بان خاک میں ملائی تھی...... اور وہ ابھی تک زندہ تھا، راج بھون کی بلند دیواروں کے اندر سانس لے رہا تھا، زندگی کی ساری لذتوں سے بہرہ مند ہو رہا تھا...... اور حمیدہ جیسے نئے شکار پھانس رہا تھا۔

میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے الاؤ بن گئے۔ میں بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا...... مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دوسرے بستر پر عمران سو رہا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ میں ہر مصلحت اور اندیشے کو بالائے طاق رکھ دینے کے مرحلے میں آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک واشگاف فیصلے تک پہنچ گیا...... میں نے دیوار پر لٹکے ہوئے ہولسٹر میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھا اور جیکٹ پہن لی...... ایک سرخ دھندسی میری آنکھوں کے سامنے چھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں عمران کو سوتا چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ نیم گرم کمرے سے باہر سردی تھی اور میں جانتا تھا کہ لال بھون سے نکلتے ہی میرا سامنا کڑاکے کی ٹھنڈ سے ہوگا لیکن سردی، گرمی، بھوک پیاس، چوٹ اور بے آرامی کی دی ہوئی تکلیفیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ یہ تکلیفیں میرے بے تکلف دوستوں جیسی ہو گئی تھیں۔ مجھے ان کے ساتھ مل بیٹھنا اور ان کی ''کمپنی'' میں خوش رہنا آ گیا تھا۔ جیسے نہایت تیز مرچ مسالے کی وجہ سے آنسو آ جاتے ہیں لیکن انسان مزہ بھی محسوس کرتا ہے...... کچھ ایسا ہی مزہ مجھے دکھ جھیل کر آتا تھا۔

میں دو راہداریوں میں سے گزر کر ایک بڑے لاؤنج میں پہنچا۔ ایک قریبی ہال نما کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹی وی اور اس جیسی دوسری الیکٹرانکس اشیاء یہاں خال خال ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ ٹی وی پر وی سی آر کے ذریعے لڑکیاں کوئی رومانی فلم دیکھ رہی تھیں...... یا شاید انہیں ''تربیت'' کے طور پر دکھائی جا رہی تھی۔ گاہے بگاہے نوخیز لڑکیوں کی کھلکھلاتی ہنسی بند دروازے کے عقب سے اُبھرتی تھی۔ میں برآمدے میں چلا آیا۔ کڑک سردی نے استقبال کیا۔ وسیع لان میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف الاؤ روشن تھا مگر وہاں کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ غور کیا تو پہرے دار صاحبان ایک کھڑکی سے چمٹے نظر آئے۔ وہ تاریکی میں کھڑے تھے اور ادھ کھلی کھڑکی میں سے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے۔ یہاں یہ چیز یقیناً ''عجوبہ تفریح'' کے زمرے میں آتی تھی۔

میں پہرے داروں کی نظر بچاتا ہوا باغیچے کی طرف چلا گیا۔ دن کی روشنی میں، مَیں اس جگہ کا معائنہ کر چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ لال بھون سے چوری چھپے نکلنے کے لئے یہ راستہ بہترین ہے۔ سامنے سے ایک گارڈ ٹارچ ہلاتا آ رہا تھا۔ میں جلدی سے ایک مور پنکھ کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہاں سے ایک روش پر چلتا ہوا میں دس فٹ اونچی بیرونی دیوار تک پہنچ گیا یہاں چنار، مہندی اور جامن وغیرہ کے پیڑ تھے۔ میں ایک درخت پر چڑھ کر دیوار پر آیا اور پھر خاموشی سے دوسری طرف کود گیا۔

لال بھون کی عمارت پانچ چھ کینال میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں عمارت کا چکر کاٹ کر روشن سڑک پر آ گیا۔ یہاں اکا دکا گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، سڑک کشادہ ہوتی گئی اور رونق میں بھی قدرے اضافہ ہوا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا راج بھون کی طرف جا رہا تھا۔ راج بھون کے بلند و بالا محرابی دروازے کی روشنیاں کافی دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ آج میں نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے پہلے میں اور عمران پگڑیوں میں چہرہ چھپا کر زرگاں میں پھرتے رہے تھے، آج پگڑی نہیں تھی اور پتا نہیں کیوں میں چہرہ چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا، یہاں میرا کوئی شناسا مجھے پہچان سکتا ہے۔ میں جارج کا مفرور قیدی تھا اور اب تو اور کئی الزام بھی میرے سر آ چکے تھے جن میں تیواری لال اور ڈیوڈ کے قتل کے علاوہ ماریا کے اغوا کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔

ان اندیشوں کو دیوانی ٹھوکر سے اُڑاتا ہوا میں سیدھا راج بھون کے بلند و بالا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ دوڑ رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق، ابھی میں راج بھون کے عظیم الشان دروازے سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی تھا کہ مسلح گارڈز نے مجھے روک لیا۔

''کیا بات ہے...... کہاں جا رہے ہو؟'' ایک افسر نما شخص نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''میں جارج گورا سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میرا لہجہ سپاٹ اور مستحکم تھا۔

کئی گارڈز میرے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اچانک مجھے پہچان لیا گیا۔ ایک شخص نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ ''...... یہ تو وہی ہے...... مختار کی بیٹی کا شوہر۔''

سب سناٹے میں رہ گئے۔ میرے چہرے پر ٹارچوں کی روشنی پھینکی گئی۔ ایک دم دو گارڈز نے رائفلوں کی رخ میری طرف کر دیا۔ ''تم مہروز ہو؟'' انچارج گارڈ کی چونکی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"ہاں......اور جارج کو بتاؤ۔ میں اس سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔"

"ملاتے ہیں......ملاتے ہیں......ابھی تم ادھر آؤ۔"

انچارج نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ ایک دوسرے گارڈ نے تیزی سے میری تلاشی لی اور ریوالور میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔

وہ مجھے مین گیٹ کے پاس ہی واقع ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف کھینچنے لگے۔

"چھوڑ دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "تم نے میری تلاشی لے لی ہے، اب مجھے جارج کے پاس جانے دو۔ میں اس سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"تمیز سے بولو اور کیا بات کرنے آئے ہو تم؟"

"میں اس کے اعلان کے جواب میں آیا ہوں۔ اس نے سامبر کا چیلنج دے رکھا ہے۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔" بہت سے لوگ اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے اور میں یہی چاہتا تھا۔

میں نے چیلنج کی بات کی تو گارڈز میں ایک دم سنسنی سی دوڑ گئی۔ ان کا سخت رویہ بھی قدرے نرم پڑ گیا۔ میں نے اپنی بات دُہرائی۔ "جارج کو بتا دو کہ میں سامبر میں اس کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی نشہ وغیرہ تو ناہیں کر رکھا۔ میرا مطلب ہے جو کہہ رہے ہو، ہوش حواس میں کہہ رہے ہو نا؟" انچارج گارڈ کے لہجے میں ہلکا سا طنز داخل ہو گیا۔

"ہاں، ہوش حواس میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی ہوش حواس کے ساتھ سنو۔ مجھے جارج سے ملواؤ۔"

مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ایک بار پھر مزید احتیاط سے میری تلاشی لی گئی۔ اردگرد ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ انچارج گارڈ نے مجھ سے کچھ مزید سوالات پوچھے جن کے میں نے طے شدہ جواب دیئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں اکیلا پہنچا ہوں اور آج ہی آیا ہوں۔

قریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ایک منحوس صورت کو اپنے روبرو پایا۔ یہ جارج کا بہنوئی اور ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل تھا۔ وہ خاصا دراز قد تھا۔ نشے کے سبب اس کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی تھیں۔ چند دن پہلے میری رائفل کی گولی اس کے بھائی کو لگی تھی اور وہ جہنم واصل ہو گیا تھا۔ اس موت کا غم بھی اس کے چہرے پر تلاش کیا جا سکتا تھا۔

اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں حقارت آمیز تجسس نظر آنے لگا۔ وہ بناوٹی لہجے میں بولا۔ "خوش آمدید۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوا۔ بہت اچھا

بات......کہ تم کو ڈھونڈنے میں ہام کو زیادہ "اسٹرگل" ناہیں کرنا پڑا۔"

میں نے بے خوف ہو کر کہا۔ "مجھے بھی خوشی ہے کہ مجھے پالتو کتوں سے نہیں لڑنا پڑا۔ میں سیدھا ان کے مالک سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہوں۔"

"تم اپنی بکواس بند کرو۔" انچارج پھنکارا اور اس نے میرے سر پر چوٹ لگانے کے لئے رائفل کا دستہ فضا میں بلند کیا۔

"نہیں۔" سرجن اسٹیل نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔ "اس نے چیلنج قبول کیا۔ اب یہ ہام کی حفاظت میں ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوئیں گا، اب رُول کے مطابق ہوئیں گا۔"

انچارج پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد دو تین اور اہم افراد وہاں آن موجود ہوئے، یہ مقامی فوج کے افسران ہی لگتے تھے۔ میں نے خدابخش کو بھی دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو چند ماہ پہلے موہن کمار وغیرہ کے ساتھ نل پانی پہنچا تھا تاکہ مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں لا سکے۔ مجھے پہچاننے کے بعد ہر چہرے پر سنسنی کے آثار نظر آ رہے تھے......مجھ سے بار بار پوچھا گیا کہ کیا میرے ساتھ کوئی اور بھی یہاں زرگاں پہنچا ہے؟ میں نے ہر بار اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔ دراصل ان لوگوں کو انور خاں کے بارے میں شک تھا......سرجن اسٹیل نے مجھ سے کہا۔ "ہام کو معلوم ہوا تھا کہ وہ بھگوڑا انور خاں بھی یہاں آنا مانگتا۔ وہ بھی چیلنج قبول کرتا۔"

"وہ بھگوڑا نہیں سرجن...... وہ باغی ہے اور ابھی اس جیسے اور کئی باغی تم لوگوں کو ناکوں چنے چبوائیں گے اور جہاں تک اس کے آنے کی بات ہے تو اس کی جگہ میں آ گیا ہوں۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر تک گفتگو جاری رہی۔ سرجن اسٹیل کی طرف سے خدابخش کوئی پیغام لے کر جارج گورا کی طرف گیا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ جارج گورا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک سرجن اسٹیل اور فوجی افسران سے کھسر پھر کی۔ اس کے بعد خدابخش نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "سامبر سے پہلے کے دو چار دن تم کہاں رہنا چاہت ہو؟"

"میں تمہارے اس راج بھون کے سوا کہیں بھی رہنے کو تیار ہوں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"یہاں اور کون سی جگہ ہے؟"

میں نے چند سیکنڈ تک سوچنے کی اداکاری کی پھر کہا۔ "تم لوگ مجھے پگوڈا میں ٹھہرا سکتے

ہو۔"

"پگوڈا میں کیوں؟" سرجن اسٹیل نے دریافت کیا۔

"وہاں میری پرانی ساتھی کورتی (میڈم صفورا) موجود ہے۔"

"تو تم کورتی کے پاس رہنا مانگتا۔" اسٹیل نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ میں نے بھی اسی طرح سر کو حرکت دی۔

"لیکن کورتی تو کہیں اور ہے۔" خدا بخش نے کہا۔

"وہ جہاں بھی ہے، میں اس کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔"

"اوکے۔ اس کا ارینج منٹ ہو جائیں گا۔" اسٹیل بولا۔

گفتگو کے دوران میں وہ برابر مجھے تفتیشی نظروں سے گھور رہا تھا۔ کسی وقت اس کے تاثرات عجیب سے ہو جاتے تھے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے میرے سر کے اندر منحوس چپ پلانٹ کی تھی۔ وہ چپ جو میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی اور جسے اپنی مرضی سے جدا کرنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً اسٹیل کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ رہا ہوگا کہ مجھے زرگاں سے باہر ہر طرف دور دور تلاش کیا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ سگنل وصول کرنے والے کئی انٹینا یہاں وہاں چکرا رہے ہوں۔ میں اس ساری تلاش کو ناکام کر کے یہاں راج بھون کے عین سامنے آ نمودار ہوا تھا۔ یہ کیونکر ہو سکا تھا؟ کیا یہ ایک اتفاق تھا؟ یا پھر اس کی چپ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا؟ یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو گیا تھا؟

میں سمجھ گیا کہ بہت جلد مجھے اس چپ کے حوالے سے بھی اسٹیل وغیرہ کو جواب دینا پڑے گا۔

کچھ دیر تک مجھ سے پوچھ تاچھ جاری رہی...... پھر کڑے پہرے میں مجھے میڈم صفورا کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میں گھوڑا گاڑی میں تھا۔ تین مسلح گارڈ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی آگے اور ایک پیچھے تھی۔ ان میں بھی چوکس محافظ موجود تھے۔ ہر نگاہ میرے لئے تجسس، حیرت اور طنز کا ملا جلا تاثر تھا۔ جو کوئی دیکھ رہا تھا، مجھے تولنے والی نظروں سے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میرے اندر کیا ہے جس کے بل بوتے میں جارج گورا جیسے شخص کو للکارنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اپنے انجام کی پروا کئے بغیر موت کے جبڑوں میں سر دے رہا ہوں۔ یہ گارڈز وغیرہ اپنے افسران کی وجہ سے چپ تھے ورنہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ پر حقارت اور طنز کے تیر چلانا شروع کر دیتے۔

پھر بھی ایک گارڈ سے برداشت نہیں ہو سکا، وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ "بھگوان کا

شکر کرو، تمہیں بڑوں کی طرف سے رکھشا مل گئی ہے، ناہیں تو اس گاڑی کے اندر تمہاری ایک بوٹی بھی نہ ملتی۔"

"تم بھی شکر کرو کہ میں یہاں کتوں بلوں سے نہیں، ان کے مالک سے لڑنے کے لئے آیا ہوں۔"

گارڈ نے مشتعل ہو کر میرا گریبان پکڑنا چاہا لیکن دوسرے نے اسے روک دیا۔ "چھوڑ دو یار! یہ اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔"

"اور یہ کوئی آسان موت ناہیں ہووے گی، اس کے ساتھی کی طرح اس کی بھی ایک ایک ہڈی ٹوٹے گی پہلے۔ جتنا بڑا اپرادھ ہے اس سے بڑی سزا ہووے گی۔"

"کس اپرادھ کی بات کرتے ہو تم؟ میں نے کسی کی ماں بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟"

"تم نے کیا ہے...... اور یہ ساری دنیا جانت ہے۔ تم ان لوگن میں شامل ہو جنہوں نے سرجن صاحب کی دھرم پتنی کو اغوا کیا اور ان کی آبرو خراب کی۔" گارڈ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "اور تم نے ان کو گولی مار کر زخمی بھی کیا۔" وہ اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ماریا کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے تم جیسے کرائے کے ٹٹوؤں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی سن لو کہ سرجن کی پتنی اور جارج کی بہن ماریا کو سلطانہ کے بدلے میں اُٹھایا گیا تھا...... اور وہ بدبخت اُٹھائے جانے کے قابل تھی لیکن یہاں دوسری بات بھی یاد رکھو۔ اسے اُٹھانے والے مسلمان تھے۔ انہوں نے تمہاری عورت کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو تم نے ان کی عورت کے ساتھ کیا۔"

گارڈ پھنکارا۔ "کوئی ناری بھی کسی مرد پر ایسا جھوٹا الزام ناہیں لگا سکتی...... کیا تم انکار کرت ہو کہ شریمتی ماریا کی عزت خراب ہوئی؟"

"نہیں، میں انکار نہیں کرتا۔ شریمتی جی کی عزت خراب ہوئی لیکن کسی نے نہیں، اس نے خود کی۔ اس نے اندھیری رات میں ایک پارسی کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کیا اور اس کی مدد سے بھاگ نکلی......"

"یہ بکواس ہے۔" گارڈ گرجا۔ "اس طرح کی باتیں تم مُسلوں نے ہی پھیلائی ہیں۔ اپنے گندے اپرادھ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے تم لوگن نے۔ ناری کی عزت......"

"کون ناری؟ کیسی عزت؟" میں نے بھڑک کر اس کی بات کاٹی۔ "یہ گوری چمڑی والے جنہیں تم نے اپنا آقا بنایا ہوا ہے، عزت آبرو، پوترتا اور شرم حیا جیسے لفظوں کا مطلب ہی

نہیں جانتے۔ ان کے دیس میں جا کر دیکھو، یہ ماریا جیسی میمیں ایک برگر اور ایک کوک کے لئے کسی کے ساتھ بھی جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں...... اور یہاں برگر کوک کا نہیں، جان کا معاملہ تھا۔''

گارڈ نے دانت پیسے۔ ''بھگوان کی سوگند...... اگر مجھے بڑوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں اسی جگہ تمہاری کھوپڑیا میں سوراخ کر دیتا۔''

''اچھا، تم دونوں چپ ہو جاؤ۔'' دوسرے گارڈ نے ذرا تحکم سے کہا۔ وہ قدرے سینئر دکھائی دیتا تھا۔

اسی دوران میں اس قافلے کی گاڑیاں لال بھون کے سامنے پہنچ گئیں۔ کئی دیگر اہم عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی جنریٹر کی برقی رو سے روشن تھی۔ گاڑیاں مین دروازے کے سامنے رک گئیں اور وردی میں ملبوس دو افسر نما افراد لال بھون کے اندر چلے گئے۔ یقینی بات تھی کہ وہ میڈم صفورا کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے گئے تھے۔ مجھے میڈم کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر اعتماد تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی گفتگو سے ان افسران کو کسی طرح کا شک نہیں ہونے دے گی۔ میں ابھی صرف چند گھنٹے پہلے یہاں سے گیا اور اب ایک نئی حیثیت سے واپس آیا تھا۔

دونوں افسران پندرہ بیس منٹ بعد واپس آئے اور مجھے نیم گرم گھوڑا گاڑی سے اُتار کر لال بھون کے اندر لے گئے۔ گیٹ پر موجود گارڈز اور دیگر ملازمین نے اس سے پہلے میری صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں میڈم صفورا کا وہی مہمان ہوں جو چند روز پہلے یہاں پہنچا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب ان لوگوں میں سے کچھ نے مجھے سلطانہ کے شوہر کی حیثیت سے پہچان لیا ہو، بہرحال وہ سب خاموش تھے۔

لال بھون کی عالی شان راہداریوں سے گزر کر میں جلد ہی میڈم صفورا کے سامنے تھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ نیند سے جاگی ہے۔ میری توقع کے عین مطابق میڈم صفورا مجھ سے اسی انداز میں ملی جس میں اسے ملنا چاہئے تھا۔ اس نے قدرے حیرت ظاہر کی کہ میں اس وقت اس حال میں یہاں زرگاں میں موجود ہوں۔ اس نے اپنی اس حیرت میں ہلکی سی ''ناگواری'' بھی شامل کر لی تھی۔

ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی پھر فوجی افسر نے میڈم صفورا کو بتایا۔ ''جو کچھ بھی ہے میڈم، یہ شخص فی الحال سر جارج کے مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سر جن صاحب کا حکم ہے کہ اسے یہاں لال بھون میں رہنے کی آ گیا دی جاوے اور ہر طرح کی سہولت بھی مہیا کی

جاوے۔ اس کے بارے میں مزید احکامات سر جارج بعد میں دیویں گے۔''

میڈم نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر یہ سر کا آرڈر ہے تو یہ یہاں رہ سکتا ہے لیکن اس کی حفاظت......''

''اس کے لئے آپ کوئی چنتا نہ کریں۔ ٹھیک اسی وقت سے یہ عمارت ہمارے ''سکیورٹی گھیرے'' میں رہے گی۔ عمارت کے اندر بھی سر جارج کی اسپیشل فورس کے لوگن موجود رہیں گے۔''

میڈم صفورا کو علیحدگی میں کچھ ہدایات دینے کے بعد فوجی افسران واپس چلے گئے...... جونہی تنہائی میسر آئی، ایک دروازے کے عقب سے عمران بھی نمودار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''اوئے گھامڑ، یہ کیا گڑبڑ گوٹالا کیا ہے تُو نے؟'' اس نے مجھے گدی سے دبوچ لیا اور زور سے آگے پیچھے ہلایا۔

''سب کچھ بتاتا ہوں۔ بتانے کے لئے ہی تو یہاں آیا ہوں۔'' میں نے اس سے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔

''غضب خدا کا اتنا بڑا دھوکا۔ نہ کوئی صلاح نہ مشورہ۔ مجھے سوتا چھوڑ کر نکل گئے اور جا پہنچے راج بھون کے سامنے...... یار! سچی بات ہے، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ تم اتنے بے وفا اور کمینے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اتنا بڑا قدم اُٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے یا میڈم سے بات تک نہیں کی۔ نہیں نہیں...... ضرور میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا......'' وہ اداکاری کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ واقعی بہت حیران بھی تھا۔

''تم نے جو کچھ سنا ہے، وہ صحیح ہے ڈیئر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یعنی تم جارج گورا کا چیلنج قبول کر آئے ہو...... اور اسے للکار آئے ہو کہ اس سے دوبدو لڑائی کرو گے؟''

''ایسا ہی ہے۔''

وہ میڈم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میڈم! اس نے ضرور کوئی زہریلی چیز کھا لی ہے۔ یہ زہر اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے یا پھر اس نے نشہ کیا ہے۔ اس کا ڈوپ ٹیسٹ کراؤ میڈم...... یہاں ڈوپ ٹیسٹ ہو سکتا ہے نا...... چل بھئی چل...... اُٹھ......''

اسی دوران میں کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ گیتا نے میڈم کو پکارا۔ غالباً کوئی ایمرجنسی کام تھا۔ میڈم 'ابھی آئی' کہہ کر باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عمران ایک دم

سنجیدہ ہوگیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے گہری فکرمندی جھانکنے لگی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تابی! یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا تُو نے...... کم از کم مشورہ ہی کر لیتا۔ اس کی مطلب ہے کہ تُو مجھے اپنا نہیں سمجھتا۔''

''اپنا سمجھتا ہوں لیکن مشورہ نہیں کرسکتا تھا۔ مشورہ کرتا تو تم مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ اس کام میں سے سیکڑوں خطرے نکال کر مجھے بتا دیتے اور بعد میں ہوسکتا تھا کہ یہ سارے خود مول لے لیتے۔''

''تو کیا ساری مصیبتوں، پریشانیوں اور سارے خطروں کا ٹھیکا تُو نے لے لیا ہے؟''

''یہ ساری مصیبتیں اور پریشانیاں پیدا بھی تو میری ہی کی ہوئی ہیں۔ تمہارا جارج اور حکم وغیرہ سے کیا واسطہ ہے۔ یہ ساری دشمنیاں میری ہی پالی ہوئی ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں نے آج تک تم سے لیا ہی کیا ہے۔ ہر قدم پر تمہارا سہارا مانگتا رہا ہوں اور تم کسی بھی چیز کی پروا کئے بغیر یہ سہارا مجھے دیتے رہے ہو لیکن اب نہیں...... اب پلیز مجھے اپنے طور پر کچھ کرنے دو۔ مجھے میرے ہونے کا احساس ہونے......''

''لیکن تابی......''

''نہیں عمران! اب اس بارے میں کچھ نہ بولو۔ ویسے بھی جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو...... کسی بھی ذریعے سے انور خاں تک اطلاع پہنچا دو۔''

''کیسی اطلاع؟''

''یہی کہ اب وہ زرگاں نہ آئے۔ وہ جس کام کا ارادہ رکھتا تھا، وہ اب میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اب اسے جان مصیبت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

عمران ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسی دوران میں میڈم بھی واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش اور برہمی تھی۔ وہ بولی۔ ''تابش! یہ بہت جذباتی فیصلہ کیا ہے تم نے۔ یہ قدم اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے آناً فاناً خود کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال لیا ہے۔''

''مصیبت میں تو ہم سب ہیں ہی۔''

''لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی جارج کے ''مرضی کے محاذ'' پر لڑنے کی؟ تم اس کام کے لئے کوئی اور راستہ بھی ڈھونڈ سکتے تھے۔ ہم تینوں مل کر سوچتے تو کوئی حل نکل آتا۔''

''اب تو جو ہونا تھا ہو چکا میڈم۔'' میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ''بے وقوفی ہوئی ہے تم سے۔ کم از کم مشورہ ہی کر لیتے تم...... جارج نے ایک پھندا لگایا ہوا ہے اور تم نے اس کے پھندے میں آنے کے لئے شاندار پھرتی دکھائی ہے۔ اب واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے تمہارے پاس۔''

''میں واپس آنا چاہتا بھی نہیں ہوں میڈم...... اور آپ اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اب زمانے کا بہت گرم سرد دیکھ لیا ہے۔ مرنے مارنے کی ہمت آ چکی ہے مجھ میں۔ میں جارج گورا کے لئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گا۔ آپ یقین رکھیں، اس شخص کو اس کی توقع سے کہیں زیادہ مزاحمت ملنے والی ہے۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

میرے لہجے کی حرارت اور توانائی کو محسوس کر کے میڈم کے چہرے کے تناؤ میں ایک بے ساختہ کمی واقع ہوئی۔ وہ ایک نشست پر بیٹھ گئی اور مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے چند ماہ میں تم بہت زیادہ بدلے ہو۔ تمہارے بارے میں اُڑتی اُڑتی خبریں بھی ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ ان میں رنجیت پانڈے والی خبر بھی شامل تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے تن تنہا پانڈے سے مار اماری کی تھی اور وہ اس مار اماری میں زخمی بھی ہوا تھا...... واٹ سوا یور...... میں سمجھتی ہوں کہ یہ جارج بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ اس کا ٹیپرامنٹ ایک پروفیشنل فائٹر جیسا ہو چکا ہے۔ پچھلے تین چار سالوں میں اس نے اس طرح کی لڑائیوں کا خاطر خواہ تجربہ حاصل کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ وہ ہر طرح کی فائٹنگ میں ایک نہایت طاق اور سخت جان حریف ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ وہ یہاں اسٹیٹ میں آباد ہونے سے پہلے انگلینڈ میں کیا کرتا تھا؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''برمنگھم میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب ہے۔ یہ کلب 1925ء میں جارج کے دادا نے شروع کیا تھا۔ دادا کے بعد جارج کا باپ اور پھر خود جارج اس کلب کا کرتا دھرتا رہا۔ فائٹنگ آرٹ میں اس شخص کی دلچسپی خاندانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مجرمانہ ذہن کا مالک بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے دو دھاری تلوار کہہ سکتے ہیں۔ اس تلوار کو زہر کی پان لگانے کے لئے حکم جی کی دوستی اور مکمل پشت پناہی بھی موجود ہے۔ ہم اس برصغیر کے لوگ فطری طور پر محکوم طبیعت کے مالک ہیں۔ جو چیز باہر سے اور خاص طور سے مغرب سے آتی ہے، وہ ہمیں بہت جلد متاثر کرتی ہے اور اگر اس چیز میں واقعی کوئی بات بھی ہو تو پھر تو سونے پر سہاگا ہے۔ جارج باہر سے آیا ہے اور اس میں ٹیلنٹ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی لوگ پوجنے کی حد تک اس سے متاثر ہیں لیکن تو ہم پرست تو اسے شکتی کا دیوتا تک کہہ ڈالتے ہیں۔

حکم جی کی طرف سے اس کو ''سر'' کا خطاب ملا ہوا ہے۔''

''اور دوسری طرف ان سر جی نے راجواڑے کو اپنی شکار گاہ بنایا ہوا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ طاقت اپنے قانون خود بنا لیتی ہے۔ جس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس کے لئے ہزار ہا آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں اور اگر اختیار گورے کے پاس ہو تو پھر کیا ہی بات ہے۔ گورا ہم جیسے لوگوں پر اپنا اختیار استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ لوگ یونہی تو دو سو سال یہاں حکومت نہیں کر گئے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! میں اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوں لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ میرے دو کام کر دیں۔''

''کیسے کام؟''

''زیادہ مشکل کام نہیں۔ آپ بہ آسانی کر سکتی ہیں میڈم۔''

''کچھ کہو گے تو پتا چلے گا۔''

''کسی طرح نل پانی میں انور خاں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ یہاں آنے کا پروگرام فوراً ختم کر دے کیونکہ میں نے جارج کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔''

''میڈم صفورا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... اور دوسرا کام۔''

''مجھے اس عمارت میں ایک علیحدہ پورشن دیں جہاں میں دو چار دن میں اپنی فٹنس کو بہتر کر سکوں۔''

''علیحدہ پورشن کی کیا ضرورت ہے، یہاں ایک چھوٹا سا ''جم'' موجود ہے۔ تم چاہو تو صبح گیارہ بارہ بجے تک اسے آزادی سے استعمال کر سکتے ہو لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ تو پتا چلے کہ سامبر رچنا والے کیا کہتے ہیں۔''

''سامبر رچنا والے کون؟'' میں نے پوچھا۔

''پنڈت مہاراج اور ان کے چیلے۔ اس سامبر کی رسم میں دو حریفوں کے آمنے سامنے آنے کا حتمی فیصلہ یہ لوگ ہی کرتے ہیں۔ باقاعدہ کنڈلیاں وغیرہ نکالی جاتی ہیں اور مناسب وقت بھی طے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں حریف کس طریقے سے ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ یعنی لڑائی خالی ہاتھ ہو گی یا کوئی ہتھیار استعمال کیا جائے گا...... اور اگر ہتھیار استعمال کیا جائے گا تو کون سا ہو گا اور اس ہتھیار سے بچاؤ کے لئے

کیا انتظام ہوگا۔ اصولی طور پر سامبر کی لڑائی صرف حریف کو زیر کرنے کے لئے ہوتی ہے لیکن کچھ موقعوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ شدید زخمی ہوئے ہیں یا پھر ان کی جان ہی چلی گئی ہے۔''

ہم تینوں کے درمیان رات آخری پہر تک گفتگو جاری رہی۔ اس گفتگو کے آخر میں میڈم نے وعدہ کیا کہ وہ صبح سب سے پہلا کام یہی کرے گی کہ کسی طرح انور خاں تک میرا پیغام پہنچائے گی۔ اس لال بھون میں ایک بندہ ایسا تھا جس پر میڈم اندھا اعتماد کر سکتی تھی۔ اس کی حیثیت یہاں میڈم کے خاص الخاص کارندے جیسے ہو گئی تھی۔

میڈم کے جانے کے بعد میں اور عمران سو گئے۔ بارونداجیکی نے میری تربیت کے دوران میں جو ہدایات مجھے دی تھیں، ان میں یہ بھی شامل تھا کہ میں نرم بستر پر سونے سے گریز کروں اور کئی دوسری ہدایتوں کی طرح میں اس ہدایت پر بھی عمل کرتا تھا بلکہ مجھے ایسا کرنا اچھا لگتا تھا۔ یہاں بھی میں قالین پر چادر بچھا کر سوتا تھا۔ عمران نے کئی بار چاہا کہ میں اس کی طرح بستر استعمال کروں لیکن میں ٹال گیا...... ہم دوپہر سے کچھ ہی دیر پہلے بیدار ہوئے۔ کئی دن کے ابر آلود موسم کے بعد یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ بھون کے وسیع سبزہ زار میں نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں میڈم نے ہی بیدار کیا تھا۔ وہ خاصی جلدی میں نظر آتی تھی۔ اس نے اطلاع دی۔ ''جارج صاحب آ رہے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے تیار ہو جاؤ...... اور تم بھی کسی کمرے میں چلے جاؤ۔ جب تک جارج صاحب یہاں ہیں، باہر نہیں آنا۔'' میڈم نے آخری الفاظ عمران سے مخاطب ہو کر کہے۔

عمران سے بات کرتے ہوئے وہ اس سے نگاہ نہیں ملاتی تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ زہریلے سانپ والے ڈرامائی واقعے کے بعد وہ عمران کو معاف کر چکی ہے یا کم از کم اتنا تو ہو چکا ہے کہ وہ اسے برداشت کر رہی ہے لیکن اس کی دلی کیفیت کے بارے میں ابھی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے، جارج کے آنے کا مقصد کیا ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''میرے خیال میں اس کے ساتھ پنڈت مہاراج ہوں گے جو کنڈلی وغیرہ نکالیں گے...... اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ سامبر کے بارے میں ڈسکشن ہو۔'' میڈم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور میڈم کا فراہم کردہ لباس پہنا۔ یہ پینٹ شرٹ اور سویٹر پر مشتمل تھا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے شیو کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔ آدھ

پون گھنٹے میں، مَیں بالکل فریش ہو گیا اور حقیقتاً میں اندر سے بھی بہت فریش تھا۔ راج بھون کے سامنے جا کر جارج گورا کو للکارنے کے بعد میرے اندر کا غبار نکل گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں دوڑنے والی بے پناہ بے قراری ایک طرح کے ٹھہراؤ میں بدل گئی تھی۔ اب مجھے یہ سوچ کر لطف محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں گا اور اس کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آؤں گا۔

جارج گورا کی آمد کی وجہ سے لال بھون میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ملازمین بھاگے پھر رہے تھے۔ گارڈز بھی چوکس اور ہوشیار نظر آتے تھے۔ قریباً ایک بجے کے قریب جارج گورا اپنے دو درجن اسپیشل گارڈز کے ساتھ لال بھون کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ اس کے یہ اسپیشل گارڈز پگڑیوں کے بغیر تھے۔ ان میں [illegible] نظر آرہے تھے اور یقیناً یہی لوگ سیکیورٹی کے انچارج بھی تھے۔ [illegible] پہلے سے موجود گارڈز کے ساتھ بیرونی حصے میں پوزیشن سنبھال لی۔ باقی جارج گورا کے ساتھ عمارت کے اندر چلے آئے۔ گارڈز کے وزنی بوٹوں سے برآمدوں کے فرش لرز گئے۔ ایک دہشت کی سی فضا پیدا ہوگئی۔ اسپیشل فورس کے دو گارڈز، جارج سے پہلے ہی اندر آگئے۔ انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ یہ دونوں سفید فام تھے۔ مجھے [illegible] لینے کے بعد انہوں نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور پھر مجھے ایک ساتھ والے [illegible] میں لے گئے۔ یہاں بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دو تین منٹ بعد جارج گورا اپنے تین مسلح گارڈز کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میڈم صفورا اور میجر مدن وغیرہ بھی اس کے عقب میں موجود تھے۔

جارج کو میں نے چند دن پہلے راج بھون کی شاہی بالکونی میں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج میں اسے اپنے رُوبرو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نہایت خطرناک چمک تھی۔ یہ آنکھیں کسی انسان سے زیادہ درندے کی آنکھیں لگتی تھیں۔ غیر متوقع طور پر اس نے مجھ سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ''زرگاں میں خوش آمدید۔''

اس نے اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میرے ہاتھ پر قائم کر رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ میری جسمانی طاقت اور اعصابی مضبوطی کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے فقط دو فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس نے اختیار اور جسمانی طاقت کے نشے میں سلطانہ کو روندا تھا۔ جی چاہا کہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس پر جا پڑوں اور تب تک خود کو اس سے جدا نہ کروں جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں

تھا۔ تین گارڈز موجود تھے، وہ مجھے چھلنی کر کے رکھ دیتے۔ مجھے ابھی صبر کرنا تھا۔

جارج نے کہا۔ ''ہام کا خیال ہے کہ تم انگلش سمجھ سکتا ہے۔''

''ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

''اوکے...... ویسے تو تم سے پوچھنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الوقت ہم صرف اس اعلان کے حوالے سے بات کریں گے جو تم نے کل راج بھون کے سامنے کیا ہے۔'' جارج کا لہجہ خشک تھا۔

''میں بھی صرف اسی حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔

''تمہیں شرائط کا پتا ہے؟''

''مجھے تمہاری ہر شرط بغیر سنے منظور ہے۔ میں صرف تم سے لڑنا اور تمہیں ہرانا چاہتا ہوں۔''

''بہت خوب...... بہت خوب۔'' میرے لہجے کی آگ کو محسوس کر کے اس نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''یسوع بُری نظر سے بچائے، مورال بہت اونچا ہے تمہارا۔''

''شکریہ۔''

''پھر بھی میں تمہیں شرائط بتا دینا چاہتا ہوں۔ تم ایک مفرور مجرم ہو...... تم پر جو سنگین الزامات ہیں، ان کی کم سے کم سزا موت ہے لیکن تم نے دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ چوہے کی طرح پکڑے جانے کے بجائے خود یہاں پہنچ گئے ہو۔ اب تم پر ریاست کا قانون نہیں بلکہ کھیل کے اصول لاگو ہوں گے۔ تم میرے ساتھ ون ٹو ون زور آزمائی کرو گے۔ اگر تم جیت گئے تو تمہارے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ تم یہاں سے جا سکو گے بلکہ اپنے دوست کی بھاوج کو بھی لے جا سکو گے...... لیکن اگر تم ون ٹو ون باؤٹ میں ہار گئے تو پھر تمہارا انجام وہی ہوگا جو تمہارے دوست اسحاق کا ہوا۔ تمہیں بغیر کسی ٹرائل کے سزائے موت دی جائے گی۔ راج بھون کے سامنے سُولی چڑھا دیا جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے بلاتوقف کہا۔

''اوکے...... لیکن اس سے پہلے پنڈت مہاراج کو تمہاری کنڈلی وغیرہ نکالنی ہوگی اور مقامی رواج کے مطابق شبھ گھڑی کا چناؤ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم یہ طے کریں گے کہ ہماری لڑائی کس طرح کی ہوگی اور اس کے رولز اور ریگولیشن کیا ہوں گے۔''

''اس حوالے سے میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں لیکن چلو...... تم کنڈلیاں وغیرہ نکلوا

لو۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کنڈلیاں وغیرہ نکلوا لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے بھی کچھ کرنا ہے۔ یہ کنڈلیوں والا کام آج نہیں کل ہو سکے گا۔ آج میں کسی اور چیز کی تصدیق کے لئے یہاں آیا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

جارج نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا، وہ باہر چلا گیا۔ جارج نے میڈم صفورا اور مدن وغیرہ کو بھی باہر بھیج دیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔ میں قالین پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی اس پر جمی تھیں۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے قریب تھی تاہم وہ اپنی عمر سے کم نظر آتا تھا۔ وہ ایک نہایت مضبوط اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ خاص طور سے اس کی گردن اور شانے غیر معمولی طور پر مضبوط نظر آتے تھے۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ مجھ سے کہیں بہتر تھا اور جسم کے پھیلاؤ میں تو کافی فرق تھا۔ اس نے مجھے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا تھا اور اب پتا نہیں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اسی دوران میں باہر جانے والا گارڈ دوبارہ واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر نما شخص بھی تھا۔ اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ اس نے ایک سرنج پکڑی ہوئی تھی۔ غالباً وہ مجھے کچھ انجیکٹ کرنا چاہ رہا تھا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔'' جارج نے کہا۔ ''تمہاری صحت اور سلامتی کا سب سے بڑا ضامن اب میں خود ہوں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے، سامبر کے دن تک تمہیں کچھ نہیں ہو گا......''

''یہ انجکشن کس لئے ہے؟''

''سمجھو، تمہاری جسمانی صحت کو چیک کرنے کے لئے ہے۔ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ آخر وہ چپ والا معاملہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے انٹینا میری پوزیشن کو لوکیٹ نہیں کر رہے تھے اور وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔ غالباً مجھے کوئی نشہ آور دوا دی جا رہی تھی۔ کمرے میں جارج کے علاوہ صرف تین افراد تھے اور یقیناً یہ جارج کے اعتماد کے لوگ تھے......

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جارج! میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم اپنا

وقت بچانا چاہتے ہو تو میں براہِ راست تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں چپ کی بات کر رہا ہوں۔''

میرے الفاظ نے جارج جیسے مضبوط شخص کو ہلا دیا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی بُری طرح چونک گئے۔ جارج نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کرو گے......؟''

''بالکل پسند کروں گا۔ میں اس چپ کی بات کر رہا ہوں جسے یہاں لوح یا تختی کہا جاتا ہے۔ یہ تختی میرے اندر بھی موجود تھی۔ شاید مجھے اس کا پتا کبھی نہ چلتا...... یا اگر چلتا بھی تو میں اس کی حقیقت کبھی معلوم نہ کر پاتا لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ صورتِ حال ایک دم بدل گئی۔''

میں نے ذرا توقف کیا اور اپنی گردن کے عقب میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگ دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ یہاں کیا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر اور جارج ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ڈاکٹر نے میری گدی کا معائنہ کیا۔ یہاں آپریشن کا نشان تھا اور ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟'' سفید فام ڈاکٹر نے پوچھا۔

''مجھے یہاں چوٹ لگی تھی اور زخم ہو گیا تھا۔ پھر زخم میں انفیکشن ہو گیا۔ میرا پورا جسم درد کے شدید شکنجے میں جکڑ گیا اور کسی وقت یوں لگنے لگا کہ مجھے اوپر کے دھڑ کا فالج ہو رہا ہے۔ طبیعت بہت بگڑ گئی تو پتا چلا کہ یہ سب اس ''چپ'' کی وجہ سے ہے۔ میرے ساتھی ڈاکٹر چوہان نے جیسے تیسے اس چپ کو نکال دیا......''

جارج اور ڈاکٹر حیران سے سن رہے تھے۔

میری بتائی ہوئی تفصیل جارج وغیرہ کے لئے حیران کن تھی اور یقیناً اس سے زیادہ یہ بات حیران کن تھی کہ میں نے چپ اپنے جسم سے علیحدہ کروا لی اور اس کے باوجود جان لیوا صورتِ حال سے بچا رہا۔

ڈاکٹر کے علاوہ جارج نے بھی میری جلد کو دبا دبا کر اس بات کی تصدیق کی کہ چپ میرے جسم میں موجود نہیں ہے۔

آخر جارج ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا واقعی اس بھگوڑے ڈاکٹر چوہان نے یہ کام کیا ہے؟''

''میں وہی بتا رہا ہوں جو میرے ساتھ ہوا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

جارج اور سفید فام ڈاکٹر کچھ دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوجے کو دیکھتے رہے پھر جارج نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''اگر واقعی سب کچھ ویسا ہی ہوا ہے جیسا تم بتا رہے ہو تو پھر تم ایک خوش قسمت شخص ہو۔ جب ڈاکٹر چوہان سے ملاقات ہو گی تو میں اسے اس آپریشن پر ''شاباش'' ضرور دوں گا۔'' اس نے شاباش کا لفظ معنی خیز انداز میں کہا تھا اور اس لفظ میں ایک سفاک دھمکی کی ساری سنگینی بھر دی تھی۔

سفید فام ڈاکٹر نے امریکن لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''اب وہ چپ کہاں ہے؟''

''مجھے اس بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکٹر چوہان نے کہیں پھینک دیا تھا۔''

''پھینک دیا تھا تو بھی اس کے سگنل تو ملنے چاہئیں۔'' جارج نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''اتنی عقل تو ڈاکٹر چوہان میں بھی تھی۔ اس نے چپ نکالتے ہی اسے ضائع کر دیا تھا۔ ضائع کرنے کے بعد ہی اس نے اسے کہیں پھینکا ہو گا۔''

''تم اتنی بے یقینی سے بات کیوں کر رہے ہو؟ کیا چوہان نے تمہیں اس بارے میں اصل صورتِ حال نہیں بتائی؟''

''یہ ایک اتفاق ہے کہ آپریشن کے بعد چوہان سے میری تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔'' میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

کچھ دیر تک اس بارے میں بات چیت جاری رہی۔ تب جارج یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ وہ کل پھر آئے گا...... اور اس سے پہلے پنڈت مہاراج یہاں پہنچیں گے اور کنڈلی وغیرہ نکالیں گے۔ چپ کے حوالے سے جارج کی اُلجھنیں ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھیں۔

جب جارج اپنے مسلح گارڈز کے ہمراہ کمرے سے نکل رہا تھا، ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس پر جھپٹ پڑوں۔ اس کو سانس لینے کے لئے...... اور مسکرانے کے لئے اور زمین پر دندنانے کے لئے چند منٹ بھی زندہ نہ چھوڑوں...... مار دوں یا مر جاؤں۔ اس عیاش، عورت باز کو دیکھ کر میرے اندر ایک ایسی ناقابلِ برداشت نفرت جاگتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔

لال بھون سے نکلتے ہوئے جارج اور اس کے ساتھی دو چار منٹ کے لئے اس بڑے

ہال کمرے میں ٹھہرے جہاں لڑکیاں کتھک ناچ کی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ جارج کے پہنچتے ہی موسیقی رک گئی اور لڑکیاں ایک قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ میڈم صفورا مؤدب انداز میں گرانڈیل جارج کے پہلو میں موجود تھی۔ وہ لڑکیوں کی صحت اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جارج کو معلومات فراہم کر رہی تھی۔ وہ کافی فاصلے پر تھے، ان کی باتیں میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد جارج، مسلح گارڈز کے جلو میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تنہائی میسر آتے ہی عمران اور میڈم صفورا پھر میرے پاس موجود تھے۔ میڈم صفورا کے چہرے پر بہت تجسس نظر آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے کمرے سے نکالنے کے بعد جارج گورا نے مجھ سے کیا بات چیت کی ہے اور جارج کے ساتھ ڈاکٹر کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

میں نے میڈم اور عمران کو وہ ساری گفتگو بتائی جو چپ کے حوالے سے میرے اور جارج کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ واقعی اہم گفتگو تھی۔ میں نے جارج کو بتایا تھا کہ چوہان نے چپ میرے جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد توڑ پھوڑ کر ضائع کر دی تھی لیکن وہ چپ صحیح سالم حالت میں اب بھی مندر کے زیریں تہ خانے میں موجود تھی۔ عمران کا خیال تھا کہ ہم اس چپ کو کسی موقع پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔

...... اگلے روز علی الصباح ہی پنڈت مہاراج اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ لال بھون میں آ دھمکا۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ اس کے گلے میں بہت سی مالائیں تھیں۔ وہ سفید دھوتی قمیص میں تھا۔ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی کشمیری شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر سورگ باشی گرو سوباش کی یاد آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنڈت مہاراج کے بال بہت لمبے تھے اور اس کی شخصیت مجموعی طور پر بہت بارعب نظر آ رہی تھی۔

پنڈت نے مجھے سر تا پا گھورا اور منہ میں کچھ اشلوک وغیرہ پڑھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت آمیز شناسائی کی جھلک صاف محسوس کی۔ اس نے اپنے بھرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے چند سوال کئے۔ میرے اندازے کے مطابق ان سوالوں کا مقصد صرف یہ جاننا تھا کہ میں ماضی میں واقعی یادداشت کے مسئلے کا شکار رہا ہوں یا پھر یہ کوئی ڈراما قسم کی چیز تھی۔

معلوم نہیں کہ وہ میرے جوابات سے کس حد تک مطمئن ہوا، بہر حال اس نے اپنا اصل کام شروع کرتے ہوئے مجھ سے چند سوالات کئے۔ میری تاریخ پیدائش، مقام اور والدین کے نام دریافت کئے۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک چیلے کے ساتھ لمبے چوڑے حساب کتاب

میں مصروف ہوگیا۔ چیلے کے پاس کچھ پرانے کاغذات اور پوتھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ نہ جانے ان پوتھیوں کی ورق گردانی سے کیا کیا ڈھونڈتا رہا اور پنڈت مہاراج کو بتاتا رہا، جسے پنڈت صاحب تحریر فرماتے رہے۔ آخر وہ دونوں اُٹھ کر چلے گئے۔

اس کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد بھون میں کل والی سنسنی آمیز ہلچل محسوس ہوئی۔ گارڈز کی بھاگ دوڑ دکھائی دی۔ ملازمین الرٹ ہو گئے۔ تب زرگاں میں شکتی کا دیوتا، یعنی حکم جی کے بعد اہم ترین شخص سر جاج گورا اپنے دو درجن گارڈز کے جلو میں دکھائی دیا۔ اس کی آمد سے پہلے میری اور کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی گئی، تب وہ دندناتا ہوا اندر آ گیا۔

آج جارج گورا نے کوٹ کے بجائے بند گلے کی ایک تپلی سی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اس ہائی نیک جرسی کے نیچے غالباً قمیص وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس ڈریس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ مجھے اپنے شان دار کسرتی جسم کی جھلک دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا یا پھر اس نے میری نقل کی تھی۔ آج کی طرح ایک دن پہلے بھی بہت سردی تھی۔ میں نے تب بھی بس ایک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شاید اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں صرف ایک ٹی شرٹ میں موسم کی سختی جھیل سکتا ہوں تو وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔

آج پھر اس نے بھرپور توانائی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے بازو کو باقاعدہ جھنجوڑا۔ کسی تمہید کے بغیر ہی وہ اصل موضوع پر آ گیا اور بولا۔ ''پنڈت مہاراج کی طرف سے کلیئرنس مل گئی ہے۔ سامبر کی رسم بدھ کو سہ پہر کے وقت ہوگی۔ بدھ کو سہ پہر کے وقت۔'' اس نے دُہرایا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟''

''میں کسی بھی طرح لڑنے کے لئے تیار ہوں لیکن جیسا کہ میں نے کل کہا تھا، اس لڑائی کے حوالے سے میں ایک تجویز دینا چاہتا ہوں۔''

''کہو۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ تم یہ تجویز مان لو گے......''

''کیا تم پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ یہ لڑائی مرنے یا مار دینے پر ختم ہو۔''

اس نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا پھر اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بہت خوب...... بہت خوب۔ دلیری دکھا رہے ہو اور چالاکی بھی۔''

''چالاکی سے کیا مطلب؟''

''لڑائی کسی بھی طرح کی ہو، ہارنے کی صورت میں تمہیں تو مرنا ہی ہے اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم سُولی چڑھنے کے بجائے گولی یا چاقو وغیرہ کے زخم سے مرو۔''

''تمہاری دلیری اور بے خوفی کے بارے میں تمہارے پیچھے بہت شور مچاتے ہیں لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ وہ سب ''شور'' ہی ہے۔ جو دلیل تم پیش کر رہے ہو اس میں کوئی خاص وزن نہیں ہے۔''

''مجھے اکسانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ گیا ہے۔ اب اسے ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔''

جارج کی نیلگوں آنکھوں میں ایک بار پھر نفرت اور رقابت کی برق لہرائی۔ وہ اندر سے اُبل رہا تھا۔ یہ جان کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ وہ مجھے قرار واقعی اہمیت دے رہا ہے۔ میرے خیال میں اس اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ان لوگوں کو کچھ ثابت کر کے دکھایا تھا۔ پہلے جارج کی حراست سے فرار ہونا اور پھر پانڈے جیسے گھمنڈی کو یادگار مزاحمت دینا معمولی واقعات نہیں تھے۔

جارج ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا تھا۔ بڑے اسٹائل سے کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟ تم ویسٹرن انداز میں ڈیول کھیل سکتے ہو، تلوار بازی کر سکتے ہو، کشتی، چاقو زنی، باکسنگ...... جو تمہارا دل چاہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ہم بغیر کسی ہتھیار کے خالی ہاتھ لڑیں اور تب تک لڑتے رہیں جب تک کوئی ایک حتمی طور پر جیت نہ جائے۔''

''تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے جیسے یہ لڑائی شاید بہت دیر تک چلے گی لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ خاصی غیر دلچسپ لڑائی ہوگی۔ ایک دو منٹ میں ہی تمہارا جنازہ تیار ہو جائے گا۔''

''کچھ ایسے ہی خیالات تمہارے بارے میں میرے بھی ہیں۔'' میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''بہت خوب...... بہت خوب۔'' اس نے ایک بار پھر اوپر نیچے سر ہلایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم ''مرو یا مارو'' کی لڑائی لڑنا چاہتے ہو۔ دوسری طرف خالی ہاتھ لڑنے کی بات کر رہے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بندہ مارنے میں کافی دقت پیش آیا کرتی

ہے اور میری کھال بھی تھوڑی سی موٹی ہے۔''

''تو اپنا کوئی من پسند ہتھیار رکھ لو۔ چاقو یا کٹاری یا کچھ اور......''

''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں تمہیں کل بتا دیا جائے گا۔'' جارج نے مبہم انداز میں کہا
مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے طرزِ تخاطب نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے
اندر طیش کا دریا ابل رہا تھا۔ وہ اس ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے جان
امان دے چکا تھا ورنہ شاید اسی جگہ وہ خوں ریز لڑائی شروع ہو جاتی جس کی منصوبہ بندی کی
رہی تھی۔

اس کے طیش اور اس کی آتش پائی نے مجھے لطف دیا۔

عمران ابھی سو رہا تھا۔ میں اس ہال کمرے کی طرف چلا گیا جہاں جسمانی ورزش کا سا
و سامان موجود تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اس جگہ کو ''جم'' کہا جا سکتا تھا۔ ایک ا
دیواروں پر انڈین فلمی اداکاراؤں ہیما مالینی، زینت امان اور سری دیوی وغیرہ کی تصویریں لگ
تھیں۔ ان تصویروں میں ان خواتین کی جسمانی ''فٹنس'' نمایاں نظر آتی تھی۔ سہ پہر کے بعد
ٹرینر گیتا دیدی لڑکیوں کو لے کر یہاں آتی تھی اور ڈیڑھ دو گھنٹے گزارتی تھی۔ فی الوقت یہ
''جم'' خالی پڑا تھا۔ ایک گوشے میں جاگنگ مشین موجود تھی اور سینڈ بیگ بھی جھول رہا تھا۔
میں جاگنگ مشین پر ایکسرسائز میں مصروف ہو گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے تک میں نے اندھا دھند
ورزش کی اور پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھر میں سینڈ بیگ پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ جب میں یہ
کام شروع کرتا تھا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ اردگرد کا احساس تو دور کی بات ہے
مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ بارونداجیکی کی تربیت نے مجھے کسی اور ہی سانچے میں ڈھال
دیا تھا۔ میں نے سینڈ بیگ کو اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ وہ جگہ جگہ سے خوں رنگ ہو گیا۔ یہ میرا
اپنا ہی خون تھا جو میرے ہاتھوں کی جلد سے اور ناخنوں سے رسّا تھا۔ یہ ورزش نہیں تھی، مشق
بھی نہیں تھی...... یہ ایک جنون تھا، ایک آگ تھی جو سینڈ بیگ کے رُوبرو ہوتے ہی میرے جسم
میں پھیل جاتی تھی۔ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ ہو جاتا تھا مجھے۔ آج کل اسحاق کی دردناک
موت کی یاد نے میرے رگ و پے میں کچھ اور بھی چنگاریاں بھر دی تھیں۔ جب میں دیوانہ
وار اپنے کام میں لگا ہوا تھا، عمران کی آمد نے مجھے چونکایا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے
ہاتھوں میں باکسنگ کے ہلکے گلوز نظر آ رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرایا
اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ مارشل آرٹ کی کسی دھواں دار فلم کا اثر ہو گیا ہے تم پر۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بات

جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بے زبان کو مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ کوئی ایسا ہو جو تھوڑا بہت
جواب بھی دے سکے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے دستانوں کی ایک جوڑی میری طرف بھی پھینک دی۔

میں نے دو گلاس پانی پیا اور دستانے پہن لئے۔ وہ چہکا۔ ''بس میری ناک پر نہ مارنا
بالکل۔ یہ میں نے جگہ جگہ گھسیڑنی ہوتی ہے اور ہو سکے تو پڑپڑی (کنپٹی) کو بھی چھوڑ دینا
بالکل۔ سنا ہے شریف لوگ یہاں لگنے والی چوٹ سے اکثر فوت ہو جاتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''تم زبان درازی کرنے لگے ہو لیکن خیر، اس کی سزا میں تمہیں ''رِنگ'' میں دوں گا۔ لو
تیار ہو جاؤ۔''

ہم دونوں لکڑی کے ہموار فرش پر باکسنگ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پہلا مواقع تھا کہ میں
اور عمران اس طرح آمنے سامنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عمران ایک زبردست ''لڑاکا''
ہے۔ میں لاہور میں ہڑپہ میں اور پھر جہلم وغیرہ میں اس کی غیر معمولی پھرتی اور توانائی کے
مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ وہ سنگین ترین صورتِ حال میں بھی بڑے سکون سے لڑتا تھا اور یوں لگتا
تھا کہ لڑ نہیں رہا، سرکس میں کوئی خطرناک آئٹم دکھا رہا ہے۔ میں نفسیاتی طور پر ہمیشہ اس سے
مرعوب رہا تھا...... لیکن اب یہ مرعوبیت میری اندرونی تبدیلیوں کے دھارے میں کافی حد تک
بہہ گئی تھی۔

ہم پہلے وارم اپ ہوتے رہے پھر ایک دوسرے پر ہلکے ہلکے حملے کرنے لگے۔ یکا یک
عمران نے اپنے دائیں بازو کو بجلی کی سی تیزی سے حرکت دی۔ بے حد کوشش کے باوجود میں
خود کو اس کے طوفانی مکے سے نہ بچا سکا۔ آنکھوں میں تارے سے ناچے اور میں لڑکھڑا کر
دیوار سے جا ٹکرایا۔

وہ مسکرایا۔ ''جارج سے لڑنا چاہتے ہو تو اس کے لئے زندہ رہنا ضروری ہے اور مجھے
تمہاری خیریت مشکوک نظر آ رہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ ایک قریبی الماری کی طرف گیا اور وہاں سے دو ''فیس گارڈز'' لے
آیا...... ہم دونوں نے یہ گارڈز پہن لئے اور ایک بار پھر باکسنگ اسٹائل میں آ گئے۔ اب میں
کافی احتیاط کر رہا تھا۔ تکنیک میں عمران مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ میں نے اسے دو تین مکے رسید
کئے لیکن جواب میں مجھے اس کے پانچ چھ سہنے پڑے۔ باکسنگ کے ساتھ ساتھ وہ فقرے بازی
بھی کر رہا تھا۔ ہم بُری طرح ہانپنے لگے۔ اسی دوران میں وہ پھر ایک چکما دے گیا۔ بایاں ہاتھ

استعمال کرتے کرتے اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا اسٹاک مکا استعمال کیا۔ اس بار میں قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور گر گیا۔

وہ خود ہی گنتی گننے لگا۔ ”ایک...... دو...... تین...... چار۔“ اس کے آٹھ تک پہنچتے پہنچتے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کھڑے ہوتے ہی وہ چیتے کی طرح جھپٹا۔ ایک بار پھر تابڑ توڑ وار کیئے۔ میں دوبارہ چت ہو گیا۔ ذہن پر دھند سی چھانے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آگ بھی بھڑک اُٹھی۔ میری قوتِ برداشت کام آئی اور میں عمران کے گنتی شروع کرتے ہی پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب ہم دونوں نے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کیئے۔ میرے ہونٹوں سے خون رِسنے لگا۔ عمران کے رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید عمران اپنی کارکردگی دکھا کر اپنی اندرونی خفگی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو بائی پاس کیا تھا اور بڑی خاموشی سے راج بھون جا کر جارج کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ شاید وہ اس طرح یہ بتانا چاہتا تھا کہ جارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لئے وہ مجھ سے بہتر ہے۔

اس کی یہ بات غلط ثابت کرنے کے لئے میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اگلے راؤنڈ میں اسے چند سخت مکے رسید کیئے مگر تب اچانک پھر اس کی بہتر تکنیک کام کر گئی۔ عمران نے راؤنڈ پنچ کے انداز کا ایک مکا میری ٹھوڑی پر رسید کیا اور اس مرتبہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب میں گرا اور کب لکڑی کے فرش نے میری پشت کو چھوا۔ دماغ لٹو کی طرح گھوم گیا تھا۔

عمران نے پھر گنتی شروع کی...... چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ...... میں پھر کھڑا ہو گیا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ ایک بار پھر ہم ایک دوسرے پر جھپٹے...... اگلے قریباً پانچ منٹ میں واقعی بہت سخت لڑائی ہوئی۔ میں نے عمران کو زیادہ چوٹیں لگائیں اور یہ سخت بھی تھیں مگر عمران کی چوٹوں میں صفائی اور ایکوریسی تھی۔ ان پانچ منٹ میں، مَیں قریباً تین بار فرش بوس ہوا اور دوبارہ اپنا توازن قائم کر کے اُٹھا۔

”بس بھئی بس۔“ عمران پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”اب سلطانہ بھابی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔“

اس نے فیس گارڈ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رِسنے لگا تھا۔ چہرے پر ایک دو نیل بھی تھے۔ میں نے بھی فیس گارڈ اُتار دیا۔ ایک طرف سے میڈم صفورا نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اوٹ میں کھڑی ہو کر یہ ساری لڑائی دیکھتی رہی ہے۔

عمران نے پسینا پونچھتے ہوئے میڈم کو مخاطب کیا اور بولا۔ ”کیا خیال ہے میڈم! میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟“

”لگتا تو ایسے ہی ہے۔“ میڈم نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا رمزیہ باتیں کر رہے ہو آپ دونوں؟“ میں نے دستانے اُتارتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

”سچ سچ بتا دوں یا گول مول بات کر دوں؟“ وہ مسکرایا۔

”سچ سچ ہی بتا دو کیونکہ یہ نیکی تم کم کم ہی کرتے ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ پانی پیتے ہوئے بولا۔ ”میں میڈم کو چھوٹا سا ثبوت دینا چاہتا تھا۔“

”کس بات کا ثبوت؟“

”میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم کچھوکوے بن چکے ہو۔ کچھوکوما سمجھتے ہو نا تم؟ جسے انگلش میں کچھوا کہتے ہیں۔“

”انگلش میں نہیں، اردو میں کہتے ہیں۔“ میں نے تصحیح کی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب اس بات کا بھی ثبوت مل رہا ہے کہ تمہارے مکے میں کافی جان ہے۔ میری یادداشت کی چولیں ہل گئی ہیں اور انگریزی اردو آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہے...... ہاں تو میں بات کر رہا تھا کچھوکوے کی...... میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم اپنے لائف اسٹائل کی وجہ سے اس جانور کی طرح ڈھیٹ اور سخت جان ہوتے جا رہے ہو اور یہ ثابت ہو گیا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“

میڈم مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بتاتی ہوں...... دراصل بات یہ ہے کہ میری رائے میں اگر جارج گورا سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہیں تو پھر تمہارے بجائے عمران کو آگے ہونا چاہیئے تھا کیونکہ میرا خیال یہ تھا اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ لڑائی بھڑائی کے فن میں عمران تم سے آگے ہے۔ دوسری طرف عمران کا کہنا یہ تھا کہ تم ایک اور حوالے سے اس سے کہیں آگے ہو اور یہ ایسا حوالہ ہے جو فائٹنگ آرٹ میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی قوتِ برداشت اور درد سہنے کی صلاحیت...... اور میرے خیال میں یہ بات پچھلے بیس پچیس منٹ میں کافی حد تک ثابت ہوئی ہے۔ میں واقعی تمہاری برداشت کی صلاحیت سے ”امپریس“ ہوئی ہوں۔ اتنی چوٹیں کھا کر گرنا اور پھر پاؤں پر کھڑے ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ یس، اِٹ از ونڈرفل۔“

”تو یہ میرا سراسر پرائز ٹیسٹ ہو رہا تھا۔“ میں نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو ایسا ہی سمجھ لو برخوردار...... اوہ...... سوری...... میں نے تمہیں برخوردار کہہ دیا۔ دماغ گھوم گیا ہے۔ تمہارے مکے میں کافی طاقت ہے یار۔“ اس نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

میں اس کی مسخری پر یکسر خاموش رہا۔ چند سیکنڈ تک کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

وہ اس گھمبیر خاموشی کو توڑنے کے لئے مسکرایا۔ ”لگتا ہے کہ تم پھوکوما کہنے کی وجہ سے ناراض ہو گئے ہو لیکن تمہاری سخت جانی کی وجہ سے میں نے تمہیں پھوکوما کہا ہے۔ تیزی اور پھرتی میں تم خود کو کسی اور جانور سے تشبیہ دے سکتے ہو...... مثلاً باہر والا۔“

وہ سؤر کی بات کر رہا تھا۔ اس کی بکواس پر میرا پارا پھر اوپر چلا گیا لیکن میڈم کی موجودگی کی وجہ سے میں بولا کچھ نہیں۔

میڈم بولی۔ ”یہ باہر والا کیا ہوتا ہے بھئی؟“

”یہ...... یہ چیتے کی طرح کا ایک جانور ہوتا ہے جی۔“ عمران نے بات بنائی۔

”بھئی اس لحاظ سے تو تم دونوں ہی باہر والے ہو۔ میں تمہاری فائٹ سے متاثر ہوئی ہوں۔“

عمران بولا۔ ”آپ بھی تو کم 'باہر والی' نہیں ہیں۔ میں نے کچھ موقعوں پر آپ کو بڑی تیزی سے فیصلہ کرتے اور حرکت میں آتے دیکھا ہے۔“

”اچھا چھوڑو اس بات کو۔ اب دونوں اپنا حلیہ درست کرو۔ شام کو کچھ لوگ تابش کو دیکھنے آ رہے ہیں۔“

”لیکن یہ تو شادی شدہ ہے۔“

وہ عمران کے فقرے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ خبر پورے زرگاں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کا شوہر زرگاں واپس پہنچ گیا ہے اور وہ جارج گورا سے لڑنا چاہتا ہے۔ ہر طرف اس بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہوگا۔“

”اس خیال کی وجہ؟“ عمران نے پوچھا۔

”رنجیت پانڈے۔“ میڈم نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ”رنجیت پانڈے زرگاں کا سب سے کرخت اور دبنگ افسر ہے۔ اس رنجیت پانڈے کے ساتھ نل پانی کے دیوان میں تابش کی ٹکر ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تابش نے نہ صرف پانڈے کا

ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی کا کریڈٹ ملنے کے بعد تابش کو یہاں کافی شہرت حاصل ہوئی ہے...... زرگاں میں اکثر لوگ اس کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کے لئے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ڈیڑھ دو سال پہلے تک ایک عضو معطل کی طرح اپنی بیوی کے آسرے پر جی رہا تھا، اب پانڈے جیسے بندے سے ٹکر لینے کے قابل ہو گیا ہے...... اب جو نئی صورت سامنے آئی ہے، اس نے مزید ہلچل مچائی ہے۔ راج بھون کے دروازے کے سامنے جا کر جارج کو للکارنا اور اس کا چیلنج قبول کرنا، ہر جگہ زیر بحث ہے۔ شام کو جو لوگ آ رہے ہیں، یہ زرگاں کے عمائدین میں سے ہیں۔“

”یہ کیا کریں گے“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے ناخن دیکھیں گے کہ کہیں تم لڑائی کے دوران میں جارج کو کھرونڈے سے مارنا نہ شروع کر دو۔“ عمران نے کہا۔

میڈم اس کے مذاق کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ”کچھ نہیں، بس یہ لوگ تم سے ملیں گے اور تمہیں یقین دلائیں گے کہ چیلنج قبول کرنے کے بعد تمہاری حیثیت ملزم یا مجرم کی نہیں رہی ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، وہ سامبر کے قدیم اصولوں کے مطابق ہوگا اور تمہیں مقابلے کے دن تک ہر طرح کی سہولت حاصل رہے گی، وغیرہ وغیرہ۔“

”میڈم! میرے کام کا کیا بنا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں...... تمہارا کام ہو گیا ہے...... میں نے پرسوں شام ہی تمہارا پیغام نل پانی روانہ کر دیا تھا۔ اب تک انور خاں کو یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ اسے فی الحال زرگاں آنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے وہ تمہارے اور جارج کے مقابلے کا نتیجہ دیکھ لے۔“

”اس بات کی تصدیق کب تک ہو سکے گی کہ اطلاع پہنچ گئی ہے؟“

”کل شام تک لیکن تم بالکل مطمئن رہو۔ یہ کام ہو چکا ہے۔“

میڈم کے جانے کے بعد میں نے عمران کو گھورا۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”جگر! اگر کہیں زیادہ چوٹ لگی ہے تو معاف کر دینا۔“

”چوٹیں تو تمہیں بھی کم نہیں لگیں۔ تمہارا تھوبڑا سوجتا جا رہا ہے...... اور میرے خیال میں میرا بھی یہی حال ہے۔“

”یعنی بقول شاعر، دونوں طرف ہے سوج برابر چڑھی ہوئی۔“ وہ چہکا۔ ہم ہنسے اور بغل گیر ہو گئے۔

رات کو بڑی بڑی پگڑیوں اور فربہ جسموں والے کچھ مقامی لوگ مجھ سے ملنے آئے۔

ان کا رویہ بس لئے دیے جیسا رہا۔ تاہم ان کی نگاہوں میں میرے حوالے سے دلچسپی اور گونا گوں تجسس تھا۔ میں ان کے لئے جیسے کوئی عجوبہ قسم کی شے تھا۔ وہ میری ''کایا کلپ'' کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے لیکن کھل کر کوئی سوال بھی نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطانہ اور اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا، حالانکہ یہ سوال بھی ان کے ذہنوں میں ہلچل مچا رہا تھا۔

رات کو میں اور عمران ایک ہی کمرے میں لیٹے تھے۔ میں اپنے معمول کے مطابق سخت فرش پر دراز تھا (قالین پر) جبکہ عمران بستر پر لحاف اوڑھے لیٹا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس طرح سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ اب مجھے سردی بے چین نہیں کرتی تھی۔ دوپہر والی مارا ماری کے سبب عمران کی ناک کافی سوج گئی تھی مگر وہ ایسی باتوں کی پروا کب کرتا تھا۔ اس نے اپنے خوبصورت بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''یار! کبھی کبھی تو میں بارونداجیکی سے واقعی بہت متاثر ہوتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کی اور میری ملاقات نہ ہو سکی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس کی شاگردی اختیار کر لیتا۔''

''پھر کوئی ڈراما رچا رہے ہو؟''

''نہیں جگر! میں سنجیدہ ہوں۔ جیکی نے تم جیسے پھوسٹر بندے کی کیمسٹری چند مہینوں میں تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔ درد کے حوالے سے جو فلسفہ اس نے تمہیں دیا ہے، میں اس سے پورا متفق تو نہیں لیکن اس کے نتائج کو جھٹلانا بھی بہت مشکل ہے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر تم سے اظہارِ یکجہتی کے طور پر آج مابدولت بھی فرش پر استراحت فرمائیں گے۔'' اس نے چھلانگ لگائی اور میرے پہلو میں آ کر قالین پر لیٹ گیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اظہارِ یکجہتی کرنا ہے تو پورا کرو۔ لحاف کیوں لپیٹ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم نے وہ شعر نہیں سنا۔ آپ سے پہلے تم ہوئے، پھر تُو کا عنوان ہو گئے۔ ہر کام آہستہ آہستہ ہوتا ہے بھائی۔ اتنا اظہارِ یکجہتی بھی نہ کراؤ کہ کل سویرے اکڑا ہوا پایا جاؤں اور لوگ اظہارِ افسوس کے لئے تمہارے پاس آنے لگیں۔ تم سے پوچھا جائے کہ کیا ہوا؟ تو بولو، بس جی اظہارِ یکجہتی ہو گیا...... اچھی بھلی رضائی پڑی تھی مگر رضائی کی جگہ اس نے ''یکجہتی'' اوڑھ لی...... اور صبح تک اپنے مرحوم بزرگوں سے اظہارِ یکجہتی کر گیا۔''

اگلے دن صبح میں اور عمران پُرتکلف ناشتے سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد جم میں

چلے گئے۔ میں ورزشوں میں مصروف ہو گیا اور عمران اس قدیم کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا جو منیجر مدن نے اسے دی تھی۔ یہ کتاب اس راجواڑے یعنی بھانڈیل اسٹیٹ کی قدیم رسموں کے بارے میں تھی اور اس میں سویمبر اور سامبر وغیرہ کا ذکر بھی تھا۔ اس کتاب میں اس مورتی کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا جسے چرانے کی پاداش میں ہم یہاں پہنچے تھے اور سنگین مسائل کا شکار تھے۔ لوگ ایک مدت سے بدھا کی اس مورتی کو آرا کوئے کے نام سے پکارتے رہے تھے، یعنی وہ شے جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ ابھی تک تو یہ مورتی آرا کوئے ہی ثابت ہوئی تھی۔

لال بھون کے وسیع سبزہ زار پر ابھی یخ بستہ اوس کے قطرے موجود تھے۔ طویل قطاروں میں کیاریوں کے اندر سرما کے پھول جیسے زردی مائل دھوپ سے حظ اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جم کے قریب دو باوردی گارڈز موجود تھے اور صرف جم ہی نہیں، پورے لال بھون کو اسپیشل فورس کے کمانڈوز نے گھیرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم جدھر جاتے ہیں، درجنوں نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔

میری ورزش اور مشق جاری تھی۔ پھر میں نے عمران کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ ابھی ہم دونوں کو مصروف ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ گیتا کی آواز سنائی دی اور پھر کئی لڑکیوں کی جلترنگ جیسی آوازیں اُبھریں۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ قریباً ڈھائی درجن نہایت خوبرو لڑکیاں ہمارے سامنے کھڑی تھیں۔ یہ سب کی سب وہی تھیں جنہیں ساتویں کے جشن میں ''سات پریوں'' کے انتخاب میں حصہ لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جنہوں نے اب خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ان میں چمک دمک آ گئی تھی۔ ان کے عارض دہکتے تھے اور زُلفیں لہراتی تھیں۔ وہ بات بات پر کھلکھلاتی تھیں، ایک دوسرے سے چہلیں کرتی تھیں اور آنکھوں آنکھوں میں بھید بھری باتیں کہتی رہتی تھیں۔

''کیا بات ہے گیتا دیوی؟'' میں نے ان کی ٹرینر سے پوچھا۔

''یہ سب تم سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کس لئے؟''

''بھئی جس لئے لوگ مشہور لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہیں قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''میں ایسا مشہور تو نہیں ہوں۔''

''یہ تو تمہارا خیال ہے نا...... ذرا یہاں سے باہر نکل کر تو دیکھو۔ ہر طرف تمہارے چرچے ہیں۔'' گیتا بولی۔

''کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے۔''

''کئی وجہیں ہیں...... اور ان میں سے ایک وجہ تمہارا یہ رہن سہن ہے۔'' وہ مسکرائی اور سخت سردی میں میرے بالکل ناکافی کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

اب لڑکیوں نے مجھے گھیرا ڈال لیا تھا۔ ان کے جسموں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ آپس میں شوخ سرگوشیاں بھی کر رہی تھیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی نظر آئی جس کا نام میڈم نے ثمرین بتایا تھا اور جس کے بارے مین کہا تھا کہ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ وہ آج بھی خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ ''سنا ہے کہ نل پانی میں آپ کی لڑائی پانڈے صاحب سے ہوئی تھی؟''

''بالکل ہوئی تھی...... لیکن اس شخص کے نام کے ساتھ ''صاحب'' لگا کر اس لفظ کی توہین نہ کرو۔''

چند لڑکیوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نظر آئی۔ ان میں ثمرین بھی شامل تھی۔

''سنا ہے، آپ کو درد ناہیں ہوتا؟'' ایک دوسری لڑکی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کون کہتا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یہاں کے ملازمین کہوت ہیں۔ ان میں سے کچھ نے آپ کو یہاں ''جم'' میں ورزش کرتے دیکھا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ آپ کے شریر سے خون بھی رِسنے لگے تو آپ کو پتا ناہیں چلتا۔''

ایک لڑکی نے لقمہ دیا۔ ''اور آپ بے موسم کے کپڑے پہن کر گھومتے ہیں، فاقے کرتے ہیں، فرش پر سوتے ہیں اور عام پانی سے اشنان بھی کر لیوت ہیں۔''

ثمرین نے کہا۔ ''لیکن جہاں تک ہم کو جانکاری ہے، آپ پہلے تو ایسے ناہیں تھے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یادداشت کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔''

''اپنے سوال کا جواب تم نے خود ہی دے دیا ہے۔'' عمران نے مدبرانہ انداز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''خیر سے آپ کون ہیں؟'' زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے تنک عمران سے

پوچھا۔

''میں میڈم کا ملازم ہوں لیکن آج کل یہاں جم میں آ رہا ہوں، ٹریننگ میں تابش کا ساتھ دینے کے لئے بلکہ...... بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ مجھے اس کا استاد بھی کہا جا سکتا ہے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟'' ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

''استاد تو یہ واقعی ہے...... بلکہ بہت استاد ہے اور آپ بھی اس سے ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہوں۔ یہ لڑکیوں کو بہت جلد شاگردی میں لے لیتا ہے۔''

''دیکھو مسٹر تابش...... اِٹ اِز ٹو مچ۔ میں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی اتنی زیادہ لڑکیوں کے سامنے۔''

اس نے مجھے مکا دکھایا پھر لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اے خوش جمال...... پری پیکران! میں آپ کو ایک بہت اونچی بات بتاتا ہوں۔ جس طرح بد سے بدنام زیادہ بُرا ہوتا ہے، اسی طرح اچھے سے مشہور زیادہ عزت دار ہو جاتا ہے۔ یہ تابش صاحب بس مشہور ہو گیا ہے، ورنہ یہ کوئی ایسا رستم سہراب بھی نہیں ہے۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔ ایک بولی۔ ''ہم تو اتنا جانت ہیں جی کہ جو شخص پانڈے صاحب جیسے شخص سے ٹکر لے سکتا ہے...... وہ جارج گورا صاحب کے لئے بھی ضرور مشکل پیدا کرے گا۔''

''تو آپ سب یہ چاہتی ہیں کہ جارج صاحب کے لئے مشکلیں پیدا ہوں؟''

لڑکیاں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کی ٹریز گیتا جلدی سے بولی۔ ''ناہیں، ایسی بات تو ناہیں۔ جارج صاحب کی حیثیت ہمارے مالک کی سی ہے۔ ہم ایک غیر کے مقابلے میں ان کی ہار کا کیوں سوچیں گے؟ ہم چاہت ہیں کہ بھگوان ہمیشہ کی طرح ان کو کامیاب کرے......'' اس کے ساتھ ہی اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

کئی لڑکیوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہرحال، ان کے تاثرات ان کے اندرونی جذبات کی چغلی کھا رہے تھے۔ ان میں سے شاید ہی دو چار ہوں جو دلی طور پر گیتا کی بات سے اتفاق کر رہی ہوں اور مجھے تو لگ رہا تھا کہ شاید گیتا بھی وہ نہیں کہہ رہی جو اس کے دل میں ہے۔ وہ تیس پینتیس سال کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب سے پانچ دس سال پہلے تک وہ خاصی حسین رہی ہو گی۔ اس کے جسم میں بھی کشش تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماضی قریب میں وہ بھی جارج کی عیش پرستی کا شکار رہی ہو۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ وہ بہت باتونی ہے۔اس ملاقات میں اس کا ثبوت بھی ملا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں جتنی باتیں ساری لڑکیوں نے کیں، اس سے دگنی صرف گیتا مکھی نے کیں۔عمران بھی ٹھیک ٹھاک چرب زبان تھا۔وہ گیتا کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔گیتا زرگاں کے بڑے بڑے لوگوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا رہی تھی اور یہ بتا رہی تھی کہ وہ رقص کی کون کون سی اکیڈمی میں ٹیچر کی حیثیت سے وزٹ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھران دونوں کی گفتگو کا رخ جارج گورا کی طرف مڑ گیا۔گیتا ایک نمک خوار کی حیثیت سے اس کی تعریفیں کرنے لگی اور بتانے لگی کہ اپنی کچھ چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود وہ زبردست قسم کا سوشل ورکر ہے اور کھل کر خیر خیرات کرتا ہے۔عمران اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

میں گیتا کے سامنے بات کرتے ہوئے خاص احتیاط کر رہا تھا۔مجھے میڈم کی یہ بات یاد تھی کہ گیتا پیٹ کی ہلکی ہے اور اس کے سامنے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا ہے۔

میرا خیال تھا کہ عمران کو بھی میڈم کی یہ نصیحت یاد ہوگی لیکن پھر جوشِ گفتار میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔گیتا کی ایک بات پر وہ شد و مد سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔''بالکل...... گیتا دیوی......تم صحیح کہہ رہی ہو۔بہت بڑا دل ہے جارج صاحب کا۔وہ ایسے ہی بڑے نہیں بنے۔اب ترسوں کی بات ہی لو، جب وہ یہاں آئے تھے۔سامبر کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔طے ہو رہا تھا کہ مقابلہ کس طرح کا ہوگا۔حضرت تابش صاحب نے جوش میں آ کر فرما دیا کہ یہ ''مرو یا مارو'' کی فائٹ ہونی چاہیے۔یعنی fight till death۔اب اگر کوئی کم ظرف ہوتا تو وہیں آگ بگولا ہو جاتا۔ہو سکتا ہے کہ وہیں پر مارا ماری شروع ہو جاتی لیکن جارج صاحب نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔یہ کہا کہ سوچ کر بتائیں گے۔اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ خدانخواستہ وہ ڈر گئے۔یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ ایک بااختیار بندہ کسی بے اختیار بندے کی غلط بات حوصلے سے سنے۔کیوں گیتا دیوی! غلط تو نہیں کہا؟''

''سولہ آنے ٹھیک ہے۔'' گیتا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔''مجھے تو واقعی حیرانی ہو رہی ہے کہ اس طرح کی بات ہوئی ہے......میں تو یہ کہوں گی کہ......''

''میں سمجھ گیا ہوں، آپ جو کہنا چاہ رہی ہیں۔'' عمران نے تیزی سے گیتا کی بات کاٹی۔''اگر جارج صاحب نے سوچنے کا وقت لیا ہے تو اس واسطے نہیں کہ وہ گھبرا گئے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ سامبر کے بارے میں جو کچھ طے ہوا ہے، وہ اسی طرح رہے اور کوئی نئی شروعات نہ ہو......یہی بات ہے نا گیتا دیوی؟''

گیتا نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر عمران کی رفتار زیادہ تیز تھی۔

''میں خود بھی فائٹنگ آرٹ کی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جارج صاحب مہا فائٹر ہیں۔ہم تابش صاحب سے صرف ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں یا پھر یہ دعا کر سکتے ہیں کہ ان کے لئے جارج صاحب کے دل میں کچھ رحم پیدا ہو جائے اور وہ سامبر کی شرطوں میں کچھ ردوبدل کر دیں۔''

''یہ بہت مشکل ہے۔'' گیتا نے دبے لہجے میں کہا اور پھر ایک جھرجھری سی لی۔اس سے پہلے کہ وہ اپنی قینچی زبان کو پھر حرکت دیتی عمران دوبارہ پہل کر گیا۔

''میں سمجھ گیا گیتا دیوی کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔میری آنکھوں میں بھی وہی دوتاریخ والا منظر ہے......کیا نام تھا اس بدقسمت کا؟''

''اسحاق۔'' گیتا نے کہا۔

''ہاں......اسحاق...... میں نے اس کا آخری وقت دیکھا تھا، اللہ ہر کسی کو ایسے وقت سے بچائے۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ایک بار پھر بولتا چلا گیا۔گیتا کا چہرہ دیدنی تھا۔وہ بولنا چاہ رہی تھی لیکن عمران کہیں سانس لیتا تو وہ منہ کھولتی۔سیر کو سوا سیر ٹکر گیا تھا۔گیتا کچھ دیر تک پیچ و تاب کھاتی رہی۔اسی دوران میں اندر سے اسے میڈم کا بلاوا آ گیا اور وہ اپنی شاگرد لڑکیوں کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی عمران مسکرانے لگا۔''جگر! لگتا ہے گیتا دیوی کا پیٹ آج ضرور پھول جائے گا۔ایسے لوگوں کے لئے خاموش رہنا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔''

میں غصے میں کھول رہا تھا۔جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔''یہ تُو نے کیا ڈراما کیا ہے بھئی۔میڈم نے سمجھایا بھی تھا کہ گیتا کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔تُو نے سارا کچا چٹھا کھول دیا۔یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے جارج کو 'مرو یا مارو' والی تجویز دی ہے؟''

''یار! اس میں برائی ہی کیا ہے؟ لیکن اگر تم ناراض ہوتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔'' وہ اُٹھ کر چل دیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''الفاظ واپس لینے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''دیکھو، تم دوسروں کو بے وقوف سمجھنے کی عادت چھوڑ دو۔مجھے بتاؤ تم نے گیتا کے سامنے یہ سب کچھ کیوں کہا ہے؟''

"اچھا...... تم بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے کیوں کہا ہے؟" اس نے جوابی سوال جڑ دیا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم یہ بات پھیلانا چاہ رہے ہو۔"

"کیوں؟"

"شاید تم سب کو بتانا چاہتے ہو کہ میں نے دلیری دکھائی ہے اور جارج کو 'مرو یا مارو' کا چیلنج دیا ہے۔"

"ونڈر فل، یار! تمہارے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ تم واقعی جینئس ہو۔ میرے اندر سے ایسی عقل مندی ڈھونڈ نکالی جو میرے میں تھی ہی نہیں۔ ویسے یہ بات ہے تو بڑی زبردست۔ ہر کس ناکس کو پتا چل جائے گا کہ تم نے اس لڑائی میں جارج کو 'مارو یا مارو' والا چیلنج دیا ہے۔ اب اس کے لئے اس چیلنج کو قبول نہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ بہت خوب یار...... بہت خوب۔"

میں اسے گھورتا رہا۔ کبھی اس پر طیش آتا، کبھی اس کی چالاکی کی تعریف کرنے کو دل چاہتا۔ وہ ایسا ہی گورکھ دھندا تھا۔ کبھی سیدھا سادہ، کبھی جلیبی کی طرح گول۔ یقینی بات تھی کہ اس نے گیتا سے جو کہا، پلاننگ کے ساتھ کہا تھا۔

اس پلاننگ کا نتیجہ صرف پندرہ بیس گھنٹے میں سامنے آ گیا۔ اگلے روز صبح ناشتے پر میڈم اپنے کتے سمیت آ دھمکی۔ اس نے بتایا۔ "زرگاں میں کھلبلی ہے۔ یہ بات پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کے 'پاکستانی پتی' نے جارج گورا کو سامبر کے لئے تجویز دی ہے کہ یہ لڑائی کسی ایک فریق کی موت تک جاری رہے۔"

"یہ بات پھیلی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ اس کا پتا تو جارج کے علاوہ بس ہم دو تین لوگوں کو تھا۔ بہرحال جو بھی ہے...... اب یوں لگ رہا ہے کہ اس حوالے سے جارج کا فیصلہ چند گھنٹوں میں ہی سامنے آ جائے گا۔"

جارج کا فیصلہ تو سامنے نہیں آیا تاہم رات نو دس بجے کے لگ بھگ میڈم صفورا ہمارے بیڈ روم میں آئی۔ میں اور عمران اس وقت مونگ پھلی کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع ہزاروں لوگوں کے سامنے اسحاق کی دردناک موت ہی تھی۔ وہ منظر کوشش کے باوجود ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے بسی، اس کا

کرب، اَن گنت مشتعل لوگوں کے درمیان وہ یکسر تنہا اور زخم زخم تھا۔

میڈم کے آتے ہی ہم خاموش ہو گئے۔ وہ بولی۔ "تم لوگ راج بھون میں ہلچل مچا کر یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی پنڈت مہاراج یہاں آئے ہوئے تھے۔ کسی خاص الخاص موقع کے سوا وہ کم ہی خود چل کر کسی کے پاس آتے ہیں۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ ان پر جج منٹ کی بھاری ذمے داری آن پڑی ہے۔ وہ خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر درست فیصلہ دیتے ہیں تو علم جی سمیت جارج کے خیر خواہ ناراض ہوتے ہیں اور غلط فیصلہ دے نہیں سکتے کیونکہ سب کچھ پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ جو لوگ دھرم کو سمجھتے ہیں، وہ اس فیصلے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"کیا آپ سامبر کی لڑائی کی بات کر رہی ہیں؟"

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "یہ بات پوری طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ کے شوہر نے سر جارج کو 'مرو یا مارو' کا چیلنج دیا ہے۔ اب سامبر کے پرانے اصولوں کے مطابق جارج کو تابش کی یہ للکار قبول کر لینی چاہئے...... اور یہی دلیرانہ فیصلہ بھی کہلائے گا مگر کچھ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ ان کا پوائنٹ آف ویو یہ ہے کہ یہ دو 'ہم رتبہ' افراد کا مقابلہ نہیں ہے۔ ایک عام شخص ہے، دوسرا ریاست کا ایک اہم ترین فرد ہے۔ اس پر بہت سی ذمے داریاں ہیں، بے شمار لوگوں کی بہتر زندگی اس کی سلامتی سے وابستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی سوچ رکھنے والے زیادہ تر لوگ وہی ہیں جن کا تعلق حکمراں طبقے اور ہائی جینٹری سے ہے۔"

"اب پنڈت مہاراج کیا کہتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے نا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اب اس مسئلے کو حل کرنے کی ساری ذمے داری اس پر ڈال دی گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کو لاء کی تشریح کرنی ہے اور یہ فیصلہ دینا ہے کہ جارج، تابش کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند ہے یا نہیں۔ اب شاید وہ اس اہم 'جج منٹ' سے فرار حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔"

"درمیانی راستہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ مجھ سے یہی بات کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم خود ہی اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہو جاؤ تو فیصلے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ یعنی تم کہہ دو کہ تم

جارج سے ''مرویا مارو'' کی فائٹ نہیں چاہتے ہو۔''

''اس کے بدلے میں مجھے کیا حاصل ہوگا؟ مجھے تو ہارنے کی صورت میں سُولی پر چڑھنا ہے۔''

''میں نے بھی پنڈت مہاراج سے یہی بات کہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں حکم جی سے تھوڑی بہت رعایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔''

''یعنی مجھے وہ چار گھنٹے کے لئے سُولی پر لٹکانے کے بجائے عمر بھر کے لئے لٹکا دیا جائے۔ زرگاں کی جیل میں ڈال دیا جائے...... نہیں میڈم...... مجھے یہ کڑی سزا منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو بھی ہونا ہے، بس ان دو چار دنوں میں ہو جائے۔'' میرا لہجہ حتمی اور فیصلہ کن تھا۔

میڈم نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر وہ عمران کو دیکھ کر بولی۔ ''تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟''

چند لمحوں کے لئے میری اور عمران کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک بجلی سی کوندی۔ یہ وہی بجلی تھی جو ہمیں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ جو ہمیں یاد دلاتی تھی کہ ہم موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا فیصلہ وہی ہوگا میڈم جو تابش کا ہوگا۔''

''تابش تو فیصلہ دے چکا ہے۔''

''تو میں بھی دے رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے میڈم! میں رعایت کے نام پر جارج کی جیل میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانے کے بجائے آناً فاناً موت کو گلے لگانا اس کے لئے بہتر رہے گا۔''

''میڈم کی آنکھوں میں ایک تعجب سا نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اور دھواں فضا میں چھوڑ کر بولی۔ ''بہر حال...... تم لوگ کل تک اس بارے میں مزید سوچ لو۔''

''سوچ لیا میڈم۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میرا جواب ایک دن بعد بھی یہی ہوگا اور ایک ماہ یا ایک سال بعد بھی یہی۔ آپ پنڈت کو بتا دیں کہ میں اپنے پورے ہوش و حواس سے اپنے مطالبے پر قائم ہوں۔''

میڈم چلی گئی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا اور عمران نے میری طرف۔ میں یونہی تو اس پر ناز نہیں کرتا تھا۔ وہ میری رگِ جاں سے قریب تر تھا۔ باروندا جیکی نے مجھے جسمانی طور

پر مضبوط بنایا تھا لیکن عمران نے اس سے بڑا کام کیا تھا۔ اس نے مجھے روحانی اور ذہنی استقامت دی تھی۔ مجھے اندر سے بدلا تھا۔ اب بھی وہ اس نازک موقع پر مجھے ایک ایسی توانائی دے رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔ وہ میرا دل بن کر میرے دل میں دھڑک رہا تھا۔ وہ میرے بازو بن گیا تھا، میرا حوصلہ بن گیا تھا۔

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ''تھینک یو عمران۔'' میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔

''وہ چند لمحے چپ رہا پھر ایک دم پٹری سے اُتر گیا۔ ''تھینک یو کس بات کا؟ یہ تو میرا پیشہ ہے یار۔ لوگوں کو ذرا بھڑکا کر ایک دوسرے سے لڑانا اور پھر کھٹا کھٹ بریکنگ نیوز بناتے جانا۔ اب دیکھنا، فساد پلس پر کیسی کیسی لیڈ چلے گی...... اور اس کے بعد تبصرے، تجزیے اور تڑفیے چلیں گے۔ تڑفیے سمجھتے ہو نا تم؟ ایسے ٹاک شوز جن میں گنجے دانشور اچھل اچھل کر تڑف تڑف کر لڑتے ہیں۔ اب ذرا تم سوچو، ایک تو دانشور ہو اوپر سے گنجا...... وہ کیا قیامت نہ اٹھائے گا۔ بس مزہ آ جائے گا۔ یار! آٹھ دس کروڑ تو ہم یہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی بنا لیں گے۔''

''یہ پنڈت مہاراج کی منافقت پر غور کیا ہے تم نے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''یار! غور کرنے کے لئے ناظرین جو ہوتے ہیں۔ ہمارا کام تو بس پسوڑی ڈالنا ہے اور وہ ہم ان شاء اللہ ڈالیں گے۔''

میں نے اس کی طنزیہ گفتگو کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہی منافقت ہے جو ہر مذہب کے کٹر لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے علم کا سارا زور مذہب کو موم کی ناک بنانے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اپنے گرو سورگ باشی سوبھاش کی کارستانیاں تو تمہیں یاد ہیں ناں؟ اس کے دوغلے پن کی ایک چھوٹی سی مثال وہ گرم ٹھنڈے پانی والا معاملہ تھا۔ اپنی سہولت کے لئے اس نے ادھ بجھے انگاروں کو آگ کی تعریف سے خارج کر دیا تھا۔ اب دیکھو، یہی کچھ یہاں یہ لمبی زُلفوں والا پنڈت مہاراج کر رہا ہے۔ ایک مشکل فیصلے سے بچنے کے لئے ''بیک ڈور'' کارروائیاں کر رہا ہے۔''

ہماری گفتگو کافی دیر جاری رہی پھر ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔ اب میری طرح عمران بھی سخت قالین پر ہی سوتا تھا، ہاں وہ لحاف ضرور اوڑھتا تھا۔

ہم لال بھون کی اونچی دیواروں میں بند تھے۔ چاروں طرف کڑا پہرا تھا۔ پھر بھی زرگاں کی صورتِ حال کی کچھ کچھ جھلکیاں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان جھلکیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زرگاں کی فضاؤں میں ارتعاش اور ہلچل ہے۔ یہ ہلچل دو طرح کی تھی۔ ایک تو یہی

جارج اور میری لڑائی والا معاملہ تھا۔ اس لڑائی کو یوں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ اس سے پہلے میں تل پانی میں رنجیت جیسے شخص کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ دوسری ہلچل ساتویں کے سالانہ جشن کی تھی۔ یہ جشن بھی چند روز میں پہنچا چاہتا تھا۔ اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق زرگاں کے گلی کوچوں کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ مختلف کھیل تماشوں کا انتظام ہو رہا تھا۔

ایسے ہی کچھ کھیل تماشوں کی تیاری لال بھون کے اندر بھی ہو رہی تھی۔ میں حسب معمول دوپہر سے ذرا پہلے جم میں ورزش اور مشق کے لئے چلا گیا۔ عمران کچھ دیر میرے ساتھ رہا پھر وہ گیتا مکھی کے ساتھ ایک پھول دار روش پر ٹہلتا کسی طرف نکل گیا۔ میں اکیلا ہی لگا رہا۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹنے لگا اور رگ پٹھے اپنی برداشت کی آخری حد کو چھونے لگے۔ میں اپنی دیوانہ وار کوشش سے ہر روز اس حد کو تھوڑا سا وسیع کر دیتا تھا۔ دورانِ مشق میں جم کے دروازے کھڑکیاں بند کر لیتا تھا کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ لال بھون کے گارڈز اور ملازمین کھڑکیوں اور دروازوں کی جھریوں سے مجھے دیکھنا پسند کرتے تھے۔

عمران کو اوجھل ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ورزش ختم کر کے میں نے پسینا پونچھا۔ کچھ دیر تک سانسیں درست کیں اور پھر عمران کی تلاش میں نکلا۔ وہ یہاں بھی بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنانے لگا تھا۔ کبھی کسی سے گپ شپ کرتا نظر آتا تھا، کبھی کسی کا کوئی مسئلہ حل کرنے میں لگا ہوتا تھا۔ لال بھون میں سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ میڈم کا خصوصی ملازم ہے۔ اسے مارشل آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ ہے اور میڈم کا ارادہ اسے اپنے ذاتی محافظوں میں شامل کرنے کا ہے۔

میں عمران کو ڈھونڈتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچا تو وہ مجھے ایک بڑے ہال کمرے میں ملا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ خوبرو لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی بازی گری اور شعبدہ بازی کی ریہرسل کر رہی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کی عمریں پندرہ بیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ میں آج انہیں پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف جمناسٹک کے انتظامات تھے۔ ایک طرف تنے ہوئے رسّے پر چلا جا رہا تھا۔ پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی چالیس عدد لڑکیاں بھی اس ریہرسل کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ایک جانب منیجر مدن بھی بیٹھا تھا۔ مدن کے قریب عمران ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ تند و تیز گفتگو میں مصروف تھا۔ لڑکی نے سرخ رنگ کا نیم عریاں لباس پہن رکھا تھا۔

میں نے قریب کھڑی گیتا سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ لال کپڑوں والی لڑکی بہت زبردست بازی گر ہے۔ اسے یہاں لعل مس انڈیا کہا جاوت ہے۔ تمہارا دوست خواہ مخواہ اس کے ساتھ میچ ڈال کر بیٹھ گیا ہے۔''

''کیسا میچ؟''

''یہ لڑکی لوہے کے اس چکر کے اوپر کھڑی ہو کر اسے اپنے پاؤں سے چلاوت ہے اور ساتھ ساتھ کرتب دکھاوت ہے۔ تمہارا دوست کہتا ہے کہ وہ بھی ایسا کر لیوے گا۔'' گیتا نے تھوڑی دور پڑے ایک آہنی چکر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کڑا نما چکر زمین سے قریباً آٹھ فٹ اونچا تھا۔ اسے ایک چھ سات انچ چوڑی آہنی پٹی کو گول کر کے بنایا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لئے لکڑی کا ایک اسٹول بھی پڑا تھا۔

بظاہر اس چکر کے اوپر چڑھ کر اسے پاؤں سے گول گول دھکیلنا اور ساتھ ساتھ کوئی کرتب دکھانا کافی مشکل کام لگتا تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لئے ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی جانتا نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ماہر فنکار ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ مشکل کام کر سکتا ہے۔

معاملہ کافی گرما گرم تھا۔ لعل مس انڈیا کے حمایتی اس کے حق میں چلا رہے تھے اور عمران کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ اپنا دعویٰ ثابت کر کے دکھائے۔ سترہ اٹھارہ سالہ نوخیز لڑکی بھی لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ وہ زور سے بولی۔ ''اچھا تم باتیں چھوڑو، پہلے والا آئٹم ہی کر کے دکھا دو۔''

''اوکے۔'' عمران نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں کروں گا۔''

''لو، میں تمہارے لئے ایک بار پھر دُہرا دیتی ہوں۔'' لڑکی تند لہجے میں بولی۔

گیتا مکھی نے ایک چھوٹے اسٹول پر کھڑے ہو کر اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ''لو جی، لڑکے لڑکیو! لعل مس انڈیا بمقابلہ بگ مسٹر پاکستان۔''

''ہوہا'' کا شور بلند ہوا...... سرخ کپڑوں والی نوخیز لڑکی پھرتی سے اسٹول پر چڑھی اور لوہے کے چکر پر کھڑی ہو کر توازن درست کرنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیئے تھے۔ ایک دوسری لڑکی نے اس کی دونوں ہتھیلیوں پر دو لمبی تلواریں رکھی دیں۔ یہ بالکل سیدھی تلواریں تھیں۔ لڑکی نے رومن اسٹائل تلواریں اپنی دونوں ہتھیلیوں پر عمودی رخ سے کھڑی کیں اور انہیں بیلنس کر لیا پھر وہ اپنے پاؤں کے ساتھ، چھ سات انچ والے آہنی چکر کو گول گول دھکیلنے لگی۔ اس نے تماشائیوں کے درمیان دو راؤنڈ مکمل کیئے۔

تلواروں کو ہتھیلیوں پر بیلنس رکھنے کے ساتھ ساتھ چکر کو دھکیلنا واقعی مشکل کام لگتا تھا۔

لڑکی نے دو راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد تلواریں پھینکیں اور خوبصورت انداز میں قلابازی لگا کر فرش پر آ گئی۔ تالیوں سے ہال گونج گیا۔

اب عمران کی باری تھی۔ اس نے پہلے فرش پر کھڑے ہو کر تلواروں کو اپنی ہتھیلیوں پر کھڑا کیا۔ پھر پورے کرتب کے لئے اسٹول پر چڑھ کر چکر پر کھڑا ہو گیا۔ کرتب مشکل تھ لیکن عمران جیسے شخص کے لئے نہیں۔ اس نے تلواروں کو ہتھیلیوں پر کھڑا کر کے بیلنس کیا پھ آہستہ آہستہ آٹھ فٹ اونچے چکر کو اپنے پاؤں سے دھکیلنے لگا۔ دو چار لوگ عمران کی حوصل افزائی کر رہے تھے مگر اکثریت لعل مس انڈیا کی حمایتی تھی۔ یہ لوگ عمران کو ''ہوٹ'' کر رہے تھے اور ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

عمران نے ایک راؤنڈ مکمل کیا پھر دوسرا شروع کیا اور تب وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم مجھے تو ہرگز نہیں تھی۔ عمران لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش کی۔ ایک تلوار گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن دوبارہ حاصل کرتا آہنی چکر اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا...... وہ آٹھ فٹ کی بلندی سے اُڑتا ہوا نیچے آیا۔ ایک دم شور بلند ہوا، اس میں قہقہے بھی شامل تھے۔ عمران نیچے بیٹھے تماشائیوں پر گرا تھا۔ یہ وہی، پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزائیں تھیں۔ جو ایک دو لڑکیاں اس کے نیچے آئیں، وہ بُری طرح چلائیں۔ عمران کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس کے نیچے آنے والی لڑکیوں میں ایک زخمی ہوئی تھی۔ عمران نے جو تلوار پکڑ رکھی تھی، اس کی نوک لڑکی کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لڑکی کا خون رسنے لگا تھا اور وہ تکلیف سے دُہری ہو گئی تھی۔ میں دیکھ کر بُری طرح ٹھنکا۔ یہ ثمرین تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف گیا۔ زخم گہرا نہیں تھا لیکن پانچ چھ انچ لمبا اور قریباً دو انگل چوڑا تھا۔ وہ گردن سے شروع ہو کر اس کے کان کی لو تک چلا گیا تھا۔

''ویری ساری...... ویری ساری۔'' عمران بار بار کہہ رہا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' گیتا زخم دیکھ کر بڑبڑائی۔

اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے ثمرین کا خون روکا اور اسے لے کر ہال سے نکل گئی۔ سرخ کپڑوں والی لڑکی کے حمایتی، فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ عمران پہلے تو کھسیانا نظر آیا...... پھر اس نے کھلے دل سے ہار مان لی اور تند و تیز فقروں کی طرف سے کان لپیٹ کر وہاں سے نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم آگے پیچھے کمرے میں آئے۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' میں نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے دیکھا ہے۔''

''مسخری مت کرو عمران...... مجھے بتاؤ ایسا کیوں کیا ہے؟''

''یار! کیا خوبرو لڑکیوں کے اوپر گرنا تمہارا ہی حق ہے۔ آخر ہم بھی سینے میں دل رکھتے ہیں۔ جب گر ہی گئے تو سوچا کہ چلو کسی اچھی جگہ پر گریں......''

''تم بکواس کر رہے ہو...... تم...... جان بوجھ کر گرے ہو۔ جان بوجھ کر ہارے ہو۔ کیا ضرورت تھی اس طرح اپنی بے عزتی کرانے کی...... اور پھر اس لڑکی کو جو چوٹ لگی ہے، اس کا ذمے دار کون ہے؟''

''ذمے دار کوئی نہیں...... ایسا حادثہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے یار۔ جہاں تک بے عزتی کی بات ہے، ہم پہلے ایسے کون سے نواب عزت بیگ ہیں۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو...... ہپناٹزم کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ بولا۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تم بہت اونچی شے ہو عمران...... تم نے...... جان بوجھ کر ثمرین کو زخم لگایا ہے نا؟''

''توبہ توبہ۔'' وہ گال پیٹنے لگا۔ ''اتنا بڑا الزام اور وہ بھی جمعتہ المبارک کے دن۔''

''یہ الزام نہیں...... حقیقت ہے...... میں سمجھ گیا ہوں...... سب سمجھ گیا ہوں۔ تم نے کہا تھا ثمرین بچ سکتی ہے...... اور تم نے اس کو بچایا ہے...... تم نے اسے داغ دار کیا ہے...... کیونکہ تم جانتے ہو کہ بے داغ اور بے عیب لڑکی ہی فیری سلیکشن میں حصہ لے سکتی ہے۔''

اس نے دیدے گھمائے۔ ''زبردست...... ونڈرفل۔ یار! تم واقعی سپر جینئس ہو۔ بندے کے اندر ایسی عقل مندیاں ڈھونڈ لیتے ہو جو اس نے کی ہی نہیں ہوتیں۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بھئی واہ...... یہ مجھ سے کیا بے ساختہ کارنامہ سرزرد ہو گیا ہے۔ بھئی واہ۔''

مجھے پتا تھا، وہ بدستور بکواس کر رہا ہے۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تم کو سمجھنا بڑا مشکل ہے عمران...... پتا نہیں کیا شے ہو تم؟''

''میں کوئی شے نہیں۔ بس یہ تمہارا حسن نظر ہے شہزادے۔ مجھے ایسی فلموں کا ہیرو بنا رہے ہو جن کا میں نے صرف نام سنا ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، فلم پاکیزہ میں دلیپ کمار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟'

میں خاموش رہا۔ وہ میری طرف سے خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ تم

کہنا چاہ رہے ہو کہ فلم پاکیزہ میں تو دلیپ کمار تھا ہی نہیں...... بھئی یہی ہوا تھا نا۔ اسے فلم میں لیا ہی نہیں گیا اور اس کی جگہ راج کمار کو لے لیا گیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ فلم آن میں بھی ہ تھا......'' وہ ایک بار پھر اوٹ پٹانگ بولتا چلا گیا۔

......وہ رات خاصی تاریک تھی۔ میں اور عمران پہلو بہ پہلو قالین پر لیٹے تھے۔ وہ دو دن سے زبردستی مجھے بھی لحاف اوڑھا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے لیکن دونوں کے ذہنوں میں یقیناً ایک ہی طرح کے خیالات گھوم رہے تھے۔ وہ مقابلہ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے زرگار میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ صیاد خود اپنے دام میں آ گیا ہے۔ اب بات خود جارج کے ہاتھ سے بھی نکلی ہوئی لگتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس مقابلے کی نوعیت اور دیگر شرائط کے بارے میں جو فیصلہ بھی ہونا ہے، وہ پنڈتوں، پنچوں اور دیگر عمائدین نے کرنا ہے اور آخری رائے پنڈت مہاراج کی ہونی ہے۔

O.....❖.....O

رات کا پتا نہیں وہ کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی، فقط ایک کھڑکی میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مجھے عمران نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تھا تو اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکنا اور چوکس نظر آتا تھا۔ اس نے دونوں لحافوں کو قالین پر اسی طرح پڑا رہنے دیا جیسے ان کے نیچے کوئی لیٹا ہو۔ پھر وہ قالین پر اوندھے منہ رینگتا ہوا غسل خانے کے دروازے کی طرف گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میری ساری حسیات آناً فاناً بیدار ہو گئی تھیں اور میں سمجھ گیا تھا کہ ہم کسی شدید خطرے میں ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم تاریک سرد غسل خانے کے اندر تھے۔ عمران نے دروازے میں تھوڑی سی جھری رہنے دی اور باہر دیکھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے کمرے کی کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی......

ہم غسل خانے کی تاریکی میں دم سادھے کھڑے رہے اور صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے۔ سایہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ہم رات کو دروازہ مقفل کر کے سوتے تھے۔ یہ آہنی دروازہ تھا اور اس دروازے سے ملتا جلتا تھا جو چند روز پہلے فائرنگ کی وجہ سے خراب ہوا تھا اور اسے کھولنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب ہمارا کمرا تبدیل ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ مزید گزرے، پھر دروازے کے ہضمی قفل میں چابی گھومنے کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ شک تو ہمیں پہلے ہی ہو رہا تھا، اب یقین ہونے لگا کہ یوں چوری چھپے ہمارے کمرے میں داخل ہونے والا اس عمارت میں موجود افراد میں سے ہی کوئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہمارے محافظوں میں سے کوئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ بے آواز کھل گیا اور ایک دراز قد شخص دبے پاؤں اندر آیا۔ اس

نے وارداتیوں کی طرح اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کا بیرل معمول سے زیادہ لمبا نظر آ رہا تھا۔غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اندر آنے والے شخص کے جسم پر محافظوں والا مخصوص لباس ہے۔وہ چند سیکنڈ تک تاریکی میں کھڑا دونوں لحافوں کو گھورتا رہا پھر اس نے رائفل سیدھی کی اور بڑی تیزی سے دونوں لحافوں پر پانچ چھ فائر کئے۔فائرنگ کی آواز سے انکشاف ہوا کہ رائفل پر سائیلنسر چڑھا ہوا ہے۔

فائرنگ کے فوراً بعد وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔یہی وقت تھا جب عمران نے اپنی جگہ سے تیز رفتار حرکت کی اور غسل خانے سے نکل کر اُڑتا ہوا سا حملہ آور پر جا پڑا۔حملہ آور اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور گرتے ہوئے آہنی دروازے سے ٹکرایا۔اس کے لئے یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ جیسے تیورا کر رہ گیا۔میں عمران کی مدد کے لئے آگے بڑھا تاہم اس وقت دروازے پر ایک اور پرچھائیں نظر آئی۔یہ بھی ایک محافظ تھا۔اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔اس نے بلاتردد مجھ پر فائر کیا۔دھماکے کے ساتھ شعلہ چمکا اور گولی میرے آس پاس سے گزر گئی۔میں نے حملہ آور کو دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس پر جا گرا۔میں نے سب سے پہلے اس کا پستول والا ہاتھ دبوچا۔پھر دائیں ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر رسید کیا۔یہ بڑی شدید ضرب تھی۔مدِمقابل کے دو تین دانت ضرور اپنی جگہ چھوڑ گئے ہوں گے۔وہ کراہا اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔اس دوران میں وزنی بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور سات آٹھ گارڈز موقع پر پہنچ گئے۔مجھے ایک دو لمحے کے لئے شدید خطرہ محسوس ہوا۔کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ گارڈز ہماری مدد کریں گے یا اپنے پیٹی بھائیوں کی۔

''خبردار......خبردار'' کئی آوازیں گونجیں۔

دو محافظوں نے میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے سر سے رائفلیں لگا دیں۔چند محافظوں نے عمران کا ہاتھ ہٹایا اور دوسرے حملہ آور کو دبوچ لیا۔لال بھون میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔بتیاں روشن ہو رہی تھیں اور بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔دونوں حملہ آوروں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔سیاہ رنگ کے ڈھاٹے ان کے چہروں سے علیحدہ کئے گئے،ہم نے پہچان لیا۔یہ ہمارے محافظوں میں سے ہی تھے۔ہم دن میں کئی بار انہیں اپنے آس پاس دیکھتے تھے۔جس شخص کو میرا مکا لگا تھا،اس کے دہن کا کباڑا ہو گیا تھا۔دونوں ہونٹ پھٹ گئے تھے اور دو تین دانت اپنی مقررہ جگہ سے غیر حاضر تھے۔

ہم پر گولی چلانے والا دراز قد محافظ پہلے تو سکتہ زدہ رہا پھر میری طرف رخ کر کے طیش میں چلانے لگا۔''تم کو جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ماردیں گے تم کو۔تم بچ جات......تم

گندی نالی کے کیڑے۔تم کو یہ جرأت ناہیں کرنے دیں گے،ناہیں کرنے دیں گے۔''

یقیناً یہ سامبر کی لڑائی کا ذکر کر رہا تھا اور اپنی اس تکلیف کا اظہار کر رہا تھا جو راج بھون کے بلند و بالا دروازے کے سامنے میری ''للکار'' نے اسے پہنچائی تھی۔محافظوں نے دونوں حملہ آوروں کی مشکیں کس دیں۔اسی دوران میں مینیجر مدن اور میڈم صفورا وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔میڈم سلیپنگ گاؤن میں تھی اور اس کے چہرے پر سخت ہلچل تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ واٹ از گوئنگ آن ہیئر؟'' وہ گرجی۔

پھر چند ہی سیکنڈ میں ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں آ گئی۔وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اگر محافظوں میں سے دو محافظ قاتل کا روپ دھار سکتے ہیں تو دو چار اور بھی ہو سکتے ہیں۔لہٰذا ضروری تھا کہ مجھے فوراً موقع سے ہٹا لیا جاتا۔اس نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور اپنے خصوصی پورشن میں لے آئی۔یہ لگژری پورشن الیکٹرک ہیٹرز سے گرم تھا۔''جب تک میں نہ کہوں،تم دونوں یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔'' وہ بولی۔

''آپ بےفکر رہیں۔'' عمران نے اسے تسلی دی۔

وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔

''یہ سب کیا ہے یار؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''اسے اردو میں شب خون اور انگریزی میں نائٹ اٹیک کہتے ہیں۔فرانسیسی میں بھی اس کے لئے ایک بھلا سا لفظ ہے،اس وقت یاد نہیں آ رہا۔''

''لیکن اس قاتلانہ حملے کا مقصد کیا تھا؟''

''اصل مقصد تو میڈم ہی ڈھونڈ کر لائے گی۔ہم تو بس اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ یہ لوگ تمہیں جارج گورا کے مدِمقابل دیکھنا نہیں چاہتے۔''

''تمہیں پتا کیسے چلا کہ کوئی ہمارے کمرے کی طرف آ رہا ہے؟''

''یار! میں نیوز چینل کا چڑیلا ہوں۔ایک تو چڑیلا دوسرا نیم چڑھا۔ہماری ناک بہت تیز ہوتی ہے بلکہ ہم تو مجسم ناک ہوتے ہیں۔ان واقعات کی بُو بھی سونگھ لیتے ہیں جن کی بُو ہی نہیں ہوتی،یعنی جو وقوع پذیر ہی نہیں ہوتے لیکن جس تازہ واقعے کی تم بات کر رہے ہو،اس کا شک مجھے کل شام سے ہی تھا۔دراصل بڑے پنڈت کا یہاں آنا اور میڈم سے مل کر تمہیں مقابلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ہر صورت تمہیں سامبر سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''تم نے سامبر کی صورت ہی ایسی بنا دی ہے۔ اسے مرو یا مارو کی لڑائی کا ناک نقشہ دے دیا ہے اور یہ بات ہر جگہ پھیل بھی چکی ہے۔''

''اسے پھیلانے والے بھی تم ہی ہو۔ تم نے جان بوجھ کر گیتا کے سامنے بات کی۔ تم بڑے زبردست قسم کے کھوچل ہو عمران۔ میں اب آہستہ آہستہ تمہیں سمجھنا شروع ہو گیا ہوں۔''

''ایسے ہی موقع کے لئے محمد رفیع صاحب بڑے فلسفے کی بہت گہری بات کہہ گئے ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا، میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے۔''

''یہ کیا بے تکی بات ہے؟''

''اور پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ آہستہ آہستہ مجھے سمجھنا شروع ہو گئے ہو؟ اس شعر میں چاند کے ٹکڑے سے مطلب انسان کے بیکار خیالات ہیں اور ''کھڑکی'' دماغ کا استعارہ ہے۔''

''یہ استعارہ نہیں استعارہ ہوتا ہے...... اور اب تم چپ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔''

میں اُٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم ایک خطرناک حملے سے بال بال بچے ہیں۔ یہ سب کھلی آنکھوں کے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

میڈم کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے بتایا۔ ''پکڑے جانے والے حملہ آوروں کے نام امرت اور شنکر ہیں۔ ان کے چار اور ساتھی بھی حراست میں لے لئے گئے ہیں۔ یہ سارے یہاں کے گارڈز ہیں۔''

''یہ سب کرایا کس نے ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر لگتا یہی ہے کہ اس کے پیچھے حکم جی کے کسی قریبی ساتھی کا ہاتھ ہوگا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے میڈم نے اپنی آواز بہت دھیمی کر لی۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ لوگ ظاہر تو نہیں کر رہے لیکن اندر خانے ان کی مرضی یہی ہے کہ تمہارے اور جارج کے درمیان مرو یا مارو والی فائٹ نہ ہو۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کا اتنا قریبی دوست کسی ایسی لڑائی کا شکار ہو جائے...... لیکن میں پھر کہتی ہوں، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ ان دو گارڈز کا انفرادی فعل ہی ہو۔ بہرحال یہ بات تو کنفرم ہے کہ تمہیں

یہاں بہت زیادہ سیکیورٹی کی ضرورت ہے...... اور میں اس سیکیورٹی کا ارجنٹ انتظام کر رہی ہوں۔''

ہم دونوں پر ہونے والے اس قاتلانہ حملے کی خبر بھی بہت جلد زرگاں میں پھیل گئی......

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور عمران ''جم'' جانے کے لئے کمرے سے نکلے تو بڑی بڑی مونچھوں والے ایک سینئر گارڈ نے ہمیں روک لیا۔ ''ناہیں سر!'' اس نے ادب سے کہا۔ ''اوپر سے آرڈر ہے۔ آپ ابھی کمرے سے ناہیں نکل سکتے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ میڈم کہاں ہیں؟'' میں نے تنک کر پوچھا۔

''میڈم ابھی بھون سے باہر ہیں۔ وہ تھوڑی دیر میں آوت ہیں تو ان سے بات کر لیجئے گا۔'' گارڈ بولا۔

''تم زیادہ تھانے دار بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنی ذمے داری پر جا رہا ہوں۔''

''میں شما چاہت ہوں سرکار۔ یہ میری نوکری کا سوال ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی رکھشا کے لئے کر رہے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میری اور سینئر گارڈ کی گفتگو تکرار کی شکل اختیار کرتی، گیتا مکھی وہاں آ گئی۔ وہ بہت چست لباس پہنتی تھی اور اس کے جسم میں ماہر رقاصاؤں جیسا لوچ تھا۔ اس نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ اندر آنے کے لئے کہا۔ میں اور عمران، گیتا کے ساتھ واپس کمرے میں آ گئے۔ گیتا عمران سے خفا خفا نظر آتی تھی۔ اس خفگی کی وجہ وہی ثمرین والا واقعہ تھا۔ اس دن وہاں بالکل ''مقابلے'' والا ماحول بن گیا تھا۔ مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے نعرے گونجے تھے۔ عمران کرتب دکھاتے ہوئے بلندی سے ثمرین پر گرا تھا اور اسے زخمی کر دیا تھا۔ یہ بات اب تقریباً طے تھی کہ گیتا مکھی اپنی ایک قیمتی شاگرد سے محروم ہو چکی تھی۔

کمرے میں آ کر گیتا نے مجھے مخاطب کیا اور اپنے مخصوص بازاری انداز میں بولی۔ ''اس بے چارے سے آپ کیوں مغز ماری کرت ہو۔ وہ آرڈر سے مجبور ہے۔ ابھی میڈم جی آ جاوت ہیں، جو کہنا ہے ان سے کہہ لینا۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ دونوں کا جیون بچ گیا۔ ویسے ابھی بھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں۔ کل رات میڈم جی نے یہاں کے تقریباً سارے گارڈز تبدیل کر دیئے ہیں۔ سات آٹھ بندوں کو پکڑا بھی گیا ہے۔''

''شہر کی کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

''آج تو میرا من بھی چاہ رہا ہے کہ لڑکیوں کی طرح آپ جناب سے آٹوگراف مانگوں اور سوال جواب کروں۔ رات والے واقعے کے بعد آپ کی شہرت میں ایک دم اضافہ

ہوا ہے۔ ہر جگہ آپ ہی کا چرچا ہے۔ زیادہ تر لوگن کا یہی وچار ہے کہ راج بھون میں حکم جی کے کچھ ساتھی ناہیں چاہت ہیں کہ آپ جارج گورا سے دوبدو مقابلہ کریں۔ وہ یہ مقابلہ رکوانے کے لئے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف راج بھون سے سختی کے ساتھ اس بات سے انکار کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دو تین لوگن کا ذاتی جرم ہے اور اس کا بوجھ دوسروں کے سر نہیں ڈالنا چاہئے۔ راج بھون کی طرف سے لوگن سے اور خاص طور سے مسلمان شہریوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ پُرسکون رہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہووے گا، قانون قاعدے کے مطابق ہووے گا۔''

''مسلمانوں سے خاص اپیل کرنے کی ضرورت کیوں پڑی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گیتا بولی۔ ''سچی بات یہ ہے کہ جب سے جارج صاحب اور سلطانہ والا واقعہ ہوا ہے، مسلمان آبادی جارج صاحب کے خلاف ہے۔ اب انہیں پتا چلا ہے کہ سلطانہ کا پتی جارج صاحب سے دوبدو لڑائی کے لئے یہاں پہنچا ہے تو ان کا جوش تازہ ہو گیا ہے اور پرانے زخم بھی ہرے ہو گئے ہیں۔ ان لوگن نے اس مقابلے کے ساتھ اپنی بہت سی آشائیں جوڑ لی ہیں۔ اگر تم یہاں زرگاں میں راتوں رات مشہور ہوئے ہو تو اس کا ایک کارن یہ بھی ہے۔ ان لوگن کو پورا وشواس ہے کہ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ تمہارا جارج کے محافظوں کو ادھیڑ کر یہاں سے بھاگنا، پھر نل پانی میں پانڈے کو نیچا دکھانا، پھر یہاں آنا اور جارج صاحب کو للکارنا...... اور آخر میں انہیں ''مرو یا مارو'' کا چیلنج دینا یہ ساری باتیں ان لوگن کے لئے بڑے اچنبھے کی ہیں۔ ان کا یہ وچار پکا ہو رہا ہے کہ تمہارے کارن کوئی انہونی ہو گی۔''

''جارج گورا صاحب کیا فرماتے ہیں؟'' عمران نے گیتا سے استفسار کیا۔

وہ عمران کو ناگواری سے دیکھ کر بولی۔ ''گورا صاحب بہت غصے میں ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی ساکھ خراب ہو رہی ہے۔ لوگن ان کو شکتی دیوتا کے نام سے یاد کرت ہیں مگر اب اس طرح کی سوچ پھیل رہی ہے کہ شاید جارج صاحب خود بھی سامبر لڑنا ناہیں چاہتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آج کا دن بہت اہم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شام سے پہلے جارج صاحب تمہارے چیلنج کے بارے میں کوئی واضح اعلان کر دیں۔''

''میرا چیلنج؟''

''ہاں، یہی مرو یا مارو والی بات۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیویں اور اس شبھ گھڑی کا اعلان بھی کر دیویں جو پنڈتوں نے نکالی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ جارج صاحب ایسے خطروں سے ڈرنے والے ناہیں۔ تم وشواس رکھو کہ اگر تمہارا مقابلہ ہوا تو ایک دلیر آدمی سے

ہووے گا۔''

''دلیر نہیں گھمنڈی۔'' میں نے کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو لیکن یہ بات اپنی جگہ ٹھوس حقیقت ہے کہ یہاں جارج صاحب کے بے شمار پرستار بھی ہیں۔ اچھائیاں برائیاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ جارج صاحب کی ایک بڑی اچھائی یہ ہے کہ وہ بڑے دل کے مالک ہیں۔ ان کے پاس دھن ہے اور وہ دھن کو خرچ کرنا بھی جانت ہیں۔ زرگاں کے بے شمار لوگن کو ان کی خیر خیرات سے فائدہ پہنچتا ہے۔''

''تمہاری عقل کا ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے گیتا مکھی۔ تم جیسے ہندوستانی ہی ہیں جنہوں نے ہر دور میں باہر سے آنے والے زور آوروں کے سامنے سر جھکانے کی رِیت نبھاتی ہے۔ جس کو تم خیر خیرات کہہ رہی ہو، یہ زنا کاریوں اور عیش پرستیوں کا عوضانہ ہے اور یہ عوضانہ بھی تمہارے ہی خون پسینے کی کمائی سے دیا جاتا ہے۔ ان گوری چمڑی والوں کے لئے یہاں کے لوگ بھک منگوں اور بے غیرتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ جو کچھ ان بھک منگوں اور بے غیرتوں کو دے رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ وصول کرتا ہے اور اس کام میں تمہارا حکم جی اس کا مددگار ہے۔''

میرے ان سخت ریمارکس پر گیتا مکھی نے ناراضی کا اظہار کیا لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس ناراضی کی تہ میں کہیں میری دبی دبی تائید بھی موجود ہے۔

گیتا مکھی ایک چلتی پھرتی جہاندیدہ عورت تھی۔ اس نے جارج گورا کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ درست ثابت ہوا۔ شام سے پہلے ہی سرجن اسٹیل اپنے سالے جارج کی نمائندگی کرتے ہوئے لال بھون میں پہنچ گیا۔ وہ ہم سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ ''جارج صاحب نے پنڈتوں سے مشورے کے بعد تمہارا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ''مرو یا مارو'' کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بہرحال اس کے لئے چند چھوٹی چھوٹی شرطیں بھی ہیں۔''

''مجھے یہ شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ مجھے بتاؤ مقابلہ کب ہے؟'' میں نے اسٹیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''پنڈت مہاراج نے دو شبھ گھڑیاں نکالی تھیں۔ ایک شبھ گھڑی عین ساتویں کے جشن کے روز آ رہی ہے۔ دوسری جشن کے تین دن بعد۔ مشورے سے فیصلہ ہوا ہے کہ تمہارے اور جارج صاحب کے درمیان سامبر کی رسم جشن کے بعد ہو گی۔ جشن کے تیسرے روز سورج ڈوبنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے۔''

"یہ کس طرح کی لڑائی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں ہوگا کیونکہ تمہاری خواہش کے مطابق یہ دست بدست لڑائی ہے۔ موقع پر تین یا چار تیز دھار آلے رکھے جائیں گے۔ جارج صاحب تمہیں پیشکش کریں گے کہ تم ان میں سے کوئی سا ایک آلہ اُٹھا کر ان سے لڑ سکتے ہو۔ تم جو آلہ چنو گے، جارج صاحب بھی اس جیسا آلہ استعمال کرنے کے حقدار ہوں گے۔" پھر سر جن اسٹیل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ان آلاتِ ضرب میں کٹاری، چاقو اور چھوٹے دستے کی کلہاڑی جسے مقامی زبان میں دستی کہا جاتا ہے، شامل ہوں گے۔

اسٹیل نے کچھ دیگر شرائط بھی بتائیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مرو یا مارو کی لڑائی کے باوجود جارج گورا کے پاس مجھے سزائے موت دینے یعنی سُولی پر ٹانگنے کا آپشن موجود رہے گا۔ اپنے جیتنے کی صورت میں جارج گورا مجھے موقع پر ختم کرنے کے بجائے سُولی پر چڑھانے کا شوق پورا کر سکے گا۔

دیگر شرائط کی طرح میں نے یہ شرط بھی فوراً منظور کر لی...... میں کشتیاں جلا چکا تھا، اب مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ مجھے صرف جیتنا تھا اور جیتنا تھا...... اور جب مجھے صرف جیتنا تھا تو پھر سزائے موت کا تذکرہ میرے نصاب سے باہر تھا۔ میں وجدانی جوش کے ایک ایسے دھارے میں بہا جا رہا تھا جس کے رخ اور بہاؤ کا خود مجھے بھی ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ یہ ایک جنون تھا، دیوانہ پن تھا۔ یہ وہی ضد تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور پھر پتھر کو توڑنے کا عزم بھی رکھتی ہے۔

میں نے اسٹیل کی ساری باتوں کے جواب میں بس ایک ہی بات کہی۔ "میری صرف ایک ہی شرط ہے مسٹر اسٹیل! اور یہ وہ شرط ہے جو جارج شروع میں ہی مان چکا ہے۔ میرے جیتنے کی صورت میں اسحاق کی بھاوج کو آزاد کر کے میرے حوالے کر دیا جائے گا اور مجھے نل پانی تک پہنچنے کا محفوظ راستہ دیا جائے گا۔"

"یہ بالکل طے ہے اور اس کی ضمانت اس تحریر میں بھی دی گئی ہے جو تمہارے اور جارج صاحب کے مقابلے کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اس پر حکم جی، پنڈت مہاراج اور دیگر اہم لوگوں کی گواہی موجود ہوگی۔ مقابلے کے وقت اس تحریر پر تمہارے اور جارج صاحب کے دستخط بھی لئے جائیں گے۔"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں میڈم صفورا بھی موقع پر موجود رہی تھی۔ اسٹیل اور جارج کی موجودگی میں وہ بالکل مؤدب کھڑی رہتی تھی اور صرف اس وقت بولتی تھی جب اس

سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا۔

رات کو میں سونے کے لئے لیٹا تو سلطانہ بڑی شدت سے یاد آنے لگی۔ اس کے گداز ہونٹ، اس کے گھنے بال اور سب سے بڑھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہر وقت عجز و انکساری نظر آتی تھی اور میرے لئے غیر مشروط محبت و اطاعت ٹپکتی رہتی تھی۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ جارج گورا سے بدلہ لے کر آؤں گا یا پھر کبھی نہیں آؤں گا اور اس نے مجھے اشک بار آنکھوں سے رخصت کیا تھا اور کہا تھا...... "میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گی مہروج! اور یہ دعا بھی کروں گی کہ میری عمر تمہیں لگ جائے۔"

اب وہ یہاں سے طویل فاصلے پر اس مندر کے سہ منزلہ تہ خانے میں تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ کے ساتھ موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا، وہ ہر گھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہر آہٹ پر چونکتی ہے، ہر چاپ پر سراپا نگاہ بن جاتی ہے لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں سرخرو ہو سکوں گا یا نہیں...... اور اگر سرخرو ہو گیا تو اس کے پاس جا سکوں گا یا نہیں...... اور اگر چلا گیا تو کیا وہ مجھے اس مندر میں بخیر و عافیت مل پائے گی یا وہاں حالات بدل چکے ہوں گے؟ ان گنت سوالات تھے اور جواب کوئی نہیں تھا۔

مجھے نوری یاد آئی۔ درحقیقت اس نے سلطانہ کو پھر سے میرے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اگر غور کیا جاتا تو یہ کردار بھی اصل میں عمران نے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ وہ ہر گھڑی میرے اردگرد نظر آتی تھی اور اس کی وجہ سے سلطانہ کے اندر سوئی ہوئی عورت دھیرے دھیرے بیدار ہوئی تھی۔ بچے کی محبت نے اس عورت کو بیدار کرنے میں مزید مدد کی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، ایک بار کم از کم ایک بار، سلطانہ کی آنکھوں کا سپنا ضرور پورا کر دوں۔ اس کی گود میں بالو ہو، اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرمائے اور جب میں اسے چھوؤں تو اس پر وہ اذیت ناک کپکپی طاری نہ ہو جو اس کے جسم کا خون نچوڑ لیتی تھی۔

اس پر کیوں طاری ہوتی تھی وہ کپکپی؟ اس سوال کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کپکپی کا ماخذ جارج گورا تھا اور مجھے اسے مارنا تھا۔ اس کی خون آلود لاش کو اپنے پاؤں تلے روندنا تھا...... اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر سلطانہ کو بتانا تھا کہ میں نے اس کی آن بان اور عزت کے ہتھیارے کے ساتھ کیا کیا ہے۔

ایک بار پھر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت لہریں لینے لگی۔ میں ہمیشہ کی طرح بے چین ہو اُٹھا۔ قالین سے اُٹھ کر کمرے میں

ٹہلنے لگا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ آج سردی معمول سے بڑھ کر تھی۔ کبھی کبھی گرج چمک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ میں راہداری میں پہنچا تو سینئر گارڈ جگ موہن نے مجھے روکا۔

''آپ کہاں جاوت ہیں سر؟''

''تم میری آیا مت بنو۔'' میں پھنکارا۔ ''مجھے اس چار دیواری میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔''

''لیکن سر...... رات کو اس سمے؟''

''میرے لئے رات دن برابر ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔ مجھے جم میں جانا ہے۔''

''جم میں؟ سر! یہ تو کوئی ٹائم ناہیں ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں عمران کی آواز سنائی دی۔ میرا یہ اندیشہ درست نکلا تھا کہ وہ سو نہیں رہا، بس یونہی آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ وہ گارڈ جگ موہن سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو بھئی، آگ لگنے کا کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔ بالکل جیسے زلزلہ کسی بھی وقت آ سکتا ہے اور آندھی کبھی بھی چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ تم ٹائم شائم کے چکر میں نہ پڑو۔ بڑے صاحب کو جانے دو جم میں۔''

''پیچھے ہٹو۔'' میں نے گارڈ کو ایک طرف دھکیلا۔

''لیکن جناب! جم تو اس ٹائم بند ہے۔ تالے لگے ہوئے ہیں۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم نے دو دن پہلے پریکٹس کا ایک متبادل انتظام کر لیا تھا۔ پائیں باغ میں درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ ہمارے کام آ سکتی تھی۔ یہاں ہم نے ایک سینڈ بیگ لٹکوا دیا تھا اور کینوس کا ایک بہت بڑا گدا بھی ڈلوا دیا تھا۔ اس گدے میں چاول کی چھال یعنی پرالی بھری ہوئی تھی۔

راہداری سے نکل کر ہم احاطے میں پہنچے اور پھر پائیں باغ میں داخل ہو گئے۔ کڑاکے کی سردی میں اس مصروفیت کا کوئی جواز تو نہیں بنتا تھا لیکن میں اپنے اندرونی اضطراب کا کیا کرتا جو مجھے کسی کروٹ چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ اگر میرے اندر کی آگ کو کوئی ایندھن نہ ملا تو میں خود ہی اس میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا۔ ''یار عمران! مجھے تو اس ذلیل جارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ تم کو کیا آفت آئی ہے؟ تم تو جا کر سو جاؤ۔''

''یہ تو وہی فلمی سچویشن ہے جگر! ستارو...... تم تو سو جاؤ پریشاں رات ساری ہے، اا

ب رات پریشان ہے، تم پریشان ہو تو پھر میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ لہٰذا جہاں گدھا وہیں تی۔''

ہم دونوں باغ کے اس تنہا کنج میں چلے آئے۔ ہلکی دھند نے قرب و جوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا تھمی ہوئی تھی مگر تاریک آسمان پر گاہے بگاہے بجلی چمک جاتی تھی۔ ہماری حرکت کے ساتھ ہی گارڈز نے بھی حرکت کی تھی۔ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ وہ پائیں باغ کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ میں اور عمران پہلے شیڈو فائٹ کرتے رہے پھر سینڈ بیگ کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ سینڈ بیگ کو قدرے نرم رکھنے کے لئے اس میں عموماً ریت کے ساتھ لکڑی کا باریک برادہ بھی بھرا جاتا ہے مگر اس بیگ میں صرف ریت ہی تھی۔ یہ بہت ہارڈ تھا اور خالی ہاتھ اس پر مسلسل مکابازی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہم لگے رہے۔ پھر عمران وقفہ لینے کے لئے بیٹھ گیا مگر میں بدستور مصروف رہا۔ دھم دھم کی آوازوں سے باغ کا وہ تنہا گوشہ گونجتا رہا۔ وہی جنون، وہی دیوانہ پن، وہی خواہش کہ جسم کو اتنی تکلیف پہنچے کہ وہ چیخ جائے۔ سانسوں کی کٹار اتنی تیز ہو جائے کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں اور برداشت کی وہ حد آئے کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جائے۔ میں وقفہ نہ لوں بلکہ تیورا کر گر جاؤں۔ جیکی نے کہا تھا، پہلے اپنے آپ سے جنگ جیتنا پڑتی ہے اور جب یہ ہو جائے تو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ مجھے اس طرح اندھا دھند مشق کرتے دیکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ میں بیمار پڑ جاؤں گا یا پھر کوئی ایسی چوٹ لگوا لوں گا کہ مجھے مارشل آرٹ وغیرہ سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑ جائے گی۔ ایسی باتوں میں یقیناً وزن تھا مگر میں جس راستے پر چل پڑا تھا، اس سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ یہ ایک الگ راستہ تھا، یہ ایک جدا طرز تھی۔ اس میں وہ کرنا تھا جو نہیں کرنا تھا۔ اس میں سب سے پہلا حریف اپنا ہی نفس تھا۔ اس میں بہت تکلیف تھی لیکن اس تکلیف کو برداشت کرنے کے لئے ایک اسمِ اعظم بھی تھا اور وہ اسمِ اعظم یہ یقین تھا کہ اس تکلیف کا صلہ ملے گا...... اس تکلیف کا صلہ ملے گا۔

ایک بار بادل زور سے گرجا اور پھر بارش ہونے لگی۔ میرے دہکتے ہوئے جسم پر یخ بوچھاڑ پڑی۔ ''بس کرو یار! باقی صبح سہی۔'' عمران نے رائے دی۔

''تم نے جانا ہے تو جاؤ۔'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

عمران نے تکرار نہیں کی۔ وہ میرا رمز شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ اس نے ول سے کانٹا بدلا۔ ''اچھا ایسے تو ایسے ہی سہی۔'' وہ اُٹھا اور مجھ پر پل پڑا۔

ہم پرالی سے بھرے ہوئے گدے کے اوپر گرے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی

اندھادھند کوشش کرنے لگے۔ بارش نے زور پکڑا۔ ہمیں سیکیورٹی گارڈز کے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ وہ سایہ ڈھونڈنے کے لئے دائیں بائیں ہو رہے تھے۔ یہ بڑی مزے دار صورتِ حال تھی۔ جب سارا شہر گرم کپڑوں میں آتش دانوں اور انگیٹھیوں کے سامنے بھی سردی محسوس کر رہا تھا، ہم یخ بستہ بارش میں اپنا الگ ہی تماشا لگائے ہوئے تھے۔

میری اور عمران کی زور آزمائی میں پھر وہی فرق سامنے تھا۔ وہ مہارت اور تکنیک میں مجھ سے آگے تھا لیکن میں اپنی غیر معمولی برداشت اور اسٹیمنا کے سبب اس کو ٹف ٹائم دے رہا تھا۔ زوردار بارش میں ہماری یہ اندھادھند کشتی دس پندرہ منٹ جاری رہی۔ ہماری قمیصیں تار تار ہو گئیں۔ اسی دوران میں اولے پڑنے لگے۔ فائبر کے قریبی شیڈ پر اولوں کے گرنے کی آواز بڑی زوردار تھی۔

عمران نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم دونوں میں سے ایک ضرور شیطان ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے زور لگا کر اس کا ''آرم لاک'' توڑا اور اس کے اوپر آ گیا۔

''ہمیں کنکریاں ماری جا رہی ہیں۔'' وہ بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''اور وہ دیکھو، اب حاجن بھی نظر آ رہی ہے۔''

میں نے عمران کو نیچے دبائے دبائے گھوم کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر میڈم صفورا اپنی بڑے سائز کی کالی چھتری لئے کھڑی تھی۔ اس نے سفید گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ پکاری۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ اپنے ہوش میں تو ہو؟''

میں نے جو ایک سیکنڈ میڈم کو دیکھنے میں صرف کیا تھا؟ اس میں عمران نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس نے جوڈو کی ایک فرشی تکنیک استعمال کرتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اپنے بازو کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس بار بازو کے بجائے میری گردن گرفت میں آئی۔ اب وہ میرے نیچے ہونے کے باوجود مجھے بے بس کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ جب میں اس کی یہ غیر معمولی پھرتی اور مہارت دیکھتا تھا تو مجھے میڈم کی اس بات میں وزن محسوس ہونے لگتا تھا کہ میرے بجائے جارج کا مقابلہ عمران کو کرنا چاہئے تھا۔

میں اپنی گردن کو عمران کے بازو سے نکالنے کی تدبیر سوچ رہا تھا جب دفعتاً ژالہ باری تیز ہو گئی۔ ژالوں کا سائز بھی شاید بڑھ گیا تھا۔ اب کھلی جگہ پر ہونا خود کو زخمی کرنے کے مترادف تھا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے فائبر کے شیڈ کے نیچے آ گئے۔ ہمارے جسم کی خراشوں سے خون رِس رہا تھا اور سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ میڈم بھی چھتری سمیت شیڈ میں پہنچ گئی۔ کئی مسلح گارڈز بھی ہمارے اردگرد آن موجود ہوئے۔ وہ بھیگے

ہوئے تھے اور سردی میں نیلے پڑ رہے تھے۔ یقیناً دل ہی دل میں وہ ہمیں بددعاؤں سے نواز رہے ہوں گے۔

''یہ کیا حماقت ہے بھئی؟'' میڈم نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگ مجھے مشکل میں ڈال دو گے۔ تمہاری سیکیورٹی اور صحت میری ذمے داری ہے اور تم لٹھ لے کر ان دونوں چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ یہ کوئی بات ہے۔''

وہ غصے سے کانپ رہی تھی اور غالباً اس کپکپاہٹ میں کچھ عمل دخل سردی کا بھی تھا۔

''سوری۔'' میں نے مختصراً کہا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

عمران اور میڈم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے پھر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔

کمرے میں پہنچ کر میڈم نے مجھے سیکیورٹی کے حوالے سے موجود خطرات سے آگاہ کیا اور تنبیہہ کی کہ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتوں۔ اس کی باتوں میں وزن تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں عمران لباس تبدیل کر چکا تھا۔ میں نے بھی لباس تبدیل کیا۔ میڈم نے میرے منع کرنے کے باوجود آتش دان روشن کروایا اور ملازم سے کافی وغیرہ لانے کے لئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آتش دان کے سامنے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ لگتا تھا کہ ہماری طرح ابھی میڈم بھی سوئی نہیں تھی۔ سلیپنگ گاؤن ضرور اس کے جسم پر تھا مگر چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک بستر سے دور تھی۔ اس نے بتایا کہ ساتویں کے جشن کے حوالے سے جو تیاریاں ہو رہی ہیں، وہ ان میں مصروف تھی اور ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے فارغ ہوئی ہے۔ ہم ساتویں کے جشن کے بارے میں بات کرتے رہے۔ پھر گفتگو کا رخ اس قدیم رسم سامبر کی طرف مڑ گیا جس کے لئے شبھ گھڑی اب نکالی جا چکی تھی اور ہم دھیرے دھیرے اس شبھ گھڑی کی طرف سرک رہے تھے۔

میڈم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ، میں تم دونوں کو کچھ دکھاؤں۔''

ہم نے ایک دوجے کو دیکھا پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میڈم ہمیں لے کر ایک طویل قالین پوش راہداری سے گزری پھر لکڑی کے زینوں پر آ گئی۔ یہ زینے اوپر ایک گیلری میں جا رہے تھے۔ شیشے کی رنگین کھڑکیوں سے باہر بارش اب ایک دھیمی ہموار رفتار سے برس رہی تھی اور گاہے بگاہے بجلی بھی چمک دکھا جاتی تھی۔ ہم ایک طویل گیلری میں پہنچے۔ گیلری کی چھت اونچی تھی اور یہاں اوپر تک لکڑی کی پالش شدہ الماریاں چنی ہوئی تھیں۔ یہ دراصل اس لال بھون کا شاندار کتب خانہ تھا۔

میڈم ایک الماری تک پہنچی اور اس نے کتابوں کے درمیان سے ایک بڑا سا البم نکال لیا۔ یہ دراصل سامبر کی مصور کہانی تھی۔ اس جہازی سائز کے البم میں ڈیڑھ دو سو تصویریں تھیں۔ اس میں سامبر کی تاریخ درج تھی اور پچھلے بیس پچیس سال میں جو اہم لڑائیاں ہوئی تھیں، ان کا باتصویر تذکرہ بھی تھا۔ زیادہ تر تصویریں کیمروں سے کھینچی گئی تھیں۔ کچھ ہاتھ کے بنے ہوئے اسکیچ بھی تھے۔ تصویروں کے ساتھ جو ٹیکسٹ تھا، وہ انگلش میں تھا اور وہ بھی ہر جگہ ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں راجواڑے کے اندر کتب یا اخبار وغیرہ چھاپنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔

سویمبر اور سامبر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی تھی۔ اس کے بارے میں اس البم کے اندر کافی کچھ لکھا گیا تھا۔ ماضی میں ہونے والے کئی سامبر مقابلوں کا ذکر بھی اس میں موجود تھا۔ شروع میں درج تھا۔ ''کسی مطلوبہ شے کے لئے نر جاتی کے درمیان زور آزمائی کرنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنی اس زمین کی تاریخ۔ کہنے کو تو ہم سویمبر اور سامبر کو رسم کہتے ہیں لیکن یہ رسم نہیں ہے۔ یہ عین فطرت ہے...... اور یہ فطرت انسان اور حیوان دونوں میں ایک جیسی ہے۔ مادہ کے حصول کے لئے نر جان دار ہمیشہ سے سویمبر رچاتے آئے ہیں۔ چرند، پرند، چوپائے درندے سب اس میں شامل ہیں۔ یہ جاندار اپنی مادہ کے حصول کے علاوہ علاقے اور خوراک وغیرہ کے لئے بھی دوبدو مقابلہ کرتے ہیں۔ زور آور اپنا مقصد پاتا ہے اور کمزور اپنی شکست تسلیم کر کے مزید نقصان اور خون خرابے سے بچتا ہے۔ یہ سب قدرت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اس تصویر کے نیچے پنسل سے بنا ہوا ایک اسکیچ تھا جس میں دو جوان بارہ سنگوں کو ایک مادہ کے لئے اندھا دھند لڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

اس طرح کی اور چھوٹی بڑی تصویریں اور تحریریں بھی البم میں موجود تھیں۔ ان میں سامبر کے مختلف طریقوں اور واقعات پر روشنی پڑتی تھی۔ کیمرے کی ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو میں حکم کے ایک ماموں کو ایک مغویہ کے سلسلے میں ایک ڈکیت سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ چھوٹی تلوار یعنی کٹاری کا مقابلہ تھا۔ دونوں حریفوں نے باقاعدہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ سروں کی حفاظت کے لئے آہنی ٹوپیاں تھیں۔ تصویر میں حکم کا گرانڈیل ماموں، ڈکیت کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اس نے کٹاری اس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔

میڈم نے بتایا۔ ''یہ دیکھو، نیچے اس مقابلے کی تاریخ بھی درج ہے۔ 8 ستمبر 1938ء حکم کا ماموں یہ ''باؤٹ'' جیت گیا تھا اور اس نے مغویہ لڑکی کو ڈکیت سے چھڑا کر اس سے باقاعدہ میرج کی تھی اور یہ دیکھو، یہ تصویر۔'' میڈم نے ایک اور فوٹوگراف کی طرف اشار

کیا۔ اس میں دو آدمی ''ڈیول'' کے انداز میں ایک دوسرے پر پستول سے گولی چلا رہے تھے۔ فوجی وردی والا شخص گولی چلانے میں پہل کر گیا تھا اور اس کا حریف زخمی ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کون کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''حکم جی کے والد رائے پرتاپ کا سیناپتی اشوکا اور حکم کا عسکری استاد افگن راجپوت۔ دونوں کے درمیان ایک خوبصورت خانہ بدوش لڑکی کے لئے جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ افگن اس لڑکی کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کرانا چاہتا تھا۔ جبکہ سیناپتی اسے خود اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں سیناپتی جیت گیا تھا۔''

''اور حکم کا استاد...... اللہ کو پیارا ہو گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، وہ بھی زندہ بچ گیا تھا۔ دراصل سامبر میں اگر اس طرح کا مقابلہ ہو تو اس میں ربر کی گولیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ صرف زخمی کرتی ہیں۔ سامبر اور سویمبر کی لڑائی عام طور پر حریف کو صرف زیر کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں۔''

''سویمبر اور سامبر میں اصل فرق کیا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ پڑھو۔ یہ فرق یہاں لکھا ہے۔'' میڈم نے تھوڑی سی ورق گردانی کر کے ایک تحریر عمران کو دکھائی۔

انگریزی میں لکھا تھا۔ ''سویمبر کسی عورت کے لئے رچایا جاتا ہے۔ وہ کچھ خواہش مند لوگوں میں سے اپنے لئے شوہر چنتی ہے۔ یہ چناؤ عام طور پر جسمانی طاقت کے مقابلے سے ہوتا ہے۔ تاہم سامبر کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں عورت کے علاوہ جائداد، زیور یا کوئی بھی قیمتی چیز تنازعے کی وجہ ہو سکتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ سامبر کا مقابلہ صرف دو دعوے داروں کے درمیان نہیں ہوتا۔ دعوے داروں کی جانب سے کوئی بھی شخص اس رسم میں حصہ لے سکتا ہے۔ مثلاً ایک قیمتی گھوڑے کی ملکیت پر کسی ادھیڑ عمر شخص کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی یا بیٹا سامبر میں حصہ لے سکتا ہے......''

تحریر میں اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ''مر یا مارو والی لڑائی اس سے پہلے بھی ہوتی رہی ہے؟''

''بالکل، ایسی مثالیں موجود ہیں۔ یہ دیکھو...... یہ ایک تصویر۔'' میڈم نے چند صفحات پلٹے۔

یہ ایک سنسنی خیز منظر تھا۔ رنگین تصویر تھی۔ نیچے تاریخ درج تھی۔ نو جنوری 1972ء۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک انگریز رقص کے انداز میں اچھل رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک کالا بھجنگ مقامی پڑا تھا۔ اس تنومند مقامی شخص کے سینے میں دستے تک ایک خنجر پیوست تھا اور وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ میڈم بولی۔ ''یہ پڑھو۔ مرنے والے کا نام کمار ہے۔ یہ مقامی شکاری تھا۔ اس نے حکم جی کے والد کے مہمان مسٹر ڈی جون کو ''فائٹ ٹل ڈیتھ'' کا چیلنج کیا۔ ڈی جون بھی ایک مشہور شکاری تھا اور گو شیروں پر ریسرچ کے لئے انڈیا آیا ہوا تھا۔ وہ اب بھی شاید زندہ ہے۔ دونوں میں ایک قیمتی باز کے حوالے سے جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں وقفے وقفے سے چار بندوں کا مرڈر بھی ہوا تھا۔ بالآخر بات سامبر تک پہنچی تھی۔ اس مقابلے نے بھی اسٹیٹ میں بہت شہرت پائی تھی۔ دراصل جب کبھی بھی کوئی ''مرو یا مارو'' والا مقابلہ ہوتا ہے اس کو بہت شہرت مل جاتی ہے۔ اس مقابلے میں یہ انگریز شکاری ڈی جون جیت گیا۔ اس تصویر کے بعد بھی ڈی جون نے اپنے دم توڑتے حریف پر خنجر کے دس پندرہ وار کئے تھے اور اسے زخم زخم کر دیا تھا۔ وہ تصویر اس البم میں شامل نہیں ہے۔''

البم میں کچھ تصویریں چونکا دینے والی تھیں بلکہ ان کو شرمناک بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد آٹھ دس ہو گی۔ ''یہ تصویریں کیا ہیں؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اس کو راندی کہا جاتا ہے۔'' میڈم نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ مطلب ہے لعنت بھیجنا۔ یہ سامبر کے طور طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ یہ راندی ان لوگوں کے ساتھ کی جاتی ہے جو سامبر لڑتے ہیں اور اپنے مدِمقابل سے بُری طرح ہار جاتے ہیں۔ بُری طرح ہارنے سے مطلب ایک خاص طریقے سے ہارنا ہے۔ یہ دیکھو، یہاں اس بارے میں تھوڑی سی تفصیل لکھی ہے...... جب سامبر میں ایک حریف دوسرے کو اس طرح سے ہرائے کہ اس کے پورے بوجھ کو سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دے تو وہ راندی کرنے کا حق دار ہوتا ہے اور یہ مقابلہ اس کے ساتھ ہی فوراً ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھو...... میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

میڈم نے جلدی جلدی چند ورق پلٹے اور سامبر کا ایک منظر دکھایا۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں ایک پہلوان نما شخص اپنے حریف کو باقاعدہ بازوؤں پر اُٹھا کر زمین پر پٹخنے کی تیاری میں تھا۔

میڈم بولی۔ ''سامبر میں اس داؤ کے چل جانے کے دوسرے حریف کی بدترین شکست سمجھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ہارتا ہے بلکہ راندی کا شکار بھی ہوتا ہے۔''

یہ اس ساری تفصیل کا ایک اور دلچسپ پہلو تھا اور کسی حد تک شرمناک بھی۔ ہم نے راندی زدہ افراد کی تصویریں دیکھیں۔ وہ مکمل برہنہ کر دیئے گئے تھے اور جیتنے والا حریف ان کی پشت پر لات مار کر انہیں اکھاڑے سے باہر پھینک رہا تھا۔ دو چار تصویریں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ہارنے والے کو گارڈز وغیرہ نے زبردستی برہنہ کیا ہے اور انہیں بازوؤں سے جکڑ رکھا ہے تاکہ جیتنے والا حریف ان کی ننگی پیٹھ پر لات رسید کرنے کی رسم ادا کر سکے۔

''زبردست۔'' عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''میں جارج گورا کو اس حالت میں دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کروں گا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرو اور مارو والی فائٹ میں بھی یہ رول لاگو ہوتا ہے؟''

''بالکل ہوتا ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''بلکہ اس سلسلے میں تمہیں مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ آئی تھنک، یہ ایک بہت خطرناک رُول ہے۔ لڑائی کے کسی بھی مرحلے میں اگر تمہارا حریف تمہیں بازوؤں پر سیدھا اوپر اُٹھا کر پٹخ دے تو سمجھو کہ کھیل وہیں پر ختم ہو گیا۔ یعنی مرو یا مارو والی لڑائی بھی وہیں پر ختم ہو جائے گی اور پٹخا جانے والا حریف دفاع کے قابل بھی ہوا تو مکمل طور پر دوسرے حریف کے رحم و کرم پر آ جائے گا لیکن......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''لیکن کیا میڈم؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے مارشل آرٹ وغیرہ کی اتنی سمجھ بوجھ تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقی لڑائی میں کسی شخص کا اپنے جیسے مدِمقابل کو بازوؤں پر اُٹھا کر سر سے بلند کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ایسا واقعہ شاذونادر ہی رُونما ہوتا ہوگا۔'' وہ سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' عمران نے تائید کی۔ ''نورا کشتیوں کے سوا ایسا کبھی کبھار ہی ہو پاتا ہے...... بہرحال، خطرہ تو خطرہ ہی ہوتا ہے اور اس خطرے کا ثبوت یہ آٹھ دس فوٹوگراف بھی ہیں۔''

''ہاں، میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ جارج بھی کم از کم ایک بار تو یہ کارنامہ انجام دے ہی چکا ہے۔''

میڈم نے ورق گردانی کی اور ایک رنگین فوٹوگراف دکھایا۔ یہ قریباً تین برس پرانی تصویر تھی۔ اس لڑائی میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئی تھیں۔ دونوں حریفوں نے زرہ بکتر جیسے لباس پہن رکھے تھے اور سروں پر آہنی ٹوپیاں تھیں۔ جارج نے اپنے مدِمقابل کو بازوؤں پر اُٹھا کر سر سے بلند کر رکھا تھا اور اسے پٹخنے کے مرحلے میں تھا۔ ان کے اردگرد

سیکڑوں پُرجوش تماشائی نظر آ رہے تھے۔ جس کو اُٹھایا گیا تھا، وہ تنومند شخص تھا۔ زرہ بکتر نما شے نے اسے مزید بوجھل کر رکھا تھا۔ اس منظر سے جارج کی غیر معمولی جسمانی طاقت کا سراغ بھی ملتا تھا۔ میڈم نے بتایا کہ اس شخص کو خاص طریقے سے ہرانے کے باوجود جارج نے اس کے ساتھ رانڈی نہیں کی تھی۔ یعنی اسے کپڑے اُتارنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہاں، غصے کے اظہار کے لئے اس پر تھوکا تھا اور دھکا دے کر اکھاڑے سے باہر کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں نیچے درج ہے۔ ایسے ہی چھوٹے بڑے واقعات کی وجہ سے یہاں جارج کے پرستاروں کی حلقہ موجود ہے جو اسے شکتی دیوتا کا نام دیتا ہے۔''

لگتا تھا کہ میڈم نے اس ضخیم البم کے ٹیکسٹ کو کافی غور سے پڑھ رکھا تھا۔ اس نے ہمیں گراں قدر معلومات فراہم کیں۔

میڈم آج ہم دونوں کے ساتھ کافی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو تمہارے اور جارج صاحب کے سامبر کے بارے میں سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ شبھ گھڑی بھی آ چکی ہے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ لڑائی نہ ہو سکے یا اس میں کوئی اور رکاوٹ آ جائے۔ بس ایک خیال سا ہے میرا۔''

''خیال کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے میڈم؟'' عمران نے کہا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور عمران کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں اتنی انفارمیشن دیں، اتنا کچھ بتایا لیکن تم دونوں بہت کچھ چھپاتے ہو اور چھپا رہے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گہرا کش لے کر بولی۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتانا...... کیا اس دن تم کرتب دکھاتے ہوئے واقعی گرے تھے یا یہ ایک ڈراما تھا؟''

عمران ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا؟''

''ثمرین جو زخمی ہوئی ہے، سلطانہ کی بھابی بننے والی تھی۔ یقیناً تم دونوں کے دلوں میں اس کے لئے نرم گوشہ ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے ''فیری سلیکشن'' سے بچانے کے لئے تم نے اسے زخمی کیا ہے؟''

میڈم ایک نہایت جہاندیدہ عورت تھی۔ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کا دھیان ضرور اس طرف جائے گا۔ اب اس بات کو چھپانا میڈم سے فاصلہ بڑھانے کے مترادف تھا اور ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد عمران نے یہ بات تسلیم کر لی۔ میڈم نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک حرکت تھی۔ اگر کسی کو ذرا سا شبہ بھی ہو

جاتا کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ ثمرین بھی سخت مصیبت کا شکار ہوتی۔ اب بھی گیتا اور منیجر مدن وغیرہ کو غفلت کا الزام دیا جا رہا ہے اور ان سے سخت باز پُرس ہوئی ہے۔ یہاں کی سزائیں بڑی سخت ہیں۔ تمہیں وہ درد کے انجکشن والی بات یاد ہے نا؟ یہ ثمرین جیسی لڑکی تو اتنی دوا کی ہلکی سی ڈوز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر میڈم کی ناراضی کم ہو گئی اور وہ نارمل نظر آنے لگی۔ وہ نارمل ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ''آپ ابھی یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ سامبر کی لڑائی میں اب بھی رکاوٹ ہے؟''

وہ چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''کل ایک بڑھیا حکم جی کی کچہری میں پیش ہوئی ہے۔ مجھے پوری بات کا تو پتا نہیں۔ سنا ہے، اس نے حکم جی کے سامنے واویلا کیا ہے اور کہا ہے کہ سلطانہ اور اس کا پتی دھرم وِرودھی ہیں۔ ان مہا پاپیوں کو کسی بھی رسم یا شرط وغیرہ کی آڑ میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے ان دھرم وِرودھیوں کی سزا کی خاطر اپنا بیٹا اور بہو قربان کئے ہیں۔ اپنے پوتے کے سہارے سے محروم ہوئی ہوں، وغیرہ وغیرہ۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دھیان فوراً مالا کی دادی ساس یعنی ستیش کی کھوسٹ دادی کی طرف چلا گیا جو دقیانوسیت اور توہم پرستی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے ساتھ ہی فتح پور کے مندر میں پیش آنے والے خونی واقعات بھی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ ان واقعات کے بعد ستیش، مالا اور اس کی دادی ساس اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

''یہ بڑھیا کون ہے؟'' میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے میڈم سے پوچھا۔

''ابھی مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن سنا یہی ہے کہ نل پانی سے آئی ہے۔ میں صبح اس بارے میں انفارمیشن لوں گی۔''

ہم جب اپنے کمرے میں واپس پہنچے تو عمران گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تابش! میں اپنی پہلے دن والی رائے پر قائم ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے راج بھون کے سامنے جا کر اور جارج کو للکار کر جلد بازی کی ہے۔ میں اسے بہادرانہ بے وقوفی کہوں گا۔ پہلے تو اس بات میں بھی ابھی تک شبہ موجود ہے کہ جارج کے ساتھ تمہارا ''مرو یا مارو'' والا دوبدو مقابلہ ہوگا لیکن اگر یہ مقابلہ ہو بھی گیا تو اس کے بعد کی صورتِ حال واضح نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں خراماں خراماں واپس نل پانی جانے کی اجازت دے دی جائے گی...... خدانخواستہ دوسری صورت ہوئی تو تمہیں سُولی پر لٹکا کر قصہ ختم کر دیا

جائے گا......لیکن میرے خیال میں یہ دونوں کام مشکل ہیں۔ ہار یا جیت، دونوں ہی صورتوں میں تمہارے لئے سلطانہ والا مسئلہ وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں تم سے معلومات حاصل کئے بغیر یہ لوگ تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔''

''لیکن جارج علی الاعلان یہ ''کمٹمنٹ'' کر چکا ہے۔''

''اس کمٹمنٹ کی چولیں ہلانے کے لئے یہ پنڈت پجاری وغیرہ جو موجود ہیں۔ جس طرح یہ اپنے مطلب کی کنڈلی نکال لیتے ہیں، اسی طرح ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

''لیکن ابھی تک پنڈت مہاراج نے تو کسی حد تک اصول پسندی دکھائی ہے۔ اس نے منصف کے طور پر ایک ایسا فیصلہ دیا ہے جو بہت سے لوگوں کو پسند نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، میری اور جارج کی ''مرو یا مارو'' والی فائٹ کروانے کا فیصلہ۔''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن ہوسکتا ہے اس میں وہ دیگر پنڈتوں اور پوتھیوں، شاستروں میں لکھی ہوئی تحریروں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہو۔ پھر بھی اس نے اندر خانے تمہیں تمہارے مطالبے سے ہٹانے کی کوشش تو کی۔''

ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز میڈم راج بھون سے بڑھیا کے بارے میں کوئی خبر لائے گی لیکن ہوا یہ کہ خود ہمیں ہی راج بھون سے بلاوا آ گیا۔ میں اور عمران اس وقت ثمرین کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ ابھی ہمارے سامنے سے گزر کر اندرونی پورشن کی طرف گئی تھی۔ وہ قدرے کمزور نظر آتی تھی۔ عمران کی تلوار سے لگنے والا زخم اس کی گردن سے شروع ہو کر کان کی لو تک چلا گیا تھا۔ سات آٹھ ٹانکے لگے تھے۔ اب پٹی کھل چکی تھی تاہم اب بھی زخم پر کوئی دوا لگی ہوئی تھی۔ اس زخم نے اس کے حسن کو گہنایا تھا مگر اس کی آبرو کو ایک فوری خطرے سے محفوظ کر دیا تھا......اور داغ تو چاند کے چہرے پر بھی ہوتے ہیں۔ مجھے اور عمران کو یقین تھا کہ ثمرین موجودہ صورتِ حال سے خوش ہوگی۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ اسے ایک دو دن میں ہی اس کے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ میں سوچنے لگا، کیا مستقبل قریب میں ایسا ہو سکے گا کہ ثمرین اور سلطانہ کے بھائی نبیل کو ان کی کھوئی ہوئی محبت مل سکے؟

ہم ثمرین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب میڈم افراتفری میں ہمارے کمرے میں آئی اور اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں دربار میں بلایا گیا ہے۔''

''دربار میں؟''

''ہاں، حکم جی نے تمہیں راج بھون میں بلایا ہے۔ بس آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں وہاں حاضر ہونا ہے۔''

''خیریت تو ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ تو وہاں جا کر پتا چلے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اسی برہمن بڑھیا والا معاملہ ہو یا کوئی اور پرابلم ہوسکتا ہے۔''

عمران نے پوچھا۔ ''کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں؟''

''تم کس حیثیت سے جاؤ گے؟''

''آپ کے گارڈ کے طور پر جا سکتا ہوں۔''

''دیکھو، کہیں مروا نہ دینا۔ مجھے سب سے بڑا اندیشہ یہی ہے کہ کہیں تمہارے اور تابش کے درمیان کسی طرح کا تعلق ثابت نہ ہو جائے۔''

''اس بارے میں آپ بالکل بےفکر رہیں۔'' اس نے میڈم کو یقین دہانی کرائی۔

O......❖......O

اور اب میں راج بھون کی عظیم الشان عمارت کے اندر حکم کے پُرشکوہ دربار میں تھا۔ یہ دربار جدید اور قدیم آرائش کا خوبصورت امتزاج تھا۔

مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں محافظوں کے کڑے حصار میں یہاں تک لایا گیا تھا۔ میڈم اور عمران وغیرہ دوسری گھوڑا گاڑی میں یہاں تک پہنچے تھے۔ محافظوں کی ایک کھلی چھت والی جیپ ہمارے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ بلند و بالا چھت والے شان دار دربار کے اندر کھڑے ہو کر میں خود کو کسی قدیم داستان کا حصہ محسوس کرنے لگا۔ سامنے ایک زرنگار چبوترے پر ایک بہت بڑی منقش کرسی رکھی تھی۔ اس پر سونے کے پترے جڑے تھے اور قیمتی پتھر دمک رہے تھے۔ یقیناً یہ حکم جی کی نشست تھی۔ اردگرد آٹھ دس مزید کرسیاں موجود تھیں۔ ان پر مصاحبین بیٹھتے ہوں گے۔ ابھی یہ ساری نشستیں خالی تھیں تاہم دربار میں کافی افراد نظر آ رہے تھے۔ مجھے بھی زرنگار چبوترے کی ایک جانب نشست پر بٹھا دیا گیا۔ دربار میں موجود اکثر افراد کنکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے لئے یقیناً ایک دلچسپ چیز تھا۔ ایک ایسا شخص جو کچھ عرصہ پہلے تک مفلوج و معذور سمجھا جاتا تھا، اب ایک نئے روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔ اس کی ساری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ داستانی لیکن ٹھوس حقیقت تھا اور پچھلے چند ماہ میں، میں کئی جگہ اس کا ثبوت مہیا کر چکا تھا۔

کچھ دیر بعد زرنگار چبوترے کی اداسی ختم ہوگئی۔ ایک عقبی دروازے کا مخملی پردہ حرکت

میں آیا اور حکم جی پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ رنگ گندمی اور سر پر ایک تاج نما پگڑی تھی۔ ایک قیمتی کام دار چغا اس کے پاؤں تک پہنچ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر روحانیت طاری کرنے کی شعوری کوشش کر رکھی ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر رکھی تھیں اور نپے تلے قدموں سے اپنی طلائی کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام درباری کھڑے ہو گئے اور رکوع کے بل جھک کر اسے تعظیم پیش کی۔ اس نے ہاتھ کے مدبرانہ اشاروں سے لوگوں کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے بھی بیٹھنا چاہا مگر ایک گارڈ نے مجھے کھڑا رہنے کی ہدایت کی۔

حکم جی کے ساتھ کوئی ایک درجن مصاحبین بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کچھ چبوترے کے سامنے پہلی قطار میں۔ چبوترے پر بیٹھنے والوں میں حکم کی تین بیویاں یعنی رانیاں شامل تھیں اور ان میں ایک مہارانی رتنا دیوی تھی۔ اس کا حسن آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ یہی رتنا دیوی تھی جس سے جھگڑا کر کے سلطانہ زرگاں سے فرار ہو گئی تھی۔

حکم کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والوں میں مجھے ایک جانی پہچانی صورت بھی دکھائی دی۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔ وہ ایک لمبے انگریزی اسکرٹ میں تھی۔ ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ شاید یہ دستانے انگلی کا عیب چھپانے کے لئے پہنے گئے تھے۔ کٹی ہوئی انگلی کی جگہ غالباً کوئی ”پیکنگ“ وغیرہ رکھ کر اسے برابر کر لیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری اور ماریا کی نظریں ملیں۔ ایک بجلی سی کوندگئی۔ وہ سارے منظر میرے ذہن میں بھی تازہ ہو گئے جن کا تعلق ماریا کے اغوا اور دیگر واقعات سے تھا۔

حکم جی دیگر حاضرین کی طرح مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بارعب آواز میں کہا۔ ”کیا تم ہمارے ایک دو سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گے؟“

”فرمائیں۔“

”کہا جا رہا ہے کہ جب تم جیل سے فرار ہو کرنل پانی پہنچے تو تمہارے ساتھ ایک قریب المرگ شخص بھی تھا جس کا ایک بازو اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے بے باک لہجے میں کہا۔ ”عزت مآب! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں جیل سے نہیں، جارج کے گھر سے فرار ہوا تھا۔ جیل میں تو مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ رکھا ہی نہیں گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ جس قریب المرگ شخص کی بات آپ کر رہے ہیں، آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کا نام باروندا جیکی تھا اور وہ ”قریب المرگ“ بھی آپ کے

دوست جارج کی وجہ سے ہوا تھا۔“

”سر جارج کا نام احترام سے لو۔“ چبوترے پر براجمان ایک فربہ شخص نے گرج کر کہا۔

”میرے دل میں جس کے لئے احترام نہیں، میں اپنی زبان پر اس کے لئے احترام کیسے لا سکتا ہوں؟ اور دوسری بات یہ جنابِ عالی کہ اس وقت ہم دونوں کے درمیان سامبر کی لڑائی طے ہو چکی ہے۔ اس رُو سے ہم دونوں صرف حریف ہیں اور حریفوں کا درجہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“

فربہ شخص نے مزید مشتعل ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن حکم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ”تم باروندا کے قریب المرگ ہونے کی بات تو کرت ہو لیکن یہ ناہیں جانت کہ اس کا اپرادھ کتنا بڑا تھا۔ اس نے شاہی پریوار کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہم صرف یہ پوچھنا چاہت ہیں کہ کیا واقعی تم باروندا جیکی کے شاگرد ہو؟ کیونکہ یہاں کچھ لوگن یہ بات بڑے وشواس کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کس حوالے سے شاگردی کی بات کر رہے ہیں؟“

”تمہارا رہن سہن...... تمہارا برتاؤ...... تمہارے لڑنے کا انداز...... اور اس جیسی دوسری چیزیں۔“

”میں خود کو اس بہت بڑے شخص کا شاگرد کہلوانے کا حق دار تو نہیں سمجھتا لیکن میں مانتا ہوں کہ میں نے اس سے تھوڑا بہت سیکھا ضرور ہے۔“

”سنا ہے کہ درد کے حوالے سے تمہارا کوئی خاص فلسفہ ہے اور تم خود کو آرام و آسائش سے دور رکھ کر اور جسمانی اذیتیں دے کر خوش ہوتے ہو؟“

”اس میں خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ بس میں برداشت بڑھانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔“

”اس چکر میں بھی تمہیں باروندا نے ہی ڈالا ہے؟“

”آپ اسے چکر کہہ لیں لیکن میرے نزدیک یہ بھی جینے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے...... ایک طرزِ حیات۔ میرا مذہب مجھے ایسے ہی سادہ اور پُر مشقت زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ کم کھانا، کم سونا، خود کو زیادہ آسائشوں اور نفسانی لذتوں سے حتی الامکان دور رکھنا،

یہ سب کچھ تو کوئی بھی شخص اپنا سکتا ہے۔آپ بھی اپنا سکتے ہولیکن اس کے لئے اندر کی جرأت درکار ہے۔''

''اپنا لہجہ درست رکھو۔'' فربہ شخص ایک بار پھر گرجا۔

حکم نے اسے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

مجھے گھورتے ہوئے حکم نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔''اپنے مذہب پر بہت اتراتے ہوتم لوگن اور ہرجگہ اس کی مثالیں بھی دیوت ہولیکن جب پڑھے لکھے لوگن میں بیٹھ کرتمہیں اپنے وچاروں کا دفاع کرنا پڑت ہے تو اکثرتم سپل (کامیاب) ناہیں ہو پاتے۔ خاص طور سے جب تم لوگن کی انتہاپسندی اور دہشت گردی کی بات ہووت ہے۔''

مجھے اپنے اندر آگ کی تپش محسوس ہوئی۔ میں نے جلتے لہجے میں کہا۔''مسلمانوں پر انتہاپسندی کا لیبل لگانا آج کی دنیا کا فیشن بن چکا ہے اور آپ جیسے کچھ لوگ اس میں پیش پیش ہیں۔ورنہ انتہاپسندی کس مذہب اور قوم میں موجود نہیں۔''

''یہ بڑا گھساپٹا جملہ بولا ہے تم نے...... یہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔اگرتم پسند کروتو میں تمہیں تمہاری انتہاپسندی کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھا سکتا ہوں؟'' حکم نے کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں۔''میں نے استفسار کیا۔

حکم نے اپنی دائیں جانب دیکھ کرایک سینئر گارڈ کواشارہ کیا۔وہ ادب سے سر جھکا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹااور پھرگھوم کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کے ساتھ مجھے دو جانے پہچانے چہرے دکھائی دیئے۔ میں ششدر رہ گیا۔ایک منحوس چہرہ تو رنجیت پانڈے کا تھا۔وہ وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر اس کی سرخی مائل آنکھیں دہکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔اس کی اور میری نگاہیں بس ایک ثانیے کے لئے ملیں۔ اس ایک ثانیے میں وہ ساری نفرت اور کدورت جاگ گئی جو میرے اور رنجیت کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا جیسے اس نے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہا۔''پپو...... آخراونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا نا۔اب تو ہمارے رحم وکرم پر آنے والا ہے۔اگلی پچھلی ساری کسریں نکلنے والی ہیں۔''

رنجیت کے ساتھ جو دوسرا چہرہ تھا، اسے دیکھ کر مجھے زیادہ حیرانی ہوئی۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ یہ سلطانہ کا گونگا ملازم ہاشم عرف ہاشو تھا۔ میں اسے نل پانی کی شاہی رہائش گاہ ''دیوان'' میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ مل کر ہمارے بچے بالو کی دیکھ بھال

بھی کر رہا تھا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں ہاشو کو یہاں دیکھوں گا اور وہ بھی اس حالت میں۔ ہاشو کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور اس کے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔اس کے قدرے فربہ چہرے پر گہرے نیل نظر آ رہے تھے۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پینتیس چالیس سالہ ہاشو لاچاری کی تصویر نظر آتا تھا۔ ایسے شخص کے ساتھ یہ سلوک سمجھ سے باہر تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟''میں نے تقریباً چلا کر پوچھا۔

''یہ تم لوگن کی امن پسندی، شانتی اور پریم کا شاہکار ہے۔'' حکم کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''کیا جرم کیا ہے اس نے؟''

''کوئی ایک جرم ہوتو تمہیں بتایا جاوے۔ یہ ایک لمبی لسٹ ہے اور اگر یہ دو ہفتے پہلے نل پانی سے پکڑا نہ جاتا تو یہ لسٹ اور بھی لمبی ہو جاتی تھی۔''

حکم نے رنجیت کو اشارہ کیا کہ وہ ہاشو کے بارے میں بتائے۔ رنجیت نے کہا۔''یہ شخص بہت پرانا ہندو دشمن ہے۔ آج کل بھی یہ ایک بہت بڑے جرم کا تانا بانا بن رہا تھا۔ اگر ہمارے مخبر بروقت کھوج ناہیں لگا لیتے تو بہت جیادہ نقصان ہو جاتا تھا......''

حکم نے گونگے ہاشو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''کیا تم خود اپنے اس شان دار اپرادھ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟''

ہاشو کچھ دیر تک جلتی نظروں سے حکم کو گھورتا رہا پھر گرج کر بولا۔''اگر خدا کے دشمنوں کو مارنا اپرادھ ہے تو ہم یہ اپرادھ کرتے رہیں گے۔ اپنی آخری سانس تک...... خون کے آخری قطرے تک۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ہاشو بول رہا تھا۔ اس کی غضب ناک آواز دربار میں گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔''خدا کی اس زمین سے ناپاک لوگن کے وجود کو ختم کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لئے میرے جیسی سیکڑوں زندگیاں خوشی سے قربان کی جاسکت ہیں۔ مجھے اگر سو بار بھی زندگی ملے تو میں سو بار اسی کام پر نثار کردوں گا۔''

ہاشو کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کا سینہ پھیل کر چوڑا ہو گیا تھا۔

حکم بولا۔''کیا تمہیں جانکاری ہے کہ تم جو کام کرنے جا رہے تھے، اس میں سیکڑوں لوگن مارے جاتے؟ ان میں عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے بھی شامل ہوتے اور ہوسکت ہے کہ کچھ مسلمانوں کے پران بھی چلے جاتے۔''

ہاشو نے پلٹ کر رنجیت پانڈے کی طرف دیکھا اور گرجا۔''اور اس کتے نے کچھ دن پہلے دیوان میں جو بم پھوڑا تھا، کیا اس میں بے گناہ لوگن کی جانیں ناہیں گئی تھیں؟''

پانڈے نے ایک زوردار تھپڑ ہاشو کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر اگلی نشستوں پر جا گرا۔ دو تین محافظ اس پر ٹوٹ پڑے اور بے دریغ اسے مارنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں ہاشو کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور وہ نیم جان ہو گیا۔

اس حالت میں بھی وہ پکار رہا تھا۔ ''کسی کو ناہیں چھوڑیں گے۔ ہر کافر کو مار دیں گے۔ پورے راجواڑے کو آگ لگا دیں گے......''

پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے فرش پر گرے ہوئے ہاشو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ وہ بدزبانی نہ کر سکے۔ حکم جی نے پانڈے کو اپنے قریب بلا کر کچھ کہا۔ وہ تیزی سے باہر گیا اور پھر پولیتھین کا ایک لفافہ لے کر واپس آیا۔ اس میں ایک نیلگوں پاؤڈر سا تھا۔ اس کا وزن آدھ کلو سے کچھ ہی کم ہو گا۔ یہ ویسا ہی پاؤڈر تھا جیسا سلطانہ کے پاس سے نکلا تھا۔ اس پاؤڈر میں نیلے تھوتھے کی آمیزش تھی اور پاؤڈر کی وہ پڑیا اب بھی میرے سامان میں موجود تھی۔

حکم کے اشارے پر پانڈے نے وہ پاؤڈر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جب ہمارے مخبروں نے اسے نل پانی کے ایک مندر کے پاس سے پکڑا تو اس پیکٹ جیسے تین پیکٹ اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کالی کے مندر میں پکنے والے پرشاد کے اندر یہ جہر ملا چکا تھا۔ ابھی اسے کم از کم دو اور بڑے مندروں میں جانا تھا۔ ایک مندر میں اس نے بھینٹ چڑھائے جانے والے دودھ کے اندر یہ جہر ملانا تھا اور دوسرے مندر میں حلوے کے پرشاد کے اندر۔ یہ اتنا تیج جہر ہے کہ اس کی ایک چٹکی تین چار بندوں کی ہتھیا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر یہ اپنے ارادے میں سپھل ہو جاتا تو نل پانی میں کم از کم ایک ہجار ہندو موت کے منہ میں چلے جاتے اور ہو سکت ہے کہ کئی مسلمان بھی مرتے کیونکہ کئی جگہوں پر یہ لوگن بھی پرشاد کھالیوت ہیں۔''

حکم نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''......اور...... یہ بندہ ایسے شبھ کام اب سے ناہیں، کئی برس سے کر رہا ہے۔ اس کا اصل نام ہاشم رازی ہے۔ یہ ایک بہت کٹر مُسلا ہے۔ اب اس نے سب کچھ اپنی زبان سے بتایا ہے۔ یہ کئی برس سے گونگا بن کر مختار راجپوت کے گھر میں رہ رہا تھا۔ ابھی یہ کھوج لگانا باقی ہے کہ مختار راجپوت اور اس کے پریوار کو اس کی اصل حقیقت کا پتا تھا یا ناہیں......اور اگر پتا تھا تو پھر وہ کس حد تک اس کے کاموں میں شریک تھے۔ اس شخص کی حقیقت ایک خطرناک خفیہ دشمن کی ہے۔ یہ زرگاں کے اندر کی خبریں اپنے پیرو مرشد مراد شاہ تک پہنچاتا تھا اور مراد شاہ کا پتا کیسے ناہیں؟ یہی وہ شخص ہے جو نل پانی میں راج پاٹ حاصل کرنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس نے ہمارے چھوٹے بھائی کو ہم سے دور کیا

ہے، دھرم اور سنسار کی ساری سچائیوں سے دور کیا ہے......'' حکم نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں بات مراد شاہ کی ناہیں، اس زبان دراز گونگے کی ہو رہی ہے۔ یہ انہی جنونی لوگن میں سے ہے جن کے ذہن تنگ ہو کر سوکھے اخروٹوں جیسے ہو گئے ہیں۔ ان کی نظریں کیول اپنے سامنے تک ہی دیکھ سکت ہیں۔ اب اس جانور کو کون سمجھائے کہ اس طرح بے گناہ معصوم لوگن کی جانیں لے کر یہ اپنے خدا کو خوش ناہیں کر سکتا۔''

حکم کے پہلو میں شاہانہ ٹھاٹ سے بیٹھی رتنا دیوی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ صرف ہندو جاتی کا ہی ناہیں، اپنی جاتی کا بھی دشمن ہے۔ اس نے دو تین سال پہلے ایک مسلمان لڑکے کو صرف اس لئے گھوڑا گاڑی تلے دے کر مار دیا کہ وہ بانسری بجاتا تھا...... بانسری بجانا اس کے نزدیک بہت بڑا پاپ تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال اس نے مسلمان بچیوں کے ایک اسکول میں آگ لگائی۔ اس آگ میں تین بچیاں جھلس کر ہلاک ہو گئیں۔ ان بچیوں کا دوش یہ تھا کہ وہ چکا ہے۔ تم چاہو تو اس سے پوچھ سکت ہو۔''

میں ششدر کھڑا تھا۔ رنجیت نے رتنا دیوی کے اشارے پر ہاشو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ گرجا اور ایک بار پھر ان لوگوں کو بے نقط سنانے لگا جن کے خیالات اس کے خیالات سے نہیں ملتے تھے۔ اس کی پُرطیش باتوں سے اندازہ ہوا کہ ابھی رتنا نے اس پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ انہیں قبول کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے فعل کو پورے یقین کے ساتھ درست بھی سمجھتا ہے۔

وہ جب زیادہ آگ بگولا ہونے لگا تو اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ رنجیت پانڈے اور حکم کے دیگر گارڈز اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

حکم بے حد طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''کیا وچار ہے تمہارا اس طرز کے بھائی بندوں کے بارے میں؟''

''چند لوگوں کے سخت رویے کی وجہ سے آپ کسی طبقے یا پوری قوم کو الزام نہیں دے سکتے۔''

''لیکن تم لوگن نے تو اپنی شناخت ہی اس گندے رویے کو بنا رکھا ہے۔''

اچانک عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''عالی جناب! کیا آپ کے اس سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں؟''

میں نے مڑ کر عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ ایسی بے پناہ سنجیدگی میں نے اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' حکم کی پاٹ دار آواز دربار میں گونجی۔

''عزت مآب! اگر آپ اجازت دیں تو میں بتاؤں؟'' میڈم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ۔''

''جناب! یہ پاکستان میں سیالکوٹ شہر کا رہنے والا ہے۔ عمران دانش نام ہے۔ پناہ کے لئے بھاگ کر انڈیا میں آیا اور پھر یہاں تک پہنچ گیا۔ لڑائی بھڑائی والے کام خوب کر لیتا ہے۔ میں نے چھان بین کر کے اسے اپنے سیکیورٹی گارڈز میں شامل کیا ہے۔''

حکم کی تیز نظروں نے کچھ دیر عمران کو گھورا پھر وہ بولا۔ ''کہو، کیا کہنا چاہت ہو؟''

''میں حضور کو اس کا جواب تفصیل سے دوں گا لیکن میری ایک گزارش ہے۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو پہلے وہ معاملہ نمٹا لیجئے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے جناب! انل پانی کی عمر رسیدہ خاتون والا معاملہ۔''

حکم کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں آئیں، تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔ اس نے اپنے سامنے والے کلاک کی طرف دیکھ کر پہلو میں بیٹھے پنڈت مہاراج سے تھوڑی سی کھسر پھسر کی پھر رنجیت پانڈے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بزرگ خاتون کو لایا جائے۔''

حکم کے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ وہی ہٹ دھرم، کھوسٹ بڑھیا تھی جس کے کہنے پر اس کے پچاس سالہ بیٹے رام پرشاد نے مندر میں پرکھشا کی خوفناک رسم ادا کی تھی اور جان سے گیا تھا۔ بڑھیا ساڑھی میں تھی۔ کندھوں پر موٹی شال اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑانویں تھیں۔ اسے حکم کے زرنگار چبوترے کے سامنے ہی ایک آرام دہ نشست پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جھریوں بھرے چہرے پر نفرت اور طیش کی یلغار ہو گئی۔ اس نے اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلا اُٹھی۔ اس کے منہ میں بس دو چار دانت ہی تھے۔ اس کی بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی تھی۔ خاص طور سے جب وہ غصے میں تیز تیز بولتی تھی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر پتا نہیں کیا کچھ کہنے لگی۔ جو جملے سمجھ میں آئے، وہ اس طرح تھے۔ ''تم راکھشس ہو...... تمہاری پتنی راکھشس ہے۔ ہم کو کیا خبر تھی ہم نے جس کو اتنے بڑے پُن کام کے لئے چنا ہے، وہ اتنا بڑا پاپی نکلے گا۔ تم دونوں کی سزا موت ہے، اس کے سوا کچھ ناہیں......'' وغیرہ وغیرہ۔

مجھ پر اس زبانی حملے کے دوران میں بڑھیا نے اپنی نشست سے اُٹھنے کی کوشش بھی کی

لیکن گارڈز نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

بڑھیا قدرے پُرسکون ہوئی تو حکم کا فربہ اندام مشیر چبوترے سے اُتر کر بڑھیا کی نشست کے قریب آیا اور بولا۔ ''ماتا جی! حکم جی چاہت ہیں کہ آپ نو تاریخ کو ہونے والے سامبر کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہت ہیں، تفصیل سے کہیں۔''

وہ فوراً بولی۔ ''تفصیل سے کیا کہوں۔ مجھ کو کوئی لمبی چوڑی بات ناہیں کرنی ہے۔ میں بس یہ کہوں گی کہ اس راکھشس اور اس کی اپرادھن پتنی کی سزا موت کے سوا اور کچھ ناہیں۔ اس کتے کو الٹا لٹکا کر اس سے اس کی پتنی کا اتا پتا پوچھا جاوے اور پھر دونوں کو فوراً جوتے مار مار کر مار دیا جاوے یا سُولی چڑھا دیا جاوے۔ بس...... بس اس کے سوا ہم جو کچھ بھی کریں گے، وہ ہمارا پاپ ہووے گا۔ ہم اپنے لئے نرگ کی اگنی کا انتجام کریں گے۔''

بڑھیا فرطِ جذبات سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔

حکم نے شاہانہ انداز میں پنڈت مہاراج کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''پنڈت جی! آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

ادھیڑ عمر پنڈت نے اپنے دراز گیسوؤں کو کندھوں پر سہلایا اور مؤدب انداز میں بولا۔

''جناب! میں نے ماتا جی کی پوری کتھا سنی ہے۔ ماتا جی کے پریوار سے ایک جرم تو ضرور ہوا ہے۔ ان لوگن نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو ہم سے چھینا اور پھر اپنے استھان میں لے گئے۔ ان لوگن کا خیال تھا کہ زرگاں میں مختار کی لونڈیا کو مناسب سزا ناہیں مل سکے گی۔ ان لوگن نے استھان میں مختار کی لونڈیا کی ارتھی جلانا چاہی تھی مگر یہ کام نہ ہو سکا۔ بہرحال مختار کی لونڈیا کو چھین کر لے جانے کی سزا اس پریوار کو مل گئی۔ ماتا کا بڑا بیٹا رام پرشاد اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ رام پرشاد کی پتنی کا دیہانت دل کے دورے سے ہو گیا۔ ماتا کا پوتا اور پوتے کی پتنی اس کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ میں یہ کہوں گا کہ ماتا اور اس کے پریوار نے جو کچھ کیا یہ غلط تھا...... لیکن اس کے پیچھے جو کارن تھا، وہ یہی تھا کہ یہ لوگن اپنی سمجھ کے مطابق دھرم کا نام اونچا کرنا چاہت تھے اور اپرادھن کو سزا دینے کی اچھا رکھتے تھے۔''

حکم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے پنڈت جی...... ہم آپ سے یہ جانکاری چاہت ہیں کہ کیا موجودہ حالت میں ماتا جی کی بات ماننا چاہئے کہ سامبر کی لڑائی روک دی جاوے اور سلطانہ کے پتی کو مجبور کیا جاوے کہ وہ سلطانہ کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لئے اسٹیٹ کی مدد کرے؟''

پنڈت کے بولنے سے پہلے ہی بڑھیا پھر چلا اُٹھی۔ ''آپ کو ایسا کرنا پڑے گا۔ اس کام کے لئے میرا بیٹا قربان ہوا ہے۔ میں نے اپنی بہو کا بلیدان دیا ہے۔ میرا پوتا اور اس کی پتنی مجھ سے دور ہوئے ہیں۔ میں سنسار میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اگر میرے یہ سارے بلیدان بیکار ہیں اور اس راکھشس نے سامبر کی آڑ میں چھوٹ کر یہاں سے چلے جانا ہے یا اسے آسان موت مل جانی ہے تو پھر مجھے بھی زندہ نا ہیں رہنا۔ مجھے نا ہیں چاہئے ایسا جیون۔ میں سوگندھ کھاوت ہوں، میں ہتھیا کر لوں گی۔ میں سب کے سامنے خود کو زندہ جلا لوں گی......''

بڑھیا کے سوکھے سڑے جسم میں نہ جانے اتنا زور کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ پکڑنے والوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اسی دوران میں عمران آگے آیا۔ اس نے حکم کے سامنے ادب سے جھک کر کہا۔ ''اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ماتا جی سے ایک دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

حکم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''پوچھو۔''

عمران بڑھیا کے سامنے جا کر بولا۔ ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کے بیٹے کی موت کس طرح ہوئی اور آپ کے پوتے اور اس کی پتنی نے آپ کا ساتھ کیوں چھوڑا؟''

وہ کڑک کر بولی۔ ''کون ہو تم؟ میں تمہاری باندی نا ہیں کہ تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔ میں نے جن کو بتانا تھا، انہیں سب بتا چکی ہوں۔''

فربہ اندام مشیر آگے آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جو پوچھ رہے ہو، میں بتا دیوت ہوں۔ ماتا جی کے بیٹے رام پرشاد کی ہتھیا آپس کی لڑائی کے کارن ہوئی۔ استھان کے لوگن ''دھرمی اختلاف'' کے کارن دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے رام پرشاد کو مار دیا۔ رام پرشاد کی پتنی دل کے دورے سے سورگ باشی ہوئی۔''

''اور ماتا جی کا پوتا ستیش......اور اس کی بیوی مالا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ دونوں مخالف گروہ سے ڈر گئے۔ ویسے بھی ستیش کی پتنی امید سے تھی۔ ستیش اس کی اور اپنی جان بچانے کے لئے کہیں نکل گیا۔''

''یہ باتیں آپ کو ماتا جی نے بتائی ہیں؟'' عمران نے تصدیق چاہی۔

فربہ اندام شاہی مشیر نے اثبات میں جواب دیا۔

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے جناب! یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' مشیر خاص نے آنکھیں نکالیں۔ حکم جی نے بھی تیوری چڑھالی۔

عمران اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ''ماتا جی کی عمر ایسی ہے کہ ہمیں ہر صورت ان کی عزت کرنی چاہئے لیکن یہ اس معاملے میں جھوٹ بول رہی ہیں اور کئی باتیں چھپا رہی ہیں۔''

''کتے! میں جھوٹی ہوں۔ میں ادھرمی ہوں۔ حرامجادے...... نیچ بدجات! میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔'' بڑھیا جلائی اور اس نے ایک بار پھر نشست سے اُٹھنے کی کوشش کی۔

گارڈز نے اسے سنبھال لیا۔ وہ پوپلے منہ سے پتا نہیں کیا اول فول بکتی چلی گئی۔ جو ایک فقرہ سمجھ میں آ رہا تھا وہ بار بار دُہرا رہی تھی وہ یہ تھا کہ ''تم ہو کون؟ تم ہو کون؟''

وہ مجھے تو جانتی تھی لیکن عمران اس کے لئے یکسر اجنبی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ ہم دونوں اس سارے خونی واقعے کے چشم دید گواہ ہیں جو فتح پور کے اس چھوٹے سے گاؤں کے مندر میں رُونما ہوا۔ جس میں گرو سوبھاش کا کٹا ہوا سر تھال میں سجایا گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل کے کڑاہے میں ہاتھ ڈالے۔

بڑھیا ذرا شانت ہوئی تو عمران نے بڑے ہموار اور اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ''عزت مآب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں کچھ ایسے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں جو ماتا جی آپ سے چھپا رہی ہیں۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ واقعات سچے ہیں اور اگر جھوٹ ثابت ہوں تو میں ہر بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔''

''مختصر شبدوں میں بتاؤ، کیا بتانا چاہت ہو؟'' حکم نے کہا۔

''جیسا کہ میڈم صاحبہ نے آپ کو بتایا ہے، میں پناہ کے لئے اس راجواڑے میں داخل ہوا ہوں۔ مجھے آپ کی عنایتوں کا آسرا ہے۔ آج سے چند روز پہلے تک میں زرگاں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نل پانی سے آگے نکل آیا تھا اور فتح پور نام کی بستی کے قریب ایک سانسی چرواہے کے جھونپڑے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرا وہاں فتح پور میں ہونا زبردست اتفاق تھا۔ اس اتفاق کی وجہ سے مجھے وہ مناظر دیکھنے کا موقع ملا جن کا تعلق فتح پور کے مندر سے ہے اور ساتھ ہی آپ کے سامنے کھڑی اس بڑی بی سے بھی۔''

بڑھیا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ گارڈز نے بہ مشکل اسے چپ کرایا۔ حکم نے عمران کو بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

عمران نے کہا۔ ''اس روز چرواہے کو بکریوں کا دودھ بیچنے بستی کے اندر جانا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بستی میں بہت ہلچل نظر آ رہی تھی۔ آس پاس کی چھوٹی بستیوں کے کئی لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ بڑی پگڑیوں والے کئی پنچ بھی تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ

یہاں مندر میں آج کوئی شخص جلتے تیل کے کڑاہے میں اپنے ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے رہا ہے۔ میرے میزبان چرواہے صدیق نے تفصیل معلوم کی تو پتا چلا کہ یہ کٹر ہندوؤں کے دو گروہ ہیں۔ کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ لڑکی کو دوسرے گروہ والوں نے غائب کیا ہے۔ دوسرا گروہ یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ اب پرکھشا سے فیصلہ ہونا ہے کہ سچ کیا ہے۔ مندر کے ارد گرد بھی خوب رونق تھی۔ اندر سنکھ بج رہے تھے اور اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ پھر میں نے آپ کے سامنے کھڑی اس بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ زور زور سے اشلوک پڑھ رہی تھی اور اپنے پچاس پچپن سالہ بیٹے رام پرشاد کو پرکھشا کے لئے مندر کے اندر لے جا رہی تھی۔ رام پرشاد بھی نشے کی سی حالت میں تھا۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں اندر چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد مندر کے اندر ہاہاکار مچ گئی۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ آوازیں آنے لگیں کہ بھگوان نے فیصلہ کر دیا...... دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد پتا چلا کہ مندر کے اندر بڑھیا اور اس کا ادھیڑ عمر بیٹا پرکھشا میں ناکام ہو گئے ہیں اور لوگوں نے بڑھیا کے بیٹے کو جان سے مار دیا ہے۔"

عمران نے چند لمحے توقف کیا۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔ لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ صرف بڑھیا کبھی کبھی اپنے پوپلے منہ سے بول رہی تھی مگر اب اس کی آواز میں تن فن نہیں تھی۔ اس کے الفاظ بھی کسی کے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے ایک جواں سال لڑکی کو دیکھا۔ وہ شاید حاملہ بھی تھی۔ کچھ لوگ اسے بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے مندر کے اندر لے جا رہے تھے۔ مجھے لوگوں سے پتا چلا کہ بڑھیا اس لڑکی کی دادی ساس ہے...... کیونکہ پرکھشا ناکام ہو گئی ہے اس لئے اس لڑکی کو بھی مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد جی مندر کے اندر زبردست ہنگامہ ہوا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ مندر کا بڑا دروازہ اس ہنگامے میں ٹوٹ گیا۔ میں ہمت کر کے اس دروازے کے قریب چلا گیا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اندر کے خونی منظر دیکھے۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے گولی بھی چل رہی تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو میں نے خود دیکھیں ان میں سے ایک لاش بڑھیا کے ادھیڑ عمر بیٹے کی تھی۔ پھر تیل کا ابلتا ہوا کڑاہا الٹ گیا اور مندر میں آگ لگ گئی۔ میرا دوست چرواہا مجھے کھینچ کر مندر کے قریب سے پیچھے لے آیا اور ہم کسی مصیبت سے بچنے کے لئے اپنے جھونپڑوں کی طرف چلے گئے۔

"اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ مندر کے خونی ہنگامے میں نو دس بندے مرے اور درجنوں

بُری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس واقعے کی زیادہ تر ذمے داری اسی بزرگ خاتون پر ہے۔ اسی نے اپنے بیٹے کو ایک خطرناک پرکھشا دینے پر مجبور کیا۔ اس سے دو چار دن پہلے یہ ایک اور خطرناک کام بھی کر چکی تھی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں اور اس کا پورا ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔"

"اپنی بات جاری رکھو۔" حکم نے ہدایت کی۔

عمران نے کہا۔ "اسی بزرگ خاتون اور اس کے کٹر ساتھیوں نے ایک گرو کو قتل کیا اور اس کا کٹا ہوا سر ایک تھال میں سجا کر کالی ماتا کے چرنوں میں رکھا۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کیا یا نہیں؟"

دربار میں سناٹا تھا۔ بس بڑھیا ہی اول فول بول رہی تھی۔ فربہ اندام مشیر نے اسے بہ مشکل چپ کرایا اور پوچھا کہ کیا فتح پور بستی کے مندر میں کسی گرو کا سر کاٹا گیا تھا؟ بڑھیا اب بوکھلا چکی تھی۔ طیش کے سبب اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، بولتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے پوپلے منہ سے پھس پھس کی غصیلی آوازیں نکالتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے جو واویلا کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا...... "وہ گرو اپرادھی تھا۔ اس کے مرنے میں ہی اس کی مکتی تھی۔ اپرادھی کو اس کی سزا ملنی چاہئے۔ نہ ملے تو اس کا وبال ساری ہندو جاتی پر پڑتا ہے۔ کھیت سوکھ جاتے ہیں، ناریاں بانجھ ہو جاتی ہیں...... بیماریاں آتی ہیں اور خون خرابے ہوتے ہیں۔ اگر اس اپرادھن سلطانہ کو سزا نہ مل سکی تو بھی یہی کچھ ہو گا......" وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

عمران کی خوبصورت آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ چہرے پر چھائی ہوئی بے پناہ سنجیدگی نے اس چمک کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "عزت مآب! میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ انتہا پسند ہر جگہ موجود ہیں اور جہاں بھی ہیں، قابلِ مذمت ہیں۔"

عمران کا یہ ایک فقرہ لاتعداد دلیلوں اور تاویلوں سے زیادہ وزنی تھا۔ کچھ دیر کے لئے کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی سیاست دان یا دانشور نہیں ہوں جنابِ عالی...... مگر اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی سے نفرت کرنی چاہئے، کسی خاص قوم، مذہب یا فرقے سے نہیں۔ انتہا پسندی انسان کو جنونی بناتی ہے۔ انسان ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جو شاید وہ عام حالت میں کبھی نہ کرتا۔ اب آپ اس بزرگ خاتون کو ہی دیکھئے۔ یہ عمر کے اس حصے میں ہیں جب انسان جھوٹ بولنے جیسی غلطیوں کو بھی بہت بڑے گناہوں میں شمار کرنے لگتا ہے لیکن یہ پورے وشواس اور زور و شور سے

جھوٹ بول رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا پوتا ستیش اور اس کی پتنی مالا اس لئے ان سے جدا ہو گئے کہ وہ مخالف گروہ سے خوفزدہ ہو گئے تھے لیکن ایسا نہیں ہے عزت مآب۔"

"تو پھر کیا ہے؟" حکم نے دریافت کیا۔

"اب تک میں نے جو کچھ بتایا ہے، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں لیکن جو بات میں اب بتاؤں گا، وہ میں اندازے سے بتا رہا ہوں۔ مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ میرا اندازہ درست ہے۔ بزرگ خاتون کی توہم پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ یہ اپنے عقیدے کی اتنی پکی ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتیں۔ جلتے کڑاہے میں ہاتھ ڈالنے والا امتحان اس لئے دیا گیا تھا تا کہ بزرگ خاتون کے پوتے اور اس کی پتنی مالا کی بے گناہی ثابت ہو سکے۔ ہاتھ ڈالنے والے کے ہاتھ جل گئے کیونکہ انہیں جلنا ہی تھا لیکن یہ بزرگ خاتون پھر بھی اپنی بے مثال دقیانوسیت پر قائم ہے۔ پرکھشا کے طریقے پر نظر ثانی کرنے کے بجائے اب یہ اپنے پوتے اور اس کی بے گناہ پتنی کے خلاف ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ وہ واقعی مجرم تھے، اگر مجرم نہ ہوتے تو رام پرشاد کے ہاتھ کیوں جلتے۔ اسی بات پر پوتا اور اس کی پتنی مالا اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ عزت مآب! شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انتہا پسند دن بہ دن محدود اور تنہا ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ زہریلے بھی۔"

بڑھیا پوپلے منہ سے پھنکاری۔ "یہ نیچ کمینہ جھوٹ بولت ہے، بکواس کرت ہے...... ایسا...... کچھ نا ہیں ہوا......"

اس کا لہجہ ہی گواہی دے رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ وہ زیادہ واویلا کرنے لگی تو حکم کے اشارے پر پہرے دار اسے سمجھاتے اور سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔

میں حیرت سے عمران کو تک رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں کسی عدالت میں ہوں اور کسی بہت بڑے وکیل نے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے آناً فاناً جیوری کو لاجواب کیا ہے۔ میرے لئے سب سے بڑی حیرت وہ خاص قسم کی سنجیدگی تھی جو میں نے آج پہلی بار عمران کے چہرے پر طاری دیکھی تھی۔

میں ابھی تک عمران کے ماضی میں نہیں جھانک سکا تھا۔ یقیناً وہاں کوئی خاص کہانی موجود تھی...... کہیں...... ایسا تو نہیں تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی انتہا پسندی اور جنونیت کا ڈسا ہوا ہو؟ ان مہلک رویوں نے کوئی گہرا زخم لگایا ہو اسے؟

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑھیا کے جنونی رویے کی وجہ سے بڑھیا کا کیس کافی حد تک

کمزور ہو گیا ہے۔ وہ سامبر کا مقابلہ رکوانا چاہتی تھی اور اس کی دلیل یہ تھی کہ میری سزا دردناک موت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ بہر حال، اب یہ معاملہ پنڈت مہاراج اور اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ حکم دل ہی دل میں اب بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ مقابلہ نہ ہو لیکن وہ لکھے ہوئے قانون اور پنڈتوں کی رائے کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔

لمبے بالوں والے پنڈت اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کے درمیان تادیر مشورہ ہوا، چند سال خوردہ کتابوں اور پوتھیوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ آخر پنڈت مہاراج نے سب کے سامنے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "عزت مآب! ہمارے پاس سامبر کے بارے میں بہت کھلی اور واضح جانکاریاں موجود ہیں۔ اگر کوئی منش کسی دوسرے منش کو سامبر کی دعوت دے دیوت ہے اور دوسرا اسے قبول بھی کر لیوت ہے اور سامبر کی شبھ گھڑی بھی نکل آوت ہے تو پھر واپسی کی گنجائش نا ہیں رہتی۔ اگر کوئی دوسرا معاملہ ہو بھی تو پہلے سامبر رچنا کا ہونا ضروری ہو جاوت ہے۔"

پنڈت مہاراج نے سنسکرت کی ایک قدیم کتاب کا اقتباس پڑھتے ہوئے کہا۔ "سن 512 ب، مہینا بیساکھ، تاریخ 30۔ راجستھان کے راجواڑے واشو کے مشہور راجا کرشن کمار سہائے کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تھا۔ ایک شخص آنند لال پر چوری اور ہتھیا کا الزام تھا لیکن اس کے پکڑے جانے سے پہلے ہی اس کا سامبر اپنے سوتیلے بھائی سے طے ہو چکا تھا۔ راجا نے ہتھیارے کو سزا دینے سے پہلے اس کا سامبر کرانے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ ہو سکتا ہے سامبر کے مقابلے میں ہی انصاف ہو جائے۔ یہ مرو اور مارو کا مقابلہ تھا۔ اس میں ملزم آنند لال بچ گیا اور اس کا سوتیلا بھائی مارا گیا۔ بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ملزم بے گناہ تھا اور اصل دوشی اس کا سوتیلا بھائی ہی تھا...... اور عزت مآب! ایسی اور بھی کئی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں۔"

"حکم نے کہا۔ "پنڈت جی! کیا آپ یہ چاہت ہیں کہ سلطانہ کے پتی کو سامبر کی آگیا دی جاوے اور اگر یہ اس یدھ (لڑائی) میں کامیاب جاوے تو پھر اسے مطلوبہ عورت کے ساتھ نل پانی جانے دیا جاوے؟"

"بالکل سرکار! ہم کو ایک مرتبہ تو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ بھگوان نہ کرے اگر یہ شخص سامبر جیت جاوت ہے تو پھر اسے کم از کم ایک بار تو زرگاں کی حدوں سے نکل جانے کی آگیا دینی ہو گی۔"

اس موقع پر میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن

میں آپ کے لفظوں کو درست نہیں سمجھتا۔ مجھے زرگاں کی حد سے نکلنے کی نہیں، نل پانی پہنچنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ یہ تو سراسر مذاق ہوگا کہ آپ مجھے زرگاں سے تو نکلنے دیں لیکن آپ کے اہلکار میرے ساتھ ساتھ رہیں اور زرگاں کی حد ختم ہوتے ہی مجھے پھر دھر لیا جائے۔''

''تم بال کی کھال مت اُتارو۔'' حکم نے پہلی بار برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم خوب اچھی طرح سمجھت ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اور یہ مت سمجھو کہ ہم تمہیں اور تمہاری پتنی کو نل پانی سے واپس ناہیں لا سکتے۔ اگر ہم چاہیں تو تمہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی کھینچ لیا جاوے گا۔''

پنڈت مہاراج نے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں پر سنوارتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے بھگوان سے پوری آشا ہے کہ جناب کہ اس سب کی نوبت ہی ناہیں آوے گی۔ اس پاپی کے پاپوں کا گھڑا سامبر کے مقابلے میں ہی پھوٹ جاوے گا۔''

جارج کی بہن ماریا اپنی جگہ سے اُٹھی اور پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''میں اس موقع پر پنڈت مہاراج، حکم جی اور دیگر معزز ارکان سے بس ایک ہی بات کہنا چاہوں گی۔ یہ شخص جرم وار ہے اور خدا نے چاہا تو یہ سامبر میں ضرور شکست کھائے گا لیکن اس کو اکھاڑے میں ہی مار دیا گیا تو یہ ان سب لوگوں کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی جو مختار راجپوت کی بیٹی کو انصاف کے کٹہرے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری پُرزور درخواست ہے کہ سامبر کے بعد اس شخص سے اس کی بیوی کا اتا پتا دریافت کیا جائے اور اسے برآمد کیا جائے۔'' پنڈت مہاراج نے ماریا کی باتوں کی تائید کی۔

چند منٹ مزید گفتگو جاری رہی اور پھر وہیں دربار میں سب کچھ طے پا گیا۔ دو روز بعد ساتویں کا جشن تھا اور اس سے دو روز بعد یعنی نو تاریخ کو میرا اور جارج کا مقابلہ دن کے تیسرے پہر میں ہونا تھا۔

آخر میں حکم جی نے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں راج بھون کی سیر کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ اس نے متعلقہ لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ مجھے راج بھون میں گھمائیں پھرائیں۔

ساتویں کا جشن دو روز بعد تھا لیکن اصل میں یہ جشن شروع ہو چکا تھا۔ گارڈز کے نرغے میں حکم کے فربہ اندام مشیر خاص اوم پرکاش نے ہمیں راج بھون کے مختلف حصے دکھائے۔ ہمارے ساتھ میڈم صفورا، رنجیت پانڈے اور اس کے ایک درجن ساتھی بھی تھے۔ مجھے پانڈے کی نگاہوں میں اپنے لئے طیش اور کینہ صاف نظر آ رہا تھا۔

راج بھون کے مختلف حصوں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ شاید مجھے سیر کرانے کا مقصد مجھ پر اس شان و شوکت کا رعب ڈالنا تھا۔

ساتویں کے جشن کی سب سے اہم خوبصورتی و رنگینی وہ ایک بہت بڑا قطعہ تھا جسے جنتِ ارضی کی طرح سجایا گیا تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا بے ستون کا ہال تھا۔ اس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس گنبد نما چھت کو اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ دن میں بھی رات کا سماں ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں ستارے ٹمٹما رہے ہیں اور ان کے درمیان چاند کی خوبصورت ٹکیا روشن ہے۔ یہ چاندنی فرش تک پہنچتی تھی اور نشیب و فراز کو عجیب کیفیت میں رنگ دیتی تھی۔ یہاں تین بڑی آبشاریں تھیں جن کا پانی موسیقی بکھیرتا چھوٹے چھوٹے جھرنوں میں تبدیل ہوتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض میں گرتا تھا۔ یہ حوض طول میں کم و بیش پچاس میٹر اور عرض میں چالیس میٹر ہوگا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ان کشتیوں میں شراب کی صراحیاں، جام اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ہر کشتی میں خلوت فراہم کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا کاٹیج بھی تھا۔ اس طرح کا ہر کاٹیج تازہ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ کشتیوں پر راج بھون کے خواص اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے اور خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ حوض کے کنارے موجود خوش لباس سازندے موسیقی کی تانیں بکھیر رہے تھے اور چند خوبرو لڑکیاں حوض کے اردگرد رقص فرما تھیں۔ کھلی جگہ کے مقابلے میں اندر کا ماحول نیم گرم تھا۔ یہی حرارت تھی جس کے سبب رقاصاؤں نے نہایت مختصر لباس پہن رکھے تھے اور پھر بھی خوش و خرم تھیں۔ اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا فوارا نصب تھا فوارے میں سے سات رنگوں کا شفاف پانی پھوٹتا تھا اور فوارے کے اردگرد بنے ہوئے ایک گول حوض میں جمع ہوتا تھا۔ شیشے کے اس گول حوض کی چاروں طرف آرام دہ نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ ان نشستوں پر کچھ لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے اور رقاصاؤں کے تھرکتے جسموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ لطف اندوزی صرف دیکھنے تک محدود نہیں تھی۔ گاہے بگاہے کوئی شخص اپنے اردگرد ناچتی رقاصہ کو چھوتا تھا یا آغوش میں کھینچ لیتا تھا۔ گل پوش کشتیوں میں بیٹھی بیگمات ان مناظر سے صرف نظر کرتی تھیں۔ غالباً یہ ساری رعایتیں اور گنجائشیں ساتویں کے جشن سے نسبت رکھتی تھیں۔

میڈم نے مجھے بتایا۔ ''جشن کے دن اس فوارے میں یہ سات رنگوں والا پانی نہیں ہوگا۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''مہنگی ترین امپورٹڈ شراب۔ اس شراب سے یہ گول حوض لبالب بھر جائے گا۔ لوگ اس کے اردگرد بیٹھ کر رقص دیکھیں گے اور ساتھ ساتھ مہ نوشی کریں گے۔ رقاصائیں بھی یہ نہیں ہوں گی۔ یہ وہی چالیس لڑکیاں ہوں گی جن میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چنی

جاتی ہیں۔"

"وہ کیا ہے میڈم؟" میں نے شیشے کے ایک بڑے چوکور ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اندر کوئی سنہری چیز ہلکورے لیتی تھی۔

"لیکوئیڈ گولڈ......سیال سونا" میڈم نے بتایا۔

"کیا مطلب؟"

میڈم کے بجائے ایک فوجی افسر بولا۔ "یہ پگھلا ہوا سونا ہے۔"

میں اور عمران دنگ رہ گئے۔ اگر یہ واقعی سونا تھا تو پھر ڈیڑھ دو من تو رہا ہوگا۔ اس سیال سونے کے بیچوں بیچ ایک برہنہ لڑکی کی دو فٹ اونچی مورتی نظر آ رہی تھی۔ یہ مسکراتی ہوئی مورتی کسی بہت سخت شیشے سے بنی ہوئی تھی لیکن لگتا تھا کہ یہ موم کی ہے۔ یعنی پگھلے ہوئے سونے کے اندر موم کی لڑکی۔ لڑکی کا صرف بالائی دھڑ نظر آتا تھا پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی سیال سونے میں اوجھل ہوگئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ اُبھری تو سیال سونے میں لتھڑی ہوئی نظر آئی لیکن شیشے کے باکس کے اندر اس قدر درجۂ حرارت تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پگھلا ہوا سونا پانی کی طرح اس کے بلوری جسم سے ڈھلک کر واپس گر گیا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی...... پگھلے ہوئے سونے میں مسکراتی لڑکی کا برہنہ جسم۔ یہ چھوٹا سا تماشا ایک طرح کی علامتی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ سونا، دولت اور اختیار کی علامت تھا...... دولت اور اختیار جو عورت کے برہنہ جسم کو عیش وعشرت کی آگ میں جھلساتے تھے۔ وہ جھلستی تھی لیکن پھر بھی سب کچھ جھیلتی اور مسکراتی رہتی تھی۔

لڑکی کی مورتی کو پگھلے ہوئے سونے میں ڈوبنے اور پھر ابھارنے کے لئے کوئی مشینی تکنیک استعمال کی گئی تھی۔ ہر بیس تیس سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ سیال سونے میں غوطہ زن ہوتی تھی اور پھر باہر نکل آتی تھی۔ اس تماشے کا سب سے بہترین منظر وہ تھا جب پگھلا ہوا سونا پانی کی دھاروں کی طرح اس کے بلوری جسم سے جدا ہوتا تھا۔

ہماری چاروں جانب بجتے ہوئے ساز رکے تو رقص بھی تھم گیا۔ رقاص لڑکیاں مختلف گوشوں میں اوجھل ہوگئیں۔ ایک خوبرو لڑکی اپنی ساڑھی کو چٹکیوں میں ٹخنوں سے اوپر اُٹھائے دوڑتی ہوئی آئی...... وہ ہنس رہی تھی اور اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں نشے میں دھت ایک امیر زادہ تھا۔ وہ غالباً پریمی جوڑا تھا۔ لڑکا، لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی بل کھا کر لہرائی اور چکما دے کر اس کی زد سے نکل گئی۔ دونوں ہنستے ہوئے ایک جانب اوجھل ہوگئے۔

یہاں ہر طرف خرمستی اور مدہوشی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔ ابھی ایک دو دن میں اس ماحول کو مزید پروان چڑھنا تھا اور جشن کے دن کلائمیکس تک پہنچنا تھا۔

مجھے اس وسیع وعریض کمپاؤنڈ کی کھڑکیوں کے نیلے شیشوں میں سے راج بھون کے وسیع لان کا منظر نظر آیا۔ باہر دن اور اندر رات تھی۔ راج بھون کی بیرونی دیوار پر خاردار باڑ لگی تھی۔ اس فصیل نما دیوار کے اوپر باڑ کے ساتھ ساتھ مسلح پہرے دار گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے دو پہرے داروں کے ہاتھوں میں مجھے رکھوالی کے کتے بھی دکھائی دیئے۔

چند روز پہلے ہم اسی دیوار کی طرف سے راج بھون میں گھسے تھے اور تہلکہ مچایا تھا۔ اب یہاں سخت نگرانی تھی اور چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی لیکن اس ساری نگرانی کے باوجود ہم کسی اور روپ میں راج بھون کے اندر موجود تھے۔

......رقص اب ختم ہو چکا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر گانے والی اپنے چاندی بال چمکاتی ہوئی سازندوں کے قریب جا بیٹھی اور ایک ہندی گیت گانے لگی۔ مغنیہ کی آواز پُرسوز تھی۔ لَے بھی اچھی تھی۔ رقص کی دھنا دھن سے یہ موسیقی کہیں بہتر تھی۔ گیت کے بولوں کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

رنگ وبُو کے دھاروں میں
روز وشب کے پُرشور ہنگاموں میں
گرجتی برستی بارشوں میں اور تیز آندھیوں میں
غرض زندگی کے کسی بھی تیز بہاؤ میں
میں تجھے بھول نہیں پاتا
تیری یاد میرے ساتھ رہتی ہے، سردیوں کی دھوپ کی طرح
اور صحرا کی رم جھم کے مانند
باغوں کی چاندنی کی مثال
اور جلتے راستوں پر ملنے والے گھنے پیڑوں کی طرح

گیت کے بول میرے دل میں سرایت کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا، میں بھی کسی کو یاد کرتا ہوں۔ کوئی ہر وقت میرے ساتھ بھی رہتا ہے۔ وہ کون ہے؟ شاید سلطانہ جو میری زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ جس کی دل نواز محبت مدھم بارش کی طرح میرے دل کی زمین میں اندر تک سرایت کر گئی تھی۔ میں اس کے پاس واپس جانا چاہتا تھا، آنکھوں میں فتح مندی اور کامیابی کی چمک بھر کر۔ پھر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا اور اس کی شفاف

آنکھوں سے نکلنے والے سارے آنسو اپنے ہونٹوں سے چن لینا چاہتا تھا۔ ہاں، وہ ایک سائے کی طرح میرے ساتھ تھی...... لیکن...... لیکن اس سائے کے پیچھے ایک اور سایہ بھی تو تھا۔ ایک اور مدھم سا ہیولا بھی، ایک لڑکی...... جو ایک سہانی شام کی راہ تکا کرتی تھی۔ جو ڈائری پر لکیریں کھینچ کر انتظار کی تاریخیں کاٹا کرتی تھی اور جو شہنائیوں کی گونج سے پہلے ہی کہیں گم ہوگئی تھی...... کبھی نہ ملنے کے لئے۔ سلطانہ کے سائے کے پیچھے اس کا سایہ بھی تو تھا۔ میں ایک بار...... زندگی میں بس ایک بار اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کو دیکھنا چاہتا تھا اور اگر وہ سننا پسند کرلیتی تو اس سے صرف معذرت کہنا چاہتا تھا۔

ہاں، سلطانہ کے سائے کے پیچھے وہ سایہ بھی تو تھا۔ کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا تھا؟ کیا ایسا ممکن تھا کہ میں ایک ہی وقت میں سلطانہ کو چاہوں اور ثروت کو دیکھنے کی حسرت بھی دل میں رکھوں؟ کیا سلطانہ سے میری محبت جسمانی رخ اختیار کرچکی تھی اور ثروت سے روحانی؟ سلطانہ کے لئے میرے اندر طلب تھی کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی بے خبری کے زمانے میں اس کے بہت قریب رہا ہوں۔ اس کے جسم کی ساری حرارت اور رعنائی میرے اندر جذب ہوتی رہی ہے۔ اب میں اس حرارت اور رعنائی کا خلا محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ کی بے پناہ قربانیاں بھی مجھے اس کی طرف کشش کرتی تھیں لیکن ثروت کی محبت اس کانٹے کی طرح تھی جو جسم کے اندر ٹوٹ چکا تھا۔ ایک بار تکلیف برداشت کرکے اس کانٹے کو نکالا جانا ضروری تھا۔

لیکن یہ سب کچھ تو تب ہوتا جب میں اپنے مہلک حالات کے گھیرے سے نکل سکتا۔ ابھی مجھ پر صرف موت کا پہرا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والے چار پانچ دنوں میں میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر جارج کے ساتھ میرا مقابلہ ہوا تو یہ یادگار اور بہت خوفناک ہوگا۔ مغنیہ کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ گیت کے آخری مرحلے میں تھی۔

ہمارے آنسو بھی تمہارے دامن پہ نہ بہہ سکے
افسوس یہ ہے کہ تمہیں الوداع بھی نہ کہہ سکے
اور دل میں بے شمار باتیں لئے
کچھ دکھی برساتیں اور بے چین راتیں لئے
یادوں کی جھولی میں چند ادھوری ملاقاتیں لئے
ہم تم سے دور جانے پر مجبور ہوئے
ہاں بہت دور ہوئے

...... بہت جلد اس گنبد نما وسیع و عریض چیمبر میں مجھے پہچان لیا گیا۔ بیشتر لوگ اپنی دلچسپ مصروفیات چھوڑ کر میری طرف آ گئے۔ ان میں راج بھون کے حکام تھے۔ شاہی مہمان اور ان کی بیگمات و ساتھی خواتین تھیں۔ حتیٰ کہ رقاصائیں اور ملازمین وغیرہ بھی مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور میرے گرد اکٹھے ہونے لگے تھے۔

یہ صورت حال پانڈے کو بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوگ میرے گرد اکٹھے نہ ہوں لیکن وہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ سب کے سب معززین میں سے تھے۔ پانڈے انہیں تو کچھ نہ کہہ سکا مگر رقاصاؤں اور دیگر ملازمین پر بگڑنے لگا۔ ”آپ لوگن کیا کرتے ہو، یہ تماشا نا ہیں۔ چلیں اپنے اپنے کام کریں۔ پیچھے ہٹ جائیں۔“

میرے ہاتھوں کی جلد سینڈ بیگ کی مار سے سیاہ ہوچکی تھی۔ سوکھے چمڑے کی طرح کھردری اور سخت۔ ایک گوراچٹا چودھری نما شخص آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ”سنا ہے تم خالی ہاتھ سے بندے کی کھوپڑیا توڑ سکت ہو؟“

اس کا ساتھی بولا۔ ”مجھے پتا ہے، تم اس سے کس کی کھوپڑیا تڑانا چاہت ہو۔“

”کیا بکواس ہے؟“ پہلا شخص بولا۔

دوسرے نے کہا۔ ”معشوقہ کے لئے پتنی کو مروانا بڑا پرانا رواج ہے اور پتنی کھوپڑیا ٹوٹنے سے مرے، یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے۔“

”مجھ کو لگت ہے کہ تم اپنے گھریلو حالات یہاں بیان کر رہے ہو۔“ پہلے شخص نے کہا اور بھنایا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رنجیت پانڈے جھلا کر مشیر خاص اوم پرکاش سے بولا۔ ”میں اسی لئے کہوت ہوں جناب! یہ سیراب ختم کیجئے۔“

اس سے پہلے کہ مشیر خاص جواب میں کچھ کہتا، ایک نوجوان امیر زادہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے کیمرے سے کھٹا کھٹ میری دو تین تصویریں اُتار لیں۔ ایک تصویر اس نے خاص طور سے میرے ہاتھوں کی اُتاری تھی۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک شخص جو کوئی امیر کبیر مراٹھی سیٹھ لگتا تھا، آگے بڑھا اور شرابی لہجے میں کیمرے والے کو ڈانٹ کر بولا۔ ”یہ کیا ناٹک ہے بھئی۔ یہ سالا کوئی قومی ہیرو ہے جس کے فوٹو اُتار رہے ہو؟ یہ اپرادھی ہے اور جوتوں کا حق دار ہے۔ اگر اس کی فوٹو ہی اُتارنی ہے تو تب اُتارنا جب سُولی پر ٹانک کر اس کی ہڈیوں کا چُورا کیا جاوے گا۔ کتا...... ذلیل۔“

”اپنا منہ سنبھال کر بات کرو۔“ میں نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔

سیٹھ نما شخص آگے بڑھا اور اس نے بالکل غیر متوقع طور پر ایک زور کا مکا میرے منہ پر رسید کیا۔ میں بے خبر تھا۔ اچھی خاصی چوٹ لگی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ بے ساختہ میرا دایاں ہاتھ گھوما۔ غالباً سیٹھ کو بھی امید نہیں تھی کہ اتنا فوری اور ایسا سخت جواب ملے گا۔ حالانکہ میں نے زیادہ زور کا ہاتھ نہیں مارا تھا پھر بھی وہ شخص ڈکراتا ہوا پیچھے کی طرف گیا اور حوض میں گر گیا۔ وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ ایک دم غوطے کھانے لگا۔ دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائیں اور اسے سنبھالا۔ اس کے ہونٹوں سے خون جاری تھا۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ گارڈز نے مجھے گھیرا ڈال لیا اور شرابی سیٹھ کو بھی سنبھال کر مجھ سے دور لے گئے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے اس بجے تلے مکے نے سیٹھ کا دم خم ختم کر ڈالا تھا اور ساتھ ہی اس کا نشہ بھی ہرن ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک شخص پکار کر بولا۔ ''جارج گورا صاحب اس طرف آ رہے ہیں۔'' یہ سن کر میڈم صفورا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولی۔ ''یہ شخص جسے تم نے گھونسا مارا ہے، جارج صاحب کے کلوز فرینڈز میں سے ہے۔ جارج کو پتا چلا تو وہ پھڈا کرے گا۔''

رنجیت پانڈے نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مشیر خاص اوم پرکاش مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یہاں سے نکلنا چاہئے ورنہ معاملہ خراب ہو جاوے گا۔ چلو اس طرف سے آ جاؤ۔''

اس نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور مجھے وہاں سے نکلنے کو کہا۔

ہم ''جنت ارضی'' کی خوش گوار حرارت سے نکل کر دروازے میں داخل ہوئے اور ایک طویل راہداری سے گزر کر سیدھے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کھلی جگہ پر پہنچ کر عجیب سا احساس ہوا۔ یہاں سرما کی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سہ پہر کا وقت تا جبکہ ابھی ہم جنتِ ارضی والے کمپاؤنڈ کے اوپر تاروں بھرا آسمان دیکھ رہے تھے اور چاند کی چاندنی گنگناتی آبشاروں کو منور کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے پچھلے آدھ گھنٹے سے ہم جاگتی آنکھوں کے ساتھ خواب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں فوراً گھوڑا گاڑیوں میں بٹھایا گیا اور وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

جارج کے ساتھ ایک ممکنہ ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا، جارج بہت غصے میں وہاں پہنچا تھا اور اس نے مسلح گارڈز کو سخت بُرا بھلا کہا تھا جن کے ہوتے ہوئے سیٹھ کے ساتھ میرا جھگڑا ہوا اور میں اسے ایک شدید ضرب لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ گھوڑا گاڑیاں راج بھون کا وسیع احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھیں۔ دور بائیں

طرف ہمیں وہ بلند بالکونی نظر آ رہی تھی جہاں چند دن پہلے رتنا دیوی کے ہاں بچے کی پیدائش کا جشن منایا جا رہا تھا اور میں نے عمران کے ہمراہ، اس بالکونی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے جشن کو درہم برہم کیا تھا۔ وہاں شاید ہماری چلائی ہوئی گولیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔

پھر وہ مین دروازہ دکھائی دیا جہاں سے میں اور عمران اندھا دھند بھاگتے ہوئے فرار ہوئے تھے اور پانڈے کا...... ہم شکل ''چچازاد'' ہمارے پیچھے آیا تھا۔ ہم گیٹ سے باہر نکلے تو یہاں ایک اور ہی منظر دکھائی دیا۔ گیٹ کے باہر راستے کی دونوں جانب سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ یہ زیادہ تر مسلمان نظر آتے تھے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ سب لوگ مجھے یہاں دیکھنے کے لئے جمع ہیں۔ میڈم میرے ساتھ ہی گاڑی میں موجود تھی، وہ بولی۔ ''یہ دیکھو، تمہاری للکار نے کام دکھایا ہے۔ زرگاں کے ایک بڑے طبقے نے تمہیں اپنے خیالوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تمہاری ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہیں۔''

پانڈے کے چہرے پر برہمی تھی۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں گاڑی کی کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا دیئے۔

باہر لوگوں کا شور تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے۔ گارڈز انہیں راستے سے ہٹانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ گرج برس رہے تھے اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش بوڑھے شخص کا سرخ و سپید تمتمایا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ جوش کے سبب اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں...... وہ چلا کر بولا۔ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں...... فتح تمہاری ہو گی۔ اللہ مدد کرے گا۔ تم جیتو گے......'' وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے عقب میں ایک گارڈ نمودار ہوا۔ اس نے بوڑھے شخص کو کالر سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور پیچھے گھسیٹ لیا۔ تب مزید دو افراد کے چہرے نمودار ہوئے۔ وہ بھی شکلوں سے مسلمان ہی لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لئے محبت اور خیر خواہی کی بلند لہریں تھیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک جوشیلا رنگ تھا۔ ان افراد کو بھی گارڈز نے عقب سے کھینچ کر گاڑی سے دور ہٹا دیا۔

اس کے بعد شاید کچھ لاٹھیاں وغیرہ بھی چلیں۔ بھگدڑ کے آثار نظر آئے اور گاڑی متحرک ہو کر آگے بڑھی۔ ''تیز چلاؤ۔'' گاڑی کے اندر سے رنجیت نے کرخت لہجے میں کوچبان کو حکم دیا۔ گاڑی نے رفتار پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون سے دور آ گئی۔ اب

وہ تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ میڈم صفورا نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ رنجیت پانڈے کے سامنے اس نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ پانڈے طیش سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے اسی جگہ شوٹ کر دیتا اور شوٹ کرنے کے بعد بھی میری لاش پر گولیاں برساتا رہتا۔ یہ بات وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر مجھے یہاں آناً فاناً شہرت ملی ہے اور لوگوں نے مجھے جارج کا خطرناک مدِمقابل سمجھنا شروع کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں نے نل پانی کی لڑائی میں اسے نیچا دکھایا ہے۔ یہ بات اب شاید کسی سے بھی چھپی نہیں رہی تھی کہ دیوان کے اندر ہونے والی لڑائی میں رنجیت پانڈے نے ہوشیاری سے مین سوئچ آف کر کے اندھیرا کیا تھا اور موقع سے کھسک کر اپنی جان بچائی تھی۔

میڈم کی رہائش گاہ لال بھون میں واپس پہنچ کر میں عجیب اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ میرے ذہن میں بار بار ہاشو کی شبیہہ اُبھر رہی تھی۔ اس کا کردار عجیب ڈھنگ سے سامنے آیا تھا۔ وہ گونگا نہیں تھا اور گونگے کے طور پر ایک مدت سے مختار راجپوت کے گھر میں مقیم تھا۔ اس پر راج بھون کی طرف سے بہت الزامات لگائے جا رہے تھے اور یہ نہایت سنگین الزام تھے۔ ہاشم عرف ہاشو خود اعتراف کر رہا تھا کہ جو زہر کے پیکٹ ہمیں دکھائے گئے، وہ اسی کے تھے اور وہ ان سے بہت سے لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سب کے سامنے برملا کہا تھا کہ اگر ابھی اس کی زندگی باقی ہوئی اور اسے آزاد فضا میں پہنچنا نصیب ہوا تو وہ پھر یہی کچھ کرے گا جو اس نے اب کیا ہے۔

میری گہری سوچ اور فکرمندی عمران کو بھی متاثر کر رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''کس فکر میں کھو گئے ہو جگر؟''

''وہی ہاشو والا معاملہ......'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا...... اس پیکٹ میں ویسا ہی زہر تھا جیسا سلطانہ کے پاس پڑیا میں تھا۔''

''ہاں...... یہ بات تو واقعی غور کرنے والی ہے مگر اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ سلطانہ کے پاس وہ پڑیا ملنے کا مطلب خدانخواستہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ ہاشو کے کاموں میں شریک ہے یا اس کے مقصد سے جڑی ہوئی ہے۔''

''پھر بھی ذہن میں وسوسہ تو پیدا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور وسوسوں کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وسوسہ ہی رہنا تھا کہ ہے یا نہیں۔ ویسے یار! مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ حکیم لقمان کی وجۂ شہرت اس کی قابلیت تھی یا پھر یہ محاورہ تھا۔''

میں نے قالین پر لیٹ کر اپنا سر بازو کے تکیے پر رکھا اور آنکھوں بند کر لیں۔ فکرمندی دل و دماغ میں سرایت کر رہی تھی۔ کہیں سلطانہ کا تعلق سچ مچ تو ایسے لوگوں سے نہیں تھا جن کا مذہب اور عقیدہ صرف اور صرف خوں ریزی ہوتا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی سوچ ذہن میں پال سکتی تھی؟ ذہن نے فوراً جواب دیا...... نہیں، وہ ایسی نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ناسمجھی کے سبب کسی کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہو۔ کسی اَن چاہے دھارے میں بہہ گئی ہو۔ ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں تھا۔ شاید میں واقعی ایک شوہر کی حیثیت سے اسے پیار کرنے لگا تھا۔ اس کے اچھے بھلے کی فکر کرنے لگا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر تشویش کی یہ لہریں کیوں میرے رگ وپے میں ہلچل مچا رہی تھیں۔

ہاشو کا کردار کسی طور بھی قابلِ تعریف نہیں تھا، بالکل جیسے مالا کی دادی ساس کا کردار قابلِ تعریف نہیں تھا۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا آج عمران نے بھرے دربار میں حکم، اس کے مصاحبوں، پنڈتوں اور عاملوں کا منہ بڑی خوب صورتی سے بند کیا تھا۔ انتہا پسند کس جگہ موجود نہیں ہیں...... ہاں کس جگہ موجود نہیں ہیں۔

میں وہیں لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے کانوں میں عمران اور ایک لڑکی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گوری نامی یہ لڑکی ہماری دو خادماؤں میں سے تھی۔ پارسن ہونے کے باوجود یہ گوری چٹی اور قبول صورت تھی۔ عمران اکثر اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ عمران کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہو اور وہ توجہ نہ دے...... وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور یہی نہیں، اس کی گفتگو کی مقناطیسی طاقت کسی کو اپنے جال سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ یہ گوری نامی لڑکی ان بے دام کی کنیزوں میں سے تھی جو اپنے مالکوں کی ہر ''قسم'' کی خدمت کے لئے ہر وقت اور ہر جگہ تیار رہتی ہیں...... عمران اشارہ بھی کرتا تو وہ اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی اور اسے خوش قسمتی بھی سمجھتی لیکن وہ تو صرف وقت گزاری کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بڑے خلوص سے لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں ایک امراؤ جان ادا ہوئی تھی یا پھر اب وہ ہے جو ایسی دھانسو آنکھیں رکھتی ہے۔

پھر وہ بولا۔ ''لیکن گوری! ایسی بڑی بڑی لاجواب آنکھیں رکھنے کے باوجود تم کپڑے ٹھیک سے استری نہیں کرتی ہو۔ اب دیکھو، تم یہ جو پینٹ استری کر کے لائی ہو، یہ اوپر سے اب بھی سلوٹوں والی ہے۔''

وہ ہکلائی۔ ''دراصل...... اوپر سے...... آپ کا پتلون استری کرتے

ہوئے ہام کوشرم آتا ہے......"

"ہائیں، یہ کیابات ہوئی؟"

"بس جی...... پہلے ایسا نہیں تھا، پراب ایسا ہوتا ہے۔"

"یہ کیا پہیلی ہے...... کیا کوئی بھی پتلون استری کرتے ہوئے ایسا ہوتا ہے؟"

"ناہیں جی ناہیں...... بس آپ کا پتلون۔" وہ کسی دوشیزہ کے انداز میں ہنسنے لگی۔

"پھر کیا کرتی ہو؟"

"ہام آنکھیں بند کر کے استری پھیرتا ہے۔"

"وہ تو پتلون دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے۔"

"آپ ہام کو بہت اچھا لگتا، ہام آپ کے لئے یہ گلاب کلی لایا۔" پھر اس نے شاید اپنے لباس کے اندر سے کوئی کلی نکال کر عمران کو دی۔

عمران نے کہا۔ "سچی بات ہے کہ تم بھی ہام کو بہت اچھا لگتا ہے۔ ہام تم سے شادی کرنا مانگتا ہے لیکن اگر ہام شادی کرنا مانگتا تو ہمارا پہلا دو وائف ہمارا سر توڑنا مانگتا۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ نے شادی ناہیں بنائی۔"

"ہام نے کہاں بنائی، ہام سے زبردستی بنائی گئی اور ایک بار نہیں دوبار۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "ہام کا اتنا قسمت کہاں کہ ہام آپ سے شادی بنانے کا سوچے۔ ہام تو بس آپ کا خوشبو سونگھ کر پیپی ہو جاتا۔" اس کے لہجے میں نوخیزی اور الھڑپن کی جھلک تھی۔

"اوہ، خوشبو سے یاد آیا کہ کل غسل خانہ ٹھیک سے صاف نہیں ہوا تھا۔" عمران نے کہا۔

"اوہ سوری! ہام ابھی کرتا، بالکل شیشہ بنادیتا۔" اس نے کہا۔

اس کے قدموں کی آواز آئی۔ یقیناً وہ عمران کو اپنی چال کی دل ربائی دکھاتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی گئی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ عمران میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد میں نے کروٹ بدلی تو میری نگاہ غسل خانے کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تیزی سے اُٹھنا پڑا۔ مجھے غسل خانے میں گوری فرش پر گری نظر آئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پکار کر پوچھا اور تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھا۔

عمران بھی اُٹھ بیٹھا تھا۔ "رک جاؤ۔" مجھے اپنے عقب سے عمران کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں اس وقت تک غسل خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یکا یک میرے پاؤں کے نیچے سے قالین نکل گیا۔ قالین کو زور سے پیچھے کی طرف کھینچا گیا تھا۔ میں اوندھے منہ عین دروازے کے سامنے گرا۔ قالین کھینچنے والا عمران تھا۔

عمران لپکتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں باتھ روم میں دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ گوری گیلے فرش پر پڑی تھی...... اور مرچکی تھی...... اسے غسل خانے کی ٹونٹی سے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کا گورا چٹا ہاتھ ابھی تک ٹونٹی پر تھا اور عجیب انداز سے مڑا ہوا تھا۔

"آگے نہ جانا۔" عمران نے ایک بار پھر وارننگ دی۔ "نلکوں میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔"

عمران کی زوردار آوازیں سن کر دو گارڈز کھڑکی کے سامنے آ گئے تھے۔ "کیا ہوا سر؟" ایک نے بلند آواز میں پوچھا۔

"یہاں کرنٹ ہے۔ مین سوئچ بند کرو۔"

گارڈز دوڑتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہوگئیں چند سیکنڈ بعد بجلی کی رو منقطع ہوگئی۔ ہم غسل خانے میں گئے۔ گوری کو اُٹھا کر کمرے میں لائے۔ اس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ پھر بھی ہم دونوں نے اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منیجر مدن اور درجن بھر گارڈز کمرے میں پہنچ گئے۔

منیجر مدن نے گوری کو طبی امداد کے لئے لے جانا چاہا مگر جلد ہی اسے بھی اندازہ ہوگیا کہ وہ مرچکی ہے۔ صرف چند منٹ پہلے عمران کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرنے والی اور دلنشیں انداز میں مسکرانے والی یہ نوخیز ملازمہ اب مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" منیجر مدن نے ہکلا کر پوچھا۔

"یہ ہوا نہیں کیا گیا ہے۔ نلکوں میں جان بوجھ کر کرنٹ چھوڑا گیا ہے۔" عمران نے پورے وثوق سے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ دوسرے غسل خانوں میں بھی کرنٹ آ رہا ہو۔" مدن بولا۔

"بالکل نہیں۔ تم چیک کر کے دیکھ لو۔"

میں اور عمران منیجر مدن کے ساتھ دوبارہ غسل خانے میں آئے۔ ایک منٹ کے اندر اندر ساری صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ غسل خانے کے بلب کے پیچھے سے ایک تار نکالا گیا تھا اور اسے ایک پائپ کے پیچھے پیچھے چھپا کر نہانے والی ٹونٹی تک پہنچایا گیا تھا۔

"یہ اس لمبے گارڈ کا کام ہے جسے تم لوگ لمبو کہتے ہو۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"وہ کیسے؟" مدن نے پوچھا۔

"کل میں نے نہانا تھا مگر پانی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ پانی نہیں آ رہا...... وہ دو تین اوزار لے کر غسل خانے میں گیا اور چار پانچ منٹ وہاں رہا۔ بعد میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں نے نہانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی بندے کا کام ہے بلکہ اس نے پانی بھی جان بوجھ کر بند کیا ہوگا۔"

گوری کی نیلگوں لاش کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی سراسیمگی تیرنے لگی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ ہم پر دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ ہم دونوں اور بالخصوص "میں" اس حملے کا نشانہ تھا۔ کچھ لوگ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے آقا و مربی جارج گورا کے سامنے آؤں اور اس سے "مرو یا مارو" کی فائٹ کروں...... کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا بھی ہانپی کانپی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اسے سارے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو تین گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں اور ان میں وہ دراز قد گارڈ بھی شامل ہے۔

یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ میڈم صفورا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ "میں اسی لئے تم سے بار بار کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ خاص طور سے فائٹ کے روز تک۔"

منیجر مدن، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اگر یہ خبر باہر نکلی تو لوگن میں بڑا غم و غصہ پیدا ہووے گا۔ عام لوگن میں پہلے ہی یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ کچھ بڑے لوگن ہرگز ناہیں چاہتے کہ سامبر کا مقابلہ ہو۔ وہ تابش صاحب کو راستے سے ہٹانے کا جتن کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں بھون کے معاملات کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ خبر باہر نہ پھیلے تو پھر یہاں موجود گارڈز اور ملازموں کو کسی صورت باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔ خاص طور سے لڑکیوں کی ٹرینر گیتا مکھی کو۔"

"یہ سب کچھ میرے ذہن میں بھی آ رہا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ کرتی ہوں۔" میڈم صفورا نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

چوکس گارڈز ہمارے اردگرد آ موجود ہوئے۔ یہ سب کے سب میڈم صفورا اور منیجر مدن کے انتہائی قابلِ اعتماد لوگ تھے لیکن کسی کے دل میں کس نے جھانک کر دیکھا ہوتا ہے؟ ان لوگوں کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور انہوں نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی

تھیں۔ واقعی ایک محافظ کے لئے قاتل بننا کتنا آسان ہوتا ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ "میرا تو دل چاہتا ہے ان سارے خدائی فوجداروں کو اپنے اردگرد سے ہٹا دوں۔ یہ سیکیورٹی دے رہے ہیں اور سیکیورٹی رسک بھی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر تو ہمارا خون ویسے ہی خشک ہو جائے گا اور خون خشک ہو گیا تو ہمار پسٹن یعنی دل جام ہو جائے گا۔"

میں اور عمران کمرے میں آ گئے اور دھات کا بنا ہوا سلائیڈنگ دروازہ بند کر دیا۔ میں نے عمران کو تشکر کی نظروں سے دیکھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولا۔

"ایک بار پھر تم نے مجھے خودکشی کرنے سے بچایا ہے۔"

"خودکشی؟"

"ہاں...... آج گندم میں رکھنے والی گولیاں نہیں تھیں...... بجلی کا کرنٹ تھا۔ میں تو بھاگا جا رہا تھا گوری کو تھامنے کے لئے۔ تم نے میرے نیچے سے قالین کھینچا اور مجھے گرا دیا۔ بڑی بروقت کارروائی تھی۔ آئی رئیلی اپری شیٹ یو۔"

"لگتا ہے تم پر میڈم کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ تم اردو میں بھی شکریہ ادا کر سکتے تھے۔ شکریہ اردو میں ادا کیا جائے تو خوشی بھی اردو میں ہوتی ہے......" وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا اور مجھے اپنے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ شام کے بعد کا ذکر ہے۔ ہمارے لئے کھانا آیا۔ حسبِ معمول یہ کھانا آٹھ بجے کے قریب آیا۔ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے ہمیں کھانا پہنچانے کا کام ملازمین کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ منیجر مدن خود ہمارے لئے کھانا لاتا تھا۔ اس کھانے کو باقاعدہ چیک بھی کیا جاتا تھا۔ آج اس حوالے سے مزید احتیاط نظر آئی۔ میڈم صفورا خود کھانا لائی۔ ایک ملازمہ نے بڑی ٹرے اُٹھا رکھی تھی اور میڈم اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

کھانے کے دوران میں میڈم ہمارے پاس ہی موجود رہی۔ اس نے کہا کہ دراز قد گارڈ کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں اور ایک دو بندوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں شہر کی صورتِ حال سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ نو تاریخ کو ہونے والے مقابلے کے حوالے سے لوگوں میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارا زرگاں دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف جارج گورا کے حمایتی ہیں اور دوسری طرف تمہارے۔ چھوٹے بڑے جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ دیواروں پر چاکنگ کی گئی ہے اور گلیوں میں کپڑے کے بڑے بڑے بینرز آویزاں کئے جا رہے ہیں۔

''کون کس کی حمایت کر رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ غیر واضح ڈویژن ہے۔'' میڈم نے جواب دیا۔ ''اوور آل یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچانوے فیصد مسلمان تمہاری سائیڈ پر ہیں۔ اس کے علاوہ نچلا طبقہ اور ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کے لوگ بھی تمہاری حمایت کر رہے ہیں۔ دراصل یہ نفسیاتی قسم کی صورتِ حال ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر ایسی سچویشن بن جایا کرتی ہے۔ لوگوں کی دبی ہوئی نفرت اور محرومی مناسب موقع دیکھ کر ابھر آتی ہے اور انہیں اپنے آقاؤں کے خلاف کھڑا کر دیتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن یہ ماحول خطرناک بھی تو ہے۔ یہ کوئی حق و باطل کی جنگ تو نہیں ہے۔ یہ دو بندوں کے درمیان ایک انفرادی مقابلہ ہے۔ اس میں کسی کی پیٹھ بھی لگ سکتی ہے۔ اگر کسی ایسے مقابلے کے ساتھ بہت زیادہ جذبات اور عقیدے وابستہ کر لئے جائیں تو پھر فرسٹریشن بھی بڑی گھمبیر ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن رائے عامہ کا ایک اپنا بہاؤ ہوتا ہے۔ یہ بہاؤ اپنا راستہ خود سلیکٹ کرتا ہے۔ اس کا رخ موڑنا یا اس میں کمی بیشی کرنا بہت جان جوکھم کا کام ہے۔''

کھانا مزے دار تھا۔ لکھنوی طرز کی چٹ پٹی بریانی کے ساتھ دہی پودینے اور ٹماٹر کا رائتا تھا۔ ساتھ میں کھڑے مسالے والا چکن، ماش کی دال اور گرما گرم روٹیاں تھیں...... ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ میڈم کے جانے کے بعد بھی ہم گپ شپ میں مصروف رہے...... ہماری گفتگو کا اہم موضوع آج پیش آنے والا حادثہ ہی تھا۔ کھڑکیوں سے باہر ایک تاریک سرد رات گلی کوچوں کو اپنے نرغے میں لے چکی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی خاموشی اور تنہائی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہر کے باسی شاید آج جلدی سو گئے ہیں۔

......اچانک یوں لگا کہ خاموشی کی اس جھیل میں زبردست شور کے ساتھ سیکڑوں پتھر آ گرے ہیں۔ یکا یک ایک نقارے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی بے شمار دھماکے ہوئے اور مختلف رنگوں کی اَن گنت روشن لکیریں فضا میں بلند ہوئیں۔ کچھ بلندی پر جا کر ان لکیروں میں سے پٹاخے چھوٹے اور آتش بازی کے ہزار ہا رنگ زرگاں کی فضاؤں میں بکھر گئے۔

''اوہ گاڈ! لگتا ہے ساتویں کا جشن شروع ہو گیا ہے۔'' عمران نے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ ساتویں کے جشن کا آغاز تھا۔ زرگاں کا آسمان لاتعداد رنگوں سے جگمگایا اور اس کے گلی کوچوں میں شورِ محشر برپا ہو گیا۔ اس شور میں باجا گاجا تھا، نعرہ زنی تھی اور آتش بازی کے دھماکے تھے۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی میں سے دور کچھ فاصلے پر کسی گھر کی بلند چھت نظر آ رہی تھی۔ اس چھت پر ایک ساتھ کئی انار چلائے گئے۔ ان اناروں میں سے

شرارے فواروں کی طرح پھوٹے اور قرب و جوار کو منور تر کر گئے۔ ان شراروں کی روشنی میں چھت پر مرد و زن رقص کرتے نظر آئے۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ شدید ترین آتش بازی تو قریباً آدھ گھنٹے تک رہی لیکن اس کے بعد بھی یہ کام رکا نہیں۔ ہم کمرے میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھے رہے اور یہ مناظر دیکھتے رہے۔ ایسے ہی مناظر میں نے کچھ عرصہ پہلے نل پانی میں دیکھے تھے۔ اس وقت عمران میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں لیکن آج وہ میرے ساتھ تھا۔ ہم ایک دوسرے کا بازو تھے۔ ایک اور ایک گیارہ کی زندہ مثال کی طرح۔ بے شک ہم دشمنوں کے گھیرے میں تھے اور کل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن آج ہمارا تھا...... اور ہم اس ''آج'' کو اس کی ساری خطرناکیوں کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ ایک میٹھا میٹھا درد بھی تھا، کچھ تیز تیکھے اندیشے بھی تھے۔ کھڑکی سے باہر کوریڈور کی دیوار پر فلمسٹار ریکھا کی تصویر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے مگ تھے۔ عمران سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لے رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر شعلے دکھائی دیئے، ان شعلوں کے درمیان ایک بندر اچھل کود کر رہا تھا...... اس کی دُم میں آگ لگی تھی۔ دراصل یہ ایک تنومند شخص تھا جس نے ہنومان کا روپ دھارا ہوا تھا اور جو شعلے نظر آ رہے تھے، وہ راون کی لنکا کے جلنے کے تھے۔ بھون کے وسیع و عریض گراسی لان میں یہ ناٹک رچایا جا رہا تھا۔ یہ ہندو دیومالا کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ تھا۔

عمران نے ایک آہ بھری اور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''کل منیجر مدن کہہ رہا تھا، دیومالا کے واقعات کو ناٹک کے طور پر پیش کرنے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور بھگوان کی طرف سے روزی میں برکت ہوتی ہے اور منیجر مدن ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔'' میں سمجھ گیا کہ عمران کیا کہنا چاہ رہا ہے...... وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی کی بات کر رہا تھا۔ اچانک مجھے آج سہ پہر والا سارا واقعہ یاد آ گیا۔ عمران نے جس طرح بھری محفل میں حکم اور اس کے مصاحبوں کو لاجواب کیا، وہ یادگار تھا...... اس کے علاوہ اس موقع پر عمران کے شوخ چہرے پر جو بے پناہ سنجیدگی دکھائی دی، وہ بھی ایک خاص الخاص چیز تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کے ڈسے ہوئے ہو جس کے منظر آج حکم کے دربار میں نظر آئے...... اور ہاشو اور مالا کی دادی ساس جیسے لوگ

جس کے نمائندے ہیں۔''

''میں تو سمجھتا ہوں جگر کہ ساری انسانیت ہی ایسے مہلک واہموں کی ڈسی ہوئی ہے۔ کوئی تھوڑا متاثر ہے، کوئی زیادہ اور کوئی بہت زیادہ۔''

میں نے بغور عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نشست سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ خوبصورت آنکھوں میں کھوئی کھوئی کیفیت تھی۔ زرگاں میں ہونے والی آتش بازی کے رنگ اس کے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''عمران! ہماری دوستی کو کئی سال ہو گئے ہیں لیکن تم آج بھی میرے لئے ایک پہیلی ہو۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسا کیوں ہے یار؟''

''تم اکیلے ہی تو میرے بارے میں بے خبر نہیں ہو۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

''لیکن تم مجھے اپنا قریبی دوست اور ہمدم کہتے ہو۔ کیا قریبی دوست اور ہمدم اسی طرح بے خبر ہوتے ہیں؟''

''یار! کیوں گڑے مُردے اکھاڑنا چاہ رہے ہو؟ بہت سے زخم چھل جائیں گے، مہینوں تک خون رستا رہے گا۔'' وہ پھر مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ میں حزن کی آمیزش تھی۔

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! صرف چار دن بعد میری زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ رُونما ہونے والا ہے۔ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی موت کی لڑائی لڑنے والا ہوں جسے یہاں شکتی کا دیوتا کہا جاتا ہے...... وہ دیوتا ہے یا نہیں، یہ علیحدہ بات ہے لیکن یہ بات تو تم بھی مانو گے کہ وہ ایک نہایت خطرناک حریف ہے۔ چار دن بعد میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے یار! اور اگر واقعی میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو کیا میں تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی حسرت دل میں لے کر ہی چلا جاؤں گا؟ کیا تمہیں یہ سب اچھا لگے گا؟''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ کچھ بولے گا لیکن وہ بولا نہیں۔ کتنی ہی دیر تک کمرے میں گھمبیر خاموشی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر آتش بازی کے رنگ بکھرتے رہے اور باجے گاجے کا مدھم شور ہمارے کانوں تک پہنچتا رہا۔ پھر عمران نے نیا سگریٹ سلگایا اور بغیر کسی تمہید کے ایکا ایکی بولنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز گم گشتہ یادوں کے بوجھ سے لدی ہوئی تھی۔ اس کے الفاظ دھیرے دھیرے میرے سامنے ایک کہانی کی پرتیں کھولنے لگے۔ ایک گداز روداد کے پیچ و خم میرے سامنے نمایاں ہوتے چلے گئے۔ واقعات کا ایک جہاں سا آباد ہو گیا۔ میں عمران کی اس روداد کو اپنے الفاظ میں قارئین کے سامنے بیان

کر رہا ہوں۔ اس میں پچانوے فیصد باتیں عمران کی کہی ہوئی ہیں۔ جہاں جہاں خلا تھا، وہ میں نے اپنے تصور سے پُر کیا ہے۔ اس میں جو انوکھا پن ہے، وہ غیر حقیقی نہیں۔ اس کی سائنسی بنیاد موجود ہے۔ نفسیات کے ماہر بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی کیمسٹری کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے۔ عمران کی کہانی کچھ یوں ہے۔

وہ شمالی پنجاب کا ایک گاؤں تھا۔ برسات کی ایک طوفانی رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور پھر گھن گرج سے...... در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ہر جاندار و بے جان شے سہمی ہوئی نظر آتی تھی اور ان سب سے زیادہ سہمے ہوئے وہ دو نفوس تھے۔ ایک تنہا کچے گھر میں ایک ماں اور اس کا بیٹا۔ چاندی بالوں والی ماں کی عمر قریباً پچاس سال رہی ہو گی۔ بیٹا قریباً سولہ سال کا تھا۔ اس خوفناک طوفانی رات میں ماں نے بیٹے کو یوں بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا جیسے مرغی چوزے کو پروں سے ڈھانپتی ہے۔

یہ واقعی بہت خوفناک رات تھی۔ یوں لگتا تھا کہ مکان مسمار ہو جائیں گے اور درخت جڑوں سے اکھڑ جائیں گے۔ آسمان اپنے ذخیروں کا سارا پانی زمین پر الٹ دینا چاہتا تھا اور ہوائیں اپنی ساری سرکشی آزما لینا چاہتی تھیں۔ اچانک بڑے زور سے بجلی چمکی۔ اس کا لشکارا گھروں کے اندر تک آیا پھر ایسا کڑاکا سنائی دیا کہ سینوں میں دل دہل گئے۔ عورت نے چلا کر اپنے جواں سال بچے کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

''یا اللہ خیر...... یا اللہ خیر...... لگتا ہے بجلی پنڈ میں گری ہے۔'' اس نے بے تاب ہو کر کہا۔

''نہیں امی، کہیں کھیتوں میں گری ہو گی۔'' لڑکا بولا۔

''کھیتوں میں نہیں پنڈ میں گری ہے۔ تجھے پتا ہی ہے، سارے لوگ کہتے ہیں کہ بجلی چودھری کے پتر نیاز پر عاشق ہے۔''

''نہیں امی! یہ باتیں ہوتی ہیں۔ ماسٹر جی کہتے ہیں کہ ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہئے۔ بجلی تو اس لئے چمکتی ہے کہ ایک بادل پر جمع کا چارج ہوتا ہے، دوسرے پر تفریق کا...... جب یہ دونوں بادل......''

''اچھا...... اچھا بس کر...... اب اپنی تقریر شروع نہ کر دینا...... کچھ اللہ توبہ کر...... آیت الکرسی آتی ہے نا...... بس وہ پڑھتا رہ......''

لڑکے کے لئے ماں کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا اور اس نے منہ میں ورد شروع کر دیا۔

بجلی تڑپتی رہی، بادل دھاڑتے رہے اور پانی برستا رہا۔ ماں بیٹا دیے کی لو میں ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے رہے۔ یہ ایک طوفانی رات تھی اور طوفانی راتوں کی ہلاکت خیزیاں صبح کے وقت عیاں ہوتی ہیں۔ اس طوفانی رات کی صبح بھی اس ماں بیٹے کے لئے ایک بڑی مصیبت لے کر آ رہی تھی۔

بیٹے کا نام عمران تھا۔ اسے پیار سے عمو کہا جاتا تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا تھا۔ اس سے پہلے اس کے چار بہن بھائی ایک سال کی عمر کے اندر ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس کی ماں بس اسے پروان چڑھا سکی تھی اور اب وہ اس کا واحد سہارا تھا۔ پانچ چھ سال پہلے عمو کا والد بھی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا کاشت کار تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی تاہم اس زمین کو اس نے اتنے اچھے طریقے سے استعمال کیا تھا کہ اس چھوٹے سے کنبے کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ یعنی عمو کی والدہ اس زمین کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ اس نے گھر چلانے کے لئے یہ زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ کچھ اناج اور کچھ پیسے مل جاتے تھے جس سے وہ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ اس کا عمران پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن جائے، ایک افسر، ایک ڈاکٹر یا پھر ایسا ہی کوئی قابلِ عزت شخص۔ وہ اسے اپنا پیٹ کاٹ کر پڑھا رہی تھی۔ وہ ایک مثالی ماں تھی۔ ایثار، شفقت اور وفا کا پیکر۔ عمو کے لئے وہ ایک ایسے شجر سایہ دار کی طرح تھی جس کے تلے وہ دنیا کے ہر رنج و غم سے دور تھا۔ اس کی زندگی کا محور صرف اور صرف اس کی ماں تھی۔

اس طوفانی شب کی صبح بھی ماں اسے اسکول بھیجنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کی کتابیں سنبھالنے کے بعد رومال میں اس کا کھانا باندھ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر جا کر عمو نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اپنے سامنے اونچی پگڑی والے چودھری سجاول اور اس کے منشی اکبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

چودھری سجاول نے عمو کے سر پر پیار دیا اور پھر کھنگورے مارتا ہوا اندر آ گیا۔ عمو کی ماں نے گاؤں کے چودھری کو اپنے سامنے دیکھ کر جلدی سے اوڑھنی درست کی اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

''چودھری جی! ہمارے اتنے بھاگ کہ آپ ہمارے گھر میں آئے۔ یہاں تو ایسی کرسی بھی نہیں کہ آپ کو بٹھا سکیں۔''

چودھری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''بھین شریفاں! میں آج یہاں چودھری نہیں

سوالی بن کر آیا ہوں۔''

''ہائے میں مرگئی چودھری جی...... یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ہم غریبوں کی اتنی حیثیت کہاں کہ آپ ہم کو کوئی ضرورت بتائیں۔''

''بس آج کوئی ایسی ہی بات ہے بھین شریفاں۔'' چودھری نے خلافِ معمول عجز کے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ ''تمہیں پتا ہے، رات کو کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا ہے چودھری جی۔'' عمو کی ماں نے چونک کر پوچھا۔ یقیناً اسے رات کو سنائی دینے والا بجلی کا زبردست کڑکا یاد آ گیا تھا۔

چودھری نے بتایا۔ ''حویلی کے پچھواڑے، باہر والی دیوار کے بالکل پاس بجلی گری ہے۔ دو بھینسیں مرگئی ہیں، بوڑھ کا درخت بھی جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔''

''ہائے میں مرگئی۔'' عمو کی والدہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے رات کو ہی لگا تھا کہ بجلی پنڈ کے اندر ہی کہیں گری ہے۔''

''بس بھین شریفاں! بال بال بچے ہیں۔ ایویں آٹھ دس قدموں کا فرق رہ گیا۔ ساتھ ہی تو وہ کمرے ہیں جہاں سوتے ہیں ہم...... بس سب وہی پتر نیاز والا معاملہ ہے۔ پچھلے مہینے میں اسے گجرات کے قریب شہنشاہ پیر کے مزار پر بھی لے کر گیا تھا۔ وہاں کے گدی نشین پیر صادق شاہ نے بھی یہی کہا ہے۔ نیاز پہلوٹی کا بچہ ہے اور بجلی اس پر عاشق ہے۔ یہ اس کو کسی بھی وقت نقصان پہنچا دے گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، نیاز کے بڑے تایا کی جان بھی اسی طرح گئی تھی۔ اللہ نہ کرے...... اللہ نہ کرے اس کی زندگی کو بھی......'' چودھری کی آواز بھرا گئی اور وہ پگڑی کے پلو سے نادیدہ آنسو خشک کرنے لگا۔

''آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکال رہے ہیں۔ چودھری جی؟ رب نہ کرے چھوٹے چودھری پر کوئی آنچ آئے۔ ہماری جندگی، ہمارے بچوں کی جندگی چھوٹے چودھری کو لگ جائے۔''

چودھری کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''بھین شریفاں! اللہ تمہاری اور تمہار بچے کی حیاتی لمبی کرے...... میں تم سے بس ایک چھوٹی سی منت کرنے آیا ہوں اگر تم مان لو تو۔''

''آپ حکم کریں چودھری جی۔'' عمو کی والدہ نے کہا۔ ''لیکن پہلے آپ بتائیں آپ کی کیا خدمت کروں...... کوئی لسی پانی، دودھ وغیرہ؟''

چودھری نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”بھین شریفاں! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، پچھلے مہینے کی دوسری جمعرات میں پیر صادق شاہ کے آستانے پر گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پتر نیاز پر سے یہ مصیبت ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کا سر منڈوا کر اسے چولا پہنایا جائے اور کم از کم ایک سال کے لئے مزار کی خدمت کے لئے بھیج دیا جائے۔ اس کا کھانا پینا، سونا سب کچھ وہیں مزار کے اندر ہو۔ میں اس کام کے لئے بالکل تیار تھا لیکن یہاں مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ پتر نیاز کو مہلتی بخار چڑھا ہوا ہے۔ ایک مہینا ہو گیا ہے، بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ نیاز کو مکمل علاج اور آرام کی لوڑ ہے۔ میں نے اس بارے میں پیر صادق شاہ سے بات کی تھی۔ انہوں نے اس کا ایک حل بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا بچہ جو نیاز کی عمر کا ہو اور اپنے ماں پیو کی آخری اولاد ہو، نیاز کی جگہ مزار پر خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے لئے پیر صاحب نے ایک دو شرطیں بتائی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ دس ہزار روپے کا نذرانہ مزار کو دینا پڑے گا۔ یہ سب کچھ تو اتنا مشکل نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ وہ بچہ مل جائے جو نیاز کی جگہ ایک سال کے لئے اپنے گھر والوں سے دور رہ سکے۔“

عمو کی والدہ نے ایک دم چونک کر چودھری سجاول کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یکا یک اَن گنت اندیشے جاگ اُٹھے۔

منشی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”وڈی آپا! اگر تمہارا بیٹا عمو، پتر نیاز کی جگہ لے سکے تو چودھری صاحب اور ہم سب تمہارے بڑے احسان مند ہوں گے۔ پھر عمو کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہو گی۔ ہم اس کا وہاں پورا پورا خیال رکھیں گے۔ تم دو ڈھائی مہینے میں ایک بار وہاں جا کر اس سے مل بھی سکو گی۔“

چودھری نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اگر خود چاہو تو حویلی میں ہمارے مہمان کی طرح رہ سکو گی۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہو گا۔ زمین کی طرف سے بھی فکر کرنے کی کوئی لوڑ نہیں ہو گی۔“

”لل...... لیکن چودھری جی! عمو کے تو دسویں کے امتحان ہونے والے ہیں؟“

”اس کی فکر نہ کرو بھین! اگلے سال اس کو دو جماعتیں اکٹھی پاس کرا دیں گے۔“

”پر چودھری جی! یہ تو...... یہ تو میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا...... کملا ہو جاتا ہے میرے بغیر۔ یہ کیسے رہ سکے گا ایک سال تک گجرات میں؟“

”بھین شریفاں! تم سے کہا تو ہے کہ تم ڈیڑھ دو مہینے بعد جا کر اس سے مل سکو گی۔ ہم بھی پورا دھیان رکھیں گے اس کا۔“ چودھری سجاول کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔ یوں لگتا تھا

کہ وہ عمو کو اپنے بیٹے نیاز کی جگہ گجرات کے اس دور دراز دیہہ میں بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا ہے، اب عمو کو وہاں جانا ہی جانا ہے، پیار محبت سے یا پھر دباؤ سے۔

عمو کی والدہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس اچانک آفت کا مقابلہ کیسے کرے اور گاؤں کے چودھری کو کیا جواب دے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہ آسان معاملہ نہیں ہے اور اسے ٹالنا بھی نہایت مشکل ہو گا۔ چودھری کو اپنے لاڈلے بیٹے پر سے بلا ٹالنے کے لئے کسی کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اسے نیاز کا ایک ہم عمر لڑکا چاہئے تھا اور وہ بھی ایسا جو اپنے والدین کی آخری اولاد ہو اور وہ مزار کا خادم بننے کے لئے رضامند بھی ہو جائیں یہ ساری شرطیں گاؤں میں کہیں اور پوری ہونے کا امکان نہیں تھا۔

عمو کی والدہ، چودھری سجاول اور منشی اکبر میں بات چیت جاری رہی۔ عمو کو کچھ دیر کے لئے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔ مدھم آوازیں عمو کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات چیت میں تلخی آ چکی ہے۔ چودھری سجاول کا لہجہ اب واضح ناراضی لئے ہوئے تھا۔ وہ گاہے بگاہے ان احسانوں کا ذکر بھی کر رہا تھا جو ماضی میں حویلی والوں کی طرف سے عمو کے گھرانے پر کئے گئے تھے۔

عمو کے سینے میں کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہ ماں کے بغیر چند گھنٹے مشکل سے گزارتا تھا۔ اسکول کے بعد گھر کی طرف یوں لپکتا تھا جیسے لوہ چون، مقناطیس کی طرف۔ اگر کسی دن کسی مجبوری کے سبب ماں گھر میں نہ ہوتی تو اسے سب کچھ خالی خالی لگتا، بھوک مر سی جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ چھٹی ہو کر بھی چھٹی نہیں ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد عمو نے دیکھا کہ چودھری سجاول غصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر جا رہا ہے۔ چھوٹے قد کا منشی اکبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمو نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے ماں کو دیکھا، وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ابھی عمو سوچ ہی رہا تھا کہ ماں کے پاس جائے یا نہیں کہ گھر کے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ ماں نے جلدی جلدی آنسو پونچھتے ہوئے عمو کو آواز دی۔ ”دیکھ ذرا باہر کون ہے؟“

عمو نے صحن میں جا کر دروازہ کھولا۔ منشی اکبر پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ منشی اکبر نے عمو کے سر پر پیار دیا اور اندر آ گیا۔ وہ کمرے میں آ کر عمو کی ماں کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں اسے سمجھانے بجھانے لگا۔ ”وڈی آپا! چودھری جی مشکل میں ہیں...... چودھرانی جی کا بھی رو رو کر بُرا حال ہے۔ دیکھو وڈی آپا! میں تمہیں اندر خانے کی بات بتاتا ہوں۔ چودھری جی مجبور ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ ہی نہیں ہے کہ نیاز کی جگہ عمو

کومزار کی خدمت کے لئے بھیجیں۔ ہمارے پنڈ میں اور اردگرد کے پنڈوں میں کوئی اور ایسا لڑکا ملا ہی نہیں جو پیر جی کی بتائی ہوئی شرطوں پر پورا اُتر سکے۔ صرف میاں پور میں ایک ملا تھا مگر وہ لوہار برادری کا ہے۔ پیر جی کی یہ شرط بھی ہے کہ لڑکا کمی ذات کا نہ ہو۔ وڈی آپا! اب یہ بات تو صاف ہے کہ عمو کو گجرات جانا ہی پڑے گا۔ تمہاری رضامندی سے چلا جائے گا تو اس میں اس کا فائدہ ہوگا اور تمہارا بھی۔ چودھری جی تمہیں خوش کر دیں گے۔ دوسری صورت میں تمہارے لئے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ تمہیں پتا ہی ہے تمہاری زمین والے کاغذوں میں تھوڑی سی گڑبڑ ہے۔ پٹواری عاشق بڑا کمینہ بندہ ہے۔ اگر وہ اب تک چپ بیٹھا ہوا ہے تو یہ چودھری جی کی ہی مہربانی ہے۔ نہیں تو اس نے ضرور کوئی نہ کوئی پنگا ڈال دینا تھا......''

عمو کی والدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''پر بھائی اکبر، کاغذوں میں وہ ہیرا پھیری کی بھی تو پٹواری نے ہی ہے...... پورا پنڈ جانتا ہے کہ یہ زمین اللہ بخشے عمو کے پیو کے حصے میں آئی تھی۔ سارے بھائیوں کے انگوٹھے ہیں اور......''

''وڈی آپا! یہ قانونی چکر ہیں، تم نہیں سمجھوگی۔'' اکبر نے تیزی سے بات کاٹی پھر مزید دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اور سچی بات یہ ہے وڈی آپا کہ یہ چودھری لوگ اگر کسی کو تنگ کرنے پر آ جائیں تو پھر ان کے پاس سو طریقے ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر چودھری جی بڑے ماسٹر صاحب کو کہہ دیں کہ اسکول میں سے عمو کا نام کٹ جائے تو کیا کوئی ایسا بندہ ہے جو عمو کی پڑھائی چالو کرا سکے؟ میں بس تمہیں ایک مثال دے رہا ہوں۔''

عمو کی والدہ سسکنے لگیں۔

......ٹھیک پانچ دن بعد چودھری سجاد کی حویلی میں عمو کے سر کے بال مونڈ دیئے گئے اور اسے ایک لمبا چغا پہنایا گیا۔ کلائیوں میں تانبے کے دو کڑے ڈالے گئے اور ایک ایسے تانگے میں بٹھا کر جس کی چاروں طرف کپڑے سے پردہ کیا گیا تھا، اسے گجرات کے اس دور دراز گاؤں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت ماں اسے دیر تک اپنے ساتھ لپٹا کر روئی تھی اور عمو کو بھی یوں لگا تھا جیسے اس کا دل سینے میں سو ٹکڑے ہو گیا ہے لیکن اس نے کوشش کر کے اپنے آنسو روک رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ماں اس کے آنسو دیکھے گی تو اور دکھی ہوگی اور وہ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

شیخوپورہ کے مضافاتی گاؤں سے تانگے کے ذریعے عمران کو پکی سڑک تک پہنچایا گیا۔ وہاں سے بس کا سفر شروع ہوا جو گجرات پر ختم ہوا۔ یہاں سے ایک کھٹارا کار میں نہایت مشکل اور ناہموار راستوں پر سفر کر کے وہ قریباً دو گھنٹے میں ایک دیہہ تک پہنچے۔ اس دیہہ کا بہت

بڑے گنبد والا مزار کافی فاصلے سے ہی نظر آتا تھا۔ عمو کے ساتھ یہاں تک آنے والوں میں منشی اکبر کے علاوہ چودھری کے دو دیگر ملازم بھی تھے۔ وہ عمو کو مزار کے خدمت گاروں کے پاس چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

مزار میں پہنچنے سے پہلے ہی عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے یہاں ایک سال نہیں بلکہ سترہ چاندوں تک رہنا ہے اور یہ قریباً ڈیڑھ سال بنتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی درست نہیں تھی کہ اس کی ماں ہر ڈیڑھ دو مہینے بعد آ کر اس سے ملاقات کر سکے گی۔ یہ پیر صاحب کی مرضی پر تھا کہ وہ عمو کے کسی رشتے دار کو کب اس سے ملنے کی اجازت دیتے ہیں۔

مزار کا کرتا دھرتا پیر مخدوم صادق شاہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی، اچھی صحت اور خوراک کی وجہ سے وہ پینتیس کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا، لمبے بال تیل میں چپڑے رہتے تھے اور آنکھیں ہر وقت سرمے کی دکان نظر آتی تھیں۔ اس کے چار خاص ماتحت تھے جنہیں درویش کہا جاتا تھا۔ یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ مخدوم صادق شاہ نے ان چاروں مریدوں کو ''اثر'' دیا ہوا ہے۔ یہ لوگ پیر صاحب کی جگہ لوگوں کو تعویذ دیتے تھے، جھاڑ پھونک کرتے تھے اور اس طرح کے دیگر فرائض انجام دیتے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ کثیر تعداد میں یہاں آتے تھے۔ پیر صادق شاہ سے فیضیاب ہونے کا شرف بس خاص خاص لوگوں کو ہی حاصل ہوتا تھا۔ مزار کافی بڑے رقبے پر واقع تھا۔ درویشوں، خاص مریدوں اور ملازمین کے کمرے تھے۔ روزانہ دو طرح کے لنگر بھی یہاں پکائے جاتے تھے۔ قریباً بیس مرد خادم اور اتنی ہی خادمائیں مزار کے انتظام و انصرام میں مصروف رہتے تھے۔

عمران عرف عمو صبح سویرے سے رات تک صفائی ستھرائی کے کاموں میں مصروف رہتا اور پھر اپنی کوٹھری میں دیر تک آنسو بہانے کے بعد سو جاتا۔ ماں کی یاد ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا، ماں کیا کر رہی ہوگی؟ کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں؟ اس نے آرام کیا ہوگا یا نہیں؟

قریباً ایک ماہ بعد جب وہ بہت بے تاب ہوا تو اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پتا چلا کہ یہاں نگرانی کا کافی سخت انتظام ہے۔ پہرے داروں نے اسے روک لیا اور واپس مزار میں پہنچا دیا۔

اس رات وہ ماں کے لئے بہت رویا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکے قاضی نے اسے بمشکل چپ کرایا اور تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کیا۔ قاضی کئی دوسرے لڑکوں کی طرح دو تین سال سے

یہاں خدمت انجام دے رہا تھا اور یہاں کی اونچ نیچ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''عمو! اس دفعہ تو تمہیں کچھ نہیں کہا گیا اور پیار محبت سے سمجھا دیا گیا ہے لیکن اگلی دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ لوگ سختی کریں گے اور پھر نوبت زنجیروں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہاں دو تین لڑکے اب بھی ایسے ہیں جنہیں زنجیریں ڈالی جاتی ہیں اور پھر سوچو کہ بھاگ کر جاؤ گے بھی کہاں؟ ماں کے پاس...... اور ماں تمہیں پھر یہاں بھیج دے گی۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے۔''

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ میرے بغیر نہیں۔'' عمو سسکا۔

''لیکن یار سوچو یہ ہمیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ تم دیکھنا، دو تین مہینوں میں تمہارا دل یہاں لگ جائے گا۔ پھر باقی کے دن کاٹنا تمہارے لئے زیادہ مشکل نہیں رہے گا......''

بات عمو کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگتا تو بھی اسے جانا تو ماں کے پاس ہی تھا۔ ماں چودھری کے حکم سے مجبور تھی، وہ اسے پھر یہاں بھیج دیتی۔ ماں کی جدائی کے علاوہ عمو کو یہاں مزار میں کوئی زیادہ تکلیف بھی نہیں تھی۔ بس مشقت تھی جو اسے دوسرے خادموں کے ساتھ مل کر کرنا پڑتی تھی۔ وہ صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتا تھا۔ فرش دھوتا تھا۔ دستی نلکوں سے پانی بھرتا تھا اور کبھی کبھی درویشوں کی مٹھی چاپی بھی کرتا تھا...... وہ لڑکوں میں سب سے خوب صورت تھا۔ قد کاٹھ بھی دلکش تھا۔ ایک درویش ارباب علی اس سے بہت لگاؤ رکھتا تھا اور اسے بیٹا کہہ کر بلاتا تھا۔ ارباب علی کی کوشش سے ہی عمو کو شام کے وقت کچھ دیر کھیل کود کی اجازت بھی مل گئی۔ عصر کے بعد مزار کے پچھواڑے احاطے میں والی بال اور گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلا جاتا تھا۔ ارباب کی کوشش سے ہی عمو کو کسی وقت اچھے والے لنگر سے کھانا بھی ملنے لگا۔

تین مہینے بعد عمو کی ماں اس سے ملنے کے لئے آئی۔ منشی اکبر اور چودھری کا ایک کاماں منظور بھی اس کے ساتھ تھا۔ ماں بیٹا مل کر خوب روئے۔ ماں اس کے لئے گاؤں سے کئی سوغاتیں لے کر آئی تھی۔ ماں نے عمو کو اور عمو نے ماں کو تسلی دی۔ ماں نے انگلیوں پر گن کر عمو کو بتایا کہ تین مہینے گزر گئے ہیں، اب بس تیرہ چودہ مہینے باقی ہیں۔

ماں سے ملاقات کے دس بارہ روز بعد تک عمو بہت دکھی رہا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنا دل ٹھکانے پر کر لیا اور ماں سے اگلی ملاقات کے لئے دن گننے شروع کر دیئے۔ ارباب علی نے عمو کو یقین دلایا تھا کہ اگلی ملاقات تین مہینے کے وقفے سے ہوگی اور ضرور ہوگی۔

قاضی کی باتوں سے عمو کو...... صادق شاہ کے بارے میں کافی کچھ پتا چلتا رہتا تھا۔ صادق شاہ اپنے مرحوم والد کے برعکس کافی خوش خوراک شخص تھا۔ اس کی تین بیویاں تھیں۔ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور ایک کو طلاق دے کر اس سے دوبارہ شادی بھی کی تھی۔ صادق شاہ کو گھوڑوں اور بندوقوں وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ اس کے زمیندار مرید اکثر اس کے شوق کے مطابق تحفوں کا انتظام کرتے رہتے تھے۔

ایک دن درویش عطا محمد نے عمو اور قاضی کو صادق صاحب کے حجرے سے دستر خوان اُٹھانے کے لئے بھیجا۔ عمو اور قاضی پیر صاحب کے وسیع و عریض حجرے میں داخل ہوئے۔ یہاں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور قالین پر ایک خوبصورت دستر خوان بچھا تھا۔ بھنے ہوئے بٹیر، مچھلی، دیسی مرغ کا گوشت، سندھی بریانی اور پتا نہیں کیا کچھ یہاں موجود تھا۔ پلیٹیں ہڈیوں سے بھری ہوئی تھیں اور روغنی نانوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔

جن تین چار مہمانوں نے یہ دعوت اُڑائی تھی، ان میں سب سے نمایاں ایک عورت تھی...... اسے بلاشبہ ایک گرانڈیل عورت کہا جا سکتا تھا۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کا چہرہ بہت بڑا تھا، رنگ سانولا، نقوش سخت اور ناک بالکل چپٹی تھی۔ اس کی دبنگ شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا لباس تھا۔ اس نے مردوں کی طرح کالی دھوتی اور کڑھائی والی کالی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ مردوں ہی کی طرح آلتی پالتی مارے پیر صاحب کے قریب بیٹھی تھی۔

اس نے غور سے عمو کو دیکھا اور بھاری آواز میں بولی۔ ''یہ منڈا کون ہے؟''

صادق شاہ بولا۔ ''شیخوپورہ کا رہنے والا ہے۔ خدمت کے لئے آیا ہوا ہے۔''

''صادق شاہ! تم نے بڑے ملائم منڈے رکھے ہوئے ہیں اپنے پاس۔'' وہ ہنس کر بولی۔ اس کے دانت پان سے متاثر تھے۔ پھر وہ عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''کیا نام ہے تیرا کا کا؟''

''عمو جی۔''

''میرے ساتھ چلو گے؟''

''کک...... کہاں جی؟'' وہ ڈر کر بولا۔

اس کے ڈرنے کے انداز نے عورت اور اس کے ساتھیوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ عورت کا ایک نشیلی آنکھوں والا ساتھی عمو کی پیٹھ پر ہلکا سا دھپ مار کر بولا۔ ''اوئے ڈر کیوں رہا ہے۔ تُو کوئی لڑکی ہے جو تجھے لے جا کر بازار میں بیچ دیں گے۔''

عمو نے بے بسی سے صادق شاہ کی طرف دیکھا۔ صادق شاہ کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''اچھا اچھا، تم پلیٹیں اُٹھاؤ اور جاؤ۔''

عمو پلیٹیں وغیرہ اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ قاضی دسترخوان کو صاف کرنے اور سمیٹنے لگا۔

عمو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اگلے روز صبح سویرے کیا ہونے والا ہے...... عمو کو خلافِ معمول منہ اندھیرے ہی اُٹھا دیا گیا۔ ایک خادم نے اسے بتایا کہ عطا محمد نے اسے حجرے میں بلایا ہے۔ وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر حجرے میں پہنچا تو وہاں...... ارباب علی بھی موجود تھا۔ ارباب کی آنکھوں میں دکھ تھا اور اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک عطا اور ارباب میں کسی بات پر زوردار بحث ہوتی رہی ہے۔

عطا محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمو! تجھے کچھ دنوں کے لئے یہاں سے باہر جانا ہوگا۔ صادق صاحب کی مہمان جو کل یہاں آئی ہیں، انہیں اپنے ڈیرے پر ایک کامے کی لوڑ ہے۔ ان کا پرانا کاما کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی آئے گا، تم یہاں واپس آ جاؤ گے۔''

ایک دم عمو کی آنکھوں کے سامنے کل والی عورت کا کرخت چہرہ گھوم گیا۔ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ پھر اس کا لہجہ، اس کے دیکھنے کا انداز۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں سے ایک ایسی خطرناک عورت کی کہانی سنی تھی۔ جو گھروں کی ڈیوڑھیوں سے معصوم بچے اُٹھا کر فروخت کر دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، اس عورت کو دیکھ کر عمو کے ذہن میں وہ کہانی گھومنے لگی تھی۔

وہ کچھ بول نہ سکا۔ بس خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ عطا محمد بولا۔ ''گھبرانے کی لوڑ نہیں۔ زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا بلکہ یہاں سے بھی ہلکا کام ہوگا۔''

''پپ...... پر...... مم...... میری۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔

''بولو...... بولو کیا بات ہے؟'' عطا نے تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ بمشکل بولا۔ ''مم...... میری امی...... آ رہی ہے...... اگلے ہفتے۔''

عطا محمد کے چہرے پر ناگواری کی شکن اُبھری لیکن اس نے اپنی آواز ہموار ہی رکھی اور بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اگلے ہفتے تم واپس ہی آ جاؤ اور دیکھو، یہ صادق صاحب کا حکم ہے۔ ہم اس میں کسی طرح کی چوں چراں نہیں کر سکتے۔ چلو جا کر تیار ہو جاؤ۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ان لوگوں نے یہاں سے جانا ہے۔''

عمو نے ارباب کی طرف دیکھا۔ وہ یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے عمو کو مزید پریشان کیا۔ عمو چاہتا تھا کہ ارباب کچھ بولے لیکن وہ بولا نہیں۔ عمو اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا حجرے سے باہر آ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا سارا سامان باندھا جا چکا ہے۔ جستی ٹرنک کے پاس ہی اس کا بستر بھی گول کیا ہوا پڑا تھا۔ عطا تو کہہ رہا تھا کہ اسے چند دن کے لئے جانا ہے۔ اگر چند دن کی بات تھی تو پھر سارے سامان کی کیا ضرورت تھی؟ بہرحال سوالات کی گنجائش یہاں نہیں تھی۔

وہ لوگ گھوڑوں پر سوار وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہ کل آٹھ افراد تھے۔ ان میں گرانڈیل عورت بھی شامل تھی جس کا نام عمو کو بعد میں ماجھاں معلوم ہوا۔ ان سب نے کچے راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لئے منہ، سر کپڑوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ چار افراد کے پاس پکی رائفلیں موجود تھیں۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ڈاکوؤں یا وارداتیوں کا گروہ کہیں کارروائی ڈالنے کے لئے جا رہا ہو۔

عمو کو گھڑ سواری کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لئے اسے ایک صحت مند گھوڑے پر ایک دوسرے شخص کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ یہ خاردار داڑھی والا شخص تھا اور اس کے جسم سے مردار کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ وہ عمو کے پیچھے بیٹھا تھا۔ جب گھوڑا بھاگتا اور عمو دائیں بائیں کھسکتا تو وہ شخص مذاق کے انداز میں کہتا۔ ''اوئے، سنبھل کر بیٹھ کاکا۔ کیا صابن کی گاچی کی طرح پھسل رہا ہے۔''

ایک بار اس نے عمو کی کمر پر بہت زور سے چٹکی بھی کاٹی۔ عمو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

سفر کافی طویل ثابت ہوا۔ گرمی اور دھوپ نے اسے مزید مشکل بنا دیا...... راستے میں کہیں کہیں اکا دکا لوگ ملے۔ ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کی ان سے مختصر بات چیت بھی ہوئی۔ اس بات چیت سے عمو کو معلوم ہوا کہ گرانڈیل عورت کا نام ماجھاں ہے اور اسے مالکن یا چودھرانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی موضع ''کیکراں'' کے رہنے والے تھے اور وہیں جا رہے تھے۔

تپتے دن میں نہایت دشوار راستوں پر سفر کر کے وہ لوگ شام سے کچھ ہی پہلے ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سو فیصد مکان کچے تھے۔ گاؤں کی مسجد اور حویلی بھی حلی تھی۔ حویلی کا احاطہ بہت بڑا تھا اور اس کے اردگرد بہت سے درخت لگے تھے۔ ان درختوں میں زیادہ تر کیکر ہی نظر آتے تھے۔ اس جگہ کیکروں کی بہتات تھی، شاید اسی لئے اس گاؤں کا نام کیکراں تھا...... حویلی کے احاطے میں ایک جگہ بہت سی بیل گاڑیاں اور گھوڑے خچر وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔ عمو کو حویلی سے ملحقہ ایک ڈیرا نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔

○......❖......○

اگلے تین چار روز میں عمران عرف عمو کو یہاں کے حالات کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں کا گاؤں تھا۔ بارڈر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔ یہاں کی شراب اردگرد کے دیہات میں بھی بھیجی جاتی تھی۔ یہاں اسمگلنگ کا سامان بھی آتا تھا۔ یہاں جوئے کی ایک بڑی بیٹھک تھی جسے عرفِ عام میں سراں کہا جاتا تھا۔ علاقے کی پولیس کو ان غیر قانونی کاموں میں مداخلت کی ہمت کم ہی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ ماجھاں تھی۔ وہ بڑے دھڑلے کی عورت تھی۔ وہ دو مشہور ڈکیتوں ساجے اور ناجے کی سگی بہن تھی۔ ساجا تو کوئی دو سال پہلے مارا گیا تھا مگر ناجا زندہ تھا۔ وہ پچھلے قریباً ایک سال سے رُوپوش تھا۔ ماجھاں خود بھی بہت دراچھی تھی۔ اس کی آتشیں طبع کا ایک ثبوت وہ گہرا زخم بھی تھا جو اس کی پیشانی سے رخسار تک چلا گیا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی ناک ضرورت سے زیادہ چپٹی نظر آتی تھی۔

ابھی تک عمو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ماجھاں کو ''کامے'' کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا کاما کہیں گیا ہوا ہے لیکن یہاں تو کئی کامے موجود تھے اور ان میں عمو کے ہم عمر تین چار لڑکے بھی تھے۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا، کچھ دیر پہلے ہلکی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے گرمی کا زور ذرا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ملازمہ شہناز عمو کے پاس آئی۔ وہ عمو کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''وے تجھے مالکن نے بلایا ہے۔''

''کون مالکن؟''

''وے چودھرانی جی اور کون؟ یہاں تیری ماں تو مالکن نہیں ہے۔''

عمو ملازمہ کے ساتھ ہولیا۔ ڈیرے اور حویلی کا درمیانی دروازہ پار کر کے وہ حویلی میں آ گئے۔ ملازمہ شہناز اسے اندر لے گئی۔ یہاں ایک کمرے میں رنگین پایوں والا شاندار پلنگ بچھا ہوا تھا۔ چھت پر کوئی چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا جھالر والا پنکھا حرکت کر رہا تھا۔ اس پنکھے کو کسی ساتھ والے کمرے سے ڈوری کے ذریعے حرکت دی جا رہی تھی۔ پلنگ پر مالکن ماجھاں موجود تھی۔ عمو کو دیکھ کر وہ پلنگ سے اُٹھی اور رنگین پایوں والی، بان کی ایک کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے بوجھ سے جیسے کرسی چرچرا اُٹھی۔

اس نے عمو کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور بھاری بھرکم آواز میں بولی۔ ''اوئے منڈیا! کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔ کیا بوتھی نکالی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہوگیا ہے۔''

''کھاتا ہوں جی۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''زور ہے تیرے میں؟'' اس نے پوچھا۔

عمو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا، چل دیکھ لیتی ہوں۔ ذرا مونڈھے دبا میرے۔''

عمو سکتہ زدہ سا کھڑا رہا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں عمو کو ماں کی گالی دی اور بولی۔ ''اوئے...... ایسے کیا تک رہا ہے بٹر بٹر؟ کیا کبھی کسی کا پنڈا نہیں دبایا؟''

عمو جلدی سے اس کے عقب میں آ گیا اور اس کے چربی دار مونڈھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبانے لگا۔

اسی دوران میں سانولے رنگ کا ایک غریب صورت شخص اندر آیا۔ اس نے پہلے زمین کو دونوں ہاتھ لگا کر اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ ماجھاں کے پاؤں چھو رہا ہے پھر وہ کمرے کی دہلیز پر ہی جوتیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے عاجزی سے دانت نکالے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مالکن! میرے پتر نے چوری نہیں کی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا جی۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ بھلا کسی کی بھینس چوری کرے گا؟ میں آپ کے سامنے ہتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ اس کی جان بچائیں...... پلس والے مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔''

ماجھاں نے اطمینان سے کہا۔ ''پرتھا نے دار قادر کہتا ہے کہ اس نے لوٹا فال نکالی ہے اور فال میں تیرا پتر امین ہی سامنے آیا ہے۔''

غریب صورت شخص روتے ہوئے بولا۔ ''آہو جی، انہوں نے لوٹا گھمایا تھا...... پر لوٹا غلط بھی تو گھوم سکتا ہے نا۔ میرا امین چور نہیں ہے۔''

ماجھاں نے بلا تردد غریب صورت شخص کو گالی دی اور بولی۔ ''پچھلے سال جب تیری دھی کا داج (جہیز) چوری ہو گیا تھا تو تُو نے خود دہائی مچائی تھی اور کہا تھا کہ لوٹا گھما کر چور کا پتا لگایا جائے۔ تُو نے کہا تھا یا نہیں؟''

غریب صورت شخص کا سر مزید جھک گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ ''مالکن! میں اتنا جانتا ہوں، میرے پتر نے رستا گیری نہیں کی۔ اس پر الزام لگایا گیا ہے......''

''اچھا، دوسروں کی واری لوٹا سچا اور اپنی واری جھوٹا۔'' ماجھاں نے طنزیہ انداز میں کہا اور غریب صورت شخص کی نامعلوم بہن کا رشتہ ایک پلید جانور سے جوڑا۔

اس شخص نے ایک بار پھر زمین پر دونوں ہاتھ لگا کر اپنی عاجزی کا اظہار کیا اور بولا۔

"مالکن! تم مائی باپ ہو۔ تمہارے سوا کسی کا آسرا نہیں۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ وہ پلس کی مار کھانے جوگا نہیں۔" اس نے اپنا سر زمین سے ٹکایا اور بھوں بھوں رونے لگا۔

ماجھاں کچھ دیر چپ رہی پھر گھمبیر آواز میں بولی۔ "چل اُٹھ۔ کیا زنانیوں کی طرح اتھرو وگا رہا ہے۔"

غریب صورت شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی چھدری داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ ماجھاں نے اسے چند سخت باتیں سنائیں پھر کہا۔ "چل جا، میں کچھ کرتی ہوں اس کے لئے۔"

وہ شخص سلامیں کرتا ہوا چلا گیا۔ ماجھاں نے نوکرانی شہناز کو آواز دے کر بلایا اور اسے اپنے پاؤں کے ناخن کاٹنے کا حکم دیا۔ نوکرانی شہناز، اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ایک چھوٹی قینچی سے اس کے پاؤں کے ناخن کترنے لگی۔

عمو بدستور اس کے سخت کندھے دبا رہا تھا۔ نوکرانی ناخن کاٹ کر چلی گئی تو خضاب لگے سر اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس نے ماجھاں کو سلام کیا اور بولا۔ "مالکن! وہ دیناں مسلی میرے پاس بیٹھا زنانیوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیا ہے؟" ماجھاں نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ آپ نے اس کے پتر کو پلس سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے...... ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"ہاں، وعدہ تو کیا ہے۔" ماجھاں بولی۔

"تو پھر...... اگر آپ کا حکم ہو تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں تھانے؟" گھنی مونچھوں والے نے پوچھا۔

"ہاں چلے جاؤ۔ تھانے دار قادر سے مل لینا...... دینے کے سامنے اس کے پتر کو چھوڑنے کی بات کرنا۔ پر ابھی اس ذلیل کو چھڑانا نہیں ہے۔ چار پانچ روز ابھی اس کو رگڑے لگنے دینے ہیں۔ اس کو ہیضہ ہو گیا ہے اپنی پڑھائی کا۔ اُلو کا پتر، خود کو لاٹ صاحب سمجھنے لگا ہے۔"

گھنی مونچھوں والے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سلام کر کے باہر چلا گیا۔ عمو حیرانی سے سوچتا رہا۔ یہ کتنی دغاباز عورت تھی۔

کندھے دبا دبا کر عمو کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا بلکہ پچھلے آدھ گھنٹے سے

سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی اسے بس کرنے کا کہے گی لیکن وہ تو جیسے اسے آرڈر کر کے بھول ہی چکی تھی۔ عمو کی عمر سولہ سال سے تھوڑی ہی زیادہ ہو گی۔ اس نے تھوڑا قد کاٹھ نکال لیا تھا لیکن ابھی اس کے جسم میں وہ مردوں والا زور کہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔ وہ مست بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اذیت پسند طبع رکھتی ہے۔ جانتی بھی تھی کہ عمو بُری طرح تھک چکا ہے پھر بھی اسے رکنے کے لئے نہیں کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب عمو کے ہاتھوں میں بالکل جان نہ رہی تو اس نے گھوم کر اسے دیکھا اور بولی۔ "اوئے لکڑی دے باندر! تُو تو کہتا تھا کہ زور ہے تیرے اندر۔ یہ چرخا کات رہا ہے کہ مونڈھے دبا رہا ہے؟"

عمو کچھ نہیں بولی۔ اس کے ماتھے پر پسینا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ماجھاں کے کندھوں پر حرکت دیتا رہا۔

چند سیکنڈ بعد وہ بولی۔ "اچھا چل چھوڑ۔ وہ سامنے الماری میں سے پانی کی بوتل پکڑ کر لا۔"

عمو اس کے اشارے پر الماری کی طرف گیا۔ اس نے الماری کھولی اور بوتل تلاش کرنے لگا۔ پانی کی بوتل تو نظر نہیں آئی لیکن شراب کی سیاہی مائل بوتل وہاں موجود تھی۔ ماجھاں کی بھاری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ "اوئے بٹر بٹر کیا دیکھ رہا ہے، یہی بوتل لانی ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بوتل تھامی اور اسے ماجھاں کے سامنے تین ٹانگوں والی گول میز پر رکھ دیا۔

یہاں گلاس پڑا تھا اور ایک جگ میں تھوڑا سا پانی بھی رکھا تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز کو اپنی بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔ وہ چند سیکنڈ میں اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے کے اندر پلیٹ میں برف کے ٹکڑے رکھے تھے اور کچھ نمکو وغیرہ تھی۔ عمو کو عجیب اُلجھن ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ شراب بہت بُری چیز ہے۔ اسے بدمعاش لوگ پیتے ہیں اور پینے کے بعد زیادہ خبیث ہو جاتے ہیں۔ اسے ہرگز پتا نہیں تھا کہ کچھ عورتیں بھی شراب پیتی ہیں۔

ماجھاں کی آنکھوں میں عجیب سی سرخی اُترتی جا رہی تھی۔ اس نے جگ میں برف کے ٹکڑے ڈال کر جگ کو ہلایا پھر عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چل، یہ کالا پانی ڈال۔"

"کک...... کس میں؟"

"اپنی بے بے کے سر میں۔ اوئے اس گلاس میں ڈال...... یہ جو تیرے سامنے رکھا ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بدبودار سیال گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔ گلاس ایک تہائی بھر گیا تو ماجھاں نے عمو کا ہاتھ روک دیا۔ پھر اس نے اپنے حساب سے اس میں ٹھنڈا پانی مکس کیا اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔

اس کمرے میں اس نے یہی عمل دو تین بار دہرایا اور اس کا چہرہ تمتما گیا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگیں...... بالکل انگاروں کی طرح۔ عمو کو اس سے ڈر لگنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کہیں اسے مارنا نہ شروع کر دے۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی اُٹھی۔ اس نے عمو کے گال پر ایک سخت چٹکی لی اور کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

عمو کے سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔

یک دم کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط ہلکی سرسراہٹ اور چرخی کی مدھم آواز سے پتا چلتا تھا کہ چھت پر جہازی سائز کا جھالر والا پنکھا حرکت کر رہا ہے۔

یکا یک عمو نے سخت جسم والی مہاجاں کو اپنے بالکل پاس محسوس کیا۔ اس کی سانسوں سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اس کے بازو عمو کے اردگرد تھے۔ عمو کو گھن محسوس ہوئی۔ وہ مرد عورت کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا لیکن یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی عمر کی اور ایسی بھدی عورت اس سے کوئی تعلق بنائے گی۔

"مم...... میں نے باہر جانا ہے۔" وہ ہکلایا۔

"باہر چلے جانا۔ ابھی تو ادھر چلو۔"

"کہاں...... جی؟"

"اوئے ادھر۔" اس نے اسے بستر پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اب پہلے سے سخت تھی۔

چند ہی لمحے بعد عمو نے خود کو ایک بے پناہ بوجھ تلے محسوس کیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس بدبودار عورت کے چہرے پر زوردار دوہتڑ مارے اور یہاں سے بھاگ نکلے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں بڑے کرخت قسم کے پہرے دار موجود ہیں اور ان کے کندھوں سے ہر وقت بندوقیں جھولتی رہتی ہیں۔ شہنشاہ کے مزار کے پہرے دار ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔

وہ بڑے مکروہ اور اذیت ناک لمحے تھے۔ وہ خود کو کسی شکاری جانور کے پنجوں میں محسوس کر رہا تھا۔ کراہ رہا تھا اور کسمسا رہا تھا۔ ماجھاں جب مطلب برآری میں ناکام ہوئی تو ایک دم جھلا اُٹھی۔ اس نے عمو کو اس کی گردن سے پکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے اور پھر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ اسے خالی ہاتھوں سے مارتی رہی پھر اس نے چمڑے کا ایک دیسی جوتا پکڑ لیا۔ یہ بڑے ذلت ناک لمحے تھے۔ وہ بے دردی سے اس کے جسم پر ضربیں لگاتی رہی اور گالیاں بکتی رہی۔ کوئی عمو کو چھڑانے نہیں آیا۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ عمو کراہتا رہا اور بستر پر لوٹتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور عمو کی پشت پر لات رسید کر کے اسے باہر پھینک دیا۔ ایک سیکنڈ بعد عمو اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز سن رہا تھا۔

ایک گوشے سے ملازمہ شہناز نمودار ہوئی۔ "چل اُٹھ جا۔" اس نے ترس آمیز اور کسی حد تک طنز آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔

عمو کراہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات اپنے کمرے میں جا کر عمو خوب رویا تھا۔ اس نے آج رات عورت کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ان گھڑیوں میں شاید اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو جاتی اگر اس کے تصور میں چاندی بالوں والے ایک مقدس چہرے کی شبیہہ نہ اُبھر آتی۔ یہ اس کی پیاری ماں کا چہرہ تھا۔ وہ روتا رہا اور سوچتا رہا کہ کتنا فرق ہے ان دو عورتوں میں۔ اسے اپنی ماں ٹوٹ کر یاد آئی۔ آج سے سات آٹھ روز بعد اس کی ماں کو اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آنا تھا۔ یقیناً وہ دن گن گن کر اس وقت کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ مزار پر نہیں تھا۔ خبر نہیں کہ عمو کو وہاں نہ پا کر اس کی ماں پر کیا گزرنی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی ویران آنکھیں اور اس کا زرد چہرہ دیکھا۔ اس کا دل سینے میں ٹوٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ ساری رات سسکتا رہا اور اپنی چوٹوں کو سہلاتا رہا۔ اسے بے پناہ توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ہر طرف چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی، ملازمہ شہناز پھر مالکن ماجھاں کا بلاوا لے کر پہنچ گئی۔ عمو اندر تک لرز گیا۔ کل والے سارے کراہت انگیز واقعات اسے پھر یاد آ گئے تھے۔ وہ چاروناچار پھر شہناز کے ساتھ ماجھاں کے پاس پہنچا۔ آج وہ ذرا مختلف موڈ میں تھی۔ آج وہ برآمدے میں تھی اور سوتر کی بنی ہوئی ایک رنگین چارپائی پر پھیل کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے نیچے گاؤ تکیہ تھا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی اس کے سرہانے کھڑی ایک بڑا پنکھا دونوں ہاتھوں سے جھل رہی تھی۔ اٹھارہ سال کا ایک گوراچٹا لڑکا اس کے لئے حقہ تازہ کر رہا تھا۔ حقہ تازہ کر کے اس نے ماجھاں کے قریب رکھا اور اس کی لمبی نے

ماجھاں کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ ماجھاں نے پنکھا جھلتی ہوئی لڑکی کو بھی صحن میں بھیج دیا اور عمو کو ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا...... عمو بیٹھ گیا۔

وہ بولی۔ ''کل پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں تمہیں مار بیٹھی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پر اس میں تمہارا بھی تھوڑا بہت قصور ہے۔ میرے کہنے پر چلو گے تو بہت خوش رہو گے۔ ہر طرح کا آرام ملے گا لیکن اپنی مرضی دکھاؤ گے تو پھر میں بڑی سخت بھی ہوں۔ ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔'' اس کا لہجہ آخر میں دھمکی آمیز ہو گیا۔

عمو بس سر جھکا کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹوں نے ایک بے ساختہ حرکت ضرور کی مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

''کیا کہنا چاہتا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کک...... کچھ نہیں جی۔''

''میں بتاتی ہوں۔ تُو واپس جانا چاہتا ہے اور تیرے دل میں یہاں سے بھاگنے کا فتور بھی ہے۔ یہ بھاگنے والا فتور اپنے دل دماغ سے بالکل نکال دے۔ جب تک میں نہ چاہوں گی، تیرے فرشتے بھی یہاں سے نکل نہیں سکتے...... اگر آزمانا چاہتا ہے تو آزما کر بھی دیکھ لے اور اگر نہ ہی آزمائے تو چنگا ہے۔'' ماجھاں کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہتی ہے، کر کے بھی دکھاتی ہے۔

عمو اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔ کہیں پاس ہی طویلے کی طرف رکھوالی کے بڑے بڑے کتے پُرہول آواز میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ عجیب شکل صورت کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ وہ گاؤ تکیے پر سیدھی ہو کر بیٹھی تو تکیہ تھوڑا سا ایک طرف کھسک گیا۔ تکیے کے نیچے سیاہ رنگ کے پستول کی جھلک نظر آئی۔

ماجھاں نے حسبِ سابق کالا تہبند پہن رکھا تھا۔ ویل کی سفید قمیص تھی جس کے بازو اس نے مردوں کی طرح اڑس رکھے تھے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ خاصی خوش خوراک بھی ہے۔ عمو کی موجودگی میں ہی اس نے پکی لسی کی ایک بڑی گڑوی ایک ہی ڈیک میں خالی کر دی اور پھر مردوں کے انداز میں زوردار ڈکار لی۔

اسی دوران میں اچانک احاطے کے پھاٹک پر کھڑے پہرے داروں میں ہلچل سی نظر آئی پھر ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی رکاب میں کسی شخص کا پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ وہ شخص گھوڑے کے ساتھ ساتھ ہی گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ گھوڑے کے تعاقب میں کئی افراد تھے۔ وہ شاید اسے روکنا چاہ رہے تھے لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور تھا اور

اگر پاس بھی ہوتا تو شاید اس کی سرکشی کے سبب وہ اسے روک نہ سکتے۔ ایسا جوان اور قد کاٹھ والا گھوڑا عمو کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ وہ دیوانی رفتار سے وسیع احاطے کے اندر دوڑ رہا تھا۔ زخمی سوار کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح اس کے ساتھ گھسٹتا اور پلٹتا چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے لپکنے والے دو افراد نے گھوڑے کے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ وہ بلاخیز تیزی کے ساتھ انہیں چکما دے گیا اور شمالی حصے کی طرف بڑھا۔

اور یہی وقت تھا جب عمو کی نگاہ گھوڑے کے پیچھے گھسٹتے ہوئے شخص پر پڑی۔ عمو لرز گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گاؤں میں اڑوس پڑوس میں مرنے والوں کے مُردہ جسم دیکھے تھے مگر ایسی بھیانک لاش کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بدنصیب شخص نہ جانے کتنی دور سے گھوڑے کے پیچھے رپٹتا چلا آ رہا تھا اور کہاں کہاں ٹکرایا تھا۔ اس کا سر تربوز کی طرح پھٹ چکا تھا اور سامنے کی طرف سے سینے کی کھال مکمل طور پر اُتر چکی تھی۔ ایک سائیس نما شخص نے گھوڑے کی لگام تھامنا چاہی مگر اس نے گھوم کر ایسی دولتی چلائی کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک شخص نے اضطراب کے عالم میں گھوڑے پر رائفل تانی۔ ''اوئے...... اوئے۔ گولی نہیں چلانا۔'' ماجھاں دھاڑی اور گھوڑے کی طرف بڑھی۔

ماجھاں نے گھوڑے کو اس کے نام سے پکارا۔ ''ہیرے...... ہیرے۔'' پھر وہ ایک دم چکما دے کر دائیں طرف سے آگے بڑھی۔ وہ گھوڑے کی لگام تھامنا چاہتی تھی لیکن گھوڑا تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ وہ ہنہناتا ہوا اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہوا اور تقریباً الف ہو کر واپس پلٹا۔ واپس پلٹنے کی وجہ سے اس کا رخ سیدھا عمو کی طرف ہو گیا۔ پانی کے دو بڑے مٹکوں کو توڑتا اور ایک چارپائی الٹتا ہوا وہ عمو کی طرف آیا۔ عمو اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش کی مگر دیر ہو چکی تھی۔ سرکش گھوڑا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے بے اختیار اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں بے ساختہ بند ہو چکی تھیں۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آئی۔ اس کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ بری طرح ڈگمگایا مگر گرنے سے بچ گیا۔ یہی لمحے تھے جب تنومند ماجھاں گھوڑے پر جھپٹی۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لئے سکتہ زدہ سا ہو گیا۔ شاید یہ صورتِ حال اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ پھر سے دیوانہ وار اچھل کود شروع کرنے کے لئے پینترا بدل رہا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے پورے وزن کے ساتھ گھوڑے کی گردن پر جا پڑی۔ گردن کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس نے کچھ اس طرح زور لگایا کہ گھوڑا زمین پر آ رہا۔ اس کے گرنے کی دیر تھی کہ موقع پر موجود افراد چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔

جس کے ہاتھ میں گھوڑے کے جسم کا جو حصہ آیا، اس نے جکڑ لیا۔ دو تین افراد گرے ہوئے گھوڑے کے اوپر ہی چڑھ بیٹھے۔ اس کی چرمی لگام ابھی تک عمو کے ہاتھ میں تھی۔ عمو نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہا۔ سائیس نما شخص نے ایک دوسرے ملازم کے ساتھ مل کر تیزی سے گھوڑے کی ٹانگیں باندھنا شروع کیں۔ دو تین منٹ کے اندر سرکش تازی گھوڑا پوری طرح بے بس ہو چکا تھا۔

گھوڑے کو سنبھالنے اور گرانے میں زیادہ کردار ماجھاں ہی کا تھا۔ بہرطور اس میں کچھ نہ کچھ حصہ عمو کا بھی تھا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد ہی گھوڑے کی غیر معمولی سرکشی میں کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کوشش میں عمو کی ایک کہنی بری طرح چھل گئی اور اس سے خون رِسنے لگا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئیں۔ بہرحال، سب سے خوفناک منظر اس لاش کا تھا جو سرکش گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی ہوئی حویلی کے احاطے میں پہنچی تھی۔ یہ لاش ایک چالیس بیالیس سالہ شخص کی تھی۔ اس کے جسم پر عام سا لباس تھا۔ اس کی پگڑی اور جوتے وغیرہ اُتر چکے تھے۔ سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سر کی چوٹ سب سے مہلک تھی۔ کھوپڑی تربوز کی طرح پھٹ کر کھل چکی تھی۔ لاش پر فوراً چادر ڈال دی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں احاطے کے اندر بہت سے افراد جمع ہو گئے۔ مرنے والے کا نام فاضل تھا۔ وہ حویلی کے ''کاموں'' میں سے تھا۔ مشتعل گھوڑا اسے قریباً دو کلومیٹر سے گھسیٹتا ہوا حویلی تک لایا تھا۔ اچانک عمو کو ایک روتی پیٹتی لڑکی نظر آئی۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی لاش کی طرف بڑھی۔ ''ہائے ابا جی...... ہائے ابا جی۔'' وہ پکار رہی تھی۔

عمو نے پہچان لیا۔ یہ وہی پندرہ سولہ سالہ معصوم صورت لڑکی تھی جسے اس نے کل ماجھاں کے سرہانے کھڑا دیکھا تھا، وہ اسے مسلسل پنکھا جھل رہی تھی۔

لڑکی نے لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور پھر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی گریہ زاری دل دوز تھی۔ ''ہائے ابا جی! آپ کو کیا ہو گیا...... آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ہائے اللہ، اب میں کیا کروں گی۔ مجھے بھی موت آ جائے...... یا اللہ، مجھے بھی موت آ جائے۔''

لاش کے مسخ چہرے پر دوبارہ کپڑا ڈال دیا گیا۔ ماجھاں کے اشارے پر حویلی کی ملازماؤں نے لڑکی کو بہ مشکل سنبھالا اور اسے لاش سے دور لے گئیں۔ عمو بھی حویلی کے اس حصے میں واپس آ گیا جسے ڈیرا کہا جاتا تھا۔ اس کے زخمی بازو کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی۔

○......❖......○

روتی چلاتی لڑکی کا نام شبانہ تھا۔ وہ گھوڑے سے گر کر مرنے والے فاضل کی بیٹی تھی اور باپ کے ساتھ ہی یہاں حویلی میں رہتی تھی۔ اس کی والدہ اور دو چھوٹے بھائی ایک قریبی موضع کے رہنے والے تھے۔ وہ لاش لے کر اپنے علاقے کی طرف چلے گئے تھے۔

عمو کی کہنی پر اچھا خاصا زخم آیا تھا۔ تیسرے روز ماجھاں نے اسے حویلی میں بلایا اور اس کا حال چال پوچھا۔ عمو کو ہلکا سا بخار بھی تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز سے کہا۔ ''جب تک اس منڈے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی، یہ حویلی میں ہی رہے گا۔ اسے ایک کمرا دے دو اور ذرا اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ اسے۔ دیکھو کس طرح ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں خبیث کی۔''

''مم...... میں اُدھر ہی ٹھیک ہوں جی...... ہلکا سا بخار ہے، کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' عمو منمنایا۔

''تو زیادہ ڈاکٹر نہ بن۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کر۔'' ماجھاں رعب سے بولی اور شہناز کو اشارہ کیا کہ وہ عمو کو لے جائے۔

شہناز نے عمو کو لیا اور احاطے کے اندر ہی ایک ہوادار کمرے میں لے آئی۔ یہاں تین طرف سلاخ دار کھڑکیاں تھیں۔ ویسے بھی یہ کمرا نیم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں گرمی کا گزر ہی نہیں۔ ایک پلنگ، ایک الماری اور ضرورت کی دیگر چیزیں اس کچے کمرے میں موجود تھیں۔ شہناز نے مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے عمو کو دیکھا اور بولی۔ ''تمہاری تو لاٹری نکلی ہوئی ہے۔ کھاؤ پیو اور آرام کرو۔ کام شام کرنے کے لئے ہم غریب غربا جو ہیں۔''

عمو جل کر بولا۔ ''میری جگہ تم آ جاؤ۔ میں تمہارے کام شام کر لیتا ہوں۔''

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ ''تمہاری جگہ میں کیسے لے سکتی ہوں۔ تمہاری جگہ تم

ہی لے سکتے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد عمو پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس کا دل غم و اندوہ میں بھر گیا۔ ماں کے چاندی بال اس کی نگاہوں میں چمکنے لگے اور اس کی تھکی تھکی ویران آنکھوں کا تصور عمو کی آنکھوں میں نمی جگانے لگا۔

اس کمرے میں اسے واقعی ہر طرح کا آرام ملا۔ بہترین کھانا، نئے ریشمی کپڑے، اس کے علاوہ آرام دہ بستر، نہ مکھی نہ مچھر۔ دو دن بعد ایک دو بار ماجھاں کی جھلک بھی نظر آئی۔ اس کا رویہ اب بہتر نظر آتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس کا ملازم خاص ماکھا عمو کو گاؤں کے حکیم کے پاس بھی لے کر گیا اور اس کے بازو کی مرہم پٹی کرا کے لایا لیکن چوتھے روز وہی ہوا جس کا عمو کو ڈر تھا۔ وہ بالائی دار دودھ کا بڑا گلاس پی کر بستر پر سونے کے لئے لیٹا ہی تھا کہ شہناز آ گئی اور سپاٹ لہجے میں عمو سے بولی کہ اسے مالکن یاد کر رہی ہے۔ یہ ایک اندھیری رات تھی۔ حویلی میں کہیں کہیں چراغوں کی مدھم روشنی تھی۔ عمو دھڑکتے دل کے ساتھ حویلی کے وسیع صحن میں سے گزرا۔ ماکھا اور حویلی کے دیگر مسلح ملازم ایک طرف چارپائیوں پر بیٹھے شراب پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ اس روشنی میں رکھوالی کے تین بڑے کتے بھی اپنے کھونٹوں سے بندھے نظر آ رہے تھے۔

عمو کو اندرونی حصے کی طرف جاتے دیکھ کر ماکھے نے نشیلی آواز میں ہانک لگائی۔ "دو پترا نارں دے۔ تیرا حسن ویکھیا تے، کھوتے نس گئے کمہاراں دے......"

ملازمہ شہناز، عمو کو ماجھاں کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ عمو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ماجھاں موڑھے پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ آج پھر تمتما رہا تھا اور سانسوں سے بو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ تپائی پر شراب کی آدھی بوتل پڑی تھی۔ وہ عجیب انداز سے عمران عرف عمو کو دیکھتی رہی پھر نرمی سے بولی۔ "چل وہ دروازہ بند کر دے۔"

عمو لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک گیا اور اسے بند کر دیا۔ "اوئے نامعقولا! کنڈی بھی لگانا۔" وہ ذرا درشتی سے بولی۔

عمو نے کنڈی بھی چڑھا دی۔ "چل بیٹھ جا ادھر میرے پاس۔" اس نے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی موٹی کلائی میں ایک چمک دار دھاتی کڑا نمایاں نظر آتا تھا۔

یہ دو نشستوں والا موڑھا تھا۔ عمو پھنس کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا وزنی بازو عمو کے کندھے پر ڈالا اور بھرائی ہوئی پاٹ دار آواز میں بولی۔ "دیکھ، مجھ سے ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ بڑے آرام سے بیٹھ...... سمجھ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔"

عمو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کس طرح شہنشاہ پیر کے مزار تک آیا تھا...... اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ تاہم ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ اس کے قریب بھی آتی جا رہی تھی۔ اب اس کا بازو ہی عمو کے کندھوں پر نہیں تھا، وہ خود بھی اس پر لدسی گئی تھی۔ عمو کے اندر وہی سات دن پہلے والی کراہت جاگ گئی۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا مگر اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماجھاں کا انداز بتدریج جارحانہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے اس کی قمیص اُتار پھینکی اور اس کی بدبودار سانسیں عمو کے چہرے سے ٹکرانے لگیں۔

کچھ دیر بعد اس نے لالٹین کی لو دوبارہ اونچی کر دی۔ وہ خفا نظر آ رہی تھی۔ تاہم اس خفگی کا کھلا اظہار اس نے عمو پر نہیں کیا۔ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر سگریٹ کے چند طویل کش لے کر بولی۔ "پانی پئے گا؟"

عمو کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ماجھاں نے شیشے کا گلاس تپائی پر رکھنے کے بعد پانی کے بجائے "کالے پانی" کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی شراب انڈیلی پھر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور بولی۔ "لے تھوڑا سا پی لے۔ ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"نہیں...... نہیں...... اس میں سے بو آتی ہے۔"

"اوئے باندر! یہی بو تو بندے کو شیر بناتی ہے۔ چل پی لے تھوڑا سا۔ چل شاباش۔" اس نے گلاس پکڑ کر عمو کے ہونٹوں سے لگایا۔

عمو نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ اس کے کانوں میں ماں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے عمو کو بتایا تھا، شراب بہت بری چیز ہے۔ کبھی بھول کر بھی اس کے پاس نہیں جانا۔ یہ انسان کو جانور بنا دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر کر دیتی ہے...... اور اس نے عمو کو منع کیا تھا کہ وہ ایسے بندوں کے پاس بھی نہیں بیٹھے گا جو نشہ کرتے ہیں۔

اس نے اپنے ہونٹ بند رکھے اور منہ پھیر کر کراہت کا اظہار کرتا رہا۔ دوسری طرف ماجھاں کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ اب اس سے باقاعدہ زبردستی کر رہی تھی۔ "دو گھونٹ پی لے۔ مر نہیں جائے گا۔ میرے کہنے پر پی لے......" اس نے انگلیوں کا بے رحم دباؤ ڈال کر عمو کا منہ کھولنا چاہا۔ شراب کا تلخ ذائقہ عمو کی زبان پر آیا۔ اسے ابکائی سی آ گئی۔ اس نے ہاتھ جھٹکا۔ گلاس ماجھاں کے تنومند ہاتھ سے نکل کر کچے فرش پر گرا۔ ماجھاں کا پارا ایک دم ساتویں آسمان پر چلا گیا۔ وہ دو سیکنڈ کے لئے سکتہ زدہ رہی، تب یکا یک عمو پر پل پڑی۔ "اوئے، کتے

دے پتر! تیری یہ جرأت؟ تیری یہ جرأت؟'' اس نے عمران عمو پر گالیوں کے ساتھ ہی تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بھی بارش کر دی۔ اس کے اندر حیوانی قوت تھی۔ وہ واقعی ایسی عورت تھی جس سے خوف کھایا جانا چاہئے تھا۔ اس نے عمو کو اُٹھا اُٹھا کر دیواروں سے پٹخا پھر وہی چرمی جوتا پکڑ لیا جس نے سات دن پہلے عمو کی چمڑی ادھیڑی تھی۔ ایک بار پھر عمو زبردست چھترول کی زد میں آ گیا۔ اس کے پنڈے اور ٹانگوں پر انگارے سے دہکنے لگے۔ اس کے زخمی بازو سے درد کی لہریں اُبھریں اور پورے جسم میں پھیل گئیں۔ مارنے کے ساتھ ساتھ وہ عمو کو غلیظ ترین گالیاں دے رہی تھی۔ عمو کے لئے ان میں سب سے اذیت ناک وہ گالیاں تھیں جن میں اس کی ماں کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ ہانپ گئی تو اس نے پہلے دن کی طرح ایک بار پھر اسے لات مار کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ ''ناجو...... ناجو۔'' اس نے ملازمہ شہناز کو آوازیں دیں، وہ ڈری ہوئی سی سامنے آئی۔ ماجھاں، عمو کی طرف اشارہ کر کے پھنکاری۔ ''لے جاؤ اس کتے کو اور ماکھے سے کہو سراں میں رکھ کر اس کا دماغ ٹھیک کرے۔''

شہناز نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماجھاں نے کمرے کا دروازہ بند کیا لیکن پھر فوراً ہی کھول دیا۔ شہناز سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''......اور اس اچھو کو بھیج دے میرے پاس۔''

عمو آنسو بہاتا ہوا شہناز کے ساتھ باہر صحن میں آیا۔ ماکھا ابھی تک اپنی ٹولی میں بیٹھا ہوا تھا۔ شہناز نے اس کے پاس جا کر کچھ کھسر پھسر کی۔ ماکھے نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو گدی سے دبوچ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ عمو کا جسم جوتوں کی مار سے سلگ رہا تھا۔ اس نے بس ایک شلوار پہن رکھی تھی۔ ماکھے کی ٹولی کے افراد نے عمو کو تمسخر آمیز نظروں سے دیکھا۔

جب عمو حویلی کے احاطے سے باہر نکل رہا تھا، اس نے انیس بیس سال کے گورے چٹے لڑکے اچھو کو دیکھا۔ وہ شہناز کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً آج رات اسے ؔدکی جگہ پُر کرنا تھی۔

خضاب لگے سر والا لمبا تڑنگا ماکھا عمو کو لے کر ڈیرے کے پچھواڑے سراں میں آ گیا۔ یہ دراصل وہی مکان تھا جس میں جوئے کی بہت بڑی بیٹھک بھی تھی اور شام کو یہاں خوب گہما گہمی ہوتی تھی۔ حقے گڑگڑاتے تھے، شراب کی بو پھیلتی تھی اور تاش کے پتے بکھرتے تھے۔ ماکھے نے عمو کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اس کی دیواریں کچی لیکن بہت موٹی تھیں۔ کوٹھڑی میں بس ایک دروازہ اور ایک سلاخ دار کھڑکی تھی۔ کچا فرش گیلا اور بدبودار تھا۔ اس بو سے عمو کو

اندازہ ہوا کہ یہاں شاید کتے بھی باندھے جاتے ہوں گے۔ عمو کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ صبح سویرے دو دیوہیکل بلڈاگ بھی عمو کے ساتھ ہی اس کوٹھڑی میں باندھ دیئے گئے۔ انہیں مضبوط کھونٹوں سے باندھا گیا لیکن پھر بھی ان کی قربت کی دہشت عمو کے اعصاب چٹخانے لگی۔ کوٹھڑی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اسے خود کو ایک گوشے تک محدود کرنا پڑا۔

وہ بالکل بھوکا پیاسا اڑتالیس گھنٹے تک اس کوٹھڑی میں بند رہا۔ سارا دن دونوں کتے اس کے ساتھ بندھے رہتے تھے، رات کو انہیں نکال لیا جاتا تھا۔ ان کے فضلے اور پیشاب کی بو نے شروع میں تو عمو کو بے حد پریشان کیا لیکن پھر بتدریج اس کی حس شامہ کندسی ہو گئی۔ تیسرے دن دوپہر کو جب وہ خود کو بھوک پیاس کی وجہ سے قریب المرگ محسوس کر رہا تھا، سلاخ دار کھڑکی کی طرف تھوڑی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا، وہی پندرہ سولہ برس کی معصوم صورت لڑکی کھڑکی کے سامنے تھی جو چند دن پہلے اپنے باپ کی ناگہانی موت پر دیوانہ وار روئی تھی۔ غالباً وہ اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد حویلی واپس آ چکی تھی۔ اس کے سر پر روٹیوں والی بڑی چنگیر تھی اور ہاتھ میں لسی کا ڈول تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ شکر ہے دوپہر میں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے نمکین لسی کا گلاس بھر کر عمو کی طرف بڑھایا جسے وہ غٹا غٹ پی گیا۔ لڑکی نے ایک تہ کی ہوئی روٹی بھی عمو کی طرف بڑھائی، اس کے اندر سالن بھی تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''چھپا کر کھانا۔ نہیں تو بھا ماکھا تمہاری جان کو آ جائے گا اور میری بھی شامت آئے گی۔''

پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ عمو کو اس لڑکی کا نام شبانہ معلوم ہوا تھا...... وہ اچھے خدوخال کی تھی اور اس کے چہرے پر خصوصیت اس کی آنکھیں تھیں جن میں معصومیت اور محبت سچے موتیوں کی طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

رات کو ماکھا عمو کے لئے تھوڑا سا بدمزہ کھانا اور پانی لے کر آیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ عمو کو آج بھی کچھ نہ دیا گیا تو صبح تک کوٹھڑی میں اس کی لاش سے ''ملاقات'' بھی ہو سکتی ہے۔

جب عمو روکھی سوکھی روٹی، نیم ٹھنڈے پانی کے ذریعے گلے سے اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا، ماکھے نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے پنجے میں دبوچ کر اس کے سر کو زور سے دائیں بائیں ہلایا اور پھنکارا۔ ''اڑیل ٹٹو نہ بن بے وقوفا...... جندڑی برباد ہو جائے گی تیری...... مالکن کا دل میرے اوپر آیا ہوا ہے۔ اسے خوش رکھ، وہ تجھے خوش رکھے گی۔''

عمو خاموش رہا۔

ماکھے نے زور سے اس کے بازو پر ٹہوکا دیا۔ ''اوئے بولتا کیوں نہیں...... ابھی تُو نے

مالکن کے غصے کی چھوٹی سی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، فلم کا ٹیلر دیکھا ہے، فلم نہیں دیکھی ہے ابھی۔ اس نے ابھی تو تجھے صرف کتوں کے ساتھ بندھوایا ہے پھر کتا بھی بنا دے گی اورصرف کتا ہی نہیں بنائے گی، تجھے اپنے پاؤں چاٹنے پر بھی مجبور کرے گی۔ کرنا تو تجھے وہی پڑے گا جو مالکن چاہے گی لیکن جو کام پیار محبت سے ہو جائے وہی چنگا ہوتا ہے۔"

"پپ...... پر...... یہ تو گناہ ہے۔ بہت بڑا گناہ ہے۔"

"اوئے...... اوئے مولوی ثناء اللہ...... زیادہ فتوے بازی نہ کر۔ یہاں گناہ ثواب کا مطلب کچھ اور ہے۔ گناہ وہی ہے جو مالکن کو پسند نہ ہو...... اور اپنے گناہ گاروں کے لئے مالکن کے پاس دوزخ بھی اپنا ہی ہے۔ دو چار دن میں تجھے اُٹھا کر پھینک دے گی اس میں۔"

عمو کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اپنی ماں کی دور افتادہ آواز کسی مقدس سرگوشی کی طرح اس کے کانوں گونج رہی تھی۔

ماکھے نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اگر تُو تیار ہے تو میں جا کر مالکن سے بات کروں؟"

عمو کا دل ایک بار پھر کراہت سے بھر گیا۔ ایک بدبودار بوجھ کے تصور سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماکھے نے اپنا سوال دُہرایا تو عمو نے نفی میں سر ہلا دیا اور دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

ماکھے نے اسے ایک گالی دی اور بولا۔ "لگتا ہے تیری تقدیر ہی خراب ہے۔" پھر وہ اس کے ہاتھ سے سالن والی پلیٹ چھینتا ہوا باہر چلا گیا۔

اگلے چھ سات روز عمو کے لئے بہت اذیت ناک تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ اس کے ننگے پنڈے پر ساری رات مچھر کاٹتے تھے اور دن کے وقت مکھیاں ستاتی تھیں۔ کوٹھڑی کی صفائی بس ایک دو بار ہی کی گئی تھی۔ بُو سے اس کے حواس مختل رہتے تھے۔ دن کے وقت اسے کتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا، یہ بڑے خونخوار قسم کے کتے تھے تاہم غیر متوقع طور پر عمو کے ساتھ ان کا رویہ نرم ہی تھا یا انہوں نے مجبوری کے تحت اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

عمو کو بس ایک وقت رُوکھی سوکھی روٹی بچے کھچے سالن یا دہی وغیرہ کے ساتھ دی جاتی تھی۔ وہ اس کی جسمانی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی تھی۔ اگر اسے شبانہ کا چوری چھپے کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید وہ بالکل نیم جان ہو جاتا۔ شبانہ دراصل سراں میں "کاموں" کو کھانا وغیرہ پہنچانے آتی تھی۔ واپسی پر وہ عمو والی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ رات کے وقت عموماً اس طرف گہرا اندھیرا ہوتا تھا۔ وہ نظر بچا کر کچھ کھانا کھڑکی میں سے اندر "پاس"

کر دیتی تھی۔ کبھی روٹی جس پر بھنے ہوئے مرغ کا پیس رکھا ہوتا تھا، کبھی سموسے یا جلیبی وغیرہ، کبھی کوئی پھل۔ وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی اور اس سے بہت ہمدردی رکھتی تھی۔

ایک رات وہ آئی تو عمو نے کہا۔ "تُو ایسا نہ کیا کر شبانہ! کسی نے دیکھ لیا تو تیرے لئے مصیبت ہو جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں عمو بھائی۔ کوئی ایسی بات ہوئی تو سنبھال لوں گی۔" وہ جلترنگ بجاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیسے سنبھال لوگی؟" عمو نے سرگوشی میں پوچھا۔

"بس کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔ تم فکر نہ کیا کرو۔" وہ تہ شدہ روٹی کھڑکی میں سے عمو کو تھماتے ہوئے بولی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی چوڑیاں چھنکیں اور اس کے ملائم ہاتھوں کا لمس عمو کے سراپا میں بجلی دوڑا گیا۔ یہ روٹی کے بجائے دیسی گھی میں پکا ہوا پراٹھا تھا اور اس پر آلو کی بھجیا رکھی تھی۔

عمو نے کہا۔ "شبانہ! مجھے تیرے ابا جی کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اتنے دن گزر گئے، اب بھی کبھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو تیرے ابا جی کا لہولہان چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔"

"بس عمو بھائی! ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ وہ ہر طرح کے گھوڑوں، گھوڑیوں کو سدھا لیتے تھے، پر اس منحوس گھوڑے پر کاٹھی ڈالتے ہوئے ان کو بھی ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے مالکن سے کہا بھی تھا کہ اس گھوڑے کو گولی مار دیں یا پھر کہیں بکتا ہے تو بیچ دیں لیکن مالکن اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ یہ گھوڑا یہیں حویلی میں رہے گا اور تم اس کو سدھاؤ گے بھی۔ میرے ابا جی سمجھ گئے کہ اگر اب انہوں نے انکار کیا تو نوکری تو جائے گی ہی، اوپر سے کوئی سخت مصیبت بھی آ جائے گی۔ گھر میں پہلے ہی بیماری اور بھوک تھی۔ وہ کیا کرتے۔ مالکن کے کہے پر عمل کیا......" شبانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔

عمو نے سوچا، اس نے خواہ مخواہ اس کے ابا کی موت کا ذکر چھیڑ کر اسے دکھی کر دیا ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ "اب تو اکیلی ہی نوکری کرتی ہے یہاں؟"

"ہاں عمو بھائی، ماں بیمار ہے۔ کسی طرح گھر تو چلانا ہے نا لیکن پانچ چھ مہینے بعد جب چلی جاؤں گی تو پھر شاید ماں کو ہی یہاں آنا پڑے۔"

"کہاں چلی جاؤ گی؟"

"میری شادی ہے نا۔" وہ جیسے روانی میں کہہ گئی۔ تاہم کہنے کے بعد ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

اچانک عمو کو لگا جیسے اس کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی ہے اور سینے کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ شبانہ کی شادی کا سن کر اسے شاک لگا تھا ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے ساتھ کیا تعلق تھا عمو کا؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو وہ ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے...... اور وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی۔ چند بار کسی کی سانسوں کی مہکار محسوس کر لینے سے اور چوڑیوں کی چھنکار سن لینے سے اور ہاتھوں کا لمس لینے سے...... کسی سے کوئی تعلق تو نہیں بن جاتا...... پھر عمو کو تعلق ٹوٹنے کا جھٹکا کیوں محسوس ہوا تھا؟

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ”عمو بھائی! کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”کچھ نہیں...... بس یونہی سوچ رہا ہوں...... ابھی تو...... میرا مطلب ہے، ابھی تو تمہاری عمر چھوٹی ہے؟“ وہ ہکلایا۔

”ہمارے میں شادیاں چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہیں۔ میری بہن کی شادی صرف چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ میں تو پھر بھی اس سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہوں۔“

رات گہری ہو چکی تھی۔ سراں میں دیے جل چکے تھے مگر کوٹھڑی کے پچھواڑے جہاں شبانہ کھڑی تھی، مکمل اندھیرا تھا۔ عمو جانتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر کتوں کو بچا کھچا گوشت اور روٹی وغیرہ ڈالتی تھی۔ اب بھی اگر کوئی اتفاقاً ادھر آ جاتا تو وہ کوئی معقول بہانہ بنا سکتی تھی۔

عمو نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”شبانہ! کہاں ہو رہی ہے تیری شادی؟“

”میرے چاچے کا پتر ہے اشرف۔ شہر میں ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔“ شبانہ نے کہا۔

شبانہ نے یہ فقرہ عام سے لہجے میں کہا تھا مگر یہ فقرہ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ایک ایسی اداسی اُتر آئی جسے عمو نے بہت واضح محسوس کیا۔

وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں کسی گھڑسوار کی ٹخ ٹخ سنائی دی اور شبانہ اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

یہ سلسلہ پندرہ بیس دن مزید جاری رہا۔ مالکن ماجھاں اسے کتوں کے ساتھ بند کروا کے جیسے بھول ہی گئی تھی۔ پھر عمو کو شبانہ کی زبانی پتا چلا کہ وہ کسی کام سے گاؤں سے باہر ہے۔ شبانہ موقع دیکھتے ہی اس کی کوٹھڑی کے پچھواڑے کھڑکی پر آ جاتی تھی۔ اس بدبودار کوٹھڑی میں وہ عمو کے لئے تازہ ہوا کا واحد جھونکا تھی۔ وہ اس کا انتظار کرتا تھا۔ اگر کسی دن وہ نہ آ پاتی تو وہ اداس ہو جاتا۔ لگتا کہ کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ اسے خلا محسوس ہوتا، قدموں کی مدھم چاپ کا، چوڑیوں کی چھنکار کا اور بدن کی خوشبو کا اور کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ شبانہ بھی اس سے نہ مل کر

بے قرار ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ تو اسے عمو بھائی کہتی تھی اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی باتوں سے عمو کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی...... مگر چونکہ یہ بچپن کا بندھن تھا اور ماں باپ کا دیا ہوا قول نبھانا تھا، اس لئے وہ آمادہ تھی۔

گرم بے چین راتوں کی تنہائی میں عمو اپنا سر گھٹنوں میں دے لیتا اور خوب روتا۔ اسے ماں ٹوٹ کر یاد آتی۔ وہ سوچتا ماں کتنے انتظار کے بعد اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آئی ہو گی اور پھر اسے وہاں نہ پا کر اس پر کیا گزری ہو گی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ فربہ اندام...... صادق شاہ نے اور اس کے مریدوں نے اس کی ماں کے سامنے کیا بہانہ بنایا ہو گا...... ہو سکتا ہے انہوں نے اس کی ماں کو یہ بتایا ہو کہ اس کا بیٹا یہاں سے بھاگ گیا ہے...... اور کچھ چرا کر بھی لے گیا ہے...... یا اس طرح کی کوئی اور کہانی سنا دی ہو۔ یہ بات تو عمو کی سمجھ میں اچھی طرح آ چکی تھی کہ اس کی جان جلدی یہاں سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔ وہ کچھ خطرناک لوگوں میں آن پھنسا تھا اور ان میں سب سے خطرناک خود ماجھاں تھی۔ وہ بدنام ڈکیت ناجے کی بہن تھی۔ اس کی بدمعاشیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ کوئی آٹھ دس سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور کہا جاتا تھا کہ اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کو خود اپنے ہاتھوں سے کلہاڑیوں کے وار کر کے ہلاک کیا تھا۔ اب وہ چاروں شرعی عیبوں کے ساتھ اس گاؤں کی مختار کل تھی۔ وہ شراب پیتی تھی اور شراب کا کاروبار بھی کرتی تھی۔ اس کی جوئے کی بیٹھک پورے علاقے میں مشہور تھی اور بڑے دھڑلے والے لوگ یہاں آتے تھے۔ ماجھاں نے کھلم کھلا ناجائز تعلقات بھی قائم کر رکھے تھے۔ سب سے پہلے وہ جنوبی پنجاب سے ابرار نامی ایک کشمیری لڑکے کو اغوا کر کے یہاں لائی تھی اور اسے حویلی میں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ چند مہینوں بعد اس لڑکے نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ ایک کماد میں چھپ گیا۔ وہاں جنگلی سور بھی چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے مار ڈالا...... ماجھاں کو اس کے مرنے کا افسوس ہوا لیکن پھر اس کے بعد یہ سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ اب کئی لڑکے اس کی حویلی میں اور ڈیرے پر موجود تھے۔ ان میں نیا اضافہ خود عمو تھا۔

ماجھاں اپنے کام سے فارغ ہو کر گاؤں واپس آ گئی تو ایک بار پھر ماکھے نے عمو سے بات کی۔ وہ ایک بڑے پیالے میں اس کے لئے دودھ جلیبیاں لے کر آیا۔ ساتھ میں آلو والے کرارے نان اور دہی کا رائتہ تھا۔ انہوں نے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر یہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ماکھا بولا۔ ”مالکن تجھ سے بہت ناراض ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کسی

وقت وہ تیرا کوئی ہتھ پیر ہی نہ توڑ ڈالے۔ اس کا غصہ بڑا برا ہے۔ مجھے تجھ پر بڑا ترس آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ اگر تُو کہے تو مالکن سے تیری مافی کی بات کر کے دیکھوں؟''

''مافی...... سے کیا مطلب...... ہے؟'' عمو نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا۔

''مافی سے مطلب یہ ہے کہ تجھے مالکن کا غصہ دور کرنا ہوگا۔ اس کے کہنے پر چلنا ہوگا جس طرح اچھو چلتا ہے، مقبول چلتا ہے اور دوسرے چلتے ہیں......''

عمو نے نفی میں سر ہلایا...... اس کے ساتھ ہی وہ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر ماکھے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''نہیں نہیں، اتنی جلدی جواب نہ دے۔ اک آدھ دن اور چنگی طرح سوچ لے۔ میں پرسوں پھر تجھ سے بات کروں گا۔''

عمو اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس کا جواب دو دن بعد بھی یہی ہوگا اور دو سال بعد بھی لیکن آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ دوبارہ کتوں والی کھولی میں کتوں کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس کے اندر آہستہ آہستہ بغاوت پروان چڑھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ایک طیش سا اس کے اندر سے اُبھرنے لگتا تھا۔ مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ طیش آمیز بغاوت بہت جلد دم توڑنے والی ہے۔

یہ اگلے روز شام کے بعد کی بات ہے۔ کتے اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کوٹھڑی سے باہر جا چکے تھے۔ شبانہ پورے تین روز سے دکھائی نہیں دی تھی۔ عمو اس کے لئے بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کئی طرح کی فکروں نے بھی اسے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ حالانکہ وہ جانتی بھی تھی کہ وہ ایک ایک پل گن کر گزار رہا ہے۔ اندھیرا ذرا گہرا ہو گیا تو کھڑکی کے پاس کھٹ پٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی مرغ پلاؤ کی مدھم خوشبو بھی اس کے نتھنوں تک پہنچی۔ یہ شبانہ ہی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں چاولوں والا شاپر سلاخوں میں سے عمو تک پہنچایا۔ عمو نے بے چین لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''کہیں نہیں، ماں آئی ہوئی تھی۔ آج ہی واپس گئی ہے۔ پیسے لینے آئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ میرا ہونے والا، گھر والا تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے پندرہ ہزار روپیا چاہئے...... میں نے شہر میں کرائے پر دکان لینی ہے۔ پہلے بھی اسی طرح دس پندرہ ہزار لے کر جا چکا ہے۔ پر کیا کرایا کچھ بھی نہیں...... خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم ٹھیک تو ہو نا عمو بھائی؟''

''ٹھیک ہوں...... پر تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر ہولے سے بولی۔ ''پریشان نہ ہوا کرو۔ مجھے تو ایک دو

مہینے میں چلے جانا ہے۔ پھر کیا کرو گے؟''

''پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''کہاں؟''

''یہ تو پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤں اور پھر واپس جا کر کسی دور کے رشتے دار کے گھر چھپ جاؤں...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجھے گولی مار دیں اور میں اوپر ہی چلا جاؤں۔ پھر میری لاش بھی ابرار کی طرح کماد کے کسی کھیت میں دبا دی جائے۔''

شبانہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نرم کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے عمو کے بدن میں برق سی دوڑا دی۔ پھر پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اس نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ''شبانہ!'' عمو نے کہا لیکن وہ تیزی سے گھوم کر واپس چلی گئی۔

عمو ایک دم پسینے میں نہا گیا۔ اسے لگا کہ اس نے سنگین غلطی کر دی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ چاول کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔ وہ انہیں کھڑکی سے باہر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اگر کوٹھڑی میں رکھتا تو صبح ماکھا اس سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ کتے بھی رکھوالی کے لئے جا چکے تھے ورنہ وہ ان کے آگے ہی ڈال دیتا۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ جیسے تیسے چاول گلے سے نیچے اُتارے اور بے دم سا ہو کر لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شبانہ کے حوالے سے تمام غلط خیالات اپنے دماغ سے نکال دے گا۔ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور اگر وہ کسی وقت کھڑکی پر آئے بھی تو اسے منع کر دے گا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد اس نے کھڑکی ویسے ہی بند کر دی۔ پھر شام ہو گئی۔ اس نے کوٹھڑی میں لالٹین روشن کر دی۔ کتے رکھوالی کے لئے چلے گئے۔ آج کوٹھڑی کی صفائی ہوئی تھی۔ بو قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی، اسے بند کھڑکی کی دوسری جانب مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے کھڑکی پر دباؤ ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں کھلی۔ تب مدھم دستک دی گئی۔ اس دستک کے ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی چھن چھن بھی شامل تھی۔ عمو کا دل بے طرح دھڑک اُٹھا۔ اس نے کھڑکی کھولی اور ڈرتے ڈرتے شبانہ کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہہ دے گی مگر

جب اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مدھم مسکراہٹ دیکھی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''کھڑکی کیوں بند کی؟'' اس نے پوچھا۔

''بب...... بس یونہی...... مچھر آ رہے تھے۔''

''ناراض تو نہیں ہو؟''

''کس بات پر؟'' عمو کے سینے میں جلترنگ سے بج اُٹھے۔

''کل میں جلدی سے چلی گئی تھی۔ تمہارے بلانے پر بھی رکی نہیں۔''

عمو خاموش رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا دھڑکنیں تھیں۔ شبانہ نے کل والی ''بے ساختہ حرکت'' کا برا نہیں مانا تھا۔

''شبانہ! میں...... ہر وقت...... تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' وہ عجیب لرزتے لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''پتا نہیں۔''

''ایسا نہ کیا کرو عمو...... بھائی۔'' اس نے آخری لفظ ذرا اٹک کر ادا کیا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے...... تم...... جانتے ہو میری شادی ہونے والی ہے۔''

''مجھے سب پتا ہے شبانہ...... پھر بھی......''

''پھر بھی کیا؟'' اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''تم سب کچھ مجھ سے ہی پوچھتی جاتی ہو، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ہو۔ کیا...... تم بھی...... میرا مطلب ہے، تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

اس نے شرما کر عمو کی طرف دیکھا اور پھر عجب دل رُبا انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑی لیکن ٹھٹک گئی۔ دوبارہ پلٹ کر اس نے ہاتھ میں تہ کی ہوئی روٹی عمو کی طرف بڑھائی۔ اس پر شکر اور مکھن لگا ہوا تھا۔ وہ لجائے ہوئے انداز میں عمو کو روٹی تھما کر واپس ہو جانا چاہتی تھی مگر عمو نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چوڑیوں کی کھن کھن، کلائی کا نرم لمس...... عمو کے سینے میں ترنگ سی دوڑ گئی۔

''مجھے زیادہ انتظار نہ کرایا کرو شبانہ...... میں، بس شام کے انتظار میں ہی سارا دن کاٹتا ہوں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی۔ ''ہاتھ چھوڑو عمو بب بھائی...... کوئی آ جائے گا۔''

عمو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہاتھ کو پھر چوم لے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گرج

دار آواز سنائی دی۔ ''اچھا...... تو یہاں یہ چکر چل رہے ہیں۔''

شبانہ نے بدک کر اپنا ہاتھ عمو کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ عمو بھی سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ حویلی کا خطرناک صورت ملازم کالیا اور اس کا ایک ساتھی کھڑکی کے سامنے تھے۔ کالیے نے شبانہ کو چوٹی سے پکڑا اور آگے پیچھے زوردار جھٹکے دیئے۔ شبانہ کی اوڑھنی اُتر کر دور جا گری۔ کالیے نے زوردار آوازیں دیں۔ ''ماکھے بھائی...... شوکے...... صوفی۔''

یکایک اردگرد ہلچل نظر آنے لگی۔ چند سیکنڈ کے اندر کھڑکی سے باہر کافی افراد جمع ہو چکے تھے۔ ماکھا بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر کالیا پھنکارا۔ ''یہاں عشق مشوقی کا چکر چل رہا ہے ماکھا بھائی۔ یہ دو چھٹانک کی کڑکی خیر سے ہیر بنی ہوئی ہے اور یہ اندر رانجھا کھڑا ہے۔ یہ اس کے لئے چُوریاں لے لے کر آ رہی ہے۔ ہم پچھلے تین دن سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تھپڑ شبانہ کو مارا۔

وہ چھریرے جسم کی تھی، لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ ماکھا بھی آگ بگولا نظر آنے لگا۔ اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ عمو کو گریبان سے پکڑ کر اس نے زوردار جھٹکا دیا اور باہر گھاس پر پھینک دیا۔ چند ہی لمحے میں عمو کا جسم تھپڑوں اور ٹھوکروں کی زد میں آ گیا۔ اسے غلیظ گالیوں سے بھی نوازا جا رہا تھا۔ دوسری طرف شبانہ کی مرمت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے چلانے کی آوازیں عمو کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان اذیت ناک لمحوں میں اس نے سوچا، ان کا قصور تو اتنا بڑا نہیں ہے جتنی بڑی انہیں سزا دی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ماجھاں بھی وہاں آن موجود ہوئی۔ اس کو ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے بھی شبانہ کو دو تین تھپڑ مارے پھر عمو کو شلوار کے نیفے سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ پہلے ہی نشے میں دھت تھی۔ اس کے منہ میں الائچی سپاری پان دبا ہوا تھا۔

''اچھا تو یارانے پالے جا رہے ہیں یہاں؟'' اس نے عمو کے گال کو چٹکی میں دبایا اور بے دردی سے آگے پیچھے جھلایا۔

عمو کے ہونٹوں سے خون رِس رہا تھا نمکین ذائقہ اس کے منہ میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ کراہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ ''کتنی دیر سے یہ عشقیہ فلم چل رہی تھی رانجھا صاحب؟'' وہ اسے گریبان سے دبوچ کر بولی۔

''ایسا کچھ نہیں تھا جی...... وہ تو بس ترس کھا کر کسی وقت مجھے روٹی دینے آ جاتی تھی۔''

''روٹی نہیں مکھن والی چُوری۔ پھر تُو عشق کی بانسری بجاتا ہو گا اور وہ تیرے صدقے واری جاتی ہو گی۔ میری واری موت پڑتی تھی تجھے...... موت پڑتی تھی؟''

''آپ کو...... غلطی لگ رہی ہے جی......''

اس نے عمو کے گریبان کو اندھا دھند جھٹکے دیئے اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ زہرناک انداز میں پھنکاری۔ ''مجھے غلطی لگ رہی ہے نا...... پر اب تُو غلطی نہ کرنا۔ جو کچھ کیا ہے، سب کو صاف صاف بتا دینا۔ وہ کتنی واری تیری کوٹھڑی کے اندر آئی تھی؟ اور اس کے علاوہ کیا کیا کرتے رہے ہو تم؟ یہاں سے بھاگ جانے کا پروگرام تو ضرور بہ ضرور بنایا ہوگا تم نے؟ میں پھر کہہ رہی ہوں، جھوٹ بولنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ بہت برا ہوگا۔''

ماجھاں کا انداز عمو کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ اب اس پر پوی طرح حاوی ہونے کا سوچ رہی تھی لیکن وہ بھی دل میں پوری طرح ٹھان چکا تھا کہ ماجھاں کی کسی من مانی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کی ہڈیاں ہی توڑ ڈالے گی نا۔ اس کو جان سے ہی مار دے گی نا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت اب کچھ قد نکال چکی تھی۔

ماجھاں کا کراہت آمیز وجود ایک ''دھمکی'' کی طرح اس کے سامنے تھا اور وہ اپنا دم گھٹتا محسوس کر رہا تھا۔

ماجھاں سرسراتی آواز میں بولی۔ ''دیکھ منڈیا! اگر تُو سچ نہ بتائے گا نا تو پھر میں اس نمک حرام سے پوچھوں گی اور وہ جھوٹ نہیں بول سکے گی۔ میرے پوچھنے کا طریقہ ہی ایسا ہوگا۔ میں اس شتونگڑی کو دو تین گھنٹے کے لئے کالیے کے حوالے کر دوں گی اور کالیا ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈھائی سال سے اس نے زنانی کی شکل نہیں دیکھی۔''

ایک دم عمو کو بے پناہ کمزوری محسوس ہوئی۔ اسے لگا اس کے اندر کا سارا دم خم مسمار ہو رہا ہے۔ وہ اس پھٹی پرانی اوڑھنی والی، معصوم صورت لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس لڑکی پر کوئی آفت آئے۔ وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

شاید زمانہ ساز ماجھاں نے بھی اس کے چہرے کی بدلی ہوئی رنگت دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے فقرے بڑے کارگر رہے ہیں اور جب وہ ایک بار سمجھ گئی تو پھر عمو کے پاس ہار ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس نے اپنے اندر کی کراہتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا......

○......❖......○

......اب عمو کی حیثیت ماجھاں کے زرخرید غلام کی سی تھی۔ وہ جب چاہتی، اسے اپنی خلوت میں بلا لیتی۔ بعض دفعہ نشے میں دھت ہو کر اس سے توہین آمیز سلوک بھی کرتی۔ اس

کے علاوہ بھی اسے ماجھاں کی خدمات انجام دینا پڑتیں۔ وہ اس کا حقہ تازہ کرتا، اس کو پنکھا جھلتا، اس کے پاؤں دباتا۔ جب وہ قدرے مہربان ہوتی تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا بھی کھلاتی لیکن جب موڈ آف ہوتا تو ذرا ذرا سی بات پر اسے ڈانٹتی اور گالیاں دیتی۔ اب عمو کو اچھا کھانا اور اچھا لباس مل رہا تھا۔ بس ماجھاں کی منحوس قربت کے سوا اسے کوئی تکلیف نہیں تھی اور یہ تکلیف اسے اکثر تنہائی میں خون کے آنسو رُلاتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ شبانہ کے لئے برداشت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں اس نے سرکشی دکھائی، شبانہ پر عرصۂ حیات تنگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ شبانہ سے ملاقات کا موقع اسے کم ہی ملتا تھا۔ وہ بس دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ شبانہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی خاطر عمو کس طرح کے امتحان سے گزر رہا ہے۔

ایک شام کسی زمین کی ملکیت پر ایک زوردار جھگڑا ہوا۔ ماجھاں کا ایک کارندہ صوفی شدید زخمی ہو کر گاؤں آیا۔ اس کے ساتھ ہی ماجھاں اور اس کے درجنوں ساتھیوں نے گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالیں اور اسلحہ لہراتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے۔ حویلی میں بس اکا دکا افراد ہی تھے۔ ہیڈ ملازمہ شہناز عرف ناجو بیمار تھی اور چھت پر جا کر لیٹی ہوئی تھی۔ شبانہ اور عمو کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کی یہ ملاقات قریباً تین مہینے بعد ہوئی تھی۔ یہ بھوسے والی کوٹھڑی تھی۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ شبانہ یہاں بھوسہ لینے آئی تھی۔ عمو نے اسے دیکھ لیا تھا اور ہمت کر کے وہ بھی کوٹھڑی میں چلا گیا تھا۔

''شبانہ۔'' عمو نے اسے ہولے سے پکارا۔

شبانہ نے اسے پہچان لیا اور پھر وحشی ہرنی کی طرح اَدھ کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔

''گھبراؤ نہیں شبانہ! یہاں کوئی نہیں۔ شہناز اور زینب بھی اوپر چھت پر ہیں۔''

عمو کے اس فقرے نے شبانہ کی گھبراہٹ ذرا کم کی۔ وہ زرد پڑا منہ پر رکھ کر سسکنے لگی۔

عمو نے دل گیر لہجے میں کہا۔ ''شبانہ! تم نے تو یہاں سے چلے جانا تھا۔ تم گئی کیوں نہیں ہو؟''

''مالکن جانے دے تب نا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ جان گئی ہے کہ میں جب تک یہاں ہوں، تم بھی اس کا کہا ماننے پر مجبور ہو۔ وہ اب مجھے بالکل نہیں جانے دے گی۔''

''اور تمہاری شادی؟''

''اللہ جانے۔'' شبانہ مختصر جواب دے کر خاموش ہوگئی۔

''شبانہ! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں تمہاری عزت ہر وقت خطرے میں ہے۔ یہاں شرابی ڈشکرے ہیں۔ کوئی کسی بھی وقت تم پر ہتھ ڈال سکتا ہے۔''

''یہ بڑی بری عورت ہے عمو...... بھائی۔ آسے پاسے کے سارے پنڈوں میں اس کے بندے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔ تمہیں شاید پتا نہ ہو، پچھلے مہینے دینے مسلی کے پتر سلیم نے مالکن سے اجازت لئے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تھی۔ مالکن نے اسے پکڑ کر پھر پلس کے حوالے کر دیا ہے۔ پچھلی بار اس پر چوری کا الزام تھا، اس بار ایک کڑی سے زبردستی کا الزام لگا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا ہے اس وچارے کے ساتھ۔''

''پر اس طرح کب تک چلے گا شبانہ؟ مجھے ہر وقت تمہارے بارے میں ڈر لگا رہتا ہے۔ میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں نہ سوچا کرو۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''بس نہ سوچا کرو...... تمہیں پتا ہی ہے۔''

عمو نے گہری سانس لی۔ اُدھ کھلے دروازے میں سے خالی تاریک برآمدہ دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''شبانہ! سچ بتاؤ، کیا تم اس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''میں وہی کروں گی جو میرے وڈے کہیں گے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

تاریکی اور تنہائی عمو کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اس نے شبانہ کا نرم ہاتھ ہولے سے تھام لیا اور بولا۔ ''ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا شبانہ...... میں تو ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں، کیا کبھی تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' وہ ذرا شرما کر لیکن اداس لہجے میں بولی۔

''کیا سوچتی ہو؟''

''وہی کھڑکی والی ساری باتیں یاد آتی ہیں جب میں تمہیں کھانے کی چیزیں دینے آتی تھی۔'' اس نے کہا اور ہاتھ چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

عمو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بولا۔ ''کھڑکی والی ساری باتوں میں ایک خاص بات بھی تھی۔ تمہیں یاد ہے؟''

''کک...... کیا؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

''مم...... میں نے...... تمہارا ہاتھ چوما تھا۔'' عمو کی آواز میں لرزش تھی۔

''اچھا...... مجھے جانے دو۔'' وہ جلدی سے بولی اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''ایک بار اور ایسا کرنے دو شبانہ۔'' عمو نے التجا کی۔

''عمو بھائی! ایسی باتیں نہ کرو مجھ سے۔'' وہ بدک کر بولی اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا...... پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ عمو اپنی جگہ ہکا بکا اور خجل کھڑا رہ گیا۔ اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ وہیں تاریکی میں پرالی کے گٹھوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل غم اور ندامت سے بھر گیا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ آتشیں آنسو اس کی آنکھوں سے رِسنے لگے۔ پھر ان کا بہاؤ تیز ہوتا گیا۔ اس کے گھٹنے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ حویلی کے رہے سہے مرد ملازم بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر کلہاڑیاں وغیرہ لہراتے ہوئے حویلی سے نکل گئے ہیں۔ شاید پنڈ سے باہر کہیں ہونے والی لڑائی شدت اختیار کر گئی تھی۔ اب حویلی میں بس چند پہرے دار اور رکھوالی کے کتے تھے۔

آدھ پون گھنٹے بعد شبانہ پھر بھوسے والی کوٹھڑی کے دروازے پر نظر آئی۔ وہ کچھ دیر دہلیز پر کھڑی عمو کو دیکھتی رہی، پھر اندر آ گئی۔ اس کی چوڑیاں عمو کے کان کے بالکل قریب چھن چھنائیں۔ اس کی نرم گرفت عمو نے اپنے پسینے سے بھیگے ہوئے بازو پر محسوس کی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اب اُٹھ جاؤ یہاں سے۔ وہ لوگ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ تم ابھی ڈیرے سے دودھ بھی لے کر نہیں آئے...... چلو اُٹھو......''

عمو اسی طرح بیٹھا رہا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

اس نے ذرا زور لگا کر اسے اُٹھانا چاہا اور بولی۔ ''دیکھو ایسا مت کرو عمو...... بھائی! نہیں تو میں بھی رونا شروع کر دوں گی......''

''تم جاؤ، میں آ جاتا ہوں۔'' عمو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''غصے ہو گئے ہو نا؟''

''ہاں...... لیکن اب کبھی نہیں ہوں گا۔ تم سے پکا وعدہ کرتا ہوں۔'' عمو کی آواز آتشیں آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

''اس کا مطلب ہے، بہت زیادہ غصے میں ہو۔''

عمو چپ رہا۔ وہ بھی چپ رہی۔ ایک سنسناتی خاموشی کوٹھڑی کی تاریکی میں لہریں لے رہی تھی۔ ''...... اچھا...... یہ لو......'' اچانک اس نے اپنے نرم ہاتھ کی پشت عمو کے ہونٹوں سے لگا دی۔

یکا یک عمو کی رگوں میں جوش آمیز محبت کے بہاؤ نے دھوم مچا دی۔ شبانہ کا الٹا ہاتھ عمو کے ہونٹوں پر دھرا تھا۔ اس نے چاہت بھری وارفتگی سے اس ہاتھ کو چوما...... پھر بازو کو......

پھر اس نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس نے معمولی گریز دکھانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا...... اس کے گلے سے لگ گئی۔ عمو کے رخساروں پر تازہ آنسو بہنے لگے۔ ”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا شبو! میں تجھ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ بہت زیادہ...... بہت زیادہ۔“ وہ چومتا چلا گیا، اس کے بالوں کو، پیشانی کو، رخساروں کو۔

کوئی موم کی زنجیر تھی جو پگھل گئی...... کوئی ریت کی دیوار تھی جو بہہ گئی۔ وہ گم گشتہ آواز میں بولی۔ ”عمو...... تم یہاں سے چلے جاؤ...... کسی طرح نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔“

”میں اکیلا نہیں، تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ ہم دونوں نکلیں گے۔“

”لیکن کیسے عمو؟ تم تو...... تم تو لڑکے ہو۔ بھاگ دوڑ کر جان بچا سکتے ہو...... میں تمہارے ساتھ ہوں گی تو تم جلدی پکڑے جاؤ گے۔“

”نہیں شبو! جائیں گے تو دونوں، نہیں دونوں یہیں رہیں گے۔“ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ”میں تو ایک اور بات کہتا ہوں شبو۔ یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ وہ سوردی بچی حویلی سے باہر گئی ہوئی ہے۔ بہت سے بندے بھی باہر ہیں۔ کیوں نہ ابھی یہاں سے نکل چلیں؟“

وہ لرز سی گئی۔ اس سے علیحدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی مگر کوٹھڑی کی گہری تاریکی میں وہ ایک دوجے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بس محسوس کر سکتے تھے۔ ان کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ ان کی دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے لیکن ان کا جذبہ ان کی طاقت بن گیا تھا۔ ان کے خون کی حرارت ان کی راہنمائی کر رہی تھی...... یہ عجیب انقلاب تھا۔ اب سے صرف دس پندرہ منٹ پہلے وہ کچھ اور تھے، اب کچھ اور بن گئے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے وہ اپنی بے بسی پر اشک بہا رہے تھے، اپنی لاچاریوں کو ناقابلِ شکست سمجھ رہے تھے۔ اب وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کے لئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رہے تھے۔ ایک ہی جست میں انہوں نے اظہار سے اقرار تک اور اقرار سے منزل کی جستجو تک بہت سے مرحلے طے کر لئے تھے۔

اور پھر وہ نوخیز جوڑا محبت کا ہاتھ تھام کر مالکن ماجھاں کی حویلی سے بھاگنے کو تیار ہو گیا۔ شبانہ نے ٹوپی والا دیسی برقع پہن لیا۔ عمو نے سر پر ایک صافہ سا ڈال لیا۔ دونوں حویلی کے پچھلے احاطے میں پہنچے۔ یہاں رکھوالی کا ایک بڑا کتا چکرا رہا تھا۔ عمو اور شبانہ کو دیکھ کر اس نے اپنے کان کھڑے کئے اور دُم کو تیزی سے گردش دینے لگا۔ عمو نے اسے پچکارا اور اس کے

سامنے کچے گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا پھینکا۔ غیر متوقع طور پر خطرناک کتے نے ان دونوں کے ساتھ اپنا رویہ جارحانہ نہیں رکھا۔ وہ چھوٹے عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پہرے دار سالار خاں موجود تھا۔ وہ اس کے اِدھر اُدھر ہٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سالار خاں نے اپنا ازار بند کھولا اور ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ سنہری موقع تھا، وہ دونوں نکلے اور تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔ اب وہ گاؤں کی گلیوں میں تھے۔ اِکا دُکا لوگوں سے ان کا سامنا ہوا مگر کوئی بھی ان کی طرف سے شک میں نہیں پڑا۔ جلد ہی وہ گاؤں سے باہر تھے۔ جوار کے اونچے کھیتوں میں چلتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

”ہائے میں مرگئی۔“ شبانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ٹھٹک کر عمو کے بازو سے لگ گئی۔

ان کے عین سامنے سے گھوڑے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہ ماجھاں اور اس کے ساتھی تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کامیاب لوٹے ہیں۔ وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ عمو اور شبانہ سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح ایک طرف جھاڑیوں میں دبک گئے۔ تنومند ماجھاں نے مردوں کی طرح ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کے کندھے پر رائفل تھی۔ یہ لوگ ان کے قریب سے گزرے اور گاؤں کی طرف چلے گئے۔

عمو نے سرگوشی میں کہا۔ ”شبو! اب یہ لوگ ہمارے پیچھے آنے میں زیادہ دیر نہیں کریں گے۔ ہمیں جلدی کرنی پڑے گی۔“

شبو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اونچے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں اور دھول سے اَٹے ہوئے کچے راستوں پر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ان کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ انہیں دور اپنے عقب میں لالٹینوں کی متحرک روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں گاؤں کی جانب سے بتدریج ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شبانہ نے اب اپنا دیسی برقع اُتار پھینکا تھا۔ تیز ہوا میں اس کے بال اُڑ رہے تھے۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ”عمو! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ میری ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔“ وہ بے دم سی ہو کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔

”نہیں شبو! ہمیں ہمت کرنی پڑے گی۔ دریا زیادہ دور نہیں ہے۔ کسی طرح ہم پار کر گئے تو پھر پکڑے نہیں جائیں گے۔“

شبو ہمت کر کے دوبارہ اُٹھی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ پاؤں اور پنڈلیوں میں کانٹے

چھپے ہوئے تھے۔عمو کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔اگلے بیس تیس منٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دریا تک نہیں پہنچ سکیں گے۔گھڑسوار تیزی سے ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔اب عمو اور شبانہ کو پناہ کی تلاش ہوئی۔جلدی ہی انہیں ایک چھوٹا سا ڈھارا نظر آیا۔اس کی چھت نہیں تھی اور دیواریں بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔اس میں بہت ساری پرانی پرالی پڑی تھی۔وہ اس پرالی کے اندر گھس گئے اور اپنے اوپر بھی بہت سی پرالی ڈال لی۔عام حالات میں وہ اس سڑاند ماری پھپھوندی زدہ پرالی میں گھسنے کی ہمت کبھی نہ کرتے۔یہاں کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ سانپ بھی ہو سکتے تھے۔مگر اب بیرونی خطرے نے انہیں پرالی کے اندرونی خطروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

یہ جگہ ان کے لئے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی......ان کے پیچھے آنے والے بس پانچ دس منٹ میں ہی ان کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ان کے گھوڑوں کی آوازیں، ان کی باتیں سب کچھ عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچیں انہوں نے ماجھاں کی للکارتی ہوئی آوز بھی صاف پہچانی۔یہ لوگ ان کے قریب سے ہو کر تیزی سے دریا کی طرف بڑھ گئے......چوڑے پاٹ والا دریائے چناب وہاں سے بس دو تین فرلانگ کی دوری پر ہی تھا۔یقیناً ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں دریا کی طرف گئے ہیں۔راستے میں ملنے والے......راہ گیروں اور کسانوں نے انہیں اس بارے میں اشارہ دیا ہوگا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی طرح دل کی دھڑکنیں گنتے ہوئے گزر گیا۔تب عمو اور شبانہ کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ دریا سے واپس آ رہے ہیں۔اب ان کا رخ گاؤں کی طرف تھا لیکن اگر عمو اور شبانہ یہ سمجھ لیتے کہ یہ لوگ واپس گاؤں پہنچ جائیں گے اور پھر ٹھنڈی ہوا میں لمبی تان کر سو جائیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہوتی۔عمو جانتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔رات بھر دریا کے آس پاس اور قریبی بستیوں میں ان کی تلاش جاری رہے گی۔

رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔وہ پسینے میں شرابور پھپھوندی زدہ پرالی میں لیٹے رہے۔آثار گواہی دے رہے تھے کہ وہ لوگ ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔کبھی کسی گھوڑے کی ٹاپ سنائی دے جاتی، کبھی کوئی بلند آواز تیز ہوا کے دوش پر تیر کر ان تک پہنچتی۔

وہ اسی طرح ایک دوسرے کے پہلو میں دراز رہے۔تاہم تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے انہوں نے پرالی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر لیا۔خطرے کا احساس قدرے کم ہونے لگا تو انہوں نے ایک دوسرے کے جسم کا لمس محسوس کیا۔شبانہ ہولے سے ایک طرف کھسک گئی لیکن وہ کتنا بھی کھسکتی، وہ لیٹے تو پہلو بہ پہلو تھے۔عمو کے بازو نے شبانہ کے سر کے نیچے تکیہ بنا رکھا

تھا۔عمو کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔عمو نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔''پریشان نہ ہو شبو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔یہاں دریا میں بہت سی کشتیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں گے اور پرکہیں آگے جا کر کسی کشتی والے کو پندرہ بیس روپے دیں گے اور دریا پار کر جائیں گے۔وہاں پکی سڑک ہے اور بسیں چلتی ہیں۔ہم ایک بار بس پر بیٹھ گئے تو پھر ان کے ہتھ نہیں آئیں گے۔''

وہ آزردہ آواز میں منمنائی۔''یہاں سے نکلنا مشکل ہے عمو لیکن اگر نکل بھی گئے تو جائیں گے کہاں؟''

عمو نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں اپنی چاندی بالوں والی ماں کا مقدس چہرہ گھوم گیا۔وہ بولا۔''شبو! میں اور تم ایک بار امی تک پہنچ گئے تو پھر کوئی ڈر نہیں رہے گا۔میری امی کے پاس ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔وہ یہ حل بھی نکال لے گی۔ہو سکتا ہے کہ وہ ہم دونوں کو لے کر کسی دور کے رشتے دار کے پاس چلی جائے یا پھر ملتان لے جائے۔وہاں امی کی ایک بڑی پکی سہیلی رہتی ہے۔بچپن سے اس کی بہن بنی ہوئی ہے۔''

''لگتا ہے اپنی امی پر بڑا بھروسا ہے تمہیں؟''شبانہ نے کہا۔

''ہاں شبو! بڑا بھروسا ہے۔''وہ اس کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کے حوالے سے اپنی کیفیت کا اظہار کر سکتا۔وہ اس کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ محبت کرنے والی، سب سے بڑھ کر مہربان اور چارہ گر عورت تھی......اور اگر وہ ایسا سوچتا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔عمو کو اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی کا ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ اپنی ماں کی محبت میں بھیگا ہوا نظر آتا تھا۔اپنی ماں سے بچھڑنے کے بعد وہ ہر پل اس کی یاد میں تڑپتا رہا تھا۔اب بھی وہ اس تک پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔جلد سے جلد اس کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔

وہ اسی طرح پرالی کے اندر دم سادھے لیٹے رہے...... سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح......نصف شب کے قریب انہیں بوگیر کتوں کی آوازیں بھی آنے لگیں لیکن شکر کا مقام تھا کہ یہ آوازیں شمال کی طرف سے آ رہی تھیں اور ہوا جنوب سے شمال کی طرف چل رہی تھی۔عمو کو پتا تھا کہ اگر ہوا الٹی سمت میں چل رہی ہو تو بوگیر کتے اپنے شکار کی بو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔آدھ پونے گھنٹے بعد کتوں کی آوازیں معدوم ہو گئیں وہ کسی اور طرف چلے گئے۔

عمو اور شبانہ کے جسموں پر چھوٹے موٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ کسی وقت انہیں اپنے آس پاس چوہے یا چھپکلی وغیرہ کا احساس بھی ہوتا تھا مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

عمو نے شبانہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ صبح روشنی ہونے سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑیں۔ اب ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لئے کہ ایک تو دن کے وقت یہاں اتنی گرمی ہو جائے گی کہ ہمارے کباب بن جائیں گے...... دوسرے دن کے وقت یہ لوگ کچی زمین سے ہمارا کھرا اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ہمارے پیروں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے اس پرالی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

عمو کی بات شبانہ کی سمجھ میں آ گئی لیکن وہ ڈری ہوئی بھی تھی۔

جب چڑیوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں تو وہ دونوں اس پرانی پرالی سے نکلے اور جھاڑیوں کے اندر چلتے ہوئے دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں بتا رہے تھے کہ دریا دور نہیں ہے۔ پھر انہیں پانی کی جھلک دکھائی دینے لگے۔ وہ دریا کے کنارے چلتے چلے گئے اور ڈیڑھ دو میل آگے نکل گئے۔ یہاں انہیں ایک پرانی کشتی نظر آئی۔ اس میں چپو بھی پڑے تھے...... ارد گرد کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عمو نے بڑی احتیاط سے کشتی کا رستا کھولا۔ پھر وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور عمو اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔ اچانک کنارے کے سرکنڈوں میں ایک ٹارچ کی روشنی چمکی۔ کسی نے پکار کہا۔ ''اوئے کون ہے؟''

عمو کی رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے تیزی سے چپو چلانے شروع کر دیئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کنارے پر کئی افراد کے ہیولے نظر آنے لگے۔ تب تک عمو اور شبانہ دریا کے وسط تک پہنچ چکے تھے اور تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے......

''رک جاؤ...... نہیں تو گولی مار دیں گے۔'' ایک پکارتی ہوئی آواز آئی۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ ماجھاں ہی کے لوگ تھے۔ وہ کنارے پر موجود تھے اور انہوں نے گھات لگا رکھی تھی۔ یہ کشتی بھی انہوں نے غالباً پھندے کے طور پر ہی یہاں باندھی ہوئی تھی۔

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' شبانہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

عمو کیا کہتا۔ وہ تو خود سرتا پا پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اور تیزی سے چپو چلانا شروع کر دیتا۔ کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتے تو اس تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر فائرنگ کی آواز گونجی۔ چند لمحے کے لئے تو عمو اور شبانہ کو لگا کہ آخری وقت آ گیا ہے تاہم یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ انہوں نے فضا میں بلند ہوتی چنگاریاں صاف دیکھیں اور تب ان پر ایک اور انکشاف ہوا...... دریا کے دوسرے کنارے پر بھی ماجھاں کے کارندے موجود تھے۔ یہ ہوائی فائرنگ انہیں ہوشیار کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد دوسرے کنارے پر بھی ایک دو ٹارچیں چمکنے لگیں اور ہیولے دکھائی دینے لگے......

شبانہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا عمو! یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے۔ اب...... پتا نہیں کیا ہوگا ہمارے ساتھ۔''

عمو کے ہاتھ پاؤں سے بھی جیسے جان نکل چکی تھی۔ اس نے بے دم سا ہو کر چپو کشتی میں گرا دیئے اور خالی نظروں سے شبانہ کو دیکھنے لگا۔ ان کے سر پر نیم تاریک آسمان تھا اور صبح کے چند آخری تارے چمک رہے تھے۔ ان دونوں کے ذہنوں میں ایک جیسا خیال ہی کوند رہا تھا۔ کیا وہ خود کو چناب کے اس رواں پانی میں ڈبو کر اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر لیں...... یہ چناب شاید ہمیشہ سے ایسا ہی مزاج رکھتا تھا۔ یہ ''محبت'' کو ہوا دیتا تھا، اس کی پرورش کرتا تھا لیکن پھر محبت کرنے والوں کو نگل بھی لیتا تھا۔ کچے گھڑے ٹوٹ جاتے تھے اور لہریں سوہنیوں کو اپنے اندر چھپا لیتی تھیں۔

لیکن یہ کہانی نہیں تھی۔ یہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ وہ مٹیالے رنگ کی ٹوٹی پھوٹی کشتی میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے...... اپنی جان دینے کا سوچ رہے تھے...... اور حقیقت کی دنیا میں جان دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچتے رہے اور کشتی دھیرے دھیرے بہتی رہی۔ بہنے کے ساتھ وہ بتدریج کنارے کی طرف بھی کھسک رہی تھی۔ کنارہ...... جہاں کوئی ایک درجن مسلح افراد ان دونوں کے استقبال کے لئے تیار تھے۔ کنارے تک رسائی پانا، خوشی کا استعارہ ہے مگر آج اس استعارے نے اپنا مفہوم بدل لیا تھا۔

O......❖......O

اور اب وہ دونوں پھر سے حویلی میں تھے۔ بہت بڑے چہرے اور سرخ آنکھوں والی ماجھاں سرتا پا قہر نظر آ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو شبانہ کو بری طرح مارا اور اس کے ناک منہ سے

خون چھڑا دیا پھر وہ عمو پر پل پڑی۔ اس کے جسم میں مردوں سے بڑھ کر طاقت تھی۔ اس نے عمو پر تھپڑوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور گاہے بگاہے وہ اسے پستول کا دستہ بھی مار رہی تھی۔ وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر صحن کے درمیان لے آئی اور غلیظ گالی دے کر بولی...... ''چل مرغا بن...... مرغا بن یہاں۔''

عمو کے اندر بغاوت جنم لے رہی تھی۔ گاہے بگاہے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس خبیث عورت پر جھپٹ پڑے۔ اسے دھکا دے کر دور گرائے اور نتائج سے بے پروا ہو کر یہاں سے بھاگ نکلے...... لیکن ہر بار اس کے سامنے شبانہ کا چہرہ آ جاتا تھا، وہ اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا...... وہ ابھی ہر ستم برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''سنا نہیں بچے! مالکن کیا کہہ رہی ہے۔'' ماکھے نے کہا پھر اس کا سر پکڑ کر زبردستی اس کے گھٹنوں میں گھسا دیا اور بازو ٹانگوں کے نیچے سے گزارے۔ وہ سخت دھوپ میں مرغا بنا کھڑا رہا۔ اسے مزید اذیت پہنچانے کے لئے اس کی کمر پر چند کچی اینٹیں رکھ دی گئیں۔ اس کی ناک سے پسینے اور خون کے قطرے ایک ساتھ گر رہے تھے اور یہ سب کچھ شبانہ کے سامنے ہو رہا تھا۔

ماجھاں نے گاؤں کے حجام کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد روتی سسکتی زخمی شبانہ کا سر استرے سے مونڈ دیا گیا اور پھر اس کی بھویں بھی صاف کر دی گئیں۔

بے بسی کے آنسو تواتر کے ساتھ عمو کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ کتنی تیزی سے تبدیل ہوا تھا سب کچھ۔ تین چار گھنٹے پہلے تک وہ اپنی ماں سے ملنے کے لئے اور اس کی گود میں سر رکھنے کے لئے پُر امید تھا اور اب گاؤں والوں کے سامنے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ جب کمر پر رکھا ہوا بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم سے پسینا باقاعدہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ خون کے دباؤ سے چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ماجھاں ایک بار پھر اس پر پل پڑی اور ایک سوٹے سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔ جب وہ نیم جان ہو گیا تو اسے اُٹھا کر کتوں والی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔

وہ سارا دن اور رات گئے تک درد سے سسکتا اور کراہتا رہا۔ کہتے ہیں کہ نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے پھر اسے بھی نیند آ گئی۔ اگلے روز شدید گرمی کی وجہ سے آنکھ کھلی تو ذہن میں پہلا خیال شبانہ کا ہی آیا۔ پتا نہیں کہ اس کے ساتھ کیا بیتی تھی؟ وہ کس حال میں تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ وہ خود ہی تھا۔ وہی اسے لے کر یہاں سے نکلا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اسے پھر ماجھاں کی منحوس شکل نظر آئی۔ اسے شدید اذیت

اور ذلت سے دوچار کرنے کے باوجود ابھی اس کا غصہ پوری طرح اُترا نہیں تھا۔ وہ نشے میں دھت تھی اور اس کی آنکھوں میں خباثت کا دریا بہہ رہا تھا۔ جب وہ کچھ بدتر کرنے کے موڈ میں ہوتی تھی تو اس کی ناک کچھ اور بھی چپٹی اور سیاہ دکھائی دینے لگتی تھی۔ اب بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔

وہ پھنکاری۔ ''تجھے کہا تھا نا کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت بری طرح پیش آؤں گی...... اور ایک وار نہیں دس وار کہا تھا۔ بول کہا تھا نا؟'' اس نے جوتے کی نوک سے عمو کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اُٹھانے کی کوشش کی۔

عمو کچھ نہیں بولا۔

''حرامزادے! اب منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈال لی ہیں؟ اس کمینی کے لئے سب کچھ کیا ہے نا تُو نے۔ اسی کتی کے عشق کا بخار چڑھا ہوا تھا نا تجھے؟''

عمو نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔

ماجھاں نے اپنی ویل کی سفید قمیص سامنے سے اوپر اُٹھائی اور اپنے سیاہ تہ بند کی ڈب میں سے پستول نکال لیا۔ شراب ایک زہر کی طرح اس کے آتشیں دماغ کو چڑھی ہوئی تھی۔

''اوئے! کسی گونگے کے تخم...... بولتا کیوں نہیں؟ بولتا ہے یا پھر ٹپکاؤں تیرے اندر گولیاں؟''

عمو کو لگا کہ وہ چاہے بھی تو نہیں بول سکے گا۔ وہ بس سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ''اچھا نہیں بولے گا تُو...... نہیں بولے گا تُو؟'' وہ بہکی ہوئی خطرناک آواز میں بولی۔ اس نے پستول کا حفاظتی کھٹکا ہٹایا۔ اسے عمو کی طرف سیدھا کیا اور جنونی لہجے میں دھاڑی۔ ''نہیں بولے گا تُو...... نہیں بولے گا؟''

اس کے ساتھ ہی اس نے عمو پر فائرنگ کر دی۔ عمو چلا اُٹھا۔ ماجھاں نے پستول کی چھ کی چھ گولیاں عمو پر چلا دیں۔ آخری وقت میں عمو نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسے لگا کہ شاید وہ مرنے والا ہے لیکن پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ گولیاں اس کے جسم پر نہیں لگیں۔ اس کے بالکل آس پاس کچی زمین میں لگی ہیں۔

وہ جیسے موت کو چھو کر واپس آ گیا تھا۔ ماجھاں اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بڑی بے رحم تھی۔ کئی گولیاں عمو کے جسم کو جیسے چھو کر گزری تھیں۔ ایک طرح سے اس نے اپنے بہترین نشانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

وہ عمو کی ٹانگ پر پاؤں رکھتے ہوئے بولی۔ ''ایک دن تُو نے ناجو کو بتایا تھا نا کہ مالکن کے پنڈے سے تمباکو کی بو آتی ہے۔ بتایا تھا نا؟''

عمو چپ رہا۔ اسے یاد آیا کہ شاید کچھ دن پہلے اس نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہی تھی۔ وہ پھنکاری۔ ''تیری یہ ناک بڑی تیز ہے۔ اس کی تیزی مارنے کے لئے کچھ کرنا پڑے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کالیے کو آوازیں دیں۔

کالیا بھاگتا ہوا آیا۔ وہ ایک صافہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ''اس میں تھوڑا سا گوبر لا اور ساتھ میں ایک رسّی بھی۔''

کالیا جیسے پہلے سے جانتا تھا کہ مالکن کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ ''جی اچھا'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ مطلوبہ چیزوں کے ساتھ حاضر تھا۔ وہ ساتھ میں لمبے تڑنگے ماکھے کو بھی لایا تھا۔ دونوں نے مل کر عمو کو زبردستی الٹا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ پھر اس کے پاؤں بھی رسّی کی بے رحم گرفت میں جکڑ دیئے گئے۔ تب نیلے رنگ کا صافہ جس میں گوبر تھا، عمو کے منہ پر باندھ کر سر کے پیچھے مضبوط گرہ لگا دی گئی۔

وہ عمو کے لئے زندگی کی اذیت ناک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماں اس کے سر میں چنبیلی کا خوشبودار تیل لگاتی تھی اور جب وہ اسکول جاتا تھا تو اس کے بستے میں گلاب کے پھول رکھ دیا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی، گلاب کی خوشبو بندے کو شاہ دماغ بناتی ہے۔ آج اس کے منہ پر تعفن زدہ گوبر بندھا ہوا تھا اور اس کا دم سینے میں گھٹ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے بند کر کے چلے گئے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ وہ صافے کو اپنے منہ سے ہٹانا چاہ رہا تھا لیکن ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ اسے مسلسل ابکائیاں آ رہی تھیں۔ پیٹ پرسوں شام سے خالی تھا، ورنہ اس کی مصیبت اور بڑھ جاتی۔ بالآخر وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ شاید گوبر کی بو نے بھی دھیرے دھیرے اثر کھونا شروع کر دیا تھا۔

○......❖......○

اس دن کے بعد حویلی میں عمران عرف عمو کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے ساری سہولتیں چھین لی گئیں۔ عام ''کاموں'' کی طرح اسے گھٹیا لباس پہنایا گیا اور مویشی خانے میں کام پر لگا دیا گیا۔ مویشی خانے کا نگراں وہی کالیا نامی کرخت شخص تھا۔ وہ کام لینے کے معاملے میں بہت سخت بلکہ سفاک تھا۔ عمو کے پاؤں میں باقاعدہ ایک زنگ آلود بیڑی ڈالی گئی تھی۔ اسے اس بیڑی سمیت صبح منہ اندھیرے سے شام تک مختلف کام کرنا پڑتے تھے۔ ان میں سے سخت ترین کام دستی ٹوکے پر چارا کاٹنا تھا۔ ہر روز کم از کم چھ گھنٹے کے لئے عمو کو ایک دوسرے لڑکے مولے کے ساتھ مل کر چارا کترنا پڑتا تھا۔ وہ پسینے میں نہا جاتے تھے اور دم جیسے آنکھوں میں آ جاتا تھا مگر کالیے کی بے رحم نگاہوں کا خوف انہیں ہاتھ چلائے رکھنے پر

مجبور کرتا تھا۔ سُستی کی صورت میں کالیا نہ صرف غلیظ گالیاں دیتا بلکہ بے دریغ مار پیٹ بھی کرتا تھا۔

مویشی خانے میں کل پانچ ملازم تھے۔ ان میں سے صرف عمو اور مولے کو یہ ''امتیاز'' حاصل تھا کہ انہیں بیڑیاں لگائی گئی تھیں۔ بیڑی کی وجہ سے وہ دونوں شلوار نہیں پہن سکتے تھے۔ انہیں اپنا جسم صرف لنگوٹی یا دھوتی سے ڈھانپنا ہوتا تھا۔

قریباً دو مہینے بعد مولے کی بیڑی تو اُتار دی گئی مگر عمو کی بدستور رہی اور اس کے ٹخنوں کو مسلسل زخمی کرتی رہی۔ ماجھاں کی منحوس شکل اب اسے کم ہی نظر آتی تھی۔ اسے پتا چلا تھا کہ آج کل دینے مسلّی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم ماجھاں کی زد میں ہے۔ ماجھاں نے اسے پتا نہیں کن کن چکروں میں پھنسایا تھا کہ وہ بے چارہ حویلی کا چاکر بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے ذمے ''منشی'' کا کام لگایا گیا تھا۔ وہ گھنگریالے بالوں والا بائیس تیئس سال کا قبول صورت لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا تھا۔ عمو نے اکثر اسے ایک بوسیدہ سے رجسٹر کے ساتھ حویلی میں آتے جاتے دیکھا۔

ایک دن جب عمو چارے کا وزنی گٹھر کندھے پر اُٹھائے حویلی کے مین دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا، اسے ماجھاں کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ اُدھ کھلے پھاٹک سے اس نے ماجھاں کی بس ایک جھلک دیکھی...... اور بھونچکا رہ گیا۔ ماجھاں باؤ سلیم پر برس رہی تھی۔ باؤ سلیم کے گلے میں ایک رسّی تھی۔ اس رسّی کا دوسرا سرا ماجھاں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے کسی جانور کی طرح برآمدے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ باؤ سلیم کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ جب کسی کو تھپڑ وغیرہ مارتی تھی تو اس کی کلائی کا وزنی کڑا بھی اس ''کارِ خیر'' میں شریک ہو جاتا تھا اور مضروب کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا تھا...... ماکھا اور کالیا وغیرہ قریب ہی کھڑے مضحکہ خیز انداز میں باؤ سلیم کی یہ درگت دیکھ رہے تھے۔

ماجھاں کے لئے ایک عجیب سی نفرت عمو کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اس عورت کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا اور دیوہیکل بوہلی کتوں کے آگے ڈال دیتا۔

رات کو اس نے مولے سے ذکر کیا۔ مولا بولا۔ ''باؤ سلیم نے وہی غلطی کی تھی جو اس جیسے پڑھے لکھے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس نے پنڈ میں پانچویں تک کا اسکول کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بس اسی بات پر چودھرانی ماجھاں سے اس کی تُسل ہو گئی۔ چودھرانی سے ٹکر لے کر بھلا اس علاقے میں کوئی رہ سکتا ہے۔ یہ تو بندے کو اپنے پاؤں چٹنے پر مجبور کر دیتی

ہے۔''

''کوئی اس کا کچھ کرنہیں سکتا؟'' عمو نے دکھی لہجے میں کہا۔

''تُو نے کیا کرلیا ہے؟'' مولے نے الٹا اس سے سوال کیا۔

اس سوال نے عمو کو چپ کرادیا۔ مولا بولا۔''یہ بڑی دراچھی زنانی ہے۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... اور سچی گل پوچھتا ہے نا تو مجھے تو اس کڑی شبو کی طرف سے بھی خطرہ ہی رہتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' عمو نے چونک کر پوچھا۔

''وہ بگیاڑوں کے اندر بکری کے بچے کی طرح ہے۔ اس کے ساتھ کسی ویلے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔''

مولے کی بات نے عمو کے اندر دبے ہوئے سارے اندیشے ایک دم ابھار دیئے۔ اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ پچھلے دوڈھائی مہینے میں بس دو چار بار ہی وہ شبو کو دیکھ سکا تھا۔ اس کے سر پر اب چھوٹے چھوٹے بال آ گئے تھے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد نظر آتا تھا۔ سخت گیر شہناز کی زیرنگرانی وہ حویلی کے کام کاج کرتی دکھائی دیتی تھی۔ شاید مولا سچ ہی کہہ رہا تھا۔ ماکھے، کالیے اور صوفی جیسے بگیاڑوں کے درمیان وہ ایک کمزور بکری ہی تو تھی۔

مولے کی آواز نے اسے چونکایا۔''مجھے تو ایک اور شک ہو رہا ہے عمو۔ سنا ہے کہ چودھرانی کا ڈکیت بھائی ناجا ڈیڑھ دو مہینے تک حویلی واپس آ رہا ہے۔ وہ پھر حویلی میں ہی رہے گا۔ کہتے ہیں کہ علاقے کی پُلس کے ساتھ اس کا لمبا چوڑا مک مکا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھرانی نے شبو جیسی سچل کڑی کو اپنے بھائی کی دل پشوری کے لئے ہی بچا کر رکھا ہوا ہے۔''

مولے کے بات کرنے کے انداز سے عمو بھنا گیا۔''مولے! اس کے بارے میں تمیز سے بات کر۔''

''یار تُو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے وہ معشوق نہیں، زنانی ہے تیری۔''

عمو اندر سے کھول کر رہ گیا۔ وہ منہ پھیر کر اُٹھا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مویشی خانے کی تاریکی اور بو میں وہ رات دیر تک جاگتا رہا اور بان کی چارپائی پر پہلو بدلتا رہا...... مولے کی باتوں نے شبو کے حوالے سے اس کے بدترین اندیشوں کو ہوا دی تھی اور اب وہ بری طرح بے قرار تھا۔ ہوسکتا تھا کہ مولے نے ماجھاں کے ڈکیت بھائی کے حوالے سے جو اندیشہ بیان کیا تھا، وہ پوری طرح درست نہ ہو لیکن یہ بات تو ٹھوس حقیقت تھی کہ اس حویلی

میں لاچار شبو کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی ''معاملہ'' ہوسکتا ہے۔

صرف تین چار روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ پتا چلا کہ حویلی میں دو تین بندے زخمی ہو گئے ہیں۔ ان میں دینے مسلّی کا بیٹا باؤ سلیم بھی شامل تھا۔ باؤ کو شدید چوٹ آئی تھی۔ پتا چلا کہ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑے میں جا گھسی ہیں اور اسے زخمی حالت میں تحصیل اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ یہ حادثہ گھوڑوں اور گھوڑیوں کو نمبر لگانے کے دوران میں پیش آیا۔ نمبر لگانے کے لئے جانوروں کو داغا جاتا ہے۔ جب ماجھاں کے لاڈلے تازی گھوڑے کو داغا جانے لگا تو وہ اپنی روایتی سرکشی پر اُتر آیا۔ اس نے مختصر سے طویلے میں زبردست اودھم مچایا۔ باؤ سلیم جونشی کے طور پر وہاں موجود تھا اور نمبر لگوا رہا تھا، وہ بھی گھوڑے کی زد میں آیا اور اس کی دولتی سے شدید زخمی ہوا۔ یہ وہی منہ زور گھوڑا تھا جو اس سے پہلے بھی سائیس اور اس کے ساتھی کو زخمی کر چکا تھا۔

باؤ سلیم گھائل ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور اس کے آٹھ دس روز بعد ہی ماجھاں کی ''نظر کرم'' ایک بار پھر عمو پر پڑ گئی۔ وہ اپنی بدعادات سے مجبور تھی۔ عمو کو کسی بھولی ہوئی ملکیتی شے کی طرح مویشی خانے کے ''اسٹور روم'' سے نکالا گیا اور جھاڑ پونچھ کر پھر اپنے عشرت کدے میں سجایا گیا...... وہی نیم تاریک کمرا، وہی کراہت، وہی بدبودار بوجھ، وہی غلیظ سانسیں۔ وہ اب پہلے سے دگنا کالا پانی یعنی شراب پیتی تھی اور اس کی خباثت میں بھی اسی شرح سے اضافہ ہوا تھا۔ وہ عمو کی دُکھتی رگ جان چکی تھی۔ اس نے شبانہ کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ لڑکی یہاں اسی وقت تک خیریت سے ہے جب تک عمو سیدھا سیدھا چلتا رہے گا۔

......اب وہ عمو کو گاہے بگاہے حویلی میں بلانے لگی۔ تاہم عمو کی وہ سہولتیں بحال نہیں ہوئیں جو شروع میں اسے حاصل تھیں۔ وہ بدستور مویشی خانے میں قیام پذیر تھا اور سارا دن جانور کی طرح مشقت کرتا تھا۔ اس کا کھانا پینا بھی حویلی کے ادنیٰ کارندوں کے ساتھ تھا۔ صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کی بیڑی اُتار لی گئی۔

وہ بڑے تکلیف دہ شب و روز تھے۔ سردیوں کے بعد بہار شروع ہو رہی تھی۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، مست ہوا چلتی تھی لیکن عمو کے اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی...... وہ ہر وقت معصوم چہرہ شبانہ کی سلامتی کے بارے میں سوچتا رہتا اور اس فکر میں رہتا کہ وہ کسی طرح اس مہلک جال میں سے نکل جائے۔ عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ شبانہ کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ ایک ناپسندیدہ شوہر کے پلے بندھنے سے بچ گئی ہے مگر اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی تھی۔ وہ اب ماجھاں کے پاس تھی۔ بظاہر تو اس کی حیثیت ملازمہ کی تھی۔

اس کے رشتے داروں کو حویلی میں آ کر اس سے ملنے کی اجازت بھی تھی لیکن حقیقت میں وہ قیدی تھی۔ اس کے گرد ایک نادیدہ پنجرہ تھا۔

عمو پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ اس کا تھوڑا سا مزید قد بھی نکلا تھا اور اس کے شانوں کی چوڑائی بڑھی تھی۔ اس کے اندر بغاوت کسی انگارے کی طرح سلگتی رہتی لیکن اس انگارے کو شعلہ بننے کا موقع دور دور نظر نہیں آتا تھا...... ہاں، وہ بہار کے دن تھے۔ بہار کی ہوا میں نمو کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس ہوا میں زردی کے اندر سے سبزہ پھوٹتا ہے...... بیجوں سے کونپلیں بنتی ہیں اور کبھی کبھی جذبوں کے انگارے بھی شعلوں میں بدل جاتے ہیں۔ ان دنوں حویلی میں راجا نام کا ایک نوجوان بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ راجا کے پاس ایک بہت کھٹارا لوڈر تھا۔ اس پر اردو میں ''پاٹے خاں'' لکھا ہوا تھا۔ راجا اس لوڈر میں دو تین پنجرے رکھ کر لایا تھا...... ان میں چار پانچ شکاری کتے تھے۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ بندہ شکاری کتوں کو سدھاتا ہے اور پھر انہیں فروخت کرتا ہے۔ اس دن عمو بہت اداس بیٹھا تھا۔

اتنے میں کالیا آ گیا۔ اس نے عمو سے کہا کہ وہ بھوری بھینس کا دودھ دھو دے۔ بھوری بھی کبھی اڑ جاتی تھی اور اسے ٹیکا لگا کر دودھ دھونا پڑتا تھا مگر عمو ایسے موقعوں پر بغیر ٹیکے کے ہی اسے رام کر لیتا تھا۔

وہ اسٹیل کی بڑی بالٹی لے کر بھوری کے پاس آیا۔ اس کے چمکیلے پنڈے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور اس کے تھنوں کو سہلا سہلا کر اسے تیار کرتا رہا۔ پھر بالٹی اپنے دونوں گھٹنوں میں دبائی اور بھوری کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہ مویشی خانے کا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس میں صرف دو بھینسیں اور بندھی ہوئی تھیں۔ اچانک بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا اور احاطے کا لکڑی کا دروازہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ ایک گھوڑا اپنے گھڑسوار سمیت تیزی سے اندر داخل ہوا۔ عمو نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ماجھاں کا وہی سرکش گھوڑا تھا جس نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ عمو نے اس کے سوار سالار خاں کو اچھل کر ہوا میں تیرتے اور پھر بھینسوں کی کھرلی کے پاس گرتے دیکھا۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھرلی سے ٹکرایا تھا اور وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگ لگنے سے عمو بھی دور لڑھک گیا اور دودھ والی بالٹی ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ گھوڑا بلند آواز میں ہنہنا رہا تھا اور چاروں طرف ٹانگیں چلا رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر سالار خاں چند سیکنڈ بھی اپنی جگہ پڑا رہا تو وحشی گھوڑا اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے گا۔ یہی وقت تھا جب عمو اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر گھوڑے پر جا پڑا۔ گھوڑے نے گردن کے

زوردار ہلارے سے عمو کو ضرب لگائی اور چارے کے گٹھوں پر گرا دیا۔ عمو ایک لحہ ضائع کئے بغیر پھر اُٹھا اور گھوڑے پر جھپٹا۔ اس مرتبہ گھوڑے کی لگام عمو کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے لگام کو دو تین جھٹکے دیئے۔ یکا یک اسے لگا کہ گھوڑا غیر متوقع طور پر شانت ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی غیر معمولی مستی کافور ہو گئی۔ عمو نے اس کے ساتھ بھاگتے بھاگتے احاطے کا ایک چکر لگایا۔ لگام بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اس نے ہمت کی اور جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا۔ اس وقت ماجھاں سمیت حویلی میں موجود کوئی بھی شخص ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عمو نے گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے گھڑسواری کا انداز اختیار کیا۔ وہ اس کی اچھل کود کو بتدریج کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اسے بڑے احاطے میں لے آیا اور بڑے اعتماد سے اسے اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ ماجھاں اس وقت حویلی میں نہیں تھی لیکن جو لوگ اسے دیکھ رہے تھے، وہ یقیناً حیرت زدہ تھے۔ اس سرکش گھوڑے پر اتنی کامیابی سے ابھی تک کوئی نہیں بیٹھا تھا۔

ان دیکھنے والوں میں ماجھاں کا مہمان راجا بھی تھا۔ کچھ دیر بعد جب عمو گھوڑے سے اُترا اور اس کی گردن پر تھپکیاں دینے کے بعد اسے ایک کھونٹے سے باندھ دیا تو راجا دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ راجا چھریرے بدن کا تھا، اس کے بال لمبے تھے۔ آنکھیں چمکیلی اور نقوش تیز تھے۔ وہ عام سی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے عمو کا کندھا تھپکا اور بولا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''عمران...... ویسے عمو کہتے ہیں۔''

''لگتا ہے گھوڑوں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہو...... اور گھڑسواری میں بھی ماہر ہو۔''

''نہیں، بہت کم گھوڑے پر بیٹھا ہوں۔ یہاں حویلی آ کر تو تین چار بار سے زیادہ نہیں بیٹھا۔''

''یا تم جھوٹ بول رہے ہو...... یا پھر......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

بے ہوش سالار خاں کو اُٹھا کر باہر لایا جا رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ راجا نے دیگر ملازموں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ عمو کبھی کبھار ہی گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ وہ کوئی ماہر گھڑسوار نہیں۔

راجا، عمو کو لے کر حویلی کے اس حصے میں آ گیا جہاں مہمان وغیرہ ٹھہرتے تھے۔ یہ دراصل ڈیرے ہی کے تین چار کمرے تھے۔ یہاں بڑی بڑی دو چار پائیاں اور تازہ حقے

پڑے رہتے تھے...... یہیں پر ایک طرف نیم کے درختوں کے نیچے وہ آہنی پنجرے پڑے تھے جنہیں راجا کسی جگہ لے کر جا رہا تھا۔ ان میں کتے تھے۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ راجا نے اپنے کان کی چھوٹی سی طلائی بالی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تیرے اندر فن ہے بھائی! میں خود بھی گھوڑے سدھاتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی ایسے گھوڑے کو اتنی آسانی سے رام ہوتے نہیں دیکھا۔''

''میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی کسی ایسے گھوڑے پر سواری نہیں کی۔'' عمو سادگی سے بولا۔

''اچھا اس گھوڑے سے پہلے بھی کبھی تمہارا آمنا سامنا ہوا ہے؟''

''بس دو چار بار ہی ہوا ہے۔''

''کبھی ایسی حالت میں بھی سامنا ہوا ہے جب یہ اسی طرح مستا (بپھرا) ہوا تھا؟''

عمو نے ذہن پر زور دیا اور بولا۔ ''ہاں، جب میں شروع شروع میں یہاں آیا تو ایک دن اس گھوڑے نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ وہ ایک سوار کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا یہاں لایا تھا اور وہ بے چارہ مر چکا تھا۔''

راجا بڑے دھیان سے عمو کی بات سن رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''اس وقت گھوڑے سے تمہارا سامنا ہوا؟''

اچانک اس وقت کے مناظر عمو کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ گھوڑے نے سائیس کو گرایا تھا پھر ماجھاں اسے چکما دے کر اس کی لگام تھامنے کے لئے آگے بڑھی تھی لیکن وہ تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ ایک دم الف ہو گیا اور گھوم کر سیدھا عمو کی طرف آیا۔ عمو نے حفاظتِ خود اختیاری کے طور پر اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا تھا۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی تھی۔ عمو کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لئے سکتہ زدہ سا ہو گیا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے تنومند جسم کی پوری طاقت کے ساتھ گھوڑے کی گردن سے لپٹ گئی تھی۔

''کس خیال میں کھو گئے؟'' راجا کی آواز نے اسے چونکایا۔

''ہاں، اس وقت بھی پانچ دس سیکنڈ کے لئے اس سے میرا سامنا ہوا تھا۔'' عمو نے راجا کے سوال کے جواب میں کہا۔

راجا نے عمو سے چند مزید سوال پوچھے۔ اس کے لب و لہجے میں حیرت بدستور موجود تھی۔

اسی دوران میں اندرونی کمرے سے زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے راجا کو پکارا۔ راجا اس کی بات سننے کے لئے کمرے میں چلا گیا۔ عمو کتوں کو دیکھنے کے لئے پنجرے کی طرف آ گیا۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی آوازیں کل رات بھی مسلسل حویلی کے مکینوں کو بے آرام کرتی رہی تھیں۔ یہ پتلی کمر اور لمبی تھوتھنی والا ہاؤنڈ کتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور تیور خطرناک تھے لیکن اب پچھلے دس پندرہ منٹ سے وہ قدرے خاموش نظر آ رہا تھا۔ اس کتے کو علیحدہ پنجرے میں بند کیا گیا تھا۔ عمو کتے کے نزدیک پہنچا تو وہ دُم کو ہولے ہولے گردش دینے لگا اور اس نے اپنی تھوتنی پنجرے کی سلاخوں سے لگا دی۔ کتے عام طور پر عمو سے جلد ہی مانوس ہو جاتے تھے۔ ماجھاں نے اپنے طیش کے دور میں عمو کو کئی ماہ تک ''بل ڈاگز'' کے ساتھ ایک بدبودار کوٹھڑی میں بند رکھا تھا۔ ان کتوں سے شروع میں عمو کو خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر بڑی تیزی سے یہ خطرہ کم ہوتا چلا گیا تھا۔

ہاؤنڈ کتے نے اپنی پتلی تھوتھنی کا ایک تہائی حصہ تنگ سلاخوں کے خلا سے باہر نکال لیا تھا۔ عمو نے اپنی انگلی سے تھوتھنی کے بالائی حصے کو ہولے ہولے سہلایا۔ کتے کی دُم کی بے ساختہ گردش تیز ہو گئی۔ اسی دوران راجا واپس آ گیا۔ وہ عمو کو کتے کے پاس دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے عمو کو کتے سے پیچھے ہٹایا اور بولا۔ ''زیادہ بہادری نہ دکھاؤ یارا...... یہ کسی بھی ویلے حملہ کر سکتا ہے۔''

عمو اور راجا دوبارہ جہازی سائز چارپائی پر آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ راجا، عمو سے پوچھنے لگا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر آیا۔ یہاں ہر کسی کو عمو کی کہانی معلوم تھی۔ عمو نے راجا کو بھی یہ سب کچھ بتانے میں عار نہیں سمجھا۔ اس نے اسے بتا دیا کہ کیسے وہ ایک چودھری کے پتر کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لئے شہنشاہ نامی پیر کے مزار پر پہنچا اور کیسے یہاں کیکراں گاؤں تک آیا...... اس گفتگو کے دوران میں ہی راجا تھوڑا سا چونکا۔ ہاؤنڈ کتے نے اب پھر پنجرے میں چکرانا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ راجا کچھ دیر تک پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے عمو کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ عمو پنجرے کے سامنے پہنچا تو کتے کی بے قراری کم ہو گئی۔ اس کا شور بھی تقریباً معدوم ہو گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی سلاخوں سے رگڑ رہا تھا۔

کچھ دیر تک کتے کے پاس رک کر عمو اور راجا پھر چارپائی پر جا بیٹھے۔ ایک ملازمہ ان دونوں کے لئے مکھن والی میٹھی لسی لے آئی۔ کتا اب پھر حسبِ معمول پنجرے میں چکرا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔

لسی پینے کے بعد راجا نے اپنی تیکھی مونچھیں صاف کیں اور ایک زوردار ڈکار لینے کے بعد کھوئی کھوئی نظروں سے عمو کو دیکھنے لگا...... کچھ دیر بعد بولا۔ ''میرے استاد، اللہ بخشے بابا مہر مشتاق کہا کرتے تھے، کچھ بندوں کے ساتھ پالتو جانور خاص طور سے کتے اور گھوڑے وغیرہ بڑی جلدی ہل جاتے (مانوس ہو جاتے) ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ایک ہو۔ کوئی خاص بات ہے تمہارے اندر...... یا پھر ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی ہو۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں بھارا جا؟''

''شاید میں تمہیں سمجھا نہ سکوں۔ استاد جی کی ساری باتیں تو میری کھوپڑی میں بھی نہیں آتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ...... ہر بندے کے اندر سے کچھ لہریں نکلتی ہیں۔ یہ لہریں اس بندے کے آسے پاسے کے سارے جی جناوروں پر اثر ڈالتی ہیں...... یہ لہریں ان جی جناوروں کو بتاتی ہیں کہ یہ بندہ چنگا ہے، برا ہے، یا بہت چنگا ہے یا بہت برا ہے۔ بس اس طرح کی بات کہا کرتے تھے استاد جی۔ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو پھر مجھے لگتا ہے کہ تیری لہریں بھی بڑی ٹیٹ قسم کی ہیں۔''

''یہ ٹیٹ کیا ہوتا ہے؟''

''یار! انگریزی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے تگڑی مضبوط۔''

عمو سمجھ گیا کہ وہ ''ٹائٹ'' کو ٹیٹ کہہ رہا ہے۔

رات کو عمو سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ راجا کی کہی ہوئی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ وہ بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ وہ شبانہ کو اس خطرناک حویلی سے کیسے نکال کر لے جا سکتا تھا؟ وہ اس کے لئے بہت اہم ہو چکی تھی۔ اس کی رگِ جاں میں بس گئی تھی اور خون بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتی رہتی تھی۔ وہ اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کو بچانے کے لئے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شبانہ کی ماں اور دیگر رشتے داروں میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شبانہ کو ماجھاں کے چنگل سے نکال کر لے جا سکتے۔ ایسا کرنے والوں کا حشر یہاں دینے مسلّی کے بیٹے باؤ سلیم جیسا ہو ہوتا تھا۔

ایک دن بعد راجا سے پھر عمو کی ملاقات ہوئی۔ وہ اسے بڑی محبت سے ملا۔ دونوں مہمان خانے میں بیٹھے تربوز کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ راجا کا ہر دم شور مچانے والا...... خوفناک کتا آج پھر پہلے دن والے رویے کا مظاہرہ...... کر رہا تھا۔ وہ قدرے پُرسکون نظر آ رہا تھا...... اس نے حیران کن طور پر عمو کو اپنے پنڈے پر ہاتھ لگانے کی اجازت

بھی دی تھی۔ تربوز کھانے کے دوران میں عمو نے راجا سے پوچھا۔ ''وہ رنگ برنگے کپڑوں والی کڑی کہاں گئی؟''

''واپس چلی گئی ہو گی اپنے کوٹھے پر۔'' راجا نے بیڑی سلگا کر کہا۔

''کیا مطلب؟ وہ طوائف تھی؟''

''اوئے کھوتے، آہستہ بول۔ آپاں ماجھاں نے سن لیا تو غصہ کرے گی۔ تجھے پتا ہی ہے، سچی بات اسے کتنی کڑوی لگتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں بھارا جے۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''آپاں ماجھاں نے یہ کڑی مجھے ذرا موج میلے کے لئے دی تھی۔ کہتی تھی گھریلو کڑی ہے۔ بڑی مشکل سے پھنسا کر لائی ہوں۔ وہ بھی بات بات پر ہائے اللہ توبہ اللہ، نہیں جی، نہ جی کہتی تھی۔ پر یارا! ہم نے بھی تھاں تھاں کا پانی پیا ہے۔ زنانی کی آواز سن کر بتا دیتے ہیں کہ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ بازاری کڑی تھی خانہ خراب...... میں نے بھی سوچا چلو وقت ہی پاس کرنا ہے نا۔''

''تو اس میں اصل قصور تو مالکن ماجھاں کا ہوا نا۔'' عمو نے کہا۔

''یہ تیری مالکن ماجھاں بڑی کتی شے ہے عمو...... میں اس کے ساتھ کبھی کبھی کاروبار کرتا ہوں اس لئے مجبوراً اسے آپاں کہنا پڑتا ہے۔ ایسا کہتے ہوئے جو میرے دل پر گزرتی ہے، میں ہی جانتا ہوں لیکن میں اس کی کسر ''ماجھاں'' کہتے ہوئے نکال دیتا ہوں۔ شاید تو نے غور نہیں کیا۔ میں اسے ماجھاں کے بجائے ماچاں کہتا ہوں۔''

''ماچاں کا کیا مطلب؟''

''بڑا کرارا مطلب ہے۔ ایک دم ٹیٹ۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ عمو کے استفسار پر اس نے بتایا۔ ''ماچاں، پوٹھوہار کے خانہ بدوشوں کی بولی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے جنگلی سور کی مادہ جس کے پیٹ میں بچہ ہو......'' بات کرتے کرتے راجا ایک دم ٹھٹک گیا۔ اپنی شریر مسکراہٹ سمیٹ کر بولا۔ ''لو آ گئی آپاں ماچاں۔''

ماجھاں اپنے تنومند جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اس کے منہ میں تمباکو والا پان تھا۔ ایک نگاہِ غلط انداز عمو پر ڈالنے کے بعد وہ راجا سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں بھئی راجے...... کیسی تھی کڑی؟''

''ایک دم ٹیٹ...... آپاں ماچاں۔'' وہ آنکھ دبا کر بولا۔

''ویسے راجے! تُو ہے بڑا کمینہ۔ اسے دو چار سو روپیا ہی دے دیتا۔''

"کیسی بات کرتی ہو آپاں! وہ گھریلو کڑی تھی۔ غصہ کر جاتی تو پھر؟ اگلی بار آؤں گا تو کوئی تحفہ شحفہ لاؤں گا۔"

"تُو بہت وڈا کھوچل ہے۔" ماجھاں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ پھر بولی۔ "اچھا وہ انگریزی بوتل کہاں ہے جس کا کہہ رہا تھا؟"

"ہاں ہاں آپاں ماجاں! وہ تو تیرے لئے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ قسم سے ایک دم انگریزی ہے، بالکل سیل بند۔"

راجا اندر گیا اور پھر اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی امپورٹڈ شراب کی ایک نفیس بوتل اُٹھا لایا۔ "یہ لو...... کیا یاد کرو گی اپنے بھائی کو۔" وہ بولا۔

تھوڑی سی مکالمے بازی کر کے ماجھاں واپس چلی گئی تو راجا کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "ایسے مسکرا کیوں رہے ہو بھا راجے؟" عمو نے پوچھا۔

"سچی سچی بتاؤں؟"

"ہاں ہاں...... مجھے کون سا کسی کو بتانا ہے۔"

راجا خود کو عمو سے کافی بے تکلیف محسوس کرنے لگا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ "کہتے ہیں نا، کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس نے مجھے کنڈم کڑی دی، میں نے اسے کنڈم شراب تھما دی۔" وہ ٹیٹ کو "اچھے" اور کنڈم کو "خراب" کے معنوں میں استعمال کرتا تھا۔

"کنڈم شراب؟ کیا مطلب؟" عمو نے پوچھا۔

"یہ سیل بند بوتل نہیں ہے اور اس میں جو شراب ہے، وہ بھی بچی کھچی ہے۔ کچھ دن پہلے فیروز آباد گاؤں کے زمیندار ملک آفتاب کے ڈیرے پر ایک بڑی شراب پارٹی ہوئی تھی۔ وہاں بڑی ٹیٹ انگریزی شراب چلی تھی۔ میں بھی وہاں تھا۔ پارٹی کے بعد میں نے گلاسوں میں بچی کھچی شراب اس بوتل میں جمع کر لی تھی......" وہ دبی آواز میں ہنسا۔

"اور یہ بوتل کی سیلیں؟" عمو نے پوچھا۔

"یہ سیلیں شیلیں جھوٹی ہوتی ہیں یارا...... ہر طرف ایک دم کنڈم مال چل رہے ہیں۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

اگلے دو تین روز میں راجے سے عمو کی چند ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ وہ عمو سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔ اسے عمو کی تقریباً ساری روداد معلوم ہو چکی تھی۔ یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ یہاں عیاش ماجھاں نے اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا ہے۔ ماں کے حوالے سے اپنی تڑپ کے بارے میں بھی عمو نے راجا کو بہت کچھ بتایا تھا۔ ایک دن بیڑی پیتے پیتے اس نے

اچانک عمو سے پوچھا۔ "یہاں سے بھاگنا ہے عمو؟"

عمو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ...... کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ ہکلایا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ۔ یہ بتا یہاں سے بھاگنا ہے تجھے؟"

عمو نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ "ہاں...... پر اکیلے نہیں۔ شبو کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے، اس کو بھی لے چلتے ہیں لیکن...... میری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"گھبرا مت یارا۔ کوئی ایسی شرط نہیں۔ تُو آسانی سے پوری کر دے گا لیکن تجھے بتاؤں گا بعد میں۔"

"لیکن...... تم ہمیں یہاں سے نکالو گے کس طرح؟" عمو نے پوچھا۔

"کہا ہے نا، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بس تمہیں تھوڑی سی ہمت دکھانی پڑے گی۔"

"تمہارے اندازے سے بڑھ کر ہمت دکھاؤں گا۔" عمو نے عجیب ولولے سے کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "مگر پروگرام کب کا ہے؟"

"بس ایک دو دن کے اندر۔ تیری مالکن ماجاں سے کوئی شے خریدنی ہے۔ اس کا سودا ہو جاتا ہے تو پروگرام پکا کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھا راجے...... پر میری تو ملاقات شبو سے ہوتی نہیں ہے۔ کسی طرح تُو اس سے ملاقات کر لے اور اسے بتا دے کہ وہ بھاگنے کے لئے تیار رہے۔"

"اور اگر وہ نہ مانی تو؟"

"تم اسے ساری بات بتانا نا۔ اسے بتانا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی بس دو تین ہفتے میں یہاں تشریف لانے والا ہے۔ وہ آ گیا تو پھر اس کے لئے بڑی مصیبت ہو جائیگی۔ اسے ساری حقیقت کھول کر سمجھا دینا۔"

راجا نے چالاکی دکھائی اور اگلے روز مہمان خانے میں شبو سے ملاقات کر لی۔ نہ صرف ملاقات کر لی بلکہ کالے اور صوفی کو چکما دے کر دو تین منٹ کے لئے عمو کو بھی اس ملاقات میں شریک کر لیا۔ شبو بھی شاید اپنی طرف بڑھنے والے خطروں کو بھانپ چکی تھی۔ اس نے نیم رضامندی ظاہر کر دی۔

اگلا روز عمو کے لئے بہت افسوس ناک تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا۔ صبح سویرے حویلی میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ دینے مسلی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم جو شدید زخمی تھا، گجرات کے اسپتال میں انتقال کر گیا ہے۔ وہ ماجھاں کے ظلم کے...... شاہ کاروں میں سے

ایک شاہ کار تھا۔ اس کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور جاہلیت میں غرق اس ''کیکراں گاؤں'' میں بچوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ وہ افسر بننے کے لائق تھا، پر ماجھاں نے اسے حویلی میں رکھ کر منشی...... کا کام سونپا تھا۔ اسے اپنی عیاشی کا سامان بنایا تھا اور ذلیل وخوار کیا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کا تھا۔ اس عمر میں تو زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سپنے دیکھے جاتے ہیں۔ راستے چنے جاتے ہیں۔ تازہ حوصلوں کے ساتھ سہانی مسافتوں کی شروعات ہوتی ہے اور وہ خشک ہونٹوں، ویران آنکھوں کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ بظاہر اس کی موت گھوڑے والے حادثے کی وجہ سے ہوئی لیکن یہ حادثہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہو جاتا۔ اس حویلی میں اس کی زندگی کو برباد تو ہونا ہی تھا۔

باؤ سلیم والے واقعے نے عمو کے ارادے کو مزید پختہ کیا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ راجا کا تعاون حاصل کرے گا اور شبو سمیت اس حویلی سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ اس دن شام کو جب وہ راجا کے ساتھ ڈیرے پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاؤنڈ کتے کو اپنے ہاتھ سے گوشت کھلا رہا تھا، راجا نے سرگوشی میں ماجھاں کو ایک کلاسیکل گالی دی اور بولا۔ ''عمو! تیری خاطر ایسا کنڈم سودا کر رہا ہوں، نہیں تو قسم سے لات مار دیتا اس مال پر اور مال والی کی ''تشریف'' پر۔''

''کس مال کی بات کر رہے ہو بھا راجے؟'' عمو نے پوچھا۔

راجے نے قمیص کے نیچے سے چاقو نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قریب رکھے ایک چھوٹے سے تربوز کو بیچ میں سے کاٹ دیا۔ عمو دنگ رہ گیا۔ تربوز اندر سے بالکل خالی تھا۔ اس کے خول میں پولیتھین کا ایک موٹا لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی سیاہی مائل شے نظر آ رہی تھی۔ یہ افیم تھی۔ راجا نے تھوڑی سی افیم نکالی۔ اسے چٹکی میں مسلا۔ زبان کی نوک سے چکھا پھر ناک سے لگایا...... اور دوبارہ ماجھاں کو گالی دی۔ ''ایک دم کنڈم ہے۔ جتنے پیسے مجھ سے لے رہی ہے، اس سے آدھے بھی نہیں دینے چاہئیں۔ پر تیری اور شبو کی خاطر یہ گھاٹا بھی قبول ہے۔''

وہ اپنے خاص انداز میں مسکرایا۔

''تو کیا تمہیں یہ افیم کہیں لے کر جانی ہے؟''

''تو کیا خود کھا کر اللہ بخشے ہونا ہے؟''

عمو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے چھوٹے سائز کے آٹھ دس تربوز ایسے ہیں جن میں یہ افیم بھری گئی ہے۔ ان تربوزوں کو دوسرے تربوزوں میں ملا کر لوڈر میں بھر دیا جائے گا۔ کسی کے باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ

تربوزوں میں ''کھوچل'' تربوز بھی ہیں۔''

''پہلے بھی یہ کام کرتے رہے ہو؟''

''ہاں، دو چار بار تو کیا ہے۔ ایک دم ٹیٹ کام ہے۔ یہ دیکھو، تربوز پر مٹی وغیرہ بھی لگی ہوئی ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ جوڑ کہاں ہے۔ اسے آپاں ماچاں کے کارندے مسالا لگا کر بڑی صفائی سے جوڑ دیتے ہیں۔'' ماجھاں کو ماچاں کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شریری سی چمک آ جاتی تھی۔

عمو نے کہا۔ ''بھا راجے! تم نے یہ کیوں کہا ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا تم میرے اور شبو کے لئے کر رہے ہو؟''

اس نے اپنے لمبے بالوں کو سہلایا اور بولا۔ ''یارا! ان تربوزوں کی آڑ میں ہی تو تم دونوں کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔ لوڈر پر تربوزوں کا ڈھیر ہوگا اور اس کے اندر ہی تمہارے بیٹھنے کے لئے جگہ ہوگی۔''

''بھا راجے! کہیں تربوزوں کے نیچے ہماری سانس ہی نہ گھٹ جائے۔ تم نے دیکھا ہی ہے، شبانہ تو ویسے بھی ملوک سی ہے۔''

''اور یہ تربوز بھی تو دیکھو ملوک سے ہیں۔ بڑے خربوزے جتنا سائز ہے ان کا۔'' راجا نے تربوز کو ہاتھوں میں گھمایا۔

○......❖......○

قریباً اڑتالیس گھنٹے بعد وہ تینوں حویلی سے نکلنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ راجا کو صبح سویرے حویلی سے روانہ ہونا تھا۔ کتوں والے تین پنجرے اور تربوز رات کو ہی لوڈر پر بار کر دیئے گئے تھے۔ آدھی رات کے بعد راجا نے ان تربوزوں میں سے پچیس تیس دانے علیحدہ کر کے ڈیرے میں پڑی پرالی کے اندر چھپا دیئے۔ یہ تربوز کم ہونے سے اتنی گنجائش پیدا ہوگئی کہ عمو اور شبانہ بھی تربوزوں میں چھپ سکیں اور تربوزوں کا حجم بھی زیادہ نظر نہ آئے۔ مویشی خانے میں اپنے دیرینہ ساتھی مولے سے عمو نے رات ہی کو الوداعی ملاقات کر لی تھی۔ بہرحال، مولے کو یہ ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔ پروگرام کے مطابق صبح اجالا ہونے سے پہلے ہی عمو اور شبانہ ڈیرے پر راجا کے پاس پہنچ گئے۔ راجا نے بڑی احتیاط سے انہیں خستہ حال لوڈر کے اندر تربوزوں میں چھپا دیا۔ تربوزوں کے اندر خلا موجود تھا، اس لئے عمو اور شبانہ کو سانس لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ بہرطور پھل کا بوجھ وہ اپنے جسموں پر ضرور محسوس کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ حالات ان کے حق میں ہیں۔ آدھی رات کے

وقت ہی ماجھاں تین گھڑسواروں کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ ان میں عقابی آنکھوں والا ماکھا بھی شامل تھا۔ کہا جارہا تھا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی کسی پاس کے گاؤں میں آیا ہوا ہے اور وہ اس سے ملنے گئی ہے۔

صبح کے ملگجے میں راجا کا لوڈر ایک جگر پاش آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوا۔ یوں لگا کہ پوری حویلی اس کی پاٹ دار آواز سے تھرانے لگی ہے۔ وہ اتنا دھواں اگل رہا تھا کہ کئی ٹرک ایک ساتھ مل کر بھی نہیں اگل سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے پہیوں نے حرکت کی اور وہ حویلی کے بڑے پھاٹک سے گزر کر کچے راستے پر آ گیا۔ یہاں ماجھاں کے مسلح کارندے وجود تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس لوڈر میں کیا جارہا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ''جو کچھ'' جارہا ہے اس کے نیچے کیا جارہا ہے۔

کیکراں گاؤں کی مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد لوڈر باہر جانے والے کشادہ راستے پر آ گیا۔ گاہے بگاہے راجا کی چہکتی ہوئی آواز عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ راہ میں ملنے والے کسی شخص کو سلام کرتا یا اس کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ ان ملنے والوں میں زیادہ تر یقیناً ماجھاں کے کارندے ہی تھے۔

لوڈر کے اندر تربوزوں کے نیچے عمو اور شبانہ ایک دوسرے سے پیوست ہو کر لیٹے تھے، ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی۔ صورتِ حال تناؤ بھری تھی، اس کے باوجود شبانہ کے جسم کا پُرگداز لمس عمو کے سراپا میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ شبانہ کے چھوٹے چھوٹے ملائم بالوں پر رکھ دیئے اور سرگوشی میں بولا۔ ''شبو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ہم ساتھ جئیں مریں گے۔''

''میں بھی......'' شبو نے اپنا چہرہ اس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی خوب صورت ناک کی چبھن اپنے سینے پر عمو کو بڑی بھلی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپا لے۔ اسے اتنا پیار کرے کہ گزرے ماہ و سال کے ان سارے زخموں کا مداوا ہو جائے جو اس کے کومل جسم پر لگے ہیں۔

لوڈر کو لگنے والے جھٹکے بتا رہے تھے کہ اب اس کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ان جھٹکوں کے ساتھ تربوزوں کا بوجھ بھی تکلیف دہ ہوتا جارہا تھا۔ کبھی کبھی شبانہ کو کراہنا پڑتا اور وہ کسمسانے لگتی۔ ایک جگہ پہنچ کر لوڈر کی رفتار سُست ہونے لگی اور پھر وہ رک گیا...... عمو سمجھ گیا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں اور راجا شاید ان پر سے تربوزوں کا بوجھ کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے...... لیکن اصل صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ عمو اور شبانہ اس سے یکسر بے خبر تھے......

چند سیکنڈ بعد انہیں اپنے اردگرد گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں اور پھر ایک پاٹ دار آواز سن کر عمو کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ یہ ماجھاں کی آواز تھی اور وہ راجا سے اس کا حال چال پوچھ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس گاؤں کی طرف جارہی ہے۔

شبانہ کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ سہم کر عمو سے چمٹ سی گئی۔ چند لمحے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہو گئی۔ ماجھاں کی آواز آئی۔ اس نے راجا سے پوچھا۔ ''مال ٹھیک ٹھاک جارہا ہے؟''

''بالکل ٹیٹ آپاں۔'' راجا نے مختصر جواب دیا۔

ماجھاں تربوزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ کسی کسی تربوز کو وہ انگلی کی گانٹھ سے ٹھونک کر بھی چیک کرتی۔ عمو کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ دونوں کسی بھی وقت ماجھاں کی نظر میں آ سکتے تھے۔ وہ دم سادھے لیٹے رہے۔ یکایک عمو کے پاؤں کے پاس حرکت ہوئی۔ وہاں سے تربوز اُٹھایا گیا تھا۔ عمو کا پاؤں ننگا ہو چکا تھا۔ دو سیکنڈ بعد ماجھاں کی پُرحیرت آواز عمو کے کانوں میں پڑی۔ ''اوئے...... یہ کیا ہے؟''

اس کے ساتھ ہی عمو نے ایک کرخت گرفت اپنے ٹخنے پر محسوس کی۔ یقیناً یہ ماجھاں ہی تھی۔ اس نے عمو کی ٹانگ کو پوری طاقت سے کھینچا اور اسے تربوزوں کے نیچے سے باہر گھسیٹ لیا۔ سورج کی چمکیلی کرنوں میں عمو نے ماجھاں کا بہت بڑا تھوبڑا دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب ناک چمک تھی اور اس کی رنگت ''سیاہی مائل سرخ'' ہو رہی تھی۔ عمو نے دیکھا کہ راجا لپک کر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ہے۔ عمو کے اندر ایک مدت سے دھیرے دھیرے جو بغاوت پروان چڑھ رہی تھی، وہ یکایک توانائی بن کر اس کے دست و بازو میں دوڑ گئی۔ اَن گنت شب و روز سے سینے کے اندر سلگتا ہوا انگارہ دفعتاً شعلہ جوالا بن گیا۔ عمو نے پوری طاقت سے اپنا دایاں ہاتھ گھمایا اور ماجھاں کے چربی دار تھوبڑے کو نشانہ بنایا۔ یہ بڑی کارگر ضرب تھی اور کیوں نہ ہوتی...... اس کے پیچھے بہت سے زخموں کا درد، بہت سے دکھوں کی تلخی اور بہت سی توہین کا زہریلا احساس موجود تھا۔ اس چوٹ نے ''چٹاخ'' کی آواز پیدا کی اور ماجھاں اپنے تنومند جسم کے ساتھ اچھل کر دور جا گری۔ اس کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔

یہی وقت تھا جب ماکھے نے عمو کو ایک گندی گالی دی اور اچھل کر لوڈر پر چڑھا۔ اب عمو کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ یہ چاقو اسے راجا نے ہی علی الصباح دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماکھا اپنی

رائفل کندھے سے اُتارتا اور اسے عمو اور شبانہ کی طرف سیدھا کرتا، عمو ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ راجا نے اسے تاکید کی تھی کہ کسی کو جان سے نہیں مارنا ہے۔ اگر یہ تاکید عمو کے ذہن میں نہ ہوتی تو وہ شاید سیدھا ماکھے کے پیٹ میں چاقو گھونپتا لیکن اس نے ماکھے کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ پہلے اس نے ماکھے کی بائیں ران میں دستے تک چاقو اُتارا پھر اس کی دائیں ران پر جانگ کے بالکل پاس وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سر کی شدید ضرب ماکھے کے پیٹ میں لگا کر اسے لوڈر سے نیچے پھینک دیا۔ اس وقت تک لوڈر حرکت میں آ چکا تھا اور اپنے پیچھے سیاہ دھوئیں کے بادل چھوڑتا رفتار پکڑ رہا تھا۔

اس نے زخمی ماکھے کو گرد میں لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ باقی دو افراد ماجھاں سمیت تیزی سے گھوڑوں پر سوار ہوتے نظر آئے۔ ڈھول سے اٹے ہوئے اونچے نیچے راستے پر راجا کا پاٹے خاں تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔ اس نے غیر متوقع رفتار پکڑ لی اور اس رفتار کی وجہ سے بعض جگہ کئی کئی فٹ اچھل رہا تھا۔ خطرے کو محسوس کر کے کتے قیامت خیز شور مچا رہے تھے۔ تربوز لڑھک لڑھک کر لوڈر سے نیچے گرتے چلے جا رہے تھے۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لئے عمو اور شبانہ نیچے بیٹھ گئے اور ایک اینگل آئرن کا سہارا لے لیا۔

"وہ......وہ پیچھے آ رہے ہیں۔" عمو نے چلا کر راجا کو اطلاع دی۔

"جو آتا ہے آنے دو۔" کیبن کی طرف سے راجا کی پُرجوش آواز آئی اور اس کے ساتھ لوڈر کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔

ماجھاں کے دونوں ساتھیوں میں سے کالیے کے کندھے پر رائفل موجود تھی۔ تاہم بھکٹٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر سے گولی چلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لوڈر کی طرف دو تین فائر کئے گئے مگر ان میں سے کوئی لوڈر کو نہیں لگا۔ عمو نے دیکھا، سامنے ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا اور راستہ بند نظر آتا تھا۔ دائیں بائیں اونچے نیچے کھیتوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ "ہائے......اب کیا ہوگا؟" شبانہ نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔

یہی سوال عمو کے دماغ میں بھی تھا لیکن پھر یہ دیکھ کر عمو کو حیرت ہوئی کہ راجا نے لوڈر کو بلا تردد جوہڑ میں اُتار دیا ہے۔ کھٹارا لوڈر کا سائیلنسر تھوڑی سی بلندی پر لگایا گیا تھا تاکہ پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ یہ جان کر عمو کو حیرت ہوئی کہ لوڈر جیسے تیسے ہچکولے کھاتا اس ڈھائی تین فٹ اونچے پانی سے گزرتا چلا گیا۔ عقب میں ڈھول اور دھوئیں کے بادل چھٹ گئے تھے۔ ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی نظر آ رہے تھے۔ ماجھاں کے دونوں ساتھی گھڑ سوار تو جوہڑ کے کنارے کنارے بائیں طرف بھاگے تاکہ کلاوا کاٹ کر جوہڑ کی دوسری طرف پہنچ

جائیں مگر مشتعل ماجھاں نے اس نصف فرلانگ چوڑے جوہڑ کا چکر کاٹنے کا رسک نہیں لیا اور اپنا گھوڑا لوڈر کے پیچھے ہی سیدھا جوہڑ میں ڈال دیا۔ غیظ و غضب نے اسے جیسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ جوہڑ کے درمیان پہنچ کر ماجھاں کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماجھاں نیچے اُتری اور پا پیادہ ہی لوڈر کے پیچھے لپکی۔ وہ کسی فربہ اندام آبی مخلوق کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ چلا رہی تھی اور لوڈر کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوڈر یعنی راجا کے پاٹے خاں نے توقع سے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا اور جوہڑ سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ ماجھاں تب تک کافی نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کے پاس پستول نہیں تھا ورنہ اس موقع پر وہ ضرور فائر کرتی۔ راجا کے پاس بھرا ہوا پستول موجود تھا لیکن اس نے یہ ساری کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی عمو کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی کو جان سے مارنے کا رسک نہیں لیں گے۔ اگر بہت زیادہ پھنس گئے تو پھر زخمی کرنے کی حد تک جائیں گے۔

جونہی پاٹے خاں خشکی پر پہنچا، ماجاں بھی پہنچ گئی۔ اس کا جسم فربہ ضرور تھا لیکن ساتھ ہی صحت مند اور زور آور بھی تھا۔ بہ وقتِ ضرورت وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اب بھی وہ اپنے گٹھے ہوئے جسم کی پوری توانائی کے ساتھ پاٹے خاں کے پیچھے لپکی تاکہ اس پر ہاتھ ڈال سکے اور پھر پائدان پر پاؤں رکھ کر اس پر چڑھ سکے اور وہ جانتی تھی کہ یہ کام اسے پاٹے خاں کے رفتار پکڑنے سے پہلے پہلے کرنا ہے...... یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے تیزی سے پاٹے خاں پر ہاتھ ڈالا۔ آہنی کنارہ اس کے ہاتھ میں آیا...... مگر اس کا پاؤں ٹھیک سے پائدان پر نہیں پڑا۔ وہ گری اور پھر لوڈر کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

شبانہ عمو سے چمٹی ہوئی تھی اور چلا رہی تھی۔ اس کے لئے ماجھاں کسی "موذی جانور" کی طرح تھی جو لوڈر پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے لئے عمو حیران ہوا کہ ماجھاں کی گرفت کتنی مضبوط ہے جو وہ بھاری تن و توش کے ساتھ لوڈر کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی ہے۔ مگر پھر اسے اصل حقیقت کا پتا چلا۔ ماجھاں کی کلائی کا موٹا دھاتی کڑا لوڈر کے ایک زیریں ہک میں اٹک گیا تھا۔ ایسے ہک عموماً ترپال وغیرہ تاننے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

راجا نے چلتے لوڈر کی کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی پھر پکار کر پوچھا۔

"کہاں ہے ماجاں؟"

"پیچھے گھسٹ رہی ہے۔ چھوڑ نہیں رہی۔" عمو ہانپی آواز میں بولا۔

"چھڑا دو۔ کوئی چیز مار دو۔"

"اس کا کڑا ہک میں پھنس گیا ہے۔"

"زور لگا کر نکال دو۔" راجا پکارا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں گھڑسواروں نے جوہڑ کا چکر مکمل کرلیا ہے اوراب تیزی سے لوڈر کے پیچھے آرہے ہیں۔

تنومند ماجھاں کے لوڈر کے پیچھے گھسٹنے کا منظر دیدنی تھا۔ وہ قریباً کندھوں تک گھسٹ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ غضب ناک انداز میں چلا بھی رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنا دوسرا ہاتھ استعمال کرتی تھی اور کڑے کو ہک سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی...... لوڈر کو لگنے والے کسی جھٹکے کی وجہ سے کڑا خود بخود بھی ہک میں سے نکل سکتا تھا...... عمو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ نفرت الاؤ بن چکی تھی۔ ماں بہن کی وہ اَن گنت گالیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں جو گزرے ماہ وسال میں اسے دی گئی تھیں۔ وہ سارے تھپڑ، وہ سارے زخم، ساری توہین اور وہ سارے کراہت آمیز لمحے اس کے تصور میں تھے جن سے اس کا واسطہ پڑتا رہا تھا۔

اس نے ماجھاں کی کلائی اور آہنی ہک کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا کہ ان کے "جدا" ہونے کا امکان کم سے کم ہوگیا۔ فرنٹ سیٹ پر سے راجا کی آواز آئی۔ "ہاں عمو! کڑا چھوٹ گیا؟"

"نہیں بھا راجے...... بری طرح پھنسا ہوا ہے۔" وہ ایسے انداز میں بولا جیسے کڑا چھڑانے کے لئے زور لگا رہا ہو۔ حالانکہ وہ کڑا پھنسائے رکھنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سفاک جھوٹ تھا جو اس نے بولا...... ماجھاں کی موت کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ وہ لوڈر کے پیچھے گھسٹتے ہوئے اچھل رہی تھی، پلٹ رہی تھی، چلا رہی تھی۔ اس کا چربیلا جسم لہولہو ہو رہا تھا۔ کپڑے پھٹ رہے تھے، چمڑی اُتر رہی تھی۔ کچے راستے کے کنارے، ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے سے وہ ٹکرائی، اس کا لہولہان چہرہ ایک طرف سے پچکا ہوا نظر آیا۔ اپنی آنکھوں کو ان مناظر سے محفوظ رکھنے کے لئے شبانہ لوڈر کے فرش پر بیٹھ گئی تھی اور اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

راجا جانتا تھا کہ کالیا اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تیزی سے پیچھے آرہے ہیں۔ وہ اپنے "پاٹے خاں" کی رفتار کم نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے پھر چلا کر پوچھا۔ "کڑا چھوٹا؟"

"نہیں بھا راجے۔" عمو نے پھر وہی جواب دیا۔

ماجھاں اب تقریباً ایک لاش میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں کے چیتھڑے اُڑ چکے تھے۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہ دیکھنے کے بعد عمو نے اس کی کلائی اپنی طرف کھینچ کر تھوڑا سا زور لگایا اور دھاتی کڑے کو ہک میں سے نکال دیا۔ ماجھاں کی خونچکاں

لاش چند پلٹیاں کھا کر کنارے پر اُگی ہوئی جھاڑی میں جا رکی۔

لوڈر کی رفتار ایک دم تیز ہوگئی۔ عقب میں دھول کے بادل کچھ اور دبیز ہوگئے۔ کچھ ہی دیر بعد ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی ان بادلوں کی اوٹ میں اوجھل ہوگئے۔

O......❖......O

راجا کا مکان ٹھیکرا نامی گاؤں میں تھا۔ مکان کا احاطہ کافی بڑا تھا۔ ایک طرف گھوڑوں کو سدھانے اور بھگانے کے لئے علیحدہ جگہ تھی۔ لوہے کے کئی زنگ آلود پنجرے بھی یہاں نظر آرہے تھے۔ عمو نے ماجھاں کو بہت بری حالت میں دیکھا تھا لیکن وہ ابھی تک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مری ہے یا نہیں۔

راجا از حد پریشان تھا۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ ماجھاں پر کیا بیتی ہے۔ عمو اور شبانہ کو گھر چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح آیا تھا۔ کتوں والے پنجرے اور بچے کھچے تربوز ابھی تک لوڈر میں ہی تھے۔ راجا آتے ساتھ ہی چلایا۔ "عمو...... جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ بس دو منٹ لگاؤ۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ مرگئی ہے۔ کیکراں میں ترتھلی مچی ہوئی ہے۔ اب کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" اس نے لوہے کا ایک پنجرہ گھسیٹ کر لوڈر کے قریب کیا۔ اس میں کتے کے چند چھوٹے پلے تھے۔

عمو نے اس خبر پر بظاہر دکھی چہرہ بنایا لیکن درحقیقت اس کے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ راجا کے ساتھ مل کر اس نے پلوں والا پنجرہ لوڈر پر چڑھایا۔ راجا نے افراتفری میں کچھ چیزیں ایک بیگ میں رکھیں اور لوڈر میں آبیٹھا۔ اس کے اشارے پر عمو اور شبانہ بھی سوار ہوگئے۔ پاٹے خاں کا انجن پرشور آواز سے بیدار ہوا۔ غالباً سائیلنسر کو نقصان پہنچنے سے پاٹے خاں کچھ اور بھی "پاٹے خاں" ہوگیا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ لوگ گھر چھوڑ چکے تھے اور تیز رفتاری سے کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہے تھے۔

شبانہ کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کے لئے وہ مناظر ہی کم خوفناک نہیں تھے جو جوہڑ سے نکلنے کے بعد پیش آئے تھے۔ اب وہ ماجھاں کی موت کی مصدقہ اطلاع بھی سن رہی تھی...... اور ماجھاں کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ اس علاقے کی "پھولن دیوی" تھی۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ناجے جیسے ڈکیت کی بہن تھی۔ اگر راجا پریشان تھا تو اس کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔

اس مرتبہ پاٹے خاں پر ان کا سفر بغیر رکے قریباً آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ ڈیزل ختم ہو گیا تو کیبن میں رکھا ہوا ایک ''کین'' کام آیا۔ ایک جگہ انہیں سخت جان پاٹے خاں کا پہیا بھی تبدیل کرنا پڑا۔ ان کا سارا سفر کچے راستوں اور بے آباد زمینوں کا تھا۔ چھوٹے موٹے ٹیلے اور کٹی پھٹی زمین ان کے راستے میں آ رہی تھی۔

وہ اب پنجاب کی ایک اور دور دراز بستی میں پہنچے۔ اس کا نام شاد پورہ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں سے قریب ترین پکی سڑک قریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ نزدیکی شہر خوشاب تھا اور اس کا فاصلہ بھی کم و بیش چالیس کلومیٹر تھا۔ شاد پورہ سے باہر ہی آموں کا ایک بڑا باغ تھا۔ اس باغ کے اندر ایک کھلے احاطے والا گھر تھا۔ یہ باغ اور جگہ کبیر احمد نامی ایک ادھیڑ عمر شخص کی ملکیت تھی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا اور بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ دو تین سال پہلے کبیر کو راجا نے ایک بڑے حادثے سے بچایا تھا۔ ان دنوں کبیر کی اپنی ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ وہ پھل بیچ کر خوشاب منڈی سے گاؤں واپس آ رہا تھا۔ ٹونا کے قریب اسے موٹر سائیکل سوار راہزنوں نے روک لیا اور لوٹنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ فائر کی آواز سن کر راجا اپنے لوڈر پر وہاں پہنچا۔ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے ہوائی فائر کئے اور ڈاکوؤں نے اس پر سیدھی فائرنگ کر دی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا، دوسرے کو راجا نے پکڑ لیا تھا۔ اردگرد کے کھیت مزدور موقع پر پہنچ گئے اور ڈاکو فرار ہو گئے۔

کبیر احمد اس واقعے کے بعد راجا کا بہت زیادہ احسان مند تھا۔ اس نے دو تین بار راجا کو خط لکھا کہ وہ اس کے پاس شاد پورہ آئے۔ وہ خود تو ٹانگ کے زخم کی وجہ سے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب راجا، عمو اور شبانہ سمیت اس شخص کے پاس پناہ کے لئے پہنچا تھا۔

چالیس پینتالیس سالہ کبیر احمد ایک خوش اخلاق اور ہمدرد شخص ثابت ہوا۔ اس نے ان تینوں کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر ہیں۔ راجا نے کبیر احمد کو اصل کہانی تو نہیں سنائی تھی، تاہم بتایا تھا کہ ایک دشمنی کی وجہ سے اسے کم از کم ڈیڑھ دو ماہ کے لئے یہاں پناہ چاہئے۔ کبیر احمد نے مسکرا کر کہا۔ ''ڈیڑھ دو ماہ کیا یار! تم ویسے ہی یہاں پر ٹک جاؤ۔ یہ دیکھو، باغ اجڑ رہا ہے۔ میرا آگے پیچھے کون ہے جو اسے سنبھالے گا۔ گھر والی اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔ ایک بیٹی تھی جو بیاہ کر اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ بیٹا ایسا دبئی گیا ہے کہ اس نے چھ سال سے پلٹ کر نہیں دیکھا۔''

یہ بڑی ٹھنڈی اور پُرسکون جگہ تھی۔ ہر طرف درختوں کے سائے تھے۔ کبیر نے ایک چھوٹا ٹیوب ویل لگا رکھا تھا جسے پمپی کہتے تھے۔ یہ پمپی ڈیزل انجن سے چلتی تھی۔ کبیر نے شاید اپنی تنہائی کم کرنے کے لئے بہت سی مرغیاں بطخیں اور طوطے پال رکھے تھے۔ کچھ بطخیں اور مرغیاں بہت مہنگی تھیں جنہیں وہ لاہور سے لے کر آیا تھا۔ کبیر یہاں اپنے نہایت قابلِ اعتماد ملازم محمد شریف اور اس کی بیوی مریم کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دونوں بے اولاد تھے۔ کبیر نے عمو کو پتر اور شبانہ کو دھی رانی کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔ راجا کو وہ اس کے نام سے بلاتا تھا۔ راجا اسے وڈھا بھا کہتا تھا۔ گاؤں میں کبیر نے اپنے ملنے والوں کو یہی بتایا کہ یہ اس کے دور پار کے رشتے دار ہیں۔

وہ تینوں ایک نہایت محفوظ مقام پر آ گئے تھے، اس کے باوجود راجا، عمو اور شبانہ کے دلوں میں ماجھاں کی موت کا خوف موجود تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے میں بڑی کھلبلی مچی ہو گی۔ شبانہ کو یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اس واقعے کی وجہ سے اس کی والدہ اور دیگر رشتے داروں پر کوئی آفت نہ آئے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتی۔ عمو اور راجا اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ وہ ہر آہٹ پر چونک جاتی۔ ہر اجنبی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ بہرحال جب بیس پچیس روز خیریت سے گزر گئے تو بتدریج ان کا خوف کم ہونے لگا۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ وہ یہاں خیریت سے ہیں۔

ایک روز، رات کو بڑی مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ عمو اور راجا گھر کی چھت پر چارپائیاں ڈالے لیٹے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ عمو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ''بھا راجا! میری ماں کا پتا کراؤ۔ اللہ جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ وہ تو میرے بغیر ایک دن بھی بڑی مشکل سے گزارتی تھی۔ یہ ڈیڑھ دو سال اس نے پتا نہیں کیسے گزارے ہوں گے۔''

راجا بولا۔ ''جو کچھ تُو سوچ رہا ہے، میں بھی وہی سوچ رہا ہوں لیکن یارا! ابھی دو چار ہفتے ہمیں بالکل سکون سے گزارنے چاہئیں اور کسی طرح کا چھوٹا بڑا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔''

''لیکن بھا راجا......''

''میں تیرے اندر کی حالت سمجھتا ہوں عمو۔ تُو فکر نہ کر۔ میں نے اس بارے میں شریف سے تھوڑی بہت بات کی تھی۔ وہ بالکل ایک نمبر کا سچا بندہ ہے۔ ہر لحاظ سے بالکل ٹھیٹ۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے تیرے گھر کا ایڈریس دے کر شیخوپورہ بھیجوں۔ سب کچھ معلوم وہ کر لے گا۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ماں جی کو یہیں بلا لیں۔''

اس رات وہ اس بارے میں دیر تک بات کرتے رہے۔ شبانہ کا معاملہ بھی زیر بحث

آیا۔ راجا نے عمو کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ایک بات جانتا ہوں عمو! جو کرنا ہے کرو، دنیا سے مت ڈرو۔ یہ دنیا کمینی ایک دم کنڈم ہے۔ تم شبانہ سے پیار کرتے ہو، وہ تم سے کرتی ہے۔ اس کا پہلا رشتہ کنڈم ہو چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں کسی مولوی کو بلا لاتے ہیں۔ ایک ٹیٹ سا کھانا پکاتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں، مولوی صاحب کو بھی کھلاتے ہیں اور تمہارے دو بول پڑھا دیتے ہیں۔''

''یہ اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے بھارا جا! کم از کم ماں کو تو یہاں ہونا چاہئے اور پھر ابھی تو میں نے شبو سے بھی ٹھیک طرح بات نہیں کی۔ کیا پتا، وہ اس طرح شادی پر راضی بھی ہو یا نہیں۔''

''تو بھی نرا بدھو ہے۔ پیارے، ہم زنانی کی چال دیکھ کر اس کے پورے خاندان کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ وہ تجھ پر سو جان سے مرتی ہے کھوتے۔ ہاں، ماں کے یہاں پہنچنے والی بات پر غور کیا جا سکتا ہے۔''

اچانک رات کے سناٹے میں بطخوں کی خوفناک قیں قیں گونجی اور اس کے ساتھ ہی شکاری کتے کا زبردست شور سنائی دیا۔ عمو اور راجا بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُترے۔ صحن کا منظر خوفناک تھا۔ راجا کا گرے ہاؤنڈ کتا جسے اس کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے راجا علیحدہ پنجرے میں بند کرتا تھا، کسی طرح باہر نکل آیا۔ شاید پنجرے کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کتا کبیر احمد کی نایاب بطخوں پر حملہ آور تھا۔ وہ ایک بطخ کو ادھیڑ کر پھینک چکا تھا اور اب دوسری پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ کبیر احمد بھی اپنی بیساکھی کے سہارے باہر نکل آیا تھا اور بری طرح چلا رہا تھا۔ کتے نے اب جس بطخ کو منہ میں دبوچا تھا، وہ نر یعنی بطخا تھا۔ چھ مادہ بطخوں کے لئے یہ نر کبیر احمد نے بڑی مشکلوں سے ڈھونڈا تھا۔ اب یہ پرندہ کسی بھی وقت ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتا تھا۔

''پارے...... پارے۔'' راجا نے کتے کو اس کے نام سے پکارا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔

کتے نے فقط ایک سیکنڈ کے لئے تڑپتے ہوئے بطخے کو چھوڑا اور دوبارہ پکڑ لیا۔ وہ پوری طرح مشتعل تھا۔ ''چھوڑ دے پارے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ۔'' راجا نے ایک بار پھر پارے کے پٹے پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

عمو بے ساختہ راجا کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے بھی پارے کو اس کے نام سے پکارا۔ یکا یک صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی۔ کتے نے زخمی پرندے کو چھوڑا اور

زبردست شور مچاتا ہوا احاطے میں چکرانے لگا۔

''رک جا پارے...... رک جا۔'' عمو اس کے راستے میں آیا۔

یہ عمل خطرناک تھا مگر کارگر رہا۔ کتا عمو کے اردگرد چکرانے لگا۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ عمو نے اس کی تھوتھنی سہلائی۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کلاوے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راجا کو اشارہ کیا۔ وہ پہلے سے تیار تھا، اس نے آگے بڑھ کر کتے کے منہ پر حفاظتی جالی چڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسے دوبارہ پنجرے کے اندر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

بڑے سائز کے خوب صورت بطخے کو زخم تو آئے تھے مگر طبی امداد سے اس کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ کبیر احمد اور شریف اسے لے کر جلدی سے گودام کی طرف چلے گئے۔

اس واقعے نے راجا کی نظر میں عمو کی اہمیت اور بڑھا دی۔ عمو پر اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔ اگلی صبح جب ایک گرم اور طویل دوپہر کی شروعات ہو رہی تھی اور وہ گھنے باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے، راجا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''عمو یار! تیرے اندر کوئی بات ہے ضرور۔ شاید کسی پیر فقیر کی دعا ہے تجھے۔ پالتو جانور تجھ سے بڑی جلدی ہل جاتے ہیں۔''

''یہ بات تم ہی مجھے بتا رہے ہو۔ پہلے تو کسی نے نہیں کہا۔''

''پہلے کسی نے غور ہی نہیں کیا ہو گا۔ پر میرا تو کام ہی جانوروں کو سدھانا ہے...... خاص طور سے اڑیل جانوروں کو۔''

''اچھا بھارا جا! مجھے یاد آیا، جب ہم ماجھاں کی حویلی سے نکلنے کا پروگرام بنا رہے تھے، تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔''

''ہاں...... لیکن وہ کوئی ایسی خاص شرط نہیں ہے۔ تم آسانی سے پوری کر سکتے ہو...... بلکہ اب تو یہ تمہارے فائدے میں بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصہ میرے ساتھ...... میرے پاس ہی رہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم گھوڑوں اور شکاری کتوں کو سدھانے میں میری زبردست مدد کر سکتے ہو۔ اگر میں تمہیں کچھ خاص خاص گُر بتا دوں تو تم دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر بن سکتے ہو اور میں تمہیں سچ کہتا ہوں، اس کام میں بڑا فائدہ ہے۔ ایک سدھایا ہوا ٹیٹ نسل کا کتا آرام سے پندرہ وی ہزار کا بک جاتا ہے۔ خرچہ وغیرہ نکال کر اس میں سے سات آٹھ ہزار تو بچ ہی جاتا ہے۔ یہ چودھری لوگ پیسے دے کر اپنے گھوڑوں کو بھی شکار کے لئے ٹرینڈ کرواتے ہیں۔''

’’پر بھا راجے! میں تو ماں اور شبو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور پتا نہیں وہ یہاں رہنا چاہیں گی یا نہیں؟‘‘

’’جب ساری بات کا پتا تمہاری امی کو چلے گا تو دیکھنا وہ خود کہے گی کہ تم ابھی یہیں رہو۔ ماجھاں کی جان نہ جاتی تو پھر اور بات تھی۔ پر اب تو اس کے وارث ہم تینوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ وہ ہمیں دور دور تک ڈھونڈیں گے۔ ہم تینوں جتنے محفوظ اس جگہ ہیں، کہیں اور ہو ہی نہیں سکتے۔‘‘

راجا کی باتوں میں وزن تھا۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ عمو اس کے بارے میں شک و شبہے کا شکار ہوتا۔ اس میں کچھ خامیاں خرابیاں ضرور تھیں۔ وہ شراب اور عورت کا شوقین بھی تھا لیکن عمو اور شبانہ سے اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ شبانہ کے ساتھ اس کا رویہ بڑے بھائی جیسا تھا۔

رات کو عمو سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو وہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں جو آج دوپہر راجا کے ساتھ ہوئی تھیں۔ کل رات اس نے جس طرح مشتعل پارے کو کنٹرول کیا اور سنبھالا تھا، وہ خود اس کے لئے بھی حیران کن تھا۔ وہ سوچنے لگا کیا واقعی اس میں کوئی خاص صلاحیت موجود ہے...... یا پیدا ہو رہی ہے؟ اسے کئی باتیں یاد آنے لگیں...... جب ایک موقع پر ماجھاں نے سخت ناراض ہونے کے بعد اسے کتوں والی کوٹھڑی میں بند کرا دیا تھا تو وہ بہت سہا ہوا تھا۔ اسے پتا تھا کہ خوفناک کتے یہاں اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں لیکن پھر ایک دو دن میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کتوں نے اس کمرے میں اسے اپنے ساتھ شریک کر لیا ہے۔ اس صورتِ حال نے ماکھے اور کالیے وغیرہ کو بھی حیران کیا تھا۔ پھر اسے ڈیرے کی بھوری بھینس والا واقعہ یاد آیا۔ یہ بڑی شان دار بھینس تھی لیکن دودھ دھونے کے لئے کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ سب کوشش کر کے ہار گئے تھے مگر عمو نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے رام کر لیا تھا۔

یہ باتیں یاد کر کے عمو کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔ اس نے کہیں سے سنا تھا کہ قدرت جب دکھ دیتی ہے تو اس کا مداوا بھی کرتی ہے۔ کئی دفعہ دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس کا مداوا بھی کسی صورت آس پاس ہی موجود ہوتا ہے...... اور اگر انسان ہمت نہ ہارے تو یہ ’’مداوا‘‘ اسے ملتا ہے۔ عمو کے لئے ماں سے جدائی کا دکھ بھی بہت بڑا تھا...... ناقابلِ بیان و ناقابلِ برداشت...... عمو نے یہ دکھ جھیلا تھا، شاید اسی دکھ کے اندر سے خوشی اور صلاحیت کی یہ چھوٹی سی کونپل پھوٹی تھی......

عمو عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس کے پہلو میں راجا اپنی چارپائی پر سو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر کبیر احمد اور شریف کی چارپائیاں تھیں۔ شبو نیچے برآمدے میں شریف کی بیوی کے ساتھ سو رہی تھی۔

عمو ننگے پاؤں آہستہ آہستہ پکی سیڑھیاں اُتر کر نیچے احاطے میں آ گیا۔ پارے کے پلبرے کی چابی اس نے راجا کے تکیے کے پاس سے اُٹھالی تھی۔ وہ پارے کے پنجرے تک پہنچا۔ پارا ایک غیر معمولی قد کاٹھ والا، نہایت طاقتور لیکن خطرناک جانور تھا۔ راجا بھی فی الحال اس کے قریب جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ عمو نے اس کا پنجرہ کھولا۔ ایک عجیب سا اعتماد تھا عمو کے اندر...... سینے میں سنسنی خیز دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ اپنے غیر معمولی اعتماد کے سہارے ہی عمو نے ہاتھ بڑھائے اور بگیاڑی یعنی حفاظتی جالی پارے کی تھوتھنی سے اُتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی پارا عمو کی طرف آیا۔ اس نے سیدھا اس کی گردن پر جھپٹا مارا۔ وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں عمو کی شہ رگ ادھیڑ سکتا تھا لیکن یہ دوستانہ جھپٹا تھا۔ وہ اس کی گردن سے اپنی گرم تھوتھنی رگڑنے لگا۔ اس کا پارا صفت جسم مچل رہا تھا اور دُم کی گردش بڑی تیز تھی۔ عمو نے اس کی کمر اور تھوتھنی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو اس کی بے قراری کم ہوتی چلی گئی۔ اب وہ عمو کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا اور ہولے ہولے اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی آواز میں پسندیدگی کا اظہار تھا۔

یک لخت عمو چونک گیا۔ ڈری ہوئی تیز سرگوشی عمو کے بالکل پاس سے اُبھری۔ ’’یہ کیا کر رہے ہو عمو؟‘‘

عمو نے مڑ کر دیکھا، یہ شبو تھی۔ مدھم چاندنی میں اس کی پھول دار اوڑھنی سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور بال جواب کافی بڑے ہو گئے تھے، ریشم کی طرح چمک رہے تھے۔

’’کچھ نہیں شبو۔ یہ بالکل رام ہے...... دیکھو...... کیسے لاڈ کر رہا ہے۔‘‘

’’لل...... لیکن یہ تو بہت خطرناک ہے۔ اس نے تو راجا بھائی کو بھی زخمی کر دیا تھا۔‘‘

’’مگر ہمیں نہیں کرے گا۔ یہ دیکھو، کس طرح لوٹیں لگا رہا ہے۔‘‘ عمو نے سرگوشی میں کہا۔ شبو حیرت زدہ تھی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

عمو اسے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور گاہے بگاہے اپنے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ شبانہ ڈرے ہوئے انداز میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پھر عمو نے شبانہ کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لئے اپنی ننگی کلائی پارے کے کھلے ہوئے جبڑے میں دے دی۔ ایک یقین تھا کہ پارا اسے نقصان نہیں پہنچائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پارے نے عمو کی کلائی اپنے نہایت نکیلے دانتوں میں ہولے

سے دبائے رکھی اور اپنی ادائیں دکھاتا رہا۔

''کہا ہے نا پاس آجاؤ۔ کچھ نہیں کہے گا۔'' عمو نے سرگوشی میں شبانہ کو پاس بلایا۔

وہ ہمت کر کے دو قدم آگے آگئی مگر وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ عمو بولا۔ ''چلو اس کی کمر پر ہتھ لگاؤ۔''

''نہیں...... نہیں۔'' وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ ''اس کو پنجرے میں بند کر دو۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے عمو نے پارے کو پنجرے کی طرف بلایا۔ وہ جو پنجرے میں واپس جاتے ہوئے راجا کو ناکوں چنے چبوا دیتا تھا، فوراً ہی پنجرے میں چلا گیا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد عمو شبانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں لکڑی کے خالی کریٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے بچھی چارپائی پر جا بیٹھے۔ آج وہ کافی دنوں بعد ملی تھی۔ عمو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پھر بے قراری سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''یہ...... تم سب کیسے کر لیتے ہو عمو؟'' وہ اس کے سینے سے لگی لگی منمنائی۔

''کیا مطلب؟''

''تم نے مالکن کے اتھرے گھوڑے ہیرے کو رام کر لیا۔ بھوری جیسی اڑیل بھینس تمہیں دودھ دینے لگی۔ تم کیا کرتے ہو؟''

''تمہیں بتاؤں؟'' وہ دبی دبی شرارت سے بولا۔

''ہاں بتاؤ۔'' وہ معصومیت سے کہنے لگی۔

عمو نے اسے اپنے ساتھ بھینچا۔ شبو نے خود کو پیچھے ہٹایا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''بتاؤ نا؟''

عمو نے گہری سانس لی اور مدھم چاندنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سچی بات ہے شبو! میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ بھا راجا کہتا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔ جانور مست ہو جاتا ہے......'' پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا تم کو لگا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔''

''کیا مطلب؟''

عمو نے بڑی نرمی سے اس کا ملائم گال سہلایا اور بولا۔ ''کچھ لگا تمہیں؟''

وہ اس کی بات سمجھ کر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی اور شرما کر بولی۔ ''تم بڑے خراب ہو۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔ میں چلتی ہوں۔''

''تم...... مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟''

''تم سے نہیں...... لوگوں سے ڈرتی ہوں۔''

''کیا...... تمہارا دل نہیں چاہتا...... میرے پاس بیٹھنے کو؟''

''چاہتا ہے...... پر...... اس طرح سے نہیں۔'' وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

عمو کے اندر جیسے ایک دم سے کوئی روشنی بجھ گئی۔ وہ اداس ہو گیا۔ شبو جو جانے کے لئے بالکل تیار تھی، عمو کی اداسی محسوس کر کے رک گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر شبو نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

عمو بولا۔ ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شبو...... جیسے جو کچھ ہے میرے ہی دل میں ہے۔ تیرے دل میں کچھ نہیں۔ بس مجبوری کی وجہ سے تو میرے ساتھ ہے۔''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہی، تب عجیب لہجے میں بولی۔ ''عمو! تجھے پتا ہے کہ میرا رشتہ کیوں ٹوٹا؟''

''کیوں ٹوٹا؟''

''اس لئے میں نے اپنے پنڈ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب مالکن کے بندے مجھے اور تمہیں دریا سے پکڑ کر واپس لائے اور مالکن نے ہم دونوں کو مارا پیٹا تو اس کے ڈیڑھ دو مہینے بعد مالکن کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میری ماں نے اس کا منت ترلا کیا، اس کے پاؤں کو ہتھ لگائے اور اس نے ماں کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے حویلی سے لے جا سکتی ہے۔ جہاں میرا رشتہ ہوا تھا، ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا۔ وہ میری ڈولی لے جانے کو تیار تھے، پر میں نے کہا کہ میں پنڈ نہیں جاؤں گی۔ میں...... میں تمہارے پاس رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ حویلی میں کسی وقت میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے، پر میں تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی......'' شبو کی آواز بھرا گئی۔

عمو ٹھٹکا ہوا اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اس حوالے سے ان دونوں میں چند سوال جواب مزید ہوئے۔ عمو کو یقین ہو گیا کہ شبو جو کچھ بتا رہی ہے، ویسا ہی ہوا ہے۔ اس کا اپنا دل بھی بھر آیا۔ اس نے شبو کو پھر گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے بھیگے رخساروں کو چومنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھونے لگے۔

عمو نے کہا۔ ''شبو! بھا راجا کہتا ہے، ہم دونوں شادی کر لیں۔''

''اپنے بڑوں کے بغیر ہم اکیلے یہ کیسے کر سکتے ہیں عمو! ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو مجھے ہر ویلے اپنی ماں اور ماموؤں کی فکر لگی رہتی ہے۔ ہماری برادری کافی بڑی

ہے، پر سارے غریب لوگ ہیں۔ اگر مالکن کے مرنے کی وجہ سے ان پر کوئی آفت آئی تو وہ تو رُل کر رہ جائیں گے......"

"بھا راجا کہتا ہے، بس دو چار ہفتے گزر جائیں تو وہ شریف کو بھیج کر سارے حالات کا پتا کرالے گا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کسی طرح میری اور تمہاری ماں بھی یہاں پہنچ جائیں۔ یا ہم ہی کہیں جا کر ان سے مل سکیں۔"

شبانہ الجھی الجھی نظروں سے عمو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں چاندنی کا عکس تھا اور ایک سوالیہ رنگ بھی تھا۔ وہ بولی۔ "عمو! ایک بات سچ بتانا۔ اس دن تم نے جان بوجھ کر مالکن ماجھاں کا کڑا گاڑی کے کنڈے سے نہیں چھڑایا تھا نا؟"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "نہیں شبو...... میں نے تھوڑی سی کوشش تو کی تھی...... شاید اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔"

"نہیں عمو! تم نے کوشش نہیں کی تھی...... بلکہ...... شاید تم نے یہ کوشش کی تھی کہ کہیں کڑا چھوٹ ہی نہ جائے...... بولو...... ایسا ہی ہے نا؟"

عمو کچھ دیر خاموش رہا، تب گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر تم جانتی ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ "عمو! تم اپنی ماں سے بہت پیار کرتے ہو نا...... اور تم نے ماجھاں کو اس لئے اس طرح مارا نا کہ وہ تمہاری ماں کو گالیاں دیتی تھی؟ بولو، ایسا ہی ہوا نا؟"

عمو کے نوخیز چہرے پر چٹان کی سی سختی نمودار ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اندرونی کمروں سے کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر شریف کی بیوی مریم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "شبو...... شبو...... کہاں ہو؟"

"ہائے میں مرگئی۔" شبو نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ عمو کچھ دیر تک اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب اندرونی حصے میں خاموشی چھا گئی اور وہ دونوں چارپائیوں پر لیٹ گئیں تو عمو پنجرے میں پارے کو پچکارنے کے بعد اوپر چھت کی طرف چلا گیا۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک شبو کے بارے میں سوچتا رہا۔ ماجھاں کے مویشی خانے میں اس کا دوست مولا کہا کرتا تھا، عورت ایک بجھارت کی طرح ہوتی ہے...... اس کا اندر باہر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آج اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ ایک موقع پر ماجھاں نے شبو کو حویلی سے جانے کی

اجازت دے دی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر حویلی کے خطروں کو نظر انداز کیا تھا اور وہیں پر اس کے ساتھ رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے رشتے سے بھی جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ عمو کے لئے تھا۔ تین چار ہفتے بعد عمو کے لئے شدید پریشانی کا دور شروع ہوا۔ راجا نے وعدے کے مطابق شریف کو عمو کی والدہ کا اتا پتا دے کر شیخو پورہ بھیجا اور اسے ساری ضروری ہدایات بھی دیں۔ شریف کی واپسی پورے چھ دن بعد ہوئی۔ عمو بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شریف کو عمو کے گاؤں سے پتا چلا کہ کوئی ایک سال پہلے عمو کی ماں شریفاں بی بی بیٹے کی جدائی میں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ عمو کے پنڈ میں یہی مشہور تھا کہ عمو کی والدہ شریفاں بی بی اور گاؤں کے چودھری سجاول کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق شریفاں کے پتر عمران عرف عمو کو قریباً ڈیڑھ سال تک شہنشاہ پیر کے مزار پر خادم بن کر رہنا تھا تا کہ چودھری کے پتر پر سے آسمانی بجلی والی نحوست ختم ہو سکے۔ اس کام کے لئے شریفاں بی بی نے چودھری سجاول سے کافی سارے پیسے لئے تھے اور اپنی زمین کے کاغذات وغیرہ بھی ٹھیک کروائے تھے۔ اس نے چودھری سجاول سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا پتر عمو پورے سترہ چاندوں تک شہنشاہ پیر کے مزار پر چاکری کرے گا لیکن صرف پانچ مہینے بعد ہی اس کا پتر عمو مزار سے فرار ہو گیا۔ اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی گئی، پر وہ نہیں ملا۔ کسی نے بتایا کہ وہ کراچی کی طرف نکل گیا ہے۔ مزار سے بھاگتے وقت اس نے مزار کا چندے والا گلا بھی توڑا تھا اور اس میں سے تین چار ہزار روپے نکال کر لے گیا تھا۔ صادق شاہ صاحب نے کہا تھا کہ چودھری سجاول کے پتر والی نحوست اب اس بھگوڑے کے پیچھے ہے اور وہ کہیں بھی چلا جائے، چین سے نہیں رہ سکے گا...... یہی حالات تھے جن میں عمو کی والدہ بیمار پڑی اور اس نے اپنی زمین اونے پونے داموں بیچ دی۔ اس کے بعد ایک دن پتا چلا کہ وہ پنڈ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کو بہت ڈھونڈا گیا مگر کہیں خبر نہیں ملی۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے پتر عمو کا پتا چل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس پہنچ گئی ہے اور اب وہ سندھ کے کسی شہر میں چین سکون سے رہ رہے ہیں۔

شریف نے عمو کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "عمو! میں پوری پوری پرچول کر کے آیا ہوں۔ تمہارے پنڈ میں دو دن رہنے کے بعد میں کوٹ لکھپت میں تمہارے رشتے دار نوازش علی کے گھر پہنچا۔ وہاں سے بھی ساری بات پتا کی۔ بھائی نوازش نے بھی وہی کچھ بتایا جو تمہارے پنڈ سے پتا چلا تھا۔ اس کے بعد میں ملتان گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہاں ایک عورت تمہاری والدہ کی پرانی سہیلی ہے بلکہ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ تمہاری والدہ وہاں بھی نہیں

تھی۔ صغراں نامی یہ عورت خود بھی تمہاری والدہ کی گمشدگی پر سخت پریشان ہے اور کئی مہینوں سے اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

شریف کی باتیں سن کر عمو کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اسے لگا جیسے اس کے ارد گرد ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی ہے۔ اس کے ننگے پاؤں کے نیچے جلتی زمین ہے اور وہ اپنی ماں کو آوازیں دیتا پھر رہا ہے۔ کہیں...... اس کی ماں کو کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔ وہ بیمار تھی، اس کی جدائی میں ٹوٹی ہوئی تھی، کوئی آسرا دینے والا نہیں تھا اسے۔ وہ کہاں گئی ہوگی؟ اس کی صورت دیکھنے کے لئے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی ہوگی۔

اسے صادق شاہ پر، اس کے چار درویشوں پر اور چودھری سجاول وغیرہ پر بے پناہ غصہ آیا۔ اس کے سینے میں شعلہ بن جانے والی بغاوت کی چنگاری اب الاؤ کا روپ دھارنے لگی۔ ہاں، اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اب وہ بہت کچھ کر سکتا تھا اور اسے پتا تھا کہ اگر اس کی ماں نہ ملی تو وہ "ذمے داروں" کو دن میں تارے دکھا دے گا۔ ہاں...... وہ کافی بدل چکا تھا۔ وہ چاقو بھی ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا جس سے اس نے دو ماہ پہلے ماکھے کی ٹانگوں پر مہلک وار کئے تھے۔

O......❖......O

شریف نے اپنا کام یقیناً ذمے داری سے نبھایا تھا مگر عمو جب تک خود ماں کو نہ ڈھونڈتا، اس کی تسلی کیسے ہو سکتی تھی۔ قریباً ایک ماہ بعد وہ راجا کے ساتھ بڑی خاموشی سے لاہور پہنچا اور پھر اپنے خالو نوازش علی سے ملاقات کی۔ خالو نوازش علی عمو کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ "اوئے عمران! تُو تو ایک دم جوان ہو گیا ہے۔" اس کے خالو نے لرزتی آواز میں کہا۔

عمو اور راجا دو دن نوازش علی کے گھر میں رہے۔ انہوں نے اپنے پتے ٹھکانے کے بارے میں نواز علی کو کچھ نہیں بتایا تاہم اس سے سارے حالات پوچھے...... خاص طور سے عمو نے اپنی والدہ کے حوالے سے سب کچھ جاننے کی کوشش کی۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں صرف ایک نئی بات معلوم ہو سکی اور وہ یہ کہ عمو کی والدہ نے زمین بیچی نہیں تھی بلکہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ قیمتی زمین اونے پونے بیچ دے اور یہ زمین اپنے ایک مزارعے کے ذریعے دراصل چودھری سجاول نے ہی خریدی تھی۔ دولت، طاقت اور جبر کی وہی صدیوں پرانی کہانی...... غربت، کمزوری اور لاچاری کی وہی قدیم روداد۔

عموشاد پورہ واپس آ گیا۔ دل میں بے پناہ درد لئے ہوئے...... وہ دیوانوں کی طرح اپنی ماں کی تلاش میں گھومنا چاہتا تھا لیکن راجا نے اسے سمجھایا۔ "ابھی ماجھاں کی موت والا

واقعہ تازہ ہے۔ ہم زیادہ گھومیں پھریں گے تو ہمارے لئے ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ابھی ہمیں چار چھ ماہ بالکل چپ کر کے گزارنے پڑیں گے۔"

عموشاد پورہ یوں واپس آیا جیسے کوئی اپنا سب کچھ لٹا کر کسی ویرانے میں آ جاتا ہے۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا، کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ بھوک نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کی سوچیں بس اپنی ماں کے گرد ہی گھومتی تھیں۔ کہیں وہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی؟ یہ سوال تیر کی طرح اس کے دل میں لگتا تھا اور اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی۔

ان جاں گسل لمحات میں اگر اسے شبو کی ڈھارس اور بے لوث محبت میسر نہ ہوتی تو شاید وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ وہ اس کی امید بندھاتی تھی۔ اس کے اندر آس جگاتی کہ اس کی ماں زندہ ہے اور ایک دن ضرور وہ اس کے سینے سے لگے گا۔ راجا اور شبانہ کی کوششوں سے دھیرے دھیرے عمو کو کچھ قرار آنے لگا۔ وہ مایوسی کے اندھیرے میں آس کی روشنی جلا کر دھیرے دھیرے قدم اُٹھانے لگا۔

پارے جیسا خوفناک کتا اب عمو کا بالکل مطیع ہو چکا تھا۔ وہ اس کے اشاروں پر چلتا...... کبیر احمد، شریف اور شبو وغیرہ عمو کے لیے اس کی اطاعت مندی دیکھ کر حیران ہوتے...... اور بات صرف اکیلے پارے ہی کی نہیں تھی، دوسرے جانور بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتے۔ راجا ہاؤنڈ نسل کے جو نایاب پلے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، وہ تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔ راجا نے انہیں شکار کے لئے سدھانے کا کام عمو کو سونپا تھا اور وہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ یوں لگتا کہ اسے زیادہ محنت ہی نہیں کرنی پڑتی، جانور خود بخود اس کی مرضی ومنشا سمجھنے لگتا ہے۔

کچھ دن بعد راجا کہیں سے دو مشکی گھوڑے لے کر آیا۔ یہ بھی ماجھاں کے ہیرے کی طرح اوّل درجے کے سرکش جانور تھے۔ دونوں بھائی تھے۔ ان کے رنگ ڈھنگ بالکل ایک جیسے تھے۔ اگر راجا انہیں خود سدھانے کی کوشش کرتا تو شاید اس کے لئے مہینوں درکار ہوتے لیکن عمو کے ساتھ مل کر اس نے تین چار ہفتوں میں ہی گھوڑوں کو ایک دم سواری اور شکار کے لئے ٹرینڈ کر دیا۔ راجا دونوں گھوڑوں کو اپنے "پاٹے خاں" پر لاد کر لے گیا اور اس زمیندار کو دے آیا جس سے لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ایک دو گھوڑے، کبھی دو چار کتے وہاں کبیر احمد کے باغ میں پہنچنے لگے۔ راجا اور عمو انہیں مل کر سدھاتے۔ گھوڑوں کو دُلکی اور سرپٹ چال سکھاتے۔ مالک کے اشاروں کو سمجھنے کی تربیت دیتے، کتوں کو پلٹنے اور جھپٹنے کی ٹرینگ

دیتے۔ شکار کو پکڑنے اور پھر مالک تک لانے کا طریقۂ کار انہیں سمجھاتے...... یہ دلچسپ لیکن نہایت مشکل اور کسی حد تک خطرناک کام تھا۔ عمو کی موجودگی نے اس کام کو آسان کر دیا بلکہ اب زیادہ تر ذمے داری وہ خود اُٹھا رہا تھا۔ جانور کی تربیت مکمل ہو جاتی تو راجا اسے مالک کے پاس واپس لے جاتا...... یا پھر مالک خود وہاں آ جاتا اور ایک دو روز وہیں باغ میں رہ کر اپنے اور اپنے جانور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا...... کام کا معاوضہ وغیرہ راجا ہی وصول کرتا۔ وہ اخراجات کے لئے عمو کو معقول رقم دے دیتا تھا۔ ویسے بھی وہ ہر طرح عمو اور شبانہ کا خیال رکھتا تھا۔ بہر حال اس کی خامیاں خرابیاں بھی اس کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ گاہے بگاہے اپنی دل پشوری کے لیے اپنے ''پاٹے خاں'' سمیت باغ سے غائب ہو جاتا اور اگلے دن یا پھر ایک دن بعد واپس آ جاتا۔

زندگی ایک ہموار رفتار سے آگے بڑھنے لگی تھی۔ جون، جولائی کے دن تھے۔ پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔ کبیر احمد کے لئے چلنا پھرنا اب مزید دشوار ہو گیا تھا۔ وہ ٹانگ کے ساتھ ساتھ اپنے ایک کولہے کو بھی مفلوج محسوس کرتا تھا اور وہیل چیئر استعمال کرنے لگا تھا۔ وہ، شریف، اس کی بیوی اور دو ملازم لڑکے سارا دن باغ کے کاموں میں مصروف رہتے۔ اکثر شبانہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ راجا اور عمو ایک کھلے احاطے میں گھوڑوں کو دوڑاتے، ان پر سواری کرتے، بانس یا رسّی کے سرے پر گوشت کے ٹکڑے باندھ کر شکاری کتوں کو پلٹنے جھپٹنے کی تربیت دیتے۔ عمو شعلہ مزاج جانوروں کا سامنا بالکل بے خطر ہو کر کرتا اور راجا حیرت سے دیکھتا رہ جاتا۔ طویل گرم دوپہروں میں جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا، وہ باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈال لیتے...... پمپ کے شفاف پانی میں نہاتے، اپنے باغ کے آم چوستے اور کچی لسی کے گلاس بھر بھر کر پیتے۔ رات کا کھانا وہ سب اکٹھے کھاتے اور چھت پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ان ساری مصروفیات میں عمو کا دل لگا رہتا لیکن جب وہ فارغ اور اکیلا ہوتا تو ماں کی جدائی کا غم ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا اور بے حال کر دیتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی تاروں بھری رات تھی۔ رات کی رانی اور پختہ آموں کی ملی جلی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ نیچے صحن میں شبانہ اور مریم رات کے کھانے کے بعد برتن دھو رہی تھیں۔ صحن میں پاٹے خاں کی پھٹی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ راجا ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کچی سیڑھیاں چڑھ کر عمو کے پاس آن موجود ہوا۔ اب وہ عمو کو اکثر عمران کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی ہلکی بو آ رہی تھی۔ وہ عمو کے کندھے پر

ہاتھ مار کر بولا۔ ''عمران! بڑا ٹیٹ آرڈر ملا ہے۔ چار سور مار گھوڑے ہیں۔ سور مار سمجھتے ہو نا تم؟ جن پر بیٹھ کر برچھی وغیرہ سے سور کا شکار کھیلتے ہیں۔ ایسے گھوڑوں کو سدھانا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔ پر فی گھوڑا تین ہزار روپیا دے رہے ہیں۔ سودا فٹ ہے......''

عمو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ ''کیا بات ہے یار! تیری بتی آج پھر بجھی ہوئی ہے؟''

عمو نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''بھا راجا! تم نے کہا تھا کہ برسات سے پہلے پر نکلیں گے اور ماں کا کھوج لگا کر ہی واپس آئیں گے۔''

''مجھے سب یاد ہے عمران! بلکہ تم سے بھی کچھ زیادہ ہی یاد ہے۔ میں بس باہر کے حالات دیکھ رہا ہوں۔ کہیں ذرا سی گنجائش ملی نہیں اور ہم یہاں سے نکلے نہیں۔''

''حالات کو کیا ہے؟''

راجا نے سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی پاؤں سے مسل کر بولا۔ ''عمران! میں تجھے اور شبو کو سب کچھ بتاتا نہیں ہوں کہ تم دونوں کو بھی پریشانی ہو گی لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی کیکراں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ماچاں کا بھائی ناجا بہت غصے میں ہے۔ پچھلے مہینے اس نے میرے ''ٹھیکرا'' والے گھر پر ہلا بولا ہے۔ پہلے وہاں توڑ پھوڑ مچائی پھر ہوائی فائرنگ کی اور بعد میں آگ لگا دی۔ پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ ناجے نے پنڈ میں اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو میرا اتا پتا بتائے گا، وہ اس کا منہ نوٹوں سے بھر دے گا اور جو مجھے چھپانے کی کوشش کرے گا اس کا حشر نشر ہو جائے گا۔''

''پر...... یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا بھا راجے! ہم کب تک چوہوں کی طرح چھپ کر یہاں بیٹھے رہیں گے؟''

''میں نے سنا ہے کہ پچھلے دو تین ہفتوں سے ناجا کیکراں میں نظر نہیں آ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے وڈے افسر پھر اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ کبھی کبھی قبائلی علاقے کی طرف بھی نکل جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے لئے آسانی ہو جائے گی۔''

''لیکن...... میں کیا کروں بھا راجے...... میرے لئے اب ایک ایک دن گزارنا مشکل ہے۔'' عمو کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

راجا نے سگریٹ کے دو طویل کش لئے اور اپنی تیز تیکھی ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''عمران! میں تو تجھے پھر وہی رائے دوں گا۔ تُو شبو سے دو بول پڑھوا لے۔ یہ دنیا ایک دم کنڈم ہے یار! کل کے لئے اس پر بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ جو کچھ آج مل رہا ہے

نا، وہ لے لینا چاہئے۔ دیکھ وہ تجھے چاہتی ہے اور تُو اس پر مرتا ہے۔ تم دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ بس ایک مولوی صاحب کی لوڑ ہے اور دو گواہوں کی......"

"پر بھاراجے! وہ اس طرح نہیں مانتی۔ میں نے دو تین دفعہ بات کر کے دیکھی ہے۔"

"اوئے ذرا ٹیٹ ہو کر بات کر۔ اسے سمجھا کہ یہاں آنے جانے والے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر نکاح ہو جائے گا تو پھر کسی کو شک کرنے کی ہمت ہی نہیں رہے گی۔"

"میں نے کہا ہے بھاراجے...... پر وہ رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے......" وہ اٹک گیا۔

"کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے...... میں تمہاری ہوں...... اور آخری ساہ (سانس) تک تمہاری ہی رہوں گی۔ پر ہمیں اس طرح یہاں شادی نہیں کرنی چاہئے۔"

"لیکن اگر کل کلاں کوئی اور پھڈا پڑ گیا تو؟"

"وہ کہتی ہے...... ہماری محبت سچی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ضرور ملیں گے۔"

...... یہ پندرہ بیس روز بعد کی بات ہے۔ ایک طویل گرم دن گزر چکا تھا۔ ملازم لڑکوں نے احاطے میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا اور مٹی کے گھڑوں میں تازہ پانی بھر دیا تھا۔ عمو کمرے میں کتوں کے لئے راتب تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں راجا کے پاٹے خاں کی آواز آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد پھاٹک کھلا اور پاٹے خاں دھواں چھوڑتا ہوا اندر آ گیا۔ خلافِ معمول راجا اسے سیدھا برآمدے کے آخری تاریک کونے میں لے گیا۔ پاٹے خاں کے اوپر ترپال تنا ہوا تھا۔ انجن بند کرنے کے بعد راجا نیچے آیا اور برآمدے کی جہازی سائز کی چق نیچے گرا دی۔ یوں لوڈر مکمل طور پر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ راجا پیسے کمانے کے لئے ہر طرح کے کام کر لیتا تھا۔ عمو نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ آج پھر کوئی افیم یا چرس قسم کی شے لے کر آیا ہے۔ انڈین شراب کا بھی امکان ہو سکتا تھا...... لیکن تھوڑی دیر بعد عمو نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ دیوہیکل ہاؤنڈ کتا پارا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی گونجیلی آواز در و دیوار کو لرزا رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجا اس کے پاس پہنچا۔ اپنے لمبے بال پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "عمران! آج ایک بڑی ٹیٹ ڈیل ہوئی ہے۔" اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا اور آنکھوں میں سنسنی لہریں لے رہی تھی۔

"کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا۔"

"یہ بتانے والی نہیں دکھانے والی شے ہے۔" راجا نے سرگوشی کی اور عمو کو ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

راتب تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ عمو نے ہاتھ دھوئے اور راجا کے ساتھ ہو لیا۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کبیر احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دوا کھا کر پچھواڑے کے باغیچے میں سویا ہوا تھا۔ راجا نے شریف کے کمرے سے فالتو لالٹین لی اور برآمدے کی طرف آ گیا۔ طویل برآمدے کے آخری گوشے میں سرکنڈے کی چقوں کے پیچھے پاٹے خاں کھڑا تھا۔ اس کے اوپر ترپال اس طرح تنا ہوا تھا کہ وہ چاروں طرف سے ڈھک گیا تھا۔ صحن کی طرف سے پارے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ عمو کی چھٹی حس بھی جیسے کچھ مبہم اشارے دے رہی تھی۔

"بھاراجا! کیا چکر ہے؟" عمو نے پوچھا۔

راجا نے لالٹین عمو کو تھمائی اور ترپال کے تسمے کھول کر اسے پچھلی طرف سے دائیں بائیں ہٹا دیا۔ عمو بھونچکا رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ لوڈر کے اندر ایک بڑا آہنی پنجرہ رکھا تھا اور اس میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کسی کتے یا دوسرے پالتو جانور کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ ایک دھاری دار شیر تھا۔ وہ اپنے کانوں کو چوکنے انداز میں حرکت دے رہا تھا اور سیدھا ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا...... جیسے حملہ کرنے کے لئے بس ایک نادیدہ اشارے کا منتظر ہو۔ وہ ایک جوان شیر تھا۔ ابھی اس کا جسم پوری طرح بھرا نہیں تھا پھر بھی اس کی دید لرزہ طاری کرتی تھی۔

راجا نے ترپال پھر برابر کر دیا اور عمو کو لے کر واپس احاطے میں آ گیا۔ "یہ کہاں سے لے کر آئے ہو بھاراجا؟" عمو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بس لے آیا ہوں...... اور زیادہ ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ یہ بالکل ہی "اَن ٹرینڈ" نہیں ہے۔ تھوڑا بہت سکھایا ہوا ہے۔ جو کسر رہ گئی ہے، وہ ہم دو چار ہفتوں میں پوری کر دیں گے۔ کتے کے پچاس پلے سدھانے سے اتنے پیسے نہیں ملتے جتنے اس اکیلے کے مل جائیں گے۔ پورے چالیس ہزار میں بات ہوئی ہے۔"

"پر بھاراجا...... یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔ مم...... میں نے تو اس سے پہلے چڑیا گھر سے باہر شیر دیکھا ہی نہیں۔"

"لیکن میں نے تو دیکھا ہے نا۔ تُو گھبرا مت، ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو یہ سارا کام ایک دم حلوہ ہو جائے گا۔ صرف تین چار ہفتے میں چالیس ہزار روپے۔ یار عمران! یہ تھوڑی رقم تو نہیں ہے۔"

اس نے اپنی خوش گفتاری سے عمران کو چپ کرا دیا۔

عمران اب اتنا نا سمجھ نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راجا اسے جو کچھ بتاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کماتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی کوئی ''ناجائز پھیرا'' بھی لگا لیتا تھا۔ اس کے پاس کافی پیسے آئے تھے لیکن یہ پیسے اس کے پاس ٹکتے نہیں تھے۔ وہ انہیں شراب اور عورت وغیرہ پر اڑا دیتا تھا۔ جہاں تک جانوروں کو سدھانے کا تعلق تھا، یہ کام بھی زیادہ تر عمو کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ راجا نے اسے شروع میں چند بنیادی باتیں بتائی تھیں، اس کے بعد اس نے سارا بوجھ عمو پر ہی ڈال دیا تھا اور عمو کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کام بھارا راجا دو مہینے میں کرے گا، وہ خود پندرہ دن میں کر لے گا۔ حیران کن طور پر جانور اس سے غیر معمولی انس محسوس کرتے تھے اور وہ بھی ان سے وابستگی محسوس کرنے لگتا لیکن یہ شیر والا کام اسے واقعی پرخطر محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اس کے رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔

اگلے روز تک کبیر احمد، شریف، اس کی بیوی اور شبو کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ راجا کسی سرکس کے مالک سے ایک نر شیر لے کر یہاں آیا ہے اور اسے سدھانا چاہتا ہے۔ راجا کا دعویٰ تھا کہ وہ دو ڈھائی سال پہلے بھی ایک ایسے شیر کو ٹریننگ دے چکا ہے۔ شبو کو جب یہ ساری بات پتا چلی تو وہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے عمو سے کہا۔ ''عمران! تمہارے یہ کام کسی دن میری جان لے لیں گے۔ بھارا راجا جو کہتا ہے تم کرتے چلے جاتے ہو۔ اب بات خطرناک گھوڑوں، کتوں سے آگے بڑھ کر شیر تک جا پہنچی ہے۔''

رات بھر سوچنے کے بعد اب عمو کے اندر خوف کی جگہ ایک عجیب سی ترنگ جاگ چکی تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اندر کچھ خاص ہے۔ اب وہ اس ''خاص'' کو ایک جنگلی درندے کے سامنے آزمانا چاہتا تھا۔

اس نئے کام کے لئے باغ کے ایک کشادہ گودام کو ''رِنگ'' کی شکل دی گئی۔ راجا نے دھاری دار شیر کو ذرا سست اور ڈھیلا کرنے کے لئے اسے گوشت کے ٹکڑوں پر کوئی دوا لگا کر کھلائی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس کے گلے میں دو مضبوط رسیاں ڈالی گئی تھیں تا کہ اگر وہ بپھرے تو اسے دونوں طرف سے کھینچ کر کنٹرول کیا جا سکے۔

پہلے روز عمو کو کچھ خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر حالات حیران کن تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ راجا اور اس کا معاون ساتھی بھی ششدر رہ گئے۔ خونخوار خصلت والا رائل بنگلہ ٹائیگر بڑی تیزی سے عمو سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ غالباً اس ساری صورتِ حال میں اس بے پناہ اعتماد کو بھی دخل تھا جو پچھلے چند ماہ سے مسلسل عمو کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔

پانچ چھ روز میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عمو نے کئی احتیاطی تدابیر ترک کر دیں اور کئی

بار اکیلا ہی جانور کے سامنے جانے لگا۔ راجا بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ چار پانچ مہینوں والا کام بس دو ڈھائی ماہ میں مکمل کر لیں گے۔ انہیں بس دو اہم مراحل مکمل کرنے تھے۔ شیر کو ایک بڑے آہنی کڑے میں سے گزرنے پر آمادہ کرنا اور جست لگا کر ایک چار فٹ اونچی رکاوٹ کو پار کرنا۔

ایک روز تربیت کے دوران میں ٹائیگر نے راجا کے معاون نذیر کو پنجہ مارا اور بازو پر سے اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اس روز کے بعد راجا اور نذیر مزید پیچھے ہٹ گئے اور عمو کی ذمے داری مزید بڑھ گئی۔ کتے کی نایاب نسل ''سلوکی ہاؤنڈ'' کے پلے بھی اب بڑے ہو چکے تھے۔ عمو ان کی تربیت بھی تن دہی سے کر رہا تھا۔

○......❖......○

نو دس ہفتے میں ہی ٹائیگر والی ذمے داری تقریباً پوری ہو گئی۔ اس دوران میں سرکس کا مالک جان محمد دو تین بار اپنے جانور کو دیکھنے بھی آیا۔ وہ چھوٹی داڑھی والا ایک ملنسار اور خلیق شخص نظر آتا تھا۔ بہر حال عمران کی کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس سے ہر طرح کی ڈیل راجا ہی کرتا تھا۔ جان محمد کے ساتھ پینٹ شرٹ والی ایک خوبرو لڑکی بھی ہوتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ راجا، جان محمد کے علاوہ اس کی بھتیجی سے بھی خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔ وہ لوگ بھی راجا کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تو ٹائیگر کو سدھانے والی ساری فن کاری راجا ہی کی تھی۔

جب بنگلہ ٹائیگر کو جان محمد صاحب کے ساتھ روانہ کیا گیا تو راجا خود بھی ساتھ ہی گیا اور تین چار روز تک خوشاب میں جان صاحب کی مہمان نوازی کا لطف اُٹھا کر واپس آیا۔ آتے ہوئے وہ خوشاب سے ہی چار پانچ تربیت یافتہ کتوں کی فروخت کا آرڈر بھی پکڑ کر لایا تھا...... اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں اس کا کام چل نکلا ہے۔

کبیر احمد اب بیمار رہنے لگا تھا۔ باغ کی زیادہ تر ذمے داری شریف اور اس کی فیملی کے سر پر تھی۔ ایک روز جب راجا اپنے پاٹے خاں کے نئے ٹائر ڈلوانے اور اس کی نوک پلک ٹھیک کروانے خوشاب گیا ہوا تھا، عمران اور شریف پچھواڑے کی پھلواری میں آ بیٹھے۔ وہ ابھی ابھی ایک زخمی کتے کی مرہم پٹی سے فارغ ہوئے تھے اور اب نومبر کی آخری سہ پہروں میں سے ایک سہ پہر کی سنہری دھوپ کا لطف اُٹھانا چاہ رہے تھے۔

گفتگو کے دوران میں شریف نے عمران سے پوچھا۔ ''سنا ہے کہ ٹائیگر والے کام کے لئے راجا نے تمہیں کوئی انعام شنام بھی دیا ہے؟''

''ہاں...... مجھے اور شبو کو دو دو نئے جوڑے سلوا کر دیئے ہیں۔ تین ہزار روپیا نقد بھی دیا ہے۔''

''تین ہزار؟'' شریف نے پوچھا۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ شریف کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے انداز میں بولا۔ ''سنا ہے اس نے خود تو کافی پیسے لئے ہیں...... شاید ساٹھ ستر ہزار روپیا۔ اوپر کا خرچہ اس کے علاوہ ہے۔''

ساٹھ ستر ہزار کے ہندسے نے عمران کو بھی تھوڑا سا چونکایا لیکن اس نے اپنے اندرونی احساسات کو چہرے پر نہیں آنے دیا۔ وہ نارمل لہجے میں بولا۔ ''چلو کوئی بات نہیں...... اپنا وقت ٹھیک گزر رہا ہے۔''

شریف بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ جان صاحب کی بھتیجی نیلم بھی راجا کے چکر میں ہے۔ آج کل اسی لئے راجا بھی خوشاب کے چکر لگا رہا ہے...... پچھلے ہفتے جب جان صاحب شیر لینے آئے تھے تو نیلم نے شیر کے ساتھ راجا کی کئی تصویریں بھی اُتاری تھیں۔ وہ تو راجا کو ہی ماسٹر سمجھتی ہے نا اور بات صرف اس لڑکی کی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ راجا کو باکمال فن کار سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تو بس ہم دو چار بندوں کو پتا ہے نا کہ اصل فن کاری کس کی ہے۔''

''چلو، میں نے کون سا تمغہ لگوانا ہے۔ اگر بھا راجے کی عزت بن رہی ہے تو سمجھو ہماری بن رہی ہے۔''

شریف مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عمران کی غیر دلچسپی دیکھ کر خاموش رہا۔ عمران کھلے دل کا مالک تھا۔ ویسے بھی وہ راجا کو اپنا محسن و سرپرست سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھا راجا جو کر رہا ہے، صحیح کر رہا ہے۔

راجا اب پہلے سے اچھا لباس پہننے لگا تھا۔ پہلے وہ ہفتے میں ایک رات باہر گزارتا تھا، اب دو تین راتیں باہر گزارنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے دیرینہ ساتھی پاٹے خاں کو بھی فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پرانے لوڈر کی جگہ کوئی اور اچھی گاڑی لی جائے۔ عمران کو اس کا یہ پروگرام زیادہ پسند نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں اسے اس پرانی گاڑی سے اُنس سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس گاڑی نے کوئی ایک سال پہلے بڑی سخت جانی کا مظاہرہ کر کے عمران اور شبانہ کو کیکراں گاؤں کی جان لیوا حدود سے نکالا تھا۔ بہرحال راجا کے اپنے فیصلے ہوتے تھے۔ ایک روز وہ پاٹے خاں کو کہیں چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک اچھی حالت کا سیکنڈ ہینڈ لوڈر لے آیا۔

یہ پانچ چھ دن بعد کی بات ہے۔ راجا اپنے نئے لوڈر پر آندھی طوفان کی طرح باغ میں

داخل ہوا۔ وہ کل دوپہر سے کہیں گیا ہوا تھا۔ اسے لوڈر سے اُترتے دیکھ کر عمران اور شریف حیران رہ گئے۔ شبو تو باقاعدہ چلا اُٹھی۔ راجا کا سویٹر سامنے سے اُدھڑا ہوا تھا۔ قمیص کا گریبان بھی کٹا پھٹا تھا۔ راجا کی گردن اور چہرے پر زخم نظر آ رہے تھے۔ ان زخموں سے بہنے والا خون ناف تک چلا گیا تھا۔ راجا لنگڑاتا ہوا عمران کی طرف آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''چلو عمران! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''کہاں؟ اور تم تو اتنے زخمی ہو؟''

''کوئی بات نہیں، تم بس آؤ میرے ساتھ۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''کسی ہتھیار وغیرہ کی لوڑ تو نہیں؟''

''نہیں نہیں۔ بس تم آ جاؤ۔''

عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ راجا کے ساتھ اس کے نئے لوڈر میں آ بیٹھا۔ عمران نے راجا کے زخموں کو غور سے دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ زخم کسی آلے وغیرہ سے نہیں آئے تھے۔ یہ پنجوں کے زخم تھے۔ عمران کا دھیان سیدھا دھاری دار بنگلہ ٹائیگر کی طرف چلا گیا۔

لوڈر تیزی سے کچے پکے راستے پر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ عمران نے پوچھا۔ ''بھا راجا! کہیں جان صاحب کے شیر نے تو کام نہیں دکھایا؟''

راجا نے اپنے مفلر سے خون صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کسی طرح سنبھالا ہی نہیں جا رہا۔ ایک ملازم کا تو اس نے تقریباً پیٹ ہی پھاڑ دیا ہے۔ ایک دو اور بندوں کو بھی زخم آئے ہیں۔''

''اوہو...... کہاں ہے وہ؟''

''جان صاحب کے گاؤں والے مکان پر۔ صحن میں گھوم رہا ہے۔ ہم نے صحن کے دونوں دروازے باہر سے بند کر دیئے ہیں۔ وہ لڑکی نیلم ابھی اندر کے ایک کمرے میں ہے۔ اسے ہم نہیں نکال سکے۔''

راجا اونچے نیچے راستے پر لوڈر کو اڑائے چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں بری طرح اچھل رہے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے راجا نے پہلے خود کوشش کی ہے، جب کوئی بس نہیں چلا تو عمران کی طرف بھاگا ہے۔

قریباً ایک گھنٹے میں وہ دونوں مطلوبہ گاؤں کے مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک پھاٹک کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مکان کے احاطے کی دیوار سات آٹھ فٹ

اونچی تھی۔ لوگ اردگرد کی چھتوں پر سے احاطے میں جھانک رہے تھے۔ کچھ لوگ ریڑھوں وغیرہ پر کھڑے ہو کر بیرونی دیوار کے اوپر سے احاطے میں جھانکنے کی کوشش میں تھے۔ ہر چہرے پر گھمبیر تجسس اور ہراس نظر آتا تھا۔ یہاں عمران کو جان محمد صاحب اور ان کے دو تین ملازم بھی نظر آئے۔ ایک ملازم زخمی تھا اور اس کے بازو پر تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جان محمد صاحب کے ہاتھ میں پمپ ایکشن رائفل تھی اور وہ پھاٹک کی درز میں سے احاطے میں جھانکنے کی سعی میں مصروف تھے۔ عمران کے وہاں پہنچتے ہی ہر طرف ہلچل نظر آئی۔ سب لوگ گہرے تجسس اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ عمران کے پھاٹک کے سامنے پہنچتے ہی راجا نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلوایا اور عمران کو اندر داخل کر دیا...... خود وہ اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کے ساتھ دروازے میں کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی ناخوش گوار صورتِ حال پیش آنے کی صورت میں مناسب ردِعمل ظاہر کر سکے۔

ہمیشہ کی طرح عمران کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کا ہتھیار بس اس کے اندر کا اعتماد اور وجدان تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا سینہ پُر جوش دھڑکنوں سے بھر جاتا تھا۔ وہ ہاتھ میں بس ایک چھوٹی سی چھڑی لئے بڑے نپے تلے قدموں سے برآمدے کی سمت گیا۔ اسے بتایا گیا تھا اور اسے خود بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ شیر برآمدے کی طرف ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد شیر یعنی رائل بنگلہ ٹائیگر اور عمران آمنے سامنے تھے۔ ٹائیگر کی آنکھوں میں آج وحشت چمک رہی تھی اور اس کی حرکات و سکنات میں تبدیلی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے اندر سے ایک بے ساختہ گونج برآمد ہو رہی تھی۔ اس دھیمی لیکن پاٹ دار گونج میں، غیظ و غضب اور خونخواری کی ساری علامات موجود تھیں۔ وہ خطرناک انداز میں عمران کی طرف بڑھا۔ عمران جانتا تھا کہ یہی فیصلے کا لمحہ ہے۔ اب اگر اس نے قدم پیچھے ہٹائے تو بپھرا ہوا جانور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے بے پناہ اعتماد اور وجدان کے سہارے وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ نہ صرف کھڑا رہا بلکہ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ چھڑی سے مخصوص اشارہ کیا...... اور اسے حکم دیا۔ "بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ۔" اس کے حکم میں سختی کی جگہ ایک محبت بھری نرمی تھی۔

چند سیکنڈ تک انسان اور درندے نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست رکھیں اور پھر فیصلہ ہو گیا۔ عمران کا جادو پھر کام کر گیا۔ ٹائیگر کا دباؤ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کم ہو گیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ جارحانہ انداز ترک کر چکا ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس کے آگے کو جھکے ہوئے کان نارمل حالت میں آ گئے۔ عمران نے اسے چھڑی کے اشارے سے چند قدم پیچھے ہٹایا پھر دلیری سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ اس کے سینے سے اپنا سر رگڑنے

لگا۔ عمران اسے پچکارتا ہوا اس کے آہنی پنجرے کی طرف لے گیا۔ کسی اندرونی کمرے سے نیلم کے چلانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

ٹائیگر کو پنجرے میں بند کرنے کے بعد عمران نیلم کی طرف متوجہ ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ جب اس نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ جانور دوبارہ پنجرے میں جا چکا ہے تو اس نے دروازے کی کنڈی گرائی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد کسی طرف اوجھل ہو گئی۔ بدحواسی میں اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ اپنا کمرا ایک اجنبی کے سامنے کھلا چھوڑے جا رہی ہے۔ وہ اپنی ریشمی نائٹی میں بھاگی تھی۔ اس کے شاندار پلنگ پر اس کا لباس بکھرا ہوا تھا اور زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک طرف میز پر ایک مردانہ کوٹ بھی پڑا ہوا تھا...... عمران کے لئے اس کوٹ کو پہچاننا بالکل مشکل نہیں تھا۔ یہ راجا کا کوٹ تھا۔ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ شیر والا واقعہ پیش آنے سے پہلے راجا اس شہری لڑکی کے ساتھ یہاں اس کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران میں راجا بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ ہی اس کمرے میں سے نکالا۔

عمران کی مہارت اور دلیری نے موقع پر موجود لوگوں کو اَش اَش کرنے پر مجبور کر دیا۔

جان محمد صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجا سے پوچھا۔ "یہ وہی لڑکا ہے نا جو وہاں تمہارے پاس کتوں کا راتب وغیرہ بناتا ہے؟"

"جج...... جی ہاں۔" راجا ہکلایا۔ "اس کے علاوہ یہ جانوروں کی سکھائی میں بھی میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ بڑا گن ہے، جی اس کے ہتھ میں۔"

جان محمد صاحب گہری نظروں سے کبھی راجا اور کبھی عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ایک جہاندیدہ زیرک شخص تھے۔ انہیں یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں "پس پردہ" بھی کچھ ہے۔

ٹائیگر کے بارے میں پتا چلا کہ پچھلے دو دن سے اس کی طبیعت میں اشتعال موجود تھا۔ صبح تجربہ کار ملازم غلام رسول اس کے پنجرے کی صفائی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بس ایک سیکنڈ کے لئے پنجرے کا دروازہ کھولا۔ ٹائیگر خوفناک تیزی سے اس پر جھپٹا اور اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک اس نے حویلی میں تہلکہ مچائے رکھا اور کسی طرح کنٹرول نہیں ہوا۔

اب وہ حالانکہ دوبارہ پنجرے میں بند ہو چکا تھا مگر اس کے تیور معمول پر نہیں آئے تھے۔ جان محمد صاحب کی خواہش تھی کہ عمران ابھی ایک دو دن یہیں رہے۔ راجا نے بھی اس بات کی تائید کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر زیادہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

دو دن میں ہی عمران کو معلوم ہو گیا کہ جان محمد صاحب بہت اچھی طبیعت کے مالک ہیں۔ ایک بڑے سرکس میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی ساجھے داری تھی اور پچھلے قریباً پندرہ سال سے یہ ساجھے داری بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی...... اور لگتا تھا کہ آئندہ بھی چلتی رہے گی۔ پینٹ شرٹ والی لڑکی نیلم، جان صاحب کی بھتیجی نہیں بلکہ معاون تھی...... یا یہ کہہ لیں کہ سیکرٹری تھی۔ ایک دفعہ اس کی شادی ہو کر ختم ہو چکی تھی اور اب وہ دوسری دفعہ شادی کرنے کی فکر میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مرتبہ اس نے ایک ایسا شخص شادی کرنے کے لئے چنا تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہا تھا اور آئندہ بھی پینا چاہتا تھا۔

عمران کو اندازہ ہوا کہ ٹائیگر والے تازہ واقعے کے بعد جان محمد صاحب راجا کے بارے میں ٹھٹک گئے ہیں اور وہ اس کے بارے میں اچھی طرح ٹوہ لگانا چاہتے ہیں۔ شاید یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ راجا ایف سولہ کی رفتار سے نیلم کے قریب آتا جا رہا تھا اور وہ نیلم کو اپنی بھتیجی کہتے تھے۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے موقع ملا تو جان صاحب نے راجا کے بارے میں ٹوہ لینے والے سوال عمران سے پوچھے۔ عمران نے بس گول مول جواب دے کر وقت ٹال دیا۔ جان صاحب عمران کی مہارت سے بہت متاثر نظر آتے تھے اور وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ راجا کی ''شان دار قابلیت'' کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا ہے۔ درحقیقت ٹائیگر والے واقعے نے ایک طرح سے راجا کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔

دو دن بعد عمران واپس تو چلا گیا مگر جان صاحب سے اس کا ایک قلبی تعلق سا بن گیا...... یہ دس بارہ روز بعد کی بات ہے۔ راجا کسی نوخیز طوائف کے پہلو میں رات گزارنے کے لئے خوشاب گیا ہوا تھا۔ جان محمد صاحب کا ملازم غلام رسول آیا۔ اس نے بتایا کہ ٹائیگر پھر بگڑا ہوا ہے اس لئے اسے فوراً حویلی پہنچنا ہو گا۔ غلام رسول جیپ پر آیا تھا۔ کبیر صاحب سے اجازت لے کر اور پریشان شبو کو تسلی دے کر عمران غلام رسول کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ بہت کم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلتا تھا لیکن جب بھی نکلتا تھا، ایک عجیب سا خوف اس پر طاری رہتا تھا۔ اس خوف کا تعلق ماجھاں کی موت اور ماجھاں کے خطرناک ساتھیوں سے ہوتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ جان محمد صاحب کی حویلی پہنچ گیا۔ یہاں پنجروں میں سرکس کے فن کار یعنی دو بندر، ایک ریچھ اور کتے وغیرہ بند تھے۔ بنگلہ ٹائیگر بھی تھا لیکن غیر متوقع طور پر وہ بالکل پُرسکون نظر آیا۔ عمران کو حیرت ہوئی۔ اس کی حیرت دیکھ کر جان محمد صاحب مسکرائے اور بولے۔ ''آؤ میں تمہاری حیرت دور کرتا ہوں۔''

وہ دونوں حویلی کی نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ جان صاحب کے فربہ چہرے پر گہری

سنجیدگی طاری ہو گئی۔ انہوں نے کہا۔ ''عمران بیٹے! ٹائیگر ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں بہانے سے بلایا ہے۔ میں تم سے اس خبیث راجا کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

راجا کے لئے خبیث کے خطاب نے عمران کو شاک پہنچایا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولا۔

''جان صاحب! بھا راجا کو میں اپنے بڑوں کی طرح سمجھتا ہوں۔''

''تم سمجھتے ہو لیکن وہ بڑا ہے نہیں...... میرے خیال میں تو بڑے تم ہو جو بہت کچھ جانتے ہوئے بھی چپ ہو اور اس کی ہر بات پر ''جی جی'' کہتے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کل میں نے اسے ذلیل کر کے گھر سے باہر کر دیا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی حیا ہے تو اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا، نیلم سیدھی سادی لڑکی ہے۔ شہری لڑکیوں جیسی ہوشیاری چالاکی اس میں نہیں ہے۔ یہ خبیث راجا اس کو دھوکا دینے کے چکر میں تھا۔ ایک طرف اس سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا تھا، دوسری طرف شہر میں ایک طوائف کے پاس بھی راتیں گزار رہا تھا اور مجھے پورا یقین ہے کہ کل رات بھی وہ اسی کے بستر پر شراب پیتا رہا ہے۔''

''آ...... آپ کے پاس کیا ثبوت ہے جان صاحب؟''

''میرے پاس راجا اور اس تھرڈ کلاس لڑکی کی تازہ تصویریں ہیں...... اور گھبراؤ مت، میرے پاس ہر بات کا مکمل ثبوت ہے۔''

جان صاحب نے چند سیکنڈ توقف کیا پھر ایک رسید دکھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ دیکھو، یہ رقم چند روز پہلے راجا نے مجھ سے وصول کی ہے۔ یہ اس کے دستخط ہیں۔ پڑھو، کتنی رقم ہے؟''

''بیس ہزار...... اور اس کے نیچے ستر ہزار۔ کل نوے ہزار۔'' عمران نے جواب دیا۔

جان محمد صاحب بولے۔ ''یہ بیس ہزار ٹائیگر کی خوراک وغیرہ کا خرچہ تھا اور ستر ہزار روپیا اس نے ٹائیگر کی سدھائی کا لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دو چار ہزار کے علاوہ یہ ساری رقم اس کی اپنی جیب میں ہی گئی ہے اور دیکھو، بات صرف ٹائیگر کی سدھائی ہی کی نہیں ہے، میں نے سارا پتا کرایا ہے۔ جانوروں کی سدھائی کی ساری محنت تمہاری ہوتی ہے اور اس محنت کا راجا ٹھیک ٹھاک معاوضہ بھی وصول کرتا ہے۔ تمہیں وہ اس معاوضے کا چوتھا...... حصہ بھی نہیں تھماتا۔ یہ ساری رقم شراب اور نت نئی لڑکیوں پر خرچ ہوتی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ جان صاحب جانتے تھے کہ عمران کبھی کبھار سگریٹ پیتا ہے۔ انھوں نے اسے سگریٹ پیش کیا جو اس نے جھجکتے ہوئے قبول کر لیا۔ جان صاحب بولے۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ عمران! تم اس راجا تک کیسے پہنچے اور کب سے اس کے ساتھ ہو؟"

عمران اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے گول مول بات کی اور بتایا کہ وہ اپنے کچھ رشتے داروں کے پاس گجرات میں ٹھہرا ہوا تھا، وہیں راجا سے جان پہچان ہوئی۔

جان صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولے۔

"تم گجرات میں نہیں، گجرات کے ایک پنڈ میں ٹھہرے ہوئے تھے...... اور اپنے کسی رشتے دار کے پاس نہیں، ایک بدمعاش عورت ماجھاں کے گھر میں تھے۔"

عمران ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جان صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "ایک روز راجا نے مجھے اس بارے میں تھوڑا سا بتایا تھا۔ بعد میں، مَیں نے اپنے طور پر چھان بین کی اور مجھے تمہارے بارے میں اور بھی کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔"

"کیسی باتیں جی؟"

جان صاحب ہولے سے مسکرائے اور اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے عمران! میرا وعدہ ہے، ہم دونوں کے تعلقات آگے چل کر کیسے بھی ہوں، میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اس بات کا تو مجھے یقین ہے جی۔"

"اب اس سے آگے میں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں...... تمہاری نظر سے بھی اوجھل ہے۔" جان صاحب نے کہا پھر نیا سگریٹ سلگا کر بولے۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت کیکراں نام کے گاؤں میں حالات کیا ہیں؟"

"مجھے کچھ زیادہ تو پتا نہیں جی۔ راجا نے بتایا تھا کہ ماجھاں کا بھائی ناجا ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔ چار مہینے پہلے اس نے راجا کے پرانے ڈیرے پر آگ بھی لگا دی تھی اور پنڈ والوں کو دھمکیاں دی تھیں راجا کے بارے میں۔"

"اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تو پھر؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

جان صاحب بولے۔ "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ناجے کو پولیس مقابلے میں مرے پورے دس مہینے ہو گئے ہیں۔ تمہارے آنے کے کچھ ہی دن بعد یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد مخالف پارٹی کے لوگوں نے ایک دم طاقت پکڑ لی...... اور ایک دو زوردار لڑائیوں کے بعد ماجھاں کے رشتے داروں کو بھی کیکراں گاؤں سے مار بھگایا۔ اب کیکراں میں ان لوگوں کا نام و نشان تک نہیں۔ تم پتا نہیں کہاں پھر رہے ہو۔"

عمران واقعی ششدر رہ گیا...... وہ کتنی ہی دیر سناٹے میں رہنے کے بعد بولا۔ "تو کیا بھا راجا نے جھوٹ بولا تھا؟"

"سفید جھوٹ...... اور یہ سب کچھ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اپنے مطلب کے لئے کسی کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ تمہیں خوف زدہ کر کے رکھنا چاہتا تھا تاکہ تم کہیں جانے کا سوچ ہی نہ سکو۔ وہ تم سے زبردست فائدے لے رہا تھا اور اب بھی لے رہا ہے عمران۔"

عمران ہکا بکا سا بیٹا رہا...... اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ وہ پچھلے ایک عرصے سے بری طرح اپنی ماں کے لئے تڑپ رہا تھا اور راجا نے اسے فریب کے جال میں پھنسا کر شاد پورہ میں قید کیا ہوا تھا۔

جان صاحب بولے۔ "عمران! تمہارے اندر گُن ہے۔ تمہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوئی ہے۔ تم ترقی کر سکتے ہو، آگے جا سکتے ہو۔ تمہارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی راجا ہے۔ اس کمینے سے جان چھڑا لو۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔ تمہیں عزت ملے گی اور پیسا بھی اور اگر تم چاہو تو میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی لمبے چوڑے وعدے تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہاں تمہاری محنت کا بھرپور صلہ ملے گا۔"

عمران کا دماغ ابھی تک کیکراں کے اردگرد گھوم رہا تھا، وہ بولا۔ "جان صاحب! کیا واقعی ناجا ختم ہو چکا ہے؟"

جان صاحب اُٹھ کر الماری کی طرف گئے اور ایک پرانا اخبار لے آئے۔ "میں نے کہا ہے نا کہ میرے پاس ہر بات کا ثبوت ہے۔"

یہ نو دس ماہ پرانا اخبار تھا۔ عمران نے دیکھا، اس میں ناجے ڈکیت اور اس کے تین ساتھیوں کی ناگہانی ہلاکت کا سارا واقعہ موجود تھا۔ ایک دم عمران کو لگا کہ وہ آزاد ہو گیا ہے، اس کے پنجرے کی تیلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس بارے میں عمران نے جان صاحب سے دیر تک بات کی اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے اُٹھ گئے۔

......شام سے پہلے عمران شاد پورہ واپس آ گیا۔ راجا ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی نہیں آیا۔ رات عمران دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ راجا یقیناً اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا لیکن عمران کو پتا تھا کہ شریف نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس کی والدہ واقعی شیخو پورہ میں موجود نہیں تھی اور نہ کہیں اور اس کا سراغ ملا تھا۔ عمران سب سے پہلے اپنی والدہ کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ میں ان لوگوں کے خلاف بھی نفرت بڑھ رہی تھی

جنہوں نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر در در دھکے کھانے پر مجبور کیا۔ ان میں چودھری سجاول اور صادق شاہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ ان لوگوں کو ان کے کئے کا مزہ چکھانا چاہتا تھا...... لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا۔ جہاں تک راجا کی بات تھی، اس کے لئے عمران کے دل میں نفرت نہیں تھی...... ہاں، افسوس ضرور تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ راجا اسے اس طرح اندھیرے میں رکھے گا اور فریب کرے گا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور اب اس سوچ بچار میں راجا ہرگز شامل نہیں تھا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت راجا نشے میں دھت واپس آیا اور اس کے ساتھ عمران کی دوٹوک بات ہوئی۔ عمران نے راجا کو اخبار کا وہ ٹکڑا دکھایا جس میں دس مہینے پہلے ناجے ڈکیت کی موت کی خبریں چھپی تھیں اور لاش کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔

راجا یہ سب دیکھ کر ششدر ہوا لیکن بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ معلومات عمران کو کیسے اور کس سے ملی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ آخر میں راجا نے کہا۔ ''عمو یار! ٹھیک ہے کہ میں نے تجھے خطرے سے بچانے کے لئے ناجے کے بارے میں غلط اطلاع دی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم دشمن بن گئے۔ ہم اب بھی دوست ہیں۔ دشمن وہ بندہ ہے جو تمہیں ورغلا رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے توڑ رہا ہے۔''

عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''جو بھی ہے بھا راجا! اب ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ اب زیادہ باریکیوں میں جائیں گے تو دکھ اور رنجش کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں، تم مجھے معاف کر دو۔ ہمیں دشمنوں کی طرح نہیں، دوستوں کی طرح علیحدہ ہو جانا چاہئے۔''

راجا نے کئی پینترے بدلے مگر عمران چونکہ تہیہ کر چکا تھا، اس لئے وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور پھر وہ دونوں نم ناک آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

عمران نے علی الصباح ہی شبو کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ساتھ چلنے کو تیار تھی وقتِ رخصت راجا نے شبو کے سر پر پیار دیا اور آٹھ دس ہزار روپے زبردستی اس کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''اپنی شادی پر مجھے بھول نہ جانا۔''

وہ اپنی طرز کا جدا بندہ تھا۔ کہیں بہت برا، کہیں صرف برا اور کہیں اچھا۔

○......❖......○
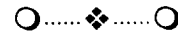
عمران اور شبو سیدھے جان محمد صاحب کے قصبہ نما گاؤں میں ان کی حویلی میں آ گئے۔ جان صاحب نے خوش دلی اور محبت سے ان کا استقبال کیا۔ حویلی میں دو معزز مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک تو کوئی مولوی صاحب تھے۔ دوسرے جان محمد صاحب کے منہ بولے بھائی اور پارٹنر حاجی احمد اشفاق صاحب تھے۔ اس رات جان صاحب نے حاجی اشفاق سے بھی عمران کی ملاقات کرائی۔ انہوں نے حاجی اشفاق کو بتایا۔ ''قدرت جب کچھ چھینتی ہے تو اس کے بدلے کچھ دیتی بھی ہے۔ اس بچے سے نوعمری میں اس کی پیاری ماں چھن گئی۔ یہ دن رات اس کے لئے تڑپا، ماں تو اسے نہ ملی...... کم از کم ابھی تک تو نہیں ملی، پر اس کا صلہ اسے ایک اور شکل میں مل گیا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں بڑی کرامات دی ہیں......''

پھر جان محمد صاحب اپنے ساجھے دار کو ان حیران کن واقعات کے بارے میں بتانے لگے جو عمران اور جانوروں کے حوالے سے ان کے مشاہدے میں آئے تھے، یا انہوں نے سنے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا مگر ہاتھ کے کنگن کو آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حاجی اشفاق بھی عمران سے بہت متاثر ہوئے۔

شبو، جان صاحب کی بیوی صدیقہ بی بی کے ساتھ زنان خانے میں چلی گئی تھی۔ عمران کا بستر حویلی کی بیٹھک میں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والی تیز رفتار تبدیلیوں پر حیران ہو رہا تھا۔ جوں جوں اسے اختیار، آزادی اور جسمانی توانائی مل رہی تھی، اپنی ماں کے لئے اس کی تڑپ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے لئے سب سے مقدم اپنی ماں کی تلاش تھی۔ رات گئے تک ماں کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔ وہ غنودہ حالت میں بستر پر لیٹا رہا۔ اچانک ایک آواز نے اسے بری طرح چونکایا...... وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھک کے کسی

قریبی کمرے سے کسی شخص نے بڑے وجدانی انداز میں حق ہُو کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ایسا نعرہ عمران نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ ایسے نعرے اس نے کہاں سنے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں بجلی سی لپک گئی۔ وہ اُٹھا اور کچے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا آواز کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچا۔ اس نیم پختہ کمرے کے اندر گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی تھی۔ عمران نے تھوڑی سی کوشش کی اور پھر ایک چوبی کھڑکی کی جھری میں سے اندر جھانکنے میں کامیاب رہا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ کل اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مہمان خانے میں کوئی مولوی صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن یہ مولوی صاحب نہیں تھے۔ یہ تو شہنشاہ کے مزار کا وہی پیر فرتوت مخدوم صادق شاہ تھا جس نے ڈھائی تین سال پہلے عمران کو بڑی بے حسی سے بدمعاش ماجھاں کے سپرد کیا تھا اور پھر پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور فربہ ہو چکا تھا۔ سرمے سے بھری ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آ ئی تھیں۔ وہ غالباً بھنگ کے نشے میں تھا۔ جان محمد صاحب کی معاون نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کے سامنے مؤدب کھڑی تھی۔ وہ خود پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس نے نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرا نہیں بچے۔ تیری شادی ہوگی اور بڑی جلدی بڑا اچھا دولہا ملے گا۔ تیری برادری کا ہی لڑکا ہوگا۔''

اس نے نیلم کو اوڑھنی یعنی گرم شال اُتارنے کو کہا۔ نیلم نے فوراً اُتار دی۔ صادق شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور نیلم کے جسم پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرنے اور کچھ پڑھنے لگا۔ صادق شاہ کو دیکھ کر عمران کے سینے میں انگارے دہکنے لگے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس شخص سے اتنی جلدی مل پائے گا اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ آج کی رات کو صادق شاہ کے لئے یادگار اور عبرت ناک بنا دے۔ اس کے اندر وہی سفاک تدبر سر اُٹھانے لگا جو ماجھاں کی موت کے وقت اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا۔

کمرے کے اندر صادق اور نیلم میں گفتگو جاری تھی۔ صادق نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ کل ظفر پھر یہاں آ رہا ہے۔ جب تم دونوں میں طلاق مکمل ہو چکی ہے تو پھر وہ یہاں کیا لینے آتا ہے؟ اس کا کیا کام ہے یہاں؟''

''مجھے تو یہ خود اچھا نہیں لگتا شاہ جی۔'' نیلم کے چہرے پر نفرت نظر آئی۔

''تم خود جان صاحب سے کہو کہ وہ یہاں نظر نہ آیا کرے۔ تمہیں یاد ہے کہ پچھلی دفعہ جب یہاں آیا تھا تو میرے ساتھ کتنی بدتمیزی سے بولا تھا وہ؟ اس خبیث کے دماغ میں یہ

بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اسے تم سے دور کرنے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ یہ اس کے کرتوت ہیں جنہوں نے اسے ذلیل کیا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں...... یہ تمہاری ہمت ہے کہ تم اس جیسے گندے بندے کے ساتھ دو تین سال گزار گئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے دنوں وہ کسی تھیٹر کے گانے والے کے ہاتھوں بھی ذلیل و خوار ہوا ہے۔''

''ہاں جی، اس گویے کے ساتھ مل کر وہ کوئی نیا تھیٹر بنا رہا تھا۔ وہ بندہ اس سے بھی بڑا فریبی نکلا۔ اس کا پانچ چھ لاکھ روپیا کھا گیا۔ اب اس کا ہاتھ کافی تنگ ہے۔ اسی لئے یہاں کے چکر لگا رہا ہے اور چچا سے جھگڑ رہا ہے۔''

عمران یعنی عمو کھڑکی میں سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس بندے کا نام ظفر لیا جا رہا ہے، یہ وہی ہے جس سے نیلم کی طلاق ہوئی ہے۔

''اب کیا جھگڑا ہے؟'' صادق شاہ نے نیلم سے پوچھا۔

''جھگڑا تو کوئی خاص نہیں ہے جی۔ بس وہ خواہ مخواہ اس کو بڑھا رہا ہے۔ جہیز کا سامان ہم نے واپس لینا ہے اور شادی کے موقع پر جو زیور وغیرہ ان لوگوں نے مجھے پہنایا تھا، وہ ہم نے واپس دینا ہے۔ وہ زیور کو بڑھا چڑھا کر بتا رہا ہے......''

صادق شاہ نے اپنے تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کی لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ خبیث تمہیں ملنے اور پھر سے اپنے جال میں پھنسانے کے ارادے سے یہاں آتا ہے، حالانکہ اس گدھے کو پتا ہونا چاہئے کہ طلاق مکمل ہو چکی ہے اور اب اس کا تمہاری طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے جی کہ وہ مجھ سے بات وغیرہ کرنا چاہتا ہے لیکن اب مجھے تو اس کی صورت سے ہی ڈر لگنے لگا ہے۔''

صادق شاہ نے اپنی ٹانگیں پساریں اور نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کی پائنتی بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''اور مجھے تو وہ دوسرا لڑکا راجا بھی ایک دم فراڈیا لگتا ہے۔ وہ تمہیں بس شادی کا جھانسا دے رہا ہے۔ بُری عورتوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہاری دوسری شادی تمہاری برادری ہی کے کسی لڑکے سے ہوگی اور بڑی جلد ہوگی۔''

نیلم اور زور زور سے اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل فکر نہیں کرنا۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ فقیروں کی دعا ہے تیرے ساتھ۔ بس اپنے چچا سے کہو کہ اس ظفر سے فوراً جان چھڑا لیں۔''

کچھ دیر بعد نیلم نے صادق شاہ کو ادب سے سلام کیا اور اجازت لے کر کمرے سے چلی گئی۔ وہ بھینسے کا بھینسا کچھ دیر تک بستر پر پڑا اپنی ٹانگیں کھجاتا رہا پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ عمو کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلے روز عمو نے نیلم کے سابقہ شوہر کو دیکھا۔ اس وقت عمو گھر کے وسیع صحن میں جان محمد صاحب کے ساتھ سرکس کے بے زبان فن کاروں یعنی جانوروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختلف جانوروں ریچھ، بندر، بارہ سنگھے وغیرہ کے پنجرے ایک قطار میں رکھے تھے۔ جان محمد صاحب کا سلوک اپنے ملازموں کے ساتھ ساتھ اپنے جانوروں سے بھی بہت اچھا تھا۔ وہ ان کی بہترین نگہداشت کے قائل تھے۔ مکمل تربیت سے پہلے ان کے سرکس کے جانور اسی جگہ رہتے تھے اور بہترین مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس وقت بھی جان محمد صاحب ایک نیم تربیت یافتہ بندر کو اپنے ہاتھ سے ڈبل روٹی مکھن کھلا رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور نیلم کا سابقہ شوہر ظفر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے کلف دار کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس کی پھولی ہوئی ناک سے اس کی کرخت طبع کا اندازہ ہوتا تھا۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص خوشاب شہر میں ایک پیٹرول پمپ چلاتا ہے۔ تاہم شکل سے وہ کاروباری شخص کے بجائے ایک اجڈ زمیندار نظر آتا تھا۔

اس کے ساتھ ایک ملازم نما شخص بھی تھا۔ جان صاحب سے بے دلی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد ظفر ان کے ساتھ بیٹھک میں چلا گیا۔

پانچ دس منٹ کے بعد بیٹھک کے اندر سے تیز لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں...... جان محمد صاحب اور ظفر کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ غالباً وہی زیورات والا معاملہ تھا۔ کبھی جان صاحب کی آواز بلند ہو جاتی تھی، کبھی ظفر کی۔ ظفر کی بوجھل آواز میں کبھی کبھی شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ بھی آ جاتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں دیکھتے ہی بندے کے ذہن میں ناپسندیدگی کی لہر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو میں ایک دو بار صادق شاہ کا نام بھی آیا۔ شاید صادق شاہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ ظفر نامی شخص اپنی اور نیلم کی طلاق میں صادق شاہ کو قصوروار سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صادق شاہ نے نیلم کو الٹے سیدھے تعویذ پلائے ہیں...... جب یہ بحث چل رہی تھی، صادق شاہ مہمان خانے میں سویا ہوا تھا۔ اس نے بھنگ پی رکھی تھی۔ امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی جاگے گا۔

عمو (عمران) کل رات سے بہت محتاط تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ صادق شاہ کی نظروں میں نہ آ جائے۔ کل جان محمد صاحب نے جس طرح عمو کا تعارف اپنے پارٹنر حاجی احمد اشفاق

سے کروایا تھا، اسی طرح صادق شاہ سے بھی کرا سکتے تھے۔ بہرحال خیریت ہی گزری۔ ایک تو صادق شاہ سہ پہر سے پہلے جاگا ہی نہیں۔ دوسرے جاگتے ساتھ ہی وہ مصروف ہو گیا۔ گاؤں کا چودھری اور دو تین دیگر معزز افراد اس سے ملنے چلے آئے۔ وہ اس کے لئے نذرانے وغیرہ بھی لائے تھے جن میں دیسی گھی، سوہن حلوہ اور گرم چادریں وغیرہ شامل تھیں...... یہ محفل رات تک چلتی رہی۔ نیلم کا سابقہ شوہر ظفر بھی ابھی تک حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے کل صبح جان محمد صاحب سے حتمی بات کرنی تھی اور زیورات والا معاملہ طے کر کے واپس جانا تھا۔ عمو نے محسوس کیا تھا کہ صادق شاہ اور ظفر ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے۔

عمو کے ذہن میں جس منصوبے نے پرورش پائی تھی، اس کے لئے حالات مزید سازگار ہو گئے تھے۔ شام کو عمو نے شبانہ کے ہاتھ کے تلے ہوئے بینگن پکوڑے کھائے اور دیر تک اس سے باتیں کیں۔ جان محمد صاحب کی خوش خلق بیوی صدیقہ بی بی بھی وہیں موجود تھی۔ عمو اور شبانہ اسے خالہ کہنے لگے تھے۔ وہ بھی ان دونوں کا اپنے بچوں ہی کی طرح خیال رکھنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے ان دونوں کے لئے ملاقات کا موقع فراہم کر دیتی تھی۔

رات گہری ہوئی تو عمو کے سینے میں سلگتے ہوئے انگارے آگ کا روپ دھارنے لگے۔ وہ صادق شاہ کو یادگار سبق سکھانا چاہتا تھا۔ وہ بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ آخر اسے اندازہ ہوا کہ جان محمد کے اس حویلی نما گھر میں سب لوگ سو چکے ہیں۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا اور محتاط قدموں سے جانوروں کے پنجروں تک پہنچ گیا۔ جانوروں کو سردی سے بچانے کے لئے پنجروں پر ترپالیں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ رائل بنگلہ ٹائیگر کے پنجرے پر بھی ترپال تھی۔

بنگلہ ٹائیگر یوں تو تربیت پا چکا تھا اور جان محمد نے اس کی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی راجا کو ادائیگی کی تھی، تاہم بعد میں صورت حال بدل گئی تھی۔ اپنے مزاج کے اندرونی اشتعال کی وجہ سے بنگلہ ٹائیگر نہ صرف بپھر گیا تھا بلکہ اس نے ایک ملازم کا پیٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اب عمو یہاں موجود تھا اور اسے اندازہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اسے ٹائیگر کے ساتھ مزید محنت کرنا پڑے گی۔

عمو نے ٹائیگر کے پنجرے کی ترپال اوپر اُٹھائی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور تیزی سے دُم ہلانے لگا۔ عمو کو پہچاننے کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ٹائیگر کے پنجرے کے دروازے کو یوں کھولنے کی ہمت یہاں عمو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا...... بلکہ عام ملازم تو

اس کے پنجرے کے پاس بھی نہیں جاتے تھے۔ عمو نے دروازہ کھولا۔ ٹائیگر تیزی سے باہر آیا۔ یوں لگا جیسے وہ حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ دوستانہ جھپٹ تھی۔ عمو نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کی پشت سہلا سہلا کر اسے پچکارنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کے جادو نے کام کر دکھایا۔ ٹائیگر کا پارے کی طرح مچلتا ہوا جسم پُرسکون ہونے لگا۔ عمو نے اسے پوری طرح اپنے کلاوے میں لیا پھر اسے اس کے کالر سے پکڑ کر دھیرے دھیرے اس کمرے کی طرف بڑا جہاں صادق شاہ سو رہا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ جس وقت عمو ٹائیگر کے ساتھ صادق شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے پاؤں میں اپنی جوتی نہیں تھی۔ یہ ظفر کی جوتی تھی جو اس نے اس کے کمرے کے سامنے سے اُٹھائی تھی۔ یہ براؤن رنگ کی گرگابی عمو کے پاؤں میں ذرا سی کھلی تھی تاہم کام چل رہا تھا۔

عمو بڑی احتیاط سے تقریباً چار سو دس پونڈ وزنی اس ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے تک لایا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازہ بند ہے لیکن اسے اندر سے کنڈی نہیں چڑھائی گئی۔ عمو نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ ٹائیگر کے جسم میں ایک بار پھر ہلکا سا اضطراب پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی دھاری دار دُم کو تیزی سے حرکت دے رہا تھا اور گردن معمول سے لمبی نظر آ رہی تھی۔ عمو نے اسے کمرے میں دھکیلا اور دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹا۔ ظفر کی جوتی اس کے کمرے کے سامنے اُتاری اور پھر بڑی احتیاط سے گھاس والی جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ بہت جلد یہاں قیامت کا شور بلند ہونے والا ہے۔ اسے پتا تھا کہ ٹائیگر کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر صادق شاہ زبردست واویلا کرے گا۔ اس کا یہ واویلا اور اضطراب ہی اس کی بدقسمتی کا سبب بننے والا تھا۔ ٹائیگر کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔

......اور پھر یہی کچھ ہوا۔ صادق شاہ کے کمرے سے تہلکہ خیز آوازیں بلند ہوئیں۔ صادق شاہ دہشت ناک انداز میں چلا رہا تھا اور کمرے کے بند دروازے کو دھڑا دھڑ کوٹ رہا تھا۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... دروازہ کھولو۔'' صادق شاہ کی کرب ناک آواز اتنی زوردار تھی کہ بند کمرے سے بلند ہونے کے باوجود پوری حویلی میں پھیل رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جان صاحب کے ایک ملازم نے چلا کر کہا۔ ''مالک...... ٹائیگر پنجرے میں نہیں ہے...... مالک۔''

عمو نے دروازے کی جھری سے دیکھا۔ جان محمد صاحب ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں ٹارچ لئے بھاگتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ فوری طور پر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے بس صادق کی دہشت زدہ پکار سنی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... دروازہ کھولو۔''

جان صاحب بے ساختہ صادق کے کمرے کی طرف لپکے۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر ان پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ٹائیگر بھی کمرے کے اندر ہے۔ ٹائیگر کی لرزہ خیز آواز کو پہچاننا ان کے لئے ہرگز مشکل نہیں تھا۔

چند لمحوں کے لئے جان صاحب حواس باختہ نظر آئے۔ تب وہ پیچھے ہٹے اور انہوں نے عمران کو پکارنا شروع کیا۔ ''عمو...... عمو!''

عمران کمرے کے اندر بے حس بنا کھڑا رہا۔ یہ وہی سفاک بے حسی تھی جو اس پر ماجھاں کی موت کے وقت طاری ہوئی تھی۔ اس بے حسی کا تعلق یقیناً ان بے رحم حالات سے تھا جن سے وہ گزرا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تو کتابوں، پھولوں اور موسموں سے پیار کرنے والا لڑکا تھا۔ اسے وہ سب کچھ اچھا لگتا تھا جو اس کی من موہنی ماں کے نزدیک برا تھا۔ اس کی خوبصورت دنیا اس کی ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اب ظالم لوگوں نے اس سے اس کی ماں چھین لی تھی۔ اس طویل جدائی نے عمران کے دل میں جو زہر بھرا تھا، اس کا تریاق ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ حویلی میں برپا ہونے والا شور محشر سن رہا تھا مگر بہرا بنا کمرے کی تاریکی میں کھڑا تھا۔ اب کئی ملازم صحن میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ تب عمران نے دیکھا کہ جان صاحب بھاگتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ اب وہ مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی چپل پہنی اور خود ہی کمرے سے نکل آیا۔

جان صاحب اسے دیکھ کر چلائے۔ ''عمو! ٹائیگر...... پیر جی کے کمرے میں گھس گیا ہے۔'' دکھ اور دہشت کی شدت سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

عمران ان کے ساتھ لپکتا ہوا صادق شاہ کے کمرے تک پہنچا۔ صادق شاہ کی زخمی آواز مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غالباً مشتعل درندے کے سامنے اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

عمران نے اپنے ہاتھ بند دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھائے تو جان صاحب کے دو ملازموں نے رائفلیں سونت لیں۔ عمران نے دروازہ کھولا۔ ٹارچوں کی روشنی کمرے میں گئی۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ صادق شاہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم خونچکاں تھا۔ مشتعل درندے نے

پلٹ کر عمران کی طرف دیکھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دکھائی دیں۔ اس کے منہ پر تازہ خون کے نشان تھے۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ عمران پر بھی جھپٹ پڑے گا......

عمران کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ پکارا۔ ''ٹائیگر...... ٹائیگر۔'' اس کا خیال تھا کہ ٹائیگر اس کی سمت آئے گا مگر وہ بے مہار ہو رہا تھا۔

وہ واپس پلٹا۔ اس نے طیش کے عالم میں مخملی لحاف پر پنجہ مارا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔

عمران ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کی وہ خداداد صلاحیت کام آئی جو اسے جانوروں سے قریب تر کر کے اسے ان کی فطرت پر اختیار دے دیتی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر عمران نے مشتعل درندے کو سنبھال لیا اور پھر اسے اپنے کلاوے میں لیتا ہوا آہنی پنجرے کی سمت لے گیا۔ پوری حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں اور ملازم بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عمران نے اپنے عقب میں جان صاحب کی وحشت زدہ آواز سنی۔ وہ ملازموں سے کہہ رہے تھے۔ ''اُٹھاؤ...... جلدی کرو۔ اسپتال لے جاؤ۔ ابھی یہ زندہ ہے۔''

تب عمران نے دیکھا کہ چند ملازم فربہ اندام صادق شاہ کو ہاتھوں میں اُٹھائے جیپ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ صادق شاہ کی ادھڑی ہوئی خونچکاں شلوار زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ آندھی طوفان کی طرح حویلی کے پھاٹک سے نکلی اور خوشاب کے سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

جان صاحب دہاڑے۔ ''یہ سب کیسے ہوا؟ ٹائیگر کس طرح نکلا ہے پنجرے سے؟ کیسے پہنچا ہے پیر صاحب کے کمرے میں؟'' یقیناً یہی سوال سب لوگوں کے دماغوں میں بھی گھوم رہا تھا۔

حاجی احمد اشفاق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ حادثہ نہیں ہے۔ یہ کوئی چکر لگتا ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر جانور کو کھولا ہے۔ وہ پنجرے سے باہر آیا ہے اور سب سے نزدیک پیر صاحب کا کمرا ہی پڑتا تھا، وہ اس میں گھس گیا ہے۔''

''ایسا کون کر سکتا ہے؟ کس کو ہو سکتی ہے اتنی ہمت؟'' جان صاحب شدید اُلجھن کے عالم میں بولے۔

یکایک ایک ملازم حسن دین پکارا۔ ''مالک! یہ دیکھیں...... یہ پنجرے کے پاس تازہ

قدموں کے نشان ہیں۔''

حسن دین اپنی طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ کچی زمین پر پھینک رہا تھا۔ یہاں دو طرح کے تازہ نشان تھے۔ ایک عمران کی چپل کا تھا۔ یہ نشان تھوڑی ہی دیر پہلے بنا تھا جب عمران ٹائیگر کو کنٹرول کرنے کے بعد پنجرے کی طرف لایا تھا۔ دوسرا نشان گرگابی کا تھا۔ یہ نشان پنجرے کے سامنے سے شروع ہو کر نیم پختہ برآمدے کی طرف گیا تھا۔ ملازم حسن دین کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر اس نے جان صاحب کے کان میں کچھ کہا...... جان صاحب کے چہرے پر بھی ہلچل نظر آنے لگی۔ تاہم انہوں نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپایا اور نارمل لہجے میں حسن دین سے پوچھا کہ ظفر کہاں ہے؟

اسی دوران میں ظفر بھی شراب کے نشے میں ڈگمگاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کیسا شور ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پیر صادق صاحب سخت زخمی ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔'' جان صاحب نے ظفر کو بتایا۔

ظفر نشیلے انداز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''وہ کیسے زخمی ہو سکتا ہے؟ وہ تو دوسروں کو زخمی کرتا ہے۔ اس کی راکھی (حفاظت) تو اس کے دو درجن مؤکل کرتے ہیں۔''

جان صاحب غصے سے بولے۔ ''یہ مذاق ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب کو پتا تھا، ٹائیگر خطرناک ہو رہا ہے۔ پھر اس کا پنجرہ کس نے کھولا؟''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ صادق کو شیر نے زخمی کیا ہے؟'' ظفر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

جان صاحب نے ظفر کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ظفری! تم کہاں تھے؟''

''ظاہر ہے مردانے میں ہی تھا۔ زنانے میں تو اب جا نہیں سکتا کیونکہ آپ جناب کی منہ بولی بھتیجی مجھ سے طلاق لے چکی ہے۔'' وہ بدستور نشیلی آواز میں بولا۔ ''لیکن...... لیکن آپ جناب مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی۔'' جان صاحب نے مختصر جواب دیا اور ایک بار پھر غور سے پنجرے کے اردگرد کچی زمین پر قدموں کے نشانات کو دیکھنے لگے۔ ان کے پریشان چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں۔

O......❖......O

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا عمران نے چاہا تھا۔ کسی کا دھیان عمران کی طرف گیا ہی نہیں۔ صادق شاہ اور نیلم کے سابق شوہر ظفر میں رنجش چلی آ رہی تھی۔ ظفر ایک دو بار صادق شاہ کو دھمکی بھی دے چکا تھا۔ پھر پنجرے کے آس پاس ظفر کے قدموں کے تازہ نشان بھی ملے۔ ہر کسی نے یہی نتیجہ نکالا کہ ظفر نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر صادق شاہ سے خوفناک بدلہ لیا ہے۔ اس نے پنجرہ کھولا ہے۔ اسے پتا تھا کہ شیر جب پنجرے سے نکلے گا تو سب سے پہلے وہ جس دروازے تک جائے گا، وہ صادق شاہ کے کمرے کا ہی ہو گا۔

صادق شاہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ ہنسلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ بپھرے جانور نے اس کا ایک کندھا تقریباً چبا ڈالا تھا۔ پتا چلا کہ اسپتال میں اس کی ذہنی کیفیت بھی ابتر ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چلا اُٹھتا ہے اور ''بچاؤ جان صاحب...... بچاؤ جان صاحب'' کی دہائی دینے لگتا ہے۔ خوشاب سے اسے لاہور کے اسپتال لے جایا گیا۔ جیسے تیسے اس کی جان تو بچ گئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کئی ماہ اسپتال میں گزارنے پڑیں گے۔

واقعے کے اگلے دن ہی ظفر عرف ظفری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ''شک'' اس کی طرف جا رہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ صادق شاہ کے سیکڑوں مرید آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ وہ جان صاحب کی حویلی سے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کے خلاف کچی رپورٹ بھی درج ہو گئی تھی۔

جان صاحب نے ایک بار تو ٹائیگر کو اونے پونے بیچنے کا ارادہ کر لیا مگر پھر عمران آڑے آیا۔ اس نے جان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ٹائیگر کو ٹھیک کر لے گا اور ایسا ٹھیک کرے گا کہ وہ بکری کی طرح اشاروں پر چلے گا۔ جان صاحب کو بھی عمران کی حیرت انگیز صلاحیتوں پر یقین تھا۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

آٹھ دس ہفتے میں حالات معمول پر آ گئے...... اب ایک بار پھر جان صاحب کی حویلی میں پکوان پکتے تھے، شطرنج ہوتی تھی۔ ملازمین جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آتے تھے اور کبھی کبھار جب خوشاب شہر سے سرکس کا کوئی مزاحیہ فن کار آ جاتا تھا تو قہقہے بکھرتے تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں صادق شاہ کے ساتھ جو ہوا، وہ کس نے کیا اور اس کے پیچھے کتنی پرانی کہانی تھی۔

عمران اور شبانہ بتدریج جان صاحب کے گھرانے کے فرد بنتے جا رہے تھے۔ جان

صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی گھر والی صدیقہ بی بی بڑی محبت کرنے والی اور دانا عورت تھی۔ عمران اور شبانہ اسے خالہ کہتے تھے، وہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ خصوصاً وہ شبانہ سے بہت پیار کرنے لگی تھی۔ اسے شبانہ کی یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ اس نے پورا پورا موقع ہونے کے باوجود عمران سے صرف اس لئے شادی نہیں کی کہ وہ اس شادی میں اپنے گھر والوں کی مرضی شامل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے شبانہ کو یقین دلایا کہ وہی کچھ ہو گا جو وہ چاہتی ہے اور جو عمران چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ''شبانہ اس شادی کے سارے انتظام میں خود کراؤں گی۔ دیکھنا ہم اس کو ایک یادگار شادی بنا دیں گے۔''

خالہ صدیقہ نے جان صاحب سے کہہ کر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا۔ شبانہ کی والدہ اور ماموں وغیرہ ابھی تک گجرات کے اس گھوگنی نامی گاؤں میں ہی مقیم تھے۔ آخر ایک دن جان صاحب کا خاص ملازم حسن دین خود گھوگنی گاؤں گیا تاکہ شبانہ کے گھر والوں کو شبانہ کے بارے میں خوش خبری سنائے اور انہیں لے کر خوشاب آئے۔

اب شبانہ کے جانے کا وقت تھا۔ عمران کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال اُٹھتا تھا، کیا وہ دونوں ایک ہو پائیں گے؟ کہیں ان کے درمیان کوئی دیوار تو کھڑی نہیں ہو جائے گی؟ اگلے روز شبانہ کے گھر والوں کو خوشاب پہنچ جانا تھا اور شبانہ کو واپس اپنے گاؤں لے جانا تھا۔ اس دن عمران بہت اداس تھا۔ شبانہ بھی چپ چپ تھی۔ خالہ صدیقہ نے رنگین پیڑھی پر شبانہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے لمبے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے بولیں۔ ''شبو! تُو ذرا فکر نہ کر۔ ہم بڑی جلدی تجھے پھر واپس یہیں پر لے آئیں گے۔ تیری اور عمو کی شادی کے سارے انتظام ہم خود کریں گے۔ دیکھنا یہ بڑی دھوم دھام والی شادی ہو گی۔''

''لیکن خالہ! ابھی عمران کی امی جی کا تو کچھ پتا نہیں چلا ہے۔''

''وہ بھی جلد ہی چل جائے گا۔ تمہارے خالو پوری کوشش کر رہے ہیں اور اگر فرضِ محال ابھی کوئی کھوج کھرا نہ بھی ملا تو بھی یہ شادی تو اب ہونی ہی ہے۔ ہم سب مل کر عمران کو راضی کر لیں گے۔ کیوں عمو؟'' خالہ صدیقہ نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

عمران خاموش رہا۔ خالہ نے عمران کو بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔ پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ''عمو! مجھے پتا ہے تم نے اپنی والدہ کو ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی ہے...... ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ جو کچھ ہو سکا کریں گے لیکن اگر خدانخواستہ...... تمہاری امی کا پتا نہ بھی چلا تو بھی ہم تم دونوں کا نکاح کر دیں گے۔ سیانے کہتے ہیں کہ نیک کام میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے اور اس کام میں تو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ وہ ''ہاں'' میں جواب کیسے دے سکتا تھا۔ اس کی تو زندگی کا دوسرا نام ہی ماں تھا۔ وہ ابھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ماں کے بغیر وہ یہ شادی کر سکے گا یا نہیں۔

رات کو شبانہ اور عمران تنہائی میں ملے۔ حویلی کی چھت پر ہلکی سی سردی تھی۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ بستی سو رہی تھی لیکن دو پیار کرنے والے دل دھڑک رہے تھے اور ان میں نم ناک کسک جاگی ہوئی تھی۔

عمران نے شبانہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''کل تمہارے گھر والے تمہیں لے جائیں گے شبو! میں بہت اکیلا رہ جاؤں گا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''ہم بڑی جلدی پھر ملیں گے عمران۔ اس بات کا یقین رکھنا۔ میں اب تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔''

''اس طرح کے وعدے کبھی کبھی ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں شبو۔''

''میری طرف سے نہیں ٹوٹیں گے عمران! میں...... مرتے دم تک تمہاری ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

عمران نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''تم مجھے بھول جاؤ تو بھول جاؤ۔ میں نہیں بھول سکتی عمران...... تمہیں بھول کر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔''

''اور میں کیا زندہ رہ سکتا ہوں؟ تمہیں کیا پتا تمہارے بغیر ایک ایک دن کس طرح گزاروں گا۔''

اس نے اپنی پیاری سی ناک عمران کی گردن میں گھسا دی۔ عمران نے اسے پوری طرح اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ فلک دیکھ رہا تھا...... وہ ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے۔ پیار کرنے والوں کو...... بچھڑنے والوں کو...... وعدے کرنے والوں کو اور پیمان باندھنے والوں کو...... وہ سب جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ صدیاں اس کے نیچے سے دبے پاؤں گزرتی چلی جاتی ہیں اور محبت و نفرت کی ہزار ہا داستانوں کا شاہد بنتا ہے۔

اگلے روز شبانہ کی والدہ اور دو ماموں گجرات کے اس دور دراز گاؤں سے خوشاب کی اس نواحی بستی میں پہنچے۔ اپنی والدہ سے شبانہ کے ملنے کا منظر دیدنی تھا۔ دونوں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ شبانہ کے دونوں ماموں بھی بھانجی کو دیر تک گلے سے لگائے رہے۔ سہ پہر کو وہ لوگ واپس گجرات کے گاؤں گھونکی روانہ ہو گئے۔

اس کے تیسرے دن عمران ایک بار پھر حسن دین کے ساتھ اپنی والدہ کی تلاش میں

شیخوپورہ اور لاہور روانہ ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کسر بھی اُٹھا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ شیخوپورہ روانگی سے اسے ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ شبانہ کی جدائی سے وقتی طور پر اس کا دھیان ہٹ گیا۔ حسن دین کے ساتھ اس نے کئی جگہوں کی خاک چھانی، کئی لوگوں سے ملا۔ اس کی ملاقات اس کہانی کے ایک اور ناپسندیدہ کردار چودھری سجاول سے بھی ہوئی۔ چودھری سجاول کو شوگر کا مرض لاحق ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ چودھری سجاول نے عمران سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ اس نے قسمیں کھا کر عمران کو یقین دلایا کہ اس کی طرف سے اس کی والدہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس نے اپنی زمین مرضی سے بیچی تھی اور اپنی مرضی سے ہی گاؤں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ شریفاں بی بی کی تلاش میں ہر طرح اس کی مدد کرنے کو تیار ہے اور اس سلسلے میں پولیس میں بھی اپنا اثر رسوخ استعمال کر سکتا ہے۔ اس نے عمران کو یقین دلایا کہ شہنشاہ کے مزار سے اس کے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن مزار والوں کی طرف سے انہیں یہی بتایا گیا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

چودھری سجاول ان لوگوں میں سے تھا جن پر پیاز کی طرح تہ در تہ چھلکے ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ چودھری سجاول کے علاوہ وہ اپنے آبائی گاؤں کے کچھ اور لوگوں سے بھی ملا۔ ان میں ماسٹر عطا صاحب اور قاری سلیم وغیرہ شام تھے...... ماسٹر عطا صاحب کی تو خیر اور بات تھی مگر باقی کسی شخص میں بھی اسے گرم جوشی یا ہمدردی نظر نہیں آئی۔ وہ لوگ اس سے لئے دیئے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر لوگوں کے نزدیک وہ شہنشاہ کے مزار کا بھگوڑا تھا۔ بہر حال قاری سلیم کے گھر میں اسے بہ وجوہ دو تین گھنٹے رکنا پڑا کیونکہ تیز بارش ہونے لگی تھی۔ اس نے وہاں کھانا کھایا اور حسن دین کے ساتھ تھوڑی دیر آرام بھی کیا۔

......قریباً دو ہفتے کی بھاگ دوڑ کے بعد عمران اور حسن دین ایک بار پھر ناکام ہو کر خوشاب کی اس نواحی بستی چک میں جان صاحب کے پاس واپس آ گئے۔

ہر طرف ناکامی نظر آتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں عمران کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی تھی کہ اس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ وہ جو اسے ''گھر'' میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتی تھی، دنیا میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟ ابھی اس نے ماں کے ہاتھ سے بہت سے محبت بھرے لقمے کھانے ہیں۔ ابھی اس کی گود میں بڑے دنوں تک سر رکھ کر لیٹنا ہے اور ابھی اس کی شفقت کی بہت سی بارشوں میں بھیگنا ہے۔

ٹائیگر کے حوالے سے عمران نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس نے آٹھ دس ہفتوں میں ہی کر دکھایا۔ یہ تیز طرار جانور ایک دم شانت ہو گیا اور اشاروں پر چلنے لگا۔ جان محمد اور حاجی احمد اشفاق عمران سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے سرکس میں ملازمت دے دی اور عمران ''چک'' کی حویلی چھوڑ کر خوشاب آ گیا۔

جان محمد اور حاجی اشفاق کا سرکس وسطی پنجاب کا جانا پہچانا سرکس تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اس کا نام ''اسٹار سرکس'' تھا۔ ابھی یہ لوگ چھوٹے شہروں کے میلوں ٹھیلوں اور عرسوں وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس سرکس کے مختلف شعبے تھے۔ مثلاً جسمانی کرتب...... رقص و موسیقی، جوکرز اور پھر وہ کرتب جن میں مختلف جانور، ہاتھی، گھوڑے، کتے، شیر اور پرندے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ عمران کو اس آخری شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہاں آ کر عمران کو ایسے ہی لگا جیسے مچھلی پانی میں آ گئی ہے۔ وہ جیسے مدتوں سے یہ کام کر رہا تھا اور اس کی ہر ہر باریکی سے آگاہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب کچھ کمال مہارت سے سنبھال لیا۔ اب وہ ایک جگہ مقیم نہیں تھا۔ سرکس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں اور شہروں میں اس کی حرکت جاری رہتی تھی۔

انہی دنوں میں جان محمد صاحب اور خالہ صدیقہ نے گھوکی گاؤں میں عمران کے رشتے کی بات چلا دی۔ اس رشتے میں سب سے زیادہ اہمیت شبانہ کی والدہ اور اس کے ماموؤں کی تھی۔ ان سب نے دو چار دن کی سوچ بچار کے بعد رضامندی ظاہر کر دی۔ ظاہر تھا کہ ان کے نزدیک اپنی بیٹی کی مرضی اہم تھی۔ خوشاب میں ہونے والی ملاقات میں بھی شبانہ کی والدہ نے عمران کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان دنوں عمران کی زندگی میں خوشی کی ایک لہر آئی اور اس لہر نے وقتی طور پر ماں کی جدائی کا غم ہلکا کر دیا۔ یہ وہ دن تھے جب اس کی آنکھوں میں شبانہ کی سادہ مسکراہٹ چمکتی رہتی۔ اس کی ہنسی کے مدھر سُر عمران کے کانوں میں گونجتے اور اس کے جسم کی خوشبو اس کے حواس کو معطر کرتی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ گھوڑوں پر سواری کرتا۔ خطرناک جانوروں کی ٹریننگ میں شریک ہوتا اور ٹرینڈ جانوروں کی دیکھ بھال انجام دیتا۔ تاہم ان سارے کاموں کے دوران میں اس کا دھیان شبانہ کی طرف ہی رہتا۔ ایک روز جب ان کا سرکس میانوالی میں تھا اور وہ پنڈال کے پچھواڑے رائل بنگلہ ٹائیگر کے پنجرے کی صفائی کروا رہا تھا، جان صاحب وہاں پہنچے۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم ضرورت سے زیادہ کام کر رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تین چار روز کی چھٹی کر لو اور خوشاب جا کر اپنی خالہ سے مل آؤ۔''

وہ بولا۔ ''لیکن انکل! شادی پر بھی تو چھٹیاں ہونی ہی ہیں۔ ابھی مجھے کام کرنے دیجئے۔''

''جب شادی کا وقت آئے گا، تب شادی کی چھٹیاں بھی کر لینا۔ ابھی منگنی کی دو چار چھٹیاں کر لو۔'' وہ مسکرائے۔

''منگنی؟''

''ہاں، اسے منگنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں وہ لوگ کوئی نشانی وغیرہ کرنے آئیں۔ ابھی تو شبانہ کے ماموں شیخوپورہ گئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کس لئے؟''

''بھئی آخر وہ لڑکی والے ہیں۔ لڑکی والوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور یہ ان کا حق بھی ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں چھان بین کریں۔''

''سب کچھ تو ہم بتا چکے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''پھر بھی وہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہوں گے۔''

''تو ٹھیک ہے، جان لیں۔ ہم نے کیا چھپایا ہے۔''

''ارے ہاں، یاد آیا۔ یہ دیکھو، یہ چھوٹی سی انگوٹھی ہے۔ تمہاری خالہ نے کہا تھا کہ جب عمران آئے تو یہ انگوٹھی لیتا آئے۔ تمہاری ہونے والی بیوی کے لئے ہے۔'' جان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ ڈبیا میں سے خوبصورت طلائی انگوٹھی عمران کو دے دی۔

اگلا دن کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ عمران نے شام کو خوشاب جانا تھا مگر دوپہر کو جب جان صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بجھے ہوئے نظر آئے۔ وہ پریشان ہوتے تھے تو اس کی نشانی یہ ہوتی کہ وہ سگریٹ کو مسلسل ہونٹوں میں دبائے رکھتے اور اسی طرح گفتگو بھی کرتے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ''شامیانہ دفتر'' میں بیٹھے یہی کچھ کر رہے تھے۔

عمران نے ان کے سامنے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے انکل!''

وہ کچھ دیر خاموشی سے عمران کو دیکھتے رہے پھر گھمبیر انداز میں بولے۔ ''تمہارے گاؤں جھنڈوال سے شبو کے دونوں ماموں کوئی اچھی رائے لے کر نہیں لوٹے۔ مجھے لگتا ہے کہ چودھری وغیرہ نے انہیں الٹا سیدھا بتایا ہے۔''

عمران کے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل؟''

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''...... تم نے وہ جو آسمانی بجلی والی بات بتائی تھی نا، وہ ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے نکلی نہیں ہے۔ خاص طور سے چودھری گھرانا تو وہ بات بڑے

یقین سے کہتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"یہی کہ تم مقررہ میعاد یعنی سترہ چاندوں تک شہنشاہ کے مزار پر رہنے کے بجائے دو تین مہینے بعد ہی وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس لئے آسمانی بجلی والی نحوست تم پر آ گئی ہے۔ مطلب ہے کہ جو کچھ پہلے چوہدری کے پتر کے ساتھ ہوتا تھا، وہ اب تمہارے ساتھ ہوگا بلکہ ہو رہا ہے۔"

"کک......کیا ہو رہا ہے؟"

"آسمانی بجلی تمہارے پیچھے رہتی ہے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" عمران کا خون کھول اُٹھا۔

جان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائے دبائے اگر گہرا کش لیا اور بولے۔ "میں بھی جانتا ہوں، یہ سب بکواس ہے لیکن ایسی بکواس جب دلوں کے اندر گھر کر لیتی ہے اور بندے کا یقین بن جاتی ہے تو پھر اسے کھرچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے مہینے تم پھر شیخوپورہ گئے تھے اور چودھری سجاول، ماسٹر اور قاری سلیم وغیرہ سے بھی ملے تھے؟"

"ہاں۔" عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

جان صاحب بولے۔ "اس دن بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ تم بارش میں ہی واپس آئے تھے۔ تمہاری واپسی کے دس پندرہ منٹ بعد ہی قاری سلیم کے ٹیوب ویل پر آسمانی بجلی گری۔ ایک بھینس مر گئی اور ایک لڑکے کے دونوں بازو جل گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل ایک اتفاق ہے۔ ایسے واقعے پچھلے مہینے کی بارشوں میں کئی جگہ ہوئے ہوں گے۔ کہیں کہیں جانی نقصان بھی ہوا ہوگا مگر میں نے کہا ہے نا کہ جب وہم ہمارا یقین اور عقیدہ بن جاتا ہے تو پھر اس سے چھٹکارا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس واقعے کو بھی تمہاری آمد کے ساتھ نتھی کر کے بتا رہے ہیں۔"

عمران کے اندر آگ سی دہکنے لگی تھی۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے جان انکل سے پوچھا۔ "شبو کے ماموں کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ ذرا توقف سے بولے۔ "یہاں بدقسمتی یہ ہے عمران...... کہ...... شبانہ کے گھر اور برادری والے بھی ان باتوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس کے ماموں اور دوسرے ننھیال والے۔ ان میں سے ایک دو گھرانے تو خاصے پیر پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لڑکے کی زندگی کو اتنا بڑا روگ چمٹا ہوا ہے اور کسی بھی وقت اس کے ساتھ

کچھ ہو سکتا ہے، اسے اپنی لڑکی نہیں دینی چاہئے۔"

"یعنی وہ انکار کر رہے ہیں؟"

"فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔" جان انکل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

عمران اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اس دقیانوسیت اور توہم پرستی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اسی دقیانوسیت نے اس سے اس کی ماں چھینی تھی اور اب یہی اس کی زندگی کی ایک اہم ترین خوشی کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جان انکل نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"گجرات۔ میں خود بات کروں گا شبانہ سے اور اس کے گھر والوں سے۔"

"نہیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس سے بات اور بگڑ جائے گی۔ ہم جو ہیں تمہاری طرف سے بات کرنے کے لئے۔" جان انکل نے اس کے کندھے تھام کر اسے نیچے بٹھا دیا۔

اگلے چار پانچ روز بے حد تناؤ میں گزرے۔ جان صاحب سب کام چھوڑ کر خود خوشاب گئے اور پھر خالہ صدیقہ کے ساتھ گھوٹکی پہنچے۔ عمران کی اطلاع کے مطابق انہوں نے گھوٹکی کے دو چکر لگائے......لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ عمران کو معلوم ہوا کہ اس معاملے پر گھوٹکی گاؤں کی پوری برادری ایک ہو گئی ہے اور انہوں نے رشتہ دینے سے معذرت کر لی ہے۔

اب عمران کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ ایک دوپہر وہ میانوالی سے روانہ ہوا اور رات تک شبانہ کے پنڈ جا پہنچا۔ اس کے سینے میں آگ سلگ رہی تھی اور آنکھوں میں گھمبیر دکھ کی نمی تھی۔ کوئی اس سے اس کی زندگی کیسے چھین سکتا تھا...... وہ اور شبانہ محبت کی ناقابلِ شکست ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بے شمار شب و روز ایک دوسرے کے قریب گزارے تھے لیکن پھر بھی بہت دور رہ کر۔ انہیں اپنی محبت پر بھروسا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنے بڑوں کی رضامندی اور خوشنودی کے ساتھ ایک ہوں گے لیکن اب یقین ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اور عمران نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے بکھرنے نہیں دے گا۔ وہ سب سے پہلے شبانہ سے ملنا چاہتا تھا۔

اس رات اس نے سیدھا جا کر شبانہ کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا شبانہ کا بڑا ماموں نیاز احمد تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک چھوٹا سا کاشت کار تھا لیکن اپنے اندر زمینداروں کی سی اکڑفوں رکھتا تھا۔ اس نے عمران کو پہچان لیا اور فوراً ہی اس کے چہرے

کا رنگ بدل گیا۔

''کیا بات ہے عمو؟'' اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سے؟''

''آپ سے اور شبانہ سے بھی۔''

''خبردار، اگر ہماری لڑکی کا نام لیا تو...... بہت برا ہوگا۔'' نیاز احمد پھنکارا۔

''وہ میری منگ ہے۔ میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔'' عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوئے کون منگ؟ کس کی منگ؟'' نیاز کا انداز مزید بگڑ گیا۔

اسی دوران میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف بھی باہر آ گیا۔ وہ بڑے ماموں سے زیادہ سمجھدار تھا۔ اس نے لڑائی کو بڑھنے سے روکا اور عمران کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''تم شبانہ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری بات کراؤں گا۔ پر ابھی نہیں۔ کل سویرے۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں مگر ایک بات آپ لوگ ذہن میں رکھیں۔ اگر شبانہ کو کسی طرح مجبور کیا گیا یا اسے کوئی ڈراوا دیا گیا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''جب تم خود بات کرو گے تو پھر سب کچھ تم پر کھل جائے گا۔'' شبانہ کے چھوٹے ماموں نے کہا۔

یہ اجنبی گاؤں تھا۔ عمران نے جیسے تیسے گاؤں کے ''دائرے'' میں رات گزاری۔ وہ یہاں اکیلا چلا آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ڈر نہیں تھا۔ اب اسے اپنے ڈر کو دبانا اور خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا آ چکا تھا۔ اب وہ نمایاں قد کاٹھ اور مضبوط جسم کا مالک نوجوان تھا۔ اس کی پیشانی روشن اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

شبانہ کے چھوٹے ماموں نے اگلے روز علی الصباح شبانہ اور عمران کی ملاقات کرا دی۔ مگر یہ ملاقات شبانہ کے گھر میں نہیں بلکہ گھر سے باہر ایک کنوئیں پر ہوئی کنوئیں کے ساتھ دو تین کچے کوٹھے سے تھے۔ ایک کوٹھے میں شبانہ موجود تھی۔ اس بات کا پتا عمران کو بعد میں چلا کہ عمران کی ملاقات گھر میں اس لئے نہیں کرائی گئی کہ کہیں اس کی نحوست گھر پر اثر انداز نہ ہو جائے اور کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔

عمران اس کچے کوٹھے کے اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے مزید حیرانی ہوئی کہ کمرے کے درمیان کپڑے کا ایک پردہ تھا اور شبانہ اس پردے کی دوسری جانب تھی۔ یعنی وہ اس سے

بات تو کر سکتا تھا مگر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ جو خوش رنگ سویروں اور چاندنی راتوں میں ہر وقت اس کے قریب رہتی تھی، آج اس کمرے میں اسے اپنی صورت بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہ کیسا دل فگار انقلاب تھا۔ شبانہ کے ماموں وغیرہ آس پاس ہی موجود تھے۔ ایک ماموں زاد کے ہاتھ میں باقاعدہ رائفل نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود ہوں گے۔

عمران نے کہا۔ ''شبانہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہارے گھر والے انکار کر رہے ہیں اور میں جانتا ہوں، ایسا صرف اس چودھری سجاول کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے بالکل بیکار کی باتیں کر کے تمہارے ماموؤں کو گمراہ کیا ہے۔ یہ پرانے زمانے کے جاہلوں والے خیال ہیں۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ان جعلی پیروں کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یہ بڑی بوجھل خاموشی تھی۔ آخر اس خاموشی کی دیوار ٹوٹی اور شبانہ کی گھمبیر آواز سنائی دی۔ ''جو کچھ بھی ہے عمران...... مم...... میرا فیصلہ وہی ہے جو میرے بڑوں کا ہے۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں...... شبانہ کیوں......؟'' عمران تڑپ کر بولا۔

''بس میں نے کہا ہے نا۔ میں اپنے بڑوں کے خلاف نہیں جا سکتی...... وہ میرے لئے جو سوچیں گے، ٹھیک ہی سوچیں گے۔'' شبانہ کی آواز کی تہ میں اشکوں کا بہاؤ تھا لیکن اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

''شبانہ! یہ گھسی پٹی باتیں ہیں...... تم اندر کی بات نہیں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجبور کیا جا رہا ہے شبانہ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔'' شبانہ کے لہجے میں اشکوں کا بہاؤ کم ہو گیا اور مضبوطی کچھ بڑھ گئی۔ وہ جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں پہلے دن سے کہا تھا عمران! میں اپنی ماں اور اپنے بڑوں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ راضی ہو جاتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اب یہ نہیں ہو سکتا عمران۔ تمہیں میری اور اپنی عزت کے لئے خود کو سنبھالنا ہوگا...... سب کچھ بھولنا ہوگا...... اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے...... اگلے مہینے میری شادی ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اب تم دوبارہ یہاں ہمارے پنڈ آؤ...... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا کہ کسی کھوہ میں چھلانگ مار دوں۔ میں سچ کہتی ہوں...... میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

دکھ کی شدت نے عمران کو بے بس کر دیا۔ وہ پردہ ہٹا کر شبو کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ ''خدا کے لئے شبو! ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں سب کچھ ختم کر دوں گا۔ تمہیں کسی اور کی نہیں بننے دوں گا...... شبو...... خدا کے لئے شبو۔''

اس نے اسے جھنجوڑ دیا۔ فرطِ غم میں اس نے اسے اپنے گلے لگانے کی کوشش کی، اپنے اندر چھپانا چاہا۔ وہ ایک دم غیر ہو گئی۔ اس نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ ''چھوڑ دو مجھے...... چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ کراہی۔

عمران نے اسے چھوڑ دیا...... وہ ایک گوشے میں سمٹ گئی...... وہ اپنے چہرے پر دنیا جہان کی التجا سمیٹ کر بولا۔ ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا شبو! میرے ساتھ ایسا مت کرو...... میں نے......''

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ شبانہ کے رشتے دار آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے شبانہ کی احتجاجی آوازیں سن لی تھیں۔ شبانہ کے بڑے ماموں نے گھما کر پستول کا دستہ عمران کے سر پر مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ چھوٹا ماموں ان کے درمیان آ گیا۔ اس نے عمران پر حملہ آور ہونے والوں کو روکا اور گرجا۔ ''اس کو مار دو گے...... تو اپنی بدنامی کا اشتہار لگاؤ گے۔ اس کو ایک موقع دو دفع ہو جانے کے لئے۔ اگر یہ دوبارہ یہاں آیا تو میں تمہارے ساتھ مل کر اس کے ٹوٹے کروں گا......''

حملہ آور بہت بپھرے ہوئے تھے لیکن شبانہ کے چھوٹے ماموں کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔

شبانہ کا چھوٹا ماموں عمران کو کھینچ گھسیٹ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اپنے ایک ساتھی سے کہہ کر اس نے عمران کے سر پر پٹی بندھوائی۔ پھر اسے سمجھایا کہ اس کے لئے اب یہاں سے چپ چاپ چلے جانا ہی بہتر ہو گا۔ ورنہ یہ لوگ اسے ابھی کاٹ کر یہیں کھیتوں میں دبا دیں گے۔

عمران نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''چاچا! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرا لیکن...... میں تیرے کہنے پر چلا جاتا ہوں۔ ہاں، یہ بات تُو بھی اچھی طرح سن لے اور دوسروں کو بھی سمجھا دے، میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگوں نے ہاں کی ہوئی ہے۔ اب اس ہاں کو نہ میں نہیں بدلنے دوں گا۔ تم لوگ شبانہ پر زبردستی کر سکتے ہو، مجھ پر نہیں۔ میں ہر حد تک جاؤں گا۔''

شبانہ کے ماموں نے بے رخی سے کہا۔ ''میں بھی تجھے بتا دوں۔ اگلی دفعہ میں کسی کا ہتھ نہیں روکوں گا۔ اگر تُو اس پنڈ کی جو میں داخل ہوا تو تیرے ٹوٹے ہو جائیں گے۔''

''جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں مجھے ہزار دفعہ مرنا بھی قبول ہے۔'' عمران نے بھی آتشیں لہجے میں کہا۔

پھر وہ گھوئکی گاؤں سے چلا آیا۔

صورتِ حال بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ جہاں جاہلیت اور ناخواندگی کا اندھیرا ہو، وہاں توہم پرستی کا آسیب بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔ گھوئکی گاؤں میں رہنے والی برادری کے لوگوں کو بھی پورا یقین ہو گیا کہ آسمانی بجلی کی نحوست والی بات درست ہے اور اگر اس نوجوان کی شادی برادری میں ہو گئی تو یہ نحوست برادری میں آ جائے گی۔ برادری میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ویسے بھی برادری کے باہر شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

ایک روز جان محمد صاحب نے عمران کو بتایا۔ ''مجھے پتا لگا ہے کہ شبانہ کے ماموؤں نے کسی نام نہاد مولوی سے فتویٰ بھی لیا ہے۔ اس نے بھی یہی کہا ہے کہ آسمانی بجلی والی نحوست پہلوٹی کے بعض بچوں میں ہوتی ہے اور یہ نحوست ایک بچے سے دوسرے بچے اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں جا سکتی ہے...... یہ لوگ تمہارے گاؤں والے واقعے کو بھی بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قاری سلیم کے گھر پر صرف اس لئے بجلی کی آفت آئی کہ تم وہاں رکے تھے اور تم نے کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد بجلی گاؤں کے پاس بیلے کے درختوں پر کوندتی رہی...... جیسے تمہیں ڈھونڈ رہی ہو۔''

''آپ کو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے یا رونا آتا ہے؟'' عمران نے جان صاحب سے پوچھا۔

''دونوں...... لیکن بات وہی جاہلیت کے قصوں کی ہے...... اور واہموں کی ہے۔ تم نے ناگ اور ناگن والی بات تو سنی ہو گی۔ لوگوں کو یقین ہے کہ اگر کوئی ناگ کو مار دے تو ناگن اس کا بدلہ لیتی ہے اور ہر سال ایک خاص وقت میں مارنے والے کو ڈسنے کے لئے آتی ہے...... اور ایسی بے شمار باتیں ہیں یار۔''

عمران نے گہری سانس لی۔ ان جاہلوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اگر بجلی کو مجھ سے ایسی ہی دشمنی ہے تو پھر پچھلے تین چار سال سے میں زندہ کیسے بچا ہوا ہوں؟''

''جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔'' جان صاحب نے کہا۔ ''ان لوگوں کا خیال ہے کہ تم ایک رُوپوش شخص ہو۔ جب آسمان پر بادل ہوتے ہیں تو

تم چھت کے نیچے سے نہیں نکلتے۔ خاص طور سے بارش کے موسم میں۔ کسی دن جب بھی کسی کھلی جگہ پر تمہارا اور بارش کا آمنا سامنا ہوگا، تمہاری موت ہوجائے گی۔''

اگلے دو تین ہفتے میں عمران نے جان صاحب کے ساتھ مل کر بہت کوشش کی مگر اچھے طریقے سے اس معاملے کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ شبانہ کے گھر والے کسی بھی طرح کی بات چیت کا دروازہ بند کر چکے تھے۔ پھر عمران کو پتا چلا کہ شبانہ کی شادی کی تیاری ہورہی ہے۔ اس کی شادی اس کے اسی ماموں زاد سے ہورہی تھی جسے اس نے گھوٹکی گاؤں سے باہر کنوئیں پر دیکھا تھا۔ قدرے چھوٹے سر اور بڑے منہ والا وہ اکھڑ سا لڑکا جو کندھے سے رائفل لٹکائے پھرتا تھا۔

سینے میں بھڑکنے والی آگ اس کے پورے بدن میں پھیلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے شبانہ کے چھوٹے ماموں اشرف کو ایک خط بھی لکھا۔ اس خط میں اس نے لکھا کہ وہ باقیوں کے مقابلے میں سمجھ دار ہے۔ آخر وہ بھی ایسی بیکار کی باتوں پر یقین کیوں کر رہا ہے۔ یہ سب جعلی پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈے والوں کی بیان بازیاں ہوتی ہیں۔ زندگی موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور اگر کوئی اس بات پر بہت پکا یقین رکھتا ہے کہ مجھ پر آسمانی بجلی کی نحوست ہے اور میں گھر میں چھپا رہتا ہوں تو میں اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر کوئی میرا امتحان لینا چاہتا ہے تو لے لے۔ مجھے بارش میں کھڑا کردو۔ ایک دن نہیں، دو دن نہیں، جتنے دن مرضی یہ آزمائش کرلو۔ اگر مجھ پر بجلی گر گئی تو آپ سب لوگوں کی جان مجھ سے چھوٹ جائے گی اور اگر یہ بات بکواس ثابت ہوتی ہے تو پھر آپ لوگوں کو اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔

یہ طویل خط اس نے جان صاحب کے ملازم حسن دین کے ذریعے گجرات میں شبانہ کے چھوٹے ماموں تک پہنچایا...... کئی دن کے انتظار کے باوجود اس کا ذرا سا ردِعمل بھی ظاہر نہیں ہوا۔ شاید جان صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا...... جو لوگ اندھے عقیدے بنا لیتے ہیں، ان کے پاس اپنے عقیدوں کے حوالے سے ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے۔

ایک دن جب جاں گسل بے قراری عروج پر تھی، عمران شاد پورہ پہنچا اور آموں کے باغ میں اپنے پرانے یار راجا سے ملا۔ راجا ابھی تک یہیں باغبان کبیر کے گھر رہائش پذیر تھا۔ اس کے باقی شغل بھی اسی طرح جاری تھے۔ افیم کی نقل و حرکت، گھوڑوں اور کتوں کی سدھائی، شراب نوشی اور طوائف بازی بھی۔ اپنے میزبان کبیر احمد سے راجا کے تعلقات میں وہ پہلے والی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ عمران کو اندازہ ہوا کہ شاید راجا جلد ہی واپس گجرات

جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

راجا، عمران سے تپاک سے ملا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ''بھا راجا! مجھے تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔''

وہ خوش ہوگیا۔ عمران کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر مخصوص انداز میں بولا۔

''یار! اب اگر کوئی ضرورت بتانے لگے ہو تو ''ٹیٹ'' سی بتانا۔ کوئی کنڈم بات نہ کرنا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کوئی زوردار کام ہو۔ راجے کی شان اور تیری شان کے مطابق۔''

''کام تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا وقفے سے بولا۔ ''شبو کی شادی ہو رہی ہے۔''

''اوئے مبارکاں۔ یعنی تیری اور شبو کی شادی۔''

''نہیں راجا! اس کی شادی کسی اور سے ہورہی ہے۔'' عمران نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کنڈم خبر دے رہا ہے۔'' راجا ششدر رہ گیا۔

عمران نے اگلے پندرہ بیس منٹ میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس پر بیتا تھا۔

O......❖......O

شبانہ کی شادی ہو رہی تھی۔ آج اس کی مہندی کی رات تھی۔ گھوٹکی گاؤں کے اس گھر میں سرسوں کے بہت سے دیے جل رہے تھے اور کئی لالٹینیں روشن تھیں۔ گاؤں کی الھڑ مٹیاریں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی اور کبھی کبھی کوئی لڑکی رقص بھی کرنے لگتی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آلو گوشت کی دیگ ابھی ابھی خالی ہوئی تھی اور چھوٹی لڑکیاں اور بڑی عمر کی عورتیں برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھیں۔ اس گھر کے پچھواڑے مکئی کے اونچے کھیتوں میں عمران موجود تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ اس کے رگ و پے میں خون کی جگہ سیال آگ دوڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی، اس کے ساتھ اٹھائیس گولیوں والا میگزین اٹیچ تھا۔ یہ رائفل اسے راجا نے فراہم کی تھی۔ راجا بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے پاس بھی پمپ ایکشن گن تھی۔ ان کا لوڈر تھوڑے ہی فاصلے پر درختوں میں کھڑا تھا۔

''یہ بڑا ٹھیک وقت ہے۔'' راجا نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میرے اندازے کے مطابق گھر میں تین چار سے زیادہ مرد نہیں ہیں۔''

عمران نے جیسے سن کر بھی نہیں سنا۔ اس کا چہرہ خون کے بے پناہ دباؤ سے سرخ تھا۔ اس

نے رائفل کو بے حد مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ رائفل کا لوہا اس کی ہتھیلیوں میں پیوست سا ہو گیا تھا۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ شبانہ کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''عمران! کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہو گا کہ میں کھوہ (کنوئیں) میں چھال مار دوں۔ میں سچ کہتی ہوں، میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہو گا۔''

اسے اپنے گھر والوں کی عزت اپنی جان سے پیاری تھی۔ وہ اس کے لئے جان دے سکتی تھی۔ تو کیا وہ اسے جان دینے پر مجبور کر دے گا؟ کیا اس کا یہ اقدام اسے موت کے اندھیروں میں لے جائے گا؟ وہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اس کی بربادی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑے، آنکھوں میں آنسو لئے اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اسے کہہ رہی ہے...... اپنے قدم روک لو عمران! کچھ باقی نہیں بچے گا اور تمہارے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ میں جان دے دوں گی۔ ہمارا پیار قربانی مانگ رہا ہے۔ ہمیں یہ قربانی دینی ہو گی۔ خدا کے لئے عمران......

رائفل کے دستے پر عمران کی گرفت بہت مضبوط رہی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے رہے لیکن اس کے اندر کی کیفیت بدلنے لگی۔ اس کے غیظ وغضب کو بے بسی کی ایک بلند و بالا دیوار نے گھیر لیا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکے۔ ڈھولک کی مدھم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ لڑکیاں گا رہی تھیں۔ اساں چڑیاں دا چنبہ ہو...... بابل اساں اڈ جاناں۔

راجا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''عمران! یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ مجھے پتا ہے، دو منٹ لگیں گے اور شبو ہماری گڈی میں ہو گی۔''

عمران خاموش رہا۔

''اوئے تُو سوچ کیا رہا ہے؟ کہیں تیرا ارادہ تو ڈانواں ڈول نہیں ہو رہا...... اوئے کھوتے، ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔'' راجا نے عمران کا کندھا جھنجوڑا۔

دونوں کے درمیان ایک نہایت بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پھر عمران نے نہایت عجیب لہجے میں کہا۔ ''نہیں راجے...... میں...... نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

عمران جواب دینے کے بجائے اُٹھ کھڑا ہوا اور لوڈر کی طرف چل دیا۔ راجا کچھ دیر ٹھٹکا رہا پھر وہ بھی اس کے پیچھے لوڈر میں آ گیا۔ اس نے عمران کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''راجا! چلو یہاں سے۔''

اس کے ان چار لفظوں میں کچھ ایسا درد تھا...... اور کچھ ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ راجا کچھ بول نہیں پایا۔ اسے لوڈر اسٹارٹ کرنا پڑا۔ اس نے عمران کو کبھی ایسی گھمبیر کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔

گھوکی گاؤں سے قریباً دو میل دور آنے کے بعد عمران نے راجا کو لوڈر روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے لوڈر روک دیا۔ ''مجھے شراب دو۔'' عمران نے کہا۔

راجا نے انڈین شراب کی بوتل اسے تھما دی۔ اس نے بوتل منہ سے لگائی اور عجب دیوانگی کے عالم میں اس سیال آگ کو سینے میں اُتارتا چلا گیا۔ دو تین سانسوں میں وہ آدھی سے زیادہ بوتل چڑھا گیا۔ اس نے اپنا سر ڈیش بورڈ پر پھینک دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ راجا کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہنا سننا فضول ہے۔ عمران وہی کرے گا جو وہ چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا سا نیچے اُتر آیا۔ الکحل اس پر اثر انداز ہو چکی تھی...... اس نے رائفل لوڈر میں پھینک دی اور اپنے لڑکھڑاتے قدم واپس گھوکی گاؤں کی طرف بڑھائے۔

''کہاں جا رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟'' راجا چلایا۔

وہ ٹوٹی آواز میں بولا۔ ''کچھ نہیں کر رہا۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اس کو برباد نہیں کر سکتا۔ میں تو...... میں تو ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کل جب وہ دوہٹی بنے گی...... لال جوڑا پہنے گی، اس کے ماتھے پر جھومر لگے گا، تو وہ کتنی پیاری لگے گی۔ میں بس ایک بار...... ایک بار اسے دور سے دیکھوں گا اور پھر واپس خوشاب آ جاؤں گا۔ بس ایک بار۔''

''کیسی جھلوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔'' راجا نے اسے ڈانٹا۔ ''اس طرح جائے گا تو وہ تیرا قیمہ کر کے کتوں کو ڈال دیں گے۔''

''تو ڈال دیں۔ میں پہلے کون سا زندہ ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے ہاتھ لہرائے۔

راجا نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ''چل...... چل گڈی کے اندر بیٹھ۔''

"یار! ایسے کیوں کرتے ہو۔ میں کچھ مانگ تو نہیں رہا۔ کچھ چھین تو نہیں رہا۔ میں ایک بار اسے لال کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یار! اب میرا اتنا حق بھی نہیں ہے؟ تم مجھے اتنا بھی نہیں کرنے دیتے۔ یار تم کیسے یار ہو؟" وہ سسک اُٹھا۔

راجا نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور خود بھی اشک بار ہو گیا۔ وہ اسے کھینچ کھینچ کر لوڈر تک لایا۔

عمران لوڈر میں بیٹھ گیا لیکن جب راجا نے لوڈر اسٹارٹ کیا تو وہ دروازہ کھول کر پھر باہر نکل آیا۔

"اب کیا ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"یار! مجھے ایک بار جانے دو۔ بس ایک بار...... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا...... کسی کے سامنے نہیں آؤں گا۔ اپنا منہ چھپا کر رکھوں گا۔ بس دور سے اس کو دیکھوں گا۔"

راجا پھر اس پر جھپٹا۔ "تجھے چڑھ گئی ہے۔ چل بیٹھ گڈی میں اور اگر نہیں تو پھر آ میرے ساتھ...... آ میرے ساتھ...... اُٹھا لیتے ہیں اس کو۔ لے جاتے ہیں کہیں دور۔ دیکھتے ہیں ان میں سے کون مائی کا لال روکتا ہے ہمیں۔" اس نے رائفل پھر عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران نے رائفل تھام لی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت رائفل پر بے ساختہ سخت ہوتی چلی گئی۔ چہرہ، انگارہ نظر آنے لگا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ اس کی نگاہ دور گھونکی کی مدھم روشنیوں پر تھی۔ وہ روشنیاں جہاں ایک گھر کے اندر مہندی کے گیت گائے جا رہے تھے، ایک ماں اپنی بیٹی کی بلائیں لے رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں آتشیں آنسو جھلملانے لگے۔ تب عجیب ہیجانی انداز میں اس نے رائفل کا رخ کئی...... کلومیٹر دور نظر آنے والی ان روشنیوں کی طرف کیا اور ٹریگر دباتا چلا گیا۔ بیرل سے شعلے نکلے اور دھماکوں سے فضا گونج اُٹھی۔ تاریک سناٹا لرز گیا۔ گولیاں لامتناہی اندھیرے میں کہیں گم ہو گئیں۔ تب اس نے وحشت بھرے انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ سرخ ڈبیا نکالی جو اسے جان صاحب نے دی تھی۔ اس میں خوبصورت انگوٹھی تھی۔ اس نے ڈبیا زمین پر پھینکی اور ایک پورے برسٹ سے اسے اُڑا کر رکھ دیا۔ تب اس نے رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر اندھا دھند ایک درخت کے تنے پر مارا۔ وہ شاید اسے مزید مارتا اور برباد کر کے رکھ دیتا مگر راجا نے اسے سنبھال لیا۔ رائفل اس سے چھینی اور اسے کھینچتا ہوا لوڈر تک لے آیا۔ عمران کی آنکھوں سے آتشیں آنسو اب تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر لوڈر کے ڈیش بورڈ پر پٹخ دیا۔ راجا نے لوڈر کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

...... صبح ہونے تک وہ لوگ واپس خوشاب پہنچ گئے لیکن عمران جیسے واپس آ کر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا صرف بت باقی ہے، روح وہیں گھونکی گاؤں کے آس پاس کہیں رہ گئی ہے۔ ڈھولک کی تھاپ میں گم ہو گئی ہے، یا لڑکیوں کے گیتوں میں، یا مہندی کی خوشبو میں۔

وہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی بوجھ بن گئی تھی اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ماں تو بہت پہلے ہی اس سے بچھڑ گئی تھی، اب وہ ہستی بھی بچھڑ گئی تھی جس نے اس میں پھر سے زندہ رہنے کی امنگ جگائی تھی۔ اب کیا کرنا تھا جی کر...... وہ ہر وقت یہی سوچ رہا تھا۔ راجا کی تسلیاں، جان صاحب کی محبت اور خالہ صدیقہ کی شفقت کچھ بھی اس کے دکھ کا مداوا نہیں تھا۔ ہاں، اب وہ اور جینا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اب سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ شبانہ کو اس شادی کے لئے اس طرح مجبور کیا گیا تھا کہ بالآخر اس کے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ خاندان، برادری کا زور چل گیا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک روز خود پر مٹی کا بہت سا تیل چھڑک کر ماچس ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اگر شبانہ نے شادی کے لئے ہاں نہیں کی تو وہ ابھی اسی وقت خود کو جلا کر کوئلہ کر لے گی۔ شبانہ نے اس سے ماچس لے لی تھی اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

بہرحال اب یہ سب کچھ ماضی بن چکا تھا۔ حال یہ تھا کہ عمران زندگی اور موت کے درمیان لٹک گیا تھا۔ سانس ایک تیز زہریلی کٹار تھی جو ہر پل اس کے سینے کو چیر رہی تھی۔ پھر بھی شاید بہت دور، دل کی اتھاہ گہرائی میں کہیں آس کا دیا ٹمٹماتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تک سانس تب تک آس، کرب کے بے رحم پنجوں میں تڑپتے ہوئے وہ کبھی کبھی سوچتا تھا...... کیا کوئی انہونی ہو سکتی ہے؟ کیا کسی وقت شبو اس کی طرف پلٹ سکتی ہے؟ انہونیوں کی خواہش پالنا شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

شبانہ کی شادی کو تین چار ہفتے گزر گئے تھے جب ایک اور اندوہناک سانحہ ہوا اور ہر امید ختم ہو گئی۔ اس سانحے نے عمران کی زندگی یکسر اندھیر کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب زندگی کا زہر مزید پینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔ ایک دن صبح سویرے جان انکل کے ملازم حسن دین نے عمران کو روتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ شبانہ اور اس کا شوہر حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

عمران کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کی زندگی کے لئے تو اس

نے اتنا بڑا جہنم اپنے سینے میں اُتارا تھا۔ وہ کیسے چلی گئی؟ وہ کیسے مرگئی؟ شروع میں پتا چلا کہ رائفل صاف کرتے ہوئے رائفل کا برسٹ چلا اور دونوں میاں بیوی موقع پر ہی دم توڑ گئے لیکن پھر رات کے وقت اصل تفصیل سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ شبانہ کے سخت گیر شوہر نے اس سے جھگڑا کیا تھا۔ اس نے بے قصور شبانہ پر بدچلنی کا الزام لگایا اور پھر اسے بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شعلہ مزاج بھتیجے کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ اسی بات پر چچا بھتیجا میں شدید جھگڑا ہو گیا۔ شبانہ کے شوہر سجاد نے پستول نکال لیا۔ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر اشرف نے دیوار سے آٹھ ایم ایم رائفل اُتار لی۔ روتی بلکتی شبانہ، شوہر اور ماموں کے بیچ آ گئی۔ سخت کھینچاتانی کے دوران میں آٹھ ایم ایم رائفل چل گئی۔ اس کی ایک ہی گولی شبانہ اور سجاد دونوں کے جسم سے پار ہو گئی۔ شبانہ نے تو وہیں اپنے کمرے میں دم توڑ دیا...... سجاد گجرات کے سرکاری اسپتال میں پہنچ کر ختم ہو گیا۔ عمران دو تین دن تک اپنے ہوش میں ہی نہیں رہا۔ وہ نشے میں غرق تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نے یہ دو تین دن کہاں اور کس حال میں گزارے ہیں۔ آہ...... یہ کیا انجام تھا اس کی محبت بھری داستان کا۔ وہ داستان جو دریائے چناب کے کنارے کی ہواؤں میں پور پور بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اپنے شباب کو پہنچی تھی۔ سب کچھ کس طرح اور کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا۔ عمران نے وہ فیصلہ کر لیا جو کئی ہفتے سے اس کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی شبانہ کے پاس پہنچ جائے گا۔ وہ اس دنیا میں نہیں مل سکے شاید اُس دنیا میں قدرت کو ان پر رحم آ جائے۔

O......❖......O

یہ وہ دن تھے جب وہ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اپنی جان لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنے حوالے سے ایک عجیب سی بے حسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ لباس کے علاوہ وہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے جانوروں کی طرف سے بھی وہ بالکل غافل ہو چکا تھا۔ اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی کسی کام میں۔ وہ ہر چیز کو اوپری اور الوداعی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ان کا سرکس سرگودھا میں تھا۔ ایک روز وہ اپنے شامیانے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ سرکس میں کام کرنے والی نئی لڑکی شاہین اس کے پاس آئی۔ وہ چند ہفتے پہلے جمناسٹک کے شعبے میں بھرتی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عمران! تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ دفتر میں کیا ہوا ہے؟''

عمران اپنی سوچی سوچی آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔

''گولڈن سرکس کے لوگوں نے جان صاحب سے جھگڑا کیا ہے۔ گالی گلوچ تک نوبت آئی ہے۔ وہ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں؟''

''وہی پرانی بات۔ ان علاقوں میں ہمیں کام نہیں کرنے دیں گے۔ اگر ہم کریں گے تو پچھتائیں گے۔''

''جان انکل ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔'' عمران نے آنکھیں بند کر کے گہرا کش لیا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا۔

......مگر دو دن بعد وہ لاتعلق نہیں رہ سکا۔ شام کا وقت تھا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ اتوار کی وجہ سے کافی رش بھی تھا۔ عمران کے کانوں میں یہ اُڑتی اُڑتی سی خبر پہنچی کہ گولڈن سرکس والوں نے اپنے کچھ لوگ تماشائیوں کے روپ میں اس شو میں بھیج دیئے ہیں اور وہ ہنگامہ کریں گے۔ بہرحال ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والا ہر دلعزیز فن کار ''بادشاہ'' موجود نہیں ہے۔ اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔ موت کے کنوئیں پر موجود سیکڑوں تماشائی ہلڑبازی کے موڈ میں ہیں۔ اس بات کا پتا اگلے روز چلا کہ بادشاہ کو گراں معاوضہ دے کر گولڈن سرکس والوں نے بھرتی کر لیا تھا اور یہ کام اس طرح کیا گیا تھا کہ جان صاحب کے اسٹار سرکس میں زوردار ہنگامہ کا ماحول بن سکے۔

جان صاحب مصیبت میں تھے اور ان کے عمران پر بہت سے احسان تھے۔ عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ کبھی کبھی بادشاہ کی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کنوئیں کے اندر نیچے ہی نیچے ایک دو چکر لگانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج وہ بادشاہ کی جگہ لے اور کنوئیں کے اندر موٹر سائیکل چلائے۔ یہ بڑا سنسنی خیز خیال تھا۔ شاید ایک دو ماہ پہلے تک وہ ایسی خطرناک حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اب اس کی ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ وہ خود کو زندگی سے دور اور موت کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ مرنا چاہ رہا تھا اور جب مرنا تھا تو پھر زندگی جانے کا خوف کیا......؟

اس نے ڈریسنگ روم میں جا کر کاسٹیوم پہنا اور کنوئیں میں آ گیا۔ تب تک ہلچل واضح نظر آنے لگی تھی۔ تماشائی شور مچا رہے تھے۔ کنوئیں کے اندر سگریٹوں کے خالی پیکٹ، پھلوں کے چھلکے اور جوس کے ڈبے وغیرہ پھینکے جا رہے تھے۔ جان صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے نوآموز شاگرد انور کو ہلکے پھلکے تماشے کے لئے

آمادہ کر رہے ہیں مگر وہ سخت خوف زدہ ہے۔

عمران نے عجیب ہیجانی انداز میں کہا۔ ''عباس بھائی! یہ کام میں کروں گا۔''

عباس حیرت سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔ عمران نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو عباس سامنے آ گیا۔ ''نہیں عمران! میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر جان صاحب کو آ جانے دو۔''

عمران نے اس بات کا جواب یوں دیا کہ ریس گھما کر ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل کا کلچ چھوڑا اور اسے لہراتا ہوا، عباس کے پہلو سے نکال لے گیا۔ اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اردگرد کی ہر شے اسے بے معنی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی موت بھی اور یہ خیال بھی کہ وہ شدید زخمی ہو جائے گا۔ اسے اس کھیل کی بنیادی تکنیک کا پتا تھا۔ جتنی زیادہ رفتار، اتنی زیادہ بلندی اور اتنی ہی زیادہ کنوئیں کی دیواروں پر پہیوں کی ''گرپ''۔ وہ بے خوف ہو کر رفتار بڑھاتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک عجیب تجربہ تھا، وہ ایک دیوانی کوشش تھی اس نے سنا تھا کہ ڈر سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔ آج یہ کہاوت عملی شکل میں اس کے سامنے تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنی پوزیشن کو دیکھا تو خود ہی حیران رہ گیا۔ اس کی برق رفتار موٹر سائیکل کنوئیں کے بالائی کنارے سے بس چار پانچ فٹ ہی نیچے رہ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کے زبردست ''مومنٹم'' سے چوبی کنوئیں کی دیواریں ہل رہی تھیں۔ تماشائی دم بخود تھے۔ عمران اندھا دھند رفتار بڑھاتا ہوا موٹر سائیکل کو آخری حد تک لے گیا۔ اب وہ بالائی کنارے کے بالکل ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ تماشائی تالیاں پیٹنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے گرا تو سیدھا کنوئیں کی تہ میں گرے گا اور پھر شاید اُٹھ نہ سکے لیکن یہ متوقع سانحہ بھی اسے خوف زدہ کرنے میں ناکام تھا۔ اس نے ''ریس'' کے گھماؤ کو ایک جگہ ایڈجسٹ کرنے کے بعد ''بادشاہ'' کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلا دیئے۔ موٹر سائیکل اسی طرح آندھی کی رفتار سے دوڑتی رہی...... عمران اس ایکشن کو بہت مشکل سمجھا کرتا تھا مگر یہ اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا...... یا شاید عمران کی بے خوفی نے اسے آسان بنا دیا تھا۔ بادشاہ اس اسٹیج پر کچھ اور پوز بھی بناتا تھا لیکن وہ عمران کے بس میں نہیں تھے۔ عمران جو کچھ کر چکا تھا، وہ تماشائیوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ رفتار کم کی اور پھر موٹر سائیکل کو تہ میں لے آیا۔

جان محمد صاحب، عباس اور دیگر لوگ ہکا بکا تھے۔ جان صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا تاہم اس غصے کی تہ میں محبت بھی شامل تھی۔ ان کا سگریٹ مسلسل ان کے ہونٹوں میں دبا

ہوا تھا۔

تماشائیوں کی ساری توقعات تو پوری نہیں ہوئی تھیں۔ بہر حال وہ منتشر ہونے لگے۔ یقیناً یہ ساری صورتِ حال ان لوگوں کے مفاد میں نہیں تھی جو تماشائیوں کو توڑ پھوڑ پر اکسانا چاہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ سنبھل گیا ہے تو انہوں نے اپنے طور پر گڑبڑ کر دی۔ سرکس کا ایک سینئر فنکار ''سینڈو'' بھاگتا ہوا آیا اور اس نے جان صاحب کو بتایا۔ ''سر! ایک بندے نے پنڈال کے پیچھے خیمے میں آگ لگا دی ہے۔ چوکیداروں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ کچھ لوگ اسے چھڑانے کے لئے جھگڑا کر رہے ہیں۔''

یہی وقت تھا جب اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔ ''یہ وہی لوگ ہیں جی۔'' سینڈو نے اُڑی اُڑی رنگت کے ساتھ کہا۔

جان صاحب اور دیگر لوگ موقع کی طرف لپکے۔ عمران بھی ان کے ساتھ تھا۔ پنڈال کے عقب میں آگ بھڑک رہی تھی اور کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ان میں گولڈن سرکس والوں کے غنڈے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس دن عمران پر عجیب سی وحشت طاری ہو گئی۔ وہ کم ہمت تو پہلے بھی نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کرنا اور خم ٹھونک کر میدان میں آنا جانتا تھا...... لیکن اس روز وہ اس انداز سے لڑا کہ سب دنگ رہ گئے۔ وہ دیوانہ وار گولڈن سرکس کے غنڈوں میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے کئی افراد کے سر پھٹے اور دو تین کی ہڈیاں بھی ٹوٹیں۔ پھر ہاکی ٹوٹ گئی اور عمران کے ہاتھ میں ایک چاقو آ گیا۔ یہ چاقو بھی ہاکی ہی کی طرح مخالفین کے لئے مہلک رہا۔ عمران کے بازو پر ایک گہرا زخم آیا۔ اس زخم کے بدلے اس نے کم از کم تین افراد کو زخمی کیا۔ اسی دوران میں پولیس کود پڑی۔ پولیس اہلکاروں نے اندھا دھند ہوائی فائرنگ کر کے متحارب گروہوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔

بعدازاں عمران کو بھی دیگر زخمیوں کی طرح مرہم پٹی کے لئے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں سے پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ جان صاحب نے اسے دو دن سے زیادہ تھانے میں نہیں رہنے دیا اور پرچے سے اس کا نام خارج کرا کے واپس لے آئے۔

دو دن بعد عمران نے ایک اور حیران کن کام کیا۔ وہ کسی کو بھی بتائے بغیر خاموشی سے گولڈن سرکس والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی شلوار کے نیفے میں بھرا ہوا بریٹا پسٹل تھا اور کمر سے گولیوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دندناتا ہوا گولڈن سرکس کے مالک کے دفتر میں جا گھسا۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا اور جب بندہ ایسا چاہتا ہے تو پھر دیواریں گرتی ہیں۔ بند

گلیوں سے رستے نکلتے ہیں اور لوہا ہاتھوں میں موم ہوتا ہے۔عمران کی اس آمد نے گولڈن سرکس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔عمران نے سرکس کے مالک ''چودھری جی'' سے کہا۔''بادشاہ نے جان محمد صاحب سے ستر ہزار روپیا ایڈوانس لیا ہوا ہے اور اپریل تک کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔اگر آپ اس کو اپنے پاس رکھو گے تو پھر کام بگڑ جائے گا۔''

جو کام شاید بہت سی گفتگو اور میٹنگز وغیرہ کے بعد بھی نہیں ہوسکتا تھا، وہ صرف دس منٹ میں ہوگیا۔عمران، جان صاحب کے پرانے ملازم بادشاہ کو اپنے سرکس واپس لے آیا۔

عمران کی اس جرأت اور دلیری نے جان صاحب اور حاجی اشفاق کو ششدر کر دیا...... جان صاحب کے نزدیک پہلے بھی عمران کی بہت اہمیت تھی، اب یہ اہمیت اور بڑھ گئی۔ وہ اسے مزید ذمے داریاں سونپنا چاہتے تھے لیکن عمران جانتا تھا کہ وہ تو پہلی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ جانوروں سے اس کی رغبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اپنے اردگرد کے لوگوں سے وہ بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔وہ تو مرنے کی جگہ ڈھونڈتا پھرتا تھا......

اگلے چند دن میں اس نے کئی ایسے کام کئے جن میں مرنے کا خطرہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔سرگودھا کے ایک پوش علاقے میں بگڑے تگڑے امیرزادے، موٹر سائیکلوں کی ایک خوفناک ''ریس'' لگاتے تھے۔عمران نے اس ریس میں حصہ لیا اور حیران کن طور پر نہ صرف محفوظ رہا بلکہ دوسرا انعام بھی جیت گیا۔

پھر اس نے جان صاحب کے ایک اور پرانے حریف استاد چھیمے تھیٹر والے کو للکارا اور اس کے دو غنڈوں کو بُری طرح مار پیٹ کر اسپتال پہنچا دیا۔اس پھڈے کا نتیجہ بھی فوری اور مفید نکلا۔استاد چھیمے کی طرف ڈوبا ہوا جان صاحب کا ایک لاکھ روپیا نکلنے کی قوی امید پیدا ہو گئی......اور اس رقم کی پہلی قسط تقریباً تیس ہزار روپے جان صاحب کے ہاتھوں میں بھی پہنچ گئے۔

......اس کے بعد ایک روز عمران نے راجا کو ساتھ لیا اور دندناتا ہوا شیخوپورہ میں اپنے گاؤں جھنڈووال پہنچ گیا۔اس کی قمیص کے نیچے بریٹا پستول لگا ہوا تھا اور تیز دھار چاقو تھا جبکہ راجا کی گرم چادر کے نیچے چھوٹی نال کی رائفل چھپی ہوئی تھی۔نومبر کی وہ سرد ابر آلود رات گاؤں کے چودھری سجاول پر بہت بھاری گزری۔عمران اور راجا حویلی کی پچھلی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ کچھ دیر تک پرالی کے ڈھیر میں دبکے رہے پھر ایک پہرے دار کے سر پر بندوق کا وزنی دستہ مار کر اسے نیم جان کیا اور اس کی مشکیں کسنے کے بعد سیدھے اس کمرے میں جا پہنچ جہاں چودھری سجاول اپنی فربہ اندام بیوی کے ساتھ سو رہا تھا۔ یہی شخص تھا جس

نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر اس کی ماں کو بھی سب کچھ چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جانے پر مجبور کر دیا۔اپنے لاڈلے بیٹے کو ایک بے حقیقت نحوست سے بچانے کے لئے ان میاں بیوی نے عمران کی ہنستی بستی زندگی کو زہرناک حقیقتوں کے حوالے کیا تھا اور آج وہ خود عمران کے حوالے تھا۔

راجا نے وسیع کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور عمران نے پستول کی نال چودھری سجاول کی پیشانی سے لگا دی۔شوگر کے مرض نے ہٹے کٹے چودھری سجاول کو خزاں رسیدہ پتے جیسا کر رکھا تھا۔وہ لرزنے لگا۔اس کی فربہ اندام بیوی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولی۔''یہاں سے جو کچھ لے کر جانا ہے لے جاؤ، پر ہمیں کچھ نہ کہو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنے طلائی کڑے اُتارنے لگی۔

عمران نے چہرے سے مفلر ہٹاتے ہوئے کہا۔''مجھے پہچان چودھرائن! میں یہاں کچھ لوٹنے نہیں آیا۔اس کا حساب لینے آیا ہوں جو تم لوگوں نے لوٹا ہے۔ بتاؤ کیا کیا تھا تم لوگوں نے میری مسکین ماں کے ساتھ؟ بتاؤ کس طرح انگوٹھے لگوائے تھے اس سے زمین کے کاغذوں پر......اور مجھے بتاؤ کہاں پھینکا تھا اسے؟''

چودھرائن ہکی بکی عمران کو دیکھ رہی تھی۔ چودھری نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک ہی زوردار جھانپڑ نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے۔وہ پختہ دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ عمران کے قدموں میں گر کر کراہنے لگا۔عمران نے اسے سیدھا کر کے بٹھایا اور اپنے سوال دہرائے۔ یہ گفتگو قریباً پندرہ منٹ جاری رہی...... اس دوران میں حویلی کے اندر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ چودھری کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ چودھری سجاول اور اس کی بیو نے رو رو کر عمران کو یقین دلایا کہ انہیں اس کی والدہ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہاں...... چودھری سجاول نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اپنے ایک ملازم کے ذریعے اس نے شریفاں بی بی کی زمین خود ہی خریدی تھی۔ وہ اسی وقت زمین کی رجسٹری ایک آہنی الماری میں سے نکال کر لایا اور عمران کے حوالے کر دی۔عمران اپنے ساتھ کچھ اسٹامپ پیپر لے کر آیا تھا۔اس نے اسی وقت ان اسٹامپ پیپرز پر چودھری سجاول کے سائن انگوٹھے کروا لئے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد چودھری کو امید پیدا ہونے لگی کہ اس کی جان بخشی ہو جائے گی مگر عمران کے دل و دماغ میں چودھری کے لئے زہر کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔وہ آج اس کی دو چار ہڈیاں توڑے بغیر یہاں سے جانے والا نہیں تھا۔

چودھری نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔''میں بیمار ہوں۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے

گا...... یہ سب کچھ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

عمران نے کہا۔''جو کچھ پچھلے ایک گھنٹے سے تم پر بیت رہی ہے، وہ مجھ پر کئی سال سے بیت رہی ہے۔ مجھے بھی ہر گھڑی یہی لگتا رہا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔''

چودھری بولا۔''میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ ہم نے اپنے بچے کی محبت میں تمہیں تمہاری ماں سے وکھرا کر دیا۔ شاید اسی کی سزا مجھے اس ظالم بیماری کی شکل میں ملی ہے۔ میری ہڈیاں کھر کھر کر میرے پیشاب کے ساتھ نکلتی جاتی ہیں۔ میں نے اب زیادہ وقت نہیں جینا۔ تم میرا خون اپنے سر نہ لو۔''

عمران بولا۔''ابھی تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہارے جیسے شیطان کی ٹانگیں قبر میں چلی جائیں تو بھی وہ اپنی آخری شیطانیوں سے باز نہیں آتا...... گجرات سے کچھ لوگ میرے بارے میں سن گن لینے کے لئے یہاں آئے تھے۔ وہ مجھے اپنی دھی کا رشتہ دینا چاہتے تھے۔ تم نے اور تمہاری اس ''بھینس بیوی'' نے بڑی اچھی طرح ان کو اطمینان دلایا...... میری تعریفوں کے پل باندھے اور میرے رستے کے سارے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چن لئے۔ یہی کیا نا تم دونوں نے؟''اس کے لہجے میں طنز کی تیز کاٹ تھی۔

چودھری کا رنگ جو تھوڑی دیر کے لئے نارمل ہوا تھا پھر ہلدی ہو گیا۔ اس کی بیوی چاپلوسی کے انداز میں عمران کو ''عمو پتر'' کہنے لگی اور منت ترلے میں مصروف ہو گئی۔

تب اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ چودھری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا۔ پھر وہ یکا یک ایک طرف کو جھکتا چلا گیا۔

''ہائے میں مری۔''اس کی بیوی پکاری اور دوڑ کر الماری کی طرف گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چودھری کی زبان کے نیچے گولی رکھی۔ تب تک چودھری تقریباً بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ کراہی۔''اسے دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔ اسے اسپتال لے جاؤ۔''

عمران نے پستول چودھرائن کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔''ہم اسے ماریں گے نہیں تو بچائیں گے بھی نہیں۔ اپنے پتر کو بلاؤ، وہی اس کا کچھ کرے گا اور ایک اور بات پورے دھیان سے سن لو، اگر یہاں ہمارے بارے میں کسی کو پتا چلا تو تیری اور تیرے پتر کی خیر نہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو، ہم تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔''

''نہیں...... میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔''چودھرائن نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے، بلاؤ جس کو بلانا ہے۔'' راجا نے کہا۔ عمران اور راجا دونوں نے اپنے

ہتھیار چھپا لئے۔ عمران نے پہلے کی طرح مفلر میں اپنا منہ سر لپیٹ لیا۔ چودھرائن نے اپنے پتر کا نام لے کر دہائی دی۔''نیازے...... نیازے جلدی آؤ۔ تمہارے پیو کو کچھ ہو گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی چوپٹ کھول دیا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ نیازے کا کمرا کہیں پاس ہی ہے۔ چودھرائن کی دوسری آواز پر ہی نیازا ہکا بکا وہاں پہنچ گیا۔ وہ عمران ہی کا ہم عمر تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ یقیناً بستر سے نکلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی جواں سال بیوی بھی تھی۔ وہ بھی سر پاؤں سے ننگی تھی۔ جب اس نے کمرے میں دو غیر مردوں کو دیکھا تو جلدی سے اپنا سر ڈھانپنے کی کوشش کی۔

چودھری کو بے ہوشی کے عالم میں پڑے دیکھ کر ہی نیازے اور اس کی بیوی کو اندازہ ہو گیا کہ اباجی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک دم کھلبلی سی مچ گئی۔ ملازموں کو آوازیں دی گئیں اور بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ اس افراتفری میں کسی کو عمران اور راجا کی طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ جب بے ہوش چودھری سجاول کو ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی، عمران اور راجا وہاں سے کھسک آئے...... اور پھر اگلے چند گھنٹوں میں واپس خوشاب پہنچ گئے۔

چوتھے دن راجا ہی کی زبانی عمران کو یہ اطلاع ملی کہ چودھری سجاول دل کے اس شدید دورے سے جانبر نہیں ہو سکا...... اور انجام کو پہنچ گیا ہے۔

ان دنوں عمران کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی اس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا تھا۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ اپنی زندگی تو ختم کر لے لیکن اس طریقے سے کہ کوئی اسے حرام موت قرار نہ دے۔ یہی پراگندہ خیالات تھے جن کے زیر اثر وہ اپنی صحت و سلامتی کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گیا تھا اور خطرناک ترین کام بھی کر گزرتا تھا۔ ایک روز وہ موت کے کنوئیں میں اندھا دھند موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گر کر سخت زخمی بھی ہوا اور اسے دس بارہ روز اسپتال میں گزارنا پڑے لیکن اس کے طرزِ زندگی پر کوئی اثر پڑا...... اور نہ اس کی سوچوں میں کوئی فرق آیا۔ اسپتال میں قیام کے دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں آیا کہ شاید چودھرائن اور اس کے پتر نیازے کی طرف سے کسی طرح کا کوئی ردِعمل ظاہر ہو لیکن حیران کن طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یوں لگا کہ وہاں چودھری سجاول کی حویلی میں کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ غالباً چودھرائن نے بھانپ لیا تھا کہ عمران نے جو کچھ کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔ وہ خاوند سے تو محروم ہو ہی چکی تھی، اب بیٹے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے دم سادھ لیا

تھا۔

عمران کو اسپتال سے آئے ہوئے پانچ چھ روز ہوئے تھے، جب ایک انگریز پروفیسر صاحب، جان محمد صاحب کے ہاں آئے۔ وہ پچاس پچپن برس کے صحت مند شخص تھے...... فرنچ کٹ داڑھی اور عینک ان کے چہرے کا حصہ تھی۔ ان کا پورا نام تو کچھ اور تھا مگر جان صاحب انہیں مسٹر رچی یا رچی صاحب کہتے تھے۔ رچی صاحب اپنے ساتھ ایک خوفناک سینٹ برنارڈ کتا بھی لائے تھے۔ اس کا وزن سو کلو کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کے پورے جسم پر بال اور آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔

جان صاحب نے عمران کو حیران کرتے ہوئے بتایا۔ ''رچی صاحب تمہارے لئے ہی یہاں آئے ہیں۔''

''میرے لئے؟''

''ہاں...... یہ تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے جب تم ٹائیگر کو ''ٹرینڈ'' کر رہے تھے، عباس نے تمہاری ویڈیو فلم بنائی تھی...... یہ فلم کسی طرح اسلام آباد...... میں مسٹر رچی تک پہنچی۔ اس کے بعد اور بھی کچھ لوگوں نے یہ فلم دیکھی۔ پچھلے مہینے مسٹر رچی نے اسلام آباد سے عباس سے رابطہ کیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کام کے سلسلے میں عباس راولپنڈی تو جا ہی رہا تھا، اس نے رچی صاحب سے ملاقات کا پروگرام بھی بنا لیا۔ وہاں رچی صاحب اور ان کے دو دوستوں نے عباس سے تمہارے بارے میں بہت سی معلومات لیں۔ یہ لوگ جانوروں کے ساتھ تمہارے رویے اور تمہارے ساتھ جانوروں کے رویے سے بھی زیادہ حیران ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب رچی صاحب خود یہاں موجود ہیں۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''بس تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں کوئی عجوبہ ہوں؟'' عمران کا لہجہ روکھا تھا۔

''نہیں...... لیکن جو کچھ تمہارے اندر ہے، وہ ضرور عجوبہ ہے۔ جس طرح یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، اسی طرح رچی صاحب اور ان کے دوستوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔''

رات کو ایک پُر تکلف کھانے پر رچی صاحب سے عمران کی ملاقات ہوئی۔ عمران اس صورتِ حال سے بیزار تھا مگر جان صاحب کے کہنے پر اس نے رچی صاحب کو تفصیلی انٹرویو دیا۔ رچی صاحب کافی عرصے سے پاکستان میں مقیم تھے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتے

تھے...... ان کے کچھ سوالوں کے جواب عمران نے تفصیل سے دیئے، کچھ کو وہ گول کر گیا۔

رچی صاحب نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ''عمران! تمہیں اپنے ساتھ جانوروں کے خاص رویے کا پتا پہلی بار کب چلا؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں جی۔ میں نے آپ سے ماجھاں نامی عورت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا سرکش گھوڑا ''ہیرا'' تھا۔ کوئی اسے سنبھال نہیں پاتا تھا مگر میں نے تھوڑی سی کوشش سے اسے سنبھال لیا۔ اس وقت مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہوا۔''

''کیا تمہیں اپنے بچپن کی کوئی ایسی بات یاد ہے جب کسی جانور نے تمہارے ساتھ خاص رویے کا مظاہرہ کیا ہو؟''

عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ رچی صاحب نے اس طرز کے اور کئی سوال عمران سے پوچھے۔ پھر ٹی وی اسکرین پر وہ ویڈیو دیکھی گئی جس میں عمران، ٹائیگر اور چند دوسرے جانوروں کو تربیت دیتے ہوئے نظر آتا تھا۔ اس ویڈیو کو دیکھنے کے دوران میں رچی صاحب نے کئی بار ''ونڈر فل اور امیزنگ'' کے الفاظ استعمال کئے۔

اگلے روز عمران کا عملی امتحان تھا۔ پنجرے میں بند خوفناک سینٹ برنارڈ کتے کو ٹریننگ والے احاطے میں چھوڑا گیا۔ اب عمران کو اس احاطے میں داخل ہونا تھا۔ عمران کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور صورتِ حال میں کیا تبدیلیاں رُونما ہو چکی ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا لیکن اس کا ہلکا سا احساس عمران کی چھٹی حس کو ضرور ہو رہا تھا...... وہ مختصر احاطے میں داخل ہوا۔ اس کے چاروں طرف دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگائے گئے تھے۔

سینٹ برنارڈ کا انداز خطرناک تھا۔ وہ اپنی دُم کو تیزی سے گردش دے رہا تھا اور اس کے چوڑے جبڑے میں سے نکیلے دانتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ عمران نے اسے پچکارا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کتا چند قدم آگے بڑھا عمران نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور اسے شانت رہنے کا اشارہ دیا۔

وہ ذرا سا جھجکا لیکن اگلے ہی لمحے بھیانک انداز میں عمران پر جھپٹا۔ عمران کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لحظے کی دیر ہوتی تو اس کا نرخرہ ادھڑ چکا ہوتا۔ جانور کے بالوں کا لمس اُس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اس کی حیوانی بُو اس کے نتھنوں میں گھسی۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ بڑے تہلکہ خیز تھے۔ بپھرا ہوا کتا عمران کو ذرا خاطر میں نہیں لایا۔ یہ صرف عمران کی غیر معمولی پھرتی تھی جس نے اسے کتے کے تند و تیز حملوں سے بچایا...... جان صاحب کے گارڈز نے

رائفلیں تان لی تھیں۔ جان صاحب چلا رہے تھے۔ ''باہر آ جاؤ...... جلدی کرو۔''

رچی صاحب بھی کچھ اسی طرح کا واویلا کر رہے تھے۔ عمران نے ہنگامی راستہ استعمال کیا اور ٹریننگ والے احاطے سے باہر آ گیا۔ عمران حیران تھا اور اس سے بھی زیادہ دیگر لوگ حیران تھے۔ اسی احاطے میں انہوں نے ٹائیگر جیسے خطرناک جانوروں کو عمران کے اشارے پر چلتے اور اس کی گود میں سر رکھتے دیکھا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں عمران پر یہ انوکھا انکشاف ہوا کہ اس کے اور جانوروں کے درمیان جو ایک غیر معمولی و خصوصی تعلق تھا، وہ ختم ہو چکا ہے یا بہت ماند پڑ چکا ہے۔ وہ ٹائیگر کے پاس گیا، سفید ریچھ کے پاس گیا، اسٹار سرکس کی معروف ہتھنی نازو کے پاس گیا، ہر جگہ اس کا یہ احساس قوی تر ہوا کہ صورتِ حال بدل چکی ہے۔

دوسرے روز رچی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے عمران سے تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارے بارے میں جو اندازے لگائے تھے، وہ درست ثابت ہوئے ہیں۔ بے شک کل تم کسی بھی طرح کی کارکردگی دکھانے میں ناکام ہوئے ہو...... لیکن تمہاری یہ غیر متوقع ناکامی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے اندر وہ خاص صلاحیت موجود ہے جس کے بارے میں، مَیں اور میرے ساتھی غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس صلاحیت کا کچھ عرصے کے لئے اوجھل ہو جانا ہی اس کی موجودگی کا ثبوت ہے۔''

''میں سمجھا نہیں جی۔'' عمران نے کہا۔

پروفیسر رچی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ ''جانوروں کے ماہر اور نفسیات دان بڑے عرصے سے یہ بات مانتے ہیں کہ کچھ انسانوں اور جانوروں میں ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی ایک طرح کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کی مقناطیسیت حیوانوں کی مقناطیسیت سے ایک جدا ''لنک'' بنا لیتی ہے۔ عام طور پر یہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے مگر اپنی کوشش اور محنت سے اسے بہت بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس صلاحیت کو Animal Mastery کہا جاتا ہے۔ مسمریزم سمجھتے ہو تم؟'' رچی صاحب نے آخر میں عمران سے پوچھا۔

''جی...... جسے ہپناٹزم کہتے ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔ عرصہ پہلے فرانز مسمر نام کا شخص ہوا کرتا تھا۔ اسی کے نام سے مسمریزم کا لفظ نکلا۔ فرانز مسمر نے بھی اسی خاص قسم کی کشش کی بات کی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کشش سے حیران کن نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جدید دور میں بھی جانوروں کو ہپناٹائز کرنا

ایک ٹھوس حقیقت کی طرح جانا جاتا ہے۔'' اس کے بعد پروفیسر رچی نے اس حوالے سے چند ایک مثالیں دیں۔

پروفیسر رچی کی کہی ہوئی باتیں بہت اہم اور توجہ طلب تھیں لیکن عمران کو اس ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی رہی ہی نہیں تھی۔ کسی صلاحیت کا حاصل ہو جانا...... کھو جانا...... اور پھر دوبارہ ملنے کی امید ہونا...... یہ سب اس کے لئے بے معنی باتیں تھیں۔ وہ تو کسی اور ہی آگ میں جل رہا تھا، کسی اور ہی اذیت سے گزر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سچ مچ چلی گئی ہے...... ہمیشہ کے لئے ناتا توڑ گئی ہے۔ امید آس کی ہلکی سی کرن بھی نہیں چھوڑ گئی جس میں اسے اپنی زندگی کی شکل نظر آ سکے۔ اس نے بارہا سوچا تھا کہ وہ کیسے گئی ہو گی۔ جب وہ اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر گری ہو گی تو اس نے کیا سوچا ہو گا؟ کیا آخری بار اس نے اسے یاد کیا ہو گا؟ اس کے دل نے اسے آواز دی ہو گی؟ آہ...... برسوں کی پیار کہانی کتنی جلدی ختم ہوئی تھی۔ بس دو چار ماہ کے اندر ہی ان کی جدائی ہوئی۔ وہ دلہن بنی اور پھر قبر میں جا سوئی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ عمران کی آنکھوں میں چمکتی رہتی۔ اس کے سادہ فقرے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے اور اس کی دلکش ہنسی عمران کی روح کو چرکے لگاتی رہتی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھی، کتنے سہانے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں...... اور ایک آٹھ ایم ایم کی گولی نے وہ سب کچھ ختم کر ڈالا تھا۔

عمران اسے بھولنا چاہتا تھا مگر بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ راتوں کو دیوانہ وار خوشاب شہر کی گلیوں میں پھرتا، شراب پیتا، جھگڑے کرتا اور پھر نڈھال ہو کر سو جاتا۔ اس کی دلیری اور بے خوفی کے چرچے ہونے لگے۔ یہ چرچے دو طرح کے تھے۔ ایک تو وہ پھڈے اور جھگڑے تھے جن میں وہ بے دریغ ''انوالو'' ہو جاتا تھا۔ دوسرے سرکس میں اس کی خطرناک پرفارمنس تھی...... جانوروں سے دور ہونے کے بعد اس نے دیگر شعبوں کی طرف خطرناک تیزی کے ساتھ غیر معمولی توجہ دی اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔ ''موٹر سائیکلسٹ بادشاہ'' کا سرکس سے معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی عمران نے اس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے بھی خاطر خواہ مدد کی۔ اب وہ موت کے کنوئیں میں شاندار پرفارمنس دینے کے قابل ہو گیا تھا...... بلکہ کچھ آئٹمز میں بادشاہ سے دو ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔

اس کے لئے بدترین خطرات کے لئے ایک بھوک سی پیدا ہو چکی تھی۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ وغیرہ کے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے جھولوں پر بازی گری بھی شروع کر دی...... اس کی غیر معمولی دلیری و بے خوفی اسے ہر دلعزیز بنا رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں کسی

ناتواں لاچار شخص پر زیادتی ہوتے دیکھتا، سینہ تان کر اس کے دفاع میں کھڑا ہو جاتا اور اس حوالے سے اپنی جان کی بھی پروا نہ کرتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ احسان مند شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسے اپنے اردگرد سے محبتیں ملنے لگیں۔ لوگ اس سے اپنائیت محسوس کرنے لگے اور مشکل وقت میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی طرف اٹھنے والی الفت بھری نظریں اس کے اندر دھیرے دھیرے ایک تبدیلی کو راہ دینے لگیں۔ اسے اپنی بیکار زندگی کا موہوم سا مقصد نظر آنے لگا۔ وہ اپنے اردگرد ایسے آنسو تلاش کرنے لگا جنہیں پونچھ سکے...... ایسے بے وسیلہ لوگ ڈھونڈنے لگا جن کا وسیلہ بن سکے۔ اس کی تباہ حال زندگی غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ اختیار کرنے لگی۔ اب اس کے لباس میں ہر وقت بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا لیکن یہ ریوالور زیر دستوں کے لئے نہیں، ان زبردستوں کے لئے تھا جو محبت کی زبان نہیں سمجھتے۔ عام لوگوں کے لئے تو وہ سراپا مہر تھا۔ وہ بڑی اپنائیت سے اسے عمران بھائی اور ہیرو بھائی جیسے القابات سے نوازتے تھے۔

جان صاحب کے اسٹار سرکس میں کئی خوبرو لڑکیاں تھیں۔ عمران کی مردانہ وجاہت اور اس کی غیر معمولی دلیری صنفِ مخالف کو بڑی شدت سے اپنی طرف کشش کرتی تھی۔ دو تین لڑکیاں ہر وقت عمران کی قربت کی خواہش مند رہتی تھیں...... مگر وہ تو یہ باب اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے بند کر چکا تھا...... ان میں سے صرف ایک لڑکی تھی جسے وہ کسی حد تک قابلِ توجہ سمجھتا تھا لیکن وہ بھی ایک عورت کی حیثیت سے نہیں، صرف ایک ''مصیبت زدہ'' کی حیثیت سے۔ اس کا نام شاہین تھا۔ شاہین اور اس کے اہلِ خانہ ایک شاطر عامل کے چکروں میں پھنسے ہوئے تھے...... وہ شخص نہ صرف ان سفید پوش لوگوں سے ہزاروں روپے بٹور چکا تھا بلکہ اپنی عیاریوں کے ذریعے اس نے ان کا مکان بھی اپنے ایک چہیتے مرید کے پاس گروی رکھوا دیا تھا۔ شاہین، عمران کے ساتھی فنکاروں میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس لئے بھی شاہین کی مدد ضروری سمجھتا تھا کہ اسے ان نام نہاد عاملوں اور جعلی پیروں، فقیروں سے خدا واسطے کا بیر پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آتشیں اسلحہ لے کر نکلتا اور جہاں کہیں اسے ایسی جاہلیت کا کوئی علم بردار نظر آتا، اسے بھون کر رکھ دیتا۔ جو کام شاہین اور اس کے سفید پوش گھر والے پچھلے تین برسوں سے نہیں کر سکے تھے، وہ عمران نے صرف دو روز میں کر دیا۔ عامل کے چیلے نے نہ صرف مکان کا قبضہ چھوڑا بلکہ عامل نے اس رقم کا کافی حصہ بھی واپس کیا جو اس نے عملیات کے نام پر سادہ لوح گھرانے سے ہتھیایا تھا۔

شاہین، عمران کو کسی اور نظر سے دیکھنے لگی تھی لیکن عمران نے اس پر بالکل واضح کر دیا کہ

اس کی زندگی میں اب عورت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہاں، اس کی دل جوئی کے لئے وہ اس سے ملتا بھی تھا اور ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتا تھا۔ کسی وقت اسے ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں آگے جا کر ان کا تعلق کوئی اور رخ اختیار نہ کر لے لیکن پھر شبانہ کا غم بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے سینے کو بھر دیتا اور اسے یقین ہونے لگتا کہ اس مختصر سی زندگی میں تو یہ غم اسے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت نہیں دے گا۔ اسے شبانہ کے ساتھ اپنی ''وفا'' بالکل محفوظ نظر آنے لگتی اور یہی اس کی آخری خواہش تھی۔ وہ اس وفا کو آخری دم تک محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کی زندگی تبدیل ہونے لگی۔ اس نے خود کو دوسروں کی آسانیوں اور خوشیوں میں گم کر دیا۔ اپنے اردگرد کے نچلے طبقے سے اسے خاص طور پر وابستگی پیدا ہونے لگی۔ جاہلیت و توہم پرستی کے مسائل کا شکار لوگ اس کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرے۔

وہ اندر سے جھلس رہا تھا مگر اس کو اپنے ہونٹوں پر ہنسی سجانا آ گیا۔ اس کا کلیجا چھلنی تھا مگر اس نے خوش خلقی کو اپنے اشکوں کا پردہ بنا لیا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اور چہرے پر مسکان سجا کر ایک اور ڈھنگ سے جینے لگا۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ کے لئے وہ سگی اولاد کی طرح تھا۔ وہ اسے اپنے کاروبار میں کوئی انتظامی حیثیت دینا چاہتے تھے مگر عمران اپنے ڈھب سے جینے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ اب جان صاحب کے سرکس کا سب سے مقبول فن کار تھا...... خطروں سے کھیلنا اس کی فطرتِ ثانیہ ہو گیا تھا۔ وہ ہیرو کہلاتا تھا اور شاید ایسا کہلانے کا حق دار بھی تھا۔ اپنی ماں کی یاد اور اپنی شبانہ کی تصویر کو سینے سے لگائے وہ اپنے ڈھنگ سے جیتا رہا...... اور جیتا رہا۔

○......❖......○

......اب میں اسی جگہ واپس آتا ہوں جہاں سے عمران کی طویل کہانی شروع ہوئی تھی...... ہاں، یہ زرگاں کی وہی پُرفسوں رات تھی۔ ساتویں کے جشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہو گیا تھا مگر آسمان پر ابھی تک گاہے بگاہے آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور قرب و جوار کو منور کر جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں آج سونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ موسیقی کی لہریں، نعروں کا شور، ہاتھیوں کی آوازیں، آتش بازی کی تڑتڑاہٹ یہ سب کچھ ایک دل نواز ارتعاش پیدا کرتا تھا اور ہر جان دار و بے جان شے ایک سرمستی میں ڈوب جاتی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے کئی خالی مگ رکھے تھے۔ عمران کے اردگرد سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ اس کی کہانی نے میرے دل میں عجیب سا گداز بھر دیا تھا۔ میں نے اس کے خوبرو چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک یادوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ”ماں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا؟“

”نہیں۔“ اس نے نیا سگریٹ سلگا کر مختصر جواب دیا۔

”تم نے تلاش ختم کر دی؟“

”نہیں جگر! وہ زندگی کی آخری سانس تک ختم نہیں ہو سکتی لیکن پتا نہیں، اب کبھی کبھی آس ٹوٹ جاتی ہے۔“

”تمہارا شیخوپورہ والا آبائی گھر تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں، کئی بار سوچا کہ اسے بیچ ڈالوں لیکن نہیں بیچا۔ پتا نہیں کیوں دل کہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اس گھر میں، میں اور ماں اکٹھے ہوں گے۔ اس کے صحن میں بیری کے نیچے بیٹھیں گے۔ اس کے کمروں میں ہماری آوازیں گونجیں گی۔ بڑی یادیں ہیں اس گھر کے ساتھ۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے کبھی بیچ سکوں گا۔“

”اور چودھری سجاول وغیرہ؟ چودھری کے وارثوں نے کبھی تم سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی؟“

عمران نے کہا۔ ”چودھرائن ڈیڑھ دو سال تو خاموش رہی۔ پھر اس نے پتا نہیں کس موڈ میں اپنے پتر نیاز اور داماد شیر افگن کے سامنے سب کچھ بک دیا۔ ان لوگوں نے مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی......“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر کیا ہونا تھا۔“ وہ مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ”تیرا یار اب تر نوالہ نہیں، لوہے کا چنا بن چکا ہے۔ تیری دعا سے نیازے اور افگن جیسے لوگ اب یہاں اس جیب میں رہتے ہیں۔“ اس نے اپنی جیب تھپتھپائی جیسے واقعی وہاں نیاز اور افگن موجود ہوں اور وہ انہیں تھپک رہا ہو۔

”اور...... وہ تمہارا یار راجا؟“

عمران نے گہرا کش لیا۔ ”راجا، اپنی طرز کا کھرا کریکٹر تھا۔ میں نے بہت روکا لیکن وہ اپنے شغلوں سے باز نہیں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کی ہیرا منڈی کے قریب ایلیٹ فورس کے ہتھے چڑھ گیا۔ منشیات اور فراڈ کے تین سنگین کیسوں میں اسے سات سال قید کی سزا ہوئی۔ اب وہ پنجاب ہی کی کسی جیل میں ہے۔ کافی عرصے سے اس کی کچھ خبر نہیں......“

”اور شاہین؟“

عمران کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اور اقبال قریباً ایک سال پہلے پاکستان سے تمہارے کھوج میں روانہ ہوئے

تھے۔ اس وقت تک وہ بقید حیات تھی۔ میں اس پر زور دے کر آیا تھا کہ وہ منگنی شنگنی کرا لے بلکہ میری واپسی تک اس کی شادی اور ایک آدھ بچہ بھی ہو جانا چاہئے۔ وہ خوب ہنسی تھی۔“

”کیوں؟“

”میں نے کہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ تین چار مہینوں میں واپس آ جاؤں گا۔ اسے یقین تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی لیکن اب تو سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری فرمائش پوری کر دے۔“

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی تم...... میرا مطلب ہے تمہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں؟“

”نہیں تابی!“ وہ پورے یقین سے بولا۔ ”میں اسے صاف بتا چکا ہوں کہ مجھ پر یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہے، ہنسی مذاق بھی ہے اور ایسا دیگر لڑکیوں کے ساتھ بھی ہے لیکن...... میرے دل میں جو کچھ مر چکا ہے، وہ پھر زندہ نہیں ہو سکت۔ شاید میں چاہوں بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اِٹ از آل اوور۔ اور اب ان باتوں کو چھوڑو یار۔ تم ماضی میں بہت غوطے دے چکے ہو مجھے۔ اب میرا سانس ٹوٹنے لگا ہے۔ اب مجھے باہر نکالو ورنہ ساتویں کا جشن دیکھنے سے پہلے ہی میرا اپنا ساتواں اور دسواں ہو جائے گا۔“ وہ دھیرے دھیرے پھر اپنی مخصوص خوش گفتاری کی طرف پلٹ رہا تھا لیکن میرا دل اس کے لئے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہی لگ رہا تھا کہ معصوم صورت شبانہ کی ناگہانی موت میرے سامنے واقع ہوئی ہے اور میں اس سارے درد و کرب کا چشم دید گواہ ہوں جو چناب کے کنارے پیار کرنے والے دو دلوں کے حصے میں آیا اور جسے انہوں نے آنسوؤں کے دریا میں تیر کر جھیلا۔

میرا یہ قیافہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کا ڈسا ہوا ہے جو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں کسی عفریت کی طرح پنجے گاڑے ہوئے ہے۔

سادہ لوحی اور توہم پرستی کی کوکھ سے جنم لینے والی یہ دقیانوسیت عمران کی ہنستی بستی زندگی کو چاٹ گئی تھی اور ایسی نہ جانے کتنی زندگیاں قرنوں سے اس کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں۔ میں گہری نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ”جب تم ایسے دیکھتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ ہپناٹزم سیکھ رہے ہو اور اس کا پہلا پہلا تجربہ مجھ پر کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو جگر! اناڑی جادوگر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ بندے کو غائب کر دیتا ہے اور پھر واپس نہیں لا سکتا...... بعدازاں ایسے جادوگر متاثرین کے ڈر سے قبائلی علاقے

میں فرار ہو جاتے ہیں۔"

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔"عمران! ایک بات کہوں؟ تمہیں عجیب تو لگے گی لیکن ہے حقیقت۔"

"ہاں ہاں کہو۔ عجیب باتیں سننے کے لئے میں ہی تو رہ گیا ہوں۔"

میں نے کہا۔"ابن صفی مرحوم کا ایک کردار ہوا کرتا تھا علی عمران...... کالج کے دور تک ہم نے اسے خوب پڑھا ہے۔ بڑی دلچسپ جاسوسی کہانیاں ہوتی تھیں اور کہانیوں سے زیادہ دلچسپی ہمیں اس اوٹ پٹانگ کردار میں ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے تمہارا نام بھی عمران ہے، صرف اس میں دانش کا اضافہ ہے۔ مجھے تمہارے اندر اس کردار کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں تم اس کردار کا دوسرا جنم تو نہیں ہو؟"

"دیکھو، اب تم نے ہندوؤں میں رہ کر ہندوؤں جیسی باتیں شروع کر دی ہیں۔ کل تم یہ بھی کہو گے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں بلکہ دھرم پتنی ہے اور تم اسے پیار نہیں کرتے بلکہ پریم کرتے ہو اور تمہارا بچہ دراصل "پوشل" کے بغیر ہنومان کا چالیسواں جنم ہے۔"

"ہاں ہاں، وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔" میں نے کہا۔"فرق صرف یہ ہے کہ ابن صفی کے مطابق وہ تم سے ذرا کم خوبصورت اور تم سے ذرا زیادہ عقلمند تھا اور اس کی کرچیچن محبوبہ ابھی زندہ تھی اور وہ در پردہ ایک بڑا سرکاری عہدیدار تھا...... سیکرٹ سروس کا چیف وغیرہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ادیبوں اور دیگر فن کاروں کا ذہن تخلیق کرتا ہے، وہ سراسر خیالی نہیں ہوتا۔ چاہے اس میں کتنی بھی فینٹسی ہو، اس جیسی یا اس سے ملتی جلتی چیزیں اس دنیا میں فی الواقع موجود ہوتی ہیں۔ شاید تم بھی ایک ایسی ہی ملتی جلتی چیز ہو۔"

اچانک ایک دھماکا ہوا اور ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے۔ یہ دھماکا عمارت کی بیرونی دیوار کے اندر ہوا تھا۔ یہ زیادہ زوردار نہیں تھا۔ کسی کریکر یا آتش بازی والے بم کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ عمارت سے باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور نعرہ زنی کر رہے ہیں۔

رات کے اس پہر یہ صورت حال تعجب خیز تھی مگر آج تو شاید رات ہوئی ہی نہیں تھی۔ زرگاں کی بیشتر آبادی ناچ گانے اور عیش عشرت میں مصروف تھی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

"لگتا ہے کہ کچھ لوگ شاید تم پر اپنا غصہ اُتار رہے ہیں۔ آوازیں غور سے سنو۔"

مدھم آوازیں اب ہمارے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ انہیں زیادہ وضاحت سے

سننے کے لئے عمران نے ایک کھڑکی وا کر دی۔

"قاتل ہے...... پھانسی دو...... زندہ جلاؤ۔" اس طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کسی نے نعرہ مارا۔"سامبر مقابلہ۔"

جواب میں بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔"نامنظور۔"

یہ نعرہ کئی مرتبہ دہرایا گیا اور مظاہرین میں ہلچل نظر آنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عمارت کے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی۔ یقیناً یہ فائرنگ اسپیشل گارڈز کر رہے تھے جو ہماری حفاظت پر یہاں مامور تھے۔

کچھ ہی دیر بعد یہ ہنگامہ سرد ہو گیا اور مظاہرین جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی، منتشر ہو گئے۔ یہ صورت حال ہمارے لئے نئی نہیں تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ زرگاں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو جارج گورا جیسے "مہان پُرش" سے میرے دوبدو مقابلے کا مخالف ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ میں ایک معمولی شخص ہونے کے ساتھ ساتھ اسٹیٹ کا مجرم بھی ہوں۔ جارج کے ساتھ دوبدو مقابلے کے پروگرام نے مجھے جارج کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم دونوں کے حقوق برابر ہو گئے ہیں اور یہ کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہے۔

علی الصباح میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا۔"وہ مٹھی بھر لوگ تھے۔ گارڈز کی ہوائی فائرنگ سے منتشر ہو گئے۔" پھر وہ دھیمی آواز میں رازداری کے لہجے میں بولی۔

"میرے خیال میں یہ بھی تم پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ مقابلے سے پہلے یہ لوگ تمہیں زیادہ سے زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انتظامیہ چاہتی تو یہ مٹھی بھر لوگ یہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں کہیں دور ہی روک لیا جاتا جیسے دوسرے لوگوں کو روکا گیا۔"

"دوسرے لوگ کون؟" میں نے پوچھا۔

"کل رات تمہارے حق میں بھی بہت سے لوگ نکلے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کا جلوس تو ہو گا۔ یہ لوگ تمہاری جیت کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں غصہ بھی تھا۔ کسی طرح یہ خبر نکل ہی گئی ہے کہ کل تم پر پھر حملہ ہوا ہے۔ غسل خانے کے نلکے میں کرنٹ چھوڑ کر تمہاری جان لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ لوگ احتجاج کرتے ہوئے یہاں تک آنا چاہتے تھے اور شاید اس سے آگے راج بھون بھی جانا چاہتے ہوں لیکن گارڈز نے انہیں روک لیا اور مار پیٹ کر منتشر کر دیا۔"

وہ جشن کا دن تھا۔ اس روز میں نے اور عمران نے زرگاں میں حیرت انگیز نظارے دیکھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں کے بیشتر باشندے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں اور انہوں

نے خود کو مستیوں میں غرق کر لیا ہے۔ جشن کا ایک اہم نظارہ ہاتھیوں کا جلوس تھا۔ یہ جلوس دوپہر کے فوراً بعد راج بھون سے روانہ ہوا۔ اسے شہر کے اہم راستوں سے گزر کر شام کے بعد واپس راج بھون پہنچنا تھا۔ ہماری قیام گاہ کے سامنے سے یہ شان دار جلوس سہ پہر کے وقت گزرا۔ یہ درجنوں سجے سجائے ہاتھی تھے۔ ان پر خوبصورت ہودے تھے اور ہودوں میں زرگاں کے معزز مرد و زَن تھے۔ جلوس کے راستے کی دونوں جانب سیکڑوں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کھڑکیوں، چوباروں اور چھتوں پر بھی اہلِ زرگاں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ جلوس میں سب سے آگے جو دیوہیکل ہاتھی تھا، وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔ اس کی سجاوٹ بھی دیدنی تھی۔ اس کے ہودے میں حکم جی اپنی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کے ساتھ موجود تھا۔ رتنا کو بچہ تولد ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے پھر بھی وہ تمام مصروفیات میں حصہ لے رہی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ وہ پیچھے رہی تو کوئی دوسری رانی اس کی جگہ لے لے گی۔

دورویہ کھڑے لوگ جلوس پر گل پاشی کر رہے تھے۔ جواباً شاہی ہاتھیوں پر سے عوام الناس پر سکوں کی بارش کی جا رہی تھی۔ ہم یہ سب کچھ لال بھون کی چھت کے اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ نعروں اور باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

''کاش میں بھی ایک ہاتھی ہوتا۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''کیوں، ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دیکھو۔'' عمران نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، ایک ہاتھی کی سونڈ میں ایک خوبرو نیم برہنہ لڑکی بیٹھی تھی اور تماشائیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو یہ ہتھنی ہے۔ کیا تم ایک لڑکی کو اپنی سونڈ پر بٹھانے کے لئے ہتھنی بننا پسند کرو گے؟''

''یہ ہتھنی ہو ہی نہیں سکتی۔'' عمران نے وثوق سے کہا۔ ''تم دیکھ نہیں رہے ہو، وہ کتنا خوش ہے۔ کتنی طاقت آ گئی ہے اس کی سونڈ میں۔ یہ محاورہ بالکل درست ہے کہ ہاتھی اور مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

''یہ محاورہ گھوڑے اور مرد کے بارے میں کہا گیا ہے۔'' میرے اور عمران کے عین پیچھے کھڑی گیتا مکھی نے کہا۔

ہم نے مڑ کر اسے دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں کی یہ بے باک استاد ہمیشہ کی طرح ہوشربا لباس میں تھی۔ اپنی عادت کے مطابق وہ گفتگو کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''لگتا ہے گیتا دیوی تمہیں ایسے ''محاوروں'' میں خاصی دلچسپی ہے۔''

''تمہیں نا ہیں ہے؟'' وہ نیم باز آنکھوں سے بولی۔

''ہوتی تو غلط محاورہ نہ بولتا۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسا گیتا دیوی، تمہیں آج کے دن تو کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنے کپڑوں پر بالکل بھی پیسے خرچ نہیں کئے۔ اتنا تھوڑا سا لباس۔ یہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔''

وہ بے باکی سے مسکرائی۔ ''اور تم اسے کنجوسی کہہ رہے ہو؟ یہ تو فراخ دلی ہے...... زرگاں کی بیشتر عورتیں آج کے دن ایسی ہی فراخ دل ہو جاتی ہیں۔''

''کیا تم بھی ''بیشتر'' عورتوں میں شامل ہو؟''

''ہاں...... لیکن ہر کسی کے لئے نا ہیں۔'' وہ عمران کو خاص نظروں سے دیکھ کر بولی اور تھوڑا سا اس کی طرف کھسک آئی۔

عمران نے جلدی سے موضوع بدلا اور گیتا سے پوچھا کہ یہ جلوس یہاں سے گزر کر کس طرف جائے گا۔ گیتا نے بتایا کہ یہاں پاس ہی ایک اسٹیڈیم نما جگہ ہے جہاں بہت سے کھیل تماشے ہو رہے ہیں۔ جلوس کے شرکاء کچھ دیر تک وہاں رکیں گے پھر راج بھون روانہ ہو جائیں گے۔ راج بھون میں آج جشن کی رات ہے۔ کل چونکہ زرگاں میں عام چھٹی ہے، اس لئے یہ جشن رات گئے تک جاری رہے گا۔ سات پریوں کا انتخاب اور اس کے علاوہ بھی بہت سی تقریبات ہوں گی۔

زرگاں کی وہ رات قابلِ دید تھی۔ گھروں پر چراغاں کیا گیا۔ دیسی گھی کے دیے روشن ہوئے۔ انواع واقسام کے پکوان بنائے گئے اور لوگوں نے زرق برق لباس پہنے۔ مجھے اور عمران کو علم نہیں تھا کہ ہم بھی راج بھون جا سکیں گے یا نہیں؟ تاہم شام سے تھوڑی دیر پہلے میڈم صفورا نے مجھ سے کہا۔ ''حکم جی نے تمہیں راج بھون آنے کی اجازت دی ہے لیکن یہ اجازت مشروط ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے کہ جارج صاحب بھی وہیں وجود ہوں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر طیش میں آ سکتے ہیں یا تمہاری طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس لئے تم عام حاضرین میں نہیں بیٹھو گے بلکہ ایک گیلری تک محدود رہو گے اور وہیں سے جو کچھ دیکھ سکو، دیکھو گے۔ ہاں، عمران میرے گارڈز میں شامل ہو کر میرے ساتھ رہے گا اور ہر جگہ جا سکے گا۔''

شام سے کچھ دیر پہلے ہی مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ میڈم صفورا اور منیجر

مدن وغیرہ بھی میرے ساتھ موجود تھے۔ نہایت سخت حفاظتی انتظامات میں ہم راج بھون کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے جشن کے پُر جوش مناظر دیکھے۔ جگہ جگہ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نوجوان رقص کر رہے تھے۔ راستوں پر شراب کی خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ ہیجڑے بھی رنگین کپڑوں میں ملبوس، اس گہما گہمی کا حصہ تھے۔ وہ نہر جو راج بھون کی عظیم الشان سیڑھیوں کے پاس سے گزرتی تھی، کشتیوں اور رنگ برنگے تفریحی بجروں سے بھری ہوئی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں بادبان چمک رہے تھے اور موسیقی کی لہریں پھیل رہی تھیں۔

ہم راج بھون کے سامنے پہنچے تو روشنیاں جگمگا اُٹھی تھیں۔ سارا بھون دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ خوب صورت فواروں سے ہفت رنگ پانی کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں...... رنگین آنچل لہراتے تھے اور قہقہے بکھرتے تھے۔ گارڈز کے کڑے نرغے میں مجھے راج بھون کے اندر پہنچایا گیا اور مختلف راہداریوں سے گزار کر ایک گیلری میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی اور نشستیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک بہت بڑا مخملی پردہ کھچا تھا۔ اس پردے کی دوسری جانب سے خوشبوؤں کی لپٹیں آتی تھیں اور سریلے قہقہے سنائی دیتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پردے کی دوسری جانب بہت سے لوگ موجود ہیں۔

میڈم صفورا اور منیجر مدن کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی اس گیلری میں موجود تھے۔ یہ بھی زرگاں کے معزز باشندوں میں سے تھے۔ ان سب کی نظروں میں میرے لئے بے پناہ دلچسپی موجود تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے اور پھر چور نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ میں ان کے لئے بے حد توجہ کی چیز تھا۔ صرف دو دن بعد راج بھون کے سامنے جارج گورا سے میرا دو بدو مقابلہ ہونے والا تھا...... فائٹ ٹل ڈیتھ۔ میں نے ایک ایسے شخص کو للکارا تھا جس کے مقابلے میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ غالباً یہ لوگ مجھے ایک چلتی پھرتی لاش کے طور پر دیکھ رہے تھے اور کچھ یہی حال ان گارڈز کا بھی تھا جو اس بالکونی نما گیلری میں میری حفاظت پر مامور تھے۔ وہ کنکھیوں سے مجھے تاکتے تھے جیسے نگاہوں نگاہوں میں مجھے تولتے ہوں اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوں کہ میں جارج گورا جیسے فائٹر کے سامنے کتنی دیر تک کھڑا رہ سکوں گا۔

میری تیاریوں اور رہن سہن کے حوالے سے بھی بہت سی سچی جھوٹی باتیں پھیل چکی تھیں۔ ان باتوں کا علم ہمیں زیادہ تر گیتا بھی اور میڈم صفورا سے ہی ہوتا تھا۔ مثلاً یہ بات پتا نہیں کیسے پھیل گئی تھی کہ میں گھنٹوں برف کی سل پر لیٹا رہتا ہوں اور اپنے جسم کو زہریلے

کیڑوں سے ڈسواتا ہوں جس سے میرے جسم کی کھال بالکل بے حس ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، یہ بے بنیاد بات تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد نیم تاریک گیلری کا مخملی پردہ ہٹایا گیا۔ سامنے کا منظر ہوش ربا تھا۔ یہ وہی وسیع و عریض بغیر ستون کا ہال کا تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ آج یہ ہال پہلے سے زیادہ مرصع و مزین نظر آتا تھا۔ ہال کی گنبد نما چھت پر مصنوعی ستاروں کی برات تھی اور چاند دلہا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ تین آبشاروں کا پانی وسیع تالاب میں گرتا تھا۔ اس تالاب میں چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ راجواڑے کے امراء خوش پوش نازنینوں کے ساتھ مصروفِ سیر تھے۔ تالاب کے کنارے ناچنے والیوں نے مختصر ترین لباس پہن رکھے تھے۔ سخت سردی میں وہ یہ مظاہرہ کرنے میں اس لئے کامیاب ہوئی تھیں کہ اس سارے چیمبر کو مصنوعی طریقے سے گرم کر دیا گیا تھا۔

میڈم صفورا نے ٹھیک کہا تھا۔ اس وسیع ہال کے بیچوں بیچ نصب فوارے میں سے آج پانی کی جگہ شراب پھوٹ رہی تھی اور فوارے کے گرد بنے ہوئے بلوری حوض میں جمع ہو رہی تھی۔ اس حوض سے جام بھر بھر کر پیئے جا رہے تھے اور ''پینے والے'' اپنی ساتھی حسیناؤں کے ساتھ بے تکلف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آج کی شب کے لئے سارے قانونی و اخلاقی قاعدے ضابطے معطل ہو چکے ہیں......اور یہاں کی جلوت......خلوت بن گئی ہے۔

ایک طرف ڈانسنگ فلور بنا ہوا تھا۔ یہاں موسیقی کی دھنا دھن پر جوڑے محوِ رقص تھے۔ انہی جوڑوں میں ایک بلند قامت شخص نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ میرا مدِمقابل جارج گورا تھا۔ ایک مقامی حسینہ کو اپنے ساتھ پیوست کئے وہ محوِ رقص تھا۔ پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میری نگاہ حکم جی پر پڑی۔ وہ ایک بلند مرمریں چبوترے پر اپنی تینوں رانیوں کے ساتھ تشریف فرما تھا۔ اس کے گرد بھی جام گردش کر رہے تھے اور خوش بدن شاہی خادمائیں چکرا رہی تھیں۔ کئی دیگر مصاحبین بھی اس چبوترے پر حکم کے عقب میں موجود تھے۔

کچھ دیر بعد اس وسیع ہال میں جیسے رنگ و نور کا سیلاب سا آ گیا۔ روشنیوں کے زاویے بدل گئے۔ موسیقی کی پُر جوش تانوں نے ماحول کو گرمایا۔ وہ چالیس حسینائیں جگمگاتے اسٹیج پر ایک ساتھ نمودار ہوئیں جو پچھلے کئی ماہ سے اس تیاری میں تھیں کہ دیکھنے والوں پر بجلیاں گرائیں اور ان کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں جکڑ لیں۔ یہ زرگاں کے گلشنِ حسن کے منتخب پھول تھے اور ان میں سے آج سات بہترین پھول منتخب کئے جانے تھے۔ اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا

حشر خیز تھا۔لڑکیوں نے مشترکہ رقص کیا اور اپنے حسن و شباب کے جلوؤں سے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا۔حاضرین بار بار تالیاں پیٹتے رہے اور آہیں بھرتے رہے۔

میڈم صفورا نے کہا۔''لڑکیوں کا کمال تو ہے لیکن اس میں گیتا مکھی کی ٹریننگ کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔یہ لڑکیوں کی کایا پلٹنے میں ماہر ہے۔''

''کیا اب سات لڑکیوں کا سلیکشن ہو جائے گا؟''میں نے پوچھا۔

''ابھی کہاں۔'' وہ بولی۔''ابھی ان کا ایڑی چوٹی کا زور لگے گا۔اپنے بہت سارے کپڑوں سے بھی محروم ہو جائیں گی۔''

اس کے بعد اگلا دور شروع ہوا۔لڑکیوں نے لباس تبدیل کئے اور کیٹ واک کے انداز میں ایک ایک کر کے اسٹیج پر آنا شروع کیا۔ان کی چال، مسکراہٹ، اُٹھنے بیٹھنے کا انداز، خوش لباسی، سب کچھ نوٹ کیا جا رہا تھا۔منصف خواتین و حضرات کی تعداد دس کے قریب تھی۔وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔حاضرین خاموش رہ کر یا تالیاں بجا کر ان کی مدد کر رہے تھے۔

اس کے بعد آخری مرحلے کا آغاز ہوا۔یہ بھی بڑا سنسنی خیز تھا۔دوشیزائیں مختصر لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔وہ پانچ پانچ کی ٹولیوں میں آئیں۔انہوں نے رقص کے مختلف انداز اپنائے اور داد وصول کی۔بعدازاں چالیس کی چالیس لڑکیاں اکٹھی نمودار ہوئیں۔انہوں نے اپنے اپنے انداز سے رقص کیا۔پھر وہ اسٹیج سے اُتر کر وسیع ہال میں چلی گئیں۔انہوں نے حاضرین کے درمیان پرفارمنس دی۔آخر یہ طویل کارروائی ختم ہوئی۔کچھ ہی دیر بعد ان لڑکیوں میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چن لی گئیں۔یہ سات لڑکیاں تالیوں کی گونج اور پھولوں کی بارش میں چبوترے پر آئیں۔انہوں نے باری باری حکم اور اس کی تینوں بیویوں کے چرن چھوئے۔تب وہ حکم، جارج، اسٹیل اور دیگر حکام کے قدموں میں فرش پر بیٹھیں اور تصویریں بنوائیں۔

اس اہم مرحلے کے بعد شراب نوشی کا دور شروع ہوا۔ساتوں پریاں حکم اور اس کے مصاحبین و بیگمات کے لئے ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔اس پُرشکوہ و شاندار شاہی ضیافت کے بعد حاضرین ہاتھوں میں قہوے کی پیالیاں اور جام وغیرہ لئے پھر سے اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔ایک عجیب سی سرمستی نے ہر ذی نفس کو گھیرا ہوا تھا۔اب زیادہ تر بیگمات یہاں سے جا چکی تھیں۔مرد حضرات رہ گئے تھے یا وہ حسینائیں جو آج کے دن اپنے حسن و شباب کا سارا سرمایہ اپنے پرستاروں پر لٹانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

ان میں سے کچھ خود بھی ''شیری'' طرز کا مشروب پی رہی تھیں اور اپنے ساتھی مردوں کی بے باکی کو خوش دلی سے قبول کر رہی تھیں۔ان میں مجھے جارج گورا اور اسٹیل وغیرہ بھی نظر آئے۔جارج گورا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ایک مقامی حسینہ کو اپنی بغل میں لئے وہ اس نہایت مضبوط بلوری شوکیس کے پاس بیٹھا تھا، جس میں پگھلا ہوا سونا ہلکورے لیتا تھا اور لڑکی کی برہنہ مورتی اس میں ڈوبتی اُبھرتی تھی۔پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ پرسوں کا انتظار نہ کروں۔آج ہی سارے بندھن توڑ کر اس گورے عیاش پر جا پڑوں اور اسے اس پگھلے ہوئے سونے میں ایک مکمل غوطہ دے دوں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ میں صرف سوچ سکتا ہوں۔عمران بھی اسی نیم تاریک گیلری میں میڈم صفورا کے سیکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے موجود تھا۔میری اور اس کی نظر گاہے بگاہے ملتی تھی۔اچانک عمران مجھے چونکا ہوا نظر آیا۔میں نے دیکھا، وسیع و عریض حال میں ایک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ایک شخص نے رم کی ایک خالی بوتل کے اوپر لکڑی کا ایک مستطیل ٹکڑا رکھا اور اس پر کھڑا ہو گیا۔پھر اس نے لکڑی کے ٹکڑے پر ایک اور خالی بوتل رکھی اور اس پر لکڑی کا ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر بھی اپنا توازن برقرار کیا۔حاضرین نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا مگر چوتھی بوتل پر کھڑا ہونے کی کوشش میں وہ گر گیا اور بوتلیں لڑھک گئیں۔

''یہ کیا ہے؟''میں نے میڈم سے پوچھا۔

''یہاں کا بہت پرانا کھیل۔رم کی خالی بوتلوں کو اوپر نیچے رکھ کر ان پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے،ایک جشن کے موقع پر رتنا دیوی نے ترنگ میں آ کر یہ آفر کر دی تھی کہ جو شخص اس طرح آٹھ بوتلوں کے اوپر کھڑا ہو جائے گا، وہ اسے شاہی اصطبل کے بہترین آٹھ گھوڑے انعام میں دے گی۔اس کے علاوہ وہ طلائی زیوارات کا بھی حق دار ہوگا۔''

''کون سے زیورات؟''میں نے پوچھا۔

''رتنا دیوی کی جیولری۔یعنی وہ جیولری جوان کی ملکیت ہے۔حکم جی کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی ہونے کی حیثیت سے رتنا دیوی کے پاس سب سے زیادہ جیولری ہے۔قریباً تین باکس بھرے ہوئے ہیں جن کے کل وزن کا شاید رتنا دیوی کو بھی نہیں پتا۔دیوی نے کہا ہوا ہے کہ جو اس شرط کو پورا کرے گا، وہ جیولری باکس میں سے دو مٹھی بھر کر زیورات لے سکتا ہے۔اب اس کی قسمت کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔دو مٹھیوں میں کچھ نہیں تو لاکھوں کے

زیورات تو آ ہی سکتے ہیں۔ یہ جڑاؤ زیورات معمولی قیمت کے تو نہیں ہوں گے۔''

''عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''ان راجوں مہاراجوں کی تفریحات اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ دینے پر آئیں تو بے وجہ لاکھوں کروڑوں لٹا دیں، نہ دیں تو پھوٹی کوڑی کے بدلے جان لے لیں۔ اب پچھلے تین چار سال سے شغل بنا ہوا ہے کہ کھانے کے بعد جب لوگ گپ شپ کے لئے بیٹھتے ہیں تو یہ کھیل شروع کر دیتے ہیں۔ اچھا، وہ دیکھو...... آج وہ بھی قسمت آزمانے آئی ہے۔''

''کون؟''

''او وہی مس انڈیا...... وہ دیکھو ننگی ٹانگیں چلاتی آ رہی ہے۔'' میڈم صفورا نے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہاں، یہ وہی سولہ سترہ سالہ تیز طرار لڑکی تھی جس نے لال بھون میں ریہرسل کے دوران میں جمناسٹک کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ بعدازاں اس نے عمران سے بحث بحثی شروع کر دی تھی۔ اس تکرار کا انجام یہ ہوا تھا کہ عمران نے اس لعل مس انڈیا سے مقابلہ کیا تھا اور بعدازاں جان بوجھ کر ہار گیا تھا۔ اس ہار کے اندر جو جیت چھپی ہوئی تھی، اس کا پتا ہمیں بعد میں چلا تھا۔

آج یہ لعل مس انڈیا پھر میدان میں تھی۔ کھیل تماشوں میں حصہ لینے والے دو اور نوجوانوں نے آٹھ بوتلوں والی شرط پوری کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک نوجوان باقاعدہ ''جگر'' تھا۔ وہ بھی پانچویں بوتل کے بعد توازن برقرار نہ رکھ سکا اور قہقہوں کے درمیان قالین پر گر گیا۔ گرنے والوں کو ہلکی پھلکی خراشیں بھی آ رہی تھیں۔ تاہم موج مستی کے اس ماحول میں چھوٹی موٹی چوٹوں کی پروا نہیں کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لعل مس انڈیا کی باری آ گئی۔ وہ زیادہ بااعتماد نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ اس کی ٹریننگ کا حصہ نہیں تھا۔ بہرحال انعام کے لالچ میں وہ قسمت آزمائی کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے کھیل کا آغاز کیا۔

وہ رم کی بوتل رکھتی پھر اس پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھتی اور کھڑی ہو جاتی۔ بہتر توازن حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی۔ معاون لڑکی رم کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتی۔ لعل مس انڈیا بوتل کو بڑے دھیان سے لکڑی کے ٹکڑے میں جماتی۔ جس مستطیل ٹکڑے پر وہ کھڑی ہوتی تھی، وہ شمالاً جنوباً ہوتا تو وہ اوپر والا ٹکڑا شرقاً غرباً رکھتی تا کہ نچلے والے ٹکڑے پر پاؤں جمے رہیں۔

اسی طریقے سے وہ ساتویں بوتل تک پہنچ گئی۔ حاضرین نے سانسیں روک لیں۔ میڈم نے کہا۔ ''یہ ہائیسٹ اسکور ہے بھئی...... اگر......''

ابھی میڈم کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ بوتلوں کا مینار ٹوٹا اور وہ دھڑام سے نیچے گری۔ کچھ قہقہے اُبھرے لیکن زیادہ تر لوگوں نے تالیاں بجا کر لڑکی کی ہمت کو داد دی۔ حکم جی کے پہلو میں بیٹھی رتنا دیوی نے لڑکی کو اپنے پاس بلایا اور اس کی اشک شوئی کے لئے اسے کوئی تحفہ دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ اور ادب سے جھک کر قبول کیا۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! یہ کھلا مقابلہ ہے نا؟ میرا مطلب ہے ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے؟''

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! ایک مزے کی بات بتاؤں آپ کو۔ آپ عمران کو کہیں کہ وہ یہ کھیل کھیلے۔''

میڈم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات کو وزن دے رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عمران ایک پروفیشنل فن کار ہے...... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ لاہور میں اسٹار سرکس کے شوز کے دوران میں کبھی کبھی خاص شوز بھی ہوتے تھے جن کو خاص لوگ دیکھتے تھے اور نڈر فن کار اس میں نہایت خطرناک ''پرفامنسز'' دیتے تھے۔ تو جو شخص پنڈال کی خطرناک بلندی پر بغیر کسی حفاظتی انتظام کے شاندار مہارتوں کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ یہ رم کی خالی بوتلوں والا کھیل بھی کھیل سکتا تھا۔

میں نے عمران کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میڈم صفورا اس سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ عمران کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ یہ کام کر لے گا۔

چند منٹ بعد میڈم صفورا گیلری سے نکل کر نیچے ہال میں پہنچی۔ منیجر مدن بھی اس کے ساتھ تھا۔ منیجر مدن نے ادب سے جھک کر رتنا دیوی سے کچھ کہا۔ رتنا دیوی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا...... پھر میڈم صفورا کی طرف دیکھ کر بھی سر کو اثباتی حرکت دی۔

کچھ ہی دیر بعد عمران وسیع و عریض ہال میں حاضرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس کے جسم پر سیکیورٹی گارڈز والا مخصوص لباس تھا...... تاہم بہتر کارکردگی کے لئے اس نے اپنے جوتے اور موزے اُتار لئے تھے۔ اب یہاں کافی لوگ عمران کو پہچاننے لگے تھے۔ عمران کی پہچان دراصل صرف ڈیڑھ دن پہلے راج بھون کے بھرے پُرے دربار میں ہوئی تھی جب عمران نے حکم کے سوالوں کے مدلل جواب دیئے تھے اور ثابت کیا تھا کہ انتہا پسندی اور کٹر پن کا الزام صرف مسلمانوں پر لگانا کسی طور درست نہیں۔ اس کی باتوں نے جہاں کھوسٹ بڑھیا کی بولتی بند کی تھی، وہاں حکم کے مصاحبین کو بھی کچھ دیر کے لئے سانپ سونگھ گیا تھا۔

آج عمران ان معززین کے سامنے ایک دوسری طرح کے چیلنج کے لئے موجود تھا۔ چار بوتلوں تک تو عمران بہ آسانی پہنچ گیا۔ پانچویں اور چھٹی بوتل پر اسے دقت ہوئی۔ ساتویں بوتل کی باری آئی تو وسیع ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس سنسنی خیز خاموشی میں بس فواروں اور آبشاروں کی حرکت کرتے پانی کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ سازندوں نے بھی اپنے ہاتھ روک لئے تھے اور ان کی نگاہیں تماشے پر جمی تھیں۔ ''کیا وہ کر لے گا؟'' میڈم نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

ہاں، مجھے یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی شخصیت میں کرامات ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس نے ساتویں بوتل پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر اپنے پاؤں جمائے اور مکمل توازن حاصل کیا تو سازندوں نے سازوں کو زور سے چھیڑا اور وسیع و عریض ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اب عمران کو آخری بوتل پر چڑھنا تھا۔ وہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ بلند ہو چکا تھا۔

آخری مرحلہ شروع اور ختم ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔ دھڑکنیں تھم گئی تھیں اور نگاہیں جامد ہو گئی تھیں۔ خواتین نے ہاتھ سینوں پر رکھے ہوئے تھے۔ عمران نے وہ کر دکھایا جس کی میں اس سے توقع کر رہا تھا۔ جب وہ آٹھویں بوتل پر کھڑا ہوا اور اس نے فاتحانہ انداز میں اپنے دونوں بازو دونوں طرف پھیلائے تو لعل مسل انڈیا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ چند روز پہلے کی جھوٹی فتح کا خمار، زبردست کھسیانے پن میں بدل چکا تھا۔ ان لوگوں نے خود ہی اسے لعل مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے مقابلے کا نام دیا تھا۔ اب یہ ''نام'' اس کے لئے اضافی ہزیمت کا باعث تھا۔

عمران نے اس پر بس نہیں کیا۔ اس نے اپنی جیت کو مزید واضح اور مستحکم کرنے کے لئے ایک اور بوتل طلب کی۔ ہال تالیوں سے گونجا۔ مختصر لباس والی معاون لڑکی نے ایک اسٹول پر کھڑی ہو کر بوتل اور لکڑی کا ٹکڑا عمران کو تھمایا...... عمران نے بے پناہ داد کے شور میں یہ آخری step بھی کر دکھایا......

O.....❖.....O

یہ نئے دن کی صبح تھی۔ گیارہ بج چکے تھے...... لیکن راج بھون میں بیشتر لوگ سوئے پڑے تھے۔ ساتویں کا جشن کل رات آخری پہر تک جاری رہا تھا۔ اس کے اختتام پر شراب پانی کی طرح استعمال ہوئی۔ رقص و موسیقی نے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کیا اور آخر بدمست

جوڑے خلوت گاہوں میں جا گھسے۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ وہ تمام تینتیس لڑکیاں بھی ان خلوت گاہوں کا حصہ بنی ہیں جنہوں نے پریوں کے انتخاب میں حصہ تو لیا تھا مگر چنی نہیں جا سکی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کل رات راج بھون کے اعلیٰ ترین افراد کی تنہائیوں کو رنگین کیا تھا۔ انہیں چند دن یہیں رہنا تھا۔ پھر تحائف سے لد پھند کر گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں معمول کے مطابق تھا۔ گیتا مکھی نے بتایا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی بعدازاں باقاعدہ شادیاں ہوتی ہیں اور وہ نارمل زندگی گزارتی ہیں۔ راج بھون میں گزری ہوئی دو چار راتوں کے لئے انہیں کبھی مطعون نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے تو ذمے دار شخص حکم کے عتاب کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ پریوں کو یہاں ایک خاص الخاص درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ وہ مستقل طور پر راج بھون کے ساتھ منسلک ہو جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ سات پریاں پاکیزگی اور تقدس کا نشان ہوتی تھیں مگر گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ روایتیں تبدیل ہوئی تھیں اور اب یہ پریاں چند ماہ، بلکہ ہفتوں کے اندر ہی اعلیٰ سطح پر ''رکھیلوں'' کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ حرص و ہوس نے اپنی بقا کے راستے ڈھونڈ لئے تھے۔ غالباً دھرم کے ٹھیکیداروں نے ہی آقاؤں کی خوشنودی کے لئے اس رسم میں کچھ ایسی شقیں ڈھونڈ نکالی تھیں جن کی رُو سے حکم اور اس کے نہایت قریبی ساتھی ان پریوں سے جسمانی ربط قائم کر سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال بارونداجیکی کی محبوبہ شکنتلا تھی جسے پتنی بنانے میں ناکام ہو جانے پر حکم نے اسے پری کا درجہ دیا اور اپنے حرم میں شامل کیا۔

میں اور عمران ابھی تک راج بھون میں ہی تھے۔ دوپہر کے بعد خمار زدہ لوگوں نے جاگنا اور چلنا پھرنا شروع کیا۔ سہ پہر کے وقت میڈم صفورا کے ذریعے عمران کو رتنا دیوی کا بلاوا آیا۔ یقیناً یہ بلاوا اسے وعدے کے مطابق انعام سے نوازنے کے لئے تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے میں بھی میڈم صفورا، منیجر مدن اور عمران وغیرہ کے ساتھ شاہی اصطبل میں چلا گیا۔ میری وجہ سے درجن بھر مسلح گارڈز کو بھی میرے ساتھ حرکت کرنا پڑی۔ ہم شان دار اصطبل میں پہنچے۔ یہاں بیش قیمت گھوڑے گھوڑیوں اور ان کے بچوں کی طویل قطاریں موجود تھیں۔ طویل اصطبل کے ایک حصے میں پارٹیشن کر کے اسے گیراج کی حیثیت دی گئی تھی اور یہاں شاہی استعمال کی چند گاڑیاں موجود تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد رتنا دیوی اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں آن موجود ہوئی۔ اس نے عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اپنے گارڈ سے کہو کہ یہ بلا جھجک اپنی پسند کے آٹھ بہترین گھوڑے یہاں سے چن لے۔ ہم اس سے بہت خوش

ہیں۔ بے شک ہمیں یہ جانکاری بھی ہوئی ہے کہ یہ شخص شوقیہ کھلاڑی ناہیں تھا۔ یہ کسی سرکس میں کام کرتا رہا ہے اور جسمانی کمالات دکھاتا رہا ہے لیکن ہمیں پتا ہے کہ پچھلے تین چار سالوں میں اس شرط کو پورا کرنے کے لئے کھلاڑی لوگن بھی آتے رہے ہیں۔ جیسے کل رات وہ مس انڈیا نام کی لڑکی آئی تھی مگر اس کے سوا کوئی بھی سپل (کامیاب) ناہیں ہوا ہے۔ ہم اس کو انعام دیتے ہوئے من سے خوش ہیں۔ یہ گھوڑے چن سکتا ہے اور یہ رہا اس کا دوسرا انعام۔'' رتنا دیوی نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا اور اس نے ایک مخملی پوٹلی عمران کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے رانی؟'' عمران نے ادب سے پوچھا۔

''طلائی زیور...... تمہاری دو مٹھیاں کتنی بھی بڑی ہوتیں یہ ان سے زیادہ ہی ہے۔'' رتنا نے جواب دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ یہ زیادہ زیور تھا۔

عمران نے پوٹلی لے تو لی مگر اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اسے لینا نہیں چاہتا۔

عمران کی اکثر باتیں سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھیں۔ رتنا دیوی نے ایک بار پھر عمران سے کہا کہ وہ اپنی مرضی کے آٹھ گھوڑے شاہی اصطبل میں سے چن لے۔

عمران نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''رانی صاحبہ میں آپ کی ان نوازشوں کے قابل نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت مہنگے گھوڑے ہیں...... لیکن میں انہیں کہاں رکھوں گا اور سچ یہ ہے کہ مجھے گھڑسواری کا شوق بھی نہیں ہے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چاہوں گا کہ گھوڑے شاہی اصطبل میں ہی رہیں اور ان لوگوں کے استعمال میں آئیں جو ان کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

رتنا دیوی سمیت کئی افراد نے عمران کو حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ وہ عجب سیر چشمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رتنا دیوی نے کہا۔ ''ایسا ناہیں ہوسکت۔ ہم نے جو وچن دے رکھا ہے اسے پورا کریں گے۔ اگر تم گھوڑے لینا ناہیں چاہت ہو تو اس کی قیمت لے لو۔ یہاں کوئی بھی گھوڑا، ایک لاکھ سے کم قیمت کا نہیں ہے۔ یہ کافی بڑی رقم بن جاوے گی۔''

''لیکن رانی صاحبہ! میں یہ رقم لینا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ نہیں چاہیے۔ میرے لئے آپ کی توجہ اور مہربانی ہی بڑا انعام ہے۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے کسی قابل جانا اور میری ستائش کی میں بصد احترام اور خوشی یہ زیورات بھی واپس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں جی کہ ان کا بوجھ اُٹھا سکوں۔ آپ کے قدموں میں جگہ مل جائے، میرے لئے یہی بڑی بات ہے۔'' عمران کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

وہ زبردست اداکار تھا۔ بظاہر سادہ مگر اندر سے پیچیدہ۔

رتنا دیوی کا تنا ہوا چہرہ قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔

''صفورا! تمہارا یہ سیکیورٹی گارڈ خاصے کی چیز ہے۔ جو کچھ اسے مل رہا ہے، اس سے اس کے اگلے دس بیس سال بڑے آرام سے گزر سکت ہیں لیکن یہ لینے سے انکار کرت ہے۔''

''جی رتنا دیوی! یہ ایسا ہی ہے۔ بس اپنے آپ میں خوش اور مست رہنے والا۔''

رتنا دیوی نے بھرپور نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس کے جبڑے کا تھوڑا سا ٹیڑھا پن ظاہر ہوتا تھا۔ یہ دراصل اس پرانے حادثے کی نشانی تھا جب سلطانہ اور رتنا کا جھگڑا ہوا تھا۔ شاہی پن گھٹ کی سیڑھیوں پر رتنا شاید اپنے ہی زور میں گری تھی اور اس کا جبڑا ہل گیا تھا۔ اس معمولی سے نقص کے سوا رتنا دیوی ایک نہایت پُرکشش عورت تھی۔

اس نے عمران کا نام پوچھا اور پھر اسے نام سے مخاطب کر کے بولی۔ ''تمہیں کچھ نہ کچھ تو لینا پڑے گا۔ ورنہ ہمیں نراشا ہوگی۔''

عمران نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ''محترمہ رانی صاحبہ! یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں کہ میں خود کو جس کے قابل سمجھ سکوں۔''

''تم نراش کر رہے ہو۔'' رتنا دیوی کے ماتھے پر ہلکی سی سلوٹ نظر آئی۔

عمران نے گیراج کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''پاکستان میں کچھ عرصہ میں نے گاڑیوں کا کام کیا ہے جی۔ مجھے اچھی گاڑیوں کا شوق ہے اور ڈرائیونگ بھی اچھی کر لیتا ہوں...... اگر آپ کا اصرار ہے تو مجھے ان گاڑیوں میں سے کوئی عنایت کر دیجئے۔''

رتنا دیوی بولی۔ ''تو پھر تم خود چن لو...... وہ تمہارے سامنے کھڑی ہیں۔''

عمران گاڑیوں کے پاس گیا۔ کچھ دیر گھوم پھر کر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک فور وہیل ڈرائیو، چھوٹی جیپ کا انتخاب کیا۔ یہ اسپیشل ماڈل کی شاندار جرمن گاڑی تھی۔ حالت بھی اچھی تھی۔ رتنا دیوی کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے تردد نظر آیا۔ شاید یہ اس کی پسندیدہ گاڑی تھی۔ ویسے بھی اس بھانڈیل اسٹیٹ میں گنتی کی گاڑیاں ہی تھیں اور ان میں سے اکثر فاضل پرزوں کی عدم دستیابی کے سبب کھڑی رہتی تھیں۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد رتنا دیوی کے چہرے سے تردد کے آثار اوجھل ہو گئے۔ یقیناً اس نے حساب کتاب لگایا تھا۔ جو کچھ عمران اپنی منشا سے چھوڑ رہا تھا، وہ اس جیپ کی قیمت سے، کچھ نہیں تو بیس پچیس گنا زیادہ تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بس یا کچھ اور؟''

''بس رانی صاحبہ۔''

''ٹھیک ہے، یہ تمہاری ہوئی۔'' رتنا دیوی نے کہا۔

میں نے عمران کی دلکش آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں ایک چمک سی تھی۔

O......❖......O

سنسنی خیز گھڑیاں قریب پہنچ رہی تھیں۔ پورے زرگاں میں اس مقابلے کی دھوم تھی جو کل میرے اور جارج گورا کے درمیان ہونا تھا۔ وہ شکتی دیوتا تھا۔ وہ شکست کھانا نہیں جانتا تھا اور میں اسے شکست دینے کا دعویٰ کر چکا تھا۔

اس شام ہم لال بھون میں واپس آ گئے۔ ہم ''جم'' میں پہنچے اور قریباً تین گھنٹے تک اندھا دھند پریکٹس کی۔ یہ درد اور برداشت کا مقابلہ تھا۔ عمران بیٹھ گیا مگر میں لگا رہا۔ آخر میں بھی تھک کر چُور ہوا اور گدے پر گر گیا۔ عمران نے مجھے پانی پلایا اور پھر کیلوں کا ایک گچھا لے آیا۔ اس نے ایک کیلا چھیل کر بڑی محبت سے میری طرف بڑھایا۔ ''لو، منہ میٹھا کر لو اور اس میں توانائی بھی بہت ہوتی ہے۔''

''منہ میٹھا کس خوشی میں؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ترقی کی خوشی میں۔ سہ پہر کو رتنا دیوی کی ہدایت پر میڈم صفورا نے مجھے سیکیورٹی گارڈ سے پروموشن دے کر اسسٹنٹ انچارج بنا ڈالا ہے۔''

''بھئی واہ۔ رتنا، میڈم نادیہ اور گیتا لکھی جیسی عورتوں کو شیشے میں اُتارنا تمہیں خوب آتا ہے۔''

''تم بھی تو کچھ کم نہیں ہو۔ تم نے بھی تو یہاں آ کر سلطانہ جیسی منہ زور لڑکی کو شیشے میں اُتارا ہے۔''

سلطانہ کے ذکر نے ایک دم مجھے اداس کر دیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''عمران! کل کچھ بھی ہو سکتا ہے...... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو تم کیا کرو گے؟''

''میں گانا گاؤں گا۔ ساتھی رے...... تیرے بنا بھی کیا جینا...... جب دودھ میں بس پانی رہ گیا تو دودھ کا کیا پینا...... اس کے بعد میں گیتا لکھی کی آخری خواہش پوری کر کے آتما ہتھیا کر لوں گا۔ ویسے خودکشی کے مقابلے میں آتما ہتھیا قدرے بہتر چیز ہے۔ اس میں دوسرے جنم کی امید تو رہتی ہے نا۔''

''گیتا لکھی کی آخری خواہش؟ کیا مطلب؟''

''یار، وہ سونا چاہتی ہے میرے ساتھ اور تمہیں پتا ہے کہ وہ سوئے گی ہرگز نہیں۔''

''میں بہت سنجیدہ ہوں عمران۔''

''تو پہلے بتانا تھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی لطیفہ سنا رہے ہو۔ دیکھو جگر! ہم وصیتوں وغیرہ کی باتیں تو تب کریں جب ہمیں ہارنا ہو۔ ہمیں ہارنا ہے ہی نہیں۔ بس جیتنا ہے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ مڑ کر دیکھنے والے پتھر ہو جاتے ہیں اور ویسے بھی پیچھے کچھ نہیں۔ کل تم کشتیاں جلا کر میدان میں اُترو گے اور جیت کر باہر نکلو گے۔''

''لیکن عمران! غیب کا علم تو قدرت کے سوا کسی کو نہیں اور جب ہم غیب نہیں جانتے تو پھر ہمیں صرف ایک ہی رخ پر تو نہیں سوچنا چاہئے۔ کچھ پلاننگ تو ہونی چاہئے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اگر کل مجھے کچھ ہو گیا تو تم تین کام ضرور کرو گے۔ پہلا یہ کہ سلطانہ اور بالو کو سنبھالنا اور انہیں اسٹیٹ کے اندر یا باہر کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا...... دوسرا پاکستان جا کر فرح اور عاطف کا خیال رکھنا اور تیسرا......''

میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ آواز بیٹھ سی گئی۔

''ہاں...... ہاں۔ اب بولنا شروع کیا ہے تو بول دو۔''

''ہو سکے تو ثروت کا کھوج لگانا اور اگر کبھی اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہنا، میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے...... اور آخری سانس تک کیا ہے۔''

''یہ سب باتیں تم اس سے خود ہی کہو گے...... اگر سلطانہ نے کہنے کی اجازت دی تو۔ باقی جگر! دلیپ کمار وغیرہ تو خواہ مخواہ مشہور ہو گئے ہیں، اگر تم فلموں میں روندو ہیرو کے روپ میں آ جاؤ تو سب کی چھٹی کرا دو۔''

وہ ایسے ہی باتوں کو ہوا میں اُڑاتا تھا اور نہایت گھمبیر و کشیدہ ماحول کو بھی کسی دوسرے رخ پر دھکیل دیتا تھا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ امکانات پر غور کرتے رہے اور آمدہ گھڑیوں کی حشر خیز چاپ سنتے رہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری کہانی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے کہ میں سارے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔ ویسے مجھے ایک بات بتاؤ...... مجھے ذرّہ بھر بھی شک نہیں کہ جانوروں سے اپنے حیران کن تعلق کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے یہ حرف بہ حرف سچ ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ خصوصی تعلق ایک دم ختم کیسے ہو گیا؟ کیا اس میں تمہاری کوئی کوتاہی تھی یا اسے ہونا ہی تھا اور پھر پروفیسر رچی صاحب کی پیشین گوئی کہ یہ خاص صلاحیت پھر سے تمہارے اندر آ سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ شدت سے آئے۔ کیا یہ سب

درست ہے؟''

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے سچ سمجھوں۔ ہوسکتا ہے کہ جیسے اچانک ہی یہ سب کچھ میرے پاس سے چلا گیا، ایسے ہی واپس آ جائے اور ہوسکتا ہے نہ بھی آئے۔''

''کیا اب بھی تم جانوروں سے اسی طرح لگاؤ محسوس کرتے ہو؟''

''سچی بات یہ ہے جگر کہ زیادہ لگاؤ تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ جو کچھ تھا، دوسری طرف سے ہی تھا جواب نہیں ہے۔ ابھی دو تین دن پہلے ہی میں غلطی سے شیڈ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں بندھے ہوئے، منیجر مدن کے کتے نے مجھ پر جھپٹا مارا اور ٹانگ زخمی ہوتے ہوتے رہ گئی۔''

''اچھا اور ایک بات مجھے اُلجھن میں ڈال رہی ہے۔ تم اندر کی بات نہیں بتا رہے ہو۔ آج تم نے رتنا دیوی کی اتنی بڑی آفر ٹھکرا کر وہ جیپ کیوں چنی ہے۔ کیا اس سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہو؟''

''یار! اب تم میرے سیدھے سادے کاموں میں بھی ''پلاننگ'' ڈھونڈنے لگتے ہو۔ بس وہ گاڑی مجھے اچھی لگی اور میں نے لے لی۔ دوسری طرف میں نے رتنا کی آفر کو ٹھکرا کر اس کی انا کو ٹھیس بھی پہنچائی۔ وہ آج جتنی بھی میٹھی بنی ہوئی تھی مگر ہے تو تمہاری اور سلطانہ کی دشمن نا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا، کل بھی تم پر کیسی قہر بھری نظر ڈالتی تھی خانہ خراب۔''

''اس گاڑی کا کیا کرو گے؟''

''کل تمہاری جیت کے بعد تمہیں اس میں بٹھاؤں گا اور فاتحانہ پورے زرگاں کا چکر لگاؤں گا......''

''اور اگر معاملہ الٹ ہوا تو؟''

''اب آگے بولو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' اس نے گل دان اُٹھا لیا۔

میں خاموش ہو گیا تو اس نے ایک کتاب اُٹھا کر میری طرف بڑائی۔ ''اس میں ٹائم لگاؤ، فائدہ ہوگا۔''

یہ وہی مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی باتصویر کتاب تھی جو چند روز پہلے میڈم صفورا نے ہمیں دکھائی تھی۔ اس کا عنوان ''سویمبر اور سامبر'' تھا۔ آج میں نے میڈم سے فرمائش کی کہ یہ کتاب منگوائی تھی اور کافی دیر تک اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ میں باقی ماندہ کتاب پر نگاہ دوڑانے لگا۔ ساتھ ساتھ ہم دونوں باتیں بھی کرتے جا

رہے تھے۔ ہم قریباً نصف شب تک اپنی آخری تیاریوں میں مصروف رہے...... پھر فرش کے بستر پر پہلو بہ پہلو لیٹے اور سو گئے۔ کتنا حوصلہ بخش ساتھ تھا عمران کا۔

O......❖......O

راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے، جہاں تک نظر جاتی تھی لوگوں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک اسٹیڈیم نما جگہ تھی۔ بیٹھنے کے لئے پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی مقابلے ہو چکے تھے لیکن آج کے مقابلے نے بے نظیر شہرت پائی تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ایسے پوسٹرز اور بینرز نظر آ رہے تھے جن پر جارج گورا کی تصویر تھی اور اسے شکتی دیوتا کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ لڑائی کا اکھاڑا تھا۔ اس کی چاروں طرف آہنی جنگلا تھا جس میں بس ایک داخلی دروازہ تھا۔ وسیع گول اکھاڑا قریباً بیس میٹر قطر کا ہوگا۔ اس اکھاڑے کے درمیانی حصے کو لکڑی کے ایک گول سائبان کے ذریعے ڈھانپا گیا تھا۔ سائبان کم بیش بارہ فٹ اونچا تھا۔ اکھاڑے سے باہر حکم اور شاہی خاندان کے افراد کے بیٹھنے کے لئے ایک شاندار گیلری تھی۔ یہاں نہایت شاندار نشستیں تھیں اور سردی سے بچانے کے لئے انگیٹھیاں وغیرہ دہکائی گئی تھیں۔ بالکونی نما گیلری کی دائیں جانب وہ منحوس سُولی کھڑی تھی جس کا نظارہ میں نے اور عمران نے چند دن قبل کیا تھا۔ میرے دیرینہ ساتھی اسحاق کو یہاں بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ اس کی آخری دردناک آوازیں ابھی تک میرے کانوں میں زہر گھولتی تھیں۔ دائیں جانب ایک چھوٹا سا احاطہ اور بھی تھا۔ اسے بھی آہنی جنگلے اور خاردار تاروں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ جگہ بھی خاص لوگوں کے بیٹھنے کے لئے تھی۔ یہاں شامیانے وغیرہ تنے ہوئے تھے۔

''بڑے خونی مقابلے'' سے پہلے یہاں تین چار چھوٹے مقابلے بھی ہونے تھے۔ ان سامبر مقابلوں میں حصہ لینے والے افراد ایک چھوٹے سے احاطے میں موجود تھے اور خود کو وارم اَپ کر رہے تھے۔ شاہی مہمانوں کی گیلری کے ساتھ ہی میں ایک پختہ کمرے میں موجود تھا۔ میرے اردگرد گارڈز کا سخت پہرا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میرے جسم پر فقط ایک کاٹرائے پتلون تھی۔ بے شمار لوگ میری جھلک دیکھنے کے خواہش مند تھے تاہم سخت سیکیورٹی کے سبب وہ نزدیک نہیں آ سکتے تھے۔ جارج کہاں تھا، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ عمران میرے ساتھ ہی تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ میڈم صفورا کا پاکستانی گارڈ (عمران)

ٹریننگ میں میری معاونت کرتا رہا ہے۔لہٰذا میرے ساتھ اس کی موجودگی پر کسی کو تعجب نہیں تھا۔عمران کی موجودگی مجھے بے پناہ حوصلہ دے رہی تھی۔اس کے علاوہ بھی مجھے دو تین تجربہ کار معاون فراہم کئے گئے تھے۔ان میں سے ایک درمیانی عمر کا پارسی تھا۔اس نے اکھاڑے کے اندر لڑائی کے دوران میں میری دیکھ بھال کرنا تھی۔

اب تک ہم نے جارج گورا کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق لڑائی میں جارج کا اہم ترین ہتھیار اس کی ''بدزبانی'' تھی۔وہ اپنے حریف کو تاؤ دلاتا تھا اور غلطی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔جوڈو کی ایک تکنیک ''نیک لاک'' اس کا پسندیدہ ترین داؤ تھا۔اپنے بیشتر حریفوں کو اس نے اسی طرح پچھاڑا تھا کہ ان کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی تھی اور انہیں بے بس کر دیا تھا۔ایسی صورت میں جارج کے حریف کے پاس دو ہی راستے ہوتے تھے کہ وہ اپنی گردن تڑوالے یا پھر ہار مان لے۔

عمران نے مجھ سے کہا تھا۔''جگر! جس طرح اپنے حریف کے خطرناک ہتھیار کا پتا ہونا چاہئے، اسی طرح اپنے بہترین ہتھیار کا بھی علم ہونا چاہئے۔تمہیں پتا ہے تمہارا بہترین ہتھیار کیا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔''تمہاری برداشت، تمہاری درد سہنے کی گنجائش۔تم نے مہینوں تک اپنی جان کو جس طرح رولا ہے، اس نے تمہارے اندر درد سہنے کی زبردست صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ تمہاری یہ صلاحیت تمہارے مدِمقابل کو کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہے۔وہ جس وقت تمہیں تکلیف کے شکنجے میں سمجھ رہا ہوگا اور یہ سمجھ رہا ہوگا کہ تم مزید وار نہیں کر سکتے، تم وار کرنے کی پوزیشن میں ہو گے، اگر تم کسی ایسے موقع سے فائدہ اُٹھا سکو تو......تمہارے لئے بہت اچھا رہے گا۔''

بات کرتے کرتے اس نے تیزی سے مکا چلایا۔میں نے بے ساختہ ایک طرف جھک کر اس کا وار بچایا اور جوابی مکا مارا۔یہ مکا عمران نے اپنی ہتھیلی پر روکا۔''ہاں، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔''تمہارے دائیں کے کی طاقت سے مجھے بڑی امیدیں ہیں، چند روز پہلے تم نے فصیل پر جس طرح پہرے دار کی کھوپڑی توڑی تھی...... ایسے ہی ایک بدبودار ناریل ادھر بھی توڑ ڈالو تو مزہ آ جائے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی چھوٹے مقابلے شروع ہو چکے تھے۔ایک مقابلہ زرہ بکتر جیسا لباس پہن کر کیا گیا اور اس میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئیں۔ایک

شخص کے زوردار وار سے اس کے حریف کا آہنی خود پچک گیا۔منصف نے مقابلہ وہیں روک دیا اور زوردار وار کرنے والے کو فاتح قرار دیا۔

دوسرا مقابلہ خاصا یک طرفہ تھا۔صرف تین چار منٹ میں ختم ہو گیا۔جیتنے والے نے سر کی ایک زوردار ٹکر سے اپنے کمزور مدِمقابل کو لمبا لٹا دیا۔وہ نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔اسے اُٹھا کر باہر لے جانا پڑا۔اس کے فوراً بعد تیسرے مقابلے کی شروعات ہو گئی۔

آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا انتظار بے پناہ شدت سے کیا جا رہا تھا۔جس کے لئے لوگوں کا چین سکون حرام ہوا تھا۔وہ مقابلہ جس پر بیش بہا شرطیں لگ چکی تھیں اور جس کے نتیجے کے بارے میں ہزار ہا قیاس آرائیاں فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔رنجیت پانڈے جیسے ''جن'' کو چند منٹ میں پسپا کر دینے والا شخص......شکتی دیوتا کے مدِمقابل تھا۔

عمران جیسا ''لکی'' شخص میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔وہ بدترین رسک لیتا تھا اور کامیاب ہوتا تھا۔خطرات اس سے آنکھیں چرا کر گزرتے تھے......اور ''بازیاں'' اس کے حق میں پلٹنے کو تیار رہتی تھیں۔اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر میرے ذہن میں آیا......کہیں عمران کے ہوتے ہوئے میں جارج کے مقابل جانے میں غلطی تو نہیں کر رہا لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو رد کیا۔عمران کی ساری آشیر باد میرے ساتھ تھی۔ وہ اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ مجھے اکھاڑے میں داخل کر رہا تھا۔میں اس سے بغل گیر ہوا۔میں نے اس کا شانہ چوما، اس نے میرا اور پھر میں اکھاڑے میں آ گیا۔

ہوا بند تھی۔میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔اس نے پتلون اور بغیر آستین کی بنیان پہن رکھی تھی۔اس کا فولادی جسم ڈھلتے سورج کی کرنوں میں دمک رہا تھا۔میں پاؤں سے ننگا تھا جبکہ جارج نے جوگرز پہن رکھے تھے۔ہماری بائیں جانب لوہے کی ایک مستطیل میز تھی۔اس پر تین تیز دھار آلے رکھے تھے۔چھوٹے دستے کی دو کلہاڑیاں، دو رام پوری چاقو اور دو چھوٹی تلواریں یعنی کٹاریاں۔ہم ان میں سے کوئی سے بھی ایک جیسے دو ہتھیار چن سکتے تھے۔

دو فربہ اندام شخص میدان میں آئے۔ان میں سے ایک نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں چند کاغذ تھے۔لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج بھی عقب میں موجود تھا۔

''ان کاغذوں پر تمہارے دستخط ہوں گے۔'' عینک والے نے فائل میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

میں نے سرسری نظر ڈالی۔ اردو میں وہی تحریر لکھی گئی تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ یعنی یہ سامبر مقابلہ میری مرضی و رضامندی سے ہو رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لڑائی ہم دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کی موت تک جاری رہے گی...... میری موت کی صورت میں میرے وارثوں کو کسی طرح کا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا...... اور یہ کہ میں اپنی تحریری یا زبانی وصیت کر چکا ہوں اور مجھے اس حوالے سے مزید کچھ نہیں کہنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بلاتردد ان کاغذوں پر دستخط کر دیئے۔ جارج گورا نے فقرہ کسا۔ ''اس پر یہ نوٹ بھی لکھ دو کہ میرے بعد میری بیوی کو اجازت ہے کہ وہ شادی کے بغیر جارج کے ساتھ رہ سکے۔''

میرے بدن میں انگارے دہک گئے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ تو شروعات ہے۔ مجھے آخر تک اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ہے۔

میرے بعد جارج گورا نے کاغذات پر دستخط کیئے۔ اب بے پناہ شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ یہ امر میری حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہجوم میں میرے حمایتی بھی کم نہیں ہیں۔ جارج نے اپنی زہریلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب ان ہتھیاروں کی طرف آؤ اور دیکھو کہ تم کس ہتھیار سے مرنا پسند کرو گے۔''

سرجن اسٹیل نے مجھے بتا رکھا تھا کہ جارج مجھے ہتھیار چننے کی پیشکش کرے گا۔ یہ ایک طرح سے زبردست نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ غالباً اس طرح وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ لڑائی کے ہر طریقے پر عبور رکھتا ہے۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے رام پوری چاقو اٹھا لیا۔ یہ مضبوط دستے کا وزنی چاقو تھا۔ اس کی دھار اور لوہا دونوں شاندار تھے۔ درمیان میں خم سا تھا۔

''گڈ چوائس۔'' جارج نے کہا۔ پھر انگلش میں ہی بولا۔ ''لگتا ہے، یہ لڑائی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔'' اس کے بعد اس نے بھی چاقو اٹھا لیا۔

ایک ہٹا کٹا معاون آگے بڑھا اور آہنی میز اوزاروں سمیت اٹھا کر میدان سے باہر لے گیا۔ منصف کے فرائض انجام دینے والے سفید فام شخص نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر ہم دونوں کا لباس چیک کیا اور آخری ہدایات دینے کے بعد ہمارے درمیان سے ہٹ گیا۔ یہ آخری رکاوٹ بھی دور ہوگئی۔ اب میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہزاروں تماشائیوں کے ساتھ ساتھ جیسے نیلگوں آسمان بھی تماشائی تھا۔ یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لئے ہوا بھی ساکن ہوگئی ہے اور ڈھلتا ہوا سورج بھی اپنی حرکت بھول کر اس منظر میں

کھو گیا ہے۔

ہم ایک دوسرے پر گہری نظر رکھے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرتے رہے۔ جارج نے زہر افشانی کی۔ ''تمہارا باپ ضرور ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنی والدہ کا شوہر نہ سمجھو...... بس حریف سمجھو، حملہ کرو۔''

ایک بار پھر تن بدن میں آگ بھڑکی لیکن میں نے خود کو ٹھنڈا رکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک مناسب موقع نظر آیا۔ جارج گورے کا ایک پاؤں ہوا میں تھا۔ دوسرے پر ابھی پورا وزن نہیں پڑا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وار کیا۔ جارج نے خود کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔ میرا چاقو اس کے پیٹ میں لگا۔ چاقو کی نوک نے اس کے جسم پر ایک سرخ لکیر سی کھینچ دی لیکن یہ معمولی نقصان تھا۔ لکیر گہری نہیں تھی۔ اس حملے کے جواب میں جارج گورا مغلظات بکتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے چاقو کے کم از کم چھ وار کیئے۔ ان میں سے ایک وار نے میرے کندھے پر کھرونچ ڈالی۔ باقی وار میں نے کامیابی سے بچائے۔ اسی دوران میں میرا داؤ چل گیا۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے ایک بھرپور لات گورا کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ مجھے اٹھنے کا موقع ملا اور میں پھر بازو کھول کر اس کے سامنے آ گیا۔

میرے دوبارہ کھڑے ہو جانے پر میرے خیرخواہوں نے شور بلند کیا اور جوش کے عالم میں پگڑیاں ہوا میں لہرائیں۔ جارج آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ماہر چاقو زنوں کے انداز میں وہ چاقو کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جس کی توقع گورا کو ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ شاید مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ وار اتنی کامیابی سے کر سکوں گا۔ اس وار کے لئے بے حد پھرتی اور ٹائمنگ درکار تھی جو میرے اندر کی آگ نے مجھے فراہم کی۔ میں نے اپنی ٹانگ چلائی۔ جارج گورا کا چاقو اس وقت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا رہا تھا۔ وہ کسی ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔ میرے پاؤں کی ضرب نے اسے ہوا میں اچھالا اور وہ اڑتا ہوا سا اکھاڑے کے آخری کنارے تک چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ جارج سنبھلتا، میں نے زوردار حملہ کیا۔ رام پوری چاقو کی نوک گورا کے عین دل کے مقام پر لگتی مگر اس نے بروقت پینترا بدلا اور چاقو اس کے بازو میں پیوست ہوا۔ میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی گورا نے اس میدان نما اکھاڑے کے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اپنے چاقو تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ نصف راستے میں تھا کہ میں نے جست لگا کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ تاہم اس کوشش میں چاقو میرے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔

ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے ہم پھر میدان کے وسط میں پہنچ گئے۔ دونوں چاقو ہماری پہنچ سے دور رہ گئے۔ میں جارج گورا کے منحوس بوجھ تلے دب گیا۔ جارج نے پھر زہر افشانی کی۔ ”اپنی پتنی سے بس تھوڑا ہی زیادہ زور ہے تمہارے اندر۔“

میں نے اس کا جواب ایک بھرپور مکے سے دیا۔ یہ مکا جارج کے چوڑے تھوبڑے پر لگا۔ چند لمحوں کے لئے وہ تیورا گیا۔ میں اس کے اوپر آ گیا اور یہیں پر مجھ سے وہ غلطی ہوئی جو نہیں ہونی چاہئے تھی...... اور جس کے حوالے سے میں الرٹ بھی تھا۔ پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اچانک میں نے اپنی گردن کو ایک آہنی شکنجے میں محسوس کیا۔ میں نے تڑپ کر نکلنا چاہا مگر دیر ہو چکی تھی۔ جارج مجھے اپنے بدنام زمانہ داؤ میں لے چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ میں اب یہاں سے زندہ نہیں نکلوں گا۔ میں نے دوبارہ بھرپور کوشش کی مگر گردن پر اس کے فولادی بازو کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ کوشش ناکام ہوئی۔ بے پناہ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یقیناً یہ جارج گورا اور حکم کے حمایتی ہی تھے۔ میری نگاہ شاہی بالکونی میں گئی۔ وہاں بھی تماشائی جوش کے عالم میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں جارج کی بہن ماریا اور بہنوئی سرجن اسٹیل پیش پیش تھے۔ ان کے سرخ چہرے تمتما رہے تھے۔

اگلے قریباً بیس منٹ کا وقت میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں موت و حیات کے درمیان لٹک گیا تھا...... میں گردن چھڑانے کے لئے بس ایک خاص حد تک زور لگاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھتا تھا تو لگتا تھا کہ گردن ٹوٹ جائے گی اور ذہن تاریکیوں میں ڈوب جائے گا۔ میں نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں جارج گورا کے سر کے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرا ہاتھ اس کے آہنی شکنجے میں اس طرح گھسا دیا تھا کہ وہ میری گردن پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے۔ یہ ایک طرح کا ڈیڈ لاک بن گیا تھا۔ جارج اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ زور لگا کر میری گردن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکے۔ دوسری طرف میں بھی اس کے بازو کا شکنجہ کھولنے میں ناکام تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اگر میں اندھا زور لگا کر گردن چھڑانے کی کوشش کرتا تو جارج کو اپنے بازو کے لئے اضافی توانائی مل جاتی اور وہ اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے میں کامیاب ہو جاتا...... یا پھر مجھے بے ہوش ہی کر دیتا۔

وہ ناقابلِ فراموش گھڑیاں تھیں۔ میری سانس رک رہی تھی، آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ لگتا تھا پھیپھڑے پھٹ جائیں گے...... یہ درد سہنے کی خو ہی تھی جو مجھے ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑا رکھے ہوئے تھی اور یہ جاں گسل اذیتوں سے میرا ناتا ہی تھا جو مجھے مزاحمت کا حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے میدان میں اِدھر اُدھر گھما رہا تھا اور جنونی لہجے میں بک

رہا تھا۔ ”تمہاری پتنی کا جسم بڑا کومل ہے۔ کیا ایسے جسم والی تمہاری کوئی اور قریبی رشتے دار بھی ہے؟“

اسی قسم کے زہریلے فقرے تھے جو وہ بار بار میرے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔

میں اسے دھکیلتا ہوا کئی قدم پیچھے لے جاتا تھا پھر آگے لاتا تھا، پھر اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے بالوں سے ہٹا کر اس کی جانگ تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ بڑا عیار تھا۔ اس نے معقول انتظام کر رکھا تھا کہ میں اپنا ہاتھ اس کی ناف تک نہ پہنچا سکوں۔ جونہی میں اپنا ہاتھ نیچے لاتا، وہ اپنا آزاد ہاتھ میری بغل میں حائل کر دیتا اور یوں میری حرکت کر جاتی۔

میرے حمایتیوں کو چپ لگ چکی تھی۔ کان پھاڑ دینے والا شور جارج کے پرستاروں کا تھا۔ میری سانس ٹوٹنے لگی۔ جارج کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ مجھے یہ آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ ”...... تم حاملہ بکری ہو۔ تمہاری گردن نرشیر کے پنجوں میں ہے۔ اگر تم اپنی گردن نکال لو تو میں ابھی سب لوگوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں کاٹ لوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے کسی قصاب کی طرح نیچے کو زور لگایا۔ میری پیشانی زمین سے جا لگی۔ وہ حیوانی قوت سے میرا چہرہ زمین سے رگڑنے لگا۔ میرا باقی جسم آزاد تھا لیکن وہ عضو معطل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سلطانہ کا چہرہ میرے ڈوبتے ذہن میں چمکا...... اس کے بعد باروندا جیکی کی شبیہہ نمودار ہوئی...... پھر اسحاق کی زندگی کے آخری دردناک مناظر نگاہوں میں گھومے۔ میں نے اپنے جسم کی رہی سہی قوت جمع کی، ایک حتمی اور آخری کوشش کی۔ بے پناہ زور لگایا اور اپنا بایاں ہاتھ جارج کے مڑے ہوئے بازو میں گھسا کر اس کی بندش توڑنا چاہی۔ میری جنونی مزاحمت نے چند لمحوں کے لئے جارج کو ہلا دیا۔ یوں لگا کہ اس مرتبہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرے حمایتیوں میں جان پیدا ہوئی...... مگر پھر اچانک ہی جارج نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور اپنی اس وحشیانہ طاقت کا مظاہرہ کیا جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا اور میرا چہرہ ایک بار پھر بے بسی کی مٹی میں لتھڑا گیا۔ میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن کا دخل اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اگلے دو تین منٹ میں، مَیں ختم ہونے والا ہوں۔ تو یہ تھا انجام...... اس خونی مقابلے کا؟

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی کی ڈور کو تھامنے کی کمزور کوشش کرنے لگا۔

دفعتاً مجھے لگا کہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی رُونما ہوئی ہے۔ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انہونا

تھا۔ ہماری لڑائی میں کسی کو بھی مداخلت نہیں کرنا تھی لیکن کوئی کررہا تھا۔ کوئی جارج کو میری جان لینے سے روک رہا تھا۔ کون تھا؟ کون ہوسکتا تھا؟ میں اوپر دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری دھندلائی نگاہوں کو صرف پاؤں نظر آرہے تھے۔ شاید یہ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج تھا۔ ''چھوڑ دیجئے سرکار...... چھوڑ دیجئے اسے...... سے ختم ہوگیا ہے......''

پنڈت مہاراج کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے اُبھر کر میرے کانوں تک پہنچی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ پنڈت مہاراج اور اس کے دوتین چیلے مجھے جارج کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ ''وقت'' کا ذکر کررہے تھے اور جارج کو بتارہے تھے کہ مقابلے کے قاعدے کے مطابق ''وقت'' ختم ہوگیا ہے۔ سورج ڈوب گیا ہے۔

جارج نہیں سن رہا تھا۔ وہ ایک آخری جھٹکا دے کر ڈراپ سین کرنا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کرچکا تھا کہ میری مزاحمت کم ہوتے ختم ہورہی ہے۔

اچانک میری نگاہ کچھ دور عمران پر پڑی۔ وہ جست لگاتا ہوا میدان میں داخل ہورہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے ہماری طرف آیا اور ان تین چار افراد میں شامل ہوگیا جو مجھے جارج گورا کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کررہے تھے۔ عمران کی آمد نے یکا یک صورتِ حال بدل دی۔ اس کی ''پکڑ'' معمولی نہیں تھی۔ جارج کے فولادی بازو پر عمران کی پکڑ قائم ہوتے ہی مجھے اپنے سانس کی آمدورفت بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں اچانک جیسے موت سے زندگی کی طرف آیا۔ میری گردن جارج کے شکنجے سے نکل گئی۔ میں نے دیکھا، جارج غضب ناک انداز میں عمران پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھ۔ ''یو باسٹرڈ...... یو باسٹرڈ منکی۔''

اس نے عمران پر کئی مکے چلائے جنہیں عمران نے کمال صفائی سے بچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دفاعی انداز میں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یکا یک بہت سے گارڈز جارج اور عمران کے درمیان کود پڑے۔ کچھ گارڈز نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میرے لئے کھڑا ہونا مشکل ہورہا تھا۔ گارڈز مجھے سہارا دیتے ہوئے اس خونی میدان سے باہر لے آئے۔

O......❖......O

اور یہ رات کا وقت تھا۔ میں راج بھون کے اندر ہی ایک مہمان خانے میں تھا۔ عمران اور میرے تین چار معاون بھی میرے ساتھ تھے۔ ان میں پارسی معاون بھی تھا۔ وہ ایک اچھے کمپاؤنڈر کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ وہ میرے زخموں کی دیکھ بھال کررہا تھا۔ میری گردن کا پرانا زخم مسلسل خون اگل رہا تھا۔ اس کے علاوہ پسلیوں پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ کسی وقت مجھے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہونے لگتا تھا۔ اگر میں زندہ تھا تو اس میں میری

خوش قسمتی کو بھی دخل تھا۔ جیسا کہ چند دن پہلے ہی مجھے بتادیا گیا تھا کہ شبھ گھڑی کے مطابق یہ مقابلہ سورج غروب ہونے سے قریباً ایک گھنٹا پہلے شروع ہوگا اور غروب آفتاب تک جاری رہے گا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ یہ مقابلہ اتنی دیر چلے گا۔ ایسی خونی لڑائیاں عموماً بیس پچیس منٹ کے اندر ہی اختتام پذیر ہوجاتی تھیں اور بعض اوقات تو پہلے دوتین منٹ کے اندر ہی فیصلہ ہوجاتا تھا مگر اس لڑائی نے غیر متوقع طول پکڑا تھا۔ یہاں تک کہ پنڈتوں کی رائے کے مطابق سورج غروب ہوگیا تھا۔ اب بھی اگر مقابلہ جاری رہتا تو یہ سراسر ''پاپ'' ہوتا...... لہٰذا اسے روک دیا گیا۔ اب کل سورج نکلنے کے بعد یہ مقابلہ پھر شروع ہونا تھا...... اور پہلے پہر کی تیسری گھڑی تک جاری رہنا تھا۔

آج کی لڑائی ایک نہایت مایوس کن موڑ پر ختم ہوئی تھی۔ عمران خاموش تھا۔ میرے معاونین کے چہرے بھی اُترے ہوئے تھے۔ پارسی گوہل نے کہا۔ ''تابش صاحب! آپ کی قسمت نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ورنہ جارج صاحب کے اس داؤ میں آکر کوئی نکلتا ناہیں۔ کل پھر وہ شروع میں ہی آپ کو اس داؤ میں پکڑنے کی کوشش کریں گے...... اور آپ گھائل بھی ہیں۔''

''کیا تم صرف نراشا کی باتیں کرنے کے لئے یہاں بیٹھے ہو؟'' دوسرے معاون نور محمد نے تڑخ کر کہا۔

''میں وہ کہہ رہا ہوں جو نظر آوت ہے۔ تم ان کی گردن کا زخم ناہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ کھل گیا ہے۔ میں نے بڑے جتن سے پٹیاں باندھ کر خون روکا ہے اور یہ پسلیوں والی چوٹ بھی معمولی ناہیں ہے۔''

''لیکن کچھ بھی ہے، تمہیں حوصلہ بڑھانے والی بات کرنی چاہئے...... اگر ہم......'' ایک دم معاون نور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

عمران نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دو گارڈز کے پیچھے آٹھ دس افراد اندر آگئے۔ ''نمستے نمستے'' کی کئی آوازیں گونجیں۔ اندر آنے والے اپنے حلئے سے نچلی ذات کے ہندو لگتے تھے۔ ان کے لباس بھی معمولی تھے۔ پگڑیاں سر سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مسکین لہجے میں کہا۔ ''سرکار! ہم آپ سے بات کرنا چاہت تھے۔ بڑی مشکل سے اجاجت ملی ہے جی۔ کئی جگہ تلاشیاں دے کر یہاں تلک آئے ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے جی کہ اس سامبر مقابلے میں ہم جیسے بہت سے لوگن کی ہمدریاں

آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کی جیت چاہت تھے اور...... اب بھی چاہت ہیں لیکن سرکار......مم......میرا مطلب ہے کہ......سرکار......" وہ بُری طرح ہکلا گیا۔

عمران بولا۔"جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے لجاجت سے کہا۔"سرکار! آپ ہماری بات کا برا نہیں مانیے گا لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ آپ کی دھرم پتنی سلطانہ بی بی سے ایک اپرادھ ہوا ہے۔ان سے ایک برہمن موہن کمار جی کی ہتھیا ہوئی ہے۔ پتی ہونے کے کارن اس کا کچھ نہ کچھ بوجھ تو آپ پر بھی پڑتا ہے۔ہم نے اپنے طور پر آپ کے اور آپ کی پتنی جی کے زائچے بنوائے ہیں اور فالیں بھی نکلوائی ہیں۔آنے والے سمے کا ٹھیک پتا تو بھگوان کو ہی ہے لیکن جو رنجر یہی آوت ہے کہ...... آپ...... یہ لڑائی جیت ناہیں سکیں گے۔ہم آپ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے بنتی کرت ہیں کہ آپ اس لڑائی سے پیچھے ہٹ جاویں۔"

اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔اس کی گدلی آنکھوں میں واقعی سچی خیر خواہی نظر آتی تھی۔ میں نے اپنی گردن کی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔"اگر میں پیچھے ہٹ جاؤں تو کیا ہوگا؟ یہ برہمن زادے مجھے چھوڑ دیں گے......اور وہ سفید شیطان میری جان بخشی کر دے گا؟"

"میں نے پنڈت مہاراج سے بھی بات کی تھی جی...... وہ کہوت ہیں کہ ایشور کی طرف سے آپ کو ایک موقع تو ملا ہے۔ یہ لڑائی سورج ڈوبنے کے کارن رک گئی ہے۔اگر آپ لڑائی سے پیچھے ہٹ جائیں اور کچھ شرطیں مان لیں تو ہوسکت ہے کہ آپ کی موت کی سجا کسی اور سجا میں بدل جاوے۔"

عمران بولا۔"اور ان شرطوں میں سب سے پہلی شرط یہی ہوگی کہ تابش اپنی بیوی کا پتا بتائے اور اسے ان بے رحم قاتلوں کے حوالے کرے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"اس بات کا تو ٹھیک سے پتا ناہیں جی۔ پر شاستروں سے نکالی گئی فالیں جھوٹ نہیں بتا سکتیں۔ جی ساری فالوں کا یہی کہنا ہے کہ یہ لڑائی......" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم نے کچھ اور کہنا ہے یا بس؟" میں نے پوچھا۔

"بس سرکار! یہ ہم سب کے من کی آواز تھی جو ہم آپ تلک پہنچانا جروری سمجھتے تھے۔ آخری فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تمہاری ہمدردی اور تمہارے مشورے کا شکریہ۔" میں نے کہا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لوگ اب چلے جائیں۔ مجھے اور عمران کو حیرانی ہوئی جب باہر جانے سے پہلے ان سب مسکین صورت لوگوں نے باری باری میرے پاؤں چھوئے۔

ان کے جانے کے بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور دھیمی آواز میں بولا۔"تو ہم پرستی کے اس بت کو تو ہم نے توڑنا ہے۔اب ہمارا جیتنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے......اور ہم جیتیں گے۔" اس کی آواز میں وہی ولولہ تھا جو اسے کسی بھی دوسرے شخص سے ممتاز کرتا تھا۔

وہ درد اور تناؤ کی رات تھی۔ ہم آتش دان کے پاس بیٹھے تھے۔عمران ہر پل میرے ساتھ تھا۔ کبھی میری مرہم پٹی کرتا ہوا، کبھی میرے بازو دباتا ہوا اور مجھے حوصلہ دیتا ہوا۔ کبھی مجھے تکنیکی مشوروں سے نوازتا ہوا۔اس نے مجھے بتایا کہ اپنے زخموں کی وجہ سے میں کچھ کمزور پڑ رہا ہوں۔ ایسی صورت میں جارج مجھے اچانک غیر متوازن کر کے اپنے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مجھے سامبر مقابلے کے اس "ناک آؤٹ داؤ" سے ہوشیار رہنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ آخر میں اس نے اپنا وہ پسندیدہ فقرہ بھی میرے سامنے دہرایا۔ میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر اور دلکش انداز میں مسکرا کر بولا۔"تابی جگر! جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا......"

اگلے روز سورج نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد میں اور جارج پھر آمنے سامنے تھے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بہت سے تماشائی سرد موسم کے باوجود ساری رات اس اسٹیڈیم نما جگہ پر موجود رہے ہیں۔ جو گھروں کو چلے گئے تھے، وہ بھی صبح سویرے اپنی جگہوں پر لوٹ آئے تھے۔ سخت سردی میں ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ جوں جوں سورج اوپر آ رہا تھا، یہ دھند اوجھل ہو رہی تھی۔ سنہری دھوپ درختوں پر سے اوس چن رہی تھی ور قرب و جوار کی ہر شے کو نکھارتی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کل کی طرح پھر کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ نقارے بج رہے تھے اور نعروں کے شور سے زمین دہل رہی تھی۔

ہمارے لباس کل والے ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ گرانڈیل جارج کے کندھے پر ایک سفید پٹی نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف میری گردن اور پسلیوں پر بھی پٹیاں موجود تھیں۔ کل والے رام پوری چاقو پھر سے ہمارے حوالے کر دیئے گئے۔ ہم وسیع اکھاڑے کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آج جارج کل سے زیادہ بااعتماد نظر آتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی سی کوندر ہی تھی۔ وہ مجھ سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اشتعال انگیزی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔"یہ خیرات کی زندگی تمہیں پنڈتوں کی طرف سے ملی ہے۔ تم لوگ ہوتے ہی بے غیرت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم رات کو ہی اپنے

گلے پر چھری پھیر لیتے لیکن کوئی بات نہیں۔ آج ''ہم'' یہ کام کریں گے اور زیادہ اچھے طریقے سے کریں گے۔''

میں کل کی طرح آج بھی یکسر خاموش رہا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے پھر جارج نے ہی حملے کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے چاقو سے میری گردن کو نشانہ بنانا چاہا۔ چاقو کی دھار میری گردن کی پٹی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا۔ اس نے پھرتی سے گھٹنا چلایا۔ ضرب میری ٹھوڑی پر لگی۔ میں اچھل کر دور جا گرا۔ وہ مجھ پر جھپٹا۔ مجھے اس کے چاقو سے زیادہ اس کے خطرناک داؤ کا اندیشہ تھا۔ میں اپنی گردن بچانے کے لئے بائیں طرف جھکا اور اپنے دائیں بازو کو اس کے چاقو سے نہ بچا سکا۔ ایک انگارہ سا گوشت میں اُتر گیا۔ کندھا زخمی ہوا اور خون نکلنے لگا۔ میں کئی پلٹیاں کھا کر جارج کی زد سے نکلا۔ جارج کے ساتھیوں نے جارج کے کارگر وار پر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ مقابلے کے شروع میں ہی یہ زخم لگ جانے سے جارج کا پلڑا اور بھاری ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اسے فتح یقینی نظر آنے لگی ہے۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میری شکست کی صورت میں کیا ہو گا۔ غالب امکان یہی تھا کہ جارج مجھے اکھاڑے میں مارنا نہیں چاہے گا بلکہ سُولی چڑھانے کے لئے زندہ رکھے گا۔

ایک دم میں چونکا۔ میں اپنی شکست کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران نے یہی کہا تھا کہ شکست کے بارے میں نہیں سوچنا۔ کچھ اسی سے ملتی جلتی بات باروندا جیکی بھی کہہ گیا تھا۔ وہ کہتا تھا...... تکلیف اور توہین (شکست) کا ڈر ہی فائٹر کو کمزور کرتا ہے۔

یکا یک میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ جارج نے آج میرے ساتھ وہی کیا تھا جو کل میں نے مقابلے کے شروع میں اس کے ساتھ کیا تھا، ایک طرح سے اس نے میرے کل والے جادوئی وار کا جواب دیا تھا۔ میں زخمی کندھے کے سبب اپنے چاقو کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کر رہا تھا جب اس نے زبردست ٹائمنگ کے ساتھ ٹانگ چلائی اور چاقو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ ہوا میں اُڑ کر اوپر لکڑی کے سائبان میں پیوست ہو گیا۔ اب وہ میری پہنچ سے دور تھا اور میں خود کو نہتا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر جارج کے حمایتیوں نے شورِ قیامت بلند کیا۔ ان میں سے بہت سے اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ جارج نے اپنے چاقو کو اس طرح پکڑا کہ اس کا رخ نیچے کو ہو گیا۔ اب جارج کا انگوٹھا چاقو کے دستے کے آخری سرے پر تھا۔ اس نے مجھے جھکائی دے کر پہلے بائیں طرف ہٹایا پھر اچانک تڑپ کر وار کیا۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی چاقو والی کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اپنے زخمی جسم کی

رہی سہی طاقت جمع کر کے اس کی کلائی مروڑی۔ میں چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ گورے کا دوسرا ہاتھ آزاد ہے اور میری یہ چاقو چھڑانے والی دیوانہ وار کوشش میری گردن کو پھر سے گورے کے شکنجے میں لا سکتی ہے مگر اب رسک لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور چاقو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ چاقو گرا تو میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے کے آخری کنارے تک پہنچا دیا لیکن پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا اور غالباً بہت سے تماشائی بھی جانتے تھے۔ جارج گورا گھوم کر میرے پیچھے آیا اور میری زخمی گردن ایک بار پھر اس کے منحوس شکنجے میں پھنس گئی۔ اس مرتبہ تماشائیوں کا شور فلک شگاف تھا۔ شکتی دیوتا والے کتبے ہوا میں لہرانے لگے اور سیکڑوں بینر زمحوِ رقص ہو گئے۔

جارج پھنکارا۔ ''باسٹرڈ! میں نے کہا تھا نا، حاملہ بکری اور نر شیر کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔''

اگلے آٹھ دس منٹ پھر اسی اذیت ناک صورتِ حال میں گزرے جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں اور اگر کروں گا تو یہ خونی روداد طوالت کا شکار ہو گی۔ یہ باروندا جیکی کا انوکھا فلسفہ بھی تھا جو مجھے ان جاں گسل لمحوں میں درد سہنے کا حوصلہ دے رہا تھا...... میری سانس اکھڑتی جا رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میری زخمی پسلی ٹوٹ چکی ہے۔ میری گردن اور کندھے سے خون کا اخراج بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ اخراج میری ناتوانیوں کو تیزی سے بڑھا رہا تھا۔ میں مسمار ہو رہا تھا...... مٹ رہا تھا۔ بعین کل والی صورتِ حال تھی۔ جارج کا لاک مکمل تھا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے لاک میں پھنسایا ہوا تھا تا کہ اپنی گردن پر اس کے بازو کا دباؤ کم رکھ سکوں۔ دوسرے ہاتھ سے میں اسے کوئی جسمانی تکلیف پہنچانے کی جوابی کوشش کرتا تھا تو وہ میرے آگے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو ''بلاک'' کر دیتا تھا۔ میں نہتا تھا۔ میرا چاقو کہیں اوپر سائبان میں اٹک چکا تھا اور جارج والا چاقو میں خود پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے سے باہر پھینک چکا تھا۔

تو کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟ میں نے خود سے پوچھا۔

کیا باروندا جیکی کی حسرت ناک موت کا بدلہ نہ لیا جا سکا؟ مرتے وقت اس نے جو آگ میرے ارادوں کو سونپی تھی، وہ رائیگاں گئی؟

کیا اپنے گھر کے بند دروازے کے پیچھے سلطانہ کے بانکپن اور آبرو کی دھجیاں اُڑانے والا جانور ایک بار پھر اپنی غلیظ زندگی کو طول دینے میں کامیاب رہا؟

کیا ہزاروں کے مجمعے میں سسک سسک کر تنہا جان دینے والے اسحاق کی موت بھی فی

الحال بیکار ہی رہی؟

میرے ڈوبتے ذہن میں یہ سارے سوال اُبھر رہے تھے اور میرے کلیجے کو شق کر رہے تھے۔

اسی دوران میں، مَیں نے محسوس کیا کہ جارج گورا ایک بار پھر اپنے آزاد ہاتھ کو میری دونوں ٹانگوں کے درمیان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں جانتا تھا، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ وہ مجھے ہوا میں اُٹھانا چاہ رہا تھا۔ عمران کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے سامبر کے سارے اصول یاد تھے اور ان میں ایک اصول ''راندی'' کا بھی تھا۔ جو شخص اپنے حریف کو سر سے بلند کر کے زمین پر پٹخنے میں کامیاب ہوتا تھا، وہ اسے ذلیل وخوار کرنے کا حق دار بھی ٹھہرتا تھا۔ وہ اسے ننگا کر سکتا تھا۔ اس کی پشت پر تھوک کر اور اسے لات رسید کر کے اکھاڑے سے باہر پھینک سکتا تھا۔ ''مرو یا مارو'' کے مقابلے میں بھی اس داؤ کے چل جانے کے بعد مقابلہ وہیں ختم ہو جاتا تھا اور پٹخے جانے والے حریف کو ''ناک آؤٹ'' قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فاتح، اس شخص کو جان سے مارنے کا حق دار ٹھہراتا تھا۔ کل اور آج کی لڑائی میں جارج نے متعدد بار ایسی کوشش کی لیکن میں اس طرف سے پوری طرح چوکس تھا۔ دوسری طرف میں نے بھی کل ایک دو موقعوں پر یہ ''ٹرائی'' کی تھی لیکن جارج جیسا شخص جو سامبر کا ایکسپرٹ تھا، مجھے اتنی آسانی سے یہ موقع کیسے دے سکتا تھا؟ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر خود کو حتی الامکان حد تک اکھاڑے کی مٹی کے قریب کر لیا اور یوں خود کو اوپر اُٹھائے جانے کی کوشش ناکام بنادی۔

ایک بار پھر وہی جدوجہد شروع ہو گئی جو پچھلے دس منٹ سے جاری تھی۔ غالباً جارج گورا میری گردن کو اتنی دیر تک اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا کہ میری سانس رک جائے اور میں بے ہوش یا بے جان ہو کر زمین بوس ہو جاؤں۔ دوسری طرف میں سانسوں کی کمزور ڈور کو ٹوٹنے سے بچا رہا تھا اور کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جو مجھے جارج کا شکنجہ توڑنے میں کامیاب کرتا...... بہرحال، یہ موقع کل کی طرح آج بھی مجھ سے دور تھا بلکہ اب تو دور دور نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بجلی سی لپک گئی۔ دماغ کے تاریک ترین گوشے بھی ایک لمحے کے لئے منور ہو گئے۔ مجھے لگا میں جیت سکتا ہوں۔ میں اب بھی جیت سکتا ہوں۔ ہم سائبان کے نیچے تھے۔ یہی جگہ تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے جارج نے میری ٹانگوں میں ہاتھ دے کر مجھے سر سے اوپر اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش...... اس کی شکست کا باعث بن سکتی تھی۔ مجھے ایک ایسی چیز نظر آ رہی تھی جو اس کو شکست فاش دے سکتی تھی۔ وہ

مجھے بدترین طریقے سے ہرانا چاہتا تھا اور اس کی اسی خواہش میں اس کی ''ہار'' کے قوی امکانات چھپے ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا، میں اسے موقع دوں گا۔ میں اسے خود کو اوپر اُٹھانے کا موقع دوں گا اور میں جانتا تھا، وہ میرے زخم زخم جسم کو اُٹھا لے گا...... وہ سامبر مقابلوں کا ماہر ترین کھلاڑی تھا...... سامبر کے ہر داؤ کا شناور تھا لیکن وہ ایک چیز نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس رام پوری چاقو کو نہیں دیکھ رہا تھا جو قریباً بارہ فٹ کی بلندی پر لکڑی کے سائبان میں پیوست تھا۔ شکتی دیوتا اپنی تمام تر جسمانی اور روحانی شکتی کے باوجود اس چاقو کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

...... مجھے لگا کہ باروندا جیکی کی بے بسی، سلطانہ کے لاچار آنسو اور اسحاق کے خونچکاں زخم سب ایک پلڑے میں آ گئے ہیں اور انہوں نے آناً فاناً جارج کی توانائیوں اور برتریوں سے لدا ہوا پلڑا ہواؤں میں اُٹھا دیا ہے......

مکافاتِ عمل جارج گورا کو آواز دے چکی تھی مگر ابھی میں نے یہ آواز سنی نہیں تھی۔ وہ اپنی امکانی فتح کے نشے میں چُور تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ٹوٹی ہوئی پسلی کی وجہ سے میرے لئے حرکت کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ گردن کے پچھلے حصے اور کندھے سے بہنے والے خون نے میرے تقریباً پورے جسم کو رنگین کر دیا تھا۔ میری گردن بدستور جارج کی آہنی گرفت میں تھی۔ یقیناً جارج کو بھی حیرت تھی کہ میں ابھی تک دم گھٹنے کے سبب ہوش وحواس سے بیگانہ کیوں نہیں ہوا۔ اس کا جواب بڑا مختصر تھا۔ میری غیر معمولی برداشت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ورنہ مجھ سے زیادہ تن وتوش اور طاقت رکھنے والا جارج کب کا فتح کا جھنڈا لہرا چکا ہوتا۔

میں نے وہی کیا جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے جارج کو وہ موقع دیا جس کا وہ کافی دیر سے متلاشی تھا۔ اس نے جھک کر میری ٹانگوں تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی تو میں نے اسے ایسا کرنے دیا۔ جارج اس سنہری موقع سے فائدہ کیوں نہ اُٹھاتا۔ وہ مجھے سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دیتا تو اس کی یہ عظیم فتح اور بھی چمک دار ہو جاتی۔ جونہی میری ایک ران پر اس کی گرفت قائم ہوئی، اس نے میری گردن کے گرد لپیٹے گئے اپنے بازو کو پوزیشن تبدیل کی...... پھر ایک زوردار جھٹکے اور چنگھاڑ کے ساتھ اس نے میرے خونچکاں جسم کو ہوا میں اُٹھا لیا۔ تماشائی پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے۔ زبردست شور بلند ہوا...... میں نے اپنی دھندلائی نگاہوں کے ساتھ سائبان کی چھت کو دیکھا۔ رام پوری چاقو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر تھا۔ میں اپنے زخم زخم جسم کے ساتھ جس ہتھیار تک پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہاں تک خود میرے حریف نے مجھے پہنچایا تھا۔

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج دوسری مرتبہ چنگھاڑتا اور مجھے اکھاڑے میں پٹختا، اس سے پہلے کہ اس کی فتح کا ڈنکا بجتا اور شورِ قیامت بلند ہوتا، میں سائبان میں اٹکے ہوئے چاقو کو اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ اس کے لئے مجھے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔ بس ایک ہلکے سے جھٹکے نے مجھے چاقو کا قبضہ سونپ دیا۔ یہ سب کچھ ساعتوں میں ہوا۔

میں نے پہلا وار اوپر سے نیچے کی طرف جارج کی گردن کی جڑ میں کیا۔ وزنی چاقو دستے تک جارج کی چربی دار گردن میں گھسا۔ وہ جیسے ایک لمحے کے لئے سکتے میں رہ گیا۔ اس کی کرب ناک کراہ میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے ''سیراب'' کر گئی۔ جارج اپنے قدموں پر لڑکھڑایا اور پیچھے کی طرف گرا۔ میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ جارج کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا اور دوسرا وار اس کے سینے پر کیا...... ''یہ جیکی کے لئے جسے تم نے اپاہج کر کے مارا'' میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

تکلیف کی شدت سے جارج کا منہ وا ہو گیا۔

میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار اس کے عین دل کے مقام پر کیا۔ ''......اور یہ سلطانہ کی عزت کے بدلے میں......'' میں نے جارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

نو انچ لمبا پھل ایک بار پھر دستے تک اس کے سینے میں گھس چکا تھا۔ اس مرتبہ وہ بے پناہ تکلیف کے سبب بلند آواز میں ڈکرایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں اکڑاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ہزاروں تماشائی یکسر خاموش تھے۔ وہ بھی جیسے اس اچانک تبدیلی کے سبب سکتے کی سی کیفیت میں چلے گئے تھے۔

اس مرتبہ مجھے چاقو جارج کے جسم سے نکالنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے زور لگانا پڑا۔ اس کے زخموں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ آخری وار میں نے اس کے پیٹ پر کیا......اور وار کرنے کے بعد چاقو کو نیچے کی طرف کھینچا...... جارج کا پیٹ ناف تک کھل گیا اور انتڑیاں نکل آئیں۔ ''...... اور یہ اسحاق کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے لئے۔'' میں نے دم توڑتے جارج کے سامنے سرسراتی ہوئی وضاحت کی۔

اس نے سنا لیکن وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اپنی آخری منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی نظر پتھراتی چلی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کی طرف سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں ماریا کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ اپنے بھائی کا یہ اچانک انجام دیکھ کر یقیناً اسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ حیرت کے پہلے شدید

جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب تماشائی بھی اپنا ردِعمل ظاہر کرنے لگے۔ یہ دو طرح کا ردِعمل تھا۔ کچھ لوگ تو شاک کی کیفیت میں تھے اور کچھ غیظ و غضب دکھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ملا جلا شور بھی تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے۔ ان میں سے ایک ہاتھ کے اندر خون آلود چاقو بھی تھا۔ میں جیت چکا تھا...... اس ہجوم میں میرے سیکڑوں حمایتی بھی تھے لیکن انہوں نے میری فتح کی خوشی میں اچھل کود کی اور نہ نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے۔ جو ہوا تھا، وہ بالکل غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے ہر کسی کو چپ لگا دی تھی۔ شاہی ردِعمل کیا ہوگا؟ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

سائبان کے نیچے جارج گورا کی تازہ لاش پڑی تھی اور شاہی بالکونی کی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تب میں نے دیکھا کہ بالکونی کے نیچے سے تماشائیوں کا ایک ریلا سا اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ بے شک یہ جارج کے مشتعل حمایتی ہی تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ میدان میں داخل ہو کر میری تکا بوٹی کر دینا چاہتے ہوں۔ انہیں روکنے کے لئے کئی درجن گارڈز سامنے آ گئے اور انہوں نے اکھاڑے میں کھلنے والا راستہ بلاک کر دیا۔ اسی دوران میں ایک اور اچھی پیش رفت ہوئی۔ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں آ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ میں نے ایک نظر شاہی بالکونی پر ڈالی...... ماریا نوحہ کناں تھی۔ کچھ لوگ اسے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ حکم جی، رتنا دیوی اور سرجن اسٹیل وغیرہ کے چہرے بھی دھواں دھواں نظر آ رہے تھے۔ شکتی دیوتا، خاک اور خون میں لتھڑا ہوا میرے پاؤں میں پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ باروندا جیکی کہیں، میرے آس پاس ہے اور مسکرا رہا ہے......

○......❖......○

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے غیر یقینی اور پُرخطر تھے۔ میں زرگاں کے سرکاری اسپتال میں تھا۔ میری گردن کے ٹوٹے ہوئے ٹانکے دوبارہ لگے تھے اور میری مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ سب سے پریشان کن صورت حال میرے دائیں پہلو کی تھی۔ نیچے سے چوتھی پسلی ٹوٹ گئی تھی...... یہاں جارج کی ایک تباہ کن ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے وزنی جوگرز پہن رکھے تھے۔ پسلی میں ایک بڑا فریکچر ہوا تھا۔ تاہم خوش قسمتی سے اندھا دھند لڑائی کے باوجود پسلی ''ڈس لوکیٹ'' نہیں ہوئی تھی یا شاید ''ڈس لوکیٹ'' ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے مقام پر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد عمران نے مجھے بتایا۔ ''تمہیں کم از کم تین ہفتے آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی تم یہاں سے جانے کے قابل ہوسکو گے۔''

''اور ان تین ہفتوں میں یقیناً جارج کے حمایتی اپنا کام کرگزریں گے۔ کسی رات وہ اسپتال میں گھسیں گے اور میری باقی پسلیاں توڑ کر مجھے اناللہ کردیں گے۔''

عمران میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔ ''اب یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جگر! تم نے جارج گورے کو شکست دی ہے، کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو نہیں پچھاڑا۔ شکتی دیوتا کو ہرانے کے بعد اب تم شکتی دیوتا ہو۔ لوگ نہ بھی مانیں، پھر بھی ان کا دل دماغ تو یہی کہتا ہوگا کہ اب تم ''شکتی دیوتا صاحب'' کی جگہ پر ہو اور شکتی دیوتا صاحب کی چاہے ایک پسلی ٹوٹی ہوئی ہو، اس پر شب خون مارنا آسان نہیں ہوتا......''

''مجھے بانس پر چڑھا رہے ہو؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''نہیں جگر!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ ''تم نے وہ کر دکھایا ہے جو یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں گے...... اور کچھ تو آخری دم تک بھول نہیں سکیں گے۔ بے شک تمہاری فتح پر کسی نے جشن نہیں منایا، کہیں ڈنکے بجے ہیں اور نہ چراغاں ہوا ہے لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا

ہوں کہ زرگاں کے بے شمار لوگوں کے دلوں کے اندر ضرور جشن کا سماں ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں اور نچلی مسلی ذاتوں والے ہندو بھی اور وہ سب لوگ بھی جن کو کسی نہ کسی طور جارج کی من مانیوں اور خرمستیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ تمہیں پتا ہے کل رات جارج کی جیل میں کیا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

وہ دائیں بائیں نظر دوڑا کر سرگوشی میں بولا۔ ''کسی نے راتوں رات جیل کی دیواروں پر چاکنگ کردی ہے۔ قیدیوں کو جارج گورے کی موت کی مبارک باد دی گئی ہے اور اس کے بارے میں اور بھی کئی سخت باتیں لکھی گئی ہیں۔ اس حرکت کے شبہے میں دو تین قیدی گرفتار ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں آج دوپہر جارج کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد جیل میں اور گرفتاریاں بھی ہوں گی۔ پانڈے اس سلسلے میں بڑا سرگرم ہے۔''

''لیکن پانڈے تو کل رات تک یہیں اسپتال کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔''

''وہ ان گارڈز کا انچارج تھا جو یہاں اسپتال میں تمہاری حفاظت پر مامور ہیں۔ رات گئے میں نے اور میڈم صفورا نے مشورہ کیا۔ اس مشورے کے بعد میڈم صفورا نے پنڈت مہاراج سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ رنجیت پانڈے جیسے افسر کو تمہاری سیکیورٹی کا ذمے دار بنانا ٹھیک نہیں۔ پنڈت مہاراج نے انتظامیہ سے بات کی اور پانڈے کو اس کے ماتحتوں سمیت یہاں سے ہٹوا دیا۔ اب میڈم صفورا والا سیکیورٹی اسٹاف ہی یہاں ڈیوٹی دے رہا ہے اور میں خیر سے اس اسٹاف میں اسسٹنٹ انچارج ہوں۔'' عمران نے اپنے یونیفارم کے بازو پر لگے سرخ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ جھٹ بولا۔ ''نیوز چینل کا چڑیلا...... میرا مطلب ہے نمائندہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ بری خبر ہی دوں گا۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے میں نے ''بہ زبانِ خود'' قوم کو بڑی اچھی خبر سنائی تھی۔''

''وہ کیا؟'' میں نے درد سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے کہا۔

''میں نے کہا تھا، ناظرین آج کوئی خبر نہیں ہے۔''

''تو یہ اچھی خبر تھی؟''

''بالکل، اس دور میں تو ایسی خبروں کو بھی اچھا ہی سمجھنا چاہئے۔ اتنی تیزی سے خبریں آ رہی ہیں اور اتنی بری کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ پچھلے ہفتے ہمارے ایک ساتھی کی سالی لاپتا ہوگئی۔

ہمارے ساتھی کو اس ''گمشدگی'' سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا چینل یہ خبر پہلے نشر نہ کر دے۔ لہٰذا اس نے پہلے سالی کے اغوا کی خبر چلائی۔ پھر تصدیق کرنے کے لئے گھر ٹیلی فون کیا تو سالی صاحبہ، کہیں سے ایزی لوڈ کرا کے واپس بھی آ چکی تھیں...... اس کے بعد موصوف کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ واقعی ''بریکنگ نیوز'' کے زمرے میں آتا تھا...... بیوی سے مار کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے، اب یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک...... یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا بریک لیکن بیوی نے بھی اس وقت تک بریک نہیں لیا جب تک موصوف کی ہنسلی کی ہڈی بریک نہیں ہوگئی اور...... اور زبان میں فریکچر نہیں ہوگیا۔''

''زبان میں فریکچر؟ تمہارا مطلب ہے زبان کی ہڈی ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو، ہم ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے یوں ہی بول لیتے ہیں؟''

''تم میڈیا پر طنز کرتے ہو مگر میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ مجھے اس وقت درد ہو رہا ہے ورنہ میں اس موضوع پر لمبی بحث کر سکتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے اچھے ہونے کا انتظار کر لیتے ہیں۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔ کل صبح والے خونی مقابلے اور اس کے انجام کے بعد سے زرگاں میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کے سارے جذبات یعنی غصہ، خوف، حیرت، خوشی...... سب کچھ اس خاموشی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ جارج کے حمایتیوں میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ اور کھاتے پیتے لوگ شامل تھے...... انہیں جارج کی شکست اور موت بڑی مشکل سے برداشت ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک نہایت کڑوی گولی تھی جو انہیں کسی نہ کسی طور نگلنا پڑی تھی۔ دھرم کے حوالے سے یہاں انصاف کا ترازو پنڈت مہاراج کے ہاتھ میں تھا اور اسے وہی کچھ کرنا تھا جو کتابوں میں درج تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت، موقع دیکھ کر عمران پھر میرے پاس چلا آیا۔ اس نے گلاب کی ایک کلی میرے سرہانے رکھ دی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! تمہارا کیا خیال ہے...... جارج کی شکست اور موت کی خبر سلطانہ اور اقبال وغیرہ تک پہنچ گئی ہوگی؟''

''ہاں، میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے جگر! یہ اتنی بڑی خبر ہے کہ پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کی گونج سنائی دی ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ فتح پور والے بے خبر ہوں گے۔''

''لیکن سلطانہ وغیرہ تو مندر کے تہ خانوں میں ہیں اور تم نے آفتاب خاں کو تہ خانوں میں جانے سے منع کر دیا تھا۔''

''مگر اشد ضرورت کے وقت وہ جا بھی سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنی بڑی خوش خبری سنانے کے لئے اس نے مندر کا ایک چکر لگا ہی لیا ہو۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک زخمی چڑیا کی طرح ہر وقت پھڑپھڑاتی رہتی تھی۔ جارج کی شکست اور میری کامیابی کی خبر اس کے زخموں پر مرہم کا کام دے سکتی ہے...... بلکہ ضرور دے گی۔''

شاید میں مزید بھی کچھ کہتا مگر اسی دوران میں دروازے پر گارڈز نمودار ہوئے۔ ان کے عقب میں میڈم صفورا، منیجر مدن اور پنڈت مہاراج کی صورتیں نظر آئیں۔ پنڈت مہاراج کی تعظیم کے لئے میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پنڈت مہاراج کے ساتھ ایک جواں سال، قبول صورت لڑکی بھی تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ باقی جسم گرم شال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حزن و ملال کی عجیب سی کیفیت تھی۔

میڈم صفورا نے ہولے سے کہا۔ ''یہ تمہارے دوست اسحاق کی بھاوج حمیدہ ہے۔ وعدے کے مطابق پنڈت مہاراج اسے تمہارے سپرد کرنے کے لئے آئے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے مجھے سلام کیا اور خاموش ہو گئی لیکن اس کی خاموشی بات کر رہی تھی۔ یہ خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''میرے محسن! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں ایک درندے کی تحویل میں تھی۔ اس نے میرے دیور کو موت کے جال میں جکڑنے کے لئے مجھے چارا بنا رکھا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ اس نے میرے بھائی جیسے دیور کو سولی پر لٹکایا اور اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا اور اب میری باری آنے والی تھی۔ میں اس کے ''بستر ہوس'' پر پامال ہونے والی تھی۔ میرا روگ اذیت ناک موت کا دوسرا نام تھا۔ تم مسیحا بن کے آئے...... تم نے میرے زہر کو تریاق دیا اور میری زنجیروں کو پگھلا کر مجھے پھر سے زندہ کیا۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

پنڈت مہاراج نے اپنے مخصوص اسٹائل سے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینکا اور ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اب تمہارا حال کیسا ہے؟''

''مجھے پہلے سے بہتر لگ رہا ہے مہاراج۔''

''بھگوان نے چاہا تو تم جلد ہی بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔ یہاں تمہیں ہر طرح کی سہولت ملے گی...... اور پوری رکھشا بھی کی جاوے گی۔''

"مجھے آپ کے انصاف پر پورا بھروسا ہے۔" میں نے کہا۔

پنڈت مہاراج نے حمیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب یہ تمہاری امانت ہے۔ تم جیسے ہی ٹھیک ہوگے، اسے یہاں سے لے جا سکو گے۔ حکم جی نے اس سلسلے میں جروری ہدایتیں دے دی ہیں۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر پنڈت مہاراج اور حکم جی کا شکریہ ادا کیا۔

پنڈت مہاراج نے مجھے بتایا کہ میرے صحت یاب ہونے تک حمیدہ لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس رہے گی اور وہاں اس کی حفاظت کا پورا انتظام ہوگا۔

کچھ دیر بعد پنڈت مہاراج اپنے ساتھیوں اور گارڈز وغیرہ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میڈم صفورا بھی اسحاق کی بھاوج حمیدہ کو لے کر لال بھون چلی گئی۔ میں ایک بار پھر اپنے سفید بستر پر اکیلا رہ گیا۔

سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ شہر کی فضا بھی پُرسکون تھی۔ اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا کہ سینوں کے اندر ہلچل موجود ہے۔ شہر کے باسی اپنے اپنے طور پر اس بہت بڑے واقعے کے اثرات سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ اسپتال سرجن اسٹیل کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ یہاں تین سفید فام ڈاکٹروں کے علاوہ دو تین مقامی ڈاکٹر بھی موجود رہا کرتے تھے۔ یہ مقامی ڈاکٹر وہ تھے جنہوں نے ڈاکٹر چوہان ہی کی طرح انڈین حکومت سے بھاگ کر اس دشوار گزار علاقے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ بے شک یہاں میرا علاج ہو رہا تھا لیکن یہ اندیشے اپنی جگہ موجود تھے کہ علاج ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ میں اپنے حفاظتی انتظامات پر بھی پورا بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس حوالے سے عمران یہاں موجود نہ ہوتا تو شاید میں مسلسل تناؤ کا شکار ہو جاتا۔

سہ پہر کے وقت بتدریج اندھیرا چھا گیا اور پھر تیز بارش شروع ہوگئی۔ سردی میں اضافہ ہوگیا۔ ایک چھوٹی انگیٹھی میرے قریب دہکا دی گئی۔ کچھ دیر بعد عمران بھی مجھے کمپنی دینے کے لئے میرے پاس آ بیٹھا۔ گارڈز کی ہلکی نیلی یونیفارم اس کے جسم پر سجتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پر ہر لباس ہی جچتا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "عمران! سچ پوچھو تو تمہاری کہانی ایک گہرے دکھ کی طرح میرے دل کی تہ میں بیٹھ گئی ہے۔ میں نے شبانہ کو دیکھا نہیں، پر اس کی غم زدہ صورت نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ تم دونوں لمبے عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ

رہے۔ تمہارے رستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ راجا اور کبیر صاحب وغیرہ بار بار تم سے کہتے رہے کہ شادی کر لو...... اور تم نے نہیں کی۔"

"اسی کو تقدیر کہتے ہیں جگر! کبھی بہت آسان کام بھی نہیں ہو پاتے اور کبھی ناممکن، عین ممکن ہو جاتا ہے۔ باقی جہاں تک شادی نہ ہونے کی بات ہے تو اس میں مجھ سے زیادہ شبانہ ہی کا قصور تھا۔ وہ اپنے فیصلے میں اپنے گھر والوں کو شامل کرنا چاہتی تھی۔ اس بے چاری کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا اور حالات اس طرح پلٹا کھا جائیں گے۔"

"یار! وہ تو لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ محدود تھی مگر تم نے تو کافی سرد گرم دیکھا ہوا تھا۔ تمہیں تو پتا ہونا چاہئے تھا کہ ایسے معاملے کسی بھی وقت الٹ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اصرار کرتے اور زور دیتے تو وہ شاد پورہ میں تم سے شادی پر رضامند ہو جاتی۔"

عمران نے گہری سانس لی۔ "سانپ کی لکیر پیٹنے سے کبھی کوئی فائدہ ہوا ہے جو ہمیں ہوگا؟ ایسی باتیں دُہرانے سے بس دکھ ہی بڑھتا ہے۔ جو بگڑ گیا سو بگڑ گیا...... جو ابھی نہیں بگڑا اسے بچانا چاہئے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ حال کے بارے میں سوچنا چاہئے اور حال میں...... سلطانہ بھی شامل ہے۔ اس نے تمہیں بہت چاہا ہے یار! تمہارے لئے پورے زرگاں سے ٹکر لی ہے۔ جب تم اپنے حواس میں نہیں تھے، وہ تمہارے بچاؤ کے لئے ایک دیوار بن کر کھڑی رہی ہے۔ ایسی ہمت والی، بے جگر عورتیں کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ بہت انوکھی ہے...... اور تمہارے لئے اس کا پیار بھی اتنا ہی انوکھا ہے۔ لوگ شادی سے پہلے رومانس کرتے ہیں لیکن اس نے تم سے شادی کے بعد رومانس کیا اور ایسا کیا کہ حق ادا کر دیا۔ اب اسے تمہاری محبت اور سہارے کی ضرورت ہے تابی۔"

میری نگاہوں میں سلطانہ کا چہرہ گھوم گیا۔ رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، انار جیسا رنگ، پتلی کمر لیکن مضبوط جسم جس سے جنگلی پھولوں کی باس آتی تھی...... وہ میرے لئے سراپا محبت اور اطاعت تھی۔ شاید میں اسے پہاڑ سے کودنے کے لئے کہتا تو وہ بس ایک بار میری خواہش کی تصدیق کرتی اور پھر کود جاتی۔ میرا دل اس کے لئے محبت سے بھر گیا۔ جی چاہا کہ اُڑ کر اس تک پہنچ جاؤں...... مگر پھر اچانک دل میں یہ وسوسہ جاگا، کہیں میرے اور سلطانہ کے درمیان بھی تو کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو جائے گی؟ آنکھوں کے سامنے ہاشو کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ایک انتہا پسند شخص ثابت ہوا تھا۔ اس کے پاس سے نیلگوں زہریلے پاؤڈر کے جو پیکٹ ملے،

اسی جیسا زہر سلطانہ کے پاس بھی موجود تھا۔ یہ زہر ایک پڑیا میں تھا اور یہ پڑیا اب میرے پاس تھی۔ سلطانہ کے پاس یہ زہر کیوں تھا؟ کہیں کسی طور اس کا تعلق بھی تو ہاشو وغیرہ سے نہیں تھا؟ یہ سنگین سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھرتا اور مجھے جھنجوڑ دیتا۔ سلطانہ بھی ایک باغی تھی۔ اپنی دلیر والدہ کی طرح وہ بھی خطروں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ مرنا اور مارنا جانتی تھی...... زرگاں کے بااثر ہندوؤں سے اس کا ٹکراؤ، دیرینہ تھا۔ کہیں وہ بھی تو زرگاں میں موجود ''خطرناک شدت پسندی'' کا حصہ تو نہیں تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''بالکل غلط۔ سائیکالوجسٹ نادر اکبر گوندل صاحب نے کہا ہے کہ انسان کا دماغ کچھ سوچے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔''

''یہ نادر اکبر گوندل تو شاید کسی پولیس افسر کا نام تھا؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، پولیس افسر سائیکالوجسٹ نہیں ہوتے؟ گدھے! ان سے بڑا نفسیات داں اور کون ہوگا۔ عشق کا بھوت سب سے تگڑا ہوتا ہے۔ یہ اسے بھی دو چار گھنٹے میں اُتار دیتے ہیں اور ''مریض'' اپنی محبوبہ کو باجی کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ یہ لوگ ''چھترول'' کے ذریعے تحلیل نفسی کرتے ہیں اور ماضی کے ان سارے حادثوں کا پتا چلا لیتے ہیں جو کبھی وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے ہوتے۔ دیگر امراض کے علاوہ ''کنجوسی'' بھی دراصل ایک نفسیاتی روگ ہے۔ ان معالجوں کے علاج سے یہ بھی جڑ سے ختم ہو جاتا ہے۔ مریض اپنی ساری جمع پونجی بلکہ قرض اُٹھائی ہوئی رقوم بھی بے دریغ خرچ کرنا اور لٹانا شروع کر دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی اس ''فیاضی'' کا پچانوے فیصد فائدہ بھی اس کے معالجوں کو ہی ہوتا ہے......''

اچانک زور سے بجلی چمکی۔ میں اور عمران کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔ بارش زور پکڑ رہی تھی۔ دن میں ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بادل زور سے گرجے اور در و دیوار دہل گئے۔ عمران سگریٹ کا کش لے کر زخمی انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''دیکھا تم نے۔ آسمانی بجلی مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ میں باہر برآمدے میں نکلا نہیں اور جل کر کوئلہ ہوا نہیں۔''

اس کے لہجے نے مجھے آزردہ کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یار! یہ وہم پرستیاں ہمارے دماغوں سے کس طرح نکل سکتی ہیں...... کس طرح ہم ان پھپھوندی زدہ عقیدوں کے جال کو توڑ سکتے ہیں؟''

''اس کا کوئی فوری حل نہیں۔ اس کے لئے کوشش کرنا ہوگی، طویل انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے لئے انسان کے اندر کی مضبوطی درکار ہے اور اندر کی مضبوطی میں سب سے اہم کردار علم کی روشنی کا ہے ''دی نالج اِز پاور''...... اور سیانے کہتے ہیں جہاں ''پاور'' بڑھتی جاتی ہے وہاں ''ہارر'' کم ہوتا جاتا ہے۔''

''مگر یار! عقلِ سلیم بھی تو کوئی شے ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں اس دنیا میں ایسی آئی ہیں جو ان پڑھ تھیں مگر انہوں نے خداداد عقل سے سچ اور جھوٹ میں پہچان کی ہے۔ بیکار عقیدوں پر لعنت بھیج کر انہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینکا ہے۔''

عمران مسکرایا اور مقامی زبان کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک کہوت ہو بھیا لیکن میں عام لوگن کی بات کرت ہوں۔ یہ جو عام لوگن ہووت ہیں نا، یہ بڑے کٹر ہووت ہیں۔ جہاں اڑ گئے بس اڑ گئے۔ پہاڑ میں سے زندہ اونٹنی نکلنے والا معجزہ دیکھ لیں پھر بھی نہ ماننے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں...... اگر تمہاری بیکار سمجھ میں ناہیں آیا تو میں تمہیں ایک اور مثال دیوت ہوں......''

وہ ایک بار شروع ہوا تو پھر بولتا چلا گیا...... اس کے پاس ہر موضوع پر باتوں کا ذخیرہ رہتا تھا۔ اچانک دروازے سے باہر شور سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے گارڈز کسی شخص کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر یکایک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سانولے رنگ کا ایک شخص طوفانی رفتار سے میری طرف بڑھا۔ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسپتال کے عملے کا ہی آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ چمک رہا تھا۔ وہ چلاتا ہوا، خطرناک انداز میں مجھ پر جھپٹا لیکن وہ مجھے نقصان کیسے پہنچا سکتا تھا؟ میرے اور اس کے درمیان عمران تھا۔ وہ شخص جو میری طرف بڑھنے والے ہر خطرے کے لئے ایک فلک بوس آہنی دیوار تھا۔ حملہ آور دوگنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو عمران کو جُل نہ دے سکتا۔

عمران نے مجھ سے دس بارہ فٹ دور ہی اسے روک لیا۔ ''ماردوں گا'' حملہ آور گرجا اور اس نے اندھا دھند عمران پر وار کیا۔ عمران نے نیچے جھک کر تیز دھار آلے کا وار بچایا اور اسے اس طرح بازوؤں میں جکڑا کہ اس کا آلے والا ہاتھ بھی بازوؤں کے گھیرے میں آ گیا۔ عمران اسے دھکیلتا ہوا دیوار کی طرف لے گیا۔ یہ کافی تیز رفتار عمل تھا۔ حملہ آور کا سر شدت سے پختہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ ڈکرانے والے انداز میں چلایا۔ تیز دھار آلے پر اس کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی۔ عمران نے پاؤں کی ٹھوکر سے یہ آلہ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ دو تین گارڈز بھاگتے ہوئے آئے اور حملہ آور سے لپٹ گئے۔ فرش پر گرنے والا ایک خطرناک

کٹر ہندو تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص سر جن اسٹیل کے ماتحت عملے میں سے تھا اور اس کا تعلق اسی برادری سے تھا جس کے دو افراد نے چندن دن پہلے لال بھون میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں افراد لال بھون کے گارڈز میں شامل تھے۔

سر پر لگنے والی سخت چوٹ کے سبب حملہ آور نڈھال ہو گیا، اس کے باوجود اس کا واویلا جاری تھا۔ ”تم مکار ہو۔ تم نے دھوکا کیا ہے۔ سر جارج نے تم کو بازوؤں پر اُٹھا لیا تھا۔ تم ہار چکے تھے۔ تم نے ہارنے کے بعد ان پر وار کیا۔ تم نے فتح ناہیں پائی، تم نے...... ہتھیا کی ہے۔ تم ہتھیارے ہو۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ اس جنم میں بھی اور بعد کے ہر جنم میں بھی......“

وہ دہاڑتا رہا۔ گارڈز اسے کھینچ کر باہر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور اچھل اچھل کر بول رہا تھا۔ ”تم نے ایک مہان شخص کی ہتھیا کی ہے۔ ایک ایسے بندے کو مارا ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں گھروں کے چولہے جلت تھے۔ ہزاروں کنیاؤں کی ڈولیاں اُٹھتی تھیں۔ بھگوان تمہیں کبھی شما ناہیں کرے گا...... اور نہ ہم کریں گے۔“ وہ اتنے زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی اور الفاظ گڈمڈ ہو گئے......

گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تیز دھار آلہ عمران کے ہاتھ میں تھا۔ عمران نے مزید احتیاط کے طور پر میرے کمرے کی طرف آنے والے تمام دروازے بند کرا دیئے اور نگرانی پر مامور گارڈز کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔

”ایک بار پھر جان بچانے کا شکریہ۔“ میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ تم صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے ایسی مقتولانہ حرکتیں کرتے ہو۔“

”تم دیکھ ہی رہے ہو، میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ ابھی تو میں کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔“

”ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھا، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ تو ہم پرستی کا روگ آسانی سے جان نہیں چھوڑتا۔ ایسے روگیوں کے پاس ہر بڑی سے بڑی دلیل کا جواب موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنے پھپھوندی زدہ عقیدوں کو اپنے سامنے پاش پاش ہوتے دیکھتے ہیں لیکن انہیں پھر سے جوڑ لیتے ہیں۔ اب دیکھو...... یہ وہی لوگ ہیں جو کہہ رہے تھے کہ تمہاری پتنی کے پاپ کی وجہ سے تمہاری شکست لازم ہے۔ اب وہ اس لڑائی کے نتیجے کو ہی تسلیم نہیں کر رہے لیکن ایسا کرنے والے بہت کم لوگ ہی ہوں گے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ اس

کے علاوہ جن لوگوں کے پاس فیصلہ کرنے کی اتھارٹی تھی، انہوں نے بھی متفقہ طور پر تمہیں فاتح قرار دیا ہے۔“

”یہ بندہ کیا نکتہ اُٹھا رہا تھا؟“

”یہ بڑا کمزور نکتہ تھا۔ کہہ رہا تھا کہ جارج تمہیں بازوؤں پر اُٹھا کر سر سے بلند کر چکا تھا...... اور لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ یہ بات کوئی نہیں مانے گا۔ سامبر کے اصولوں کے مطابق لڑائی تب ختم ہوتی جب وہ تمہیں اکھاڑے میں پٹخ دیتا۔ خیر چھوڑو، یہ لاحاصل بحث ہے۔ اب نئی صورتِ حال پر غور کرو۔ تم پر پھر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی ہے...... یہ خبر بھی دو تین گھنٹے کے اندر پورے زرگاں میں پھیل جائے گی۔ لوگوں میں پھر ہلچل پیدا ہو گی۔ شہر کی آبادی پہلے ہی دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔“

”یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے تو یہی لگتا ہے عمران کہ جتنی جلدی ہو ہم یہاں سے نکل جائیں۔“

”تمہارے زخموں کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم کوشش کرتے۔“

”اب بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی ذمے داری پر جانا چاہیں تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

”اعتراض کی بات تو ہے یار! ابھی تم ملنے جلنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ دشوار راستوں کا طویل سفر تو دور کی بات ہے۔“

O......❖......O

میرے اگلے چار پانچ روز کافی تکلیف میں گزرے لیکن پھر بتدریج طبیعت بہتر ہونے لگی۔ میری سیکیورٹی پہلے سے زیادہ سخت کر دی گئی تھی۔ عمران بھی زیادہ وقت میرے آس پاس ہی گزارتا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اوجھل بھی ہو جاتا...... ساتویں کے جشن کے روز جو گاڑی اس نے انعام میں جیتی تھی، وہ اسے مل گئی تھی۔ وہ کسی وقت اس پر سیر کے لئے بھی نکل جاتا۔ ایک دو بار وہ اپنے ساتھ گیتا مکھی کو بھی لے گیا۔ اس کی یہ مصروفیت میرے لئے پریشان کن تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ تو یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا قریبی ساتھی ہے اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے کے لئے یہاں آیا ہوا ہے مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ وہ بھی پاکستانی ہے اور میری ٹریننگ وغیرہ میں میرا ساتھ دیتا رہا ہے۔

میں نے ایک دو بار اسے آزادانہ گھومنے سے منع بھی کیا لیکن وہ سنتا کب تھا۔ دوستیاں

بنانا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ مشکل ترین لوگوں میں بھی اپنے پرستار پیدا کر لیتا تھا۔ یہاں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر پھر ایک روز ایسا واقعہ ہوا جس کی ہم دونوں میں سے شاید کسی کو توقع نہیں تھی۔

منیجر مدن میرے پاس آیا اور بولا۔ ''تمہیں پتا چلا ہے، عمران کو چوٹیں لگی ہیں۔''

''کیسے؟'' میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے پوری جانکاری تو نا ہیں...... لیکن معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس سے اس کی گاڑی چھینی ہے۔''

میں نے ماتھا پکڑ لیا۔ مدن نے کہا۔ ''یہیں پر ایمرجنسی والے کمرے میں اس کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ ویسے وہ بالکل خیریت سے ہے۔''

یہ پریشان کن خبر تھی۔ کچھ ہی دیر بعد عمران سر اور ہاتھ پر پٹی باندھے مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ ''شاباش! یہ کام دکھایا ہے تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ضرورت مند ڈاکو تھے۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی صاحب! یہ ہماری پہلی پہلی واردات ہے۔ اگر کوئی غلطی شلطی ہو گئی تو معاف کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ انہوں نے کیا غلطی کرنی ہے۔ انہوں نے ڈر کر خواہ مخواہ ہی گولی چلا دینی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ مفت میں گولی کھانے کے بجائے، ان کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کر دی جائے۔ کیریئر کے شروع میں نوجوانوں کو واقعی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر جھانکنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ کبھی کبھی حیران کن فیاضی کا مظاہرہ بھی کر جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''کہیں سچ مچ کسی کو تحفے میں تو نہیں دے آئے گاڑی؟''

''تابش صاحب! اگر دے بھی آیا ہوں تو کسی دوسرے کی دُم پر تو پاؤں نہیں آنا چاہئے۔ میری اپنی گاڑی تھی۔''

شاید وہ پھر اپنی ہانکنا شروع کر دیتا مگر مجھے سنجیدہ دیکھ کر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔ ویسے بھی منیجر کی موجودگی میں وہ میرے ساتھ زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ زرگاں کی نہر کے ساتھ کچھ آگے تک چلا گیا۔ واپسی پر جیپ کا پہیا پنکچر ہو گیا۔ وہ پہیا بدل کر اٹھ ہی رہا تھا کہ چار بندوں نے اس پر اسلحہ تان لیا۔ اس کے پاس میڈم صفورا کا فراہم کردہ پستول تو موجود تھا مگر وہ جیپ کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔ ایک

شخص نے اچانک اس پر پیچھے سے رائفل کے دستے کا وار کیا، وہ گر گیا۔ انہوں نے اس پر دو رائفلیں تانے رکھیں اور جیپ لے کر نکل گئے۔

عمران جیسے بندے سے یوں گاڑی چھین کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ کئی دفعہ جب بندہ خطرے کی طرف سے بالکل غافل ہوتا ہے تو بے دست و پا ہو بھی سکتا ہے۔ پھر عمران کو جو چوٹیں لگی تھیں، ان سے بھی تصدیق ہوتی تھی کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

عمران نے میری تفتیشی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تابش صاحب، ابھی تمہاری پوری تسلی نہیں ہوئی...... پر حقیقت وہی ہے جو میں نے بتا دی ہے۔ میں لڑائی بھڑائی کر سکتا تھا لیکن اس میں کافی ''رسک'' تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں ہی حکم جی کے ہرکارے کہیں نہ کہیں سے گاڑی برآمد کر لیں گے۔ یہاں کوئی ایسا قبائلی علاقہ تو ہے نہیں جہاں لے جا کر گاڑی کا مدعا غائب کر دیا جائے۔''

منیجر مدن لال بولا۔ ''خیر، اس لحاظ سے تو تم نے واقعی عقل مندی کی ہے کہ گاڑی کے لئے کوئی بڑا خطرہ مول نا ہیں لیا۔ وہاں اس علاقے میں اس طرح کی کچھ وارداتیں پہلے بھی ہوئی ہیں۔ راہزنوں کی دو تین ٹولیاں ہیں جو ایسے کام کرتی رہتی ہیں لیکن عام طور پر ان کی واردات پکڑی جاتی ہے۔''

اسی دوران میں شاہی محافظوں کا ایک لمبا تڑنگا انچارج اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے عمران کی خیر خیریت دریافت کی پھر اس سے واقعے کی تفصیل جاننے میں مصروف ہو گیا۔

اسی روز شام کو اطلاع ملی کہ زرگاں کی جیل میں زبردست بلوا ہوا ہے۔ قیدیوں نے جیل توڑنے کی کوشش کی ہے۔ جیل کی انتظامیہ نے پہلے ہوائی اور پھر سیدھی فائرنگ کی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کم و بیش آٹھ قیدی ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے ہیں۔ طاقت کے بے رحمانہ استعمال کے بعد انتظامیہ قیدیوں کو واپس بیرکوں میں بند کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر کشیدگی برقرار ہے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد عمران اس سلسلے میں پوری تفصیل لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''اس واقعے کی وجہ وہی وال چاکنگ بنی ہے جس میں قیدیوں کو جارج کی شکست اور موت کی مبارکباد دی گئی تھی۔ جیل حکام نے اس سلسلے میں پانچ چھ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ پتا چلا ہے کہ بعد میں ان میں سے چار قیدیوں کو ٹیکا لگا کر مار دیا گیا ہے۔''

''کیسا ٹیکا؟'' میں حیران رہ گیا۔

"وہی جو ایک دفعہ ہماری میڈم صفورا ہمیں لگانے لگی تھی۔ اس نے ساری تفصیل بتائی تھی تمہیں۔ وہ درد کا ٹیکا ہے لیکن درد روکنے والا نہیں، درد شروع کرنے والا۔"

مجھے ساری تفصیل یاد آ گئی۔ وہ سبزی مائل مہلک دوا جس کے بارے میں میڈم نے بتایا تھا کہ یہ بندے کو مچھلی کی طرح تڑپاتی ہے اور اس کی دوسری ڈوز اسے زندگی کی سرحد پار کرا دیتی ہے۔ میڈم کے مطابق زرگاں میں سُولی کی سزا کے بعد یہ دوسری بڑی سزا تھی اور یہ سزا چار افراد کو صرف اس بنا پر دی گئی تھی کہ انہوں نے اپنے بے رحم صیاد کی موت پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

عمران نے بتایا۔ "ٹیکے کی سزا والی خبر پھیلی تو قیدی مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے گارڈز کی وردیاں پھاڑیں، انہیں مارا پیٹا...... اور کوٹھریوں میں بند کر دیا۔ وہ شاید جیل توڑنے میں ہی کامیاب ہو جاتے مگر زبردست فائرنگ نے انہیں بے بس کر دیا۔ اب جیل حکام نے سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے تیس چالیس قیدیوں کو مثالی سزا دی جائے گی تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔"

"مثالی سزا سے کیا مطلب؟"

"اسحاق والی سزا۔ سرِ عام سُولی پر ٹانگ کر ہڈیوں کا چُورا اور پھر موت۔" عمران نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کوئی قانون بھی لاگو ہوتا ہے یہاں؟ یا جو کچھ حکم جی کے دماغ میں آئے وہی قانون ہے۔" میں نے کہا۔

"حکم جی کا تو نام ہی حکم ہے، وہ حکم صادر نہیں کرے گا تو کیا گنگو تیلی کرے گا...... لیکن یہ بات صحیح ہے کہ اس طرح کی حاکمیت بغاوت کو جنم دیتی ہے اور یہی کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ پکڑے جانے والے زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن میں نل پانی سے بھی کوئی گرما گرم خبر آ جائے گی۔ اس سے پہلے بھی زرگاں اور نل پانی میں اسی وجہ سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جارج گورا کی جیل میں انور خاں کا ساتھ دینے والے کئی قیدیوں کو سرِ عام سُولی چڑھایا گیا تھا۔"

"لگتا ہے کہ حالات پھر کشیدہ ہو رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کسی گڑبڑ سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔" میں نے پوچھا۔

عمران بولا۔ "کل میڈم صفورا تمہارے ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں کم از کم دس دن اور بیڈ ریسٹ کرنا ہو گا لیکن...... میرا خیال ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو

بہتر بتاؤ...... اور ذرا چل پھر کر دکھاؤ تو ہو سکتا ہے کہ چار پانچ روز میں ہی چھٹی مل جائے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں اب سفر کر سکتا ہوں۔" میں نے بستر سے اُٹھ کر چند قدم کمرے کے اندر ہی چہل قدمی کی۔

"تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تمہیں درد ہو رہا ہے۔"

"درد تو اب اپنا "عشق" ہے یار! اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے مگر کچھ اور باتیں ضرور فکرمند کرتی ہیں۔"

"مثلاً؟" عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دائیں بائیں دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ حکم جی اور اس کے ہزاروں بے رحم ہرکارے ہمیں حمیدہ سمیت یہاں سے نکل جانے دیں گے؟"

"یہ بات واقعی سوچنے کی ہے۔" عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ پنڈت مہاراج نے یہاں انصاف کا جھنڈا تھاما ہوا ہے۔ وہ یہاں وہی کچھ کر رہا ہے جو دھرم کی کتابوں اور پوتھیوں شاستروں وغیرہ میں لکھا ہوا ہے لیکن اندر سے اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ وہ بھی اسی حد تک جا سکتا ہے جس حد تک اسے اپنی خیریت نظر آئے گی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو...... کیا ہمیں یہاں سے روانہ کرنے کی باتیں بس ڈھکوسلا ہیں؟"

"خیر، ایسا تو نہیں ہے۔ زرگاں کے مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لئے حکم اور اس کے ساتھیوں کو کچھ تو کرنا ہو گا۔ وہ زبان دے چکے ہیں، اگر صاف مکر یں گے تو ان کی ساکھ کا بیڑا غرق ہو گا۔ ہاں، ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ عین موقع پر تمہاری اور حمیدہ کی روانگی روکنے کے لیے کوئی زبردست عذر تراش لیں یا پھر ایک خاص فاصلے تک تمہیں محفوظ راستہ دینے کے بعد دوبارہ پکڑ لیں۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیسا بھی ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چلو چھوڑو یار ان باتوں کو۔ لوگ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ یہ نیوز چینلز والے تصویر کا سب سے برا رخ دکھاتے ہیں اور بعض اوقات صرف رخ ہی رخ ہوتا ہے، تصویر ہوتی ہی نہیں۔" وہ ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔

"اور لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ یہ چکنے گھڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ صرف وہی بات بتاتے ہیں جو بتانا چاہتے ہیں۔"

''خدا کا خوف کرو۔ تم مجھے چکنا گھڑا کہہ رہے ہو جبکہ میرے سر پر بال ہی بال ہیں اور یہ بال یونہی میرے سر پر نہیں ہیں۔ اس کے لئے بڑی محنت ہوئی ہے۔ اپنے دماغ کو بہت بچا کر رکھتے ہیں ہم لوگ۔ برے سے برے حالات میں بھی اس پر زور نہیں پڑنے دیتے۔ یہ دانش کا دور نہیں، فیس ویلیو کا دور ہے۔ اسکرین پر اپنی آب و تاب برقرار رکھنا پڑتی ہے۔ باقی دانش کا کیا ہے؟ یہ تو انٹرنیٹ سے آ ہی جاتی ہے۔ بیس منٹ انٹرنیٹ کے سامنے بیٹھو، کسی بھی موضوع پر علامہ کا درجہ پا جاؤ گے......''

وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اصل موضوع وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بہر حال، یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہماری روانگی کے حوالے سے عمران کے ذہن میں بھی بہت سے خدشات موجود ہیں۔ آنے والا وقت ایک گہری دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس دھند میں داخل ہونے سے پہلے یہ جاننا مشکل تھا کہ اندر کیا ہے۔

O......❖......O

ایک ہفتے بعد مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور میں لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس آ گیا۔ لال بھون میں آج کل سناٹا تھا۔ ساتویں کا جشن گزرے ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے۔ پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزاؤں کی تربیت کی گہما گہمی اب یہاں نہیں تھی۔ وہ گھنگروؤں کی جھنکار، وہ سریلے قہقہے...... اور رنگ برنگے آنچل۔ وہ سب کچھ کہیں اور تھا۔ غالباً وہ سب کچھ ابھی تک راج بھون کی خلوت گاہوں کو چمکا رہا تھا۔ رنگ برنگے آنچلوں میں ڈوبتے اُبھرتے ہوئے دودھیا ہاتھ مہ نوشوں کے لئے جام بنا رہے تھے...... اور لال بھون میں سناٹا تھا۔

گیتا مکھی بھی بس آرام ہی فرما رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بنی سنوری نظر آتی تھی اور شاید اس کی ایک وجہ عمران بھی تھا۔ وہ اس کی ہلکی پھلکی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ حوصلہ افزائی صرف باتوں تک محدود ہے۔ دونوں گفتگو کے دھنی تھے۔ گیتا مکھی سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی تھی اور عمران کے پاس اس رفتار کا توڑ موجود تھا۔

حمیدہ بھی لال بھون میں ہی موجود تھی۔ وہ سوگوار حسن کی مثال نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر صرف ایک سال پہلے اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یقیناً وہ ابھی اس کی موت کا غم بھول نہیں سکی تھی۔ اب اس کا دیور بھی اسے ایک نہ بھولنے والا دکھ دے گیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یہ خوف جما ہوا تھا کہ ابھی وہ خطرے میں ہے۔ غالباً ہماری طرح اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زرگاں سے بحفاظت نکل سکے گی۔ اس کی عجیب سی کیفیت

تھی۔ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔ کوئی آواز دیتا تو بدک اُٹھتی۔ کہتے ہیں کہ درندے کی دہشت، درندے کے جانے کے بعد بھی تادیر اس کے شکار پر طاری رہتی ہے۔ حمیدہ بھی جارج کا شکار تھی۔ وہ اس کے قبضے میں رہی تھی۔ اب وہ عدم آباد روانہ ہو چکا تھا۔ حمیدہ آزاد تھی مگر گزرے دنوں کا ہراس جیسے اس کی روح میں جذب ہو گیا تھا۔

مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے تادیر اس سے گفتگو کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد میرے ساتھ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔ وہ بس 'ہوں ہاں' میں جواب دیتی رہی۔ آخر میں اس نے لرزتی آواز میں بس اتنا کہا۔ ''میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ جھیلا۔ اتنے سارے زخم کھائے۔ میں جتنی دیر زندہ رہی، آپ کی یہ مہربانی بھول نا ہیں سکوں گی۔''

''تم سے کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے گردن جھکائی اور نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ہولے سے بولی۔ ''لیکن جب میرے دیور اسحاق نے میرے لئے لڑائی کی اور ہارا تو جارج صاحب نے بہت شراب پی تھی۔ لڑکیوں کا ناچ دیکھا تھا اور مجھے بھی ناچنے کے لئے کہا تھا۔ میں نا ہیں ناچ سکی تو انہوں نے مجھے سخت برا بھلا کہا اور بولے...... تم اب بہت جلد میری جورو بننے والی ہو۔ میرے طریقے کے مطابق چلنا سیکھو۔''

''اب پریشانی کی کوئی بات نہیں حمیدہ۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ ذلیل ''اپنے طریقے'' کے مطابق چلتا ہوا قبر میں اُتر چکا ہے اور ہم اپنے طریقے پر چل کر ان شاء اللہ نل پانی پہنچیں گے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ہولے سے بولی۔ ''آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نا ہیں بتایا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہارے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہم دونوں اسحاق کے دوست ہیں۔ تم اس کی بھابی تھیں تو ہماری بھی بھابی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ اپنی سفید اوڑھنی سے آنکھوں کے کنارے پونچھ کر بولی۔ ''آپ کو میرے بارے میں اسحاق نے بتایا تھا؟''

''نہیں، یہ کوئی اور تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اسی نے ہمیں تمہاری ساری کہانی سنائی اور بتایا کہ تم کس حال میں ہو۔''

''کون تھا وہ؟'' وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تمہاری ایک خیر خواہ..... لیکن اس کے بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا کی آواز آنے لگی۔ وہ راج بھون سے واپس آئی تھی اور ملازموں کو ضروری ہدایات دے رہی تھی۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ عمارت کی ڈیوڑھی سے اندر آنے کے لئے میڈم کو یقیناً چھتری کی ضرورت تھی۔ عمران نے مجھے آنکھ ماری اور پھر ایک چھتری لے کر بڑے "خادمانہ" انداز میں جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عمران نے میڈم کے ساتھ اپنے تعلقات کافی سے زیادہ بہتر کر لئے تھے۔ اسے دلوں میں گھر کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین پر زبردست خوش اخلاقی اور اپنائیت سے حملہ آور ہوتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نفرت کے دانت کھٹے کر دیتا تھا۔ میڈم کی "دشمنی" پر اس نے پہلا شدید حملہ تب کیا جب بند کمرے میں زہریلے سانپ نے میڈم کو ڈسا تھا۔ عمران نے بے دریغ اپنے ہونٹ میڈم کے زہریلے زخم پر رکھ دیئے تھے اور دراصل یہیں سے ان کے تعلق نے ایک نیا موڑ لینا شروع کر دیا تھا۔ میڈم کے لئے اپنی چھوٹی بہن کے قاتل کو معاف کرنا آسان نہیں تھا..... مگر دھیرے دھیرے ایسا ہو رہا تھا..... اور اب تو کسی وقت لگتا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میڈم اور عمران باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عمران خود بھیگ گیا تھا مگر میڈم کے اوپر چھتری موجود رہی تھی۔ میڈم کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ راج بھون سے کامیاب لوٹی ہے۔ دراصل میں نے میڈم صفورا سے کہہ رکھا تھا کہ وہ حکم سے اس بات کی اجازت لے کہ میں عمران کو اپنے ساتھ نل پانی لے جا سکوں۔ وہ اسی سلسلے میں راج بھون گئی ہوئی تھی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ میڈم نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ حکم جی نے میری یہ استدعا قبول کر لی ہے۔ میں اپنے ہم وطن کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔

عمران نے کہا۔ "کیا بات ہے میڈم! ہماری ہر استدعا مانی جا رہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہو تو کہیں کچھ غلط بھی ہوتا ہے۔"

میڈم فوری جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔ "اس موقع پر یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ہوں۔ پنڈت مہاراج نے واقعی راج بھون والوں کو قائل کر لیا ہے ہو کہ "کمٹ منٹ" کے مطابق تابش کو چھوڑ دینا چاہئے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات بھی پنڈت مہاراج اور حکم جی کی طویل میٹنگ

ہوئی ہے۔ اس میٹنگ میں رنجیت پانڈے شریک نہیں تھا حالانکہ ایسے موقعوں پر وہ شریک ہوتا ہے۔ تمہاری بحفاظت روانگی اور سیکیورٹی کی ذمے داری ایک مسلمان فوجی افسر بشارت علی خاں کو سونپی گئی ہے۔ وہی تمہیں زرگاں کی آخری حد تک لے جائے گا۔ بہرحال ابھی اس بارے میں حتمی فیصلہ ہونا ہے....." وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر خاموش ہو گئی۔

عمران نے کریدا۔ "آپ کچھ بتانے لگی تھیں؟"

اس نے طویل سانس لی اور بولی۔ "کچھ باتیں شک رفع کرنے والی ہیں تو کچھ شک ڈالنے والی بھی ہیں۔ تمہیں وہ بڑھیا تو یاد ہے نا جس نے حکم جی کے دربار میں ہنگامہ مچایا تھا؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم بولی۔ "گیتا مکھی کو اردگرد کی بڑی خبر رہتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پرسوں صبح بڑھیا نے پھر بڑا غدر مچایا ہے۔ اس نے چار پانچ دن سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا۔ پرسوں صبح وہ محافظوں کے روکنے کے باوجود بھرے دربار میں چلی آئی۔ اس نے اس بات پر سخت احتجاج کیا کہ سامبر کی آڑ میں تم جیسے بڑے اپرادھی کو چھوڑا جا رہا ہے۔ اس نے واویلا کیا کہ دھرم کے پالن کے لئے اس نے اپنی پوری فیملی قربان کی ہے۔ اب وہ خود کو بھی قربان کر دے گی۔ اس نے خود کو باقاعدہ آگ لگانے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا گیا۔ بعدازاں حکم جی اور رتنا دیوی وغیرہ نے اسے علیحدگی میں سمجھایا بجھایا۔ یہ بڑھیا اب بالکل مطمئن نظر آتی ہے۔ گیتا مکھی بتا رہی تھی کہ وہ اب کھا پی بھی رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے....."

کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوئی پھر عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "میڈم! تو پھر آپ نے اپنے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کب پہنچ رہی ہیں نل پانی؟"

"تمہیں اتنی فکر کیوں ہے میری؟"

"آپ کی فکر کیوں نہیں ہو گی۔ یقین کریں ان چند ہفتوں میں آپ کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ آپ کی کمی بے طرح محسوس ہو گی..... اور ویسے بھی ہمارا ساتھ کوئی آج کا تو نہیں ہے میڈم۔ برسوں کی بات ہے۔"

"اُلو مت بناؤ۔ میں جانتی ہوں تم یہاں اسٹیٹ میں صرف تابش کے لئے آئے۔ میرے یا ابرار صدیقی کے بارے میں تم نے بھول کر بھی نہیں سوچا ہو گا۔"

"ایسا مت کہیں میڈم! آپ نہیں جانتیں کہ آپ ہمارے لئے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین کریں، میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی یہاں

سے روانہ ہوں۔"

"اور تم جانتے ہو، ایسا ممکن نہیں ہے۔" میڈم مسکرائی۔ پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "ہاں، مستقبل قریب میں امید رکھی جا سکتی ہے۔ میں کوئی ایسا موقع تلاش کروں گی کہ یہاں سے نکل کر نل پانی پہنچ سکوں۔"

"لیکن آپ کوئی بڑا خطرہ مول مت لیں۔" میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ "اگر بڑا خطرہ مول لینا پڑے تو پھر آپ انتظار کریں۔ ہمارا وعدہ ہے میڈم! ہم آپ کو اور ابرار صدیقی کو لئے بغیر اسٹیٹ سے نہیں جائیں گے۔"

"میں نے بہت پہلے وعدوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال، اچھے کی امید تم بھی رکھو میں بھی رکھتی ہوں۔" میڈم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف کر کے کہنے لگی۔

"تابش! تم اپنا بہت خیال رکھو۔ تم نے جارج جیسے شخص کو ہرا کر جہاں ایک بے مثال وکٹری حاصل کی ہے، وہاں اپنے بہت سے دشمن بھی بنا لئے ہیں۔ یہ دشمن صرف یہاں ہی نہیں، نل پانی میں بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

میں نے میڈم صفورا کو یقین دلایا کہ میں اس کی ہدایات پر عمل کروں گا۔

......اور پھر ہماری روانگی کی تیاری مکمل ہو گئی۔ ہم عجیب گومگو کی کیفیت میں تھے۔ کبھی لگتا تھا کہ ہمیں نیک نیتی کے ساتھ یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے۔ کبھی دال میں کچھ کالا لگتا تھا۔ ایک دن پہلے پنڈت مہاراج نے لال بھون آ کر مجھے آشیرباد دی اور کہا کہ نہایت نامساعد حالات کے باوجود حکم جی اپنا وعدہ پورا کر رہے ہیں اور مجھے حمیدہ بی بی کے ساتھ زرگاں سے روانہ کیا جا رہا ہے۔

میں نے پنڈت مہاراج کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری سلامتی اور بخیریت واپسی میں ان کا کردار ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

پنڈت مہاراج ان لوگوں میں سے تھا جو میانہ رو ہوتے ہیں۔ انہیں برا کہا جا سکتا ہے نہ اچھا، نہ سیاہ نہ سفید۔ ان میں انسانی خوبیاں اور خامیاں ایک عجیب امتزاج کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔

روانگی سے ایک رات پہلے میں نے لال بھون کے ایک کمرے میں عجیب منظر دیکھا۔ عمران اور میں ساتھ ساتھ ہی فرش پر سوتے تھے۔ رات کے وقت میری آنکھ کھلی تو عمران موجود نہیں تھا...... میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمران باہر نکلا ہے۔ میں نے باہر نکل کر راہداری میں جھانکا۔

آخری سرے پر جہاں لڑکیوں کی ٹریز گیتا مکھی کا کمرا تھا، روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے تک پہنچا۔ کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر نائٹ بلب کی روشنی تھی۔ شروع میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر کمرے کے اندر حرکت ہوئی اور خوش قسمتی سے میں عمران اور گیتا مکھی کو دیکھنے میں کامیاب رہا۔ گیتا مکھی کی جوانی ڈھل رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا لوچ دار جسم بھی۔ وہ زیادہ خوش شکل بھی نہیں تھی۔ بس اس کا فن اور رقص میں اس کی مہارت تھی جس کی وجہ سے اس کی قدر تھی۔ لڑکیوں کی استاد کی حیثیت سے وہ اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی۔ زرگاں کے خواص سے اس کے تعلقات تھے۔ عمران اس سے دل لگی کرتا رہتا تھا لیکن یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں عمران جیسے وجیہہ اسمارٹ شخص کو گیتا جیسی تھکی ہوئی عورت کے اتنا قریب پاؤں گا۔ میں نے اسے عمران کے بالکل پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتے دیکھا۔ پھر وہ عجیب جذباتی انداز میں عمران کے گلے لگ گئی اور عمران کے رخسار کا بوسہ لیا۔ یہ کافی طویل بوسہ ثابت ہوا۔ اسی دوران میں اس نے عمران کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران نے بھی اپنی بانہیں اس کے گرد حمائل کر دیں۔ عمران کے رخسار کے بعد اس کے ہونٹوں کی باری آئی...... وہ اس کے ساتھ پیوست سی ہو گئی۔ وہ قریباً نصف منٹ تک اسی طرح کھڑے رہے پھر وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ عمران سے علیحدہ ہو گئی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران باہر آنا چاہ رہا ہے۔ میں جلدی سے ہٹ گیا اور واپس کمرے میں پہنچ کر فرشی بستر پر دراز ہو گیا۔ ایک دو منٹ بعد عمران بھی واپس آ گیا۔ اس نے کھوجی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں جاگ تو نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اس کا شک رفع ہوا یا نہیں، بہرحال وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا۔ اس کی کسی بھی بات کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔

اگلے روز علی الصباح ہم لال بھون سے روانہ ہو گئے۔ سردی کا زور کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ زرگاں کے مندروں اور گرجوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ راج بھون کی عظیم الشان عمارت کی بلندیاں بھی لشکارے مار رہی تھیں۔ اس عظیم الشان عمارت میں چند ہفتے پہلے ہم دونوں نے "نزول" کیا تھا اور مار دھاڑ کے موسم کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں پر بھرے دربار میں حکم جی اور عمران کے درمیان یادگار مکالمہ ہوا تھا جس میں عمران نے فتح پائی تھی۔ یہیں پر ساتویں کا جشن برپا ہوا تھا اور رنگ و بو کا سیلاب آیا تھا۔ یہیں پر میرے اور جارج گورا کے درمیان یادگار مقابلہ ہوا اور جارج گورا ایک سنگین غلطی کے سبب رام پوری چاقو کا شکار ہوا۔

زرگاں حدِ نگاہ تک ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا اور اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت ہم اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اس کی ساری خوب صورتیاں اور بدصورتیاں، ساری محبتیں اور نفرتیں ہم سے جدا ہو رہی تھیں لیکن کیا ہم واقعی جا رہے تھے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں، حمیدہ اور عمران ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار تھے۔ منیجر مدن بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس گھوڑا گاڑی کو چاروں طرف سے مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک اور گھوڑا گاڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ منیجر مدن نے بتایا کہ اس میں پنڈت مہاراج کا ایک نمائندہ ہے اور دربار کے ایک دو عہدے دار ہیں۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ ہماری روانگی کو راز رکھا جا رہا ہے، اس کے باوجود ہمیں اندازہ ہوا کہ مسلح گارڈز کے حصار سے آگے بہت سے عام لوگ بھی موجود ہیں...... ان میں ہمارے حمایتی تھے اور مخالف بھی۔ بہرحال حمایتیوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ان کے نعرے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ دوسری طرف مخالفانہ نعروں کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ مخالفانہ نعروں کا مفہوم یہ تھا کہ میں اپرادھی ہوں، میری جگہ نل پانی نہیں، زرگاں کی جیل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میری حمایت کے نعرے کچھ سہمے سہمے تھے مگر نعرہ زن افراد کی تعداد زیادہ تھی...... میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ ان نعرہ زن افراد میں وہ لڑکی بھی شامل ہو جس نے شروع شروع میں ہمیں زرگاں میں پناہ دی تھی۔ اس کا نام وجنتی تھا۔ ہم اتفاقاً اس کے گھر میں گھسے تھے۔ وہ حمیدہ کی سہیلی نکلی تھی اور اسی نے ہمیں حمیدہ کی مصیبت سے سب سے پہلے آگاہ کیا تھا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ ریٹائرڈ فوجی اہلکار کی وہ خوش باطن لڑکی بھی ہمیں الوداع کہنے والوں میں شامل ہے اور اپنی سہیلی کی رہائی کی خوشی اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''وجنتی! اگر تُو ہمیں دیکھ رہی ہے تو جان لے کہ ہم نے یہاں تک اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسحاق کے بے رحم قاتل کو جہنم واصل کیا اور تیری سہیلی کو رہائی دلائی۔ اب آگے کیا ہونا ہے، یہ ہم نہیں جانتے۔ انسان کا کام کوشش ہے اور وہ ہم کر رہے ہیں۔''

ہمارے سیکیورٹی گارڈز کا انچارج وہی بشارت علی خاں نامی افسر تھا۔ وہ اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہماری گھوڑا گاڑی کے بالکل ساتھ جڑا کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ مسلح گارڈز کے عقب میں میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ ہمارے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ شاید وہ ہماری روانگی کا نظارہ

کرنے کے لئے یہاں موجود تھا۔ اس کا سانولا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نفرت کی سرخی تھی۔ جارج کی شکست نے جہاں ہمارے اور بہت سے بدخواہوں کو گہری مایوسی میں دھکیلا تھا، وہاں رنجیت پانڈے کے غیظ و غضب کی کمر بھی توڑ کر رکھ دی تھی۔ سامبر مقابلے کے بعد سے رنجیت پانڈے ایک بار بھی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ گھوڑا گاڑی سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔

ہمیں ''الوداع'' کرنے والوں میں گیتا مکھی بھی شامل تھی۔ وہ میڈم صفورا کے عقب میں کھڑی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا، گیتا مکھی کو باتیں کرتے ہی دیکھا تھا۔ آج وہ پہلی بار گم صم نظر آئی۔ گھوڑا گاڑی حرکت میں آئی تو اس نے بھی الوداعی انداز میں ہماری طرف ہاتھ ہلایا مگر مجھے لگا کہ اس نے یہ ہاتھ صرف عمران کے لئے ہلایا ہے۔

نل پانی کی طرف ہمارا سفر شروع ہوا۔ منیجر مدن نے ہمیں بتایا۔ ''یہاں سے قریباً ساٹھ کلومیٹر کی دوری پر وہ جگہ ہے جسے ''جوڑا ٹیلے'' کہا جاوت ہے۔ یہ دراصل دو ٹیلے ہیں جہاں پر زرگاں کی حد ختم ہو جاوت ہے۔ ان ٹیلوں کے پاس سے گزرنے والے ایک برساتی نالے کو ہم زرگاں کی سرحد بھی کہہ سکت ہیں۔ آپ لوگن کے ساتھ جو گارڈز جا رہے ہیں، وہ آپ کو اس سرحد تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ اس سے آگے آپ خود سفر کریں گے۔''

''اسی گھوڑا گاڑی پر؟'' میں نے پوچھا۔

''ناہیں جی۔ آگے کچھ دشوار راستے بھی ہیں جہاں گھوڑا گاڑی کے لئے چلنا مشکل ہووے گا۔ آپ کو گھوڑے دیئے جاویں گے۔ دو دن کا راشن دیا جاوے گا۔ اپنی رکھشا کے لئے آپ کو دو رائفلیں بھی مہیا کی جاویں گی۔''

''اس کے بعد ہم جانیں اور ہمارا کام؟'' عمران نے لقمہ دیا۔

''ہاں، پنڈت مہاراج کے فیصلے کے مطابق اس کے بعد آپ کو خود ہی سفر کرنا ہووے گا۔''

سنہری دھوپ حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی کے اندر بھی خوش گوار حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ سفر میں لگنے والے دھچکوں کی وجہ سے میری متاثرہ پسلی میں بار بار درد کی لہر اُٹھتی تھی مگر یہ قابلِ برداشت درد تھا۔ حمیدہ بدستور سہمی بیٹھی تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح جس پر خونخوار عقاب کی دہشت نے سکتہ طاری کر رکھا ہو۔ شاید اسے ابھی تک بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اسے جارج گورا جیسے شخص سے چھڑا لیا گیا ہے اور اب وہ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔

ایک جگہ درختوں کے درمیان ایک قدرتی چشمے کے قریب رک کر ہم نے دوپہر کا کھانا

کھایا اور ہمارا سفر پھر سے شروع ہوا۔ عمران اپنی پُر مزاح باتوں سے اس تناؤ کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا جو سفر کے آغاز سے ہمارے اندر موجود تھا۔

سہ پہر کے وقت ہم اس خاص مقام تک پہنچ گئے جسے ''جوڑا ٹیلے'' کہا جاتا تھا۔ چند ہفتے پہلے جب میں اور عمران سبزیوں سے لدی ہوئی گھوڑا گاڑی کے ساتھ دیہاتیوں کے روپ میں زرگاں پہنچے تھے تو تب بھی یہ جڑواں ٹیلے ہماری نگاہوں سے گزرے تھے۔ تاہم اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے زرگاں کی حد شروع ہوتی ہے۔

جس برساتی نالے کا مدن نے ذکر کیا تھا، وہ بالکل خشک تھا۔ اس کی گہرائی بھی معمولی سی تھی۔ اس کے کنارے ہمیں جنگلی جانوروں کے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ جھاڑیوں کی حالت اور درختوں کی شکست و ریخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ پالتو ہاتھی بھی یہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔ ایک مقام پر ہمارا قافلہ رک گیا۔ پنڈت مہاراج کی نمائندگی ایک چھوٹے قد کا سیاہی مائل پنڈت کر رہا تھا۔ اس کے سر پر لمبی بودی اور گلے میں نصف درجن مالائیں تھیں۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اُترے۔ پنڈت نے ہمیں آشیر بادی۔ سیکیورٹی کے انچارج فوجی افسر بشارت علی خاں نے ہمیں بتایا کہ یہاں پر ان کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب آگے ہم کو خود ہی سفر کرنا ہوگا۔

اس نے دو رائفلیں اور ایمونیشن کے دو چھوٹے بیگ ہمارے حوالے کر دیئے۔ چھ صحت مند گھوڑے ہمارے لئے تیار کھڑے تھے۔ یہ تازہ دم گھوڑے پہلے سے یہاں موجود تھے۔

بشارت نے نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تین گھوڑے آپ تینوں کی سواری کے لئے ہیں۔ اس سفید گھوڑے پر آپ لوگن کا سامان اور راشن وغیرہ ہے۔ باقی دو گھوڑے فالتو ہیں۔ راستے میں آپ کو ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

پنڈت نے کہا۔ ''بھگوان سے ہماری پرارتھنا ہے کہ تم لوگن کا باقی کا سفر بھی خیریت سے گزرے۔ ہمارے لائق کوئی اور سیوا ہو تو ہمیں بتا دو۔''

''ایک گرم گرم دودھ پتی مل جاتی تو کیا بات تھی۔'' عمران نے سرگوشی کی جو بس میں ہی سن سکا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' پنڈت نے عمران سے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی۔ آپ لوگوں کا پریم دیکھ کر آپ سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا...... کتنا اچھا ہوتا اگر آپ کچھ دیر اور ہمارے ساتھ رہتے۔''

''کوئی بات ناہیں۔ ہماری پرارتھنا تو آپ کے ساتھ ہے۔''

عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ ''کدھر ہے جی؟''

''کون؟''

''پرارتھنا۔'' عمران نے کہا۔

''پرارتھنا کا مطلب ہے کہ ان کی دعا ہمارے ساتھ ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ، میں سمجھا پنڈت جی اپنی سندر بیٹی کی بات کر رہے ہیں۔ اس سے مندر کی سیڑھیوں پر ملاقات ہوئی تھی۔ میں سمجھا شاید اس کا نام پرارتھنا ہے۔'' عمران نے بتیسی نکال کر کہا۔

پنڈت کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے ناگواری سے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پایا کہ اس کی اس اوٹ پٹانگ بات کا کیا جواب دے۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ بے ہودگی برداشت کی اور اشلوک پڑھ کر ہمیں جانے کی اجازت دی۔

عمران نے حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ باقی تینوں گھوڑے بھی ایک ہی رسّی سے بندھے ہوئے ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے زرگاں کی خیالی سرحد پار کی اور مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ ویران راستہ تھا۔ یہ کہیں کہیں جھاڑیاں یا اونچی جنگلی گھاس تھی۔ زمین نیم پختہ تھی۔ گھوڑے دلکی چال چلتے ''جوڑا ٹیلے'' سے دور ہونے لگے۔

ہم تقریباً نصف کلو میٹر دور آ گئے تو عمران نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ہمیں رخصت کرنے والے اب ایک سیاہ لکیر کی طرح نظر آ رہے تھے۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتا ہے تابی...... یہ لوگ ہمیں بڑی گرم دودھ پتی پلانے والے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''یار دودھ پتی کا مطلب دودھ پتی ہوتا ہے اور یہ اتنی زیادہ گرم ہوگی کہ اگر ہم نے پینے کی بے احتیاطی کی تو ہمارے تالو جل جائیں گیا اور روزِ حشر تک یہ سڑن کم نہیں ہوگی۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ میں نے کہا۔

''یار! سیدھی بات کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''ان لوگوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا...... بس چھوڑا ہے...... وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔''

''ہاں، میرا خیال ہے۔ ان سامنے والے درختوں تک پہنچتے پہنچتے سب کچھ سامنے آ

جائے گا لیکن ابھی تم مڑ کر نہ دیکھنا...... بس اسی طرح چلتے رہو۔'' عمران نے سنسناتی آواز میں کہا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ہم نے یہ گفتگو دھیمے لہجے میں کی تھی پھر بھی ہمارے آگے جاتی ہوئی حمیدہ کچھ چونک سی گئی۔ اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔'' کیا کوئی خطرہ ہے بھائی؟''

''نہیں...... ابھی تو نہیں ہے لیکن تمہیں چوکس رہنا ہے۔'' میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔

''ایک رائفل مجھے دے دو۔'' میں نے عمران سے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کام نہیں کریں گی۔'' عمران نے پورے یقین سے کہا۔

میری بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ جونہی ہم ٹنڈ منڈ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچے، عمران نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دور ہمارے عقب میں ''جوڑا ٹیلے'' کے پاس سیاہ لکیر حرکت میں آ چکی تھی۔ یہ دراصل وہ درجنوں مسلح گھڑسوار تھے جو ہمارے محافظ بن کر ہمیں یہاں تک چھوڑنے آئے تھے۔ اب وہ آندھی کی رفتار سے پھر ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا بدترین اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا ہے۔ یہ لوگ پھر سے ہمیں پکڑنے کے لئے آ رہے تھے۔ یہ منافقت اور ریاکاری کی انتہا تھی۔ یہ ان پنڈتوں، پجاریوں کی بے مثال دھوکا دہی تھی۔ پہلے ہمیں چھوڑ کر اپنے دھرم اور عقیدوں کا منہ بند کیا گیا پھر ہمیں دوبارہ پکڑنے کا جواز ڈھونڈ لیا گیا۔

عمران نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے حمیدہ والے گھوڑے کی لگام بھی تھام لی اور چلایا...... ''بھاگو تابش۔''

ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور انہیں بھگا دیا۔ ہمارے عقب میں رسد والا گھوڑا اور اس کے عقب میں دونوں اضافی گھوڑے بھی بھاگ اُٹھے۔ یہ کافی رفتار تھی پھر بھی اس رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی جو ہمارے پیچھے آنے والوں نے پکڑ رکھی تھی۔ صاف اندازہ ہوا کہ وہ تیزی سے ہمارے قریب آ رہے ہیں۔ سامنے چٹیل میدان تھا اس میں بس کہیں کہیں جھاڑیاں اور خودرو درختوں کے جھنڈ تھے۔ کہیں کوئی قابلِ ذکر جائے پناہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''تیز دوڑاؤ تابی!'' عمران نے پھر پکار کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی رفتار کو حتی الامکان حد تک بڑھایا۔ پسلیوں میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ عمران کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ ہم زیادہ دور تک اس طرح نہیں جا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم دو تین کلومیٹر تک اس طرح جاتے اور پھر دھر لئے جاتے۔ غالباً ہم نہتے بھی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عمران نے خود کہا تھا کہ ہمیں دی گئی رائفلیں کام نہیں کریں گی اور لگتا تھا کہ اس نے درست کہا ہے......

''عمران! وہ پاس آ رہے ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔

''آنے دو۔ تم بس آگے دھیان رکھو۔'' اس نے حمیدہ والے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے عقب میں دھول تھی اور اس دھول کے عقب میں کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر زرگاں کے ہرکارے طوفانی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اب ایک قوس کی سی شکل بنالی تھی۔ یہ قوس لحہ بہ لحہ ہم سے اپنا فاصلہ کم کرتی جا رہی تھی۔ اچانک عمران نے اپنے مشکی گھوڑے کا رخ ترچھا کیا۔ ہم ناگ پھنی اور تھوہر کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ یہاں درختوں کے درمیان گھنی شاخوں کا سایہ تھا اور بارشی پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ نظر آ رہا تھا۔ اس جوہڑ کے کنارے درختوں میں وہی جرمن جیپ کھڑی تھی جو عمران کے مطابق چند دن پہلے اس سے چھین لی گئی تھی۔

عمران نے بڑی تیزی سے راشن کا سامان گھوڑے سے اُتارا اور اسے جیپ میں پھینک دیا۔ اس دوران میں، مَیں اس کے کہنے پر حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سے اُتار چکا تھا۔

''چلو جلدی کرو...... جیپ میں بیٹھو۔'' عمران چلایا۔

ہم دو تین سیکنڈ کے اندر جیپ میں تھے۔ جیپ ایسے رخ سے کھڑی کی گئی تھی کہ اسے بس اسٹارٹ کرنے کی دیر تھی، وہ سیدھی آگے نکل سکتی تھی۔ عمران نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی لگائی۔ میں عمران کے پہلو میں تھا۔ حمیدہ ہکا بکا سی پچھلی نشست پر تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ جیپ پہلے ''سیلف'' پر اسٹارٹ ہوئی۔ عمران نے ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھا دیا۔ ہم درختوں کے اس جھنڈ سے یوں نکلے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ ہم نے اپنے عقب میں زرگاں کے تیز رفتار ہرکاروں کو دیکھا...... ان سے اب ہمارا فاصلہ مزید کم ہو چکا تھا۔ ان کی مدھم آوازیں بھی اب ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ غیظ و غضب سے لتھڑی ہوئی یہ آوازیں لحہ بہ لحہ واضح ہوتی جا رہی تھیں...... لیکن اب ہمیں فکر نہیں تھی۔ ہمارے نیچے ہانپتے ہوئے گھوڑے نہیں، اسپیشل ماڈل کی شاندار جرمن گاڑی تھی۔ عمران اس کی رفتار بڑھاتا چلا

گیا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ایک انگلش ساخت کی طاقتور ''گن'' رکھی تھی۔ اس پر ٹیلی اسکوپ بھی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے گن اُٹھا کر عقب میں دیکھا۔ ٹیلی اسکوپ میں موت کے ہرکاروں کی شکلیں نظر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں مگر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور کہ درختوں کے جھنڈ سے یوں اچانک جرمن جیپ نکلے گی اور ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر دے گی۔ پھر یکایک مجھے تعاقب کرنے والے گھڑسواروں میں ایک چہرہ نظر آیا اور میرا خون کھول اُٹھا۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین کمانڈو اور سفاک پولیس افسر رنجیت پانڈے تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چند قدم آگ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپکا ہوا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے بار بار گھوڑے کو کوئی چابک وغیرہ رسید کرتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ چلانے والے انداز میں اپنے ساتھیوں کو احکامات وغیرہ بھی جاری کر رہا تھا۔

میرے سینے میں ایک لہر سی اُٹھی۔ وقت کا پھیر زرگاں کے اس خطرناک ترین شخص کو میرے نشانے پر لے آیا تھا لیکن میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ہاں، میں کوشش کر سکتا تھا۔

میں نے گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور عمران سے پوچھا۔ ''لوڈ ہے نا؟''

''لوڈ ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمیں پکڑ نہیں سکیں گے۔''

''ضرورت ہے عمران!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کتا میرے نشانے پر آ رہا ہے۔''

''کون؟''

''رنجیت پانڈے۔''

یہ اطلاع عمران کے لئے بھی دلچسپ تھی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر بولا۔ ''لیکن تم چلتی جیپ میں اتنی دور سے نشانہ نہیں لے سکو گے۔''

''کوشش تو کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگا دی۔

ناہموار راستے پر جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔ دوسری طرف ٹارگٹ بھی متحرک تھا۔ پھر بھی میں نے پوری یکسوئی کے ساتھ ٹیلی اسکوپ میں دیکھتے ہوئے پہلی گولی چلائی۔ زوردار دھماکا ہوا۔ رنجیت پانڈے کے پہلو میں گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک گارڈ الٹ کر گرا اور گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

طاقتور گن کی دوسری گولی رنجیت پانڈے سے آٹھ دس فٹ دائیں جانب ایک

دوسرے گھڑسوار کو لگی۔ یہ شخص دوڑتے گھوڑے پر سے رائفل کا فائر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً اس کا نشانہ ہماری جیپ ہی تھی۔ گولی کھا کر یہ شخص بھی اپنی رائفل سمیت گھوڑے کی پشت پر سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے کل چار گولیاں چلائیں۔ ان میں سے تین نے حکم کے گارڈز کو ہٹ کیا اور وہ اس دوڑ میں سے خارج ہو کر زمین بوس ہوئے۔ رنجیت پانڈے گن کے ہلاکت خیز بو سے بچا رہا۔ شاید میری یہ ''شوٹنگ'' ان تین افراد کی موت کا بہانہ تھی جنہیں میں مارنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قدرت اسی طرح انسانی ارادوں کو خام کرتی ہے اور مستقبل کے وہ نقشے ترتیب دیتی ہے جو تقدیر کہلاتے ہیں۔ رنجیت کو ابھی زندہ رہنا تھا اور مرنے سے پہلے ایک سنگین واقعے کا سبب بننا تھا۔

......جرمن جیپ اپنی فور وہیل پاور سے اُڑی جا رہی تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والے دیکھتے ہی دیکھتے بہت پیچھے رہ گئے۔ یقیناً انہوں نے ہمت ہار دی تھی۔ وہ جیپ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ رہی سہی کسر گن کی مہلک فائرنگ نے پوری کر دی تھی۔

عمران بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب سکون کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر کہا۔ ''تو یہ تھا سارا گیم؟''

''گیم......کون سا گیم؟''

''تم بڑی کھوچل شے ہو عمران! مجھے شروع سے شک تھا کہ تم نے بیش قیمت انعام چھوڑ کر یہ جیپ لی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے۔''

''نہیں نہیں......تم خواہ مخواہ شک کر رہے ہو، اس وقت میرے دماغ میں کوئی بات نہیں تھی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ اپنے پیدا ہونے سے پہلے بھی تمہارے دماغ میں باتیں موجود تھیں اور تم پوری پلاننگ کے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہو گے۔''

''دیکھو تم مجھ پر جوگنگ کا الزام لگاتے ہو اور اب خود جگتیں لگا رہے ہو۔''

''پتا نہیں کیوں، مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی تم سے کوئی جیپ چھین کر لے گیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس میں کوئی ہیر پھیر ہے......''

''دیکھو، اب تم مجھ پر ہیرا پھیری کا الزام بھی لگا رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم گھوڑوں پر ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اور برساتی نالے کے آس پاس کہیں فوت

ہو جاتے۔ کم از کم مجھے ایسی خوب صورت خاتون کے سامنے یوں ذلیل تو نہ ہونا پڑتا۔''

سنگین صورتِ حال کے باوجود میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا۔ ''گویا تم یہ بات مان رہے ہو کہ یہ ساری تمہاری پلاننگ تھی؟''

''میں کہاں مان رہا ہوں...... میں تو برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کی بات کر رہا ہوں...... ویسے...... یار تابش! برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔ تمہیں تو سب یاد ہی ہوگا، اس سے پہلے ایک دفعہ میں لاہور جی ٹی روڈ کے قریب ایسی وفات کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ واہ واہ...... کیسا دل بہار سین تھا جب اکٹھی چار گولیاں میرے سینے پر لگی تھیں۔ جان یوں جسم میں سے نکلی تھی جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔''

''اور اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم زندہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''یہ جینا بھی کوئی جینا ہے یار! چڑیلے کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ زندوں میں نہ مُردوں میں اور پھر اگر اس چڑیلے کو نیوز چینل کا پیٹ بھی بھرنا ہو تو اور بڑا عذاب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قیامت تک میری روح یونہی بھٹکتی رہے گی۔''

''ان شاءاللہ۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''لیکن اتنا خوش ہونے کی ضرورت بھی نہیں تمہیں...... میرے لئے ''یوں قیامت تک بھٹکنے'' میں ایک پہلو اطمینان کا بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے چینل پر قیامت کی خبر دے سکوں گا۔ ذرا سوچو، کتنا مزہ آئے گا جب میں ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو کر اپنا دو فٹ لمبا غمگین پریشان چہرہ ناظرین کو دکھاؤں گا اور کہوں گا...... خواتین و حضرات! قیامت آ گئی ہے۔ بالآخر ہم قیامت لانے میں کامیاب رہے ہیں...... اب کہیں جائیے گا مت۔ ہم اس حوالے سے طویل دورانیے کی خصوصی ٹرانسمیشن شروع کر رہے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے لقمہ اجل بننے تک یہ ٹرانسمیشن جاری رہے گی......''

حمیدہ ہم دونوں کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی۔ پیچھے اب دور دور تک تعاقب کرنے والوں کا نشان نہیں تھا مگر وہ پھر بھی خوف زدہ تھی۔ جیپ تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں کو نگلتی چلی جا رہی تھی۔

ہم نے بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھا۔ جیپ کے اندر وافر مقدار میں فیول تھا۔ اس کے علاوہ فیول سے بھرا ہوا ایک فالتو ٹینک بھی تھا۔ گن کے اضافی راؤنڈز، ٹارچ، شکاری چاقو اور اس طرح کی کئی اشیاء پہلے سے جیپ میں موجود تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ عمران نے پوری تیاری کے ساتھ جیپ کو وہاں چھپایا تھا۔ گھوڑے سے اُترنے والا راشن بھی جیپ کے اند

موجود تھا اور یہ ہم تینوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ عمران نے بالکل درست کہا تھا۔ وقتِ رخصت بشارت علی خاں وغیرہ کی طرف سے جو دو رائفلیں ہمیں دی گئی تھیں، وہ بیکار تھیں۔ ان میں گڑبڑ کی گئی تھی۔ انہیں بس لاٹھی کے طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے کھانا بھی چلتی جیپ میں کھایا۔ ہمارے اصرار کے باوجود حمیدہ نے ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لئے۔ رات کے وقت ہم اسی پُرخطر علاقے سے گزرے جس کے بارے میں عمران نے کہا تھا کہ یہ ''سانپوں کا علاقہ'' کہلاتا ہے۔ اس وقت کے سارے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ تب میں اور عمران گھوڑا گاڑی پر سوار تھے۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ زرگاں کی طرف سفر کر رہے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے زندہ پلٹ سکیں گے یا نہیں...... اور پھر ہماری گھوڑا گاڑی میں ایک زہریلا سانپ رینگ آیا تھا۔ بعدازاں لال بھون میں اس سانپ نے میڈم اور عمران کو ایک دوجے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس گھنے جنگل میں یہ سفر ہمارے لئے دشوار ثابت ہوا۔ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کر رہے تھے۔ بس پارکنگ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی جگہ عمران کو یا مجھے نیچے اُتر کر جیپ کے لئے راستہ بنانا پڑا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ہمارے لئے اضافی تناؤ کا باعث تھیں۔ خاص طور سے حمیدہ کا برا حال تھا۔ وہ مسلسل منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ ہم دونوں کو بھائی جی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ گاہے بگاہے کہتی۔ ''بھائی جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

عمران کہتا۔ ''اس کا ایک ہی حل ہے بھابی جی...... بس ڈرتی رہو۔ عشق کی طرح ڈر پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ یہ وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔''

ایک بار پھر جب حمیدہ نے کہا۔ ''بھائی جی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' تو عمران بولا۔ ''دیکھو بھابی جی! تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم ڈر کو لگ جاؤ۔ ڈر کو لگنے کا طریقہ یہ ہے کہ اچھی اچھی باتیں یاد کرو۔ جیسے میں اور تابش کر رہے ہیں۔ تابش اس وقت اپنی طرح دار بیوی کو یاد کر رہا ہے اور رضائی کے اندر گھس کر...... اس کے ہاتھ کے گرم گرم پکوڑے کھانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'' اس نے جان بوجھ کر فقرے میں ''لمبا وقفہ'' دیا تھا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اسی طرح میں اس کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس نے اپنی ضد سے اپنا پورا پریوار تباہ کر دیا اور اب شاید خود بھی تباہ ہونے والی ہے۔''

''کون بڑھیا جی؟'' حمیدہ نے پوچھا۔

"وہی جس نے حکم کے دربار میں میرے ساتھ "ٹاک شو" کیا تھا۔ ذرا تصور کرو تابی! اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی۔ اس نے تو پانچ چھ دن پہلے ہی خود کو آگ لگا کر بدروح بن جانا تھا۔ غالباً پنڈت مہاراج وغیرہ نے اسے تسلی دی ہوگی کہ ہمیں آزاد نہیں کیا جا رہا۔ چھوڑنے کے بعد ہمیں پھر پکڑ لیا جاوے گا...... لیکن اب، جب اس "ہائی اسپیڈ" بڑھیا کو پتا چلا ہوگا کہ ہم نکل گئے تو اس نے یقیناً قیامت مچا دی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اب تک وہ اپنے تئیں "شہید" بھی ہو چکی ہو۔"

اڑیل بڑھیا کے ذکر نے مجھے بھی محظوظ کیا لیکن میں نے عمران کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "یار! ایسے لوگ خود شہید نہیں ہوتے، دوسروں کو شہید کرانا زیادہ باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے نوجوانوں کو۔ یہ بڑھیا اپنے خاندان کو برباد کر چکی ہے لیکن اب بھی اس کے پاس اپنے حق میں بڑی ٹھوس دلیلیں موجود ہوں گی۔"

عمران نے میری بات سے اتفاق کیا۔

ہم نے اگلے روز بھی وقفے وقفے سے سفر جاری رکھا۔ ہم بتدریج سرسبز علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ اس علاقے میں کسی سے بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ ایک طرح سے یہ سارا علاقہ زرگاں اور نل پانی کے درمیان "نو مین لینڈ" تھا۔ ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں زرگاں اور نل پانی دونوں کے گارڈز اور جاسوس حرکت کرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ قیام کر لیا جائے۔ اگر ہم چلتے رہتے تو ہمیں بغیر روشنی کے سفر کرنا پڑتا اور یہ بہت دشوار تھا۔ اس کے علاوہ پچھلے قریباً چھتیس گھنٹے میں تھکاوٹ بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ خاص طور سے حمیدہ کا تو برا حال تھا۔

ہم نے ایک نسبتاً اونچی جگہ پر درختوں کے درمیان جیپ روک دی۔ سردی کافی تھی مگر ہم جیپ کا ہیٹر آن نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ فیول اب گزارے مافق ہی رہ گیا تھا......

تھوڑا سا کھانا کھا کر حمیدہ پچھلی نشست پر لیٹ گئی۔ میں نے عمران سے کہا۔ "تم بھی اپنی سیٹ اسٹریچ کر کے تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، حمیدہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "بھائی جی! آپ نے بتایا ناہیں کہ زرگاں میں میری مصیبت کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا تھا؟ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "عورت نہیں لڑکی۔ تمہاری سہیلی وجنتی...... ہم اتفاقاً اس کے گھر میں جا گھسے تھے۔ اسی سے ہمیں ساری باتیں پتا چلیں۔"

"وجنتی؟" حمیدہ ششدر رہ گئی۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں سب کچھ بتایا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ بولی۔ "جب جارج صاحب کے سپاہی مجھے پکڑنے کے لئے میرے گھر آئے تو وجنتی بھی وہیں تھی...... اس نے انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ ان سے لڑ پڑی تھی۔ سپاہیوں نے اسے گالیاں اور دھکے دیئے تھے۔ میں اس کے بارے میں بڑی فکرمند تھی۔ آپ نے یہ بتا کر میری تسلی کی ہے کہ وہ خیریت سے ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"...... جب میں نے آپ سے زرگاں میں اس بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے تب کیوں ناہیں بتایا؟"

"اس کا جواب سیدھا سادہ ہے حمیدہ۔" میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔ "تب تک ہم دشمنوں میں تھے، خطرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ تمہیں وجنتی کے بارے میں بتانا کوئی مسئلہ پیدا کر سکتا تھا۔"

بات حمیدہ کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگی مگر وہ پھر بھی نشست پر لیٹی نہیں۔ ہچکچاہٹ کے عالم میں بیٹھی رہی۔ عمران اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ وہ ہماری موجودگی میں بے آرامی محسوس کر رہی ہے...... عمران اور میں جیپ سے باہر نکل آئے۔ طاقتور گن عمران کے ہاتھ میں تھی۔ "آ...... آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ بوکھلائی۔

"کہیں نہیں۔ ہم ذرا سگریٹ وغیرہ پئیں گے۔ یہیں جیپ کے پاس بیٹھ رہے ہیں۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔" عمران نے کہا۔

جیپ کے پاس ہی صاف ستھری پتھریلی جگہ تھی۔ ہم نے وہاں ایک چٹائی بچھائی اور تناور درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہم اپنے اردگرد زیادہ اچھی طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مدھم روشنی درختوں سے چھن چھن کر خشک پتوں سے اٹی زمین پر پڑ رہی تھی۔ ہلکی سرد ہوا اور درختوں کے درمیان سے یوں گزرتی تھی جیسے کوئی دوشیزہ لمبا آنچل لہراتی بے شمار ستونوں والے محل سرا میں بھاگ رہی ہو...... اس کی پائل مدھر آواز پیدا کرتی ہو اور اس کی خوشبو قرب و جوار کو مہکاتی ہو...... یوں لگتا تھا کہ اس سنسان جنگل میں میلوں تک ہم تینوں کے سوا اور کوئی ذی نفس نہیں۔ یہاں جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر اسے اپنے ہاتھ کی قوس سے ڈھانپ لیا اور اپنا دوسرا ہاتھ میری زخمی پسلی پر چلاتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ درد تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں درد کے حوالے سے نہیں کہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے تم ''نہیں'' ہی کہو گے۔''

''کیا یہ بری عادت ہے؟''

''بالکل نہیں اور میرا خیال ہے کہ اسی ''نہیں'' کی وجہ سے تم جارج گورا جیسے شخص کو مات دینے میں کامیاب ہوئے ہو۔ وہ جس طرح تمہیں زخمی کر چکا تھا تمہاری گردن جکڑ چکا تھا، لگتا نہیں تھا کہ تم کھڑے رہ پاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ اس ''نہیں'' کے سلسلے میں تو تمہاری شاگردی اختیار کر لینی چاہئے۔''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ہم دونوں ایک دوسرے کی شاگردی اختیار کر سکتے ہیں۔ کچھ باتیں تمہارے اندر ایسی ہیں جو مجھ میں نہیں۔''

''مثلاً؟''

میں ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً، بات کو چھپانے اور گول کرنے کا فن۔''

''میں نے کیا چھپایا ہے؟''

''تم نے بتایا کیا ہے، ہر معاملے میں گھپلا کیا ہے۔ تمہیں پتا تھا کہ حکم کی نیت میں فتور ہے، وہ ہمیں صرف دکھاوے کے لئے چھوڑ رہا ہے۔ اس کی پلاننگ کو ناکام بنانے کے لئے تم نے بھی لمبی چوڑی پلاننگ کی۔ رتنا دیوی والی جیپ حاصل کی پھر اس کے چھینے جانے کا ڈراما کیا پھر اسے پوری تیاری کے ساتھ مناسب جگہ پر چھپایا اور مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔''

اس نے کش لے کر تنے سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں بھی یقین نہیں تھا۔ یہ سب اندازے تھے جو غلط بھی ہو سکتے تھے اور صحیح بھی۔ شکر ہے کہ یہ صحیح ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں کہ میں جیپ کے چھینے جانے والا ڈراما کرنے والا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے بعد تمہیں مسلسل اداکاری کرنا پڑے گی اور ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں تمہاری اداکاری زیادہ اچھی نہ ہو اور حکم کے ہرکاروں کو شک گزرے۔''

''شک تو خیر مجھے شروع سے ہی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''حکم اور پنڈت مہاراج وغیرہ جس طرح ہماری ہر بات مانتے چلے جا رہے تھے...... خاص طور سے جس طرح انہوں نے تمہیں بھی میرے ساتھ آنے کی اجازت فراخ دلی سے دے دی تھی، لگتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن کچھ باتیں اب بھی اُلجھن میں ڈالتی ہیں۔ مثلاً تمہارا جیپ کو بالکل صحیح جگہ پر چھپانا...... تمہیں اس بات کا پہلے سے علم ہونا کہ جو رائفلیں ہمیں دی گئی ہیں، وہ ناکارہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

وہ مسکرایا۔ ''ابھی تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ کچھ معاملوں میں تم بھی میری شاگردی اختیار کر سکتے ہو۔ درست اندازے لگانا بھی تو ایک فن ہے جگر...... اور اس حوالے سے میں تم سے تھوڑا سا آگے ہوں۔''

''تم بہت سے معاملوں میں آگے ہو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''چھپے رستم ہو...... بہت پہنچی ہوئی شے ہو بلکہ مستی میں ضرورت سے زیادہ ہی ''پہنچ'' جاتے ہو۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چاندنی اس کی ٹھوڑی کے دلکش گڑھے کو نمایاں کر رہی تھی۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کوئی بات نہیں کر رہا۔ وہی پرانی دُہرا رہا ہوں۔ اگر باتوں کو چھپانے اور گول کرنے کا کوئی عالمی مقابلہ ہو تو تم ضرور گولڈ میڈل لے جاؤ۔'' میں مسکرایا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی تیز یقابی نگاہیں میری آنکھوں کے راستے جیسے میرے دماغ کے اندر گھسنے لگیں۔ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''تم نے میری مستی کی بات کیوں کی ہے؟ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے؟''

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا، میں نے کہا۔ ''ہاں دیکھا ہے اور بہت حیران بھی ہوا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ گیتا بھی ایسی زوردار لڑکی ہے۔''

اس نے نتھنوں سے دھوئیں کی طویل لکیریں خارج کیں اور قدرے پُرسکون نظر آنے لگا...... اب اس کے چہرے پر اُلجھن کے بجائے ایک طرح کی چمک سی آ گئی۔ چند لمحے بعد وہ مسکرایا اور بولا۔ ''انڈیا کا ایک مشہور فلمی گانا ہے، میرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے...... تُو کہیں بھی رہے میری نگاہ میں ہے۔ اسی طرح بھئی ہم بھی جو کچھ کرتے ہیں تمہارے لئے ہی کرتے ہیں۔ تمہارے سکون کے لئے...... تمہاری خوشی کے لئے۔''

''یعنی تم نے میرے سکون اور خوشی کے لئے گیتا سے زبردست قسم کے رومانی سین کئے۔ بھئی واہ...... زبردست...... کل تم کہو گے کہ میرا غم غلط کرنے کے لئے تم نے شراب کی

میری کھوجی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ ''کب ملے تمہیں یہ زیور؟''

''جن دنوں تم نے اپنی پسلی کی ''ویلڈنگ'' کرائی تھی اور اسپتال میں تھے۔'' وہ مسکرایا۔

مجھے یاد آیا کہ ان دنوں عمران کافی گھومتا پھرتا رہا تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ کا بہانہ کر کے وہ تین چار بار اسپتال سے نکلا تھا اور دیر تک باہر رہا تھا۔

ایک دم میں نے چونک کر پوچھا۔ ''لیکن...... ہم بات تو کچھ اور کر رہے تھے۔ میں نے تم سے تمہارے اور گیتا مکھی کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''تو وہی تو بتا رہا ہوں یار۔ ان زیوروں کی دستیابی اور گیتا مکھی میں گہرا تعلق ہے۔ تمہیں کچھ عجیب تو لگے گا لیکن میں وہی بتا رہا ہوں جو سچ ہے۔ ایک دن میں اور گیتا مکھی بڑے اچھے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ طوفانی رفتار سے بول رہی تھی اور اپنے ماضی کے قصے سنا رہی تھی۔ میں نے اس سے سلطانہ کے زیورات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور بتایا کہ وہ زیور کیسے اور کن حالات میں زرگاں کے ایک تجربہ کار وید کے پاس چلے گئے تھے۔ میں نے گیتا مکھی سے کہا کہ وہ ایک چلتا پرزہ ہے۔ زرگاں کے چپے چپے کی خبر اسے رہتی ہے۔ کیا وہ کسی طرح اس وید کا اور زیوروں کا پتا نہیں چلا سکتی؟ وہ موڈ میں تھی۔ الائچی سپاری پان چبا کر بولی کہ وہ یہ کام کر دے گی لیکن اس کے بدلے مجھ سے ایک من پسند تحفہ لے گی۔ میں نے کہا کہ تحفہ تو دینے والے کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ بولی لیکن میں اپنی مرضی کا لوں گی۔ میں ذرا چونک گیا۔ میں نے کہا، اگر کوئی ایسی چیز ہوئی جو میں نہ دے سکا تو؟ وہ بولی۔ میں تمہیں بڑی اچھی طرح جان گئی ہوں عمران صاحب! کوئی ایسی چیز ناہیں مانگوں کی جو تم نہ دے سکو۔ بس اس طرح ہمارے درمیان ایک ''ڈیل ٹائپ'' کی چیز ہو گئی...... گیتا مکھی نے میری توقع سے زیادہ صلاحیت دکھائی۔ ایک دو جگہ میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ آٹھ دس دن کے اندر ہم اس وید صاحب تک اور ان زیوروں تک جا پہنچے۔ وید صاحب ان زیوروں کے منہ مانگے پیسے مانگ رہا تھا لیکن لالچی شخص اکثر ڈرپوک بھی ہوتا ہے۔ میں نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ معقول رقم پر زیور واپس کرنے پر رضامند ہو گیا...... وید کو قائل کرنے کے سلسلے میں گیتا مکھی نے بھی کردار ادا کیا۔''

''اور زیورات کے لئے رقم کہاں سے لی تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''جگر! تمہیں بتایا ہے نا کہ پیسوں کے سلسلے میں تمہارے یار کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔''

''پھر بھی پتا تو چلے؟''

''میڈیم صفورا سے ادھار لئے تھے۔ اگر اللہ نے اسے زندگی دی تو جلد ہی لوٹا دوں گا۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میڈم صفورا جیسی عورت تمہیں ادھار دے سکتی ہے۔''

''وہ بہت کچھ دے گی اور لے گی، اگر اس کی زندگی رہی تو۔ تم آگے آگے دیکھنا۔''

''اس کی زندگی کی بڑی فکر ہے تمہیں۔ خود تو جیسے آبِ حیات پی رکھا ہے تم نے۔''

''چڑیلے کو موت نہیں آتی یار...... وہ مر کر ہی تو چڑیلا بنتا ہے۔''

چاندنی درختوں میں اپنا زاویہ بدل چکی تھی۔ ہلکی اوس گرنا شروع ہو گئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جرمن جیپ کے اندر حمیدہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ کسی چکور کی آواز بلند ہوئی اور سناٹے میں دور تک پھیل گئی۔ میں نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تو پرسوں رات میں نے لال بھون کے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ گیتا مکھی کا من پسند تحفہ تھا؟''

''تم کہہ سکتے ہو۔ ان عورتوں کی خواہشیں بھی انہی کی طرح عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ وہ کہتی تھی، میں تمہیں اپنے ہونٹوں سے الوداع کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کر لو بھئی۔ اس نے میرے ساتھ اس کمرے میں اپنی مرضی کے ایک دو منٹ گزارے اور اسی میں خوش ہو گئی۔ کوئی اس طرح خوش ہو جائے تو اسے کر دینا چاہئے یار۔ ہمارے حقوق کون سے بحق زوجہ محفوظ ہیں۔''

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا شخص تھا۔ پولیتھین میں لپٹے ہوئے زیورات چاندنی میں دمک رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''عورت کی زندگی میں گہنوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے اور عروسی گہنے تو اس کی روح کے اندر دمکتے ہیں۔ انہیں کھو کر وہ اندر سے تاریک ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل یا پرسوں رات جب تم سلطانہ سے تنہائی میں ملو تو اپنے ہاتھ سے اسے یہ گہنے پہناؤ۔ مجھے یقین ہے، تمہارے ہاتھوں سے یہ سونا پہن کر وہ اندر سے روشن ہو جائے گی۔''

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ''لیکن ایک بات کا تمہیں مجھ سے ابھی اور اسی وقت وعدہ کرنا ہو گا اور اگر تم نے وہ وعدہ توڑا تو سمجھو ہمارے درمیان جنگِ عظیم ہو جائے گی۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ بہت نقصان ہو گا ہماری دوستی کا۔''

''سلطانہ بھابی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہئے کہ گہنے برآمد کرنے میں میرا عمل دخل ہے۔''

میں یہ کریڈٹ تمہارے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میری یہ خواہش پوری نہ کی تو...... سچ کہتا ہوں، ہماری لڑائی ہو جائے گی۔" وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

میں نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں پاس کے درختوں میں ایک بار پھر چاندنی میں نہائی ہوئی...... چکور کی رومان انگیز آواز سنائی دی۔ عمران کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ "سلطانہ بڑی اسپیشل لڑکی ہے تابی۔ وہ باہر سے شاید بہت خوب صورت نظر نہ آتی ہو مگر اندر سے حسین و جمیل ہے۔ وہ تمہارے پیار کی اتنی زیادہ حق دار ہے جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ تم نے اسے ٹوٹ کر بکھرنے سے بچایا ہے، اب اس کی زندگی کو زندگی بنانا بھی تمہارا ہی کام ہے......"

O......❖......O

یہ اگلی شب، دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ہم ایک بار پھر اس مچھیرا بستی فتح پور کے نواح میں تھے۔ فتح پور کا قدیم مندر دو کلومیٹر دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ ہلکی چاندنی میں ہم دونوں اپنی کیچڑ زدہ جرمن جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ جیپ کا انجن خاموش تھا۔ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔

حمیدہ کو اس کی شدید خواہش کے مطابق ہم نے شام کے وقت یہاں سے چالیس پچاس کلومیٹر دور ایک بستی "شاہی پور" میں اُتار دیا تھا۔ شاہی پور میں حمیدہ کے دو شادی شدہ تایا زاد بھائی رہتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان کے ذریعے بحفاظت نل پانی میں اپنے دیگر رشتے داروں کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ وقتِ رخصت وہ بے حد ممنون اور احسان مند نظر آتی تھی۔ خاص طور سے میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتی تھیں۔

اور اب ہم فتح پور میں داخل ہونے کے لئے تیار تھے۔ فتح پور میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ایک نہایت ناپسندیدہ کام کرنا تھا اور وہ یہ کہ اپنی اسپیشل جرمن جیپ کو، جس نے کٹھن راستوں پر ہمارا بے مثال ساتھ دیا تھا...... پانی میں غرق کرنا تھا۔ اس کام کے لئے ہم ایک بڑا بارشی جوہڑ پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔ عمران چونکہ کئی ماہ سے یہاں فتح پور میں رہ رہا تھا، اس لئے وہ اور اقبال یہاں کے نشیب و فراز کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ جوہڑ کافی گہرا تھا۔ دوسرے جوہڑوں کی طرح اس میں بھی چھوٹے سائز کی مچھلیاں موجود ہوتی تھیں لیکن انہیں پکڑنے کے لئے کوئی اس جوہڑ کی طرف نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی وہی توہم پرستی کارفرما تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں اوپر تلے تین لڑکے بالے اس جگہ ڈوب کر ہلاک ہو چکے تھے اور حسبِ رواج یہ جوہڑ آسیب زدہ قرار پا گیا تھا۔

ہم نے جیپ میں سے تمام ضروری اشیاء نکال لی تھیں...... جیپ بالکل جوہڑ کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اس کے دروازے بند کرنے کے بعد ہم نے اسے آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کیا اور وہ جوہڑ کے مٹیالے پانیوں میں اُترتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے اندر اس کا نام و نشان مٹ گیا...... ہم نے جوہڑ کے قریب سے اس کے چوڑے ٹائروں کے نشان ختم کر دیئے۔ امید تھی کہ دو چار دن میں جب بارش ہو جائے گی تو باقی ماندہ نشانات بھی ختم ہو جائیں گے۔

اب مسئلہ آفتاب خاں کو ڈھونڈنے اور اسے بتانے کا تھا کہ ہم واپس پہنچ گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس کام کے لئے عمران کو آگے جانا تھا۔ ہمارے رسد کے سامان میں دو بڑے سائز کی گرم چادریں بھی موجود تھیں۔ عمران نے ایک چادر مقامی انداز میں اس طرح جسم کے گرد لپیٹی کہ اس میں منہ سر بھی چھپ گیا۔ ایک لاٹھی کے ساتھ اس نے کپڑوں والی گٹھڑی باندھ کر کندھے سے لٹکا لی۔ اس حلیے میں وہ ایک مقامی مسافر ہی نظر آنے لگا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر اس نے دور مار رائفل بھی اپنی چادر کے نیچے ہی چھپالی تھی۔ میرے پاس ہتھیار کے نام پر بس ایک چاقو تھا۔ یہ بڑا خاص چاقو تھا اور میرے لئے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

ہم پیدل ہی فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مندر کے تہ خانوں میں صورتِ حال کیا ہو گی؟ وہ سب لوگ خیر خیریت سے ہوں گے جنہیں ہم یہاں چھوڑ کر گئے تھے؟

فتح پور کے بالکل پاس آ کر میں درختوں کے ایک جھنڈ میں ٹھہر گیا اور عمران آگے چلا گیا۔ میں ایک ایک پل گن گن کر گزارنے لگا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا، ہمارا اپنے ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ جہاں ان سے ملنے کی خوشی تھی، وہاں اَن گنت اندیشے بھی ذہن میں سر اُٹھا رہے تھے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں آج رات سلطانہ کو اپنے رُوبرو دیکھ سکوں گا؟

مجھے عمران پر پورا بھروسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ فتح پور میں داخل ہو کر وہی کچھ کرے گا جو موجودہ صورتِ حال میں بہترین ہو گا۔

انتظار کے پل، برسوں کی طرح گزرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخر مجھے ایک شخص کا سایہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ عمران تو ہرگز نہیں تھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے چاقو پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ آنے والا دراز قد تھا۔ پھر

میں نے پہچان لیا۔ وہ آفتاب خاں تھا۔ میں درختوں کی اوٹ سے باہر نکلا، ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

آفتاب خاں نے جوش کے عالم میں میرا کندھا چوما اور بولا۔ ''مرحبا...... مرحبا تابش بھائی! آپ نے...... آپ نے ام سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ آپ نے وہ کر دکھایا جس کا ام سب لوگ بس سپنا ہی دیکھ سکتا تھا۔ امارے بس میں ہوتا تو ام آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا اور آپ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر گاؤں میں لے جاتا۔''

اس نے ایک بار پھر جوش سے میرا کندھا چوما۔

میں نے کہا۔ ''سب خیریت سے ہیں نا آفتاب خاں...... میرا مطلب ہے، اقبال، تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور سلطانہ؟''

''سب ایک دم خیریت سے ہے جی۔ بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے، اس کے بارے میں ام آپ کو بعد میں بتا دے گا۔''

''سلطانہ اور اقبال تو خیریت سے ہیں نا؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بالکل جی، ایک دم ٹھیک ٹھاک۔ ام لوگوں کو زرگاں میں ہونے والے زبردست دنگل کا خبر دس پندرہ دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ ام کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایک بہت بڑے مقابلے میں ایک جوان نے جارج گورا کو جان سے مار ڈالا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ مارنے والا کون ہے۔ کچھ لوگ اسے نل پانی کے انور خاں کا کارنامہ بتاتا تھا، کچھ چھوٹے سرکار کے ایک فوجی افسر کا نام لیتا تھا لیکن ام کو یقین تھا کہ یہ آپ دونوں میں سے ہی کوئی ہوگا۔ ایک دو روز بعد سارا تفصیل مالوم ہوگیا اور اس بات کا پکا پکا تصدیق ہوگیا کہ یہ کارنامہ آپ نے ہی کیا ہے۔'' آفتاب خاں اتنا پُرجوش تھا کہ اس کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

''عمران کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ام انہیں مندر میں چھوڑ آیا ہے۔ وہ خود بھی میرے ساتھ یہاں آنا چاہتا تھا لیکن ام نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں۔''

آفتاب مجھے اپنے ساتھ لے کر مندر کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں فتح پور کے سنسان گلی کوچے سو رہے تھے۔ بس کہیں کہیں کسی بکری کی ممیاہٹ یا آوارہ کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ حسبِ معمول آفتاب خاں کے ہاتھ میں لاٹھی اور لالٹین تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اس بکل میں یقیناً چھوٹا موٹا اسلحہ بھی موجود تھا...... مندر کا جلا ہوا مسمار شدہ حصہ دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ تعمیر کا سامان یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔ اردگرد

احتیاط سے دیکھنے کے بعد آفتاب خاں مندر کی شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر چوبی دروازے تک پہنچا اور اس کا قفل کھول دیا۔ تب اس نے اشارے سے مجھے بھی اوپر بلا لیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر کے نیم گرم ماحول میں چلے گئے۔ بالائی تہ خانے میں ہمارے سارے ساتھی موجود تھے۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہونے والا اقبال ہی تھا۔ اس نے جوش کے عالم میں مجھے اُٹھایا اور کئی چکر دیئے۔ اس کے بعد طلال، تاؤ افضل اور دیگر لوگوں نے میرا استقبال کیا۔ مجھے سلطانہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری نگاہ اس کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ وسوسے سر اٹھانے لگے۔ ''سلطانہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

عمران چہکا۔ ''ہم ڈھونڈتے ہیں ان کو جو مل کے نہیں ملتے...... روٹھے ہیں نہ جانے کیوں مہماں وہ مرے دل کے۔'' پھر اس نے نیچے والے تہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔

تاؤ افضل بولا۔ ''چلو جاؤ۔ وہ وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جب سے پتا چلا ہے کہ تم آ گئے ہو، مسلسل رو رہی ہے۔''

میں سیڑھیاں اُتر کر زیریں تہ خانے میں پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ دروازہ بند تھا...... میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اُٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پہلے اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی پھر بے بس ہو گئی اور بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ دل فگار انداز میں بولی۔ ''وہ مر گیا ہے نا...... وہ مر گیا ہے نا مہروج؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں سلطانہ! میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے میں نے نہیں تم نے مارا ہے۔ تمہاری دی ہوئی طاقت نے مارا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔''

''سچ کہو مہروج...... سچ کہو۔''

''ہاں سلطانہ...... وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔ اس کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر تھیں۔ وہ اپنے خون میں لت پت تھا۔''

''وہ رویا چلایا بھی تھا؟''

''ہاں سلطانہ! میں نے اسے کئی زخم لگائے۔ وہ ہر زخم پر ڈکرایا تھا اور اس کی آواز پورے میدان میں گونجتی تھی۔''

وہ اور جوش کے عالم میں مجھ سے لپٹ گئی اور شدت سے رونے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ میری جیکٹ کو بھگوتی رہی۔ پھر میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ میں

نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ رام پوری چاقو نکالا جس سے میں نے جارج گورا کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے خم دار پھل پر ابھی تک اس کے خون کا نشان موجود تھا۔

''یہ دیکھو سلطانہ! یہ ہے وہ ہتھیار جس سے میں نے اس شیطان کو ڈھیر کیا۔'' اس نے چاقو میرے ہاتھ سے لیا اور بے ساختہ اس کے دستے کو چوم لیا۔ پھر وہ میرے سینے سے لگ گئی اور ایک بار پھر تشکر کے آنسو بہانے لگی۔

مندر کے تہ خانوں میں وہ رات جشن جیسی تھی۔ سب میرے اور عمران کے گرد جمع تھے...... دو آتش دانوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لئے تھے۔ تاؤ افضل کی بیٹیوں نے نوری اور سلطانہ کے ساتھ مل کر بڑی تیزی سے گوشت بھونا تھا اور چاول پکائے تھے۔ سب نظر آ رہے تھے مگر گاڑی بان ہوشیار سنگھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ قتل ہو جانے والے گرو کی جواں سال پتنی رادھا بھی نظر نہیں آئی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ درمیانی تہ خانے میں سو رہی ہے۔

''ہوشیار سنگھ کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب خاں سے پوچھا۔

وہ ذرا ٹھٹکا پھر اقبال کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تابش بھائی! ابھی باہر ام نے آپ کو بتایا تھا نا کہ امارے ساتھیوں میں سے بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے...... وہ یہی خانہ خراب ہوشیار سنگھ ہے۔ وہ ہوشیاری دکھا کر یہاں سے نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ گرو کی پتنی رادھا کو بھی لے گیا۔''

''اوہ گاڈ...... یہ کیسے ہوا؟'' میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ عمران بھی حیران پریشان نظر آنے لگا۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ ''رادھا ہر وقت اپنے گرو پتی کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس خبر پر اس نے بڑا واویلا مچایا۔ رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ کلائیوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں سیندور مٹا دیا اور پتا نہیں کیا کچھ کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے گرو کی موت کا غم بھی ہو مگر اس سے زیادہ خوف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے ''مہان'' شخص کی ہتھیا کی وجہ سے کوئی بڑی سخت مصیبت آئے گی۔ لال آندھی چلے گی، باڑ تباہی مچا دے گی یا بیماری پھوٹ پڑے گی۔ وہ رونے چلانے لگی اور اس نے کہا کہ وہ اپنے گرو پتی کے ساتھ ہی ستی ہونا چاہتی ہے۔ وہ خود کو آگ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اسے روکا۔ دو تین دن یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ستی ہونے کی کوشش کرتی اور ہم اسے پکڑ وکڑ کر روکتے۔ پھر ایک دن میری

برداشت ختم ہوگئی۔ میں نے مٹی کے تیل کی بوتل لی، ماچس پکڑی اور یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ میں نے کہا، اگر تم نہیں رہ سکتیں تو پھر ہو جاؤ ستی۔ اگلے دن سے وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اس نے سفید کپڑے پہن لئے، زمین پر سونا شروع کیا اور رُوکھی سوکھی روٹی بس دو وقت کھانے لگی۔ اس نے کہا کہ وہ گرو کے غم میں بیوہ کی زندگی گزارے گی...... میں نے ہوشیار سنگھ کو رادھا کی دیکھ بھال پر لگایا ہوا تھا اور یہ میری غلطی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ اسے پتا تھا کہ اگر رادھا ستی ہونے کے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی تو ''بیوگی'' کے فیصلے پر بھی نہیں رہ سکے گی۔ وہ بھرپور جوان تھی اور ابھی ایک موٹے بوڑھے شوہر کے سوا اس نے دیکھا ہی کچھ نہیں تھا۔ ہوشیار سنگھ نے پتا نہیں کیا کرامات دکھائی کہ تھوڑے ہی دنوں میں جوان رادھا کو پوری طرح شیشے میں اُتار لیا۔ ہمیں ہوشیار سنگھ کے اس ''سنہری کارنامے'' کا پتا تب چلا جب نوری نے ہوشیار سنگھ اور رادھا کا پول کھولا۔ دراصل نوری کو ان دونوں پر شک ہو چکا تھا۔ ایک شام اس نے چالاکی دکھائی اور رادھا کے کمرے کی چٹخنی کو ہتھوڑی سے چوٹ لگا کر خراب کر دیا۔ رات کسی وقت ہوشیار سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھا اور رادھا کے پاس چلا گیا۔ نوری نے ایک ٹارچ کا انتظام پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہم رادھا کے کمرے میں جا گھسے۔ ہم نے جو کچھ وہاں دیکھا، وہ ان خواتین کے سامنے دُہرانا مناسب نہیں...... مختصر یہ کہ وہ دونوں سخت نازیبا حالت میں تھے۔ ہم نے دونوں پر بہت لعن طعن کی۔ ہوشیار سنگھ دو تین دن اپنے کمرے میں ہی گھسا رہا۔ اس دن کے بعد سے نوری اور کلثوم نے رادھا کے کمرے میں سونا شروع کر دیا۔

''اگلے آٹھ دس روز میں معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ہمیں لگنے لگا کہ دونوں سدھر گئے ہیں مگر ہوشیار سنگھ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ اسے اپنی بے عزتی کا رنج بھی تھا۔ دوسری طرف رادھا کی جوانی کا نشہ اسے لگ گیا تھا۔ اس نے چپکے سے ایک منصوبہ بنایا اور ایک رات رادھا کو لے کر مندر سے نکلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ آفتاب خاں تالا کھول کر مندر میں آیا تو ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں سب سے اوپر والے کمرے میں کاٹھ کباڑ کے اندر موجود تھے۔ ہوشیار سنگھ نے آفتاب کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر نیچے گرایا اور رادھا کے ساتھ نکل گیا۔ آفتاب جس بری طرح گرا تھا اس کی موت بھی ہو سکتی تھی مگر ایک خوش گوار اتفاق یہ ہوا کہ جہاں وہ گرا تھا وہاں دو تین لحاف پڑے تھے۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بس سر پر ایک زخم لگا۔ زوردار آوازیں سن کر میں بھی اوپر آ گیا۔ میں اور آفتاب مندر سے نکل کر ہوشیار سنگھ اور رادھا کے پیچھے لپکے۔ وہ شاید گاؤں کی طرف بھاگتے تو ان کے لئے اچھا ہوتا

لیکن رات کے بارہ بجے تھے اور شاید ہوشیار سنگھ کے بھی بجے ہوئے تھے، وہ جنگل کی طرف گیا۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے برساتی نالا پار کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک گھنٹا پہلے تک تیز بارش ہوتی رہی تھی۔ نالے میں بہاؤ بڑا تیز تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ ٹھیک اندازہ نہ لگا سکے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آوازیں سنیں لیکن ہم بھی کچھ نہ کر سکے۔ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پانی کے ساتھ بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔''

''یعنی ان کا کچھ پتا ہی نہیں چلا؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی، دو تین دن تک تو کچھ پتا نہیں چلا'' اقبال کی جگہ آفتاب خاں نے جواب دیا۔ ''ام سب سخت پریشان تھا۔ اگر وہ زندہ بچ گئے تھے تو پھر ام سب اس مندر میں بالکل بھی خیریت سے نہیں تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ تھا تو بھی خطرہ موجود تھا۔ کبھی کبھی کسی کی موت کا دعا بھی مانگنا پڑتا ہے۔ ام نے بھی مانگا اور یہ قبول ہوا۔ تیسرے دن ام کو پتا چلا کہ نیچے کی طرف کھوڑی نام کی جگہ پر نالے سے دو لاشیں ملا ہے۔ ایک کسی جوان سکھ کا اور دوسرا ہندو ناری کا ہے......''

یہ رُوداد میرے اور عمران کے لئے بڑی سنسنی خیز رہی۔ رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا، شاید یہ بھی انتہا پسندی کا ایک شاخسانہ تھا۔ وہ جوان خوب صورت لڑکی صرف دھرم کی خاطر ایک ادھیڑ عمر بدوضع پتی کی ''خواہشوں'' کا شکار رہی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس جال سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اس کے آدرش کہتے تھے کہ وہ خود کو ستی کر لے یا پھر ایک ہندو بیوہ بن کر زندہ درگور ہو جائے لیکن اس کے اندر کی عورت ان غیر فطری سوچوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ٹوٹی تو ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اقبال اور نوری نے اسے موقع پرست ہوشیار سنگھ کی آغوش میں دیکھا۔

اس رُوداد کے المناک پہلو نے ہمیں جہاں افسردہ کیا، وہاں اس بات کا احساس بھی دلایا کہ چند دنوں کے ساتھ میں کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں کے بارے میں جو علیحدہ علیحدہ اندازے لگائے تھے، وہ دونوں اس سے بہت مختلف نکلے تھے۔

O......❖......O

......اور یہ رات میرے اور سلطانہ کے ملن کی رات تھی۔ ہمیں تہ خانوں میں واپس آئے ہوئے اب تقریباً اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ سفر کی تھکان اور تکلیف ختم ہونے کے بعد میری جسمانی حالت اب کافی بہتر ہو چکی تھی۔ ہمارے کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔

میرے کہنے پر آفتاب خاں باہر سے سلطانہ کے پسندیدہ پھول لایا تھا۔ گیندے اور موتیے کے یہ پھول میں نے سلطانہ کے تکیے کے قریب رکھ دیئے۔ اس نے ہلکے گلابی پھولوں والا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آج پھر میرے لئے اپنے ہاتھ سے حلوہ بنایا تھا۔ اب وہ اس حولے کی تعریف سننے کی منتظر تھی۔ میں نے حلوے کے بجائے حلوہ بنانے والی کی تعریف شروع کر دی تو اس کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرانے لگا......

آج یہ وہ سلطانہ نہیں تھی جو میرے چھونے سے کپکپانے لگتی تھی اور جس کا چہرہ دھواں ہو جاتا تھا۔ میری تعریف کے جواب میں وہ سادگی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں، میں جیادہ خوب صورت ناہیں ہوں۔ یہ آپ اچ ہیں جنہیں میری تعریفوں کے پل باندھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔''

''کبھی خود کو میری آنکھوں سے دیکھو تو تمہیں اپنی اہمیت کا پتا چلے۔'' میں نے کہا۔

''میں تو آپ کے خدموں کی خاک بھی ناہیں ہوں مہروج! آپ نے میرے اندر پھر سے جندگی ڈالی ہے۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''اپنوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا سلطانہ۔ اگر کیا جاتا ہوتا تو میں تمہارے سامنے شکریے کے انبار کھڑے کر دیتا۔''

''ناہیں مہروج۔'' اس کی جھیل آنکھوں میں پانی چمکنے لگا۔ ''میں جانتی ہوں آپ نے وہاں زرگاں میں میرے لئے بہت مصیبت اُٹھائی ہوئے گی، بہت جیادہ خطرے مول لئے ہوئیں گے۔ میرا بس چلے تو آپ کے ان جخموں کے لئے مرہم بن جاؤں۔''

''تم مرہم ہو سلطانہ! تم سے بڑا مرہم اور کیا ہو سکتا ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو...... تم نے ابھی تک مجھ سے بیویوں والی کوئی بات نہیں کی۔''

''کیا جی؟'' وہ چونک کر بولی۔

میں مسکرایا۔ ''شوہر جب سفر سے گھر واپس آتے ہیں تو بیویاں پوچھتی ہیں کہ وہ ان کے لئے کیا لائے ہیں۔''

''آپ خود آ گئے ہیں، میرے لئے اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوئیں گا۔'' وہ بولی۔ وہ اب بڑے تواتر سے مجھے ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی بھی ان تبدیلیوں میں سے ایک تھی جو اس میں رُونما ہوئی تھیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ پوچھا جا سکتا ہے۔''

"آپ جو بھی لائے ہوں گے، وہ میرے لئے سب سے اچھا ہوئیں گا۔"

"اچھا، مجھے ایک بات بتاؤ سلطانہ! آخر تم زیور کیوں نہیں پہنتی ہو؟ میں نے کسی غریب سے غریب مقامی عورت کو بھی چھوٹے موٹے زیور کے بغیر نہیں دیکھا؟"

"میں نے بتایا تھا نا مہروج! مجھے عادت اچ نا ہیں ہے۔"

"عادت ہی نہیں ہے یا پھر زیور ہی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب مہروج؟" وہ چونک سی گئی۔

میں نے کہا۔"سلطانہ! بات وہی ہے جس کا تمہیں پتا ہے اور مجھے بھی۔ کچھ عرصہ پہلے تم اپنے سارے زیور اور جمع پونجی، میری زندگی بچانے پر خرچ کر چکی ہو۔ تمہاری شادی کے گہنے جن میں تمہاری ماں کے گہنے بھی شامل تھے، اب تمہارے پاس نہیں ہیں۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالا اور موی کاغذ میں لپٹے ہوئے سلطانہ کے گہنے اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے ان طلائی زیورات کو ٹٹولا اور اس کی حیرت بڑھتی گئی۔"یہ...... یہ آپ کو کہاں سے ملے مہروج؟"

"ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے، یہ تو پھر گہنے تھے سلطانہ۔ یہ ابھی تک زرگاں کے اسی وید کے پاس تھے جس نے میرا علاج کیا۔ بے شک وہ ایک بہت قابل اور بہت لالچی وید ہے۔ میں نے ان زیورات کے لئے اسے باقاعدہ قیمت دی ہے اور موجودہ بھاؤ کے مطابق دی ہے۔"

سلطانہ کے سادہ چہرے پر ایک عجیب معصوم سی چمک نمودار ہو گئی۔ اس چمک میں اندرونی خوشی کا عکس تھا۔ اس نے ایک بار پھر زیورات کو اپنی کپکپاتی انگلیوں سے ٹٹولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے ماتھے پر جھومر سجایا، اس کے گلے میں گلوبند پہنایا، اس کے کانوں میں جھمکے آویزاں کئے اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا لیا۔ آج کی شب وہ اندر باہر سے جگمگا گئی تھی۔

"مہروج! میں سوچ بھی نا ہیں سکتی تھی کہ آپ میرے لئے اتنا کچھ کریں گے۔" وہ نیازمندی سے میرے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کا سر اٹھایا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کر دیا...... ہاں، آج اس کا مرمریں جسم اس کپکپی سے محفوظ تھا جو میرے چھوتے ہی اس پر طاری ہو جاتی تھی۔

اس نے بڑی "عاجزانہ خودسپردگی" کے ساتھ خود کو میرے اندر جذب کر دیا۔ میں نے لالٹین بجھا دی۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہو گئے۔ اس کے جسم میں پہاڑی بارشوں کا ترنم تھا...... جنگلی پھولوں کی مہک تھی اور خودرو درختوں کا بانکپن تھا۔ وہ بڑی محبت سے میرا نام پکارتی رہی۔ اس کی یہ حسین سرگوشی ریشمی اندھیرے میں جذب ہوتی رہی......

اگلے آٹھ دس روز بڑے حسین تھے۔ میری گردن کا زخم غیر متوقع تیزی سے ٹھیک ہوا تھا۔ پسلی کا درد بھی اب نہ ہونے کے برابر تھا۔ کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیوں اور نوری وغیرہ سے بہت گھل مل چکی تھی۔ یہ کلثوم وہی لڑکی تھی جسے میں نے فتح پور کے چودھری اور ستیش وغیرہ سے نجات دلائی تھی۔ کلثوم، نوری اور تاؤ افضل کی بیٹیاں ان تہ خانوں کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ وہ دیگر امور خانہ داری کے علاوہ مزے دار کھانے بھی پکا رہی تھیں۔ کئی ہفتوں کی جان توڑ مشقت اور خطرات کی یلغار کے بعد مجھے اور عمران کو راحت کی گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں۔ سلطانہ بھی بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے کانوں میں اب جھمکے چمکتے تھے اور کلائیوں پر چوڑیاں گنگناتی تھیں۔ وہ سرِشام صاف ستھرا لباس پہنتی، خود کو تھوڑا سا سنوارتی اور اس کی آنکھوں میں شرمگیں سائے لہراتے...... ان خوب صورت شب و روز میں اگر اس کے ذہن میں کوئی کسک تھی تو وہ بالو کے حوالے سے تھی۔ ہمارا بچہ ہم سے دور تھا۔ بے شک وہ محفوظ رہا تھا اور خیریت سے تھا لیکن دوری تو تھی۔

ایک شب کے ریشمی اندھیرے میں جب میں چت لیٹا تھا اور سلطانہ کا سر میرے سینے پر تھا، میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔"ایک بات پوچھوں سلطانہ؟"

"جی۔" اس نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"تمہیں پتا ہے کہ تمہارا پرانا ملازم ہاشو ٹل پانی میں نہیں ہے؟"

اس نے چونک کر میرے سینے سے سر اٹھایا اور بولی۔"کہاں ہے وہ؟"

"زرگاں میں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔"اور وہ وہاں اچھی حالت میں بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب مہروج؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے لالٹین کی لو اونچی کی تو کمرے میں مدھم روشنی پھیل گئی۔ سلطانہ نے اپنے دودھیا شانوں کے گرد گرم شال لپیٹ لی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سلطانہ! مجھے ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ ہاشو گونگا نہیں ہے؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ

کے لئے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر بولی۔ ’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہروج! ہا...... ہاشو بول ناہیں سکتا۔ یہ سب جانتے ہیں......‘‘

’’لیکن...... وہ بول سکتا ہے سلطانہ! میں نے اسے خود بولتے سنا ہے۔‘‘

’’کب...... کہاں؟‘‘

’’حکم کے دربار میں...... جہاں اسے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے تل پانی سے پکڑا ہے جہاں وہ ایک بڑی سنگین واردات کرنے جا رہا تھا۔‘‘

سلطانہ کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

’’میری سمجھ میں کچھ ناہیں آ رہا مہروج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہیں...... کہیں وہ کوئی اور شخص تو ناہیں جسے آپ نے زرگاں میں دیکھا ہے؟‘‘

’’مجھے اتنا ہی یقین ہے کہ وہ ہاشو ہے، جتنا اس بات کا یقین ہے کہ تم سلطانہ ہو۔‘‘

’’یہ کیسے ہو سکتا ہے...... کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘ وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

اس کے کہنے پر میں نے اسے تفصیل سے سارے واقعات بتائے۔ میرا اور عمران کا حکم کے بھرے دربار میں پہنچنا، وہاں سخت مزاج بڑھیا اور ہمارا مکالمہ، ہاشو کا پابہ زنجیر نمودار ہونا۔ پانڈے کے ہاشو کے بارے میں انکشافات...... زہر سے بھرے ہوئے پیکٹ کی رُونمائی...... میں نے سب کچھ سلطانہ کے گوش گزار کیا۔ آخر میں، میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہاشم عرف ہاشو نے کس طرح بہ بانگِ دہل خود پر لگائے جانے والے الزامات قبول کئے اور بچ جانے کی صورت میں اپنے اقدام کو دہرانے کا اعلان کیا۔

سلطانہ سخت حیرت کے عالم میں سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

’’میں ایسا سوچ بھی ناہیں سکتی تھی۔‘‘ وہ آخر میں لرزاں آواز میں بولی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

میں اس سے زہر والی پڑیا کی بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کی کیفیت دیکھ کر خاموش رہا۔ وہ اگلے روز بھی بالکل گم صم رہی۔ تیسرے روز اس نے خود ہی اس پڑیا کی بات چھیڑ کر مجھے حیران کر دیا۔ نوری نے بڑا زبردست پلاؤ بنایا تھا۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک سلطانہ نے کہا۔ ’’مہروج! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔‘‘

’’کہو سلطانہ۔‘‘ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

’’جن دنوں میں بہت جیادہ دکھی تھی اور جارج کی جان لینے کے لئے طلال کے ساتھ زرگاں چلی گئی تھی، میں نے خود کو مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔‘‘

’’کیا مطلب سلطانہ؟‘‘

’’میں نے فیصلہ کیا تھا مہروج کہ اگر میں زرگاں میں پکڑی گئی تو بے عجت ہونے کے بجائے موت کو گلے لگا لوں گی۔ میں نے جہر کی ایک پڑیا اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہ جہر بس تھوڑے سے سمے میں بندے کو مار سکتا ہے۔ یہ جہر مجھے ہاشو نے دیا تھا۔ پرسوں آپ نے جہر والے لفافے کی بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے...... [illegible] سکتا ہے یہ جہر بھی اسی لفافے کا ہو۔‘‘

’’تم بڑے ڈرا دینے والے انکشاف کر رہی ہو سلطانہ! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس حد تک جا چکی ہو۔ کیا ان دنوں تمہیں میرا اور بالو کا خیال بھی نہیں آتا تھا؟‘‘

وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ’’اگر سچ پوچھتے ہیں...... مہروج...... تو ناہیں آتا تھا۔ میں اس وقت خود کو جندہ سمجھتی اِچ ناہیں تھی، ہاں...... مُردہ سمجھتی اِچ تھی۔ مرنا میرے لئے اتنا اِچ آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا......‘‘ وہ عجب لہجے میں بات کر رہی تھی۔

’’اب وہ پڑیا کہاں ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اب وہ کہیں ناہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو مجھیں کہ ناہیں تھی۔ اب میں ان باتوں کے بارے میں سوچنا اِچ ناہیں چاہتی۔‘‘

’’کہیں پھینک دی ہے؟‘‘

’’ناہیں...... کھو گئی ہے۔‘‘

’’تمہاری بہت سی کھوئی ہوئی چیزیں میرے پاس سے ملتی ہیں۔‘‘ میں نے کہا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلگوں پاؤڈر والی چھوٹی سی پڑیا سلطانہ کے سامنے کر دی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ’’یہ...... یہ آپ کو کہاں سے ملی؟‘‘

’’جہاں تم نے چھپائی تھی۔‘‘ میں نے کہا...... اور پڑیا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

اس نے لرزاں ہاتھوں سے اس پڑیا کو کھولا۔ کچھ دیر تک اشک بار آنکھوں سے اس نیلگوں پاؤڈر کو دیکھتی رہی جو کسی بھی شخص کو دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی سرحد پار کرا سکتا تھا۔ پھر اس نے اس پڑیا کو انگیٹھی کے دہکتے انگاروں پر الٹ دیا اور میرا بازو تھام کر میرے کندھے

سے سرٹکا دیا۔

ہاشو کے بارے میں، مَیں نے جو انکشافات پرسوں سلطانہ کے سامنے کئے تھے، انہوں نے بظاہر سلطانہ کو بھی ورطۂ حیات میں ڈال دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص اتنا عرصہ ان کے گھر میں ان کے ساتھ گونگا بن کے رہا اور وہ اس کے بارے میں جان نہ سکے۔ اس کے علاوہ وہ صرف ہاشو نہیں تھا بلکہ ہاشم رازی تھا اور اس کی اہمیت اور حیثیت ان کی سوچوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ ''میں آپ کو اور عمران بھائی کو جھٹلا نہیں سکتی مہروج! اگر کوئی اور یہ بات کہتا تو میں کبھی بھی ناہیں مانتی۔''

اس رات بھی ہم دیر تک ہاشو اور اس کے جنونی رویے کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اس کے علاوہ زرگاں کے وہ حالات بھی ہماری گفتگو کا موضوع بنے جو مقامی حکمرانوں کی من مانیوں سے پیدا ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے فرقہ پرستی اور شدت پسندی کو ہوا مل رہی تھی...... اور وہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔

سلطانہ نے ہاشو کے حوالے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر یقین کرلیا تھا۔ پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ اس معاملے میں تھوڑا بہت پیچ ضرور ہے۔

للکار
Pakistanipoint
Waqar Azeem
5
جاوید مغل

عمران اپنی باتوں سے ان تہ خانوں کی گھٹن اور سنجیدگی دور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی باتوں سے ماحول کو کشتِ زعفران بنا دیتا تھا۔ اور تو اور تاؤ افضل جیسا بے رنگ شخص اور طلال جیسا نہایت سنجیدہ لڑکا بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ طلال سلطانہ کا سگا بھانجا تھا اور ہر سرگرمی میں اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اپنی خالہ پر جان چھڑکتا تھا۔ درحقیقت یہ طلال ہی تھا جس نے مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ اس کی خالہ، جارج گورا سے بدلہ لینے کے لئے تڑپ رہی ہے اور وہ کسی بھی وقت خاموشی کے ساتھ تہ خانوں سے نکل کر دوبارہ زرگاں کا رخ کر لے گی۔ یہ سب کچھ مجھے بتاتے ہوئے وہ زار و قطار روتا بھی رہا تھا۔ اس کی باتوں نے میرے دل پر ایسا اثر کیا تھا کہ مہینوں میں ہونے والا کام دنوں میں ہوا اور میں عمران کے ساتھ جارج گورا کی طرف نکل کھڑا ہوا تھا۔

طلال اب بھی ہر وقت سلطانہ کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ اپنی خالہ سے اس کا ایک قلبی تعلق بن چکا تھا۔ جارج کے ساتھ اپنی لڑائی کی رُوداد میں پوری تفصیل سے سب کو سنا چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب مزید سننا چاہتے تھے۔ یہ تذکرہ تہ خانے کے سارے مکینوں کے لئے زبردست دلچسپی کا باعث تھا۔ خاص طور سے طلال کے لئے۔ وہ اس سارے واقعے کی مکمل جزئیات جاننے کا خواہش مند تھا۔ آج بھی وہ موقع دیکھ کر میرے پاس آن بیٹھا تھا اور سامبر کے اس مقابلے کی باتیں کرنے لگا۔

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہیں سمجھی اور اس کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ اس کے سوالوں میں سادگی بھرا تجسس ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”خالو تابش! جب آپ کی گردن جارج کے بازو میں پھنس گئی اور آپ اسے نکال نا ہیں سکے تو آپ کیا سوچ رہے تھے؟ کیا

آپ کو امید تھی کہ آپ نکل سکیں گے؟''

''امید پر ہی تو دنیا قائم ہے۔ سیانے یہی کہتے ہیں کہ امید اور کوشش کا دامن آخر تک نہیں چھوڑنا چاہئے۔''

''میرا مطلب ہے جی کہ سورج ڈوب جانے کی وجہ سے پنڈتوں نے لڑائی رکوا دی۔ فرج (فرض) کیا اگر وہ یہ لڑائی نا ہیں رکواتے تو کیا آپ نکل جاتے؟''

''میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ میری برداشت ساتھ دیتی رہی اور میں لڑائی کو لمبا کھینچتا رہا، یہاں تک کہ لڑائی کا وقت ختم ہو گیا۔ اسی لئے کہتے ہیں نا کہ قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے جو کوشش کرتے ہیں۔''

طلال کی نگاہوں میں میرے لئے ستائش ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ مجھ سے مختلف سوال پوچھتا رہا۔ میں اتنی سردی گرمی کیسے برداشت کر لیتا ہوں؟ میں بھوک کیسے جھیل لیتا ہوں؟ میں کھردرے فرش پر کیسے سو جاتا ہوں؟ کیا واقعی مجھے درد محسوس نہیں ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران میں آفتاب خاں بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپر تھا اور اس میں میٹھے چاول تھے۔ ''یہ کیا ہے آفتاب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ''تابش صاحب! ام نے منت مان رکھا تھا کہ اگر آپ زرگاں سے کامیاب ہو کر خیریت کے ساتھ واپس آ گیا تو ام لوگوں کا منہ میٹھا کرائے گا۔ ام نے آج زردے کا دیگ پکوایا تھا اور بچوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ کچھ چاول ام یہاں لے آیا۔ ام چاہتا ہے کہ آپ امارے سامنے اپنا منہ میٹھا کرے۔''

میں نے اور طلال نے ایک ایک لقمہ لیا۔ ''تمہیں جارج کے مرنے کی خوشی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اتنا زیادہ کہ آپ سوچ نہیں سکتا۔ لوگ کہتا ہے کہ دشمن کے مرنے پر بھی خوشی نہیں منانا چاہئے لیکن یہ ایسا گندہ دشمن تھا کہ ام خوشی منائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا...... اور یہ صرف امارا بات ہی نہیں ہے۔ اس راجواڑے کا زیادہ تر لوگ خوش ہے۔ پتا ہے، جب زرگاں سے یہ خبر یہاں پہنچا تو لوگوں کا چہرہ چمک اُٹھا۔ آپ جاتے جاتے ام کو منع کر گیا تھا کہ ام تہ خانے کے اندر نہیں جائے گا۔ پر ام سے برداشت ہی نہیں ہو سکا۔ رات تک کا وقت ام نے پتا نہیں کس طرح کاٹا اور پھر تہ خانے میں آ گیا۔ اس وقت آپ کا بی بی سلطانہ مصلے پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ خوشی کے مارے امارے منہ سے بات ہی نہیں نکلا۔ ام بس اتنا ہی کہہ سکا...... وہ

خبیث مر گیا، ختم ہو گیا......''

آفتاب خاں نے اس دن کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا جب فتح پور میں جارج گورا کے مرنے کی اطلاع پہنچی تھی۔

ہمارے یہاں تہ خانوں میں آنے کے بعد آفتاب خاں تقریباً روزانہ ہی اندر آ رہا تھا۔ وہ رات کو فتح پور کی گلیوں میں پہرا دیتا تھا۔ اس پہرے کے دوران میں ہی نصف شب کے وقت وہ چپکے سے مندر کا پرانا دروازہ کھولتا تھا اور اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت تہ خانوں میں اُتر آتا تھا۔ مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تشویش تھی۔ اسی تشویش کی وجہ سے میں نے اور عمران نے زرگاں جاتے وقت آفتاب سے کہا تھا کہ وہ تہ خانوں میں آنے سے گریز کرے۔

میں نے ایک بار پھر اس سے یہی بات کہی۔ میں نے کہا۔ ''آفتاب! دل تو یہ چاہتا ہے کہ تم ہر وقت ہمارے پاس رہو مگر مسئلہ وہی ہے کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اگر کسی رات کسی نے تمہاری آمدورفت دیکھ لی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''آپ کہتے ہیں تو ام آنا کم کر دیتا ہے لیکن ام آپ کو ایک بات کا پورا یقین دلاتا ہے، اماری وجہ سے کبھی کسی کو آپ کے یہاں ہونے کا پتا نہیں چلے گا......''

پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے اور دروازہ کھول کر اندر آنے میں کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

اگلے روز آفتاب خاں نے تہ خانوں میں آ کر جو خبر سنائی، وہ واقعی سنسنی خیز تھی۔ یہ خبر اسی کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں تھی جسے ہم اس کی ساری نحوست سمیت زرگاں میں چھوڑ آئے تھے۔ آفتاب خاں نے بتایا کہ پچھلے چار پانچ روز سے بڑھیا نے مرن برت رکھا ہوا تھا۔ وہ زرگاں کے بڑے مندر کی سیڑھیوں پر دھرنا دیئے بیٹھی تھی۔ کمزور عقیدہ لوگوں کا ایک جم غفیر اس کے گرد اکٹھا رہتا تھا بڑی عمر کے کچھ اور مرد و زن بھی اس کے ساتھ اس بھوک ہڑتال میں شریک ہوتے گئے اور اچھا خاصا تماشا بن گیا تھا۔ پرسوں رات کو بڑھیا بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی۔ پتا چلا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس کے دیہانت کی خبر سے ہندوؤں نے مندر کے قریب ہی مسلمانوں کے ایک محلے پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو چاروں طرف سے گھیرا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ اس نہایت سنگین واقعے میں کم و بیش ساٹھ لوگوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

یہ دل خراش اطلاع تھی۔ زرگاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتعال بڑھ رہا تھا۔

خاص طور سے اونچی ذات کے ہندو بہت مشتعل تھے۔ مسلمانوں نے جس طرح میری اور جارج کی لڑائی میں میری حمایت کی تھی اور جس طرح چپکے چپکے میری جیت کی خوشی منائی تھی، اونچی ذات کے ہندوؤں کو یقیناً بہت تاؤ چڑھا تھا۔ اب اس کا بدلہ مسلمانوں کے پورے ایک محلے کو جلا کر لیا گیا تھا۔

یہ بہت افسردہ کر دینے والی خبر تھی اور اس میں افسردہ کر دینے والا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کم بخت بڑھیا اس سارے فساد کے باوجود ابھی زندہ تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا جہاں چند گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب پتا نہیں کہ وہ واقعی بے ہوش ہوئی تھی یا یہ اس کا کوئی مکر تھا۔ زرگاں کے ضعیف العقیدہ لوگ اسے بھی بھگوان کا چمتکار قرار دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا واقعہ بس کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

اگلے روز سب بجھے بجھے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی کسی نے نہیں کھایا۔ سلطانہ بھی افسردہ تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ زرگاں اور نل پانی میں حالات پھر سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اس بار لڑائی تک نوبت آ جائے۔''

''ہاں، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ساٹھ لوگوں کے مرنے کی خبر ہے۔ بہت سے زخمی بھی ہیں۔''

''اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔'' عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ وہ وجہ زیادہ اہم ہے۔ جب ہم زرگاں سے آ رہے تھے تو وہاں جیل میں ہنگامہ ہوا تھا بلکہ اسے بغاوت ہی کہنا چاہئے۔ سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ان میں سے تیس چالیس کو سُولی کی سزا ہو جائے گی...... اگر واقعی ایسا ہو گیا تو مجھے نہیں لگتا کہ یہاں امن رہ سکے گا۔''

''آئندہ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں، تاؤ افضل کی کسی دختر سے شادی کر کے اسے جلدی سے دو تین بچوں کا نانا بنا دوں۔ اگر یہاں ہونے والی لڑائی میں مر بھی گیا تو کوئی میرا نام لینے والا تو ہو گا......'' وہ پھر پٹڑی سے اُتر گیا۔

''بس اب اپنی بکواس شروع کر دو۔'' مجھے بھی تاؤ آ گیا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر بمشکل بٹھایا اور خلافِ توقع سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''تابی! ہم زیادہ دیر یہاں رہ نہیں سکتے۔ تمہیں پتا ہی ہے، حکم کے سامنے مجھے بتانا پڑا تھا کہ میں فتح پور کے مندر میں ہونے والے خونی ہنگامے کا چشم دید گواہ ہوں۔ اب ہمارے فرار کے

بعد ہماری تلاش شروع ہو چکی ہے۔ دیکھنا ایک دو دن میں حکم کے سپاہی یہاں فتح پور تک بھی پہنچیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آفتاب خاں سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ کسی بھی وقت ہماری یہاں موجودگی کا پول کھل سکتا ہے۔''

''تو پھر؟''

''ہمیں جلد از جلد نل پانی پہنچ جانا چاہئے۔ وہیں سے ہماری واپسی کا کوئی راستہ نکل سکے گا۔''

''لیکن اگر نل پانی پہنچنے کی کوشش میں دھر لئے گئے تو پھر؟''

''اس کا ایک حل ہے لیکن وہ حل یہاں سے سات آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ مجھے پہلے اس حل تک پہنچنا ہو گا۔''

''کھل کر بات کرو یار۔''

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''جب تمہاری گردن سے ''الیکٹرانک چپ'' نکلوانے کے لئے میں ڈاکٹر لی وان کو یہاں لے کر آیا تھا تو راستے میں ہنومان نامی ایک بستی میں رکا تھا۔ یہاں ایک ٹیلے پر ایک بڑا پگوڈا ہے۔ اس بستی میں ننھا کمار نامی ایک شودر سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص خاندانی شکاری ہے۔ اس علاقے کی ہر اونچ نیچ کو جس طرح جانتا ہے، شاید ہی کوئی دوسرا جانتا ہو۔ مجھے یقین ہے اگر ہم اس بندے کو کچھ رقم دیں تو یہ ہمیں نہایت محفوظ رستوں سے نل پانی کے نواح تک پہنچا سکتا ہے اور یہی نہیں، ہمارے لئے مناسب سواری کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔''

اس حوالے سے میرے اور عمران کے درمیان آدھ پون گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ حسبِ معمول عمران یہ کام بھی اکیلے ہی کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اڑ گیا کہ اگر جانا ہے تو پھر ہم اکٹھے جائیں گے۔ ورنہ نہیں جائیں گے...... کافی بحث وتمحیص کے بعد عمران رضامند نظر آیا۔ ہم نے اس بارے میں دیگر تفصیلات طے کرنا شروع کر دیں۔ بے شک اس میں خطرہ موجود تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ عمران کی طرح مجھے بھی خطرات کو گلے لگانا اچھا لگنے لگا ہے۔

اس رات میں نے سلطانہ کو بھی بتا دیا کہ میں اور عمران ایک دو روز کے لئے مندر سے باہر جائیں گے تاکہ نل پانی پہنچنے کا معاملہ آسان ہو سکے۔ سلطانہ نے اس پر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ کرے گی اور مجھے باہر جانے سے روکے گی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ میں اسے زرگاں سے آنے والی دل خراش خبر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ دوسرے تیسرے دن مجھے پتا چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ میرے لئے بالکل ناقابلِ یقین

ثابت ہوا۔ آفتاب خاں کا ایک اور روپ میرے سامنے آیا جس نے مجھے بھونچکا کر کے رکھ دیا...... بلکہ بنیادوں تک ہلا ڈالا۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ پسلی کے درد کی وجہ سے میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ سلطانہ میرے پہلو میں موجود نہیں ہے۔ میں نے لحاف ہٹایا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالٹین روشن کر کے میں نے دیکھا، کمرا خالی تھا۔ سلطانہ کی چپل بھی موجود نہیں تھی۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے غسل خانے میں دیکھا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی تہ خانے میں گیا۔ نوری، کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیاں اور طلال وغیرہ سب سو رہے تھے۔ یہاں تک کہ تاؤ افضل بھی جو رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتا تھا، سویا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سب سے اوپر والے تہ خانے کی طرف سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک کمرے میں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ میں لکڑی کے قدیم زینوں پر ننگے پاؤں چلتا ہوا اوپر گیا۔ ایک دم مجھے ایک دروازے کی اوٹ میں ہونا پڑا۔ میں نے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں سے سلطانہ کو نکلتے دیکھا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ادھ کھلے دروازے میں آفتاب خاں نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ سے کچھ کہا پھر ایک چھوٹا سا مستطیل ڈبا سلطانہ کو تھمایا جسے سلطانہ نے لے کر اپنی چادر میں چھپا لیا۔

وہ اب واپس پلٹنے والی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اُترا۔ کمرے میں واپس جا کر لالٹین بجھائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ رہا ہے۔ یہ میں کیا دیکھ آیا تھا؟ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد سلطانہ کا ہیولا کمرے میں داخل ہوا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کیے بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے آفتاب سے حاصل ہونے والا گتے کا ڈبا پلنگ کے نیچے کہیں چھپایا۔ جو ہلکی پھلکی آوازیں پیدا ہوئیں، ان سے مجھے شک ہوا کہ ڈبے میں چوڑیاں یا اس قسم کی کوئی شے ہے۔

باقی کی رات میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ ایسی ہرگز نہیں تھی۔ یقیناً یہ کوئی اور معاملہ تھا لیکن کیا تھا؟ اور اگر تھا تو وہ مجھ سے کیوں چھپا رہی تھی؟

میں نے سلطانہ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل تھی۔ اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے مجھے وہ ڈبا دیکھنے کا موقع ملا جسے سلطانہ نے پلنگ کے نیچے

چھپایا تھا۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ اس میں پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں۔ یہ خوب صورت چوڑیاں وہ آفتاب سے لے کر آئی تھی...... اور آفتاب وہ شخص تھا جسے میں نے اپنی غیر موجودگی میں تہ خانے میں آنے سے منع کیا تھا اور وہ پھر بھی آتا رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچ گیا۔ عمران سارا دن مجھ سے پوچھتا رہا کہ میں کھویا کھویا کیوں ہوں؟

میں مختلف حیلوں سے اسے ٹالتا رہا۔ اس کی عقابی نگاہیں جان چکی تھیں کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ''ہماری پیاری سی بھابی سے پھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں۔''

''اگر ہے تو بتاؤ یار' میں ایک اچھے دیور کا کردار بڑی خوبی سے ادا کر سکتا ہوں بلکہ ضرورت ہو تو بارعب جیٹھ بن کر بھی دکھا سکتا ہوں۔ بھابی کے پاس اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہوگا کہ میاؤں میاؤں...... میرا مطلب ہے، میں آؤں، میں آؤں کرنے لگے۔''

اس روز آفتاب خاں رات دس بجے کے قریب تہ خانے میں آیا۔ حسبِ معمول اس کے پاس باہر کی خبریں موجود تھیں۔ آج کی اہم ترین خبر وہی تھی جس کا اندیشہ دو دن پہلے عمران نے ظاہر کیا تھا۔ آفتاب نے بتایا کہ سہ پہر کے وقت دو جیپوں پر سوار آٹھ دس مسلح افراد بستی میں آئے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔

''کس طرح کی پوچھ گچھ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پوچھتا تھا کہ دو ڈھائی ماہ پہلے مندر میں جو ہنگامہ ہوا، کس طرح کا تھا۔ اس میں کتنا لوگ مرا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ یہ پوچھنے لگا کہ باہر کا جو مسلمان لوگ یہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ دوبارہ یہاں آیا ہے یا نہیں۔ خو، انہوں نے ہر گھر میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں تفصیل مفصیل پوچھا اور کہا کہ اگر کسی نے کچھ چھپانے کا کوشش کیا تو اس کا حشر خراب ہو جائے گا۔ وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر شام کے وقت واپس گیا ہے۔''

آفتاب خاں بالکل معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ وہ کل کیوں نہیں آیا؟

''بس جی...... کل مندر کے پاس ہی ایک گھر میں فوتیدگی ہوا۔ لوگ جاگ رہا تھا۔ ام نے ٹھیک نہیں سمجھا۔''

اس کے سفید جھوٹ نے میرے تن بدن کی آگ کو مزید بھڑکایا۔ اس گفتگو کے دوران میں سلطانہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ اس نے چائے کی پیالی آفتاب خاں کی طرف بڑھائی...... دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے میں گڑی رہیں۔ مجھے لگا کہ کوئی میرے منہ

پر طمانچے رسید کر رہا ہے۔

یہ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ سلطانہ جو ایک بیوی سے زیادہ ایک زرخرید باندی کی طرح میری اطاعت گزاری میں مصروف رہتی تھی، اپنے کردار کا ایسا رخ پیش کرے گی، یہ بعید از گماں تھا۔

اگلی رات صورتِ حال کچھ اور بھی واضح ہوگئی۔ نصف شب کا وقت تھا۔ میں بستر پر جاگ رہا تھا لیکن آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ سینے میں بے چین دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ سلطانہ میرے پہلو میں ساکت لیٹی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سو رہی ہے یا نہیں۔ پروگرام کے مطابق آج آفتاب خاں کو نہیں آنا تھا۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت ہوگا جب سلطانہ بستر سے اُتری اور چپل پہن کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔ میری بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ میں نے پندرہ بیس منٹ انتظار کیا پھر خود بھی اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں نے احتیاطاً ریوالور شلوار کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔ درمیانی تہ خانے سے تاؤ افضل کی غنودگی بھری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ یہ کھانسی تھمی تو میں درمیانی تہ خانے سے گزر کر بالائی تہ خانے میں آیا۔ آج پھر کاٹھ کباڑ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر ہلکی روشنی تھی جو یقیناً آفتاب خاں کی لالٹین ہی کی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے کے بالکل قریب چلا گیا۔ مجھے کسی جھری یا درز کی تلاش تھی تاکہ اندر جھانک سکوں۔ کافی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بس میں اندر، مدھم آواز میں بولے جانے والے دو تین جملے ہی سن سکا...... سلطانہ کی دبی دبی آواز آئی...... ''ناہیں آفتاب! اب یہ ممکن ناہیں۔ میں اسے اور دھوکے میں ناہیں رکھ سکتی۔ اسے کسی بھی وخت (وقت) پتا چل جائے گا۔ اب بھی بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ مجھے فکر تھی کہ تم انتظار کرتے رہو گے۔ اب بس چلتی ہوں۔''

''ابھی تو ام نے کوئی بات ہی نہیں کیا۔'' آفتاب کی آواز اُبھری۔

''ناہیں، کافی باتیں ہوگئیں۔''

''چلو ٹھیک ہے لیکن پرسوں تو تم ٹائم پر آجائے گا؟''

''اس شرط پر کہ مہروج اپنے کام سے چلا گیا...... اور دوسری بات یہ آفتاب کہ یہ آخری بار ہوئیں گا۔ بالکل آخری بار۔'' سلطانہ کا لہجہ حتمی تھا۔

آفتاب نے شاید ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ منمنایا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کے بعد بس ایک ہی مختصر سا جملہ میری سمجھ میں آسکا۔ آفتاب خاں نے کہا تھا۔ ''گرم چادر ضرور لے کر آنا۔''

زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورتِ حال سے پالا پڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ دل چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور دونوں کے سینوں میں گولیاں ٹھونک دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوچ بھی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ واہمہ ہی نہ ہو۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو کچھ دیکھا یا سنا جائے، وہ ویسا ہی ہو جیسا سمجھ میں آ رہا ہو۔ یہ آدھی رات کی ملاقاتیں اور باتیں کسی اور حوالے سے بھی تو ہو سکتی تھیں۔ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت میرے سامنے نہیں آیا تھا جسے حتمی کہا جاسکے۔

میں سیڑھیاں اُتر کر واپس کمرے میں آگیا اور بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد سلطانہ بھی آگئی۔ پرسوں کی طرح بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس نے پھر پلنگ کے نیچے چپل چھپایا اور میرے پہلو میں لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے پر سلطانہ نے خود ہی میرے جانے کا ذکر چھیڑ دیا...... عام سے لہجے میں بولی۔ ''مہروج! کل پھر جا رہے ہیں آپ؟''

''جانا تو چاہیے۔'' میں نے بے دلی سے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

''عمران بھائی بھی ساتھ جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''کتنے بجے نکلیں گے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، کتنے بجے نکلوں تو تمہیں آسانی رہے گی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا چونکی۔

''میرا مطلب ہے، بہت سویرے نکلوں گا تو تمہیں جلدی اُٹھنا پڑے گا۔ کھانا وغیرہ بنانا ہوگا۔ صبح پانچ چھ بجے کے قریب نکلیں گے، یا پھر شام کو۔''

''اور واپسی؟''

''دو راتیں تو تمہیں اکیلے گزارنا پڑیں گی۔''

''مہروج! اس کام میں جیادہ خطرہ تو ناہیں ہے؟'' اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خطرہ ہے تو اچھی بات ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''خطروں سے ہی تو راستے نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران میں طلال اندر آگیا۔ اس نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''خالہ! نوری کو

بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے، وہ تمہیں بلا رہی ہے۔

سلطانہ، طلال کے ساتھ بالائی تہ خانے کی طرف چلی گئی۔ کھانا زہر لگ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف کر دیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے پلنگ کے نیچے ہاتھ چلایا۔ ایک تاریک خلا میں چوڑیوں والے ڈبے کے ساتھ ایک بالکل چھوٹی سی پوٹلی بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے باہر نکال لی۔ یہ ایک ریشمی رومال تھا جس میں کچھ باندھا گیا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ یہ چاندی کے جھمکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی خوب صورت طلائی نتھ تھی۔ یہ نتھ میں نے یہاں اکثر ہندو عورتوں کو پہنے ہوئے دیکھی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی ان چیزوں کے ساتھ موجود تھی۔ سلطانہ کے واپس لوٹنے سے پہلے میں نے یہ اشیاء پھر اسی جگہ پر رکھ دیں۔

دروازہ کھولا اور بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ رگوں میں آگ دوڑ رہی تھی۔ رات کو جو ٹوٹے پھوٹے فقرے سنے تھے، وہ زہریلے تیروں کی طرح سوچوں میں سنسنا رہے تھے۔ ایک فقرہ بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔ آفتاب نے سلطانہ سے کہا تھا، گرم چادر لے کر آنا...... اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے مندر سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا وہ سلطانہ کو کسی قریبی گھر میں لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کیوں تھا؟ اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا تھا۔ وہ کاٹھ کباڑ والے سرد کمرے کے بجائے کسی آرام دہ ماحول میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ بہرحال جو کچھ تھا، فی الحال اندازوں اور قیافوں کے زمرے میں آتا تھا، یقین سے کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا تھا۔

اس روز میں نے عمران کے ساتھ مل کر مندر سے باہر نکلنے اور ''ہنومان گاؤں'' میں نتھا کمار نامی اس ہندو شکاری سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ ہمیں اگلے روز شام کا اندھیرا ہوتے ہی مندر سے نکل جانا تھا۔ دیہاتیوں کے بھیس میں ہمیں پیدل سفر کرنا تھا اور ہنومان گاؤں پہنچنا تھا۔ ہمارے دیہاتیوں والے بھیس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے آفتاب نے ہمیں دو کسیاں بھی فراہم کرنا تھیں جنہیں ہم نے کاشت کاروں کے انداز میں کندھے پر رکھنا تھا۔ مقامی دیہاتیوں والے لباس ہمارے پاس پہلے سے موجود تھے۔ میں نے عمران کو اپنی اندرونی ہلچل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

O......❖......O

اگلے روز شام ہونے تک ہم جانے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں یہاں کا کرتا دھرتا اقبال ہوتا تھا۔ اب بھی وہی تھا۔ میں سلطانہ کو چور نظروں سے دیکھتا تھا اور اس کے اندرونی اضطراب کو محسوس کر کے دل خون ہونے لگتا تھا۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی

لیکن ہماری روانگی کے حوالے سے بڑی فکر مند تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اڑچن پیدا ہونے سے ہمارا پروگرام بدل نہ جائے۔

کیا یہ وہی سلطانہ تھی جسے میں جانتا تھا اور شوہر سے جس کی وفاداری کے قصے مشہور تھے؟ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈتا تھا تو ذہن میں دھند سی بھرنے لگتی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی آفتاب خاں مندر میں پہنچ گیا اور ہم اس کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ فتح پور میں ابھی چراغ جل رہے تھے تاہم گلیاں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مندر کی تعمیر کے لئے اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے۔ ہم ان ڈھیروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ کچھ آگے جا کر ہم نے آفتاب خاں کو ''الوداع'' کہا اور اپنے منتخب راستے پر چل دیئے۔

قریباً ایک فرلانگ آگے آ کر میں ناگ پھنی اور تھوہر کے گنجان درختوں میں رک گیا۔ یہیں پر وہ آسیب زدہ جوہڑ بھی تھا جس میں چند دن پہلے ہم نے شان دار جرمن جیپ کو غرقاب کیا تھا۔ عمران بولا۔ ''یہاں کیوں رک گئے ہو؟ ابھی کوئی جن بھوت آ کر کہے گا، السلام علیکم۔ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں اور یہاں گھاس پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو چٹنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کاشت کاروں والی ''کسی'' کندھے سے اُتار کر ایک طرف رکھی اور بیٹھ گیا۔ عمران نے آنکھیں نکالیں۔ ''اوئے، تم تو سچ مچ بیٹھ گئے ہو۔ کیا واقعی مرنے کا ارادہ ہے؟''

میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ چونکا۔ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر خود بھی ''کسی'' ایک طرف رکھ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس مشکوک جوہڑ کی طرف کوئی آئے گا نہیں...... دیگر خطرات سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس ہتھیار موجود تھے۔ عمران کی بھاری چادر کے نیچے وہی دور مار رائفل تھی۔ میرے تہ بند کی ڈب میں ریوالور تھا اور جیب میں وہی نارفی چاقو جس نے جارج گورا کے عروج کو دائمی زوال دیا تھا۔

عمران نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے یار! دو تین دن سے تمہاری بتی گل ہے۔ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گہرے اندھیرے میں اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ''کچھ بولو یار! ہم بھی ایک دوسرے کو نہ بتائیں گے تو اور کون بتائے گا۔ اچھا...... چلو یہی بتا دو کہ یہاں کیوں رکے ہو؟''

''اس لئے کہ ہم نے آگے نہیں جانا۔ آج رات یہیں رکنا ہے۔''

"یہیں رکنا ہے؟ وہ کیوں؟"

"میں ایک بندے کی اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔"

"کون بندہ؟"

"آفتاب خاں......" میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ دکھ کے بوجھ سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

"آفتاب خاں؟ اس نے کیا کیا ہے؟"

"وہ جو میری سمجھ میں نہیں آرہا......اور شاید تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔" مجھے اپنی آنکھیں نم محسوس ہوئیں۔

عمران ایک ایسا دوست تھا جس کو میں اپنی ہر غمی خوشی میں شریک کر سکتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی پردہ ہی نہیں ہے لیکن آج عمران سے سلطانہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے حوصلہ جمع کیا اور دل فگار لہجے میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو اب تک صرف میں جانتا تھا۔

گہری تاریکی میں، مَیں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کا چہرہ بھی حیرت کی آماج گاہ بن گیا ہے۔ اس نے مجھ سے کئی سوال جواب کئے......اور آخر میں وہ بھی اسی گومگو کی کیفیت میں چلا گیا جس میں، مَیں تھا۔ سلطانہ کے سابقہ کردار کی طرف دیکھتے تھے تو سب جھوٹ لگنے لگتا تھا، نگاہ کا فریب محسوس ہوتا تھا......مگر واقعات کی گواہی کچھ اور کہانی سناتی تھی۔

عمران نے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "......تو تمہارا خیال ہے کہ آج رات سلطانہ، مندر سے آفتاب خاں کے ساتھ نکلے گی اور کسی قریبی گھر میں جائے گی۔"

"یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر لگتا یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دس بجے کے بعد سے مندر کے آس پاس موجود رہیں تاکہ ہمیں آفتاب کے آنے اور جانے کا پتا چلے۔"

عمران نے ماتھا ہاتھ میں پکڑ لیا اور کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ اب نو بجنے والے تھے۔ وہ بولا۔ "اگر ہمیں مندر کی طرف ہی جانا ہے تو پھر اُٹھ جائیں۔ دس پندرہ منٹ پہلے کیا اور بعد میں کیا۔ جاتے جاتے بھی آدھ گھنٹا تو لگ ہی جاتا ہے۔"

میں نے کسّی اُٹھائی۔ پگڑی درست کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ عمران بھی اُٹھ گیا۔ وہ ایک دم پژمردہ نظر آنے لگا تھا۔ تاہم مجھے حوصلہ دینا بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ میرے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "گھبراؤ نہ تابی! جو ہوگا ہمارے لئے اچھا ہی ہوگا اور پتا نہیں کیوں اب بھی میرا ذہن اس ساری صورتِ حال کو مان نہیں رہا ہے۔"

ہم گھنے درختوں میں چلتے ہوئے جوہڑ سے واپس روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹے میں ہم واپس مندر کے آس پاس پہنچ گئے۔ آسمان پر ہلکا سا ابر تھا جس کے سبب تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی تھی۔ فتح پور کی زیادہ تر روشنیاں اب بجھ چکی تھیں۔ گلیوں میں ہلکی دھند تھی اور آوارہ کتوں کا شور تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان ایک مناسب جگہ دیکھی اور گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ قریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب ہمیں ایک روشنی مندر کی طرف آتی دکھائی دی۔ دھیرے دھیرے وہ روشنی مندر کی سیڑھیوں تک آگئی۔ یہ یقیناً آفتاب خاں ہی تھا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے لالٹین بجھا دی۔ چند لمحے بعد غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ آفتاب کا ہیولا سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد ہیولا اوجھل ہوگیا۔ وہ مندر میں جاچکا تھا۔

اب انتظار پہلے سے زیادہ کٹھن ہوگیا۔ نصف شب کے سناٹے کا فائدہ اُٹھا کر آفتاب مندر کے اندر تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں طول پکڑتی گئیں۔ ایک ہی جگہ سردی میں بیٹھے بیٹھے جسم اکڑنا شروع ہوگیا تھا۔ میں تو ایسی سختی کا کچھ عادی ہوگیا تھا لیکن عمران اس موسم کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ انتظار ختم ہوا۔ مندر کا دروازہ کھلا اور سیڑھیوں پر حرکت نظر آئی۔ اس مرتبہ آفتاب کے ہیولے کے ساتھ دو اور ہیولے بھی تھے۔ ایک ہیولا واضح طور پر عورت کا تھا اور یہ یقیناً سلطانہ ہی تھی۔ اس نے خود کو سرتاپا چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ تینوں ہیولے سیڑھیوں سے اُترے اور انہی درختوں کی سمت بڑھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے خود کو لمبی گھاس اور گھنی شاخوں میں کچھ اور بھی "کیموفلاج" کرلیا۔ ہم سے قریباً پندرہ بیس میٹر کی دوری پر آکر تینوں ہیولے جھاڑیوں میں ٹھہر گئے۔ میرے اندازے کے مطابق تیسرا ہیولا ہمارے دوست اقبال کا تھا۔ اس نے سلطانہ کو کندھے سے تھاما ہوا تھا اور وہ تھوڑا سا جھکی ہوئی تھی جیسے تکلیف میں ہو۔ آفتاب کی مدھم آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ "آپ بس دو منٹ یہاں رکیں۔ ہم اس سامنے والے احاطے سے بائیسکل لے کر آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد اقبال کی جانی پہچانی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ سلطانہ کو تسلی دے رہا تھا۔ "کچھ نہیں بھابی! پیٹ کا معمولی درد ہے۔ جلد ٹھیک ہوجائے گا۔ آفتاب بتا رہا ہے،"

بڑا سیانا حکیم ہے۔ پورا علاقہ مانتا ہے اسے۔“

سلطانہ شاید ہولے سے کراہی تھی۔ پھر اس نے ایک بوتل میں سے دو گھونٹ پانی پیا۔ اسی دوران میں آفتاب خاں بھی سائیکل لے کر آ گیا۔ اقبال نے سلطانہ کو سہارا دے کر سائیکل کے چوڑے کیریئر پر بٹھایا۔ اس کی مدھم ہائے ہائے سنائی دی۔ اقبال ۔ نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”یہ اجوائن اور سونف کا پانی ہے۔ دو دو گھونٹ پیتی جائیں اس سے فائدہ ہوگا۔“

آفتاب خاں سائیکل پر سوار نہیں ہوا بلکہ اسے یونہی چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا...... اقبال تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا پھر واپس مندر کی طرف چلا گیا۔ اب ہمارے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہیں کھڑے رہتے۔ ہم درختوں میں سے نکلے اور ایک محفوظ فاصلے سے بائیسکل کا پیچھا کرنے لگے۔ سلطانہ بدستور کیریئر پر تھی اور آفتاب اسے پیدل دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ یقین کرنا تو مشکل تھا کہ سلطانہ واقعی بیمار ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ اس ڈرامے کا حصہ لگتا تھا جس کے کچھ سین میں پچھلے تین چار روز سے دیکھ رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ اور آفتاب خاں نے مندر سے باہر آنے کے لئے بیماری والا کھیل کھیلا ہے۔ اقبال کو تو خواتین کی حفاظت کے لئے مندر میں ہی رہنا تھا۔ آجا کے آفتاب خاں ہی تھا جو ناگہانی تکلیف کی صورت میں سلطانہ کو کسی معالج کے پاس لے جا سکتا تھا۔ اب یہ ”تکلیف“ کیا تھی، اس کا ”علاج“ کیا تھا اور معالج کون تھا، اس کا پتا تو آنے والی گھڑیوں میں ہی چل سکتا تھا۔ کچھ آگے جا کر آفتاب خاں نے اپنی لالٹین روشن کی اور سائیکل کے ہینڈل سے لٹکالی۔ حفاظت کے لئے اس کے پاس اپنی رائفل بھی موجود تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ گھنے درختوں میں سفر نہیں کر رہا تھا۔ لالٹین روشن ہونے سے ہمیں تعاقب میں مزید آسانی ہوگئی اور ہم نے احتیاطاً اپنا اور آفتاب خاں کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔

یہ سفر بغیر کسی وقفے کے جاری رہا اور میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا کہ آفتاب اور سلطانہ کی منزل کہیں آس پاس ہی ہے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اپنے مقامِ آغاز سے تقریباً پانچ میل آگے آ چکے تھے...... یہاں ان دونوں نے آدھ گھنٹے کا وقفہ کیا اور ایک بار پھر چل پڑے۔ سفر کی شکل اب بھی وہی تھی۔ سلطانہ سائیکل کے کیریئر پر تھی اور آفتاب پیدل چل رہا تھا۔ جس قسم کے راستے تھے، وہ سوار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سفر کا یہ دوسرا دورانیہ اندازاً ایک گھنٹے کا رہا۔ نہایت ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ صبح صادق کا وقت قریب آ گیا ہے۔

سلطانہ اور آفتاب کا یہ دوسرا قیام گھنی خودرو جھاڑیوں میں ہوا۔ ہم ابھی تک بڑی کامیابی سے تعاقب کر رہے تھے۔ ہم اب بھی ان دونوں کے زیادہ قریب نہیں گئے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کی وجہ سے تاریکی ذرا کم محسوس ہونے لگی تھی۔ عمران نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آفتاب، سائیکل کے پاس اکیلا کھڑا ہے۔“

”سلطانہ کہاں ہے؟“

”شاید اپنی کسی ضرورت کے لئے درختوں میں گئی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سلطانہ کے ہیولے کو خودرَو جھاڑیوں اور درختوں میں سے نمودار ہوتے دیکھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ اپنے کپڑے بدلنے کے لئے جھاڑیوں میں گئی تھی۔ اب اس کے جسم پر ہندو لڑکیوں کی طرح لہریے دار ساڑھی تھی۔

آفتاب اور سلطانہ کا سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ اب وہ دونوں ہی سائیکل کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اجالا ہونے کی وجہ سے تعاقب ہمارے لئے دشوار ہو گیا تھا لیکن یہ دشواری تا دیر برقرار نہیں رہی۔ اچانک ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایک بڑے مندر کا کلس دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بھجن کی آواز بھی کانوں میں پڑنے لگی۔ درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس بستی میں کافی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مختلف رنگوں کے جھنڈے لہراتے نظر آئے...... اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی مذہبی تہوار ہے۔ یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ مسلمان نہ ہونے کے برابر نظر آ رہے تھے۔ غالباً اردگرد کی چھوٹی موٹی بستیوں سے بھی لوگ یہاں پہنچ رہے تھے۔ ہم سلطانہ کو دور سے دیکھ سکتے تھے۔ اس نے اپنا نصف سے زیادہ چہرہ ساڑھی کے پلو سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اپنے حلیے سے ایک ہندو لڑکی نظر آتی تھی۔ ہمیں دور سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا مگر لگتا ایسے ہی تھا کہ اس نے ماتھے پر تلک بھی لگا رکھا ہے۔ اچانک میرے ذہن میں وہ نتھ اور جھمکے وغیرہ آ گئے جو تہ خانوں میں آفتاب نے اسے دیئے تھے۔ کیا وہ چیزیں بھی سلطانہ کو صرف روپ بدلنے کے لئے دی گئی تھیں؟ صورتِ حال تشویش ناک تھی، پھر بھی میرے سینے میں خوش گوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ کچھ بھی تھا مگر سلطانہ کے حوالے سے میرا بدترین اندیشہ ماند پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم ایک شامیانے کی اوٹ میں چلے گئے اور ان دونوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگے۔ سلطانہ اب ہرگز بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے ایک عارضی دُکان سے پوجا کی کچھ چیزیں خریدیں اور اس طرف چلی گئی جدھر عورتوں کا ہجوم تھا۔ آفتاب خاں اب اس سے الگ تھلگ

ہو گیا تھا۔ مندر کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ مندر میں داخل ہونے کے لئے عورتوں اور مردوں کے علیحدہ علیحدہ راستے تھے۔ کم عمر بچے بھی عورتوں کے ساتھ تھے۔ اندر داخل ہونے کے لئے قطاریں بنائی گئی تھیں۔ سکیورٹی سخت تھی۔ عورتوں کی تلاشی لینے کے لئے عورتیں موجود تھیں۔ سلطانہ بھی ایک قطار میں لگ چکی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرتی ایک ہندو عورت کی کلائیوں پر لال اور پیلی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ ہندو عورت کے کندھے سے لگا ہوا ایک شیر خوار بچہ مجھے دیکھ کر بے وجہ مسکرایا۔ پھر ماں بیٹا بھیڑ میں اوجھل ہو گئے۔

ہم نے دیکھا کہ آفتاب خاں ایک سائیکل مرمت والے کے پاس بیٹھ گیا ہے۔ ہم بھی ایک قریبی چائے خانے میں گھس گئے۔ یہاں سے ہم آفتاب پر نگاہ بھی رکھ سکتے تھے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ساری سائیکل کھلوا کر اسے ''اوور آل'' کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یقیناً یہ بھی وقت گزاری کا ایک بہانہ تھا۔

''یہ تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے پیارے۔'' عمران نے چائے خانے کی خستہ میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں چکر تو کوئی اور ہی ہے۔'' میں نے تائید کی۔ میرے اندر خوشی اور دکھ کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ سلطانہ کے کردار کے حوالے سے جو جان لیوا شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے، وہ اب باطل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نسبت سے میرے سینے میں پیدا ہونے والا گاڑھا سیاہ دھواں اب چھٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک دوسری طرح کے فکر و غم نے لے لی تھی۔ کچھ عرصے پہلے سلطانہ کے پاس سے ایک زہریلی پڑیا ملی تھی۔ اس پڑیا میں ویسا ہی نیلگوں زہر تھا جیسا زرگاں میں ہاشم رازی عرف ہاشو کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ تب میرے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں سلطانہ کا تعلق بھی تو کسی طور پر ہاشو کی سرگرمیوں سے نہیں؟ آج کی صورتِ حال چلا چلا کر اعلان کر رہی تھی کہ میرا وہ اندیشہ درست تھا۔

''مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔'' میں نے چائے کی پیالی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ سلطانہ کسی بہت خاص مقصد سے اندر گئی ہے۔''

''کہیں یہ وہی زہر والا معاملہ تو نہیں؟'' میری آواز میں لرزش آ گئی۔

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس بارے میں ہمیں...... آفتاب خاں ہی بتا سکتا ہے۔

''تو پہنچیں اس کے پاس؟''

''نہیں تابی! یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا۔ آفتاب خاں بھی وہ نہیں جو ہمیں نظر آتا رہا

ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے کوئی اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اس کے پاس جائے۔ دوسرا دور رہ کر ارد گرد کا جائزہ لے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ دیکھو، ان شامیانوں کے پیچھے گنے کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ تم کسی طرح آفتاب کو ان کھیتوں میں لے آؤ۔ میں بھی تمہارے آس پاس ہی رہوں گا۔''

تھوڑی سی تفصیل طے کر کے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں سیدھا سائیکلوں کی اس دُکان پر پہنچا جہاں آفتاب بیٹھا اپنی سائیکل سروس کرا رہا تھا اور ساتھ ساتھ جلیبی کھا رہا تھا...... مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ چند لمحوں کے لئے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''اوہو، تابش بھائی! آپ یہاں؟ یہ ام...... کیا دیکھ رہا ہے؟''

''مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا...... تم یہاں کیسے؟'' میں نے کہا۔

''ام نے یہاں ایک بندے کو ادھار پیسا دیا ہوا ہے۔ اس سے لینے آیا تھا۔ یہاں اس میلے میں یہ سائیکل کا دُکان دیکھا تو سوچا کہ سائیکل کو بھی ٹھیک ٹھاک کرا لے لیکن...... لیکن آپ تو ہنومان گاؤں گیا تھا نا۔ خو، اس کا راستہ تو نالے کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔''

میں نے آواز دبا کر کہا۔ ''نالے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہے تھے مگر راستے میں گڑبڑ ہو گئی۔ کچھ لوگ پیچھے لگ گئے۔ شاید زرگاں کے ہی تھے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر اس طرف کو نکلے ہیں۔''

''عمران بھائی کہاں ہے؟''

''وہ سامنے کھیتوں میں۔ اسے تھوڑی سی چوٹ بھی لگ گئی ہے۔''

آفتاب خاں بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یقیناً اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور آفتاب خاں گنے کے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ یہ آٹھ دس فٹ اونچے کھیت تھے۔ ''کہاں ہے عمران بھائی؟'' آفتاب نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔

میں نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ریوالور نکال لیا۔ آفتاب کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''خبردار آفتاب! اپنے ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو...... اور نیچے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ارد گرد کے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور عمران بھی وہاں آ گیا۔ اپنی گرم چادر کے نیچے اس نے رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت رکھی ہوئی تھی۔ آفتاب سمجھ گیا

کہ معاملہ سنگین ہے۔ ''نیچے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے پھر پھنکار کر کہا۔

اب آفتاب کا رنگ سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ بہر حال، وہ نیچے بیٹھ گیا۔ عمران نے بھی دور مار رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ میرا ریوالور پہلے سے ہی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے آفتاب کی پھولی ہوئی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک شکاری چاقو، نسوار کی ڈبیا، تھوڑی سی کرنسی اور چند کاغذ نکلے۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ یہ چھوٹی نال والی رائفل میں نے اُتار لی اور دور پھینک دی۔

''امارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ سنبھل کر بولا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ یہ سب کیا کر رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔

''ام نے کیا کیا ہے؟''

''سلطانہ، اندر کیا کرنے گئی ہے؟'' عمران نے رائفل آفتاب کے سر سے لگا کر پوچھا۔

آفتاب ایک بار پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ ہم دونوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا......

عمران نے کہا۔ ''دیکھو آفتاب! چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ تہ خانوں کے اندر اور تہ خانوں سے باہر جو کچھ ہوا ہے، وہ ہم دیکھتے رہے ہیں۔ جب تم ''بیمار'' سلطانہ کو سائیکل پر بٹھا کر فتح پور سے روانہ ہوئے تھے، تب بھی ہم تمہارے پیچھے تھے۔ اب کوئی سوال نہ کرنا۔ بس جواب دینا......سلطانہ کو تم نے کس کام سے اندر بھیجا ہے؟''

''ام نے نہیں بھیجا۔ وہ خود گیا ہے۔ وہ خود جانا چاہتا تھا۔'' آفتاب خود سری کے انداز میں بولا۔

''کیوں جانا چاہتی تھی وہ؟''

''ام نہیں جانتا......اور اگر جانتا بھی ہوتا تو تم کو نہ بتاتا۔'' آفتاب کا لہجہ اب واشگاف ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو ہراس نظر آیا تھا، اب ناپید ہو چکا تھا۔

''تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو ہم دوسری طرح پوچھیں گے۔'' میں نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کیا۔

''آپ کا جس طرح مرضی پوچھو۔ ام اپنے باپ کا اولاد ہی نہیں اگر تم کو ایک لفظ بھی بتائے۔'' آفتاب کا انداز مزید آتشیں ہو گیا۔ اب وہ سر تا پا ایک خر دماغ پٹھان نظر آتا تھا۔

''اور ام تم کو ایک اور بات بتا دے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے۔ اگر تم زیادہ واویلا کرے گا تو پھر سلطانہ بی بی کا جان بھی چلا جائے گا۔ یہ لوگ اس کا بوٹیاں نوچ لے گا۔ بہتر ہے کہ جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو اور یہ سب کچھ ہمارے فائدے میں بھی ہے۔''

''کس فائدے کی بات کر رہے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چند سیکنڈ چپ رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ زبان کھولے یا نہیں۔ پھر پھنکارتی آواز میں بولا۔ ''کیا تم مسلمان نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل اس ظلم پر خون نہیں ہوتا جو یہ لوگ ام پر کر رہا ہے؟ کیا تم نے زرگاں میں جل کر مرنے والے بچوں کی آخری پکاروں کو بھلا دیا ہے؟ ان کا بدلہ لینا ام سب کا فرض ہے اور ام لیں گے۔''

عمران نے ایک دم اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ اس نے گن کی نال جھکا دی اور بولا۔ ''ہماری سوچیں تم سے علیحدہ نہیں ہیں آفتاب! جو آگ تمہارے دل میں بھڑک رہی ہے، وہی ہمارے دل میں بھی ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ تم ہمارے ساتھی ہوتے ہوئے بھی ہم سے سب کچھ چھپا رہے ہو۔''

''اور یہی کچھ سلطانہ نے بھی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ مجھے اعتماد میں لے لیتی تو مجھے یہ دکھ نہ ہوتا۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ شاید تم نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

''نہیں......ام نے کسی کو مجبور نہیں کیا......اور یہ سارا کام مجبوری کا ہے بھی نہیں۔ یہ تو اندر کی غیرت اور جوش کا کام ہے۔ یہ نہ زبردستی کروایا جا سکتا ہے، نہ زبردستی رکوایا جا سکتا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''اگر ہمیں دوست سمجھتے ہو آفتاب خان تو سب کچھ کھول کر بتا دو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں۔''

''ام کیا بتائے؟''

''تم اور سلطانہ کس کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہے ہو؟''

''ام نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ بس اندر کا جذبہ ہوتا ہے۔''

''اندر کا جذبہ تو ہمارے اندر بھی ہے......لیکن ہم کچھ کر نہیں پا رہے۔ تم نے کچھ کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی تمہیں راہ دکھا رہا ہے۔ ہمیں صاف بتاؤ آفتاب خاں! ہمیں لگ رہا ہے کہ تمہارے، سلطانہ اور ہاشو وغیرہ کے درمیان تعلق ہے۔''

آفتاب کے چہرے پر رنگ سا گزرا لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔ سنبھل کر بولا۔ ''ام ہاشو وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ام کو صرف اتنا پتا ہے کہ وہ سلطانہ بی بی کے گھر میں کام کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سوچ بھی امارے جیسا ہو مگر امارے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' آفتاب کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ ہاشو، سلطانہ، طلال، آفتاب شاید کسی ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔

میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، سلطانہ کتنے پیکٹ لے کر گئی ہے اندر؟“

”کک...... کون سے پیکٹ؟“

”زہر کے پیکٹ۔ جو پرشاد میں ملائے جاتے ہیں۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”آ...... آپ پتا نہیں کیا بات کر رہے ہیں...... وہ کسی اور کام سے گیا ہے۔ خو، ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔“

مجھے لگا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ آفتاب کا کھوکھلا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اندر سے ہل گیا ہے۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھو، اگر تم ہمیں دوست نہیں سمجھو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ تمہیں بعد میں پچھتاوا ہوگا۔“

”آپ امارا دوست ہے لیکن اس بارے میں ابھی ام آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ ابھی یہ کام ہو لینے دو۔“ وہ اٹل آواز میں بولا۔ اس کے اندر وہی سختی موجود تھی جو انتہا پسند گروہوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی خاموشی برقرار رکھنے کے لئے ہر خطرہ مول لینے اور ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔

آفتاب کی تلاشی سے برآمد ہونے والی چیزیں ابھی عمران کے ہاتھ میں تھیں۔ ان میں دو تین تہ شدہ کاغذ بھی تھے۔ ایک رقعہ نما کاغذ پر عمران کی توجہ مبذول ہوگئی۔ اچانک مجھے لگا کہ آفتاب، عمران پر جھپٹے گا اور رقعہ نما کاغذ اس سے چھین لے گا۔ میں نے...... ریوالور کا رخ ایک بار پھر اس کے سر کی طرف کر دیا۔ ”آفتاب! اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ حرکت کرو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔“

عمران نے دو قدم پیچھے ہٹ کر تحریر پڑھنا شروع کی۔ وہ کچھ اس طرح تھی۔ ”...... ش تمہارے پاس آ رہا ہے۔ اس کے پاس دو تھیلی ہے۔ ایک اپنے پاس رکھو، دوسری کام میں لاؤ۔ چڑھاوے کا میلہ تین چار اور پانچ تاریخ کو ہوگا۔ ان میں سے کوئی تاریخ چن لو۔ عورتوں والے حصے میں جانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ س حلیہ بدل کر جا سکے گی۔ اس کا کام بس یہ ہوگا کہ وہ تھیلی گلزار تک پہنچا دے۔ گلزار ”میٹھا“ بانٹنے والی عورتوں کی کرتا دھرتا ہے۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ باقی کام وہ کرے گی۔“

یہ تحریر رونگٹے کھڑے کرنے والی تھی۔ تحریر میں موجود اشارے واضح تھے۔ تھیلی کا

مطلب زہریلے پاؤڈر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ س کا اشارہ سلطانہ کی طرف تھا۔ میٹھے سے مراد پرشاد تھا۔

یہ وہی بے رحم انتہا پسندی تھی جو ہم نے ہاشم عرف ہاشو میں دیکھی تھی۔ یہ اندھا جوش کہیں بھی ہوتا، کسی بھی مذہب، فرقے یا گروہ میں ہوتا، یہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ چھوٹا سا بچہ آیا جو اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا، میری طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور بے وجہ شرمایا تھا۔ وہ بچہ صرف ایک بچہ تھا۔ ایک بے گناہ...... یہی بچہ پھر یہاں، زہر کھا کر مرنے والا تھا۔ اس بچے کو نہیں مرنا چاہئے تھا۔ یہ کوئی بھی تھا، یہ اس دنیا کا ”کل“ تھا۔ یہ امید کی کرن تھا یہ آس کی ڈور تھا۔ میں یا آفتاب خاں یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے تھے کہ کل یہ بچہ، خدا کا نام لیوا نہیں ہوگا، یہ سچائیوں کا علم نہیں اُٹھائے گا، کہنہ عقیدوں کو نہیں توڑے گا اور زخموں کا مرہم نہیں بنے گا۔ ہم اسے مرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے آفتاب خاں، ہاشو، کھوسٹ بڑھیا اور ستیش میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔

عمران نے میری اور میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے تھے۔ سلطانہ جو میری بیوی تھی، جو میرے سانسوں میں بستی تھی، مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔ اس کے لباس میں زہر چھپا ہوا تھا۔ یہ زہر پرشاد میں ملایا جانے والا تھا، یا ملایا جا چکا تھا۔ ہم حرکت میں آتے تو سلطانہ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ نہ آتے تو بے شمار عورتیں اور بچے موت کے منہ میں چلے جاتے۔ حرکت میں آنا ضروری تھا۔

اچانک بندوق کا زوردار فائر سنائی دیا۔ یہ فائر مندر کے عین سامنے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ چلائے۔ ایک سیکنڈ کے لئے...... صرف ایک سیکنڈ کے لئے میری اور عمران کی توجہ اس دھاکے کی طرف گئی، آفتاب نے فائدہ اُٹھایا اور اُٹھ کر تیزی سے فصل میں گھس گیا۔ ”رک جاؤ“ عمران دہاڑا۔

اس نے رائفل سیدھی کی مگر فائر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر آفتاب اونچے گنوں کے اندر کافی آگے پہنچ چکا تھا۔ اس کا پیچھا کرنا بے سود لگا۔ ہم واپس پلٹے اور اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہوئے جس نے مندر کے سامنے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لوگ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی کے گھوڑے بدک گئے تھے اور وہ خالی ہی ایک طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کسی کو لپک کر اس گھوڑا گاڑی میں آ گھستے دیکھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ مجھے سبز اوڑھنی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سلطانہ کی اوڑھنی بھی سبز تھی۔

عمران نے بھی سبز اوڑھنی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسے بھی وہی شک ہوا جو مجھے ہوا تھا۔ کیا اس بھگدڑ میں دوڑتی ہوئی خالی گھوڑا گاڑی میں سلطانہ داخل ہوئی تھی؟ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی نے تیزی سے یوٹرن لیا اور گھوڑا گاڑی کے پیچھے روانہ ہوئی۔ چار پانچ مقامی افراد چھلانگیں لگا کر اس ٹریکٹر ٹرالی پر چڑھے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا اور دوڑتی ہوئی ٹرالی پر چڑھ گئے اور اکیلی یہ ٹریکٹر ٹرالی ہی نہیں تھی جو گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکی تھی اور دو تین گھوڑا گاڑیاں اور گھڑ سوار بھی گھوڑا گاڑی کو روکنے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا گاڑی میں سبز اوڑھنی والی عورت گھسی ہے اور یقیناً یہی عورت مندر میں ہنگامے کی ذمے دار تھی۔ اب ہمارے لئے اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں گھسنے والی سلطانہ تھی۔

گھوڑا گاڑی برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی دونوں طرف مکئی اور گنّے کے بلند کھیت تھے۔ وہ کافی آگے نکل گئی تھی۔ بھاری بھرکم ٹریکٹر ٹرالی کو اس کا پیچھا کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پیچھے سے آتے ہوئے گھڑ سواروں میں سے ایک نے چلا کر کہا۔ ''رستہ دو۔''

ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو راستے کے بائیں کنارے پر کر لیا۔ یوں گھڑ سواروں کو تیزی سے آگے جانے کا موقع مل گیا۔ ہماری بوسیدہ ٹرالی اور دیگر دو گھوڑا گاڑیوں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔

ٹرالی پر سوار افراد بھی دیگر لوگوں کی طرح مشتعل نظر آتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر دیہاتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسی گاڑی میں گھسی ہے وہ۔''

دوسرا شخص بولا۔ ''اس کے پاس چاقو تھا۔ میں نے اسے چاقو چلاتے دیکھا ہے...... جیادہ عمر کی بھی نا ہیں ہے۔ لڑکی سی لگتی ہے۔''

ایک اور آواز آئی۔ ''ایسی گندی ناری کو کون ہندو کہے گا۔ مندر میں گھس کر فساد کرت ہے۔ یہ تو ہندو کے بھیس میں کوئی راکھشس لگت ہے۔''

''اس نے کیا کیا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی پکڑی جاوے گی تو پتا چل جاوے گا۔''

ایک نوجوان نے کلہاڑی ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں دیہاتی حلیے میں تھے۔ ہمارے کندھوں پر رکھی ہوئی ''کسیاں'' ہمارے بہروپ کو پختہ کر رہی تھیں۔ ٹرالی کے

اگلے حصے میں کھڑا ایک پنڈت نما شخص بولا۔ ''یہ زنانے حصے کی طرف سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی۔ دو تین گوپیاں اس کے پیچھے تھیں اور پکڑو پکڑو کی دہائی دے رہی تھیں۔ چھوٹے پجاری نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے چاقو چلا دیا۔ پھر دو اور بندوں کو بھی گھائل کیا اور باہر نکل آئی۔''

میں نے عقب میں دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ ایک دو گاڑیاں اور چند مزید گھڑ سوار بھی اس تعاقب میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہی وقت تھا جب سب سے آگے بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں سے اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔ یہ فائر ان گھڑ سواروں پر کئے گئے جو اس تعاقب میں سب سے آگے تھے اور گھوڑا گاڑی کے کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ بڑے کارگر فائر ثابت ہوئے۔ پہلی گولی تو براہِ راست گھڑ سوار کو لگی۔ ہم نے اسے گھوڑے سے الٹ کر کچے راستے کی دھول میں گم ہوتے دیکھا۔ دوسری گولی نے ایک گھوڑے کو ''ہٹ'' کیا۔ گھوڑا بدک کر اچھلا اور پھر مکئی کے کھیتوں میں گھس کر ہنہنانے اور گول گول چکرانے لگا۔

تعاقب کرنے والے گھڑ سوار بری طرح ٹھٹک گئے۔ ان میں سے کوئی بھی مسلح نہیں تھا۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ گھوڑا گاڑی سے اپنا فاصلہ بڑھا دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہماری ٹریکٹر ٹرالی کے آس پاس آ گئے۔ دو چار گھڑ سوار رک گئے اور راستے کے کنارے پر پڑے اس موچھیل گھڑ سوار کو دیکھنے میں مصروف ہو گئے جو گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولی کا شکار ہوا تھا۔

''لگتا ہے کہ کمینی گاڑی میں اکیلی نا ہیں ہے۔'' ایک شخص پھنکارا۔

''لیکن گھسی تو اکیلی ہی تھی۔''

''ہوسکت ہے کہ کھیتوں میں سے نکل کر اس کا کوئی یار بھی گھس گیا ہو اندر۔'' پنڈت نما شخص نے خیال ظاہر کیا۔

میرا دھیان سیدھا آفتاب خاں کی طرف چلا گیا۔ اس واقعے سے ایک منٹ پہلے آفتاب موقع سے فائدہ اُٹھا کر کھیتوں میں بھاگ نکلا تھا۔ عمران اس پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سلطانہ کو فرار ہوتے دیکھ کر وہ بھی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا ہو؟

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی شاید اسی انداز میں سوچ رہا ہے۔

تعاقب طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر ٹرالی بری طرح ہچکولے کھا رہی

تھی۔ ہچکولوں کی وجہ سے پنڈت نما شخص دو بار فرش پر لڑھکا اور کھڑا ہوا تھا۔ سب لوگوں کے چہروں پر جوش کے ساتھ ساتھ ہراس بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ گھوڑا گاڑی میں سے ان پر فائرنگ کی جائے گی۔ وہ سب کے سب کلہاڑیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔
ہمیں صرف ایک گھڑ سوار کے کندھے پر رائفل نظر آ رہی تھی لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ بھاگتے گھوڑے پر سے فائر کر سکتا۔ ویسے بھی وہ زیادہ باہمت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کافی پیچھے آ گیا تھا۔ دوسری رائفل ایک تنومند شخص کے پاس تھی اور وہ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار تھا۔ یہ گھوڑا گاڑی ٹرالی سے بھی پیچھے تھی۔ تنومند شخص اپنی رائفل کو ٹھیک سے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

یوں یہ تعاقب طویل سے طویل ہوتا جا رہا تھا...... اگلے پندرہ منٹ میں فرار ہونے والی گھوڑا گاڑی میں سے پستول کے چار فائر مزید ہوئے۔ تین فائر تو ہوائی تھے اور گھڑ سواروں کو ڈرانے کے لئے کئے گئے تھے لیکن چوتھا فائر سیدھا تھا۔ یہ اس گھڑ سوار کے عین سر میں لگا جو دلیری دکھا کر گھوڑا گاڑی کے زیادہ قریب آ گیا تھا۔ یہ گھڑ سوار گولی کھا کر بھی گھوڑے کی پشت سے ہی چپکا رہا لیکن وہ زندہ حالت میں نہیں تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد وہ ریت کی بوری کی طرح گھوڑے سے لڑھک گیا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولیوں نے دو افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ نشانے کی درستگی اس شبہے کو تقویت دے رہی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں دوسرا فرد شاید آفتاب خاں ہے۔ دوسرے گھڑ سوار کے شکار ہونے کے بعد پیچھے آنے والی گھوڑا گاڑی سے تنومند رائفل بردار نے چار فائر کئے مگر یہ بے مقصد فائر تھے۔ رائفل اور نشانے کے درمیان ٹریکٹر ٹرالی اور دو گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ وہ شخص درست نشانہ لے ہی نہیں سکتا تھا......

یہ عجیب و غریب تعاقب قریباً ایک گھنٹا مزید جاری رہا۔ راستے میں بھی کچھ گھڑ سوار تماشا دیکھنے کے لئے اس تعاقب میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے۔ گھوڑے اب ہانپنا شروع ہو چکے تھے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے۔ گھوڑا گاڑی کی رفتار بھی سُست پڑتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پندرہ بیس منٹ یہ سلسلہ مزید جاری رہا تو گھوڑے بے دم ہو جائیں گے۔ تعاقب کرنے والے بھی شاید اسی وقت کے منتظر تھے...... مگر پھر جو کچھ ہوا اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔

ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ یہ چند سو نفوس پر مشتمل کوئی کچا پکا گاؤں تھا...... گاؤں

کے درمیان سے گزرتے گزرتے گھوڑا گاڑی نے ایک دم موڑ کاٹا اور سیدھی ایک نیم پختہ احاطے میں گھس گئی۔

تعاقب کرنے والے رک گئے۔ ٹریکٹر ٹرالی کی رفتار سُست ہوئی پھر وہ بھی ٹھہر گئی۔ گھوڑا گاڑی جس احاطے میں داخل ہوئی تھی، اس کے آخر میں آٹھ دس نیم پختہ کمرے اور برآمدے نظر آ رہے تھے۔ چھت پر پانی کی گول پختہ ٹینکی بھی تھی۔ دیکھنے میں یہ کوئی اسکول لگتا تھا مگر پھر میری نظر لکڑی کے پھاٹک کے قریب لگے ایک بورڈ پر پڑی یہ ایک شفاخانہ تھا۔ اس کے ایک علیحدہ پورشن میں شاید جانوروں کا علاج بھی ہوتا تھا۔ ہم کافی فاصلے پر تھے پھر بھی احاطے میں بندھے ہوئے مویشی اور خچر وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والے اپنی اپنی سواریوں سے اُترے۔ افراتفری کے عالم میں انہوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہی وقت تھا جب عمارت کے اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ تب ہم نے ایک حواس باختہ عورت کو عمارت کے اندر سے بھاگ کر باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے سر پر چادر تھی اور نہ ہی پاؤں میں چپل۔ ابھی وہ احاطے کے وسط میں بھی نہیں پہنچی تھی کہ عقب سے دو فائر ہوئے اور وہ اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گئی۔ اس جواں سال عورت کے نیلگوں لباس کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اس طرح کا وردی نما لباس میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس عورت کو عمارت سے نکل کر بھاگنے کی سزا دی گئی ہے۔ سزا دینے والا آفتاب خاں بھی ہو سکتا تھا۔

چار پانچ منٹ کے اندر اس پُرسکون بستی میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ عمارت کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کچھ آس پاس کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ کھڑکیوں میں بھی ڈرے ڈرے چہرے نظر آنے لگے۔

میں اور عمران بھی کچھ قریب چلے گئے۔ کھلے ہوئے پھاٹک میں سے ہمیں وہ گھوڑا گاڑی نظر آ گئی جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے پانی اور گھاس کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے بدترین اندیشے درست ہیں۔ آفتاب خاں اس عمارت میں ہی موجود تھا۔ ہم نے چھت پر اس کی جھلک دیکھی۔ وہ بھاگ کر پانی والی ٹینکی کے پیچھے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل صاف نظر آئی۔
''یہ تو وہی ہے۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔
''اور اس کا مطلب ہے کہ سلطانہ بھی اندر ہی ہے۔''

''یہ تو بڑا خطرناک کام ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اب انہیں چھوڑیں گے نہیں۔'' عمران نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

عمران کی بات سو فیصد درست تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو ہمارے سامنے گر چکی تھیں۔ دو راستے میں اور تیسری یہاں احاطے میں۔ اس کے علاوہ کہا جا رہا تھا کہ بھاگنے والی عورت نے مندر میں بھی چاقو چلایا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہاں بھی کوئی موت ہوئی ہو۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے کندھوں پر ''کسیاں'' تھیں۔ ہم دیہاتیوں کے لباس میں تھے اور ہجوم کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ہم دونوں ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہم نے ابھی تک سلطانہ کو دیکھا نہیں تھا۔ اب بھی دل میں یہ موہوم سی امید موجود تھی کہ شاید سلطانہ اس خرد ماغ قاتل پٹھان کے ساتھ نہ ہو۔

میں نے کہا۔ ''سوچنے کی بات ہے کہ آفتاب کے پاس رائفل کہاں سے آئی؟ ہم نے تو اس کی رائفل کھیت میں پھینک دی تھی...... سلطانہ کے پاس بھی کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ اسے اس عمارت کے اندر سے ہی ملی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، آفتاب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ وہ بھاگ کر اسی جگہ گھسے گا؟''

''لگتا تو نہیں۔'' عمران نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''تم نے دیکھا ہی ہو گا، گاڑی نے سیدھا چلتے چلتے ایک دم موڑ کاٹا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آفتاب نے اندازہ لگایا تھا کہ گھوڑے اب زیادہ دیر ساتھ نہیں دیں گے۔''

''ایسے علاقے میں ایسی صاف ستھری عمارت کا ہونا بھی حیران کن ہے۔ مجھے تو ایک اور شبہ ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ایک جواں سال دیہاتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے گلے میں کئی تعویذ تھے اور وہ حلیئے سے کھیت مزدور ہی لگتا تھا۔ بہت سے تماشائیوں کی طرح وہ بھی ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور دیوار کی اوٹ سے بار بار شفاخانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس صاف نظر آتا تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے مقامی لہجے میں کہا۔ ''یہ کوئی اسپتال ہے بھیا؟''

''ہاں بھیا! اندر مریج بھی ہیں۔ تیس چالیس تو جرور ہوں گے۔ چھوٹے بچے بھی ہیں اور خود بڑے ڈاکٹر جی اور ان کے ملاجم بھی۔''

''اوہو'' میں نے حیرت ظاہر کی پھر عام لہجے میں پوچھا۔ ''بڑے ڈاکٹر جی کون ایں؟''

''پتا نا ہیں۔ ہم ان کو بس بڑے ڈاکٹر جی ہی کہوت ہیں۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔

''قریب کھڑا ایک دوسرا شخص بولا۔ ''جاپانی ڈاکٹر ہیں۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے ان کے ہاتھ میں۔''

میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ان کا نام لی وان تو نا ہیں؟''

''ہاں، اسی طرح کا ہے۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔ ''ہر مہینے تین روج کے لئے یہاں آتے ہیں۔ بڑا لمبا سفر کرتے ہیں۔ بھگوان ان کی اور ان کے ملاجموں کی رکھشا کرے۔'' یہاتی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس کی نگاہیں احاطے کے وسط میں پڑی لاش پر جم گئیں۔

''یہ کون ہے جس کو گولی لگی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑے ڈاکٹر جی کی ملاجم ہے۔ زبیدہ نام ہے۔ ہمارے گاؤں ہی کی ہے۔ بڑی اچھی عورت تھی۔'' دیہاتی کی آواز بھرا گئی۔

دراصل اس عورت کی نیلگوں وردی دیکھ کر ہی مجھے شک گزر رہا تھا کہ ایسا لباس میں کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اب سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ جب میں نل پانی میں تھا تو ڈاکٹر مجھے لے ڈاکٹر لی وان کے شاندار اسپتال میں گیا تھا۔ تب اس نے لی وان سے میری الیکٹرک کے بارے میں ڈسکشن کی تھی۔ وہیں اسپتال میں، مَیں نے ایسے کپڑوں والی دو تین یں دیکھی تھیں۔

اچانک چھت پر سے بڑی گھن گرج کے ساتھ رائفل کے تین فائر ہوئے۔ لوگ سہم سہم مختلف چیزوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہمارے ساتھ بات کرنے والے دونوں دیہاتی بھی ہو کر نیچے بیٹھ گئے۔ کسی شخص نے پکار کر کہا۔ ''ڈاکو گولی چلا رہے ہیں۔ سب لوگن ہاں سے دور ہٹ جاویں۔ ورنہ نقصان ہو جاوے گا۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب خاں نے لوگوں کو احاطے سے دور رکھنے کے لئے ہوائی فائر ہیں۔ وہ بڑی چابک دستی اور سفاکی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے طانہ نے مل کر عمارت میں موجود مرد و زن کو یرغمال بنا لیا ہے اور کسی کو باہر نہیں نکلنے دے

صورت حال میں بڑی تیز رفتار تبدیلیاں آئی تھیں جس نے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ں بھی چکرا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والی گھڑیوں میں کیا ہوگا۔

سلطانہ کا جو روپ میرے سامنے آیا تھا، وہ ناقابلِ تصور تھا۔ صرف ایک ہفتہ پہلے میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری بانہوں میں آ کر اور آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانے والی سلطانہ کو میں ایک نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار دیکھوں گا اور یہ صورتِ حال اس کی اپنی پیدا کردہ ہو گی...... میرا دل خون ہونے لگا تھا۔

آفتاب خاں کی پکارتی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ بڑی پاٹ دار آواز میں بول رہا تھا۔ تعجب تھا کہ اتنے فاصلے سے بھی اس کے الفاظ صاف سنائی دیئے۔ اس نے جنونی لہجے میں کہا۔ ''ام تم لوگوں کو صاف بتاتا ہے، اگر کسی نے اندر آنے کا کوشش کی تو ام ان سب کو بھون ڈالے گا جو یہاں امارے پاس ہے۔ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اسپتال کے پھاٹک اور دیواروں سے دور رہو، ورنہ اپنے نقصان کا تم خود ذمے دار ہو گا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' ایک اونچی پگڑی والے شخص نے پکار کر پوچھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص اس ''اٹھرا'' نامی گاؤں کا مکھیا تھا۔

''بس فی الحال ام یہی چاہتا ہے کہ کوئی اندر آنے کا کوشش نہ کرے۔ اگر کوئی ام سے بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اکیلا اندر آئے اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

ہمارے ساتھ ٹرالی پر سوار ہو کر یہاں آنے والا ایک شخص گرج کر بولا۔ ''تم ہتھیارے ہو۔ تم نے خون کیے ہیں۔ ہم تم جیسے حرامزادے سے بات کاہے کو کریں گے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالیں گے۔''

ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والے تنومند رائفل بردار نے ایک گندی گالی دی اور آفتاب خاں کی طرف اندھا دھند دو فائر کیے۔

گاؤں کا مکھیا تڑپ کر رائفل بردار کے سامنے آ گیا اور اسے مزید فائر کرنے سے روک دیا۔ وہ چلا کر بولا۔ ''یہ کیا کرت ہو تم؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ اندر ہمری عورتیں اور بچے ہیں۔ ان کا جیون خطرے میں ہے۔''

دو تین مقامی افراد آگے بڑھے اور انہوں نے تنومند رائفل بردار سے زبردستی رائفل چھین لی۔ رائفل بردار بھی طیش میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑتے، عمران ان کے درمیان آ گیا۔ اس نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ''کیا کرت ہیں آپ لوگ۔ یہ جھگڑنے کا ناہیں، سوچنے کا وقت ہے۔ یہ ایک دم جنونی لوگن ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ کسی بھی وقت کچھ کر سکت ہیں۔ ہمیں ان سے بات کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ اصل میں کون ہیں اور کیا چاہت ہیں۔''

''کون بات کرے گا آگے جا کر؟'' مکھیا نے ارد گرد دیکھ کر پوچھا۔

سب ٹھٹکے ہوئے نظر آئے۔ عمران ترت بولا۔ ''میں کرتا ہوں جی۔ یہ پٹھان لوگن ہیں اور مجھے تھوڑی بہت پشتو بھی آوت ہے۔''

مکھیا چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر عمران کے چہرے کا اعتماد دیکھ کر وہ بولا۔ ''اگر تم اپنی مرضی سے جانا چاہت ہو تو چلے جاؤ۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی دُرگھٹنا ہوئی تو ہم ذمے دار ناہیں ہوں گے۔''

''ناہیں جی۔ آپ کی کوئی ذمے داری ناہیں۔ آپ بس پرارتھنا کریں۔''

''کیا بات کرو گے؟'' سانولی رنگت والے مکھیا نے پوچھا۔

''وہی جو آپ کرنا چاہت ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

چند سیکنڈ میں عمران نے مکھیا اور اس کے ساتھیوں کو شیشے میں اُتار لیا بلکہ ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والا پنڈت نما شخص بھی اس بات پر راضی ہو گیا کہ عمران اندر جائے۔ عمران نے اپنی چادر اُتار پھینکی اور پگڑی بھی کھول کر گلے میں ڈال لی۔ بہرحال چادر اُتارنے سے پہلے اس نے اپنی رائفل بڑی صفائی سے میری چادر کی بغل میں منتقل کر دی تھی۔ رائفل دو حصوں میں تھی، اس کا بیرل کھول دیا گیا تھا۔ اپنی دھوتی کو اچھی طرح اڑس کر وہ بڑے اعتماد سے احاطے میں داخل ہوا۔ چھت پر سے یقیناً آفتاب نے عمران کو دیکھ لیا تھا اور پہچان بھی لیا تھا۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ آفتاب کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے مقامی دیہاتیوں کے سامنے ہمارے بھانڈا پھوٹ جائے۔ بہر طور اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

چند سیکنڈ بعد آفتاب کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے عمران کو مخاطب کر کے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''قمیص اُٹھا کر دکھاؤ۔''

عمران نے قمیص اُٹھا کر دکھا دی۔

''دھوتی کھولو۔'' آفتاب نے چھت پر سے حکم صادر کیا۔

عمران نے اپنے میلے کچیلے تہ بند کے بند کھول کر دکھا دیئے۔ تہ بند کے نیچے زیر جامہ تھا۔

''ٹھیک ہے، آگے آ جاؤ۔''

عمران سیڑھیوں کی طرف اوجھل ہو گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ آفتاب

اب دوست نہیں دشمن تھا۔ دو گھنٹے پہلے ہم نے اس پر رائفل تانی تھی۔ اب عمران اس کی رائفل کے نشانے پر تھا۔ ابھی تک یہ کنفرم نہیں تھا کہ آفتاب کے ساتھ صرف سلطانہ ہی ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی گھوڑا گاڑی سے نکل کر عمارت میں روپوش ہوا ہے۔ مجھے عمران کی صلاحیتوں اور اس کی ''لک'' پر بھروسا تھا۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی راستے نکال لیتا تھا۔ اسے گفتگو اور قائل کرنے کا فن آتا تھا مگر دوسری طرف بھی ایک نہایت سرپھرا شخص تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے یوں بیگانہ ہوا تھا جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔ اب اس کے سر پر خون سوار تھا۔

عمران کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اب تقریباً پانچ چھ سو مرد و زن اس نیم پختہ عمارت کے گرد اور آس پاس جمع ہو چکے تھے۔ بہت سی لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور رائفلیں اپنی چمک دکھانے لگی تھیں۔ بہرحال، یہ سارے کے سارے مقامی دیہاتی تھے اور یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے میری اصل حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں جارج گورا کو عبرت ناک شکست دے کر اس کا پیٹ چاک کرنے والا شخص ایک، گرد سے اٹے ہوئے دیہاتی کے روپ میں ان کے درمیان موجود ہے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ عمران کو دیکھ کر ہجوم میں ہلچل نمودار ہوئی۔ عمران پھاٹک سے گزر کر ہمارے درمیان آ گیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس کے تہ بند کی ڈب میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو پہلے نہیں تھی...... لیکن یہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا۔ عمران نے گاؤں کے مکھیا بلرام اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ اندر ایک عورت اور دو بندے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پٹھان اور دوسرا مقامی لگتا ہے۔ دونوں کے پاس رائفلیں ہیں، اس کے علاوہ دھماکا خیز مواد بھی ہے۔ انہوں نے یہ دھماکا خیز مواد اسپتال کے اکلوتے وارڈ میں اس طرح رکھ دیا ہے کہ اسے کسی بھی وقت اڑایا جا سکتا ہے۔ بڑا ڈاکٹر لی وان بھی اندر ہی ہے۔ وہ اور اس کی عملہ، حملہ آوروں کے قبضے میں ہے۔ سب کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔

''یہ لوگن چاہتے کیا ہیں؟'' مکھیا نے پوچھا۔

''پہلے تو وہ بات ہی ناہیں سن رہے تھے جی۔ پھر میں نے پٹھان سے پشتو میں بات کی اور اس کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ تھوڑے سے نرم پڑے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ یہاں سے جانا چاہت ہیں۔ انہیں تازہ دم گھوڑوں کی ایک بڑی گھوڑا گاڑی

دی جاوے۔ اس کے علاوہ گھوڑا گاڑی کے دو فالتو گھوڑے دیئے جاویں...... اور وشواس دلایا جاوے کہ ان کا پیچھا ناہیں کیا جاوے گا۔ ایسا ہو گیا تو وہ چلے جاویں گے۔''

ہمارے ساتھ آنے والا پنڈت نما شخص تڑخ کر بولا۔ ''یہ ناہیں ہوسکت۔ ان لوگن نے ہمارے گاؤں کے کم از کم دو بندوں کا جیون لیا ہے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے ایک نردوش ناری کی ہتھیا کی ہے۔ اب یہ ہمیں الٹا دھمکا رہے ہیں اور یہاں سے نکل جانا چاہت ہیں۔''

مکھیا اور پنڈت نما شخص ایک بار پھر الجھ پڑے۔ مکھیا نے کہا۔ ''تم بدھی (عقل) کی بات ناہیں کر رہے ہو پنڈت۔ کیا تم یہ چاہت ہو کہ اگر تمہارے گاؤں کے بندے مارے گئے ہیں تو اس گاؤں کے بھی دس بیس بندے مارے جاویں؟ تم دیکھ رہے ہو ان لوگن کے سر پر خون سوار ہے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کو بند کر لیا ہے۔ یہ سب کچھ اڑا دیں گے تو پھر کیا ہووے گا؟ ہمیں اس بارے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔''

پنڈت نما شخص بولا۔ ''تم لوگن ضرورت سے زیادہ ڈر گئے ہو۔ دھماکے سے سب کو اڑا دینا اتنا آسان ناہیں ہے اور کیا پتا ان کے پاس بارود ہے بھی یا وہ کیول ڈراوا دے رہے ہیں۔''

عمران جلدی سے بولا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے جی۔ انہوں نے وارڈ میں دو تین جگہ کچھ رکھا ہوا ہے۔ کالے رنگ کے تار بھی بچھائے ہوئے ہیں۔ وہ بارود کے تار ہی ہوسکت ہیں۔ مجھے وشواس ہے جی......''

پنڈت نما شخص کا نام مہاویرا تھا۔ وہ بولا۔ ''جو کچھ بھی ہے لیکن ہم کو جلد بازی ناہیں کرنی چاہیے۔ ہم کو چاہیے کہ ان لوگن کو کچھ دیر باتوں میں لگائیں اور ایک دو گھنٹے کا وقت گزاریں۔ اتنے میں ہم اپنے کچھ بندے ہنومان گاؤں کی طرف بھیجیں۔ وہاں چوکی موجود ہے۔ چوکی سے سپاہی یہاں آ سکت ہیں۔ ہوسکت ہے کہ اتنی دیر میں کسی دوسری جگہ سے بھی مدد آ جاوے۔ تب ان قاتلوں کے ساتھ اچھے طریقے سے معاملہ نمٹایا جاسکت ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن آپ لوگن نے میری آخری بات تو سنی ہی ناہیں۔''

''کیسی بات؟''

''ان کتوں نے ہمیں گھوڑا گاڑی دینے کے لئے صرف آدھ گھنٹے کا سمے دیا ہے اور اس سمے میں سے آٹھ دس منٹ گزر بھی چکے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر آدھ گھنٹے میں گاڑی ناہیں پہنچی تو وہ ایک بندے کو گولی مار کر باہر برانڈے میں پھینک دیویں گے اور پھر ہر پندرہ

منٹ بعد ایک بندے کی ہتھیار کرتے جاویں گے۔ پٹھان کے پاس گھڑی ہے اور اس نے گھڑی دکھا کر مجھے ٹائم بتایا ہے۔''

مہاویرا اور کھیا بلرام سمیت کئی افراد کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ ''اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔'' عمران نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کہوت ہیں کہ ہم یہاں سے جاتے وقت آٹھ دس بندوں کو ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ رکھیں گے۔ جب سمجھیں گے کہ محفوظ جگہ پر پہنچ گئے ہیں تو انہیں چھوڑ دیویں گے۔ ضمانتیوں میں کوئی عورت ناہیں ہووے گی۔ بڑا اور چھوٹا ڈاکٹر ہووے گا اور کچھ دوسرے بندے ہوویں گے۔''

کھیا بلرام نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھا اور ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ابھی پنچایت میں مشورہ کرے گا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود پنچوں کو اکٹھا کیا اور حویلی کی طرف چلا گیا۔ لوگ عمران کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ اس سے اندر کے حالات جاننا چاہ رہے تھے۔ عمران نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے کھیا اور دیگر لوگوں کو بتایا تھا۔ وہ اندر کی صورتِ حال کو سنگین بتا رہا تھا۔ تاہم میرا اندازہ تھا کہ وہ اس سنگینی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ اس کا یہ انکشاف بھی مجھے مشکوک لگ رہا تھا کہ اندر آفتاب خاں کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے۔

کچھ دیر بعد جب عمران کے گرد سے بھیڑ چھٹی تو میں نے [illegible] لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''کیا واقعی آفتاب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ایک نیوز چینل والا اپنی 'خبر' دوسرے چینل کو نہیں دیتا، اپنی جان دے دیتا ہے۔''

''لیکن میں چینل والا نہیں ہوں۔''

''کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چینل والا ہے یا نہیں۔ آج کل تو اینٹ اکھاڑیں تو نیچے سے کیمرے والا اچھل کر باہر آ جاتا ہے۔ ناظرین کم پڑتے جا رہے ہیں، چینل زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر اینکر ایک ہی دہائی دے رہا ہے، ہمارے ساتھ رہیے گا۔ اب تو بچے بھی اور کھیلوں کی جگہ چینل چینل کھیلتے نظر آتے ہیں۔ دیکھنا بہت جلد ہر فیملی کا اپنا اپنا چینل ہوگا۔ فیملی کا سربراہ ہی اس کا ڈائریکٹر کہلائے گا۔''

''تم بکواس ہی کرو گے یا کچھ بتاؤ گے؟''

''میں بتاؤں گا، تب بھی تم کہو گے کہ بکواس کر رہا ہے۔''

''نہیں کہتا۔''

''آفتاب خاں اکیلا ہے۔'' عمران نے خلافِ توقع سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ صرف سلطانہ ہے۔ سلطانہ نیچے ہے۔ آفتاب چھت پر ہے۔ چھت پر ایک روشن دان ہے۔ اس روشن دان کے نیچے مریضوں سے بھرا ہوا وارڈ ہے۔ آفتاب اوپر سے کسی بھی مریض کو یا اس کے لواحقین کو شوٹ کر سکتا ہے...... وہ بالکل جنونی نظر آ رہا ہے۔''

''بارود والی جو بات تم نے کی ہے؟''

''وہ بھی درست نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ دباؤ میں آئیں اور آفتاب کو یہاں سے نکلنے کا راستہ دینے میں دیر نہ کریں۔ آفتاب کے پاس بس ایک رائفل ہے اور اس کے پچاس ساٹھ راؤنڈز ہیں۔ یہ رائفل اس نے یہیں اسپتال کے چوکیدار سے چھینی ہے۔''

''کیا تم نے سلطانہ کو دیکھا ہے؟''

''نہیں لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں کہ آفتاب کے ساتھ سلطانہ ہی بھاگ کر یہاں پہنچی ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ عمران کی اس اطلاع کے بعد یہ امید دم توڑ گئی کہ شاید اس مار دھاڑ میں شریک ہونے والی سلطانہ نہ ہو۔ سینے میں اندھیرا سا اُتر گیا۔

''سلطانہ کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آفتاب نے بتایا نہیں مگر لگتا ہے کہ ہتھیار ہے۔ ورنہ وہ اسے نیچے اکیلا چھوڑ کر اوپر نہ آتا۔''

''آفتاب کا رویہ کیسا رہا ہے تمہارے ساتھ؟''

''وہی جو دشمن کا دشمن سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دم غیر نظر آ رہا ہے۔ اس نے مجھے خود سے پندرہ بیس فٹ دور رکھا ہے اور تمام وقت رائفل مجھ پر تانے رکھی ہے۔ پہلے تو وہ کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ صرف مرنے اور مارنے کی بات کر رہا تھا۔ پر میں نے کوشش کی تو اس کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی وقت ہے، وہ سلطانہ کے ساتھ یہاں سے نکل سکتا ہے۔ ابھی اس کے گرد صرف مقامی لوگ ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد جب حکم [illegible]ے کارندے اور زرگاں کے مسلح گارڈز اپنے جدید اسلحے کے ساتھ یہاں پہنچ گئے تو اس کے لیے اپنی کوئی شرط منوانا ناممکن ہو جائے گا۔ شکر ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب [illegible]ے یہ کھیا اور پنچ وغیرہ بھی کوئی عقل کا فیصلہ کر لیں۔''

''اگر انہوں نے نہ کیا تو پھر؟''

''پھر خون خرابا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آفتاب اپنی دھمکی کو عملی شکل دے گا۔ وہ بے گناہ

لوگوں کو مارنا شروع کر دے گا۔''

''کیا جو لوگ مندر سے آفتاب اور سلطانہ کا پیچھا کرتے یہاں پہنچے ہیں، وہ انہیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟''

''اگر یہ دونوں جلدی نکل جائیں تو نکل بھی سکتے ہیں۔ میں نے بتایا ہے نا کہ آفتاب اور سلطانہ اکیلے نہیں نکلیں گے۔ وہ اپنے ساتھ کم از کم آٹھ دس یرغمالی رکھیں گے، اسی لئے آفتاب نے بڑی گھوڑا گاڑی بھی مانگی ہے...... میں تو اس کی باتیں سن سن کر حیران ہوا ہوں۔ یہ وہ آفتاب لگتا ہی نہیں جس کے ساتھ ہم نے تہ خانوں میں وقت گزارا ہے۔''

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے جب پھر کئی افراد عمران کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے اندر کے حالات پوچھنے لگے۔ یہ سب سیدھے سادے مقامی دیہاتی تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک اس دور دراز جگہ پر کسی نے ہمیں پہچانا نہیں تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر دور تک کھیت تھے اور ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور راستے تھے۔ اس گاؤں کے بیشتر مکان کچے تھے۔ نیچی چھتوں پر اور گلیوں کی نکڑوں پر نیم عریاں بچے اور رنگ برنگی اوڑھنیوں والی دیہاتنیں نظر آتی تھیں...... ایک حویلی کی دیوار پر بہت سے اپلے لگائے گئے تھے۔ ان اوپلوں کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔

اچانک مکھیا بلرام اور اس کے پنچ تیز قدموں سے واپس آتے دکھائی دیئے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے عزیز اسپتال کے اندر گھِر گئے تھے۔ اس کے علاوہ احاطے میں مری پڑی عورت کے لواحقین بھی گریہ زاری کرتے دکھائی دیئے۔ وہ انگلیوں سے احاطے کی طرف اشارے کر رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے جاتا اور عورت کی لاش کو اُٹھا کر لے آتا۔

مکھیا اور پنچوں نے عمران سے چند ایک سوال مزید پوچھے۔ تب وہ پنچ عمران کے ساتھ احاطے کے اندر گئے۔ آفتاب خاں چھت پر بالکل چوکس موجود تھا۔ اس نے پہلے یہ یقین کیا کہ اندر آنے والے افراد بالکل غیر مسلح ہیں پھر اس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دی۔

اس بار ہونے والی گفتگو پانچ دس منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہی۔ پنچ دھوتیاں پھڑپھڑاتے ہوئے واپس آئے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حملہ آور طیش میں ہیں۔ آدھ گھنٹے سے اوپر ہو چکا ہے۔ انہوں نے چھوٹے ڈاکٹر کو مارنے کی تیاری کر لی ہے۔ دو چار منٹ اور گزر گئے تو وہ اس راج نامی ڈاکٹر کو گولی مار کر چھت سے نیچے پھینک دیں گے۔

پنچوں کے واپس آنے کے صرف پانچ منٹ بعد مکھیا بلرام نے اعلان کیا کہ انہوں نے اندر موجود لوگوں کا جیون بچانے کے لئے حملہ آوروں کی بات ماننے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں گھوڑا گاڑی اور گھوڑے دیئے جا رہے ہیں۔ یہ پیغام لے کر عمران ایک ادھیڑ عمر پنچ کے ساتھ اندر گیا۔ مکھیا بلرام اور اس کے دیگر پنچ ان لوگوں کو سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گئے جنہیں یہ فیصلہ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ امید تھی کہ عمران اور پنچ جلد ہی لوٹ آئیں گے مگر ان کی واپسی میں پھر تاخیر ہوئی۔ کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی۔ وہ دونوں قریباً پندرہ منٹ بعد واپس آئے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ادھیڑ عمر پنچ نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

''وہ حرامجادے مکر گئے ہیں۔ وہ کہوت ہیں کہ وہ کسی کو چھوڑیں گے اور نہ یہاں سے جاویں گے۔ اگر کسی نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو وہ سب کچھ اڑا ڈالیں گے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ہاتھ پیچھے موڑ کر ایک رسّی سے باندھ دیئے ہیں اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔''

''وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' مکھیا نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''کچھ پتا ناہیں جی۔ شاید ان کو شبہ ہے کہ ان کے ساتھ وشواس گھات ہوگا۔ وہ باہر نکلے تو مارے جاویں گے۔''

''لیکن اس سے پہلے تو وہ سب کچھ مان رہے تھے؟'' ایک پنچ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''لیکن اب وہ کچھ نہیں مان رہے۔ پٹھان نے کہا ہے کہ وہ سرکاری لوگن سے بات کرنا چاہت ہیں۔''

''سرکاری لوگن؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وکہوت ہیں کہ کسی سرکاری بندے کو بلایا جاوے...... یا پھر کوئی فوجی افسر یہاں آوے۔''

یہ تبدیلی حیران کن تھی۔ عمران بھی الجھا ہوا اور خاموش نظر آیا۔

ہجوم میں اب اور طرح کا اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ جن لوگوں کے عزیز اندر تھے، وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کئی پھر واویلا کرنے لگے۔ آفتاب خاں نے عورت کی لاش احاطے میں سے اُٹھانے کی اجازت دے دی تھی۔ عمران اور پنچ امام دین دو افراد کے ساتھ احاطے میں گئے اور عورت کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر باہر لے آئے۔ [illegible] ایم ایم رائفل کی گولی اس کی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان لگی تھی اور سامنے سے

باہر نکل گئی تھی۔ اس کی نیلی یونیفارم سے اُٹھنے والی ''دواؤں کی بو'' سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے چاری یہاں نرس کے طور پر مریضوں کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ اس کی موت نے ہر کسی کو افسردہ اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کے رشتے دار نوحہ کناں تھے جن میں اس کا اسکول ماسٹر شوہر اور دو چھوٹے بچے بھی تھے۔

میں نے عمران کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''یہ کیا چکر چل گیا ہے یار؟''

''ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا...... لگتا ہے کہ آفتاب اور سلطانہ نے اچانک اپنا ارادہ تبدیل کیا ہے۔ شاید کوئی نئی بات ان کے سامنے آئی ہے جس کی وجہ سے وہ جانا نہیں چاہ رہے۔''

''وہ سرکاری لوگوں کو بلانے کی بات بھی کر رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔''

عمران نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں تھیں۔ وہ بے خیالی میں اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھو رہا تھا۔ یہ بھی اس کے سوچنے کا ایک انداز تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ مجھ سے بولا۔ ''اب ہم زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے۔ کسی بھی وقت ہمیں پہچانا جا سکتا ہے۔''

''تو پھر؟''

''ہمیں کھسکنا پڑے گا۔'' اس نے کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

میری سمجھ میں بھی یہی بات آ رہی تھی کہ اب یہاں سے کھسکنا ہی بہتر ہے۔ زیادہ تر لوگ جواں سال عورت کی لاش کی طرف متوجہ تھے۔ ہم ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھے۔ اچانک میری نظر تین گھڑ سواروں پر پڑی وہ چمکیلی دھوپ میں گرد اڑاتے تیزی سے موقع واردات کی طرف آ رہے تھے۔ یہ سرخی مائل پگڑیوں والے زرگاں کے مسلح سپاہی تھے۔ عمران نے بھی انہیں تاک لیا تھا۔ ہم دونوں نے چہرے اپنی میلی کچیلی پگڑیوں میں چھپائے اور رخ پھیر کر دوسری طرف نکل گئے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم موقع واردات سے محفوظ فاصلے پر کماد کے کھیت میں موجود تھے۔ ہم ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ عمران کے کہنے پر میں نے چادر کے نیچے سے دور مار رائفل نکالی اور اس کے بیرل کو فکس کر کے اسے تیار حالت میں کر لیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ایک چھوٹا سا ریڈیو نما آلہ نکال لیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک واکی ٹاکی تھا۔ ''اوئے! یہ کہاں سے ملا تجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسپتال سے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کا ہے، پر اب آفتاب کے قبضے میں ہے۔ اس کا دوسرا سیٹ'' آفتاب کے پاس ہے۔''

''اس نے خود دیا تھا؟''

''تو کیا میں چھین کر لایا ہوں؟'' عمران نے کہا اور سیٹ کو آن کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مجھے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے شبہ تھا کہ عمران کی قمیص کے نیچے تہ بند کی ڈب میں کچھ ہے۔ اب یہ شبہ درست نکلا تھا۔ عمران نے ''سیٹ'' کا چمکیلا انٹینا کھینچا۔ بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کی سیٹ کے بیٹری سیل وغیرہ دیکھے لیکن اس میں زندگی کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اس نے جھلا کر سیٹ کو تھپڑ رسید کیا۔ وہ ایک دم جاگ اُٹھا۔ اس پر دو چھوٹی لائٹس روشن ہو گئیں، ایک سرخ دوسری سبز۔ اسپیکر سے گھوں گھوں کی مدھم آواز آنے لگی۔

عمران نے ایک کھٹکا دبایا تو بیپ کی باریک آواز اُبھری۔ یہ بیپ دوسرے سیٹ پر جا رہی تھی۔ آٹھ دس دفعہ کی بیپ کے بعد کھٹ پٹ ہوئی اور اسپیکر پر آفتاب کی آواز اُبھری۔ وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ''ہیلو...... کون ہے؟''

''عمران بول رہا ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ بے موت مارے جاؤ گے۔ ساتھ میں وہ بھی جان سے جائے گی۔''

''تم اپنا نصیحت اپنے پاس رکھو۔ ام جو کچھ کر رہا ہے، سوچ سمجھ کر رہا ہے اور ایک بار پھر ام تم کو بتا دینا چاہتا ہے، کسی نے کوئی چالاکی مالا کی دکھایا تو بہت خون خرابا ہوگا۔ ام کسی کو نہیں چھوڑے گا۔''

''لیکن اب کیا نئی بات ہوئی ہے؟ تمہارا مطالبہ تو مان لیا گیا تھا۔ کھیا نے بڑی گھوڑا گاڑی اور گھوڑوں کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ یہ لوگ تمہیں راستہ دینے پر تیار ہیں۔ تم اپنے ساتھ ضمانت کے طور پر کچھ لوگوں کو بھی رکھ سکتے ہو۔''

''نہیں، اب ام نہیں جائے گا۔ اب امارا مطالبہ کچھ اور ہے اور یہ مطالبہ کسی اور کو نہیں، صرف حکم کے لوگوں کو بتائے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''حکم کے لوگ دس بیس کی تعداد میں نہیں سیکڑوں کی تعداد میں آئیں گے اور بہت جلد ان کو یہ شک بھی ہو جانا ہے کہ جو لڑکی تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں پہنچی

ہے، وہ سلطانہ ہے...... ایک بار ان کو یہ شک ہو گیا تو سمجھ لو کہ وہ آخری حد تک جائیں گے۔ تم اس پورے گاؤں کو بھی گولیوں سے اڑا دو تو وہ تمہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔''

''وہ جانے دیں گے۔ ان کا باپ بھی ام کو نہیں روک سکتا۔ تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد مت کرو عمران صاحب۔ تم اس معاملے سے نکل جاؤ ورنہ پچھتانا پڑے گا۔''

میں نے واکی ٹاکی پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''آفتاب خان میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار اسے بلا دو۔''

''وہ اپنی جگہ پر ہے۔ وہ اب نہیں آ سکتا۔ اس کی طرف سے بھی تم دونوں کے لئے یہی پیغام ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ بری طرح پھنس جاؤ گے۔''

اس کے ساتھ ہی کسی بڑی عمر کے مرد کی زور زور سے رونے کی آواز آئی اور آفتاب خاں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ کی اصلیت سامنے آنے والا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا، اب یہ نئی آفت آ گئی تھی۔ آفتاب یہاں سے بحفاظت نکلنے کے بجائے ایک بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا تھا۔

ہم نے پھر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ واکی ٹاکی یکسر خاموش تھا۔

عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آفتاب کے ہاتھ میں کوئی ایسی شے لگی ہے جس کے بعد اس کے اعتماد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی کچھ شرطیں منوانا چاہتا ہے۔''

''ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ اسلحہ...... یا پھر کوئی ایک ایسا شخص جو حکم وغیرہ کے لئے بہت اہم ہو...... یا پھر حکم اور اس کے ساتھیوں کی کوئی خاص کمزوری۔''

قریباً ایک گھنٹے کے اندر صورتِ حال بہت تبدیل ہو گئی۔ حکم کے کم و بیش دو درجن سپاہی یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایک جیپ پر آئے تھے۔ یہ جیپ غالباً ان جیپوں میں شامل تھی جو ہماری تلاش میں یہاں چکرا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اور جیپ بھی پہنچ گئی۔ پہلی جیپ بڑی تیز رفتاری سے واپس روانہ ہو گئی۔ غالباً یہ لوگ مزید نفری لانے اور حکام بالا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لئے لپکے تھے۔ ہم یہ ساری نقل و حرکت گنے کے اونچے کھیت کے اندر سے دیکھ رہے تھے۔ اب

ہمارے لئے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ واپس بستی میں پہنچیں۔ آفتاب اور سلطانہ بھی وہ قیمتی وقت ضائع کر چکے تھے جو انہیں یہاں سے نکال سکتا تھا۔ حکم کے سپاہیوں کے آنے کے بعد اب یقیناً وہ آوازیں بھی دب گئی تھیں جو اندر پھنس جانے والے لوگوں کے عزیزوں کی تھیں۔ اب یہ لوگ اصرار نہیں کر سکتے تھے کہ حملہ آوروں کی بات مان کر لوگوں کو رہا کرا لیا جائے۔

مزید ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ کوشش کے باوجود ہم دوبارہ آفتاب یا سلطانہ سے رابطہ نہیں کر سکے۔ کماد کا کھیت ہمارے لئے نہایت محفوظ پناہ گاہ تھا۔ اگر کوئی دیہاتی اس طرف آتا بھی تو ہم خود کو پوشیدہ رکھنے کے لئے دائیں بائیں ہو سکتے تھے۔ حرکت کرنے سے پودوں میں سرسراہٹ کی آواز ضرور پیدا ہوتی تھی لیکن اس سرسراہٹ کو کسی کتے بلی کی حرکت سے بھی منسوب کیا جا سکتا تھا۔

واپس جانے والی جیپ کچھ دیر بعد تیز رفتاری سے دھول اڑاتی واپس آ گئی۔ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ خوش گوار سنہری دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے دور سے دیکھا، جیپ میں سے کوئی اعلیٰ فوجی افسر نکل کر شفاخانے کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس کی کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس واقعے کے بیس پچیس منٹ بعد اچانک ہمارا رابطہ ایک بار پھر آفتاب خاں سے ہو گیا۔ عمران نے بٹن دبایا تو اسپیکر پر آفتاب کی آواز اُبھری۔

''ہیلو...... کون؟''

''میں عمران بول رہا ہوں۔ یہ جیپ پر ابھی کون آیا ہے یہاں؟''

''حکم کا ہندو فوجی افسر تھا۔ ام نے اسے بتا دیا ہے کہ ام کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ امارا ڈیمانڈ پورا کرتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ام ان سب کو ایک ایک کر کے مارے گا اور لاشیں باہر گراؤنڈ میں پھینکے گا۔'' آفتاب کی آواز میں شعلے لپک رہے تھے۔

''کیا ڈیمانڈ کی ہے تم نے؟''

''ام کو ہاشم صاحب کی رہائی چاہئے...... فوراً...... ان لوگوں کو ہاشم صاحب کو چھوڑنا پڑے گا اور یہاں پہنچانا پڑے گا۔''

''ہاشم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بات کو چھوڑو۔ بس ام چاہتا ہے کہ حکم اس کو رہا کرے اور وہ یہاں پہنچ جائے۔''

''لیکن وہ تمہاری بات کیوں مانیں گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس لئے کہ ان کا دُکھتا رگ امارے قبضے میں آ گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

"راج بھون کا کاپر (کافر) عورت امارے پاس ہے۔ وہ لوگ امارا بات نہیں مانے گا تو ام اس حرامزادی کو ننگا کر کے اور اس کے سر میں روشن دان کھول کر اسے برانڈے میں پھینکے گا اور یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ یہ جارج گورا کا بہن اور سرجن اسٹیل کا بیوی ہے۔"

میں اور عمران سناٹے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا۔ "تم...... ماریا کی بات کر رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہ امارے سامنے بیٹھا ہے۔ ام نے اس کو مرغی کی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔ کسی بھی وقت اس کے گلے پر چھری چلا دے گا۔"

اس کے ساتھ ہی چلانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ آفتاب خاں نے شاید اسے ٹھوکر ماری تھی۔ ہم ششدر تھے۔ میں نے قریباً پہچان لیا۔ یہ آواز ماریا ہی کی تھی۔

"یہ یہاں کیسے؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"برا وقت بندے کو خود گھیر کر اس کی اصل جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔" آفتاب بولا۔ "یہ یہاں شکار پر آیا ہوا تھا۔"

"شکار...... کس کا شکار؟"

"ڈاکٹر لی وان کا...... یہ سفید کتیا اس پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس سے تم دونوں کے بارے میں سن گن لینا چاہتا تھا۔ یہ دو دن پہلے مریضہ کے روپ میں اپنا منہ سر لپیٹ کر یہاں پہنچا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ مقامی کپڑوں میں یہ انگریز عورت ہے۔ یہ تو سلطانہ بی بی نے اسے پہچانا اور ام کو بتایا۔"

"ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عمران بولا۔

"ابھی ام تم کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ ابھی ام تم سے صرف یہ کہتا ہے کہ اس معاملے سے نکل جاؤ۔ ام کو امارے حال پر چھوڑ دو۔ ام ان لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اس پر بھی غور کر لیتے ہیں لیکن ہمیں بتاؤ تو سہی کہ ماریا یہاں پہنچی کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

واکی ٹاکی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ بس گھوں گھوں کی مدھم آواز آتی رہی۔ ہمیں لگا کہ شاید آفتاب نے پھر سلسلہ منقطع کر دیا ہے مگر پھر اس کی آواز اُبھری۔ "ام نے تم کو بتایا ہے نا کہ یہ شکارن ہے اور یہ بندوق مندوق سے نہیں اپنے حسن سے شکار پر ماتا ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کو اپنی گوری چمڑی پر ریجھانے کے لئے یہاں آیا تھا۔ سامبر مقابلے میں اپنے بھائی کی موت کے بعد سے یہ جلے پاؤں کا بلی...... بلکہ کتیا بنا ہوا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی

…ن یہ بھی تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کے خصم سرجن اسٹیل کو شک تھا کہ تمہاری …ن سے "بجلی کا چپ" کسی عام شخص نے نہیں نکالا، کسی بہت سیانے ڈاکٹر نے ہی ایسا کیا ہو گا۔ ان لوگوں کے دماغ میں ڈاکٹر لی وان یا چھوٹے ڈاکٹر کے بارے میں شک تھا۔ یہ کتیا …س کو تم ماریا کہتا ہے، مریض کے روپ میں ڈاکٹر لی وان کے پاس آیا۔ یہ اس سے اندر کا بھید لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ بھید لیتا، اس کا اپنا بھید کھل گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ …کاری خود شکار ہوا۔" اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے لیٹی ماریا کو ٹھوکر وغیرہ رسید کی۔ اس …ے چلانے اور پھر انگلش میں گالیاں دینے کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔

"خاموش۔" آفتاب دہاڑا۔ "ابھی تمہارا ایک انگلی کٹا ہوا ہے۔ ام باقی بھی کاٹ ڈالے گا پر یہ سارا انگلی تمہارے اندر ٹھونسے گا...... تمہارے پلید منہ کے اندر اور تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گا۔" آفتاب کا لہجہ لرزا دینے والا تھا۔

ہم صورتِ حال کی اس قطعی غیر متوقع کروٹ پر ششدر تھے۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ سرجن اسٹیل کی بیوی اور جارج کی بہن، آفتاب کے قبضے میں آ گئی ہے۔

ماریا نے غالباً پھر واویلا شروع کر دیا تھا۔ آفتاب نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔

اب سچویشن سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آفتاب نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ ماریا ایک شکارن تھی۔ وہ اپنے جسم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس سے پہلے ہم دیکھ ہی چکے تھے کہ وہ رات کے اندھیرے میں ایک پارسی کو "جسمانی رشوت" دے کر راہِ فرار اختیار کر گئی تھی۔ شاید یہاں وہ ڈاکٹر لی وان یا اس کے اسسٹنٹ کو حسن کے جال میں جکڑنے کے لئے وارد ہوئی تھی۔ آفتاب کا کہنا تھا کہ وہ ان سے ہمارے بارے میں کوئی "کلیو" حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"اس کا جواب لاہور میں اکثر رکشوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے، وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔" وہ بولا۔

"یہ تو بہت لمبا چکر چل گیا ہے۔ اگر واقعی ماریا، آفتاب کے قبضے میں آ چکی ہے تو زرگاں میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ انہیں ہاشم رازی کو رہا ہی کرنا پڑ جائے۔"

"لیکن یہ جو کچھ بھی ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کو بڑی تیزی سے لڑائی اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔" عمران کی پیشانی پر بال لہرا رہے تھے اور آنکھوں

میں گہری سوچ تھی۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا لیکن رات کے وقت اب بھی کافی سردی ہوتی تھی۔ جوں جوں شام کے سائے لمبے ہوتے گئے، کماد کے اس کھیت میں خشکی بڑھتی گئی۔ شام کے فوراً بعد ہی اوس بھی گرنا شروع ہوگئی۔ بستی میں چراغ روشن ہوگئے۔ شفاخانے کی عمارت کے اردگرد اب ایک جم غفیر موجود تھا۔ زرگاں کے بیسیوں مسلح سپاہی اور گارڈز بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شفاخانے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے ہر طرف حرکت کر رہے تھے۔

میرے سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ کی صورت بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور دل کو درد سے لبریز کر دیتی تھی۔ دو چار دن میں ہی کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ اوپر تلے دل فگار انکشاف ہوئے تھے اور اب وہ ایک بدترین صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ جب دو دن پہلے میں نے تہ خانوں میں آفتاب اور سلطانہ کو رازدارانہ گفتگو کرتے سنا تھا۔ سلطانہ نے کہا تھا...... آفتاب! ایک بات ذہن میں رکھنا، یہ آخری بار ہو گا...... یقیناً وہ اسی خطرناک مہم جوئی کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ زہر سے بھرا ہوا ایک پیکٹ اپنے لباس میں چھپا کر مندر میں کسی گلزار نامی معذور عورت تک پہنچائے گی۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جائے گا لیکن انسانی ارادے اور منصوبے ہمیشہ تو پورے نہیں ہوتے۔ جہاں، سلطانہ کے خیال میں اس کا کام ختم ہو جانا تھا، وہیں سے صورتِ حال نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ مندر کے اندر گڑبڑ ہوئی اور سلطانہ خود کو بچانے کے لئے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے دفاع میں تیز دھار آلہ بھی استعمال کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہمارے سامنے تھا۔ وہ اور آفتاب کم از کم تین افراد کے قتل میں ملوث ہو چکے تھے اور اب سیکڑوں افراد کے گھیرے میں تھے۔ ان کے حوالے سے اگر کوئی امید تھی تو یہی تھی کہ وہ اپنے پاس سفید فام ماریا کی موجودگی کا دعویٰ کر رہے تھے۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ سردی کے سبب وہ قدرے لرزاں آواز میں بولا۔ ''کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ واقعی تمہاری شاگردی اختیار کر لی جائے۔''

''کس معاملے میں؟''

''سردی، گرمی اور بھوک پیاس جھیلنے کے معاملے میں۔ یار! تم تو ایسے بیٹھے ہو جیسے خالہ جی کے ڈرائنگ روم ہو اور باقاعدہ انگیٹھی دہک رہی ہو۔ یہاں تو اپنی قلفی جمی جا رہی ہے۔''

''تو بن جاؤ شاگرد۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''لو بن گیا۔'' اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب اپنے شاگرد کے لئے کچھ کرو۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! اپنے شاگرد کی جان بچاؤ۔ اس کے لئے کہیں سے کوئی انگیٹھی وغیرہ لے کر آؤ۔ لوئی مونگ پھلی، چلغوزے، کوئی دودھ پتی وغیرہ۔''

''ایسے کام تو شاگرد اپنے استادوں کے لئے کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ پرانے زمانے کی پرانی باتیں ہیں استاد جی۔ ہم نئے لوگ ہیں۔ ہمیں ایسی فرسودہ رسموں کو ختم کرنا چاہئے بلکہ آج ہی سے اس نیک کام کا آغاز کر دینا چاہئے۔'' اس نے میری گرم چادر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

مجھے واقعی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے چادر اُتاری اور اس کی طرف بڑھا دی۔ ''لو، اسے اپنی چادر سے جوڑ کر ڈبل کر لو تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔''

''نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا استاد جی۔ مجھے اکڑ کر مرنا قبول ہے لیکن یہ طعنہ مجھ سے ہرگز برداشت نہیں ہوگا کہ میں نے صرف یہ چادر تم سے ہتیانے کے لئے استادی شاگردی کا ڈراما رچایا تھا۔ نو ناٹ ایٹ آل۔''

''رکھ لو۔ مجھے واقعی ٹھنڈ نہیں لگ رہی۔''

''تمہیں ٹھنڈ نہیں لگ رہی لیکن مجھے تو بے عزتی لگ رہی ہے نا۔'' اس نے کہا۔

پھر اس مسئلے کا درمیانی حل ہم نے یہ نکالا کہ دونوں گرم چادروں کو آپس میں جوڑا اور اس کی ایک ہی بکل بنا کر اس میں گھس گئے۔ ہم نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے مگر عمران کی حسِ مزاح ہمیشہ کی طرح برقرار تھی۔ وہ میرا دھیان بٹانے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ساتھ بے مثال تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ ایک اور ایک گیارہ کا محاورہ کسی عمران جیسے ساتھی کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا جب ایک بار پھر سیون ایم ایم رائفل کی خوفناک آواز نے سناٹے کو چکنا چور کیا۔ اس کے فوراً بعد بستی میں ہلچل کے آثار نظر آئے۔ پانچ دس منٹ بعد عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے دور سے دیکھا۔ کچھ لوگ ایک چارپائی اُٹھائے احاطے سے نکل رہے تھے۔ یہ ویسا ہی سین تھا جیسا ہم نے صبح کے وقت دیکھا تھا۔ جب ماری جانے والی نرس کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر احاطے سے نکالا گیا تھا۔ اب یقیناً کوئی اور لاش نکالی جا رہی تھی۔

آفتاب کا رویہ بے حد جارحانہ تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ جارحیت بڑھ رہی تھی۔ ”لگتا ہے کہ یہ ہوش کھو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہوش کھونے کے لئے ہوش کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں تو شاید ہوش ہے ہی نہیں۔“ عمران نے جواب دیا۔

”ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سیکڑوں کا مجمع ہے، اگر طیش میں آ کر یہ لوگ ایک دم اندر گھس گئے تو دونوں کی تکا بوٹی کر دیں گے۔“

ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ اچانک بہت سے لوگوں کی نعرہ زنی سنائی دی۔ جے جے کار کا زوردار آوازہ گونجا اور اندازہ ہوا کہ مشتعل افراد کا ایک بڑا گروہ شفاخانے کے پھاٹک کی طرف بڑھنا چاہ رہا ہے۔ یہی وقت تھا جب پھاٹک کے قریب شعلے سے چمکے اور رائفل کے کئی فائر ہوئے۔ آگے بڑھنے والا گروہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہوائی فائرنگ کرنے والے یقیناً حکم کے سپاہی ہی تھے۔ وہ مشتعل لوگوں کو آگے بڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ اندر ایک اہم ترین عورت یرغمالی کی حیثیت سے موجود تھی۔ وہ جارج گورا کی بہن اور سرجن اسٹیل کی بیوی تھی اور سرجن اسٹیل جیسے سفید فام لوگ حکم کی ناک کا بال تھے۔ وہ ان سے معاملات بگاڑنے کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتے تھے...... وہ جانتے تھے ان لوگوں کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں، پیسا ہے، اسٹیٹ کے کئی امراء اندر خانے ان سفید فاموں کے وفادار ہیں۔ جارج کے بعد اگر ماریا کو بھی کچھ ہو جاتا تو بہت بڑے نقصان کی بات تھی۔

مشتعل لوگوں کو نہ صرف منتشر کر دیا گیا بلکہ عام ہجوم کو بھی شفاخانے کی چاردیواری سے دور ہٹا دیا گیا۔ ہم دور سے صاف نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ رسیاں وغیرہ لگا کر عمارت اور لوگوں کے درمیان ایک فاصلہ بنایا جا رہا ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے کے وقفے سے سیون ایم ایم کا ایک اور فائر ہوا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہی شور وغوغا برپا ہوا۔ چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ ٹارچوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں ایک چارپائی اُٹھا کر احاطے سے باہر لائی جا رہی ہے۔ یقیناً اس چارپائی پر بھی ایک لاش تھی اور یہ لاش آفتاب خاں کی طرف سے، محاصرہ کرنے والوں کو تیسرا تحفہ تھی۔

رات کے ٹھٹھرے ہوئے سناٹے میں ایک بار پھر عورتوں کے بَین گونجے۔ ہجوم میں ہلچل نظر آئی۔ گاہے بگاہے حکم کے فوجیوں کے للکارے بھی سنائی دے رہے تھے۔ یہ للکارے عام لوگوں کو پُرسکون رکھنے کے لئے بلند کئے جا رہے تھے۔

میں اور عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف یکسر خاموشی تھی۔ ہم بھی تا دیر یہ کوشش جاری نہیں رکھ سکتے تھے، بیٹری کے کمزور پڑنے کا خدشہ تھا۔ آفتاب بالکل دیوانے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس طرح کا دیوانہ پن بندے کو حیران کن کامیابی دلاتا ہے یا برباد کر دیتا ہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب نے ہاشم عرف ہاشو کی رہائی کے لئے حکم کے ہرکاروں کو ایک خاص مہلت دی ہے۔ وہ مہلت چونکہ ختم ہو گئی ہے اس لئے وہ یرغمالیوں میں سے کچھ لوگوں کو مار کر باہر پھینک رہا ہے۔

”یار! اس نے کہیں ڈاکٹر لی وان کو ہی نہ مار دیا ہو؟“ میں نے کہا۔

”میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ مقامی عورتیں جس طرح واویلا کر رہی ہیں، یہی لگتا ہے کہ کوئی مقامی ہی مرا ہے۔“

”مگر مقامی لوگ ڈاکٹر کو بھی تو بہت چاہتے ہیں۔ اس کی موت بھی انہیں دکھی کر سکتی ہے۔“ میں نے نکتہ اُٹھایا۔

”لیکن میرا نہیں خیال کہ آفتاب اتنی جلدی کسی اہم یرغمالی کو مارے گا۔ وہ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے، عام لوگوں میں آفتاب اور معذور گلزار جیسے لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ اپنے ظاہری روپ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تربیت یافتہ ہیں۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہاشم رازی، ان کے بڑوں میں سے ہو، یا پھر ان کا سرغنہ ہی ہو؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔ حکم کے دربار میں ہم نے ہاشم کی جو شعلہ فشانی دیکھی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھی۔“

”لیکن اگر وہ اہم ترین شخص ہے تو پھر اس کی رہائی زرگاں والوں کے لئے اتنی آسان نہیں ہو گی۔“

”مگر ادھر بھی تو دیکھو جگر! یہاں ماریا جیسی لڑکی پھنسی ہوئی ہے۔ یہاں کے گورے ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ماریا کو کچھ ہو۔ وہ حکم کو ماریا کے لئے ہر قیمت دینے پر تیار کر لیں گے۔ حکم اور اس کے حواریوں کے لئے ان انگریزوں کی بات ٹالنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے گاڑے ہوئے ہیں۔“

”یہ انگریز کتنی تعداد میں ہوں گے یہاں اسٹیٹ میں؟“ میں نے پوچھا۔

”تعداد تو زیادہ نہیں ہے۔ گیتا مکھی بتا رہی تھی کہ یہ ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔

اتنے ہی لوگ فوج کے مختلف عہدوں پر ہیں لیکن اس انگریز خانہ خراب میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ ہمیشہ سے مقامی لوگوں کو تقسیم کر کے اپنا کام نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارے برِ صغیر کی تاریخ پچھلے ڈھائی سو سال سے اسی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ یہاں بھی ان لوگوں نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اندر خانے اپنی طاقت بنائی ہوئی ہے۔ شروع شروع میں یہ لوگ گو گر شیروں پر ریسرچ کرنے اور تیندوؤں کا شکار کرنے یہاں آئے تھے۔ اب یہاں یہ کافی تعداد میں ہیں۔ راج بھون میں ان کا اثر رسوخ ہے۔ فوج میں انہوں نے اہم عہدے سنبھالے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے مقامی لوگوں میں سے ہی ایسے وفادار ڈھونڈ لئے ہیں جو وقت پڑنے پر حکم کو بھی تگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔ اصل میں حکم کی جو شان و شوکت نظر آ رہی ہے وہ ان گوروں کی وجہ سے ہی ہے۔ حکم کے پیچھے گورے ہیں جن کی وجہ سے مقامی لوگ حکم کی ساری عیاشیوں کے باوجود اسے اوتار کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال، وہ قیدیوں کو اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑ لینے والی بات ہے۔''

''اَن دیکھی زنجیریں؟''

''یار! وہی بے ہودہ افواہ کہ حکم کے خاص قیدی اگر جارج گورے کی جیل سے بھاگ بھی جائیں اور کسی طرح اسٹیٹ کی حدوں سے نکلنا چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ حکم نے انہیں روحانی عمل سے پابند کیا ہوا ہے اور وہ کہیں بھی ہوں، پکڑ لئے جاتے ہیں۔ اب ہم جان ہی چکے ہیں، یہ ''روحانی عمل'' دراصل وہی منحوس الیکٹرانک چپ ہے جو سرجن اسٹیل خاص قیدیوں کے جسموں میں پلانٹ کرتا ہے۔ اسی طرح کے اور کئی شعبدے ہیں جن کے ذریعے حکم کی ''روحانیت'' کو جلا بخشی جاتی ہے۔''

''تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! پھر وہی بے ہودہ سوال؟ تم جانتے بھی ہو کہ میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میرا تو کام ہی ریسرچ کرنا ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے سر کے خوب صورت بالوں کا خیال رہتا ہے، اگر میں گنجا ہونا قبول کر لوں اور اپنے دماغ کو اس کی پوری گنجائش کے مطابق استعمال کرنے لگوں تو میں ''بالکل بکواس چینل'' اور ''چغد نکمے نابینا چینل'' کو بھی مات دے دوں۔''

''یہ کون سے چینل ہیں بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار وہی...... بالکل بکواس چینل یعنی بی بی سی اور چغد نکما نابینا، سی این این۔''

وہ پٹری سے اکھڑ رہا تھا۔ میں اسے بمشکل واپس لایا۔ وہ گرم چادر میں سمٹتے ہوئے

بولا۔ ''تم نے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا ہوگا؟ وہی مغلیہ سلطنت کا آخری تاج دار۔ اسے انگریزوں نے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ بس نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ اصل حکم انگریزوں کا ہی چلتا تھا۔ کچھ ایسی ہی ملتی جلتی صورتِ حال یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اورنگ زیب کا پڑپوتا بہادر شاہ مسلمان تھا اور حکم جی ہندو ہے۔ جو کچھ نتیجہ میں نے نکالا ہے، اس کے مطابق حکم نے بس اپنے راج پاٹ کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ وہ اچھا کھا پی رہا ہے۔ ایک ہندو کی حیثیت سے ناچ گانے اور خوب صورت عورتوں کی صحبت سے لطف لیتا ہے۔ ساتویں کے جشن جیسی تقریبوں کی آڑ میں اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ چل رہا ہے، اسی طرح چلتا رہے۔ وہ ان گوروں کے خلاف کسی طرح کا سخت رویہ اختیار کر کے اپنے آرام سکون کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں ان گوروں کا اصل دشمن کوئی اور ہے۔''

''کون؟''

''یہاں کے مسلمان۔ مراد شاہ اور انور خاں جیسے لوگ۔ جو بکنا اور جھکنا نہیں جانتے...... جو حکم کے چھوٹے بھائی ''چھوٹے سرکار'' کے ساتھ مل کر نل پانی میں بہت طاقت پکڑ چکے ہیں اور کسی بھی وقت زرگاں میں حکم اور اس کے انگریز دوستوں کے لئے شدید خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نچلی ذاتوں کے کچلے مسلے ہندو اور بودھی بھی زرگاں کے عیش پرستوں کے لئے خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں۔''

''فی الوقت تو تم واقعی ایک صحافی لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''صحافی ایک نسبتاً چھوٹا لفظ ہے۔ تم میرے لئے مناسب لفظ استعمال کرنا چاہو تو وہ دان شور (دانشور) ہے۔ دان شور سمجھتے ہو نا تم؟ عقل مند، صاحب ذی شور۔''

''ذی شعور۔'' میں نے کہا۔

وہ میری تصحیح کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''عقل تو بچپن سے ہی میرے اندر بہت زیادہ تھی بلکہ میری ماں تو پریشان ہو جاتی تھی۔ مجھے کہتی تھی، کبھی دوسروں کے سامنے کوئی بے وقوفی کی بات بھی کر لیا کرو، ورنہ لوگ سمجھیں گے تم بونے ہو۔ میری ہوشیاری کا اندازہ لگاؤ، جہاں دوسرے لوگ پانی کے بھرے ہوئے لوٹے سے طہارت کرتے ہیں، میں صرف آدھے کپ پانی سے کام چلا لیتا تھا۔ بارہ ٹہنی کھیلنے میں، مَیں اپنے محلے کا چمپئن تھا۔ ایسی ایسی چالیں چلتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ میرے ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، تم میں قدرتی طور پر ایک اچھا ''لڑاکا'' بننے کی صلاحیت ہے۔ اگر تم فوج میں چلے جاؤ تو بڑے اچھے جرنیل بن سکتے ہو۔ میں اپنے بے تحاشا ''آئی کیو'' کی وجہ سے فوج میں نہ جا سکا۔ انٹرویو کرنے والے

نے پوچھا جلدی سے بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں...... میں نے کہا، دینے ہوں تو چار اور لینے ہوں تو بائیس۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور پوچھا۔ نو دو اور گیارہ کتنے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ تو ہوتے ہی نہیں کیونکہ وہ تو بھاگ جاتے ہیں۔ اس نے کہا...... ٹھیک ہے تم بھی بھاگ جاؤ۔ یو آر ٹو انٹیلی جینٹ۔ میں فوج میں تو نہ جا سکا لیکن میں نے ایک اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے بارہ ٹینی کے تجربے کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ پتا ہے کس طرح؟''

''کس طرح؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نے جنگی چالوں اور لڑائی کی حکمت عملیوں پر ایک کتاب لکھی۔ وہ پاپولر ہوئی۔ بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کو اور میری دانشوری کو تسلیم کیا۔ یقین کرو بہت سی حالیہ جنگوں میں میری کتاب کی دی ہوئی تکنیکیں ہی استعمال ہوئی ہیں۔ بلکہ جگر...... کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا ہے کہ پلاسی کے میدان میں انگریزوں نے سراج الدولہ کے خلاف بھی یہی تکنیکیں استعمال کی تھیں۔''

''حضور! یہ بڑی پرانی بات ہے۔ آپ اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں موجود ہوتا تو انگریزوں کو اپنی کتاب کی نقل کرنے دیتا......؟ اور سراج الدولہ صاحب کو شکست ہونے دیتا؟'' وہ تڑخ کر بولا۔

میں خاموش رہا۔ وہ بے سروپا باتیں کر کے میری توجہ صورتِ حال کی سنگینی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ سنگینی ایک بہت بھاری پتھر کی طرح رات کے سینے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اسے کچل رہی تھی۔

یہ پہاڑ جیسی رات تھی۔ صورتِ حال کی بے یقینی نے اسے مزید گراں کر دیا تھا۔ آخری فائر رات ساڑھے دس بجے کے قریب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی بوگیر کتوں کی آوازیں گونجتی تھیں یا مسلح محافظوں کے بلند آوازے سنائی دیتے تھے۔ اب کم از کم چار جیپیں یہاں موجود تھیں۔ جیپوں کو شفاخانے کے اطراف میں مختلف جگہوں پر کھڑا کر کے ان کے انجن اسٹارٹ رکھے گئے تھے اور ان کی ہیڈ لائٹس کو سرچ لائٹس کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔

عمران واکی ٹاکی سے مسلسل چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ وہ ایک بار پھر آفتاب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو آفتاب؟ تم نے دو بندے اور مار دیئے ہیں۔ تم اپنے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہو۔ تم مرد

گے اور تمہارے ساتھ سلطانہ کی جان بھی جائے گی۔''

''ام مرنے سے نہیں ڈرتا اور نہ سلطانہ بی بی ڈرتا ہے۔ مرنے سے تم جیسا بزدل ڈرتا امارا راستہ ایک دم سیدھا ہے۔ غازی یا شہید۔''

''لیکن بے گناہ نہتے لوگوں کو مارنا کون سا جہاد ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ بے گناہ نہیں، یہ کافر لوگ ہے۔''

''کہاں کہا گیا ہے کہ غیر مسلموں کو اس طرح مارا جا سکتا ہے؟''

''جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ تو کافروں کا ہی بنایا ہوا مقولہ ہے۔''

''ام مقولوں شقولوں کو نہیں جانتا، ام صرف اتنا جانتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو نہیں چھوڑا تو ام ان سب کو اگلے جہان روانہ کرے گا لیکن ام کو لگتا ہے کہ شاید اس کا نوبت نہ آئے۔ یہ بزدل لوگ اندر سے ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ یہ ہاشم صاحب کو چھوڑے گا...... ان کو چھوڑنا پڑے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''دیکھو آفتاب! اگر تم زیادہ سختی دکھاؤ گے تو پھر تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی برداشت کھو دیں اور تم پر حملہ کر دیں۔ ہم نے اپنی طرف سے تمہاری ہوا باندھ رکھی ہے۔ گاؤں کے سرکردہ لوگوں کو یہ بتایا ہوا ہے کہ اندر دو سے زیادہ لوگ موجود ہیں۔ ان کے پاس دھماکا خیز مواد بھی ہے جو انہوں نے مریضوں کے وارڈ میں نصب کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم صرف دو ہو اور رائفل کے علاوہ تمہارے پاس کوئی کارگر ہتھیار بھی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ تم پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا لیں۔''

آفتاب بے پروائی سے بولا۔ ''ان کا جو جی چاہتا ہے کرے لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کچھ کرے گا تو سب کا خانہ خراب ہوگا۔ کم از کم یہ سفید رنگ کی کتیا تو بالکل بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

ایک بار پھر ماریا کے چلانے اور کراہنے کی آواز آئی۔ آفتاب جب بھی اس کا ذکر کرتا تھا، اسے کوئی ٹھوکر وغیرہ بھی رسید کرتا تھا۔

''ڈاکٹر لی وان کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''وہ ایک دم سڑی بڈھا ہے۔ ام اس کا عزت کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے مندر میں تمہارا [illegible]ہن کر کے ام سب کا مدد کیا تا۔ ام نے کل اس سے کہا تھا کہ اگر وہ یہاں سے نکلنا چاہتا

ہے تو ام اسے چھوڑنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ بک بک کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے مریضوں کو اور اپنے اسپتال کو چھوڑ کر یہاں سے نہیں جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ جینا مرنا پسند کرے گا۔ ام نے کہا ٹھیک ہے، اگر تمہاری قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا ہے تو پھر مرو۔''

''اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لگاتار بک بک کر رہا تھا۔ پھر اس نے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ام کو مارنا شروع کر دیا۔ ام نے اسے غسل خانے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا ہے۔ اب اس نے جو واویلا بھی کرنا ہے، اندر ہی کرتا ہے۔''

''تم نے اسے مارا بھی ہے؟''

''اس نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے مار کھایا ہے...... لیکن زیادہ نہیں...... بس ام نے رائفل کے دستے سے ایک چوٹ لگایا ہے اس کی کنپٹی پر۔ ہاں، اگر یہ اپنا منحوس واویلا بند نہیں کرے گا تو اور مار کھائے گا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں طیش نے اندھا کر رکھا ہے آفتاب خاں! ڈاکٹر لی وان ایک خدا ترس شخص ہے۔ اس نے اس دور دراز علاقے میں یہ اسپتال بنایا ہے...... ہر مہینے بارہ چودہ گھنٹے کا مشکل سفر کر کے یہاں پہنچتا ہے۔ ضرورت مندوں کا مفت علاج کرتا ہے۔ ان ضرورت مندوں میں مسلمان بھی ہوتے ہیں......''

''لیکن وہ خود تو کافر ہے نا...... اور کافر کافر ہی ہوتا ہے...... کافر ہی ہوتا ہے۔'' آفتاب کے لہجے میں پھر آگ بھڑک اُٹھی۔

شاید یہ بحث طول کھینچتی مگر عمران نے مداخلت کی اور آفتاب سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ایک بار سلطانہ کی بات ہم سے کرا دے۔ پہلے تو آفتاب نہیں مانا لیکن پھر اس نے رائے بدل لی۔ شاید دوسری طرف یعنی سلطانہ کی طرف سے بھی ایسی خواہش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ واکی ٹاکی لے کر نیچے جا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سلطانہ سے بات کراتا ہے۔

دور ناگ پھنی اور کیکر کے درختوں کے پیچھے بہت سی روشنیاں حرکت کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ فوجیوں کو مزید کمک مل گئی ہے اور گھیرا مضبوط کیا جا رہا ہے۔ آنے والی گھڑیوں میں یہاں کیا ہو گا، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں سلطانہ کی پژمردہ آواز واکی ٹاکی کے اسپیکر پر اُبھری۔ ''مہروج...... مہروج! آپ میری آواج سن رہے ہیں؟''

''ہاں سلطانہ! میں سن رہا ہوں۔'' میری آواز میں خود بخود درد لہریں لینے لگا۔

''آپ کہاں ہو مہروج؟''

''تمہارے آس پاس ہی ہوں اور تم کہاں ہو؟''

''مم...... میں یہاں اسپتال کے اندر۔''

''اور کوئی ہے تمہارے پاس...... میرا مطلب ہے آفتاب خاں کہاں ہے؟''

''وہ چلا گیا ہے۔ اس وخت (وقت) میں اکیلی ہوں۔'' سلطانہ کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! ایسا کیوں کیا تم نے؟ کیوں مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھا؟ میں تمہارا شوہر تھا سلطانہ...... تمہارا شریکِ زندگی...... تم نے اتنا بڑا جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم ان لوگوں کا حصہ تھیں جن میں آفتاب، ہاشو اور گلزار بی بی جیسے خطرناک قاتل شامل ہیں لیکن تم نے میرے سامنے ایک گھریلو عورت کا روپ بنائے رکھا۔ تم نے مجھے بتایا کہ تمہاری زندگی مجھ سے اور بالو سے شروع ہو کر ہم دونوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے...... ایسا کیوں کیا تم نے؟''

جواب میں سلطانہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم نے ہر قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے سلطانہ۔ یہاں تک کہ پرسوں رات کو بھی تم نے بس مندر سے میرے جانے کا ہی انتظار کیا اور پھر آفتاب کے ساتھ اپنے کام پر نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ سب کیا تھا سلطانہ؟''

دوسری طرف سے چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی۔ تب مدھم سسکی کی آواز اُبھری۔ سلطانہ نے کہا۔ ''اپنی صفائی میں کہنے کے لئے میرے پاس کچھ ناہیں ہے مہروج! میں بس آپ سے مافی اِچ مانگ سکتی ہوں۔ اتنا جرور کہوں گی کہ میں جو کچھ ہوں، پہلے سے ہوں۔ اس وخت آپ بھی میری جندگی میں ناہیں آئے تھے۔''

''لیکن تم کیا ہو؟ مجھے تو پتا چلے سلطانہ...... میں جسے اپنی بیوی کہتا رہا ہوں، وہ اصل میں ہے کیا؟''

''وہ آپ کی بیوی اِچ ہے۔'' وہ جذباتی انداز میں بولی۔ ''اور آپ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ...... آپ...... سوچ بھی ناہیں سکتے...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

وہ گمبھیر توقف کے بعد بولی۔ ''میں جو کچھ ہوں، مجھے حالات نے بنایا ہے مہروج! جب حکم جی اور جارج گورے جیسے حاکم تقدیروں کے مالک بن جاتے ہیں، لوگن پر جلم

ڈھاتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، راہ چلتی عورتوں کو بری نجر سے دیکھتے اور انہیں بے عزت کرنا چاہتے ہیں، تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے بہت جلم سہا ہے مہروج! ہم راجپوت ہیں، ہمارا دوش بس یہ تھا کہ ہم حکم اور گورے جیسے لوگن کی من مانیوں کے سامنے سر ناہیں جھکاتے تھے۔ شاید کسی وخت ہم ہار ہی جاتے لیکن پھر ہمیں ہاشم صاحب جیسا آسرا مل گیا۔ ہاشم صاحب وہ سب کچھ کر سکتے تھے جو ہم ناہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا، خفیہ ٹھکانے تھے اور بڑے نڈر ساتھی بھی تھے۔ ہاشم صاحب گونگے ملازم کے روپ میں ہمارے گھر رہنے لگے تھے۔ صرف میں، میرے ابا جی اور بھائی نبیل جانتے تھے کہ ہاشم صاحب کیا ہیں۔''

''سلطانہ! تم میری شریکِ زندگی ہونے کا دعویٰ کرتی رہیں اور مجھے اتنی اہم باتوں سے بے خبر رکھا؟''

''میں نے کئی بار سوچا مہروج کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں لیکن ہر بار ڈر گئی۔ مجھے لگا کہ میں آپ کو کھو دوں گی۔ آپ مجھ سے بہت دور چلے جائیں گے۔ میں یہ ناہیں کہتی مہروج کہ میں نے ہاشم صاحب کے کہنے پر جو کچھ کیا، وہ سب ٹھیک اِچ تھا لیکن وہ سب کچھ غلط بھی ناہیں تھا۔ یہ ان گوروں کا کٹھ پتلی حکم جی، کم جور مسلمانوں پر جس طرح کے جلم ڈھا رہا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔ ہاشم صاحب اور ان کے ساتھی اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ کہیں ان سے جیادتی بھی ہو جاتی ہوئے گی مگر جیادتیاں تو دونوں طرف ہو رہی ہیں۔''

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''زرگاں جانے سے پہلے میں نے تم سے کیا کہا تھا سلطانہ؟ میں نے کہا تھا کہ...... اب میں ہوں...... اب اپنے سارے غم دکھ مجھے دے دو۔ ایک بیوی کی طرح گھر کی چار دیواری میں آ جاؤ۔ میں تمہارے ہر دکھ کا مداوا کروں گا، تمہارے سارے آنسو پونچھوں گا۔ میں نے کہا تھا نا؟''

وہ ایک بار پھر سسک اُٹھی۔ چند لمحے بعد رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے انکار ناہیں ہے مہروج! آپ نے کہا تھا اور آپ اپنے کہے کا پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ اب وہی کچھ کروں جو آپ چاہتے ہیں لیکن قدرت کو شاید یہ منجور ناہیں تھا۔ میں آپ کے لئے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی مہروج! لیکن ایک آخری کام مجھے کرنا تھا...... اور...... یہ کوئی جیادہ خطرناک کام بھی ناہیں تھا۔ لل...... لیکن ہم پھنس گئے مہروج...... اور اب جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ اگر......'' اس کی آواز بیٹھ گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''وہاں مندر میں کیا ہوا تھا؟'' میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ''میں اس بڑے کمرے کی طرف جا رہی تھی جہاں [illegible]ایا جاتا ہے۔ وہیں پر مجھے گلزار سے ملنا تھا مگر راستے میں ایک بار پھر تلاشی ہو گئی۔ اس [illegible] میں بڑی گوپی کو میرے کپڑوں میں چھپے لفافے کا پتا چل گیا۔ اس نے لفافہ نکال لیا اور [illegible] نے کی کوشش کی۔ پاس ہی ایک چھری پڑی تھی۔ میں نے چھری اٹھائی اور بھاگ [illegible] تین لوگن میرے راستے میں آئے۔ میں نے ان پر وار کیا اور پھر ایک بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں چڑھ گئی۔ اس وخت مجھے بالکل جانکاری ناہیں تھی کہ آفتاب خاں بھی مجھ سے مل جائیں گے۔ گھوڑا گاڑی کھیتوں میں تھوڑا اِچ آگے گئی تھی کہ وہ ایک طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔''

''اسے پتا تھا کہ تم گھوڑا گاڑی میں ہو؟''

''ہاں، اس نے مجھے گاڑی میں چڑھتے دیکھ لیا تھا......''

اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خبر نہیں کہ سگنل آنا بند ہو گئے تھے یا پھر ویسے ہی واکی ٹاکی آف کر دیا تھا۔

میں اور عمران کوشش کرتے رہے لیکن دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوا۔ سلطانہ سے گفتگو شروع کرنے سے پہلے درختوں کے درمیان جو متحرک روشنیاں نظر آئی تھیں، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں حکم کے گارڈز اور سپاہیوں کو کافی بڑی کمک مل گئی ہے۔ ایک طرف آفتاب کہہ رہا تھا کہ اس کا مطالبہ مانا جانے والا ہے اور بہت جلد ماریا کے بدلے میں ہاشم رازی کو رہا کر کے یہاں پہنچایا جانے والا ہے...... جبکہ دوسری طرف اسپتال کا گھیرا مضبوط تر کیا جا رہا تھا۔ حالات تیزی سے پینترے بدل رہے تھے۔ سلطانہ سے بات کرنے کے بعد میں بالکل گم صم ہو گیا تھا۔ رگ و پے میں تاریکی سی اُتر گئی تھی۔ سلطانہ وہ ہستی تھی جس نے مجھے نئے سرے سے جینا سکھایا تھا۔ ثروت کے بے پناہ غم کو بھلانے میں اس کی سحر انگیز شخصیت نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ نڈر، بے دھڑک اور اپنے پیاروں پر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی۔ وہ جب میرے پاس ہوتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مرکز و محور بس میں ہی ہوں لیکن یہ غلط نکلا تھا۔ ایک بہت بڑا بھرم ٹوٹا تھا اور اس کے ٹوٹنے نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔

''کوئی آ رہا ہے۔'' عمران کی سرگوشی نے مجھے ایک دم خیالوں سے چونکا دیا۔

میں نے کان لگا کر سنا۔ گنے کے پودوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ پچیس [illegible] قدم دور تھی تاہم اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ گہری تاریکی میں ہم کچھ دیکھنے کے

قابل تو نہیں تھے لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ ایک سے زیادہ افراد ہیں۔ عمران نے رائفل کو تیار حالت میں کر لیا۔ میں بھی چوکس ہو گیا۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ اگر کوئی دیہاتی اپنی ''حاجت روائی'' کے لئے آیا ہوتا تو اکیلا ہوتا......

ہم دم سادھ کر بیٹھ رہے اور سرسراہٹ کا اُتار چڑھاؤ سنتے رہے۔ آنے والوں کی خوش قسمتی یا بدقسمتی انہیں ہمارے بالکل قریب لا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کسی بھی لمحے وہ ہمارے سامنے ہوں گے...... لیکن پھر اچانک ہم سے صرف چھ سات میٹر کے فاصلے پر سرسراہٹ رک گئی۔ ایک باریک ڈری ڈری نسوانی آواز اُبھری۔ ''کیا ہوا جی؟''

''بس یہیں بیٹھ جاوت ہیں۔'' ایک مردانہ آواز نے جواب دیا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی لڑکی لڑکا ہیں۔ پودوں کے درمیان سے ہمیں ان کے موہوم سے ہیولے بھی دکھائی دیئے۔ لڑکا شاید بیٹھنے لگا تھا مگر نوجوان لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ''ناہیں جی...... آپ کے کپڑے خراب ہوویں گے۔ میں اپنی چادر بچھا دیوت ہوں۔''

نوجوان لڑکا منع کرتا رہا مگر لڑکی نے ہموار جگہ پر اپنی اوڑھنی بچھا دی۔ پھر نوجوان غالباً بیٹھ گیا مگر لڑکی کھڑی رہی۔ ''بیٹھو نا تم بھی۔'' نوجوان نے کہا۔

''نن...... ناہیں جی...... آپ کھتری ہیں، میں شودر...... میں آپ کے برابر بیٹھوں گی تو مجھ کو پاپ لگے گا۔''

''ناہیں...... کچھ ناہیں ہوگا۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں...... بیٹھ جاؤ۔'' پھر شاید نوجوان نے لڑکی کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہم سے اتنے قریب تھے کہ اگر ہم حرکت کرتے یا اونچی سانس بھی لیتے تو شاید انہیں شک ہو جاتا۔

لڑکی مسکین آواز میں بولی۔ ''باپو کہوت ہیں کہ ہم لوگن کا سایہ بھی آپ پر ناہیں پڑنا چاہیئے۔ آپ کی پوترا بھرشٹ ہو جاوت ہے۔''

''لیکن یہ تو کالی رات ہے چمپی! اس میں تو سایہ ہوتا ہی ناہیں اور ویسے بھی میں تم سے کہوت ہوں کہ یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں۔ بھگوان نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ ذات پات، یہ اونچ نیچ کی سیڑھیاں، یہ سڑی ہوئی رسمیں، یہ سب کچھ تو ہمارا بنایا ہوا ہے۔''

''ناہیں جی! باپو کہوت ہیں ایشور نے سب کو ایک جیسا ناہیں بنایا۔ کوئی آپ کی طرح عقل مند اور شکتی والا ہے، کوئی ہماری طرح کم عقل اور کم جور ہے۔ کوئی پیسے والا ہے، کوئی گریب، کوئی گورا، کوئی کالا، کوئی مالک کوئی چاکر...... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سنسار ہی ناہیں چل

ماتا تھا۔''

''سارے پرانے لوگن کی طرح تمہارے باپو کے دماغ میں بھی بھس بھرا ہوا ہے چمپی! ...ہا ور ہے۔ کبھی کسی بڑے شہر میں جا کر دیکھو۔ چھوٹی سے چھوٹی جاتی کے لوگن بھی پڑھ لکھ ...ر بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ بڑی جاتیوں کے ناکارہ لوگن ان کی نوکری کرنے پر مجبور ...ہو جاوت ہیں۔ ہمارے دھرمی مہاشوں نے دھرم کو توڑ موڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب دیکھو، یہ جو کچھ ہمارے گاؤں میں ہو رہا ہے اس کا کارن بھی تو یہی ظلم اور انیائے ہے نا۔ حکم جی ان سفید پگڑی والوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ پھر ان مسلمانوں میں سے کچھ سر پھرے خون خرابا شروع کر دیوت ہیں۔''

''چھوٹے مالک! مجھ کو تو بڑا ڈر لگت ہے۔ میری دیدی کا دیور بھی اسپتال کے اندر ہے۔ دیدی کی ساس اور سسر کل سے رو رہے ہیں۔ کچھ لوگن اب کہوت ہیں کہ فوجی کبھی بھی اندر والوں کی بات ناہیں مانیں گے۔ وہ ایک دم اندر گھس جاویں گے اور پھر بہت خون خرابا ہو جاوے گا......''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر نوجوان کی آواز اُبھری۔ ''چلو چمپی! چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تو سب اندازے ہی ہیں۔ جو کچھ ہوگا، سامنے آ جاوے گا۔ تمہیں ٹھنڈ تو ناہیں لگ رہی؟''

''ناہیں جی۔''

''پر تمہارے گال تو ٹھنڈے ہیں۔''

''ہائے رام...... ایسا نہ کرو مالک۔ آپ کو پاپ لگے گا۔''

''تمہیں چھونے سے مجھے پاپ لگے گا؟'' وہ مسکراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تو اور کیا مالک! آپ پلید ہو جائیں گے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''تو تمہیں چھوؤں گا ناہیں تو پریم کیسے کروں گا؟''

''مم...... مجھے بہت ڈر لگت ہے جی۔ آپ...... مجھے کپڑوں کے اوپر سے ہاتھ لگا لیں۔''

''چلو کہیں کہیں ایسا بھی کر لیں گے لیکن پاس تو آؤ نا۔'' پھر شاید اس نے چمپی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لوگن کو پتا لگ گیا تو میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ میں آپ کے چرن چھوتی ہوں، مجھے شما کر دیں۔''

''دیکھو، غلطی میں کر رہا ہوں اور شما تم مانگ رہی ہو۔ اس کو کہوت ہیں الٹی گنگا......

ویسے میں نے ایک دن پنڈت جی سے پوچھا تھا۔ وہ کہوت تھے کہ اگر نیچی ذات کی ناری اونچی ذات کے مرد کو سیوا (خدمت) کی نیت سے چھوئے گی اور ناری صاف ستھری بھی ہووے گی تو پھر پاپ ناہیں لگے گا۔ تم یہ سمجھو کہ تم سیوا کر رہی ہو۔“

”لل...... لیکن...... مالک......“ پھر شاید نوجوان نے لڑکی کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے ڈھانپ دیا تھا، اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

وہ دونوں اب زمین پر بچھی چادر پر لیٹ گئے تھے۔ ان کی ہانپی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ منمنائی۔ ”آپ ایسا نہ کریں۔ آپ کو صبح اپنے پتا کے ساتھ مندر جانا ہے۔ میرے انگ سے لگ کر آپ پلید ہو رہے ہیں۔“

”یہ کوئی پلیدی ناہیں ہے۔ میں اشنان کر لوں گا۔“

”بڑے پجاری جی کہوت ہیں، ایسی پلیدی اشنان سے دور ناہیں ہوتی۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں بڑے پجاری کو بھی۔ چار سال پہلے بھنگن کی بیٹی کو جو جڑواں بچے ہوئے تھے اور مر گئے تھے، وہ اسی پجاری کے تھے......“

”ہائے رام! آپ کیسی باتیں کرت ہیں؟“ اچھوت لڑکی لرز کر بولی۔

کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے رہے پھر لڑکی خود کو اپنے پریمی کی بانہوں سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گئی...... ”بس مالک! اب مجھ کو جانے دو۔ کچھ دیر میں پو پھٹ جاوے گی پھر میرا جانا مشکل ہو جاوے گا۔“

دونوں اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ نوجوان اسے چوم کر بولا۔ ”مجھ سے پریم کرتی ہو نا؟“

”وہ کچھ دیر چپ رہی پھر دبی آواز میں بولی۔ ”بہت زیادہ...... لیکن اس پریم کا انت کیا ہووے گا؟“

”میں تم سے بیاہ کروں گا۔“

”یہ کیسے ہو سکت ہے جی؟ میں آپ کی باندی تو بن سکت ہوں، پتنی ناہیں۔“

”میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔ ہم دونوں نل پانی چلے جاویں گے۔ وہاں ڈنکے کی چوٹ پر بیاہ کریں گے۔“

وہ دو چار منٹ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر لڑکی نے اوڑھنی جھاڑ کر اپنے سر پر لی اور کھیت سے نکل کر چلی گئی۔ نوجوان وہیں رکا رہا۔ وہ شاید لڑکی کے ساتھ ہی کھیت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہیولا نظر آیا لیکن وہ واپس جانے کے بجائے تھوڑا سا آگے آیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے لئے کوئی اچھا گنا منتخب کرنا چاہ رہا ہو یا پھر

شاید وہ ویسے ہی نظر دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً اسے ہماری موجودگی کے بارے میں شک ہو گیا۔ وہ ذرا ٹھٹکا پھر اس نے تیزی سے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ قمیص کے نیچے سے اپنا دیسی ساخت کا ریوالور نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”کون ہے؟“

عمران تڑپ کر اس پر جا پڑا۔ اس نے پھرتی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر وہ تین چار گنا زیادہ پھرتیلا بھی ہوتا تھا شاید عمران سے بچ نہ سکتا۔ وہ عمران کے نیچے عین اس جگہ پر گرا جہاں کچھ دیر پہلے وہ چمپی کے ساتھ موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے چمپی اس کے نیچے تھی، اب وہ خود کسی کے نیچے تھا۔ عمران نے دائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور بائیں ہاتھ سے اس کی وہ کلائی پکڑ لی جو قمیص کے نیچے تھی۔ اس نے نیچے پڑے پڑے عمران پر مکا چلایا جو خالی گیا۔ عمران نے جواباً اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ تکلیف سے دُہرا ہو گیا۔ عمران نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا اور اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جدوجہد فضول ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ ماچس کی تیلی روشن کر کے ہم نے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس نے مقامی انداز کی سفید دھوتی قمیص پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ حلیے سے کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا۔ ”یہ کون سی فلم کا سین ہو رہا تھا یہاں؟“ عمران نے اس کی گردن میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

”مم...... میں تو پیشاب کرنے آیا تھا۔“

”پیشاب کرتے ہوئے تم باتیں بہت کرتے ہو...... ہم سب کچھ سن رہے تھے۔“ عمران نے جواب دیا۔

وہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے سب کچھ مان لیا۔ اس نے اپنا نام بھرت کمار بتایا۔ وہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا ابھی یہاں اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ ان کی حویلی کے ایک غریب نوکر کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے سچا پریم کرتا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

بھرت نامی اس نوجوان کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ہم دونوں کی یہاں موجودگی پر بھی حیران تھا۔ میں اور عمران اس سے مقامی دیہاتیوں کے انداز میں، باتیں کرتے رہے لیکن وہ ہمارے اس انداز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ غالباً اسے شبہ لگا کہ ہمارا تعلق نل پانی سے یا پھر حکم کے دیگر مخالف لوگوں سے ہے اور ہم یہاں ”اٹھرا“ گاؤں میں ہونے والے واقعات کی ٹوہ لے رہے ہیں۔

بھرت نامی اس نوجوان سے ہمیں تازہ ترین صورتِ حال معلوم ہوئی اور یہ تشویش ناک تھی۔ اس نے بتایا کہ اسپتال کی عمارت کے اندر جن حملہ آوروں نے لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے، ان میں مختار راجپوت کی خطرناک بیٹی سلطانہ بھی شامل ہے۔

ہمارا یہ بدترین اندیشہ درست ثابت ہوگیا تھا کہ بہت جلد ان لوگوں کو یہاں سلطانہ کی موجودگی کا علم ہوجانا ہے۔ اس انکشاف کی تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''حکم جی کے لوگن پہلے ہی سلطانہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو بھی پتا ہووے گا کہ کچھ مہینے پہلے سلطانہ نے زرگاں میں گھس کر چار اہم بندوں کو جان سے مار دیا تھا۔ ان میں موہن کمار بھی تھا جسے یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا تھا لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ سلطانہ کسی خطرناک گروہ میں بھی شامل ہے۔ کل یہ ایک زہریلا لفافہ لے کر پونم پور کے مندر میں گھسی تھی۔ وہاں یہ لفافہ اس نے کسی ایسی عورت کو دینا تھا جو اسے پرشاد کے حلوے میں ملا سکے...... تلاشی میں لفافے کا پتا چل گیا اور سلطانہ دو بندوں کو گھائل کر کے وہاں سے بھاگ نکلی۔ اب سوال یہ تھا کہ سلطانہ زہر والا لفافہ کس کو دینا چاہت تھی۔ مندر والوں کو تین عورتوں پر شک تھا۔ ان تین عورتوں کو باری باری ٹیکا لگایا گیا اور ان میں سے ایک نے اپنا اپرادھ قبول کرلیا۔''

''ٹیکا لگایا گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہی درد والا ٹیکا جو حکم کے سپاہی لگاتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے، دو چار منٹ میں پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔''

میں اور عمران سمجھ گئے کہ بھرت اسی منحوس انجکشن کی بات کر رہا ہے جو دو ڈھائی ماہ پہلے ہم نے میڈم صفورا کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں میں اس انجکشن کے حوالے سے بڑا ہراس پایا جاتا تھا۔ بھرت نے روانی میں اپنی بات جاری رکھی اور بتایا کہ جرم کا اعتراف کرنے والی ایک شوبھا نام کی عورت ہے لیکن اس کا اصل نام گلزار معلوم ہوا ہے۔ یہ ٹانگوں سے معذور ہے اور مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ اس نے مانا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ، اسی کو زہر کا پیکٹ دینے کے لئے مندر میں گھسی تھی۔

بھرت کے اس انکشاف کے بعد کہ سلطانہ کو پہچانا جاچکا ہے، یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آ گئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں فوجیوں کی مزید کمک کیوں آئی ہے اور گھیرے کو مضبوط کیوں کر دیا گیا ہے۔ اب یہ زبردست تناؤ والا معاملہ بن چکا تھا۔ ایک طرف ماریا کی زندگی تھی اور دوسری طرف سلطانہ کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا معاملہ تھا۔

بھرت نامی اس کھتری نوجوان نے بتایا۔ ''رات گیارہ بجے کے قریب ہی یہ خبر ہر طرف

جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ اسپتال کے اندر حملہ آوروں میں جو لڑکی ہے، وہ مختار راجپوت کی بیٹی ہے۔ اب علاقے کے ہندوؤں...... میں بہت جوش پایا جاتا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ مختار کی بیٹی کو کسی صورت بھی نل پانی کی طرف جانے کی آگیا نہیں دینی چاہئے۔ اسے پکڑ لینا چاہئے اور اس کو اس کے کرموں کی سزا ملنی چاہئے لیکن کچھ لوگن یہ بھی کہوت ہیں کہ ایسا ناہیں ہو سکے گا۔ حکم جی انگریزوں کی مرضی کے خلاف ناہیں چل سکتا اور انگریز بالکل بھی ناہیں چاہیں گے کہ سلطانہ کو مار دینے کے چکر میں اسٹیل گورا صاحب کی پتنی ماریا بھی ماری جاوے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا کیا خیال ہے...... کیا ہونا چاہئے؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نئی نسل کے ان لوگن سے ہوں جو دھرم کے کٹر پن کو اچھا ناہیں سمجھتے۔ اگر سلطانہ نے زرگاں میں چار لوگن کو مار کر اپرادھ کیا تو حکم اور جارج نے بھی دھرم کی آڑ میں سلطانہ کو پری بنانے اور رکھیل بنانے کی کوشش کر کے اپرادھ کیا تھا۔ سب کو پتا ہے کہ اب تک ساتویں کے جشن کے نام پر راجواڑے کی سیکڑوں لڑکیاں ''پری'' بن کر عزت گنوا چکی ہیں۔ حکم اور اس کے غیر ملکی دوست ان پریوں کے پر نوچ کر انہیں ہمیشہ کے لئے راج بھون کی غلام گردشوں اور تہ خانوں میں سسکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ دکھ سہہ سہہ کر مر جاوت ہیں اور کچھ پرانی ہو کر نچلے درجے کے عہدیداروں کا کھلونا بن جاوت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر سلطانہ نے اس انجام سے بچنے کی کوشش کی تو کچھ غلط ناہیں کیا۔ اگر اس کے اس اپرادھ کے کارن کچھ لوگن اسے زندہ جلانا چاہت ہیں تو وہ خود بہت بڑے اپرادھی ہیں۔''

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں ہمیں یقین ہوگیا کہ بھرت نامی یہ نوجوان، نئی پیڑھی کے ان لوگوں میں سے ہے جو دھرم کو موم کی ناک بنانے والے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی سے پیدا ہونے والی تمام خرافات کو دل سے برا جانتے ہیں۔ یہ نوجوان ہمیں اپنے لئے بالکل بے ضرر محسوس ہو رہا تھا۔

بھرت ہمیں مسلسل کھوجنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ''دیکھیں، میں نے آپ کو اپنے بارے میں ساری جانکاری دے دی ہے لیکن آپ نے ابھی تلک کچھ ناہیں بتایا۔ مم...... میرا مطلب ہے کہ آپ ہیں کون؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کون ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کھیت مزدور ناہیں

ہو اور نہ ہی آپ کا تعلق اس علاقے سے ہے۔ شش...... شاید آپ نل پانی سے آئے ہیں...... اور...... کسی خاص کام سے یہاں پر ہیں۔"

"کس قسم کا خاص کام؟" عمران نے دریافت کیا۔

"کہیں آپ کا تعلق چھوٹے سرکار کے سپاہیوں سے تو ناہیں؟ میرا مطلب ہے، کچھ لوگن خفیہ جانکاریاں لینے کے لئے بھی تو نل پانی سے یہاں آوت ہیں۔"

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری پہلی بات تو درست ہے کہ ہمارا تعلق نل پانی سے ہے لیکن اگر تم ہمیں جاسوس وغیرہ سمجھ رہے ہو تو یہ غلط ہے۔ تمہاری طرح ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس خون خرابے کو برا سمجھتے ہیں۔ ہمیں کل دوپہر یہ اڑتی اڑتی سی خبر ملی تھی کہ "پونم پور" کے مندر میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے۔ ہم اسی بارے میں جاننے کے لئے اس علاقے میں آئے تھے کہ یہاں اس گاؤں میں بھی ہنگامے کا پتا چلا۔"

بھرت نے کہا۔ "بھائی صاحب! یہ سارا علاقہ بڑا شانتی والا تھا۔ کوئی ہلچل ناہیں تھی کیونکہ یہ نل پانی سے دور ہے اور زرگاں سے بھی۔ یہاں حکم جی کا بھی زیادہ اثر رسوخ ناہیں ہے لیکن زرگاں چونکہ ذرا کم دور ہے، اس لئے حکم کے سپاہی یہاں نظر آتے رہوت ہیں۔ گڑبڑ اس وقت سے ہوئی ہے جب سے زرگاں میں سامبر والا مقابلہ ہوا ہے۔ آپ لوگن کو بھی پتا ہووے گا، اس مقابلے کی گونج پورے راجوڑے میں [illegible]...... سلطانہ کے پاکستانی پتی سے جارج گورا کے ہارنے اور [illegible] اطلاع نے سب کو ہکا بکا کر ڈالا ہے۔ اب کچھ لوگن کا کہنا ہے کہ سلطانہ کا پتی اور اس کا پاکستانی ساتھی جیت تو گئے تھے مگر حکم جی وغیرہ انہیں چھوڑنا ناہیں چاہت تھے۔ صرف دھرم کی مانگ پوری کرنے کے لئے انہیں عارضی طور پر چھوڑا گیا تھا...... انہوں نے اس عارضی چھوٹ کا زبردست فائدہ اٹھایا اور چکما دے کر نکل بھاگے۔ اب زیادہ لوگن کا خیال یہی ہے کہ وہ ابھی نل پانی واپس ناہیں پہنچے اور اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ جیپ سوار فوجی ان کی تلاش میں بھاگ دوڑ کرتے رہوت ہیں۔ اب یہ دوسرا واقعہ مختار راجپوت کی بیٹی والا ہو گیا ہے۔ خون خرابا ہوا ہے اور ابھی لوگن کو اور زیادہ خون خرابے کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "بھرت! تمہاری کیا رائے ہے...... اس معاملے کا انجام کیا ہونا چاہئے؟" اب میں اور عمران پہلے کی طرح بھرت سے مقامی لہجے میں بات نہیں کر رہے تھے۔

بھرت نے بے تکلفی سے عمران کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اس کے دو کش لئے اور

پھر پُرسوچ نظروں سے گاؤں کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے مدھم خدوخال دیکھ سکتے تھے۔ اوس سے بھیگے ہوئے کھیت میں خنکی بہت بڑھ چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد بھرت نے کہا۔ "میری تو بھگوان، اللہ اور واہگرو سے یہی پرارتھنا ہے کہ یہ معاملہ شانتی سے حل ہو جاوے۔ سلطانہ اور میم (ماریا) دونوں کا جیون بچ جاوے۔ حملہ آور جو بندہ مانگ رہے ہیں، انہیں دے دیا جاوے، اس طرح میم بھی مرنے سے بچ جاوے گی اور سلطانہ بھی زندہ سلامت یہاں سے نکل جاوے گی۔ پر پتا ناہیں کیوں لگت ہے کہ کچھ لوگن ایسا ناہیں ہونے دیویں گے۔ وہ چاہت ہیں کہ ایسا نہ ہو۔"

"وہ لوگ کون ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"حکم کے اردگرد کے کچھ لوگ ہی ہیں۔ اس کے چند فوجی افسر، کچھ مذہبی سوچ رکھنے والے رشتے دار، پنڈت مہاراج اور اس کے کچھ ساتھی...... اور ایک بڑی کڑک بڑھیا بھی۔"

بڑھیا کے ذکر پر میں اور عمران چونکے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا دھیان سیدھا مالا کی دادی ساس پر گیا۔ "تم کس بڑھیا کی بات کر رہے ہو؟" میں نے بھرت سے پوچھا۔

"ہے ایک...... اس نے آج کل بڑا اودھم مچایا ہوا ہے زرگاں میں۔ بے شمار بے وقوف اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ پتا ناہیں اسے کس کس دیوی کا نیا روپ قرار دے رہے ہیں۔ زرگاں میں اس بڑھیا کی ضد تھی کہ سلطانہ کے پاکستانی پتی کو جارج گورے سے مقابلے کی آگیا نہ دی جاوے بلکہ اس سے ایک بڑے اپرادھی کا سلوک ہو اور اس کو مار پیٹ کر اس سے اس کی اپرادھن پتنی کا پتا ٹھکانا پوچھا جاوے لیکن پنڈتوں نے کہا کہ سلطانہ کا پتی چونکہ جارج گورے کو سامبر کی دعوت دے چکا ہے، اس لئے اسے قید میں ناہیں رکھا جا سکتا۔ تقریباً سارے پنڈتوں کا خیال یہ تھا کہ سلطانہ کا پتی سامبر مقابلہ ہار جاوے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی پتنی کا کھوج دینے پر بھی مجبور ہو جاوے گا لیکن ہو گیا، اس کے الٹ۔ اس پر اس بڑھیا نے زبردست واویلا مچایا تھا اور مرن برت رکھ لیا تھا۔ اس مرن برت میں بھوک پیاس کی وجہ سے یہ بڑھیا دم پخت ہو گئی۔ لوگن نے سمجھا کہ یہ بھگوان کو پیاری ہو گئی ہے۔ انہوں نے مشتعل ہو کر خوفناک ہنگامہ کر دیا۔ اس ہنگامے میں قریباً تیس نردوش مسلمان زندہ جل گئے لیکن بعد میں اسپتال جا کر پتا چلا کہ فساد کی جڑ ابھی جوں کی توں موجود ہے۔ بڑھیا زندہ تھی۔ لوگن نے اس کو بھی چمتکار قرار دیا۔ اس کو چاندی میں تولا گیا اور اب اسے "بڑی ماتا" کا خطاب دے دیا گیا ہے۔ زرگاں کے ہزاروں لوگن اسے کسی سوامی کی سی عزت دے رہیں۔ یہ ہے ہم لوگن کی سمجھ بوجھ۔"

''یہ بڑی ماتا اب کیا فرماتی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کی بس ایک ہی ہٹ ہے۔ کہتی ہے کہ میں نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو سزا دلوانے کے لئے اپنا پورا پریوار قربان کر دیا ہے۔ اس کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔ نہ ملے گی تو زرگاں پر تباہی اور بربادی آوے گی۔ یہاں کی گلیوں میں لوگن کی لاشوں پر کتے بلیاں منہ ماریں گے۔ بس اسی طرح کی پیش گوئیاں کرت ہے۔ یہ بڑی کٹر اور خرانٹ بڑھیا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانت ہوں۔ اس کی ایک قریبی رشتے دار ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ وہ آج کل بھی یہاں ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بڑھیا کی بہو کی بہو۔ مالا نام ہے اس لڑکی کا۔ تھوڑا پڑھی لکھی بھی ہے۔ اچھے برے کی سمجھ بوجھ رکھتی ہے لیکن اس کی قسمت کہ بیاہ کر سخت کٹر گھرانے میں چلی گئی۔''

مالا کے نام نے مجھے اور عمران کو چونکایا۔ وہ اجلے چہرے والی روشن خیال لڑکی جو اپنے کٹر سسرالی گھرانے سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ جب فتح پور کے پرانے مندر میں بڑھیا کا ادھیڑ عمر بیٹا آزمائش میں ناکام ہوا اور اس کے [illegible] تیل میں جھلس گئے تو وہاں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ اس ہنگامے کے بعد سے مالا اور اس کا شوہر ستیش غائب تھے۔ آج اتنے دنوں بعد مالا کے بارے میں کوئی خبر ملی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم بھرت نامی اس نوجوان سے مالا کے بارے میں کچھ اور پوچھتے، ایک بار پھر اسپتال میں سیون ایم ایم رائفل گرجی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں میں ہلچل نظر آئی......

اب رات کا اندھیرا کافی حد تک اجالے میں ڈھل چکا تھا۔ اردگرد کے سارے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ فائر کے فوراً بعد اسپتال کے اردگرد موجود سپاہیوں اور گارڈز نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں لگا کہ یہ لوگ اسپتال پر ہلا بول دیں گے اور سب کچھ ختم ہو جائے گا مگر پھر ایک دم قدرے ٹھہراؤ محسوس ہوا۔ ہم نے دو تین انگلش فوجی افسروں کو دیکھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور مقامی فوجیوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ ان کے حکم پر مقامی فوجی اور گارڈز وغیرہ رک گئے۔ نہ صرف رک گئے بلکہ تھوڑا پیچھے بھی ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد پھر وہی منظر دہرایا گیا جو ہم اس سے پہلے دو بار دیکھ چکے تھے۔ عورتوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ چار پانچ افراد ایک چارپائی لے کر احاطے میں گئے اور ایک لاش اُٹھا کر باہر لے آئے۔ اس بات میں کوئی

شبہ نہیں رہا تھا کہ سرپھرے آفتاب خاں نے اپنی خوفناک دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک اور یرغمالی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔

''کہیں ڈاکٹر لی وان ہی نہ ہو۔'' عمران نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''لیکن جس طرح مقامی عورتیں رو پیٹ رہی ہیں، شاید کوئی مقامی ہی مرا ہے۔'' میں نے کہا۔

میں نے بھرت کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظر کا انداز سمجھ کر بولا۔ ''اگر آپ کہو تو میں جا کر ٹھیک جانکاری لے آتا ہوں؟''

میری اور عمران کی نگاہیں ملیں۔ یقیناً ہم دونوں ہی بھرت کو بھروسے کے قابل سمجھ رہے تھے۔ وہ ہمیں اپنا ہم خیال لگ رہا تھا اور یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عمران نے اس کا دیسی ریوالور بھی واپس کر دیا۔

O......❖......O

اب اجالا پھیل گیا تھا۔قرب وجوار کی ہر شے روشن تر تھی۔گاؤں کی گلیوں میں بہت سی جیپیں اور فوجی گھڑسوار نظر آ رہے تھے۔انہوں نے اسپتال کے گرد مختلف جگہوں پر پوزیشنیں بھی لی ہوئی تھیں۔عام لوگوں کو اسپتال کی عمارت سے بہت دور ہٹا کر راستوں کی ناکا بندی کر دی گئی تھی۔اسپتال کے اردگرد کے تمام مکانات خالی کرا لئے گئے تھے۔ان گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں دوربینوں کے شیشے چمک رہے تھے اور رائفلوں کے بیرل صاف نظر آ رہے تھے۔یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔میرا دل بیٹھنے لگا۔سلطانہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔مجھے لگا کہ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔میں اب اسے کبھی اپنے سامنے زندہ سلامت نہیں دیکھ سکوں گا......میرا وہ سپنا اب کبھی پورا نہیں ہوگا جس میں ایک خوش رنگ شام کو میں اور سلطانہ اکٹھے ہوتے اور سلطانہ کی بانہوں میں ہنستا مسکراتا بالو ہوتا۔

''وہ دیکھو تابی!'' عمران نے دور ایک طرف سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''میرے خیال میں گاؤں کا شمشان گھاٹ ہے۔کوئی لاش جلائی جا رہی ہے۔''

شمشان گھاٹ سے اُٹھتے ہوئے ارتھی کے دھوئیں نے ماحول کو کچھ اور بھی گھمبیر کر دیا۔اسپتال سے کچھ فاصلے پر تازہ لاش کے گرد بَین کرتی عورتوں کی دل خراش آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ہوا کے دوش پر یہ آوازیں کبھی بلند اور کبھی دھیمی محسوس ہوتی تھیں۔

ہم نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔جو آخری چیز ہم نے لی، وہ بے مزہ سی چائے کا ایک کپ تھا۔یہ کپ ہم نے تب پیا تھا جب آفتاب خاں سائیکل مرمت کی دُکان پر سائیکل ٹھیک کروا رہا تھا اور سلطانہ مندر میں جا چکی تھی۔ہم نے چائے خانے میں بیٹھ کر آفتاب پر

نگاہ رکھی تھی۔ان واقعات کو اب چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔بہرحال، بھوک کی جتنی شدت محسوس ہونی چاہئے تھی، وہ نہیں ہو رہی تھی۔اس کی بڑی وجہ موجودہ تشویش ناک صورتِ حال تھی۔یہ اور بات ہے کہ خالی پیٹ ہونے کے سبب ایک نقاہت سی رگ وپے میں اُتری ہوئی تھی۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم تناؤ محسوس کرنے لگے۔بار بار ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہمارا بھروسا غلط تو نہیں۔اس نے آدھ پون گھنٹے میں آنے کا کہا تھا مگر اب ڈیڑھ گھنٹا ہو چلا تھا۔اس کی واپسی کے آثار کہیں نہیں تھے۔میں نے کہا۔''اگر یہ بھرت اکیلا آنے کے بجائے بیس پچیس مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے آیا تو پھر؟''

''پھر میں تمہیں یرغمال بنا لوں گا اور کہوں گا کہ اگر ان میں سے کوئی آگے آیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' وہ بولا۔

''تو پھر کیا ہوگا؟ وہ کہیں گے کر دو شوٹ۔تمہارا ہی ساتھی ہے۔''

''میں انہیں ساری حقیقت بتاؤں گا جگر! انہیں بتاؤں گا کہ اپنے اس ساتھی کے قیمتی مشوروں کی وجہ سے ان لوگوں کا کتنا فائدہ ہو رہا ہے۔ظاہر ہے کہ نالائق دوست سے عقل مند دشمن کے بہتر ہونے والا مقولہ حکم کے سپاہیوں نے بھی سن رکھا ہوگا۔''

''میں نے کون سا بے عقلی کا مشورہ دیا ہے تمہیں؟''

''بہت سے ہیں۔تازہ ترین مثال تو یہی ہے کہ تم نے گنے کے کھیت میں گھسنے کا مشورہ دیا جبکہ میں مکئی کے کھیت میں گھسنا چاہتا تھا۔مکئی کا کھیت ہوتا تو ہم بھوک سے یوں تو نہ بلکتے......دو چار بھٹے توڑتے اور بھون کر کھا لیتے۔''

''بھٹے بھوننے کے لئے آگ درکار ہوتی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''آہ......'' اس نے لمبی آہ بھری۔''آگ کی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔آگ تو عاشق کے دل کے اندر بھی موجود ہوتی ہے۔وہ سنا نہیں تم نے......خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں......میں نے تم سے ریما جی کا ذکر کیا تھا نا۔انہوں نے سینے میں ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ دو چار بھٹے تو کیا دو چار بکرے بھی روسٹ ہو سکتے ہیں لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ ایک طرفہ معاملہ ہے۔آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔تمہیں بتایا تھا نا کہ شوٹنگ میں موٹر سائیکل کا کرتب دکھاتے ہوئے میں اور ریما جی گر گئے تھے۔بس اسی وقت سے یہ محبت شروع ہو گئی......بلکہ میرے خیال میں موٹر سائیکل بعد میں گری، محبت پہلے شروع ہو گئی تھی......اب تم پوچھو گے کہ اگر آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے تو پھر شادی میں اڑچن کیا ہے۔پوچھو

گے نا؟‘‘

’’نہیں پوچھوں گا۔‘‘ میں نے بیزاری سے کہا۔

’’بڑے شرارتی ہو......اصل میں اڑچن یہ ہے کہ ریما جی شادی کے بعد بھی فلموں میں کام کرانا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ وہ شان اور معمر رانا جیسے گرم اور خطرناک ہیروز کے ساتھ ہیروئن آئیں۔ اس کا جواب وہ یہ دیتی ہیں کہ ان کی خاطر میں خود بھی فلم لائن میں آ جاؤں۔ انہیں پتا ہے کہ میں بنا بنایا ہیرو ہوں، فوراً ہٹ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ صرف ان فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائیں گی جن میں، مَیں ہیرو ہوں گا۔ اب یہاں پھر ایک مسئلہ ہے۔ میں اداکاری کر کر کے تنگ آ چکا ہوں بلکہ مجھے اس شعبے سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ اب یقیناً تم پوچھو گے کہ میں نے کہاں اداکاری کی ہے...... پوچھو گے نا؟‘‘

’’فرماؤ......کہاں کی ہے؟‘‘

’’یہ بالکل بیکار سوال ہے اور اسی لئے تم نے کیا ہے۔ میرے بھائی! یہ نیوز کاسٹر اور اینکر پرسن ہونا اداکاری ہی تو ہے۔ خاص طور سے نیوز کاسٹری تو اداکاری کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں اداکاری کا جتنا مارجن ہے، دیوداس اور بیجو باورا فلموں میں بھی نہیں ہے۔ تم دیکھنا، عنقریب نانا پاٹیکر اور نصیر الدین شاہ جیسے لوگ خبریں پڑھا کریں گے......‘‘

اس کی طولانی گفتگو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچتی مگر اسی دوران میں ہمیں دور سے بھرت کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے...... کھیتوں کے قریب پہنچ کر بھرت نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔ دو منٹ بعد وہ کماد کے نہایت گھنے اور بلند کھیت کے اندر ہمارے سامنے تھا۔

’’بڑی دیر لگا دی۔‘‘ عمران نے کہا۔

’’شما چاہت ہوں۔ میں پہلے گھر چلا گیا تھا۔ اصل میں مجھے لگ رہا تھا کہ آپ دونوں کو بھوک لگی ہووے گی۔ یہ کچھ بھوجن لایا ہوں آپ کے لئے۔‘‘ اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں مکھن، روٹی سالن اور ایک بوتل میں چھاچھ تھی۔

’’اس کے لئے بہت شکریہ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن پہلے ہمیں گاؤں کی خبر دو۔ گولی کس کو ماری گئی ہے؟‘‘

بھرت بولا۔ ’’ڈاکٹر لی وان کے بارے میں آپ کا اندازہ غلط تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال کی دوسری نرس مالتی کو مارا گیا ہے۔ میرے خیال میں مالتی کا چناؤ اس لئے ہوا ہے کہ

اس نے بال تراشے ہوئے تھے، انگریزی بھی بول لیوت تھی اور کھلے ڈلے انداز میں بات کرت تھی۔ یہ زرگاں سے یہاں آئی ہوئی تھی۔‘‘

یہ افسوس ناک صورتِ حال تھی۔ ہم نے کبھی مالتی کو دیکھا نہیں تھا، اس کے بارے میں کچھ جانتے نہیں تھے پھر بھی رنج ہوا۔ یقیناً یہ جو کچھ ہو رہا تھا، آفتاب ہی کر رہا تھا۔ اس میں سلطانہ کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔ میں نے بھرت سے پوچھا۔ ’’اب اسپتال کی صورتِ حال کیا ہے؟‘‘

بھرت نے کہا۔ ’’مالتی کو گولی لگنے کے بعد ایک دم ہلچل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ سپاہی ایک دم اسپتال پر دھاوا بول دیویں گے مگر انگریز افسروں اور پانڈے صاحب وغیرہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔‘‘

پانڈے کا نام سن کر ہم دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ عمران نے کہا۔ ’’یہ پانڈے وہی......رنجت پانڈے ہے نا جو حکم کا خاص آدمی ہے؟‘‘

بھرت نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ’’اب انگریز افسر اینڈرسن صاحب اور حملہ آوروں کے درمیان بات ہوئی ہے۔ اینڈرسن صاحب نے کل سہ پہر چار بجے تک کا سمے مانگا ہے اور کہا ہے کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا کر دیا جاوے گا۔‘‘

’’یعنی ہاشم کو یہاں پہنچا دیا جائے گا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں...... اور یہاں سے نل پانی جانے کے لئے ایک بڑی گھوڑا گاڑی اور چار گھوڑے بھی دے دیئے جاویں گے۔ پٹھان حملہ آور نے یہ سمے دے دیا ہے اور کہا ہے کہ کل چار بجے تک وہ مزید کسی شخص کی ہتھیا ناہیں کریں گے۔ اس بات چیت کے بعد مسلح فوجی اسپتال کے پھاٹک سے کچھ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اینڈرسن صاحب نے باہر سے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی اندر بھیجا تھا لیکن حملہ آوروں نے وہ واپس کر دیا ہے۔ شاید ان کو اس بارے میں کوئی شک ہووے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے پاس کھانے پینے کو بہت کچھ ہے۔‘‘

میں نے اور عمران نے دیکھا۔ بھرت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زرگاں کے مسلح کمانڈوز جو کچھ دیر پہلے اسپتال کے گیٹ کے عین سامنے پوزیشنیں سنبھال چکے تھے اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے، اب ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی اضافی تشویش کا باعث تھی۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین پولیس افسر تھا اور یہ جہاں بھی موجود ہوتا تھا، وہاں خطرات کے بادل منڈلانے لگتے تھے۔

بھرت نے بڑی اپنائیت سے ہمیں ناشتا وغیرہ کرایا۔ وہ میرا لباس دیکھ کر حیران ہو رہا

تھا۔ میں سوئٹر یا کوٹ کے بغیر تھا۔ گرم چادر کی بھی خاص ضرورت مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بھرت نے کہا۔ ’’بھائی جی! آپ کو گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں گھر سے آپ کے لئے کچھ لے آؤں؟‘‘

’’نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔‘‘

عمران فوراً بولا۔ ’’یہ انڈین فوج میں رہا ہے اور سیاچن پر ڈیوٹی دیتا رہا ہے۔ اس میں سردی محسوس کرنے کی حس ختم ہو چکی ہے۔ جون، جولائی میں تو اسے برف کے بلاک پر لیٹنا پڑتا ہے۔‘‘

بھرت نے مسکرا کر سر ہلایا۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے لگا۔ مارشل آرٹ کی کڑی مشقوں اور سینڈ بیگ کے مسلسل استعمال سے ہاتھ پاؤں کی کھال موٹی ہو کر رنگ بدل چکی تھی۔

بھرت بولا۔ ’’لگتا ہے فوج میں آپ نے لڑائی بھڑائی کی بھی خاصی ٹریننگ کی ہے؟‘‘

’’ہاں، ہمیں ایک خاص آپریشن کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ بڑی سخت ٹریننگ ہوئی تھی لیکن بعد میں ایک شرابی افسر سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ میں فوج سے بھاگ آیا...... اور یہاں پہنچ گیا۔‘‘ میں نے گول مول بات کی۔

عمران نے بھی بھرت کو اس سے ملتی جلتی کہانی سنائی۔ اس نے اپنا نام شیام اور میرا کرشن بتایا۔ ہم ایک دوسرے پر کافی حد تک بھروسا کرنے لگے تھے۔ ہم نے بھرت کو بتایا کہ اس سارے معاملے کے انجام تک ہم یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ فراخ دلی سے بولا۔ ’’آپ میرے گھر پر آ جاویں۔ بڑے بھیا زرگاں گئے ہوئے ہیں۔ باپو کی طبیعت ٹھیک ناہیں، وہ اپنے کمرے تک ہی رہت ہیں۔ میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہراؤں گا۔ کوئی اس طرف ناہیں آوے گا...... میں ملازموں کو بھی منع کر دوں گا۔‘‘

عمران نے کہا۔ ’’اچھا اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔‘‘ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ’’کیا خیال ہے، رات تک تو یہیں ٹھیک ہے؟‘‘

’’ٹھیک تو ہے لیکن اگر کھیت کا مالک یا کام کرنے والے مزدور اس طرف آ نکلے تو پھر؟‘‘

بھرت مسکرایا۔ ’’ایسا کوئی خطرہ ناہیں۔ یہ کھیت میرا ہے۔ آپ دونوں بے فکر ہو کر بیٹھو اور من چاہے تو گنا وغیرہ بھی چوسو۔ جس مزدور نے اس کھیت کو دیکھنا تھا، میں اسے کسی دوسری طرف بھیج دوں گا۔‘‘

’’زبردست۔‘‘ عمران نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم ستانے کے لئے لیٹ گئے۔ اب ہر طرف خوش گوار دھوپ پھیل گئی تھی۔ اوس تیزی کے ساتھ پتوں اور گھاس پر سے غائب ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈک کا احساس بھی کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی طرف اب سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ غالباً کل تک کی مہلت کے بعد دونوں فریق ہی کم تناؤ محسوس کر رہے تھے۔ ہم نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہی گزارا تھا۔ اب نرم دھوپ کا لمس محسوس ہوا تو اونگھ آنے لگی۔ رائفل بالکل تیار حالت میں عمران کے سینے پر دھری تھی۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزرا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ عمران اُٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ میں بھی اُٹھ بیٹھا۔ کسی خطرے کے وقت عمران کی تمام حسیں برق رفتاری سے بیدار ہو جاتی تھیں۔ اب بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ نہ صرف ہمہ تن گوش تھا بلکہ ہوا میں بھی کچھ سونگھ رہا تھا۔

’’کیا ہے؟‘‘ میں نے مدھم سرگوشی کی۔

’’کوئی آ رہا ہے۔‘‘ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

چند لمحے بعد مجھے بھی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ عمران نے رائفل ہاتھ میں لے لی۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ کوئی دشمن یا پھر کوئی عام دیہاتی جو اپنی ضرورت کے تحت کھیت میں گھسا تھا یا پھر کوئی جانور وغیرہ؟ یہ بھرت تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ہوتا تو سامنے سے آتا اور ہمیں دکھائی بھی دیتا۔

چند سیکنڈ سخت تناؤ میں گزرے۔ آواز قریب آتی گئی۔ آخر آنے والا سامنے آ گیا۔ یہ ایک بڑے سائز کا آوارہ کتا تھا۔ یہ عام حالت میں بھی بندے کو خوف زدہ کر سکتا تھا مگر اب وہ جس حالت میں تھا، وہ بڑی دہشت ناک تھی۔ اس کتے کی تھوتھنی پر ایک گہرا زخم تھا...... اس کے گلے میں ایک رسّی اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کا منہ سوج کر اصل سائز سے تقریباً دُگنا ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور ان کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ کتے کی آواز گھمبیر اور لرزا دینے والی تھی۔ یوں لگا کہ وہ کسی بھی لمحے ہم پر حملہ کر دے گا۔

عمران نے پہلے تو رائفل اس کی طرف سیدھی کی لیکن پھر اسے نیچے کر لیا۔ وہ گہری نظروں سے جانور کی طرف دیکھتا رہا، تب منہ سے پچ پچ کی آواز نکالی اور اسے پچکارا۔ میں نے دیکھا، حیران کن طور پر کتے کا اشتعال کم ہو گیا۔ عمران کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور بغیر کسی کراہت کے کتے کے سر کو ہاتھ سے سہلایا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میری

طرف بڑھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاقو مانگ رہا ہے۔ میں نے چاقو اسے تھما دیا۔ کتا اضطراب کے عالم میں کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتا، کبھی ایک قدم آگے آتا تھا۔ رسّی اس کی گردن میں دھنسی ہوئی تھی۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے پہلے اس رسّی کو چاقو کی دھار سے کمزور کیا پھر توڑ دیا۔ گردن کا آزاد ہونا اس جانور کے لئے موت سے زندگی کی طرف...... آنے کی طرح تھا......اس نے ہمارے گرد ایک چکر کاٹا پھر تیزی سے فصل میں گم ہوگیا۔

آج مجھے عمران میں اسی عمو کی جھلک نظر آئی تھی جو چند سال پہلے تک سرکس کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا تھا اور شیر، بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پینے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ غالباً اس میں وہ پہلے جیسی صلاحیت تو موجود نہیں تھی لیکن اب بھی تھوڑے بہت اثرات اس میں پائے جاتے تھے۔

''زبردست۔'' میں نے تعریفی انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے کہ جانوروں کے حوالے سے اب بھی کچھ نہ کچھ بات تم میں موجود ہے۔''

''وہ تو ظاہر ہے کیونکہ تم جیسے سرکش کو اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں۔'' اس نے فوراً چوٹ کی۔

میں نے کہا۔ ''فضول بحث شروع کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنے تعریفی الفاظ واپس لے لوں۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بس یہی سرکشی ہے تمہاری۔ فوراً جواب دینے لگے ہو۔ بڑوں کا احترام ختم ہوتا جا رہا ہے تمہارے اندر۔''

میں نے کہا۔ ''ایک طرف بزرگ بنتے ہو، دوسری طرف یہ بتاتے ہو کہ ریما سے تمہارا عشق زوروں پر ہے۔''

''عشق کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ پکی عمر کا عشق پرانی شراب کی طرح زیادہ نشے والا ہوتا ہے لیکن میں یہاں عمر کی بات نہیں کر رہا۔ میں ''عقل'' کے لحاظ سے تمہارا بزرگ ہوں بلکہ اس لحاظ سے تم مجھے اپنا پڑدادا کہہ سکتے ہو۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر اس عقل کو سات پردوں میں چھپا کر کیوں رکھتے ہو؟ میں نے تو کبھی اس کی جھلک نہیں دیکھی۔'' میں بھی بحث کے موڈ میں آ گیا۔

''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس عقل مندی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کبھی ٹی وی پر میرا ٹاک شو دیکھنا...... چار چار گنجے دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کرتا ہوں...... اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان چاروں کو ایک ساتھ بولنے پر مجبور کرتا

ہوں۔ ایک گھنٹے کے شو میں اگر ان کی ایک بات بھی کسی کی سمجھ میں آ جائے تو میں اپنا نام بدل دوں۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ ان کی بات کا سمجھ میں نہ آنا کوئی قابلِ تعریف چیز ہے؟''

''اوئے گھامڑ...... یہی تو قابلِ تعریف چیز ہے۔ ان کی بودی باتیں اور پیش گوئیاں سننے والوں کی سمجھ میں آ جائیں تو بھٹا بیٹھ گیا ناٹاک شو کا۔ اینکر پرسن کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ ''دانشور'' بس بولتے ''نظر'' آئیں، سنائی نہ دیں اور اگر سنائی دینے لگیں تو اینکر پرسن مزید شور و غوغے کے لئے خود بھی بحث میں کود پڑے......''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، تم ہر وقت طنزیہ انداز میں بات کرتے ہو اور تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہو۔ میڈیا کی بہت سی اچھی باتیں بھی تو ہیں۔''

''بہت سی اچھی باتیں نہیں، میڈیا میں ہیں ہی اچھی باتیں تم مجھے ورغلانے کی کوشش نہ کرو۔''

''میں کیا ورغلاؤں گا، تم پہلے ہی ورغل شدہ ہو بلکہ ورغل ہو۔ اب دیکھو...... میڈیا ریاست کا ایک اہم ستون بن کر سامنے آیا ہے۔ کیمرے کی آنکھ دور دور تک اور گہرائی تک دیکھ رہی ہے۔ غیر قانونی کاموں پر، حکومتی غفلتوں اور قدرتی آفتوں وغیرہ پر اتنا شور مچایا جاتا ہے کہ بچہ بچہ باخبر ہو جاتا ہے۔ نقب زن جس طرح روشنی سے ڈرتا ہے، اسی طرح قانون شکن میڈیا سے ڈر رہا ہے۔''

''اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہماری قدر کرو۔ وہ کیا شعر ہے، ڈھونڈو گے ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم۔''

''مگر تم یہ سب کچھ طنز کے انداز میں کہتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کی شرارت سو میل دور سے نظر آتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں اپنے ہی ساتھ شرارت کرتا ہوں۔ یعنی ہاتھ پیچھے کر کے خود کو ہی پتھر مارتا ہوں اور خود ہی حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہوں۔''

''ایسا ہی کرتے ہو...... تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ مشکل ترین حالات میں کام کر رہے ہیں۔ خطرناک ترین جگہوں پر رپورٹنگ کرتے ہیں۔ بدترین لوگوں کی دشمنیاں مول لیتے ہیں۔ بے شک ان سے بھی غلطیاں کوتاہیاں ہوتی ہیں، پر غلطیاں کوتاہیاں تو ہر شعبے میں ہیں۔''

''تو پھر سلام کرو نا مجھے۔''

''میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں سلام کروں لیکن دور ہی سے۔''

''یعنی تم اپنا راستہ الگ کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں سچ مچ زبان لگ گئی ہے اب تم ہر بات پر پیچ ڈالنے کے موڈ میں آتے جا رہے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ملاؤ ہاتھ۔''

اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اس میں بھی شرارت کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہی ہاتھ تم نے پانچ منٹ پہلے بدبودار کتے کو لگایا ہے۔ ویری سوری۔''

''بڑے کھوچل ہو گئے ہو تم۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔

دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہو گئی۔ کماد کا یہ کھیت ایک بار پھر تاریکی اور سردی میں ڈوبتا چلا گیا۔ گاؤں کے اندر گاڑیوں، اسلحے اور گارڈز کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تا۔ ایک بڑا جنریٹر بھی یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس جنریٹر کی گھوں گھوں مسلسل ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ جنریٹر کی مدد سے چلنے والی روشنیوں نے اسپتال اور اس کے تین اطراف کی گلیوں کو پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ یقیناً یہ معاملہ زرگاں کے لئے بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا اور اس کی وجہ ماریا اور سلطانہ کا ایک اسپتال کے اندر موجود ہونا تھا۔

بھرت نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد ہمیں لینے آئے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یہاں سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات گزارنے کے بجائے اس کی آرام دہ حویلی میں قیام کریں۔ وہ ہمیں ہر طرح کی سہولت اور حفاظت کا یقین دلا رہا تھا لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں تھا۔ شاید پھر کسی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ اچانک میں نے عمران کو پھر چونکا ہوا محسوس کیا۔ ایک بار پھر اس کی غیر معمولی حسیات اسے کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے بھی یہ احساس ہو گیا۔ ہمارے آس پاس کھیت کے اندر یا ساتھ والے کھیت میں کوئی موجود تھا۔ عمران نے سگریٹ فوراً بجھا دیا۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور جھکے جھکے انداز میں اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً ہمیں ساتھ والے کھیت میں کچھ سائے نظر آئے۔ مکئی کے اس کھیت میں پُراسرار انداز میں حرکت کرنے والے سایوں کی تعداد سات کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھاپا مار کارروائی کرنے والے سپاہیوں کی طرح جھک کر چلتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ ذہن میں پہلا سوال یہی آیا کہ کیا بھرت کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط نکلا ہے؟ عمران نے رائفل تیار حالت میں کر لی۔ میں نے بھی اپنا ریوالور تہ بند کی ڈب سے نکال لیا اور بالکل چوکس ہو گیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ اپنی پوزیشن پر رہیں اور اگر وہ ہم پر فائر کھولیں تو ہم جوابی فائر کر کے انہیں مارنے یا بھگانے کی کوشش کریں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہم اپنی یہ پوزیشن چھوڑ کر بھاگ نکلیں

اور روپوش ہونے کی کوشش کریں۔ دونوں صورتوں میں خطرات موجود تھے۔ ان لمحوں میں، مَیں عمران کی اعصابی مضبوطی اور ان معاملوں میں اس کی مہارت کا اندازہ ہوا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید ان لوگوں کے قریب آنے پر فائر کرتا یا پھر بھاگ کر دوسرے کھیت میں گھسنے کی کوشش کرتا لیکن اس کی آنکھ وہ دیکھ چکی تھی جو میری آنکھ نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری کلائی پر رکھ کر مجھے یہ اشارہ دیا کہ میں فائر وغیرہ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت اور جامد بیٹھا تھا۔ آنے والے ہماری طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کے قدموں کی چاپ چند میٹر کی دوری پر محسوس ہوئی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ہماری طرف نہیں آ رہے۔ وہ ہم سے قریباً دس قدم کے فاصلے سے اور بالکل سامنے سے گزرے۔ ہم نے اپنے سانس تک روک لئے تھے۔ رنجیت پانڈے کی منحوس آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''اور کتنی دور ہے؟'' اس نے کہا۔

''بس پہنچ گئے جی۔ وہ سامنے کیکر کے پیڑوں کے پاس۔'' ایک دوسری آواز سنائی دی۔

وہ ہمارے پاس سے گزر کر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ وہ اندھیرے میں بغیر کسی لالٹین یا ٹارچ کے جا رہے تھے۔ انداز سخت محتاط تھا۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''دیکھنا پڑے گا۔'' عمران نے کہا۔ ''وہ کتا پانڈے بھی ساتھ ہے۔''

ہم نے دیکھا، درختوں کے قریب جا کر وہ سائے رک گئے پھر غائب ہو گئے۔ وہ نشیب میں اُتر گئے تھے۔ ''تم ادھر رکو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ساتھ چلنا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

عمران پہلے تو انکار کے موڈ میں نظر آیا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے ہر موقع پر وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے خطرے سے بچانا بھی چاہتا تھا، دوسری طرف خطروں کا خوگر بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنی جگہ چھوڑی اور بے حد احتیاط سے اس نشیب کی طرف بڑھے جہاں رنجیت اور اس کے ساتھی اوجھل ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر ہم اوندھے لیٹ گئے اور سن گن لینے لگے۔ اندازہ ہوا کہ رنجیت اور اس کے ساتھی جھنڈ کے بالکل قریب نشیبی جگہ پر موجود ہیں۔ ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

اب زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہم رینگتے ہوئے آگے گئے۔ ہماری انگلیاں اپنے

ہتھیاروں کے ٹریگرز پر تھیں اور ہم کسی بھی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ درختوں کی طویل قطار کے آگے زمین کا کٹاؤ نظر آیا۔ یہاں ایک وسیع جوہڑ کی سی شکل بن گئی تھی مگر یہ جوہڑ تقریباً خشک تھا۔ متحرک سائے اس نشیب میں موجود تھے۔ اب انہوں نے دو ٹارچیں روشن کر لی تھیں اور کسی خاص چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رنجیت کی مدھم لیکن کرخت آواز اُبھری۔ ''پائپ تو یہی لگتا ہے لیکن پتا ناہیں کب سے بند پڑا ہے۔ پہلے اسے کھولنا پڑے گا۔''

''بس مٹی وغیرہ سے بند ہو گیا ہے۔ ابھی کھل جاوت ہے جی۔'' دوسری آواز اُبھری۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں کدال چلنا شروع ہو گئی۔ کدال چلانے والا کوئی مزدور ٹائپ شخص تھا۔ وہ وردی کے بجائے ہماری طرح دھوتی اور پگڑی میں نظر آ رہا تھا۔ رنجیت پانڈے نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اوئے بہن کے جھکنئے! دھیان سے کدال چلا۔ کہیں پائپ پر نہ مارنا۔''

ایک دو منٹ بعد کدال واقعی پائپ پر لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز سناٹے میں دور تک گئی۔ پانڈے پھنکارا۔ ''تجھے کہا بھی تھا کہ اس ماں کو دھیان سے چلا۔'' اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز آئی۔ یقیناً شعلہ مزاج پانڈے نے مزدور کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ پھر وہ پھنکارتی آواز میں کسی سپاہی سے بولا۔ ''رامو! تُو پکڑ کدال اور خبردار آواز پیدا ناہیں ہونی چاہیئے۔''

دوسرا شخص کدال چلانے لگا۔ ایک ٹارچ کا روشن دائرہ مسلسل کھدائی والی جگہ پر مرکوز تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک پرانے سیوریج پائپ کا دہانہ نظر آنے لگا۔ سیمنٹ کا یہ پائپ قریباً تین فٹ قطر کا ہو گا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کا خطرناک ترین کمانڈو رنجیت پانڈے اپنے ایک سفید فام ساتھی کے ہمراہ پائپ میں داخل ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ سفید فام بھی کوئی تربیت یافتہ کمانڈو ہی تھا۔ یہ دونوں افراد پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ ہمیں یہ شک بھی پڑا کہ یہ شاید دو کے بجائے تین افراد ہیں۔ یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ سب کچھ تقریباً واضح ہو چکا تھا۔ یہ پرانا سیوریج پائپ اسپتال کی عمارت کے اندر تک جا رہا تھا۔ اسپتال میں موجود آفتاب خاں اور سلطانہ کو زبردست قسم کا ''شاک'' پہنچنے والا تھا۔

عمران نے میرا بازو دبایا۔ ہم تیزی سے واپس مڑے۔ رینگتے ہوئے بیس پچیس میٹر کی دوری تک گئے کھیت میں داخل ہوتے ہی ہم کھڑے ہو گئے اور جھک کر بھاگتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھے۔ آفتاب یہاں اسپتال میں جو کچھ کر رہا تھا، ہم ہرگز اس کے حق میں

نہیں تھے لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اور سلطانہ...... پانڈے جیسے شخص کے ہاتھوں بے موت مارے جائیں۔

گنے کے کھیت میں اپنے ٹھکانے تک پہنچتے ہی عمران نے واکی ٹاکی اُٹھایا اور اس پر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بار بار بیپ دینے والا بٹن دبایا۔ انٹینا کو گھمایا۔ پاور کو آن آف کیا لیکن حسبِ معمول رابطہ نہیں ہو سکا۔ واکی ٹاکی بے جان پڑا تھا۔ دو تین منٹ کی سرتوڑ کوشش کے بعد عمران نے سخت جھلاہٹ میں واکی ٹاکی کو ایک طرف پٹخ دیا۔ وہ جاگ اُٹھا۔ سبز اور سرخ روشنیاں جل اُٹھیں۔ بیپ کی مدھم آواز پیدا ہونے لگی۔ یہ بیپ دوسری طرف آفتاب والے سیٹ پر جا رہی تھی۔ ہم ہمہ تن گوش تھے۔ چند سیکنڈ بعد دوسری طرف سے آفتاب کی بھاری آواز اُبھری۔ ''ہیلو۔''

عمران بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''آفتاب! تم پر حملہ ہو رہا ہے۔ پانڈے اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' آفتاب کی چونکی ہوئی آواز اُبھری۔

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔ سوال نہ کرنا۔ ابھی چار پانچ منٹ پہلے ہم نے پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو کھیتوں میں دیکھا ہے۔ یہاں ایک پرانا سیوریج پائپ ہے۔ یقیناً اس کا دوسرا سرا اسپتال کے احاطے یا پھر پچھلے صحن میں کہیں ہو گا۔ ان لوگوں نے اس پائپ کو کھولا ہے۔ پانڈے اور اس کا ایک انگریز ساتھی اس پائپ میں گھسے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے اندر پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس جدید رائفلیں ہیں۔ تم دیکھ لو، تم نے اپنا بچاؤ کیسے کرنا ہے......''

''ٹھیک ہے۔ ام دیکھتا ہے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا اور واکی ٹاکی آف کر دیا۔

ہم جو کچھ کر سکتے تھے، ہم نے کر دیا تھا۔ اب آگے آفتاب اور سلطانہ کی قسمت تھی۔

پندرہ بیس منٹ سخت بے چینی کے عالم میں گزرے، تب اسپتال کی عمارت کی طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ پہلے یکے بعد دیگرے رائفل کے تین فائر ہوئے۔ پھر ایک برسٹ چلا۔ عمران نے بتایا کہ یہ ایل ایم جی کا برسٹ ہے۔ اس برسٹ کے بعد دوطرفہ گولیاں چلیں۔ یہ سلسلہ بمشکل ایک منٹ جاری رہا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ عمارت کے ادرگرد درجنوں ٹارچیں گردش کر رہی تھیں۔ جیپوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں۔ ایک چھکڑا ایمبولینس کی گول گھومتی سرخ بتی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ بہت سے امکانات ذہن پر یورش کر رہے تھے۔ کیا

آفتاب اور سلطانہ مارے گئے ہیں؟ کیا پانڈے اور اس کا ساتھی ناکام ہوئے ہیں؟ کیا وہ اب بھی اندر موجود ہیں؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے۔ دس پندرہ منٹ اسی شدید کشمکش میں گزرے پھر ہمیں درختوں کے جھنڈ کی طرف حرکت کے آثار نظر آئے۔ نشیب میں سے دو ٹارچوں کے روشن دائرے اوپر آئے اور گنے کے کھیتوں کی طرف آنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اور ان کے ساتھ کوئی زخمی بھی ہے۔'' عمران نے اپنی تیز نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دو منٹ بعد پانڈے اور اس کے ساتھی ہمارے قریب سے گزرے۔ پانڈے کا انگریز ساتھی زخمی ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اس کی کرب ناک کراہیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ تب پانڈے کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جلدی کرو۔ خون تیجی (تیزی) سے بہہ رہا ہے۔'' وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس کے بعد اس نے کسی کو گالی دی اور کہا کہ وہ زخمی کی ٹانگیں اوپر اُٹھا کر رکھے۔

پچیس تیس سیکنڈ میں وہ لوگ تیزی سے چلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

اطمینان کی ایک طویل سانس عمران کے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے پانڈے کا آپریشن پی جی ناکام ہوا ہے۔''

''آپریشن پی جی کیا مطلب؟''

''آپریشن براستہ پائپ اور گٹر۔'' اس نے روانی سے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، عمارت کے اندر سے پھر سیون ایم ایم کا گونج دار فائر سنائی دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے سرپھرے آفتاب نے پھر کسی کو لڑھکا دیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یرغمالی کو؟''

عمران نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ صورتِ حال بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار پھر عمارت کے اردگرد شدید اضطراب نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے درجنوں فوجی اور مشتعل دیہاتی اپنی برداشت کھو کر عمارت کے اندر گھس جائیں گے اور اس ڈرامے کا خونی ڈراپ سین سامنے آ جائے گا۔ مگر انگریز افسروں کو پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ماریا بھی ماری جائے گی اور یہ انہیں کسی طور قبول نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں لالٹینوں اور ٹارچوں کی روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ تین چار افراد

ایک چارپائی کے ساتھ اندر گئے ہیں اور تازہ لاش لے کر باہر آ گئے ہیں۔ ایک بار پھر رونے پیٹنے کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ ایک بار ٹارچ کی ایک روشنی اسپتال کی چھت پر پانی والی گول ٹینکی کے قریب بھی نظر آئی۔ یقیناً یہ آفتاب خاں ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چھت پر سے حکم کے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ بھی رہا ہو مگر فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہم کچھ سن نہیں سکتے تھے۔

عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ آفتاب نے ''پاور آف'' کر رکھا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہماری بائیں طرف سے ایک ہیولا کھیتوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چال ڈھال سے اندازہ ہو گیا کہ یہ بھرت ہی ہے۔ بھرت محتاط انداز سے کھیت میں داخل ہوا اور ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ بولا۔ ''شما چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہوئی۔ وہاں اسپتال کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فائرنگ کی آواز تو آپ دونوں نے بھی سنی ہووے گی۔''

''ہاں، آواز تو سنی ہے، پر ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے گھر پہنچتے ہیں پھر میں سب کچھ بتاوت ہوں۔'' بھرت نے کہا۔

ہم بھرت کے ساتھ چلنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ یخ بستہ ٹھنڈ نے ہڈیوں میں اُترنا شروع کر دیا تھا۔ منہ سے بھاپ خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے گرم چادروں کی بکلیں ماریں، پگڑیاں اس طرح لپیٹیں کہ چہرے بھی کافی حد تک چھپ گئے۔ ہمارا واحد سامان کسّیاں ہی تھیں۔ یہ ''کسّیاں'' ہم نے کھیت مزدوروں کی طرح کندھوں پر رکھیں اور بھرت کے ساتھ گاؤں کی روشنیوں کی طرف چل دیئے۔

بھرت کا حویلی نما مکان گاؤں کی شمالی جانب تھا۔ یہ جگہ اسپتال کی عمارت سے قریباً آدھا فرلانگ کے فاصلے پر ہو گی۔ ہم دو بڑی گھوڑا گاڑیوں کے قریب سے گزرے۔ یہ دونوں گاڑیاں باوردی سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ مسلح پہرے دار بھی نظر آئے۔ چونکہ بھرت ہمارے ساتھ تھا، اس لئے کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی جانور کھیتوں میں سے نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ یہ وہی بڑے سائز کا کتا تھا جس کے گلے میں دھنسی ہوئی رسّی عمران نے کاٹی تھی۔ وہ یقیناً ابھی تک ہمارے اردگرد ہی موجود تھا۔ اس کا ہمارے پیچھے پیچھے آنا ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عمران کے اچھے سلوک کی وجہ سے اسے ہمارے ساتھ وابستگی پیدا ہو

گئی ہو۔ عموماً جانور اس طرح کے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کی ایک تیسری وجہ بھی ہو سکتی تھی اور یہ زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ عمران کی طویل رُوداد میں، مَیں نے اس کی اس خاص صلاحیت کے بارے میں جانا تھا جو وہ جانوروں کے حوالے سے رکھتا تھا...... یہ بظاہر ناقابلِ یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ عمران کے حوالے سے کچھ بھی ناقابلِ یقین نہیں ہوسکتا۔ وہ بے پناہ مقناطیسی کشش کا مالک تھا۔ یہ کشش انسانوں پر اثر کرتی تھی تو دیگر جانداروں کو بھی متاثر کرسکتی تھی۔

عمران نے بھی کتے کو اپنے ساتھ ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ کتے کے چہرے کی غیر معمولی سوجن اب بہت کم رہ گئی تھی۔ وہ ذرا لنگڑاتا ہوا ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ بھرت نے ایک دو بار اسے شُشکارا۔ وہ ٹھٹکا ضرور لیکن ہم سے دور نہیں گیا۔

ہم جلد ہی بھرت کے نیم پختہ مکان میں پہنچ گئے۔ بھرت نے ہمیں مکان کے بیرونی حصے میں ٹھہرایا۔ یہ ایک لمبا برآمدہ تھا جس کے ساتھ دو تین بیٹھک نما کمرے تھے۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی کھاتے پیتے ہندو زمیندار کی رہائش گاہ ہے۔ بھرت کا بڑا بھائی زرگاں میں تھا۔ والد دمے کی تکلیف کی وجہ سے [illegible]رے تک محدود تھے۔ گھر میں کئی نوکر چاکر تھے۔ ان میں گندمی رنگت والی وہ لڑکی بھی شامل تھی جس کا نام ہمیں چھپی معلوم ہوا تھا اور جس نے گنے کے کھیت میں بھرت سے محبت بھری ملاقات کی تھی۔ چھپی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی اسی گھر میں خدمت گار تھی۔ مکان کے وسیع احاطے میں ایک طرف بھینسوں اور بکریوں وغیرہ کا باڑا تھا۔

یخ بستہ کھیت میں سے اس آرام دہ گھر میں منتقل ہونا ہمیں کافی اچھا لگا۔ بھرت نے دیسی مرغی کے سالن، تندوری روٹی اور حلوے سے ہماری تواضع کی۔ ہندو گھرانوں میں عام طور پر گوشت نہیں پکتا لیکن بھرت نے ہمارے لئے پکوالیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں رازداری کے انداز میں بتایا کہ اسپتال میں سخت گڑبڑ ہوئی ہے۔ حملہ آوروں نے طیش میں آ کر چھوٹے ڈاکٹر راج کو مار ڈالا ہے اور لاش اسپتال کے احاطے میں پھینک دی ہے۔

طیش کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے ٹھیک سے معلوم تو ناہیں بھیا لیکن لگت ہے کہ حکم کے سپاہیوں نے خفیہ طور پر اسپتال کے اندر گھسنے کی کوئی کوشش کی ہے۔ اس خیال کا ایک کارن یہ بھی ہے کہ پانڈے صاحب یہاں موجود ہے اور جہاں پانڈے صاحب موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی ہلچل والا کام تو ہوتا ہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسپتال میں گھسنے کی یہ کوشش ناکام ہوگئی ہے اور ایک گورے افسر پیٹر صاحب کو ٹانگوں پر گولیاں بھی لگی ہیں۔ اس

واقعے کے فوراً بعد ہی اندر موجود پٹھان حملہ آور نے بے دردی سے چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو گولی سے اڑا دیا...... اور چھت پر چڑھ کر دھمکی دی کہ اگر سپاہیوں کی طرف سے کوئی اور چال چلی گئی تو وہ سب کچھ ختم کر ڈالیں گے۔"

"اب کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چھوٹے ڈاکٹر صاحب کی ہتھیا کے بعد تو ایسا لگت تھا کہ لوگن اسپتال پر چڑھ دوڑیں گے مگر انگریز افسر مسٹر اینڈرسن نے لوگن کو روکا۔ اب مجھے لگت ہے کہ گورے افسروں نے حملہ آوروں کی "مانگیں" ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہوسکت ہے کہ مہلت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ہاشم رازی رہا ہوکر یہاں پہنچ جائے۔"

"کیا ہندو برداری کو اس کی رہائی قبول ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"بھیا! یہ ہے تو بڑا مشکل۔ سنا ہے کہ سب سے زیادہ شور وہی بڑی بی مچا رہی ہے۔ زرگاں کا بہت سا لوگن اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ وہ نئی نئی پیش گوئیاں کررہی ہے۔ دوسرے شبدوں میں اس نے حکم جی کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ حکم کے لئے ممکن ہی ناہیں کہ وہ اپنے انگریز دوستوں کے خلاف چل سکے۔ اسے ہر حال میں وہی کرنا ہووے گا جو انگریز افسر اور مسٹر اسٹیل وغیرہ کہیں گے۔ چاہے اس کے لئے اسے بڑی بی اور اس کے خاص حمایتیوں کو جیل میں ڈالنا یا انہیں سورگ باشی کرنا پڑے۔"

وہ رات ہم نے بھرت کے آرام دہ گھر میں گزاری۔ اگلا سارا دن بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ ہم بھرت کے مکان کی چھت سے اسپتال اور اس کے اردگرد کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہو چکی تھی۔ اسپتال گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے وسیع احاطے اور برآمدوں میں کسی طرح کی کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔

رات قریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہم بھرت کے ہمراہ اس کے گھر کی چھت پر تھے، اچانک گاڑیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ کل تین جیپیں تھیں۔ یہ اسپتال کے عین سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی۔ بھرت نے کہا۔ "میں دیکھ کر آوت ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔"

وہ گیا اور دس پندرہ منٹ بعد اس نے آ کر بتایا کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا ہوگیا ہے۔ ہاشم رازی زرگاں سے رہا ہوکر یہاں پہنچ گیا ہے۔ بھرت نے بتایا۔ "حملہ آوروں کو ایک گھوڑا گاڑی دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے تاکہ وہ یہاں سے روانہ ہوسکیں۔"

''اور ماریا کا کیا بنے گا؟'' عمران نے پوچھا۔

''جب ہاشم رازی کو اندر بھیج دیا جاوے گا تو ماریا باہر آ جاوے گی۔ ماریا کے ساتھ ہی اندر موجود کچھ عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ دیا جاوے گا۔ باقی لوگن یرغمالی کے طور پر حملہ آوروں کے پاس رہیں گے۔ ان میں ایک انگریز بھی شامل ہے۔ یہ لوگن گھوڑا گاڑی پر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ نل پانی کی حد پر پہنچ کر جب حملہ آوروں کو پورا اوشواس ہو جاوے گا کہ اب وہ محفوظ ہیں تو باقی یرغمالیوں کو چھوڑ دیا جاوے گا۔''

''یرغمالیوں میں انگریز کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اصل میں پانڈے کے ساتھ ایک ناہیں دو گورے کمانڈو اندر گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی ٹانگوں میں تو گولیاں لگی ہیں لیکن دوسرے کو زخمی حالت میں قیدی بنا لیا گیا ہے۔''

ہمارا یہ شک درست نکلا تھا کہ پانڈے کے ساتھ دو گورے پائپ لائن میں گھسے تھے...... عمران نے بھرت سے پوچھا۔ ''ماریا اور ہاشم رازی کا تبادلہ کب ہوگا؟''

''آج رات ہی کسی وقت ہو جاوے گا۔ اس سلسلے میں زرگاں کی بڑی جامع مسجد کے امام قادر بخش صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ اصل میں یہ سارا معاملہ انہوں نے ہی طے کراویا ہے۔ انہوں نے دونوں طرف وعدے کی پاسداری کی ضمانت دی ہے۔ حکم کے افسروں کی طرف سے بھی وچن دیا گیا ہے کہ وہ نل پانی کے راستے میں کسی طرح کی کوئی کارروائی ناہیں کریں گے اور حملہ آوروں کو ہاشم رازی سمیت نل پانی میں داخل ہونے دیویں گے۔''

آدھ پون گھنٹے بعد بھرت دوبارہ سن گن لینے کے لئے اسپتال کی طرف چلا گیا۔ ہمارے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ کمرے میں گھس کر ہم نے واکی ٹاکی آن کیا اور ایک بار پھر آفتاب سے رابطے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے رابطہ ہو گیا۔ آفتاب خاں اب قدرے پُرسکون محسوس ہوتا تھا۔ اسے پتا چل چکا تھا کہ ہاشم رازی یہاں آ چکا ہے اور اب کسی بھی وقت ماریا کے ساتھ اس کا تبادلہ ہو جائے گا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں کو ڈاکٹر لی وان اور دیگر یرغمالیوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔ میرے کہنے پر وہ نیچے گیا اور اس نے سلطانہ سے بھی میری بات کروائی۔ سلطانہ کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد تھکی ہوئی ہے تاہم اس کا اعصابی تناؤ اب کم محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! تم لوگ کب تک یہاں سے نکلو گے؟''

''آفتاب کہہ رہا ہے، ابھی دو ڈھائی گھنٹے تو لگیں گے۔ شاید...... ہم کل شام تک نل پانی پہنچ سکیں اگر سب کچھ ٹیخ (ٹھیک) رہا تو۔'' اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ مت...... اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ کل رات ہم نل پانی کے دیوان میں ملیں گے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بالو، وہیں ہے نا؟'' میں نے اس کی بات کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''میں اسے بہت پیار کرنا چاہتی ہوں مہروج۔ میں نے اس معصوم کو بہت دکھ دیا ہے۔ بڑا انتجار کرایا ہے اسے۔ میں بہت اِچ بری ماں ہوں مہروج۔ میرا اللہ مجھے ماف کر دے گا نا؟''

''اگر سچے دل سے معافی مانگی جائے تو وہ ضرور معاف کرتا ہے۔''

''اور...... آپ بھی کر دیں گے نا؟''

''مجھے کوئی گلہ نہیں ہے سلطانہ۔''

''لیکن میں نے آپ کو رنج تو دیئے ہیں نا۔ اگر آپ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ واکی ٹاکی پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کچھ فاصلے پر دو افراد بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ سلطانہ نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے ہاشم صاحب اندر آ گئے ہیں...... ہاں، یہ ہاشم صاحب ہی ہیں۔ امام صاحب بھی ان کے ساتھ ہیں۔ آفتاب انہیں لے کر اندر آ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اب ہمیں یہاں سے نکلنے میں جیادہ سمے ناہیں لگے گا لیکن آپ کہاں ہیں مہروج؟''

''میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔ بے فکر رہو۔''

''مجھے یخین ناہیں ہو رہا مہروج کہ سب کچھ ٹھیخ ہوتا جا رہا ہے۔ میں تو اپنی آشا بس ختم اِچ کر چکی تھی۔ اچھا اب میں بند کرتی ہوں۔ آفتاب اور ہاشم صاحب اس طرف آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بھرت ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلے گئے اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، وہ زخمی کتا ابھی تک گلی میں گھوم رہا تھا جس سے کماد کے کھیت میں ملاقات ہوئی تھی۔ عمران نے بھی اسے دیکھا مگر تبصرہ نہیں کیا۔ تبصرے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

بھرت کے بوڑھے پتا جی صحن میں گھوم رہے تھے اور مسلسل کھانس رہے تھے۔ بھرت نے ابھی تک انہیں ہماری موجودگی سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ ہم چھت کی تاریکی میں سے انہیں دیکھتے رہے۔ وہ بمشکل چل پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتے

ہوئے کسی کمرے میں چلے گئے...... تاہم ان کی کھانسی کی آواز آتی رہی۔ ہمیں ابھی تک یہ اندیشہ تھا کہ یہاں کوئی ہمیں پہچان نہ لے۔ خاص طور سے بھرت کے بڑے بھائی کی فکر تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گھومنے پھرنے والا شخص ہے۔ وہ اب بھی زرگاں میں تھا۔ اگر اس نے زرگاں میں ہمیں دیکھا ہوتا تو اس کی واپسی کے فوراً بعد ہمارے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

بھرت کی واپسی میں دیر ہوئی تو ایک بار پھر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں پھر کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہو گئی تھی؟ بھرت نے واپس آنے میں آدھ گھنٹا مزید لگا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی واضح نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر گڑ بڑ ہو گئی...... اور اس دفعہ بڑی سخت ہوئی ہے۔ پتا ناہیں بھگوان کو کیا منظور ہے۔''

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ہمارے پوچھنے پر بھرت نے بتایا۔ ''ہاشم رازی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ بہت ہی سخت اور کٹر بندہ ہے...... بلکہ کچھ لوگن اس کو جنونی کہوت ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ اس نے اندر پہنچ کر صاف کہا ہے کہ وہ ابھی ماریا کو ناہیں چھوڑے گا۔ ماریا کو اس سے رہائی ملے گی جب وہ نل پانی کی حد تک پہنچ جاویں گے۔ اس کی وجہ سے امام قادر بخش سخت مصیبت میں آ گئے ہیں۔ وہ اس سمجھوتے کے ضامن تھے اور وہی ہاشم رازی کو اندر لے گئے تھے۔ انگریز افسروں اور پانڈے وغیرہ نے امام صاحب کو دھمکی دی ہے کہ اگر ماریا کو کچھ ہوا تو وہ بھی برابر کے جرم وار ٹھہریں گے۔ ان بے چاروں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔''

یہ بس کچھ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس ہاشم رازی کے بارے میں پہلے بھی ہمارے خیالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ہم نے حکم کے دربار میں اسے جنونیوں کی طرح چنگھاڑتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جو اپنے قریبی ساتھیوں اور ہم خیالوں کے سوا ہر شخص کو کافر یا منافق قرار دیتے ہیں اور انہیں ہر طرح کا نقصان پہنچانا جائز سمجھتے ہیں۔ حکم کے دربار میں ہی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہاشم نے اپنے ہیجانی خیالات کے زیر اثر کئی مسلمانوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جب سب کچھ طے تھا تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

بھرت بولا۔ ''میرا وچار ہے کہ اندر جا کر ہاشم کو کل رات والے واقعے کی جانکاری ملی ہے۔''

''کون سا واقعہ؟''

''وہی پانڈے اور دو گورے چھاپا ماروں کے اندر گھسنے والا واقعہ۔ اس کے بعد ہی وہ بھپرا ہے اور اس نے کہا ہے کہ یہ لوگن پھر دھوکا دیں گے۔ حالانکہ میری سمجھ کے مطابق اس کا یہ وچار بالکل غلط ہے۔ اس کو کسی اور پر ناہیں تو بڑے امام صاحب پر تو وشواس کرنا چاہئے اور پھر اتنے یرغمالی بھی ہیں اس کے پاس جن میں ڈاکٹر لی وان کے علاوہ وہ زخمی انگریز افسر بھی ہے۔''

اسی دوران میں اسپتال کی چھت کی جانب سے کسی کے غصیلے انداز میں دہاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بھرت بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ ہاشم بول رہا ہے۔ انگریز افسر اینڈرسن صاحب نے اسے بات چیت کرنے کے لئے بیٹری سے چلنے والا لاؤڈ اسپیکر بھجوایا ہے۔''

ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آئے۔ یہ واقعی ہاشم رازی تھا۔ وہ اسپتال کی چھت پر موجود تھا مگر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میگافون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیر کر اس کی مشتعل آواز ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ''...... بکواس مت کرو۔ تم لوگن خود دغاباز ہو، فریبی ہو۔ اب ہم تمہارا فریب ناہیں چلنے دیں گے۔ وہی کچھ ہووے گا جو ہم چاہیں گے۔ میم تب چھوٹے گی جب ہم نل پانی پہنچ جاویں گے۔''

ایک قریبی گھر کی چھت سے ایک دوسری آواز آئی۔ یہ بھی میگافون کے ذریعے آئی تھی۔ بولنے والا حکم کا کوئی افسر تھا۔ اس نے انگریز افسر اینڈرسن کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب کہوت ہیں، تم زبان دے کر پھر رہے ہو۔ کیا تمہارا دھرم تمہیں اس کی اجازت دیوت ہے؟ یہ سراسر جھوٹ اور مکاری ہے۔ اس کے بعد تمہاری اور کس بات پر وشواس کیا جا سکتا ہے؟''

''یہ جھوٹ اور مکاری ناہیں۔'' ہاشم دہاڑا۔ ''یہ سب کچھ لڑائی کا حصہ ہے اور تم لوگن خود کہوت ہو کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہووت ہے......''

حکم کے افسر نے کہا۔ ''اچھا...... یہ ایک منٹ، امام صاحب سے بات کرو۔''

چند سیکنڈ بعد میگافون پر امام قادر بخش صاحب کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ ''ہاشم! تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس طرح وعدے سے پھرنا ٹھیک ناہیں۔ اس سے فساد ہوگا...... اور اس فساد میں اگر کچھ جانیں گئیں تو اس کا بوجھ بھی تم پر آئے گا۔ میں نے تمہیں ضمانت دی ہے اور ایک بار پھر پوری ذمے داری کے ساتھ یہ ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت

نل پانی جانے کی اجازت دی جائے گی......"

"میں آپ کی عزت کرتا ہوں امام صاحب! لیکن آپ ایک سیدھے سادے شخص ہو۔ آپ کی دوڑ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک ہے۔ آپ ان گوروں کے چلتر نا ہیں جانتے۔ جب ہم ان کے نشانے پر آ گئے تو یہ طوطے کی طرح آپ کی طرف سے آنکھیں پھیریں گے۔ ایک نا ہیں سنیں گے آپ کی۔ آپ اس معاملے سے ایک طرف ہو جائیں۔"

"میں کس طرح ایک طرف ہو جاؤں ہاشم؟ میں ضامن ہوں تمہارا۔ یہ مجھے بھی تمہارا ساتھی کہنے لگے ہیں۔ مجھے اور میرے سارے خاندان کو جیل میں سڑا دیں گے۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟"

"ایسا کچھ نا ہیں ہوگا مولانا! یہ حرامجادے آپ پر صرف دباؤ ڈال رہے ہیں اور اگر خدا نخواستہ کوئی ایسی بات ہو بھی تو آپ کی طرف سے اس کارِ خیر میں حصہ ڈلے گا۔ یہ سچ اور جھوٹ کی لڑائی ہے۔"

"لیکن اس لڑائی میں بے گناہوں کا خون بہے گا ہاشم۔ ان بیمار بچوں اور عورتوں کا کیا قصور ہے جنہیں تم لوگوں نے قیدی بنایا ہوا ہے؟ ان کا لہو کس کی گردن پر ہوگا؟"

"یہ کھلی جنگ ہے مولانا...... اور جنگوں میں فوجیوں کے ساتھ شہری بھی مرتے ہیں لیکن جو بے گناہ مریں گے، ان کو صلہ ملے گا۔ ان کی بخشش ہووے گی......" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر دہاڑتی آواز میں بولا۔ "اور میں ایک بار پھر سب کو وارننگ دیوت ہوں۔ اگر کل سویرے ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ دی گئی تو ہم ناپاک لوگن کی لاشوں کو صحن میں پھینکنا شروع کر دیویں گے اور سب سے پہلے مرے گا یہ بڈھا لی وان......"

بڈھا لی وان...... اس کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر لی وان وہ شخص تھا جو اپنی خداداد قابلیت کے ساتھ مقامی لوگوں کی بے لوث خدمت کر رہا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے جسم کو گھسیٹتا ہوا اس دور دراز علاقے میں اپنے کسی ذاتی مطلب سے نہیں پہنچا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی۔ ایک موقع پر آفتاب نے اسے اسپتال سے بحفاظت نکال دینے کی آفر کی تھی لیکن اس نے اپنے عملے اور اپنے مریضوں کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اکثر قابلِ ترین لوگوں کی طرح کچھ سنکی اور موڈی تھا مگر اس کی ان کیفیات میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی اور اب چھوٹے ڈاکٹر راج کی طرح ڈاکٹر لی وان بھی موت کے دہانے پر تھا۔ صورتِ حال ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ گھمبیر ہو چکی تھی۔

میگافون پر ہونے والی بات چیت ختم ہو چکی تھی۔ ہم بھی چھت سے نیچے آ گئے۔ گھر کے اندر خوش گوار حرارت موجود تھی۔ چمپی نے ہمارے بستر لگا دیئے تھے اور انگیٹھی وغیرہ دہکا دی تھی۔ وہ پُرکشش صورت اور جسم کی مالک تھی۔ بھرت کے اردگرد وہ یوں رہتی تھی جیسے کوئی داسی، دیوتا کے گرد پروانہ وار منڈلاتی ہے۔ اس کی نگاہیں جیسے ہر وقت اپنے دیوتا کے چرن چھوتی رہتی ہیں۔ بھرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اپنے پتا کی طرح وہ بھی چکنی مٹی اور چونے وغیرہ سے بڑے خوب صورت مجسمے بنا لیتی ہے۔ اس کا پتا ان مجسموں کو بیچ دیتا ہے اور اس رقم سے چمپی کا جہیز بناتا ہے۔

مجسموں کی بات چلی تو بھرت نے ہمیں چمپی کے بنائے ہوئے چند Statue دکھائے۔ جوتیاں گانٹھتا ہوا موچی، کھیت میں ہل چلاتا ہوا کسان، پن گھٹ سے پانی لاتی ہوئی عورت...... یہ واقعی خوب صورت کام تھا۔ بھرت نے یہ مجسمے ایک چوبی الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ عمران کی عقابی نظر نے دیکھ لیا کہ الماری میں ایک چور خانہ بھی ہے اور غالباً اس میں بھی مجسمے رکھے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھرت بھیا! کیا وہاں کچھ خاص نمونے ہیں؟"

بھرت نے دو لمحے توقف کیا پھر مسکرا کر بولا۔ "اب آپ دونوں سب کچھ جان ہی چکے ہیں تو یہ بھی دیکھ لیں۔"

اس نے ایک چابی سے چور خانہ کھولا۔ اس میں وہ مجسمے تھے جو غالباً چمپی نے جذبات میں ڈوب کر بنائے تھے۔ یہ ایک دیوتا کے لئے ایک داسی کی بے مثال محبت اور خود سپردگی کی تصویر پیش کرتے تھے۔ شاید یہ مجسمے بناتے ہوئے چمپی خود بھی شرمائی تھی اور اس کی یہ شرم داسی کے خوب صورت چہرے پر بھی نقش ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھرت نے اصرار کر کے چمپی سے یہ مجسمے بنوائے ہوں۔ تین چار مجسمے Couple STatues کی شکل میں تھے۔ ان میں داسی قریباً عریاں نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دیوتا کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ کہیں اسے اپنے پُرکشش جسم کی نذر پیش کر رہی تھی۔ کہیں اس کی آغوش میں تھی۔

غالباً ایسے ہی خیالات عملی زندگی میں بھی چمپی کے رہے ہوں گے۔ ہم اس کی ایک جھلک رات کے وقت گنے کے کھیت میں دیکھ چکے تھے۔ وہ اپنی ماں کی نگاہ بچا کر وہاں پہنچی تھی اور بھرت سے ہم آغوش ہوئی تھی۔ ان دونوں کے تعلقات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر بھرت چاہے تو وہ اپنی اس شودر خادمہ کو کسی بھی وقت اپنی "بھرپور خدمت" پر آمادہ کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا چاہتا نہیں تھا۔ وہ اس سے پیار کرتا تھا اور اسے پوری عزت کے ساتھ بیاہ کر ایک

اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔

کچھ اور مجسمے بھی چور خانے میں موجود تھے لیکن یہ جذبات انگیز مجسمے نہیں تھے۔ یہ تو سیدھے سادے دیوی دیوتاؤں کے Statue تھے۔ درگا دیوی، لکشمی دیوی، کرشن، لکشمن، ہنومان وغیرہ۔

میں نے کہا۔ ''ان بے ضرر مجسموں کو کیوں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟''

بھرت بولا۔ ''اس لئے کہ یہ چمپی نے بنائے ہیں۔ وہ نچلی ذات کی ہے۔ دھرم کے ٹھیکے دار اسے یہ آگیا نا ہیں دیتے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو ہاتھ لگائے۔ وہ شوق پورا کرنے کے لئے چوری چھپے ایسا کام کرت ہے۔''

باہر کسی تاریک گلی سے کتے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ وہی کتا تھا۔ عمران نے بھرت سے کہا۔ ''یار! یہ کتا زخمی ہے۔ اس کے گلے میں شاید شرارتی لڑکوں نے بہت کس کر رسّی باندھ دی تھی۔ یہ مرنے کے قریب تھا۔ ہم نے کھیت میں اس کی رسّی کھولی تھی۔ اگر ہو سکے تو کسی نوکر کو بھیج کر اسے اندر باندھ دو اور اس کی مرہم پٹی کرادو۔ یہ بڑا پُن کا کام ہے۔''

بھرت نے کہا۔ ''ہاں، میں نے بھی کل اسے دیکھا تھا۔ چلو میں کسی نوکر سے کہوت ہوں۔ ویسے لگت ہے کہ تم کو جانوروں سے کافی پریم ہے؟''

''ہاں...... کچھ ایسا ہی ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ بے پر کی بھی اڑاتے ہیں کہ میں پہلے ایک جانور تھا یعنی بندر...... پھر ڈھائی تین کروڑ سال میں آہستہ آہستہ بندہ بن گیا۔ یعنی بندر کی ''ر'' اڑ گئی اور ''ہ'' لگ گئی۔ غور کریں تو اب بھی بندے کے لفظ میں تین چوتھائی حصہ بندر کا ہی ہے...... اور کچھ لوگوں میں تین چوتھائی صفتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔'' اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا، شاید بحث کے موڈ میں تھا۔ بہر حال میں نے اسے نظر انداز کیا۔

بھرت مسکرایا۔ ''تمہاری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں شیام بھائی۔''

بھرت کے باہر جانے کے بعد میں اور عمران ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ جو کچھ اسپتال میں ہو رہا تھا، بہت تکلیف دہ تھا۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک سلطانہ مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید تین رات پہلے فتح پور کے پرانے مندر سے سنگین واقعات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ اب رک جائے گا اور موت کے گھیرے سے نکل کر پھر آزاد فضاؤں میں پہنچ سکے گی۔ اس ہٹ دھرم ہاشم عرف ہاشو نے ایک بار پھر صورتِ حال کو ریورس گیئر لگا دیا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے؟ کیا مسٹر اینڈرسن اور پانڈے وغیرہ

ہاشم کی یہ بات مان لیں گے کہ وہ ماریا سمیت یہاں سے نکل جائے؟''

''نہیں...... لگتا ہے کہ وہ نہیں مانیں گے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر ہاشم رازی اتنے سخت گھیرے میں بھی ان کی بات نہیں مان رہا تو پھر وہ نل پانی کی سرحد پر پہنچ کر بھی نہیں مانے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ خون خرابا ہو گا؟'' میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''آثار تو ایسے ہی ہیں۔''

''اس کو روکنے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں عمران؟ کیا ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟''

''نہیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

ہم رات کو بہت تھوڑی دیر کے لئے سوئے۔ صبح سویرے بھرت کی زبانی ایک خبر ملی جو بڑی اندوہناک تھی۔ معلوم ہوا کہ شعلہ صفت ہاشم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے اور ڈاکٹر لی وان کے سر میں دو گولیاں اُتار کر اس کی لاش چھت پر سے صحن میں پھینک دی ہے۔ وہ شخص اپنی جان کی بازی ہار گیا تھا جس نے بے لوث جذبے کے ساتھ اس راجواڑے کے بے شمار لوگوں کی جانیں بچائی تھیں۔ ہمارے دل غم سے لبریز ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جب عمران ڈاکٹر کو نل پانی سے زبردستی فتح پور لے کر آیا تھا تا کہ وہ میری گردن میں سے الیکٹرانک چپ نکال سکے۔ شروع میں ڈاکٹر بے حد سیخ پا ہو رہا تھا اور اس نے کمرے سے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر عمران کو مارنا شروع کر دی تھیں۔ مگر جب عمران نے بڑے اسٹائل سے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی تھی تو وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی تمام توجہ اور مہارت میری گردن کے آپریشن پر صرف کر دی تھی۔

ہم کتنی ہی دیر خاموش اور آزردہ بیٹھے رہے۔ یہ کیفیت اس بوڑھے ناتواں شخص کے لئے تھی جس نے دلیری سے موت کو گلے لگایا تھا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کے کپتان کی طرح اس نے شدید خطرے کے وقت اپنا اسپتال اور اپنے مریض چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور موت کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا۔ بھرت کے مطابق وہ پورے دو دن سے بھوکا پیاسا اپنے مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں اس نے فوزیہ نامی ایک کم سن بچی کے گلے کا آپریشن اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ اب وہ ہم میں نہیں تھا۔ اس کی لاش گاؤں کے مکھیا بلرام کی حویلی میں پڑی تھی اور سیکڑوں لوگ اس کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

بھرت نے ہمیں چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بارے میں بھی تفصیل بتائی۔ چھوٹے

ڈاکٹر راج سنہا کو کل رات مارا گیا تھا۔ بھرت نے بتایا کہ اب بہت سی باتیں کھل گئی ہیں۔ میم ماریا یہاں ڈاکٹر لی وان پر ڈورے ڈالنے آئی تھی۔ وہ اس سے کوئی خاص کام لینا چاہتی تھی لیکن لی وان کی طرف سے ناکام ہو کر اس نے چھوٹے ڈاکٹر راج کو اس کام کے لئے چنا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم کس خاص کام کی بات کر رہے ہو؟''

بھرت گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک سے تو پتا نا ہیں لیکن جو لوگن اندر کی بات جانت ہیں، وہ کہوت ہیں کہ ڈاکٹر لی وان کو سلطانہ کے پتی کے ٹھکانے کے بارے میں پتا تھا اور شاید چھوٹا ڈاکٹر راج بھی جانتا تھا۔ میم ماریا بھی اس کا ٹھکانا ہی جاننا چاہت تھی۔ سامبر مقابلے میں اپنے سوتیلے بھائی جارج کی موت کے بعد سے وہ دیوانوں کی طرح سلطانہ کے پتی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یہاں آ کر ماریا کو جلد ہی پتا چل گیا ہوگا کہ ڈاکٹر لی وان اور طرز کا بندہ ہے اور اس کے ڈھب پر نا ہیں آوے گا۔ اس نے نوجوان ڈاکٹر راج پر اپنے حسن کا جال پھینکا اور کسی حد تک اسے گھیرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اسپتال کے ایک ملازم نے جانکاری دی ہے کہ یہ میم صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے تک چھوٹے ڈاکٹر راج کے کمرے میں رہی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر پھر اور ہی چکر چل گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا جو آپ کے اور میرے سامنے ہے۔ چھاپا ماروں نے اسپتال کو یرغمال بنالیا۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت شاید اسی کارن ہوئی کہ وہ میم ماریا کے حسن کا شکار ہو گیا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' عمران نے پوچھا۔

''چھوٹے ڈاکٹر نے ماریا کی مدد کرنے کے لئے احمقانہ بہادری دکھائی اور رات پٹھان چھاپا مار سے رائفل چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ سب کو وشواس ہے کہ اسی ناکام کوشش کی وجہ سے کل اسے گولی مارنے کے لئے چنا گیا تھا۔''

بھرت کی بات ختم ہوئی تو عمران نے کرتے کی جیب سے ایک چھوٹا سا رقعہ نکال کر بھرت کو دیا۔ ''بھرت! یہ ایک بہت ضروری کام کرو۔ کسی طرح یہ پیغام انگریز افسر مسٹر اینڈرسن تک پہنچا دو۔''

''مسٹر اینڈرسن؟ کیا وہ تم کو جانت ہے؟'' بھرت نے پوچھا۔

''نہیں لیکن اس رقعے کو وہ ضرور اہمیت دے گا۔'' عمران نے کہا۔

''اس میں کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ بھرت بھی کچھ ٹھٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

عمران بھرت کو ایک طرف لے گیا۔ دھیمی آواز میں اسے کچھ سمجھایا۔ بھرت کی تشویش قدرے کم ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

''یہ سب کیا ہے عمران؟ تم کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے اطمینان سے کندھے اچکائے۔

''رقعے میں کیا لکھا ہے تم نے؟''

''کچھ خاص نہیں۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دے۔ میں اس کا داماد بن جاؤں گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ یہاں کے ہندوؤں سے تو پہلے ہی گوروں کی بنتی ہے، زیادہ دشمنی مسلمانوں سے ہی ہے۔ اس رشتے داری سے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے گی اور میری یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی کہ کسی گوری چٹڑی والی حسینہ کو...... سمجھ گئے ہو نا تم؟'' اس نے ایک آنکھ میچی۔

میں نے کہا۔ ''عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم مسخرے ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بے حس بھی ہو۔ وہاں اسپتال میں لاشیں گر رہی ہیں اور تم اوٹ پٹانگ بول رہے ہو۔''

''تم بھی تو سوال پر سوال کرتے ہو۔ کبھی اپنا دماغ بھی استعمال کیا کرو...... بلکہ میرے خیال میں تو یہ بات تمہارے دماغ شریف میں بھی آنی چاہئے تھی کہ اینڈرسن سے رابطہ کیا جائے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا عمران! کہیں ہم کسی مصیبت کو دعوت نہ دے لیں۔ کیا تم نے اینڈرسن کو یہاں اپنی موجودگی کے بارے میں بتایا ہے؟''

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''میں نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں بتا بھی دیتا تو کوئی زیادہ خطرے والی بات نہیں تھی۔ تم ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''حکم اور اس کے انگریز دوستوں میں بڑا بھائی چارہ ہے لیکن فی الوقت دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ ہندو افسر اور سپاہی ہر صورت دھرم دشمن سلطانہ کو پکڑنا یا قتل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف انگریزوں اور انگریز افسروں کے نزدیک سب سے اہم بات ماریا کی زندگی بچانا ہے اور میں نے اینڈرسن کو جو رقعہ لکھا ہے، وہ اسی حوالے سے ہے اور اس کی تحریر اینڈرسن کے دل کو ضرور لگے گی۔''

''کیا کہا ہے تم نے؟''

''فی الحال بس اتنا بتایا ہے کہ وہ کسی بھی ہندو فوجی افسر یا سپاہی کو بتائے بغیر مجھ سے ملاقات کرے۔ میرے پاس اس کے لئے ایک بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کا تعلق سلطانہ کے پتی تابش اور اس کے ساتھی عمران سے ہے۔''

''اوہ گاڈ...... یہ کیا کر رہے ہو تم۔ یہ تو بڑا رسک والا کام کر دیا ہے تم نے۔'' میں کراہا۔

''رسک والا کام ہی تو ہم کرتے ہیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھولے سے دوسرے پر بغیر جال کے چھلانگ لگانا، سر پر سیب رکھ کر چاقو سے نشانہ لینا، ریوالور کے چیمبر کو گھما کر تین چھ کا کھیل کھیلنا...... یہ سب کچھ رسک ہی تو ہے جگر! اور رسک ہی اپنی زندگی ہے۔ کیونکہ رسک سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔'' اس نے عجیب کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ خطروں کا کھلاڑی تھا اور اس کھیل میں اس کی خوش قسمتی اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کس موڈ میں تھا کہ انچارج انگریز افسر کو خط لکھ مارا تھا۔

عمران نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ میری توقع کے خلاف اور عمران کی توقع کے عین مطابق نکلا۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد بھرت ہانپا ہوا نمودار ہوا اور اس نے عمران سے کہا کہ مسٹر اینڈرسن اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

حویلی کی ڈیوڑھی کے پاس بھرت کی ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ بھرت نے خود کوچبان کی نشست سنبھالی اور گھوڑا گاڑی حویلی نما مکان کے پھاٹک سے نکل کر ایک طرف روانہ ہوگئی۔ دن چڑھ آیا تھا مگر ابھی گلیوں میں آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ اِکا دُکا افراد خالی ہاتھ یا لوٹے وغیرہ لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ مویشیوں کے ایک دو ریوڑ بھی کھیتوں کی جانب جاتے دکھائی دیئے۔ ان کی گھنٹیاں اس ٹھٹھری ہوئی دھند آلود صبح میں ارتعاش پیدا کرتی تھیں...... کہیں کہیں حکم کا کوئی باوردی فوجی بھی ٹہلتا نظر آ جاتا تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک چھوٹے سیم نالے کے ساتھ چلتی چلتی کوئی نصف میل باہر آ گئی۔ کماد کی ایک فصل کے پیچھے جوار کے کٹے ہوئے کھیت میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی۔ اس کو لوڈر نما گاڑی کہا جا سکتا تھا...... ترپال کے ذریعے اسے چاروں طرف سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سفید فام ڈرائیور بیٹھا تھا۔ بھرت ہم دونوں کو اس کیچڑ آلود گاڑی میں لے گیا۔

ہم اندر چلے گئے اور وہ باہر کھڑا رہا۔ اس لوڈر کے اندر ایک چھوٹا سا آرام دہ صوفہ پڑا تھا۔ دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفے پر پینتالیس اڑتالیس سال کا ایک بارعب فوجی افسر بیٹھا تھا۔ اس کے ہولسٹر میں چمکدار پستول لگا ہوا تھا اور منہ میں سگار تھا۔

اس نے ہمیں دھیان سے دیکھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں تحیر کے آثار اُبھرے۔ اس نے یقیناً ہم دونوں کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ''ہیلو مسٹر

آمران اور ہیلو مسٹر تابش۔'' اس نے ہم دونوں کے نام بگاڑتے ہوئے کہا۔

''ہیلو مسٹر اینڈرسن۔'' عمران نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ ''ویل ڈن...... ویل ڈن...... بہت آچھا کیا کہ تم نے ام سے رابٹا (رابطہ) کر لیا اور اس سے بھی زیادہ آچھا یہ کیا کہ ہام کو اکیلے میں بلایا۔ آئی ایم رئیلی امپریسڈ۔''

''اس میں خطرہ موجود تھا مسٹر اینڈرسن...... لیکن ہمیں آپ کی فہم و فراست پر یقین بھی تھا۔ ہمیں امید تھی کہ آپ کا رویہ ہمارے لئے نرم ہوگا اور ہم اس سنگین سچویشن میں ایک دوسرے کے کام آ سکیں گے۔''

''وائی ناٹ...... وائی ناٹ۔ ہام کو خوشی ہوا کہ تم نے ایسا دلیری کا فیصلہ بنایا...... اور ہام کا خیال ہے کہ ہام تینوں انگلش میں بھی بات کر سکتا ہوئیں گا۔''

''بالکل جی! اس میں ہم تینوں کو آسانی رہے گی۔'' عمران نے انگلش میں کہا۔

اب گفتگو انگریزی میں ہونے لگی۔ عمران نے کہا۔ ''جناب! زرگاں کے سامبر مقابلے میں جو کچھ ہوا، وہ کھیل کا حصہ تھا۔ اس خونی کھیل میں کسی ایک کو تو ہارنا تھا۔ پھر بھی ان واقعات کا رنج ہے۔''

''چھوڑو...... ان باتوں کو اب چھوڑ دو۔ وہ سب ماضی کا حصہ ہے۔'' اینڈرسن نے تیزی سے کہا۔ ''اب ہمیں موجودہ صورتِ حال کو دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس میں سے کیسے بحفاظت نکل سکتے ہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''آپ نے ہندوؤں کا رویہ تو ملاحظہ فرما لیا ہوگا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو ہر صورت سلطانہ کی موت چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کچھ قیمت بھی دینی پڑے۔ یہاں آ کر ہمارا اور آپ کا مفاد ایک ہوگیا ہے۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے ہیں اور آپ مس ماریا کو...... اور انگلش آفیسر کو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس معاملے کو ہینڈل کرنے کا موقع دیں۔''

''تم کس طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتے ہو؟''

''بات چیت کے ذریعے اور اگر یہ طریقہ کام نہ آیا تو پھر کسی بھی طریقے سے...... تابش کا خیال ہے کہ سلطانہ اب شاید خود بھی وہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اگر اسے کسی طرح پتا چل جائے کہ تابش یہاں موجود ہے اور اس معاملے کے حل کی کوشش کر رہا ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اندر سے کوئی ایسی کوشش کرے جس سے بازی ہمارے حق میں پلٹ جائے۔''

"تم اندر کے لوگوں سے کس طرح رابطہ کرو گے؟" اینڈرسن نے اپنی بارعب آواز میں دریافت کیا۔

"آپ ہمیں اسپتال کے آس پاس کی کسی قریبی چھت تک رسائی دلا دیں۔ باقی ہم خود سنبھال لیں گے۔" عمران نے کہا۔ اس نے اینڈرسن کو یہ بات نہیں بتائی کہ اسپتال کے اندر رابطہ کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک واکی ٹاکی کا برا بھلا سہارا بھی موجود ہے۔

ہمارے اور مسٹر اینڈرسن کے درمیان یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اس دوران میں بھرت اور انگریز ڈرائیور باہر دھوپ میں بیٹھے رہے۔ اگر کوئی اس طرف آ بھی جاتا تو شاید یہی سمجھتا کہ کوئی صاحب بہادر رفع حاجت فرمانے کے لئے اس طرف آیا ہوا ہے۔

مسٹر اینڈرسن یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ ہم جو کچھ بھی کریں گے، اس میں ماریا کی زندگی کے لئے کسی طرح کا خطرہ موجود نہیں ہوگا۔ عمران نے اپنی بے مثال مدلل گفتگو کے ذریعے اینڈرسن کا یہ اندیشہ کافی حد تک کم کر دیا۔ دوسری طرف ہمیں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ مسٹر اینڈرسن یا اس کے دو چار قریبی انگریز ساتھیوں کے سوا کسی کو ہماری یہاں موجودگی کا علم نہیں ہوگا۔ اینڈرسن نے ہمیں یقین دہانی کرادی۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا کہ اگر یہ معاملہ خیریت کے ساتھ طے ہو جاتا ہے اور ماریا باہر آ جاتی ہے تو وہ ہماری اور سلطانہ کی نل پانی واپسی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالے گا بلکہ کسی اور کو بھی نہیں ڈالنے دے گا۔

دراصل سلطانہ کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا اصل خبط تو کٹر ہندوؤں پر ہی سوار تھا۔

گفتگو کے انجام تک اینڈرسن اچھے موڈ میں آ چکا تھا۔ اس نے مجھے اور عمران کو سگار پیش کئے۔ عمران نے شکریے کے ساتھ سگار قبول کر لی۔ اینڈرسن پاٹ دار آواز میں بولا۔

"ہمارے دور میں برصغیر کے اندر جو کچھ بھی ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے وعدہ خلافیاں نہیں کیں۔ ہم نے کسی کو دوست بنایا تو اس کا ساتھ نبھایا۔ کسی کو جان کی امان دی تو اس کی حفاظت کی۔ اس کی ایک مثال آخری تاج دار بدر شے ظافر (بہادر شاہ ظفر) بھی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ وہ اپنے جرنیل بخت کے بلند بانگ دعوؤں سے متاثر ہو گیا اور اس کے ساتھ مل کر برٹش فوج کو دلی سے دور رکھنے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن ہم نے چونکہ اس کی بیوی زینات محل (زینت محل) اور بچے کو جان کی امانت دی ہوئی تھی، اس لئے سخت مشکلوں کے باوجود ان کی حفاظت کی اور انہیں ہندوستان کے بھڑکتے شعلوں سے نکال کر رنگون پہنچایا......اور برادرز! یہ تو بس ایک مثال ہے......"

"ہم جانتے ہیں جی، آپ ایسی بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں۔" عمران نے نیازمندی

سے کہا۔ "آپ پر ہمارا یہ بھروسا ہی ہے جس نے ہمیں اپنی جان خطرے میں ڈالنے اور آپ سے رابطہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔"

اینڈرسن نے عمران کو گہری نظروں سے دیکھا...... جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کے لہجے کی تہ میں کوئی طنز وغیرہ تو نہیں لیکن وہ عمران ہی کیا تھا جس کے اندر جھانکا جا سکتا۔ ہمارے اور اینڈرسن کے درمیان کئی تفصیلات طے ہوئیں۔ آخر یہ ملاقات ختم ہوئی۔

میں نے اس گفتگو میں بہت تھوڑا حصہ لیا تھا۔ اینڈرسن ہم دونوں سے تھوڑا تھوڑا متاثر ہوا تھا۔ عمران کی گفتگو اور حاضر جوابی نے اسے متاثر کیا تھا جبکہ میرے کریڈٹ میں میری جسمانی فٹنس تھی اور وہ تاریخی مقابلہ تھا جس نے جارج جیسے فائٹر کو خاک چٹوائی تھی۔ بہرحال، ہمارے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو کے دوران میں اینڈرسن کی آنکھوں میں احساسِ برتری کی وہی چمک نظر آئی تھی جو ہمارے جیسے محکوم ملکوں میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں کی نگاہوں میں سما جاتی ہے۔

شام سے پہلے ہی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ پھر بادل چھا گئے اور سردی میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم نے بھرت کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا...... یہ جان کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو سلطانہ کا شوہر کہلاتا ہوں اور میں نے ہی زرگاں کے مقابلے میں راجواڑے کے شکتی دیوتا کو خاک وخون میں لوٹایا تھا۔

اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اس آگاہی کے بعد وہ ہم دونوں سے اور خصوصاً مجھ سے بہت مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سیدھا سچا شخص تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر معذرت کے انداز میں کہا۔ "اگر میں نے بے خبری میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی ہو تو مجھے شما کیجئے۔ مجھے ہرگز معلوم ناہیں تھا کہ اتنا بڑا شخص ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ہمارا مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ راجواڑے کے ہزاروں لوگن ہوں گے جو آپ کی صرف ایک جھلک دیکھنا چاہت ہوں گے۔"

میں نے بھرت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں کچھ خاص نہیں بھرت! مجھے تو لگتا ہے کہ یہ یہاں کے لوگوں کی بددعائیں اور آہیں تھیں جو جارج کو لے ڈوبی ہیں۔"

"کچھ بھی ہے تابش صاحب! آپ نے ایک مہان کام کیا ہے۔ یہ راجواڑہ آپ کی اس جیت کو مدتوں یاد رکھے گا۔"

عمران نے کہا۔ "یار! تعریف کے دو بول میری طرف بھی پھینک دو۔ آخر میں نے بھی کچھ کردار ادا کیا ہے۔"

جواب میں بھرت نے کہا کہ آپ دونوں ہی تعریف کے قابل ہیں۔ عمران بولا۔ ''ہاں اب کچھ بیلنس ہوا ہے۔''

پروگرام کے مطابق ہم نے شام سات بجے تک تیاری کر لی۔ ہم نے اپنے کپڑے بدل لئے تھے۔ بھرت نے ہمارے لئے اپنے دو جوڑے فراہم کر دیئے۔ سائزوں میں تھوڑا بہت فرق تھا لیکن گزارا ہو گیا۔ ان شلواروں قمیصوں کے ساتھ جوتوں کا انتظام بھی بھرت کو کرنا پڑا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ایک بند گھوڑا گاڑی بڑی خاموشی کے ساتھ آئی اور ہمیں لے کر ایک جانب روانہ ہو گئی۔ اس میں ایک انگریز فوجی افسر موجود تھا۔ ہم رات کی تاریکی میں ایک مکان کے پچھواڑے رکے اور گاڑی سے اُتر گئے۔ مکان کے عقبی دروازے کے ذریعے ہم گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دو تین روز پہلے ہی مکینوں سے خالی کرالیا گیا تھا۔ گرد آلود سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر پہنچے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہم اسپتال کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اسپتال کی چھت اور اس گھر کی چھت کے درمیان محض ایک پچیس تیس فٹ چوڑا راستہ ہی تھا۔ ہم ایک برساتی نما کمرے میں آ گئے۔

عمران نے انگریز افسر منیارڈ سے انگریزی میں کہا۔ ''یہ بہت اچھا کام ہے۔ ہم کافی نزدیک آ گئے ہیں۔''

''لیکن بہت احتیاط بھی کرنا ہوگی۔'' منیارڈ نے کہا۔ ''یہ دیکھو۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں کھڑکی میں گولیوں کے تین چار سوراخ نظر آئے۔ منیارڈ نے بتایا کہ پرسوں ذرا سے شک کی بنیاد پر پٹھان حملہ آور نے اس طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ شاید کوئی اس طرف حرکت کر رہا ہے۔

''وہ اب بھی چھت پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ایک بندہ تو ہر وقت چھت پر رہتا ہے۔ وہ گول ٹینکی دیکھ رہے ہو نا؟'' اس کے پیچھے پوزیشن ہے اس کی۔ چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس سیون ایم ایم رائفل ہے اور زبردست نشانہ ہے باسٹرڈ کا۔''

منیارڈ اپنے ساتھ جو سامان لایا تھا، اس میں دو رائفلیں، ایک ٹیلی اسکوپ، ایک بڑی ٹارچ اور ایمونیشن وغیرہ تھا۔ منیارڈ دو منٹ کے لئے نیچے گیا تو ہمیں آپس میں بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ''حیرت ہے، یہاں ڈھائی تین سو فوجی موجود ہیں لیکن وہ دو دن تک اکیلے آفتاب کے خلاف کچھ کر نہیں پائے؟''

عمران نے کہا۔ ''اس کی بڑی وجہ تو ماریا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے آفتاب کی ہوا باندھ دی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ اندر آفتاب کے ساتھی موجود ہیں اور انہوں نے

دھماکا خیز مواد نصب کر رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن...... یہ سب کچھ یہاں نہیں ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں پتا ہے اور دوسروں کو نہیں۔ آفتاب کے پاس کوئی دھماکا خیز مواد تھا ہی نہیں اور یہی حقیقت ہمارے لئے آسانیاں پیدا کر سکتی ہے۔''

اچانک مجھے اور عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ کام اتنی جلدی شروع ہو جائے گا۔ یکا یک پانی کی گول ٹینکی کے پیچھے سے کسی لڑکے یا جوان لڑکی کے رونے سسکنے کی صدا آئی۔ اس کے ساتھ ہی ہاشم کی چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی۔ ''نو بج گئے ہیں۔ ایک اور بکرے کی قربانی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اس بکرے کا کھوپڑا توڑ کر نیچے پھینک رہا ہوں۔ تم اپنی ضد نا ہیں چھوڑو گے تو ایسے ہی اپنے چہیتوں کی لاشیں گنو گے۔'' وہ میگا فون پر بول رہا تھا...... اسپتال کے اردگرد ہر طرف ہلچل نظر آئی۔

O......❖......O

میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ ہلکی روشنی میں مجھے ایک چونکا دینے والا منظر نظر آیا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا تنومند ہاشم کی گرفت میں تھا۔ ہاشم نے اس کی دبلی پتلی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ رکھی تھی اور اس کے سر سے رائفل کی نال لگا رکھی تھی۔ لڑکا کسی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رو رہا تھا اور غالباً جان بخشی کے لئے منت سماجت بھی کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال نے مجھے مزید چونکایا، وہ مقامی نہیں تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ شاید جاپانی ہے اور آج صبح قتل ہونے والے ڈاکٹر لی وان سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہاشم میگا فون پر پھر دہاڑا۔ اس نے گھیرا ڈالنے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ جس کی لاش نیچے آ رہی ہے، یہ لی وان کا پوتا ہے۔ امید ہے کہ پوتے کو دیکھ کر دادا خوش ہو جاوے گا۔ اس کے بعد اس انگریز کی باری آدے گی......''

ہمیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ آنجہانی ڈاکٹر لی وان کے ساتھ اس کا کوئی عزیز بھی یہاں اسپتال میں پھنسا ہوا ہے۔ اب اس لڑکے کو دیکھ کر حقیقت کا پتا چل رہا تھا۔ روتا بلکتا لڑکا انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ ہاشم رازی کو انکل کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس سے اپنی جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یقیناً اس سے پہلے اس نے خونچکاں لاشیں دیکھی تھیں جن میں اس کے دادا کی لاش بھی شامل تھی۔ موت کا خوف اس لڑکے کو پوری طرح جکڑے ہوئے تھا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ سر پر پی کیپ تھی اور اس نے دھاری دار سویٹر پہن رکھا تھا۔

عمران نے بھی ٹیلی اسکوپ کے ذریعے یہ منظر دیکھا۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ دوسری کئی لاشوں کی طرح یہ بچہ بھی لاش میں تبدیل ہو کر چھت سے احاطے میں گرنے والا تھا۔ ہاشم رازی کی آواز کی وحشت گواہی دے رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت بچے کے سر میں گولی مار دے گا۔

میگافون پر انگریز افسر اینڈرسن کی آواز گونجی۔ وہ گلابی اردو بول رہا تھا۔ اس نے ہاشم کو اس عمل سے باز کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں ہاشم نے کہا کہ وہ لوگ انہیں ماریا سمیت یہاں سے نکلنے کا راستہ دیں۔ اینڈرسن نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ''کمٹمنٹ'' کے مطابق انہیں پہلے ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ تاہم اس دوٹوک مؤقف کے ساتھ ساتھ اینڈرسن نے ہاشم سے صبح تک کی مہلت بھی مانگی تاکہ مزید مشورہ کیا جا سکے۔

مشورے کی بات پر ہاشم رازی ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ وہ دہاڑا۔ ''تم ذلیل دھوکے باز ہو۔ تمہارا مشورہ ہمیں صرف دھوکا دینے کے لئے ہے۔ تم اپنی چالیں چلنے کے لئے وقت چاہ رہے ہو اور یہ وقت میں تمہیں نا ہیں دوں گا۔ بالکل نا ہیں دوں گا۔''

وہ روتے چلاتے بچے کو کھینچ کر منڈیر کے قریب لے آیا۔ تاہم وہ دونوں ابھی تک پانی والی ٹینکی کی اوٹ میں تھے۔ ہاشم اور اینڈرسن کے درمیان ہونے والے مکالمے کے دوران میں ہی عمران نے اسنیپر گن کے بیرل کو گن کے ساتھ اٹیچ کر لیا تھا۔ اس نے گن کو کھڑکی کی درز میں رکھا۔ ایک گھٹنا زمین پر ٹکایا اور آنکھ گن کی ٹیلی اسکوپ سے لگا دی۔ وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ غالباً اس نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس قدم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

اب یہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اگر ہم لڑکے کی جان بچانا چاہتے تھے تو پھر فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔ اس ایکشن کے لئے ہم سب سے نزدیک اور مناسب ترین جگہ پر موجود تھے۔ سوال بس ایک ہی تھا۔ ہمیں ہاشم پر حملہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ یقینی بات تھی کہ عمران نے بھی اس بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔ سنگین صورتِ حال میں وہ بہت تیزی سے فیصلہ کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین چار سیکنڈ کے اندر وہ اپنے اردگرد سے یکسر بے خبر ہو گیا۔ اسنیپر گن جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی اور آنکھ دوربین سے لگی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک خطرناک ترین نشانہ لینے جا رہا ہے۔

اسے اپنے ٹارگٹ یعنی ہاشم کا بہت تھوڑا حصہ نظر آ رہا تھا اور جو آ رہا تھا، وہ بھی تین چوتھائی لڑکے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے والی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ لڑکے کے سر کے پیچھے ہاشم کے سر کے بال اور نصف پیشانی ہی دکھائی دے پا رہی تھی۔

''غلطی کی گنجائش نہیں ہے عمران۔'' میں نے سرگوشی کی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بھی سوچ لینا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟''

اس نے سر کو موہوم سی حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ سوچ لیا ہے۔

ہاشم چنگھاڑا۔ ''یہ لو سنبھالو اس کو بھی۔'' اس کے ساتھ ہی شاید اس نے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے عمران لبلبی دبا چکا تھا اور یہ کسی عام شخص کا فائر نہیں تھا۔ یہ وہ ماہر نشانہ باز تھا جو ہر شام سیکڑوں لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا اور انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا اور قسمت کی دیوی اس کے کندھوں پر سوار رہتی تھی۔

ٹیلی اسکوپ میری آنکھوں پر تھی۔ میں نے ہاشم رازی کو اچھل کر لڑکے سے الگ ہوتے اور پھر ٹینکی کے قریب گرتے دیکھا۔ لڑکا چلاتا ہوا چھت پر چکرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ غالباً چند لحظوں کے لئے اس نے یہ بھی سوچا کہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دے لیکن چھت بہت اونچی تھی۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے آفتاب خاں لپک کر آیا اور وحشت زدہ لڑکے کو دبوچ کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ہاشم مر گیا ہے۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی ہے۔''

''مجھے پتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کہیں آفتاب خان مریضوں پر برسٹ نہ چلا دے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسا کرے گا لیکن اگر باہر سے کوئی حرکت ہوئی تو پھر وہ ضرور وحشی ہو جائے گا۔''

اسی دوران میں منیارڈ جھک کر دوڑتا ہوا اس برساتی نما کمرے میں آ گیا۔ اس کے گلے میں بھی ٹیلی اسکوپ جھول رہی تھی۔ وہ ہانپی ہوئی لرزاں آواز میں بولا۔ ''بہت خوب! مجھے لگتا ہے کہ تمہاری گولی نے ہاشم کو ہٹ کیا ہے۔ وہ گرا پڑا ہے۔''

''لیکن تم لوگوں نے باہر سے کسی طرح کی کارروائی نہیں کرنی۔ ورنہ یہ لوگ سب کچھ بارود سے اڑا دیں گے۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔'' عمران نے کہا۔ منیارڈ اٹھا اور جھک کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ یقیناً وہ عمران کا یہ پیغام اینڈرسن تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔

صرف دو تین منٹ بعد مسٹر اینڈرسن خود بھی ہمارے پاس چھت پر چلا آیا۔ وہ بھی ہانپا ہوا تھا۔ جوش کے سبب اس کا سرخ چہرہ تمتما رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''جناب! ہم یہ سمجھتے ہیں

کہ جس شخص کی وجہ سے یہ کام زیادہ بگڑ گیا تھا، وہ ختم ہو گیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے پرانی شرطوں پر بات ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں انہیں قائل بھی کیا جا سکتا ہے۔''

اینڈرسن نے کہا۔ ''میں خود بھی چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بغیر کسی مزید خون خرابے کے حل ہو جائے۔ تم دونوں نے کہا تھا کہ تم ان لوگوں سے مذاکرات کر سکتے ہو۔ اگر تم تیار ہو تو میں تم دونوں کو اندر بھجوا سکتا ہوں لیکن...... لیکن...... یہ تمہارے لئے بہتر نہیں رہے گا۔ تم ہندو آفیسرز کے سامنے آنا نہیں چاہتے۔'' اس کی کشادہ پیشانی پر چند لمحے کے لئے سوچ کی لکیریں نظر آئیں پھر وہ تیزی سے بولا۔ ''میں ایک واکی ٹاکی کا انتظام کرتا ہوں۔ ایک سیٹ اندر بھجواتا ہوں، دوسرا تمہیں دے دیتا ہوں۔''

''میرے خیال میں یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔'' عمران نے کہا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

ہم اینڈرسن وغیرہ کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہمارے درمیان پہلے سے وائرلیس رابطہ موجود ہے۔ ویسے یہ رابطہ زیادہ قابل بھروسا بھی نہیں تھا۔ ہمارا ''سیٹ'' کسی وقت اڑیل ٹٹو کی طرح کوئی بات بھی مان کر نہیں دیتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ کے اندر ایک اچھی حالت کا واکی ٹاکی ہمارے پاس آن موجود ہوا۔ اس کا دوسرا سیٹ اندر آفتاب خاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عمران نے مسٹر اینڈرسن سے کہا۔

''جناب! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جلدی سے میرے لئے دو باتوں کی وضاحت فرما دیں۔''

''کہو۔'' اینڈرسن نے افسرانہ شان سے جواب دیا۔

''پہلی بات تو یہ جناب کہ آپ کا اور ہمارا مفاد اس وقت ایک ہی ہے۔ ہم اس معاملے کو اس طرح حل کرنا چاہتے ہیں کہ محترمہ ماریا اور سلطانہ دونوں کی زندگی بچ جائے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ اس حوالے سے ہمارا ارادہ کتنا مضبوط ہے۔ اندر موجود لوگوں میں سے بدترین شخص کو ہم نے شوٹ کر دیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے بات چیت نسبتاً آسان ہو گئی ہے۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں یہ بات چیت تنہائی میں کرنے کی اجازت دیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں یا مسٹر منیارڈ یہاں موجود نہ ہوں؟''

''بہت معذرت کے ساتھ میرا مطلب یہی ہے جناب! یوں ہمیں بات چیت کرنے میں زیادہ آسانی رہے گی۔''

اینڈرسن چند لمحوں کے لئے متذبذب نظر آیا۔ پھر اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر ہامی بھر لی۔ عمران نے کہا۔ ''بعد میں، میں آپ کو ساری بات چیت سے تفصیلاً آگاہ کر دوں گا جناب۔''

''او کے...... او کے! دوسری بات کیا ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''ہم ان سے ''کمٹمنٹ'' کی بات کریں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری کریں۔ باہر سے بھی پاسداری ہوگی۔ اگر وہ محترمہ ماریا کو چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں یہ رعایت دی جائے گی کہ وہ باقی یرغمالیوں کو نل پانی کی حدود میں پہنچنے کے بعد آزاد کریں۔ اور نل پانی پہنچنے تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔''

''بالکل...... تم لوگ ان سے اس ''کمٹمنٹ'' کی بات کر سکتے ہو۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ایک بار پھر گارنٹی دیتا ہوں کہ اگر وہ مس ماریا کو رہا کر دیں تو ہم بھی اپنے عہد کی پاسداری کریں گے۔ یہ پاسداری ہم پہلے بھی کر رہے تھے۔ جو کام بھی خراب ہوا ہے، وہ ہماری طرف سے نہیں ان کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے پیش امام صاحب کو زبان دے کر اس سے رُوگردانی کی۔ ان کے لئے شرمندگی کا باعث بنے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار وہ اکیلا شخص تھا جو ابھی دس منٹ پہلے مارا گیا ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' اینڈرسن نے کہا۔ ''ہماری اور تم دونوں کی توقعات ٹھیک ثابت ہوں۔ میری اور محترم حکم جی کی طرف سے تم انہیں معاہدے کی پاسداری کی پوری ضمانت دے سکتے ہو۔''

طے شدہ پروگرام کے مطابق اینڈرسن نیچے چلا گیا۔ تاہم اس کا ماتحت آفیسر منیارڈ اور دو انگریز رائفل مین چھت پر ہی رہے لیکن وہ برساتی نما کمرے کے اندر نہیں تھے۔ یوں ہم اپنی مرضی سے آفتاب اور سلطانہ وغیرہ سے بات کر سکتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ کسی ذریعے سے اینڈرسن وغیرہ ہماری بات چیت سن نہ لیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے، اپنی طرف سے آفتاب کو مسٹر اینڈرسن وغیرہ کی ضمانت دی جا سکتی ہے؟''

''اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ویسے سنا تو یہی تھا کہ یہ گورا اینڈرسن وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ شاید تم ہی نے بتایا تھا۔''

''اور مجھے گیتا مکھی نے بتایا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے اور رات رات

کا مزہ لیا ہوا ہے۔شاید اس نے اپنا کوئی ذاتی تجربہ بیان کیا ہو۔''

''عمران! میرے خیال میں ہمیں اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔تم بات کرو آفتاب سے۔''

عمران نے واکی ٹاکی آن کیا۔پہلی ہی کوشش میں آفتاب سے رابطہ ہو گیا۔اس کی دہاڑتی آواز سنائی دی۔''تم لوگوں نے اپنی موت پر خود مہر لگایا ہے۔اب ام کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔کتے کا موت مارے گا سب کو اور سب سے پہلے یہ پھنسنے کے منہ والا تمہارا گورا افسر مرے گا......''

عمران نے کہا۔''میں عمران بول رہا ہوں آفتاب...... مجھے افسوس ہے کہ......''

''ام اب کسی کا بکواس سننا نہیں چاہتا۔ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو شہید کر دیا ہے۔اب ان کو بھی موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ام ان کو صرف ایک گھنٹے کا مہلت دیتا ہے۔یہ لوگ یہاں سے امارے جانے کا انتظام کرے۔ورنہ چارپائی لے کر آئے اور احاطے میں سے اپنے ذلیل افسر کا لاش اٹھا کر لے جائے۔صرف ایک گھنٹا...... پورے ساٹھ منٹ۔'' مہلت کی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاشم کی نسبت آفتاب خاں میں لچک موجود ہے۔

عمران نے دھیمے دوستانہ لہجے میں کہا۔''آفتاب خاں! میری بات کا برا نہ ماننا۔ہاشم صاحب کا رویہ ایک دم بہت سخت ہو گیا تھا۔شاید ان کی جان جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔انہوں نے امام صاحب کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔حالانکہ وہ اپنی طرف سے پوری گارنٹی دے رہے تھے۔''

آفتاب گرجا۔''تمہارا کیا خیال ہے، ام اس میم کو چھوڑ دے گا تو یہ ام پر حملہ نہیں کرے گا؟ یہ ایک سیکنڈ کا دیر نہیں لگائے گا اور امارا تکا بوٹی کر دے گا۔اس گورے افسر کا زیادہ اہمیت نہیں ہے ان لوگوں کی نظروں میں۔''

''اہمیت ہے آفتاب...... اہمیت ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔''ابھی پانچ منٹ پہلے یہاں کے انچارج افسر اینڈرسن سے ہماری بات ہوئی ہے۔وہ ہر صورت میں اپنے اس بندے کو بچانا چاہتے ہیں۔پھر بہت سے دوسرے لوگ تمہارے پاس اندر موجود ہیں۔ان لوگوں کے بے شمار وارث یہاں دھرنا دیئے بیٹھے ہیں۔ان کو ہر صورت اپنے عزیز زندہ چاہئے ہیں۔وہ افسروں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔لی وان کا پوتا بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ماریا کو چھوڑنے کے بعد بھی تمہیں کچھ خاص گھاٹا نہیں ہونے والا ہے۔''

عمران بولا۔''اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم نے مسٹر اینڈرسن کے ذہن کو

پوری طرح ٹٹولا ہے۔اس کا ارادہ یہی ہے کہ اگر ماریہ کو یہاں رہا کر دیا جائے اور باقی لوگوں کو نل پانی کے اندر جا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔''

''ام کیسے یقین کر لے اس بات پر؟ اس انگریز کے دماغ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' آفتاب کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

میں نے کہا۔''تم ہماری بات پر اس لئے یقین کرو کہ یہ مسئلہ جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔میں سلطانہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔مجھے اس کی ضرورت ہے، میرے بچے کو اس کی ضرورت ہے۔''

''کچھ بھی ہے۔ام یہاں سے نکلنے سے پہلے اس سفید کتیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔کسی صورت نہیں۔'' اس کے الفاظ سخت تھے لیکن لہجے میں تھوڑا سا ڈھیلا پن بھی محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔''تم سلطانہ سے مشورہ کرو۔مجھے یقین ہے کہ وہ بھی خون خرابا نہیں چاہے گی۔کیا تم اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟''

''بالکل نہیں۔وہ نیچے ہے۔وہاں سے ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ہل سکتا۔'' آفتاب نے کہا۔

میرے، عمران اور آفتاب کے درمیان یہ گفتگو قریباً آدھ گھنٹا جاری رہی۔ہاشم رازی کی اچانک موت کے غم نے آفتاب کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہاشم رازی کا رویہ غیر معمولی طور پر سخت تھا۔غالباً یہ رویہ آفتاب اور سلطانہ کے لئے بھی اچنبھے کا باعث بنا تھا۔آفتاب یقیناً ہاشم رازی کی موت کی وجہ انگریز اور ہندو فوجیوں کو سمجھ رہا تھا۔اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اسے اسپتال کے ساتھ والی چھت سے ہم نے شوٹ کیا ہے۔

ہاشم اس سارے ''سین'' میں آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح رخصت ہو گیا تھا۔اب اس ساری صورتِ حال میں فیصلے کی طاقت ایک بار پھر آفتاب کے پاس تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے والا فیصلہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔یعنی ماریا کو چھوڑنا اور باقی یرغمالیوں کے ساتھ روانہ ہونا۔

قریباً دس منٹ بعد آفتاب نے ہم سے واکی ٹاکی پر رابطہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خود رابطہ کیا تھا۔ایک بار پھر ہمارے اور اس کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔وہ سمجھوتے کے مطابق ماریا کو چھوڑنے پر رضامند تو تھا لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط بھی کچھ اتنی زیادہ سخت نہیں تھی۔اس کا کہنا تھا کہ وہ اسپتال کے احاطے سے نکلتے وقت اپنے

ساتھ دس یرغمالی بٹھائے گا، ان میں زخمی انگریز اور لی وان کا پوتا بھی شامل ہوں گے۔ ان میں کوئی عورت نہیں ہوگی۔ یہ سب کچھ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ نئی شرط یہ تھی کہ احاطے سے نکلتے ہوئے ماریا بھی ان کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوگی۔ بہرحال، گاؤں سے باہر نکلنے کے فوراً بعد وہ ماریا کو گاڑی سے اتار دے گا۔

آفتاب کی یہ نئی شرط فوری طور پر قابلِ قبول نہیں تھی تو اسے ناقابلِ قبول بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس بارے میں انگریز افسروں سے بات کی جا سکتی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید وہ یہ شرط مان بھی جائیں گے۔

غالباً آفتاب خاں کو اندیشہ تھا کہ یرغمالیوں کے ساتھ اسپتال کے اندر سے نکل کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کا مرحلہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ اچانک حملے کے خطرے سے دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد جب وہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں کی گلیوں سے گزریں گے تو تب بھی خطرے میں ہوں گے۔ لیکن گاؤں سے نکل کر کھلے راستے پر پہنچنے کے بعد وہ نسبتاً محفوظ ہو جائیں گے۔ تب وہ ماریا کو اتار دے گا۔

ہم نے آفتاب خاں سے پندرہ منٹ کا وقت لیا اور واکی ٹاکی پر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہم نے آفیسر منیارڈ سے کہا کہ وہ اینڈرسن صاحب کو یہاں بلائے۔ منیارڈ گیا اور پانچ منٹ میں اینڈرسن کو لے آیا۔ اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ کی یہ ساری آمدورفت بڑی رازداری ہو رہی تھی۔ ہندو آفیسر اور فوجی اس سارے معاملے سے بےخبر تھے۔ عام لوگوں کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی کہ اس رہائشی مکان کی چھت پر کون موجود ہے اور یہاں کس طرح کے مذاکرات چل رہے ہیں۔

عمران نے پُرامید لہجے میں کہا۔ ''جناب اینڈرسن صاحب! ہمارا خیال ہے کہ یہ معاملہ حل کے قریب آ گیا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے۔ ہاشم کی موت کے بعد اس کے ساتھیوں نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کے حوالے سے زیادہ محتاط ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ محترمہ ماریا کو اسپتال میں نہیں بلکہ گاؤں سے باہر کھلی جگہ پر نکل کر چھوڑیں گے۔''

''کھلی جگہ سے کیا مطلب ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ گاؤں کی آبادی سے نکلنے کے فوراً بعد۔'' میں نے جواب دیا۔

اینڈرسن نے سگار کے دو طویل کش لئے پھر بولا۔ ''تم دونوں کا کیا خیال ہے، اس میں کوئی چکر بازی تو نہیں ہوگی؟''

''میں نے تفصیلی بات کی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ہاشم کی موت کے بعد وہ لوگ کچھ ڈرے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہے کہ گاڑی میں منتقل ہونے کے دوران میں ان پر حملہ نہ ہو جائے۔''

میں نے کہا۔ ''مسٹر اینڈرسن! آپ ان معاملوں میں زیادہ بہتر فیصلہ دے سکتے ہیں لیکن جو چیز مجھ جیسے بندے کو بھی نظر آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ پورا گاؤں فورس کے گھیرے میں ہے۔ عمارت کے اندر کی نسبت گھوڑا گاڑی میں ان لوگوں کی پوزیشن کہیں زیادہ کمزور ہو گی۔ اگر وہ گاؤں سے نکلتے ہی محترمہ ماریا کو رہا کرنے کی بات کر رہے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔''

اس معاملے میں ہمارے درمیان چند منٹ بات ہوئی۔ دو چار منٹ کے لئے سیکنڈ آفیسر منیارڈ بھی اس میں شامل ہوا۔ آخر طے ہوا کہ اگر حملہ آور باقی ساری شرائط مان رہے ہیں تو ان کو یہ گنجائش دے دی جائے۔ اینڈرسن وغیرہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر دو سے زیادہ حملہ آور موجود ہیں۔

اینڈرسن کی موجودگی میں ہی ہم نے واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطہ کیا۔ اس رابطے میں ساری تفصیلات طے ہو گئیں۔ ہم نے آفتاب کو بتایا کہ دو گھوڑوں والی بڑی گھوڑا گاڑی تیار ہے۔ دو اضافی گھوڑے بھی موجود ہیں۔ راستے کے لئے راشن وغیرہ بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔

آفتاب بولا۔ ''ٹھیک ہے، ام آدھ گھنٹے کے اندر اندر تیس عورتوں اور مردوں کو چھوڑ دے گا۔ دس بندہ امارے ساتھ رہے گا۔ ام ایک بار پھر سب لوگوں کو بتانا چاہتا ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی حرکت ہوا تو ان سب میں سے کوئی ایک بھی زندہ حالت میں نہیں ملے گا۔''

اینڈرسن کے اشارے پر عمران نے اس سے پوچھا۔ ''کیا ماریا یا آفیسر ٹام سے بات کرا سکتے ہو؟''

''نہیں، ابھی کسی سے نہیں ہو سکتا۔'' اس نے بھڑک کر کہا۔ ''ابھی تم فوجیوں سے کہو کہ وہ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں لے کر آئیں اور برآمدے کے پاس بائیں طرف کھڑا کر کے باہر نکل جائیں۔ پھاٹک کے سامنے اور آس پاس کوئی کالا گورا فوجی نہیں ہونا چاہئے۔ پوری تسلی ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں کو چھوڑے گا۔''

آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ آفتاب نے ایک بار پھر چھت پر چڑھ کر

اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ہمیں واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پانی والی گول ٹینکی کے پیچھے بس اس کے ہیولے کی جھلک ہی دکھائی دیتی تھی۔ ہاشم کی اچانک موت کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو چکا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ہاشم کی لاش بھی ابھی تک ٹینکی کے آس پاس ہی پڑی تھی۔

آفتاب نیچے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ دیکھا کہ اسپتال کا ایک اندرونی دروازہ کھلا اور ایک قطار میں کچھ لوگ باہر نکلے۔ ان میں چھ سات عورتیں اور تین بچے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی کل تعداد تیس کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھا۔ ان میں سے کچھ افراد زخمی بھی تھے۔ ایک مریض کی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور وہ بیساکھی کے سہارے باہر آ رہا تھا۔ قریباً بہتّر گھنٹے کے اعصاب شکن دباؤ کے بعد ان لوگوں کو کھلی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ ان کا یہ سفر موت سے زندگی کی طرف تھا۔ وہ احاطے میں پہنچے اور باہر نکل آئے۔ پھاٹک سے پچیس تیس میٹر کی دوری پر ان کے لواحقین موجود تھے۔ وہاں رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایک فاقہ زدہ یرغمالی عورت جس کا شوہر آفتاب خاں کی گولی کا شکار ہو کر مر گیا تھا، باہر آ کر بے ہوش ہو گئی اور لوگ اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

صبح چار بجے کے قریب وہ مرحلہ شروع ہوا جس کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا۔ آفتاب خاں نے واکی ٹاکی پر بتایا۔ ''ام لوگوں کو لے کر باہر نکل رہا ہے۔ ام ایک بار پھر کہہ رہا ہے کہ احاطے کے آس پاس اور پھاٹک کے قریب کسی کو موجود نہیں ہونا چاہئے۔''

''کوئی موجود نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اور تم سے بھی گزارش ہے کہ خود کو پُرسکون رکھو۔ اب جو کچھ ہونا ہے، وہ سب طے ہے۔ کوئی چکر، کوئی چالبازی اب یہاں نہیں ہے۔''

چند منٹ بعد ہم نے چھت پر سے اسپتال کے برآمدے کا منظر دیکھا۔ منیارڈ بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اندرونی دروازہ کھلا اور یرغمالیوں کی قطار باہر نکلی۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹر لی وان کا سہا ہوا پوتا بھی نظر آیا۔ سب سے آخر میں ماریا تھی۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر کسے گئے تھے۔ آفتاب نے اپنی طاقتور سیون ایم ایم کی نال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ یقیناً اس رائفل کے دو تین برسٹ چند سیکنڈ میں ان دس گیارہ یرغمالیوں کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ پھر ہم نے سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چادر میں اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال کی

رائفل تھی۔ اس کا رائفل تھامنے کا انداز اور اس کا اعتماد بتاتا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور بوقت ضرورت اسے بے دریغ استعمال بھی کر سکتی ہے۔ وہ یرغمالیوں کی قطار کی بائیں جانب تھی۔ صرف زخمی انگریز آفیسر ٹام وہ شخص تھا جس کے ہاتھ پشت کے بجائے سامنے کی طرف باندھے گئے تھے۔ ٹیلی اسکوپ میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے کندھے پر گہرا زخم ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بہ مشکل چل پا رہا تھا۔

یرغمالیوں کی قطار احاطے میں کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھی۔ یہ بے تناؤ بھرے لمحے تھے۔ اسپتال کے اردگرد گلیوں میں اور گھروں کی چھتوں پر سیکڑوں سپاہی اور گارڈز موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے براہِ راست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ابھی پہلا یرغمالی گھوڑا گاڑی میں داخل ہوا تھا کہ وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ میں نے آفتاب کو ایک دم لڑکھڑاتے اور جھکتے دیکھا...... اس کے ساتھ ہی آفتاب نے اپنی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز گونجی۔ کئی گولیاں ماریا کے جسم کے آر پار ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطانہ نے بھی اوپر تلے فائر کئے۔ میں نے یرغمالیوں میں سے کم از کم دو افراد کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔

ایک دم کہرام مچ گیا اور شب کا سناٹا چنگھاڑتی آوازوں سے چکنا چُور ہو گیا۔ کئی طرف سے فائر ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ زخمی آفتاب تیزی سے رینگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا ہے۔ رائفل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلطانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ لگتا تھا کہ وہ بھی کسی اوٹ میں ہو گئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

دفعتاً میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا چھت کے آخری کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے لپکا ہے۔ چھت کی منڈیر تک پہنچ کر اس نے ہوا میں جست لگائی۔ یہ ویسی ہی جست تھی جیسی پیراک سوئمنگ پول میں کودنے کے لئے لگاتے ہیں لیکن عمران کے نیچے سوئمنگ پول نہیں تھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پرالی کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا ہے اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر آ گیا ہے۔ اٹھ کر وہ پھر کسی کے پیچھے لپکا۔ اب میں نے بھاگنے والے کا سایہ بھی دیکھ لیا۔ وہ برق رفتاری سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔

ایک دم میری سمجھ میں آ گیا کہ عمران کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ جن دو فائرز کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہوا، وہ ہماری دائیں جانب والی دو تین چھتوں میں سے کسی ایک چھت پر سے ہوئے تھے۔ غالباً عمران نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور اب اس کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ اس

شخص نے بھاگتے بھاگتے ایک دم پلٹ کر عمران پر گولی چلائی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ عمران نے نیچے گر کر خود کو بچایا تاہم اس وقت یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ عمران نے نیچے لیٹے لیٹے دو جوابی فائر کیے لیکن یہ فائر مدِمقابل کو لگے نہیں۔ میں نے اسے برق رفتاری سے گنّے کے کھیتوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

جونہی عمران کھڑا ہوا، میں نے ایک اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ایک جانب سے ایک اور لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اس کا ارادہ عیاں تھا، وہ عقب سے عمران کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ پھینک کر رائفل پکڑی۔ ابھی مجھے رائفل سیدھی کرنے اور نشانہ لینے میں تین چار سیکنڈ لگنے تھے اور میرا نشانہ بہت اچھا بھی نہیں تھا لیکن یہ تین چار سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا جس کی توقع نہیں تھی۔ قریبی کھیت میں سے ایک ہیولا سا نکلا اور برق رفتاری سے رائفل بردار پر جا پڑا۔ یہ ایک کتا تھا۔ اس کی آواز کھیتوں کے درمیان دور تک گونجی۔ میں نے کتے اور رائفل بردار کو اوپر نیچے گرتے دیکھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ ان کے درمیان فائر کا شعلہ لپکا...... یہ وہ وقت تھا جب عمران کو اندازہ ہوا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہے...... عمران پلٹا۔ مگر تب تک کھیل ختم ہو گیا۔ تنومند کتے نے ایک دم رائفل بردار کو چھوڑا اور کھیتوں میں اوجھل ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ فائر کی خوفناک آواز سے بدک گیا ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، کتا اپنا کام کر گزرا تھا۔ رائفل بردار بے سدھ پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دیوہیکل کتے کی اچانک جست کے سبب اس کی رائفل سے گول چل گئی تھی۔ رائفل کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لئے گولی نے رائفل بردار کو ہی نشانہ بنا ڈالا تھا۔ پگھلا ہوا قریباً بیس گرام سیسہ رائفل بردار کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں داخل ہوا تھا اور اس کا تالو پھاڑ کر کھوپڑی میں گھس گیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی اور نہیں، وہی کتا ہے جو پچھلے دو تین دن سے ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

آفتاب کو گولی لگنے سے لے کر، کتے کے نمودار ہونے اور پھر نامعلوم رائفل بردار کی ہلاکت تک کے سارے واقعات صرف آٹھ دس سیکنڈ کے اندر ہی رُونما ہوئے۔ عمران دوڑتا ہوا دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر پھر چھت پر آ گیا۔ اسپتال کے احاطے کے اندر قیامت برپا تھی۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمیں احاطے میں کم از کم پانچ لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک واضح طور پر ماریا کی تھی۔ وہ اوندھی پڑی تھی، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

''اب یہ لوگ سلطانہ اور آفتاب کو نہیں چھوڑیں گے۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں

کہا۔

میرے سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اس کی کرچیاں پورے جسم میں پھیل گئیں۔

''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

عمران نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں احاطے پر جمی تھیں۔ جنریٹر چل رہا تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ درجنوں مسلح گارڈز اور کمانڈوز نے ایک دم تین اطراف سے اسپتال پر ہلا بول دیا تھا۔ وہ بارش کی طرح گولیاں برساتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں گھس گئے اور مختلف چیزوں کی آڑ لے لی۔ کمانڈوز کی ایک ٹولی احاطے کا ایک بغلی دروازہ توڑ کر اندر گھس گئی۔ انہوں نے برآمدے کے بالکل قریب پوزیشن لے لی۔ ان کی اندھا دھند فائرنگ نے اسپتال کے سارے اندرونی شیشے توڑ ڈالے۔ ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے اور دھواں پھیل گیا۔ میں ٹیلی اسکوپ سے دیکھ رہا تھا۔ تب اچانک میری نظر ایک منظر پر پڑی اور ہر امید دم توڑ گئی۔ یہ آفتاب خاں کی لاش تھی۔ وہ برآمدے کے ایک چوکور ستون کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا سارا جسم چھلنی ہو گیا ہے۔ اس کی لمبے بیرل والی سیون ایم ایم رائفل بھی اس کے پاس پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ''عمران! سلطانہ اکیلی رہ گئی ہے شاید۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی اسکوپ عمران کی طرف بڑھائی اور برآمدے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ عمران نے دیکھا اور اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے۔

''اس کا مطلب ہے کہ جوابی فائر صرف سلطانہ کر رہی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ...... دو تین منٹ سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔'' میری آواز رندھ گئی۔

احاطے کے اندر اور برآمدے کے آس پاس کمانڈوز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان میں سفید فام کمانڈوز بھی تھے۔ ماریا کی موت نے گھیرا ڈالنے والوں کو جیسے وحشی کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ آفتاب اور سلطانہ کو قیمہ کر دینا چاہتے ہیں۔

''کیا خیال ہے عمران...... اسے بچانے کی کوشش کریں؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''کوشش کرنی چاہیے لیکن اس کے لئے ہمیں نیچے جانا ہو گا۔ سب کے سامنے آنا ہو گا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو......؟''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

عمران ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اترے پھر ایک گلی سے گزر کر اسپتال کی طرف آ گئے۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہر طرف دہشت برس رہی تھی۔ ہم پھاٹک پر پہنچے۔ ہندو گارڈز نے ہمیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا۔ ان کی آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت نظر آئی۔ پانڈے کے ایک ماتحت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے پستول کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب عمران کی نظر منیارڈ پر پڑ گئی۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ''مسٹر منیارڈ بات سنیے۔''

منیارڈ بھی ہمیں کھلے عام سب کے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران اسے ایک طرف لے گیا۔ ان دونوں کے درمیان بس چار پانچ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ احاطے میں ہونے والی فائرنگ شدید ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے کہیں اچھی پوزیشن لی ہوئی ہے اور بھرپور جواب دے رہی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ عمران نے منیارڈ سے کیا کہا ہے۔ یقیناً اس نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسے آگے جانے کا موقع دیا جائے۔ وہ سلطانہ کو ہتھیار ڈالنے اور گرفتاری دینے پر آمادہ کر دے گا۔ منیارڈ کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ عمران کی بات کا اس پر مثبت اثر ہوا ہے۔ وہ تیزی سے پیچھے گیا۔ غالباً آپریشن انچارج مسٹر اینڈرسن سے اجازت لینے گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا تھا، دوڑتا ہوا ہی واپس آیا۔ اس دوران میں ہندو سپاہی ہمیں شعلہ بار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ واپس آتے ہی منیارڈ نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور چکر کاٹ کر احاطے کے اس بغلی دروازے پر پہنچا جسے توڑ کر کمانڈوز چار پانچ منٹ پہلے اندر گھسے تھے۔

احاطے میں داخل ہونے سے پہلے منیارڈ نے میری اور عمران کی رائفلیں لے کر اپنے ساتھیوں کو تھما دیں۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں کمانڈوز کو حکم دیا کہ وہ کچھ دیر کے لئے فائرنگ روک دیں...... فائرنگ مدھم ہوئی اور پھر رک گئی۔ تاہم کمانڈوز نے اپنی پوزیشنیں برقرار رکھیں۔ رائفلوں کے کندے ان کے شانوں سے لگے رہے اور نگاہیں ٹارگٹ پر جمی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ سلطانہ اسٹور روم کے قریب ایک دس فٹ اونچی گیلری میں موجود ہے...... اور اس کے اندر سے جوابی فائر کر رہی ہے...... قیامت خیز فائرنگ میں وقفہ آیا تو دبی ہوئی آوازیں ابھر آئیں۔ ایک آواز کسی شدید زخمی کی تھی جو برآمدے کے اندرونی حصے میں پڑا تھا اور مدد کے لئے تڑپ رہا تھا...... دوسری آواز احاطے میں تڑپتے پھڑکتے زخمی گھوڑے کی تھی۔ اس کے علاوہ احاطے کے باہر اور اردگرد کی چھتوں پر گونجنے

والی صدائیں تھیں۔ مسلح فوجی اور کمانڈوز ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ہدایات دے رہے تھے یا لے رہے تھے۔

''آ جاؤ اندر۔'' منیارڈ نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے منیارڈ کے پیچھے، برآمدے تک پہنچے اور ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ آفتاب خاں کی لاش بس آٹھ دس قدم کے فاصلے پر چوکور ستون کے پیچھے پڑی تھی۔ لگتا تھا کہ کمانڈوز نے وحشت میں اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی ہیں۔ چوکور ستون کی اوٹ میں کھڑے ایک انگریز نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تو گیلری کی طرف سے فوراً رائفل کا فائر ہوا۔ کمانڈو بال بال بچا۔

منیارڈ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگافون میری طرف بڑھایا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی رائفل نیچے پھینک دو اور خود بھی باہر آ جاؤ۔ منیارڈ صاحب نے وعدہ کیا ہے، تم پر فائر نہیں کیا جائے گا۔''

کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر اندر سے چلا کر کچھ کہا گیا۔ یہ سلطانہ ہی تھی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن آواز واضح طور پر پہنچ رہی تھی۔ میں نے میگافون ایک طرف رکھ دیا اور بلند آواز میں کہا۔ ''سلطانہ! یہ لوگ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔ تم فوراً رائفل باہر پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر نکل آؤ۔''

جواب میں سلطانہ نے پھر چلا کر کچھ کہا۔ اس مرتبہ الفاظ بھی ہماری سمجھ میں آئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''ناہیں مہروج...... میں بندوخ ناہیں پھینکوں گی۔ میں...... آخری دم تک لڑوں گی......'' اس کی آواز میں زخمی شیرنی جیسا درد موجود تھا اور طنطنہ بھی۔ یہ اسی راجپوت لڑکی کی آواز تھی جو سر جھکانے سے سر کٹانا بہتر سمجھتی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی...... ''ہوا'' کو زنجیریں کون پہنا سکتا ہے اور میں گھنے جنگلوں کی مست ''ہوا'' ہوں۔ اور سمندر کو قید کون کر سکتا ہے؟ میں ساحلوں کے گھیرے میں نہ رہنے والا سمندر ہوں اور حق کی آواز کو کوئی ''حکم'' کیسے دبا سکتا ہے اور میں حق کی وہی سرکش آواز ہوں۔ میں نے ہر دور میں ظلم کو للکارا ہے۔ میں ہر دور میں لہولہان ہوئی ہوں اور ہر آنے والے دور میں نئی طاقت اور نئے جوش کے ساتھ ابھری ہوں۔

میں نے اور عمران نے دیکھ لیا تھا کہ سلطانہ موت کے گھیرے میں ہے۔ کسی بھی وقت اس کی جان جا سکتی ہے۔ یہ گھنٹوں یا منٹوں کی نہیں، سیکنڈوں کی بات تھی۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر بچانا چاہتے تھے۔ وہ زندہ گرفتار ہو جاتی تو پھر شاید اس کی

زندگی کے لئے کوئی راستہ بھی نکل آتا، کوئی وسیلہ بھی پیدا ہو جاتا۔ انہونیوں کی گنجائش تو ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ امید کی آنکھیں ہمیشہ کرشموں کی راہ دیکھتی ہیں اور کبھی کبھی یہ انتظار رنگ بھی لاتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس موجودہ واقعے میں سلطانہ کا کردار، سنگینی میں سب سے کم تھا۔ خون خرابے کے اصل ذمے دار آفتاب اور پھر ہاشم رازی تھے۔ ممکن تھا کہ سلطانہ کے گرفتار ہو جانے کی صورت میں مسٹر اینڈرسن اور دوسرے انگریز عہدیداروں کے دلوں میں اس کے لئے رحم کی کوئی رمق پیدا ہو جاتی۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ مسٹر اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

سلطانہ کا انکار سننے کے بعد کمانڈوز نے پھر گیلری کا نشانہ لے لیا تھا۔ اب مسٹر اینڈرسن خود بھی وہاں آن موجود ہوا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی جدید ماؤزر تھا۔ اس کے صرف ایک اشارے پر ایک بار پھر سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی۔ میں مسٹر اینڈرسن کے سامنے آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ کوئی فائر نہ کرے۔ میں سلطانہ سے بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ گرفتاری دے دے گی۔''

''جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔'' مسٹر اینڈرسن کا لہجہ سخت تھا۔

میں کمانڈو اور مسٹر منیارڈ کی ہدایات کو نظر انداز کرتا ہوا تھوڑا سا اور آگے چلا گیا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں...... زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ انکار نہ کرنا سلطانہ...... بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن مان لو۔ رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دو اور خود بھی نکل آؤ......''

چند سیکنڈ بعد سلطانہ کی گلوگیر آواز ابھری۔ ''مہروج...... خدا کے لئے...... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں ناہیں ڈالو۔ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔''

''سخت امتحانوں میں سے ہی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے سلطانہ...... اور مجھے امید ہے نکلے گا۔ میری اور بالو کی خاطر بات مان لو۔ باہر نکل آؤ۔ میں نے بڑے صاحب سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ تم بس کھڑکی کھول کر رائفل باہر پھینک دو۔''

وہ خاموش رہی۔ یوں لگا کہ وہ فیصلے کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ مسٹر اینڈرسن نے دیوار کی اوٹ سے دہاڑ کر کہا۔ ''میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اسے کہو باہر نکل آئے۔''

کمانڈوز اب آگے بڑھتے ہوئے گیلری کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''سلطانہ...... باہر آجاؤ...... میری خاطر۔''

پندرہ بیس سیکنڈ...... پندرہ بیس گھنٹوں کی طرح گزرے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ گیلری کا دروازہ کھلا۔ سلطانہ باہر نکلی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں پونم پور کے مندر میں گئی تھی۔ اس کے جسم پر لہریے دار ساڑی تھی، کانوں میں چاندی کے جھمکے، کلائیوں میں وہی پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں جو اسے آفتاب نے لا کر دی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک ہندو ناری کا روپ دھارنے کے لئے تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ساڑھی کندھے پر سے خون آلود ہے۔ یقیناً وہ زخمی تھی۔ اس کے ہر وقت قندھاری اناروں کی طرح دہکنے والے رخسار زرد نظر آتے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے رائفل پھینک دی۔ رائفل پُرشور انداز میں سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ یہی وقت تھا جب میری نظر سیکنڈ آفیسر مینارڈ پر پڑی۔ اس نے کمانڈوز کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے کوئی اشارہ کیا۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ ایک ساتھ تین چار رائفلوں سے تڑتڑ کی خوفناک آواز بلند ہوئی۔ سلطانہ کا جسم اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ گیلری کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔

''سلطانہ!'' میرے سینے کی گہرائی سے پکار بلند ہوئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف لپکا۔

میں اس کے اوپر گر گیا۔ ان حشر خیز لمحوں میں شاید میرے دماغ کے اندر یہ آیا تھا کہ میں اس کے اوپر گر جاؤں گا تو وہ مزید گولیوں کی زد سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن اسے مزید گولیوں کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ اس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کے آخری دو تین سیکنڈ تھے۔ ''مہروج'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی...... وہ مر چکی تھی۔ میرے زخموں پر اپنے محبت بھرے ہونٹ رکھنے والی، میرے رستے کے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے والی، میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی مر چکی تھی اور اس کا سر میری بانہوں میں تھا۔

...... میں پلٹا...... مجھے اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس ایک سرخ چادر تھی جو آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی۔ اس چادر کے اندر سے کمانڈوز کے منحوس چہرے پرچھائیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں دہاڑا۔ مجھے نہیں معلوم کیا کہا اور کس کو کہا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اس آواز کی گونج مجھے اپنے پورے جسم میں اور سارے در و دیوار میں محسوس ہوئی۔ میں اپنے قریب

ترین انگریز کمانڈو کی طرف بڑھا۔ یہ انہی میں سے تھا جنہوں نے میری نہتی سلطانہ پر گولی چلائی تھی۔ اس کے جسم کو چھلنی کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو نے میری طرف رائفل سیدھی کی ہے۔ اس وقت یہ قاتل رائفل مجھے دنیا کی حقیر ترین چیز محسوس ہوئی۔ میں کمانڈو سے ٹکرایا اور اسے اپنے نیچے لیتا ہوا دور جا گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے منیارڈ کو دیکھا۔ وہ میری طرف رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ ایک طرف سے عمران عقاب کی طرح جھپٹا اور منیارڈ کی رائفل کی نال اوپر اٹھا دی۔

اچانک میرے سر پر کوئی بہت وزنی چیز لگی۔ اس کے ساتھ ہی محسوس ہوا کہ درجنوں ہاتھوں نے مجھے دبوچ لیا ہے۔ ایک بار پھر کوئی وزنی شے سر سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنی ہوئی سرخ چادر کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ وہ بتدریج سیاہ ہوتی چلی گئی۔

O......❖......O

پتا نہیں کتنی دیر بے ہوش رہا اور کس حال میں رہا۔ دوبارہ حواس بحال ہوئے تو میرے اردگرد لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ میں کچھ دیر تک بالکل خالی ذہن کے ساتھ لیٹا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر کیا قیامت بیت چکی ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ لیکن شاید اس سے دس گنا زیادہ درد بھی ہوتا تو مجھے وہ کرنے سے نہ روک سکتا جو میں نے کیا۔ میں اٹھا اور نیم دیوانگی کی سی کیفیت میں ''سلطانہ......سلطانہ......'' پکارنے لگا۔ پھر میں کمرے کے بند دروازے پر پل پڑا۔ میں نے دوہتڑ چلائے، اسے ٹھوکریں رسید کیں۔ میری آواز نے در و دیوار کو لرزا دیا۔ میں چلا رہا تھا۔ ''دروازہ کھولو حرام زادو......تم نے اسے مار دیا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ میں سب کو راکھ کر دوں گا۔ میرا کچھ نہیں بچا۔ کان کھول کر سن لو۔ کسی کا کچھ نہیں بچے گا۔ کسی کا نہیں بچے گا۔'' میں پھر دروازے پر حملہ آور ہوا۔ چوبی دروازہ بہت مضبوط تھا پھر بھی چٹخنے لگا۔

ایک طرف سے عمران نمودار ہوا اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''ہوش کرو تابی! اس طرح کچھ نہیں ہو گا۔ جانے والی جا چکی ہے......اب صبر اور ہمت سے کام لینا ہو گا۔''

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ ''تم لو صبر اور ہمت سے کام، میں نہیں لوں گا۔ میں مر جاؤں گا اور ان سب کو مار ڈالوں گا۔ انہوں نے میری نہتی سلطانہ کو مارا ہے۔ وہ میرے کہنے پر باہر آئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے خود کو حوالے کیا تھا۔ اس سفید سؤر منیارڈ اور

اینڈرسن نے مروایا اسے۔ انہوں نے دھوکا دیا۔''

عمران نے ایک بار پھر مجھے بازوؤں میں بھرا۔ ''نہیں تابی! موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ہوا ایسے ہی ہونا تھا۔ اور کیا پتا...... یہ اچھا ہی ہوا ہو۔ وہ پکڑی جاتی تو اس کی موت مشکل ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اسے معاف تو نہیں کرنا تھا نا۔ یہ تو اس کی بوٹیاں نوچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب اسے خدا کی رضا سمجھو۔ اپنے آپ کو سنبھالو تابی۔''

درد میری برداشت سے باہر تھا۔ میں کراہا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مر جانے دو مجھے۔ اس کے پاس چلے جانے دو۔''

میں نے خود کو چھڑانے کے لئے زور لگایا۔ عمران نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے زوردار جھٹکے دیئے۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے گرفت میں نہ رکھ سکتا مگر اس کے فولادی بازوؤں نے مجھے گھیرے رکھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر زور لگایا۔ اس کی گردن پیچھے مڑ گئی مگر بازوؤں کی گرفت برقرار رہی۔ میں پھنکارا۔

''تم نے کیا کیا......تم نے بھی بس تماشا دیکھا؟ میری طرح تم نے بھی اسے مرنے دیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چھلنی ہو گئی۔ مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے پورا زور لگایا۔ ہم دونوں دیوار سے ٹکرائے پھر پختہ فرش پر گر گئے لیکن عمران نے مجھے چھوڑا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں پھر دروازے پر پل پڑوں گا۔ اسے توڑ دوں گا یا خود کو شدید زخمی کر لوں گا۔ اس کی مضبوط گرفت اس کی دوستی ہی کی طرح ناقابلِ شکست تھی۔

کچھ دیر بعد میری وحشت ایک دم شدید غم و اندوہ میں ڈھل گئی۔ میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم اسی طرح فرش پر گرے رہے۔ میں روتا رہا، وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچتا رہا، میرا سر چومتا رہا۔ مجھے لگا میرے جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے نچڑ جائے گا۔ میری نگاہوں میں چند دن پہلے کے وہ مناظر تھے جب مندر کے تہ خانے میں وہ میرے ساتھ تھی۔ شب کے اندھیرے میں وہ اپنی تمام تر نسوانیت اور حلاوت کے ساتھ میرے اندر سما جاتی تھی۔ وہ ہولے ہولے میرا نام پکارتی تھی۔ میں اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا تھا۔ وہ جواب دیتی تھی۔ وہ نل پانی کی ان سہانی شاموں کا سپنا دیکھتی تھی جب ہم دیوان کے وسیع احاطے میں گیندے اور موتیے کے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے چلے جاتے۔ ہمارا ہالو ہماری بانہوں میں ہوتا اور ہم باری باری اس کے گال چومتے۔ وہ اب اپنے اس سپنے

سمیت مٹی کے نیچے سو رہی تھی، کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔ وہ بس تین چار دن کے اندر ہی سوکھی ریت کی طرح میری مٹھی میں سے پھسل گئی تھی۔

میں رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ میں نے جسم کا درد سہنا تو کسی حد تک سیکھ لیا تھا لیکن دل کا درد سہنا مجھے کہاں آتا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر نیم جان ہو گیا تو عمران کے ساتھ ہی چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ شاید یہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو بدستور اندھیرا تھا۔ لالٹین روشن تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بالکل بند جگہ ہے۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، کوئی درز کچھ بھی نہیں۔ بس وزنی چوبی دروازے کے اندر ایک چوکور خانہ سا تھا اور وہ بھی بند تھا۔ یہاں رات اور دن کی تمیز مشکل تھی۔ عمران میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میرے سر کے زخم سے رسنے والے خون کو روئی سے پونچھ رہا تھا۔

''ہم کہاں ہیں عمران؟'' میں نے پوچھا۔

''زرگاں میں۔''

میں نے اردگرد دیکھ کر کہا۔ ''زرگاں کی جیل میں؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کب پہنچے ہم یہاں؟''

''کل رات۔''

''اور سلطانہ؟'' میری آواز دکھ کے بوجھ سے بیٹھ گئی۔

''وہ بھی آ گئی تھی۔ اسے کل رات دفن کیا گیا۔ یہاں زرگاں میں اس کے کچھ عزیز موجود ہیں۔ اس کی میت انہیں دے دی گئی تھی۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے تازہ گرم آنسو رسنے لگے۔ عمران کہہ رہا تھا۔ ''اس کا جنازہ کڑے پہرے میں پڑھا گیا۔ شاید پندرہ بیس لوگ ہی ہوں گے۔ لیکن پتا چلا کہ آج دوپہر زرگاں میں ہزاروں لوگوں نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔''

اسپتال میں سلطانہ کے آخری لمحات میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا اندازہ غلط نکلا عمران! ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ گورے اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے خود اس سفید سؤر منیارڈ کو اشارہ کرتے دیکھا تھا۔ اس کے اشارے پر ہی سپاہیوں نے گولیاں چلائیں۔''

عمران نے طویل سانس لی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان چٹی چمڑی والوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے سوچ لیا تھا کہ سلطانہ والا معاملہ وہیں پر ختم کر دینا چاہیے۔ اپنے

حساب سے انہوں نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطانہ کو زندہ پکڑا گیا تو اسے مارنے اور نہ مارنے کا مسئلہ بہت بڑا ایشو بن جائے گا۔ بہت سی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔ راجواڑے کے حالات تو پہلے ہی سے بہت خراب ہیں۔''

میں نے سسک کر کہا۔ ''عمران! یہ سب کیوں ہوا؟ سب کچھ تو ٹھیک ہونے جا رہا تھا۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ وہ گولی کس نے چلائی جس نے آفتاب کو زخمی کیا اور پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔''

عمران نے کہا۔ ''وہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس بندے نے چلوائیں جو اس راجواڑے میں ہمارا سب سے کمینہ اور خطرناک دشمن ہے...... وہ پانڈے نے چلوائیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ سلطانہ بچ کر یہاں سے نکل جائے۔''

میرا لہو کھول گیا۔ میں نے کہا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پانڈے نے چلوائیں؟''

''یہ گولیاں ہمارے پیچھے والی ایک چھت سے چلائی گئی تھیں۔ میں نے اس بندے کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ چھت سے کودا اور بھاگ نکلا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔ وہ ایک پاؤں ذرا دبا کر بھاگ رہا تھا۔ پانڈے کا ایک چوڑی ناک والا ماتحت بھی ایک پاؤں دبا کر چلتا ہے۔ سریش نام ہے اس کا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بندہ تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ...... ماریا کی جان جانے کے علاوہ اور بھی جو جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار یہی رنجیت پانڈے ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اپنے دوسرے ساتھی کیپٹن ٹام اور باقی یرغمالیوں کی جان بچانے کے لئے ان گوروں نے سلطانہ اور آفتاب کو نل پانی میں داخل ہونے دینا تھا۔''

ایک جاں گسل افسوس اور دکھ نے مجھے گھیر لیا۔ واقعی اگر وہ دو گولیاں نہ چلتیں تو حالات اس وقت کتنے مختلف ہوتے۔ ہو سکتا تھا کہ اب سلطانہ کے علاوہ ہم دونوں بھی نل پانی کے خوبصورت دیوان میں ہوتے۔ وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر نہال ہو رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے ستارے چمکتے۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک ناقابلِ تلافی دکھ تھا۔ ایک آگ تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی اور میرے تن بدن کو بار بار بھسم کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''عمران! وہ دوسرا بندہ کون تھا جس پر کتے نے حملہ کیا؟''

''وہ یقیناً سریش کمار کا کوئی ساتھی ہوگا۔''

میری نگاہ میں سارا منظر پھر سے گھوم گیا۔ اس شخص کا عقب سے عمران کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کھیت میں سے اچانک جسیم کتے کا نکلنا اور اس پر جا پڑنا۔ کتے کی لرزہ خیز آوازیں، اس شخص کی دردناک چنگھاڑ، پھر گولی کا چلنا اور کتے کا پلک جھپکتے میں اوجھل ہونا......

میں خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہ کتا وہی تھا نا جس کی رسّی تم نے کھیتوں میں کھولی تھی؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کتا بڑا وفادار جانور ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، وہ تب سے ہمارے آس پاس ہی تھا۔'' عمران نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ عمران کچھ اور بھی کہے گا...... اس نے کچھ نہیں کہا...... لیکن میرے ذہن میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے جو عمران نے اپنی رُوداد بیان کرتے ہوئے کہے تھے...... اس نے جانوروں کے ساتھ اپنے خصوصی اور حیرت انگیز تعلق کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ خاص کشش جس کی وجہ سے وہ پہلے جان صاحب کی مردم شناس نظر میں آیا اور پھر اسٹار سرکس میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بعدازاں امریکن پروفیسر رچرڈ رچی نے عمران کی اس انوکھی صلاحیت کو ''اسپیشل اینیمل ماسٹری'' کا نام دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وقتی طور پر یہ صلاحیت عمران کے اندر دب گئی ہے یا کہہ لیا جائے کہ زائل ہوگئی ہے لیکن امکان ہے کہ یہ کچھ عرصے بعد پھر بحال ہو جائے گی۔

تو کیا وہ صلاحیت بحال ہو رہی تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔

''یہی کہ اگر وہ کتا اچانک نمودار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟''

''یہ 'اگر' بڑا عجیب لفظ ہے تابی! اس کے بارے میں زیادہ غور نہیں کرنا چاہئے۔ جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہئے۔''

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ واضح طور پر کوئی بڑا بارودی دھماکا تھا۔ در و دیوار لرز گئے۔ اس کے فوراً بعد رائفلوں کی گرج سنائی دی۔ جیل کے آس پاس کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے عمران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے کہ زرگاں میں گڑبڑ چل رہی ہے۔ رات کو تم تو سوئے پڑے تھے، پر میں

گولیوں کی آوازیں سنتا رہا ہوں۔ رات تین بجے کے قریب دستی بموں کے کئی دھماکے بھی ہوئے تھے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے؟''

''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ انگریزوں اور ان کے پٹھو حکم جی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ گڑبڑ تو یہاں پہلے سے ہی چل رہی تھی۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوٹھڑی کے وزنی چوبی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور دروازے میں موجود چوکور خانہ کھل گیا۔ اس ڈیڑھ فٹ مربع خانے میں اب ایک موٹی آہنی سلاخ نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف ایک باوردی گارڈ موجود تھا۔ اس کے عقب میں ایک دوسرا گارڈ مسلح کھڑا تھا۔ پہلے گارڈ نے چوکور خانے میں سے کھانے کے برتن اندر پہنچا دیئے۔ ایک قہر آلود نگاہ ہم پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے چوکور خانہ پھر سے بند کر دیا۔ کوٹھڑی میں ایک بار پھر صرف لالٹین کی روشنی رہ گئی۔

عمران نے مجھے کھانا کھلانا چاہا مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اسپتال کے اندر تین دن تک بھوکی پیاسی رہی اور پھر آزاد فضا میں سانس لینے سے پہلے ہی گولیوں سے چھلنی ہوگئی۔ اس کا زرد چہرہ، اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، اس کے سوکھے ہونٹ، سب کچھ میری نگاہوں میں گھوما۔ میں ٹھنڈے فرش پر ایک کونے میں لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ماں کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو میں نے جھیلا تھا اور اس نے مجھے اندر سے جھلسا ڈالا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ سارے گہنے پہنے آنکھوں میں کاجل لگائے میرے سامنے کھڑی ہے۔ میرے کانوں میں جیسے اس کی جیتی جاگتی آواز گونجی۔

''مہروج! آپ نے کھانا کیوں ناہیں کھایا؟ آپ کو پتا اِچ ہے کہ آپ ناہیں کھائیں گے تو میں بھی ناہیں کھاؤں گی۔ بھوکی اِچ رہوں گی۔''

میں تصور میں کراہا۔ ''سلطانہ کہاں چلی گئی ہو تم؟ میں تو ٹوٹا پھوٹا برباد سا پردیسی تھا۔ تم نے مجھے پھر سے جینا سکھایا۔ مجھے پھر سے زندگی دی...... میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری ناتوانیوں کو سہارا دیا۔ میرے لئے ساری دنیا سے ٹکر لے لی لیکن مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اب کیوں چھوڑ گئی ہو مجھے؟ تم نے کہا تھا...... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کو تمہاری ضرورت ہے...... وہ معصوم تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔ ایک بار آ جاؤ سلطانہ...... پھر میں تمہیں اپنی بانہوں میں چھپالوں گا۔ تمہیں اتنی دور لے جاؤں گا کہ اس آگ کی گرم ہوا بھی تمہیں چھو نہ

سکے۔''

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں سنہری جھمکے ہلتے رہے۔ اس کے سینے پر طلائی ہار چمکتا رہا۔ وہ بولی۔ ''مجھے میری غلطیوں پر معاف کر دینا مہروج...... میں اب آ نا ہیں سکتی۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی...... میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی...... اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں...... اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی...... جب سردیوں کی نرم دھوپ آپ کے شہر میں پھولوں اور بچوں کے منہ چومے گی تو میں آپ کے آس پاس ہی ہوں گی...... ہاں، میں آپ کو اور اپنے بالو کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہوں۔''

اس کا ہیولا مدھم ہوتا چلا گیا...... پھر اوجھل ہو گیا۔ میری جلتی آنکھوں میں نمی تھی...... اس کا تصور آنکھوں میں بسائے بسائے میں سو گیا۔

○......❖......○

دوبارہ میں زوردار آوازوں کی وجہ سے جاگا۔ گارڈ چلا رہے تھے۔ کسی قریبی کوٹھڑی کا دروازہ زور سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ تب ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی دھماکے سے کھلا۔ مسلح گارڈز نے دو افراد کو اندر دھکیلا، پھر ایک تیسرے شخص کو اٹھا کر بیدردی سے کوٹھڑی کے پختہ فرش پر پھینکا اور دروازہ دوبارہ باہر سے لاک کر دیا۔

میری طرح عمران بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جس شخص کو اٹھا کر فرش پر پٹخا گیا تھا، وہ بے ہوش تھا۔ وہ حلیے سے مسلمان لگتا تھا۔ اس کی کھچڑی داڑھی خون سے رنگین تھیں باقی افراد میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں اور عمران بری طرح چونکے۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اسے یہاں دیکھیں گے اور وہ بھی اس حالت میں۔ وہ بھرت تھا۔ اس کے نفیس کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر ضربوں کے نیلگوں نشان تھے۔ بھرت بھی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید اسے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اس جیل کے اندر ہماری ہی کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا۔ ہم کچھ دیر تک ساکت و جامد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ''یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا بھرت؟'' عمران نے پوچھا۔

''جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، وہ زرگاں میں بہت سے لوگن کے ساتھ ہو رہا ہے اور ان میں زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ زرگاں میں گوروں اور حکم جی کے سپاہیوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔'' بھرت کا لہجہ انکشاف انگیز تھا۔

''یہ بغاوت نہیں، یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہم جیتیں گے۔'' بھرت کے ساتھ کوٹھڑی ئیں بند کیا جانے والا دوسرا شخص جوش سے بولا۔

اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر کسی کند آلے کا زخم تھا۔ رائفل کی ایک گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیرتی

ہوئی گزر گئی تھی۔اس زخم پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا کوئی نام نہیں۔ میں بس مسلمان ہوں اور ان سؤر خور گوروں کو اپنے شہر سے نکالنا چاہتا ہوں۔یہ ہمارا خون چوسنے والے درندے ہیں، یہ ہماری عزتوں کے قاتل ہیں۔یہ مٹھی بھر پلید جانور ہمارے راجواڑے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ہم انہیں یہاں سے مار بھگائیں گے۔''

ہم نے دیکھا کہ جس بے ہوش شخص کو بیدردی سے فرش پر پھینکا گیا تھا، وہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔جو کھانا ہمارے لئے اندر آیا تھا، اس میں پانی بھی موجود تھا۔عمران نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔یہ پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ہم نے پہرے داروں کو آوازیں دیں لیکن کسی نے نہیں سنیں۔ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادھیڑ عمر شخص جان کی بازی ہار گیا۔اس کے سینے پر تلوار کا گھاؤ تھا اور یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔میں نے دیکھا، اس کے گلے میں دو تین تعویذ تھے۔اس کے بازو پر امام ضامن بندھا ہوا تھا۔یہ امام ضامن یقیناً اس کے کسی پیارے نے اسے باندھا تھا اور باندھ کر اس لڑائی میں بھیجا تھا جو گوروں کے خلاف لڑی جا رہی تھی یا لڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مسلح گارڈز نے دروازہ کھولا۔کم از کم چار رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور یہاں یہ اکیلے چار گارڈز ہی نہیں تھے۔ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہاں ہر طرف باوردی گارڈز موجود ہیں۔مرجانے والے شخص کی لاش گھسیٹ کر باہر نکالی گئی۔بھرت کے ساتھ اندر آنے والا دوسرا شخص چلایا۔''تم گوروں کا ساتھ دے رہے ہو۔تم کتوں کی موت مرو گے۔ تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا اس راجواڑے سے۔تم نے......''

ابھی اس کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک ہندو گارڈ نے رائفل کا دستہ پورے زور سے گھما کر اس کے منہ پر مارا۔وہ دیوار سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔کچھ دیر کے لئے تو ہمیں یہ خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی ختم ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔تین چار منٹ بعد وہ کسمسانے اور بڑبڑانے لگا۔اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔

''تم اسے جانتے ہو؟'' عمران نے بھرت سے پوچھا۔

''ناہیں......لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان لوگن میں شامل ہے جو زرگاں کے اندر پچھلے دو دن سے مختلف کارروائیاں کر رہے ہیں۔شاید تم کو پتا نہ ہو، باغیوں نے جامع مسجد کے علاقے میں فوجیوں کا ایک بڑا ڈپو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔وہاں پندرہ بیس سپاہی زندہ جل مرے

ہیں۔ان میں تین چار گورے بھی شامل ہیں۔''

''ہاں، ایک بڑا دھماکا تو ہوا تھا آج آدھی رات کے وقت۔'' عمران نے کہا۔

''یہ وہی ڈپو والا دھماکا تھا۔اس کے بعد زرگاں میں حکم کے سپاہیوں اور گورے فوجیوں پر کئی جگہ حملے ہوئے ہیں۔گوروں کے کئی گھروں کو بھی آگ لگائی گئی ہے۔ان کی عورتیں اور بچے پناہ کے لئے راج بھون کی طرف جا رہے ہیں۔''

''تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بے گناہی کے جرم میں۔'' وہ تاسف سے بولا اور اپنی پیشانی سے رسنے والا خون پونچھنے لگا۔

ہم کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔''کسی شک میں پکڑا گیا ہے تمہیں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''شک میں ناہیں، وشواس میں پکڑا گیا لیکن یہ بالکل جھوٹا وشواس تھا۔'' بھرت نے آہ بھری۔

''تمہارے گھر والے اور چمپی وغیرہ تو خیریت سے ہیں نا؟''

''میرے آنے تک تو خیریت سے تھے، اب کا پتا ناہیں۔''

تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔''سچ پوچھیں تو زرگاں شہر میں بہت خون خرابا ہو رہا ہے۔ [illegible]ائیوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی ہے۔آپ کو آواز آ رہی ہو گی......سنیں اب بھی گولیاں چل رہی ہیں۔''

واقعی کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔

بھرت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''شہر میں فساد کی خبر [illegible] کر میں گاؤں سے یہاں پہنچا تھا۔آپ کو پتا ہے نا، میرے بڑے بھیا یہاں آئے ہوئے ہیں۔مجھے ان کی چنتا تھی۔میں یہاں اپنے ایک دوست مدن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔کل رات ایک انگریز فیملی مدن کے پاس پناہ کے لئے آئی۔اس میں اٹھائیس تیس سال کی ایک جواں سال ناری اور اس کے دو بچے تھے۔ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔لڑکے کی عمر سات آٹھ سال ہووے گی، لڑکی چار پانچ برس کی تھی۔یہ مدن دراصل سرکاری ملازم بھی ہے۔یہ اسی انگریز عورت کرسٹی کے محلے میں رہتا ہے۔اس عورت نے سوچا ہووے گا کہ یہاں وہ محفوظ ہو جاوے گی۔لیکن اسے پتا ناہیں تھا کہ بغاوت پھوٹنے کے بعد بہت کچھ بدل چکا ہے۔پرائے اپنے بن گئے ہیں اور دوستوں نے دشمنوں کا روپ دھار لیا ہے۔مدن نے کرسٹی کو پناہ تو دے دی لیکن اندر خانے اس کی

نیت خراب ہوگئی۔ اس نے اپنی پتنی سے کہا کہ کرسٹی اور اس کے بچے یہاں گھر میں محفوظ نا ہیں ہیں۔ بلوائیوں کو شک ہوگیا تو وہ انہیں گھسیٹ کر یہاں سے لے جاویں گے اور گلی میں جا کر ان کی ہتھیا کر دیویں گے۔ شاید میں نے بتایا نہیں، یہ کرسٹی محلے دار ہونے کے کارن مدن کی پتنی کی سہیلی بھی تھی۔ وہ بھی ڈر گئی کہ کہیں کرسٹی اور اس کے بچوں کے ساتھ کچھ ہو نہ جاوے۔ مدن نے کہا کہ وہ کرسٹی کو اپنی باغ والی حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہ اسے وہاں لے گیا۔ وہاں اس کے دو دوست بھی موجود تھے۔ تیسرا میں تھا۔ باغ والی حویلی میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ مدن کی نیت کیا ہے......"

میں نے بھرت کو روکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات کاٹ رہا ہوں...... کہیں یہ مدن وہ...... منیجر مدن تو نہیں جو لال بھون میں کام کرتا ہے؟"

بھرت نے کہا۔ "مجھے لال بھون کا تو پتا نا ہیں لیکن اتنا جانت ہوں کہ وہ منیجر ہے۔ اس کے بال جلدی سفید ہوگئے ہیں اس لئے کبھی کبھی خضاب بھی لگاوت ہے۔"

میں اور عمران جان گئے کہ وہ اسی منیجر مدن کی بات کر رہا ہے جو لال بھون میں "پریوں" کی تربیت کے کام میں میڈم صفورا کی مدد کرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ جنٹل مین لگتا تھا لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آ رہی تھی، وہ کسی دوسری طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے بھرت سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ بھرت نے تفصیل میں جاتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب کچھ یوں ہے۔

مدن اور اس کے دونوں دوستوں کی نیت کرسٹی پر خراب ہو چکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کبھی عورت نہیں دیکھی تھی۔ ہاں، یہ بات ضرور تھی کہ انہوں نے کبھی گوری عورت نہیں دیکھی تھی۔ جس طرح ٹکٹیں جمع کرنے کے شوقین ہر طرح کی ٹکٹیں اپنے البم میں جمع کرنا چاہتے ہیں، ایسے ہی عیاش لوگ ہر طرح کی اور ہر رنگ ڈھنگ کی عورت کے ساتھ شب بسری کی خواہش رکھتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت مدن اور اس کے دوستوں کی تھی۔ وہ کسی انگریز میم کی قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جو سنسنی خیز اور خطرناک صورتِ حال پیدا ہوئی تھی، اس نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایک میم کو اپنے تصرف میں لائیں۔ دوسری طرف میم کرسٹی بھی اچھی طرح جان گئی تھی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے معصوم بچوں کی جان بچانا چاہتی ہے تو اسے مدن کمار کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ مدن کمار نے اسے مجبور کیا کہ وہ نہا دھو کر ہندوستانی کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور ان سب کو شراب پلائے۔ درحقیقت یہ لوگ اپنے طور پر یہ حتمی نتیجہ نکال چکے تھے کہ اگر انگریزوں اور ان

کے پٹھو حکم جی کے خلاف، یہ خونی ایجی ٹیشن کامیاب ہونا ہے اور کرسٹی اور اس جیسی دوسری عورتوں کی حیثیت مالِ غنیمت سے زیادہ نہیں۔

بھرت فطرتاً اچھا آدمی تھا۔ جو کچھ مدن اور اس کے دوست کرنے جا رہے تھے وہ اسے کسی طور قبول نہیں تھا۔ اس نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئے۔ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ نوبت گالم گلوچ تک آئی۔ بھرت نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا، وہ جا کر چوکی میں اطلاع کرے گا۔ بھرت کے یہ تیور دیکھ کر مدن کمار اور اس کے دوستوں نے بھرت کو ایک اسٹور روم میں بند کر دیا۔ بھرت شور مچاتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح وہاں سے نکل سکے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کرسٹی کے ساتھ عیاشی شروع کر دی۔ کرسٹی کے دونوں بچے بالائی منزل کے ایک کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ کرسٹی کو امید تھی کہ وہ اپنی اور بچوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی "خدمات" کے عوض یہ ہندوستانی اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں گے لیکن جو کچھ ہوا، اس کا علم کرسٹی کو نہیں تھا اور مدن وغیرہ بھی بے خبر تھے۔ حکم کے وفادار سپاہیوں کی ایک گھوڑا گاڑی اس عمارت کے پاس سے گزری۔ ان سپاہیوں میں ایک گورا افسر بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں ایک سفید فام بچی کو روتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کرسٹی ہی کی بچی تھی۔ سپاہیوں نے حقیقت حال جاننے کے لئے عمارت کے اندر آنا چاہا...... مدن کے چوکیدار نے رنگ رلیوں میں مصروف مدن کمار کو اطلاع دی۔ اسی دوران میں سپاہیوں نے پھاٹک پھلانگ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ مدن تو قدرے ڈرپوک بندہ تھا مگر اس کے ساتھیوں نے گولی چلا دی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہوگئی۔ ایک گولی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر آئی اور کرسٹی کے سر کے سنہری بالوں میں سرخ پھول کھل گیا۔ وہ چند سیکنڈ میں دم توڑ گئی۔ حکم کے سپاہیوں میں سے ایک کو عمارت کے احاطے میں گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا شدید زخمی ہوا۔ باقی دو بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاید انہیں اندر سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اب یقیناً وہ کمک لینے گئے تھے۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اب انہیں فوراً یہاں سے کھسکنا ہو گا۔ تاہم جاتے جاتے انہوں نے بھرت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسٹور روم میں آئے، مدن تو بھرت سے گالم گلوچ کرتا رہا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے اچانک عقب سے بھرت کو دبوچ لیا۔ اس کے منہ پر بڑی سختی سے ایک بدبودار رومال رکھ دیا گیا۔ چند سیکنڈ میں بھرت بے ہوش ہوگیا۔

جب آدھ پون گھنٹے بعد وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آیا اور اس نے بوجھل آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھا تو خود کو عجیب حالت میں پایا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور کرسٹی کی برہنہ لاش کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ کرسٹی کی برہنہ لاش کے اوپر چادر ڈال دی گئی تھی۔ ان کے اردگرد کئی گورے اور مقامی فوجی موجود تھے۔ گورے فوجیوں نے اسے ٹھوکریں ماریں اور گندی گالیاں دیں۔ اسے کرسٹی کے روتے ہوئے بچوں کے سامنے لایا گیا۔ بچوں نے بھی تصدیق کی کہ بھرت ان بندوں کا ساتھی ہے جنہوں نے ان کی مما کو پکڑا تھا۔ بھرت نے بہت دہائی دی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ اس کی مدہوشی کو بھی شراب اور منشیات کی مدہوشی سے ہی تعبیر کیا گیا اور اب بھرت یہاں اس جیل میں تھا۔ پکڑ دھکڑ کی وجہ سے جیل میں گنجائش کم پڑ رہی تھی لہٰذا بھرت کو بھی دیگر دو قیدیوں کے ہمراہ ہماری کوٹھڑی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ہم نے پوری توجہ سے بھرت کی رُوداد سنی اور بیچ میں سوالات بھی کئے۔ بھرت نے باہر کے حالات کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ماریا کی موت کا گورا جاتی کے لوگن (انگریز کمیونٹی) نے بہت سوگ منایا ہے۔ ماریا کو گورا قبرستان میں جارج کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ سرجن اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ نے سوگند کھائی ہے کہ وہ ماریا کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کریں گے۔''

''اس زخمی افسر کیپٹن ٹام کا کیا بنا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ خبیث بچ گیا ہے۔ سنا ہے کہ اسے بچانے کے لئے پولیس افسر رنجیت پانڈے نے خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ اسے برستی گولیوں میں اپنا ''کور'' دے کر احاطے سے باہر لے آیا تھا۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن ٹام کو اور باقی لوگوں کو خطرے میں ڈالنے والا بھی تو یہی کتا پانڈے تھا۔''

''کیا مطلب؟'' بھرت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' عمران بات گول کر گیا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''آفتاب اور ہاشم کی لاشوں کا کیا بنا؟''

''ان کی لاشیں کسی نے وصول ہی ناہیں کیں۔ ان کا جو کچھ کیا ہوگا، حکم کے سپاہیوں نے ہی کیا ہوگا یا پھر ہوسکت ہے کہ انہیں امام مسجد قادر بخش صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ کچھ کٹر قسم کے لوگن یہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ امام قادر بخش صاحب کے دہشت گردوں سے رابطے ہیں اور ان کی بدعہدی کی وجہ سے ماریا کی جان گئی ہے۔ حالانکہ سب جانت ہیں

کہ آغا صاحب نے معاملے کو سنبھالنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ یہ ہاشم رازی کی ہٹ دھرمی تھی جس کے کارن معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ بہرحال، جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کچھ لوگن کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ دونوں یعنی آپ اور تابش، گورے افسروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور ماریا کے بدلے میں سلطانہ بی بی کا جیون بچانا چاہت تھے......''

عمران نے کہا۔ ''اب باہر کے حالات کیا ہیں بھرت؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ گوروں اور حکم کے وفادار سپاہیوں کے خلاف عام لوگوں کی یہ بغاوت کامیاب ہو جائے گی؟''

بھرت نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''ابھی وشواس سے کچھ ناہیں کہا جا سکتا۔ فی الوقت جو بھی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان میں زیادہ تر مسلمان ہی حصہ لے رہے ہیں۔ کہیں کہیں نچلی جاتیوں کے ہندو اور بودھ بھی اس میں شریک ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ گوروں اور حکم جی کے پاس جدید اسلحہ اور طاقت ہے۔ ایک باقاعدہ فوج ہے۔ جب تک نل پانی میں چھوٹے سرکار کی طرف سے کوئی حرکت ناہیں ہووے گی، اس لڑائی کا فوری نتیجہ نکلنا آسان ناہیں ہے......''

''غلط...... بالکل غلط۔'' اچانک فرش پر لیٹے زخمی نے دہاڑ کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ ''زرگاں کے جی داروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اکیلے ہی اس مٹھی بھر گوروں کو چیر کر چیل کوؤں کے آگے پھینک دیں۔ انور خاں ہمارا سالار ہے...... اور اب وہ ہمارے درمیان ہے۔ اس شیر کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ انور خاں کا ایک ایک جاں نثار...... کرائے کے ان سو سو ٹٹوؤں پر بھاری ہے......''

انور خاں کا نام سن کر میں چونکا۔ اس کا روشن چہرہ، اس کی کشادہ پیشانی، اس کا چوڑا سینہ اور اس کا پُرجوش انداز...... سب کچھ ایک لمحے میں میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا زرگاں کے مسلمان انور خاں کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ یہ انور خاں ہی تھا جس نے سلطانہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بعد جارج گورا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا...... انور کی قیادت میں سیکڑوں پُرجوش لوگوں نے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہلا بولا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اب یہ زخمی شخص بتا رہا تھا کہ انور خاں پھر زرگاں میں ہے اور باغی گروہوں کی قیادت کر رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ حوصلہ افزا صورتِ حال تھی۔ میں نے زخمی شخص سے پوچھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو کہ انور خاں یہاں ہے؟''

''بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ جو انگریزوں اور دیسی انگریزوں کی دم میں نمدہ فٹ ہو رہا ہے، یہ یونہی نہیں ہو رہا۔ لوگ جانتے ہیں کہ شیر بھیڑوں میں گھس آیا ہے اور اب ان بھیڑوں کو

بھاگتے ہی بنے گی۔ تم دیکھنا چند دن کے اندر زرگاں کی گلیوں میں حکم کے بھاڑے کے ٹٹوؤں
اوران گوروں کی لاشیں گھسیٹی جائیں گی۔''

بھرت نے کہا۔'' بے شک انور خاں دلیر شخص ہے۔ بہت سے لوگن اس سے ہمدردی
بھی رکھتے ہیں لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ زرگاں میں ابھی تک کہیں نظر نا ہیں آیا۔ یہی کارن ہے
کہ ابھی تک بہت سے لوگن یہ وشواس نا ہیں کر رہے کہ وہ واقعی یہاں موجود ہے۔''

''وہ ہے......وہ ہے۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے اور باقی بھی جلد دیکھیں گے۔'' زخمی
شخص پورے اعتماد سے بولا۔'' کل جن جاں بازوں نے اسلحہ گودام میں آگ لگائی ہے، ان
میں انور خاں بھی شامل تھا۔''

اسی دوران میں ایک اور بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھماکا شہر کے وسط میں
کہیں ہوا تھا۔ گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک بڑا دھماکا ہے...... اس کے ساتھ ہی
چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ بھی سنائی دینے لگی۔ زخمی شخص نے پُرجوش انداز میں ایک
فاتحانہ نعرہ بلند کیا اور پھر اپنے گلے میں موجود چاندی کے ایک چمکیلے تعویذ کو کئی بار چوما۔

ہم کچھ دیر تک کان لگا کر سنتے رہے۔ قریباً پانچ منٹ بعد فائرنگ تھم گئی۔ زخمی شخص نے
عمران اور بھرت کے پوچھنے پر اپنا نام ابراہیم بتایا۔ وہ بولا۔'' آج رات بارہ بجے تک پورے
شہر میں کارروائیاں ہوں گی۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔''

''مبارک دن؟'' میں نے پوچھا۔

''آج چاند کی سات تاریخ ہے اور بدھ کا دن ہے۔ چاند کی سات اور بدھ کا دن ان
گوری چمڑی والوں کے لئے بہت منحوس ہے۔ اسی طرح اگر چاند کی پانچویں اور تیرھویں
تاریخ کو بدھ کا دن آئے گا تو وہ بھی ان گوروں اور حکم ہرکاروں کے لئے بڑا نحس ہوگا۔ اور میرا
تو خیال ہے کہ اب آنے والا ہر دن ہی ان مردودوں کے لئے نحس ہوگا۔ بہت جلد ان کا بیڑا
غرق ہونے والا ہے۔ ان کا ظلم ہی ان کے گلے کا پھندا بننے والا ہے۔

''یہ چاند کی تاریخوں والی بات کس نے بتائی ہے؟'' بھرت نے ابراہیم سے پوچھا۔

ابراہیم نے چاندی کے تعویذ کو چوما اور عقیدت سے بولا۔'' ہمارے حضرت صاحب
نے۔ اور یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ نہ ہی تم ان کو وہم سمجھ سکتے ہو۔ ان گوری چمڑی والوں کے
دن اس راجواڑے میں پورے ہو چکے ہیں۔ اب ان کو یہاں سے بھاگنا ہے یا کتے کی موت
مرنا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر پُرجوش نعرہ لگایا۔

کوٹھڑی کے چوبی دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھلا اور ایک گارڈ نے شعلہ بار

نظروں سے ہمیں گھورا۔ وہ زخمی ابراہیم کو مخاطب کر کے بولا۔'' گندے گٹر کی طرح زیادہ ابلتا
مت جا۔ چپ کر کے بیٹھ، ورنہ ابھی گلا کاٹ کر پھینک دیویں گے۔''

ابراہیم پھنکارا۔'' گلا کاٹ بھی دو گے تو یہ آواز بند نہیں ہوگی۔ تم کتنے گلے کاٹو گے،
کتنی آوازیں بند کرو گے؟''

گارڈ نے زہرناک لہجے میں کہا۔'' دوسروں کا تو کہہ نا ہیں سکتا لیکن تیری بولتی ضرور صبح
تک بند ہو جاوے گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے چوکور خانے کا پٹ زور سے بند کر دیا۔

ابراہیم نے بلند آواز میں اسے کوسا پھر دروازے کی طرف تھوک دیا۔

گارڈ کی دھمکی اور اس کا لہجہ قابلِ غور تھے۔'' یہ کیا کہہ کے گیا ہے؟'' عمران نے ابراہیم
سے پوچھا۔

''جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن نہیں مار سکتے۔ جب تک میری زندگی ہے،
کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' اس نے ایک بار پھر عقیدت سے چاندی کے تعویذ کو چوما۔ اس
کے چہرے پر فکر تردد کا نشان تک نہیں تھا۔

ابراہیم ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھا جن کے دلوں میں انگریزوں اور ان کے کٹھ
پتلی حکم جی کے خلاف شعلے بھڑک رہے تھے۔ سلطانہ کی موت کے بعد یہ شعلے کچھ اور بلند ہو
گئے تھے...... وہ مرنا یا مار دینا چاہتے تھے......

رات بھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ علی الصباح مسلح گارڈز آئے۔ انہوں
نے ابراہیم کو بتایا کہ بڑے صاحب محترم اینڈرسن اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ابراہیم نے
جانے میں پس و پیش کی لیکن وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ ہمیں مختلف آوازوں سے
اندازہ ہوا کہ اردگرد کی کوٹھڑیوں سے بھی کچھ قیدیوں کو نکال کر لے جایا جا رہا ہے۔ ایسے کچھ
قیدی مزاحمت بھی کر رہے تھے۔

صرف آدھ گھنٹے بعد ساری صورتِ حال سامنے آ گئی اور یہ کافی سنگین تھی۔ یہ سنگین
صورتِ حال ہمیں دکھانے کے لئے گارڈز نے ہماری کوٹھڑی کے دروازے میں موجود چھوٹا
چوکور پٹ کھول دیا۔ آہنی سلاخ کی دوسری جانب دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ایک
دوسرا دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اب ہمیں جیل کے ایک چھوٹے احاطے کا منظر دکھائی دے
رہا تھا۔ یہاں ایک سرسری ساعت کی عدالت لگی ہوئی تھی۔ بس ایک لمبی میز تھی جس کے پیچھے
اسٹیٹ کے چار فوجی افسر بیٹھے تھے۔ دو مقامی اور دو انگریز تھے۔ انگریزوں میں تمتماتے
چہرے والا اینڈرسن بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ بہنے لگی۔ سلطانہ کی

اچانک موت کے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔

اسٹیٹ کے فوجی افسروں کے سامنے ایک قطار میں قریباً پندرہ افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط رسیوں سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کو بھی اسی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھی ان میں شامل تھا۔ لگتا تھا کہ ان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اینڈرسن نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”تم لوگوں پر یہ الزام ثابت ہوتا ہیں کہ تم نے عام شہریوں پر حملے کئے۔ اسپیشلی تم نے برٹش عورتوں اور بچوں کا مرڈر کیا۔ ان کی پراپرٹی کو نقصان پہنچایا...... اور کھلے عام بغاوت کی...... اس کے علاوہ دوسروں کو بغاوت پر اکسایا۔ ان کرائمز کے لئے یہ کورٹ تم کو سزائے موت دیتا......“

قیدیوں میں سے دو افراد چلانے لگے۔ ان میں ایک ابراہیم تھا۔ وہ اینڈرسن کے فیصلے کو یکسر رد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو نہیں، اپنے ساتھ لڑنے والے مسلح لوگوں کو مارا۔ ان ظالموں کو مارا جنہوں نے یہاں کے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔

اینڈرسن اور دیگر افسروں کے چہرے پتھر کی طرح سپاٹ تھے۔ ان پر ان باتوں کا بالکل اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان قیدی کا رنگ یکسر ہلدی نظر آیا۔ اس نے التجا کے لہجے میں کچھ کہا۔ شاید افسروں کی منت سماجت کی۔ غالباً وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ان لوگوں میں شامل نہیں ہوا۔ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس کی حالت ترس ناک تھی مگر یہاں انہیں ترس کھانے کے لئے نہیں، شوٹ کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لی وان کا تیرہ چودہ سالہ پوتا یاد آ گیا۔ وہ بھی تو ایسے ہی رویا بلکا تھا۔ بھرت کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اسپتال کے خونی ہنگامے میں وہ بچ گیا ہے۔ ابراہیم دہاڑنے لگا۔ ”تم گوری چمڑی والوں کی موت بڑی دردناک ہو گی۔ کتوں کی طرح زرگاں کی گلیوں میں گھسیٹے جاؤ گے۔ موت کو ترسو گے لیکن موت نہیں ملے گی۔“ پھر اس نے اپنا سینہ تان لیا۔ جیسے گولی کھانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا ہو۔

اس کو دیکھ کر اور کئی افراد نے بھی سینے تان لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں سے اکثر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ رائفل اسکواڈ بالکل تیار کھڑا تھا۔ یہ چھ باوردی سپاہی تھے جو جدید رائفلیں کندھوں سے لگائے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ اینڈرسن نے اپنے ہاتھوں میں سفید رومال پکڑ لیا تھا۔ رومال کے اس اشارے پر قیدیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جانا تھی۔ یہ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ مجھے کچھ عرصے پہلے اسحاق کی دردناک موت یاد

آ گئی۔ دو مسلح سپاہی آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز دھار چاقو تھے۔ انہوں نے قیدیوں کے تعویذ اور امام ضامن وغیرہ کاٹ کر ان کے جسموں سے علیحدہ کر دیئے۔ ایک پارسی نوجوان کے لباس سے ایک چھوٹی سی...... پاکٹ سائز کی مذہبی کتاب بھی نکلی۔ یہ اشیاء قیدیوں کے جسموں سے علیحدہ کرنے کے بعد قیدیوں کو بتایا گیا کہ وہ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا سے گناہوں کی معافی مانگ لیں، انہیں گولی ماری جا رہی ہے۔

نوجوان لڑکا آخری کوشش کے طور پر پھر منت سماجت کرنے لگا۔ آٹھ دس سیکنڈ بعد اس کی آواز فائرنگ کی خوفناک آواز میں دب گئی۔ فائرنگ اسکواڈ نے اندھا دھند برسٹ چلائے اور پندرہ کے پندرہ قیدیوں کو چھلنی کر دیا۔ ان کے جسم اوندھے سیدھے گرے اور تیزی سے خون اگلنے لگے......

ہماری طرح یہ منظر جیل کے اور بھی بہت سے قیدیوں نے دیکھا۔ ایک وحشت زدہ سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مقدمہ چلا تھا۔ استغاثہ اور صفائی کے دلائل سنے گئے تھے اور سزائے موت دے دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے کا چوکور روزن بند کر دیا گیا اور ہماری کوٹھڑی میں صرف لالٹین کی مدھم روشنی باقی رہ گئی۔

”یہ لوگ درندگی پر اتر آئے ہیں۔ انصاف کے تقاضے پورے کئے بغیر زردوشوں کو مارا جا رہا ہے۔“ بھرت نے تاسف سے کہا۔

”جب پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگے تو ظالم حکمران ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔“ عمران نے بوجھل لہجے میں کہا۔

زخمی ابراہیم نے دو گھنٹے پہلے جن برتنوں میں ناشتا کیا تھا، وہ اسی طرح ایک کونے میں پڑے تھے۔ اس کی خون میں بھیگی ہوئی ایک پٹی بھی ایک گوشے میں رکھی تھی لیکن وہ خود اب نہیں تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان پندرہ قیدیوں کو سرعام سزا اس لئے دی گئی ہے کہ دیگر قیدی عبرت پکڑیں اور عملے کے احکام پر بے چوں چراں عمل کریں۔ اس سزا کے بعد دروازے کا روزن بند ہو چکا تھا اور ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی دوبارہ کھلے گا۔ مگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دروازے کی دوسری جانب ایک دو منٹ تک کھٹ پٹ ہوتی رہی۔ یوں لگا جیسے کوئی وزنی کرسی گھسیٹ کر دروازے کے پاس لائی گئی ہے۔ پھر روزن یعنی چوکور خانے کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا۔ دوسری طرف کا منظر تعجب خیز تھا۔ ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر مسٹر اینڈرسن بڑی شان سے ایک صوفہ نما نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں

-گار اور دوسرے میں وہسکی کا جام تھا۔ اس کا سرخ چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تمتمارہا تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح انگریز فوجی موجود تھے۔ وہ اپنے چمکیلے جوتے والے ایک پاؤں کو مسلسل ہلا رہا تھا۔

میرا خون ایک بار پھر رگوں میں سیال آگ کا روپ دھار گیا۔ جی چاہا کہ اردگرد کی ساری رکاوٹوں سے ٹکرا جاؤں، ان کو توڑ دوں یا خود ختم ہو جاؤں...... اور اگر ان کو توڑ دوں تو پھر اس تمتماتے چہرے والے سفید شیطان پر جا پڑوں اور خالی ہاتھوں سے اس کا جسم پھاڑ کر رکھ دوں۔

اس نے سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ''افسوس ہے کہ مجھے تمہیں یہاں دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''ہمیں بھی افسوس ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ہمارے درمیان کچھ طے ہوا تھا۔''

اینڈرسن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کھڑے دونوں انگریز محافظ ایک طرف اوجھل ہو گئے۔

اینڈرسن بولا۔ ''ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی پہلی شرط تو یہی تھی کہ تم دونوں ہندو سپاہیوں کے سامنے نہیں آؤ گے۔ لیکن جب تم آ گئے اور بہت سے لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر ہمارا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔''

عمران نے جواب دیا۔ ''ہم اس وقت سامنے آئے تھے جب سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کم از کم سلطانہ کو ہی بچایا جا سکے اور پھر......''

یکا یک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک طرف سے وزنی بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر رنجیت پانڈے ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی میں ایک سرخ رنگ کی پٹی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالی اور پھر مسٹر اینڈرسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات مسٹر اینڈرسن کے حوالے کئے اور دھیمے لہجے میں کچھ کہا بھی۔

''ویل ڈن...... ویل ڈن۔'' اینڈرسن نے سر ہلایا۔

ہم پر ایک اور ترچھی نظر ڈال کر وہ واپس چلا گیا۔ بڑی زہریلی کمینگی تھی اس نظر میں۔

عمران نے اینڈرسن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لگتا ہے پانڈے صاحب کی پروموشن ہو گئی ہے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔ ہمیں اچھے اور قابل ساتھیوں کی قدر کرنا آتی ہے۔

پانڈے نے اٹھرا گاؤں میں کارکردگی دکھائی ہے۔''

''ہاں کارکردگی تو اس نے واقعی دکھائی ہے۔'' عمران نے ہولے سے کہا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... آپ...... پانڈے صاحب کی کارکردگی کا بتا رہے تھے۔''

اینڈرسن نے گلاس میں سے ایک سنہری گھونٹ لیا اور بولا۔ ''اسپتال میں اندھا دھند فائرنگ کے وقت پانڈے نے زخمی کپتان ٹام بریرے کو بچانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ وہ برستی گولیوں میں اس تک پہنچا اور اسے اپنی اوٹ میں لے کر فائرنگ کی زد سے نکال لیا۔ اور یہی نہیں، اس سے صرف دو منٹ پہلے وہ ایک اور اہم کارنامہ انجام دے چکا تھا۔''

''وہ بھی بتا دیجئے جناب۔'' عمران نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس جنونی قاتل آفتاب خان کو شوٹ کیا۔ اگر وہ جلدی ہی ایسا نہ کرتا تو شاید اور کئی لوگوں کی جان جاتی...... بہرحال، وہ تیسرا بندہ کہیں نہیں مل سکا جو آفتاب اور سلطانہ کے ساتھ تھا۔''

عمران خاموش رہا۔ ہم جانتے تھے کہ تیسرے بندے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ساری گفتگو حسبِ سابق انگلش میں ہو رہی تھی۔ عمران چند سیکنڈ خاموش رہا، پھر اینڈرسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''واقعی جناب! وہاں پانڈے صاحب کی کارکردگی زبردست رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ محترمہ ماریا کی موت کا ''کریڈٹ'' بھی پانڈے صاحب کو ہی جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' اینڈرسن نے عمران کو گھورا۔

عمران نے کہا۔ ''آپ نے سوچا ہے کہ وہ گولی کس نے چلائی جس کی وجہ سے یہ ساری گڑبڑ ہوئی اور محترمہ ماریہ سمیت کئی افراد کی جان چلی گئی؟''

اینڈرسن نے سگار کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ دھوئیں کے پس منظر میں وہ قیدی مزدور نظر آ رہے تھے جو ''سرسری عدالت'' کے فرش پر سزائے موت پانے والے قیدیوں کا خون صاف کر رہے تھے۔ کسی ساتھ والی راہداری میں پہرے داروں کے جوتوں کی ٹھک ٹھک گونج رہی تھی۔ ماحول میں عجیب سی سہمی ہوئی خاموشی تھی۔ اینڈرسن نے ایک ابرو اٹھائی اور انگلش میں اسٹائل میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے گولی چلانے والا کوئی باسٹرڈ مقامی ہو گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہی ہو۔ وہ نہیں چاہتا ہو گا کہ سر جارج کی معزز بہن اس صورتِ حال میں سے زندہ سلامت نکل جائے۔ اس نے کسی قریبی چھت پر سے فائرنگ کی اور سب

کچھ درہم برہم کر دیا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہوتا ہی جنونی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ گولی چلانے والا اور اس سارے معاملے کو خراب کرنے والا آپ کا چہیتا افسر رنجیت پانڈے تھا تو پھر......"

"میں تمہاری اس بکواس پر ہرگز یقین نہیں کروں گا۔"

"بہت اعتماد ہے آپ کو اس پر؟"

"اعتماد بھی ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ گولیاں چلیں، اس وقت وہ میرے ساتھ موجود تھا۔"

"اس نے وہ خود نہیں چلائیں۔ اس کے ساتھیوں نے یہ کام کیا۔"

"کیا میں شکل سے تمہیں اتنا گاؤدی نظر آتا ہوں کہ تمہاری باتوں پر بھروسا کروں گا؟"

"اسی لئے تو آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

اینڈرسن جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "اپنی اطلاع تم اپنے پاس رکھو۔ میں تم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنے سوالوں کا صحیح صحیح جواب چاہئے؟"

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ہم آپ سے تعاون کریں تو ہمارے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟"

اینڈرسن نے دھواں نتھنوں سے خارج کیا۔ "تم نے اسپتال والے ہنگامے میں سب کے سامنے آکر غلطی کی۔ اس غلطی کا خیازہ تو تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ کیا خمیازہ ہوگا، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" عمران نے کہا۔

"انور خاں کے بارے میں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ تابش کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اس وقت یہاں زرگاں میں موجود ہے۔ یہاں ہونے والی تخریبی کارروائیوں میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں تابش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہاں زرگاں میں انور خاں کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔ مجھے زرگاں میں اس کے قریبی دوستوں کے کوائف بھی درکار ہیں۔"

میں اب تک ہونے والی گفتگو میں بالکل خاموش رہا تھا۔ میری آنکھیں اینڈرسن کی دید سے جل رہی تھیں اور سینے میں آتشیں طوفان ابل رہا تھا۔

اینڈرسن نے عمران سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ہاں...... انور خاں کے بارے میں تم کیا بتا سکتے ہو ہمیں......"

میں خاموش رہا۔ عجیب سی بے حسی طاری تھی مجھ پر۔

اینڈرسن پھنکارا۔ "میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ جناب سے...... اپنے ساتھی انور خاں کے بارے میں کیا جانتے ہو تم؟"

میں نے اینڈرسن کی نیلگوں آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ انور خاں تم جیسے سارے سفید کتوں کی ٹانگیں چیرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ ضرور چیرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ یہ کام نہ کر سکا تو پھر کوئی اور کرے گا۔ میں کروں گا یا میرے جیسا کوئی دوسرا۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس راجواڑے میں تم ذلیلوں کی بدمعاشیوں کے دن گزر گئے ہیں...... گزر گئے ہیں۔" میں نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ...... در و دیوار میں گونج محسوس ہوئی۔

میرا یہ جواب اور لب و لہجہ بالکل غیر متوقع تھا۔ پہلے اینڈرسن کی آنکھوں میں شدید حیرت نظر آئی پھر اس کا چوڑا چکلا سرخ چہرہ سرخ تر ہوتا چلا گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "باسٹرڈ...... بدذات کالے...... تیری یہ جرأت......" وہ صوفے پر سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے چنگھاڑ کر آواز دی۔ "جوزف...... ڈیوی...... ادھر آؤ...... جلدی کرو۔"

پھر اس نے فرطِ طیش میں جھپٹ کر اپنا توانا بازو دروازے کے چوکور خلا سے اندر گھسا دیا۔ وہ میری گردن پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن میری گردن اس کی پہنچ سے قریباً ایک فٹ دور تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا اور خوفناک آواز میں دہاڑا۔ "لگتا ہے سامبر مقابلے نے تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیئے۔ اس جھوٹی فتح کی زہریلی خماری تیرے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ میں تیرا علاج کرتا ہوں۔ بڑا کارگر علاج کرتا ہوں۔ اگر آج کے بعد تجھے ایسے کمینے پن کی شکایت ہوئی تو میرا نام بدل دینا......"

یہی وقت تھا جب دونوں انگریز گارڈز لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ اینڈرسن نے ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ٹریل ٹو رائفل لی اور دروازے کے چوکور خلا میں سے میرا نشانہ لے لیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلے قدم کے طور پر میری ٹانگ کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دریغ گولی چلائی جو میری ٹانگ کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگوں پر دوسرا فائر کرتا، عمران تڑپ کر چوکور خلا کے سامنے آ گیا۔ "نہیں جناب! گولی نہ چلائیں۔ میں اس کی غلطی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اس نے غلطی کی ہے لیکن......"

"تم آگے سے ہٹ جاؤ باسٹرڈ۔ ورنہ تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا۔" اینڈرسن دہاڑا۔ اس نے رائفل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران نے پھر لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "بیوی کی موت کے بعد یہ اپنے حواس میں

نہیں ہے۔ جناب! اول فول بک رہا ہے۔ ہوش ٹھکانے آئیں گے تو آپ سے معافی مانگے گا۔"

"ہوش تو اس کتے کے ابھی ٹھکانے آجاتے ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔" اینڈرسن پھر گرجا۔

عمران اپنی جگہ ڈٹا رہا اور دو تین منٹ کی کوشش سے اینڈرسن کا پارا نیچے لانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس تند و تیز گفتگو کے آخر میں اینڈرسن نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔ "میں تم دونوں کو کل اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں انور خاں کے بارے میں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، اس کے ذمے دار تم خود ہوگے۔" وہ اپنے بھاری بوٹوں سے فرش کو کوٹتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر تو جیسے اس کی باتوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ اردگرد کا سارا ماحول ہی مجھ پر بے اثر تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ نگاہوں کے سامنے صرف سلطانہ کا دم توڑتا ہوا چہرہ تھا۔ اکھڑی سانسیں، مجھے حسرت سے تکتی نظریں اور پھر اس کے بعد رنجیت پانڈے کی منحوس شکل۔ اس کا چہرہ میرے لئے دنیا کی سب سے قابلِ نفرت شے بن گیا تھا۔ اسی شخص کی مکاری نے اسپتال میں بساط الٹی تھی۔ اس شیطان نے بارود کو چنگاری دکھا کر سب کچھ ختم کیا تھا۔

اینڈرسن نے ہمیں انور خاں کے حوالے سے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن یہ مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا کہ ہمیں اس امتحان سے گزرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ سارا دن ہی عجیب سے تناؤ اور غیر یقینی کیفیت میں گزرا۔ صبح سویرے جس طرح پندرہ قیدیوں کو سب کے سامنے گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا، وہ ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ ان قیدیوں کی آخری کراہیں جیسے ابھی تک در و دیوار میں گونج رہی تھیں۔ عمران کے بے حد اصرار پر میں نے شام کے وقت کھانے کے دو تین لقمے لئے اور پھر ایک گوشے میں پڑ کر لیٹ گیا۔ بھرت ایک خوش گفتار شخص تھا مگر اس کوٹھڑی میں آنے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ اس پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات تھے اور وہ آج دیکھ ہی چکا تھا کہ سزا دینے میں یہ گورے کتنے سفاک اور بے حس ہیں۔ عمران کی خوش کلامی بھی سنجیدگی کی گھمبیرتا میں چھپی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے موجودہ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

رات کوئی نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ بھرت نڈھال سا ہو رہا تھا۔ عمران ایک گوشے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولا۔

"ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

جب اس نے دوسری بار اصرار سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اٹھنے بیٹھنے سے میرے سر کے گومڑوں میں ٹیسیں اٹھتی تھیں لیکن ایسی ٹیسوں کو میں نے اب خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے زخموں کے حوالے سے میں ایسی بے پروائی برتتا تھا کہ کبھی کبھی بھول ہی جاتا تھا کہ مجھے زخم لگا ہے۔ میں عمران کے پاس پہنچا تو اس نے انگلی سے پتھریلی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے غور کیا اور حیران رہ گیا۔ یہاں کسی نکیلی شے سے انگریزی کے پانچ حرف کندہ کئے گئے تھے۔ ان حرفوں سے جو لفظ بنتا تھا وہ "جیکی" تھا۔

عمران نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے روحانی استاد بارونداجیکی نے اسی کوٹھڑی میں اپنے اسیری کے دن گزارے تھے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ حیرت انگیز اتفاق تھا۔ میں نے چاروں طرف سر گھما کر پہلی بار اس کوٹھڑی کو بغور دیکھا۔ یہ قریباً دس ضرب بارہ فٹ کی مختصر جگہ تھی۔ یہاں رات اور دن میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ کوٹھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ موٹے لوہے کا ایک چھوٹا سا زنگ آلود دروازہ تھا۔ یہ دروازہ قریباً پانچ ضرب چار فٹ کے ایک بدبودار غسل خانے میں کھلتا تھا۔ تو یہ تھی وہ جگہ جہاں جارج گورا نے بارونداجیکی کو رکھا اور اس پر ستم کے پہاڑ ڈھائے۔

عمران نے لالٹین کی روشنی میں مجھے کوٹھڑی کا ایک اور گوشہ دکھایا۔ یہاں جیکی کے نام کا پہلا حرف "جے" اور اس کی محبوبہ شکنتلا کے نام کا پہلا حرف "ایس" کندہ تھا۔ ان دو حرفوں کے اوپر یقیناً کوئی رومانی فقرہ لکھا گیا تھا مگر اس فقرے کو بعدازاں رگڑ کر اس طرح مٹا دیا گیا تھا کہ اسے پڑھنا مشکل تھا۔ ظاہر ہے یہ کام جیل کی انتظامیہ نے ہی کیا ہوگا۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ بارونداجیکی نے اپنی قید کے دن یہاں کاٹے تھے۔ یا کم ازکم اپنی قید کا کچھ عرصہ یہاں کاٹا تھا۔

ہم لالٹین کی زرد روشنی میں ان دیواروں کو بغور دیکھتے رہے۔ یہ جگہ میرے لئے ایک دم تاریخی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ایک جگہ جیکی کا سب سے پسندیدہ فقرہ لکھا ہوا نظر آیا۔ "نو پین...... نو گین۔" یعنی درد نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

...... ہاں، یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں جیکی رہا تھا۔ یہاں کی دیواروں پر اس کا لمس تھا۔ یہاں کی فضا میں اس کی سانسیں رچی ہوئی تھیں۔

رات گہری ہوگئی۔ میں سونے کے لئے لیٹا تو جیکی کا تصور میرے سامنے آ گیا۔ کٹا پھٹا

اپاہج جسم، مدقوق چہرہ، اندر دھنسی ہوئی لیکن چمکیلی آنکھیں۔ میں نے سوچا، وہ بھی ایسے ہی اس فرش پر چت لیٹتا ہوگا۔ ایسے ہی لالٹین کی زرد روشنی میں سیاہی مائل چھت کو دیکھتا ہوگا۔ اپنی شکنتلا کو یاد کرتا ہوگا۔ ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے آس پاس ہے۔ اس کی روح اپنے اس پرانے مسکن میں موجود ہے۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جیکی! تم نے اس تاریک کوٹھڑی میں کرب کے جو شب و روز گزارے تھے، ان کا مداوا تو شاید کوئی نہ کرسکے لیکن تیرے بدترین دشمن جارج کو اس کے انجام تک میں نے پہنچا دیا ہے۔ اس نے تیرے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تجھے اس تاریک قبر میں پھنکوایا تھا، آج وہ خود ''گورا قبرستان'' کی ایک قبر میں موجود ہے......''

میں تصور میں جیکی سے محوِ کلام تھا جب اچانک مجھے اس چاقو کا خیال آیا جو جارج کی موت کی یادگار تھا اور میں نے اپنے پاس محفوظ کیا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے جیبیں ٹٹولیں۔ ہماری گرفتاری کے وقت یقیناً وہ چاقو بھی دوسری اشیاء کے ساتھ فوجیوں کے پاس چلا گیا تھا...... میں اس بارے میں سوچ رہا تھا جب یکا یک ایک بار پھر جیل کی چار دیواری سے باہر دھماکے سنائی دیئے۔ عمران کا کہنا تھا کہ یہ دستی بموں کے دھماکے ہیں۔ ساتھ میں فائرنگ بھی شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ یہ فائرنگ کافی شدید تھی اور لگتا تھا کہ جیل کے آس پاس ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوطرفہ فائرنگ شدت پکڑ گئی۔ عمران اور بھرت بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جیل پر حملہ ہوا ہے۔''

''ایسے ہی لگت ہے۔'' بھرت بولا۔

ہم فائرنگ اور دھماکوں کی آوازوں کو بغور سنتے رہے۔ یہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ نعروں کی مدھم گونج بھی سنائی دینے لگی۔ ''یہ تو لگتا ہے کہ جیل کے احاطے میں لڑائی ہو رہی ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''اور لڑنے والے کافی زیادہ تعداد میں ہیں۔'' عمران نے اضافہ کیا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ جیل پر ایک بڑا حملہ ہوا ہے اور کچھ لوگ جیل توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہنگامہ شدت اختیار کرتا گیا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بارود کی تیز بو ہماری بند کوٹھڑی تک پہنچ رہی تھی۔ یوں لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ جارج کی جیل پر مارے جانے والا یہ زبردست شب خون کامیاب

ہو جاتا اور ہم اپنی کوٹھڑی کے دروازے کو اپنے سامنے کھلا پاتے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر ایسا ہوگیا تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمارے ذہن تیزی سے سوچ رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد محسوس ہونے لگا کہ لڑائی ہماری کوٹھڑیوں کے آس پاس ہی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جیل کا دفاع کرنے والے بھی جم کر لڑ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی کوٹھڑی کے قریب ہی کسی انگریز افسر کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا اور ''کالے باغیوں'' کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ دو تین ایسے دھماکے بھی سنائی دیئے جو دستی بموں کے دھماکوں سے مختلف تھے۔ عمران نے کہا۔ ''شاید راکٹ لانچر ہے۔''

یہ فیصلہ کن معرکہ آٹھ دس منٹ جاری رہا، یکا یک صورتِ حال پلٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں قدرے فاصلے پر چلی گئیں۔ پھر یوں لگا جیسے جیل پر حملہ کرنے والے پسپا ہو رہے ہیں۔ غالباً جیل کی چھت پر سے بھی گارڈز نے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی تھی۔ قریباً پندرہ منٹ مزید یہ ہنگامہ جاری رہا۔ ہم اس بند کوٹھڑی میں صرف اندازے ہی لگا سکتے تھے۔ ہماری کوٹھڑی کے عین سامنے بھی گارڈز کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان کی آوازوں سے جوش وخروش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی آوازیں مزید فاصلے پر چلی گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ انتظامیہ کے مسلح لوگ، بھاگتے ہوئے حملہ آوروں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری کوٹھڑیوں کے سامنے گارڈز کا جمگھٹا ہوا۔ کوٹھڑیوں کے دروازے کھلنے لگے اور پکڑے جانے والے لوگوں کو گالیوں کی بوچھاڑوں کے ساتھ کوٹھڑیوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی کھلا اور ایک زخمی قیدی کو بیدردی سے دھکا دے کر کوٹھڑی میں گندے فرش پر پھینک دیا گیا۔ میں نے انگریز افسر منیارڈ کو دیکھا، اس نے نفرت سے قیدی پر تھوکا اور اسے ''کالے ذلیل......سوّر'' کے خطابات دیئے۔

وزنی دروازے کو ایک بار پھر دھماکے سے بند کردیا گیا۔ زخمی کا ایک بازو کلائی پر سے ٹوٹ چکا تھا اور عجیب انداز میں مڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی زخم تھا اور اس زخم سے بہنے والے خون نے اس کے پورے چہرے کو لتھڑا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا...... ''انور خاں تم؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

انور خاں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس کھینچ کھینچ کر سانس لیتا رہا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے سینے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہاں کسی رائفل کی سنگین یا کوئی اور تیز دھار چیز لگی

تھی۔

عمران نے بھی سن لیا تھا کہ میں نے زخمی کو کس نام سے پکارا ہے۔ وہ بھی جلدی سے پاس آ گیا۔ چوبی دروازے کا چوکور خانہ کھلا۔ ایک مقامی گارڈ نے ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا ہماری طرف پھینکا اور پھنکارا۔ ''اس کی مرہم پٹی کرو۔''

چرمی تھیلے میں مرہم پٹی کا سامان تھا لیکن یہ انور خاں کے زخموں کے لئے کافی نہیں تھا۔ وہ زخموں سے چُور...... بے بسی کی تصویر بنا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی، ابراہیم نامی شخص انور خاں کے حوالے سے کتنے جوش و خروش کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ انور خاں زرگاں کے لئے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انور خاں کی قیادت میں حکم کے باغی زرگاں میں تہلکہ مچانے والے ہیں۔ وہ بہت جلد سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔ اس حوالے سے اس بے چارے نے بڑے جوش سے چاند کی سات تاریخ اور بدھ کا ذکر بھی کیا تھا۔

لیکن یہ توقعات غلط ثابت ہوئی تھیں۔ بے شک انور اور اس کے ساتھیوں نے ایک بہت دلیرانہ قدم اٹھایا۔ وہ جارج کی جیل توڑنے کے لئے بڑی قوت سے حملہ آور ہوئے تھے لیکن بالآخر یہ کوشش ناکام ہوئی تھی۔ اور اس ناکامی سے بھی بڑھ کر مایوس کن بات یہ تھی کہ انور خاں خود بھی شدید زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ اس کے زخموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے آخری وقت تک کوشش کی ہے کہ اسے زندہ نہ پکڑا جا سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

''انور خاں...... آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو...... میں تابش ہوں۔'' میں نے اس کے کندھوں کو ہلایا۔

اس نے پلکیں اٹھائیں۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یوں اس نے مجھے سمجھایا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔

اس نے خشک، خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ عمران اور بھرت اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی کلائی کی حالت بھی تشویش ناک تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''...... مجھے ختم کر دو...... یہ لوگ مجھے...... بہت بری موت مارنا چاہتے ہیں......''

عمران نے عجیب گونجتے سے لہجے میں کہا۔ ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے انور خاں...... تم حوصلہ رکھو۔''

انور خاں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔ میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوست ہے اپنا...... پاکستان سے آیا ہے......''

انور خاں کی خون آلود آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر عمران کے ہاتھ پر رکھا اور ایک بار پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں...... آخری فتح ہماری ہو گی۔ ان گوروں کو ہمارا راجواڑہ چھوڑنا ہو گا۔ لوگ جاگ پڑے ہیں...... وہ قربانیاں دے رہے ہیں......''

زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انور خاں پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ اسے کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہئے تھا مگر وہ یہاں ہمارے درمیان اس تاریک سرد کوٹھڑی میں موجود تھا۔ ہم کئی گھنٹے تک اس کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ اس کی حالت قدرے اچھی ہو گئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رات کو قریباً چار سو مسلح جاں بازوں نے جیل پر حملہ کیا تھا۔ ان کو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جانا تھا۔ یہ زبردست منصوبہ بندی تھی لیکن عین موقع پر ایک شخص نے دغا کیا اور بازی پلٹ دی۔ ہم نے انور خاں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ شخص کون تھا مگر انور خاں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی۔

میں نے آج انور خاں کو کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ میں اس سے نل پانی کے حالات پوچھنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست ڈاکٹر چوہان، کپتان اجے، عبدالرحیم اور شکنتلا وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مگر انور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے سکتا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ ڈاکٹر چوہان بھی یہاں زرگاں میں موجود ہے۔

سارا دن انور خاں کی حالت کبھی بگڑتی اور کبھی سنبھلتی رہی۔ اس کے سینے پر شدید اندرونی ضرب آئی تھی اور اس وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

شام کے وقت انور خاں سو گیا۔ عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھیں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ''صحیح کہتے ہیں تابی! تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ان کے قبضے، ان کی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں صرف پڑھا اور سنا تھا، آج ہم وہ سب کچھ یہاں اس بھانڈیل اسٹیٹ میں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماحول بھی وہی ہے۔ یہاں بندوقوں اور مشین گنوں کے ساتھ تلواریں اور کلہاڑیاں بھی ہیں۔ یہاں بھی ان مٹھی بھر گوروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کر رکھا ہے اور اپنے لئے کٹھ پتلیاں ڈھونڈی ہوئی ہیں۔ اور ابھی انور خاں بتا رہا تھا کہ خیر سے میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس عمران کی باتیں سنتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بس خاموش رہنا چاہتا تھا۔

عمران بولا۔ ''جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سمجھا تھا کہ حکم جی زرگاں کا حکمراں ہے اور انگریز اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں لیکن اب کھلا ہے کہ یہاں کے تو حکمراں ہی یہ انگریز ہیں۔ حکم جی کو ایک ڈمی کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ وہ شراب اور عورت کے نشے میں غرق رہتا ہے۔ عملی طور پر اس نے یہاں کی باگ ڈور سرجن اسٹیل اور اینڈرسن جیسں لوگوں کو تھما رکھی ہے۔''

رات کسی وقت زرگاں کے وسطی علاقے میں پھر فائرنگ شروع ہوگئی۔ پھر یہ فائرنگ اور بھی دو تین علاقوں تک پھیل گئی۔ ہم اس قبر نما کوٹھڑی میں بس آوازیں ہی سن سکتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس ڈیڑھ ضرب ڈیڑھ فٹ کے چوکور خلا کے ذریعے تھا۔ اس خلا میں سے ہمیں کھانا اور ضرورت کی دیگر اشیاء پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ اشیاء فراہم کرنے والے تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ رات کی شفٹ میں کام کرنے والا ایک گہرا سانولا ہندو تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا لہجہ اور آواز مجھے پہچانی سی لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ آواز کچھ دن پہلے میں نے کہیں سنی ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اس بارے میں عمران سے پوچھا تو وہ بھی کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ بہر حال یہ آواز میرے ذہن میں کھٹکتی رہی۔

رات کو پھر سلطانہ کی موت کے دردناک مناظر نظروں کے سامنے گھومتے رہے۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہوتی رہیں کہ معصوم بالو اب کبھی اپنی ماں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کو کبھی پتا ہی نہیں چلے گا کہ ماں کا محبت بھرا لمس کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اگر میں موت کے اس گھیرے سے نکل کر واپس فتح پور کے مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہاں میرے دل کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہاں سلطانہ کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ اس کے کپڑے، اس کے برتن، اس کے زیور...... اور وہ سب کچھ جو وہ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ سلطانہ کے قاتلوں کے ساتھ ساتھ کٹر انتہا پسند ہاشم رازی کا چہرہ بھی میری نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ بھی تو بالواسطہ سلطانہ کے قتل میں شریک رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جسم میں لاوا سا بہنے لگا۔

رات کسی وقت میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کا چوکور خانہ کھلا ہوا ہے۔ خانے کی اکلوتی سلاخ کی دوسری جانب وہی پکی رنگت والا پہرے دار موجود ہے اور عمران سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔

صبح میں نے دیکھا کہ انور خاں ہولے ہولے کراہ رہا ہے۔ اس کی چوٹوں میں شدید درد تھا۔ جب انور خاں جیسا فولادی بندہ کراہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ درد معمولی نہیں ہے۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد ایک انگریز گارڈ کا ٹماٹر جیسا چہرہ چوکور خلا میں نظر آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ شاید یہ اس فتح کا نشہ تھا جو ان کو ملی تھی یا مل رہی تھی۔ ''کیا تکلیف ہے؟'' وہ انگریزی میں بولا۔

''انور خاں کو بہت درد ہے۔''

''اس کا درد بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دم ختم۔ بس تھوڑی دیر انتظار کرو۔'' اس کے معنی خیز لہجے نے میرے ذہن میں اندیشوں کی بھرمار کر دی۔

کچھ اسی طرح کی دھمکی ان گارڈز نے اس وقت دی تھی جب زخمی ابراہیم کو گولی سے اڑانے کے لئے اس کوٹھڑی سے لے جایا گیا تھا۔

تو کیا اب انور خاں کی باری آنے والی ہے؟ میں نے بے حد کرب سے سوچا۔ اور اگر ایسا ہوا تو کیا ہم اب بھی تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے؟ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آٹھ بجے کے قریب مسلح گارڈز آ گئے۔ میں سمجھا کہ وہ انور خاں کو لے جانے آئے ہیں لیکن انہوں نے پہلے بھرت کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور تیوروں سے پتا چلتا تھا کہ اگر ہم حکم عدولی کریں گے تو وہ ہمیں اندر ہی بھون سکتے ہیں یا اس بری طرح زخمی کر سکتے ہیں کہ ہم پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہ رہیں۔ وہ لوگ بھرت کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ پھر ہم سب کو باری باری باہر نکالا گیا اور ہمارے ہاتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ پشت پر رسیوں سے باندھ دیئے گئے۔ ہمارے اردگرد درجنوں رائفلوں کا پہرا تھا۔ یہاں کسی بھی طرح کی مزاحمت خودکشی کے مترادف تھی۔ انور خاں کو سب سے آخر میں ایک اسٹریچر پر باہر لایا گیا۔ اس کے ہاتھ بھی مضبوطی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے اور تیور خطرناک۔ پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ میں بار وندا جیکی کی یہ تاریخی کوٹھڑی آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

ہمیں برہنہ پا اور برہنہ سر چند تنگ راہداریوں سے گزارا گیا اور پھر ہم صحن میں آ گئے۔ ہماری آنکھیں روشنی میں چندھیا گئیں۔ آج ہم پورے چار دن بعد سورج کی روشنی دیکھ رہے

تھے۔ جارج کی اس بدنام زمانہ جیل کے درودیوار میں اس سے پہلے بھی ایک بار دیکھ چکا تھا جب مجھے سلطانہ کے ہمراہ پکڑ کر زرگاں لایا گیا تھا اور پھر میری خدمات جارج گورا کے حوالے کی گئی تھیں۔ لیکن آج جارج گورا تھا اور نہ سلطانہ۔

گارڈز کے نہایت سخت پہرے، میں ہم جیل کے پھاٹک سے باہر آئے اور یہی وقت تھا جب ہمیں زرگاں کی اصل صورتِ حال کا پتا چلا۔ یہ سب کچھ تعجب خیز تھا۔ جیل کی بیرونی دیوار اور پھاٹک وغیرہ گولیوں سے چھلنی تھے۔ یقیناً یہ نشانیاں اس زبردست شب خون کی تھیں جو دو دن پہلے باغیوں کی طرف سے مارا گیا تھا اور جو بقول انور خاں ایک غدار کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ ہم نے اپنے اردگرد درختوں پر کچھ لاشیں لٹکتی دیکھیں۔ ان لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، ہم نے زرگاں کے لرزہ خیز منظر دیکھے۔ ایک چوراہے میں کئی جلی ہوئی لاشیں ایک چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ کچھ منہدم اور ادھ جلے مکان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں اور مختلف پولوں سے لٹکتی ہوئی لاشیں جابجا دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے، کچھ کے چہرے مسخ تھے۔ ان میں سے چند ایک کے سوا سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔

''لگتا ہے کہ بغاوت پوری طرح کچل دی گئی ہے۔'' میرے پہلو میں چلتے ہوئے عمران نے سرگوشی کی۔ ہم آخری قطار میں تھے۔ ہر قیدی کے عقب میں ایک مسلح گارڈ تھا جس نے اسے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم جیل سے نکلنے والے قریباً چالیس قیدی تھے۔ تین قیدی اسٹریچرز پر تھے۔ ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔ بھرت بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ اچھا ہونے نہیں جا رہا۔ میم کی عزت لوٹنے کے جرم میں وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا مگر یہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جب ہمارا قافلہ ایک کشادہ سڑک پر مڑا تو بھرت نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے زیرلب کہا۔ ''ہم قاسمیہ کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ یہاں مسلمان آبادی ہے بلکہ یہ زرگاں میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔''

اردگرد کے مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے سہمے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ ہر طرف ہراس کی فضا تھی۔ ہم نے ایک چھوٹا سا محلّہ دیکھا جو پورے کا پورا جلا ہوا تھا۔ یہاں نمائش کے لئے ایک سر بریدہ لاش چوراہے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ جب ہم اس علاقے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوئے تو ایک فوجی گاڑی ہمارے قافلے کے پیچھے پیچھے چل

پڑی۔ میں نے اور بھرت نے مڑ کر دیکھا۔ اس گاڑی میں منحوس تھوبڑے والا اینڈرسن موجود تھا۔ تاہم ایک شخص اینڈرسن سے بھی اہم اس گاڑی میں موجود تھا۔ وہ دراز قد سرجن اسٹیل تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت برس رہی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر اس نے اپنے سگے بھائی کے علاوہ اپنی بیوی بھی کھوئی تھی۔ اس کا لمبوترا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اندر بدلے کی آگ بھڑک رہی ہے۔

بھرت کے پیچھے چلنے والے مقامی گارڈ نے اس کی گردن پر زوردار جھانپڑ رسید کیا اور حکم دیا کہ وہ صرف آگے دیکھے۔

ہم پابجولاں چلتے رہے۔ چند منٹ بعد پیچھے آتی ہوئی گاڑی میں سے اینڈرسن کی کرخت آواز بلند ہوئی۔ وہ میگافون کے ذریعے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بول رہا تھا۔

''یہ اسٹیٹ اور حکم جی کے مجرم ہیں۔ آج ان لوگوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے عبرت ناک پنشمنٹ دیئے جائیں گے۔ ہام تم کو دکھائیں گا کہ باغیوں کا انجام کیا ہوتا۔ دیکھو اور عبرت پکڑو۔''

اس نے یہ چند فقرے بار بار دہرائے۔ ایک چھوٹے چوراہے پر یہ قافلہ رک گیا۔ یہاں ایک مسجد نظر آ رہی تھی۔ اردگرد کی دیواروں پر انگریزوں اور حکم کے خلاف باغیانہ نعرے لکھے تھے۔ جنہیں بعد ازاں مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں آبادی گنجان تھی۔ اردگرد کے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اگر یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تو ان دو ڈھائی سو فوجیوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے لیکن عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اینڈرسن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہی جگہ ہے جہاں سے پانچ دن پہلے تم لوگوں نے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ اسی جگہ سے وہ آگ بھڑکا جس نے اسٹیٹ کے پُرامن لوگوں کا بہت زیادہ نقصان کیا۔ سیکڑوں بے گناہ لوگوں کا مرڈر ہوا۔ ہاں، یہی وہ جگہ ہے۔''

اینڈرسن نے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا۔ انہوں نے قیدیوں میں سے چند افراد چنے۔ رائفلوں کی سنگینوں کے ذریعے ان کے کپڑے چاک کر دیئے گئے اور انہیں زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ اینڈرسن کھنکھارا۔ ''یہی وہ جگہ ہے جہاں پُرامن شہری ڈاکٹر ولیم اور اس کی وائف کا کپڑا پھاڑا گیا اور ان کو مار مار بے ہوش کر دیا گیا۔ اگر تم لوگوں نے وہ سین دیکھا تھا تو آج یہ بھی دیکھو۔''

اوندھا لٹائے جانے والے چھ قیدیوں کو اس طرح بے بس کیا گیا کہ ان کے سر کے بال اور ٹخنے گارڈز نے اپنی گرفت میں لے لئے...... پھر ان پر چمڑے کے وزنی جوتوں کی بارش

کر دی گئی۔ وہ چلاتے رہے، چلاتے رہے۔ ان کی جلد سے خون رِسنے لگا۔ ان میں سے تین نیم بے ہوش اور تین مکمل بے ہوش ہو گئے۔ مکمل بے ہوش ہو جانے والوں کو بھی اسٹریچرز پر ڈال لیا گیا اور انہیں بغیر کوئی طبی امداد دیئے یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے نکل کر لوگ اس قافلے کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ ان کی حیثیت صرف تماشائیوں کی تھی۔ مزاحمت تو دور کی بات ہے، وہ مسلح فوجیوں کے سائے سے بھی خوفزدہ تھے۔ ان میں زیادہ تر لڑکے بالے تھے۔

قیدیوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ سب کو انجام دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک سرسری سی عدالتی کارروائی، تین چار منٹ کا رسمی مکالمہ اور پھر سزائے موت۔ مجھے لگا کہ میں کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے 1857ء میں کھڑا ہوں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کچل دی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ لوگوں کو سرِ عام پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کے سر جدا کئے جا رہے ہیں۔ کمپنی کی حکومت نے ساڑھے تین سو سالہ مغلیہ دورِ حکومت کو ختم کر دیا ہے اور لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے...... ہاں، یہ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کا برائے نام اقتدار ایک ہندو کے پاس تھا اور وہ ان گوروں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

میں نے سوچا۔ 'تو کیا آج ہماری زندگیوں کو فل اسٹاپ لگنے والا ہے؟' میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

آخر ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچے۔ یہ قاسمیہ چوک تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی یہاں بہت سے افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے بعد اور بھی ہجوم ہو گیا۔ گھروں کی چھتوں اور گلیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ جو کچھ یہاں ہونے جا رہا ہے، وہ انہیں خون کے آنسو رُلا رہا ہے مگر وہ اسے روکنے کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں بھی درختوں پر کٹی لاشیں لٹکی نظر آئیں۔ ابھی ان میں سے بو اٹھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ان بدنصیبوں کو کل رات کسی وقت پھانسی دی گئی تھی۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے۔

یہاں ہمیں ایک قطار میں دس سولیاں گڑی نظر آئیں۔ ایک طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں اور میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر صاف ستھرے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں درجنوں انگریز صاحبان پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک لرزہ خیز تماشے کی ہوس تھی۔ اس جگہ چاروں طرف خاردار باڑ تھی۔

ہمیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ برہنہ کئے جانے والے چھ افراد میں سے تین تو اسٹریچرز پر تھے، باقی تین ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر کپڑے کی ایک دھجی نہیں تھی۔ سولیاں ہم سے فقط پندرہ بیس قدم کی دوری پر تھیں۔ دو ہٹے کٹے جلاد نما افراد یہاں موجود تھے۔ ایذا رسانی کے بیشتر آلات بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے دستے والے وزنی ہتھوڑے، چھوٹی ہتھوڑیاں، آہنی میخیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ میری نگاہوں میں ایک بار پھر اسحاق کی لرزہ خیز موت کے مناظر گھوم گئے۔ ہزاروں افراد کے سامنے اس ''جاں بہ لب'' کو میخوں کے ذریعے سولی پر ٹھونکا گیا اور پھر اس کی ہڈیوں کا چورا کر دیا گیا تھا۔

فوجی افسر منیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم چالیس قیدیوں کی تین قطاروں میں سب سے آخری قطار میں تھے...... لیکن بھرت کو اب پہلی قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ قیدیوں والے چار اسٹریچرز بھی ایک طرف رکھے تھے۔ اسٹریچرز کی بیلٹس باندھ کر قیدیوں کو ہلنے جلنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انور خاں کی آنکھیں بند ہیں اور وہ منہ میں مسلسل کچھ پڑھ رہا ہے۔ منیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ بہرحال، تمہارے لئے ایک خبر اچھی ہے اور ایک بری۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھی خبر یہ ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ابھی سزا نہیں دی جا رہی۔ تمہاری سزا ملتوی ہو گئی ہے۔''

میرے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ ''اور بری خبر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سفاکی سے بولا۔ ''یہ سزا زیادہ دیر کے لئے ملتوی نہیں ہوئی۔ آدھے قیدیوں کو یہاں سزا دی جا رہی ہے۔ آدھے قیدیوں کو ڈیڑھ دو میل دور قاسمیہ کے دوسرے چوک میں دی جائے گی...... چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ تمہیں دو ڈھائی گھنٹے اور زندگی مل گئی ہے اور زندگی تو پھر زندگی ہی ہوتی ہے۔''

میں آزاد ہوتا تو شاید اس سفید سؤر پر پل پڑتا مگر میرے ہاتھ پشت پر بے انتہا سختی سے بندھے ہوئے تھے اور درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

منیارڈ نے بڑی ادا سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اردگرد کا نظارہ تم کو کیسا لگ رہا ہے؟ دیکھو، یہ صرف دو ڈھائی سو سپاہی ہیں۔ انہوں نے اردگرد کے ہزاروں تماشائیوں کو ہپناٹائز کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ اندر سے کھول رہے ہیں، ابل رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہیں اور بھیڑ بکریاں بھی ایسی جو ہپناٹائز ہو چکی ہیں۔ میرا

خیال ہے کہ تمہیں عزت مآب اسٹیل صاحب کی بہادری کی داد دینی چاہئے۔ لوگ کہتے تھے کہ قاسمیہ چوک کے علاقے میں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ لیکن ہم یہاں موجود ہیں اور قاسمیہ کے ان باغی قیدیوں کو ان کے عزیز واقارب کے سامنے ہی کتے کی موت مارنے والے ہیں۔ ہے نا بہادری؟'' منیارڈ نے ستائش طلب نظروں سے مجھے اور عمران کو دیکھا۔

''لیکن یہ نہتے لوگ ہیں۔'' عمران نے کہا۔

وہ ہنسا۔ ''اتنے بھی نہتے نہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہے ان کے پاس۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس توپیں اور راکٹ لانچر بھی ہوں تو یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لڑائی ہتھیار سے نہیں یہاں سے ہوتی ہے...... یہاں سے۔'' اس نے اپنے سینے کو بائیں طرف سے ٹھونکا۔

سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''اسٹیل صاحب اور مسٹر اینڈرسن چاہتے تو یہاں بہت ساری نفری بھی لا سکتے تھے۔ یہاں کے ہر کالے کے سر پر ایک رائفل بردار کھڑا کر سکتے تھے لیکن وہ صرف دو کمپنیوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سپاہی۔ اور تم ان ڈھائی سو سپاہیوں کی دہشت دیکھ رہے ہو۔ یہ اس سے آدھے بھی ہوتے تو نتیجہ یہی ہونا تھا۔ اب تو تمہیں یہ بات ماننی چاہئے کہ ایک برٹش سپاہی ایک سو کالے جنگجوؤں پر بھاری ہے......''

منیارڈ صرف بڑ نہیں مار رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ سیکڑوں تماشائی واقعی انسانوں کے بجائے بھیڑ بکریاں نظر آ رہے تھے۔ دور فاصلے پر چند ٹولیاں ضرور ایسی تھیں جو نعرے لگا رہی تھیں اور احتجاجی رویے کا اظہار کر رہی تھیں مگر باقی سب سکوت تھا۔

اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ ایک شاندار میز کے عقب میں مخملی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ہلکی سنہری دھوپ میں ان کے چہرے پر کچھ اور بھی سرخ دکھائی دیتے تھے۔ انڈرسن اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترے پر آیا اور ایک بار پھر میگافون کے ذریعے دہاڑا۔ ''...... ہام دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ یہ تمہارے سامنے عبرت کا تصویر بنا وہ سب ڈرٹی لوگ کھڑا ہے جس نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ظلم کیا۔ پچھلے پانچ دن تک ان لوگوں نے اس شہر کو جہنم بنائے رکھا۔ یہ سب کا سب اپنے کرائمز کو تسلیم کر چکا ہے۔ حکم جی کے قانون میں ان کے لئے کوئی رعایت ناہیں اور نہ ہی ہام دیں گا۔ اب کہاں ہیں وہ موٹی گردنوں والے سرکردہ لوگ جنہوں نے ان کو بھڑکایا۔ ان میں سے بہت سا بھاگ چکا اور بہت سا چوہوں کی طرح انڈر گراؤنڈ ہے۔ یہ بیویوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں رہنے والے، جھوٹے دغاباز، فریبی عیاش تم کو کچھ ناہیں دے سکتے۔ اسپرین کا ایک گولی، جنریٹر کا ایک پرزہ، رائفل کا ایک

راؤنڈ...... کچھ بھی ناہیں۔''

قوی ہیکل اینڈرسن کئی منٹ تک دہاڑتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''ہام ڈرنے والا ناہیں، لڑنے والا لوگ ہے۔ ہام کو اپنے بازو پر بھروسا ہے اور اسی لئے ہام یہاں موجود ہے۔ اگر کسی کو کسی بھی ٹائم اپنے دل کا ارمان نکالنا ہے تو ہام اس کے لئے تیار ہے۔''

اینڈرسن کی تقریر ختم ہوئی تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کوئی سرسری سماعت بھی نہیں ہو گی اور اگلے چند منٹ کے اندر کم از کم بیس قیدیوں کو مقامی طریقے کے مطابق سولی چڑھا دیا جائے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انور خاں اور بھرت بھی ان بیس افراد میں شامل ہوں گے۔ ہم نے دیکھا کہ بھرت کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ آفیسر منیارڈ اس کے قریب ہی موجود تھا۔ بھرت نے دو تین بار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن گارڈز نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ یقیناً وہ ان آخری لمحوں میں پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوگا۔ ان کو بتانا چاہتا ہوگا کہ وہ میم کرسٹی کو مارنے والوں میں نہیں بچانے والوں میں شامل تھا...... مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اب صفائی دہائی کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ کسی فریادی کی کسی فریاد پر اب کان نہیں دھرا جائے گا۔

اسی دوران میں میری نظر میڈم صفورا پر پڑی۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے معزز مہمانوں کی آخری قطار میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غم واندوہ کی تصویر تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اتنی دور سے بھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ صفورا میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں بیٹھ کر سفاکانہ طریقے سے سولیاں چڑھائے جانے کا منظر دیکھ سکے۔ یقیناً وہ صرف ہمیں دیکھنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ خونی تماشا شروع ہونے سے پہلے ہی اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔

عمران نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''میڈم کو اپنانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ آہ...... اب اس کو کبھی پتا نہیں چل سکے گا کہ میں اس پر کس طرح فدا تھا۔''

میں نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ سلطانہ کی موت کے بعد سے میری طرح اسے بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد تھوڑا سا چہکا تھا۔ ہم بے حد سنگین صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اپنے مخصوص انداز میں کیوں بولا تھا؟

میں نے بھی اپنی خاموشی توڑی۔ میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! کیا آج پھر ہم دیکھتے رہ جائیں گے؟ ہم اسحاق کو نہ بچا سکے، کیا انور خاں اور بھرت کے لئے بھی

کچھ نہ کرسکیں گے؟''

''نہیں یار! اس دفعہ تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''کیسے ہو جائے گا؟''

''یار! جب تم چاہو گے تو ہو جائے گا۔ تم کوئی ایویں شیویں چیز ہو؟ تم نے یہاں کے شکتی دیوتا جارج گورا کو ناکوں چنے چبوائے ہوئے ہیں۔ اکھاڑے میں اسے موت کے گھاٹ اتارا ہوا ہے۔ تم کوشش کرو گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم زور لگاؤ تو تمہارے ہاتھوں کو جکڑنے والی رسّی ٹوٹ جائے گی۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''یار! میں نے کبھی خبروں کے علاوہ جھوٹ بولا ہے؟ میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہو سکتا ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔

ہم دونوں پنجابی میں بات کررہے تھے اور لہجہ بہت دھیما تھا۔ گارڈز کچھ فاصلے پر تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہماری بات نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ عمران کی اس بے وقت کی راگنی پر میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کنارے جل اٹھے۔ ''عمران!'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا اور بدلے ہوئے آہنگ میں بولا۔ ''یار! تمہارے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ تم اسے توڑ نہ سکو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اسے کمزور کردیا گیا ہے۔ تمہارے پیچھے پیچھے چلنے والا گارڈ اسے کمزور کرتا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریزر بلیڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو رسّی کے بلوں پر چلاتا رہا ہے۔ اب یہ رسّی سات آٹھ جگہ سے کمزور پڑ چکی ہے۔ ہمارے پیچھے دیوار ہے اس لئے ہمارے بندھے ہوئے ہاتھ کسی کو نظر نہیں آرہے۔''

میں نے اپنے ہاتھ ہلا کر دیکھے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں...... ابھی زور نہیں لگانا۔ ابھی زور لگانے کا وقت نہیں آیا۔''

میں نے سرگوشی کی۔ ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی...... اگر...... رسّی کمزور کی ہے تو کس نے کی ہے...... اور کیوں؟''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ تمہارے پیچھے چلنے والے گارڈ نے کی ہے۔ اور کیوں کی ہے، اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ اس پر تو پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔'' وہ عجیب کھوئے سے انداز میں بولا۔ میں اس کا اطمینان اور ٹھہراؤ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ اطمینان اور ٹھہراؤ میرے

اندر ایک بے نام امید جگا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چلو تم طویل جواب نہ دو، مختصر دے دو۔''

ہم بڑے عام سے انداز میں بات کررہے تھے۔ بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ گارڈز نے ابھی تک ہمارا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

عمران بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''کہتے ہیں ناکہ چیونٹی بھی اپنی طاقت کے مطابق اپنا دفاع کرتی ہے۔ کچھ لوگ چیونٹیوں ہی کی طرح حقیر اور بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔ جب رنجیت پانڈے جیسے لوگ ان کی انا کے منہ پر تھپڑ مارتے ہیں تو وہ اندر سے بدل جاتے ہیں۔ وہ رہتے تو چیونٹی ہی ہیں لیکن یہ زہریلی چیونٹی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو گرا دیتی ہے......'' عمران کا لب ولہجہ معنی خیز تھا۔

عمران کی بات نے میرے اندر ایک چھناکا سا کیا۔ دماغ میں روشنی سی بھر گئی۔ پانڈے اور تھپڑ والی بات سے مجھے چند روز پہلے کا ایک منظر یاد آ گیا...... اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد آ گیا کہ ہماری کوٹھڑی پر پہرا دینے والے گہرے سانولے گارڈ کی آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی۔ وہ آواز مجھے یوں ہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ جب ہم اٹھرا گاؤں میں کماد کے کھیت میں چھپے ہوئے تھے تو رات کی تاریکی میں رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمانڈو ایکشن کے لئے نکلا تھا۔ یہ لوگ سیوریج کی ایک پرانی پائپ لائن تک پہنچے تھے اور اسپتال میں گھسنے کے لئے اس پائپ لائن کے سرے پر سے مٹی ہٹائی تھی۔ پانڈے کی ہدایت پر اس کا ماتحت کدال چلا رہا تھا۔ کدال سیمنٹ کے پائپ سے ٹکرا گئی تھی اور آواز پیدا ہوئی تھی۔ پانڈے نے بھنا کر اس ماتحت کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ تھپڑ کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ پانڈے اور اس کے اس مزدور نما ماتحت کے درمیان جو مختصر مکالمہ ہوا تھا، اس میں یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ بھرائی ہوئی سی آواز والا ماتحت اس وقت ایک دیہاتی کے حلیے میں تھا اور دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔

ایک دم واقعات کی بہت سی کڑیاں مل گئیں۔ کوٹھڑی میں، میں نے دو تین بار اس سانولے ماتحت گارڈ کو عمران سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی کھچڑی پکی تھی۔ کوئی پلان بنا تھا۔ عمران نے دوبارہ تیز سرگوشی کی۔ ''میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ ابھی زور نہیں لگانا۔ جب وقت آئے گا، میں بتا دوں گا۔''

دوسری طرف اجتماعی سولیوں کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ورزشی جسم والے مقامی جلاد بالکل تیار تھے۔ ہزاروں کا مجمع مضطرب لیکن خاموش تھا۔

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''لیکن میرے پیچھے چلنے والا گارڈ تو کوئی اور تھا؟''

''وہ اس کا ساتھی ہے۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔

اب مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ ساری صورتِ حال یاد آ رہی تھی۔ جب ہم یہاں آ رہے تھے، سب قیدیوں کے پیچھے ایک ایک گارڈ تھا اور ہر گارڈ نے اپنے قیدی کو باقاعدہ بازو سے پکڑا ہوا تھا۔ میرے والے گارڈ نے بھی میری کلائی تھامی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں کی بندش کے ساتھ کچھ کیا جا رہا ہے۔

''عمران! اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں۔ یوں نہ ہو کہ وقت پھر ہاتھ سے نکل جائے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''بس تھوڑا سا انتظار...... تھوڑا سا...... کسی نے یہاں آنا ہے۔''

''کس نے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں...... لیکن وہ آئے گا ضرور۔''

''تم پھر پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ تمہیں سب پتا ہوگا۔''

''سب نہیں...... ہاں تھوڑا بہت پتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جب آئے گا تو سیدھا ان میز کرسیوں کی طرف جائے گا جہاں یہ گورے بیٹھے، انگور کی بیٹی سے کھیل رہے ہیں۔ ایک دم ہلچل مچ جائے گی...... اور یہی وقت ہوگا تمہارے زور لگانے کا۔ تم اپنی رسیاں توڑ دینا اور سیدھا سرجن اسٹیل کی طرف جانا۔''

''سرجن اسٹیل کی طرف؟ وہ تو وہاں بیٹھا ہے۔ ان آخری کرسیوں کی طرف۔''

''تب وہ وہاں نہیں ہوگا۔'' عمران نے کہا۔ ''وہ یہاں ہوگا، ہمارے سامنے۔ وہ ذلیل ان بیس بندوں کو اپنے ''دستِ مبارک'' سے سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی آنجہانی ماریا کی روح کو خوش کرنا چاہتا ہے۔''

ایک تنومند گارڈ ہمارے قریب آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''تم دونوں لگاتار باتیں کر رہے ہو۔ چپ ہو جاؤ ورنہ پہلے تمہاری باری آ جاوے گی۔''

میں اور عمران اس زہرناک وارننگ کے بعد خاموش ہو گئے۔ میڈم صفورا اب اپنی جگہ سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اب بھی کہیں پیچھے تماشائیوں میں موجود ہو۔ عمران کا کہا درست ثابت ہوا۔ دراز قد سرجن اسٹیل اپنی جگہ سے اٹھا اور گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا چبوترے پر آ گیا۔ سولیاں اب بالکل تیار تھیں۔ قطار میں کھڑے پہلے قیدی کا رنگ بالکل سفید ہو چکا

تھا۔ یقیناً پہلی باری اسی کی تھی۔ اسٹریچرز پر لیٹے قیدیوں کو بھی چبوترے پر چڑھا دیا گیا۔ ان میں انور خاں بھی تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ہمارے لئے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا نہیں۔

اینڈرسن، منیارڈ اور دیگر معزز گورے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود تھے۔ وہ اس سفاکی کا نظارہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار و آمادہ تھے جو یہاں روا رکھی جانے والی تھی...... پہلے قیدیوں کو سولیوں سے باندھا جانا تھا۔ پھر ان کی ہتھیلیوں اور ٹخنوں میں آہنی میخیں ٹھونکی جانی تھیں۔ پھر آہنی ہتھوڑے کی ضربوں سے ان کے جسم کی اہم ہڈیاں ٹوٹنی تھیں۔ آخر میں رائفل کی گولی یا خنجر کے وار سے ان کا قصہ تمام ہونا تھا۔

......اور وہ کون تھا جسے آنا تھا؟ جس کے آنے کی امید عمران کو تھی...... وہ کون ہو سکتا تھا؟ ڈاکٹر چوہان؟ کپتان اجے؟ چھوٹے سرکار کا کوئی جانباز یا پھر اقبال جسے ہم فتح پور کے تہ خانے میں چھوڑ آئے تھے؟

...... تین قیدیوں کو سولی سے باندھا جا چکا تھا۔ میری دھڑکن عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے بے حد اضطراب کے ساتھ عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں آنکھوں میں مجھے انتظار کرنے کو کہا...... دو تین منٹ مزید گزرے اور پھر وہی ہوا۔ آنے والا آ گیا۔ وہ کون تھا؟ میں نے اسے کافی فاصلے سے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی ایک ڈھاٹے میں چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کے قد کاٹھ، اس کی جسامت اور اس کے بھاگنے کے انداز سے پہچانا۔ اور یہ وہ تھا جس کے بارے میں، میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ میں اسے بھولا ہوا تھا...... شاید میں نے لاشعوری طور پر بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہاں نظر آ سکتا ہے...... وہ طلال تھا۔ سلطانہ کا پندرہ سولہ سالہ بھانجا...... جو کسی رشتے سے اس کا بھتیجا بھی تھا...... کم گو، کم آمیز۔ بڑی بڑی بھید بھری آنکھوں والا۔ سلطانہ اس کے لئے خالہ تھی، ماں تھی اور بہن بھی۔ وہ اس سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں نے طلال کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ غور کیا تھا کہ جب فتح پور مندر کے تہ خانوں میں سلطانہ کی موت کی خبر پہنچے گی تو اس کے اس راجپوت بھانجے پر کیا گزرے گی۔ اور اب اچانک وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس کی آمد کا منظر قابلِ دید تھا۔ وہ اور اس کی برادری کے قریباً دس پندرہ افراد اچانک ہجوم میں سے نکلے تھے اور اندھا دھند ان نشستوں کی طرف دوڑے جہاں گورے صاحبان مے نوشی میں مصروف تھے۔ طلال سب سے آگے تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں چھوٹی نال

والی رائفل نظر آئی۔ وہ لگاتار فائر کرتا اور چلاتا ہوا سلطانہ کے قاتلوں اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ کے لئے جیسے درجنوں گارڈز سکتہ زدہ ہو گئے۔ پھر انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کیں۔ دھماکوں سے فضا کچھ اور بھی لرز اٹھی۔ طلال کے چار پانچ ساتھی رستے میں ہی گر گئے لیکن باقی خاردار باڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ طلال کے پیچھے آنے والے شخص کے ہاتھ میں قریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ خاردار باڑ کے گول چھلوں کے اوپر پھینکا، پلک جھپکتے میں طلال اپنے تین چار ساتھیوں سمیت اس تختے پر چڑھا اور خاردار رکاوٹ پار کر گیا۔ میں نے اس کی گولی سے سیکنڈ آفیسر منیارڈ کو زخمی ہوتے اور میز پر اوندھے گرتے دیکھا۔

سولیوں کے قریب کھڑے درجنوں گارڈز اپنے ''وی آئی پیز'' کو بچانے کے لئے چبوترے سے اترے اور خاردار تاروں کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب عمران نے مجھے کہا۔ ''توڑ دو۔''

اور میں نے پشت پر بندھے ہاتھوں کی بندش توڑ دی۔ رسّی کے کئی بل تڑاخے سے ٹوٹے اور وہ میرے ہاتھوں سے علیحدہ ہو گئی۔ میں پوری رفتار سے دراز قد سرجن اسٹیل کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ بھی خاردار باڑ اور اس کے اندر موجود معززین کی طرف تھا۔ ایک گارڈ نے مجھ پر فائر کیا۔ گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی ہوئی نکل گئی۔ میں اپنے پورے زور سے اسٹیل پر جا پڑا۔ سلطانہ کی موت کے بعد جو آگ میرے اندر جمع ہوئی تھی، اسے ایک دم نکاسی کا راستہ ملا۔ وہ شعلہ جوالا بن گئی۔ آسمانی بجلی کا روپ دھار گئی۔ اسٹیل اور میں لڑھکتے ہوئے تین فٹ اونچے چبوترے سے نیچے گرے۔ تب تک اسٹیل کا چمکیلا پسٹل میرے قبضے میں آ چکا تھا۔ میں نے پسٹل اس کی زرافے جیسی لمبی لیکن مضبوط گردن سے لگا دیا...... اور اسے گھسیٹتا ہوا دیوار کے بالکل پاس لے گیا۔ کئی گارڈز نے رائفلیں میری طرف سیدھی کیں۔

''خبردار...... گولی مار دوں گا۔ اڑا دوں گا اسے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

گارڈز ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے لیکن اسی دوران میں بائیں طرف سے ایک گارڈز نے گولی چلا دی۔ یہ گولی میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزری۔ میں نے بھی اپنی دھمکی سچ کر دی۔ میں نے تڑپتے پھڑکتے، زور لگاتے اسٹیل کی گردن میں گولی ٹھونک دی...... میرا دوسرا فائر اس کے نیچے جبڑے کو چیر کر یقیناً اس کے سر میں گھسا ہو گا۔ وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں اس کے جسم کو ڈھال کی طرح استعمال کر کے پیچھے ہٹا اور پھر جست لگا کر ایک فوجی جیپ کے عقب میں گرا۔ یہ جگہ جوابی فائرنگ کے لئے بہترین تھی۔

ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔ سلیقے سے رکھی ہوئی میزیں الٹ چکی تھیں۔ گورے بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے طلال کی ایک جھلک دیکھی۔ میرے سامنے اس نے زمین پر گرے ایک فربہ اندازم انگریز کی توند میں تلوار گھونپی اور دستے تک اتار دی۔ پھر وہ نیچے جھک کر بھاگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب صورتِ حال نے ایک بالکل غیر متوقع کروٹ لی۔ کچھ دیر پہلے تک یہ کروٹ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ ڈیڑھ دو ہزار کا وہ مجمع جسے انگریزوں اور مسلح گارڈز نے اپنی دہشت سے ہپناٹائز کر دیا تھا...... اس ''ٹرانس'' میں سے اچانک ہی نکل آیا۔ عمران کہتا تھا، جادو ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں۔ زنجیریں ایسے ہی کسی اچانک واقعے کی حدت سے پگھل جاتی ہیں اور رکے ہوئے پانی ایسے ہی کسی ہلچل کے سبب بلند و بالا ڈیموں کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انگریزوں اور ان کے گارڈز کو تتر بتر دیکھ کر ایک دم مجمع حرکت میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے تک جو لوگ بالکل غیر مسلح نظر آتے تھے، اب ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، تلواریں اور ایسی ہی دیگر اشیاء نظر آئیں۔ وہ نعرہ زنی کرتے ہوئے کسی سیلاب کی طرح آگے بڑھے۔ گارڈز نے رائفلوں کے منہ کھول دیئے۔ دھماکے ہوئے، شعلے لپکے۔ لیکن ہجوم رکنے کے لئے نہیں بڑھا تھا۔ وہ منظر گواہی دے رہا تھا کہ یہاں شاید توپیں بھی نصب ہوتیں تو ان دیوانے لوگوں کو روک نہ سکتیں۔ تابڑ توڑ فائرنگ سے زخمی ہو کر بہت سے لوگ گرے لیکن وہ رکے نہیں۔ یہ بڑا کلاسیکل منظر تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے مجھے یوں لگا کہ میں پھر ڈیڑھ سو برس پیچھے چلا گیا ہوں اور آزادی کی جنگ کا ایک ٹکڑا دیکھ رہا ہوں۔ لوگ للکارتے ہوئے خاردار تار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لئے یہ شعر کہا جاتا ہے۔ کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت......

اور پھر تصادم ہو گیا۔ زرگاں شہر کا قاسمیہ چوک میدانِ جنگ بن گیا۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، عمران کے ہاتھ چند سیکنڈ پہلے اسی ''سیاہ رنگت اور روشن دل'' والے غریب گارڈ نے کھولے تھے جس نے میرے ساتھ مہربانی کرائی تھی۔

عمران لپکتا ہوا چبوترے پر چڑھا اور اس اسٹریچر تک پہنچا جس [illegible]ور خاں دراز تھا۔ میں بھی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے انور کے اسٹریچر کو اٹھایا اور فائرنگ کی زد سے دور ایک بڑی ٹرک نما گاڑی کی اوٹ میں لے گئے۔ باقی چار اسٹریچرز پر موجود افراد گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ ہم نے چھٹے اسٹریچر کو بھی محفوظ اوٹ میں پہنچا دیا۔ طلال

کے کچھ ساتھی چبوترے پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے ان تین قیدیوں کی رسیاں کاٹ دی تھیں جنہیں سولیوں سے باندھا جا چکا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص راہی عدم ہو گیا تھا لیکن باقی دو سلامت تھے۔

میری نگاہیں صرف اور صرف سلطانہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں ان سے اپنی سلطانہ کا بدلہ نہ لے سکا تو اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ رنجیت پانڈے، منیارڈ اور اینڈرسن میں سے کوئی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہاں موجود تھے۔ مجھے پتا تھا، وہ موجود ہیں۔ میں نے ماؤزر نما پسٹل پر گرفت مضبوط کی اور خاردار تاروں کی طرف بڑھا۔ یہ ساری جگہ دو طرفہ فائرنگ کی زد میں تھی۔

عمران نے میرا ارادہ بھانپ کر مجھے روکا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی؟''

''نہیں، مجھے جانے دو عمران...... مجھے مر جانے دو یا مار دینے دو۔''

''حوصلہ کرو...... سب کچھ ہوگا۔''

''اب نہیں ہوگا تو کب ہوگا؟'' میں نے خود کو عمران سے چھڑایا اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا خاردار تاروں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جب عمران نے دیکھا کہ میں رکوں گا نہیں تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں دیوانہ وار ان پوزیشنوں میں گھس گئے جہاں سے انگریز اور مقامی گارڈز ہجوم پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم نے کم از کم چار گارڈز کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔ یہاں ہماری دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ عمران نے بے دریغ ایک گورے سپاہی کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونپی اور میں نے ایک مقامی گارڈ کے پیٹ میں گولی مار کر اس کی رائفل چھین لی۔ اور تب ہمیں منیارڈ نظر آیا...... اس کا ایک کندھا طلال کی گولی سے شدید زخمی ہو چکا تھا۔ شاید چند سیکنڈ پہلے تک وہ اپنے بچے کھچے گارڈز کو یہ ہدایات دے رہا تھا کہ گولیوں کی بارش کر دو۔ ان لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دو۔ لیکن وہ بھول رہا تھا کہ ہر جگہ جلیانوالہ باغ نہیں ہوتا اور نہ ہر جگہ جنرل ڈائر کے ظلم کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے عمران سے سنگین چڑھی رائفل لی اور اپنی رائفل اسے دے دی۔ یہی وقت تھا جب منیارڈ نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہی شخص تھا جس نے سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے لئے گورے کمانڈوز کو آنکھ کا قاتل اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ کو ہی نشانہ بنایا۔ نکیلی سنگین قوت کے ساتھ اس کی آنکھ سے ٹکرائی اور وہ سب کچھ تباہ کر گئی جو اس کی آنکھ کے پیچھے اور کھوپڑی کے اندر موجود تھا۔ شاید میں کچھ زور اور لگاتا تو سنگین کھوپڑی توڑ کر دوسری طرف سے باہر آ جاتی۔ منیارڈ کی دوسری آنکھ اور چہرے کے تاثرات بڑے بھیانک

تھے۔

ایک انگریز رائفل مین نے قریبی گلی کے اندر سے عمران کو نشانہ بنایا۔ عمران کی بے مثال لک کہاں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے یہاں بھی کام کیا۔ گولی سیدھی عمران کو لگتی مگر راستے میں عمران کی رائفل آ گئی۔ گولی اس کے دستے سے ٹکرائی تھی۔ عمران نے مہارت سے جوابی فائر کر کے رائفل مین کو ڈھیر کر دیا۔

اب یہ وقت تتر بتر ہونے کا تھا۔ چبوترے کے اردگرد اور میز کرسیوں والے احاطے میں تیس چالیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے بیس پچیس تو ضرور گارڈز کی ہوں گی۔ ان بیس پچیس میں کئی انگریز بھی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً دو سب سے اہم لاشیں سرجن اسٹیل اور منیارڈ کی تھیں۔ اب کسی بھی وقت راج بھون سے کمک یہاں پہنچ سکتی تھی۔ اگر کمک پہنچ جاتی تو راہِ فرار اختیار کرنے والے اور گلیوں میں روپوش ہونے والے سرکاری فوجی بھی واپس آ کر لڑائی میں شامل ہو جاتے۔ نہتے شہری کی کہاں تک مسلح فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

''بھرت کہاں ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''ابھی تک مجھے بھی کہیں نظر نہیں آیا۔''

ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے واپس اس گاڑی تک پہنچے جس کے عقب میں دونوں اسٹریچرز رکھے تھے۔ یہاں مسلح اور نیم مسلح شہریوں کا جمگھٹا تھا۔ ہم بھرت کے ساتھ ساتھ اس معرکے کے اصل ہیرو طلال کو بھی ڈھونڈ رہے تھے لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ شہری فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے سرجن اسٹیل کی لاش کو گھسیٹنے کی کوشش بھی کی مگر عمران کے اشارے پر میں نے انہیں منع کر دیا۔ جمع ہونے والے لوگ مجھے بے حد اہمیت دے رہے تھے۔ میں نے جارج، یہاں کے شکتی دیوتا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی میری پہچان تھی۔ کچھ لوگ وہ ٹوٹی ہوئی رسّی دیکھ رہے تھے جسے توڑنے کے بعد میں اسٹیل پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ یہ رسّی ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے اور تبصرے کر رہے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس رسّی کے ٹوٹنے میں مجھ سے زیادہ ایک ریزر بلیڈ کا کام ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں مرکزِ نگاہ بن گیا۔ میرے گرد ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے میرے اور انور خاں کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ وہ میرے اور انور خاں کے حق میں فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ نعرہ زنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''ان لوگوں سے کہو کہ وقت ضائع نہ

کریں۔ بہت جلد سرکاری فوجی پوری طاقت سے یہاں ہلا بولیں گے۔ لوگ اپنے دفاع اور بچاؤ کی تیاری کریں۔ گھروں اور محفوظ جگہوں پر مورچے بنالیں۔ خاص طور سے ان دو اہم راستوں کو روک لیں جو قاسمیہ میں داخل ہوتے ہیں...... یقیناً ان میں کچھ لیڈر ٹائپ بندے بھی ہوں گے۔ ان کے ذریعے فوری بندوبست کریں۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب باتیں تم خود کیوں نہیں کہتے؟"

"نہیں یار! تمہاری بات کا اثر ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں اہمیت دے رہے ہیں اور ٹھیک ہی دے رہے ہیں۔"

"لیکن......"

"لیکن شیکن کچھ نہیں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔" اس نے ایک بندے سے میگافون لے کر میری طرف بڑھایا۔ یہ وہی خون آلود میگافون تھا جو ابھی ہم نے منیارڈ کی لاش کے پاس سے اٹھایا تھا۔

میں نے کبھی تقریر کی تھی اور نہ اس طرح لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ پھر بھی عمران کے کہنے پر میں چبوترے پر چڑھ گیا۔ دور تک پُر جوش لوگ نظر آ رہے تھے۔ خاردار تاروں کے ارد گرد کالے اور گورے فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ لاشوں پر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ قاسمیہ کے نوجوان، فوجیوں کی بکھری ہوئی رائفلیں اور ایمونیشن وغیرہ اکٹھا کر رہے تھے۔ میں نے میگافون ہونٹوں کے قریب کیا۔ یہی وقت تھا جب دو افراد مجمع چیرتے ہوئے آئے اور چبوترے پر آ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ یہ ڈاکٹر چوہان اور عبدالرحیم تھے۔ چوہان کو میں نے بس اس کی آواز سے پہچانا۔ ان دونوں نے اپنے چہرے منڈاسوں میں چھپا رکھے تھے۔ کندھوں سے رائفلیں جھول رہی تھیں۔ چوہان نے مجھے زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا تھا، میں تمہیں ایک دن ضرور زندہ دیکھوں گا۔ مجھے پتا تھا۔"

عبدالرحیم بھی میرے گلے لگ گیا۔ عبدالرحیم ان قیدیوں میں سے تھا جو اسحاق اور انور خاں وغیرہ کے ساتھ ہمارے ہمراہ نل پانی پہنچے تھے۔ عبدالرحیم زرگاں کے اسی محلے میں رہتا تھا جہاں سلطانہ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ ادھیڑ عمر عبدالرحیم ہچکیوں سے رونے لگا۔ "سلطانہ بی بی چلی گئی۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔ اس کی کوئی عمر تھی جانے کی۔"

عمران نے اسے بمشکل مجھ سے علیحدہ کیا۔ پھر میرے کان میں تیز سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "وقت کم ہے۔ جو کچھ کہا ہے جلدی سے اس کا اعلان کر دو۔"

میں نے میگافون اپنے سامنے کیا اور بلند آواز سے وہ الفاظ دہرانے شروع کر دیئے جو

عمران نے کہے تھے۔

لوگوں کا جوش وخروش عروج پر پہنچ گیا۔ وہ ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ تلواریں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں ہوا میں لہرانے لگیں۔ کچھ دیر پہلے تک، ان لوگوں کو اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ مردہ سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے ہی ان کے پیاروں کو بدترین طریقے سے مار کر اپنی ہیبت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے مگر اک "پُر جوش واقعے" نے انہیں زندہ کر دیا تھا۔ ایک شخص نے فوجی جیپ کی چھت پر چڑھ کر حکم کے لئے مردہ باد کا نعرہ لگوایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا اور کڑک کر بولا۔ "آپ فکر نہ کریں جی۔ ہم ان گوروں اور ان کے چمچوں کے لئے قاسمیہ کو قبرستان بنا دیویں گے۔ ان کو اپنی لاشیں اٹھانے کی ہمت بھی ناہیں ہووے گی۔"

ایک اور شخص جیپ پر چڑھ گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی انور خاں کا ایک قریبی ساتھی حسنات بھائی تھا۔ وہ دہاڑتی آواز میں بولا۔ "تابش صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکٹھا ہونے کا فائدہ ناہیں۔ اپنے گھروں میں جاؤ۔ عورتوں اور بچوں کو پیچھے پرانے قلعے میں بھیج دو۔ ہر گھر کو مورچا بنا لو۔ ہر گلی میں ان سفید سوروں کے لئے موت کا ناکا لگا دو۔ اب ہم پیچھے ناہیں ہٹ سکتے۔ اب ہمیں مرنا ہے یا مار دینا ہے۔"

عمران نے پھر مجھے بولنے کے لئے کہا۔ میں نے خون آلود میگافون اپنے سامنے کیا تو لوگ پھر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے کہا۔ "بھائیو! آج یہاں قاسمیہ چوک میں جو کچھ ہوا ہے، اس نے پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہلچل مچا دینی ہے۔ میں غائب کا علم نہیں جانتا اور نہ انور خاں جانتا ہے لیکن میں آپ سب کو وشواس دلاتا ہوں کہ اب "نل پانی" نے خاموش نہیں رہنا۔ اب وہاں سے سیلاب ضرور آئے گا اور یہ سیلاب ہمارے ساتھ مل کر ان گورے کالے حکمرانوں کو بہا کر لے جائے گا۔ راج بھون کی اینٹ سے اینٹ بجے گی۔ ہاں، اینٹ سے اینٹ بجے گی۔"

لوگوں کا جوش وخروش عجیب رنگ اختیار کر گیا۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس وقت اس چبوترے پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور راج بھون پر ہلا بول دیں تو وہ فوراً تیار ہو جائیں گے۔ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔

زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عوام الناس کس طرح کسی کو اچانک بلند ترین درجے پر پہنچاتے ہیں اور پھر اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی لوگوں کو کسی انتہائی اقدام کی طرف لے جانے کا وقت نہیں آیا اور غالباً اسٹریچر پر لیٹے ہوئے انور خاں کی سوچ بھی یہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں، وہ

سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔

عمران کے اصرار پر سانولی رنگت والا گارڈ امر ناتھ بھی چبوترے پر آ گیا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''اس کو بھی چند لفظ بولنے کا موقع دو۔''

میں نے میگا فون امر ناتھ کو تھمایا۔ وہ چند لمحے تک ہچکچایا پھر جذباتی انداز میں بولا۔ ''ہمار کو جیادہ بولنا ناہیں آوت۔ اور نہ ہم نے جیادہ کچھ کہنا ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ ہم سب نے مل کران جالموں کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اب مرنا ہے یا مار دینا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر مجھے پرنام کیا۔ میگا فون مجھے تھمایا اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

عمران کے اشارے پر میں نے لوگوں کو منتشر ہونے اور ہدایات پر عمل کرنے کا کہا...... لوگ منتشر ہونے لگے۔

O......❖......O
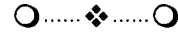
سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہم زرگاں کے پرانے قلعے میں تھے۔ یہ کافی قدیم عمارت تھی۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اسے چاروں طرف سے گنجان آبادی نے گھیرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی تھی۔ یہ کھنڈر قلعہ اس راستے پر واقع تھا جو مشرقی سمت سے قاسمیہ میں داخل ہوتا تھا۔ چوہان، عبدالرحیم اور انور خاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انور خاں کی حالت میں بہتری واقع ہوئی تھی۔ وہ اب دھیمے لہجے میں بات بھی کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے بھرت بھی بچ بچا کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی محبوبہ چمپا عرف چمپی اور اس کی ماتا بھی تھی۔ چمپی کا یہاں آنا اس کے لئے خطرناک تھا مگر بھرت تو اسے کنوئیں میں کودنے کو کہتا تو بھی وہ ایک سیکنڈ کی دیر نہ لگاتی۔ بہرحال دونوں ماں بیٹی اوڑھنیوں میں لپٹی بڑی سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ قاسمیہ چوک میں لڑائی شروع ہوتے ہی بھرت نے چبوترے سے چھلانگ لگا دی تھی اور ایک قریبی گلی میں رُوپوش ہو گیا تھا۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کے ہاتھ کھولے تھے اور اسے گوروں سے بچانے کے لئے کئی گھنٹے ایک بیکری میں چھپائے رکھا تھا۔

سرکاری فوج نے ابھی تک قاسمیہ پر کسی طرح کی کارروائی نہیں کی تھی یقیناً انہیں پتا چل چکا تھا کہ وہاں زبردست مزاحمت کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ ہر گھر نے ایک مورچے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب وہ بڑی احتیاط اور پوری طاقت کے ساتھ کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ بس چند گھنٹوں کے اندر ہی میں بالکل غیر متوقع طور پر مزاحمت کاروں کا لیڈر بن گیا تھا۔ وہ میرے گرد پروانوں کی طرح جمع تھے۔ قاسمیہ چوک میں میرا جست لگا کر چبوترے سے اترنا

اور پھر سرجن اسٹیل پر جھپٹنا ایک ایسا واقعہ تھا جو ہر کسی کی زبان پر تھا۔ میں نے اسٹیل کو اس کے اپنے ہی ماؤزر نما پسٹل سے قتل کیا تھا۔ یہ پسٹل ابھی تک میرے پاس تھا۔ لوگوں کے لئے یہ اسپیشل پسٹل بھی ''زیارت'' کی چیز بنا ہوا تھا۔ جارج کی عبرت ناک شکست کے بعد جو ''ہوا'' میرے سلسلے میں بندھی تھی۔ اب وہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ میرا اپنے ہاتھوں کی بندش کو توڑنا بھی لوگوں کے لئے زبردست حیرت اور تحریک کا باعث تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اس صورتِ حال کا اصل ہیرو عمران تھا یا پھر گارڈ امر ناتھ کا وہ ساتھی جس نے میری بندش کو بڑی صفائی سے قابلِ شکست بنایا تھا۔

میرے بعد اگر لوگ کسی کو تھوڑا بہت کریڈٹ دے رہے تھے تو وہ راجپوت نوجوانوں کا وہ جتھا تھا جس نے اچانک ہجوم میں سے نکل کر ہنگامے کا آغاز کیا۔ اس جتھے کے تقریباً چار نوجوان جاں بحق اور دو سخت زخمی ہوئے تھے۔ ان کو ڈاکٹر چوہان وغیرہ قلعے کے اندر ہی طبی امداد دے رہے تھے۔ جتھے کے باقی نوجوانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی تسلی ضرور ہوئی تھی کہ طلال مرنے والوں میں شامل نہیں۔

سرجن اسٹیل اور منیارڈ کی موت نے میرے اندر بھڑکتی آگ پر پانی کے کچھ چھینٹے تو ڈالے تھے مگر اس کی حدت میں خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں میں ابھی تک سرجن اسٹیل کے خونچکاں جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔

یہ شخص تھا جس نے اپنی سائنسی مہارت سے بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں حکم کو کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتا تھا اور لوگ حکم کو بہت بڑا اوتار سمجھنے لگے تھے۔

عمران نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''جگر! آج تم نے سرجن صاحب کو ٹھنڈا کر کے اپنا بہت پرانا بدلہ چکا دیا ہے۔''

''کون سا بدلہ؟''

''الیکٹرانک چپ والا بدلہ۔ دراصل یہ چپ ہی تو تھی جس نے تمہیں برسوں اسٹیٹ کا قیدی بنائے رکھا ہے۔''

''لیکن حکم اور اینڈرسن ابھی زندہ ہیں عمران۔''

''یہ جو ایکشن سے بھرپور فلم شروع ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ مریں گے...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

"لیکن یہ گارنٹی نہیں دیتا کہ ان فوت شدگان میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا۔"کم از کم میں تو شامل ہو ہی جاؤں تو اچھا ہے۔"

میری آنکھوں میں پھر سلطانہ کا غم جاگ اٹھا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ عمران کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکائے آنکھیں بھگوتا رہا۔ اچانک ایک آواز نے ہمیں چونکایا۔"دیکھو تابش! کون آیا ہے؟" یہ چوہان کی آواز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میرے سامنے کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا اور پوتا ستیش کھڑے تھے۔ مالا کے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ وہ بہت کمزور اور خستہ حال نظر آتی تھی۔ مالا اور ستیش کو ہم نے آخری بار فتح پور کے مندر میں دیکھا تھا۔ ایک خونی ہنگامہ ہوا تھا۔ ستیش کے والد کے ہاتھ تیل کے کڑاہے میں جلے تھے اور پھر لوگوں نے اسے دوشی ٹھہرا کر قتل کر دیا تھا۔ مالا کی جان بھی بہ مشکل بچ پائی تھیں اس کے بعد سے مالا اور ستیش منظر سے یکسر اوجھل تھے۔

ستیش ایک نہایت کٹر اور انتہا پسند برہمن زادہ تھا لیکن جو اطلاعات ملی تھیں، ان سے پتا چلا تھا کہ وہ اب بہت حد تک بدل گیا ہے۔ اس کے بدلنے کی ایک وجہ تو یقیناً اس کی خوبرو اور روشن خیال پتنی مالا ہی تھی۔ دوسرے اس نے اپنے بزرگوں کا جو انتہائی دقیانوسی رویہ دیکھا تھا، اس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ستیش کا ایک بازو پلاسٹر میں جکڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سنگین اور بگڑی ہوئی چوٹ اسی مندر والے ہنگامے کی یادگار ہے۔ وہ بیمار اور کمزور بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اور عمران نے ان دونوں کو خوش آمدید کہا۔ ان دونوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ہمارا رویہ ان کے ساتھ کیسا ہوگا۔ بہرحال، میرے دو چار فقروں نے ہی ان کے خدشات دور کر دیئے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا گیا۔ مالا اور ستیش ان تمام حالات سے آگاہ تھے جو پچھلے ڈھائی تین ماہ میں پیش آئے تھے۔ سامبر مقابلے میں جارج کی عبرت ناک شکست اور موت کی تفصیلات بھی انہیں معلوم تھیں۔

مالا نے اشک بار لہجے میں مجھے بتایا۔"ماتا جی ہماری جان کی دشمن ہو رہی ہیں، تابش بھیا۔ آپ کو پتا ہی ہووے گا، یہاں زرگاں میں ان کے بہت سے عقیدت مند پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ان کے اشارے پر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاوت ہیں۔ ماتا جی نے چند خطرناک لوگن کو ہمارے پیچھے لگا رکھا ہے۔ ان لوگن کو حکم ہے کہ میں جہاں بھی ملوں، میری ہتھیا کر دی جاوے۔ میرے بچے اور ستیش کو پکڑ کر ان کے پاس لایا جاوے۔ ہم دو مہینوں سے جگہ

جگہ چھپتے پھر رہے ہیں۔"

عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔"بہت جلد آپ دونوں کو کہیں چھپنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ دونوں یہاں قلعے میں آ گئے ہیں، یہ بڑا اچھا کیا ہے۔"

اس گفتگو میں مالا کے پتی ستیش نے بھی حصہ لیا۔ وہ اپنے سابقہ رویہ پر بڑا نادم تھا۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ اس نے استھان میں سلطانہ کو زندہ جلانے کی کوشش میں حصہ لیا اور بعدازاں وہ گرو کی موت کا سبب بھی بنا۔ وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"مجھ کو وشواس ناہیں ہوتا کہ دادی جی اس حد تک جا سکت ہیں۔ وہ میری پتنی اور میرے بچے کے جیون کی دشمن ہو رہی ہیں۔ ان کے ہرکارے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

یہ واقعی کٹڑپن کی انتہا تھی۔ وہ بڑھیا کہنہ عقیدوں کی پجارن تھی۔ اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ پرانی نسل کے ایسے ہزاروں لوگ یہاں موجود تھے۔

اسی دوران میں انور خاں کے ساتھی حسنات احمد کے ایک مخبر نے اطلاع دی کہ حکم کے فوجی دستے بڑی تعداد میں قاسمیہ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کمان اینڈرسن صاحب خود کر رہے ہیں۔ وہ ایک بند فوجی جیپ میں سوار ہیں۔ اس جیپ کے علاوہ بھی درجنوں گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں اس کارروائی میں شریک ہیں۔

مخبر فیروز احمد نے کہا۔"وہ لوگ اسپیکروں کے ذریعے بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ علاقے کے لوگن اپنے گھر خالی کر کے پیچھے ہٹ جاویں ورنہ ان کو دشمن سمجھا جاوے گا اور اپنے انجام کے وہ خود ذمے دار ہوں گے۔"

حسنات احمد نے مجھ سے کہا۔"اس وقت قاسمیہ کے لوگن اور زرگاں کے دوسرے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ ان کے درمیان ہوویں گے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاویں گے۔ وہ ایک دو دن تک تو ان حکم کے ٹٹوؤں کو قاسمیہ میں داخل ہی نہیں ہونے دیویں گے۔"

میں عمران سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تنہائی کہیں نہیں تھی۔ پورا قلعہ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں عمران کو لے کر ایک ڈیوڑھی میں آ گیا۔ مجھے اپنے دل دماغ پر بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔"عمران! تم دیکھ رہے ہو، یہ لوگ مجھ پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں جارج کو مار سکتا ہوں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں تو پتا ہے یہ سب کچھ میرے بس کا روگ نہیں۔"

"کیا تمہارے بس کا روگ نہیں؟"

"یار! انجان نہ بنو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح کی مار دھاڑ کر سکتا ہوں اور کروا سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے کمانڈر وغیرہ بنانے کے چکر میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ لڑیں اور میں ان کو لڑاؤں۔"

"تو یار! اس میں مشکل کیا ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ...... تم یہ سمجھو کہ سب کچھ میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے، تم صرف آرڈر جاری کر رہے ہو۔"

"مگر......"

"یار! کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہو جائے گا۔ اصل کام تو یہاں کے لوگوں کے جذبے اور حوصلے نے ہی کرنا ہے۔ بس ان کو تھوڑی سی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ راہنمائی ہم کریں گے۔"

"ہم نہیں، تم کرو گے۔"

"چلو، میں ہی کروں گا۔ کیا ہم انور خاں کا اتنا ساتھ بھی نہیں دے سکتے؟ اب یوں کرو کہ قلعے سے باہر نکلتے ہیں۔ جیپ پر علاقے کا ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ میگافون ساتھ لے لیتے ہیں راستے میں دو چار جگہ رک کر لوگوں کو حوصلہ دیں گے...... انہیں بتائیں گے کہ وہ جم کر اپنا دفاع کریں۔ کم از کم اتنی دیر تک ان گوروں اور کالوں کو روکیں جب تک نل پانی سے "اٹیک" نہیں آجاتا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ نل پانی سے اٹیک آئے گا؟"

"ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ سویرے قاسمیہ چوک میں ہزاروں کا مجمع تھا اور دو ڈھائی سو مسلح سپاہیوں نے انہیں بھیڑ بکری بنایا ہوا تھا۔ مگر جب طلال اور اس کے ساتھیوں نے ہلا بولا اور تم نے سرجن اسٹیل کی گردن دبوچی تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر بدل گیا۔ یار یہ منظر ایسے ہی بدلتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اب نل پانی چپ نہیں رہے گا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار دیکھ رہے ہیں کہ حکم مکمل طور پر ان گوروں کا کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ وہ اب آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ اب تک یہ لڑائی ٹلتی رہی ہے مگر اب نہیں ٹلے گی۔"

ہم نے گوروں سے چھینی ہوئی دو جیپوں پر قاسمیہ کے اندر ایک چکر لگایا۔ حسنات اور آٹھ دس مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم اہم جگہوں پر تھوڑی دیر کے لئے رکے۔ عمران کے کہنے پر میں نے میگافون کے ذریعے لوگوں کے جوش و جذبے کو ابھارا۔ ہر جگہ فلک شگاف نعروں سے فضا گونجی۔

ہم رات دس بجے کے قریب واپس آئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد گوروں اور حکم کے دستوں کی طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ یہ حملہ دو طرف سے تھا۔ حملے کی جگہ قلعے سے خاصی دور تھی۔ پھر بھی تابڑ توڑ فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے ہلچل مچ گئی...... ہمیں معلوم تھا کہ سرکاری دستوں کے لئے تیزی سے آگے بڑھنا ناممکن ہو گا۔ دفاع کرنے والے گھروں میں مورچا بند تھے اور سرکاری سپاہیوں کو کھلی جگہ پر آگے بڑھنا تھا۔ حسنات اپنے دیگر اہم کمان داروں کے ساتھ دفاعی لائن پر موجود تھے۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کم از کم چوبیس گھنٹے تک سرکاری دستوں کو قاسمیہ کی گلیوں میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ "ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لڑائی والی جگہ پر موجود ہونا چاہئے۔ اور میرا خیال ہے کہ میرا جانا مناسب ہے۔"

"تم نے ہر خطرے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"مجھے پتا تھا کہ تم یہ فقرہ ضرور بولو گے۔ لیکن ایک طرف تم مجھے مکمل ذمے داریاں سونپ رہے ہو، دوسری طرف میرے اختیارات میں مداخلت بھی کر رہے ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔ یہاں عورتیں، بچے اور بوڑھے ہیں۔ ان پر خوف طاری ہے۔ لیکن اگر یہ اب تک حوصلے کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ان کے درمیان ہو۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ باقی جہاں تک لڑائی کی بات ہے، فی الحال میں نے لڑنا ہے اور نہ تم نے۔"

اس نے مجھے وہاں رہنے پر مجبور کیا اور خود چوہان، عبدالرحیم اور دیگر مسلح افراد کے ساتھ قلعے سے نکل گیا۔

پتا نہیں کیوں وہ مجھے قائل کر لیتا تھا۔ اور مجھے ہی کیا، وہ ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ کر سکا...... تو شاید ایک لڑکی کو نہ کر سکا...... شبو کو آمادہ نہ کر سکا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور سارے بندھن توڑ کر اس کے ساتھ آزاد فضاؤں کا رخ کر لے۔ یا شاید اس نے اسے قائل کرنے کے لئے اپنا پورا زور لگایا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے اس کی اپنی خواہش اور اندر سے پیدا ہونے والی رضا کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ بہر حال، اب یہ سب دور افتادہ ماضی کی باتیں تھیں۔

شدید لڑائی کی صورت حال قریباً ڈیڑھ گھنٹا رہی۔ پھر غیر متوقع طور پر ایک دم سکون ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد عمران اور چوہان وغیرہ قلعے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ حکم کے وفاداروں کا پہلا بڑا حملہ روک دیا گیا ہے۔ ہاں، جنوبی راستے سے وہ لوگ قریباً ایک فرلانگ اندر آ گئے ہیں اور انہوں نے دو محلوں پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عمران کو کندھے پر

معمولی زخم بھی آیا تھا۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرا تھا جو اس کے کندھے سے چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔

عمران، چوہان اور میرے درمیان لڑائی کی صورتِ حال کے بارے میں بات ہوئی...... عمران نے کہا۔ ”ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرانی چاہئے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہم اکیلے انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ ہے کہ ہم انہیں کچھ دیر تک روک سکتے ہیں۔ اگر اس دوران میں نل پانی حرکت میں آ جاتا ہے تو پھر راج بھون کی باقاعدہ فوج کے ساتھ زوردار مقابلے کا ماحول بن سکتا ہے۔“

قرائن سے پتا چلتا تھا کہ اب سویرے تک کوئی نیا حملہ نہیں ہو گا۔ اس دوران میں قاسمیہ کے اندر گھس آنے والے دستے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائیں گے۔ اتفاقاً اس لڑائی میں دونوں فریقوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دونوں طرف سے صرف سات آٹھ افراد ہلاک اور دو درجن کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تعداد حکم اور اینڈرسن کے فوجیوں کی تھی۔

چوہان، حسنات، بھرت اور عبدالرحیم وغیرہ کو نگرانی کا کام دے کر میں اور عمران تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ کل کے ہنگامہ خیز دن کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ہم تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔ حسنات احمد نے قلعے کی دوسری منزل پر ایک محفوظ کمرا ہمارے لئے منتخب کیا تھا۔ یہاں ایک بڑا پلنگ تھا جس پر کمبل پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں انگیٹھی کی حرارت بھی موجود تھی۔ دور کہیں قلعے کی بیرونی دیوار کے پاس کسی کتے کی آواز بار بار سنائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ وہی کتا تو نہیں لیکن پھر اس ”فضول“ خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ابھی ہمیں لیٹے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کمرے کے قدیم طرز کے منقش چوبی دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ عمران نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف انور خاں کا ساتھی حسنات احمد تھا۔ مجھے شک گزرا کہ شاید انور خاں کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے لیکن یہ شک صحیح نہیں تھا۔ حسنات احمد سے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرنے کے بعد عمران نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر آیا۔ اس نے بے تابی سے دائیں بائیں دیکھا جیسے چھپنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ واقعی جگہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اپنے چھپنے کے لئے نہیں، میرے چھپنے کے لئے...... اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور جلدی سے ایک قدِ آدم آبنوسی الماری کے پیچھے موجود خلا میں چھپا دیا۔ میں سرگوشیوں میں پوچھتا رہ گیا کہ کیا بات ہے مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی اہم معاملہ لگ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر

لے آیا۔ یہ ایک لمبی گرم چادر میں لپٹی ہوئی جواں سال عورت تھی۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے چادر سر سے سرکائی تو میں دنگ رہ گیا۔ گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی میں میرے سامنے گیتا مکھی کھڑی تھی۔ وہی لڑکیوں کی ڈانس انسٹرکٹر، پکی عمر لیکن چست جسم والی ”چلتی پرزی“۔ اس کے ہونٹوں پر لالی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگا کہ وہ ہلکے سے نشے میں ہے۔ اس نے عجیب دل ربا انداز سے عمران کو دیکھا۔ گرم چادر اس کے شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔ جسمانی نشیب و فراز نمایاں تر ہو رہے تھے۔ عمران نے ذرا جھنجلاہٹ سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنا ہاتھ عمران کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

”بیکار میں ناہیں آئی ہوں۔ بڑے کام کی خبر لائی ہوں۔ تمہارا من خوش ہو جاوے گا۔ تم کہو گے، مانگو گیتا آج کیا مانگتی ہو۔“

عمران نے کہا۔ ”گیتا! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ تمہیں سنائی دے رہا ہو گا، اب بھی فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔“

”مجھے کیا بتا رہے ہو۔ جتنا زرگاں کے بارے میں، میں جانتی ہوں کوئی اور ناہیں جان سکتا۔ زرگاں گیتا مکھی سے ہے اور گیتا مکھی زرگاں سے ہے۔“ اس نے عجیب بے باکی سے کہا اور عمران کو نیم باز آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی۔

یہ زرگاں کے شبستانوں کی رازداں وہی تیز طرار عورت تھی جو اس سے پہلے زرگاں سے ہماری واپسی کے وقت، عمران کے ساتھ ایک رومانی سین کر چکی تھی۔ یہ رومانی سین ان کوششوں کا عوضانہ تھا جو اس نے سلطانہ کے زیور ڈھونڈنے کے حوالے سے کی تھیں۔

...... لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بے باک نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی چادر تھوڑی سی اور سرکائی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چادر کے نیچے اس نے دو حصوں پر مشتمل مختصر ترین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے عمران کو کندھوں سے تھاما اور جذباتی انداز میں اس کا گال چوم لیا۔ عمران بھنا گیا۔ اسے ذرا دھکیل کر بولا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میں شرم کی اتنی کمی ہو سکتی ہے۔“

وہ نشیلے انداز میں بولی۔ ”اپنوں سے شرم ناہیں ہوتی۔ شاید تم میری گستاخی پر ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن اگر یہ گستاخی ہے بھی تو سوچو کہ کیوں ہے؟ کوئی تو ایسی بات ہووے گی جس کی وجہ سے تمہاری اس بندی کو اتنی جرأت ہو رہی ہے۔“

عمران نے غور سے اسے دیکھا اور تاڑ لیا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ اپنے لہجے کو ذرا نرم رکھ کر بولا۔ ”گیتا! مجھے پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ بات بتاؤ۔“

”بات کی قیمت؟“ وہ صرف دو تین انچ کے فاصلے سے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے بولی۔

''کیا قیمت؟''

وہ اس کے گلے لگ گئی۔ عمران نے جیکٹ اور قمیص اتاری ہوئی تھیں اس نے عجیب جذباتی انداز میں اس کے کندھے کی خونی خراش پر اپنے احمریں ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ کسی جونک کی طرح اس کے کندھے سے رسنے والا خون چوس رہی تھی۔ عمران نے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔ ''یہ کیا حرکت ہے گیتا؟''

''یہ پریم ہے عمران...... اور پریم کی کئی قسمیں ہووت ہیں۔ کچھ پریم بلیدان دیتے ہیں، کچھ نہیں دیتے۔ ایسے پریموں میں ایک ہاتھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ لیا جاتا ہے۔''

''تم کیا دینا چاہتی ہو؟''

''میں تمہیں بھانڈیل اسٹیٹ کی تقدیر بتانا چاہت ہوں۔ میں تمہیں ایک ایسی جانکاری دینا چاہت ہوں جو اس لڑائی کا نقشہ بدل دیوے گی۔''

''کیسی جانکاری؟''

وہ نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''سب کچھ بتا دوں گی تو پھر مجھ بے چاری کے پاس کیا رہ جاوے گا۔ چلو تمہیں تھوڑا سا بتا دیوت ہوں۔ نل پانی سے آنے والی بڑی بی جسے اب لوگن ماتا جی کہنے لگے ہیں، اس سارے کھیل میں ترپ کے پتے جیسی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس بڑی بی نے اب سے تھوڑے سے پہلے قاسمیہ کے علاقے اور قلعے پر زوردار حملے کے لئے ایک شبھ گھڑی بھی نکالی ہے۔ یہی کارن ہے کہ ہندو فوجیوں کے مشورے سے گوروں نے ابھی لڑائی روک دی ہے۔ لیکن اس بڑی بی کے حوالے سے اگلی بات بہت زیادہ خاص ہے......''

''کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''قیمت؟'' گیتا مکھی نے عمران کو خمار آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

○......❖......○

وہ سراپا دعوت عمران کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ دے...... ایک ہاتھ لے کی عملی تفسیر نظر آتی تھی۔ وہ عمران کو ''ہونے والی لڑائی'' کے حوالے سے کوئی خاص الخاص بات بتانا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی اس ''انفارمیشن'' کے بدلے وہ عمران کی قربت کی خواہش رکھتی تھی...... عمران جیسے ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''گیتا! ہم اس وقت جنگ کی حالت میں ہیں۔ ایک ایک

منٹ قیمتی ہے۔ یہ ساری باتیں اور شرطیں پھر کسی اور وقت کے لئے رکھ چھوڑو۔ یہ نہ ہو کہ تم مجھے معلومات بھی دے دو اور وہ کسی کام کی بھی نہ رہیں۔''

یوں محسوس ہوا کہ عمران کی بات کسی حد تک گیتا کے دل کو لگی ہے۔ اس نے ذرا ٹھٹک کر عمران کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھریں۔ بہرحال، وہ اتنی جلدی مکمل ہار ماننے والی عورت نہیں تھی اس نے بل کھا کر عمران کی گردن میں بازو ڈالے۔ اس کے کنگنوں کی چھنکار کمرے میں گونجی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ عمران سے جڑی کھڑی تھی، بڑی ادا سے بولی۔ ''محبت اور جنگ دونوں بڑی خاص چیزیں ہیں عمران! ہم ایک کے لئے دوسری کو قربان تو نا ہیں کر سکتے۔''

''لیکن گیتا! جو کچھ تم چاہ رہی ہو، اس کے لئے ذہنی سکون اور اندر کی خوشی درکار ہے۔ ہم اس وقت بڑی آزمائش کی گھڑیوں سے گزر رہے ہیں۔ اس آزمائش کو اور زیادہ سخت مت کرو۔''

''میں نے کیا کہا ہے، بس تم سے تھوڑا سا سمے ہی تو مانگا ہے۔'' وہ نشیلے لہجے میں بولی۔

''یہ سمے ہی تو قیمتی ہے گیتا۔ میں رات تمہارے پہلو میں گزار دوں گا تو بہت سے کام بگڑ جائیں گے۔''

اس نے ایک طویل آہ بھری...... اور اپنے مؤقف پر ذرا ڈھیلی نظر آنے لگی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ''چلو کچھ دیر ہی سہی...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی وچن بھی تو دو۔''

''کیا وچن؟''

وہ مسکرائی۔ ''یہی کہ جب تمہاری یہ آزمائش ختم ہو جاوے گی تو اپنے ہزار برس کے جیون میں سے ایک رات اپنی دیوانی کے نام کرو گے۔''

''ٹھ...... ٹھیک ہے۔ وچن دیتا ہوں۔''

وہ عمران سے چمٹ گئی۔ اس نے اس کی گردن، چہرے اور ہونٹوں پر گرم بوسوں کی بارش کر دی۔ عمران نے بھی تھوڑی بہت جوابی کارروائی کی۔ وہ عمران کو دھکیلتی ہوئی بستر پر جا گری۔ اس کے لمبے ریشمی بال منتشر ہو گئے۔ عمران بڑے تحمل اور دانش مندی سے اسے اس کی حدود کے اندر رکھنے میں کامیاب رہا۔

دس پندرہ منٹ بعد گیتا کے جذبات کا چڑھا ہوا دریا کسی حد تک اتر گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں کہنیاں گاؤ تکیے پر ٹکا کر ٹیک لگائی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ ہرگز

نہیں جانتی تھی کہ اس خلوت گاہ میں ایک اور شخص بھی موجود ہے اور آبنوسی الماری کے عقب سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہے۔ عمران کی سوالیہ نظریں گیتا مکھی پر تھیں۔ دور کہیں قاسمیہ کی کسی گلی میں فائرنگ ہو رہی تھی اور یہ گونجتی ہوئی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔

گیتا مکھی نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''اس بڑی بی کی چوتھی پشت اس راجواڑے کے ایک راجا، راہول جگجیت رائے سے ملتی ہے۔ جگجیت رائے کے زمانے میں راجواڑے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کافی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی قاسمیہ کے مسلمان اس قلعے کی دیوار گرانے اور اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کہا جاوت ہے کہ اس لڑائی میں دونوں طرف کے کم از کم چار ہزار لوگن مارے گئے تھے۔ اس لڑائی کے بعد راجا جگجیت رائے نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اگر پھر کبھی اسی طرح کی صورتِ حال بن جاوے اور مسلمان قلعے کے اندر بند ہو جاویں تو ان کو باہر نکالنے میں آسانی ہووے۔ کچھ لوگن کا خیال ہے کہ راجا نے اس وقت کوئی ایسا زمین دوز راستہ بنایا تھا جس کو استعمال کر کے قلعے کے اندر داخل ہوا جا سکے۔ لیکن یہ بات سچ ناہیں ہے۔ قلعے کے اندر گھسنے کا کوئی خفیہ راستہ ناہیں ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے گیتا داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

عمران نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے برا سا منہ بنایا اور بولا۔ ''لیکن تمہاری اس اہم جانکاری سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟''

گیتا نے چٹ سے عمران کے گال کا بوسہ لیا اور بولی۔ ''ابھی میری بات مکمل ناہیں ہوئی۔ لیکن جتنی بات میں نے تم کو بتائی ہے، اس کی تعریف تو کرو۔''

''چلو ٹھیک ہے...... تعریف کرتا ہوں۔''

''ناہیں، منہ زبانی تعریف مجھے ناہیں چاہئے۔'' وہ اس کے گلے لگ کر بولی۔

چار و ناچار عمران نے اسے چوما، وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''بڑی بی جسے اب بہت سے لوگن بڑی روانی سے بڑی ماتا جی کا خطاب دے رہے ہیں، ایک بڑا خاص الخاص انکشاف سامنے لائی ہے۔ یہاں زرگاں میں بڑی بی کی ایک بڑی پرانی آبائی حویلی ہے۔ اس حویلی میں کچھ جدی کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ یہ کاغذات بڑی بی نے حکم جی کو پیش کئے ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ وہ پرانی بات کچھ ایسی غلط بھی ناہیں تھی جو اس قلعے کے حوالے سے کہی جاوت ہے۔ اس قلعے میں ایک بڑی خامی ہے...... اور راجا رائے کے دور میں یہ خامی جان بوجھ کر رکھی گئی تھی...... تا کہ اگر کسی آنے والے سمے میں مسلمان اس قلعے میں قلعہ بند

ہوں تو ان پر حملہ کیا جا سکے......''

عمران کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات ابھرے اور اس کی توجہ بڑھ گئی۔ گیتا، عمران کی اس کیفیت سے محظوظ ہوئی۔ وہ نیم دراز ہو گئی اور اس کی گود میں سر ٹکا کر بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے عمران! وہ خامی کا ہووے گی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

وہ اس کے سینے کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''یہ وہی خامی ہے جو سات پردوں میں چھپی ہوئی اکیلی ناری کے اندر ہووت ہے۔ اس خامی کو سات پردوں کی وجہ سے دور ناہیں رکھا جا سکتا۔ یہ خامی تو ناری کے اندر ہی ہووت ہے۔ وہ اوپر سے چاہے بڑی مضبوط نظر آوت ہو لیکن اس میں چھپی ہوئی کمزوری اسے مضبوط ناہیں رہنے دیتی۔''

عمران نے کہا۔ ''تمہارا فلسفہ سمجھنے میں مجھے تھوڑی دیر لگے گی...... اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''عمران! قلعے کی فصیل پرانی ہونے کے باوجود بہت مضبوط ہے لیکن ایک جگہ ایسی ہے جہاں یہ فصیل بالکل مضبوط ناہیں ہے۔ وہ دیکھنے میں مکمل فصیل نظر آوت ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ شاید ایک بڑا فوجی ٹرک بھی اس سے ٹکرا جاوے تو وہ گر سکتی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ہے عمران۔ اور میں تمہیں اس کا مکمل ثبوت دے سکت ہوں...... فصیل کا وہ حصہ دراصل کبھی ایک بڑا دروازہ ہوا کرت تھا۔ راجا رائے کے زمانے میں وہ دروازہ گرا دیا گیا اور وہاں پر بھی فصیل بنا دی گئی۔ مگر فصیل کا یہ ٹکڑا اندر سے بالکل کھوکھلا بنایا گیا ہے۔ سمجھو کہ نانک چندی اینٹوں کی دو عام سی دیواریں ہیں جن کے درمیان آٹھ دس فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ سارا کام راتوں کے اندھیرے میں بڑی راز داری سے کیا گیا ہووے گا۔ ہو سکتا ہے کہ جن کاریگروں نے یہ کام کیا ہو، ان کو ویسے ہی جان سے مار دیا گیا ہو یا پھر قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ بہر حال، فصیل کا یہ کھوکھلا ٹکڑا ایک چھپی ہوئی حقیقت ہے اور بڑی ماتا نے یہ حقیقت اپنے جدی کاغذوں کے ذریعے حکم جی وغیرہ پر کھول دی ہے۔''

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ یقیناً عمران کی کیفیت بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ گیتا کا انکشاف اگر درست تھا تو بڑا خطرناک تھا۔ ہماری حالت اس شخص کی سی تھی جو کسی جنگل میں کسی درندے سے بچنے کے لئے درخت پر چڑھ جائے اور اچانک اسے پتا چلے کہ وہ جس

درخت پر چڑھا ہے، وہ جڑوں کے بغیر ہے اور زمین بوس ہو رہا ہے۔

"وہ جگہ کون سی ہے؟" عمران نے گیتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو، سب کچھ مجھ سے چھین رہے ہو اور اس کا صلہ بھی کوئی نہیں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"پلیز گیتا...... پلیز۔ ہم بڑی نازک سچویشن سے گزر رہے ہیں۔ اور جو کچھ تم بتا رہی ہو، وہ سچ ہے تو پھر سچویشن اور نازک ہو جاتی ہے۔"

"وہ تو میں بھی اچھی طرح جانت ہوں۔" اس نے عمران کے ہونٹوں پر انگلی چلا کر کہا۔

"یہ بات تو طے ہے کہ کل سویرے قاسمیہ کے لوگن برٹش فوجیوں اور حکم کے سپاہیوں کا حملہ زیادہ دیر ناہیں روک سکیں گے۔ ہو سکت ہے کہ وہ دس بارہ گھنٹوں کے اندر ہی چاروں طرف سے پسپا ہو کر قلعے کے اندر آ جائیں اور دروازے بند کر دیں۔ ہزار ڈیڑھ ہزار عورتیں اور بچے تو اب بھی قلعے میں موجود ہیں۔ پھر یہاں موجود لوگن کی تعداد کئی ہزار تک ہو جاوے گی۔ ان سارے لوگن کے جیون اسی صورت میں بچے رہ سکیں گے جب یہ قلعہ ان کی رکھشا کرے گا۔ اگر قلعہ رکھشا نہ کر سکا تو بڑی جلدی سب کچھ ختم ہو جاوے گا۔"

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، بالکل درست تھا۔ عمران کے تاثرات بھی یہی کہہ رہے تھے کہ وہ گیتا کی بات کے وزن کو پوری طرح محسوس کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"گیتا! اٹھو...... مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔"

"لیکن پہلے اپنے وچن کی تصدیق تو کرو۔"

"کیا کروں؟"

"اپنے دستخط کر دو۔"

"کہاں؟"

"یہاں۔" اس نے اپنے بالائی جسم کو بے لباس کر دیا اور کوئی مارکر نما شے عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران سٹپٹایا ہوا نظر آیا مگر وہ بحث کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ڈھلتی جوانی والی طرار گیتا مکھی شاید آج اپنا ہر مطالبہ پورا کرانے پر تلی ہوئی تھی۔ عمران نے اس کا یہ بے ہودہ مطالبہ بھی پورا کیا اور پھر اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ گیتا مکھی نے خود کو سر تا پا گرم چادر سے ڈھانپا اور عمران کے پہلو میں چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سیاہ چادر میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عام لوگوں کے لئے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ کون ہے۔ اب میرا وہاں رکنا بھی بیکار تھا۔ میں الماری کی اوٹ سے نکل کر ان کے پیچھے گیا۔ قلعے کے

طویل برآمدوں اور وسیع وعریض احاطوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بے شمار مشعلیں اور گیس کے ہنڈولے قرب وجوار کو روشن کر رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر خوف ہراس کے ساتھ ساتھ جوش وخروش کے آثار بھی تھے۔ عمران اور گیتا مکھی درمیانی احاطے سے گزر کر فصیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ میں نے رسماً عمران سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ عمران کو بھی معلوم تھا کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حسنات اور چوہان وغیرہ بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ ہم قلعے کے مرکزی دروازے سے، فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے سو ڈیڑھ سو قدم شمال کی طرف آ گئے۔ یہاں پہنچ کر گیتا مکھی کچھ دیر تک قرب وجوار کا جائزہ لیتی رہی اور وہ نشانیاں ڈھونڈتی رہی جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھیں۔ آخر اس نے فصیل کے ایک حصے کو منتخب کیا۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ "یہاں سے اینٹیں نکال کر دیکھو۔"

حسنات کی ہدایت پر فوراً ہی دس بارہ افراد وہاں پہنچ گئے۔ ان کو کدالیں وغیرہ فراہم کر دی گئیں۔ فصیل پر کدالیں چلنا شروع ہوئیں۔ پہلی دو چار اینٹیں نکالنے میں دشواری ہوئی لیکن اس کے فوراً بعد اینٹیں گرنا شروع ہو گئیں۔ وہاں موجود تمام افراد کے چہرے تحیر کی آماجگاہ بن گئے۔ فصیل کا یہ حصہ واقعی کھوکھلا تھا۔

یہ ایک تہلکہ خیز انکشاف تھا۔ حسنات کی ہدایت پر اور بھی بہت سے افراد کدالیں اور ہتھوڑے وغیرہ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو شاید آدھ پون گھنٹے میں فصیل کا یہ ٹکڑا منہدم کر ڈالتے لیکن ہم نے آپس میں مشورے کے بعد انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ یہ فصیل جیسی بھی بری بھلی تھی لیکن اس کا کھڑا رہنا اس کے منہدم ہونے سے بہتر تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ فصیل کا یہ حصہ گرنے کی صورت میں دفاع کا متبادل انتظام موجود ہو۔ یہ انتظام کیا ہو؟ اور اسے جلد سے جلد کس طرح مکمل کیا جائے؟ یہ دونوں بڑے اہم سوال تھے۔ اس موقع پر ایک بار پھر عمران کے مشورے نے مجھے طاقت بخشی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ سب تمہاری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

"یار، تم نے مجھے بُری طرح پھنسا دیا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے بس کا نہیں ہے۔"

"کسرِ نفسی سے کام مت لو۔ جو شخص جارج گورا کو ہرا سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

لوگ تمہیں نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں یار۔ کچھ تو خیال کرو ان کے جذبات کا۔''

''میں نے گھونسا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دینی ہے۔'' میں دھیمی آواز میں پھنکارا۔

''تمہیں گھونسا مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بس آنکھ سے اشارہ کردو۔ تمہارے یہ سیکڑوں پرستار میری ہڈیوں کا چُورا کر ڈالیں گے۔ آخر کمان دار ہو تم۔ لیڈر شپ ہے تمہارے پاس۔''

''عمران...... یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔'' میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ تھوڑی کھجا کر بولا۔ ''دیکھو، بات میری ہوگی لیکن زبان تمہاری ہوگی۔ اس ''ڈمی'' فصیل کے پیچھے ہمیں ایک اور دفاعی لائن قائم کرنی پڑے گی۔ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی دیوار وغیرہ تو بنائی نہیں جا سکتی۔ ہاں، ایک نیم گول خندق ضرور کھودی جا سکتی ہے......''

''تمہارا مطلب ہے کہ اگر فصیل کا کمزور حصہ ٹوٹ بھی جائے تو آگے خندق ہو؟''

''بالکل...... یہ بات جب تم کہو گے تو اس کا زیادہ اثر ہوگا۔ ابھی درجنوں لوگ کام پر لگ جائیں گے۔''

اگلے آدھے گھنٹے میں وہی ہوا جو عمران نے کہا تھا۔ میں نے حسنات اور مبارک علی وغیرہ سے مشورہ کیا اور وہی تجویز دی جو عمران نے میرے کان میں ڈالی تھی۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کدالوں اور کسیوں والے قریباً ڈھائی تین سو افراد جمع ہو گئے اور فصیل کے کمزور حصے کے سامنے نیم دائرے میں ستر فٹ لمبی خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ کام حیران کن تیزی سے بس پانچ چھ گھنٹے کے اندر ہی مکمل ہو جائے گا۔

یہی وقت تھا جب تین گھڑسوار بڑی تیزی سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے احاطے میں پہنچے۔ وہیں سے ان کی نظر مجھ پر اور حسنات وغیرہ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا ہماری طرف آئے۔ ان میں انور خاں کا ایک اور قریبی ساتھی مبارک علی تھا۔ اس کے علاوہ امرناتھ اور ایک دوسرا شخص تھا۔ وہ باہر سے کوئی اہم خبر لے کر آئے تھے۔

''کیا بات ہے مبارک؟'' حسنات نے دریافت کیا۔

مبارک بولا۔ ''قاسمیہ کے داخلی دروازے کے پاس بہت بڑا ہجوم ہو گیا ہے۔ وہاں ایک بہت خاص خبر آپ لوگن کا انتظار کر رہی ہے۔''

''کیسی خبر؟'' میں نے پوچھا۔

مبارک نے میری طرف دیکھا اور مؤدب انداز میں کہا۔ ''وہاں ایک چوبارے پر ہم

نے بڑا پکا مورچا بنا رکھا ہے۔ ابھی پہلے پہر کو جو حملہ ہوا تھا، اس کا مقابلہ اس مورچے کے اندر سے بہت ڈٹ کر کیا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑی دوربین چوبارے کی سب سے اونچی جگہ پر لگائی گئی ہے۔ اس دوربین کے ذریعے ہم کو ایک بڑی خاص جانکاری ملی ہے جی۔ ہم نے اس بڑھیا کو دیکھ لیا ہے جسے لوگن بڑی ماتا کہہ رہے ہیں اور اس کو دیوی کا درجہ دے رہے ہیں۔''

''کہاں ہے بڑھیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دھرم شالا کے تالاب کے اندر جو اونچا مینارہ ہے اس پر چڑھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص قسم کی پوجا پاٹ کر رہی ہے۔ دو اور پجارنیں بھی اس کے ساتھ ہیں۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے حسنات احمد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''یہاں قاسمیہ کے ساتھ ہی ہندو آبادی میں ایک بڑا دھرم شالا ہے۔ دھرم شالا کے تالاب کے اندر ایک چوکور مینارہ ہے۔ اس کو ناگ مینارہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اردگرد پتھر کا ایک بڑا سانپ لپٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پرانے وقتوں سے پنڈت اور پجاری وغیرہ خاص چلے کاٹنے کے لئے یا خاص قسم کی پوجا پاٹ کے لئے اس پر چڑھتے ہیں۔''

یہ خبر واقعی اہم لگتی تھی۔ اگر کہیں سے واقعی بڑی بی نظر آ رہی تھی تو پھر ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک بند جیپ میں سوار مبارک علی کے ساتھ جا رہے تھے۔ مبارک علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ جیپ میں میرے ساتھ حسنات احمد، عمران اور بھرت تھے۔ ہم قاسمیہ کی مختلف گلیوں سے گزرے۔ جگہ جگہ مورچے نظر آ رہے تھے۔ جو مورچے کھلی جگہوں پر تھے، ان کو ریت کی بوریوں اور اینٹوں وغیرہ سے محفوظ کیا گیا تھا۔ مسلح افراد ہر طرف گشت کر رہے تھے۔ خوراک سے بھرے ہوئے بہت سے چھکڑے قلعے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ انتظام اس لئے تھا کہ اگر قلعے میں محصور ہونا پڑے تو دشواری پیش نہ آئے۔

جلد ہی ہم قاسمیہ کے داخلی راستے کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں ہم ایک زیادہ تنگ گلی میں مڑے۔ پھر اپنی سواریوں سے اترے اور بیس تیس قدم فاصلہ طے کر کے ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ اردگرد سیکڑوں افراد جمع تھے۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا اور فلک شگاف نعرے لگائے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک چار منزلہ چوبارے کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ چوبارے کی ساری منزلوں پر مسلح افراد کا ہجوم تھا۔ وہ بے حد پُرجوش نظر آتے تھے۔ انگریزوں اور حکم کے ہرکاروں کے خلاف زبردست نعرہ زنی کر رہے تھے۔ یہاں مجھے ایک

چونکا دینے والا منظر بھی نظر آیا۔ ایک راہداری میں ایک انگریز کی برہنہ لاش کو الٹا لٹکایا گیا تھا۔ غالباً یہ شخص کل صبح ہونے والے معرکے میں مرا تھا یا پکڑا گیا تھا۔ لاش کے جسم پر تشدد کے بہت سے نشان تھے۔ یقیناً یہ لاش اس سفا کی کا ردِعمل تھی جو ''تہذیب یافتہ گوروں'' کی طرف سے پچھلے پانچ چھ دنوں میں یہاں روا رکھی گئی تھی۔ جیل سے قاسمیہ کی طرف آتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے درجنوں افراد کی درختوں سے جھولتی لاشیں دیکھی تھیں۔ ان بدنصیبوں کو ٹکم اور اینڈرسن کے جوانوں نے سرعام پھانسیاں دی تھیں اور لاشیں چیل کوؤں کے لئے چھوڑ رکھی تھیں۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم چوبارے کی چھت پر پہنچ گئے۔ اب صبح صادق کا اجالا نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس چوبارے کے اردگرد چاروں طرف لاتعداد لوگ گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں نظر آ رہے تھے۔ رائفلیں لہرا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ چوبارے کی چھت پر قاسمیہ کے سرکردہ افراد اور جنگجو موجود تھے۔ ایک تین فٹ لمبی ٹیلی اسکوپ ایک اسٹینڈ پر رکھی گئی تھی اور اس کے اردگرد ہجوم تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ہجوم نے راستہ دیا۔ میں اور عمران، حسنات احمد کے ساتھ ٹیلی اسکوپ پر پہنچے۔ سب سے پہلے مجھے ہی مطلوبہ منظر دکھایا گیا۔ منظر واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ٹیلی اسکوپ کو بڑی خوبی سے قریباً نصف کلومیٹر دور ایک مینار پر فوکس کیا گیا تھا۔ مینار کے بالائی سرے پر برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ روشنی جنریٹر کی مرہونِ منت رہی ہوگی۔ غور سے دیکھنے پر بڑی بی کی شبیہہ نظر آتی تھی وہ آلتی پالتی مارے شاید فرش پر ہی بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر ایک سیاہ بکرے یا بکری کا کٹا ہوا سر جھول رہا تھا۔ خاصی سردی میں بھی بڑی بی کے جسم پر فقط سفید سوتی ساڑھی ہی دکھائی دیتی تھیں تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کے کندھوں پر کوئی شال قسم کی چیز بھی ہے۔ درمیانی عمر کی دو اور عورتیں بھی بڑی بی کے ساتھ تھیں۔

''آپ لوگ بھی دیکھو۔'' میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے عمران اور حسنات وغرہ کو دعوت دی۔

باری باری سب نے یہ منظر دیکھا۔ آخر میں پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ بڑی بی دوسری طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ اپنے کندھوں پر پھونک مارنے کے لئے اپنی گردن گھماتی تو اس کا چہرہ بھی نظر آتا تھا۔ اچانک شور اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قاسمیہ کے کچھ مکین آپس میں ہی گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ تین چار باریش افراد کو لوگ بُری طرح مار

رہے تھے۔ انہیں غدار، دھوکے باز اور پتا نہیں کیا کیا قرار دے رہے تھے۔ دیگر افراد انہیں چھڑانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔ ''یہ کیا تماشا ہے؟ ختم کرو یہ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔''

شدید گرما گرمی میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی لیکن پھر بھی کھینچا تانی اور بدزبانی جاری رہی۔ حسنات اور مبارک وغیرہ نے آگے بڑھ کر یہ ہنگامہ بمشکل کنٹرول کیا۔ دو چار افراد اب بھی بری طرح گرج برس رہے تھے۔ ''تم منافق ہو۔ تم غیروں سے ملے ہوئے ہو۔ تم جیسے لوگن کی وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔''

اس طرح کے فقرے چاروں طرف گونج رہے تھے۔ مار کھانے والے زخمی افراد کو موقع سے ہٹا لیا گیا۔ مارنے والے سیکڑوں کی تعداد میں تھے، وہ اور جوش وخروش سے نعرے لگانے لگے...... ان کے نعروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بڑی بی کو فوراً سے پہلے شوٹ کر دینے کے خواہشمند ہیں۔

حسنات مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے جھگڑے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ''ایک قبیلے کے لوگوں نے رائے دی ہے کہ بوڑھی عورت پر گولی نہ چلائی جاوے۔ یہ بدشگونی ہووے گی۔''

''بدشگونی سے کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کا کہنا ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق جنگ میں کسی پر اس کی بے خبری میں پیچھے سے وار کرنا بالکل غلط ہے...... اور جس پر وار کیا جاوے، وہ ناری ہو اور عمر رسیدہ بھی ہو تو یہ اور بھی غلط ہے۔ بس اسی بات پر باقی لوگن غصے میں آ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی عام عورت نا ہیں، یہ فساد کی جڑ ہے۔ یہ اس لڑائی میں بڑے بڑے فیصلے کر رہی ہے۔ یہ مرے گی تو دشمنوں کی کمر ٹوٹے گی۔ وہ اسے مارنے میں ذرا سی بھی دیری کرنا نا ہیں چاہتے۔''

''ظاہر ہے ان حالات میں تو یہ سنہری موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی دور نشانہ لگ بھی سکے گا؟'' عمران نے کہا۔

''وہ دیکھیں جی، جہاں بہت سے لوگن جمع ہیں...... چھت کے اس کونے میں۔'' مبارک علی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

عمران کے ساتھ ساتھ میں نے بھی دیکھا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ پھر مجھے ایک دور مار رائفل بھی نظر آئی۔ یہ کافی بڑی رائفل تھی۔ اس کے اوپر بھی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ کئی اہم جنگجو کمانڈر یہاں جمع تھے۔ حسنات احمد نے کہا۔ ''یہ زرگاں کے تین چار بہترین نشانے باز

ہیں جی۔اڑتے پرندے پر سو فیصد ٹھیک نشانہ لگا لیوت ہیں۔ مجھے یقین ہے،ان میں سے کوئی ایک بڑی بی کے کھوپڑے میں سوراخ کر لیوے گا۔''

چھت پر موجود لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بالکل غیر متوقع طور پر ان کو ایک بڑی شاندار کامیابی ملنے والی ہے۔اس ٹیلی اسکوپ نے اتفاقیہ طور پر ایک ایسا کام کر دکھایا تھا جو بظاہر بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماہر فلکیات اپنی ٹیلی اسکوپ سے آسمان کا طول وعرض ناپ رہا ہو اور اچانک ایک ایسا ستارہ اسے نظر آ جائے جس کی خبر پہلے کسی کو نہ ہو۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی حیران کن دریافت تھی۔ وہ بڑی بی جو زرگاں کے شعلوں پر تیل ڈالنے کا کام بڑی ہٹ دھرمی سے کر رہی تھی، اچانک ہی اس ٹیلی اسکوپ کے عدسوں پر نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا، باریک نقوش اور تیکھی لمبی ناک والا ایک نشانے باز دور مار رائفل میں بلٹ ڈال رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہی شخص بڑھیا پر نشانہ لگانے والا ہے۔سیکڑوں تماشائیوں کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔عمران نے میرا کندھا دبایا۔ ہم نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھے۔ حسنات احمد اور چوہان نے ہمیں دیکھ لیا۔اس سے پہلے کہ چوہان ہماری روانگی کے بارے میں پوچھتا،عمران نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ اردگرد موجود ہر شخص کا دھیان، دور مار رائفل اور نشانے باز کی طرف تھا۔ سانسیں جیسے رک گئی تھیں اور نگاہیں دھرم شالا کے دور افتادہ مینارے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ زینوں کی تاریکی میں پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عمران کوئی خاص کام کرنا چاہ رہا ہے۔

''کچھ بتاؤ گے بھی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ آن ایئر ہونے سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے کہا اور مجھے تقریباً کھینچتا ہوا نچلی منزل پر لے آیا۔ یہاں تاریکی تھی۔ کسی نے ہمیں پہچانا نہیں۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ایک کمرے میں گھس گیا اور کمرے کا دروازہ شتابی سے بند کر دیا۔ میں نے دیکھا یہاں بھی ایک کھڑکی کے پاس ایک لمبی رینج کی رائفل پڑی تھی۔ بہر حال، یہ اوپر والی رائفل سے کم طاقتور تھی۔ اس رائفل کو چلانے والا بھی غالباً بڑی بی کی ہلاکت کا منظر دیکھنے کے لئے بالائی منزل پر چلا گیا تھا۔ عمران نے رائفل کو فوراً چیک کیا۔ اس میں دو بلٹس موجود تھیں۔ رائفل پر چھوٹے سائز کی ٹیلی اسکوپ بھی لگی ہوئی تھی۔

''بڑھیا کو مارنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اسے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ رائفل لوگوں کو زندہ کرنے کے لئے ہی تو ہوتی ہے۔...... یار...... کبھی کبھی کیسا احمقانہ سوال کرتے ہو تم۔''

''لیکن تمہیں پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اوپر بڑی گن سے فائر کرنے تو لگے ہیں وہ لوگ۔''

''میں نشانہ چوکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اگر نشانہ چوک گیا تو دو تین سیکنڈ میں بڑی بی غائب ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

''لیکن ان لوگوں کے پاس بڑی گن ہے۔ حسنات بتا رہا ہے کہ وہ لوگ زرگاں کے بہترین نشانے باز ہیں۔''

''زرگاں اور لاہور میں بڑا فرق ہے۔ لاہور...... لاہور ہے۔ اور لاہور کا نشانے باز بھی، لاہور کا نشانے باز ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم شکار دیکھو، شکاری دیکھو اور نشانہ دیکھو۔''

وہ بڑے اعتماد سے رائفل کے سامنے جا بیٹھا۔ مینارہ اور اس کی بالائی روشنی یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی رات کی تاریکی بتدریج دن کے اجالے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔''میں نشانہ لینے لگا ہوں۔ اگر دروازے پر دستک ہو بلکہ اگر کوئی دروازے کو اکھاڑ بھی دے تو تم نے دروازہ نہیں کھولنا ہے۔''

''عمران! دیکھ لو۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔''

''تمہیں پتا ہے، میں صرف نازک معاملوں کو ہی دیکھتا ہوں۔ نزاکت مجھے پسند ہی بڑی ہے۔ خاص طور سے اگر لڑکیوں اور ان کے معاملوں میں ہو تو......''

میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ جو کرنے جا رہا ہے، کر کے رہے گا۔ اسے دلیلیں دینا بیکار تھا۔ اسی دوران میں میری نگاہ ایک اور دوربین پر پڑ گئی۔ یہ کمرے کی ایک دیوار پر لگی کھونٹی سے جھول رہی تھی۔ میں نے یہ پیتل کی دوربین اتار کر آنکھوں سے لگا لی۔ عمران رائفل کے سامنے اوندھا لیٹ کر شست باندھ چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا۔ میں نے آج تک اس کا نشانہ خطا ہوتے نہیں دیکھا تھا...... مگر آج...... اس نے نشانہ خطا کیا۔ اور ایک نہیں دونوں نشانے خطا کئے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ بڑھیا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کی دونوں ساتھی عورتیں بھی اٹھیں۔ میں نے ان کے ہیولوں کو تیزی سے اوجھل ہوتے

دیکھا۔

''اوہ شٹ۔'' عمران نے دانت پیس کر رائفل پر مکا رسید کیا۔

پھر وہ مجھے لئے تیزی سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ہلچل تھی۔ اوپر تلے ہونے والے دو فائرز کی گرجدار آواز سن کر لوگ بالائی منزل کی طرف دوڑے جا رہے تھے، تاہم کچھ اوپر سے نیچے بھی آ رہے تھے۔ ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔ تاریکی اور بھگدڑ میں کسی نے ہمیں کمرے میں داخل ہوتے یا نکلتے نہیں دیکھا۔ کم از کسی نے ہمیں پہچانا ہرگز نہیں۔ ہم بھی زینے طے کر کے اوپر آ گئے۔ یہاں دور مار رائفل کے قریب موجود چوٹی کے نشانے باز، بُری طرح آگ بگولا ہو رہے تھے۔ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ ان کے فائر کرنے سے پہلے ہی کسی اور نے گولی چلا دی ہے اور اس اچانک فائرنگ کے نتیجے میں ''شکار'' اوجھل ہو گیا ہے۔ لمبی ناک والا شخص زینوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور دھاڑ رہا تھا۔ ''نیچے دیکھو۔ وہاں سے گولی چلائی ہے کسی حرامزادے نے۔''

چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے زینے اتر گئے۔ ''کیا ہوا حسنات؟'' عمران نے پوچھا۔

''گڑبڑ ہو گئی عمران بھائی۔ بڑھیا بچ گئی۔ لگتا ہے کہ ہم سے پہلے کسی اور نے گولی چلا دی۔ لیکن وہ اس خبیث کو لگی نہیں۔''

میں جب سے عمران کے ساتھ تھا، مجھے پہلی بار اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے جلد بازی ہوئی تھی۔ اس نے نسبتاً چھوٹی گن سے اور افراتفری میں نشانہ لیا تھا...... بہرحال، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ شاید اس میں کوئی بہتری ہو۔ ایک نشانے باز اب بھی بڑی گن کے پاس موجود تھا۔ اس گن کی دوربین بھی نسبتاً بڑی تھی۔ نشانے باز نے مسلسل دوربین سے آنکھ لگا رکھی تھی۔ مگر اب توقع نہیں تھی کہ بڑھیا پھر نشانے پر آئے گی۔

چوبارے کے اندر اور اردگرد موجود سیکڑوں لوگوں میں مایوسی کی لہر سی دوڑ گئی۔ تاہم کچھ لوگ امید ظاہر کر رہے تھے کہ شاید بڑھیا کو گولی لگ ہی گئی ہو۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور عمران اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ واپس قلعے میں آ گئے۔ فصیل کے کمزور حصے کے سامنے قوس کی شکل کی سرنگ تیزی سے کھودی جا رہی تھی۔ سیکڑوں مرد و زن اور بچے قلعے کے مختلف حصوں میں موجود تھے۔ وہ اپنی اپنی اہلیت کے مطابق مختلف کام انجام دے رہے تھے۔ کہیں ناشتا بنایا جا رہا تھا، کہیں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ دفاعی انتظامات میں بھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام رہی تھیں۔ گیتا مکھی اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ان سیکڑوں عورتوں کے درمیان

کہیں موجود تھی یا شاید واپس جا چکی تھی۔ میں اور عمران دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ پتا نہیں کیوں، مجھے عمران کی نشانے بازی پر مسلسل شک سا ہو رہا تھا...... میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''عمران! تم مجھے ہر وقت الجھن میں رکھتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری کون سی بات کو حقیقت سمجھوں اور کس کو جھوٹ؟''

''بھئی! میڈیا کا تو کام ہی الجھن میں رکھنا ہوتا ہے۔ ایک الجھن کے ختم ہونے سے پہلے دوسری الجھن شروع ہو جانی چاہئے۔ ورنہ ناظرین بھاگ جائیں گے اور اینکر بے چارے پکارتے رہ جائیں گے، جایئے گا نہیں...... جایئے گا نہیں۔'' وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں، میں نہیں بھاگوں گا۔ مگر مجھے سچ سچ بتایا کرو۔''

''ٹھیک ہے، آئندہ سچ بتایا کروں گا۔''

''یعنی تم بالواسطہ اعتراف کر رہے ہو کہ یہ سچ نہیں تھا۔ تم نے...... تم نے جان بوجھ کر بڑھیا کو بھگایا ہے؟''

''یار بھگایا تو جوان اور خوبصورت عورتوں کو جاتا ہے۔ بڑھیا کو بھگانے سے کیا فائدہ۔ کتنا بے ہودہ الزام لگا رہے ہو...... ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے بڑی بی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔''

''کیوں؟''

''یار! دشمن پر پیچھے سے وار کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا اور دشمن بھی اتنا پرانا، جتنا یہ قلعہ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بڑھیا ضرور بہادر شاہ ظفر کا حقہ تازہ کرتی رہی ہے...... یا کم از کم مہاتما گاندھی کی گرل فرینڈز میں شامل رہی ہے۔''

''تم پھر بکواس کر رہے ہو۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر دستک ہوئی اور پھر حسنات اور ڈاکٹر چوہان اندر آ گئے۔ حسنات کچھ دیر پہلے تک کافی افسردہ نظر آتا تھا مگر اب اس کی کیفیت بدلی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''میں انور بھائی سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ بڑھیا کا بچ جانا ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔''

''کس لحاظ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں، اس بڑھیا نے قاسمیہ پر بھرپور حملے کے لئے شبھ گھڑی نکالی ہوئی ہے۔ اس شبھ گھڑی کی وجہ سے ہی ابھی تک ہندو فوجی حملے سے رکے ہوئے ہیں۔ مجبوراً

گورے فوجیوں کو بھی رکنا پڑا ہے۔ حالانکہ یہ گورے وقت ضائع کرنا ناہیں چاہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اب تک ہم پر حملہ ناہیں ہوا تو اس کی وجہ یہ بڑھیا ہی ہے۔ اگر یہ بڑھیا مر جاتی تو ہم پر ابھی حملہ ہو جانا تھا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے معصوم صورت بنا رکھی تھی۔ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ بڑھیا کو بھگانے والا کام عمران نے کیا ہے اور اس طرح سے کیا ہے کہ اس کام سے اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا موقع نہیں مل سکا۔ حسنات نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''انور بھائی کہہ رہے ہیں، یہ بہت ضروری ہے کہ ابھی دس بارہ گھنٹے تک ہم پر اٹیک نہ ہو۔ امید ہے کہ آج رات تک ہمیں باہر سے زبردست کمک مل جاوے گی۔''

''کمک سے تمہاری مراد نل پانی سے آنے والی مدد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل جناب! ہمارے مخبر بتا رہے ہیں کہ نل پانی سے کم و بیش چار ہزار سپاہی روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کی قیادت خود چھوٹے سرکار کر رہے ہیں۔''

یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ یہ بات بھی بالکل واضح سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہم پر حملے کا آغاز جتنی دیر سے ہوگا، اتنا ہی ہمارے لئے بہتر ہوگا۔

O......❖......O

گورے اور کالے فوجیوں کی طرف سے ہم پر حملے کا آغاز شام سے کچھ دیر بعد ہوا۔ یہ بھرپور حملہ تھا اور ہم سب اس حملے کے لئے پوری تیار بھی تھے۔ عمران نے مجھے پابند کر دیا تھا کہ میں قلعے میں رہوں اور یہاں کے معاملات کو کنٹرول کروں۔ خود وہ حسنات، چوہان اور مبارک علی کے ساتھ لڑائی کی جگہ پر [illegible] لڑائی کی شدت سے در و دیوار لرزنے لگے اور [illegible] کے شعلوں نے آگ بھی لگا دی۔

انور خاں کی حالت اب بہتر تھی۔ ہم دونوں قلعے کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ انور خاں بستر پر نیم دراز تھا اور گاہے بگاہے مجھ سے بات بھی کر رہا تھا۔ انور خاں نے عمران کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ خاص طور سے ایسے سنگین حالات میں عمران کا ٹھہراؤ اور اس کا مطمئن انداز انور خاں کو بہت پسند آیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''شاباش! تم نے پہلے کبھی اپنے اس دوست کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیا یہ بھی پاکستان سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟''

''نہیں انور بھائی! یہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ میرا ایک دوسرا دوست اقبال بھی اس کے ساتھ ہے۔''

انور خاں نے کہا۔ ''مجھے اس شخص کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آتی ہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی بجھتی نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ مردِ میدان ہے۔ نہ صرف خود لڑ سکتا ہے بلکہ ساتھیوں کو بھی لڑا سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! سچ پوچھو تو میں نے یہاں ابھی تک جو فیصلے کئے ہیں، وہ اسی کے مشورے سے ہوئے ہیں۔ ظاہری طور پر میں کمان دار کا کردار ادا کر رہا ہوں لیکن اصل میں سب کچھ عمران ہی کر رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔''

انور خاں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کراہتے ہوئے ذرا پہلو بدلا اور بولا۔ ''خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے تابش! تم نے یہاں زرگاں میں جو کچھ کیا ہے وہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ تم نے ایک دوبدو مقابلے میں اس شخص کو مات اور موت دی ہے جو خود کو ناقابلِ شکست سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے ایک بہت بڑا بت توڑا ہے۔ اس بت کے ٹوٹنے سے ہی لوگ زندہ ہوئے ہیں اور اپنا آپ منوانے کے لئے گلی کوچوں میں آئے ہیں......''

ہم باتیں کر رہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بتدریج پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ قیامت کا شور تھا جس میں گاہے بگاہے لرزہ خیز بارودی دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔ قلعے کے طول وعرض میں پُر جوش مسلمان نوجوانوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے......
''شہادت یا موت۔''

انور خاں نے کہا۔ ''انسان حوصلہ نہ ہارے تو کچھ نہیں ہارتا۔'' پھر وہ تکیے سے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اینڈرسن اور حکم کے دستے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شاید وہ قاسمیہ کے درمیان تک پہنچ چکے ہیں۔''

انور بولا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ہمارا آخری مورچا یہ قلعہ ہی ہوگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم کتنی دیر تک اپنے حریفوں کو قاسمیہ کے گلی کوچوں میں روک سکتے ہیں۔ اس بارے میں تمہارا اندازہ کیا ہے؟''

میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر بغور ارد گرد کا جائزہ لیا۔ مجھے صورتِ حال زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے عام شہری اور نیم فوجی دستے ایک باقاعدہ فوج کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکتے تھے۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اب لڑائی قاسمیہ کے عین وسط میں ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہمیں قلعے میں محصور ہونا پڑے گا۔''

''جو خندق تم کھدوا رہے ہو، اس کی پوزیشن کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ جگہ مجھے یہاں سے نظر نہیں آ رہی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مکمل ہو چکی ہے۔''

''یہ اللہ کا خاص کرم ہوا ہے۔'' انور خاں بولا۔
''لیکن...... وہ عورت کون تھی جس نے تمہیں فصیل کے کمزور حصے کے بارے میں بتایا؟''

''سچی بات یہ ہے انور بھائی کہ اس میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا کردار ہے۔ وہ عورت عمران کی کوئی جاننے والی تھی۔ اسی نے عمران کو یہ اطلاع دی تھی۔''

''تابش! اگر ہم یہ لڑائی جیتنے میں کامیاب ہو گئے تو اس میں اس ''اطلاع'' کا بھی بہت بڑا حصہ ہوگا۔''

زخمی انور خاں نے جو اگلا سوال مجھ سے کیا، اس نے ایک بار پھر مجھے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تابش! تمہارا بچہ ماں کے بغیر بے حال ہے۔ سلطانہ اب کہاں ہے؟''

میں ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایک ٹیس سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! سلطانہ اب وہاں ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ شاید تمہیں پتا نہیں چل سکا۔ وہ زرگاں کے قبرستان میں سو رہی ہے۔''

انور خاں کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی سلطانہ کے آخری لمحات کا منظر گھومنے لگا۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔ رخساروں کے انار، آنکھوں کی روشنی کی طرح بجھتے چلے جا رہے تھے...... اس نے خاموشی کی زبان میں کہا تھا...... خدا حافظ میرے شریکِ حیات۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔ میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی...... اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں۔ اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی اور......

انور خاں کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''یہ کب ہوا تابش...... اور کیسے؟''

میں نے مختصر الفاظ میں انور خاں کو وہ ساری دل فگار رُوداد سنا دی۔ سلطانہ اور آفتاب خاں کا گھیرے میں آنا۔ ہاشم رازی عرف ہاشو کی ہٹ دھرمی۔ رنجیت پانڈے کی عیاری...... اور پھر ماریا کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی موت...... میں نے سب کچھ انور کے گوش گزار کیا......

ہمارے ٹھکانے یعنی پرانے قلعے کے گرد لڑائی کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قاسمیہ کے گلی کوچوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور اینڈرسن کے سپاہیوں کے پاس ایل ایم جی...... اور ایم جی تھری ٹائپ کی گنز بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دستی بموں اور راکٹ لانچرز کے دھماکے بھی تواتر سے سنائی دے رہے تھے۔ مرکزی حصے میں جگہ جگہ آگ بھڑکی ہوئی تھی...... زخمی تیزی سے قلعے

میں آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان زخمیوں کی جگہ لینے کے لئے تازہ دم جوانوں کو باہر بھیجنا ضروری ہے۔ میں انور خاں سے اجازت لے کر نیچے چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بے شمار مسلح افراد میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان کا جوش وخروش دیدنی تھا...... میں نے ایک کمان دار سے کہا کہ وہ فوری طور پر سو ڈیڑھ سو افراد کا دستہ تیار کرے اور دفاع کرنے والوں کو کمک مہیا کرے۔

میرے کہنے کی دیر تھی کہ اس ہدایت پر عمل ہو گیا۔ دو منٹ کے اندر ایک لہریئے دار جھنڈے کے نیچے ڈیڑھ دو سو جنگجو جمع ہو گئے اور پھر اپنے کمان دار کے عقب میں گھوڑے دوڑاتے قلعے سے باہر نکل گئے۔ جوں جوں لڑائی کی شدت بڑھ رہی تھی، عمران اور چوہان وغیرہ کی سلامتی کے حوالے سے میرے خدشے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب قلعے سے صرف نصف فرلانگ کی دوری پر کئی زوردار دھماکے ہوئے۔ بھڑکنے والے شعلوں کا نارنجی عکس اب قلعے کے اندر تک پہنچ رہا تھا۔ چند گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اندر داخل ہوئے۔ ان میں مبارک علی بھی شامل تھا۔ اس کا کندھا زخمی تھا اور خون اس کے سفید لباس کو تربتر کر رہا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ادب سے سلام کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''جناب! لڑائی قلعے کے سامنے ہو رہی ہے۔ حسنات بھائی اور ان کے قریباً ایک ہزار جاں نثاروں نے کہا ہے کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ باقی سب لوگ اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر قلعے میں گھس جاویں اور دروازے بند کر لیویں۔ انہوں نے اس بارے میں آپ سے اجازت مانگی ہے......''

''عمران صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اگلی صفوں میں ہیں۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی ہے۔'' پھر مبارک علی نے اپنی خون آلود قمیص میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر بولا۔ ''عمران صاحب نے یہ رقعہ بھی بھیجا ہے آپ کے لئے۔''

میں نے جلدی سے رقعہ کھولا، اس پر بس ایک ہی جملہ لکھا تھا۔ ''میری رائے ہے کہ باہر لڑنے والوں کو اب اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔''

میں نے مبارک علی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم لوگ موقع پر موجود ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب واپس آ جانا چاہئے اور دروازے بند کر لینے چاہئیں تو ایسا کر لو۔''

مبارک علی تعظیمی انداز میں سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے چاروں پانچوں ساتھی بھی واپس چلے گئے۔ میں بالائی منزل پر انور خاں کے پاس پہنچا تو وہ شدید زخمی ہونے کے

باوجود اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مختلف دستہ سالاروں کو پوزیشن سنبھالنے کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔

......ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑائی قلعے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ پھر قلعے کے دو بڑے دروازے کھول دیئے گئے اور مزاحمت کرنے والے مسلح شہری اور جنگجو تیزی سے قلعے میں داخل ہونے لگے۔ ان میں لڑکے، کم عمر نوجوان یہاں تک کہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے لڑائی کی تربیت حاصل نہیں کر رکھی تھی، صرف اپنے جذبے اور حوصلے کی مدد سے انہوں نے کئی گھنٹوں تک حکم کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کیا تھا۔

پروگرام کے مطابق حسنات احمد اور اس کے جاں نثار ساتھیوں نے حملہ آور دستوں کو آخر وقت تک روکے رکھا یہاں تک کہ قلعے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

میں قلعے کی بالائی منزل سے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ایسے مناظر کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ جیتی جاگتی حالت میں نگاہوں کے سامنے تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں، زخمیوں کی پکاریں، جگہ جگہ پڑی ہوئی لاشیں، بارود کی بو، دھواں اور شعلے۔ شاید میں ڈیڑھ سو سال پہلے کی دہلی میں تھا۔ انگریزوں اور سکھوں نے لال قلعے کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ تاجدار ہندوستان پر آخری ضرب لگانے کے لئے اور ہمیشہ سے تاراج ہونے والی دہلی کو پھر سے تاراج کرنے کے لئے وہ اپنی توپوں کو لوڈ کر رہے تھے اور اپنی سنگینوں کو چمکا رہے تھے۔ لیکن یہ دہلی نہیں تھا، یہ بھانڈیل اسٹیٹ تھی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ مگر کیا تاریخ نے آخر تک خود کو دہرانا تھا؟

قلعے کے اندر واپس آنے والوں میں مجھے عمران نظر نہیں آیا۔ میری نگاہیں بے قراری سے اسے تلاش کرنے لگیں۔ آخر اس کی جھلک دکھائی دی اور میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ اور چوہان صحیح سلامت تھے۔ ایک گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ہونٹوں میں بڑے اسٹائل سے سگریٹ دبا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس نہایت سنگین صورتِ حال کو بھی انجوائے کر رہا ہے۔ عمران اور چوہان سیدھے میرے پاس آئے۔ دونوں کے چہرے دھوئیں اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ قلعے کے دروازے بند ہو جانے کے بعد لڑائی کچھ دیر کے لئے تھم گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے سے پہلے کمانڈر انڈر [illegible] کر رہا ہے۔

[illegible] میں [illegible] نے حسنات احمد کو [illegible] دیکھ لیا۔ وہ بھی اپنے بستر [illegible] ے

ساتھ بالکل آخری وقت میں قلع کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی...... عمران نے سگریٹ کا دھواں میری طرف چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''ٹھیک ٹھیک بتانا...... میں اس وقت فرسٹ بلڈ کے ہیرو جان ریمبو کی طرح نہیں لگ رہا؟''

''لگ رہے ہو۔ لیکن فرسٹ بلڈ میں جان ریمبو زندہ بچ گیا تھا۔ یہاں ایسا سین نظر نہیں آ رہا۔''

''جگر! تمہاری سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ ہم یہ لڑائی جیتیں گے اور زندہ بھی رہیں گے...... نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ لاہور بھی پہنچیں گے...... نہ صرف لاہور پہنچیں گے بلکہ ہفتے کی کسی خوب صورت شام کو پی سی میں بوفے ڈنر بھی کریں گے...... اور نہ صرف ڈنر کریں گے بلکہ واپسی پر میں تمہیں رکشے میں بھی بٹھاؤں گا......''

''کیا مطلب؟''

''بھئی واپسی پر تم میرے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکو گے نا۔ میرے ساتھ تو ریما جی ہوں گی۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا میں دور تک جائیں گے داو ہو ہو ہو...... جب ریما جی میرے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوں، موٹر سائیکل اڑی جا رہی ہو اور راستے میں اسپیڈ بریکر آ جائے...... تو تمہاری قسم مزہ ہی آ جاتا ہے۔ ایک بار تو شوٹنگ پر......''

یکایک رائفل کا ایک برسٹ آیا۔ کھڑکی کے تختوں میں چھید ہو گئے اور ہماری عقبی دیوار سے بہت سا پرانا پلاستر اکھڑ کر فرش پر آ گرا۔

میں اور عمران بے ساختہ نیچے جھک گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر حسنات اور چوہان بھی موجود تھے۔ بہر حال، کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''تم جب بھی جھوٹ بولتے ہو اس طرح کا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔''

''میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔''

''لیکن کہنے تو لگے تھے۔''

''مجھے لگتا ہے اینڈرسن کے فوجیوں میں ضرور کوئی ریما جی کا عاشق موجود ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا اور اپنی گر جانے والی پی کیپ اٹھا کر پھر سر پر رکھ لی۔

لڑائی کی شدت میں واقع ہونے والی کمی صرف پانچ دس منٹ تک رہی۔ اس دوران میں ہم سب نے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اچانک ہی اینڈرسن کی زیر کمان باقاعدہ فوج نے قلعے پر زبردست ہلا بول دیا۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ جدید ہتھیاروں سے لیس یہ دستے زبردست تربیت یافتہ تھے۔ وہ طوفان کی طرح قلعے کی طرف بڑھے۔ فصیل کے اوپر

سے مسلمان سپاہیوں اور مسلح نوجوانوں نے ان پر زبردست فائرنگ اور خشت باری کی۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ وہی ہوا جس کی توقع تھی اور جس کے بارے میں گیتا مکھی نے پیش گوئی کی تھی۔ اینڈرسن نے فصیل کے اسی کمزور حصے کو نشانہ بنایا جس کے سامنے ہم قوس نما خندق کھدوا چکے تھے۔ خندق سے نکلنے والی مٹی کنارے کے ساتھ ساتھ جما دی گئی تھی اور اس مٹی نے خندق کو اور بھی ناقابلِ عبور بنا دیا تھا۔

راکٹ لانچروں کے پے در پے دھماکے ہوئے۔ یہ بڑے سائز کے ڈیڑھ دو درجن راکٹ فصیل کے اسی کمزور حصے پر داغے گئے جو اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لئے ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس جگہ سے فصیل میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے اور وہ مسمار ہو گئی۔ ہر طرف دھواں اور بارود کی تیز بو پھیل گئی۔ مسمار ہونے والی فصیل کے عین سامنے قلعے کے احاطے میں ہم نے ایک مضبوط مورچا بنا رکھا تھا۔ انور خاں کے دو درجن بہترین ''لڑاکے'' اس مورچے میں میرے اور عمران کے ساتھ موجود تھے۔ جب وہی کچھ ہوا جو بندے نے سوچ رکھا ہو تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں بھی جو کچھ ہوا تھا، ہماری توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ جونہی فصیل کا کمزور حصہ مسمار ہوا، اینڈرسن کے گورے اور کالے فوجی سیلابی ریلے کی طرح اندر گھسے...... تب انہیں علم ہوا کہ ان کے لئے راستہ صاف نہیں ہے ان کے سامنے گہری خندق کی صورت میں ایک زبردست رکاوٹ موجود ہے۔ وہ رک گئے...... ان کے رکنے، پلٹنے اور پوزیشنیں سنبھالنے میں جو دو تین منٹ کا وقت لگا، اس نے ان پر قیامت ڈھا دی۔ ہمارے مورچے سے ان پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ یہ لرزہ خیز منظر تھا۔ اس وقت کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔ ٹریگر دبا کر کسی زندہ شخص پر گولی چلانا اور پھر اسے گھائل ہو کر گرتے ہوئے دیکھنا...... اور پھر دوسرے کو نشانہ بنانا۔ ان کی بے بسی، ان کی ناکام جدوجہد اور ان کی تڑپ پھڑک کو دیکھنا، یہ سب کچھ اور ہی طرح کا عمل تھا۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی آخری کرب ناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں......

تین چار منٹ کے اندر فصیل کو گرانے والے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے۔ وہاں درجنوں لاشیں گری ہوئی تھیں۔ کچھ ہلاک شدگان خندق کے اندر بھی گرے تھے۔ اس فوری صدمے سے سنبھلنے کے بعد اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں نے پیچھے ہٹ کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ میں مصروف ہو گئے۔ ایک لحاظ سے ہم قلعے پر اینڈرسن اور حکم کا پہلا بڑا حملہ روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لڑائی کی شدت میں بتدریج کمی

آتی چلی گئی۔ ظاہر تھا کہ اب اینڈرسن اور اس کے اہم کمان دار ساتھی سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور کوشش کریں گے کہ یہ رات گزرنے سے پہلے پہلے کسی اور طرف سے زوردار حملہ کیا جائے۔ قلعے کی بالائی منزل سے ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ گھیرا ڈالنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے پورے قلعے کو گھیرا ہوا تھا۔ اردگرد کی سیکڑوں عمارتوں کی چھتوں پر بھی یہ لوگ موجود تھے۔ ان کی کثیر تعداد کا اندازہ ان کی حرکت کرتی ہوئی مشعلوں اور ٹارچوں وغیرہ سے بھی ہوتا تھا۔ ان کا زیادہ اجتماع قلعے کے مرکزی دروازے کی طرف دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ سیلابی ریلے کی طرح دروازے کی طرف بڑھے اور انہوں نے دروازہ توڑنا چاہا تو تادیر انہیں روکا نہیں جا سکے گا۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''یار! اگر اب بھی نل پانی سے کوئی مدد نہ آئی تو پھر کب آئے گی؟''

''ہاں، اب تو انہیں آ جانا چاہئے......'' عمران کے بجائے چوہان نے جواب دیا۔

یہ بڑے قیمتی لمحے تھے اور ان کی قدر و قیمت ہم سب کو معلوم تھی۔ اسی دوران میں حسنات احمد کا ایک ساتھی بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس نے حسنات احمد کے کان میں کچھ کہا۔ حسنات کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جھجکتا رہا پھر میرے قریب آ کر بولا۔ ''جناب! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔''

میں اور عمران، حسنات کے ساتھ سیڑھیاں اترے۔ حسنات کے دو تین ساتھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ بھی کچھ سراسیمہ نظر آتے تھے۔ ہم قلعے کے برآمدے سے گزرے اور پھر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہ تہ خانہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شہتیر، بالے، لکڑی کے قدیم تختے، نہ جانے کیا کچھ یہاں بھرا ہوا تھا اور ان سب چیزوں کے بیچ ٹوٹے پھوٹے فرش پر گیتا مکھی کی خون آلود لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا تھا۔ گیتا مکھی کے مرمریں گالوں پر انگلیوں کے گہرے نشانوں سے واضح ہوتا تھا کہ اس کا منہ کافی دیر تک دبا کر رکھا گیا ہے۔ گیتا نیم عریاں پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سگریٹ سے داغنے کے کئی نشان بھی تھے۔

ہم حیرت اور صدمے سے گنگ کھڑے رہ گئے۔ حسنات کے ساتھی نے آگے بڑھ کر ایک گرم چادر گیتا کے خونچکاں جسم پر پھیلا دی۔

حسنات بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ گیتا مکھی ہے۔ یہ راج بھون کی خاص ملازماؤں میں سے ہے۔ یہ راج بھون میں ناچنے والی لڑکیوں کو ٹریننگ

دیوت تھی۔ اس کے سمبندھ بڑے بڑے لوگن سے تھے۔ اوہ خدایا! یقین نہیں آ رہا کہ یہ یہاں مری پڑی ہے۔''

عمران نے تاسف انگیز انداز میں کہا۔ ''اس پر دست درازی کی گئی ہے اور مارا بھی گیا ہے......''

عمران بغور موقع واردات کو دیکھنے لگا۔ حسنات کے ساتھی نے ایک گیس لیمپ اور پکڑ لیا۔ فرش پر قدموں کے نشان تھے۔ اس کے علاوہ گیتا مکھی کو گھسیٹے جانے اور مارنے پیٹنے کے شواہد بھی ملتے تھے۔ ایک نم کپڑا بھی ملا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کپڑا گیتا مکھی کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا یا ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گیتا کی ایک ہاتھ کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ عمران نے غور سے انگلیوں کا معائنہ کیا۔

''لاش سب سے پہلے کس نے دیکھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے جناب!'' حسنات کا ایک ساتھی بولا۔ ''ہمیں مشعلوں کے لئے لکڑیوں کی جرورت تھی۔ ہم یہاں آئے تو درواجے کو باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی ہم نے درواجا کھولا تو خون کی لکیر نجر آئی۔ جرا آگے بڑھے تو یہ لاش تھی۔''

''تمہیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی لاش ہے؟''

''جج...... جی ہاں۔'' دوسرا شخص بولا۔ ''یہ بڑی مشہور عورت ہیں جی۔ ہم نے ان کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی ہوئی ہیں۔''

''تم کسی پر شک کر سکتے ہو؟''

''ناہیں جی ہمیں کچھ اندازا ناہیں۔ ہم تو اس بات پر حیران ہو رہے ہیں کہ یہ لال بھون کے ناچ گھر سے یہاں اس قلعے میں کیسے پہنچی ہیں؟''

عمران کا چہرہ تو سپاٹ تھا لیکن اس کے اندر کا گہرا دکھ میں نے محسوس کیا۔ یہ جواں سال عورت جس کا نام گیتا مکھی تھا، اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اب تک ہمارے لئے سودمند ہی ثابت ہوئی تھی۔ صرف ایک رات پہلے تک یہ عمران کے ساتھ ایک تنہا کمرے میں موجود تھی اور اپنی معلومات کے عوض اس کے پیار اور قربت کی طالب ہو رہی تھی۔ اب وہ اپنی تمام خواہشات سمیت مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ وہ عمران سے اپنی خفیہ ملاقات کی وجہ سے ہی موت کا شکار ہوئی ہے۔

لاش کے بارے میں حسنات کے آدمیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد ہم اوپر واپس انور خاں کے پاس آ گئے۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دو جاں نثار

محافظ اس کی دونوں جانب چوکس کھڑے تھے۔

عمران کے اشارے پر میں نے ان محافظوں کو باہر بھیج دیا۔ اب کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ انور خاں کو اس سارے معاملے کی خبر تھی جو یہاں ہمارے اور گیتا مکھی کے درمیان ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں ہم نے خندق کھدوانے والا نہایت مفید کام کیا تھا۔

گیتا مکھی کے اس بہیمانہ قتل کی اطلاع نے انور خاں کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ بولا۔ ''میرے اندازے کے مطابق یہ کافی پیچیدہ معاملہ ہے برادرز...... میں نے تمہیں جیل میں بتایا تھا نا کہ جیل پر ہم نے ایک زبردست حملہ کیا تھا۔ اگر وہ حملہ ناکام ہوا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ہمارے اندر سے یہ غداری ہوئی۔ ہمارے شب خون کی اطلاع پہلے سے جیل کے گارڈز کو ہو چکی تھی۔ اب یہاں بھی کوئی ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔ ہمارے اندر ہی کوئی ایسا بندہ موجود ہے جو ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس بندے کو گیتا مکھی اور عمران کی ملاقات کا علم ہوا ہے اور اس کا نتیجہ گیتا مکھی کی موت کی شکل میں نکلا ہے۔''

''کون ہو سکتا ہے؟'' عمران کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

''میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' انور خاں نے کہا۔ ''جیل والے واقعے کے بعد مجھے اپنے ایک ساتھی پر شبہ تھا مگر وہ شبہ درست نہیں نکلا۔ ہاں، اس بات کا یقین مجھے اب پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ بندہ ہمارے قریبی ساتھیوں میں موجود ہے۔''

میں نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔ کون ہو سکتا تھا؟ انور خاں کے ساتھ جو لوگ یہاں زرگاں پہنچے تھے، وہ سب بھروسے کے تھے اور انہیں ہم اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ ان میں ڈاکٹر چوہان، عبدالرحیم اور اجے کمار بھی شامل تھے۔ اس کے بعد بھرت اور امرناتھ تھے۔ مالا تھی اور اس کا شوہر ستیش جواب کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مبارک علی، مخبر فیروز اور حسنات کے بارے میں بھی کسی طرح کا شبہ رکھنا غلط تھا۔ وہ انور خاں کے جاں نثار تھے اور ان کی اب تک کی کارکردگی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھی۔

ہم دیر تک اس معاملے پر غور کرتے رہے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ انور خاں کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جس شخص یا اشخاص نے جیل کا شب خون ناکام بنایا تھا، وہی اب گیتا مکھی کی دردناک موت کا بھی ذمے دار ہے...... یا ذمے دار ہیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہم سب کو حد سے زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

عمران اور انور خاں نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے حسنات اور مبارک علی کو بتایا اور ان دونوں کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ انور خاں کو بولنے میں کافی دقت ہو رہی تھی، اس لئے زیادہ تر ہدایات میری زبانی ہی جاری ہو رہی تھیں۔ ہم نے اسلحے کے گودام کی سکیورٹی تین گنا کر دی۔ دیگر اہم مقامات پر بھی نفری میں اضافہ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر چوہان جی جان سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ چند اور افراد بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان میں آنجہانی ڈاکٹر لی وان کا ایک اسسٹنٹ بھی شامل تھا۔ میں چوہان کی حوصلہ افزائی کے لئے شفاخانے کی طرف گیا۔ یہ عارضی شفاخانہ ہنگامی بنیادوں پر قلعے کے شمالی حصے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہاں دو تین جنریٹرز کا اہتمام بھی تھا۔

زخمیوں میں سے زیادہ تر کو گولیوں اور تلواروں کے زخم آئے تھے۔ ہر طرف زخمیوں کی کراہیں اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ان کو حتی الامکان طبی امداد دی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر چوہان ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر عمران نے اسے شفاخانے کے اسپیشل وارڈ میں دیکھ لیا۔ یہاں زیادہ نازک حالت والے زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ کو جلنے سے زخم آئے تھے۔ ایک زخمی کے پیٹ میں راکٹ کے پرخچے لگے تھے۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک شخص کا بازو بارودی دھماکے میں جھلس گیا تھا۔ چوہان ایک نرس کی مدد سے اس کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہولے سے اس کا کندھا تھپکا۔ وہ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے تھکن ٹپک رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بس ایک چھوٹے سے وقفے کے سوا پچھلے چوبیس گھنٹے سے کام کر رہا ہے۔ اسے آرام اور اچھے کھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ اپنا خیال نہیں رکھے گا تو پھر خود بھی مریضوں میں شامل ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، دو تین گھنٹے بعد وہ کچھ دیر کے لئے اوپر جا کر آرام کر لے گا۔

بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ مسلمانوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اونچی ذات کا ہندو ہے۔ وہ ایک مریض کے پاؤں سے بہنے والا خون اپنے ہاتھ سے صاف کر رہا تھا۔ بھرت کی شخصیت اسے ایک مختلف فرد بناتی تھی۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا میں گوروں کے جبر کا شکار ہوا تھا اور پھر یہاں پہنچا تھا۔ وہ اپنا نہیں تھا لیکن بیگانہ بھی نہیں تھا۔

میں اپنے سامنے لیٹے ایک تنومند زخمی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ اور چہرہ بھی جھلسا ہوا نظر آ تا تھا۔ پورے چہرے پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے سینے تک ایک سفید چادر کھینچی ہوئی تھی۔ اس نے چادر ہٹائی تو نیچے خطرناک سیون ایم ایم رائفل نظر آئی۔ بڑی پھرتی سے اس

نے رائفل میری اور عمران کی طرف سیدھی کی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''خبردار...... چھلنی کر دوں گا۔'' وہ دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مہارت سے گولی چلائی۔ ایک گارڈ جو رائفل سیدھی کرنی چاہ رہا تھا، الٹ کر دروازے کے پاس گرا۔ گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔

''خبردار...... اڑا دوں گا۔ اڑا دوں گا۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' رائفل بردار پھر بولا۔ اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس کی آواز نے بتا دیا کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔

بھانڈیل اسٹیٹ کا عیار ترین اور خطرناک قاتل۔ اس کا سارا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ پٹیاں یقیناً صرف چہرہ چھپانے کے لئے ہی لپیٹی گئی تھیں۔

میں نے اور عمران نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ چوہان چونکہ رنجیت کے بستر سے قریب تھا، اس نے بلا کی تیزی سے رنجیت پانڈے کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ مگر یہ جعلی مریض، اصلی ڈاکٹر کو مات دے گیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان اپنا ہاتھ پانڈے کی رائفل تک پہنچاتا، سیون ایم ایم کی گولی اس کی پیشانی توڑ کر اندر گھس گئی۔ رائفل پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔

اس سے بہت پہلے کہ چوہان کا جسم فرش سے ٹکراتا، پانڈے کی رائفل پھر ہماری طرف سیدھی ہو چکی تھی۔ وہ ذرا سا موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میری سکتہ زدہ نظریں چوہان پر جمی تھیں، اس کی پیشانی سے خون کی پہلی بوندیں خارج ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر پانڈے پر جھپٹتا، میری گردن سے کوئی سخت چیز آ لگی۔ ''خبردار! گولی مار دوں گا۔'' عقب سے ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ عبدالرحیم کی آواز تھی۔ میں نے اور عمران نے تقریباً ایک ساتھ ہی مڑ کر دیکھا۔ عبدالرحیم ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور سفاکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں ایک اور مریض اچھل کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چھوٹے بیرل کی رائفل نظر آئی۔

ڈاکٹر چوہان کی اچانک موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ میں برداشت کھو دوں گا اور کچھ ایسا ہو جائے گا جو نہیں ہونا چاہئے...... لیکن عمران کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ اور اس کے تاثرات دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا...... اس سچویشن میں مزاحمت کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ سفید پٹیوں کے اندر سے پانڈے کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں...... اور یہ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ ان کے اندر خون کی

پیاس...... جنون بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جنو، ان نازک لمحوں میں کوئی بھی قیامت برپا کر سکتا تھا۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔

ایک بار پھر رنجیت پانڈے نے بیدردی سے کئی بار رائفل کا ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے سات آٹھ بار ''ٹھک ٹھک'' کی آواز بلند ہوئی۔ اس اسپیشل وارڈ میں موجود پانچ چھ مریض پلک جھپکنے میں زندگی سے موت کی طرف روانہ ہو گئے۔ پانڈے نے بڑی مہارت سے ان کے سینوں یا سروں میں گولیاں ماری تھیں۔ یہ بربریت کی انتہا تھی۔ عبدالرحیم اور پانڈے کے دوسرے ساتھی کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ جدید رائفلیں تھیں، ایک سیکنڈ میں گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتی تھیں۔ ان کی موجودگی میں صبر کا دامن چھوڑنے کا مطلب، خود موت کے جبڑوں میں اپنا سر دے دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یہ دردناک منظر تھا وارڈ میں موجود کم و بیش چھ مریض جو پہلے ہی اپنے جان لیوا زخموں کی وجہ سے کراہ رہے تھے، تین چار سیکنڈ کے اندر خون میں نہا گئے۔ ایک درمیانی عمر کے باریش شخص نے سینے پر گولی کھانے کے باوجود اٹھنے کی کوشش کی مگر پانڈے کی اگلی گولی نے اس کی شہ رگ چیر کر رکھ دی اور وہ بستر سے گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

''چلو آگے لگو میرے پو۔'' پانڈے نے مجھ سے مخاطب ہو کر جنونی لہجے میں کہا۔ اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کے درمیان جیسے ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اکثر اوقات ہم بغیر کچھ کہے سنے بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے...... شاید اکثر دوست جو پُرہنگام حالات میں زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور کٹھن واقعات کا سامنا کرتے ہیں، اسی طرح ایک دوسرے کے رمز شناس ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں نے پانڈے کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل کیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔

یہ لوگ ہمیں اندرونی سیڑھیوں کی طرف لے گئے۔ یہ نسبتاً تنگ اور تاریک سیڑھیاں تھیں۔ ہم قلعے کی بالائی منزل پر پہنچے۔ جب ہم ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے، کئی افراد نے ہمیں اس حالت میں دیکھا اور حیران ہوئے لیکن ان افراد میں سے کوئی بھی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کر سکا۔ یہ سب لوگ چونکے ضرور لیکن اس سے پہلے کہ ان کا چونکنا کسی طرح کی کارروائی کا سبب بنتا، ہم اس کمرے میں داخل ہو چکے تھے جہاں انور خاں ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ مبارک علی بھی اس کے پاس موجود تھا اور اس کے زخمی کندھے کی پٹی بدل رہا تھا۔

اس سچویشن نے ان دونوں کو بھی بری طرح چونکایا۔ اندر داخل ہوتے ہی پانڈے نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کھڑکیوں کو بھی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ کمرے میں موجود ایک گارڈ نے جاں بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہولسٹر سے پستول نکالا...... مگر اس کے پستول سیدھا کرنے سے پہلے ہی ٹھک کی منحوس آواز بلند ہوئی اور یہ گارڈ ماتھے پر گولی کھا کر ایک میز پر گرا اور اسے چکنا چور کر کے فرش بوس ہو گیا۔

''میرا نشانہ چوکتا ناہیں حرامجادو۔ گولی چلا کر اڑتی مکھی کا پر کاٹتا ہوں۔'' پانڈے زہری ناگ کی طرح پھنکارا۔ لگتا تھا کہ وہ آج سفاکی کی ہر حد سے گزرنے کو تیار ہے۔

اس نے اپنے چہرے کی طویل پٹیاں اتار کر ایک طرف پھینک دیں۔ وہ ایک بیگی ٹائپ جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا اس نے جیکٹ کے اندر سے لوہے کے دو کڑے نکالے۔ دیکھنے میں یہ کڑے بائیسکل کو لگائے جانے والے تالے کی طرح لگتے تھے مگر اس تالے سے کچھ بڑے تھے۔ اسٹیل کے بنے ہوئے ان کڑوں کی ایک جانب ایک ڈیجیٹل میٹر بھی بنا ہوا تھا اور ہندسے حرکت کر رہے تھے۔ پانڈے نے اپنی قاتل رائفل ہماری طرف سیدھی رکھی اور ایک کڑا اپنے تنومند ساتھی کو تھما دیا...... اس نے آگے بڑھ کر اسٹیل کا یہ کڑا شدید زخمی انور خاں کی گردن میں پہنا دیا۔ ''کھٹ'' کی آواز سے کڑا لاک ہوا اور اس پر ایک سرخ بلب جل اٹھا۔ یہ سارا عمل بس چار پانچ سیکنڈ کے اندر مکمل ہو گیا۔

دروازے سے باہر ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ پھر حسنات احمد کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''مبارک! دروازہ کھولو...... کون ہے اندر؟''

جب حسنات نے یہ فقرہ دو تین بار دہرایا تو پانڈے کرخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پپو! دیکھتا کیا ہے۔ سسرے کھڑکی کھول...... اور اس ذلیل سے بول کہ ابھی کچھ دیر چھری کے نیچے سانس لے۔ اندر انور خاں کی ماں، بہن کے ساتھ جروری کام ہو رہا ہے۔''

میں نے یہ فقرہ بمشکل برداشت کیا اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ فی الحال پانڈے کی ہدایت پر عمل کرنا ہی مناسب ہے۔

میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ باہر حسنات اور مبارک کے مشتعل ساتھیوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہر ایک کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

''کھبر دار! کوئی فالتو بات کی تو تیرا گندا بھیجا دیوار سے چپکا دوں گا۔'' پانڈے پھنکارا۔

میں نے حسنات سے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔

ابھی تھوڑی دیر میں دروازہ کھولتے ہیں۔''

''لیکن...... آپ پر رائفلیں اٹھانے والے یہ لوگ کون ہیں؟ اور ان میں سے ایک تو شاید عبدالرحیم ہے۔''

''ہاں...... وہ بھی ہے لیکن اب معاملہ طے ہو رہا ہے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے حسنات احمد کو تسلی دی۔

''ہمارے پاس زیادہ ٹائم ناہیں ہے جی۔ بڑے دروازے کے سامنے اینڈرسن کے لڑاکا دستے جمع ہو رہے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہلا بول سکت ہیں......'' حسنات نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ وقت ناہیں لگائیں گے۔'' میں نے کہا اور کھڑکی بند کر دی۔

پانڈے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر جلنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ اس نے پسپا ہوتے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں گھسنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نے ایک زخمی کی حیثیت سے اپنا منحوس تھوبڑا پٹیوں میں لپیٹ لیا تھا اور یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کی عیاری اور خطرات پسندی کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ درست ثابت ہوا تھا۔ نل پانی کے دیوان کی طرح وہ یہاں بھی بے خوف گھس آیا تھا اور اب ایک جنونی قاتل کی حیثیت سے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دائیں طرف عبدالرحیم کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اسی بدترین شخص کا چہرہ تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے اندر رہا ہے اور آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق پیچھے کی طرف پلٹتے جائیں، یہ شخص اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ ہر کٹھن وقت میں پایا جائے گا۔ عبداللہ بن ابی سے لے کر میر جعفر اور میر صادق تک، اور پھر وہاں سے لے کر موجودہ دور کے نامی گرامی غداروں تک یہ شخص ہر جگہ کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ یہاں بھی انور خاں کے قریبی ساتھی عبدالرحیم کی صورت میں موجود تھا۔ اب اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ انور خاں کا یہی ساتھی تھا جس نے جیل پر کئے جانے والے زوردار حملے کو ناکام بنایا تھا۔ یقیناً اینڈرسن یا مینارڈ جیسے کسی شاطر گورے نے اسے ''چمک'' دکھا کر اپنے جال میں پھنسایا تھا اور بازی پلٹی تھی۔

میں نے عبدالرحیم کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بھی پوری ڈھٹائی سے میری طرف دیکھ رہا تھا...... دو دن پہلے یہ شخص میرے گلے لگ کر رویا تھا اور سلطانہ کی موت پر آنسو بہائے تھے۔ آج یہ بڑے طمطراق سے مجھ پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اپنے آقاؤں کے ایک اشارے پر یہ میرے جسم میں ایک درجن سوراخ کر سکتا تھا۔ اب یہ بات بھی ثابت تھی کہ گیتا مکھی کی موت

کا ذمے دار بھی یہی عبدالرحیم ہے۔ جب گیتا کھی، عمران سے ملاقات کے لئے کمرے میں داخل ہوئی تھی...... یہ کمرے سے باہر پہرے والوں کے ساتھ موجود تھا۔

پانڈے نے سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے بولا۔ ''پپو! میرا خیال ہے کام کی بات کرلیویں۔ ہمارے پاس جیادہ سمے نا ہیں ہے۔ ویسے بھی تم سب کو بڑے جور کی لگ رہی ہووے گی۔ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسٹیل کا کڑا ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسٹیل کا کڑا ہے اور مجے کی بات یہ ہے کہ اسٹیل صاحب کا ہی بنایا ہوا ہے مرنے سے پہلے یہ آخری تحفہ وہ تم دونوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے پوری آشا ہے کہ جب یہ تحفہ تم دونوں کی دم میں نمدہ فٹ کرے گا تو اسٹیل صاحب کی آتما کو جرور شانتی ملے گی۔''

''جو بکواس کرنی ہے صاف صاف کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ کڑا عجت مآب جناب خان صاحب کی گردن میں فٹ ہو چکا ہے۔ اس میں جبردست قسم کا دھماکا خیج مواد ہے یہ پھٹے گا تو خان صاحب کے چیتھڑے اڑا جاویں گے۔ ان کے شریر (جسم) کے سارے ظاہری اور پوشیدہ ٹکڑے اڑ اڑ کر اس کمرے کی دیواروں سے چپکیں گے۔ یہ دیکھ لو، اس کے اوپر میٹر چل رہا ہے۔ الٹی گنتی ہو رہی ہے۔ صرف اور صرف تیس منٹ ہیں تم لوگن کے پاس...... بلکہ اب تیس بھی کیا صرف ستائیس رہ گئے ہیں۔ اب تم دونوں کے ذلیل دماغوں میں جرور آئے گا کہ اپنے خان صاحب کی جان اس کڑے سے کیونکر چھٹروائی جاوے...... تم سوچو گے کہ کسی طرح ہمیں ''ناک آؤٹ'' کر دو اور پھر یہ کڑا خان صاحب کی گردن شریف سے اتار پھینکو...... لیکن ایک بات میں تم کو بالکل صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ یہ کڑا کسی بھی طرح خان صاحب کی گردن سے اتارنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جاوے گا...... اس کو کھولنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ بس ایک ہی......''

ہم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی حرکات وسکنات اور اپنے لب و لہجے سے وقعی بے حد خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمارے چہرے دیکھے پھر اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی چابی وابی نا ہیں ہے۔ اس کی چابی اس کا کوڈ ہے۔ بارہ ہندسوں کا کوڈ...... اور وہ کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں...... ''اور یہ کمینہ پن میں نے اپنے تک نا ہیں رکھا۔ آگے بھی چلایا ہے۔ بھگوان کی کرپا سے زرگاں کے آدھے

سے جیادہ کمینے بچے میرے ہی چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں بہت سے غیر قانونی سالے ہیں میرے۔ یہ عجت مآب خان صاحب بھی ان میں سے ایک ہو سکتے ہیں......'' اس کے لہجے میں زہر تھا اور آگ تھی۔

انور خاں سے یہ ریمارکس برداشت نہیں ہوئے۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی پانڈے نے بے دریغ گولی چلائی۔ ''ٹھک'' کی آواز کے ساتھ گولی انور خاں کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ''حرامجادے! اگلی گولی سے تیرا نایل پھوڑ دوں گا۔''

انور خاں کا چہرہ سرخ...... انگارہ ہو گیا لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ ان لمحوں میں دلیری دکھانا، ہوش وحواس کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

رنجیت پانڈے کا پارا چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اس کڑے کو کھولنے کا کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور وہ کہیں لکھا ہوا نا ہیں ہے۔ بس یہاں ہے یہاں...... میرے کھوپڑے میں۔'' اس نے انگلی سے اپنی کنپٹی کو ٹھونکا۔ ''اگر تمہارے گندے دماغوں میں مجھے مارنے کا کیڑا رینگ رہا ہے تو اس کیڑے کو کچل دو کیونکہ اگر کسی وجہ سے میں مر گیا تو تمہارے اس خان صاحب کو دو ڈھائی ہجار ٹکڑوں میں بٹنے سے کوئی نا ہیں بچا سکے گا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی بتا دیوت ہوں پپو۔ پہلے تم دونوں کے کھوپڑوں میں گھسے ہوئے شک کا کچومر تو نکال دوں۔ مجھے پتا ہے تم دونوں بوگیر کتوں جیسے ہو۔ بڑی دور دور کی بو سونگھنے کی کوشش کرت ہو۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس کے ثبوت کے لئے یہ دوسرا ''اسٹیل رنگ'' حاجر خدمت ہے۔''

اس نے وہ دوسرا کڑا ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کڑے پر بھی بالکل دوسرے کڑے کی طرح ڈیجیٹل میٹر لگا ہوا تھا۔ اس نے اس کڑے کو لاک کیا۔ اس پر سرخ بلب روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میٹر پر الٹی گنتی شروع ہو گئی۔

''پچیس...... چوبیس...... تیئس......

رنجیت بولا۔ ''تم دونوں کے والد ہورگ باشی اسٹیل صاحب نے یہ بڑے کمال کی چیز بنائی ہے۔ یہ دیکھو، اس ''رنگ'' پر پچیس سیکنڈ کا ٹائم فکس تھا۔ پندرہ سیکنڈ گزر چکے، دس سیکنڈ باقی ہیں۔ لو اس کی کارکردگی ملاحجہ کرو۔'' اس نے احاطے کی طرف والی کھلی کھڑکی میں سے اسٹیل رنگ باہر پھینک دیا۔ احاطے میں یقیناً یہ اسٹیل رنگ لوگوں کے درمیان ہی گرا ہوگا۔

کچھ کرنے یا کہنے سننے کا وقت ہی نہیں تھا۔ پانچ چھ سیکنڈ بعد ایک زبردست دھماکا ہوا۔ دھماکے کے ساتھ تیز چمک بھی تھی۔ بچوں اور عورتوں کے چلانے کی کرب ناک آوازیں بلند ہوئیں۔ احاطے کے اس حصے میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ انسانی گوشت کا ایک ٹکڑا کھڑکی کے پٹ سے آ چپکا تھا۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ کپڑے کی ایک دھجی بھی تھی۔ یہ شاید کسی بچی کا پھول دار فراک تھا۔

پانڈے کے چہرے پر درندگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کتنا بھیانک شخص ہے۔ نل پانی میں میرے ساتھ لڑتے ہوئے وہ کسی وجہ سے پسپا تو ضرور ہوا تھا مگر پسپا ہوتے ہوتے بھی ایک خوف ناک بم بلاسٹ کر گیا تھا جس میں درجنوں افراد کی جان گئی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میرا وچار ہے کہ اب تمہیں وشواس ہو گیا ہوگا کہ یہ کوئی ناٹک نہیں ہے۔ خان صاحب کی گردن شریف میں جو پٹا ڈالا گیا ہے، وہ جوروان کے جسم کے پوشیدہ ٹکڑوں کو اس کمرے کی دیواروں اور چھت سے چپکائے گا۔'' پھر اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اور اب ہمارے پاس بچا ہے فقط بیس منٹ کا سمے۔ ان بیس منٹوں کے اندر تمہیں اس قلعے کا بڑا درواجا کھلوانا ہے اور اس سارے معاملے کو بغیر لڑائی مار کٹائی اور جیادہ خون خرابے کے حل کرنا ہے۔ اور میں جانت ہوں کہ یہ کام عجت آب جناب خان صاحب کر سکت ہیں یا تم کر سکت ہو۔'' اس نے اپنی بھدی کالی انگلی میری طرف سیدھی کی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی کی رگ ابھری ہوئی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔

''تم چاہتے ہو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیں؟'' عمران نے کہا۔

''یہ گلا کاٹنا ناہیں ہووے گا۔ یہ جندہ رہنے کا اور امن شانتی کا معاہدہ ہووے گا۔ اینڈرسن صاحب بہادر کی طرف سے یہ وچن ہے کہ درواجا کھول دیا جاوے تو کسی عورت، مرد، بچے سے کوئی جیادتی ناہیں ہووے گی۔ عام معافی کا اعلان کیا جاوے گا۔''

انور خاں پھنکارا۔ ''حکم جیسے دغا باز اور اینڈرسن جیسے عیار لومڑ کی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی دیوانہ ہی ہوگا۔ اینڈرسن اپنی گندی زبان سے پہلے بھی ایسے بہت سے وعدے کرتا رہا ہے..... اور یہی کام جارج گورا کا ہوا کرتا تھا.....''

''دیکھو خان صاحب! یہاں لمبا بھاشن ناہیں چلے گا۔ سمے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں تم کو صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ ہمارے فوجی دستوں نے اندر تو آنا ہی آنا ہے۔ یہ درواجا

کھلے گا ناہیں تو پھر ٹوٹ جاوے گا۔ اور اگر یہ ٹوٹے گا تو پھر بہت برا ہووے گا۔ یہاں کیچڑ ہو جاوے گا تم لوگن کے خون سے۔ اور اس کیچڑ پر تمہاری روتی چلاتی عورتوں سے برا بھلا بھی کریں گے ہمارے سینک۔ خود پر اور اپنے بال بچوں پر کرپا فرماؤ۔ درواجا کھلوا دو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی صورت نہیں۔'' انور خاں کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ بم پھٹتا ہے تو پھٹنے دو۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔''

پانڈے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم کیا کہتے ہو پپو؟ تمہیں بھی جناب خان صاحب کے جیون کی کوئی پروا نہیں؟ یہ محترم خان صاحب ہی ہیں جن کی لعنتی شخصیت کی وجہ سے زرگاں کے یہ مُسلے یک جان ہیں، ورنہ یہ گندی نالے کے کیڑے ایک جگہ جمع ہونے کے بجائے زرگاں کی ایک سو دس نالیوں میں علیحدہ علیحدہ بہہ رہے ہوتے۔''

انور خاں کی گردن میں ''اسٹیل رنگ'' تھا اور اس ''رنگ'' کا ڈیجیٹل میٹر بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وحشت ناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینا چمکنے لگا ہے۔ پانڈے نے دونوں راستے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیئے تھے۔ ہمیں قلعے کا بڑا دروازہ کھلوانا تھا یا پھر اپنی اور انور خاں کی موت کو قبول کرنا تھا۔ ہمارے یعنی میرے، عمران اور بھرت وغیرہ کے لئے تو پھر بھی چانس موجود تھا۔ ہم پانڈے اور اس کے دونوں ساتھیوں پر غلبہ پانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر انور خاں کی زندگی تو سو فیصد نشانے پر تھی۔ ہم کسی طرح پانڈے، عبدالرحیم اور تیسرے شخص کو بے بس کر بھی لیتے تو انور خاں کا کیا کرتے..... پانڈے بتا چکا تھا کہ اس بلاسٹ ڈیوائس کی الٹی گنتی کو بس کوڈ لگا کر ہی بند کیا جا سکتا ہے اور کوڈ بس پانڈے کو معلوم تھا۔ ہم پانڈے کو جان سے مار کر بھی انور خاں کو نہیں بچا سکتے تھے۔

''اب صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔'' پانڈے نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''چابیاں نکالو اور درواجا کھلواؤ۔ ورنہ کچھ باقی ناہیں بچے گا اور خان صاحب کی موت کی تو پوری گارنٹی ہے۔''

عبدالرحیم رائفل تھامے، کمرے کے کونے میں بالکل چوکس کھڑا تھا۔ وہ بکا ہوا شخص تھا اور اس کی آنکھوں میں بے غیرتی ناچ رہی تھی۔ وہ ایک عام سا شخص تھا لیکن اپنے ہم وطنوں سے بے وفائی کا تمغہ سینے پر سجا کر وہ عام نہیں رہا تھا۔ گھر کا بھیدی ہونے کی حیثیت سے وہ انور خاں کو اور ہم سب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکا تھا۔

کمرے سے باہر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اندر کی صورتِ حال جاننے کے لئے بے قرار تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ کچھ دیر پہلے کمرے کی کھڑکی سے احاطے میں کوئی

مہلک چیز پھینکی گئی ہے جس سے زبردست بلاسٹ ہوا ہے اور لوگوں کی جانیں گئی ہیں۔ یقیناً ہماری سلامتی کے حوالے سے بھی باہر کے لوگوں کے خدشات بڑھتا جارہے تھے۔

ہمارے اور پانڈے کے درمیان اعصاب شکن مکالمہ ہوا۔ انور خان کے گلے میں آویزاں ''اسٹیل رنگ'' کو ''ڈی ایکٹی ویٹ'' کرنے کے لئے پانڈے کی بس ایک ہی شرط تھی۔ قلعے کا دروازہ کھلوا دیا جائے اور اینڈرسن کے دستوں کو پُرامن طریقے سے اندر آنے کی اجازت دی جائے...... یہ شرط ہمارے لئے اور خاص طور سے انور خان کے لئے کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ وہ ایک حوصلہ مند حریت پسند تھا زرگاں میں اس کی جدوجہد کی داستان طویل تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی درجنوں بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ چکا تھا۔ اس نے آج بھی جان ہتھیلی پر رکھ دی تھی...... اور ڈیجیٹل میٹر تیزی سے پیچھے کو جارہا تھا۔ اب صرف آٹھ منٹ کا وقت باقی تھا۔ پانڈے پھنکارا۔ ''صرف آٹھ منٹ...... اس کے بعد خان صاحب کی رخصتی تو یقینی ہے...... پھر تم تینوں کو بھی باری باری جانا پڑے گا۔''

''لیکن تم......''

''لیکن...... کچھ ناہیں۔''

پانڈے نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''اب ساڑھے سات منٹ ہیں۔ اس میں تم بڑی مشکل سے دروازے تک پہنچ سکو گے اور اسے کھلوا سکو گے...... جونہی دروازہ کھلے گا، میں کوڈ لگا کر گنتی اسٹاپ کردوں گا۔ جلدی کرو۔ اب اٹھ جاؤ۔''

وہ خبیث اپنے مؤقف سے ایک ملی میٹر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا اور وقت واقعی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی صورت حال کے بے پناہ دباؤ کو محسوس کررہا تھا۔ اب یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ اگر ہم دروازہ نہیں کھلوائیں گے تو کم از کم انور خان تو فوری طور پر موت کے منہ چلا جائے گا۔

''ٹھیک ہے۔'' عمران نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''پانڈے! تم تھوڑی دیر کے لئے اسے اسٹاپ کرو تاکہ ہمیں دروازے تک پہنچنے اور اسے کھلوانے کے لئے مناسب وقت مل سکے۔''

''یہی تو پرابلم ہے پپو کے یار! اس ڈیوائس کو بس ایک ہی دفعہ آن اور ایک ہی دفعہ آف کیا جاسکت ہے۔ اگر میں نے اسے ایک بار آف کردیا تو پھر یہ میرے لئے اتنا ہی بیکار ہو جاوے گا جتنا کسی ہیجڑے کے لئے منگل سوتر ہوتا ہے۔ میں تم سے پھر کہوت ہوں۔ اب بھاگو یہاں سے، وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔''

''او کے...... او کے۔'' عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آؤ تابی!''

ہم مڑ کر دروازے کی طرف بڑھے اور یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ میری چھٹی حس مجھے پہلے سے خبردار کررہی تھی کہ عمران کچھ کرنے والا ہے اور اس نے کر دیا تھا۔ میں نے اس کا وہی خطرناک روپ دیکھا جو دیکھنے والوں کو مبہوت کردیتا تھا۔ عبدالرحیم کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تڑپ کر اس کی رائفل پر ہاتھ ڈالا۔ یہ ایسی برق رفتار حرکت تھی جس کی تیزی کو شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جاسکے۔ عمران نے بیرل کو تھاما۔ یہی وقت تھا جب عبدالرحیم کی انگلی بے ساختہ ٹریگر پر دب گئی۔ عمران شاید جانتا تھا کہ یہ ہوگا۔ اس نے بیرل کا رخ اپنی مرضی کے رخ پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ رائفل سے چھ گولی کا برسٹ چلا اور پانڈے کے لحیم شحیم ساتھی کو چھلنی کرگیا۔ چند گولیاں کھڑکی کے تختوں سے پار ہوگئیں میں پانڈے سے قریب تھا۔ پوری طاقت اور تیزی سے اس پر جا پڑا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزری۔ میں نے اسے دوسری بار ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا۔ پانڈے کی اپنی ہی رائفل کا آہنی بیرل، وزنی سائیلنسر سمیت اس کے چہرے پر لگا۔ یہ اتنی بھرپور ضرب تھی کہ میں نے پانڈے کی ناک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ وہ پشت کے بل پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے گھٹنے کی طوفانی ضرب اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ یہ بھی ایک بے مثال ضرب تھی۔ زرگاں میں ان گنت ناجائز بچوں کا مبینہ باپ گھٹنوں کے بل گرا لیکن...... اس نے ابھی تک اپنی رائفل نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ایک بار پھر رائفل میری طرف سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر تب تک عمران...... طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عبدالرحیم سے چھینی ہوئی رائفل کا دستہ گھما کر پانڈے کی کھوپڑی پر مارا۔ وہ اچھل کر اپنے مردہ ساتھی کے پہلو میں گرا۔ اس مرتبہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ تاہم گرتے ساتھ ہی وہ یوں اٹھا جیسے اس کے پورے جسم میں اسپرنگ لگے ہوں۔ وہ بلاخیز رفتار سے عمران کی طرف آیا۔ عمران نے اس پر لاٹھی کی طرح رائفل چلائی مگر وہ جھک کر بچ گیا۔ اس کے کندھے کی ٹکر عمران کے سینے پر لگی۔ دونوں اوپر تلے فرش پر گرے۔ چند سیکنڈ کے لئے ان دونوں کے درمیان زبردست کشمکش نظر آئی۔ دونوں لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھے مگر پھر عمران کا داؤ چل گیا۔ وہ پلٹ کر پانڈے کو اپنے نیچے لے آیا۔ اور یہی وقت تھا جب وہ کچھ ہوا جس کی توقع مجھے یا عمران کو نہیں تھی۔ پانڈے نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور اپنے مردہ ساتھی کے ہولسٹر میں سے اچانک پستول کھینچ لیا۔ بس ایک سیکنڈ کی بات تھی، وہ گولی عمران کے سر پر ٹھونک سکتا تھا۔ پانڈے کی رائفل اب

میرے ہاتھ میں تھی۔ میں...... جان گیا کہ اگر ایک سیکنڈ کے اندر میں نے یہ رائفل استعمال نہیں کی......اور بالکل درست استعمال نہیں کی تو میں عمران کو کھو دوں گا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے ایک بار پھر ''ٹھک'' کی ہلاکت خیز آواز بلند ہوئی۔ گولی کھا کر پانڈے کا سر ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ اس کی کنپٹی میں موت کا روشن دان کھل گیا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ......مردہ چھپکلی کی طرح واپس، پٹ سے فرش پر گرا۔ اس کی کنپٹی بڑی سرعت سے سرخ ہوتی چلی گئی۔ زرگاں میں ہمارا خطرناک اور مکارترین دشمن موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور یہ سب کچھ حیران کن سرعت سے ہوا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب مجھے اور عمران کو ایک ساتھ صورتِ حال کی بدترین سنگینی کا احساس ہوا۔ انور خاں کی زندگی خطرے میں تھی۔ انور خاں کے گلے میں مقفل ہو جانے والے ''اسٹیل رِنگ'' کا میٹر چل رہا تھا اور سرخ بلب روشن تھا۔ اب صرف چھ منٹ باقی تھے۔ پانڈے نے کہا تھا کہ اس میٹر کی الٹی گنتی کو روکنے کا کوڈ صرف وہ جانتا ہے اور اگر اس ''اسٹیل رِنگ'' کو کسی بھی طرح انور خاں کی گردن سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جائے گا۔ اور قرائن سے لگتا تھا کہ پانڈے کی دونوں باتیں درست تھیں۔ عمران نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حسنات اور مبارک علی سمیت کئی افراد اندر آ گئے۔ اندر پڑی ہوئی خونچکاں لاشوں نے ان سب کو ششدر کر دیا۔ ان میں سے صرف عبدالرحیم کے جسم میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی...... باقی پانڈے سمیت داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ عبدالرحیم کا سر بھی عمران کی ایک سخت ضرب کی وجہ سے پھٹ چکا تھا۔ عمران نے تیزی سے پانڈے کے لباس کی تلاشی لی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ پانڈے نے بارہ ہندسوں والے جس کوڈ کی بات کی تھی، وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا اور پانڈے کی جیبوں میں موجود ہو لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی ہم کوئی ایسا نمبر نہیں ڈھونڈ سکے۔ اسی دوران میں حسنات اور مبارک وغیرہ بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ میں نے حسنات کو تیزی سے باہر نکلتے اور ایک جانب اوجھل ہوتے دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص بات آئی تھی۔

حسنات جس تیزی سے گیا تھا، اسی تیزی سے واپس آ گیا۔ وہ کسی قریبی کمرے سے چند انگریز قیدیوں کو ہانک کر لایا تھا۔ ان میں دو لڑکیاں اور تین مرد تھے۔ ان کے چہروں پر چوٹوں کے نشان تھے۔

حسنات نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل کے ساتھ ہیں جی۔ اس کے ساتھ لیبارٹری میں کام کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی اس

رِنگ کے کوڈ کے بارے میں جانتا ہووے گا۔''

میں نے بغور ان پانچوں افراد کو دیکھا۔ ان میں سے دو نوجوان تھے، باقی ادھیڑ عمر تھے۔ ایک بھوری داڑھی والے کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ یہ گرفتار شدگان تھے۔ اب بھی ان کی طرف تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ بظاہر ان کی تن فن ختم ہو چکی تھی مگر اندرونی اکڑ باقی تھی۔ شاید یہ اکڑ مغربی ممالک کے باشندوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر خود کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ ہزیمت اٹھا کر بھی وہ اپنی گردن کا تناؤ برقرار رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جلد ہی ان کی شکست جیت میں بدل جائے گی۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے چند سیکنڈ بعد ہی یہ پانچوں افراد یہاں کی سنگین ترین صورتِ حال کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ بستر پر نیم دراز انور خاں کی گردن میں موت کا پھندا موجود ہے اور ہندسے تیزی سے پیچھے کی طرف حرکت کر رہے ہیں۔ سرجن اسٹیل اس قسم کے جتنے بھی منحوس آلات تخلیق کرتا تھا، وہ انہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسٹیل کے اس مہلک رِنگ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کا کوڈ ان میں سے کسی کو معلوم ہو۔

میں نے اور عمران نے ان پانچوں سے بڑی تیزی کے ساتھ اس بارے میں سوالات کئے۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اس الیکٹرانک رِنگ کو کوڈ کے ذریعے پھٹنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن کوڈ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ یا معلوم تھا اور وہ بتا نہیں رہے تھے۔ یہ بڑے دردناک لمحات تھے۔ ہماری پیشانیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ میں نے بھوری داڑھی والے کے سر پر رائفل کی نال رکھ دی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے۔ کوڈ بتا دو۔''

''میں نہیں جانتا۔ میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا یہ ڈیوائس تم لوگوں نے نہیں بنایا؟ اس کے کل پرزے تم نے نہیں جوڑے؟''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اس کام کی دوسری اسٹیج میں شریک رہا ہوں مگر کوڈ کی تفصیل مجھے پتا نہیں۔ اگر تم مجھے اس کوڈ کی وجہ سے مارو گے تو یہ غلط وجہ ہوگی۔''

میں نے کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت کے بال پکڑے۔ وہ انگریزی میں بولی۔

''مجھے نہیں معلوم مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس میں کوئی کوڈ لگتا ہے...... اگر...... اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس شخص کی جان بچانے کے لئے بتا دیتی۔''

وہ سارے کوڈ کی جانکاری سے انکاری تھے۔ اور وہ سب قریبی ماتحتوں کی حیثیت سے سرجن اسٹیل کی شعبدہ ساز لیبارٹری میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو

رہی تھی۔

اب تین ساڑھے تین منٹ کا وقت باقی رہ گیا تھا۔انور خاں نے کراہتے ہوئے کہا۔
''اب تم لوگ کمرے سے باہر چلے جاؤ۔میرے ساتھ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے۔''
اس نے اصرار کے ساتھ ہم سب کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔وہ قیامت کی ساعتیں تھیں۔
وہ بے بسی کا عروج تھا۔زرگاں کا ہر دل عزیز حریت پسند، جبر کی آنکھوں میں ہر پل آنکھیں ڈال کر رکھنے والا انور خاں موت کے منہ میں تھا اور ہم اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

اچانک کرشمہ ساز عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔اس نے رائفل کا دستہ ایک انگریز قیدی کی پیٹھ پر رسید کیا اور اسے واپس انور خاں کے کمرے میں دھکیل دیا۔اس ہٹے کٹے شخص کو پانڈے کی لاش سے ٹھوکر لگی اور وہ انور خاں کے بستر کے قریب گرا۔پھر عمران نے ایک دوسرے قیدی کی پیٹھ پر لات رسید کی اور اسے بھی کمرے میں پھینک دیا۔

وہ گرجا۔''ان سارے حرامزادوں کو کمرے میں پھینکو۔اگر انور خاں جائے گا تو پھر یہ بھی ساتھ جائیں گے۔''

یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ڈیجیٹل میٹر کی الٹی گنتی اب دو منٹ تک پہنچ چکی تھی۔ہم نے پانچوں انگلش ٹیکنیشنز کو دھکیل کر انور خان والے کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔قیدی ٹیکنیشنز کے رنگ برف کی طرح سفید ہو گئے۔وہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔انور خاں کے ساتھ ہی وہ بھی ''اڑنے'' والے تھے۔موت کو عین سامنے دیکھ کر ان کا صبر وتحمل اور ٹھہراؤ جواب دے گیا۔وہ دہائی دینے لگے۔اندر سے دروازہ پیٹنے لگے۔شارٹ اسکرٹ والی نوجوان انگریز لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔
یہ سارے مناظر ہم کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے۔
''اسٹیل رِنگ'' کا میٹر پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ایک منٹ تیس سیکنڈ...... ایک منٹ پچیس سیکنڈ...... ایک منٹ بیس......

موت آتی ہوئی نظر نہیں آتی...... لیکن یہاں اس کمرے میں وہ نظر آ رہی تھی۔انگریز قیدیوں کے چہروں پر، ان کی آنکھوں میں۔انور خاں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور یہی وقت تھا جب کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت تیزی سے مڑی اور لڑکھڑاتی ہوئی انور خاں کے پاس پہنچ گئی۔اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔اس نے اسٹیل کے ''رِنگ'' کا ایک کھٹکا کھولا۔نیچے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا ''کی پیڈ'' تھا۔اس نے جلدی جلدی اپنی کانپتی انگلیاں چلائیں۔وہ کوڈ پریس کر رہی تھی...... اور وہ زندگی کا کوڈ تھا بارہ ہندسوں کا کوڈ...... جو موت کے میسج کو

''ڈیلیٹ'' کر کے زندگی کو جاری رکھنے کی انسٹرکشنز دے سکتا تھا۔اور پھر الٹی گنتی رک گئی۔
آخری ریڈنگ بیس سیکنڈ تھی۔بیس سیکنڈ کے فرق سے موت کا فرشتہ راستہ بدل گیا تھا۔عمران کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ تھی جو اس کے اندر کے اطمینان کو ظاہر کیا کرتی تھی۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔کھچڑی بالوں والی عورت کانپتے ہاتھوں سے انور خاں کی گردن سے مہلک ڈیوائس اتار رہی تھی۔بیشتر قیدی سرتھامے بیٹھے تھے۔نوجوان لڑکی زار زار رو رہی تھی۔یقیناً اس کے رونے کی وجہ فوری موت سے بچ جانے کا احساس تھا...... اور وہ خوشی تھی جو کسی ریلے کی طرح اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

انور خاں سے بغل گیر ہونے کے بعد، میں اور عمران زیریں منزل کی طرف لپکے۔ہمیں ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ ڈاکٹر چوہان زندہ ہوگا...... لیکن اس ''آس امید'' کا کیا کیا جائے۔یہ آخر تک انسان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ہمارے دلوں میں بھی یہ جلتی بجھتی سی کرن موجود تھی کہ شاید چوہان کی زندگی کی راکھ میں کوئی چنگاری موجود ہو۔

ہم نیچے پہنچے۔ہجوم کو چیرتے ہوئے اسپیشل وارڈ میں داخل ہوئے۔چوہان ایک بستر پر تھا۔اس کی لاش پر ایک سفید چادر کھینچ دی گئی تھی۔یہ چادر گواہی دے رہی تھی کہ راکھ ہی راکھ ہے۔چنگاری کہیں نہیں۔میں نے اس کے پاؤں کو چھوا۔اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔وہ ''سو رہا تھا۔'' پچھلے چوبیس گھنٹوں سے مسلسل کام کر رہا تھا۔بہت تھکا ہوا تھا۔بھوکا بھی تھا...... ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا اور اسی طرح ''روانہ'' ہو گیا تھا۔یہ سفر ہی ایسا ہوتا ہے۔کسی بھی وقت شروع ہو جاتا ہے، کسی بھی حالت میں۔میں نے اس کا ماتھا چوما اور میرے دو آنسو اس کے خون اور آلود رخساروں پر گرے پھر اس کی بڑھی ہوئی شیو کے بالوں میں رینگ گئے۔

قلعے سے باہر ہونے والے زوردار دھماکوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اینڈرسن نے حملہ شروع کروا دیا ہے۔چوہان کے چہرے پر چادر ڈال کر میں اور عمران واپس مڑے۔اس اسپیشل وارڈ کے بستروں پر مریض نہیں تھے، خونچکاں لاشیں تھیں۔چوہان کی لاش کی طرح ان لاشوں پر بھی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔یہ وہی لوگ تھے جنہیں تقریباً ایک گھنٹا پہلے پانڈے نے بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔اب وہ خود بھی اپنے مقتولوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔میں اور عمران سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے واپس بالائی منزل پر پہنچے۔

عبدالرحیم کو گہری بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا۔پانچوں انگریز قیدیوں کو واپس ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔باقی لاشیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں۔ان میں خونچکاں کھوپڑی اور ٹوٹی ہوئی ناک والا رنجیت پانڈے بھی تھا۔وہ پستول ابھی تک اس

کے ہاتھ میں تھا جس سے اس نے عمران کو شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مرنے کے بعد بھی وہ جیسے اسی پستول کے ذریعے اپنی مزاحمت جاری رکھنا چاہتا تھا...... عمران نے پستول پانڈ کے مردہ ہاتھ سے چھڑایا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کر دیا۔

انور خاں نے کہا۔''اینڈرسن نے حملہ شروع کر دیا ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس مزید راکٹ ہیں تو وہ ''مین'' دروازے پر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوشش کی جائے کہ یہ راکٹ دروازے کے قرب پہنچنے ہی نہ پائیں۔ فصیل کے اوپر سے لمبی رینج کی رائفلوں کے ساتھ راکٹ لانچروں کو نشانہ بنایا جائے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ ان لوگوں کے پاس اب زیادہ راکٹ نہیں ہوں گے۔''

میں نے کہا۔''عمران! میرا خیال ہے کہ ہمیں لڑائی والی جگہ پر پہنچنا چاہئے۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مبارک اور بھرت کو ہدایت کی کہ وہ انور خاں کے قریب رہیں اور اس کی سکیورٹی کی ذمے داری اٹھائیں...... اس کے علاوہ انور خاں کے پیغامات کو کمان داروں تک پہنچانے کا انتظام بھی کریں۔ میں، عمران اور حسنات احمد قلعے کے اس حصے کی طرف روانہ ہوئے جہاں زوردار لڑائی ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں ہر طرف شعلہ فشاں دھماکے ہو رہے تھے اور پگھلا ہوا سیسہ آتشیں بارش کی طرح برس رہا تھا۔

ایسی لڑائیوں کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا لیکن آج ہم خود اس قدیم طرز کی لڑائی کا حصہ تھے۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ ایسی لڑائیوں کا تناؤ اور خوف لڑائی سے قبل زیادہ ہوتا ہے۔ جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے، جب نعرے بلند ہوتے ہیں اور خون اچھلتا ہے تو پھر صورتِ حال کا ڈر بتدریج دل سے نکلتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں سے ''ڈر'' یوں بھی بہت دور تھا کہ اس کی جگہ ایک بھڑکتے ہوئے طیش نے لی ہوئی تھی۔ ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے گیتا مکھی اور ڈاکٹر چوہان کی لاشیں اٹھائی تھیں اور اس سے بھی بہت بڑی بات یہ تھی کہ ہم نے معصوم بالو کی ماں کی لاش اٹھائی تھی...... سلطانہ کی لاش اٹھائی تھی۔ وہ لاش جیسے ابھی تک میرے ہاتھوں پر دھری تھی۔ اتنے دن گزرنے کے باوجود میرے بازوؤں پر نہ اس کی گرمی کم ہوئی تھی، نہ اس کا لمس مدھم پڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی...... مجھے بھولنا نہیں...... میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں آپ سے ملوں گی اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں اور......

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ اعصاب تن گئے۔ جسم میں پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک اک آگ سی پھیل گئی۔ جلد ہی ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ قلعے کی فصیل کا وہ حصہ تھا جو مین دروازے کے عین اوپر تھا۔ قریباً بارہ فٹ چوڑی اس فصیل پر حسنات اور اس کے قریبی ساتھیوں نے زبردست مورچا بندی کر رکھی تھی۔ وہ فصیل کے رخنوں میں سے نیچے، اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے دستی بم بھی نیچے پھینکے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ پیٹرول اور ڈیزل بم تھے۔ مٹی کے ہنڈولوں اور شیشے کی بوتلوں میں تیل بھر کر اور ان میں آگ کی بتی رکھ کر نیچے پھینکا جاتا تھا اور آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ کچھ بڑے سائز کی تھری جی ٹاپ گنز بھی یہاں موجود تھیں۔ ان کے عقب میں زرگاں کے ماہر نشانے باز بیٹھے تھے اور ان کے چلائے ہوئے برسٹ حملہ آور فوجیوں کے لئے زبردست مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ میں نے یہاں عورتوں اور نوعمر لڑکوں کو بھی دیکھا۔ وہ لڑنے والے سپاہیوں کی اعانت کر رہے تھے۔ ایمونیشن کی نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ رائفلوں، میگزینز میں گولیاں بھر رہے تھے۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ حسنات کے مشورے سے عمران اور میں نے بھی ایک جگہ پوزیشن سنبھال لی۔ حملہ آوروں کا اجتماع بہت بڑا تھا۔ وہ قلعے کے چاروں طرف چیونٹیوں کی طرح موجود تھے۔ وہ اپنے راکٹ لانچرز کو بار بار قلعے کے دروازے کے سامنے لانے کی کوشش کر رہے تھے اور فصیل پر سے ہونے والی زوردار فائرنگ انہیں اس عمل سے روک رہی تھی۔ اس لڑائی میں جانی نقصان بھی ہو رہا تھا اور زیادہ نقصان حملہ آوروں کا ہی تھا۔ قلعے کے دروازے سے قریباً سو قدم کے فاصلے پر مجھے کئی لاشیں نظر آئیں۔ شعلوں کی سرخ روشنی میں یہ خون آلود لاشیں سنسنی خیز منظر پیش کر رہی تھیں۔ بارود کا زہریلا دھواں، شعلے...... دھماکے اور للکارے۔ ایک داستانی سا منظر تھا۔

دروازے کے عین سامنے سے قریباً سو ڈیڑھ سو قدم کی دوری پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ یہ بکتر بند ٹاپ گاڑی تھی۔ اندازہ ہوا کہ اس گاڑی کے پیچھے ایک ٹریکٹر ٹرالی باندھی گئی ہے اور اس ٹرالی پر دو تین راکٹ لانچر رکھ کر دروازے کی طرف لائے جا رہے ہیں تاکہ مناسب فاصلے اور زاویے سے دروازے کو نشانہ بنایا جا سکے۔ ایک بار پھر فصیل پر موجود نشانے بازوں نے زبردست نشانے لگائے اور گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیئے...... تب یکایک گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی ٹرالی اور راکٹس کو بچانے کے لئے گورے سپاہیوں نے ٹرالی کو پھرتی سے جلتی ہوئی گاڑی سے علیحدہ کیا اور پیچھے لے گئے۔ اس کوشش میں کئی افراد کو گولیاں

لگیں اور ان میں سے تین چار میدان میں ہی کھیت رہے۔ مگر اس ناکام کوشش کے فوراً ہی بعد ایک اور گاڑی حرکت کرتی نظر آنے لگی۔

عمران نے کہا۔ ''یہ لوگ حوصلے میں تو کم ہو سکتے ہیں لیکن تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور باقاعدہ تربیت یافتہ بھی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر اس دروازے کو بچا نہیں سکیں گے۔''

عمران کا فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ رائفل کا ایک برسٹ ہمارے بالکل قریب فصیل کے پتھروں سے ٹکرایا۔ بہت سی دھول اور سنگریزے ہمارے اردگرد بکھر گئے۔ حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی شدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہر طرح کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے فائر کر رہے تھے۔

حسنات احمد ہم سے کچھ فاصلے پر سپاہیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی، وہ جھک کر دوڑ رہا تھا۔ مبادا کوئی آوارہ گولی اس کے مزاج نہ پوچھ جائے۔ اس کے عقب میں ایک اور سپاہی بھی تھا۔ وہ وردی میں تھا۔ یہ وہ مسلمان سپاہی تھے جو حکم کی فوج میں شامل تھے مگر بغاوت ہونے کے بعد مزاحمت کاروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ ایسے کم و بیش پانچ سو سپاہی اس وقت قلعے کے اندر موجود تھے اور حکم کے خلاف لڑائی میں حصہ لے رہے تھے۔

حسنات نے آ کر مجھے بتایا۔ ''جناب! انگریزوں کی طرف سے ایک ایلچی آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے لایا جائے؟''

میں نے عمران کی طرف دیکھ کر اس کے تاثرات سے اس کا عندیہ لیا اور حسنات احمد سے کہا کہ اسے لایا جائے۔

دو منٹ بعد ایک انگریز کی صورت نظر آئی۔ وہ لڑائی کے لباس میں تھا لیکن فی الوقت غیر مسلح نظر آ رہا تھا۔ اس لمبے تڑنگے انگریز کے ساتھ ایک درمیانے قد کا انڈین بھی تھا یہ بھی فوجی لباس میں تھا۔ حسنات احمد اور اس کے دو ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب افراد گولیوں کی زد سے بچنے کے لئے جھک کر چل رہے تھے۔ ہم دونوں ایلچیوں سمیت ایک محفوظ برجی میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

انگریز اور انڈین فوجی نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ انگریز فوجی کا عہدہ کیپٹن کا جبکہ انڈین کا سیکنڈ لیفٹیننٹ کا تھا۔ انگریز کیپٹن نے انگلش میں کہا۔ ''میرا خیال ہے جناب کہ میں اس وقت قلعے کے کمانڈر سے بات کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔''

''کمانڈر انور خاں ہے۔ میں اس کی جگہ ڈیوٹی دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم کام کی

بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ جناب اینڈرسن نے آپ کے لئے ایک نامہ ارسال کیا ہے۔ اسے پڑھ لیجئے۔''

اس نے اپنی وردی کے اندر سے خاکی لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا میں نے لفافہ چاک کیا، اس میں ایک خط تھا۔ تاہم خط کے علاوہ بھی ایک چیز تھی۔ اس چیز نے مجھے تھوڑا سا چونکایا مگر میں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میں نے خط نکالا اور عمران سے کہا کہ وہ اسے پڑھے۔ عمران نے حسنات احمد اور دیگر ساتھیوں کے سامنے خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ اینڈرسن کی طرف سے تھا اور اردو میں تھا۔ نیچے اینڈرسن کے دستخط تھے اور کمانڈر کی حیثیت سے اس کی مہر بھی لگی تھی۔ اینڈرسن نے لکھا تھا۔

''دوستو! تم نے ہماری طاقت دیکھ لی ہو گی اور یہ بھی جان لیا ہو گا کہ ہمیں ہر صورت قلعے کے اندر داخل ہونا ہے۔ یہ کام ایک دو گھنٹے کے اندر اندر ہو جانا ہے۔ بہرحال، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خونریز لڑائی ہو گی اور اس میں دونوں طرف سے جانی نقصان ہو گا۔ ہم اس دوطرفہ جانی نقصان سے بچنا چاہتے ہیں، کیونکہ اگلے ایک دو گھنٹوں میں یہاں جو بھی مرے گا، وہ بھانڈیل کا باشندہ ہو گا۔ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا برٹش، وہ اس دھرتی کا بیٹا ہو گا۔ ہم اسے مزید دکھ سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک معاہدے کے تحت تم لوگ قلعے کے دروازے کھول دو اور عالی جناب حکم جی کے دستوں کو قلعہ میں داخل ہونے دو۔ ایسی صورت میں ہماری طرف سے ہر بچے، بوڑھے اور عورت کو جان کی امان دی جائے گی۔ لڑنے والے لوگوں میں سے بھی جنہوں نے کوئی جنگی جرم نہیں کیا، ان کے لئے عام معافی کا اعلان ہو گا۔ کسی بھی مجرم کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور اسے عام عدالت میں صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ اس معاہدے کی دیگر شرائط ہم ابھی مل بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے اس خط کا جواب ہمارے ہی ایلچی کے ذریعے دینا چاہتے ہیں تو ہمارا ایلچی انتظار کر لیتا ہے۔''

عمران نے خط ختم کیا تو ہم سب خاموش تھے۔ میں عمران کو لے کر سیڑھیاں اترا اور نیچے ایک خالی کمرے میں آ گیا۔ یہ جگہ زخمیوں کی آمد کے پیشِ نظر خالی کرائی گئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ خاکی لفافہ دکھایا جس میں سے خط برآمد ہوا تھا۔ لفافے کے کاغذ پر اندر کی طرف بھی باریک قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک موٹے سرخ مارکر سے لکھا گیا یہ فقرہ فوراً

پڑھا جا سکتا تھا۔ ’’یہ صرف تابش اور عمران صاحب کے لئے۔‘‘

’’یہ کیا ہے بھئی؟‘‘ عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔

’’یہ خط کے اندر خط ہے جو لفافے کے اندرونی حصے پر لکھا گیا ہے۔‘‘

ہم نے لفافے کو احتیاط سے چاک کیا۔ لفافے نے خط کی شکل اختیار کر لی۔ اس اندرونی خط کو لکھنے والا بھی انگریز کمانڈر مسٹر اینڈرسن ہی تھا۔ اس خط کی انگریزی تحریر کچھ یوں تھی۔

’’ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کے اردگرد کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جن کے سامنے مجھے پوری بات نہیں لکھنی چاہئے۔ اس لئے اس دوسرے خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ ہمارے درمیان پہلے بھی دوستی کا رشتہ رہا ہے۔ یہ دوستی یقیناً ہم سب کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی مگر ایک اچانک حادثے کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمیں محترمہ ماریا سے اور تمہیں سلطانہ بی بی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہر حال، اب ہمیں ماضی کو بھول کر آگے دیکھنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں، قاسمیہ کے اہم کمان داروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور قلعے کے دروازے کھول کر خون خرابے کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔ اور تم دونوں کو یہ کردار ادا کرنا بھی چاہئے۔ میں کرنل اینڈرسن...... عالی جناب محترم ’’وشوا ناتھ حکم جی‘‘ کی طرف سے تم دونوں کو تحفظ کی ضمانت دیتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا کردار ادا کرو تو تمہارے اس عمل کی ’’قدر‘‘ تمہاری توقع سے بڑھ کر کی جائے گی۔ تم بھانڈیل اسٹیٹ میں رہنا چاہو یا بھانڈیل اسٹیٹ سے جانا چاہو، دونوں صورتوں میں تمہیں سہولت دی جائے گی۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ہمارے دوست تاحیات ہماری دوستی پر ناز کر سکیں......

جواب کا منتظر

خیر اندیش اینڈرسن‘‘

خط پڑھنے کے بعد عمران نے دانت پیسے۔ ’’سن آف اے بچ۔‘‘

میں نے گہری سانس لے کر لفافہ تہ کیا اور اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ عمران کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ خود میرے اندر بھی نفرت کی نئی لہر ابھر آئی تھی۔

عمران پھنکارا۔ ’’یہ سفید کتا! ہمیں بکاؤ مال سمجھتا ہے...... ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے ہمیں بے غیرتی کے بازار میں، ہوس کے سکوں کے عوض بکنے کی پیشکش کی ہے اور...... میرا خیال ہے کہ یہ آج کی بات نہیں، ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ ان سفید بندروں نے ہمارے خطے پر دو سو سال حکومت کی ہے تو اسی مکاری کے زور پر کی ہے۔ انہوں نے ہمیں تقسیم کیا ہے۔

ہمارے اندر سے غدار ڈھونڈے ہیں اور پھر ہمارے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’سچ کہتے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج اس کے ذریعے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ خط میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہے۔‘‘

’’اس سفید بندر نے ہمارے سامنے ہڈی پھینکنے کی جو ناکام کوشش کی ہے، اس کا مطلب سمجھ رہے ہو نا تم...... تمہیں سہولت دی جائے گی۔ یعنی اگر ہم اسٹیٹ میں رہنا چاہیں تو ہمیں ہز ہائی نس کی طرف سے کوئی جاگیر شاگیر عطا فرمائی جائے گی اور اگر ہم اپنے ملک واپس جانا چاہیں تو شاید ہمیں زر و جواہر میں تول کر سب کچھ ہمارے حوالے فرما دیا جائے۔ لعنت...... ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک دفعہ لعنت۔‘‘ اس نے خستہ دیوار پر تھوکا۔

’’تمہارے خیال میں اس تاریخی خط کا جواب کیا ہونا چاہئے؟‘‘ میں نے عمران سے پوچھا۔

’’تم بتاؤ۔‘‘

’’چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں...... بلکہ لکھ دیتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور عمران کی جیب میں سے قلم نکال لیا۔

باہر جنگی نعروں کی گونج تھی۔ دھماکوں کا شور تھا اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ، شاید یہ 1857ء کی ہی ایک جھلک تھی۔ انگریزوں اور سکھوں کی فوجیں دہلی کے لال قلعے کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک آخری ضرب لگانے کے لئے صفیں باندھ رہی تھیں اور ہتھیار تول رہی تھیں۔ میں نے تہ شدہ خط جیب سے نکالا۔ اسے کھولا اور اس کی پشت پر لکھ دیا۔ ’’تم پر لعنت...... یہ انیسویں نہیں، اکیسویں صدی ہے۔ اس دفعہ نہیں اینڈرسن...... اس دفعہ نہیں۔‘‘

یہ فقرہ لکھنے میں مجھے اتنا مزہ آیا جو شاید ہزار ہا الفاظ پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھنے میں بھی نہ آتا۔ میں سر تا پا ایک عجیب سے اطمینان اور ولولے سے بھر گیا مجھے لگا اب جیت یا ہار...... زندگی یا موت کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل فتح یہی ہے کہ اکڑی ہوئی گردنوں والے ان شیطانوں سے پوری توانائی کے ساتھ لڑا جائے اور آخری سانس تک لڑا جائے۔

عمران نے بھی میرے فقرے کو سراہا۔ ہم نے یہ جواب انگریز ایلچی اور اس کے ہندو ساتھی کے حوالے کیا اور انہیں بحفاظت واپس بھیج دیا۔

ہم دوبارہ فصیل پر پہنچے۔ لڑائی کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایلچی کے واپس جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی انگریز اور مقامی حملہ آوروں نے قلعے پر ایک اور زوردار حملہ کر دیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ حملہ اس جواب کا نتیجہ ہے جو ہم نے بھینسے کے چہرے والے غصیلے اینڈرسن کو دیا ہے۔ اس کی غرور سے تنی ہوئی گردن، اس کی نیلی آنکھوں میں چھپی حقارت، اس کا طنزیہ لہجہ، سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ مجھے وہ جارج گورا ہی کی طرح قابلِ نفرت محسوس ہوا۔ جی چاہا وہ میرے سامنے ہو، میں اسے مار ڈالوں یا وہ مجھے مار ڈالے۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو وہی تھا۔

اسی دوران میں ہمیں یہ پریشان کن اطلاع ملی کہ مشرقی جانب سے مدِمقابل سپاہیوں کے دو دستے فصیل پر چڑھ آئے ہیں...... اور وہاں زوردار لڑائی ہو رہی ہے۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر اس جگہ تک پہنچ سکتے۔ مبارک علی اپنے بہترین ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا اور حسنات کو یقین تھا کہ وہ آسانی سے اینڈرسن کے ہرکاروں کو آگے نہیں آنے دے گا۔

فصیل پر ایک بڑی ٹیلی اسکوپ بھی موجود تھی۔ یہ گوروں سے چھینی ہوئی وہی ٹیلی اسکوپ تھی جس میں سے ہم نے مالا کی دادی ساس یعنی بڑی ماتا کو دھرم شالا کے مینارے پر پوجا کرتے دیکھا تھا۔ عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگا رکھی تھیں اور اسے اسٹینڈ پر اِدھر اُدھر حرکت دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے ٹیلی اسکوپ کو ایک جگہ فوکس کیا اور پھر مجھے اس میں دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ مجھے فصیل کے اس حصے کا منظر دکھائی دیا جہاں سے ہمارے ''مدِمقابل'' اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہاں واقعی زوردار لڑائی ہو رہی تھی۔ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ لاتعداد مشعلوں اور گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں مناظر واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ فصیل پر دو جگہ بھڑکتی ہوئی آگ نے بھی اردگرد کے منظر کو روشنی فراہم کر رکھی تھی۔

''کچھ نظر آیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''کیا؟''

''چوکور برجی پر سے جو دو بندے فائرنگ کر رہے ہیں، ان میں سے ایک بھرت ہے۔''

میں نے دھیان سے دیکھا۔ وہ بھرت ہی تھا۔ اس کا گلابی دھاری دار سویٹر اتنی دوری سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان گورے سپاہیوں کا بھرپور مقابلہ کر رہا تھا جو فصیل پر چڑھ آئے تھے اور اپنی پوزیشن پکی کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ یہاں کسی بھی وقت......'' ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے بھرت کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ دھاری دار سویٹر برجی کی آٹھ

دس سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا فصیل پر گرا۔ ''اوہ گاڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوا؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسے گولی لگ گئی۔'' میں نے کہا اور عمران کو دیکھنے کی دعوت دی۔

عمران نے اپنی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگائیں اور وہ بھی سکتہ زدہ رہ گیا۔ گیتا مکھی اور ڈاکٹر چوہان کی طرح بھرت کمار بھی اس لڑائی کا ایندھن بن چکا تھا؟ عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائے لگائے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، یہ زخمی ہو لیکن بڑی خطرناک جگہ پر گرا پڑا ہے۔ یہاں کسی بھی وقت مزید گولیاں اسے لگ سکتی ہیں۔''

میں نے عمران کو پیچھے ہٹا کر ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھرت کھلی جگہ پر پڑا تھا، یہاں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا...... سچویشن ایسی تھی کہ کوئی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک طرف سے ایک لڑکی جھک کر بھاگتی ہوئی آئی اور بھرت کے جسم کو ڈھال فراہم کرنے کے لئے اس کے اوپر جا گری۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شکل دیکھے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہے...... یقیناً وہ چمپی تھی۔ وہ جو محبت کرتی تھی...... اور جو پوجا کرتی تھی۔ وہ اپنے محبوب کی طرف آنے والی موت اپنے جسم پر سہنے کے لئے اس کے اوپر گری ہوئی تھی۔ اسے اپنے جسم سے ڈھانپے ہوئے تھی یہ وہ نیچ ذات کی ادنیٰ خادمہ تھی جس کا سایہ بھی اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بھرشٹ کرتا تھا۔ لیکن یہ نیچ ذات، کمین لڑکی اپنی نقد جان لے کر اپنے محبوب کی موت کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔

میں نے عمران کو یہ منظر دکھایا۔ وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ اس جگہ اردگرد یقیناً ہمارے سپاہی موجود تھے لیکن وہ لڑائی میں اس بری طرح انگیج تھے کہ چند لمحوں کے لئے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور بھرت اور چمپی موت کی زد میں تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک اور ''پیار کہانی'' فرشتہ اجل کے نشانے پر تھی۔ ہم بے چین ہونے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

تب عمران چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر تک نگاہیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے چپکائے رکھیں۔ پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا...... منظر کچھ بدلا ہوا تھا۔ چمپی کے ساتھ ایک اور لڑکی آ گئی تھی۔ وہ دونوں بھرت کمار کے مردہ یا بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر دوطرفہ فائرنگ کی زد سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ جھکی ہوئی تھیں اور بھرت کو بازوؤں سے گھسیٹ رہی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ دوسری لڑکی ''بڑی ماتا'' کی پوتی بہو مالا تھی۔ میں نے اسے اس کے لباس اور بالوں سے پہچانا۔ وہی روشن دماغ لڑکی

جوایک کٹر برہمن گھرانے کی بہو ہونے کے باوجود اپنے سینے میں ایک گداز اور انسان دوست دل رکھتی تھی۔ کڑے پہرے بھی جس کی سوچوں کو زنجیریں نہیں پہنا سکے تھے۔ اب وہ اپنے شوہر سمیت اس تہلکہ خیز مزاحمت کا حصہ تھی جو حکم اور اینڈرسن کے خلاف کی جا رہی تھی۔
دونوں لڑکیاں دیوانہ وار لگی رہیں اور بھرت کو گھسیٹ کر ایک محفوظ آڑ میں لے گئیں۔

''کیا بنا؟'' عمران نے اپنی ''ایم 16'' رائفل سے نیچے فائر کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اسے لے گئیں۔'' میں نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔

''زبردست...... کاش میرے پاس کیمرا ہوتا۔''

ایک گولی عمران کے سر کے عین اوپر سے سیٹی بجاتی گزر گئی اور اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ہمیں کچھ اور نیچے جھکنا پڑا۔ اب فصیل کے اوپر سے بھی فائر آ رہا تھا...... اور یہ فائر یقیناً اینڈرسن کے ان دستوں کی طرف سے تھا جو مشرقی جانب فصیل کے اوپر جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہماری ٹیلی اسکوپ کے عین اوپر سے بھی مختلف ''کیلیبر'' کی گولیاں سرلائے مارتی گزر رہی تھیں۔ موت سامنے تھی اور اس کی حقیقت اور دہشت اپنی اہمیت کھوتی جا رہی تھی۔

میں نے دوربینی جائزہ جاری رکھا۔ بھرت کا جسم خطرناک رینج سے ہٹایا جا چکا تھا۔ وہاں اب بارش کی طرح گولیاں برس رہی تھیں۔ اینڈرسن کے باوردی سپاہی اب کچھ اور آگے آ گئے تھے...... ایک جگہ فصیل پر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے دفاع کرنے والوں کی مزاحمت میں شدت محسوس کی۔ میں نے ایک بار پھر نوعمر طلال کو دیکھا۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں ہم نے دو روز پہلے اسے پھانسی گھاٹ پر دیکھا تھا۔ جب بھرت اور انور خاں سمیت کم و بیش پندرہ افراد کو دردناک طریقے سے سولی چڑھایا جانے والا تھا۔ طلال اور اس کے نڈر دوست، عقابوں کی طرح حکم کے سپاہیوں پر جھپٹے تھے اور ان کی اس خونریز جھپٹ نے ہزاروں کے مردہ ہجوم کو زندہ کر دیا تھا۔

سلطانہ کا یہ چہیتا راجپوت بھانجا آج پھر اسی دلیری اور ولولے کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں یقیناً اس کی برادری کے جاں نثار ساتھی تھے۔ ان کی رائفلوں پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں صرف دیکھ سکتا تھا، مجھے سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا...... وہ لوگ اپنی جگہ سے نکلے اور نعرے بلند کرتے ہوئے مخالف پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ گھمسان کی لڑائی میں یہ جارحانہ انداز سمجھا جاتا ہے۔ عسکری زبان میں اسے ''چارج کرنا'' کہتے ہیں اس میں حملہ آوروں کی Casualties تو ہوتی ہیں لیکن دشمن پر دھاک بیٹھ جاتی ہے یہاں بھی

حملہ آوروں کو گولیاں لگیں اور وہ گرے بھی مگر وہ آناً فاناً گوروں اور ان کے ساتھیوں کی پوزیشنوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں دست بدست لڑائی شروع ہوئی دستی بموں کے دھماکوں سے ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میری نظر کا راستہ مسدود ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''عمران! وہاں بہت سخت جھڑپ ہو رہی ہے۔ ہمیں وہاں مدد پہنچانی چاہیے۔''

تقریباً تین چار منٹ بعد ہم نے دوبارہ ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ اب فصیل کے اس حصے سے گہرا دھواں چھٹ گیا تھا اور صورتِ حال کی تھوڑی بہت جھلک نظر آ رہی تھی۔ یوں لگا کہ طلال اور اس کے ساتھی اوپر چڑھ آنے والے دستوں کو کافی حد تک پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یقیناً پیچھے ہٹنے اور پسپا ہونے والوں میں سے بہت سے نیچے بھی گرے ہوں گے۔ زوردار فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ طلال اور اس کے ساتھیوں نے اب کافی آگے جا کر پوزیشنیں لے لی ہیں......

اسے اطمینان بخش صورتِ حال کہا جا سکتا تھا، تاہم یہ اطمینان تادیر برقرار نہیں رہا۔ بہت جلد پھر سے فصیل کے اس حصے پر گورے اور مقامی سپاہیوں کا اجتماع ہو گیا۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

عمران نے حسنات سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنا ہوگا۔ وہاں اپنی تعداد میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔''

''وہاں پہنچنا ہی تو مشکل ہے جی۔ مجھے اس کے لیے پہلے راستہ بنانا پڑے گا۔''

''تو پھر بنواؤ راستہ...... یہ ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

حسنات احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے فصیل کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں ایمونیشن میں آگ لگنے کی وجہ سے مسلسل شعلے بھڑک رہے تھے اور راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہم نے غلط فیصلہ تو نہیں کر لیا؟ کیا ہمیں اینڈرسن کی پیشکش پر مزید غور کر لینا چاہئے تھا؟ قلعے کی حفاظت کب تک کی جا سکے گی اور اگر اینڈرسن اور حکم کے دستے قلعے میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر کیا صورتِ حال ہو گی؟ یہاں قاسمیہ کی بے شمار عورتیں اور بچے موجود تھے۔ فتح اور شراب کے نشے میں چُور سپاہی، خاص طور سے ہندو سپاہی کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے بلند فصیل کے کنگروں کے اوپر سے دور تاریکی میں نظر دوڑائی۔ ایک دم یوں لگا میرے جسم کا سارا لہو میری بصارت میں سمٹ

آیا ہے۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں سے بہت آگے گہری تیرگی میں مجھے ایک روشن لکیر سی نظر آئی۔ یہ لکیر یہاں پہلے نہیں تھی...... یہ کیا تھا؟

میں نے لرزتے ہاتھوں سے آہنی اسٹینڈ پر وزنی ٹیلی اسکوپ کو گھمایا اور اسے اس روشن لکیر پر فوکس کرنے کی کوشش کی جو شمالی افق پر نمودار ہوئی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کامیاب ہو گیا...... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ہزاروں مشعلیں تھیں جو تیز رفتاری سے زرگاں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ وہ ''کمک'' تھی جس کا انتظار کرتے کرتے زرگاں کے باسیوں نے کئی برس گزار دیئے تھے...... یہ نل پانی کی سربکف فوج تھی اور اس کی قیادت یقیناً مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کر رہے تھے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب مصیبت میں گھرے ہوئے شخص کو اپنے دوستوں کی پکار سنائی دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ 'ہمت نہ ہارو' ہم آ رہے ہیں، تو اس شخص کے اندر سے ہی اتنی توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی ''مصیبت'' کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ میں نے اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور یہ ایک یادگار کیفیت تھی۔ میں نے لرزاں آواز میں عمران سے کہا۔ ''عمران! وہ آ گئے ہیں۔''

''کون؟'' اس نے فائر کرتے ہوئے کہا۔

''خود دیکھو۔'' میں نے اسے ٹیلی اسکوپ کی طرف بلایا۔

اس نے میگزین کے آخری دو فائر کئے اور جھک کر ٹیلی اسکوپ کی طرف آیا۔ اس نے دیکھا اور وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ ''زبردست۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا......

میں نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی تعداد میں ہیں...... اور ابھی کچھ فاصلے پر ہیں۔ ہم بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ پا رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد عمران نے ٹیلی اسکوپ سے نگاہ ہٹائی اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا تابی! وہ ضرور آئیں گے۔ انہیں حرکت میں لانے کے لئے جس ڈنکے کی ضرورت تھی، وہ ڈنکا ہم نے یہاں بجا دیا تھا...... ڈنکے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا تابی......''

O......❖......O

اس سے آگے کا احوال تفصیلات سے لکھا جائے تو اس کے لئے بہت سے صفحات درکار ہوں گے۔ وہ ایک خوں ریز لڑائی تھی۔ غالباً اینڈرسن کے دستوں کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ جب فتح کے قریب پہنچ چکے ہوں گے، اچانک ان پر عقب سے یلغار ہو جائے گی۔ درحقیقت چھوٹے سرکار اجیت رائے اور مراد شاہ بالکل درست وقت پر پہنچے تھے۔ وہ کم و بیش چار ہزار

سپاہیوں کے ساتھ ایک سیلاب کی طرح زرگاں میں داخل ہوئے اور بلا توقف اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ قلعے کے اندر سے ہمارے جنگجوؤں نے بھی زوردار حملہ کیا۔ انور خاں بالائی منزل کی کھڑکی سے یہ سارا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے رائے دی کہ اب قلعے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور باہر نکل کر گوروں پر ہلا بولا جائے۔

انور خاں کا یہ پیغام میرے ذریعے حسنات اور مبارک علی وغیرہ تک پہنچا۔ پھر چار پانچ منٹ کے اندر قلعے میں موجود ہزاروں پُرجوش سپاہیوں تک پہنچ گیا۔ قلعے کے دو دروازے کھول دیئے گئے۔ حسنات، مبارک اور دوسرے کمان داروں کی قیادت میں مسلمان سپاہی اور جنگجو بلائے ناگہانی کی طرح اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ اینڈرسن کی فوج بلاشبہ زبردست تربیت یافتہ تھی۔ ان کے پاس بہترین اسلحہ بھی موجود تھا، مگر جب وہ دوطرفہ حملے کی زد میں آئی تو اس گندم کی طرح پس گئی جو چکی کے پاٹوں کے درمیان آتی ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے زیادہ حصہ نہیں لیا۔ ہمیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ درحقیقت ہم اپنے کرنے والا کام کر چکے تھے۔ ہم نے حسنات، مبارک علی اور طلال جیسے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر وہ طبل، بجا دیا تھا جس کی گونج پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں پھیلی تھی۔ مردہ ساعتیں زندہ ہوتی تھیں اور لوگوں نے بدست فرماں رواؤں کے لئے اس یوم کو یوم حساب بنا دیا تھا۔

اصل اور فیصلہ کن لڑائی قریباً ایک گھنٹا ہی جاری رہ سکی۔ اس میں خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔ ظاہر ہے کہ زیادہ نقصان اینڈرسن اور حکم کے وفاداروں کا تھا۔ قلعے کے سامنے اور قاسمیہ کے گلی کوچوں میں ہر طرف گورے اور مقامی سپاہیوں کی لاشیں بکھری نظر آ رہی تھیں۔ گورے سپاہیوں اور افسروں کی لاشیں نفرت اور انتقام کا نشانہ بنیں۔ انہیں تاراج کیا گیا اور گھسیٹا گیا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے اور لاتعداد افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اب مسلح سپاہیوں اور عام لوگوں نے خود کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ایک حصہ مراد شاہ اور حسنات وغیرہ کی قیادت میں بھگوڑے فوجیوں کے تعاقب میں روانہ ہوا، دوسرا زرگاں کے عظیم الشان راج بھون کی طرف بڑھنے لگا۔ وہی راج بھون جو دورِ قدیم کے شاہی محلات سے کہیں زیادہ شان و شوکت، دبدبہ اور رنگینی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ یہاں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ یہاں پریوں کے جمگھٹے تھے اور رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی، راجا اِندر کی طرح یہاں دادِ عیش دیتا تھا۔ اس ''راجا اِندر'' کے حواری وہی جارج گورا، سرجن اسٹیل، اینڈرسن اور منیارڈ جیسے لوگ تھے۔

میں اور عمران بھی اس نعرہ زن ہجوم کا حصہ تھے جو راج بھون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راج

بھون کے سامنے پہنچ کر مسلح دستے اور عام لوگ چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے راج بھون کو گھیر لیا تھا۔ یہاں بمشکل ڈیڑھ دوسو گارڈز ہوں گے یا پھر حکم کا خاص محافظ دستہ تھا جس کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ لوگ کتنی بھی جاں نثاری دکھاتے، ان کے لئے ممکن نہیں تھا کہ حکم کا دفاع کر سکتے۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ مبارک علی تھا۔ اس نے کہا۔ ”جناب! آپ کو چھوٹے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں جیپ میں بیٹھے ہیں۔“ مبارک علی نے بتایا۔

میں اور عمران لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس گرد آلود لینڈ روور جیپ تک پہنچے جس پر ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا اور مسلح گارڈز نے جسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میں اور عمران موقع پر پہنچے تو چھوٹے سرکار جیپ سے اتر آئے۔ وہ شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ نل پانی میں ان سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی لیکن آج وہ پہلی بار فوجی وردی میں تھے اور ان کے جسم پر اسلحہ سجا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معانقہ کیا پھر عمران سے ہاتھ ملایا۔
میں نے عمران کا تعارف کرایا تو پھر اس سے بھی ”شاہی معانقہ“ ہوا۔ چھوٹے سرکار کے ذاتی گارڈز نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ اس سیلوٹ کو دیکھ کر عمران نے بہت برا سا منہ بنایا اور مجھے سرگوشی میں مخاطب کر کے بولا۔ ”زیادہ بانس پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح جہانگیر کی کامیابیوں کے پیچھے نور جہاں کا ہاتھ تھا، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔“

ہمیں بڑے اہتمام کے ساتھ اس شاہی جیپ میں سوار کیا گیا۔ چھوٹے سرکار نے سب سے پہلے مجھ سے انور خاں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔ ”انور خاں زخمی ہے جناب...... لیکن خطرے سے باہر ہے۔ وہ اس وقت قلعے میں ہے۔“

”بھگوان کا شکر ہے۔“ چھوٹے سرکار نے کہا۔ ان کی اونچی ناک کا بانسہ کامیابی کی خوشی میں ہمیشہ سے زیادہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولے۔
”ہم جانت ہیں، اس سمے یہاں تمہاری حیثیت ایک کمان دار کی ہے۔ لوگن تمہارے اشاروں پر چل رہے ہیں...... بلکہ شاید تم دونوں کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔“ چھوٹے سرکار نے آخری الفاظ عمران کی طرف دیکھ کر کہے۔

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اس میں عمران نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔“

”ہاں، ہمیں بہت سی جانکاریاں ملی ہیں۔ بہرحال، ان تفصیلی باتوں کے لئے سمے

چاہئے۔ اب ہم نے تمہیں ایک خاص بات کرنے کے لئے بلایا ہے۔“

”جی فرمائیے۔“

”لوگن راج بھون میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم چاہت ہیں کہ صرف خاص لوگن ہی اندر داخل ہوں اور اگر بھائی صاحب واقعی اندر موجود ہیں تو ان کو زندہ گرفتار کیا جاوے...... اور ان کے ساتھ کوئی برا برتاؤ نہ ہو۔“

میں نے چونک کر چھوٹے سرکار اجیت رائے کی طرف دیکھا۔ بڑے بھائی حکم کی طرف سے چھوٹے بھائی پر کیا ظلم روا نہیں رکھا گیا تھا۔ ناانصافی اور نفرت کی حد کر دی گئی تھی لیکن اس کے دل میں پھر بھی کسی نہ کسی درجے میں بھائی کا احترام موجود تھا۔ یہ اس چھوٹے بھائی کے بڑے پن کی نشانی تھی۔

میں نے کہا۔ ”آپ جو حکم کریں گے ویسا ہی ہو گا چھوٹے سرکار! اب آپ آ گئے...... ہیں جناب! اب میں، عمران یا انور خاں کچھ نہیں ہیں اب جو کچھ ہیں آپ ہیں۔“

چھوٹے سرکار نے میرا کندھا تھپکا۔

...... کچھ دیر بعد میں راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے ایک جیپ کی چھت پر موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک لاؤڈ اسپیکر تھا۔ میں نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ چھوٹے سرکار کے حکم کے مطابق سب لوگ راج بھون کے سامنے سے ہٹ کر کم از کم دو سو گز پیچھے چلے جائیں...... راج بھون کا صرف ایک دروازہ کھولا جائے گا اور اس دروازے میں سے بھی صرف ایک فوجی دستہ اندر داخل ہو گا جس کی کمان میں خود کروں گا۔

میں نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے اور پھر معقول حد تک پیچھے چلے گئے۔ میں، عمران اور مبارک علی کمانڈوز کی تین ٹولیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ہم نے میگافونز پر بار بار وارننگ دی کہ راج بھون کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے اور کسی طرح کی مزاحمت بیکار ہے۔ لہٰذا اندر موجود گارڈز فائر نہ کریں اور خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔ حکم سے بھی کہا گیا کہ وہ باہر نکل آئے اور اپنی گرفتاری پیش کر دے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ ہم راج بھون کے وسیع و عریض احاطے سے گزر کر اس شاندار شاہی بالکونی کے سامنے پہنچے جہاں چند ہفتے پہلے حکم کی چہیتی بیوی رتنا دیوی کے ہاں بچے کی ولادت کی خوشی منائی گئی تھی اور حکم نے مٹھیاں بھر بھر کے نیچے کھڑے لوگوں پر سونا چاندی نچھاور کیا تھا۔ آج یہ بالکونی سنسان پڑی تھی مگر بالکل سنسان بھی نہیں تھی۔ یہاں شاہی گارڈز کی پوزیشنیں موجود تھیں۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہماری

طرف سے بھی بھرپور جواب دیا گیا۔ دو تین منٹ کے اندر بالکونی خاموش ہوگئی اور وہاں آگ بھڑک اٹھی۔

ہم راج بھون کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ مزاحم گارڈز کو شوٹ کر دیا گیا اور باقی کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ درجنوں ملازماؤں، خواجہ سراؤں اور خوب صورت لڑکیوں نے محل کے اندرونی حصوں سے نکل کر خود کو ہماری حفاظت میں دیا۔ مرد خادموں کی تعداد بھی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی۔ حکم اور اس کی بیوی رتنا کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں پہنچ کر ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ قالین پر خواتین اور بچوں کی کم و بیش بیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان لوگوں پر اندھا دھند مشین گن کے برسٹ چلائے گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور تھے۔ دیواروں اور فرنیچر وغیرہ پر گولیوں کے اَن گنت نشان دکھائی دے رہے تھے۔ مرنے والے بچوں کی عمریں تقریباً پندرہ اور دو تین سال کے درمیان تھیں۔

مبارک علی نے کہا۔ ''یہ حکم کے اہلِ خانہ ہیں جی۔ یہ اس کی تینوں رانیاں ہیں۔ یہ بچے ہیں۔ یہ بچوں کی بڑی پھوپی ہے...... یہ شاید چھوٹی ہے......'' مبارک بتا رہا تھا اور ہم حیران کھڑے تھے۔ رعایا کی عزت آبرو کو کھلونا سمجھنے والے لوگ اپنی آن عزت کے حوالے سے کتنے حساس ہوتے ہیں۔ جب یوم حساب آتا ہے اور انہیں اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ مکافاتِ عمل کی وجہ سے ان کی اپنی عزت پر حرف آئے گا تو وہ خود سے وابستہ خواتین اور دیگر لوگوں کو بیدردی سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔

مبارک علی اور دو دیگر افسر الٹ پلٹ کر خونچکاں لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ مبارک علی نے ایک کونے میں پڑی اکٹھی چار لاشوں کو دیکھ کر بتایا۔ ''یہ اس آخری جشن والی پریاں ہیں۔ لگتا ہے کہ حکم جی نے ان کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔''

خوب صورت لڑکیاں، نودمیدہ کلیوں جیسے چہرے، خوش گول، خوش اندام و خوش اطوار۔ انہیں حکم اور اس کے حواریوں کی راتوں کو رنگین کرنے کے لیے سخت ترین تربیت اور آزمائشوں سے گزارا گیا تھا۔ نہ جانے یہ کن کن آنگنوں سے یہاں لائی گئی تھیں؟ کن کن آنکھوں کا نور تھیں؟ ان کی عمر مرنے کی نہیں تھی لیکن وہ مری پڑی تھیں...... فراعین مصر کی طرح حکم نے اپنی ان جواں سال کنیزوں کو اپنے انجام کے مقبرے میں زندہ دفن کرنے کی رسم نبھائی تھی۔

''ان میں رتنا دیوی بھی ہے؟'' میں نے مبارک سے پوچھا۔

''ناہیں جی۔ وہ کہیں نظر ناہیں آ رہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ان لوگوں کو آدھ پون گھنٹے پہلے مارا گیا ہے۔''

مبارک کے ساتھی افسروں نے اس کی تائید کی۔

ہم دیگر کمروں کی طرف بڑھے۔ دروازے توڑ کر حکم کے پُرشکوہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ یہ بیڈ روم جدید اور قدیم طرزِ آرائش کا شاندار نمونہ تھا جدید ترین بستر، قیمتی شرابوں سے بھرا ہوا اور خودکار طور پر گھومنے والا ''بار''...... آڈیو اور ویڈیو سسٹم، گھوڑا گاڑیوں اور لالٹینوں والے اس شہر میں جو کچھ بھی تھا مگر اس بیڈ روم میں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں پہنچ کر ہمیں پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ شاید حکم یہاں سے فرار ہو گیا ہے۔ ہماری نگاہیں ایک بھاری بھرکم خفیہ سیف کے ادھ کھلے دروازے پر پڑیں۔ وہاں اب بھی دو چار مرصع طلائی زیور اور قیمتی پتھر موجود تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ حکم نے اس سیف کا قیمتی ساز و سامان افراتفری میں نکالا ہے اور اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

ہمارے ساتھ آنے والے تقریباً ڈیڑھ سو مسلح کمانڈوز راج بھون میں چاروں طرف پھیل گئے اور اہم افراد کی تلاش شروع ہوئی۔ میں اور عمران کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اس وسیع و عریض عشرت کدے میں پہنچے جہاں ساتویں کا جشن اپنے کلائمیکس پر پہنچا تھا...... وہی آبشار جو ایک بلوری تالاب میں گرتا تھا۔ جس کی چاروں جانب شاندار نشستیں تھیں اور دن میں بھی رات کا سماں نظر آتا تھا۔ عشرت کدے کی گنبد نما چھت تاریک آسمان کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور اس پر چاند تارے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ بہرحال، فی الوقت یہ سب کچھ نہیں تھا۔ ایک عجیب سی اداسی اور خاموشی نے در و دیوار کو گھیرا ہوا تھا۔ آبشار بند تھی، وہ تالاب جس میں سنہری شراب چمکتی تھی، خالی پڑا تھا...... پگھلے ہوئے سونے میں ڈوبنے ابھرنے والی عریاں مورتی بھی بے حرکت تھی۔

''یہ دیکھو تابی!'' عمران نے میری توجہ ایک گوشے کی طرف دلائی۔

ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ ان کے جسم نیلے پڑ کر اکڑ گئے تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ اذیت جھیل کر مری ہیں۔

ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی مبارک بولا۔ ''ان بے چاریوں کو یقیناً درد کا ٹیکا لگایا گیا ہے جی۔ یہ ڈبل ٹیکا بندے کی جان لے لیوت ہے۔''

پھر اس نے ایک لڑکی کے عریاں بازو پر ٹیکے کے دو تازہ نشان دریافت کر لئے...... لڑکیوں کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مری تھیں۔ ان کی ایڑیوں

سے خون رِس رہا تھا۔ جان کنی کی بے پناہ اذیت ان کے خوبرو چہروں پر یوں نقش ہوگئی تھی کہ دیکھنے والی نگاہ کانپ جاتی تھی۔

مبارک نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹے پہلے ان لڑکیوں کو کسی جرم کی سزا دی گئی ہے۔ شاید ان پر مخبری وغیرہ کا شبہ ہو۔''

اچانک ایک دروازہ کھلا اور میں میڈم صفورا کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا...... اس نے خود کو ''ہینڈز اپ'' کر رکھا تھا۔ اس کے عقب میں آٹھ دس سہمی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ ان کے رنگ زرد تھے۔ انہوں نے میڈم کے پیچھے خود کو یوں سمیٹ رکھا تھا جیسے وہ ان کے لئے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتی ہو۔

مجھے اور عمران کو پہچاننے کے بعد میڈم نے ہاتھ نیچے گرادیئے اور آگے بڑھ آئی۔ وہ ہم سے گلے ملی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار ہلکی سی نمی دیکھی۔ اس نے کہا۔ ''ہم نے اپنی لائف بڑی مشکل سے بچائی ہے۔ حکم نے اپنے بہت سے گھر والوں اور خدمت کرنے والی لڑکیوں کو مار دیا ہے۔ میں ان لڑکیوں کو لے کر یہاں اس سٹور میں چھپ گئی تھی۔ حکم اور کرنل اینڈرسن کے ذاتی گارڈز یہیں آس پاس سرچ کرتے رہے۔ پھر چلے گئے۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے کسی طرح یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

''اینڈرسن بھی ساتھ تھا؟'' عمران نے پوچھا۔

''اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔ جب حکم نے اپنے فیملی ممبرز کو گولیاں ماریں تو اینڈرسن بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم نے اسٹور روم کے پاس بھی اس کے گرجنے برسنے کی آوازیں سنیں۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ کے خیال میں راج بھون میں کوئی ایسی جگہ جہاں وہ چھپ سکتا ہو؟''

''آپ لوگوں نے لیبارٹری کا ایریا دیکھ لیا ہے؟'' میڈم نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔ میڈم نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم نے خوف زدہ لڑکیوں کو مبارک علی کی حفاظت میں دیا اور خود میڈم کے ساتھ لیبارٹری کی طرف بڑھے۔ ایک کوریڈور میں ہمیں ایک اور لڑکی کی نیلگوں لاش نظر آئی۔ شدید اذیت کے سبب اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ اس بری طرح تڑپی پھڑکی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی۔

میڈم نے کہا۔ ''حکم نے اپنے پانچ ملازموں کو زہر والا ٹیکا لگوایا ہے۔ یہ گرین رنگ کا

وہی Pain Giving Injection ہے جو جسم میں شدید ترین تکلیف پیدا کرتا ہے۔ ان پانچ ملازموں میں سے چار لڑکیاں تھیں اور ایک خواجہ سرا۔ ان کے بارے میں حکم کو شک تھا کہ انہوں نے باغیوں سے رابطہ رکھا ہوا ہے اور راج بھون کی نیوز باہر دے رہے ہیں۔''

ایک سپاہی نے لڑکی کی اکڑی ہوئی لاش پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ ہم ایک سلائیڈنگ دروازے کو کھول کر سرجن اسٹیل کی وسیع لیبارٹری میں داخل ہوئے۔ اس لیبارٹری کے تین چار پورشن تھے۔ یہاں جدید ساز و سامان موجود تھا۔ وہ تمام ''شعبدے'' یہیں پر تخلیق پاتے تھے جو بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے۔

ہم نے چار درجن مسلح کمانڈوز کے ساتھ مل کر اس لیبارٹری کا چپا چپا چھان مارا مگر حکم، رتنا دیوی یا اینڈرسن کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس لیبارٹری کو کھنگالنے کے دوران میں ہم نے کئی اہم چیزیں دیکھیں۔ ہمیں وہ خاص الیکٹرانک چپس اور ان کے سگنلز وصول کرنے والے انٹیناز بھی نظر آئے۔ اس سبز رنگ کی دوا کے درجنوں وائلز بھی جن سے درد کا انجکشن تیار ہوتا تھا۔ زہریلی گیس، اعصاب شل کرنے والی گیس، طاقت بخش ادویات اور اس طرح کی نہ جانے کتنی اشیاء یہاں موجود تھیں۔

میڈم صفورا مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گئی۔ وہ رازداری کے انداز میں بولی۔ ''حکم اور اینڈرسن یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ کہیں بھی چلے جائیں، ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے وہ اپنے قیدیوں کو ڈھونڈ لیتے تھے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''میں نے حکم کا طریقہ اسی پر الٹ دیا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''حکم جہاں بھی ہے، اپنے ساتھ ایک الیکٹرانک چپ لے کر گھوم رہا ہے۔ ہم انٹیناز کے ذریعے اس کا سگنل وصول کر سکتے ہیں۔''

یہ واقعی حیران کن اطلاع تھی...... ''چپ کیسے رکھی آپ نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''آخری وقت میں مجھے شک ہوگیا تھا کہ حکم اپنی وائف کے ساتھ یہاں سے بھاگنا چاہ رہا ہے۔ یہاں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میں یہاں لیبارٹری میں آئی اور یہاں سے دو الیکٹرانک چپس نکال لیں۔ ان کے نمبر میرے پاس نوٹ ہیں۔ ان میں سے ایک چپ میں نے اس سفری بیگ میں ڈال دی جو حکم کے کمرے میں تیار

رکھا تھا.....''

اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو یہ زبردست بات تھی۔ میڈم صفورا کی فہم وفراست اور معاملہ فہمی پر ہمیں بھی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو ہر طرح کے ماحول میں جینے کی راہیں نکال سکتی تھی اور پیچیدہ گرہیں اپنے ناخنِ تدبیر سے کھول لیتی تھی۔

عمران نے پوچھا۔ ''ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ چپ ہماری مدد کر سکتی ہے؟''

میڈم نے ہم سے صرف پانچ منٹ مانگے۔ وہ جن لڑکیوں کے ساتھ چیمبر کے اسٹور روم میں چھپی ہوئی تھی، ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ لڑکی سرجن اسٹیل کی اسسٹنٹس میں سے ایک ہے۔ میڈم صفورا نے چند منٹ کے اندر ایسے دو انٹینا ز ڈھونڈ لئے جو اس خاص چپ کو ٹریپ کر سکتے تھے جو حکم کے سفری بیگ میں موجود تھی۔ ان دونوں انٹینا ز کی بیٹریاں پہلے سے چارج تھیں۔

O......❖......O

......اور اب ہم ایک بند جیپ پر سوار شہر کے نواح کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ مسلح کمانڈوز والی پانچ چھ گاڑیاں اور کوئی دو درجن گھڑ سوار تھے۔ انٹینا سگنل وصول کر رہا تھا۔ ان سگنلز سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم یہاں سے قریباً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر جنگل میں موجود ہے اور شمال کی طرف حرکت کر رہا ہے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گزرے۔ یہاں جشن کا سماں تھا۔ ہزاروں شہری ہتھیار لہرا رہے تھے اور نعرہ زنی کر رہے تھے۔ حکم اور اس کے انگریز حواریوں سے ہمدردی رکھنے والے لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ ان میں سے جنہوں نے زیادہ وفاداری دکھانے کی کوشش کی تھی، انہیں برے نتائج بھگتنا پڑے تھے۔

ایک جگہ ہمیں بڑا ہجوم نظر آیا۔ راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ ہماری گاڑیاں رک گئیں۔ یہاں ہمیں تین لاشیں الٹی لٹکی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لاش ہم نے دور ہی سے پہچان لی۔ یہ اس اسٹیٹ کے سب سے سفاک پولیس آفیسر رنجیت پانڈے کی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ ایک شخص لپک کر ہمارے پاس آیا۔ یہ کانسٹبل امرناتھ تھا...... وہی سانولا سلونا غریب صورت شخص جس نے ایک رات اپنے چہرے پر پانڈے کا نفرت بھرا تھپڑ وصول کیا تھا...... اور پھر اس تھپڑ کی بازگشت بڑی دور تک گئی تھی۔ قاسمیہ کے ''قاسمیہ چوک'' میں میری کلائیوں کے گرد لپٹی ہوئی رسیاں اس تھپڑ کی بازگشت سے ہی ٹوٹی تھیں۔ ایسے نفرت بھرے تھپڑوں کے اثرات بڑی دور تک جاتے ہیں...... ہر دور کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔

امرناتھ ہماری جیپ کی کھڑکی سے آ لگا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ ''جناب! لوگن نے پانڈے کی لاش کو گلیوں میں گھسیٹا ہے اور یہاں الٹا لٹکا دیا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ قلعے میں گیتا مکھی کے شریر کو سگریٹوں سے جلانے والا اور اس کی ہتھیا کرنے والا یہی پانڈے صاحب ہے۔''

''اس بات کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''قلعے کی نچلی منجل (منزل) پر کام کرنے والے دو چاکروں نے سب کچھ بتایا ہے جی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ جلم ہوتے دیکھا تھا۔'' امرناتھ کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں تھیں اور سیاہ چہرے پر انتقام کا جوش تھا۔

سپاہیوں نے ہجوم میں سے راستہ بنایا اور ہمارا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ جلد ہی ہم زرگاں کے نواحی علاقے سے گزرے اور پھر جنگل میں پہنچ گئے۔ جس جیپ میں، میں اور عمران تھے، مبارک علی بھی اسی پر سوار تھا۔ شہر میں سگنل مدھم تھے مگر جونہی ہم کھلے علاقے میں پہنچے، یہ واضح ہوتے چلے گئے۔ حکم اور اینڈرسن غالباً کسی جیپ پر سوار تھے اور یہ ایک دشوار گزار علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ یہاں ٹیلے تھے اور ان کے درمیان راستے بھول بھلیوں کی طرح تھے۔ اگر ہمیں سگنلز کی راہنمائی نہ ہوتی تو ہم شاید حکم کی گرد بھی نہ پا سکتے۔

کہیں کہیں سگنلز مدھم بھی ہو جاتے اور ہمیں پریشانی ہوتی لیکن جلد ہی ان کی کوالٹی پھر سے لوٹ آتی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم سگنلز کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ حکم جس چیز پر سواری کر رہا تھا، وہ ٹھہر چکی ہے۔ یہ اونچے نیچے ٹیلوں سے اٹا ہوا جنگل تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک گاڑی کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے۔ ہم ان نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ سگنلز اب بالکل صاف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم نے دوربینوں سے جگہ کا معائنہ کیا۔ قریباً دو کلو میٹر کی دوری پر ایک ٹیلے کے دامن میں ہمیں کسی رہائشی مکان کی جھلک نظر آئی۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ چھوٹا سا بوسیدہ گھر اس ویرانے میں پتا نہیں کیوں موجود تھا۔ یقیناً وہ جیپ بھی اس گھر کے آس پاس ہی موجود تھی جس پر حکم اور غالباً گورا اینڈرسن یہاں پہنچے تھے۔ درختوں کی وجہ سے وہ جیپ ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب گاڑیوں سے اتر جانا چاہئے۔'' عمران نے تجویز پیش کی۔

میرے ذہن میں بھی یہی خیال آ رہا تھا۔ میری ہدایت پر مبارک علی نے کمانڈوز کو اترنے کا حکم دیا۔

ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم پھیلتے بھی جا رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ ایریا کور کیا جا سکے۔ جلد ہی ہم نے اس بوسیدہ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہمیں وہ شاندار لینڈ کروزر بھی نظر آ گئی جس پر شاہی جوڑا یہاں پہنچا تھا...... میں نے کہا۔ ''مبارک علی! چھوٹے سرکار کی طرف سے سخت ہدایات ہیں کہ حکم کو زندہ گرفتار ہونا چاہئے۔''

''آپ بےفکر رہیں۔ ایسا ہی ہووے گا جناب...... اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے جناب کہ حکم کا کمانڈر اینڈرسن صاحب بھی اندر ہے۔'' مبارک دبے دبے جوش سے بولا۔ مبارک علی نے مجھے لینڈ کروزر کے قریب ہی کچی مٹی پر بڑے سائز کے فوجی بوٹوں کے نشانات دکھائے اور کہا۔ ''مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ یہ اینڈرسن صاحب کے بوٹوں کا نشان ہی ہے...... اور یہ بھی فوجی بوٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان لوگن کے ساتھ ایک یا دو فوجی بھی ہیں۔''

ہم ایک کٹے ہوئے ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ ہمارے کمانڈوز چاروں طرف پوزیشنیں لے چکے تھے۔ میں نے میگافون کے ذریعے بلند آواز میں کہا۔ ''رائے وشوا ناتھ اور اینڈرسن صاحب! آپ چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بھاگنے یا چھپنے کی کوشش بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔''

دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ عمران کے مشورے سے میں نے یہ اعلان دو بار مزید کیا۔ آخری اعلان میں، میں نے کہا۔ ''ہم آپ کو فیصلہ کرنے کے لئے پانچ منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ اگر آپ باہر نہیں آئے تو ہمیں اندر گھسنا پڑے گا اور اس صورت میں اپنے نقصان کی ساری ذمے داری آپ پر ہو گی۔''

اعلان کے بعد ہم نے گھڑی دیکھی اور انتظار کرنے لگے۔ میں نے مبارک علی سے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ کچے کے ساتھ والا علاقہ ہے۔ آپ نے جلا ہوا جنگل دیکھا ہے نا...... وہ یہاں سے بس سات آٹھ میل کی دوری پر ہے...... اور...... آپ کو پتا ہے، یہ گھر کس کا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے پُرتجسس انداز میں کہا۔

''یہ ایک اچھوت بلو رام کا گھر ہے جی۔ چار پانچ سال پہلے تک یہ بندہ راج بھون کے بھنگی خانے میں کام کرتا تھا۔ بھون کا خاندانی چاکر تھا۔ پھر اس بے چارے کو کوڑھ ہو گیا۔ اس کو راج بھون کی نوکری سے نکال دیا گیا بلکہ شہر سے ہی نکلنے کا حکم دیا گیا۔ کافی سمے تک تو بلو

رام کا کچھ پتا نا ہیں چلا۔ پھر زرگاں کے دو شکاریوں نے بتایا کہ بلو رام اپنی پتنی اور دو بچوں کے ساتھ ''کچے'' کے قریب جنگل میں کٹیا بنا کر رہت ہے۔ یہ اسی بلو رام کا گھر ہے جی۔'' مبارک کے لہجے میں طنز تھا۔

میں اور عمران حیران رہ گئے۔ جان بچانے کی خاطر انسان کیا کچھ کرتا ہے...... اور کبھی کبھی کس درجے تک گر جاتا ہے۔ زرگاں کے اونچی شان والے راجا وشوا ناتھ عرف حکم کو پناہ ملی بھی تھی تو کہاں؟

مبارک علی نے کہا۔ ''اگر ہمیں ان سگنلز کی مدد حاصل نا ہیں ہوتی تو ہم کبھی یہاں تک نہ پہنچتے۔ اور اگر پہنچ بھی جاتے تو شاید یہ نہ سوچتے کہ حکم جی اور اینڈرسن صاحب بہادر نے اس کمی کمین کوڑھی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہووے گا۔''

...... پانچ منٹ گزر گئے۔ چھٹا اور ساتواں منٹ بھی گزر گیا۔ اب حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مبارک علی کے اشارے پر کمانڈوز نے گھر کی کھڑکیوں اور دروازے پر چند راؤنڈ فائر کئے۔ جواب میں اندر سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں...... اور ہمارا ایک کمانڈو کندھے پر گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر والے بھرپور مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اب اپنا لائحہ عمل سوچنا تھا۔ سورج ڈھل گیا تھا اور اب جلد ہی شام کے سائے تاریکی میں بدلنے والے تھے۔ تاریکی کے بعد گھر کے اندر گھسنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی تھی۔ ہم نے اس کے لئے صلاح مشورہ شروع کر دیا۔

جونہی تاریکی گہری ہوئی، ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس کام کے لئے عمران نے سب سے پہلے پہلے خود کو پیش کیا۔ مبارک علی بھی اندر جانے پر آمادہ تھا مگر پھر اسے باہر کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ اس کی جگہ میں کارروائی میں شامل ہوا۔ میرے اندر اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لئے بے پناہ آگ تھی۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو یہی نیلی آنکھوں اور بھینسے کے جسم والا انگلش کمانڈر تھا۔ ہمارے ساتھ چھ اور منتخب جوان اندر جانے کے لئے تیار تھے۔

پروگرام کے مطابق، مبارک علی اور اس کے ساتھیوں نے گھر میں موجود افراد کو سامنے کی طرف سے فائرنگ میں انگیج کیا۔ یہ بڑی زوردار فائرنگ تھی۔ ہم بغلی طرف سے گھر کی بیرونی چار دیواری کی طرف بڑھے۔ یہاں درخت زیادہ تھے جو ہمیں کیموفلاج کر رہے تھے۔ سب سے پہلے عمران گھر کے اندر کودا...... اس نے ایک کھڑکی نما دروازہ کھول دیا۔ ہم بھرا مار

کر اندر گھس گئے۔ شدید فائرنگ کی زد میں آ کر دو بکریاں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھیں۔ تیسری شاید ہلاک ہو چکی تھی۔ عمران نے ایک کھڑکی کو زوردار لات رسید کی۔ وہ کھل گئی۔ ایک رائفل بردار گورا عمران کے سامنے آیا مگر اس کی تیزی عمران کی تیزی کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ عمران کا چلایا ہوا پانچ گولی کا برسٹ اس گورے کو چھلنی کر گیا۔ ہم کمرے میں کود گئے۔

یہی وقت تھا جب ہم پر بائیں جانب سے فائرنگ ہوئی۔ ایک گولی میرے سامنے کھڑے کمانڈو اشرف کے سر میں لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا۔ ایک دوسرے کمانڈو کو بھی میں نے اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ میں نے رائفل کے شعلے سے حملہ آور کی پوزیشن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلائی اور ساتھ ہی اس پر جست کی۔ میری چلائی ہوئی گولی تو اسے نہیں لگی لیکن میری رائفل کی سنگین اس کے سینے میں اندر تک گھس گئی۔ میں نے لات رسید کر کے اسے اپنی رائفل سے علیحدہ کیا۔ اس کی اپنی رائفل اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

اسی دوران میں ایک کمانڈو مجھ سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''یہ دیکھیں جی۔''

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ گولیوں کے بہت سے خولوں اور ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے ٹکڑوں کے درمیان کچے فرش پر رتنا دیوی اور اس کے بچے کی لاش پڑی تھی۔ رتنا دیوی اس حال میں بھی گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اندھا دھند ہونے والی ''کراس فائرنگ'' میں گولی لگی ہے۔ یہ ایک ہی گولی تھی جو پہلے اس کے بچے کو لگی پھر اس کے اپنے سینے سے پار ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک پاؤں بھی اس کی شاہی جوتی سمیت خون سے رنگین نظر آ رہا تھا۔

''حکم اور اینڈرسن آس پاس ہی ہوں گے۔'' عمران نے عقابی نظروں سے اردگرد دیکھ کر کہا۔

یہی وقت تھا جب دو کمانڈوز حکم کو پکڑ کر لے آئے۔ یہ نظارہ بھی عبرت ناک تھا۔ زرگاں کا تاجدار جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، مٹی میں لت پت نظر آتا تھا۔ اس کی کام دار سنہری پگڑی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

''یہ بھوسے والے کمرے میں چھپے ہوئے تھے جی۔'' کمانڈو نے اطلاع دی۔

''یہ پستول ان کے لباس سے نکلا ہے۔'' دوسرے کمانڈوز نے بھرا ہوا قیمتی بریٹا پسٹل میری طرف بڑھایا۔

لگتا تھا کہ گرفتاری کے وقت وشوا ناتھ عرف حکم جی نے تھوڑی بہت مزاحمت بھی کی

ہے۔ اس کا چغہ نما لباس ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا اور انگلیاں بھی زخمی تھیں۔

''تلاشی لے لی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ناہیں جناب۔'' کمانڈو آفیسر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تلاشی لو۔'' میں نے کہا۔

حکم گرجا۔ ''اپنے گندے ہاتھ ہم سے دور رکھو۔ ہمارے پاس کچھ ناہیں۔''

میں نے رائفل کی نال حکم کے سینے کی طرف کی اور انگلی ٹریگر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ہاتھ کتنے بھی گندے ہوں گے مگر اس شخص کے ہاتھوں سے گندے نہیں جسے تم اچھوت اور کوڑھی کہتے ہو...... اور جس کے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہو۔''

میرے اشارے پر کمانڈو آگے بڑھا اور اس نے حکم کی مزاحمت کی پروا کئے بغیر اس کی تلاشی لی۔ حکم کی آنکھوں میں ہر وقت جلتی ہوئی آگ کی جگہ اب راکھ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی نہایت قیمتی لیکن ٹوٹے ہوئے فانوس کی طرح تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کی چہیتی پتنی اور بچے کی لاشیں پڑی تھیں۔ غالباً اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک نظر انہیں دیکھ ہی سکے۔ کمانڈوز اسے گن پوائنٹ پر باہر لے گئے۔

مبارک علی ایک کمرے سے یہاں کے مکینوں کو نکال کر لے آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے دو لڑکے تھے۔ لڑکوں کی عمریں اٹھارہ بیس سال رہی ہوں گی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ عورت کے ہاتھ کوڑھ زدہ ہیں۔ یہ غریب صورت عورت صورتِ حال کی سنگینی کے سبب تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''ان کو بھی باہر لے جاؤ۔'' میں نے مبارک علی سے کہا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ عمران نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں سے بھی گولی چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ صاحب بہادر اینڈرسن صاحب وہیں پر چھپے ہوئے ہیں۔''

اگلے دو تین منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ اینڈرسن وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس ایک ''ایل ایم جی'' تھی اور یقیناً کافی تعداد میں راؤنڈز بھی تھے۔ مگر جو کچھ بھی تھا، اپنی تمام تر ہوشیاری اور دیدہ دلیری کے باوجود وہ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک چوہے کی طرح ٹریپ ہو چکا تھا۔ ایک گوشت خور سفید چوہا ذہانت اور دلیری میں خود کو حرفِ آخر سمجھتا تھا اور بات بات پر تاریخی حوالے بھی دیتا تھا۔ وہ یہاں زرگاں میں کمانڈر انچیف کی حیثیت رکھتا تھا مگر اب ہمارے اور اس کے درمیان ایک بوسیدہ چوبی دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! باہر آ جاؤ۔ اس کے سوا تمہارے پاس اب کوئی راستہ نہیں ہے۔''

چند سیکنڈ بعد یہی بات عمران نے بھی دہرائی۔

کچھ دیر تک اندر خاموشی طاری رہی۔ پھر اینڈرسن کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ برٹش لب و لہجے میں بولا۔ ''کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ میں گرفتاری دے دوں تو تم گولی نہیں چلاؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! تم کوئی بھی شرط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔ ہم تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔''

ہمارے درمیان مختصر مکالمہ ہوا۔ پھر ہماری ہدایت کے مطابق اینڈرسن نے اپنی خطرناک ''ایل ایم جی'' کھڑکی سے باہر پھینکی۔ تب اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہ فوجی وردی میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ اسے تین اطراف سے مسلح کمانڈوز نے نشانے پر لیا ہوا تھا۔ اس کی ذرا سی غلط حرکت اس کے لئے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کا ایک کندھا خون آلود ہے۔

''گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ'' میں نے گرج کر کہا۔

وہ ذرا سا جھجکا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے۔ فوری موت سے بچنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ بالکل سیدھے کھڑے کر رکھے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی توقع اینڈرسن کو نہیں تھی۔ میری چلائی ہوئی گولی اینڈرسن کے سینے پر لگی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ گولی کے جھٹکے سے اس کی کیپ اچھل کر دور جا گری۔

میں نے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب! یاد کرو۔ اس طرح کا سین پہلے بھی دہرایا جا چکا ہے۔ اٹھرا گاؤں میں سلطانہ راجپوت نے بھی اسی طرح ہتھیار پھینکے تھے اور خود کو تمہارے حوالے کرنا چاہا تھا لیکن تم نے اس کی حوالگی قبول نہیں کی تھی۔ تم نے اسے مار ڈالا تھا۔''

اینڈرسن کی حالت ایک زخمی درندے کی سی تھی مگر اس کی بے پناہ تکلیف کے سامنے اس کی درندگی بے بس تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری گولی اس کے سر پر ماری۔ وہ اس کا رخسار توڑ کر سر میں گھس گئی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو ایک ریلے کی طرح دروازے کی طرف بہتا چلا گیا۔

میری آنکھوں میں آتشیں سی نمی تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی

جائیں لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ عمران کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس کی بھرپور تائید کرتا ہے۔

''یہ بھی مر گیا ہے جی۔'' مبارک علی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک اور مقامی کی لاش پڑی تھی۔ کالے رنگ کا یہ دبلا پتلا شخص اس گھر کا سربراہ بلو رام تھا۔ اس کے جسم پر بھی کوڑھ تھا اور یہ کافی بڑھ چکا تھا۔ حکم نے اپنے اس حقیر ملازم کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا لیکن اس شخص نے حقِ نمک ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک رائفل بھی پڑی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ آخری لمحوں میں حکم اور اینڈرسن وغیرہ کے ساتھ مل کر وہ بھی ہم پر گولی چلاتا رہا ہے۔ میں نے دیکھا۔ کمرے میں رتنا دیوی کی لاش سے نکلنے والا خون اور اس کوڑھی اچھوت کا خون گھل مل گئے ہیں...... سچ کہتے ہیں، موت ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو برابر کر دیتی ہے۔ ساری اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بڑی عبرت ناک صورتِ حال تھی۔ زرگاں کے فرمارروا اور اس کے سپہ سالار نے جان بچانے کے لئے ایک ایسے شخص کے گھر میں پناہ لی، عام حالات میں جس کا سایہ بھی وہ خود پر پڑنے نہ دیتے۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ وہاں کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ ہاں، گندم رکھنے والے ایک بڑے مٹکے کے اندر سے ایک گٹھڑی دستیاب ہوئی۔ ایسی ہی ایک گٹھڑی ایک چارپائی کے نیچے سے ملی۔ یہ گٹھڑیاں زیورات اور جواہرات سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی مالیت لاکھوں میں نہیں، کروڑوں میں تھی۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگوں کا خون پسینہ تھا۔

''یہ دیکھو، ہمارا دوست اور راہنما۔'' عمران نے اس سفری بیگ کی طرف اشارہ کیا جو ایک جستی ٹرنک پر رکھا ہوا تھا۔ یہی بیگ تھا جس میں حاضر دماغ میڈم صفورا نے الیکٹرانک چپ ڈالی تھی۔ مبارک علی اور عمران نے تین چار منٹ کی کوشش سے وہ چپ ڈھونڈ نکالی۔

ہم باہر پہنچے تو وشوا ناتھ عرف حکم جی کو بند جیپ میں بٹھایا جا چکا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''کتنا ہمدرد راجا ہے، زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔''

''زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر نہیں، اپنی چہیتی پتنی اور بچے کی موت پر۔'' میں نے کہا۔ ''زرگاں میں تو اس سے دس گنا نقصان بھی ہو جاتا تو اس کے کان پر جوں نہ رینگتی۔''

وہ بولا۔ ''دیکھو، تم کہتے ہو کہ ہم ٹی وی چینلز والے ہر واقعے کا منفی پہلو دیکھتے ہیں۔

اب تم خود منفی پہلو دیکھ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو راجا صاحب کے رونے کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے بعد زرگاں کے انجام کا غم کر رہے ہیں۔ اب شراب خانوں میں دھڑا دھڑ شراب بنانے والے مزدوروں کے گھروں کے چولہے کیسے جلیں گے؟ اب کون خیال رکھے گا غریبوں کا اور ان کی خوب صورت بیٹیوں کا؟ اب مسکین انگریز پردیسیوں کی مہمان نوازیاں کس کے ذمے ہوں گی؟ اب یہاں ناچ گھروں میں رات دن خون پسینا ایک کرنے والی شریف عورتیں اور نیک خواجہ سرا زندگی کی گاڑی کیسے کھینچیں گے؟ اُف...... ایسی پتا نہیں کتنی سوچیں چکرا رہی ہیں حکم صاحب کے دماغ میں۔''

ہماری آواز حکم تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن کمانڈوز اس کے لئے جو توہین آمیز نعرے لگا رہے تھے، وہ ضرور اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ یہ انجام تھا اس آرام طلب و عیش پرست شخص کا جس نے دنیاوی لذتوں کے بدلے دھیرے دھیرے اپنے سارے اختیار عیار گوروں کے حوالے کر دیئے تھے...... اور یوں اپنے عوام کی بربادی کا سبب بنا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''مجھے حکم کو دیکھ کر برادر محترم شہنشاہ جہانگیر صاحب یاد آ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''سنا ہے کہ بھائی جہانگیر صاحب نے بھی آخری دنوں میں اپنے سارے اختیارات میڈم نور جہاں...... مم...... میرا مطلب ہے ملکہ نور جہاں کے حوالے کر دیئے تھے۔ لگتا ہے کہ یہاں زرگاں میں حکم نے بھی انگریزوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کا پیکیج کیا ہوا تھا۔ کچھ نرم ملائم ''کچا گوشت''...... دو تین کلو بھنا ہوا گوشت اور انگریزی شراب کی دو چار بوتلیں باقی سب کچھ انگریزوں کے پاس۔''

○......❖......○

یہ اگلے روز دوپہر کی بات ہے۔ چوہان کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ اپنے اس دیرینہ دوست اور ساتھی کو الوداع کرتے ہوئے میں کرب کے کئی جانکاہ مرحلوں سے گزرا...... راج بھون میں اب جشن کا سماں تھا۔ راج بھون کے عظیم الشان دروازے عام لوگوں کے لئے کھول دیئے گئے تھے۔ بھون کے اندرونی حصوں کے سوا وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔ نعرہ زنی کی گونج سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاص و عام ہمیں مبارک بادیں دے رہے تھے...... ہماری تعریف کے پُل باندھ رہے تھے اور میں اس ہجوم میں اس چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا جو عام لوگوں کے لئے اجنبی تھا لیکن زرگاں کی خون ریز لڑائی میں جس کا کردار اہم ترین تھا۔ میں طلال کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اور میری

ہدایت پر اور بھی بہت سے افراد اس کی تلاش میں تھے۔ وہ پتا نہیں کہاں کھو گیا تھا۔

چھوٹے سرکار کو راج بھون کے شاندار تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے دائیں بائیں درجنوں مصاحب اور خواص کی کرسیاں تھیں۔ مجھے اور عمران کو بھی وہیں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے قریب نشستیں دی گئی تھیں۔ لیکن میں پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی نشست پر موجود نہیں تھا۔ میں طلال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

آخر طلال کا کھوج قبرستان میں ملا۔ ایک ہرکارے نے آ کر بتایا کہ طلال کے حلیے سے ملتا جلتا ایک لڑکا قبرستان میں موجود ہے اور ایک قبر سے لپٹا رو رہا ہے۔ میں دو محافظوں اور اس ہرکارے کے ساتھ قبرستان میں پہنچا۔ میں نے طلال کو دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ سلطانہ کی قبر پر موجود تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا اور ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ باقی لوگ فاصلے پر ہی کھڑے رہے۔ میں آگے گیا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے اپنا تربتر چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ کہے جا رہا تھا۔ ''خالو جان...... وہ چلی گئیں۔''

اس نے میری آنکھیں بھی ایک بار پھر نم کر دیں۔ ہم کافی دیر تک اس کی قبر پر موجود رہے اور اسے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔

راج بھون میں واپس آ کر میں نے طلال کو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! زرگاں کی جنگ میں طلال کا کردار بڑا اہم رہا ہے۔''

چھوٹے سرکار نے طلال کو سر تا پا دیکھا۔ پھر اسے اپنے قریب بلایا اور کندھا تھپکا۔ مراد شاہ صاحب بولے۔ ''ہم نے سنا تھا کہ جب قاسمیہ چوک میں انور خاں اور کچھ دوسرے قیدیوں کو سولی چڑھایا جا رہا تھا تو چند راجپوت لڑکوں نے ہجوم سے نکل کر اچانک ہلا بول دیا تھا۔ کیا یہ ان میں شامل تھا؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! یہ نہ صرف ان میں شامل تھا بلکہ ان کا لیڈر بھی تھا۔ یہ ان میں سب سے آگے تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں جناب کہ اس ساری لڑائی کا نقشہ بدلنے میں وہ واقعہ سب سے اہم تھا۔ یہ وہی موڑ تھا جہاں سے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی اور انہوں نے گارڈز پر حملہ کرنے کا حوصلہ کیا۔''

چھوٹے سرکار نے طلال کو بے حد تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ دوبارہ شاباش دی اور اس بار شاباش کے ساتھ ہی اپنے گلے سے سچے موتیوں کا ایک ہار نکالا اور طلال کو دیا۔ بہت جھجکتے ہوئے اس نے یہ ہار لے لیا۔ طلال کو اگلی نشستوں پر جگہ دی گئی۔ مراد شاہ صاحب نے

اسی وقت طلال کے زندہ رہ جانے والے اور جان دینے والے ساتھیوں کے لئے مختلف انعامات اور مراعات کا اعلان کیا۔

ہمارا مقامی دوست کھشتری بھرت کمار زخمی ہوا تھا اور سیکڑوں دوسرے زخمیوں کی طرح اس کا علاج بھی راج بھون کے ساتھ واقع شفاخانے میں ہو رہا تھا۔ میں اور عمران بھرت کو دیکھنے پہنچے۔ وہ اسی دھاری دار سویٹر میں تھا جس میں اسے گولی لگی تھی اور وہ چوکور برجی کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گرا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا مگر اس کی حالت ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں تھی۔ گندمی رنگت والی خوش شکل چمپی اب بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبا رہی تھی اور ساتھ ہی ان پاؤں پر اپنے آنسو بھی گرا رہی تھی۔ مالا بھی وہیں موجود تھی اور تیمارداری میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ درحقیقت یہ دونوں لڑکیاں ہی تھیں جو بھرت کو یقینی موت کے منہ سے کھینچ کر لائی تھیں۔ میں نے چمپی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دلاسا دیا۔

”گھبراؤ نہیں، چمپی! یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری محبت نے اس بچایا ہے اور تمہاری محبت ہی اسے زندہ بھی رکھے گی۔“

چمپی کے آنسو اور تیزی سے گرنے لگے۔ وہ یوں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی جیسے بہت بڑی مجرم ہو اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے، بس اسی کی بدقسمتی کا نتیجہ ہے۔ ہم بڑے ڈاکٹر سے ملے اور اسے بھرت کمار کے علاج اور نگہداشت کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں۔

جب ہم واپس جانے والے تھے، اچانک چونک گئے۔ ہم نے بھرت کے والد کو دیکھا۔ وہ سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتا اور مسلسل کھانستا ہوا بھرت کی طرف آ رہا تھا۔ چمپی نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس کے عقب میں تھا کھانسی کی آواز سن کر چمپی پلٹی اور ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

بھرت کے والد نے دیکھ لیا تھا کہ چمپی بھرت کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وہ تڑخ کر بولا۔

”تُو یہاں کیا کرت ہے؟ تُو نے چھوٹے مالک کو ہاتھ کیوں لگائے؟ تجھے دیا نا ہیں آئی؟ کیا کام تھا تیرا یہاں؟ کیا کام تھا؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے چمپی کو ٹھوکے دیئے۔

مالا جھپٹ کر آگے بڑھی۔ اس نے بھرت کے پتا کو روکا اور کہا۔ ”چاچا جی! یہ لڑکی آپ کے بیٹے کو ہاتھ نہ لگاتی تو یہ اس وقت زندہ بھی نہ ہوتا۔ یہی ہے جو اسے برستی گولیوں سے نکال کر لائی ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

عمران نے کہا۔ ”مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔ یہاں شور شرابا کرو گے تو اسپتال والے چپت مار مار تمہارا گنج لال کر دیں گے۔“

بھرت کا پتا ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ میری طرح عمران نے بھی چمپی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ بھرت کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری جاری رکھے۔ مسلح گارڈز بھرت کے پریشان حال پتا کو لے کر باہر آ گئے۔ میں نے انچارج گارڈ کو سمجھایا کہ وہ بھرت کے اس خرد ماغ باپ کو ساری بات بتائے اور اسے وارننگ دے کہ اگر اس نے چمپی یا اس کی والدہ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ایک گارڈ نے بھرت کے والد کو بتا دیا تھا کہ اس سے مخاطب ہونے والے کون ہیں۔ میرا اور عمران کا تعارف بھرت کے والد کو ہکا بکا کرنے اور لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔

زرگاں کی لڑائی کا ایک اہم غدار...... ہمارا سابقہ ساتھی عبدالرحیم بھی اسی اسپتال میں زیر علاج تھا۔ عمران نے اس کے سر پر رائفل کے دستے سے ایک تباہ کن ضرب لگائی تھی...... جس کی وجہ سے وہ چار پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اب وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی مرہم پٹی بھی ہو چکی تھی۔ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں اس سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اس کے دو چار مزید ساتھی بھی اس مخبری والے ”کارخیر“ میں اس کے ساتھ شریک ہوں گے۔ تاہم ابھی تک عبدالرحیم نے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں تھا۔ وہ کافی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔

ہم عبدالرحیم کے کمرے میں پہنچے۔ اسے ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ زنجیر کا سرا بیڈ کے ساتھ منسلک تھا۔ عبدالرحیم کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور شکل ڈراؤنی ہوگئی تھی۔ عبدالرحیم سے پوچھ گچھ کی ساری ذمے داری حسنات احمد پر تھی۔ وہی پچھلے بارہ گھنٹے سے اس کے ساتھ سر کھپا رہا تھا۔ ہم پہنچے تو عبدالرحیم کا سر جھک گیا۔ وہ ہم سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا......

حسنات احمد مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے رازداری سے کہا۔ ”بڑا سخت جان ہے۔ ابھی تک کوئی جانکاری ناہیں دی اس نے...... لیکن جانکاری بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی وجہ سے ہمیں مزید نقصان پہنچ سکت ہے۔ بہرحال، آپ بڑے اچھے سمے پر آئے ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ٹیکا لگوایا ہے۔ اس پر اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زبان کا تالا کھل جاوے گا۔“ میں چونک گیا۔ ٹیکے سے حسنات کی مراد وہی درد والا ٹیکا تھا۔

دوسرے کمرے میں عبدالرحیم کے کراہنے کی آوازیں آنے لگی تھیں...... یہ آوازیں

بتدریج بلند ہو رہی تھیں۔ آج ہم پہلی بار اس سبز رنگ کے مہلک انجکشن کے اثرات ملاحظہ کر رہے تھے جو زرگاں میں دہشت کی علامت تھا۔ اس مہلک انجکشن کی ڈبل ڈوز کا مطلب ایک دردناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں تین خوبرو لڑکیوں کی وہ اکڑی ہوئی لاشیں یاد آئیں جو ہم نے ایک دن پہلے راج بھون کے عشرت کدے میں دیکھی تھیں۔

اور اب یہ سنگل ڈوز والا انجکشن عبدالرحیم کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا...... حسنات احمد نے اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کروا دیئے تھے تاکہ عبدالرحیم کی آہ و بکا باہر نہ سکے۔ عبدالرحیم کے چہرے پر دھیرے دھیرے اذیت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ ''میں مرگیا...... مجھے بچاؤ...... میں مرگیا۔'' وہ بار بار یہی الفاظ کہہ رہا تھا۔

وہ کبھی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا۔ کبھی سینے پر...... اسے جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تکلیف ہو کہاں رہی ہے۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کی زنجیر کو دیوانہ وار جھٹکے دینے لگا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ لاحاصل کوشش تھی۔ وہ تین منٹ کے اندر اندر اس کی یہ کیفیت ہوگئی کہ وہ بیڈ پر سے ایک ایک بالشت اچھلنے لگا۔ وہ کند چھری سے ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا۔ اس کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ پھر وہ چلاتے چلاتے بستر سے گر گیا۔ تڑپ تڑپ کر اس نے اپنے پاؤں زخمی کر لئے۔ جب تکلیف انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بالکل جیسے سرکٹ بریکر کی وجہ سے مشین بند ہو جاتی ہے۔ لیکن سرجن اسٹیل کے بنائے ہوئے اس انجکشن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ بندے کو حتی الامکان حد تک ہوش میں بھی رکھتا تھا یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

''خدا کے لئے...... خدا کے لئے۔'' عبدالرحیم ہولناک آواز میں پکارا۔

حسنات احمد کے اشارے پر ایک کمپاؤنڈر نے تین ایم ایل کا ایک انجکشن بھرا...... حسنات نے عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہیں درد کا انجکشن لگایا گیا ہے۔ اس دوسرے انجکشن سے پہلے انجکشن کا اثر ختم ہو جائے گا۔ صرف ایک منٹ لگے گا۔ لیکن پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔''

''میں بتاتا ہوں۔ خدا کے لئے...... خدا کے لئے۔'' اس کا زیریں لباس گیلا ہو چکا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔

حسنات احمد نے جو جو کچھ پوچھا، عبدالرحیم بتاتا چلا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ رحم کی بھیک بھی مانگتا جا رہا تھا...... اس کی آواز کرب کی شدت سے پھٹ رہی تھی اور اس کے الفاظ سمجھنے میں

دشواری ہو رہی تھی۔ حسنات کے اشارے پر فربہ اندام کمپاؤنڈر نے مخصوص قسم کی پین کلر دوا عبدالرحیم کے مسل میں انجیکٹ کی۔ اس کام کے لئے تین افراد کو بڑی مضبوطی سے عبدالرحیم کو دبوچنا پڑا۔ ایک دو منٹ بعد عبدالرحیم کی غیر معمولی اذیت کم ہونا شروع ہوگئی۔ تاہم وہ حسنات کے سوالوں کے جواب روانی سے دے رہا تھا۔

میں اور عمران اسپتال کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ عمران نے کہا۔ ''کاش میرے پاس کیمرا ہوتا، میں عبدالرحیم کے تڑپنے پھڑکنے کی فلم بنا سکتا۔ کتنا مزہ آتا اگر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی پندرہ بیس چینل کام کر رہے ہوتے۔ عبدالرحیم کی فلم بننے کے فوراً بعد میں اپنے ''فساد چینل'' پر پٹی چلانا شروع کر دیتا۔ ناظرین ہمیں مظلوم عبدالرحیم پر بدترین تشدد کی فوٹیج موصول ہوگئی ہے۔ جلد ہی آپ دیکھ سکیں گے۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تک تو ناظرین کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ''کہیں جائیے گا مت۔'' ڈیڑھ دو گھنٹے میں کم از کم پندرہ سو اشتہارات دکھانے کے بعد ہم یہ فوٹیج چلاتے اور ساتھ میں بتاتے کہ 18 بچوں کے باپ عبدالرحیم نے چونکہ مبینہ طور پر اعلیٰ افسروں کو رشوت نہیں دی تھی اس لئے اس پر ظلم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ ہم فوٹیج پر سرخ دائرے لگا لگا کر بتاتے کہ یہ عبدالرحیم کو ٹیکا لگایا جا رہا ہے...... یہ تکلیف اور خوف کی وجہ سے اس کا پاجامہ گیلا ہوتا جا رہا ہے...... یہ دیکھئے یہ دیکھئے...... یہ مزید گیلا ہو گیا ہے۔ اور یہ دیکھئے، اس تیسرے سرخ دائرے کے اندر یہ بندہ مسکرا رہا ہے۔ اسی نے رشوت طلب کی تھی۔ رات کے ٹاک شو میں ہم چار دانشوروں سے اس فوٹیج پر تبصرہ کراتے اور وہ بڑی آسانی سے درد کے اس انجکشن کے ڈانڈے امریکا کی اندرونی بے چینی اور نیو ورلڈ آرڈر سے جوڑ دیتے۔ عبدالرحیم کسی بڑے ایرانی سائنس داں کا اسسٹنٹ قرار پاتا۔''

''لیکن دو روز بعد یہ سب کچھ غلط ثابت ہو جاتا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کیا ہوتا۔ یہ ایک اور بریکنگ نیوز بن جاتی...... عبدالرحیم مظلوم کے بجائے ظالم نکلا۔ اس سے کسی نے رشوت طلب نہیں کی تھی...... اس کی بے وفائی اور غداری کے ٹھوس ثبوت منظرِ عام پر آ گئے...... وغیرہ وغیرہ۔''

''چلو، تمہارا یہ چینل چینل کھیلنے والا شوق بھی جلد پورا ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھانڈیل اسٹیٹ میں ہماری واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔''

''ہائے۔'' عمران نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تیر مارا ہے تم نے دل پر۔ ایک دم ریما جی کی یاد آ گئی...... وہ لاہور کی سڑکیں، وہ سردیوں کی سنہری دھوپ، وہ نہر کا کنارہ۔ وہ مزے

مزے کے ریستوران......''

پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے بھی خاموشی نے گھیر لیا۔ سامنے ہی زرگاں کا قبرستان نظر آیا تھا۔ وہ قبرستان جہاں سلطانہ دفن تھی۔ اپنی تمام تر سادگی، دلیری اور محبت کے ساتھ۔ مجھے پتا تھا کہ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مجھے یہ جگہ بہت یاد آئے گی۔ شیشم اور بیری کے پیڑوں کے نیچے وہ کچی قبر جس میں میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سو رہی تھی۔ قریباً تین برس تک وہ شب و روز سائے کی طرح میرے ساتھ رہی تھی۔ اس کی قربانیوں نے مجھے زندہ رکھا اور اس کی بے لوث محبتوں نے میرے دل و دماغ میں انمٹ رستے بنائے۔ لیکن اب مجھے ہمیشہ کے لئے اسے یہاں چھوڑ کر جانا تھا۔ خوش آئند بات بس ایک ہی تھی۔ اس کی ایک نشانی میرے پاس موجود تھی۔

اچانک مجھے اور عمران کو چونکنا پڑا۔ اسپتال کی طرف سے دو گھڑ سوار گھوڑے بھگاتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، ان کے عقب میں کھوسٹ بوڑھیا کی پوتی بہو مالا بھی دوڑی چلی آ رہی تھی۔ یہ تینوں ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ یقیناً کوئی بہت خاص بات تھی۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔

''یا اللہ خیر۔'' عمران نے کہا۔ ''کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے؟''

○......❖......○

دونوں گھڑ سوار اور مالا ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ اتنے میں پانڈے کا اچھوت ماتحت امر ناتھ بھی بھاگا ہوا آیا اور ہمارے پاس آ کر رک گیا۔

مالا نے ہانپی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، ماتا جی کہاں ہوں گی؟''

میں نے کہا۔ ''میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج صبح کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ نہیں بچیں۔''

''یہ غلط ہے۔'' مالا نے کہا۔ ''میں پورے وشواس سے کہہ سکت ہوں کہ وہ زندہ ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں ابھی ابھی اسپتال سے ملا ہے۔''

''کیسا ثبوت؟'' عمران نے پوچھا۔

''پتا چلا ہے کہ رات کو کچھ لوگن اسپتال میں آئے تھے۔ انہیں جانکاری ملی تھی کہ یہاں اسپتال میں کوئی ایسی ناری موجود ہے جو ودھوا ہے اور اس کی عمر تیس بتیس ورش کے لگ بھگ ہے۔ ان لوگن کو اسپتال میں تو ایسی عورت ناہیں ملی مگر پھر پتا چلا کہ اسپتال کے صحن میں جو

چھوٹا سا مندر ہے، وہاں ایک ایسی ودھوا عورت سیوا کا کام کرت ہے۔ یہ لوگن اس عورت کے پاس پہنچے اور اسے ایک گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ دیکھنے والے نے بتایا ہے کہ گھوڑا گاڑی میں ایک بوڑھی عورت بھی موجود تھی جس نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دیکھنے والے کا وچار ہے کہ وہ کالے کپڑوں والی عورت ماتا جی ہی تھی۔''

''تم اپنی اس ساری بات سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو مالا؟'' عمران نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میں یہ بتانا چاہت ہوں کہ ماتا جی نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی عادت کے مطابق کوئی خطرناک شوشہ چھوڑنے والی ہیں۔ وہ اسپتال کے اندر سے ایک تیس ورش کی بیوہ عورت کو ڈھونڈ کر لے گئی ہیں۔ مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ میں نے تیس ورش کی بیوہ کا ذکر ماتا جی کی زبانی کسی پرانی رسم کے سلسلے میں سنا تھا۔ کوئی ایسی رسم جو بہت بری تھی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد ناہیں آ رہا ہے۔ پر میرا من کہہ رہا ہے کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ ماتا جی کا کٹر پن اور ان کا ''میں نہ مانوں'' والا رویہ کوئی مصیبت کھڑی کرنے والا ہے۔''

امر ناتھ نے لجاجت سے کہا۔ ''میں اس قابل تو ناہیں ہوں جی لیکن اگر آپ کی اجاجت ہو تو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ ہم کو اس بارے میں پنڈت مہاراج سے پوچھنا چاہئے۔ ان کو بہت سی پوتھیاں اور شاستریں منہ جبانی یاد ہیں۔ پنڈت مہاراج ہمیں فوراً بتا سکت ہیں کہ اگر بھگوان نہ کرے ماتا جی کوئی بری رسم ادا کرنے والی ہیں تو وہ کیا ہووے گی۔''

مالا نے فوراً تائید کی۔ ''میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں فوراً ماتا جی کے ارادے کے بارے میں جاننا چاہئے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کچھ لوگن اسپتال سے تیس ورش کی ودھوا ناری کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ اور اگر اسے لے جانے والوں میں ماتا جی بھی ہیں تو پھر ہمیں جانکاری ہونی چاہئے کہ وہ کیا کرنا چاہ رہی ہیں۔''

تھوڑے سے مزید مشورے کے بعد ہم سیدھے راج بھون میں پنڈت مہاراج کے پاس پہنچے۔ پنڈت مہاراج کو عارضی طور پر راج بھون کے ایک رہائشی پورشن میں نظر بند کیا گیا تھا۔ پنڈت مہاراج اپنے لمبے بالوں اور اپنے گلے میں جھولنے والی درجنوں مالاؤں کے ساتھ لکڑی کی چوکی پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ جارج گورا کے ساتھ میرے سامبر مقابلے سے پہلے اور مقابلے کے بعد بھی پنڈت مہاراج نے کچھ اچھے فیصلے دیئے تھے اور ہمارے دل میں جگہ بنائی تھی لیکن آخر میں وہ بھی موقع پرستی اور مصلحتوں کا شکار ہوا تھا۔ دھرم کا منہ بند کرنے کے لئے پہلے مجھے، عمران اور حمیدہ کو آزاد کیا گیا تھا اور جب ہم ایک خاص حد سے

آگے نکلے تھے تو ہمیں پھر سے پکڑنے کے لئے گھوڑے دوڑا دیئے گئے تھے۔

آج اگر پنڈت مہاراج شرمسار اور سرنگوں نظر آ رہا تھا تو اس کی وجہ وہی واقعات تھے۔ بہر حال، اس موقع پر ہم نے پنڈت مہاراج کو مزید شرمسار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے اسے تسلی تشفی دی اور اسے باور کرایا کہ دیگر دھرمی لوگوں اور پنڈتوں پجاریوں کی طرح اس سے بھی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ مالا نے پنڈت مہاراج سے وہ سوال پوچھے جو بڑی شدت سے اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ اس نے تیس سالہ بیوہ کا ذکر کیا اور اس خونی رسم کا ذکر کیا جس کے بارے میں اس نے کوئی ادھوری سی بات کہیں سنی تھی۔

پنڈت مہاراج کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس حوالے سے کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں سے ایک موٹی تگڑی قدیم شاستر کھولی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک تحریر کی نشاندہی کی۔ یہ سنسکرت میں تھی۔ مالا کی درخواست پر پنڈت مہاراج نے تحریر کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کچھ اس طرح تھا۔

''بھانڈیل کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں جب بھی بھگوان کے سینکوں (سپاہیوں) کو دشمن کے خلاف یدھ (جنگ) میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ہورا کی رسم کا سہارا لیا۔ ہورا کی رسم بلیدان کی وہ رسم ہے جس سے ہمیشہ ہاری ہوئی جنگ جیتی گئی ہے۔ یہ بلیدان ایشور کو اتنا پسند آتا ہے کہ وہ کایا پلٹ دیتا ہے۔ انہونی، ہونی ہو جاتی ہے۔ اتہاس (تاریخ) میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔''

...... نیچے کچھ مثالیں لکھی ہوئی تھیں۔

آخر میں درج تھا۔ ''ہورا کی رسم کے مطابق کالے رنگ کی تینتیس بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے مردہ جسم مٹی میں دبا دیئے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آ سکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ ہتھنیوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کرنے کے باوجود بھی ورودھیوں (دشمنوں) کی شکست اور اپنی فتح کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ ہورا کی اس دوسری رسم میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ ان تینوں ناریوں کو ودھوا ہونا چاہئے اور ان کی عمریں تیس سال سے کم نہ ہوں۔ یہ ناریاں دھرم کے پالن کے لئے اپنی خوشی اور اکھشا سے اپنا جیون قربان کریں...... تو یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔''

اس کے علاوہ بھی اس رسم کے حوالے سے دو چار شرائط لکھی ہوئی تھیں۔

مالا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پورے یقین سے بولی۔ ''اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا

ہے۔ بے شک...... بے شک یہی باتیں تھیں جو میں نے اپنے گھر میں اپنی دادی ساس سے سنی تھیں اور مجھے پورا وشواس ہے کہ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا کام ہونے جا رہا ہے۔''

''لیکن آپ تو ایک عورت کی بات کر رہی ہیں۔ یہاں تین عورتوں کا ذکر ہے۔'' میں نے مالا سے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ ہو سکت ہے کہ میری دادی ساس نے دو عورتوں کا انتظام پہلے سے کر رکھا ہو۔ وہ جو کام کرنے کی ٹھان لیوت ہیں پھر وہ کر گزرتی ہیں۔''

''اب سوچنے کی بات ہے کہ یہ کام کب اور کہاں ہوگا؟'' عمران نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی ہجوم والی جگہ پر ہووے گا۔ جہاں بہت سارے لوگن اس کو دیکھ سکیں اور ان کے اندر جوش اور شکتی پیدا ہو سکے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ شہر کے ''زیادہ ہندو آبادی'' والے علاقے میں ماتا جی کو تلاش کرایا جائے۔ بہت سے بندوں کو فوری طور پر اس کام پر لگا دیا جاوے۔ یہ بھی ہو سکت ہے کہ ماتا جی اور ان کے قریبی ساتھیوں نے کسی مندر یا دھرم شالے میں پناہ لے رکھی ہو۔''

مالا کی رائے میں وزن تھا۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے مشورہ کیا فوری طور پر مبارک علی کو بلایا گیا اور اسے ساری صورتِ حال بتا کر تلاش کی ذمے داری سونپ دی گئی۔

ہم دوبارہ راج بھون کے دربار میں پہنچے تو وہاں فتح کا جشن جاری تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اپنے ایک پرانے ساتھی اجے سے بھی ہوئی۔ اجے نل پانی کی فوج میں کپتان تھا۔ وہ انور خاں کے ساتھ ہی یہاں زرگاں میں پہنچا تھا۔ اب یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکی تھی کہ زرگاں کے حکمراں وشوا ناتھ عرف حکم جی نے جان بچانے کے لئے ایک کوڑھ زدہ بھنگی کے گھر میں پناہ لی تھی اور اسے وہیں سے پکڑا گیا ہے۔ رتنا دیوی کی اتفاقیہ موت کی خبر بھی ہر جگہ پھیل چکی تھی۔ انگریز کمان دار اینڈرسن کی لاش راج بھون میں لائی جا چکی تھی۔ اس کی لاش کو کڑی حفاظت میں رکھا گیا تھا ورنہ منیارڈ اور پانڈے کی لاش کی طرح وہ بھی لوگوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتی۔

چھوٹے سرکار نے اپنے بڑے بھائی حکم جی کے لئے فی الحال نظر بندی کے احکام جاری کئے تھے۔ اس سے ضروری کاغذات پر دستخط وغیرہ کرانے کے بعد اسے اپنے اہلِ خانہ کی آخری رسومات میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا راج بھون کا تہ خانہ تھا۔ کچھ دیر بعد حسنات احمد بھی دربار میں پہنچ گیا۔ وہ اسپتال میں انور خاں کے غدار ساتھی عبدالرحیم سے تفتیش کر کے یہاں پہنچا تھا درد کا انجکشن جو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کرتا

تھا،عبدالرحیم کی زبان کھلوانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

حسنات احمد نے بتایا۔''عبدالرحیم نے انگریز افسر منیارڈ کے ساتھ معاملہ طے کیا تھا۔ راج بھون کی ایک ''پری'' عبدالرحیم کے پیچھے لگائی گئی۔اس نے ایک ہی رات میں نہ صرف عبدالرحیم کو شیشے میں اتار لیا بلکہ عبدالرحیم کے ذریعے انور خاں کے دو تین اور ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔منیارڈ کی طرف سے ان افراد کو فی کس پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ ہوا اور ایک ایک لاکھ روپیا نقد فراہم کیا گیا۔عبدالرحیم کو خصوصی رشوت کے طور پر زرگاں کی ایک قیمتی زمین دینے کا وچن بھی دیا گیا۔''

''باقی لوگ کون ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''وہ انور خاں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ان کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارے جا رہے ہیں اور شہر کے ناکوں پر ان کے لئے خاص ہدایتیں جاری کر دی گئی ہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک پیغام رساں بڑی تیزی سے وہاں پہنچا۔اس نے حسنات کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کچھ گفتگو کی۔حسنات نے مجھے اور عمران کو بھی بلا لیا۔

''کیا بات ہے؟''میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''بڑھیا کی کارستانی سامنے آ گئی ہے جی۔'' حسنات نے جذباتی لہجے میں کہا۔''وہ قاسمیہ کے قریب دھرم شالے میں موجود ہے۔وہی دھرم شالہ جس کے مینار پر چڑھ کر اس نے تین دن پہلے پوجا پاٹ کی تھی۔''

''کیا کسی نے اسے دیکھا ہے وہاں؟'' کپتان اجے نے پوچھا۔

''ابھی دیکھا تو ناہیں لیکن امید ہے کہ وہ خانہ خراب بھی وہیں پر ملے گی۔جس ودھوا عورت کو وہ اسپتال کے مندر سے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، وہ دھرم شالے کے مینارے پر موجود ہے۔اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی ہے۔دونوں عورتیں آتما ہتھیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔وہاں بہت سے ہندو جمع ہو گئے ہیں اور نعرے وغیرہ لگا رہے ہیں...... مجھے لگت ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تیسری عورت بھی مینارے پر چڑھ جاوے گی اور پھر رسم کے مطابق یہ تینوں ودھوائیں آتما ہتھیا کر لیویں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہورا کی رسم کے مطابق، ہاری ہوئی جنگ کو جیتنے کے لئے قربانی دیں گی۔''میں نے کہا۔

حسنات نے اثبات میں سر ہلایا۔''بالکل ایسا ہی ہے جی۔لگت تو یہی ہے کہ وہ سیکڑوں لوگن کے سامنے مینارے سے چھلانگ لگا دیویں گی...... اور شہر میں ایک نئے فساد کی

شروعات ہو جاوے گی۔''

''نہیں، اب کوئی فساد نہیں ہوگا۔'' عمران نے یقین سے کہا۔''فساد کرنے والوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔پھر بھی ہمیں اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لینا چاہئے اور فوری سدِباب کرنا چاہئے۔''

حسنات نے کہا۔''مجھے یقین ہے جی کہ فساد کی اصل جڑ بڑھیا بھی دھرم شالے کے اندر ہی ہے۔وہی ان تین عورتوں کو اس خونی کھیل کے لئے تیار کر رہی ہے۔''

میں، عمران، اجے اور حسنات فوراً وہاں سے روانہ ہوئے۔ایک بند فوجی گاڑی میں ہم بیس منٹ کے اندر ایک بار پھر قاسمیہ کے نواح میں پہنچ گئے۔یہ سہ پہر کا وقت تھا۔لوگ جگہ جگہ ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے۔نل پانی کے سپاہیوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ہر طرف طربیہ ماحول کی جھلکیاں تھیں مگر جب ہم دھرم شالے کے نواح میں پہنچے تو وہاں کچھ اور طرح کی فضا دکھائی دی۔وسیع دھرم شالے کے بیچوں بیچ ایک تالاب میں کھڑا چوکور مینار لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا......اردگرد کی چھتوں اور گلیوں میں چار پانچ سو افراد جمع ہو چکے تھے اور بھی مزید آ رہے تھے۔بلند و بالا مینار پر ہمیں دو عورتیں نظر آئیں۔دونوں نے گہرے زرد رنگ کے چولے پہن رکھے تھے۔انہوں نے بال کھولے ہوئے تھے اور اپنے سروں کو ہیجانی انداز میں ہلا کر کچھ اشلوک وغیرہ پڑھ رہی تھیں۔

''تیسری عورت نظر نہیں آ رہی۔''میں نے حسنات احمد سے پوچھا۔

''شاید اسی کا انتظار ہو رہا ہے۔'' حسنات احمد نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔''عمران نے کہا۔

ہم بند فوجی گاڑی کے اندر ہی بیٹھے تھے۔اردگرد کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ اس گاڑی میں اہم لوگ موجود ہیں لیکن پھر بھی دھرم شالا کے ایک پجاری کی نظر ہم پر پڑ گئی۔یہ ادھیڑ عمر شخص تیزی سے گاڑی کی طرف آیا اور کھڑکی کے شیشے سے چمٹ گیا۔اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ فریادی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ساتھ ساتھ وہ مینار کی بلندی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''اسے اندر آنے دو۔''عمران نے حسنات احمد سے کہا۔

حسنات نے دروازہ کھول لیا اور اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور فریاد کناں لہجے میں بولا۔''ان دونوں ناریوں کا جیون بچاؤ جی۔یہ آتما ہتھیا کر لیویں گی۔بڑی ماتا ان کو آتما ہتھیا پر مجبور کر دیوے گی۔یہاں جو کچھ ہونے جا رہا ہے......وہ بڑی ماتا

ہی کروارہی ہے۔ پرنتو! وہ وہی کچھ کرت ہے جو اس کے اپنے من میں آوت ہے۔''

عمران نے پوچھا۔''وہ ان کو آتما ہتھیا پر کیوں مجبور کر رہی ہے؟''

جواب میں ادھیڑ عمر پجاری نے قریباً وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے مالا نے بتایا تھا۔ ادھیڑ عمر پجاری نے ''ہورا'' کی رسم کا ذکر کیا اور بتایا کہ کچھ لوگوں کے عقیدے کے مطابق اگر تین ودھوا ناریاں جن کی عمریں تیس سال سے زیادہ اور پینتیس سال سے کم ہوں، اپنی مرضی سے اپنے جیون کی بلی دیں تو ہاری ہوئی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ ادھیڑ عمر پجاری نے یہ بھی بتایا کہ دو ودھوا عورتیں مینار پر چڑھ گئی ہیں۔ دھرم شالا کے اندر سے ہی ایک تیسری عورت کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ بس چند منٹ میں وہ بھی مینار کے اوپر نظر آئے گی اور پھر تینوں عورتیں مینار سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیں گی۔

عمران نے کہا۔''ہمیں ہورا کی اس رسم کے بارے میں پنڈت مہاراج نے ایک شاستر میں سے پڑھ کر بتایا تھا۔ کیا تمہارے پاس بھی کوئی ایسی شاستر یا پوتھی ہے؟''

''کیوں ناہیں جی...... دھرم شالا میں ایسی کئی پوتھیاں ہیں جن میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔''

''کیا تم کوئی ایسی پوتھی ہمیں دکھا سکتے ہو؟''

''بالکل دکھا سکتا ہوں جی......مگر ابھی سمے بہت کم ہے۔ آپ پہلے ان ناریوں کا جیون بچانے کے لئے کچھ کریں۔''

''جیون ضرور بچے گا، تم گھبراؤ مت۔ تم فٹافٹ اندر سے کوئی پوتھی لے کر آؤ۔ جلدی کرو۔'' عمران نے پجاری کو تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ چار و ناچار گاڑی سے اترا اور اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دھرم شالے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ دھرم شالے کے اردگرد ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ مینار پر چڑھی ہوئی عورتوں کا انداز مزید ہیجانی ہو گیا تھا۔

ادھیڑ عمر پنڈت فقط دو تین منٹ میں واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور کتاب کی ورق گردانی کرتا چلا آ رہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے گرم صافوں میں چھپائے اور کپتان اجے کے ساتھ گاڑی سے نکل آئے۔ ہم کے ادھیڑ عمر پجاری کو بھی ساتھ لے لیا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم مینار کے داخلی دروازے تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی ہندو اور مسلمان سپاہی موجود تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔

ہم نے طویل سیڑھیاں طے کیں اور مینار کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں سے زرگاں کی آبادی دور تک دکھائی دیتی تھی۔ قاسمیہ کا پرانا قلعہ، راج بھون کے چمکتے ہوئے کلس، لال بھون کی اونچی چھتیں، شہر کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی نہر اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

گہرے زرد لباس والی دونوں عورتیں ہمیں دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ ان دونوں کے سانولے چہروں پر عجیب سی جنونی کیفیت تھی۔ ''کک...... کون ہو تم؟'' ایک عورت نے پوچھا۔

''میں اجے کمار ہوں، آپ دونوں کی مدد کے لئے مجھے بڑی ماتا نے کہا ہے۔'' اجے کمار آگے بڑھ کر بولا۔

''ہماری تیسری بہن کہاں ہے؟'' عورت نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔ تیسری بہن سے اس کی مراد اپنی تیسری ساتھی تھی۔

''وہ بس آ رہی ہے۔'' اجے نے مبہم جواب دیا۔

جب اجے کمار دونوں عورتوں سے مکالمہ کر رہا تھا، میں اور عمران پندرہ بیس سیڑھیاں نیچے اترے اور بڑی ماتا کو تلاش کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی حجرہ نما جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ مینار کے اندر ہی واقع تھی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں ستیش کی کھوسٹ دادی یعنی بڑی ماتا تین عورتوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تینوں عورتیں یہاں کی پجارنیں تھیں۔ ایک چوتھی عورت فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کے سانولے سلونے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے جا رہے تھے۔ اس فرش بوس عورت نے بھی اوپر والی عورتوں کی طرح گہرے زرد رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

ہمیں دیکھ کر بڑی ماتا اور اس کی ساتھی عورتیں بری طرح ٹھٹکیں۔ ''کون ہو تم؟'' بڑی بی یعنی بڑی ماتا نے کڑک کر پوچھا۔

''ہمیں اوپر والے نے بھیجا ہے۔'' عمران بڑے اطمینان سے بولا۔ ''دراصل آپ دھرم کے لئے اتنا کچھ کر رہی ہیں کہ اوپر والے کو آپ پر پیار آ گیا ہے۔ وہ اب آپ کی ساری پرکھشائیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ سورگ کی ٹھنڈی ہوائیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''کیا بکتے ہو......کون ہو تم؟'' بڑھیا پھر کڑکی۔

''میں موت کے دیوتا کا اردلی ہوں۔ آپ کو سنسار کے دکھوں سے نجات دلانے آیا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں......مکتی دلانے آیا ہوں۔''

غیر معمولی پیرانہ سالی کے باوجود بڑھیا کی یادداشت غضب کی تھی۔ اس نے عمران کی آواز پہچان لی۔ ''کون ہو تم؟ میں کہتی ہوں یہ کپڑا ہٹاؤ اپنے منہ سے۔''

عمران نے کپڑا ہٹا دیا۔ میں نے بھی ہٹا دیا۔ بڑھیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تو تم یہاں بھی آ گئے ہو منحوس...... موئے...... مردود۔''

''بس آپ کا پیار کھینچ لایا ہے ہمیں۔ ہم آپ کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتے۔'' عمران نے اپنے لباس میں سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ تینوں عورتیں چلا کر ایک کونے میں سمٹ گئیں۔

بڑھیا عمران کو مارنے دوڑی۔ عمران نے اس کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ وہ کسی بدروح کی طرح چلانے لگی۔

اس کی ایک ساتھی عورت لرز کر بولی۔ ''بھگوان کی مار سے ڈرو۔ چھوڑ دو ان کو۔ تم کو کچھ پتا نا ہیں تم کیا کر رہے ہو۔''

''ہمیں پتا ہے، ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی پتا ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تم نے دو عورتوں کو قربانی کی بکریاں بنا لیا ہے اور انہیں اوپر چڑھا دیا ہے۔ اب اس تیسری کو تیار کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ یہ بے چاری موت کے خوف سے بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ تم اسے ہوش میں لانا چاہ رہی ہوتا کہ اسے دھرم کا واسطہ دے کر آخری سفر پر روانہ فرما سکو۔''

بڑھیا خود کو چھڑانے کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ مدد کے لئے پکار بھی رہی تھی۔ ہم اسے حجرے سے باہر لے آئے۔ باقی عورتوں کو اندر ہی رہنے دیا۔ حجرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ ہم شور مچاتی بڑھیا کو لے کر اوپر اس جگہ آ گئے جہاں بلی دینے والی دونوں بیوہ عورتیں موجود تھیں۔ ادھیڑ عمر پجاری اور اجے ان کو باتوں میں مصروف رکھے ہوئے تھے۔ بڑی ماتا کو ہمارے ساتھ دیکھ کر یہ دونوں عورتیں بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ بڑی ماتا عمران کو بددعائیں دے رہی تھی اور بدترین گالیوں سے نواز رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اس کا منہ نوچنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ عمران کی گردن سے خون رِسنے لگا تھا۔ تاہم وہ یہ سب کچھ تحمل سے برداشت کر رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر عمران نے بڑھیا کی دونوں کلائیاں اجے کمار کے حوالے کر دیں تاکہ وہ اسے سنبھال کر رکھے پھر اس نے پجاری سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''پجاری جی! تم ''ہورا'' کے بارے میں پوتھی کی تحریر پڑھ کر سناؤ۔''

پریشان حال پجاری نے تحریر پڑھی۔ یہ پوری تحریر کچھ اس طرح تھی۔ ''رسم کے مطابق تینتیس کالی بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے جسم مٹی میں دبا دیئے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آ سکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ ہتھنیوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی اگر وجے (فتح) کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ اس میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے ان ناریوں کو ودھوا ہونا چاہئے اور ان کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں۔ یہ ناریاں اپنی مرضی سے اپنا جیون قربان کریں...... تو یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔ اگر کسی کارن تیس سال کی تین ودھوا ناریاں نہ مل سکیں تو پھر مجبوری کی صورت میں تیس سال سے تین گنا عمر والی ودھوا ناریاں بھی یہ بلیدان دے سکت ہیں۔''

عمران نے اجے کمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجے! مجھے لگتا ہے کہ اس دھرمی تحریر میں یہ آخری فقرہ سب سے اہم ہے......''

میری طرح بات اجے کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو عمران بھائی۔ اس طرف تو پہلے ہم میں سے کسی کا دھیان ہی نا ہیں گیا۔''

پھر اجے ادھیڑ عمر پجاری سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ کا کیا وچار ہے پجاری جی۔ اگر شرط کے مطابق تین ناریاں نہ مل سکیں تو پھر ایک ہی بڑی عمر کی ناری کی قربانی ہو سکت ہے؟''

گھمبیر صورتِ حال کی وجہ سے پجاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تحریر کو پھر پڑھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنا مٹکا سا سر اثبات میں ہلایا...... ''جی ہاں...... ایسا ہو سکت ہے۔ شبدوں میں یہی کچھ لکھا ہے۔ میں نے پنڈت مہاراج سے بھی اس بارے میں سنا تھا۔''

پجاری کی بات سن کر زرد لباس والی دونوں عورتوں کے دھواں دھواں چہروں پر ہلکی سی چمک نظر آئی۔ بڑی ماتا کی صورت مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن جیسی ہو گئی۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ''اپنی بک بک بند کرو۔ منحوسو! چھوڑ دو مجھے......'' پھر وہ نیچے کھڑے سیکڑوں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے واویلا کرنے لگی لیکن اس کی آواز وضاحت سے نیچے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اگلے دو تین منٹ میں کپتان اجے، ادھیڑ عمر پجاری اور بڑی ماتا کے درمیان زوردار

مکالمہ ہوا۔ پہلے اجے اور پھر پجاری نے بھی بڑی ماتا کو قائل کرنا چاہا کہ اگر وہ ہوزا کی رسم ادا کرنا ہی چاہتی ہے اور اس کے لئے شبھ گھڑی بھی نکال چکی ہے تو پھر خود یہ قربانی دے دے...... کیونکہ شرائط کے مطابق تین عورتیں میسر نہیں ہیں۔ نہایت سنگین اور عبرت ناک ہونے کے باوجود یہ صورتِ حال کسی حد تک دلچسپ بھی تھی۔ بڑی ماتا اپنے جیون کی نوے سے زیادہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ اس کی انتہا پسندی اور کٹڑپن کی وجہ سے اب تک نہ جانے کتنے نوجوانوں کی جانیں گئی تھیں لیکن وہ اب بھی جینا چاہتی تھی۔ ''وہ ہورا'' کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور ہمارے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اجے نے ابھی تک اسے دونوں کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اب اجے کا چہرہ غصے سے سرخ دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑی ماتا کی ایک گندی گالی کے جواب میں وہ چیخ کر بولا۔ ''دھرم تمہاری مرضی کا نام ناہیں ہے بڑھیا۔ دھرم کے پالن کے لئے اور ہندو جاتی کا نام اونچا کرنے کے لئے اگر یہ عورتیں قربانی دے سکت ہیں تو تم بھی دے سکت ہو۔ تم ودھوا ہو۔ تمہاری عمر بھی تیس سے تین گنا یعنی نوے ورش سے اوپر ہے۔ پھر تم کیوں آگے ناہیں آتی ہو؟ تم دوسروں کو سورگ کی خوش خبریاں سناوت ہو، اب جب سورگ کے لئے تمہاری اپنی ٹکٹ پکی ہو رہی ہے تو تم بھاگ رہی ہو۔''

وہ پوپلے منہ سے اجے کو کوس رہی تھی۔ اسے گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے اجے کے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ ایک جگہ اچانک اجے کا پاؤں پھسلا۔ بڑی بی کی کلائیوں پر اس کی گرفت کمزور ہوئی۔ وہ ایک دم اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترنا چاہیں مگر اس کی اپنی ہی سفید ساڑھی اس کے پاؤں میں الجھی۔ اس سے پہلے ہم میں سے کوئی اسے تھامتا، وہ دس پندرہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے گری۔ اس کا سر شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ میں سیڑھیوں کے پاس تھا۔ میں لپک کر اس تک پہنچا، اسے اٹھایا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ وہ شدید زخمی ہو چکی تھی۔

اسی دوران میں امرناتھ اور مالا بھی کچھ دیگر افراد کے ساتھ مینار پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بڑھیا کو حجرہ نما کمرے میں لٹا دیا۔ امرناتھ تو نیچے دوڑا تاکہ اس کے لئے طبی امداد لا سکے۔ اندازہ ہوا کہ بڑھیا آخری سانسیں لے رہی ہے۔ مالا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ پکارتی چلی گئی۔ ''دادی جی...... دادی جی۔'' اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

دادی نے اپنی سفید سفید آنکھوں سے مالا کو دیکھا۔ ان لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں

میں اپنی پوتی بہو کے لئے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دھرم شالا کا ایک سیوک گنگا جل لے آیا۔ مالا نے گنگا جل بڑی ماتا کے منہ میں ٹپکانا چاہا مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ وہ اپنا سر مالا کی گود سے نکالنا چاہ رہی تھی۔ یہی وہ کہنہ ہٹ دھرمی ہے جو ہزارہا سال سے انسان کے اندر سفر کر رہی ہے۔ یہ جب ایک بار دل میں جگہ بناتی ہے تو آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس ہٹ دھرمی کا سرچشمہ اکثر فرسودہ عقیدے ہی ہوتے ہیں۔

مالا سمجھ گئی کہ وہ اپنی دادی ساس کے آخری لمحات کو مزید اذیت ناک بنا رہی ہے۔ اس نے دادی ساس کا لہولہو سر چوما اور پھر یہ سر ایک خدمت گار عورت کی گود میں دے دیا۔ بڑی بی نے خدمت گار عورت کے ہاتھ سے گنگا جل پیا۔ کچھ دیر کھینچ کھینچ کر سانس لیتی رہی پھر بے ہوش ہو گئی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں چند منٹ بعد اس کی نبض رک گئی۔ وہ جا چکی تھی...... جذبات میں آ کر رسم کے لئے تیار ہو جانے والی دونوں بیوہ عورتیں اب اجے کمار کے سپاہیوں کی تحویل میں تھیں۔ انہیں حفاظت سے نیچے اتار لیا گیا۔

○......❖......○

دو تین روز کے اندر زرگاں میں حالات معمول پر آنے لگے۔ ہمارا یارِ غار اسد اب فتح پور سے زرگاں پہنچ چکا تھا۔ نوری بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسد نے بتایا تھا کہ تاؤ افضل اپنی بیٹیوں سمیت بالکل خیریت سے ہے۔ فتح پور کے نئے مکھیا نے تاؤ افضل اور اس کی بیٹیوں کی حفاظت کی پوری ذمے داری لی تھی۔ اسد اور نوری کو سلطانہ کی موت کی اطلاع مندر میں ہی مل گئی تھی مگر انہیں ابھی تک اس کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دیر تک روتے رہے۔ وہ اس بات پر بھی ششدر تھے کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا چوکیدار آفتاب ایک اس انتہا پسند گروہ کا حصہ تھا...... اور وہ اپنی موت کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی بے وقت موت کا سبب بھی بنا تھا۔

اقبال نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ مجھے ایک پوٹلی تھمائی اور بولا۔ ''اس میں سلطانہ بھابی کی چیزیں ہیں اور وہ زیور بھی جو وہ مندر کے تہ خانے میں چھوڑ آئی تھیں۔''

میں نے لرزتے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی۔ ایک تھیلی میں رکھے ہوئے وہ گہنے میری نگاہوں میں جگمگانے لگے جو اس کے جسم اور چہرے پر دمکا کرتے تھے۔ میں نے تھیلی بند کر دی گٹھڑی کی دیگر اشیا میں اس کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں تھوڑی سی نقدی جو ایک رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی شیشی جو میں نے اسے نل پانی میں دی تھی۔ کچھ تصویریں جن میں ایک بڑی تصویر ہمارے بالو کی تھی بالو سے دور ہو کر اس نے نہ جانے کتنی بار اس تصویر کو چوما ہوگا، اس کے لئے روئی ہوگی۔ اس تصویر کی دید نے میری آنکھیں بھی نم کر دیں۔

میں اسد کو لے کر ایک بار پھر سلطانہ کی قبر پر گیا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ اسے آنسوؤں کا خراج پیش کرتے رہے۔ وہ جو کچھ بھی تھی، جارج گورا اور حکم جیسے لوگوں کے جبر کا ردِعمل تھا۔ پھر وہ آفتاب اور ہاشم جیسے شدت پسندوں کے ہتھے چڑھ گئی اور نادانستہ کہیں سے

کہیں پہنچ گئی۔

میں اور اسد قبرستان سے واپس آئے تو حسنات میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ پی کیپ والے اس لڑکے کو میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر لی وان کا بھتیجا تھا۔ عمران نے اس کی جان بڑے ڈرامائی انداز میں بچائی تھی۔ ہاشم اس لڑکے کو شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر بالکل آخری لمحات میں عمران نے ایک سچا نشانہ لگا کر ہاشم کو شوٹ کر دیا تھا۔

میں نے لی وان کے بھتیجے کو گلے سے لگایا۔ حسنات نے کہا۔ ''جناب! یہ آج صبح مجھ سے ملا تھا۔ اس کے پاس آپ کے لئے ایک چیز تھی۔ اس نے مجھے دی اور کہا کہ آپ تک پہنچا دوں لیکن میں نے کہا کہ تم خود ہی پہنچاؤ تو بہتر ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔

اس نے واسکٹ کی جیب میں سے ایک تہ شدہ لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''یہ آپ کے لئے ہے۔ مجھے آپ کی وائف نے دیا تھا۔''

''سلطانہ نے؟''

''جی ہاں۔''

''کب دیا تھا؟''

''جب ہم اسپتال میں بند تھے۔''

میں نے اس بارے میں لی وان کے بھتیجے سے تھوڑی سی تفصیل پوچھی۔ پتا چلا کہ اٹھرا گاؤں میں جب آفتاب اور ہاشم نے ہندو اور مسلمان مریضوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور حالات خراب سے خراب ہو رہے تھے تو سلطانہ نے یہ رقعہ اس کو دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔

لی وان کے بھتیجے اور حسنات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کمرے میں آیا اور بلب کی روشنی میں یہ تحریر پڑھی۔ میری نم آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ آئے۔ سارے واقعات ذہن میں پھر تازہ ہو گئے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کے نسخہ جات والے پیڈ کا کاغذ تھا۔ اس کاغذ پر سلطانہ نے نیلی روشنائی سے لکھا تھا۔ ''مہروج! امید بندھ کر پھر ٹوٹ گئی ہے۔ حالات خراب ہو گئے ہیں۔ ہاشم رازی اس بات پر بالکل تیار نہیں کہ ہم ماریا کو یہاں آزاد کریں۔ وہ اسے نل پانی

جا کر رہا کرنا چاہتے ہیں۔ ماریا کے وارثوں کو یہ بات قبول نا ہیں۔ اللہ جانے اب کیا ہوئیں گا۔ ایک ایک کر کے لوگن مرنا شروع ہو جائیں گے اور پھر...... شاید...... میری باری بھی آ جائے۔ مہروج! اگر ایسا ہو گیا تو تم میرے بالو کا بہت خیال رکھنا۔ اسے زندگی میں کوئی دکھ نہ ہونے دینا۔ اسے یہ بھی کبھی نہ بتانا کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا اور کیوں ہوا تھا۔

”اور ہاں مہروج! ایک بہت اِچ ضروری بات بھی تم سے کرنی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت بہت اچھے ہو۔ تم نے میرا بہت بہت خیال رکھا ہے۔ لیکن تم محبت صرف اور صرف اس لڑکی سے کرتے ہو جو پاکستان میں تم سے بچھڑ گئی تھی۔ تم بھول گئے ہو لیکن میں نا ہیں بھولی۔ جب تم اپنے ہوش میں نا ہیں تھے، میں نے راتوں کے اندھیروں میں تمہیں اس لڑکی کے لئے سسکتے اور روتے دیکھا ہے۔ اس کے لئے تڑپتے دیکھتا ہے۔ جیسے کوئی بے کل پرندہ اپنا پنجرہ توڑ کر نکلنا چاہتا ہو۔ تم بھی اس راجواڑے کا پنجرہ توڑ کر ثروت تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اور مجھے وشواس ہے، تم اب بھی چاہتے ہو گے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو مہروج۔ اور اگر تم کرتے ہو تو وہ کیوں نہ کرتی ہوئے گی۔ وہ جہاں بھی ہوئے گی، تمہاری راہ دیکھ رہی ہوئے گی۔ ضرور دیکھ رہی ہوئے گی۔ تم اسے ڈھونڈو مہروج۔ وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی، میں جہاں بھی ہوں گی ضرور خوش ہوں گی۔ اگر دنیا میں نہ ہوئی تو میری روح خوش ہوئے گی۔ پھر اگر ہو سکے تو میرے بالو کو اس کی گود میں دینا اور اسے میرے بارے میں بتانا...... اور اس سے کہنا کہ دور اتر پردیش کے ایک راجواڑے میں اس کی ایک بہن تھی۔ وہ بن دیکھے اس سے بہت پیار کرتی تھی...... تمہاری سلطانہ۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ نظر دھندلا گئی۔ میں دیر تک اس خط کے تاثر میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شام ہو گئی۔ عمران کی آواز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”اٹھ جاؤ، کب تک ایسے بیٹھے رہو گے؟ دیکھو تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ نل پانی میں دیوان کی ملازمہ صفیہ کھڑی تھی۔ اس کی گود میں ننھا بالو تھا۔ عمران نے بالو کو اپنی بانہوں میں لیا، اس کا منہ چوما اور پھر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس ننھی جان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے اندر جذب ہو گیا، میرے جسم کا حصہ بن گیا۔ مجھے اس کے بدن سے اس کی ماں کی مہک آئی۔ وہ اپنی گول مٹول مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

وہ معصوم اس جانکاہ حادثے سے بے خبر تھا جو اس پر گزر چکا تھا۔ اس کی قریب ترین

ہستی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسے اب کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور اس کا پیار کیا ہوتا ہے۔ وہ ہستی کیا ہوتی ہے جو کوکھ سے جنم دیتی ہے اور پھر زندگی کی ہر مشکل کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی بے خبری پر میرا دل خون ہو گیا۔

میں نے اسے بہت پیار کیا۔ پھر اسے صفیہ کے حوالے کر کے ضروری ہدایات دیں۔ صفیہ کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ وہ بالو کے ساتھ طویل سفر کر کے ابھی کچھ ہی دیر پہلے نل پانی سے یہاں پہنچی تھی۔

عمران نے مجھے بتایا۔ ”مراد شاہ صاحب کل زرگاں سے واپس نل پانی جا رہے ہیں مگر چھوٹے سرکار پانچ چھ مہینے یہیں گزاریں گے۔ وہ یہاں مختلف انتظامات کریں گے۔ اپنا نائب مقرر کریں گے اور بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کا عمل شروع ہو گا۔ انہوں نے برٹش باشندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں...... ٹھیک تیس روز بعد جو غیر ملکی یہاں ہو گا، وہ گرفتار ہو جائے گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ نکل جائیں گے؟“

”نکل جائیں گے نہیں...... وہ لوگ نکل رہے ہیں۔ ان کا بس چلے تو اڑ کر یہاں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ اب یہاں ان کے اور ان کے بچوں کے سروں پر موت کی تلوار لٹک رہی ہے۔“

میڈم صفورا بہت پریشان تھی۔ وہ ابرار صدیقی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میڈم صفورا نے ہمیں صدیقی کے بارے میں جو آخری اطلاع دی تھی، وہ یہی تھی کہ صدیقی ایک قریبی پگوڈا میں خدمت گار کی حیثیت سے اپنی اسیری کے دن کاٹ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ صدیقی کی سزا کو معطل کرانے کی کوششیں بھی کرتی رہی تھی...... اور اب جبکہ ہم سب کی سزائیں ختم ہو چکی تھیں اور سزائیں دینے والے خود سزاؤں کی زد میں تھے، مولانا صدیقی ناپید ہو چکے تھے۔ یہ بڑے افسوس کی بات تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید پانچ چھ روز تک جاری رہنے والے خونی فسادات کے دوران میں صدیقی کے ساتھ کچھ ہو گیا ہو یا پھر وہ خود ہی کہیں روپوش ہو۔ صدیقی اپنی طرز کا ایک عجیب کردار تھا۔ دین دار اور پارسا بھی۔ لالچی اور موقع پرست بھی۔ وہ نوادرات میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اسی دلچسپی کے سبب وہ بدھا کے مجسمے کی چوری میں ملوث ہوا اور میڈم صفورا کے ساتھ پاکستان سے یہاں لا پنچا گیا۔

اگلے روز میڈم صفورا نے ایک اہم اطلاع دی۔ اس نے بتایا۔ ”پگوڈا کے ایک عمر

رسیدہ بھکشو کا کہنا ہے کہ صدیقی چار پانچ روز پہلے زرگاں سے نکل چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک اسٹیٹ سے ہی نکل چکا ہو۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''پہلے تو نہیں تھا لیکن آج کل ہے۔ خاص طور سے جن دنوں زوردار لڑائی ہو رہی تھی، سرحدی پوسٹوں پر سارا سسٹم درہم برہم تھا۔ بہت سے لوگ جن پر مقدمے چل سکتے ہیں، ان چار پانچ دنوں میں اسٹیٹ سے نکلے ہیں۔ ان میں برٹش افراد بھی ہیں۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال، آپ اس بارے میں پوری تسلی کر لیں۔ ابھی ہماری یہاں سے روانگی میں پانچ چھ روز باقی ہیں۔''

''پانچ چھ نہیں...... آٹھ دس روز۔'' عمران نے فوراً کہا۔ ''ابھی ہمیں یہاں ایک شادی میں شرکت کرنی ہے اور کچھ دیگر ضروری کام نمٹانے ہیں۔''

''کس کی شادی؟''

''بھرت کمار اور چمپی کی۔ اس کے لئے مہورت نکالا جا چکا ہے۔ اونچی ذات کے لڑکے اور اچھوت لڑکی کی یہ شادی اس اسٹیٹ میں نئے رجحانوں کی بنیاد رکھے گی۔ اس جاہلیت پر ایک بڑی کاری ضرب لگائے گی جس کے علمبردار حکم اور بڑی ماتا جیسے لوگ ہیں۔''

''لیکن بھرت تو زخمی ہے شاید؟'' میڈم صفورا نے کہا۔

''اس کی حالت اب بہتر ہے۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ سکتا ہے۔ سینئر ڈاکٹر نے کہا ہے، وہ تین چار روز تک ڈسچارج ہونے کے قابل ہو گا۔''

اجیت رائے عرف چھوٹے سرکار کے بارے میں اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے ہیں، یا ہونے والے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں کوئی مصدقہ بات تو معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم اس بات میں تو شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ایک انصاف پسند اور روشن خیال شخص ہیں۔ جن دنوں میں سلطانہ کے ساتھ پہلی بار نل پانی گیا تھا، میں نے چھوٹے سرکار کے انصاف کا ایک یادگار منظر دیکھا تھا۔ ایک شاہی ہاتھی نے ایک غریب مزدور کو کچل دیا تھا۔ یہ ہاتھی چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کا تھا۔ چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کنور کو وہی سزا دی تھی جو کسی عام شخص کو دی جاتی۔ اسے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا اور جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی۔

یہاں زرگاں میں چھوٹے سرکار نے بھرت کمار اور چمپی کی شادی کو آفیشل شادی قرار دیا اور اس کی سادہ سی باوقار تقریب راج بھون میں ہوئی۔ گندمی رنگت والی اچھوت لیکن

دلکش چمپی دلہن بن کر کھشتری بھرت کمار کی حویلی میں پہنچ گئی۔ چھوٹے سرکار نے چمپی کے داج یعنی جہیز کا انتظام اپنی طرف سے کیا۔ اور یہ انتظام اتنا بیش قیمت تھا کہ بھرت کمار کے پتا کے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ یقیناً ساری عمر کے لئے اس کا اور اس کے پورے خاندان کا منہ بند ہو چکا تھا...... اور پھر چمپی کی ڈولی راج بھون سے اٹھی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اسے معمولی بات سمجھنے والا آنے والے دنوں میں زبردست مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔

ابرار صدیقی کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا اور اب میڈم صفورا کے نزدیک ستر اسی فیصد امکان اس بات کا تھا کہ صدیقی خونی ہنگاموں اور لڑائی کے دوران میں یہاں سے نکل چکا ہے۔ اب ہم اپنا رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ رخصت ہونا تھا۔ چھوٹے سرکار کے خصوصی حفاظتی دستے نے ہمیں اپنی نگرانی میں لینا تھا اور ایک طویل سفر کے بعد ہمیں اسٹیٹ کی حدود سے باہر نکالنا تھا۔ اسٹیٹ کی حدود سے آگے کا چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں کپتان اجے کے ساتھ کرنا تھا۔ کپتان اجے کی ذمے داری تھی کہ ہمیں الہ آباد میں ایک مستقیم نامی شخص تک پہنچائے۔ یہ چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں اپنے رسک اور اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔ بے شک اس سفر میں ان راستوں کا شناور کپتان اجے ہمارے ساتھ تھا پھر بھی اس سفر کے بخیریت طے ہونے میں ہماری قسمت کو بہت عمل دخل تھا۔ ہمیں مقامی طرز کے دیہاتی لباس فراہم کر دیئے گئے تھے۔ یہ چرواہوں کے لباس تھے اور زنانہ مردانہ دونوں طرح کے تھے۔

وہ ایک سرد شب کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ زرگاں سو رہا تھا۔ اپنے سارے گلی کوچوں، شبستانوں اور جلوہ گاہوں سمیت۔ اس کے بارونق بازار خالی پڑے تھے۔ اس کے گھر غنودگی کے جھونکوں میں تھے...... اور ہم زرگاں کو اس حالت میں چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ہمارا اپنا فیصلہ تھا کہ ہماری رخصتی خاموشی سے ہو گی۔ اگر یہ علی الاعلان ہوتی تو شاید ہزاروں لوگ ہمارے راستوں پر جمع ہو جاتے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے جن کے لئے ہماری واپسی حوصلہ شکن ہوتی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگ ہم دونوں اور خاص طور سے مجھے بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر خاص و عام کی یہ خواہش تھی کہ ہم یہاں سے روانہ نہ ہوں۔ کم از کم...... چند ماہ تک تو کہیں نہ جائیں۔

لیکن ہمیں جانا تھا۔ یہاں ہمارا دانہ پانی پورا ہو چکا تھا۔ کچھ نئے راستے ہمیں پکار رہے تھے...... اور ہم اس آخر شب کے دُھند آلود سناٹے میں زرگاں کو الوداع کہہ رہے تھے۔

زخمی انور خاں، طلال......بھرت کمار......ستیش......عبدالغنی......حسنات اور مبارک وغیرہ نے ہمیں بڑی محبت اور بڑے دکھ بھرے انداز میں الوداع کہا۔ چھوٹے سرکار اور ان کے قریبی مصاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس موقع پر مجھے چھوٹے سرکار کی طرف سے ایک گراں قدر تحفہ بھی دیا گیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے میں نے جارج گورا کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ جب اٹھرا گاؤں سے ہمیں پانڈے وغیرہ نے گرفتار کیا تھا تو یہ چاقو میرے لباس سے نکال لیا گیا تھا۔

سب سے رخصت ہو کر ہم بند جیپ میں آبیٹھے۔ ایک نم ناک سی فضا میں ہمارا قافلہ چل پڑا۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں تو ایک طرف سے طلال دوڑتا ہوا آیا اور گاڑی کی کھڑکی سے لپٹ گیا۔ میں نے دروازہ کھلوایا۔ وہ زار زار رو رہا تھا۔ ''مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ چلی گئیں، آپ بھی جا رہے ہیں۔ میرے لئے اب یہاں کچھ بھی نہیں۔''

میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اسے پیار سے سمجھایا۔ ''تم یہاں سے نہیں جا سکتے طلال۔ تم تو آنے والے کل کی امید ہو۔ تم نے یہاں ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ آنے والے وقت میں یہاں کچھ اور رنجیت پانڈے، جارج گورے اور حکم جی پروان چڑھ سکتے ہیں۔ تمہیں انہیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم کرنا ہے۔ تم یہیں رہو گے طلال۔''

پتا نہیں وہ میری باتیں سمجھا یا نہیں لیکن میرے تسلی بخش انداز نے اسے حوصلہ دیا......

عمران نے کہا۔ ''طلال! ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تم سے رابطہ رکھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ہم یہاں کے حالات سے باخبر رہیں گے......تم سے وعدہ ہے۔''

ہم طلال کو بمشکل سنبھالنے اور الوداع کہنے میں کامیاب ہوئے۔

......ہم کافی دور نکل گئے تو میں نے مڑ کر زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا۔ انہی روشنیوں میں کہیں وہ قبرستان تھا جہاں ایک بے مثال لڑکی اپنی تمام تر دلیری، شجاعت اور وفاداری کے ساتھ ابدی نیند سو رہی تھی۔

''خدا حافظ سلطانہ۔'' میں نے زیر لب کہا اور آنکھیں موند لیں۔

○......❖......○

اگلا دن ابر آلود تھا۔ ٹھٹھرا ہوا سورج چند منٹ کے لئے اپنی بیمار صورت دکھاتا اور پھر بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا۔ ہمارا سفر درمیانی رفتار سے جاری رہا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ حکم

ے بچے کھچے سپاہی کہیں کہیں جو مزاحمت کر رہے تھے، وہ بھی کچلی جا چکی تھی۔ پھر بھی گھڑسوار سپاہیوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔

شام کو ہم نے گھنے سنسان جنگل میں پڑاؤ کیا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بلند و بالا درخت بھیگے ہوئے خاموش کھڑے تھے جیسے کسی بات پر شرمسار ہوں۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اچانک میں چونکا۔ یہ جگہ جانی پہچانی لگی۔ تھوڑا سا غور کیا تو سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میں نے جارج گورا کی حراست سے فرار ہونے کے بعد دو نہایت مشکل راتیں گزاری تھیں۔ ہاں، یہ وہی جگہ تھی۔ یہ چھوٹی سی آبی گزرگاہ جو جنگل کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی جاتی تھی اور جس کے کنارے جنگلی جانوروں کے قدموں کے بہت سے نشان تھے۔

دفعتاً مجھے ایک اور بات یاد آئی اور میں پھر چونک گیا۔ عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ بولا ''تم تو اس جگہ کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پچھلے جنم میں یہاں کسی ہندو ناری کے ساتھ لو سین کرتے رہے ہو۔''

''ہندو ناری کے ساتھ تو نہیں مگر اپنی تنہائی کے ساتھ لو سین کرتا رہا ہوں۔''

''یہ کیا بے ہودہ بات ہے۔ ''تنہائی'' نے کوئی ساڑھی تھوڑی پہن رکھی ہوتی ہے۔ نہ ہی تنہائی کے سر پر لمبے ریشمی بال ہوتے ہیں۔ نہ ہی پتلی کمر ہوتی ہے۔ لو سین کے لئے ایسی دو چار چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے، جب میں جارج گورا کی رہائش گاہ سے فرار ہوا تھا تو انہی جگہوں پر بھٹکتا رہا تھا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر کیا کیا تھا؟''

''وہی کیا ہوگا جو تمہارے آباؤ اجداد گاؤں کے کھیتوں میں کرتے رہے ہیں۔''

''یار! تم مذاق سمجھ رہے ہو......لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ اس وقت بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کبھی اس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہیں سکوں گا۔ دوڑ دوڑ کر اور پھڑ پھڑا کر مر جاؤں گا لیکن مجھے آزادی نہیں ملے گی۔ اس وقت یہاں پانی کے کنارے بیٹھ کر میں نے ایک عجیب کام کیا میں نے ایک خط لکھا اور اسے بوتل میں بند کر کے اس ندی میں بہا دیا۔ وہ بوتل میرے سامنے بہتے بہتے دور چلی گئی۔ دریا کی طرف۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے بہتی چلی گئی ہو۔ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہو......اور دریاؤں کا آخری ٹھکانا تو سمندر ہی ہوتا ہے۔ کیا پتا کہ وہ سمندر تک پہنچی ہو۔ کسی کشتی راں یا کسی جہاز

کے سواروں نے اسے دیکھا ہو۔ پانی سے نکالا ہو۔ میرا خط پڑا ہو۔''

''بالکل ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امریکا نے اپنا ساتواں بحری بیڑا تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا ہو۔ وہ الٹے پانیوں میں چلتا چلتا دریائے آمو میں پہنچا ہو اور پھر اگلے منگل تک یہاں اس جنگل میں پہنچ جائے۔ زبردست...... کتنا مزہ آئے کہ یہ بیڑا یہاں آ کر ریت میں پھنس جائے۔ بیڑے کے سارے مرد فوجیوں کو تیندوے کھا جائیں یا ہاتھی کچل دیں۔ بس لڑکیاں بچ جائیں۔ ہو ہو ہو...... ہر بندے کے حصے میں پانچ پانچ لڑکیاں اور وہ بھی امریکن۔ نیو ورلڈ آرڈر......''

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتا، ہمیں اجے کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ بوندا باندی سے بچنے کے لئے اس نے چھتری لے رکھی تھی۔ ایک اضافی چھتری وہ ہمارے لئے لا رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے یہ چھتری مجھے تھما دی۔

''کیا کہیں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جانا تو نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو جا بھی سکت ہیں۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور ایک جنگل باسی کی جھونپڑی ہے۔ ایک عمر رسیدہ مسلمان بزرگ ہے، اپنے دو مریدوں کے ساتھ عرصے سے یہیں رہوت ہے۔ مسافر محفوظ سفر کے لئے اس سے دعائیں کرواتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی کروا سکت ہیں۔''

''اگر زیادہ دور نہیں تو چلتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے شام کا اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ ہم رم جھم میں ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اجے کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس جھٹپٹے میں اس طرح چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد ہم گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر ایک نسبتاً اونچی جگہ پر واقع ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جھونپڑی تین درختوں کے تنوں کے اوپر زمین سے قریباً دس فٹ کی بلندی پر تیار کی گئی تھی۔ اوپر چڑھنے کے لئے بانس کی سیڑھی موجود تھی۔ اندر مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ سیڑھی کے قریب ایک نوجوان باریش شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے دستے والی کلہاڑی تھی...... ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس نے ہم سے دو چار سوال کئے۔ وہ اس بات پر کچھ حیران بھی تھا کہ ہم اس ابر آلود شام میں کیچڑ زدہ راستے پر چلتے ہوئے اس جگہ آ پہنچے ہیں۔ وہ سیڑھی چڑھ کر اوپر گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے ہمیں بھی اوپر بلا لیا۔

بزرگ کی عمر اسّی پچاسی برس رہی ہوگی۔ لمبی سفید داڑھی، بھاری پلکیں، وہ ایک بوسیدہ

کمبل لئے بیٹھے تھے۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نیکوکار اور ہر وقت عبادت و ریاضت میں گم رہنے والے شخص ہیں۔ اجے کے بقول یہ بات مشہور تھی کہ ان کی دعا سے سفر کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور بھٹکے ہوئے راہیوں کو راستے ملتے ہیں۔

ہم نے بھی ان سے اپنے لئے دعا کرائی...... انہوں نے گڑ اور سوکھی کھجوروں سے ہماری تواضع کی۔ جب ہم اٹھنے والے تھے، اچانک میری نظر ایک چیز پر پڑی اور میں حیران رہ گیا...... میں نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ کچھ دیگر اشیا کے ساتھ وہ شیشے کی بوتل بھی ایک کونے میں پڑی تھی جسے کچھ عرصہ پہلے میں نے چلتے پانی میں بہایا تھا...... ہاں، یہ وہی بوتل تھی...... سو فیصد وہی تھی۔ میں نے اسے کسی دور دراز کے سفر کے لئے ندی میں بہایا تھا۔ مگر...... وہ دور دراز کے سفر پر نہیں گئی تھی۔ یہ تو بس ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا سفر طے کر کے اس جھونپڑی کے گوشے میں پڑی تھی۔

میں حیران رہ گیا۔ بوتل کے اندر وہ مڑا تڑا کرنسی نوٹ بھی اسی طرح موجود تھا جو میں نے اس میں ڈالا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بیٹا جی!'' عمر رسیدہ شخص نے میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ...... یہ بوتل...... آپ کو کہاں سے ملی؟''

عمر رسیدہ شخص نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر ہولے سے بولے۔ ''سامنے والی ندی سے...... گھاس میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں وضو کر رہا تھا۔ میری نظر پڑ گئی۔ میں نے نکال لی۔''

میں نے بزرگ کی اجازت سے بوتل اٹھائی۔ اس میں دو انگلیاں ڈال کر اپنا لکھا ہوا خط نکالا۔ بزرگ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''مجھ کو لگت ہے کہ تم یہ بوتل پہچانتے ہو...... کہیں...... تم نے ہی تو اسے پانی میں ناہیں بہایا تھا......''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ یہ چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ ندی کنارے اداس بیٹھا تھا۔ کنارے پر اٹکی ہوئی اس بوتل پر نظر پڑ گئی۔ یونہی وقت گزاری کے لئے میں نے نوٹ پر یہ رقعہ لکھ کر اس میں ڈال دیا اور پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں کی یہیں رہے گی......''

بزرگ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''دیکھو، کتنا عجیب اتفاق ہے۔ تم نے اس بوتل کو جہاں پھینکا تھا، یہ وہیں سے تم کو مل گئی۔ تم کہہ سکت ہو کہ یہ کہیں نہیں گئی

لیکن اس نے کہیں نہ جا کر بھی بہت لمبا سفر کیا ہے اور اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ کیا یہ بڑی بات نا ہیں ہے؟''

''میں سمجھا نہیں بزرگوار۔''

وہ بولے۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ ہزاروں میل کا سفر کر کے بھی کسی کی نظر میں نہ آ سکتی...... کسی کی توجہ کا مرکز نہ بنتی۔ لیکن یہ ایک بالکل چھوٹا سا سفر کر کے مجھ تک آ گئی۔ میں نے تمہاری تحریر پڑھی...... تمہارے درد کو محسوس کیا۔ میرے ناچیز ذہن میں تمہارے لئے فکر جاگی۔ میں نے تمہارے لئے اپنے رب کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ وہ غفور الرحیم ہے...... سنتا ہے۔ مجھ جیسا حقیر بندہ بھی جب ''دل'' سے کچھ مانگتا ہے تو وہ عطا کرتا ہے۔''

میں گم صم کھڑا تھا، عمران اور اسد بھی خاموش تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں بزرگ کا سرخ و سپید چہرہ کسی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں بزرگوار...... وہ عطا کرتا ہے۔ ہم نے پچھلے چند ہفتوں میں اس کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ ہم سخت مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہمیں آگے بھی کچھ سخت مرحلے درپیش ہیں۔ ہمیں آپ کی مزید دعاؤں کی ضرورت ہے جناب۔ آپ ہمارے لئے خصوصی دعا فرمائیے......''

بزرگ کے پاس گزرے ایک دو گھنٹوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس درویش صفت شخص سے رخصت ہو کر واپس اپنے پڑاؤ میں پہنچ چکے تھے۔ وہ بوتل اب میرے پاس تھی۔ اس کے اندر رکھا جانے والا رقعہ میری جیب میں تھا۔ عمران نے کہا۔ ''بھئی واہ...... آج تک تو ہم نے ایسی بوتلوں کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ لمبے سفر کر کے دور دیس کے نامعلوم لوگوں تک پہنچتی ہیں اور پھر ان میں موجود خطوں سے کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ پہلی بوتل ہے جو کہیں گئی بھی نہیں اور پھر بھی اپنا کام دکھا گئی ہے...... پڑھ کر تو سناؤ اس میں لکھا کیا تھا تم نے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ بس دو تین فقرے تھے۔'' میں نے کہا اور مڑا تڑا کاغذ نکال کر عمران کے سامنے پڑھا۔ اس کاغذ یعنی کرنسی نوٹ کے کنارے پر میں نے شاخ کے قلم اور اپنے زخم کے خون سے لکھا تھا۔ ''میرے پیارو! میں زندہ ہوں میرا انتظار کرنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا...... تابش۔'' نوٹ پر تین نام یعنی فرح، عاطف اور ثروت بھی لکھے تھے۔ ہم دیر تک اس نوٹ اور اس کی تحریر پر تبصرہ کرتے رہے۔ اپنوں سے ملنے کا سپنا آنکھوں میں اجاگر ہو گیا۔

...... بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنا ایک سپنے جیسا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کسی بہت بڑی جیل سے اچانک آزاد فضاؤں میں پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تقریباً پچاس کلومیٹر کا سفر چرواہوں کے بھیس میں طے کرنا تھا۔ ہم ایسے چرواہے تھے جنہیں بھیڑ بکریاں چرانے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ فی الوقت بھی ہمارے پاس بھیڑ بکری نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہم نے چرواہوں کے لباس پہن لئے۔ سروں پر پگڑ بھی رکھ لئے۔ مسلسل سفر نے حلیے پہلے ہی خراب کر رکھے تھے۔ مزید خرابی کے لئے بالوں میں دھول ڈالی گئی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا گیا۔ مردوں نے کانوں میں بالیاں ڈالیں۔ میڈم صفورا، نوری اور صفیہ نے کنگن پہنے۔ میڈم صفورا کا حلیہ دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ پینٹ شرٹ اور بوائے کٹ بالوں والی ایک اسٹائلش عورت تھی۔ چرواہی کے بھیس میں اسے چولی اور گھاگرا پہننا پڑا۔ اپنا منہ سر، بھاری اوڑھنی میں چھپانا پڑا۔ اسے دیکھ کر عمران کی ہنسی چھوٹی تو اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ وہ منہ پھیر کر ہنستا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میڈم جانتی تھی مگر خاموش رہی۔ اسے اب عمران کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ عمران اپنی طرز کا انوکھا بندہ ہے۔ وہ عمران کا احسان بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ عمران نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک نہایت زہریلے سانپ کا زہر میڈم کے بدن سے چوسا تھا۔ وہ سنگین واقعہ ہم سب کی یادداشت میں درج تھا۔

ہمارے لئے بھیڑ بکریوں کا انتظام اسٹیٹ کی حدود ختم ہونے سے دو تین میٹر پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ریوڑ تھا۔ اس میں ایک اصلی چرواہا اور چرواہی بھی موجود تھے۔ ہمارے لباسوں کے اندر اسلحہ چھپا ہوا تھا۔ کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے میرے اور عمران کے علاوہ اسد نے بھی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ ریوڑ میں ایک خچر بھی موجود تھا۔ اس پر کاٹھ کباڑ لدا ہوا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ میں وہ شاندار دور مار رائفل بھی موجود تھی جس سے عمران نے پچھلے دنوں میں چند یادگار نشانے لئے تھے۔

بہرحال، ہمارا یہ سفر خیریت سے گزرا۔ راستے میں دو تین جگہ ہمارا گزر چیک پوسٹوں کے قریب سے ہوا۔ ایک جگہ ہمیں روکا بھی گیا۔ صفورا، نوری اور صفیہ لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھیں۔ ہماری صورتوں پر شک کیا جا سکتا تھا مگر ہماری جگہ اصلی چرواہے نے ہی بی ایس ایف کے اہلکاروں سے بات کی اور ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے لئے ہمیں بی ایس ایف کے اہلکاروں کو معمولی رشوت بھی دینا پڑی۔ یعنی بکریوں کا چار پانچ کلو دودھ اور ایک چھوٹا سا میمنا۔

کپتان اجے کمار ہمارا بہترین راہنما اور مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ بھی مقامی چرواہے کے بھیس میں تھا، تاہم ہمارے خیریت کے اس سفر میں اس کی راہنمائی کے علاوہ چھوٹے سرکار کے انتظامات کو بھی عمل دخل تھا۔ ہم جہاں پہنچتے تھے، ہمارے پروگرام کے مطابق ہمارے لئے اسباب پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ الہ آباد سے تقریباً تیس کلومیٹر دور ماچھی گڑھ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک مسلمان زمیندار کے گھر میں ہماری شب بسری کا انتظام کیا گیا تھا۔ ماچھی گڑھ میں ہم چرواہوں کے بھیس سے دوبارہ عام لوگوں کے بھیس میں آ گئے۔ اصلی چرواہا اور چرواہی اپنی بھیڑ بکریوں سمیت ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ دونوں بڑے سادہ اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا سفر بڑا اچھا گزرا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ دونوں سگے بہن بھائی تھے۔ بہن ایک سال بڑی تھی۔ بھائی چھوٹا تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ بہن کی نسبت ہمیں بھائی کسی حد تک افسردہ نظر آیا تھا۔ بہن اسے ہنسانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس نوجوان چرواہے کی بیوی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد اپنے نومولود بچے سمیت پانی کے ایک گڑھے میں گرنے سے مر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بچے سے بہت پیار کرتا تھا۔ ان کی موت نے اسے نیم دیوانہ کر دیا تھا مگر اب وہ بتدریج سنبھل رہا تھا۔

میرے سینے میں بھی تو ایک ایسا ہی غم انگاروں کی طرح دہکتا رہتا تھا۔ میری سلطانہ بھی تو مجھے چھوڑ گئی تھی لیکن مجھے اس چرواہے کا غم اپنے غم سے بڑا لگا...... شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ نانک دکھیا سب سنسار۔

ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہمیں الہ آباد کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ عجیب اور ناقابلِ یقین۔ مجھے ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ عمران میں کچھ خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ رات کوئی ایک ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا۔ میں اور عمران حویلی کے ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ مجھے گاؤں کی کسی قریبی گلی میں کتے کی آواز سنائی دی۔ یہ بھاری آواز مسلسل تاریکی کی لہروں پر ڈوب ابھر رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ عمران اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔ میں نے لالٹین کی لو اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اسی دوران میں گلی میں سے ایک بار پھر کتے کی گونجتی ہوئی آواز ابھری۔ مجھے اپنے جسم میں پھریری سی محسوس ہوئی...... مجھے لگا میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہوئی ہے۔ یہ وہی آواز تھی۔ یہ وہی جسیم کتا تھا جسے ہم نے اٹھرا گاؤں کے ٹھٹھرے ہوئے کھیت میں دیکھا تھا۔ میں چپل پہن کر تیزی سے برآمدے میں آیا۔ وسیع صحن کے

آخری سرے پر حویلی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ میں دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آ گیا۔ یخ بستہ ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے عمران نظر آ گیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ ایک سایہ سا اس کے پاؤں میں حرکت کر رہا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وہی کتا تھا۔ وہ عمران کے پاؤں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ الٹا سیدھا ہو رہا تھا۔ اس کی دُم بے ساختہ تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ عمران اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اور گردن کے بال سہلا رہا تھا۔

میں چند قدم آگے آیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کتا اٹھرا گاؤں سے قریباً ایک سو بیس کلومیٹر دور یہاں تک ہمارے پیچھے آیا ہے...... اچانک عمران کو احساس ہو گیا کہ میں اس سے کچھ فاصلے پر یہاں گلی میں موجود ہوں۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ ''عمران! یہ وہی کتا ہے؟'' میری آواز حیرت سے لرز رہی تھی۔

''ہاں، یہ وہی ہے۔ مجھے کل رات بھی شک ہوا تھا کہ یہ ہمارے خیمے کے آس پاس موجود ہے۔ شاید یہ مسلسل ہمارا پیچھا کرتا رہا ہے۔''

''یار! یہ بڑی حیران کن بات ہے'' میں نے کہا۔

''کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اور پھر اپنے ہاتھوں میں ''اینیمل ماسٹری'' بھی تو ہے۔ یہ تو تم ہی ناقدرے ہو جو گھاس نہیں ڈالتے ہو۔ جگر! اتنا پیار کسی پتھر سے بھی کروں نا تو وہ سچ مچ میرے پیچھے آنا شروع ہو جائے۔'' وہ ادا سے مسکرایا۔

میں الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا...... ان لمحوں میں اس کی آنکھوں کے شیشے میں واقعی ایسا کچھ نظر آیا جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔ کچھ دیر تک اس جسیم کتے کو بہلانے اور پچکارنے کے بعد اس نے اسے واپس بھیج دیا۔ اور وہ واقعی یوں واپس چل پڑا جیسے اس سے وداع ہو کر جا رہا ہو۔ کچھ دیر تک اس کا متحرک ہیولا ماچھی گڑھ کی تاریکی میں نظر آتا رہا پھر اوجھل ہو گیا۔ ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہم شہر رنگ و بو الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں ایک طویل عرصہ کی الگ تھلگ جزیرے پر گزارنے کے بعد ایک جیتی جاگتی، ہنستی بستی دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ بڑے شہروں کے جانے پہچانے مناظر نگاہوں کے سامنے آئے۔ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک، انسانوں کا ہجوم، بارونق بازار، ٹی وی، سینما ہاؤس، چائے خانے، ریسٹورنٹ، پارک، تفریح گاہیں۔ میں ہر منظر کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے لئے ایک عجوبہ تھا۔ ہمیں ایک فور اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارا اندراج فرضی ناموں سے تھا۔ شام کے وقت

ہم بالائی منزل کی لابی میں بیٹھے نیچے سڑک پر رواں دواں زندگی کا نظارہ کرنے لگے۔ میڈم صفورا، اسد اور اے جے بھی وہیں تھے۔

عمران نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی اُلو کو اندھیری جگہ سے نکال کر اچانک روشنی میں بٹھا دیا گیا ہو۔ نالائق شخص، ایسے ہر چیز کو ندیدوں کی طرح دیکھو گے تو مشکوک قرار پاؤ گے۔ خاص طور سے لڑکیوں کو دیکھنا تو بالکل ترک کر دو۔ تمہاری جگہ یہ کام میں کئے دیتا ہوں۔ میں یہ کام نسبتاً اچھے طریقے سے کرلوں گا۔“

اس نے جیب سے ہلکے رنگ والے سن گلاسز نکالے اور لگا لئے۔ سن گلاسز اسے ہمیشہ اچھے لگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”جیمز بانڈ لگ رہا ہوں یا نہیں؟“

”جیمز بانڈ تو نہیں، انعامی بانڈ لگ رہے ہو۔ اور وہ بھی ایسا جو پانچ سو قرعہ اندازیوں میں شامل ہونے کے بعد بھی نہ نکلا ہو۔“

”تم میری توہین کر رہے ہو اور یہ بھول رہے ہو کہ جس طرح ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے...... بلکہ میں پورے کا پورا تمہارے پیچھے ہوں۔“

اسد بولا۔ ”یعنی...... تمہارا مطلب ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک عورت کا ہاتھ ہی ہو۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر اس بندے میں تھوڑی سی بھی احسان شناسی ہوتی تو اپنے گلے میں ڈھول ڈالتا اور میرے آگے آگے ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے چلتا۔ اے الٰہی آباد کے رہنے والو! استقبال کرو میرے محسن کا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے تابی کو تابی بنایا۔ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور اتنا سکھایا اتنا سکھایا کہ ایک دن وہ جارج گورا جیسے شخص سے متھا لگانے اور اسے مار گرانے کے قابل ہوا۔ اور ایک جارج گورا ہی نہیں، اس نے تابی کو ہر ہر موڑ پر جارج گوروں اور سیٹھ سراجوں اور میڈم صفوروں سے لڑنا سکھایا ہے۔“

”میڈم صفوروں“ کا لفظ اس نے ہولے سے بولا تھا پھر بھی میڈم کو بھنک پڑ گئی۔ وہ کافی پیتے پیتے چونک کر بولی۔ ”تم نے میرے بارے میں کیا کہا؟“

”کچھ بھی نہیں میڈم۔“ وہ صاف مکر گیا۔

”میں نے خود سنا ہے۔ تم نے میڈم کہا ہے۔“

”نن...... نہیں...... میں تو میڈم نور جہاں کی بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ تابی اور میڈم نور جہاں کی لڑائی ہوئی تھی نا...... تو میں نے صلح کرائی تھی۔ یہ بھی بڑا عجیب واقعہ ہوا تھا۔“ وہ تالی

بجا کر بولا۔ ”میڈم نور جہاں...... فلمسٹار ریما کو بیٹیوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی شریف، خوش شکل اور مخلص بندے سے شادی کر کے اپنا گھر بسائے۔ فلم لائن میں تو انہیں ایک بھی ایسا بندہ نظر نہیں آتا تھا۔ آ جا کے ان کی نظرِ کرم مجھ پر ہی جاتی تھی۔ وہ ہم دونوں کو قریب لانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یا تو میں سرکس چھوڑ کر فلموں میں اداکاری شروع کر دوں یا پھر ریما جی فلمیں چھوڑ کر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلایا کریں۔ ایک روز اس سلسلے میں انہوں نے بات کرنے کے لئے مجھے بلایا۔ تابی بھی ساتھ تھا...... تابی نے غلطی سے میڈم کے سامنے ڈکار مار دی۔ بس انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے گرج کر کہا، وے توں ڈکار مار کر مینوں دس رہیا ایں کہ توں گھروں رج کے آیا ایں۔ یعنی تم ڈکار مار کر مجھے بتا رہے ہو کہ گھر سے کھا پی کر آئے ہو۔ تابی نے بہتیرا کہا کہ غلطی سے ڈکار نکل گئی ہے مگر وہ واقعی غصے میں تھیں۔ وہ تو ہمارے لئے لمبے چوڑے لنچ کا انتظام کر رہی تھیں...... وہ بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں...... لیکن جب......“

اچانک عمران چپ ہو گیا۔ اس کی نظر سامنے ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ میں اب اس کا رمز شناس ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب میں نے ایک شخص کو تیزی سے ایک دروازے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ عمران کے اندر جیسے اچانک ہی کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ اس کے بعد وہ چائے تو پیتا رہا اور باتوں میں بھی حصہ لیتا رہا مگر اس کی چہکار ختم ہو چکی تھی۔ محفل برخاست ہوئی تو ہم اپنے اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں تھے۔ میں نے عمران کو پہلے اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے...... کچھ بتاؤ گے نہیں؟“ میں نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”تمہارے ساتھ رہنے کے بعد اب میری نظر بھی کافی تیز ہو گئی ہے۔ میں نے لابی میں چائے پیتے ہوئے کچھ دیکھا ہے۔“

”کیا دیکھا ہے؟“

”وہی جو تم چھپا رہے ہو۔ کالی جیکٹ والا وہ بندہ جو تمہیں دیکھ کر اچانک سیڑھیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد سے تمہارا چہکنا بالکل بند ہے۔“

”بولوں تب مصیبت، نہ بولوں تب مصیبت۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اب خاموش رہنا چاہئے۔“

"اور میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں لینا چاہیئے۔"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔"وہ بہت خطرناک بندہ ہے یار۔"

"تم سے بھی خطرناک؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے تیرے جیسے اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ وہ بہت ہی زیادہ گڑبڑ بندہ ہے.....اور میرا خیال ہے کہ وہ اب کسی بھی وقت یہاں ہمارے کمرے میں پہنچنے والا ہے۔"

"یہاں پہنچنے والا ہے؟ کیا کرے گا وہ یہاں آ کر؟"

"یہ تو پتا نہیں لیکن...... جو ہوگا بہت برا ہوگا۔"

"مگر یہ ہے کون؟" میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

"سفید کپڑوں میں ایک پولیس والا۔ سجاد موہل نام ہے اس کا۔ بظاہر یہ تمہیں عام سا شخص لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں۔"

"یہ تمہیں پہلے سے کیسے جانتا ہے.....تم تو شاید پہلی بار انڈیا آئے ہو؟"

"تمہارے ساتھ پہلی بار آیا ہوں۔ اس سے پہلے اپنے سرکس کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ روسی فن کار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے بمبئی کے علاوہ اور کئی شہروں میں بھی جھک ماری تھی۔"

"سرکس میں کام کرنا کوئی جرم ہے جو تم اس الہ آبادی پولیس والے سے ڈر رہے ہو؟"

"یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی سہی۔ ابھی ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

وہ اٹھا اور تکیے کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر چیک کرنے لگا۔ چیک کرنے کے بعد اس نے پستول دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔"یار! ہمارے لئے خطرناک قسم کے پولیس والے ہی رہ گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے پانڈے سے جان چھوٹی ہے تو اب تم اس نئی آفت کا ذکر فرما رہے ہو۔"

"اسی کو کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ابھی اسٹیٹ سے باہر تشریف لائے دو ہی دن ہوئے ہیں اور اس نانجار سے ملاقات ہوگئی ہے......"

اچانک ہمارے بائیں جانب والی کھڑکی ایک دھماکے سے کھلی۔ کسی نے اسے باہر سے ٹانگ رسید کی تھی۔ ایک نوجوان کود کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں وہی سیاہ جیکٹ والا شخص تھا۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس سال رہی ہو گی۔ کھچڑی بال مہندی میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ صورت سے ہی کرخت مزاج اور غصیلا نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ تاہم یہ پستول اس کی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب

کے اندر ہی تھا۔ وہ بے پناہ اعتماد سے کھڑکی سے باہر ہی کھڑا رہا۔ اس کے ساتھی نوجوان نے مقامی لب و لہجے میں دھمکایا۔"خبردار! ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ یو آر انڈر اریسٹ۔"

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں جھپٹ کر اس نوجوان پر حملہ کر سکتا ہوں۔ دوسری طرف عمران کھڑکی کے پاس تھا۔ وہ جست لگا کر کالی جیکٹ والے کو دبوچ سکتا تھا لیکن جب میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں لکھا ہوا پیغام صاف نظر آیا۔ وہ مجھے حملہ کرنے سے روک رہا تھا اور خود بھی ہرگز حملے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجے...... "بظاہر یہ تمہیں عام سا بندہ لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں......"

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ درحقیقت میرے اور عمران کے درمیان ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ پیدا ہو چکا تھا میں اس بارے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بہت رمز شناس ہو گئے تھے۔ میں واضح طور پر محسوس کر چکا تھا کہ عمران مجھے ری ایکٹ کرنے سے روک رہا ہے اور خود بھی ری ایکٹ کرنے کا رسک نہیں لے رہا۔

پستول بردار نوجوان جو بعد ازاں خود بھی پولیس والا نکلا، دروازے کی طرف گیا اور پھر اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ جیکٹ والا اندر آ گیا۔ ہمارا کمرا طویل کوریڈور کے آخری سرے پر تھا۔ اتفاقاً ارد گرد کے چند کمرے خالی تھے۔ باقی کمروں کے دروازے بند تھے۔ یہاں ہونے والی کارروائی کا پتا کسی کو نہیں چلا۔ جیکٹ والے نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔"مجھے وشواس نہیں تھا کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ پاؤں گا...... اور وہ بھی پھر اسی شہر میں۔"

عمران بولا۔"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں قانونی طور پر انڈیا آیا ہوں۔ میرے پاس کاغذات ہیں۔"

"تم قانونی طور پر انڈیا آئے ہو گے لیکن یہاں سے بھاگے تو قانونی طور پر نہیں تھے۔ تمہاری پوری فائل ہے میرے پاس۔ اور اب اسی فائل کے آخری صفحے پورے کرنے کا سمے آ گیا ہے۔"

"لیکن میری بات سنو......"

"باقی ساری باتیں تھانے چل کر ہوں گی۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ وہ وردی میں نہیں تھا، اس لئے مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس رینک کا افسر ہے۔

"مگر آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ......"

''تم ہمیں بھاشن مت دو اور نہ ہی قانون سکھاؤ۔ بس چپ چاپ چلو ہمارے ساتھ۔ اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔''

عمران مجھے دبا دبا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت مجھے بھی کمزور کر رہی تھی۔ ورنہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں ان دونوں سادہ پوش پولیس والوں پر قابو پانا اتنا دشوار نہیں ہوگا۔ میں نے ایک بار پھر عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا کہ ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو یہ سجاد نامی شخص کہہ رہا ہے۔

یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ تقریباً پانچ فٹ دس انچ قد والا ایک عام سے جسم والا، عام سا شخص ہمیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جا رہا تھا اور عمران اس کی بات ماننے میں ہی عافیت سمجھ رہا تھا۔

ہم آگے پیچھے کمرے سے نکلے اور قالین پوش کوریڈور میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ کچھ آگے جا کر عمران نے سجاد سے کہا۔ ''اگر یہ معاملہ ہمارے درمیان طے ہو سکتا ہے تو......''

''ہمارے درمیان کچھ طے نہیں ہو سکتا...... تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور اگر تم نے یہ بات دوبارہ کی تو میں لوگوں کی پروا کئے بغیر تمہارے منہ پر تھپڑ جڑ دوں گا۔ بس چپ چاپ چلتے رہو۔'' سجاد نے کہا۔

اس کا رویہ میرے ذہن میں چنگاریاں سی چمکا رہا تھا۔ ہم مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ایک انتہائی سنگین دور سے گزر کر آئے تھے۔ زرگاں کی وہ خون آشام رات ابھی کل کی بات تھی جب پرانے قلعے کے سامنے نل پانی اور حکم کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا تھا...... بارود کی بارش ہوئی تھی۔ لاشوں کا فرش بچھا تھا۔ ہم بھی اس میدانِ جنگ کا حصہ تھے اور سرخرو ہو کر نکلے تھے...... اور آج الٰہ آباد کا یہ چھریرے جسم والا پولیس اہلکار صرف اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ہمیں ہانک کر لے جا رہا تھا۔ عمران ساتھ نہ ہوتا تو میں ہرگز اس صورت حال کو قبول نہ کرتا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ تک ہم اس طرح آئے کہ سجاد اپنا ہاتھ کالی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب میں ڈالے ہمارے عین پیچھے چل رہا تھا جبکہ اس کے نوجوان ساتھی نے اردگرد کی پروا کئے بغیر پستول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اکادکا راہ گیروں نے اس کے پستول کو دیکھا اور ان کے چہروں پر خوف و ہراس بھی نمودار ہوا تاہم کسی نے بھی اس صورت حال میں کسی طرح کی مداخلت کی ہمت نہیں کی۔

پارکنگ میں سفید رنگ کی ایک پرائیوٹ کار موجود تھی۔ کار میں ایک ڈرائیور پہلے سے

موجود تھا۔ ''تم آگے بیٹھو۔'' سجاد نے تحکم سے عمران کو مخاطب کیا۔

عمران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ مجھے پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ سجاد اور اس کا نوجوان ساتھی میری دونوں جانب بیٹھ گئے۔ نوجوان نے اپنا سرکاری پستول باقاعدہ میرے پہلو سے لگایا ہوا تھا۔ یہ لوگ ذرا سی رعایت دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اچانک ایک اور کارروائی ہوئی۔ میری بائیں طرف بیٹھے سخت گیر نوجوان نے ایک آہنی کڑا میری پنڈلی کے نچلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ایک زنجیر بھی تھی۔ ایسے کڑے عام طور پر تھانوں میں پولیس والوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

گاڑی میں پہنچنے کے بعد ان پولیس اہلکاروں نے آپس میں جو بات چیت کی، اس سے پتا چلا کہ کالی جیکٹ والا سجاد ڈی ایس پی ہے۔ نوجوان جس نے پستول پہلو سے لگا رکھا تھا سب انسپکٹر تھا اور یہ ڈی ایس پی سجاد کا [illegible] عزیز بھی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دراز قد ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔

گاڑی روانہ ہوئی اور الٰہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزرنے لگی۔ رات ہو چکی تھی۔ بازار جگمگا رہے تھے، ٹریفک رواں دواں تھا۔ [illegible] عمران نے ایک بار پھر ڈی ایس پی سجاد سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے تحکمانہ لہجے میں اسے خاموش کر دیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم جس جگہ پہنچے وہ پولیس اسٹیشن نہیں تھا بلکہ رہائشی علاقے میں درختوں سے گھری ہوئی ایک کوٹھی تھی۔ مجھے معلوم [illegible] انڈیا اور پاکستان میں پولیس والوں کے نجی ٹارچر سیل اور تفتیشی مراکز بھی ہوتے ہیں۔ کہیں یہ کوئی ایسی جگہ ہی تو نہیں؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ گاڑی ایک نیم تاریک پورچ میں رکی۔ ایک چوکیدار نے پولیس والوں کے انداز میں سجاد کو سیلوٹ کیا۔ ہمیں ایک اندرونی کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں دو بوسیدہ چارپائیاں اور لحاف پڑے تھے۔ ایک طرف پرانا سا جستی ٹرنک رکھا تھا۔ چھت سے لوہے کی دو زنگ آلود زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار میں دو آہنی کڑے نصب تھے۔ کمرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں لوگوں سے تفتیش ہوتی ہے اور انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں کو اندر دھکیل کر کمرے کا وزنی آہنی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

میں اور عمران چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں آہنی دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں اندر کی طرف مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کھڑکی کے تین چوبی پٹ گرل سے باہر لگے تھے اور باہر کی طرف ہی کھلتے تھے۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک بڑا سا ایگزاسٹ فین بھی دکھائی دیا۔ کمرے میں بند

کرنے سے پہلے ہماری اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ بہرحال، سگریٹ کا پیکٹ اور ایک لائٹر عمران کی جیکٹ کی جیب میں ہی تھے۔ عمران نے سگریٹ سلگایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے، تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔''

''خود کچھ پھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہ لوگ کر دیں گے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میری جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ ''یار! یہ کوئی بات ہے۔ الٰہی آباد کے دو پلسیے ہمیں بکریوں کی طرح ہانک کر یہاں اس ٹارچر سیل میں لے آئے ہیں۔ کیا ہم......''

''معمولی پولیس والے نہیں۔'' عمران نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ''اگر تم نے اس سجاد موہل کو معمولی سمجھا تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔ یہ شخص ہمیں اتنا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم غور کرو، اگر میں اس شخص کو اتنی اہمیت دے رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔''

''یار! اگر کوئی وجہ ہے تو مجھے بھی بتاؤ نا۔ میری برداشت جواب دے رہی ہے۔ یہ نہ ہو میں دھوکے میں مارا جاؤں۔ تم سن ہی رہے تھے، وہ خبیث راستے میں کیا باتیں کر رہا تھا ہمارے بارے میں اور پاکستان کے بارے میں۔ لگتا ہے کہ کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا ہے اس میں۔''

''آہستہ بولو یار یہ جنونی شخص ہے۔ دو سال پہلے میرا اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ اور بہت برا پڑ چکا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں الٰہ آباد میں اس سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، تین چار افراد دندناتے ہوئے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں سے صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل پولیس کی خاکی وردی میں تھا، باقی سادہ لباس میں تھے۔ دو افراد کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ انہوں نے اپنی انگلیاں لبلبی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے عقب میں دبلے پتلے جسم لیکن نہایت کرخت چہرے والا سجاد موہل چلا آ رہا تھا۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اور وہ اس پر کسی نامعلوم شخص کی ماں بہن ایک کرتا چلا آ رہا تھا۔

سجاد نے فون بند کیا۔ اس کے اشارے پر ہمارے کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ ''منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' سجاد نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو تم؟'' عمران نے پوچھا۔

''تمہارے پیچھے گولی مارنا چاہتا ہوں تاکہ تم شہید نہ بن سکو۔ پتا چلے کہ تم بھگوڑے ہو اور تم نے بھاگتے ہوئے گولی کھائی ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن کی ماں کی ایسی تیسی۔ جو میں بک رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ ورنہ سچ مچ تمہارے اندر دو تین روشن دان کھول دوں گا۔'' سجاد کا لہجہ جنونی ہو گیا۔

عمران چند لمحے ہچکچایا پھر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ حالانکہ میں ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پنڈلی والی زنجیر ابھی تک میرے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔

اب ہم دونوں کے سامنے سپاٹ دیوار تھی۔ کہیں کہیں سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں ہمارے ہیولے بائیں جانب دکھائی دے رہے تھے۔ ''اپنے ہاتھ پیچھے موڑو۔'' سجاد موہل کی طرف سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہمیں الٹی ہتھکڑی لگائی جانے والی ہے۔ عمران نے جیسے آخری کوشش کے طور پر اپنا رخ ڈی ایس پی موہل کی طرف پھیرا اور کہا۔ ''اگر تم میری پوری بات سن لو گے تو شاید اپنی رائے بدلنے پر تیار ہو جاؤ۔''

سجاد موہل کا جواب بڑا سخت تھا۔ ایک غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے عمران پر اپنے سرکاری پسٹل سے گولی چلائی۔ یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری اور میرے سامنے دیوار کا تھوڑا سا اور پلاستر اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ سجاد موہل گرجا۔ ''کمینے! اگلی گولی تیرے کھوپڑے میں ماروں گا۔ منہ دوسری طرف کر...... دوسری طرف کر۔''

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر رخ پھر دیوار کی طرف پھیر لیا...... اور ہاتھ پیچھے کر دیئے۔ میں نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے مجھے عندیہ دیا کہ میں سجاد کی ہدایت پر عمل کروں۔

میں نے بھی چاروناچار ہاتھ پیچھے موڑ دیئے اور حقیقت یہی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے خود پر بے پناہ جبر کرنا پڑا۔

دو افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑے کرخت انداز میں ہمارے ہاتھوں میں یخ بستہ ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوسنے لگا جب ہم چائے پینے کے لئے ہوٹل کی بالکونی میں آئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اس موہل نامی بلا نے ہمیں نیچے سڑک پر سے

ہی تاڑا ہوا اور پھر اوپر آ گیا ہو۔

''چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔'' موہل نے نیا حکم صادر کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ ایک آٹو میٹک رائفل اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود چاروں افراد کے چہروں سے سفاکی برس رہی تھی اور خاص طور سے موہل کا چہرہ بے رحمی کی تصویر تھا۔''اب اپنی کس ماں کا بدلہ لینے آئے ہو یہاں؟'' موہل دانت پیس کر بولا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو موہل۔ میں کسی ایسی نیت سے یہاں نہیں ہوں۔ میں اور میرا یہ دوست......''

''یہاں دلیپ کمار سے ملاقات کے لئے آئے ہیں......'' موہل نے عمران کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔ اس کا آہنگ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک جگر پاش نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر بولا۔''کاغذات کہاں ہیں تمہارے؟''

''ہمارے ٹریول ایجنٹ کے پاس ہیں۔''

''اور ٹریول ایجنٹ کون ہے؟''

''اس کا ایڈریس ہوٹل میں ہے۔'' عمران نے جھوٹ بولا۔

''تم بکتے ہو۔ تم غیر قانونی طور پر انڈیا آئے ہو اور تمہارا ٹارگٹ وہی منوج ہے۔ تمہارے اندر ضد ہے اور وہ ضد یہ ہے کہ تم منوج کی ہتھیا کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری یہی ضد تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے...... اور تمہیں وشواس دلاتا ہوں، اس مرتبہ تم پر دفعہ 356 نہیں دفعہ 302 لگنے والی ہے۔ تمہاری اس منحوس گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے والا ہے۔''

''کیوں، میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میں نے کسی کی جان نہیں لی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے جان نہیں لی تھی، تم نے منوج کو صرف گھائل کیا تھا۔ تم نے اس کی ٹانگیں ضائع کر دی تھیں۔ ٹانگیں ضائع ہونے کے بعد وہ مٹی کا ڈھیر ہو گیا۔ اس کا جیون اس کے لئے بہت بڑا بوجھ بن گیا۔ اس کے زخم بھی خراب ہوتے چلے گئے اور پھر ان زخموں کی وجہ سے اس کا دیہانت بھی ہو گیا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ منوج مر گیا؟'' عمران نے قدرے حیرت سے کہا۔

''مر نہیں گیا حرامزادے...... تُو نے اسے مار دیا۔ تیرے دیئے ہوئے زخموں کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ اور یہ ہتھیا کا کیس بنتا ہے۔''

''اگر وہ واقعی مر گیا ہے تو...... پھر اسے اس کے کرموں کی سزا ملی ہے۔ لیکن اگر تم یہ سمجھ

رہے ہو موہل کہ میں اسے مارنے یا نقصان پہنچانے کے لئے یہاں آیا ہوں تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔''

''غلط فہمی ہے یا نہیں لیکن پھانسی کا پھندا تو اب تمہارے گلے میں پڑ گیا ہے...... بچو جی...... اگر کسی اندھے بہرے جج کے کارن تم بچ بھی گئے تو عمر قید تو کہیں نہیں گئی...... ساری عمر یہاں انڈیا کی کسی جیل میں سڑنا پڑے گا۔ اور اس دفعہ تمہیں یہاں سے بھاگنے بھی نہیں دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو پہلے ریمانڈ سے پہلے ہی تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ نہ رہے گی ٹانگ، نہ بھاگے گا گنگو تیلی۔''

ہندو ہیڈ کانسٹیبل بولا۔''میں تو کہتا ہوں جناب ابھی توڑیں۔ پُن (نیکی) کے کام میں دیری نہیں ہونی چاہئے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رائفل ڈی ایس پی سجاد موہل کی طرف بڑھائی۔ اس نے رائفل کو الٹی طرف سے پکڑا اور بڑے زور سے عمران کی پنڈلی پر رسید کیا۔ آہنی دستے نے یقیناً عمران کو زبردست چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ دوہرا ہو گیا۔

پہلی چوٹ کے بعد سجاد موہل ایک دم عمران پر پل پڑا۔ اس نے عمران کو رائفل کے کندے سے پے در پے ضربیں لگائیں۔ ساتھ ساتھ وہ اسے ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اب میرے لئے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر زوردار لات سب انسپکٹر کے سینے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر جستی ٹرنک پر گرا۔

حوالدار نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی ٹانگ رسید کر کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ میرے جسم میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ یہ وہی بجلی تھی جو جیکی کی خوفناک تربیت سے میرے رگ و پے میں سمائی تھی۔ یہ ایک ایسی توانائی تھی جس نے میری کایا پلٹی تھی اور مجھے میرے حریفوں کے لئے خطرناک بنا دیا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ اس الٹی ہتھکڑی کا تھا جس نے میرے اور عمران کے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔ میری زوردار مزاحمت نے پولیس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔ انہیں سخت چوٹیں لگیں۔ خود ڈی ایس پی موہل بھی اچھل کر دیوار سے ٹکرایا لیکن پھر اس کے بعد کئی افراد بھرا مار کر کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے ہمیں بے بس کر دیا۔ کوئی دس افراد ہوں گے جو ہم سے کالی بھڑوں کی طرح چمٹ گئے۔ انہوں نے ہمیں بری طرح زد و کوب کیا۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر چلتا اور اس کا حتمی نتیجہ کیا نکلتا کہ ایک نسوانی آواز نے صورتِ حال تبدیل کر دی۔ یہ آواز کوٹھی کے برآمدے کی طرف سے بلند ہوئی تھی۔ اس آواز کے سنتے ہی ہمیں مارنے والے ٹھٹک گئے۔ ڈی ایس پی سجاد موہل نے

بھی اپنا ہاتھ روک لیا۔

آواز ایک بار پھر ابھری۔ کسی نے چلا کر کہا۔ ''موہل! جلدی آؤ...... پلیز۔''

موہل نے مڑ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ تب میری نگاہ بھی کھڑکی سے باہر باغیچے کی ایک روش پر پڑی۔ گارڈن لائٹ کی دودھیا روشنی میں ایک دراز قد عورت ذرا جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی نارنجی ساڑھی کا پلو زمین پر لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا پہلو دبایا ہوا تھا۔ وہ کسی طرح کے درد کا شکار تھی۔

سجاد موہل تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہمیں زدوکوب کرنے والے اس کے ماتحت بھی تتر بتر ہو گئے۔ ہم دونوں ٹھنڈے فرش پر پڑے خون تھوک رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر دو تین گومڑ ابھر آئے تھے اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ میری ناک سے خون رِس رہا تھا۔ پسلیوں سے بھی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کمرے کا دروازہ باہر سے پھر لاک کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی سجاد کے ایک ماتحت نے ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور بکتا جھکتا ہوا باہر چلا گیا۔ ''ہائے...... ہوئی...... اُف۔'' عمران نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ ''رانی خاں کے سالوں نے بالکل بہنوئی سمجھ کر مارا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میرا گُردہ زخمی ہو گیا ہے۔'' اس نے پیٹ کے درمیان ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''گردہ یہاں نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''یار! جتنی اٹھک پٹخ ہوئی ہے ہمارے ساتھ، گُردہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ دماغ کے سوا تمہارے سارے اعضا اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم نے جان بوجھ کر یہ ''چھینٹی کھاؤ'' پروگرام کیوں بنایا ہے۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ یہ بندہ جنونی ہے اور میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ تو پھر کیوں پھنسے ہو اس کے شکنجے میں؟ کتنی فرماں برداری سے ہتھکڑی لگوائی ہے تم نے۔ اور ساتھ ساتھ مجھے بھی بندھوا دیا ہے۔''

''جب تمہیں اس بندے کی اصلیت کا پتا چلے گا نا تو تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔ میں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔''

''ٹھیک کیا ہے تو پھر ہائے ہائے کیوں کر رہے ہو؟''

''یار! تم تو بن چکے ہو آئرن مین۔ چھوٹی موٹی چوٹ تمہیں کچھ کہتی ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مار تم نے ایسے ہی کھائی ہے جیسے دودھ جلیبی کھاتے ہیں۔ سوچو اگر میں بھی

ہائے ہائے نہ کروں تو ان لوگوں کا پارا تو پہنچ جائے گا ساتویں آسمان پر۔ جو مارتا ہے وہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ مار کھانے والا ہائے ہائے بھی کرے۔'' اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر ''اوئی اللہ'' کہہ کر لیٹ گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ کسی اندرونی چوٹ کی وجہ سے تمہاری جنس تبدیل ہو گئی ہے۔'' میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''اتنی جلدی جنس تبدیل نہیں ہوتی۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اتنی جلدی جنس تبدیل ہونے لگے تو کوئی ماں اپنے بچے کو گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دے...... ادھر جھگڑا ہوا ادھر جنس تبدیل۔ ایک دفعہ پتا ہے کیا ہوا......''

''ہاں، مجھے پتا ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن یہ پتا نہیں کہ آج کیا ہوا ہے۔ یہ انڈین پولیس والا کیوں تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے...... اور یہ منوج کون ہے؟ کیا تم نے واقعی اس نام کے کسی بندے سے مار پیٹ کی تھی؟''

''ہاں یار! دو سال پہلے جب میں انڈیا آیا تھا تو یہاں بمبئی میں ایک ایسا جھگڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ ایسا سنگین نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس بندے کی جان چلی جاتی۔ اس میں کوئی گڑبڑ گوٹالا ہے۔ شاید یہ بندہ ہمیں بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ تم خود بھی بلیک میل ہونا چاہ رہے ہو۔ راستے میں کئی موقع ایسے آئے تھے جب ہم گاڑی کے اندر ہی اس ڈی ایس پی صاحب کی طبیعت صاف کر سکتے تھے۔ کم از کم میں تو ایسا کر سکتا تھا۔''

''اور یہی تمہاری بھول ہے۔'' عمران نے ترت کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی جیکٹ کی زپ ٹوٹ چکی تھی اور قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ آئندہ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

''یہ ہم ہیں کس جگہ پر اور یہ جوان عورت کون تھی؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہیں یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں اور ابھی تمہیں ''گدڑ کٹ'' بھی میں نے ہی لگائی ہے۔ بھئی تمہاری طرح میں بھی یہاں ایک ''معزز'' مہمان کی حیثیت سے موجود ہوں اور تمہارے ساتھ ہی مہمان نوازی اور عزت افزائی کے مرحلوں سے گزر رہا ہوں۔''

''یار! کچھ اندازہ تو ہو گا تمہارا؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اندازہ یہی ہے کہ یہ ڈی ایس پی موہل کی اپنی ہی رہائش گاہ ہے اور اس کے ایک

حصے میں خاص ملزموں سے پوچھ گچھ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ میرے دوسرے اندازے کے مطابق یہ عورت جو ابھی موہل کو آوازیں دے رہی تھی، اس کی گھر والی ہے یا پھر آدھی گھر والی یعنی سالی ہوگی...... یا پھر دو تہائی گھر والی یعنی منہ بولی بیوی ہوگی۔''

تھوڑی دیر پہلے ہونے والی مار پیٹ کا عمران پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا...... ہاں، موہل کے حوالے سے وہ اب بھی پریشان تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ موہل کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا؟ ہمارے ہاتھ بدستور الٹی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ خاصی تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔ ہم اپنے چہرے سے رسنے والا خون بھی صاف نہیں کر سکتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار کمرے کی دیوار کا وہ حصہ آ رہا تھا جہاں گولی کا تازہ نشان موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ یہ گولی اور گولی کا نشان اس امر کا ثبوت تھے کہ عمران ڈی ایس پی موہل کی جنونیت کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہمیں موہل پھر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے دبلے چہرے پر بھاری مونچھیں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے ساتھ صرف سب انسپکٹر تھا۔ دروازے پر کھڑے رائفل بردار حوالدار نے کمرے کا قفل کھولا اور موہل کے لئے ایک کرسی کمرے کے اندر رکھ دی۔ موہل اس کرسی پر براجمان ہو گیا۔ رائفل بردار بالکل چوکس حالت میں اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ موہل کا پارا جو آدھ پون گھنٹا پہلے ضرورت سے زیادہ اوپر چلا گیا تھا، اب قدرے نیچے محسوس ہوتا تھا۔ اس نے دانتوں میں ماچس کی تیلی چلاتے ہوئے آتشیں نظروں سے عمران کو گھورا اور کہا۔ ''کیا ارادے ہیں؟ مزید مرمت کرانی ہے یا سب کچھ صاف صاف بتانا ہے؟''

''آپ لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں؟'' عمران نے کہا۔

''ہمیں پتا چل چکا ہے۔ تم سات بندوں نے ہوٹل میں بکنگ کرائی تھی، چار مرد تین عورتیں۔ مجھے یقین ہے تمہاری طرح تمہارے ساتھیوں نے بھی فرضی نام لکھوائے ہیں۔ تم دونوں کے پکڑے جانے کے بعد تمہارے ساتھی موقع سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن بھاگ کر حرامزادے جائیں گے کہاں؟ موہل انہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی نکال لے گا۔''

موہل کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جب یہ پولیس والے ہمیں گن پوائنٹ پر ہوٹل سے باہر لا رہے تھے تو اسد یا اجے نے یہ منظر دیکھ لیا تھا اور فوری طور پر اپنا تحفظ کیا تھا۔ موہل نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کہیں یہ کوئی دہشت

گردی کی پلاننگ تو نہیں ہے؟''

''دہشت تو تم پھیلا رہے ہو موہل صاحب! ہم پر بھیانک قسم کے الزام لگا رہے ہو۔ ورنہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم فن کار لوگ ہیں۔ لوگوں کو تفریح فراہم کر کے روزی کماتے ہیں۔''

''بے شک...... بے شک...... تم جیسے آٹھ دس اور فن کار انڈیا میں آ جائیں تو پورے ملک میں تفریح کی لہر لہر ہو جائے۔ دو سال پہلے تو صرف ایک منوج کمار کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں...... ایک بندہ زخمی ہوا تھا اور ایک گاڑی تباہ ہوئی تھی، اب تم لوگ اس سے کہیں بڑی تفریح فراہم کرنے کے قابل ہو۔ ویسے تم پاکستانیوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اپنے ملک کی مسجدوں میں تو خیر خیریت سے نماز بھی نہیں پڑھ سکتے ہو اور حج کے موقع پر ہم ہندوستانیوں سے پوچھتے ہو کہ انڈیا میں تم پر ظلم تو نہیں ہوتا؟ واہ! کیا شان ہے تمہاری؟''

''لیکن یہ بات کیوں بھولتے ہو کہ یہاں احمد آباد میں سیکڑوں لوگوں کو مسلم کُش فسادات میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے...... بمبئی میں کیا ہو رہا ہے......''

''جو کچھ بھی ہو رہا ہے لیکن یہاں ہم مسلمان تم لوگوں سے زیادہ محفوظ اور خوش ہیں۔ تم لوگوں نے حکومتیں بنانے اور توڑنے کے سوا کیا ہی کیا ہے اپنے ملک میں۔ اپنی ضرورت کی چھوٹی سے چھوٹی شے کے لئے تم باہر کی دنیا کے محتاج ہو۔ تم نے اس خطے کو کلاشنکوف کلچر، ہیروئن اور دہشت گردی کے تحفے دیئے ہیں۔''

''مگر معاف کرنا موہل صاحب! بڑے سے بڑا ڈان تو تمہارے ملک میں بھرا ہوا ہے۔ تمہاری پوری فلم انڈسٹری پر ڈانوں کا راج ہے۔ تمہارے بڑے بڑے شہر ان دادا گیروں نے یرغمال بنا رکھے ہیں۔''

''اور وہاں پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی جانکاری بھی ہم کو ہے۔ یہاں تو فلم انڈسٹری میں ڈان ہوں گے، وہاں تمہاری پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارے سرکاری محکموں میں بیٹھے ہوئے ہیں...... اور تو اور تمہاری سرکس کمپنیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک منحوس سرکس کے ساتھ ایک حرامزادہ بازی گر یہاں آتا ہے اور سڑکوں پر دادا گیری کرتا ہے۔ لوگوں کی ٹانگیں توڑتا ہے، ان کے جیون برباد کرتا ہے۔ ان کو ان کے بال بچوں سمیت زندہ جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔'' ڈی ایس پی موہل نے آخری الفاظ دانت پیس کر کہے اور عمران کو قہرناک نظروں سے دیکھا۔ چند لمحے کے لئے یوں لگا کہ وہ طیش میں آ کر اس پر جھپٹ پڑے گا۔

اس نے حوالدار سے کہہ کر شراب کی چھوٹی بوتل منگوائی اور وہیں ہمارے سامنے بیٹھ کر اس کے تلخ گھونٹ بھرنے لگا۔ ذرا نشہ چڑھا تو اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے عمران کے پہلو میں لات رسید کی اور پھنکارا۔ ''اگر تیرے دل میں کوئی ارمان ہے تو نکال لے۔ میں تیری یہ ہتھکڑی کھلوا دیتا ہوں۔ تجھے بھاگنے کے لئے سمے بھی دیتا ہوں۔ بیس تیس سیکنڈ سے پہلے تیرے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔ لیکن پھر اگر پکڑا گیا تو ننگا کر کے ماروں گا۔ ایک ایک انچ گوشت اڑا دوں گا تیرے پنڈے پر سے۔'' اس نے باقاعدہ انگوٹھے اور انگلی کو ملا کر ایک انچ کا اشارہ بتایا۔

ابھی کچھ دیر پہلے عمران نے مجھے ڈی ایس پی موہل کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ موہل ماضی میں کبڈی کا نامور کھلاڑی بھی رہا ہے اور اسی کھیل کی بنیاد پر پولیس میں بھرتی بھی ہوا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی انور موہل بھی پولیس میں تھا اور وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ بعدازاں اس نے پولیس چھوڑ دی تھی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔

موہل دس پندرہ منٹ مزید ہمارے پاس بیٹھا۔ اس دوران میں اس نے بس زہر ہی اگلا۔ اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ خصوصاً پاکستانی پولیس اور قانون نافذ کرنے والی دیگر ایجنسیوں سے وہ بہت متنفر تھا۔ اب پتا نہیں اس نفرت کی وجہ کیا تھی۔ عین ممکن تھا کہ عمران کو علم ہوتا مگر وہ کچھ بتاتا تو تب تھا۔ موہل کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ عمران کو ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ افسروں کے حوالے کرنا چاہتا ہے اور اپنی چھاتی پر کامیابی کا ایک یادگار تمغہ سجانے کا خواہش مند ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی شک تھا کہ عمران اب پھر کسی جرم کی نیت سے ہی یہاں الٰہ آباد میں موجود ہے۔ وہ اس نئے جرم کا کھوج بھی چاہتا تھا۔ ہم دونوں کے حوالے سے اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہی اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ یہ کال موہل کے کسی ماتحت کی تھی۔ اس ٹیلی فونک گفتگو سے ہمیں پتا چلا کہ الٰہ آباد میں اسد اور میڈم سمیت ہمارے ساتھیوں کی تلاش زور شور سے جاری ہے اور اس شخص کا بھی سراغ لگایا جا رہا ہے جس کی وساطت سے ہمارے لئے ہوٹل میں کمرے بک ہوئے تھے۔

سجاد موہل کے جانے کے بعد ہمارے کمرے کو باہر سے پھر وزنی تالا لگا دیا گیا۔ دو رائفل بردار اہلکار کمرے سے باہر چوکس حالت میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک حوالدار فیاض اور دوسرا ہندو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

حوالدار فیاض ہماری طرف مسلسل تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گرل

دار کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگتا۔ عمران نے اس سے کہا۔

''میرے برادر! کہیں سے سبز چارا مل جائے گا تھوڑا سا؟''

''کیا کرو گے؟''

''کھائیں گے یار اور کیا کریں گے۔ تمہارے ڈی ایس پی نے ہمارے ہاتھ تو پیچھے باندھ دیئے ہیں، اب روٹی اور برگر وغیرہ تو ہم کھا نہیں سکتے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چارا وغیرہ ہی کھانا پڑے گا۔''

وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ''گھبراؤ مت۔ چارا وغیرہ بھی دیں گے۔ پہلے تم سے تھوڑا سا ہل تو چلوا لیں۔''

''یار! ہل چلوایا تو ہے تم لوگوں نے۔ دیکھ لو ہم دونوں کے تھوبڑے نیلو نیل ہو رہے ہیں۔''

''ابھی تو صرف تھوبڑے نیلو نیل ہوئے ہیں، کل شام تک تمہیں ہر جگہ نیل نظر آئیں گے۔ اور جو جگہیں تم خود نہ دیکھ سکو گے، ان پر ہاتھ لگانے سے پتا چل جائے گا کہ نیل پڑے ہوئے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے ہم شام تک یہیں رہیں گے؟'' عمران نے حیرت ناک صورت بنائی۔

''کل شام تک نہیں میرے ہیرے...... اگلی پانچ چھ شاموں تک تم یہیں رہو گے...... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ شامیں لگ جائیں۔ ویسے شام پر تمہارے کسی پاکستانی کوی نے بڑا اچھا گانا بنایا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے...... میرا کوئی کام کرو اور...... شام کرو۔''

عمران نے فوراً تصحیح کی۔ ''ہو سکے تو میرا ایک کام کرو، شام کا ایک پہر میرے نام کرو۔ ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھا ہے۔ میری بڑی پکی یاری ہے ان سے...... لیکن یار! تمہاری ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارے ڈی ایس پی صاحب ہمیں اس کوٹھی میں کس طرح رکھ سکتے ہیں...... یہ کوئی تھانہ تو نہیں؟''

''گھبراؤ مت۔ یہاں تم دونوں کو تھانے سے زیادہ ''سہولتیں'' ملیں گی۔'' وہ مونچھیں مروڑ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''باقی رہی یہاں رکھنے کی بات تو میرے ہیرے...... تھانے تو تمہیں تب لے جایا جائے گا جب تمہاری گرفتاری ڈالی جائے گی۔ ابھی تو تمہارا کوئی اندراج ہی نہیں۔ کوئی کھوج کھرا، کوئی مائی باپ نہیں تمہارا۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں یہاں زندہ بھی گاڑ دیں گے تو کسی کو خبر نہیں ہو گی۔''

وہ دیر تک ہمیں ڈراتا دھمکاتا رہا اور بتاتا رہا کہ ڈی ایس پی صاحب اس چاردیواری میں مختارِکل ہیں۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم پوچھ گچھ کے سلسلے میں ان سے پورا تعاون کریں ورنہ ہماری خیریت جو پہلے ہی مشکوک ہے، مزید خطروں میں گھر جائے گی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ ہمیں بیدردی سے مارا گیا تھا۔ میرا جسم پھوڑا بنا ہوا تھا لیکن ایسی تکلیفیں اب مجھے مزہ دیتی تھیں۔ میں ایسی تکلیفوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا تھا، ان سے دوستی کرتا تھا۔ اب مجھے ان کی ''شدت'' سے لذت کشید کرنا آ گئی تھی۔ بوسیدہ لحاف ہمیں سردی سے بچانے کے لئے ناکافی تھے۔ ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ جسمانی اذیت میں بھوک کی بے چینی بھی شامل ہو گئی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ مجھے دکھ پہنچانے میں ناکام تھا۔ رہی عمران کی بات تو وہ بھی بلا کا سخت جان تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ڈی ایس پی موہل اپنی پرائیویٹ کار لے کر بڑی تیزی سے کہیں نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک حوالدار نے اندر آ کر میری ہتھکڑی کھولی۔ عمران کی ہتھکڑی میں نے کھولی۔ میرے پاؤں سے زنجیر بھی اتار لی گئی۔ تب تک حوالدار باہر نکل کر دروازہ لاک کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک عمران ایک خطرناک شخص تھا کیونکہ وہ ماضی قریب میں، منوج نامی کسی شخص کی ٹانگیں توڑ چکا تھا اور پولیس کی حراست سے فرار ہو چکا تھا۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہ شخص عمران کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔

ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈی ایس پی موہل کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ شام کے بعد بھی اپنی رہائش گاہ پر نظر نہیں آیا۔ اس کی کار بھی دکھائی نہیں دی۔ دو رائفل بردار اہلکار مسلسل کمرے کے دروازے کے سامنے پہرا دے رہے تھے۔ صبح ہمیں واجبی سا ناشتا دیا گیا تھا مگر رات کا کھانا اچھا تھا۔ رات نو دس بجے کے قریب ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ وہی عورت برآمدے کی سیڑھیوں پر دکھائی دی جسے ہم نے کل شب موہل کو پکارتے سنا تھا۔ تب وہ شدید درد میں محسوس ہوئی تھی۔ تاہم اب وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔ اس نے آج مختلف رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس، تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ قبول صورت اور متوازن جسم کی تھی۔ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی وہ ہمارے کمرے کی طرف آئی۔ کانسٹیبل اور حوالدار نے اسے ادب سے سلام کیا۔ وہ کھڑکی میں سے ہمیں گھورتے ہوئے بولی۔ ''کیا کیا ہے انہوں نے؟''

اس کا یہ سوال حوالدار فیاض سے تھا۔ فیاض نے کہا۔ ''ابھی انہوں نے کچھ بتایا نہیں بیگم جی...... مگر کل تک سب کچھ بک دیں گے۔ ویسے شاید آپ نے غور سے دیکھا نہیں۔ ان

میں سے ایک کو آپ پہلے سے بھی جانتی ہوں گی۔ یہ سرکس کا وہی بازی گر ہے جس نے منوج صاحب کی ٹانگوں میں گولیاں ماری تھیں۔''

بیگم صاحبہ نے غور سے عمران کو دیکھا اور ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکیڑا...... ''اوہ مائی گاڈ...... تو یہ پھر پکڑا گیا۔''

''صاحب جی نے آپ کو اس کے بارے میں بتایا نہیں؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ کل شام کو مجھے کڈنی کا شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ آج صبح سویرے ان کو کسی چھاپے کے لئے جانا پڑ گیا۔ یہ تو بڑی اہم سماچار ہے۔ اگر انہیں موقع ملتا تو مجھے ضرور بتاتے۔'' اس نے ایک بار پھر غور سے عمران کو دیکھا پھر حوالدار سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''وشواس نہیں ہو رہا کہ یہ دوبارہ سلاخوں کے پیچھے ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟''

''یہ بھی ہو گا کوئی اٹھائی گیرا جی۔ یہ بھی پاکستان سے ہی تشریف لایا ہے۔''

بیگم صاحبہ نے تھانے داری لہجے میں کہا۔ ''اب کیا ارادے تھے تمہارے؟''

عمران نے مسمسی صورت بنائی۔ ''ارادے تو بڑے نیک تھے جی۔ کسی ہندوستانی لڑکی کو جیون ساتھی بنا کر پاکستان لے جانا چاہتا تھا مگر آپ کے شوہر صاحب بڑی دور کی سوچتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب میں ہندوستانی لڑکی کو پاکستان لے کر جاؤں گا تو اسے ضرور تنگ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ مار پیٹ بھی کروں۔ لہٰذا انہوں نے شادی سے پہلے ہی مجھے ایک ''سخت گیر داماد'' کا رتبہ بخش دیا کہ بلکہ چھینٹی بھی لگا دی۔ دیکھیں کتنے ستم کی بات ہے، میں نے ابھی اس بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھی جس پر میں نے ظلم کرنا ہے اور مرمت میری پہلے ہی ہو گئی ہے۔''

حوالدار نے کہا۔ ''اسے بکنے کی عادت ہے بیگم صاحبہ آپ کو یاد ہو گا پچھلی دفعہ جب اسے عدالت میں ریمانڈ کے لئے پیش کیا گیا تھا، اس نے مجسٹریٹ صاحب کو اس لئے مجسٹریٹ صاحبہ کہہ دیا تھا کیونکہ ان کی آواز بہت باریک تھی۔ ایک نمبر کا چرب زبان ہے۔''

بیگم صاحبہ نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ عمران سے ایک دو باتیں کیں۔ پھر حوالدار کو ایک ڈاکٹری نسخہ دیا اور اپنے لئے میڈیکل اسٹور سے دوا لانے کو کہا۔ حوالدار چلا گیا تو بیگم صاحبہ نے ہیڈ کانسٹیبل کو برآمدے کی لائٹ روشن کرنے کو کہا۔ جب ہیڈ کانسٹیبل رخ دوسری طرف پھیر کر لائٹ روشن کر رہا تھا، بیگم صاحبہ نے اچانک اپنی گرم شال کے نیچے سے ایک موبائل فون نکالا اور گرل دار کھڑکی میں سے عمران کی طرف بڑھایا۔ عمران ایک لمحے کے لئے چونکا

پھراس نے موبائل لے کر چارپائی پر پڑے لحاف کے نیچے رکھ دیا۔

ہیڈ کانسٹیبل لائٹ روشن کر کے واپس ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ بیگم صاحبہ نے انکشاف انگیز لہجے میں عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہیں جانکاری نہیں کہ منوج کمار مر چکا ہے اور اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی موت تمہارے دیئے ہوئے زخموں سے ہی ہوئی ہے...... اب تم انڈیا آ گئے ہو۔ نہ صرف آ گئے ہو بلکہ پکڑے بھی گئے ہو۔ شاید اسی کو کہتے ہیں جو کرو گے سو بھرو گے۔''

عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی کی طرح دار بیوی واپس چلی گئی۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اس نے عمران کو موبائل دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتی ہے اور نہ صرف اسے جانتی ہے بلکہ رابطہ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اس نے حوالدار وغیرہ کے سامنے ضرور کچھ کھردری باتیں کی تھیں مگر اندر خانے وہ عمران کی ہمدرد محسوس ہوئی تھی۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی؟'' میں نے عمران سے سرگوشی میں پوچھا۔

''یہ شریفانہ چکر ہے۔ تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل ہی جانا تھا اور پھر یہی ہوا موبائل فون نے ''وائبریٹ'' کیا۔ اس پر میسج آیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی کی وائف ہی کی طرف سے تھا۔ اس طویل میسج کا ٹیکسٹ انگریزی میں تھا۔ عمران نے یہ میسج مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''بھائی جان! آپ کو پھر سے پولیس کی کسٹڈی میں دیکھ کر مجھ پر جو گزری ہے، کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ آپ کو تقریباً دو سال بعد دیکھا اور وہ بھی اس حالت میں۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کل رات میں نے آپ کو اور آپ کے دوست کو گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا...... پھر جب کمرے میں آپ دونوں سے مار پیٹ شروع ہوئی تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ میں نے درد کا بہانہ کیا اور سجاد کو آوازیں دیں۔ میں نے وقتی طور پر تو آپ کی مصیبت ٹال دی لیکن یہ زیادہ دیر نہیں ٹلے گی۔ سجاد کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کے لئے میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔''

جواب میں عمران نے لکھا۔ ''تم بھائی جان کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہو۔ تمہیں پتا

ہے، میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اس جن زاد سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں جس نے پچھلے سات آٹھ سال سے تمہیں قید کر رکھا ہے۔ بہر حال، یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو میں اس کی قید میں ہوں۔ جہاں تک تمہاری مدد کی بات ہے تو تم بس دعا کرو۔ ذاتی طور پر اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے میں سنبھال لوں گا۔''

میسج کا جواب آیا۔ ''یہ آپ کا نہیں سراسر میرا معاملہ ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا، میرے لئے کیا۔ میرے گھر کو بچانے کے لئے کیا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اگر آپ کی وجہ سے منوج کی ٹانگیں کٹیں تو وہ اسی لائق تھا۔ اس نے ایک گندا جرم کیا تھا...... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سجاد بھی آپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے صرف اور صرف میری وجہ سے گرفتاری دی۔ میں آپ کی بہت احسان مند ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اس بوجھ تلے اور نہ دبائیں۔ مجھے بتائیں، آپ دوبارہ کیوں سجاد کی کسٹڈی میں نظر آ رہے ہیں؟ اور میں آپ کے لئے کیا کروں؟''

عمران نے لکھا۔ ''اگر تم میرے لئے کچھ کرنا چاہتی ہو تو خدا کے لئے اپنے اس نانہجار...... جن زاد شوہر سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ میری دلی خواہش پوری ہو جائے گی۔ اگر مجھ سے کہو گی تو میں سر کے بل حاضر ہوں، ورنہ کوئی مناسب شخص ڈھونڈنے میں، میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔''

جواب آیا۔ ''یہ مذاق کا موقع نہیں۔ میرا دل رو رہا ہے۔ آپ کو بری طرح مارا ہے انہوں نے۔ اور ابھی وہ اور سختی کریں گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سجاد آپ کے ان ساتھیوں کی تلاش میں گئے ہیں جو آپ کے پکڑے جانے کے بعد ہوٹل پارک ویو سے فرار ہو گئے تھے۔ کم از کم آپ مجھے یہ تو بتا دیں کہ اس بار آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ یہ منوج والا معاملہ ہی ہے یا کچھ اور ہے؟''

''نہیں عاصمہ! اس دفعہ ہم اہم فلمی شخصیات کے انٹرویوز لینے آئے ہیں۔'' عمران نے لکھا اور پھر مزید پیغامات سے بچنے کے لئے فون آف کر دیا۔

میں نے دیکھا کھڑکی سے باہر حوالدار فیاض رائفل گود میں رکھے کرسی پر بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نریندر کے قدموں کی چاپ برآمدے میں مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! مجھے سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''یہاں سینڈ بیگ نہیں ہے اور میں سینڈ بیگ کی کمی تمہارے تھوبڑے سے پوری کروں

گا۔ مکے مار مار کر تمہاری بتیسی کا سوا ستیاناس کر دوں گا۔‘‘

عمران کچھ دیر غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ’’کیا پوچھنا چاہتے ہو؟‘‘

’’یہ ڈی ایس پی کی بیوی عاصمہ کس گندے جرم کی بات کر رہی تھی؟ کیا کیا تھا منوج نے؟‘‘

’’اس نے ایک پاکستانی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اور لڑکی بھی وہ جو اس سے عمر میں بیس بائیس سال چھوٹی تھی۔ وہ ہمارے سرکس میں جگلر تھی۔ ہمارے ساتھ ہی انڈیا کے شہروں میں شو کرنے کے لئے پاکستان سے آئی تھی۔ منوج نے اسے ورغلایا۔ اسے کوک میں نشہ آور دوا ملا کر پلائی اور اس سے دست درازی کی۔‘‘

’’یہ منوج کون تھا؟‘‘

’’بمبئی میں مرغ حلیم بیچتا تھا۔ راج کپور کی بہن کی ساس کی خالہ کا چھوٹا بہنوئی تھا۔‘‘

عمران پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔

میں نے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ’’یار! ایک بار مجھے شروع سے سب کچھ بتا دو پھر مجھے پریشانی ہوگی نہ تمہیں۔‘‘

’’کہاں سے بتاؤں؟‘‘

’’منوج سے بتا دو۔ یہ کون تھا؟‘‘

’’بمبئی کی فلمی دنیا کا بندہ تھا۔‘‘

’’ایک تو مشہور اداکار منوج کمار ہے؟‘‘

’’نہیں، یہ فلمسازی کرتا تھا۔ شاید ایک دو فلموں کی ڈائریکشن بھی دی تھی...... کافی کھاتا پیتا شخص تھا۔ ایسے لوگوں کو لڑکیوں کی کیا کمی ہوتی ہے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ یہ بمبئی میں ہمارا شو دیکھنے آیا۔ وہاں اس کی ملاقات ہماری ٹیم سے ہوئی۔ ان میں زیب بھی شامل تھی۔ زیب لاہور کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکول کے زمانے میں اسے جمناسٹک کا شوق پیدا ہوا اور پھر شوق ہی شوق میں وہ ہمارے سرکس تک آ پہنچی۔ جان محمد صاحب نے اسے اچھے معاوضے کی پیشکش کی اور وہ باقاعدہ شوز میں حصہ لینے لگی۔ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اس نے منوج سے بھی ہنس کر باتیں کیں۔ بعد میں منوج نے اسے فون کیا اور بتایا کہ اگر وہ کوشش کرے تو فلموں میں آ سکتی ہے۔ ان فلمی لوگوں میں ایک جادو ہوتا ہے یار...... ان کی آفر کو ٹھکرانا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے، خاص طور سے لڑکیوں کے لئے۔ اچھے بھلے گھرانوں کی لڑکیاں ان چکروں میں پھنستے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔

بہر حال، یہاں جو کچھ ہوا، اس میں شاید تھوڑا بہت قصور زیب کا بھی تھا۔ ہم بمبئی میں قریباً پندرہ دن رہے تھے۔ وہ ہمیں بتائے بغیر منوج سے فون پر بات کرتی رہی اور اس سے ملتی بھی رہی۔ منوج نے اسے فلمی دنیا کی چکاچوند کی کچھ جھلکیاں دکھائیں۔ ایک روز اسے ساحل پر اپنے کاٹیج میں لے گیا۔ زیب کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ وہ چھتیس سال سے اوپر کا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اسے دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے اس بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا تو وہ اسے ذلیل و خوار کر دے گا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ زیب نے یہ سب کچھ مجھے بتا دیا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے لئے تھے۔ مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کسی کو کچھ بتاتی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اپنی نادانی کے سبب وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی اور اس کا دکھ جاننے میں کامیاب رہا۔ اب میرے لئے برداشت کرنا مشکل تھا۔ میں جانتا تھا کہ منوج سنہا واقعی ایک ’بڑا آدمی‘ ہے۔ اپنے تعلقات کے سبب وہ اپنا کچھ بگڑنے نہیں دے گا اور میں اسے یونہی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے گھیر لیا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ رات کے وقت جب وہ اپنے ڈرائیور اور ایک فلمی دوست کے ساتھ نشے میں دھت اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا، میں نے اسے جا لیا۔ اس کا دوست زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ ڈرائیور نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔ میں نے منوج کے گھٹنوں اور رانوں پر چھ گولیاں ماریں۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر جان بخشوائی۔ اس کے بعد کے واقعات کا تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔‘‘

’’میں تمہاری طرح جیمز بانڈ نہیں ہوں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ پوری بات بتاؤ۔ یہ ذلیل موہل تمہارے پیچھے کیسے پڑا؟‘‘

’’اوئے گھامڑ! میں مجرم تھا اور یہ پولیس والا۔ اس نے میرے پیچھے نہیں پڑنا تھا تو کیا جوہی چاولہ یا شبانہ اعظمی نے پڑنا تھا۔ ان دنوں یہ شرابی پلسیا بمبئی میں ہی تعینات تھا۔ اس نے مجھے پکڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے تو اس خبیث کو خاص طور سے ’’محبت‘‘ ہے۔ منوج کو گولیاں مارنے اور اس کی مرسڈیز کو آگ لگانے کے بعد میں اورنگ آباد کی طرف نکل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس کارروائی کی وجہ سے سرکس کے مالک جان محمد صاحب یا میرے دیگر دوستوں کو کوئی پریشانی ہو۔ منوج پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ یہ بس مجھ اکیلے کی کارروائی تھی۔ اس کا نتیجہ بھی میں اکیلے ہی بھگتنا چاہتا تھا......‘‘

میں نے عمران کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’پہلے ایک چیز کلیئر کرو۔ تم نے بتایا ہے کہ سجاد کو پاکستان اور پاکستانیوں سے خداواسطے کا بیر ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟‘‘

’’ہاں، خاص وجہ ہے۔‘‘ عمران نے اپنے زخمی ہونٹ سے رسنے والے خون کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ’’میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ سجاد کا ایک بھائی انور بھی تھا۔ وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا وہ کچھ عرصے کے لئے پولیس میں بھی رہا۔ بعد میں اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا مگر اس کام کی آڑ میں وہ غلط دھندے بھی کرتا تھا۔ وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہیروئن اسمگل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ انڈیا سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہ لاہور میں پکڑا گیا اور فرار ہونے کی کوشش میں اپنے ایک پاکستانی دوست سمیت پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کوئی چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ سجاد جس طرح کا بھی ہے لیکن اس نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو باپ بن کر پالا تھا اور اس سے بہت پیار بھی کرتا تھا۔ اس کی موت نے سجاد کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ شراب تو وہ پہلے بھی بہت پیتا تھا لیکن اب پانی کی طرح پینے لگا۔ وہ کچھ جنونی سا ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی عاصمہ سے کہتا تھا کہ پاکستان جائے گا اور ان پولیس والوں کو قتل کرے گا جنہوں نے اس کے بھائی پر گولیاں چلائیں۔ وہ ان لوگوں کو قتل نہ کر سکا اور نہ ہی پاکستان جا سکا لیکن اس کے دل میں روز بروز نفرت پروان چڑھتی رہی۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے وہ دو تین بار نوکری سے معطل بھی ہوا۔ وہ چڑچڑا اور غصیلا بھی ہوتا جا رہا تھا...... بات بات پر بیوی کو پیٹنے لگتا تھا۔ اس کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس کا ذمے دار بھی وہ اپنی بیوی عاصمہ کو ہی ٹھہراتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ایک چھوٹی سی بات سے ہو سکتا ہے۔ پاکستان اور انڈیا کا کرکٹ میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ پاکستانی ٹیم جیت گئی۔ عاصمہ نے اتنا کہہ دیا کہ پاکستانی ٹیم اچھا کھیل کر جیتی ہے۔ اس بات سے سجاد بھڑک اٹھا۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ سجاد نے بیوی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا۔ وہ تین مہینے کی حاملہ تھی۔ اس کی ابارشن ہو گئی۔ اسے کئی ہفتے اسپتال میں رہنا پڑا۔ انہی دنوں شدید ڈپریشن اور نوکری کی پریشانیوں کی وجہ سے سجاد نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔

’’یہ وہ حالات تھے جن میں اسے میرا کیس ملا۔ میں ایک پاکستانی تھا اور میں نے یہاں بمبئی میں ایک بڑے پروڈیوسر کو جان کے لالے ڈالے تھے۔ سجاد موہل کی ساری خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میری گرفتاری کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ میری گرفتاری سے اسے دہرا فائدہ ہوتا۔ ایک پاکستانی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر اس کی انا کو تسکین ملتی، دوسرے اس کی ڈانواں ڈول نوکری کو سہارا مل جاتا۔ اور عین ممکن

تھا کہ سبکدوشی کے خطرات کے بجائے ترقی کا پروانہ اس کے ہاتھ میں آ جاتا۔ بس یہی حالات تھے جن میں، میں نے سوچا کہ موہل کو اپنی گرفتاری دے کر اس کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا چاہئے۔ سو میں نے یہ کر دیا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہاں تم شارٹ کٹ لگا رہے ہو۔ کوئی اہم واقعہ چھپا رہے ہو۔ سجاد کی بیوی عاصمہ کا اس معاملے میں کیا کردار ہے؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ مجھے عنقریب...... فساد پلس میں تمہیں نوکری دلانا پڑے گی۔ تمہاری ناک بہت لمبی ہوتی جا رہی ہے اور تم اسے ہر معاملے میں گھسیڑ رہے ہو۔ نیوز چینل میں نوکری کے لئے اصل کوالیفکیشن لمبی سے لمبی ناک ہی ہوتی ہے جو ہر جائز و ناجائز معاملے میں گھسیڑی جا سکے۔ اور اگر اسے گھسیڑنے میں تھوڑی بہت چوٹ بھی آ جائے تو اس کی پروا نہ کی جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ بہت جلد نیوز چینل میں نوکریوں کے لئے جو اشتہار دیئے جائیں گے، وہ اس طرح کے ہوں گے۔ نامہ نگار کے لئے ناک کی کم از کم لمبائی چھ انچ درکار ہے۔ رپورٹر کے لئے آٹھ انچ...... سینئر رپورٹر اور اینکر پرسن کے لئے دس انچ تاہم اگر اینکر پرسن کے نتھنے آدھ انچ سے زیادہ کشادہ ہوں اور اس کی آنکھوں میں شکرے کی چمک ہو تو ناک کی لمبائی میں رعایت ہو سکتی ہے وغیرہ وغیرہ......‘‘

’’تم پٹڑی سے اتر رہے ہو۔ میں نے تم سے عاصمہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ اس سارے منظر میں کہاں سے آئی؟‘‘

’’بالکل، یہ صلاحیت بھی اینکر پرسن اور دانشور کے لئے ضروری ہے۔ ٹاک شو کے دوران میں بات کہیں بھی چلی جائے، وہ اسے پھر کان سے پکڑ کر وہیں لے آتے ہیں جہاں سے وہ بھاگی تھی۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ بات کو بھگاتے بھی وہ خود ہی ہیں۔ چلغوزوں کے بڑھتے ہوئے ریٹ کو وہ امریکا کی خارجہ پالیسی تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر اچانک خارجہ پالیسی میں سے چلغوزے اور خستہ مونگ پھلی کی بات نکال لیتے ہیں...... اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوتا ہے کہ چلغوزوں کے مسلسل مہنگا ہونے میں ریوڑیوں کے کردار کا پتا چلا ہے تاہم اس بارے میں بریک کے بعد بتایا جائے گا۔‘‘

’’یعنی تم عاصمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟‘‘ میں نے جھلا کر کہا۔

میری جھلاہٹ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ’’وہ بڑی تناؤ بھری رات تھی تابی۔ مجھے آج تک وہ سب کچھ یاد ہے۔ میں نے تمہیں اپنی کہانی میں بتایا تھا نا، میں سرکس کے مالک جان محمد صاحب سے بہت محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ ان کے بہت سے

احسان ہیں مجھ پر۔ اس رات مجھے پتا چلا کہ بمبئی میں پولیس اہلکار جان محمد صاحب کو ہوٹل سے گرفتار کر کے لے گئے ہیں...... اور سجاد موہل نے تھانے میں ان پر تشدد کیا ہے۔ وہ جان صاحب سے میرا اتا پتا پوچھنا چاہتا تھا۔ جان صاحب کو پہنچنے والی تکلیف اور ان کی بے عزتی نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دیں۔ میں اسی وقت بمبئی واپس آیا۔ میں نے پتا ہے کیا کیا؟''

''کیا کیا؟''

''میں نے سجاد موہل کو سزا دینے کے لئے اس کے بیوی بچوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ سجاد کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ مجھے بمبئی کے پوش ایریا میں سجاد کی کوٹھی کا پتا تھا۔ میں نے وہاں موجود چوکیدار سے اپنا تعارف سجاد کے دوست کے طور پر کرایا اور اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ سجاد گھر میں موجود نہیں تھا۔ گھر میں صرف عاصمہ اور اس کی ساس تھیں۔ عاصمہ کی ساس بیمار تھیں اور دوا کھا کر سوئی پڑی تھیں۔ رو رو کر عاصمہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ بھی چہرے سے بیمار ہی نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے سجاد کا دوست ہی سمجھا اور مجھے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میں کسی بھی طرح سجاد کی جان بچاؤں...... میرے پوچھنے پر اس نے بتایا...... ڈی آئی جی صاحب سجاد سے بہت ناراض ہیں۔ نوبت سجاد کی نوکری ختم ہونے تک پہنچ چکی ہے۔ سجاد کی آخری امید پاکستانی ملزم والا کیس تھا۔ لیکن وہ ملزم بھی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اعلیٰ افسروں نے سجاد کو دو ہفتے کی ڈیڈ لائن دی تھی۔ یہ ڈیڈ لائن پرسوں ختم ہو رہی ہے...... سجاد پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ وہ نوکری ختم ہونے کا صدمہ سہہ نہیں سکے گا، وہ خودکشی کر لے گا...... عاصمہ رو رو کر بے حال ہونے لگی......''

عمران اپنے جسم پر لحاف کو درست کرنے کے لئے چند سیکنڈ کے لئے رکا تو میں نے کہا۔ ''شاید تم یہ کہنے جا رہے ہو کہ تم نے عاصمہ کے کہنے پر اپنی گرفتاری دے دی اور یوں اس کا سہاگ اجڑنے سے بچا لیا۔ یہ تو ڈرامائی سی کہانی لگتی ہے۔''

''ہاں، یہ ڈرامائی کہانی ہے...... ایک خوش شکل عورت کے کہنے پر ایک مفرور کا خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا...... لیکن جب تم اصل بات جانو گے تو تمہیں مزید حیرانی ہو گی۔ پتا نہیں کہ تم اس پر یقین کرو گے بھی یا نہیں۔''

''تم سچ بتاؤ گے تو میرے دل کو خود بخود یقین آنے لگے گا۔'' میں نے کہا۔

عمران نے گہری سانس لے کر اپنی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو انگلی سے چھوا اور

بولا۔ ''عاصمہ جس طرح بلک بلک کر میرے سامنے روئی، میرا دل پسیج گیا۔ تم جانتے ہی ہو، میں نے ہمیشہ برائی کا مقابلہ اچھائی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ نفرت کا مقابلہ محبت سے، غصے کا تحمل سے، عداوت کا دوستی سے۔ میں نے اس رات اشک بار عاصمہ کے سامنے بیٹھے بیٹھے سوچ لیا کہ میں سجاد کی اس نفرت کا جواب ایک انوکھے طریقے سے دوں گا جو وہ پاکستانیوں کے خلاف رکھتا ہے۔ میں اس کی عداوت اور کم ظرفی پر ایثار اور ظرف کا وار کروں گا۔ مجھے اپنی قوتِ بازو اور اندر کی سچائی پر بھروسا تھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ سجاد موہل کو گرفتاری دے کر بھی میں انڈین پولیس کی گرفت سے بچ نکلوں گا۔ میں نے روتی بلکتی عاصمہ کو یقین دلایا کہ پروڈیوسر منوج کمار کی ٹانگوں میں گولیاں مارنے والا پاکستانی ملزم ضرور گرفتار ہو گا اور سجاد ہی اسے گرفتار کرے گا۔ اب میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں جسے سننے کے بعد تم اس کہانی کو مزید ڈرامائی قرار دے دو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سچائی پر بھی تھوڑا بہت شک کرنے لگو۔''

''میں نے کہا ہے نا عمران کہ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میرے دل کو یقین آنا ہی آنا ہے۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''فلموں، ڈراموں میں لوگوں کی شکلیں ہو بہو ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور یہ ایک افسانوی بات ہوتی ہے۔ لیکن عام زندگی میں اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ عاصمہ کی صورت شبانہ سے ملتی ہے مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے قد کاٹھ اور چہرے مہرے میں کچھ جھلکیاں ایسی ہیں جو مجھے شبانہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اس کی ناک، اس کے ہونٹ، خاص طور سے اس کے بولنے کا انداز۔ اس کے اندر کی یہی جھلکیاں تھیں جنہوں نے اس رات میرے ارادے کو مزید طاقت دی...... اور میں جو ایک خطرناک پلاننگ کے ساتھ سجاد موہل کے گھر میں گھسا تھا، ایک بالکل دوسرے رخ پر چل پڑا...... میں نے انوکھا کام کیا اور ایسے انوکھے کام تمہارا یہ یار ہی کر سکتا ہے۔ اس رات میں نے انسپکٹر سجاد موہل کو گرفتاری دے دی...... وہاں، ان دنوں وہ انسپکٹر ہی تھا۔ ڈی ایس پی تو اسے میری گرفتاری نے بنایا۔''

''لیکن پھر تم بھاگ گئے؟''

''تمہارا یہ یار بھاگنے میں بھی ماہر ہے۔ اگر میں سرکس کو جوائن نہ کرتا تو ضرور سیاست میں آ جاتا۔''

''میں سجاد موہل کی حراست سے بھاگنے کی بات کر رہا ہوں۔''

''سجاد موہل کی حراست سے نہیں بھاگا تھا یار۔ اس کی حراست سے بھاگتا تو پھر وہ ڈی

ایس پی کیسے بنتا اور آتما ہتھیا کا ارادہ کیسے بدلتا؟ وہ موہل بھی ایک عجیب کیس ہے یار۔ اصل میں یہ کھلاڑی تھا اور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے پولیس میں بھی آ گیا۔ لیکن اس میں اصلی پولیس والوں جیسا دم خم نہیں تھا اور نہ ہی شروع میں اس کا مزاج پولیس والوں جیسا تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی کامیابی ملی اور نہ یہ خود کو محکمے میں اچھی طرح ایڈجسٹ کر سکا۔ بعد میں جب اس کا بھائی انور موہل پاکستان میں مارا گیا تو یہ بالکل ہی مایوس ہو گیا بلکہ دیوداس بن بیٹھا۔ یہ روزانہ تین بوتل شراب پی جاتا تھا اور یہ مقدار بڑھ رہی تھی۔ ایک دفعہ خودکشی کی کوشش کر چکا تھا اور دوسری دفعہ کرنے والا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں میں نے اسے اپنی گرفتاری کا سہارا دیا اور اس کے کیریئر کے ساتھ ساتھ شاید اس کی زندگی بھی بچائی۔''

''لیکن پھر اپنی زندگی کیسے بچائی تم نے؟''

''میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ مجھے عدالت میں پیشی کے بعد واپس جیل لایا جا رہا تھا۔ ایک موٹے تازے ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ تین اور اہلکار بھی پولیس کی گاڑی میں ہمارے ساتھ تھے۔ شام کے وقت بمبئی کی سڑکوں پر رش بہت ہوتا ہے۔ ہماری گاڑی ایک پل پر رکی ہوئی تھی۔ نیچے سے نہر کا پانی رواں دواں تھا۔ میں نے اچانک موٹو کانسٹیبل کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا اور کوئی چالیس فٹ نیچے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ پولیس والے اپنی رائفلیں کندھوں سے بھی نہیں اتار سکے۔ پانی تیز تھا۔ موٹا کانسٹیبل غوطے کھانے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے تیرنا آتا ہو لیکن وہ اتنا بدحواس تھا کہ ٹھیک سے تیر بھی نہیں سکا۔ پانی بھی بہت ٹھنڈا تھا۔ اوپر سے پولیس والے گولی بھی نہیں چلا سکتے تھے۔ ان کی فائرنگ سے ان کا اپنا ساتھی ہی سورگ باشی ہو سکتا تھا۔ جتنی دیر میں وہ پل سے اتر کر نہر کے کنارے پہنچتے، ہم سوڈیڑھ سو میٹر آگے جا چکے تھے۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے بے ہوش موٹے کو کھینچ کر پانی سے نکالا۔ کندھے پر لادا اور درختوں میں گھس گیا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک امپالا کار کھڑی تھی۔ اس میں ایک لڑکا لڑکی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کے کپڑوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور نو بیاہتا ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ کانسٹیبل صاحب پانی میں ڈوب کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔ نوجوان جوڑے کے لئے شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ڈھائی تین من کا کانسٹیبل پانی میں لت پت میرے کندھے پر بے سدھ پڑا تھا۔ نوجوان خدمت خلق کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ میں کانسٹیبل سمیت پچھلی نشست پر آ گیا۔ گاڑی فوراً روانہ ہو گئی۔ اسی دوران میں مجھے پھل کاٹنے والی ایک چھری نظر آ گئی جو پھلوں والے لفافے کے اندر ہی

رکھی تھی۔ میں نے چھری نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دی اور شوہر صاحب سے کہا کہ اگر وہ اپنے ہنی مون کو آج کی شام یہیں پر ختم کرنا نہیں چاہتا تو سیدھا چلتا رہے۔ صراطِ مستقیم۔''

اب یہ ساری رُوداد میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ میرا یار واقعی انوکھا شخص تھا۔ بظاہر چلبلا، کھلنڈرا لیکن اندر سے بہت حساس اور سنجیدہ بھی۔ ایک انجان عورت کے آنسو سیدھے اس کے دل پر گرے تھے اور اس نے عورت کے جنونی شوہر کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی جو ویسے بھی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اگر کوئی مناسب موقع ہوتا اور میرے اندر حوصلہ بھی ہوتا تو میں جوتا اتار لیتا اور تمہارا سر پلپلا کر دیتا۔ بندہ پوچھے کہ اگر تم نے ایک بار اتنی بڑی نیکی کما ہی لی تھی تو دوسری بار اوکھلی میں سر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب خود پھنسے ہو اور مجھے بھی پھنسایا ہے۔''

''یار! تمہیں بتایا ہے نا کہ عاصمہ میں شبانہ کی تھوڑی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ بس یہ جھلک ہی لے کر بیٹھ گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا یہ جنم اور اس سے اگلے سات آٹھ جنم بھی اس پر قربان کر دوں۔ اور کیا پتا کہ اسی جنم میں ہی کوئی کام بن جائے۔ میری یہ ڈبل قربانی کوئی رنگ لے آئے۔'' وہ پھر مذاق کے موڈ میں تھا۔

میں نے کہا۔ ''عمران! سچ کہتا ہوں۔ میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ اب کیا ضرورت تھی اتنے بڑے پنگے کی۔ اب تو یہ بندہ خیر سے ڈی ایس پی بن چکا ہے اور اس کا خودکشی وغیرہ کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر تم کیوں اس کے ہتھے چڑھے ہو؟''

''یار! میں نے بتایا تو ہے تمہیں۔ یہ بڑا خطرناک بندہ ہے۔ جب اس پر غصے کا حملہ ہوتا ہے تو بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا ہے...... ایک دم حیوان بن جاتا ہے......''

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا عمران...... اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تم نے ایک بار پھر اس بندے کو فی سبیل اللہ گرفتاری دی ہے۔ اب شاید تم اسے ایس پی بنوانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں نفسیاتی ماہر کو دکھائے جانے کی ضرورت ہے۔''

''نفسیاتی مریض کو نفسیاتی مریض بڑی جلدی پہچان لیتا ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

''لعنت ہے تم پر۔'' میں نے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ مجھے واقعی اس پر تاؤ آ رہا تھا۔

کچھ دیر ایسے ہی گزری پھر میرے کان میں کھجلی ہوئی۔ وہ میرے کان کو کسی تنکے سے چھیڑ رہا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہو؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

اس نے گہری سانس لے کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''یار! سچی بات بتاؤں گا تو تم اور ناراض ہو جاؤ گے۔ دیکھو، بات یہ ہے کہ میرے دل میں ان دونوں میاں بیوی کے لئے ہمدردی موجود ہے۔ خاص طور سے اس کی بیوی کے لئے۔ میں نے اس کی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے لئے اور اس کے شوہر کے لئے جو کچھ بھی ہو سکا، کروں گا اور میں نے کر کے دکھایا۔ یہ حقیقت ہے کہ میری گرفتاری ہی تھی جس کی وجہ سے سجاد موہل کی زندگی کی ڈوبتی کشتی کو سہارا ملا...... اب میری گرفتاری اس کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ اسی کیس کی وجہ سے اپنے محکمے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ وہ کیس اس کی ساکھ ہے۔ یہ ساکھ بنانے میں، میں نے موہل کی بہت مدد کی ہے۔ اب اسے اپنے ہاتھوں سے برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ خبطی بندہ پھر اسی جگہ پر آ جائے گا جہاں دو سال پہلے تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا بھرم قائم رہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ ہمارے Clash میں اسے کوئی نقصان پہنچ جائے گا۔ باقی اپنی اور میری رہائی کی فکر نہ کرو۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''کس طرح بائیں ہاتھ کا کھیل ہے؟''

''یار! تم نے امیتابھ بچن کا وہ مشہور ڈائیلاگ نہیں سنا ہے جس میں وہ کہتا ہے...... جیلر! تم اپنی جیل کی سلاخیں جتنی بھی مضبوط کر لو اور دیواریں جتنی بھی اونچی لے جاؤ، جب میں نے یہاں سے نکلنا ہو گا تو نکل جاؤں گا۔''

''کوئی گیدڑ سنگی ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں، فی الحال تو صرف گیدڑ ہے اور وہ پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل میرا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں نے اسٹیل کا ایک جگ اسے مارنے کے لئے اٹھایا۔ اس نے فوراً بوسیدہ تکیے کو ڈھال بنا لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم میں باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو جاتی اور ہماری چوٹیں پھر تازہ ہو جاتیں، کوٹھی کے پورچ میں دو گاڑیاں تیزی سے داخل ہوئیں اور تیزی سے رک گئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی تو وہی تھی جس میں سجاد موہل ہمیں ہوٹل سے پکڑ کر یہاں لایا تھا۔ دوسری گاڑی ایک پجیرو جیپ تھی۔ اس میں سے تین چار ہٹے کٹے افراد باہر نکلے...... اور ہمارے کمرے کی طرف بڑھے۔ موہل اور اس کے دو اہلکار بھی ساتھ تھے۔ موہل کے اشارے پر

حوالدار فیاض نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ تمتماتے چہروں والے یہ سارے افراد ہمیں یوں دیکھنے لگے جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں۔ پھر شرابی آنکھوں والا ایک سانولا شخص بولا۔ ''تو تم ہو عمران دانش...... تمہاری غائبانہ شہرت تو ہمارے محکمے میں خوب ہے۔ تم نے مشہور پروڈیوسر منوج صاحب کی ہتھیا کی اور پھر فلمی انداز میں چالیس فٹ اونچے پل سے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی تم یہاں بمبئی پولیس کو تگنی کا ناچ نچاتے رہے۔ تمہاری اور موہل صاحب کی کہانی میں تھوڑا سا مرچ مسالا اور شامل کر لیا جائے تو فلم بن سکتی ہے۔''

باقی افراد نے بھی حسبِ توفیق ہم پر ریمارکس پاس کئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں چاروں افراد موہل کے قریبی دوستوں میں شامل ہیں اور موہل انہیں اپنی یہ حیران کن اچیومنٹ دکھانے کے لئے یہاں لایا ہے۔ یہ تینوں چاروں افراد نشے میں تھے اور سگریٹ بھی پھونک رہے تھے۔ وہ ہمیں گرل دار کھڑکی میں سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں بند جانوروں کو دیکھا جاتا ہے۔

ایک گھنی مونچھوں والے شخص نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''انور موہل ہمارے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ وہ روٹی روزی کے لئے پاکستان گیا تھا۔ تم لوگوں نے اسے بدیش میں تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ بتاؤ کیسے مارا تھا تم نے اسے...... کیسے مارا تھا؟''

عمران نے کہا۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں اس بندے کو جانتا نہیں، میں نے کبھی زندگی میں اسے دیکھا تک نہیں۔ اس کے قتل سے میرا کیا تعلق ہے؟''

''تمہارا تعلق ہے...... ہے تمہارا تعلق۔'' سجاد موہل شرابی لہجے میں گرجا۔ ''تم پاکستانی ہو۔ اور جن کتوں نے اسے مارا وہ بھی پاکستانی تھے۔ اب بتاؤ کیا سلوک کیا جائے تمہارے ساتھ؟''

گھنی مونچھوں والے نے کہا۔ ''سجاد بھائی! پچھلی دفعہ تمہارا مغز پھر گیا تھا جو تم نے اس کی گرفتاری ڈالی اور اسے کورٹ میں پیش کیا۔ اس دفعہ ایسا نہیں کرنا۔ کمینے کو مار کر یہیں اس کمرے کے فرش میں گاڑنا ہے۔''

''لیکن گاڑنے سے پہلے اس کی پوری پوری مہمان نوازی بھی کرنی ہے۔'' ایک دوسرا شخص بولا۔ ''جب مر جائے گا تو اس کی جان چھٹ جائے گی مگر مرنے سے پہلے اسے جو حلوہ پوڑی ہم کھلائیں گے، اس کی یاد مرنے کے بعد بھی اس کے من میں تازہ رہے گی۔ جگدیش بھائی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ یہاں سے نکل کر کورٹ کچہری کے چکر میں پڑے گا تو پھر بچ

کرنکل جائے گا۔"

عمران نے کہا۔"میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ انور موہل کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

جگدیش بولا۔"انور موہل نہ سہی، منوج کمار سہی۔ منوج جی کو تو تم نے ہی مارا ہے؟"

"منوج نے ایک نابالغ لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ وہ برے سے برے سلوک کا حق دار تھا لیکن میں نے پھر بھی اسے مارا نہیں، صرف زخمی کیا اسے۔"

"لیکن وہ تمہارے دیئے ہوئے زخموں کی وجہ سے ہی مرا۔ یہ ہتھیا ہی کی شکل ہے۔" سجاد نے دانت پیس کر کہا۔

"چھوڑو یاران باتوں کو۔" موٹی توند والے ایک شخص نے کہا۔"یہ بازی گر ہے، سرکس میں تماشے دکھاتا ہے۔ آج ہمیں بھی اس کا کوئی تماشا دیکھنے دو۔"

اسی دوران میں حوالدار فیاض اور اس کے ساتھی کانسٹیبل نے چار پانچ کرسیاں لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی تھیں۔ سجاد موہل اور اس کے مہمان ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز واقعی تماشا دیکھنے والا ہی تھا۔ لیکن جب کھڑکی کے لکڑی کے پٹ باہر سے بند کر دیئے گئے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب یہ لوگ کوئی بھی تماشا کیسے کر سکیں گے۔

اچانک ایک انجن چلنے کی آواز آئی۔ غالباً یہ کوئی ڈیزل انجن تھا۔ ایسے انجن ٹیوب ویل وغیرہ چلانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یکا یک ہمارے بند کمرے میں گاڑھا دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ دھواں چھت کے کسی سوراخ سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ہمارا دم گھٹنا شروع ہو گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ملیریا وغیرہ سے بچانا چاہتے ہیں۔ کمرے میں دھونی دے رہے ہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھونی ہمارے لئے عذاب بن گئی۔ ہم منہ پر کپڑے رکھے کھانستے جا رہے تھے۔ پھر دم ٹوٹنے لگا۔"دروازہ کھولو۔" میں چلایا اور زوردار لات آہنی دروازے پر رسید کی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

سنا تھا کہ آگ میں جل کر مرنے والے بہت تکلیف سے مرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔ غالباً آگ کی جلن کے ساتھ ساتھ اس دھوئیں کی بے پناہ اذیت بھی مرنے والے کے حصے میں آتی ہے جو پھیپھڑوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ میں نے

بہت دیر تک سانس روکنے کی کوشش کی۔ آخر بے بس ہو گیا...... ڈیزل کا گاڑھا زہریلا دھواں سینے میں گھسا اور لگا کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ میں تکلیف کے سبب تڑپنے لگا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے کھڑکی کی گرل پر ٹانگیں رسید کیں۔ مگر یہ کوشش "سعی لاحاصل" کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے عمران کو دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب ہے۔ کھانستے کھانستے مجھے زور کی ابکائی آئی، مجھے لگا میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ اچانک ایک کونے میں لگا ہوا بڑے سائز کا ایگزاسٹ فین تیزی سے گھومنے لگا۔ اس فین نے چند سیکنڈ میں دھوئیں کو کھینچ کر باہر پھینک دیا۔

میں کھانستے کھانستے فرش پر گر گیا تھا۔ تکلیف اور اذیت برداشت کرنے کی ساری مشق آج دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ عمران کی حالت مجھ سے کافی بہتر رہی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی سانس غیر معمولی وقت تک روکے رکھی تھی۔ بہرطور اس کا رنگ بھی بالکل زرد ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے گئے۔ سجاد موہل اور اس کے ساتھی بڑے تمسخر سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جگدیش نامی شخص نے وہسکی کا طویل گھونٹ لے کر الٹے ہاتھ سے اپنے سیاہی مائل ہونٹ پونچھے اور بولا۔"جی جناب! کیسا لگا فلم کا یہ ٹریلر؟"

"اچھا تھا۔" عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔

"فلم اور بھی اچھی لگے گی۔ بڑی مزاحیہ فلم ہے۔ ہنس ہنس کر برا حال ہو جائے گا تمہارا۔ پھیپھڑے، دل، جگر سب کچھ منہ کے رستے باہر آ جائے گا۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟" عمران نے میری بری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

سجاد موہل بولا۔"سب کچھ ایک ہی سانس میں بک دو، فٹافٹ...... کس چکر میں یہاں آئے ہو۔ تمہارے کتنے ساتھی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ کیا کر چکے ہو اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں سچ کہتا ہوں۔ میرے پاس تمہیں بتانے کو کچھ نہیں ہے۔ اور اگر میں کچھ بتاؤں گا تو وہ صرف وقت ٹالنے کے لئے اور تمہارے اس ڈیزل انجن سے بچنے کے لئے بتاؤں گا۔ ہاں، اگر تم مجھے منوج کو زخمی کرنے کی سزا دینا چاہتے ہو تو یہ اور بات ہے۔ مگر اس بارے میں بھی یہ ضرور کہوں گا کہ جرم کے مقابلے میں سزا بہت بڑی ہے۔"

سجاد گرجا۔"بکومت۔ کوئی سزا بڑی نہیں ہے تم لوگوں کے لئے۔ تم نے اپنے ملک میں میرے نہتے بھائی کو مارا ہے۔ اس کو چھلنی کیا ہے۔ میں بھی چھلنی کروں گا۔ مجھے جہاں کوئی سرحد پار کا بندہ نظر آئے گا، اسے جیون اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا...... یوں کر کے۔"

اس نے شراب کی خالی بوتل کو انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے الٹا پکڑ کر ہوا میں جھلایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ کھڑکی کے پٹ پھر سے بند کر دے۔ اس نے پٹ بند کر دیئے۔ ڈیزل انجن کی منحوس آواز پھر سے بلند ہونے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ''ٹھہرو، میں بتاتا ہوں تمہیں۔ کھڑکی کھولو۔''

کھڑکی پھر کھل گئی۔ انجن کی آواز بھی تھم گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اب ان لوگوں سے کچھ وقت لینا چاہتا ہے اور اس دوران میں ہی وہ کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ کیا کرے گا؟ اس بارے میں وثوق سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہر حال، مجھے اس پر اعتماد تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر کر ہی گزرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ عمران اور سجاد موہل میں بات چیت شروع ہوتی اور عمران اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنے ڈھب پر لاتا، ایک اور واقعہ رُونما ہو گیا۔ ایک دراز قد شخص تیزی سے ہماری طرف آیا۔ یہ درصل جگدیش کا ڈرائیور تھا جو پجیرو گاڑی کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ جگدیش کے لئے کسی کی کال تھی۔

جگدیش موبائل لے کر کال سننے میں مصروف ہو گیا۔ جبکہ لمبے قد والا ڈرائیور بڑے غور سے عمران کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جگدیش نے فون بند کیا تو ڈرائیور نے ادب سے جھک کر کہا۔ ''مالک...... یہ اندر نیلی قمیص والا کون ہے؟''

''یہ بہت بڑے ہیرو نے جنم لیا ہے ہمارے پڑوسی ملک میں۔'' سجاد زہر خند انداز میں بولا۔ ''چالیس فٹ اونچے پل سے تین من کے بندے کے ساتھ پانی میں چھلانگ لگاتا ہے اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے فلمی ہیرو سنی دیول اور سنجے وغیرہ تو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ تُو نے کوئی آٹوگراف وغیرہ لینا ہے تو لے لے اس سے۔ پھر یہ لوگ بہت مصروف ہو جائیں گے۔ جناب نے بہت ٹھکائی کروانی ہے ہم سے۔''

ڈرائیور سمجھ گیا کہ یہ بات مذاق میں کی جا رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے عمران کو دیکھا پھر جگدیش کمار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مالک! اس بندے کی تو فوٹو چھپی ہے اخبار میں۔ کافی بڑی فوٹو تھی۔ شاید کل کے اخبار میں تھی۔ میں دیکھتا ہوں اخبار گاڑی میں پڑا ہوگا۔''

''جگدیش بولا۔ ''کسی اور کی ہوگی...... یہ تو ایک دم پردہ نشین قسم کے بندے ہیں۔''

''نہیں مالک...... میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔'' ڈرائیور نے کہا اور تیزی سے واپس گاڑی کی طرف گیا۔

چند سیکنڈ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں انگلش کا اخبار تھا۔ وہ ورق گردانی کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ ''یہ دیکھیں مالک۔'' اس نے کہا اور اخبار کا ایک صفحہ جگدیش کمار کے سامنے پھیلا دیا۔

سجاد موہل سمیت سب نے سر جوڑ لئے۔ پھر ان کے تاثرات بدلے بدلے نظر آئے۔ انہوں نے اخبار کی تصویر کا موازنہ بار بار عمران سے کیا۔ آخر سجاد موہل معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں بھئی، یہ تو سچ مچ اسی خبیث کی تصویر ہے۔'' تب اس نے اخبار ہماری طرف کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ''کیوں بے! یہ تُو ہی ہے نا؟''

دھوئیں کی وجہ سے عمران کی آنکھیں ابھی تک اشک بار تھیں۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے دھیان سے تصویر دیکھی۔ میں نے بھی غور کیا۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ نفیس کوٹ اور ٹائی میں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تلاش گمشدہ کا اشتہار تین کالمی تھا اور بیرونی صفحے پر تھا۔ انگریزی کے اس اشتہار کا متن کچھ اس طرح تھا۔

''اسٹار سرکس کمپنی کے اسٹاف ممبر اور معروف فن کار مسٹر عمران دانش پچھلے قریباً ڈیڑھ برس سے لاپتا ہیں۔ ان کے قریبی ذرائع کے مطابق وہ اپنے کسی ذاتی کام سے پاکستان سے بھارت آنے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے تھے۔ سفری دستاویزات سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ پچھلے سال جون میں واہگہ اٹاری کے راستے بھارت میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی گمشدگی ان کے قریبی عزیزوں کے لئے سخت تشویش کا باعث ہے۔ کوئی ان کے بارے میں جانتا ہو تو اطلاع دے۔ وہ خود پڑھیں تو فوری طور پر رابطہ کریں۔''

''یہ کیا چکر ہے بھائی؟'' سجاد موہل اور جگدیش وغیرہ نے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔

''فون لگا کر دیکھو۔'' موٹی توند والے سیٹھ نما شخص بنسی لال نے کہا۔

سجاد موہل نے جگدیش سے موبائل فون لیا۔ پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی پاکٹ سے ایک دوسری سم نکال کر موبائل سیٹ میں لگائی اور اخباری اشتہار سے نمبر پڑھ کر ملانے لگا۔

اس کی پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی۔ رابطہ ہو گیا۔ دوستوں کو گفتگو سے آگاہ کرنے کے لئے سجاد نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ''ہیلو...... کون؟'' دوسری طرف سے بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

سجاد بولا۔ ''اخبار میں آپ کا دیا ہوا ''ایڈ'' دیکھا ہے، پاکستانی فن کار عمران دانش کے بارے میں......''

"جی جی...... فرمائیں۔"

سجاد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "ہمارے پاس آپ کے لئے ایک اہم جانکاری ہے۔"

"جی...... جی...... بتائیں...... اور آپ بول کون رہے ہیں؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

"بالکل نہیں۔ اگر آپ اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔"

"اگر ہم آپ کو اس بندے کے بارے میں کوئی تصدیق شدہ جانکاری دیتے ہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟"

"اس کے لئے نہایت معقول انعامی رقم ہے۔ اشتہار میں اس کا ذکر مناسب نہیں تھا۔"

"کیا رقم ہے؟"

دوسری طرف سے چند لمحے خاموشی رہی جیسے بولنے والا سوچ رہا ہو کہ کہیں یہ کوئی فیک کال تو نہیں اور وہ اپنا وقت تو برباد نہیں کر رہا۔

موہل نے اپنا سوال دہرایا۔ "آپ چپ کیوں ہو گئے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اگر آپ کی جانکاری واقعی مصدقہ اور کارآمد ہے تو پھر انعامی رقم آپ کی توقع سے زیادہ ہو گی۔"

موہل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں۔

"آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"یہیں الٰہ آباد سے۔ ہم تھوڑی دیر بعد آپ سے پھر رابطہ کرتے ہیں۔"

"کتنی دیر تک؟"

"قریباً ایک گھنٹے بعد۔" موہل نے کہا۔

اس نے فون بند کر دیا۔ ان سب کے چہروں پر سنسنی کے آثار تھے۔

"یہ کوئی لمبا چکر ہے بھیا۔" بنسی لال نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سجاد موہل نے اپنی عقابی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "ہاں بھئی بازی گر! یہ تیرے کون سے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں یہاں؟ کسی سے کوئی لمبی چوڑی ٹھگ بازی تو نہیں کی ہوئی تو نے؟"

بنسی لال بولا۔ "یا ہو سکتا ہے کہ کسی کی لڑکی شڑکی بھگائی ہو۔ اس کی گندی آنکھ میں سؤر کا بال تو صاف نظر آتا ہے۔"

عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔ "آپ کو کوئی صدمہ پہنچ چکا ہے شاید اس سلسلے میں۔"

اس کی چوٹ پر بنسی لال تلملا گیا۔ "اوئے...... اوئے سؤر کے تخم۔" وہ پھنکارا۔ اس نے اپنے سفید کرتے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے عمران پر گولی چلا دے گا۔

سجاد نے اس کا پستول والا ہاتھ تھاما۔ "اوئے کیا کرتا ہے بنسی! اگر اس کتے کو مارنا ہی ہے تو اتنی آسانی سے نہیں ماریں گے۔ اس کو ڈیزل کے دھوئیں والی مزاحیہ فلم دکھائیں گے اور ہنس ہنس کر اس کی ساری اندر کی چیزیں منہ کے رستے باہر نکل آئیں گی۔ چل آ میرے ساتھ۔ ابھی ذرا اشتہار کا پوسٹ مارٹم تو کر لیں۔"

سجاد اٹھ کھڑا ہوا۔ جگدیش، بنسی اور ان کا تیسرا ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بنسی لال جاتے جاتے بھی خونی نظروں سے عمران کو گھور رہا تھا۔ عمران نے سرگوشی کی۔ "لگتا ہے اس کی بیٹی واقعی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"یہ گئے کہاں ہیں یار؟"

"ظاہر ہے کہ مشورہ کرنے ہی گئے ہیں۔"

دھوئیں کی آفت ابھی تک ذہن پر سوار تھی۔ سینہ جیسے اندر سے زخمی ہو گیا تھا۔ ایک انسان نے دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کر لئے ہیں۔ کہیں زدوکوب کرنا، کہیں درد کے انجکشن اور کہیں یہ گاڑھا دھواں۔ اس دھوئیں سے دھیان ہٹانے کے لئے میں نے عمران سے کہا۔ "یہ کیا چکر چل گیا ہے؟ تصویر تو سو فیصد تمہاری ہی ہے...... باقی تفصیل بھی درست ہے۔"

"اس کو کہتے ہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑے بلکہ دوبار پڑے۔ ابھی راجواڑے کے طلسم سے نکل کر گھر بھی نہیں پہنچے کہ یہ سجاد والا سیاپا سامنے آ گیا اور اب یہ اشتہار والا ٹینٹا کھڑا ہو گیا ہے۔"

"کہیں اس کا تعلق راجواڑے والے واقعات سے تو نہیں...... میرا مطلب ہے جارج اور سر جن اسٹیل وغیرہ کی موت؟ یہ اشتہار انگریزی کے اخبار میں چھپا ہے۔ اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہو سکتی ہے۔"

"نہیں تابی! میں نہیں سمجھتا کہ اس کا تعلق راجواڑے والی مار دھاڑ سے ہو گا۔ مجھے اس میں کسی اور معاملے کی بو آ رہی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے باس...... سرکس کے مالک جان محمد صاحب تمہاری تلاش میں سرگرداں ہوں؟"

''وہ ایسے اشتہاری انداز میں اتنی بھاری رقمیں خرچ کر کے مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اشتہار ایک اخبار میں نہیں، کئی اخباروں میں آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں بھی دیا گیا ہو۔اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ یہ اشتہار پہلی بار ہی آیا ہو۔ہوسکتا ہے کہ یہ گاہے بگاہے چند ہفتوں یا مہینوں سے دیا جا رہا ہو۔''

''کہیں ہماری بے خبری میں ہمارا کوئی سودا وغیرہ ہی نہ ہو جائے۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''ہاں، اگر سودا کرنے والی کوئی ارب پتی بیوہ یا راجکماری وغیرہ ہو تو ''بکنے'' میں کوئی ایسا حرج بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس راجکماری کی کوئی بہت خوبصورت کزن بھی ہو۔اس کا ٹانکا تم سے جڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں، باقی زندگی عیش آرام سے گزار سکتے ہیں۔ایسی عورتیں اپنے پیارے رکھیلوں کو بڑے مزے کرواتی ہیں۔ میں پہلے بھی ایک ایسے خوب صورت تجربے سے گزر چکا ہوں۔''

میں نے کہا۔''پھر تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس خوب صورت تجربے کے شوہر یا ابا وغیرہ نے تمہاری ایسی تیسی کرنے یا پھر جنس تبدیل کروانے کے لئے یہ اشتہار چھپوایا ہو۔''

''کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔''

وہ بظاہر میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا مگر اس کی خوب صورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مسلسل سوچ بھی رہا ہے۔ یہ معاملہ اس کے لئے بھی انوکھا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد سجاد موہل دوبارہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ صرف اس کے مسلح ماتحت ہی تھے۔ موہل کے چہرے پر دبا دبا جوش صاف دکھائی دیتا تھا۔ موہل کی ہدایت پر ہمارے ٹارچ سیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ کم از کم تین رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہم کسی طرح کی مہم جوئی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں ایک برآمدے سے گزار کر نہایت آرام دہ کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک شاندار ڈبل بیڈ، فریج اور الیکٹرک ہیٹر وغیرہ کی سہولت یہاں موجود تھی۔ ڈیکوریشن پیس کے طور پر شیشے کی ایک برہنہ مورتی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں اس کمرے میں داخل کر کے دوبارہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ عاصمہ کا دیا ہوا موبائل عمران کی جیب میں تھا۔ ہم نے شکر کیا کہ دوبارہ ہماری تلاشی نہیں ہوئی تھی۔

عمران نے بہت پوچھا کہ یہ لطف و کرم اور عنایت کس سلسلے میں ہے لیکن موہل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس معنی خیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔

ہمارے اگلے چوبیس گھنٹے بڑی اچھی طرح گزرے۔ نہ صرف ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کیا گیا بلکہ نئے کپڑے بھی دیئے گئے۔ شیو اور غسل کے سارے لوازمات پہلے ہی کمرے کے واش روم میں موجود تھے۔

عمران بولا۔''ہوسکتا ہے یہ واقعی کسی راجکماری کا چکر ہو یار۔ مجھے بڑے عرصے سے شوق ہے کسی راجکماری کے ہاتھوں اغوا ہونے کا اور اپنی تمام مردانہ دلکشیوں کے ساتھ اس کی ''خدمت'' کرنے کا۔''

''میں پھر وہی بات کہوں گا۔ اگر کوئی ''راجکمار'' ہوا اور اس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ چکانا ہوا تو پھر؟ میں تو یونہی مفت میں مارا جاؤں گا۔''

''تم مرنے کے پیسے لے لینا یار مگر اس طرح کی مایوس کن باتیں نہ کرو۔ اور کیا پتا تمہاری یہ ساری بدگمانیاں دور ہو جائیں اور ہم واقعی کسی اچھے مقصد کے لئے اشتہاری قرار پائے ہوں۔''

''تمہارے کرتوت تو کبھی ایسے نہیں رہے۔ تم نے خود بتایا ہے، سرکس میں آنے کے بعد تم ہر طرح کے لوگوں سے ہر طرح کے پنگے لیتے رہے ہو۔ کیا پتا، کوئی ایسا ہی پنگا پھر سے زندہ ہو گیا ہو۔''

''میڈم صفورا ایسے حالات میں بڑے صائب مشورے دیتی ہے لیکن افسوس وہ بھی نہیں ہے۔ کاش، ہم اس کو بھی اپنے ساتھ ہی یہاں لا سکتے۔''

''تو اب پھنسوا دو اسے۔ اس بندے کا پتا بتا دو جس کے ذریعے کپتان اجے نے ہوٹل میں ہمارے کمرے بک کروائے تھے۔ یہ تمہارا یار ڈی ایس پی چنگیز خاں نہ صرف میڈم بلکہ اسد اور نوری، صفیہ وغیرہ کو بھی یہاں لے آئے گا۔ پھر سارے مل کر روئیں گے۔''

''بس ہر بات کو رونے کی طرف لے جانا۔'' عمران نے برا سا منہ بنایا۔

اسی دوران میں عمران کی جیب میں پڑے موبائل سیٹ نے وائبریٹ کیا۔ عمران نے احتیاط سے موبائل نکالنے کے بعد میسج چیک کیا۔ یہ ڈی ایس پی کی جواں سال بیوی عاصمہ کی طرف سے ہی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔''بھائی جان! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو باہر والے کمرے سے نکال کر انیکسی میں لے آئے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا ہے۔ سجاد اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے کہ انہوں نے آپ کو دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن مجھے سب پتا ہے۔ اگر آپ خود نہ چاہتے تو وہ آپ کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ آپ اپنے وعدے کا پاس کر رہے ہیں، اس کے لئے آپ نے خود کو ایک بڑی مصیبت میں ڈال

لیا ہے۔ کاش، یہ وعدہ ہمارے درمیان نہ آیا ہوتا۔ اور اگر آیا تھا تو پھر یہ صورتِ حال ہی نہ بنتی جواب بنی ہے۔ آپ کا اور سجاد کا آمنا سامنا ہی نہ ہوتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ اللہ کرے میں ہی مر جاؤں اور آپ پر سے یہ بلا ٹل جائے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بتائیں میں کس طرح آپ کی مدد کروں؟''

عمران نے جواب میں لکھا۔ ''گھبراؤ مت۔ تمہاری مدد کے بغیر ہی مدد پہنچ رہی ہے اور اس کا ایک ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ ہم اس ٹارچر سیل سے اس آرام دہ مہمان خانے میں آ گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آگے اور ترقی کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے ایس ایم ایس کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ وعدے وغیرہ کا کیا معاملہ ہے؟ یہ کیسا وعدہ تھا جس کی وجہ سے تم نے اس مگرمچھ کے جبڑوں میں اپنا سر دیا ہے؟''

''عشق پر کسی کا زور نہیں غالب...... تمہیں بتایا تو ہے اسے دیکھ کر میرے دل کو کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو میں اب تک سہرا باندھ چکا ہوتا۔ اب بھی میں نے اسے آفر دے رکھی ہے کہ اگر وہ اپنے کھڑوس شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو سیکنڈ آپشن کے طور پر میں حاضر ہوں۔''

''میں جانتا ہوں یہ بات تم صرف مذاق میں کرتے ہو اور عاصمہ بھی یہ بات سمجھتی ہے۔''

''تمہارے جیسے دوست کے ہوتے ہوئے بندے کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی...... شیکسپیئر نے اپنی ایک پنجابی نظم میں لکھا ہے کہ اے فرینڈ ان نیڈ از فرینڈ ان ڈیڈ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ......''

وہ پھر پٹڑی سے اتر گیا تھا لیکن اس بار میں بھی پٹڑی سے اتر گیا۔ میں نے اسے بے نقط سنائیں۔ میں نے کہا کہ وہ ہر بات کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے ہر وقت مخمصے میں رکھنے کی اسے عادت پڑ گئی ہے۔ میں اب یہ عادت مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جب واقعی غصہ آ جاتا تھا تو وہ فوراً سنبھل جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے حسبِ عادت فوراً ہاتھ جوڑ دیئے اور اتنے مسکین لہجے میں مجھے منانا شروع کیا کہ میں اپنا غصہ برقرار نہ رکھ سکا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تابی! یہ ہماری مشرقی عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بس جس کے پلے بندھ گئیں، بندھ گئیں۔ ڈی ایس پی سجاد ہرگز اچھا شوہر نہیں ہے لیکن

عاصمہ کے لئے تو سب، کچھ وہی ہے۔ وہ اس کی ماریں بھی کھاتی ہے اور پوجا بھی کرتی ہے...... اس کی ترقی اور بھلائی کی دعائیں اس کا معمول ہیں۔ جس رات میں سجاد کو سبق سکھانے کے لئے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا، عاصمہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے بجا طور پر یہ خدشہ لاحق تھا کہ آج رات سجاد خودکشی کر لے گا یا کثرت شراب نوشی سے موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ عاصمہ کی گریہ زاری دیکھ کر پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے سجاد کو گرفتاری دے دی۔ یہ گرفتاری ایک ایسے بے بدل ٹانک کی طرح تھی جس نے سجاد کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے ابھارا اور اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ میرے خیال میں تمہیں یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہو گا لیکن اس بات کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ اس رات، ٹوٹے پھوٹے اور اپنی ہی آگ میں راکھ ہوتے سجاد کے لئے میری گرفتاری کتنی ضروری تھی...... میری گرفتاری کے دسویں بارہویں روز عاصمہ برقع پہن کر رازداری کے ساتھ مجھ سے ملنے جیل آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ روتے ہوئے میرے قدموں پر سر رکھ دیتی۔ وہ میری رہائی کے بارے میں بہت فکرمند تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ میں اس سنگین معاملے سے کس طرح نکل پاؤں گا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ایک مسئلہ بھی لے کر آئی تھی۔ اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ جھانسی کی ایک پیرزادی سیدہ جویریہ رضوی کی انتہائی معتقد ہے اور ان سے راہنمائی لیتی ہے۔ سیدہ جویریہ استخارہ کرتی تھیں اور فال وغیرہ نکالتی تھیں۔ انہوں نے عاصمہ سے سارے حالات معلوم کرنے کے بعد ایک خاص بات بتائی تھی اور وہ یہ کہ جس بندے کی بے لوث قربانی اور ہمدردی کی وجہ سے سجاد موہل خطرناک مایوسی اور ابتلا کے دور سے نکلا ہے، وہی بندہ کسی دوسرے موقع پر سجاد کی زندگی کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا ہے...... اس لئے سجاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ آئندہ اپنے اس محسن سے دور رہے یا پھر وہ محسن اس بات کا خصوصی خیال رکھے کہ ان دونوں کی ملاقات دوبارہ نہ ہونے پائے۔ اور اگر ایسا ہو ہی جائے تو پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محتاط ہیں......

''اپنی فال ہی کے ذریعے اس مستقبل بیں خاتون نے عاصمہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا اور میں چند دن کے اندر ہی خود کو قانونی گرفت سے بچانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ جیل میں ہونے والی اس ملاقات میں عاصمہ نے رو رو کر مجھ سے فریاد کی کہ میں اس سے ایک وعدہ کروں۔ آئندہ اگر کبھی میرے اور سجاد کے درمیان تصادم یا ٹکراؤ کی کوئی بھی صورت پیدا ہوئی تو میں خود کو روک لوں گا اور اس تصادم سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔

"میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شوہر پرست عورت اس وقت شدید واہموں کا شکار ہے۔ میں نے اس کی تشفی کے لئے اس سے وعدہ کیا کہ بالفرض کبھی اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا ہوئی تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ وہ اس طرح مانی نہیں تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا...... میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں۔ اور میں نے اس کی خاطر قسم کھالی۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ پیشین گوئیاں کبھی کبھی درست بھی ثابت ہو جاتی ہیں لیکن ان کی کوئی سائنسی بنیاد تو نہیں ہے یار میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سجاد موہل سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ لیکن جب پارک ویو ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے میں نے اچانک اسے دیکھا اور اس نے مجھے تو میرے ذہن میں وہ تمام باتیں تازہ ہوگئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا دیا ہوا قول بھی۔"

عمران نے ذرا سا توقف کیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "وہ سچویشن تم نے بھی دیکھی تھی۔ سجاد موہل اس وقت غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایسا شخص شدید تناؤ میں دوسروں کو یا پھر خود کو شدید نقصان پہنچا لیتا ہے۔"

عمران نے بات ختم کی اور پُرسوچ انداز میں سگریٹ کے لمبے کش لینے لگا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی باتیں بھی انوکھی تھیں۔

دو سال پہلے وہ بمبئی شہر کی ایک پُرفسوں رات میں ایک عورت کی حالتِ زار سے متاثر ہوا تھا...... اس کے لئے ایک انوکھی قربانی دی تھی اور پھر اس سے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ عورت اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی اس سے اسے کوئی مطلب تھا۔ وہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا فائدہ بھی لینا نہیں چاہتا تھا مگر اس سے کیا ہوا عہد اسے یاد تھا۔ اس عہد کی خاطر اس نے خود کو بے دریغ مشکل میں ڈال دیا تھا۔

میں نے کہا۔ "تمہاری منطق نرالی ہے یار...... اور سچی بات یہ ہے کہ پوری طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ تمہیں پتا تھا کہ تم ایک سنگین کیس میں ملوث ہو اور پولیس کی کسٹڈی سے بھاگے ہوئے بھی ہو پھر بھی......"

"یار! میرا خیال تھا کہ ہم راستے میں کچھ نہ کچھ کر گزریں گے اور شاید کسی مناسب طریقے سے سجاد سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن تم نے دیکھ ہی لیا، اس نے گاڑی میں ہماری کوئی بات سنی اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی موقع دیا۔ پھر تمہارے پاؤں میں بھی اچانک ہی زنجیر ڈال دی گئی۔ جہاں تک کیس کے سنگین ہونے کا تعلق ہے، میرا نہیں اندازہ تھا کہ یہ اتنا سنگین ہے۔ میں نے پروڈیوسر منوج کو صرف زخمی کیا تھا...... جان سے نہیں

مارا تھا۔ اب یہ لوگ اسے قتل کہہ رہے ہیں لیکن یہ کسی طور قتل نہیں بنتا...... اور اب تو...... یہ ویسے بھی کوئی دوسرا کیس بنتا جا رہا ہے۔" عمران نے کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔

"دوسرا کیس؟"

"جگر! یہی اشتہار والا معاملہ۔ جس طرح ہمیں ایک دم حوالاتی سے وی آئی پی بنا دیا گیا ہے، مجھے لگتا ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یہ وہی ٹریٹ منٹ ہے جو بکروں کا مالک قربانی کے بکروں کو دیتا ہے۔"

کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ تھی۔ کوئی عورت ادھر آ رہی تھی۔ امکان تھا کہ یہ عاصمہ ہی ہوگی۔ یہ امکان درست نکلا۔ وہ اس مختصر لاؤنج میں آ گئی جو ہمارے کمرے کے سامنے واقع تھا۔ یہاں حوالدار فیاض چوکس حالت میں موجود تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی لیکن اس کی توجہ ہماری ہی طرف تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور رنگت اڑی اڑی تھی۔ وہ دراز قد اور خوش شکل تھی۔ کھلی ہوئی رنگت، تھوڑے سے ابھرے ہوئے رخسار اور ستواں ناک میں کوکے کی مدھم چمک۔ وہ ہاتھ کا بنا ہوا لمبا اونی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گلابی رنگ کی گرم شال کوٹ کے ہم رنگ تھی۔ میں نے اسے خاصی توجہ سے دیکھا۔ عمران نے بتایا تھا کہ عاصمہ میں کسی حوالے سے شبانہ کی ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ وہی شبانہ جس نے شبو بن کر عمران کے دل پر راج کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی تھی۔

صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ہم سے بات کرنا چاہتی ہے مگر حوالدار فیاض اور ہیڈ کانسٹیبل کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل تو قدرے دور تھا مگر حوالدار بالکل ہمارے سر پر موجود تھا۔ حوالدار کی توجہ ذرا دوسری طرف ہوئی تو عاصمہ نے بڑے التجائی انداز میں عمران کو اشارہ کیا۔ وہ اس سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ موبائل فون آن کرے۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ واپس چلی گئی۔

کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد عمران نے موبائل آن کر لیا۔ چند ہی منٹ بعد موبائل نے وائبریٹ کیا اور عاصمہ کا میسج آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "بھائی جان! آپ مجھے کیوں اتنی سخت سزا دے رہے ہیں۔ آپ صرف میری خاطر اس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں اور مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے ہیں۔ سجاد پتا نہیں کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کل سے تھانے بھی نہیں گئے۔ ایک لینڈ کروزر پر کچھ لوگ شام کے وقت سجاد سے ملنے آئے تھے۔ ان میں ایک بندہ کسی یورپی کنٹری کا لگتا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹا یہاں رہے۔ پھر سجاد کا

دوست جگدیش ان کے ساتھ چلا گیا۔ یہ جگدیش مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس کے رابطے غلط لوگوں سے ہیں۔ پلیز! مجھے جواب دیں۔''

عمران نے لکھا۔''تم خود کو خطرے میں نہ ڈالو اور اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ رہو۔ جب بھی کوئی خوب صورت لڑکی میری خاطر خود کو خطرے میں ڈالتی ہے، میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ خاص طور سے منگل اور بدھ کو ایسا ہوتا ہے۔ اور آج منگل ہے...... میں اپنی حفاظت کرلوں گا۔ پلیز! اب رابطہ نہ کرنا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ خدا حافظ۔''

اس میسج کے بعد عمران نے فون حتمی طور پر بند کر دیا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''عاصمہ نے کسی غیر ملکی کی بات کی ہے۔''

''ہاں، یہ قابلِ غور بات ہے۔''

ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ دو بڑی جیپیں کوٹھی کے ڈرائیو وے پر نظر آئیں اور پورچ میں آ کر رک گئیں۔ ان میں سے ایک شاندار لینڈ کروزر جیپ کے شیشے سیاہ تھے۔ گاڑیوں میں سے آٹھ دس افراد اترے۔ ان میں کچھ مسلح تھے اور کسی پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے اہلکار لگتے تھے۔ ان کمانڈو ٹائپ اہلکاروں نے تاریک شیشوں والی عینکیں لگا رکھی تھیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ سادہ شیشوں والی لگژری جیپ میں سے دو سوٹڈ بوٹڈ افراد اترے۔ ان میں سے ایک کے بال سفیدی مائل تھے۔ بہر حال، ہم ان کی صورتیں ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے۔ انہوں نے مہمانوں کا استقبال کیا اور انہیں کوٹھی کے اس حصے میں لے آئے جہاں ہم موجود تھے۔

''لگ رہا ہے کہ اب ہمارا چل چلاؤ ہے۔ یہ موبائل فون کہیں چھپا دینا چاہئے۔'' عمران نے کہا۔

میں نے جلدی سے ایک چھوٹے صوفے کو ترچھا کیا اور اس کے نیچے کا کپڑا بلیڈ سے ذرا سا کاٹ کر موبائل سیٹ اس میں گھسا دیا۔

دو تین منٹ بعد بھاری قدموں کی چاپوں سے کمرے کے سامنے والا لاؤنج گونج اٹھا۔ حوالدار فیاض نے کمرے کے دروازے کو''اَن لاک'' کیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ ہماری طرف کوئی گن''پوائنٹ'' نہیں کی گئی تھی۔ گنیں اہلکاروں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن کسی بیرل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ تھری پیس سوٹ والا ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور سپاٹ لہجے میں ہم دونوں سے ہمارے نام پوچھے اور ولدیت دریافت کی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چھپانے سے فائدہ نہیں۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے

بارے میں مکمل معلومات موجود تھیں۔ عمران کی قمیص کی آستین اٹھا کر اس کے بازو پر پرانے کٹ کا ایک نشان دیکھا گیا۔ اسی طرح میرے کندھے پر، گردن کے قریب دو تل تلاش کئے گئے۔ یہ تل شناختی کارڈ میں علامت کے طور پر موجود تھے۔

ادھیڑ عمر شخص نے شستہ اردو میں کہا۔''امید ہے کہ آپ دونوں ہم سے تعاون کریں گے۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔''

میں نے کہا۔''یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم آپ سے آپ کے بارے میں پوچھیں۔''

''آپ کو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن فی الحال ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ ہمیں عارضی طور پر آپ دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھنا ہو گی۔'' ادھیڑ عمر شخص نے پھر شائستہ لہجے میں کہا۔

''اگر ہم انکار کریں تو پھر؟'' عمران نے کہا۔

''ہمیں افسوس ہو گا کہ آپ ہمارے دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہے۔''

''او کے۔'' عمران نے کہا۔

''ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھی گئیں۔ دو افراد نے ہم دونوں کو بازوؤں سے پکڑا اور لے کر چل دیئے۔ ہمارے عقب میں اور دونوں طرف کم و بیش آٹھ مسلح افراد موجود تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ زبردست تربیت یافتہ ہیں۔ ہمیں پورچ میں لا کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ اگلی گاڑی تھی اور وہی تھی جس کی کھڑکیوں میں تاریک شیشے تھے۔

ہمارا سفر شروع ہوا۔ ہمارے گرد مسلح افراد موجود تھے اور وہ بالکل خاموش تھے۔ ادھیڑ عمر شخص بھی اسی گاڑی میں موجود تھا اور وہ اگلی نشست پر تھا۔ عمران نے راستے میں ایک دو سوال پوچھنے کی کوشش کی مگر ادھیڑ عمر شخص کا رویہ اب پہلے سے زیادہ خشک ہو چکا تھا۔ اس نے عمران کو فی الوقت خاموش رہنے کی ہدایت کی......

ہم الہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزر کر قریباً پون گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ یہ منزل بھی کوئی رہائشی عمارت ہی تھی۔ یہاں رکھوالی کے بڑے...... کتے موجود تھے اور ماربل کے فرش پر لوگوں کے ٹھک ٹھک چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک دو افراد کو انگریزی بولتے بھی سنا۔ ان میں سے ایک یقیناً کوئی غیر ملکی خاتون تھی۔ اس عورت نے عمران کو دیکھ کر حیرت اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا...... اس کے الفاظ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آ سکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمیں ایک اور گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرک نما گاڑی تھی...... تاہم نشستیں نہایت آرام دہ تھیں۔ اس موقع پر عمران نے اپنی پٹی اتارنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک سکھ گارڈ نے پنجابی لہجے میں کہا۔ ''نہیں، ابھی نہیں جی۔ ابھی سر جی کا آرڈر آئے گا تو پٹی ہٹا لیجئے گا۔''

ہمارے اندازے کے مطابق گاڑی میں شاید گتے کے بہت سے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ گاڑی کے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گاڑی پہلے سے یہاں ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔

دو تین منٹ بعد ایک انٹرکام جیسی آواز سنائی دی۔ ''اب آپ اپنی پٹیاں ہٹا سکتے ہیں۔''

ہم دونوں نے پٹیاں ہٹالیں اور چندھیائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہم ایک چھوٹے سائز کے کنٹینر میں تھے۔ تاہم یہ کوئی عام کنٹینر نہیں تھا۔ اس کا انٹیریئر زبردست تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی ریل گاڑی کے اسپیشل لگژری کیبن میں سفر کر رہے ہیں...... ایک طرف ایک درمیانے سائز کا ریفریجریٹر بھی موجود تھا اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے لئے آکسیجن کے سلنڈر بھی رکھے تھے۔

عمران نے کنٹینر کی دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کنٹینر کی بیرونی دیواریں نہیں ہیں۔ یہ ڈبل دیواروں والا کیبن تھا۔ یعنی اگر ہم اندرونی دیوار کو پیٹنا بھی شروع کر دیتے تو شاید باہر تک اس کے اثرات نہ پہنچ پاتے۔ اس چھ فٹ چوڑے اور قریباً آٹھ فٹ لمبے کیبن میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کیبن کی ایک دیوار گتے کے اسٹاکلش ڈبوں کی تھی۔ یہ ڈبے فرش سے چھت تک چنے ہوئے تھے۔ عمران نے ان ڈبوں پر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھنا شروع کیا۔ ''کمپیوٹر ہارڈ ویئرز اینڈ اسیسریز فاران کمپنی لمیٹڈ الٰہ آباد۔''

عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ کمپیوٹرز کے پرزہ جات ہیں جو فیکٹری سے کسی مارکیٹ میں پہنچائے جا رہے ہیں۔''

''اور ہمیں ان کی آڑ میں پہنچایا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

میری آواز ذرا بلند تھی۔ عمران نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری آواز سنی جا رہی ہے۔

دفعتاً انٹرکام نما آلہ پھر جاگ اٹھا۔ کسی مقامی شخص نے ریڈیو اناؤنسر کی سی آواز میں

کہا۔ ''فریج میں آپ کے کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ دائیں طرف شیلف پر اوون پڑا ہے جس میں آپ کھانا گرم کر سکتے ہیں۔ بائیں طرف جو چھوٹا دروازہ نظر آ رہا ہے، وہ واش روم کا ہے۔ پانی محدود ہے اس لئے آپ کفایت سے استعمال کریں۔''

''لیکن ہم......'' عمران کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ انٹرکام بند ہو چکا تھا۔

''ہیلو...... ہیلو'' عمران نے ایک دو مرتبہ کہا پھر گہری سانس لے کر لچک دار بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

''لگتا ہے ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

عمران نے ٹانگ سے فریج کا دروازہ کھولا اور اندر موجود کھانے پینے کی اشیاء کو دیکھ کر بولا۔ ''ان چیزوں کو دیکھا جائے تو پھر چار پانچ دن کا سفر تو بنتا ہی ہے۔''

''لیکن اگر تمہاری بھوک کو دیکھا جائے تو پھر کچھ کم بنتا ہے۔''

''تمہیں زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں بچو۔ کھٹمنڈو پہنچ کر بولتی بند ہو جائے گی...... وہاں کڑاکے کی سردی ہوگی۔''

''یہ کھٹمنڈو بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

''بھئی جس جگہ سے ہم چلے ہیں اور جدھر کا ہمارا رخ ہے، ہم چار پانچ دن میں کھٹمنڈو تو پہنچ ہی جائیں گے...... نہ ہوا تو تبت ہوگا یا پھر سن کیانگ وغیرہ۔ کیوں جی، ایسا ہی ہے نا برادرز۔'' عمران نے آخری الفاظ کنٹینر والوں کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کنٹینر بڑی رفتار سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی موٹروے جیسی سڑک پر جا رہا ہے۔ عمران نے اداسی بھرے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

مجھ پر بھی اداسی سوار ہو رہی تھی۔ بالو بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ وہ معصوم ماں سے تو جدا ہو ہی چکا تھا، اب مجھ سے بھی دور تھا۔ بہرحال، مجھے میڈم صفورا کی ہوشیاری اور اسد کی دلیری سے خاصی توقعات تھیں۔ امید تھی کہ وہ حالات کا مقابلہ کر لیں گے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ انہیں اجے کا تعاون بھی حاصل تھا۔

کپتان اجے کا خیال آتے ہی وہ سارے واقعات ذہن میں اودھم مچانے لگے جو صرف چند روز پہلے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمارے ساتھ پیش آ چکے تھے...... ایسا لگتا تھا کہ ہم 1857ء کی جنگ آزادی کے دور سے ایک دم جدید دور میں لوٹ آئے ہیں۔ قاسمیہ کے پرانے قلعے کے اردگرد ہونے والی خوں ریز لڑائی، آگ، دھواں، بارود، تلواروں کی

جھنکار...... اور پھر اس سے پہلے اسٹیل اور منیارڈ کی موت، سولیاں چڑھائے جانے کے مناظر اور بازاروں میں ہونے والی قتل و غارت اور عصمت دری۔ وہ سب واقعات آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

وہ سب کچھ اب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا لگتا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسٹیٹ کی لڑائی کو یاد کر رہا ہوں...... اور تم؟''

''میں لاہور کو یاد کر رہا ہوں۔ لگتا ہے اپنا ملک اور اپنا شہر دیکھنے کی حسرت پھر دل میں ہی رہ جائے گی۔ ہائے پاکستان...... ہائے لاہور''۔

O......❖......O

ہمارے اگلے پانچ روز ایک انوکھے تجربے جیسے تھے۔ ہم نے یہ پانچ دن ایک چھ ضرب آٹھ فٹ کے کیبن میں گزارے تھے...... اور یہ کیبن تقریباً دن رات حرکت کرتا رہا تھا۔ کبھی ہموار سڑکوں پر، کبھی بہت ہموار سڑکوں پر۔ ہم کہاں سے گزرتے رہے تھے، ہمیں کچھ خبر نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ باہر سے کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی...... نظر کا راستہ بھی یکسر مسدود تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا واحد رابطہ وہ انٹرکام تھا جس کے ذریعے کبھی ایک مرد اور کبھی ایک عورت ہمیں مخاطب کرتے تھے اور یہ رابطہ بھی دن میں صرف ایک آدھ بار ہی ہو پاتا تھا۔ ہمارا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے پانچویں روز یہ سفر اختتام کو پہنچا۔ عمران کی رسٹ واچ شام ساڑھے پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ پانچ روز بعد پہلی بار ہمارے لگژری کیبن کا دروازہ کھلا اور ہمیں کسی آدم زاد کی صورت نظر آئی۔ اس آدم زاد کے پیچھے ایک اور آدم زاد بھی تھا جس کے ہاتھ میں خطرناک ''اے کے 56'' رائفل تھی...... ہم سے بڑے شائستہ لیکن فیصلہ کن لہجے میں ایک بار پھر درخواست کی گئی کہ ہم اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا لیں۔ اس درخواست کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہماری آنکھوں پر سیاہ ریشمی پٹی باندھ دی گئی۔ مسلح کمانڈوز ٹائپ افراد نے ہمیں بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ ہمارے اردگرد بہت سے بوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ موسم خاصا ٹھنڈا تھا۔ قریباً پچاس میٹر پیدل چلانے کے بعد ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا اور آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ ہم باقی سب باتیں فراموش کر کے اندازے لگانے میں مشغول ہو گئے کہ ہم کس مقام پر

ہیں۔ یہ انڈیا تو ہرگز نہیں تھا۔ کمرے کی ڈیکوریشن اور دیگر اشیاء سے بھی کچھ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمارے اردگرد موجود افراد تو کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ ورنہ ان کی زبان اور لہجے سے کوئی قیافہ لگایا جاتا۔

عمران نے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے، انڈیا، نیپال یا چائنا؟ ویسے مجھے، تو ماحول کچھ کچھ نیپال جیسا لگتا ہے۔ اور یہ پینٹنگ دیکھو۔ اس میں بھی کچھ ایسا ہی رنگ ہے۔''

''لیکن یہ فرش دیکھو...... یہ ماربل ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق کھٹمنڈو وغیرہ میں اچھے ہوٹلوں کے فرش اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں اور یہ پردوں کا اسٹائل...... یہ بھی کچھ وکھری ٹائپ کا ہے۔''

اچانک عمران کی نظر ایک دیوار گیر الماری پر پڑی۔ وہ اس کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا بالائی سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک اسٹائلش ایگزاسٹ فین نظر آ رہا تھا۔ عمران نے اس فین کی پلاسٹک جالی سے باہر جھانکا۔ پھر بے اختیار پکار اٹھا۔ ''اوئے ہوئے ہوئے۔'' اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔

''خود دیکھ لو اوپر آ کر۔''

میں نے عمران کی تقلید کی اور الماری کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا ایگزاسٹ فین کی جالی تک پہنچا۔ میں دنگ رہ گیا۔ اس دوسری منزل سے بلند درختوں کے پیچھے مجھے جو منظر نظر آیا، وہ مینارِ پاکستان کا تھا۔ مینارِ پاکستان کا اوپر والا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ لاہور کا جانا پہچانا آسمان تھا...... شام ڈوب رہی تھی۔ سرخ افق پر پتنگیں ڈول رہی تھیں......

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یار تابی! یہ مینارِ پاکستان لاہور سے چل کر کھٹمنڈو کیسے پہنچ گیا؟''

میں کیا جواب دیتا۔ میں خود حیرت کے دریا میں بہہ رہا تھا۔ میری نگاہیں ایگزاسٹ فین کی جالی سے باہر مینارِ پاکستان کے بالائی حصے پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بالائی حصہ سرسبز درختوں کی ہریالی کے درمیان سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہم منٹو پارک کے آس پاس کہیں موجود تھے۔

میں نے گہری سانس لی...... اور مجھے اس سانس میں اپنے پاکستان اور اپنے لاہور کی جانی پہچانی خوشبو صاف محسوس ہوئی۔ یہ خوشبو سینے میں اتری اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ میں حیران ہوا کہ اس جاں فزا خوشبو کی طرف میرا دھیان پہلے کیوں نہیں گیا۔ بے شک ہمیں

ائرٹائٹ اور تقریباً ساؤنڈ پروف کنٹینر سے نکال کر لایا گیا تھا اور ہماری آنکھوں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی مگر ہوا تو ہمارے سینوں میں آ جا رہی تھی۔ تب یہ پتا کیوں نہ چلا کہ یہ اپنی دھرتی کی ہوا ہے۔

عمران بولا۔ ''چلو اب الماری سے نیچے آؤ اور میرے ہاتھ پر چٹکی کاٹ کر بتاؤ کہ میں کہیں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

میں نیچے آ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ حیرت اور خوشی کی ملی جلی عجیب سی کیفیت تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو، کیسا عجیب تماشا ہوا ہے۔ ہم لاہور آنا چاہتے تھے اور ہمیں پکڑ کر زبردستی جس جگہ لایا گیا ہے، وہ بھی لاہور ہی ہے۔''

''فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ باقی لوگ نہیں ہیں، اقبال، میڈم اور بالو وغیرہ۔''

بالو کے ذکر نے مجھے ایک بار پھر پریشان کر دیا۔ کچھ پتا نہیں تھا وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اچانک کہیں فاصلے سے رکشے کی جانی پہچانی پھٹ پھٹ ابھری اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد کسی چھت سے ''بوکاٹا'' کی بلند آواز سنائی دی۔ چھت پر چڑھی ہوئی کسی پتنگ باز ٹولی نے کوئی پتنگ کاٹی تھی۔ ان دو آوازوں نے ایک دم لاہور کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا۔ اس شہر ہزار رنگ کے سارے رنگ نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔ جانی پہچانی گلیاں، بازار، ریستوران، چوراہے، تفریح گاہیں...... اور شام گہری ہو رہی تھی...... روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ ایک اور جگمگاتی شب زندہ دلوں کے اس نگر پر وارد ہو رہی تھی۔ میرا دھیان ایک دم اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی اس شہر کی کسی چار دیواری میں موجود تھے۔ انہی فضاؤں میں سانس لے رہے تھے۔ عمران میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ بولا۔ ''فرح اور عاطف کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور میری آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے تم سے کچھ غلط نہیں کہا تھا، وہ دونوں یہاں بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ان شاءاللہ۔''

''میں...... انہیں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''یار! میں نے بہت صبر کیا ہے۔ پچھلے تین سالوں کا ایک ایک پل گن کر گزارا ہے۔

اب ان کے بالکل پاس آ کر ان سے دور نہیں رہا جاتا۔ جی چاہتا ہے کہ یہ دروازے توڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاؤں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ اس طرح ہمیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟ انہوں نے بہت بڑی رقمیں خرچ کی ہیں ہم پر۔''

''مگر پتا تو چلے کہ یہ ہیں کون؟ کیا چاہتے ہیں ہم سے؟''

''دیکھو، تم پھر خود کو ایڈیٹ ثابت کر رہے ہو۔ کیا پتا ہمارے ان مہربانوں نے اس کمرے میں ہماری باتیں سننے کا انتظام کر رکھا ہو۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''میں نے کہا۔'' مجھے پروا نہیں۔''

''ٹھیک ہے اگر تمہیں نہیں تو پھر مجھے بھی نہیں۔'' اس نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔ ''مہربانو، قدردانو! اگر ہماری آواز سن رہے ہو تو ازراہ مہربانی سامنے آؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ ہم اس زبردست مہمان نوازی کے بدلے آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

شاید عمران کو بھی توقع نہیں تھی کہ اس کی پکار کا جواب اتنی جلدی مل جائے گا۔ یکایک کمرے کے دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں اور وہ سلائڈ کر کے کھل گیا۔ ایک درمیانی عمر کا خوش پوش شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، ساتھ قیمتی کپڑے کا کوٹ تھا اور گلے میں مفلر کو اسکارف کی طرح باندھ رکھا تھا۔

اس شخص کو دیکھ کر عمران کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور گرم جوشی کی چمک نمودار ہوئی۔ دوسری طرف، اندر آنے والا شخص بھی ایک دم جذباتی نظر آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور عمران سے لپٹ گیا۔ عمران نے کہا۔ ''امید نہیں تھی انکل کہ آپ سے اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔''

دونوں کچھ دیر گلے...... لگے رہے اور ایک دوسرے کے کندھے تھپکتے رہے۔ تب عمران نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سے ملو، یہ ہیں انکل جان محمد اور انکل! یہ تابش ہے۔ یہ سرکس میں تین چار بار میرے ساتھ آیا تھا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔''

میں پُر تجسس نظروں سے جان محمد صاحب کو دیکھتا چلا گیا۔ زرگاں میں جشن کی رات، عمران نے مجھے جو اپنی طویل رُوداد سنائی تھی، اس میں جان صاحب کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا تھا۔ یہ اسٹار سرکس کے مالک جان صاحب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عمران کی خداداد صلاحیتیں پہچانی تھیں اور اس کی قدر کی تھی۔ انہوں نے عمران کو ''راجا'' کے چکر سے نکال کر اپنی سرکس کمپنی میں معقول معاوضے پر ملازمت دی تھی اور قدم قدم پر اسے سہارا دیا تھا۔

بعدازاں عمران نے بھی اپنے محسن کی خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔اس کی کوششوں سے اس سرکس کمپنی نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔

جان صاحب مجھ سے بھی بغلگیر ہوئے اور میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔انہوں نے کہا۔''تابش! تم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہو۔تمہاری خاطر عمران ایک سال سے زیادہ عرصے تک ہماری نظروں سے غائب رہا ہے۔خوشی کی بات ایک ہی ہے......اور وہ یہ کہ اس کی تلاش بیکار نہیں گئی۔تم اس کے ساتھ ہو۔''

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔جان صاحب نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''کہنے اور سننے کو تو بہت کچھ ہے عمران......اور ہم دونوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال بھی ہیں۔لیکن میں جانتا ہوں، تمہارے ذہن میں جو سب سے اہم سوال ہے، وہ یہی ہوگا کہ تمہیں اس طرح یہاں پاکستان لانے والا کون ہے اور کیوں لایا ہے؟''

''ہمیشہ کی طرح آپ کا خیال درست ہے انکل۔'' عمران نے جواب دیا۔''لیکن اس سے بھی پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آنٹی کیسی ہیں اور کہاں ہیں؟''

''وہیں خوشاب میں ہے اور میری طرح وہ بھی تمہیں بے حد بے حد مس کرتی رہی ہے۔تم بھی تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوئے۔کوئی اتا پتا نہ خیر خبر۔یہ کوئی پرانا دور تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے بارے میں ایک اطلاع بھی نہ دے سکے......''

عمران دلکش انداز میں مسکرایا۔''جہاں ہم تھے، وہ پرانا دور ہی تھا انکل۔سمجھ لیں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں کا دور تھا۔خچر، گھوڑا گاڑیاں، لالٹینیں اور تلواریں۔ایک ایسی جزیرے جیسی جگہ تھی جہاں سے ہم باہر نہیں آسکتے تھے اور نہ ہماری خبر آسکتی تھی۔یہ لمبی کہانی ہے، آپ کو آرام سے سنائیں گے۔''

''تم الٰہ آباد جیسے جدید شہر کو پرانے دور کا جزیرہ کہہ رہے ہو؟'' جان صاحب نے پوچھا۔

''الٰہ آباد اس کے مقابلے میں پیرس ہے جناب۔میں کسی اور جگہ کی بات کر رہا ہوں......الٰہ آباد تو ہم بس آٹھ دس روز پہلے پہنچے تھے۔وہاں پہنچ کر ٹھیک سے کمر بھی سیدھی نہیں کی تھی کہ اٹھا لئے گئے۔''

جان محمد صاحب کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ ان کے اندر تجسس بڑھتا جا رہا ہے، تاہم اس موقع پر وہ بات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے تھے۔انہوں نے کرسی کی آرام دہ

نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔''عمران! میں تو پچھلے قریباً ایک سال ہی سے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر زور وشور سے تمہاری تلاش کوئی تین مہینے پہلے شروع ہوئی تھی۔اس تلاش کو شروع کرنے والا ایک ایسا شخص ہے جسے تم جانتے نہیں ہو۔وہ پاکستانی بھی نہیں ہے۔اس سے مل کر تمہیں ضرور حیرت ہوگی۔وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔''

''کوئی تھوڑا بہت اشارہ تو دیں؟''

''وہ بہت مال دار برطانوی باشندہ ہے لیکن وہ شکل سے تمہیں برطانوی نظر آئے گا اور نہ ہی مال دار...... بلکہ اس کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا تمہارے لئے بہت مشکل ہوگا۔اسے تمہاری بہت سخت ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہی ہے جس کی وجہ سے اس نے پچھلے چند مہینوں میں تمہاری تلاش پر پانی کی طرح پیسا بہایا ہے۔انڈیا کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کونے کونے میں تمہاری تلاش ہوئی ہے۔پولیس اور انٹرپول کے علاوہ پرائیویٹ اداروں سے مدد لی گئی ہے۔اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار دیئے گئے ہیں۔ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا گیا ہے۔میرے اندازے کے مطابق اب بھی الٰہی آباد کی اس پارٹی کو قریباً پچاس لاکھ روپیا دیا گیا ہے جس کی تحویل میں تم دونوں تھے۔''

''اوہ گاڈ!'' عمران نے دیدے پھاڑے۔''یعنی اس کھڑوس الٰہ آبادی ڈی ایس پی اور اس کے مچھندر یاروں کو میرے لئے پچاس لاکھ روپیا دے دیا گیا؟''

''مجھے زیادہ نہیں معلوم۔بس اتنا پتا ہے کہ وہ کوئی مقامی پولیس والا تھا اور اس نے تم دونوں کو پکڑ کر کسی نجی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ابھی گرفتاری وغیرہ نہیں ڈالی تھی تمہاری۔اس نے جو مانگا، اسے دے دیا گیا۔ہوسکتا ہے کہ وہ ڈبل بھی مانگتا تو دے دیا جاتا۔''

''اوہ گاڈ! یہ بالکل بیکار کا خرچہ کر دیا آپ لوگوں نے۔ہم نے تو لاہور ہی پہنچنا تھا۔اب نہ آتے تو دس پندرہ روز یا ایک مہینے بعد آجاتے۔'' عمران نے تاسف سے سر ہلایا اور کسی اداس بکرے کی طرح گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

جان صاحب نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولے۔''اصل قیمت تو ضرورت کی ہوتی ہے عمران......اور ریان صاحب کو تمہاری ضرورت ہے۔شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ پچھلے مہینے کے شروع میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر انڈیا گئے تھے۔ہم کوئی دو ہفتے تک امرتسر، جالندھر اور چندی گڑھ کے علاقوں میں گھومتے رہے۔کسی نے ریان صاحب تک یہ غلط اطلاع پہنچائی تھی کہ تمہیں اور اقبال کو وہاں دیکھا گیا ہے...... پورے دو ہفتے، اور

ریان ولیم وہ شخص ہیں جن کے لئے اپنے کام سے دو گھنٹے کا وقت نکالنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''اچھا تو ان کا اسم مبارک ریان ولیم ہے۔ میں نے یہ پہلی بار سنا ہے۔''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ تم انہیں پہلے سے نہیں جانتے لیکن ان کے ساتھ جو دوسرا بندہ ہے، اسے تم ضرور جانتے ہو۔''

''کون ہے؟''

''وہی پروفیسر رچی جس نے تمہارا ٹیسٹ لیا تھا۔ اپنے بہت بڑے کتے سے تمہاری ملاقات کرائی تھی۔ تمہارا لمبا چوڑا انٹرویو بھی لیا تھا اور تمہاری ویڈیو بھی بنائی تھی۔''

''وہ کیا چاہتا ہے؟''

جان صاحب بولے۔''رچی صاحب تو کچھ نہیں چاہتے لیکن ان کے کہنے پر یہ ریان ولیم بہت کچھ چاہنے لگا ہے۔ اسے ''لک'' کی تلاش ہے اور یہ ''لک'' اسے تم میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک بہت بڑا داؤ لگانا چاہتا ہے اور اس داؤ کے لئے اسے تمہاری ''خوش قسمتی'' کی ضرورت ہے۔''

''آپ پہیلیوں میں بات کررہے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

جان صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر بولے۔''میرا خیال ہے کہ میں تابش کے سامنے ہر طرح کی بات کرسکتا ہوں۔''

''یہ میرا ہمزاد بن چکا ہے جناب...... بلکہ ہمزاد سے بھی آگے کی چیز ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں...... رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی...... غالباً یہ مولانا رومی کا مقولہ ہے نا؟''

میں نے کہا۔''یہ مولانا رومی کا نہیں ہے اور نہ ہی فارسی کا ہے اور یہ مقولہ بھی نہیں ہے۔ یہ مصرع ہے۔''

جان صاحب نے میری اور عمران کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔''مسٹر ریان یورپ اور امریکا میں کیسینوز کی ایک بہت بڑی ''چین'' کا مالک ہے۔ ارب پتی شخص ہے لیکن دیکھنے میں وہ تمہیں ایسا نہیں لگے گا۔ جوا خانوں کے کچھ مالکان نے پچھلے دنوں ایک بڑا گیم کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس گیم کے دو شوز اس سے پہلے ہوچکے ہیں اور خاص حلقوں میں بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ ان شوز کو اسپیشل ٹرانسمیشن کے ذریعے یورپ اور امریکا کے کئی علاقوں میں دکھایا بھی گیا تھا۔ مسٹر ریان ولیم ان شوز میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف

انتظامیہ میں شامل ہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھتیجے گیری نے پچھلے دنوں دوسرے شو میں حصہ بھی لیا تھا۔ وہ گیم کے پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کرنے کے بعد چوتھے مرحلے میں آچکا ہے۔ یہ فائنل مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں ہر سوال کے ساتھ انعامی رقم دگنی ہوجاتی ہے اور اگر کھیلنے والا صرف تین سوالوں کے درست جواب دے دیتا ہے تو وہ ایک بہت بڑا انعام جیتنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''

''کچھ اندازہ تو بتائیں؟'' عمران نے ذرا دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

جان صاحب مسکرائے اور تھوڑا سا توقف کرکے بولے۔''اس وقت یہ گیم دو ملین ڈالرز پر رکا ہوا ہے۔ پاکستانی کرنسی کے مطابق یہ قریباً پندرہ کروڑ روپیا بنتا ہے۔ بنتا ہے یا نہیں؟''

''بالکل بنتا ہے۔'' عمران نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

''اب پہلے سوال کا درست جواب دینے سے یہ رقم دگنی یعنی قریباً تیس کروڑ روپے ہو جائے گی...... اور صرف دو مزید درست جواب اسے کہاں پہنچائیں گے، اس کا اندازہ تم آسانی سے لگا سکتے ہو۔''

عمران کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں۔''...... یعنی ایک سو بیس کروڑ؟''

''بالکل...... اور یہ انعام اس سے پہلے بھی ایک بار دیا جاچکا ہے۔ پچھلے سال ہونے والے پہلے ''گرینڈ شو'' میں یہ آخری انعام فلپائن کے ایک انیس سالہ لڑکے نے حاصل کیا تھا۔ دوسرے شو میں دو امیدوار تیس کروڑ کے انعام تک پہنچے لیکن اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس سے آگے بڑھنے کے لئے بہت سی ہمت بھی درکار ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' عمران نے پوچھا۔

''اگر بندہ تیس کروڑ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو پھر اسے ساٹھ کروڑ والے سوال کا جواب دینا ہوگا۔ لیکن اگر یہ جواب غلط ہوا تو پھر اسے تیس کروڑ سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے صرف Basic انعام ہی ملتا ہے۔ یعنی پچاس لاکھ روپیا...... قریباً 65000 امریکی ڈالرز۔ اس گیم کا ''فارمیٹ'' وہی ہے جو اکثر ٹی وی چینلز پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس میں انوکھی بات بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آخری انعام نقد رقم کی صورت میں نہیں ہے۔''

''تو کس صورت میں ہے؟''

جان صاحب ذرا سا مسکرائے اور بولے۔''ایک خوبصورت ائیر ہوسٹس کی شکل

میں......آپ کی خدمت کے لئے چوکس۔ ہر بات پر 'یس سر' کہنے والی......''

''شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ایک ارب بیس کروڑ روپے میں ایک ائیر ہوسٹس۔''

وہ پھر مسکرائے۔''تم نے ابھی پوری بات نہیں سنی۔ وہ ائیر ہوسٹس جس لگژری جہاز میں سروس فراہم کرتی ہے وہ جہاز بھی آپ کو ملے گا۔ ایک شاندار فیلکن 900 سی...... بڑا سال کا پرائیویٹ طیارہ ہے۔ قریباً 12 مسافروں کی گنجائش والا۔ اس کو مزید لگژری بنانے کے لئے اس کے انٹیریئر میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ایک بیڈ روم جس میں زبردست آسائشیں موجود ہیں۔ جدید سہولتوں سے آراستہ ایک نشست گاہ۔ کئی طرح کی اِن ڈور تفریحات۔''

''زبردست......کون دے گا یہ لگژری جہاز؟'' عمران کو ابھی تک پورا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہی لوگ جو میگا شو کرا رہے ہیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ دنیا کے ''معزز'' اور مال دار ترین جواری ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس اپنے پرائیویٹ طیارے اور تفریحی بجرے ہیں۔ ان لوگوں نے گیم کے گرینڈ پرائز کے لئے ایسے تین جہاز تیار کروائے ہیں۔ ان میں سے ایک تو سب سے پہلے شو میں ہینڈ اوور کیا جا چکا ہے۔ فلپائنی لڑکا اس کا مالک ہے۔ دو جہاز ابھی باقی ہیں۔ ان پر بہت سوں کی رال ٹپک رہی ہے۔ اپنے ریان ولیم صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کا بھتیجا گیری نہ صرف گیم میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے بلکہ پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کر چکا ہے۔ وہ پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً پندرہ کروڑ جیت چکا ہے۔''

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔''اس سلسلے میں، میں ان لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''مسٹر رچی اور مسٹر ریان کا خیال ہے کہ تم کر سکتے ہو۔''

''یعنی آپ مجھے ارسطو اور بقراط کا ہم پلہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے دنیا بھر کا جنرل نالج گھول کر پیا ہوا ہے۔ لہٰذا ٹھک ٹھک تین جواب دے کر رئیس زادے گیری کو فائنل انعام تک پہنچا دوں گا۔ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ بھول ہے۔ میرے جیسے بندے تو کسی عام سے کوئز شو میں جائیں تو انہیں انعام ملنے کے بجائے جرمانہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہماری خاندانی ''صلاحیت'' ہے۔ ایک دفعہ میرے دادا جی طارق عزیز کے نیلام گھر میں گئے تھے، شرمندگی کے باعث آج تک گھر واپس نہیں آئے۔''

جان محمد صاحب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔''ان لوگوں کو تمہارا جنرل نالج یا ذہانت درکار نہیں......تمہاری خوش قسمتی درکار ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' عمران نے پوچھا۔

جان محمد صاحب نے مہنگے برانڈ کے سگریٹ کا طویل کش لیا اور بولے۔''شاید تم نے اس طرح کا کوئی ٹی وی شو دیکھا نہیں۔ ان میں سے اکثر شو ایسے ہوتے ہیں جن میں سوالوں جوابوں کا سلسلہ بس رسمی طور پر رکھا جاتا ہے۔ ان ''سوالوں جوابوں'' کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ جنرل نالج کا پروگرام نظر آئے اور اسے جوئے بازی سے نتھی نہ کیا جا سکے۔ ہر سوال کے جواب کے چار آپشن دیئے جاتے ہیں اور دراصل یہی قسمت آزمائی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جان صاحب! پچھلے دنوں اللہ آباد کے ہوٹل میں، میں نے ایک ٹی وی چینل پر ایسا شو دیکھا تھا۔ بے معنی سے سوال تھے۔ مثلاً دمے کا مریض کیا کھائے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ آپشن نمبر 1 دہی پراٹھا...... آپشن نمبر 2 اچار پراٹھا......آپشن نمبر 3 انڈا پراٹھا......یا پھر ٹھنڈا پراٹھا۔''

''بالکل ٹھیک۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔''ایسے پروگراموں میں اکثر سوال تو صرف خانہ پُری کے لئے ہوتے ہیں۔ اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہوتی ہے۔ اسے عام زبان میں تکا لگانا کہتے ہیں۔ جس میگا شو کی بات کر رہا ہوں، اس میں بھی اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہے۔ مثلاً پچھلے میگا شو میں جس سوال پر ایک ڈچ خاتون نے تقریباً تیس کروڑ جیتے، وہ یوں تھا۔ مختلف پیش گوئیوں کے مطابق قیامت 2012ء میں آ سکتی ہے۔ آپ کے خیال میں قیامت کب آئے گی؟ 2012ء میں؟ 2013ء میں؟ 2090ء میں؟ 2113 میں؟ یہ سراسر قسمت آزمائی کا سوال تھا مگر یہ بڑی اعصاب شکن قسمت آزمائی ہے۔ اندازہ اس بات سے لگا لو کہ اس کھیل کے ایک 'پارٹی سی پینٹ' اور تین تماشائیوں کو باقاعدہ ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔''

''تو آپ کا کہنا ہے کہ مسٹر رچی اور مسٹر ریان یہ قسمت آزمائی مجھ سے کرانا چاہتے ہیں؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ اسی لئے پچھلے تین ماہ سے تمہاری تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ مسٹر ریان کا یقین ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر بہت ''لکی'' ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کرامات ہوتی ہیں۔ وہ جو پانسا پھینکتے ہیں، وہ سیدھا پڑتا ہے...... یا امکان ہوتا ہے کہ وہ سیدھا پڑے گا۔ مسٹر رچی یہاں تم سے پاکستان میں مل چکے تھے۔ انہوں نے سرکس میں

تمہارے اسپیشل شوز کے بارے میں بھی سب کچھ سن رکھا تھا۔ پسٹل اپنے اوپر تان کر تم جو دو چھ اور تین چھ والا دیوانہ پن کرتے ہو، اس کے بارے میں بھی انہیں ساری معلومات حاصل تھیں۔ انہوں نے مسٹر ریان ولیم کو تمہارے بارے میں بتایا اور وہ تمہاری تلاش میں لگ گئے۔ دوسرے اور تیسرے شو کے درمیان تقریباً چھ سات مہینے کا وقفہ موجود تھا اور مسٹر ریان کو یقین تھا کہ وہ اس عرصے میں تمہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کی یہ توقع پوری ہوئی بلکہ بالکل آخری وقت میں پوری ہوئی۔''

''عجیب کہانی سنا رہے ہیں آپ۔'' عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ ''یا تو یہ ریان نامی بندہ سنکی ہے یا بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ ایک انجان شخص کی ''لک'' پر اتنا زیادہ یقین کر رہا ہے۔ اسے کیا پتا کہ میں خوش قسمتی اور بدقسمتی کا کتنا بڑا امکسچر ہوں......''

میں نے اس کی بات اُچکتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی جان صاحب! کیا عمران اس گیری نامی نوجوان کی جگہ یہ گیم کھیلے گا؟''

''نہیں...... گیم تو گیری ہی کھیلے گا۔ عمران اس کی ہیلپ کر سکے گا۔ ایسے گیمز میں تین لائف لائنز ہوتی ہیں۔ اس میں بھی تین لائف لائنز ہیں۔ لیکن یہ تینوں لائف لائنز ایک ہی طرح کی ہیں۔ وہ یہ کہ کھیلنے والا تین بار اپنے کسی دوست سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے اس سے مدد لے سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکا لگا سکتا ہے۔ اب ریان ولیم صاحب یہ چاہتے ہیں کہ یہ تکا لگانے والی قسمت آزمائی عمران کرے۔''

''اور اس کے لئے انہوں نے میری تلاش پر لاکھوں لٹا دیئے۔ پچاس لاکھ انڈین روپیا تو اس جنونی الٰہی آبادی ڈی ایس پی کو ہی دے دیا گیا۔'' عمران نے کہا۔

''یہ ریان صاحب کے لئے ہرگز مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ پولیس والے تمہارے لئے دگنا یا سہ گنا بھی مانگتے تو ریان صاحب دے دیتے۔ انہیں جب کسی بات کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس یقین سے پیچھے نہیں ہٹتے...... اور پروفیسر رچی انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ تمہاری شان دار ''لک'' اس کھیل میں کام دکھا سکتی ہے۔''

''اور اگر اس نے کام نہ دکھایا تو پھر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ایسے کاموں میں یہ ''اگر'' ہی تو اصل تھرل ہوتا ہے۔ تم سرکس میں کیا کرتے رہے ہو عمران؟'' جان صاحب نے پوچھا پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''میرے بار بار منع کرنے کے باوجود تم ان اسپیشل شوز میں حصہ لیتے رہے ہو جن میں کسی بھی وقت جان کے

لالے پڑ سکتے تھے...... میں نے ایک حد تک تمہیں روکا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں کہ تم باز نہیں آؤ گے۔ تم یہ سب کچھ میرے سرکس میں نہیں کرو گے تو کسی اور جگہ کر لو گے...... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تماشے کرو۔ ان سب تماشوں میں ''اگر'' کے لفظ کی خاص اہمیت ہوتی ہے...... دیکھنے والا سوچتا ہے اگر یہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اگر وہ ہو گیا تو کیا ہو گا...... یہاں اس گیم میں بھی یہ ''اگر'' ہی سب سے بڑا تھرل ہے۔''

ابھی جان محمد صاحب کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر جدید دروازے نے بے آواز سلائڈ کیا اور مسلح محافظ کے ہمراہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ گوشت کے پہاڑ جیسا تھا۔ تاہم بہت فربہ لوگوں کی طرح اس میں سستی نظر نہیں آتی تھی...... وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس بڑی سہولت سے قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا۔ اس کی صورت دیکھ کر تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ برٹش ہے۔ وہ بالکل عام سے خدوخال کا شخص تھا۔ اگر اسے اس کے قیمتی لباس سے علیحدہ کر دیا جاتا تو اسے کسی ہوٹل کا ہیڈ خانساماں یا پھر کوئی ٹرک ڈرائیور سمجھا جا سکتا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں سے اس نے بغور عمران کو دیکھا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے انداز میں گرم جوشی تھی۔ عمران کے بعد مجھ سے مصافحہ کیا گیا۔

''میں ریان ولیم ہوں''۔ اس نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میرا دوست اور میرا گارڈ یوراج سنگھ ہے۔''

یوراج سنگھ نے بھی ہم سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک مضبوط جسم اور عقابی آنکھوں والا پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ ہم سب لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مصروف کاروباری لوگوں کی طرح ریان ولیم نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی اور عمران سے مخاطب ہو کر برٹش اسٹائل کی انگریزی میں بولا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر ایمران۔ میرے دماغ میں اس بارے میں بہت تجسس ہے کہ تم اچانک پاکستان سے غائب کیوں ہوئے اور اتنا عرصہ کہاں رہے۔ بہر حال، یہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں اور میں اپنے تجسس کی خاطر تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میرے لئے خوشی کی بات بس یہ ہے کہ تم ہمیں مل گئے ہو اور ہمارے سامنے بیٹھے ہو۔''

''میرے لئے بھی خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ ناچیز کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔'' عمران نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

''مجھے امید ہے کہ مسٹر جان محمد نے تمہیں کافی کچھ بتا دیا ہو گا اور تم نے سمجھ بھی لیا ہو

گا...... مسٹر ایمران! دراصل میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تدبیر سے زیادہ ''لک'' پر یقین رکھتے ہیں اور آج اس چالیس سال کی عمر میں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے اس یقین کی وجہ سے میں نے زندگی میں بہت سی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ میرا اس بات پر ایمان ہے کہ قدرت نے اس دنیا میں کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں سے زیادہ خوش قسمت بنایا ہوتا ہے۔ اپنے اس خداداد وصف کی بدولت وہ بدترین خطرات سے بچ نکلتے ہیں۔ مشکل ترین حالات میں رستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور کامیابیوں کو اپنی طرف کشش کرتے ہیں۔ اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو یہاں اس شہر میں جو میگا شو ہونے جا رہا ہے، اس میں بھی سارا کھیل خوش بختی کا ہے۔ جو سوال پوچھے جانے والے ہیں، وہ اتنے مشکل ہوں گے کہ فہم وفراست سے ان کا جواب دینا شاید ناممکن ہوگا۔ وہ صرف چوائس ہوگی اور دیکھنا ہوگا کہ بہترین چوائس کون کرتا ہے۔''

''کیا اس گیم میں کوئی اور بھی حصہ لے رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

مسٹر ریان نے اپنا بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ ''پچھلا شو قریباً سات ماہ پہلے ہوا تھا۔ اس میں میرا بھتیجا گیری کھیل رہا تھا جب شو کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔ اب اٹھائیس تاریخ کو جو شو ہونے جا رہا ہے، اس میں سلسلہ وہیں سے جڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ یعنی گیم کا چوتھا مرحلہ شروع ہوگا۔ اس مرحلے میں اگر تین سوالوں کے جواب درست ہو گئے تو ہم فائنل انعام تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد جس کھلاڑی کی باری آئے گی، وہ ایک امریکن لڑکی ہے۔ میرے کاروباری حریف مسٹر بفیلو کی اکلوتی بیٹی ماریانی۔ بہت ہوشیار، بہت ذہین اور قسمت کی دھنی بھی۔ اس نے ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں کئی ڈپلومے لے رکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مقابلے میں میرا بھتیجا کچھ زیادہ لکی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بھی پڑھا لکھا ہے اور اچھی ملازمت کرتا ہے لیکن لکی ہونا بالکل اور بات ہے۔''

''اور یقیناً آپ چاہتے ہوں گے کہ آپ کے کاروباری حریف کی بیٹی آپ کے بھتیجے سے آگے نہ نکل جائے۔''

''بالکل، میں اس حقیقت کو چھپا نہیں رہا۔ ایک طرح سے یہ گیم میرے لئے دُہری اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ایک اہمیت تو سولہ ملین امریکی ڈالرز کی ہے اور دوسری اپنے کاروباری حریف کو نیچا دکھانے کی۔''

عمران نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مجھے بہت فکرمند کر دیا ہے جناب۔ اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا تو کیا ہوگا؟''

''تم اترو گے۔ ضرور اترو گے۔ مجھے یقین ہے۔'' ریان ولیم نے عجیب ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''لک کا ہونا ایک بہت سالڈ چیز ہے۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں۔''

جان محمد صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ریان! عمران اور تابش ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان آئے ہیں۔ تابش اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے بے چین ہوگا۔ کیا وہ ان سے ملنے کے لئے جا سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' ریان ولیم نے کہا۔ ''ان دونوں پر کوئی پابندی ہیں۔ خاص طور سے تابش پر تو بالکل بھی نہیں۔ آپ اسے جہاں چاہے لے جا سکتے ہیں۔ ہاں، آپ نے کہا تھا کہ ان کی دشمنی وغیرہ ہے۔ اگر کوئی سکیورٹی کا مسئلہ ہے تو پھر آپ ذرا احتیاط کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ اٹھائیس تاریخ تک کسی بھی طرح کی گڑبڑ سامنے آئے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کی ذمے داری لیتا ہوں۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔

O......❖......O

لاہور سے ملنا...... لاہور کے گلی کوچوں سے ملنا اور پھر عاطف اور فرح سے ملنا میرے لئے جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ مجھے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ یہ بے بہا خوشی میرے حصے میں آ رہی ہے۔ میں ایک طویل مدت تک اپنے دیس کی فضاؤں اور خوشبو کے لئے تڑپا تھا۔ میں نے اپنے پنجرے میں پھڑ پھڑا کر اپنے پر زخمی کر لئے تھے۔ خود کو لہولہان کر لیا تھا اور آخر اپنے دوست عمران کی مدد سے یہ پنجرہ توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں جان صاحب اور عمران کے ساتھ ایک بند اسٹیشن وین میں سوار تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اسکول سے چھٹی کرنے والے بچے مختلف گاڑیوں میں یا پھر پیدل گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ سڑکوں پر زندگی رواں تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا، میں گاڑی سے اتر جاؤں۔ ان جانے پہچانے کوچوں میں پا پیادہ چلوں۔ شاہراہ قائداعظم، میکلوڈ روڈ اور نسبت روڈ کی رواں دواں گہما گہمی میں گم ہو جاؤں۔ یوں اس زندگی کا حصہ بنوں کہ جان صاحب اور عمران مجھے ڈھونڈتے رہ جائیں۔

ہم لوئر مال روڈ سے گزرے۔ کچھ بھولے بسرے منظر نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ مجھے لگا میرا بدترین دشمن، میری ماں کا قاتل، میری ہنستی بستی زندگی تاراج کرنے والا سیٹھ سراج یہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ ان فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔ اور وہ راشی تھانے دار اشرف اور ان کا سرپرست ایم این اے گورایا۔ میرے بدن میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ بائیں طرف مڑنے والی یہی وہ سڑک تھی جو دو تین کلومیٹر آگے ایک چلڈرن پارک تک پہنچتی تھی۔ ساڑھے تین چار برس پہلے اسی چلڈرن پارک میں وہ واقعہ ہوا تھا جس نے میری زندگی کا رخ بدلا اور مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں نے ایک شریف کمزور نوجوان کو بیدردی سے مارا تھا۔ اسے نیم برہنہ کیا تھا، زمین پر

گھسیٹا تھا اور وہ شرمیلا سا چپ چاپ سا نوجوان اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ گھر واپس نہیں گیا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف چلا گیا تھا...... اپنا سر ریل کے پہیوں کے نیچے رکھنے کے لئے۔ پھر وہ ریل کے پہیوں سے تو بچ گیا تھا مگر گردشِ دوراں سے نہیں بچ پایا تھا۔ ہواؤں میں تنکے کی طرح اڑتا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس کی ماں بچھڑی، بہن اور بھائی بچھڑے اور وہ عزیز ہستی بچھڑی جو اس کی رگِ جاں میں بستی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ بس آنکھوں میں آنسو لے کر ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ اپنی بربادی کا نوحہ کرتا رہا...... لیکن آج...... آج وہ نوجوان کمزور اور بے بس نہیں تھا۔ وہ بدل چکا تھا۔ حالات کی بے رحم بھٹی نے اسے پگھلا کر ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ مرنا اور مارنا سیکھ گیا تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس عمران جیسا بے مثل ساتھی اور غم خوار تھا۔ وہ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بڑی سے بڑی مصیبت کا رخ بدل سکتا تھا۔

میرا جی مچل اٹھا۔ میرا دل چاہا آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میرا سامنا سیٹھ سراج سے ہو جائے۔ اس کی تنی ہوئی گردن، اس کی مغرور پیشانی، اس کی کینے سے بھری ہوئی آنکھیں، سب کچھ میرے سامنے آئے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور کہوں۔ ”میں آ گیا ہوں سراج! میرا نام تابش ہے اور میں ایک بیٹا ہوں۔“

عمران نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپکا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ ”حوصلہ رکھو جگر...... وہ سب کچھ ہو گا جو تم سوچ رہے ہو۔“

بھانڈیل اسٹیٹ میں عمران نے مجھے بتایا تھا کہ میری والدہ کے قتل کے بعد اس نے عاطف اور فرح کو راولپنڈی میں رکھا تھا لیکن اب وہ ہمیں ان سے ملانے کے لئے لاہور ہی کے کسی علاقے میں لے جا رہا تھا۔ وہ ہمیں شہر کے جنوبی علاقے میں ایک جدید رہائشی بستی میں لے آیا۔ باؤنڈری وال اور سکیورٹی انتظامات والی اس وسیع بستی میں بیشتر گھر دو اور چار کنال کے تھے۔ ہم دو کنال کے ایک خوب صورت گھر میں داخل ہوئے۔ یہاں باقاعدہ گارڈ موجود تھا۔ رہائشی حصے کے چاروں طرف خوب صورت ہریالی تھی۔ اس ہریالی کی تراش خراش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں فرح موجود ہے۔ وہ ایسے ہی پودوں کی دیکھ بھال کا خاص شوق رکھتی تھی۔

پروگرام کے مطابق عمران نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے ابھی تک فرح اور عاطف کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر میں اچانک ان کے سامنے آتا تو انہیں شدید ذہنی شاک

لگتا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ جان صاحب باہر لان میں دھوپ سینکتے رہے۔ قریباً دس منٹ بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ مجھے اپنی پیاری بہن فرح اور بھائی عاطف کی صورتیں نظر آئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی۔ پھر فرح چلاتی ہوئی بھاگی اور آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ عاطف نے بھی آگے بڑھ کر مجھے دیوانہ وار بانہوں میں جکڑ لیا۔

ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کھو کر پایا تھا اور درمیان میں بے یقینی کا ایک بہت طویل وقفہ تھا۔ یہ خوشی اور غم کی ایک ملی جلی یادگار کیفیت تھی۔ میں فرح اور عاطف کی پیشانیاں چومتا چلا گیا۔ ان کو اپنے ساتھ بھینچتا رہا۔

''بھائی! امی چلی گئیں۔ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئیں۔'' فرح روتے ہوئے بولی۔

عاطف بھی ہچکیوں سے رونے لگا۔ ہم کتنی ہی دیر اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو نظروں میں بھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ عمران کی مسکراتی صورت دروازے میں نظر آئی۔ ''چار بج گئے ہیں چائے کا وقت ہو گیا ہے حاضرین۔'' اس نے کہا اور خود ہی چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

فرح جلدی سے اٹھی۔ ''بھائی! آپ خود کیوں لے آئے؟ عبدل سے کہا ہوتا۔''

عمران نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں آج اتنا خوش ہوں کہ ٹی ٹرالی تو کیا ریت والی ٹرلی بھی آسانی سے دھکیل سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں...... بلکہ اگر تم کہو تو لگا کر دکھا بھی دیتا ہوں۔''

پھر اس نے ہمارے کہنے سے پہلے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر الٹی قلابازی لگائی۔ یہ ڈہری قلابازی تھی لیکن وہ پاؤں کے بل گرنے کے بجائے کمر کے بل ایک صوفے کے ہتھے پر گرا اور کمر پکڑ کر ''اف ہائے'' کرنے لگا۔

فرح کی اشک بار آنکھوں میں آنسو مسکرانے لگے۔ عاطف کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ عمران نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے ورنہ ڈہری قلابازی اس کے لئے چنداں مشکل نہیں تھی۔ وہ مسخرہ پن کر رہا تھا۔

عمران نے عاطف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عاطف نے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''لگتا ہے پریکٹس ختم ہو گئی ہے۔ ویسے بھی تمہارے بھائی کے ساتھ رہ رہ کر میری صلاحیتوں کا کباڑا ہو گیا ہے۔''

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی مگر کمر ڈہری ہی رہی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے

سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا ہے مگر سیدھا نہیں ہو پا رہا۔ وہ کراہا۔ ''اف یہ کیا ہو گیا ہے اب میں اپنی ریما جی کو کیا کمر دکھاؤں گا۔''

میں نے بیزار لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ کبڑا عاشق فلم بنائیں اور اس میں تمہیں ہیرو لے لیں۔''

عاطف آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''تابش بھائی جان! اگر عمران بھائی نہ ہوتے تو شاید ہم بھی اس وقت آپ کو یہاں صحیح سلامت نظر نہ آتے۔ انہوں نے ہمارے لئے وہ سب کچھ کیا جو ہم سوچ سکتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ آپ کی گمشدگی اور امی جی کی وفات کے بعد سیٹھ سراج کے بندے ہمیں بوگیر کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ہم کبھی ایک جگہ چھپتے کبھی دوسری جگہ۔ عمران بھائی ہماری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئے۔'' عاطف کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے سب پتا ہے عاطف۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک بات کا تجھے پتا نہیں۔'' عمران پھر چہکا۔ ''میں نے اپنی اور تیری اس بہن کے لئے بڑا اچھا بر بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ اگر مجھے تیری تلاش میں انڈیا نہ جانا پڑتا تو اب تک اس کے ہاتھ بھی پیلے ہو چکے ہوتے۔ بس بھانڈیل اسٹیٹ کے اس چکر نے سب کچھ لیٹ کیا ہے۔''

فرح کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ عاطف نے پوچھا۔ ''یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے کیا؟''

''یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی چھوٹی بہن ہے۔ تمہارے بھائی جان کھیلتے کھیلتے ادھر نکل گئے اور راستہ بھول گئے۔ اسٹیٹ کے ایک خدا ترس بزرگ نے انہیں گلیوں میں روتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ مسجدوں میں اعلان کرایا کہ ایک بچہ ملا ہے ''جن کا بچہ'' ہے آ کر لے جائیں۔ تو وہاں کے لوگ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ ''جن'' کا بچہ ہے۔ انہوں نے خدا ترس بزرگ کو تمہارے بھائی سمیت ایک تہ خانے میں بند کر دیا۔ اس کے آگے لمبی کہانی ہے۔''

عمران نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔ فضا کی سوگوار سنجیدگی کسی حد تک کم ہو گئی۔ فرح اور عاطف میرے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے تھے مگر اس کے لئے وقت درکار تھا۔ میں ان کے چیدہ چیدہ سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ ماں کی یاد ہم تینوں کی آنکھوں کو بار بار نم کرتی رہی۔ وہ منظر میں زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ سراج کے

غنڈے شیرے اور اس کے ساتھیوں نے ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے ''فروزن'' کندھوں کو بے رحم طریقے سے جھنجوڑا تھا۔ وہ انہیں بار بار جھنجوڑتے رہے تھے، یہاں تک کہ ماں جی نے برداشت کی آخری حدوں کو چھولیا تھا۔ پھر اس ڈر سے کہ میں ان کی بے پناہ اذیت کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہار جاؤں، عاطف اور فرح کے بارے میں نہ بتا دوں، انہوں نے خود کو دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ان کا پختہ فرش پر گرنا، ان کے سفید بالوں میں کھلا ہوا خون کا سرخ پھول۔ وہ سب کچھ میری تلخ ترین یادوں کا حصہ تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کی صعوبتوں میں اور زرگاں کے قاتل اندھیروں میں بھی میں ان مناظر کو بھول نہیں پایا تھا۔

ہم سب ماں جی کی قبر پر پہنچے۔ اس سفر کے لئے وہی تاریک شیشوں والی اسٹیشن ویگن استعمال کی گئی۔ میں قریباً ایک گھنٹا اپنی ماں کی قبر پر رہا اور اس کی مٹی اشکوں سے بھگوتا رہا۔ لوگوں کی نگاہ میں اور قانون کے کاغذوں میں میری بیمار ماں حادثاتی طور پر کھڑکی میں سے گرنے سے مری تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کیسے مری تھی۔ جلتی آنکھوں اور سلگتے سینے کے ساتھ میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں سیٹھ سراج کی ''دید'' کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ رات، عمران اور میں نے اس گھر میں عاطف اور فرح کے ساتھ گزاری۔ جان محمد صاحب ہمیں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ اس گھر میں ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ بھی موجود تھے، تاہم فرح نے ہمارے لئے خود کھانا پکایا۔ اس نے میری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور شاشلک اپنے ہاتھوں سے تیار کئے۔ ہم ایک مزے دار کھانا کھا چکے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ فرح مسلسل میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے میرا کندھا چوم لیتی تھی اور میرے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگتی تھی۔ میرے ہاتھ پہلے سے بہت سخت ہو چکے تھے۔ مارشل آرٹ کی نہایت کرخت مشقوں نے ان پر چنڈیاں سی ڈال دی تھیں۔ وہ اپنی ملائم انگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر چلاتے ہوئے بولی۔ ''بھائی جان! آپ کے ہاتھ ایسے کیوں ہیں؟ اور آپ کے پاؤں بھی ایک دم کھردرے نظر آتے ہیں؟''

''برف باری کی وجہ سے۔'' عمران نے جھٹ جواب دیا۔ ''سخت ٹھنڈ میں ایسا ہو جاتا ہے۔''

''لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میدانی علاقہ ہے۔'' فرح نے فوراً نکتہ اٹھایا۔

''مگر وہاں کا موسم عجیب سا ہے۔ گرمیوں میں برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ سردیوں میں ایک دم لو چلنے لگتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اس لُو کی وجہ سے عمران کو سرسام ہو گیا تھا۔ اب یہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔''

فرح نے ہماری نوک جھوک کو نظر انداز کیا اور میرے ہاتھوں کا معائنہ جاری رکھا، وہ بولی۔ ''بہت سخت ہو گئے ہیں آپ کے ہاتھ...... بلکہ آپ پورے کے پورے بہت بدلے ہوئے لگتے ہیں۔''

عمران مسکرایا۔ ''تم اور عاطف ٹھیک اندازے لگا رہے ہو۔ تابش میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ شاید تمہیں بھروسا نہ ہو۔ اب تمہارا بھائی بھانڈیل اسٹیٹ کا ہر دلعزیز ہیرو ہے۔ ایک موقع پر اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے کڑک شخص کو دوبدو مقابلے کا چیلنج دیا اور نہ صرف چیلنج دیا بلکہ اسے ہرایا بھی۔ اگر اس نے یہ کارنامہ انڈیا یا پاکستان کے کسی بڑے شہر میں میڈیا کے سامنے انجام دیا ہوتا تو آج اس کے نام کا ڈنکا پورے ایشیا میں بج رہا ہوتا۔''

پھر عمران اس واقعے کی دیگر تفصیلات سے عاطف اور فرح کو آگاہ کرنے لگا۔ اس نے بارونداجیکی کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ کس طرح اس جاں بلب شخص نے مہینوں تک مجھے تربیت دی اور ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

یہ ساری رُوداد فرح اور عاطف کے لئے بے حد تعجب خیز تھی۔ عمران سب کچھ تفصیل سے شاید اس لئے بھی بتا رہا تھا کہ وہ فرح اور عاطف میں حوصلہ جگانا چاہتا تھا۔ ان کو بتانا چاہتا تھا کہ بے شک انہیں بڑے بھائی کی چار سالہ جدائی سہنا پڑی ہے لیکن اب اس بھائی کی صورت میں انہیں ایک مضبوط اور ناقابلِ شکست سہارا میسر ہے۔

عاطف نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان! بارونداجیکی کا نام تو کہیں میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ وہ شروع میں ایکٹنگ وغیرہ کرتا تھا؟''

''شروع میں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شروع سے ہی فائٹر تھا۔ ایکٹنگ وغیرہ میں تو اسے لوگوں نے بعد میں گھسیٹا اور یقیناً اس نے دونوں میدانوں میں بڑا نام کمانا تھا مگر وقت اور زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔''

''آپ نے ہمیں ایک دردناک کہانی سنائی ہے۔'' عاطف نے جیکی اور شکنتلا کی پوری رُوداد سننے کے بعد کہا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک اور دردناک کہانی بھی ہے۔ لیکن وہ پھر کبھی سہی۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ یقیناً عمران کا اشارہ سلطانہ والے اندوہناک واقعے کی طرف تھا...... سلطانہ کا خیال آتے ہی بالو کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں بھی میری نگاہوں میں گھومنے لگیں۔

فرح کے معصوم چہرے پر اندیشے سے تھے۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بھائی؛ آپ کہہ رہے ہیں کہ جارج گورا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اس کے ساتھی اور رشتے دار بھی ایسے ہی ہوں گے۔ سنا ہے کہ وہ لوگ ایسی دشمنیوں کو بھولتے نہیں۔ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟''

''کس بات کا؟''

''وہ جارج گورا، بھائی کے پیچھے یہاں آ جائے؟''

عمران نے جارج گورا والی رُوداد میں فرح اور عاطف کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سامبر مقابلے میں جارج گورا کی انتڑیاں اکھاڑے میں بکھر گئی تھیں اور وہ ہلاک ہو گیا تھا۔ عمران نے فقط اس کے زخمی ہونے کا ذکر کیا تھا۔ فرح بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ جارج گورا ہی نہیں اور کئی افراد بھی میرے ہاتھوں راہیِ عدم ہو چکے ہیں۔ اور تو اور قاسمیہ کی خوں ریز لڑائی کا نقشہ ہی ہم کھینچ دیتے تو فرح اور عاطف ہکا بکا رہ جاتے۔ اب وہ ساری باتیں ایک خونچکاں افسانے کی طرح لگتی تھیں۔

عمران نے فرح کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں بھئی۔ تابش اور جارج کے درمیان کوئی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک مقابلہ تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ شرطیں لکھی گئی تھیں اور مقابلے میں کسی کی بھی ہار جیت ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی وہ باب اب بند ہو چکا ہے۔ اب بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی چودہ اگست ہو چکا ہے۔''

''چودہ اگست؟'' فرح نے پوچھا۔

''بھئی، یومِ آزادی۔ گورے بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ لئے ہیں وہاں سے۔''

فرح اور عاطف ہم سے سوال کرتے رہے...... ہم جواب دیتے رہے۔ وہ تعجب میں ڈوب کر سنتے رہے۔ یہ سب کچھ ان کے لئے کسی قدیم کہانی جیسا تھا۔ ہیٹر روشن تھا۔ ہم سبز چائے پی رہے تھے اور کھڑکیوں سے باہر لاہور کی وسعت کو گہری دھند ڈھانپتی جا رہی تھی۔ ہم سب کچھ فرح اور عاطف کو نہیں بتا سکتے تھے۔ میں نے انہیں اپنی چار سالہ طویل کہانی کے مختلف ٹکڑوں سے آگاہ کیا۔ میرا ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گرنا، اپنے ہوش و حواس کھونا اور اسی حالت میں بھانڈیل اسٹیٹ پہنچ جانا۔ میں نے سب کچھ فرح اور عاطف کو بتایا۔ وہ یہ سن کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے کہ یہاں سے اوجھل ہونے کے بعد میں قریباً ڈھائی

سال تک اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں رہا۔ یعنی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کون ہوں۔ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ کے حالات بھی ان دونوں کو بتائے۔ وہاں کی کہنہ رسمیں، وہاں کے تنازعے، انگریزوں اور مقامی لوگوں کی کشمکش۔ وہاں کے فرسودہ عقیدے اور مار دھاڑ۔ میں نے بہت کچھ فرح اور عاطف کے گوش گزار کیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے رہے۔

رات گئے گفتگو کا رخ ایک بار پھر ماں جی اور ثروت کی طرف چلا گیا۔ شروع میں پولیس نے ماں جی کی موت کو حادثہ قرار دیا تھا مگر بعدازاں عمران کی کوشش سے مقامی تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی تھی۔ اس میں سیٹھ سراج، اس کے کارندے شیرے اور اکبر کے نام شامل تھے۔ تفتیش شروع ہوئی تھی تو سیٹھ سراج کے کئی اور جرائم بھی سامنے آئے جن میں نوادرات کی ہیرا پھیری، ڈکیتی اور اغوا کے الزامات تھے۔ اس پر تین چار اور پرچے کٹ گئے۔ پرچوں کی بھرمار اور عمران کے بڑھتے ہوئے خوف سے وہ ایک دم زیرِ زمین چلا گیا تھا۔ شیرا اور اس کے دو چار قریبی ساتھی بھی روپوش ہو گئے تھے۔ اس سارے معاملے کا ایک اہم کردار سراج کا لفنڈر بیٹا واجد تھا۔ یہ واجد عرف واجی ہی تھا جس نے اس المناک کہانی کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اپنی غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے سڑک سے اٹھا کر لے گیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ واجی کے بارے میں عمران نے بتایا تھا کہ سیٹھ سراج نے روپوش ہونے سے پہلے ہی بیٹے کو بیرونِ ملک فرار کرا دیا تھا۔ وہ یورپ ہی کے کسی ملک میں تھا۔

میں نے فرح اور عاطف سے پوچھا۔ ''تم دونوں کے پاس ثروت کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟''

ثروت کے نام پر دونوں کے چہروں پر غم کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ فرح نے کہا۔ ''اس بارے میں بھی آپ کو عمران بھائی ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں بتاتا۔ بس یہی کہتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے تک وہ جرمنی میں تھی۔ یوسف نامی ایک لڑکے سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ شادی ہو چکی ہے یا نہیں، اس بارے میں یہ کچھ نہیں بتاتا۔''

''مجھے معلوم ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ اب ہم آ گئے ہیں۔ جرمنی بھی ہم سے کون سا دور ہے۔ دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں کیا حالات ہیں۔'' عمران بولا۔

پتا نہیں کیوں وہ جب بھی ثروت کے بارے میں بات کرتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ

چھپا رہا ہے۔ ہماری گفتگو کو اچانک بریک لگ گئے۔ عمران کے موبائل پر کال آ گئی تھی۔ یہ جان محمد صاحب کی کال تھی۔ جان محمد صاحب کی مدبر اور ہمدرد شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ عمران کی رُوداد سننے کے بعد میں نے ایک بڑی سرکس کمپنی کے اس کرتا دھرتا کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا، وہ اس پر پورے اترے تھے۔ انہوں نے فون پر عمران کو بتایا کہ مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا گیری بات کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے آٹھ دس روز بعد ایک زبردست ایونٹ میں حصہ لینا تھا۔ عمران اس سے باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں، فرح اور عاطف پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ فرح کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اسے میرے ملنے کی بے انتہا خوشی بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک فکر بھی گھیرتی جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں ماں جی کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لئے خطرے مول لوں گا۔

وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہے تو قانونی طریقے سے کروں۔ عاطف ایک بڑے وکیل کا پتا بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے ایک دوست کا والد ہے اور معقول فیس پر یہ کیس بڑے اچھے طریقے سے لڑ سکتا ہے۔

ان دونوں کی سنجیدہ گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ گزرے ہوئے ساڑھے تین چار برسوں میں وہ دونوں کافی میچور ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی طبیعت کا الابالی پن اور شوخی اب ان کے اندر کہیں دب چکی تھیں ان کی اس تبدیلی نے نہ جانے کیوں مجھے آزردہ کیا۔ میں ان دونوں کی باتیں سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میرے اندر کچھ اور طرح کی آگ جل رہی تھی۔

O.....❖.....O

سیٹھ سراج اور شیرا ابھی تک منظر سے اوجھل تھے۔ عمران نے اپنے ذرائع سے پتا کرایا۔ معلوم ہوا کہ آٹھ دس ماہ پہلے سیٹھ سراج کراچی میں دیکھا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک سیاسی شخصیت کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی تھی۔ ایک خوبصورت تھائی خاتون بھی اس کے ساتھ تھی۔ قیافہ تھا کہ وہ تھائی لینڈ سے آیا تھا اور وہیں واپس چلا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے پس پردہ رہ کر کراچی میں ہی اپنی جائز اور ناجائز سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہوں۔ میرے اور عمران کے درمیان طے تھا کہ ہم جلد سے جلد سیٹھ سراج اور شیرے کا کھوج لگائیں گے لیکن اس سے پہلے عمران کو وہ کام بھی سرانجام دینا تھا جس کے لئے مجھے اور اسے آناً فاناً الٰہ آباد سے اٹھا کر یہاں لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب ڈرامائی طریقے سے ہوا تھا۔ ہم وہیں پہنچے تھے جہاں ہمیں پہنچنا تھا لیکن کسی اور ڈھنگ سے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اقبال، میڈم صفورا اور بالو وغیرہ ابھی تک انڈیا میں ہی تھے۔ مسٹر ریان ولیم نے عمران سے

وعدہ کیا تھا کہ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور وہ جہاں بھی ہوئے، انہیں جلد از جلد پاکستان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ریان ولیم نے اتر پردیش میں بہت سے مقامی لوگوں کو متحرک کر دیا تھا اور امید تھی کہ دو چار دن کے اندر اس سلسلے میں کوئی اچھی خبر مل جائے گی۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا، عمران بھی اس حوالے سے لاتعلق نہیں تھا، وہ اپنے طور پر بھی کوشش کر رہا تھا۔

اٹھائیس تاریخ سر پر تھی۔ وہ دن قریب آ رہا تھا جب عمران کو ایک بڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔ ریان ولیم نے عمران کو وی آئی پی مہمان کی حیثیت دے رکھی تھی۔ وہ اسی شاندار وِلا میں رہ رہا تھا جہاں ہم لاہور پہنچتے ہی اترے تھے۔ یہ جگہ مشہور منٹو پارک کے قریب واقع تھی۔ قریباً آٹھ کنال پر پھیلی ہوئی اس قدیم کوٹھی کی اندرونی آرائش زبردست تھی۔ بلند و بالا ستون، محرابی دروازے، اونچی چھتیں اور چاروں طرف احاطے میں اونچے درخت۔ یہ انگریزوں کے دور کی رہائش گاہ تھی۔ کبھی یہاں کوئی بڑا انگریز لارڈ رہائش پذیر تھا۔ اس نے گرم دوپہریں گزارنے کے لئے کمروں کے اندر ہی چھوٹے چھوٹے حوض بنائے ہوئے تھے۔

پچھلے دو روز سے میں بھی عمران کے ساتھ ہی تھا اور اس غیر معمولی مہمان نوازی کا تجربہ کر رہا تھا جو یہاں عمران کے حصے میں آئی تھی۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی عزت افزائی کبھی کبھی عمران کو بھی پریشان کر دیتی تھی۔ چھبیس تاریخ کی شام کو چند نہایت خوش پوش افراد عمران سے ملنے کے لئے آئے۔ ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ مال و دولت کے انبار پر بیٹھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے دو سفید فام تھے جن میں سے ایک کی ناک بالکل ٹماٹر کی طرح سرخ تھی۔ دو جاپانی تھے، ایک عربی اور ایک کا تعلق ملائشیا یا سنگاپور وغیرہ سے تھا۔ ان کی توجہ کا مرکز عمران ہی تھا۔ انہوں نے کھُل مل کر عمران سے باتیں کیں۔ ان کی دلچسپی ریوالور کے اس کھیل میں تھی جسے عمران کئی بار کامیابی سے کھیل چکا تھا۔ ایک چھ...... دو چھ...... اور تین چھ کا کھیل۔ ان افراد میں سے کئی ایک کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ عمران منہ مانگے معاوضے پر انہیں اس کھیل کی کوئی جھلک دکھائے مگر یہ خواہش کسی کی زبان پر نہیں آئی۔ وہ سب جانتے تھے کہ صرف دو دن بعد عمران کو ایک بہت بڑے شو کا حصہ بننا ہے۔ ایک بہت بڑا انعامی گیم۔ اس گیم میں شمولیت کی خاطر پچھلے مہینوں میں عمران کو انڈیا اور پاکستان کے طول و عرض میں دیوانہ وار ڈھونڈا گیا تھا اور اب ریان صاحب کی خوش قسمتی سے وہ یہاں موجود تھا۔

یہ لوگ واپس گئے تو عمران سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے ضرورت سے زیادہ بانس پر چڑھا رہے ہیں یہ لوگ۔ اگر بے عزتی خراب ہو گئی پھر؟ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔''

''بھاگ جاؤ گے تو بے عزتی خراب نہیں ہو گی؟''

''چلو، آنکھوں کے سامنے تو نہیں ہو گی۔ پیٹھ پیچھے تو بڑے بڑے لوگ بے عزت ہو جاتے ہیں۔''

''مگر تم تو میڈیا کے بندے ہو۔ تم تو بے عزتی کرنے والے طبقے سے ہو۔ بے عزتی ''کروانے'' کا تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے تمہیں؟''

''ہاں، یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ جب بے عزتی ہو رہی ہو تو کس طرح کا منہ بناتے ہیں۔ بے عزتی کے بعد کس طرح نیچے نیچے ہو کر کھسکتے ہیں اور پھر کیسے دوبارہ سے ڈھیٹ بن کر دکھاتے ہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ راہنمائی فرما سکتے ہو؟''

میں مسکرایا۔ ''تم ہاتھ دھو کر اپنی بے عزتی کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی تمہیں عزت مل جائے، جس سے تم پیدائشی طور پر محروم ہو۔ یار! صرف تین سوالوں کے درست جواب اور ایک بہت بھاری رقم ریان ولیم کے اکاؤنٹ میں۔ اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تمہیں بھی ملے گا۔''

''میں اس میں سے آدھا تمہیں دے دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر بے عزتی ہوئی تو پھر آدھی تم کراؤ گے۔ دس دھکے پڑے تو پانچ تمہارے، پانچ میرے۔ بیس کلمہ ہائے لعنت و پھٹکار سننے پڑے تو آٹھ میرے، بارہ تمہارے۔''

''بھئی! یہ لعنتوں کے کھاتے میں ڈنڈی کیوں مار رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے ان سوالوں کی وجہ سے ہی میرا دماغ پلپلا ہوا ہے۔ اب جو نا کامی بھی حصے میں آئے گی، اس پلپلے دماغ کی وجہ سے ہی آئے گی۔ تمہیں اس کی سزا تو ملنی چاہیے۔''

''سزا تو مل رہی ہے مجھے۔ رات دن تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں پکڑ رکھا ہے۔''

میں واقعی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا خدا حافظ۔''

''کبھی کبھی خط لکھتے رہنا۔'' وہ پکارا۔

''اس کی بھی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''او تیری تو ایسی کم تیسی...... بھاگڑ بلے...... میری زندگی تباہ کر کے، مجھے ودھوا بنا کر جانا چاہتے ہو؟''

اس نے جست لگا کر مجھے عقب سے چھاپ لیا۔ ہم دونوں اوپر نیچے قالین پر گرے۔ میں نے اس کی گدی پر گھونسا جڑا۔ جواباً اس نے میرے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ ہم باقاعدہ کشتی لڑنے لگے۔ ڈرائنگ روم کی کئی بیش قیمت چیزیں ٹوٹ گئیں۔ باورچی، ملازمین ہکا بکا ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو دو گارڈز نے ہمیں چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ سمجھ گئے کہ یہ دوستانہ لڑائی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو نپی تلی ضربیں لگائیں۔ یہ ایسی چوٹیں تھیں جن سے شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک طرح سے لہو گرم رکھنے کا بہانہ تھا۔ ہم جب بھی اس طرح گتھم گتھا ہوتے تھے، وہ ایک طرح سے عمران کی مہارت اور میری برداشت کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اچانک عمران کی گردن مرے بازو میں آ گئی۔ اس نے عورتوں جیسی باریک آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... اس غنڈے سے بچاؤ۔''

''تم تو فرما رہے تھے، میں تمہارا شوہر ہوں؟''

''تو کیا شوہر زبردستی نہیں کر سکتے۔'' اس نے ترت جواب دیا اور ایک بار پھر چلانے لگا۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... مردانہ پولیس کو بلاؤ۔''

''مردانہ کو کیوں؟'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''زنانہ پولیس کا بڑا شوق ہے تمہیں۔'' اس نے کہا اور پھر اچانک مجھ اڑنگا لگا کر پیچھے کی طرف گرا دیا۔ اب میں اس کے شکنجے میں تھا۔ اس نے مجھے جوڈو کی تکنیک سے فرشی داؤ لگایا اور تقریباً بے بس کر دیا۔

''کیسا ہے؟'' اس نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ ''شوہر ہونے کا جھانسا دے کر کسی کو بھی اس طرح بے دست و پا کیا جا سکتا ہے۔ اب لگاؤ کانوں کو ہاتھ۔''

میں نے اس کے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''بڑے کھوچل ہو تم۔'' اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ملازمین اس تفریح سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

عمران کپڑے جھاڑ کر بولا۔ ''یہ مشرقی اور مغربی عورتیں اسی طرح پہلے اپنے شوہروں کو بانس پر چڑھاتی ہیں پھر چاروں شانے چت کر دیتی ہیں۔ ایسا فرشی داؤ لگاتی ہیں کہ بے چارہ ہل بھی نہیں سکتا...... یہ جارج پنجم کا نام سنا ہوا ہے نا تم نے؟''

''ہاں، سنا ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''وہ ایک ایسے ہی داؤ کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ بے چارہ خود بھی ساری عمر عورتوں سے ڈرتا رہا۔''

ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف تین چار منٹ کی دھینگا مشتی میں ہم نے اس کمرے میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا نقصان تو کر ہی دیا تھا۔ دو نہایت قیمتی گل دان، ایک امپورٹڈ ٹیلی فون سیٹ اور شیشے کی ایک بڑی تپائی چکنا چُور ہو گئے تھے۔

اسی دوران میں جان محمد صاحب اور مسٹر ریان ولیم بھی آن وارد ہوئے۔ شاندار ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ پھر ان کی نگاہیں ہمارے حلیے پر پڑیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

''کیا ہوا ایمران (عمران)۔'' ولیم صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں تھوڑی سی مشق کر رہا تھا...... مار کھانے کی۔''

''کیا مطلب؟''

وہ مسکرایا۔ ''اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تو مجھے پتا ہے جان انکل نے میری بڑی درگت بنانی ہے۔''

''تم بہادر آدمی ہو۔ تمہیں منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہئے۔'' ریان ولیم نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ جان صاحب تمہارے ساتھ کسی طرح کا برا سلوک کر سکتے ہیں۔ یہ تو تمہارے بہت بڑے مداح ہیں۔''

''مداح ہی درگت بھی بناتے ہیں جناب! آپ نے کرکٹرز کی شامت آتے نہیں دیکھی؟''

''تم دلچسپ آدمی ہو ایمران۔'' ولیم مسکرایا۔

''شکریہ جناب! مگر اس ٹوٹ پھوٹ کا مجھے واقعی افسوس ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔''

''تم ہمارے قابلِ قدر مہمان ہو اور اس مقابلے کے بعد بھی رہو گے۔ رہی نقصان کی بات تو اس سے دس گنا بھی ہو جاتا تو پروا نہیں۔''

اس کے بعد سنجیدہ گفتگو شروع ہوئی۔ ولیم اور جان محمد صاحب نے عمران کو تفصیل سے آگاہ کیا کہ یہ کھیل کس طرح ہو گا۔ رُول کیا ہیں اور کھیل کی ٹائمنگ وغیرہ کس طرح ہو گی...... انہوں نے بتایا کہ امریکا، جنوبی امریکا، جاپان، انڈیا اور یورپ کے کئی ممالک میں یہ گرینڈ شو مخصوص ٹی وی چینلز پر دکھایا جائے گا۔ موقع پر بھی کافی لوگ موجود ہوں گے۔ ان میں سے

زیادہ تر کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہو گا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جناب! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ امریکا یا یورپ کے کسی بڑے شہر میں ہونے کے بجائے یہ شو پاکستان میں ہو رہا ہے...... اور لاہور میں ہو رہا ہے؟''

''یہ اچھا سوال کیا ہے تم نے۔'' ولیم صاحب نے کہا۔ ''...... دراصل اس شو کے لئے شہر کے انتخاب کا طریقہ دلچسپ ہے۔ قرعہ اندازی سے پانچ شہر منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو سکتے ہیں۔ بعد ازاں ان پانچ شہروں کے بارے میں ''فزیبلٹی'' رپورٹ تیار ہوتی ہے اور ایک کمیٹی ان میں سے ایک شہر کا انتخاب کثرتِ رائے سے کر لیتی ہے۔ اس دفعہ پانچ شہروں کی لسٹ میں صرف دو ہی نمایاں شہر تھے۔ کولمبو اور لاہور۔ لہٰذا لاہور کا انتخاب ہو گیا۔''

''یہ شو کس جگہ منعقد ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کو ابھی راز ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔'' فربہ اندام ریان ولیم نے مسکرا کر کہا۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں کا گوشت اوپر کی طرف سفر کرتا تھا اور اس کی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر دیتا تھا۔

○......❖......○

شام سات بجے کے قریب ہمیں سکیورٹی گارڈز نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ یہ بڑے چاق و چوبند...... تربیت یافتہ اور شائستہ تھے۔ نہایت معتبر سکیورٹی ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بار پھر بڑی معذرت کے ساتھ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی اور ہمیں ایک بڑی اسٹیشن وین میں بٹھا دیا گیا۔ جان صاحب نے ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔

لاہور کی مختلف سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہم ایک نسبتاً کشادہ علاقے میں نکل آئے۔ آوازوں کے ذریعے شہر کی گہما گہمی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ہم ایک خاص ایونٹ میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ اس ایونٹ کے حوالے سے کئی طرح کا تجسس ذہن میں موجود تھا۔ ایونٹ میں حصہ لینے والے گیری گرانٹ کے حوالے سے عمران کو جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق گیری...... ریان ولیم کا سگا بھتیجا نہیں تھا۔ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور یہ پڑھی لکھی فیملی تھی۔ اس انعامی مقابلے کے حوالے سے ریان ولیم کی نظرِ انتخاب گیری پر پڑی تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق گیری ''جلدی بیماری برص'' میں بھی مبتلا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد ہم ایک زمین دوز پارکنگ لاٹ میں رک گئے۔

ہماری آنکھوں پر اب بھی پٹیاں تھیں۔ ہمیں کسی نیم گرم کوریڈور سے گزار کر ایک وسیع جگہ پہنچایا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کافی لوگ موجود ہیں۔ ہماری آنکھوں سے پٹیاں ہٹائی گئیں۔ ہم نے خود کو ایک آرام دہ کیبن میں پایا۔ یہاں صوفے تھے۔ میز پر سافٹ ڈرنکس اور وہسکی وغیرہ موجود تھیں۔ ایک طرف دو فون سیٹ بھی پڑے تھے۔ ایک سرخ، ایک سبز۔ کیبن میں سامنے کی طرف تقریباً آٹھ ضرب بارہ فٹ کا شیشہ لگا ہوا تھا۔

ہم نے ایک نیچی چھت والا گول ہال دیکھا۔ اس جدید ہال کے چاروں طرف آرام دہ نشستوں پر دو ڈھائی سو کے قریب افراد موجود تھے۔ یہ سب ایلیٹ کلاس کے خوش پوش لوگ تھے۔ دو درجن کے قریب خواتین بھی ان میں شامل تھیں۔ ان میں ہر رنگ کے افراد نظر آتے تھے۔ جاپانی، یورپین، مشرقِ وسطیٰ کے باشندے اور رشین وغیرہ۔ اس گول ہال کے بیچوں بیچ شیشے کا ایک شاندار چیمبر تھا۔ یہ چیمبر بھی گولائی میں تھا اور اس کے اندر دو نشستیں موجود تھیں۔ اس چیمبر کی اونچائی ہال کے فرش سے آٹھ دس فٹ زیادہ تھی۔ اس گول چیمبر کی لائٹنگ اس طرح سے کی گئی تھی کہ یہ ایک جاذب نظر روشنی میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ چیمبر کے اندر ایک ایسا اسکور بورڈ تھا جسے چاروں طرف سے بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

ہمارے کیبن میں جان محمد صاحب پہلے سے موجود تھے۔ عمران نے پوچھا۔ ''جان انکل! آپ کو بھی پٹی باندھ کر لایا گیا ہے؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہاں موجود سارے تماشائی اسی طرح لائے گئے ہیں۔''

''وجہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''وجہ تو یہی لوگ بتا سکتے ہیں اور وہ بتائیں گے نہیں۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔

موقع پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایک عجیب سی سنسنی نے ہر شخص کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ جدید قسم کے ٹی وی کیمرے ان تمام مناظر کی کوریج کر رہے تھے۔ تاہم ان کیمروں کو اس طرح ''انسٹال'' کیا گیا تھا کہ وہ منظر کی مجموعی دلکشی پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ موسیقی کی دھنیں دلوں کو گرما رہی تھیں۔ اسی دوران میں فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دو خوش پوش دوست بھی کیبن میں آ گئے اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں ٹماٹر کی ناک والا چالیس بیالیس سالہ شخص بھی تھا...... اور پھر فل لائٹس کے ساتھ شو کا آغاز ہو گیا۔ ایک لمبا تڑنگا خوش لباس سفید فام، شیشے کے چیمبر میں داخل ہوا اور اہل تالیوں سے گونج اٹھا۔

جان صاحب نے سرگوشی میں بتایا۔ ''یہ مشہور امریکی چینل سی این این کا ایک سابق

ہوسٹ ہے۔''

''ہاں، شکل کچھ کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔'' عمران کہا۔

امریکن کمپیئر اپنی خوبصورت پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''خواتین و حضرات! آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ہم اس شو کا آغاز کرتے ہیں جس کے لئے آپ کی نگاہیں اور سماعتیں قریباً آٹھ ماہ سے منتظر تھیں۔ دنیا بھر میں موجود اپنے ان گنت ناظرین تک میرا اسلام پہنچے۔''

اس تمہید کے بعد کمپیئر نے کہا۔ ''پچھلے شو کے آخر میں آپ نے دیکھا تھا کہ ہمارے ذہین و خوش قسمت دوست مسٹر گیری گرانٹ نے کامیابی سے کھیل کے پہلے تین مرحلے طے کر لئے تھے۔ بغیر کوئی لائف لائن استعمال کئے، وہ چوتھے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تک کے اعصاب شکن مقابلے میں انہوں نے جو انعامی رقم اپنے نام کی ہے، اس کی مالیت دو ملین ڈالرز ہے۔ اب میں انہیں تشریف لانے اور پھر سے ''ہاٹ سیٹ'' پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں۔''

مسٹر ریان ولیم کا مبینہ بھتیجا گیری گرانٹ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔ اپنے تایا کی طرح اس کا جسم بھی فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی، عینک لگا رکھی تھی اور تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک شائستہ نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شخصیت کی نمایاں بات اس کے چہرے کے سفید داغ تھے۔ پھلبہری کے یہ داغ زیادہ پھیلے ہوئے تو نہیں تھے پھر بھی اس کی شباہت کو داغ دار کرتے تھے۔

گیری ہاٹ سیٹ پر براجمان ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ہینڈسم کمپیئر نے رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد گیری کا حال چال پوچھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی ہلچل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اس سنسنی خیزی کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ گیری کے سامنے آ بیٹھا اور اناؤنسمنٹ کے انداز میں بولا۔ ''تو حاضرین! ہم اس سنسنی خیز مقابلے کا آغاز کرتے ہیں۔ اب مسٹر گیری کے سامنے صرف اور صرف تین سوال ہیں۔ ہر سوال کے صحیح جواب کے بعد ان کی انعامی رقم دگنی ہو جائے گی اور تیسرے سوال کے جواب کے بعد یہ پہنچ جائیں گے گرینڈ پرائز یعنی سولہ ملین ڈالرز تک۔ جی ناظرین! سولہ ملین ڈالرز۔ مقامی کرنسی میں قریباً ایک سو بیس کروڑ۔''

ہال ایک بار پھر زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس میگا شو کے حاضرین میں کئی اہم شخصیات موجود تھیں۔ فٹ بال کے ایک انٹرنیشنل کھلاڑی اور ہالی وڈ کے ایک ایکٹر کو ہم دور سے بھی پہچان سکتے تھے۔

کمپیئر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر کھیل کے کسی بھی مرحلے میں مسٹر گیری کو سوال مشکل محسوس ہوا اور انہیں جواب دینے میں خطرہ نظر آئے تو وہ اس کھیل کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جیتی ہوئی رقم کے حق دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ غلطی سے غلط جواب دے بیٹھے تو پھر انہیں اکتفا کرنا ہوگا ابتدائی انعامی رقم یعنی صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر اور یہی اس کھیل کی ساری خوبصورتی ہے۔“

ہال میں ایک بار پھر تالیاں گونجیں۔

کچھ دیر بعد کھیل کے اس اہم مرحلے کا پہلا سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ سوال کچھ یوں تھا۔ ”نیلا رومال، ایک معروف فن پارے کا نام ہے۔ اس کا تعلق دوسری جنگ عظیم سے ہے۔ یہ فن پارہ کیا ہے؟“

آپشن نمبر ایک ناول...... آپشن نمبر دو پینٹنگ...... آپشن نمبر تین گیت...... آپشن نمبر چار فلم۔“

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ہر نگاہ پچیس چھبیس سالہ گیری پر مرکوز تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اس مشکل مرحلے کا پہلا سوال ہی اس کی سمجھ سے باہر کا نکلا ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کیبن میں ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دونوں دوستوں کے چہروں پر بھی اضطراب صاف نظر آیا۔ ان دونوں دوستوں میں ایک تو وہی ٹماٹر کی ناک والا غصیلا سا شخص تھا۔ دوسرا کوئی پروفیسر ٹائپ نظر آتا تھا۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”لگتا ہے کہ سرمنڈواتے ہی اولے پڑ گئے ہیں۔“

”جی مسٹر گیری!“ کمپیئر کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”آپ کے ذہن میں کیا جواب آ رہا ہے؟ آپ اگر چاہیں تو بلند آواز میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے دلچسپ ہو گا۔“

گیری ایک بار پھر پریشان انداز میں مسکرایا۔ اس نے ”ہاٹ سیٹ“ پر پہلو بدلا اور اپنی فرنچ کٹ داڑھی سہلاتے ہوئے بولا۔ ”خاصا مشکل سوال ہے۔“

”انعام بھی تو بہت بڑا ہے مسٹر گیری! آپ کا انعام دگنا ہونے جا رہا ہے۔ دو ملین ڈالرز سے چار ملین ڈالرز۔ آپ کے پاس چار آپشنز ہیں اور آپ کی تینوں لائف لائنز (فون کالز) آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ آپ اچھی پوزیشن میں ہیں۔ آپ اپنا وقت لیں اور تحمل

سے غور کریں۔ آپ کے ذہن میں کیا آ رہا ہے؟“

گیری ذرا ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”نیلا رومال...... یہ بظاہر تو کسی ناول یا افسانے کا عنوان لگتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ کسی ناول کا نام ہو...... فکشن پڑھنے میں مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی...... جہاں تک فلم کا تعلق ہے...... کم از کم میری نظر سے تو اس طرح کی کوئی فلم نہیں گزری۔ ایک فلم شاید سرخ رومال کے نام سے میں نے دیکھی تھی......“

”پینٹنگز کی طرف آپ کا دھیان جاتا ہے؟“ کمپیئر نے پوچھا۔ ”کیونکہ اکثر مصور اپنی پینٹنگز کو عنوانات بھی دیتے ہیں۔“

”جی ہاں، دھیان تو جا رہا ہے۔“ گیری نے اپنا بڑا سا سر ہلایا۔ ”عنوان میں رنگ کو خاص اہمیت دی گئی ہے...... اور پینٹنگز میں رنگ ہی سب کچھ ہوتے ہیں لیکن......“ وہ گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔

گھڑی کی سوئیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ تقریباً پندرہ کروڑ یعنی دو ملین ڈالرز کے اس سوال کے لئے گیری کے پاس کل آٹھ منٹ تھے۔ بے شک یہ ایک مشکل سوال تھا۔ ہمارے کیبن میں موجود کسی فرد کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سوال کے جواب کے بارے میں کوئی قوی امکان ذہن میں رکھتا ہے۔ گیری کے لئے ایک آسانی موجود تھی۔ اسے کل تین سوالوں کے جواب دینے تھے اور اس کے پاس تینوں لائف لائنز موجود تھیں...... یعنی دو تین فون کالز کر سکتا تھا۔

تقریباً چار منٹ گزر گئے تو اس نے کمپیئر کو بتایا کہ وہ فون کال کرنا چاہتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے ہوئے سرخ فون سیٹ کی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔ پروگرام کے مطابق عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے برٹش لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔ ”ایمران! سوال تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ نیلا رومال ایک فن پارے کا نام ہے...... اس کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔ ہمیں بتانا ہے کہ یہ فن پارا کیا ہے...... ناول؟ پینٹنگ؟ گیت یا فلم؟“

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں ناول اور فلم کو تو رد کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ ایک مشہور فن پارہ ہے اور ناول یا فلم کی صورت میں ہے تو پھر اس ہال میں موجود کچھ نہ کچھ لوگوں کو ضرور اس کا پتا ہونا چاہئے۔ مگر جہاں تک میں جج کر رہا ہوں، میرے اردگرد موجود کسی شخص کا چہرہ یہ ظاہر نہیں کر رہا کہ وہ اس سوال کا حتمی جواب جانتا ہے۔ اب دو آپشن رہ جاتے ہیں۔ نیلا رومال کسی پینٹنگ کا عنوان ہے یا گیت کا عنوان ہے۔ میرے خیال میں یہ ففٹی ففٹی کا چانس بنتا ہے۔“

''تم کیا چانس لو گے ایمران؟'' گیری نے پوچھا۔

عمران نے چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔ مجھے یاد آیا، یہ وہی تاثر تھا جو ایک چھ اور دو چھ کا کھیل کھیلتے ہوئے اس کے چہرے پر آتا تھا۔ ریوالور کے ایک خانے میں گولی اور پانچ خانے خالی یا پھر دو میں گولی اور چار خانے خالی۔ ایک وجدانی سی کیفیت اس نے کہا۔ ''میں آپشن نمبر تین کی طرف جاؤں گا۔ نیلا رومال ایک گیت ہے۔''

فون کال کا وقت صرف دو منٹ کا تھا اور یہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ لائن منقطع ہو گئی۔ اب گیری کو جواب دینا تھا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں۔ کمپیئر نے گیری کی کیفیت سے لطف اندواز ہوتے ہوئے اور سنسنی کو بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں مسٹر گیری! آپ کیا جواب دینا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو گیم کا رول ایک بار پھر بتا دیتا ہوں۔ آپ دو ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ درست جواب دیں گے تو آپ کی انعامی رقم ہو جائے گی چار ملین ڈالرز...... انعامی کرنسی میں یہ قریباً تیس کروڑ روپیا بنتا ہے۔ اگر آپ کا جواب غلط ہو گیا تو پھر آپ کو بنیادی انعام یعنی پینسٹھ ہزار ڈالرز پر جانا ہو گا۔ اگر آپ تذبذب میں ہیں اور رسک لینا نہیں چاہتے تو پھر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ اپنا جیتا ہوا انعام یعنی دو ملین ڈالرز یہاں سے لے جا سکیں گے اور یقیناً یہ ایک خاصی معقول رقم ہے۔

گیری نے چند لمحے توقف کیا پھر اس نے جواب دیا۔ ''میں کھیلنا چاہتا ہوں اور میرا جواب ہے، آپشن نمبر تین۔ نیلا رومال ایک گیت کا عنوان ہے۔''

ہال میں سناٹا تھا۔ کمپیئر نے سسپنس کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے جواب کو ''سیف'' کر لیا جائے؟''

''جی ہاں۔''

کمپیئر نے اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ''مسٹر گیری کے جواب کو محفوظ کیا جائے۔ آپشن نمبر تین۔'' الیکٹرانک اسکرین پر آپشن نمبر تین سیف ہو گیا۔

ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ کمپیئر جان بوجھ کر وقفے کو طول دے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نوجوان گیری کی اضطرابی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

''مسٹر گیری...... چار ملین ڈالرز۔ آپ کا جواب درست ہے۔''

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے۔ ریان ولیم بھی جوش کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے عمران کو گلے لگایا۔ ''مجھے یقین ہے...... مجھے یقین ہے۔ تمہاری خوش بختی ضرور اپنا زور مارے گی۔''

گیری بھی شیشے کے چیمبر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس نے ناظرین کے پُرجوش ردِعمل کا جواب دیا۔ پھر اپنے تایا اور عمران وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

کمپیئر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''نیلا رومال ایک گیت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ گیت روس میں بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی یہ گایا جاتا ہے۔ لوگ اسے سن کر روتے تھے اور دل ہی دل میں گنگناتے تھے۔ یہ ایک ایسے سپاہی کا واقعہ ہے جو لڑائی پر روانہ ہوتے ہوئے، اپنی محبوبہ کو ایک نیلے رومال کا تحفہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے یاد رکھے۔ وہ لڑکی برسوں اس رومال کو سینے سے لگائے رکھتی ہے اور اس خوب صورت چمکیلے دن کی منتظر رہتی ہے جب اس کا محبوب واپس آئے گا مگر وہ نہیں آتا۔ وہ کبھی نہیں آتا۔ وہ مر چکا ہے۔''

کمپیئر نے چار ملین ڈالرز کا چیک گیری کو دیا اور بولا۔ ''مسٹر گیری! یہ ایک کافی بڑی رقم ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں اور ابھی امید ہے کہ آپ کی ملکیت میں اضافہ ہو گا۔ آپ اس خطیر رقم کو کس طرح استعمال کرنا چاہیں گے؟''

گیری کچھ کھویا کھویا نظر آیا۔ تب اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، مجھے یہ ظاہر کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں عالی جناب ریان ولیم صاحب کا ایک دور کا رشتے دار ہوں اور میری مالی حیثیت انکل ریان ولیم سے کہیں...... کہیں کم ہے۔ یہ انکل کی عنایت ہے کہ انہوں نے اس انعامی رقم کا کچھ پورشن مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے...... اور مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ میں ان کی طرف سے اس میگا ایونٹ میں حصہ لوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں برص میں مبتلا ہوں۔ میری ایک بہن بھی برص کی مریضہ تھی۔ اس نے محبت میں ناکامی کے بعد زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے کر اپنی جان دے دی تھیں خیر، یہ تو اب ماضی کا قصہ ہے۔ اگر میں ایک بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو میں آسٹریا میں اپنا علاج کرواؤں گا اور اس کے علاوہ برص کے علاج پر تحقیق کرنے والے عالمی ادارے کو 'ڈونیشن' دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب کرے۔ اب ہم آتے ہیں اس اہم ترین مرحلے کے دوسرے سوال کی طرف۔ کیا آپ تیار ہیں؟'' کمپیئر نے پوچھا۔

''جی، میں تیار ہوں۔'' گیری نے جواب دیا اور ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا۔

کمپیئر بولا۔ ''ایک ہوسٹ اور کمپیئر ہونے کی حیثیت سے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جواب دینے سے پہلے اپنا پورا وقت لیں۔ چار ملین ڈالرز کافی بڑی رقم ہے۔ اگر کسی مرحلے پر آپ کو محسوس ہو کہ آپ ایک بہت ''رسکی'' جواب دینے جارہے ہیں تو آپ گیم چھوڑ دیں۔''

گیری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

کمپیئر نے کہا۔ ''لیجئے ناظرین! اس مرحلے کا دوسرا سوال آپ کے سامنے اسکرین پر آ رہا ہے۔ اس سوال کا درست جواب ہمارے دوست مسٹر گیری گرانٹ کی انعامی رقم کو ڈبل کرے گا، یعنی وہ چار ملین ڈالرز سے آٹھ ملین ڈالرز ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے۔ سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ کمپیئر نے پڑھ کر سنایا۔ ''9 اگست 1945ء وہ المناک تاریخی دن ہے جب امریکن بمبار جہاز نے جاپانی شہر ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا...... لیکن اصل میں یہ بم ایک اور شہر پر گرایا جانا تھا۔ اس شہر کا نام کیا ہے؟ آپشن نمبر ایک ہیپو...... آپشن نمبر دو یوکوہاما...... آپشن نمبر تین اوساکا...... آپشن نمبر چار کوکورا۔''

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ یہ ایک اور مشکل سوال آ گیا تھا۔ ناگاساکی کا نام تو ہر کوئی جانتا تھا لیکن وہ شہر کون سا تھا جس پر اصل میں ایٹم بم گرائے جانے کا امریکی پروگرام تھا۔ اس بار گیری گرانٹ کے چہرے پر ہلکی سی کرن نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مکمل طور پر اندھیرے میں نہیں ہے۔ اس نے ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا اور ایک بار پھر سوال کو نہایت توجہ سے پڑھا۔ تناؤ کی کیفیت ناظرین میں بڑھتی جارہی تھی۔

''جی جناب...... مسٹر گیری گرانٹ! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا ذہن میں کچھ آ رہا ہے؟''

گیری نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، آپشن نمبر دو اور تین تو ہرگز نہیں کیونکہ یہ دونوں شہر ناگاساکی سے ذرا فاصلے پر ہیں...... اور میرے خیال میں اس شہر کو ناگاساکی سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہئے۔''

''اس خیال کی وجہ؟'' کمپیئر نے دریافت کیا۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، اس دوسرے شہر پر بم اس لئے نہیں گرایا جاسکا تھا کہ وہاں بادل چھائے ہوئے تھے، ان بادلوں کی وجہ سے ہی امریکی بمباروں نے ایک قریبی ہدف یعنی ناگاساکی کا انتخاب کرلیا تھا۔''

کمپیئر بولا۔ ''اگر آپ کے ذہن میں اتنا کچھ آ رہا ہے تو پھر اس شہر کا نام بھی آپ کے

ذہن میں آنا چاہئے۔''

گیری نے بے چینی سے اپنی انگلیوں کے پٹاخے نکالے۔ نشست پر پہلے آگے جھکا پھر پیچھے کی طرف گیا۔ ''میرے اندازے کے مطابق یہ شہر ہیپو ہوگا یا پھر کوکورا۔ لیکن ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ ابھی آپ کو چاروں آپشن ذہن میں رکھنے چاہئیں۔'' کمپیئر نے اسے مزید الجھانے کی کوشش کی۔

گیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس الیکٹرانک اسکرین کو دیکھتا رہا اور اپنی سوچ کے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ ہال میں پن ڈراپ سائیلنس تھا۔

قریب ایک منٹ کے غور وفکر کے بعد اس نے اپنی دوسری لائف لائن استعمال کرنے کے لئے عمران سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو عمران...... تم کیا مشورہ دیتے ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''میرے ذہن میں بھی وہی کچھ آ رہا ہے جو تمہارے ذہن میں آ رہا ہے۔ آپشن نمبر ایک یا آپشن نمبر چار...... اور تھوڑا بہت آپشن نمبر دو بھی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''میرا خیال ہے کہ آپشن ایک اور آپشن چار پر ہی توجہ رکھنی چاہئے۔'' عمران نے کہا اور پھر کیبن میں موجود باقی افراد کی طرف دیکھا۔

مجھ سمیت کیبن میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس مشکل سوال کے حوالے سے عمران اور گیری کی کوئی مدد کرسکتا۔ مسٹر ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی اور بے بسی کا اظہار کیا۔ ان کے دونوں دوستوں کے تاثرات بھی یہی تھے۔

کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''ہاں مسٹر گیری...... آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ فون کال کے حوالے سے آپ کے پاس صرف چالیس سیکنڈ بچے ہیں۔''

''بتاؤ عمران...... تمہاری چوائس کیا ہے؟'' گیری نے بے قراری سے کہا۔

''میری چوائس...... کوکورا ہے۔'' عمران نے ذرا توقف کے بعد نہایت مضبوط اور دو ٹوک انداز میں کہا۔

شاید اس کا یہی دوٹوک انداز ہوتا تھا جو اس کی خوش بختی کا وسیلہ بنتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہاں بھی یہ انداز کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے یا نہیں۔

یہ تھرل اور سسپنس سے بھرپور لمحے تھے۔ گیری کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا......

''ہاں مسٹر گیری!'' کمپیئر نے اپنی آواز سے گیری کو ٹہوکا دیا۔ ''یہ بہت اہم مرحلہ ہے۔ آپ کا درست جواب آپ کو پہنچا سکتا ہے آٹھ ملین ڈالرز کے خطیر انعام تک۔ غلط جواب کی صورت میں آپ آ جائیں گے بنیادی انعام صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر...... اگر آپ کھیل چھوڑنا چاہیں تو یہاں چار ملین ڈالرز کے انعام پر چھوڑ سکتے ہیں۔''

گیری کی پیشانی پر نمی چمکنے لگی۔ ایک طرف چار ملین ڈالرز یعنی تقریباً تیس کروڑ پاکستانی روپیا تھا اور دوسری طرف صرف انچاس لاکھ روپے کے لگ بھگ۔

گیری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا اپنا ذہن تو آپشن نمبر ایک یعنی ہیو کی طرف جا رہا ہے لیکن میں اپنے دوست کے ساتھ جانا چاہوں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی ''لک'' میری مددگار رہوگی۔ میرا جواب ہے آپشن نمبر چار، کوکورا......''

''کوکورا'' سی این این کے کمپیئر نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر بولا۔ ''مسٹر گیری! کیا یہ آپ کا حتمی جواب ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا ہم اسے ''سیو'' کرلیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کے پاس ابھی پچاس سیکنڈ ہیں۔ اگر آپ مزید سوچنا چاہتے ہیں تو سوچ لیں۔''

''سوچ لیا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے جی...... آٹھ ملین یو ایس ڈالرز کے لئے مسٹر گیری کے جواب کو ''سیو'' کیا جائے۔''

اسکرین پر آپشن نمبر چار کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ کمپیئر نے اگلے تین چار منٹ میں اس جواب کے حوالے سے ہزاروں لاکھوں ناظرین کے تجسس کو خوب ابھارا۔ تجسس اور سنسنی کو یوں ابھارا جانا ان شوز کا خاصہ ہوتا ہے۔ کمپیئر کے چہرے اور باتوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ اپنی ساری ہمدردیاں گیری کے ساتھ بتا رہا تھا اور کبھی کبھی اسے تاسف کی نظروں سے بھی دیکھنے لگتا تھا۔ ٹی وی کیمرے ناظرین کے ہجوم میں سے بار بار گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھا رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں اور ان کے ہونٹ بے ساختہ، دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے......

آخر کمپیئر اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''مسٹر گیری! ہمیں

خوش قسمتی پر یقین رکھنا چاہئے اور خوش قسمتی اکثر لوگوں کی مدد بھی کرتی ہے۔ مگر...... خوش قسمتی نے اس دفعہ آپ کی مدد نہیں کی...... بلکہ آپ کو باقاعدہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر منزل تک پہنچایا ہے۔'' کمپیئر نے آخری چند الفاظ بے حد جوش کے عالم میں اور ڈرامائی انداز سے کہے۔

پورا ہال اپنے پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے ایک پُر جوش آواز بلند کیا...... گیری نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور خوشی سے چلا اٹھا۔ قیامت کے شور میں کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''آپ کا جواب درست ہے مسٹر گیری۔ آپ اسّی ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ اس رقم کے مالک ہیں۔''

گیری نے فون سیٹ کو چوما اور پکارا۔ ''تھینک یو ایمران...... تھینک یو......'' گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو بڑے جذباتی انداز میں ایک دوسرے سے بغل گیر دکھایا گیا۔

قریباً ایک منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ پھر کمپیئر کی آواز گونجی۔ اس نے جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کوکورا وہ شہر تھا جہاں امریکیوں نے دوسرا ایٹم بم گرانے کی پلاننگ کی تھی۔ امریکی بمبار جہاز کوکورا کے لئے ہی روانہ ہوئے تھے لیکن کوکورا والوں کی خوش قسمتی کہ اس روز شہر پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت دھواں بھی تھا جس کی وجہ سے بمبار، شہر کے تین چکر لگانے کے باوجود اپنا ٹارگٹ نہ ڈھونڈ سکے۔ یوں ایک بہت بڑے اسلحے کے ڈپو اور کارخانے والا یہ شہر بچ گیا۔ اس کے حصے کی موت ناگاساکی پر برس گئی۔ 9 اگست 1945ء...... گیارہ بج کر دو منٹ۔ کوکورا کی جگہ ناگاساکی موت کے منہ میں چلا گیا۔''

شو اپنے کلائمیکس پر پہنچ گیا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہو رہی تھیں۔ گیری پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً ساٹھ کروڑ کا انعام جیت چکا تھا۔ اب صرف ایک سوال کے عوض اس کی انعامی رقم ایک بہت بڑا جمپ لے سکتی تھی۔ سولہ ملین ڈالرز یعنی تقریباً ایک ارب بیس کروڑ روپے۔ یہ انعام ایک لگژری جہاز کی صورت میں تھا۔ اسے سپنوں کا جہاز کہا جا سکتا تھا۔ نہایت قیمتی، نہایت آرام دہ اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ۔ بتانے والے بتا رہے تھے کہ ''فیلکن 900 سی'' نامی اس جہاز کو کسی بھی وقت سولہ ملین بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم پر فروخت کیا جا سکتا تھا۔ صرف ایک سوال کے جواب کی قیمت ساٹھ کروڑ روپے تھی اور یہ سوال گیری کے سامنے آنے والا تھا۔

آخر کمپیئر نے پروگرام کو اس فائنل مرحلے کی طرف بڑھایا۔ اس نے کہا۔ ''ناظرین! دل تھام کر بیٹھیں۔ مسٹر گیری اس مقابلے کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز

جیت چکے ہیں اور اس رقم کا چیک انہیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ یہ چیک واپس کرنا چاہیں اور آگے بڑھنا چاہیں تو ہم آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔''

طے شدہ پروگرام کے مطابق گیری آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے چیک کمپیئر کی طرف واپس بڑھا دیا جو پہلے کی طرح شیشے کے ایک باکس میں رکھ لیا گیا۔ کمپیئر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر گیری! آپ کے دل کے دھڑکن کیا کہہ رہی ہے؟''

گیری کوشش کر کے مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کے برص زدہ ہونٹ کچھ اور نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ بولا۔ ''جناب...... دھڑکن سولہ سولہ کی رٹ لگا رہی ہے۔ سولہ ملین۔''

کمپیئر نے کہا۔ ''آٹھ ملین بھی تو معمولی رقم نہیں ہے۔ کیا آپ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہیں؟''

''اس کا فیصلہ سوال آنے کے بعد کرتے ہیں۔''

گیری پھر نروس انداز میں مسکرایا۔

''سوال خاصا مشکل ہے مسٹر گیری۔ میں آپ کو پھر مشورہ دوں گا کہ جواب کے حوالے سے اگر آپ کے ذہن میں شکوک زیادہ ہیں تو پھر آپ جواب مت دیں۔ آپ ایک خطیر رقم کے مالک بن چکے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اب یہ رقم آپ سے دور نہ ہو۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خواہش ہے کہ میں گرینڈ پرائز حاصل کروں۔''

''تو ٹھیک ہے جی۔ اب تیسرا اور آخری سوال آپ کے سامنے آ رہا ہے، اسکرین پر۔'' کمپیئر نے کہا۔

اسکرین پر سوال جگمگایا۔ ''اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے Fleas کی کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں، 1000...... 1400...... 2400 یا پھر 850۔''

اسکرین پر سوال پڑھنے کے بعد گیری کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ یہ ایک نہایت مشکل سوال تھا یا شاید یہ ترتیب ہی اس لئے دیا گیا تھا کہ اس کا جواب دیتے ہوئے صرف اور صرف اندازے سے کام لیا جا سکے۔ یعنی اس سوال کے حوالے سے یہ سراسر قسمت کا کھیل بن گیا تھا۔ بس ایک تکا لگایا جانا تھا اور یہ تکا کامیاب بھی ہو سکتا تھا اور ناکام بھی۔

کمپیئر نے متجسس نظروں سے گیری کے برص زدہ چہرے کو دیکھا۔ ''جی مسٹر گیری! سولہ ملین ڈالرز کا سوال آپ کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ کے ذہن میں کیا آ

رہا ہے؟''

''یہ بہت کٹھن سوال ہے۔'' گیری پھیکے انداز میں مسکرایا۔

''انعام بھی تو بہت بڑا ہے۔ آپ اپنے ذہن کو سوال پر مرکوز کریں اور پھر یہ بھی سوچیں کہ یہاں کوئی دس پندرہ یا بیس آپشن نہیں ہیں۔ صرف چار آپشن ہیں اور ان میں سے ایک درست ہے۔''

گیری کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ یقیناً وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک سوال کے بدلے میں اس کی انعامی رقم تقریباً ساٹھ کروڑ سے قریباً ایک سو بیس کروڑ ہونے والی تھی۔ صرف ایک سوال کا درست جواب اور وہ جواب ان چار آپشنز میں موجود تھا۔ یہی اس کھیل کی خوبصورتی تھی۔ اب یہ بس ہمت کا کھیل تھا۔ درست جواب پر ساٹھ کروڑ روپے کا اضافہ اور غلط جواب پر جیتی ہوئی رقم سے بھی محرومی۔ اس صورت میں گیری کو فقط پینسٹھ ہزار ڈالرز یعنی تقریباً انچاس لاکھ روپے ملنے تھے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ گیری اپنی انعامی رقم کو ڈبل کرنے کی بے پناہ کشش سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اس کھیل کو یہیں پر چھوڑ دیتا۔

اگلے دو تین منٹ بے حد اعصابی تناؤ اور کشیدگی کے تھے۔ کمپیئر اس تناؤ اور سنسنی میں اضافے کے لئے مسلسل چھوٹے چھوٹے فقرے بول رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''مسٹر گیری! یقیناً کوئی ایک آپشن تو ایسا ہو گا جسے آپ دوسرے آپشنز سے بہتر سمجھتے ہوں گے۔''

گیری پھیکے انداز میں مسکرایا اور طویل سانس لے کر بولا۔ ''نہیں۔ یہ پہلا سوال ہے جس کے حوالے سے میرا ذہن بالکل ''بلینک'' ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کوئی بھی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں۔''

ہمارے کیبن میں ریان ولیم نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران کا چہرہ بھی سپاٹ تھا اور لگ یہی رہا تھا کہ اس بھرے پُرے ہال میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اس سوال کا جواب جانتا ہو۔

''تو کیا آپ کھیل یہیں پر چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' کمپیئر نے گیری سے پوچھا۔

''جی...... میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی آخری لائف لائن استعمال کروں گا۔'' گیری نے پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

''مسٹر گیری کے دوست کو فون لگایا جائے۔'' کمپیئر نے آرڈر جاری کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اور ہم امید کرتے ہیں کہ گیری کا یہ دوست ان کے لئے پہلے کی طرح بخت

آور ثابت ہوگا۔"

چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے کہا۔ "ہیلو ایمران ڈیئر! تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

عمران نے کہا۔ "اس سوال کے حوالے سے میری پوزیشن بھی وہی ہے جو تمہاری ہے..... اور شاید اس ہال میں موجود تمام لوگوں کی ہے۔ اب یہ سراسر قیافے اور "لک" کا کھیل بن گیا ہے۔ یہ ففٹی ففٹی کا نہیں سیونٹی فائیو اور ٹوئنٹی فائیو کا رسک ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کسی ریوالور میں آٹھ خانے ہیں۔ چھ خانوں میں گولیاں ہیں اور دو خانے خالی ہیں۔ آپ کو چرخی گھما کر اپنی کنپٹی پر ٹریگر دبانا ہے۔"

"شاید تم نے ٹھیک مثال دی ہے۔" گیری نے ٹھنڈی سانس بھری۔

چیمبر میں ایک بیل کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی برٹش کمپیئر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اس فائنل مرحلے میں ہم اپنے معزز Participant کو سوچ بچار کے لئے جو وقت دیتے ہیں، وہ پانچ منٹ کے بجائے دس منٹ کا ہوتا ہے۔ فون کال بھی دو منٹ کے بجائے چار منٹ کی ہوتی ہے۔ مسٹر گیری! آپ اپنا پورا ٹائم لیں اور جو فیصلہ کریں، سوچ سمجھ کر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے ایک بڑی اماؤنٹ لے کر جائیں۔ آپ نے اپنے علاج اور دوسروں کی صحت و تندرستی کے لئے جو ارادے ظاہر کئے ہیں، وہ پورے ہوں۔"

ناظرین بہت شور مچا رہے تھے اور ہاتھوں کے اشارے سے گیری کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ کھیل یہیں پر ختم کر دے کیونکہ ایک خطیر رقم اس کے حصے میں آ چکی ہے۔ ٹی وی کیمروں نے گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھایا۔ وہ بھی زبردست کشیدگی کا شکار تھیں۔ گیری کی چھوٹی بہن بھی اشاروں سے بھائی کو کھیل Quit کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

ہمارے کیبن میں عمران نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور ریان ولیم سے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں جناب؟"

"میں صرف جیتنا چاہتا ہوں۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں کہ رسک لیا جائے؟"

"بالکل لیا جائے..... لیکن یہ رسک تم لو۔"

"میں آپ کو پھر بتا دوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریوالور کے چھ خانوں میں گولیاں ہوں اور صرف دو خانے خالی ہوں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی خانے نہیں گنے مسٹر ایمران! میں یہ داؤ کھیلنا چاہتا ہوں اور..... تمہارے ذریعے کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کا فیصلہ حتمی ہے؟"

"ہاں حتمی ہے۔" ریان ولیم نے ٹھوس آواز میں کہا۔ "تخت یا تختہ۔"

عمران کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے فون سیٹ کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "گیری! میری رائے میں آپشن نمبر 2۔"

چند سیکنڈ کے بعد فون کال کا وقت ختم ہوگیا۔

اب سب کچھ گیری گرانٹ پر تھا۔ کمپیئر نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "جی مسٹر گیری! آپ جواب دیجئے۔ اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثوے Fleas کی کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ 1000...... 1400...... 2300...... یا پھر 850۔"

گیری خاموش رہا۔ اتنے بڑے چیلنج کے سامنے وہ سکتہ زدہ نظر آ رہا تھا۔

کمپیئر نے دہرایا۔ "جی مسٹر گیری! آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ آپ کے درست جواب کا مطلب ہے، سولہ ملین ڈالرز سے زیادہ مالیت کا بے مثال لگژری طیارہ۔ ایک سپنوں کا جہاز۔ آپ کے غلط جواب کا مطلب ہے، قریباً آٹھ ملین ڈالرز سے محرومی۔ آپ اب بھی کھیل چھوڑ سکتے ہیں۔"

گیری نے آخری بار ہمارے کیبن کی طرف دیکھا۔ ریان ولیم نے اپنا..... بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ گیری نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "میں آپشن نمبر 2 کے ساتھ جانا چاہوں گا...... 1400۔"

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ سب نگاہیں شیشے کے گول چیمبر پر اور الیکٹرانک اسکرین پر مرکوز تھیں۔

کمپیئر سنسنی خیز نظروں سے کبھی گیری کی طرف اور کبھی اپنے لیپ ٹاپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "مسٹر گیری!!! ابھی آپ کا جواب "سیو" نہیں کیا گیا۔ کوئز شوز کی تاریخ کے اس سب سے بڑے شو میں، میں آپ کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر اب بھی آپ اپنا جواب بدلنا چاہیں تو بدل سکتے ہیں۔"

گیری نے متوحش نظروں سے کمپیئر کو دیکھا پھر ہمارے کیبن کی طرف نگاہ دوڑائی۔

عمران خاموش تھا اور ریان ولیم بھی۔ ریاں ولیم کے دونوں دوست بھی یکسر خاموش تھے۔

ایسے شوز میں کمپیئرز اور ہوسٹ اپنے کھلاڑی کو اس طرح کی آفرز دیتے ہیں۔ ان آفرز کا مطلب کھلاڑی کے اعصاب ٹیسٹ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ آفر کبھی سودمند ہوتی ہے اور کبھی نقصان دہ۔ ریان ولیم نے گیری کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑے ہو کر ایک بار پھر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ جواب دے اور آپشن نمبر 2 کے ساتھ رہے۔

گیری نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میرا جواب آپشن نمبر 2 ہی ہے۔''

آپشن نمبر 2 کو ''سیو'' کر لیا گیا۔

سینوں کی دھڑکنیں نقاروں کی طرح گونج رہی تھیں۔ ہر نگاہ الیکٹرانک اسکرین پر تھی۔ اگر جواب درست ہوتا تو اسکرین پر سبز رنگ نمودار ہونا تھا...... دوسری صورت میں سرخ رنگ۔ شاید کوئی بھی نگاہ سرخ رنگ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ان فیصلہ کن گھڑیوں میں یہ سرخ رنگ خوف کی علامت بن گیا تھا۔ سبز رنگ خوشی اور جوش سے منسلک ہو گیا تھا۔ ہال میں پن ڈراپ خاموشی تھی۔ گیری آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

......اور پھر ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ اس خاص قسم کے چھناکے کے ساتھ ہی الیکٹرانک اسکرین پر سرخ رنگ ابھرا۔ وقت کی گردش جیسے تھم گئی۔ گیری کا جواب غلط ہو چکا تھا......

ٹی وی کیمروں نے بار بار چہروں کے ردِعمل دکھائے۔ گیری سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ اس کی والدہ اور بہن نے اپنے سر گھٹنوں میں دے رکھے تھے۔ کمپیئر خاموش تھا۔ ریان ولیم خاموش تھا۔ دو سو سے زیادہ ناظرین خاموش تھے اور کچھ صدا ہائے تاسف بلند کر رہے تھے۔ کئی سیکنڈ بعد کمپیئر کی نہایت گھمبیر آواز ابھری۔ ''مجھے افسوس ہے مسٹر گیری! آپ کا جواب غلط ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آپ نے بہت دلیری سے مقابلہ کیا۔ آپ کے پاس کھیل سے پسپا ہونے کا آپشن موجود تھا مگر آپ نے اور آپ کے دوست نے فائٹ کرنے اور خطرہ مول لینے کو ترجیح دی۔ اس کے لئے آپ کی تعریف کرنا پڑے گی۔ زندگی خطرے مول لینے کا نام ہی تو ہے۔''

کمپیئر نے تالیاں بجائیں۔ آڈئینز نے بھی مرے مرے انداز میں اس کا ساتھ دیا۔

جو جواب اسکرین پر آیا، وہ آپشن نمبر تین تھا...... یعنی 2400۔

کمپیئر نے قاعدے کے مطابق جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''سائنسی تحقیق کی تازہ رپورٹ کے مطابق طاعون کے جرثومے کی کم و بیش 2400 اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ تاہم ان میں سے صرف 120 اقسام ایسی ہیں جو طاعون کا جرثومہ انسان میں منتقل کر سکتی

ہیں۔ ان 120 اقسام میں سے تقریباً بیس بائیس قسمیں ایسی ہیں جو چوہوں کے ذریعے طاعون کے پھیلاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں طاعون جیسی خطرناک بیماری پھیلنے کے امکانات ہمہ وقت موجود ہیں۔''

ہال میں ویسی ہی خاموشی طاری تھی جو طاعون سے بربادشدہ کسی بستی میں ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک کے کھیل میں اپنے رویے سے گیری نے قریباً سو فیصد ناظرین کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ صدمے کی شدت سے گیری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں۔

کمپیئر نے گیری کو گلے سے لگایا اور تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی پینسٹھ ہزار ڈالرز کا چیک بھی اسے دیا گیا۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا اینٹی کلائمیکس تھا۔

......قریباً دس منٹ بعد کھیل کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کھیل کا سارا پیٹرن وہی پہلے والا تھا...... پہلے ایک ہاؤس وائف کھیلنے کے لے آئی۔ اس کا تعلق انڈیا سے تھا۔ یہ بھی چند دیگر امیدواروں کی طرح پہلے مرحلے میں منتخب ہوئی تھی۔ یہ پچیس چھبیس سالہ خاتون صرف دوسرے مرحلے تک پہنچ سکی۔ اس نے فقط دس ہزار ڈالرز جیتے۔ پھر ایک جاپانی آیا۔ یہ بھی زیادہ آگے نہیں جا سکا۔ اگلے قریباً پون گھنٹے میں چار امیدوار ابتدائی مرحلوں میں فارغ ہو کر واپس گئے۔ صرف ایک شخص پانچ لاکھ ڈالرز یعنی قریباً تین کروڑ پچھتر لاکھ روپے کے انعام تک پہنچ سکا۔

چھٹے نمبر پر جو کھلاڑی شیشے کے چیمبر میں داخل ہوئی اور ہاٹ سیٹ پر بیٹھی، یہ وہی امریکن لڑکی تھی جس کا باپ ریان ولیم کا کاروباری حریف بھی تھا۔ اس لڑکی کا نام ماریانی اور اس کے باپ کا نام مسٹر بفیلو بتایا گیا تھا۔ لڑکی دیکھنے میں پُرکشش تھی اور کسی ماڈل ہی کی طرح نظر آتی تھی۔ اس نے نہایت ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم کا لباس بھی ایسا تھا جو چھپا کم رہا تھا اور دکھا زیادہ۔ ریان ولیم نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ''کہتے ہیں کہ خوب صورتی اور ذہانت عورتوں میں کم کم ہی اکٹھی ہوتی ہے لیکن اس خبیث میں یہ دونوں چیزیں اکٹھی آئی ہیں۔''

یہ فقرہ بولنے کے فوراً بعد ریان ولیم اپنے بھاری بھرکم جسم کو ہلکورا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غالباً وہ اس لڑکی کو کھیلتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دونوں دوست بھی بیزاری کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

ریان ولیم کی ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس وقت ہم اس میگا شو میں سے باہر نکل رہے تھے، کمپیئر کی خوبصورت آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ ''......تو جی ناظرین! مس ماریانی وہ ہونہار امیدوار ہیں یا کہہ لیں کہ Participant ہیں جن سے لوگوں نے مسٹر گیری ہی کی طرح بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ مس ماریانی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک بڑی کامیابی سے کوئز شوز میں حصہ لیتی رہی ہیں...... اور آج وہ اس میگا ایونٹ میں موجود ہیں جس میں یہ قریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر گرینڈ پرائز سولہ ملین ڈالرز تک پہنچ سکتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے میگا شو میں مس ماریانی نے تین مرحلے حیران کن تیزی سے پار کر لئے تھے۔ اب تک وہ دو ملین یو ایس ڈالرز جیت چکی ہیں اور چوتھے مرحلے میں ہیں......''

کمپیئر کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم ایک بند کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں حسبِ سابق میری اور عمران کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور ہمیں ایک نیم گرم کوریڈور میں سے گزار کر اسٹیشن وین میں پہنچا دیا گیا۔

ہم واپس اسی رہائش گاہ میں پہنچ گئے جہاں سے ہمیں میگا شو میں حصہ لینے کے لئے لے جایا گیا تھا۔ یہاں ہمارا خدمت گار عملہ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اب ان لوگوں میں پہلے سی گرم جوشی موجود نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ مسٹر ریان ولیم اور ان کے دونوں دوست بھی اسی کوٹھی میں موجود ہیں مگر انہوں نے عمران کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنے پورشن تک محدود رہے۔

جان محمد صاحب ہمارے پاس آئے۔ وہ بھی افسردہ تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ''ریان ولیم صاحب دوستوں کے ساتھ مل کر غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہسکی پی رہے ہیں۔''

''میرے بارے میں کچھ فرمایا ہے انہوں نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی وہ فرمانے کی پوزیشن میں نہیں۔'' جان صاحب نے کہا۔

دس پندرہ منٹ بعد ایک اور اطلاع پہنچی اور یہ بھی پریشان کن تھی۔ وہی ہوا تھا جس کا ریان ولیم کو ڈر تھا۔ میگا کوئز شو کے حوالے سے یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ جان محمد صاحب کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی گہری ہو گئی۔ انہوں نے فون پر پوچھا۔ ''یہ کنفرم اطلاع ہے؟'' دوسری طرف سے غالباً اثبات میں جواب دیا گیا تھا۔

جان محمد صاحب نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''امریکن ماریانی گرینڈ پرائز جیت گئی

ہے۔ سولہ ملین ڈالرز کا لگژری پلین۔''

''اب تو ریان صاحب کا حال اور بھی برا ہو جائے گا۔ کہیں پریشر کی وجہ سے ان کا بھاری بھرکم جسم پھٹ ہی نہ جائے۔'' عمران نے تشویش ظاہر کی۔

ریان صاحب تو نہیں پھٹے لیکن ان کا ایک دوست ضرور پھٹ گیا۔ قریباً دس منٹ بعد وہ نشے میں ڈولتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا۔ یہ وہی ٹماٹر کی ناک والا تھا۔ وہ بالکل ٹن ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کو گھورا اور کرخت انگلش میں بولا۔ ''واہ...... واہ بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے ہو ہمارے لئے۔ ہمیں تو نہال کر دیا تم نے اور مالا مال کر دیا۔ تمہارا تھوبڑا چومنے کو دل چاہتا ہے...... اور دل چاہتا ہے کہ تمہیں گائے کے گوبر میں تولا جائے اور یہ سارا گوبر گٹھڑی میں باندھ کر تمہارے سر پر رکھ دیا جائے۔ واہ...... کہاں چھپے ہوئے تھے تم اب تک؟ کہاں سے ڈھونڈا ہے تمہیں ہمارے پیارے ریان نے؟''

''تمہارے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ تمہاری وائف کے بستر کے نیچے۔'' عمران نے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا بکا تم نے؟'' ریان کے شرابی دوست نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میری صفائی تو آپ نے خود ہی پیش کر دی ہے۔ میں خود نہیں آیا بلکہ مجھے ڈھونڈ کر لایا گیا ہے اور بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ آپ لوگوں کے...... اصرار پر ہوا ہے۔ باقی قسمت کے کھیل میں تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اس نے شرابی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ''ہاں، قسمت کے کھیل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں کوئی چیز اٹھا کر مارتا ہوں تو تمہیں لگ سکتی ہے اور نہیں بھی لگ سکتی۔ قسمت کا کھیل ہی ہے نا؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر کا ایک چھوٹا گلدان اٹھایا اور طاقت سے عمران کے سر کو نشانہ بنایا۔ عمران نے جھک کر خود کو گلدان کی ضرب سے بچایا۔ گلدان اڑتا ہوا ایک قدِ آدم آئینے سے ٹکرایا اور اسے چکنا چُور کر گیا۔

''واقعی قسمت کا کھیل ہے۔'' ٹماٹر کی ناک والے نے سر اوپر نیچے ہلایا...... ''اس شیشے کی قسمت میں موت لکھی تھی۔ چچ چچ...... کتنا قیمتی شیشہ تھا...... میڈ اِن فرانس۔'' اس نے کہا اور تاسف انگیز انداز میں جھک کر شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ یہ ٹکڑا عمران کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بہت برق رفتار تھا۔ اس شخص نے آئینے کے ایک بڑے ٹکڑے سے یکا یک عمران کی رانوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو بچا نہ سکتا۔ پھر بھی نکیلا ٹکڑا اس کی ناف کے قریب لکیر ڈالتا ہوا نکل گیا۔

ٹن حملہ آور سخت اشتعال میں تھا۔ شاید وہ مزید حملے کرتا مگر عمران نے اس کی کلائی دبوچ لی پھر اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر طاقت سے دھکا دیا۔ وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے ٹکرایا اور ایک چھ فٹ اونچے آرائشی لیمپ پر گر کر اسے چکنا چور کر گیا۔ لیمپ کی روشن ٹیوب لائٹ ایک چھوٹے سے دھماکے سے چکنا چور ہو گئی۔ عمران نے ٹماٹر کی ناک والے کی فربہ گردن اپنے آہنی بازو میں جکڑ لی اور ٹوٹ جانے والے لیمپ کا الیکٹرک تار اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امکان تھا کہ اس تار میں ابھی تک کرنٹ دوڑ رہا ہو گا۔ عمران نے تار کے ننگے سرے حملہ آور کے چہرے کے قریب کیے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ تاہم اس کی چربی دار گردن پر عمران کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا بالائی دھڑ بس مچل کر رہ گیا۔ عمران الیکٹرک تار اس کے چہرے کے بالکل قریب لے گیا۔ پھر فلم شعلے کے گبر سنگھ کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ ''ہم کو کچھ پتا ناہیں ٹھاکر...... کہ اس میں کرنٹ ہے یا ناہیں...... ہم کو کچھ پتا ناہیں۔ یہ سارا قسمت کا کھیل ہے۔ اگر کرنٹ ناہیں ہوا تو تمہیں جندگی مل جائے گی۔ اگر ہوا تو پھر ناک کی طرح تمہارا باقی کا تھوبڑا بھی بندر کی پیٹھ جیسا ہو جائے گا۔''

سرخ ناک والے حملہ آور کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس آفت میں آ گیا ہے۔ نہایت زوردار اور جسیم ہونے کے باوجود وہ اپنے بالائی جسم کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا نشہ یقیناً ہرن ہو چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب ریان ولیم اپنے پہاڑ جیسے جسم کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوا......

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ریان چنگھاڑا۔

عمران نے چند لمحے توقف کیا پھر حملہ آور کی گردن چھوڑ دی۔ وہ بری طرح کھانستا اور ابکائیاں لیتا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اتنے میں مسلح گارڈز بھی اندر داخل ہو گئے۔ وہ خطرناک ارادوں سے عمران کی طرف بڑھے مگر ریان ولیم نے گرج کر انہیں روک دیا۔

اس کے اشارے پر دو گارڈز، ابکائیاں لیتے اور گالیاں بکتے ہوئے سرخ ناک والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ بری طرح ڈول رہا تھا۔ ریان ولیم نے خشمگیں نظروں سے عمران کو گھورا اور بولا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟ تمہیں پتا ہے اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا جناب...... اور میرے خیال میں آپ کے معزز دوست نے بھی کچھ نہیں کیا۔ یہ سب کچھ نشے کی زیادتی کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے زیادہ پی رکھی تھی۔''

عمران کے اس ڈپلومیٹک جواب نے ریان ولیم کا طیش قدرے کم کیا۔ وہ کچھ دیر عمران

کو گھورتا رہا پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے چلنے کا انداز اور اس کا لب و لہجہ دونوں بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی کافی سے زیادہ پیے ہوئے ہے۔

ناکامی کا افسوس تو یقیناً سب کو ہوا تھا...... اور ماریانی کی کامیابی بھی یقیناً ریان اور اس کے ساتھیوں کو بہت کھٹکی تھی مگر اپنے جذبات کا ایسا بھونڈا اظہار سراسر غلط تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ریان ولیم بروقت آ گیا ورنہ بات بہت بڑھ سکتی تھی۔

O......❖......O

اسی روز رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ریان ولیم کی مہمان نوازی کو خیر باد کہا اور عاطف وغیرہ کے پاس واپس آ گئے۔ اگلے دن صبح جان محمد صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے رات والے واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے فورڈ (سرخ ناک والے) پر غائبانہ لعنت ملامت بھی کی۔

میں بہت پریشان تھا۔ اقبال، میڈم صفورا اور دیگر ساتھیوں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ میری پریشانی اور بے چینی کا اصل مرکز بالو تھا۔ وہ پتا نہیں کس حال میں تھا۔ اگر مجھے تسلی تھی تو صرف ایک بات کی۔ صفیہ اس کے ساتھ تھی پچھلے چند ماہ میں وہ اس کے ساتھ بہت مانوس ہو چکا تھا۔

میں نے جان محمد صاحب سے پوچھا۔ ''ریان صاحب سے کوئی بات ہوئی، ہمارے ساتھیوں کے بارے میں؟''

''پرسوں ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا رابطہ الٰہ آباد میں موجود انٹرپول کے ایک اعلیٰ افسر سے ہے۔ کچھ سراغ ملے ہیں۔ ان پر پیش رفت ہو رہی ہے۔''

''اس کے بعد بات نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بعد تو یہ شو والا ہلا گلا شروع ہو گیا تھا۔ اور اب ویسے ہی ریان صاحب اور اس کے ساتھی بڑے خراب موڈ میں ہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''جان انکل! یہ تو ساری وقت گزاری والی باتیں لگتی ہیں۔ سراغ مل گئے ہیں...... پیش رفت ہو رہی ہے...... ٹارگٹ کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ یہ تو وہی گھسے پٹے جملے ہیں جو ہر سنگین واقعے کے بعد اربابِ اختیار کی طرف سے بولے جاتے ہیں۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' جان محمد صاحب نے پوچھا۔

''اس کا تو مطلب ہے کہ اب تک ہم نے وقت ہی ضائع کیا ہے...... اور وقت بھی ایسا جو بڑا قیمتی تھا۔'' عمران بولا۔

''خیر، ایسی بات بھی نہیں۔ ریان صاحب نے جس طرح ذمے داری لی تھی مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کچھ نہ کچھ کیا ہے۔''

''آپ ابھی اس سے رابطہ کریں اور صحیح صورت حال کا پتا کریں۔'' عمران کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

جان محمد صاحب نے چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد موبائل پر نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگے۔ چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ ''ہیلو کون؟...... ریان صاحب کہاں ہیں...... کیا؟...... لاہور سے چلے گئے...... کب؟...... لیکن انہوں نے انفارم ہی نہیں کیا۔ اچھا اچھا...... چلو ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔'' جان محمد صاحب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ جان محمد صاحب کی انگریزی بس واجبی سی تھی۔

ان کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ''کیا ہوا؟'' عمران نے پوچھا۔

''ریان اور اس کے ساتھی آج صبح سویرے لاہور سے چلے گئے ہیں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''شاید اسلام آباد۔ میں دوسرے نمبر پر کوشش کرتا ہوں۔'' جان محمد صاحب نے کہا اور دوسرا نمبر ملانے لگے۔ دوسری طرف بیل ہوتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیور کرنے کی زحمت نہیں کی۔

عمران گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جو کچھ کرنا ہوگا، ہمیں خود کرنا ہوگا۔ اس گورے میں اتنا ظرف نہیں ہے کہ کوئز شو میں ہارنے کے بعد بھی اپنی کمٹ منٹ پوری کرے۔ وہ اب کچھ نہیں کرے گا ہمارے لئے۔''

عمران ایک یار باش شخص تھا۔ ہر جگہ اس کے دوست نشانیاں چھوڑ جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اس کے جاننے والے موجود ہیں۔ عمران نے لکھنؤ میں اپنے ایک شناسا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس شخص کا تعلق سیّد گھرانے سے تھا اور یہ انڈیا کی وزارتِ خارجہ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔

عمران ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ پہلی کوشش میں حسیب شاہ نامی اس شخص سے رابطہ نہیں ہو پایا لیکن دوسری کوشش میں ہو گیا۔ اس بندے سے عمران کی پُرتپاک گفتگو ہوئی اور عمران نے اسے اپنے مسئلے کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ ظاہر ہے کہ فون پر تفصیلی گفتگو ٹھیک نہیں تھی۔ رات کو انٹرنیٹ پر تبادلہ خیال کرنے کے بارے میں فیصلہ ہوا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ''کیا ہمیں دوبارہ انڈیا جانا پڑے گا؟''

''اگر جانا بھی پڑا تو تم نہیں، میں جاؤں گا۔''

''تم نے خطرے مول لینے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟''

''ٹھیکیدار تو میں ہوں...... اور تمہیں پتا ہے کہ بہت عرصے سے ہوں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں میرا اپنا لالچ بھی شامل ہے۔ یار! اُدھر جاؤں گا تو عاصمہ سے پھر ملاقات ہونے کا موقع پیدا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ایک بے کس پری ہے اور ایک جابر دیو کی قید میں ہے۔ یہ ڈی ایس پی سجاد موہل کسی دیو یا جن سے کم تو نہیں۔ ان جنات کی جان عام طور پر طوطوں میں ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں وہ طوطا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں جس میں سجاد کی جان ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ عاصمہ سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم صرف بے پَر کی اڑاتے ہو......''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ اپنے دل کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ آہ...... اس میں جب مجھے شبانہ کی جھلک نظر آتی ہے تو لگتا ہے کہ ماضی کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور ''گردشِ صیام'' پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔''

''گردش صیام نہیں گردش ایام ہوتا ہے۔''

''اب تم بھی غلطی کر رہے ہو، گردش ہوتا نہیں بلکہ ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یا ہوتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ میں وہ طوطا پکڑ سکتا ہوں یا نہیں جس کی ٹانگ توڑنے سے ڈی ایس پی سجاد کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے......''

''اور فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ ہم اقبال، صفورا، نوری اور بالو وغیرہ کو واپس لا سکتے ہیں یا نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

میرے اس فقرے نے اسے پھر سے سنجیدہ کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبے کش لینے لگا۔ میں نے کہا۔ ''سچ پوچھو عمران، تو کبھی کبھی تم پر غصہ آنے لگتا ہے۔ کئی معاملوں میں تم حد سے گزر جاتے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں خطروں میں رہنا پسند ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ تم اپنی زندگی موت کی طرف سے بہت بے پروا ہو...... اور یہ بے پروائی اب تمہارے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ پھر بھی عاصمہ جیسے معاملات سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مانا کہ اس کا شوہر مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا...... لیکن اس کی مایوسی دور کرنے کے لئے تم نے خود کو اس کے لئے چارا بنا لیا۔ اور ایک بار نہیں دوبار۔''

''یار! دوسری بار تو میں نے صرف اپنی قسم پوری کی تھی...... اور بات صرف موہل کی

مایوسی کی نہیں تھی، وہ جنونی اپنی نقد جان دے رہا تھا۔ باقاعدہ راہی عدم ہو رہا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ دو سال پہلے میں نے جس رات اسے گرفتاری دی تھی، اگر نہ دیتا تو وہ شراب میں دس پندرہ نشہ آور گولیاں ڈال کر مرحوم ہو جاتا...... یا پھر اپنے سرکاری پستول سے اپنی کنپٹی میں سوراخ کر لیتا۔ میں نے ایک انسان کی جان بچائی......اور ایک عورت کو بیوگی سے بچایا...... بس......اور مجھے یہ کرنے میں کوئی پچھتاوا نہیں۔''

''اور اس کا صلہ کیا ملا ہمیں...... ہمیں مارا پیٹا گیا۔ ڈیزل انجن کی دھونی دی گئی۔ ہمارے ساتھی دربدر ہوئے۔ بالو دربدر ہوا۔ اب وہ پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہیں؟''

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جگر! فکر نہ کرو۔ انہیں یہ خیریت یہاں لانا میری ذمے داری ہے۔ اور میں یہ پوری کروں گا۔''

اس کی آواز میں وہی یقین تھا جو سننے والے کی سماعت میں جذب ہوتا تھا اور اسے گہرائی تک متاثر کرتا تھا۔

ہم اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے، تب عمران ایک بار پھر ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ اپنی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ اس نے جہاں بھی فون کیا، وہاں سے گرم جوشی کے ساتھ جواب ملا۔ یہ فروری کی آخری تاریخیں تھیں لیکن سردی کا زور پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ایک شفاف چمکیلی دوپہر تھی۔ کوٹھی کے خوب صورت لان میں پھول جھوم رہے تھے۔ تتلیاں منڈلا رہی تھیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔ یہ میری جانی پہچانی فضا تھی۔ یہ میرا جانا پہچانا لاہور تھا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کی ان گنت یادیں ایسی ہی سہانی دوپہروں اور شاموں سے وابستہ تھیں۔

اچانک وہ ہوا جس کا ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مایوسی اور پریشانی کی گھٹن میں یکا یک ایسی ہوا چلی جس نے سارے منظر ہی بدل دیئے۔ میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ ہماری بائیں جانب والا دروازہ کھلا اور جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ میڈم صفورا، اقبال، نوری، صفیہ اور اس کی گود میں بالو۔

عمران ریسیور چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرح مجسم حیرت ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ان سب کے پیچھے عمران کے ساتھی جیلانی کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ یقیناً یہ لوگ جیلانی کے ساتھ ہی یہاں تک پہنچے تھے۔ میں لپکا اور آگے بڑھ کر بالو کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران اور اقبال ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اقبال کے بعد عمران اور میڈم صفورا ایک دوسرے کے گلے ملے۔ اقبال مجھ سے آ چمٹا۔ یہ ایک جذباتی منظر تھا۔ صفیہ اور نوری بھی آنکھوں میں

آنسو لئے کھڑی تھیں۔ نوری کی کلائی پر پلاسٹر نظر آ رہا تھا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' کیسے پہنچے آپ لوگ یہاں؟'' میں نے حیران لہجے میں پوچھا۔

''یہ سب ان کی مہربانی ہے۔'' میڈم صفورا نے دروازے میں کھڑے ایک گندمی نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان اچھی شکل وصورت کا تھا۔ اس نے جرسی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔ اس کے سلام کے انداز سے ہی پتا چل گیا کہ وہ انڈیا سے آیا ہے۔ میڈم صفورا نے کہا۔ ''اس کا نام عطا الرحمان ہے۔ ایئر انڈیا میں سروس کرتا ہے۔ یہ اپنی اسٹوری خود ہی سنائے گا تو زیادہ اچھی طرح تم لوگوں کی سمجھ میں آئے گی۔''

ہم نے عطا الرحمان سے مصافحہ کیا۔ اس سے گلے ملے۔ ''آپ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے ہیں......'' اقبال نے کہا۔

''سوائے نوری کے۔'' عمران نے فقرہ مکمل کیا۔ ''اس کے بازو پر چوٹ لگی ہے۔''

نوری کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ اقبال بھی چپ ہو گیا۔ میڈم صفورا نے کہا۔

''ہمیں بیٹھنے کے لئے بھی کہا جائے گا یا کھڑے کھڑے ہی سب کچھ پوچھ لیا جائے گا؟''

ہم سب نشستوں پر بیٹھ گئے۔ بالو بدستور میری بانہوں میں تھا۔ اس کا معصوم لمس مجھے سلطانہ کی یاد دلانے لگا۔ وہ بھی دو چار منٹ کے اندر ہی میری گود میں سے مانوس سا ہو گیا۔ بالو اس لباس میں نہیں تھا جس میں بیس بائیس دن پہلے ہم نے اسے الٰہ آباد میں چھوڑا تھا۔ باقی سب کے لباس بھی وہ نہیں تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ آج صبح ہی عطا الرحمان کے ساتھ نیو دہلی سے لاہور پہنچے ہیں۔ اقبال کو بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ عمران سے کہاں اور کیسے رابطہ کیا جائے۔ ہاں، اپنے ساتھی جیلانی کا فون نمبر اسے معلوم تھا۔ اس نے جیلانی سے رابطہ کیا اور پھر یہ سب لوگ ایک زبردست سرپرائز کے طور پر ہمارے پاس یہاں اس کوٹھی میں پہنچ گئے۔

اس سارے معاملے میں عطا الرحمان کا کردار نہایت اہم محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کردار کیا تھا؟ میرے، عمران اور جیلانی کے ذہن میں بھی یہ سوال مچل رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کا سفری سامان دیکھ کر یہ پتا تو ہمیں چل ہی گیا تھا کہ یہ لوگ قانونی طریقے سے بذریعہ ایئر لائن یہاں پہنچے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہو پایا، اس کا جواب ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ملا۔

ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ عطا الرحمان الہ آباد کی عاصمہ کا سگا بھائی ہے۔ عطا الرحمان لکھنوی لب و لہجے میں بڑی صاف اردو بولتا تھا۔ اس کی شکل و شباہت بھی اس کی گواہی دیتی تھی کہ ڈی ایس پی سجاد کی بیوی عاصمہ سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔

عطا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ حضرات کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھیوں کو بحفاظت یہاں پہنچانے کے لئے جو بھی تھوڑی بہت کوشش کی ہے، وہ اپنی بہن عاصمہ کے کہنے پر ہی کی ہے۔ عاصمہ، عمران بھائی کی بے حد احسان مند ہے۔ اسے ہرگز ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ عمران بھائی کے قریبی ساتھیوں کو وہاں الہ آباد میں کسی طرح کی کوئی مشکل پیش آئے۔ وہ اس بارے میں بہت فکرمند تھیں۔ انہی دنوں وہ واقعہ ہوا جس کی وجہ سے عاصمہ بہن اس قابل ہوئی کہ وہ آپ کے ساتھیوں کی مدد کر سکے۔ وہ واقعہ آپ کی ساتھی نوری کے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا تھا۔“

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”عطا بھائی! بہتر ہے کہ آپ شروع سے ساری بات بتائیں تا کہ ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔“

عطا بولا۔ ”شروع میں جو کچھ ہوا، وہ تو آپ کو اقبال بھیا یا میڈم صفورا ہی بتا سکتی ہیں۔“

اقبال بولا۔ ”تابش اور عمران بھائی...... جب ڈی ایس پی سجاد موہل نے آپ دونوں کو ہوٹل پارک ویو سے پکڑا تو ہم نے دیکھ لیا تھا۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ صرف دو پولیس اہلکاروں نے آپ دونوں کو بے بس کر کے گاڑی میں بٹھا لیا ہے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی معمولی پولیس والے نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب ہمارا ہوٹل پارک ویو میں رکنا ازحد خطرناک ہے۔ ہم نے فوراً ہوٹل چھوڑ دیا اور کرائے کی اسٹیشن وین کے ذریعے وہاں سے نکل گئے۔ کیپٹن اجے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے پاس بھرا ہوا ماؤزر بھی تھا۔

”ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمیں ایک پولیس ناکے پر رکنے کا اشارہ کیا گیا...... میرا خیال ہے کہ یہاں ہم سے غلطی ہوئی۔ وہ معمول کی چیکنگ تھی۔ ہم رک جاتے تو سرسری جائزے کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی جاتی مگر اجے کی ہدایت پر وین ڈرائیور نے گاڑی کا رخ یکدم ایک بغلی گلی میں موڑ لیا۔ یہیں سے ایک پولیس موبائل ہمارے پیچھے لگ گئی۔ وین ڈرائیور خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے اجے کے ہاتھ میں ماؤزر دیکھ لیا تھا۔ اجے نے اسے گاڑی تیز چلانے کے لئے کہا اور ہدایت کی کہ وہ پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے لیکن پولیس موبائل تو گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے پیچھے لگ چکی تھی۔ اجے نے چلتی وین میں ڈرائیونگ خود سنبھال لی اور کچھ آگے جا کر وین کو ایک تنگ سڑک میں گھسا

دیا۔ یہاں ہماری تیز رفتار ڈرائیونگ کی وجہ سے کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ دو تین افراد زخمی بھی ہوئے لیکن یہ فائدہ ہوا کہ ہم وقتی طور پر پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے وین ڈرائیور کو چلتی گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ جلد ہی ہم الہ آباد کے مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں مگر اتنا پتا تھا کہ پورے شہر میں پولیس حرکت میں آ چکی ہوگی اور وائرلیس پر پیغام چل رہے ہوں گے۔

”ہم نے وین کو ایک جگہ کھیتوں میں چھوڑ دیا اور وہ دو ٹولیوں کی صورت میں اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ کر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہم ایک ویران خشت بھٹا پر پہنچ گئے۔ یہ خشت بھٹا ڈھے چکا تھا اور یہاں بھٹے کی بنیادوں میں نیچے کی طرف دو کھولیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم ان کھولیوں میں جا چھپے۔ اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ چمگادڑیں اور بلیاں تھیں یا آوارہ کتے تھے۔ ہم پورے چار دن وہاں چھپے رہے۔ آخر بھوک سے بے بس ہو گئے۔ تھوڑے سے بسکٹ اور نمکو تھے، وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ پولیس اس علاقے میں بھی ہمیں ڈھونڈ رہی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اجے اور نوری نے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ سردی بہت تھی۔ اجے نے اپنا منہ سر ایک گرم چادر میں لپیٹ لیا۔ نوری نے بھی اپنی چادر سے نقاب کر لیا۔ وہ دونوں میاں بیوی کے روپ میں کھولی سے نکلے اور قریبی بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ قریبی بازار بھی وہاں سے قریباً تین کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی ریلوے کالونی کی تین چار دکانیں تھیں...... اب آگے کی بات بتاؤ نوری۔“

اقبال نے نوری کو گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

نوری گم صم بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں کے جھمکے بھی اس کی طرح اداس نظر آتے تھے...... بھانڈیل میں وہ ہمیں گھاگرے اور کھلے گریبان والی چولی میں نظر آتی تھی۔ اس کی عریاں کمر نازک شاخ کی طرح لچکتی تھی اور اس کی چال میں ایک ”مشتعل کرنے والا لہراؤ“ ہوتا تھا...... مگر آج وہ یکسر مختلف دکھائی دیتی تھی۔

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”اجے بابو اور میں بازار کے پاس پہنچے تو وہاں پولیس کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اجے بابو نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں کا اکٹھے آگے جانا ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں ایک کھمبے کے پاس کھڑا کیا اور خود سودا لینے کے لئے آگے چلے گئے۔ ابھی ان کو گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک جیپ میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں بھی پولیس والے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا...... بی بی! تم یہاں کیا کرت ہو؟ میں نے کہا، میرا گھر والا آگے گیا ہے، میں اس کا انتظار کرت ہوں۔ انہوں

نے دو چار باتیں کیں اور ان کو مجھ پر شک ہو گیا۔ انہوں نے مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے لے گئے۔ مجھے ایک چوکی پر زنانہ پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس والیوں نے بھی مجھ سے بہت سوال جواب کئے۔ انہوں نے میرا پتا ٹھکانا پوچھا۔ میں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ ان کا شک پکا ہو گیا کہ میں ان چھ لوگن میں سے ہوں جو پانچ دن پہلے ہوٹل سے غائب ہوئے تھے۔

''کوئی تین گھنٹے تک چوکی میں رکھنے کے بعد مجھے ایک کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ایک کمرا تھا جو دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا۔ یہاں مارنے پیٹنے کا سامان بھی پڑا ہوا تھا...... تھوڑی دیر بعد بھاری مونچھوں والا سوجی سوجی آنکھوں والا ایک افسر کمرے میں آیا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو آپ دونوں کو ہوٹل سے پکڑ کر لے گیا تھا۔ وہ بہت خراب بندہ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور بہت ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کمرے میں دھواں چھوڑ دیوے گا اور میں کھانس کھانس کر مر جاؤں گی۔ وہ بہت برا بندہ تھا۔ اس نے مجھے بہت تھپڑ مارے اور دیواروں کے ساتھ پٹخا...... میرا بازو ٹوٹ گیا اور......''

نوری کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکنے لگی۔

میڈم صفورا نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔ میڈم صفورا نے باقی کی رُوداد انگلش میں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈی ایس پی موہل بالکل جنونی بندہ تھا۔ یہ نوری سے ہمارا پتا ٹھکانا پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے نوری کو 'ریپ' کرنے کی کوشش بھی کی...... مگر یہاں ہمیں موہل کی بیوی کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس کا نام عاصمہ ہے اور عطاالرحمٰن اس کا سگا بھائی ہے۔ جب سجاد موہل نشے میں چور بے کس نوری سے زیادتی کی کوشش کر رہا تھا، وہ کمرے میں آئی۔ اس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنے شوہر کے سر پر پیچھے سے ماربل کے وزنی گل دان سے ضرب لگائی۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ عاصمہ نے نوری کو کپڑے پہنائے اور اسے فوری طور پر اپنے بھائی عطا کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے سجاد موہل کی کوٹھی سے لے کر نکل گیا۔ سجاد موہل کو کچھ زیادہ ہی چوٹ لگ گئی تھی۔ عاصمہ نے اسے گاڑی میں ڈالا اور خود لے کر اسپتال پہنچی۔ اب پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔''

عطاالرحمان نے کہا۔ ''سجاد بھائی اب تک اسپتال میں ہیں۔ ان کے دماغ میں خون جم گیا ہے۔ آپریشن کے ذریعے خون کا لوتھڑا نکالا گیا ہے۔ اب وہ بہتر ہو رہے ہیں۔''

''کسی طرح کا شک تو نہیں ہوا اسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' عطاالرحمان نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو کوئی شک نہیں ہے۔ آگے کا

پتا نہیں۔ ویسے بھی چوٹ کے بعد بھائی صاحب کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ......'' وہ خاموش ہو گیا۔

''کیا لگتا ہے؟'' عمران نے استفسار کیا۔

''لگتا ہے کہ اب وہ پولیس کی سروس بھی چھوڑ دیں گے۔ بہت بدلے بدلے نظر آتے ہیں وہ۔''

میری آنکھوں کے سامنے عاصمہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ ایک وفا شعار بیوی تھی۔ ایک باہمت عورت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ احسان شناس بھی تھی۔ اپنی احسان شناسی میں وہ اس حد تک گئی تھی جہاں تک جا سکتی تھی۔ وہ ہمارے لئے تو کچھ خاص نہیں کر پائی تھی لیکن اس نے نوری کے لئے اور ہمارے دیگر ساتھیوں کے لئے اپنی ہمت کے مطابق سب کچھ کیا تھا۔

عطاالرحمان نے کہا۔ ''نوری میرے پاس تھی۔ میں نے اسے اپنے ایک سکھ دوست کے گھر ٹھہرا دیا۔ اب نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ نوری ٹھیک سے بتا نہیں سکتی تھی کہ باقی لوگ کہاں ہیں۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ لوگ جہاں پر ہیں، وہاں سے تھوڑی دور دو اور خشت بھٹے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے 11 کے ہندسے کی طرح بالکل ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے چالو ہیں اور ان میں سے رات دن دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اب ہم نے ان دونوں بھٹوں کی تلاش شروع کی۔ ہم بھٹے تلاش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید نوری کے لاپتا ہونے کے بعد باقی لوگ اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہوں...... ساتھ ساتھ جڑے ہوئے دونوں بھٹوں کی تلاش کسی جاسوسی کہانی کی طرح تھی جی......'' عطا نے ذرا توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ''میں اور میرے دوست اس جانکاری تک پہنچے کہ الٰہ آباد کے آس پاس کم از کم آٹھ جگہ ایسے جڑواں بھٹے موجود ہیں۔ اب ان میں سے ہماری مطلوبہ جگہ کون سی تھی...... پھر نوری نے ایک اور جانکاری دی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ اور باقی ساتھی جہاں چھپے ہوئے تھے، وہاں سے دن میں تین چار بار ریل گاڑی بھی گزرتی تھی۔ ریلوے لائن زیادہ دور نہیں تھی۔ نوری کی اس دوسری جانکاری نے ہمیں صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق اقبال صاحب، اے جے صاحب اور باقی خواتین مسمار بھٹے کی کھولیوں میں موجود نہیں تھے۔ نوری کے لاپتا ہونے کے بعد وہ یہ جگہ چھوڑ گئے تھے۔ مگر پھر قسمت نے یاوری کی۔ جب ہم دونوں دوست واپس جا رہے تھے اچانک اے جے صاحب گنے کے ایک کھیت میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے اپنی گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا ماؤزر پکڑ رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ہم کوئی بھی حرکت

کرتے تو وہ ہمیں اڑا دیتے۔ بہر حال، ہماری اور ان کی غلط فہمی جلد ہی دور ہوگئی۔ اجے صاحب کو پتا چل گیا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں اور نوری ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے۔ ہمیں بھی یقین ہوگیا کہ ہماری ملاقات نوری کے ساتھی اجے صاحب سے ہی ہوتی ہے۔ اقبال، میڈم صفورا، صفیہ اور بچہ مال گاڑی کے ایک خراب ڈبے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ میں ان سب کو لے کر اپنے سکھ دوست لال سنگھ کے گھر آ گیا...... اور عاصمہ کو یہ خوش خبری سنائی۔ میں ایئر لائن میں اسٹیوارڈ کے طور پر کام کرتا ہوں۔ میرے سسر بھی ایئر انڈیا میں ہیں۔ عاصمہ بہن کی یہ پُر زور خواہش تھی کہ میں نہ صرف اقبال صاحب اور تینوں خواتین کے سفری کاغذات تیار کرواؤں بلکہ انہیں خود پاکستان چھوڑ کر بھی آؤں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سفری کاغذات فرضی ناموں سے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے تیار کئے گئے ہیں۔ ان کو Valid کرانے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اللہ نے بھی مدد کی اور اب ہم آپ کے سامنے ہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''عطا! ہم تو ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لئے لمبے چوڑے پلان بنا رہے تھے۔ تم نے ایک دم نمودار ہو کر ہماری مشکلیں آسان کر دیں۔''

عطا نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''میں نے اور عاصمہ نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر۔ احسان تو آپ نے کیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے عمران بھائی۔''

پھر عطا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر عمران کی طرف بڑھایا۔ ''عاصمہ نے یہ خط بھی دیا ہے آپ کے لئے۔''

عمران نے لفافہ کھول کر خط پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔

ہم لوگ نوری کی چوٹ پر تبصرہ کرنے لگے۔ اس کی کلائی کی بڑی ہڈی میں فریکچر ہوا تھا۔ یہ چوٹ اسے تب لگی جب ڈی ایس پی سجاد موہل اس سے مار پیٹ کر رہا تھا۔ پھر وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کی چوٹ کی پروا کئے بغیر اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ یہ کوشش عاصمہ نے ناکام بنائی اور سجاد کو اسپتال پہنچا دیا۔

ہم رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ اگلے روز ناشتے کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ ہم نے اقبال اور صفورا کو اس میگا کوئز شو کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے ہماری جان ڈی ایس پی موہل اور انڈین جیل سے بچی تھی۔ میگا شو کی تفصیلات جان کر اقبال اور میڈم صفورا بھی حیران ہوئے۔

دوپہر کے وقت ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے عاصمہ کے خط کے بارے میں

پوچھا۔ اس نے جھٹ خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ عاصمہ نے لکھا تھا۔ ''عمران بھائی جان! مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بس اندازہ سا ہے کہ آپ کی جان سجاد سے چھوٹ گئی ہے اور آپ شاید پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ اللہ کرے میرا یہ اندازہ درست ہو...... اور میرا یہ خط بھی عطا کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے۔ دو سال پہلے آپ نے میرے لئے جو کچھ کیا تھا، میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ انگوٹھے ہیں عمران...... اور آپ کی ہر ادا انوکھی ہے۔ آپ نے سجاد کی زندگی بچانے اور میری زندگی سنوارنے کے لئے خود کو بلاتردد پولیس کے حوالے کر دیا تھا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بات تھی۔ آپ کی ساری زندگی انڈیا کی کسی جیل میں گزر سکتی تھی۔ آپ کے اس احسان کا بوجھ ہی کم نہیں تھا کہ پچھلے مہینے آپ نے اس احسان کو دہرا دیا۔ میرے سر کی قسم کو پورا کیا اور خود کو سجاد کی سختی اور بے حسی کے حوالے کر دیا۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں سچ کہتی ہوں مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

''دو سال پہلے جب سجاد کا چھوٹا بھائی اور میرا دیور انور پاکستان میں ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا تو میرے دل میں بھی پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف ایک میل سا آ گیا تھا۔ لیکن آج میں اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچتی ہوں تو شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ ایک پاکستانی ہیں...... اور اس ایک پاکستانی نے میرے دل کا سارا میل دھو دیا ہے۔ مجھے ہر اس شخص سے محبت کرنا سکھا دی ہے جس کا تعلق سرحد کے اس پار سے ہے۔ آپ ہمیشہ میری دعاؤں میں رہتے ہیں اور رہیں گے۔ سخت بیمار رہنے کے بعد سجاد بھی اب کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔ کاش ایک وقت ایسا آئے جب میں انہیں آپ کے پاس لے کر آؤں اور وہ آپ سے معافی مانگیں...... اور اس نوکھے احسان کا شکریہ ادا کریں جو آپ نے دو سال پہلے ان پر کیا تھا۔''

میں خط پڑھ چکا تو عمران بولا۔ ''اس خط میں دو باتیں غلط ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''ایک تو وہ امید غلط ہے جو عاصمہ نے اس کھڑوس سجاد موہل سے لگائی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ سیدھا ہو سکے۔''

''اور دوسری غلط بات؟''

''اس نے پھر بھائی جان لکھا ہے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی اور کسی اُلو کی طرح اداس نظر آنے لگا۔

قریباً چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد عطاالرحمان جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہی کچھ دیر بعد جان محمد صاحب آ گئے۔ انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اقبال، میڈم صفورا اور نوری وغیرہ بخیریت واپس آ چکے ہیں۔ وہ پریشان تھے۔ انہوں نے قدرے پشیمان لہجے میں کہا۔ ''ریان سے یہ امید نہیں تھی۔ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ اسے اپنی کمٹ منٹ پوری کرنی چاہئے تھی...... یا ہمیں کم از کم اتنا ہی بتا دیتا کہ تلاش کا کام کس اسٹیج پر پہنچا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... لیکن مجھے امید ہے وہ رابطہ کرے گا ضرور۔ شاید ابھی تک وہ اپنی شکست اور ماریانی کی فتح کے صدمے سے باہر نہیں آیا۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ساتھ والے ٹی وی لاؤنج سے میڈم صفورا کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''عمران...... تابش...... ادھر آؤ...... دیکھو یہ کیا نیوز آ رہی ہے۔''

ہم لپکتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں پہنچے۔ جان محمد صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ٹی وی چینل پر ایک سنسنی خیز بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

میڈم صفورا نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''جہاز گر گیا...... پرائیویٹ جیٹ فیلکن 900 سی یہ وہی ہے جس کا تم نے بتایا تھا۔ اوہ مائی گاڈ...... یہ دیکھو، نیچے پٹی میں تفصیل بھی چل رہی ہے۔''

ہم بھی سکتہ زدہ دیکھتے رہ گئے۔ یہ سی این این تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا...... ''ہمارے ذرائع کے مطابق یہ لگژری طیارہ چند ہی روز پہلے مسٹر بفیلو کی ملکیت میں آیا تھا۔ وہ اپنی ایک خاتون دوست مس امینڈ اور دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس طیارے پر برمنگھم سے ہمبرگ جا رہے تھے۔ ان چاروں کے علاوہ عملے کے تین افراد بھی اس لگژری طیارے میں سوار تھے۔ یاد رہے کہ مسٹر بفیلو ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ کیسینوز کی ایک انٹرنیشنل چین کے مالک تھے جس کو نائٹ رائیڈر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسٹر بفیلو کی عمر پینتالیس سال تھی۔ انہوں نے اپنے پس ماندگان میں......''

عمران نے چینل بدلا۔ یہ ''وی او اے'' تھا۔ یہاں بھی یہی خبر موجود تھی۔ ایک پہاڑی پر طیارے کا سلگتا ہوا ملبا دکھایا جا رہا تھا اور امدادی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر بتا رہا تھا کہ طیارے میں سوار سات افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ اس نے ہلاک شدگان

کے ضمن میں طیارے کی ائر ہوسٹس کا ذکر بھی کیا جو ایک معروف ماڈل گرل بھی تھی۔

ہم قریباً آدھ گھنٹے تک سخت حیرت کے ساتھ اس حادثے کی خبریں سنتے رہے۔ پھر توقع کے عین مطابق وہ خبر بھی آ گئی جو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ایک انگلش نیوز چینل نے بتایا کہ اطلاعات کے مطابق مسٹر بفیلو بوائڈ نے یہ تین انجن والا جیٹ جہاز جوئے کی کسی بڑی بازی میں جیتا تھا۔ اس بازی، یا کہہ لیں کہ انعامی بازی میں کئی ایسے معروف افراد نے حصہ لیا تھا جن کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہے۔ ان میں مسٹر بفیلو کے کاروباری حریف مسٹر ریان ولیم بھی شامل تھے۔ اطلاعات کے مطابق مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا تھوڑے سے مارجن کے ساتھ یہ مقابلہ جیت نہیں پایا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم نے ٹی وی بند کیا اور تبصرے میں مصروف ہو گئے۔ عمران بولا۔ ''اس کو کہتے ہیں بال بال بچے۔ ہمارا آخری جواب درست ہوتا تو آج یقیناً بفیلو کے بجائے وہ موٹا ریان ولیم آنجہانی ہو چکا ہوتا۔''

جان محمد صاحب نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کھوئی کھوئی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ ''میرا خیال ہے...... ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بار پھر تمہاری ''لک'' کام کر گئی ہے۔ یعنی جس کو ہم بدقسمتی سمجھے تھے، وہ خوش قسمتی نکلی۔''

اقبال اور میڈم صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ جان محمد صاحب نے کہا۔ ''خبروں کے مطابق بظاہر یہ فیلکن تکنیکی خرابی کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔ کوئز شو کے روز یہ ''تکنیکی خرابی'' کسی کے حصے میں بھی آ سکتی تھی۔''

میڈم صفورا نے کہا۔ ''مسٹر بفیلو کی اس طیارے میں یہ شاید دوسری پرواز تھی۔''

اقبال بولا۔ ''اسے پہلی ہی کہنا چاہئے۔ نیوز کے مطابق پہلی پرواز تو برمنگھم شہر کے اوپر تھی اور بالکل مختصر سی تھی۔ شاید دس پندرہ منٹ کی۔''

اس خبر نے ہمیں حیرت کے ساتھ ساتھ صدمے سے بھی دوچار کیا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک طمانیت کے احساس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شاندار فیلکن 900 سی ریان ولیم کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ ریان ولیم، اس کا بھتیجا گیری یا پھر ہم میں سے بھی کوئی اس حادثے کا لقمہ بن سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد جان محمد صاحب کے سیل فون پر مسٹر ریان ولیم کی کال آ گئی۔ اس نے جان محمد صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے طیارے کے حادثے کی خبر سن لی ہے؟ جان محمد صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔

دونوں میں دس پندرہ منٹ تک اس بارے میں بات ہوئی۔ پھر جان محمد صاحب نے عمران سے کہا کہ ریان ولیم، اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عمران نے بات کی۔ بات کرتے ہوئے اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوطرفہ گفتگو ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ ریان کی آواز آئی۔

''ہیلو مسٹر ایمران! تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں...... اور آپ؟''

''میں بھی خیریت سے ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے بخیریت ہونے میں کچھ نہ کچھ تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ بظاہر جو کچھ ہمارے نقصان میں نظر آ رہا تھا، وہ دراصل فائدے میں تھا۔ ہمیں وقتی طور پر ضرور شاک پہنچا لیکن اب یوں لگ رہا ہے کہ ہم اس روز اپنی سلامتی جیت کر اٹھے تھے اور بفیلو اپنی زندگی ہار کر اٹھا تھا۔''

''بس جی، یہ اتفاقات ہیں زمانے کے......''

ذرا توقف کے بعد ریان ولیم نے کہا۔ ''تمہارے ساتھیوں کا کیا بنا؟''

''آپ کو ان کا خیال کیسے آ گیا؟'' عمران نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ دن تک اس کام کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ لیکن اب میں پھر سے کوشش شروع کرتا ہوں۔''

''پھر سے کوشش کی ضرورت نہیں جناب...... وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے ہیں اور اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ جو کام آپ اور ہم نہیں کر سکے، وہ ایک اکیلی عورت نے کیا ہے۔''

''زبردست مسٹر ایمران! یہ خبر تو تم نے بہت اچھی سنائی ہے۔ کیسے ہوا یہ سب؟''

''جیسے آپ ہمیں اچانک اٹھا کر الہ آباد سے لاہور لے آئے تھے، اسی طرح ان لوگوں کو بھی خدا کا ایک بندہ مل گیا۔ وہ انہیں یہاں لے آیا......''

عمران اور مسٹر ریان ولیم کے درمیان کچھ دیر تک مزید بات ہوئی۔ آخر میں ریان نے کہا۔ ''ایمران! ہمارے درمیان رابطہ رہے گا۔ مجھے اس واقعے پر بھی بہت افسوس ہے جو لاہور میں تمہارے اور میرے دوست فورڈ کے درمیان پیش آیا۔ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔''

''اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جی۔ جو ہو گیا، وہ ہو گیا۔''

O......❖......O

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے۔ میں حسب

معمول فرش کے سخت بستر پر تھا۔ سونے سے پہلے میں نے قریباً دو گھنٹے تک مارشل آرٹ کی کڑی مشق کی تھی۔ اس وقت تھک کر چُور ہو رہا تھا۔ ایسی تھکن اب مجھے تکلیف کے بجائے راحت دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے اس جسم کو سزا دے رہا ہوں جس نے ماضی میں مجھے سستی، بزدلی اور ذلت کے تاریک غاروں میں پھینک رکھا تھا۔ باروندا جیکی کے فلسفے کے مطابق میں اپنی ذات سے لڑتا تھا، اپنے نفس کو مارتا تھا۔ میری خوراک بہت سادہ ہو چکی تھی۔ میں سادہ ترین لباس پہن رہا تھا اور موسم کی شدت سے نبرد آزما ہونا میرا مشغلہ بن چکا تھا...... عاطف، فرح اور جیلانی میری تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔

موبائل کی گھنٹی نے مجھے بیدار کیا۔ عمران بستر پر سو رہا تھا۔

یہ اس کے موبائل کی گھنٹی تھی۔ میں نے اسکرین پر نام پڑھا۔ ریان ولیم کا نام دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے عمران کو جگایا۔

''کیا ہوا؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

تمہارے ابا جی کا فون ہے۔'' میں نے اسے موبائل تھماتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی اسکرین پر نام دیکھا اور برا سا منہ بنا کر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو ایمران؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''جی میں بول رہا ہوں۔ کیا ملکہ الزبتھ قاتلانہ حملے میں ماری گئی ہے؟'' عمران نے آخری فقرہ اردو میں کہا۔

''کیا کہا تم نے؟'' ریان ولیم نے پوچھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں، اتنی رات گئے آپ کا فون؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' ریان کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔ موبائل فون کا اسپیکر آن تھا اس لئے اس کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

''کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے؟''

ریان ولیم کی آواز ابھری۔ ''میں لک پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔ اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہاری لک پر بھروسا ہے۔ یہ بھروسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ میں لکی بندے کو پہچان لیتا ہوں۔ میری اس صلاحیت نے مجھے کم کم ہی دھوکا دیا ہے۔''

عمران مسکرایا۔ ''کیا آپ نے مجھے یہی بتانے کے لئے آدھی رات کو فون کیا ہے؟''

''تمہارے لئے آدھی رات ہو گی لیکن یہاں امریکا میں دوپہر ہے۔ ایک بڑی چمکیلی اور خوش قسمت دوپہر۔''

''خوش قسمت دو پہر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں ایران! تمہیں پتا ہے نا کہ آخری سوال کا جواب غلط ہونے کی وجہ سے ہم مقابلے کے ابتدائی انعام پر آ گئے تھے۔ یعنی بنیادی انعام پینسٹھ ہزار ڈالرز۔ پتا ہے گیری نے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کا کیا کیا؟''

''کیا کیا؟''

''اس نے کیلیفورنیا میں یونہی راہ چلتے چلتے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کے لاٹری ٹکٹ خرید لئے۔ اس ریاستی لاٹری کے لئے چار بڑے انعام نکلتے ہیں۔ گیری کا دوسرا بڑا انعام نکل آیا ہے۔ پتا ہے یہ کتنا ہے؟''

''کتنا ہے جناب؟''

''آٹھ ملین ڈالرز...... پورے آٹھ ملین ڈالرز۔'' ریان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ ''تم لکی ہو بھئی۔ مجھے پہلے بھی اس میں شبہ نہیں تھا، اب بھی نہیں ہے۔''

''آپ میرے لئے اس طرح کا گمان کرتے ہیں، اس کے لئے آپ کا شکریہ۔'' عمران کا لہجہ روکھا پھیکا تھا۔

''میں بہت جلد پھر پاکستان آ رہا ہوں۔ پروفیسر رچی بھی میرے ساتھ ہوگا۔ کچھ اور کام بھی ہیں لیکن سب سے اہم کام تم سے ملنا ہوگا۔''

کچھ دیر بعد یہ بات چیت ختم ہوئی تو عمران نے تکیے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی اور بولا ''دنیا مطلب دی او یار۔ مطلب ہووے تے پیار وی کردے ظالم دنیا دار۔''

''یہ تو واقعی چمتکار ہوا ہے عمران۔ جو بدترین ہار نظر آ رہی تھی، وہ ایک مناسب جیت میں بدل گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو پینسٹھ ہزار ڈالرز اس انعامی مقابلے میں جیتے گئے، وہ پینسٹھ ہزار ڈالرز نہیں تھے۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز تھے قریباً ساٹھ کروڑ پاکستانی روپیا۔''

''کہنے کو تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جگر! خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے کہا ہے نا کہ اتفاقات ہیں زمانے کے۔ اب پروگرام کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کل کا پروگرام۔''

''تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اپنی گرل فرینڈ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''شاہین کی اور کس کی؟ تمہاری سرکس کی ساتھی۔ موت کے کنوئیں کی ساتھی...... اور شاموں اور راتوں کی ساتھی۔''

''یہ آخری بات تم نے بالکل غلط کی ہے۔ میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ تم پر 'توہین

چینل' کا مقدمہ ہو سکتا ہے۔ شاموں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن وہ میری راتوں کی ساتھی نہیں ہے...... بلکہ کوئی بھی راتوں کی ساتھی نہیں ہے۔ یہ باب اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے......''

''چلو جو بھی ہے لیکن کچھ تو خوفِ خدا کرو۔ تمہیں چوبیس روز ہو گئے ہیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے لیکن ابھی تک اسے شکل بھی نہیں دکھائی۔''

''میں نے ابھی شکل دکھائی ہی کسے ہے؟ ابھی تو میں لاہور سے بھی ٹھیک طرح سے نہیں ملا۔ میرے گلی کوچے...... میرے لوگ...... میرے بازاروں کی رونقیں سب کچھ مجھ سے دور ہے۔ یہاں آتے ہی یہ ریان ولیم والا ٹینٹا کھڑا ہو گیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے سب کچھ۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ کل لاہور سے ملیں گے۔''

''ضرور ملیں گے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات ہو گی۔'' عمران نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''بچوں کے لئے ہر بات کا سمجھنا ضروری نہیں ہوتا۔ کئی باتیں اور فلمیں صرف اٹھارہ سال سے اوپر کے لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے تایا جی۔'' میں نے کہا۔

''یار! ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ اٹھارہ سال کی حد کیوں رکھی گئی ہے؟ کیا اس عمر میں بندہ بہت مضبوط ہو جاتا ہے؟ یہ تو بہت طوفانی عمر ہوتی ہے۔ حد ہونی چاہئے پینتیس سال چالیس سال یا پھر اٹھاسی سال سے اوپر۔ یوں بے راہ روی کا کوئی خطرہ تو نہیں رہے گا۔''

''خطرہ تو پھر خطرہ ہوتا ہے۔'' میں مسکرایا۔

''تم اپنے آباؤ اجداد کا کوئی تجربہ بیان کر رہے ہو۔ میں عام بات کر رہا ہوں۔''

میں نے گھونسا تانا تو وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے جا کھڑا ہوا۔

اب ہم میں خاصی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بے دریغ لتاڑتے تھے۔ زبانی بھی اور جسمانی بھی۔ مجھے پھر اس لاٹری کا خیال آ گیا جس کا دوسرا بڑا انعام برص زدہ گیری کو ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس خطیر انعامی رقم سے بہت سی ریان ولیم کے گنبد نما پیٹ میں چلی جاتی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو گیری کے حصے میں آنا ہی تھا۔ وہ اس ''کچھ نہ کچھ'' سے بھی اپنی بہت سی خواہشات پوری کر سکتا تھا۔ اسے ایک ڈیڑھ ملین بھی مل جاتا تو بہت تھا۔ میں نے

تصور کی نظروں سے گیری گرانٹ کے افسردہ چہرے کو خوشی کی روشنی میں چمکتے دیکھا۔ میں اور عمران دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ میں اور عمران ایک موٹر سائیکل پر سوار لاہور کی سیر کے لئے نکلے۔ یہ وہی موٹر سائیکل تھی جو کئی برسوں سے موت کے کنوئیں میں عمران کی ساتھی تھی۔ ایک شیطانی چرخا۔ جب یہ چلتی تھی تو لگتا تھا کہ پوری دنیا میں بس اسی کی گونج ہے۔ عمران کی فرمائش پر جان محمد صاحب نے کل ہی یہ موٹر سائیکل سرکس سے منگوائی تھی۔ جان محمد صاحب نے عمران ہی کی فرمائش پر ابھی تک اس کے سارے ''سرکس فیلوز'' کو اس کی آمد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ شاہین بھی ان میں شامل تھی۔

ہم دونوں ہیلمٹ پہن کر اس ''تاریخی'' موٹر سائیکل پر بیٹھے اور لاہور میں گم ہو گئے۔ عمران ایک گرمی میں جھلسے ہوئے پیراک کی طرح تھا اور وہ لاہور کے ٹھنڈے تالاب میں غوطہ زن ہو گیا تھا۔ مال روڈ، لوئر مال روڈ، میکلوڈ روڈ، سر آغا خاں روڈ، فیروز پور روڈ، وہ کون سی سڑک تھی جس کے سکون کو اس موٹر سائیکل کے شور نے تہ و بالا نہیں کیا۔ وہ بلا کی رفتار سے چلاتا تھا اور اس کے پیچھے بیٹھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ جیل روڈ کے قریب ایک چوراہے پر وہ دائیں جانب سے آنے والے ایک ٹرک کے سامنے سے اتنی تیزی سے گزرا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ ''یار! اب اتنے بھی شوخے نہ بنو۔ مانا کہ تمہاری جان ہتھیلی پر ہے لیکن دوسروں کی جان تو ہتھیلی پر نہ رکھو۔''

''یار! کبھی موٹر سائیکل کے نیچے آ کر بھی ٹرک تباہ ہوا ہے۔''

''یہ بالکل بیکار دلیل ہے تمہاری۔ ٹرک ڈرائیور گھبرا کر ٹرک کو گندے نالے میں بھی گرا سکتا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ رفتار کچھ کم کر دیتے ہیں اب ساٹھ سے اوپر نہیں جاؤں گا۔''

''یعنی تمہارے خیال میں ساٹھ کم ہے؟''

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، ٹریفک پولیس کی موٹر سائیکل کا ہوٹر سنائی دیا۔ وہ ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

''لو اب بھگتو...... اشارہ کاٹا تھا نا تم نے۔ تمہارا پھوپی زاد پیچھے لگ گیا ہے۔''

عمران نے بھی عقب نما آئینے میں ٹریفک سارجنٹ کو دیکھ لیا۔ پھر عمران نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ رفتار کم کرنے یا موٹر سائیکل روکنے کے بجائے اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔ اگلے پانچ منٹ تک ٹریفک سارجنٹ اور عمران کے درمیان اچھی خاصی ریس

ہوئی۔ ایک اور ٹریفک سارجنٹ بھی اس ''کارِ خیر'' میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر وہ عمران ہی کیا جو ان لوگوں سے پکڑا جاتا یا خوف کھا کر رک جاتا۔ وہ موت کے کنوئیں کا کھلاڑی تھا...... بلکہ اس سے بھی آگے کی چیز تھا۔ کسی بھی گیم کو ''گیم آف ڈیتھ'' بنا کر اسے مزا آتا تھا۔ بہرحال، میرے کہنے پر اس نے بے چارے سارجنٹس کو زیادہ ''خجل'' نہیں کیا اور داتا دربار کے قریب اپنے شیطانی چرخے کو ایک تنگ گلی میں گھسا دیا۔ پھر ایک اور زیادہ تنگ گلی میں گھسنے کے بعد اندر ہی اندر سفر کرتا راوی روڈ کی طرف نکل آیا۔

بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہیرو بھائی، ہیرو بھائی کی آوازیں بلند ہوئیں...... میں نے چار برس پہلے کے چاچے رفیق کو دیکھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا آیا۔ اس نے عمران کو گلے لگایا...... پوپلے منہ سے بولا۔ ''پتر کہاں رہے اتنی دیر؟ ڈیڑھ سال سے اوپر ہو گیا تمہیں شکل دکھائے ہوئے۔ بڑے برے برے خیال آتے تھے ہمیں۔ لگتا تھا کہ پورا محلّہ ویران ہو گیا ہے۔''

''بس آ گیا ہوں نا۔ اب آپ کے آس پاس ہی رہوں گا۔ اور زاہد بھائی! یہ جھنڈیاں شنڈیاں کس سلسلے میں ہیں؟ کیا آپ کو پتا تھا کہ میں تشریف لا رہا ہوں......''

عمران کا پڑوسی زاہد بولا۔ ''ہمیں پتا ہوتا، تم آ رہے ہو تو پھر ان جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ ڈھول ڈھمکا اور باجا گاجا بھی ہوتا۔ یہ تو نذیرے کی شادی کی جھنڈیاں ہیں...... چاچے نذیرے کی شادی ہو رہی ہے ہفتے کے دن۔ آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔''

''بھائی زاہد تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ چاچا نذیر اور شادی؟''

''ہاں، یہ لمبی کہانی ہے ہیرو بھائی۔'' لمبے بالوں والا ایک لڑکا بولا۔ ''جوانی میں چاچے نذیرے کی ایک منگیتر تھی۔ دو سال رہی تھی یہ منگنی پھر ٹوٹ گئی۔ لڑکی کی شادی کہیں اور ہوئی، ہمارے چاچے نذیرے کی شادی کہیں اور۔ اور پھر پینتالیس پچاس سال گزر گئے۔ اب دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں کے جیون ساتھی دیر ہوئی، اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ دونوں کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ ہم سب محلے والے مل کر امام صاحب کے پاس گئے۔ ان کی اجازت اور رضامندی سے ہم لوگ چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی شادی کرا رہے ہیں۔ اسی محلے سے برات جانی ہے۔ اسی محلے سے ڈولی اٹھنی ہے۔''

''زبردست...... یہ تو بڑی فائیو اسٹار قسم کی خبر سنائی ہے تم لوگوں نے۔'' عمران نے کہا۔

عمران کی آمد پر لوگوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہم سب کے ساتھ ہی سیمنٹ کے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ کوئی ہمارے لئے حلوہ پوری لے آیا، کوئی چائے، کوئی گاجر کا حلوہ۔ ایک لڑکی نے چوبارے کی تیسری منزل سے ٹوکری لٹکائی اور زور سے بولی۔ ''عمران بھیا! گرم نہاری۔''

"شکریہ...... شکریہ۔" عمران نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

کئی چھوٹے لڑکے عمران کے شیطانی چرخے کے اردگرد گھوم رہے تھے اور اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک موٹر سائیکل کے ہوٹر کی آواز سنائی دی۔ عمران کی تلاش میں بھٹکنے والے ٹریفک سارجنٹس میں سے ایک یہاں پہنچ گیا تھا۔ "لو کر لو تماشا۔" میں نے عمران سے کہا۔

سارجنٹ نے عمران کی کھٹارا موٹر سائیکل دور ہی سے دیکھ لی تھی۔ وہ غصے میں تپا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ "السلام علیکم سارجنٹ بھائی۔" عمران نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔

"یہ تمہاری بائیک ہے؟" سارجنٹ نے کرخت لہجے میں کہا۔

"میں اس کا مالک ہونے پر شرمندہ ہوں۔ لیکن میں اس ملکیت سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا...... موٹر سائیکل سمیت۔" سارجنٹ کو وردی کی موجودگی نے ایک دم پتھر کا بنا دیا تھا۔

عمران نے منت سماجت کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ وہ بار بار اپنے واکی ٹاکی کو اپنے منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ غالباً اپنے ساتھیوں کو اپنی لوکیشن بتانا چاہتا تھا۔ یکا یک ایک عمر رسیدہ باریش شخص آگے بڑھا اور اس نے سارجنٹ کے ہاتھ سے واکی ٹاکی چھین لیا۔ وہ گرج کر بولا۔ "ہم تمہیں کچھ نہیں کرنے دیں گے ہیرو پتر کے خلاف۔ یہ ڈیڑھ سال بعد آیا ہے یہاں۔ ہماری آنکھیں ترسی ہوئی ہیں اس کے لئے۔ تم اسے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟"

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مظاہرے کی سی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ ایک ادھیڑ عمر پھل فروش بولا۔ "ہماری یونین ہے ٹھیلے والوں کی۔ تم بھتا لیتے ہو ہم غریبوں سے۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں...... ہم تمہارے خلاف کارروائی کرائیں گے۔ اخباروں کے دفتروں کے سامنے مظاہرہ کریں گے...... تم کرو چالان۔ ہم سے بھی جو کچھ ہو سکا، کریں گے۔ یہاں کوئی بھی دودھ کا نہایا ہوا نہیں ہے۔"

سارجنٹ ذرا ڈھیلا پڑتا نظر آیا...... لیکن وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اتنی دیر میں ایک اور موٹر سائیکل کا ہوٹر گونجا۔ غالباً اس دوسرے سارجنٹ کو وائرلیس پر پیغام مل چکا تھا۔ اس نے طوفانی انداز میں اپنی ہیوی موٹر سائیکل موقع پر پہنچائی اور اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے عمران کی طرف بڑھا۔

عمران کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار ابھرے۔ پھر یہ آثار مسرت میں بدل گئے۔ "عمران بھائی آپ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"بے شک میں ہوں۔ بقلم خود۔"

"او گاڈ! آپ نے اتنا دوڑایا ہمیں۔ آپ نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا اس لئے پتا ہی نہیں چلا۔"

"میری بے مثل موٹر سائیکل نے تو ہیلمٹ نہیں پہن رکھا تھا۔"

"مجھے تھوڑا سا شک تو ہوا تھا لیکن......"

دوسرا سارجنٹ جو ذرا سینئر تھا، بدستور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا ساتھی اسے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے بجھانے لگا۔ وہ کبھی خاموش ہو جاتا، کبھی نفی میں سر ہلانے لگتا۔ اسی دوران میں بالا دودھ فروش، دو بڑے گلاس باداموں والے دودھ کے لے کر آیا۔ سب نے سینئر سارجنٹ کو گھیرا ڈال لیا اور زبردستی بٹھا کر دودھ پلایا۔ کوئی اس کے کندھے دبانے لگا۔ کوئی اس کی پینٹ سے مٹی جھاڑنے لگا۔ یہاں تک کہ سارجنٹ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔

چاچے رفیق نے پوپلے منہ کے ساتھ پُرخلوص دعا دی۔ "ہنستے ہوئے کتنا چنگا لگتا ہے۔ دیکھنا بڑی ترقی ہوگی تیری۔ وڈی عید سے پہلے پہلے "ہیڈ کانسٹیبل" بن جائے گا۔"

چاچے رفیق کی بات پر قہقہہ پڑا۔ ماحول خوش گوار ہوگیا۔ دونوں سارجنٹ ڈیوٹی پر تھے۔ وہ زیادہ دیر ہمارے ساتھ نہیں ٹھہر سکے اور واپس چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والا سارجنٹ نواز احمد عمران کا شناسا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے کسی نئی ہنڈا گاڑی کا چالان کیا اور رجسٹریشن بک رکھ لی۔ لیکن یہ بک تھانے میں جمع کرانے سے پہلے ہی نواز احمد سے کہیں گم ہوگئی۔ نواز احمد کے لئے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ گاڑی مالکان کا دعویٰ تھا کہ ڈپلی کیٹ بک کی وجہ سے ان کا ڈیڑھ دو لاکھ کا نقصان ہوگیا ہے۔ نواز احمد کو نوکری کے لالے پڑ گئے۔ اس موقع پر عمران نے اپنی گرہ سے کچھ رقم دی تھی اور اس نوجوان ٹریفک آفیسر کی نوکری بچائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح کے اَن گنت واقعات عمران سے منسوب ہیں۔ یہی واقعات تھے جنہوں نے بہت سی جگہوں پر لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

عمران اور میں عمران کے پرانے گھر میں بھی گئے اور وہاں کچھ وقت گزارا۔ اس گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی زندگی کے وہ بدترین دن یاد آ گئے جب میں ہر گھڑی خودکشی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران اپنی شخصیت کے تمام تر سحر کے ساتھ میرے اور میری موت

کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ تب میرا اور اس کا کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ اپنوں سے کہیں بڑھ کر میرے لئے فکر مند تھا۔

ہم نے اس شاندار ماحول میں قریباً چار گھنٹے گزارے۔ ہم نے لنچ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی کیا۔ لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر یہ ایک عوامی لنچ تھا۔ گرما گرم نان، انڈا چنے، سلاد اور آخر میں ملائی والی دودھ پتی۔ جوں جوں اردگرد کے لوگوں کو عمران کی آمد کا پتا چل رہا تھا، وہاں اس سے ملنے کے لئے آرہے تھے۔ اس سے اپنے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔ گفتگو کا ایک دلچسپ موضوع چاچے نذیرے کی شادی بھی تھا۔ عمران نے وعدہ کیا کہ وہ نذیرے کی شادی میں ضرور شرکت کرے گا اور چاچے، چاچی کو سلامی بھی دے گا۔

تین بجے کے قریب عمران کی موٹر سائیکل پھر اسٹارٹ ہوئی اور آدھے لاہور کو پتا چل گیا کہ کچھ اسٹارٹ ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ ''اس دفعہ مجھے چلانے دو۔ میں بھی تو اس کا مزہ چکھوں۔''

وہ بولا۔ ''میں تمہاری استادی سمجھ رہا ہوں۔ گھبراؤ مت، میں آہستہ چلاؤں گا۔''

ہم نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے اچھرہ پہنچے۔ یہاں ہم نے عمران کے ایک پسندیدہ ریستوران میں چائے پی۔ اس ریستوران سے میری بھی ایک یاد وابستہ تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ ایک عید کے موقع پر ہم سب گھر والے آئس کریم کھانے یہاں آئے تھے۔ کتنے سہانے دن تھے۔ میں، عاطف، فرح اور امی...... ہم اصرار کر کے ثروت اور بھائی ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے...... امی میرے سامنے اُس کونے والی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میں پانی پی رہا تھا انہوں نے کہا تھا۔ ''تابش! تین گھونٹ میں پیتے ہیں۔''

وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں۔ میں آج بھی پانی پی رہا تھا لیکن وہ آواز کہیں نہیں تھی، وہ چہرہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ آنکھیں جل اٹھیں۔ سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ میری ماں کو مارنے والے کہاں تھے؟ وہ اسی شہر میں تھے شاید۔ اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''عمران! ہم سیٹھ سراج کو کب ڈھونڈیں گے؟''

وہ مسکرایا۔ ''بھئی، ہم ڈھونڈنا شروع تو کر چکے ہیں بلکہ...... میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی حد تک کامیابی بھی مل چکی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

اس نے اپنے سر کو حرکت دیئے بغیر ڈائننگ ہال کے بائیں گوشے کی طرف دیکھا اور

بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ راوی روڈ سے دو بندے مسلسل ہمارے پیچھے ہیں۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ان کا تعلق سراج وغیرہ سے ہے۔ نہ...... نہ، مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ انہیں شک ہوگا۔''

ایک دم مجھے یاد آیا۔ جب آج صبح گھومنے پھرنے کے لئے نکلے تھے تو عمران نے ایک تیر سے دو شکار والی بات کہی تھی۔ تو کیا اس کا اشارہ اس طرف تھا؟ شاید۔ ایسا ہی تھا...... وہ جانتا تھا کہ جب ہم اس طرح نکلیں گے اور جانی پہچانی جگہوں پر جائیں گے تو سیٹھ سراج کے گرگوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہمیں دیکھے گا، یا اسے ہمارے بارے میں پتا چلے گا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''جو کچھ بھی کرنا ہے لیکن اب گھر کا رخ نہیں کرنا۔ یقیناً یہ لوگ ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ اور یہ ان کے نزدیک ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔''

ہم تقریباً پندرہ منٹ وہاں مزید بیٹھے۔ عمران سوچ میں تھا۔ اس نے دو سو روپے کے بل کے ساتھ بیرے کو پورے آٹھ سو روپے ٹپ دے دی۔ بیرے کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آج صبح جب ہم گھر سے نکلے تو عمران کی جیکٹ کی جیب میں ایک موٹی رقم موجود تھی۔ اب اس رقم میں سے تھوڑی ہی بچی تھی۔ اس نے یہ روپے اپنی جان پہچان والے مختلف ضرورت مندوں میں تقسیم کئے تھے۔ بیس ہزار کی رقم موج میلے کی مد میں خرچ ہوئی۔ یہ بیس ہزار روپے اس نے چاچے نذیرے کی شادی کے انتظامات مزید بہتر کرنے کے لئے دیئے تھے۔

ہم ریستوران سے نکلے اور اپنے شیطانی چرخے پر آ بیٹھے۔ عمران نے عقب نما آئینہ درست کر لیا۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس نے راوی روڈ سے روانہ ہونے کے بعد طوفانی رفتار اختیار کیوں نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔

یہ ''پیچھا'' ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ وہ دونوں افراد بھی بائیک پر تھے۔ واقعی اب گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عمران یونہی اِدھر اُدھر موٹر سائیکل گھمانے لگا۔ ''کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی سنسان سڑک پر چلتے ہیں۔ وہاں جا کر ان سجن پیاروں سے ہیلو ہیلو کرتے ہیں۔''

لیکن صرف ایک دو منٹ بعد عمران قدرے متفکر نظر آیا۔ وہ بار بار عقب نما آئینہ دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

"یار! عجیب اناڑی لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ لگتا ہے "پراپر" طریقے سے کسی شریف بندے کا پیچھا کرنے کا پتا ہی نہیں ہے انہیں۔ اب پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔"

"تم بھی تو موڑ پر موڑ کاٹ رہے ہو۔"

"لیکن یار، رفتار تو معمولی سی ہے۔ اتنی رفتار پر تو کوئی نابالغ بدمعاش بھی تعاقب جاری رکھ سکتا ہے۔"

اس نے جھلا کر موٹر سائیکل روک دی۔ ہم دونوں بدستور عقب نما آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ دونوں ... واقعی کوئی غلط موڑ کاٹ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد عمران نے موٹر سائیکل واپس موڑی۔ ہم انہی راستوں پر واپس ہوئے۔ یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ... نے کہا۔ "اس کمینے سیٹھ سراج کے کارندے ایسے اناڑی نہیں ہو سکتے۔ کہیں یہ کوئی اور معاملہ نہ ہو۔"

"کبھی کبھی تم عقل کی بات کر ہی جاتے ہو۔" عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ دور فاصلے پر وہ دونوں اپنی موٹر سائیکل سمیت ایک پان شاپ کے قریب کھڑے نظر آئے۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے۔ ہماری موٹر سائیکل کی آواز...... ٹریفک کے شور کے باوجود دور ہی سے ان کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔ اس وقت یقیناً ان کی سٹی گم ہوگئی جب عمران نے اپنی عجوبہ بائیک عین ان کے پہلو میں جا کھڑی کی۔

انہوں نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ایک نے سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ دونوں کی عمریں پچیس چھبیس سال رہی ہوں گی۔ دیکھنے میں وہ بالکل عام سے دکان دار ٹائپ نظر آتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل پر آگے بیٹھے ہوئے نوجوان سے پوچھا۔ "ماچس ہوگی تمہارے پاس؟"

"نن...... نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" عمران بولا۔ "تم اتنی دور سے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے ہو۔ یقیناً تمہیں اپنا سگریٹ جلانا ہوگا۔ یہ لو۔" عمران نے اپنا سگریٹ لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا...... مطلب...... جی۔"

"مطلب کے بچے۔ پیچھا کیوں کر رہے ہو ہمارا؟ کوئی لڑکی نہیں ملی تمہیں۔" عمران

پھنکارا۔

"وہ تو...... وہ جی...... ہم تو......" وہ بری طرح ہکلایا۔

"ہم تو...... تم تو...... چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ۔ ورنہ ابھی یہاں مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ بھرکس سمجھتے ہو نا تم؟"

دونوں بندوں کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ صاف پتا چلا کہ وہ اس قماش کے لوگ نہیں ہیں۔ یا تو چھوٹے موٹے جرائم پیشہ ہیں یا کسی اور چکر میں ہمارے پیچھے ہیں۔ عمران نے ان کی موٹر سائیکل کی چابی نکال لی۔ چند ہی منٹ بعد ہم دونوں ان دونوں کے ساتھ ایک سستے سے چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ اب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ "کیا چکر ہے صاف صاف بتاؤ۔ اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔" عمران نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم...... ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"کیوں، میں نے دیوتا لکھی ہے یا ہیری پوٹر میں کام کیا ہے؟"

"وہ جی...... دراصل۔" وہ ہکلا کر بولا۔

"اور تمہاری شکل مجھے کچھ پہچانی سی لگ رہی ہے۔ تم راوی روڈ پر تو نہیں رہتے ہو؟" عمران نے قدرے فربہ نوجوان سے پوچھا۔

"جج...... جی ہاں۔ میں ادھر ہی رہتا ہوں۔ در...... دراصل کسی نے کہا تھا کہ آپ جب بھی مجھے نظر آئیں، میں آپ سے ملوں اور آپ کو اس کے پاس لے کر آؤں۔"

"یہاں لاہور میں مجھے سب سے زیادہ فلمسٹار ریما جی چاہتی ہیں۔ دوسرا نمبر نرگس کا ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی تم جیسے گاؤدی کدو کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ بتاؤ کون ہے وہ؟ اور کہاں رہتی ہے؟"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تصدیق کیے بغیر ہی مؤنث کا صیغہ استعمال کر رہا تھا۔ یہ بھی اس کی ہلکی پھلکی گفتگو کا انداز تھا۔

"وہ ہمارے پیر جی ہیں جی۔ پیر شوکت تھانوی صاحب۔ یہاں لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ وہ کافی عرصے سے آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔"

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یار! مجھے تھانوی کے لفظ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کہیں یہ "تھانے" سے تو نہیں نکلا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو پھر پیر تھانوی کا مطلب تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ ابھی الٰہ آباد والے پیر تھانوی سے بمشکل جان چھڑائی ہے۔"

''کس مقصد سے ملنا چاہتے ہیں تمہارے پیر صاحب؟'' میں نے فربہ اندام شخص سے پوچھا۔

''انہوں نے بتایا نہیں۔ لں...... لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوا ہوں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''سچ پوچھیں جی تو میں پچھلے تقریباً آٹھ ماہ سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں آتے جاتے آپ کے خالی گھر پر نظر ڈالتا تھا۔ آج گھر میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ آپ کی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ میں دوڑا ہوا باہر نکل آیا۔''

''تم چھپا رہے ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تمہارے پیر صاحب ہیں اور تمہیں ہی پتا نہیں کہ وہ کیوں اتنی بے قراری سے میرا انتظار کر فرما رہے ہیں۔''

وہ ذرا تذبذب میں رہ کر بولا۔ ''مجھے زیادہ تو پتا نہیں جی۔ پر کوئی ایسا مریض ہے جس کا وہ علاج کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے علاج کے لئے ان کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ پوری بات تو آپ کو پیر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، چلو ان کے پاس۔ ابھی ملاقات کر لیتے ہیں۔ لیکن جانا کہاں ہے؟''

''یہیں جی۔ شاہ جمال موڑ کے قریب۔'' اکہرے بدن والے نے جواب دیا۔

ہم چائے خانے سے باہر نکل آئے۔ عمران نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تم اس موٹے کدو کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے ساتھی کو بٹھا لیتا ہوں۔''

○......❖......○

ہم اسی ترتیب کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ہم مختلف
سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے شاہ جمال کے علاقے کی طرف نکل آئے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی
آستانہ نما جگہ ہوگی لیکن یہ تو ایک اچھی خاصی رہائشی کوٹھی تھی۔ ہم لان میں داخل ہوئے اور
دونوں موٹر سائیکلیں بند کردیں۔ عمران کی جیکٹ میں بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ یہاں ہمیں کسی
طرح کے حالات بھی پیش آسکتے تھے۔ ہمیں ایک ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ یہاں
الماریوں میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

زیادہ تر مذہبی علوم کے بارے میں تھیں۔ کچھ تاریخی نوعیت کی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ
پیر صاحب آرام فرما رہے تھے۔ انہیں جگا دیا گیا ہے۔ وہ ابھی دو چار منٹ میں تشریف لے
آتے ہیں۔ اور پھر پیر صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ پیروں، فقیروں اور عاملوں وغیرہ کے
حوالے سے میرے ذہن میں جو بھی تصورات تھے، وہ ان سے مختلف نکلے۔ ان کا رنگ سرخ و
سپید تھا۔ انہوں نے ایک لمبا سفید چغا پہن رکھا تھا۔ داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے
تھے۔ عمر پچاس کے قریب تھی۔

انہوں نے نرم الفاظ میں ہم سے بات چیت کی اور حال احوال پوچھا۔ عمران سے
مخاطب ہوکر بولے۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی بیٹا۔ مجھے کافی عرصے سے تمہارا انتظار
تھا ... روڈ والا مکان خالی پڑا تھا۔ کسی کو بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔
... وہاں سے بھی کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہ جمیل تمہارے ہی محلے میں رہتا
... ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ جب بھی تمہارے بارے میں کچھ پتا چلے یہ مجھے

... احمد تھانوی کی شخصیت سے قدرے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔

''مجھے بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

تھانوی صاحب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔''میں تم سے معافی چاہتا ہوں بیٹے لیکن میں وقت سے پہلے تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

''......اور وقت کب آئے گا؟''عمران نے پوچھا۔

''بہت جلدی۔شاید دو چار دنوں میں۔''تھانوی صاحب نے کھڑکی سے باہر آسمان کو تکتے ہوئے کہا جو شام کے جھٹپٹے میں اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

''آپ نے تجسس میں ڈال دیا ہے۔''عمران نے کہا۔

انہوں نے عمران کے شانے کو چھوا اور بولے۔''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔بس تم یوں سمجھ لو کہ ایک مریض ہے جس کے علاج کے لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔میں ان شاء اللہ تمہارا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔بس ایک آدھ گھنٹے کی بات ہوگی۔''

''کیا اس مریض سے میرا کوئی تعلق ہے؟''

''ہاں، پرانا تعلق بھی ہے......لیکن بیٹے، تم خود کو پریشان نہ کرو بس چند دن میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔اور یہ کوئی مجبوری کی بات بھی نہیں ہے۔اگر تم چاہو گے تو مدد کرنا ورنہ منع کر دینا۔مجھے ذرا سی بھی شکایت نہیں ہوگی۔''

میں نے کہا۔''حضرت! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ مدد کس طرح کی ہوگی؟''

''میں پھر معافی چاہتا ہوں۔وقت سے پہلے بتانا مناسب نہیں۔اگر کوئی عذر نہ ہو تو آپ مجھے اپنا رابطہ نمبر دے دیں۔جیسے ہی موقع آیا، میں آپ کو بتا دوں گا۔باقی مجھے پتا چلا ہے کہ جمیل اور اس کے ساتھی نے آپ کا پیچھا کیا تھا۔اس کی وجہ سے آپ دونوں کو جو پریشانی ہوئی، اس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔انہیں یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں جی۔''عمران نے کہا۔''اگر ہمارے دل میں کچھ تردد تھا بھی تو آپ کی بات چیت سے دور ہو گیا ہے۔''

ہم تقریباً آدھ گھنٹا پیر صاحب کے ساتھ رہے۔وہ بہت مختلف نظر آئے۔لیکن ایک بات تھی، وہ بہت سی چیزیں پردۂ اخفا میں رکھ رہے تھے۔عمران نے انہیں تھوڑا بہت کریدا لیکن زیادہ اصرار نہیں کیا۔انہوں نے ہمیں پُرتکلف چائے پلائی۔کھانے کے لئے بھی اصرار کیا لیکن ہم چلے آئے۔ویسے بھی ان کے مریدوں اور مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

ہماری واپسی موٹر سائیکل پر ہی ہوئی......پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عمران کی

پرانی روداد والا کوئی معاملہ ہے۔اس وقت جب وہ عمران کے بجائے عمو تھا......گاؤں کے چودھری نے اپنے اکلوتے بچے پر سے ایک آفت ٹالنے کے لئے عمو کو قربانی کا بکرا بنایا [illegible] اس کی روتی بلکتی بیوہ ماں سے جدا کیا گیا اور پھر ایک بدقماش عامل کے حوالے کر دیا [illegible] اس موڑ پر سے عمو کی زندگی کے راستے بدلتے چلے گئے اور وہ وہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

''کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟''میں نے موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے بیٹھے عمران کے کان میں پوچھا۔

''میرا اندازہ تو یہی ہے کہ امریکا کو عراق سے نکلنا ہی پڑے گا۔''

''میں پیر صاحب کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔''میں نے ٹپٹا کر کہا۔

''پیر صاحب تو گوشہ نشین سے بندے ہیں یار! ان کا امریکا کی خارجہ پالیسی سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''بھاڑ میں جاؤ۔''میں نے کہا۔

یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی گولی چلی۔یہ رائفل کی گولی تھی اور سڑک کے کنارے کھڑی ایک ایف ایکس کار کے اندر سے ہم پر چلائی گئی تھی۔یہ گولی موٹر سائیکل کے فریم میں لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔دوسری گولی ہمارے ہیلمٹس کو چھوتی ہوئی گزری۔عمران نے بریک لگائے۔موٹر سائیکل لہراتی اور سلپ کرتی ہوئی ایک بس اسٹاپ کے شیڈ کے پیچھے چلی گئی۔ارد گرد ٹریفک موجود تھا، کچھ لوگوں کو تو اس فائرنگ کا پتا ہی نہیں چلا مگر جن کو چلا، ان میں کھلبلی محسوس ہوئی......میں نے صاف دیکھا، ایف ایکس میں صرف ایک بندہ موجود تھا۔جب اس نے دیکھا کہ موٹر سائیکل زد سے نکل گئی ہے تو اس نے پوری رفتار سے گاڑی بھگا دی۔عمران نے گری ہوئی موٹر سائیکل کو اٹھایا۔ہم پھرتی سے اس پر بیٹھے اور تیز رفتاری سے کریم کلر ایف ایکس کے پیچھے لپکے۔

......اگلے دو منٹ میں ہم نے ایک بھری پُری سڑک پر ایف ایکس کا تیز رفتار تعاقب کیا۔ہمیں تسلی تھی کہ گاڑی میں صرف ایک بندہ ہے۔وہ چلتی گاڑی سے ہم پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔اچانک ایف ایکس نے ایک رکشا کو ٹکر ماری اور پھر ایک الیکٹرک پول سے جا ٹکرائی۔اس کے بونٹ سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔جب تک ہم گاڑی تک پہنچے، گاڑی سوار باہر نکل کر [illegible] اکا پکا تھا۔وہ اکہرے بدن کا شخص تھا۔اس نے شلوار قمیص پر ڈبی دار کوٹ پہن رکھا تھا۔اندازہ یہی ہوا کہ چھوٹی نال کی رائفل اس کے ہاتھ میں ہے۔ہم خواتین و حضرات سے

ٹکراتے، خوانچوں کو الٹتے، سائیکل سواروں کو گراتے اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے......

بازار کے پیچھے ایک قدرے سنسان گلی میں ہم نے اسے جالیا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس شخص کے کوٹ کا کالر پیچھے سے پکڑا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرادیا۔ حیرت تھی کہ اب تک اس نے رائفل استعمال نہیں کی تھی۔ اس بات کا پتا بعد میں چلا کہ اس کی رائفل میں بس دو ہی گولیاں تھیں جو وہ ہم پر چلا چکا تھا۔

میں نے دو تین زوردار ہاتھ اس کے چہرے پر رسید کئے۔ وہ اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے تاڑ لیا کہ قمیص کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ موجود ہے۔ اس نے اس کی کلائی جکڑ کر اتنی زور سے مروڑی کہ وہ چلا اٹھا۔ عمران نے اس کی قمیص کے نیچے ہاتھ چلایا اور چمڑے کی بیلٹ میں لگا ہوا ایک تیز دھار چاقو نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

کئی لوگ تیزی سے ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسے ہے؟ ایسے بہت سے سوال فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

عمران نے مبہم سا جواب دیا۔ ''یہ پُولیس کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیں۔ اس نے گولی چلائی ہے۔ قاتلانہ حملہ کیا ہے۔''

عمران کے بارعب انداز نے لوگوں کو شک میں ڈال دیا کہ ہم شاید پولیس کے سادہ پوش یا کسی خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں۔

عمران کے اشارے پر میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی اسکول وین کو روکا۔ عمران نے وین ڈرائیور سے کہا۔ ''اس بندے کو تھانے لے جانا ہے۔'' اور ڈرائیور کے جواب دینے سے پہلے ہی حملہ آور کی گردن پر دو ہتڑ مار کر اسے وین میں پھینک دیا۔ اس کے منہ سے اب باقاعدہ خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی بائیں کلائی کو دائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ رائفل اور چاقو دونوں چیزیں اس سے چھینی جا چکی تھیں۔

اس نے اضطراری طور پر وین سے نکلنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک اور زوردار گھونسے نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا۔ ''چپکا بیٹھا رہ۔ نہیں تو اس سڑک کو ہی تھانے کا ڈرائنگ روم بنا دوں گا۔ ... ہڈیوں کا چورا کر دوں گا۔'' عمران پھنکارا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابی! تم موٹر سائیکل پر پیچھے پیچھے آؤ۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

عمران نے بھگوڑے حملہ آور کے چیک دار کوٹ کا خون آلود کالر پکڑا اور اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے واپس دوڑ لگائی۔ کھمبے سے ٹکرا جانے والی ایف ایکس گاڑی میں

سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ کئی افراد اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ ہماری چرخہ موٹر سائیکل بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سیدھی کی تو لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ ایک ٹریفک سارجنٹ بھی نپے تلے قدموں سے آگے بڑھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ایکسیڈنٹ کے بعد میں بغیر کچھ کہے سنے موٹر سائیکل لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن پھر سارجنٹ کا چہرہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی۔ یہ وہی نواز احمد نامی نوجوان تھا جس سے راوی روڈ پر چند گھنٹے پہلے بھی دوستانہ ملاقات ہو چکی تھی۔ میرے سر پر ابھی تک ہیلمٹ موجود تھا لیکن چرخہ موٹر سائیکل کو نواز نے فوراً پہچان لیا۔

اسی دوران میں وہ اسکول وین بھی موقع پر پہنچ گئی جس میں عمران نے زخمی آور کو بٹھا رکھا تھا۔ سارجنٹ نواز نے عمران کو پہچان کر کہا۔ ''یہ کیا ہوا ہے عمران بھائی؟''

''لمبا لفڑا ہو گیا ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اس نے پیچھے اچھرہ موڑ کے قریب گولی چلائی ہے ہم پر...... بلکہ دو گولیاں...... تھانے لے جا رہے ہیں اسے۔''

سارجنٹ نواز نے ہمارے اردگرد لوگوں کی بھیڑ ہٹا کر ہمارے لئے راستہ بنایا اور ہم آگے پیچھے مزنگ چونگی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ عجلت میں ہوا۔ یہ خطرہ موجود تھا کہ ابھی کوئی پولیس موبائل یہاں پہنچ جائے گی اور نیا بکھیڑا شروع ہو جائے گا۔ مجھے ہرگز نہیں لگتا تھا کہ عمران اس زخمی شخص کو تھانے لے کر جائے گا۔ اسکول وین درمیانی رفتار سے چل رہی تھی، میں اس کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ اونٹ کی طرح اس موٹر سائیکل کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں تھی۔ میں نے عمران کے سامنے دو تین بار اس موٹر سائیکل کو شاہجہانی جوٹھ کا نام دیا تھا لیکن اب، جب میں اس پر سواری کر رہا تھا، یہ نام بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں لگا۔ اس پر سواری کرتے ہوئے سیدھی سڑک پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ پتا نہیں عمران اسے موت کے کنوئیں میں کیسے چلا لیتا تھا۔ موٹر سائیکل پر کنٹرول رکھنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن تیزی سے سوچ بھی رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا، بالکل آناً فاناً اور ڈرامائی تھا۔ ہم تو پیر شوکت احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لئے آئے تھے اور تھانوی صاحب ہمیں کافی مناسب شخص لگے تھے۔ مگر ان کی چاردیواری سے رخصت ہونے کے فوراً بعد ہی ہم پر دو ''قاتل فائر'' کئے گئے تھے۔

قریباً دو کلومیٹر آگے جا کر عمران نے اسکول وین جین مندر کے قریب ایک بغلی سڑک پر لوالی۔ عمران کے اشارے پر میں بھی موٹر سائیکل سے اتر کر وین میں چلا گیا۔ عمران نے حملہ آور کے سر کے بال بیدردی سے مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ حملہ آور کے چوڑے تھوبڑے پر دو

تین تازہ نیل بھی نظر آ رہے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے راستے میں بھی عمران سے زور آزمائی کی کوشش کی ہے۔ بہر حال، اب وہ مزید مار کھانے کے بعد بالکل شانت نظر آتا تھا۔

عمران نے مجھ سے پوچھا۔ ''کہاں لے جانا ہے اِسے؟ میرے خیال میں گھر تو لے جا نہیں سکتے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گھر میں فرح اور عاطف تھے اور فرح تو پچھلے چند دن سے مسلسل دہائی دے رہی تھی کہ ہم کسی خطرناک کام میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ اگر ہم اس زخمی مچھندر کو رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں لے جاتے تو فرح اور عاطف کو بہت شاک لگتا۔

''تمہارے روای روڈ والے گھر میں جا سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں پورے محلے کو پتا چل جائے گا۔''

''تو پھر؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''جیلانی بھی لاہور میں نہیں ہے...... ہاں، ایک کام ہو سکتا ہے۔'' اس کے چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی۔

''کیا ہو سکتا ہے؟''

''چلو بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر وین والے سے کہا کہ وہ گاڑی چلائے۔ وین والا اب کچھ ہراساں بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ ہم اس شخص کو تھانے لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے عمران سے معذرت کی ہو کہ وہ یہ ''خدمت'' انجام نہیں دے سکتا لیکن وہ عمران ہی کیا جو ایسی کسی معذرت کو خاطر میں لائے۔

میں وین سے اترا اور ایک بار پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے عمران اور حملہ آور کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اسکول وین ایک رہائشی کالونی میں رکی۔ یہاں زیادہ تر گھر پانچ اور چھ سات مرلے کے تھے۔ ایک دو منزلہ گھر کے سامنے جا کر عمران نے وین رکوا دی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وین کے رکتے ہی گھر کا مین گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک دبلا پتلا نوجوان لڑکا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اس گھر کے مکینوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ دبلے پتلے نوجوان نے وین کو گیراج میں جانے کے لئے راستہ دیا اور پھر مین گیٹ بند کر دیا۔ عمران نے سو سو کے چھ سات نوٹ وین ڈرائیور کو دیئے اور حملہ آور کو گردن سے دبوچے نیچے اتر آیا۔ اب عمران کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل گیراج میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ موٹر سائیکل کے رکتے ہی جیسے

ایک طوفان تھم گیا تھا۔

وین کا ڈرائیور اپنی وین سمیت یوں بھاگا جیسے تھوڑی دیر بھی یہاں رکا تو یہ مکان اپنی وزنی چھتوں سمیت اس کے اوپر آن گرے گا۔ یقیناً عمران نے راستے میں اس کی کافی برین واشنگ کی تھی اور اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں کسی طرح کی مخبری کرتا۔

ہم نے اندر جا کر حملہ آور کو ایک اسٹور نما تاریک کمرے میں بند کر دیا اور یہی وقت تھا جب ایک طرف سے عمران کی سرکس کی ساتھی شاہین تیزی سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی نمی تھی۔ شاید وہ آگے بڑھ کر عمران کے گلے ہی لگ جاتی مگر نوجوان لڑکے کی وجہ سے نہیں لگی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ شاہین کا چھوٹا بھائی ظفر تھا۔

''مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا کہ تم اس طرح اچانک آ گئے ہو۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''اور اکیلا نہیں ہوں۔ کسی کو ساتھ بھی لایا ہوں۔'' عمران نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے ہیلمٹ اتارا۔ ''اوہ گاڈ! تابش بھائی آپ؟'' وہ پکاری اور بھاگ کر میرے گلے لگ گئی۔

عمران نے برا سا منہ بنایا۔ ظفر اندر جا چکا تھا۔ عمران، شاہین کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولا۔ ''اگر گلے لگنے کے لئے چار سال باہر رہنا ضروری ہے تو میں ڈھائی تین سال اور گزار آتا ہوں۔''

شاہین کے ملیح چہرے پر شفق کا رنگ بکھر گیا۔ وہ کبھی حیرت سے عمران کو اور کبھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پچھلے ساڑھے تین چار سال میں، میں جسمانی طور پر کافی تبدیل ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں شاہین کو حیران کر رہی تھیں۔ ''آپ بہت بدل گئے ہو تابش بھائی۔ میں نے پہلے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو پہلے ایک لڑکا تھا، وہ مرد بن کر واپس آیا ہے۔ آپ کہاں تھے اب تک؟ پتا ہے ہم نے کتنا یاد کیا ہے آپ کو؟ پتا ہے کتنا پریشان ہوئے ہیں؟ میں نے [illegible] دعائیں کی تھیں۔ آپ کے لئے۔''

''اچھا بھئی، میں تو چلتا ہوں۔ یہاں میرا کیا کام ہے؟'' عمران جلے بھنے انداز میں [illegible]

''تمہارے لئے بھی کی تھیں۔'' شاہین جلدی سے بولی۔ ''تمہارے لئے بھی سب [illegible] ہیں۔ میں تقریباً روزانہ جان انکل کو فون کرتی تھی۔ تمہیں کیا پتا......'' اس کی

آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''لو بھئی رونَدو پروگرام شروع ہونے لگا ہے۔ اچھا یار! نہیں جاتا، بالکل نہیں جاتا۔ اگلے پندرہ بیس سال تک یہیں رہوں گا بلکہ یہیں اس گیراج میں کھڑا رہوں گا۔ ہلوں گا بھی نہیں۔'' عمران نے کہا اور شاہین کے آنسوؤں کو مدھم مسکراہٹ کے بریک لگ گئے۔

اسی دوران میں ظفر واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''عمران بھائی! آپ کب آئے؟ آپ نے تو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فون پر آپ کی آواز ہے۔''

عمران بولا۔ ''اس طرح نہیں کہتے کہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ مجھے تو وشواس ہی ناہیں ہووت تھا کہ میں فون پر آپ کی آواج سنت ہوں...... جب حیرانی والے فقرے میں یقین کے بجائے وشواس کا شبد استعمال کیا جائے تو فقرے میں بڑی شکتی آ جاوت ہے۔''

وہ دونوں مسکرانے لگے۔ شاہین بولی۔ ''چلو، اس سے کم از کم اتنا پتا تو چلا کہ تم انڈیا سے ہی آ رہے ہو لیکن......'' پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کا دھیان یقیناً اس بندے کی طرف چلا گیا تھا جسے ہم پکڑ کر یہاں لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس بھی ہوا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، اندر آ جائیں۔''

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاہین اور ظفر کے سوا اس چھوٹے سے گھر میں کوئی نہیں۔ اب اسٹور روم کے مقفل دروازے پر دستک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یقیناً زخمی شخص بے چین ہو رہا تھا...... عمران نے شاہین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اس بندے سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔ اس دوران میں تم کچھ پکا و کا سکتی ہو۔ زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ دو تین ڈشیں کافی رہیں گی۔ میٹھے کے طور پر آئس کریم منگوا لینا۔ پھل ول تو ہوتا ہی ہے تمہارے فریج میں۔''

شاہین بولی۔ ''ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ زیادہ بڑا گھر نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری پوچھ گچھ کے دوران میں محلے والوں کو شک ہو جائے۔ ایک بار پہلے بھی تمہاری مہربانی کی وجہ سے مجھے ایک اچھے مالک مکان سے محروم ہونا پڑا تھا۔''

''گھبراؤ مت۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ بس تم کچن میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لو۔ زور کس پر ہوا؟ کچن پر۔''

شاہین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر لایا۔ وہ دونوں گھر کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے میں اور عمران اسٹور روم کی طرف بڑھے۔ عمران نے اپنا پستول ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسٹور روم کے اندر اب ہمارے ''حوالاتی'' نے چلانا شروع کر دیا

تھا۔ ''دروازہ کھولو۔ میں مر رہا ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' اس کی آواز میں کرب کی شدت صاف محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال، اس کی آواز گھر کے برآمدے تک بمشکل ہی پہنچ رہی تھی۔

ہم اسٹور روم میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی کلائی دوسرے ہاتھ سے تھامے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ اس کا رنگ زرد نظر آ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کلائی میں کوئی فریکچر وغیرہ ہو چکا ہے۔ عمران نے جاتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کی۔ ''اوئے! تم تو کہتے ہو، میں مر رہا ہوں۔ کیا اس طرح کھڑے کھڑے کوئی مرتا ہے؟ مرنے کے لئے لیٹنا پڑتا ہے۔ کھینچ کھینچ کر سانس لینی ہوتی ہے۔ آنکھیں اوپر اٹھانا پڑتی ہیں۔ اس طرح سے۔'' عمران نے باقاعدہ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھا کر دکھائیں۔

''میری کلائی ٹوٹ گئی ہے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔'' وہ کراہا۔

''اپنی کلائی کی تمہیں بڑی فکر ہے۔ اگر ہمارے سر میں گولی لگتی تو ہمیں درد نہیں ہونا تھا؟ سر میں گولی لگے تو چلا چلا کر گلا بیٹھ جاتا ہے اور یہ گلا اس کا نہیں بیٹھتا جسے گولی لگی ہو بلکہ اس کے گھر والوں کا بیٹھتا ہے...... ذرا دکھاؤ اپنی کلائی۔'' عمران نے کہا۔

اس نے اپنی کلائی عمران کی طرف بڑھائی۔ اس نے ذرا دبا کر دیکھا۔ زخمی ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ یہاں اسے الٹا لٹکانے کے لئے چھت پر کوئی کنڈا وغیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ اپنی اس کلائی کی وجہ سے ہی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔''

اس شخص کا رنگ کچھ مزید زرد ہو گیا۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا۔ اس کی شکل و صورت گواہ تھی کہ وہ متعدد بار جیل جا چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شکرے کی سی سفاک چمک تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی قتل جیسی وارداتیں کر چکا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود کو بری طرح گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ عمران نے مجھے بتایا کہ اسکول وین میں اس نے خود کو چھڑانے اور چلتی گاڑی سے کودنے کی ایک زوردار کوشش کی تھی مگر عمران کے سامنے اس کا بس نہیں چلا۔ عمران نے وین میں ہی بری طرح اس کی دھنائی کر دی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس شخص نے ہمیں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اس کا نام ...ید عرف چھیدا ہے۔ وہ ہسٹری شیٹر ہے اور پیسے لے کر کام کرتا ہے۔ اس کام کے لئے اسے بہاولپور کے کسی بندے نے ایک واقف کار کے ذریعے ایک لاکھ کی رقم بھجوائی تھی۔ باقی ...00 لاکھ روپیا اسے کام ہونے کے بعد ملنا تھا۔ کام ہمیں قتل کرنا ہرگز نہیں تھا...... بلکہ ڈرانا یا زخمی ...نا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اس خبیث کی شکل ہی بتا رہی تھی کہ وہ بک رہا ہے۔ اس کی باتوں میں سچ اتنا ہی ہے، جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس بندے کی شکل مجھے کچھ شناسا سی لگ رہی تھی۔ پھر ایک اور چیز سامنے آئی اور اس نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔

اسکول وین میں عمران کے ساتھ زوردار کھینچا تانی کے دوران میں چھیدے کے کوٹ کی ایک آستین کہنی تک ادھڑ گئی تھی۔ یہ آستین ذرا سی اوپر ہوئی تو مجھے چھیدے کے بازو پر کٹ کا ایک لمبا نشان نظر آیا۔ یہ تیز دھار آلے کا ایک قوس نما پرانا زخم تھا، ٹانکے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ماضی میں یہاں سے گولی وغیرہ نکالنے کے لئے کوئی آپریشن کیا گیا ہو۔ بہرحال، یہ سب کچھ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی۔ چار سال پہلے کے مناظر میری نگاہوں کے سامنے شعلوں کی طرح پھیل گئے۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہ بندہ ان سفاک غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے ماں جی کو درد کے سمندر میں غرق کر کے مجھ سے فرح اور عاطف کا پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ فلیش بیک میں وہ سین...... وہ خونی سین آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔

ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے کندھوں کو بے رحمی سے جھنجوڑا جا رہا تھا۔ وہ چلا رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ پھران کے ایک کندھے میں بریٹا پسٹل کی گولی اتار دی گئی تھی۔ جن افراد نے ماں جی کو دبوچا ہوا تھا، ان میں یہ زخمی بازو والا بندہ بھی شامل تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے زخم کا یہ نیم گول نشان ایک انمٹ ثبوت بن کر چمکنے لگا۔

میں نے ایک بار پھر دھیان سے چھیدے کی صورت دیکھی۔ اس کی صورت نے میرے اخذ کئے ہوئے نتیجے کو تقویت دی۔ میرے اندر تہلکہ سا مچ گیا۔ ایک سرخ چادر سی تھی جو میری نگاہوں کے سامنے تن گئی۔ میں دیوانگی کے عالم میں چھیدے پر جا پڑا۔

''حرامزادے...... کتے...... قاتل!'' میرے منہ سے بے ساختہ پتا نہیں کیا کچھ نکل رہا تھا۔

اگلے ایک منٹ میں، میں نے چھیدے کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ اچھل اچھل کر دیواروں سے ٹکرایا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کلائی سمیت خوفناک انداز میں جھولنے لگا۔ یہ وہی کلائی تھی جس میں کچھ دیر پہلے عمران کے مروڑنے کی وجہ سے فریکچر ہوا تھا۔ عمران خود بھی ہکا بکا تھا۔ وہ چھیدے کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''بس کر تابی...... یہ مر جائے گا...... چھوڑ دے۔''

لیکن میرے سر پر خون سوار تھا۔ پچھلے چار سال سے جو آگ سینے میں دہک رہی تھی، وہ شعلوں میں بدل گئی تھی اور اس کی ساری تپش رشید عرف چھیدے کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔

میں نے چھیدے والا چاقو پکڑا تو عمران میرے سامنے دیوار بن گیا۔ ''کیا کرتے ہو تابی...... اس کو مار دیں گے تو سراجے تک کیسے پہنچیں گے؟ کیا دیوانہ پن ہے؟ پیچھے ہٹو......'' اس نے مجھے دھکیلا۔

''نہیں عمران...... میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔'' میں دہاڑا۔ اپنی آواز خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

عمران نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ''کیا کرتے ہو تابی! شاہین کیا سوچے گی؟ آواز باہر تک جا رہی ہے۔ ذرا تحمل کرو۔''

چھیدا کسی پھٹے پرانے خون آلود کپڑے کی طرح اسٹور روم کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کی شکل میرے دماغ میں شعلے بھڑکا رہی تھی۔ میں نے اس کے منحوس سراپا کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو سرسراہٹ جگانے لگے۔ عمران مجھے اپنے کلاوے میں لے کر اسٹور سے باہر نکل آیا اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

شاہین اور ظفر ساتھ والے کمرے میں کھڑے تھے اور ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً اسٹور روم میں جو تہلکہ مچا تھا، اس کی آوازیں پورے گھر میں گونجی تھیں۔ کھلا ہوا چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ شاہین اور ظفر کا ہراس دیکھتے ہوئے میں نے یہ چاقو جیکٹ میں رکھ لیا۔

عمران نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کتے کو پہچان لیا ہے۔ یہ ان غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے شیرے وغیرہ کے ساتھ مل کر ماں جی کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

''تم نے شروع میں تو نہیں پہچانا تھا؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے تھوڑا بہت شک تو پہلے سے ہو رہا تھا مگر اب اس کا زخمی بازو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے۔ یہ سراج اور شیرے کا ساتھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سراج اور شیرا بھی ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے تو ایک اور خطرہ محسوس ہو رہا ہے......'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شاہین سے کہا کہ وہ میرے لئے پانی لائے۔ وہ چلی گئی تو میں نے عمران سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہمارا پیچھا کیا گیا ہو اور چھیدے کے ساتھی یہاں آس پاس موجود ہوں۔''

''نہیں، اس بارے میں فکر نہ کرو۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''میں وین والے کو کافی

گھما پھرا کر لایا ہوں۔ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا۔''

''عمران! یہ بندہ سراج کا پتا ٹھکانا بتا سکتا ہے اور ہمیں جلدی کرنی چاہئے، یہ نہ ہو کہ وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔''

''تم غم نہ کرو۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولے گا اور سب کچھ فرفر بتائے گا۔''

عمران دو چار منٹ مزید میرے پاس بیٹھا اور پھر چھیدے سے پوچھ گچھ کے لئے اسٹور روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے شاہین کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ گھر کے سارے دروازے بند رکھے اور کیسٹ پلیئر پر اونچی آواز میں کوئی میوزک وغیرہ لگا دے۔

عمران اسٹور روم میں گیا اور پندرہ بیس سیکنڈ بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔

''کیا ہوا؟'' شاہین نے پوچھا۔

''مر گیا۔'' عمران نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''اس نے گلے پر بلیڈ پھیرا ہے۔ بازو کی نسیں بھی کاٹی ہیں۔ سارا فرش خونم خون ہو رہا ہے۔''

''او گاڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

• ہم تیزی سے اسٹور روم میں آئے۔ عمران نے شاہین کو آنے سے منع کر دیا تھا...... اسٹور روم کا منظر واقعی دہلا دینے والا تھا۔ چھیدا ٹھنڈے فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کی گردن اور ٹوٹی ہوئی کلائی میں سے بڑی تیزی کے ساتھ خون کا اخراج ہوا تھا اور اب اس کی آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔ عمران نے اسے ایک بار پھر ہلا جلا کر دیکھا۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

''ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا خودکشی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ واقعی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے تمہاری والدہ پر بہیمانہ تشدد کیا اور یقیناً یہ ہمیں سراج اور شیرے کا اتا پتا بھی بتا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ہم اس کی کھال اتار کر بھی اس کی زبان کھلوا لیں گے۔ اس نے مرنا آسان سمجھا۔''

ہم نے اسے گھسیٹ کر خشک فرش پر کیا اور اس کے اوپر ایک چادر ڈال دی۔ ''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے پریشان لہجے میں عمران سے پوچھا۔

''لاش غائب کرنا پڑے گی اور کیا؟''

''لیکن کیسے؟''

''سوچ لیتے ہیں، زیادہ پریشان صورت نہ بناؤ۔'' عمران نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

دروازے کو مقفل کر کے ہم باہر آ گئے۔ شاہین اور ظفر کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ عمران نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ اس کے رویے سے شاہین اور ظفر کو بھی کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ ''اس بندے کی موت پر زیادہ سوگوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک قاتل کی موت ہے۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے، اس کی لاش سے نمٹنے کے لئے...... لہٰذا ہم پہلا کام پہلے کریں گے۔ بھوک میں دماغ بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس لئے پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔''

میرے کانوں میں چھیدے کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے شروع میں خود کو کرائے کا [illegible]ا ظاہر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس نے کسی کے کہنے پر ہمیں صرف ڈرانے دھمکانے کے لئے فائر کئے تھے۔ لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ نہایت خطرناک شخص اور سراج کے [illegible]ہی کارندوں میں سے تھا۔ یقیناً آج اس نے ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے ہی ہمارے راستے میں گھات لگائی تھی...... لیکن اب وہ خود موت کے اندھیرے میں اتر گیا تھا۔ عمران کو پورا یقین تھا کہ چھیدا، پیر تھانوی صاحب کی کوٹھی سے ہمارے پیچھے نہیں لگا ہے۔ عمران کے خیال کے مطابق ہمیں راستے میں کہیں دیکھا گیا تھا اور ہمارا پیچھا شروع کیا گیا تھا۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست نکلا۔ یہ بھی پتا چلا کہ ہمارے پہچانے جانے میں عمران کی موٹر سائیکل نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ گھر کے اسٹور روم میں ایک خون آلود لاش پڑی ہو [illegible] اطمینان سے کھانا کیسے کھایا جا سکتا ہے۔ عمران کے اصرار کے باوجود ہم نے کھانے کا [illegible]ام کینسل کیا۔ میں نے علیحدگی میں جا کر عمران کو سمجھایا کہ ہمیں لاش سمیت جلد از جلد [illegible]ے نکل جانا چاہئے۔

''[illegible]ت خوب۔ کتنی دلیری والی بات کی ہے تم نے۔ اور شاہین کو یہاں خطرے میں چھوڑ [illegible]

[illegible]''

[illegible]''

[illegible] رہے ہو کہ ممکن ہے یہ گھر سراج اور اس کے ہرکاروں کی نظر میں آ چکا [illegible]

[illegible] نے کہا۔

[illegible] نے میرے اس خیال کو بالکل رد کر دیا تھا۔''

"لیکن اندیشہ تو بہرحال اندیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر ہم اس اسکول وین والے کی طرف سے بھی پوری طرح غافل نہیں ہو سکتے۔ اس کی نیت میں کوئی فتور آ گیا تو پھر؟"

"تو کیا چاہتے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔ "شاہین اور ظفر کو یہاں سے لے جانا ہے؟"

"میرے خیال میں اب یہی مناسب رہے گا۔" عمران بولا۔

اگلے پانچ منٹ میں عمران نے شاہین اور ظفر کے لئے یہ نادر شاہی حکم جاری کر دیا کہ وہ ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑیں گے اور ان کے ساتھ جائیں گے۔

"لیکن کتنی دیر کے لئے؟" شاہین نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کے نہایت چمکیلے بلوری رخسار قدرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

"بس دو چار دن کے لئے۔" عمران نے کہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ شاہین اور ظفر کو مستقل طور پر یہاں سے لے جا رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں لے لیں اور گھر کو تالا لگا دیں۔ موجودہ صورتِ حال میں شاہین کا حوصلہ قابلِ ذکر تھا۔

ایک طرح سے ہم دونوں شاہین اور ظفر کے لئے بلائے ناگہانی ثابت ہوئے تھے۔ وہ اچھے بھلے سکون سے بیٹھے تھے۔ اب نہ صرف ان کے گھر میں ایک خونچکاں لاش پڑی تھی بلکہ انہیں فوراً گھر بھی چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ شاہین کے چہرے پر زیادہ تردد نہیں تھا۔ وہ عمران کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اسے جیسے عمران پر بھروسا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا بھروسا اور اعتماد آسانی سے پروان نہیں چڑھتا لیکن جب ایک بار پروان چڑھ جائے تو بڑا پائیدار ہوتا ہے۔

عمران نے جیلانی کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور واپس آ چکا ہے۔ وہ پچیس تیس منٹ میں ایک ٹویوٹا کار لے کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ گاڑی کو گھر کے گیراج میں کھڑا کیا گیا۔ چھیدے کی لاش ایک بڑے پولیتھین میں لپیٹ کر ڈکی میں رکھی گئی۔ گھر کو تالے لگانے کے بعد جیلانی اور ظفر...... ظفر کی موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے جبکہ میں، شاہین اور عمران ٹویوٹا کار پر روانہ ہوئے۔ عمران کا شیطانی چرخہ وہیں کھڑا رہنے دیا گیا۔ جیلانی موٹر سائیکل پر ہم سے قریباً دو فرلانگ آگے تھا۔ اس نے اپنا موبائل مستقل آن کر رکھا تھا۔ دوسری طرف عمران کا موبائل بھی آن تھا۔ راستے میں کوئی بھی خطرناک پولیس ناکا دکھائی دیتے کی صورت میں جیلانی نے ہمیں اطلاع دینا تھی اور ہمیں اس کی ہدایت کے مطابق راستہ تبدیل کرنا تھا۔

یہ شام سات بجے کا وقت تھا۔ پھر بھی لاش کو ڈکی میں رکھ کر شہر کی بھری پری سڑکوں سے گزرنا ایک پُرخطر کام تھا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ شاید چھیدے مرحوم کے ساتھیوں میں سے کوئی ہمارا پیچھا کرے۔ بہرحال، یہ اندیشہ تو غلط ہی ثابت ہوا۔ تناؤ کی اذیت کو ختم کرنے کے لئے، عمران نے حسبِ عادت ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔ اس گفتگو کا آغاز شاہین کے ایک سوال ہی سے ہوا۔ شاہین نے رشید عرف چھیدے کے بارے میں عمران سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اور کیسے ہمارے پیچھے لگا......؟

عمران نے کہا۔ "اگر میں جھوٹ بولوں گا تو میرے دل پر بوجھ پڑے گا۔ اگر سچ بولوں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔"

"نہیں ہوتی ناراض بتاؤ تم۔"

وہ معصوم صورت بنا کر بولا۔ "تم تو جانتی ہی ہو کہ ریما جی ایک عرصے سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اب نرگس جی کے بعد یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی ہے۔"

"نرگس کون؟" شاہین نے برا سا منہ بنایا۔

"وہی یار، اسٹیج دھماکوں...... میرا مطلب ہے ڈراموں والی۔ میں نے تو صرف اس لئے اسے تھوڑی سی لفٹ کرائی تھی کہ شاید اس طرح ریما جی سے پیچھا چھوٹ جائے۔ ریما کا دل کھٹا ہو جائے اور شاید اس طرح میرا بھی ہو جائے۔ لیکن وہ کیا مولانا سر سید احمد خاں کا پنجابی شعر ہے، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا۔ ریما کا دل تو پھر بھی کھٹا نہیں ہوا، الٹا نرگس کا دل بھی میٹھا ہو گیا۔ ایک دوست نے مجھے بتایا تھا کہ ریما نے شوٹنگ کے دوران میں کئی لوگوں کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔ وہ جہاں بھی گیا میرے پاس آیا...... اک یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی۔ تو اب معاملہ یوں ہے کہ ریما اور نرگس میں میرے حوالے سے ٹھنی ہوئی ہے...... بات کافی آگے نکل چکی ہے......"

"ہاں، مجھے بھی لگتا ہے کہ کافی آگے نکل چکی ہے۔ تمہیں اب کہیں داخل کرانا پڑے گا۔" شاہین نے رواں لہجے میں کہا۔

عمران نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے، یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب نرگس کی سوچ یہ ہو گئی ہے کہ اگر میں اس کا نہیں بن سکتا تو کسی کا بھی نہ بنوں۔ یہ رشید عرف چھیدا یقیناً اسی کا بندہ تھا۔"

عمران کی گفتگو کو بریک لگ گئے۔ موبائل پر جیلانی نے اطلاع دی کہ آگے ایک ناکا

ہے لہٰذا ہم سیدھا چوبرجی آنے کے بجائے سمن آباد کے اندر سے ہو کر نکل جائیں۔

ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم رائے ونڈ روڈ کی اس شاندار کوٹھی میں موجود تھے جہاں فرح اور عاطف ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ فرح نے آج لان میں باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ ہم رات گئے تک باہر بیٹھیں گے اور گپ شپ کریں گے۔ لیکن یہاں ڈکی میں لاش موجود تھی اور ہم کسی طرح کی تفریح کے موڈ میں نہیں تھے۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے گہرے اندھیرے میں بدل چکے تھے۔ کوٹھی کے باغیچے کے پاس فرح اور عاطف باربی کیو کی طویل انگیٹھی میں کوئلے وغیرہ رکھ رہے تھے۔ ایک ملازم کرسیاں وغیرہ ترتیب دے رہا تھا۔ میڈم صفورا ان انتظامات کی نگرانی کر رہی تھی۔ صفیہ بالو کو گود میں لئے ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ ان لوگوں کا موڈ کچھ اور تھا جبکہ ہمارا کچھ اور۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''ان کو سنبھالو۔ یہ پروگرام ایک دو روز بعد کا رکھ لیا جائے۔''

''لیکن یہ لوگ کیسے مانیں گے؟ یہ تو کل سے انتظامات میں لگے ہوئے ہیں۔ جان محمد صاحب کو بھی بلایا ہے انہوں نے۔''

اس نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ ''ایسا کرو...... ان سے کہو کہ شاہین کی نانی فوت ہو گئی ہے۔ وہ بہت پیار کرتی تھی اس سے۔ سوگ کی حالت میں یہاں آئی ہے۔''

''لیکن جب وہ پوچھیں گے تو؟''

''ان سے کہو، کوئی نہ پوچھے۔ اس بارے میں کوئی ذکر ہی نہ کرے۔ وہ سخت ڈیپریشن میں ہے اس وقت۔''

''لیکن......''

''یار! جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔'' عمران نے جلدی سے کہا۔

ہم نے پورے گروپ کے سامنے شاہین کی نانی کو فوت کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ سخت ڈیپریشن میں ہے، کوئی اس سے اس بارے میں بات نہ کرے۔

بادلِ ناخواستہ کھلی فضا میں ''روسٹ ڈنر'' کا پروگرام کینسل ہو گیا اور اس پروگرام کو اِن ڈور عام ڈنر میں بدل دیا گیا۔ کوٹھی کا لان اور عقبی لان خالی ہو گئے۔ ہمارے لئے ممکن ہو گیا کہ ہم چھیدے کی لاش سے نجات حاصل کر سکیں۔ عمران اور جیلانی ٹویوٹا کار کو دھکا لگا کر عقبی باغیچے کی طرف لے گئے۔ یہاں کھاد تیار کرنے کے لئے پہلے ہی ایک گڑھا سا بنایا گیا تھا۔ اس گڑھے کو مزید گہرا کیا گیا اور پھر چھیدے کی لاش کو اچھی طرح پولی تھین کی شیٹ میں لپیٹ کر دبا دیا گیا۔

میں رات دیر تک جاگتا رہا اور صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ ہمیں یہاں لاہور پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور سیٹھ سراج کی طرف سے ہم پر پہلا وار ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی شک ہوتا تھا کہ شاید سراج اور شیرا وغیرہ پاکستان میں ہی ہیں۔ میں باقی سب کچھ بھول بھال کر جلد از جلد شیرے اور سراج کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے لئے اب اور صبر ممکن نہیں رہا۔ اگلے روز میں نے عمران سے اس بارے میں تفصیلی بات کی۔ وہ تو ہر وقت ایکشن اور خطرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہی رہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، جو تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔ ہم باہر نکلتے ہیں۔ سراج اور اس کے گماشتوں کو تلاش کرتے ہیں۔ ہم ان کو ڈھونڈ لیں گے یا وہ ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔''

اگلے روز ہم نے وہی کیا جو ہمارے ذہن میں تھا۔ ہم دونوں جیلانی کی موٹر سائیکل پر نکلے اور شہر میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ ہم دونوں ہیلمٹ کے بغیر تھے۔ میری جیب میں ٹی ٹی پسٹل تھا اور وہی یادگار رام پوری خنجر تھا جس سے میں نے جارج گورا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ خنجر نما چاقو الٰہ آباد کے پارک ویو ہوٹل میں ہمارے سامان کے اندر موجود تھا۔ جب ڈی ایس پی سجاد نے ہمیں گرفتار کیا اور ہمارے ساتھی ہوٹل سے فرار ہوئے تو وہ دیگر سامان کے ساتھ یہ خنجر بھی ساتھ لے گئے۔ بعدازاں میڈم صفورا اسے کسٹم کی نظر سے بچا کر یہاں لانے میں کامیاب رہی۔ میری طرح عمران بھی مسلح تھا۔ اس کی جیکٹ میں بارہ گولی والا ماؤزر موجود تھا۔

ہم شام تک شہر کے مختلف علاقوں میں چکراتے رہے۔ خاص طور سے ان جگہوں کے آس پاس بھی گھومے جہاں سیٹھ سراج کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا...... یا اس کے ہرکاروں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ شام تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم اس جگہ بھی گئے جہاں کل ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس فائرنگ کے حوالے سے بھی کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ بس ایک دُکان والے نے بتایا کہ یہاں کل دو تین گولیاں چلی تھیں...... اور دو موٹر سائیکل سوار بڑی تیزی سے ماڈل ٹاؤن کی طرف گئے تھے۔ اس نے ہمیں بس اسٹاپ کی دیوار پر ایک گولی کا نشان بھی دکھایا۔

بعدازاں ہم ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچے۔ کھمبے سے ٹکرانے والی ایف ایکس کو وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا۔ یقیناً اب وہ کسی قریبی تھانے میں کھڑی اپنی مزید بربادی کا انتظار کر رہی تھی۔ پچانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ ایف ایکس کی نمبر پلیٹ جعلی ہو گی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم بڑی احتیاط سے اپنے تعاقب کا دھیان رکھتے ہوئے رائے ونڈ روڈ پر

واپس آ گئے۔

شاہین غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی یہ بات عمران کی سمجھ میں آ گئی کہ نانی کی وفات والا جھوٹ کھل چکا ہے۔ بہرحال، کسی نے اس بارے میں بات نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہین نے عمران کی بات کا بھرم رکھا ہے اور نانی کی وفات والی بات کو جھٹلایا نہیں۔ کھانے کے بعد جب تنہائی ملی تو شاہین سیدھی ہمارے کمرے میں آئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ عمران پر برس پڑی۔ ''تم نے یہ غلط بات کیوں کی؟ تم ہمیشہ ''ہرٹ'' کرتے ہو۔''

عمران نے مسمسی صورت بنائی۔ ''بس مجبوری تھی یار! فوری طور پر کوئی بہانہ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اس لئے نانی ماں کو مذاق بنا دیا۔'' شاہین نے بات اُچکی۔

وہ بولا۔ ''شاہین! دیکھو، ہر بات میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ اسی بہانے تم نے بلکہ ہم سب نے تمہاری نانی ماں کو یاد کر لیا۔ ورنہ آج کل بزرگوں کو کون یاد کرتا ہے...... تم سچ بتاؤ، کبھی تمہیں نانی یاد آئی ہے؟ میری وجہ سے ہی آئی ہے نا......؟''

''تم بہت برے ہو عمران...... آتے ساتھ ہی دل دکھانا شروع کر دیا ہے۔'' اس نے آنچل سے آنسو پونچھے۔

''اچھا چلو معاف کر دو یار! جب تم کہو گی تمہاری نانی ماں سے ملنے چلیں گے۔ کہاں رہتی ہیں وہ؟''

''جہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ وہ فوت ہو چکی ہیں۔ ایک سال پہلے۔''

''زبردست...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔'' وہ چہکا۔

''مم...... میرا مطلب ہے، اگر وہ فوت ہو چکی ہیں تو پھر تو ہم نے کوئی جھوٹ ہی نہیں بولا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے لیٹ خبر دی ہے اور لیٹ خبر آج کل کون سا چینل نہیں دیتا...... بلکہ ہمارا ''فساد پلس'' تو اس میں نمبرون ہے۔ وشواس کرو، صرف چار دن پہلے ہم نے اندرا گاندھی کے قتل کی خبر نشر کی ہے اور سب کو ہکا بکا کر دیا ہے۔ بڑے بڑے چینلوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائی ہیں۔''

''یعنی چینلوں کے دانت ہوتے ہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے، چینل دانتوں کے بغیر ہی ہر قسم کا گوشت ہڈی سمیت چبا جاتے ہیں......

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی خاص تکلیف پہنچی ہے کسی چینل سے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہمارا چینل کسی دوڑ میں شامل ہی نہیں ہے۔ یہاں تو جلد سے جلد خبر دینے کی دوڑ ہے جبکہ ہم لیٹ سے لیٹ خبر دینے کے چیمپئن بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا اپنا راستہ ہے، اپنا ٹارگٹ ہے۔ دیکھنا عنقریب ہمارے چینل سے اس طرح کی بریکنگ نیوز نشر ہوں گی...... ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ اتحادی فوجوں نے جرمنی کے دارالحکومت برلن پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا ہے۔ ہٹلر جو اپنے زمین دوز بنکر میں تھا، لاپتا ہے۔ ہمارے خصوصی نامہ نگار نے اپنے خاص ذرائع سے اطلاع دی ہے کہ ہٹلر زندہ یا پھر مر گیا ہے۔ ہمارے نامہ نگار نے دو دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس آخری معرکے میں ہٹلر مر جائے گا یا پھر زندہ رہے گا......''

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز ہماری آوارہ خرامی پھر شروع ہوئی۔ میں اور عمران لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتے رہے۔ اندرونِ شہر گئے، خاص اڈوں پر جا کر بھی اپنی صورت دکھائی۔ شہر میں عمران کو جگہ جگہ اپنے شناسا ملے۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ مشکل میں پھنسے ہوئے لوگوں کا مددگار، ضرورت مندوں کا خیال رکھنے والا۔ چاہنے والے اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہتے تھے۔ وہ نگاہوں کے راستے دل میں اترتا تھا، ہر محفل کی جان بن جاتا تھا۔ ایک قحبہ خانے میں ایک سابق پولیس انسپکٹر سے عمران کی تلخ کلامی ہوئی تو عمران کی حمایت میں بولنے والے کئی افراد سامنے آ گئے اور اس سابق انسپکٹر کی بولتی بند کر دی...... شام کے وقت ہم سیٹھ سراج کے اس پلازا میں بھی گئے جو وہ اب فروخت کر چکا تھا۔ پلازا میں بھی کسی مطلوبہ شخص سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہو سکی۔

اس روز بھی ہم ناکام واپس آئے۔ مجھ پر عجیب سی مایوسی طاری ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ تک پہنچنے کا موقع میں نے اپنے ہاتھوں گنوایا ہے۔ بھیدے کو پہچاننے کے بعد میں خود پر ضبط نہ رکھ سکا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ اب ہم ایک بار پھر مکمل اندھیرے میں تھے۔ اپنی کیفیت کے زیراثر میں چھت پر چلا گیا۔ یہاں عاطف نے ہلکی پھلکی ورزش کے لئے چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا۔ ایک سینڈ بیگ بھی یہاں جھول رہا تھا۔ میں سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں نہا گیا اور ہاتھوں کی پشت سے خون رِسنے لگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو عمران اور عاطف کھڑے تھے۔ عمران نے تو مجھے پہلے بھی ایسے دیوانے پن سے مشق کرتے دیکھا تھا مگر عاطف کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ششدر دکھائی دیا۔ میری آنکھوں کی نمی بھی اسے حیران

کر رہی تھی۔

عمران نے اشارے سے عاطف کو واپس بھیج دیا اور دھیمے قدموں سے میرے پاس آیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''تمہارا دکھ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جگر...... لیکن ذرا انتظار...... بس تھوڑا سا صبر۔ ہم ماں جی کی روح کو اب زیادہ دیر تڑپنے نہیں دیں گے۔''

اس کے لفظوں نے میرے اندر ایک حوصلہ سا بھر دیا۔ وہ جب بھی بولتا تھا، اسی طرح زخموں پر مرہم رکھ دیتا تھا۔

اگلے روز چاچے نذیرے کی شادی تھی۔ میں اور عمران حسبِ وعدہ وہاں پہنچے۔ عمران کی موجودگی نے اس انوکھی شادی کی رونق دوبالا کر دی۔ عمران نے باقاعدہ گانا گایا اور ڈانس کرنے والے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ڈانس بھی کیا۔ عمران کا دوست ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی خصوصی اہمیت دی جا رہی تھی۔ حاضرین میں فربہ اندام نوجوان جمیل بھی موجود تھا...... یہ وہی بندہ تھا جس نے چند روز پہلے ہمیں اپنے پیر شوکت احمد تھانوی سے ملایا تھا اور پیر تھانوی نے ہم سے کچھ الجھی سلجھی باتیں کی تھیں۔ میں نے جمیل سے اس کے پیر کا حال احوال دریافت کیا اور پوچھا کہ وہ ہم سے دوبارہ کب ملاقات کر رہے ہیں؟

جمیل اس کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکا۔ اس نے بس یہ کہا کہ پیر صاحب کے پاس آپ کے موبائل نمبرز موجود ہیں۔ انہیں جیسے ہی ضرورت پڑے گی، وہ آپ کو کال کریں گے۔

چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی انوکھی شادی کی کوریج کے لئے تین چار اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ دو ٹی وی کیمرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چاچا نذیرا روایتی دیہاتی لباس تہبند اور کرتے میں تھا۔ سر پر رنگ دار پگڑی تھی۔ اس نے خود کو خوب چمکایا ہوا تھا۔

ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔ ''چاچا جی! اس شادی پر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

بہرے چاچے نے کہا۔ ''پیسا؟ شادی پر میرا پیسا تو نہیں لگ رہا۔ یہ میرے سجن بیلی ہیں جو لگا رہے ہیں۔''

نمائندے نے نذیرے کے کان کے پاس جا کر ذرا زور سے کہا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ بچپن کی محبت کو پا کر آپ نے کیسا محسوس کیا ہے؟''

''جوس تو نہیں پیا ہے۔ پتر، جوس تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میں نے سویرے گری بادام والا دودھ پیا تھا۔ اب تم سب کے ساتھ میٹھا حلوہ کھایا ہے......'' سب ہنسنے لگے۔

عمران نے کہا۔ ''چاچے! تم بڑے خوش قسمت ہو، شوہر کو سنائی نہ دے تو وہ بڑا ہی چنگا رہتا ہے۔''

''پنگا؟ نہیں عمران پتر! میرا تو کسی سے پنگا نہیں رہتا اور کلثوم کے ساتھ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

شام کے وقت چاچے نذیرے کی شادی سے فارغ ہو کر میں اور عمران ایک بار پھر لاہور کی سڑکوں کی پیمائش کرنے لگے۔ یہ ہفتے کا روز تھا ہر طرف ویک اینڈ کی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ہم اس ہوٹل کے پاس سے گزرے جہاں کبھی ثروت اور میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ ہم ذرا چائے پینے کے لئے رک گئے۔ یہاں کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ یہی جگہ تھی جہاں سیٹھ سراج کے بیٹے واجی نے اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھے اور ثروت کو زچ کیا تھا۔ ہم پر فقرے کسے تھے اور اپنی ہیوی موٹر بائیکس ہماری گاڑی کے پیچھے پارک کر کے ہمارا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد ہم کبھی اس جگہ نہیں آئے۔ آج قریباً چار سال بعد میں ان در و دیوار کو دیکھ رہا تھا اور...... سینے میں دھواں بھر رہا تھا۔

''چلو عمران چلیں۔'' چائے ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو ایک دبلے پتلے ویٹر مقبول نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ پرانے چہروں میں سے بس یہی ایک چہرہ مجھے یہاں نظر آیا تھا۔ ''آپ بہت عرصے بعد یہاں آئے ہیں صاحب جی؟'' وہ بتیسی نکال کر بولا۔

''ہاں، میں یہاں نہیں تھا۔ باہر تھا ملک سے۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

وہ ذرا جھجکا پھر بولا۔ ''مجھے یاد ہے جی، آپ جب بھی آتے تھے...... وہاں اس کونے والی میز پر بیٹھتے تھے۔ اس وقت کافی دبلے پتلے تھے آپ...... اور...... اور آپ کے ساتھ وہ بی بی بھی ہوتی تھیں۔ آپ کی منگیتر تھیں نا شاید؟''

''ہاں۔'' میں نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔

''وہ کچھ مہینے پہلے بھی یہاں آئی تھیں۔ میں نے جس طرح آپ کو پہچانا، انہیں بھی فوراً پہچان لیا تھا۔''

ویٹر مقبول کے اس فقرے نے جیسے میرے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو زمین سے پیوست کر دیا۔ عمران بھی چونک گیا۔

''کک......کب کی بات ہے یہ؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں، میرا خیال ہے، یہی اگست، ستمبر کے دن تھے۔ اور ایک بار نہیں، وہ تین چار بار آئی تھیں یہاں۔ اکیلی ہی ہوتی تھیں۔ پہلے سے کمزور لگتی تھیں اور کچھ گم صم بھی۔ وہ اسی کونے والی میز پر بیٹھتی تھیں۔'' ویٹر مقبول نے ایک بار پھر ہال کے شمالی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے تعجب سے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ عمران کی اطلاع کے مطابق ثروت اور ناصر وغیرہ جرمنی میں تھے لیکن یہ ویٹر مقبول کچھ اور خبر دے رہا تھا۔ ویٹر مقبول کا یہ جملہ بھی میری دھڑکنوں کو زیروزبر کر رہا تھا کہ ثروت یہاں آتی تھی اور فلاں میز پر بیٹھتی تھی۔

عمران نے ویٹر مقبول سے پوچھا۔ ''کیا ہم کہیں اور بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں جی...... میری ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے۔ میں تو واپس جا رہا تھا۔ اگر آپ دو سیکنڈ پہلے کاؤنٹر کی طرف نہ آتے تو میں نے تو سیدھا نکل جانا تھا۔''

''کہاں بیٹھیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کہیں باہر چلتے ہیں جی...... یہاں آپ کے برابر بیٹھتے ہوئے شرم آئے گی۔''

بہتر یہی تھا کہ کہیں اور بیٹھا جائے۔ ہم ویٹر مقبول کے ساتھ باہر نکلے۔ اب آٹھ بجنے والے تھے۔ ان گنت نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ سڑک پر روشنی کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ ہم نے سڑک پار کی اور کچھ فاصلے پر ایک پارک میں جا بیٹھے۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے مقبول سے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ...... میرا مطلب ہے کہ وہ ثروت ہی تھی؟''

''آپ کیسی بات کرتے ہیں جی...... میں آپ دونوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یوں تو ہمارے کیفے میں بہت سے جوڑے آتے ہیں لیکن آپ دونوں کی بات اور تھی۔ آپ کے میل ملاقات میں کوئی لوفر پن نہیں تھا۔ آپ دونوں کبھی کسی کیبن میں نہیں بیٹھے اور بی بی جی کی تو شکل دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آپ دونوں اکثر گرین ٹی پیتے تھے اور مجھے یاد ہے جس حساب سے بل بنتا تھا، اسی حساب سے مجھے ٹپ بھی دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ دونوں منگیتر ہیں۔ بی بی جی کا چہرہ اس بات پر بالکل گلابی ہوگیا تھا۔''

میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بتا رہے ہو کہ چند مہینے پہلے وہ تین چار بار یہاں آئی...... تمہاری کوئی بات ہوئی ان سے؟''

''جی ہاں...... مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ کے ساتھ ان کی منگنی وغیرہ آگے نہیں چل سکی۔ ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی ہیں اور آج کل یہاں اکیلی کیوں آتی ہیں؟ انہوں نے بس گول مول سا جواب دیا۔ کہنے لگیں، میں پاکستان سے باہر تھی۔ یہاں کی چائے کی بہت یاد آتی تھی اس لئے آ جاتی ہوں...... سوچتی تھی ہمارے سوا سب کچھ بدل چکا ہے۔ مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے ان سے یہ سب کچھ کیوں پوچھا۔''

''کیوں؟''

''اس کے بعد وہ آئی ہی نہیں۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے، وہ عارضی طور پر لاہور میں تھیں یا یہاں رہ رہی تھیں؟''

''میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ان کے پاس اپنی سواری نہیں تھی جی۔ وہ پیدل ہی آتی تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں رکشا سے اترتے بھی دیکھا...... ہاں، ایک بات یاد آئی۔ ایک دن میں نے انہیں انشورنس کمپنی والے دفتر کی سیڑھیاں اترتے بھی دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نوکری کی تلاش میں وہاں گئی ہیں لیکن اس کے بعد میں نے انہیں دوبارہ نہیں دیکھا۔''

انشورنس کمپنی کے دفتر والے ذکر نے مجھے چونکا دیا۔ یہ دفتر پاس ہی چوراہے میں تھا...... ایک لحاظ سے یہ اس علاقے میں سب سے پرانا دفتر تھا۔ یہاں میرے کالج کی ایک ساتھی فائزہ کام کرتی تھی۔ فائزہ کسی حد تک ثروت کو بھی جانتی تھی۔ جب میں اور ثروت یہاں ویٹر مقبول والے کیفے میں ملنے آتے تھے تو کبھی کبھی یہاں فائزہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ثروت کو واقعی ملازمت کی تلاش ہو۔ وہ اس سلسلے میں فائزہ سے ملی ہو اور فائزہ اس کے بارے میں جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔

اگلے دن تک کا وقت میں نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ انشورنس کمپنی کے اس دفتر کے علاوہ میرے پاس فائزہ کا اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علی الصباح میں اور عمران موٹر سائیکل پر سوار ہو کر انشورنس کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔ یہ جان کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں کہ فائزہ ابھی تک اسی آفس میں کام کرتی ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن چکی ہے...... جلد ہی میں اور عمران، فائزہ کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھے۔ فائزہ نے مجھے پہچان لیا اور بڑے تپاک سے ملی۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہوگئی تھی اور لڑکی کے بجائے خاتون نظر آتی تھی۔

وہ میری آمد پر بے حد حیران ہوئی۔ ''تم اتنا عرصہ کہاں رہے تابش! مجھے تو لگتا تھا کہ تم سے اب کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میرے اندازے کے مطابق تم پاکستان میں تو ہرگز نہیں تھے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے فائزہ۔''

''میں نے تمہارے گھر بھی کئی بار فون کئے۔ پھر ایک بار خود وہاں گئی تھی لیکن پتا چلا کہ اس گھر میں اب کوئی اور رہتا ہے۔ فرح اور عاطف وغیرہ کا بھی کچھ کھوج نہیں ملا۔ بس ایک اڑتی اڑتی سی افسوس ناک خبر ملی کہ تمہاری والدہ کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہیں اور اس کے بعد سے تم بھی لاپتا ہو۔''

فائزہ نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے ہمارے لئے چائے منگوائی اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اسے والدہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں مختصراً بتایا اور فرح عاطف کی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔

''ثروت کہاں ہے آج کل؟'' فائزہ نے چائے کا دوسرا دور شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو فائزہ! مجھے پتا چلا ہے کہ ثروت تمہارے پاس نوکری کے لئے آئی تھی اور تم نے اسے نوکری دلوا بھی دی تھی۔ وہ یہیں پر کام کرتی رہی ہے۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

فائزہ گہری نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''تمہیں یہ کس نے بتایا؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''غلط نہیں کہہ رہے ہو تو درست بھی نہیں کہہ رہے ہو۔ شاید تم قیافے سے بات کر رہے ہو۔''

''چلو تم خود بتا دو۔ میں نے کتنا درست کہا ہے اور کتنا غلط۔''

''چلو، کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔'' فائزہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

ہم دفتر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سڑک پار کر کے اسی جانے پہچانے کیفے میں آ بیٹھے جو کبھی میری اور ثروت کی ملاقاتوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کیفے کی فضا میں پہنچتے ہی میرے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ آج ویٹر مقبول آن ڈیوٹی نہیں تھا۔ ہم نے کولڈ کافی کا

آرڈر دیا..... اور ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عمران نے اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا۔ بہر حال، فائزہ سمجھ چکی تھی کہ عمران کی حیثیت میرے نہایت قریبی دوست کی ہے اور وہ عمران کے سامنے ہر طرح کی بات کر سکتی ہے۔

میں بے چینی سے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گھمبیر آواز میں بولی۔ ''تمہاری یہ بات درست ہے تابش کہ سات آٹھ مہینے پہلے ثروت یہاں نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں ملی۔ شاید اسے پتا ہی نہیں تھا کہ میں ابھی تک یہاں کام کر رہی ہوں۔ وہ ایک خانہ پُری والا انٹرویو دے کر مایوس واپس جا رہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ میں اسے پکڑ کر دفتر کے کیفے ٹیریا میں لے گئی۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ بس مجھ سے جلد از جلد پیچھا چھڑا کر چلی جانا چاہتی تھی۔

''میں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے اور میرا یہی تجسس اسے مجھ سے دور جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا کہ اگر میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے تو پھر میں اس سے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھوں۔ میں نے کہا کہ میں خود سے کچھ نہیں پوچھوں گی، اگر وہ اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہے تو اور بات ہے۔

''اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو ماہ پہلے جرمنی سے پاکستان آئی ہے۔ یہاں ایک پرانی سہیلی کے پاس ماڈل ٹاؤن میں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ شادی شدہ سہیلی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں لیکن اب وہ مزید اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ اسے نوکری کے ساتھ ساتھ ایک ٹھکانے کی تلاش بھی ہے۔

''میں نے کہا کہ ثروت یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا اور میرا ٹاکرا ہو گیا۔ میرا گھر تمہارے لئے بہترین ٹھکانا ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا بچہ کوئی نہیں ہے۔ ساس کے ساتھ رہتی ہوں۔ شوہر ملازمت کے سلسلے میں آج کل دبئی مقیم ہیں۔ ہمارا وقت بڑا اچھا گزرے گا۔ باقی رہی نوکری کی بات تو تم پڑھی لکھی ہو۔ اب جرمنی کی ڈگری بھی ہے تمہارے پاس۔ تھوڑی سی کوشش سے تمہیں کہیں بھی باوقار نوکری مل سکتی ہے۔ لیکن اگر تم میرے ساتھ انشورنس کمپنی کے دفتر میں کام کرو تو مجھے اچھا لگے گا۔ یوں میں نے ثروت کے لئے اپنے دفتر میں ہی بڑی مناسب جاب کا انتظام کر دیا۔ میں نے اپنے شوہر سے بھی اجازت لے لی اور وہ میرے [illegible] ہی میرے گھر میں رہنے لگی۔ وہ کوئی تین ماہ میرے ساتھ رہی اور ہم دونوں کا وقت اتنا اچھا گزرا کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن الجھن بس ایک ہی تھی۔ اس نے میری زبان کو تالا لگا

دیا تھا۔ میں اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ جو تھوڑا بہت مجھے معلوم ہوا، وہ بس یہی تھا کہ تمہارے ساتھ اس کی منگنی برقرار نہیں رہ سکی تھی اور وہ ڈھائی تین سال جرمنی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے واپس آئی ہے۔''

میں نے کہا۔''فائزہ! تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس نے شادی کی ہے یا نہیں؟''

''میں سچ کہتی ہوں تابش! مجھے اس بارے میں بڑا تجسس تھا لیکن یہ سوال ان نازک ترین سوالوں میں سے تھا جنہیں وہ کسی صورت سننا پسند نہ کرتی۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنا وعدہ توڑا تو اسے ایک دم کھو دوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ صبح اٹھوں تو وہ میرے گھر میں موجود ہی نہ ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ ایک بہت بھاری بوجھ سینے پر لئے پھر رہی ہے۔ اس بوجھ اور دکھ سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے وہ گاہے بگاہے، ہنستی بھی تھی، باتیں بھی کرتی تھی، رات گئے تک دفتر کے کام میں بھی لگی رہتی تھی لیکن اس سب کے دوران میں بھی اس کا دھیان جیسے کہیں اٹکا رہتا تھا۔''

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔''کیا کبھی اس نے آپ سے تابش کے بارے میں کوئی سوال کیا؟''

''نہیں...... براہِ راست تو نہیں لیکن ایک بار اتنا ضرور پوچھا کہ کیا میری ملاقات کبھی بھی فرح اور عاطف سے نہیں ہوئی؟ میں نے بتایا کہ نہیں۔ ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں نے اسے تجویز دی کہ لاہور میں اس کے دو چار رشتے دار موجود ہیں، وہ ان سے ملے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فرح اور عاطف کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔ اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملنا چاہتی ہے اور نہ ماضی سے کسی طرح کا رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔''

ہم باتیں کر رہے تھے۔ کیفے کی کھڑکیوں سے باہر ایک ابر آلود دوپہر گرد و پیش کو نیم روشن کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔''فائزہ! تم نے کہا ہے کہ وہ دو تین مہینے تمہارے ساتھ رہی...... پھر کہاں گئی؟''

فائزہ نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولی۔''ایک دن میں فیلڈ ورک کے لئے دفتر سے باہر تھی۔ شام کے وقت واپس آئی تو پتا چلا کہ ثروت جلدی چھٹی کر کے چلی گئی ہے۔ اس کے ساتھی آفیسر نے بتایا کہ لمبے قد کا ایک شخص وہاں آیا تھا۔ اس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر ثروت سے آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کوئی تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ شاید وہ شخص ثروت کو کسی بات پر دھمکا بھی رہا تھا۔ اس کے

ہاتھ میں ایک لیگل سائز لفافہ تھا جسے وہ بار بار ثروت کے سامنے کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ثروت چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ جب میں گھر جاؤں گی تو وہ وہاں موجود ہو گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں بے چینی سے اس کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ وہ ساری رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اگلے روز بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ شام کے وقت بس اس کا مختصر ٹیکسٹ میسج میرے موبائل پر آیا۔ وہ میسج ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے......''

فائزہ نے اپنے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون نکالا اور تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک میسج دکھایا۔ اس ٹیکسٹ میسج میں قریباً پانچ مہینے پہلے کی ڈیٹ تھی۔ میسج کچھ یوں تھا۔

''فائزہ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں بتائے بغیر چلی آئی ہوں۔ میری کچھ ذاتی مصروفیات ہیں جن کی وجہ سے میں آ نہیں سکتی۔ بہرحال، میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آفس بھی نہیں آؤں گی۔ میرا استعفا آفس میں مل جائے گا۔''

فائزہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''میں نے ثروت کے اس نمبر پر رابطے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نمبر کے علاوہ میرے پاس اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ آخر میں تھک ہار کر بیٹھ گئی۔''

عمران نے فائزہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔''اس بندے کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے جو ثروت سے ملنے آیا تھا؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ ثروت نے مجھے اپنے بارے میں بالکل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس اس کے رہنے کی پہلی شرط ہی یہ تھی کہ میں کچھ پوچھوں گی نہیں۔ جہاں تک اس بندے کا تعلق ہے...... ہو سکتا ہے...... وہ اس کا شوہر ہو لیکن اگر وہ شادی شدہ نہیں تھی تو پھر وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً میرا دھیان ثروت کی اس شادی شدہ سہیلی کی طرف بھی جاتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آنے کے بعد ٹھہری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سہیلی کا شوہر یا دیور وغیرہ ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنی اس سہیلی کا گھر چھوڑنے پر ''بہ وجوہ'' مجبور ہوئی تھی۔''

عمران نے کہا۔''آپ کا مطلب ہے کہ سہیلی کے شوہر یا گھر کے کسی اور مرد کا رویہ ثروت سے ٹھیک نہ ہو؟''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں عمران صاحب! ہماری سوسائٹی میں خوب صورت اکیلی لڑکی کے لئے زیادہ تر مرد تو شکاری ہی ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کا ریشو کم ہے۔''

عمران نے سگریٹ کے روشن سرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس بندے کا پتا چلنا چاہئے جو آخری بار ثروت سے ملا تھا۔“

”یا پھر ثروت کی اس سہیلی سے کچھ پتا چل سکتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آ کر ٹھہری تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی کھوج کھرا نہیں۔“ میں نے کہا۔

عمران نے پوچھا۔ ”دفتر میں جاب حاصل کرتے وقت ثروت نے جو اکوائف لکھوائے، ان سے کوئی مدد نہیں ملتی؟“ فائزہ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

”اور وہ سامان جو وہ تمہارے پاس چھوڑ گئی تھی؟ ہوسکتا ہے اس سے کوئی کھوج ملے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے تو وہ کئی بار دیکھا ہے۔ اگر تم چاہتے وہ تو تم بھی دیکھ لو۔“ فائزہ نے کہا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی موسم کافی ابر آلود ہو گیا تھا۔ دوپہر میں ہی لگ رہا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو...... کون؟ جی جی تھانوی صاحب۔ میں بول رہا ہوں...... ابھی؟...... لیکن......“

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا...... پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو میں حاضر ہو جاتا ہوں...... اوکے۔“

فون بند کر کے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”پیر احمد تھانوی صاحب کی کال تھی۔ زور دے رہے ہیں کہ میں ابھی آ جاؤں۔ مریض کی حالت خراب ہے۔“

”تو پھر؟“ میں نے پوچھا۔

فائزہ بولی۔ ”میرے خیال میں آپ کو کوئی ضروری کام ہے، آپ چلیں۔ میں بھی دفتر کا تھوڑا سا کام نمٹا لوں۔ آج رات کا کھانا آپ میرے گھر کھائیں۔ تفصیل سے بات چیت بھی ہو گی۔ ابھی آپ کو بہت کچھ بتانا ہے اور آپ سے پوچھنا بھی ہے۔“

فائزہ نے اپنے گھر کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر مجھے دیا۔ فائزہ سے رخصت ہو کر ہم جیلانی کی موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور شاہ جمال کے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ راستے میں ہی زوردار بارش شروع ہو گئی۔ یہ اچھا خاصا طوفانِ باد و باراں تھا، ہم کہیں رکنے کے بجائے چلتے رہے۔ ساون میں تو سب ہی بارش میں نہانا چاہتے ہیں...... اس جاتی سردیوں کی بارش میں نہانے کے لئے ہمت کی ضرورت تھی اور یہ ہمت ہم دونوں میں موجود تھی۔ عمران کی جیکٹ مکمل واٹر پروف تھی۔ اس کی پاکٹ میں موجود ماؤزر

اور ایمونیشن کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے ہمارے اندر جو تجسس جگایا تھا، وہ اب عروج پر پہنچ چکا تھا۔ پیر صاحب فرماتے تھے کہ ایک مریض کے علاج میں عمران ان کی خاطر خواہ مدد کر سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک مریض کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور نہ اس کے علاج کے بارے میں۔

ہم جس وقت شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے، بارش پورا زور پکڑ چکی تھی۔ ہمارے استقبال کے لئے فربہ اندام جمیل اور ایک باریش ادھیڑ عمر مرید پہلے سے برآمدے میں موجود تھے۔

جمیل نے کہا۔ ”اوہو عمران بھائی! آپ تو بھیگتے ہوئے آئے ہیں۔ آپ بتا دیتے، پیر صاحب آپ کے لئے گاڑی بھجوا دیتے۔“

عمران بولا۔ ”کسی ایک کو تو بھیگنا ہی پڑتا۔ ہم نہ بھیگتے تو گاڑی بھیگ جاتی بلکہ چیکڑ و چیکڑ ہو جاتی۔ پھر سروس کرانے پر کافی پیسے لگ جاتے۔ ہمارا کیا ہے، تھوڑے سے پانی سے نہا لیں گے اور پانی کی بچت بہت ضروری ہے۔ امریکا نے کہا ہے کہ اگلی ساری لڑائیاں پانی کی وجہ سے ہوں گی...... جیسے پچھلی ساری لڑائیاں امریکا کی وجہ سے ہوئی ہیں......“

عمران جب ایک بار زبان کو حرکت دے دیتا تھا تو پھر وہ جلدی رکتی نہیں تھی۔ لیکن یہاں بولنے کا زیادہ موقع نہیں تھا کیونکہ ہم جلدی ہی...... تھانوی صاحب کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ تھانوی صاحب نے اپنے کمرے میں ہمارا استقبال کیا، تپاک سے ملے۔ اس بات پر معذرت بھی کی کہ ہمیں بھیگتے ہوئے یہاں آنا پڑا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھے۔ کندھوں پر ایک سنہری شال تھی۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا اور ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کا منظر تعجب خیز تھا۔ ایک پلنگ پر ایک نہایت کمزور شخص لیٹا نظر آیا۔ اس کی عمر یہی کوئی چھبیس ستائیس سال دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ٹھوڑی تک لحاف اوڑھ رکھا تھا۔ تاہم اس لحاف کے اوپر ایک سفید چادر بھی تھی۔ اس نے اپنا سر وغیرہ بھی ایک سفید کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لحاف کا ایک کنارہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ اس شخص کے سینے پر کوئی زخم سا ہے جس پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اس جواں سال شخص کی گدلی آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر عورت مدقوق شخص کے سرہانے بیٹھی تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔ اندازہ ہوا کہ یہ مریض کی ماں ہے۔ ماں بیٹا نے جن نظروں سے عمران کو دیکھا، مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ وہ اسے پہلے سے جانتے ہیں۔ دوسری طرف عمران کے چہرے پر بھی شناسائی کے آثار نظر آئے۔

عمران کو دیکھ کر ادھیڑ عمر عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

احمد تھانوی صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کر کے مدقوق شخص سے کہا۔ ''نیاز محمد! اسے پہچان رہے ہونا تم؟ یہ عمران ہے...... جسے تم عمو کہتے ہو۔''

مدقوق شخص نے اپنے سوکھے سڑے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مزید ڈرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ تھانوی صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔ ''بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لایا ہوں اسے۔ اگر اب بھی تمہارے دماغ کا فتور نہ نکلا تو یہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔''

میرے دماغ میں ہلچل ہوئی۔ عمران کی روداد میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ نیاز اسی چودھری زادے کا نام تھا جس پر سے آفت ٹالنے کے لئے برسوں پہلے عمران کا انتخاب کیا گیا تھا۔ چودھری سجاول اور اس کی بیوی نے اپنے لاڈلے بیٹے کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لئے عمران کو قربانی کا بکرا بنایا اور اسے شہنشاہ کے مزار پر خدمت کے لئے بھیج دیا تھا۔

میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ وہی نیاز تھا۔ خوف اور بیماری نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا تھا...... یوں لگتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور وہ یہیں اس پلنگ پر پڑا پڑا آخری ہچکیاں لینی شروع کر دے گا۔ باہر طوفانِ بادوباراں اپنے زور پر تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل دہاڑ رہے تھے۔

تھانوی صاحب نے عمران کو اشارہ کیا اور ہم پیر صاحب کے ساتھ باہر آ گئے۔ دوسرے کمرے میں آ کر پیر صاحب نے مجھے اور عمران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ بولے۔ ''عمران بیٹا! انسان جو کچھ بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ اس میں دیر ہو سکتی ہے، اس کی شکل بدل سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔ نیاز کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ وہم کا دنیا میں کوئی علاج نہیں...... اور یہ وہم نیاز اور اس کے گھر والوں کو جکڑ چکا ہے۔ یہ وہی وہم ہے جس کی وجہ سے تم پر مصیبتیں آئیں اور تمہیں اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔''

''آپ کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔'' عمران نے ہنکارا بھرا۔

تھانوی صاحب نے اپنی سفید براق داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں یہ بات کیسے ان لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی کچھ خاص لوگوں کا پیچھا کرتی ہے...... اور انہیں مارے بغیر نہیں چھوڑتی۔ کئی برس پہلے جب اس وہم نے ان لوگوں کو جکڑا تو انہوں نے اپنی دانست میں اپنی بلا تمہارے گلے ڈالنے کی کوشش کی...... اب ایک بندے کی

وجہ سے یہ وہم پھر ان لوگوں کی طرف واپس آ گیا ہے کہ آسمانی بجلی نیازے کو کھا جائے گی۔ اب یہ بندہ رات دن جان کنی کے عذاب میں پڑا ہوا ہے۔ تم نے ابھی اسے دیکھا ہی ہے، کیا حال ہو رہا ہے اس کا۔ راتوں کو اٹھ کر چلانے لگتا ہے۔ اونچی آواز میں روتا ہے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے نیچے چھپتا ہے۔ نیم دیوانوں کی سی حالت ہو چکی ہے۔''

عمران پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ''لیکن یہ لوگ تو ساری مصیبت میرے سر...... ڈال کر ''فارغ'' ہو چکے تھے۔''

''میں نے بتایا ہے نا کہ ایک بندے کی وجہ سے یہ وہم پھر ان کی طرف لوٹ آیا ہے...... یا یوں کہہ لو کہ اس بندے کی خود غرضی اور طمع نیاز کو موت کے منہ میں لے آئی ہے۔ تم اس بندے کو جانتے ہو اور پہچان بھی لو گے۔'' احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دراز کھولی اور ایک کتاب میں رکھی ہوئی تصویر نکال کر عمران کو دکھائی۔ عمران کے چہرے پر نفرت کا رنگ لہرا گیا۔ حالانکہ یہ رنگ کم کم ہی اس کے چہرے پر آتا تھا۔ میں نے بھی تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ گول چہرے والا ایک شخص تھا۔ بال لمبے تھے۔ اس نے سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ ایک رخسار اور کنپٹی پر گہرا زخمی تھا جیسے کسی جانور کے پنجے کا کھرونچا ہو۔ اس کھرونچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کی یہ آنکھ بھی سلامت نہیں ہے۔ میرا ذہن فوراً صادق شاہ کی طرف چلا گیا۔ وہی شیطان صفت عامل جو عمران کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ ''نوجوان مردوں کی شکاری ماجھاں'' کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جسے عمران نے بڑی خوب صورتی سے اپنے انتقام کی تپش سے آگاہ کیا تھا۔ عمران نے مشتعل بنگلہ ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے میں چھوڑ دیا تھا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ شیر اور صادق شاہ کی اس طوفانی ملاقات میں پیر صادق شاہ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ دونوں ہنسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ''خادم'' نے مخدوم کا ایک کندھا بھی چبا ڈالا تھا۔

تھانوی صاحب کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''نیاز اور اس کی ماں کے ذہن میں یہ بات اسی صادق شاہ نے ڈالی ہے کہ عمو چونکہ اب تک بجلی والی آفت سے بچا ہوا ہے، اس لئے اب یہ آفت عمو کے ساتھ ساتھ نیازے پر بھی آ گئی ہے۔ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی پہلے آسمانی بجلی کے نشانے پر آئے گا، مارا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ چودھرائن اور اس کے اکلوتے بیٹے سے موٹی رقمیں بٹورنے کے لئے کیا تھا۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیاب بھی رہا ہے۔ سنا ہے کہ نقد رقم کے ساتھ ساتھ وہ اب تک کافی اراضی بھی ماں بیٹے سے ہتھیا چکا ہے۔''

عمران نے اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھوا اور پُر سوچ انداز میں بولا۔ ”مجھے پتا تھا، ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہے۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ وہم کا کوئی علاج نہیں اور وہی شخص کو کسی نئے وہم میں مبتلا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔“

تھانوی صاحب نے کہا۔ ”دو تین ماہ پہلے یہ لوگ پیر صادق شاہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ کسی نے ان کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی۔ چودھرائن کو نماز، روزے کی طرف راغب کیا۔ وظیفے بتائے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ نیاز محمد پچھلے قریباً ڈھائی مہینے سے میرے پاس ہی رہ رہا ہے۔ دو تین روز کے لئے گاؤں جاتا بھی ہے تو فوراً پلٹ آتا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ میرے پاس زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہاں بھی وہ مکمل سکون میں نہیں ہے۔ اس کی ذہنی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ میں مختلف طریقوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ اسے نارمل زندگی کی طرف لا سکوں۔ آج میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی ہے تو اسی سلسلے میں دی ہے۔“

”جی، میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ عمران نے کہا۔

”یہ سب کچھ تمہیں عجیب تو لگے گا عمران...... لیکن عجیب بیماریوں کے علاج بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں عمران کہ آج تم اس برسوں پرانے خیال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو جو تمہارے آبائی گاؤں کے لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے...... اور یہ بس تمہارے گاؤں کی بات نہیں ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ علاقے کے بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آسمانی بجلی تمہاری دشمن ہے اور تم اس سے چھپتے پھرتے ہو۔ نیاز اور اس کی چودھرائن ماں کا خیال بھی یہی ہے۔ آج تم نیاز اور اس کے سامنے اس خیال کو غلط ثابت کر دو۔“

”میں بالکل تیار ہوں جی...... مجھے خوشی ہو گی اگر میرے اس چھوٹے سے کام سے ان لوگوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔“

”میں جانتا ہوں عمران...... تم بڑے دل کے مالک ہو۔ اپنے دشمنوں سے بھی اچھا کر سکتے ہو۔“ احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سچ پوچھیں جی تو میں نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا رکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ جاہلیت اور دقیانوسیت نظر آئے گی، اس کے خلاف اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق کوشش کروں گا۔ اور اس کام میں میرا یہ بھائی اور دوست تابش بھی میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہے۔“

تھانوی صاحب نے گہری نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے توقف

کرنے کے بعد بولے۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں ہمارے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ بہر حال، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔“

تھانوی صاحب ہمیں وہیں چھوڑ کر پھر نیازے اور اس کی ماں کے پاس چلے گئے...... بارش اسی تسلسل سے جاری تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ تین چار منٹ بعد...... تھانوی صاحب واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ لبادہ تھا...... انہوں نے یہ لبادہ عمران کے بھیگے ہوئے کپڑوں کے اوپر سے ہی اسے پہنا دیا۔ پھر وہ عمران کو لے کر باہر صحن میں آ گئے۔ یہاں فائبر کی ایک کرسی پڑی تھی...... تھانوی صاحب کی ہدایت کے مطابق عمران جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران کو کمپنی فراہم کرنے کے لئے فربہ اندام جمیل بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دونوں باتیں کرنے لگے اور بارش میں بھیگنے لگے...... میں اور تھانوی صاحب اس کمرے میں آئے جہاں نیاز اور اس کی ماں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کمرے کی گرل دار کھڑکی میں سے صحن کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ بستر پر بیٹھے نیازے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی ہیں۔ چودھرائن بھی سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ تھانوی صاحب کچھ دیر تک ان دونوں کے پاس کھڑے رہے پھر نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ”نیاز! مجھے پتا نہیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تمہارے دماغ کا خناس دور ہو گا یا نہیں...... لیکن جو حقیقت ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ یہ اس چمکتی بجلی اور برستی بارش میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہے اور میں تمہیں دعوے سے کہتا ہوں۔ یہ بندہ کبھی بھی ان چیزوں سے چھپا نہیں بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہ اسی طوفان میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔“

”لیکن......“ نیاز ہکلا کر رہ گیا۔

”تم چاہو تو جب تک یہ بارش برس رہی ہے...... عمران یہاں کھڑا رہے گا۔ اور صرف آج کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر تم آئندہ بھی چاہو تو یہ تمہیں اس تجربے سے گزر کر دکھا سکتا ہے۔ اپنے اندر کے بے جا خوف اور واہموں کو دور کرو نیاز...... جس طرح عمران عمو کے سر پر کوئی آفت نہیں، تمہارے سر پر بھی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک زہریلا وسوسہ ہے......“

بجلی چمکی۔ ساتھ ہی ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ در و دیوار لرز گئے۔ نیازا بے ساختہ چلا اٹھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنے کلاوے میں لے لیا، اسے پچکارنے لگی۔ ”کچھ نہیں پتر...... کچھ نہیں ہوا۔ پیر جی ہمارے پاس ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

"میرے ہونے نہ ہونے کی بات نہیں چودھرائن۔ اصل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک دھواں ہے، دھند ہے، وسوسہ ہے۔ وہ دیکھو، حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ کالا چولا پہنے وہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور جب تک تم چاہو گے بیٹھا رہے گا۔"

نیازے نے ڈری ڈری نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ عمران اور جمیل باہر موجود تھے۔ نیازے کا سارا جسم کانپنے لگا...... چودھرائن نے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ خود بھی کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ عمران اب اندر آچکا تھا۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دوسرے پہن لئے تھے...... یہ تھانوی صاحب کے کسی مرید کی شلوار قمیض اور جرسی تھی۔ ایک ہال کمرے میں...... تھانوی صاحب کے کئی مریض اور معتقدین موجود تھے۔ وہ بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ سات بج چکے تھے۔ ہال میں موجود افراد میں سے بھی دو چار لوگوں نے عمران کے بارش میں بھیگنے کا منظر دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید اسے کسی روحانی عمل سے تعبیر کیا ہو۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے عمران سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ آج نہیں بلکہ پھر کسی اور دن اسے زحمت دیں گے۔ یقیناً انہیں کسی ابر آلود دن کا انتظار تھا...... اور یہ انتظار آج ختم ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد فربہ اندام چودھرائن اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے تھے۔ لباس دیہاتی طرز کا لیکن قیمتی تھا۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ کمرے میں صرف میں، عمران اور جمیل موجود تھے۔ چودھرائن ہم دونوں کی پروا کئے بغیر زمین پر بیٹھ گئی اور عمران کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عمران نے جلدی سے چودھرائن کو اپنے پاؤں پر سے اٹھایا اور کوشش کر کے صوفے پر بٹھایا۔

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "عمو پتر...... خدا کے واسطے ہمیں ماف کر دو۔ ہم نے تمہیں بڑے دکھ دیئے ہیں۔ ہم کو انہی کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ میرا پتر جھلا ہو گیا ہے۔ وہ کسی کام جوگا نہیں رہا۔ دن رات کمرے میں بند رہتا ہے۔ کھڑکیاں دروازے بھی نہیں کھولتا۔ اس کا جینا حرام ہو گیا ہے پتر...... تُو ہمیں ماف کر دے۔ شاید اسی طرح اس کی مشکل آسان ہو۔"

عمران خاموش کھڑا تھا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ وہ فوراً چودھرائن کی اشک شوئی کرے گا اور نیازے کو معاف کرنے کی بات کرے گا۔ عمران کے چہرے سے اس کے دلی

جذبات کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اندرونی کرب کے اثرات اس کے چہرے پر بھی تھے۔

چودھرائن نے اپنی گرم شال کے پلو سے اپنا تر بتر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں مانتی ہوں عمو پتر! ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں...... پہلے تمہاری ماں کو تم سے دور کیا پھر تمہاری منگ بھی تم سے چھڑا دی۔ یہ ظلم شاید پہلے ظلم سے بھی بڑا تھا...... اس دکھ نے تمہیں بالکل اجاڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے سارے قصور مانتی ہوں پتر! تیرے سسرال والے تیرے بارے میں سن گن لینے کے لئے ہمارے پاس ہی آئے تھے۔ ہماری حویلی میں آئے تھے۔ اللہ بخشے نیازے کے پیو نے انہیں ڈرا دیا۔ ان سے کہا کہ عمو پر سایہ ہے۔ عاملوں نے کہا ہے کہ بجلی اس کی ویری ہے۔ وہ چھپ چھپا کر رہتا ہے۔ ہماری ان باتوں نے تمہیں اجاڑ دیا پتر...... وہ کُڑی بھی مر گئی...... اس کی قبر بن گئی۔ اس سارے ظلم میں ہم حصے دار ہیں پتر...... ہم حصے دار ہیں۔ خدا کے واسطے ہمیں ماف کر دو۔ میرے نیازے کی جان بچا لو...... وہ ایک بار پھر عمران کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں تھام لئے۔ عمران نے اسے دوبارہ اٹھایا۔

وہ روتی رہی، بلکتی رہی۔ اپنے ایک ایک گناہ کا اعتراف کرتی رہی۔ اس نے یہ مانا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے عمران کو مشکلوں کی آگ میں پھینک دیا...... اور آج اس کا پھل یہ ملا ہے کہ اس کا بیٹا موت کے منہ میں ہے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ اس کے بیٹے کو سینے کی کوئی بیماری ہے۔

اسی دوران میں تھانوی صاحب بھی اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر چودھرائن ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ دہائی دینے لگی۔ "پیر جی...... آپ سفارش کریں۔ آپ عمو سے کہیں ہمیں ماف کر دے۔"

پیر صاحب نے چودھرائن کو ڈانٹا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاؤں سے اٹھ جائے۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر...... تھانوی صاحب نے نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے تسلی دی کہ عمران ان کے ساتھ وہ نہیں کرے گا جو انہوں نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ وہ انہیں معاف کر دے گا اور اس کی معافی ان شاء اللہ نیازے کو ٹھیک ہونے میں بھی بہت مدد دے گی۔

چودھرائن سسکیاں لیتی رہی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ میں سوچنے لگا، انسان جب طاقت اور اختیار کے نشے میں سرشار ہوتا ہے تو فرعون اور شداد جیسے

جابروں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے لیکن جب حالات کی چکی میں پستا ہے تو ذرے سے حقیر نظر آتا ہے۔

کچھ دیر بعد احمد تھانوی صاحب کے کہنے پر چودھرائن نے بتانا شروع کیا کہ پیر صادق شاہ نے کس طرح نیاز کو اور باقی گھر والوں کو اپنی باتوں میں جکڑا...... کیسے ان کے دلوں میں ایک جان لیوا خوف کی بنیاد رکھی اور پھر کس کس طرح اس خوف کو بڑھاوا دیا۔ یہاں تک کہ چودھرائن اپنے بیٹے اور اس کے بچوں کی خاطر صادق شاہ کے شکنجے میں جکڑتی چلی گئی۔ چودھرائن کے پاس زیورات کی شکل میں ڈھائی تین کلو سے کم سونا نہیں تھا۔ نیازے کے علاج کے سلسلے میں وہ اپنا قریباً آدھا زیور وقتاً فوقتاً صادق شاہ کو دے چکی تھی......اس کے علاوہ کچھ اراضی بھی تھی......

عمران نے چودھرائن کی ساری گفتگو سنی۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ ''چاچی! میری ماں کے بارے میں کوئی خیر خبر نہیں تمہارے پاس؟''

چودھرائن نے نفی میں سر ہلایا اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''پیر صاحب کی دعا سے اب میں پنج وقت کی نماز پڑھنے لگی ہوں۔ میں ہر نماز کے بعد رب سے دعا کرتی ہوں کہ ہمیں بھین شریفاں کا کوئی پتا چلے۔ ہم اس کے پاؤں میں گر کر معافی مانگیں۔ پتا نہیں یہ دعا کب قبول ہوگی۔''

عمران نے کہا۔ ''چاچی! تُو پچھلے چند مہینے سے جس طرح اپنے پُتر کے لئے تڑپ رہی ہے، میری ماں پچھلے دس سال سے اسی طرح تڑپ رہی ہوگی۔ کیا کبھی تم نے سوچا ہے اس بارے میں کہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

وہ ایک بار پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

بارش تھم گئی تھی......تھانوی صاحب کے عقیدت منداب جانا شروع ہوگئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر قطار میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کچھ گاڑیاں اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ موٹر سائیکلوں وغیرہ پر آئے ہوئے لوگ بھی نکل رہے تھے۔ ایک چادر پوش لڑکی رکشے والے کو ہاتھ کے اشارے سے روک رہی تھی رکشا رک گیا۔ جب وہ اندر بیٹھنے کے لئے ذرا سا گھومی تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا......اور اپنی جگہ سے بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ چ[illegible] دیکھا بھالا تھا۔ یہ قد کاٹھ، یہ حلیہ...... یہ ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی...... جو ثروت ا[illegible] ساتھ ہی جرمنی چلی گئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ چند سیکنڈ کے

لئے مجھے پوری کی پوری دکھائی دی پھر رکشے میں اوجھل ہوگئی۔ میں تڑپ کر کھڑکی تک پہنچا۔ ایک باریش مرید میرا دھکا لگنے سے دور جا گرا تھا۔ میں کھڑکی سے منہ نکال کر دیوانہ وار چلایا......''رکو......رک جاؤ۔''

تب تک رکشا سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو چکا تھا۔ ''عمران آؤ'' میں بلند آواز سے بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے باہر گیراج میں آئے۔ عمران جان چکا تھا کہ میں نے کسی کو دیکھا ہے اور اب اس کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے لپک کر موٹر سائیکل سنبھالی۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ تین چار کِکس سے پہلے اسٹارٹ نہیں ہوسکی۔ ہمارا انداز دیکھ کر اردگرد کے سارے لوگ ٹھٹکے ہوئے تھے۔ جونہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی، ہم طوفانی انداز میں احمد تھانوی صاحب کی کوٹھی سے نکلے۔

''کدھر؟'' عمران نے پوچھا۔

''رکشے کے پیچھے۔ ابھی دائیں طرف مڑا ہے۔ نیلے رنگ کا ہے۔''

''سارے رکشے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ نمبر دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

عمران نے سڑک پر پھسلن کی پروا کئے بغیر خطرناک رفتار سے موٹر سائیکل کو دائیں طرف موڑا۔ رکشا قریباً سو میٹر سڑک کے موڑ پر اوجھل ہوتا دکھائی دیا۔ عمران ایکسلریٹر کو گھماتا چلا گیا۔ جب ہم موڑ پر پہنچے تو رکشا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ قریباً دو سو میٹر آگے جا کر ہم سٹپٹا گئے۔ یہ ایک چوراہا تھا۔ تین اطراف میں خم دار سڑکیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عمران نے اندازے سے ایک سڑک پر موٹر سائیکل ڈال دی۔

ہم قریباً پانچ منٹ تک اِدھر اُدھر چکرائے مگر مطلوبہ رکشے کا کھوج نہیں ملا۔ آخر ہم رک گئے۔ اس دس منٹ کی بھاگ دوڑ کے دوران میں میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنی کنپٹیوں میں محسوس کیا تھا۔ ''کون تھا رکشے میں؟'' عمران نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا عمران...... لیکن نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ رکشے میں ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بیٹھ کر گئی ہے۔''

''یار! تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ آج کل تمہارے ذہن میں رات دن یہی باتیں گردش کر رہی ہیں۔ ایسی کیفیت میں اس طرح کے ''نظری دھوکے'' ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے عمران! ہمارے پاس ثبوت ہے کہ چار پانچ مہینے

پہلے تک ثروت یہاں پاکستان میں موجود تھی اور عین ممکن ہے کہ اب بھی ہو۔ اگر ثروت یہاں ہوسکتی ہے تو نصرت بھی ہوسکتی ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ ناصر بھائی بھی ہوں......"

"تم نے کب دیکھا ثروت کی بہن کو؟"

"جب وہ رکشے میں بیٹھ رہی تھی۔ وہاں مرکری اسٹریٹ لائٹ ہے۔ مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں واپس تھانوی صاحب کے پاس چلنا چاہئے۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتے ہیں۔"

ہم واپس شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے...... تھانوی صاحب کے بیشتر عقیدت منداور مریض رخصت ہو چکے تھے۔ تھانوی صاحب کے دو مرید اور عمران کا محلے دار جمیل پریشان سے گیراج میں کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھا تو وہ لپک کر ہمارے پاس آئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم یوں آناً فاناً کس کے پیچھے گئے تھے۔

ہم نے ان لوگوں کو تو کچھ نہیں بتایا تاہم تھانوی صاحب کے سامنے ساری بات کھول دی۔ تھانوی صاحب نے سب کچھ توجہ سے سنا۔ آخر میں بولے۔ "میں نے آج تقریباً پچیس تیس مریضوں کو دیکھا ہے۔ ان میں آٹھ دس عورتیں بھی تھیں۔ اکثر بیبیاں اپنا نام بتا دیتی ہیں لیکن ان میں نصرت کا نام تو میرے سامنے نہیں آیا۔ لڑکی کا لباس کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک میں نے دیکھا ہے، اس نے گلابی رنگ کی کڑھائی دار شال لے رکھی تھی۔ سویٹر شاید سفید تھا۔"

تھانوی صاحب نے اپنے مرید خاص فرید کو آواز دی۔ "فرید! اندر آؤ۔"

درمیانی عمر کا ایک باریش شخص دست بستہ اندر داخل ہوا اور مؤدب کھڑا ہو گیا......

تھانوی صاحب نے پوچھا۔ "آج نصرت نام کی ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے گلابی شال اور سفید سویٹر پہن رکھا تھا شاید۔"

فرید نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی حضرت! گلابی شال والی ایک بی بی، عورتوں والے حصے میں بیٹھی ہوئی تو تھی لیکن میرا خیال ہے کہ آج اس کی باری نہیں آئی۔ جو آخری ٹوکن نمبر میں نے آپ کے پاس بھیجا، وہ تیس تھا۔ اس کے بعد بھی دس بارہ ٹوکن اور تھے لیکن پھر آپ کے مہمان آگئے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

فرید الٹے پاؤں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھانوی صاحب نے کہا۔ "اگر آج اس کی باری نہیں آئی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کل آئے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے

کہ یہاں اس سے تم دونوں کی ملاقات ضرور ہوگی۔"

اگلے اٹھارہ گھنٹے میں نے اور کسی حد تک عمران نے بھی بے حد بے چینی میں گزارے۔ یہ احساس بے حد سنسنی خیز اور صبر آزما تھا کہ ثروت جرمنی میں نہیں بلکہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ جس کے لئے میں پل پل تڑپا تھا جس کو میں کبھی بھی بھولا نہیں تھا۔ نہ اپنی خود فراموشی کے اندھیروں میں، نہ نل پانی کے ہنگاموں میں، نہ زرگاں کی قتل گاہوں میں...... جوں جوں صبح ہوئی تھی، جوں جوں دن ڈھلا تھا، جوں جوں رات نے آنچل پھیلایا تھا، میں نے اسے یاد کیا تھا۔ اس سے ملنے کی آرزو کی تھی...... اس رات میں بالو کو دیر تک گود میں اٹھائے کوٹھی کے پائیں باغ میں گھومتا رہا۔ اس کے نرم گال چومتا رہا۔ یہ بالو جیسے میرے لئے ماضی اور مستقبل کا سنگم تھا۔ بالو کے ایک طرف سلطانہ کی یادیں تھیں اور دوسری طرف ثروت کی۔

میڈم صفورا اپنی لال کوٹھیوں میں واپس جا چکی تھی۔ اقبال بھی جا چکا تھا۔ تاہم نوری اور صفیہ یہیں پر تھیں۔ شاہین کا بھائی ظفر اپنے ہاسٹل چلا گیا تھا۔ شاہین بھی جانا چاہتی تھی مگر عمران نے اسے جانے نہیں دیا۔ میری توقع کے عین مطابق عمران نے کرائے کا وہ گھر خالی کر دیا تھا جہاں شاہین اور ظفر احمد ہماری آمد سے پہلے رہ رہے تھے۔ جیلانی کے ذریعے شاہین اور ظفر کا سارا سامان بھی یہیں پر منگوا لیا گیا تھا۔ اب یہاں دن میں کئی بار عمران اور شاہین کی نوک جھونک دیکھنے کو ملتی تھی۔

اگلے روز میں اور عمران دوپہر ایک بجے ہی پیر احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ چودھرائن اور اس کے بیٹے نیازے سے بھی مختصر ملاقات ہوئی۔ چودھرائن ہم دونوں کے سامنے اور خاص طور سے عمران کے سامنے بجھ بجھ جا رہی تھی۔ کل والے واقعات کے بعد نیازے کی حالت کچھ بہتر لگتی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا دو تین تکیوں کے سہارے بیٹھا گندم کا دلیا کھا رہا تھا۔ اس نے عمران سے نظر نہیں ملائی...... ہم جب تک وہاں رہے، وہ کچھ بولا اور نہ ہی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی چھاتی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کئی ایلو پیتھک دوائیں قریبی میز پر پڑی تھیں۔

دوسرے کمرے میں آکر میں نے عمران سے پوچھا۔ "یار! اس نیازے کی بیماری ہے کیا؟ کل تم نے کینسر کی بات کی تھی۔ چھاتی کا کینسر وغیرہ تو پھیپھڑوں میں ہوتا ہے نا۔ اس نے چھاتی کے اوپر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "یہ چھاتی کے اندر کا نہیں پستان کا کینسر ہے...... یہ بریسٹ کینسر عام

طور پر عورتوں میں ہوتا ہے لیکن شاذ و نادر کوئی ایسا کیس بھی ہوتا ہے جس میں مریض ''مرد'' ہوتا ہے۔ یہ نیاز ابھی اسی تکلیف کا شکار ہوا ہے۔ پیر صادق شاہ کے چکروں میں رہتا تو شاید اب تک عدم آباد کی تیاری شروع کر دیتا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ یہاں احمد تھانوی صاحب کے پاس آ گیا۔ انہوں نے روحانی علاج کے ساتھ ساتھ اس کا ڈاکٹری علاج بھی شروع کرایا۔ اب اس حوالے سے یہ کافی بہتر ہے۔''

احمد تھانوی صاحب ظہر اور مغرب کے درمیانی وقت میں اپنے عقیدت مندوں اور مریضوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ انہیں وظائف بتاتے...... نماز، روزے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے پاس حکمت کے حوالے سے کچھ مجرب نسخے بھی تھے جو وہ اپنے خاص مریضوں کو استعمال کراتے تھے۔ تاہم اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا کہ فلاں مریض کو مناسب ڈاکٹری علاج کی ضرورت ہے تو وہ فوراً اسے کسی ڈاکٹر کی طرف ''ریفر'' کر دیتے تھے۔

مریض اور عقیدت مند آنے شروع ہو گئے تھے۔ ہم بہت بے قراری سے منتظر رہے لیکن جس کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ مغرب ہو گئی اور لوگ واپس جانا شروع ہو گئے۔ مایوسی کا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ جس کے بغیر جیسے تیسے چار برس گزار دیئے تھے، اب اس کے بغیر گھڑیاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اگلے روز بھی یہی ہوا۔ میں اور عمران بارہ بجے ہی احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ پروگرام یہی تھا کہ اگر وہ آ گئی اور وہ نصرت ہی ہوئی تو ہم اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ ہاں، احمد تھانوی صاحب رسمی انداز میں اس کا پتا ٹھکانا پوچھ لیں گے۔ جب وہ یہاں سے واپس جائے گی تو ہم اس کا پیچھا کریں گے۔ لیکن یہ سب تو تب ہوتا جب وہ آتی۔ اور اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

وہ رات بھی عالم بے قراری میں گزری۔ رات کے کھانے کے بعد میں اکیلا ہی باغیچے میں ٹہلتا رہا اور ثروت کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان گنت سوالات ذہن میں کلبلاتے تھے۔ کیا وہ ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہو گی؟ کیا اس نے شادی کر لی ہو گی؟ کیا اس کے دل میں اب بھی میری چاہت ہو گی؟ میں بالو کے بارے میں اسے کیا بتاؤں گا؟ سلطانہ کا ذکر کس طرح کروں گا؟

مجھے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو فرح تھی۔ اس نے بالو کو اٹھایا ہوا تھا۔ بالو مجھے دیکھ کر ہمکنے لگا۔ میں نے اسے پیار کیا اور اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

فرح میرے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگی۔ ''بھائی جان! آپ پریشان ہیں۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ آپ بتاتے کیوں نہیں؟''

میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور فرح کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''تُو ہمیشہ کی طرح وہمی ہے۔ کسی نہ کسی مسئلے کی کھوج میں رہتی ہے۔''

''نہیں بھائی جان...... میرا دل کہتا ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ کل عاطف بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اسے ڈر ہے کہ شاید آپ نے سیٹھ سراج سے الجھنا شروع کر دیا ہے۔ کیا واقعی ایسی بات ہے؟''

''نہیں فرح! تم دور دراز کے اندیشوں کو دل میں جگہ دے رہی ہو۔ سیٹھ سراج کا تو ابھی کوئی کھوج کھرا ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہ وہ خبیث پاکستان میں ہے بھی یا نہیں۔''

''عاطف کہہ رہا تھا کہ عمران بھائی، شاہین باجی کو اس لئے یہاں لے کر آئے ہیں کہ انہیں سیٹھ سراج کی طرف سے کوئی خطرہ تھا۔ اب وہ بھی میری اور عاطف کی طرح اس چار دیواری میں رہنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فرحی! مجھے لگتا ہے تیرے اندر کسی اسی نوے سالہ بڑھیا کی روح گھس گئی ہے جو تجھے ہر وقت فکروں میں مبتلا رکھتی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ''بھائی جان! میرا دل چاہتا ہے کہ ہم سب پھر سے پہلے کی طرح ہو جائیں۔ ہماری کسی سے دشمنی ہو اور نہ زیادہ دوستی ہو۔ کہیں کسی انجان جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر ہو...... جہاں ہم سکون سے رہیں۔ عاطف اپنی پڑھائی مکمل کرے...... آپ کہیں سروس کریں اور...... اور......''

''...... تمہاری شادی ہو جائے۔'' میں نے اس کی بات اچکی۔

''نہیں بھائی جان۔'' وہ ٹھنکی۔ ''آپ شادی کریں۔ ہمارے گھر میں رونق آئے۔ ہماری اداسیاں دور ہوں۔''

وہ، رات کی رانی کے ایک پودے کے پاس کھڑی ہو گئی اور اس کے پھولوں پر نزاکت سے انگلیاں چلانے لگی۔ میں اس معصوم، بے خبر لڑکی کو کیسے بتاتا کہ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ وہ جس خوشبودار زندگی کے سپنے دیکھ رہی ہے، وہ کچھ سانپ صفت لوگوں کی وجہ سے زہریلی ہو چکی ہے۔ اور یہ ایسا زہر ہے جس کا تریاق آسانی سے ملنے والا نہیں۔ وہ بے خبر کیا جانتی تھی کہ وہ اب بھی جس جگہ کھڑی پھولوں کو سہلا رہی ہے، وہاں چند دن پہلے ہم نے ایک لاش دبائی ہے۔ وہ چھیدے کے مدفن کے عین اوپر کھڑی تھی۔ میں

نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ اس کا سر چوم کر کہا۔ ''فرحی! وہی ہوگا جو تم اور عاطف چاہتے ہو......لیکن اس کے لئے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا......''

اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میں نے شاہین کو دیکھا۔ اس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور وہ مرے مرے قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف جارہی تھی۔ فرح نے بھی اسے دیکھ لیا۔ میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ آج پھر عمران سے اس کی لڑائی ہوئی ہے۔''

اتنے میں عمران بھی نظر آگیا۔ وہ شاہین کے پیچھے گیا۔ وہی کھلنڈرا سا جانا پہچانا انداز تھا، اس کا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کالی سی چیز تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی چرمی تھیلا وغیرہ ہے۔ اس نے شاہین کو آواز دی۔ پھر اس کے قریب پہنچ کر یہ کالی سی شے اس کے سامنے پھینک دی۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ ایک کالی بلی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے گزر کر درختوں میں اوجھل ہوگئی۔

ہم عمران اور شاہین کے پاس پہنچے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو، یہ بالکل اچھا شگون نہیں ہے۔ کالی بلی تمہارے سامنے سے گزر گئی ہے۔ اب تو تمہیں بالکل بھی نہیں جانا چاہئے۔ اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہو گیا ہے تو صبح میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گا۔''

وہ تنک کر بولی۔ ''اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔''

''لیکن بلی؟''

میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ ''بلی تم نے خود چھوڑی ہے عمران! اور جان بوجھ کر شاہین کے سامنے پھینکی ہے۔ کم از کم اس بھونڈی دلیل کے ذریعے تو تم شاہین کو نہیں روک سکتے۔''

وہ بولا۔ ''لیکن یار! یہ بھی تو دیکھو کہ بلی کسی اور طرف بھی بھاگ سکتی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے ہو کر نکلی ہے۔ اسی کو شگون کہتے ہیں۔''

''اسے بے ہودگی کہتے ہیں اور مجھ سے یہ بے ہودگیاں اور برداشت نہیں ہوتیں۔'' شاہین نے کہا۔ وہ واقعی آزردہ تھی۔

''اب کیا کیا ہے اس نے؟'' میں نے شاہین سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی اور چھوٹی سی ناک سرخ ہوتی جارہی تھی۔

عمران بولا۔ ''یار! بات بس اتنی سی ہے، میں نے کہہ دیا کہ شادی کے لئے لڑکیوں کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اب اسے شادی کر لینی چاہئے بلکہ میں نے اس کام کو مزید آسان بھی کر دیا ہے۔ ایک بڑا اچھا ''لڑکندہ'' ڈھونڈا ہے اس کے لئے۔''

''لڑکندہ کیا ہوتا ہے؟'' فرح نے پوچھا۔

''لڑکے اور بندے کی جمع ہے یہ۔ یعنی درمیانی عمر کا مرد۔ اچھا بھلا اسمارٹ ہے۔ ایک چینل میں اینکری بھی کرتا ہے۔ اوپر نیچے کی اچھی کمائی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ بھلکڑ ہے۔ اتنا بھلکڑ کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ کئی دفعہ تو ٹاک شو کے دوران میں بریک لیتا ہے اور پھر واپس آنا ہی بھول جاتا ہے۔ قریب ہی اس کا گھر ہے...... گھر چلا جاتا ہے۔ پون گھنٹا اشتہار چلتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک اسے یاد آتا ہے کہ واپس بھی آنا تھا۔ تب تک ٹائم ختم ہو چکا ہوتا ہے...... اسکرین پر آکر وہی گھسا پٹا فقرہ بولتا ہے۔ ناظرین! وقت کم تھا اور موضوع بہت وسیع تھا...... بہت ہی زیادہ وسیع تھا...... ہم نے اسے زیادہ چھیڑا ہی نہیں۔ اب آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ خدا حافظ۔ اب سوچو تابی! ایسا بھلکڑ شوہر کہیں مل سکتا ہے؟''

''تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بھلکڑ شوہر بیوی کے لئے بہت بڑی نعمت خداوندی ہوتا ہے۔ اللہ کے بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ جیب میں کتنے پیسے تھے۔ کتنے نکلے اور کتنے رہ گئے۔ جمعرات کو ہونے والی بے عزتی جمعے کو بھول جاتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ لڑکندہ بڑا آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ٹاک شو میں ایک تاریخی جملہ بول گیا۔ کہنے لگا...... آج کل ٹی وی ڈراموں میں اتنی عورتیں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کر ''سوچتی'' ہوں کیا دنیا میں بس عورتیں ہی رہ گئی ہیں...... اندازہ لگاؤ۔ عورتوں کے بارے میں بات کرتے کرتے اپنی جنس بھی بھول گیا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر اتنا بھلکڑ ہے تو کچھ اور بھی نہ بھول رہا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں بچے وچے نہ ہوں اس کے۔''

''یار! تم ہر بات کا منفی پہلو لیتے ہو۔ تم ضرور کسی بڑے چینل کو جوائن کرو گے۔''

''چلو، جو بھی ہے لیکن تم دانستہ کالی بلی شاہین کے سامنے سے گزار کر اسے روک نہیں سکتے۔ اس کے لئے تمہیں معافی مانگنی پڑے گی۔''

''معافی تو میں ہرگز نہیں مانگوں گا۔'' وہ اکڑ کر بولا۔ ''ہاں، کہو تو ہاتھ وغیرہ جوڑ دیتا ہوں۔'' آخری الفاظ اس نے مسکین لہجے میں کہے۔

پھر واقعی اس نے بڑی دل جمعی کے ساتھ شاہین سے معافی تلافی کی۔ یہاں تک کہ وہ بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔

فرح نے کہا۔ ''بھائی جان! باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہیں کہ اب شاہین باجی کے

سامنے سے کبھی کالی بلی نہیں گزاریں گے۔''

اس نے جھٹ شاہین کے کانوں کو ہاتھ لگائے اور فقرہ دہرایا۔

شاہین اپنے کان چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''اور اپنی نظر بھی ٹیسٹ کرواؤ جناب عمران صاحب! یہ شگون جو تم بتا رہے ہو کالی بلی کے لئے بنا ہوا ہے۔ کالے بلے کے لئے نہیں۔ جو آپ نے میرے سامنے سے زبردستی گزارا، وہ کالا بلا تھا۔''

''ہائیں، بلا تھا؟ نہیں نہیں یار۔''

اسی دوران میں وہ ''کالی بلی'' پھر سے چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر نکل آئی۔ ہم نے دھیان سے دیکھا، وہ واقعی بلا تھا۔ عمران نے کانوں کو ہاتھ لگا کر میری طرف دیکھا۔ ''دیکھو جگر! تم میری پرستاروں ریما اور نرگس کو یونہی بدنام کرتے ہو۔ آج کل تو ہر لڑکی طوفان ہے۔ اتنی تیز نظریں ہیں ان لڑکیوں کی کہ ایک سیکنڈ میں زنانہ، مردانہ صفتوں کا پوسٹ مارٹم کر لیتی ہیں۔''

شاہین شولڈر بیگ پکڑ کر اس پر جھپٹی۔ وہ چھلاوے کی طرح برآمدے کی طرف نکل گیا۔

...... اگلے روز ہم پھر بارہ بجے کے قریب پیر احمد تھانوی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج عمران نے ایک مہران کار کا بندوبست بھی کیا تھا۔ ''کار پر جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یار! کار پر تم جاؤ گے۔ میں موٹر سائیکل پر رہوں گا۔''

''وہ کیوں؟''

''ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہئے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر وہ لڑکی آجاتی ہے تو ہم دونوں اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر کوئی ایک اسے مس بھی کر دے تو دوسرا تو پیچھے لگا رہے۔''

''لیکن ہوسکتا ہے کہ احمد تھانوی صاحب ہی اس سے سارا پتا ٹھکانا پوچھ لیں۔''

''دیکھو، جس فقرے میں ''ہوسکتا ہے'' آئے، اس پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔''

اس دن ہم علیحدہ علیحدہ سواری پر احمد تانوی صاحب کے گھر پہنچے اور اس روز ہم کامیاب بھی رہے۔ تین بجے کے قریب ایک رکشا کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے رکا اور اس میں سے اسی دن والی چادر پوش لڑکی اتری۔ اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے پلو میں چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نصرت ہی تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ پہلے سے ذرا بھر چکا تھا۔ بہرحال، میں اسے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دوڑ کر نصرت کے پاس پہنچوں۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑوں اور پوچھوں کہ بتاؤ

ثروت کہاں ہے؟

لیکن میں جانتا تھا، مجھے صبر کرنا ہے۔ نصرت سے براہِ راست بات کرنے سے پہلے ہم جتنا بھی جان سکتے، وہ ہمارے لئے بہتر تھا۔

پانچ بجے کے لگ بھگ نصرت کی ملاقات احمد تھانوی صاحب کے ساتھ ہوئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ واپس چل دی۔ حسبِ سابق اس نے ایک رکشے کا انتخاب کیا تھا۔ رکشا روانہ ہوا تو ہم دونوں مناسب فاصلے سے اس کے تعاقب میں تھے۔ عمران موٹر سائیکل پر آگے تھا، میں کار میں تھوڑا سا پیچھے تھا۔

رکشا مختلف سڑکوں سے گزر کر گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں آیا اور پھر ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گیا۔ نصرت اتری اور کرایہ ادا کر کے اندر چلی گئی۔ ہم تھوڑا آگے جا کر سروس روڈ پر کھڑے ہو گئے۔

عمران موٹر سائیکل چھوڑ کر گاڑی میں آبیٹھا۔ ''نیم پلیٹ پڑھی ہے تم نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں کسی جمشید ناگی کے نام کی تھی۔''

''یہ ناگی صاحب کون ہو سکتے ہیں؟''

''اللہ جانے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مالک مکان کا نام ہو۔'' میرے ذہن میں مختلف سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ یہ ناگی صاحب کون ہیں؟ کیا یہاں ثروت سے ملاقات ہوسکتی ہے؟ کیا بھائی ناصر سے یہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟

ہمیں وہاں کھڑے قریباً پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک سوزوکی سوئفٹ کوٹھی میں سے نکلی۔ سوزوکی کار کو جو ادھیڑ عمر شخص چلا رہا تھا، وہ شکل وصورت سے ڈرائیور ہی لگتا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک اکیلی خاتون بیٹھی تھی۔ ہمیں فقط اس کے ہلکے براؤن لباس کی جھلک دکھائی دی۔ جب گاڑی ٹرن لے کر ہماری طرف آئی اور ہمارے پاس سے گزری تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پچھلی نشست پر خاتون نہیں، ایک جواں سال لڑکی بیٹھی تھی...... اور وہ کوئی اور نہیں ثروت تھی۔ وہ سو فیصد ثروت تھی۔ میری نظریں اس کے بارے میں دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ اخبار کی اوٹ میں کر رکھا تھا، ویسے بھی ثروت نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

جونہی سفید سوزوکی کار آگے نکلی، میں نے اخبار نیچے رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور پیچھے روانہ ہو گیا۔ ''اوئے میری موٹر سائیکل۔'' عمران پکارا۔

''بھاڑ میں جائے موٹر سائیکل۔'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

''کون تھی؟''

''ثروت۔'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف اور مہران کو سوئفٹ کار کے پیچھے ڈال دیا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ قریباً دس منٹ میں ہم گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ میں آ گئے۔ گاڑی ایک شاپنگ مال کے عین سامنے پارک ہوئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر عقبی دروازہ کھولا اور ثروت باہر نکل کر شاپنگ مال میں داخل ہو گئی...... وہ ہمیشہ کی طرح بالکل سادہ لباس میں تھی۔ چہرہ بھی میک اَپ سے خالی تھا لیکن اس کی اندرونی خوب صورتی اور کشش اس کے چہرے پر روشنی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ یہ میرے جانے پہچانے خدوخال تھے۔ یہ میری جانی پہچانی چال ڈھال تھی۔

''بھئی واہ! ان کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔'' عمران نے بے تکلفی سے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں یہیں بیٹھتا ہوں۔ تم جاؤ محترمہ کے پیچھے۔'' عمران نے کہا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکلا اور ثروت کے پیچھے چل دیا۔ پچھلے تین چار برسوں نے مجھے بہت بدلا تھا۔ میں اب کوئی کمزور شخص نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے عمران کے ساتھ اور پھر زرگاں میں ہونے والی مار دھاڑ نے میری پوری کیمسٹری ہی تبدیل کر دی تھی۔ پھر بھی آج یوں ثروت کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اور اب اس کے پیچھے آتے ہوئے مجھے اپنے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔

ثروت فرسٹ فلور پر پہنچی اور گارمنٹس وغیرہ دیکھنے لگی۔ اس دوران میں اس نے ایک چھوٹی سی موبائل کال بھی سنی۔ میں اس سے اپنا فاصلہ کم کرتا گیا اور بالکل قریب پہنچ گیا۔ ایک کاؤنٹر سے واپس مڑتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تو میں اس کے سامنے تھا۔ چند لمحے کے لئے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خالی پن کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر دنیا جہان کی حیرت اور سنسنی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ چند لمحے کے لئے یوں لگا جیسے وہ ایک دم اجنبیوں کی طرح گھومے گی اور دوسری طرف نکل جائے گی۔ لیکن میں اتنا پاس تھا اور وہ اس قدر وضاحت سے مجھے دیکھ چکی تھی کہ نظریں چرا لینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ چار پانچ سیکنڈ کے اندر اس کے خوبرو چہرے پر کئی رنگ آئے...... آخری رنگ آنسوؤں کا تھا۔ یہ آنسو اس کی جھیل آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

''ہیلو ثروت!'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ میری آواز میں صدیوں کا کرب سمٹ آیا تھا۔

''ہیلو۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سر جھکا لیا۔ دو چمکیلے قطرے اس کے سیاہ شولڈر بیگ پر گرے۔

''کیسی ہو ثروت؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے عجیب آواز میں کہا۔

''اپنی نظروں پر بھروسا نہیں ہو رہا...... کیا میں واقعی تمہیں دیکھ رہا ہوں؟'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بس جھکی پلکوں اور لرزاں جسم کے ساتھ کھڑی رہی۔

''ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈال کر کال منقطع کر دی۔

''ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے متوحش نظروں سے اردگرد دیکھا اور بولی۔ ''نہیں، میرے ساتھ کوئی ہے۔''

''تو پھر کب؟''

''یہ سب مشکل ہے۔'' اس کی آواز میں کرب سمٹ آیا۔

''کیا...... تم...... بات بھی نہیں کرو گی؟'' میری آواز ٹوٹنے لگی۔

وہ چند سیکنڈ تک جیسے فیصلے کی سولی پر لٹکتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔ میں آپ کو کال کر کے بتاؤں گی۔''

میں نے اسے نمبر دیا جو اس نے لرزاں انگلیوں سے اپنے موبائل میں ایڈ کر لیا......

''کیا تم اپنا نمبر نہیں دو گی؟''

''نہیں، میں خود کال کروں گی۔''

''کتنا انتظار کرنا ہو گا؟'' میری آواز بھرا گئی۔

''ایک دو دن تک۔'' اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ سینے میں دھڑکن کی گونج تھی۔ کچھ دیر کے لئے مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں ایک ٹین ایجر ہوں اور پہلی بار کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

دو تین روز انتہائی بے چینی میں گزرے۔ میری نگاہ ہر وقت اپنے سیل فون پر رہتی تھی۔ کوئی ایس ایم ایس آتا، کوئی فون کال آتی تو میں بے طرح چونک جاتا۔ پھر مایوسی ایک سرد لہر

بن کر رگ و پے میں اتر جاتی۔ بہت سے اندیشے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں وہ پھر پہلے کی طرح اچانک اوجھل تو نہیں ہو جائے گی؟ تیسرے روز مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید میں نے ثروت کی بات پر بھروسا کر کے غلطی کی ہے۔ وہ کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کرے گی...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آناً فاناً اپنے گارڈن ٹاؤن والے ٹھکانے سے بھی لاپتا ہو جائے۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ثروت کی کال آ گئی۔ یہ کسی پی سی او کا نمبر تھا۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے اس کی جاں فزا آواز سنائی دی۔ ''ہیلو تابش! میں ثروت بول رہی ہوں۔''

''بہت انتظار کروایا تم نے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ میری بات اور میرے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''رائے ونڈ روڈ پر۔''

''اقبال ٹاؤن میں سپر کافی شاپ پر آ سکتے ہیں؟''

''آ سکتا ہوں۔ کب تک پہنچوں؟''

''اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ آپ ٹھیک ڈھائی بجے پہنچ جائیں۔''

جونہی گفتگو ختم ہوئی، میں نے عمران کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پروگرام بنا کہ عمران میرے ساتھ جائے گا لیکن ثروت کے سامنے نہیں آئے گا۔ بس میرے آس پاس موجود رہے گا۔ ہم پندرہ منٹ بعد ہی روانہ ہو گئے۔ عمران موٹر سائیکل پر تھا جبکہ میں گاڑی میں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کر رہی تھیں اور اس سے کئی گنا رفتار کے ساتھ میرا دل حرکت کر رہا تھا۔ پردۂ غیب سے جو کچھ ظہور میں آنے والا تھا، وہ میرے لئے بے حد اہم تھا۔ اسی پر میری آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ جو کچھ بھی تھا، دل سے ایک گواہی بار بار آ رہی تھی۔ وہ اب بھی مجھے پیار کرتی ہے۔ جس طرح میں نے اس کی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے، اس کے دل میں بھی میری یادیں موجود ہیں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں خوب صورت کافی شاپ کے نیم گرم ہال میں موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ عمران کافی شاپ سے باہر اوپن ایئر میں ایک کونے میں بیٹھا سہ پہر کے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بے رحم ہوتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے بھی تھا لیکن آج یہ بے رحمی شدید تھی۔ ثروت نے ڈھائی بجے پہنچنے کا کہا تھا مگر وہ تین بجے پہنچ سکی۔ حسبِ سابق اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں...... بلکہ آنکھوں پر بھی براؤن شیڈ کے سن گلاسز تھے۔ وہی خوش قامتی، وہی ہلکورا لیتی ہوئی دل نواز چال، وہی ایک جاں فزا خوشبو قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی اس

نے مجھے دیکھ لیا تھا، وہ سیدھی میری میز پر چلی آئی۔ میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ وہ اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ ہم کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر ان گنت شکوے شکایتوں کا بوجھ تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا ثروت؟''

''ہوں......'' اس نے کہا پھر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے ہولے سے بولی۔ ''ہم تم کتنے بدل گئے ہیں تابش۔''

''لیکن جو کچھ دلوں میں تھا وہ تو نہیں بدلا نا۔ درمیان میں چار سال کا طویل وقفہ ہے لیکن مجھے یہی لگ رہا ہے کہ سلسلہ وہیں سے جڑا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہے۔ میں امی اور فرح کو لے کر تمہارے گھر آیا ہوں۔ تمہاری ناراضی دور کرنے کے لئے۔ تمہاری ڈھارس بندھانے کے لئے...... تمہاری بنی ہوئی چائے پینے کے لئے اور تم سے بہت سی باتیں کرنے کے لئے...... ہاں، لگتا ہے کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ تم مجھے اچانک چھوڑ کر گئی ہو، نہ امی ہم سے جدا ہوئی ہیں، نہ ہم سب تتر بتر ہوئے ہیں...... وہ بے رحم چار سال بھی ابھی ہمارے درمیان نہیں آئے جنہوں نے مجھے بار بار مارا اور زندہ کیا۔''

وہ پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد دل گرفتہ آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں رہے اتنا عرصہ؟''

''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں لیکن پہلے تم نے پوچھا ہے اس لئے بتا دیتا ہوں۔ تفصیلی جواب تو بہت لمبا ہے ثروت...... اور شاید ابھی تمہارے پاس اتنا وقت نہ ہو...... مختصر یہ ہے کہ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ ایک ایسی جگہ تھا جہاں مجھے میری خبر بھی نہیں ملتی تھی۔ اترپردیش کے دوردراز علاقے میں ایک خودمختار اسٹیٹ تھی۔ دنیا سے بالکل کٹی ہوئی جگہ تھی...... اب ان سارے حالات کے بارے میں سوچتا ہوں تو جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا ہے لیکن...... لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ ہم تمہارے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ تم اور نصرت، ناصر بھائی کے ساتھ پاکستان سے ہی چلے گئے ہو۔ میں حسرت سے تمہارے گھر کے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا ثروت اور پھر آنے والے دنوں میں، میں نے اس بند دروازے کو اتنی بار دیکھا...... اتنی بار دیکھا کہ وہ سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا ثروت کہ میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں، وہ بند دروازہ ہی نظر آتا ہے......'' میرا اگلا

رندھ گیا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا تابش! ہر طرف سے انگلیاں اٹھائی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کو لگتا تھا کہ ناصر بھائی کو کچھ ہو جائے گا، ہم انہیں بھی کھو دیں گی...... اور ویسے بھی ناصر بھائی نے ہمیں کچھ بتایا نہیں۔ انہوں نے ساری تیاری خاموشی سے کی تھی۔ انہوں نے آخر میں مجھے قسم دے دی کہ میں آپ کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی اور میں سمجھتی ہوں تابش ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''ثروت! کیا یہاں سے جانے کے بعد بھی تمہارے دل میں نہیں آیا کہ ایک بار مجھ سے رابطہ کرلو؟ صرف ایک بار مجھے حالات کو سنبھالنے کا موقع دے دو؟ پھانسی پانے والے مجرم کو بھی پھانسی سے پہلے پانی پلا دیتے ہیں، تم نے تو مجھے اپنی شکل تک نہ دکھائی۔ آواز تک نہ سنائی......''

''آپ میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے تھے تابش! کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا...... اپنی اس بے بسی نے مجھے بہت رُلایا۔ پر میں کچھ کر نہ سکی......'' وہ بول رہی تھی اور اپنے دودھیا ہاتھوں کی حنائی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ہاتھوں سے پیچھے اس کی کلائیوں میں کانچ کی خوش رنگ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں کی مدھم کھنک مجھے کچھ بھولے بسرے نغمے یاد دلا رہی تھی۔ وہ نغمے جو کبھی ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے تھے۔ جن کے بولوں میں ملن کی گھڑیوں کی چاپ تھی۔ انتظار کی میٹھی میٹھی کسک تھی...... اور ساتھ ساتھ شہنائیوں کی گونج بھی سنائی دیا کرتی تھی۔ میں نے پلکیں اٹھا کر ثروت کی طرف دیکھا۔ اس میں بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ وہی سادگی، وہی ملاحت، آئینے جیسی وہی شفاف رنگت، جھیل آنکھوں پر گری ہوئی وہی لمبی پلکیں...... ثروت کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اسکرین کو دیکھنے کے بعد کال ریسیو کی۔ ''جی...... جی...... نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... غلط کہتا ہے وہ۔ صدقے کے لئے کالا رنگ ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔''

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور پلکیں جھکا لیں۔ ''میرے شوہر۔''

یہ دو الفاظ، دو ساعت شکن دھاکوں کی طرح تھے۔ مجھے لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر شے تھم کر سکتے میں چلی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی۔ ایک یخ بستہ لہر سی کانوں کے راستے میرے جسم میں اتری اور مجھے سرتاپا برفاب کر گئی۔ میں بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ پلکیں جھکائے بیٹھی تھی۔

یہی وہ الفاظ تھے جو میں ثروت کے منہ سے سننا نہیں چاہتا تھا اور یہی وہ ''جواب'' تھا جس کا سوال پچھلے آدھ گھنٹے سے میری زبان پر تو تھا مگر ہونٹوں سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس سوال کی غیر معمولی سنگینی اسے میرے ہونٹوں تک آنے سے روک رہی تھی۔ بس یہ ڈر تھا کہ پتا نہیں اس سوال کا کیا جواب مل جائے گا۔ اور اب...... یہ جواب بغیر میرے پوچھے ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ اور یہ ایسا جواب تھا جس نے چند لمحوں میں میرے سینے کے اندر ایک وسیع و عریض قبرستان آباد کر دیا۔ ہر قبر آرزوؤں اور امیدوں کا مدفن تھی۔

''مبارک ہو۔'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اور آپ؟'' اس نے نم ناک پلکیں اٹھائیں۔

میں نے گہری سانس لے کر بمشکل کہا۔ ''ثروت! شادی کا مطلب خوشی ہوتا ہے اور جہاں تک خوشی کی بات ہے، میں اس سے بہت دور ہوں۔''

اس کے موبائل سیٹ پر میسج ٹون ہوئی۔ اس نے اداسی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے جانا چاہئے......''

''ہاں، اب چلنا چاہئے۔'' میری آواز انجانے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیجئے گا۔'' وہ عجیب سی آواز میں بولی۔

''ثروت! یہ نہیں پوچھو گی، میں اب تک کیسے جیا اور کہاں رہا؟''

اس کی جھیل آنکھوں پر ایک بار پھر گھنیری پلکوں کا سایہ ہو گیا۔ وہ ہولے سے بولی۔

''جہاں بہت کچھ ''اَن کہا'' رہ گیا ہے، اس کو بھی رہنے دیں۔ میں جانتی ہوں، میں نے آپ کو ایک ایسا دکھ دیا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ اسی لئے تو آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ سے ایک التجا بھی ہے تابش! آپ نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ امید ہے اب بھی نہیں کریں گے۔''

''کہو۔'' میں بمشکل بول پایا۔

''ہم دوبارہ نہیں ملیں گے تابش! اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

''کچھ اور؟'' میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''بس۔''

''اس سے تو بہتر تھا کہ شاپنگ مال میں تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی۔ اور اگر ہوئی تھی تو تم وہیں میرے لئے اجنبی بن جاتیں۔ اس طرح زخموں سے خون تو نہ رستا۔'' میرے لہجے کی

شکستگی ناقابلِ بیان تھی۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔ لب تھرا کر رہ گئے۔ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''اسی لئے تو اس ملاقات کو آخری ملاقات بنانا چاہتی ہوں۔ ہم دوبارہ بھی ملیں گے تو اسی طرح زخموں سے خون رِسے گا۔''

ہم کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے...... جیسے قبرستان میں آمنے سامنے دو قبریں جن کے کتبوں پر اجل کی بے رحمی سے متعلق شعر لکھے ہوں۔ آخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ثروت! جیسے تمہاری مرضی۔ جہاں اتنی خواہشیں مری ہیں، شاید میری یہ خواہش بھی آہستہ آہستہ مر جائے گی کہ تمہارے بارے کچھ جان سکتا۔ اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے لینا۔ تمہارے لئے میرے رابطے کا نمبر ہمیشہ وہی رہے گا جو میں نے اس دن تمہیں دیا تھا۔''

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ جب جدائیاں طے ہو چکی ہوں تو یہ نمبر اور یہ پتے تعلق کا ذریعہ نہیں بن سکتے......

ہم کچھ دیر بالکل خاموش بیٹے رہے جیسے کسی جانکاہ موت پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

''مجھے اجازت ہے؟'' آخر اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہاں کہوں۔''

میرے ہاتھ دو بے جان پرندوں کی طرح میرے سامنے میز پر رکھے تھے۔ چند لمحے کے لئے لگا کہ وہ الوداعی انداز میں میرے ہاتھوں کو چھونا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے اپنی انگلیوں کو میری طرف بڑھانے کے بجائے اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھا دیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ ''خدا حافظ۔'' اس نے کہا۔

''خدا حافظ۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے لگا کہ کافی شاپ میں موجود ہر شے سے خون رِس رہا ہے...... تازہ سرخ خون۔ یہ خون دیواروں سے بہہ رہا ہے اور چھت سے ٹپک رہا ہے۔ اس خون کے اندر چلتے چلتے ثروت میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں آخر تک دیکھتا رہا، اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایسے جانے والے مڑ کر نہیں دیکھتے...... ہاں، وہ کہیں آگے جا کر بہت روتے ہیں۔ یہ رونے والی شام تھی...... ٹوٹ کر رونے والی۔

مجھے بھی تنہائی چاہئے تھی۔

میں کافی شاپ سے باہر آیا۔ تب تک ثروت جا چکی تھی۔ میرے اور عمران کے درمیان

کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم خاموشی سے کار میں بیٹھے اور واپس روانہ ہو گئے۔ کار عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ ''شادی ہو چکی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے بھی مختصر جواب دیا۔

''ناصر اور نصرت ساتھ ہی رہتے ہیں۔''

''پتا نہیں۔''

''دوبارہ ملے گی؟''

''نہیں۔''

گاڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ عمران جانتا تھا کہ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ زیادہ مخل نہیں ہوا۔ میری عجیب سی کیفیت تھی۔ کوئی بھاری بوجھ دل کو پیس رہا تھا۔ عاطف نے مجھ سے بات کرنا چاہی لیکن میں اسے نظرانداز کرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دروازے بند کر لئے اور تاریک کمرے میں گم صم لیٹ گیا۔ آنسو اپنے آپ ہی چہرے کو بھگونے لگے ایک خاموش بارش کی طرح جو تواتر سے برستی ہے اور سب کچھ بھگوتی چلی جاتی ہے۔ کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی دوبارہ ختم ہو گئی تھی یہ کہانی۔ شاید ایسے ہی ہونا تھا۔ شاید یہی لکھا ہوا تھا۔ آس کا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو رہتی ہی انہونیوں کی تلاش میں ہے...... اور انہونیاں تو بس کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں۔ معجزے عام ہو جائیں تو پھر وہ معجزے نہ رہیں۔ چار سال کا عرصہ کوئی کم تو نہیں ہوتا۔ میں چار سال اس سے دور رہا تھا...... اسے میرا پتا تھا، نہ مجھے اس کا۔ پھر بھی میں نے یہ آس پالی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی ہو گی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ جب میں اسے ڈھونڈوں گا تو وہ مل جائے گی اور یوں ملے گی کہ میرے جسم اور روح کا حصہ بن جائے گی......

ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایسا نہیں ہونا تھا۔

......لیکن یادوں کے کانٹے...... ہاں، یادوں کے کانٹے تو شاید اس کے دل میں بھی تھے۔ انارکلی کیفے کے ویٹر مقبول نے مجھے بتایا تھا۔ وہ کیفے میں آتی تھی۔ اس میز پر بیٹھتی تھی جہاں کبھی ہماری سرگوشیاں گونجا کرتی تھیں۔ شاید وہ ان سب جگہوں پر گئی ہو جہاں جہاں ہم ملتے تھے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دل سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں کیا ہے، کوئی نہیں جان سکتا۔

رات ایک بجے کے قریب عمران نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کیا ہے عمران؟'' میں نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

''کھانا نہیں کھاؤ گے یار؟''

''نہیں، بالکل بھوک نہیں۔''

''اچھا باہر تو آجاؤ۔ سب پریشان ہو رہے ہیں۔''

''سر میں درد ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں یار۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ میرا رمز شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں ابھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔ وہ چلا گیا۔

دکھ ایک مہیب طوفان کی طرح تھا جو مجھے اٹھا اٹھا کر پٹختا رہا۔ روندتا اور مسلتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ رات کیسے گزری۔

اگلے روز میں نے ناشتے کے نام پر چند لقمے لئے اور خاموشی سے موٹر سائیکل پکڑ کر نکل گیا۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ بہ زبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں کرب کے شدید ریلے سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ فرح اور عاطف مجھ سے اَن گنت سوال کریں گے۔ میرا دکھ ان کے دل و دماغ تک میں بھی سرایت کر جائے گا۔ عمران اس وقت سویا پڑا تھا۔ میں نے وہی موٹر سائیکل لی جو اس کے زیرِ استعمال تھی۔ سیاہ ونڈ اسکرین والا ہیلمٹ اپنی شناخت چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ سے باہر نکلتے ہوئے ہمیں بے حد محتاط رہنا پڑتا تھا۔ میری نگاہیں گاہے بگاہے عقب نما آئینے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جونہی میں گلشن اقبال کی طرف مڑا، چونک گیا۔ عقب میں ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ ایک دم ذہن میں وہ سنگین واقعہ گھوم گیا جب سیٹھ سراج کے ہرکارے چھیدے نے ہمیں فائرنگ کا نشانہ بنایا تھا اور پھر خود ایک اچانک موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میں گلشن اقبال جانے کے بجائے سیدھا نکل گیا۔ ایک دو سڑکوں پر موڑ کاٹے۔ نیلے رنگ کی موٹر سائیکل بدستور پیچھے تھی اور اب کافی نزدیک آ گئی تھی۔ دفعتاً میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہو گئی۔ موٹر پر عمران تھا۔ میں نے اسے لباس سے پہچانا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا اور ہیلمٹ اتار کر بولا۔ ''موٹر سائیکل چرانا جرم ہے۔ اس پر سزا ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے نیوز چینل کے نمائندے کی موٹر سائیکل چرا کر کوئی کیسے خیر منا سکتا ہے۔ اس کی تو اگلی پچھلی موٹر سائیکلیں نکل آتی ہیں۔ وہ ایسی موٹر سائیکلیں بھی برآمد کرا دیتا ہے جو اس نے ابھی چرائی بھی نہیں ہوتیں۔''

میں نے کوئی جواب دیا اور نہ ردِعمل ظاہر کیا۔ میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے تم گلشن اقبال میں بیٹھنا چاہ رہے تھے۔'' اس نے کہا۔

''بیٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اکیلا۔''

''چلو تھوڑی دیر اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اکیلے بیٹھ جانا۔''

میں جانتا تھا کہ اس کو قائل کرنا ناممکن ہے۔ میں نے خاموشی سے موٹر سائیکل موڑی اور گلشن اقبال کی پارکنگ میں روک دی۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ سبزہ زاروں اور کوتاہ قامت درختوں پر خوش گوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی سی تمازت کو ہوا کی مدھم حرکت زائل کر رہی تھی۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ ہم مصنوعی جھیل کے کنارے ایک چوبی بینچ پر بیٹھ گئے۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر دھواں فضا میں چھوڑا اور گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''تابش! میں تمہارے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ لیکن سب کچھ پا لینے کا نام ہی تو محبت نہیں ہے۔ محبت تو کسی سے دور رہ کر بھی کی جا سکتی ہے اور ساری عمر کی جا سکتی ہے۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''وہ بے شک کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن وہ تمہارے دل میں زندہ رہے گی۔ تم اس کو سوچو گے اور اس کا تصور بہت سے روپ بدل کر تمہارے سامنے آئے گا۔ اس کی یادیں سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پچھتاوا یہی ہے عمران کہ میں جلدی نہ لوٹ سکا۔ پتا نہیں وہ کب تک میرا انتظار کرتی رہی۔ کیسی کیسی آسیں دل میں پالتی رہی......''

''لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تابی! ہم گئے وقت کو آواز تو نہیں دے سکتے نا۔ وہ کیا ایک بھلا سا شعر ہے۔ ہر سوالی پر یہ دروازہ سدا رہتا ہے بند...... کب کسی کو گمشدہ لمحوں کی سوغاتیں ملیں...... اب تو بس دل پر پتھر رکھنا ہے تابی...... اپنی آگ میں جلنا جھلسنا ہے...... کڑھنا ہے...... زندگی کے دن گزارنے ہیں۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔ آنسو اس کی ٹھوڑی تک بہہ آئے۔ ''بس تابی! عشق نام ہی جلنے کڑھنے اور کوئلہ ہونے کا ہے۔ اپنی ہی تپش سے پک پک کر مرونڈا ہو جانا...... مرونڈا سمجھتے ہو نا تم؟''

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے روتے روتے ناک سے ''سووں' کی زوردار آواز نکالی اور ناک کا رقیق مادہ چٹکی میں پکڑ کر میرے کُرتے کے دامن صاف کر دیا۔

''کیا کرتے ہو؟'' میں نے سخت ناگواری سے کہا۔

''اوہ سوری...... سوری۔'' اس نے میرا کرتہ پکڑ کر کھینچا اور پھر کھینچتا چلا گیا جیسے اسے جھیل کے پانی میں دھونا چاہتا ہو۔ میں نے رکنے کی بہت کوشش کی لیکن رک نہیں سکا۔ ہم دونوں دھڑام سے جھیل کے ٹھنڈے پانی میں گرے۔ ''عمران'' میں چلایا۔ بھنا کر میں نے

اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

اس نے جواباً میری گردن پر جھانپڑ امارا اور میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔ ''اوئے کھوتے کے پتر! میرے ہوتے ہوئے بھلا تو بن سکتا ہے دیوداس۔ تیری تو ایسی کم تیسی۔'' اس نے میری گردن دبوچی۔

میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا اور خود کو چھڑانا چاہا۔ اس نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے پھر پانی میں گرا دیا۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ''اتنی جلدی پیچھا نہیں چھڑانے دوں گا اسے تجھ سے۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا یہ ہو سکتا ہے۔ پوری تحقیقات اور پوری تفتیش ہو گی۔ پورے حالات معلوم کرنے ہوں گے اس کے۔ اور اگر تُو نے بھی کوئی دلیپ کماری دکھائی نا تو دونوں کانوں میں سر کر دوں گا تیرا۔ ایسا مکا ماروں گا کہ چباڑا کڑک ہو جائے گا۔''

''عمران! تُو ہوش میں تو ہے؟'' میں دہاڑا۔

''ہوش میں ہوں اور تمہیں بھی ہوش میں لانا چاہتا ہوں۔ پانی سے نکل۔ میں تجھ بتاتا ہوں۔ کچھ معلوم ہوا ہے مجھے۔'' اس کی آواز میں چمک سی تھی۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے کوئی خاص اطلاع دینا چاہتا ہے۔ ہم باہر نکل آئے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ گارڈز بھی سیٹیاں بجاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ سخت نالاں تھے کہ ہم نے قواعد کو توڑتے ہوئے جھیل میں چھلانگ لگائی ہے اور اودھم مچایا ہے۔ عمران نے انہیں کسی نہ کسی طرح رام کر لیا اور مجھے لے کر بڑی جھیل کی جنوبی جانب ایک خاموش اور تنہا گوشے میں آن بیٹھا۔ ہمارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ عمران نے اپنے سویٹر اور قمیص وغیرہ اتار کر نچوڑے اور سنہری دھوپ میں اپنے کسرتی جسم کے مسلز دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک جگہ دو ناکام عاشق بھی نہیں رہ سکتے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میں ابھی تک اس کی بے ہودہ حرکت کی وجہ سے اَپ سیٹ تھا۔

''یار! اس چھوٹے سے شہر لاہور میں کیا میں ایک ناکام عاشق کافی نہیں ہوں جو تم بھی پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نامعقول حرکت نہیں کرنے دوں گا۔ آخر دم تک کوشش کروں گا کہ تمہارا نام رانجھا، مہینوال، پنوں اور عمران وغیرہ کی فہرست میں نہ آ سکے۔ اور اگر تم نے اس کوشش میں میرا ساتھ نہ دیا تو تمہارا حشر نشر کر ڈالوں گا۔''

''عمران! میں سچ کہتا ہوں۔ تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم...... تم ثروت کے بارے میں کیا

بات کر رہے تھے؟''

اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پیکٹ، لائٹر وغیرہ سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کل جب تم کمرے میں گھس کر بیٹھ گئے تھے تو میں بھی کمبل اوڑھ کر سو گیا تھا؟ نہیں جگر! جب تیرے دل پر چوٹ پڑتی ہے تو ساتھ ہی میرے دل پر بھی پڑتی ہے۔ میرا وشواس کرو۔ یہ ہو ہی ناہیں سکت ہے کہ تم تڑپ رہے ہو اور میں شانتی سے سوتا رہوں۔ اگر تم ایسا سوچت ہو تو یہ میرے لئے بڑی نراشا کی بات ہووے گی۔'' اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کی۔

''تم نے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کچھ چھان بین کرائی ہے اور مجھے ایک دو باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں۔''

''کچھ بکو بھی۔''

''ان خاص باتوں سے پہلے یہ جان لو کہ ثروت کا شوہر وہی یوسف ہے جس سے جرمنی میں اس کی منگنی ہوئی تھی اور جس کے بارے میں ہم پہلے بھی جانتے ہیں۔ جو دو خاص باتیں پتا چلی ہیں، ان میں پہلی تو یہ ہے کہ ثروت اور یوسف کے درمیان کوئی خاص قسم کی ناچاقی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے ثروت، شوہر کا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی...... اور دوسری بات یہ ہے کہ یوسف کے گھر میں انیس بیس برس کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے جس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ یوسف کی دوسری بیوی ہے۔''

''عمران! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟'' میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ایک سو دس فیصد سنجیدہ ہوں۔''

''یہ باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جیلانی کے ذریعے۔ میں نے اسے اس کام پر لگایا تھا۔ اور تمہیں پتا ہی ہے، وہ ہرفن مولا بندہ ہے۔ اس نے بس دو تین گھنٹے کے اندر ایک ایسی عورت کا کھوج لگا لیا جو یوسف کے گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل تک وہ اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرے گی۔''

''تم ثروت اور اس کے شوہر کے درمیان کس طرح کی ناچاقی کی بات کر رہے ہو؟''

''ابھی وضاحت سے تو پتا نہیں چلا لیکن امید ہے کہ ایک دو دن میں چل جائے گا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا

عمران! ہر کسی کے گھریلو معاملات ہوتے ہیں۔ اب ثروت کی زندگی میں دخل دینا......"

"واہ...... واہ کیا بات کی ہے تم نے۔" عمران نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ ڈائیلاگ بہت سی فلموں میں بولا گیا ہے۔ چار پانچ فلموں میں تو دلیپ کمار صاحب نے ہی اس طرح کا ڈائیلاگ بولا ہے...... نہیں، اب رادھا کا جیون اس کے پتی کے ساتھ ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا بھی پاپ ہے۔ میں اب اس کے جیون پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا...... دور چلا جاؤں گا...... بہت دور...... بہت دور...... ٹن ٹنانن...... اور اس کے ساتھ ہی انٹرویل ہو جاتا تھا۔ بہرحال، دلیپ صاحب بہت دور نہیں جاتے تھے کیونکہ پرانی فلموں میں "بہت دور" جانے سے مطلب [illegible] ہوتا تھا۔"

"عمران! تمہاری [illegible] ہے۔ آخر تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟"

"کچھ ثابت کرنا نہیں چاہ رہا۔ بس اتنی سی درخواست ہے کہ مجھے رادھا کے بارے میں...... مم، میرا مطلب ثروت کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل ہونی چاہئیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو...... یا کوئی مشورہ درکار ہو۔ جیسا کہ اندازہ ہو رہا ہے، اس کے بھائی ناصر صاحب اس کے ساتھ نہیں ہیں...... بس دونوں بہنیں ہیں یہاں۔ نصرت بھی پریشان ہے۔ احمد تھانوی سے اس کی جو ملاقات ہوئی تھی، اس کے بارے میں پتا ہے تمہیں؟"

"تم نے ہی بتایا تھا کہ نصرت نے پیر صاحب سے اپنی گھریلو پریشانیوں کا ذکر کیا تھا اور دعا وغیرہ کے لئے کہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لئے کسی اچھے رشتے کی خواہش رکھتی ہے۔"

"ہاں...... لیکن کل احمد تھانوی صاحب نے کچھ اور بھی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس کی اہم پریشانی اس کی بڑی بہن کی وجہ سے ہے۔ اس کی شوہر کے ساتھ ناچاقی ہے۔ اسی وجہ سے وہ نو دس ماہ پہلے جرمنی سے اکیلی ہی پاکستان آگئی تھی۔ بعد میں اس کا شوہر یوسف پاکستان آگیا۔ اب دونوں میاں بیوی میں کچھ سلوک ہے مگر حالات ابھی بھی ٹھیک نہیں ہیں......"

"نصرت نے یوسف کی دوسری شادی کا کوئی ذکر بھی کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس بارے میں نصرت نے تو کچھ نہیں بتایا لیکن کل حمیدن نے یہ کہا ہے کہ گھر میں انیس بیس سال کی ایک انگریز لڑکی ہے جو یوسف صاحب کی بیوی ہی ہے۔ حمیدن اس

نوکرانی کا نام ہے۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آج شام حمیدن سے ملنے کا پروگرام ہے۔ جیلانی اسے چھ بجے کے قریب گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں لے کر آئے گا۔ ہم وہاں اس سے تفصیلی بات کرسکیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا عمران؟"

"ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی کوئی مدد کرسکیں۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے یار...... تمہاری اپنی ہے۔ ٹھیک ہے، اس کی شادی اور جگہ ہوگئی ہے لیکن باقی سارے رشتے اسی ایک رشتے کی وجہ سے ختم تو نہیں ہوسکتے۔ یہ ایک خاصا سنجیدہ معاملہ ہے یار! دیکھو کہ وہ جرمنی سے تن تنہا پاکستان چلی آئی۔ یہاں پہلے کسی سہیلی کے گھر ٹھہری...... پھر فائزہ کے پاس رہی اور اسی کے ساتھ دو تین مہینے سروس بھی کی۔ اب اس کا شوہر پھر اسے اپنے پاس لے گیا ہے...... اب یہ اندازہ بھی ہو رہا ہے کہ کوئی ٹین ایجر جرمن لڑکی اس کی دوسری بیوی ہے۔"

ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اپنے کپڑے سکھاتے رہے۔ میں تو اتفاقاً اپنا موبائل لے کر ہی نہیں آیا تھا۔ عمران کا موبائل بھیگ گیا تھا۔ اس نے دھوپ میں رکھا ہوا تھا اور گاہے بگاہے موبائل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا تھا کہ وہ اسے داغ جدائی دینے کی کوشش نہ کرے۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ عمران نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔

"پیر احمد تھانوی صاحب واقعی پہنچے ہوئے ہیں۔ دیکھو، اس بھیگے ہوئے سیٹ پر بھی ان کی کال آگئی۔ اب یہ بچ جائے گا۔"

اس نے کال اٹینڈ کی اور اسپیکر بھی آن کر دیا۔ تھانوی صاحب کی آواز آئی۔ "ہیلو، کیسے ہو عمران؟"

"آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکی نصرت یہاں پھر آئی تھی۔ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی کہ اچانک اسے واپس جانا پڑ گیا۔"

"وہ کیوں حضرت؟" عمران نے پوچھا۔

"فرید بتا رہا تھا کہ موبائل پر کوئی کال سنی تھی اس نے۔ پریشان ہوگئی اور ٹوکن واپس کر کے جلدی سے نکل گئی۔"

"کیا معاملہ ہوسکتا ہے جی؟" عمران نے پوچھا۔

"پتا نہیں لیکن یہ لڑکی کافی پریشان لگتی ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی ایسا رشتے دار مرد بھی اس

کے آس پاس نہیں جو اس کی مدد کر سکے۔ اگر تم لوگ کچھ کر سکتے ہو اور مناسب طریقے سے کر سکتے ہو تو اس کے لئے کرو۔"

"بالکل ٹھیک ہے حضرت۔ ہم ابھی اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ تھوڑی سی پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ میں حاضر ہوں گا تو بتاؤں گا۔"

احمد تھانوی صاحب نے کہا۔"اس روز ہم نے جو کوشش کی، وہ کافی کامیاب رہی ہے۔ نیازے کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔ کل رات بھی بارش ہوئی ہے لیکن اس میں پہلے کی طرح جو شدید بے چینی پیدا ہوتی تھی، وہ نہیں ہوئی۔ وہ تم سے دوبارہ ملنا بھی چاہ رہا ہے۔"

"آپ جب کہیں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا اور اگر اس کا وہم توڑنے کے لئے پھر بارش میں بھیگنا ضروری ہے تو میں اس کے لئے بھی حاضر ہوں۔"

احمد تھانوی صاحب کے ساتھ عمران کی گفتگو دو تین منٹ مزید جاری رہی۔ فون بند کر کے اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔"کیا خیال ہے تمہارا؟ کیا نصرت کسی گھریلو مسئلے کی وجہ سے آناً فاناً واپس گئی ہوگی؟"

میں نے کہا۔"اگر ملازمہ حمیدن سے تمہاری ملاقات کنفرم ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ بتا دے۔"

عمران نے اثبات میں سر ہلایا......

حمیدن سے ہماری ملاقات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوئی۔ گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں شام سے تھوڑی دیر پہلے حمیدن اپنی آٹھ نو سالہ بیٹی کے ساتھ آ گئی۔ بیٹی بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے لگی۔ حمیدن ہمارے پاس آ بیٹھی۔ حمیدن کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ جسم فربہ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ جیلانی بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ جیلانی نے بتایا تھا کہ حمیدن کو شیشے میں اتارنے کے لئے اسے صرف تین ہزار روپے خرچ کرنے پڑے ہیں۔ ان تین ہزار کے عوض وہ یوسف کے گھر کی ہر"معلوم بات" بتانے کو تیار ہوگئی ہے۔

حمیدن نے کہا۔"یہ ثروت بی بی یوسف صاحب کی پہلی بیوی ہیں جی۔ ہم ان کو بڑی بی بی جی کہتے ہیں۔ گھر کے سارے ملازم بڑی بی بی کی عزت کرتے ہیں۔ چھوٹی بی بی اور طرح کی ہے۔ ایک تو اس کو اپنی بولی نہیں آتی، دوسرے وہ کبھی کبھی بہت غصہ بھی کرتی ہے۔"

"تم کب سے ملازم ہو اس گھر میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی چار مہینے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ باہر کے ملک سے آئے ہیں۔ ابھی کرائے کی کوٹھی میں رہ رہے ہیں لیکن ان کا اپنا بڑا شاندار مکان بھی بن رہا ہے جوہر ٹاؤن میں۔"

"یوسف صاحب کیسے بندے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم سے تو ٹھیک ہیں جی۔ بخششیں وغیرہ بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی بڑی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ سنا ہے، کافی زیادہ تنخواہ ہے ان کی۔ شاید دس پندرہ لاکھ روپے۔"

"بڑی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟"

"بس ٹھیک ہے جی...... جو چیز لاتے ہیں، دونوں بیبیوں کے لئے لاتے ہیں۔ دونوں کو ٹائم دیتے ہیں مگر پھر بھی قدرتی بات ہے، چھوٹی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک زیادہ ہے۔ وہ بھی ہر وقت ان کے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔"

"گھر میں اور کون کون ہے؟"

"بس جی، ہم تین چار نوکر ہیں۔ ایک بڑی بی بی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی ہے۔ ہاں، دو ڈھائی مہینے پہلے یوسف صاحب کے ابا جی"بڑے صاحب" بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ کافی پیسے والے ہیں۔ باہر کے ملک میں ان کی پراپرٹی شراپرٹی بھی ہے۔ جب تک وہ یہاں رہے، بڑی بی بی ثروت کے ساتھ یوسف صاحب کا سلوک بڑا اچھا رہا۔ وہ ایک دوسرے سے ہنستے بولتے تھے۔ یوسف صاحب بڑی بی بی کو لے کر شاپنگ شوپنگ کرنے بھی جاتے تھے۔ لگتا تھا کہ یوسف صاحب اپنے ابا جی سے ڈرتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔"تم بتا رہی ہو کہ ابا جی کے ہوتے ہوئے یوسف صاحب کا سلوک بڑی بی بی سے اچھا رہا ہے۔ یعنی اب اس کا سلوک اچھا نہیں ہے؟"

وہ ذرا توقف کر کے بولی۔"آہو جی۔ بڑے صاحب کے جانے کے بعد ان دونوں میں پھر زیادہ صلح صفائی نہیں رہی ہے۔ کبھی کبھی جھگڑا شگڑا بھی ہو جاتا ہے دونوں میں۔ بلکہ...... آج دوپہر کو بھی ہوا ہے۔"

میں چونک گیا۔ احمد تھانوی صاحب نے بتایا تھا کہ آج نصرت کو دوپہر کے وقت کوئی فون کال آئی تھی جس کے بعد وہ فوراً واپس چلی گئی تھی۔ کہیں یہ اسی جھگڑے کا شاخسانہ تو نہیں تھا۔

"آج کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ خرابی تو یوسف صاحب کی طرف سے ہی ہوتی ہے جی۔ بڑی بی بی تو کچھ بولتی ہی نہیں ہیں لیکن کبھی ان کو بھی تھوڑا بہت غصہ آ جاتا ہے۔ آج دوپہر کو چھوٹی بی بی نے کوئی

واہیات سی فلم ٹی وی پر لگائی ہوئی تھی۔ آواز بھی بڑی اونچی کر رکھی تھی۔ بڑی بی بی نے کہا، میں نے نماز پڑھنی ہے، آواز ذرا کم کر دو۔ اس بات پر چھوٹی بی بی جھگڑا کرنے لگی۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی چھت سے اتر کر آ گئے۔ انہوں نے بھی بڑی بی بی کو ہی جھڑکا اور کہا کہ وہ برداشت کرنا سیکھے، وہ اپنا دل تنگ سے تنگ کرتی جا رہی ہے۔ بڑی بی بی رونے لگیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک چھوٹا اٹیچی کیس لیا اور کہیں جانے کے لئے نکل پڑیں۔ یوسف صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے بی بی کو گیٹ پر روک لیا۔ وہاں پھر جھگڑا ہوا۔ بی بی جانا چاہتی تھی اور یوسف صاحب انہیں روک رہے تھے۔ وہ بی بی کو کھینچ کر اندر لے گئے۔ بی بی کمرا بند کر کے روتی رہیں۔ نصرت بی بی بھی گھر میں نہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد آئیں اور انہوں نے بڑی بہن کو سنبھالا۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ان میں جھگڑا ہوتا ہے اور پھر جلدی سے ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یوسف صاحب نے بی بی ثروت کو منا لیا ہے۔ آج سویرے وہ بی بی ثروت کے کمرے میں ہی ناشتا کر رہے تھے اور باتیں شاتیں بھی ہو رہی تھیں۔''

جیلانی نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے حمیدن...... کہیں اپنے باپ کے ڈر کی وجہ سے تو یوسف، بی بی ثروت کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں ہے؟''

''آپ کی بات ٹھیک بھی ہو سکتی ہے جی۔'' حمیدن نے سر ہلایا۔

''بی بی ثروت سے یوسف صاحب کے ابا جی کا رویہ کیسا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''بہت چنگا جی...... بہت ہی چنگا۔ وہ انہیں بہو نہیں، بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ انگریز بی بی سے ان کو کچھ زیادہ پیار نہیں ہے۔ اس سے بس ضرورت کی بات ہی کرتے ہیں۔''

صورتِ حال کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف نے ثروت سے شادی اپنے ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے کی جبکہ جرمن لڑکی سے اس کا کوئی معاشقہ وغیرہ تھا۔ حمیدن کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یوسف کا والد امیر کبیر اور صاحبِ جائیداد ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ جائیداد سے محروم ہونے کے ڈر سے یوسف، ثروت کو خود سے دور کرنا نہ چاہتا ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا تھا، اگر ایسی بات تھی تو پھر اس نے جرمن لڑکی سے شادی کیوں کی؟ اور اگر کی تھی تو پھر اسے منظرِ عام پر کیوں لایا؟ یا پھر ممکن تھا کہ یہ شادی خفیہ ہو اور خفیہ رہ نہ سکی ہو...... یا جرمن بیوی نے ہی اسے مجبور کر دیا ہو کہ وہ اس شادی کا اعلان کرے......

جیلانی نے حمیدن سے پوچھا۔ ''یوسف کی جرمن بیوی خوبصورت ہے؟''

''ہاں جی، خوب صورت تو ہے۔ نیلی آنکھیں، گولڈن بال۔ لگتا ہے کہ شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ پر خوش شکل ہونا اور بات ہوتی ہے جی اور سوہنا ہونا اور بات۔ چھوٹی بی بی خوش شکل ہے، پر بڑی بی بی سوہنی ہے۔ اوپر سے بھی اور اندر سے بھی۔ ہمیں تو بڑی بی بی ہی چنگی لگتی ہے جی۔''

عمران نے جیلانی کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو بھئی! حمیدن نے شیکسپیئر اور شیلے کے پائے کی بات کی ہے۔ خوش شکل ہونا اور بات ہے، سوہنا ہونا اور بات۔''

جیلانی نے کہا۔ ''حمیدن! تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے، یہ دو شادیاں کیسے اور کیوں ہوئیں؟''

وہ بولی۔ ''میں تو جی موٹی عقل کی غریب نوکرانی ہوں۔ سارا دن کھوتے کی طرح کام کرنے والی پھر بھی مہینے کے آخر میں رونے والی۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑے لوگ ہی جانیں۔ پر میرا اندازہ ہے کہ بی بی ثروت بزرگوں کی مرضی سے آئی ہے اور چھوٹی بی بی کے ساتھ یوسف صاحب کا کوئی چکر شکر تھا۔ میرا مطلب ہے، کوئی پہلے کا معاملہ۔ سنا ہے کہ وہ اس دفتر میں کام کرتی تھی جہاں یوسف صاحب کام کرتے تھے۔ دونوں کی عمروں میں کافی فرق بھی لگتا ہے جی۔ پر جب مت ماری جائے تو ایسے فرق کون دیکھتا ہے۔''

حمیدن کے ساتھ ہماری گفتگو کوئی ایک گھنٹا رہی۔ یہاں تک کہ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور وہ واپسی کے لئے بے چین نظر آنے لگی۔

جیلانی...... حمیدن کی مٹھی کو تھوڑا سا مزید گرم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک دو دن میں کچھ مزید کارآمد باتیں بتائے گی۔

○......❖......○

اس رات میں دیر تک اکیلا ہی چھت پر ٹہلتا رہا۔ موسم صاف تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ بالو گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا میرے بازوؤں میں تھا۔ وہ کبھی اپنے ننھے ہاتھ میرے منہ پر چلاتا، کبھی ناخنوں سے میری جلد کریدتا پھر ایک دم گردن گھما کر اوپر دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی نگاہ تاریک آسمان کی بے کراں وسعتوں میں دمکتے ستاروں پر جاٹکتی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے ستاروں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ کیا اناری رخساروں اور جھیل آنکھوں والی سلطانہ بھی ان ستاروں میں کہیں موجود تھی؟ پتا نہیں کیوں لگا کہ وہ موجود ہے۔ ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی گم گشتہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ ''......مہروج! تم ثروت نام کی اس لڑکی سے بہت پیار کرتے ہو۔ شاید اتنا پیار جتنا تم خود بھی نہیں جانتے۔ اسے ڈھونڈنا جرور...... اس سے ملنا جرور۔ اور مجھے یخین (یقین) ہے مہروج! وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی تو اس سے کہنا......''

میں سلطانہ کی آواز سنتا رہا۔ میرے قدم چھت کے پتھریلے فرش پر اٹھتے رہے اور بالو میری بانہوں میں کھیلتا رہا...... ہمکتا رہا۔

میں نے سوچا کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ثروت کے سلسلے میں اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے؟ کیا اب بھی کوئی ایسی انہونی ہو سکتی ہے جو میری اور اس کی راہوں کو ملا دے؟

بالو کے دودھ کا وقت ہو گیا تھا۔ صفیہ آئی اور اسے نیچے لے گئی۔ میں اوپر ہی رہا۔ سرد ہوا کی کاٹ میرے لئے بے معنی تھی۔ میں برداشت کے معاملے میں اتنا ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ شاید اس سے دس گنا سردی بھی جھیل سکتا تھا۔

عاطف نے چھت پر جو چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا، وہ آج کل میرے استعمال میں تھا...... میں رات کے وقت دیر تک یہاں مصروف رہتا۔ اپنے آپ کو جسمانی مشقت کے حوالے کر

کے مجھے عجیب سا سکون ملتا تھا۔ جب سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹتے، جب مساموں سے پسینا دھاروں کی صورت میں بہتا اور سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چلتی، میرے سامنے جیکی کا مسکراتا ہوا چہرہ آ جاتا۔ اس نے کہا تھا...... تکلیف کا صلہ ملتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ قدرت اپنے اس اٹل اصول سے انحراف کر ہی نہیں سکتی۔

میں جان توڑ ورزش میں مصروف ہو گیا۔ ایک خیالی دنیا میں چلا گیا...... اپنے اردگرد موجود ان بدترین لوگوں کے سامنے آ گیا جن سے مجھے نبرد آزما ہونا تھا۔

اسی دوران میں عمران بھی اوپر چلا آیا۔ اس کا چہرہ ہی بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ وہ بولا۔ ''ابھی احمد تھانوی صاحب کا فون آیا ہے۔ نصرت آج پھر ان کے پاس پہنچی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ آج اس نے تھانوی صاحب سے بہت اہم ڈسکشن کی ہے۔''

''کس حوالے سے؟'' میں نے پوچھا۔

''خاوند سے علیحدگی اور طلاق کے موضوع پر۔''

''کیا مطلب؟ نصرت کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''اس نے یہ گفتگو اپنی بہن ثروت کے حوالے سے کی ہے۔ اس نے تھانوی صاحب سے اس بارے میں شرعی پوزیشن پوچھی ہے۔ بہت سے متعلقہ سوال کئے ہیں۔ تھانوی صاحب نے نصرت کو بتایا ہے کہ مذہب میں کسی بھی صورت میں زبردستی نہیں ہے۔ اگر ایک عورت سمجھتی ہے کہ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور شوہر کی اصلاح کا بھی کوئی امکان نہیں تو وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہے۔ اس کے لئے طلاق کا راستہ ہے۔ جو بے شک ناپسندیدہ ہے لیکن موجود ہے۔ میں نے کہا تھا نا تابش! ثروت کے ازدواجی معاملوں میں کافی گڑبڑ ہے۔''

''نصرت کیا کہتی ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اس کی بڑی بہن اور اس کے شوہر میں بہت فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ معاملے ایسی جگہ پر ہیں جہاں اس کی بہن کو شوہر سے علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ وہ اسے ایک گناہ کی طرح سمجھ رہی ہے۔ اس کی یہ سوچ اس کی زندگی تباہ کر دے گی۔ نصرت کا کہنا ہے کہ ثروت کے شوہر نے جعلی اجازت نامے کے ذریعے خفیہ شادی کی۔ اب وہ دوسری بیوی کو گھر لے آیا ہے۔ وہ پرلے درجے کا مفاد پرست ہے اور صرف اپنے باپ سے جائیداد کا باقی حصہ حاصل کرنے کے لئے ثروت کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے

ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ثروت اس کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔"

عمران کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"جہاں تک میری چھٹی حس کہتی ہے جگر...... اب موقع آ گیا ہے کہ ہم نصرت سے مل لیں۔"

"کہیں اس سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ...... ثروت مجھ کو خدا حافظ کہہ کر جا چکی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے راستے میں نہ آؤں...... اب ہم نصرت سے ملے تو وہ سمجھے گی کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔"

"بالکل اصلی ناکام عاشقوں والا رویہ ہے تمہارا۔ یہی کرتوت تھے جن کی وجہ سے عظیم اداکار دلیپ کمار کو ہر فلم میں ہیروئن سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہی گھسی پٹی سوچ، میں اس کے رستے میں نہیں آؤں گا...... میں اس کی زندگی پر اپنا منحوس سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ میں اندر ہی اندر جل کر خاک ہو جاؤں گا، راکھ ہو جاؤں گا، مرونڈا بن جاؤں گا...... بندۂ خدا...... یہ نیا دور ہے۔ خود اذیتی والی حرکتیں چھوڑو۔ منطقی انداز میں سوچو، ہم اس کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کرنے نہیں جا رہے۔"

"اچھا کہو، کیا کرنا ہے؟"

"احمد تھانوی صاحب بتا رہے تھے کہ کل نصرت پھر آ رہی ہے۔ وہ جب تھانوی صاحب سے مل کر واپس جائے گی، ہم اس کے سامنے آئیں گے اور اس سے ملاقات کریں گے۔"

"لیکن......"

"لیکن کے آگے جھانپڑ ہے۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔" اس نے اپنی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر جمائی اور میرا منہ بند کر دیا۔

اگلے روز سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح ہم نے سوچا تھا۔ نصرت پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر اور ان سے وظیفہ جات وغیرہ لکھوا کر رکشا پر روانہ ہوئی تو ہم کار میں اس کے پیچھے تھے۔ وہ ابھی گارڈن ٹاؤن سے کافی دور تھی جب ہم نے کار رکشا کے پاس سے گزاری۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اتفاقاً میری نگاہ نصرت پر پڑ گئی ہے۔ نصرت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے وہ مجھے پہچان نہیں سکی پھر ہکا بکا رہ گئی۔ کچھ دیر تک رکشا ہماری کار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر میں نے رکشا ڈرائیور کو ہاتھ

کے اشارے سے روکا۔ اس نے رکشا سائیڈ پر روک دیا۔ میں کار سے اتر کر نصرت کی طرف بڑھا۔ وہ بھی رکشا میں سے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ چہرے پر کئی رنگ یکجا ہو گئے تھے جن میں پریشانی کا رنگ بھی شامل تھا۔ "تابش بھائی آپ......؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ اس کے انداز نے ثابت کیا کہ ثروت نے ابھی تک اسے میری اور اپنی حالیہ ملاقاتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہیں دیکھ کر اتنا ہی حیران ہو رہا ہوں جتنی تم۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ شاید اب کبھی......" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

......قریباً پندرہ منٹ بعد ہماری کار ایک اسنیک بار کے سامنے رک رہی تھی...... عمران کار میں ہی رہا جبکہ میں اور نصرت اتر کر اندر چلے گئے۔ نصرت حیران تھی کہ اس نے اپنا تین چوتھائی چہرہ چادر کے پلوں میں چھپا رکھا تھا پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا...... اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں سے اس کے پیچھے تھے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ میں اسے بہت بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی اور بول چال کے اعتبار سے بھی۔ ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈھیروں سوال جواب تھے لیکن نصرت کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لئے ہم اہم سوال و جواب کے دائرے میں ہی رہے۔ نصرت میری بہن فرح اور بھائی عاطف کے بارے میں جاننے کے لئے بہت بے چین تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ دونوں خیر خیریت سے ہیں۔ نصرت نے ہماری والدہ کی وفات پر جو نصرت کی خالہ بھی تھیں، گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے سپاٹ لہجے میں مجھے بتایا کہ ثروت باجی کی شادی ہو چکی ہے اور یہ وہیں ہوئی ہے جہاں ان کی منگنی طے تھی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کی ثروت باجی اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں۔ انہیں ایک اچھا شوہر ملا ہے...... اس نے اس "اچھے شوہر" کی دوسری شادی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! میں جتنا عرصہ انڈیا میں رہا ہوں، کچھ لوگ بہت ہی شدت سے یاد آتے رہے ہیں۔ ان میں ناصر بھائی بھی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ چند سیکنڈ کے لئے چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بہت سی دیگر باتیں چھپا رہی ہے، ناصر بھائی کے بارے میں بھی چھپانا چاہ رہی ہے۔ لیکن پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے ایک بار رونا شروع کیا تو روتی چلی گئی۔ "کیا ہوا نصرت! ناصر بھائی ٹھیک تو ہیں نا؟"

وہ ہچکیوں میں بولی۔ ''وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں تابش بھائی۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔'' میرے سینے میں جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹی اور بکھر گئی۔ کئی سیکنڈ تک میں کچھ بول نہیں سکا۔ وہ روشن چہرہ میری نگاہوں میں چمکا اور پوری طرح چمک کر ایک دم بجھ گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ ''نصرت! کیا ہوا انہیں؟''

''ایکسیڈنٹ۔'' وہ سسک کر بولی۔ ''فرینکفرٹ سے ہمبرگ جاتے ہوئے ان کی کار کا حادثہ ہو گیا۔ ناصر بھائی کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔ ان کی منگیتر اور منگیتر کا بھائی بھی اس حادثے میں ختم ہو گئے۔ دو سال ہو گئے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس حادثے کے اثر سے نکل نہیں سکے۔''

ہم کتنی ہی دیر تک اس تکلیف دہ موضوع پر بات کرتے رہے پھر دھیرے دھیرے گفتگو میں دیگر موضوعات بھی شامل ہونے لگے۔ میں نے نصرت سے پوچھا۔ ''جب یہ واقعہ ہوا، ثروت کی شادی ہو چکی تھی؟''

''جی تابش بھائی! صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ باجی نے تو اس کا اتنا غم لیا کہ بستر پر پڑ گئیں۔ ایک دفعہ تو ایسے لگنے لگا کہ ان کو بھی کچھ ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے دو تین مہینوں بعد کچھ سنبھل سکیں۔''

ناصر کے مرنے کی اطلاع نے ہمیں ایک دم سوگوار کر دیا تھا۔ کسی اور موضوع پر بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دوسری طرف یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ نصرت اگر اب چلی گئی تو پھر شاید جلد ہی اس سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اس کی باتوں اور اس کے انداز سے ''گریز'' صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ اس ملاقات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہے کہ اس ملاقات سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے سمجھا دیا کہ ثروت کی کچھ گھریلو مصروفیات ہیں۔ شاید ابھی اس کے لئے ممکن نہ ہو کہ وہ مجھ سے مل سکے۔ اس نے گارڈن ٹاؤن والے گھر کا ادھورا سا ایڈریس تو بتا دیا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی ثروت باجی اور یوسف بھائی کچھ دنوں کے لئے لاہور سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''نصرت! کیا فرح اور عاطف وغیرہ سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا؟''

وہ بولی۔ ''دل تو بہت کچھ چاہتا ہے تابش بھائی لیکن میں باجی اور یوسف بھائی کی اجازت کے بغیر تو کچھ نہیں کر سکتی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ثروت باجی ابھی کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتیں۔ پھوپی زینب، چچی کلثوم اور تایا شفیق سمیت کئی رشتے دار لاہور میں موجود ہیں لیکن ابھی تک کسی کو پتا نہیں کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ سے بھی...... بس اتفاقاً ہی ملاقات ہو گئی ہے......''

اس نے یوں کہا جیسے اس ''اَن چاہی'' ملاقات نے اسے خوش تو کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ بہت پریشان بھی کیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''ابھی تم کہاں سے آ رہی تھیں؟''

اس نے ایک اور غلط بیانی کرتے ہوئے کہا۔ ''انارکلی گئی تھی، کچھ چیزیں لینے کے لئے۔''

میں کچھ دیر تک نصرت کی طرف دیکھتا رہا پھر طویل سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''نصرت! ناصر بھائی کی وفات کی اطلاع دے کر تم نے جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے بعد کوئی اور بات چھیڑنے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن کچھ باتیں کرنا ضروری بھی ہیں۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''نصرت! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک سچی لڑکی ہو لیکن اس وقت حالات کی مجبوری تمہارے سچ پر گہرا سایہ ڈال رہی ہے۔''

''مم...... میں سمجھی نہیں تابش بھائی!''

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''نصرت! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چند دن پہلے میں ثروت سے مل چکا ہوں۔ شاید ثروت نے تمہیں یہ بات بتانی مناسب نہیں سمجھی۔''

''آ...... آپ ملے ہیں؟'' وہ ششدر رہ گئی۔

''ہاں نصرت! میں اس سے ملا ہوں اور میں نے اس کے بارے میں کافی کچھ جانا بھی ہے۔ اور جو کچھ میں نے جانا ہے، وہ اس سے بہت مختلف ہے جو تم بتا رہی ہو۔''

میز پر رکھے ہوئے نصرت کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہو گئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''آپ...... کو...... کیا پتا چلا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ثروت اپنے گھر میں بالکل بھی خوش نہیں ہے۔ یوسف کا کہیں معاشقہ تھا۔ اس نے خفیہ طور پر دوسری شادی کی اور پھر دوسری بیوی کو گھر بھی لے آیا۔ اس نے صرف اپنے امیر باپ کے خوف سے ثروت کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ان دونوں میں طلاق تک نوبت پہنچ چکی ہے لیکن ثروت اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ ''آپ غلط نہیں کہہ رہے لیکن صحیح بھی نہیں کہہ رہے۔ شاید کسی نے آپ کو درست نہیں بتایا۔ تھوڑی بہت بات تو ہے میاں بیوی میں...... لیکن ایسی

باتیں تو گھروں میں ہوا ہی کرتی ہیں......''

''کیا یوسف کی دوسری شادی والی بات بھی غلط ہے؟''

''ہاں...... یہ شادی ہوئی تو ہے...... لیکن میں سمجھتی ہوں تابش بھائی، یہ سب کچھ عارضی ہے۔ وقتی جذبات کا نتیجہ ہے۔ یوسف بھائی کی اصل اور خاندانی بیوی تو باجی ثروت ہی ہیں۔ مم...... مجھے یقین ہے کہ یوسف بھائی بہت جلد گریس کو چھوڑ دیں گے۔''

میں نے نصرت کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نصرت! کچھ لوگوں کے چہرے شیشے کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولنا چاہیں بھی تو نہیں بول سکتے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔''

وہ روہانسی ہوگئی۔ غالباً وہ خوف زدہ تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی انکشاف کی وجہ سے ثروت کے مسائل میں اضافہ ہو اور وہ جو پہلے ہی دکھوں کے بھنور میں ہے، کچھ اور بھی بے حال ہو جائے۔

''آپ غلط سوچ رہے ہیں تابش بھائی! تھوڑی بہت رنجش ضرور ہے لیکن......''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم ابھی انارکلی سے نہیں بلکہ شاہ جمال سے آرہی ہو۔ وہاں کسی پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر...... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہاں ثروت کی شدید گھریلو پریشانیوں کے سلسلے میں ہی گئی ہوگی۔''

نصرت کا رنگ کچھ اور زرد ہوگیا۔ وہ سٹپٹائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی! میں آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ آپ ثروت باجی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں...... وہ پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نصرت! تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا تھا۔ ''بہت دکھی'' کو اس کے حال پر چھوڑنا کیا مناسب ہوگا؟ جہاں تک تمہارا مسئلہ ہے نصرت! وہ بھی میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈر رہی ہو کہ ثروت تمہیں مجھ سے ملنے اور صورتِ حال سے آگاہ کرنے پر موردِ الزام ٹھہرائے گی...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں نصرت! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس سارے معاملے میں کبھی تمہارا نام نہیں آئے گا۔ اور میں ایک بھائی کی حیثیت سے تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے ثروت کے مسئلوں میں کوئی چھوٹا سا بھی اضافہ ہو۔''

''لیکن تابش بھائی......''

''لیکن میری بہن! اگر تم کچھ نہ بھی بتاؤ گی تو صورتِ حال میں کوئی خاص فرق نہیں

پڑے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں اور باقی بھی مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔''

وہ آبدیدہ ہوگئی۔ ''تابش بھائی! آپ کیوں خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ آپ خود کو اس سارے معاملے سے الگ کیوں نہیں رکھتے؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ یہ جملہ بے دھیانی میں بول گئی تھی لیکن اس جملے میں چھپے ہوئے اندیشے مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے کہا۔ ''نصرت! ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ دوسری طرف مشکلوں کی بات بھی کر رہی ہو۔ جب سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر ثروت کے بارے میں جاننے سے میں مشکل میں کیوں پڑوں گا......؟''

''آپ نہ پڑیں گے لیکن ان کے لئے تو مشکل ہو سکتی ہے نا۔ آپ کو اس معاشرے کا پتا ہی ہے۔ آپ سے زیادہ اور کون جانے گا کہ چار سال پہلے کیا ہوا تھا۔ باجی کچھ گھنٹوں کے لئے گھر سے باہر رہی تھیں اور خیریت سے واپس آگئی تھیں لیکن ایک طوفان کھڑا ہوگیا تھا۔ اتنی باتیں بنی تھیں، اتنی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں کہ ہم زندہ درگور ہوگئے تھے۔ آپ کچھ کر سکے تھے، نہ ناصر بھائی، نہ کوئی اور...... تھانے دار اشرف اور گورایا جیسے لوگوں نے سراج کے ساتھیوں والا کردار کیا تھا اور ہمیں بے بس کر کے دکھ دیا تھا...... آپ کے سامنے ہی تو ابا جی کی لاش اٹھی تھی تابش بھائی۔ امی کے جنازے کو آپ نے بھی کندھا دیا تھا...... کس طرح ایک ہنستا بستا گھر اجڑا تھا تابش بھائی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس کی مار بڑی سخت ہے تابش بھائی۔ ہم اور طرح کے لوگ ہیں، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے......''

میری اور نصرت کی گفتگو جاری تھی جب اچانک میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ہال کے ایک گوشے میں گئی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ وہاں دھاری دار کوٹ والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص موجود تھا۔ اس کی پھولی ہوئی ناک اس کے چہرے پر خاصی نمایاں تھی۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص سیٹھ سراج اور شیرے کے ساتھیوں میں سے ہے۔ اور اگر وہ یہاں موجود تھا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے نصرت کا خیال ہی آیا۔ وہ میرے ساتھ یہاں موجود تھی اور کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھی۔

میں نے بائیں ہاتھ سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھایا اور بڑی آہستگی سے اعشاریہ پانچ کا پستول نکال لیا۔ ایک ہی ہاتھ سے میں نے اس کا میگزین علیحدہ کر کے اس میں گولیوں کی تعداد دیکھی اور پھر اسے دوبارہ اٹیچ کر کے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

نصرت کو شک پڑ گیا تھا کہ میں ٹیبل کے نیچے کچھ کر رہا ہوں۔ اس کی نظر کا زاویہ بدلا اور اس نے میری گود میں سیاہ رنگ کا پستول دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی چہرے پر زردی چھا گئی۔ ''آ...... آپ کے پاس پستول ہے بھائی؟''

میں اسے کیا بتاتا کہ اب میرے ہاتھوں میں پھول، کتابیں، خوشبوئیں اور امن آشتی کی لکیریں نہیں ہیں۔ اب یہ ہاتھ بہت بدل چکے ہیں۔ اب ان ہاتھوں کے اثاثے کچھ اور طرح کے ہیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''نصرت! ایک ایسا بندہ یہاں موجود ہے جو کوئی غلط حرکت کرسکتا ہے۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تو تم...... پچھلے دروازے سے نکل کر چھوٹی سڑک پر چلی جانا۔ جو سواری بھی ملے، اس میں بیٹھ کر نکل جانا۔''

''لل...... لیکن۔''

''اگر کوئی پیچھا کرے تو پولیس اسٹیشن سامنے ہی ہے۔ سو ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔''

نصرت کا پورا جسم لرزنے لگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ گوشے میں بیٹھا ہوا موٹی ناک والا الرٹ ہوگیا ہے۔ غالباً اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اسے دیکھ کر چونکا ہوں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ وہ اپنی میز چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے والا ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ نصرت کو وہیں پر چھوڑ کر میں عام سے انداز میں اٹھا اور گوشے کی طرف بڑھا۔ وہ شخص تاڑ گیا کہ میں اس کی طرف آ رہا ہوں۔ یکایک اس نے اپنا ہاتھ اپنے دھاری دار کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پستول نکال لیا۔ یقیناً اس نے جو کرنا تھا، اس کا فیصلہ وہ پہلے سے کر چکا تھا۔ میں ابھی اس سے آٹھ دس قدم دور تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے بے دریغ مجھ پر فائر کیا۔ میں فائر کے دھماکے سے پہلے ہی جھک گیا تھا۔ گولی ایک میز پر رکھے ہوئے ایک خاتون کے سنہری شولڈر بیگ میں لگی۔ میں نے بیگ کو اچھل کر نصرت کے پاؤں میں گرتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا، میرے ہاتھ میں دبے پستول کی نال سے شعلہ نکلا۔ گولی حملہ آور کے کندھے میں کہیں لگی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا لیکن گرتے ساتھ ہی اٹھا اور ایک خالی میز کو الٹاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ پورے اسنیک بار میں کہرام مچ گیا تھا۔ میزیں الٹ رہی تھیں، برتن گر رہے تھے...... لوگ بھاگ رہے تھے۔

میں پوری رفتار سے موٹی ناک والے شخص کے پیچھے لپکا۔ ابھی میں نے آٹھ دس قدم ہی اٹھائے تھے کہ میری بائیں جانب سے ایک پرچھائیں سی مجھ پر جھپٹی۔ یوں لگا جیسے رفتار سے بھاگتا ہوا کوئی ٹرک مجھ سے آن ٹکرایا ہے۔ میں ایک میز کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک خاتون کو روندتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ شیشے کی ایک نہایت خوب صورت سائیڈ ٹیبل میری ٹکر

سے چکنا چور ہوگئی۔ دیوار کے ساتھ میرے سر کا بھی زوردار تصادم ہوا تھا۔ یہ میری غیرمعمولی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے بے ہوش ہونے سے بچایا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں بھنا کر اٹھا، کرخت شکل وصورت والا ایک گرانڈیل شخص میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا لمبا چاقو تھا۔ بڑی بیدردی سے اس نے میرے پیٹ پر وار کیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر خود کو بمشکل بچایا پھر بھی چاقو کی نوک میری چرمی جیکٹ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے طوفانی مکا اس کے چوڑے جبڑے پر رسید کیا...... وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اسے جبڑے پر میری دوسری ضرب سہنا پڑی۔ غالباً اسے ایسی زوردار ضربوں کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن کھو کر شیشے کے طویل کاؤنٹر سے ٹکرایا۔ تب دوبارہ اچھل کر میری طرف آیا۔ اس مرتبہ میں نیچے جھکا، مہلک چاقو میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ میرے اردگرد سے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں خواتین کی آوازیں نمایاں تھیں۔ میں نے گرانڈیل شخص کے پہلو پر زوردار لات رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ یقیناً اس کی ایک آدھ پسلی اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے گرے ہوئے پستول کے لئے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اس دوران میں میرے مدِمقابل کو جو ایک سیکنڈ کا وقفہ ملا، اس میں اس نے بار کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کھلا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ اسے روکتا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ بار سے نکلتے ہی وہ یوں اوجھل ہوا جیسے زمین میں کہیں سما گیا ہو۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، وہ کہیں نہیں تھا...... یوں لگا جیسے وہ کسی قریبی دکان میں گھسا ہے اور پھر دوسری طرف سے نکل گیا ہے۔

اسنیک بار کے ملازمین اور مالک بھی میرے اردگرد موجود تھے اور چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن حملہ آور اوجھل ہو چکا تھا۔ پھر مجھے نصرت کا خیال آیا...... وہ کہاں تھی؟ میرا اندازہ تھا کہ وہ میری ہدایت کے مطابق بھاگی نہیں ہے بلکہ وہیں کہیں دبک گئی ہے۔ یہ اندازہ درست تھا۔ وہ بار ہی کے ایک گوشے سے نکلی اور روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب مجھے عمران بھی نظر آیا۔ بار میں دو گولیاں چلی تھیں اور یقیناً یہ آوازیں پارکنگ میں عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ ''کیا ہوا تابی! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔

''ہاں، ٹھیک ہوں۔ سیٹھ سراج کے بندے تھے۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

عمران کی نگاہ میری کٹی ہوئی جیکٹ پر پڑی اور اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس

ہوا۔ ہمارے اردگرد ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہم واپس بار کے اندر آئے۔ میں نے سب سے پہلے اپنا پستول تلاش کیا اور جیب میں ڈالا۔ بار کے ہال میں کافی نقصان ہوا تھا۔ پتلون اور جرسی والی ایک جواں سال لڑکی ہنگامے کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی، اسے ہوش میں لایا جا رہا تھا۔

کون تھے یہ لوگ؟ کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے کیوں حملہ کیا؟ اس طرح کے بہت سے سوال مجھ سے پوچھے جا رہے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تابی! تم نصرت کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ یہاں کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

لیکن جب میں نصرت کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا تو اسنیک بار کے ”منیجر مالک“ نے مجھے روک لیا۔ ”جناب! آپ رکیں۔ میں نے پولیس کو بلایا ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”ان کو جانے دو۔ ان کے ساتھ خاتون ہے۔ ان کی جگہ میں ہوں یہاں۔“

مالک بولا۔ ”آپ بھی رک جائیں۔ پانچ دس منٹ کی بات ہے۔ وہ لوگ پہنچ ہی رہے ہوں گے۔“ مالک کو یقیناً زیادہ فکر توڑ پھوڑ سے ہونے والے اپنے نقصان کی تھی۔

عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ دونوں یہاں کھڑے رہیں...... اور ابھی کسی طرف سے کوئی اور حرامزادہ ان پر گولی چلا دے...... ان کو جانے دو۔ ان کے سارے معاملات کے لئے میں جو ہوں یہاں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم نکلو تابش! یہ لو گاڑی کی چابی۔“

عمران کے تحکمانہ لہجے نے بار کے مالک کو چپ کرا دیا۔ میں ڈری سہمی نصرت کو لے کر پارکنگ میں آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے آ کر میں نے دیکھا کہ ایک پولیس موبائل جس میں ایک سُست الوجود تھانے دار بھی بیٹھا تھا، اسنیک بار کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اس معاملے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسے مسئلوں کو عمران چٹکیوں میں حل کرتا ہے۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے۔

ہم گلبرگ مین مارکیٹ کی طرف نکل آئے اور پھر ایک اور ریستوران میں جا بیٹھے۔ اپنی کٹی ہوئی جیکٹ میں نے گاڑی میں ہی رہنے دی تھی۔ نصرت کے چہرے پر اب تک حیرت جمی ہوئی تھی۔ اسے جیسے میرے اس روپ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ روپ اُس روپ سے

یقیناً بہت مختلف تھا جو وہ بچپن سے لے کر چار سال پہلے تک دیکھتی رہی تھی۔ دبلا پتلا، کم گو اور دابو تابش بھائی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آج اس نے جس تابش کو دیکھا تھا، وہ نہ صرف مار دھاڑ کر سکتا تھا بلکہ آتشیں اسلحے کا استعمال بھی اس کے لئے معمولی بات تھی۔ نصرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ میں نے دو خطرناک غنڈوں سے ٹکر لی تھی بلکہ انہیں بھاگنے پر بھی مجبور کیا تھا۔ اس واقعے کی شدت نے اسے ابھی تک لرزہ براندام کر رکھا تھا۔

”آپ بہت بدل گئے ہیں تابش بھائی۔ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں کسی اور شخص سے مل رہی ہوں۔“ وہ کانپتی سی آواز میں بولی۔

”یہ تم تعریف کر رہی ہو یا ناپسندیدگی ظاہر کر رہی ہو؟“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تابش بھائی! مجھے لگتا ہے کہ آپ...... بہت خطرناک قسم کا وقت گزار رہے ہیں۔ آپ کے آس پاس جو لوگ ہیں، وہ بھی خطرناک ہیں۔ یہ آپ کا دوست کون ہے جس نے ذمے داری لے کر ہمیں وہاں سے نکالا ہے؟“

”یہ بھی ہے ایک۔ تم اسے جانو گی تو تمہاری یہ موجودہ حیرت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں نصرت جن کو دیکھ کر زندہ رہنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔“

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ نصرت میں وہ جھجک اور وہ خوف کی کیفیت کم ہو گئی ہے جو اس ملاقات کے شروع میں اس میں نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میری بدلی ہوئی شخصیت دیکھی تھی۔ عورت ایک کمزور صنف کا نام ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر سہارے، تحفظ اور مضبوطی کی طلب ہوتی ہے۔ اور یہ صفات اسے جہاں بھی نظر آتی ہیں، کشش کرتی ہیں۔

میں گفتگو کے ذریعے اسے ہفتوں تک قائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تو بھی شاید کامیاب نہ ہوتا لیکن بار میں پیش آنے والے اس ایک واقعے نے نصرت کو اس کے سخت خول کے اندر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے کے راستے پر گامزن ہو گئی تھی۔ وہ اب تفصیل سے جاننا چاہ رہی تھی کہ میں اتنا عرصہ کہاں اور کس حال میں رہا ہوں۔ کن کن مرحلوں سے گزرا ہوں۔ کن کن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے...... اور کیا ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے دونوں گھرانوں کی زندگیوں کو تباہ کیا۔

میں اسے گزرے ماہ و سال کے سارے حالات تو نہیں بتا سکتا تھا تاہم چیدہ چیدہ واقعات سے اسے آگاہ کیا...... نصرت نے اپنے موبائل فون سے گھر میں ثروت کو فون کر دیا اور اسے بتایا کہ اسکول کے دور کی ایک دوست اسے مل گئی ہے، اس لئے وہ کچھ دیر بعد آئے

گی۔ میں نے ایک بار پھر ثروت اور اس کے گھریلو حالات والا موضوع چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ نصرت کی آنکھوں میں فوراً نمی جاگ گئی۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد گمبھیر آواز میں بولی۔

''تابش بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ باجی کے گھریلو حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ یوسف بھائی نے اپنے مطلب کے لئے باجی کو کھلونا بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی حیثیت اس گھر میں بیوی کی ہے ہی نہیں۔ بیوی تو وہی گریس ہے۔ یوسف بھائی نے اس کا اسلامی نام حدیقہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ جب بندے کا دل نہ بدلے تو کچھ نہیں بدلتا۔ وہ صرف نام کی مسلمان ہے۔ اس نے یوسف بھائی پر پوری طرح قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ شاید بے دام کی غلامی اسی کو کہتے ہیں۔''

''کیا یہ گریس والا معاملہ ثروت سے شادی کے بعد شروع ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

نصرت نے آنسو پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں تابش بھائی! یہ چکر پہلے سے چل رہا تھا۔ یوسف بھائی فرینکفرٹ کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ یہ وہاں ان کی ماتحت تھی۔ وہیں سے یہ افیئر شروع ہوا۔ یوسف بھائی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے والد فاروقی صاحب کی وجہ سے ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ جرمن لڑکی سے شادی کر کے وہ والد کی جائیداد سے عاق ہو سکتے تھے۔ فاروقی صاحب اپنی جائیداد کا تقریباً آدھا حصہ اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ آدھا حصہ بھی پندرہ سولہ لاکھ روپوں سے کم کا نہیں تھا۔ یوسف بھائی نے باجی ثروت سے شادی کر لی اور کچھ ہی ہفتے بعد فاروقی صاحب نے پراپرٹی یوسف بھائی کے نام کر دی۔ پراپرٹی نام ہو گئی تو یوسف بھائی نے اپنا اصل کھیل کھیلا اور ایک فیک اجازت نامے کے ذریعے گریس سے میرج کر لی۔ نہ صرف میرج کر لی بلکہ اسے گھر بھی لے آئے۔ اس موقع پر باپ بیٹے میں تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے...... لیکن آہستہ آہستہ یوسف بھائی نے فاروقی صاحب کو منا لیا...... فاروقی صاحب نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ لاہور میں اپنا پرانا گھر ثروت باجی کے نام کریں گے۔ اس کے علاوہ یوسف بھائی دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے اور ثروت باجی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری بات سمجھ آ رہی ہے نصرت...... کیونکہ ابھی فاروقی صاحب کی آدھی جائیداد کا فیصلہ ہونا باقی ہے اس لئے یوسف اپنے باپ کی خواہش کے مطابق ثروت کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے تابش بھائی۔'' نصرت نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''یوسف بھائی

گریس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس گھر میں باجی کے لئے کوئی جگہ نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ یوسف بھائی سے خلع حاصل کر لیں...... اور انہیں فوراً مل بھی سکتا ہے۔ لیکن...... وہ اس کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتیں۔ وہاں ہر دکھ سہہ رہی ہیں لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو سمجھنے کے لئے بالکل تیار نہیں کہ وہ ایک غلط جگہ پر، غلط لوگوں کے درمیان، غلط حیثیت سے آ گئی ہیں۔''

نصرت کا چہرہ کرب کی آماجگاہ تھا۔ اپنی جوان سال من موہنی بہن کا دکھ اس کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔ پھر اپنائیت کے انداز میں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی جان! میں آپ کو یوسف بھائی اور باجی کے بارے میں ایک اور خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں......''

میں تجسس سے نصرت کی طرف دیکھنے لگا۔ نصرت نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی......

قسط ۲۸

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولی۔ ''ان کے درمیان میاں بیوی والا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یوسف بھائی بری طرح گریس کی محبت میں گرفتار ہیں...... انہوں نے والد کے مجبور کرنے پر اور اپنی بیمار والدہ کی خاطر باجی ثروت سے شادی تو کر لی مگر ان سے ہمیشہ دور دور رہے۔ باجی سے شادی کے صرف چھ مہینے بعد ہی انہوں نے گریس سے نکاح کر لیا تھا۔ ایک مہینا اس شادی کو خفیہ رکھنے کے بعد وہ گریس کو گھر لے آئے۔ اس کام کے لئے انہیں یقیناً گریس نے ہی مجبور کیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ چھپا رہے۔''

نصرت جو کچھ بتا رہی تھی، وہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ثروت شادی شدہ تھی اور نہیں بھی۔ اسے ثانوی بیوی کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اسے ایک شخص بڑی بے حسی سے صرف اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اسے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے باپ کی طرف سے جائیداد اس کے نام منتقل ہو جائے۔ ایک دو یا پھر تین چار سال بعد جب بھی جائیداد اس کے نام منتقل ہو جاتی، وہ ثروت کو دھکا مار کر گھر سے نکال سکتا تھا۔

وہ اس گھر میں ایک بیکار شے کی طرح پڑی تھی جیسے کوئی ان چاہی مہمان...... یا پھر کوئی بے ضرورت فرنیچر یا کوئی فالتو کپڑا۔ لیکن کیا وہ واقعی ان چاہی، بے ضرورت یا فالتو تھی؟

میرے سینے میں انگارے دہکنے اور آنکھیں جل اٹھیں۔ اسے کیا پتا وہ کیا تھی؟ کسی کے لئے اس کی کیا اہمیت تھی؟ کوئی کس کس طرح اس کے لئے تڑپا تھا اور اب بھی تڑپ رہا تھا۔ وہ تو زندگی کا دوسرا نام تھی، وہ تو ہزار ہا روز و شب کا حاصل تھی۔ اَن گنت دعاؤں کا گمشدہ ثمر تھی۔ میں نے چند روز پہلے اسے دیکھا تھا اور میری آنکھیں اب تک اس کی دید سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ اس کا ملیح چہرہ، اس کی آبگینہ آنکھیں، اس کی دل کی گہرائی تک اُتر جانے والی آواز، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

''آپ کس سوچ میں کھو گئے تابش بھائی جان؟'' نصرت کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میرے اور نصرت کے درمیان ثروت کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی۔ نصرت کے خیالات وہی تھے جو وہ اس سے پہلے پیر احمد تھانوی کے سامنے بیان کر چکی تھی۔ اس نے احمد تھانوی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن کے سارے گھریلو معاملات کو بڑی گہرائی سے دیکھتی رہی ہے اور اس کے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی بہن اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے۔

میں نے کہا۔ ''نصرت! اس بارے میں ثروت سے کبھی تمہاری کھل کر بات ہوئی ہے؟''

نصرت بولی۔ ''یہ کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ہم جرمنی میں ہی تھے۔ میں نے کئی دفعہ باجی کو کمرے میں بند ہو کر روتے دیکھا تھا۔ بے شک ناصر بھائی کی موت کا غم بھی ابھی پوری طرح بھولا نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی کہ یہ اور طرح کا غم ہے۔ ایک دن جب وہ سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں، میں نے ان سے وجہ پوچھی تو وہ بولیں کہ پاکستان بہت یاد آ رہا ہے۔ پتا نہیں فرح اور عاطف کہاں ہوں گے، کیا کر رہے ہوں گے اور پھوپی زینب اور ماموں عرفان۔ میں نے کہا باجی! آپ نے سب کا نام لیا ہے لیکن تابش بھائی کا نہیں لیا، ان کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ میں نے کہا مجھے پتا ہے باجی! آپ ان کو بہت یاد کرتی ہیں۔ وہ ہر وقت آپ کے خیالوں میں رہتے ہیں۔ آپ انہیں بھولی ہیں نہ کبھی بھول سکیں گی۔ وہ سسکنے لگیں۔ میں نے کہا، باجی! آپ دہری زندگی جی رہی ہیں۔ یہ کسی طور بھی مناسب نہیں۔ یوسف بھائی آپ کے نہیں ہیں اور نہ کبھی ہوں گے اور جو آپ کا ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ کیوں یوسف بھائی سے طلاق نہیں لے لیتیں۔ کیوں کسی کے مفاد کے لئے خود کو برباد کر رہی ہیں۔

''تابش بھائی! ان دنوں میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ باجی شاید اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہیں۔ لیکن انہی دنوں میں بیمار پڑ گئی۔ سینے میں دائیں طرف ذرا نیچے درد شروع ہو گیا۔ تیز بخار اور رات کے وقت متلی کی شکایت بھی شروع ہو گئی۔ اسپتال داخل ہونا پڑا۔ میری تکلیف کے دنوں میں یوسف بھائی نے بھی کافی ذمے داری اٹھائی اور بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ایسے کاموں میں وہ کافی ماہر ہیں۔ ناراض دوستوں کو منا لینا، جہاں کوئی مطلب ہو وہاں اپنے لئے جگہ بنا لینا، ضرورت ہو تو نرم پڑ جانا، ضرورت نہ ہو تو پتھر کی طرح سخت ہو جانا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید انہی دنوں میں باجی نے ایک بار پھر اپنا خیال بدل دیا۔ ویسے بھی ان کے پاس آپ کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ پاکستان میں ہمارے کسی اور عزیز کو آپ کے اور فرح، عاطف کے بارے میں کچھ پتا تھا۔ ایسے میں بندہ کتنی دیر تک جھوٹی آسوں، امیدوں کا سہارا لے سکتا ہے۔ پھر جو کچھ بھی تھا باجی کی حیثیت ''شادی شدہ'' کی تھی۔'' نصرت کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

اس نے بیگ سے ٹشو نکال کر آنکھیں صاف کیں اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی! پھر میں نے ایک دن دیکھا کہ باجی نے کئی پرانے کاغذ جلا کر پھینک دیئے۔ وہ ڈائری بھی لکھا کرتی تھیں، وہ بھی پھاڑ کر جلا دی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دن باجی نے آپ کے حوالے سے اپنے دل میں موجود ہلکی ہلکی امید بھی کھرچ کر پھینک دی۔ شاید انہوں نے اپنے حالات پر ہمیشہ صابر شاکر رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن نصرت...... اس کے بعد وہ یوسف صاحب سے ناراض ہو کر اکیلی پاکستان آئی اور کئی ماہ اکیلی یہاں رہی تھی؟''

''وہ دوسرا معاملہ تھا تابش بھائی! گریس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا تھا...... اس نے یوسف بھائی کو بھی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر دو مہینے کے اندر اندر انہوں نے باجی کو علیحدہ گھر لے کر نہیں دیا تو وہ خود گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ یہ شرط بھی لگا رہی تھی کہ یوسف بھائی، باجی سے برائے نام رابطہ بھی نہیں رکھیں گے۔ جب معاملہ بہت بڑھا تو باجی نے اپنی کچھ جیولری بیچ کر ٹکٹ کے پیسے اکٹھے کئے اور یوسف بھائی کے نام ایک طویل خط لکھ کر خاموشی سے پاکستان آ گئیں۔''

''اور تم؟''

''میں ان دنوں یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔''

''پھر تم لوگ ثروت کے پیچھے یہاں کیسے آئے؟''

''میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ یوسف بھائی کے والد انکل فاروقی ہیں۔ وہ تیس چالیس سال جرمنی میں رہے ہیں لیکن اب ان کی خواہش ہے کہ یوسف بھائی یہاں پاکستان میں اپنا گھر بنوائیں اور وہ اپنی زندگی کے آخری سال اپنے وطن میں گزار سکیں۔ باجی کے خاموشی سے پاکستان آجانے کے بعد انکل فاروقی ازحد پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یوسف بھائی جلد از جلد پاکستان پہنچیں اور باجی کو تلاش کریں۔ نہ صرف تلاش کریں بلکہ یوسف بھائی اور گریس دونوں ان سے معاف بھی مانگیں۔''

''تو کیا یوسف آسانی سے پاکستان آنے پر راضی ہو گیا؟''

''آسانی سے تو نہیں تابش بھائی لیکن ظاہر ہے کہ کروڑوں کی جائیداد کا معاملہ ہے۔ انہیں انکل فاروقی کی بات ماننا پڑ رہی ہے۔ شروع میں یوسف بھائی نے مزاحمت کی...... انہوں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ہمایوں کو پاکستان جانے پر آمادہ کریں مگر ہمایوں کی جاب کچھ اور طرح کی ہے۔ یوسف بھائی کے لئے یہ آسانی ہے کہ وہ پاکستان آکر بھی جرمن کمپنی میں اپنی جاب بحال رکھے ہوئے ہیں۔ وہ یہیں پاکستان میں کام کر کے بذریعہ نیٹ جرمنی کے مین آفس میں بھیج دیتے ہیں۔ زیادہ ضرورت ہو تو وہاں کا چکر لگا لیتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''پاکستان آکر یوسف نے ثروت کو کیسے ڈھونڈا...... اور وہ معافی والی بات کیا ہوئی؟''

''یہ تو پتا نہیں کہ باجی کو کیسے ڈھونڈا...... بہرحال وہ یوسف بھائی کو مل گئیں۔ وہ یہاں اپنی ایک پرانی دوست کے پاس رہ رہی تھیں اور اسی کے دفتر میں ملازمت بھی کر رہی تھیں۔ جہاں تک معافی کا تعلق ہے، ضرورت پڑنے پر یوسف بھائی معافی تلافی بھی کر لیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ وقت گزاری کے لئے ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، گریس نے بھی ثروت سے معافی مانگی ہو گی؟''

''اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' نصرت نے فوراً کہا۔ ''اس میں بہت زیادہ اکڑ ہے۔ ابھی دو دن پہلے بھی اس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا ہے۔ معمولی سی بات تھی۔ اس نے ٹی وی کی آواز بہت اونچی کر رکھی تھی۔ باجی نے بس آواز کم کرنے کو کہا......''

میں یہ سارا واقعہ ملازمہ حمیدن کی زبانی سن چکا تھا۔

میرے اور نصرت کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔ نصرت کو اس سلسلے میں بہت

تجسس تھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ مجھے اس معاملے میں نصرت سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں ابھی اس شادی کے بارے میں بتا کر نصرت کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میرا ارادہ مستقل طور پر اس شادی کو چھپانے کا ہو۔

نصرت اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ثروت کو یوسف جیسے مطلب پرست اور حیلہ ساز شخص کی زندگی سے نکل جانا چاہئے۔ اس نے مجھ سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا۔

میں نے کہا۔ ''نصرت! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا اور ثروت کا کیا رشتہ تھا۔ اگر اس سلسلے میں، میں ثروت سے ملوں گا یا کوئی بات کروں گا تو اس کا الٹا اثر ہو گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں اپنے مطلب کے لئے اس کی ازدواجی زندگی کے مسئلوں کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''تو پھر کیا کیا جائے تابش بھائی! انہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ان کے سامنے گہرا کنواں ہے۔ اگر وہ......''

''میری بات سنو نصرت۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ایک بڑی اچھی تجویز دیتا ہوں۔ اگر تم واقعی سمجھتی ہو کہ معاملات ''پوائنٹ آف نو ریٹرن'' تک پہنچ چکے ہیں اور یوسف سے علیحدگی ہی ثروت کے لئے آخری حل ہے...... تو پھر تم اس سلسلے میں احمد تھانوی صاحب سے مدد لو۔ وہ ایک بڑی متوازن روحانی شخصیت ہیں۔ تم ثروت کو ان سے ملواؤ۔ ساری بات کھول کر بیان کرو اور پھر ان سے مشورہ لو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ حالات کے مطابق بالکل ٹھیک مشورہ دیں گے۔ ان میں قائل کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ وہ سکتا ہے کہ وہ جو مشورہ دیں، اس پر ثروت کو قائل بھی کر لیں۔''

نصرت گہری سوچ میں کھو گئی۔ پتا نہیں کیوں وہ کچھ مضمحل سی نظر آتی تھی۔ اس کے رنگ میں ایک پھیکا پن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ صورتِ حال ان گھریلو پریشانیوں ہی کا نتیجہ ہے جن کا سامنا وہ اس وقت کر رہی ہے۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''اگر آپ سچ پوچھیں تابش بھائی تو آج آپ سے ہونے والی اس اچانک ملاقات نے میرے اندر بہت حوصلہ جگایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ ناصر بھائی کے بعد میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ جو کچھ بھی جھیلنا ہے، مجھ اکیلی کو جھیلنا ہے مگر آج ایسا نہیں ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ۔ ''تم اپنی ہر فکر، پریشانی مجھے دے دو۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔ تمہارا یہ بھائی سب کچھ سنبھال لے گا۔ تم اپنی صحت کی طرف بھی توجہ دو۔ مجھے بہت تھکی ہوئی سی نظر آتی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ ”ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ پھر ناصر بھائی چلے گئے اور یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ باجی پر جو گزر رہی ہے، وہ بھی آپ کو پتا چل گیا ہے۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اس ہنستے بستے گھر کو۔“

”ہر رات کے بعد سویرا اور ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے نصرت۔ انسان ہمت نہ ہارے اور انتظار کرے تو سب ٹھیک ہوا جاتا ہے۔“

وہ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ ”تابش بھائی! آج آپ سے مل کر میں خوش ہوئی ہوں اور مجھے بہت ڈر بھی لگا ہے۔ ابھی اس اسنیک بار میں ہونے والی لڑائی نے مجھے بہت ڈرایا ہے۔ کہیں یہ معاملہ زیادہ سیریس تو نہیں ہو جائے گا۔ مم...... میرا مطلب ہے وہاں گولیاں چلی ہیں۔ آپ نے بھی گولی چلا کر ایک بندے کو زخمی کیا ہے۔ اگر......“

”اس بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں نصرت۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا یہ بھائی بہت بدل چکا ہے۔ اب ان غنڈوں جیسے کن ٹٹے اس کی جیب میں رہتے ہیں۔“ میں نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

میری اس مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں میں اطمینان آمیز حوصلے کی چمک کو نمایاں کر دیا۔

O......❖......O

میری توقع کے عین مطابق عمران نے اسنیک بار میں ہونے والے پھڈے سے بخوبی نمٹ لیا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے وہاں ہونے والے نقصان کے ضمن میں کوئی رقم بھی مالک کو نہیں دی تھی۔ صرف ایک زخمی ہونے والے ویٹر کی اشک شوئی کے لئے اس نے اپنی خوشی سے دو ڈھائی ہزار روپے دیئے تھے۔ اس سارے واقعے میں ہمارے لئے مایوسی کا پہلو بس یہی تھا کہ سیٹھ سراج کا سراغ پھر لگتے لگتے رہ گیا تھا۔ دونوں حملہ آور گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ تاہم عمران کے کہنے پر جیلانی اپنے طور پر ان کا کھوج ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

اس صورتِ حال میں عمران نے میرے ساتھ طویل مشورہ کیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ سراج کے لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت خونی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم فرح، عاطف، بالو اور شاہین وغیرہ کی حفاظت کا سوچیں۔ بے شک ہم رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں آتے جاتے ہوئے بے حد احتیاط سے کام

لیتے تھے مگر کسی بھی وقت یہ احتیاط دھری کی دھری رہ سکتی تھی۔

سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں عمران کے راوی روڈ والے پرانے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور اسی گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں گے۔ اقبال بھی اب چھٹی گزار کر بالکل فٹ ہو چکا تھا اور سیٹھ سراج اینڈ کمپنی کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ ایک دن میں، عمران اور اقبال خاموشی سے راوی روڈ والے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ جیلانی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ حفاظت کی غرض سے رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں ہی موجود رہے گا۔

جس روز ہم شفٹ ہوئے، اسی روز نصرت نے ثروت کے ہمراہ پیر احمد تھانوی صاحب سے ملاقات بھی کی۔ یہ ایک تفصیلی ملاقات تھی۔ یقیناً ثروت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ملاقات نصرت نے میرے ایما پر کرائی ہے اور نہ ہی اس کے گمان میں یہ بات تھی کہ چند روز پہلے اتفاقاً میری اور نصرت کی ایک نتیجہ خیز ملاقات ہو چکی ہے۔

جس وقت نصرت اور ثروت ایک رکشے پر سوار ہو کر احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لئے آئیں، میں اور عمران بھی وہیں موجود تھے۔ تاہم ہم ان دونوں کے سامنے نہیں آئے۔ ثروت زرد پھولوں والی ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں...... جیسے بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کا ایک روشن کنارہ۔ وہ جب چلتی تھی تو ایک عجیب جاذبیت سی اس کے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی تھی۔ وہ انتظار گاہ میں چلی گئیں۔ ہم اس کمرے کے پہلو والے کمرے میں چلے گئے جہاں...... تھانوی صاحب اپنے مریضوں اور عقیدت مندوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ ایک قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے تھے۔ ان کے عقب میں ایک بہت بڑی الماری تھی جس میں یونانی طب کی مختلف دوائیں پڑی رہتی تھیں۔ وہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ اتنا پختہ ہوتا تھا کہ وہاں سے اٹھنے سے پہلے دعا ان پر اثر کر جاتی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ثروت کی باری بھی آ گئی۔ نصرت باہر ہی رہی تھی۔ ثروت نے اکیلے میں احمد تھانوی صاحب سے ملاقات کی۔ ہم انہیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے مگر چونکہ دروازے کے بالکل قریب موجود تھے اس لئے مدھم آوازیں ہم تک ضرور پہنچ رہی تھیں۔ ثروت کے بیشتر حالات تو احمد تھانوی صاحب پہلے ہی جانتے تھے۔ ثروت نے کچھ مزید تفصیلات بتائیں۔ تاہم اس نے یہ بات احمد تھانوی صاحب پر ظاہر نہیں کی کہ وہ یوسف کی بیوی ہونے کے باوجود بیوی نہیں ہے۔ ساری باتیں سننے کے بعد احمد تھانوی صاحب نے

شرعی صورتِ حال بیان فرمائی۔ انہوں ء نے کہا۔ ''ہمارے دین میں طلاق...... ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور اس سے حتی الامکان بچنے کا حکم ہے...... بہرحال، یہ ایک جائز عمل ہے اور بعض صورتوں میں تو ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک نیک خصلت لڑکی بدقسمتی سے ایک ایسے شوہر کے پلے بندھ جاتی ہے جو بعدازاں عادی شرابی، جواری نکل آتا ہے...... تو ساری زندگی اس شخص کے ساتھ بربادی کرنے کے بجائے اور اپنے ہونے والے بچوں کا مستقبل بھی تاریک کرنے کے بجائے اس بی بی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ناپسندیدہ عمل کو اختیار کر لے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں بھی اگر کوئی کم فہم شخص اپنی بیٹی، بہن یا بچی سے یہ کہتا ہے کہ جس گھر میں اس کی ڈولی گئی ہے، اسی گھر سے اس کا جنازہ نکلنا چاہئے تو وہ بالکل غلط کہتا ہے۔''

ثروت نے دبی آواز میں کہا۔ ''حضرت! یہ حکم بھی تو ہے کہ اگر پہلی بیوی اپنے شوہر پر اپنا حق چھوڑ کر یا اس حق کو کم کر کے اس کے ساتھ رہنا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے؟''

''بالکل، ایسا کہا گیا ہے لیکن عام طور پر ان عورتوں کے لئے ہے جو بڑی عمر کی ہوں، بال بچے دار ہوں یا اس قسم کی کوئی اور وجہ ہو۔ لیکن بیٹی! جو صورتِ حال تم بتا رہی ہو، وہ اور طرح کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ شک بھی ہو رہا ہے کہ تم طلاق کے حوالے سے کسی طرح کے وہم میں بھی جکڑی ہوئی ہو۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے کھل کر بیان کرو۔''

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید ثروت اشک بار ہو گئی تھی۔ جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔ کوئی اڑتا اڑتا سا لفظ ہی ہمارے کانوں تک پہنچ پا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے والدین اور پھر ناصر بھائی کی موت کا ذکر کر رہی تھی اور احمد تھانوی صاحب کو بتا رہی تھی کہ ان پے در پے اموات نے اس کا دل بہت ہلکا کر رکھا ہے۔

یہی وقت تھا جب اچانک قریبی کمرے میں چلانے کی مردانہ آوازیں ابھریں۔ یہ چودھرانی کا بیمار بیٹا نیازا تھا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر تھا پھر بھی کسی وقت اس کا دیوانہ پن عود کر آتا تھا۔ اب بھی ہلکے ہلکے بادل موجود تھے۔ شاید اسے کہیں بجلی کی چمک نظر آتی تھی یا تھوڑی بہت گرج سنائی دی تھی۔ وہ پکار رہا تھا۔ ''یا اللہ کرم...... یا اللہ کرم...... حضرت جی بچاؤ...... حضرت جی کہاں ہو......''

چودھرانی کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی......

''حضرت جی کہیں نہیں گئے۔ وہ یہیں ہیں۔ تم بس منہ میں پڑھتے رہو۔''

''کھڑکیاں بند کر دو۔ برآنڈے کی کھڑکیاں بھی بند کر دو۔'' نیازا چلایا۔

میں اور عمران نیازے کے کمرے کی طرف گئے۔ یہاں کا منظر عبرت ناک تھا۔ نیازا پلنگ سے اتر آیا تھا اور اپنے لحاف سمیت کمرے کے ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ پورے کا پورا لحاف سے ڈھکا ہوا تھا اور لحاف کے اندر سے ہی واویلا کر رہا تھا۔ پورا لحاف لرز رہا تھا۔ چودھرانی نے لحاف سمیت نیازے کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ احمد تھانوی صاحب کا مرید خاص فرید بھی نیازے کو تسلی تشفی دینے لگا۔ کچھ دیر بعد نیازے کی بے چینی میں کمی آ گئی...... ہم واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ دروازے کی دوسری جانب ثروت اور احمد تھانوی صاحب میں گفتگو جاری تھی۔ احمد تھانوی صاحب قدرے بلند آواز میں بول رہے تھے۔ ان کے بیشتر الفاظ ہماری سماعت تک پہنچ رہے تھے...... وہ کہہ رہے تھے۔ ''...... سمجھو، وہم بس گھن کی طرح ہوتا ہے۔ یہ آوازیں جو تم ابھی سن رہی تھیں، یہ بھی ایک ''ضدی وہم'' کا شاخسانہ ہیں۔ اس بندے کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی اس کی جان لے لے گی۔ ذرا سے بادل آ جائیں تو خوف سے اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ یہ وہم اسی طرح بندے کے ذہن کو جکڑتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کو طاقت اور شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اللہ پر اور اس کی قدرت پر ہمارا یقین جتنا پختہ ہو گا، ہمارے اندر واہموں اور وسوسوں سے لڑنے کی قوت اتنی ہی بڑھ جائے گی......''

ثروت اور احمد تھانوی صاحب کے درمیان یہ گفتگو پانچ دس منٹ مزید جاری رہی پھر اگلے مریض کی باری آ گئی۔

ہم شام کے بعد تک وہیں رہے۔ ثروت اور نصرت جا چکی تھیں۔ دیگر لوگ بھی رخصت ہو چکے تھے۔ احمد تھانوی صاحب رات کا کھانا بہت جلدی کھا لیتے تھے، یعنی شام کے فوراً بعد انہوں نے مجھے اور عمران کو بھی کھانے میں شریک کیا۔ کھانا بالکل سادہ تھا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ احمد تھانوی صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس لڑکی کے دل میں کوئی گہرا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا شوہر یوسف بس اپنے مطلب کے لئے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ یوسف کے گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔ پھر بھی وہ اس سے علیحدہ ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنے لئے کسی بہت بڑی مصیبت کو دعوت دے لے گی۔''

''حضرت! اپنے اس خوف کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ شاید وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ اس کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔“

”کیا ایسا تو نہیں کہ یوسف نے در پردہ اسے کوئی خطرناک دھمکی دے رکھی ہو یا کسی اور طرف سے اسے دھمکایا جا رہا ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ ہو بھی سکتا ہے لیکن بظاہر مجھے اس طرح کا امکان نہیں لگ رہا۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں جو تھوڑا بہت بتا رہی ہے، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ دھیمے مزاج کا شخص ہے۔ اپنی سوکن کے حوالے سے بھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔“

”اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے حضرت؟“

احمد تھانوی صاحب نے قہوے کا گھونٹ لے کر اپنی سفید براق داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ہولے سے بولے۔ ”کسی طرح اس خوف کا کھوج لگنا چاہئے جو اس کے اندر جگہ بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کوئی بہت قریبی عزیز اسے اپنے اعتماد میں لے اور اس کا اصل مسئلہ معلوم کرے......“

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

O......❖......O

ثروت سے رابطہ کرنا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ میں نصرت کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ میرے پاس اس کا موبائل نمبر بھی موجود تھا۔ میں دو تین بار رازداری کے ساتھ اس سے بات چیت بھی کر چکا تھا۔ میں نے اس سے ثروت کا موبائل فون نمبر لے لیا اور پھر ایک رات اس سے رابطہ کیا۔

میں نے تین بار کال کی۔ تیسری مرتبہ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ ”ہیلو......کون؟“ اس کی پریشان آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! میں تابش بول رہا ہوں۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔ مجھے تم سے ایک بہت خاص بات کرنی ہے۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر ثروت کی گھمبیر آواز ابھری۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ......آپ مجھ سے رابطہ نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر بالکل قائم ہوں ثروت......لیکن ایک ایسی بات ہے جسے کئے بغیر چارہ نہیں۔ اگر میں یہ بات نہیں کروں گا تو تمہارا نقصان ہوگا اور یقین کرو ثروت...... میں تمہارا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”اس بارے میں بھی تمہیں بتا دوں گا......بس ایک بار......ایک آخری بار مجھ سے مل لو اور یہ ملاقات میں اپنے لئے نہیں، تمہارے لئے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا رکھنا ثروت...... تمہاری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رہی ہے اور اب بھی ہے۔“

وہ جیسے سخت الجھن میں تھی۔ چند سیکنڈ بعد کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”تابش! آپ کو جو کہنا ہے فون پر ہی کہہ لیں......“

”اگر ایسی بات ہوتی ثروت تو میں تمہیں کبھی زحمت ہی نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم شادی شدہ ہو۔ تمہاری بہت سی مجبوریاں ہیں......لیکن ہمارا ایک بار ملنا بہت ضروری ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی تمہیں ایسی تکلیف نہیں دوں گا۔“

”یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تابش! پلیز آپ مجھے کسی امتحان میں نہ ڈالیں۔ آپ عورت کی مجبوریوں کی بات تو کر سکتے ہیں مگر ان مجبوریوں کو سمجھ ایک عورت ہی سکتی ہے۔ میرے شوہر کو کسی طور قبول نہیں ہوگا کہ میں انہیں بتائے بغیر کسی شخص سے ملوں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔“

میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ آخر میرا دل بھر آیا۔ مجھے بڑا مان تھا اس پر۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں دل کی گہرائیوں سے کوئی التجا بھی اس کے سامنے کروں گا...... وہ اسے رد نہیں کرے گی لیکن آج وہ رد کر رہی تھی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ؟ کتنی سخت ہو چکی تھی۔ میرے بغیر ایک پل نہ گزارنے والی، میری ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جانے والی، میری ایک آواز پر دس بار ”جی“ کرنے والی آج میرے کشکول میں ایک ملاقات کی خیرات بھی نہیں ڈال رہی تھی...... حالانکہ وہ جانتی تھی، میں جو کچھ کہوں گا اس کے فائدے میں کہوں گا۔ میں اندر سے کراہ اٹھا۔ اپنی مجبوریوں کو جواز بنا کر کتنی جلدی اجنبی بنتی ہیں یہ عورتیں...... کتنی سنگ دلی سے راہیں بدلتی ہیں......اور پھر مڑ کر بھی ان راہوں کی طرف نہیں دیکھتیں۔ میری آواز بھرا گئی اور میں نے فون بند کر دیا۔

ہم عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی تھے۔ یہ گنجان آبادی تھی۔ قریب کی تنگ سڑک پر موٹر سائیکلوں اور رکشاؤں وغیرہ کا ہلکا شور سنائی دیتا تھا۔ کبھی کسی خوانچے والے کی آواز ابھرتی تھی اور اس شور میں دور تک سرایت کر جاتی تھی۔ رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ عمران اور اقبال کافی دیر تک کارڈ کھیلنے کے بعد سو چکے تھے۔ بس میں جاگ رہا تھا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کہیں پڑوس کے کسی گھر میں ٹیپ ریکارڈر سے موسیقی کی لہریں ابھر رہی تھیں۔ سریلی آواز در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن......

اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑ نا اچھا......

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ یہ ثروت کا نمبر ہی تھا۔ ’’ہیلو۔‘‘ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’ثروت بول رہی ہوں۔‘‘

’’ترس آگیا؟‘‘

’’لیکن آپ وعدہ کریں کہ...... یہ آخری بار ہوگی۔‘‘ وہ نمناک آواز میں بولی۔ ’’اس کے بعد چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ رابطہ نہیں کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے ثروت۔‘‘ میں نے گہری سانس لی۔ ’’اس کے بعد تمہیں ملنے پر مجبور نہیں کروں گا۔‘‘

کچھ دیر تک خاموش رہی۔ تب ثروت نے پوچھا۔ ’’کہاں ملنا ہے؟‘‘

’’جہاں تمہیں آسانی رہے۔‘‘

’’میرے لئے تو گھر میں رہنے سے زیادہ آسانی کہیں نہیں ہے آپ بتائیں۔‘‘

’’کینال روڈ کے ’’کے ایف سی‘‘ کے سامنے آجانا۔ میں تمہیں وہاں سے پک کرلوں گا۔ اگر وہیں بیٹھنا ہوگا تو بھی ٹھیک ہے۔‘‘

’’وہیں بیٹھ جائیں گے۔‘‘ ثروت نے کہا۔ ’’میں تین بجے آجاؤں گی اور...... زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔ مجھے پانچ بجے تک گھر واپس پہنچنا ہوگا۔‘‘

’’ٹھیک ہے ثروت۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اگلے روز تین بجے سے پہلے ہی میں ریسٹورنٹ کے سامنے موجود تھا اور ثروت کا انتظار کررہا تھا۔ میرے پاس عمران والی مہران گاڑی تھی۔ میں اکیلا ہی آنا چاہتا تھا لیکن عمران اس پر ہرگز راضی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیٹھ سراج کے ہرکارے ہمارے اردگرد موجود ہیں، ان حالات میں وہ مجھے شہر کی سڑکوں پر تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ جیلانی والی کار میں میرے آس پاس موجود تھا۔ ہم موبائل پر کسی بھی وقت ایک دوسرے سے رابطہ کرسکتے تھے۔

تین بجے کے فوراً بعد ایک رکشا ریسٹورنٹ کے سامنے آکر رکا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ثروت اس میں سے نکلی۔ حسب سابق وہ ایک طویل چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی دکھائی دیتی تھی۔ وہی بادلوں میں سے چاند کا روشن کنارہ۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ’’یہاں سے چلیں۔‘‘

’’خیریت تو ہے؟‘‘ میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

’’بس چلیں آپ۔‘‘ وہ دوبارہ بولی اور چہرے پر چادر کا نقاب کچھ اور اوپر کرلیا۔

میں نے گاڑی موڑی اور بڑی سڑک پر آگیا۔ ثروت نے کہا۔ ’’وہاں چچا اختر گاڑی سے اتر رہے تھے۔‘‘

’’یہ تو پھر اچھا کیا کہ نکل آئے۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل میرا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے گاڑی ضرور دیکھی تھی لیکن اس میں سے کسی کو اترتے نہیں دیکھا تھا۔ ’’اب کہاں جانا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’مجھے نہیں پتا۔‘‘ اس نے کہا اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

ایک دم میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے پرانے گھر کی طرف موڑ دیا۔ ہمارا یہ آبائی مکان پچھلے تقریباً چار سال سے خالی ہی پڑا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد فرح یا عاطف کی کبھی یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس گھر کا رخ کرسکتے۔ ہاں، عاطف نے اتنا ضرور کیا تھا کہ عمران سے کہہ کر ایک ادھیڑ عمر بے اولاد میاں بیوی کو یہاں رہائش دلوا دی تھی...... سات آٹھ ماہ پہلے، بیوی فوت ہوگئی اور ادھیڑ عمر شخص یہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت عمران تو یہاں موجود نہیں تھا تاہم جیلانی نے کوشش کی تھی اور ادھیڑ عمر شخص کو یہاں روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ یوں ہمارا یہ گھر...... ہماری یادوں کا مرکز...... بے آباد ہونے کے باوجود پوری طرح بے آباد نہیں ہوا تھا۔

میں ان گلی کوچوں میں داخل ہوا تو یادوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔ میں نے پی کیپ پہن رکھی تھی...... سن گلاسز بھی لگا لئے۔ مجھے امید تھی کہ چلتی گاڑی میں سے کوئی فوراً ہی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ آخری بار ان گلی کوچوں میں میرے قدم کب پڑے تھے؟ آخری بار میرے قدم تب پڑے تھے جب میں سکون بخش دوا الیگزاٹائل کھا کر گھر سے نکلا تھا۔ ایک طرف ثروت کی یادوں نے مجھے بری طرح گھیرا ہوا تھا، دوسری طرف میری چچی کی بھتیجی آرسہ نے مجھ پر جذبات اور جنس کا جال پھینکا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے دوپہر کو گیارہ بجے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور یہ عندیہ بھی دے رکھا تھا کہ اس فیصلہ کن ملاقات میں وہ اپنی گناہ ’’خود سپردگی‘‘ کے ضمن میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ میں گناہ کے اس ریشمی جال سے بچ کر نکلا تھا اور اس چلڈرن پارک کی طرف روانہ ہوگیا تھا جہاں سیٹھ سراج کی صورت میں ’میری زندگی کا بدترین المیہ میرا انتظار کررہا تھا۔ جب ماضی کی اس چمکیلی دوپہر میں میرے قدم اس تنگ سڑک پر پڑ رہے تھے، میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایک دو گھنٹے کے لئے

نہیں، کئی برس کے لئے ان گلی کوچوں سے جدا ہوا رہا ہوں...... چلڈرن پارک میں وہی کچھ ہوا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں۔ سیٹھ سراج کے بے رحم گماشتوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کیا اور میں گھر لوٹنے کے بجائے کہیں کا کہیں نکل گیا۔

آج میں پھر اسی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا جس کی دوسری جانب میرا ماضی دفن تھا۔ ''یہاں کون رہتا ہے آج کل؟'' ثروت نے بے حد اداس لہجے میں پوچھا۔

''ہیں ایک انکل۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

''میں نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے دو تین بار ہارن دیا تو گھر کا چھوٹا گیٹ کھل گیا اور پچپن ساٹھ سال کا ایک شخص باہر نکل آیا۔ اس کی کھچڑی داڑھی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام حیات محمد تھا۔ چند دن پہلے جیلانی نے حیات کو فون پر بتا دیا تھا کہ اس گھر کا مالک گھر دیکھنے کے لئے آئے گا۔ حیات نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ یقیناً اس نے گھر کی دیوار پر میری تصویر دیکھی ہوگی۔ گھر کے کامن روم میں جو گروپ فوٹو تھا، اس میں بھی میں موجود تھا۔ حیات نے تھوڑی سی کوشش سے مجھے پہچان لیا اور فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری اور ثروت کی آنکھوں کے سامنے یادوں کا ایک جہان آباد ہو گیا۔ پچھلے چار ساڑھے چار سالوں میں گھر کے اندر بہت کم تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ حیات محمد اور اس کی مرحومہ بیوی نے بس ایک کمرا ہی اپنے استعمال کے لئے کھولا ہوا تھا۔ باقی کمرے مقفل رہتے تھے۔ ہاں، مہینے میں پانچ چھ بار ان کی صفائی ستھرائی حیات محمد اور اس کی بیوی ہی کیا کرتے تھے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ فرح کی الماری، اس کے لکھنے کی میز...... عاطف کا کمرا۔ اس کا جہازی سائز ٹیپ ریکارڈر، دیواروں پر آویزاں ٹینس ریکٹ ماں جی کا کمرا، ان کا چوبی تخت جس پر جائے نماز بچھی تھی، قرآن مجید کے نسخے جو شیشے کی ایک الماری میں بڑی حفاظت سے رکھے تھے، بستر پر ان کا تہ کیا ہوا ایرانی کمبل اور پلنگ کے نیچے ان کی چپل اور جوتی۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ سب کچھ وہیں تھا لیکن ماں نہیں تھی۔ وہ آواز نہیں تھی جو بسم اللہ کہتی تھی اور وہ گود نہیں تھی جس میں، میں اپنا تھکا ہارا سر رکھتا تھا۔

ہم کمروں میں گھومتے رہے اور یادوں کو اپنے اندر سمیٹتے رہے۔ حیات محمد نے ہماری کیفیت دیکھ کر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا اور باہر لان میں بیٹھ گیا۔

ہم کچن میں آ گئے۔ کچن کی الماریوں کے خانوں میں سب کچھ ویسے کا ویسا دھرا تھا...... چھوٹے چھوٹے خوش نما ڈبے...... نمک، چینی، ہلدی، مرچیں، کالا زیرہ، سوکھا دھنیا...... اَن

گنت پکوانوں کی خوشبوئیں میرے نتھنوں میں گھسنے لگیں۔ وہ سارے لذیذ پکوان جو ہماری ماں نے اس کچن میں کھڑے ہو کر ہمارے لئے بنائے تھے اور پھر ہمیں کھاتے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئی تھیں...... بہت سی گم شدہ آوازیں سماعت سے ٹکرائیں، چپاتیاں بنانے کی آواز...... مجھے لگا، میری ماں یہیں کہیں ہے۔ وہ ابھی کسی اوٹ سے نکلے گی اور ڈانٹ کر کہے گی۔ اتنی دیر گھر سے باہر رہے۔ میں نے کوئی پچاس بار فون کیا ہے۔ ایسے نواب زادے ہو کہ فون ہی نہیں اٹھاتے۔

میں نے آنسو پونچھے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ صرف ماں کی یادیں ہی نہیں تھیں، اَن گنت یادیں تھیں جو گوشے گوشے سے نکل کر دل و دماغ پر یلغار کر رہی تھیں۔

کھڑکی کے سامنے ہی سرخ گلاب کے وہ خوبصورت پودے تھے جو فرح نے بڑی چاہت سے لگائے تھے۔ ایک دفعہ ثروت ہمارے گھر آئی تو میں نے بہت سی کلیاں توڑ کر ثروت کو دیں پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فرح مصنوعی غصہ دکھاتی اور مجھ سے لڑا کرتی کہ اگر میں نے باجی سے اتنا زیادہ اور یوں بار بار اظہارِ محبت کرنا ہے تو پھر میں اپنے لئے لان میں ایک درجن علیحدہ پودے لگا لوں۔ اور سامنے ہی وہ گول ستون تھا جس کی اوٹ سے میں رات کے وقت کچن میں جھانکتا تھا۔ کچن میں روشنی ہوتی تھی امی، فرح اور ثروت وہاں مصروف ہوتی تھیں اور صرف ثروت کو پتا ہوتا تھا کہ میں ستون کی تاریک اوٹ میں کھڑا ہوں اور اس کی ہر حرکت دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''ثروت! وہ اوپر والی بالکونی دیکھ رہی ہو؟''

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پتا ہے، ایک کٹی پتنگ پکڑنے کی کوشش میں تم یہاں گر پڑی تھیں۔ میں تمہیں اٹھانے آیا تھا اور خود بھی پھسل گیا تھا...... اور گرا بھی تمہارے اوپر تھا۔ امی نے بہت ڈانٹا تھا کہ بیچاری کی کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی تو پھر......''

ثروت کی آبگینہ آنکھوں میں یادوں کی خوش نما چمک ابھری۔ یوں لگا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر فوراً یہ چمک بجھ گئی۔ وہ رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ سنہرے ماضی کی جلترنگ جیسی گونج نے اس کے دل و دماغ میں بھی ارتعاش پیدا کیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ثروت کو یہاں لا کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ در و دیوار، یہ ماحول، یہ یادوں کا جھرمٹ یہ سب کچھ اسے متاثر کر رہا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت میں کچھ تبدیلی

واقع ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اس بات کے لئے بہت مناسب تھی جو میں اس سے کرنا چاہ رہا تھا۔

ہم کامن روم میں آ کر بیٹھے تو حیات محمد نے کئی کھانے پینے کی اشیاء لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ جوس، نمکو، چپس، کیک اور کوک وغیرہ۔ یقیناً یہ وہ ابھی سامنے والے جنرل اسٹور سے لے کر آیا تھا۔ وہ کچن میں چائے بنانے چلا گیا تو ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چھوٹی سی تمہید باندھنے کے بعد میں نے کہا۔ ''ثروت! تمہیں پتا ہے کہ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہم اسی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم ایک ایسے شیشے کی طرح ہو میں جس کے آر پار آسانی سے دیکھ سکتا ہوں اور تمہیں پتا ہے کہ اس وقت میں کیا دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! جب پچھلے ہفتے میں نے تمہیں اس شاپنگ مال میں پہلی دفعہ دیکھا تو تمہیں دیکھنے کے چند ہی منٹ بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم کسی بڑی الجھن میں گرفتار ہو۔ کوئی ایسی پریشانی ہے تمہارے ساتھ جو تمہیں مسلسل ایک تیز آنچ دے رہی ہے۔''

''اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں تو پھر؟''

''تم نے جتنی بار بھی یہ بات کہی ہے ثروت...... مجھے تمہاری آنکھیں چہرے سے علیحدہ نظر آئی ہیں۔ اور تمہاری آنکھوں کی اس بے ساختہ ادا کو میں بہت اچھی طرح جانتا پہچانتا ہوں۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''تابش! آپ ان باتوں کو چھوڑیں۔ آپ بتائیں کہ مجھے کیا خاص بات بتانا چاہ رہے تھے؟''

''وہ یہی بات تھی ثروت! میں پچھلے چند دنوں میں تمہارے لئے بہت پریشان رہا ہوں اور میری نیت پر کسی طرح کا شک نہ کرنا۔ میں کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتا جس کی وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی اور تمہاری عزت پر ذرا سا بھی حرف آئے۔ لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میں تمہیں اس طرح کسی مصیبت میں دیکھوں اور منہ پھیر کر چلا جاؤں۔ ہمارے درمیان بس یہی ایک رشتہ تو نہیں تھا ثروت۔''

وہ بولی۔ ''ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتے جس کی وجہ سے میری عزت اور میری شادی شدہ زندگی پر کوئی حرف آئے اور دوسری طرف ایسا کر بھی رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ثروت؟''

''اگر میرے شوہر مجھے اس طرح آپ کے ساتھ اس گھر میں بیٹھے اور اس کمرے میں باتیں کرتے دیکھ لیں تو کیا وہ اسے برداشت کر لیں گے؟''

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو ثروت! کیا ہمارے درمیان کوئی اور تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیا ہم نارمل انداز میں کوئی مسئلہ ڈسکس نہیں کر سکتے؟''

''بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے تابش۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''عورت بڑی کمزور شے کا نام ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ آپ وہ چار سال پہلے کے واقعات بھولے تو نہیں ہوں گے۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! پرانے زخموں کو چھیڑو گی تو خون رِسے گا۔ تب جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میرا بھی نہیں تھا۔ اس واقعے نے تو ہم دونوں کو ڈسا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، میں تمہارے ساتھ تھا ثروت۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی پھر بھی میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے تم سے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی اور اس مہلت میں، میں نے امی کو بھی راضی کر لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا لیکن تم خاموشی سے سب کچھ چھوڑ کر چلی گئیں۔ تم نے مجھ پر بھروسا نہ کیا ثروت......'' میری آواز بھرا گئی۔

وہ خاموش رہی۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے معاف کر دو ثروت تو میں کہوں گا کہ تم نے اس وقت کم ہمتی کا مظاہرہ کیا...... اور یہی کچھ تم اب بھی کر رہی ہو۔ ہاں ثروت! تم ایک بار پھر کم ہمتی دکھا رہی ہو۔ میں تمہارے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ تمہاری پُرسکون اور بہت خوش گوار ازدواجی زندگی کا سارا ماجرا مجھے پتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گھر میں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ ''آپ کو جس نے بتایا ہے تابش، غلط بتایا ہے۔ اور اگر...... اگر یہ صحیح بھی ہوتا تو میں ہرگز نہ چاہتی کہ آپ میرے ذاتی معاملوں میں اس طرح دخل دیں۔'' اس کی آواز لرزنے لگی۔

''ثروت...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے...... میں تو......''

''پلیز تابش...... پلیز!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کے پاس مجھے بتانے کے لئے کچھ نہیں۔ آپ نے صرف مجھ سے ملنے کے لئے ایک

بات گھڑی تھی...... مجھے بہت افسوس ہے تابش...... میں جا رہی ہوں......"

وہ تیزی سے واپس مڑی۔ "ثروت! میری بات تو سنو۔" میں نے اسے کندھوں سے تھاما۔

وہ ایک دم لرز گئی۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ "چھوڑ دیں مجھے۔ جانے دیں...... جانے دیں۔"

"میری بات تو سن لو ثروت۔"

"نہیں۔" اس نے مجھے زور سے جھٹکا۔ میرے گریبان کا بٹن ٹوٹ گیا۔ میں جو سخت ترین ضربیں سہہ لیتا تھا، بدترین درد بھی سہار لیتا تھا، اس نازک لڑکی کے دیئے ہوئے جھٹکے سے اندر ہی اندر کراہ اٹھا۔ مجھے لگا جیسے میں مسمار ہو گیا ہوں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میرے بازو دو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح میرے اطراف میں جھول رہے تھے۔

اس نے اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر مڑی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ حیات محمد بھی ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ کھٹکے پر رکھا مگر اس کو کھولا نہیں۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے ماتھا دروازے (گیٹ) کی آہنی چادر سے ٹکا دیا اور اشک بہانے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ باہر نہیں نکلے گی۔ میں دھیمے قدموں سے اس کے پاس پہنچا...... ثروت! پلیز ایسے مت کرو۔" میرا لہجہ دھیما اور دل فگار تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر میرے ساتھ کامن روم میں بیٹھی تھی۔ حیات محمد اسے پانی کا گلاس تھما کر چلا گیا تو وہ اپنی تر بتر پلکیں اٹھائے بغیر بولی۔ "مجھے معاف کر دیں تابش......"

"معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ میں تمہیں زبردستی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے گداز لبوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن بات اس کے لبوں تک نہیں آئی۔ ہاں، آنسو اس کی بلوری آنکھوں تک ضرور آ گئے۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اپنا چہرہ آنچل میں چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل کا غبار تھوڑا کم ہوا تو بولی۔ "تابش! میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے کہ...... نصرت کو کچھ ہو جائے گا اور جو کچھ ہو گا اس کی ذمے دار میں ہوں...... بس میں ہوں گی۔"

"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی...... تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"نصرت...... بیمار ہے تابش...... مصیبت میں ہے...... اور جو کچھ ہے میری وجہ سے

ہے۔"

"کیا ہے اسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں لیکن جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔ میں اس کی ذمے دار ہوں۔ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا بوجھ اس کے پیاروں پر ہی آتا ہے۔"

"تم نے کیا گناہ کیا ہے ثروت! تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم صرف وہم کر رہی ہو۔"

"گناہ نہیں کیا لیکن غلط سوچا تو تھا۔ ایسا خیال تو ذہن میں آیا تھا جو نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"کیا خیال ذہن میں آیا تھا؟" میں نے اپنائیت بھرے نرم لہجے میں پوچھا۔

وہ آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ کر اس میں اپنے آنسو جذب کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "میں نے یوسف کو چھوڑنے کا سوچا تھا، ان سے طلاق لینے کا سوچا تھا...... اور وہ سب کچھ سوچا جو مجھے نہیں سوچنا چاہئے تھا اور اس کی سزا مجھے فوراً ملی۔ میری نصرت......" ثروت کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

چند لمحے توقف کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ "نصرت کو کوئی تکلیف ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

"کس قسم کی تکلیف ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"اس کو جگر کی تکلیف ہے۔"

"لیکن ہے کیا؟"

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں اور نہ پتا کرنے کی ہمت ہے۔ لیکن وہ بہت بیمار ہے۔ دیکھنے میں زندہ نظر آتی ہے لیکن بیماری اس کے اندر تک اتری ہوئی ہے......"

میں نے طویل سانس لی۔ میرے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے میں نے کہا۔ "ثروت! کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا آج کے دور میں علاج نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت نے بیماریاں بعد میں پیدا کیں، ان کے علاج پہلے بنائے۔ کیا تم نے اس کے کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرائے ہیں؟"

"ہاں...... ٹیسٹ بھی ہوئے تھے۔"

"پھر؟"

"میری کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی...... کہ ان کی رپورٹیں دیکھ سکوں۔ یہ رپورٹیں بس لفافوں میں بند پڑی رہ گئیں۔"

"یہ کیا بچپنا ہے ثروت! تم نے اس کے ٹیسٹ کرائے اور پھر رپورٹیں بھی نہیں دیکھیں

اور کہہ رہی ہو کہ اسے جگر کی تکلیف ہے۔''

وہ سسک کر بولی۔''مجھے پتا ہے کہ تکلیف ہے...... لیکن شاید میں اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی۔ میں سوچتی ہوں کہ جو کچھ ہے...... کم ہے یا زیادہ ہے، یا بہت زیادہ ہے بس چھپا ہی رہے...... اور قدرت اسی طرح نصرت کو صحت دے دے۔ میں اس کا روحانی علاج کروا رہی ہوں...... رات دن دعائیں بھی کر رہی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اوپر والا یہ دعائیں ضرور سنے گا۔ وہ اب پہلے سے کافی بہتر نظر آتی ہے۔''

میں نے کہا۔''ثروت...... مجھے روحانی علاج سے ہرگز انکار نہیں لیکن دعا اور دوا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس دنیا کو اسی لئے دارالاسباب کہا جاتا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سبب مہیا کرتے ہیں...... پھر اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔ رزق، شفا، خوشی، کامیابی ایسی سب چیزوں کے لئے دعا اور کوشش دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''لیکن...... لیکن وہ تو قادر مطلق ہے نا۔ وہ تو سب کے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔''

''اس کو معجزہ کہتے ہیں لیکن معجزے تو کبھی کبھی رُونما ہوتے ہیں۔ اگر وہ عام ہو جائیں تو پھر معجزے ہی نہ رہیں۔ ہمیں معجزوں کی آس ضرور رکھنی چاہئے لیکن ہر وقت انہی کے انتظار میں نہیں رہنا چاہئے۔ اب...... اب تمہاری یہ منطق بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم نے جگر وغیرہ کی کسی تکلیف کے لئے نصرت کے ٹیسٹ تو کرائے ہیں لیکن رپورٹوں کو کھول کر ہی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے......''

''بس...... میں خود کو کسی بڑے وہم میں ڈالنا نہیں چاہتی۔''

''بڑے وہم میں تو تم خود کو اب ڈال رہی ہو۔ ہو سکتا ہے ثروت کہ وہ رپورٹیں صحیح ہوں یا اتنی خراب نہ ہوں، جتنا تم انہیں سمجھ رہی ہو۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہے بھی تو پھر وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ایسی بیماریوں کے علاج کے لئے وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ثروت! تمہاری یہ بات بھی بالکل منطق کے بغیر ہے کہ تم نے اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور اس کے نتیجے میں نصرت بیمار ہو گئی۔ یہی واہمے اور "Illusions" ہوتے ہیں جو ہمیں آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا سے بہت دور لے جاتے ہیں۔''

''ہر کام کا پھل تو ہوتا ہے نا۔'' وہ بدستور اشک بار تھی۔

''بالکل ہوتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اور برے کا برا۔ لیکن تم نے ایسا کون سا برا کام کیا یا کرنے کا سوچا جس کے نتیجے میں نصرت پر کوئی بوجھ آیا۔ اگر تم نے بہ حالت مجبوری اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا تو یہ گناہ نہیں ہے۔ مذہب، معاشرہ، قانون سب تمہیں اس کا

حق دیتے ہیں......''

''لیکن...... یہ فیصلہ کرنا بھی تو آسان نہیں کہ کیا اس طرح کے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ میں ایسا سوچتی۔''

وہ اپنے مؤقف پر بہت مضبوط نظر آتی تھی...... میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔''ثروت! یہ ایک لمبی بحث ہے اور شاید ہم اس قابل بھی نہیں کہ اس پر کوئی بہت معتبر رائے دے سکیں۔ اب جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ نصرت بیمار ہے...... زیادہ ہے یا کم ہے، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اگر ہم اس بیماری کی طرف سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے رکھیں گے تو یہ مسئلہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ تھوڑی سی ہمت دکھا کر تمہیں کم از کم وہ رپورٹس تو دیکھنی چاہئیں۔ کتنا عرصہ ہوا ہے وہ ٹیسٹ کروائے ہوئے؟''

''ایک سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ان دنوں ہم جرمنی میں ہی تھے۔ نصرت کو تیز بخار اور ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی۔ میں نے اسے معمول کا بخار سمجھا لیکن جب وہ جلد ٹھیک نہیں ہوئی تو ایک جرمن معالج کو دکھایا۔ وہ ہومیو پیتھک ٹائپ کے تھے اور جڑی بوٹیوں کے عرق سے علاج کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اکیلے میں بتایا کہ مریضہ کا جگر بہت زیادہ خراب ہو چکا ہے۔ وہ بظاہر اتنی بیمار نظر نہیں آ رہی، جتنی اصل میں ہے اور انہیں یہ بھی شبہ ہے کہ یہ جگر کا کینسر ہے۔ ڈاکٹر کی اس بات نے میری دنیا اندھیر کر دی۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی لیکن پھر کسی نہ کسی طرح میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جگر کا کینسر دنیا کے خطرناک ترین امراض میں سے ہے اور اس کے مریض شاذ و نادر ہی بچ پاتے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے، ہماری ممانی شفقت بھی دبئی میں اسی مرض کے ہاتھوں اپنی زندگی ہاری تھیں۔ ڈاکٹروں نے واحد حل یہ بتایا تھا کہ ان کے جگر کی پیوند کاری ہو گی لیکن اس سے بہت پہلے ہی ان کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔''

میں نے کہا۔''ہاں، مجھے وہ واقعات یاد ہیں۔''

ثروت نے گھمبیر لہجے میں بات جاری رکھی۔''میری سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ کیا کروں اس کے ساتھ ساتھ میرا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ قدرت مجھے اتنے سخت امتحان میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ناصر بھائی کے بعد نصرت بھی موت کے رستے پر چل پڑے۔ میں نے نصرت کو کچھ نہیں بتایا۔ اسے یہی معلوم ہے کہ اسے عام قسم کا یرقان ہے جو علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ دو ہفتے بعد میں نصرت کو ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے ایک دو ابتدائی ٹیسٹ کرائے۔ اس کے بعد چند اہم ٹیسٹ لکھ کر دئے۔ یہ ڈاکٹر بھی ابتدائی ٹیسٹوں

کی رپورٹ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ نئے ٹیسٹ کافی مہنگے بھی تھے۔ قریباً پانچ ہزار روپوں میں ہوئے...... ان دنوں میں دروازے بند کر کر کے روتی تھی اور کوئی غم دل کو آرے کی طرح کاٹتا رہتا تھا۔ انہی دنوں فرینکفرٹ کی ایک مسجد کے امام عبدالحمید صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہاں باقاعدہ مدرسہ بنایا ہوا تھا...... اور درس وغیرہ دیتے تھے۔ ان کی عمر چالیس سال کے قریب ہے...... بڑے پرہیزگار بندے ہیں۔ میں اکثر ان کو مدرسے کے لئے پیسے وغیرہ دیتی رہتی تھیں زکوٰۃ کے پیسے بھی ان کو ہی دیتی تھی۔ ان کو میری اس مصیبت کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دواؤں اور ڈاکٹروں وغیرہ کے چکر سے بچ جاؤں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ تو رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔ ایک بیماری ٹھیک کرتے ہیں تو ساتھ دس اور لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ وظیفے بتائے، اس کے علاوہ ایک خاص قسم کا معدنی پانی دم کر کے دیا۔ یہ پانی اردن اور فلسطین کے کچھ چشموں سے لایا جاتا ہے اور لوگ اس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ امام عبدالحمید صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے عجیب سا اطمینان حاصل ہوا۔ انہی دنوں نصرت کے ٹیسٹوں کی رپورٹس بھی آ گئی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں رپورٹس دیکھوں گی اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے ملوں گی...... اب ان باتوں کو قریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ نصرت کا علاج اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح امام عبدالحمید صاحب نے کہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر بھی لگتی ہے لیکن کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ بیماری اس کے اندر ہے اور کسی وقت ابھر کر سامنے آ جائے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”ثروت! اپنی بیماری کا نصرت کو کہاں تک پتا ہے؟“

”اسے کچھ پتا نہیں۔“ ثروت نے بڑے دکھی انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ بس اتنا ہی جانتی ہے کہ اس کے معدے، جگر میں تھوڑا بہت نقص ہے جس کی وجہ سے کسی وقت ہاتھ پاؤں پر سوجن آتی ہے یا بخار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مصیبت سے بے خبر ہر وقت میری پریشانیوں میں گھری رہتی ہے۔ یہاں شاہ جمال کے علاقے میں ایک اللہ والے ہیں...... پیر احمد تھانوی صاحب۔ تین دن پہلے مجھے ان کے پاس لے کر گئی ہوئی تھی۔ میرے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے اور میں اس کی صحت کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی رہتی ہوں۔“

ثروت کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

میں چند دن پہلے نصرت سے مل چکا تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت ہونے کے باوجود بجھی بجھی سی تھیں۔ رنگت بھی زردی مائل تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا پورا وجود کسی اضمحلال کی زد میں ہے۔

میں نے ثروت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ زیادتی تم اپنے ساتھ کر رہی ہو اور نصرت کے ساتھ بھی...... اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا ثروت۔ اگر تم میں وہ رپورٹس دیکھنے کا حوصلہ نہیں تو وہ مجھے دے دو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو میں ہر چیز کا سامنا کروں گا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مصیبت دور نہیں ہوتی۔ اس کا ہمت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔“

ثروت شدید ترین تذبذب میں نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف اسے میرے بے لوث رویے اور جرأت مندانہ انداز سے کچھ حوصلہ بھی مل رہا تھا۔

آخر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تابش! میں آپ کو وہ رپورٹس دکھا دیتی ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ برا سننے کا حوصلہ نہیں۔ آپ مجھے فوری طور پر ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ نہ اچھا، نہ برا۔“

”ٹھیک ہے ثروت! میں کچھ نہیں بتاؤں گا بلکہ میں نصرت کی پوری ذمے داری بھی لیتا ہوں۔ اگر مجھے ڈاکٹروں وغیرہ سے مشورہ کرنا پڑا تو خود ہی کروں گا۔ اور اگر نصرت کو علاج کی ضرورت ہوئی تو پھر بھی میں ہر طرح کے تعاون کو تیار ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے ثروت کہ حالات اتنے برے نہیں جتنے تم سمجھ لئے ہیں۔ تم نے ایک امکان کو ٹھوس حقیقت شکل دی ہے اور پھر اس ”حقیقت“ کے خوف کو اپنے اندر بڑھاتی چلی گئی ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ نصرت کی تکلیف اتنی سنگین ہو گی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یوں چل پھر نہ رہی ہوتی۔“

”جی؟“ ثروت نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ثروت کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں نصرت سے ملا ہوں، نہ ہی نصرت نے اسے بتایا تھا۔ میں نے جلدی سے بات بدلی۔ ”تم نے خود ہی بتایا ہے نا کہ نصرت بظاہر ٹھیک ہے اور روزمرہ کے کام بھی کرتی ہے۔“

ثروت نے کہا۔ ”میں آپ کو وہ رپورٹس کس طرح پہنچاؤں؟“

”جیسے تم مناسب سمجھو۔ یہیں آ کر دے جاؤ یا پھر ٹی سی ایس کر دو۔ میں تمہیں ایڈریس لکھوا دیتا ہوں۔“

”میں ٹی سی ایس کر دوں گی۔“

”لیکن فون پر مجھ سے رابطہ ضرور رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ میں کال کرتا رہوں اور تمہاری طرف سے جواب ہی نہ ہو۔“

وہ خاموش رہی۔ پھر ہولے سے بولی۔ ”اگر بات کرنا ضروری ہو تو رات دس بجے کے

بعد کال کیجئے گا۔"

ہمارے درمیان دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ میری حوصلہ افزا باتوں سے ثروت کو کافی ڈھارس ملی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نصرت کی رپورٹس ضرور بھجوائے گی۔

میرا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں، عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی موجود تھا۔ میں اور اقبال ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ عمران فون پر شاہین سے لڑائی کرنے میں مصروف تھا۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا۔ ثروت کی بھیجی ہوئی رپورٹس آ گئی تھیں۔

لفافہ میرے ہاتھ میں تھا اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اقبال اور عمران بھی اپنی اپنی مصروفیات چھوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ وہ دونوں بھی تمام تر صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ پچھلے تین چار دن کی پریشانی اب نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ یہ رپورٹس اچھی ہوں اور میں ابھی ثروت کو فون کر کے اسے خوش خبری سنا سکوں۔ ایسی سنگین نوعیت کی رپورٹس کو دیکھنا بھی کتنا اعصاب شکن عمل ہوتا ہے۔ میں نے لفافہ عمران کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ "تم کھولو۔"

وہ بولا۔ "یہ بھی تو ہم پرستی کی ایک قسم ہے۔"

بہرحال اس نے لفافہ کھولا۔ "فرینکفرٹ کی کوئی لیب تھی۔ بہرحال رپورٹس انگلش میں تھیں۔ سب سے اوپر نصرت کا نام لکھا تھا...... اور تاریخ درج تھی۔ نیچے دیگر Contents تھے۔ اے سے زیڈ تک سارے حرف کاغذوں پر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے سیاق و سباق اور پس منظر کی وجہ سے یہ کبھی روشن پیشانیوں والے فرشتوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی زہریلے ناگ بن جاتے ہیں۔ نصرت کی میڈیکل رپورٹس پر نظر آنے والے حرف بھی زہریلے ناگوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ہمیں پہلی رپورٹ دیکھنے کے ساتھ ہی پتا چل گیا کہ نصرت کو جگر کا کینسر ہے اور یہ کافی پھیلا ہوا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عمران اور اقبال بھی گم صم نظر آ رہے تھے۔ ہم نے دیگر رپورٹس بھی دیکھیں۔ ان میں سے کچھ خون اور پیشاب کے حوالے سے تھیں۔ ایک معدے کی گیسٹریالوجی کا رزلٹ تھا۔ ایک دوسری رپورٹ سے پتا چل رہا تھا کہ نصرت کے جگر کا تقریباً تین چوتھائی حصہ اور جگر تک پہنچنے والی دو نالیاں متاثر ہو چکی ہیں اور یہ نتیجے قریباً ایک سال پہلے کے تھے۔ اب کیا پوزیشن ہے؟ یہ یقیناً ایک اور تشویش ناک سوال تھا۔

عمران نے اپنے ایک واقف کار ڈاکٹر کو فون کیا۔ ان ڈاکٹر صاحب نے جگر کے ایک اسپیشلسٹ سرجن امتیاز علی سے عمران کی بات کرائی۔ عمران نے رپورٹس کے وہ حصے سرجن امتیاز کو پڑھ کر سنائے جن میں خاص میڈیکل اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں اور جن کو ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

امتیاز علی صاحب نے یہ حصے سننے کے بعد ہم سے لیبارٹری اور پیتھالوجسٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد گھمبیر لہجے میں بولے۔ "دیکھیں بھئی، اگر یہ رپورٹس درست ہیں اور ایک سال پرانی بھی ہیں اور اس دوران میں مریضہ کا خاطر خواہ علاج بھی نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے کافی مشکلات ہیں۔ وہ کسی بھی وقت Collapse کر سکتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال جاننے کے لئے آپ کو نئے ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور فوری طور پر کسی اچھے اسپتال سے رجوع کرنا ہو گا۔ میرے خیال میں آپ پہلے ہی کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔ اگر یہ رپورٹس آپ کے پاس موجود تھیں تو پھر آپ کو ہرگز تاخیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

اب میں سرجن صاحب کو کیسے بتاتا کہ یہ رپورٹس تو ابھی تک لفافے میں بند پڑی تھیں، انہیں پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔

اگلے روز میں اور عمران نصرت کی انہی پرانی رپورٹوں کے ساتھ سرجن امتیاز علی سے ملے۔ انہوں نے مزید تفصیل سے رپورٹس کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے بتایا۔ "یہ کینسر رسولیوں کی شکل میں ہے۔ قریباً سات سینٹی میٹر کی تین چار رسولیاں ہیں۔ جگر کا بہت تھوڑا حصہ کام رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے Staging کرنا ہو گی۔"

"اس سے کیا مراد ہے جناب؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم اندازہ لگائیں گے کہ بیماری اب کس مرحلے میں ہے۔ کیا وہ صرف جگر تک محدود ہے یا قریبی اعضا معدے اور پھیپھڑے وغیرہ بھی متاثر کر چکی ہے۔ اس کے لئے ہمیں مریضہ کا سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ کرنا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ہم لیپرو اسکوپی کے ذریعے جگر کا کوئی ٹشو بھی حاصل کریں اور اس کا معائنہ کریں۔"

"ان ٹیسٹوں پر اندازاً کتنا خرچ آئے گا؟" عمران نے پوچھا۔

"سرجن امتیاز علی نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "یہ سارا علاج بہت مہنگا ہے۔ اگر آپ سارے ضروری ٹیسٹ کرائیں تو میرے اندازے کے مطابق ان ٹیسٹوں پر ہی چھ سات لاکھ روپیا خرچ ہو گا۔ پھر کچھ چیزیں بیماری کی نوعیت پر بھی منحصر ہیں۔ کئی صورتوں میں علاج پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر امتیاز سے ملاقات کے بعد ہم گھر واپس آئے اور تادیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔

صورتِ حال از حد تشویش ناک تھی۔ میری نگاہوں میں نصرت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ بے چاری اپنی حالت سے بے خبر تھی۔ اپنی تکلیف کو معمولی تکلیف سمجھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار احمد تھانوی صاحب سے ملی تو اس نے دیگر پریشانیوں کے علاوہ اپنے رشتے کی بات بھی کی اور تھانوی صاحب سے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے اچھے بر کی دعا کریں۔

رات کے دس بجے تو میں نے، عمران اور اقبال کے مشورے کے مطابق ثروت کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اس سے چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے اس سے نصرت کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ثروت! میں نے ساری رپورٹیں دیکھ لی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو بھی دکھا دی ہیں۔ تم یقین رکھو، سب اچھا ہو جائے گا اور بہت جلدی ہو جائے گا۔ نصرت ایک دم فٹ ہو جائے گی۔''

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''نصرت کے ایک دو مزید ٹیسٹوں کی ضرورت ہے۔ عام سے ٹیسٹ ہیں۔ وہ چند گھنٹوں میں فارغ ہو جائے گی۔''

''کہاں...... جانا ہوگا؟''

''یہیں لاہور میں، جیل روڈ پر ایک کلینک ہے۔''

''کتنے پیسے لگیں گے؟''

''کچھ زیادہ نہیں ثروت...... آٹھ دس ہزار میں کام ہو جائے گا۔ ایک دوست سے بات کی ہے میں نے۔ وہ رعایت سے کام کروا دے گا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''لیکن...... نصرت کو تو کل سے بخار ہے۔ کوئی چیز ہضم بھی نہیں کر رہی ہے۔''

''ایسا تکلیف کی وجہ سے ہے۔ علاج شروع ہوگا تو دنوں میں بہتر نظر آنے لگے گی۔''

ثروت شروع میں تو متذبذب نظر آئی لیکن پھر آمادہ ہو گئی۔ اس کا شوہر یوسف لاہور سے باہر تھا۔ طے ہوا کہ کل سہ پہر چار بجے وہ نصرت کو لے کر جیل روڈ کے پرائیویٹ کلینک میں پہنچ جائے گی۔

وہ اسی سوئفٹ کار میں آئی جس پر میں نے اسے پہلی بار گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا...... گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ دونوں بہنیں پچھلی نشست پر موجود تھیں۔ ثروت کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ نصرت واقعی لاغر نظر آ رہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اور نصرت نے ثروت کے سامنے بالکل ظاہر نہ کیا کہ ہم پہلے بھی

مل چکے ہیں۔ نصرت نے جذباتی انداز میں میرا حال احوال پوچھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھوڑی بہت اداکاری کرنا پڑی۔ میری اور اپنی ملاقات کے بارے میں ثروت اسے بتا ہی چکی تھی۔ اس جدید کلینک میں نصرت کے مختلف ٹیسٹ شروع ہوئے تو ثروت کے چہرے پر نظر آنے والی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ٹیسٹ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ سی ٹی اسکین، ایم آر ٹی اور لیپرواسکوپی وغیرہ کو عام ٹیسٹ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ثروت سے کہا۔ ''آج کل یہی طریقۂ کار ہے۔ ڈاکٹر صاحبان علاج شروع کرنے سے پہلے ہر طرح کی تسلی کر لیتے ہیں۔''

''میرے اندازے کے مطابق تو یہ کافی مہنگے ٹیسٹ ہوں گے۔'' ثروت منمنائی۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ سارا کام عمران اپنے کسی ریفرنس سے کروا رہا ہے۔''

ثروت کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ جان رہی تھی کہ صورتِ حال وہ نہیں جو اسے بتائی جا رہی ہے۔ لیکن وہ اس حوالے سے میرے ساتھ کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس خشک لبوں پر زبان پھیرتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کی ہر ہر ادا کو جانتا تھا۔ اس کی باڈی لینگوئج کو اتنی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے ٹیلی پیتھی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ وہ میرے اندر رہتی تھی۔ میری روح میں مدتوں سے بستی تھی اور وہ ان گھڑیوں میں بے حد پریشان تھی۔

نصرت کے ٹیسٹ وغیرہ مکمل ہونے میں قریباً پانچ گھنٹے لگ گئے۔ وہ خود بھی کافی الجھن میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں زردی سی اتری ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تابش بھائی! آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کیا میں زیادہ بیمار ہوں؟''

میں نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''نصرت! اپنی حالت کا پتا مریض سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتا۔ کیا تم خود کو بہت زیادہ بیمار محسوس کرتی ہو؟''

''بس...... بھوک آج کل کم لگتی ہے اور دو چار دن سے بخار ہے۔''

''تو پھر وہم کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ معدے کا پرابلم ہے تمہیں، یا پھر جگر کی معمولی سوزش ہے۔ یہ لیب عمران کے ایک دوست کی ہے۔ اس لئے احتیاطاً سارے ٹیسٹ کروا لئے ہیں۔''

''کتنا خرچ ہوا ہے؟'' ثروت نے مجھ سے پوچھا۔

''بس سمجھو...... نہ ہونے کے برابر۔''

''نہیں، اس طرح نہیں ہوگا تابش! آپ بتائیں کتنے پیسے لگے ہیں۔''

میں نے نہیں بتایا لیکن جب ان دونوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے ان سے پچیس

ہزار روپے لے لئے۔ اصل خرچہ ڈھائی لاکھ کے قریب تھا۔

ثروت اس ساری صورتِ حال سے مطمئن نظر نہیں آتی تھی، بہرحال خاموش تھی۔ اس پرائیویٹ اسپتال کے ''فوڈ ایریا'' میں بیٹھ کر ہم نے قریباً ایک گھنٹا گفتگو کی۔ دس پندرہ منٹ کے لئے عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہوا۔ عمران کی شخصیت اور اس کے مخلص و بے لوث انداز نے ثروت اور نصرت کو متاثر کیا۔ عمران کے جانے کے بعد بھی میں ثروت اور نصرت سے باتیں کرتا رہا۔ ثروت نے نصرت کو سب بتا دیا تھا کہ مجھ سے اس کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی لیکن نصرت نے مجھ سے ملاقات کے بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایسا اس نے میرے کہنے پر ہی کیا تھا۔ بہرحال، ثروت کے ذہن میں ابھی تک یہ الجھن موجود تھی کہ میرے پاس اس کا موبائل فون نمبر کیسے پہنچا۔

وہاں فوڈ ایریا میں ہماری گفتگو زیادہ تر نصرت کی تکلیف اور اس کے علاج کے گرد ہی گھومتی رہی۔ میں نے ثروت اور نصرت سے کہا کہ وہ بے شک روحانی علاج بھی جاری رکھیں مگر اس کے ساتھ اگر ڈاکٹر بھی کچھ دوائیں تجویز کرتا ہے تو نصرت انہیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرے۔ نصرت اس پر آمادہ تھی۔

ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی۔

......اگلے چند روز سخت کشمکش کے تھے۔ نصرت کی کچھ رپورٹس کا نتیجہ کراچی سے بھی آنا تھا۔ ثروت دن رات دعاؤں میں مصروف تھی۔ وہ احمد تھانوی صاحب کے پاس بھی دو چکر لگا چکی تھی۔ میں، عمران اور اقبال راوی روڈ والے مکان میں تھے۔ گنجان آبادی میں گھرا ہوا یہ گھر ہماری دھینگا مشتیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا لیکن نصرت والی پریشانی کے سبب آج کل ہم سب سنجیدہ تھے۔ ہاں، عمران کسی وقت ضرور شاہین سے چونچ لڑا لیتا تھا۔ شاہین، رائے ونڈ روڈ والی شان دار کالونی میں فرح اور عاطف کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھی۔ اب بھی فون پر عمران اور شاہین میں کشمکش جاری تھی۔ عمران اسے بتا رہا تھا کہ اسے ایک فلم میں اسٹنٹ مین کا کام ملا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ سیکنڈ ہیرو کا کردار بھی کرے گا۔ یہ فلم ریما پروڈیوس کر رہی ہے اور اس کی ہیروئن بھی وہی ہے۔

شاہین نے جواباً اسے چڑانے کے لئے کہا۔ ''مجھے بھی اکشے کمار کا فون آیا تھا۔ اس نے انڈیا میں ہمارا شو دیکھا تھا۔ وہ سرکس کے موضوع پر فلم بنا رہا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ ہیروئن لینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

''لیکن اکشے تو پیسے والا بندہ ہے۔ اسے گھٹیا اور زہریلی شراب پینے کی کیا ضرورت

تھی؟''

''کیا مطلب؟'' شاہین کی آواز فون سے اسپیکر پر ابھری۔

''بھئی زہریلی شراب پینے سے ہی تو لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اندھا ہوا ہے تو اس نے تمہیں ہیروئن کاسٹ کرنے کا سوچا ہے نا۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے، ریما اور نرگس کی آنکھیں سلامت ہیں جو وہ تم پر سو جان سے فدا ہوئی پڑی ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے پاس اب ایسی باتوں کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہوں بالکل جیسے رنبیر کپور انڈیا میں ہے۔ ہم دونوں کے شیڈول آج کل بڑے ٹائٹ ہیں۔ باقی فلم میں میرے کاسٹ ہونے کی اطلاع بالکل سچی ہے۔ اگر یقین نہیں تو کل کے اخبارات میں نیوز دیکھ لینا۔''

شاہین نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے بھی تو......تم مجھے کیا بتانا چاہتے ہو؟''

''دیکھو جو درمیانی عمر کا ''لڑکندہ'' میں نے تمہارے لئے دیکھا ہے، لاکھوں میں ایک ہے۔ نیوز چینل میں ملازم ہے۔ تم دولت میں کھیلو گی اور رعب دبدبہ علیحدہ۔ پلیز، میرا خیال دل سے نکال دو۔ ہمارے ستارے کبھی نہیں ملیں گے۔''

وہ جل کر بولی۔ ''اللہ نہ کرے ہمارے ستارے ملیں۔ اس سے تو اچھا ہوگا کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں۔''

''دقیانوسی باتیں مت کرو۔ آج کل کنوئیں کہاں ہوتے ہیں۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں ٹرین کے نیچے سر رکھ کر یا خود پر پیٹرول چھڑک کر یا بجلی کا جھٹکا کھا کر مر جاؤں گی۔'' اس نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے یہ سارے طریقے بھی کافی محال ہیں۔ یہ چیزیں اب ملتی ہی کہاں ہیں۔''

''جس نے مرنا ہو وہ کوئی نہ کوئی رستہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔''

''اسٹیج ڈراموں میں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مر جانا پر کسی غریب کے کام نہ آنا۔ اچھے لوگ اپنے اعضا عطیہ کر جاتے ہیں......تم تو پوری کی پوری عطیہ ہو۔ یہ خوب صورتی، یہ شباب، یہ چمک دمک......ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرو گی تو یہ سخت قسم کا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اگلی دنیا میں جاتے ساتھ ہی تمہاری مرمت شروع ہو جائے گی۔ فلمسٹار زینت امان کا ایک مشہور فرانسیسی شعر ہے۔ اس کا ترجمہ فراق گورکھ پوری نے کچھ اس طرح کیا ہے، اب تو گھبرا کے کہوت ہیں کہ مر جاویں گے......مر کے بھی شانتی نہ پائی تو کدھر جاویں گے۔

شاہین! میں تو اب بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ وہ لڑ کندہ......"

اس نے فون بند کر دیا۔ عمران کے چہرے پر شریر مسکراہٹ تھی۔

اقبال نے آنکھیں اوپر چڑھا کر کہا۔ "یا اللہ...... یہ کیسے کیسے انکشاف ہو رہے ہیں۔ فلمسٹار زینت امان شعر کہتی تھی اور ان کا ترجمہ بھی ہوتا تھا۔"

عمران بولا۔ "تمہیں اعتراض کس پر ہے، زینت امان پر یا ترجمے پر؟"

"ہمیں تم پر اعتراض ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ خدا کا خوف کرو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو......اور آتے ساتھ ہی اسے گھر سے بے گھر بھی کر دیا ہے۔ اب اسے ستانے پر تلے ہوئے ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ چلو، اس کی محبت کا اقرار نہ کرو مگر اس طرح اس کی توہین تو نہ کرو۔"

"اس وقت تو بالکل شاہین کے بڑے بھائی لگے ہو تم۔" وہ مسکرایا۔

"چلو بڑا بھائی ہی سمجھ لو لیکن اگر میں نے عقل کی بات کی ہے تو اس پر غور کرو۔"

اسی دوران میں عمران کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے چہرے پر پھر شرارت کی چمک نمودار ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پھر شاہین کا فون آیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کا دوست ڈاکٹر فہد تھا۔ اس نے عمران کو بتایا کہ نصرت کی رپورٹس آ گئی ہیں...... اور یہ بھی بتایا کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں۔

وہ جو ماحول میں تھوڑی سی خوش گواری آئی تھی، اک دم کافور ہو گئی۔ میں اور عمران ڈاکٹر فہد کے کلینک پہنچے اور وہاں سے سرجن ڈاکٹر امتیاز علی کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز صاحب نے ساری رپورٹس اور پرنٹ آؤٹ وغیرہ دیکھنے کے بعد چشمہ اتار کر ایک طرف رکھا اور بولے۔

"اب سب کچھ سامنے ہے اور ایک مکمل تصویر بن رہی ہے...... اور یہ تصویر اچھی نہیں ہے۔"

ہم سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سی ٹی اسکین کا ایک پرنٹ ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "جگر تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ پچھلے ایک سال کی تاخیر نے بیماری کو بہت پھیلا دیا ہے۔ یہ دیکھیں...... یہ سارا ایریا متاثر ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ متاثرہ حصے کو فریز کرنے سے یا پھر یہاں جراحی کے عمل سے کچھ فائدہ ہو جائے گا۔"

"تو پھر جناب؟"

انہوں نے طویل سانس لی۔ وہی سانس جو کوئی گھمبیر بات کہنے سے پہلے اعصاب کو کمپوز کرنے کے لئے لی جاتی ہے۔ نشست سے ٹیک لگا کر بولے۔ "اگر کوئی چانس نظر آتا ہے تو وہ ٹرانسپلانٹیشن میں ہی ہے...... جگر کی تبدیلی...... اور یہ کوئی معمولی طریقۂ کار نہیں ہے۔

یہ ہر لحاظ سے مشکل ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے، جگر بیکار ہو چکا ہے؟"

"قریباً ہو چکا ہے۔ بہت تھوڑا حصہ کام کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مریضہ کی ظاہری حالت اس کی اندرونی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن یہ زیادہ دیر بہتر نہیں رہے گی۔ اچانک ہی بریک ڈاؤن ہوگا۔ ایسے بریک ڈاؤن میں دو چار دنوں میں ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے......"

"اوہ گاڈ۔" عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑنے لگی۔ جواں سال نصرت کا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

امتیاز صاحب نے کہا۔ "اس بدترین صورتِ حال میں اگر کوئی اچھا پہلو ڈھونڈا جا سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ بیماری ابھی جگر سے باہر نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے اردگرد کے ٹشوز اور Blood Vessels کو ٹچ کیا ہے۔ یہ صورتِ حال جگر کی ٹرانسپلانٹیشن کے لئے بہترین سمجھی جاتی ہے۔"

عمران نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اس کام پر کیا کاسٹ آ سکتی ہے؟"

امتیاز صاحب بولے۔ "یہ آپریشن انڈیا میں ہو تو رہے ہیں اور وہاں کاسٹ بھی نسبتاً کم ہے لیکن وہاں باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہاں پہنچنے کا "پروسیجر" بھی لمبا ہے جبکہ مریضہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر کسی مغربی ملک میں یہ آپریشن ہو سکے تو مناسب ہے۔ لیکن وہاں اخراجات بہت ہوں گے اور اس سے بھی اہم یہ بات ہے کہ جگر کا عطیہ مل جائے۔"

"کیا اس کے لئے پورا جگر درکار ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دو طرح کے آپریشن ہوتے ہیں۔ ایک جگر کی پیوندکاری کہہ سکتے ہیں، دوسرے کو جگر کی تبدیلی۔ یہ تو جگر کی حالت پر منحصر ہوتا ہے کہ کون سا آپریشن ہوگا......"

وہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ خاصی پریشان کن اور گھمبیر تھی۔ ایک بہت بڑا امتحان تھا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ نصرت کی زندگی خطرے میں تھی۔

ہم گھر واپس آئے تو چونک گئے۔ اندر کوئی مہمان موجود تھا اور اقبال سے مصروفِ گفتگو تھا۔ یہ ثروت تھی۔ وہ بذریعہ رکشا یہاں پہنچی تھی اور برقع میں آئی تھی۔ اس گھر کا ایڈریس اسے میں نے ہی بتایا تھا۔

''تم کب آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ابھی پانچ منٹ پہلے پہنچی ہوں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟ اقبال صاحب کہہ رہے تھے کہ کچھ بتا کر نہیں گئے۔''

''فرح کی طرف گئے تھے پھر راستے میں ایک دوست کے پاس ٹھہر گئے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔ ''اور تم کہاں سے آ رہی ہو؟''

''یہاں بھاٹی گیٹ میں ایک خیراتی اسپتال ہے، وہاں کچھ پیسے دینے آئی تھی۔ سوچا آپ کی طرف سے بھی ہو جاؤں۔''

''نصرت اب کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے، بخار تو اترا ہوا ہے لیکن بھوک بالکل نہیں لگ رہی۔ بڑی مشکل سے ایک دو لقمے کھلاتی ہوں۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور پھر بولی۔ ''آپ کہہ رہے تھے کہ جمعرات تک سب رپورٹیں آ جائیں گی۔''

''ہاں میرا خیال ہے، آج شام یا کل دوپہر تک پہنچ جائیں گی۔''

''زیادہ فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''نہیں ثروت! تکلیف تو ہے لیکن اگر ہم ہمت سے کام لیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اقبال چائے بنانے چلا گیا۔ میں اور عمران کمرے میں رہ گئے۔ ثروت نے اپنے برقع کے اندر سے ایک سبز شاپر نکالا اور کانپتے ہاتھ سے میری طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے شاپر تھامتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میری کچھ جیولری ہے تابش! ناصر بھائی نے بنوا کر دی تھی۔ آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ نصرت کے علاج کا خرچہ اس سے کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا اچھا علاج ہو اور وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔''

میں نے زیورات لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اس کی ضرورت نہیں ثروت! اگر ہوئی تو پھر میں بتا دوں گا......''

وہ مصر رہی کہ میں زیورات اپنے پاس رکھوں۔ میرے مسلسل انکار کے باوجود وہ نہیں مانی۔ وہ بہت دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ اس نے ہمارا دل رکھنے کے لئے بس چائے کے بھی ایک دو گھونٹ ہی لئے۔ اس نے کہا کہ نصرت کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ اسے جلدی واپس جانا ہے۔ اقبال اس کے لئے رکشا لے آیا۔ وہ چلی گئی۔

وہ جو جیولری دے کر گئی تھی، ساری کی ساری طلائی تھی۔ مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت چھ سات لاکھ سے کم نہیں تھی۔ لیکن جو مصیبت آئی تھی، وہ ثروت کے اندازے سے بہت بڑی تھی۔ نصرت کے علاج کے حوالے سے تو یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرے جیسی تھی۔

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔

''عمران! ہم ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ میرے دل میں آ رہا ہے کہ میں اپنا مکان بیچ دوں۔ تم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرو۔''

وہ بولا۔ ''اتنی تیزی مت دکھاؤ۔ بریک پر تھوڑا سا پاؤں رکھو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ویسے بھی وہ مکان تمہارے اکیلے کا نہیں ہے۔ عاطف اور فرح بھی اس میں حصے دار ہیں اور شاید تمہاری ایک پھوپی جان کو بھی کچھ حصہ دینے کے بارے میں تمہارے والد وصیت کر کے گئے ہوئے ہیں۔''

''یار! میں بعد میں دے دوں گا ان لوگوں کو حصہ لیکن اس وقت تو ایک انسانی زندگی کا معاملہ ہے۔''

''جب چیز اس طرح بیچی جاتی ہے تو لوگ کوڑیوں کے بھاؤ خریدنا چاہتے ہیں۔ تم اتنی جلدی مت دکھاؤ۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

میں کمرے میں بند ہو کر دیر تک سوچتا رہا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ لیور کی ٹرانسپلانٹیشن کوئی معمولی آپریشن نہیں تھا۔ انڈیا میں بھی اس کے مکمل علاج پر پچاس لاکھ کے قریب خرچہ آ رہا تھا۔ کسی مغربی ملک میں تو یہ دوگنا سے بھی زیادہ ہو جانا تھا...... عمران کی مالی حالت کا مجھے پتا تھا۔ وہ ایک پرندے جیسی زندگی گزارتا تھا۔ آج جو کچھ ہے، وہ خرچ کر ڈالو...... کل کی فکر نہ کرو۔ پیسا اس کے پاس آتا تو تھا لیکن ٹکتا نہیں تھا...... آج کل بھی نصرت کے ٹیسٹوں کا بل دینے کے بعد وہ تقریباً قلاش تھا۔

اگلے روز میں، عمران کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنے آبائی گھر پہنچا۔ وہاں سے مکان کی رجسٹری لی۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کرائی اور علاقے کے ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس پہنچ گیا۔ اس شخص نے مجھے فوراً پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں کچھ بھولے بسرے منظر اور کچھ سوال ابھر آئے۔ ان مناظر اور ان سوالوں کا تعلق یقیناً اسی تاریک دن سے تھا جب مجھے ایک قریبی پارک میں سراج کے غنڈوں نے لہولہان کیا تھا اور میں چہرہ چھپا کر ہر شناسا نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اس نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ''تم...... میرا مطلب ہے...... آپ...... وہی......''

''ہاں......تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں وہی ہوں...... میں نے ایک سیٹھ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور اس نے مار مار کر میرا حشر خراب کر دیا تھا...... بہت سے لوگوں نے تماشا دیکھا تھا۔ شاید تم بھی ان میں شامل ہو گے۔ اب پلیز...... مزید کوئی سوال نہ کرنا...... یہ میرے مکان کے کاغذات ہیں۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔''

پراپرٹی ڈیلر نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر بند کر لیا۔

میں نے اسے مکان کی فروخت کر کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور واپس آ گیا۔

ایک عجیب سی پریشانی نے مجھے گھیر رکھا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ عمران پریشان ہے۔ اس کی یہی ادا تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔ وہ دوسرے کی پریشانی کو اپنی پریشانی بنا لیتا تھا اور پھر تن من دھن سے اسے رفع کرنے کی کوششوں میں لگ جاتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو جان محمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ عمران ان سے گفتگو میں مصروف تھا۔ عمران رات کو بھی اسسٹنٹ منیجر عباس کے ساتھ دیر تک ٹیلی فون پر بات کرتا رہا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید وہ ایک بار پھر کسی خطرناک ''سرکس شو'' کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ میرے ذہن میں اسٹار سرکس کے وہ اسپیشل شو گھومنے لگے جن میں عمران اور اس کے ساتھی نہایت خطرناک کرتب دکھاتے تھے۔ بغیر حفاظتی جال کے جھولوں پر بازی گری، آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی زندہ ہدف پر چاقو زنی، اپنے پہلو یا پھر کنپٹی پر ریوالور وغیرہ رکھ کر گولی چلنے یا نہ چلنے والا رسک۔ اور ایسے بہت سے دیگر کام...... عمران ایسی خطرناک حرکات کو کبھی کبھی پیسا کمانے کے لئے بھی استعمال کرتا تھا۔

بہرحال، میرا یہ شک...... شک ہی رہا۔ مجھے اس بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں مذکورہ پراپرٹی ڈیلر سے ملا۔ اس نے مجھے یہ مایوس کن خبر سنائی کہ میرے مکان کی فوری فروخت ممکن نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے مکان کا رقبہ ان رقبوں میں شامل ہے جس کا ریکارڈ کچھ عرصہ پہلے جل کر ضائع ہو گیا تھا۔ اب میرے مکان کی ''فرد'' نہیں نکل سکتی اور فروخت کے لئے فرد کا ہونا بہت ضروری ہے۔

''اب کیا کرنا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نئے سرے سے کاغذات کا ریکارڈ بنوانا ہو گا۔''

''اس میں کتنا وقت لگے گا؟''

''اگر آپ خود بنوائیں گے تو کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر دے دلا کر کام کرائیں گے تو بھی ڈھائی تین مہینے تو کہیں نہیں گئے۔ اخبار میں اشتہار وغیرہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ بھی قانونی کارروائی ہوتی ہے۔ شاید آپ کو ڈی پی او کے سامنے بھی پیش ہونا پڑے۔''

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

رات کو میں گھر واپس گیا تو میری توقع کے خلاف عمران بازار کے کسی تھڑے پر محلے داروں سے گپ شپ نہیں کر رہا تھا بلکہ کمرے میں خاموش بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کی گھمبیر خاموشی کے بعد عمران نے کہا۔ ''تم اپنا موبائل، گھر چھوڑ گئے تھے۔ ابھی ثروت کا فون آیا تھا۔''

''خیریت ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نصرت کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ رات سے اسے تیز بخار ہے۔ پیٹ میں دائیں طرف درد بھی ہوتا ہے۔''

''ثروت کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس کا خیال ہے کہ شاید کھانے پینے میں کچھ بدپرہیزی ہوئی ہے لیکن اصل بات وہی ہے جس کا ہمیں پتا ہے۔ بیماری تیزی سے اسے جکڑ رہی ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمران بھی خاموش رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ گھر سے باہر بازار سے معمول کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ رکشے کا شور...... خوانچے والے کی صدا، بچوں کی چہکار۔ میوزک سینٹر سے بلند ہونے والے نغمے کی آواز موسم حسیں ہے لیکن تم سا حسیں نہیں ہے...... میری نظر سے پوچھو، تم سا کہیں نہیں ہے...... لیکن موسموں کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ انسان خوش ہو تو اسے چلچلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ غمگین اور پریشان ہو تو چاندنی بھی جھلسانے لگتی ہے۔

اچانک عمران کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جان محمد صاحب تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''عمران! کوئی تم سے ملنے آیا ہے، یہاں میرے دفتر میں۔''

''کون؟'' عمران نے پوچھا۔

''لو خود ہی بات کرو۔'' جان صاحب کی آواز موبائل کے اسپیکر میں سے ابھری۔

چند سیکنڈ بعد کوئی انگلش میں بولا۔ ''ہیلو ایمران! کیسے ہو؟ کہاں چھپے بیٹھے ہو برادر۔''

میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ بھاری بھرکم آواز مسٹر ریان ولیم کے علاوہ اور کسی کی نہیں

تھی۔عمران بولا۔''گڈ ایوننگ مسٹر ریان! آپ کب آئے؟''

''میں نے کہا تو تھا کہ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔تم سے ملنے کے لئے...... میں اور مسٹر رچی بہت بے چین تھے۔''

''یعنی مسٹر رچی بھی آئے ہیں؟''

''بالکل، وہ بھی موجود ہیں۔انہیں بھی تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔تم کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو یہاں؟''

''آپ دونوں اس وقت ہیں کہاں؟''

''جان محمد کے آفس میں۔اگر تمہیں مشکل ہے تو ہم خود آجاتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں۔ایسی بات نہیں۔کیا میں...... ابھی آجاؤں؟''

''بالکل ابھی...... یہاں ایک دلچسپ معاملہ تمہارا انتظار کر رہا ہے......''ریان ولیم نے کہا۔

''ٹھیک ہے جی، میں لباس تبدیل کر کے تیس چالیس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔''

قریباً گھنٹے بعد ہم جان محمد صاحب کے دفتر واقع میکلوڈ روڈ پر موجود تھے۔گوشت کے پہاڑ مسٹر ریان ولیم نے بڑی گرم جوشی سے عمران کا استقبال کیا۔پروفیسر رچی بھی ہم دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے۔پروفیسر رچی کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ان کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔رنگ سرخ وسپید تھا اور نفیس سی عینک لگا رکھی تھی۔

چائے کی میز پر ہماری گفتگو شروع ہوئی۔پہلے تو ان حیران کن واقعات کا ذکر ہوتا رہا جو چند ہفتے پہلے پیش آئے تھے۔سوال و جواب کا وہ بے نظیر مقابلہ جس کی انعامی رقم ایک سو بیس کروڑ کے قریب تھی۔اس انعامی مقابلے میں عمران اور ہیری کا ہارنا لیکن پھر اس ہار میں سے سلامتی اور جیت کا پہلو نکل آنا۔ایک طرف تقریباً ایک سو بیس کروڑ روپے مالیت کے شاندار ''فلیکس 900 سی'' طیارے کا تباہ ہو جانا اور دوسری طرف ہیری کا لاٹری کے ذریعے ایک معقول رقم جیت جانا۔یہ سارے واقعات زیادہ پرانے نہیں تھے اور ابھی تک ہمارے ذہنوں میں تازہ تھے۔

پروفیسر رچی تو پہلے ہی عمران کا گرویدہ تھا، اب ریان ولیم بھی نظر آتا تھا۔یوں لگتا تھا کہ اسے عمران کی ذہانت اور ''لک'' پر ایک وجدانی قسم کا بھروسا...... ہو چکا ہے۔اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''ایمران! میں اور رچی ایک بہت اہم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور پتا نہیں کیوں ہمیں یقین ہے کہ یہ کام تم بہت آسانی سے کر سکتے ہو۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں۔''عمران نے رسمی انداز میں کہا۔

پروفیسر رچی اور مسٹر ریان کی نظروں کا تبادلہ ہوا۔پھر ریان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''ایمران! یہاں ہمارا واسطہ ایک عجیب سے کریکٹر سے پڑا ہوا ہے۔ایک ایسا بندہ جسے ہینڈل کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ایک ایسا پیچیدہ بندہ ہے جو لالچ میں آ رہا ہے، نہ پیار سے رام ہو رہا ہے، نہ سختی سے۔''

پروفیسر رچی نے اپنی گھنی بھوری مونچھوں کے نیچے مسکراتے ہوئے کہا۔''آنجہانی ہٹلر نے کہا تھا، جارحیت کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے۔جو کام پیار محبت کے ساتھ برسوں میں نہیں ہو سکتا، وہ میں طاقت کے استعمال سے چند گھنٹوں میں بخوبی کر سکتا ہوں۔لیکن میرا خیال ہے کہ ہٹلر بھی ہوتا تو یہاں آکر نا کام ہو جاتا۔''

''کوئی بہت سخت جان بندہ ہے؟''عمران نے پوچھا۔

''نہیں...... اس کے الٹ ہے۔''مسٹر ریان نے جواب دیا۔''سمجھو کہ سرکنڈے میں جان پھنسی ہوئی ہے۔بالکل دبلا پتلا۔عمر اسی سال سے اوپر ہے۔بیماریوں نے گھیرا ہوا ہے۔''

جان محمد صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔''وہ جو کہتے ہیں نا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔''

''لیکن جناب! ہم اس سے حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''یہ ایک اہم سوال ہے مگر فی الحال اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے یا کہہ لو کہ مکمل جواب نہیں ہے۔''مسٹر ریان ولیم نے کہا۔

''آپ کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے؟''عمران نے سوال کیا۔

مسٹر ریان ولیم نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔''کچھ لوگ ہم سے یہ کام معاوضے پر کروا رہے ہیں ایمران۔خاصا معقول معاوضہ دے رہے ہیں۔ہمیں ابھی تک صرف اتنا ہی پتا ہے کہ کوئی بہت خاص چیز ہے جو کسی غلطی سے یا پھر اتفاقاً اس سنکی بڈھے کے قبضے میں آگئی ہے۔وہ یہ ''چیز'' واپس کرنے کو تیار نہیں ہے۔اس پر بہت سختی بھی نہیں کی جا سکتی۔میں نے تمہیں بتایا نا کہ وہ کئی طرح کی بیماریوں کا شکار ہے۔تین دفعہ تو اس کا بائی پاس ہی ہو چکا ہے۔کسی بھی جسمانی صدمے کی وجہ سے اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ سکتی ہے۔شاید تمہیں تھوڑا بہت اندازہ ہو کہ ایسے لوگ جو بالکل قریب المرگ ہوتے ہیں، اپنی زندگی موت کی طرف

سے خاصے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ یہ بڈھا بھی ان میں سے ایک ہے۔''

عمران نے کہا۔''جناب! آپ کی بات ٹھیک ہے کہ ایسے کچھ لوگ اپنی زندگی کی طرف سے بے پروا ہو جاتے ہیں مگر ان کو کسی بات پر مجبور کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے قریبی عزیز...... ان کے پوتے پوتیاں، ان کی ان محبتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔''

ریان ولیم نے کہا۔''یہاں اس معاملے میں یہی تو مصیبت ہے، یہ بالکل لنڈورا شخص ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بیوی پچیس تیس سال پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ دو بیٹے تھے، وہ برسوں پہلے ''اباجی'' کی سخت مزاجی کی وجہ سے ان کو چھوڑ کر بیرون ملک جا چکے ہیں اور وہیں پر آباد ہیں۔ ان سے بزرگوار کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہے۔ ایک بیٹی تھی، اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی کوئی بیس برس پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب جناب اکیلے ہیں اور اپنے پانچ ایکڑ کے فارم ہاؤس میں تن تنہا رہتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی تھوڑی بہت دلچسپی ہے تو وہ پرندوں اور جانوروں میں ہے۔ انہوں نے فارم ہاؤس میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا ہے۔ اس چڑیا گھر کی دیکھ بھال کے لئے کچھ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ اپنی دیکھ بھال کے لئے ایک ڈاکٹر ہے اور دو تین ملازمائیں ہیں۔ خاصے امیر کبیر ہیں۔ چاہیں تو نئے ماڈل کی دو تین گاڑیاں رکھ سکتے ہیں مگر ایک ستر ماڈل کی شیورلیٹ رکھی ہوئی ہے اور اگر کہیں آنا جانا ہو تو اسی پر سفر کرتے ہیں۔''

عمران نے ریان ولیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''جناب! آپ کے ذہن میں یہ بات کیوں آئی ہے کہ میں اس شخص کو ہینڈل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟''

ریان ولیم نے طویل کش لے کر سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور کہا۔''اس کی دو وجوہات ہیں ایمران۔ پہلی وجہ تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ میں تمہاری ''لک'' پر بہت بھروسا کرنے لگا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جس کام میں ہاتھ ڈالو گے، اس کا کوئی اچھا نتیجہ ہی نکلے گا اور دوسری وجہ تمہیں رچی بتائے گا۔ بتاؤ رچی۔'' ریان نے پروفیسر رچی کی طرف دیکھا۔

رچی نے اپنے سرخ و سپید چہرے پر نفیس عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔''ایمران! جیسا کہ تمہیں مسٹر ریان نے بتایا ہے...... اس سنکی بوڑھے کا ایک ہی شوق ہے اور وہ ہیں جانور۔ وہ دن رات ان میں گم رہتا ہے۔ اگر ملک کا صدر یا وزیراعظم بھی اس کے فارم ہاؤس پر چلا جائے تو وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دے گا جتنی اس عام شخص کو دے گا جو کسی جانور کی کسی

خاص بیماری کے بارے میں اسے کچھ بتا سکتا ہو۔ وہ جانوروں سے پیار کرتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو جانوروں سے پیار کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے میرا ذہن تمہاری طرف گیا ہے ایمران...... تم جانوروں سے بہت جلد ناتا جوڑ لیتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ خاص صلاحیت اس سنکی کو ضرور متاثر کرے گی بلکہ حیران بھی کرے گی۔ تم ضرور اس کے قریب جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔''

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔''جناب! آپ نے ابھی تک اس بزرگ کا نام نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ رہتے کہاں ہیں؟''

مسٹر ریان نے کہا۔''یہاں لاہور کے قریب ہی کوئی قصبہ ہے، شاید شیکاؤ پورہ۔''

''شیکاؤ پورہ نہیں...... شیخوپورہ۔'' جان محمد صاحب نے تصحیح کی۔''اور باباجی کا نام سہراب جلالی ہے۔ بڑے مشکل سے بندے ہیں۔ اب عمر رسیدہ ہونے کے بعد مزید مشکل ہو گئے ہیں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کچھ عرصہ انگریز کی فوج میں بھی رہ چکے ہیں۔ یہ پاکستان، ہندوستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ ملازمت کے دوران میں ایک انگریز کرنل کا جبڑا توڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے۔ ہم نے جلالی صاحب سے اپنے سرکس کے لئے ریچھ کا ایک بچہ حاصل کیا تھا۔ تب ان سے واسطہ پڑا اور ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ بڑے سیلانی قسم کے بندے ہیں۔''

عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔''ریان صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ اگر ہمیں کوئی غیر قانونی یا ناجائز کام نہیں کرنا پڑے گا تو ہم حاضر ہیں لیکن ہمیں تھوڑا بہت اندازہ تو ہو جائے کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

''سب سے پہلے تو اس گھر میں داخل ہونا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہاں کس قسم کی سرگرمی ہے۔ اگر اگلے چھ سات روز میں یہ پہلا مرحلہ طے ہو گیا تو پھر تمہیں مزید ہدایات دے دی جائیں گی۔ باقی رہی کام کے جائز یا ناجائز ہونے کی بات تو یقین رکھو کہ یہ سو فیصد جائز کام ہے۔ وہ خبطی بڈھا ایک ایسی چیز پر قبضہ جمائے ہوئے ہے جو ہرگز اس کی نہیں ہے اور جس کا اس کے پاس رہنا اس کے اپنے لئے بھی خطرناک ہے۔ انڈر ورلڈ کے کئی لوگ ایسے ہیں جو اس شے کی خاطر اس کے جانی دشمن ہو سکتے ہیں۔''

اس انوکھے اور پُراسرار موضوع پر ریان ولیم اور پروفیسر رچی سے ہماری گفتگو قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ ریان ولیم کہنے کو تو یہی کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ناجائز کام کروانا نہیں چاہ رہا لیکن اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ یہ کام ناجائز بھی ہو سکتا تھا، غیر قانونی اور خطرناک

بھی۔

ہماری بات اختتام پذیر ہوئی تو ریان ولیم نے ایک چیک کاٹ کر عمران کے حوالے کیا۔

''یہ کیا ہے جناب؟'' عمران نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارا حصہ۔''

''کس چیز میں؟''

''اسی کوئز شو کے انعام میں جس میں تم نے حصہ لیا تھا۔'' ریان مسکرایا۔

''لیکن وہ تو ہم ہار گئے تھے۔''

''مگر ہمیں بنیادی انعام کی تھوڑی سی رقم تو ملی تھی۔ اس رقم سے جو لاٹری خریدی گئی، اس نے ہیری کو قریباً 8 ملین ڈالرز دلا دیئے۔ یہ سب قسمت کی کرشمہ سازی ہے۔ اس رقم میں سے یقیناً تمہارا بھی تھوڑا بہت حصہ بنتا ہے۔''

عمران انکار کرتا رہا لیکن ریان نے چیک زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے چیک پر ایک ترچھی سی نظر ڈالی۔ یہ پچاس لاکھ روپے کا تھا......

اس چیک کے بعد ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے ایک اور چیک کاٹا۔ یہ پانچ لاکھ روپے کا تھا۔ ریان ولیم نے کہا۔ ''یہ اس کام کے لئے تمہارے ابتدائی اخراجات کے لئے ہے۔''

اس کے انداز سے اشارہ مل رہا تھا کہ اگر عمران کسی طرح ریان اور پروفیسر رچی کی توقعات کے مطابق کام کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ خاصی بڑی رقم حاصل کر سکے گا۔

○......❖......○

اگلے دو تین روز میں کچھ واقعات تیزی سے رُونما ہوئے۔ یہاں وہی محاورہ صادق آرہا تھا کہ قدرت جب دیتی ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ چند ہفتے پہلے کی کارکردگی کی بنیاد پر ایک معقول رقم عمران کے ہاتھ آگئی تھی...... بلکہ آگے کے لئے بھی اچھے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ''تابش! یہ پچاس لاکھ روپے نصرت کا علاج شروع کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند ہفتوں میں مزید انتظام ہو جائے گا۔ تم ثروت سے بات کرو اور پروگرام طے کر لو۔''

''لیکن عمران! میں یہ رقم نہیں لے سکتا اور شاید ثروت بھی خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکے۔''

''میں مکا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دوں گا۔ تکلفات میں مت پڑو۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔ تم ابھی بات کرو ثروت سے۔''

''لیکن میں کس حیثیت سے اسے یہ رقم دوں اور وہ کس حیثیت سے قبول کرے گی؟ وہ اپنے شوہر کو کیا بتائے گی اس بارے میں؟''

''اس کا کوئی حل تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔''

''لیکن عمران...... یہ رقم......''

''دیکھو تابی! زیادہ ''تکلف حسین خاں'' مت بنو۔ اگر زیادہ بات ہے تو اسے ادھار سمجھ لو۔ جب تمہارا مکان فروخت ہوگا، مجھے لوٹا دینا۔''

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس نے حسبِ عادت اپنی ہتھیلی سے میرا منہ ڈھانپ دیا اور تب تک نہیں چھوڑا جب تک میں ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔

رات کو میں دیر تک سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں ایک ہی طریقہ آرہا تھا۔ میں اپنے چچا احمد کو اس کام کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ آج کل ''ویانا'' میں رہائش پذیر تھے۔ آرسہ ان کی بیوی سلطانہ کی بھتیجی تھی۔ یہ آرسہ وہی کزن تھی جو مجھے شادی کے لئے گھیرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جب ثروت مجھ سے جدا ہو کر بھائی ناصر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تو آرسہ نے کئی طرح سے مجھ پر جال پھینکنے کی کوشش کی۔ اب قریباً ڈھائی سال پہلے آرسہ کی شادی ہو چکی تھی۔ چچا احمد اور چچی سلطانہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ دو سال پہلے ویانا چلے گئے تھے۔

اگلے روز میں نے ثروت کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ راوی روڈ والے گھر پر آجائے مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ ثروت خاصی ذہین تھی۔ بے شک میں نے اسے نصرت کی حالت کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا مگر وہ جان چکی تھی کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں اور شاید وہ خدشے بھی درست ثابت ہوئے ہیں جو نصرت کے بارے میں شروع میں ظاہر کئے گئے تھے۔

وہ سہ پہر کے وقت آئی۔ میں اس سے اکیلے میں اور تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا عمران اور اقبال اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ ثروت نے کبھی برقع نہیں پہنا تھا لیکن آج کل وہ اپنی آمدورفت کو چھپانے کے لئے برقع استعمال کر رہی تھی۔ ہر لباس کی طرح برقع بھی اس کے جسم پر بہت جچتا تھا۔ حالانکہ وہ زینت کے لئے نہیں پردے کے لئے تھا۔ نقاب میں سے بس اس کی خوب صورت آنکھیں ہی نظر آتی تھیں اور یہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ آج کل دکھ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔''ثروت! آنکھیں بند کرنے سے حقیقت اوجھل نہیں ہو جاتی۔ اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب بندہ ایک بار حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتا ہے تو پھر بڑے بڑے مسئلوں کا حل بھی نکل آتا ہے۔ ہمیں اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نصرت بیمار ہے...... اور خاصی بیمار ہے......''

ثروت نے ایک سرد آہ بھری اور دل کڑا کر کے پوچھا۔''رپورٹس کیا کہتی ہیں؟''

''جگر کا کینسر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرتے رہے......

میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔''ثروت! ہم نصرت کا علاج کروا رہے ہیں اور تم دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

''کیا دوائیوں سے علاج ہو جائے گا؟'' اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔

''نہیں ثروت! اس کے لئے سرجری کی ضرورت پڑے گی اور یہ سرجری باہر کے ملک میں ہو تو زیادہ اچھا ہے۔''

''لل...... لیکن اس پر تو بہت زیادہ خرچہ آئے گا۔''

''خرچے کی فکر نہ کرو۔ جس طرح فرح میری چھوٹی بہن ہے، اسی طرح نصرت بھی ہے۔ ہم اس کی بیماری سے لڑیں گے اور اللہ نے چاہا تو جیت کر دکھائیں گے۔''

''لیکن یہ کس طرح سے ہوگا تابش! میں یوسف کو کیا بتاؤں گی۔ میں تو پہلے ہی بہت ڈر رہی ہوں۔ میں یوسف کو بتائے بغیر آپ سے مل رہی ہوں۔ انہیں پتا چل گیا تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں گے۔''

''میں اس سارے معاملے میں نہیں آؤں گا ثروت...... سب کچھ کسی اور طرح سے ہوگا۔ میں نے طریقہ سوچ لیا ہے۔''

''کیسا طریقہ؟''

''چچا احمد اور چچی جان آج کل آسٹریا میں ہیں۔ شاید ویانا میں ہی رہ رہے ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ہم نصرت کو علاج کے لئے بھی ویانا ہی لے جائیں گے۔ میں چچا احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری پوری مدد کریں گے۔ ویسے بھی وہ تم دونوں بہنوں سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ یہی ظاہر کریں گے کہ وہی نصرت کو علاج کے لئے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اور وہی اخراجات میں بھی تعاون کریں گے۔ بس یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب کچھ ارینج کر لوں گا۔''

ثروت نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور جیسے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے پلکیں جھکا لیں۔

اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی مجھ میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں پر حیران ہے۔ میں جو ماضی قریب میں ہر طرح سے ایک ناتواں اور دبا ہوا شخص تھا، اب مشکل حالات کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور میرے لب و لہجے کا اعتماد ثابت کرتا تھا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔

مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ میرا اعتماد ثروت کو بھی اعتماد بخش رہا ہے۔ وہ جو نصرت کی بیماری کے متعلق بات کرنے سے بھی خوف زدہ رہتی تھی، اب بات کر رہی تھی۔ مجھ سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھی۔ میں نے بجلی کی کیتلی کے ذریعے اسے چائے بنا کر دی۔ میرے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے اس کی نازک انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ اس مختصر سے لمس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا اور میرے ذہن میں یادوں کے اَن گنت دریچے وا ہو گئے۔ جب ہم قریب تھے، یک جان دو قالب کی طرح...... شب و روز میں ایک جادو تھا۔ موسم حسین تھے۔ کانوں میں ہر وقت نغمے گونجتے تھے اور دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی لَے پر رقص کرتی تھیں۔

میں نے سوچا...... کیا ثروت کو بھی وہ سب کچھ یاد ہے؟

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یاد نہ ہو؟ انسان کتنا بھی بدل جائے، رسم و رواج، مذہب اور معاشرے کے بندھن اُسے کتنا بھی جکڑ لیں، دل و دماغ میں نقش ہو جانے والی سنہری یادوں کو کھرچا تو نہیں جا سکتا۔ ذرا سی ہوا چلے تو ماہ و سال کے در کھل جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ جنہیں کوئی گریز، کوئی وجہ روک نہیں سکتی۔

رات کو فون پر چچا احمد سے میری طویل بات ہوئی۔ میں نے انہیں ساری صورتِ حال بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں......

نصرت کی بیماری کے معاملات نے چچا احمد کو بھی بہت پریشان کیا۔ وہ آبدیدہ ہو گئے۔ وہ ویانا کی کسی الیکٹرک کمپنی میں درمیانے درجے کی ملازمت کرتے تھے۔ چار پانچ افراد کی فیملی تھی۔ بس گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں نے چچا احمد کو ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں بھی تھوڑا بہت بتایا اور انہیں آگاہ کیا کہ نصرت کے علاج کا کام ہمیں کس طرح کرنا ہوگا۔ اس سارے کام میں میرا نام نہیں آنا تھا۔ چچا احمد کو خود ہی ثروت سے رابطہ کرنا تھا اور پھر نصرت

کے علاج معالجے کی بات آگے چلانا تھی......

ایک دن بعد چچا احمد سے میری ایک اور ٹیلی فونک گفتگو ہوئی۔ اس میں مزید تفصیلات طے کی گئیں۔ میں نے قریباً پچاس لاکھ روپے ویانا میں چچا احمد کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا انتظام بھی کر دیا۔

ایک طرف یہ کام ہو رہا تھا، دوسری طرف عمران مسٹر ریان ولیم کی ہدایت کے مطابق شیخوپورہ کے قریب سہراب جلالی کے فارم ہاؤس میں پہنچ چکا تھا۔ وہ وہاں باورچی کے روپ میں داخل ہوا تھا اور اس طرح مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ جہاں اور بہت سے کام کر لیتا ہے، وہاں کھانا پکانا بھی جانتا ہے۔ رات کو اس نے جلالی کے فارم ہاؤس سے ہی مجھے فون کیا۔ ''جگر! اب آ جاؤ تم بھی۔ مجھ سے اکیلے یہ سارا کام نہیں سنبھالا جا رہا۔ پیاز کاٹ کاٹ کر میں نابینا ہونے والا ہوں۔''

''ایسے کام تو مجھ سے بھی نہیں ہوں گے۔''

''لیکن کچھ ایسے کام بھی ہیں جو تم کر لو گے۔ بس اب آ جاؤ فٹافٹ۔ میں نے جلالی صاحب سے کہہ رکھا ہے کہ میرا اسسٹنٹ بھی ایک دو دن میں آنے والا ہے۔ پرسوں یہاں ایک دعوت بھی ہے۔ میں تو پیاز چھیل چھیل کر مینا کماری بن جاؤں گا۔''

''مینا کماری کیوں؟''

''بھئی میں رونے دھونے کی بات کر رہا ہوں۔ باقی یہاں کے حالات واقعی گڑبڑ ہیں۔ اندر خانے کچھ نہ کچھ ہے۔ ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں جان کر میری کھوپڑی فیل ہو گئی ہے۔ تم آؤ گے تو کچھ مشورہ بھی ہو جائے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں، ایک ایک اور دو گیارہ۔''

''کس قسم کی باتیں ہیں؟''

''بس کچھ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لگتا ہے کہ یہاں کوئی فلم چل رہی ہے۔ تو پھر کب پہنچ رہے ہو تم؟''

''میں چاہتا ہوں کہ ثروت اور نصرت یہاں سے علاج کے لئے روانہ ہو جائیں تو پھر آؤں۔''

''جگر! وہ کام تو اب ہو ہی جانا ہے۔ ابھی جیلانی کا فون آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آٹھ دس روز تک ویزا لگ جائے گا۔ اب وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم بس آنے والی بات کرو۔''

''ٹھیک ہے، کل شام تک پہنچ جاؤں گا...... لیکن آنا کس حیثیت سے ہے؟''

''تمہیں بتایا تو تھا، تم میرے معاون ہو۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے ہندوستانی صنعت کار نے لاہور میں ہمارے ہاتھ کا کھانا کھایا اور ہمیں اپنے ساتھ انڈیا لے گیا۔ انڈیا میں ہم دونوں کئی کھاتے پیتے گھرانوں میں خدمات انجام دے چکے ہیں جن میں مشہور فلمی ستارے بھی شامل ہیں۔ مثلاً راج کپور، سمیتا پاٹیل، امجد خان، دیویا بھارتی۔''

''جن ستاروں کے تم نے نام لئے ہیں، وہ سارے کے سارے دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔''

''تو یار! انہوں نے ہمارے کھانوں کی وجہ سے تو کوچ نہیں کیا ہے۔ اور اگر کیا بھی ہے تو اس میں اچھائی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ہمارے پکائے ہوئے کھانے اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ بندہ ان پر اپنی جان لٹا دیتا ہے۔''

''اچھا زیادہ زبان مت چلاؤ۔ مجھے وہاں کس نام سے پہنچنا ہے اور تمہیں کس نام سے بلانا ہے؟''

''تم اپنے اصلی نام سے ہی آؤ گے اور مجھے جس طرح کی عزت چاہے دے لینا۔ استاد جی کہہ لینا، ماسٹر جی، جناب، سر، وغیرہ وغیرہ۔''

...... وہ ایک شفق رنگ شام تھی جب میں ایک دیہاتی تانگے سے اترا اور فارم ہاؤس کے مین دروازے کی طرف بڑھا۔ میں عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس وسیع فارم ہاؤس کو ایک دس فٹ اونچی پختہ دیوار سے محفوظ کیا گیا تھا۔ دیوار سے اوپر خاردار تار بھی تھے۔ گیٹ پر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ انہیں میری آمد کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا لہٰذا مجھے گیٹ سے گزرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک محافظ نے پکار کر کہا۔ ''فتح محمد! ان بھائی صاحب کو باورچی خانے میں عمران صاحب کے پاس پہنچا دو۔''

فتح محمد گھنی مونچھوں اور گہری رنگت والا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ ہونٹ سگریٹ نوشی کے سبب سیاہ تر تھے۔ اس کے کندھے سے پستول کا سیاہ ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے پرکھنے والی نظروں سے دیکھا پھر ایک لفظ کہے بغیر میرے آگے آگے چل دیا۔ فارم کی زمین کے بیچوں بیچ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ عمارت کا رقبہ قریباً دو کنال ہوگا۔ عمارت تک ایک طویل ڈرائیو وے جاتا تھا۔ اس کی دونوں طرف کیاریاں تھیں اور سفیدے کے درخت تھے۔

سورج کا سرخ تھال ان درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ دائیں طرف ٹیڈی بکریوں کا ایک بہت بڑا باڑا نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف ایک فش فارم تھا جس کے کنارے پر خشک گوبر وغیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم ڈرائیووے پر چلتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ اس پیدل سفر کے دوران میں نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا رہا کہ کچھ نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ پورچ میں جلالی صاحب کی پرانی شیورلیٹ ایک نئی شان کے ساتھ موجود تھی۔ جلد ہی میں کوٹھی کے وسیع باورچی خانے میں عمران کے ساتھ موجود تھا۔

فتح محمد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ''تم بڑے وقت پر آئے ہو تابی...... یہاں زبردست مارکٹائی ہونے والی ہے۔''

''کس کے ساتھ؟''

''میرے ساتھ۔''

''کیا مطلب؟''

اس نے کھڑکی میں دور کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک کوتاہ قامت شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے انداز اور حرکات وسکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ ''یہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں کا بڑا ویٹرنری ڈاکٹر۔ اس نے یہاں کے سارے جانوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔''

''لیکن یہ تم سے کیوں جھگڑے گا؟''

''بس اس کی دُم پر میرا پاؤں آ گیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں مرچیں بھری گئی ہیں۔''

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے وسیع باورچی خانے پر ایک نظر ڈالی۔ تین، چار دیگچوں میں کھانا پک رہا تھا۔ عمران بڑی مہارت سے باری باری ان میں چمچہ چلا رہا تھا۔ خوشبو مزے دار تھی اور اس بات کا پتا دیتی تھی کہ وہ اس کام میں اناڑی نہیں ہے۔ باورچی خانے میں تمام جدید اور مہنگی سہولتیں موجود تھیں۔ ایک طرف ماضی کی مشہور فلم اسٹار جین فونڈا کی ایک بڑی تصویر لگی تھی۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں فلم اسٹار ''کک'' کا لباس پہنے کچھ پکانے میں مصروف تھی۔ ایک الماری میں کوکنگ سے متعلق بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔

''لو جی، وہ پھڈے باز اسی طرف آ رہا ہے۔'' عمران نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص غصے میں تپا ہوا باورچی خانے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا انداز تشویش ناک تھا۔

عمران نے دو چولہے بند کئے اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ مار کھانے کے لئے یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! دیکھو یہاں اتنی خوب صورت فلم اسٹار کی تصور لگی ہوئی ہے۔ کیسی Live تصویر ہے۔ لگتا ہے وہ باقاعدہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ اتنی حسین عورت کے سامنے بے عزت ہونے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔''

وہ نکلا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مار کھانے کی باتیں جان بوجھ کر رہا ہے۔ ایک ویٹرنری ڈاکٹر بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہیں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو، تم صرف خانساماں ہو اور وہ بھی اسسٹنٹ خانساماں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند سیکنڈ بعد ہٹا کٹا شخص دندناتا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوا۔ پھر ہمیں ساتھ والے کمرے میں دیکھ کر ہماری طرف چلا آیا۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال ہو گی۔ ناک چوڑی اور پھولی ہوئی تھی۔ ماتھے پر کٹ کا پرانا نشان اس کی تندمزاجی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

وہ عمران کو دیکھ کر پھنکارا۔ ''میں نے کل کیا کہا تھا تم سے؟ کیا کہا تھا؟ میں نے بکواس کی تھی کہ میرے کام میں دخل مت دو۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! وہ اتنی [illegible] بلی...... وہ مر رہی تھی اور آپ لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے اندر کچھ نہ گیا تو وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔''

''وہ مر جاتی۔ ساری بلیاں مر جاتیں لیکن تم حرامزادے کون ہوتے ہو میرے معاملوں میں ٹانگ اڑانے والے۔ کون سی ڈگری ہے تمہارے پاس؟ کیا کوالیفکیشن ہے تمہاری؟ کس باغ کی مولی ہو؟''

اس نے عمران کو زور سے دھکا دیا۔ عمران دیوار سے ٹکرایا پھر غصے میں بولا۔ ''دیکھو ڈاکٹر راشد! زبان سے بات کرو، ہاتھ مت چلاؤ۔ ورنہ......''

اس نے ہاتھ گھما کر عمران کو تھپڑ مارا۔ ''ورنہ کیا...... ورنہ کیا...... کیا کر لے گا تُو...... کتے کے بچے...... دو ٹکے کے باورچی...... میں دانت توڑ دوں گا تیرے۔'' وہ عمران پر پل پڑا۔

عمران گر گیا۔ اس نے لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

میں نے عمران کو چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی۔ اس کوشش میں مجھے بھی ایک دو گھونسے پڑے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عمران کی کوئی پلاننگ ہے۔

عمران پر غصہ اتارنے کے بعد ڈاکٹر راشد پھنکارتا اور گالیاں بکتا ہوا واپس چلا گیا۔ عمران کی ایک باچھ سے خون رِسنے لگا تھا۔ رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔

عمران واپس باورچی خانے میں آ گیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کسی صابر شاکر بیوی کی طرح پھر سے کھانا پکانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ پچھلے چار پانچ دنوں میں اس ڈاکٹر راشد سے کافی یاد اللہ ہو گئی ہے تمہاری۔''

''تمہیں پتا ہے، اڑیل بندوں سے یاد اللہ ہو ہی جاتی ہے میری۔ یہاں جلالی صاحب کے چڑیا گھر میں ایک بڑی قیمتی ایرانی بلی ہے۔ دس پندرہ دن میں اس نے بچے بھی دینے ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ دو ہفتے سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی ''ٹریٹ منٹ'' اس پر الٹا اثر کر رہی تھی۔ میں نے بلی کو پیار محبت سے سمجھایا۔ اسے گانا سنایا...... کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے...... بلی کا دل پسیج گیا۔ اس نے آج میرے ہاتھوں سے قریباً ایک پاؤ دودھ پیا ہے۔ بس اسی بات سے ڈاکٹر صاحب کو تپ چڑھ گئی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں ''کارِ سرکار'' میں مداخلت کر رہا ہوں۔''

''لیکن اس اچھے کام کے لئے تمہیں اس ڈنگر ڈاکٹر سے مار کھانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بس یہ معرفت کی باتیں ہیں۔'' اس نے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے باورچی خانے کے چوبی اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''فون پر تم نے بتایا تھا کہ یہاں، فارم ہاؤس میں کچھ الٹی سیدھی باتیں ہو رہی ہیں۔''

''یار! تم بڑے گھامڑ ہو۔ ابھی جو کچھ تم نے دیکھا ہے، کیا وہ الٹا سیدھا نہیں ہے؟ ایک سانڈ نما ڈاکٹر نے تمہارے سامنے تمہارے یار کو مارا پیٹا ہے اور دندناتا ہوا واپس چلا گیا ہے۔ اور کیا یہ الٹا سیدھا نہیں ہے کہ تمہاری شکل میں ایک ایسا شخص یہاں باورچی کی خدمات انجام دینے آیا ہے جسے انڈا تلنا بھی نہیں آتا۔ اور اگر اس کے علاوہ بھی کچھ الٹا سیدھا دیکھنا چاہتے ہو تو وہ بھی دیکھ لینا۔ ابھی رات ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب، رات ہونے والی ہے؟''

''یار! اکثر الٹی سیدھی باتیں رات ہی کو تو ہوتی ہیں۔'' اس نے آنکھ میچی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس نے ایک نیپکن کی گدی بنائی اور اسے چولہے پر گرم کر کے اپنے رخسار کی چوٹ کی ٹکور کرنے لگا۔

میں عمر رسیدہ سہراب جلالی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر رات گئے تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے جلالی کے پرائیویٹ چڑیا گھر کا ایک حصہ ضرور دیکھا۔ وہ یقیناً جانوروں میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ان کی رہائش اور خوراک وغیرہ کا بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً اس کام پر لاکھوں خرچ ہو رہے تھے۔ اس نے بعض جانوروں کی ملکیت کے لئے باقاعدہ لائسنس لے رکھے تھے۔ کئی قسم کے ہرن، سانپ، ریچھ اور زیبرے وغیرہ اس کی کولیکشن کا حصہ تھے۔ حال ہی میں اس نے تیندوے کا ایک جوڑا بھی حاصل کیا تھا۔ ابھی وہ عارضی قیام گاہ میں تھا۔ اب اس جوڑے کے لئے ایک شایانِ شان رہائش گاہ تیار ہو رہی تھی۔ اس رہائش گاہ کے عقب میں نایاب اور کم یاب پرندوں کے بہت سے پنجرے تھے۔

عمران کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ جانوروں کا ایک ڈاکٹر چوبیس گھنٹے یہاں فارم میں رہتا ہے۔ اس کے ساتھ دو اسسٹنٹ بھی ہیں۔ سینئر ڈاکٹر راشد ایک دن چھوڑ کر یہاں وزٹ کرتا ہے۔ سہراب جلالی کے دو ذاتی معالج ہیں۔ دونوں نوجوان ڈاکٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ فارم ہاؤس میں ملازمین کا ایک دستہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ مرد ملازم فارم ہاؤس میں خدمات انجام دیتے ہیں جبکہ ملازمائیں کوٹھی کے اندر ہوتی ہیں۔

رات سکون سے گزری۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سہراب جلالی سے میری پہلی ملاقات اگلے روز صبح سویرے ہی ہو گئی۔ عمران بڑی چابکدستی سے ناشتا تیار کر رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھا۔ جیسے انڈا پھینٹنا، ٹماٹر اور پیاز کاٹنا، آئل گرم کرنا۔ اچانک ایک چھوٹے سے ٹیڈی کتے کی باریک آواز سنائی دی۔ کتا تیزی سے کچن کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت اسٹریپ تھا۔ یہ اسٹریپ جس شخص کے ہاتھ میں تھا، وہ سہراب جلالی تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کا وزن بمشکل پچاس کلوگرام رہا ہو گا۔ اس نے نیکر پہن رکھی تھی جس میں سے اس کی سوکھی سڑی ٹانگیں، دو چوبی بیساکھیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ چہرہ جھریوں بھرا، مونچھیں سفید اور گھنی، آنکھیں گدلی تھیں۔ اپنے نیم گنجے سر کو اس نے پی کیپ سے چھپا رکھا تھا۔ عمران نے

مجھے بتایا تھا کہ جلالی کا دل ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔اس کے سینے میں دل کی رفتار برقرار رکھنے کے لئے ''پیس میکر'' لگا ہوا ہے۔اس پیس میکر کے علاوہ بھی جلالی کی ''بے مثال صحت'' کی کچھ نشانیاں اس کے لاغر جسم پر دکھائی دے رہی تھیں۔اس کی ایک کلائی پر انجکشن وغیرہ لگانے کے لئے ''کینولا'' لگا ہوا تھا۔جسم سے کسی فاسد مادے کے اخراج کے لئے لگائی جانے والی تھیلی بھی کمر سے جھول رہی تھی۔

ان ساری صعوبتوں کے باوجود وہ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔اس کی نگاہ سب سے پہلے عمران کے رخسار کی چوٹ پر ہی پڑی۔''یہ کیا ہے بھئی؟''اس نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔

''بس جی......کل کھڑکی کا پٹ لگ گیا تھا......''

جلالی بولا۔''کھڑکی کا پٹ لگنے سے ایسی چوٹ تو نہیں آتی۔یہ تو لگتا ہے کہ کسی نے گھونسا مارا ہے۔نیچے ٹھوڑی پر بھی نیل نظر آ رہا ہے۔''

''نن......نہیں جناب!ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''ڈاکٹر راشد سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا؟''

''نہیں جی۔ان سے جھگڑا کیوں ہوگا؟''

''وہ اپنے کام میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا اور تم تین دن سے ایرانی بلی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو۔''جلالی کا لہجہ تھوڑا سا سخت تھا۔

''وغلطی ہوگئی تھی جی......اب ایسا نہیں کروں گا۔''

''کیوں نہیں کرو گے تم ایسا؟تم ایسا کرو گے بلکہ آج سے چاروں ایرانی بلیوں کی خوراک کی ذمے داری تمہاری ہے۔''

''مم......میں سمجھا نہیں جی۔''

''تمہیں پتا ہے،میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ایرانی بلیوں کا وزن مسلسل کم ہو رہا ہے۔انہیں کھانا پلانا تمہاری ذمے داری ہے۔''

''لیکن......جناب......ڈاکٹر راشد صاحب؟''

''ڈاکٹر راشد ملازم ہے،مالک نہیں ہے۔مالک میں ہوں۔اور تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔او اس کو تم سے معافی بھی مانگنی پڑے گی۔''

''معافی......،بات کی جی؟''

''زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔میں جانتا ہوں یہاں کل جو کچھ ہوا ہے۔اور اب اپنی چونچ بند کرو۔وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔جلالی نے جیسے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولا۔''اور یہ کون ہے؟''

''تابش نام ہے جی اس کا۔میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تھا۔یہ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔''

جلالی نے ایک مرتبہ پھر مجھے گھورا اور پھر سر ہلا کر بولا۔''ٹھیک ہے،اسے یہاں کے اصول قاعدے اچھی طرح سمجھا دو۔''

''جو حکم جناب۔''عمران نے ادب سے سر جھکایا۔میں نے بھی گردن کو خم دیا۔سہراب جلالی نے ٹیڈی کتے کے اسٹریپ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔وہ شتابی سے واپس مڑا......سہراب جلالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سہراب جلالی کے جانے کے بعد عمران نے دائیں بائیں دیکھا پھر جلالی کی نقل اتارتے ہوئے اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔آنکھوں پر خیالی چشمے کو درست کیا......نیکر کے ''گیلوز'' کو اوپر کی طرف کھینچا اور بولا۔''برخوردار!دوپہر کا کھانا ٹھیک بارہ بجے اور رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے کھایا جاتا ہے۔نہ ایک منٹ زیادہ نہ کم۔سونے کا وقت دس بجے ہے۔دس بجے تک ساری روشنیاں بجھ جانی چاہئیں۔سگریٹ نوشی ایک دم ممنوع ہے......بلکہ ہر طرح کی تمباکو نوشی۔کوئی ملازم یا اس کا کوئی ملاقاتی ایسا کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے سزا کے طور پر فارم کے دو چکر دوڑ کر لگانے پڑیں گے اور تنخواہ کا چوتھائی حصہ کاٹ لیا جائے گا۔ٹی وی دیکھنا بھی منع ہے......موسیقی دھیمی آواز میں سنی جا سکتی ہے لیکن وہ بھی پرانی۔''ویڈیو'' پر پرانی انگلش اور اردو فلمیں دیکھی جا سکتی ہیں......اسی کی دہائی سے بعد کی فلمیں دیکھنے پر بھی خاطر خواہ جرمانہ ہوگا......اور تم......تم ایسے مسکرا کیوں رہے ہو؟میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو؟مذاق سمجھ رہے ہو؟''

اس نے غصے میں آ کر کچن کی میز پر زور سے مکا مارا۔جلالی کے انداز میں عینک کو درست کیا اور پھنکارا۔''دفع ہو جاؤ یہاں سے......دور ہو جاؤ میری نظروں سے......تمہاری تنخواہ تمہارے ایڈریس پر بھیج دی جائے گی۔گیٹ آؤٹ۔''اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔پھر کرسی پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔جلالی کے انداز میں اپنی ذاتی ڈاکٹر کو آواز دیتے ہوئے بولا۔''مہناز......گولی لاؤ......سانس ٹھیک کرنے والی گولی لاؤ۔''

''یہ ڈراما بند کرو۔میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ جلالی صاحب کس ٹائپ کی چیز ہیں۔مجھے صرف یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب کو کل والے واقعے کا پتا کیسے چلا؟یہاں بھی حکم جی کے دربار کی

طرح کوئی جادو وغیرہ تو نہیں چلتا؟'' میرا اشارہ کل ہونے والی مار پٹائی کی طرف تھا۔

''جادو تو ہر جگہ چلتے ہیں پیارے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جدید جادو ہیں۔ انٹرنیٹ بھی ایک جادو ہے۔ یہ سیٹلائٹس بھی جادو ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر باسی کے گھر کا صحن تک دیکھ سکتے ہیں......''

''یہاں کون سا جادو ہے...... انٹرنیٹ یا سیٹلائٹ؟''

''یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں۔''

''بہت خوب! مجھے لال کوٹھیاں یاد آ گئیں۔ وہاں بھی تو میڈم صفورا نے خفیہ نگرانی کا نظام قائم کیا ہوا ہے...... لیکن...... ایک بات کی وضاحت فرما دو۔''

''ارشاد۔''

میں نے کچن میں دائیں بائیں دیکھا پھر ہولے سے کہا۔ ''اگر یہاں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں تو پھر ابھی تم نے جلالی صاحب کی جو بھونڈی نقل اتاری ہے اور ان کے اسٹائل کی مٹی پلید کی ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''اتنی کچی گولیاں میں نے نہیں کھیلی ہوئیں...... بلکہ میں نے تو سرے سے گولیاں ہی نہیں کھیلیں...... کیمرے ہر جگہ نہیں ہیں۔ بس خاص خاص جگہوں پر ہیں......''

''یعنی کل جس کمرے میں ڈاکٹر راشد نے تمہیں تھپڑ اور ٹھڈے وغیرہ مارے وہاں کیمرا نصب تھا؟''

''عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کل جب عمران نے ڈاکٹر راشد کو غصے کی حالت میں کچن کی طرف آتے دیکھا تھا تو یہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں کیوں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا...... یار، یہاں پری چہرہ جین فونڈا کی تصویر لگی ہوئی ہے، یہاں مار کھاتے اچھا لگوں گا۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کے پیچھے اکثر کوئی وجہ ہوتی تھی۔

شام کے ٹھیک چار بجے جب میں اور عمران کچن میں چائے کی تیاری کر رہے تھے، میں نے ڈرائنگ روم میں سہرب جلالی کو دیکھا۔ وہ گداز صوفے میں دھنس کر بیٹھے ہوئے تھے اور صوفے کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ ڈاکٹر راشد سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ان کا انداز سمجھانے بجھانے والا تھا۔ آج وہ بڑے تحمل سے بات کرتے نظر آ رہے تھے۔ گرانڈیل ڈاکٹر راشد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ موضوع گفتگو یقیناً کل والا واقعہ ہی تھا۔ شاید جلالی صاحب، ڈاکٹر راشد کو آمادہ کر رہے تھے

کہ وہ اپنی جارحیت پر عمران سے معذرت کر لے۔

جب ملازم ان دونوں کو چائے سرو کر کے آیا، تب تک سب ٹھیک تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے اچانک جلالی صاحب ہتھے سے اکھڑ گئے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آواز سنی۔ ڈرائنگ روم میں جھانکا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے چٹاخ سے ایک زوردار تھپڑ ڈاکٹر راشد کے منہ پر مارا پھر ایک چھتری پکڑ لی۔ وہ بڑی تیزی سے اسے پیٹنے لگے۔ وہ ہکا بکا تھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن جلالی صاحب اسے موقع ہی کہاں دے رہے تھے...... وہ الٹے پاؤں چلتا چلتا پشت کے بل گرا۔ جلالی صاحب نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ ڈاکٹر کبھی شدید غصہ دکھاتا تھا، کبھی معذرت کا انداز اختیار کرتا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔ ''نکل جاؤ یہاں سے۔ اور یہ کپڑے بھی اتارو۔ یہ وردی میری دی ہوئی ہے...... اتارو یہ وردی بھی۔''

جلالی صاحب نے ڈاکٹر راشد کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اس کی شرٹ اتارنے کی کوشش کی۔ جلالی صاحب کا مطمع نظر سمجھ کر گارڈز ڈاکٹر راشد کی طرف لپکے۔ جلالی صاحب ڈاکٹر راشد کو مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کے کپڑے اتارنے کا حکم بھی دے رہے تھے۔ دو منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر راشد کے جسم پر چڈی اور بنیان کے سوا اور کچھ نہ رہا۔

جلالی صاحب دہاڑے...... ''دو منٹ کے بعد تمہیں فارم کے اندر نظر نہیں آنا چاہئے۔ ورنہ کتے چھوڑ دوں گا......''

ہم نے ڈاکٹر راشد کو بڑی بے توقیری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے اور راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا۔ جلالی صاحب کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ایک طرف سے نوجوان لیڈی ڈاکٹر مہناز اپنے سفید کوٹ میں دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک ملازم وہیل چیئر لایا۔ جلالی صاحب بے دم ہو کر اس پر بیٹھ گئے۔ یہ قریباً ویسا ہی نقشہ تھا جو آج سویرے عمران نے مذاق مذاق میں کھینچا تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر فوراً انہیں ایک گولی کھانے کے لئے دی۔

وہ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون ہونے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ جلالی صاحب کا پارا بدستور چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل فون نکالا اور اپنے سیکرٹری ندیم سے کہا کہ وہ ڈاکٹر عقیل کا نمبر ملائے۔ ڈاکٹر مہناز اپنا خوب صورت ہاتھ جلالی صاحب کے سینے پر چلا رہی تھی اور انہیں آمادہ کر رہی تھی کہ وہ ابھی کسی سے بات نہ کریں۔ لیکن جلالی صاحب کی تیوریاں بتا رہی تھیں کہ وہ اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں۔

سیکرٹری ندیم نے نمبر ملایا تو انہوں نے فون پر گرجتے ہوئے کہا۔ اسے باریک آواز

میں گرجنا کہا جا سکتا تھا۔ ''ڈاکٹر عقیل! کہاں ہو تم؟...... ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ فوراً لاہور واپس آؤ...... اور شیخوپورہ پہنچو۔ میں تمہیں ابھی اسی وقت اس بدمعاش راشد کی جگہ پر اپائنٹ کر رہا ہوں...... ابھی اسی وقت...... نہیں...... نہیں...... یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم ابھی شیخوپورہ پہنچو۔ یہ حکم ہے میرا۔''

جلالی کے مزاج کا یہ رخ دیکھنے کے بعد ان کی شخصیت کے بارے میں کافی کچھ پتا چل رہا تھا۔ جو ایک دوسری بات معلوم ہو رہی تھی، وہ یہ تھی کہ جلالی صاحب خوب صورتی کو پسند کرتے تھے۔ ان کی دونوں ذاتی معالج نوجوان اور خوب صورت تھیں۔ خاص طور سے مہناز۔ وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کی عمر اور صحت تو ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ ایک مرد کی حیثیت سے خواتین کی خلوت سے روایتی فائدہ اٹھا سکتے۔ تاہم جس طرح خوبصورت پھولوں کی موجودگی طبع میں خوشگواری پیدا کرتی ہے، اسی طرح عین ممکن تھا کہ خوب صورت خواتین کی موجودگی سے جلالی صاحب کے دل و دماغ پر اچھے اثرات پڑتے ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ فارم ہاؤس میں موجود بیشتر ملازمائیں جوان اور خوش شکل تھیں یا کم از کم قبول صورت تھیں۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ایک شاندار ہنڈا اکارڈ پورچ میں آ کر رکی۔ اس میں سے اترنے والی ایک جواں سال خاتون تھی۔ عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ شہد رنگ خوب صورت بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک درمیانے قد کاٹھ کا سفید فام بھی اس کے ساتھ تھا۔ خاتون کے ہاتھ میں اسٹیل کا بنا ہوا ایک نہایت نفیس و دیدہ زیب پنجرہ تھا۔ اس پنجرے میں بالکل چھوٹے سائز کی دو رنگین چڑیاں تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خاتون اور اس کا ساتھی چڑیوں کا یہ جوڑا جلالی صاحب کے لئے بطور تحفہ لائے ہیں۔

جلالی صاحب سے ان دونوں مہمانوں کا وقت طے تھا، اس لئے وہ سیدھے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا، جواں سال عورت بڑی عاجزی اور لگاوٹ سے جلالی صاحب سے باتیں کر رہی تھی۔ جلالی صاحب نے نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ان کے سوکھے سڑے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگاتی تھی۔ نایاب چڑیوں والا پنجرہ شیشے کی تپائی پر رکھا تھا۔

میں کچن میں پہنچا۔ میں عمران کو ان مہمانوں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر وہ بڑے انہماک سے ایک دیگچے میں چمچہ چلانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کچن کیبنٹ کے اندر

رکھا ہوا ریڈیو بھی سن رہا تھا۔ میں نے سمجھا شاید وہ ''ایف ایم'' سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ''شی'' کی آواز نکالی۔

اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیو نہیں سن رہا۔ یہ کوئی نئی طرز کا ڈکٹافون تھا۔ ڈکٹافون کا ریسیور بڑی صفائی سے ایک ڈیکوریشن پیس میں چھپایا گیا تھا۔ یہ ڈیکوریشن پیس کچن کیبنٹ کے اندر پڑا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو کی آوازیں وضاحت سے مجھ تک پہنچنے لگیں۔

عورت کی دلکش آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''بس جی، وہ خود بھی اپنی غلطی مان رہا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ آپ کا سامنا کر سکے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو وہ خود بھی آپ کے پاس حاضر ہو جائے گا۔''

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں اس کے آنے کی۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا...... اگر وہ آئے گا تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اور ایک بات تم دونوں بھی اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ پیار محبت جتا کر اور نرم رویہ دکھا کر مجھے کسی غلط کام پر آمادہ کر لو گے تو یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔ وہ باکس تمہارا نہیں اور نہ میرا ہے۔ ہم میں سے کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ میرے پاس بھی وہ بس امانت کے طور پر ہے۔ اس کا اصل مالک مل جائے گا تو میں اسے ایک منٹ بھی اپنے پاس رکھنا بہت بڑا گناہ سمجھوں گا۔''

''پلیز سر...... پلیز، اب اس کا ذکر مت چھیڑیں۔ وہ چیپٹر کلوز ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر یہاں آئی ہوں۔ یقین کریں آپ کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی شاندار لائبریری میں بہت سا وقت گزارا ہے۔''

''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے لائبریری سے کتابیں چوری کرنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔'' جلالی صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

جواں سال عورت نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھی نوجوان کا قہقہہ بھی اس میں شامل تھا۔

نوجوان نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''انکل! خدا کرے باکس کا مالک مل جائے۔ آپ اس کے لئے پورا پورا انتظار کریں۔ دو مہینے، چار مہینے، چھ مہینے لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر وہ چیز آپ کے لئے تو بالکل بیکار ہوگی لیکن ہمارے لئے کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود آپ اس بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے، وہ ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا۔ اور

اگر......''

''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' جلالی نے نوجوان کی بات کاٹتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

''مائیکل جناب۔''

''مائیکل صاحب! کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے کہ میں اُلو کا پٹھا ہوں......؟''

''جج......جی......میں سمجھا نہیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ کھڑے ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں کھڑے ہو جاؤ۔''

جواں سال عورت نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز جلالی کی پُر جلال آواز میں دب گئی۔ وہ چلائے۔ ''تم بھی کھڑی ہو جاؤ۔ نیچے رکھو یہ چائے کا کپ...... نیچے رکھو۔''

جلالی کی تلون مزاجی ایک بار پھر کام دکھا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی صورتِ حال ڈرامائی ہو گئی تھی۔ جلالی کی کڑکتی آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ کیا سمجھتے ہو؟ جو کام مجھ پر سختی کرنے سے نہیں ہو سکا، وہ مجھے بہلا پھسلا کر اور بے وقوف بنا کر کروا لو گے......؟ تمہارے جیسے لونڈے لونڈیوں کو اپنے ازار بند سے باندھ کر رکھتا ہوں میں...... میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بارے میں کوئی بات نہیں ہو گی۔ اب پھر وہی بکواس کر رہے ہو تم؟''

جلالی صاحب کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ جواں سال خاتون گھبرا کر بولی۔

''جلالی صاحب! مائیکل کا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ تو......''

''بند کرو بکواس۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے......فوراً نکلو'' غالباً جلالی صاحب نے جواں سال خاتون کو دھکا دیا تھا۔

نوجوان بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مسٹر جلالی! ہم تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے لیکن تم خود مشکل کو دعوت دے رہے ہو۔ اس طرح سے نہیں چلے گا......''

''آ گئے ہو نا اپنی اصلیت پر۔ تم گینگسٹر ہو، حرامزادے ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا، جان سے مار دوں گا۔''

''اپنے بڑھاپے پر رحم کھا جلالی۔ مرنا مشکل ہو جائے گا تیرا......''

''تو کر دو مشکل۔ الٹا لٹکا دو اپنے اس باپ کو...... لیکن اس باپ نے تمہیں کچھ بتا کر نہیں دینا۔ آخری دم تک نہیں۔'' جلالی صاحب اتنے زور سے بولے تھے کہ انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ صورتِ حال دھما کا خیز ہوتی جا رہی تھی۔

عمران نے ڈکٹا فون کا ریسیور آف کر کے کچن کیبنٹ کا پٹ بند کیا اور مجھے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف آیا۔ تب تک جلالی صاحب جواں سال عورت اور اس کے سخت گیر ساتھی کو دھکے مار کر ڈرائنگ روم سے باہر نکال چکے تھے۔ ہمارے سامنے ہی رنگین چڑیوں والا قیمتی پنجرہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر گرا اور پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ جلالی صاحب گرجے...... ''آئی سے گیٹ آؤٹ...... جسٹ ناؤ...... یو باسٹرڈ...... یو راسکل۔''

پھر ہم نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا۔ جلالی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور جھکتے جھکتے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا رنگ زردی مائل ہو رہا تھا۔ ''ڈاکٹر مہناز!'' کسی نے زور سے پکار کر کہا۔

اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ ڈاکٹر مہناز بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ اس نے جلدی سے جلالی صاحب کو صوفے پر لٹا لیا۔ ان کی زبان کے نیچے ایک اسپرے کیا۔ پھر ایک انجکشن بھرنے لگی۔ جلالی صاحب نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر مہناز نے جلدی جلدی ان کی وین میں دوا انجیکٹ کی۔

میں نے دیکھا، جواں سال عورت کا چہرہ پریشانی اور گھبراہٹ کی آماجگاہ تھا۔ وہ اپنے ساتھی سفید فام نوجوان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے غصہ تھا کہ اس کی تلخ کلامی کی وجہ سے جلالی کا پارا چڑھا تھا اور اب وہ سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے۔ جواں سال عورت نے آگے بڑھ کر جلالی کی حالت کا اندازہ لگانا چاہا۔ ڈاکٹر مہناز طیش سے بولی۔ ''پلیز! آپ لوگ باہر چلے جائیں...... آپ ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو پتا بھی ہے سب کچھ۔''

جواں سال عورت باہر آ گئی اور بے قراری سے ہاتھ ملنے لگی۔ مہناز کی ہدایت پر ڈاکٹر لائبہ موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ غالباً اپنے کسی سینئر سے ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز ہی کی ہدایت پر سیکرٹری ندیم بھاگا بھاگا گیا اور آکسیجن کا سلنڈر اور ماسک وغیرہ لے آیا...... جلالی صاحب کو فوراً آکسیجن چڑھا دی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں نے جلالی صاحب کو Hospitalize کرنے کا بیشتر انتظام گھر پر کر رکھا تھا۔

اس ساری افراتفری کے دوران میں ہی جواں سال عورت اور اس کا ساتھی، فارم ہاؤس سے کھسک گئے۔ میں نے ان کی نئی ہنڈا اکارڈ کو بیرونی گیٹ کی طرف جاتے دیکھا...... جلالی صاحب مسلسل آنکھیں بند کئے لیٹے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی

رہے تھے۔ان کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ڈاکٹر مہناز انہیں طبی امداد دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون رہنے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔لیکن ''جلالی'' تو ماننے والے شخص کا نام ہی نہیں تھا۔آخر ڈاکٹر مہناز نے انہیں ایک اور انجکشن دے دیا۔غالباً یہ انہیں پُرسکون کرنے کے لئے تھا۔

میں اور عمران کچن میں واپس آ گئے۔''یہ کیا گورکھ دھندا ہے یار! یہ کس باکس کی بات ہو رہی ہے یہاں؟''

''یہی معلوم کرنے کے لئے تو ہم یہاں ہیں۔''

''پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اندازہ لگایا ہو گا تم نے...... آخر جیمز بانڈ کے ہم زاد ہو تم۔یہاں تم نے ڈرائنگ روم میں باقاعدہ ڈکٹا فون چسپاں کیا ہوا ہے۔''

خلافِ توقع عمران سنجیدہ رہا اور دھیمے لہجے میں بولا۔''یہ تو ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز کا باکس ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، خاصا قیمتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس میں رقم وغیرہ ہو یا کوئی قیمتی دھات، یا پھر نوادر قسم کی چیز۔یہ باکس اتفاقاً ہی جلالی کے ہاتھ لگا ہے اور انہوں نے اسے کسی کی امانت کے طور پر سنبھال لیا ہے۔جلالی صاحب سنکی شخص ہیں۔ایسے لوگوں کے ذہن میں ایک بار جو بات بیٹھ جائے، وہ آسانی سے نکلتی نہیں۔وہ اب اس باکس کو ایک امانت کا درجہ دے چکے ہیں اور اس سے پیچھے ہٹنے کو ہرگز تیار نہیں۔ہوسکتا ہے کہ شروع میں انہوں نے اس باکس کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی ہو لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اس کو کہیں چھپا دیا۔اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے اور اس کا پتا جلالی صاحب کے سوا کسی کو نہیں۔اب جلالی صاحب سے اس باکس کو برآمد کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔مشہور جاپانی فلاسفر میر تقی میر نے اپنی ''انگریزی کتاب'' محمد خان جونیجو والے باب میں لکھا ہے۔کبھی کبھی انسان کی کمزوری ہی اس کی طاقت بن جاتی ہے...... یہاں حضرت جلالی صاحب کی ناتوانی ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار بنی ہوئی ہے۔درحقیقت جلالی صاحب پاکستان میں دوسرے نمبر کے اڑیل اور ضدی شخص ہیں۔''

''اور پہلے نمبر پر کون ہے؟''

''میں بتاؤں گا تو تم مجھ سے مارشل آرٹ شروع کر دو گے۔یہ موضوع پھر کبھی سہی۔''

وہ شرارت سے بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''چند دن پہلے جلالی صاحب نے اپنی ان صلاحیتوں کو پوری طرح ثابت بھی کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، کم از کم دو خطرناک پارٹیاں ایسی ہیں جو اس باکس کے پیچھے ہیں۔ان میں سے ایک پارٹی تو وہی ہے جس کے دو ''معزز'' ممبران ابھی تھوڑی دیر پہلے جلالی صاحب سے مل کر گئے ہیں۔کچھ دن پہلے یہ لوگ جلالی صاحب کو اپنا انتہائی خطرناک روپ بھی دکھا چکے ہیں۔انہوں نے جلالی صاحب کے گھر میں ہی ان پر سختی کی بلکہ باقاعدہ تشدد کیا۔جلالی صاحب کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔اپنی زندگی موت کی طرف سے بھی وہ تقریباً تقریباً بے پروا ہو چکے ہیں۔وہ اس بدمعاشی کے خلاف ڈٹ گئے۔تشدد کے دوران میں جب ان کی حالت خراب ہوئی تو تشدد کرنے والے خوف زدہ ہو گئے۔انہوں نے بجا طور پر سوچا کہ اگر باباجی کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تو وہ باکس ہمیشہ کے لئے ''گمشدہ'' ہو سکتا ہے۔وہ لوگ اس کوٹھی اور فارم ہاؤس کا چپا چپا چھان چکے ہیں۔باباجی سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو بھی نچوڑ چکے ہیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

''اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اب باکس میں ہے کیا بلا؟ اور شاید اس سے بھی اہم یہ کہ وہ باباجی یعنی جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟''

عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔''مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس سلسلے میں ہماری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی ہے مگر وہ بھی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔میرا خیال ہے کہ وہ بہت پہلے ہی یہ فارم ہاؤس چھوڑ چکی ہوتی۔یہ جلالی صاحب سے اس کا لگاؤ ہے جس نے اب تک اسے یہاں روکا ہوا ہے۔''

''لگاؤ سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' کیا وہ انہیں ایک بزرگ کی حیثیت دیتی ہے؟''

''نہیں یار خود کو بزرگ کہنے والے کا تو جلالی صاحب منہ توڑ دیتے ہیں۔یہ وہی ''لگاؤ'' ہے جو میر تقی میر کے شعروں میں ہوتا ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔''فضول بول بول کر تمہارا دماغ چکرا گیا ہے۔ابھی تم فرما رہے تھے کہ میر تقی میر ایک مشہور جاپانی فلاسفر کا نام ہے۔''

''میر تقی میر کے ننھیالی جاپان میں تھے اور ہر شاعر پارٹ ٹائم فلسفی بھی ہوتا ہے۔تم بال کی کھال مت اتارا کرو۔بس یہ بتاؤ کہ تم کسی طرح ڈاکٹر مہناز سے کچھ سن گن لے سکتے ہو یا نہیں؟''

''سن گن لینے والے کام تم مجھ سے بہتر کر لیتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہاں گڑبڑ ہے۔پرسوں باتوں میں ڈاکٹر صاحبہ سے ذرا نوک جھوک ہو

گئی تھی۔ وہ میری طرف سے ذرا بدگمان سی ہیں، تم کوشش کرو تو شاید بات بن جائے۔''

''کیا کیا تھا تم نے؟''

''بس وہی یار! زبان میں کھجلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا بول دیا۔ ان کو برا لگ گیا'' وہ معصومیت سے بولا۔

''یہ کھجلی کسی دن تمہیں بے طرح پٹوائے گی۔ ہر لڑکی کو شاہین سمجھنا چھوڑ دو۔''

''اچھا چچا جان! لیکن اب کیا کرو گے؟ مہناز سے بات کرنے کے لئے کوئی طریقہ ڈھونڈو۔''

...... مجھے مہناز سے بات کرنے کا موقع اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ مل گیا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا کرنے کے بعد جلالی صاحب اپنی چہیتی شیورلیٹ گاڑی میں لاہور چلے گئے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ عمران (باورچی) بھی ان کے ساتھ تھا۔ جلالی صاحب بہترین سبزی کے علاوہ بہترین دیسی مرغی کے گوشت کے بھی شوقین تھے۔ ان چیزوں کے انتخاب کے لئے وہ اپنی بیماری کے باوجود لاہور کی ٹولینٹن مارکیٹ تک جاتے تھے اور باورچی بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں اکیلا تھا۔ ذہن ثروت کی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ نصرت کے بیماری کے حالات بھی پریشان کر رہے تھے۔ وہ ثروت کے ساتھ چچا احمد کے پاس آسٹریا پہنچ رہی تھی مگر علاج شروع ہونے تک ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔ اتنے میں ملازم وحید نے آ کر بتایا کہ مہمان آئے ہیں۔ دو کپ چائے کی ضرورت ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ انہیں ''ٹی بیگ'' والی چائے کی ضرورت تھی ورنہ میں کوئی ایسی خاص چائے بنانے کے قابل نہیں تھا۔ ''کون آیا ہے؟'' میں نے رسمی انداز میں وحید سے پوچھا۔

''ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔''

کچھ دیر بعد وحید چائے لے کر چلا گیا تو میری رگِ تجسس پھڑکی۔ ڈاکٹر مہناز اور اس کی والدہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں تھیں اور یہی وہ جگہ تھی جہاں عمران نے سینٹر ٹیبل کے نیچے ایک نہایت حساس مائیکروفون نصب کر رکھا تھا۔ میں نے کچن میں رکھے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ تھوڑی سی کوشش کی اور ریسیور کو آن کرنے میں کامیاب رہا۔ ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں چائے کے برتن کھڑکھڑانے کی آوازیں بھی تھیں۔ میں نے ڈیکوریشن پیس کو کچن کیبنٹ کے اندر رکھا اور آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔ ایک بڑی عمر کی عورت کی آواز ابھری۔ ''مہناز! سمجھنے کی کوشش کرو یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی بھی وقت دوبارہ مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟ میرا اور کون ہے تمہارے

سوا؟''

''پھر بھی ہے امی! میں ان حالات میں جلالی صاحب کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ انہیں میری ضرورت ہے۔''

''لیکن مہناز! یہ ضرورت کوئی اور ڈاکٹر بھی پوری کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر لائبہ یہاں موجود ہے۔ وہ اپنی مدد کے لئے کسی اور سینئر ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر کو یہاں بلا سکتی ہے۔''

''مگر امی! جس طرح میں ان کی طبیعت کو سمجھتی ہوں، کوئی اور نہیں سمجھے گا۔ اسے سمجھنے میں کافی وقت لگے گا۔''

بڑی عمر کی عورت کی تپی ہوئی آواز ابھری۔ ''کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ ٹھیک ہیں جو کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ''انوالو'' ہو چکی ہو...... کچھ رحم کرو ہم پر مہناز...... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ چپکائے رکھتا ہے۔ وہ تمہارے......''

''پلیز امی...... پلیز...... خاموش ہو جائیں۔ میری اور اپنی توہین مت کریں۔ کیا مرد عورت کا بس ایک ہی تعلق ہوتا ہے...... ایک ہی رشتہ ہوتا ہے......؟''

''میں کب کہتی ہوں ایک ہی ہوتا ہے۔ بہت سے ہوتے ہیں لیکن اس رشتے کو کیا نام دو گی؟'' مہناز کی والدہ بھی بپھری ہوئی تھی۔

''ضروری نہیں کہ ہر رشتے کو نام ہی دیا جائے...... اس کو کسی خود ساختہ خانے میں ہی ''فٹ'' کیا جائے۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں، ان کی عزت کرتی ہوں...... اور وہ محبت اور عزت کے قابل ہیں بھی۔ وہ ایک الگ طرح کے انسان ہیں۔ ان میں ایسی خوبیاں ہیں جو عام لوگوں میں نہیں ہوتیں......''

''یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی عینک لگاتی ہو تم یہ خوبیاں دیکھتے ہوئے۔ ہمیں تو اس کھوسٹ میں رنگ برنگی بیماریوں، اکڑفوں اور غصے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔''

''پلیز امی...... ان کے بارے میں ایسا مت بولیں۔ پلیز۔'' پھر ڈاکٹر مہناز شاید رونے لگی تھی۔

اس کی والدہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دیکھ مہناز! اگر تُو نے میری بات نہیں مانی نا...... تو پھر مجھے امی بھی مت کہنا۔ سمجھ لینا...... کہ مر گئی ہے تمہاری امی...... وہ بھی تمہارے باپ کے پاس چلی گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ اب نہیں آؤں گی......'' وہ بات

کرتے کرتے مائیکروفون سے دور چلی گئی تھی لہٰذا اس کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ میں نے پلٹ کچن کی ایک کھڑکی کھولی۔ مجھے چھوٹے ڈرائنگ روم میں سے ایک درمیانی عمر کی صحت مند عورت نکلتی نظر آئی۔ اس نے براؤن چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ غصے میں دکھائی دیتی تھی۔ تب ڈاکٹر مہناز دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو روکنا چاہا...... لیکن اس نے مہناز کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا اور کچھ کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

مہناز ہچکیوں سے روتی ہوئی جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف واپس چلی گئی۔ عورت پورچ میں کھڑی ایک گرے رنگ کی سوئفٹ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ کار میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا، وہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عورت بھی مسلسل رو رہی ہے۔

میں کچھ دیر بعد چائے کے برتن لینے کے بہانے چھوٹے ڈرائنگ روم میں گیا تو ڈاکٹر مہناز کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے بالوں کی دو لٹیں سرخی مائل چہرے پر جھول رہی تھیں۔ ایک سوگوار سی دلکشی نے اس کے نقوش کو ڈھانپا ہوا تھا۔

''کسی چیز کی ضرورت ڈاکٹر صاحبہ؟'' میں نے آنکھیں ملائے بغیر پوچھا۔

''تابش! ایک گلاس پانی لے آؤ...... مجھے گولی کھانی ہے۔''

''لیکن...... آپ نے تو ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ خالی پیٹ گولی؟''

''اوہ۔'' ڈاکٹر مہناز نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اچھی ڈاکٹر ہوں۔''

''کچھ لے آؤں؟''

''چلو، ڈبل روٹی کے دو پیس سینک لاؤ اور پانی۔''

میں دو تین منٹ میں پیس سینک کر لے آیا۔ میں نے پلیٹ میز پر رکھی تو وہ غور سے میرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاہٹ کے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں کہو؟''

''مجھے یہاں آئے ہوئے بس دو چار دن ہی ہوئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کچھ گڑبڑ ہے۔ سارے ملازم کچھ ڈرے ڈرے سے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ بات بھی نہیں کرتے؟''

''بس اس جگہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ یہاں بڑا سکون تھا، ہر چیز ایک روٹین کے

مطابق تھی۔ پھول، پرندے، خوب صورت جانور، موسیقی، مزیدار کھانے سب کچھ تھا یہاں...... لیکن اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ کسی ان دیکھے سے خوف نے ہر چیز کو جکڑ لیا ہے۔''

''خوف کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے ڈاکٹر صاحبہ؟''

''کوئی ایک وجہ تو نہیں ہے۔'' ڈاکٹر مہناز نے گول مول سا جواب دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ابھی آپ نے کہا ہے کہ یہاں بہت سی اچھی چیزیں تھیں۔ پرندے، پھول اور مزیدار کھانے وغیرہ۔ آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے پکائے ہوئے کھانے مزیدار نہیں ہوتے۔''

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''سچ پوچھو تو یہی مطلب ہے۔ پہلے دونوں باورچی بہت اچھے تھے۔''

''لیکن وہ چھوڑ کیوں گئے؟''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔'' مہناز کا جواب پھر گول مول تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا ڈرائیور بھی نیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مالی بھی موجود نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ یہاں کے حالات کی وجہ سے ملازمتیں چھوڑ گئے ہوں؟''

یکایک ڈاکٹر مہناز کو احساس ہوا کہ وہ میرے ساتھ ایک غلط موضوع چھیڑ بیٹھی ہے۔ میں ملازم کی حیثیت سے یہاں نیا نیا آیا تھا۔ وہ بولی۔ ''تم لوگوں نے جلالی صاحب کو بتایا ہے کہ تم اس سے پہلے انڈیا میں کام کرتے رہے ہو لیکن مجھے تم دونوں کے ہاتھوں میں کوئی خاص انڈین ذائقہ نظر نہیں آیا۔ اور سچ پوچھو تو......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی؟'' میں نے کہا۔

''سچ پوچھو تو مجھے تمہارا یہ استاد باورچی لگتا ہی نہیں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔''

میں اندر سے چونک گیا مگر تاثرات کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا کھانوں کے ذائقے میں کمی کی وجہ سے آپ کو ایسا لگ رہا ہے؟''

''یہ بات بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ باورچی اور خانسامے اس طرح کے نہیں ہوتے۔ یہ گہرا شخص لگتا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ کام کرتے شاید زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

"نہیں جی...... چھ سات سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"تم نے کچھ محسوس نہیں کیا؟"

"نہیں جی۔" میں نے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے کہا۔ "ویسے...... میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں بھی استاد عمران ہی کی طرح لگتا ہوں؟"

اس نے اپنی دھلی دھلائی آنکھوں سے مجھے سرتاپا دیکھا اور بولی۔ "سچ بات یہ ہے کہ باورچی تو تم بھی نہیں لگتے۔ یا پھر یہ ہے کہ ماڈرن لوگوں کے ساتھ کام کر کر کے تم ذرا ماڈرن ہو چکے ہو۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ ان کی کھال بہت سخت ہے۔ جیسے مشقت......"

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے دروازے کی نچلی درز میں سائے کی حرکت سی نظر آئی۔ یوں لگا کہ کوئی دروازے کے بالکل پاس موجود ہے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈاکٹر مہناز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستگی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھول دیا۔ ایک تنومند شخص شاید "کی ہول" سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہکا بکا رہ گیا۔ غالباً اس نے دروازے سے ٹیک بھی لگا رکھی تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور لڑکھڑا کر ایک قدم اندر آیا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا مگر اس نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے سیاہ پسٹل نکالا اور پھنکارا۔ "خبردار! گولی مار دوں گا۔"

اس کے گول چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوکھلاہٹ میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر مہناز کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔ میں بھی جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس شخص نے ڈرائنگ روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا لیکن وہ ایک چیز بھول گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر مہناز کے کافی پاس آ گیا۔ ڈاکٹر خوف کے پہلے شدید حملے سے سنبھل چکی تھی۔ اس نے دلیری دکھائی اور تیزی کے ساتھ ماربل کے گل دان سے تنومند شخص کے ہاتھ پر چھوٹ لگائی۔ گل دان ٹوٹ گیا اور پسٹل بھی حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتنی مہلت میرے لئے کافی تھی۔ میں نے حملہ آور کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ وہ صوفے پر گرا اور اسے الٹاتا ہوا قالین پر لڑھک گیا۔ میں اس پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی بریک لگانے پڑے۔ اس شخص کے ہاتھ میں قریباً ایک فٹ لمبے پھل والا خوفناک چھرا دکھائی دیا۔ وہ برق کی طرح مجھ پر آیا۔ اس نے پہلا وار گردن پر کیا۔ میں نے سرعت سے پیچھے ہٹ کر یہ جان لیوا وار

بچایا۔ دوسرا وار پیٹ پر تھا۔ میں یہ وار بچانے میں بھی کامیاب رہا۔ میری کڑی مشقیں کام آ رہی تھیں، ورنہ میں ایسے بے رحم "لڑاکوں" کے مقابلے کی سکت کہاں رکھتا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر مہناز دروازہ کھولنے کے لئے لپکی مگر قالین کے کنارے سے الجھ کر الٹے پڑے صوفے پر گری۔ حملہ آور کے قاتل چھرے کا تیسرا وار بچانے کے بعد مجھے جوابی حملے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس کی ناف میں ٹانگ رسید کی۔ وہ ڈکرایا اور تکلیف کی شدت سے جھکا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑا۔ اسے نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور دیوار سے دے مارا۔ یہ بڑا شدید تصادم تھا بلکہ میری توقع سے بھی شدید تھا۔ تنومند حملہ آور کا سر یقیناً پھٹ گیا تھا۔ وہ اوندھے منہ قالین پر گرا۔ چھرا اس کے ہاتھ سے نکل کر میز کے نیچے چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر زوردار ٹھوکر رسید کرنے کے لئے پاؤں کو پیچھے کی طرف حرکت دی لیکن یہ حرکت وہیں رک گئی۔ حملہ آور کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے لگا وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر لائبہ کی آواز آئی۔ "ڈاکٹر مہناز! کیا ہے؟ کون ہے اندر؟"

میرے اشارے پر ڈاکٹر مہناز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر لائبہ اندر آئی تو میں نے دروازہ جلدی سے دوبارہ لاک کر دیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر نوجوان ڈاکٹر لائبہ کا رنگ بھی سفید پڑ گیا۔ صوفے پر گرنے سے ڈاکٹر مہناز کے بازو پر چوٹ آئی تھی اور اس کی پھول دار قمیص کا گریبان الٹے ہوئے صوفے کے پائے سے الجھ کر پھٹ گیا تھا۔ اس کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک نظر آ رہا تھا۔ اس نے اوڑھنی سے اپنے جسم کو ڈھانپا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور حملہ آور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی ناک اور دائیں کان سے خون رسنے لگا تھا۔ یہ تشویش ناک علامت تھی۔

اس کے جسم نے ایک خفیف سی جھرجھری لی اور ساکت ہو گیا۔ مجھے لگا وہ مر گیا ہے۔ صرف تین چار سیکنڈ بعد ڈاکٹر مہناز نے بھی دہشت زدہ انداز میں تصدیق کر دی۔ حملہ آور کی ایک کنپٹی پر نہایت سنگین چوٹ آئی تھی۔ "اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا؟" ڈاکٹر مہناز لرزاں آواز میں بولی۔ لائبہ بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کون تھا یہ؟" میں نے ان دونوں سے پوچھا۔

"فارم کی ٹریکٹر ٹرالیاں چلانے والوں میں سے ہے۔ آٹھ دس دن پہلے ہی ملازم ہوا تھا۔" ڈاکٹر مہناز نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"اب کیا ہو گا؟" ڈاکٹر لائبہ روہانسی ہو کر بولی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ اس شخص نے ہماری جان لینے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ ملازم کے بھیس میں کوئی خطرناک مخبر تھا۔ لیکن...... لیکن ابھی ہم نے اس خبر کو عام نہیں ہونے دینا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

ڈاکٹر مہناز ٹھٹکی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اب اس کے لئے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا کہ میں صرف ایک باورچی ہوں۔

میں نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اتفاقاً اردگرد کوئی اور ملازم موجود نہیں تھا۔ نہ ہی ڈاکٹر لائبہ کے علاوہ یہاں کسی کو ڈرائنگ روم میں ہونے والی دھینگا مشتی کی خبر ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کا صوفہ الٹا ضرور تھا مگر اس کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صوفے کو سیدھا کر کے رکھا۔ باقی بے ترتیبی کو بھی درست کیا۔ پھر ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ اپنی اوڑھنی کو درست کر کے اپنے کمرے میں جائیں اور یہ قمیص بدل لیں۔ کسی کو ابھی کچھ نہیں بتانا۔ ہمارا موقف ہے کہ یہ بندہ ڈرائنگ روم کے سامنے والی سیڑھیوں سے گر کر مرا ہے۔ وہاں اوپر کسی نے پانی پھینکا ہوا تھا۔ یہ تیزی سے آیا اور لڑھک گیا...... آپ دونوں میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟"

ڈاکٹر مہناز اور لائبہ جیسے ہپناٹائز ہو چکی تھیں۔ دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلا دی۔ میں نے حملہ آور کا پسٹل اور چھرا دونوں کپڑے میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لئے۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے ایک بار پھر کہا کہ وہ حملہ آور کو چیک کرے۔ قریباً ایک منٹ بعد ڈاکٹر مہناز اور لائبہ دونوں نے تصدیق کی کہ وہ "ایکسپائر" ہو چکا ہے۔

"ٹھیک ہے، آپ دونوں جائیں۔ میں اس کی باڈی کو سیڑھیوں کے پاس رکھ دیتا ہوں۔ ایک بار پھر گزارش ہے کہ آپ ابھی اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ نہ جھوٹ بولیں، نہ سچ بولیں......"

ڈاکٹر مہناز بدستور مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں کون ہیں؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں، میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو اور جلالی صاحب کو ہم سے فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں......"

"کہیں تم...... خفیہ پولیس سے تو......" ڈاکٹر لائبہ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں نے کہا ہے نا۔ موقع ملتے ہی میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال صرف یہ گزارش ہے کہ مجھے دوست سمجھیں اور چند گھنٹے کے لئے مکمل خاموشی اختیار کریں۔"

دونوں ڈاکٹرز حواس باختہ تھیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر لائبہ۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں تو میں نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ متوفی کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے موبائل فون کے علاوہ ڈھائی تین ہزار کی نقدی، ٹریکٹر کی چابیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ میں نے صرف موبائل فون نکالا۔ باقی ساری چیزیں دوبارہ اس کی جیبوں میں رکھ دیں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر میں نے دھیان سے دائیں بائیں دیکھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے لاش کو گھسیٹا اور سیڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ڈال دیا...... اس کے بعد میں نے کچن تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

قریباً پانچ چھ منٹ مکمل خاموشی سے گزرے۔ بس فارم ہاؤس کے چڑیا گھر کی طرف سے بندروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں یا طوطے ٹیں ٹیں کرتے رہے...... کوٹھی کے اندر کسی کمرے میں دھیمی آواز سے "ٹی وی" بول رہا تھا۔ اچانک ایک ملازمہ سیڑھیوں کے قریب زور سے چلائی۔ اس کی آواز پوری کوٹھی میں گونجی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہرام سا مچ گیا۔

○......❖......○

فارم ہاؤس میں اگلے آٹھ دس گھنٹے ہنگامہ خیز تھے۔ ڈاکٹر مہناز میری توقعات پر سو فیصد پوری اتری تھی۔ اس نے اور اس کے کہنے پر ڈاکٹر لائبہ نے بھی اپنی زبان بالکل بند رکھی تھی۔ اس ''حادثے'' نے وقتی طور پر جلالی صاحب کو بھی خاصا پریشان کیا۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ ہلاک ہونے والے اس مختار نامی شخص کے سر کے علاوہ کہیں کوئی اور زخم نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس کے کپڑے پھٹے تھے، نہ ہی کسی طرح کی زمینی شہادت تھی۔ فارم ہاؤس میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ شخص ایک خطرناک قاتل ہے اور اپنے ایک خطرناک کرتوت کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترا ہے۔ اس کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی ڈرائیور ہے۔ محنتی ہے اور ایک قریبی مزار پر حاضری بھی دیتا ہے۔ کسی کو اس کے مہلک پسٹل کا پتا تھا اور نہ ایک فٹ لمبے چھرے کا۔ اس کا پورا نام مختار ملک تھا۔

عمران کی واپسی کے آدھ گھنٹے بعد ہی میں نے اسے اس واقعے کی پوری تفصیل بتا دی تھی۔ عمران کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ فارم ہاؤس میں حملہ آور کا کوئی اور ساتھی بھی موجود ہو سکتا ہے۔

''ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''گھبراؤ مت۔ اللہ بخشے ''مختار ملک'' کا بھرا ہوا پسٹل میرے پاس ہے...... اور اب مجھے ٹریگر دبانا بھی بڑی اچھی طرح آ گیا ہے۔ کہو تو تمہارے پاؤں کی طرف دبا کر دکھاؤں؟''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''بڑے پرزے نکل رہے ہیں تمہارے؟''

''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''ایک تو جارج گورا نے تمہارے ہاتھوں مار کھا کر میرا مستقبل تاریک کر دیا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ہمارا اندازہ تھا کہ مختار کا تعلق لاہور سے تھا اور یہ بھی قیافہ تھا کہ چار پانچ بجے تک اس کے ورثا لاش وصول کرنے کے لئے پہنچ جائیں گے مگر شام کے بعد تک بھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمیں جلالی صاحب کے سیکرٹری ندیم کے ذریعے پتا چلا کہ مختار کو جس شخص کی ضمانت اور سفارش پر نوکری دی گئی تھی، وہ کوئٹہ میں ہے...... اور فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتا۔ مختار کی بیوی اور بھائی سے رابطہ ہو گیا ہے۔ ان کی خواہش پر میت کو بذریعہ گاڑی لاہور پہنچایا جا رہا ہے۔ ان اطلاعات سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید پوسٹ مارٹم وغیرہ کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔ فارم ہاؤس میں بھی اس واقعے کو حادثاتی ہی سمجھا جا رہا تھا۔ اگر کسی کو کوئی شبہ تھا بھی تو اس نے زبانی اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں، میں نے ایک چیز نوٹ کی۔ کچھ ملازم اس واقعے کو پُراسرار رنگ بھی دے رہے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایسے توہمات عام پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایک ملازم کو یہ کہتے سنا کہ ان سیڑھیوں پر پہلے بھی ایک حادثہ رُونما ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جلالی صاحب کا ایک مہمان تیورا کر نیچے گرا تھا اور سر پر چوٹ لگنے سے اپنی یادداشت مکمل طور پر کھو بیٹھا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ایک پرائیویٹ ایمبولینس پر مختار کی لاش لاہور کے لئے روانہ کر دی گئی۔ جلالی صاحب کا سیکرٹری ندیم اور ملازم خاص فتح محمد ایمبولینس کے ساتھ گئے۔

لاش کی روانگی کے بعد کوٹھی میں قدرے سکون ہو گیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے سیل فون سے ریان ولیم سے بھی بات چیت کی اور انہیں فارم ہاؤس کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے نئی ہدایات طلب کیں۔

عمران سے مشورہ کر کے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے چائے تیار کی اور چائے دینے کے بہانے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ سے ضروری بات کرنی ہے...... اگر آپ چھت پر آ سکیں۔''

اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

میں چھت پر چلا گیا۔ صاف ستھری وسیع چھت پر خوبصورت اور آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف فوم کا بیڈ پڑا تھا۔ اوس اور ہلکی پھوار سے بچانے کے لئے اس پر ایک چھپر کٹ تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خوش گوار خنکی تھی۔ جھونکوں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو نتھنوں

سے ٹکرا رہی تھی۔ ٹریکٹر چلنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھی۔ چھت پر بھی پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ان کیاریوں کے درمیان چہل قدمی کے لئے ایک طویل روش تھی۔ دو دودھیا بلب اس وسیع چھت کو نیم روشن کر رہے تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی ایک شال اوڑھے وہاں پہنچ گئی۔ صبح والے سنگین واقعے کے اثرات ابھی تک اس پر عیاں تھے۔

ہم دونوں پاس پاس کھڑے ہو گئے۔ ''یہ سب کیا ہے تابش! آپ دونوں کون ہیں؟'' وہ تقریباً روہانسی آواز میں بولی۔ وہ مجھ سے واضح طور پر مرعوب بھی نظر آتی تھی۔

''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا لیکن آپ کو بھی کچھ بتانا پڑے گا۔ ہمارے درمیان یہ دوطرفہ انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تو یقین کریں کہ ہم سب کے لئے بہت اچھا ہو گا۔ جلالی صاحب بھی اس بحران سے صاف نکل آئیں گے جس نے ان کا جینا مشکل کر رکھا ہے۔''

''لیکن مجھے پتا تو چلے کہ میں دراصل کس سے بات کر رہی ہوں۔ ابھی تک تو سب کچھ اندھیرے میں ہے۔ جس طرح مجھے مختار ڈرائیور کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ اصل میں کون ہے، اس طرح آپ دونوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کوئی شخص بھی اپنے اصل چہرے کے ساتھ نہیں ہے۔''

...... اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان تفصیل سے بات ہوئی۔ اس گفتگو میں ہمارے درمیان اجنبیت کی کئی دیواریں گر گئیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو یہ باور کرا دیا کہ ہم یہاں صرف جلالی صاحب کی مدد کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں اس باکس سے کوئی غرض نہیں جو جلالی صاحب کے پاس ہے اور جس کے پیچھے کچھ خطرناک لوگ دیوانے ہو رہے ہیں۔

مہناز کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں یہاں بھیجنے والا کون ہے؟

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! وقت آنے پر میں اس کا جواب بھی پوری وضاحت سے آپ کو دے دوں گا۔ فی الحال آپ مجھے اس حوالے سے خاموش رہنے کی اجازت دے دیں۔ آپ کی الجھن کم کرنے کے لئے میں آپ کو صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ ہمیں یہاں بھیجنے والے جلالی صاحب کے نہایت مخلص دوست بلکہ پرستار ہیں۔ کسی وجہ سے وہ فی الوقت سامنے آنا نہیں چاہ رہے۔''

پتا نہیں کہ میری باتوں پر ڈاکٹر مہناز نے کتنے فیصد بھروسا کیا۔ تاہم اس کی چھٹی حس

کافی توانا لگتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شاید مردم شناسی کا قدرتی وصف بھی اس کے اندر موجود تھا۔ اس نے میرے کچھ اہم سوالوں کے جواب دیئے جس سے صورتِ حال کی نہایت دھندلی تصویر قدرے وضاحت سے دکھائی دینے لگی۔

میرا سب سے اہم سوال اس باکس کے متعلق ہی تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟''

مہناز نے صاف گوئی کے انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں تابش صاحب! اس بارے میں جلالی صاحب نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے دو بار پوچھا تھا۔ اب تیسری بار پوچھنے کی ہمت نہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتے ہیں۔ غصے میں آنے سے ان کی طبیعت تیزی سے بگڑتی ہے اور پھر سب کچھ مجھے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔''

''آپ کا اپنا اندازہ کیا ہے؟''

''ظاہر ہے کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز ہی ہے۔ نقدی یا پھر جم اسٹون یا قیمتی دھات وغیرہ۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق باکس کا سائز زیادہ بڑا نہیں اور نہ وہ زیادہ وزنی ہے۔ ورنہ اسے چھپانے یا کہیں لے جانے کے لئے جلالی صاحب کو کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ اور اب تک جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں جلالی صاحب نے ندیم اور فتح محمد سمیت کسی کی مدد بھی نہیں لی ہے۔''

''کیا وہ کسی وقت گاڑی میں خود بھی ڈرائیور کر لیتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں نہیں کرنی چاہئے لیکن وہ موڈی بندے ہیں۔ انہیں کوئی کسی کام سے روک نہیں سکتا۔''

''آپ بھی نہیں؟'' میں نے ذرا معنی خیز انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''نہیں، جب ان کی مرضی نہ ہو تو وہ میری بھی نہیں سنتے۔ حالانکہ طبیعت بگڑنے پر مجھے ہی آوازیں دی جاتی ہیں۔''

''اگر وہ کسی وقت خود بھی گاڑی ڈرائیور کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ باکس فارم ہاؤس کے اندر ہی موجود ہو۔''

''بالکل...... یہ ضروری نہیں۔''

''ڈاکٹر مہناز! ایک اہم سوال ہے۔ اگر ممکن ہو تو پلیز، اس کا جواب ضرور دیجئے...... یہ باکس جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟''

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر تھوڑی دیر کے لئے ہچکچاہٹ نظر آئی۔ پھر اس نے اس

ہچکچاہٹ پر قابو پایا اور بولی۔ ''یہاں پاس ہی ایک نہر ہے۔ جلالی صاحب کبھی کبھی چاندنی رات میں نہر کنارے جانا پسند کرتے ہیں۔ اس رات بھی وہ گاڑی پر وہاں گئے۔ ڈرائیور ریاض ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ...... '' وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''میں بھی تھی۔ ہم کوئی دو گھنٹے وہاں رہے۔ پھر بادل آ گئے اور چاندنی ختم ہو گئی۔ ہم واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک کھلی چھت والی ایک جیپ بڑی تیزی سے آئی۔ وہ کچے راستے پر ہمارے سامنے سے گزری اور آگے نکل گئی۔ ڈرائیور ریاض نے اس میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گرتے دیکھی۔ کوئی آدھ منٹ بعد ایک اور گاڑی کی آواز آئی۔ یہ ایک ٹویوٹا 86 ماڈل تھی۔ وہ بھی اندھا دھند آ رہی تھی اور کچے راستے پر بری طرح اچھل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ ڈرائیور ریاض نے جلالی صاحب کو بتایا کہ آگے جانے والی جیپ میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گری ہے۔ میں تو گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہی۔ ریاض اور جلالی صاحب آگے جنتر کی جھاڑیوں میں گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا، وہ اندھیرے میں واپس آ رہے تھے۔ ریاض کے ہاتھ میں ایک بڑا تھیلا سا تھا جس میں کوئی چوکور شے تھی۔ انہوں نے ڈکی کھولی اور تھیلا وہاں رکھ دیا۔ اس کے فوراً بعد ہم فارم ہاؤس واپس آ گئے...... راستے میں جلالی صاحب نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک باکس ہے جسے لوہے کی پتریاں لگا کر سیل بند کیا گیا ہے......''

میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔ ''جلالی صاحب کا کیا خیال تھا...... یہ باکس جیپ میں سے اتفاقاً گرا یا خود گرایا گیا تھا؟''

''دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال، یہ بات تو بالکل صاف تھی کہ پچھلی گاڑی جیپ کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈرائیور ریاض کا اندازہ تھا کہ اگلی گاڑی میں صرف ایک یا دو بندے تھے جبکہ ٹویوٹا کار میں زیادہ افراد تھے۔''

''اس کے بعد جلالی صاحب نے آپ سے باکس کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں نے دو بار اس حوالے سے بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ تیسری بار پوچھنے کی مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہاں، اس بات کا اندازہ مجھے دو چار دن کے بعد ہی ہو گیا تھا کہ وہ کوئی بہت خاص قسم کا باکس ہے۔ جلالی صاحب بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ پھر یہ پریشانی اس وقت مزید بڑھ گئی جب فارم ہاؤس میں کچھ اجنبی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ پہلے دو مقامی بندے آئے، ان کے ساتھ ایک سفید پوش بھی تھا اور میرے خیال میں وہ مقامی پولیس کا کوئی بندہ تھا۔ اگلے روز

ایک بہت بڑی لگژری جیپ میں ایک سیاست داں ٹائپ شخص آیا۔ اس کے ساتھ دو سوٹڈ بوٹڈ بندے تھے اور وہ نوجوان عورت بھی تھی جو کل جلالی صاحب کے لئے رنگین چڑیوں کا تحفہ لائی ہے اور ذلیل ہو کر واپس گئی ہے۔ دو دن بعد پھر دو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان لوگوں نے قریباً تین گھنٹے تک بڑے ڈرائنگ روم میں جلالی صاحب اور ندیم سے بات چیت کی۔ ان میں سادہ کپڑوں والا وہی پولیس افسر بھی شامل تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ جان چکے تھے کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے...... اب وہ انہیں باکس کی واپسی پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن جلالی صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اپنے انکار پر اڑ گئے تھے۔''

''ڈاکٹر! ان لوگوں کو معلوم کیسے ہوا کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے؟''

''میں صرف قیافہ ہی لگا سکتی ہوں...... اور قیافہ یہ ہے کہ جس جگہ باکس گرا، یا گرایا گیا وہ بالکل کچی زمین تھی۔ وہاں کچھ نشانات رہ گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باکس کے ساتھ کوئی اور چھوٹی موٹی چیز بھی وہاں گری ہو جس کی وجہ سے تلاش کرنے والوں کو کوئی سراغ ملا ہو۔ اس جگہ کے قریب ہی شیورلیٹ گاڑی کے پہیوں کے نشان ملے ہوں گے جو فارم ہاؤس تک آئے ہوں گے......''

''آپ بتا رہی تھیں کہ سادہ کپڑوں والے پولیس افسر اور دیگر دو بندوں نے قریباً تین گھنٹے تک جلالی صاحب سے بات چیت کی...... اس کے بعد کیا ہوا؟''

ڈاکٹر مہناز کی شربتی آنکھوں میں دکھ آمیز خوف کے سائے لہرائے۔ وہ بولی۔ ''اس کے بعد یہاں فارم ہاؤس میں سب سے بری رات آئی۔ کچھ مسلح لوگوں نے پورے فارم ہاؤس کو یرغمال بنا لیا۔ پہلے جلالی صاحب سے بدتمیزی کی گئی پھر ان کی عمر اور بیماری کی پروا کئے بغیر ان پر بے رحمی سے تشدد کیا گیا۔ سب مرد عورت ملازمین کو دو کمروں میں بند کر دیا گیا اور ان کے ساتھ بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی گئی......''

بات کرتے کرتے اچانک ڈاکٹر مہناز کو خاموش ہونا پڑا۔ میں بھی چونک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ شاید ایک بار پھر کوئی ہمارے آس پاس موجود تھا۔ میں اس قسم کی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھا۔ مختار ملک کا پسٹل ابھی تک میری قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ میں پسٹل کی موجودگی کو کنفرم کرنے کے بعد جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل چونکی ہوئی نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے مطمئن نظر آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ''تابش! میرے خیال میں جلالی صاحب ہیں۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے اوپر آ رہے

ہیں۔ آپ اس کونے میں چلے جائیں اور جب جلالی صاحب اوپر آ جائیں تو آپ احتیاط سے سیڑھیاں اتر جائیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پانچ دس سیکنڈ بعد قدموں کی چاپ واضح ہوگئی۔ کوئی سُست روی سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ جلالی صاحب ہی تھے۔ چھت پر نمودار ہوتے ہی انہوں نے آواز دی۔ ”مہناز...... کہاں ہو مہناز؟“

مہناز تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ اس نے انہیں کندھوں سے تھاما۔ ”سر! آپ اوپر کیوں آ گئے؟ آپ کو سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہئیں۔“

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولے۔ ”تم نے بتانا تو تھا کہ چھت پر ہوا خوری کرنے جا رہی ہوں۔“

”میں نے سمجھا آپ سو رہے ہیں۔“

”پریشانی میں اتنی جلدی نیند کہاں آتی ہے۔“ وہ ڈگمگا رہے تھے۔ مہناز انہیں سہارا دیتی ہوئی چھپرکٹ تلے لے آئی۔ وہ فوم کے بیڈ پر لیٹ گئے۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا......

میں زینوں پر آ گیا لیکن نیچے اترنے ے بجائے وہیں کھڑا رہا۔ جلالی صاحب اپنا بایاں بازو دائیں ہاتھ سے دبا رہے تھے۔ ”درد ہو رہا ہے؟“ مہناز نے پوچھا۔

”تھوڑا تھوڑا۔“

”آپ سیدھے لیٹ جائیں۔ آپ کو اس طرح سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہئے تھیں۔“ مہناز نے کہا۔ وہ چست انداز میں بھاگتی ہوئی نیچے گئی اور میڈیکل باکس لے آئی۔ اس نے بی پی آپریٹس سے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ انہیں کھانے کے لئے ایک گولی دی اور بیڈ پر دوزانو بیٹھ کر ان کا بازو دبانے لگی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جلالی صاحب اپنے دوسرے ہاتھ سے مسلسل مہناز کے بالوں اور رُخساروں کو سہلا رہے ہیں۔ یہ ایک میکانکی سی حرکت تھی۔ اس کو کوئی معنی دینے مشکل تھے۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھے، ان سے کسی شدید جذباتی کیفیت کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہیں دوزانو بیٹھے بیٹھے مہناز نے اپنا سر جلالی صاحب کے سینے پر ڈال دیا۔ جلالی صاحب نے اپنا بازو مہناز کے کندھوں پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے۔ اس سے اگلا منظر اس سے بھی تعجب خیز تھا۔ مہناز اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بالوں کو سمیٹا اور سیڑھیوں کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر دیا۔ میں نے کوشش کی اور چند سیکنڈ بعد چوبی دروازے کی سائیڈ میں ایک باریک جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ جواں سال ڈاکٹر مہناز، عمر رسیدہ سہراب جلالی کے ساتھ ہی فوم کے بستر پر لیٹ گئی ہے۔ جلالی صاحب نے آہستگی سے کروٹ بدلی اور اپنا رخ مہناز کی طرف کر لیا۔ اس نے کمال مہربانی سے جلالی صاحب کو اپنے جوان بازوؤں کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

میں مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ دو تین منٹ بعد یوں لگا جیسے جلالی صاحب سو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کی ٹھوڑی ان کے نیم گنجے سر پر ٹکی ہوئی تھی اور ان کا چہرہ مہناز کے جسمانی گداز میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ سکڑے سمٹے کسی بچے کی طرح لگ رہے تھے۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ وہ جلالی صاحب ہیں، جن کے غصے سے بے شمار لوگ خوف کھاتے ہیں اور جن کو ان کی مرضی کے خلاف چلانا جُوئے شِیر لانے سے زیادہ مشکل ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بظاہر تو یہ روحانی تعلق تھا لیکن اگر یہ واقعی رومانی یا جنسی تعلق تھا تو پھر یوں سرِعام کیوں تھا؟ اس چھت پر کسی وقت کوئی بھی آ سکتا تھا۔ جس طرح میں نے بند دروازے میں سے جھانکا تھا، کوئی دوسرا بھی جھانک سکتا تھا۔ برساتی میں ایک کھڑکی بھی موجود تھی جس کی چٹخنی کو تھوڑی سی کوشش سے کھولا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر مہناز کی والدہ کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ”کبھی تو مجھے لگتا ہے، لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ’انوالو‘ ہو چکی ہو۔ کچھ رحم کرو ہم پر مہناز...... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے......“

وہ جلالی صاحب کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اسی طرح لیٹی رہی۔ مدھر ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ اس کی زلفوں کو ہوا میں اڑا رہے تھے۔ چھت پر مکمل خاموشی تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے چمکتے تھے اور حیرت سے پلکیں جھپکتے تھے، جیسے وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر ششدر ہوں...... انسان بھی کیا چیز ہے۔ اس کے دل و دماغ کی گہرائی کو ناپنا ناممکن ہے۔

آٹھ دس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر شاید ڈاکٹر مہناز نے محسوس کیا کہ جلالی صاحب سکون سے سو گئے ہیں۔ اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ خود کو جلالی صاحب سے جدا کیا۔ کوئی آواز پیدا ئے بغیر فوم کے بیڈ سے اتری۔ اپنائیت بھری نظروں سے جلالی صاحب کو دیکھتی رہی۔ اپنے بال درست کئے۔ ایک بھاری چادر سے جلالی صاحب کا سکڑا سمٹا جسم کندھوں تک ڈھانپ دیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں تاریک سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

میں نے سارا ماجرا عمران کو سنایا۔ وہ بھی اس ساری صورتِ حال پر حیران نظر آیا...... یہ باکس ایک معمہ بنتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جلالی اور ڈاکٹر مہناز کا رشتہ بھی کچھ عجیب نوعیت کا

تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جلالی صاحب کے قیلولے کا ٹائم ٹھیک ایک بج کر پینتالیس منٹ پر شروع ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں کوٹھی کے اندر ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا تھا۔ کسی کو کھانسی یا چھینک بھی آ جاتی تو وہ لرز جاتا۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجھے ڈاکٹر مہناز سے پھر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔ کل والے خوفناک واقعے کے اثرات ابھی تک اس کے سرخ و سپید چہرے پر عیاں تھے۔ مختار ملک کا اچانک ہمارے سامنے آنا اور پھر لڑائی کے دوران میں اس کے سر کا پختہ دیوار سے زوردار تصادم، یہ سب کچھ یقیناً مہناز اور لائبہ کے لئے دہلا دینے والا تھا۔ میں کچن سے ایک ''کک بک'' لے آیا تھا..... میں ڈاکٹر مہناز کے صوفے کے پاس ہی ایک کشن پر بیٹھ گیا اور ''کک بک'' اپنے سامنے پھیلا لی۔ ہم دونوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ڈاکٹر مہناز میرے ساتھ کسی خاص ڈش کی کوکنگ پر بات چیت کر رہی ہو۔

میں نے اس امر کا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ میں نے کل رات جلالی صاحب اور مہناز کو ایک ہی بستر پر دراز دیکھا ہے۔ میں نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے منقطع ہوئی تھی۔ جس وقت جلالی صاحب کے آنے سے ہماری گفتگو کو بریک لگے تھے، اس وقت مہناز مجھے بتا رہی تھی کہ تین چار ہفتے پہلے اس پُراسرار باکس کی خاطر کچھ سخت گیر لوگوں نے یہاں کوٹھی میں کیا اودھم مچایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف عمر رسیدہ جلالی صاحب پر تشدد کیا بلکہ ان کے قریبی ملازموں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔

میں نے پکوانوں کی کتاب پر جھکے جھکے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ''کیا اس رات ان لوگوں نے آپ سے بھی پوچھ گچھ کی تھی؟''

''آپ پوچھ گچھ کی بات کر رہے ہیں، ان خبیثوں نے باقاعدہ تشدد کیا۔ بال کھینچے، تھپڑ مارے..... مجھے تین گھنٹے سردی میں ننگے پاؤں کھڑا رکھا گیا۔ خوفناک دھمکیاں دیں۔ لائبہ اور دوسری عورتوں کو بھی بُری طرح ہراساں کیا گیا۔ ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، ہم کیا بتاتے؟ اور جس کو معلوم تھا، وہ بتا کر نہیں دے رہا تھا۔ میرا مطلب جلالی صاحب سے ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ باکس ان کے پاس ہے لیکن اگر ان کے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تو وہ بتائیں گے نہیں۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جلالی صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ ان لوگوں کو لگا کہ جلالی صاحب کی صورت میں باکس کا جو واحد سراغ موجود ہے، وہ ناپید ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے لیکن یہ صرف ایک ہی بار نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

''تین روز بعد یہ لوگ دوبارہ کوٹھی میں گھس آئے۔ اس مرتبہ جلالی صاحب پر تو ہاتھ ہلکا رکھا لیکن ملازمین کی بہت کم بختی آئی۔ ڈرائیور ریاض کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ اس کے بچے کی کنپٹی پر بندوق رکھی گئی۔ مالی خورشید سے بھی برا سلوک کیا گیا۔ اس کی بیوی کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ ملازموں کے ہاتھوں میں کدالیں اور کسیاں تھمائی گئیں اور ان سے کوٹھی اور فارم میں مشتبہ جگہوں پر کھدائی کرائی گئی۔ کوٹھی میں موجود سب لوگوں کے سیل فون ایک جگہ جمع کر لئے گئے تھے اور لینڈ لائن فون کے تار کاٹ دیئے گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اب شاید عارضی طور پر نرم ڈپلومیسی سے کام لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔'' ڈاکٹر مہناز نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ ''پرسوں جو فیشن ایبل عورت ایک یورپین کے ساتھ یہاں آئی تھی، اس کا نام دُرِشہوار ہے۔ چار ہفتے پہلے بھی یہ اپنے ساتھی مائیکل کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ تب ان کے ساتھ ان کا باس جاوا اور دیگر دس پندرہ بندے بھی شامل تھے۔''

''جاوا..... یہ کون ہے؟''

''بڑا خطرناک بندہ ہے۔ قتل پہلے کرتا ہے، نام بعد میں پوچھتا ہے۔ سرحد کے آر پار آتا جاتا رہتا ہے۔ ابھی تک کسی کو ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ اصل میں انڈین ہے یا پاکستانی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں جن دو چار لوگوں کے نام کا سکہ چلتا ہے، ان میں ایک یہ جاوا بھی ہے۔ شوبز کے بڑے بڑے گرو گھنٹال اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں اور اپنے مسئلوں کے حل کے لئے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔''

''تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ یہاں جو باکس کا چکر چل رہا ہے، اس کا تعلق کسی طور فلم انڈسٹری یا شوبز وغیرہ سے ہے؟''

''ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ جاوا جیسے لوگ پیسے کی خاطر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس سارے کام میں دو چار سفید فام لوگ بھی ملوث ہیں۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید اس باکس والے معاملے کا تعلق شوبز سے نہ ہو بلکہ..... یہ کوئی اسمگلنگ وغیرہ کا چکر ہو۔''

''یہ جاوا نامی بندہ کتنی بار یہاں آیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے علم کے مطابق تو دو بار آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی آیا ہو لیکن مجھے خبر نہیں۔ جب یہ دوسری بار آیا تھا تو بڑے طیش میں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اس کا

جلالی صاحب پر بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ان کے جسم کی بوٹی بوٹی علیحدہ کر دیتا۔ طیش میں آ کر اس نے ڈرائیور ریاض کو بری طرح پٹوایا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مالی خورشید اور اس کے بھائی کی ایک ایک ٹانگ سے رسی باندھ کر انہیں ایک گھنٹے تک الٹا لٹکائے رکھا، یہاں تک کہ خورشید بے ہوش ہو گیا۔ جاوے کے کہنے پر خورشید کی جواں سال بیوی کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ اسے بے عزت کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس موقع پر دُرشہوار آگے آئی اور اس نے مالی کی بیوی کی جان بچائی۔ اس موقع پر انگریز مائیکل نے بھی اس کا ساتھ دیا بلکہ جاوا سے ہلکا سا جھگڑا بھی کیا۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ سارا بھی ایک ڈراما تھا۔ ان لوگوں نے جاوے کی نسبت نرم رویہ دکھایا اور اس طرح یہاں واپس آنے کے لئے راستہ بنایا۔''

''آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ پرسوں دُرشہوار اپنے ساتھ جلالی صاحب کے لئے نایاب چڑیوں کا تحفہ بھی لائی تھی۔''

''لیکن جلالی صاحب کی یادداشت اتنی کمزور نہیں اور نہ ہی وہ اتنے سیدھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ خطرہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ لوگ اس باکس تک پہنچنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔''

'کیا اس حوالے سے جلالی صاحب نے پولیس میں رپورٹ وغیرہ بھی کروائی ہے؟''

''انہوں نے نہیں کروائی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ان کا خیال ہے کہ مقامی پولیس کے دو چار لوگ بھی ان گینگسٹرز کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مقامی تھانے دار معاملہ پوچھنے کے لئے یہاں آیا تو جلالی صاحب نے اس بے نقط سنائیں۔ وہ دُم دبا کر نکل گیا۔ بعد میں یہ بات اوپر تک پہنچی۔ لاہور میں دو تین اعلیٰ پولیس آفیسر ایسے ہیں جو جلالی صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایس ایس پی حمزہ صاحب ہیں۔ حمزہ صاحب چند دن پہلے خود یہاں آئے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ایف آئی آر درج کروائی اور کوٹھی کی حفاظت کے لئے گارڈز مہیا کیے۔ بہرحال جلالی صاحب اس سلسلے میں بالکل بے پروا ہیں۔ کبھی کبھی وہ بالکل نوجوانوں کی طرح بے خوف اور پُرجوش ہو جاتے ہیں۔ پرسوں بھی وہ شام کی چائے کے بعد اکیلے ہی واک پر نکل گئے اور کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ میرے منع کرنے سے بھی کوئی اثر نہیں لیتے۔''

''آپ نے کہا ہے کہ دونوں بار جاوا اور اس کے ساتھی یہاں آئے تو ان کے ساتھ کوئی مقامی پولیس والا بھی تھا۔ اس کا پتا چلا؟''

''کہتے ہیں کہ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ مقامی پولیس والوں سے اس کی دوستی وغیرہ ہے۔ ایف آئی آر میں اس کا نام بھی آیا ہے۔''

اس دوران میں، میں نے دیکھا کہ عمران کوریڈور میں سے گزرا۔ اس نے دو ایرانی بلیاں اپنی بغلوں میں دے رکھی تھیں اور ان سے لاڈ کرتا ہوا لان کی طرف جا رہا تھا...... جلالی صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ نہایت قیمتی و نایاب بلیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے رنگ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

''یہ کدھر جا رہے ہیں؟'' میں نے مہناز سے پوچھا۔

''آپ کا یہ ساتھی چھپا رستم ہی لگتا ہے۔ بڑی تیزی سے جلالی صاحب کے قریب آتا جا رہا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے جانوروں سے دلچسپی ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جلالی صاحب بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔''

''ذرا دیکھیں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

مہناز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دبے قدموں کوریڈور میں پہنچے اور پھر لان کی طرف چلے آئے۔ عمران اور جلالی صاحب جانوروں والے پورشن کی طرف موجود تھے۔ ایک ملازم نے ایرانی بلیوں والے پنجرے کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ یہاں دو اور بلیاں بھی موجود تھیں۔ جلالی صاحب بڑی بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر پنجرے کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ عمران نے بھی تقلید کی۔ وہ دونوں ایک موٹی تازی بلی کو کوئی دوا کھلانے میں مصروف ہو گئے۔ دوا کو دودھ میں ملایا گیا تھا۔ غالباً یہ وہی تندمزاج حاملہ بلی تھی جسے چند روز میں بچے دینے تھے۔ بلی عمران کی گود میں آ کر مست ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ جلالی صاحب کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ بلیوں سے فارغ ہو کر عمران اور جلالی صاحب ایک قریبی پنجرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں زیبرے کا ایک خوبصورت جوڑا تھا۔ مادہ جانور کے پاؤں میں شاید کوئی تکلیف تھی، وہ اپنے پنڈے پر ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ عمران نے آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ کو سہلایا۔ وہ رام نظر آنے لگی۔ تب عمران اور جلالی صاحب نے اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ جلالی صاحب نے ڈیجیٹل کیمرے سے پاؤں کی دو تین تصویریں کھینچیں اور کوئی میڈیسن لگائی۔ وہ دونوں آپس میں بڑی محویت اور بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے لیکن پھر اچانک صورتِ حال بدلی ہوئی نظر آئی۔ جلالی صاحب کا مخصوص چڑچڑاپن ان کے چہرے پر جھلک دکھانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مشتعل ہو گئے۔ وہ کسی بات پر عمران کو ڈانٹ رہے تھے۔ عمران صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو یہ آوازیں ہمارے

آپ کا رہن سہن، آپ کی دلچسپیاں۔''

''آپ نے یہاں میری کون سی دلچسپی دیکھی ہے؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

میں کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا کیونکہ میں نے بہت کچھ دیکھا تھا...... کل رات والا واقعہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا جب وہ جلالی صاحب کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ مگر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔'' آپ شہر میں جاب کرنے کے بجائے اور کوئی کلینک چلانے کے بجائے یہاں اس فارم میں جلالی صاحب جیسے مشکل بندے کے ساتھ وقت گزار رہی ہیں۔''

وہ بولی۔''بس اتنی سی بات پر آپ نے مختلف کہہ دیا ہے حالانکہ خود آپ میں بھی کئی ایسی باتیں ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو نہایت مختلف کہا جا سکتا ہے۔''

''میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔''

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما اور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔'' میں نے ایسے سخت بلکہ کرخت ہاتھ پاؤں بہت کم لوگوں کے دیکھے ہیں۔ لگتا ہے آپ نے اپنے جسم کے ان حصوں پر بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ سخت فرش پر سوتے ہیں۔ شدید تکلیف کی صورت میں بھی دوا وغیرہ نہیں لیتے۔''

میں نے کہا۔''بس کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک استاد ملا تھا۔ یہ اسی کے دیئے ہوئے اسباق ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میرا استاد درد خور تھا۔ اس نے مجھے بھی درد خور بنا دیا۔''

''درد خور؟ یہ کیا لفظ ہوا؟''

''درد سہنے والا۔ درد کھانے والا۔ درد سے پیار کرنے والا۔ میں کچھ ایسے حالات سے گزر رہا ہوں جن میں بندہ مر جاتا ہے یا پھر انوکھا ہو جاتا ہے۔ شاید مجھ میں بھی انوکھا پن آ گیا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور خاص طور سے جسم کو اذیت دینا بہت عرصے سے میرا معمول بن چکا ہے۔ اب یہ سب کچھ مجھے بالکل نارمل سا لگتا ہے۔''

''شاید مارشل آرٹ وغیرہ کی بہت کڑی مشقیں کی ہیں آپ نے۔ جسمانی طور پر آپ گرانڈیل نہیں، یعنی نارمل ہی ہیں۔ لیکن پرسوں آپ نے جس طرح اس خونی کو گھمایا تھا، وہ جسمانی طور پر آپ سے کم از کم ڈیڑھ گنا تو تھا۔''

''لیکن اس میں آپ کا کردار بھی تو ہے۔ اگر اس کے ہاتھ سے پسٹل نہ گرتا تو میرے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔''

''مارشل آرٹ میں بیلٹس وغیرہ ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس بھی کوئی بیلٹ ہے؟''

''میرے اندر کے زخم ہی میری بیلٹس ہیں۔ کچھ زخم چھوٹے ہیں لیکن ایک دو بہت بڑے ہیں۔ ان بڑے زخموں کو آپ میری بلیک بیلٹس کہہ سکتی ہیں۔''

''آپ اچھی گفتگو کرتے ہیں اور آپ کی کہانی بھی دلچسپ لگتی ہے۔ اگر زندگی رہی تو تفصیل سے سنیں گے۔''

''زندگی رہی کیا مطلب؟ آپ اتنی پریشان اور مایوس کیوں ہیں؟''

''جو کچھ یہاں کے حالات ہیں، ان میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''آپ حالات کی فکر چھوڑیں۔ اس فکر کے لئے ہم جو ہیں یہاں۔ ان شاء اللہ بال بھی بیکا نہیں ہو گا یہاں کسی کا۔ آپ آرام سے جا کر سوئیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں۔''

میرے پُراعتماد لہجے نے اسے متاثر کیا۔ اس نے پُرتشکر نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔'' آپ دونوں اپنا بہت خیال رکھیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا...... وہ مجھے کچن میں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ بہت متناسب جسم کی مالک تھی۔ پُرکشش بھی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ڈاکٹر تھی کوئی بھی نوجوان اس کے حصول کو اپنی خوش قسمتی سمجھ سکتا تھا۔

عمران کا کمرا تبدیل ہو گیا تھا۔ اب اسے Zoo کی طرف اپارٹمنٹ دے دیا گیا تھا۔ مجھے یہ اکیلا پن اچھا نہیں لگا۔ عمران کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ میں دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ یہ بہار کی ایک پُرفسوں رات تھی۔ کھڑکیوں سے باہر رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ چاند کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا...... ثروت کی یاد نے دل کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ملی بھی تو لیکن یوں کہ دل کے زخم کچھ اور گہرے کر گئی تھی۔ وقت کا دریا اسے بہا کر مجھ سے بہت دور لے گیا تھا...... اور وہ ایک منجدھار میں بھی تھی۔ یہ ایک سنگین منجدھار تھی لیکن وہ اس کی سنگینی کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا اور بہار میں تو پھولوں کے ساتھ ساتھ زخم بھی کھل اٹھتے ہیں۔ سوختہ جگری مہک جاتی ہے۔ مجھے بھی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے لئے ہمارا دیوانہ پن...... کیلنڈر پر سے تاریخیں کاٹنا اور شادی کے دن کا انتظار کرنا۔ پھر وہ طوفان جس نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ ایک بظاہر چھوٹا سا واقعہ جو زندگی بھر کا ناسور بن گیا۔ وہ ایک شب جو ثروت کو گھر سے باہر گزارنا پڑی...... اور وہ ایک شب ہماری ساری زندگی پر محیط ہو گئی۔ پھر وقت کا پُرشور ریلا ثروت کو بہا کر جرمنی لے گیا اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے وہ ساڑھے تین

کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔

جلالی صاحب گرجے۔ ’’اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو چھٹی کرلو۔ ابھی کرلو چھٹی...... جسٹ گیٹ آؤٹ۔‘‘

عمران نے کہا۔ ’’سر! میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے یہاں زیادہ ٹائم دیا تو کچن کا کام سُست پڑ جائے گا اور......‘‘

’’کیوں سُست پڑ جائے گا؟ کیوں پڑ جائے گا؟ کیا وہ تمہارا ساتھی، باورچی نہیں ہے؟ وہ اندھا اور اپاہج ہے؟ تم تو اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہو۔ کیا جھوٹ بولتے ہو تم؟‘‘

’’نہیں سر! وہ کر تو لے گا لیکن اسے میری ماتحتی میں کام کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔‘‘

’’یہاں عادتیں نہیں چلیں گی۔ وہی کچھ چلے گا جو میں کہتا ہوں۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچن سے زیادہ یہاں "Zoo" میں تمہاری ضرورت ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک نیا ڈاکٹر ہمیں جوائن نہیں کر لیتا۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو پھر تم فارغ ہو اور تمہارا وہ اسسٹنٹ بھی۔‘‘ وہ ایک دم بھنائے ہوئے تھے۔

’’سوری سر! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ جیسا کہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ میں کچن کا کام تابی کے سپرد کر دیتا ہوں۔ وہ گزارہ کرلے گا۔‘‘

جلالی صاحب تیوریاں چڑھائے ہوئے اٹھے اور واپس چلے گئے۔ ان کے جسم سے جیسے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ عمران کھوپڑی سہلا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد میں اور وہ کچن میں موجود تھے۔ عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ ’’یہ تو مصیبت کھڑی ہوگئی ہے۔ بابا جی تو آگ کا گولہ ہیں اور تمہیں ننگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اب تم سے کھانا پکوائیں گے اور تم ایسا کھانا پکاؤ گے کہ ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹے گا اور بابا جی اچھل اچھل کر چھت کو لگیں گے۔‘‘

’’یار! تم ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہے ہو۔ تم مجھے پوری ترکیب کاغذ پر لکھ کر دے دو۔ میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔‘‘

’’اوئے باندر! کھانا پکانا پینٹنگ کرنے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر میں تمہیں رنگ، برش، ایزل وغیرہ دے دوں اور انہیں استعمال کرنے کی پوری ترکیب بھی بتا دوں تو کیا تم کوئی شاہکار تصویر بنالو گے؟‘‘

’’آلو، بینگن اور مونالیزا میں کافی فرق ہوتا ہے یار۔‘‘

’’یہ بڑا اشکی بابا ہے۔ تم اس کو نہیں سمجھتے۔ اگر......‘‘

اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر مہناز دلکش مسکراہٹ بکھیرتی ہماری طرف آرہی تھی۔ اس نے اپنے خوبصورت بال جُوڑے کی صورت میں سمیٹے ہوئے تھے اور باقاعدہ ایپرن باندھ رکھا تھا۔ ’’ہیلو! گڈ ایوننگ۔‘‘ اس نے کہا۔

’’آپ یہاں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ لوگوں سے کچھ سیکھوں۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں منفرد ذائقہ ہے۔ ایک دم کلاسیکل انڈین ٹچ۔ آج دوپہر ہم کک بک میں جو ڈش دیکھ رہے تھے، وہ بھی انڈین اسٹائل ہی کی تھی نا؟‘‘ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

’’یعنی آپ میری مدد کرنا چاہ رہی ہیں؟‘‘ میں نے گہری سانس لی۔

’’دراصل میں اپنی ہی مدد کر رہی ہوں۔‘‘ وہ مسکرائی۔ ’’اگر ہم دونوں مل کر کھانا نہیں بنائیں گے تو جلالی صاحب کا پارا ساتویں آسمان سے کافی اوپر چلا جائے گا۔ ان کی طبیعت بگڑے گی اور پھر بھگتنا مجھے ہی پڑے گا۔‘‘

’’تھینک یو۔‘‘ عمران نے کہا۔

’’ویسے آپ دونوں ابھی تک اپنی اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے۔‘‘ مہناز کا لہجہ پھر معنی خیز تھا۔

میں نے کہا۔ ’’پلیز ڈاکٹر! اس کے لئے تھوڑا سا انتظار کرلیں۔‘‘

مجھ سے کوکنگ سیکھنے کے بہانے ڈاکٹر مہناز نے میرے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا اور یہ خاصا بہتر کھانا تھا۔ ہم نے آلو، بینگن کے ساتھ، دیسی مرغ کی یخنی تیار کی اور فرنی بنائی۔ ڈاکٹر مہناز ایک خوش اخلاق اور معاملہ فہم لڑکی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ پرسوں یہاں جو سنگین واقعہ رُونما ہوا، اس میں مہناز کا کردار قابلِ ذکر تھا۔ اس نے مختار ملک کے ہاتھ پر گل دان سے کاری ضرب لگائی اور یوں مجھے اس پر حملہ کرنے کا مواقع ملا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہاں صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کرسکتی تھی۔ ڈاکٹر مہناز قدرے مختلف لڑکی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کی منگنی ہوئی تھی۔ دو سال بعد یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ اب ڈاکٹر مہناز تقریباً چھبیس سال کی تھی۔ اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اس حوالے سے کچھ بیزار سی ہے۔

میں نے کہا۔ ’’ڈاکٹر مہناز! ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو؟‘‘

’’میں زیادہ تر بُرا نہیں مانتی۔‘‘ وہ مسکرائی۔

’’آپ اپنی ہم عمر ڈاکٹرز کے مقابلے میں کافی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی گفتگو،

برس یاد آئے جن کا ہر ہر پل حوادث اور بے چارگیوں سے عبارت تھا۔ اور وہ لڑکی بھی یاد آئی جو اپنی فطرت میں انوکھی تھی۔ جس نے بھانڈیل اسٹیٹ میں مجھے نئی زندگی دی۔ میرے مصائب کے سامنے ڈھال بنی اور میرے بچے کی ماں بھی۔ اور پھر کیا ہوا؟ پھر ایک دن وہ بھی بچھڑ گئی۔ مجھے بالو کی صورت میں ایک محبت بھری نشانی دے کر اور ایک پیغام دے کر...... اسے تلاش کرنا مہروج...... اس کا کھوج لگانا...... وہ تمہیں ملے گی...... کیونکہ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو اور جب وہ کسی خوبصورت دن کی سنہری دھوپ میں تم سے ملے تو اس سے کہنا...... ہندوستان کے ایک دور دراز راجوڑے میں تمہاری ایک بہن تھی......

الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ سلطانہ اور ثروت کے چہرے میری نگاہوں میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ اچانک میں چونک گیا۔ میری نظر سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر پڑی۔ آج تو میری پیدائش کا دن تھا۔ ہاں، یہ سالگرہ تھی میری۔ وقت کی دھول میں کیا کچھ گم ہوا تھا۔ اتنے اہم دن بھی اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ خاموشی سے آتے اور گزر جاتے تھے۔

میں کتنی ہی دیر نیم تاریک کمرے میں گم صم لیٹا رہا۔ زندگی مجھ سے کتنی دور ہو گئی تھی۔ بہار کے سارے رنگ بجھتے محسوس ہوئے اور ساری خوشبوئیں ماند پڑنے لگیں۔ جب ایسی مایوسی طاری ہوتی تھی تو مجھ پر وہی خود اذیتی کی خواہش غالب آ جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی صحرا ہو یا برفستان جس میں، میں برہنہ بدن بھاگتا چلا جاؤں۔ میرے پاؤں خون اگلنے لگیں، میرے پھیپھڑے چاک ہونے لگیں اور میں بے دم ہو کر گر جاؤں۔

میں لیٹا رہا، بالکل خاموش۔ اتھاہ سوچوں میں ڈوبا رہا۔ اچانک موبائل فون کی وائبریشن ہوئی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور بُری طرح چونک گیا۔ یہ آسٹریا کا نمبر تھا۔ میں نے کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ کو اچھی طرح بند کیا اور کمرے کے ڈریسنگ روم میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نصرت کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو نصرت! کیسی ہو؟'' میں نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں بھائی...... اور آپ کو سالگرہ مبارک۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''تھینک یو نصرت کہ تم نے یاد رکھا۔''

''کاش، ہم ایک ساتھ ہوتے۔''

''گھبراؤ مت، ان شاء اللہ وہ وقت بھی جلد آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور تمہاری ٹریٹمنٹ کیسی جا رہی ہے؟''

''ابھی تو ٹیسٹ ہی ہوئے جا رہے ہیں بھائی جان...... روزانہ ایک لیٹر خون نکال لیتے

ہیں میرا۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔

نصرت کو اس کی بیماری کے بارے میں سب کچھ بتایا جا چکا تھا اور اس نے یہ سب کچھ جھیل بھی لیا تھا۔ اب وہ کافی حد تک نارمل محسوس ہوتی تھی اور اپنی بیماری سے لڑنے کے لئے پُرعزم بھی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دل کڑا کر کے مریض کو اس کی تکلیف کے بارے میں بتا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔

نصرت کے بعد میری بات ثروت سے ہوئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خوشگوار سا احساس موجود تھا کہ شاید نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی ہے۔ اس سے پہلے تو نصرت کو کبھی یہ دن یاد نہیں رہا تھا۔ ثروت سے میری گفتگو سنجیدہ نوعیت ہی کی رہی۔ اس نے تھوڑا سا نصرت کے علاج کے بارے میں ڈسکس کیا پھر مجھے اپنے شوہر کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے بولی۔ ''یوسف بھی منگل تک یہاں آ رہے ہیں۔ انہوں نے دو دن پہلے کچھ رقم بھی بھیجی ہے پاکستان سے۔''

''چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تقریباً روزانہ ہی فون کر رہے ہیں۔ یہاں ویانا میں ان کا ایک پاکستانی ڈاکٹر دوست بھی ہے۔ اس سے بھی ڈسکس کر رہے ہیں۔'' ثروت نے اطلاع دی۔

''نصرت کے علاج والی آزمائش کافی بڑی ہے ثروت! ہمیں یہ لڑائی مل جل کر لڑنا ہو گی۔ اللہ اسے جلد سے جلد صحت دے۔''

''جو کچھ ہے تابش! اس کی شروعات تو آپ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ میں اس کے لئے شکریے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔'' اس کی آواز قدرے بھرا گئی۔

''شکریہ غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ کیا اب میں تمہارے لئے اتنا ہی اجنبی ہو چکا ہوں؟''

''لیجئے انکل احمد سے بات کیجئے۔'' ثروت نے جلدی سے فون چچا احمد کو تھما دیا۔

''ہیلو تابی! کیسے ہو...... سالگرہ مبارک۔'' انہوں نے کہا۔

''تھینک یو انکل...... نصرت کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟''

''لگتا ہے کہ ابھی وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں میرا مطلب ہے کہ ٹرانسپلانٹیشن کے حوالے سے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نصرت کو 'اسٹے ایبل' رکھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں اور لگتا ہے کہ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ نصرت کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ درد میں افاقہ ہے اور کھا پی بھی رہی ہے۔''

چچا احمد شاید باتیں کرتے کرتے نصرت کے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ اسی لئے کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گفتگو کا رخ ثروت کے شوہر یوسف کی طرف مڑ گیا۔ چچا احمد کو میں نے تقریباً وہ سارے معاملات بتا دیئے تھے جو ثروت کے گھر میں چل رہے تھے۔ یوسف جس طرح اپنی ٹین ایجر جرمن بیوی کے عشق میں گم تھا اور جس طرح ثروت کا استعمال رہا تھا، وہ سب کچھ کچھ چچا احمد کے علم میں تھا اور جو میں نے نہیں بتایا تھا، اس کا اندازہ انہوں نے خود لگا لیا تھا۔

وہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے بولے۔ ''تابی! یہ یوسف کافی تیز بندہ لگتا ہے۔ دو تین دفعہ فون پر اس سے بات بھی ہوئی ہے میری۔ نصرت کے علاج اور صحت سے تو اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں لگتی لیکن وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ دیکھ چکا ہے کہ نصرت کا علاج شروع ہو چکا ہے اور خرچ کا انتظام بھی ہوتا جا رہا ہے، اب وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ روپے کا ایک ڈرافٹ بھیجا ہے اس نے۔ چند دن تک شاید خود بھی یہاں آئے گا۔''

''بس جو بھی ہے چچا جان! یوسف کو یہ شک نہیں ہونا چاہئے کہ نصرت کے علاج کا خرچہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔''

''لیکن وہ ہے بہت کائیاں...... مجھ سے میرے کام کے بارے میں سوال جواب کر رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میری انکم کیا ہے، اخراجات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

''آپ اس کے لئے کوئی معقول سا جواب تلاش کر چھوڑیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں اپنا کوئی اثاثہ بیچا ہو۔''

''ہاں، میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اگر وہ بال کی کھال اتارنے پر آ گیا تو پھر ایسا ہی کوئی جواب دینا ہوگا۔''

چچا احمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے دیکھا۔ فون پر ایک بڑا اچھا میسج آیا ہوا تھا۔ یہ فرح اور عاطف کی طرف سے تھا۔ مجھے سالگرہ کی پُر جوش مبارک باد دی گئی تھی اور بہت سی نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں بالو کی طرف سے ایک فقرہ تھا...... ''پیارے ابو! آج کے دن آپ کو بہت یاد کر رہا ہوں۔ سالگرہ مبارک۔''

میں نے فرح اور عاطف کے اس میسج کو ''ڈیلیٹ'' کر دیا، اس کے علاوہ چچا احمد اور ثروت والی کال کا ریکارڈ بھی ''ڈیلیٹ'' کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے فرشی بستر پر لیٹ گیا۔ نہ چاہنے کے باوجود ثروت کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ رات عجیب سرور کی

سی کیفیت میں گزری۔ اس سرور کی وجہ یقیناً یہ خیال تھا کہ نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی تھی۔

صبح مجھے ناشتا اکیلے ہی تیار کرنا تھا اور ایک بار پھر اس کام کا میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا لیکن ڈاکٹر مہناز میری مشکل آسان کرنے کے لئے پھر آن موجود ہوئی۔ اس نے میرے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا اور پورے سات بجے خود بھی ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گئی۔ جلالی صاحب ناشتا زیادہ تر ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی کرتے تھے۔ ان کا ٹیڈی کتا بھی عین اسی وقت ناشتے کی میز کے نیچے اپنا ناشتا کرتا تھا۔ وہ بڑا پھرتیلا کتا تھا اور جلالی صاحب اسے واکنگ اسٹک کی طرح استعمال کرتے تھے۔ جلالی صاحب اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی کچھ اور گرہیں میرے سامنے کھلی تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں جیسے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھے۔ جلالی صاحب کو گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ اس کو آوازیں دیتے تھے اور کبھی کبھی بہت سخت بھی بولتے تھے۔ دوسری طرف مہناز بھی ہر وقت ان کی طرف سے باخبر رہتی تھی۔ وہ کیا کھا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ وہ کئی ایک دوائیں کھاتے تھے اور ان دواؤں کا طویل ٹائم ٹیبل مہناز کو ازبر تھا۔ جلالی صاحب اچھے موڈ میں ہوتے تو پاس بیٹھی مہناز کا ہاتھ تھام لیتے اور جیسے بے خیالی میں اس کے اتھ اور بازو کو سہلاتے رہتے۔ کسی وقت اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور نرمی سے اس کے کندھے کو مسلتے رہتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ سلسلہ صرف ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے انہیں اسی طرح ڈاکٹر لائبہ کا ہاتھ تھامے ہوئے دیکھا۔ پھر ایک دن جب وہ اچھے موڈ میں سیکرٹری ندیم سے باتیں کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ایک نوخیز ملازمہ رخشی ان کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے اور جلالی صاحب کا بازو اس کے کندھوں رہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مشکل ''بزرگوار'' تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو اس لحاظ سے بھی جلالی صاحب کی قربت حاصل تھی کہ وہ ان کا علاج معالجہ کرتی تھی۔ ملازمین نے اپنی کوئی مشکل بات جلالی صاحب تک پہنچانا ہوتی تو اس کے لئے ڈاکٹر مہناز کا سہارا لیتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جلالی صاحب دونوں ڈاکٹرز اور خاص طور سے ڈاکٹر مہناز کی بات تحمل سے سنتے ہیں لیکن مہناز بھی سو فیصد ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ نہیں تھی...... کبھی کبھی جلالی صاحب کا خراب موڈ مہناز کی بھی ایسی تیسی کر ڈالتا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز، ڈاکٹر لائبہ اور سیکرٹری ندیم کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ جلالی صاحب کو اپنا چیک اَپ کرانا تھا۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عمران آ دھمکا۔ اس کے کپڑوں سے وہی بو آ رہی تھی جو چڑیا گھر میں سے آتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''بس دُم کی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ میں یہی سمجھتا کہ کمرے میں بن مانس گھس آیا ہے۔''

''مادہ بن مانس کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا پھر اپنے موبائل کی اسکرین کو گھورنے لگا۔

''کیوں خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ریان ولیم صاحب کا فون آرہا ہے۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ میں سن نہیں سکتا تھا۔ لگتا ہے کہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے ریان صاحب سے رابطہ کیا تھا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''مختار ملک کے بارے میں بھی کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں، میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے زو جانے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شکر کرو کہ مختار ملک کا تعلق ریان اینڈ کمپنی سے نہیں نکلا۔ ورنہ اپنے ہی ساتھی کو مارنے کے جرم میں ہمیں لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ عمران مسلسل اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے خود ریان صاحب کو کال ملائی۔ چند سیکنڈ بعد رابطہ ہو گیا۔ ''ہیلو ایمران۔'' ریان ولیم کی آواز اس کے جسم ہی کی طرح بھاری بھرکم تھی۔

''جی سر...... آئی ایم سوری۔ مصروف تھا اس لئے دوبارہ آپ کی کال کاٹنا پڑی۔'' عمران نے انگلش میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' ریان نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''کل جو کچھ تم نے بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم حسبِ توقع بڈھے کے قریب جانے میں کامیاب رہے ہو۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق ''زو'' کے جانور تم دونوں کی مشترکہ دلچسپی ٹھہرے ہیں۔''

''جی ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''میں ابھی زو میں ہی تھا۔ ایک زیبرے کے پاؤں کا زخم دھو رہا تھا۔''

ریان ولیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہیں اس معاملے کے بارے میں کچھ اور بتا دیا جائے۔ اس سے تمہیں اس سارے ''ایشو'' کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور تمہیں آگے کام کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔ کیا تم فی الوقت ایسی محفوظ جگہ پر ہو

کہ میں اپنی بات جاری رکھ سکوں؟''

''بالکل جناب! جلالی صاحب، ان کی دونوں ڈاکٹرز اور سیکرٹری ندیم فارم سے باہر ہیں۔ میں اس وقت علیحدہ کمرے میں موجود ہوں۔''

''تمہیں پتا ہے کہ یہاں کوٹھی میں دو تین جگہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی ہیں؟''

''اس طرف سے بالکل تسلی رکھیں جناب۔ ہم اس کمرے کو اچھی طرح چیک کر چکے ہیں۔''

''ہاں، میں کہیں بھول نہ جاؤں۔ اس سیکرٹری ندیم کی طرف سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جتنا ہوشیار نظر آتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' عمران نے کہا۔

ریان ولیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں بھی یہ سوال بہت مرتبہ ابھرا ہوگا کہ اس باکس میں کیا ہے۔ جس کے لئے یہ ساری جدوجہد اور بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ اس باکس میں ایک بہت قیمتی دھات ہے۔ صرف ''ایک دھات'' لیکن بہت قیمتی...... کم از کم میں تو اسے دھات ہی کہوں گا کیونکہ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سن رہے ہو؟''

''جی ہاں۔ پوری توجہ سے۔'' عمران نے کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کہنے کو وہ ایک مورتی ہے۔ اسے آراکوئے کہا جاتا ہے۔ آراکوئے برما میں بولی جانے والی ایک زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنی حفاظت خود کرنے والا۔

''اس مورتی کے حوالے سے مشہور ہے کہ یہ نہ صرف صدیوں سے اپنی حفاظت خود کر رہی ہے بلکہ یہ جس مقام پر موجود ہوتی ہے اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اب تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ یہ کس چیز کی مورتی ہے؟ یہ دراصل بدھا کا ایک دو فٹ اونچا مجسمہ ہے......''

ریان ولیم بول رہا تھا۔ اس کے الفاظ موبائل فون میں سے نکل کر ہم دونوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے اور ان الفاظ نے جیسے ہم دونوں کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یہ ہم کیا سن رہے تھے؟ جو کچھ ریان ولیم بڑی رازداری کے انداز میں بتا رہا تھا، وہ ہمارے لئے نیا نہیں تھا۔ اس دھاتی مجسمے کے بارے میں ہم سے زیادہ کون جانتا تھا۔ یہی بدھا تو تھا جس نے ہمیں میڈم صفورا جیسی شاطر عورت اور صدیقی جیسے منافق بندے سے ٹکرایا

تھا۔ اسی نایاب بدھا کی خاطر بھانڈیل اسٹیٹ کے رنجیت پانڈے جیسے خطرناک کمانڈوز پاکستان آئے تھے اور انہوں نے مار دھاڑ کی تھی۔ اسی بدھا کو چرانے کی سزا میں ہمیں یعنی مجھے، صفورا اور صدیقی کو پاکستان سے اٹھا کر انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں پھینکا گیا تھا۔
یہی نایاب مورتی جسے لوگ آرا کوئے کہتے تھے۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جاتی تھی کہ آرا کوئے اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور اسے ناجائز طور پر اپنے قبضے میں رکھنے والے برباد ہوتے ہیں۔ ہماری آخری اطلاعات کے مطابق یہ بدھا بھانڈیل اسٹسٹ میں تھا۔ وہاں کے بڑے پگوڈا میں...... لیکن اب یہ سفید فام ریان ولیم ہم پر انکشاف کر رہا تھا کہ وہ یہاں ہے۔ شیخوپورہ کے اس فارم میں یا کہیں آس پاس۔ ایک مستطیل چوبی ڈبے میں بند اور کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔

عمران نے اپنے ''ری ایکشن'' سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ریان ولیم بدستور فون پر بول رہا تھا۔ ''...... یہ مجسمہ آرا کوئے کچھ لوگوں کے لئے بے حد قیمتی ہے۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس مجسمے کے بہت سے مداح ابھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ یہاں پاکستان میں لاہور کے قریب موجود ہے۔ اگر یہ نیوز پھیل گئی تو یہاں بہت ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ بہت سے ملکی اور غیر ملکی گروہ اس علاقے کا رخ کر سکتے ہیں۔ ہم اس کام کو جتنی جلدی نمٹا لیں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

عمران نے کہا۔ ''ذہن میں بہت سے سوال ابھرتے جناب! سب سے اہم سوالات تو یہی ہے کہ یہ خاص بدھا یہاں پہنچا کس طرح اور یہ کس کی ملکیت ہے؟''
ریان بولا۔ ''میری معلومات بھی اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس حوالے سے کسی ابرار صدیقی کا نام لیا جا رہا ہے۔ اب یہ صدیقی کہاں ہے، اس کا بھی کسی کو کچھ پتا نہیں۔ تم نے بھی کل بتایا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے بیان کے مطابق یہ بدھا ایک چاندنی رات میں ایک تیز رفتار گاڑی میں سے نہر کے کنارے جھاڑیوں میں گرا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ صدیقی ہی اس بدھا کو لے کر کہیں جا رہا ہو اور کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ ان لوگوں سے مجسمے کو بچانے کے لئے اس نے اسے جان بوجھ کر پھینک دیا ہو۔''
شاید ریان ولیم کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر کسی وجہ سے سگنل خراب ہو گئے اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہم سناٹے میں تھے۔ یہاں فارم ہاؤس میں آنے کے بعد ہم نے پُراسرار باکس کے بارے میں کئی بار سنا تھا لیکن ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس باکس کا تعلق نایاب

مجسمے کی اسمگلنگ کے ان واقعات سے نکل آئے گا جن کو ہم تقریباً بھول چکے ہیں۔
عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا گڑبڑ گوٹالا ہو گیا ہے جگر! آرا کوئے کا بھوت پھر زندہ ہو گیا ہے۔ نہ صرف زندہ ہو گیا ہے بلکہ زرگاں سے ترت یہاں شیخوپورہ روڈ کے اس فارم میں بھی آ پہنچا ہے۔ تمہاری سوگند، میری تو بدھی چکرا گئی ہے۔ بدھی کا مطلب سمجھتے ہو نا تم؟''

میں نے کہا۔ ''صدیقی کا نام آنے کے بعد اس معاملے میں شبے کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہاں صدیقی اور بدھا کا نام ساتھ ساتھ کیوں آ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ صدیقی ہی بدھا کو پھر انڈیا سے پاکستان لے آیا ہو۔''
''بڑا مبارک دن ہے۔ کئی مہینوں کے بعد تم نے کوئی عقل کی بات کی ہے۔'' عمران نے کہا اور پریشان بکری کی طرح سر جھکا لیا۔
''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''
''یار! وہی جو تم کہنا چاہ رہے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا جب ہم اسٹیٹ سے واپس روانہ ہونے لگے تھے تو صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا۔ میڈم صفورا نے پورے دو دن اس کو کھوجنے میں لگائے تھے۔ پھر ایسے شواہد ملے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صدیقی ہم سے پہلے ہی اسٹیٹ سے نکل چکا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ ''اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے اسی وقت شبہ سا ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ یہ بندہ اگر واقعی یہاں سے گیا ہے تو پھر جاتے جاتے کوئی کارنامہ انجام دے گیا ہے۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ صدیقی نے اسٹیٹ سے نکلتے نکلتے وہ بدھا پھر چرا لیا ہے جس کے لئے وہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا اور جس کی چوری نے چار سال پہلے ہر جگہ تہلکہ مچایا تھا۔''
''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔''
''لیکن یہ کام کچھ آسان تو نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔
''تم بھول رہے ہو کہ ایڈووکیٹ صدیقی ایک شاطر ترین شخص کا نام ہے۔ اس کے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ ہے اور پھر ان دونوں اسٹیٹ میں جس طرح کے حالات تھے تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ حکم اور اس کے حواری گوروں کو شکست ہو چکی تھی۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ حفاظتی انتظام درہم برہم ہو چکے تھے۔''

''لیکن پھر بھی آرا کوئے کی بڑی اہمیت تھی یار! اگر اسے غائب کیا جاتا تو چند گھنٹوں کے اندر زرگاں میں تہلکہ مچ جاتا۔''

''تمہارے اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں جگر...... یہ بھی تو ممکن ہے کہ پگوڈا کے اندر اصلی مورتی کی جگہ اس کی نقل رکھ دی گئی ہو۔''

عمران کی بات میں وزن تھا۔

ایک دم ہی صدیقی کا کردار ہماری نظروں میں زبردست اہمیت اختیار کر گیا تھا اور کسی حد تک صفورا کا کردار بھی۔ صفورا اور صدیقی نوادرات کے حوالے سے دو پرانے دوستوں کی طرح تھے۔

میں اور عمران اس بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ باکس والے معاملے میں ہماری دلچسپی ایک دم ہی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ 16 ملین ڈالرز کے انعامی مقابلے اور فربہ اندام ریان ولیم سے شروع ہونے والے واقعات کے ڈانڈے یوں اس فارم ہاؤس اور پھر آرا کوئے سے جا ملیں گے۔ ریان ولیم کو بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ اس نے عمران کو جس کام پر مامور کیا ہے اور جس چیز کا کھوج لگانے کو کہا ہے، اس چیز سے عمران کا پہلے ہی گہرا واسطہ رہا ہے۔ بہرحال، اب بھی آرا کوئے کی یہاں موجودگی کے بارے ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

عمران اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ تیزی سے سگریٹ بھی پھونک رہا تھا۔ اپنی خوب صورت ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یار یہ تو بڑا قضیہ شروع ہو جائے گا۔ سارے کے سارے حالات پلٹ آئیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ انڈیا سے پھر خطرناک کمانڈوز آئیں گے اور آرا کوئے کو ڈھونڈیں گے؟''

''بالکل ایسا ہی ہو سکتا ہے...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، ریان ولیم جیسے لوگ بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا ہونا چاہئے؟''

''یہ بدھا اگر واقعی جلالی کے آس پاس ہے تو پھر اسے جلد از جلد برآمد ہونا چاہئے اور ہماری حفاظت میں آنا چاہئے...... لیکن یہ بابا جی...... اپنی ذات شریف میں خود ایک بہت بڑی مصیبت ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ آسانی سے کچھ بتا کر دیں گے۔''

''اور سختی کر کے ان سے پوچھنا ممکن ہی نہیں۔ یہ چلتا پھرتا مدعا ہیں...... آناً فاناً اللہ کو

پیارے ہو سکتے ہیں۔''

''اصل مسئلہ تو یہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ورنہ ریان اور جاوا جیسے لوگ دو گھنٹے میں ان کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیتے۔''

''کوئی ترکیب سوچو۔''

وہ کش لے کر بولا۔ ''شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر مہناز سے جلالی کا لگاؤ کچھ کام آ سکتا ہے۔ یعنی اگر مہناز کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لئے یہ حضرت اپنی زبان کھول دیں گے لیکن اب اندازہ ہوا ہے کہ ایسے معاملوں میں یہ بالکل بے حس ہیں۔ ان حضرت نے رشتوں ناتوں کے حوالے سے اپنے اندر کوئی کمزوری رہنے ہی نہیں دی۔ مہناز اور دوسری جوان ملازماؤں کو یہ اپنے سکون اور راحت کے لئے استعمال ضرور کرتے ہوں گے لیکن ان کے لئے کوئی جذباتی وابستگی یہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔''

''پھر تو ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔ کسی طرح باکس کا اصل مالک سامنے آ جائے۔ یعنی وہ بندہ جس نے چلتی گاڑی سے باکس پھینکا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی انجان شخص کو ساری بات سمجھا کر اور باکس کا مالک بنا کر جلالی صاحب کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ انہیں مطمئن کر دے؟''

''یہ حضرت کچی گولیاں نہیں کھیلے بلکہ پکے گولے کھیلے ہوئے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ کچھ عرصہ فوج میں رہے ہیں۔ انہیں الو بنانا آسان نہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ دس پندرہ دن پہلے ایک پینٹ کوٹ والا شخص ''مالک'' بن کر آیا تھا یہاں۔ پورا پورا ڈراما کیا اس نے لیکن جلالی صاحب نے باکس کے بارے میں تفصیل پوچھی۔ باکس کا رنگ کیا ہے؟ تالا کس کمپنی کا لگا ہوا ہے؟ باکس کے اندر مجسمہ کس چیز میں لپٹا ہوا ہے؟ اس پر کوئی داغ ہے یا وہ بے داغ پیس ہے؟''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس بندے کو بھی ڈاکٹر راشد کی طرح صرف ایک چڈی میں یہاں سے بھاگنا پڑا۔ گرے ہاؤنڈ کتے اس کی گاڑی کو کافی دور تک ''سی آف'' کرنے گئے۔''

''واقعی یار! اگر یہ بابا جی کہیں اللہ کو پیارے ہو گئے تو...... آرا کوئے تو ایک معما بن کر رہ جائے گا۔''

رات کو کھانے کے بعد میں عمران کا کمرا دیکھنے چلا گیا۔ یہ شاندار کمرا تھا۔ ڈبل بیڈ، فریج، ٹی وی سب کچھ موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرا اس سے پہلے چھوٹے ویٹرنری ڈاکٹر

لطیف کا تھا۔عمران نے کہا۔’’مجھے مبارک باد دو۔میری ترقی ہوگئی ہے۔میں باورچی سے ڈاکٹر بن گیا ہوں۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’سنا ہے کہ نیا ڈاکٹر عقیل یہاں آنے سے مکر گیا ہے۔اب جونیئر ڈاکٹر لطیف ہی جانوروں کی دیکھ بھال کا کام سنبھالے گا۔مجھے اس کے اسسٹنٹ کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اس کا کمرا بھی مجھے عنایت کر دیا گیا ہے۔وہ خود بھگوڑے ڈاکٹر راشد کے کمرے میں منتقل ہو گیا ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر عقیل کیوں نہیں آیا؟‘‘میں نے پوچھا۔

’’کیا کہا جا سکتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ اسے یہاں کے گڑبڑ حالات کا پتا چل گیا ہو۔آج کل جو کچھ یہاں چل رہا ہے، وہ کسی کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔لیکن میرے لئے بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔‘‘

’’کیوں، تمہیں جنگلی بھینس کا دودھ دھونا پڑتا ہے؟‘‘

’’نہیں یار! جب میں کسی اچھے آرام دہ کمرے میں ہوتا ہوں اور وہاں ڈبل بیڈ بھی ہوتا ہے تو مجھے کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔جی چاہتا ہے کہ کوئی ساتھی ہو۔‘‘

’’تو فتح محمد کو ساتھ سلا لیا کرو۔‘‘

’’حسِ لطافت تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔کھوتے! میں کسی خوبرو لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔چلو، وہ اس ڈبل بیڈ تک نہ آئے لیکن کم از کم کوئی آس امید تو ہو۔‘‘

’’تو کوئی یارانہ جوڑ لو یہاں بھی۔یہ تمہارے لئے کون سا مشکل کام ہے۔‘‘

’’یہاں ڈاکٹر مہناز کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتی اپنے اسٹینڈرڈ کی۔اب سوچو نا جس نے ریما اور نرگس جیسی دل ربا خواتین کے ساتھ وقت گزارا ہو، اس کا کوئی معیار تو ہوگا نا۔ ویسے لڑکی یہ مہناز بھی ٹھیک ہے۔کل لان میں ڈاکٹر لائبہ، سیکرٹری ندیم اور کچھ دوسرے ملازموں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔میں تو بس کھڑکی میں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔اتنی خوبصورتی سے دوڑ کر رن بناتی ہے کہ فیلڈر گیند ہاتھ میں پکڑ کر تکتا رہ جاتا ہے۔رن آؤٹ کرنا ہی بھول جاتا ہے۔‘‘

’’پھر کیا ارادے ہیں؟‘‘

’’یار! اسے باؤلنگ کرانے کو دل چاہتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ کیچ پکڑا ہی دے۔‘‘

’’وہ باؤلر کو بیک ڈرائیو مارے گی اور تمہاری مڈل اسٹمپ اڑا دے گی...... میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں۔لگتا ہے کہ اپنی منگنی ٹوٹنے کے بعد اسے ہر جواں سال مرد سے الرجی ہوگئی ہے۔وہ جلالی صاحب کے ساتھ بڑی مطمئن ہے۔‘‘

’’لیکن جگر! جلالی صاحب نے تو زیادہ سے زیادہ رمضان شریف تک اللہ کو پیارے ہو جانا ہے۔‘‘

’’وہ ہو بھی گئے تو وہ ہم جیسوں کو گھاس نہیں ڈالے گی۔کوئی اور ادھیڑ عمر ڈھونڈ لے گی اور شاید شادی بھی کر لے۔‘‘

’’اچھا، دوسری ڈاکٹر لائبہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ ذرا ماٹھی ہے لیکن گزارہ کر جائے گی۔تھوڑی بہت لفٹ بھی کرا رہی ہے۔کل اس نے......‘‘

یکا یک وہ چپ ہوگیا۔ایک دم اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔یہاں موبائل فون موجود تھا۔وہ گڑبڑا کر بولا۔’’اوئے، یہ کیا؟ یہ موبائل تو ابھی آن ہے...... اوگاڈ...... یہ تو بند ہی نہیں ہوا۔‘‘

اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔میں نے دیکھا اسکرین پر شاہین کا نمبر تھا...... وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔اب یہ ساری گفتگو اس نے شاہین کو سنانے کے لئے کی تھی اور ظاہر یہ کیا تھا جیسے غلطی سے موبائل کھلا رہ گیا ہے۔

’’تم بہت بے ہودہ اور خبیث شخص ہو۔جو لوگ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے تمہیں ہیرو کہتے ہیں، اس لفظ کی توہین کرتے ہیں۔‘‘

’’اور تم کیا کر رہے ہو۔تم ’’توہین چینل‘‘ کر رہے ہو۔یار رکھو بعض اوقات اس کی سزا توہین عدالت سے بھی کڑی ہوتی ہے۔‘‘

’’ماشاء اللہ! کیا سزا ہوتی ہے اس کی؟‘‘

’’تمہارا کارٹون بنایا جائے گا اور اسے انڈیا کے کسی آئٹم سانگ پر رقص کرایا جائے گا۔وہ سانگ بھی ایسا ہوگا جس کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آئیں گے۔اور تمہیں پتا ہی ہے جب ایسے گانوں کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے تو سننے والوں کے ذہنوں میں کیسے کیسے گندے خیالات آتے ہیں...... وہ گانا......‘‘

عمران کہتے کہتے اچانک خاموش ہوگیا۔ایک دم اس کے چہرے کی ساری غیر سنجیدگی سمٹ کر اس کی آنکھوں میں کہیں غائب ہوگئی۔وہ کچھ سن رہا تھا۔میں نے بھی اس کی سماعت کا تعاقب کیا۔یہ چکور کی آواز تھی جو سناٹے میں بلند ہوئی تھی۔یہ آواز فارم ہاؤس کی باؤنڈری

کے باہر سے آئی تھی۔

''سن رہے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں، چکور کی آواز ہے شاید۔''

''چکور ہی کی ہے لیکن اصلی نہیں ہے کوئی یہ آواز نکال رہا ہے۔'' وہ یقین سے بولا۔

جانوروں کے حوالے سے عمران کی معلومات کو جھٹلانا بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل چکور کی آواز تھی لیکن عمران کہتا تھا کہ نہیں ہے تو کیا درختوں کی تاریکی میں کوئی شخص کسی دوسرے کو کوئی اشارہ وغیرہ دے رہا تھا؟ یہ کوئی پہرے دار ہوسکتا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی غیر متعلق شخص ہو۔ میں اور عمران دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میری شلوار کے نیفے میں ابھی تک وہ پسٹل موجود تھا جو مختار ملک سے لڑائی کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ ہم تیزی سے باہر نکلے۔ جانوروں کے پنجرے کے درمیان سے ہوتے ہوئے فارم کے بڑے گیٹ کی طرف آئے...... ابھی ہم گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تھے کہ پہلا فائر سنائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پستول کا فائر تھا۔ فوراً بعد دو اور گولیاں چلیں، یہ رائفل کی تھیں۔ یہ شوٹنگ بھی سو ڈیڑھ سو گز دور ہو رہی تھی۔ ان آوازوں نے ایکا ایکی فارم ہاؤس میں تہلکہ سا مچا دیا۔ پنجروں میں پرندے پھڑ پھڑانے لگے اور کئی چوپایوں نے چلانا شروع کر دیا۔ گارڈز بھی آوازوں کی طرف لپکے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے اور درختوں کی طرف بڑھے۔ باؤنڈری وال کے اردگرد بیس تیس میٹر جگہ بجلی کی ٹیوبس سے نیم روشنی تھی مگر اس کے بعد گہری تاریکی تھی۔ کوئی سو میٹر آگے جانے کے بعد ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے دیکھ لیا، یہ سیکرٹری ندیم کی سفید مہران تھی۔ وہ کچے راستے پر آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ پھر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے ندیم بھی دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ حواس باختہ تھا۔

''کیا ہوا ندیم صاحب؟'' فتح محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔

''وہ نکل گئے۔''

''کون تھے؟''

''پتا نہیں، انہوں نے مجھ پر گولی بھی چلائی ہے۔''

اس وقت ہم نے دیکھا کہ مہران کار راستے سے اتری ہوئی تھی اور اس کا ایک پہیا گڑھے میں تھا۔ غالباً ندیم نے کسی کے پیچھے جانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔

دو تین اور گارڈز بھی دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ہمیں تھوڑے فاصلے پر لوہے کی

چھوٹی سی ہتھ ریڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایسی ریڑھیاں مزدور، تعمیراتی سامان ڈھونے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں ہانپتے کانپتے ہوئے ندیم کا معائنہ کیا۔ وہ زخمی ہونے سے محفوظ رہا تھا۔ ہاں، گاڑی کی ونڈ اسکرین میں گولی کا سوراخ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''ہوا کیا ہے ندیم صاحب؟'' فتح محمد نے دوبارہ پوچھا۔

وہ اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ ''میں پُل کی طرف سے آ رہا ہوں۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ دو بندے ہتھ ریڑھی میں سے کچھ نکال کر جیپ میں رکھ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑا تھیلا سا تھا۔ بڑی جلدی میں نظر آ رہے تھے وہ۔ میں نے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ وہ جواب دینے کے بجائے جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہتھ گاڑی بھی وہیں چھوڑ دی۔ میں نے ان کی طرف جانا چاہا تو انہوں نے فائر کر دیا۔ یہ مجھے ڈرانے کے لئے تھا۔ میں نے بھی گاڑی سے رائفل نکال لی اور جیپ کے ٹائر کو نشانہ بنانا چاہا...... اس کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اس بڑے درخت کے پیچھے تھا جو ہتھ گاڑی کے پاس نظر آ رہا ہے۔ چار پانچ گولیاں چلانے کے بعد انہوں نے جیپ بھگا دی۔ میں نے مہران پر ان کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن ریورس کرتے ہوئے یہ ٹائر یہاں کھڈے میں چلا گیا۔'' ندیم نے تاسف سے کہا۔

فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اعشاریہ تین آٹھ...... کی ایک گولی ونڈ اسکرین میں لگی تھی جبکہ ایک گولی نے پچھلے دروازے میں سوراخ بنایا تھا۔

ہم سب فوراً واپس کوٹھی میں پہنچے۔ جلالی صاحب سلیپنگ گاؤن میں تھے اور بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں ساری صورتِ حال بتائی گئی۔ دو گاڑیاں فوراً مشتبہ جیپ کی تلاش میں روانہ ہوئیں۔ جلالی صاحب نے دونوں گاڑیوں سے موبائل فون پر رابطہ رکھا ہوا تھا۔ قریباً ڈھائی گھنٹے بعد دونوں گاڑیاں گھوم پھر کر واپس آ گئیں۔ مشتبہ جیپ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر چل رہا ہے؟''

''کافی سنگین چکر لگتا ہے۔ جلالی صاحب بھی پریشان ہیں۔''

''کہیں یہ وہی باکس والا معاملہ ہی تو نہیں؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ آرا کوئے والا باکس بابا جی کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔''

''کیا اسے اتنی آسانی سے ڈھونڈ لیا گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا تابی! یار لوگوں نے صدام کو بھی ڈھونڈ نکالا تھا مگر ہم میں سے کچھ نکتہ چیں اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صدام کے بجائے اس کے کسی ہم شکل کو پھانسی دی گئی تھی۔ انسان چاند پر قدم رکھ چکا لیکن ہم اسے اب بھی ڈراما قرار دیتے ہیں۔ نائن الیون کے حوالے سے بھی نئی نئی موشگافیوں کی فیکٹریاں ہم نے لگا رکھی ہیں۔ میرے اور ٹنڈولکر کے بارے میں بھی کئی بے ہودہ خبریں لوگ پھیلاتے رہتے ہیں۔''

''تمہارا اور ٹنڈولکر کا کیا میل ہے؟'' میں مسکرایا۔

''اسی کو تو بے ہودہ اور بے بنیاد خبر کہتے ہیں۔'' وہ دانائی سے بولا۔ ''نہ میں ٹنڈولکر کی طرح کرکٹ کھیلتا ہوں، نہ وہ کسی نیوز چینل کا اینکر ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی فرصت میں ریان ولیم کو فون کر کے یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہئے۔''

''ہاں، یہ تو ضروری ہے۔'' میں نے تائید کی۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ کچھ دیر تک کمرے میں گہری خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ''ویسے تابی! ہمیں اس صورتِ حال کا ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے...... سچویشن کا ایک دوسرا اینگل بھی ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

اس نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا، تب دھیمے لہجے میں بولا۔ ''یہ امکان بھی ہے کہ جلالی صاحب کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔''

''وہ کس طرح؟''

''ہم کچھ دیر کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ جلالی صاحب نے آرا کوئے والے باکس کو حفاظت کی غرض سے فارم ہاؤس کے اردگرد کہیں چھپا رکھا ہے۔ انہوں نے یہ کام اکیلے کیا ہے اور اس جگہ کی خبر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کچھ دیر پہلے جو واقعہ ہوا ہے، اس نے یقیناً جلالی صاحب کو بہت پریشان کیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جسے کچھ لوگوں نے ہتھ گاڑی سے نکال کر جیپ میں رکھا اور پھر بھاگ گئے۔ نہ صرف بھاگے بلکہ خود کو بچانے کے لئے باقاعدہ فائرنگ بھی کی۔''

''ہاں، بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ ان کا دھیان 'باکس' کی طرف بھی جا سکتا ہے۔''

''بالکل جا سکتا ہے...... بلکہ گیا ہوگا۔ اب سوچو...... وہ کیا کرنا چاہیں گے؟ وہ تصدیق

کرنا چاہیں گے کہ باکس اپنی جگہ پر موجود ہے یا نہیں۔''

میں نے سنسنی محسوس کی۔ عمران کی بات میں زبردست منطق موجود تھی۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ جلالی صاحب کا پیچھا کیا جائے گا؟''

''اللہ تمہیں نرینہ اولاد دے۔ میرا مطلب بالکل یہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اگلے ایک دو دن میں ہمیں جلالی صاحب کی آمد و رفت پر نظر رکھنی ہوگی۔''

''یقیناً...... خاص طور پر اس وقت جب وہ کہیں اکیلے روانہ ہوں۔''

''فرض کیا وہ روانہ ہوتے ہیں اور ہمیں پتا بھی چل جاتا ہے، تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر ان کا پیچھا کیا جا سکتا ہے۔ 'زو' میں تین پک اپ گاڑیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کی چابی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک اسکوٹر بھی قابلِ استعمال حالت میں ہے۔''

''یہ لمبا چوڑا کھیل لگتا ہے عمران۔ جاوا جیسے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ فرض کیا سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا ہم نے سوچا ہے۔ ہم نے جلالی صاحب کا پیچھا بھی کر لیا لیکن جب جلالی صاحب موقع پر پہنچے اور پندرہ بیس مسلح بندے وہاں آ دھمکے تو پھر؟''

''یار! تم سب کچھ پہلے ہی تو مت سوچ لو نا۔ کچھ فیصلے موقع پر بھی کئے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں محسوس ہوا کہ جلالی صاحب کے آس پاس زیادہ گڑبڑ ہے تو ہم انہیں آگے جانے سے روک بھی سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ انہیں ٹریپ کیا جا رہا ہے۔ وہ جہاں جا رہے ہیں، وہاں کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ لیکن ابھی تو یار یہ سب مفروضہ ہی ہے نا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی چکر ہی اور ہو؟''

وہ رات گزر گئی۔ اگلے دن بھی کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا۔ فارم ہاؤس کے اردگرد چوکیداروں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔ حسبِ سابق اس واقعے کی رپورٹ بھی جلالی صاحب نے پولیس میں درج نہیں کرائی۔ تاہم وہ پریشان نظر آتے تھے اور یہ پریشانی واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ عمران ڈاکٹر لطیف کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا۔ ایک ایرانی بلی بھی ساتھ گئی تھی۔ اس کا کوئی چیک اَپ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں جانوروں کے لئے کچھ ادویات بھی لے کر آنا تھیں۔ ان کی واپسی شام کے فوراً بعد ہو جانا تھی لیکن پھر

عمران کا فون آیا کہ قیمتی ایرانی بلی کو مزید ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے اور وہ کل سہ پہر سے پہلے واپس نہیں آسکیں گے۔ یہ وہی حاملہ بلی تھی جس کو بچے جنم دینے تھے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ کوٹھی کی بیشتر روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ وسیع و عریض لان بھی خالی تھا۔ میں دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ یہاں سے مجھے کوٹھی کا پورچ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ شیورلیٹ بھی دکھائی دیتی تھی جسے جلالی صاحب زیادہ تر سفر کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پچھلے تین دن سے میں نے مسلسل پورچ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ عمران بھی یہی کر رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں جلالی صاحب کی آمدورفت کی خبر رہے لیکن وہ ان تین دنوں میں کہیں نکلے ہی نہیں تھے۔ صرف ایک صبح پیدل نکلے تھے۔ طرح دار ڈاکٹر مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے واپس لوٹ آئے تھے۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے جلالی صاحب کی شیورلیٹ کے قریب ایک سایہ سا نظر آیا۔ شیورلیٹ کے قریب ہی چھوٹی پوٹھوہار جیپ کھڑی تھی۔ سائے نے جیپ کے گرد مشکوک انداز میں ایک چکر لگایا۔ چند سیکنڈ بعد نیچے جھکا جیسے اگلے پہیے کی ہوا چیک کرنا چاہتا ہو۔ وہ قریباً آدھ منٹ تک وہیں رہا۔ مجھے لگا کہ اس نے کچھ کیا ہے۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ بظاہر یہ عام سا واقعہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تقریباً آٹھ دس منٹ بعد میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھنا شروع ہو گئی۔ میں نے پوٹھوہار جیپ کے قریب ایک اور سایہ دیکھا۔ یہ یقیناً جلالی صاحب تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سے آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ وہ اکیلے کہیں جا رہے تھے۔ ان کی عمر اور ان کی جسمانی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ اس طرح رات کے وقت کہیں اکیلے نکلیں لیکن انہیں روکنے ٹوکنے کی جرأت کون کر سکتا تھا؟ ایک دم میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا اور عمران یہاں نہیں تھا۔ مجھے اس کی بے وقت غیر موجودگی پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر سیڑھیاں اتر کر تیزی سے نیچے آیا۔ عمران نے کہا تھا کہ ہم اسکوٹر پر جلالی کا پیچھا کریں گے لیکن اس وقت تو اسکوٹر نظر آرہا تھا اور نہ ہی وہ پک اَپ جس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ جلالی صاحب کو جانے سے روکا جائے۔ وہ کسی جال میں پھنسنے والے تھے۔

میں احاطے میں پہنچا تو ان کی سفید پوٹھوہار جیپ مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا۔ میں نے گارڈز کو پکار کر کہا کہ وہ جلالی صاحب کو روکیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ جلالی صاحب نکل گئے۔ میں گیٹ پر پہنچا تو گارڈز نے مجھے روک

لیا۔ وہ ششدر تھے۔ ”کیا بات ہے؟“ فتح محمد نے گرج کر پوچھا۔

جلالی صاحب کو روکو۔ ان کے لئے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔“

”کیا مسئلہ ہے؟“ وہ جھلا کر بولا۔

”تم پہلے ان کو روکو۔“ میں نے بھی جھلا کر کہا۔

”کیا تماشا لگا رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟“ اس نے مجھے دھکا دیا۔

میں نے بھی جواباً اسے دھکا دیا۔ اسے مجھ سے ایسے شدید دھکے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ادھ کھلے گیٹ سے ٹکرایا اور پلٹ کر ایک اسٹول پر گرا۔ میں اندھا دھند جیپ کے پیچھے بھاگا۔ جیپ کافی آگے درختوں میں پہنچ چکی تھی۔ وہ رفتار پکڑ چکی تھی۔ شاید میرے لئے اسے روکنا ممکن نہ ہوتا مگر اسی دوران میں سامنے ایک ٹارچ چمکی، کوئی گارڈ موجود تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”جلالی صاحب کو روکو۔“

بات گارڈ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے جیپ کے سامنے آ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ دھیمی ہوئی اور پھر رک گئی۔ میں نے ہانپا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جلالی صاحب موجود تھے اور حیرت آمیز غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے اجازت طلب کئے بغیر جیپ کا دروازہ کھولا اور ان کے برابر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ ہنکارے۔

”صاحب جی! آپ نہ جائیں۔ آپ کے لئے کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اور تم مجھے روکنے والے کون ہو؟“

”میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ پلیز، آپ فارم میں واپس چلیں۔“

”میں سمجھ گیا۔ ڈاکٹر مہناز نے بھیجا ہے نا تمہیں؟ اسی کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے۔ وہ کیا سمجھتی ہے...... میں بڈھا ہوں، ناکارہ ہوں، اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتا؟ کون ہوتی ہے وہ مجھ پر پابندیاں لگانے والی؟ میری موت جب آنی ہے، وہ آ جائے گی۔ وہ اسے روک نہیں سکتی۔ بے وقوف کی بچی......“

”نہیں سر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملے سے ڈاکٹر مہناز کا کوئی تعلق نہیں۔ لگتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کو ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں سب کچھ۔ آپ واپس چلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آپ کی جیپ میں کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔“

میرے آخری فقرے سے جلالی کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس نے عینک کے پیچھے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا ہے...... کہاں دیکھا ہے تم نے؟“

میں نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا ہے جناب...... اور مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ آپ کا پیچھا کرنا چاہ رہے ہیں۔ کیا آپ کسی خاص جگہ پر جا رہے تھے؟“

”کیا بک رہے ہو تم؟ میرا پیچھا کون کرے گا؟ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ گاڑی میں گڑبڑ کی گئی ہے، اب کہہ رہے ہو کوئی پیچھا کر رہا تھا؟“

”آپ گاڑی کو چیک کریں۔ اس کا بریک وغیرہ تو فیل نہیں یا اسٹیئرنگ میں کوئی مسئلہ ہو؟“

جلالی نے وہیں بیٹھے بیٹھے بریک پیڈل دبا کر دیکھا، وہ بالکل صحیح تھا۔ اندرونی لائٹ جلا کر اس نے اسٹیئرنگ کے نیچے کراس کو دیکھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ اس دوران میں فتح محمد اور دیگر گارڈز بھی ہانپتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ فتح محمد کا ایک بازو چھلا ہوا تھا اور ناک سے خون رِس رہا تھا۔ وہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا۔

”یہ مجھے دھکا دے کر آپ کے پیچھے بھاگا ہے۔ صادق تو اس پر گولی چلانے لگا تھا، میں نے روکا۔“

میں نے کہا۔ ”جلالی صاحب! میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ پلیز، آپ گاڑی واپس لے جائیں۔ اگر میرا کہا غلط نکلے تو جو سزا چاہیں مجھے دے لیں۔“

جلالی صاحب کچھ دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ پھر انہوں نے جیپ کو یوٹرن دیا اور واپس فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جلالی صاحب نے اپنی سیٹ کے قریب ایک شاندار ”بیکارل“ رائفل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ بوقتِ ضرورت اس کا گھوڑا دبانے کی طاقت اپنے اندر رکھتے تھے یا نہیں۔

جیپ واپس پورچ میں پہنچ گئی۔ کئی ملازم ہمارے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں سیکرٹری ندی، ملازم خاص فتح محمد اور ہیڈ گارڈ صادق علی وغیرہ بھی شامل تھے۔ رکھوالی کے کتے اپنی دُموں کو گردش دیتے ہمارے اردگرد چکرانے لگے۔

جلالی صاحب نے کڑکتے لہجے میں کہا۔ ”ہاں بتاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟“

میں جیپ کے اگلے پہیے کے پاس بیٹھ گیا اور مڈگارڈ کے نیچے اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ میں نے پہیے کے نٹ بھی دیکھے، وہ ٹھیک کسے ہوئے تھے۔ میں نے خود کو پزل محسوس کیا۔ اگر میں کوئی خاص تبدیلی نہ ڈھونڈ سکتا تو میری بات غلط ثابت ہو جاتی۔ ایسے میں جلالی صاحب میری کم بختی لا سکتے تھے۔ یقیناً فتح محمد کا پارا

بھی چڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے فتح محمد کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور پشت کے بل جیپ کے نیچے لیٹ کر اس کے اگلے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ یکا یک میں چونک گیا۔ مڈگارڈ کے پلاسٹک کور میں اندر کی طرف درز نظر آ رہی تھی، میں نے اس درز کو کھولا تو ایک چھوٹی سی براؤن ڈبیا گاڑی سے چپکی نظر آئی۔ میں نے یہ ڈبیا سیکرٹری ندیم کو بھی دکھائی اور پھر اسے اکھاڑ لیا۔

”یہ کیا ہے؟“ جلالی صاحب بھی اب چونک گئے تھے۔

”مجھے کیا پتا جی۔ میں تو کھانا پکانا جانتا ہوں۔ بس میں نے جو دیکھا تھا، آپ کو بتا دیا ہے۔“

سیکرٹری ندیم نے اس ”چھوٹی ماچس“ کے سائز کی ڈبیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ”یہ تو کوئی الیکٹرانک ڈیوائس لگتی ہے۔ شاید اس سے کوئی سگنل وغیرہ نشر ہوتا ہو۔“

جلالی صاحب کو ایک دم صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے سیکرٹری ندیم کے سوا سب کو پورچ سے باہر نکال دیا۔ باہر نکلنے والوں میں فتح محمد بھی شامل تھا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا لیکن اس گھورنے میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ جلالی صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ”جناب! میرا کام تو باورچی کا ہے۔ ایسی باتوں کا مجھے زیادہ پتا نہیں لیکن مجھے شک پڑ رہا ہے کہ یہ سازش ہے۔ اس سازش کا تعلق اسی باکس سے ہے جس کے پیچھے کچھ لوگ ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس رات کو جو کچھ ہوا، وہ بھی ایک ڈراما ہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ندیم صاحب کو جان بوجھ کر ناٹک دکھایا گیا ہو۔ اس طرح آپ کو شک میں ڈالا گیا ہو کہ آپ نے جس جگہ باکس چھپایا ہے، شاید اب وہ وہاں موجود نہیں ہے......“

جلالی صاحب ایک دم گم صم نظر آئے۔ وہ بار بار اپنی عینک کو ناک پر درست کر رہے تھے۔ یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ سیکرٹری ندیم بھی متحیر تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”اگر واقعی یہ سازش ہے تو بڑی گہری ہے جناب...... ان لوگوں نے سوچا ہوگا کہ آپ باکس کے بارے میں فکرمند ہوں گے اور دیکھنا چاہیں گے کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں۔ وہ آپ کا پیچھا کریں گے اور لوکیشن دیکھ لیں گے۔ پیچھا کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے یہ سگنل دینے والا ٹریکر گاڑی پر لگا دیا۔“

جلالی صاحب بے دم سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی باڈی لینگویج گواہی دے رہی

تھی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ درست ہے۔

''یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ کوئی گھر کا بھیدی ہی ہے۔'' ندیم نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابش! تم چشم دید گواہ ہو۔ تم نے بندے کو دیکھا ہے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟''

''نہیں، جی، میں نے بس ہیولا سا دیکھا تھا۔ میں تو شاید یہ بھی ٹھیک سے نہ بتا سکوں کہ وہ مرد کا ہیولا تھا یا عورت کا۔''

ندیم نے ٹارچ جلائی اور گرد آلود فرش پر پاؤں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں روانگی سے پہلے پوٹھوہار جیپ پارک تھی۔ زمین پر بہت سے قدموں کے نشان نظر آرہے تھے مگر گڈمڈ تھے۔ ان میں ایک دو نشان لیڈیز جوتے کے بھی تھے۔ جلالی صاحب بالکل گم صم تھے۔ شاید وہ میری تعریف میں کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں۔ ماچس نما ڈیوائس لے کر اندر چلے گئے۔

اگلے روز میں نے ڈاکٹر مہناز کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا۔ ''کل جو کچھ ہوا ہے، وہ ظاہر کرتا ہے کہ باکس کو ڈھونڈنے والے اس تک پہنچنے کے لئے ہر ہتھکنڈا آزما رہے ہیں۔ جلالی صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ عقل دانش کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ ایک باورچی کے دماغ میں وہ بات آگئی جو ہم میں سے اور کسی کے دماغ میں نہیں آتی۔''

میں خاموش رہا۔ میں سے بتانا چاہتا تھا کہ اس ہوشیاری میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا عمل دخل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول اٹھی۔ ''میں نے جلالی صاحب کو بتا دیا ہے کہ آپ دونوں باورچی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ ایک خاص مشن پر یہاں موجود ہیں۔ کچھ خاص لوگوں نے آپ کو یہاں بھیج رکھا ہے۔''

میں نے چونک کر ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میرا پورا جسم تھرا گیا تھا۔ پھر ایک دم میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ وہ ہنسی اور اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ایسا غضب نہ کرنا ڈاکٹر صاحبہ! سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔ جناب ہتھے سے اکھڑ گئے تو کھڑے کھڑے لات مار کر کوٹھی سے باہر کر دیں گے اور کیا پتا کپڑے بھی اتروا لیں۔''

''لیکن تابش صاحب! ایک بات ہے۔ آپ لوگوں کو کم از کم میرا سسپنس تو دور کرنا چاہئے۔ میں آپ پر اعتماد کر رہی ہوں، آپ مجھ پر نہیں کر رہے۔ مختار ملک والا کتنا بڑا واقعہ ہو گیا لیکن آپ نے مجھے ابھی تک اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ کون تھا؟ کیا یہاں اکیلا تھا یا اس کا کوئی بھی ساتھی ہے؟ اس کی ضمانت دے کر اسے یہاں نوکری دلانے والا کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے ڈاکٹر مہناز کہ ابھی تک اس حوالے سے میں بھی اندھیرے میں ہوں۔ عمران پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مختار کا ضامن کون تھا لیکن اس بارے میں بھی کوئی چونکا دینے والا انکشاف نہیں ہونے والا۔ مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ مختار کا تعلق جاوا سے ہی ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ ناشتے کا ٹائم شروع ہونے میں صرف آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔

مجھے اور ڈاکٹر مہناز کو تیزی سے ہاتھ چلانا پڑے۔ ناشتا تیار ہوتے ہی مہناز اپنا ایپرن اتار کر اور ہاتھ وغیرہ دھو کر کھانے کے کمرے کی طرف لپک گئی۔ ناشتے کی ٹیبل پر وہ روزانہ جلالی صاحب کے ساتھ ہوتی تھی۔ دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی ملازم پھر آیا۔ اس مرتبہ وہ مجھے بلانے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں صاحب جی کھانے کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔''

''یا اللہ خیر۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

جلالی صاحب کے روبرو جانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ ان کے موڈ کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا والا معاملہ تھا۔ ایک دم بھڑک اٹھتے تھے اور پھر انہیں سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں ناشتے میں کوئی کسر رہ گئی ہے جس کے لئے یہ نادر شاہی حکم آیا ہے۔ میں کھانے کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے ایک عجیب آرڈر جاری کیا۔ ''یہاں بیٹھو کرسی پر۔''

میں ٹھٹک گیا۔ وہ مجھے اپنے برابر، ناشتے کی میز پر بٹھا رہے تھے۔ میں تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد بیٹھ گیا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے ویسا ہی کرنا ہوگا جیسا وہ کہہ رہے ہیں، ورنہ یہ عزت افزائی کسی بھی وقت زبردست تذلیل میں بدل سکتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آگئے۔

''مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ کل تم نے بہت اچھی کارکردگی

دکھائی۔ ہم میں سے کسی کا دماغ اس طرف نہیں گیا جس طرف تمہارا گیا۔ شروع میں جب تم نے مجھے باہر جانے سے روکا تو مجھے بہت غصہ آیا تھا لیکن بعد میں وہی کچھ درست نکلا جو تم نے کہا تھا۔ وہ ڈبیا جو کل جیپ کے نیچے سے نکلی ہے، ایک الیکٹرانک ٹریکر ہے۔ قریباً سات آٹھ کلومیٹر کے ایریا میں اس کا سگنل آسانی سے ریسیو کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ ایک سازش کا حصہ تھا۔ تم بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔ میں پوچھنا پسند کروں گا کہ یہ سب کچھ تمہارے دماغ میں آ کیسے گیا؟''

میں نے انکساری کے انداز میں کہا۔ ''سچ بات تو یہ ہے جناب کہ اس بارے میں بھی استاد جی نے ہی اپنا دماغ دوڑایا تھا۔ استاد عمران نے کافی عرصہ ایک بڑے انڈین پولیس افسر کے گھر میں بھی ملازمت کی ہے۔ شاید یہ وہاں کے ماحول کا ہی اثر ہے کہ انہیں ایسے معاملوں میں سوچ بچار کی عادت پڑ گئی ہے۔ شکل وصورت سے بندے کے کریکٹر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں اکثر اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ جس رات درختوں میں ندیم صاحب اور جیپ والوں میں فائرنگ ہوئی، اسی رات استاد جی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس میں کوئی چکر ہو سکتا ہے۔''

جلالی صاحب نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی اونچی ناک پر موٹے چشمے کو درست کیا اور بولے۔ ''یہ تمہارا استاد ہر فن مولا شخص لگتا ہے۔ پتا نہیں کہ کس کس گھر میں کام کر چکا ہے اور کیا کیا سیکھ چکا ہے۔ جانوروں کے بارے میں بھی اسے کافی جانکاری ہے۔ بتا رہا تھا کہ مشہور شکاری تہور علی صندوقی صاحب کا باورچی بھی رہ چکا ہے اور ان کے شکار کئے ہوئے ہر طرح کے جانوروں کا گوشت پکاتا رہا ہے۔ خاص طور سے ہرن کی ڈشیں تیار کرنے میں اسے خاص الخاص مہارت حاصل ہے۔''

''جی ہاں لیکن استاد جی کو جانوروں سے پیار بھی بہت ہے اور جانور بھی ان سے بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ آج کل ان کو یہ شوق چرایا ہوا ہے کہ ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیاں ان کے ہاتھ سے لے کر دانہ کھائیں۔ یہ کوشش کر رہے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں، کچھ لوگ ایسا کر لیتے ہیں۔ میں نے خود ایک ڈاکومنٹری فلم میں دیکھا تھا۔ اٹلی کے شہر ''پیسا'' کا ایک سین دکھایا گیا تھا۔ ایک شخص ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ''فیڈ'' کر رہا تھا۔ بعض لوگوں میں جانوروں کے لئے خاص کشش پائی جاتی ہے۔ یہ تمہارا استاد بھی ان میں سے ایک ہے۔ میرے خیال میں تو اسے باورچی کا کام چھوڑ دینا چاہئے۔

ذہین بندہ ہے، یہ کام چھوڑ کر زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں کر رہے۔ جس کو موٹر مکینک ہونا چاہئے، وہ ڈاکٹر بننے کی کوشش کر رہا ہے، جس کو ڈاکٹر ہونا چاہئے، اس کے پاس وسائل نہیں...... وہ کھڑکیاں ویلڈنگ کر رہا ہے۔''

''لیکن جناب! کھانا پکانا تو استاد عمران کا خاندانی کام ہے...... ان کے والد......''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' جلالی صاحب نے تیزی سے میرا فقرہ کاٹا۔ ''کسی کا باپ ڈکیت رہا ہے تو کیا اسے ڈکیتی ہی زیادہ راس آئے گی؟ چور سے قطب اور قطب سے چور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا بات کہی تم نے کہ یہ اس کا خاندانی کام ہے۔ خاندانی کام کا مطلب کیا یہ ہوتا ہے کہ ایک نسل کے بعد دوسری اور پھر تیسری مکھی پر مکھی مارتی رہے۔ تمہارے باپ کا خاندانی کام کیا تھا؟'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ میں بحث میں الجھنے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے ڈھیلے انداز میں کہا۔ ''وہ تو باورچی نہیں تھے جی...... وہ درزی کا کام کرتے تھے۔''

''تو پھر تم کیسے باورچی بن گئے اور ایک اچھے باورچی بنے۔ یہ ناشتا تم نے ہی بنایا ہے نا...... یا کسی اور نے بنا کر دیا ہے تمہیں؟''

مہناز کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے ہی بنایا ہے جی۔''

''تو پھر......؟ اس میں خاندانی فن کاری کہاں سے آ گئی۔ یا پھر یہ ہو گا کہ تمہاری ماں باورچن ہو گی یا پھر تمہاری پڑدادی یا لکڑدادی بہادر شاہ ظفر کے لئے بریانی بناتی رہی ہو گی۔ یہ کس حساب سے تم نے کہا ہے کہ خاندانی کام، خاندانی کام ہوتا ہے......''

مہناز نے آنکھ بچا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں جی۔ ایویں غلط بات کر دی میں نے...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......''

جلالی صاحب کچھ دیر تک تلملاتے رہے اور مجھے گھورتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مہناز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اب خالی برتن اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

ویسے اندر ہی اندر میں بھی سٹپٹایا ہوا تھا۔ بابا جی کس وقت اور کس بات پر ہتھے سے اکھڑیں گے، اس کے بارے میں اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔ اب وہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ڈاکٹر مہناز کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے عمران کے

لگائے ہوئے ڈکٹافون کا ریسیور آن کر دیا۔ واضح آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بالکل یوں لگا جیسے ریڈیو کے کسی ٹاک شو میں دو افراد بول رہے ہوں۔ ایک ایک لفظ پوری وضاحت کے ساتھ کانوں تک رسائی حاصل کر رہا تھا۔ میں نے آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔

جلالی صاحب کا موڈ شاید اب تک آف تھا۔ وہ سخت لہجے میں مہناز سے کہہ رہے تھے۔ ''جو کچھ بھی ہے، مجھے اس رات والا کام پسند نہیں آیا۔ وہ کھلی چھت تھی، کوئی کمرا تو نہیں تھا...... کوئی بھی تمہیں میرے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ آئندہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔''

مہناز کی آواز ابھری۔ ''معافی چاہتی ہوں۔ میری بات کا غصہ نہ کیجئے گا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو کیا ہوتا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ تو نہ ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ یہ بس آپ کی عادت ہے۔ اس میں کوئی خاص جذبہ تو نہیں ہوتا......''

''تم کیا جانتی ہو میری اس عادت کے بارے میں؟'' جلالی کا لہجہ تلخ تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں جی۔ بس اتنا پتا ہے کہ اس سے پہلے آپ رخشی کے ساتھ بھی اسی طرح لیٹتے رہے ہیں اور اس سے پہلے ایک استانی شائستہ آئی تھی یہاں...... جو ملازموں کے بچوں کو پرائمری کے امتحان کی تیاری کراتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی آپ کا ایسا ہی تعلق تھا...... اور شاید اس کے علاوہ بھی ایک دو ہوں گی۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کرتا رہا ہوں...... لیکن تمہاری وجہ سے یہ معاملہ کچھ اور رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے اور مجھے اس وجہ سے پریشانی ہے۔''

''کیا آپ کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟'' مہناز نے کہا۔

لگتا تھا کہ آج وہ بھی اپنے خوف کو پس پشت ڈال کر کھلی باتیں کرنا چاہ رہی ہے۔

جلالی صاحب نے پُرطیش کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''دیکھو مہناز! میں تمہیں ایک بات بالکل صاف صاف بتا دوں۔ میں وہ ضدی گھوڑا ہوں جس نے کسی بڑے سے بڑے سورما کو کبھی خود پر سواری نہیں کرنے دی اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کسی طرف سے کمزور نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں جس روز جلالی کی کوئی کمزوری دنیا والوں کے ہاتھ آ جائے گی، جلالی...... جلالی نہیں رہے گا۔ تم جس طرح ہر وقت میرے آگے پیچھے پھر رہی ہو، میرے ذاتی معاملوں میں دخل دے رہی ہو، یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔''

چند سیکنڈ تک مکمل خاموشی رہی۔ پھر ریسیور پر ڈاکٹر مہناز کی آواز ابھری۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''سر! جب آپ کے دل میں کچھ ہے ہی نہیں تو پھر میری ذات آپ کی کمزوری کیسے بن سکتی ہے؟ میں بھی تو ان دوسری عورتوں کی طرح ہی ہوں جو آپ کے

اردگرد ہیں، آپ کی خدمت گار ہیں اور جن کے ساتھ آپ کسی وقت ایک خاص قسم کے رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں یا انہیں اپنے بہت قریب رکھتے ہیں۔''

''تم مجھ سے بحث کرنا چاہتی ہو، زبان چلانا چاہتی ہو میرے ساتھ؟'' ایک دم جلالی صاحب پوری طرح ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''میری اتنی جرأت کہاں سر! میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے یہ خاص اہمیت کیوں دے رہے ہیں جبکہ میری کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔''

''کیا اس طرح تم مجھ سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ تمہاری خاص اہمیت ہے؟'' وہ بدستور بپھرے ہوئے تھے۔

''نہیں سر! میں ایسا نہیں چاہتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جلالی صاحب نے قدرے بدلے ہوئے لب و لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں کہوں کہ ایسا ہے یا ایسا ہو رہا ہے تو پھر؟''

''کک...... کیا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟'' مہناز نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کپکپاہٹ کی تہ میں کہیں شاید خوشی کی ہلکی سی لہر بھی تھی۔

''وہی جو تم سن رہی ہو...... اگر میں تمہارے ساتھ یہ ساری بکواس کر رہا ہوں اور اپنا مغز کھپا رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ میں تمہارے سلسلے میں پریشان ہوں۔ میں تم سے دو دفعہ پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تم چلی جاؤ...... کم از کم کچھ دنوں کے لئے ہی چلی جاؤ لیکن تم یہاں سے ہل نہیں رہی ہو۔''

جلالی صاحب کے اندازِ گفتگو نے مہناز کو کچھ حوصلہ دیا۔ وہ ذرا اٹھلا کر بولی۔ ''اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا...... لیکن میں آپ کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ آپ کے پاس بہت پیسا ہے۔ زمین ہے، شہر میں کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔ آپ کے قریب رہوں گی تو کچھ نہ کچھ فائدہ تو مجھے بھی ہو گا نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں جانتا ہوں۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، سب کچھ اس کے الٹ ہے۔ تمہیں ان چیزوں کا لالچ نہیں اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ تم کچھ علیحدہ ٹائپ کی لڑکی ہو۔ اپنے من کی موج میں بہنے

والی۔اپنے بنائے ہوئے رستے پر چلنے والی۔''

وہ پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔''لیکن کسی کے دل کا کیا پتا ہوتا ہے سر! ہوسکتا ہے کہ میرے دل میں کچھ ایسی باتیں ہوں جو آپ کی سوچ سے مختلف ہوں۔''

''میں نے یہ بال اور یہ بھویں وغیرہ دھوپ میں سفید نہیں کیں۔'' جلالی صاحب نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم انداز میں کہا۔

لگتا تھا کہ ان باتوں نے مہناز کو دل سے خوش کیا ہے۔ وہ بولی۔''اچھا، اب آپ یہیں بیٹھیں آپ کی معدے والی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاؤں کا مساج بھی کرنا ہے۔کل بھی ناغہ ہوگیا تھا۔ میں ابھی آئنٹمنٹ لے کر آتی ہوں۔''

''لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات ذرا دھیان سے سن لو۔'' جلالی صاحب کے لہجے میں پھر گہری سنجیدگی آگئی۔

''جی۔'' مہناز نے کہا۔

''یہ جو تم میرا ایکسٹرا دھیان رکھتی ہو، یہ چھوڑ دو۔ اسی طرح نظر آؤ جیسے دوسرے نظر آتے ہیں۔ اسی میں میرا اور تمہارا بھلا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو پھر کچھ غلط ہوا تو اس کی ذمے دار تم خود ہوگی۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں احتیاط کروں گی۔'' مہناز نے کہا پھر اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ چھوٹے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر جارہی تھی۔

جی چاہ رہا تھا کہ یہ ساری گفتگو ریکارڈ کرسکتا اور عمران کو سنا سکتا۔ یوں اسے بھی مہناز اور جلالی صاحب کے تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ عمران کا کہنا تھا کہ جلالی ایک سخت دل اور کسی حد تک ایک بے حس شخص کا نام ہے۔ وہ کسی شخص یا چیز کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیتا۔ بعض اوقات وہ اپنی خوب صورت ملازماؤں کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق پیدا کرلیتا ہے۔ ان کو اپنے قریب رکھتا ہے، ان کے ساتھ لیٹتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی نرم جذبہ کبھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لئے بس اجرتی ملازم ہی رہتی ہیں اور ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہے۔ لیکن آج جو گفتگو میں نے پوشیدہ مائیکروفون کے ذریعے سنی تھی، وہ اشارہ کر رہی تھی کہ اس صورتِ حال میں مہناز کے حوالے سے کچھ نہ کچھ چینج موجود ہے ''بابا جی'' کے نزدیک اگر وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا کسی طرح اس ''اہمیت'' کو بابا جی کی زبان کھلوانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ یا پھر یہ اہمیت ابھی اتنی توانا ہی نہیں کہ اس سے کوئی کام لیا جاسکے؟

دو چھٹیاں ساتھ ساتھ آرہی تھیں۔ ان میں تئیس مارچ کی چھٹی بھی تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ جلالی صاحب کیلنڈر پر موجود ساری روایتی چھٹیاں بڑے اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس موقع پر بھی انہوں نے خاص انتظام کروا رکھا تھا۔ فارم سے پانچ کلومیٹر دور ایک نہر گزرتی تھی۔ یہاں چکور کے شکار کا پروگرام بنا۔ شکار کے پروگرام سے پہلے کھلی فضا میں ''باربی کیو'' ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ پانچ چھ خیمے لگائے جانے تھے اور جنریٹر بھی لے جایا جارہا تھا۔ آج پھر عمران کی صلاحیتوں کا امتحان تھا۔ ایک باورچی کی حیثیت سے ہم دونوں سہ پہر تک کچھ دیر بعد ہی موقع پر پہنچ گئے اور کھانے کا انتظام شروع کردیا۔ حسبِ معمول سارا کام عمران ہی کر رہا تھا۔ وہ مجھے ثانوی حیثیت کے کام سونپ رہا تھا اور دیکھنے والے کو لگتا یوں تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ برابر کا مصروف ہوں۔

ایک بڑے دیگچے میں چمچہ چلاتے ہوئے وہ بولا۔''اب تو جی چاہتا ہے کہ کسی کماؤ لڑکی سے شادی کرلوں۔ وہ باہر کا کام کرے، میں گھر میں کھانا پکاؤں اور بچوں کو سنبھالوں۔''

میں نے چکن کے ٹکڑوں کو دہی میں بھگوتے ہوئے کہا۔''تو کماؤ لڑکی ہے نا تمہارے پاس۔ رات دن ریما جی کے قصیدے پڑھتے ہو یا نہیں۔''

''یار! وہ تو مجھے لگتا ہے کہ دو مولویوں میں مرغی حرام ہوچکی ہے۔ نرگس، ریما کو کچا کھا جائے گی یا ریما، نرگس کو شوٹ کرڈالے گی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی میرے حوالے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اب تو کوئی تیسری ہی ڈھونڈنی پڑے گی۔'' بولتے بولتے اس نے ایک دم چونک کر بائیں طرف دیکھا اور بولا۔''لو، دیکھو وہ آگئی تیسری بھی۔''

ڈاکٹر مہناز پوٹھوہار جیپ سے اتر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی بلی اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے بار بار سہلا رہی تھی اور اپنے ساتھ لگا رہی تھی۔ ڈوبتی شام میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی گلابی نظر آتا تھا۔ براؤن سن گلاسز چہرے پر جچ رہے تھے۔ عمران نے سرد آہ بھری اور بولا۔

''کاش، میں ایک بلی ہوتا اور اس خوبصورت شام میں...... میرا سر عین اس جگہ پر ہوتا...... جہاں بلی کا ہے۔''

''حالانکہ میں تمہیں سب کچھ بتا بھی چکا ہوں۔ یہ لڑکی کسی اور کے کام کی نہیں رہی۔ جلالی صاحب کے بڑھاپے پر عاشق ہوچکی ہے۔ اس ناتے سے تم تو اس کے نزدیک کل کے بچے ہو بلکہ بلونگڑے ہو۔''

عمران نے آہ بھری۔''یار! یہ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جلیبی کی طرح گول، پیاز کی طرح تہ در تہ اور امر بیل کی طرح الجھی ہوئی۔ یہ کب کیا گزرے گی، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

میں نے کنکھیوں سے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کل سے بڑے اچھے موڈ میں تھی اور موڈ کی یہ تبدیلی اس گفتگو کے بعد سے دکھائی دے رہی تھی جو جلالی صاحب کے ساتھ اس نے ڈرائنگ روم میں کی تھی۔ سورج ڈوبنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ کافی روشنی تھی۔ کوٹھی کے نوجوان ملازم، ڈاکٹر لائبہ اور ندیم وغیرہ کے ساتھ کھلی جگہ پر کرکٹ کھیلنے لگے تھے۔ ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہو گئی۔ سب خوش گوار موڈ میں تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے ڈرائیور رشید کو ایک زوردار شاٹ مارا اور گیند نہر میں جا گری۔ گیند نکالنے کی کوشش میں مالی رمضان کا بیٹا سلیم نہر میں گر گیا۔ خوب ہنسی مذاق ہوا۔ کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر مہناز آؤٹ ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

عمران نے سرد آہ بھری۔ ''کاش، میں اس ماہ جبیں کو باؤلنگ کراتا اور کلین بولڈ کرتا۔ لیکن افسوس اے حسن کی شہزادی! میں اس محل سرا کا ایک ادنیٰ باورچی ہوں۔ سرد آہیں تو بھر سکتا ہوں لیکن تیرے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔''

''تم کسی کے ساتھ بھی نہیں کھیل سکتے۔ تم بارہویں کھلاڑی بن چکے ہو جو بس فیلڈنگ کر سکتا ہے۔''

''چلو یار! فیلڈنگ ہی کروں لیکن کچھ تو ہو۔ ڈاکٹر مہناز جیسی لڑکی کا کیچ پکڑ لیا تو سمجھو پورا میچ جیت لیا۔''

میں اور عمران ایک بڑے چکن پیس کے چھوٹے ٹکڑے کر رہے تھے۔ چھری عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''یار! ذرا دھیان رکھنا، مہناز جی کے حسن میں کھو کر کہیں میں تمہاری انگلی ہی نہ کاٹ ڈالوں۔''

میں نے کہا۔ ''بڑے کھوچل عاشق ہو۔ انگلی بھی کاٹو گے تو کسی اور کی......'' پھر میں نے چونک کر اس کی چیسٹ پاکٹ کی طرف دیکھا۔ ''کہیں آج بھی فون تو آن نہیں کر رکھا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھئی۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''شاہین کی بچی نے تو اس دن سے بات کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔ صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں ریما اور نرگس مل رہی ہیں تو مجھے بھی کوئی اکشے کمار یا عامر خان مل جائے گا۔''

''دیکھو عمران! وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے اور تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ پیار کرنے والوں کو اس طرح ستایا نہیں کرتے۔ وہ تم کیا کہا کرتے ہو مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے پر دل نہ کسے دا ڈھائیں......''

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا ہو ہا کی زوردار آواز سنائی دی۔ مالی کے بیٹے قیوم نے ایک زوردار ہٹ لگا کر گیند جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ سب اسے تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اب اندھیرا اتر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جلالی صاحب ہر جگہ اپنی مرضی کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی مرضی خطرناک بھی ہوتی ہے۔ اب جس قسم کے حالات یہاں چل رہے ہیں، اس آؤٹ ڈور پروگرام کی بھلا کیا تک تھی۔ سکیورٹی کے لحاظ سے یہ کسی طور مناسب نہیں۔''

''تم یہی بات بابا جی کے سامنے فرمانا۔ تمہیں نہر کے کنارے ساری رات کے لئے مرغا نہ بنا دیں تو میرا نام بدل دینا۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے کہنے کی؟ مگر کوئی تو ان کو سمجھانے والا ہونا چاہئے۔''

''اب یہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکے ہیں۔ خواہ مخواہ دل جلانے سے فائدہ نہیں۔ بس ہوشیار رہو اور آنکھیں کھلی رکھو۔ کوئی گڑبڑ ہو تو ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مختار ملک والا پسٹل ہے نا تمہارے پاس؟''

''ابھی تک تو ہے۔'' میں نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے کو ٹٹولا پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''دیکھو، ابھی تک ہمیں یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ مختار ملک کا تعلق کس سے تھا اور وہ کس مشن پر یہاں موجود تھا۔''

''مشن کے بارے میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں تابی ڈیئر...... لکڑی کے باکس میں وہی دو فٹ کا فتنہ ساز آرا کوئے ہمارے آس پاس موجود ہے اور کچھ لوگوں نے اس کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو پارٹیاں ہیں۔ ایک تو وہی پارٹی ہے جس نے ہمیں بھی ہائر کیا ہوا ہے۔ یعنی ریان ولیم اور پروفیسر رچی وغیرہ ہیں۔ دوسری پارٹی انڈین گینگسٹر جاوا کی ہے۔ اس میں دُرِ شہوار اور انگریز مائیکل وغیرہ شامل ہیں۔''

''لیکن مختار ملک کا تعلق کس سے تھا؟ ریان ولیم اینڈ کمپنی سے یا جاوا سے؟''

''یہ سوال ابھی جواب طلب ہے۔ لیکن ایک بات تو میرے نزدیک کلیئر ہے۔ شروع میں گوشت کے پہاڑ ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سراسر جھوٹ بولا تھا کہ وہ باکس کو ڈھونڈنے والا کام کسی اور کے لئے کر رہا ہے۔ دراصل وہ خود ہی باکس کے پیچھے ہے۔ شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ یہ شخص نسل کے اعتبار سے یہودی ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ خالص کاروباری ذہانت بھی رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جس کام میں بھی پیسا نظر آتا ہے وہ اسے کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ کوئز شو ہو، جوئے بازی ہو، بھتا خوری ہو یا کوئی بزنس۔''

''یار! یہ ساری معلومات تمہیں حاصل کیسے ہوجاتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اقبال اور جیلانی وغیرہ کسی قبرستان میں بیٹھ کر بھنگ گھوٹ رہے ہیں۔ بھئی وہ کام کررہے ہیں...... اور اچھا کام کررہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اطلاعات اکٹھی کرنے کے لئے تمہارا اپنا نیٹ ورک موجود ہے۔''

''بالکل۔ یہی وجہ تو ہے کہ فساد پلس اس وقت پاکستان کا نمبرون چینل ہے۔''

''تم ایک دم جلیبی کی طرح گول ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تمہاری۔ مجھے تو پھر ابن صفی والی بات یاد آرہی ہے۔ اگر محترم حیات ہوتے تو تمہیں دیکھ کر ضرور حیران ہوتے...... بلکہ دانتوں میں انگلی دباتے کہ ان کا تخیلاتی کردار زندہ حالت میں آموجود ہوا ہے۔''

''تم ان رائٹرز لوگن کو ناہیں جانتے۔ یہ انسپائر ہووت ہیں بھیا۔ پہلے کسی چیز کو دیکھت ہیں پھر اس کی نقل اتار کر کہانیوں میں پیش کر دیوت ہیں۔ ان ابن صفی صاحب نے بھی یقیناً میری نقل اتاری ہووے گی۔''

''تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔''

''یہی تو ہوشیاری ہوتی ہے ان لوگن کی۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی نقل اتار لیوت ہیں۔ ویسے بھی پیدا ہونے سے پہلے بندے کی آتما تو موجود ہوتی ہے نا۔ کسی رات میری آتما محترم لکھاری صاحب کے کمرے میں چلی گئی ہووے گی۔ انہوں نے جھٹ اس کا خاکہ اتار لیا ہووے گا......'' وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کر رہا تھا۔

ایک باوردی گارڈ ٹہلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ ہم خاموش ہوگئے۔

پروگرام کے مطابق نہر کے کنارے کافی ہلا گلا رہا۔ کوئلوں پر دیسی مرغی اور دیسی بکرے کا گوشت بھونا گیا۔ سیخ کباب بنائے گئے۔ پرانے طرز کے گراموفون پر سہگل، ثریا بیگم اور نور جہاں کے گانے سنے گئے۔ جلالی صاحب نے اپنے جدید ٹینٹ میں قدیم فلم جگنو دیکھی اور کئی ساتھیوں کو بھی زبردستی دکھائی۔ ان میں ڈاکٹر مہناز، لائبہ، ندیم اور ڈرائیور رشید وغیرہ شامل تھے۔ چاندنی رات تھی۔ چکور کا شکار بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میں نے سحرانگیز چاندنی میں ڈاکٹر مہناز کو نہر کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھے دیکھا۔ وہ ڈاکٹر لائبہ اور ندیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور جلدی سے جلالی صاحب کے ٹینٹ کی طرف دوڑ گئی۔ غالباً جلالی صاحب کی کسی دوا کا وقت ہوگیا تھا۔

رات دھیرے دھیرے کھسکتی رہی اور خیریت سے گزر گئی۔ کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں

ہوا۔ رات کے آخری پہر سب لوگ سو گئے تھے۔ بس گارڈز ہی پہرا دیتے رہے۔ نو دس بجے تک یہ لوگ وہیں اوپن ایئر میں ناشتے سے فارغ ہوگئے اور واپس فارم ہاؤس روانہ ہوئے۔

جب ہماری گاڑیاں فارم ہاؤس کے سامنے رکیں، کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گیٹ پر ہر وقت دو باوردی گارڈز موجود رہتے تھے اور جواب نہیں تھے۔ جلالی صاحب کے ڈرائیور رشید نے تین چار بار شیورلیٹ کا ہارن دیا لیکن گیٹ نہیں کھولا گیا۔ پھر گارڈز جیپ سے اترے، انہوں نے گیٹ کھٹکھٹایا اور آوازیں دیں۔ کافی تاخیر سے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک گارڈ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر سب بری طرح چونک گئے۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہوئی تھی اور ایک ٹانگ بھی بری طرح گھائل تھی۔ دروازہ کھولنے کے عد وہ وہیں لڑکھڑا کر گر گیا۔ سب گاڑیوں سے اترے اور اس کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر مہناز پیش پیش تھی۔ ندیم نے زخمی کو سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ مدھم آواز میں بولا۔ ''انہوں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ بہت ساروں کو زخمی کر دیا، کچھ کو مار ڈالا۔ ہم نے بڑی کوشش کی...... مم...... مگر......'' اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس کی گردن سے خون بہنے لگا۔ تب ہم نے دیکھا کہ اس کی گردن میں بھی گولی لگی ہوئی تھی۔ یہ گولی اس کی گردن کے سائڈ مسلز کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ شاید اسی لئے وہ زندہ تھا۔

ہم اسے چھوڑ کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف لپکے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور تھے، ہر طرف کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمروں کے اندر تکیے پھٹے ہوئے اور گدے ادھڑے ہوئے تھے۔ قالین الٹ پلٹ کر دیئے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی گئی ہے اور یقیناً یہ کام دو چار بندوں کا نہیں تھا۔ یہاں کئی درجن افراد نے ہلا بولا تھا۔

''یار! کہیں ہماری چوری تو نہ پکڑی گئی ہو؟'' عمران نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی۔

ہم چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔ ڈرائنگ روم کے عین سامنے ایک ملازمہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے بڑی کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کے کھچڑی بال خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ چھوٹے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ صوفے اور میز الٹے پڑے تھے۔ ہر طرف تباہی کا منظر تھا۔ جس سینٹر ٹیبل کے نیچے ''ڈکٹافون'' نصب کیا گیا تھا، وہ بھی الٹی پڑی تھی۔ تاہم ڈکٹافون محفوظ تھا۔ دراصل عمران نے اسے اس طریقے سے نصب کیا تھا کہ وہ لکڑی کے ایک دو انچ موٹے کالر کے پیچھے آ گیا تھا۔ میز الٹنے کے باوجود کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ عمران نے میز کو سیدھا کر دیا۔ یکا یک رونے چلانے کی آوازیں

آئیں۔ہم ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آئے۔ یہاں کا منظر دہلا دینے والا تھا۔نوجوان گارڈ مشتاق کی لاش سیڑھیوں کے آغاز میں پڑی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔اس کے ہاتھوں پر ہلکی سی مہندی بھی نظر آ رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق مشتاق نامی اس گارڈ کی شادی پانچ چھ ہفتے پہلے ہی ہوئی تھی۔ مشتاق کو دیکھ کر ہی پتا چل گیا کہ وہ اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سیڑھیوں کے اوپر سے دھکا دیا گیا ہے اس کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور شاید رخسار کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی خون آلود چپل اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ دو عورتیں اس کی لاش پر بین کر رہی تھیں۔ یہ مشتاق کی قریبی رشتے دار ہی تھیں۔

بڑے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ ایک دیوار پر جلالی صاحب اور ان کے تین چار بزرگوں کی فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ ان ساری تصویروں پر رائفل کی گولیاں برسائی گئی تھیں اور انہیں چکنا چور کر دیا گیا تھا۔

سیکرٹری ندیم نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلالی صاحب یہ سارے اندوہناک مناظر دیکھیں اور اپنی حالت بگاڑ لیں۔ وہ انہیں فوراً لفٹ کے ذریعے فرسٹ فلور کے ایک کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر مہناز اور لائبہ زخمیوں کی طرف متوجہ تھیں اور انہیں ابتدائی طبی امداد دے رہی تھیں۔ شدید زخمیوں کو لاہور منتقل کرنے کے لئے انہیں پورچ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ابھی تک صرف ایک لاش ملی تھی مگر زخمی ہونے والے زیادہ تھے۔

ندیم دانش مندی کا مظاہرہ کر کے جلالی صاحب کو اوپر والے ایک علیحدہ کمرے میں تو لے گیا تھا مگر جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی اس کی یہ کوشش بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو جلالی صاحب کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور وہ ندیم سے بار بار پوچھ رہے تھے۔ ''کیا کوئی اور بھی زخمی ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ، کسی کی جان تو نہیں گئی؟ تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔تم مجھے نیچے جانے دو۔''

''سر! سب ٹھیک ہے۔ چار پانچ بندوں کو چوٹیں آئی ہیں۔ دونوں ڈاکٹرز ان کی مرہم پٹی کر رہی ہیں۔آپ پریشان نہ ہوں۔''

وہ دہاڑے۔''تم کہہ رہے ہو چوٹیں آئی ہیں۔ وہ گارڈ اشرف تو آخری سانسیں لے رہا ہے۔''

''اشرف کے سوا کسی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا جناب۔ زخم ضرور لگے ہیں لیکن خطرے کی بات نہیں۔''

وہ مختلف ملازموں کے نام لے کر ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ندیم اور ڈرائیور رشید گول مول جواب دیتے رہے۔ پھر جلالی صاحب اپنے پالتو جانوروں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ انہیں زیادہ پریشانی ایرانی بلیوں کی طرف سے تھی۔ عمران نے انہیں بتایا کہ دیگر جانوروں کی طرح بلیاں بھی بالکل محفوظ ہیں۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا کہ کل رات جانے سے پہلے وہ چاروں بلیوں کو حفاظت کی غرض سے بالائی منزل کے پنجرے میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اٹھک پٹخ کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگا جیسے کوئی بند دروازے کو دھکے دے رہا ہے یا ٹھوکریں مار رہا ہے۔ اس کے ساتھ ''اُوں اُوں'' کی منہ بند صدائیں بھی سنائی دیں۔ ''یہ کیا ہے؟ یہ تو کوئی عورت ہے۔'' جلالی صاحب نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ دروازہ کھولا تو آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ جلالی صاحب کی دو جوان ملازمائیں رخشی اور زرینہ بالکل برہنہ حالت میں موجود تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹیلی فون کے تار سے باندھے گئے تھے اور نیلگوں نشان ان کے جسموں پر نظر آ رہے تھے۔ انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہم نے فوراً ان کے جسموں پر چادریں ڈال دیں۔ رخشی تو نیم بے ہوش تھی۔ وہ قالین پر کھڑکی کے قریب پڑی تھی۔ یہ زرینہ ہی تھی جس نے بند دروازے کو ٹانگیں رسید کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے تھے۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، شراب کے پوے اور کٹے پھٹے زنانہ لباس پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

زرینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے گندمی چہرے اور گردن پر گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ وہ بلکی۔ ''انہوں نے ہمیں برباد کر دیا۔ کہیں کا نہیں چھوڑا۔ یا اللہ مجھے موت آ جائے۔ میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' زرینہ کی آہ و بکا دل دوز تھی۔

''کون تھے وہ؟'' عمران نے زرینہ کا سر گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ان کتوں نے اپنے منہ کپڑوں اور ٹوپیوں میں چھپا رکھے تھے۔ ایک دوسرے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ وہ ساری رات یہاں کمرے میں رہے ہیں۔ میرے کاکے کو دیکھو، زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خدا کے لئے اس کو دیکھو۔'' اس نے اپنے چہرے کی مدد سے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک چھوٹی چارپائی پر ایک کھیس سا پڑا تھا۔ اس کے نیچے کچھ تھا۔ چھوٹا سا ایک بچہ۔ میں نے کھیس اٹھایا۔ قریباً ایک سالہ بچہ بالکل ساکت پڑا تھا۔ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ زندہ تھا لیکن نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ میرے زور سے جھنجوڑنے کے باوجود جاگا نہ رویا۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے کسی دوا کی تیز بو آ رہی تھی۔ پھر میری نگاہ اس دوا پر پڑی۔ یہ کھانسی کا ایک نہایت تیز اثر شربت تھا۔ بالغ شخص بھی اس کے دو چمچ پی کر چار پانچ گھنٹے کے لئے اتنا غفیل ہو سکتا تھا۔ بچے کو غالباً زیادہ مقدار میں یہ شربت پلا دیا گیا تھا۔

میں نے باہر جا کر اسے ڈاکٹر لائبہ کے حوالے کیا۔ وہ اسے فوراً طبی امداد دینے میں مصروف ہو گئی۔ کمرے میں واپس آیا تو زرینہ کے ہاتھ کھولے جا چکے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چادر سی تان دی گئی تھی اور ہمارے ساتھ پکنک پر جانے والی دو ملازمائیں زرینہ اور بے ہوش رخشی کو کپڑے وغیرہ پہنا رہی تھیں۔ زرینہ کی آہ و زاری جاری تھی۔ اس کی اپنی حالت بھی بُری تھی لیکن اسے زیادہ فکر اپنے بچے کی تھی۔

میں نے آواز دے کر اسے بتایا۔ ''زرینہ! تیرا بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر لائبہ نے اسے ٹیکا لگایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔''

دونوں ملازماؤں کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کئی شرابی مردوں نے ان کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا ہے اور دیر تک اس کمرے میں رہ کر اپنے چہروں پر گناہ اور نحوست کی کالک ملتے رہے ہیں۔

رخشی کی حالت زیادہ بری تھی۔ اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ گاہے بگاہے عجیب انداز سے کراہ اٹھتی تھی۔

عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''تابی! مجھے تو لگتا ہے، یہ سب کچھ ٹریکٹر ڈرائیور اور مخبر مختار ملک کا بدلہ لینے کے لئے کیا گیا ہے۔''

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟''

''مشتاق کی لاش سے۔'' عمران نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ لاش عین اس جگہ پڑی ہے جہاں تم نے مختار ملک کو مارنے کے بعد ڈالا تھا۔'' میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ قابلِ غور بات تھی۔

مشتاق کا چھوٹا بھائی اعجاز بھی زخمی ہوا تھا۔ اسے اس کے ایک ساتھی سمیت غسل خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ان دونوں کی گھڑیاں، موبائل

اور نقدی وغیرہ سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ تھپڑوں کے نشان ابھی تک ان دونوں کے چہروں پر واضح تھے۔ ان کے تین دیگر زخمی ساتھی بھی ایک غسل خانے کا تالا توڑ کر نکالے گئے۔ اعجاز نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی تین درجن بندے تھے۔ ڈکیتوں کی طرح ان سب نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ ایک لمبے قد کے بندے کے سوا وہ سب پنجابی بولتے تھے۔ لمبے قد والا پٹھانی اردو بولتا تھا۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی سب سے پہلے مین گیٹ کے گارڈز کو بے بس کیا۔ جس نے بھی ان کو روکنا چاہا، اس کی ٹانگوں پر گولیاں ماریں اور ناکارہ کر دیا۔ جب انہوں نے زرینہ سے اس کا بچہ چھینا اور اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی تو بھائی مشتاق ان کے سامنے آ گیا۔ اس نے چاقو چلایا جس سے ان کے دو بندے پھٹڑ (زخمی) ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے بھائی کو پکڑ لیا اور بڑی بیدردی سے مارا۔ بابے طفیل نے بھائی کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس کی داڑھی کھینچی گئی اور اس کی عمر کی پروا کئے بغیر اسے فرش پر لٹا کر جانوروں کی طرح مارا گیا۔ بھائی ادھ موا ہو کر گر گیا تو ان کا سرغنہ بولا...... خو، اسے پار کر دو۔ وہیں پہنچا دو جہاں امارا ساتھی گیا ہے۔'' ہم سمجھتے تھے کہ وہ بھائی کو گولی مارنے لگے ہیں۔ لیکن وہ اسے سیڑھیوں پر لے گئے۔ غسل خانے کی کھڑکی میں سے ہم کو سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ بھائی آخر تک خود کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ انہوں نے اسے پندرہ سیڑھیوں سے نیچے پکے فرش پر پھینک دیا۔ وہ اسے سر کے بل گرانا چاہتے تھے مگر وہ کندھوں کے بل گرا۔ انہوں نے نیچے جا کر دیکھا۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ اوکھے اوکھے سانس لے رہا تھا۔ وہ ظالم اسے اٹھا کر پھر اوپر لائے۔ پھر اسی طرح اسے اٹھا کر نیچے پھینکا۔ اس مرتبہ وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا رہا۔ شاید اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ میرے بھائی کو بڑی تکلیف دی ہے انہوں نے......'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اسی دوران میں مالی کے بیٹے امین نے ہمارے کان میں بتایا کہ کوٹھی کے پچھواڑے اور چڑیا گھر کی پچھلی طرف دور تک کھدائی کی گئی ہے اور وہاں مٹی کے ڈھیر پڑے ہیں۔ میں اور عمران کوٹھی کی چھت پر گئے۔ فتح محمد اور ندیم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ امین کی بات درست تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے اور شمال کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کئی جگہ کھدائی کی گئی تھی۔ یہ کھدائی باقاعدہ ''ڈگنگ مشین'' کے ذریعے ہوئی تھی۔ مشین کے بڑے بڑے ٹائروں کے نشان بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔

ندیم نے طویل سانس لی اور کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ یہ اسی موٹے ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کی کارستانی ہے۔ ان میں مرجان خان نام کا ایک لمبے قد کا بدمعاش بھی تھا۔ وہ

پٹھانی لہجے میں اردو بولتا ہے۔"

"یہ ریان ولیم کون ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہ وہ دوسری پارٹی ہے جو باکس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ایک رات یہ لوگ بھی ہمارے بن بلائے مہمان بنے تھے۔ ریان کوئی غیر ملکی جواری ہے۔ بہت موٹا شخص ہے اور صرف انگریزی بول سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ دو تین مقامی بندے بھی لایا تھا۔ یہ لوگ بھی پہلے نرمی سے جلالی صاحب کو گھیرنے کی کوشش کرتے رہے پھر سختی پر اتر آئے۔ اس ریان نامی شخص نے جلالی صاحب کو دھمکی دی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ باکس کے لئے اس سارے فارم ہاؤس کو کھود کر رکھ دے گا۔" کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر ہم دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ سب سے اہم کام زخمیوں کو اسپتال پہنچانا تھا۔ ہم نیچے آئے اور اس سلسلے میں دیگر افراد کی مدد کی۔ ایک اسٹیشن وین، ایک ڈبل کیبن اور ایک جیپ اس کام کے لئے استعمال کی گئی۔ پانچ بندے ایسے تھے جن کی ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ چھٹا شخص شدید زخمی تھا یہ وہی گارڈ اشرف علی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ دو عورتیں بھی شدید زخمی تھیں۔ ان میں سے ایک تو رخشی ہی تھی جسے زرینہ کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بھی درست نہیں لگ رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ بار بار عجیب انداز میں بڑبڑانے لگتی تھی۔

کوٹھی اور فارم ہاؤس میں عام طور پر چالیس پینتالیس ملازم ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ ان میں سے بیس پچیس تو گارڈز ہی تھے۔ لیکن واردات کے وقت کچھ لوگ تو ہمارے ساتھ نہر کے کنارے خیموں میں موجود تھے اور کچھ چھٹیوں کی وجہ سے غیر حاضر تھے۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس واردات کی وجہ سے زیادہ جانی نقصان ہوتا۔ سیکرٹری ندیم نے جلالی صاحب کو بتائے بغیر ہی پولیس کو فون کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کوٹھی میں ایک لاش بھی موجود تھی اور اس کی فوری رپورٹ کرنا ضروری تھی۔ اس دوران میں عمران نے باریک بینی سے مختلف شواہد اکٹھے کئے، میں بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ نیم بے ہوش رخشی کے ایک ہاتھ کی طرف دلائی۔ ناخنوں میں گوشت کے باریک ریزے سے پھنسے ہوئے تھے جیسے اس نے خود پر حملہ کرنے والے کو نوچا ہو۔ دوسری ملازمہ زرینہ نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ رخشی نے زیر ہونے سے پہلے لمبے قد والے پٹھان کی سخت مزاحمت کی تھی۔ جواباً اس شخص نے بھی رخشی کو اپنا خصوصی نشانہ بنایا تھا۔ رخشی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی تقریباً ساری ذمے داری اسی شخص پر آتی تھی۔

آدھے گھنٹے میں پولیس جیپ سائرن بجاتی کوٹھی میں پہنچ گئی مقامی ایس ایچ او چوڑے جبڑوں اور موٹی توند والا ایک روایتی سا تھانیدار تھا۔ سب سے پہلے تو جلالی صاحب نے اس کی کلاس لی۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں۔ بولے۔ "تم زنانے بن کر تھانے میں گھسے رہتے ہو کھڑکی کے پیچھے سے وارداتیں ہوتی دیکھتے ہو اور جب سب کچھ ہو جاتا ہے تو توندیں مٹکاتے پہنچ جاتے ہو۔ یہ چور، ڈاکو تمہارے بھائی بند ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

ندیم اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ نے بمشکل جلالی صاحب کو سنبھالا لیکن وہ بدستور طیش میں تھے۔ فتح محمد تھانیدار اکرام خان کو ایک طرف لے گیا اور کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتا رہا مجھے کئی دفعہ فتح محمد پر عجیب سا شبہ ہوتا تھا۔ یہ شخص دوسرے ملازموں سے کچھ الگ تھلگ سا تھا۔ ایک طرح سے اس کی حیثیت انچارج گارڈ کی تھی مگر وہ ڈیوٹی پر کم ہی نظر آتا تھا۔ کسی وقت شک ہوتا تھا کہ شاید اس رات جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے ارد گرد گھومنے والا اور پھر مڈگارڈ کے اندر "ٹریکر" چپکانے والا یہ فتح محمد ہی تھا موقع پر اس کے گرگابی نما جوتے کے نشان بھی موجود تھے پھر جب میں جلالی صاحب کو روکنے کے لئے جیپ کے پیچھے بھاگا تھا تو سب سے پہلے میرے راستے میں آنے والا یہ فتح محمد ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ کل رات ہونے والی خونی واردات میں بھی اس شخص کا کردار ہو۔ اسی نے حملہ آوروں تک اطلاع پہنچائی ہو کہ جلالی صاحب رات نہر کے کنارے گزاریں گے اور کوٹھی کے اندر کی دیگر معلومات بھی اسی نے دی ہوں۔

بہر حال، ایک بات تو طے تھی کہ کوٹھی اور فارم ہاؤس میں ایک دو افراد اب بھی ایسے موجود ہیں جو اندر کی خبریں باہر دے رہے ہیں اور باہر والوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر بعد پتا چلا کہ جلالی صاحب کے جلال سے بچنے کے لئے تھانیدار اکرام خان واپس چلا گیا ہے اور اب کوئی اعلیٰ افسر ہی جلالی صاحب کو مطمئن کرنے کے لئے لاہور سے آئے گا۔ یہ افسر دو گاڑیوں کے ساتھ قریباً ایک گھنٹے میں پہنچ گیا اور یہ وہی حمزہ صاحب تھے جن کی حیثیت جلالی صاحب کے پرانے دوست اور پرستار کی سی تھی۔ اعلیٰ سطح پر جلالی صاحب کا ایک حلقۂ احباب تھا۔ جلالی باقاعدہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے۔ جنگلی حیات کے تحفظ پر لکھے ہوئے ان کے ریسرچ مقالے نے ماضی میں کافی شہرت پائی تھی۔ وہ امریکا میں وائلڈ لائف کی ایک ویلفیئر سوسائٹی کے بنیادی اور اہم رکن تھے۔ دس پندرہ برس پہلے تک جب ان کی صحت ٹھیک تھی، وہ اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے امریکا اور کینیڈا وغیرہ

جاتے رہتے تھے۔ انہیں بعض اوقات غیر ملکی یونیورسٹیوں میں لیکچر کے لئے بھی بلایا جاتا تھا۔

سہ پہر کے بعد جونہی موقع ملا، عمران نے موبائل فون پر ریان ولیم سے رابطہ کیا۔ میں بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ایسے رابطے کے وقت عمران موبائل کا اسپیکر آن کر لیتا تھا تاکہ میں بھی دوطرفہ گفتگو سن سکوں۔ عمران کے ذہن میں بھی یقیناً وہی سوال مچل رہا تھا جو میرے ذہن میں بھی موجود تھا۔ اگر واقعی کل رات ہونے والی خونی کارروائی ریان ولیم کے ایما پر ہوئی تھی تو پھر ہمیں اس سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟ یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ ہم ریان ولیم کے لئے کام بھی کر رہے تھے اور اس کی منصوبہ بندی سے بھی لاعلم تھے۔ اس سے پہلے بھی ریان ولیم نے ہمیں آدھا سچ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے خود ''باکس'' میں دلچسپی نہیں بلکہ وہ کسی اور کے لئے اسے ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

رابطہ ہونے پر عمران نے ریان ولیم کو کل رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ ریان اور رچی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ان واقعات کے بارے میں جان چکے ہیں۔ بہرحال، ریان نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ اس کارروائی میں ان کا کوئی عمل دخل ہے۔

عمران نے کہا۔ ''سر! یہاں کچھ معاملات ہمیں الجھا رہے ہیں۔ اگر ہم اس الجھن میں رہے تو ہماری کارکردگی پر بھی اثر پڑے گا۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک دو باتوں کی وضاحت کر دیجئے۔''

''ہاں ہاں، پوچھو ایمران! برا لگنے کی کیا بات ہے؟''

''کیا آپ کے مقامی ساتھیوں میں کوئی مرجان خان نام کا شخص بھی ہے؟''

''تم اسے ساتھی تو نہیں کہہ سکتے، بہرحال میں گاہے بگاہے اس سے کام لے رہا ہوں۔ بے خوف شخص ہے۔ ہر کام میں کود پڑتا ہے۔''

''کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہی یہاں شیخوپورہ پہنچے اور کسی کام میں کود پڑے؟''

''نہیں، وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''سر! کل یہاں جو خونی واردات ہوئی ہے، اس میں کم و بیش تین درجن بندے شامل تھے۔ ان سب نے شروع سے آخر تک اپنے چہرے منڈاسوں اور ٹوپیوں میں چھپائے رکھے۔ ان کا سرغنہ ایک خاصے لمبے قد کا شخص تھا اور پٹھانی لہجے میں اردو بولتا تھا۔''

ریان ولیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''اگر وہ شخص لمبے قد کا تھا اور خاص طرح

کی اردو بولتا تھا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مرجان خان ہوگا؟''

''میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سر! میں نے تو وہ معلومات آپ تک پہنچائی ہیں جو مجھ تک پہنچیں۔ باقی آپ اس ساری صورتِ حال کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔''

''نہیں ایمران! اگر مرجان خان کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی شک ہے تو وہ نکال دو۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا اور نہ میں کسی کو ایسا کام کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میرے خیال میں تو کل رات جس نے بھی کارروائی کی ہے، اس نے حماقت کی ہے۔ ایسی کسی حماقت کا نتیجہ جلالی کے ہارٹ اٹیک یا اس کی موت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے اور اگر یہ بڈھا عدم آباد روانہ ہو گیا تو سمجھو سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔''

''پھر آپ کے خیال میں یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں سر؟'' عمران نے پوچھا۔

''تمہیں بتایا تھا نا کہ کچھ اور لوگ بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ یقیناً ان میں سے ہی کسی نے یہ حماقت فرمائی ہے۔''

''لیکن سر! یہاں کوٹھی میں مرجان خان کا نام لیا جا رہا ہے اور اس حوالے سے آپ کا نام بھی آ رہا ہے۔ پولیس تفتیش کا رخ آپ کی طرف مڑ سکتا ہے۔ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میری طرف سے فکر نہ کرو ایمران! میں محفوظ جگہ پر ہوں...... مرجان خان بھی پچھلے کئی مہینے سے انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنا آسان نہیں۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوسرے گروہ نے تفتیش کا رخ جان بوجھ کر غلط رخ پر موڑنے کی کوشش کی ہو۔ میرا مطلب اس لمبے قد اور پٹھانی لہجے والے شخص سے ہے۔''

''یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی آ رہا ہے سر! بہرحال آپ بھی اس بارے میں غور فرمائیں، کل پھر بات کریں گے۔''

کچھ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد بات چیت کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ عمران کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

O......❖......O
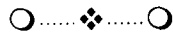
اگلے روز سہ پہر کے وقت عمران نے مجھے بتایا۔ ''لگتا ہے کہ ملازموں کی ہمت جواب دے گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''زیادہ تر ملازم کوٹھی چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کچھ جا بھی چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر لائبہ اور ڈرائیور رشید وغیرہ۔ مجھے لگتا ہے کل تک یہ ساری جگہ بھائیں بھائیں کرنے لگے گی۔''

''ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟''

''وہ رکی ہوئی ہے۔ صبح سے جلالی صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ مسلسل ان کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لائبہ کی جگہ کسی اور کو یہاں بلائے گی۔''

''پرسوں رات والی کارروائی کے بارے میں تم کسی نتیجے پر پہنچے ہو؟ یہ ریان اینڈ کمپنی کا کام ہے یا جاوا اینڈ کمپنی کا؟''

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ آج مبارک دن ہے۔ تم اچھے سوال کر رہے ہو...... دراصل ہم کل سے ایک نکتہ فراموش کر رہے ہیں۔ پرسوں رات کے واقعات سے اس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ اس خونی کارروائی میں کسی حد تک انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا اور وہ انتقام تھا مخبر مختار ملک کی موت کا۔ دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مختار ملک کا تعلق اپنے ریان ولیم صاحب سے نہیں تھا۔ کم از کم ریان صاحب نے تو یہی کہا تھا کہ مختار ملک کو وہ نہیں جانتے۔''

''ہاں، یہ پوائنٹ تو ہے لیکن یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ مختار کے بارے میں ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سچ بولا تھا؟''

''یار! میرا دل کہتا ہے کہ اس نے سچ بولا تھا۔ کم از کم اتنی سی رعایت تو دے دو میرے دل کو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی ہم پرسوں رات کی کارروائی کے لئے ریان ولیم کو اپنی ''تفتیش'' سے خارج فرما رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائی تھی۔''

''جاوا خود تو بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پرسوں والی کارروائی میں وہ خود تو شریک نہیں ہوا ہوگا۔ یہ اس کے ساتھیوں کا کام ہوگا۔''

''بات پھر وہیں آ جاتی ہے۔ وہ پٹھانی لہجے میں اردو بولنے والا کون تھا؟''

''ہوسکتا ہے کہ ریان ولیم کا شک درست ہی ہو۔ جاوا گروپ نے تفتیش کا رخ غلط سمت موڑنے کے لئے یہ ''پٹھانی لہجے'' والا چکر چلایا ہو۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ یہ بے ہودہ اور سفاک کارروائی جاوا جیسے اکھڑ مزاج شخص کے ذہن میں ہی ترتیب پا سکتی ہے۔ جلالی صاحب ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ہیں۔ اگر اس کارروائی کے صدمے سے یہ

چراغ گل ہو جاتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ جاوا کو بھی سر پیٹنا پڑتا۔''

''لیکن یار! اگر یہ جاوا کا کام ہے بھی تو اس نے جلالی صاحب کو براہِ راست تو نشانہ نہیں بنایا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر کارروائی کے لئے پرسوں کی رات چنی تھی۔ انہیں پتا تھا کہ جلالی صاحب خود یہاں موجود نہیں۔ غالباً انہوں نے جلالی صاحب کو صرف ڈرایا ہے اور ان پر دباؤ بڑھایا ہے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن جلالی صاحب کتنا دباؤ برداشت کر سکتے ہیں، یہ بھی تو کنفرم نہیں۔ ایسے شخص کا پٹا کا کسی بھی وقت بول سکتا ہے۔ پٹا کا سمجھتے ہو نا تم؟''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری وہ سیڑھیوں والی تھیوری بھی درست ہی لگتی ہے۔ کارروائی کرنے والوں نے گارڈ مشتاق کو جان بوجھ کر دوبار سیڑھیوں سے گرایا اور جان سے مارا۔ وہ ہمیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ مختار ملک اتفاقاً نہیں گرا تھا، اسے قتل کر کے وہاں سے پھینکا گیا تھا یا وہاں ڈالا گیا تھا۔''

عمران بولا۔ ''اب وہ سیڑھیاں خوف کا ٹریڈ مارک بن گئی ہیں۔ کچھ ملازم انہیں پُراسرار رنگ دے رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں سے بھاگنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان سیڑھیوں کے خوف سے فرار ہوئے ہیں۔ ابھی یہاں آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے کہ سیڑھیوں کی طرف والا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہاں زینوں پر تلسی کے پتے بکھیرے گئے ہیں اور ریلنگ کے ساتھ دو تعویذ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کارروائی بابے طفیل یا اس کی بیوی کی ہے۔''

''لیکن عمران! یہ سیڑھیوں والا چکر تو کافی پہلے کا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ باکس والے معاملے سے چند مہینے پہلے بھی یہاں کے ملازم ان سیڑھیوں سے خوف کھاتے تھے۔ ندیم نے خود مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ سب سے پہلے یہاں جلالی صاحب کا ایک لاڈلا طوطا مردہ پایا گیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چلا کہ وہ اپنے پنجرے سے کیسے نکلا اور کیسے یہاں پہنچ کر ختم ہوا۔ پھر وہ مہمان کے گرنے والا واقعہ ہوا جس میں وہ اپنی یادداشت بالکل کھو بیٹھا اور ابھی تک اسی حالت میں ہے...... دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ملازموں نے ان سیڑھیوں پر خون کے باریک باریک چھینٹے دیکھے، جیسے کوئی پھوار پڑی ہو۔ رات کے وقت سیڑھیوں سے ایسی آوازیں سنی جاتی ہیں جیسے کوئی بھاری بھرکم شخص ٹھہر ٹھہر کر اتر رہا ہو۔ اب یہ اوپر نیچے دو اموات ہوگئی ہیں یہاں۔''

''یہ تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو تابش! ہمارے دیہی علاقوں میں ایسی سیڑھیاں،

ایسی چھتیں، ایسے تالاب اور درخت ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ان سے کہانیاں وابستہ کی جاتی ہیں اور پھر انہیں بڑھایا چڑھایا جاتا ہے۔ یہ سادہ لوح لوگوں کے اندر کے وہم ہی تو ہوتے ہیں۔ بعض اوقات عیار لوگ اس کمزوری کو اپنے کسی مقصد کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں جارج اور حکم جی کی ایک اہم کارستانی تو یاد ہوگی...... وہ اپنے قیدیوں کے جسموں میں ''الیکٹرانک چپ'' نصب کرتے تھے اور پھر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ قیدی آزاد ہو کر بھی حکم کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن ایک بات تو ہے عمران! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم اپنی سائنس کے پیمانے پر نہیں تول سکتے۔ خود سائنس بھی یہ مانتی ہے کہ بہت کچھ ابھی انسان کے ذہن اور نظر سے اوجھل ہے۔''

''میں اس کو مانتا ہوں لیکن وہم اور ماورا میں بہت فرق ہے جگر...... جوں جوں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، وہم سکڑتا جاتا ہے اور ماورا کے لئے اس کی جستجو بڑھتی جاتی ہے۔ ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی...... پہلے یہ ماورا تھے، اب یہ سارے علوم ہیں۔''

''اچھا علامہ صاحب! اب یہ فرمایئے کہ ہمیں یہاں سے بھاگنا ہے یا ٹکنا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ مبارک گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اب تم نے پھر بے وقوفی کی باتیں شروع کر دی ہیں۔ بھئی، ہم نے ریان ولیم صاحب سے ایڈوانس پکڑا ہوا ہے...... کمٹمنٹ کی ہوئی ہے۔ اب ہم اس کام کو رستے میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ کام پورا کریں گے تو باقی پیسے بھی ملیں گے اور پیسے ملیں گے تو نصرت کا علاج اچھے طریقے سے ہو سکے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تم نے یہ سوال بس برائے سوال ہی پوچھا ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم بھاگنے والے ہیں، نہ جھکنے والے، نہ بکنے والے...... نہ ٹکنے والے۔''

''یہ ''ٹکنے والے'' کیوں شامل کر دیا؟''

''بھئی، سیاست میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ہر نعرے میں بچاؤ کا کوئی راستہ کھلا رکھنا چاہئے۔''

گفتگو مذاق کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''یار! تم عجیب گھن چکر ہو۔ ایک طرف تو اڑیل سے اڑیل اور غصیلے سے غصیلے جانور کو رام کر لیتے ہو، دوسری طرف جلالی صاحب کے ساتھ کچھ نہیں کر پا رہے۔''

''تم جلالی صاحب کو اڑیل جانور سے ملا رہے ہو۔ تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ اپنے اس ''طرزِ کلام'' کی وجہ سے تم نے عنقریب جلالی صاحب کے ہاتھوں مرحوم ہو جانا

ہے۔''

''تو اس سے پہلے کچھ کر گزرو نا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہو چلے ہیں لیکن ابھی تک کوئی سراہاتھ نہیں آیا۔''

اس کی کشادہ پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''میرے خیال میں سراہاتھ آیا ہے اور تمہارے ہاتھ ہی آیا ہے لیکن تم غور نہیں کر رہے۔ ہم ایک ایسے پوائنٹ تک پہنچ چکے ہیں جو یہاں کسی کی نظر میں نہیں۔''

''کس پوائنٹ کی بات کر رہے ہو؟''

''جلالی صاحب اور مہناز کی وہی گفتگو جو منگل کے روز تم نے مائیکروفون پر سنی ہے۔ جلالی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر مہناز کا تعلق بظاہر تو اس کوٹھی کے رواج کے مطابق عام ہی نظر آتا ہے لیکن وہ تھوڑا سا مختلف ہو چکا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود عزت مآب جلالی صاحب کے دل میں اس نرم و نازک ڈاکٹر مہناز کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ گوشہ وسیع ہو رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی وہ اہم پوائنٹ ہے جو ہمیں غیر متوقع فائدہ پہنچا سکتا ہے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گوشہ فائدہ پہنچائے گا؟''

''اس کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اس گوشے کے بارے میں کسی دوسرے کو پتا نہ چلے اور دوسرا یہ کہ یہ گوشہ واقعی وسیع ہو جائے۔ اگر ہم......''

بات کرتے کرتے اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ کھانسی کی آواز سے اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب اِدھر تشریف لا رہے ہیں۔ عمران نے جلدی سے سگریٹ بجھایا۔ جلالی صاحب کی آمد پر ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان کا رنگ معمول سے زیادہ زرد نظر آ رہا تھا۔ ''بیٹھو بیٹھو۔'' جلالی صاحب نے کہا اور پھر ہمارے پاس ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے ہمیں یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ زخمی گارڈ اشرف جانبر نہیں ہو سکا۔ اس کی میت لاہور سے اس کے آبائی علاقے ایمن آباد پہنچا دی گئی ہے۔ یہ واقعی دل گرفتہ کرنے والی اطلاع تھی۔

جلالی صاحب نے دوسری اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''گارڈ مشتاق کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی ہے۔ اس کے جسم پر ایسے نشان ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سیڑھیوں سے گرانے سے پہلے بھی اسے بیدردی سے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس کی ایک ران کا گوشت اندر سے پھٹا ہوا ہے اور پیٹھ پر ٹھڈوں کے نشان ہیں۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ یہ اسی سفید کتے کی

کارستانی ہے۔ وہ موٹا سؤر...... اس نے خطرناک دھمکیاں دی تھیں۔ وہ لمبے قد والا قبائلی بدمعاش بھی اس کے ساتھ تھا۔'' جلالی صاحب نے بے حد مغموم لہجے میں کہا۔ وہ کافی پریشان تھے۔ موٹے سؤر سے ان کی مراد ریان ولیم ہی تھا۔

جن لوگوں سے وہ مشورہ وغیرہ کرتے تھے، ان میں سے کئی ایک انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آج یہاں اس کمرے میں بیٹھے ہم سے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی انہیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ گئی۔ جلالی صاحب کے اشارے پر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اور عمران بھی مؤدب بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ندیم کا فون آیا ہے سر...... اس نے کہا ہے کہ دوسرے قتل کی ایف آئی آر بھی درج ہوگئی ہے۔ مشتبہ افراد میں انگلینڈ کے شہری ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف جاوا اور دُرشہوار وغیرہ کا نام بھی شامل ہے۔ پولیس ان لوگوں کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی ہے۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔'' جلالی صاحب نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔ ''یہ گھسے پٹے فقرے بہت سن رکھے ہیں ہم نے۔ ہماری پولیس تو صرف شرفا کی پگڑیاں اچھالنے کے لئے ہے۔ مجرموں کے ساتھ ان کے یارانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت کم امید ہے ان کی طرف سے کسی اچھی خبر کی...... باقی جہاں تک اپنی حفاظت کا تعلق ہے، یہ اب میں خود کروں گا۔ اس فارم کے ایک ایک انچ پر بہترین گارڈز کھڑے کر دوں گا۔ وہ جدید اسلحے سے لیس ہوں گے۔ دس پندرہ دن تک کوٹھی کی چھت پر واچ ٹاور بھی مکمل ہو جائے گا۔ وہاں سے فارم کے اردگرد چار پانچ کلومیٹر تک نظر رکھی جا سکے گی۔''

مہناز نے ہمت کر کے کہا۔ ''لیکن سر! ان قاتلوں کو بھی تو پکڑنا ہے جنہوں نے دو جانیں لیں۔ دو عورتوں کو بے آبرو کیا۔ درجن بھر افراد کو بری طرح زخمی کیا۔ پورے فارم میں توڑ پھوڑ کر کے کروڑوں کا نقصان کیا۔ ایرانی بلیوں کو......''

مہناز کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ عمران نے ٹھوکا دے کر مہناز کو فقرہ پورا کرنے سے روکا تھا۔ جلالی صاحب نے غالباً آخری الفاظ سنے ہی نہیں اس لئے انہوں نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

عمران نے مہناز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، حملہ آوروں کا کھوج لگنا ضروری ہے۔ ورنہ ان کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔''

''یہ سب بھی ہوگا...... ضرور ہوگا۔'' جلالی صاحب نے وجدانی انداز میں سر ہلایا۔ ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمجھ گئی کہ اگر یہ موضوع تھوڑی دیر مزید چلا تو جلالی صاحب کا بلڈ پریشر شوٹ کر جائے گا۔ اس نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وہ جلالی صاحب کو یہ بتانے میں مصروف ہوگئی کہ ڈاکٹر لائبہ کی جگہ کسی ڈاکٹر کا انتظام کر رہی ہے۔ اس طرح کی کچھ مزید حوصلہ افزا باتیں بھی اس نے جلالی صاحب کے سامنے کیں۔

اگلے روز صبح سویرے موقع ملا تو میں نے عمران سے کل والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب ڈاکٹر مہناز، جلالی صاحب کے سامنے ایرانی بلیوں کا ذکر کرنے لگی تھی تو اس نے مہناز کو روک کیوں دیا تھا؟

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر مدھم آواز میں بولا۔ ''تم ان بلیوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں، بس یہ سنا تھا کہ تم جلالی صاحب کو واردات کے روز بتا رہے تھے کہ بلیوں کو حفاظت کی غرض سے کسی بالائی منزل کے پنجرے میں رکھا گیا ہے۔''

''وہ غلط بات تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''بلیاں اوپر والے پنجرے میں نہیں ہیں۔ اوپر والے پنجرے کا ذکر میں نے صرف اس لئے کیا تھا کہ جلالی صاحب دو منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا نہیں سکتے...... بلیاں مرچکی ہیں۔''

''مرچکی ہیں؟''

''ہاں، یہ خونی واقعہ بھی ان واقعات میں شامل ہے جو بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں ہوئے۔''

''چاروں بلیاں؟'' میں نے سخت تحیر کے عالم میں پوچھا۔

''ہاں چاروں ہی۔ ان خبیثوں نے ان پر افریقن جنگلی کتے چھوڑ دیئے۔ جنگلی کتوں کا بڑا پنجرہ بلیوں والے پنجرے کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے دونوں پنجروں کی درمیانی رکاوٹ ہٹا دی۔ آٹھ عدد خونخوار کتوں کے گروہ نے منٹوں میں بلیوں کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ یہ بڑے ظالم کتے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے چرندے درندے پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اپنے شکار کو زندہ حالت میں ہی پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتے ہیں۔''

''اوہ گاڈ۔'' میں نے سر پکڑ لیا۔ وہ بڑی قیمتی اور نایاب بلیاں تھیں۔ جلالی صاحب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے وہ نہایت سفاک تماشا دیکھا۔ کالے دھبوں والے وہ خوفناک جنگلی کتے نرم و نازک بلیوں پر جھپٹ رہے تھے۔ انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔

حملہ آوروں نے بدھ کی رات اس فارم ہاؤس میں جو درندگی دکھائی، وہ ''یادگار'' تھی۔
اب اس درندگی میں ان بلیوں والے واقعے کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ بے مثل سفاکی تھی۔
جہاں بے گناہ ملازماؤں کی عصمت دری کی گئی تھی، وہاں بے زبان جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا گیا تھا۔ دو افراد جان سے گئے اور ایک درجن کے قریب بے طرح گھائل ہوئے اور پولیس ابھی تک صرف ''چھاپے'' ہی مار رہی تھی۔ میرے خیال میں عمران نے اچھا ہی کیا تھا جو جلالی صاحب کو بلیوں والے واقعے سے ابھی تک بے خبر رکھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے صدمے کو شدید تر کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ آج کل میرے ذہن میں رہ رہ کر ابرار صدیقی کا خیال بھی آرہا تھا۔ اگر اس چاندنی رات میں واقعی اسی نے لکڑی کا باکس جھاڑیوں میں پھینکا تھا تو پھر وہ اس کی کھوج میں واپس کیوں نہیں آیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اس بھاگ دوڑ میں کہیں مارا ہی گیا ہو؟

مشتاق کی دردناک موت اور دیگر سنگین واقعات کو اب چوتھا روز تھا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس پر عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ بھاگ جانے والے ملازموں کا خلا پُر کرنے کے لئے جلالی صاحب کافی کوشش کر رہے تھے پھر بھی وہ پانچ چھ افراد سے زیادہ کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ درحقیقت یہاں رُونما ہونے والے واقعات نے اردگرد کے سارے علاقے میں ہراس پھیلا دیا تھا اور فارم ہاؤس کے لئے زیادہ تر ملازم آس پاس ہی سے مہیا ہوتے تھے۔

ہاں، جلالی صاحب ایک اچھی سکیورٹی کمپنی سے معاملہ طے کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کمپنی نے جدید اسلحے سے لیس کم و بیش چالیس گارڈز فارم ہاؤس کو مہیا کر دیئے تھے۔ ان گارڈز نے بارہ بارہ گھنٹے کی دو شفٹوں میں فارم ہاؤس کی نگہبانی کرنا تھی۔ ان لوگوں کے پاس واکی ٹاکی، سرچ لائٹس، دو پیٹرولنگ گاڑیاں اور اس طرح کی دیگر سہولتیں موجود تھیں۔ اب جلالی صاحب اپنی ذاتی حفاظت کی طرف سے بھی چوکس ہو گئے تھے۔ پچھلے دنوں میں وہ صرف ایک بار فارم سے باہر گئے تھے۔ اس موقع پر گارڈز کی ایک گاڑی اور دو موٹر سائیکل سوار ان کی شیورلیٹ کے ساتھ موجود رہے تھے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے ذہن میں کچھ پک رہا ہے۔ وہ ظلم برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا اور یہاں ظلم ہوا تھا۔ خاص طور سے دو بے بس عورتوں کو ایک ہی کمرے میں رات بھر بے آبرو کرنے والا واقعہ عمران کے ذہن کو مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ میں بھی اپنے طور پر بہت ذہنی بوجھ محسوس کرتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ بدھ کی رات جو خونی واردات ہوئی، اس کی شروعات میری طرف سے ہی ہوئی تھی۔ مختار ملک سے میری لڑائی ہوئی اور وہ آناً فاناً مارا

گیا۔ حملہ آوروں نے یہاں جو کچھ کیا، اس میں یقیناً مختار ملک کی موت کا غم و غصہ بھی شامل تھا۔

عمران اور میں اب بھی علیحدہ علیحدہ کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے عمران نے مجھے فون کیا۔ ''تابی! تیار ہو جاؤ، کل ہمیں کہیں جانا ہے۔''

''کہاں؟''

''وہ کام کرنے کے لئے جو ابھی تک پولیس نہیں کر سکی۔''

''پولیس نہیں کر سکی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! بڑی کمزور یادداشت ہے تمہاری۔ اسی کمزوری کے بارے میں پشتو فلموں کی مشہور ہیروئن مسرت شاہین نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھا تھا کہ جن قوموں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، ان پر ہر کوئی کاٹھی ڈال سکتا ہے۔''

''پتا نہیں کہاں کی بات کہاں جوڑ دیتے ہو۔ آج مسرت شاہین سے تحقیقی مقالہ لکھوا رہے ہو، کل کسی دانشور سے ڈانس کروا دو گے۔''

''تمہاری معلومات ناقص ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ کسی نامعلوم مضمون میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اس نے۔ علم الابدان کی ایسی ایسی تشریح کرتی تھی کہ لوگ سر دُھنتے تھے۔ خیر، چھوڑو اس موضوع کو۔ میں اس واردات کی بات کر رہا ہوں جو بدھ کی رات ہوئی۔''

''کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''یہ پوچھو، کیا کرنے کا ارادہ نہیں۔ تمہیں کل شام کے بعد جلالی صاحب سے رخصت لینی ہے اور تیار رہنا ہے۔''

وہ زبردست موڈ میں دکھائی دیتا تھا مگر اس نے زیادہ بات نہیں کی اور فوراً ہی فون بند کر دیا۔

رات کوئی تین بجے کا وقت ہوگا۔ میں کمرے میں اپنے فرشی بستر پر سو رہا تھا۔ اچانک نیند سے جاگ اٹھا۔ کچھ دیر بے حرکت لیٹا رہا پھر اندازہ ہوا کہ موبائل فون کی مدھم گھنٹی کی وجہ سے آنکھ کھلی ہے۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے اسکرین کو دیکھا اور مزید چونک گیا۔ آسٹریا کا نمبر تھا۔ یہ کال نصرت کے سیل فون سے تھی۔ ''ہیلو نصرت!'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

''ہیلو تابش بھائی!'' وہ بھی بالکل مدھم آواز میں بولی۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم تو خیریت سے ہو...... اتنی رات گئے فون؟''

''آپ بھول رہے ہیں جناب! یہاں بہت زیادہ رات نہیں ہوئی۔ صرف بارہ بجے

ہیں، تقریباً تین گھنٹے کا فرق ہے ٹائم میں۔'' وہ بدستور سرگوشیوں میں بول رہی تھی۔

''پھر بھی آدھی رات تو ہوگئی ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف بھائی اور چچا احمد تو چلے گئے ہیں۔ باجی آج میرے پاس اسپتال میں رہیں گی۔ یہاں اجازت تو نہیں ہوتی ہے ساتھ رہنے کی لیکن بعض اوقات مل بھی جاتی ہے۔ بہر حال، اس وقت باجی بھی ساتھ والے کیبن میں سو رہی ہیں۔''

''ہاں...... کیسے فون کیا؟''

''بھائی جان! آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میری بات پر غور ضرور کرنا۔''

''نصرت! جب تم بات بتاؤ گی تو پھر ہی غور ہو سکے گا نا۔''

''بھائی جان! پتا نہیں کہ مجھے یہ بات آپ سے کہنی چاہئے یا نہیں لیکن اگر آپ کو برا بھی لگے تو مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔ پلیز بھائی۔''

''دیکھو تم خواہ مخواہ الجھا رہی ہو۔ میں تم سے کبھی ناراض ہوا ہوں اور نہ اب ہوں گا۔ تم جو بھی کہنا چاہتی ہو بے دھڑک کہو۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ ''تابی بھائی! بہت کچھ بدل چکا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ ابھی تک نہیں بدلے۔ آپ...... اب بھی وہی تابی بھائی ہیں جو باجی کو دیوانوں کی طرح چاہتے تھے۔ رات دن بس باجی کو سوچتے تھے۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے اور اپنے اس یقین کی وجہ سے میرے اندر ایک خوشی سی پیدا ہوتی ہے تابی بھائی...... پتا ہے کیوں؟''

''تم اپنی بات مکمل کرلو، میں پھر جواب دوں گا۔''

''اس لئے تابی بھائی کہ میرے خیال میں آپ باجی ثروت کو اس دلدل سے نکال سکتے ہیں جس میں وہ گلے گلے دھنسی ہوئی ہیں۔ باجی نے ایک ایسے شوہر کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے جو اصل میں ان کا شوہر ہے ہی نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں تابی بھائی جان! میں یوسف بھائی کو دیکھتی ہوں تو میرے گلے میں دھواں سا بھرنے لگتا ہے۔ آج کل بھی یوسف بھائی ہر وقت باجی کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ میری تیمارداری پر بھی بڑی توجہ دے رہے ہیں، روز گلدستے آ رہے ہیں لیکن میں سب جانتی ہوں۔ یہ باجی کے ساتھ بنائے رکھنے کی کوششیں ہیں اور یہ کوششیں بھی بس اس وقت تک ہیں جب تک یوسف بھائی کا مطلب نہیں نکل جاتا۔ جس روز انکل فاروقی نے پراپرٹی ان کے نام کر دی، یا پھر انکل فاروقی کی آنکھیں بند ہوگئیں، یوسف بھائی نے کسی کچرے کی طرح باجی کو اٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھینک دینا ہے۔ میری ہیروں جیسی باجی کی کوئی قدر نہیں انہیں۔ آپ...... میری بات سن رہے ہیں نا؟''

''ہاں میں سن رہا ہوں۔''

''یوسف بھائی کے دو چہرے ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں باجی ثروت کو بس ایک چہرہ ہی نظر آتا ہے یا پھر نظر تو آتا ہے لیکن انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ وہ یوسف بھائی سے علیحدہ ہونے والا گناہ نہیں کریں گی اور اگر کریں گی تو کسی نہ کسی صورت ...... پائیں گی۔ وہ جانتی ہیں کہ طلاق ان کے لئے ضروری ہے لیکن وہ اس کو ایک گالی کی طرح سمجھتی ہیں۔''

''کیا اب کوئی نئی بات ہوئی ہے نصرت؟'' میں نے پوچھا۔

''روز ہی نئی باتیں ہوتی ہیں تابی بھائی!'' وہ بدستور سرگوشی میں بولی۔ ''یوسف بھائی نے اب یہاں ایک نئی ''تفتیش'' شروع کی ہوئی ہے۔ انہیں شک پڑ گیا ہے کہ میرے علاج کا خرچہ چچا احمد نہیں کر رہے بلکہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔ وہ اس بارے میں باجی کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ اپنے والد...... انکل فاروقی کو بھی باجی کی طرف سے بدظن کر دیں گے۔''

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟''

''پرسوں وہ انکل فاروقی سے فون پر بات کر رہے تھے...... اتفاقاً ان کے ایک دو فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ انکل سے کہہ رہے تھے...... کوئی رشتے دار ہے ثروت کا۔ شاید کوئی کزن ہے...... کبھی کبھی اس کا فون بھی آتا ہے۔ جواب میں انکل فاروقی نے کچھ کہا۔ یوسف بھائی بولے، کچھ بھی ہے ڈیڈی...... ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے...... ہم نصرت کا علاج اچھی سے اچھی جگہ پر کرا سکتے ہیں...... کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''تم نے یہ سب کچھ ثروت کو بتایا؟''

''تابی بھائی! ان کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ذرا سی بات کروں تو ڈانٹ دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ مجھے یوسف بھائی میں بس خامیاں ہی نظر آتی ہیں۔ میں جواب میں کہتی ہوں کہ آپ کو خوبیاں ہی نظر آتی ہیں جو کہیں نہیں ہیں۔ دراصل تابی بھائی! باجی کے سارے مسئلوں کی جڑ وہ خوف ہے جو انہوں نے لفظ ''طلاق'' سے جوڑا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، خوش قسمتی سے ہمارے خاندان میں طلاق کا کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ پچھلے چالیس پچاس

سالوں میں ہمارے قریبی عزیزوں میں شاید ہی کہیں ایک آدھ طلاق ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب باجی اس بارے میں سوچتی ہیں تو ان کو یہ ایک بہت ہی بُرا اور گھمبیر واقعہ لگتا ہے۔ انہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس نے ایک جادو کی طرح انہیں جکڑ رکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے تابی بھائی! صرف آپ باجی کو اس ''گھیرے'' سے نکال سکتے ہیں۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ آپ باجی کے لئے اور میرے لئے بھی ایک مسیحا کی طرح آئے ہیں۔ آپ کے آنے سے بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ ہاں تابی بھائی! بہت کچھ۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے بتاؤ نصرت! میرے بس میں کیا ہے...... میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ کوشش کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے تابی بھائی! گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے...... تابی بھائی! ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھی طرح جانتی ہے...... اور باجی تو میری بہن ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ باجی کے دل کی گہرائی میں اب بھی آپ کی تصویر ہے۔ وہ آپ کو سوچتی ہیں لیکن ان کی سوچوں کے گرد دنیا اور رسم و رواج کے پہرے ہیں...... آپ کو یاد ہے نا چند دن پہلے میں نے فون پر آپ کو سالگرہ کی مبارک باد دی تھی۔ آپ کی سالگرہ کا دن مجھے باجی نے ہی یاد کرایا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے ان کا نام نہ لوں...... یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے تابی بھائی! ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نصرت! ابھی تم اپنے ذہن کو ان فکروں میں نہ ڈالو تو اچھا ہے۔ اپنی ساری توجہ اپنی صحت پر رکھو اور ہمیں جلد سے جلد بھلی چنگی ہو کر دکھاؤ۔''

وہ بولی۔ ''آپ باجی کو ٹھیک کر دیں تابی بھائی...... میں وعدہ کرتی ہوں، میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''نصرت! میرے خیال میں تم بالکل الٹ بات کہہ رہی ہو۔''

''میں سمجھی نہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ جب تم تندرست ہو جاؤ گی تو تمہاری باجی بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''نصرت! جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے، ثروت کے وہم کی بنیاد ہی تمہاری بیماری ہے۔ اس نے یوسف سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور انہی دنوں تمہاری بیماری ڈائیگنوز ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھر کر چکی ہے کہ اس کی ''غلط

ہوں کا بوجھ تمہاری صحت اور زندگی پر پڑا ہے۔ بس یہی وہ نفسیاتی گتھی ہے نصرت جس نے ثروت کو بے طرح الجھا رکھا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی، ثروت کی یہ نفسیاتی گتھی بھی اپنے آپ کھل جائے گی۔ اس کی سوچوں کے سارے جکڑ بند ٹوٹ جائیں گے۔ پھر وہ ایک آزاد عورت کی طرح سوچنا شروع کر دے گی۔''

وہ میری بات خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا انداز گواہ تھا کہ وہ میری بات کو اہمیت دے رہی ہے۔

میں خاموش ہوا تو وہ دبی آواز میں بولی۔ ''آپ کے پاس باجی کا نیا موبائل نمبر ہے؟''

''نہیں۔''

''اچھا، میں ابھی آپ کو بھیجتی ہوں۔ آپ کسی وقت باجی کے نمبر پر بھی بات کیا کریں۔ یوسف بھائی پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ پھر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ پلیز، اپنی اس بیمار چھوٹی بہن کی یہ بات مان لیں۔ ان کو فون کریں۔'' اسی دوران میں کھٹ پٹ کی مدھم آواز آئی۔ وہ بولی۔ ''اچھا میں بند کرتی ہوں، باجی شاید جاگ گئی ہیں۔''

میں بے وقت جاگا تھا اور اس کے بعد جس طرح کی گفتگو ہوئی تھی، اس نے نیند آنکھوں سے اُڑا دی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پہرے دار باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ گشت پر تھے۔ رکھوالی کے کتوں کی آوازوں کے سوا تقریباً سناٹا ہی تھا۔ یوسف کا کردار اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد کو بھی ثروت کی غیر معمولی حمایت و تائید سے روکنا چاہتا تھا۔ نصرت نے جو کچھ بتایا، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے والد فاروقی صاحب کو ان کی بڑی بہو کے حوالے سے بدظن کرنا چاہتا ہے...... اس کی ہوشیاری بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے فقط چند دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نصرت کے علاج کے لئے رقم چچا احمد نہیں دے رہے بلکہ کہیں اور سے مہیا ہو رہی ہے۔

ثروت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ میرا عشق تھی، میرا وجدان، یقین، سب کچھ وہی تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا تھا تو مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے بغیر میری زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ میں چار برس تک یہ آس سینے میں کسی جوت کی طرح جگا کر زندہ رہا تھا کہ ثروت میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ آس پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ شادی شدہ ہو چکی تھی لیکن اس صورتِ حال میں بھی ایک زبردست پھیر موجود تھا۔ اور اس پھیر نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا

کھڑا کیا تھا۔ اس موڑ پر گہری تاریکی تھی مگر تاریکی میں آس امید کی کچھ کرنیں بھی موجود تھیں۔ کیا اب بھی وقت میرے لئے پلٹ سکتا ہے؟ کیا اب بھی میں اور ثروت بیت جانے والے موسموں کو آواز دے سکتے ہیں؟ میں نے بڑی حسرت کے عالم میں سوچا اور سینے میں فروزاں آگ کچھ اور بھی تپش دینے لگی۔

O.....❖.....O

میں اور عمران فارم ہاؤس سے نکلے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ ہم نے ایک مشترکہ عزیز کی شادی میں شرکت کا بہانہ بنا کر جلالی صاحب سے چھٹی لی تھی۔ گارڈز کی ایک گاڑی شیخوپورہ سے شاہدرہ تک جا رہی تھی۔ ہم اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک محفوظ طریقہ تھا۔ اگر ہم اپنے طور پر سفر کرتے تو یہ اندیشہ موجود تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جائے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

ہم شاہدرہ موڑ پر گارڈز کی جیپ سے اتر گئے اور ایک رکشا میں بیٹھ کر لاہور کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور جگمگا رہا تھا۔ زندگی عروج پر تھی۔ ہم مینارِ پاکستان اور بادشاہی مسجد کے قریب سے گزرے۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں پہلی بار عمران سے ملا تھا۔ وہ مجھے جان لیوا مایوسی کے گھیرے سے نکال کر اپنے آشیانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ آج کی طرح تب بھی مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ آج بھی اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا ایک بندے کی دُم میں نمدہ فٹ کرنا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری پینٹ کی جیب میں چھوٹے سائز کا لیکن ایک طاقتور پستول موجود تھا۔ عمران کی پنڈلی سے بھی ایک لوڈڈ پستول بندھا ہوا تھا۔ یہ دونوں ہتھیار عمران نے فارم ہاؤس کے اندر سے ہی حاصل کئے تھے، کیسے کئے تھے، یہ اس نے نہیں بتایا۔

فارم ہاؤس سے تو عمران میری طرح پتلون قمیص میں ہی نکلا تھا لیکن رکشا میں بیٹھنے کے بعد اس نے جیب سے ایک ٹائی نکالی اور نفاست سے باندھ لی۔ ''خیر ہے، آج کسی فلم ایکٹریس پر بجلی گرانے کا ارادہ ہے۔''

''بھئی، اپنے یار کی شادی پر جا رہے ہیں، بن ٹھن کر جائیں گے۔''

''یہ بہانہ تو جلالی صاحب کے لئے تھا۔ اصل بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک عجیب کام کیا۔ اپنی سیاہ پتلون کی جیب میں سے ایک نو دس انچ لمبا چاقو نکالا۔ اس چاقو کا دستہ پتلا لیکن مضبوط تھا۔ یہ چاقو اس نے اپنی ٹائی کے اندر کی طرف بنی پاکٹ میں اس طرح چھپا لیا کہ اسے سامنے سے دیکھنا ناممکن ہو گیا۔

اس نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''بتاؤ، کسی بالی لالی وڈ فلم میں تم نے کسی ہیرو میں اس طرح کی ذہانت دیکھی ہے؟''

''میں واقعی متاثر ہوا ہوں۔ اچھا طریقہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ پتلے دستے والا چاقو تو واقعی ٹائی کا حصہ بن گیا تھا۔ میں نے کہا۔'' لیکن اتنی زیادہ احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟ کہیں ہماری خصوصی تلاشی ہونے والی ہے؟''

''تلاشی جیسی تلاشی۔ تم دیکھتے رہنا، ہر چیز ٹٹول لیں گے تمہاری۔''

''لیکن کون؟''

''ہمارے دوست۔ بڑے محتاط قسم کے لوگ ہیں۔''

''یار! اب تو کچھ بتا دو۔ کیوں امتحان لینے پر تلے ہوئے ہو؟'' میں نے عاجز لہجے میں کہا۔

اس نے اچھلتے کودتے رکشے میں میری صورت دیکھی اور بولا۔ ''چلو کیا یاد کرو گے، کس مہربان سے پالا پڑا ہے۔ ہم جاوا صاحب کے ایک اڈے پر جا رہے ہیں۔''

''جاوا کا اڈا؟ تمہیں کیسے معلوم؟''

''ایک ڈان کو دوسرے ڈان کا ٹھکانا معلوم نہ ہو گا تو کیا تم جیسے شریفے کو ہو گا۔''

''خیر، اب اتنے ڈان بھی نہیں ہو تم۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اندھیرے میں کوئی تیر چلانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''اندھیرے میں نہیں اُجالے میں...... اور تیر بھی نہیں، توپ۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم جاوا سے ملتے رہے ہو؟''

''جاوا سے نہیں لیکن اس کے ایک بڑے گرگے سے۔ سلطان نام ہے اس کا...... سلطان چٹا۔ خطرناک بندہ ہے۔ کچھ عرصے سے زیرِ زمین ہے لیکن آج کل لاہور میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آج اس کے ساتھ چائے پی سکیں گے۔''

''کہیں زیادہ ہی تیز چائے نہ ہو؟''

''تم بھی تو اب دودھ پتی کے مرحلے سے گزر چکے ہو۔ کتنی بھی تیز ہوئی، جارج گورے سے تو تیز نہیں ہو گی۔''

''بڑی رمزیہ باتیں کر رہے ہو۔ اللہ ہی خیر کرے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

یقیناً ہم کسی خطرناک کام سے جا رہے تھے لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب خطرنا کی میرے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کرتی تھی۔ خاص طور سے عمران کا ساتھ ہوتا تھا تو یہ

سب کچھ ایک سنسنی خیز انجوائے منٹ کی طرح ہو جاتا تھا۔

رکشا، مال روڈ کے علاقے میں ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ عمارت کا مین گیٹ بند تھا۔ لان میں گھاس اُگی ہوئی تھی اور اسے مدت سے کاٹا نہیں گیا تھا۔ کھڑکیاں، دروازے بند اور فرش پر گرد و غبار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بلڈنگ عرصے سے بے آباد پڑی ہے۔

ہم عمارت کے اندر جانے کے بجائے سیدھے نکلتے چلے گئے تو مجھے شک گزرا کہ شاید عمران حسبِ عادت مذاق کر رہا تھا۔ ایک چکر کاٹ کر ہم مال روڈ کے بارونق علاقے کی طرف نکل آئے۔ مین سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ایک شاپنگ پلازا کے نیچے ایک نیم تاریک سا پارکنگ لاٹ تھا۔ ہم ڈھلوان اتر کر پارکنگ میں داخل ہو گئے۔ پارکنگ کی زیریں منزل پر بھی کافی تعداد میں گاڑیاں موجود تھیں۔ اِکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک لاری نما بس کے عقب میں پہنچ کر عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک چھوٹا سا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم ایک نیم تاریک کوریڈور سے گزرے۔ یہاں بھی زیادہ صفائی ستھرائی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص نے ہمیں کڑی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''سلطان چیتے سے کہو، تمہارا باپ ملنے آیا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ہٹے کٹے شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''باپ کا مطلب باپ ہی ہوتا ہے۔ بیٹے کی ماں کا خصم۔ جاؤ اسے بتا دو، وہ سمجھ جائے گا۔''

ہٹا کٹا شخص جز بز نظر آ رہا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ وہ عمران پر پھٹ پڑے گا، کبھی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے سے ریوالور جھول رہا تھا۔ عمران کو اور مجھے سرتا پا دیکھتا ہوا وہ دروازے کی دوسری طرف چلا گیا۔ بہر حال، جاتے ہوئے وہ دروازے کو دوسری طرف سے مقفل کر گیا تھا۔

اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں عمران سگریٹ پھونکتا رہا اور میں موبائل فون پر میسج وغیرہ چیک کرتا رہا۔ ہٹا کٹا شخص اب قدرے مرعوب اور مؤدب نظر آ رہا تھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''عمران دانش......ابو سلطان چیتا۔'' عمران نے کہا۔

''آیئے۔'' اس نے تیوری چڑھائی اور ہمیں راستہ دیا۔

یہ بھی ایک راہداری تھی مگر خاصی صاف ستھری تھی، قالین بچھا ہوا تھا۔ ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ چند قدم آگے گھنگریالے بالوں والا ایک کرخت صورت مکرانی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی۔ ساتھ میں ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص نظر آتا تھا۔ وہ بھی شکل سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔

''سوری۔'' اس نے کہا اور عمران کی جامہ تلاشی شروع کر دی۔ عمران کی پنڈلی سے لگا ہوا پستول نکال لیا گیا۔ بعد ازاں میری تلاشی ہوئی اور میرا اسٹیڈی پستول بھی ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ ''یہ دونوں ہتھیار واپسی پر آپ کو مل جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

ہم آگے بڑھے۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک پانچ چھ فٹ چوڑا ساگوانی دروازہ تھا۔ یہاں دو مسلح افراد نے پھر ہماری تلاشی لی۔ اس مرتبہ ہمیں موبائل فونز سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ''سوری'' کے لفظ سے شروع ہونے والی یہ تلاشی خاصی باریک بینی سے کی گئی۔ پنڈلیاں اچھی طرح ٹٹولی گئیں اور جوتوں کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ عمران کا چہرہ تمتما رہا تھا لیکن وہ بہ وجوہ خاموش تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ عمران کی ٹائی ابھی تک اس تلاشی سے محفوظ تھی۔ میں نے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ عام طور پر سخت ''سکیورٹی چیکنگ'' والی جگہوں پر بھی ٹائی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ عمران کی یہ ''ایجاد'' قابلِ غور تھی۔

ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم تو اسی دو منزلہ بلڈنگ کے اندر آ گئے ہیں جو باہر سے مقفل اور بالکل بے آباد نظر آ رہی تھی۔

''یہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''آج کل ہر کام بیک ڈور سے ہو رہا ہے۔ اسے بیک ڈور ڈپلومیسی کہتے ہیں جگر۔''

بظاہر اجاڑ نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے مکمل آباد تھی۔ ایک لمبا تڑنگا گن مین قالین پوش راہداری میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں ایک گول کمرے کے سامنے لے آیا۔ کمرے کا خوب صورت ساگوانی دروازہ بھی گولائی میں تھا۔ گن مین کی دستک پر جس خوبرو لڑکی نے دروازہ کھولا، وہ بھی سرتا پا خوبصورت گولائیوں کا مجموعہ تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دفعہ تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یقیناً عمران کو بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ یہ لڑکی مشہور انڈین فلمسٹار کرشمہ کپور تھی...... یا پھر اس کی ہو بہو کاپی تھی۔ ''آیئے جی۔'' اس نے اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے بازو لہرایا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ بیڈ نما صوفے سے ایک چوڑا چکلا شخص اٹھا۔ لال پری کے نشے سے اس کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند سیکنڈ تک عمران کو گھورتا

رہا پھر پُرتپاک انداز میں بولا۔ ''اتنی دیر کہاں رہے ہو ہیرو صاحب! مدت بعد شکل دکھائی ہے۔''

''تم بھی تو ''کتے'' کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔'' عمران نے جان بوجھ کر غلط محاورہ بولا۔ دونوں نے زوردار مصافحہ کیا۔ شاید وہ عمران سے معانقہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کنی کترا گیا۔ اس کی وجہ عمران کی ٹائی بھی ہو سکتی تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ڈراؤنی آنکھوں میں چوڑے تھوبڑے والا یہی شخص جاوے کا گرگا سلطان چٹا ہے۔ سلطان چٹے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ عمران بولا۔ ''یہ میرا دوست تابش ہے۔ یہ بھی تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتا تھا۔''

''خوش آمدید، ویلکم۔'' سلطان نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کی سختی سے آشنا کرنے کی کوشش کی لیکن جو ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا، وہ بھی کچھ کم پتھریلا نہیں تھا۔

کرشمہ کپور ایک طرف خاموش و مؤدب کھڑی تھی۔ جمناسٹک کرنے والی لڑکیوں کی طرح اس کی ٹانگیں اور بازو لباس سے بے نیاز تھے۔ بیڈ نما صوفے کے قریب ہی مساج آئل اور تولیا وغیرہ پڑا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے تھوڑی دیر پہلے سلطان چٹا کرشمہ کپور کے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے کھردرے پنڈے کی مالش کروا رہا تھا۔ سلطان چٹا کتنا بھی بڑا بدمعاش سہی مگر اتنا بڑا نہیں تھا کہ کرشمہ کپور اس کی مٹھی چاپی کرتی پائی جاتی...... اس بات کو دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کرشمہ کپور کی مارکیٹ ویلیو کتنی بھی کم ہو گئی تھی مگر اتنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سلطان چٹے جیسے گرگے کی خلوت میں پائی جاتی۔ یہ یقیناً اس کی ہم شکل تھی۔ ذرا غور سے دیکھنے پر کرشمہ اور اس لڑکی کے خدوخال میں کچھ فرق بھی نظر آتا تھا۔ عام طور پر مشہور فلمی ستاروں کے دو چار ڈپلی کیٹ بھی ان کے اردگرد موجود رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اصل اداکاروں سے کافی مماثلت بھی رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک تھی۔

سلطان نے کہا۔ ''ہاں جی، یہ تابش صاحب مجھ سے ملنے کا شوق کیوں رکھتے ہیں؟'' لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''اس کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے اور تمہارا باس تو بڑے بڑے نکموں کو ہیرو بنا دیتا ہے۔ تابش تو شکل کا بھی اچھا بھلا ہے۔ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ ایڈوانس لے کر بھول جاتا ہے۔ ریل گاڑی کی طرح کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ سمجھو فلمسازوں کی ساری شرائط پوری

کرتا ہے۔''

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''مسخری نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ ٹائم تمہارے پاس بھی زیادہ نہیں ہوگا اور میرے پاس بھی کم ہے۔''

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔''

''مجھے پتا ہے تم جیسے لوگ مرنے کے بعد بھی سنجیدہ نہیں ہوتے، ان کے تھوڑے بہت دانت ضرور نظر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اتنا عرصہ تم رہے کہاں ہو...... اور تمہیں کیسے پتا تھا کہ میں یہاں ملوں گا؟''

''بس انڈیا میں تھا ایک لونڈیا کے چکر میں۔ اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے...... بلکہ کبھی کبھی تو راہ کے بجائے موٹروے ہوتی ہے۔ چیتا، کتے کی بو کافی دور سے سونگھ لیتا ہے۔''

وہ پھر زہرخند انداز میں بولا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ کتا، کتے کی بو سونگھ لیتا ہے۔''

''تم نے آدھی بات درست کہی ہے۔ چلو تمہارے جیسے کے لئے یہ بھی بڑی بات ہے۔''

سلطان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''میں اب یہاں سے نکلنے ہی والا تھا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''کیا کیا خدمتیں ہیں تمہارے پاس؟''

''اچھا کھانا...... شراب...... لونڈیا...... اور اگر کوئی پیچھے لگا ہوا ہے اور ایک دو راتیں یہاں گزارنا چاہتے ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں لونڈیا کے بجائے ایک لونڈے کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہارا وہ لمبو ساتھی، کیا نام ہے اس کا، نادر ڈی ڈی یا نادر ٹی ٹی۔''

''نادر ٹی ٹی نے کیا کر دیا ہے تمہارے ساتھ؟''

''یہی تو پتا کرنا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

سلطان کچھ دیر گہری نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کرشمہ کپور کی طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ ''نیتو! جاؤ نادر کو بلاؤ یہاں۔''

نیتو اپنی کمر کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دیوار پر شاندار ایل سی ڈی موجود تھا۔ کوئی انگلش فلم چل رہی تھی۔ فٹ بال میچ کے دوران میں بار بار تالیوں کی آواز گونجتی تھی۔ سلطان

کے سامنے میز پر تین سیل فون پڑے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون میں وائبریشن بھی ہو جاتی تھی مگر سلطان کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ سلطان کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ چٹانی جسم کا مالک، ایک خطرناک صورت بدمعاش تھا۔ خاص طور سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھنے والے کو ہراساں کرتی تھیں۔

عمران اور سلطان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ''ہم پیشہ'' کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس سے پہلے بھی ان کی دو چار دھواں دھار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ سلطان نے تین فرنچ گلاسوں میں انڈین بیئر انڈیلی۔ سلطان اور عمران تو غٹاغٹ پی گئے، میرا گلاس وہیں دھرا رہا۔ چند منٹ بعد خوبرو نیتو پھر کمر لچکاتی آ گئی۔ اس نے شاید اپنی آنکھوں کا رنگ کرشمہ کپور سے ملانے کے لئے نیلے لینسز لگا رہے تھے۔ نیتو کے عقب میں ایک دراز قد شخص چلا آ رہا تھا۔ اس کا قد یقیناً ساڑھے چھ سے نکلتا ہوا تھا۔ جسم اکہرا لیکن مضبوط تھا۔ اس نے گہرے رنگوں کی پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔

اس نے سپاٹ لہجے میں عمران کو سلام کیا۔ عمران نے جواب دیا۔ سلطان کی ہدایت پر یہ نادر نامی شخص ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران نے نادر کی آنکھوں میں دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے اچانک کہا۔ ''پچھلے بدھ کی رات دس بجے کے بعد تم کہاں تھے نادر؟''

نادر کے سانولے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس نے تعجب سے پہلے اپنے باس سلطان اور پھر عمران کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' نادر نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''تم میری بات کا جواب دو نادرے...... اور دیکھو، بالکل سچ بولنا۔ جھوٹ بولو گے تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر جو کچھ ہوگا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔''

سلطان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پولیس میں بھرتی نہیں ہو گئے ہو۔ بالکل تھانیداروں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ اگر حکم کرو تو ہم دونوں نیچے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ تم اچھی طرح تفتیش کر سکو۔'' سلطان کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

''ضرورت پڑی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کم از کم تمہارے اس نادرے کے ساتھ تو ضرور ہو سکتا ہے۔''

''تمہیں شبہ کیا ہے؟''

''شبہے تو بہت سے ہیں سلطان جی۔ فی الوقت میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بدھ کی

رات تمہارا یہ چمچہ کہاں تھا؟''

سلطان چٹے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''تم بدھ کی رات کہاں تھے نادر؟''

نادر کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا ابھرا۔ وہ کچھ دیر تک سوچ کر بولا۔ ''بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی کوٹھی پر پروگرام تھا۔ چھوٹے وزیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ میں آپ کے ساتھ ہی تھا۔''

سلطان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی چھوٹی بیٹی کا پہلا مجرا تھا۔ بڑے ملے گلے والی محفل تھی۔ میں اور نادر وہیں تھے۔ صبح تین بجے کے قریب واپسی ہوئی تھی۔''

''تین کہاں جی، چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔'' نادر نے کہا۔

''لیکن بات کیا ہے؟ نادر نے کسی کی ماں، بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟'' سلطان خشک لہجے میں بولا۔

''کسی کی ماں،، بہن والا معاملہ بھی ہے لیکن یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس سے کہو اپنی قمیص اتارے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! فرانسیسی تو نہیں بول رہا۔ نہ ہی فرانسیسی گلاس میں بیئر پینے سے کوئی فرانسیسی بولنے لگتا ہے۔ اس سے کہو قمیص اتارے۔''

نادرے کی آنکھوں میں چنگاریاں نظر آنے لگیں۔ سلطان کی آنکھیں بھی کچھ اور ڈراؤنی ہو گئیں۔ وہ بولا۔ ''دیکھو ہیرو! تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ اس وقت تم میرے ڈیرے پر ہو۔ تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔ برداشت کا زیادہ امتحان نہ لو۔ معاملہ بتاؤ کیا ہے؟''

''معاملے کا پتا تو قمیص اتارنے سے ہی چلے گا۔ اس لمڈھینگ سے کہو قمیص اتارے۔''

عمران کا لہجہ حیران کن حد تک بے باک تھا۔

نادرے کو دوسری بار چمچے کا خطاب ملا تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ایک قدم آگے آ کر بولا۔

''اتار دیتا ہوں قمیص...... کہو تو پینٹ بھی اتار دیتا ہوں۔ کیا کیا دیکھنا ہے تم نے؟''

''بڑے بے غیرت ہو۔ اپنی اس ہمشیرہ کرشمہ کپور کے سامنے ہی سب کچھ دکھا دو گے۔'' عمران اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

عمران کا خطرناک انداز دیکھ کر سلطان چٹا ایک دم عمران کے سامنے آ گیا۔ ''ایک منٹ......ایک منٹ۔'' سلطان نے اپنے بے پناہ طیش کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

عمران پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دراز قد نادرو ہیں ساکت کھڑا رہا۔ اس کا سانولا سلونا چہرہ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ سلطان چٹے کے محتاط انداز سے صاف عیاں تھا کہ اس سے پہلے عمران سے اس کا واسطہ پڑ چکا ہے......اور اسے پتا ہے کہ عمران کس ٹائپ کا بندہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بات کو بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے دھیمے انداز میں نادرے کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کوئی بات نہیں نادرے، یہ مہمان ہے اپنا۔ چل کر ہمارے پاس آیا ہے۔ تُو کون سی لونڈیا ہے۔ مان لے بات اس کی۔''

نادرا کچھ دیر خشمگیں نظروں سے عمران کو تکتا رہا۔ کچھ دیر کے لئے تو لگا کہ وہ سلطان کی بات بھی نہیں مانے گا اور اچانک عمران پر حملہ کر دے گا۔ مجھے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔ یہاں ہمیں مار کر دفن کر دیا جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ یہ عمران ہی تھا جو جنگلی جانوروں کی طرح اس کچھار میں گھسا تھا اور اب بڑے اطمینان سے کشیدگی بڑھا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد نادرے نے اپنا ہاتھ قمیص کی طرف بڑھایا۔ پہلے اسے پتلون کے اندر سے کھینچا پھر بٹن کھول کر اتار دیا۔

''بنیان بھی اتارو۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔

اس نے بنیان بھی اتار کر پھینک دی۔

ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں تالیوں کی زوردار آواز گونجی۔ یوں لگا جیسے یہ تالیاں، نادرے کے بنیان اتارنے پر بجائی گئی ہوں۔

عمران اٹھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں اس نے گھوم پھر کر نادرے کے جسم کا معائنہ کیا۔ اس کا سانولا جسم جیسے فولادی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ کمر پر ایک ٹیٹو بھی دکھائی دیتا تھا۔ عمران نے نادرے کی پتلون کے دونوں پائنچے پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچے اور گھٹنوں تک اس کی پنڈلیوں کا معائنہ بھی کیا۔ ایک دم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بننے والی زرینہ نے بتایا تھا کہ رخشی نے دراز قد پٹھان کی زبردست مزاحمت کی تھی۔ رخشی کے ناخنوں میں اس کے گوشت کے ریزے بھی تھے۔ عمران شاید یہی ثبوت دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن یہ ثبوت یہاں موجود نہیں تھا۔

عمران واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''پہن لو قمیص۔'' اس نے نادر ٹی ٹی سے کہا۔

وہ غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر قمیص بنیان پہننے میں مصروف ہو گیا۔

''کچھ ہمیں بھی بتاؤ تھانیدار صاحب یہ کس چیز کی تفتیش ہو رہی ہے؟'' سلطان نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اسی چیز کی جو تم جلالی کے فارم ہاؤس میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو اور جس کی خاطر تم نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کرایا ہے۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''تمہاری سمجھ دانی اتنی چھوٹی نہیں۔ تم گھنے بن رہے ہو۔ جو کچھ تم اور تمہارا باس جاوا، فارم ہاؤس میں کر رہے ہو وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اپنے ایک بندے کی اتفاقیہ موت کا بدلہ لینے کے لئے تم نے فارم ہاؤس پر جو قیامت ڈھائی ہے، اس کا حساب بھی دینا ہو گا تمہیں۔ آج نہیں تو کل......کل نہیں تو پرسوں۔''

''تم ثبوتوں کے بغیر ایک بیکار بات کر رہے ہو ہیرو۔ اس طرح تو کسی پر کوئی بھی الزام لگایا جا سکتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ منگل کے روز سبزی منڈی میں جو بم دھماکا ہوا ہے، وہ تم نے کیا ہے......تمہارا اباس جان محمد بھی تمہارے ساتھ تھا۔ اور اس سے پہلے کوپر روڈ پر مارے جانے والے تین پولیس اہلکار بھی تمہاری ہی گولیوں سے چھلنی ہوئے تھے، وغیرہ وغیرہ۔''

''میں ہوائی باتیں نہیں کروں گا۔ ثبوت دوں گا اور جب ثبوت آ جائے گا تو پھر تمہارے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا اور نہ ہی کسی رو رعایت کی توقع رکھنا۔''

''ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم جیسوں سے رعایت مانگوں۔ اور تم اتنی بڑی بات کرو جتنا تمہارا منہ ہے۔ زیادہ وزن اٹھانے سے بندہ کبھی کبھی وزن کے نیچے بھی آ جاتا ہے۔''

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا سلطانے......اور یہ بات اپنے گرو جاوے کو بھی بتا دینا۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو سامنے مجھے کھڑا پاؤ گے۔''

''چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ہم جاوا صاحب کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔ باقی تم نے اچھا کیا کہ بتا دیا کہ اب تم جلالی کے چوکیدار ہو۔'' سلطان نے کہا پھر ذرا وقفہ دے کر بولا۔ ''تم چل کر یہاں آئے ہو۔ تمہاری عزت کر رہے ہیں۔ ورنہ بہت سے لوگ یہاں آنے کے بعد کہیں جانے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ میں اب بھی تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بدھ کی رات کو اگر کسی فارم ہاؤس میں کوئی واردات شاردات ہوئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ بدھ کی رات......''

''تم فیروزہ بائی کے بالا خانے میں تھے...... اور وہاں نوٹوں کی گڈیاں چھت والے پنکھوں میں مار رہے تھے۔'' عمران نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا......

''یہ قصہ چہار درویش کسی اور کو سنانا سلطانے۔ تیرے جیسے وارداتیے واردات کی رات کو بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھوت پریتوں کو ڈنڈے مار مار کر ایک ہی قالب میں گھسانے کا فن مجھے آتا ہے......''

سلطان چٹے کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے انگارہ ہو گیا۔ اس نے چٹکی بجائی اور گرانڈیل گن مین سے کہا۔ ''ان دونوں تھانیداروں کو عزت سے باہر لے جاؤ۔ ان کے ستارے گردش میں آ گئے تو بڑی مٹی پلید ہونی ہے ان کی۔''

عمران کچھ دیر تک سلطان چٹے کی ڈراؤنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جا رہا ہوں لیکن اگلی ملاقات بھی جلد ہی ہوگی۔''

O......❖......O

ہم واپس مڑے۔ واپس مڑتے ہوئے عمران نے کرشمہ کپور کی ہم شکل کو آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ہم دروازے سے نکل کر قالین پوش کوریڈور میں پہنچے۔ دائیں طرف سنگِ مرمر کی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر بھی اکا دکا لوگ موجود ہیں۔ ویکیوم کلینر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اچانک ایک مدھم آواز نے عمران کو چونکا دیا۔ یہ بلی کی آواز تھی۔ چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ یوں لگا جیسے وہ بلی پکار رہی ہے۔ وہ کس کو پکار رہی تھی؟ یکا یک میرے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بلی کی یہ خاص انداز کی آواز میرے لئے نئی نہیں تھی۔ میں نے یہ آواز پہلے بھی فارم ہاؤس میں سنی ہوئی تھی۔ پکارتی ہوئی سی یہ آواز پھر بلند ہوئی۔ یہ نایاب ایرانی بلیوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی۔ مجھے عمران کے چہرے پر ہیجانی تاثرات نظر آئے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور واپس سلطان کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب گرانڈیل گن مین نے عمران کی طرف گن سیدھی کرنا چاہی۔ میں گن مین سے قریب تھا۔ میں نے زور سے ٹانگ چلائی۔ گن اس شخص کے ہاتھ سے نکلی اور راہداری کا ایک شیشہ توڑتی ہوئی باہر جا گری۔

ایک دوسرے شخص نے اپنی کمر کے ہولسٹر سے پستول نکالنا چاہا مگر وہ عمران کی پھرتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عمران چیتے کی طرح لپک کر اس پر جا پڑا۔ دونوں اوپر نیچے نیم عریاں لڑکی نیتہ کے قریب گرے۔ وہ چلا کر صوفے پر چڑھ گئی۔ میں نے گرانڈیل گن مین کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور ٹکر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ دوسری ٹکر نے اس کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔

یہی وقت تھا جب میں نے ایک دل ہلانے والا منظر دیکھا۔ عمران اپنے مدِ مقابل کے اوپر تھا اور سلطان چٹا اسے اپنے پستول کی زد میں لے چکا تھا۔ کسی بھی وقت دھماکے کی آواز

سے گولی عمران کی کمر میں داخل ہوسکتی تھی لیکن اس وقت عمران کی ''کِک'' نے پھر کام دکھایا۔
صوفے پر چڑھی ہوئی نیتو عرف کرشمہ کپور کو پتا نہیں کیا ہوا، اس نے بدحواسی میں چھلانگ لگائی اور عمران کو پھلانگ کر دروازے کی طرف جانا چاہا۔ سلطان کی چلائی ہوئی گولی نیتو کی برہنہ ٹانگ میں لگی اور وہ چلا کر دھڑام سے شیشے کی تپائی پر گری۔ عمران کے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ اس نے اپنے جسم کی پیشہ ورانہ لچک کا بھرپور استعمال کیا...... بڑی تیزی سے خود کو قالین پر رول کیا۔ سلطان کے پاؤں سے ٹکرایا اور اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ سلطان نے گرتے ہوئے جو دوسرا فائر کیا، وہ نہ جانے کس طرف گیا۔ ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں ایک بار پھر زوردار تالیاں گونجیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا۔

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ مزید مسلح لوگ آرہے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ گن مین کے ہاتھوں سے جو رائفل نکلی تھی، وہ باہر جا گری تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران ایک بدلا ہوا شخص نظر آیا۔ ایک لرزا دینے والی سفاکی نے اس کے چہرے کو ہی نہیں، پورے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پتلے دستے والا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا پھل سلطان چٹے کی شہ رگ پر دھرا تھا۔ عمران کے ہاتھوں میں سلطان چٹا یکسر بے بس نظر آیا۔ سلطان کا پسٹل بھی اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ ''خبردار!'' عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ ''کوئی آگے آیا تو یہ مارا جائے گا۔''

لپک کر آنے والے مسلح افراد جہاں کے تہاں رک گئے۔ ان میں نادر ٹی ٹی بھی تھا۔
عمران نے سلطان کو عقب سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ اس نے چاقو کا پھل اتنی سختی سے سلطان کی گردن پر رکھا ہوا تھا کہ وہاں کٹ لگ چکا تھا اور خون رِسنا شروع ہوگیا تھا۔ تھوڑا سا دباؤ بھی بڑھتا تو یقیناً سلطان کی اہم رگیں کٹنا شروع ہوجاتیں۔ عمران عجیب انداز میں پھنکارا۔ ''دیکھو سلطانے! یہاں ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا لیکن تُو اسے دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔ تیری زندگی کی ڈور بس کٹی کہ کٹی۔ اپنے ان پالتو کتوں سے کہہ، ہتھیار پھینک دیں اور چار چار قدم پیچھے ہٹ جائیں۔''

سلطان کو اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ ایک ''جنونی گرفت'' میں ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہوجائے گا۔ اس کی پیشانی پر پسینا نمودار ہوچکا تھا۔ اس کی نیتو عرف کرشمہ کپور قالین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ سلطان نے نادر ٹی ٹی کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ نادر نے رائفل قالین پر پھینک دی۔ اس کے دوساتھی گارڈز نے بھی تقلید کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ نادر کی حالت زخم کھائے ہوئے سانپ جیسی تھی۔ وہ دو تین قدم سے زیادہ پیچھے نہیں ہٹا

تھا۔ شاید اس کی نیت میں ابھی فتور تھا۔ عمران دہاڑا۔ ''اور پیچھے ہٹ۔ نہیں تو تیرا یہ باپ جا رہا ہے۔'' اس نے سلطان کی گردن پر تیز دھار چاقو کا دباؤ کچھ اور بڑھایا۔ سلطان مچلا۔ خون تیزی سے رِسنے لگا...... عمران کے تیور دہلا دینے والے تھے، چاقو کی کارکردگی بھی بے مثال تھی۔ نادر مزید پیچھے ہٹ گیا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا کہ میں نادر والی رائفل اٹھالوں۔
میں نے رائفل اٹھالی...... اور باقی دو رائفلوں کو پاؤں سے دھکیل کر صوفے کے نیچے پہنچا دیا۔ رائفل کو چیک کرتا ہوا میں الٹے قدموں دروازے کی طرف گیا اور اسے اندر سے لاک کر دیا۔

دروازہ بند ہوجانے کے باوجود ایرانی بلی کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچتی رہی۔ شاید اس نے عمران کی خوشبو پالی تھی اور اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی......
عمران نے سلطان کی جیب سے ایک اور پستول برآمد کرلیا تھا اور اب یہ پستول اس کی کنپٹی پر تھا۔ اپنا اسپیشل ڈیزائن کا چاقو اس نے بند کر کے پتلون کی سائیڈ پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔

کمرے میں گھمبیر سناٹا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ راہداریوں کے ساؤنڈ پروف دروازوں کی وجہ سے یہاں ہونے والے دو فائروں کی آواز باہر تک نہیں گئی۔ جن تین لوگوں تک یہ آواز پہنچی تھی، وہ یہاں آن موجود ہوئے تھے۔ عمران آتشیں لہجے میں بولا۔ ''سلطانے! لگتا ہے کہ جانوروں سے تجھے بھی تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شاید چاروں بلیاں، جنگلی کتوں نے پھاڑ ڈالیں۔ لیکن تُو نے بڑی نیکی کی۔ ایک دو کو شاید بچالیا۔ کتنی بچی ہیں...... ایک یا دو؟''

سلطان بالکل خاموش رہا...... پتھر کی طرح ساکت۔
اچانک ایک شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ مجھ پر آنا چاہ رہا تھا۔ عمران نے گولی چلائی اور عین اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران کا پستول دوبارہ سلطان کی کنپٹی پر آگیا۔ یہ سارا عمل شاید ایک سیکنڈ کے اندر مکمل ہوا تھا۔ بدنصیب شخص پٹ سے اوندھی پڑی نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر گرا اور تب ہمیں علم ہوا کہ وہ نازک بدن تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوچکی ہے۔ عمران کی پھرتی اور نشانے کی سچائی نے باقی تینوں افراد کو مبہوت کر دیا تھا۔ عمران زہریلے انداز میں مسکرایا اور ایڈورٹائزمنٹ'' کے انداز میں بولا۔
''اسٹار سرکس...... لاجواب کھلاڑی...... بے مثال کمالات...... اور تمہارے لئے آخری وارننگ ٹی ٹی! کوئی حماقت نہ کرنا۔''

نادر ٹی جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سانولے رنگ میں ہلدی گھل گئی تھی۔ اس کے ساتھی کا حال بھی یہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں نے موت کے فرشتے کو مجسم حالت میں اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔

وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہاں، اس کے رنگ میں ہلدی کی آمیزش کچھ اور بڑھ گئی۔ عمران نے مجھے اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ ''جناب سلطان صاحب کے کھوپڑے پر رائفل کی نال رکھو اور چوں چراں کریں تو ایک سیکنڈ میں ان کا بھیجا فرائی کر دو...... بلکہ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگنا چاہئے۔ میں ذرا نادر جی کی خبر لے لوں۔''

میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کیا اور ٹرپل ٹو رائفل کی نال سلطان چٹا کے سر سے لگا کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران، نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''نادر جی! ذرا پینٹ اتار کر کچھ دکھائیے ہمیں۔ اب تو کرشمہ کپور صاحبہ بھی سو رہی ہیں۔ اب کون سی پردہ داری ہے؟''

نادر کے چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ سب کچھ بھول کر عمران پر جھپٹ پڑے گا، کبھی سکتہ زدہ نظر آنے لگتا۔ جب عمران نے دیکھا کہ نادر اپنے ہاتھ پتلون کی بیلٹ کی طرف نہیں بڑھا رہا تو اس نے پستول کا رخ نادر کی ٹانگ کی طرف کر کے بے دریغ گولی چلائی۔ دھماکے کے ساتھ ہی نادر لڑکھڑایا اور اپنی پنڈلی پکڑ کر جھک گیا۔ اس کی گرے پتلون دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہونا شروع ہو گئی۔

عمران کی سفاک آواز پھر کمرے میں گونجی۔ ''نادر جی! میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنی پتلون اتاریئے۔ آپ کے یہ خادم کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چلئے، جلدی کیجئے۔''

نادر ٹی مسلسل، کھا جانے والی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا لمبوترا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ عمران نے دوسری بار گولی چلائی اور یہ اس کی دوسری ٹانگ میں گھٹنے سے تین چار انچ اوپر لگی۔ اس بار وہ درد سے چلا اٹھا۔ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

''جناب عالی...... آخری بار مؤدبانہ گزارش ہے۔ پتلون اتاریئے۔ اس بار آپ کا یہ خادم جو گولی چلائے گا، وہ آپ کے ناریل شریف میں لگے گی۔'' عمران نے پستول کا رخ نادر ٹی کے سر کی طرف کر دیا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے۔ نادر ٹی نے بھی شاید اس کی آنکھوں میں اپنی موت پڑھ لی تھی۔ اس نے تکلیف سے کراہتے اور بل کھاتے ہوئے اپنے ہاتھ بیلٹ کی طرف بڑھائے اور پتلون انڈرویئر سمیت

گھٹنوں تک اتار دی۔ عمران کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جو وہ دیکھنا چاہتا تھا، اس نے دیکھ لیا تھا۔ نادرے کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ کی بائیں طرف دو کھرنڈ سے تھے۔ ایک بڑا تھا، دوسرا قدرے چھوٹا تھا۔ یہ دراصل کھرونچوں کے پانچ چھ دن پرانے نشان تھے۔ عمران نے ذرا قریب جا کر مزید دھیان سے ان کھرونچوں کو دیکھا۔

اب اس بات میں شبہے کی ذرّہ بھر گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ دراز قد ڈھاٹا پوش نادرے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جس نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کیا۔ رخشی کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطان چٹا براہِ راست اس واردات میں شریک نہیں تھا مگر سب کچھ ہوا اسی کی پلاننگ اور آشیرباد سے تھا۔ عمران کے اشارے پر نادرے نے اپنی پتلون اوپر چڑھا لی۔

عمران اب نفسیاتی طور پر کمرے میں موجود تینوں افراد پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ تینوں اس کے سامنے ساکت و جامد موجود تھے۔ فقط سلطان چٹا میں تھوڑا بہت دم خم نظر آتا تھا مگر ٹرپل ٹو رائفل کی نال اس کی کھوپڑی سے لگی ہوئی تھی۔ نادر کو دو گولیاں لگ چکی تھیں اور خون اس کی دونوں ٹانگوں سے بہہ رہا تھا۔ قالین پر گل کاریاں کر رہا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''ذرا ہوشیار رہنا جگر! میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔''

میں نے سر ہلا کر عمران کو تسلی دی۔ وہ ساگوان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران کی گود میں وہی شاندار ایرانی بلی تھی جس کی آواز پر ہم رکے تھے اور یہ سارا نقشہ تبدیل ہوا تھا۔ یہ نایاب حاملہ بلی عمران کی گود میں آ کر ایک دم شانت تھی، اس کے سینے سے اپنا سر رگڑ رہی تھی۔ اس کی ٹائی سے کھیل رہی تھی۔

عمران نے زہرناک نظروں سے نادر کو دیکھا...... اور بولا۔ ''نادر صاحب! اسی لئے مشہور باکسر محمد علی کلے نے اپنی سرائیکی شاعری میں کہا ہے، جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔ ایسی خوبصورت سرائیکی میں نے کہیں نہیں پڑھی اور تم نے تو بالکل بھی نہیں پڑھی ہو گی ورنہ تم واردات کی رات یہ بلی اٹھانے کی غلطی نہ کرتے۔ اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے نادر صاحب! تم نے اس رات ہر وہ کام کیا ہے جو تمہیں سزائے موت دینے کے لئے کافی ہے۔ تو کیوں نا اس سلسلے میں جناب کی تھوڑی سی مدد کی جائے۔ کتنا لمبا سفر کرنا پڑے گا جناب کو! تھانہ، عدالت، جیل، وکیل، وکیل کی فیسیں، اپیلیں، ہبلیں...... اور پتا نہیں کیا کچھ؟ تو کیوں نا آپ کو شارٹ کٹ لگوا دیا جائے۔ آپ کے رتبے اور مرتبے کے لحاظ سے بھی آپ کو یہ آسانی ملنی چاہئے۔''

نادر کا رنگ یکسر ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عمران کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا، جیسے بہ زبانِ خاموشی اسے مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ لیکن سلطان کیا کرتا؟ وہ تو خود موت کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا...... وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اچانک نادرے کا پندار ٹوٹ گیا۔ اس کی ساری اکڑفوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دہشت زدہ عاجزی میں ڈھل گئی۔ موت کو سامنے دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت میں آج پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ نادرا گھگیایا۔ ''دیکھو...... مم...... میں بڑے کام کا بندہ ہوں۔ مجھے ایسے ضائع مت کرو۔ جو کچھ کر رہا ہوں روزی روٹی کے لئے کر رہا ہوں۔ میں...... تمہارے لئے کام کرنے کو تیار ہوں۔ میں...... وقت پڑنے پر جان دے سکتا ہوں۔''

''تو وقت پڑ گیا ہے نا جناب نادر صاحب! مجھے آپ کی روح قبض کروانی ہے۔''
عمران نے انگلی کا دباؤ پھر ٹریگر پر بڑھا دیا۔ نالی کا رخ نادرے کے سر کی طرف تھا۔ بہرحال، اس نے گولی چلائی نہیں۔ نادرا تڑپ کر اوندھے منہ عمران کے پاؤں میں گر گیا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں۔ مم...... میں نے بس سلطان کا حکم مانا۔ یہ سامنے کھڑا ہے۔ پوچھ لو اس سے۔ بس یہی میری غلطی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لئے معاف کر دو۔''
عمران پھنکارا۔ ''تم نے سلطان کا حکم مانا لیکن اس ڈیوٹی میں سارا مزہ تو تمہیں ہی آیا نا۔ رات بھر تم نے فارم ہاؤس میں مفت کی شراب پی۔ لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے رہے۔ بے وجہ قیمتی چیزیں برباد کر کے اپنے اندر کے جانور کو تسکین دیتے رہے، یہ سب کچھ تم نے کیا یا نہیں؟''

''مم...... میں اپنا یہ قصور مانتا ہوں۔ میں نے یہ سب کیا۔ میں نے زیادہ شراب پی لی تھی...... میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں سچے دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تم جو کہو گے میں وہ کروں گا۔ بس مجھے ایک موقع دے دو۔ خدا کے لئے...... میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔''

عمران پھنکارا۔ ''اس طرح کی منت سماجت اس ملازمہ نے بھی کی ہو گی جسے تم نے زخم زخم کر کے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا ہے...... اور شاید اعجاز نے بھی کی ہو جس کے نئے نئے دولہا بنے بھائی کو تم نے دو بار سیڑھیوں سے گرا کر موت کے گھاٹ اتارا۔''
عمران نے ٹریگر پر دباؤ اور بڑھایا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب گولی کسی وقت چل سکتی ہے۔ پستول کا رخ نادرے کے عین سر کی طرف تھا اور عمران کے نشانے کی سچائی تھوڑی دیر

پہلے نادرا اور سلطان دیکھ ہی چکے تھے۔
سلطان ہمت کر کے بولا۔ ''دیکھ ہیرو اتنا ہی بوجھ اٹھا جتنا جھیل سکے۔ اگر تم نے......''
''چپ۔'' عمران دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی جو سلطان کے کان کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کان پر رکھ لیا۔ خون کی ایک دھار اس کی انگلیوں کی درز سے نکل کر ہاتھ کی پشت پر بہنے لگی۔ اس کا چہرہ تکلیف اور زلزلے کی آماجگاہ بن گیا۔ عمران نے اسی لہجے میں کہا۔ ''اگر بکواس کرو گے تو دوسرے کان میں بھی جھمکا ڈالنے کی جگہ بنا دوں گا۔''
کمرے میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نادرے کی موت اب یقینی ہے۔ نادرا آخری کوشش کے طور پر بولا۔ ''میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ تمہارے کام کی باتیں...... بہت زیادہ کام کی باتیں۔'' اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
عمران نے کہا۔ ''تم کیا بتاؤ گے۔ تم دونوں تو خود اندھے کتے ہو اور ہرن کا شکار کر رہے ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی۔ یہ گولی نادرے کی دائیں آنکھ اور ناک کے بانسے کے درمیان لگی، وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور پھر کروٹ کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ ایل سی ڈی پر چلنے والی فلم میں ایک بار پھر تالیوں کی گونج تھی۔
سلطان چٹا جیسے گنگ ہو چکا تھا۔ بس متوحش نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون آلود ہاتھ بدستور اپنے زخمی کان پر تھا۔ قطرہ قطرہ خون اس کی بالوں بھری کلائی پر رینگ رہا تھا۔ اب کمرے میں ہمارے علاوہ بس دو افراد موجود تھے...... اور ان میں سے بھی ایک زخمی تھا۔ یعنی سلطان چٹا۔ اس کا ساتھی صم بکم کی تصویر بنا دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اپنے بڑوں کا حال دیکھنے کے بعد اس کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ عمران کے ایک اشارے پر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ سامنے ہی ایک شوکیس کے بالائی خانے میں ایک ویڈیو کیمرا نظر آ رہا تھا۔ اس پر ایک بڑا سا لینس چڑھا ہوا تھا۔ سائز کے اعتبار سے بھی یہ کیمرا پروفیشنل ٹائپ نظر آتا تھا۔ عمران نے سلطان چٹے کے ساتھی کو حکم دیا کہ وہ شوکیس پر سے کیمرا اتارے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ عمران نے کیمرے کی چارجنگ وغیرہ چیک کی۔ وہ ورکنگ پوزیشن میں تھا۔
''کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔
''یار دیکھو! اتنا زبردست رومانی سین ہو رہا ہے بلکہ ''رومانی'' بھی چھوٹا لفظ ہے۔ دیکھو تو سہی۔'' عمران نے بے ہوش پڑی کرشمہ کپور کی طرف اشارہ کیا۔ عمران کی پہلی گولی سے ہلاک ہونے والا مشٹنڈا اوندھے منہ نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر ہی گرا تھا اور قدرتی طور پر یہ

ایک عجیب سا اسٹائل بن گیا تھا۔ کوئی دور سے دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ جذبات سے مغلوب ایک جوڑا یہاں قالین پر ہی اپنی ''حسرتیں نکالنے'' کا ارادہ رکھتا ہے۔

عمران نے میرے ہاتھ سے گن لے کر مجھے کیمرا تھما دیا اور بولا۔ ''چلو جگر! تم ریکارڈنگ شروع کرواور اوپننگ سین اسی کرشمہ کپور کا رکھو۔ چلو شاباش۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسی سے دنیا و آخرت میں بھلا ہوگا۔''

میں سمجھ گیا کہ اس ریکارڈنگ سے عمران کا کوئی خاص مقصد ہے۔ میں نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ بے سُدھ پڑی نیتو عرف کرشمہ کا ایک شاٹ لیا پھر کیمرے کو پین کر کے سلطان چٹا کو فوکس کیا۔ اس کی کنپٹی پر رائفل کی نال تھی اور عمران کی انگشت شہادت ٹریگر پر تھی۔ سلطان کے تاثرات کو ریکارڈ کرنے کے بعد میں کیمرے کو نادرے کی خونچکاں لاش پر لے آیا۔ وہ کروٹ کے بل پڑا تھا۔ چہرے کے علاوہ اس کی دونوں ٹانگوں سے بھی مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے صحت مند جسم میں خون کی خاصی فراوانی تھی۔ شاید یہ فراوانی اور حرارت ہی نادرے جیسے بدمعاشوں کو درندہ صفت بناتی ہے۔ وہ سرتا پا آتش بنتے ہیں۔ لوگوں کو جلاتے ہیں اور پھر دو چار سالوں میں خود بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔

ایرانی بلی عمران کی ٹانگوں میں لوٹ رہی تھی۔ کبھی اس کے پاؤں سے سر رگڑنے لگتی، کبھی ایک دم رخ پھیر کر نادرے اور اس کے ساتھی کی لاشوں کو دیکھنے لگی...... اور یوں محسوس ہوتا کہ یہ مناظر اسے حیران کر رہے ہوں۔

عمران نے بڑی تسلی سے سلطان چٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اب تم بتاؤ سلطانے! تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔''

''مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔'' سلطان چٹے نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل کہا۔

''لیکن اگر تم کو چھوڑ دوں گا تو تم اچھا نہیں کرو گے۔ اس نادرے کا خون چہرے پر ملو گے اور مجھے مارنے کی قسم کھا لو گے۔''

''مم...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔'' اس نے آخری الفاظ زور دے کر کہے۔

''تم سامنے نہیں آؤ گے تو تمہارا باپ جاوا آئے گا۔ تم اس کی بات نہیں مانو گے تو لوگ تمہیں جاوے کی حرامی اولاد کہیں گے۔ کیا تم حرامی کہلوانا پسند کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی لگے ہاتھوں مجھ سے اپنا قصہ پاک کروا ہی لو۔ یہاں بڑا لمبا چوڑا ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ تم

بڑی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے۔ بڑا فائیو اسٹار مشورہ دے رہا ہوں تمہیں۔''

سلطانے کی صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے گا، یعنی نتائج سے بے پروا ہو کر عمران سے بھڑ جائے گا یا پھر اسے کوئی ہارٹ اٹیک قسم کی چیز ہو جائے گی۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا سلطانے! تمہیں ایک موقع دیتے ہیں...... امید ہے کہ تم خیرسگالی کے اس جذبے کی قدر کرو گے اور اپنے والد جاوے کو بھی ایسا کرنے کے لئے کہو گے۔ جب تک میں فارم ہاؤس میں ہوں، جاوے نے یا اس کے کسی کتے نے جلالی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو سمجھو جنگ چھڑ گئی۔ امید ہے کہ جاوا میرے بارے میں تھوڑا بہت تو جانتا ہو گا۔ مزید تفصیل اسے تم بھی بتا سکتے ہو۔ تمہارے ساتھ تو خاکسار کی دو چار ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔''

سلطانے نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جمی ہوئی موت کی زردی میں زندگی کی چمک نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن اسے اب بھی پورا یقین نہیں تھا کہ وہ موت کے اس ناگہانی گھیرے سے نکل گیا ہے۔

عمران نے کہا۔ ''میں اپنے الفاظ پھر دہرا رہا ہوں۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو پہلے مجھ سے سامنا ہو گا...... اور یہ سامنا معمولی نہیں ہو گا۔'' سلطان نے پھر مشینی انداز میں سر کو اثباتی حرکت دی۔ اس کی قمیص کا ایک کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

عمران نے ٹرپل ٹو رائفل کی مہلک نال بدستور سلطان چٹے کی کھوپڑی سے لگا رکھی تھی۔ یہ بڑا ڈرامائی سا سین تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔

عمران نے میری طرف دیکھا۔ ''چلو جگر! اب چلیں۔''

''لیکن کیسے؟'' سلطان صاحب کے گرگے ہمیں نکلنے دیں گے؟''

''نہ نکلنے دیں گے تو سلطان جی کا بھیجا بھی نادر صاحب کی طرح فرائی ہو جائے گا۔''

''لیکن اس کو گن پوائنٹ پر کہاں تک لے جائیں گے؟''

''اپنی گاڑی تک۔ جب گاڑی پر بیٹھ کر ڈیڑھ دو سو فرلانگ آگے نکل جائیں گے اور یقین ہو جائے گا کہ کوئی کتا بلا ہمارے پیچھے نہیں آ رہا تو سلطان جی کی تشریف پر لات مار کر...... نہیں...... نہیں...... یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ سلطان جی کو عزت کے ساتھ گاڑی سے اتار دیں گے اور خود شیخوپورہ پہنچ جائیں گے۔''

''شاید تم بھول رہے ہو۔ ہم گاڑی پر نہیں، موٹر رکشا پر تشریف لائے تھے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا دماغ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔'' عمران نے مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر سلطانے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

''پارکنگ میں پہلے فلور پر۔ ستون نمبر 18 کے پاس۔ کالے رنگ کی ٹویوٹا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، چلو...... یہ گاڑی تمہارا ڈرائیور شیخوپورہ سے واپس لے آئے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یار! کیا کر رہے ہو؟ پارکنگ لاٹ میں لوگ ہوں گے۔ دو چار پولیس والے بھی وہاں ٹہل رہے تھے۔ چوکیدار بھی ہیں۔ وہ اس کو گن پوائنٹ پر دیکھیں گے تو شور مچ جائے گا۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا ہے۔''

''یار! تم دیکھنا سارے نابینا ہو جائیں گے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

''تم ضرورت سے زیادہ بے پروائی تو نہیں کر رہے؟''

''تم ضرورت سے زیادہ ناسمجھی دکھا رہے ہو۔ ذرا غور کرو یار! تمہارے ہاتھ میں اتنا بڑا ویڈیو کیمرا ہے۔ تم باقاعدہ ریکارڈنگ کر رہے ہو۔ شکل وصورت سے بھی تم کسی پرائیویٹ پروڈکشن کمپنی کے ناکام ڈراما ڈائریکٹر ہی نظر آتے ہو۔ آج کل لوگ ایسی ریکارڈنگز کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔''

''یعنی تم......''

''ہاں، یعنی یعنی یہی کچھ......تم بس کیمرا آن رکھنا۔ باقی سب میرا کام ہے۔''

دو منٹ بعد ہم بڑی شان کے ساتھ سلطان چٹا کے اس خفیہ اڈے سے باہر نکل رہے تھے۔ ہم کم از کم دو ساؤنڈ پروف سلائڈنگ ڈورز میں سے گزرے۔ یہاں چوکس مسلح محافظ موجود تھے مگر اپنے باس کے سر پر رائفل کی نال دیکھ کر اور اس کا اُڑا ہوا رنگ اور رنگا ہوا کان دیکھ کر سب دم بخود رہ گئے۔ مزید احتیاط کے طور پر سلطان نے انہیں زبانی بھی کہہ دیا کہ وہ کسی طرح کی مہم جوئی نہ کریں۔ میں کیمرے کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ سلطان چٹا کے قدم کانپ رہے تھے اور اس کی گردن پر تیز دھار چاقو نے جو کٹ لگایا تھا، وہ بھی مسلسل خون افشانی کر رہا تھا۔

یہ بظاہر بے آباد کوٹھی اندر سے آباد تھی۔ یہاں ہر وہ انتظام کر دیا گیا تھا جس سے یہ بے آباد ہی نظر آتی۔ کچھ کھڑکیوں کے شیشوں پر گہرا سیاہ روغن پھیر دیا گیا تھا اور کچھ کھڑکیاں ویسے ہی بند کر دی گئی تھیں۔ مقصد یہی تھا کہ رات کے وقت یہاں ہونے والی روشنی سڑک پر سے نظر نہ آ سکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آخری دروازے میں سے نکلے اور انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں پہنچ

گئے۔ ایرانی بلی عمران نے سلطان چٹے کو تھما دی تھی۔ وہ اس بلی کے ساتھ کسی انگریزی فلم کا زخمی ولن ہی نظر آ رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اب چہل پہل کافی بڑھ چکی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم آٹھ دس قدم آگے گئے تھے کہ لوگوں کی نگاہ ہم پر پڑنی شروع ہو گئی۔ دیکھنے والوں کو سب سے پہلے سلطان کے خونچکاں چہرے نے ہی متوجہ کیا ہوگا۔ پھر عمران کی رائفل پر نظر پڑی ہوگی۔ لوگ متحیر نظر آئے۔ عورتوں اور بچوں کے چہروں پر ہراس نمایاں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے اور میرے کیمرے کو دیکھا۔ وہ متذبذب نظر آئے۔ ان میں سے زیادہ تر جلد ہی خود کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ یہ کسی ڈرامے وغیرہ کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ چند پولیس والے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی بس دیکھنے...... چونکنے......اور مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس دن مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہم لوگ اپنے اردگرد کے حالات سے کتنے لاتعلق ہو رہے ہیں۔ بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے سنگین وارداتیں ہو جاتی ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا...... یا پتا چلتا ہے تو ہم کوئی مناسب ردِعمل ظاہر نہیں کر پاتے۔ عمران نے جو اندازہ لگایا تھا، سو فیصد درست تھا۔ لوگوں نے بس دور دور سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ پولیس والے بھی جوں کے توں کھڑے رہے۔ صرف ایک کیمرے نے واقعی ہر شخص کی نظر بندی کر دی تھی۔ سلطان کے ڈرائیور نے ٹویوٹا کار کا دروازہ کھولا۔ عمران اور سلطان پیچھے بیٹھ گئے۔ عمران نے رائفل بدستور سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خطرناک ترین جگہ پر ہے۔ یہاں ہمارے اردگرد درجنوں قاتل موجود تھے۔ وہ ذرا سا موقع ملنے پر مجھے اور عمران کو چھلنی کر سکتے تھے۔ میں کیمرے سمیت اگلی نشست پر آ گیا۔ کیمرے کا رخ بدستور عمران اور سلطان چٹے کی طرف ہی تھا۔ سلطان کے ڈرائیور کی تلاشی ہم روانہ ہونے سے پہلے ہی لے چکے تھے۔ اب اس کے پاس گاڑی کی چابی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔

''کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟'' سلطان نے پوچھا۔

''نہیں، ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں مگر یہ رہائی مشروط ہے۔ میں نے تمہیں کوٹھی پر ہی بتا دیا تھا۔ اگر تیرے پالتو کتوں نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کی تو پھر ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا۔''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ کوئی پیچھے نہیں آئے گا۔'' سلطان نے اپنا زخمی کان دبائے دبائے کہا۔

"لیکن تسلی تو ضروری ہے نا جنابِ عالی! ایک پچھلی ملاقات میں تم نے خود ہی تو ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے پیشے میں اعتبار کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح عام لوگوں کے لئے شراب اور پرائی عورت۔"

سلطان چٹا دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ آج کا دن اس دبنگ شخص پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا پہلے جب وہ اپنے کمرے میں نیتو عرف کرشمہ کپور سے اپنے گورے چٹے جسم کی مالش کروا رہا تھا اور ایک پُرسکون شب گزارنے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنے دو قیمتی ساتھیوں سے ہاتھ دھونے والا ہے بلکہ دادا گیر کی حیثیت سے یادگار رسوائی کا شکار بھی ہونے جا رہا ہے۔

عمران نے عقب پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میں بھی گاہے بگاہے جائزہ لے رہا تھا۔ ہم مال سے گزر کر لوئر مال روڈ پر آ گئے، وہاں سے ہمارا رخ پہلے داتا دربار اور پھر راوی کے پل کی طرف ہو گیا۔ شیخوپورہ روڈ پر پہنچ کر عمران نے واقعی خیر سگالی کا مظاہرہ کیا۔ سلطان چٹے کو گاڑی سے اتار دیا۔

اب خطرے کی شرح کافی کم ہو چکی تھی۔ سلطان چٹا کسی پی سی او سے فون کر کے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرتا اور انہیں ہمارے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا بھی تو اس میں آدھ پون گھنٹا تو لگ ہی جانا تھا۔ تب تک ہم یقیناً شیخوپورہ اور فارم ہاؤس کے آس پاس پہنچ جاتے۔ بہرحال، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم بحفاظت فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ حاملہ بلی عمران کی گود میں تھی...... اور ویڈیو کیمرا میری گود میں۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے پاس ہی رہیں۔ ہم نے سلطان کے ڈرائیور کو گاڑی سمیت واپس بھیج دیا، یہاں تک کہ ٹرپل ٹو رائفل بھی واپس بھیج دی۔

○......❖......○

ہم کوٹھی میں پہنچے تو وہاں ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ ملازم سہمے ہوئے تھے۔ ملازم وحید کوریڈور میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اسے جلالی صاحب کا تھپڑ سہنا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی طرح جلالی صاحب کو ایرانی بلیوں کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ اس سلسلے میں ان سے سفید جھوٹ بولا گیا ہے۔ بدھ کی رات کوٹھی میں جہاں اور بہت سے سنگین واقعات ہوئے ہیں، وہاں لاکھوں روپے مالیت کی ایرانی بلیاں بھی جنگلی کتوں نے پھاڑ کھائی ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے ہراساں لہجے میں کہا۔ "بہت برا ہوا ہے۔ جلالی صاحب کا بلڈ پریشر ڈھائی سو سے اوپر چلا گیا تھا۔ ہارٹ بیٹ بھی دوگنا سے بڑھ گئی تھی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ

آج کچھ ہو جائے گا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ ابھی خطرہ ٹلا نہیں۔ میں نے انہیں سکون کا انجکشن دیا ہے اور بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والا کیپسول منہ میں نچوڑا ہے۔ کچھ دیر کے لئے غنودگی میں چلے گئے ہیں لیکن دل کی تکلیف کے سبب انہیں زیادہ غنودگی بھی نقصان دے سکتی ہے۔"

کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ عمران نے کہا۔ "لیکن انہیں پتا کیسے چلا ڈاکٹر...... بلیوں کے بارے میں آپ کے اور ندیم کے سوا کسی کو خبر ہی نہیں تھی؟"

"میں نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا...... اور مجھے یقین ہے کہ ندیم بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے فتح محمد کسی کام سے اوپر گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دوسری منزل کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہاں تین پنجرے ہیں۔ تینوں خالی تھے۔ فتح محمد نے آ کر جلالی صاحب کو بتا دیا۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا پھر جب یقین آیا تو قیامت آ گئی۔ وہ اتنا گرجے برسے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ خاص طور سے...... عمران صاحب آپ پر انہیں بہت غصہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ نے یا تابش صاحب نے بلیاں کہیں غائب کر دی ہیں یا اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ آپ کے پیچھے بندے دوڑانے لگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ کام زیادہ بگڑ گیا ہے تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا......"

"آپ نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو کہنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ بدھ کی رات جہاں اور بہت کچھ ہوا ہے، وہاں ان بلیوں کی بھی موت ہو گئی ہے۔ یہاں گھسنے والوں نے جنگلی کتوں کے غول کو بلیوں والے پنجرے میں گھسا دیا تھا۔ انہوں نے انہیں مار کھایا۔ پنجرے میں بس بلیوں کے بچے کھچے حصے ہی ملے۔ عمران نے اور ہم نے اس خوف سے کہ آپ کو صدمہ ہوگا، یہ خبر آپ سے چھپا لی۔"

عمران سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحبہ! دوسری منزل کا دروازہ کھولا کس نے؟ میں نے وہاں تالا لگایا تھا۔ وہ تالا کس نے کھولا اور فتح محمد کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس نے کھلا ہوا تالا دیکھا ہے؟"

ڈاکٹر مہناز نے ایک ملازم سے کہا کہ وہ فتح محمد کو بلا کر لائے۔ کچھ دیر بعد فتح محمد آ گیا۔ یہ شخص پہلے دن سے مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ ایک دم خاموش اور گہرا شخص تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی بولا۔ "آپ لوگوں کو مجھ پر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہی کچھ نہیں تھا۔ مجھے تو بس یہ بتایا گیا تھا کہ ایرانی بلیاں دوسری منزل کے پنجرے میں ہیں۔ میں بابے طفیل کے حقّے کے لئے سوکھی لکڑیاں لینے اوپر گیا تھا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر پنجروں کی طرف چلا گیا۔ تینوں پنجرے خالی پڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر صاحب جی کو بتا دیا۔"

''دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔وہ تالا تمہیں نظر نہیں آیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، تالا دروازے میں تو نہیں تھا۔آس پاس بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔اگر اس کی چابی صرف آپ کے پاس ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اسے کسی نے توڑ کر علیحدہ کر دیا ہوگا۔''

ہم نے دو چار سوال فتح محمد سے مزید پوچھے۔اس نے جیسے سارے جواب پہلے سے تیار کر رکھے تھے۔

جلالی صاحب ابھی تو سوئے ہوئے تھے۔یقینی بات تھی کہ یہ طوفان بہت دیر تک سویا نہیں رہے گا۔وہ جلد ہی جاگ جائیں گے اور ایک بار پھر بلیوں کے حوالے سے زبردست واویلا مچے گا۔اس واویلے کے کئی نتیجے نکل سکتے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ''حضرت'' کی حالت نازک ہو جاتی اور وہ اسپتال پہنچ جاتے۔ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔

''بلی کہاں ہے؟''

''میرے کمرے میں؟''

''کیا یہ اکیلی بلی جلالی صاحب کے غصے اور صدمے کو کم کر سکے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔''

''لیکن یہ بچ کیسے گئی؟ ہمارا تو خیال تھا کہ چاروں کا صفایا ہو گیا ہے۔

''یار! تمہیں محمد علی کلے کا سرائیکی شعر نہیں سنایا تھا جو چپ رہے گی زبان خنجر...... یہی بات مشہور فلم ڈائریکٹر ابو الاثر حفیظ جالندھری نے اپنی ایک پشتو فلم میں ایک کردار سے کچھ اور طرح سے کہلوائی ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ قاتل اور چیچک کا دانہ اپنی نشانی ضرور چھوڑتا ہے۔اور اگر قاتل کو چیچک بھی ہو تو پھر تو اس کا پکڑا جانا ایک دم یقینی ہے......''

''تمہاری معلومات پر اش اش کرنے کو دل چاہتا ہے۔چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہو تم۔''

''لیکن میں نے کبھی غرور نہیں کیا۔اکبر اعظم نے اپنے بڑے بھائی سکندر اعظم کو غالباً پانی پت میں شکست دینے کے بعد کہا تھا...... جو شاخ جتنی پھل دار ہوتی ہے، اتنی ہی جھکی ہوتی ہے۔''

''تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سکندر اعظم کافی پہلے پیدا ہوا تھا......کوئی پونے دو ہزار سال پہلے۔''

''اسی بات پر تو لڑائی ہوئی تھی۔اکبر اعظم کا کہنا تھا کہ پہلے اس نے پیدا ہونا تھا۔اکبر کا تو مطلب ہی ہوتا ہے ''بڑا'' یعنی بڑا بھائی۔اگر ایسی بات ہوتی تو اس کا نام اصغر اعظم ہوتا......'' وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ صرف دو تین گھنٹے پہلے ہم نہایت

سنگین حالات سے گزرے ہیں......اور ان حالات میں کم از کم دو افراد کا قتل بھی شامل ہے۔

وہ سیلانی روح تھا اور اور مجھے بھی اپنے ساتھ سیلانی بناتا چلا جا رہا تھا۔وہ تین منٹ بعد وہ چڑیا گھر والے پورشن کی طرف چلا گیا۔مجھے لگا جیسے وہ کسی کام سے گیا ہے لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کے اندرونی حصے سے جلالی صاحب کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔میں نے کچھ آگے جا کر سنا۔وہ اپنے ملازم وحید کو پھر سے بری طرح لتاڑ رہے تھے۔مجھے اندازہ ہوا کہ واردات کی رات وحید اور اس کا ایک ساتھی ZOO کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔وحید پر جلالی صاحب کا غصہ بے وجہ تھا۔واردات کے وقت جہاں پوری کوٹھی کے گارڈ بے بس ہو گئے تھے، وہاں وحید اکیلا کیا کرتا۔حملہ آوروں نے رات بھر وہی کیا تھا جو ان کا دل چاہا تھا۔

آوازوں سے اندر کی صورت حال واضح ہو رہی تھی۔جلالی صاحب گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی نرم ملائم آواز بھی سنائی دیتی تھی۔وہ جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی عاجزانہ کوشش کر رہی تھی۔کچھ دیر بعد جلالی صاحب کے غیظ و غضب کا رخ وحید سے جاوا وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔انہوں نے غائبانہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کو بے نقط سنائیں۔پھر اندازہ ہوا کہ وہ مقامی ایس ایچ او اکرام کے لتے لینے لگے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ یہ شخص مجرموں سے ملا ہوا ہے۔اسے ہر اونچ نیچ کی خبر ہے۔وہ دھاڑ رہے تھے۔

''یہ حرام خور......غدار ہے۔جب تک یہ کتا اس تھانے میں موجود ہے، مجھے انصاف نہیں مل سکتا۔اس نے میرا بیڑا غرق کیا ہے، میں اس کا بیڑا غرق کر دوں گا میں......اسے ویسے ہی ختم کر دوں گا۔میں ختم کر دوں گا۔'' ان کی آواز غصے کی شدت سے اجنبی محسوس ہونے لگی۔

پھر شاید جلالی صاحب کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔دو تین منٹ بعد ڈاکٹر مہناز ہانپتی ہوئی میرے پاس پہنچی۔''تابش! بہت گڑبڑ ہے۔جلالی صاحب رائفل لوڈ کر رہے ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ وہ ایس ایچ او اکرام خان کی طرف جا رہے ہیں......اور ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ پورچ تک بھی جا سکیں۔وہ ضرور اپنا نقصان کر لیں گے۔انہیں کسی بھی وقت برین ہیمرج یا ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔''

''کیا کیا جائے؟''

''ندیم کو بلاؤ۔اس کے پاس ایس پی حمزہ صاحب کا فون نمبر ہے۔شاید وہ جلالی

صاحب کو سنبھال سکیں۔''

اس سے پہلے کہ میں ندیم کی تلاش میں بالائی منزل کی طرف جاتا، عمران کمرے میں داخل ہوا۔ مہناز کا متغیر چہرہ دیکھ کر وہ چونکا۔ ''خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

مہناز نے وہ سب کچھ عمران کو بھی بتا دیا جو مجھے بتایا تھا۔ آخر میں وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا صبر اب جواب دے گیا ہے۔ وہ مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں اور یہ باتیں ان کی صحت کے لئے بہت خطرناک ہیں...... کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جناب ابھی تھوڑی دیر میں خود کو کافی بہتر محسوس کریں گے۔''

''لیکن کیسے؟'' مہناز نے پوچھا۔

''اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے۔ باقی جو تھوڑی بہت کسر رہ جائے گی، وہ میں ایک تازہ خبر سنا کر پوری کر دوں گا۔''

''تازہ خبر؟'' ڈاکٹر مہناز نے تعجب سے پوچھا۔

''جی ہاں...... آیئے، میرے ساتھ آیئے۔'' وہ بڑے ایکشن سے بولا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آگ بگولا جلالی صاحب کے سامنے تھے۔ جلالی صاحب بوٹ پہننے کے لئے موزے چڑھا رہے تھے اور یہی ''مشقت'' انہیں بری طرح ہانپنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، جلالی صاحب کی بوڑھی ناتواں آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا جیسے کوئی پر بریدہ پنچھی بے قراری کی انتہا کو چھو رہا ہو اور پھڑپھڑا رہا ہو۔ اس اضطراب کا تعلق یقیناً بدھ کی رات والے خونی واقعات سے تھا۔ جلالی صاحب کو اپنے تین وفادار ملازموں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ ایک درجن کے قریب سخت زخمی ہوئے تھے۔ دو عورتوں کی عزت پامال ہوئی اور بے زبان جانوروں تک کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ جلالی صاحب کا غم وغصہ سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن شدید غم وغصہ جلالی صاحب کی جسمانی حالت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ پریشان حال مہناز بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس سے آگے میں تھا۔ میرے آگے عمران۔

''کیا بات ہے؟'' وہ عمران کو اپنے سامنے دیکھ کر دہاڑے۔ ''کیا اب کوئی اور جھوٹ بولنا چاہتے ہو؟''

''نہیں سر! اپنے ایک پہلے جھوٹ پر آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''سر! میں نے 'ور تابش نے کل شام غلط کہا تھا کہ ہمیں ایک دوست کی شادی پر جانا ہے۔ ہم ایک اور کام سے گئے تھے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کام کے بارے میں سن کر ضرور خوش ہوں گے۔ دراصل ہم اس شخص کی طرف گئے تھے جس نے بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں قیامت مچائی اور آپ سمیت ہم سب کو بے حد دکھی کیا۔ ہم اس سے دو دو ہاتھ کرنے گئے تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں جی۔''

''کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہو...... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

عمران نے گہری سانس لی اور مسکین لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم کو گھوم پھر کر کام کرنے کی عادت ہے۔ ہمیں نئے نئے لوگوں سے ملنے میں مزہ آتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں کئی طرح کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ مدراس میں ہم نے سات آٹھ ماہ ایک گینگسٹر کے گھر میں بھی نوکری کی تھی۔ مجبوری تھی جناب! وہ ایک مشہور انڈین ایکٹر کا ماموں تھا۔ ہم نے ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے جناب! اس گینگسٹر سے بھی بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا، وہ آج رات بہت کام آیا ہے سر۔''

جلالی صاحب پھنکارے۔ ''اگر تم مسخری کر رہے ہو تو میں بہت بری طرح پیش آنے والا ہوں اور اگر سیریس ہو تو پھر...... یقیناً تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔''

''میں آپ کا خادم، ہوش میں ہوں سر! میں آپ کو زبانی بتاؤں گا تو شاید آپ یقین نہ کریں اور آپ کو مزہ بھی نہ آئے۔ میں آپ کو اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

جلالی صاحب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مہناز بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تجسس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر عمران اتنا بول رہا ہے تو پھر اس کے پاس کوئی ٹھوس وجہ بھی ہوگی۔

جلالی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عمران نے ویڈیو کیمرے کو سامنے شیشے کی ایک خوبصورت میز پر رکھ دیا۔ ویڈیو کیمرے کی اسکرین تقریباً چھ ضرب چار انچ کی تھی۔ عمران نے ریکارڈنگ چلا دی۔ پہلا منظر ہی چونکا دینے والا تھا۔ سلطان چٹے کے ساتھی کی لاش نیتو عرف کرشمہ کے اوپر پڑی تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا کہ کوئی جذبات انگیز کارروائی ہو رہی ہے۔ کیمرا پین کر کے عمران اور سلطان چٹے پر آیا...... عمران نے رائفل کی نال سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی اور کہہ رہا تھا کہ ''دکھاؤ دکھاؤ اس کتے کو بھی دکھاؤ، جس نے صاحب کے گھر گھسنے کی

حماقت فرمائی۔''

کیمرے نے حرکت کی اور فرش پر پہلو کے بل پڑے نادرے کی لاش دکھائی۔ اس کا کھوپڑا ٹوٹ چکا تھا اور ٹانگیں خونچکاں تھیں۔ خون ابھی اس کے جسم سے بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ پس منظر میں عمران کی آواز ابھری۔ ''اب تم بتاؤ سلطانے کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔''

''مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔'' سلطانے نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ کیمرا اس کے تاثرات کو بڑی خوبی سے دکھا رہا تھا۔ سلطان چٹا کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ جاوا جیسے شخص کا قریبی ساتھی تھا۔ ایسے لوگوں کو مرعوب کرنا آسان کام نہیں ہوتا مگر وہ مرعوب ہو چکا تھا اور اس کی وجہ یہ یقین تھا کہ عمران اس کو مار سکتا ہے۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔'' سلطان چٹے کی ریکارڈ شدہ آواز ابھری۔

''تم نہ آؤ گے تو تمہارا باپ جاوا آئے گا......'' عمران نے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس کمرے میں دو خونچکاں لاشوں کے درمیان عمران اور سلطانے نے جو بات چیت کی، اس نے بہت کچھ واضح کر دیا۔

جلالی صاحب حیرت سے گنگ سن رہے تھے۔ مہناز کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ہم دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ یہ ایک مکمل فلم بندی تھی۔ عمران نے سلطان کو گن پوائنٹ پر رکھا اور پھر پارکنگ لاٹ میں آ گیا۔ درجنوں لوگوں اور پولیس والوں کے سامنے اس نے زخمی سلطان کو گاڑی میں بٹھایا اور شاہراہِ قائداعظم کی جگمگاتی روشنیوں میں آ گیا۔

عمران نے ہاتھ آگے بڑھا کر کیمرا آف کیا تو جلالی صاحب چونک کر اس ریکارڈنگ کے سحر سے باہر نکل آئے۔ ان کا غیظ وغضب اب ایک طرح کی حیرت میں ڈھل چکا تھا۔

''یہ سب کیا تھا؟'' وہ لرزاں آواز میں بولے۔

عمران نے انہیں بتا دیا کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے تھا۔ یہ جان کر جلالی صاحب ششدر رہ گئے کہ ہم کل شام یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سیدھے جاوا کے ایک اڈے پر پہنچے تھے اور ہم نے اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے جس نے بدھ کی رات یہاں زبردست خون خرابا کیا۔ عمران نے جلالی صاحب کو یہ نکتہ بھی وضاحت سے بتایا کہ وہ لمبا شخص نادرا ہی تھا جو پشتو لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے پشتو لہجے کا سوانگ رچایا تھا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں

تھی کہ وہ تفتیش وغیرہ کا رخ ریان ولیم کے گروہ کی طرف موڑنا چاہتا تھا۔

ریکارڈنگ میں گاہے بگاہے ایرانی بلی بھی جلالی صاحب کو نظر آئی تھی۔ ان بلیوں میں جلالی صاحب کی جان تھی۔ وہ بلی کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور بہت سے دیگر سوالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔ ''یہ بلی بچ گئی ہے؟''

''جی سر! یہ اکیلی ہی بچی ہے۔''

''کہاں ہے؟'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

''یہیں میرے پاس ہے۔''

''اور باقی؟''

''وہ اب نہیں ہیں۔'' عمران کا لہجہ دکھ آمیز تھا۔ ''جنگلی کتوں نے انہیں مار ڈالا۔''

جلالی صاحب کے چہرے پر ایک بار پھر گہرے کرب کے آثار نظر آئے۔

عمران نے کہا۔ ''لیکن سر! میں نے آپ سے ایک اچھی خبر سنانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''کیسی......خبر؟''

عمران نے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ ''ڈاکٹر! کیا سر جی ہمارے ساتھ Zoo تک جا سکتے ہیں؟''

مہناز نے کہا۔ ''ان کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں جانے سے سر جی کی طبیعت میں بہتری آئے گی۔''

مہناز کے اجازت دینے سے پہلے ہی جلالی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے Zoo کے صاف ستھرے پنجرے تک لے آئے۔ رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا لیکن کوٹھی میں بیشتر لوگ جاگ رہے تھے۔ سکیورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز پوری طرح چوکس تھے اور ان کی سائرن بجاتی ایک گاڑی فارم ہاؤس کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہی تھی۔ ایک روشن پنجرے کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ خود مجھے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر چلے گئے اور تب ہم سب بری طرح چونک گئے۔ پنجرے کے ایک گوشے میں نرم پرالی کا بچھونا سا بنا ہوا تھا۔ اس بچھونے پر نایاب ایرانی بلی کے چار خوبصورت بلونگڑے موجود تھے اور ان کی ننھی منی رنگ دار آنکھیں نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایرانی بلی انہیں چومنے چاٹنے میں مصروف تھی۔ یہ ایک نہایت خوش کن منظر تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کچھ دیر پہلے عمران مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک کدھر چلا گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بچوں کی ڈلیوری کا

وقت قریب ہے۔

اس منظر نے واقعی جلالی صاحب پر حیران کن اثر مرتب کیا۔ ان کا جسم پھر کانپنا شروع ہو گیا لیکن اب یہ جسم غصے کی شدت سے نہیں، خوشی سے کانپ رہا تھا...... وہ بچوں کے قریب اکڑوں بیٹھ گئے۔ انہیں انگلی سے چھو چھو کر دیکھتے رہے۔ ان کی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ وہ بھی اپنا جسم جلالی صاحب کے بازوؤں سے رگڑتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ واقعی قابلِ دید تھے۔ ان رنگوں میں وہ اطمینان بھی تھا جو نئی زندگی کو وجود دینے کے بعد کسی ماں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

اچانک جلالی صاحب چونک گئے۔ وہ جیسے کسی سحر سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ بغور مجھے اور عمران کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں خاص طور سے عمران کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''آؤ چلیں۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور پنجرے سے نکل آئے۔

پنجرے کو بند کر کے ہم بھی جلالی صاحب کے ساتھ چل دیئے۔ پورچ کی تین چار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑائے تاہم ڈاکٹر مہناز نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بی پی چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ہم دونوں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔

''دیکھو، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میں سچ سننا پسند کروں گا...... تم کون ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''آپ کے...... خادم سر۔''

''ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن تم دونوں باورچی تو ہرگز نہیں ہو۔''

''میں تو سمجھتا ہوں سر...... ہم آپ جیسے بڑے آدمی کے باورچی بننے کے لائق بھی نہیں ہیں۔''

''بات کو گھماؤ پھراؤ مت...... کیا تم بھی اسی چکر میں ہو جس میں دوسرے ہیں؟''

''میرا خیال ہے سر کہ آپ کا اشارہ مورتی والے باکس کی طرف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جناب! اگر ایسا ہوتا تو تابش اس رات آپ کے پیچھے بھاگ کر آپ کو روکتا نہ، جب آپ باکس چیک کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ ہم ان لالچیوں میں نہیں ہیں سر اور نہ ہی کسی حوالے سے آپ کا برا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر کون ہو تم؟''

عمران نے بڑے مطمئن انداز میں اپنی ٹھوڑی کو کھجایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم جلالی صاحب کو بتاؤ تابش!''

''نہیں، تم ہی بتاؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

عمران نے ایک لمبی سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''سر! کہا جاتا ہے کہ دشمن کا دشمن، دوست ہوتا ہے۔ اس حوالے سے آپ ہم ناچیزوں کو دوست بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہمیں آپ کا خادم کہلانا زیادہ اچھا لگتا ہے اور آئندہ بھی لگتا رہے گا۔''

''تم میرے کس دشمن کی بات کر رہے ہو؟''

''انڈین گینگسٹر جاوا کی سر! ہم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر چھلانگ لگائی ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے اس حرامزادے کے ساتھ ٹکر لی ہوئی ہے۔''

جلالی کی سفید بھوؤں کے نیچے ان کی گدلی آنکھوں میں ایک بار پھر شدید حیرت ابھری۔ مہناز بھی حیران تھی اور توجہ سے یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ ''اس حرامی سے تمہارا واسطہ کیسے پڑا؟'' جلالی صاحب نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو یہ پھر کسی وقت آپ کو سنا دیں گے۔ فی الحال صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند ہفتے پہلے ہمیں آپ کے اسم گرامی کا پتا چلا تھا اور باقی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ باقی باتوں سے میرا مطلب یہی باکس والا چکر ہے جناب! ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جاوا اور اس کی پرانی رکھیل دُرِشہوار کسی وجہ سے بار بار فارم ہاؤس کے چکر لگا رہے ہیں اور آپ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ بس ہماری رگِ عداوت پھڑک اٹھی۔ میں سیدھے سچے لفظوں میں یہی کہوں گا جناب! ہمیں اس بندے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ تین چار سال پہلے اس شخص نے ہمارا جینا حرام کیا تھا، اب ہم اس کا جینا حرام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ عمران اس معاملے میں ریان ولیم کا نام لینا نہیں چاہتا اور اس نے جاوا کے حوالے سے جلالی کو سنانے کے لئے کوئی کہانی گھڑی ہوئی ہے۔ باتوں کے فن میں وہ یکتا تھا۔ اس نے فقط پانچ دس منٹ کے اندر جلالی صاحب کو بڑی حد تک شیشے میں اتار لیا۔ اس نے جلالی صاحب کو باور کرایا کہ ہم دونوں جاوے کی ٹکر کے لوگ ہیں اور اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، فی سبیل اللہ کر رہے ہیں۔ ہمیں جلالی صاحب کے باکس یا کسی اور چیز سے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں نے بھی وقتاً فوقتاً اس گفتگو میں حصہ لیا۔

جلالی صاحب اپنی پتلون کی گیلوس درست کرتے ہوئے بولے۔ ''تم دونوں کی باتوں پر یقین کرنا کافی مشکل ہے لیکن جو ثبوت تم دے رہے ہو، انہیں جھٹلانا بھی آسان نہیں۔ یہاں

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔تم جو کچھ جاوے کے ساتھیوں کے ساتھ کر آئے ہو، اس کاری ایکشن کیا ہوگا؟ اگر وہ وحشی ہوکر یہاں چڑھ دوڑے تو تم کیا کرو گے؟‘‘

عمران نے جلالی صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔’’سر! آپ اپنے اس خادم کا پچھلا ریکارڈ دیکھ لیں۔پچھلے دو چار ہفتوں میں، میں نے جو کچھ کہا ہے، اللہ کے کرم سے درست نکلا ہے۔اب یہ بات بھی درست نکلے گی کہ جاوا اور سلطان وغیرہ کوئی فوری ردِعمل ظاہر نہیں کریں گے۔انہوں نے ہمارے بازو آزمائے ہوئے ہیں اور ہم نے بھی ان کے حوصلے دیکھے ہوئے ہیں۔ہم چاہتے جناب تو جاوے کے ’’خصوصی چمچے سلطان‘‘ کے علاوہ پانچ چھ مزید بندے بھی پھڑکا سکتے تھے لیکن ہم نے انہیں اتنی ہی سزا دی ہے جو بہت ضروری تھی۔اس بات کو سلطان اور جاوا بھی ضرور سمجھیں گے۔‘‘

جلالی نے عمران کو گھورا۔’’تم کیا چیز ہو؟ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آرہی۔میں نے جب اخبار میں باورچی کے لئے اشتہار دیا تھا، مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس اشتہار کے نتیجے میں تم جیسا شخص میرے گھر میں گھس آئے گا۔تم باورچی بھی ہو۔جانوروں کے ٹرینر اور ڈاکٹر بھی ہو۔میراثی بھی ہو اور گینگسٹر بھی......اور بھی نہ جانے تمہارے کون کون سے روپ سامنے آنے ہیں۔‘‘

عمران نے کمال بے تکلفی سے جلالی صاحب کے استخوانی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا۔’’سر! ہمارا جو روپ بھی ہوگا، وہ آپ کی بھلائی کے لئے ہوگا۔آپ یقین کریں۔خاص طور سے جاوا اور اس کے گینگ کے خلاف آپ جو بھی حکم کریں گے، ہم اس کے لئے حاضر ہیں۔ہمارے اندر ان لوگوں کے لئے آگ ہے۔ہم ان کے دانت ان شاء اللہ اس طرح کھٹے کریں گے کہ ان کے پاس......دانت نکلوانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔‘‘

جلالی صاحب کا پارا چڑھتے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگتا تھا۔عمران نے جس طرح ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا، وہ بھڑک بھی سکتے تھے لیکن مجھے اور مہناز کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جلالی صاحب خاموش رہے۔شاید وہ ٹھیک کہتا تھا کہ جس کو چھوتا ہے، اسے موم کر دیتا ہے۔اگر نہ کرسکا تو اس لڑکی کو نہ کرسکا جو اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی تھی۔جلالی صاحب نے اپنا دوسرا ہاتھ عمران کے ہاتھ پر رکھا اور قدرے کمزور لہجے میں بولے۔’’میں جانتا ہوں، تم بہت سی غلط بیانیاں کر رہے ہو مگر اوور آل تم برے نہیں ہو......کیونکہ جو برائی کو ختم کرتا ہے، وہ عموماً خود برا نہیں ہوتا۔اس لمبے شیطان کو مار کر تم نے ایک بڑی برائی کو ختم کیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ جو کام ان حرام خور پولیس والوں کے کرنے کا تھا، وہ تم نے کیا ہے۔اور سچی بات یہ ہے کہ

میں اپنا کلیجا ٹھنڈا محسوس کر رہا ہوں۔مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں اپنے ملازموں اور ساتھیوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرسکتا ہوں۔‘‘

پھر جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہوئے۔’’وہ کہاں ہے رخشی......اور دوسری زرینہ؟‘‘

’’مہناز نے کہا۔’’سر! رخشی تو ابھی اسپتال میں ہے۔تین چار دن تک ہی آسکے گی۔زرینہ یہیں ہے اپنے کمرے میں۔اس کا بچہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔اسے کافی زیادہ مقدار میں کف سیرپ پلایا گیا تھا۔ابھی تک اس کا پیٹ خراب ہے۔‘‘

جلالی صاحب نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔’’یہ ریکارڈنگ ان دونوں لڑکیوں کو ضرور دکھانی ہے۔کم از کم اس کے وہ حصے جن میں تم دونوں کی شکلیں نظر نہیں آتیں۔اس سے ان بے چاریوں کے زخموں پر تھوڑا بہت مرہم رکھا جائے گا۔‘‘

ہم ابھی تک کھڑے تھے، جلالی صاحب کو اس کا احساس ہوا۔انہوں نے ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ہم بیٹھ گئے۔انہوں نے ملازم کو بلایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ملازم پریشانی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔جلالی صاحب بھول رہے تھے کہ وہ جن کے لئے چائے منگوا رہے ہیں، انہوں نے ہی تو چائے بنانی ہے۔

جلالی صاحب کے روکتے روکتے عمران اٹھا اور ملازم کے ساتھ کچن میں آگیا۔چائے وغیرہ تیار کر کے اس نے ٹرالی میں رکھی اور اسے خود ہی دھکیلتا ہوا لے آیا۔ایسے کاموں کے لئے اس میں بے پناہ انکساری موجود تھی۔

اس دوران میں جلالی صاحب نے سکیورٹی گارڈز کے انچارج اور دوسیکنڈ انچارج کو فون کئے اور انہیں کوٹھی کی سکیورٹی ہائی الرٹ کرنے کی ہدایت کی۔انہوں نے انچارج سے یہ بھی کہا کہ اے گریڈ کے کم از کم دس گارڈز کا مزید انتظام کیا جائے۔

چائے کے دوران میں جلالی صاحب نے ہمارے بارے میں کئی سوالات پوچھے۔ان سوالات کے لئے ہم دونوں پہلے سے تیار تھے۔دو تین سوالات کا جواب دینے سے عمران نے بڑی معذرت کے ساتھ احتراز کیا۔جلالی صاحب زبردست موڈ میں تھے۔انہوں نے اس معذرت کو قبول کیا۔

عمران نے کھنکھار کر گلا صاف کیا لیکن پھر خود بولنے کے بجائے ڈاکٹر مہناز کو بولنے کا اشارہ کیا۔ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو دیکھا۔وہ اپنے ٹیڈی کتے کو پچکارنے میں مصروف تھے۔وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔’’سر! چند دن پہلے ایک اور اہم واقعہ ہوا تھا......

ہم نے آپ کو اس کے بارے میں صرف اس لئے نہیں بتایا کہ آپ کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں تھی۔"

جلالی صاحب چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔
"تم لوگوں نے جو جو کچھ چھپایا ہوا ہے، وہ آج بتا ہی دو تا کہ یہ ٹینشن ختم ہو۔"

مہناز نے کہا۔"سر! میں آپ کو مختار ملک کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ وہ...... وہ سیڑھیوں سے گر کر نہیں مرا تھا۔"

"تو پھر؟"

مہناز نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران اپنی جادو اثر آواز میں بولا۔"سر! مختار ملک دراصل جاوے کا مخبر تھا۔ وہ چھپ کر تابش اور ڈاکٹر مہناز کی باتیں سن رہا تھا۔ تابش کو پتا چل گیا۔ اس خبیث نے ایک چھرے سے تابش پر قاتلانہ حملہ کیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور اس کی جان چلی گئی۔"

عمران نے اس واقعے کی دیگر تفصیل بھی جلالی صاحب کے گوش گزار کی۔ آخر میں جلالی صاحب بولے۔

"بہت خوب بھئی، بہت خوب۔ تم لوگ میرے ہی گھر میں رہ کر مجھ سے راز داریاں برت رہے ہو۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے حکومت کے اندر حکومت قائم کر لی جائے۔"

"معافی چاہتے ہیں جناب۔" عمران لجاجت سے بولا۔"ہمیں پتا تھا، آپ بڑے دل کے مالک ہیں۔ اس گستاخی کو درگزر کریں گے۔ ڈاکٹر مہناز تو ہر صورت آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھی مگر ہماری پُر زور درخواست پر انہوں نے چند دن چُپ رہنے کی حامی بھری۔"

"کچھ اور بتانا ہے تو وہ بھی بتا ڈالو" جلالی کا لہجہ نارمل ہی تھا۔

عمران مسکرایا۔"بس ایک چھوٹی سی بات اور تھی۔ تابش کو کنگ وغیرہ بالکل نہیں جانتا۔ اس حوالے سے ہماری درخواست پر ڈاکٹر مہناز، تابش کی مدد کرتی رہی ہیں۔"

جلالی نے چشمے کے پیچھے سے مہناز کو گھورا اور بولے۔"اس بات کا تو مجھے بھی شک تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ جو ہر وقت کچن میں گھسی رہتی ہے، اس میں کوئی چکر ہے۔"

جلالی صاحب کا اچھا موڈ دیکھتے ہوئے عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے کہا۔"سر! ایک التجا ہے۔ یہاں ایک دو بندے ایسے ضرور موجود ہیں جو ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ فی الحال ہماری باورچیوں والی حیثیت برقرار رکھئے۔ اس حیثیت سے ہم زیادہ محفوظ رہیں گے اور زیادہ کارآمد بھی ثابت ہوں گے۔"

جلالی بولے۔"تمہاری اس آخری بات میں وزن ہے۔ تم لوگ مار دھاڑ کے ماہر لگتے ہو۔ اور مار دھاڑ کا ماحول یہاں کسی بھی وقت بن سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عمران کی ضرورت Zoo میں ہے۔ بہرحال، مجھے اس بارے میں سوچنے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل صبح تک اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گا۔"

مختار ملک والے واقعے کے بارے میں انہوں نے ہم تینوں سے مزید پوچھ گچھ کی اور اس واقعے پر حیرت آمیز غصے کا اظہار کرتے رہے۔ بہرحال، اس غصے میں ایک طرح کی ستائش بھی چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت ان کا موڈ بتدریج بہتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عام حالات میں بھی انہیں تھانے کچہری کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے، جب بندہ اکثر اندیشوں اور خطروں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

باتیں کرتے ہوئے، جلالی صاحب کا ہاتھ...... ڈاکٹر مہناز کے کندھے پر تھا۔ وہ جیسے بے دھیانی میں گاہے بگاہے اس کے گداز کندھے کو مسلنے لگتے یا اس کے بالوں کو سہلانے لگتے۔ جلالی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ہمارے لئے ابھی تک پُراسرار تھا۔ ان کے اندر جیسے کوئی خلا سا تھا، کوئی طلب، کوئی بھوک سی۔ وہ حسن پرست بھی تھے۔ اپنے اردگرد خوب صورت ملازماؤں کو جگہ دیتے تھے اور رخشی جیسی کچھ لڑکیاں ان کے بہت قریب بھی رہی تھیں۔ اس سب کے باوجود ان کے طرزِ عمل میں گناہ یا ہوس کاری کا عمل دخل نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی وہ عمر کے اس دور میں تھے جہاں انسان کی کیمسٹری بہت حد تک بدل جاتی ہے۔

اس روز جلالی صاحب کافی حد تک مطمئن بلکہ خوش نظر آئے۔ انہوں نے اپنے Zoo میں جا کر تادیر عمران سے بھی ملاقات کی۔ بلی کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ناتوانی کے باوجود اپنے ٹیڈی کتے کے ساتھ شام کے وقت باغیچے کی روش پر چہل قدمی کرتے رہے۔ مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ عام لوگوں کے سامنے وہ مہناز کے ساتھ کسی خصوصی لگاؤ کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر میں جان چکا تھا کہ یہ لگاؤ موجود ہے۔

اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا اور اس نے مجھے چونکایا۔ یہاں کے دستور کے مطابق ٹھیک نو بجے ڈنر کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی کے اردگرد پہرے داروں کا گشت شروع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، ڈاکٹر مہناز معمول کے مطابق جلالی صاحب کو دوا وغیرہ کھلا کر ان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور گورے چٹے بازو دودھیا بلب کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ اسٹیتھو اسکوپ اس کے گلے میں تھا۔ کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے وہ ذرا رکی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے دائیں

بائیں دیکھا۔ جیب سے ایک رومال نکالا اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ دودھیا بلب دیوار پر قریباً سات فٹ کی بلندی پر لگا ہوا تھا۔ اس نے گرم بلب کو رومال کے ذریعے ہولڈر میں سے نکالا۔ کوریڈور میں تاریکی چھا گئی۔ مہناز کا ہیولا آگے بڑھ گیا۔

میں حیران ہوا۔ دو تین دن پہلے بھی ایسا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے ایک ملازمہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ کوریڈور کا بلب نہیں ہے۔ تو کیا وہ بلب بھی ڈاکٹر مہناز نے اتارا تھا؟ خیر، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ بلب چوری کرتی ہوگی۔ یہ یقیناً کوئی اور چکر تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ شاید رات کسی وقت اسی کوریڈور سے گزر کر مہناز کو پھر سے جلالی صاحب کے کمرے میں جانا ہو اور وہ اس آمدورفت کو دوسروں سے چھپانا چاہتی ہو۔

ایک بار یہ بات میرے ذہن میں آ گئی تو پھر تجسس بڑھتا چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی نیم تاریک بالکونی میں آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر میں ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا اور امید تھی کہ ڈاکٹر مجھے دیکھ نہیں سکے گی۔ دس بجے کے قریب ایک ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ مہناز نے دروازہ کھولا، اب وہ براؤن پھولوں والی ایک گلابی نائٹی میں نظر آ رہی تھی۔ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ رکھے تھے۔ ملازمہ نے رات کی رانی اور نرگس کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا دستہ مہناز کو تھما دیا۔ اس نے پھولوں کی سونگھا اور شکریہ ادا کر کے دروازہ بند کر لیا۔

میں بالکونی کی تاریکی میں سمٹا بیٹھا رہا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتوں کا شور تھا۔ دور فاصلے پر پیٹرولنگ گاڑی کی نیلی روشنی بھی حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ Zoo کی طرف سے کسی بندر کی طویل آواز ابھرتی اور سناٹے کو چیر جاتی۔ میرے اردگرد مچھر منڈلا رہے تھے۔ میں بے سکونی محسوس کر رہا تھا، اس کے باوجود اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ رات کا ایک بج گیا تھا مجھے مایوسی ہونے لگی۔ شاید میرا اندازہ غلط تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد اٹھنے کا سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور میں نے ڈاکٹر مہناز کا ہیولا دیکھا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔

میں نے بھی بالکونی چھوڑی اور کمرے میں آ گیا۔ اب میں نے آنکھیں کھڑکی کی اس درز سے لگا دیں جہاں سے دس بجے کے قریب میں نے مہناز کو گزرتے دیکھا تھا...... کوریڈور تاریک تھا۔ بہت کوشش کر کے میں اس کا بس مدھم سا ہیولا ہی دیکھ پایا...... وہ جلالی صاحب کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرا شک درست نکلا تھا۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹا وہیں انتظار

کیا۔ مہناز کی واپسی نہیں ہوئی۔ میں نے عمران کو فون کیا۔ وہ چڑیا گھر والے پورشن کے لگژری اپارٹمنٹ میں ہی سوتا تھا۔ شاید وہ سویا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش میں اس نے کال اٹینڈ کی۔ ''کیا کھایا تھا تم نے جو آدھی رات کو مروڑ اٹھ رہا ہے؟'' اس نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بکواس نہ کرو۔ ایک اہم اطلاع دے رہا ہوں تمہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟ ریما جی نے نرگس کو شوٹ کر دیا؟'' وہ بھی سرگوشی میں بولا۔

''وہ دونوں مل کر تمہیں شوٹ کریں گی۔ اس وقت یہاں ایک اور چکر چل رہا ہے......''

میں نے عمران کو ساری تفصیل سے آگاہ کر دا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا، کہنے لگا۔ ''تمہاری سراغ رسانی تو اچھی جا رہی ہے۔ کیا کچھ اور پتا چل سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کمرے کے اندر کے حالات۔ کسی بہانے تم بزرگوار کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے ہو یا کوئی اور طریقہ......''

''بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔'' میں نے موبائل آف کیا اور ایک بار پھر کوریڈور کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں تاریکی اور سکوت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔ میرے کمرے میں وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز تھی۔

میں نے سلیپر پہنے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ تاریک کوریڈور میں سے گزر کر جلالی صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے پتا چلتا تھا کہ اندر بہت ہلکی روشنی والا نیلگوں بلب آن ہے۔ گراموفون یا کیسٹ پلیئر پر سہگل کا کوئی بہت پرانا گیت دھیمی آواز میں پلے ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس بیڈروم کا ایک چھوٹا دروازہ عقبی برآمدے کی طرف بھی ہے۔ اس دروازے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اگر جلالی صاحب کو کسی وقت فوری طبی امداد کی ضرورت ہو تو انہیں یہیں سے نکال کر فوراً گاڑی میں پہنچایا جا سکے۔

میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ کسی کمرے سے بابے طفیل کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ عقبی صحن میں کوئی آوارہ بلی کسی ساتھی کو آواز دے رہی تھی۔ میں برآمدے پہنچا، یہاں تاریکی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں اردگرد دیکھا پھر دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ مجھے کمرے کا ایک چوتھائی حصہ نظر آنے لگا۔ اس چوتھائی حصے میں قالین اور ایک سینٹر

ٹیبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے ٹیبل پر وہی گلدستہ پڑا نظر آیا جو کچھ دیر پہلے ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ پھر ایک اور چیز نظر آئی اور اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ بے شک میں کمرے میں اور کچھ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس ایک ''چیز'' کی دید نے کمرے کا ایک غائبانہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اور یہ نقشہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

سینٹر ٹیبل کے ساتھ ہی نیچے قالین پر براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی پڑی تھی۔ بابے طفیل کی کھانسی کی آواز پھر ابھری۔ ساتھ ہی اس کی بیوی کی مدھم آواز سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے بابا طفیل اٹھ کر پانی وغیرہ پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرا یہاں رکنا اب مناسب نہیں تھا۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹا اور جس طرح یہاں آیا تھا، اسی طرح دبے پاؤں واپس چلا گیا۔

کمرے میں آ کر میں بستر پر نیم دراز ہوا اور اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی آنکھوں کے سامنے کھلتی چلی گئی جس طرح کسی درخت کا ایک پتا دیکھنے کے بعد سارے درخت کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، صرف اس ایک نائٹی کے منظر نے پورے کمرے کا ماحول آشکار کر دیا تھا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مہناز اپنے انوکھے مریض کے ساتھ موجود تھی اور عجیب انداز سے موجود تھی۔

کیا ڈاکٹر مہناز اس حد تک جا سکتی ہے اور اگر جا سکتی ہے...... اور چلی گئی ہے تو کیوں؟ وہ ہر لحاظ سے ایک معقول لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور دانش مند بھی تھی۔ اس کے کردار کی کوئی اور کمزوری ابھی تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ہر لحاظ سے غلط ہے؟ اس کے لئے کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کتنی بھی رعایت برتی جائے، بطور ڈاکٹر اور معالج بھی مہناز کو اس طرح کی کوئی ''گنجائش'' نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ گنجائش پیدا کی ہوئی تھی۔

مہناز کی واپسی رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی، اسی خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ میں نے فون پر عمران کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی میری ہی طرح جاگ رہا تھا۔ صبح میں نے دیکھا تو کوریڈور میں بلب پھر سے موجود تھا۔

پچھلی رات کا بیشتر حصہ تناؤ اور سنسنی کی کیفیت میں ہی گزرا تھا۔ ایک تو یہ ڈاکٹر مہناز والی سنسنی تھی، دوسری اس کارروائی والی جو ہم پیر کی رات کو لاہور میں انجام دے کر آئے تھے۔ عمران نے نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاوا کے قریبی ساتھی نادرے کو

اس کے ایک ہمنوا سمیت ان کے ڈیرے میں گھس کر ہلاک کیا تھا اور باقاعدہ اس کی ویڈیو فلم بھی بنائی تھی۔ کچھ بھی تھا، میرے ذہن میں یہ شدید اندیشہ موجود تھا کہ جاوا کی طرف سے کوئی نہایت سخت ردِعمل ظاہر ہو گا لیکن عمران مطمئن تھا۔ کل رات بھی جب میں نے سے مہناز کے بارے میں بتانے کے لئے موبائل پر کال کی تو وہ اطمینان سے سو رہا تھا۔ کوٹھی اور فارم میں سکیورٹی ہائی الرٹ تھی۔ کوئی شخص بھی مکمل شناخت اور دو تین جگہ تلاشی دینے کے بعد ہی فارم کی حدود میں داخل ہو سکتا تھا۔

دوپہر گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے دیکھا، ڈاکٹر مہناز سبز رنگ کا سلکی سوٹ پہنے، خوش رنگ ربن میں بال باندھے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے، اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ جلالی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ میری اور مہناز کی نگاہیں ملیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ہم دونوں نے سر کے اشارے سے ایک دوسرے کو سلام کیا پھر وہ شڑاپ سے چھوٹے ڈرائنگ روم میں اوجھل ہو گئی۔

میں کچن کے اسٹول پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ انسان بھی کیا الجھی ہوئی پیچ در پیچ شے ہے۔ اب اس دُھلے دُھلائے چہرے والی ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کل شب ایک اور ساڑھے تین بجے کے درمیان وہ کہاں تھی؟

جلالی صاحب پر یہ بات اب عیاں ہو چکی تھی کہ ہم دونوں باورچی نہیں ہیں بلکہ میں تو کوکنگ کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوں اور اب تک ڈاکٹر مہناز میری مدد کرتی رہی ہے۔ اب جلالی صاحب نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کو میری مدد کے لئے کچن کی ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ کل سے کچن کا بیشتر کام وہی کر رہی تھی۔ میں نے کندھوں میں اور دونوں کہنیوں میں شدید درد کا بہانہ کیا ہوا تھا اور ڈاکٹر مہناز کی ہدایت کے مطابق مکمل آرام ہی کر رہا تھا۔ اس وقت بھی رضیہ دو عدد دیسی چوزوں کا گوشت بھوننے میں مصروف تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مائیکروفون آن کر کے جلالی اور مہناز کی گفتگو سننے کی کوشش کروں۔ جونہی گوشت بھونا گیا اور رضیہ نے اس میں پانی ڈالا، میں نے اس سے کہا کہ وہ مٹن کا پیاز بنانے کے لئے برآمدے میں بیٹھ کر پیاز وغیرہ کاٹ لے۔ میں مرغی کا سالن دیکھ لوں گا...... وہ باہر چلی گئی تو میں نے کچن کیبنٹ کھول کر ڈیکوریشن پیس میں چھپائے ہوئے ریسیور کو آن کیا اور آواز کو مطلوبہ حد تک کھول لیا۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں، پھر مائیکروفون کے بالکل قریب سے مہناز کی نکھری ہوئی واضح آواز سنائی دی۔ ''سر! میں دعوے سے کہتی ہوں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے اور میرے ساتھ......''

''کیا، میرے ساتھ؟'' جلالی نے پوچھا۔

''میرے ساتھ ہنی مون پر کاغان اور ناران چلیں گے۔''

''تم ایک بے وقوف...... احمق لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ ایک ایسے شخص کو زندہ کرنے کا دعویٰ کر رہی ہو جو مدت ہوئی مر چکا ہے۔''

''محبت مردہ جسموں میں زندگی دوڑاتی ہے سر...... ناممکن کو ممکن کرتی ہے۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ جو درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہزار سال تک ریت میں دبا رہا ہو اس پر ہرے بھرے پتے کون لگا سکتا ہے؟''

''جناب! آپ درخت نہیں ہیں اور نہ ہزار سال سے ریت میں دبے ہوئے ہیں......''

جلالی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اس انوکھی شادی کے ذریعے اپنا نام گینز بک آف ریکارڈز میں درج کرانا چاہتی ہو تو تمہیں زبردست ناکامی ہونے والی ہے۔''

''محبت کسی شہرت کی محتاج نہیں ہوتی سر! یہ تو اپنے آپ میں ایک اعزاز ہوتی ہے۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر جلالی صاحب کی بوڑھی آواز سنائی دی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اپنی ماں کو اس نکاح کے بارے میں بتا ہی دو تو اچھا ہے۔''

وہ الھڑ انداز میں بولی۔ ''سر! آپ کیوں اتنی جلدی رنڈوا ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ میرا سر توڑ دیں گی...... لیکن مجھے اپنے سر کی اتنی پروا نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ وہ آپ سے کوئی سخت بات نہ کہہ دیں۔ میں سچ کہتی ہوں سر! آپ کی ذرا سی...... بالکل ذرا سی توہین بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم ایک بے وقوف ضدی لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔''

''کیا ایک ڈاکٹر بھی نہیں ہوں؟''

خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد جلالی صاحب کی آواز ابھری۔ ''نہیں...... وہ تو ہو۔''

''تو پھر جناب! چپ چاپ بیٹھ جائیے۔ میں نے آپ کا ٹمپریچر لینا ہے اور بی پی چیک کرنا ہے۔''

مائیکروفون کے ریسیور پر خاموشی چھا گئی۔ میں ششدر تھا۔ اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا، اس سے انکشاف ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز نے خفیہ طور پر جلالی صاحب سے نکاح پڑھوا لیا ہے اور یہ تعجب خیز واقعہ شاید پچھلے دو چار دن کے اندر ہی ہوا ہے۔ میں سناٹے میں تھا اور یہ سنسنی خیز خبر جلد از جلد عمران کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں ریسیور سے پھر مدھم آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے ڈاکٹر مہناز نے قدرے فاصلے سے کچھ کہا جو واضح سنائی نہیں دیا...... پھر جلالی کی بالکل صاف آواز ابھری۔

''ان دونوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے مہناز؟''

مہناز نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''سر! جو کچھ انہوں نے کہا ہے، وہ تو واقعی حیران کن ہے۔ اگر ویڈیو ثبوت نہ ہوتا تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ نادر کے جسم پر وہ کھرونچے والی بات بھی انہوں نے بالکل درست بتائی ہے۔ میں نے خود رخشی کے ناخنوں میں خون اور گوشت کی آلائش دیکھی تھی......''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر معمولی نہیں ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کی طرف سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے گھر میں ہیں اور ہر وقت ہمارے قریب موجود ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟''

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد مہناز نے کہا۔ ''سر پتا نہیں کیوں، اس بارے میں میری رائے بری نہیں ہے۔ اگر میری رائے بری ہوئی تو میں اسی روز آپ کو سب کچھ بتا دیتی جب مختار ملک کی موت والا واقعہ ہوا تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ سر کہ یہ لوگ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''تو کیا پھر ان کی یہ بات درست سمجھی جائے کہ یہ جاوے کے گروپ سے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے یہاں موجود ہیں؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' مہناز نے کہا۔

''لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہی مطلب ہوا نا کہ یہ بھی گینگسٹر ہیں۔ پھر ان کی اس بات پر کیسے اعتبار کیا جائے کہ انہیں یہاں کے دیگر حالات سے کوئی دلچسپی نہیں...... جن میں مورتی والے باکس کا معاملہ بھی ہے۔''

''ہاں، اس بات پر پوری طرح یقین کرنا تو مشکل ہے سر۔''

''میں نے آج بھی عمران سے دیر تک بات کی ہے۔ اس بندے میں بہت سے ''گٹس'' ہیں۔ اگر اس کے بارے میں بلکہ ان دونوں کے بارے میں ''چھپے رستم'' والی بات کہی جائے تو شاید غلط نہ ہو......''

اچانک رضیہ کے بھاری اور تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مجھے مائیکروفون کا ریسیور آف کرنا پڑا۔ وہ ایک بڑی ٹرے میں پیاز اور ٹماٹر وغیرہ کاٹ کر لے آئی تھی۔ پیاز کی وجہ سے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔ مجھے عمران کی بات یاد آ گئی۔ اس نے شروع میں کہا تھا کہ

میں تو یہاں پیاز کاٹ کاٹ کر مینا کماری بن گیا ہوں۔ یہاں پیاز واقعی بہت استعمال ہوتی تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے عمران کو وہ دھماکا خیز خبر سنائی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ تک پہنچی تھی۔ عمران اور میں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر ڈاکٹر مہناز نے واقعی ایک انوکھا کام کیا تھا۔ ایک ایسی باغیانہ روش جو رسموں، روایتوں اور معاشرتی بندھنوں کو چیرتی ہوئی گزرتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ ایک حادثے کا ردِعمل تھا۔ اس کی جڑیں اس المیے میں تھیں جو منگنی ٹوٹنے کی صورت میں مہناز کے ساتھ ہوا تھا۔ ڈاکٹر لائبہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت خوبرو لیکن گھمنڈی نوجوان تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ تن سازی کا شوق بھی رکھتا تھا۔ پنجاب کی سطح پر اس نے کافی نام کمایا تھا۔ پھر وہ کراچی کے ایک مال دار میمن کی بیٹی سے شادی کر کے کینیڈا چلا گیا......

شام تک کا وقت بخیریت گزر گیا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس کی سکیورٹی بدستور ہائی الرٹ تھی۔ جاوا گروپ کی طرف سے فوری ردِعمل کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اندیشے بدستور موجود تھے۔ ان میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ شاید کسی طرح پولیس میں دہرے قتل کی رپورٹ کر دی جائے گی اور متعلقہ پولیس نادرے کے ''قاتلوں'' کو پکڑنے کے لئے یہاں فارم ہاؤس میں آ دھمکے گی۔ بہرحال، ان اندیشوں میں سے کسی نے ابھی تک حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا اور عمران کا سکون و اطمینان دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہ اندیشے حقیقت کا روپ دھاریں گے بھی نہیں۔ عمران نے ایک بات کی تاکید مجھے ضرور کی تھی اور وہ یہ کہ میں ابھی فارم ہاؤس کی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں محتاط تھا۔ شام کے فوراً بعد جلالی صاحب سے بڑے اچھے ماحول میں طویل گفتگو ہوئی۔ عمران کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر مہناز کے سوا کوٹھی میں موجود کسی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اب ہماری حیثیت ''باورچی'' کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جلالی صاحب نے یہ میٹنگ ایک بند کمرے میں رکھی تھی اور کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سیکرٹری ندیم ویسے ہی فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔ وہ بلی کے نومولود بچوں کے لئے کچھ ادویات اور ویکسین وغیرہ لینے کے لئے لاہور گیا ہوا تھا۔ ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بھی اس کے ساتھ تھا۔

آج ہم جلالی صاحب کے برابر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ جلالی صاحب کا موڈ اچھا تھا اور ان کا رویہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ تھا۔ انہوں نے عمران سے کہا۔ ''جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ تم دونوں کی نظر میں کیسا ہے؟ میرا مطلب ہے باکس کے حوالے سے؟''

عمران نے کہا۔ ''آپ کا رویہ سو فیصد قابلِ تعریف ہے۔ اور جناب! یہی وجہ ہے شاید کہ ہم ناچیز بھی اپنی ہمت کے مطابق آپ کی مدد کے لئے یہاں موجود ہیں۔ اس سارے کام میں آپ کا اپنا کوئی لالچ نہیں۔ آپ نے اس بات پر اسٹینڈ لیا ہے کہ وہ باکس آپ کے پاس کسی نامعلوم بندے کی امانت ہے اور جب وہ بندہ آپ سے رابطہ کرے گا تو آپ اسے لوٹا دیں گے۔''

مہناز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''لیکن سر! اس امانت کی حفاظت کے لئے آپ کو جو مشکلات اٹھانا پڑ رہی ہیں، وہ آپ کی صحت پر بہت بھاری ہیں۔ آپ...... اپنی ہمت سے زیادہ...... مزاحمت کر رہے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے میری ہمت کو...... کیا میں چلتے چلتے گر پڑا ہوں؟ کیا میں نے بستر پر پیشاب کر دیا ہے؟ تم بھی ان لوگوں جیسی باتیں کرتی ہو جو سمجھتے ہیں کہ میری ٹانگیں قبر میں جھول رہی ہیں۔''

''نہیں سر...... خدانخواستہ ایسی بات نہیں لیکن آپ بیمار تو ہیں نا۔'' مہناز نے جلدی سے کہا۔

لیکن جلالی صاحب ہتھے سے اکھڑ چکے تھے۔ گرج کر بولے۔ ''بیمار...... بیمار...... بیمار! میں عاجز آ چکا ہوں اس لفظ سے۔ تمہاری صورتیں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ تم کفن اور صابن تولیا لے کر میرے سرہانے بیٹھے ہو۔ میری سانسیں گن رہے ہو۔ میں زندہ ہوں...... ابھی میں زندہ ہوں۔ میں اپنے سارے فیصلے خود کروں گا۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ نہ مجھے کسی سے مشورہ کرنا ہے......''

''سر! میں تو کہہ رہی تھی......''

''میں جانتا ہوں تم کیا کہہ رہی تھیں۔ تم لوگ میرے منہ پر کچھ اور کہتے ہو، میرے پیٹھ پیچھے کچھ اور...... مجھے ناکارہ اور سنکی سمجھتے ہو۔ منافق ہو تم لوگ، جھوٹے ہو۔ مجھے ایسے لوگوں کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ...... اٹھ جاؤ......''

مہناز کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میرے اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران جلدی سے بولا۔ ''سر! ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں لیکن بلیوں کے بارے میں جو ضروری بات میں نے آپ سے کرنی تھی...... وہ تو یہیں رہ جائے گی۔''

جلالی صاحب کی دکھتی رگ پر ہاتھ آیا تھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر اب طیش کے ساتھ ساتھ الجھن اور تجسس بھی نظر آیا۔ وہ خاموش رہے۔

عمران نے کہا۔''اگر آپ کی اجازت نہیں تو میں صبح آ جاؤں گا۔''

جلالی صاحب نے عجیب تاثرات کے ساتھ عمران کو دیکھا، جیسے نہ چاہنے کے باوجود کوئی کڑوی دوا پی رہے ہوں۔''کیا بات ہے؟''انہوں نے پوچھا۔

''سر! ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو گیا ہے کہ یہ چاروں بلونگڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک بلونگڑا ہے۔ میں پوری تفتیش کر کے آیا ہوں۔ اگر تھوڑا بہت شک ہے بھی تو صبح تک دور ہو جائے گا۔ یہ دیکھیں جی...... یہ ڈیجیٹل کیمرے سے میں نے بلونگڑے کے پچھلے پورشن کی تصویریں بھی لی ہیں۔''اس نے جیب سے کیمرا نکالا اور اسے آن کر کے ڈس پلے اسکرین (مانیٹر) پر جلالی صاحب کو تصویریں دکھانے لگا۔''یہ دیکھیں سر اس تصویر کو زوم کریں...... کچھ اور زوم کریں...... یہ دیکھیں نر کی نشانی۔ کافی بڑی ہے لیکن سیاہ دھبے کی وجہ سے پتا ہی نہیں چل رہا تھا......''

''ہاں...... یہاں سیاہ دھبا تھا نا۔'' جلالی صاحب نے اپنی مڑی ہوئی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ بعد یہ کیفیت تھی کہ جلالی صاحب اور عمران کندھے سے کندھا بھڑائے بیٹھے تھے۔ تصویریں دیکھ رہے تھے اور مہناز کی موجودگی میں ہی بلونگڑوں کی زنانہ مردانہ صفات پر سیر حاصل بحث کر رہے تھے۔ جلالی صاحب کے ماتھے کے بل بتدریج کم ہو رہے تھے...... عمران کی جادو بیانی کام کر رہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عمران نے ایک دم پلٹا مارا اور بولا۔''سر! مجھے یقین ہے ایسی خوبصورت آنکھوں والی بلیاں تو ایران میں بھی اب شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہوں گی۔ آپ ان کی ملکیت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی جب یہ باکس والی پریشانی دور ہو جائے گی تو آپ صحیح طور پر ان بلونگڑوں اور ان کی ماں کی محبت سے لطف اندوز ہو سکیں گے......''

باکس کے ذکر پر جلالی صاحب نے کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور پھر سے گہری سنجیدگی نے ان کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ شاید چار پانچ منٹ پہلے کی ساری باتیں انہیں یاد آ گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ان کا غصہ پھر حرارت اور رفتار پکڑتا، میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سر! میں باکس کے حوالے سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔''

''کیا ہے؟''انہوں نے ماتھے کی تیوریاں برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''سر! ہم جانتے ہیں کہ باکس کے حوالے سے آپ کے بہت سے اندیشے ہیں اور یہ بالکل بجا اندیشے ہیں۔ مثلاً انتظامیہ کی بات ہی لیں۔ پولیس کا حال ہی دیکھیں۔ ان پر کسی طرح کا اعتبار بھلا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان پر اعتبار کیا جا سکتا تو میرا خیال ہے کہ آپ کب کے اس باکس والی ذمے داری سے فارغ ہو چکے ہوتے لیکن اس کا کوئی درمیانی حل تو نکالا جا سکتا ہے۔''

جلالی صاحب کے تاثرات نارمل ہی رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ خراب ماحول کے باوجود میری ایک آدھ بات ضرور ان کے دل کو لگی ہے۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے ''ویل ڈن'' کا اشارہ کیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''جناب! میں صرف اپنی معلومات کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ معزز لوگوں یا پھر میڈیا والوں کے سامنے یہ باکس کسی اہم حکومتی عہدے دار کے حوالے کر دیا جائے اور یہ تب تک وہاں رہے جب تک اس کا اصل مالک سامنے نہیں آ جاتا؟''

جلالی صاحب نے برا سا منہ بنایا۔''اہم عہدے دار کون ہو گا؟ کوئی وزیر، مشیر یا پھر کوئی بڑا پولیس افسر۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ اعتبار کے قابل ہیں؟ ہرگز نہیں، یہ لوگ گرم توے پر اپنی پیٹھ رگڑیں تو بھی ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور میڈیا میں بھی ابھی اتنی ذمے داری کہاں پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ شکاری جانوروں کی طرح ایک خبر کے پیچھے بھاگتے ہیں، اس کو دبوچتے ہیں، اس کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ابھی وہ ''خبر'' تڑپ پھڑک ہی رہی ہوتی ہے کہ انہیں کوئی اور خبر نظر آ جاتی ہے۔ وہ پہلی کو چھوڑ کر اس کے پیچھے لپک جاتے ہیں اور پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔''

''یہ بات تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' عمران نے فرمائشی انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلایا۔

میں نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔''آپ یقیناً اس معاملے کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں سر! اور یقیناً اس سلسلے میں آپ نے کوئی مناسب پلاننگ بھی کر رکھی ہو گی۔''

''پلاننگ کوئی نہیں ہے...... کوئی پلاننگ نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، بس اس پر قائم ہوں۔ وہ باکس میرے پاس امانت کے طور پر موجود ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا اصل مالک مجھ سے رابطہ نہیں کرتا۔ اس امانت کی حفاظت کرتے ہوئے اگر مجھے جان بھی دینا پڑے تو میں دے دوں گا۔'' جلالی کا لہجہ اٹل تھا۔

اب یہ بات ان سے کون کہتا کہ حضرت! اگر آپ نے واقعی جان دے دی اور داعی

اجل کو لبیک کہہ ڈالا تو مورتی والے باکس کو کیسے ڈھونڈا جائے گا؟ وہ تو آپ کے ساتھ ہی لحد میں اتر جائے گا۔

میں اور عمران کچھ دیر تک اشاروں کنایوں میں بات جلالی صاحب کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ انہیں کسی طرح کا کوئی لالچ ہی نہیں ہے تو پھر وہ کسی طرح اس باکس والی ذمے داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔ لیکن ڈاکٹر مہناز نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

''وہ اپنے مؤقف پر فولاد کی طرح سخت رہتے ہیں۔ کسی بھی طرح کے دلائل سے ان کے مؤقف میں لچک پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اگر کبھی یہ لچک پیدا ہوئی ہو تو پھر ان کے اندر سے ہی ہوتی ہے۔''

اس ملاقات میں کچھ اور امور ضرور طے ہو گئے۔ جلالی صاحب نے اتفاق کیا کہ یہاں کوٹھی میں ہم موجودہ حیثیت سے ہی موجود رہیں۔ ضرورت پڑنے پر رضیہ کے علاوہ عمران بھی کچن میں خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں موجود کالی بھڑوں کا سراغ لگایا جائے اور یہ کام جلد سے جلد ہو۔ سیکرٹری نیدم کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے اور اسے ہدایت کی جائے کہ وہ ہم دونوں کو بھی سکیورٹی کے انتظامات اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھے۔ جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی، میں نے سانولی رنگت والے فتح محمد کی آواز سنی۔ وہ کسی ملازمہ کو آواز دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اردگرد موجود ہے حالانکہ جلالی صاحب نے کسی کو بھی اس طرف آنے سے منع کیا تھا۔ یہ فتح محمد اس کوٹھی اور فارم ہاؤس میں یقیناً ایک مشکوک شخص تھا۔ میں اور عمران جلد از جلد اس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو میں نے پھر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ڈاکٹر مہناز اپنی والدہ سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ عمران نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا تھا اور اب وہ ڈاکٹر عدیل کا ہاتھ بٹانے کے لئے Zoo کی طرف چلا گیا تھا۔ بارہ بج چکے تھے اور جلالی صاحب کا کھانا لے جانے والا ملازم وحید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پھر ایک ملازمہ نے مجھے بتایا کہ جلالی صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اس نے تفصیل نہیں بتائی۔ میں جلالی صاحب کو دیکھتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں پہنچا تو یہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔ جلالی صاحب ایک صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ اسے نیم دراز ہونا کہا جاسکتا تھا۔ بیس بائیس سال عمر والی دو قبول صورت ملازمائیں ان کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دیگر لفظوں میں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے جلالی صاحب کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ جلالی صاحب کے دونوں ہاتھ دونوں ملازماؤں کے ہاتھ میں تھے اور انہوں نے جلالی صاحب کی انگلیوں کو یوں دبا رکھا

تھا جیسے وہ سن ہو چکی ہوں اور لڑکیاں انہیں اپنی مٹھی میں دبا کر حرارت پہنچانا چاہتی ہوں۔ جلالی صاحب کی آنکھیں بند اور چہرے پر عجیب سی بے چینی تھی۔ پھر میں نے ملازمہ زرینہ کو دیکھا۔ وہ ایک طرف سے آئی۔ جلالی صاحب کے پاؤں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی اور ان کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے گداز ہاتھوں سے ہولے ہولے دبانے لگی۔

میں کچن میں واپس آ گیا۔ اس چاردیواری میں جلالی ایک ایسا معما تھا جو ابھی تک پوری طرح ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف دو دن پہلے ہم پر یہ حیرت ناک انکشاف ہو چکا تھا کہ اس کوٹھی میں جلالی اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی نوعیت یکسر بدل چکی تھی۔ وہ بڑی رازداری سے خفیہ شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ جلالی صاحب کے قریب ترین لوگ بھی اس نئے تعلق سے بے خبر ہیں۔ یقیناً میرے کانوں میں بھی اتنی جلدی اس تعلق کی بھنک نہ پڑ سکتی اگر ڈرائنگ روم میں مائیکروفون نصب نہ ہوتا۔ آ جا کے بابا طفیل اور اس کی بیوی دو ایسے افراد تھے جن کے بارے میں شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس نئے تعلق سے آگاہ ہیں۔ کسی وقت تو مجھے شک ہوتا تھا کہ شاید جلالی اور مہناز کے نکاح کی کارروائی بھی بابے طفیل نے ہی انجام دی ہو گی۔

بابا طفیل بھی فتح محمد کی طرح اس کوٹھی کا ایک خاموش اور گہرا کردار تھا۔ وہ سفید ریش اور جھکی کمر والا شخص تھا۔ وہ اور اس کی بیوی پنج وقت کے نمازی تھے۔ اس کی بیوی کے ہاتھ میں اکثر تسبیح بھی نظر آتی تھی۔ ان کا بیٹا اور بہو رضیہ بھی یہاں ملازمت کرتے تھے۔ بہرحال وہ دونوں سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔ اس کے برعکس بابے طفیل اور اس کی بیوی کو یہاں گھر کے افراد جیسی حیثیت حاصل تھی۔ سہ پہر کے وقت جلالی صاحب کی طبیعت سنبھل گئی۔ انہوں نے Zoo کا ایک راؤنڈ بھی لگایا۔ ایرانی بلی اور بلونگڑوں کی حفاظت کے لئے ایک مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے موجود تھا۔ چار بجے کی چائے کی جگہ جلالی صاحب نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر لاہور ٹیلی فون کر کے اپنے زخمی ملازموں کی عیادت کرنے کے بعد سو گئے۔

ڈاکٹر مہناز کی واپسی پانچ بجے کے قریب ہوئی۔ وہ کچھ تھکی تھکی اور کچھ روئی روئی سی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ والدہ سے مل کر آئی ہے اور حسبِ معمول والدہ سے اس کی جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ والدہ نے اسے الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ دو ہفتے کے اندر جلالی صاحب کے لئے کسی دوسرے ڈاکٹر کا انتظام کر کے کوٹھی چھوڑ دے، ورنہ وہ زندگی بھر اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔

والدہ بے چاری کو کیا پتا تھا کہ ڈاکٹر بیٹی اب کوٹھی نہیں چھوڑے گی کیونکہ وہ اس

ملازمت کو باقاعدہ ایک رشتے میں بدل چکی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو آشکار ہو گیا تو زبردست قسم کی جگ ہنسائی اور طعنہ زنی کا سبب بنے گا۔ مطلع دوپہر سے ابر آلود تھا۔ شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور تیز بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنے اور مہناز کے لئے چائے بنائی۔ چائے سے بھرے ہوئے مگ لے کر ہم ایک برآمدے میں آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ مجھے اور مہناز کو ساتھ دیکھ کر دیگر ملازموں کو حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ ڈاکٹر مہناز میری شوقیہ شاگرد بنی ہوئی ہے اور مجھ سے کوکنگ سیکھ رہی ہے۔

میں نے مہناز کو آج دوپہر والی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ آج میں نے جلالی صاحب کو کس حالت میں دیکھا ہے۔

میرے اس بیان میں ایک طرح کا تجسس تھا اور کئی ایک سوالات تھے۔ میں اس تجسس کا اظہار پہلے بھی دو تین بار مہناز سے کر چکا تھا مگر وہ کنی کترا گئی تھی۔ آج میں چاہتا تھا کہ وہ کنی نہ کترائے اور مجھے کچھ نہ کچھ بتائے۔ میں کوشش کرتا رہا، آخر مہناز کو نیم آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اس کوٹھی میں دو تین جگہوں پر سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے مگر ہم جس جگہ بیٹھے تھے، وہاں اس طرح کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔

مختار ملک والے واقعے کے بعد سے مہناز مجھ پر خاصا بھروسا کرنے لگی تھی۔ وہ میری جسمانی فٹنس اور فائٹنگ اسپرٹ سے بہت متاثر تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے بھی چند دن پہلے اسے اپنی کایا کلپ کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں لڑکپن سے مارشل آرٹ کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں لیکن کبھی اس میدان میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ ادنیٰ کھلاڑیوں میں بھی شامل نہ ہو سکا لیکن پھر حالات کی سختیاں میرا ہانکا کر کے مجھے ایک ایسے شخص تک لے گئیں جو شاید مرنے سے پہلے میری آمد کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میں نے مہناز کو بارونداجیکی کی کہانی سنائی تھی اور اس کے بارے میں دیگر باتیں بتائی تھیں۔

تو میں ذکر کر رہا تھا ڈاکٹر مہناز کی نیم آمادگی کا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جلالی کے اسرار پر سے سارا نہیں تو تھوڑا بہت پردہ ضرور اٹھا دے گی۔ بادل برس رہے تھے اور ہوا کی سرسراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''تابش صاحب! ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست اور...... ہمراز ہیں۔ آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ جو کچھ آپ کو بتاؤں گی، آپ صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں ڈاکٹر مہناز۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

کچھ دیر توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''تابش! جلالی صاحب بچپن سے...... سمجھیں

کہ تین چار سال کی عمر سے زبردست اکیلے پن کا شکار رہے ہیں۔ ان کا یہ اکیلا پن زندگی کے کسی حصے میں دور نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری دور میں داخل ہو گئے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں ڈاکٹر مہناز! آپ کس اکیلے پن کی بات کر رہی ہیں؟ بابا طفیل بتا رہا تھا کہ جلالی صاحب نے اپنا بچپن اور جوانی ایک بھری پُری فیملی میں گزارے ہیں۔ پھر ان کے والدین نے بڑے چاؤ سے ان کی شادی بھی کی۔ انہوں نے تیس سال تک ایک اچھی ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے تین بچے بھی ہوئے۔''

مہناز عجیب پھیکے انداز سے مسکرائی۔ ''اس کے باوجود تابش صاحب...... جلالی ہمیشہ تنہا رہے، یکسر اکیلے۔ بابے طفیل نے آپ کو ایک خاص بات نہیں بتائی اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے...... جلالی صاحب تین چار سال کی عمر سے ایک بیماری کا شکار رہے ہیں۔ یہ جلد کا ایک متعدی مرض تھا۔ نہایت تکلیف دہ...... نہایت ضدی۔ اس مرض نے جلالی صاحب کی زندگی تو اجیرن کی ہی، ان کے قریبی رشتوں کو بھی ہمیشہ ایک سخت امتحان سے دوچار رکھا۔ ماں سے زیادہ قریبی بھلا کون ہوتا ہے۔ اس ماں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جو اپنے تین چار سال کے بچے کو چھو بھی نہیں سکتی ہو اور اس بچے کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا جو اپنے ماں باپ کے لمس کو ترستا رہتا ہو۔''

''یہ بیماری کب تک رہی۔'' میں نے پوچھا۔

''سمجھو ہمیشہ رہی۔'' مہناز نے افسردگی سے کہا۔ ''عام طور پر جلدی امراض کا دورانیہ طویل ہوتا ہے لیکن یہ بیماری تو جلالی صاحب کی تقریباً تین چوتھائی زندگی کو نگل گئی۔ اس نے قریباً ساٹھ سال تک جلالی صاحب کو اپنے پنجوں میں جکڑے رکھا۔ جلالی صاحب کے پورے جسم پر بہت باریک باریک سے دانے نکل آتے تھے...... گرمی دانوں جیسے...... لیکن یہ گرمی دانوں کی طرح خشک نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سرخی اور گیلا پن ہوتا تھا۔ جلالی صاحب کی والدہ اور ان کی بڑی بہن کے ہاتھ بھی اس بیماری کا شکار ہو گئے تھے اور اگر وہ دونوں ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل نہ کرتیں تو شاید وہ بھی پوری طرح اس کی لپیٹ میں آ جاتیں۔''

''جلالی صاحب کی بیماری کا علاج بھی ہوا؟''

''کیوں نہیں...... جلالی صاحب چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ ان کا تعلق ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تھا۔ لاہور اور شیخوپورہ کے نواح میں ان کی سیکڑوں ایکڑ زرعی زمین تھی۔ جلالی صاحب کے والد ایک پڑھے لکھے شخص تھے۔ انہوں نے ننھے جلالی کا علاج اندرونِ ملک ہی نہیں، بیرون ملک بھی کرایا۔ انہیں انگلینڈ اور جرمنی

تک لے کے گئے۔ جلالی صاحب کی تکلیف کنٹرول ضرور ہو جاتی تھی مگر ختم نہیں ہوتی تھی۔ یہ چھوت کے زبردست اثرات بھی رکھتی تھی۔ معالجوں کی ہدایت کے مطابق جلالی صاحب کو دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ چار پانچ سال کا بچہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لمس کو ترستا رہتا تھا لیکن ایسی کوئی راحت اس کے نصیب میں نہیں تھی۔''

''جلالی صاحب کے خاندان میں پہلے بھی یہ تکلیف موجود تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... نہ پہلے تھی نہ بعد میں کسی کو ہوئی۔ یہ واحد کیس تھا۔ بابے طفیل اور اس کی بیوی کو ان وقتوں کا سارا حال معلوم ہے لیکن وہ دونوں کسی کو بتاتے نہیں۔ ایک طرح سے وہ دونوں جلالی صاحب کے پرانے رازدار بھی ہیں۔ بہرحال، میرے ساتھ انہوں نے کافی کچھ شیئر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بیماری میں چھوت کے اثرات اتنے شدید تھے کہ کوئی بھی جلالی صاحب کے قریب نہیں جاتا تھا۔ انہیں پیاز کا زیادہ استعمال کرایا جاتا تھا تا کہ چھوت کے اثرات کم ہوں اور بیماری میں بھی افاقہ رہے۔ وہ جلن کی وجہ سے ساری ساری رات تڑپتے رہتے تھے۔ ماں انہیں دو دو گھنٹے بعد دوا پلاتی تھی...... اور دیگر تدبیریں کرتی تھی۔ کسی وقت وہ انہیں گلے سے بھی لگاتی تھی لیکن اس طرح کہ جلالی صاحب کے جسم کا کوئی ننگا حصہ اس کے جسم سے چھو نہ پائے۔ خاص طور سے بیماری سے متاثرہ حصوں کو چھونا تو بہت خطرناک تھا۔ ان حصوں پر دوا وغیرہ لگاتے وقت دستانے استعمال کئے جاتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹر! ہم جانتے ہیں کہ جلالی صاحب کی شادی ہوئی۔ ان کے صحت مند بچے بھی ہوئے۔''

''مگر میں سمجھتی ہوں کہ شادی جیسا رشتہ بھی جلالی صاحب کی تنہائی اور اکیلے پن کو ختم نہ کرسکا۔ ان کی ازدواجی زندگی عام لوگوں سے بہت مختلف تھی۔ یہ ازدواجی زندگی ڈری سہمی اور کپڑوں میں لپٹی لپٹائی...... پتا نہیں کس طرح گرتی پڑتی چلتی رہی...... وہ بھی کسی متوسط گھرانے کی صابر شاکر عورت تھی، اس نے یہ سب کچھ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اسے دنیا کی ہر خوشی نصیب تھی لیکن میاں بیوی کے بھرپور تعلق سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہی ہوگی۔''

''پھر جلالی صاحب ٹھیک کیسے ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسکن کی کچھ بیماریاں عجیب ہوتی ہیں۔ یہ سالہا سال مریض کو پریشان رکھتی ہیں لیکن عمر کے کسی دور میں یہ خود بخود مریض کا پیچھا چھوڑ دیتی ہیں یا پھر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ جلالی صاحب کی تکلیف کے بارے میں بھی ڈاکٹروں کا یہی کہنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی وقت خود ہی ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا...... لیکن بہت دیر سے ہوا۔ یہ

انیس بیس سال پہلے کی بات ہے۔ جلالی صاحب کی وائف کو بھی فوت ہوئے پانچ چھ سال گزر چکے تھے۔ جلالی صاحب کی تکلیف بغیر کسی خصوصی علاج یا دوا کے کم ہونے لگی اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں ناپید ہوگئی۔ اب وہ اس حوالے سے بالکل صحت مند ہیں لیکن اس طویل ترین بیماری نے ان کی شخصیت پر جو منفی اثرات ڈالے ہیں، وہ موجود ہیں اور شدت سے موجود ہیں۔''

بارش برس رہی تھی لیکن اس کی ساری خوب صورتی تاریکی میں دفن تھی، بس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی یا پھر پانی کی بوچھاڑوں کی آواز۔ آسمان پر بجلی چمکی تو جیسے برآمدے میں بھی ایک بجلی چمک گئی۔ مہناز کا پُرشباب کمان کی طرح کسا ہوا جسم ایک لمحے کے لئے روشن ہو کر نیم تاریکی میں اوجھل ہوگیا...... کہا جاتا ہے کہ بادوباراں میں عورت کا حسن نکھر جاتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ یہی کہنا چاہ رہی ہیں کہ جلالی صاحب کو اپنی بیماری کی وجہ سے عمر بھر لمس کی جو کمی رہی ہے، وہ اب انہیں نفسیاتی طور پر دق کر رہی ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ آج دوپہر آپ نے ان کی جو کیفیت دیکھی ہے، وہ اکثر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اپنے وجود کا اکیلا پن بڑی شدت سے ان کے اندر ابھرتا ہے۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں میں ایک تکلیف دہ سنسناہٹ ماتھے پر پسینا آتا ہے۔ میڈیکل زبان میں اس تکلیف کے لئے لمبے چوڑے اور مشکل نام ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ شدید اعصابی بے قراری کی ایک شکل ہے۔ آپ کو میں ایک مثال دیتی ہوں۔ آپ نے پالتو جانوروں مثلاً بلیوں وغیرہ کو دیکھا ہوگا...... وہ اپنے جسم کو کسی جاندار جسم کے ساتھ ٹچ کرنا پسند کرتی ہیں۔ پاؤں میں لوٹتی ہیں۔ اپنا آپ اپنے مالک کی ٹانگوں سے رگڑتی ہیں...... یہ بھی اسی قسم کی اعصابی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ پچھلے چالیس پچاس برسوں میں جلالی صاحب کو جانوروں سے جو خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی ہے، اس کی وجہ بھی شاید یہی اکیلا پن ہے...... مگر کچھ بھی ہے تابش صاحب...... اپنے جیسے انسان کی کمی پالتو جانوروں سے تو پوری نہیں ہو سکتی۔ یقیناً دیکھنے والوں کو بہت برا لگتا ہوگا کہ یہ عمر رسیدہ شخص جوان ملازماؤں کو اپنے اردگرد رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ قریب ہونا اور لیٹنا بھی پسند کرتا ہے۔ وہ اسے ایک بوڑھے کی کج روی اور شاید رنگین مزاجی سے تعبیر کرتے ہوں گے لیکن وہ اس مسئلے کی دردناک بنیاد سے واقف نہیں ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! آپ نے تو اس تصویر کا ایک

بالکل دوسرا رخ پیش کر دیا ہے...... آپ کا کیا خیال ہے، اس حوالے سے جلالی صاحب کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟''

''شاید کچھ بھی نہیں۔ اب بڑھاپے کی کئی بیماریاں جلالی صاحب کو چمٹ چکی ہیں...... آپ جانتے ہی ہو، ان کے تین بائی پاس ہو چکے ہیں۔ زندگی کا تو پل بھر کا بھروسا نہیں لیکن ظاہری حالت سے بھی پتا چلتا ہے کہ جلالی صاحب اب زیادہ عرصہ نہیں گزاریں گے۔ شاید دو تین سال...... یا اس سے بھی کم۔ اب تو کوئی ایسا شخص ہو جو پورے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ جلالی صاحب کے ان آخری دنوں کو...... خوشگوار اور کم اذیت ناک بنا سکے۔''

میں نے کنکھیوں سے مہناز کی طرف دیکھا۔ ہوا کی وجہ سے اس کا آنچل سرک گیا تھا اور ملائم بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے شخص کا ذکر رہی تھی جو جلالی کی زندگی کے آخری حصے کو خوش گوار بنا سکے...... اور وہ ''شخص'' وہ خود تھی۔ وہ بڑی رازداری سے ان کی زندگی میں آ چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کوئی ایسی عورت ہو جو جلالی صاحب کو قربت مہیا کر سکے۔ لیکن یہ قربت تو وہ اپنے اردگرد موجود عورتوں سے حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔''

''لیکن یہ بھی تو ادھوری قربت ہی ہوتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ...... میاں بیوی والی قربت...... مگر اس عمر میں اور اتنی بیماریوں کے ساتھ......؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا پھر جلدی سے موضوع بدل کر بولی۔ ''آپ کے اور میرے درمیان گہرے اعتماد کا رشتہ ہے تابش! میں پھر کہوں گی کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوں، وہ ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ یہی اعتماد ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ ڈسکشن جلالی صاحب کو ان کے مسئلوں سے چھٹکارا دلانے میں معاون ثابت ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ کسی طرح ہم جلالی صاحب کو باکس والی ذمے داری چھوڑنے پر آمادہ کر لیں۔''

میں نے کہا۔ ''مہناز! میں اپنی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس اعتماد کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ بس اس حوالے سے میں عمران کی بات ضرور کرنا چاہوں گا۔ آپ اس معاملے میں مجھے اور عمران کو ایک ''اکائی'' سمجھ لیں تو آپ کی مہربانی ہو گی...... میں حلفیہ کہتا ہوں ڈاکٹر مہناز! میں اس شخص پر اپنی ذات ہی کی طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔''

میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوئی اور میں اسے قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ تب گفتگو کا رخ ایک بار پھر جلالی کے عجیب و غریب کردار کی طرف مڑ گیا۔ مہناز ان کی تعریفیں کرنے لگی...... اور یہ تعریفیں بے جا بھی نہیں تھیں۔ جلالی صاحب ایک نہایت پڑھے لکھے، بین الاقوامی شہرت کے حامل شخص تھے۔ جنگلی حیات کے معاملات پر انہیں اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ غیر ملکی اور ملکی سلیبس کی کتابوں میں ان کا ذکر موجود تھا۔ بے شک وہ غصے کے بہت تیز تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت میں کجروی تھی مگر ان کے کردار کے اخلاقی پہلو بھی قابلِ ذکر تھے۔ انہیں غیر ملک شہریت کی آفرز ہوئیں لیکن وہ پکے پاکستانی تھے، انہوں نے اپنی مٹی نہیں چھوڑی۔ وہ ماضی کی خوب صورتیوں میں زندہ رہنے والے شخص تھے۔ وہ جوانی میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے لیکن ان کا نام ہر قسم کی آلائش سے پاک رہا۔ وہ سچ کی حمایت میں بولنے والے اور پھر ڈٹ جانے والے شخص تھے۔ ایک ایسا بندہ جس کے کمزور جسم کے اندر ایک طاقتور مزاحمت کار موجود تھا۔ مہناز نے ذہانت اور معاملہ فہمی کے حوالے سے بھی جلالی کی تعریف کی۔

میں نے کہا۔ ''اس میں تو کوئی شک نہیں مہناز! اب ان کا یہ فیصلہ ہی دیکھو کہ انہوں نے ''باکس'' کے بارے میں اپنے سوا اور کسی کو بتایا ہی نہیں۔ اگر بتایا ہوتا تو باکس کب کا ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔''

''ہاں، انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ باکس کی خاطر فارم ہاؤس کے مکینوں پر تشدد کی راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ خود ان پر بھی تشدد ہو سکتا تھا لیکن صرف ایک حد تک۔ تشدد کرنے والے انہیں زندگی سے محروم کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے اور وہ اب بھی نہیں لے سکتے...... وہ اب جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کے سوا باکس کا علم اور کسی کو نہیں۔ اور وہ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کئی بیماریوں کے نشانے پر ہیں، انہیں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے اور اگر کچھ ہو گیا تو وہ باکس آرا کوئے سمیت ہمیشہ کے لئے لاپتا ہو سکتا ہے۔''

''بے شک۔'' میں نے تائید کی۔ ''ہم یہی فرض کر لیں گے کہ جلالی صاحب نے باکس، کسی درخت کی جڑوں میں گڑھا کھود کر دبا دیا ہے۔ اب فارم ہاؤس کے اردگرد ہزاروں درخت ہیں...... کوئی کہاں تک ڈھونڈ سکتا ہے؟''

ڈاکٹر مہناز نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں کل رات بھی دیر تک سو نہیں سکی۔ بار بار تم دونوں کی بنائی ہوئی ویڈیو کے منظر نگاہوں میں گھومتے رہے ہیں۔ ماننا پڑتا ہے، یہ واقعی دل گردے کا کام تھا۔ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے تم لوگ جاوے جیسے شخص کے ٹھکانے

میں گھسے اور اس کے دو بندوں کو قتل کر کے دندناتے ہوئے واپس آ گئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ میں تم دونوں کے بارے میں الجھتی جا رہی ہوں۔ تم...... بہت خطرناک لوگ ہو۔ کسی وقت ڈر لگنے لگتا ہے۔''

''دشمنوں کو تو ڈرنا چاہئے لیکن یہ ہمارے لئے بڑی شرمندگی کی بات ہے کہ دوست ہم سے ڈر رہے ہیں؟''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''انجانی چیز کا ڈر زیادہ ہوتا ہے۔ تم دونوں اپنے بارے میں کھل کر بتاتے بھی تو نہیں ہو۔''

''کیا تم نے اپنے بارے میں سب کچھ کھل کر بتا دیا ہے؟'' میرے سوال پر وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ یقیناً اس کے چہرے پر رنگ بھی گزرا ہو گا جو نیم تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے جلدی سے بات بدلی۔ ''یہی کہ ہم ایک دوسرے پر جتنا زیادہ بھروسا کریں گے، اتنا ہی جلالی صاحب کا فائدہ ہو گا بلکہ یہاں موجود ہر شخص کا فائدہ ہو گا۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔''

مہناز کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''وڈیو کے منظر یاد آتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ جاوے جیسا شخص چپکا بیٹھا رہے گا۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کا ردِعمل جتنا تاخیر سے ہو، اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔''

''ہاں ڈاکٹر! تمہاری بات کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔'' اب ہم دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے آگے کو جھک کر اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے پیالے میں رکھی اور اس کی کلائیوں کی چوڑیاں، چھن چھنا کر کہنیوں کی طرف چلی گئیں۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''کل تم نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی تھی کہ ہمیں دیکھنا چاہئے...... مختار ملک جیسی کوئی اور کالی بھیڑ تو کوٹھی یا فارم ہاؤس میں موجود نہیں۔''

''بالکل ڈاکٹر...... سیانے یہی کہتے ہیں کہ کھلے دشمن سے چھپا دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

○......❖......○

نصرت نے فون پر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ثروت سے ٹیلی فونک رابطہ رکھوں لیکن پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی جھجک مانع ہوتی جا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، میں اس کی بے رخی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی تھی مگر تصورات میں تو وہ میری ہی تھی۔ میں اپنے تصورات کا یہ شیش محل برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات کا وقت تھا، موبائل فون میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ثروت کو کال کروں یا نہیں......

اچانک فون پر بیل ہوئی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا۔ یہ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو'' کہا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک جوان مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! آپ تابش صاحب بول رہے ہیں؟''

''آپ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام یوسف ہے...... یوسف فاروقی۔ میں آپ کی کزن ثروت کا شوہر ہوں۔'' دوسری طرف سے مسکراتی آواز میں کہا گیا۔

میں ایک لمحے کے لئے سناٹے میں رہ گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''جی...... جی...... میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا لیکن آپ کے پاس میرا نمبر کیسے آیا؟''

''بس ایسے ہی آ گیا۔ دو تین دن پہلے تک میں آسٹریا میں تھا۔ ایک دن ویسے ہی نصرت کا موبائل دیکھ رہا تھا۔ ''کال لوگ'' میں دو تین جگہ ''تابش بھائی'' کی کال تھی۔ میں نے نصرت سے پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گئی۔ شاید آپ سے ملانا نہیں چاہتی تھی لیکن ہم تو جناب یاروں کے یار ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے لوگوں سے ملتے ہیں۔ سوچا خود رابطہ کر کے دیکھتے ہیں۔''

مجھے نصرت پر غصہ آیا۔ اس سے بے پروائی ہوئی تھی۔ اپنے بہنوئی کی متجسس طبیعت کا اسے پتا ہی تھا۔ اسے میری کال Delete کرنی چاہئے تھی۔ میں نے کہا۔ ''خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری تو چند دن سے بات نہیں ہوئی اس کے ساتھ۔''

''آپ کو تو باخبر ہونا چاہئے تابش صاحب! میرے اندازے کے مطابق تو آپ خاصے ''انوالو'' ہیں نصرت کے علاج میں۔''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں......''

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے نا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں سے

نہیں۔ ورنہ یہ تو نمود و نمائش کا دور ہے۔ اور تو اور لوگ آٹے کی بوری ضرورت مند کے سر پر رکھتے ہیں اور تصویر کھنچواتے ہیں۔''

''لیکن......''

''میں سب جانتا ہوں تابش صاحب! آپ چھوڑیں اس موضوع کو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ ہی نے نصرت اور ثروت کو منع کیا ہوگا کہ اس سلسلے میں آپ کا نام نہ آئے۔ بزرگوں نے درست کہا ہے کہ کسی کے کام آیا جائے تو اس طرح کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے کو پتا نہ چلے...... ویسے آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہے؟''

وہ واقعی چرب زبان شخص تھا۔ میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو غالباً لاہور میں ہیں لیکن میں لاہور سے باہر ہوں اور ابھی مصروف بھی ہوں۔ چند دن بعد کوئی وقت رکھ لیتے ہیں۔''

''لیکن ملاقات ہونی بہت ضروری ہے۔'' اس نے ''ہونی'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ آپ کو ایک دو غلط فہمیاں ہیں جو دور ہونی چاہئیں۔'' میں نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔

کچھ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ہماری گفتگو ختم ہوگئی۔

میں نے فوراً نصرت کو فون کیا۔ ''ہیلو تابش بھائی، کیسے ہیں؟'' اس کی ہشاش آواز سنائی دی۔

''میں زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔'' میں نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے یوسف بھائی جان کا فون آیا تھا۔''

وہ حیران رہ گئی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور ساتھ ہی غصے کا اظہار بھی کیا کہ اس نے میری کالز کا ریکارڈ حذف کیوں نہیں کیا۔ وہ ٹپٹائی آواز میں بولی۔ ''لیکن تابش بھائی! یہ بھی تو سراسر غلط ہے نا۔ یوسف بھائی کیوں جاسوسیاں کرتے پھر رہے ہیں؟ انہیں میری اجازت کے بغیر میرا موبائل دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں ابھی انہیں فون کر کے پوچھتی ہوں۔''

''یہ تم غلطی کے اوپر ایک اور غلطی کرو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اب اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ تمہاری کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کوئی ''ٹاپ سیکرٹ'' تھا جو افشا ہوگیا ہے۔ یوسف اس بارے میں تم سے بات کرے گا لیکن تم نے ہرگز یہ تسلیم نہیں کرنا کہ میں نے علاج کے لئے کوئی رقم وغیرہ دی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ علاج کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ

وغیرہ ہوتا تھا۔ میرے اور ثروت کے پرانے رشتے کے بارے میں بھی از خود کچھ نہیں بتانا۔ اگر اسے اپنے آپ پتا چل جائے تو اور بات ہے۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں بھائی جان...... یوسف بھائی کو جو پتا چلنا ہے، چل جائے۔ انہوں نے جو بم پھوڑنا ہے پھوڑ لیں۔ ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ گناہ وہ کر رہے ہیں۔ باجی کو اپنے مطلب کے لئے بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں۔''

میں نے نصرت کو سمجھایا بجھایا کہ وہ جذباتی رویہ نہ اپنائے۔ اس کا پارا نیچے آ گیا۔ وہ مجھے اپنی صحت اور علاج کے بارے میں بتانے لگی۔ دیگر معاملات پر باتیں کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''ثروت کہاں ہے؟''

وہ پورا نقشہ کھینچتے ہوئے بولی۔ ''باہر لابی میں بیٹھی ہیں۔ میں کھڑکی سے انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ سرخ سویٹر پہن رکھا ہے، کندھوں پر ہلکی گلابی شال ہے۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا کی وجہ سے ان کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری پڑھ رہی ہیں۔ اتنی پیاری لگ رہی ہیں، کہ کیا بتاؤں۔ وہ گریس، باجی کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ پلیز...... پلیز! آپ ایک کام کریں۔ اسی وقت باجی کے نمبر پر کال کریں...... پلیز۔'' اس کے لہجے میں دنیا بھر کی التجا سمٹی ہوئی تھی۔

''لیکن اگر اس نے جواب نہ دیا تو؟''

''وہ دیں گی...... ضرور دیں گی۔ اچھا، اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے انہیں کال کریں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے ثروت کا نمبر ملایا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے لیکن اب اسے کال کرتے ہوئے میں اندر سے کانپ رہا تھا۔ بیل ہوئی اور پھر ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔

میں نے پھر کوشش کی...... پھر ناکامی ہوئی۔ تیسری کوشش بھی ناکام ہوئی تو میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ میں نے خود کو ایک دم معمولی اور بے وقعت محسوس کیا۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ نہ سن سکے گا تیری صدا...... جو چلا گیا اسے بھول جا۔

تیس چالیس منٹ بعد پھر بیل ہوئی۔ میں نے دیکھا، نصرت کا نام تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ''کیا کر رہے ہیں بھائی جان؟''

''بیٹا افسوس کر رہا ہوں کہ میں نے کیوں کال کی۔''

''ایسی بات نہیں ہے بھائی جان۔ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ آپ نہیں دیکھ رہے۔ جب آپ کی کال آ رہی تھی، باجی کے، چہرے کے رنگ دیکھنے والے تھے۔ انہوں نے خود کو پتا نہیں کس طرح کال ریسیو کرنے سے روکا۔ پھر ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر نکلی ہیں تو آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے پتا ہے روتی رہی ہیں لیکن کہہ رہی تھیں کہ الرجی ہو رہی ہے، چھینکیں آ رہی ہیں۔ بھلا کوئی آواز کے بغیر بھی چھینک مارتا ہے تابش بھائی جان؟'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟''

''اس میں خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ خوش ہونے کی بات دوسری ہے۔'' وہ اسی ترنگ میں بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور سے یوسف بھائی کا فون آیا تھا۔''

''پھر؟''

''باجی نے ان کا فون بھی نہیں سنا۔'' نصرت بہت خوش تھی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔ ''میرے خیال میں یہ پہلا موقع ہے تابش بھائی جان کہ باجی نے اس طرح یوسف بھائی کی کال ریجیکٹ کی ہے۔ دن میں کم از کم چھ کالیں تو کرتے ہیں وہ۔ پتا نہیں، آج کل کیا ہو گیا ہے انہیں۔ اتنی فکر کیوں پڑی ہوئی ہے باجی کی؟ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ادھر لاہور میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ فاروقی انکل وہاں آئے ہوئے ہوں۔ کسی طرح وہاں کے حالات کا پتا چلے نا۔''

نصرت نے حالات کا پتا چلنے کی بات کی تو میرے ذہن میں فوراً ملازمہ حمیدن کی صورت ابھر آئی۔ اس سے پہلے لاہور میں عمران کے ساتھ جیلانی نے یوسف کی اس ملازمہ کو بڑی خوبی سے شیشے میں اتارا تھا اور گراں قدر معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے نصرت سے تو نہیں کہا لیکن دل میں سوچا کہ ضرورت پڑنے پر حمیدن کو پھر متحرک کیا جا سکتا ہے۔

نصرت کی صحت کے معاملات پر کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا۔ اس کوریڈور میں ایک بار پھر تاریکی چھائی ہوئی تھی جہاں سے گزر کر مہناز بڑی رازداری سے جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچتی تھی۔ اپنی آمدورفت سے پہلے وہ اس بلب کو یہاں سے اتار لیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آج وہ پھر اپنے عمر رسیدہ شوہر کے پاس موجود ہے۔

اگلے روز جب سہ پہر کے وقت جلالی صاحب عمران کے ساتھ اپنے چڑیا گھر کا دورہ کرنے کے بعد فارم کے سکیورٹی انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، ڈاکٹر مہناز سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس نے خلافِ معمول ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ تاہم وہ کچھ سُست سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے ڈاکٹر! لگتا ہے کہ رات کو آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی۔''

اس کے خوش نما چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ تاہم فوراً بولی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو تابش! رات کافی دیر تک جاگتی رہی ہوں۔ وہ تمہاری خون خوار ویڈیو ذہن سے نہیں نکلتی۔ بہتر ہے کہ تم لوگ اسے ضائع کر دو۔ وہ تمہارے خلاف دو بندوں کے قتل کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔''

''وہ بندے نہیں تھے مہناز...... خونی جانور تھے۔ ایسے جانوروں کو جہنم واصل کرنے پر تو یار لوگوں کو انعام ملا کرتے ہیں۔''

''ویسے اندر سے جلالی بھی فکر مند ہیں۔ وہ سکیورٹی مزید سخت کروا رہے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ جاوا نچلا نہیں بیٹھے گا۔''

میں نے کہا۔ ''سکیورٹی سے بھی زیادہ یہ بات اہم ہے کہ ہم اندر سے محفوظ ہوں۔ ہمیں پتا چلے کہ کوئی دوسرا ''مختار ملک'' تو یہاں موجود نہیں...... اور...... اور لگتا ہے کہ وہ ہے۔''

''مجھے بھی یہی پریشانی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہر وقت کوئی ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔''

یہ وہی موضوع تھا جس پر ہم کل بھی ''ڈسکس'' کرتے رہے تھے۔ میں نے کہا۔

''مہناز! اگر میں تم سے کہوں کہ کسی ایک شخص کا نام بتاؤ تو تم کس پر شک کر سکتی ہو؟''

اس کی چمکیلی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ ''کیا کہوں اس بارے میں...... سیکرٹری ندیم تو ہر طرح بھروسے کا بندہ ہے۔ بابا طفیل اور فتح محمد وغیرہ خاندانی ملازم ہیں۔ ڈاکٹر عدیل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیگر ملازموں میں وحید اور مصطفیٰ کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔''

میرے ذہن میں بار بار وہ ہیولا ابھر رہا تھا جسے میں نے چند روز پہلے جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے پاس دیکھا تھا۔ وہ کس کا ہیولا تھا؟ یقیناً کسی ایسے شخص کا جو ہمارے اردگرد موجود تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی لاہور سے مہناز کی والدہ کی کال آ گئی۔ یقیناً ماں اور بیٹی کے درمیان وہی موضوع شروع ہونے والا تھا جو اس سے پہلے بھی زیرِ بحث رہا تھا۔

لیکن ماں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ رسموں رواجوں سے باغی بیٹی اس حوالے سے انتہائی قدم اٹھا چکی ہے۔

وہ بہار کی ایک بڑی خوشبودار شام تھی۔ سہ پہر کو ہلکی پھوار پڑی تھی، اس کے بعد چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ اس دھوپ نے گل لالہ، گل عباسی، گلاب اور نرگس کے اَن گنت پھول قرب و جوار میں مہکا دیئے تھے۔ احاطے میں سفیدے اور سائپرس کے لاتعداد درخت تھے۔ ان دھلے دھلائے درختوں کے نیچے پھول دار بیلیں بہار دکھا رہی تھیں۔ Zoo کی طرف سے موروں کی "می آؤں" اور کوئل کی کوک سنائی دیتی تھی۔ ایک دم میرے سینے میں گھونسا سا لگا۔ یہ اپریل کی 18 تاریخ تھی۔ پچھلے چند سالوں میں یہ تاریخ مجھے کبھی نہیں بھولی تھی۔ یہی تاریخ تھی جب میں نے آخری بار ثروت کو چھوا تھا، اسے پیار کیا تھا۔ مجھے وہ منظر آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ ثروت کے کپڑوں کا رنگ، اس کی لگائی ہوئی خوشبو، اس کی کہی ہوئی باتیں، اس کا پیار، اس دن اسے کتنی بار چوما تھا، کتنی بار گلے لگایا تھا، کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔ ان دنوں کتنے قریب آ چکے تھے ہم۔ اپنے گھر کے لئے پردوں کے رنگ بھی ہم نے چن لئے تھے۔ وہ پکوان بھی منتخب کر لئے تھے جو ہمیں اپنے مہمانوں کو کھلانے تھے اور وہ تفریح گاہیں بھی جہاں جہاں ہمیں پہنچنا تھا اور وہ موسم جو ہمیں دریافت کرنے تھے۔ مجھے آج بھی یاد تھا، 18 اپریل کو ہونے والی اس آخری ملاقات میں ہم نے ان پھولوں کے نام لئے تھے جو ہم نے اپنے باغیچے میں لگانے تھے۔ گل خیرو کے ذکر پر ہمارے درمیان تھوڑی سی پیار بھری لڑائی بھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ پھول زیادہ پسند نہیں تھا مگر ثروت کو اچھا لگتا تھا...... اور پھر وہ پھول رہا، نہ وہ پکوان، نہ وہ موسم جو ہم نے مل کر دریافت کرنے تھے۔ وہ ملاقات، پیار بھری آخری ملاقات ثابت ہوئی تھی۔ پیار کی کہانیوں میں یہ "آخری" کیوں آتا ہے......؟ کیوں آخری خط؟ کیوں آخری کال؟ کیوں آخری بوسہ؟ کیوں؟ رب کائنات نے پیار کے ساتھ جدائی کیوں لکھی ہے...... یہ "آخری" کیوں لکھا ہے؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب پیار کرنے والوں کی زندگی میں یہ "آخری" آتا ہے، تو وہ اس کی موجودگی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ آخری ملاقات ہو رہی ہوتی ہے اور وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ آخری ہے۔ آخری کال ہو رہی ہوتی ہے اور پتا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آوازیں دم توڑ جائیں گی۔ آخری بار چوما جا رہا ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی کہ اب ہونٹوں کو عمر بھر ترسنا ہے...... میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس خوشبودار شام کو جانے نہ دیتا۔ اس شام کو اور اس میں موجود ساری دلکشیوں کو ثروت سمیت اپنے سینے میں چھپا لیتا اور کہیں دور نکل جاتا۔ واجی، تھانے دار اشرف اور سیٹھ سراج جیسے

بدفطرت لوگوں کی دنیا سے بہت دور۔

سیٹھ سراج کا سراپا نگاہوں کے سامنے آیا تو میرا پورا وجود جلنے لگا۔ وہ میری محبت کا قاتل تھا، میری ماں کا قاتل تھا...... اور وہ زندہ تھا۔ انہی گلی کوچوں میں کہیں دندنا رہا تھا۔ اپنی تمام تر خباثت اور فرعونیت کے ساتھ۔ اب وہ بونے سے دیو بن چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کچھ اور پھیلا لئے تھے۔ اب وہ ایک ملک گیر شہرت کا حامل نہایت بااثر بدمعاش تھا۔ میرے اندر وہی شعلے دہکنے لگے جو مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھاگتا چلا جاؤں، یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں۔ کوٹھی کے اردگرد مٹی کا ایک ٹریک موجود تھا۔ غالباً جب جلالی صاحب کی صحت قدرے بہتر تھی تو وہ یہاں چہل قدمی کیا کرتے ہوں گے یا پھر جاگنگ۔ میں شوز پہن کر اس ٹریک پر آیا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ میں بغیر دم لئے بھاگتا رہا...... چکر پر چکر لگاتا رہا، یہاں تک کہ سانس نے سینے میں سمانے سے انکار کر دیا۔ پسینا مساموں سے دھاروں کی صورت بہہ نکلا۔ یوں لگا کہ ٹانگیں بے جان ہو جائیں گی، میں لڑکھڑا کر گروں گا اور پھر اٹھ نہ سکوں گا۔ یہ برداشت کی انتہا تھی اور بارونڈا جیکی نے کہا تھا، جہاں برداشت کی انتہا ہونے لگتی ہے، وہیں سے کچھ حاصل ہونا شروع ہوتا ہے، وہیں سے معجزے پھوٹتے ہیں۔

ایک جگہ میرے قدم ڈگمگائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی گر پڑوں گا۔ میں رک گیا اور سفیدے اور شیشم کے درختوں کے درمیان گھاس پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے فتح محمد نظر آیا۔ ہاں، وہ فتح محمد ہی تھا، وہ ایک دوسرے ملازم کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہوا درختوں کے اندر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے جثّے اور چلنے کے انداز سے پہچانا۔ چند دن پہلے حملہ آوروں نے فارم میں گھس کر کھدائی کی تھی۔ مٹی کے وہ ڈھیر ابھی تک فارم میں موجود تھے۔ ایک ایسے ہی ڈھیر کے پیچھے ایک جگہ رک کر وہ دونوں رازداری سے باتیں کرتے رہے پھر فتح محمد نے اپنے ساتھی کا کندھا تھپتھپایا اور اس سے رخصت ہو کر آگے بڑھ گیا۔ گارڈز کے قریب پہنچ کر فتح محمد نے ان سے بھی تھوڑی سی بات چیت کی اور کوٹھی کے ایک عقبی دروازے کی طرف چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ میں نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا لیکن آج یہ کھل گیا۔ اس کی چابی فتح محمد کے پاس موجود تھی۔ دروازے سے نکل کر اس نے باہر سے تالا لگا دیا۔ میرے ذہن میں ہلچل شروع ہو گئی۔ فتح محمد باہر جانے کے لئے یہ عقبی دروازہ استعمال کر رہا تھا اور اس کا انداز بھی مشکوک تھا۔ "وہ کہاں جا رہا ہے؟" یہ سوال شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔

میرا دل چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں لیکن سکیورٹی ایجنسی کے نہایت چوکس گارڈز کی نظر میں آئے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی عمران نے اس سلسلے میں احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور گارڈز کے پاس پہنچ گیا۔ صرف تین چار دن پہلے جلالی صاحب ان گارڈز کے تین اہم افسران کو یہ ہدایات دے چکے تھے کہ سکیورٹی کے حوالے سے مجھے اور عمران کو آگاہ رکھا جائے اور ہمارے ساتھ تعاون کیا جائے۔ یہ ہدایات اس وقت بہت کام آئیں۔ میں نے ایک سکیورٹی انچارج فراست شاہ کو بتایا کہ میں فوری طور پر کوٹھی سے باہر جانا چاہتا ہوں اور عقبی دروازے سے جانا چاہتا ہوں...... وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی اہم معاملہ ہے۔ اس نے نہ صرف کوٹھی کی چاردیواری پھلانگنے میں میری مدد کی بلکہ کوٹھی سے باہر موجود دوسرے سکیورٹی انچارج کو بھی میرے بارے میں واکی ٹاکی کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ اب تک سکیورٹی ایجنسی کے تقریباً سارے لوگ اچھی طرح جان چکے تھے کہ میری اور عمران کی اصل حیثیت باورچیوں کی نہیں ہے۔

میں نے باہر نکلتے ہی فارم ہاؤس کے سکیورٹی انچارج قادر خان سے پوچھا کہ فتح محمد کس طرف گیا ہے۔ وہ فتح محمد کو اس کے نام سے نہیں جانتا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔ ’’جو ملازم ابھی نکلا ہے، وہ ادھر فش فارم کی طرف گیا ہے۔‘‘

یہ فش فارم بھی فارم ہاؤس کا حصہ تھا۔ اس کے قریب ہی فارم ہاؤس کا بہت بڑا مرغی خانہ بھی تھا۔ میں فش فارم کی طرف لپکا۔ جلد ہی میں نے فتح محمد کو دیکھ لیا۔ وہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کے پیچھے موجود تھا اور ایک پرانی موٹر سائیکل کو مسلسل ککیں مار رہا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو کر نہیں دے رہی تھی اور اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسٹارٹ ہو گی بھی نہیں۔

میں فتح محمد سے کافی فاصلے پر تاریکی میں موجود رہا تھا اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ وہ سخت جھلایا ہوا نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے موٹر سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیدل چلنے لگا۔ یہ صورتِ حال میرے لئے بہتر تھی۔ اگر موٹر سائکل اسٹارٹ ہو جاتی اور وہ آناً فاناً کسی طرف نکل جاتا تو میرے لئے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ میں ایک محفوظ فاصلے سے فتح محمد کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس وہی یادگار چاقو تھا جس کی دھار نے چند ماہ پہلے جارج گورا جیسے فرعون صفت شخص کا خون چکھا تھا۔ اپنے پاس اس چاقو کی موجودگی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

میری چھٹی حِس نے کہا کہ آج کی رات فتح محمد کے لئے کچھ اچھی ثابت نہیں ہونے

والی۔ آج میں بہت برے موڈ میں تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے تک سیٹھ سراج کی منحوس صورت میری آنکھوں میں تھی اور میرا خون اچھالے مار رہا تھا۔ سیٹھ سراج تو نہیں ملا تھا تاہم اس کرخت چہرہ فتح محمد سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا اور اپنے تعاقب سے لاعلم تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایسے راستے اختیار کر رہا ہے جن پر سکیورٹی گارڈز سے ملاقات ہونے کا امکان کم سے کم ہو...... کچھ آگے جا کر اسے سکیورٹی والوں کی پیٹرولنگ جیپ کی نیلی بتی نظر آئی تو وہ دو تین منٹ کے لئے گھنی جھاڑیوں میں ٹھہر گیا۔ جیپ آگے نکل گئی تو اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ آج میں اس بندے کی حقیقت جاننے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنے سیل فون کے ذریعے عمران کو بھی آگاہ کر سکتا تھا اور ممکن تھا کہ وہ بھی میری اس کوشش میں شریک ہو جاتا لیکن پتا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ شاید میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں ہر کام میں عمران کا سہارا نہ لوں، عمران خود بھی تو یہی چاہتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد فتح محمد اچانک اس پختہ سڑک پر آ گیا جو آگے جا کر لاہور جانے والی مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ اس تیس فٹ چوڑی سڑک پر زیادہ تر تانگے، ٹریکٹر ٹرالیاں اور سائیکل یا موٹر سائیکل ہی نظر آتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کھٹارا لوکل بس بھی گزر جاتی تھی۔

مجھے پھر پریشانی لگ گئی۔ اگر یہاں فتح محمد کسی گاڑی پر سوار ہو جاتا تو میں اس کا تعاقب جاری نہ رکھ سکتا۔ ابھی اس اندیشے نے ذہن میں سر اٹھایا ہی تھا کہ اس کی عملی صورت سامنے آ گئی۔ فتح محمد نے ایک ٹریکٹر ٹرالی والے کو ہاتھ دے کر روکا۔ ٹریکٹر ٹرالی والا رک گیا۔ غالباً اس نے فتح محمد کو جلالی فارم ہاؤس کے ملازم کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ اردگرد کے دیہاتی جلالی صاحب کے نام کی توقیر کرتے تھے۔ فتح محمد ٹریکٹر پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ٹرالی روانہ ہو گئی۔ میں نے تیزی سے سوچا، اب میرے پاس راست اقدام کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا، ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اس نے کیریئر پر کوئی وزنی شے باندھ رکھی تھی۔

میں اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گوالا ٹائپ شخص تھا۔ قد ساڑھے چھ فٹ سے کیا کم ہو گا۔ اس نے موٹر سائیکل کی دونوں جانب دودھ والے برتن لٹکائے ہوئے تھے۔ ’’کیا بات ہے بھئی؟‘‘ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

"دیکھو...... میں پولیس والا ہوں۔ مجھے تمہاری موٹر سائیکل چاہئے...... تھوڑی دیر کے لئے۔ نیچے اترو۔"

"اوئے تم کون سے پولیس والے ہو؟ یہاں کے پولیس والوں کو میں جانتا ہوں۔"

وہ لمبی بحث کرنے کے موڈ میں تھا اور خاصا اکھڑ مزاج بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا جثہ تو عام ہی تھا اس وجہ سے اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ میرے پس وقت نہیں تھا ورنہ شاید میں اس سے یہ سلوک نہ کرتا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور سخت جھلاہٹ کے عالم میں کھینچ کر سڑک سے نیچے نشیبی جگہ پر لڑھکا دیا۔ موٹر سائیکل پہلو کے بل گرگئی تھی۔ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھا، گر کر فوراً ہی کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس پر جست لگائی اور جبڑے پر دو شدید ضربیں لگا کر اسے انٹاغفیل کر دیا۔ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

میں بھاگ کر واپس سڑک پر آیا۔ ایک برتن سے دودھ بہہ کر سیاہ سڑک پر لکیریں بنا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے سڑک خالی ہی تھی۔ دور اس ٹرالی کی عقبی بتیاں نظر آ رہی تھیں جس پر لفٹ لے کر فتح محمد بڑی سڑک کی طرف گیا تھا۔ گرنے کے باوجود موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ ہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور ٹریکٹر ٹرالی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ احتیاطاً میں نے ہیڈ لائٹ آف کر دی تھی۔

یہ تعاقب زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ بڑی سڑک سے ڈیڑھ دو کلو میٹر پہلے ہی ٹرالی رکی اور فتح محمد اس پر سے اتر آیا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل درختوں کے نیچے روک دی۔ یہ فیکٹری ایریا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر چند ایک کوٹھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ فتح محمد ان کوٹھیوں کی طرف چل دیا۔ میں نے موٹر سائیکل سڑک کی ڈھلوان پر جھاڑیوں کے اندر چھپائی اور فتح محمد کے پیچھے روانہ ہوا۔ اب مجھے فتح محمد سے اپنا فاصلہ کم کرنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ یکا یک اوجھل ہو جاتا اور میں منہ دیکھتا رہ جاتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا۔

فتح محمد کوٹھیوں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ آخر کافی آگے جا کر وہ درختوں میں گھری ہوئی دو تین کنال کی ایک کوٹھی کے پاس پہنچ گیا۔ کوٹھی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس ایک دو کھڑکیوں میں ہی روشنی دکھائی دیتی تھی یا پھر گیٹ کے قریب ایک بلب جل رہا تھا۔ فتح محمد کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ کوٹھی کی دس بارہ فٹ اونچی باؤنڈری وال پھلانگنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں کیکر کے درختوں میں چھپ کر اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک

کھیت میں پرالی کے گٹھے پڑے تھے اور ایک گدھا گاڑی بندھی ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے فتح محمد نے ساری منصوبہ بندی پہلے سے کر رکھی ہے۔ وہ پرالی کا ایک گٹھا اٹھا کر لایا اور کوٹھی کی چاردیواری کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا گٹھا اٹھا لایا۔ اس نے کل پانچ گٹھے دیوار کے قریب رکھے اور اوپر چڑھنے کا انتظام کر لیا۔ وہ قدرے بھاری جسم کا تھا اور فارم ہاؤس میں سستی کا شکار نظر آتا تھا مگر اب اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیوار پر چڑھ کر کوٹھی کے اندر اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی جگہ جامد کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ فتح محمد کے پاس کوئی ہتھیار موجود ہے اور وہ اس کوٹھی کے مکینوں کو آڑے ہاتھوں لینے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی کے اندر فتح محمد کا کوئی ساتھی پہلے سے موجود ہوتا۔

ایک طرف سے دو بندے نمودار ہوئے۔ انہوں نے درخت سے گدھا کھولا اور اسے ریڑھی میں جوتنے لگ گئے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک بولا۔ "اب بتا فلم دیکھنی ہے کہ بازارِ حسن جانا ہے؟"

دوسرا بولا۔ "تو تو اسٹیج ڈرامے کی بات کر رہا تھا۔"

پہلے نے کہا۔ "اوئے بھوتنی دے۔ یہ اسٹیج ڈراما بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے نا۔"

دونوں گندے انداز میں ہنسنے لگے اور ان واہیات گالیوں کی بات کرنے لگے جنہیں لوگ غلطی سے جگت کہہ دیتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور لڑکا بھی اس "فلمی بحث" میں شریک ہو گیا۔ اس نے ماں بہن ایک کر دینے والی کچھ تازہ "جگتوں" کا ذکر کیا اور ایک ایسے گانے کی تشریح کی جسے سن کر بچہ بالغ اور بالغ آگ بگولا ہو سکتا تھا۔

ان تینوں نے وہاں سے ٹلنے میں دس پندرہ منٹ لگا دیئے۔ میرے اندر جو چنگاریاں بھڑک رہی تھیں، انہوں نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں کوٹھی کے اندر جانا چاہتا تھا اور پرالی کے وہ گٹھے ابھی تک وہیں موجود تھے جنہیں فتح محمد چھوڑ گیا تھا۔ گدھا گاڑی پر تفریح کے لئے روانہ ہونے والے تینوں لڑکوں میں سے کسی کی نظر ان گٹھوں پر نہیں پڑی تھی۔ چند منٹ بعد میں اردگرد سے پوری طرح مطمئن ہو گیا اور پھر ان گٹھوں پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں کود گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اپنا سیل فون آف کر کے لمبی گھاس میں چھپا دیا تھا۔

دوسری طرف مکمل تاریکی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کوئی متنفس موجود نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اچانک پورچ کی طرف سے کتوں کی آواز سنائی دی اور

دوعدد دیوہیکل کتے برق رفتاری سے میری طرف بڑھے۔ ان کے عقب میں مجھے چند افراد کے ہیولے بھی دکھائی دیئے۔ مجھے لگا جیسے یہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

کتوں کو اپنی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھنا ایک لرزہ خیز تجربہ تھا۔ مگر آج 18 اپریل کے حوالے سے میرے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی، اس نے میرے ہر خوف کو طیش کی دبیز تہوں کے اندر چھپا دیا تھا۔ میں بھاگنے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج گورا کے سینے میں اترنے والا چاقو میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ جونہی بھاری جسم والے بپھرے ہوئے کتے نے مجھ پر جست کی، میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے ساتھ ساتھ میں تھوڑا سا بائیں جانب بھی ہٹا۔ میں نے چاقو کو حرکت دی۔ وہ کتے کی گردن کو سینے تک چیرتا چلا گیا۔ ایک لرزہ خیز آواز کے ساتھ کتا کچی زمین پر دور تک لڑھک گیا۔ دوسرا کتا میرے پہلو سے ٹکرایا۔ یوں لگا کہ کسی بھینسے نے اپنے سینگوں سے مجھے ضرب لگائی ہو۔ اس طاقتور دھکے نے مجھے کروٹ کے بل گرایا۔ کتا میرے اوپر تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے خارج ہونے والی تیز حیوانی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کی خونی آنکھیں ایک لمحے کے لئے میری نگاہوں میں چمکیں۔ مجھے ایک ساعت کی دیر ہوتی تو وہ اپنے دانتوں میں میرا نرخرہ دبوچ لیتا۔ میں نے تیز دھار چاقو کو افقی رخ پر حرکت دی اور قریباً ایک فٹ تک کتے کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ پھر اسے اپنے پاؤں پر اچھالا اور دور پھینک دیا......

دو سائے مجھ پر جھپٹے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے سر پر خون سوار ہے اور میرے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جو میری رگوں میں سیال آگ دوڑا دیتا ہے۔ آگے آنے والے شخص نے میرے سر پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور چاقو دستے تک اس کی ناف میں گھسا دیا۔ وہ دردناک آواز میں چلایا۔ پیچھے آنے والے شخص نے جو کچھ کیا اور جواب میں، میں نے جو کچھ کیا، وہ بالکل ایکشن ری پلے جیسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس شخص کی رائفل پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سنگین سے نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے جھک کر یہ وار خالی دیا اور اس کی ناف میں بھی دس انچ کا پھل اتار دیا۔

ایک گولی چلی لیکن اس نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ دو تین افراد مجھ پر جھپٹے...... میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ مجھے یہ افراد مٹی کے پتلوں کی طرح نظر آئے۔ میں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میری وحشت ان پر حاوی ہو گئی۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے افراد

کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں۔ ان میں سے ایک اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرا۔ پورچ میں کھڑی ہنڈا اکارڈ کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔

بھاگنے والے افراد نے کوٹھی میں گھس کر دروازے بند کر لئے۔ وہ جیسے مورچا بند ہو گئے تھے۔ میں نے بہت سنا تھا کہ سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ آج سچ مچ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں مار دینا چاہتا تھا اور مر جانا چاہتا تھا۔ یہ دنیا زندہ رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ سیٹھ سراج جیسے لوگوں نے اسے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور آج 18 اپریل تھی۔ میری موت شاید اسی دن واقع ہو گئی تھی۔ آج دوبارہ میں لاش میں تبدیل ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ سیٹھ سراج میرے سامنے نہیں تھا لیکن سیٹھ سراج جیسے لوگ تو تھے۔

پاس ہی ایک لینڈ روور جیپ کھڑی تھی، اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ غالباً میری آمد سے پہلے بوگیر کتے اور مسلح افراد اس جیپ پر بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ اب بوگیر کتے باؤنڈری وال کے پاس نیم مردہ پڑے تھے اور تین افراد بھی شدید زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔

میں جیپ کے اندر گھسا۔ اسے پہلے گیئر میں ڈال کر میں نے کلچ چھوڑا اور ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ ایک برق رفتار یوٹرن لے کر میں نے بھاری بھرکم جیپ کا رخ کوٹھی کے اندرونی دروازے کی طرف کر دیا۔ یہ اندرونی دروازہ تقریباً سات فٹ چوڑا اور نہایت بیش قیمت دکھائی دیتا تھا۔ جیپ نے خوفناک رفتار سے پورچ کی دو سیڑھیاں طے کیں اور پھر ایک دھماکے سے ساگوانی دروازے سے ٹکرا گئی۔ دروازے کے پرخچے اڑے، شیشے کی سیکڑوں کرچیاں ہوا میں بکھرتی نظر آئیں۔ مجھے اپنے گھٹنوں اور کہنیوں میں درد کا احساس ہوا لیکن اس احساس میں ایک ہیجانی سا لطف تھا۔ اب جیپ کوٹھی کے شیش محل جیسے کامن روم میں تھی۔ میں نے ایک بندے کو رائفل تانتے ہوئے دیکھا اور اندھا دھند جیپ اس پر چڑھا دی۔ دو فیشن ایبل لڑکیاں چلاتی ہوئی دروازوں میں اوجھل ہوئیں۔ جیپ ایک قیمتی صوفے کا کچرا بنا کر ایک شوکیس کو الٹاتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ ایک بیش قیمت فانوس پکے ہوئے پھل کی طرح چھت سے گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ اردگرد گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یکایک عقب سے کسی نے میرے سر پر رائفل کے کندے سے شدید ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ میں گھومتا، ایک اور ضرب لگی۔ میں نے حملہ آور کی طرف رائفل گھمائی۔ دو افراد پہلو سے آئے اور کیکڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میں اوندھے منہ گرا۔ میں سنبھلنا چاہتا تھا مگر سنبھل نہیں سکا۔ کئی اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ کسی نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور خون آلود چاقو بھی نکال لیا۔ وہ مجھ

پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگے۔ میری قوت برداشت ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ میں بری طرح گھرا ہونے کے باوجود زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ حیران تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی وقت ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔ پھر میرے گھٹنے پر رائفل کے دستے کی ایک شدید چوٹ لگی۔ اسی جگہ پر لگنے والی یہ دوسری چوٹ تھی۔ مجھے اپنی ٹانگ سن ہوتی محسوس ہوئی۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔ انہوں نے ہر طرف سے مجھے دبوچ لیا۔

جس شخص نے جارج گورا والا چاقو نکالا تھا، اس نے اسے کھولا اور دھاڑا۔ ''مار دو کتے کو۔'' وہ مجھ پر جھپٹا۔

ایک دوسرا شخص اس کے سامنے آیا۔ ''کیا کرتے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟''

وہ مجھے بری طرح پیٹنا چاہتے تھے لیکن پیٹنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ مجھے چھوڑتے۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے دبوچ رکھا تھا...... اور دبوچے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسی طرح میرا سر پختہ فرش سے ٹکرانے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا کریں۔ میری ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ ایک آواز ابھری۔ ''اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچاؤ۔''

انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر موڑ کر رسی سے باندھے اور مجھے فرش پر اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ کامن روم میں گھسی ہوئی جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ احاطے کی طرف سے گاہے بگاہے ایک زخمی کتے کی کربناک آواز ابھرتی تھی۔ وہ لوگ ایک کوریڈور سے گزرے۔ ایک دروازہ کھولا گیا اور مجھے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں پر دھکا دے دیا گیا۔ تیرہ چودہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا میں پختہ فرش پر گرا۔ ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میرا چہرہ مزید زخمی ہونے سے محفوظ رہا۔ بس کندھوں اور سینے پر کچھ چوٹیں آئیں...... سیڑھیوں والا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا گیا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اردگرد دیکھا۔ یہ بیسمنٹ ایک ہال کمرے جیسا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، اس جگہ دو افراد اور موجود تھے۔ ایک کی عمر تیس سال کے قریب ہو گی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کافی دیر سے یہاں بند ہے۔ غالباً وہ کسی نشے کے زیر اثر سویا ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ میری دھماکا خیز آمد کے باوجود وہ اسی طرح پڑا رہا تھا۔ یہاں موجود دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ یہ فتح محمد تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اسے بری طرح پیٹا گیا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ سر

پھٹ چکا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ وہ بھی نیچے کھسکی ہوئی تھی اور اس کے ستر کو بس جزوی طور پر ہی چھپا پا رہی تھی۔ فتح محمد نیم بے ہوش تھا اور اسی عالم میں اس کی سیاہی مائل توند، سانس کی ضرورت کے تحت بے ساختہ پھول پچک رہی تھی۔

میرے ہاتھ افراتفری میں باندھے گئے تھے۔ میں نے معمولی کوشش کے ساتھ انہیں کھول لیا۔ میں نے فتح محمد کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ ''اٹھو، ہوش کرو۔''

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اور کراہ کر رہ گیا۔ اس کے سر کی چوٹ شدید تھی، مسلسل خون رس رہا تھا۔ قریب ہی ایک ٹرے میں کھانے کے جھوٹے برتن پڑے تھے۔ اسٹیل کے ایک جگ میں پانی بھی تھا۔ میں نے فتح محمد کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

میرے کانوں میں تھوڑی دیر پہلے سنا ہوا وہ فقرہ گونجنے لگا جو کسی شخص نے بولا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچا دو۔''

یعنی یہ لوگ مجھے اور فتح محمد کو ایک ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی کہ اس کوٹھی میں گھستے ہی مجھے دھر کیوں لیا گیا تھا۔ فتح محمد کے پکڑے جانے کے بعد یہ لوگ پوری طرح الرٹ ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں جونہی احاطے میں کودا، وہ مجھ پر پل پڑے...... لیکن میں ان کے لئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے دو اور چار ٹانگوں والے کم از کم چھ کتوں کو جان لیوا طور پر زخمی کیا تھا۔ آخری زخمی وہ تھا جس پر میں نے جیپ چڑھائی تھی۔ میں اس گنتی میں اسے شامل نہیں کر رہا۔

صورت حال نے عجیب پلٹا کھایا تھا۔ میں جب فارم ہاؤس سے چلا تو میری نظر میں فتح محمد ایک مشکوک شخص تھا اور اس کے لئے میرے اندر ایک طیش پرورش پا رہا تھا۔ مگر اب اس طیش کا رخ اس کوٹھی میں موجود غنڈا صفت لوگوں کی طرف ہو گیا تھا۔ یہ بات ابھی تک ایک معما تھی کہ فتح محمد چوری چھپے یہاں کیوں گھسا اور کیوں اسے یوں بری طرح زخمی کیا گیا؟ کیا وہ کسی واردات کی نیت سے آیا تھا، یا یہ آپس کا کوئی گروہی جھگڑا تھا؟

اسی دوران میں سیڑھیوں کے دروازے کے قریب ہنگامے کے آثار نظر آئے۔ یوں لگا کہ کوئی شخص دھاڑ رہا ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرے اسے روک رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اوپر مجھ کو چاقو سے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، انور نامی یہ شخص اس زخمی کا بھائی تھا جس کی ناف میں، میں نے چاقو اتارا تھا۔ وہ اسپتال روانہ ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا تھا۔ اب یہ شخص غم و غصے میں

دیوانہ ہو رہا تھا۔

میرا جسم چوٹوں سے معمور تھا۔ خاص طور سے ٹانگ میں زبردست ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے مزہ دے رہا تھا۔ میرے اندر چوٹوں اور تکلیف کی طلب بڑھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں پکار رہا تھا۔ ''آؤ، میرے سامنے آؤ۔ دو دو تین تین ہو کر آ جاؤ۔ مجھ سے لڑو۔ تم مجھے مار دو یا میں تمہیں مار دوں۔'' ہاں، آج 18 اپریل تھی۔ آج کے دن وہ جدا ہوئی تھی مجھ سے۔ آج کے دن میں مرا تھا۔ آج کے دن دوبارہ مر جاتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔

دو تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ میں اونگھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کہیں پاس سے ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''میں خود دیکھ لیتا ہوں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔''

میں دھوکا نہیں کھا رہا تھا۔ یہ آواز جلالی صاحب کے وفادار ساتھی ''سیکرٹری ندیم'' کی تھی۔ میرے اندر امید کی کرن روشن ہوئی۔ 'تو کیا عمران اور دیگر لوگ یہاں پہنچ گئے تھے؟ کیا پولیس بھی ان کے ساتھ تھی؟ ایسے کئی سوال ذہن میں چمکے۔ بیسمنٹ کے ساتھ والے پورشن میں روشنی ہوئی پھر میں نے آہنی سلاخوں کی طرف سیکرٹری ندیم کو دیکھا...... ہاں، وہ ندیم ہی تھا مگر جس حلیے میں تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک انڈرویئر تھا۔ ہاتھ میں وہسکی کا جام اور ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ ایک پری پیکر اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس نے ایک ''نائٹ گاؤن'' پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اتنا باریک تھا کہ اپنے ہونے پر شرمندہ دکھائی دیتا تھا...... اس کے اندر پری پیکر کا جسم اسی طرح دہک رہا تھا جیسے مہین چلمن کے پیچھے شمع دہکتی ہے۔ پری پیکر کے خدوخال میں ایک خاص بات تھی اور اس نے مجھے حیران کیا......

لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرانی مجھے سیکرٹری ندیم کے حوالے سے تھی۔ اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ جلالی صاحب کا وفادار ترین ساتھی یہاں ایک بالکل مختلف روپ میں موجود تھا۔ ہم جب فارم ہاؤس میں کسی کالی بھیڑ کے بارے میں سوچتے تھے تو بہت سے ملازمین کی طرف دھیان جاتا تھا لیکن سیکرٹری ندیم کی طرف کبھی دھیان نہیں گیا۔ اس کی دھیمی شخصیت، اس کا پُرخلوص انداز، اس کی ملنساری...... یہ ایسی چیزیں تھیں شاید، جو اس کی طرف دھیان جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ندیم نے ایک کرسی گھسیٹی اور آہنی سلاخوں کے عین سامنے میری طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ پری پیکر اس کے عقب میں کسی خدمت گار داشتہ کی طرح کھڑی تھی۔ ندیم کی آنکھوں میں نشہ تھا اور زہر تھا۔ اس نے انگلی سے اپنی ناک پر نظر کی عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''جب کسی حرامی گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم خود ہی یہاں تشریف لے آئے ہو۔ ہمیں تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔''

میں خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ بڑا بدحال ہے۔ بال بکھرے ہوئے، ناک اور منہ سے بار بار خون رِسنے لگتا تھا۔

ندیم کے عقب میں کھڑی لڑکی نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرے حوالے سے خوف زدہ ہے۔ وہ مجھے انہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن سے پنجرے میں بند کسی خطرناک جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ آہنی سلاخوں کی وجہ سے تحفظ کا احساس تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی تحت الشعور میں رہتا ہے کہ سلاخیں نہ ہوں تو کیا ہو۔ اس لڑکی کے خدوخال نے مجھے چونکایا تھا اور یہ چونکنا بے وجہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے سلطان کے ٹھکانے پر میری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس کی شکل وصورت بہت حد تک انڈین فلمسٹار کرشمہ کپور سے ملتی تھی۔ اب جو لڑکی میرے سامنے تھی، اس کا چہرہ کئی زاویوں سے ایک اور معروف اداکارہ ایشوریا رائے سے مشابہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کے پاس معروف اداکاراؤں سے مشابہت رکھنے والی لڑکیوں کی ''کلیکشن'' ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہو رہی تھی کہ یہ جاوا اور سلطان گروپ کے لوگ ہی ہیں......

ندیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں باورچی نہیں ہو، اس کا اندازہ تو مجھے تمہاری آمد کے دو چار روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ پھر جب تم نے جلالی کی جیپ کے پیچھے بھاگ کر اسے روکا اور جیپ کے نیچے سے ٹریکر نکالا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم بھیڑ کی کھال میں کوئی خطرناک اور پلید جانور ہو۔ مگر اتنا اندازہ پھر بھی نہیں ہوا کہ تم بھیڑیے وغیرہ سے بھی زیادہ خطرناک اور پلید ہو۔ تم نے پچھلے ہفتے سلطان جی کے ٹھکانے میں گھس کر نادرا اور ایک ملازم کو جان سے مارا اور نیتو کو زخمی کیا...... دراصل اس دن تم دونوں نے اپنی بدقسمتی پر مہر لگا لی تھی۔''

''بدقسمت کون ہے، یہ وقت بتائے گا۔ تم دور بیٹھے ہو، اگر پاس ہوتے تو میں تمہارے منہ پر ضرور تھوکتا۔ جلالی صاحب نے تمہیں بیٹوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ تم ان کی جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔''

''میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ جو کچھ تم بول رہے ہو، اس کی سزا تمہیں تمہارے گمان سے زیادہ ملنے والی ہے۔ یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، وہ بہت برا ہے۔ جاوا صاحب فلمی آدمی ہیں۔ دنیا بھر کی فلموں میں آج تک جتنے بھی بڑے بڑے ولن تشریف

لائے ہیں، ان کی ساری سختی اور گرمی یکجا ہو کر جاوا صاحب کے اندر آ گئی ہے اور اب تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔''

اس نے ذرا توقف کیا۔ نیا سگریٹ ہونٹوں میں رکھا۔ ایشوریا کی ہم شکل لڑکی نے جھک کر لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو دکھایا۔ اس کا جسم توبہ شکن تھا۔ ندیم سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر اچانک بولا۔ ''سلطانی گواہ بننا پسند کرو گے؟''

''کیا مطلب؟''

''یوں سمجھ لو کہ تمہاری ایک طرف دوزخ ہے اور دوسری طرف جنت۔ دونوں میں داخلے کا ٹکٹ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں مشروط معافی مل سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے نادر اور دیگر دو بندوں کو براہِ راست نہیں مارا۔ اصل قاتل، وہ ماں کا ہیرو عمران بازی گر ہے۔''

''میں ان باتوں کے جواب میں بھی تمہارے منہ پر بس تھوکنا ہی پسند کروں گا۔''

''بہت گرمی ہے...... بہت گرمی ہے۔''

''تمہارے خیال سے بھی زیادہ۔''

''اسی لئے تو کہتا ہوں جنت میں آ جاؤ۔ یہاں ٹھنڈی ہوائیں ہیں...... زمین پر بہشت کا مزہ پاؤ گے۔'' اس نے بڑی ادا سے ایشوریا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ذرا سا گھما کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بالوں کو چومتے ہوئے بولا۔ ''یہ فلمی دنیا ایک بہت بڑا پری خانہ ہے...... اور جاوا صاحب اس پری خانے کے چار داروغوں میں سے ایک ہیں۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ پری خانوں میں کیا نہیں ہوتا۔''

میں خاموش رہا۔

وہ سمجھا شاید میں کچھ سوچ رہا ہوں لیکن میں تو وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی شان کے مطابق ہوں اور اس کے منہ سے لے کر اس کی دُم تک آگ لگا دیں۔

وہ بولا۔ ''وہ ماں کا ہیرو بہت کھوچل اور خرانٹ بندہ ہے۔ دیکھو، وہ آپ تو بیٹھا ہوا ہے اس ٹھرکی بڈھے جلالی کے پاس۔ خود تو فارم ہاؤس سے باہر نہیں نکلا اور تم دونوں کو یہاں بھیج دیا ہے مرنے کے لئے۔''

''تم دونوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''تم اور یہ مردہ بھینسا۔'' اس نے فتح محمد کی طرف اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا۔ ندیم اور اس کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ میں اور فتح محمد اکٹھے فارم ہاؤس

سے یہاں آئے ہیں۔ پہلے فتح محمد دیوار پھلانگ کر اندر گھسا، کچھ دیر بعد میں بھی کود پڑا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہاں کوئی خزانہ دفن ہے جسے ڈھونڈتے ہوئے ہم یہاں پہنچ گئے ہیں؟''

''یہ تو تمہیں پتا ہو گا کہ کیا دفن ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم کیوں آئے ہیں؟''

اس نے گہرا کش لے کر الکحل کی بو والا دھواں ''ایشوریا'' کے عین منہ پر چھوڑا۔ ممکن ہے کہ اسے ناگوار گزرا ہو لیکن وہ اس کی ذاتی خدمت گار تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو ذرا سی حرکت بھی نہیں دی اور حاکم مرد کی دیگر دست درازیوں کی طرح اس دھوئیں کو بھی خوش دلی سے قبول کیا۔ ندیم بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، تم دونوں نے یہاں بوگیر کتوں والا کردار ادا کیا ہے۔ شاید آج میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔ وہ ماں کا ہیرو دیکھنا چاہتا ہو گا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کیوں؟''

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ غلط ہے اور تم خود کسی اوندھے کتے کی طرح ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو تو پھر؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری باتوں کا برا نہیں مانوں گا...... کیونکہ اس بکواس کے بدلے میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے وہ زبانِ بیان سے باہر ہے۔ اگر تم اس ماں کے ہیرو کے ساتھ چپٹے رہو گے اور میری آفر سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو تم پر بھی موت کی مہر لگ جائے گی۔ جیسے اس ماں کے ہیرو پر لگی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''جاوا صاحب کے بھرت وچن کا پتا ہے تمہیں؟''

''یہ کیا ہے؟''

وہ ہنسا اور ایشوریا رائے کو دوبارہ اپنی آغوش میں کھینچ کر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا سویٹی ان باسٹرڈز کو کچھ پتا نہیں۔ کچھ بھی پتا نہیں۔ وہ اس کتے کے پلے عمران ہیرو کو زندہ سمجھ رہے ہیں جبکہ وہ مر چکا ہے۔ ایک سو دس فیصد مر چکا ہے۔ سمجھو ایک ایسا مرغا جس کا سر کٹا ہوا ہے لیکن وہ ابھی اچھل کود کر رہا ہے۔ ان احمقوں کو بتاؤ سویٹی کہ جاوا صاحب کا بھرت وچن کیا ہوتا ہے۔''

''جی...... میں؟'' وہ ہکلائی۔

''ہاں تم......''

وہ ذرا سا جھجکی پھر سیکرٹری ندیم کی آغوش میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی انگلی سے پہلے خود کو اور پھر وہسکی کے جام کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''جاوا صاحب کو اس سے اور اس سے بڑی محبت ہے۔ مطلب عورت اور وائن...... لیکن کبھی کبھی وہ ان دونوں چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب اپنے آپ سے کوئی کام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ مثلاً...... مثلاً......'' وہ ہاتھ نچا کر رہ گئی۔ شاید اسے کوئی مناسب مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔

ندیم بولا۔ ''مثلاً یہ کہ تین چار مہینے پہلے انڈیا کی ایک نئی ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئن زیڈ نے جاوا صاحب کے آستانے پر حاضری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ دس پندرہ حاضریاں بخوشی لگوا چکی تھی۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے اکسانے پر ایسا کیا تھا۔ اس کا بوائے فرینڈ بھی ایک بہت بڑا بزنس مین ہے۔ بڑی اکڑ تھی اس میں بھی۔ اس اکڑ کی وجہ سے اس نے معاملہ خراب کر لیا۔ جاوا صاحب نے اپنا مشہور زمانہ بھرت رکھ لیا۔ اور بھرت یہی تھا جو ابھی تمہیں سویٹی نے بتایا ہے۔ انہوں نے سوگند کھا لی کہ جب تک زیڈ ان کے گھر پر آ کر ان کے پاؤں نہیں چومے گی، وہ عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ دیکھو، بڑے بندوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اب کیا زبردست سائنس ہے اس بات میں۔ لیکن شاید یہ تم دونوں احمقوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ ان کو ذرا بتاؤ سویٹی۔''

''جی، آپ ہی بتائیں......'' وہ لجاجت سے بولی۔

ندیم نے کش لے کر دھوئیں کی ایک اور بدبودار پھوار سویٹی عرف ایشوریا کے منہ پر ماری جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ ندیم اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''بندے کی کمزوری ہے کہ وہ بھول جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی سے بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کے غصے میں وہ تیزی اور طاقت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اگر اس غصے کو کسی دوسری چیز کے ساتھ نتھی کر لیا جائے تو پھر بھولنے کا عمل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ جاوا صاحب عورت اور شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان دونوں چیزوں کی دوری انہیں بری طرح تڑپاتی ہے۔ ان کا ارادہ کمزور نہیں ہونے دیتی۔ جب جاوا صاحب عہد کر لیتے ہیں کہ فلاں کام کے ہونے تک وہ ان دونوں چیزوں سے دور رہیں گے تو پھر وہ کام ہر صورت ہوتا ہے اور جلد سے جلد ہوتا ہے۔ تمہارے اس ماں کے ہیرو کے لئے بھی بھرت وچن ہو چکا ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ اب وہ ایک سر کٹا مرغا ہے۔ نہ دانہ کھا سکے گا، نہ کسی مرغی سے میل کر سکے گا، نہ بانگ

دے سکے گا۔ ایسے مردہ مرغے کے لئے اپنی جان مت گنواؤ۔ سلطانی گواہ بن جاؤ۔ بہت فائدے میں رہو گے۔ ٹھنڈی ہوائیں، پری خانہ......'' اس نے ایک بار پھر گل بدن سویٹی سے رومانی چھیڑ چھاڑ کی۔

وہ ہمارے روبرو ان حرکات پر شرمسار تھی لیکن اس نے اپنے ردِعمل سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ''آپ نے ہیروئن زیڈ والی پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔''

وہ وہسکی کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''پوری بات کیا ہونی تھی۔ بس دھوبی پٹکا مار دیا جاوا صاحب نے۔ دفعہ 302 کے ایک پرچے میں ہیروئن کے بوائے فرینڈ کا نام شامل ہو گیا اور ایسا شامل ہوا کہ جناب کے کڑاکے نکل گئے۔ دفعہ 302 کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی۔ کینسر کی طرح بندے کو لگ جاتی ہے۔ دو ڈھائی مہینے میں ساری چوکڑی بھول گئی۔ ڈیڑھ دو کروڑ روپیا بھی لگ گیا۔ بھاگ دوڑ میں بزنس کی علیحدہ سے بینڈ بجی۔ آخر وہی ہوا جو جاوا صاحب چاہتے تھے۔ اپنے بوائے فرینڈ سے محبت نبھاتے ہوئے زیڈ نے چپکے سے جاوا صاحب کے پاس ''حاضری'' لگوا دی لیکن ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ سب کو پتا چل گیا کہ ''بوائے فرینڈ'' کا نام پرچے سے کس طرح اور کیوں خارج ہوا ہے۔''

بات کرتے کرتے ندیم خاموش ہو گیا۔ سیل فون کی مترنم بیل سنائی دی تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا رائے نے اپنے نہایت باریک سیلینگ گاؤن کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک سیل فون نکال کر ندیم کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ کس کی کال ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ندیم ہی کا سیل فون ہے۔ ندیم نے اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد کال ریسیو کی اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگا۔ ''جی باس...... جی باس...... میں آپ ہی کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ جی سر...... فارم ہاؤس سے نکلنے والے سارے راستوں پر ہمارے بندے پہنچ چکے ہیں...... بالکل گھیرے میں ہے جی۔ قریباً ایک گھنٹا پہلے گھیرا مکمل ہو گیا ہے...... نہیں نہیں سر! آپ فکر نہ کریں...... وہ نکل نہیں سکے گا۔ بالکل نہیں جناب...... یہ جو اس کے دو یار پکڑے گئے ہیں، گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ہی فارم سے نکل آئے تھے۔ بہرحال تسلی کی بات ہے جی کہ دونوں خود چل کر اپنے مرنے کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ میرے سامنے پڑے ہیں دونوں پنجرے میں۔ ایک تو خاصا زخمی ہے جی۔''

وہ کچھ دیر تک دوسری جانب سے کی جانے والی بات کو غور سے سنتا رہا اور ادب سے سر ہلاتا رہا۔ اس دوران میں سویٹی چور نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میرے حوالے سے اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس موجود تھا اور یہ ہراس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ندیم نے آخر

میں کہا۔ ''جی باس...... میں نے اسے آفر کر دی ہے۔ امید ہے اس کے کھوپڑے میں بات آ جائے گی۔''

یہ آخری فقرہ غالباً میرے بارے میں تھا۔ میرا دماغ بری طرح سنسنا رہا تھا۔ صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ گھمبیر تھی۔ پورے فارم ہاؤس کو جاوے کے لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ راستوں کی ناکابندی کی ہوئی تھی۔

فون بند کر کے ندیم نے واپس سویٹی ایشوریا کو تھمایا اور اس نے اسے لائٹر اور سگریٹ کیس کے ساتھ ہی اپنے پیازی رنگ کے گاؤن میں رکھ لیا۔ ندیم نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی آفر کے سلسلے میں تمہیں کل بارہ بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت دوزخ اور جنت والی بات ضرور ذہن میں رکھنا۔ اور ہاں، ایک بات اور...... فریب نہیں چلے گا۔ اگر سلطانی گواہ بنو گے تو اس کا سالڈ ثبوت بھی دینا پڑے گا، بالکل سالڈ۔''

میں بس اسے گھورتا رہا۔ وہ بولا۔ ''یہ نہیں پوچھو گے کہ سالڈ ثبوت سے کیا مطلب ہے؟...... اچھا چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں۔ سالڈ ثبوت یہ ہوگا کہ تمہیں اس ماں کے ہیرو کو کال کرنا ہوگی اور کال کر کے اسے ایک خاص جگہ پر بلانا ہوگا۔ ہمارے مطلب کی جگہ پر اور...... اور اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ اپنے گرگوں کی فوج کے ساتھ آئے گا۔ ہمیں تو پھر بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اس کا بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی کوئی فوج نہیں ہے...... اور نہ اس نے جاوے کی طرح پالتو کتے رکھے ہوئے ہیں...... وہ اکیلا تم جیسے بھگوڑوں سے نمٹ سکتا ہے۔''

''غلط فہمیاں ہیں تمہاری۔'' وہ کش لے کر بولا۔ ''اور یہ بھی غلط فہمی ہے کہ اس کی فوج نہیں ہے۔ وہ بہت کچھ چھپاتا ہے تم جیسے چچھوں سے۔ اس کے بہت سے گرگے ہیں جو اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ اپنے تئیں ڈان شان بنتا ہے۔ وہ...... لیکن اب اونٹ پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ اب اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا اور یہ بھی خبر ہو جائے گی کہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانا کسے کہتے ہیں۔ اس کو تو اب مرنا ہی ہے لیکن اگر تم زیادہ خون خرابے سے بچنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ وہ کسی طرح اکیلا چلا آئے۔''

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں واقعی اس خبیث کے منہ پر تھوک دوں لیکن میں معاملے کو مزید گرم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے تھا...... عین ممکن تھا کہ کوئی راستہ نکل آتا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی سویٹی کو اپنی بغل میں لیا اور ڈگمگاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس ساری بات چیت میں لکڑی کے باکس کا ذکر ہوا تھا اور نہ اس میں موجود آرا کوئے کا۔ یقیناً ندیم کو بھی پتا تھا کہ ہم جلالی صاحب کے دیگر ملازمین کی طرح آرا کوئے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب یہاں جو کارروائی بھی ہو رہی تھی اور ہونے والی تھی، وہ خالصتاً انتقامی تھی اور اس کے ڈانڈے یقیناً چند روز پہلے ہونے والے نادر ٹی کے قتل سے مل رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ سلطان چٹا اور عمران ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور شاید ہاتھوں میں ہاتھ بھی ڈال چکے ہیں۔ دشمنی کی یہ دبی دبی چنگاریاں نادر ٹی کے قتل کے بعد ایک دم شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اور اب کھلی جنگ کی صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ جاوا گروپ کے درجنوں مسلح افراد فارم ہاؤس کے اردگرد موجود ہیں۔ یقیناً اسی علاقے میں جلالی صاحب کی سیکورٹی کے لوگ بھی موجود تھے، ان کے درمیان کسی بھی وقت ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

ندیم کے جانے کے بعد میں فتح محمد کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے خون رِس رِس کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رائفل کے کندے سے زوردار چوٹ لگائی گئی ہے۔ میں نے سب سے پہلے ایک کپڑے کی پٹی بنائی اور سر سے بہنے والا خون بند کیا پھر اس کے چہرے پر گیلا کپڑا پھیرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اسے مدھم آواز میں پکارتا رہا۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد فتح محمد نے پلکوں کو حرکت دی اور اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدلنے لگی۔

آخر، میں اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہمارے اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا بیسمنٹ سنسان پڑا ہے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ بظاہر مجھے کوئی خفیہ کیمرا یا مائیکروفون کی شے دکھائی نہیں دی۔

فتح محمد مجھے دیکھ کر اور پہچان کر حیران ہوا۔ میں نے اس سے حوصلے تسلی کی باتیں کیں اور اسے باور کرایا کہ میں اس کی مدد کے لئے یہاں پہنچا ہوں۔ اس نے نہایت نحیف آواز میں پانی مانگا۔ میں نے پانی پلایا۔ ایک ڈبے میں تھوڑا سا دودھ بھی بچا ہوا تھا۔ میں نے وہ بھی فتح محمد کے گلے میں ٹپکا دیا۔ اس کا خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اور وہ سخت نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

وہ لڑکھڑاتی آوز میں بولا۔ ''باؤ تابش! میں نے جلالی صاحب کا نمک کھایا ہے۔ مجھے

ان کا درد ہے۔ یہ...... یہ سیکرٹری ندیم ایک دم غداری کر رہا ہے۔ جلالی صاحب کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے...... اسے معاف نہیں کرنا...... بالکل نہیں کرنا۔''

''پر تم یہاں کیسے پہنچے؟''

اس نے کھینچ کر دو تین سانس لئے اور بولا ''مجھے اس پر کئی دنوں سے شک تھا۔ دو دن پہلے میں نے اس کا پیچھا کیا۔ یہ اس کوٹھی میں گھسا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا چل رہا ہے، پر...... مجھے پتا نہیں تھا کہ یہاں اتنے سارے لوگ ہوں گے۔ میں...... آہ...... آہ۔'' وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے بائیں بازو پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس بازو سے میں نے فتح محمد کی کمر کو سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرا یہ بازو خون سے گیلا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گھوم کر نظر ڈالی اور لرز گیا۔ عقب سے فتح محمد کا پہلو کسی تیز دھار آلے سے چرا ہوا تھا۔ زیریں پسلیاں نظر آ رہی تھیں اور اندرونی چربی بھی۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ زخمی تھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔

میں نے پکار کر کہا۔ ''کوئی ہے؟''

تیسری چوتھی آواز پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر چوڑے جبڑوں والا ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آیا تھا۔ یقیناً نیند سے بیدار ہوا تھا۔ ''کیا بات ہے وڑی؟ کیا لفڑا ہے؟'' وہ مکرانی لہجے میں بولا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں...... اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت ہے فوراً۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک کراہتے ہوئے فتح محمد کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''تھوڑا صبر کرو وڑی۔ صبح ہونے والی ہے۔ اس کو درد کا ٹیکا لگا دیتے ہیں۔ آرام آ جائے گا۔ باقی کل دیکھا جائے گا۔''

''یہ ٹیکے کا معاملہ نہیں، اس کا زخم زیادہ بڑا ہے۔''

''ٹیکا بھی عام نہیں ہے۔ اس کو بالکل شانت کر دے گا۔ ایک دم پھسٹ کلاس۔'' وہ واپس گیا اور تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک پتلی اونچی ناک والا کرخت سا شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پسٹل تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''ٹیکا ہے۔ ابھی اس میں دوائی ڈالتے ہیں۔'' مکرانی نے کہا۔

اونچی ناک والے نے جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کی گولی نکال کر پسٹل میں لگائی۔ میرے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ فتح محمد کا منہ کھلا رہ گیا ہے۔ اس کی سمجھ

میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں چنگھاڑا۔

''ٹیکا لگا رہے ہیں۔ تسلی سے سو جائے گا۔ ہمیں بھی سونے دے گا۔'' اونچی ناک والا سفاک لہجے میں بولا۔

''تم یہ نہیں کر سکتے۔'' میں نے پھر چنگھاڑتی آواز میں کہا۔

''کیوں نہیں کر سکتے؟ تم نادر صاحب کو مار سکتے ہو، فضلو اور راہی کو پار کر سکتے ہو تو ہمارے ہاتھوں میں کوڑھ تو نہیں ہے۔''

میں نے فتح محمد کو دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور خود کو اس کے سامنے ڈھال بنا دیا۔

''میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ ندیم کو بلاؤ۔''

''وڑی اپن کا مغز کھراب مت کرو۔ ندیم صاحب سینئر ڈاکٹر ہیں۔ ویسے بھی ابھی وہ ایک اور مریض کو دیکھ رہے ہیں بلکہ ''مریضہ'' کو۔ اب وہ صبح ہی ''وارڈ'' کا راؤنڈ لگائیں گے۔ وڑی، انہوں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اگر یہ فتح محمد زیادہ درد بتائے تو پھر اسے یہ SOS انجکشن لگا دینا۔''

اونچی پتلی ناک والے نے سائیلنسر لگا پسٹل فتح کی طرف سیدھا کر لیا لیکن فتح تو مکمل طور پر میرے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اونچی ناک والا پھنکارا۔ ''زیادہ ہمدرد مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ مریض کے بجائے تمہارا علاج ہو جائے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔''

میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس نے کافی کوشش کی مگر میرا ارادہ اٹل تھا۔ میں سامنے سے نہیں ہٹا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کم از کم یہ لوگ فی الحال مجھے تو قتل نہیں کریں گے۔

اسی دوران میں اونچی ناک والے کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے مؤدب انداز میں کال اٹینڈ کی۔ ''جی ندیم بھائی...... جی ہاں اس کی حالت خراب ہے...... کافی خراب ہے...... ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اس نے ساتھ ہی پسٹل بھی دوبارہ اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر اور چھری کے نیچے سانس لے لو...... بڑے ''ڈاکٹر صاحب'' نے کہا ہے کہ ابھی ٹیکا رہنے دو۔ لیکن اگر یہ زیادہ ہائے وائے کر کے ہم ''ڈیوٹی ڈاکٹرز'' کی نیند خراب کرے گا تو پھر ٹیکا لگانا ہی پڑے گا۔''

فتح محمد نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی کراہیں نہ نکل جائیں۔ مکرانی اور لمبی ناک والا ہمیں گھورتے ہوئے واپس چل گئے۔

''پپ...... پانی۔'' فتح محمد نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

میں کھانے کے برتنوں کی طرف بڑھا اور تب اچانک فائر ہوا۔ یہ سائیلنسر لگے پسٹل کا فائر تھا۔ گولی فتح محمد کی عین پیشانی پر لگی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا، اس کی کھلی آنکھوں میں دہشت تھی اور خشک ہونٹ وا تھے۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا...... لمبی ناک والا سفاک انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے فلمی اسٹائل میں پسٹل کو پھونک ماری اور اسے بیلٹ میں اڑس کر دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ ''کتے...... خنزیر کی اولاد! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں دیوانہ وار سلاخوں پر جھپٹا۔ میں نے سلاخوں کو جھنجوڑا۔ ان سے اپنا سر ٹکرایا، ان پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میری آواز سارے در و دیوار میں گونج رہی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب بھانڈیل اسٹیٹ میں سلطانہ کی دردناک موت کے بعد میں غم و غصے سے دیوانہ ہوا تھا۔ آج بھی کچھ ملتی جلتی کیفیت تھی۔

لمبی ناک والے بدمعاش نے ڈاج دیا تھا۔ مجھے زخمی فتح محمد کے سامنے سے ہٹانے کے لئے اس نے واپسی کا ڈھونگ رچایا تھا اور پھر اسے شوٹ کر دیا۔ یہ بڑی بے رحمی تھی اور یہ بے رحمی شاید اس لئے بھی دکھائی گئی تھی کہ میری اکڑفوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہو جائے۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔ اس اچانک موت نے مجھ پر الٹا اثر کیا تھا۔ میرے بدن میں شعلے بھڑک اٹھے تھے...... یہ سلاخیں میرے رستے میں حائل نہ ہوتیں تو آج انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی بہت برا وقت دیکھتی۔

فتح محمد کا لہو فرش پر ایک نہایت افسردہ سی ماتمی لکیر بنا رہا تھا۔ سانس کے لئے اس کی مسلسل حرکت کرتی ہوئی توند اب بالکل ساکت ہو چکی تھی۔ میں نے ایک کپڑا اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ بستر کی ایک کھیس نما چادر سے میں نے فرش پر بہنے والا خون صاف کیا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا شخص بیدار نہیں ہوا تھا۔ نشہ آور نیند نے اسے اردگرد سے یکسر بیگانہ کر رکھا تھا۔

میں نے ٹھنڈے دل دماغ سے غور شروع کیا۔ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ جاوا کے گروہ نے فارم ہاؤس سے نکلنے والے راستوں پر اپنے بندے مقرر کر دیئے تھے۔ یہ لوگ پوری طرح مسلح اور ہر کارروائی کے لئے تیار تھے۔ ان لوگوں کا اوّلین مقصد عمران کے خلاف انتقامی کارروائی تھی۔ اب ان لوگوں کو صرف اور صرف عمران کے باہر

نکلنے کا انتظار تھا۔

میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا اور گرفت میں آ گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ مجھے چارے کے طور پر استعمال کر کے عمران کو یہاں بلانا چاہ رہے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا...... اور بیدردی سے قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ اپنی سفاکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ مجھے ابھی دکھا بھی دیا گیا تھا۔ انسانی زندگی کی ان لوگوں کے نزدیک قطعاً اہمیت نہیں تھی۔ فتح محمد کو صرف اس لئے گولی سے اڑایا گیا تھا کہ وہ شدید زخمی تھا اور اس کی زندگی کی آس برقرار رکھنے کے لئے اسے لاہور کے کسی اسپتال میں پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے فتح محمد کی بے حس و حرکت لاش کو دیکھا جو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر پڑی تھی۔ میں فتح محمد کو مشکوک سمجھ کر اس کے پیچھے لگا تھا لیکن وہ میرے شک سے بالکل مختلف نکلا تھا۔ اور جس شخص کو ہم جلالی کا سب سے وفادار اور مستعد ملازم سمجھتے تھے، وہ غداری کا مثالی نمونہ بن کر سامنے آیا تھا۔ اب یقینی بات تھی کہ کچھ راتیں پہلے اس نے فرم کے نواحی درختوں میں بھی ڈراما ہی رچایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کچھ لوگ لکڑی کے ایک باکس کو ہتھ ریڑھی پر رکھ کر لائے اور جیپ پر لادا۔ اسے خبر تھی کہ اب جلالی صاحب باکس کی لوکیشن چیک کرنے کے لئے جائیں گے اور وہ ان کا پیچھا کرے گا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد رات کے اندھیرے میں جلالی کی پوٹھوہار جیپ کے نیچے ٹریکر ڈیوائس لگانے والا شخص بھی یہی ندیم تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر بڑی سرگرمی سے مشکوک شخص ڈھونڈتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنی کارروائیاں بھی ڈالتا رہا۔

...... صبح تک کوشش کر کے میں نے خود کو کافی حد تک پُرسکون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ صبح سویرے فتح محمد کی نیم عریاں لاش وہاں سے ہٹالی جائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ لوگ اس لاش کی موجودگی کو میری زبان کھلوانے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ میں جب فتح محمد کے پیچھے نکلا تھا تو میں نے عمران کو مطلع نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اندر خود بھی فیصلے کرنے کی قوت پیدا ہو...... اور اب میں فیصلے کی سولی پر تھا۔ مجھے دوپہر تک کا وقت دیا گیا تھا مگر ٹھیک گیارہ بجے ہی ندیم آن دھمکا۔ اب وہ صاف ستھری پینٹ قمیص میں تھا۔ سرخ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے والا محنتی اور تعلیم یافتہ شخص نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت

خطرناک گروہ کا حصہ بن چکا تھا۔

وہ سگریٹ سلگانے کے بعد سلاخوں کی دوسری جانب رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بولا۔ ''کیا ارادے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''پہلے یہ لاش یہاں سے ہٹاؤ۔''

''اٹھا لیتے ہیں، اتنی جلدی کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو اکٹھی ہی اٹھانا پڑیں۔''

''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔ تم نے غداری کی ایک زبردست مثال قائم کی ہے، اب تمہیں دوسرے بھی اسی بے غیرتی میں غرق نظر آتے ہیں۔''

''اپنی جان بچانے کو بے غیرتی مت کہو۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں، اگر تم نے ہمارے مطابق عمل نہیں کیا تو تمہاری اور فتح محمد کی لاشیں تھوڑی دیر میں اکٹھے یہاں سے اٹھیں گی۔''

''باندھ کر مارنا کوئی بہادری نہیں۔ اگر ہمت ہے تو اپنے یہ دو چار کتے مجھ پر چھوڑ کر دیکھو۔ نظارہ نہ آجائے تو پیسے واپس۔''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولا۔ ''رات رات میں کافی زبان لگ گئی ہے تمہیں۔ ویسے...... کتے چھوڑنے والی بات تو تم نے اچھی کہی ہے۔ جو دو کتے تم نے قتل کئے ہیں، ان کے بھائی بند کافی غم و غصے میں ہیں۔''

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک خطرناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں رات بھر یہاں پالتو کتوں کی آوازیں سنتا رہا تھا اور وہ بڑے جسیم کتے تھے۔

میرے اور ندیم کے درمیان دس پندرہ منٹ تک معنی خیز مکالمہ ہوا۔ مکالمے کا لب لباب یہی تھا کہ میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ عمران کو پھنسانے میں ان کی مدد کروں یا پھر نادرے اور دیگر افراد کے قتل کے جرم میں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔

اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ بیسمنٹ سے باہر پورچ کی طرف تین چار بڑی گاڑیاں آکر رکی ہیں۔ ان گاڑیوں کی آواز سن کر ندیم نے ٹانگ پر سے ٹانگ اتاری اور الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اہم شخص یہاں وارد ہوا ہے۔

رات والی سویٹی ایشوریا رائے تیز قدموں سے اندر آئی۔ اب وہ بہتر لباس میں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ ملازمہ نے فرش پر سے سگریٹ کے ٹکڑے اور دیگر فالتو چیزیں اٹھائیں۔ کرسیوں کو درست کر کے رکھا۔ سویٹی نے جلدی جلدی لائٹس آن کیں اور ایک میز پر منرل واٹر کی بوتل سجائی۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم قدموں کی آوازیں آئیں۔ کئی افراد بیسمنٹ کی سیڑھیوں کی طرف آرہے تھے، دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے مجھے ایک گرجتی برستی

آواز سنائی دی۔ اس آواز نے ایک غلیظ گالی دی اور کسی پولیس افسر کی شان میں ایک زبردست قصیدہ پڑھا پھر دہاڑتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑو اس کی ماں کے خصم کو۔ لعنت بھیجو۔ تم اس کے بھائی سے رابطہ کرو۔ کسٹم میں ہے۔ اس سے میرا نام لو اور کہو کہ ایک بجے سے پہلے پہلے ہمارا سامان ائیر پورٹ سے نکلنا چاہئے۔ ورنہ اس کی بیوی جب ہری پلیٹ والی ہنڈا کار پر اپنے دونوں بچوں کو لینے اسکول جائے گی تو اسے کچھ نہیں ملے گا...... اور صدمے سے تیسرا بچہ جو اس کے پیٹ میں ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

قدم دھڑا دھڑ سیڑھیوں پر پڑ رہے تھے۔ سب سے پہلے مجھے آنے والوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ قریباً ایک درجن کے قریب تھے۔ ندیم اور سویٹی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو چکے تھے۔ آنے والوں میں سب سے آگے پینتیس چالیس سال کا ایک جسیم و توانا شخص تھا۔ اس کا رنگ گندمی اور چہرے پر چیچک کے پرانے داغ تھے...... لیکن یہ بہت نمایاں نہیں تھے۔ اس کی ناک چوڑی اور ہونٹ حبشیوں کی طرح موٹے تھے۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ آستینیں اڑسی ہوئی تھیں جن میں سے بازوؤں کی مضبوط مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک بدصورت اور ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کے اگردگرد مسلح گارڈز تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی جاوا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ گواہی درست ثابت ہوئی۔ ایک سیل فون جاوا کے ہاتھ میں، دوسرا اس کے گارڈ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرے فون پر جاوا نے بات شروع کی تو پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جس دوسرے کالر سے جاوے نے بات شروع کی، وہ اس کی کوئی ساتھی عورت تھی مگر اس سے بات کرتے ہوئے بھی جاوا تواتر سے گالیاں دے رہا تھا۔

بات کرتے کرتے ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے سیل کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ اَن لاک ہوا اور جاوا سمیت درجن بھر مسلح گارڈز اندر گھس آئے...... عجیب دہشت اور سنسنی کی فضا تھی۔ ایک گارڈ تیزی سے جھکا۔ اس نے میری ٹانگ پر ٹخنے سے ذرا اوپر ایک آہنی کڑا پہنا دیا۔ اس کڑے کے ساتھ ایک موٹی زنجیر منسلک تھی۔ زنجیر کے آخری سرے پر بھی ایک کڑا تھا۔ اس کڑے کو سیل کی آہنی سلاخوں کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ یہ سارا عمل چار پانچ سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ تین چار رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ سیل میں موجود تیسرا شخص نشے کے زیر اثر اب بھی سویا پڑا تھا۔ دو گارڈز اسے اسی حالت میں گھسیٹ کر بیسمنٹ کے دوسرے حصے میں لے گئے۔

جاوے نے فون پر بات ختم کی۔ سرتا پا مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ ندیم نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔ ''جی باس! یہی ہے ہیرو کا ساتھی۔ تابش نام ہے اس کا۔''

''ہیلو.....کون؟''

''میں تابش بول رہا ہوں عمران۔''

''تابی..... یہ کیا بے غیرتی کی ہے یار تم نے؟ کہاں ہو یہ کس کے نمبر سے کال کر رہے ہو؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے چھوٹا سا وقفہ لیا اور پھر تیز اور صاف لہجے میں کہا۔''عمران...... جاوا کے بندے فارم کے چاروں طرف موجود ہیں۔تم کو باہر نہیں نکلنا۔وہ تمہیں قتل کر دیں گے......''

ابھی آخری دو لفظ پوری طرح ادا نہیں ہوئے تھے کہ جاوا نے جھپٹا مار کر فون میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک فولادی گھونسا میرے جبڑے پر پڑا اور میں اچھل کر دیوار سے ٹکرایا...... پھر کئی گارڈز وحشیوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔ میرا جسم جیسے اچانک ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔ رائفلوں کے بٹ، ٹھوکریں، گھونسے، ہر طرح کی کاری ضرب مجھے لگائی جا رہی تھی۔ مارنے والوں میں یقیناً جاوا بھی شامل تھا۔ اس کی دہاڑوں اور غلیظ گالیوں سے اس زمین دوز کوٹھری کے در و دیوار گونجنے لگے۔ دو تین منٹ میں ہی میں زخم زخم ہو گیا۔ تب مجھے اپنی ایک ٹانگ میں شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ میرا سر پہلے پختہ فرش سے ٹکرایا پھر ہوا میں معلق ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے الٹا لٹکایا جا رہا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد میں تہ خانے کی چھت سے الٹا جھول رہا تھا۔ میرا سر فرش سے قریباً پانچ فٹ بلند تھا۔ میرے جسم اور چہرے سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ سیاہی مائل فرش پر گرنے لگا۔ جاوا دہاڑا۔''مارو کتے کو۔ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کی گندی ناک کے راستے باہر آ جانا چاہئے۔''

دو تنومند گارڈز نے اپنی چرمی بیلٹ اپنی پتلونوں سے نکالیں اور مجھ پر پل پڑے۔ ان بیلٹوں کے ساتھ بھاری آہنی بکل بھی موجود تھے۔ میرے پورے جسم پر انگارے دہکنے لگے۔ ہر دفعہ جب شڑاپ کی آواز آئی۔ مجھے لگتا کہ کسی نے آگ میں دہکائی ہوئی سلاخ میرے جسم پر رکھ دی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ میں صرف ایک ٹانگ کے ذریعے چھت سے جھول رہا تھا۔ ٹانگ کے جوڑ اکھڑتے محسوس ہو رہے تھے اور یہ وہی ٹانگ تھی جس پر لڑائی کے دوران میں، میں نے ایک شدید چوٹ سہی تھی۔ میری دوسری ٹانگ...... زنجیر کی بندش سے آزاد تھی، عجیب بے ڈھنگے انداز میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی۔

ہر انسان میں تکلیف برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے اور میں کوشش و مشق سے اس

حد کو کافی آگے لے جا چکا تھا لیکن پھر بھی ایک حد تو موجود تھی۔ یہ حد کافی دیر سے آئی لیکن آ گئی۔ گارڈز کی وحشیانہ ضربوں نے میری تکلیف کو عروج پر پہنچایا اور پھر...... میرا ذہن ایک گھٹن زدہ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ میں بے ہوش ہو گیا...... لیکن نہیں...... یہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کی کیفیت تھی۔ مجھے اپنی مدھم کراہیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور جاوا کی دہاڑیں بھی۔ پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر وہ لوگ باہر نکل گئے اور یہ بہت برا حال تھا۔ جیسے کسی شکار کئے ہوئے پرندے کے جسم پر کٹ لگا کر اور ان کٹس میں مرچ مسالا بھر کر اسے انگاروں پر بھونا جا رہا ہو۔ مجھے لگا جیسے میری ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اور میں اس ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ ہی جھول رہا ہوں۔

میرا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اس خون کو اپنے چہرے پر رینگتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اردگرد کے سارے مناظر تاریکی میں ڈوب چکے تھے۔ کوئی آواز سماعت تک پہنچتی تھی تو وہ جیسے کسی اتھاہ کنوئیں سے برآمد ہوتی تھی۔ اس کنوئیں کی گہرائی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا...... تو کیا میں مر رہا ہوں؟ ثروت کا چہرہ ایک بار پھر نگاہوں میں آیا۔ ایک سہانی شام یاد آئی۔ ہم پھولوں سے گھری ہوئی ایک روش پر پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک وعدے کی طرح...... ایک پیمان کی صورت۔''ثروت! ہم کبھی جدا تو نہیں ہوں گے نا؟'' میں نے کہا۔

''نہیں تابش! اب تو واپسی کا راستہ ہی نہیں ہے۔''

''لیکن اگر کوئی اونچی دیوار رستے میں آ گئی تو؟''

''میں اس دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اسے توڑ دوں گی یا پھر اپنی جان دے دوں گی۔''

''وعدہ؟''

''ہاں وعدہ۔'' اس نے میرے ہاتھ کو ہولے سے دبایا تھا اور چلتے چلتے میرے ساتھ لگ گئی تھی۔ جیسے وہ صرف اپنی زبان سے نہیں، اپنے پورے جسم کے ساتھ وعدہ کر رہی ہے۔

تب ساون کی ایک طویل جھڑی کا منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اپنے گھر کی بالکونی میں ہم پاس پاس کھڑے تھے۔ بارش کی چھینٹیں جسم میں ایک جاں فزا گدگدی پیدا کر رہی تھیں...... ''ثروت! مجھے ڈر کیوں لگتا ہے...... کیوں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہم کہیں بچھڑ نہ جائیں؟''

''پیار کرنے والوں کو دھڑکا تو ہوتا ہی ہے۔''

''اس دھڑکے کو کیسے ختم کریں؟''

اور یہ فتح محمد ہے۔'' ندیم نے فتح کے خون آلود چہرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ فتح کے خشک ہونٹ وا تھے اور آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔

جاوا پھنکارا۔ ''جو سالا کمینہ مر گیا ہے اس کی بات چھوڑو۔ جو زندہ ہے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ نکالو۔ کیا کہتا ہے یہ کتا؟''

ندیم نے کہا۔ ''سر! میں نے اسے دوپہر تک کا وقت دیا تھا ہیرو کو کال کرنے کے لئے۔''

جاوا بھنائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وقت تمہاری والدہ نے ایجاد کیا تھا جو ہر کسی کو دیتے پھرتے ہو؟ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، بالکل نہیں ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس نے اپنی قیمتی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ پھر میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''بچے! ہونے کو تو تیرے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن معاملہ جلدی کا ہے۔ میں دوٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ یاد رکھنا میرا نام جاوا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔'' جاوے کے عقب میں سلطان چیتا بھی نظر آیا۔ اس کے گلے اور ''زخمی کان'' پر پٹیاں بندھی تھیں۔ جاوے نے ایک گارڈ سے سیل فون لے کر میرے ہاتھ میں دیا پھر ایک دوسرے گارڈز کو اشارہ کیا۔ اس نے صرف چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اپنی جدید رائفل کا رخ میرے سر کی طرف کر دیا۔

جاوا دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''اس کتے کو کال کرو اور اسے صرف اتنا بتاؤ کہ تمہیں اس کی مدد کی فوری ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ اسے لاہور، شیخوپورہ روڈ کے تیسرے پل پر گورنمنٹ ہائی اسکول کے عین سامنے بلالو۔ یہ لو مکمل ایڈریس۔'' اس نے ایک پرچی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور آخر میں بولا۔ ''میں صرف دس تک گنوں گا بچے۔ اس کے بعد میرے کہے بغیر ہی گولی چل جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر تم نے بات کے دوران میں کوئی غلط اشارہ دینے کی کوشش کی تو بھی گولی چل جائے گی۔''

○.....❖.....○

جاوے کی آواز میں ایک ایسا فیصلہ کن آہنگ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلایا۔ نہ جانے اس وقت کیوں اچانک ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں آ گیا۔ کیا اب میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا؟ کیا محبت کے راستے میں صدیوں کا سفر رائیگاں گیا؟ کیا یہ اختتام ہے؟ مجھے عمران کو ہرگز نہیں بلانا تھا اور میرے دشمن کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ گولی چلانے سے ہرگز نہیں جھجکے گا۔ جاوا سفاک لہجے میں گنتی شروع کر چکا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا...... ایک...... دو...... تین...... چار......

وہ قیامت کے لمحے تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جاوا کی فیصلہ کن آواز کوٹھری میں گونج رہی تھی۔ پانچ...... چھ...... سات......

رائفل کا رخ میرے سر کی طرف اور رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ میں نے جاوا...... کی دم بدم سرخ ہوتی آنکھوں میں جھانکا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ مجھے اس شخص کے حوالے سے رسک نہیں لینا چاہئے۔

جاوا...... کی گنتی ''نو'' پر پہنچی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو جاوا گرجا۔ ''نہیں...... ایک لفظ نہیں...... نہ میں سنوں گا، نہ تم بولو گے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو عمران کا نمبر ڈائل کرو اور اسے میری بتائی ہوئی جگہ پر بلاؤ۔ اگر وہ تفصیل میں جائے تو تمہیں فوراً سے پہلے فون بند کرنا ہے۔''

میں نے سیل فون پر عمران کا نمبر پریس کیا۔ میرے اردگرد موجود کچھ چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ عمران کے نمبر پر بیل گئی۔ دوسری بیل پر ہی کال اٹینڈ ہو گئی۔ عمران کی جاں بخش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''بچھڑ جائیں...... کم از کم دھڑکا تو ختم ہو جائے گا۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''ثروت کی بچی......'' میں نے اس کی چٹیا پکڑنا چاہی، وہ ایک دم جھکائی دے کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی چھت پر چلی گئی۔ اس نے برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کرنا چاہا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا چھت پر آ گیا۔ بارش نے ہمیں سرتاپا بھگو دیا۔ میں نے ایک کونے میں اسے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر بارش کے ساتھ ساتھ پیار کی بارش بھی ہونے لگی۔

''بس کریں۔'' اس نے تیز سرگوشی کی۔

''اس طرح کیوں کہا؟''

''چلو کہہ دیا لیکن اتنی سزا کافی ہے۔'' وہ بدستور شوخ تھی۔

''اچھا...... یہ سزا ہے؟'' میں نے اسے کچھ اور بھی جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں...... پیار سے...... اب چھوڑیں...... چھوڑیں بھی...... امی آوازیں دے رہی ہیں۔''

امی واقعی پکار رہی تھیں۔ ''یہ امیوں کو ایسے موقعوں پر پتا نہیں کیسے خبر ہو جاتی ہے۔'' میں نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آنچل لپیٹتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

وہ دن رات ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور شوخیوں سے عبارت تھے......

میں چھت سے الٹا لٹکا رہا۔ میرے زخموں سے خون بہتا رہا اور میرے جسم میں موت کی سردی داخل ہوتی رہی۔ پھر میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک لق و دق صحرا ہے۔ سورج سوا نیزے پر ہے۔ گرم ریت پاؤں جھلسا رہی ہے۔ میرے گلے میں پیاس کے کانٹے اترے ہوئے ہیں۔ میں آبلہ پا ایک جگہ پہنچتا ہوں۔ یہاں چند گھنے چھتاور درختوں کے نیچے ثروت پُرسکون کھڑی ہے۔ اس کے حسین جسم پر جھلملاتا عروسی لباس ہے، اس کے ہونٹوں پر لالی اور آنکھوں میں کاجل ہے۔ میں چلاتا ہوں۔ ''ثروت! یہ کیا ہے؟ تم نے تو کہا تھا...... میں دیوار کو توڑ دوں گی یا اس سے ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گی۔ تم نے کیوں نہ توڑی دیوار؟ تم نے یہ آگ کا لباس کیوں پہن لیا؟''

وہ بالکل خاموش کھڑی رہتی ہے۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں جیسے میرے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ میں پھر پکارتا ہوں...... ''ثروت! یہ لباس اتار دو...... اسے بدل ڈالو۔ یہ تمہارے لئے نہیں ہے۔ تم دلہن نہیں ہو۔ دلہن کوئی اور ہے۔ تم خود کو رسموں رواجوں کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔ توڑ ڈالو یہ جھوٹ کی زنجیریں۔ ہم اب بھی ایک ہو سکتے

ہیں۔ اب بھی گئے وقت کو آواز دے سکتے ہیں۔''

وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ کسی بت کی طرح بے حس کھڑی رہتی ہے۔ میری آواز کا دم خم ختم ہو جاتا ہے۔ بدن میں اترتی ہوئی موت کی نقاہت کچھ اور گہری ہونے لگتی ہے...... میں اندر سے سسک اٹھتا ہوں۔ ایک دم مسمار ہو جاتا ہوں۔ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہوں۔ عاجز لہجے میں کہتا ہوں...... ''میں اب زیادہ دیر کا مہمان نہیں ہوں ثروت...... میں مر رہا ہوں۔ کیا تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا؟ میں جلتے صحرا میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے تم تک پہنچا ہوں۔ کیا تم اسی طرح بت بنی کھڑی رہو گی؟ رسموں رواجوں کے حصار میں بند رہو گی؟ میری طرف دیکھو گی بھی نہیں؟ پلیز ثروت...... پلیز میری طرف دیکھو...... مجھے یوں بے موت نہ مارو۔''

ثروت پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ لاتعلق کھڑی رہتی ہے۔ ایک طرف سے ایک بے چہرہ ہیولا برآمد ہوتا ہے۔ ایک نوجوان...... وہ ثروت کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لگاتا ہے اور پھر اسے لے کر درختوں کی ٹھنڈی تاریک چھاؤں میں اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں اسے پکارتا رہتا ہوں مگر وہ مڑ کر نہیں دیکھتی۔ مایوسی اور صدمے کی بے پناہ شدت سے میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ میں اسی طرح تہ خانے کی چھت سے الٹا لٹک رہا ہوں۔ میرے جسم کا رہا سہا خون میرے سر اور سینے میں جمع ہو چکا تھا۔ میری ایک ٹانگ بالکل سن ہو چکی تھی اور دوسری...... نہایت تکلیف دہ زاویے سے بائیں طرف جھکی ہوئی تھی۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سہ پہر سے بعد کا وقت ہے۔ کہیں پاس ہی کوئی اپنے موبائل فون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز واضح طور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا اور پہچان لیا۔ یہ سلطان چٹے کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''نہیں جاوا صاحب! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ فارم سے نکلے گا تو ہماری نظروں میں ضرور آئے گا۔ پوری پوری ناکا بندی ہے جی۔''

غالباً دوسری طرف سے پوچھا گیا کہ کیا اندر کی اطلاع نہیں مل سکتی؟

سلطان چٹا بولا۔ ''جناب! اندر کی اطلاع تو ندیم ہی دے سکتا تھا اور اب وہ واپس فارم ہاؤس میں نہیں جا سکتا۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ اس حرامی کے لئے الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ وہ باہر نکلا نہیں اور ہمارے ہتھے چڑھا نہیں......''

یہ گفتگو یقیناً عمران کے متعلق ہی ہو رہی تھی۔ میرے سینے میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ

اسے مارنے کا پکا پکا پروگرام بنا چکے تھے اور اس کے لئے پوری تیاری بھی ہو چکی تھی۔ میں نے فون پر اسے آگاہ کرنے کی اپنی سی کوشش تو کی تھی، پتا نہیں کہ یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی تھی۔

جاوا...... سے گفتگو ختم کرنے کے بعد سلطان کسی دوسرے بندے سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے یہ آواز بھی پہچان لی۔ یہ ندیم کی تھی۔ وہ بے پروائی سے باتیں کرنے لگے۔ ان کے نزدیک میں ابھی تک بے ہوش تھا۔ ندیم نے کہا۔ ''ایک طریقہ تو یہ بھی ہے کہ اس ماں کے ہیرو کو ''اس چمچے تابی'' کی آہ و بکا سنائی جائے۔ وہ جب فون پر اسے چلاتا سنے گا تو اس کی دُم میں ضرور آگ لگے گی۔ اس سے کہا جائے گا کہ اگر وہ تابی کو اس عذاب سے نکالنا چاہتا ہے تو فلاں جگہ پر پہنچ جائے۔ ان دونوں کے درمیان بڑا پکا یارانہ ہے اور میرا تو خیال ہے کہ یہ یارانہ ضرور کام دکھائے گا۔''

چند سیکنڈ بعد ندیم کی آواز آئی۔ ''تو پھر دوسرا راستہ تو انتظار کا ہی ہے۔ ویسے مجھے اس کتے تابی پر غصہ بہت ہے۔ سویرے اس نے بڑی حرامزدگی کی ہے۔ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک دم وہ فقرہ بول دے گا۔ وہ فقرہ اگر اس ''ماں کے ہیرو'' نے پورا سن لیا ہے تو پھر اس نے جلدی اپنے بل سے باہر نہیں نکلنا۔''

سلطان نے مجھے غائبانہ...... گالی دی اور بولا ''چلو اگر فقرہ بولا ہے تو اس کا مزہ بھی تو چکھا ہے ناخبیث نے۔ قصائی کی دُکان پر بکرے کی طرح لٹکا ہوا ہے۔''

''دیکھنا تھا کہیں پار ہی نہ ہو گیا ہو۔'' ندیم نے کہا۔

''نہیں، بڑا سخت جان ہے۔ بڑی موٹی کھال ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے ہیں تم نے؟ لگتا ہے لوہے کے ڈھلے ہوئے ہیں، پتا نہیں کیا کرتا رہا ہے ان کے ساتھ۔ اتنی درگت کسی اور کی بنی ہوتی تو اب تک مر کر بو چھوڑ گیا ہوتا۔''

''لیکن بو تو آ رہی ہے۔'' ندیم بولا۔

''وہ اس کے یار فتح محمد صاحب کی ہے۔''

میں نے غور کیا۔ بو واقعی میرے نتھنوں میں بھی گھس رہی تھی۔ ہلکی تھی لیکن محسوس ہو رہی تھی۔ میری پلکوں پر خون جما ہوا تھا۔ میں نے بمشکل پلکیں کھولیں اور نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ فرش پر میرا اپنا ہی خون لوتھڑوں کی شکل میں جما ہوا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر فتح محمد کی نیم عریاں لاش موجود تھی۔ گرمی کے سبب لاش نے خراب ہونا شروع کر دیا تھا۔ توند پہلے سے بڑی نظر آ رہی تھی اور چہرے پر بھی سوجن محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد چار پانچ افراد کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سلطان اور ندیم بھی شامل تھے۔ میری ٹانگ سے بندھی ہوئی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیل دی گئی ہے۔ پہلے میرا سر خون آلود فرش سے لگا پھر کندھے، پھر باقی جسم بھی فرش پر ڈھے گیا۔ کسی نے کہا۔ ''ہوش میں ہے، مکر کر رہا ہے۔''

کسی نے میرے کندھے پر ٹھوکر رسید کی۔ ایک گارڈ نے قریب آ کر میرے چہرے پر پانی کا چھینٹا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن پلکوں پر میرا اپنا ہی خون جما ہوا تھا۔ میں بس آنکھوں کو نیم وا ہی کر سکا۔ مجھے اپنے اردگرد دھندلے چہرے نظر آئے۔ کم از کم دو رائفلیں اب بھی میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میرے زخمی ہونٹ خشک تھے اور زبان چمڑے کا سوکھا ٹکڑا بنی ہوئی تھی۔ مجھے چند گھونٹ پانی پلایا گیا تاکہ میں بولنے کے قابل ہو سکوں۔

میں نے اپنے جسم کو محسوس کیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو تولا۔ کیا میں اچانک جھپٹ کر کسی گارڈ کے ہاتھ سے رائفل چھین سکتا ہوں؟ اس کا جواب میری زخمی ٹانگ نے انکار کی صورت میں دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگ بالکل سن ہے۔ یہ میرے جسم کا بوجھ نہیں سہار سکتی اور بالفرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو میرا باقی جسم بھی زخموں سے چُور تھا اور میرے پاؤں میں آہنی زنجیر تھی۔ میں اپنی مزاحمت کو کہاں تک لے جا سکتا تھا۔

سلطان نے بڑی بے رحمی سے میری گردن پر پاؤں رکھا اور دباؤ بڑھانے لگا۔ میری سانس رکنے لگی۔ وہ پھنکارا۔ ''تم دونوں اس موٹے سؤر ریان ولیم کے لئے کام کر رہے ہو۔ تم دونوں کے علاوہ اس نے اور کتنے کتے پالے ہوئے ہیں، ان کے نام بتاؤ۔ اور ''حرام گوشت'' کا وہ پہاڑ خود کہاں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے؟''

مجھ سے جواب حاصل کرنے کے لئے اس نے میری گردن پر سے پاؤں کا دباؤ کچھ کم کیا...... میری سانس کی آمدورفت بہتر ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ میں نے بھی اپنی خاموشی دہرا دی۔ اس نے گردن پر اپنے پاؤں کا سفاک دباؤ پھر بڑھا دیا۔

''ریان ولیم کا ٹھکانا بتاؤ۔ ورنہ ابھی دو منٹ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

میری سانس بند ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے چہرے دھندلاتے چلے گئے۔ سلطان کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں...... سے آ رہی تھی۔ ''ہمیں پتا ہے وہ سؤر لاہور میں ہے...... لیکن کہاں ہے؟ اس کا فون نمبر کیا ہے؟ کیسے رابطہ کرتا ہے تم سے؟ بتاؤ...... بتاؤ۔''

جب میری سانس بالکل بند ہو گئی تو میں نے اپنے زخمی ہاتھوں سے سلطان کی پنڈلی دبوچی اور زور لگا کر اس کا منحوس پاؤں اپنی گردن سے ہٹا دیا۔ وہ لڑکھڑایا لیکن گرنے سے بچ

گیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سلطان خود بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گیا۔

وہ وقفوں وقفوں سے مجھے مارتے رہے اور سوالات کرتے رہے۔ وہ عمران کے حوالے سے بھی معلومات چاہ رہے تھے لیکن میں نے اپنے ہونٹوں پر برداشت کا قفل لگا لیا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد انہوں نے میری زنجیر کھینچی اور مجھے پھر سے الٹا لٹکا دیا۔ تاہم اس بار ایک اور غیر معمولی ستم ظریفی بھی کی گئی۔ فتح محمد کی ایک ٹانگ کو بھی زنجیر کیا گیا اور اسے بھی میرے ساتھ الٹا لٹکایا گیا۔ یہ ایک لاش کی سفاکانہ بے حرمتی تھی فتح کی لاش سے اٹھنے والی بو تیز ہوتی جا رہی تھی اور وہ مجھ سے صرف تین چار انچ کے فاصلے پر جھول رہی تھی۔ پھر میری اذیت میں اضافہ کرنے کے لئے پلاسٹک ٹیپ کا ایک بڑا رول لایا گیا اور اس کی لاش کو ٹیپ کے ذریعے میرے ساتھ پیوست کر دیا گیا۔ ٹیپ کو کئی بل اس طرح دیئے گئے کہ فتح کی لاش سرتا پا مجھ سے پیوست ہو گئی۔

یہ بے پناہ اذیت کی گھڑیاں تھیں۔ وہ حد بھی شاید گزرنے والی تھی جو اذیت اور صدمے کو میرے لئے پُرلطف بناتی تھی۔ میں مسلسل کراہ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ دل چاہتا تھا کہ بس جلدی سے بے ہوش ہو جاؤں...... یا پھر ویسے ہی قیدِ حیات سے آزادی نصیب ہو جائے۔

لاش کا پھولا ہوا زخمی چہرہ میرے چہرے سے جڑا ہوا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ ناقابل بیان بو کا بھبکا میرے نتھنوں میں داخل ہوتا تھا اور رگ و پے میں کراہت کا دریا بہنے لگتا تھا۔ یہ کراہت میری جسمانی اذیت کو کئی گناہ بڑھا رہی تھی۔ میں نے ابکائیاں لیں مگر معدے میں کچھ ہوتا تو باہر نکلتا۔ ہاں ہر ابکائی کے ساتھ جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور درد کی لہریں بلند تر ہو گئیں۔ درد...... درد...... اور بس درد......!

......اور پھر اچانک درد کا عاشق برونڈا جیکی بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہی ادھورے جسم والا ہڈیوں کا ڈھانچا جس کو درد سے لڑنا اور جیتنا آ گیا تھا۔ وہ مسکرایا اور اس کی تصوراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''کیا بات ہے؟ کہیں درد کے حوالے سے تمہارا یقین ڈانواں ڈول تو نہیں ہو رہا۔ یاد رکھو، درد بے وجہ نہیں ہوتا اور نہ بے صلہ ہوتا ہے۔ یا ہم اس کا صلہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یا ہمیں صلہ حاصل ہونے والا ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ دکھ درد اتنا زیادہ صلہ...... تو پھر دکھ درد سے ڈرنا کیسا...... یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس میں گھاٹا ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کا شکر کرو اس نے تمہاری زندگی کو روکھا پھیکا اور

بے عمل نہیں رکھا۔ یہ گہری تاریکیاں، صبح نو کی نوید ہوتی ہیں۔''

''مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا'' میں نے دل ہی دل میں پکارا۔

''تم اپنی تربیت کا پہلا سبق ہی بھول رہے ہو۔ درد کے اندر ڈوب جاؤ۔ اس کی حقیقت اور اس کے حجم پر غور کرو اور گرد کی کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ۔ مت سوچو کہ تمہارا جسم زخموں سے چُور ہے۔ مت سوچو زخم کھل رہے ہیں، خون بہہ رہا ہے۔ مت سوچو کہ تم الٹے لٹکے ہوئے ہو۔ بس یہ دیکھو درد کتنا ہو رہا ہے...... بس درد پر غور کرو۔''

میں نے درد کی اصل شدت پر غور کرنا شروع کیا اور حیرت انگیز طور پر درد کم ہونے لگا۔ کم ہوتا چلا گیا۔

وہ جادو اثر باتیں کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ چکا تھا لیکن کڑے وقتوں میں وہ میرے آس پاس آن موجود ہوتا تھا۔ اس کا تصور اتنی طاقت سے میری نگاہوں کے سامنے ابھرتا تھا کہ زندگی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھے شاباشی کی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''میں جا چکا ہوں لیکن تم میری نشانی کے طور پر یہاں موجود ہو۔ تم میرا تسلسل ہو، میری اضافت ہو۔ مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کرو جو میں نہ کر سکا...... تم درد کو پسپا کرتے ہوئے آخری حدوں تک لے جاؤ...... قابل تسخیر بنا جاؤ۔ اور تمہاری کارکردگی بری نہیں ہے۔ تم نے میرا سینہ ٹھنڈا کیا ہے۔ تم نے بھانڈیل میں اس شخص کو جہنم واصل کیا ہے جس نے میری شکنتلا چھینی اور میری زندگی برباد کی۔ ہاں تابش! مجھے تم پر فخر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آنے والی ہر گھڑی میں میرے اس فخر میں اضافہ ہو۔''

اس کا ہیولا اوجھل ہو گیا لیکن میرے اندر ہمت اور برداشت کی ایک نئی جوت جگا گیا۔ میں ششدر تھا۔ میرا درد نمایاں حد تک کم ہو چکا تھا۔ اب صرف کراہت تھی اور یہ کراہت اس بو سے پیدا ہو رہی تھی جو فتح کے مردہ جسم سے اٹھ رہی تھی اور اس بند کوٹھری میں پھیلتی...... جا رہی تھی۔

پتا نہیں...... کتنی دیر اس عالم کراہت اور اذیت میں گزر گئی۔ تکلیف کی گھڑیاں ویسے بھی طویل ہوتی ہیں۔ فتح ایک جیتا جاگتا شخص تھا تو میں اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب وہ ایک لاش تھا اور اس لاش کی جبری قربت میرے لئے شدید ذہنی اذیت کا باعث بن رہی تھی۔ شاید یہ لوگ اس طرح مجھے ذہنی طور پر مفلوج و بے بس کرنا چاہ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو میری زبان کھلوانے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

میرا دھیان رہ رہ کر عمران کی طرف جاتا تھا۔ مجھے پتا تھا...... اگر وہ جان گیا کہ میں کہاں ہوں تو پھر اسے مجھ تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ وہ ہر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر میری طرف آئے گا اور ایک بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ شاید بہت سے لوگوں کی جان چلی جائے اس ہنگامے میں۔ ہمیشہ یہی سنا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس روز انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی کے بند بودار تہ خانے میں چھت سے الٹا لٹکے ہوئے مجھ پر اس محاورے کی ازلی صداقت ثابت ہوئی۔ بے پناہ ذہنی اور جسمانی تناؤ کے باوجود مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میرے احساسات کند ہوتے چلے گئے اور میں اپنے اردگرد سے بیگانہ ہونے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ رات دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ تہ خانے سے باہر کہیں کوٹھی کے احاطے سے رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی کمرے میں ڈسکو میوزک بج رہا تھا اور تہ خانے کے اندر ٹیوب لائٹ کی پھیکی روشنی پھیلی ہوئی تھی...... اچانک میری نظر اس تہ خانے کے تیسرے مکین پر پڑی۔ یہ وہی شئے تھا جسے میں نے صرف سوتے ہی دیکھا تھا۔ وہ اب بھی فرش پر دراز تھا۔ اگر سویا ہوا نہیں تھا تو کم از کم غنودگی میں ضرور تھا۔ اس کے جسم پر پھٹی پرانی پتلون اور چیک دار شرٹ تھی۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔

یہ کون تھا؟ اور کس پاداش میں یہاں پایا جا رہا تھا؟ کیا میرے اور عمران کی طرح اس کا تعلق بھی کسی طور ریان ولیم سے تھا...... یا پھر یہ کوئی اور معاملہ تھا؟ میرے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے دماغ میں کئی سوال سر اٹھانے لگے۔

قریباً 30 گھنٹے سے میرے معدے میں کچھ نہیں گیا تھا...... اس کے علاوہ خون بھی کافی مقدار میں نکل چکا تھا۔ ایک عجیب سی نقاہت رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ پر بار بار غنودگی سی طاری ہوتی...... اور میں اردگرد سے بالکل بے خبر ہو جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا، میں نے آخری کھانا کل دوپہر عمران کے ساتھ فارم ہاؤس میں ہی کھایا تھا اور دوپہر کا کھانا پورے بارہ بجے کھا لیا جاتا تھا۔ چار بجے کی چائے میں نے نہیں پی تھی۔ اس حساب سے یقیناً کم و بیش تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔

غنودگی کے ایک ایسے ہی وقفے کے بعد میں اپنے حواس میں آیا تو میں نے محسوس کیا کہ ایک بار پھر میرے پاؤں کی زنجیر کو ڈھیل دی جا رہی ہے اور میں فتح کی بدبودار لاش سمیت آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہوں۔ میں نے سر گھما کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ مجھے یوں آہستہ

آہستہ نیچے اتارنے والا کوئی اور نہیں، وہی بوسیدہ پینٹ شرٹ والا شخص تھا جسے میں نے اب تک سوتے ہوئے ہی پایا تھا۔ اس بے ڈھنگے شخص کے بارے میں، میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ کسی نشے کے زیر اثر اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ میلا کچیلا چہرہ ورم زدہ سا تھا۔ ویسے اس کے نقوش تیکھے تھے۔ اپنی دبلی پتلی جسمانی ساخت کی وجہ سے وہ اٹھائیس تیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔

ہم فرش سے لگ گئے تو اس شخص نے میری اور فتح محمد کی زنجیریں چھوڑ دیں۔ تب اس نے جلدی جلدی وہ طویل ٹیپ میرے جسم سے علیحدہ کیا جس نے مجھے فتح کی لاش سے پیوست کر رکھا تھا۔ مجھے خوفناک بو کی سزا دینے کے لئے جاوا کے کارندوں نے وہ سلاخ دار کھڑکی بھی بند کر رکھی تھی جس میں سے تہ خانے کا دوسرا پورشن دکھائی دیتا تھا۔ غالباً اسی بند کھڑکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شخص نے مجھے نیچے اتارا تھا اور فتح کی لاش سے علیحدہ کیا تھا۔

بے شک بو بڑی شدید تھی۔ وہ معدے میں گھس گئی تھی اور پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ مجھے نیچے اتارنے والے شخص کا چہرہ بھی بو کی وجہ سے مکدر تھا۔ وہ گاہے بگاہے اپنی شرٹ کے کالر سے اپنی ناک ڈھانپنے کی کوشش کرتا تھا۔ لاش کی حالت بھی اب کافی خراب نظر آتی تھی۔ وہ پھول رہی تھی۔ ورم زدہ پپوٹوں کے نیچے سے سرخی مائل مادہ رِس رہا تھا۔ مجھے لاش کے ساتھ پیوست کر دینے والی سزا واقعی بہت کڑی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں چند گھنٹے مزید اس حالت میں رہتا تو میرا دماغ مختل ہو جاتا اور ہمت جواب دے جاتی۔

شرٹ والے شخص نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟''

''کس طرح؟'' میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''تم...... بڑے چنگے وقت پر یہاں آئے ہو۔ میں یہاں سے نکلنے کا پروگرام تقریباً فٹ کر چکا ہوں اور آج موقع بھی زبردست ہے۔ آج اوپر کوئی شراب پارٹی ہے۔ دو تین فلمی ''ڈانسریں'' بھی آئی ہوئی ہیں۔ ڈھول ڈھمکے کی ہلکی سی آواز آ رہی ہے نا تمہیں بھی؟''

وہ ڈسکو میوزک کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''ان لوگوں نے تمہیں زندہ تو کسی صورت میں نہیں چھوڑنا۔ میں نے ان کی ساری گل بات سنی ہے۔ اگر جان بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ مل کر لو۔''

''پر کیسے؟'' میں نے اپنی مفلوج ٹانگ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹخنے پر ابھی تک زنجیر کا حلقہ موجود تھا اور اس حلقے نے ٹخنے کو بری طرح زخمی کیا ہوا تھا۔

''میں نے کہا ہے نا کہ تم بڑے چنگے ویلے پر آئے ہو۔ پچھلے ایک مہینے سے میں جو محنت کر رہا تھا، اس کا پھل اب بالکل تیار ہے۔ شاید میں ایک ڈیڑھ ہفتے اور صبر کر لیتا، پر ان کنجروں نے اس لاش کی بو سے ہمارے ساہ (سانس) روک دیئے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔''

''تم کس محنت کی بات کر رہے ہو؟''

''میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ تم ذرا اپنی اس ٹانگ کو چالو کر لو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بالکل سن ہو چکی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کہا اور ایک بار پھر ٹانگ پر وزن ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے سہارنے سے بالکل انکار کر دیا۔

وہ شخص میری ٹانگ کو ہلانے جلانے لگا۔ میں نے بھی کوشش کر کے ٹانگ کو تھوڑی بہت حرکت دی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد ٹانگ پر کسی حد تک بوجھ پڑنے لگا۔ جسم کے سارے جوڑ جیسے اکڑ کر رہ گئے تھے۔ کئی زخموں سے اب بھی خون رِس رہا تھا، فرش پر گرنے والا خون اب سوکھ کر سیاہ ہو چکا تھا۔

''تم ہمت والے ہو۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر ستائشی انداز میں کہا۔ ''اور اس کے ساتھ ساتھ سخت جان بھی ہو۔ جتنی ''کُٹ'' تمہیں پڑی ہے، کسی اور کو پڑی ہوتی تو اب تک اوپر کا ٹکٹ کٹا چکا ہوتا۔ کہیں تم کوئی کھلاڑی شلاڑی تو نہیں رہے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ جوڈو کراٹے یا باکسنگ شاکسنگ......''

''یہ تم کیوں کہہ رہے ہو؟''

''تمہاری سخت ہڈی دیکھ کر۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔ اس کی نگاہیں میرے سیاہی مائل ہاتھ پاؤں پر تھیں۔

''تمہارا اندازہ کسی حد تک درست ہے۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''لیکن تم نے مجھے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔''

''نام میں کیا رکھا ہے، اصل شے تو کام ہوتی ہے۔ ویسے اگر تم چاہو تو مجھے گوہر کے نام سے بلا سکتے ہو۔''

''میرا نام تابش ہے۔ تابی بھی کہتے ہیں۔''

''مجھے پتا ہے۔ وہ کمینے کے تخم تمہیں اسی نام سے بلاتے رہے ہیں۔''

''لیکن تم تو سارا وقت سوئے پڑے رہتے تھے؟''

''کبھی کبھی ایک آنکھ سے سوتا تھا، دوسری کھلی رکھتا تھا۔'' وہ عیارانہ انداز میں بولا۔

''یہ نہیں بتاؤ گے کہ ان کتوں کے چنگل میں کیسے پھنسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ لمبی اسٹوری ہو جائے گی اور ابھی ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔''

باہر سے آنے والی ڈسکو اور پاپ میوزک کی مدھم آواز ایک دم کچھ تیز ہو گئی۔ شاید چند سیکنڈ کے لئے کوئی بند دروازہ کھلا تھا۔ اس میوزک کے ساتھ تیز شوخ نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ ویسی ہی سریلی آوازیں تھیں جو تیز ٹیمپو کے ڈانس کے دوران میں نکالی جاتی ہیں۔ اوپر کہیں ڈانس پارٹی اور شراب پارٹی عروج پر تھی۔ یقیناً ایشوریا رائے ثانی اور کرشمہ کپور ثانی جیسی لڑکیاں بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔

ایک طرف زندگی کی خوشبودار رنگینی تھی اور دوسری طرف بدبودار بے ثباتی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی فتح کی لاش کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ گوہر...... یا جو بھی اس کا نام تھا، اب میرے پاؤں کے کڑے کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے کڑے کو پکڑ کر تھوڑا سا زور لگایا تو وہ کھل گیا۔ اس میں کوئی لاک وغیرہ نہیں تھا۔ وزنی زنجیر میرے پاؤں سے علیحدہ ہوئی تو ٹانگ کو حرکت دینے میں آسانی ہو گئی لیکن وہ اب بھی صرف تیس چالیس فیصد ہی کام کر پا رہی تھی۔ میں نے اس گوہر نامی شخص کے کندھے کا سہارا لے کر تہ خانے میں دس پندرہ قدم اٹھائے۔ درد کی ٹیسوں نے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ اس درد کی پروا کئے بغیر میں گوہر کے ساتھ تہ خانے کے شمالی حصے کی طرف گیا۔ یہ جگہ انگریزی کے حرف ''L'' جیسی تھی۔ یہاں مجھے لکڑی کی ایک چھ سات فٹ اونچی الماری نظر آئی۔ تہ خانے کے اس حصے میں نیم تاریکی سی تھی۔ ایک چوتھائی حصہ تو تقریباً تاریک تھا۔ گوہر نامی اس جواں سال شخص نے بڑی احتیاط سے الماری کو اس کی جگہ سے ہلایا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں چونکا۔ الماری کے عقب میں قریباً دو مربع فٹ جگہ سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔

''کچھ نظر آیا؟'' گوہر نے اینٹوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی ذرا دھیان سے دیکھا تو صورتِ حال واضح ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس پختہ دیوار میں کم از کم تین اینٹیں ایسی تھیں جن کی درزوں میں سیمنٹ موجود نہیں تھا۔ کوئی نوکدار دھاتی چیز استعمال کی گئی تھی اور افقی رخ پر لگی ہوئی ان اینٹوں کی درزوں کو مسلسل کھرچ کھرچ کر ان کے اندر سے سیمنٹ نکال دیا گیا تھا۔

"زبردست۔" میں نے ستائشی انداز میں گوہر کی طرف دیکھا۔ "لیکن...... دوسری طرف کیا ہے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ گڈیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ مطلب کہ تہ خانے کی پارکنگ شارکنگ۔ پر میں نے ابھی دیکھا کچھ نہیں۔"

اس نے الماری کے ایک تاریک خانے میں ہاتھ ڈالا اور کچھ دیر تک ٹٹولنے کے بعد اندر سے ایک چھوٹا لیکن مضبوط پیچ کس نکال لیا۔ سیمنٹ کھرچنے والا صبر آزما کام اس نے یقیناً اسی پیچ کس سے کیا تھا۔ اس نے پیچ کس کو ایک اینٹ کی درز میں داخل کیا۔ وہ قریباً چار انچ تک اندر داخل ہو گیا۔ گوہر نے مجھے پیچ کس دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو، یہ اتنا اندر گیا ہے اور اتنی ہی اینٹ کی چوڑائی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب دوسری طرف بس دیوار کا پلستر ہی ہے۔ یہ پلستر میں نے جان بوجھ کے رہنے دیا ہے۔ اب ہم ذرا سی کوشش کریں تو یہ اینٹیں، باہر کی طرف یا اندر کی طرف نکل سکتی ہیں۔"

گوہر نامی یہ بندہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ یہاں سے نکلنے کے لئے ننانوے فیصد کام مکمل کر چکا تھا لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا یہاں سے نکل کر ہم واقعی کوٹھی سے بھی نکل سکیں گے؟ وہ کہہ رہا تھا کہ دوسری طرف کوٹھی کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ ہے اور وہ دیوار سے کان لگا کر گاڑیوں کی آوازیں سنتا رہا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر یقیناً ہم یہاں سے نکل کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ تک پہنچ جاتے۔

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے گوہر! یہاں سے نکل کر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"ہم بس تھوڑا سا چل کر کوٹھی کے باہر والے گیٹ تک پہنچ جائیں گے...... اس طرف بس ایک چوکیدار ہوتا ہے۔ کبھی اس کے پاس رائفل ہوتی ہے، کبھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے سنبھالنے میں ہمیں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ اس کے بعد اگر قسمت نے کوئی خرابی نہ دکھائی تو ہم چالیس فٹ کی روڈ پر پہنچ جائیں گے۔ ہم سامنے کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کی پچھلی طرف نکلیں گے اور کھیتوں میں گھس جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "قسمت کی خرابی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا کوئی اور خطرہ بھی تمہارے ذہن میں ہے؟"

اس نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "خطرے تو ایسے کاموں میں ہوتے ہی ہیں، اگر تمہارے دل میں ڈر ہے تو پھر رہنے دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نکلنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ اگر کہتے ہو تو تمہیں واپس اسی طرح لٹکا دیتا ہوں...... ویسے ایک بات میں تمہیں بتا

دوں۔ ان لوگوں نے تمہیں بڑی بری طرح مارنا ہے۔ ایسی موت مرنے سے کہیں چنگا ہے کہ بندہ کچھ ہاتھ پاؤں چلا کر مرے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن......" میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

وہ مجھے گھور کر بولا۔ "تم نے جتنی ہمت سے ان لوگوں کی مار کھائی ہے، مجھے لگا تھا کہ تم دل گردے والے بندے ہو لیکن اب لگا ہے کہ شاید......"

"ایسی بات نہیں ہے گوہر! میں تمہاری توقع سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں لیکن ہمیں ہر چیز کو سامنے رکھنا چاہئے۔ تم...... میری ٹانگ کی حالت دیکھ رہے ہو، یہ میرا بوجھ نہیں سہار رہی۔ اگر بھاگ دوڑ کی نوبت آئی تو شاید میں...... بھرپور طریقے سے تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "تو پھر پانچ چھ دن انتظار کر لیتے ہیں...... تاکہ تمہاری ٹانگ فٹ فاٹ ہو جائے۔ پھر تم زندہ ہوئے اور میں بھی ہوا تو ایک اور کوشش کر لیں گے۔"

اس کا طنز سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہاں بدترین صورتِ حال میری منتظر تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ یہاں سے نکل کر باہر کے حالات کا سامنا کر لیا جاتا۔ اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ہمیں کسی سنگین مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے گوہر! میں تمہارے ساتھ نکلوں گا لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیا؟" وہ کڑے لہجے میں بولا۔

"اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو تم مجھے اپنے ساتھ نہیں گھسیٹو گے۔ اپنی جان بچاؤ گے......"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اچھا، چلو دیکھ لیں گے...... لیکن...... اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، یہ شراب پارٹی ختم ہونے سے پہلے پہلے کرنا ہے۔"

ہم مصروف ہو گئے۔ اسکریو ڈرائیور کے ساتھ باہر کا پلاستر توڑنے اور پہلی اینٹ نکالنے میں تقریباً آدھ گھنٹا لگ گیا۔ یہ اینٹ ہم اندر کی طرف کھینچنے میں کامیاب رہے تھے۔ باہر سے ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی تہ خانے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی بے ہنگم موسیقی کا شور بھی کچھ واضح ہو گیا۔ یہ ڈرمنگ میوزک تھا۔ ساتھ میں بدمست آوازیں بھی سنائی دیتے تھے۔

صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ گوہر کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ دوسری طرف انڈر

گراؤنڈ پارکنگ ہے۔ ہمیں چودہ پندرہ کے قریب، قیمتی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ محفل کے شرکا کی گاڑیاں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ کچھ گاڑیاں اوپر لان اور پورچ میں بھی ہوں۔ گاڑیوں کے آس پاس ہمیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ ہم نے باقی اینٹیں دس پندرہ منٹ کے اندر نکال لیں۔ ان اینٹوں کو ضرب لگانے کے لئے سب سے پہلے نکالی گئی اینٹ استعمال کی گئی۔ اب اتنا راستہ بن گیا تھا کہ ہم اس میں سے رینگ کر اس زمین دوز عقوبت خانے سے باہر نکل سکیں۔ ہتھیار کے نام پر ہمارے پاس صرف وہی پیچ کس تھا جو اب تک گوہر کے استعمال میں رہا تھا۔ دستے سمیت اس کی لمبائی آٹھ انچ سے زیادہ نہیں تھی تاہم اس کا سرا مسلسل استعمال سے بہت نکیلا ہو چکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ضرورت پڑنے پر گوہر اسے چاقو کی طرح کامیابی سے استعمال کرے گا۔ میرے اب تک کے اندازے کے مطابق گوہر ایک نڈر اور اسلحہ شناس شخص تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہر طرح کی مار دھاڑ بھی کر سکتا تھا۔ بے شک اس کے کپڑوں اور جسم سے چرس کی تیز بو آتی تھی، اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی......اور حرکات و سکنات سے کسی طرح کی سُستی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

ہم بڑی احتیاط کے ساتھ عقوبت خانے سے باہر نکل آئے۔ میرے زخموں سے تازہ خون رِسنے لگا۔ میں بری طرح لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ قریباً 70 ضرب 100 فٹ کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ تھی...... پیچ کس گوہر کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ ہم گاڑیوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ گوہر مجھ سے دو تین قدم آگے تھا۔ اس کی چال ڈھال میں شکاری جانور کی سی چوکسی تھی۔ ہم پارکنگ کی بیرونی ڈھلوان کی طرف بڑھ رہے تھے اور گوہر کی معلومات کے مطابق یہیں ہمارا واسطہ کم از کم ایک گارڈ سے پڑنے والا تھا۔

اچانک گوہر ٹھٹک کر رک گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''کباڑا......خبیثوں نے پارکنگ کا دروازہ بند کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ باہر سے تالا لگا ہوا ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''بس یہی قسمت کی خرابی ہوتی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

ہم محتاط قدموں سے اس آہنی پھاٹک نما دروازے تک پہنچے۔ کان لگا کر باہر سے سن گن لینے کی کوشش کی۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ گوہر نے تپے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ یہ بھوتنی دا بھی رنگ بازی کے لئے اوپر چلا گیا ہے۔''

اس نے پھاٹک نما دروازے کو ایک دو بار ہلا جلا کر دیکھا۔ تب دو تین بار مدھم دستک بھی دی۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہم اس آہنی پھاٹک کو توڑ کر یا کھول کر باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک طرف یہ تھا کہ یہیں کہیں تاریکی میں چھپ کر دروازے کے کھلنے کا انتظار کیا جائے یا پھر کوٹھی سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ڈھونڈا جائے۔ یہاں رک کر انتظار کرنے میں اس امر کا شدید اندیشہ موجود تھا کہ عقوبت خانے میں ہماری غیر موجودگی کا پتا چل جاتا اور پوری کوٹھی میں خطرے کی گھنٹیاں بج جاتیں۔ اور یہ بھی امکان تھا کہ یہ دروازہ ساری رات ہی نہ کھلتا...... اور جب کھلتا تو گاڑیاں نکالنے کے لئے کئی افراد دروازے کے سامنے موجود ہوتے۔

''آؤ میرے پیچھے۔'' گوہر نے سرگوشی کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ بائیں طرف بڑھا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے حدود اربع سے بخوبی واقف ہے اور شاید کچھ عرصہ یہاں آزاد حیثیت سے بھی گزار چکا ہے۔ یہ میری غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جو ٹانگ کی شدید تکلیف کے باوجود مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ کسی وقت مجھے ایک ہاتھ سے گاڑیوں کا سہارا لینا پڑتا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر جدوجہد کا موقع آیا تو میں اس حالت میں کس حد تک گوہر کا ساتھ دے سکوں گا۔

چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے دروازے تک آ گئے۔ گوہر نے اس آہنی دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر نیلی وردی والا ایک گارڈ نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہسکی کی کوارٹر بوتل اور دوسرے میں سگریٹ تھا۔ غیر متوقع طور پر اس شخص نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم اس کے پاس سے گزر کر ایک کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ شیشے کی ایک بڑی کھڑکی کی دوسری جانب جھلملاتی روشنیوں میں لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی محو رقص نظر آئی۔ رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے لیکن یہاں بالکل آزاد شاعری ہو رہی تھی۔ یہ رقص سے زیادہ ایک واہیات تماشا تھا۔ نشے میں مخمور مرد و زن ایک دوسرے کو بڑے بھونڈے طریقے سے ''دریافت'' کر رہے تھے۔ میری نگاہ سیکرٹری ندیم پر پڑی۔ وہ ایشوریا ثانی کے ساتھ پیوست تھا اور ہر حد سے گزرا ہوا نظر آتا تھا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایشوریا کی ہم شکل لڑکی کو بازوؤں میں اٹھایا اور اسے لے کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

یہاں مجھے ایک اور ایسی لڑکی بھی محو رقص دکھائی دی جس کی شکل کسی اور انڈین ایکٹریس سے ملتی تھی۔ مجھے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ یہ کس سے مل رہی ہے۔ تب اچانک میری نگاہ دُرِشہوار پر پڑی۔ یہ وہی درمیانی عمر کی ماڈرن عورت تھی جو کچھ دن پہلے رنگین چڑیوں کا تحفہ لے کر جلالی صاحب کو رجھانے آئی تھی مگر جلالی صاحب کا پارا اچانک چڑھ جانے کی وجہ سے اسے اپنے ساتھی سمیت دُم دبا کر بھاگنا پڑا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ دُرِشہوار جاوا کی سابقہ رکھیل رہی ہے۔ اس وقت وہ نشے میں ٹن تھی اور ایک درمیانی عمر کے گنجے کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

میں اور گوہر کھڑکی کے سامنے سے گزر کر ایک برآمدے کی طرف آ گئے۔ یہاں بھی دو گارڈز بڑے ایزی موڈ میں فرش پر بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی رائفل سامنے ستون سے ٹکی نظر آ رہی تھی۔ مجھے گوہر نامی اس شخص کی پھرتی اور دیدہ دلیری کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ بلی کی چال چلتا گیا اور گارڈز سے فقط آٹھ دس فٹ کی دوری پر پہنچ کر رائفل اٹھائی اور واپس پلٹ آیا۔

''آ جاؤ شہزادے۔'' اس نے سہارے کے لئے مجھے اپنا کندھا پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے کندھے کا سہارا لیا۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گراسی لان کی طرف بڑھے۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں روشنی ہے لیکن اگر ہم کسی طرح یہ جگہ پار کر گئے تو سیدھے گیٹ پر پہنچیں گے۔''

''گیٹ پر بندے نہیں ہوں گے؟'' میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں گے تو ضرور...... پر ہو سکتا ہے کہ آج انہوں نے بھی کڑوا پانی پیا ہوا ہو...... ایسے جشن میلے میں ہر کسی کی مت ماری جاتی ہے۔ ویسے بھی اب ہمارے پاس یہ دو سو بائیس کی رائفل آ گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ فائدہ تو اس کا بھی ہو گا۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ گوہر خطرے میں حواس برقرار رکھنے والا شخص ہے۔ وہ یہاں سے نکلنے کے حوالے سے کافی پُرامید نظر آ رہا تھا۔ ہم دیوار کے سائے سائے چلتے ہوئے مین گیٹ کے قریب تر ہو گئے۔ اچانک میرے رگ و پے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی...... مجھے رکھوالی کے کتوں کی آواز آئی۔ ایک سرد لہر دوڑ گئی...... اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ وہ بھگٹٹ بھاگے آ رہے ہیں۔ بمشکل دو سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ ایک جسیم کتے نے گوہر پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا پھولدار پودوں میں گرا۔ زوردار دھماکے سے رائفل نے شعلہ اگلا اور میں نے کتے کی چلاتی ہوئی آواز سنی۔ غیر متوقع طور پر گولی کی زوردار آواز نے دوسرے کتے کو

پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اب کچھ فاصلے پر بے تاب گردش کرنے لگا اور اپنی پُرہول آواز میں مالکوں کو خبردار کرنے لگا۔ کتے کا یہ انداز روٹین سے ہٹ کر تھا۔

دو تین افراد دوڑتے ہوئے ہماری طرف لپکے...... لیکن جب گوہر نے اوپر تلے تین چار فائر کئے تو وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مختلف چیزوں کی آڑ لے لی اور جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں سے پوری کوٹھی گونج اٹھی۔ موسیقی تھم گئی۔ ہر طرف ہلچل کے آثار نظر آئے۔ ہم دونوں ایک بڑے سنگی فوارے کی اوٹ میں تھے۔

''آؤ۔'' گوہر نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''نہیں گوہر! میں نکل نہیں سکوں گا، تم جاؤ۔''

میرا خیال تھا کہ وہ کم از کم ایک بار تو اصرار کرے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور وقت کے مطابق اس نے ٹھیک ہی کیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر گیٹ کی طرف بھاگا۔ ٹرپل ٹو رائفل بالکل ریڈی تھی اور اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ جھک کر بھاگ رہا تھا۔ کتا پھر اس کے پیچھے دوڑا۔ اس نے اسے ڈرانے کے لئے فائر کیا۔ اسی دوران میں ایک بڑے مور پنکھ کے عقب سے ایک سائے نے اس پر چھلانگ لگائی۔ گوہر اور وہ اوپر نیچے گرے۔ ایک بار پھر گولی چلی لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ گولی کسی کو لگی نہیں۔ کم از کم تین مزید افراد گوہر پر پل پڑے۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے میں کامیاب رہا۔ کبڈی کے کسی تیز رفتار کھلاڑی کی طرف وہ ایک بار پھر گیٹ کی طرف لپکا۔ ایک بار تو لگا کہ وہ نکل جائے گا مگر پھر کسی چیز سے ٹکرا کر گرا۔ کئی افراد نے اسے دبوچ لیا اور بری طرح مارنے لگے۔ دو مسلح افراد نے میرے سر سے بھی رائفلیں لگا دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں افراد ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں زخمی کان والا سلطان چٹا نمایاں تھا۔ اس نے مجھے ایک زوردار ٹھوکر لگائی پھر پھنکار کر اپنے کسی ساتھی سے بولا۔ ''پتا کرو۔ یہ دونوں تہ خانے سے نکلے کیسے ہیں؟ دونوں دروازے تو باہر سے بند تھے۔''

ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے ہانپتے لہجے میں سلطان کو بتایا۔ ''ادھر پارکنگ کی دیوار میں سینڈھ لگائی گئی ہے جی۔ کافی بڑا مورا نظر آ رہا ہے۔''

''پکی دیوار توڑی ہے انہوں نے؟'' سلطان نے بہت حیرت سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اور گوہر کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ کمرا برآمدے کے پاس ہی واقع تھا۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا اور دو مسلح گارڈز وہاں کھڑے ہو

گئے۔ عین ممکن تھا کہ ہمیں دوبارہ اسی بدبودار تہ خانے میں بھیج دیا جاتا جہاں فتح کی بے گور و کفن لاش موجود تھی...... لیکن وہاں چونکہ دیوار توڑی جا چکی تھی لہٰذا ہمارے لئے عارضی طور پر یہ کمرا منتخب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی اور ایک دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کھڑکی میں بھی مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ فرنیچر نام کی کوئی شے یہاں موجود نہیں تھی۔ فرش پر ایک بوسیدہ سا قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوار پر جوہی چاولہ کی تصویر تھی۔

گوہر کو خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی شرٹ تار تار ہو چکی تھی...... پیچ کس گوہر کی جیب سے نکال لیا گیا تھا۔ دروازہ لاک کرنے سے پہلے میری بھی اچھی طرح تلاشی ہوئی تھی۔ سلطان اور ندیم وغیرہ اس بات پر حیرت زدہ نظر آتے تھے کہ ہم تہ خانے کی نو انچ موٹی پختہ دیوار توڑ کر نکلے ہیں۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہم دونوں سے سوال جواب کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف وہ اپنی محفل بھی برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ''مکمل تفتیش'' کا کام کل پر چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ یقیناً اب ایک بار پھر بوتلوں کے ڈھکن کھلنے تھے اور جسموں نے تھرکنا تھا۔ کوشش ہونی تھی کہ محفل کو ایک بار پھر رنگ پر لایا جائے۔ کھڑکی سے باہر کھڑے گارڈ ہمیں خونی نظروں سے گھور رہے تھے۔

○.....❖.....○

جیسے تیسے وہ زخمیوں سے چُور دردبھری رات گزر گئی۔ گوہر کو کافی چوٹیں آئی تھیں لیکن جب وہ میری چوٹیں دیکھتا تھا اور ان چوٹوں کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی دیکھتا تھا تو اسے حوصلہ ہوتا تھا کہ اگر گوہر مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں پھنسا ہوتا تو یقیناً میرے دل و دماغ پر بوجھ ہوتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گوہر نے اپنے طور پر نکلنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہوا۔

اب ہم ایک بار پھر قید و بند کی صعوبت کا شکار تھے اور کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ایک گارڈ گاہے بگاہے کھڑکی سے جھانک کر ہمیں دیکھ لیتا تھا کہ کہیں ہم سلیمانی ٹوپی پہن کر یہاں سے نکل نہ گئے ہوں۔ گوہر نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ پارکنگ والا گیٹ کھلا مل جاتا تو شاید اس ویلے ہم لاہور میں ہوتے۔''

''لیکن اب تو شاید لاہور دیکھنے کی حسرت ہمارے ساتھ ہی چلی جائے۔ ان لوگوں کے ارادے ہمارے بارے میں اچھے نہیں ہیں۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس طرح کے کاموں میں پھر اس طرح تو ہوتا ہی ہے...... آر یا پار۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اب مرنے کی تیاری کر لیں؟''

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجا کر بولا۔ ''مرنے کے لئے تو ہر ویلے تیار رہنا چاہئے...... یہ گل ہماری مسجد کے امام صاحب کہا کرتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''پتا نہیں اب زندگی ساتھ دے یا نہ دے۔ اب تو اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔ کہاں سے آئے ہو اور کیسے پھنسے ہو اُن خبیثوں کے چنگل میں؟''

''اس سے کیا فائدہ ہونا ہے؟ جب مر ہی جانا ہے تو پھر جاننے سے فائدہ۔ ہاں اگر زندہ بچ گئے تو پھر لاہور کے کسی باغ میں بیٹھ کر تمہیں ضرور بتاؤں گا اور تم سے پوچھوں گا بھی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

عجیب منطق تھی اس کی۔ اسی دوران میں گارڈ کھڑکی میں کھڑا ہو کر ہمیں گھورنے لگا اور ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ''اوئے بدبختو! کوئی مرہم پٹی ہی کر دو۔'' گوہر نے اپنی زخمی آنکھ کو دباتے ہوئے کہا۔

گارڈ نے بڑی نفرت سے تھوکا۔ یہ تھوک آہنی گرل میں سے گزر کر سیدھا گوہر کے ہاتھ پر پڑا۔ گارڈ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اسے لگا اپنی چوٹوں پر۔ اگر پھر بھی آرام نہ آئے تو اس میں تھوڑا سا پیشاب بھی ملا لینا۔'' وہ بکتا جھکتا آگے چلا گیا۔

گوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے ہاتھ کی پشت قالین سے گڑ کر صاف کی اور دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

میں بھی لیٹ گیا۔ کوٹھی میں مکمل سکوت تھا۔ لگتا تھا کہ رات بھر کی رنگین مصروفیات کے بعد سارے مہمان لمبی تان کر سوئے ہوئے ہیں۔ میرے بازو اور ٹانگ کے دو تین زخم بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور میں ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا کیا واقعی یہ کوٹھی میرے لئے فتح محمد کی طرح موت کا پنجرہ ثابت ہونے والی ہے؟ میں نے بڑے کرب سے سوچا...... اگر میں یہاں مر گیا تو عمران مجھے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا؟ فرح اور عاطف پر کیا گزرے گی؟ بالو مکمل طور پر بے سہارا ہو جائے گا...... اور ثروت؟ کیا ثروت کو ایک آخری بار چھونے کی حسرت دل میں ہی رہ جائے گی؟

میں نیم غنودگی میں لیٹا رہا۔ اسی دوران میں ایک بار آنکھوں کی درز سے گوہر کی طرف دیکھا تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ غالباً اسے نشے کی طلب ہو رہی تھی...... اور یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی، چرس نہ وسکی وغیرہ۔ وہ اپنی ٹانگیں کھجا رہا تھا اور سامنے دیوار کو دیکھ کر رہا تھا۔ وہاں جوہی چاولہ کی مختصر لباس والی گرما گرم تصویر لگی تھی۔ وہ للچائی ہوئی آنکھوں سے

اسے دیکھ رہا تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ للچائی ہوئی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ ایک آنکھ تو سوج کر اور نیلی ہو کر کپا بن چکی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منشیات کی طرح عورت کا بھی رسیا ہے۔

نہایت سنگین حالات تھے۔ اس کے باوجود گوہر نامی یہ شخص جس طرح فلمی تصویر کو دیکھ رہا تھا، میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

میں نے کہا۔ ''یار! اتنی مار پڑی ہے پھر بھی تمہاری طبیعت میں کچھ نرمی نہیں آئی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے مجھے گھور کر پوچھا۔

''اتنی پیاری لڑکی ہے اور تم ایسے دیکھ رہے ہو جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔''

وہ میری بات سن کر بے ڈھنگے انداز میں مسکرایا۔ ''قصائی تو ذبح کرنے کے لئے دیکھتا ہے، ہم ذبح ہونے کے لئے دیکھتے ہیں۔ ویسے کڑی بڑی ٹیٹ ہے۔'' اس کی اکلوتی آنکھ میں جنسی بھوک لشکارے مار رہی تھی۔

اس نے ''ٹیٹ'' کا لفظ اپنی گفتگو میں شاید ایک یا دو بار پہلے بھی استعمال کیا تھا۔ یہ لفظ مجھے کچھ یاد دلا رہا تھا لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا یاد دلا رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان گفتگو جاری رہی۔ ہم ایک طرح سے اپنی اپنی تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے یہ گفتگو کر رہے تھے۔ گوہر میری برداشت کی صلاحیت سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''گوہر! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ رات کو ایک کتے نے تو تم پر فوراً حملہ کر دیا اور تم نے اسے گولی بھی ٹھوک دی لیکن دوسرا کتا جو زیادہ زہریلا لگتا تھا، تم سے دور دور رہا۔ حالانکہ وہ قد کاٹھ میں بھی پہلے سے ڈیوڑھا تھا۔''

''وہ مجھے جانتا تھا۔'' گوہر نے کہا۔

''کیسے؟'' میں نے کراہتی آواز میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں نے اس کی سکھائی کرائی تھی۔''

''یعنی...... تم نے ٹریننگ دی تھی اسے؟ تم کتوں کو ''ٹرینڈ'' کرتے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے بے پروائی سے سر ہلایا اور ایک بار پھر اکلوتی آنکھ سے جوہی چاولہ کا ایکسرے کرنے لگا۔

''تو تم کتوں کو ٹرینڈ کرنے کے لئے یہاں آئے تھے مگر پکڑے کیسے گئے؟''

''یار! تم کنڈم باتوں میں اپنا ویلا (وقت) خراب کر رہے ہو۔ اگر دماغ کو تکلیف دینی ہے تو پھر جان بچانے کے بارے میں کچھ سوچو۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ آج شام تک ہمیں

زندہ رہنے دیں گے......''

ایک دم میرے ذہن میں کوندا سا لپکا...... گوہر کے بار بار بولے ہوئے ''ٹیٹ'' نے میرے اندر جو کھد بد شروع کی تھی، وہ ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ یہ شخص کتوں کو تربیت دیتا تھا۔ چھریرے جسم کا مالک تھا اور وسطی پنجاب کا رہنے والا تھا...... عمران نے اپنی روداد میں جس راجے کا ذکر کیا تھا، وہ بھی تو وسطی پنجاب کا تھا۔ اس کا بنیادی کام بھی کتوں اور گھوڑوں کی ٹریننگ ہی تھا...... اور...... پھر...... یہ لفظ ''ٹیٹ''۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑی تاہم میں نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے۔ میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم کبھی خوشاب کے قریب شاد پور میں بھی رہے ہو؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہاں، میں رہا تو ہوں شاد پور میں بھی...... پر تم کیسے جانتے ہو؟''

''کیا...... تمہارا کوئی دوست عمو نام کا بھی تھا...... عمو عمران۔'' میں نے وضاحت کی۔

اس کی اکلوتی آنکھ میں لشکارے سے نظر آئے۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا......

''تم...... تم عمو کو کیسے جانتے ہو؟'' اس نے تیز سے پوچھا۔

میں گہری نظروں سے اس کو سرتاپا دیکھتا رہا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کیا میں سمجھوں کہ تمہارا اصل نام گوہر نہیں ہے؟''

''تم نے میری گل کا جواب نہیں دیا۔''

''تم نے بھی تو جواب نہیں دیا۔ تمہارا اصل نام گوہر ہے یا...... راجا؟''

راجا کے لفظ پر وہ جیسے اچھل پڑا۔ اس نے بدکے ہوئے انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم عمو کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ کدھر ہے وہ؟''

ایک طرح سے وہ تسلیم کر رہا تھا کہ اس کا نام راجا ہے۔ میں نے اسے سرتاپا گھورا۔ ہاں، وہ راجا ہی تھا۔ وہی حلیہ جو عمران نے مجھے کئی بار بتایا تھا۔ ٹھوڑی پر زخم کا ویسا ہی نشان، وہی بول چال۔ میں غائبانہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ یہی تیز طرار شخص تھا جس نے سولہ سترہ سالہ عمران کو ماجھاں جیسی جابر عورت کے چنگل سے چھڑایا تھا اور بے رحم حالات میں اسے زندہ رہنے کے گُر سکھائے تھے۔ آگے چند برسوں میں راجے اور عمران کی دوستی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے اور پھر بقول عمران...... راجا لاہور کے بازار حسن میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے اہم کردار سے میری ملاقات ہو گی

اور ایسے حالات میں ہوگی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ دروازے کے دونوں پٹ اس طرح کھلے کہ ان میں چودہ پندرہ انچ کا فاصلہ ہوگیا۔ تاہم اسٹین لیس اسٹیل کی ایک نفیس زنجیر کے ذریعے دروازہ پورا کھلنے سے رک گیا۔ ایک رائفل بردار گارڈ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک ملازم تھا۔ ملازم نے ایک چھوٹی ٹرے ادھ کھلے دروازے میں سے اندر کھسکا دی۔ ٹرے میں انڈے اور پیاز کا آملیٹ تھا۔ دو پراٹھے اور دہی وغیرہ تھا۔ رائفل بردار سفاک انداز میں بولا۔ ''ناشتا کرلو۔ ہوسکتا ہے یہ تمہارا آخری ناشتا ہو۔''

''لسی مل جائے گی؟'' گوہر یعنی راجے نے کراہتے ہوئے کہا۔ اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ راجا ہی ہے۔

رائفل بردار پھنکارا۔ ''لسی تو نہیں لیکن دہی کافی سارا پڑا ہوا ہے۔ وہ تمہارے ہی کام آئے گا۔''

اس کے آخری الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ ان الفاظ کا اصل مطلب قریباً ایک گھنٹے بعد واضح ہوا اور یہ مطلب لرزہ خیز تھا۔

میں قریباً بیالیس گھنٹے سے بھوکا تھا۔ بدترین حالات اور اندیشوں کے باوجود کھانے کی خوشبو اشتہا انگیز محسوس ہوئی۔ میں نے ٹرے اٹھا کر قالین پر رکھ لی۔ پہلا لقمہ لیا تو پتا چلا کہ جسم کے بہت سے دیگر حصوں کی طرح جبڑا بھی پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ بمشکل تھوڑا سا منہ کھول کر لقمہ زبان پر رکھ پایا۔ عمران نے مجھے سکھا دیا تھا کہ شدید خطرات اور اندیشوں کے نرغے میں بھی کس طرح خود کو نارمل رکھا جاتا ہے اور کس طرح صرف حال پر نظر رکھ کر مستقبل اور مستقبل قریب کو چکما دیا جاتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مرنے سے پہلے مرنا نہیں چاہئے اور مصیبت سے پہلے ڈرنا نہیں چاہئے۔ گارڈ کھڑکی میں موجود تھا، لہٰذا اب ہم ''ایک دوسرے سے تعارف'' والا موضوع نہیں چھیڑ سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ گوہر یعنی راجا کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ وہ جلد از جلد مجھ سے عمران کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ ہمیں کافی لیٹ ناشتا دیا گیا تھا۔ قریباً دس بج چکے تھے۔ جس وقت ہم ناشتا کررہے تھے، پارکنگ کی طرف سے گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ''شب بسری'' کرنے والے بیشتر مہمان اب رخصت ہورہے ہیں۔ ان میں سے کئی مہمان رخصت ہونے سے پہلے ہمیں دیکھنے کے لئے آئے۔ وہ گرل دار کھڑکی میں سے یوں جھانک رہے تھے جیسے

بڑی تگ و دو کے بعد جنگل سے پکڑے جانے والے خطرناک جانوروں کو دیکھ رہے ہوں۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں شراب نوشی اور ''دیگر مصروفیات'' کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

قریباً بارہ بجے کا وقت تھا جب میری چھٹی حس نے کہا کہ یہاں کوئی خطرناک تماشا ہونے والا ہے۔ سلطان چیتا ہمارے کمرے کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔

وہ ذرا فاصلے پر گیا تو راجا نے کھڑکی میں کھڑے گارڈ سے پوچھا۔ ''کچھ ہمیں بھی بتاؤ اکرم خاں کیا ارادے ہیں تمہارے؟''

اس نے ایک بار پھر کھڑکی میں سے تھوک پھینکا جو راجے کے عریاں کندھے پر گرا۔ ''ارادے بڑے چنگے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم اوپر پہنچنے والے ہو۔'' گارڈ نے کہا۔

''تو پھر کیا سوچ رہے ہو...... جو کرنا ہے فٹافٹ کرو۔ مارو گولی اور ٹھنڈا کرو ہمیں۔''

راجا نے اپنے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ گولی تو انہیں ماری جاتی ہے جنہیں مارنا ہو۔ تمہیں تو پہلے زندگی موت کے درمیان ٹانگنا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔'' ایک طرف سے سیکرٹری ندیم نمودار ہوا اور آنکھوں پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''کئی ملکوں میں قانون ہے کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ ہم بھی تمہیں تین کتوں کے حوالے کررہے ہیں۔ اصلی نسل کے بلڈاگ ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی جو تین کتے تم لوگوں نے مارے ہیں، یہ ان کے رشتے دار ہیں...... بالکل جائز وارث ہیں۔ ایک ''متوفی'' کا بڑا بھائی ہے۔ دو اس کی مادہ کے پیٹ سے ہیں۔''

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ ندیم کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے دو دن پہلے تہ خانے میں بھی یہ بات کہی تھی کہ مجھ پر کتے چھوڑے جاسکتے ہیں۔ اب یہاں کوئی ایسا ہی سین ترتیب دیا جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ندیم کی بات سن کر راجا کا چہرہ بھی متغیر ہوا ہے۔ دراصل صورتِ حال ہمارے لئے سنگین ہوتی جارہی تھی۔

ندیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے تاسف سے کہا۔ ''معاملے کو یہاں تک پہنچانے کے ذمے دار تم خود ہو۔ تم نے اوپر تلے غلطیاں کی ہیں۔ اور سب سے اہم غلطی اس

''ماں کے ہیرو'' والی تھی۔ تم نے فون پر اسے الرٹ کر کے جاوا صاحب کی طرف سے اپنی موت پر مہر لگوالی ہے۔ جان تو اس ناکام ہیرو کی اب بھی نہیں بچنی، تم خواہ مخواہ جوانی میں اِناللہ ہورہے ہو۔''

ندیم کی بات سے مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی اور وہ تسلی یہ تھی کہ کم از کم ابھی تک تو عمران محفوظ ہے۔

ندیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ تم نے جاوا صاحب کے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کیا۔ پہلی غلطی کے بعد یہ دوسری غلطی سراسر خودکشی کے برابر تھی۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے میری دوسری غلطی کے بارے میں بتا کر ندیم ایک طرح سے مجھے امید کی مدھم سی کرن بھی دکھا رہا ہے۔ مجھے بتانا چاہتا ہے کہ اگر میں اب بھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر دوں تو کوئی بری بھلی صورت نکل سکتی ہے لیکن یہ ایک چکما بھی ہوسکتا تھا۔ کم از کم سلطان چٹا وغیرہ کے تیور تو یہی بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں مارنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ فضا میں ایک سراسیمگی سی پائی جارہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایشوریا رائے ثانی جیسی لڑکیاں اور عام ملازم جو تماشائی کی حیثیت سے کھڑکی کے اردگرد موجود تھے، اب کہیں غائب ہو چکے تھے۔ فقط کرخت چہرہ گارڈز آس پاس نظر آتے تھے یا سلطان چٹا پھنکار رہا تھا۔

سرخ رنگ کی ایک پلاسٹک کی بالٹی لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس میں جو کچھ تھا، وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر کتوں کی خوفناک...... گونجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد تین عدد جسیم کتے ہمارے سامنے تھے۔ ان کی چمکیلی زنجیریں تین تنومند افراد کے ہاتھوں میں تھیں۔ کتوں کے منہ پر بگیاڑیاں (حفاظتی جالیاں) تھیں۔ وہ پارے کی طرح مچل رہے تھے اور اپنے رکھوالوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جارہے تھے۔

گارڈ اکرم خاں نے سرخ بالٹی میں سے ایک بڑا ڈونگا بھر کر نکالا اور کھڑکی کے پاس بیٹھے راجا پر اچھال دیا اور تب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ اس بالٹی میں دہی ہے۔ راجے کا زخمی عریاں جسم دہی سے لتھڑ گیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دوسرا ڈونگا مجھ پر ڈالا گیا۔ میرے کندھوں پر کچھ دہی گرا۔

اس کے بعد گرل دار کھڑکی کے رستے ہم پر تواتر سے دہی پھینکا جانے لگا۔ فرش اور

قالین بھی دہی سے لتھڑ گیا۔ کمرے سے باہر کھڑے کتے، دہی کی خوشبو سے دیوانے ہو رہے تھے۔ غالباً ان کی تربیت ہی اسی انداز سے کی گئی تھی۔ یہ بڑی لرزہ خیز صورتِ حال تھی۔ کچھ دیر پہلے جب راجا نے ناشتے میں لسی مانگی تھی تو رائفل بردار نے کہا تھا...... لسی تو نہیں دہی بہت ہے اور تمہارے ہی کام آنے والا ہے...... اور اب یہ ''کام'' آرہا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا لیکن وہ پہلے کی طرح بس فٹ سوا فٹ ہی کھل سکا۔ زنجیر نے اسے پورا کھلنے سے روک لیا۔ یہ خلا اتنا ضرور تھا کہ اس میں سے جسیم بلڈاگ اپنی تمام تر حشر سامانی کے ساتھ اندر داخل ہوسکتا...... اور پھر وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے منہ پر سے حفاظتی جالی ہٹائی جا چکی تھی ورنہ وہ کسی کو بھی اپنے نکیلے دانتوں سے پھاڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اضطراری حرکت کے تحت ہم دونوں پیچھے ہٹ گئے...... دیوار کے ساتھ جا لگے۔ اتنے میں دوسرا کتا بھی پھنس پھنسا کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں خونخوار جانوروں کی زنجیریں ان کے رکھوالوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ انہیں کھینچ رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ تھوڑی ڈھیل بھی دے رہے تھے۔ یہ دہشت زدہ کرنے کا ایک ڈھنگ تھا۔ تاہم یہ بات بھی سامنے کی تھی کہ اگر ان تین کتوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم خالی ہاتھ ہرگز اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ دونوں شدید زخمی تھے اور میری ایک ٹانگ تو تقریباً مفلوج تھی۔

چند لمحے بعد تیسرا کتا بھی خوفناک جست کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ اپنے رکھوالے کو تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔ اس کی مدد کے لئے ایک دوسرے شخص نے بھی زنجیر تھام لی۔ کتوں کے سماعت شکن شور سے کمرے کی دیواریں لرزنے لگیں۔ دہی کی خوشبو انہیں دیوانہ کر رہی تھی اور یقیناً ان میں ہمارے زخموں اور خون کی بو بھی شامل تھی۔ یہ واقعی قیامت خیز گھڑیاں تھیں۔ اپنے جیسے شخص سے برسرپیکار ہونا، اس سے مار کھانا اور اسے مارنا ایک اور بات ہے، مگر بپھرے ہوئے خونخوار جانوروں کا سامنا کرنا دیگر بات۔

آخر میں داخل ہونے والا جسیم کتا راجا کے بالکل قریب آ گیا تو راجا نے اس کے منہ پر لات رسید کی۔ اس لات کی سزا دینے کے لئے رکھوالے نے زنجیر کو کچھ اور ڈھیل دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتے نے راجا کی پنڈلی پر منہ مارا۔ اس کی پتلون کا پائینچہ ادھیڑ کر رکھ دیا اور ساتھ ہی ٹخنے کو بھی زخمی کیا۔ راجا نے مغلظات بکیں اور تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ اس کے لمبے ملائم بال چہرے پر بکھر گئے تھے اور گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔

سلطان چٹا سب کچھ کھڑکی سے دیکھ رہا تھا...... مونچھوں کو تاؤ دے کر دہاڑا۔ ''چڑھا دو حرامزادے پر۔ پھاڑ دو پیٹ اس کا۔''

کتا ایک بار پھر راجا کی طرف آیا۔ یوں لگا کہ وہ واقعی اس کا خاتمہ بالخیر کر دے گا مگر سیکرٹری ندیم نے رکھوالے کو روکا۔ اس نے کتا پیچھے کھینچ لیا...... چند سیکنڈ بعد باقی دونوں کتے بھی کھینچ لئے گئے۔ ان کو برآمدے تک پیچھے ہٹا لیا گیا۔ ہمارے اردگرد ساعت شکن شور قدرے کم ہو گیا۔ سیکرٹری ندیم گرل دار کھڑکی میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور عداوت کی چنگاریاں تھیں۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''یہ تمہارے لئے آخری...... بالکل آخری موقع ہے سلطانی گواہ بننے کا۔ ورنہ ٹھیک پانچ منٹ بعد تم دونوں کی لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کرنا اور انہیں علیحدہ علیحدہ شاپروں میں ڈالنا کافی مشکل ہو جائے گا۔''

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' میں نے وقت ٹالنے کے لئے پوچھا۔

''نہیں نہیں، اب پوچھنا وچھنا کچھ نہیں۔ اب تو دوٹوک بات ہے۔ ایک اور سنہری موقع دیتے ہیں تمہیں۔ سیل فون تمہارے ہاتھ میں تھماتے ہیں۔ کسی طرح اپنے یار کو بل میں سے نکال سکتے ہو اور یہاں بلا سکتے ہو تو بلا لو۔ کچھ ایسا رونا روؤ اس کے سامنے کہ وہ تڑپ کر تمہارے پاس پہنچ جائے۔''

سلطان چٹا پھنکارا۔ ''لیکن اگر پہلے والا کمینہ پن کیا تو اس بار چھوٹ نہیں ملے گی...... یہ تینوں کتے ایک ساتھ تمہارے اوپر چڑھائی کریں گے۔ پہلے سیکنڈ میں تمہیں ننگا کریں گے۔ اگلے دو سیکنڈ میں پھاڑ دیں گے......''

ابھی سلطان کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہ آواز کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے فوراً بعد خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ایک طویل برسٹ چلا۔ کچھ چلاتی ہوئی آوازیں آئیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے کوئی بڑی گاڑی کوٹھی کا مین گیٹ توڑتی ہوئی اندر گھس آئی ہے اور...... یہ ایک گاڑی نہیں تھی۔ شاید کئی گاڑیاں تھیں۔ ان کے انجن چنگھاڑ رہے تھے اور شاید اس کے ساتھ ساتھ گاڑیوں پر سوار لوگ بھی للکارے مار رہے تھے۔

ایک دم ہی کوٹھی کے طول و عرض میں اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے گارڈ اکرم خاں کو دیکھا، وہ اپنی رائفل سیدھی کر کے احاطے کی طرف مڑا مگر ابھی دو قدم ہی اٹھا پایا تھا کہ اس کی چھاتی پر آٹو میٹک رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ اچھل کر برآمدے کی سیڑھیوں میں گرا۔ سلطان چٹا اور ندیم وغیرہ بھی آڑ کے لئے مختلف اطراف میں بھاگے...... رکھوالوں نے کتوں کی زنجیریں چھوڑ دیں، وہ تینوں کتے جارحانہ انداز میں مختلف اطراف میں لپکے۔

''لگتا ہے مخالف پارٹی نے حملہ کر دیا ہے۔'' راجا اپنا زخمی ٹخنہ دبائے دبائے بولا۔

''مخالف پارٹی کون ہے؟''

''کوئی تو ''اللہ کی بندی'' ہو گی۔'' راجا نے عجیب جواب دیا۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا، وہ پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ماؤزر تھا۔ اس نے ایک ستون کی آڑ لے رکھی تھی اور اندرونی کمروں کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی پکار رہا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھا۔ مجھے لگا کہ میں نے اس شخص کو ریان ولیم صاحب کے آس پاس دیکھا ہے۔

تو اس کا مطلب تھا کہ یہ ریان ولیم گروپ کے لوگ ہیں۔ فربہ اندام ریان ولیم کی شبیہ میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ ہمیں جلالی صاحب کی طرف بھیجنے والا اور نت نئے حالات سے دوچار کرنے والا ریان ولیم ہی تھا۔ ریان گروپ اور جاوا گروپ میں آرا کوئے کے مجسمے کے لئے خوفناک کشمکش چل رہی تھی۔ اس کشمکش کو چند دن پہلے اس وقت عروج ملا تھا جب جاوا کے لوگوں نے جلالی فارم پر حملہ کیا تھا، قتل کئے تھے اور عصمت دری کی تھی۔ اس بھیانک واردات کا ملبا ریان گروپ پر ڈالنے کے لئے جاوا کے لوگوں نے ایک ناٹک بھی کیا تھا۔ جاوا کے نادرے نامی دراز قامت غنڈے نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے رکھا تھا اور پشتو لہجے میں اردو بولی تھی۔ یوں انہوں نے تفتیش کا رخ ریان گروپ کے مرجان خان کی طرف موڑنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ بعدازاں عمران نے اس صورتِ حال کو ریورس گیئر لگایا تھا۔

فائرنگ کی آواز میں شدت آتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی اور نیم مفلوج ٹانگ کو متحرک کیا۔ ادھ کھلا دروازہ ہمارے سامنے تھا اور آزادی کی نوید سنا رہا تھا۔ دروازے کے خلا میں اتنی جگہ موجود تھی کہ ہم پھنس پھنسا کر اس میں سے نکل سکتے تھے۔ باہر چاروں طرف پرواز کرتی ہوئی اندھی گولیوں کا خدشہ تو موجود تھا مگر اندر بھی تو موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پہلے میں اور پھر راجا عرف گوہر دروازے سے باہر آ گئے۔ باہر آتے ہی گولیوں کے پورے ایک برسٹ نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ برسٹ راجا کے سر سے دو ڈھائی فٹ اُوپر دیوار میں لگا۔ میں نے اکرم خاں کی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور لنگڑاتا ہوا ایک دیوار کی اوٹ میں آ گیا۔ راجا بھی جھک کر دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کا چھریرا جسم تیز دھوپ میں چمک رہا تھا۔

میں نے دیکھا، ریان گروپ کا ایک شخص اندھا دھند دوڑتا ہوا واپس اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بلڈاگ اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ شخص گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسنے میں کامیاب ہوا لیکن اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی جسیم کتا بھی اندر گھس گیا۔ ممکن ہے ریان گروپ کے کسی شخص نے کتے پر فائر وغیرہ بھی کیا ہو

لیکن وہ اسے لگا نہیں۔

اگلے چار پانچ سیکنڈ گاڑی میں گھسنے والے کے لئے بڑے بھیانک تھے۔ بپھرے ہوئے کتے نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں گاڑی کے کھلے دروازے میں سے بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ کتے کے منہ میں بدقسمت شخص کے پیٹ کا ایک بڑا لوتھڑا تھا اور اس کی انتڑیاں بکھر رہی تھیں۔ اس کی آخری آوازیں بڑی دردناک تھیں۔ گاڑی کی دائیں کھڑکیوں کے شیشے خون سے لتھڑ گئے اور یہ لرزہ خیز منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا۔ احاطے میں کھڑی ایک سفید اسٹیشن وین کا ایک ٹائر گولی کا نشانہ بن کر دھماکے سے پھٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کتا کار سے باہر نکلا جس نے ریان گروپ کے شخص کو وحشیانہ طریقے سے مارا تھا۔ کار سے باہر نکلتے ہی کتا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ یقیناً اسے بھی گولی لگ گئی تھی۔

''یہاں سے نکلنے کا یہ اچھا موقع ہے۔'' راجا نے میرے کان میں کہا۔

''کس طرف سے نکلیں؟'' میں نے پوچھا۔

راجا نے عقابی نظروں سے چند قدم دور کھڑی ایک لینڈ روور جیپ کو دیکھا۔ جیپ کا سامنے والا حصہ پچکا ہوا تھا...... ہیڈ لائٹس بھی چکنا چور تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسی جیپ سے ٹکر مار کر کوٹھی کا مین گیٹ توڑا گیا تھا۔ راجا نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جیپ کی چابی اندر ہی ہے، کسی طرح جیپ تک پہنچ جاؤ۔''

ہم دونوں زمین پر لیٹ گئے۔ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اس پرانے ماڈل کی جیپ کی طرف بڑھے۔ فائرنگ شدید تر ہو گئی تھی۔ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ لڑنے والوں کے للکارے پوری کوٹھی میں سنائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے لوگ عداوت کے عروج پر پہنچ کر ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ صرف احاطے کے اندر ہمیں کم از کم چار لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم پورچ کے قریب کھڑی لینڈ روور کے پاس پہنچ چکے تھے۔ آخری سات آٹھ قدم کا فاصلہ ہم نے جھک کر دوڑتے ہوئے طے کیا...... اور جیپ میں گھس گئے۔ راجا چونکہ پہلے گھسا تھا، اس لئے اس نے بائیں طرف والی نشست سنبھالی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ جونہی میں نے اگنیشن میں چابی گھمائی، جیپ تھرتھراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو گئی۔ ٹانگ کام نہیں کر رہی تھی مگر میں کسی نہ کسی طرح کلچ دبا کر گیئر لگانے میں کامیاب رہا۔ ایکسلریٹر دبایا تو جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ گولیوں کی مار سے بچنے کے لئے ہم نے اپنے سر

حتی الامکان حد تک نیچے جھکا رکھے تھے۔ کتے کی خون آلود لاش کو روندتی ہوئی جیپ گیٹ سے نکلی اور باہر آ گئی۔ سامنے دو تین گاڑیاں اس طرح آڑی ترچھی کھڑی تھیں کہ راستہ بند تھا۔ میں جیپ کو گھما کر کوٹھی میں بغلی گلی میں لے گیا اور پھر عقب میں نکل آیا۔ اسی اثنا میں ایک اندھی گولی نے جیپ کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ ہنگامے اور افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی کچھ خبر نہیں تھی۔ کوٹھی کے عقب سے گزرتے ہوئے اچانک میں چونکا۔ میں نے جیپ کو بریک لگا دیئے۔

''عقل تو نہیں ماری گئی؟ کیا کرتے ہو؟'' راجا چلایا۔

''بس ایک سیکنڈ۔'' میں نے کہا اور چھلانگ لگا کر جیپ سے اترا۔ لنگڑاتا ہوا اس لمبی گھاس کی طرف بڑھا جس میں اپنا سیل فون چھپایا تھا۔ سیل فون ڈھونڈنے اور جیپ میں واپس آنے میں مجھے آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ جیپ ایک بار پھر آگے بڑھی اور طوفانی رفتار سے بڑی سڑک کی طرف چل دی۔ ہمارے عقب میں کوٹھی کے اندر تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ شاید کسی حصے میں آگ بھی لگ گئی تھی۔ دھوئیں کے بادل فضا میں بلند ہو رہے تھے۔

O......❖......O

ہم نے موقع واردات سے دور آنے کے لئے کچے راستے استعمال کئے۔ کھیتوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی سے قریباً دس کلومیٹر دور آ گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ پر ہیں۔ بس اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارا رخ لاہور کی طرف ہی رہا ہے۔ یہ بالکل دیہاتی علاقہ تھا۔ راستے میں چند بڑی بڑی پھلواریاں اور زرعی رقبے بھی دکھائی دیئے تھے۔ یہ عین دوپہر کا وقت تھا۔ قریباً ایک بج چکا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھیت کھلیان، راستے اور گاؤں، سب خاموش اور سنسان نظر آتے تھے۔ بس کہیں کوئی چرواہا مویشیوں کو ہانکتا دکھائی دیتا۔ چارے سے لدی ہوئی کوئی گدھا گاڑی ہچکولے کھاتی نظر آئی یا دور کہیں کسی کھیت میں ٹریکٹر کی آواز ابھرتی اور بکھرتی۔

اس سارے سفر کے دوران میں ہم دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے تھے۔ ہماری نگاہیں بار بار عقب نما آئینے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں جہاں ہچکولے کھاتے راستے اور گرد کے مرغولوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جاوے کی دہشت ناک صورت بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ وہ واقعی ایک بے رحم ڈان کا چہرہ تھا اور اس ''ڈان'' نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک عمران کو ختم نہیں کر لیتا، اپنی مرغوب چیزوں کے قریب نہیں پھٹکے گا۔ وہ

اس کو بھرت وچن کا نام دیتا تھا۔ جاوے کے اس ٹھکانے پر جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ لرزہ خیز تھا۔ میں اس سے توجہ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا...... راجا کو گاڑی کے ڈیش بورڈ کے اندر سے ایک پسندیدہ شے مل گئی تھی۔ یہ انگریزی شراب کی ایک سربمہر بوتل تھی۔ راجا نے بلاتکلیف اس کی سیل توڑی اور گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دی تھی۔ تھوڑی سی شراب اس نے اپنے زخمی ٹخنے پر بھی انڈیل تھی اور برے برے منہ بنائے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ شراب کے لیے ترسا ہوا ہے...... یا پھر اپنی جسمانی تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لئے وہ ضرورت سے زیادہ پی رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک تہائی بوتل خالی کر گیا۔ اس کی ورم زدہ آنکھ کا ورم کچھ کم ہو گیا تھا مگر وہ گہری نیلی پڑ چکی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے چہرے پر جھول رہے تھے۔ ان بالوں پر ابھی تک سوکھا ہوا دہی موجود تھا۔

عمران کی روداد میں، میں نے راجا کا ذکر بڑی تفصیل سے سنا تھا۔ ایک طرح سے اس کا مفصل غائبانہ تعارف ہو چکا تھا لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کسی وقت راجا سے اس طرح ملاقات ہو گی۔ وہ اور میں ایک ''چوری شدہ'' جیپ میں بیٹھ کر ایک پُر ہنگام جگہ سے نکلیں گے اور ایک چلچلاتی دوپہر میں چور راستوں پر سفر کریں گے۔ ہمارے جسموں پر نامکمل لباس ہوں گے۔ پاؤں ننگے ہوں گے اور زخموں سے خون رس رہا ہو گا۔ راجا مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور میں بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن فی الحال اس حوالے سے ہم دونوں خاموش تھے۔

جھاڑیوں کے ایک سایہ دار جھنڈ کے اندر سے گزرتے ہوئے میں اور راجا بری طرح چونک گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے جیپ کے پچھلے حصے میں کوئی موجود ہے۔ کوئی جاندار چیز۔

''یہ کیا ہے؟'' راجا نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، آواز تو آئی ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔

''بریک لگاؤ۔'' راجا نے کہا۔

میں نے جیپ روک دی۔ راجا کسی ماہر شکاری کی طرح چوکس ہو گیا تھا۔ مرحوم گارڈ اکرم خاں کی رائفل ابھی تک ہمارے پاس تھی۔ راجا نے رائفل اٹھائی اور اپنے چھریرے جسم کو بل دیتا ہوا جیپ کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔ لینڈ روور جیپ مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ کافی کشادہ بھی ہوتی ہے۔ یہ جیپ گو کہ پرانی تھی مگر اب تک اس نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اب یہ اپنے اندر کا کوئی اسرار ہم پر کھول رہی تھی۔ راجا عقبی نشستوں پر گیا۔ پھر وہ یوں

کسی شے پر جھپٹا جیسے بلی چڑیا پر جھپٹتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی عورت سریلے انداز میں چلائی۔ چند سیکنڈ بعد ہم مبہوت رہ گئے۔ جیپ کی سب سے پچھلی نشستوں کے اگلے خلا سے ایک لڑکی برآمد ہوئی تھی۔ جاوا گروپ کی دیگر لڑکیوں کی طرح یہ بھی ہوش رُبا لباس میں تھی۔ اس نے نہایت کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی اور سفید رنگ کی چست شارٹس ٹانگوں سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے شہد رنگ بال راجا کی مٹھی میں تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور پھر چونک گیا۔ یہ ایشوریا رائے کی وہی ہم شکل تھی جو کوٹھی میں ہر وقت ندیم کی بغل میں گھسی نظر آتی تھی۔

''اوئے یہ پری کہاں سے آ گئی؟'' راجا پُرجوش آواز میں بولا۔

''اس پری ہی سے پوچھو۔'' میں نے کہا۔

راجا نے لڑکی کو کھینچ کر سیٹ پر بٹھایا۔ اس کے بال بدستور راجا کی مٹھی میں تھے اور اس کی صراحی دار گردن ایک طرف کو خم کھائے ہوئے تھی۔ ''سوہنیو! یہ کہاں آ پھنسے ہو؟'' راجا نے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''وہ...... وہ میرے پیچھے بھاگے تھے...... میں جان بچانے کے لئے گاڑی میں گھس گئی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کون بھاگے تھے سوہنیو......؟'' راجا نے بازاری انداز میں پوچھا۔

''وہی جو کوٹھی میں گھسے ہیں۔'' اس نے کہا۔ اس کا اشارہ یقیناً ریان گروپ کے لوگوں کی طرف ہی تھا۔

راجا نے اس کے بال چھوڑے اور اس کی گردن پر ہاتھ چلاتے ہوئے بڑے دلار سے بولا۔ ''بادشاہو! یہ کیا کرتے رہے ہو آپ جناب...... ساڈے نال سفر بھی کرتے رہے ہو اور ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ ہمیں بتاتے، ہم آپ کی کوئی خدمت شدمت کرتے۔ کوئی ''چائے پانی'' پلاتے آپ کو۔'' راجا کے اندر وہسکی کے نشے نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پلیز! مجھے جانے دو۔'' وہ پھر روہانسی آواز میں بولی۔

''یہ تو میں نے بھی بہت کہا تھا کہ مجھے جانے دو لیکن تم نے میری بات مانی تھی؟''

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں اس سے۔'' وہ منمنائی۔

''تمہارا نہیں، پر تمہارے اس یار ندیمے اور سلطان جٹے کا تو ہے نا۔''

''دیکھو...... مم...... مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔''

''یہ انار کلی یا مال روڈ نہیں ہے سوہنیو...... جنگل ہے جنگل۔ یہاں کوئی جناب کا شور نہیں

سننے والا۔ اور اگر...... فرض کیا...... ہم چھوڑ بھی دیں تو جناب عالی جائیں گی کہاں؟ یہاں چاروں پاسے جھاڑیوں اور برساتی نالوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے جنگلی جناور بھی ہیں یہاں۔ وہ اتنی سوہنی، مکھن ملائی جیسی کڑی کو دیکھ کر چھوٹے موٹے جناور نہیں رہیں گے، ایک دم چیتے اور ببر شیر بن جائیں گے۔ پھاڑ کھائیں گے آپ کو۔ ویسے بھی آپ کی شکل انڈین ہیروئن سے ملتی ہے اور انڈیا ہمارا پکا دشمن ہے۔'' راجا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مم...... میں...... پاکستانی ہوں۔''

''پر شکل کا کیا کریں جناب! شکل تو انڈین ہے نا۔'' راجا نے ایک بار پھر حریص انداز میں اس کی گردن پر ہاتھ چلایا۔

راجا کی دست درازی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے زخمی جسم اور سنگین حالات کو جیسے ایک دم بھول ہی گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس قماش کا شخص ہے۔ اوپر سے ایک تہائی بوتل کا نشہ بھی تھا اسے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اگلے چند منٹ میں کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ میں نے ایشوریا ثانی اور اس کے ''معاملات'' میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''گوہر! ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔''

''تو میں کیا کہہ رہا ہوں یار! تم گاڑی چلاؤ۔ میں اس کو سنبھال کر پیچھے بیٹھا رہتا ہوں۔''

''لیکن تمہیں نشہ چڑھا ہوا ہے۔ تم ''بیٹھو'' گے نہیں۔''

''یار! کیسی کنڈم بات کر رہے ہو تم۔ اتنا بے صبرا نہیں ہوں میں۔ اللہ نے دیا ہے، آرام سے کھائیں گے۔''

جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ میں نے اسے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا لیکن وہ ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گئی۔ میں نے میٹر چیک کیا۔ فیول موجود تھا، ٹمپریچر بھی ٹھیک ہی تھا...... چابی گھما کر پھر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں ہوئی۔

''ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔ تم اس پری کا دھیان رکھنا۔'' راجا بولا اور عقبی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس نے بونٹ اٹھا کر تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور پھر بولا۔ ''لو اب کرو اسٹارٹ۔''

میں نے پھر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ چند سیکنڈ کے لئے لگا کہ انجن اسٹارٹ ہو رہا ہے مگر پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ راجا نے کہا ''لگتا ہے کاربوریٹر میں کچھ مسئلہ ہے۔''

میں نے ٹول باکس نکال کر اسے دیا۔ وہ ماہرانہ انداز میں کاربوریٹر کا ایک حصہ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے گاڑی کے انجن کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں تھا لیکن راجا ماہر لگتا تھا۔ مجھے یاد آیا...... عمران نے اپنی روداد میں بتایا تھا کہ راجا کے پاس جانوروں کو ڈھونے کے لئے ایک نہایت کھٹارا لوڈر ہوا کرتا تھا جس کا نام اس نے پانڈے خان رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے چلاتا رہتا تھا اور ٹھیک بھی کرتا رہتا تھا۔

مگر آج تو راجا بھی فیل ہوا۔ کافی کوشش کے باوجود ہم اس پرانی لینڈ روور کو اسٹارٹ نہ کر سکے۔ اس دوران میں ایشوریا ثانی پچھلی سیٹ پر دبکی بیٹھی رہی۔ میں نے رائفل اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ اس رائفل کی دید ایشوریا کو بے حد محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ویسے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے زیادہ خطرہ یہی ہے کہ اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچے۔ جہاں تک عزت آبرو کی بات تھی، ایشوریا جیسی لڑکی کو اس کی زیادہ فکر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کوئی بلند پایا فنکارہ نہیں، ایک ایکسٹرا گرل تھی اور ندیم اور سلطان جیسے لوگوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد راجا ہانپا ہوا واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ وہ پچھلی نشست پر ہی بیٹھا تھا۔ جیپ کی دیوار پر گھونسا مار کر بولا۔ ''شکر کرو کہ یہ حرام زادی ان درختوں کے اندر خراب ہوئی ہے۔ کہیں کھلی جگہ پر لمبی لیٹ جاتی تو مسئلہ ہو جانا تھا۔''

''مسئلہ تو اب بھی ہے یار! ابھی ہم موقع سے بہت زیادہ دور نہیں آئے۔ تلاش کرنے والے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''یار! اگر وہ ریان پارٹی کے لوگ ہوئے تو پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہے...... ہم نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا اور نہ انہوں نے ہمارا بگاڑا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو ہمارے لئے چنگا ہی کیا ہے۔ ہمیں وہاں سے نکلنے کا موقع دیا ہے۔ اگر وہ آ گئے تو ہم یہ پری اپنے پاس رکھ کے یہ گاڑی ان کے حوالے کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔''

''اور اگر وہ جاوے کے لوگ ہوئے تو پھر؟''

''پھر دھن دھنا دھن۔ پر تُو اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے بھالے! مجھے نہیں لگتا کہ جاوے کے لوگ اب دو چار دن سے پہلے سنبھل سکیں گے۔ ابھی تو وہاں وہ بچھی ہو گی...... کیا کہتے ہیں اسے......؟''

''صفِ ماتم۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... اور تھانے کچہری کا زبردست چکر چل رہا ہو گا۔''

''تو پھر اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی اس کو ٹھیک کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہیں۔ نہ ہوا تو پھر رات کو اڑ یکیں گے۔ دن دیہاڑے یہاں سے نکلنا تو ایک دم خطرناک ہوگا۔''

راجا کی بات میں وزن تھا۔ یہ جگہ کافی محفوظ تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ گھنی چھاؤں بھی تھی۔ کوئی اکیلا دکیلا آدمی ادھر آ بھی نکلتا تو اسے مطمئن کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھور والی جگہ تھی۔ کافی دور تک کھیت دکھائی نہیں دیتے تھے...... بالکل پاس سے ایک سیم نالہ گزر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دن ڈھلنا شروع ہوگیا۔ سائے لمبے ہونے لگے۔ راجا گھونٹ گھونٹ وہسکی پی رہا تھا۔ جیپ کے اندر سے ہی اسے نمکو اور چپس کے دو چار لفافے بھی مل گئے تھے۔ ایک پری پیکر اس کے پہلو میں تھی اور وہ زخمی ہونے کے باوجود خود کو بالکل مطمئن محسوس کر رہا تھا۔

میں اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی صورت عمران سے رابطہ ہو سکے۔ میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کر سکوں اور موجودہ صورتِ حال پر مشورہ بھی حاصل کر سکوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی بتا سکوں کہ اس کا کون سا دیرینہ ساتھی میرے ساتھ موجود ہے لیکن سیل فون پر سگنل نہیں آ رہے تھے۔ اگر کسی وقت آتے تھے تو بہت کمزور۔ میں نے سیل فون گھاس میں چھپاتے وقت آف کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کی چارجنگ بہت کم رہ گئی تھی۔

راجا، ایشوریا رائے ثانی (سویٹی) کے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اور اس کی کہانی سن رہا تھا۔ یہ کہانی اس طرز کی عام لڑکیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہی باپ کی دوسری شادی...... ماں بیمار، بھائی نشئی، گھر میں فاقے۔ وہ روزگار کی تلاش میں نکلی۔ کسی نے کہا اس کی شکل مشہور فلم ایکٹریس سے ملتی ہے۔ وہ اسے اسٹوڈیو کی روشنیوں میں لے گیا۔ وہ روشنیاں جو اندر سے بہت تاریک ہوتی ہیں...... وہ انہی ''تاریک روشنیوں'' میں چلتی ہوئی اور کئی خلوتوں سے گزرتی ہوئی سلطان صاحب اور جاوا صاحب تک جا پہنچی۔ پتا نہیں کہ اب ایشوریا کی کہانی میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے بگ باس جاوا صاحب کیا کام کرتے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''وہ ایک بڑے فلم پروڈیوسر ہیں۔ بالی وڈ میں ان کے بڑے تعلقات ہیں۔ وہ آج کل مشہور انڈین ہیروئنوں کے ڈپلی کیٹ اکٹھے کر رہے ہیں۔ ان ڈپلی کیٹس کو بڑی اچھی

تنخواہ پر ملازم رکھا جائے گا۔ ان کو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔''

''کیسی ٹریننگ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کیمرے کے سامنے آنے کی...... ویسے صحیح پتا تو بمبئی پہنچ کر چلے گا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو تمہاری ٹریننگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ ندیم اور سلطان چٹا وغیرہ تمہیں رات دن ٹرینڈ ہی تو کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو بمبئی جا کر تمہیں زیادہ تر ''یہی کام'' کرنا ہوگا۔

وہ چپ رہی۔ راجا نے نشیلے انداز میں اس کے رخساروں پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''سوہنیو! اور کتنی کڑیاں آپ کے ساتھ یہ تالیم (تعلیم) حاصل کر رہی ہیں؟''

''چھ سات ہیں۔''

''ان سب کی شکل کسی ایکٹریس سے ملتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ایشوریا نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ دائیں رخ سے واقعی ایشوریا رائے ہی نظر آتی تھی۔

راجا اس پر فدا ہوا جا رہا تھا۔ شراب بھی کام دکھا رہی تھیں اگر میں یہاں موجود نہ ہوتا تو وہ کب کا کپڑوں سے باہر ہو چکا ہوتا۔ یوں تو اب بھی اس کے جسم پر کپڑے برائے نام ہی تھے۔ اس کی شرٹ تو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہی تار تار ہوگئی تھی۔ پتلون کا ایک پائنچا بھی وہیں پر لیر لیر ہوگیا تھا۔ اپنی سوجی ہوئی نیلی آنکھ اور زخمی چہرے کے ساتھ وہ کسی حد تک مضحکہ خیز بھی نظر آتا تھا۔ وہ مجھے ابھی تک اپنا نام گوہر ہی بتا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام تابش بتایا تھا۔ اگر یہ ہوش ربا لڑکی ہمارے درمیان موجود نہ ہوتی تو شاید ہم اب تک ایک دوسرے کو اپنی سچی جھوٹی کہانی سنا چکے ہوتے۔ لیکن اس خوبرو لڑکی نے راجا کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور اسے غالباً اس کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے عمو کا ذکر بھی مؤخر کیا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کا خوف بھی اب کافی حد تک دور ہوگیا ہے۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی جان کو یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے راجا کو اپنی ''خوب شکلی'' کا کچھ خراج دینا پڑے گا۔ راجا اور ایشوریا ثانی کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس سے مجھے ایک دو باتوں کا مزید پتا چلا۔ اندازہ ہوا کہ راجا انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں واقعی بلڈاگ اور ہاؤنڈ کتوں کی ٹریننگ کے لئے موجود تھا۔ تاہم اس دوران میں اس نے اپنی عادت کے مطابق کوئی ہینگی پھینگی کی تھی غالباً کوئی قیمتی شے چوری کی۔ اس چوری

کے دوران میں اس کے چاقو سے ایک شخص شدید زخمی ہوا جس کے بعد جاوا کے لوگوں نے اسے پکڑ کر اور مار پیٹ کر تہ خانے میں ڈال دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام ہوگئی۔ اس جھنڈ کے اندر تاریکی پھیلنے لگی۔ لیکن یہ تاریکی توقع سے کچھ زیادہ تھی۔ میں نے درختوں سے باہر نکل کر دیکھا۔ گہرے بادل چھا گئے تھے اور مزید گہرے ہو رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بارش بھی ہونے لگی۔ بڑے زور کا تریڑا پڑنے لگا۔ راجا نے مسرور ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں نشست پر پھیلائے اور بولا۔ ''چلو یہ ڈر بھی ختم ہوا کہ کوئی گڈی کے پہیوں کے نشان دیکھتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب ہم وہ بجا سکتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے......؟''

''چین کی بانسری۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''ہاں......چین کی بانسری۔'' اس نے معنی خیز انداز میں ایشوریا رائے ثانی کو دیکھا۔

بارش تیز تھی اور تواتر سے برس رہی تھی۔ درختوں کے ہیولے جھومتے تھے اور ان کے درمیان رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ راجا نے ترنگ میں آکر سرائیکی انداز کا ایک گیت گنگنا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ شراب ہے، بارش بھی ہے اور محبوب بھی۔ بوتل اور پیالے کی کھن کھن، بارش کی رم جھم اور چوڑیوں کی چھن چھن آپس میں رل مل گئی تھی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان آوازوں کی لے پر ناچنا شروع کر دوں۔

رات نو بجے کے لگ بھگ میرے سیل فون کی بیٹری یکسر ختم ہوگئی اور میں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر اسے ایک طرف رکھ دیا کل کی تقریباً ساری رات بھی ہنگامہ خیزی کی نذر ہوئی تھی۔ جسم زخموں اور تھکن سے چُور تھا۔ میں نے نشست کو اسٹریچ کیا اور نیم دراز ہو گیا۔ بارش ختم ہونے کے بعد ہی ہم جیپ سے نکل سکتے تھے اور کسی طرف روانہ ہو سکتے تھے۔ ابھی تک ہم یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ ہمیں ایشوریا رائے کو اپنے ساتھ رکھنا ہے یا باندھ کر یہیں لینڈ روور کے اندر چھوڑ جانا ہے۔ ایسی فیشن ایبل خوبرو لڑکی کو ساتھ رکھنے میں یہ نقصان تھا کہ راستے میں کوئی بھی ہم پر شبہ کر سکتا تھا۔ کسی پولیس ناکے پر بھی ہمیں خواہ مخواہ روکا جا سکتا تھا یا وہ خود پولیس کو یا عام لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ جاوا گروپ کے لوگوں نے ایشوریا ثانی کی گمشدگی کے حوالے سے کوئی رپورٹ وغیرہ بھی درج کرا رکھی ہو۔ مگر اس کو ساتھ رکھنے میں یہ فائدہ تھا کہ اگر کہیں جاوا گروپ کے لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو ہم ایشوریا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ان پر کچھ دباؤ ڈال سکتے تھے۔

میں اونگھنے لگا تو راجا نے کہا۔ ''چلو تم کچھ دیر آرام کر لو۔ میں جاگتا ہوں۔ پھر میں آنکھ

لگا لوں گا اور تم پہرے داری کرنا۔''

راجا کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آرہی تھی۔ میری غنودگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ثروت کی گمشدہ مہک، میرے آس پاس بکھری گئی۔ اس مہک میں معصوم بالو کے جسم کی مہک بھی شامل ہوگئی۔ ایک مہک نے جیسے دوسری مہک کو اپنی گود میں لے لیا۔ میں ان دونوں مہکاروں کا پیچھا کرتے کرتے سو گیا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی دیر سوؤں گا۔ تھکاوٹ اور رت جگے نے کام دکھایا تھا۔ ایک پہلو سن ہو گیا تھا شاید...... میں نے نشست پر پہلو بدلا تو آنکھ کھل گئی۔ بارش دھیمی ہوگئی تھی لیکن برس رہی تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ راجا جیپ میں موجود نہیں ہے اور غالباً ایشوریا رائے بھی نہیں تھی۔

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی آن کر کے پیچھے دیکھا۔ عقبی نشستیں بالکل خالی تھیں۔ رائفل بھی نظر نہیں آئی۔ تو کیا راجا، ایشوریا کو لے کر نکل گیا تھا؟ اس نے دھوکا دیا تھا؟ میں دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک چند قدم کے فاصلے پر شاخوں اور پتوں کے اندر سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ وہاں تاریکی میں کوئی موجود تھا۔ شاید راجا اور ایشوریا...... یا پھر کوئی جانور؟ یا کوئی غیر متعلقہ شخص؟ کئی سوال ایک ساتھ میرے ذہن میں ابھرے۔

لیکن مجھے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ ہریالی کے اندر سے دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی۔ یہ یقیناً ایشوریا کی ہنسی تھی۔ اس کے ساتھ ہی راجا کی بہکی ہوئی آواز ابھری۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ پیراشوٹ کا ایک بڑا غلاف بھی جیپ کی پچھلی نشست پر موجود نہیں ہے۔ یہ جیپ کا غلاف تھا اور اب ان دونوں کے بچھونے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں راجا پر لعنت ارسال کی اور نشست پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

تین چار منٹ بعد اندازہ ہوا کہ راجا اور ایشوریا ثانی جیپ کی طرف واپس آرہے ہیں۔ میں سویا بنا رہا۔ وہ دبے پاؤں آئے۔ بڑے آرام سے پچھلا دروازہ کھولا اور بغیر کوئی آواز پیدا کئے اندر آگئے۔ راجے نے ایشوریا کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ جواباً اس نے بھی کچھ کہا۔ ایشوریا کے گیلے بالوں کے کچھ چھینٹے میرے چہرے پر بھی پڑے لیکن میں نے آنکھیں بند رکھیں اور ان دونوں کے لئے خجل ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

......راجا واقعی ایک نمبر کا خرانٹ اور چال باز تھا۔ جو جیپ کل سہ پہر کو کسی بھی طرح

اسٹارٹ نہیں ہو پا رہی تھی، وہ رات پچھلے پہر کو راجے کی تھوڑی سی کوشش سے اسٹارٹ ہو گئی۔ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ کل سہ پہر راجا کی نیت ہی خراب تھی۔ وہ درختوں کے اس جھنڈ سے نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال، میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔

بارش اب ایک دھیمی پھوار کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں کے اس جھنڈ سے نکلے اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلتے مشرق کی طرف بڑھنے لگے۔ اونچے نیچے راستے پر جیپ کی لائٹس مسلسل ہچکولے کھا رہی تھیں۔ یہ چھوٹی لائٹس تھیں۔ ہیڈ لائٹس تو اس وقت ہی ٹوٹ گئی تھیں جب ریان گروپ کی اس جیپ نے کوٹھی کا گیٹ توڑا تھا۔

''اب اس تمہاری شہزادی کیا کرنا ہے؟'' میں نے راجے سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ کسی مناسب جگہ پر اسے گڈی سے اتار دیتے ہیں اور سلاماں لیکم کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن اسے ''پھر'' کوئی جانور شانور پڑ گیا ہو تو؟'' میں نے کہا۔ میرے فقرے میں ''پھر'' کے لفظ پر شاید راجا نے زیادہ غور نہیں کیا۔

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں، اب تو تھوڑی دیر میں سویر ہو جانی ہے۔''

''یا پھر اسے اس جگہ چھوڑ دیں جہاں گاڑی چھوڑنی ہے۔ یہ گاڑی کے اندر ہی رہے۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' راجا نے تائید کی۔

قریباً پانچ کلو میٹر سفر طے کرنے کے بعد ہم شیخوپورہ سے لاہور جانے والی بڑی سڑک کے قریب پہنچ گئے۔ اب اس مسروقہ جیپ کو اس سے آگے لے جانا خود کو شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ ہم نے جیپ ایک قریبی گاؤں کے نواح میں درختوں کے درمیان کھڑی کی۔ راجا کی نگاہوں میں ابھی تک ایشوریا کے لئے حریصانہ چمک تھی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس مصیبت کو اس سے آگے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

وہ اس سے بولا۔ ''سوہنیو تے مکھنو! زیادہ گھبرانا نہیں۔ گڈی کے اندر آرام سکون سے بیٹھو۔ سویرا ہوتے ہی لوگ تمہیں یہاں سے نکال لیں گے۔''

''تو تم لوگ دروازے کو لاک کر کے جاؤ گے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''اگر دروازوں کو لاک نہ کریں گے تو خود لاک اَپ میں بند ہو جائیں گے۔''

''لیکن میں نکلوں گی کیسے؟''

راجا بولا۔ ''کوئی اللہ کا بندہ اِٹ مار کر شیشہ توڑ دے گا۔ میں نے کہا ہے نا گھبرانے کی

بات نہیں اور یہ آخری ملاقات نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کہیں نا کہیں ٹاکرا ہو جائے گا ہمارا۔''

ہم نے پہلے ہی اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ گاڑی میں کوئی ایسی شے موجود نہ ہو جس کو استعمال کر کے یہ لڑکی کوئی شیشہ توڑ سکے۔ اس گاڑی میں یہ آپشن موجود تھا کہ دروازوں کو باہر سے لاک کر دیا جائے تو وہ اندر سے نہ کھل سکیں۔

گاڑی کا پیراشوٹ کا لمبا چوڑا غلاف ایک بار پھر ہمارے کام آیا۔ ہم نے بلیڈ کی مدد سے اس کے دو ٹکڑے کئے اور ان ٹکڑوں کو برساتی کی طرح اوڑھ لیا۔ جیپ کے دروازے بند کرنے کے بعد راجا نے ایشوریا رائے کو الوداعی آنکھ ماری لیکن اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی۔ جو آنکھ اس نے دبائی تھی وہ تو پہلے ہی سوجن کی وجہ سے بند تھی۔

ہم ہلکی پھوار میں کیچڑ زدہ زمین پر سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ رائفل راجا نے اپنی برساتی میں چھپائی ہوئی تھی۔ ان برساتیوں نے ہمارے بہت سے عیب ڈھک لئے تھے۔ ہماری نیم عریانی، ہمارے خون آلود کپڑے، ہمارے زخم...... حتیٰ کہ بوقتِ ضرورت ہم ان سے اپنے ننگے پاؤں بھی ڈھک سکتے تھے۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بمشکل لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

ہم سڑک تک پہنچنے کے لئے چھوٹی پگڈنڈیاں استعمال کر رہے تھے۔ بس پر تو ہم بیٹھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے پھر حلیہ بھی مشکوک تھا۔ بہتر تھا کہ کوئی رکشا ٹیکسی مل جاتا۔ لاہور اور گرد و نواح میں ان دنوں ٹیکسیاں کم کم ہی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن ایک بہت اچھا اتفاق ہوا کہ ابھی ہمیں سڑک کے کنارے کھڑے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک پیلے رنگ کی مہران ٹیکسی نظر آ گئی۔ ہمارے اشارے پر وہ رک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈرائیور سے لاہور تک کا کرایہ طے کیا۔ ہم سوار ہو گئے۔ میں اگلی سیٹ پر اور راجا پچھلی پر چلا گیا۔

ڈرائیور گاہے بگاہے میرے چہرے کی چوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بات پر بھی الجھا ہوا تھا کہ ہم نے ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے باوجود ''برساتیاں'' اپنے جسم سے جدا نہیں کی تھیں۔ بہر طور اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی الجھن دیکھ کر میں نے خود کہا۔ ''ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا بھائی صاحب! ٹریکٹر ٹرالی الٹ گئی تھی۔ آٹھ دس بندے زخمی ہوئے تھے۔ دو چار کو تو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میری ٹانگ بھی کافی زخمی ہے۔ مرہم پٹی کے لئے لاہور کے وڈے اسپتال جا رہے ہیں۔''

راجا نے راستے میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔ اچھرہ موڑ کے قریب ایک لالہ زار نامی درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ اس کا مالک جو منیجر بھی تھا، راجا کا رازداں دوست تھا۔ راجا کو پتا تھا کہ وہ ہمارے حلیے کی پروا کئے بغیر نہ صرف ہمیں کمرا دے گا بلکہ حلیہ درست کرنے کے لئے فوری انتظام بھی کر دے گا۔ میں جلد از جلد عمران سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اب سیل فون کے سگنل تو یقیناً آ رہے تھے لیکن بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب ہوٹل پہنچ کر ہی رابطہ کروں گا۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب ہم شہر زندہ دلانِ لاہور میں داخل ہوئے۔ ابھی یہ شہر اپنے زندہ دلانوں، اپنی رونقوں، رنگینیوں اور ہنگاموں سمیت سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے انگڑائی لینی تھی اور اپنی حشر سامانیوں سمیت جاگ جانا تھا۔ یہ بڑا اچھا وقت تھا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے میناروں کی بلندیاں ہولے ہولے نمایاں ہو رہی تھیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ناکوں پر شہریوں کو رات بھر تنگ کرنے والی پولیس اپنی حرکتوں سے باز آ جاتی ہے اور تھانوں کا رخ کر لیتی ہے۔ ہم بھی کسی چیکنگ کی زد میں آئے بغیر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک چھوٹی سڑک پر لالہ زار ہوٹل کی تین منزلہ عمارت تھی۔ مالک منیجر اشفاق رانا ایک کمرے میں سویا پڑا تھا۔ چوکیدار نے اسے جگایا۔ چوکیدار بھی غالباً راجا کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد تیس پینتیس سال کا ایک فربہ اندام شخص توند مٹکاتا اور آنکھیں ملتا ہمارے سامنے تھا۔ اس کے بدن پر بس بنیان اور شلوار نظر آ رہی تھی۔

اس نے راجا کو راجے کہہ کر مخاطب کیا اور تپاک سے ملا۔ ساتھ ساتھ وہ میرے اور راجا کے زخمی حلیے پر فکر مند بھی تھا۔ راجا اور وہ کمرے میں چلے گئے۔ میں وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور زخمی ٹانگ اٹھا کر دوسرے صوفے پر رکھ دی۔ برساتی نما کپڑا ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ میرے ننگے پاؤں دیکھ کر چوکیدار کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے ایک دوسرے ملازم نے باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔

میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ میں بس بستر پر گر کر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ایک بار عمران سے رابطے کی کوشش بھی کرنا چاہتا تھا۔ فون سیٹ قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بتایا کہ ایک کال کرنی ہے۔ اس نے فون میرے قریب تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ عمران کا نمبر ڈائل کیا۔ رنگ ٹون کے طور پر اس کے سیل فون پر بڑا اوٹ پٹانگ میوزک سنائی دیا کرتا تھا۔ اب آواز آ رہی تھی، اُڈی اُڈی جاواں ہوا

دے نال۔ کافی دیر تک یہ آواز میرے کانوں کے پردے مجروح کرتی رہی پھر میں نے کوشش ترک کر دی۔ غالب گمان یہ تھا کہ اس وقت وہ Zoo کے قریب اپنے اپارٹمنٹ میں سو رہا ہو گا۔ لیکن اندیشے بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ آج تیسرا چوتھا دن تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔

اسی دوران میں راجا اور اشفاق رانا کمرے سے نکل آئے۔ گراؤنڈ فلور پر ہی ہمارے لئے ایک آرام دہ کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اشفاق ایک میڈیکل باکس لے آیا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ دردکش دوائیں بھی موجود تھیں۔ اشفاق نے ہمارے لئے کپڑوں کے تین چار جوڑے بھی مہیا کر دیئے تاکہ ہم ان میں سے اپنے ناپ کے مطابق استعمال کر سکیں۔

یہ جان کر راجا حیران ہوا کہ میں اپنے زخموں کو خاطر میں لائے بغیر نہانا چاہتا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میری تکلیف میں اضافہ ہو گا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ میرے لئے تکلیف اور راحت کی حدیں کبھی کبھی آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ میں نے اطمینان سے شاور کیا۔ بعد میں تولیے سے جسم کو اچھی طرح خشک کیا۔ یہ اور بات ہے کہ تولیے پر جگہ جگہ خون کے دھبے آ گئے۔ میرے سارے پنڈے پر چمڑے کی بیلٹس کے نشان موجود تھے۔ جہاں جہاں اسٹیل کے بکل لگے تھے، وہاں وہاں خون کا رساؤ تھا۔ میں نے خود بھی تھوڑی بہت مرہم پٹی بھی کی۔ دردکش دوائیں میں نے بہت عرصہ پہلے چھوڑ دی تھیں۔ اب بھی اسی اصول پر عمل کیا۔ جیکی کہا کرتا تھا کہ درد تو ایک نعمت ہے اور یہ دبانے کے لئے نہیں سہنے کے لئے ہوتا ہے۔ راجا گاہے بگاہے حیرت سے میری طرف دیکھتا تھا اور جیسے دل ہی دل میں میری برداشت کا معترف ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میری ٹانگ میں فریکچر ہو چکا ہے اور مجھے چلنا پھرنا نہیں چاہئے۔ مگر ایسی اذیتوں اور ایسے اندیشوں سے لڑ کر میری عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔

پُر تکلف لاہوری ناشتا ہمارے کمرے میں پہنچ گیا۔ پوڑی، آلو اور اچار والے گرما گرم چنے، سرخی مائل حلوہ، نہاری اور کلچے...... اور اس کے ساتھ میٹھی و نمکین لسی۔ بڑی اشتہا آمیز خوشبو تھی۔ میرا جبڑا اکڑا ہوا تھا تاہم میں نے آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ آدھا ناشتا میں نے بڑی رغبت سے کیا لیکن پھر ایک دم کچھ یاد آ گیا۔ ایک بو سی دماغ میں گھسنے لگی اور میں نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ فتح محمد کی لاش کی بو تھی۔ وہ لاش جو کئی گھنٹے تک میرے جسم سے لپٹی رہی تھی اور میری ہر سانس کے ساتھ میرے دل و دماغ میں سرایت کرتی رہی تھی۔

میں کبیدہ خاطر ہو کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کل صبح اور پرسوں رات کے

سارے خوں ریز مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ خونخوار کتوں کا وہی کی خوشبو پر دیوانہ وار جھپٹنا۔ میرے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ان کی شعلہ بار آنکھیں۔ گارڈ اکرم خاں کو گولی لگنا اور اس کا ڈکراتے ہوئے اوندھے منہ گرنا۔ گاڑی کے اندر گھسنے والے ریان گروپ کے بندے پر سدھائے ہوئے بلڈاگ کا جھپٹنا اور اس کا پیٹ پھاڑ دینا۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔

تھکن، رت جگے اور ایشوریا کے سرور سے چُور راجا بھی بستر پر لیٹ گیا۔ اس پر تیزی سے غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''گوہر! یہ کیا چکر ہے؟ تمہارا یہ دوست اشفاق رانا تمہیں راجا کہہ کر بلا رہا تھا۔''

''ہاں...... کک...... کچھ یار دوست اس نام سے بھی بلاتے ہیں۔''

''یعنی تمہارا اصل نام گوہر ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بس ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ایک دو فقرے اور بولے لیکن اسی دوران میں وہ سو گیا۔ یہ موقع تھا کہ میں ایک بار پھر عمران سے رابطے کی کوشش کرتا۔ میں لنگڑاتا ہوا باہر نکلا اور اپنے مردہ سیل فون کے لئے چارجر کا انتظام کیا۔

پانچ دس منٹ بعد میں ایک بار پھر عمران سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کمرے کے باتھ روم میں تھا اور دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میری سماعت عمران کی آواز سننے کے لئے بے قرار تھی لیکن وہاں وہی بے ڈھنگی صدا تھی...... اُڈی اُڈی جانواں ہوا دے نال۔ میں دانت پیسنے لگا۔ کبھی اس پر غصہ آتا تھا، کبھی دل و دماغ میں اندیشے اودھم مچانے لگتے تھے۔

میری چوتھی، پانچویں کوشش پر عمران کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً کمرے سے باہر تھا اور دوڑتا ہوا فون تک پہنچا تھا۔ ''ہیلو تابی!'' وہ بڑی بے تابی سے بولا۔

''ہیلو...... عمران...... تم...... ٹھیک تو ہو نا؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم بتاؤ...... یہ کیا خوفناک ڈرامے کر رہے ہو تم؟ پچھلے دو تین دنوں میں کوئی ایک ہزار بار تو تمہارا نمبر ملایا ہوگا۔ کوئی جواب نہیں، کوئی خبر نہیں۔ اس وقت کہاں ہو تم؟ جلدی سے بتاؤ'' اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''اب جلدی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آرام سے بات کر سکتے ہو۔ میں خیریت سے ہوں اور لاہور کے ایک ہوٹل میں ہوں۔ لالہ زار نام ہے ہوٹل کا۔ اور تم کہاں ہو؟''

وہ میرے سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''کس جگہ ہے یہ ہوٹل؟''

''اچھرہ کے علاقے میں۔ آسانی سے مل جائے گا۔ اور اب گھبرانے کی بات نہیں، میں اب یہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی فارم ہاؤس سے روانہ ہو رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤں گا تمہارے پاس۔ تم اب اپنا فون آن رکھنا۔''

''لیکن یار میں نے کیا بکواس کی تھی تم سے۔ تم نے ابھی فارم سے باہر نہیں نکلنا...... جاوا کے درجنوں کارندے اور گاڑیاں فارم کے آس پاس ہیں۔ گھیرا ڈالا ہوا ہے انہوں نے...... یہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے عمران!''

''ہاں آگے بڑھ چکی ہے۔ لیکن جہاں تک تم سوچ رہے ہو، وہاں سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ یہاں فارم ہاؤس کے قریب کافی بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ چار چھ لاشیں بھی گر گئی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

''ریان صاحب اور جاوا گروپ کے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں۔ کئی گھنٹے تک گولیاں چلی ہیں۔ دونوں طرف کے بہت سے بندے پکڑے بھی گئے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب خود شیخوپورہ آکر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پورے علاقے میں پولیس گشت کر رہی ہے۔''

یہ بات پہلے ہی میرے ذہن میں آرہی تھی کہ شاید کل صبح انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں میں جو سخت لڑائی ہوئی ہے، اس کی کوئی تازہ وجہ بھی ہے۔

عمران اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم گھبراؤ مت۔ اب فارم ہاؤس سے باہر نکلنے میں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں پورے حفاظتی انتظام کے ساتھ نکلوں گا۔''

''کیا حفاظتی انتظام ہوگا؟''

''یار! تیرے جیسے پانچ چھ جاں نثار مجاہد ساتھ ہوں گے۔ ویسے بھی روانگی خفیہ ہوگی۔'' اس نے مجھے ہر طرح سے تسلی دی۔

میں نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے آجاؤ۔ یہاں میرے پاس تمہارے لئے کچھ اہم خبریں ہیں اور ایک سرپرائز بھی ہے۔''

''کیا سرپرائز؟''

''ایک پرانے دوست سے تمہاری ملاقات کرانے والا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے لیکن تم بالکل خیریت سے تو ہو نا......اور وہ فتح محمد...... کیا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے؟''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔''تمہارے پہلے سوال کا جواب ہاں میں ہے اور دوسرے کا نہیں میں۔''

''کیا مطلب؟ فتح محمد ساتھ نہیں؟''

''وہ ساتھ تھا لیکن اب نہیں رہا۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''اوہ گاڈ۔'' عمران نے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ ہمارے درمیان گفتگو ختم ہوئی اور میں نے بستر پر لیٹ کر عمران کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ کچھ ایسی ایسوسی ایشن ہو چکی تھی کہ چند دن دور رہنے سے بھی ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور شخص اپنے اردگرد کی ہر شے کو زندگی اور توانائی سے بھر دیتا تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد عمران لالہ زار ہوٹل میں موجود تھا۔ میں نے مالک منیجر اشفاق رانا کو اس کی آمد کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ عمران کو ہمارے کمرے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے قدموں کی چاپ سے ہی اندازہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔''آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے۔''

وہ آیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے خود کو مجھ سے دور کیا اور سر تا پا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوا۔''یہ کیا کیا ہے تم نے اپنے ساتھ؟'' اس کی آواز میں درد تھا۔

''کچھ نہیں بس درد سہنے کی تھوڑی سی پریکٹس کی ہے۔''

''اوئے خبیث! یہ تھوڑی سی ہے۔ اتنی پریکٹس کوئی ہاکی میں کرے تو میاں داد بن جائے اور کرکٹ میں کرے تو سمیع اللہ بن جائے۔''

''تمہاری دونوں باتیں غلط ہیں۔'' میں مسکرایا۔

''لیکن تم کون سی صحیح بات کہہ رہے ہو...... کہ تھوڑی سی پریکٹس ہے۔ ویری سیڈ یار! بہت افسوس ہوا ہے۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ دو چار دن فارم سے نہیں نکلنا۔ لگتا ہے کہ میری ہر بات کا الٹا اثر ہونے لگا ہے تم پر......''

اسی دوران میں اس کی نگاہ راجا والے بیڈ پر پڑی۔ وہ کروٹ بدلے سویا پڑا تھا۔''یہ کون ہے؟'' عمران نے چونک کر دبی آواز میں پوچھا۔

''سرپرائز۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''ذرا آگے جا کر دیکھو۔ شاید پہچان لو۔'' میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

عمران پُرتجسس انداز میں آگے بڑھا۔ راجا کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ جیسے تھے۔ تھوڑی سی کوشش سے عمران نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا، تب دوبارہ راجے کو دیکھنے لگا۔

''کیسا ہے سرپرائز؟'' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''زبردست۔'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا پھر مجھے کمرے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں راجا کو سوتا چھوڑ کر باہر آ گئے۔ عقبی صحن میں جا کر عمران پُرجوش انداز میں بولا۔''یہ بلا کہاں سے ملی تمہیں؟ اور تم نے اسے پہچانا کیسے؟''

''سلطان چٹے کی کوٹھی سے ملی اور پہنچا اس طرح...... کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔''

''یہ تو جیل میں تھا۔ سلطان کی کوٹھی میں کیسے پہنچا؟''

''ابھی اس نے براہِ راست تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال، یہ سلطان اور ندیم کی ایک ملازمہ لڑکی سے باتیں کرتا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ قید کاٹ کر باہر آ چکا ہے اور شکاری اور رکھوالی والے کتوں کو ٹریننگ دینے کے لئے سلطان اور ندیم کے پاس موجود تھا۔''

ندیم کے ذکر پر عمران ذرا چونکا۔''یہ کس ندیم کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''سیکرٹری ندیم کی۔ تمہارے لئے ایک اہم خبر یہ ہے کہ ندیم، جاوا کے لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ سمجھو کہ اب وہ جاوا گروپ کا حصہ ہے۔ وہ فارم ہاؤس کی وہی بڑی کالی بھیڑ ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے تھے۔ اس نے جلالی صاحب کے قریب رہ کر انہیں زبردست نقصان پہنچایا ہے۔''

عمران نے اپنے ہونٹ تشویش ناک انداز میں سکیڑے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''ہم فتح محمد پر شبہ کرتے رہے ہیں لیکن وہ ہمارے شبہے کے برعکس نکلا۔ اسے ندیم کی ایک دو کارستانیاں معلوم ہوئی تھیں اور وہ اس کے بارے میں پریشان تھا۔ ندیم کی حقیقت پتا کرنے کے لئے ہی وہ منگل کی رات فارم ہاؤس سے نکلا تھا...... بس اس کی موت اسے کھینچ کر انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں لے گئی۔''

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟''

میں نے عمران کو کوٹھی میں پیش آنے والے گھمبیر واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں گم سنتا رہا۔ وہاں تہ خانے میں زخمی فتح محمد کو جس سفاکی سے گولی ماری گئی تھی، وہ نقشہ ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

پوری روداد سننے کے بعد عمران نے ایک لمبی سانس لی اور اس کے چہرے کو سنجیدگی نے ڈھانپ لیا، وہ بولا۔ ''تمہاری وہ فون کال بڑی پریشان کن تھی۔ آخری دو تین لفظ تو میری سمجھ میں نہیں آسکے لیکن اتنا پتا تو چل گیا کہ فارم کے باہر خطرہ ہے اور تم مجھے باہر نکلنے سے منع کر رہے ہو۔ اس کے بعد میں نے اس فون نمبر پر درجنوں بار کال کی لیکن فون بند تھا۔ تمہارے نمبر پر بھی بڑی کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ تمہاری یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آچکی تھی کہ نادرے وغیرہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے جاوا کے لوگوں نے فارم کے اردگرد گھات لگائی ہے۔ ابھی میں اس معامل سے نمٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ پتا چلا کہ فارم سے کوئی ایک کلومیٹر دور نہر کی طرف جاوا اور ریان گروپ کے لوگوں کے درمیان چھوٹی سی جھڑپ ہوئی ہے۔ جس میں دو بندے زخمی ہوئے ہیں۔ ابھی اس جھڑپ کی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اگلے روز شام کے وقت دونوں گروپوں میں زوردار تصادم ہو گیا۔ دونوں طرف کے لوگوں نے باقاعدہ پوزیشنیں لے کر ایک دوجے پر دو گھنٹے تک اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ پانچ کے قریب بندے جان سے گئے۔ کافی تعداد میں زخمی بھی ہیں۔ اس کے بعد پولیس کی بھاری نفری موقع پر پہنچ گئی۔ کئی اعلیٰ افسر بھی آ موجود ہوئے۔ جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ صاحب نے تو وہاں مستقل ڈیرا لگایا ہوا ہے۔ فارم کے اردگرد کرفیو کا سماں ہے۔ میڈیا میں بھی گرم گرم خبریں آ رہی ہیں۔ باکس اور آراکوئے والا معاملہ بھی زیر بحث ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب یہ معاملہ مزید بگڑے گا۔ بڑی بڑی مچھلیاں بھی اس معاملے میں ملوث ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے آراکوئے کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے جلالی صاحب پر دباؤ ڈالا جائے۔''

''تو کیا جلالی صاحب یہ دباؤ لے لیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''باباجی ہیں تو بڑے پکے۔ اندر سے ایک دم لوہے کی طرح ہیں لیکن زیادہ سخت لوہا بھی تو کبھی کبھی ایک دم ٹوٹ جاتا ہے۔'' عمران نے رمزیہ انداز میں کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''باباجی کی ایک کمزوری کم از کم ہمارے علم میں تو آچکی ہے...... ڈاکٹر مہناز اور باباجی کا تعلق...... اور یہ بہت بڑی کمزوری ہے جگر۔ اس کمزوری نے بڑے بڑے معرکے سر کرائے

ہیں۔ دنیا کے نقشے بدلے ہیں، تاریخ کا رخ پھیرا ہے۔''

''تو پھر؟''

''مجھے لگتا ہے کہ اب جلالی صاحب کی اس کمزوری کو استعمال کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔ ان کا بھی اور دوسروں کا بھی۔''

''کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ابھی پوری طرح طے نہیں کیا۔ سوچ رہا ہوں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

عمران نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم نے میری سوچ کو درہم برہم کر دیا ہے۔ یہ کس بلا کو اپنے ساتھ چھوڑ لائے ہو۔'' اس کا اشارہ راجا کی طرف تھا۔

''لیکن یہ تو تمہارا دوست ہے اور اچھے برے وقت میں کام آتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اور مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اسے دیکھ کر اور اپنے مزاج کا بندہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی چند دن ہمیں اس سے دور ہی رہنا چاہئے۔''

اچانک ایک آہٹ نے ہمیں چونکایا۔ مڑ کر دیکھا تو راہداری میں ہم سے آٹھ دس قدم دور راجا کھڑا تھا۔ شرٹ اس کے جسم پر کچھ ڈھیلی تھی۔ اپنی اکلوتی سلامت آنکھ کے ساتھ وہ عمران کو گھورتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے پاؤں میں ہوٹل کی چپل نظر آ رہی تھی۔

عمران نے بھی اسے دیکھ لیا۔ کچھ دیر تک دونوں ساکت و جامد کھڑے رہے پھر لپک کر ایک دوسرے کو لپٹ گئے۔ یہ پُرجوش ملاپ تھا۔ راجا نے عمران کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''اوئے عمو! تُو کہاں غائب ہو گیا تھا کھوتے کے سر سے سینگوں کی طرح؟ پورا ایک سال ہو گیا ہے مجھے باہر آئے ہوئے۔ کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرا ہوں تجھے۔''

''میں نے بھی انڈیا سے آتے ہی جان انکل سے تیرے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ نو دس مہینے پہلے راجا آیا تھا۔ اپنا فون نمبر بھی دے گیا تھا لیکن وہ فون نمبر جان محمد صاحب سے کہیں گم ہو چکا تھا......''

''تُو بڑا کھوچل ہو گیا ہے عمو۔ ایک دم کنڈم بات کر رہا ہے۔ اگر تُو نے مجھ سے رابطہ کرنا ہوتا تو اس کے اِک سو اِک طریقے تھے۔''

''تجھے کیا بتاؤں راجا! یہاں آتے ہی ایسا چکر چلا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی مہینے سے آسے پاسے کی کچھ خبر ہی نہیں رہی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ساری باتیں یہیں کرلینی ہیں۔ اندر چلو یار! آرام سے بیٹھتے ہیں۔''

ہم تینوں کمرے میں آگئے۔ میں ابھی تک بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ اندر پہنچ کر ایک بار پھر راجا اور عمران میں زوردار مکالمہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے شکوے شکایت کیئے۔ راجا کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ عمران وہاں انڈیا میں کس ماں کے پاس گیا تھا۔

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''ماں نہیں باپ ہے اور تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ جس طرح تم اپنے جگر ہو، یہ بھی جگر ہے۔ یہ وہاں ایک بڑے پھڈے میں پھنس گیا تھا۔''

اس خیال سے کہ عمران اور راجا ایک دوسرے سے کھل کر بات کرسکیں اور ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاسکیں، میں بہانے سے باہر نکلا اور اپنی زخمی ٹانگ کو چالو کرنے کے لئے برآمدہ نما جگہ پر ٹہلنے لگا۔ جسم کے کسی حصے میں زیادہ تکلیف ہو تو جسم کی باقی تکلیفیں اس میں دب جاتی ہیں۔ ٹانگ کی وجہ سے میری دیگر جسمانی چوٹیں نہ ہونے کے برابر محسوس ہو رہی تھیں حالانکہ اپنی جگہ وہ بھی شدید تھیں۔ برآمدے میں بلی کے دو خوب صورت بچے گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے فارم ہاؤس کے وہ نایاب ایرانی بلونگڑے یاد آگئے جنہوں نے وہاں Zoo کی رونق کو دوبالا کیا تھا...... اور ان کی ماں بھی یاد آئی۔ اس نے عمران کے ساتھ بے مثال وابستگی پیدا کرلی تھی۔ اسی وابستگی کی وجہ سے ہم سلطان چنا کے ڈیرے پر نادر لمبو کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

میرے سیل فون پر میسج ٹون ہوئی۔ میں نے دیکھا، یہ آسٹریا سے نصرت کا میسج تھا۔ میں نے میسج کھولا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''تابش بھائی! میں اور باجی آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ آپ کیوں کال اٹینڈ نہیں کررہے؟ آپ کا فون مسلسل بند جارہا ہے، کیا مسئلہ ہے؟ کوئی ناراضی تو نہیں؟ باجی سمجھتی ہیں کہ اس روز انہوں نے آپ کی کال ریسیو نہیں کی تھی اس لئے آپ خفا ہوگئے ہیں۔ پلیز بھائی جان! باجی کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ بہت بری طرح گھری ہوئی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ باجی کو ہمارے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے۔ پلیز! آپ جواب دیں۔''

میسج پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ نصرت میری خاموشی کو میری خفگی پر محمول کررہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ ان تین چار دنوں میں، میں کن سنگین حالات سے گزرا ہوں اور اگر میں بتاتا تو شاید وہ دونوں یقین نہ کرپاتیں۔ موجودہ تابش اس تابش سے بہت مختلف ہو چکا تھا جسے وہ

جانتی تھیں۔ اب اس کے شب و روز ہنگاموں سے عبارت تھے اور وہ ایک بگولے کا ہم رکاب تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نصرت سے رابطہ کروں کہ ایک منظر نے بری طرح چونکا دیا۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو وائپر پر گیلا کپڑا ڈالے ہوٹل کے فرش کو صاف کررہی تھی۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ میں اس سے مل چکا تھا اور دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ مگر یہ پتا نہیں تھا کہ اس سے یوں ملاقات ہوگی۔ وہ حمیدن تھی۔ ثروت کے شوہر یوسف کی گھریلو ملازمہ۔ چند ہفتے پہلے عمران کے ساتھی جیلانی نے اس عورت کو شیشے میں اتارا تھا اور اس نے ہمیں یوسف اور ثروت کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کی تھیں۔

اسی دوران میں حمیدن کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی۔ تھوڑی سی کوشش سے اس نے مجھے پہچان لیا اور اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ ''حمیدن! تم یہاں بھی کام کرتی ہو؟''

''جی صیب! پر آپ یہاں کیسے؟ اور آپ کو تو چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔''

''ہاں...... بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔''

میرے اور حمیدن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور میں حمیدن کو کمرے میں لے آیا۔ عمران بھی اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ حمیدن نے ہمیں بتایا کہ وہ پچھلے ایک سال سے یہاں صفائی کا کام کررہی ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں ہمارے کمرے کی صفائی بھی شاید اسے ہی کرنا تھی۔ میں نے حمیدن سے کہا۔ ''بڑا اچھا ہوا ہے کہ تم سے خود ہی ملاقات ہوگئی۔ ہمیں تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''بتائیں صیب جی۔'' حمیدن کی آنکھوں میں وہی جانا پہچانا لالچ ابھر آیا۔

''یہاں نہیں، کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کرنا ہوگی۔'' عمران نے کہا۔

''میں نے ابھی صفائی کرنے کے بعد اوپر چھت پر دو تین قالین دھونے ہیں۔ کافی ٹائم لگ جانا ہے۔ آپ اوپر چھت پر ہی آجائیں۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔''

نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ حمیدن کے لہجے میں دبا دبا جوش ہے۔ جیسے ہمیں بتانے کے لئے اس کے پاس کوئی خاص بات ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم جب چھت پر جانے لگو تو ہمیں بتادینا۔ ہم آجائیں گے لیکن اس بات کا کسی اور کو پتا نہیں چلنا چاہئے۔''

''نہیں جی، میں کیوں بتاؤں گی کسی کو...... میں نے پہلے بھلا بتایا ہے؟ ویسے مالک بڑا سخت ہے جی، کہتا ہے کہ گاہکوں سے آلتو فالتو بات نہیں کرنی۔ کہیں میری بے عزتی خراب نہ

کر دے۔"

راجا نے کہا۔" کچھ نہیں ہوگا تجھے۔ مالک یار بیلی ہے اپنا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی۔ پر گریبوں پر تو ہر کوئی چڑھائی کر دیتا ہے نا۔ پچھلے ہفتے چھوٹی سی بات پر ساتھ والے خاں صاحب کا گھر بھی مجھ سے چھوٹ گیا ہے حالانکہ......"

وہ اپنی تنگ دستی کا رونا رونے بیٹھ گئی۔ مطلب صاف ظاہر تھا۔ وہ "مال" اٹھوانے سے پہلے "ادائیگی" چاہتی تھی۔ عمران نے دو ہزار کے دو نوٹ پرس میں سے نکالے اور حمیدن کو تھما دیئے۔ اس نے تھوڑا سا تکلیف ظاہر کرنے کے بعد یہ نوٹ اپنے گریبان میں رکھ لئے اور سامنے اوڑھنی درست کر لی۔

عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔"اگر پورا تعاون کرو گی تو اتنے ہی اور ملیں گے۔"

وہ سلام کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

O.....❖.....O

اگلا ایک گھنٹا ہم نے کافی بے چینی میں گزارا۔ آخر وہ وقت آ گیا۔ حمیدن ہمارے کمرے کے سامنے سے گزری اور ہمیں سنانے کے لئے اپنے کسی ساتھی کا نام لے کر پکاری۔

"فضلو! میں چھت پر جا رہی ہوں۔"

اس اطلاع کے قریباً دس منٹ بعد میں اور عمران بھی چھت کی طرف روانہ ہو گئے۔ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھنا میرے لئے خاصا دشوار ثابت ہوا تاہم میں چڑھ گیا۔ چھت پر واقعی حمیدن کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اپریل کے آخری دنوں کی سنہری دھوپ قرب و جوار کو روشن کر رہی تھی۔ چھت پر ہوٹل کا بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے، چند ناکارہ ٹی وی سیٹ، دو چار خراب ونڈو اے سی اور اس قسم کی دیگر اشیاء۔ تاہم چھت کے ارد گرد لاہور کا بالائی نظارہ خوب صورت تھا۔ کبوتر اڑ رہے تھے۔ اکا دکا پتنگیں نظر آ رہی تھیں۔ چھتوں پر رنگین آنچلوں کی جھلک تھی اور نیچے گلی کوچوں میں زندگی رواں دکھائی دیتی تھی۔

حمیدن نے کارپٹ کے تین چار بڑے بڑے ٹکڑے چھت پر بچھا رکھے تھے اور انہیں وائپر کے ساتھ دھونے میں مصروف تھی۔ میں اور عمران قریب رکھی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ انداز ایسا ہی تھا، جیسے دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہاں آ گئے ہیں لیکن ہمیں اصل سروکار تو حمیدن سے ہی تھا۔

میں نے کہا۔"ہاں حمیدن! کیا چل رہا ہے یوسف صاحب کے گھر میں؟"

وہ دیدے گھما کر بولی۔"صیب جی! وہاں تو لمبی چوڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اللہ ماف کرے...... اللہ ماف کرے۔ دن میں تارے نظر آ گئے ہیں یوسف صیب کو۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔"

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صیب جی! یہ تو آپ کو پتا ہی ہے نا کہ بڑی بی بی جی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی بیمار ہیں اور علاج کے لئے باہر کے ملک گئی ہیں...... بڑی بی بی بھی ساتھ ہیں؟''

''ہاں پتا ہے مجھے لیکن یہاں کیا معاملہ ہے؟''

اس نے سسپنس بڑھانے کے لے اردگرد دیکھا اور رازداری کے انداز میں بولی۔

''یوسف صیب کی جرمن وہٹی واپس چلی گئی ہے۔ اس نے بڑا وڈا دھوکا دیا ہے یوسف صیب کو۔''

''دھوکا دیا ہے؟''

''آہو جی، وہ چنگی کڑی ہی نہیں ہے۔ مجھ لگتا ہے کہ یوسف صیب کا دل اس سے بھر گیا ہے اور اس کا دل یوسف صیب سے بھر گیا ہے۔ ان دونوں کی کہانی اب ختم لگتی ہے۔''

''تم کس دھوکے کی بات کر رہی تھی؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''تھوڑے دن پہلے میم کے چار پانچ رشتے دار آئے ہوئے تھے گھر میں۔ ایک کڑی تھی، تین چار منڈے تھے۔ بس چٹی چمڑی۔ نہ منہ نہ متھا۔ ایک نمبر کے لوفر تھے سارے۔ ان میں سے ایک منڈا میم جی کا کوئی چاچے بابے کا پتر بھی تھا۔ وی بائی سال کا ہو گا...... بالکل سوکھا سڑا، کانے جیسی ٹانگیں۔ میم جی کو بڑی بے شرمی سے ڈارلنگ ڈارلنگ بھی کہتا تھا۔ یہ لوگ میم جی کو ساتھ لے کر سارا دن لور لور گھومتے تھے۔ رات کو نشہ پیتے تھے اور ناچ گانا کرتے تھے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ اس سوکھے سڑے منڈے کی وجہ سے ہی یوسف صیب اور میم جی میں جھگڑا ہوا...... اللہ کی شان ہے جی...... ویکھدے ہی ویکھدے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ کہاں تو یوسف صیب اپنی میم کے پاؤں کے نیچے تلیاں (ہتھیلیاں) رکھتے تھے، کہاں وہ اسے انگریزی میں گالیاں دیتے تھے اور وہ ان کو دیتی تھی۔ اللہ معافی...... اللہ معافی۔ لگتا ہے کہ یہ عشق کا ''بھانبڑ'' جتنی تیزی سے بھڑکا تھا، اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈا بھی ہوا ہے۔''

''گریس واپس کب گئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو کوئی دو تین ہفتے ہو گئے ہیں جی۔ ایک دن سویرے میں کام پر گئی تو برآنڈے میں چینی کے کئی بھانڈے ٹوٹے پڑے تھے۔ ایک کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ پروہنے (مہمان) جا چکے تھے اور ساتھ میں میم بھی جا چکی تھی۔''

حمیدن نے اپنی آواز دھیمی کی اور دیدے گھما کر بولی۔ ''سنا ہے جی، وہ اپنی ایک ایک شے واپس لے گئی ہے۔ یوسف صیب کے ہتھ میں کوئی مہنگی گھڑی تھی، وہ تک اتروالی ہے اس

نے۔ کافی سارے نقد پیسے بھی لئے ہیں۔ ورنہ وہ تھانے جانے کی دھمکی دیتی تھی بڑی عجیب چیز نکلی ہے جی وہ۔''

ہم سن رہے تھے اور سنّاٹے میں تھے۔

اب یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ نصرت کے بقول آج کل یوسف بدلا ہوا کیوں ہے۔ نصرت نے بتایا تھا کہ وہ آج کل ثروت کا بڑا خیال رکھ رہا ہے۔ پاکستان سے دن میں کئی بار اس کا فون جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لگتا تھا کہ نصرت کی چھٹی حس کافی تیز ہے۔ اس نے فون پر مجھ سے شک کا اظہار کیا تھا کہ شاید وہاں لاہور میں یوسف بھائی کی طرف کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

عمران نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے حمیدن...... یوسف صاحب اب کیا سوچ رہے ہیں؟''

''وہی جی...... جو انہیں بہت پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ انہیں اب احساس ہو رہا ہے کہ انہوں نے ہیرے جیسی بڑی بی بی کے ساتھ بڑی جیادتی کی ہے۔ اب انہوں نے بڑی بی بی کی ایک تصویر اپنے کمرے میں لگائی ہے۔ اتنی پیاری تصویر ہے کہ کیا بتاؤں۔ ایمان سے حور لگتی ہیں اپنی بی بی اور وہ خصماں نوں کھانی...... لنگور تھی ان کے سامنے۔ بس چٹی چمڑی اور نیلی کچ آنکھیں۔ اور کیا تھا اس میں۔'' حمیدن، یوسف کی جرمن بیوی گریس کے لئے جلی بیٹھی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''حمیدن! تمہارا کیا خیال ہے، اب اپنی بڑی بی بی سے یوسف صاحب کا سلوک اچھا ہو جائے گا؟''

''ضرور اچھا ہو گا جی۔ یوسف صیب ان کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے سونے والے کمرے کو بھی ٹھیک ٹھاک کیا ہے۔ کافی روپیا لگایا ہے کمرے پر۔ اور غسل خانے کو تو شیش محل بنا دیا ہے جی۔ پتا نہیں کس ملک سے چیزیں منگوا کر لگا رہے ہیں اس میں۔''

''یعنی بڑی بی بی کے لئے یوسف صاحب کی سوئی ہوئی محبت جاگ گئی ہے؟'' عمران نے کہا۔

''آہو جی اور یہ محبت اس ففے کٹن گوری نے سلائی ہوئی تھی جی۔ ورنہ اپنی بی بی ثروت تو لاکھوں میں اک ہیں۔ اندھیرے کمرے میں بھی بیٹھیں تو چانن ہو جاتا ہے۔''

''اور اگر وہ ففے کٹن گوری پھر یہاں واپس آ گئی تو؟'' عمران نے پوچھا۔

''لگتا تو نہیں جی کہ اب وہ واپس آئے گی۔ باقی اللہ کو پتا ہے۔ پر اس نے جو جادو کر

نکل جاؤں گا۔ اس کے سکھی پریوار پر اپنی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ بندۂ خدا! اگر تم پشپا...... میرا مطلب ہے ثروت کی زندگی سے نکل جاتے تو تمہیں کیسے پتا چلتا کہ یہ یوسف عرف پریم چوپڑا کیا گل کھلانے جا رہا ہے۔ ثروت کے وشواس کی ہتھیا کرنے کے لئے کون سا نروانترے پل رہا ہے اس کے دماغ میں۔''

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پتا تھا کہ ''نروانترے'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے جہاں عمران کو کوئی لفظ نہیں سوجھتا تھا، وہاں وہ کوئی من گھڑت لفظ لگا دیتا تھا۔

وہ اس طرح کے فقرے بولتا رہتا تھا۔ ''یار تابی! میرے دماغ میں عجیب سی کروشلا آئی ہے۔''

یا پھر ''یار! آج کل گرمی کے کارن بھوجن اکشاتا تو ختم ہی ہوگئی ہے۔''

یا پھر ''جلالی صاحب کے پریم کی خبر آؤٹ ہوگئی تو بڑا سمادھار مچے گا بھیا۔''

ان فقروں میں کروشلا، اکشاتا اور سمادھار کے الفاظ ہندی کی کسی لغت میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے تھے...... بلکہ دنیا کی کسی لغت میں نہیں۔

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے سیل فون کے ذریعے جیلانی سے رابطہ کیا اور اس سے باتیں کرتا کرتا باہر نکل گیا۔ وہ یقیناً جیلانی کے ذریعے ان اہم خبروں کی تصدیق چاہتا تھا جو ابھی ہمیں ملازمہ حمیدن نے پہنچائی تھیں۔

راجا نے کمرے کا ٹی وی آن کر رکھا تھا مگر اس کی آواز بند تھی۔ اچانک اسکرین پر نظر آنے والی ایک تصویر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ ریان ولیم کی ایک پرانی تصویر تھی۔ تاہم اس میں بھی وہ کافی سے زیادہ موٹا نظر آتا تھا۔ میں نے فوراً ریموٹ کنٹرول راجا سے جھپٹا اور آواز اونچی کی۔ ایک نیوز چینل سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ فربہ اندام ریان ولیم کے فوراً بعد ایک اور دھندلی سی تصویر دکھائی گئی، یہ جاوا کی تھی۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''...... دونوں گروپوں کی اس لڑائی میں اب تک تیرہ چودہ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ یاد رہے کہ کل صبح، انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہونے والا ہنگامہ بھی ان دونوں گروہوں کی عداوت کا شاخسانہ تھا۔ ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں نے ایک دوسرے پر اندھا دھند فائرنگ کی اور کئی افراد جان سے گئے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دونوں گروپ بدھا کی اس خاص مورتی کے لئے مار دھاڑ کر رہے ہیں جسے آرا کوئے کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں عرصہ دراز سے کئی کہانیاں اور

کہاوتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مورتی اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں اور اس جگہ کی حفاظت بھی کرتی ہے جہاں یہ موجود ہوتی ہے۔ آیئے، اب ہم آپ کو اس مورتی کے بارے میں ایک ڈاکومینٹری دکھاتے ہیں......''

اس کے بعد آرا کوئے کا تاریخی پس منظر بیان کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے یہ کہاں تھی؟ اس کے بعد کہاں گئی؟ دوسری جنگِ عظیم میں یہ ایک قصبے میں موجود جاپانیوں کے لئے کس طرح سومند ثابت ہوئی۔ پھر یہ کس طرح چوری ہو کر پاکستان پہنچی اور واپس کس طرح گئی اور دوبارہ پاکستان کیونکر آئی۔ اس حوالے سے نوادرات کے شکاری ابرار صدیقی اور میڈم صفورا وغیرہ کے نام بھی آئے۔

میں نے چینل بدلنے شروع کئے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک اور نیوز چینل پر مطلوبہ خبر نظر آ گئی۔ میں چونکا۔ یہاں جلالی صاحب خود نظر آ رہے تھے۔ فارم ہاؤس کا ہی منظر تھا۔ لان میں کرسیاں بچھی تھیں۔ میز پر پرانی طرز کا گراموفون نظر آ رہا تھا۔ ایک نمائندہ جلالی صاحب کا انٹرویو کر رہا تھا۔ نقاہت زدہ جلالی صاحب آرام کرسی پر تقریباً نیم دراز تھے مگر ان کی آواز کا طنطنہ برقرار تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''...... میرا بیان وہی ہے جو میں پہلے بھی آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔ وہ باکس میرے پاس ایک امانت کے طور پر آیا ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا مالک خود مجھ تک نہیں پہنچتا۔''

''لیکن جناب! فرض کیا وہ شخص کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے اور اب آپ سے رابطہ نہیں کر سکتا تو پھر؟''

''پھر بھی میں انتظار کروں گا۔ کم از کم چار پانچ مہینے اور...... اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''جناب! کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ آپ اس باکس کی ذمے داری سے فارغ کیوں نہیں ہو جاتے؟ آخر اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟''

اس چبھتے ہوئے سوال نے جلالی صاحب کا پارا اچھال دیا۔ وہ بھڑک کر بولے۔ ''کیسے فارغ ہو جاؤں ذمے داری سے؟ کیا پولیس والوں کو یہ ذمے داری دے دوں...... یا کسی چور وزیر کو...... یا پھر تمہیں دے دوں؟ بتاؤ تمہیں دے دوں؟''

''نہیں جناب! میرا مطلب یہ تھا کہ......''

''خاموش۔'' وہ دہاڑے۔ ''میں سمجھ رہا ہوں تمہارا مطلب...... تم میں سے زیادہ تر بلیک میلر ہیں۔ تم لوگوں نے اپنی اپنی حکومتیں بنائی ہوئی ہیں۔ آزاد ریاستیں قائم ہوئی ہیں۔

رکھا تھا ناصیب جی پر، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ وہ آ بھی گئی تو اس کی وہ پہلے جیسی موجیں نہیں ہوں گی۔"

میں نے حمیدن سے پوچھا۔"ثروت کے سسر فاروقی صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ دس پندرہ دن پہلے آئے تھے جی۔ دو دن رہ کر چلے گئے۔ میم کے جانے پر وہ بھی خوش ہی تھے۔"

"بی بی ثروت باہر کے ملک سے واپس کب آ رہی ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں جی...... مگر ابھی ان کو وہاں کافی ٹائم لگنا ہے۔ نصرت بی بی کی بیماری کوئی ایویں شیویں نہیں ہے۔ ان کا جگر کھراب ہے۔ کوئی بڑی نامراد بیماری ہے۔ اللہ اس کو شفا دے، یہ دونوں بہنیں ہی بڑی چنگی ہیں۔"

حمیدن ہم سے باتیں کرتی رہی اور ساتھ ساتھ قالین بھی دھوتی رہی۔ اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ ہم یہ معلومات کیوں اور کس لئے حاصل کر رہے ہیں۔ اسے صرف دو عدد بڑے سائز کے نیلے نوٹوں کی ضرورت تھی۔ اس کی یہ ضرورت عمران نے پوری کر دی۔

حمیدن سے بات چیت ختم کرنے کے بعد میں اور عمران نیچے آ گئے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ صورتِ حال میں تیزی سے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایک طرف جلالی صاحب اور آرا کوئے والا معاملہ تھا تو جو تیزی سے رنگ بدل رہا تھا۔ دوسری طرف میری ثروت اور یوسف کی کہانی تھی جس میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔

یوسف شروع سے ہی ایک شوقین اور خواہش پرست امیر زادے کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ ایک بڑی جائیداد کا مالک تھا اور اسے توقع تھی کہ مزید جائیداد اس کے ہاتھ آنے والی ہے۔ وہ کافی حد تک جذباتی اور رومانی بھی تھا۔ اس نے خود سے تقریباً دس سال چھوٹی ایک ٹین ایج لڑکی سے عشق کیا اور اس کے لئے سب سے ٹکر لے لی۔ اپنا تن من دھن اس پر لٹا دیا۔ یہاں تک کہ اپنی خوب صورت خاندانی بیوی (ثروت) سے بھی یکسر منہ موڑے رکھا۔ وہ سہاگن ہونے کے باوجود اس کی بیوی نہ بن سکی۔ لیکن اب صورتِ حال میں ایک اور حیران کن موڑ آیا تھا۔ یوسف کی محبوبہ بیوی اس سے لڑ جھگڑ کر جرمنی پہنچ چکی تھی اور اب یوسف کی سوچوں کے دھارے شاید ثروت کی طرف مڑ رہے تھے۔ شاید...... اسے پچھتاوا محسوس ہو رہا تھا کہ ثروت جیسی خوبرو اور باوفا لڑکی ایک بیوی کی حیثیت سے ہر دم اس کے پاس رہی ہے۔ وہ اس پر مکمل اختیار رکھنے کے باوجود اس کے التفات سے محروم رہا ہے۔

یورپ کی معطر فضاؤں میں رہنے والی "خواہش پرست حس شامہ" کو اب اپنی مٹی کی خوشبو کشش کر رہی تھی۔

کیا اب یہ ثروت کے ساتھ ایک اور دھوکا تھا؟

عمران نے کہا۔"کیا خیال ہے جگر! ویانا میں ثروت اور نصرت کو یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے؟"

"میرے خیال میں تو ابھی ہمیں مزید تصدیق کر لینی چاہئے...... ہو سکتا ہے کہ حمیدن کی معلومات میں کوئی خلا ہو۔ کیا اس سلسلے میں جیلانی ہماری مدد کر سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں...... ہماری مدد نہیں کرے گا تو کیا وہ امریکا کا اور یورپی یونین کی مدد کرے گا۔"

"امریکا یہاں کہاں سے آ گیا؟"

"امریکا ہر جگہ آ سکتا ہے اور ہر طرف سے آ سکتا ہے۔ یہ شیر کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ انڈا دے یا بچہ...... یا کچھ بھی نہ دے اور صرف وعدے کرتا رہے کہ دوں گا۔ تمہیں پتا ہے پچھلے دنوں ہمارے فساد پلس چینل پر ایک پروگرام نشر کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا، امریکا کے وہ وعدے جو اس نے تیسری دنیا سے کئے اور پورے کئے۔ یہ پروگرام رات کو ٹھیک نو بجے شروع ہوا اور نو بج کر تین منٹ پر ختم ہو گیا۔ اس "مفصل" پروگرام کی وجہ سے بڑی لعنتیں ارسال ہوئی تھیں ہم پر......"

اس سے پہلے کہ عمران کی یہ عالمانہ گفتگو طول پکڑتی اور وہ آٹے دال کا بھاؤ اقوام متحدہ اور پینٹاگون سے ملا دیتا، میرے سیل فون پر پھر نصرت کا میسج آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔"کیا آپ کو میری صحت کا بھی خیال نہیں بھائی جان؟ آپ کیوں جواب نہیں دے رہے؟ میں بہت پریشان ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا، لاہور میں پتا کرائیں کہ یوسف بھائی جان کس چکر میں ہیں، ان کا رویہ بہت بدلا بدلا ہے۔ آپ نے اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"

میں نے اسی وقت نصرت کو جواب دیا اور لکھا۔"میں اور عمران فی الوقت ایک بہت ضروری کام میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس مصروفیت کی وجہ سے تم سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ تمہارے کہنے پر میں یوسف صاحب کے بارے میں ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی اہم بات معلوم ہوئی تو تمہیں آگاہ کروں گا۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی صحت پر توجہ دو۔"

عمران نے میرے کندھے پر گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔"دیکھو جگر! چند ہفتے پہلے تم دیوداس بننے جا رہے تھے۔ دلیپ کماری لہجے میں کہہ رہے تھے...... میں پشپا کے جیون سے

کالی بھیڑوں کی طرح گھسے ہوئے ہوئے تم لوگ ہر جگہ۔ اس میڈیا کو بھی بدنام کر رہے ہو۔ یہ کیمرا ''پستول'' کی طرح اٹھائے پھرتے ہو اور اس سے لوگوں کو ہینڈز اپ کرواتے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں ڈر جاؤں گا؟ میں جاوا جیسے حرامی ڈان سے نہیں ڈرا، تم کس باغ کی مولی ہو......''

نمائندے کا ٹمپریچر بھی شاید بڑھ گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ دھیما لہجہ اختیار کرتا، اس نے مزید سخت سوال کیا۔ ''جناب کل ایک چینل پر ایک پروگرام چلا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ خود بھی آرا کوئے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں فارم ہاؤس کے ماحول کے بارے میں بھی کچھ ''باتیں'' کہی گئی ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

جلالی صاحب آتشیں لہجے میں بولے۔ ''یہاں کے ماحول سے کس کی ماں بہن کو نقصان پہنچا ہے؟ کس کو پہنچا ہے؟ میں نے کہا تھا نا تم بلیک میلر ہو۔ میں تمہیں...... میں تمہیں......''

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی موٹی چھڑی اٹھائی اور پورے زور سے گھمائی۔ یہ وار غالباً کیمرا مین کی طرف تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیمرے کا زاویہ تبدیل ہونے سے ڈاکٹر مہناز بھی فریم میں آ گئی۔ ''پلیز سر...... پلیز!'' وہ پکاری اور جلالی صاحب کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہوگئی۔ چند لمحے بعد نیوز کاسٹر خجل انداز میں دیگر خبریں نشر کرنے لگی۔

''بڑا گرم بڈھا ہے بھئی۔'' راجا نے تبصرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عمران اندر آ گیا۔ ''یہ کیا چل رہا تھا ٹی وی پر؟ مجھے تو جلالی کی آواز لگ رہی تھی۔''

''وہی حضرت تھے۔ لائیو ڈراما شروع ہونے لگا تھا۔ بچ بچا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

عمران کے پوچھنے پر میں نے اسے تفصیل بتائی۔ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

''جگر! یہ معاملہ تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب ریان اور جاوا کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس تماشے میں کود پڑیں۔ جلالی کی جان کو شدید خطرہ ہے لیکن وہ سمجھ نہیں رہا اور نہ کسی کی بات مان رہا ہے۔''

''تو پھر کیا ارادے ہیں؟''

''اب کوئی راست قدم اٹھانا پڑے گا۔'' عمران نے کش لگایا۔

''یار! مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ یہ کیا اسٹوری چل رہی ہے؟'' راجا نے مداخلت کی۔

''پہلے ہمیں تو ٹھیک سے پتا چل جائے، پھر تمہیں بھی بتا دیں گے۔'' عمران نے اسے ٹالا۔

راجا کی اکلوتی صحت مند آنکھ میں ''جستجو'' چمک رہی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔

O......❖......O

اگلے روز شام کے فوراً بعد میں اور عمران جلالی صاحب کی طرف روانہ ہو گئے۔ راجا کو عمران نے فی الحال ہوٹل میں رہنے پر رضامند کر لیا تھا۔ اسے ابھی ہم نے کچھ بتایا نہیں تھا پھر بھی وہ موجودہ حالات کے بارے میں کافی سارے اندازے قائم کر چکا تھا۔ بڑا کائیاں شخص تھا وہ اور عیار بھی۔ راستے میں اس نے جس طرح لینڈ روور کو خراب کر کے مجھے اُلو بنایا تھا اور اپنا اُلو سیدھا کیا تھا۔ وہ مجھے بھولا نہیں تھا...... میری ٹانگ اب پہلے سے کافی بہتر تھی...... پھر بھی واکنگ اسٹک کے سہارے چلنا پڑ رہا تھا۔ جسم پر جا بجا چوٹوں کے نیلے پیلے نشان موجود تھے لیکن ان میں سے زیادہ تر لباس میں چھپ گئے تھے۔ مجھے اپنے خاص الخاص چاقو کی گمشدگی کا افسوس تھا۔ جارج گورا کو جہنم واصل کرنے والا یہ خنجر نما چاقو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہی رہ گیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کہاں اور کس کے پاس تھا۔

عمران ایک تاریک شیشوں والی کرولا گاڑی میں یہاں پہنچا تھا پتا نہیں یہ کس کی گاڑی تھی۔ میں نے پوچھا لیکن اس نے بتایا نہیں۔ جب وہ کچھ چھپانے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر اس سے بحث فضول ہوتی تھی۔ راستے میں وہ شاہین سے فون پر خوب لڑتا جھگڑتا رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب سنائیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے رتی بھر جگہ بھی نہیں ہے۔ اور خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے وہ ایک ہو جائیں تو زندگی برباد ہو جائے اور دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے۔ حسبِ معمول فون پہلے شاہین نے ہی بند کیا تھا اور عمران کے خوبرو چہرے پر شرارت ناچ گئی تھی۔

عمران کے بعد میں نے فرح اور عاطف سے بات کی اور انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ وہ بھی اس بات پر بہت پریشان تھے کہ میرا فون چار دن تک مسلسل بند رہا تھا۔ فون ہی پر میں نے اپنے اور سلطانہ کے لختِ جگر بالو کی زندگی بخش آواز بھی سنی۔

ہم رات نو بجے کے لگ بھگ ''جلالی فارم ہاؤس'' پہنچے۔ عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا...... فارم ہاؤس کے اردگرد کا نقشہ اب بدلا ہوا تھا۔ دو تین جگہ ہمیں پولیس ناکوں پر سے گزرنا پڑا۔ یہاں عمران نے باقاعدہ اپنی اور میری شناخت کروائی۔ آخری ناکے پر بذریعہ فون جلالی

صاحب سے اجازت حاصل کی گئی۔

فارم کے مین گیٹ پر پولیس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے لوگ بھی موجود تھے۔ یہاں گیٹ سے باہر میڈیا کے کچھ افراد بھی موجود تھے۔ انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور وہ باہر بیٹھے بس گھول رہے تھے۔ مجھے اور عمران کو دیکھ کر وہ ہماری طرف لپکے۔ دو تین افراد نے کار کی کھڑکی سے اپنے مائیک اندر گھسا دیئے۔ ایک رپورٹر نے کہا۔

''عمران صاحب! جاوا ایک بہت طاقتور شخص کا نام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو انڈین فلم انڈسٹری پر راج کرتے ہیں۔ آپ نے اسے للکارا ہے...... آپ کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟''

''مادھوری ڈکشٹ کا بلکہ وہ پوری کی پوری میرے پیچھے ہے۔ اور عورت آگے ہو یا پیچھے، اس کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے۔'' عمران نے ایک آنکھ میچی۔

''کون مادھوری جناب؟ شاید آپ مذاق کر رہے ہیں؟'' رپورٹر نے کہا۔

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ مادھوری ایک بہت ذہین اور چارہ گر خاتون ہے۔ اس کی یادداشت بھی غضب کی ہے۔ چند سال پہلے جب وہ فلموں میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی، جاوا نے اس کے ساتھ ہرول بھرشاٹ کیا تھا۔ اب وہ اس کا بدلہ چکانا چاہتی ہے۔''

''ہرول بھرشاٹ......؟ یہ کیا لفظ ہے جناب؟ پہلی بار سنا ہے۔''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم نے سنا ہے یا نہیں لیکن ہرول بھرشاٹ تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔ اور انڈیا میں تو یہ بہت زیادہ ہے۔ ہر جگہ اس کا دور دورہ ہے۔ امیر طبقے کے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو غریبوں کے ساتھ ہرول بھرشاٹ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔''

''لیکن اس کا مطلب......''

رپورٹر کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ عمران نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

ہم کوٹھی کے پورچ میں پہنچے......اور پھر اندر چلے گئے۔ دور سے دیکھا، جلالی صاحب چھوٹے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں عمران نے مائیکروفون چھپایا تھا اور اس ننھے سے آلے کے ذریعے ہم نے اس کوٹھی کے کئی سربستہ راز معلوم کئے تھے۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ ہم نے شیشے میں سے دیکھا، جلالی صاحب کمر کے پیچھے دو تین کشن رکھے صوفے پر نیم دراز تھے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ بابے طفیل کی بہو رضیہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ دوسروں کے سامنے جلالی صاحب، مہناز سے بالکل لئے دیئے رہتے تھے بلکہ کسی وقت ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ مہناز بھی جناب اور سر کے سوا بات نہیں کرتی

تھی۔ ابھی تک کوٹھی میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ یہاں ایک نہایت خفیہ شادی کی صورت میں کتنی بڑی تبدیلی آ چکی ہے۔ کم از کم ابھی تک تو یہ بات ایک ''ٹاپ سیکرٹ'' ہی تھی۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے اسے اشارے سے باہر بلایا۔ اس نے ہاتھ کی حرکت سے بتایا کہ تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ جلالی صاحب کے وائٹل سائنز چیک کرنے کے بعد اس نے جلالی صاحب کے بازو پر لگے ہوئے ''کینولا'' میں دو انجکشن دیے اور باہر آ گئی۔ نایاب ایرانی بلی کا ایک گول مٹول بلونگڑا جلالی صاحب کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔

کل شام ہی عمران نے ڈاکٹر مہناز کو فون پر ساری صورتِ حال بتا دی تھی۔ میری خیریت اور فتح محمد کی ہلاکت سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ سیکرٹری ندیم کے دہرے روپ کی اہم ترین اطلاع بھی مہناز تک پہنچا دی تھی۔ اس کے بعد اسے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو یہ معلومات جلالی صاحب کو دے دے۔

مہناز میری بخیریت واپسی پر خوش تھی، تاہم جلالی صاحب کی ابتر طبیعت نے اسے پریشان بھی کر رکھا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں نے ابھی سر کو کچھ نہیں بتایا۔ صرف تمہاری خیریت سے آگاہ کیا ہے۔'' مہناز کا اشارہ میری طرف تھا۔

''ندیم کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تک تو نہیں۔ فتح محمد کی موت کی خبر کی طرح اس خبر سے بھی سر کو بہت صدمہ پہنچنا ہے اور ان کی حالت ایسی نہیں کہ فی الحال انہیں ایسے شاک پہنچائے جائیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سب کچھ بگڑ رہا ہے۔ بلڈ پریشر، ہارٹ بیٹ، شوگر لیول۔ ایک تو حالات ایسے ہیں، اوپر سے یہ میڈیا والے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کل ایک چینل کے رپورٹر پر بہت بگڑے ہیں سر۔ طبیعت تو اسی وقت خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں سی آئی اے والے آ گئے۔ ہر ایک کی ڈیمانڈ یہی ہے کہ سر ''آرا کوئے'' والا باکس حوالے کر دیں اور اپنی جان چھڑائیں۔ لیکن یہ بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ بس ضد پکڑ لی ہے۔ کہ نہیں۔ جتنا زور دیا جا رہا ہے، اتنا ہی اپنے مؤقف پر سخت ہو رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر مہناز! تم بھی کچھ نہیں کر سکتی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے اس طرح دیکھنے سے وہ گڑبڑا گئی اور بولی۔ ''کیا مطلب؟''

''تم سر کے اتنے قریب ہو۔ وہ تمہاری بات تحمل سے سنتے ہیں، اس پر غور کرتے ہیں۔''

''لیکن ایسا تو بس کسی وقت ہی ہوتا ہے، جب موڈ اچھا ہو۔''

''تو تم موڈ اچھا کر لو نا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ ذرا چونک سی گئی۔ روشن پیشانی پر ایک شکن سی ابھری اور غائب ہو گئی۔ ''وہ آپ دونوں کو بھی تو بڑے غور سے سنتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں بات کرتے؟'' وہ بولی۔

اسی دوران میں جلالی صاحب کو شدید کھانسی ہونے لگی۔ ہماری طرح ڈاکٹر مہناز نے بھی کھڑکی میں سے انہیں کھانستے دیکھا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر بڑی تن دہی سے ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ رضیہ بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ مہناز نے جلالی صاحب کو ایک ''ان ہیلر'' دیا۔ پھر ان کا سر اونچا کرنے کے لئے اپنے زانو پر رکھا اور ان کے بوڑھے سینے پر ہولے ہولے ہاتھ چلانے لگی...... ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اب ہم اس انداز میں مہناز کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

ہاں...... اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر مہناز کو نہیں دیکھا۔ وہ کہاں گئی؟ کب اور کیوں گئی؟ کچھ پتا نہیں چلا۔ اگلے قریباً دو ماہ تک ہم ڈاکٹر مہناز کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر اس روداد میں ایک عجیب موڑ تھا۔

لیکن فی الحال تو اس رات کی بات ہو رہی ہے جب اس نے جلالی صاحب کا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ ہولے ہولے سے ان کے سینے پر چلا رہی تھی۔ ان کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ بات تو ہم اچھی طرح جان چکے تھے کہ اگر جلالی صاحب پر کسی طریقے سے دباؤ ڈالا جا سکتا ہے تو وہ طریقہ صرف ''مہناز'' ہی ہے۔ اگر جلالی صاحب کو یقین ہو جاتا کہ ان کے چپ رہنے سے مہناز کسی بڑی مصیبت میں پھنس رہی ہے یا اس کی زندگی کو خطرہ ہے تو وہ اپنی ضد کے خول سے نکل سکتے تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو دباؤ کے لئے استعمال کرنا یقیناً ہمارے لئے ایک ناخوشگوار عمل تھا۔ لیکن جس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے، ان میں اب کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اب بھی کچھ نہ کچھ کرنے میں بہت سے خطرے پوشیدہ تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خدانخواستہ جلالی صاحب کو کچھ ہو جاتا اور آراکوئے ہمیشہ کے لئے کہیں اوجھل ہو جاتا۔

ہمارے پاس دو تین پلان تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اپنی شناخت ظاہر کئے بغیر ڈاکٹر مہناز کو جلالی کے سامنے گن پوائنٹ پر رکھا جائے۔ اگر ناگزیر ہو تو کچھ تشدد بھی کیا جائے اور جلالی کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا جائے۔

رات بارہ بجے کے قریب عمران Zoo کی طرف اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ ٹانگ سمیت جسم کے مختلف حصوں سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کمرے کی الماری میں پین کلرز موجود تھیں لیکن مجھے درد کو مارنے کے بجائے درد کو سہنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ درد برداشت کرنے کے لمحوں میں، میں خود کو باروندا جیکی کے بہت قریب محسوس کرنے لگ تھا۔ وہ جیسے میرے قریب آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

نہ جانے کس وقت درد...... دوا ہو گیا اور میں سو گیا۔

کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بابا طفیل میرے سامنے تھا...... سفید داڑھی کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ دل دوز آواز میں بولا۔ ''اٹھو، دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ جلالی ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا، وہ زندہ ہے...... مجھے نہیں لگتا......''

میں اٹھا اور ننگے پاؤں جلالی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔ بابا طفیل بھی روتا ہوا میرے ساتھ تھا۔ کوٹھی میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ جلالی صاحب بالکل ساکت و جامد پڑے تھے۔ چہرے پر زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ میں نے ان کی نبض ٹٹولی۔ نبض کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جسم ٹھنڈا تھا۔ غور کرنے پر سینے میں ہلکی سی حرکت محسوس ہوئی۔ شاید یہ سانس کی حرکت تھی۔

''ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''وہ چلی گئی۔ بھاگ گئی حرام خور۔ اس کا کمرا خالی ہے۔ سارا سامان بھی غائب ہے'' بابے طفیل نے کراہتے ہوئے کہا۔

''یہ...... کیسے ہو سکتا ہے؟''

اسی دوران میں عمران بھی پہنچ گیا۔ لگتا تھا کہ بابے طفیل کے آخری الفاظ اس نے بھی سن لئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''عمران! جلالی صاحب کو اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی ان کی تھوڑی بہت سانس چل رہی ہے۔''

ایک ایمبولینس بیڈروم کے عقبی دروازے کے پاس بالکل تیار حالت میں رہتی تھی۔ دو تین منٹ کے اندر ایمبولینس دروازے پر پہنچ گئی۔ میں نے بابے طفیل اور رضیہ وغیرہ کو ہدایت کی کہ ابھی کمرے کی کسی شے کو اس کی جگہ سے ہلایا نہ جائے۔ کمرے میں کچھ چیزیں اپنی جگہوں سے ہٹی ہوئی تھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی دوا کی دو شیشیاں نیچے گری ہوئی تھیں۔

ایک چھوٹا ٹائم پیس شاید ان شیشیوں کے اوپر گرا تھا اور ٹوٹ گیا تھا۔ جلالی صاحب کی بیڈ شیٹ پر بہت سی سلوٹیں تھیں۔

ہم جلالی صاحب کے ہلکے پھلکے جسم کو اٹھا کر ایمبولینس تک لائے۔ عمران نے کہا۔ ''ہم دونوں کا جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں رہو اور فون پر مجھ سے رابطہ رکھو۔ ڈاکٹر مہناز کو ڈھونڈو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر ہی کہیں موجود ہو۔ نرس بشریٰ کا بھی پتا کرو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وحید...... عمران اور ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بے سُدھ جلالی صاحب کو ایمبولینس میں ڈال کر نکل گئے۔

ملازم آبدیدہ تھے۔ کئی باقاعدہ رو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے تئیں جلالی صاحب کو مردہ قرار دے دیا تھا۔

انچارج پولیس افسر ایس پی تیمور خاں بھی فوراً ہی اندر آ گیا۔ اس کو بیان دیتے ہوئے بابے طفیل نے کہا۔ ''جلالی کی طبیعت شام سے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ دس بجے تک طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ میرے کہنے پر مہناز نے اپنے کسی بڑے ڈاکٹر کو فون کیا۔ یہ ڈاکٹر خود تو نہیں آیا، اس نے ایک چھوٹے ڈاکٹر کو بھیج دیا۔ اب پتا نہیں وہ ڈاکٹر تھا بھی یا نہیں۔ شکل سے تو کوئی بوچڑ ہی لگتا تھا۔ یہ بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ مہناز نے کسی بڑے ڈاکٹر کو فون کیا بھی تھا یا نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ یہ ساری پلاننگ پہلے سے ہی تھی۔ اس کمینی نے جب یہ دیکھا کہ جلالی کا آخری وقت آ گیا ہے تو صفایا کر کے یہاں سے نکل گئی۔'' بابا طفیل پھر ہچکیوں سے رونے لگا۔

ایس پی تیمور نے پوچھا۔ ''صفایا کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا کچھ چیزیں بھی گئی ہیں؟''

''ہاں جی...... یہ دیکھیں، یہ ساری الماری الٹ پلٹ ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ نکالا گیا ہے یہاں سے۔'' بابے طفیل نے الماری کے پٹ کھول کر دکھائے۔ واقعی ہر شے درہم برہم دکھائی دیتی تھی۔ ایک دراز ادھ کھلی تھی۔ وہاں سے افراتفری میں کیش نکالا گیا تھا۔ پانچ پانچ سو کے دو نوٹ دراز سے نکل کر الماری کے نچلے حصے میں پڑے تھے۔ دراز میں سونے کی ایک زنجیر بھی اٹکی ہوئی تھی۔ یہ غالباً کسی قیمتی ہار کا حصہ تھی۔ بابا طفیل ہمیں ساتھ والے کمرے میں لایا۔ یہاں آبنوس کی بنی ہوئی ایک مضبوط دیوار گیر الماری تھی۔ اس الماری کا ایک تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ بابے طفیل نے پٹ کھولا۔ اندر لکڑی کا ایک باکس تھا۔ باکس کی لمبائی ڈھائی فٹ کے قریب رہی ہو گی۔ اس کی چوڑائی ایک فٹ اور اونچائی ایک فٹ سے تھوڑی کم محسوس ہوتی تھی۔

باکس کے اطراف میں سرخی مائل مٹی لگی ہوئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ باکس کہیں زمین میں دبا رہا ہے۔ باکس کا ایک کونا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ ذہن میں فوراً یہ آیا کہ یہی وہ باکس ہے جس کے لئے یہاں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ یہ وہی آرا کوئے والا نادر باکس تھا...... لیکن یہ خالی تھا۔ ایس پی تیمور نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ باکس میں اخباری کاغذوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ کاغذ غالباً مجسمے کو خراش وغیرہ سے بچانے کے لئے تہ در تہ باکس میں رکھے گئے تھے۔

''مجسمہ کہاں ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''آپ خود اندازہ لگا لیں جی کہ کہاں ہے۔ مہناز اور اس کا ساتھی لے گئے ہیں۔''

رات کو گیٹ پر موجود رہنے والا سب انسپکٹر بھی کمرے میں موجود تھا۔ ایس پی تیمور نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر مہناز کتنے بجے نکلی تھی کوٹھی سے؟''

''یہی کوئی ایک بجے کا وقت ہو گا۔''

''اور کون تھا؟''

''وہی سانولے سے رنگ والا ڈاکٹر جو رات دس بجے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کی مہران گاڑی تھی۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس وقت وہ دونوں کہاں جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا تھا کہ جلالی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ فوری طور پر کچھ دواؤں کی ضرورت ہے جو لاہور سے ملیں گی۔ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاتے ہیں۔''

ایس پی تیمور نے کہا۔ ''تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر جلالی صاحب کی طبیعت خراب ہے تو پھر وہ دونوں کیوں جا رہے ہیں؟ ان میں سے ایک کو یہاں موجود رہنا چاہئے تھا۔''

''جی، اس وقت یہ بات دماغ میں نہیں آئی۔ ویسے بھی میرا خیال تھا کہ شاید بڑے صاحب کو کوئی انجکشن وغیرہ لگایا گیا ہے اور فی الحال وہ سو رہے ہیں۔''

''گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا ہے؟''

''بالکل جناب! گاڑی کی یہاں سے روانگی کا بالکل ٹھیک ٹائم بھی لکھا ہو گا رجسٹر میں۔''

ایس پی تیمور اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کے حکم پر کوٹھی کے تینوں بیرونی دروازے بند کر دیئے گئے اور گارڈز کو ہائی الرٹ کر دیا گیا۔ سنسنی کی کیفیت شدید ہوتی جا رہی تھی۔

میں مبہوت سا لکڑی کے اس باکس کے سامنے کھڑا تھا جو اب تک ایک معما بنا رہا تھا۔ وہ اب بھی ایک معما ہی تھا کیونکہ اس کے اندر اصل چیز موجود نہیں تھی۔

بابا طفیل مسلسل اپنی سفید داڑھی کو آنسوؤں سے بھگو رہا تھا۔ اسے جیسے یقین ہو چکا تھا

کہ وہ اب جلالی صاحب کو زندہ نہیں دیکھ پائے گا۔

میں نے باکس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ یہ یہاں موجود نہیں تھا۔ ورنہ تلاش کے وقت جاوا کے ہتھے چڑھ گیا ہوتا، یا ریان کے لوگ اسے لے اڑے ہوتے۔ لگتا ہے کہ یہ دو چار دن پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' بابے طفیل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں شام کے وقت جلالی کی طبیعت کافی اچھی تھی۔ بالکل ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ شام سے کچھ دیر پہلے ہی جیپ پر بیٹھ کر سیر کے لئے نکل گئے تھے۔ ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ مغرب سے کوئی ایک گھنٹا بعد واپس آئے تھے۔ جیپ سامنے کی طرف کھڑی کرنے کے بجائے انہوں نے یہاں پچھلے صحن میں کھڑی کی تھی۔ اپنے کمرے کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ یہ جیپ ادھر کیوں لے آئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اسی شام جلالی یہ لکڑی کا صندوق کہیں سے نکال کر لائے تھے...... ہاں، ایک بات اور یاد آئی......'' بولتے بولتے بابا طفیل ایک دم چونک سا گیا۔

وہ بولا۔ ''مجھے یاد آرہا ہے کہ اسی رات گیارہ بارہ کے قریب مجھے فرش پر کچھ گھسیٹے جانے کی آواز بھی آئی تھی۔ ہاں، گیارہ بارہ کا ٹائم ہی ہوگا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ جلالی جی اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا بھی لیکن کچھ کہا نہیں پھر دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت انہوں نے یہ صندوق ہی گھسیٹا ہو۔''

میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے ذریعے صندوق کو احتیاط سے پلٹ کر دیکھا۔ کافی حد تک بابے طفیل کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ صندوق نما باکس کی نچلی سطح پر گھسیٹے جانے کے نشان موجود تھے۔ خشک لکڑی کا یہ باکس زیادہ وزنی نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن سات آٹھ کلو سے زیادہ نہیں تھا اور اگر آرا کوئے کا وزن دس کلو بھی تھا تو پھر ٹوٹل وزن 18 کلو کے قریب بنتا تھا...... بے شک جلالی صاحب بیماریوں کے نرغے میں آکر بہت کمزور ہو چکے تھے پھر بھی ان میں بلا کی مزاحمت تھی۔ جب ان کی حالت بہتر ہوتی تھی تو وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر توانا دکھائی دیتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس شام انہوں نے اکیلے ہی اس باکس کو زمین سے نکالا ہو اور جیپ پر رکھ کر یہاں لے آئے ہوں۔

میں نے کہا۔ ''بابا! یہ بات تو اب تقریباً صاف ہے کہ یہ وہی باکس ہے جس کے لئے یہ ساری کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جلالی صاحب اسے اس کی محفوظ جگہ

سے نکال کر یہاں کیوں لے آئے؟''

''میں تو ایک مسکین نوکر ہوں اس گھر کا۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے بابا طفیل! تم اتنے بھی بے خبر نہیں ہو۔ جلالی صاحب بہت بھروسا کرتے تھے تم پر۔''

میرے لہجے نے بابے طفیل کو ذرا چونکایا لیکن اس نے اس بارے میں کچھ کہا نہیں۔ میں بابے طفیل کو جلالی صاحب اور مہناز کی خفیہ شادی کے حوالے سے کرید سکتا تھا لیکن ابھی یہ موضوع چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اپنی توجہ موجودہ صورت حال پر ہی مرکوز رکھی۔ میں نے کہا۔ ''بابا! میرا خیال ہے کہ تم جلالی صاحب کے مزاج کو جتنا سمجھتے ہو شاید ہی کوئی اور سمجھتا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جلالی صاحب نے یہ باکس ڈاکٹر مہناز کے سپرد کرنے کے لئے ہی اس کی خفیہ جگہ سے نکالا ہو اور یہاں پہنچایا ہو؟''

''لیکن پتر جی! اگر ایسی بات ہوتی تو پھر تالے کیوں توڑے جاتے اور چیزیں کیوں اٹھائی جاتیں؟ وہ بڑی غلط زنانی نکلی ہے۔ وہ ہر وقت جلالی کے قریب رہ کر ہر اونچ نیچ کی خبر رکھتی رہی ہے۔ اسے ٹوہ لگ چکی ہوگی کہ جلالی جی صندوق کہیں سے نکال کر کوٹھی میں لے آئے ہیں۔ اس نے موقع دیکھا۔ اپنے ساتھی کو بلایا اور مورتی لے اڑی۔ اس کے لئے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ ہوسکتا ہے کہ...... اس نے خود ہی جلالی جی کو بے ہوشی کا ٹیکا شیکا لگا دیا ہو۔''

میں نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ باکس کا ایک کونا ٹوٹا ہوا تھا جیسے اسے کہیں سے پھینکا گیا ہو۔ یہ ٹوٹا کونا یقیناً اس واقعے کی نشانی تھا جب اس باکس کو کسی نامعلوم شخص نے چلتی گاڑی میں سے جھاڑیوں میں پھینکا تھا اور یہ جلالی صاحب تک پہنچا تھا۔ باکس پھینکنے والا ابرار صدیقی ہی تھا یا کوئی اور...... یہ بات بھی ابھی تک ایک معما تھی۔ ابرار صدیقی کے بارے میں ابھی تک کوئی اچھی بری خبر ہم تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں میرے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر دیکھا، عمران کا نمبر تھا۔ دل دھڑک اٹھا۔ جلالی صاحب کی طرف سے کوئی بری خبر آسکتی تھی۔ خبر آئی لیکن وہ اچھی نہ بری۔ جلالی صاحب کی حالت نازک تھی۔ وہ اسپتال پہنچ چکے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ کومے میں جا چکے ہیں۔ یعنی ابھی وہ سانس لے رہے تھے۔ زندوں میں شامل تھے۔

ڈاکٹر مہناز کے بارے میں میری سوچ ہمیشہ مثبت رہی تھی۔ وہ جس جانفشانی سے ہمہ وقت جلالی صاحب کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی، وہ متاثر کن بات تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے مریض کے علاج میں آخری حد سے بھی آگے چلی گئی ہے۔ یہ ایک انوکھی مثال تھی۔ اس نے اپنے اور جلالی صاحب کے درمیان ہر فاصلہ مٹا دیا تھا۔ اس فاصلے کو مٹانے کے لئے وہ مذہبی اور معاشرتی تقاضا بھی پورا کر دیا تھا جسے ہم شادی کہتے ہیں۔ لیکن...... اس سب کے باوجود جو کچھ اب سامنے آ رہا تھا، وہ بھی تحیر انگیز تھا۔ مکمل تحقیق تو ظاہر ہے کہ پولیس کو...... ہی کرنا تھی لیکن جو شواہد یہاں موقع پر نظر آ رہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے یا انہیں بے ہوش کرنے کے بعد ڈاکٹر مہناز اور اس کے ساتھی نے دونوں کمروں کی تلاشی لی۔ تالے توڑے اور بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ نایاب مجسمہ آرا کوئے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

انسان ایک پہیلی ہے اور دلوں کے راز اللہ...... ہی جانتا ہے۔ چند دن پہلے تک ہم فتح محمد کو اس کوٹھی کی کالی بھیڑ سمجھتے تھے اور سیکرٹری ندیم کو نمک حلال ملازم...... لیکن جو حقیقت سامنے آئی، وہ برعکس تھی۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہم نے ''شریف صورت'' ندیم کا جو روپ دیکھا، وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اب یہاں ڈاکٹر مہناز کے بارے میں ایک مختلف صورتِ حال سامنے آ رہی تھی۔ میں نے اب تک کئی بار اس کے سیل فون پر رابطے کی کوشش کی تھی مگر فون بند تھا۔

اسی دوران میں ایس پی تیمور اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ پھر آن موجود ہوتا۔ وہ موقع پر موجود ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور سوالات کر رہا تھا۔ پولیس فوٹو گرافر اور فنگر پرنٹس اٹھانے والے اہلکار بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ہم سب کو باہر نکال دیا اور تیزی سے کام میں مصروف ہو گیا۔

اسی دوران میں عمران کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔ جلالی صاحب کے لئے ہم جو کر سکتے تھے، کر چکے ہیں۔ اب تمہاری ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم ڈاکٹر مہناز کی والدہ کو شکل سے پہچانتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔ لیکن کیا معاملہ ہے؟''

''مہناز غائب ہو چکی ہے۔ اس کا واحد کھوج اس کی والدہ ہے۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ مہناز یہاں سے غائب ہوئی ہے تو آرا کوئے سمیت خراماں خراماں اپنی اماں جان کے پاس پہنچ جائے گی؟''

''تم ابھی کچے جاسوس ہو۔ تمہارے عقل کے دانت ابھی نکلنے ہیں۔ مہناز اپنی اماں جی کے پاس تو نہیں جائے گی لیکن وہ جلد یا بدیر ان سے رابطہ ضرور فرمائے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی والدہ خطرے میں ہے۔ ہمیں اسے اس جگہ سے ہٹانا ہوگا جہاں وہ موجود ہے۔''

''تو کیا میرا ابھی آنا ضروری ہے؟''

''نہیں، اگلی جمعرات تک آ جانا۔ یار! تم بندے ہو کہ چغد۔ یہ سوچنے کا نہیں، کچھ کرنے کا وقت ہے۔ نپولین بونا پارٹ میرے دادا جی کا یار بیلی تھا۔ دونوں نے اکٹھے ہی جڑانوالہ سے میٹرک پاس کیا تھا۔ دادا جی نپولین کو پیار سے نوپی نوپی کہتے تھے۔ دادا جی نے مجھے بتایا تھا کہ نوپی نے اپنے دشمنوں پر ہمیشہ اس لئے فتح پائی کہ وہ ان کی توقع سے پہلے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ تو میرے پیارے شہزادے! مال گاڑی مت بنو، ایکسپریس بنو۔ شٹاشٹ...... شٹاشٹ...... جتنی جلدی ہو سکتا ہے، مینار پاکستان کے سامنے پہنچ جاؤ، راوی روڈ والے گیٹ پر۔''

میرے اور عمران کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں روانہ ہو گیا۔

ایس پی تیمور نے سارے دروازے بند کروا رکھے تھے لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ یہاں میری اور عمران کی ایک خاص اتھارٹی ہے۔ اس نے مجھے نہ صرف جانے کی اجازت دی بلکہ ایک اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ میرے ساتھ جائے اور پولیس موبائل میں مجھے مطلوبہ جگہ تک پہنچائے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے۔ یہاں میڈیا والوں کا ہجوم تھا۔ ان کی رنگ برنگی اسٹیشن ویگنز نظر آ رہی تھیں۔ یہ رات کا آخری پہر تھا مگر ٹیوب لائٹس اور سرچ لائٹس کی وجہ سے گیٹ کے آس پاس دن کا سماں تھا۔ ہماری گاڑی دیکھ کر کچھ رپورٹرز ہماری طرف لپکے لیکن اے ایس آئی گل احمد تیزی سے آگے نکل گیا۔ وہ اپنے نام ہی کی طرح ذرا کھلا کھلا اور خوش باش شخص تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی عام پولیس والوں سے قدرے مختلف نظر آتا تھا۔

وہ بولا۔ ''تابش صاحب! آپ کے دوست عمران صاحب کا تو بڑا چرچا ہو گیا ہے جی۔ ہر اخبار میں خبر آئی ہے اور ٹی وی پر بھی بتایا گیا ہے کہ انہوں نے جاوا جیسے انڈین بدمعاش کو للکارا ہے اور اسے سرحد پار جانے پر مجبور کر دیا ہے......'' پھر وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ ''کیا

واقعی جاوا انڈیا واپس چلا گیا ہے یا یہیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہے؟“

میں نے کہا۔”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ لوگ یہ سوال عمران سے کرو تو شاید کوئی جواب مل جائے۔“

میں خاموشی سے سفر کرنا چاہ رہا تھا لیکن گل احمد باتونی شخص تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتا تھا۔ مثلاً جلالی صاحب کا انتقال ہو گیا تو آگے کیا ہوگا؟ کیا ڈاکٹر مہناز واقعی خود یہاں سے گئی ہے، کہیں اسے کسی نے اغوا تو نہیں کیا؟ آرا کوئے کا مجسمہ واقعی غائب ہے یا کوٹھی کے اندر ہی کہیں چھپایا گیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس کے ان سوالوں کے مختصر ترین جواب دیئے۔ اس حوصلہ شکنی کے باوجود وہ گاہے بگاہے بات چھیڑتا رہا۔ پانچ دس منٹ چپ رہنے کے بعد وہ اچانک بولا۔”تابش بھائی! یہ جو عمران صاحب نے بتایا تھا کہ جاوا نے کچھ عرصہ پہلے انڈین اداکارہ مادھوری سے ہرول بھرشاٹ کیا تھا...... تو کیا واقعی کوئی اس قسم کا کام ہوا تھا؟“

”تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بس ایسے ہی دماغ میں سوال آ رہا ہے۔ ویسے یہ ہے تو زیادتی نا کہ ایک لڑکی جو کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کے پاس کام مانگنے آتی ہے، اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔“

”کیا کیا جائے؟“

”یہی ہرول بھرشاٹ وغیرہ۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہرول بھرشاٹ کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ وہ یونہی چھوڑی تھی عمران صاحب نے۔ ان کی یہ عادت ہے۔“

”واقعی؟“ گل احمد نے دیدے گھمائے۔

”میں عدالت میں جا کر حلفیہ بیان دینے کو تیار ہوں۔“ میں نے بیزار ہو کر کہا۔

”حیرت ہے۔ وہاں گیٹ پر تو ایک اخباری نمائندہ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے اور اس کا مطلب بڑا غلط قسم کا ہے...... چلو شکر ہے، آپ نے میرا ذہن صاف کر دیا۔ ورنہ بڑے گندے گندے خیال آ رہے تھے۔“ اس نے بظاہر سکون کی سانس لی۔ لیکن لگتا تھا کہ دل ہی دل میں وہ جاوا کی طرف سے خاصا ”مایوس“ ہوا ہے۔

......آدھ گھنٹے بعد جب اے ایس آئی گل احمد نے مجھے مینار پاکستان کے مطلوبہ گیٹ پر اتارا تو رات کے ساڑھے تین چار کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس بھی جیسے اونگھ رہی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق مجھے اتارنے کے بعد بھی گل احمد وہیں کھڑا رہا۔

ایک طرف سے عمران برآمد ہوا۔ بالکل ایسے لگا کہ زمین سے نکل آیا ہے۔”یہ ساتھ کس کو لائے ہو؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”ایک اے ایس آئی ہے۔ گل احمد نام ہے۔“

”چلو اچھی بات ہے۔ ہم ابھی اسے اپنے ساتھ رکھیں گے بلکہ اسی کی گاڑی پر جائیں گے۔ ذرا آسانی رہے گی۔ میں اپنی والی گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“

کچھ ہی دیر بعد ہم اے ایس آئی گل احمد کے ساتھ تیز رفتاری سے لوئر مال روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم ایک رہائشی آبادی میں داخل ہوئے پھر ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے جا کر رک گئے۔ یہ صاف ستھرا اسپتال ایک بڑی کوٹھی کے اندر واقع تھا۔ ہم نے گل احمد کو گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور خود اس اسپتال نما کلینک میں داخل ہو گئے۔ رات کے اس پہر اسپتال کے اندر باہر خاموشی تھی۔ یہاں دس پندرہ کمرے اور تین درمیانے سائز کے وارڈز تھے۔ زیادہ تر مریض سو رہے تھے۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی مریض کے اٹینڈنٹ ہیں۔ عمران کے ہاتھ میں دواؤں والا ایک چھوٹا سا شاپر بھی تھا۔ کسی نے ہم سے روک ٹوک نہیں کی۔ ایک وارڈ کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ یہ فیمیل وارڈ تھا۔ دروازے کے شیشے میں سے دس بارہ مریض خواتین نظر آ رہی تھیں۔ اِکا دُکا تیماردار بھی تھے۔ وارڈ کے اندر ایک نرس کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی غالباً سسپنس ڈائجسٹ کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کی۔”مہناز کی والدہ کو پہچان سکتے ہو؟“

میں نے دھیان سے دیکھا۔”ہاں...... دائیں طرف پانچواں بیڈ ہے۔“

”آر یو شیور؟“

”یس۔“

ہم اندر داخل ہوئے اور سیدھے مطلوبہ بیڈ پر پہنچے۔ وارڈ کی مدھم روشنی میں خاتون نیم دراز تھیں اور ہولے ہولے کھانس رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونکیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد عمران سرگوشی کے انداز میں بولا۔”آنٹی! ہم جلالی فارم ہاؤس سے آئے ہیں۔ آپ کو ایک خاص اطلاع دینی ہے۔“

خاتون کا چہرہ ہلدی ہو گیا۔”مم...... مہناز تو خیریت سے ہے نا؟“

”وہ خیریت سے ہے لیکن اطلاع اسی کے بارے میں ہے۔“

خاتون نے گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ والے بستر کی خاتون بھی ہماری طرف دیکھنے لگی۔

عمران نے مہناز کی والدہ سے کہا۔ ''اگر آپ کو چلنے میں زیادہ دشواری نہ ہو تو سامنے لابی میں آجائیے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

مہناز کی والدہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کوشش کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عمران بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بے چینی تھی۔ ہم مہناز کی والدہ کو سہارا دے کر لابی تک لائے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عمران نے اپنے مخصوص ہمدرد انداز میں کہا۔ ''آنٹی! وہاں فارم میں پھر گڑبڑ ہوئی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ ڈاکٹر مہناز خطرہ محسوس کر کے کہیں نکل گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی طرف سے آپ کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ......''

ابھی عمران کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دو گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے آئیں اور اس پرائیویٹ اسپتال کے عین سامنے آکر رکیں۔ پہیوں کے چرچرانے کی آواز دور تک گونجی۔ چند ہیولے برآمد ہوئے اور لپکتے ہوئے اسپتال کے دروازے کی طرف آئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مین دروازے تک پہنچتے، رات کا سناٹا فائرنگ کی خوفناک آواز سے چکنا چُور ہو گیا۔ میں نے ایک ہیولے کو گولی کھا کر اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ دوسرے آڑ لینے کے لئے مختلف اطراف میں بھاگے۔

یہی وقت تھا جب دو تین اور گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک اسٹیشن ویگن نے بڑے سنگین انداز میں ایک ٹویوٹا کار کو سائیڈ ماری اور ٹویوٹا کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک شوکیس سے جا ٹکرائی۔ عمران چلایا۔ ''آنٹی! ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

آنٹی ہکا بکا تھیں۔ وہ جیسے یکسر مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہم نے انہیں اٹھایا اور اپنے ہاتھوں کی کرسی پر بٹھا لیا۔ اسپتال میں افراتفری مچ گئی تھی۔ جن مریضوں کے لئے ہلنا جلنا بھی محال تھا، وہ جان بچانے کے لئے بستروں سے اتر آئے تھے۔ ہم دونوں آنٹی کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ میری ٹانگ ایک بار پھر درد سے سنسنانے لگی۔

ایک ڈیوٹی ڈاکٹر ہمارے راستے میں آئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو انہیں؟''

عمران نے دھکا دے کر ڈاکٹر کو ایک طرف گرایا۔ ہم آنٹی سمیت سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے۔ بلندی سے اردگرد کا منظر زیادہ وضاحت سے ہمارے سامنے آیا۔ یہ لرزہ خیز تھا۔ اسپتال کے اردگرد کم از کم ایک درجن مشکوک گاڑیاں آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔ اسپتال کے عین سامنے اور بائیں جانب اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ شیشے چھناکوں سے ٹوٹ

رہے تھے۔ ٹائر برسٹ ہو رہے تھے۔ لوگ چلا رہے تھے اور اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اور کانپ گیا۔ پولیس موبائل میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس کے قریب ہی اے ایس آئی گل احمد سڑک پر اوندھے منہ بے سُدھ پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ ریان اور جاوا گروپ کے لوگوں کو باہمی عداوت نے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا ہے اور وہ ہر جگہ وحشی جانوروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ تصادم کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے چار فٹ اونچی منڈیر پھاندی اور ساتھ والی چھت پر آگیا۔ آنٹی سکتہ زدہ تھیں۔ ان کا وزن بہت زیادہ نہیں تھا۔ عمران نے انہیں بازوؤں میں اٹھایا اور منڈیر کے اوپر سے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے آنٹی کو گود میں اٹھایا۔ عمران بھی منڈیر پھاند کر دوسری چھت پر آگیا۔ یہ بھی کسی کمرشل بلڈنگ کی چھت تھی۔ برساتی کی طرف بس ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس بلڈنگ کی چھت ایک تیسری بلڈنگ سے ملی ہوئی تھی۔ ہم بہ آسانی اس تیسری چھت پر پہنچ گئے۔ یہ تیسری عمارت ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ غالباً تازہ لینٹر ڈالا گیا تھا۔ لینٹر پر تھوڑا بہت پانی کھڑا تھا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ مکمل تاریکی تھی۔ یہاں ہر طرف اینٹیں اور ریت وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔

اسپتال کے اردگرد ہونے والی فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ پسٹل، ماؤزر اور آٹومیٹک رائفلیں استعمال ہو رہی تھیں۔ گاہے بگاہے ایک ''ری پیٹر'' کی زوردار آواز بھی ابھرتی تھی۔ اسی دوران میں ہم نے پولیس موبائلز کے سائرن بھی سنے۔ پولیس موقع پر پہنچ رہی تھی۔ مجھے اے ایس آئی گل احمد کا خیال آیا۔ اسپتال کی ایک کھڑکی میں سے ہم نے اسے سڑک پر بے سُدھ پڑے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ''کام'' آگیا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صرف زخمی ہو اور اسے طبّی امداد کی ضرورت ہو۔ اب پولیس کے آجانے سے کم از کم اسے تو طبّی امداد مل ہی سکتی تھی۔

ہمیں زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے ہی ایک سوزوکی ڈبا کھڑا نظر آیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ڈرائیور غالباً اندھا دھند فائرنگ دیکھ کر یہاں گلی کے موڑ پر ہی رک گیا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''ڈبے کی طرف چلو۔''

ہم ڈبے کی طرف بڑھے۔ عمران اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عقبی دروازہ بھی کھول دیا۔ میں آنٹی سمیت پچھلی نشست پر چلا گیا۔ ڈرائیور ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں کھلی رہ

گئیں۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا،عمران نے کہا۔''بڑے بھائی!ہم ایمرجنسی میں ہیں۔ آنٹی جی کو اسپتال لے جانا ہے۔تم گاڑی ریورس کرو اور بائیں طرف موڑ لو۔''

ڈرائیور یقیناً پہلے ہی اندھا دھند فائرنگ کی وجہ سے خوف زدہ تھا،مزید ڈر گیا۔اس نے کچھ کہنا چاہا مگر عمران کی تیز آواز نے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔عمران بولا۔''گاڑی آگے بڑھاؤ۔ورنہ مسئلہ ہو جائے گا تمہارے لئے۔''

ڈرائیور نے ڈری ہوئی نظروں سے نیچے دیکھا۔یقیناً اسے عمران کے ہاتھوں میں پستول نظر آیا تھا۔ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر جب عمران نے اسے بازو سے پکڑا تو ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق اس نے گاڑی ریورس کی اور بائیں طرف موڑ لی۔

میں نے سکتہ زدہ آنٹی کو نشست پر بٹھا دیا تھا۔وہ سرتاپا لرز رہی تھیں۔عمران نے کہا۔

''آنٹی!میں نے ٹھیک کہا تھا نا کہ آپ کو خطرہ ہے۔یہ اسپتال سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے،آپ کے لئے ہو رہا ہے۔''

''مم......میرے لئے؟لیکن میں نے کیا کیا ہے؟''

''آپ نے کچھ نہیں کیا مگر جو لوگ مہناز کو ڈھونڈ رہے ہیں،وہ آپ کو بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''مم......مہناز ٹھیک تو ہے نا؟''آنٹی نے پھر لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ہو سکتا ہے کہ ہم جلد اس سے آپ کی ملاقات بھی کرا دیں۔''عمران نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ آخری الفاظ اس نے صرف تسلی دینے کے لئے کہے ہیں......مہناز کہاں ہے؟اس کے بارے میں ابھی ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا۔

آنٹی موقع محل کی پروا کئے بغیر جلالی کو کوسنے دینے لگیں۔''اس بڈھے نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے اور کام دیکھو۔اللہ کرے اس کی اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔اللہ کرے اس کا بھی ایسے یہ تماشا لگے......''وہ باقاعدہ رونے لگیں پھر روتے روتے ہی پوچھا۔''اب مجھے کہاں لے جا رہے ہو بیٹا؟''

عمران نے آنٹی کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی ایک طرف روک لے۔اس نے فوراً عمران کی ہدایت پر عمل کیا۔اسے صرف اور صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔اب ہم نہر کے کنارے شاہ جمال والے موڑ کے پاس تھے۔سڑک پر ٹریفک نہ

ہونے کے برابر تھا۔کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔عمران نے تحکم آمیز لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔''بڑے بھائی!نیچے اتر جاؤ۔اگر پولیس وغیرہ کے چکر میں پڑے تو سخت مصیبت میں پھنسو گے۔اگر خاموش رہے تو گاڑی تمہیں شہر میں ہی کہیں کھڑی مل جائے گی۔ اپنا موبائل نمبر دو مجھے۔''

ڈرائیور نے ہکلاتے ہوئے عمران کو اپنا فون نمبر بتایا جسے عمران نے کاغذ پر لکھ لیا۔اس کے بعد ڈرائیور گاڑی سے اترا اور دور کھڑا ہو گیا۔عمران نے ڈرائیونگ نشست سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''کہاں جانا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''اس وقت سب سے پہلا کام تو آنٹی جی کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا ہے۔''عمران نے کہا اور گاڑی پل کے پاس سے اندرونی سڑک پر موڑ لی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈیفنس والے گھر کی طرف جا رہا ہے۔شاید فی الوقت یہی قریب ترین ٹھکانا اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

قریباً دس منٹ کی برق رفتار ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں تھے۔یہ وہی جگہ تھی جہاں فرح اور عاطف بڑی حفاظت کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔عمران کی ساتھی شاہین اور ننھا بالو بھی اپنی آپا صفیہ سمیت یہاں موجود تھا۔جیلانی کے سوا سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔جیلانی کو بھی ہماری اچانک آمد نے حیران کر دیا۔ہمارے ساتھ دہشت زدہ آنٹی کو دیکھ کر وہ مزید حیران ہوا۔ہم نے سب سے پہلے آنٹی کو ائیرکنڈیشنڈ کمرے میں پہنچایا اور ان کا بلڈ پریشر کم کرنے کے لئے انہیں ڈسپرین وغیرہ کھلائی۔میرے اور عمران کے ہمدردانہ رویے نے آنٹی کا خوف کافی کم کر دیا اور انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ یہاں محفوظ ہیں۔

عمران نے اس کوٹھی تک پہنچتے ہوئے گاڑی کو کافی گھمایا پھرایا تھا۔اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ آنٹی کو یہاں کے محل وقوع کا اندازہ ہوا ہو گا۔عمران نے جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ سوزوکی ڈبے کی نمبر پلیٹ بدلے اور اسے ڈیفنس سے باہر نہر کنارے کسی جگہ کھڑا کر کے آئے۔جیلانی اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔عمران نے ڈسپرین کے ساتھ ہی ایک سکون بخش دوا بھی آنٹی کے معدے میں پہنچا دی تھی۔وہ جلد ہی اپنے سوالات ترک کر کے اونگھنے لگیں۔

ہم کامن روم میں آ بیٹھے۔اب دن کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔میں نے کہا۔

"تمہارا یہ اندازہ بالکل درست نکلا کہ ریان اور جاوا گروپ کے لوگ اب ایک دم مہناز کی والدہ کی طرف جھپٹیں گے۔"

وہ ادا سے مسکرایا۔"میرے اندازے ہمیشہ درست ثابت ہوتے ہیں۔اسی لئے تو فساد پلس چینل دن رات ترقی کر رہا ہے...... اب تم بتا سکتے ہو کہ کل کیا ہوگا؟ لیکن میں بتا سکتا ہوں۔"

"کیا ہوگا؟"

"آج سوموار ہے،کل یقیناً منگل ہوگا۔نہ ہوا تو میرا نام بدل دینا۔"

"یہ خبر تو نہ ہوئی۔" میں نے دلیل دی۔

"خبر ہوئی نا، کیوں نہ ہوئی۔تم نے بحث چھیڑ دی ہے نا۔اس کا انجام یہ ہوگا کہ تمہاری اس لمبی ناک پر مکا مار کر تمہارا بانسا کڑک کر دوں گا اور اپنا کوئی خراب کیمرا بھی خود ہی توڑ ڈالوں گا پھر چینل پر خبر چلے گی۔نیوز چینل کے اہل کاروں پر فرائض کی انجام دہی کے دوران میں بہیمانہ نہ نہ تشدد۔"

"بہیمانہ نہ نہ کیا ہوتا ہے؟"

"جب تشدد زیادہ برا ہو تو اس بہیمانہ نہ نہ کہتے ہیں۔کسی بھی لفظ یا وڈیو کلپ کو ری پیٹ کرنے سے اس کا امپیکٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔تم مجھے باتوں میں مت الجھاؤ۔ پوری خبر سنو...... بہیمانہ نہ نہ تشدد کیا۔کیمرا توڑ ڈالا...... بلکہ "توڑ ڈالا" بھی ذرا کمزور لفظ ہے...... چکنا چور کر ڈالا۔چینل کے ملازمین کو عبرت ناک انجام کی دھمکیاں دیں۔پتا چلا ہے کہ یہ تابش نامی شخص، ڈیفنس کی کوٹھی میں جوا کراتا ہے اور دو اشتہاری ملزموں کی پشت پناہی بھی کر رہا ہے۔یہ تابش دراصل اس سابق ناظم کا بھتیجا ہے جس کے بڑے چچا کا چھوٹا داماد، صوبائی حکومت کے اہم وزیر کے پھوپھا صاحب کا کاروباری پارٹنر ہے۔اس طرح سے یہ معاملہ صاف طور پر سیاسی اور حکومتی غنڈا گردی کا بنتا ہے۔روز افزوں مہنگائی، بیڈ گورننس اور ملکی سلامتی کی مخدوش صورتِ حال ہی کیا کم تھی کہ اب یہ کیمرا ٹوٹنے والا زبردست بحران بھی پیدا ہوگیا ہے۔لگتا ہے کہ کوئی عظیم تبدیلی آنے والی ہے۔دانشور پہلے ہی، دو سال سے کہہ رہے ہیں کہ آنے والے چند دن بہت زیادہ اہم ہیں اور اب تو دنوں کی نہیں گھڑیوں کی بات ہے۔ہوسکتا ہے کہ جب ہم بریک پر جائیں تو ہمارے واپس آنے تک ملک میں بہت کچھ بریک ہو چکا ہو اور اس تبدیلی کی وجہ سے پوری دنیا میں طاقت کا توازن خراب بلکہ چکنا چور...... بلکہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو۔اقوام متحدہ بیٹھی سر پکڑ کر رو رہی ہو اور نیٹو چلا چلا کر......"

"خدا کے لئے...... خدا کے لئے...... تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اس کے سامنے عاجزی سے ہاتھ جوڑے۔

وہ مسکرا کر چپ ہوگیا۔ایک دم میں چونک گیا۔مجھے آنٹی کے موبائل فون کا خیال آیا۔جب ہم آنٹی کو لینے اسپتال جا رہے تھے تو ہمارے ذہن میں تھا کہ ان کا موبائل فون ضرور ساتھ لانا ہے لیکن وہاں ایک دم ہی ہنگامہ شروع ہوگیا تھا۔ہمیں مہلت ہی نہیں ملی کہ ہم آنٹی کا شولڈر بیگ یا کوئی اور چیز ساتھ لے سکیں۔عمران نے میرے چہرے سے میرے خیالات کا اندازہ لگا لیا اور بولا۔"آنٹی کے موبائل فون کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون میرے سامنے رکھ دیا۔

"آنٹی کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے جاتے جاتے ساتھ ہی آنٹی کے تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا۔"

"ایک نمبر کے کھوچل ہو تم۔" میں نے کہا۔

"اور تم دو نمبر کے۔یعنی کھوچل بھی ہو اور دو نمبر بھی۔"

"مہناز کو ٹرائی مار کر دیکھو اس کے نمبر پر۔"

عمران نے نمبر پریس کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔تیسری چوتھی کوشش بھی ناکام ہوئی تو اس نے آنٹی کی طرف سے مہناز کو "کال می" کا میسج بھیجا۔

"تمہارا دماغ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میسج بھیجنا اور پڑھنا کوئی اچھا کام نہیں یار لوگوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہے اس میں۔"

"یار! میں مہناز کے بارے میں بکواس کر رہا ہوں۔بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے کے بعد اس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ مل کر الماریوں کے تالے توڑے ہیں اور آرا کوئے سمیت دوسری چیزیں لے کر نکل گئی ہے۔"

وہ خلاف توقع سنجیدہ ہوگیا۔سگریٹ کا کش لے کر بولا۔"لیکن پتا نہیں مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ ڈاکٹر مہناز فارم ہاؤس سے پہلے نکلی ہے، جلالی صاحب کی طبیعت بعد میں خراب ہوئی ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔"اگر ایسا ہے تو پھر الماریوں کے تالے

توڑے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جلالی صاحب بھی وہیں پر موجود تھے، ڈاکٹر مہناز ان سے چابیاں لے سکتی تھی۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ چابیاں کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں اور ان کی اجازت سے ہی مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر نے تالے توڑے ہوں۔''

''لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ ڈاکٹر مہناز پہلے نکلی ہے اور جلالی کی طبیعت بعد میں بگڑی ہے؟''

''جگر! میں نے کہا ہے نا کہ یہ میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر جلالی صاحب، مہناز کے جانے سے پہلے بے ہوش ہوئے ہیں تو بھی ہم یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مہناز نے ان سے دغا ہی کیا ہے۔ تالے توڑنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جلالی صاحب نے مہناز کو ہدایت کی ہو کہ وہ آرا کوئے لے کر یہاں سے نکل جائے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مہناز کو چابیاں وغیرہ سونپتے، وہ اچانک بے ہوش ہو گئے۔ افراتفری میں مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر نے قفل شکنی کی اور جلالی صاحب کی ہدایت کے مطابق چیزیں نکال کر لے گئے۔''

''یعنی تم دونوں صورتوں میں ڈاکٹر مہناز کو رعایتی نمبر ہی دینا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں۔ ہمیں ہر پہلو پر غور کرنا چاہئے۔'' عمران نے کہا۔ ''اور بہتر تو یہی ہے جگر کہ ہم ایک بار پھر موقعہ واردات کا جائزہ لیں۔''

''لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ کچھ لوگ ہمارا جائزہ بھی لے رہے ہیں اور انہوں نے باقاعدہ قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک تمہیں لمبا نہیں لٹا دیں گے، چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ کیا نام لے رہا تھا خبیث ندیم..... بھرت وچن، بھرت وچن رکھا ہوا ہے مہاشے جا وانے۔''

''اس کا انتظام بھی کر لیتے ہیں۔ آخر سرکس کمپنی میں کام کیا ہے یار! کوئی بھشیارے تو نہیں ہیں ہم۔'' عمران نے کہا۔

اسی دوران میں، میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ صبح کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پہلی خبر ہی چونکا دینے والی تھی۔ یہ کچھ دیر پہلے لوئر مال روڈ کے علاقے میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی خبر تھی۔ پرائیویٹ اسپتال کے سامنے ہونے والی اس فائرنگ میں تین افراد موقع پر جاں بحق ہوئے تھے۔ کئی افراد زخمی تھے۔ پولیس کی گاڑی کو آگ لگنے کی خبر بھی نیوز میں موجود تھی۔ اے ایس آئی گل احمد کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ پیٹ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا ہے۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ''ہمارے نمائندے نے اطلاع دی ہے کہ ہنگامہ شروع ہونے

سے تھوڑی دیر پہلے دو افراد تیمارداروں کی حیثیت سے ارباب کلینک میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک مریضہ کو اس کے بستر سے اٹھا کر لابی میں پہنچایا۔ اسی دوران میں کلینک کے سامنے اور اطراف میں کئی گاڑیاں آکر رکیں اور ان میں موجود مسلح افراد نے ایک دوسرے پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ جب یہ خوفناک ہنگامہ برپا تھا، دونوں افراد مسز جمیلہ نامی اس خاتون کو لے کر اسپتال کی چھت پر پہنچے اور وہاں سے کہیں نکل گئے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جمیلہ نامی یہ خاتون ایک لیڈی ڈاکٹر کی والدہ ہیں اور صرف تین دن پہلے کلینک میں داخل ہوئی تھیں...... ہمارے نمائندے نوید شیروانی اس وقت موقع پر موجود ہیں۔ ہم ان سے ارباب کلینک کی تازہ ترین صورت حال معلوم کرتے ہیں۔''

نوید نے پُرجوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''جیسا کہ آپ میرے عقب میں دیکھ رہے ہیں، جگہ جگہ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور نظر آتے ہیں۔ یہ میری بائیں طرف جو گاڑیاں کھڑی ہیں ان پر بھی جابجا گولیوں کے نشانات ہیں۔ اور یہ دیکھئے ناظرین! یہ دیکھئے یہ وہ جگہ ہے جہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے۔ کم از کم دو لاشیں اور پانچ زخمی افراد اسی جگہ سے اٹھائے گئے ہیں۔ یہاں آپ کو ہر طرف گولیوں کے نشانات نظر آ رہے ہیں اور خول بھی بکھرے ہوئے ہیں ابھی تک...... اب میں آپ کو اس اسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر ظفر چوہدری سے ملواتا ہوں اور اس واقعے کے حوالے سے ان کی رائے معلوم کرتے ہیں۔''

ایم ایس چوہدری صاحب غالباً منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ابھی ابھی اسپتال پہنچے تھے اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''محترمہ جمیلہ نامی وہ مریضہ جو اسپتال کے وارڈ سے غائب پائی گئی ہیں، تین دن پہلے ہائی بلڈ پریشر اور ہائی شوگر لیول کی شکایات کے ساتھ یہاں داخل ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ محترمہ جمیلہ، لیڈی ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔ یہ لیڈی ڈاکٹر مہناز وہی ہیں جن کا ذکر جلالی فارم ہاؤس والے واقعات کے سلسلے میں آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں مکمل تحقیق کرنا تو پولیس کا کام ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسپتال کے باہر جو خونی تصادم ہوا ہے، وہ ان دو گروپوں کے درمیان ہی ہوا ہے جو اس سے پہلے فارم ہاؤس کے باہر اور پھر لاہور شیخوپورہ روڈ کے قریب بھی ایک دوسرے پر حملہ کر چکے ہیں۔''

نیوز کاسٹر نے اسکرین پر نمودار ہو کر کہا۔ ''ہم نے اس سلسلے میں ایس ایس پی صاحب سے رابطہ کیا ہے۔ ان کی رائے معلوم کرتے ہیں۔''

باوردی پراچہ صاحب اسکرین پر نمودار ہوئے۔ تین چار لاشیں گر چکی تھیں۔ ایک

خاتون غائب تھی اور بہت سا مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ صورتِ حال کی سنجیدگی ٹوٹ کر پراچہ صاحب کے چہرے پر برس رہی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو وہی ''ملک گیر شہرت کا حامل'' گھسا پٹا فقرہ دہرایا کہ ہم پوری تن دہی سے کوشش کر رہے ہیں، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور مجرموں کو جلد قانون کے کٹہرے میں کھڑا کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی چھاپا مار پارٹیوں کی تفصیل بتانے لگے تھے جب نیوز کاسٹر نے پھرتی سے انہیں ٹوکا اور پوچھا۔ ''جناب! ان دو افراد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو سب سے پہلے اسپتال میں داخل ہوئے اور جنہوں نے لیڈی ڈاکٹر مہناز کی والدہ کو وہاں سے غائب کیا؟ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص بری طرح لنگڑا بھی رہا تھا؟''

پراچہ صاحب بولے۔ ''ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اسپتال کا عملہ جو حلیہ بتا رہا ہے، اس سے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی عمران نامی شخص ہے جو اس سے پہلے جاوا کے خاص کارندے قادرے کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے اور جلالی صاحب کا جاں نثار محافظ ہونے کا دعویٰ بھی کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی تابش ہو سکتا ہے لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ اس مرحلے میں یقین کے ساتھ......''

نیوز کاسٹر نے پیشہ ورانہ چابکدستی سے پولیس آفیسر کی بات کاٹی۔ ''پراچہ صاحب! خاتون کی گمشدگی کو اب چار گھنٹوں سے اوپر ہو چکے ہیں۔ شہر میں ہر طرف ناکے لگے ہیں، اس کے باوجود اس جرم کا راستہ روکا نہیں جا سکا۔ آپ کا کیا خیال ہے، مریضہ خاتون کے اغوا کا تعلق ڈاکٹر مہناز والے واقعے سے ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مریضہ خاتون کو اغوا کرنے والے لوگ ان کے ذریعے ان کی بیٹی ڈاکٹر مہناز تک پہنچنا چاہتا ہوں؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن......''

''اگر ایسا ہو بھی سکتا تھا اور خدشہ تھا کہ ایسا ہوگا کیونکہ مریضہ خاتون ڈاکٹر مہناز کی واحد قریبی عزیز ہیں، تو کیا ضروری نہیں تھا کہ حالات کو بھانپ کر خاتون کو حفاظت کا انتظام کیا جاتا؟''

اس سے پہلے کہ بوکھلایا ہوا پولیس آفیسر کوئی جواب دیتا، عمران نے ٹی وی کی آواز بند کی اور بولا۔ ''یار! کہیں یہ آنٹی جمیلہ اپنے کمرے میں ٹی وی کھول کر نہ بیٹھ جائیں...... انہیں پتا چل گیا کہ مہناز، فارم ہاؤس سے غائب ہے اور اس پر الزامات لگ رہے ہیں تو وہ ضرور خود کو ہارٹ اٹیک کروا بیٹھیں گی۔''

میں آنٹی جمیلہ والے کمرے میں گیا۔ عمران نے انہیں سکون بخش دوا دی تھی۔ وہ سو رہی

تھیں۔ میں بہ آہستگی ٹی وی ٹرالی دھکیل کر ان کے کمرے سے باہر لے آیا......

عمران گہری سوچ میں کھویا ہوا لگتا تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے سرکس کمپنی والی بات تم کیا کہہ رہے تھے؟ کیا کوئی ناٹک رچانے یا سوانگ بھرنے کا ارادہ ہے؟''

''وقت آیا تو سوانگ بھی بھر لیں گے لیکن فی الحال ہم جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ صاحب کے ساتھ پولیس گاڑی میں فارم ہاؤس تک جائیں گے اور اب تک ہونے والی تفتیش کے بارے میں جانیں گے۔''

عمران غالباً حمزہ صاحب سے پہلے ہی بات کر چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہم قریباً ایک گھنٹے بعد یہاں سے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچیں گے۔ وہاں سے ایک گاڑی جلالی فارم ہاؤس جا رہی ہے۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ یکے بعد دیگرے اس کوٹھی کے سارے مکین بیدار ہو گئے۔ میری من موہنی، بہن فرح، بھائی عاطف، ننھا بالو اور شاہین وغیرہ۔ فرح آبدیدہ ہو کر میرے گلے لگ گئی۔ میں آج کئی ہفتے بعد اسے اپنی صورت دکھا رہا تھا۔ وہ اور عاطف یہ بھی جانتے تھے کہ میں کچھ خطرناک کاموں میں الجھا ہوا ہوں بلکہ میں اور عمران دونوں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''بھائی جان! آپ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔''

میں نے اس کا سر چوما۔ ''میں نہیں بدلا۔ وقت بدل گیا ہے۔''

عاطف بھی میرے کندھے سے لگ گیا۔ میں نے اسے بھی اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ اسی دوران میں صفیہ بھی بالو کو اٹھائے نمودار ہو گئی۔ بالو کے سرخ و سپید رخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے اور مجھے ایک بھولے بسرے چہرے کی یاد دلا رہے تھے۔ بالو اسی گم گشتہ چہرے کی نشانی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور خوب چوما۔

وہ مجھے ذرا حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ایسے بٹر بٹر کیا دیکھتے ہو؟''

فرح نے کہا۔ ''آپ اس طرح ہفتوں کے بعد آئیں گے تو ہم بھی ایسے ہی دیکھنے لگیں گے۔'' صفیہ اور عاطف ہنسنے لگے۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے تیز آواز میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ

شاہین اور عمران تھے۔ عاطف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لو جی پھر چونچ لڑ گئی۔ ٹیلی فون پر بھی یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔''

عمران کی آواز سنائی دی۔ ''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ کب کر رہی ہو شادی؟''

وہ جل کر بولی۔ ''میں شادی کر نہیں رہی ہوں...... کر چکی ہوں۔''

''کس سے؟'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''ایک ایسے شخص سے جو تم سے زیادہ عقل مند اور تم سے کہیں زیادہ اسمارٹ ہے۔''

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''مجھ سے زیادہ اسمارٹ تو ٹام کروز ہی ہو سکتا ہے...... اور زیادہ عقل مند بل گیٹ کے سوا اور کون ہوگا۔''

''بس یہی سمجھ لو۔'' شاہین پھنکاری۔

''تو...... اس کا مطلب ہے کہ تم نے بیک وقت دو افراد سے شادی کی ہے؟'' عمران کی آواز میں حیرت تھی۔

اس نے غالباً کوئی شے اٹھا کر عمران کو ماری۔ ''یہ رواج تمہارے خاندان میں ہوگا، ہمارے میں نہیں۔''

''گویا...... تمہارا کوئی خاندان بھی ہے؟'' عمران نے مزید حیرت ظاہر کی۔

اٹھا پٹخ کی آوازیں آئیں۔ اس مرتبہ غالباً شاہین، عمران پر چڑھ دوڑی تھی۔ عمران کراہا۔

''دیکھو، اب تم ثابت کر رہی ہو کہ تم واقعی خاندان کے بغیر ہو۔''

کوئی برتن ٹوٹا۔ دھینگا مشتی کی دبی دبی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ مداخلت ضروری ہو گئی تھی۔ میں کھنکھارتا ہوا کمرے میں پہنچا تو عمران قالین پر چت پڑا تھا۔ شاہین اس پر سوار تھی۔ اس کا ایک گھٹنا عمران کی گردن پر تھا اور دائیں مٹھی میں عمران کے سر کے بال تھے۔

میرے قدموں کی آواز سن کر وہ دونوں ٹھٹک کر اُٹھ بیٹھے۔ شاہین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ عمران کھسیانے انداز میں بولا۔ ''میں اسے بتا رہا تھا کہ اگر عورت گھر میں اکیلی ہو اور کوئی غیر مرد تمہاری طرح اچانک کمرے میں گھس آئے تو کس طرح اپنا دفاع کرتے ہیں۔''

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ شاہین کے بجائے تمہیں سیلف ڈیفنس کی تربیت کی ضرورت ہے۔''

وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے بولا۔ ''ویسے یار! زور بڑا ہے اس میں۔ ایک دم ببر شیرنی ہے۔''

''تم نے اسے جان بوجھ کر اس طرح کا کر دیا ہے۔ ورنہ کافی معقول لڑکی ہے۔ ہمدرد اور محبت کرنے والی۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''کسی کو پتا تو نہیں چلا کیا ہوا ہے؟''

''نہیں نہیں...... بس اتنا معلوم ہوا کہ اس نے کوئی شے تمہارے سر پر مار کر توڑی ہے اور پھر تمہیں نیچے گرا کر بڑی عزت سے تمہاری شان میں دو تین قصیدے پڑھے ہیں۔''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''بس یار! میں تو ریما، نرگس اور اس شاہین کے درمیان یوں پس گیا ہوں جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گندم۔''

''ریما، نرگس اور شاہین...... یہ تو تین پاٹ ہو گئے نا۔''

''چھوڑو جگر! جب بندہ اس بری طرح پس رہا ہو تو پاٹوں کا حساب کسے یاد رہتا ہے۔'' وہ مغموم شکل بنا کر بولا۔

اسی دوران میں عاطف اور فرح وغیرہ بھی کھانستے ہوئے اندر آ گئے اور ہماری گفتگو یہاں ختم ہو گئی۔

O....❖....O

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

للکار
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
7
طاہر جاوید مغل

قریباً دو گھنٹے بعد ہم ایس پی حمزہ صاحب کے ساتھ ایک بار پھر جلالی صاحب کے فارم ہاؤس میں تھے۔ حمزہ صاحب پڑھے لکھے شخص تھے اور عام پولیس والوں سے قدرے مختلف نظر آتے تھے۔ اپنے سینئر دوست جلالی صاحب کی موجودہ حالت پر وہ بھی بہت افسردہ تھے۔ جلالی صاحب مسلسل کومے میں تھے۔ ان کی مجموعی جسمانی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

فارم ہاؤس میں اور کوٹھی کے اندر باہر اُداسی نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کے نجی چڑیا گھر کے جانور خاموش اور غمزدہ نظر آتے تھے۔ ایرانی بلی اور اس کے بچوں کی نگہداشت پر ڈاکٹر عدیل خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ بابے طفیل کو سخت بخار تھا اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں تو جلالی صاحب کی موجودگی میں سارے ملازم ان سے ڈرے سہمے رہتے تھے، مگر اب جلالی نہیں تھے تو سب کو افسردگی نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کر رہے تھے۔

ہم ایک بار پھر جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ ابھی تک کمرے کی بیشتر اشیاء اسی حالت میں تھیں جس میں ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ ایس پی حمزہ صاحب نے بتایا۔ ''فنگر پرنٹس کی رپورٹ آ گئی ہے۔ اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز کے سلسلے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ الماریوں کے ٹوٹے ہوئے تالوں اور دیگر اشیاء پر ڈاکٹر مہناز کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جانے سے پہلے ڈاکٹر مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام نے افراتفری میں تالے توڑے ہیں اور باکس میں سے بدھا کی مورتی نکالی ہے۔''

اچانک عمران کو کچھ یاد آیا۔ اس نے کہا۔ ''سر! وہ ٹوٹا ہوا ٹائم پیس کہاں ہے جو یہاں رکھا تھا؟''

"میرے پاس ہے۔" حمزہ صاحب نے کہا اور جیب سے چابی نکال کر ایک الماری کھولی۔ اس میں کچھ دیگر اشیاء کے علاوہ وہ ٹائم پیس بھی رکھا تھا۔ ٹائم پیس کی سوئیاں ایک بج کر تیس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ یہ بات اب تک وضاحت سے سامنے آ چکی تھی کہ بے ہوش ہونے سے چند سیکنڈ قبل جلالی صاحب نے اپنا ہاتھ دواؤں تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا یہ ٹائم پیس گرا۔ ایک طرح سے یہ ٹائم پیس جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے کا وقت بتا رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ "جناب! جہاں تک مجھے یاد پڑ رہا ہے، گیٹ پر آمد و رفت کے رجسٹر میں مہناز اور اس کے ساتھی کی روانگی کا وقت ایک بج کر پانچ منٹ لکھا ہوا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر مہناز جلالی صاحب کی بے ہوشی سے بیس پچیس منٹ پہلے یہاں سے نکل چکی تھی۔"

حمزہ صاحب نے غالباً ابھی تک رجسٹر کو غور سے نہیں دیکھا تھا یا شاید دیگر مصروفیات میں انہوں نے ٹائم پیس اور رجسٹر میں اندراج کے وقت کا موازنہ نہیں کیا تھا۔

انہوں نے ایک اے ایس آئی کو کہا اور وہ فوراً انچارج گارڈ کو رجسٹر سمیت لے آیا۔ عمران کا تجزیہ تقریباً درست ثابت ہوا۔ رجسٹر میں روانگی کا اندراج ایک بج کر پانچ منٹ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مہناز اور ڈاکٹر رسام جب یہاں سے نکلے تو جلالی صاحب اپنے ہوش و حواس میں تھے۔ اگر جلالی صاحب کی موجودگی میں ان کی مرضی کے خلاف الماریوں اور باکس کے تالے توڑے جاتے تو وہ یقیناً آواز دے کر دوسرے ملازمین کو بلا سکتے تھے۔

اس سے بہ آسانی یہ معنی اخذ کیے جا سکتے تھے کہ ڈاکٹر مہناز اور رسام اگر فاسٹنگ بدھا کی مورتی یہاں سے لے کر گئے ہیں تو جلالی صاحب کی مرضی سے لے کر گئے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ کیا وہ جلالی صاحب کی ہدایت پر کسی خاص جگہ چھپے ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے موقع محل کے مطابق اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہے؟

ایس پی حمزہ صاحب نے گفتگو کے دوران میں بتایا۔ "پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ڈاکٹر رسام کا کھوج لگانے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رسام کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ اس کی فیملی کے سارے لوگ ابوظہبی میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر رسام یہاں اپنے ایک دوست رضا کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ رضا کا کہنا ہے کہ اسے پچھلے دو روز سے اس کا کچھ پتا نہیں۔ جاتے وقت اس نے بس اتنا کہا تھا کہ ایک ایمرجنسی ڈیوٹی پر شیخوپورہ جا رہا ہوں، کل دوپہر تک آ جاؤں گا۔"

عمران نے کہا۔ "فیصل آباد سے بھی پتا کرایا ہے آپ نے؟"

"ہاں، ایک ٹیم وہاں بھی گئی تھی۔ ڈاکٹر رسام کے ملنے جلنے والوں سے سوال جواب کیے ہیں۔ ڈاکٹر رسام آخری بار کوئی چھ ہفتے پہلے فیصل آباد گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا کسی کو پتا نہیں۔ واقعے کے بعد سے اب تک اس کے کسی یار دوست یا جاننے والے کو اس کا فون بھی نہیں آیا ہے۔"

عمران نے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے جناب! کہیں ڈاکٹر مہناز اور ڈاکٹر رسام میں کوئی پرانا تعلق تو نہیں تھا؟"

"نہیں بھئی، ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ایک شہادت بھی نہیں ملی۔ ہاں، یہ دونوں کچھ عرصہ پہلے تک سروسز اسپتال میں اکٹھے جاب ضرور کرتے رہے ہیں۔ غالباً اسی ناتے سے ڈاکٹر مہناز نے رسام کو یہاں مدد کے لئے بلایا ہوگا۔"

اسی دوران میں عمران کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ کال سنتا سنتا باہر چلا گیا۔ یقیناً کوئی اہم کال تھی۔ کچھ دیر بعد جب ہم Zoo کی طرف آئے تو عمران نے مجھے بتایا۔ "راجا نے کام دکھا دیا ہے۔"

"کیا کیا ہے؟"

"خبیث نے کسی بندے سے پھڈا کیا ہے۔ اسے کار سے ٹکر ماری ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل لے آیا ہے...... ہوٹل لالہ زار میں۔"

"بندہ کون ہے؟"

"میرے خیال میں جاوا ہی کا کوئی گرگا ہے۔ اتفاقاً اسے بازار میں نظر آ گیا تھا۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں فوراً ہوٹل پہنچنا ہوگا۔ کوئی اور گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

ہم نے سپرنٹنڈنٹ حمزہ صاحب سے اجازت لی اور لاہور کے لئے واپس روانہ ہوئے۔ حمزہ صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ جاوا سے ٹکر لینے کے بعد عمران کی جان کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے لہٰذا انہوں نے اصرار کر کے ہمیں پولیس کی گاڑی میں ہی واپس بھیجا۔

راستے میں عمران سے جو تھوڑی بہت گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ راجا اپنے دوست، ہوٹل کے مالک اشفاق رانا کی کار میں باہر نکلا تھا۔ "لاہور ہوٹل" کے نزدیک اس نے ایک بندے کو جاتے دیکھا۔ یہ جاوا کے ساتھیوں میں سے تھا اور انڈسٹریل ایریا والی کوٹھی میں راجا اسے دیکھ چکا تھا۔ راجا کی افلاطونی طبیعت میں ہلچل ہوئی۔ کچھ آگے جا کر اس نے اس شخص کو پیچھے سے کار کی زوردار ٹکر ماری۔ وہ شخص ایک کھمبے سے ٹکرایا اور زخمی ہو کر گر گیا۔ دیکھنے

والوں کو یہ سب کچھ ایک ایکسیڈنٹ کی طرح ہی لگا۔ راجا نے پھرتی سے زخمی کو اپنی کار میں ڈالا۔ ایک معزز راہ گیر بھی راجا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بظاہر یہ لوگ اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ آگے جا کر راجا نے گاڑی روک دی اور ساتھ بیٹھنے والے شخص کو منرل واٹر کی بوتل لانے کو کہا تھا کہ زخمی کو پانی پلانے کی کوشش کی جائے۔ وہ بوتل لینے کے لئے اترا تو راجا نے گاڑی بھگا دی اور چکر کاٹ کر سیدھا لالہ زار ہوٹل آ گیا۔ اب وہ زخمی نیم بے ہوشی کی حالت میں راجا کے کمرے میں تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں ہوٹل لالہ زار پہنچ گئے۔ ہماری ہدایت کے مطابق پولیس والے ہمیں ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ہی اتار کر واپس چلے گئے۔ ہم کمرے میں پہنچے۔ راجا کے علاوہ اشفاق رانا بھی کمرے میں ہی تھا۔ قالین پر ایک ترپال بچھا کر زخمی کو لٹایا گیا تھا۔ اس کی ایک پنڈلی پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور صاف طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی پیشانی بھی سفید پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ یہ پٹیاں راجا...... اور اشفاق نے خود ہی کی تھیں۔ زخمی کی شکل دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ یہ سیکرٹری ندیم تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی عینک ایک طرف تپائی پر رکھی تھی۔ عینک کے بغیر بھی وہ کوئی نفیس قسم کا بینک آفیسر یا پروپرائٹر ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اصلیت بس ہم جانتے تھے۔ وہ جلالی صاحب کے فارم ہاؤس میں گھومنے والی وہ کالی بھیڑ تھا جس نے جلالی صاحب کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ آج یہ غدار شخص اپنے اعمال کا شکار ہو کر یہاں اس کمرے کے فرش پر موجود تھا اور بالکل بے بس نظر آتا تھا۔

راجا نے اپنا سینہ پھیلایا اور فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا پھر عمران کو دیکھ کر بولا۔

''کیوں عمو! کیسا رہا یہ شکار؟''

''شکار تو ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی مصیبت کھڑی ہو گئی تو؟''

''کیا مطلب؟''

عمران نے ایک نظر اشفاق رانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اگر کسی نے گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا ہوا تو؟''

راجا بولا۔ ''اوئے چھڈ یار! یہ میرا اور رانے کا معاملہ ہے۔ تُو اس کی فکر نہ کر۔ یہ بتا، کام ٹھیک ہوا ہے یا نہیں؟''

''ہاں کام تو واقعی ٹھیک ہے۔'' عمران نے سر ہلایا۔

راجا کے انداز نے مجھے اور عمران کو سمجھا دیا تھا کہ اس کارروائی میں کوئی گڑبڑ نمبر والی گاڑی استعمال ہوئی ہے۔

راجا نے اپنی اکلوتی سلامت آنکھ سے اشفاق رانا کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اب ہم تینوں تھے اور ہمارے سامنے ترپال پر زخمی سیکرٹری ندیم پڑا تھا۔ وہ شخص جسے صرف بہتر گھنٹے پہلے میں نے اور راجا نے بڑے ٹھاٹوں میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سنہری وہسکی اور بغل میں سنہری عورت تھی۔ انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں وہ کسی سرکاری سانڈ کی طرح چدراتا پھرتا تھا۔ اس نے پُرغرور انداز میں مجھے سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور پھر ان دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا تھا۔ اگر قدرت، راجا کی شکل میں اور پھر ریان گروپ کے حملہ آوروں کی شکل میں مدد فراہم نہ کرتی تو شاید اب فتح محمد کی طرح میری لاش بھی اس کوٹھی میں کہیں کیڑوں کی خوراک بن رہی ہوتی۔

عمران نے راجا سے پوچھا۔ ''کچھ بتایا تو نہیں اس نے؟''

''نہیں یار! ابھی ہوش میں ہی نہیں آیا۔ منہ وچ ہی کچھ بڑبڑ کر رہا تھا۔ شاید اپنی بے بے کو حج پر جانے سے منع کر رہا تھا۔''

''تلاشی لی ہے اس کی؟''

''ہاں، یہ دیکھو۔ راجا نے تکیے کے نیچے سے ایک قیمتی کولٹ پسٹل نکال کر عمران کو دکھایا اور بولا۔ ''خانہ خراب نے اپنی پنی (پنڈلی) پر ربڑ کے بینڈ سے باندھ رکھا تھا...... اور یہ چیزیں بھی ملی ہیں۔'' راجا نے ایک دراز کھول کر کچھ چیزیں دکھائیں۔

دو چار رسیدیں تھیں، ایک قلم، ایک لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، ساٹھ ہزار روپے کا ایک کراس چیک...... چار پانچ سو روپے کیش تھا۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا کیش زیادہ تھا۔ یعنی قریباً ساڑھے آٹھ ہزار روپے۔ باقی آٹھ ہزار راجا نے ''آف دی ریکارڈ'' رکھ کر اپنی جیب میں غرق کر لئے تھے۔

''موبائل نہیں ملا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں لگتا ہے کہ موقع پر ہی کہیں گر گیا ہے۔''

''ٹھیک سے دیکھ لیا ہے؟''

''آہو یار، اتنا اندھا بھی نہیں ہوں۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ موبائل کے بارے میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

اشفاق رانا نے راجا کے کہنے پر ارد گرد کے تین چار کمرے خالی کرا لئے تھے۔ ہوٹل کے اس حصے کی طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد سیکرٹری ندیم ہوش میں آ گیا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس

بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ کسی طرح کی مزاحمت کر پائے گا۔ لہٰذا اسے باندھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہوش میں آنے کے کچھ دیر بعد ندیم نے مجھے اور راجا...... کو دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ جو ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی زرد تھا، مزید زرد ہو گیا۔ اس نے طوطے کی طرح گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا اور خود کو ایک بند کمرے میں ہمارے درمیان پایا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر راجا نے ٹانگ کی دھکیل سے اسے لیٹا رہنے پر مجبور کر دیا اور پھنکارا۔ ''اگر رولا شولا پانے کی کوشش کی تو تمہارے منہ میں رانا...... کی سڑی ہوئی جرابیں گھسیڑ دوں گا اور اوپر سے کس کے پٹی باندھ دوں گا۔''

ندیم کراہتے ہوئے بولا۔ ''مم...... مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟''

''بدلہ۔'' راجا نے اطمینان سے کہا۔ ''جو کچھ وہاں تم نے ہم دونوں کے ساتھ کیا، وہی ہم تمہارے ساتھ کریں گے۔ نہ تھوڑا کم نہ زیادہ۔''

''تمہیں بری طرح پچھتانا پڑے گا۔ جاوا صاحب تمہیں زمین کی ساتویں تہ سے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم زمین کے اوپر ہیں تو وہ ساتویں تہ سے کیسے ڈھونڈ نکالے گا؟ وہ تو پچھلے دو تین دن سے شاید خود ساتویں تہ میں گھسا ہوا ہے۔''

ندیم سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ جگہ پر نہیں، ہوٹل میں ہے اور یہ ایک گنجان بازار ہے۔ اس نے اچانک چلانا شروع کر دیا۔ ان نے جست لگائی اور اس کا منہ دبوچ لیا۔ وہ بمشکل ایک آواز ہی نکال سکا تھا۔ راجا نے ایک طرف سے موٹی بدبودار جرابوں کا جوڑا نکالا اور پھرتی سے ندیم کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ اوپر سے اس نے صافہ کس کر باندھ دیا۔

ندیم زور مار رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھا۔ راجا نے نائیلون کی ایک مضبوط رسی اس کے ٹخنے سے باندھی اور اس کا دوسرا سرا چھت والے پنکھے کے کنڈے میں سے گزار دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ندیم کمرے میں الٹا لٹکا نظر آ رہا تھا۔ وہ شور مچا رہا تھا مگر منہ سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکل رہی تھیں۔

راجا نے جوتا اتار کر تین چار کراری ضربیں اس کے کولہوں پر لگائیں۔ تڑاخ تڑاخ کی زوردار آوازوں کے بعد وہ قدرے شانت ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے شدید ترین آثار تھے۔

میں نے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے۔ ''ہاں سیکرٹری صاحب! اب ہماری باری ہے۔ سلطانی گواہ بننا چاہو گے یا چھترول کے دوران میں فوت ہونا پسند کرو گے؟''

وہ کراہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ یہ بے بسی کی معراج تھی اور ایسی ہی بے بسی سے وہ مجھے دو چار کر چکا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ بے ڈھنگے طریقے سے ہوا میں جھول رہی تھی اور اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

عمران نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''سیکرٹری صاحب! اسی لئے ہر پنجابی فلم میں ہیرو، ولن سے یہ کہتا ہے کہ اتنا ہی ظلم کرنا چودھری جتنا سہہ سکتے ہو۔''

اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ راجا نے دروازہ کھولا۔ اشفاق رانا نے دبی آواز میں پوچھا۔ ''خیریت ہے؟ بڑی زور کی آواز آئی تھی؟''

''ہاں...... ہاں خیریت ہے۔ تم ذرا ٹیپ اونچی آواز میں چلاتے رہو۔'' راجا نے مشورہ دیا اور دروازے کو پھر سے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

چند منٹ کے وقفے سے اس نے سیکرٹری ندیم کی پیٹھ پر ایک اور چھترول اٹیک کیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اور منہ سے پانی بہنے لگا۔ اس نے ہاتھوں کے اشاروں سے ہمیں کہا کہ ہم اسے نیچے اتار دیں۔

راجا نے اس کی رسی ڈھیلی کی اور وہ دوبارہ خون آلود ترپال پر آ گیا۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ اس کی تن فن بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اب اگر ہم اس کے منہ سے جرابیں نکال بھی دیں گے تو وہ شور وغل نہیں کرے گا۔ پھر بھی عمران نے پہلے اس سے یقین دہانی حاصل کی اور تب جرابیں اس کے پھولے ہوئے گلے میں سے نکالیں۔

دو تین منٹ بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''سیکرٹری صاحب! تمہیں پھر سے الٹا لٹکانے میں ہمیں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا لیکن پھر ہم اتنی جلدی تمہیں اتاریں گے نہیں۔ بہتر ہے کہ جو پوچھتے ہیں، ٹھیک ٹھیک بتاتے جاؤ۔''

ندیم سخت جان نہیں تھا۔ نہ ہی شاید وہ بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ غالباً دولت کی چمک اور عیاشی کا نشہ اسے پھسلا کر کہیں کا کہیں لے گیا تھا۔ اس نے عمران کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا اور پانی مانگا۔ راجا نے اسے پانی پلایا۔ ٹانگ کی تکلیف اسے بے حال کر رہی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''لاہور ہوٹل کے پاس تم کیا کر رہے تھے؟ اور جو بتانا سچ بتانا۔''

وہ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا۔ ''میں فیصل آباد جا رہا تھا۔''

''کس لئے؟''

وہ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد بولا۔ ''مہناز کا ساتھی ڈاکٹر رسام...... وہیں کا رہنے والا ہے۔ جاوا صاحب نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا۔''

''کیا کام لگایا تھا؟''

''یہی کہ اس کا کھوج لگاؤں۔ آپ لوگوں کو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ڈاکٹر مہناز اور رسام بدھا کی مورتی سمیت غائب ہیں۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

''تم پیدل ہی فیصل آباد جا رہے تھے، خیر سے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں گاڑی تھی...... ڈرائیور اور...... ایک گارڈ بھی تھا۔ وہ صنوبر سینما کی طرف کھڑے تھے۔ میں بس دو منٹ کے لئے نیچے اترا تھا، ایک دوست سے چیک لینے کے لئے۔''

''جاوا حرامی اب کہاں ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں ندیم نے کچھ تذبذب سے کام لیا۔ مگر جب عمران کے اشارے پر راجا نے پھر سے رسی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ دوبارہ بولنے لگا۔ جاوا کے بارے میں ندیم نے جو کچھ بتایا، وہ ہمارے لئے کافی حوصلہ افزا تھا۔ ندیم کی باتوں سے پتا چلا کہ وہاں بمبئی میں جاوا پر ایک افتاد آ ئی ہے۔ ایک خر دماغ پولیس افسر نے جاوا کے چھوٹے بھائی کو اس کی گرل فرینڈ سمیت گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے اور فرار ہو گیا ہے۔ اس پولیس افسر کا یارانہ ریان گروپ کے لوگوں سے بتایا جا رہا ہے۔ اس واقعے کے بعد جاوا فوراً اپنے لاؤ لشکر سمیت بمبئی چلا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گالیاں دے رہا تھا۔ بھائی کے قتل کی اطلاع دیر سے دینے کی پاداش میں اس نے اطلاع لانے والے کو موقع پر ہی گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ ندیم نے اس کے اندھا دھند شراب پینے کا ذکر بھی کیا۔

میں نے چونک کر کہا۔ ''لیکن تمہاری اطلاع کے مطابق تو اس نے کوئی بھرت وچن رکھا ہوا تھا۔ شراب اور عورت کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی ہوئی تھی؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''وہ بھرت وچن بھی فی الحال ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا ہے نا جاوا صاحب کی حالت بہت بری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بمبئی میں بڑا خون خرابا ہوگا۔''

عمران نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور شعلے فلم کے گبر سنگھ کے انداز میں بولا۔

''اب تیرا کیا ہوگا کالیے! تیرا تو خصم ہی تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔''

ندیم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔ لگتا تھا کہ ٹانگ کی تکلیف

کے سبب وہ کسی بھی وقت بے ہوش ہو جائے گا۔ عمران نے پرچی پر ایک پین کلر انجکشن لکھا اور راجا سے کہا کہ بازار سے منگوا لے۔

اسی دوران میں عمران کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے فون سنا۔ کچھ دیر ہوں، ہاں کرتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہوٹل کے کوریڈور میں آ گیا۔ دو چار منٹ بعد عمران نے فون بند کیا اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیلانی تیرے رقیب روسیاہ کے بارے میں معلومات دے رہا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ماسی حمیدن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ یوسف کی جرمن بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ جاتے جاتے وہ اپنی ہر چیز اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس کے دوستوں اور کزنز کا ایک ٹولہ اس کے ساتھ تھا اور ان لوگوں نے یوسف فاروقی کو دھمکیاں شمکیاں بھی دی ہیں۔''

''لیکن...... طلاق وغیرہ تو نہیں ہوئی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں ہوئی ہے تو ہو جائے گی۔ جیلانی نے ایک اور خاص بات بتائی ہے۔ تمہارا رقیب روسیاہ یعنی یوسف ثانی اس وقت فورٹریس کے ایک شاندار شاپنگ پلازا میں موجود ہے اور شاپنگ فرما رہا ہے۔ اس نے بہت سے بیش قیمت لیڈیز ڈریس خریدے ہیں اور ابھی مزید چیزیں خرید رہا ہے۔''

''یار! کیوں نہ اس بندے کو ایک بار دیکھا جائے۔'' میں نے کہا۔

''بے شک ہم جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی اب ہمیں جاوا کے گرگوں کا ڈر نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تو نہیں ہے۔''

''مجھے بھی نہیں ہے اور اگر کہیں ان سے ملاقات ہو بھی گئی تو کیا ہوا۔ تم نے خود ہی تو ایک بار کہا تھا کہ لاہور کی سڑکوں پر دھینگا مشتی کرنے کا اپنا ایک مزہ ہے۔''

''یعنی تم مارا ماری کے لئے بھی تیار ہو؟''

''ایک سو ایک فیصد۔ جن سڑکوں پر ایک عمر ڈر سہم کر گزری ہے، اب ان پر سینہ چوڑا کر کے چلنے کو دل چاہتا ہے۔'' میں نے کہا اور جیب سے ندیم کا قیمتی کولٹ پسٹل نکال کر اس کا میگزین چیک کیا۔ ایک فالتو میگزین بھی ساتھ موجود تھا۔

اسی دوران میں انجکشن آ گیا۔ ساتھ میں سرنج وغیرہ بھی تھی۔ عمران نے ندیم کی مضروب و سرخ پیٹھ پر انجکشن ٹھونکا اور راجا سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہ سو

جائے۔ نہ سویا تو تھوڑی سی چرس پلا دینا اس کو۔ تمہارے پاس تو ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا۔''

''اس کی فکر نہ کرو عمو! یہ دوسری، تیسری بار بھی پیدا ہو جائے تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا...... لیکن تمہاری واپسی کس ویلے تک ہوگی؟''

''بس ایک دو گھنٹے تک۔'' عمران نے کہا۔

''ہم نیچے آئے اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر فورٹریس پہنچ گئے۔ جیلانی سے فون پر ہمارا رابطہ تھا۔ ہمیں اس تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ شاندار شاپنگ پلازا کے سیکنڈ فلور پر موجود تھا اور کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ اس نے ہمارے لئے بھی ڈرنک منگوائے۔'' کہاں ہے رقیب روسیاہ؟'' عمران نے جیلانی سے پوچھا۔

جیلانی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں شاندار قسم کا اٹالین فرنیچر سیل کے لئے موجود تھا۔ لمبی ناک والا ایک خوش رو نوجوان بڑے اسٹائل سے ''شیشہ'' پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ فرنیچر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا لباس جدید تراش کا اور قیمتی تھا۔ ایک ڈرائیور ٹائپ شخص اس کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ ''یہی ہیں یوسف فاروقی صاحب۔'' جیلانی نے سرگوشی کی۔

ہم کیفے ٹیریا کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اس کی حرکات وسکنات ملاحظہ کرنے لگے۔ اس نے ایک دو بار اپنے شاندار سیل فون کے ذریعے کسی سے بات بھی کی۔ یہ سوچ کر میرے دل میں ٹیس سی اٹھی کہ شاید یہ بات اس نے ویانا میں ثروت سے ہی کی ہو۔

اس نے لکڑی کی دو فولڈنگ کرسیاں ''پرچیز'' کیں۔ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کی اور ڈرائیور کرسیاں اٹھا کر نیچے لے گیا۔ تب اس کی نظریں قیمتی لکڑی کے ایک شاندار Swing پر اٹک گئیں۔ ایسے خوب صورت جھولے عموماً نو بیاہتا جوڑوں کو تحفتاً دیئے جاتے ہیں۔ تھوڑی سی چھان پھٹک کے بعد یوسف نے یہ جھولا بھی خرید لیا۔

''بڑی تیاریاں ہیں بھئی۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں میرے موبائل پر کال آئی۔ میں نے دیکھا، یہ ویانا سے نصرت کا نمبر تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے نصرت کی بے تاب آواز ابھری۔ ''تابش بھائی! آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟ بائی گاڈ بڑے کٹھور ہیں آپ۔ نہ میسج کا جواب دیتے ہیں، نہ کال ریسیو کرتے ہیں۔''

''بھئی تم سے بات تو کی تھی۔''

''لیکن کب کی تھی، یہ بھی تو دیکھئے نا۔ لگتا ہے کہ آپ روز بہ روز مصروف ہوتے جا رہے ہیں اور یہ مصروفیت کچھ خطرناک بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں پاکستان میں آپ اپنے دوست عمران صاحب کے ساتھ مل کر کچھ گڑبڑ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کے دوست عمران صاحب کے بارے میں ایک چھوٹی سی نیوز بھی دیکھی ہے ٹی وی چینل پر۔''

''میں نے بھی دیکھی تھی۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔''

''لیکن میری موجودگی میں آپ نے ریسٹورنٹ کے اندر جو لڑائی کی وہ تو حقیقت تھی نا؟ چلیں اس بارے میں بعد میں بات ہو جائے گی۔ اس وقت آپ کو ایک بڑی اہم اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے جناب۔''

''کیسی اطلاع؟''

''ہم پاکستان واپس آ رہے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے بڑا لمبا چوڑا ''چیک اَپ'' ہوا ہے آپ کی اس بہن کا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ابھی فوری طور پر آپریشن کی ضرورت نہیں۔ وہ دواؤں کے ذریعے پہلے مجھے اچھا کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد آپریشن کی باری آئے گی۔ جیسے بکرے کو پہلے کھلاتے پلاتے ہیں پھر چھری چلاتے ہیں۔ چچا احمد نے سینئر ڈاکٹر صاحب سے تفصیل کے ساتھ مشورہ کیا ہے۔ اگر ہم یہاں ویانا میں ہی رہیں گے تو ڈھائی تین ماہ میں کافی سارا خرچہ آ جائے گا۔ لہٰذا فیصلہ ہوا ہے کہ ہم پاکستان آ جائیں اور پہلے میڈیکیشن کا کورس پورا کریں۔''

''یہ تو اہم خبر سنائی ہے تم نے۔ لیکن پہلے میری بات احمد چچا سے کراؤ۔'' میں نے کہا۔

نصرت کی آواز سنائی دی۔ وہ احمد چچا کو پکار رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد احمد چچا کی آواز ابھری۔ وہ بھی مطمئن اور خوش محسوس ہوتے تھے۔ نصرت کے بارے میں چچا احمد سے میری تفصیلی بات ہوئی۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ ابھی آپریشن ملتوی ہوا ہے اور غیر متوقع طور پر نصرت کی حالت بھی بہتر ہے۔ اگر وہ میڈیکیشن کے لئے اسپتال میں ایڈمٹ رہتی ہے تو کافی خرچہ آ جائے گا۔ ڈاکٹروں کے مطابق مناسب یہی ہے کہ وہ چند ماہ کے لئے پاکستان چلی جائے۔

ہماری اس گفتگو کے بعد عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے فوراً ریان ولیم سے فون پر رابطہ کیا۔ ریان صاحب اور پروفیسر رچی کے ساتھ عمران کا ٹیلی فونک رابطہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ انہیں جلالی صاحب اور آرا کوئے کے حوالے سے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ رکھتا تھا۔ ریان

ولیم کو عمران کی بے پناہ ''لک'' پر کچھ انوکھا سا بھروسا ہو گیا تھا۔ حالانکہ موجودہ صورتِ حال آرا کوئے کے حوالے سے اتنی حوصلہ افزا نہیں تھی لیکن ریان ولیم کو یقین تھا کہ عمران کی کوششوں کا حتمی نتیجہ مثبت ہی نکلے گا...... جیسے کوئز شو اور لگژری طیارے کا نکلا تھا۔ جاوا گروپ سے کھلم کھلا ٹکراؤ کے بعد ریان ولیم کے نزدیک عمران کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ عمران نے جس طرح جاوا کے دستِ راست نادر ٹی ٹی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، وہ ریان ولیم کے لئے بہت اہم تھا۔ بہرحال، ریان ولیم کی خواہش تھی کہ عمران اور ریان گروپ کا تعلق پوشیدہ ہی رہے۔

عمران نے ریان ولیم سے چند لاکھ روپے منگوائے جو فوراً ہی عمران کو آن لائن ٹرانسفر کر دیئے گئے۔ اس کے لئے جیلانی کا اکاؤنٹ نمبر استعمال ہوا۔

اسپتال سے نصرت کے عارضی ڈسچارج کے لئے یہ رقم دیانا بھجوانے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

ثروت والا معاملہ بڑی تیزی سے ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ ثروت آسٹریا سے واپس آرہی تھی اور یہاں اس کا شوہر یوسف فاروقی اس کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اپنی ٹین ایجر جرمن بیوی سے زخم کھانے کے بعد اسے ثروت کا خیال آیا تھا...... اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے سب کچھ نہیں کھویا، بہت کچھ اس کے پاس ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ بھی کم پُرکشش نہیں۔

میں اور عمران دیکھ رہے تھے، وہ فرنیچر مارٹ پر مختلف اشیاء کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بہرحال اس نے دو کرسیاں اور ساگوانی جھولا خریدنے پر ہی اکتفا کیا۔

عمران نے کہا۔ ''اس سے رابطہ کرو تابی! اس کو مزید جاننے میں مدد ملے گی۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس معاملے سے دور رہوں۔''

''یار! پھر وہی دلیپ کماری...... میں رادھا کے جیون پر اپنی چھایا...... وغیرہ وغیرہ۔''

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ یوسف فارغ ہو گیا۔ دو ملازم پیک شدہ جھولا لے کر برقی سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ یوسف بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا خارجی راستے کی طرف بڑھا۔ مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان پائے گا۔ بے شک ایک مرتبہ فون پر اس سے بات ہو چکی تھی لیکن وہ مجھے شکل سے نہیں جانتا تھا۔

مگر جب وہ...... قریب سے گزرا تو مجھ پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد تھوڑا سا چونک گیا

میں گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ہیں۔ کچھ قدم آگے جا کر وہ رکا اور پھر پلٹ کر ہماری طرف آ گیا۔ اس کی تیز نگاہیں اب بھی مجھ پر تھیں۔ میرے پاس آیا اور مسکرا کر بولا۔ ''معاف کیجئے، مجھے آپ کی شکل کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔ کہیں دیکھا ہے آپ کو۔''

میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ نرم تھے اور انداز میں گہرا اعتماد تھا۔

''آپ کا عثمان صاحب کی فیملی سے تو تعلق نہیں ہے؟ عثمان صاحب جو میکلوڈ روڈ پر کیمیکلز کا اسٹور بھی چلاتے تھے؟'' اس نے پوچھا۔ عثمان، ثروت کے والد مرحوم کا نام تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی تیز نگاہی کی داد دی اور کہا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔ آپ جن عثمان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں وہ رشتے میں میرے خالو تھے۔''

''اوہ گاڈ! آپ تابش تو نہیں ہیں؟'' اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی۔

''ہاں، میرا نام تابش ہے۔''

''میں نے فیملی البم میں آپ کی تصویریں دیکھی ہیں۔ ایک آدھ فیملی ویڈیو میں بھی آپ کو دیکھا ہے...... ونڈرفل۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اس طرح آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔''

''اور آپ کی تعریف؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آس پاس سلوٹیں پڑتی تھیں۔ ''آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کیجئے۔ چند دن پہلے فون پر آپ سے تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ میں نے آپ سے ملاقات کی خواہش بھی کی تھی۔''

''میں نے کہا۔'' کہیں آپ یوسف تو نہیں؟ ثروت کے ہسبنڈ؟''

اس نے ایک بار پھر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ''آپ جناب نے بالکل ٹھیک پہچانا۔''

''زبردست۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی نظر واقعی کافی تیز ہے۔ چند تصویروں کی مدد سے آپ نے مجھے شناخت کر لیا اور تصویریں بھی چار پانچ سال پرانی ہوں گی۔''

''کچھ چہرے ہوتے ہیں جن پر وقت کی دھول زیادہ نہیں پڑتی اور پڑتی بھی ہے تو جمتی نہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ کا تعلق کسی طور ثروت کی فیملی سے ہے۔''

کچھ دیر بعد عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔ میں نے اس کا تعارف اپنے

دوست کے طور پر کرایا۔ جیلانی، عمران کے اشارے پر موقع سے کھسک چکا تھا۔ ہم وہیں کیفے ٹیریا میں بیٹھ گئے۔ میں نے تین کپ کولڈ کافی منگوائیں۔ یوسف نے مجھے ویانا کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ثروت اور نصرت اسی ہفتے پاکستان واپس آ رہی ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے اس خبر کا علم نہیں؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص تھا اور تواتر سے باتیں کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں عمران بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ باتوں کا چمپئن تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر ہی دونوں نے کئی موضوعات چھیڑ اور سمیٹے۔ یوسف، میرے اور عمران کے کاروبار کے حوالے سے ٹوہ لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ایک دوست کے ساتھ مل کر ''کار ڈیلنگ'' کر رہے ہیں۔ جیل روڈ پر ہمارا شوروم ہے۔ یہ دراصل جیلانی کا شوروم تھا۔ عمران کبھی کبھار وہاں جا بیٹھتا تھا۔ کاروں اور گاڑیوں کی بات چلی تو یوسف نے بتایا کہ اسے خوبصورت اور یونیک گاڑیوں کا شوق ہے۔ اس نے کہا۔

''میرے پاس 75 ماڈل کی ایک شاندار مرسڈیز ہے جو کافی عرصے سے ایک اہم سیاسی شخصیت کے زیرِ استعمال بھی رہی ہے۔'' اس نے ہمیں گاڑی کی تفصیل بتائی۔

عمران متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ ''کسی وقت ہمیں دکھایئے۔''

وہ بولا۔ ''کسی وقت کیوں، آپ کے پاس وقت ہے تو ابھی چلئے میرے ساتھ گارڈن ٹاؤن۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے یوسف کے گھر چلنے کا پروگرام بن گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہم پر اپنی امارت کا رعب بھی ڈالنا چاہتا تھا ہے۔ اس کے علاوہ اسے میرے بارے میں کافی جستجو تھی۔

عمران اور میں ٹیکسی میں یہاں آئے تھے لیکن عمران نے یوسف کو بتایا کہ ہماری ہنڈا سٹی پارکنگ میں کھڑی ہے اور ڈرائیور اسے خود ہی لے آئے گا۔ ہم یوسف کی شاندار ٹویوٹا میں بیٹھے اور اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ دو بجے کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ یہی وہ گھر تھا جہاں میں نصرت کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا تھا اور پھر میں نے ثروت کی پہلی جھلک بھی دیکھی تھی۔ وہ جھلک جو مجھے کئی برس کے جان لیوا انتظار کے بعد نصیب ہوئی تھی۔

مجھے زیادہ خطرہ ملازمہ حمیدن کی طرف سے تھا۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتی اور ہمیں پہچان کر کسی ردِعمل کا اظہار کرتی تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بہرحال، خیریت گزری۔ حمیدن کی عقل کا امتحان ہی نہیں ہوا۔ وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کم از کم ہمیں تو دکھائی نہیں دی۔ میری معلومات کے مطابق یوسف کا یہ گھر کرائے کا تھا۔ اس کا ذاتی شاندار گھر قریب ہی ایک پوش علاقے میں بن رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ کو اس نے خوب سجایا ہوا تھا۔ غالباً اس سجاوٹ

کی ایک وجہ ثروت کی آمد بھی تھی...... ثروت جس کے حوالے سے یوسف کا حقِ ملکیت اور احساسِ محبت اچانک جاگ گیا تھا۔ کوٹھی کے ایک کوریڈور میں رنگ و روغن ہو رہا تھا، گراسی لانوں کو خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ یوسف نے ہمیں گھر کے اندرونی حصے دکھائے یہاں تک کہ بیڈروم بھی دکھا دیا۔ بیڈروم کو بڑے لگژری انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ بیڈ اپنی ''سہولتوں'' کے اعتبار سے زبردست تھا۔ یہاں ایک دیوار پر یقیناً حال ہی میں ثروت کی ایک بڑی تصویر بھی لگائی گئی تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جس کا ذکر حمیدن نے مجھ سے کیا تھا۔

یوسف نے مجھے مخاطب کیا اور مسکرا کر بولا۔ ''تابش صاحب! آپ نے پہچان ہی لیا ہو گا۔ یہ ہیں آپ کی کزن اور میری اہلیہ ثروت۔ دو چار دن میں یہاں پہنچ جائیں گی۔ پھر آپ کو کھانے پر بلائیں گے بلکہ میرا تو پروگرام بن رہا ہے کہ ثروت کی آمد پر ایک چھوٹی سی تقریب کر دی جائے۔ ایک مزیدار سا گیٹ ٹوگیدر۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ کمرے کی آرائش اور فرنیچر وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا...... مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے یہ بیڈروم دکھا کر اور اس کوٹھی میں گھما پھرا کر لطف لے رہا ہے۔ جیسے اس نمود و نمائش سے اس کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہو رہی ہے۔

اسی دوران میں اس کے فون پر کال آ گئی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ثروت کی کال ہے۔ ثروت اس سے کسی ملازم کے بارے میں بات کر رہی تھی، جس کی بیوی کو کل فالج ہوا تھا۔ وہ یوسف سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کی مالی مدد کرے۔ تین چار منٹ یہ بات جاری رہی۔ پھر بالکل غیر متوقع طور پر یوسف نے کہا۔

''ثروت! تمہارے ایک جاننے والے میرے پاس موجود ہیں۔ لو ان سے بات کرو اور پہچانو۔''

اس نے ایک دم سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں اس صورتِ حال کے لئے تیار نہیں تھا۔ چند لمحے کے لئے گڑبڑا گیا۔ دوسری طرف سے ثروت کی مترنم آواز آ رہی تھی۔

''ہیلو...... ہیلو کون؟''

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''ہیلو...... کیسی ہیں آپ؟''

ثروت نے ایک لحظے میں آواز پہچان لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے دو تین بار ہیلو کہا پھر یہ کہتے ہوئے فون یوسف کی طرف بڑھا دیا۔ شاید لائن کٹ گئی ہے۔''

''ہاں، لمبے فاصلے کی کال میں لائن اکثر کٹ جاتی ہے اور کبھی صرف محسوس ہوتا ہے کہ کٹ گئی ہے۔'' اس کا لہجہ بظاہر عام تھا مگر اس کی تہ میں معنی خیزی چھپی ہوئی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ ثروت کو اس طرح بے وجہ فون بند نہیں کرنا چاہئے تھا۔ شاید وہ حواس باختہ ہوگئی تھی۔

ہم قریباً ایک گھنٹا یوسف کے ساتھ رہے۔ اس نے شاندار چائے پلائی۔ اپنی گفتگو میں اس نے کہیں اپنی رسوا کن محبت کا ذکر نہیں کیا...... نہ ہی ہمیں بتایا کہ اس کی چہیتی جرمن بیوی بھی اس کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ اس چہیتی بیوی کی صرف ایک نشانی ہمیں یہاں نظر آئی۔ یہ ایک شیفرڈ کتا تھا جو ڈاگ ہاؤس میں گوشت پر منہ مار رہا تھا۔ حمیدن کے مطابق یہ گریس کا کتا تھا۔ وہ شوہر کی طرح اس کتے کو بھی غیر اہم جان کر یہاں چھوڑ گئی تھی۔

یوسف ہمیں کھانا بھی کھلانا چاہتا تھا مگر مجھے ملازمہ حمیدن کی طرف سے اندیشہ تھا۔ ہم نے کھانے سے معذرت کی۔ یوسف نے ہم سے وعدہ لیا کہ ثروت اور نصرت کی آمد پر اگر پارٹی ارینج ہوئی تو ہم دونوں اس میں ضرور شرکت کریں گے۔ مجھ سے پہلے عمران نے وعدہ کر لیا۔ میں نے کولٹ پسٹل ایک ربڑ بینڈ کے ذریعے اپنی پنڈلی سے باندھ رکھا تھا۔ اس پسٹل کا ہلکا سا ابھار پینٹ میں سے نظر آتا تھا۔ مجھے شروع سے آخر تک یہی فکر رہی کہ کہیں یہ ابھار یوسف کی نگاہوں میں نہ آجائے۔

عمران دس منٹ پہلے ہی فون کر کے جیلانی کو ہدایت دے چکا تھا کہ وہ ہنڈا سوک لے کر گارڈن ٹاؤن پہنچ جائے۔ اس نے یوسف کا ایڈریس بھی سمجھا دیا تھا۔

O.....❖.....O

قریباً پندرہ منٹ بعد ہم ہنڈا سوک پر یوسف سے رخصت ہو رہے تھے۔ میرے فون پر بار بار عاطف کی کال آرہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر کال اٹینڈ کی۔ عاطف کی پریشان آواز سنائی۔ ''بھائی جان! وہ آنٹی جمیلہ جاگ گئی ہیں۔ بہت فکر مند ہیں۔ مسلسل رو رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی بیٹی مہناز کو کچھ ہوگیا ہے اور ہم لوگ ان سے چھپا رہے ہیں۔ وہ بار بار اسے فون بھی کر رہی ہیں مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں آرہا۔''

''ٹھیک ہے، ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ تم ان کے پاس بیٹھو اور باتوں میں لگاؤ۔'' دس پندرہ منٹ بعد ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں موجود تھے۔ آنٹی جمیلہ واقعی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ درحقیقت ان کی بیماری کی وجہ بھی بیٹی کا رویہ ہی تھا۔ اب بیٹی کی گمشدگی نے انہیں مزید تباہ حال کر دیا تھا۔

انہوں نے عمران کو کندھوں سے تھام کر جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ ''تم لوگ مجھے ٹھیک بات بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے میری مہناز کے ساتھ؟ کہاں گئی ہے وہ؟ اس نے تو کبھی اس طرح اپنا فون بند نہیں کیا تھا۔ وہ خبیث جلالی بھی فون نہیں اٹھا رہا۔ اللہ کرے مر گیا ہو وہ۔ جنازہ نکل جائے اس کا۔ اس نے میری بیٹی کو تماشا بنا دیا ہے۔ پتا نہیں، کیا تعویذ گھول کر پلا دیئے ہیں اسے۔'' وہ ایک بار پھر جلالی کو کوسنے لگیں۔

عمران نے کہا۔ ''آنٹی جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مہناز کے ساتھ کچھ ایسا ویسا نہیں ہوا۔ وہ خطرے سے بچ کر نکل گئی ہے۔ آپ خود سوچیں اگر وہ کسی مصیبت میں آگئی ہوتی تو پھر اسے ڈھونڈنے والے اسپتال کیوں آتے اور آپ کو پکڑنے کی کوشش کیوں کرتے؟ وہ اصل میں ڈاکٹر مہناز ہی کو تلاش کر رہے ہیں۔''

''کیوں کر رہے ہیں؟ میری بیٹی نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟ اگر کسی کو دشمنی اس خبیث بڈھے کے ساتھ ہے تو اس میں میری بچی کا کیا قصور ہے؟''

ہم اسے کیسے بتاتے کہ وہ اس ''خبیث بڈھے'' کی بیوی ہے اور اس کی ہر اچھائی برائی میں اس کی حصے دار بن چکی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس سارے معاملے میں پوری طرح ملوث ہو چکی ہے۔

ہم دونوں نے آنٹی سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور انہیں کافی حد تک پُرسکون کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''آنٹی! آپ اپنا سیل فون ہر وقت کھلا رکھیں۔ کسی بھی وقت ڈاکٹر صاحبہ کی کال آپ کے نمبر پر آسکتی ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''اس کے علاوہ آپ ایک دو ایس ایم ایس بھی اسے کر دیں۔''

''مجھے نہیں کرنا آتا۔'' آنٹی جمیلہ نے اشک بار لہجے میں کہا۔

عمران نے آنٹی جمیلہ کی طرف سے دو ایس ایم ایس مہناز کے نمبر پر بھیج دیئے۔ ان میں آنٹی کی بیماری کا ذکر تھا، اسپتال کا ذکر تھا اور مہناز سے کہا گیا تھا کہ وہ فوراً رابطہ کرے۔

آنٹی کو وہ دوائیں زبانی یاد تھیں جو انہیں اسپتال میں دی جا رہی تھیں...... عاطف نے بازار سے وہ دوائیں لا دی تھیں۔ فرح نے ہمارے سامنے آنٹی کو دوا کھلائی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ غنودگی محسوس کرنے لگیں۔ ان کو آرام دینے کے پیش نظر ہم ان کے کمرے سے نکل آئے۔

فرح نے کہا۔ ''رات کا کھانا تیار ہے۔ ڈرائنگ روم میں آجائیں۔''

''کیا پکایا ہے ہماری بہن نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''آپ کی بہن نے نہیں، آپ کی انہوں نے پکایا ہے۔ زبردست قسم کے قیمہ کریلے،

ساتھ میں دہی کی نمکین لسی اور گرم گرم روٹیاں۔''

عمران بولا۔''اگر یہ اہتمام شاہین نے کیا ہے تو پھر اس نے ضرور اس میں زہر ملایا ہو گا۔''

''زہر نہیں جی، محبت ملائی ہے۔ وہ آپ کی ناراضی دور کرنا چاہتی ہیں۔''

''میری بہن! چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، زخم تو خربوزے کو ہی لگتا ہے۔ پہلی ناراضی دور ہوگئی تو پھر اگلی لڑائی کے ۔لئے جگہ بنے گی نا۔ کیا زبردست شعر کہہ گئے ہیں اس بارے میں مولانا حسرت موہانی۔ سانوں نہر والے پل تے بلا کے تے ماہی خورا کتھے رہ گیا۔''

فرح اور عاطف ہنس ہنس کر دہرے ہونے لگے۔ انہیں ہنستے دیکھ کر بالو بے وجہ قلقاریاں مارنے لگا۔ فرح نے کہا۔''عمران بھائی! یہ شعر تو نہیں ہے اور یہ نہر کے پل کی بات کہاں سے آ گئی؟''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اور یہاں تو محبت بھی ہے اور جنگ بھی۔''

میں نے کہا۔''واقعی ''محبت والے اونٹ'' کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ اب یہی دیکھو، وہ بے چاری تمہاری وجہ سے دکھی بھی ہوئی ہے اور تمہیں مناتی بھی ہے...... تم سے معافی بھی مانگتی ہے۔''

''بہت خوب۔'' عمران نے دیدے نچائے۔''اس نے مجھے اڑنگا مار کر گرایا۔ میرے سینے پر سوار ہوئی، میرے بال نوچے اور تم اب بھی مجھے ہی جابر خاں قرار دے رہے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا فلسطینی رہنما بروس لی نے، بے وقوف دوست سے عقل مند دشمن اچھا ہوتا ہے۔''

''بروس لی، فلسطینی رہنما نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کوئی ایسی بات کہی تھیں'' عاطف مسکرایا۔

''اوئے چھبر! اگر تم حسرت موہانی کے شعر پر نہیں بولے تو بروس لی کے مقولے پر تمہیں کیوں تکلیف ہوئی ہے۔ یہ تو سراسر نسلی تعصب ہے بلکہ ہرول بھرشاٹ ہے۔''

''ہرول بھرشاٹ؟ یہ کیا ہوتا ہے عمران بھائی؟'' عاطف نے پوچھا۔

میں نے عمران کا گریبان پکڑ لیا۔''اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا...... تو میں گھونسا جڑ دوں گا۔''

اس سے پہلے کہ باقاعدہ ہماری دھینگا مشتی شروع ہو جاتی، کچن کے دروازے پر شاہین

نمودار ہوئی اور ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ فرح اور عاطف مسلسل ہنس رہے تھے۔

شاہین نے واقعی نہایت مزیدار کھانا پکایا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ سرکس میں جسمانی کرتب دکھانے والی یہ ہوش ربا لڑکی، گھر گرہستی بھی کر سکتی ہے۔

شاہین اور عمران کی صلح کی خوشی میں، میں نے سب کو آئس کریم کھلائی اور اردگرد کی گھمبیر پریشانیوں سے خود کو جدا کر کے کچھ اچھا وقت گزارا۔

بالو اس نئے ماحول میں بہت خوش تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں بابا...... تا تا کرتا تھا۔ ہر کوئی اسے گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ زری بھی اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر چکی تھی۔ وہ اب باقاعدہ فرح سے پڑھ بھی رہی تھی۔ اس کے طور اطوار اب کافی سلجھ گئے تھے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں گھاگرا چولی پہن کر اپنے جسم کی نمائش کرنے والی اور آنکھوں آنکھوں میں توبہ شکن اشارے پھینکنے والی زری اب ایک نئے سانچے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔

زری نے شروع شروع میں کئی بار کہا تھا۔''میرا من ناہیں لگتا۔ مجھے زرگاں کی یاد آوت ہے، میں واپس جانا چاہت ہوں۔'' مگر اب وہ یہ فقرہ جیسے بھول ہی گئی تھی...... میرے سامنے آتے ہوئے وہ اوڑھنی سے اپنا سینہ خوب ڈھانپ کر رکھتی تھی اور اس کی نگاہ بھی نیچی رہتی تھی۔ یہ اسباق اسے بھانڈیل اسٹیٹ میں سلطانہ نے ہی پڑھائے تھے۔

کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد عمران نے کہا۔''چلو اب چلیں۔''

''کہاں؟'' میں نے دبی آواز میں پوچھا۔

''کہیں بھی، یہاں سے تو نکلیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ ساری خوشی دھری کی دھری رہ جائے...... اور ہم دونوں کے درمیان پھر جنگ چھڑ جائے۔'' اس کا اشارہ اپنے اور شاہین کی طرف تھا۔

جب ہم اچانک جانے کے لئے تیار ہو گئے تو وہ سب لوگ کافی مایوس ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب ہم آئے ہیں تو ایک دو دن رہیں گے اور ہلا گلا ہوگا۔ خاص طور سے شاہین چپ نظر آنے لگی۔ وہ واقعی دل کی گہرائیوں سے عمران کو چاہتی تھی۔ عمران کی طرف کیا صورت حال تھی، اس کا کچھ اتا پتا نہیں چلتا تھا۔

عمران نے سب کو تسلی دی کہ وہ ایک دو دن میں ضرور واپس آئیں گے اور پھر ہو سکتا ہے کہ ویک اینڈ ان کے ساتھ ہی گزاریں۔

میں سمجھ گیا کہ عمران کو کیوں جلدی ہے۔ ہم ایک مصیبت سیکرٹری ندیم کی شکل میں ہوٹل لالہ زار کے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ اس مصیبت کی نگرانی پر بھی ایک مصیبت کو ہی مقرر کیا گیا تھا مجھے اور عمران کو پورا یقین تھا کہ ندیم کی جیب سے زیادہ کیش نکلا ہے۔ راجا نے

صرف پانچ سو روپے شو کیے تھے۔

O......❖......O

ہم ہوٹل لالہ زار پہنچے۔ یہاں راجا...... بالکل راجا اِندر بنا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھی ہوئی تھیں، وہسکی سے شغل کر رہا تھا اور کوئی چار درجن پری پیکر لڑکیاں اس کے سامنے رقص کر رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں دراصل ٹی وی اسکرین پر تھیں۔ راجا نے کوئی گرما گرم انڈین فلم لگا رکھی تھی۔ وہ سب ناچتی تھرکتی حسیناؤں کو ایک ہی نظر اور ایک ہی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ نیچے ترپال پر ندیم اسی طرح بندھا پڑا تھا۔ ہاں، یہ تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اس کی ٹانگ پر باقاعدہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور سرہانے دوائیوں کی کئی بوتلیں اور سرنجیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً راجا...... اور اشفاق نے مل کر اس کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ اشفاق رانا کا ایک پڑوسی اور ہم راز ڈاکٹر تھا۔

ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ ندیم کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔ میرا اشارہ نیم بے ہوش پڑے ندیم کی طرف تھا۔

وہ بولا۔ ''بہتر تو یہی تھا کہ حضرت جلالی صاحب یہاں ہوتے۔ وہ اپنے طریقے کے مطابق اس نمک حرام کو کوئی یادگار سبق سکھاتے۔ لیکن وہ تو خود اس وقت زندگی موت کے درمیان جھول رہے ہیں۔ اس خبیث سے حساب ہمیں ہی برابر کرنا ہوگا۔''

''اب کیا کرو گے؟''

''کچھ نہیں، ابھی تو اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچاتے ہیں جہاں یہ اطمینان سے ہماری مہمان نوازی کا لطف اٹھا سکے۔'' اس کے ساتھ ہی عمران نے اقبال کو فون کیا اور اس سے کہا کہ ندیم کے قیام طعام اور دشنام وغیرہ کا مناسب انتظام کیا جائے اور اسے لالہ زار ہوٹل سے بحفاظت اٹھا بھی لیا جائے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے پاس شہر میں کوئی ایسی خاص جگہ موجود ہے جہاں کسی کی دخل اندازی کا ڈر نہیں اور وہ دو چار بندوں کو وہاں مستقل مہمان بنا کر رکھ سکتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ بھی کر سکتا ہے۔

میرے فون پر میسج پر میسج آ رہے تھے۔ یہ نصرت کے میسج تھے۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتی تھی کہ یہاں لاہور میں اصل صورتِ حال کیا ہے۔ کیوں باجی ثروت کے ساتھ یوسف بھائی کے رویے میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں؟ کیا وہاں اندرونِ خانہ کوئی اتھل پتھل ہوئی ہے؟ یہ

بھنک شاید نصرت کو بھی پڑ چکی تھی کہ یوسف کی جرمن بیوی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔

اب میرے پاس اس حوالے سے مکمل معلومات موجود تھیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ یہ معلومات میرے ذریعے نصرت اور ثروت تک نہ پہنچیں۔ میرے دل میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ یوسف کے بارے میں، میں جو بھی منفی بات کروں گا، ثروت اس کا اُلٹا اثر لے گی۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں اس کی طرف اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے یوسف کے معاملات کو اچھال رہا ہوں۔

میں نے اس سلسلے میں عمران سے مشورہ کیا۔ اس کی رائے مجھ سے کچھ مختلف تھی۔ وہ بولا۔ ''دیکھو جگر! ہمیں اس بندے کی کیمسٹری کا پتا چل چکا ہے۔ یہ کافی حد تک موقع پرست اور شاید نفس پرست بھی ہے۔ اپنی جرمن محبوبہ کے عشق میں ڈوب کر اس نے جس لڑکی کو برسوں تک قابلِ اعتبار نہ سمجھا، اب اس کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ ''پیتل'' کے عشق میں سونے کو مٹی میں رول رہا تھا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ محبوبہ بیوی کا نشہ ہرن ہوا ہے تو اب اسے ثروت نظر آ رہی ہے۔ وہ اسے اپنی قربتیں عنایت کرنا چاہ رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے والد فاروقی صاحب بھی اس تبدیلی سے خوش ہوں گے۔ یعنی ایک تیر سے دو شکار۔ یہ محبت نہیں سراسر مطلب پرستی ہے اور ثروت کو اس مطلب پرستی سے آگاہ ہونا چاہئے۔''

''وہ آگاہ ہو جائے گی یار! کچھ بھنک تو دونوں بہنوں کو پڑ ہی چکی ہے، باقی سب کچھ یہاں پاکستان آ کر معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جو ہمارے خیال ہیں، وہ نصرت کے بھی ہوں گے۔ وہ ثروت کو ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرے گی۔''

''پھر بھی تابی! تمہیں خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ چلو ثروت سے نہیں تو نصرت سے ایک بار تفصیل سے بات کر لو۔ اسے سمجھا دو کہ جو شخص پچھلے دو ڈھائی سال ثروت کو ہتک آمیز طریقے سے نظر انداز کرتا رہا ہے، اب اس کا شوہر بننے پر کیوں تلا ہوا ہے۔''

میں نے عمران سے وعدہ کیا کہ میں نصرت کو فون کروں گا لیکن میں نے کیا نہیں۔ ہاں میں نے ایک عام سا میسج ضرور کر دیا۔ اس میں، میں نے نصرت کے اس شبہے کی تصدیق کی کہ یوسف اور گریس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اور گریس اسے چھوڑ کر واپس جرمن جا چکی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اب یوسف، ثروت کو اہمیت دینے پر مجبور ہو رہا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ باقی کا کام نصرت خود کرے گی۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ ثروت اپنے مشرقی مزاج کے مطابق یوسف کو مجازی خدا کا درجہ دے بیٹھی تھی۔ اس کی ساری ستم ظریفیوں

کواب تک خندہ پیشانی سے جھیلتی رہی تھی اور اب بھی جھیلنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب وہ یوسف کے خلاف خلع بہ آسانی حاصل کر سکتی تھی...... لیکن بقول نصرت اسے خلع یا طلاق جیسے لفظ سے ہی نفرت تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ واہمے بری طرح بیٹھ چکے تھے اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے یوسف سے طلاق لینے کا سوچا اور اس کا جوان بھائی ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔ اب وہ نصرت کی سنگین بیماری کو بھی اپنے ازدواجی حالات اور سوچوں سے نتھی کر چکی تھی۔ یہ خیال کسی عقیدے کی طرح اس کے ذہن میں راسخ تھا کہ وہ طلاق لینے والا گناہ کرے گی تو نصرت کی موت پر مہر تصدیق لگائے گی۔ میں نے اور عمران نے اس موضوع پر کئی بار بحث و تبصرہ کیا تھا۔ آخر کیوں ایسے واہمے...... ایسے بے بنیاد عقیدے انسان کے ذہن میں پلتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں؟ کیا یہ انسان کے اندر کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو وہ ان واہموں میں جکڑا جاتا ہے؟ میں فلاں کام کروں گا تو اس کی سزا مجھے فلاں طریقے سے بھگتنا پڑے گی۔ میں اس طرح سے خوشی حاصل کروں گا تو اس کا خمیازہ مجھے اس المیے کی صورت میں جھیلنا پڑے گا۔ اب بظاہر "ایک گمراہ اور قدر ناشناس شوہر سے رخ پھیرنے میں" اور چھوٹی بہن کے بیمار ہونے میں کوئی تعلق نہیں تھا مگر ثروت نے اپنے ذہن میں یہ تعلق بنایا ہوا تھا۔ اس تعلق پر ایک زوردار ضرب لگائے جانے کی ضرورت تھی۔ بے بنیاد واہمے کے اس بت کو یقین کے کلہاڑے سے چکنا چور کیا جانا ضروری تھا۔ ہم واہموں کے خلاف لڑ رہے تھے اور اب واہمے کا ایک اور سومنات ہمارے سامنے تھا۔ لیکن پتا نہیں کہ اس سومنات پر میں خود کوئی کلہاڑا چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سومنات کو توڑنے والی خود ثروت ہو۔

O......❖......O

اگلے روز میں اور عمران ڈیفنس والی کوٹھی میں واپس آ گئے۔ خوب رونق رہی...... باربی کیو کا جو پروگرام کافی عرصے سے ملتوی ہو رہا تھا، پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میڈم صفورا بھی اس خوشگوار تقریب میں شریک ہوئی۔ وہ ہلکا پھلکا رقص بھی کر لیتی تھی۔ اس کے رقص نے محفل کو دوبالا کیا۔ اس نے کھینچ کر عمران کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ عمران بھی ہر فن مولا شخص تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے پرانے محلے میں چاچے نذیر کی شادی پر رقص کرتے دیکھا تھا۔ بڑی خوبصورتی اور روانی تھی اس کی حرکات و سکنات میں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ریشم کی طرح نرم یہ شخص وقت آنے پر فولاد بلکہ دہکا ہوا فولاد بن جاتا ہے۔ شاہین اور زری نے بھی اس ہلکے پھلکے رقص میں شرکت کی۔ فرح اور عاطف نے گٹار بجانے پر اکتفا کیا۔ میں اور اقبال تالیاں

بجاتے رہے۔ زندگی میں سنگینی اور رنگینی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس بات کا علم صرف مجھے اور عمران کو تھا کہ جہاں یہ محفل برپا ہے، وہیں زمین میں سراج کے خطرناک غنڈے کی لاش بھی دبی ہوئی ہے۔

اس تقریب کے دوران میں ہی میرے سیل فون پر کال آئی۔ یہ یوسف کی طرف سے تھی۔ یوسف نے مجھے بتایا کہ...... پرسوں ثروت آسٹریا سے واپس آ رہی ہے۔ اس خوشی میں ایک گیٹ ٹوگیدر ہے۔ مجھے اور عمران کو ہر صورت آنا ہے۔ وقت رات نو بجے کا تھا۔

میری دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میری اور ثروت کی کہانی ایک نئے موڑ پر آ رہی تھی۔

اگلے دو روز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ایک بار آنٹی جمیلہ کے فون پر ایک گمنام نمبر سے کال آئی۔ آنٹی نے ریسیو کی تو دوسری طرف مہناز تھی۔ اس نے بس اتنا ہی کہا۔ "ہیلو امی! میں مہناز بول رہی ہوں۔" اس کے بعد کسی وجہ سے لائن کٹ گئی۔ آنٹی جمیلہ دیوانہ وار ہیلو ہیلو کہتی رہیں۔ ہم نے اس موبائل نمبر کا پتا کروایا جس سے کال آئی تھی۔ حسب اندیشہ وہ نمبر گمنام ہی نکلا۔ ایمن آباد کے ایک مزدور شرافت علی کا ایڈریس تھا۔ اس بے چارے کا بس شناختی کارڈ ہی استعمال ہوا تھا۔ اس کال سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوا کہ مہناز جہاں کہیں بھی ہے، زندہ سلامت ہے۔

جلالی صاحب بدستور کومے کی حالت میں تھے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ ان کی عمر تو مزاحمت کرنے والی نہیں تھی لیکن ان کی سخت جانی دیکھتے ہوئے امید کی جا سکتی تھی کہ شاید وہ موت کے فرشتے پر بھی گرجیں برسیں اور اسے اس کے کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ایس پی حمزہ صاحب دیگر پولیس افسران کے ساتھ مل کر خاصی تگ و دو کر رہے تھے لیکن ابھی تک مہناز اور رسام کا کوئی کھوج ملا تھا اور نہ ہی آرا کوئے کا کوئی سراغ ہاتھ آیا تھا۔

اسپتال سے آنٹی جیلہ کے اغوا کی کچی رپورٹ بھی درج ہوئی تھی۔ تاہم ہم نے ایس پی حمزہ صاحب کو آگاہ کر دیا تھا کہ آنٹی ہمارے پاس حفاظت سے ہیں۔ حمزہ صاحب نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ ہم انہیں اپنے پاس رکھیں۔

اسپتال کے سامنے اندھا دھند فائرنگ میں زخمی ہونے والے اے ایس آئی گل احمد کی حالت اب اسپتال میں خطرے سے باہر تھی۔ میں نے فون پر اس کی مزاج پرسی کی تھی۔

جاوا گروپ کی ہنگامہ خیزی بھی کچھ ماند پڑ گئی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ جاوا کو

اپنے ایک دوسرے پھڈے۔کے سلسلے میں فوراً بمبئی جانا پڑ گیا تھا۔ جاوا کے کئی قریبی اور سرگرم ساتھی بھی جاوا کے ساتھ ہی گئے تھے۔ عمران نے ریان ولیم سے جو رقم نصرت کے ''اسپتال کے بل'' کے لئے لی تھی، اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یوسف آج کل حاتم طائی کی قبر پر لات مار رہا تھا اور خاص طور سے ثروت پر مہربانیوں کی بارش کر رہا تھا۔ نصرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اسپتال کا بل یوسف بھائی کی طرف سے ادا کیا جا چکا ہے۔

O.....❖.....O
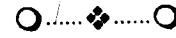
اور یہ ایک رنگین شام تھی۔ گارڈن ٹاؤن میں یوسف فاروقی کی رہائش گاہ جگمگا رہی تھی۔ کوٹھی کے اندر باہر کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وسیع لان میں خوب صورت شامیانہ لگا کر کیٹرنگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف اپنی شادی کو ''ری نیو'' کر رہا ہے۔ آج کئی ماہ بعد میں نے ثروت کو دیکھا۔ جھلملاتے ستاروں والی نیلگوں ساڑھی میں وہ دلکش نظر آتی تھی۔ ساڑھی کے ستاروں کی جھلملاہٹ میں اس کا چہرہ چاند کی طرح تھا مگر یہ چاند روشن ہونے کے باوجود اُداس تھا۔ اس کی تہ میں کہیں اداسی اور پژمردگی ایک سرد اندھیرے کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

یوسف کی موجودگی میں ہمارے درمیان بس یہ گفتگو ہوئی۔

''ہیلو تابش!''

''ہیلو ثروت! کیسی ہو تم؟ بہت کم تبدیلی آئی ہے تم میں۔''

''لیکن آپ میں تبدیلی آئی ہے اور اتنا عرصہ کہاں غائب رہے ہیں آپ؟ نصرت بتا رہی تھی کہ آپ کہیں انڈیا وغیرہ چلے گئے تھے۔''

''ہاں، کچھ عرصہ رہا ہوں انڈیا میں بھی۔ امی کے جانے کے بعد دل ایک دم اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ کہیں نکل جانے کو جی کرتا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہو گا، ان کی موت جن حالات میں ہوئی۔''

ثروت نے اثبات میں سر ہلایا اور دکھ بھری سانس لی اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''فرح اور عاطف کیسے ہیں؟ سنا ہے کہ وہ بھی لاہور میں ہیں۔ ان کو بھی لے آتے آپ۔ مدت ہو گئی انہیں دیکھے ہوئے۔''

''چلیں، اب کسی دن ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

بس اسی طرح کی چند رسمی باتیں ہوئیں۔ قریب کھڑی نصرت نے جب دیکھا کہ باتیں [illegible] ہی رسمی اور بے محل ہو گئی ہیں تو اس نے مداخلت کی اور چہکنے لگی۔ وہ اس وقت صحت

مند نظر آ رہی تھی۔ خوب سجی ہوئی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک سنگین بیماری سے فائٹ کر رہی ہے۔

یہ ایک اچھی تقریب ثابت ہوئی۔ میوزک...... قہقہے کھانا...... ڈرنک، سب کچھ موجود تھا۔ بس اس تقریب میں دو باتیں کچھ علیحدہ سی تھیں۔ ایک تو یوسف کی تیز نظریں جو گاہے بگاہے میرے اندر کچھ ٹٹولنے لگتی تھیں اور دوسرے ثروت کے بظاہر مسکراتے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی بیزاری آمیز اداسی۔ ایک دو بار اس سے نظریں ملیں لیکن یہ نظریں کسی بھی طرح کا ابلاغ نہیں کر سکتیں۔ عمران اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''اس موقع پر ایک پیانو ضرور ہوتا ہے اور ہیرو اس پر گانا گاتا ہے۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ...... یا پھر، جھوم جھوم کے ناچو آج، گاؤ آج......

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر تم گانا چاہو تو گا سکتے ہو۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

اسی دوران میں تین چار مہمان عمران کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ان میں دو لڑکیاں اور ایک جواں سال شخص تھا۔ ''ہیلو جی!'' جواں سال شخص نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ عمران سے مصافحہ کیا۔ ''ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے جی۔ بڑی خوشی ہوئی ہے آپ جیسے انٹرنیشنل فنکار کو یہاں دیکھ کر۔'' اس نے کہا۔

''انٹرنیشنل فنکار؟'' عمران نے حیرت سے کہا۔ ''میں نے تو کسی فلم میں کام نہیں کیا۔''

ایک لڑکی ہنسی۔ ''فلموں میں کام کرنے والے تو مصنوعی ہیرو ہوتے ہیں جی۔ اصل ہمت و جرأت تو آپ لوگ دکھاتے ہیں۔ ہم نے اسٹار سرکس میں دو تین بار آپ کا شو دیکھا ہے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے عمران کے گرد بھیڑ لگ گئی۔ دو چار دیگر معزز مہمانوں نے بھی اسے Acrobat کی حیثیت سے پہچان لیا۔

نصرت نے عمران کا بازو تھام لیا۔ ''عمران بھائی! دیکھیں لوگ آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اس وقت تفریح کا ماحول بنا ہوا ہے...... آپ کچھ تھوڑا بہت دکھائیں نا۔''

''تمہارا مطلب ہے میں یہاں قلابازیاں لگانا شروع کر دوں؟''

''نہیں، لیکن کوئی چھوٹا موٹا ٹرک۔ کوئی ہا[illegible] صفائی۔''

عمر[illegible] نے اپنی خوب صورت ٹائی پر [illegible]یاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا تو ایک ہی ''ٹرک'' لوگوں کو زیادہ پسند ہے۔ ریوالور میں [illegible] گولی رکھ کر اور چرخی گھما کر اپنے آپ پر

فائر کرنا۔''

''نہیں، نہیں۔ایسا خطرناک کام نہیں۔'' ''کچھ اور۔'' نصرت نے ٹھنک کر کہا۔

''تو اپنے تابش بھائی سے سیکھو نا۔اب یہ بھی کچھ کم فنکار نہیں ہے۔برف کے بلاک کو دو ٹکڑے کرسکتا ہے۔ٹکر مار کر درخت کو اکھاڑ سکتا ہے۔ڈبل اینٹیں چبا سکتا ہے۔''

''آپ مذاق نہ کریں۔'' نصرت نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

''اچھا کچھ دیکھتا ہوں۔شاید گاڑی میں کوئی چیز مل جائے۔''

وہ گاڑی میں گیا اور کچھ دیر بعد ایک ریوالور لے آیا۔سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

نصرت نے احتجاج کیا۔''یہ کیا عمران بھائی! آپ پھر یہ ہتھیار لے آئے۔''

''اور کچھ تھا ہی نہیں۔تاش کے پتوں وغیرہ کے کھیل تو آپ لوگوں کو پسند نہیں آئیں گے نا۔''

عمران نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔''مجھے بھی پتا ہے۔اسی لئے نقلی ریوالور لایا ہوں۔صرف پٹاخا چلے گا لیکن آپ اس کو اصلی گولی سمجھئے اور دیکھئے میری ''لک'' کام کرتی ہے یا نہیں۔میں تین مرتبہ ٹریگر دباؤں گا اور مجھے یقین ہے، تینوں بار گولی نہیں چلے گی۔''

یوسف نے ریوالور الٹ پلٹ کر دیکھا۔یہ واقعی ''ڈمی'' نظر آرہا تھا۔لوہے پر برش سے رنگ کیا گیا تھا۔عمران نے ریوالور ہتھیلی پر رکھا اور ٹیگر دبایا۔''ٹرچ'' کی آواز نکل کر رہ گئی۔دوسری بار پھر چرخی گھمائی گئی۔اس مرتبہ بھی گولی نہیں چلی......تیسری مرتبہ بھی گولی اور ''ہیمر'' آمنے سامنے نہیں آئے۔عمران نے کہا۔''بات صرف اعتماد اور یقین کی ہوتی ہے۔جب آپ یقین کے ایک خاص لیول کو چھو لیتے ہیں تو پھر غیر مرئی طاقتیں آپ کا ساتھ دینے لگتی ہیں۔آپ کے پانسے سیدھے پڑنے لگتے ہیں۔'' عمران نے دونوں فائر ہوا میں کئے۔دھاکوں سے فضا گونج اٹھی۔

ایک فیشن ایبل لڑکی نے انگریزی میں پوچھا۔''مسٹر عمران! آپ اصلی گولیوں سے بھی کھیلتے ہیں......اس وقت آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟''

''ویسے ہی جیسے اب ہیں۔'' عمران نے سیدھا جواب دیا۔

''ایک خاتون نے کہا۔''سنا ہے آپ کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔''

عمران نے کہا۔''غالباً آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔آپ اپنے سر پر سیب رکھیں، میں ابھی اڑانے کو تیار ہوں۔''

ایک شخص نے خاتون کے شوہر کو مخاطب کر کے ہانک لگائی۔''شاہ صاحب! جلدی

کیجئے۔سیب لائیے۔آپ کے لئے اچھا موقع پیدا ہو رہا ہے۔''

محفل کشت زعفران بن گئی۔میری نظر ایک بار پھر ثروت کی طرف اٹھی۔وہ اس شور شرابے میں بھی بالکل تنہا تھی۔اکیلی......اداس......اس کی اداسی جیسے اڑ اڑ کر میرے سینے تک بھی پہنچ رہی تھیں اور میرے اندر ایک صحرا سا آباد کر رہی تھی۔ہم دونوں کے درمیان چند میٹر کا فاصلہ تھا لیکن یہ صدیوں پر محیط تھا۔وہ یوسف فاروقی کی بیوی بن کر بھی اس کی بیوی نہیں تھی۔اس کے ہونٹوں پر میرے ہونٹوں کی مہر کے سوا ابھی کوئی مہر نہیں تھی۔لیکن اب صورتِ حال بدل رہی تھی۔کیا واقعی صورتِ حال بدل رہی تھی؟

ہم دونوں رات دو بجے کے لگ بھگ یوسف، ثروت اور نصرت سے رخصت ہو کر واپس لوٹے۔رات اوس میں بھیگی ہوئی تھی۔نہر کنارے چاندنی کا پڑاؤ تھا۔وہ ریوالور جس سے عمران نے محفل میں تماشا دکھایا تھا، سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔اسپیڈ بریکر پر جھٹکا لگنے سے وہ میرے پاؤں کی طرف کھسک آیا۔میں نے اسے اٹھایا اور اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ایک جھانپڑ عمران کی گردن پر مارا۔ریوالور نقلی نہیں تھا۔

O......❖......O

وہ بڑی جان لیوا شب تھی۔میں کمرے میں بے چین ٹہل رہا تھا۔میرے اندر وہی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، جب میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے جسم کو بڑی بے رحمی سے اذیت کی بھٹی میں جھونک دوں۔کچھ ایسا کروں کہ میرے مساموں سے پسینے کے بجائے لہو رِسنے لگے۔میری ہڈیاں چٹخ جائیں اور سینہ پھٹ جائے۔

اگلی صبح نو بجے کے لگ بھگ نصرت کا فون آ گیا۔''کیسے ہیں تابش بھائی؟'' اس نے نارمل آواز میں پوچھا۔

''ٹھیک۔''

''اتنا مختصر جواب......کیا یہ اور مختصر نہیں ہو سکتا تھا؟''

میں خاموش رہا۔وہ گہری سانس لے کر بولی۔''بھائی جان! میں آپ کی دلی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔یوں لگتا ہے کہ جو کچھ آپ جھیل رہے ہیں، میں بھی آپ کے ساتھ جھیل رہی ہوں۔لیکن ہمارے پوائنٹ آف ویو سے ایک اچھی اطلاع بھی ہے جو میں آپ کو پہنچانا چاہتی ہوں۔''

''کیسی اطلاع؟'' میں نے پژمردہ آواز میں پوچھا۔

''باجی ثروت میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔یوسف بھائی کے لئے ان کی بے دام کی

غلامی میں کچھ فرق پڑا ہے۔ وہ یوسف بھائی سے کچھ کچھی ہوئی ہیں۔ رات کو بھی وہ ماسٹر بیڈ روم میں سونے کے بجائے اس کمرے میں سوئی ہیں جہاں گریس کی موجودگی میں سویا کرتی تھیں......اوپر والی منزل میں۔"

"اس سے کیا ہوگا نصرت؟"

"مجھے نہیں پتا لیکن انہوں نے یوسف بھائی کو کم از کم یہ تو بتا دیا ہے کہ وہ چابی والا کھلونا نہیں جسے جب چاہا الماری میں پھینک دیا، جب چاہا نکالا اور چابی گھما کر چلا لیا۔"

نصرت کی باتیں میرے دل میں عجیب سی امید جگا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی اس کی باتوں نے امید جگائی۔ یوں لگا جیسے میں ابھی مکمل طور پر ڈوبا نہیں ہوں۔ ہاتھ پاؤں چلانے کی گنجائش باقی ہے اور شاید سہارے کے لئے دو چار تنکے بھی میرے ہاتھ آ گئے ہیں۔

نصرت کہہ رہی تھی۔ "......تابش بھائی، پلیز! آپ نے ہمت نہیں ہارنی۔ اگر آپ نے ہمت ہار دی تو قسم سے میں بھی ہار دوں گی۔ میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں گی۔ میں اگر اب تک زندہ ہوں تو صرف اس لئے کہ میں آپ کے چہرے پر امید دیکھ رہی ہوں۔ وہ امید جو آپ کو اور باجی کو ایک کر سکتی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ "مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ مجھے بتائیں، میں آپ سے ملنے کہاں آؤں؟"

"کیا بات ہے نصرت؟"

"وہ ایسے نہیں، مل کر ہی ہو سکے گی۔ آپ بتائیں بھی آپ کہاں مل سکتے ہیں اور کب؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر ضروری ہے تو پھر جس طرح تم چاہو۔ تم مجھے اپنی سہولت کے مطابق بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے تابش بھائی! کل دوپہر گلبرگ کے "فوڈ پوائنٹ" پر۔ آپ ایک بجے تک پہنچ جائیں۔"

اگلے روز میں مقررہ وقت پر ریسٹورنٹ پہنچ گیا اور نصرت کا انتظار کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ ہماری گفتگو ثروت اور یوسف کے حوالے سے ہی ہوگی لیکن مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس گفتگو میں ثروت خود بھی موجود ہوگی۔ مجھے تب پتا چلا جب نصرت اور ثروت دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئیں۔ نصرت کا وزن کافی کم ہو چکا تھا مگر وہ ہشاش بشاش تھی۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا لیکن ظاہر نہیں کیا۔ جب وہ دونوں بالکل قریب پہنچ گئیں تو نصرت

نے حیرت ناک لہجے میں کہا۔ "اوہ تابش بھائی! آپ یہاں؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان دونوں سے ملا۔ میں سمجھ گیا کہ نصرت نے ڈراما کیا ہے اور اب مجھے بھی یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ ملاقات اتفاقیہ ہوئی ہے۔

میں نے دونوں کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں لگا جیسے ثروت پلٹ جائے گی یا پھر کسی اور میز پر بیٹھے گی۔ لیکن جب نصرت بیٹھ گئی اور شولڈر بیگ میز پر ٹکا دیا تو مجبوراً ثروت کو بھی بیٹھنا پڑا۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی اور بے چین نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اتفاقاً میں ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جگہ باقی ہال سے کچھ کٹی ہوئی تھی۔ ثروت کے جسم سے اٹھنے والی "پروفیسی" کی خوشبو یادوں کے تار چھیڑ رہی تھی۔

"آپ کیا لیں گی؟" میں نے نصرت اور ثروت کو مشترکہ طور پر مخاطب کیا۔ ثروت سے پہلے ہی نصرت بول اٹھی۔ "کھانے کا وقت ہے پیزا منگوا لیجئے۔ میرا خیال ہے کہ ہم تینوں شوق سے کھا لیں گے۔"

"نہیں نصرت! میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ اور مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے۔ تم صرف کوئی کولڈ ڈرنک منگوا لو۔"

"خدا کا خوف کریں باجی۔ اگر اتفاقاً تابش بھائی ہاتھ آ ہی گئے ہیں تو ان کی جیب کچھ ہلکی کرنی چاہئے۔"

"پلیز نصرت! مسخری مت کرو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتیں" ثروت نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے بالوں کی لٹ اس کے سرخ ہوتے چہرے پر جھولنے لگی تھی۔

"اچھا بابا! کولڈ ڈرنک ہی منگوا لیتے ہیں۔"

میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔

ثروت بدستور لال بھبوکے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی نصرت نے لجاجت سے کہا۔

"پلیز باجی! اگر اتفاق سے تابش بھائی مل ہی گئے ہیں تو آپ اس طرح آگ بگولا تو نظر نہ آئیں۔"

"میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔" وہ تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟"

"تم جان بوجھ کر مجھے یہاں لائی ہو۔ تم نے پلان کیا ہے۔ یہ کوئی ٹی وی ڈراما نہیں ہے، زندگی ہے...... اس میں اس طرح کے ناٹک نہیں چلتے......" اس کے خوب صورت ہونٹ سے ہل رہے تھے جیسے وہ بھی طیش میں لرز رہے ہوں۔

نصرت نے گہری سانس لے کر بڑی بہن کی طرف دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”اچھا جو بھی ہے، اب اپنا موڈ ٹھیک کریں۔ ہم ڈرنک لے کر چلے جاتے ہیں یہاں سے۔“

وہ درد سے بولی۔ ”تم لوگ...... یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ آگ کا کھیل ہے۔ اس کی کوئی ایک چنگاری بھی میرے گھر کو برباد کر سکتی ہے...... اور میں...... ہرگز یہ نہیں چاہتی۔ اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ثروت! یقین کرو، مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں تم دونوں سے ملاقات ہوگی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں؟“

”لیکن آپ کو یہ تو پتا ہوگا کہ نصرت آپ سے ملنے آ رہی ہے۔ وہ کیوں آ رہی تھی۔ آپ دونوں میرے بارے میں ہی ڈسکس کرنا چاہتے ہوں گے نا۔“

”نصرت نے صرف اتنا کہا تھا کہ ایک بہت اہم بات ہے اور اس کے لئے میرا آنا بہت ضروری ہے۔ یہ روہانسی ہو رہی تھی۔“

نصرت نے کہا۔ ”اچھا باجی! ان باتوں کو چھوڑیں...... پلیز چھوڑیں۔ میں آپ سے...... بلکہ آپ دونوں سے بس...... اور بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ خدا کے لئے ان حالات کے بارے میں ٹھنڈے دل دماغ سے سوچیں...... آپ دونوں سمجھ دار ہیں، پڑھے لکھے ہیں، جھوٹ اور سچ میں فرق کر سکتے ہیں۔ خود کو رسموں، رواجوں کی بھینٹ نہ چڑھنے دینا۔ اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو نکال لینا۔ میں نے دیکھا ہے باجی کہ......“

ثروت کا چہرہ سرخ تر ہوگیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں جا رہی ہوں۔“

نصرت نے بیٹھے بیٹھے اس کا بازو تھام لیا۔ ”پلیز باجی...... پلیز! ایسا نہ کریں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو ہم دونوں چلتے ہیں۔ آپ دو منٹ بیٹھ جائیں۔“

”نصرت! چھوڑو مجھے۔“ ثروت نے تلخ لہجے میں کہا اور ہاتھ پیچھے کھینچا۔ اس کی کہنی لگنے سے شیشے کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

”پلیز باجی۔“ نصرت نے التجا کی۔ اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی تھی۔ یہ جیسے اس کی آواز ہی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے بھی ثروت کی طرح چونک کر نصرت کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ ہونٹ ایک دم ہی نیلے سے پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے ثروت کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور دونوں بازو میز پر رکھ کر ان پر اپنا سر جھکا دیا۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔

”کیا ہوا نصرت؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

ثروت بھی ایک دم ٹھٹک گئی...... اس نے شولڈر بیگ پھر سے میز پر رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”نصرت...... نصرت!“ اس نے اس کا شانہ ہلایا۔

نصرت اسی طرح بیٹھی رہی۔ لمبی سانسیں لیتی رہی۔

”ویٹر! پانی لاؤ۔“ میں نے پکار کر کہا۔

اردگرد کے لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ ایک کونے میں پیانو بجاتے فنکار ملازم نے بھی اپنے ہاتھ روک لئے۔

”یا اللہ خیر۔“ ثروت بولی۔

ویٹر پانی لایا۔ ہم نے نصرت کو پلانے کی کوشش کی۔ وہ صرف ایک گھونٹ ہی بھر سکی۔ اس کے ہونٹ خشک تر اور نیلگوں ہوتے جا رہے تھے۔

”تابش! اس کو اسپتال لے جانا ہوگا۔“ ثروت نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

میں نے ریسٹورنٹ کے ایک سینئر ملازم کو ثروت کی گاڑی کی چابی دی کہ وہ اسے ڈرائیو کر کے دروازے کے عین سامنے لے آئے۔ میں اور ثروت، ڈگمگاتی نصرت کو سہارا دے کر دروازے پر لے آئے۔ اسے گاڑی میں سوار کر کے ہم تیزی سے قریبی کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، نصرت پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھی اور اس کا سر ثروت کی گود میں تھا۔ ثروت مسلسل اسے دلاسا دے رہی تھی۔ میں نے تیز ڈرائیونگ کی اور چار پانچ منٹ میں کلینک پہنچ گئے۔ نصرت کو فوراً ایمرجنسی میں پہنچایا گیا۔ اس کی گردن پسینے سے تر تھی اور وہ تیز سانس لے رہی تھی۔ اتفاقاً نصرت کی ایک میڈیکل فائل گاڑی میں ہی تھی۔ اس میں اس کی بیماری سے متعلق کئی اہم کاغذات موجود تھے۔

ثروت نے ایک سینئر ڈاکٹر کو یہ فائل دکھائی۔ فوری طور پر نصرت کے وائٹل سائنز چیک کئے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں، وقتی اثرات ہیں۔ ان شاءاللہ یہ ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“

نصرت کو ایمرجنسی میں ہی گلوکوز ڈرپ لگا دی گئی۔ ایک دو انجکشن بھی اس میں لگائے گئے۔ ہم دونوں نصرت کے اردگرد بیٹھے تھے۔ ثروت کا چہرہ اس کی شدید اندرونی پریشانی کا غماز تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد نصرت کی حالت بہتر ہونا شروع ہوگئی۔ اس کی سانس ہموار ہونے لگی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے باہری گوشے نم ہوئے پھر ان میں سے دو موٹے آنسو نکل کر اس کے کانوں کی طرف رینگ گئے۔

ثروت نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اسے پچکارا۔ ”نہیں میری گڑیا! نہیں، ایسا نہیں کرتے۔“

وہ خاموش رہی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمایا ہوا تھا۔ شاید ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں میرا اور دوسرے میں ثروت کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب آواز میں بولی۔ ”میں آپ دونوں کے لئے جی رہی ہوں۔ آپ دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے...... اور کچھ نہیں کہتی، صرف اتنا کہتی ہوں...... آپ اپنے اپنے حالات کو سمجھیں۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ کریں، پوری سچائی کے ساتھ کریں۔ زمانے پر نہ جائیں۔ یہ زمانہ تو کسی حال میں خوش نہیں ہوتا۔“

ثروت نے نرمی سے کہا۔ ”اچھا...... ابھی تم چپ رہو۔ خود کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔“

”آپ خوش ہوں گے، تو میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں باجی! خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ وہ رونے لگی۔

ثروت جھکی اور بے چین ہو کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا...... اسے پچکارنے لگی۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک نصرت کے ہاتھ میں تھے۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت اس نے یہ دونوں ہاتھ باہم ملا دیئے اور انہیں اپنی گردن کے نیچے سینے پر رکھ لیے۔ ثروت کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے میری نگاہوں سے ٹکرائیں...... اور پھر جھک گئیں۔

ڈرپ ختم ہونے تک ہم دونوں نصرت کے دائیں بائیں موجود رہے اور اس سے دل بہلاوے کی باتیں کرتے رہے۔ پرانے دنوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں جن کے پیچھے یادوں کے تانے بانے پھیلے ہوئے تھے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ڈرپ ختم ہوگئی۔ نصرت کی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے جانے کی اجازت دے دی۔ ثروت جلد از جلد گھر واپس لوٹنا چاہتی تھی...... میری گاڑی ابھی تک شاپنگ پلازا میں ہی کھڑی تھی۔ نصرت اور ثروت اپنی گاڑی پر گھر روانہ ہوگئیں تو میں رکشا پکڑ کر شاپنگ پلازا کی طرف چل دیا۔ میرے ہاتھ پر ابھی تک ثروت کے ہاتھ کا لمس موجود تھا اور کسی سنہری روشنی کی طرح چمک رہا تھا۔ لاہور میرے اردگرد تھا۔ اس کے گلی کوچوں میں زندگی اپنی بھرپور روانی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ وہی جانا پہچانا شور، وہی دیکھے بھالے مناظر اور مناظر سے بہت اوپر نیلا آسمان، جس نے لاہور کے گنبدوں، میناروں اور شاہراہوں پر سایہ کر رکھا تھا۔ اس آسمان پر سفید کبوتر اٹکھیلیاں کرتے تھے اور رنگ برنگی پتنگیں فراٹے بھرتی تھیں۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ میں اس شام کے اثر

میں ڈوب گیا۔ مجھے لگا رکشا ڈرائیور عقب نما آئینے میں میرے ”ہاتھ“ کو دیکھ رہا ہے...... اور اس ”ہاتھ“ پر چمکتا ہوا سنہری لمس اسے نظر آ رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔

اسی دوران میں عمران کی فون کال آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ڈیفنس کی طرف ہی آ رہا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”اب ڈیفنس کی طرف نہ آؤ۔ سیدھے تھانہ گلبرگ آ جاؤ۔ میں یہیں پر ہوں۔“

”کیا ہوا؟ لاہور کالج کی کسی لڑکی سے جوتے تو نہیں کھائے تم نے؟“

”لگتا ہے کہ تمہیں کوئی تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ میں پکڑا نہیں گیا ہوں بلکہ کسی کو پکڑنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ایک اہم کھوج ملا ہے ڈاکٹر مہناز کا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کی مہران کار ٹریس ہوگئی ہے۔“

”اوہ، یہ تو واقعی خاص خبر ہے...... میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور رکشا والے کو رکشا موڑنے کی ہدایت کی۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں مطلوبہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ عمران یہاں پہلے سے موجود تھا اور فون پر جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ سے بات کر رہا تھا...... بیس اکیس سال کا ایک لڑکا انسپکٹر کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے گندمی گال پر ایک دو طمانچوں کے نشان تھے۔ تھانے کے احاطے میں سفید رنگ کی مہران کار میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ کار کی ونڈ اسکرین پر ”ڈاکٹر“ کا اسٹیکر بھی لگا ہوا تھا۔

حمزہ صاحب سے بات ختم کر کے عمران نے میری طرف دیکھا اور میلے کچیلے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ان سے ملو، یہ ہیں ڈاکٹر مہناز کے چھوٹے بھائی گلو صاحب۔ پورا نام غلام علی ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر تین ٹانگوں والے ایک جانور کے ساتھ کرتب دکھاتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ رکشا چلاتے ہیں۔“

ڈاکٹر مہناز کا بھائی اور رکشا چلاتا ہے؟ اور اس کی تو صورت بھی بالکل نہیں ملتی؟“

”سگا بھائی نہیں ہے یار، بس اسے باجی کہتا ہے۔ اس نے علاج ولاج کیا تھا اس کا دو تین سال پہلے۔“ عمران نے دبلے پتلے لڑکے کی پتلون کا پائنچا اوپر کر کے اس کی ٹانگ دکھائی۔ ٹانگ کی شکل بگڑی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ چکنا چور ہوگئی تھی اور گوشت کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر اسے پھر سے ”تعمیر“ کیا گیا ہے۔ ٹانگ بہت دبلی بھی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''دو تین سال پہلے یہ سروسز ہسپتال میں داخل تھا۔ وہیں پر ڈاکٹر مہناز سے اس کی دوستی ہوئی۔ یہ اسے باجی کہتا ہے۔ ایکسیڈنٹ میں ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کا رکشا بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔ یہ جب ٹھیک ہوا تو مہناز نے اسے پھر سے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مہناز نے ایک این جی او کے تعاون سے اسے رکشا لے کر دیا اور کرائے کا مکان بھی دلوایا۔''

''لیکن آج ڈاکٹر مہناز اور رسام والی گاڑی اس کے پاس کیسے آ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

جلالی فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر مہناز اور رسام پناہ کے لئے گلو کے مکان پر ہی آئے تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات گلو کے مکان پر رہے۔ اس دوران میں یہ مہران گاڑی باہر گلی میں کھڑی رہی۔ اس کے اوپر غلاف چڑھا دیا گیا تھا تا کہ یہ شناخت نہ ہو سکے۔''

گلو مسلسل سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے شرمساری ٹپک رہی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''لیکن اس گاڑی کا پتا کیسے چلا؟''

عمران نے کہا۔ ''یہ لاٹ صاحب، گاڑی پر اپنی گرل فرینڈ کو سیر کرانے نکلے تھے، پکڑے گئے۔'' پھر عمران نے گلو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گلو صاحب! کچھ اپنی زبان سے بھی بیان فرمایئے۔''

وہ چپ رہا تو ایس ایچ او نے اس کے کندھے پر ضرب لگائی اور دہاڑ کر کہا۔ ''اوئے بولتا ہے یا کسی اور طریقے سے تیری زبان کھولوں؟''

اگلے چار پانچ منٹ میں گلو نے خالص لاہوری لہجے میں اٹک اٹک کر جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ کنال پارک کی گنجان آبادی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ باجی مہناز منگل کی رات اس کے گھر آئی۔ اس کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر بھی تھا۔ دونوں اسی مہران گاڑی پر تھے۔ ان کے پاس کینوس کا ایک بیگ تھا جس میں کوئی قیمتی چیز تھی...... لیکن اس قیمتی چیز کے بارے میں باجی نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ گلو کو صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ باجی مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر کو کچھ لوگوں کی طرف سے خطرہ ہے اور وہ اپنی جان کے ڈر سے یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ گلو نے ان دونوں کو ہر طرح سہولت پہنچانے کی کوشش کی۔ اگلے روز گلو کے دو تین دوست اس سے ملنے آئے مگر اس نے انہیں دروازے سے ہی ٹرخا دیا۔ اگلی رات بھی مہناز اور رسام نے گلو کے گھر میں ہی گزاری۔ مہناز کے کہنے پر گلو نے ایک برقع کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ یہ برقع وہ باغبانپورہ سے اپنی ایک خالہ کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ صبح منہ

اندھیرے مہناز اور رسام کہیں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ گلو کے بار بار پوچھنے پر مہناز نے صرف اتنا ہی بتایا کہ کچھ غنڈے ان کے پیچھے ہیں اور وہ ان سے بچنے کے لئے پشاور کی طرف جا رہے ہیں۔ بہرحال گلو کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ پشاور کی طرف ہی گئے تھے۔ جاتے ہوئے مہناز نے گلو کو مہران کار کی چابی دی اور اس سے کہا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی گاڑی کو یہاں سے لے جائے۔ اس نے کہا کہ وہ اسے مین سڑک کے پاس کسی گلی میں چھوڑ آئے گا اور دوبارہ وہاں نہ جائے۔ گلو سمجھ گیا کہ یہ گاڑی ان ''غنڈوں'' کی نظر میں آ چکی ہے جو مہناز اور رسام کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گلو سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے گاڑی کے حوالے سے مہناز کی تاکید کو نظر انداز کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کی ہدایت کے عین مطابق عمل کرتا اور اسے کہیں چھوڑ آتا، اس نے تھوڑی سی تفریح کرنا چاہی۔ محلے کی ایک لڑکی فوزیہ سے اس کی دوستی چل رہی تھی۔ اس نے سوچا فوزیہ کے ساتھ ایک چکر ریس کورس پارک کا لگا لینا چاہئے۔ اس غلطی کی پاداش میں اب گلو تھانے میں تھا اور گاڑی باہر احاطے میں کھڑی تھی۔ فوزیہ کی منت سماجت کی وجہ سے ایس ایچ او نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم گلو کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے۔ گلو زیر حراست تھا اور دو پولیس اہلکار سادہ لباس میں اس کے ساتھ موجود تھے۔ گلو نے ہمیں وہ کمرا دکھایا جہاں ڈاکٹر مہناز نے رات گزاری تھی۔ ایک بوسیدہ سا پلنگ تھا۔ ایک خستہ حال جستی الماری بھی یہاں موجود تھی۔ عمران نے گلو سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر رسام کہاں رہا تھا؟''

گلو نے کہا۔ ''وہ باجی مہناز کے ساتھ ہی رہا تھا جی۔ پر سوتے وقت باہر برآمدے میں آ گیا تھا۔''

''جس تھیلے کی تم بات کر رہے ہو، وہ کہاں تھا؟''

''وہ باجی مہناز نے اپنے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا تھا، پر بعد میں انہوں نے تھیلا الماری میں رکھ دیا تھا اور تالا لگا کر چابی اپنے پرس میں ڈال لی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے مہناز سے پوچھا نہیں کہ تھیلے میں کیا ہے؟''

''جب انہوں نے خود نہیں بتایا تو پھر مجھے پوچھنا چنگا نہیں لگا تھا۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے کہ اس میں کیا تھا؟''

''کوئی وزنی سی شے تھی۔ باجی مہناز اسے بڑے آرام سے اٹھاتی اور رکھتی تھی۔ شاید وہ شیشے کی بنی ہوئی کوئی تھی۔'' پھر وہ ذرا توقف کر کے گلو گیر لہجے میں بولا۔ ''پر مجھ کو معاف کر دیں جی۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں باجی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔'' وہ مجھے اور عمران کو بھی

پولیس والے ہی سمجھ رہا تھا، اس لئے مجھ سے معافی کا طلبگار تھا۔

عمران نے کہا۔ ''معافی تمہیں ایک ہی صورت میں مل سکتی ہے۔ جو کچھ تمہیں معلوم ہے صاف صاف اور کھل کر بتاؤ۔ یہاں جو جو کچھ ہوا، اس کا پورا نقشہ بیان کر دو۔''

''مم...... میں کیا بتاؤں جی؟''

''شروع سے بتاؤ۔''

''وہ دونوں رات ڈھائی تین بجے کے قریب یہاں پہنچے تھے۔ دونوں کافی پریشان تھے۔ باجی نے بتایا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فوڑاً باہر گلی میں جا کر گاڑی پر کپڑا ڈال آؤں۔ اس کے بعد وہ دونوں کمڑے میں چلے گئے اور کھسڑ پھسڑ کرتے رہے۔ جلد ہی صبح ہوگئی۔ باجی باڑ باڑ کہیں فون کر رہی تھی، پڑ وہ مل نہیں رہا تھا۔ میڑا خیال ہے کہ کوئی بندہ بیماڑ تھا اور باجی اس کی طبیعت کے باڑے میں پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ وہ باڑ باڑ ڈاکٹر رسام سے کہہ رہی تھیں کہ پتا نہیں انہوں نے فلاں دوا کھائی ہے کہ نہیں۔ فلاں ٹیکا لگوایا ہے کہ نہیں۔ وہ شاید کوئی بڑی عمڑ کا بندہ تھا۔ باجی اس کا عجیب سا نام لے رہی تھیں...... مجھے اب...... یاد نہیں آ رہا......''

''جلالی تو نہیں کہہ رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... شاید یہی کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی پندڑا بیس دفعہ فون کیا پڑ نہیں ملا۔ پھڑ انہوں نے کسی اوڑ کو فون کیا۔ اس بندے نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔ اس نے بتایا کہ وہ جس بندے کا پوچھ رہی ہیں، وہ شاید بے ہوش ہو گیا ہے اور اسے لاہوڑ کے اسپتال میں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد باجی کی پڑیشانی اوڑ بھی بڑھ گئی۔ وہ رونے لگ پڑیں۔ انہوں نے ڈاکٹر رسام سے کہا کہ وہ ابھی اسپتال جانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے اپنا چھوٹا بیگ اٹھایا اور جانے کے لئے تیاڑ ہوگئیں۔ ڈاکٹر رسام غصے سے بولا کہ وہ ایسا کیوں کڑ رہی ہیں۔ وہ پکڑے جائیں گے۔ اس موقع پر ڈاکٹر رسام نے پولیس کی بات بھی کی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں کو غنڈوں کے علاوہ پولیس سے بھی خطڑہ ہے۔ بعد میں ڈاکٹر رسام باجی مہناز کو کھینچ کر کمرے میں لے گیا۔ اس کے بعد دونوں میں جو باتیں ہوئیں، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''مہناز نے جس دوسرے بندے کو فون کیا اور جس نے اسے جلالی کی خراب حالت کے بارے میں بتایا اس کا نام تم نے سنا؟''

''نہیں جی۔''

''یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ مرد تھا یا عورت؟''

''میرا خیال ہے کہ عوڑت تھی۔''

''اچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟'' مہناز اور رسام کا سارا دن کیسے گزرا؟'' عمران نے پوچھا۔

''باجی مہناز تو بہت پڑیشان رہیں۔ انہوں نے ساڑا دن کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ ڈاکٹر رسام ان سے تسلی کی باتیں کڑتا رہا۔ پتا نہیں انہیں کیا سمجھاتا بجھاتا ڑہا......''

باتیں کرتے کرتے اچانک عمران کی نظر کسی چیز پر گئی اور وہ چونک گیا۔ کمرے کی دہلیز سے باہر چارپائی کے نیچے اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ چارپائی کی طرف گیا اور جھک کر کسی شے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے وہاں سے کچھ اٹھایا۔ یہ کانچ کی سبز چوڑیوں کے دو تین ٹکڑے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ ایسی سبز چوڑیاں میں نے ڈاکٹر مہناز کی خوبصورت کلائی میں دیکھی تھیں۔

عمران نے ٹکڑے گلو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ یہاں کیسے آئے؟''

وہ فوراً بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ فون پڑ بڑی خبر سننے کے بعد باجی نے فوراً اسپتال جانا چاہا تھا۔ ڈاکٹر رسام نے انہیں پکڑ کڑ مشکل سے روکا تھا۔ اسی کھینچا تانی میں یہ چوڑیاں ٹوٹی تھیں۔ باجی کی کلائی سے خون بھی نکلا تھا۔''

''لیکن یہ چوڑیاں تو یہاں کمرے کے سامنے پڑی ہیں۔ تم بتا رہے ہو کہ ڈاکٹر رسام نے تمہاری باجی کو صحن میں روکا تھا۔''

''ہاں ڑوکا تو صحن میں ہی تھا۔ شاید ایک دو ٹوٹے یہاں بھی گڑ پڑے ہوں۔'' گلو نے کہا۔

میں اور عمران دھیان سے گلو کو دیکھنے لگے۔ کیا گلو کے پیچھے بھی کوئی کہانی تو نہیں تھی؟ بظاہر تو گلو بہت زیادہ ہوشیار چالاک نظر نہیں آتا تھا۔ مہناز کا نام بھی وہ بڑی عزت سے لے رہا تھا۔ بہرحال اس موقع پر کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا۔

''اچھا اس کے بعد کیا ہوا؟ مہناز اور رسام کب روانہ ہوئے یہاں سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ڑات کو بس تھوڑی دیڑ کے لئے ہی سوئے ہوں گے۔ باجی مہناز تو آدھی رات کو ہی اٹھ گئی تھیں۔ وہ باڑ باڑ کسی کو فون بھی کڑ رہی تھیں۔ پھڑ وہ دونوں جانے کے لئے تیاڑ ہو گئے۔ ڈاکٹر رسام نے باجی کو زبڑدستی بس تھوڑا سا دودھ پلایا تھا۔ جاتے وقت باجی نے ایک

بار بار مجھے تاکید سے کہا کہ میں گاڑی کو فوراً کہیں چھوڑ آؤں۔ بس جی میری بھیڑی قسمت کہ میں نے ان کی بات نہ مانی۔''

ہم نے غلام علی عرف گلو سے قریباً ایک گھنٹے تک سوال جواب کئے۔ ڈاکٹر رسام کی مہران کار کی تلاشی ہم تھانے میں ہی اچھی طرح لے چکے تھے۔ اس میں سے کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ گلو سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں دو باتیں وضاحت سے سامنے آئیں۔ پہلی تو یہ کہ عمران کا اندازہ شاید درست تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے کوئی چکر نہیں چلایا تھا بلکہ جلالی صاحب کی ہدایت کے مطابق آرا کوئے کو لے کر فارم ہاؤس سے بھاگی تھی۔ فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد اسے جلالی صاحب کی ازحد فکر رہی تھی اور ان کی بے ہوشی کا سننے کے بعد وہ بے حد غمزدہ ہوگئی تھی۔

دوسری بات یہ سامنے آئی تھی کہ جلالی صاحب کو فون کرنے میں ناکام ہونے کے بعد مہناز نے کسی اور کو فون کیا تھا اور اس نے مہناز کو جلالی صاحب کی خراب حالت کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ اطلاع دینے والی غالباً کوئی عورت تھی۔ یہ کون عورت تھی؟ یقیناً وہ فارم ہاؤس میں ہی تھی۔ لیکن اس نے پولیس تفتیش کے دوران میں یہ بات چھپائی تھی کہ اسے، جلالی صاحب کی بے ہوشی کے بعد ڈاکٹر مہناز کا فون آیا ہے۔ کیا یہ عورت ڈاکٹر مہناز کی ہم راز تھی؟ اگر وہ ہم راز تھی تو پھر یقیناً وہ مہناز کے موجودہ پتے ٹھکانے سے بھی واقف ہو سکتی تھی۔

میں اور عمران ایک بار پھر جلالی فارم ہاؤس پہنچے۔ اگلے دو تین روز ہم نے اسی کھوج میں گزارے کہ یہاں سے جانے کے بعد ڈاکٹر مہناز نے فون پر کس سے رابطہ کیا تھا۔ گینگ ریپ کا شکار ہونے والی زرینہ اور رخشی کے علاوہ مزید دس پندرہ عورتیں بھی جلالی کی رہائش گاہ میں موجود تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے، میرے فون پر نصرت کی کال آئی۔ میں اس وقت فارم ہاؤس کی چھت پر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ نصرت کی آواز میں ہلکی سی شوخی تھی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ بولی۔ ''تابش بھائی! میں خوش ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ یوسف بھائی خوش نہیں ہیں۔'' یوسف بھائی کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب سی تلخی سرایت کر جاتی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ وہ خوش نہیں ہے تو تم خوش ہو۔ وہ کیوں خوش نہیں ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''وہ اس لئے خوش نہیں ہیں کہ باجی ان سے خوش نہیں ہیں۔ باجی مسلسل میرے ساتھ اوپر والی منزل پر سو رہی ہیں۔ وہ کھانا بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی کھاتی ہیں۔ اس رویے کی وجہ سے یوسف بھائی بہت پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس بات کا اندازہ مجھے فنکشن والے روز ہی ہو گیا تھا کہ یوسف کو ثروت کی طرف سے وہ پذیرائی نہیں ملے گی جس کی وہ توقع کر رہا ہے۔''

نصرت بولی۔ ''باجی ثروت بالکل ٹھیک کر رہی ہیں...... بلکہ ابھی ''ٹھیک'' سے کچھ کم ہی کر رہی ہیں۔ عورت کو اپنی تفریح کا ذریعہ سمجھنے والوں کے ساتھ یہی رویہ ہونا چاہئے۔ کل بڑا مزہ آیا۔ حمیدن کی بڑی بیٹی شانو کی موج ہو گئی۔ جناب یوسف بھائی باجی کے لئے جو کپڑے لائے تھے، ان میں سے دو جوڑے باجی نے شانو کو عنایت کر دیئے اور کئے بھی یوسف بھائی کے سامنے ہی۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ بڑے مہنگے جوڑے تھے۔ پندرہ پندرہ ہزار سے کم کیا ہوں گے لیکن باجی کو کچھ چست تھے۔ باجی نے شانو کو دے دیئے۔ جناب یوسف تلملائے تو بہت ہوں گے لیکن موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے چپ رہے۔ آج بھی وہ مجھے اور باجی کو باہر بوفے ڈنر پر لے جانا چاہ رہے تھے لیکن باجی نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر ٹال دیا ہے۔ اب وہ منہ بنا کر اکیلے ہی چلے گئے ہیں۔ کسی دوست کو ساتھ لے گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نصرت! لیکن ایسا کب تک چلے گا؟ ظاہر ہے کہ ثروت اس کی قانونی بیوی ہے۔ وہ بھی اسے اپنا قانونی شوہر سمجھتی ہے۔ تم خود یہ کہتی ہو، وہ معافی تلافی کرنا بھی خوب جانتا ہے۔ جلد یا بدیر وہ ثروت کو منانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پھر وہی ہوگا جو وہ چاہتا ہے۔''

''آپ ہمیشہ مایوسی کی باتیں ہی کیوں کرتے ہیں؟ ایک طرف آپ مجھے ہمت دلاتے ہیں کہ میں مایوسی کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دوں، دلیری سے اپنی بیماری کا مقابلہ کروں۔ دوسری طرف خود ہمت ہارے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خدا کے لئے تابش بھائی! یہ آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ اپنے آپ کو اور اپنی محبت کو منوانے کا وقت ہے۔ آپ بڑے اچھے وقت میں...... ہاں، بڑے ہی اچھے وقت میں...... اس کہانی میں انٹر ہوئے ہیں۔ یہ بہت سنہری وقت ہے تابش بھائی! آپ کوشش کریں تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ جو کچھ ناممکن نظر آ رہا ہے، وہ بالکل ممکن ہو سکتا ہے۔''

’’لیکن نصرت...... وہ تو میری ہر بات کو الٹ لیتی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ میں بس اس کا گھر توڑنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کون سا گھر تابش بھائی! یہاں کوئی گھر نہیں ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ بس مطلب پرستی کی آگ ہے جس میں باجی کو بڑی ’’محبت‘‘ سے جھلسایا جا رہا ہے۔‘‘

’’لیکن وہ تو ایسا نہیں سمجھتی نا۔‘‘

’’وہ بھی سمجھنا شروع ہو گئی ہیں۔ جو کچھ میں آپ کو بتا رہی ہوں، اس سے کیا مطلب نکلتا ہے۔ کیا آپ سمجھ نہیں رہے یا پھر سمجھنا نہیں چاہ رہے؟‘‘ وہ ایک بار پھر جذباتی ہو رہی تھی۔ مجھے ریسٹورنٹ والا واقعہ یاد آ گیا جب اس کی طبیعت ایک دم خراب ہوئی تھی۔

میں نے موضوع بدل دیا اور کچھ دیر تک اس سے گفتگو کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد بھی ہم تین چار گھنٹے تک فارم ہاؤس میں رہے لیکن میرا ذہن مسلسل ثروت میں اٹکا رہا۔ میں اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہر بار اس کی سوچیں کلاوا کاٹ کر حملہ آور ہو جاتی تھیں۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم شیخوپورہ سے لاہور واپس آ گئے۔ راستے میں عمران نے تین چار خاص جگہوں پر گاڑی روکی اور اپنی جانی پہچانی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بڑی خاموشی سے بہت سے ضرورت مندوں کا وظیفہ لگا رکھا تھا وہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں تک پیسے پہنچاتا رہتا تھا...... وہ لوگ اس پر جان چھڑکتے تھے...... ہم راوی کے پل پر سے گزر رہے تھے جب عمران کے سیل فون پر راجا کے دوست ہوٹل اونر اشفاق رانا کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ راجا نے بازارِ حسن میں ایک پھڈا کر دیا ہے، ہم فوراً وہاں پہنچیں ورنہ وہ حوالہ پولیس ہو جائے گا۔

عمران نے راجا کو غائبانہ چند صلواتیں سنائیں اور پھر بازارِ حسن کی طرف رخ کر لیا۔ ہم زیادہ دور نہیں تھے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم اشفاق رانا کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے۔ گاڑی ہم نے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی کر دی تھی۔ رات ساڑھے نو دس کا وقت تھا۔ بازار کی رونق عروج پر تھی۔ ایک طرف زندہ دکانیں سجی ہوئی تھیں، دوسری طرف خریداروں کے پھیرے تھے۔ پکوانوں کی خوشبو، پھولوں کے ہار اور گجرے، چھنا چھن کی آوازیں اور فحش اشارے، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ ایک سہ منزلہ کوٹھے کے سامنے کئی افراد کھڑے نظر آئے۔ وہ بالائی کھڑکیوں کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک گارڈ نما شخص نے ہمیں روکا۔ عمران اسے بے پروائی سے دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں اس کے

پیچھے تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر پہنچے۔ یہاں کوٹھے والوں نے راجا کو ایک کمرے میں بند کیا ہوا تھا اور پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ راجا سخت نشے میں لگتا تھا، وہ اندر سے گالیاں بک رہا تھا۔ باہر سے نائیکا اور دیگر طوائفیں اس کے لتے لے رہی تھیں۔

پتا چلا کہ راجا یہاں گانا سننے آیا تھا۔ اس نے زیادہ مقدار میں پی لی اور پھر وہی ہوا جو اکثر ایسی جگہوں پر ہوتا ہے۔ اس نے ایک لڑکی کو گھسیٹ کر کمرے میں لے جانا چاہا۔ نائیکا نے راجا سے کہا۔ ’’یہ تمہاری بہن صرف گانا گاتی ہے، پیشہ نہیں کرتی۔ بھاگو یہاں سے۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’تم سب بکاؤ مال ہو۔ صرف قیمت بڑھانے کے لئے نخرے کرتی ہو......‘‘ اور یہ بات راجا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

تکرار بڑھ گئی تو راجا نے ایک دلال کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ اس کے بعد باقاعدہ ہنگامہ ہو گیا۔ چار چھ بندوں نے مل کر راجا کو گرایا اور کمرے میں بند کر دیا۔ راجا کا دوست اشفاق جو اس کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا، موقع کی نزاکت دیکھ کر کھسک گیا اور ہمیں فون کیا۔

اسی دوران میں نیچے سڑک سے پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز گونجی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک سب انسپکٹر اپنے چار پانچ اہلکاروں کے ساتھ دندناتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ وہ بہت طیش میں دکھائی دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نائیکا سے بات شروع کرتا، عمران اس کے قریب پہنچا اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کے کان میں کچھ کہتا ہوا اسے ایک طرف لے گیا۔ دو منٹ بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سیل فون کے ذریعے سب انسپکٹر کی بات کسی سے کروا رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ ایس پی حمزہ صاحب تھے۔ سب انسپکٹر ایک دم مؤدب نظر آنے لگا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں اور عمران کوٹھے سے نیچے اتر آئے...... اور کچھ آگے جا کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔

’’اب کیا ہو گا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کچھ بھی نہیں۔ نائیکا کو دو تین ہزار روپیا نذرانہ دینا پڑے گا سب انسپکٹر کو اور راجا صاحب کو بھی باعزت رہا کرنا پڑے گا۔ بھئی یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس...... اور جس کی بندوق اسی کا مویشی خانہ ہوتا ہے۔‘‘

عمران نے درست ہی کہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم نے راجا کو بڑے ٹھاٹ سے سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ پولیس والے اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور لے گئے۔ پروگرام کے مطابق بازار سے دور جا کر انہوں نے اسے چھوڑ دینا تھا۔ میں نے عمران سے کہا۔ ’’یار! اس کا کچھ کرو، نہیں تو یہ ہمیں کہیں بری طرح پھنسا دے گا۔‘‘

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جس کا اب تک کچھ نہیں ہو سکا، اب کیا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ یہاں وہی روپے خرچ کرنے آیا تھا جو اس نے ندیم کے بٹوے سے غائب کئے تھے۔“

عمران کے جواب دینے سے پہلے ہی میں بری طرح چونک گیا۔ میری نظر عمران کے ساتھی جیلانی پر پڑی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر ایک بارونق پان شاپ پر کھڑا پان لگوا رہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ جیلانی کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے، تمہارے سارے یار دوست اسی بازار میں گھومتے پھرتے ہیں؟“

عمران کے چہرے پر سنجیدگی طاری رہی۔ وہ بولا۔ ”اگر یہ جیلانی یہاں ہے تو پھر ضرور کوئی خاص بات ہے۔“

اچانک میری سمجھ میں عمران کی بات آ گئی۔ عمران کی ہدایت کے مطابق آج کل جیلانی، یوسف کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں جیلانی نے گھوم کر دیکھا تو اس کی نگاہ بھی ہماری گاڑی پر پڑ گئی۔ اس نے دھیان سے نمبر پلیٹ دیکھی۔ یقیناً وہ اس گاڑی کو پہچانتا تھا۔ وہ چونکا ہوا نظر آیا۔ تاہم وہ تذبذب میں تھا کہ گاڑی کی طرف آئے یا نہیں۔ عمران نے اس سے موبائل پر رابطہ کیا۔ ”ہیلو جیلانی! کیا عیاشی ہو رہی ہے؟“

”گاڑی میں آپ ہی ہیں؟“ جیلانی نے پوچھا۔

”بالکل، میں ہی ہوں بقلم خود...... آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“

چند سیکنڈ بعد جیلانی ٹہلتا ہوا ہماری گاڑی کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ الائچی سپاری پان کی خوشبو گاڑی میں پھیل گئی۔ جیلانی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ حیران لہجے میں بولا۔ ”آپ دونوں یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

عمران نے کہا۔ ”یہ بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم کچھ کہو۔“

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ”یوسف یہاں موجود ہے۔ ساتھ میں اس کا دوست ”فلم ایڈیٹر“ وسیم ہے۔ انہوں نے اپنی گاڑی ساتھ والی سڑک پر پارک کی ہے۔“

”کہاں گئے ہیں وہ؟“ عمران نے پوچھا۔

جیلانی نے گاڑی کے اندر سے ہی ایک شاندار پلازا نما بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دراصل ایک جدید کوٹھا یا چوبارہ تھا۔ سامنے دو تین گاڑیاں بھی کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ جیلانی نے کہا۔ ”یہ مشہور نائیکا شاہدہ بائی کا ڈیرا ہے۔ کہنے کو تو بس ناچ گانے کا کام ہی کرتی ہے

لیکن اندر خانے سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت تعلق اسٹوڈیو والوں سے بھی ہے۔ فلموں میں ایکسٹرا لڑکیاں بھی سپلائی کرتی ہے۔“

”یوسف یہاں کیا کرنے گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ ان گمراہ لوگوں کو نصیحت وغیرہ ہی کرنے گیا ہوگا۔“ عمران نے جھٹ کہا۔ ”انہیں بتانے گیا ہوگا کہ یہ اچھا دھندا نہیں ہے۔ اس سے باز آ جائیں اور اگر بہت ضروری ہے اور مجبوری ہے تو پھر اچھے لوگوں کے ساتھ کام کریں۔“

جیلانی نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ وسیم نامی لڑکا یوسف کو گھیر گھار کر یہاں لایا ہے اور اب یہ دونوں اوپر بیٹھے گانا سن رہے ہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”یہ گھیر گھار کر لانے والی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔ بھئی وہ عاقل بالغ بندہ ہے۔ اس کی اپنی مرضی ہے تو اس کے قدم اس ”بیوٹی کلینک“ میں پڑے ہیں نا۔“

ہمارے اردگرد لاہور کا بازارِ حسن اپنے پورے ہلارے میں تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ دودھیا قمقموں کی روشنی کے پس منظر میں گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ تھی۔ کھڑکیوں میں رنگین آنچل تھے اور گلی کوچوں میں بے شمار خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ جیسے کسی کمرے کا تعفن دور کرنے کے لئے اگربتیوں اور گلدستوں کا سہارا لیا گیا ہو۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ عمران نے کہا۔ ”یہ کافی امیر بندہ ہے۔ اس ”شوق“ کے لئے وہ کسی اس سے بہت اچھی جگہ پر بھی جا سکتا تھا۔ آج کل تو بہت سی فیشن ایبل آبادیوں اور اونچے ہوٹلوں میں بھی یہی کاروبار ہو رہا ہے......“

جیلانی نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ یہ لوگ یہاں گانا سننے نہیں، کسی اور کام سے آئے ہیں؟“

”یہ ہو بھی سکتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”لیکن آپ کا یہ خادم اندر تک ہو کے آیا ہے۔ وہاں پورا پورا فلمی سین ہے۔ باقاعدہ چاندنی بچھی ہے، گاؤ تکیے رکھے ہیں، سازندے براجمان ہیں۔ نائیکا پاندان، سیٹھ حضرات...... سارے لوازمات موجود ہیں۔ یہ دونوں صاحبان بھی بڑے سلیقے سے خاندانی نوابوں کی طرح بیٹھے ہیں۔“

......ہم تینوں قریباً آدھ گھنٹا مزید وہاں موجود رہے۔ پھر ہم نے چند تماش بین ٹائپ افراد کو زینے اترتے دیکھا۔ ان میں ہمیں یوسف بھی نظر آیا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر رات کو لگائے جانے والے گلاسز تھے۔ اس نے پی کیپ بھی پہن رکھی تھی۔

وہ ایک اونچا لمبا قبول صورت شخص تھا۔ بظاہر شریف النفس بھی نظر آتا تھا مگر آج ہم اس کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسا روپ جو شاید ثروت وغیرہ کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ تاہم ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہت کچھ سامنے آنا باقی تھا۔

یوسف اور وسیم نامی لمبے بالوں والا لڑکا ”بے فکروں“ کے انداز میں سگریٹ پھونکتے اور باتیں کرتے ایک گلی میں اوجھل ہو گئے۔ جیلانی ان کے پیچھے گیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آ کر اطلاع دی کہ دونوں قریبی سڑک سے اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں بس ناچ گانا دیکھنے ہی یہاں آئے تھے۔

عمران نے کہا۔ ”مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔ ایک کام کرتے ہیں۔“

”کیا؟“

عمران نے کچھ کہنے کے بجائے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس نے جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ محتاط طریقے سے یوسف اور لمبے بالوں والے وسیم کی نگرانی جاری رکھے۔ اس کے علاوہ رپورٹ بھی دیتا رہے۔ جیلانی ”او کے“ کہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کی طرف چلا گیا۔
عمران نے تیزی سے گاڑی موڑی اور رش میں سے چابک دستی کے ساتھ راستہ بناتا ہوا ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔

سڑکوں پر رش کم تھا۔ صرف آدھ گھنٹے میں ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ عمران نے کہا۔ ”مجھے ذرا اٹینشن ہونا ہے، مطلب ہے کہ ذرا اچھے والے کپڑے پہننے ہیں۔“

”تم کہیں شاربہ بائی کے کوٹھے پر جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہے ہو؟“

”سمجھ دار ہوتے جا رہے ہو لیکن رفتار سست ہے۔“ عمران نے کہا۔

”میں تو نہیں جا رہا۔“

”تم کیوں نہیں جا رہے؟ بھئی ہر بڑے آدمی کے ساتھ ایک اسسٹنٹ یا سیکرٹری ٹائپ کا بندہ تو ہوتا ہے نا۔ اور تم ماشاءاللہ صورت سے بھی اس کردار کے لئے بالکل فٹ ہو۔ لباس بھی تمہارا ٹھیک ہی ہے۔ بلکہ ٹھیک سے بھی کچھ کم ہی ہے۔“

”ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔“

”غلط فہمی، ضرورت کے مطابق ہو ہی نہیں سکتی...... اچھا مجھے صرف دس منٹ دو، میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔ تم اپنے بالوں کو تھوڑا سا اور تتر بتر کر لو، ایسے لگے کہ کسی سے چھانپڑ کھائے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے اپنے کمرے میں اوجھل ہو گیا۔

اب رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ عاطف، فرح اور زری سمیت تقریباً سب ہی سو چکے تھے۔ کسی کو ہماری آمد کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈا پانی وغیرہ پیا۔ میری پسندیدہ آئس کریم جو فرح نے شاید میرے ہی لئے فریزر کے ایک کونے میں چھپائی ہوئی تھی، میرے کام آ گئی۔

کچھ دیر بعد عمران کمرے سے باہر آ گیا۔ میں دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ وہ کافی حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہ نہایت قیمتی کپڑے کی شلوار قمیص میں تھا۔ اوپر عمدہ تراش کی واسکٹ تھی۔ کلائی میں ڈھائی تین لاکھ والی راڈو گھڑی [illegible] نئے ماڈل کا [illegible] سیل فون، جیسا کہ بعد میں پتا چلا [illegible] تھا۔ عمران میں خوشبو [illegible] بسا ہوا تھا۔ وہ ویسے بھی زبردست مردانہ کشش رکھتا تھا، بن سنور کر اور بھی نکھر آیا تھا۔

”یہ کس پر بجلی گرانے کا ارادہ ہے؟“ میں نے کہا۔

”ارادہ کوئی نہیں۔ جو بھی سامنے آ جائے۔ [illegible] شرط ہے کہ جوان ہو اور فیمیل ہو۔“

ایک دم وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے کوریڈور کے سرے پر شاہین کھڑی تھی اور تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ [illegible]

شاہین دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی ہمارے [illegible] آ گئی۔ اس نے سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور بال ربن میں بندھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ سونے کی تیاری میں تھی لیکن ہماری آمد کے بعد بستر پر نہیں گئی تھی۔

وہ عمران کی آنکھوں میں جھانک کر نہایت چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”رات کے بارہ بجے اس طرح بن ٹھن کر اور خوشبو میں نہا کر کہاں کا ارادہ ہے؟“

”بس ایک ضروری کام ہے یار۔“

”ظاہر ہے ضروری کام ہی ہوگا، ورنہ اس وقت تم کسی عالم دین کا درس سننے تو نہیں جا رہے۔“

”دراصل ایک لڑکی کو چکر دینا ہے۔ وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہے۔“

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ”مجھے پتا ہے وہ لڑکی میں ہی ہوں۔ مجھے ہی چکر دیا جا رہا ہے اور میں ہی غلط فہمی کا شکار ہوں۔“

”نہیں یار! میں تو...... نرگس کی بات کر رہا ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ ریما کے سوا اس کا کوئی رقیب ہے ہی نہیں۔ اور ریما جی کو وہ کافی حد تک برداشت کرنا شروع ہو گئی ہے۔ ریما جی آج کل ملک سے باہر ہیں۔ اب ذرا سوچو، میں اس طرح رات کے بارہ ایک بجے بن ٹھن کر

انداز میں عمران کی دائیں جانب بیٹھ گیا۔اقبال گارڈ کی حیثیت سے ایک طرف کھڑا رہا۔

یہاں خوب صورت لڑکیوں کی جھلک نظر آ رہی تھی اور ان کے تھکے تھکے سے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔وہسکی اور روسٹ گوشت کی ہلکی سی بُو سارے ہال میں چکرا رہی تھی۔

نائیکا شاربہ بائی اور عمران میں چند رسمی باتیں ہوئیں۔ان باتوں میں عمران نے شاربہ بائی کو بتایا کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے مگر یہاں اس کوٹھے پر پہلی بار آیا ہے۔اس نے خود کو زمیندار شو کیا جس کی شیخوپورہ کے نواح میں کوئی تیس مربع نہری زمین تھی،اس کے علاوہ ''کار ڈیلنگ'' کا کاروبار بھی دو تین شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔

شاربہ بائی بہت گھاگ تھی تاہم مرعوب نظر آنے لگی۔کچھ دیر بعد شاربہ کے اشارے پر تین سجی سنوری لڑکیاں ہال میں داخل ہوئیں اور فرش پر بچھی چاندنی پر آ بیٹھیں۔ان تینوں نے باقاعدہ گھنگرو باندھ رکھے تھے اور ایک دوسری سے چہلیں کر رہی تھیں۔انداز یہی تھا کہ پسند کرو ہمیں۔ہماری قیمت ادا کرو اور آج شب کے لئے ہماری ساری جملہ خدمات حاصل کر لو۔

اپنی ''منہ دکھائی'' کے بعد وہ چلی گئیں۔عمران نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تو ایک اور لڑکی آ گئی۔یہ ان تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔عمر بھی بس اکیس بائیس سال رہی ہو گی۔اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس انداز سے بیٹھی تھی کہ اس کے تراشے ہوئے جسم کی ہر خوبی نمایاں تر ہو گئی تھی۔یوں لگ رہا تھا جیسے خریدار کا نخرہ دیکھتے ہوئے دکاندار نے اپنا بہترین مال سامنے رکھ دیا ہو۔

نائیکا شاربہ نے بھویں اچکا کر کہا۔''ابھی نئی نئی کام میں آئی ہے۔دوڈھائی مہینے ہوئے ہیں ''نتھ اتروائی'' کو......ڈانس میں تو لکھنؤ والیوں کو بھی مات دیتی ہے۔''

عمران نے تعریفی انداز میں سر ہلایا لیکن کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔اس کے بعد شاربہ بائی نے یکے بعد دیگرے دو اور لڑکیاں سامنے کیں۔ان میں سے ایک بہت گوری چٹی تھی لیکن نقش عام سے تھے،ایک خوب صورت لیکن عمر میں بڑی تھی۔

عمران نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔''میں نے تو آپ کا بڑا چرچا شرچا سنا تھا...... پر......طبیعت کچھ جم نہیں رہی ہے۔''

میں نے کہا۔''بائی جی......یہ کوئی عام بندہ نہیں ہے،چودھری عمران صاحب شیخوپورہ والے آپ کے پاس آئے ہیں،کوئی ایسا مال دکھائیں جو کھرا باندھ کر رکھا ہوا ہے۔''

''اچھا ایک بار وہ پہلے والی کا رقص تو دیکھ لیجئے۔''نائیکا نے کاروباری لہجے میں کہا۔اس

کا اشارہ دوسرے نمبر پر آنے والی لڑکی کی طرف تھا۔

عمران نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا پھر بھی نائیکا شاربہ بائی نے مسکراتے ہوئے سازندوں کو اشارہ کیا۔انہوں نے ساز چھیڑ دیئے۔انڈیا کا کوئی فلمی گیت تھا۔لڑکی آئی۔اس نے جھک کر ''مجرا'' پیش کیا اور پھر گانے کی لے پر رقص کرنے لگی وہ واقعی اپنے فن میں ماہر تھی۔جسم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی محسوس ہوتی تھی۔اس کے باوجود عمران کے چہرے پر کسی خاص پسندیدگی کے تاثرات نظر نہیں آئے۔اس نے جیسے طے کیا ہوا تھا کہ شاربہ بائی کو مایوس ہی کرنا ہے۔بہرحال رقاصہ کی حوصلہ افزائی کے لئے عمران نے دو تین بار جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی فراخ دلی سے کرنسی نوٹ اس پر لٹائے۔یہ ہزار ہزار کے نئے نوٹ تھے۔عمران نے پلک جھپکتے میں ڈیڑھ دو لاکھ روپیا لٹا ڈالا۔شاربہ بائی کی آنکھیں کھل گئیں۔وہ کچھ اور بھی مرعوب دکھائی دی۔

یہ وہی رقم تھی جو عمران نے ریان ولیم سے چند دن پہلے وصول کی تھی تاکہ نصرت کو آسٹریا بھجوائی جا سکے۔بعدازاں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ اسپتال کا بل یوسف فاروقی نے پہلے ہی چکتا کر دیا تھا۔اب یہ رقم اس بالا خانے میں کام آ رہی تھی۔

رقص کے بعد عمران اٹھنے کے لئے تیار نظر آنے لگا۔نائیکا شاربہ بائی بےقرار نظر آئی۔وہ عمران سے کھسر پھسر کرنے لگیں چند سیکنڈ بعد اس نے سازندوں کو اشارہ کیا۔وہ جو بڑی مستعدی سے نوٹ سمیٹ رہے تھے،اشارہ پا کر باہر نکل گئے۔دو ملازمائیں بھی باہر چلی گئیں۔عمران نے چودھریانہ انداز میں اپنے ''گارڈ'' یعنی اقبال کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اب ہال کمرے میں شاربہ بائی کے ساتھ بس میں اور عمران تھے۔شاربہ بائی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا،عمران نے جلدی سے کہا۔''نہیں......یہ یہیں رہے گا،اس سے کوئی پردہ نہیں۔''

شاربہ بائی نے دو چار فقروں میں تمہید باندھی۔اس کے بعد رازداری کے لہجے میں بولی۔''ایک زبردست ''پیس'' ہے۔آپ کی شان کے مطابق۔طبیعت خوش ہو جائے گی۔ایسا موقع قسمت ہی سے ملتا ہے۔''

''موقع؟''عمران کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں،چودھری صاحب!موقع ہی سمجھو۔اس بازار کی چڑیاں جب کسی اونچے مقام پر پہنچ جاتی ہیں نا تو پھر ان کو عقاب کے پَر لگ جاتے ہیں۔آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں

آتیں۔ بڑا اونچا لیول ہو جاتا ہے ان کا۔ یہ تو مجبوری ہے جس میں یہ عقاب کے پروں والی چڑیا پھنسی ہوئی ہے۔ کچھ پیسے تو خرچ ہوں گے آپ کے پر جی خوش ہو جائے گا۔''

''تم تو بجھارتیں بجھوار ہی ہو آنٹی۔'' عمران نے کہا۔

وہ دبے دبے جوش کے ساتھ مسکرائی۔ دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک سائیڈ بورڈ کے اندر سے ایک فلمی میگزین نکال کر ہمیں دکھایا۔ میگزین کے بیک ٹائٹل پر ایک جواں سال پاکستانی ہیروئن کی تصویر تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے کافی نام کمایا تھا۔ شروع شروع میں اردو فلموں میں آئی...... پھر پنجابی فلموں کی طرف رخ کیا اور قسمت نے ایسی یاوری کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے صف اوّل کی ہیروئنوں میں شامل ہو گئی۔ اپنے معصومانہ نقوش اور رقص میں مہارت کے سبب یہ بے شمار دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ اب کچھ عرصے سے فلموں کے مجموعی حالات کے سبب اس کی مارکیٹ ویلیو میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اسے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

''اسے پہچانا آپ نے؟'' نائیکا شاربہ بائی نے پوچھا۔

''اسے کون نہیں پہچانتا لیکن...... بات کیا ہے؟'' عمران نے کہا۔

''چودھری صاحب! میں اس کی مجبوری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ آپ کو مل سکتی ہے، اگر آپ کچھ پیسے خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو۔''

''تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟'' عمران کے لہجے میں ہلکا سا جوش تھا۔

''نہیں، مذاق والی کوئی بات نہیں۔''

''لیکن...... لیکن تمہارے ساتھ اس کا لنک کیسے ہو گیا؟''

نائیکا شاربہ بائی نے ذرا فخریہ انداز میں کہا۔ ''اپنے بازار کا ہیرا ہے۔ ہمارے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ اب بھی ملتی ہے تو گھٹنوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ جن بچیوں کو اس طرح ترقی ملتی ہے، ان میں کچھ نہ کچھ گن تو ہوتا ہے نا پھر۔''

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا۔''

شاربہ بائی نے دائیں بائیں دیکھا پھر ایک گاؤ تکیے کے نیچے سے کچھ دن پرانا ایک اخبار نکال کر عمران کے سامنے کیا۔ اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی اشتہار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھیں جی۔''

عمران نے پڑھنا شروع کیا۔ گردن ٹیڑھی کر کے میں نے بھی اشتہار پر نگاہ ڈالی۔ متن کچھ اس طرح تھا۔ ''جوہر ٹاؤن میں دو کنال کی کوٹھی۔ نئی بنی ہوئی۔ 80 فٹ سڑک......

پارک کے سامنے۔ مالک ضرورت مند۔ فوری فروخت، نہایت مناسب قیمت۔''

نیچے فون نمبرز وغیرہ لکھے تھے۔

شاربہ بائی نے کہا۔ ''یہ چندو کی کوٹھی ہے (مشہور پاکستانی ہیروئن کا گھریلو نام)۔ ابھی دو سال پہلے بڑے چاؤ سے بنوائی تھی اس نے۔ چار کروڑ سے کم قیمت نہیں ہے اس کی۔ لیکن اب مجبوری کی وجہ سے تین بلکہ اس سے بھی کم پر دینے کو تیار تھی۔ پر اللہ کی مرضی ہے کوئی ڈھنگ کا گاہک ہی نہیں مل رہا۔ ویسے بھی علاقے میں پراپرٹی کا کام بڑا مندا جا رہا ہے۔''

''پر مجبوری کیا ہے اسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ان کاروباری لوگوں کو سو طرح کی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ چندو کو بیٹھے بٹھائے اپنی فلم بنانے کا شوق چرایا تھا۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ کافی سارا روپیا خرچ کر دیا اس نے، پر فلم بیٹھ گئی۔ کافی سارا نقصان ہوا۔ اب وہی نقصان پورا نہیں ہو رہا۔ قرض والے سر پر چڑھے ہوئے ہیں، کچھ قرض بینک سے بھی ہے۔ میں نے کہا ہے نا کہ مجبوری ہے ورنہ اس بازار کی چڑیاں جب اونچا اڑنے لگتی ہیں تو پھر ہاتھ نہیں آتیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ......'' عمران نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں، اسے کوئی ڈیڑھ کروڑ روپے کی فوری ضرورت ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی اکیلا بندہ تو نہیں دے سکتا۔ اس نے خاص خاص گاہکوں کے لئے اپنا تھوڑا سا ٹائم بیچا ہے۔''

شاربہ بائی نے 'ٹائم' کے لفظ پر ماہرانہ زور دیا۔

عمران تھوڑی دیر تک اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا پھر ذرا رنگ بازی کے انداز میں بولا۔ ''کیا بھاؤ نکالا ہے چندو جی نے ٹائم کا؟''

شاربہ بائی نے پان کی گلوری عمران کو پیش کی اور ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر کے بولی۔ ''دس لاکھ ایک رات کے لئے...... ہفتے کی بکنگ ہو تو چالیس۔''

''کچھ زیادہ ہیں آنٹی۔''

''چودھری جی! یہ بھی تو دیکھو کہ کس کے لئے دے رہے ہو۔ جس کی جھلک دیکھنے کے لئے لوگ اسٹوڈیو کے دروازے پر دھکے کھاتے ہیں۔''

عمران کچھ دیر تک غور و فکر کے انداز میں خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''اگر ہفتے کی بکنگ ہو تو کہیں باہر بھی جا سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ بھوربن وغیرہ...... یا پھر دبئی شوبئی؟''

''نہیں...... اس میں دو چار شرطیں ہیں اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ چندو کہیں جائے گی نہیں اور جگہ بھی اس کی مرضی کے مطابق ہو گی۔''

عمران خود کو پُر جوش ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ گاہے بگاہے میگزین کے بیک ٹائٹل کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔

اس حوالے سے شاربہ بائی اور عمران میں دس پندرہ منٹ تک مزید رازدارانہ بات چیت ہوئی۔ کچھ ضروری امور طے ہوئے۔ شاربہ بائی نے کھلے ڈلے انداز سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے عمران کو بتایا کہ اگلے چھ سات دن میں چندو کی دو بکنگز اور ہیں تیسری بکنگ اس کی ہو سکتی ہے۔

عمران نے کہا۔ ''میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں آنٹی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ کیا اس معاملے میں کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟''

وہ ذرا گردن اکڑا کر بولی۔ ''چودھری صاحب! آپ پہلی بار میرے پاس آئے ہیں اس لئے اتنے سوال پوچھ رہے ہیں۔ جب پھر آئیں گے تو کچھ نہیں پوچھیں گے، بس پیسے نکال کر رکھ دیں گے۔ اس بازار میں میرا ایک نام ہے۔ ایک ساکھ ہے۔ ہم زبان سے پھرنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

عمران نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے آنٹی! میں کل شام تک اپنے بندے کے ہاتھ دو لاکھ ایڈوانس بھیج دوں گا۔''

''نہیں نہیں چودھری! اس کی بھی لوڑ نہیں۔ جب دو 'شریف' بندوں کے درمیان زبان ہو گئی تو بس ہو گئی۔'' اس نے رسماً کہا لیکن یقینی بات تھی کہ وہ ایڈوانس رقم کی خواہش رکھتی تھی۔

اب ہمیں اس سوال کا جواب ملنا شروع ہو گیا تھا کہ یوسف فاروقی جیسا ''ہائی جینٹری'' کا بندہ اس عام سے کوٹھے پر کیوں آیا تھا۔ اس کے ساتھ فلم لائن کا وسیم احمد تھا۔ ان دونوں کو ان درمیانی شکل و صورت والی لڑکیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ ناچ گانے میں بھی کوئی بہت اونچا معیار نہیں رکھتی تھیں۔ یوسف فاروقی اور وسیم کی یہاں آمد کی وجہ کچھ اور تھی اور یہ یقیناً وہی وجہ تھی جو ابھی ہمارے سامنے آئی تھی۔ یہاں انہیں کوئی بہت خاص الخاص مال مل سکتا تھا۔ فلمی دنیا کا ایک ایسا ستارہ جسے عام لوگ اسکرین پر دیکھنے کے لئے بھی دھکے کھاتے تھے۔

ہم شاربہ بائی کے بالاخانے کی مرمریں سیڑھیاں اترنے کے بعد اپنی لینڈ کروزر میں آ بیٹھے۔ ایک نشئی مست ہو کر بیچ بازار میں ناچ رہا تھا اور کھڑکیوں میں سے چند ہیجڑے اس پر آوازیں کس رہے تھے۔ چوباروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور بالکونیوں میں

بنت حوا...... راہگیروں کو رُجھا رہی تھی۔ میں نے مذاقاً کہا۔ ''یار دیکھنا! یہ ناچنے والا کہیں راجا ہی تو نہیں۔''

اقبال بولا۔ ''نہیں، آج اسے کافی سبق مل گیا ہے۔''

عمران بولا۔ ''یہ تمہاری غلط فہمی ہے یارو...... جو سبق حاصل کر لے وہ راجا ہو ہی نہیں سکتا۔''

ہم ناچنے والے ادھیڑ عمر شخص کے قریب سے ہوتے ہوئے بڑی سڑک کی طرف آ گئے۔ یوں لگا جیسے ایک دم تازہ اور پاکیزہ ہوا پھیپھڑوں میں گھسی ہے۔

○......❖......○

''یہ کیا چکر چل رہا ہے یار! لگتا تو نہیں کہ شاربہ بائی جھوٹ بولے گی۔'' میں نے کہا۔

''گناہ کے اکثر کام بڑی نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔'' عمران نے فلسفہ بگھارا اور پھر اپنا ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا جب جیلانی کے محلے میں ایک چور مسجد سے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ چرانے کی نیت سے داخل ہوا۔ اس نے مؤذن کے سر پر چوٹ لگائی اور باندھ کر حجرے میں ڈال دیا۔ جب وہ سامان سمیٹ کر جانے لگا تو فجر کی اذان کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس نے مسروقہ لاؤڈ اسپیکر سے پہلے باقاعدہ اذان دی، اس کے بعد غائب ہوا۔

میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یوسف فاروقی اپنے مقام سے بہت گرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آج رات ایک ایسی جگہ پر پایا گیا تھا جس کے بارے میں ثروت شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے مجازی خدا کا درجہ دیتی تھی اور یہ مجازی خدا خود ہوس کے کوچے میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی ثروت کا نمبر ملاؤں اور اس سے وہی زبان بولنے لگوں جو نصرت اس سے بولتی تھی۔ اسے بتاؤں کہ وہ پیتل کو سونا سمجھ رہی ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ اپنی زندگی ایک ایسے شخص کے لئے خراب کر رہی ہے جو بگڑے امیرزادوں والی ہر برائی اپنے اندر...... رکھتا ہے۔

لیکن کیا واقعی صورتِ حال وہی تھی جو ہم نے آج محسوس کی تھی؟ کیا واقعی یوسف اس بازارِ حسن میں ایک خریدار بن کر آیا تھا؟ یا پھر یہ کوئی اور چکر تھا، اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی؟ میں جلد بازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ثروت کی اس نگاہِ ملامت کا خوف تھا جو یوسف کی بدنامی کے حوالے سے مجھ پر پڑتی۔ میں اس نگاہ کا شکار ہو جاتا تو پاتال سے زیادہ گہرائی میں جا گرتا۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہ آتا، میں نصرت سے بھی اس اہم واقعے کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی ڈیفنس والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ ہم احتیاطاً کوٹھی سے ایک بلاک پہلے ہی اتر گئے۔ ہم اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔ باقی کا فاصلہ پیدل طے کیا جاتا تھا۔ اس رات کی جانے والی اس احتیاط نے ہمیں بہت فائدہ دیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ امتیاز اور اقبال لینڈ کروزر لے کر واپس چلے گئے۔ کوٹھی جا کر عمران نے بستر پر جست لگا دی۔ میں حسبِ معمول فرش پر لیٹا۔ جسم تھکن سے چُور تھا۔ ہم نے صورتِ حال پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا اور سو گئے۔

دس بجے کے قریب عمران نے مجھے جگایا۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم راجا کی خبر لینے نکل گئے۔ وہ ہوٹل لالہ زار میں ہی تھا اور رات کی مارکٹائی کے بعد اس کا خراب حلیہ مزید خراب ہو گیا تھا۔ ہم ہوٹل پہنچے تو وہ کمرے میں ہی لیٹا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھ کے نیچے بھی ایک گومڑ نمودار ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ اور گھٹنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ تاہم ان چوٹوں کی اسے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ عمران نے بروقت اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے مکھن کے بال کی طرح نکال لیا تھا۔ اب وہ اس بات کا پکا فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ بازارِ حسن کی اس لڑکی کا غرور ضرور توڑے گا جس نے اس کی پیشکش کو ٹھکرایا ہے اور اس کی درگت بنوائی ہے۔ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے اب وہ بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا موڈ درست تھا اور جب موڈ درست ہوتا تھا تو وہ بے تکان بولتا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''بھا راجا! مار کھانے کے بعد تو تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔''

وہ بولا۔ ''تم نے بالکل کنڈم مثال دی ہے۔ قینچی کی طرح زنانیوں کی زبان چلتی ہے۔''

''چلو قینچی کی جگہ خنجر کا لفظ لگا دیتے ہیں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے اور یہ خنجر کل یا پرسوں پھر اسی کوٹھے پر جا کر چلے گا۔ ایک ایک کی بولتی بند نہ کر دوں تو نام راجا نہیں......'' پھر بات کرتے کرتے وہ ذرا سا چونکا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ہاں، ایک بات یاد آئی۔ پرسوں رات کو تم دونوں کسی خنجر کی بات کر رہے تھے۔ کوئی قیمتی چاقو یا خنجر تھا، گینڈے کی ہڈی کے دستے والا جو وہاں شیخوپورہ والی کوٹھی میں رہ گیا تھا۔''

''وہ بڑا خاص خنجر تھا بھا راجا۔'' عمران نے کہا۔ ''تابش نے اس خنجر سے انڈیا میں ایک بہت بڑے ڈان کا پیٹ پھاڑا تھا لیکن تم نے اس کا ذکر کیوں کیا ہے؟''

''مجھے پتا ہے اب وہ خنجر کس کے پاس ہے؟'' راجا نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

''کس کے پاس ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اسی کوٹھی میں سلطان چٹے کے ایک چمچے کے پاس دیکھا تھا......اور میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی اسی کے پاس ہوگا۔''

''کیا نام ہے اس کا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نام شام کا تو مجھے پتا نئیں۔ پر شکل دیکھتے ہی فوراً پہچان لوں گا کتے کے تخم کو۔''

عمران نے کہا۔ ''تمہیں کیسے یقین ہے، کہ یہ وہی خنجر ہے؟''

''مچھلی کی طرح دستہ ہے نا اس کا۔ کناروں سے سفید اندر سے کالا۔ ایک طرف لال رنگ کا نگ بھی لگا ہوا ہے۔''

''نشانیاں تو تم بالکل ٹھیک بتا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن کیسے؟''

''بس یار! یہ چھوڑو نا مجھ پر۔ ایک بندے کو پیچھے لگاتا ہوں۔ تھوڑا سا مال پانی خرچ کرنا پڑے گا۔ پر کوئی گل نئیں، میں کر لوں گا۔ بندے کا پتا لگ گیا تو پھر اس کا پیٹ پھاڑ کر بھی نکال لوں گا اپنی چیز۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن عمران نے آنکھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ وہ راجا کا رمز شناس تھا۔ اس کے ذہن کی گتھیوں کو سمجھتا تھا۔

''کچھ دیر بعد جب راجا کسی کام سے باہر گیا تو عمران نے ہولے سے کہا۔ ''جگر! مجھے لگتا ہے کہ تیرا کام بن گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''پہلے وعدہ کرو کہ ابھی بات اپنے تک ہی رکھو گے۔''

میں نے فوراً وعدہ کر لیا۔ وہ دیدے گھما کر بولا۔ ''مجھے شک ہے کہ خنجر راجا کے پاس ہے یا اس کے پاس پہنچ چکا ہے۔''

''ہائیں۔''

''یہ بڑی گڑبڑ شے ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں۔'' عمران نے کہا۔ ساتھ ساتھ اس کی نظریں تیزی سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اچھا تم ایسا کرو کمرے سے نکل کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب راجا کوریڈور کے سرے پر نظر آئے تو زور سے کھانس کر مجھے اشارہ دے دینا......اس طرح۔'' عمران نے مجھے کھانس کر دکھایا۔

میں کوریڈور میں کھڑا ہو گیا۔ عمران تیزی اور چابک دستی سے راجا کے کمرے کی تلاشی

لینے لگا۔ جلد ہی اس نے جوشیلے انداز میں مجھے پکارا۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر کمرے میں جھانکا۔ ایک الماری کے اندرونی خانے میں پرانے اخباروں کے نیچے جو شے نظر آ رہی تھی، یہ وہی یادگار خنجر تھا جس کے بے مثال پھل نے بھانڈیل میں جارج گورا کے پیٹ کی سیر کی تھی۔ اس چاقو نما خنجر سے، مجھے ایک خصوصی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔

مجھے خنجر کی جھلک دکھانے کے بعد عمران نے اسے فوراً تہ شدہ اخباروں سے ڈھک دیا اور خانے کو بند کر کے الماری کے پٹ بھیڑ دیئے۔ میں خوشی آمیز حیرت محسوس کرتا ہوا کمرے میں واپس آ گیا۔ راجا کے گُن سامنے آ رہے تھے۔ عمران نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ چاقو راجا کے پاس کیسے پہنچا؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے کیا پتا؟ تمہارا ہی یار ہے۔''

''لیکن اس آسمانی تحفے کو ڈھونڈ کر تو تم ہی لائے ہو نا۔'' عمران نے کہا اور چند لمحے توقف کر کے بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ چاقو ندیم کی تلاشی میں برآمد ہونے والی چیزوں میں ہی موجود تھا۔ راجا نے آٹھ ہزار روپے کی طرح اس چاقو کے بارے میں بھی ہمیں نہیں بتایا۔ اب اسے پتا چلا ہے کہ یہ چاقو تو تمہارے لئے بہت اہم ہے اور تم اس کی گمشدگی پر پریشان ہو۔ اب وہ ہم سے اس کے پیسے کھرے کرنا چاہ رہا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ ہمیں بہت سستے میں مل جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار روپیا۔ یہ اس کی اصل قیمت کا سواں حصہ بھی نہیں ہے۔''

''لیکن کیا یہ پیسے دینے ضروری ہیں؟''

''نہیں، راجا سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ یہ جیسا بھی ہے لیکن ہے کام کا بندہ۔ تم دیکھتے رہنا۔''

اس گفتگو کے دوران میں ہی میری نظر کچھ اشیاء پر پڑی۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو چند دن پہلے ندیم سے برآمد ہوئی تھیں۔ دو چار رسیدیں، ایک قلم، ایک لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، ساٹھ ہزار کا کراس چیک اور چار پانچ سو کیش۔ ابھی کچھ دیر پہلے الماری کی تلاشی کے دوران میں عمران نے یہ اشیاء سامنے والی دراز سے نکالی تھیں۔ میں یونہی الٹ پلٹ کر ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک ایک مڑے تڑے وزیٹنگ کارڈ نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔ میوزک اینڈ ڈانس اکیڈمی۔ شام کی ریگولر کلاسز۔ بہترین ماحول۔ زیرِ سرپرستی مسز شاربہ غیاث۔ نیچے جو ایڈریس تھا وہ میرا جانا پہچانا تھا۔ یہ بازارِ حسن کے اسی کوٹھے کا تھا جہاں ہماری ملاقات نائیکا شاربہ بائی سے ہو چکی تھی۔

میں نے یہ کارڈ عمران کو دکھایا۔ اس کی پیشانی پر بھی سوچ کی لکیریں پھیل گئیں اور آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی۔

چند ہی منٹ میں ہم ایک انکشاف انگیز نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ اس بات کے واضح اشارے مل رہے تھے کہ شاربہ بائی اور جاوا گروپ کے لوگوں میں تعلق ہے۔ جاوا کا تعلق بھی فلم لائن سے تھا، دوسری طرف شاربہ بائی بھی فلمی اداکاراؤں سے رابطوں کا دعویٰ کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یار! یہ کہیں وہی ڈبل گیم تو نہیں جو ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہی ''ہم شکلی'' والا چکر۔ جاوا کے لوگ مشہور فلمی چہروں کی نقلیں جمع کر رہے ہیں۔ دو تین انڈین اداکاراؤں کی زبردست کاپیاں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار پاکستانی اداکاراؤں کے ڈپلی کیٹ بھی ان لوگوں کو مل چکے ہوں۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔'' عمران نے پُرجوش انداز میں سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا تو یہ مطلب بھی ہے کہ کل شاربہ بائی نے تم سے جو سودا کیا ہے وہ بھی کسی ''ڈمی'' لڑکی کے لئے ہوگا۔ کوئی ایسی لڑکی جو بہت حد تک ہماری فلمی ہیروئن سے مشابہ ہوگی۔ ایسے لوگوں کے لئے اس قسم کے کھیل کھیلنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مہینا ڈیڑھ مہینا پہلے میں نے ایک اردو روزنامے میں اشتہار دیکھا۔ کچھ اس طرح کا مضمون تھا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی صورت کسی مشہور اداکار یا اداکارہ یا کسی ''سیلیبریٹی'' سے ملتی ہے تو ہم سے رجوع کریں۔ ہمارے پاس آپ کے لئے اچھی آفرز ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کے اشتہارات سے کوئی شخص بھی مشہور چہروں سے ملتے جلتے چہرے اکٹھے کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان درجنوں چہروں میں سے کوئی ایک آدھ چہرہ ایسا بھی ہو جو واقعی حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہو۔ اور جب یہ کام وسیع پیمانے پر کیا جائے تو پھر مشابہ چہرہ ملنا اور بھی ممکن ہو جاتا ہے۔''

''یہ تو بڑا زبردست گیم لگ رہا ہے۔ مشہور لوگوں سے ملتے جلتے لوگ اکٹھے کرو اور پھر انہیں مختلف کاموں کے لئے استعمال کرو۔''

''بالکل، مجھے ایک عریاں فلم یاد آ رہی ہے۔ عریاں فلمیں دیکھنے والوں میں وہ کافی مقبول ہوئی تھی۔ تماش بین طبقے نے اس فلم کو ایک مشہور اداکارہ کی فلم سمجھ کر دیکھا تھا اور دانتوں میں انگلیاں دبائی تھیں۔ لیکن بعض لوگ پورے یقین سے کہتے ہیں کہ وہ اس اداکارہ

کی نہیں بلکہ اس کی ہم شکل کی فلم تھی۔''

''میرے خیال میں تو اس طرح مشہور لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے بلیک میل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یعنی خرابی بسیار کے بہت سے طریقے موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن...... تمہارا کیا اندازہ ہے عمران...... اخبار میں کوٹھی کی ''فوری فروخت کا'' وہ اشتہار بھی ڈمی تھا؟''

''یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ڈیڑھ دو ہزار خرچ کر کے کوئی بھی ایسا ایڈ دے سکتا ہے۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ عمران موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے جگر! کیا یوسف فاروقی واقعی مشہور فلمی ہیروئن کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لئے شاربہ بائی کے ڈیرے پر پہنچا ہے؟''

''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ یوسف کی یاری لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف کا غم غلط کرنے کے لئے اس نے یوسف کو یہ انوکھی راہ دکھائی ہو۔''

''غم غلط سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا وہی ثروت والا معاملہ؟''

''ہاں، نصرت جو کچھ بتا رہی ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ گھر میں تناؤ ہے۔ ثروت اوپر کی منزل پر نصرت کے ساتھ سوتی ہے۔ میاں بیوی آپس میں بس ضروری بات چیت کرتے ہیں۔''

''اپنے آپ کو بڑے ہلکے کردار کا ثابت کر رہا ہے یہ بندہ۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن ابھی تک ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی تو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ویسا نہ ہو جیسا ہم سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ کئی شوہر اپنی بیویوں کو ''راہِ راست'' پر لانے کے لئے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ بیوی، شوہر کو غلط ماحول سے بچانے کے لئے اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی ہے۔''

اسی دوران میں راجا واپس آ گیا۔ وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یہ رات والی مار ماری کا نتیجہ تھا۔ عمران نے پکا منہ بنا کر کہا۔ ''یار بھا راجا! تم ایک دو دن میں وہ چاقو یا خنجر جو بھی ہے تابی کو لا دو، ورنہ یہ سوکھ کر کانٹا ہو جائے گا۔ لیکن ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر، کہیں کوئی اور پھڈا کھڑا نہ کر دینا۔''

''اوئے عمو...... میں خود تھوڑا جاؤں گا اوکھلی میں سر دینے کے لئے۔ ایک کرائے کے بندے کو بھیجوں گا۔ تُو فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا...... ایک دم ٹیٹ۔''

عمران نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کر اسے دیئے۔ ''یہ خرچے کے لئے رکھ لو نا...... باقی بعد میں دیکھ لیں گے۔''

راجا نے تھوڑا سا تذبذب دکھا کر روپے رکھ لئے۔ عمران کے چہرے پر ممنونیت برس رہی تھیں میں نے مسکراہٹ دبانے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

راجا کے پھٹیچر موبائل پر کال آ گئی۔ وہ اسے سنتا ہوا باہر چلا گیا۔ ہم ایک بار پھر پرانے موضوع پر آ گئے۔ عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر واقعی جاوا گروپ کے لوگوں کا تعلق شاربہ بائی سے ہے تو پھر ان لوگوں کا اس کے ہاں آنا جانا بھی ہوگا۔ ہم کل رات شاربہ بائی کے کوٹھے پر تھے۔ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ جاوا کے کسی بندے نے ہمیں پہچان لیا ہو۔''

''یہی بات میں سوچ رہا ہوں۔ ہم کوٹھے سے سیدھے ڈیفنس والی کوٹھی چلے گئے تھے۔ ہم ایک بلاک پہلے تو اُتر گئے تھے لیکن پھر بھی خطرہ تو موجود ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ گاڑی سے اترنے کے بعد کسی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ میں نے عقب میں نگاہ رکھی تھی۔ اگر کوئی ہمارے تعاقب میں ہوگا بھی تو وہ لینڈ کروزر کا پیچھا کرتے ہوئے آگے نکل گیا ہوگا۔''

''یعنی ایسی صورت میں اقبال اور امتیاز اس کی نظر میں آ گئے ہوں گے۔ اقبال کل یہاں ہوٹل میں بھی آیا تھا۔ اس طرح یہ ہوٹل بھی جاوا گروپ کی نظر میں آ سکتا ہے۔''

ابھی بمشکل میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ عمران چونک گیا۔ اس کی نگاہ ادھ کھلے دروازے سے باہر گئی تھی۔ ایک بیرا ہاتھوں میں رات کے کھانے کی ٹرے لئے گزر رہا تھا۔ عمران اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ بیرا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر جا رہا تھا۔ ہم بھی سیڑھیوں کی طرف آئے۔ بیرے نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور چونکا...... وہ اوپر والے کوریڈور میں پہنچا تو ایک بار پھر اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس نے کھانے کی ٹرے ایک طرف پھینکی۔ سالن، روغنی نان اور سلاد وغیرہ ہوا میں اُڑتے نظر آئے۔ بیرے نے اپنے لباس میں سے پستول نکالا اور اندھا دھند عمران پر گولی چلائی۔ عمران اس سے پہلے ہی فرش پر گر چکا تھا۔ فائر خالی گیا۔ جواب میں عمران کی چلائی ہوئی گولی حملہ آور کے پیٹ میں لگی۔ وہ اوندھے منہ بوسیدہ قالین پر گرا۔

عمران اور میں تیزی سے واپس پلٹے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے عمران نے سنسنی خیز لہجے

میں کہا۔ ”یہ جاوا گروپ کا بندہ ہے۔ سلطان چٹا کا گن مین۔“

ہم سیڑھیاں اترے تو ایک اور ہٹا کٹا شخص نظر آیا۔ اسے بھی ہم نے اس سے پہلے ہوٹل میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور وہ اپنے لباس سے کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے اسے ایک لمحے کا موقع بھی نہیں دیا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے اس نے بلندی سے ہی اس شخص پر جست لگائی۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں موجود پستول کا آہنی دستہ پورے زور سے اس شخص کے سر پر لگا اور وہ بے سدھ ہو کر ایک طرف گر گیا۔

میں اور عمران بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے۔ میں نے بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو کھول کر دیکھا۔ ایک بار پھر وہی نقشہ نظر آیا جو دس بارہ دن پہلے پرائیویٹ اسپتال کے باہر نظر آیا تھا۔ کم از کم تین مشکوک گاڑیاں ہوٹل لالہ زار کے سامنے موجود تھیں۔ ان کے قریب جو ایک دو غنڈا ٹائپ افراد نظر آ رہے تھے، وہ یقیناً جاوا گروپ کے ہی تھے۔

راجا بھی آ گیا تھا اور حیرت سے منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ہوٹل کو جاوا کے لوگوں نے گھیر لیا ہے۔“

”کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ عمران نے کہا۔

”یہاں پچھلی طرف ایک دروازہ ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ راجا نے کہا۔ ہم راجا کے پیچھے دوڑے۔ چند سیڑھیاں اتر کر ہم ہوٹل کے کچن میں داخل ہو گئے۔ دھڑا دھڑ کڑاہی گوشت اور سبزی وغیرہ تیار ہو رہی تھی۔ کھانا پکانے والے ہماری اس اندھا دھند مداخلت پر حیران رہ گئے۔ راجا نے کچن کا بیرونی دروازہ کھولا۔ لیکن ابھی اس نے ایک قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ عمران نے کالر سے پکڑ کر اسے واپس کھینچ لیا...... اس دروازے کے عین سامنے بھی ایک گاڑی نظر آ رہی تھی اور اس کے قریب ایک مسلح باوردی گارڈ بالکل چوکس کھڑا تھا۔ راجا کو دیکھتے ہی اس نے رائفل سیدھی کر لی تھی۔ اس کے باوجود کہ ہم نے کچن کا دروازہ بند کر دیا تھا، پمپ ایکشن گن کا ایک فائر ہوا اور کڑاہی گوشت بناتا ہوا ایک باورچی فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

”لالے! بری طرح پھنس گئے ہیں۔ ایک دم ٹیٹ کام ہوا ہے۔“ راجا نے کہا۔

”کوئی اور راستہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، آؤ میرے پیچھے۔“ راجا نے کہا اور ہوٹل کے اس حصے کی طرف بھاگا جہاں ایک

چھوٹے سے صحن میں ہوٹل کے ملازموں اور گاہکوں وغیرہ کے سائیکل اور موٹر سائیکل کھڑے رہتے تھے۔ ہم اس صحن...... سے گزر کر ایک چھوٹی سی دکان کے عقب میں پہنچے۔ راجا نے اپنے کندھے کی زوردار ضرب سے دکان کی عقبی کھڑکی توڑ دی۔ ہم کود کر دکان میں گھسے۔ یہ ربڑی اور فالودے کی دکان تھی۔ دو خواتین سمیت چار پانچ گاہک موجود تھے اور ربڑی والے دودھ کے گھونٹ لے رہے تھے۔ ان کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ عورتیں چلاتی ہوئی باہر کی طرف بھاگیں۔ ہم کرسیاں الٹاتے ہوئے لوگوں سے ٹکراتے باہر بازار میں آ گئے۔ یہاں اچھی خاصی رونق تھی لیکن اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم بچ نکلے ہیں تو یہ غلط تھا۔ جونہی ہم بازار میں نکلے، ایک طرف سے دو ہوائی فائر ہوئے۔ پھر ہم نے کچھ افراد کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ وہ لوگوں میں سے راستہ بناتے ہوئے ہماری طرف جھپٹتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ایک درجن سے کم نہیں تھی اور یقیناً اردگرد مزید افراد بھی موجود ہوں گے۔ ہوٹل لالہ زار کا بڑا مکمل گھیراؤ کیا گیا تھا...... اور گھیراؤ کرنے والوں کے ارادے نہایت خطرناک تھے۔ ہمیں دائیں جانب کچھ عافیت نظر آئی۔ ہم اسی طرف بھاگے۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ یہاں فائرنگ نہیں کی جا سکتی تھی، ورنہ اب تک ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو چکی ہوتی۔ دوسری طرف ہمارے پاس ایک پستول کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس میں سے بھی ایک گولی عمران ہوٹل کے اندر نقلی بیرے پر داغ چکا تھا۔

یکایک دائیں طرف سے جھپٹنے والے دو تین افراد ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مجھے گراری دار چاقو صاف نظر آیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس شخص نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک غلیظ گالی کے ساتھ چاقو میرے پہلو میں گھونپنا چاہا۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا ہوتا تو شاید کامیاب ہو جاتا لیکن اس نے بارونداجیکی کے شاگرد پر حملہ کیا تھا اور شاگرد بھی وہ جس نے کئی ماہ دیوانہ وار اپنے استاد کی مار کھائی تھیں میں نے بھاگتے بھاگتے اس کا خطرناک وار اپنی کلائی پر روکا اور اس کی بائیں پسلیوں کے نیچے ایک مخصوص جگہ گھٹنے کی کارگر ضرب لگائی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح سڑک پر گرا اور ہجوم کے پاؤں تلے روندا گیا۔ دوسری طرف میں نے ایک اور شخص کو عمران کے سر کی زوردار ٹکر کھا کر دودھ کے کڑاہے میں گرتے دیکھا...... لاہور کی سڑکوں پر دھینگا مشتی کی ہماری خواہش اس طرح پوری ہو رہی تھی کہ ایک خلقت انگشت بدنداں تھی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر ہم کھلی جگہ پر نکل آئے تو جاوا کے درجنوں گرگے ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہم رش

والے حصوں میں گھس رہے تھے۔ مگر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس طرح ہم عام لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں گے۔

اچانک ہمیں لگا کہ اب ہم قدرے کھلی جگہ پر آ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت ہم پر فائرنگ ہو جائے گی۔

''اس سامنے والی بلڈنگ میں۔'' عمران نے پکار کر کہا اور انگلی سے اشارہ بھی کیا۔

یہ ایک چھوٹی سی دومنزلہ عمارت تھی۔ نیچے میڈیکل اسٹور تھا۔ اسٹور کے ساتھ اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں ہم سیڑھیوں میں داخل ہوئے اور آہنی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ فائر ہوئے اور ایک گولی دروازے میں لگی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن میں آ گئے۔ یہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ ہم نے سیڑھیوں کا بالائی دروازہ بند کر دیا۔

میں نے محتاط انداز میں ایک کھڑکی تھوڑی سی کھولی اور نیچے جھانکا۔ ہمارا تعاقب کرنے والے اردگرد پوزیشنیں لے رہے تھے۔ دو گاڑیاں تیز رفتاری سے آئیں۔ ان کے بریک چرچرائے اور ان میں سے بھی مسلح افراد نکل کر اردگرد پھیل گئے۔ ان میں سلطان چٹا بھی نظر آیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' راجا نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عمران نے اپنے پستول کی گولیاں چیک کیں اور بولا۔ ''اب تو جو کرنا ہے، شیر نے ہی کرنا ہے۔''

''اور شیر کون ہے؟'' راجا نے دریافت کیا۔

''اس کا فیصلہ ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔'' عمران نے کہا۔

لائٹس آف ہو رہی تھیں۔ دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ لوگ اپنی سواریوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ سامنے والے ایک میوزک سینٹر میں دکاندار اپنا ٹیپ ریکارڈر آن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ آواز بلند ہو رہی تھی۔ اک راستہ ہے زندگی جو تھم گئے تو کچھ نہیں...... یہ قدم کسی مقام پر جو جم گئے تو کچھ نہیں۔

......اور یہ لاہور کی ایک سنگین رات تھی۔

O.....❖.....O

عمران نے سگریٹ سلگایا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ میں اور راجا بھی اس کام میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ جاوا کے لوگوں نے زبردست منصوبہ بندی کے ساتھ ہمیں گھیرا تھا۔ کم از کم دو گاڑیاں سامنے سڑک پر نظر آ رہی تھیں۔ ایک

ایک دائیں بائیں موجود تھی۔ اس کے علاوہ درجنوں افراد تھے جنہوں نے یہاں وہاں پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ عقبی جانب بھی ایک دو گاڑیاں موجود ہوں گی۔ ہم جس عمارت میں تھے، یہ بمشکل دو ڈھائی مرلے میں ہوگی۔ تاہم اس کی تین منزلیں تھیں، ہم دوسری منزل پر موجود تھے۔ تیسری منزل کا پتا ہمیں ابھی چلا تھا۔

میری نظر جاوا گروپ کی ایک کوسٹر ٹائپ گاڑی پر پڑی۔ اس کی چھت پر کوئی چیز نصب تھی، جیسے کوئی بڑی گن وغیرہ ہو۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ ایک مووی کیمرا ہے۔

''وہ دیکھو اس گاڑی کی سائیڈ پر کیا لکھا ہے؟'' عمران نے کہا۔

میں نے پڑھا۔ یہ ''ایس ایم گل فلمز لمیٹڈ'' کے الفاظ تھے۔ نیچے ملتان روڈ لاہور کا پتا درج تھا۔

''یہ تو کوئی شوٹنگ والوں کی گاڑی لگتی ہے۔'' میں نے کہا۔

ابھی مشکل سے میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ اس گاڑی کے عقب سے ہم پر رائفل کے تین چار فائر ہوئے۔ دھماکوں سے فضا گونج اُٹھی۔ ہم جس کمرے میں موجود تھے، اس کے سامنے والے شیشے چکنا چُور ہو گئے۔ ایک گولی راجا کے سر کے پاس سے گزری، وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔

''یہ لوگ آج ہمارے جنازے تیار کرنے کا پورا ارادہ رکھتے ہیں۔'' عمران نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''اور اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک پستول اور پانچ گولیاں ہیں۔'' میں نے عمران کا فقرہ مکمل کیا۔

''پانچ نہیں دو۔'' عمران نے مغموم انداز میں کہا۔ ''ایک ایک گولی تو ہمیں بھی چاہیے ہوگی، آخر میں خودکشی فرمانے کے لیے۔''

راجا نے کہا۔ ''یار! ایک دم کنڈم کام ہوا ہے۔ ہر وقت پنج پنج کلو کے پستول ساتھ لیے پھرتے ہیں اور آج لوڑ پڑی ہے تو تین بندوں کے پاس صرف ایک پستول ہے۔''

یکایک پھر فائر ہوئے۔ یہ آٹومیٹک رائفل کے فائر تھے۔ چھ سات گولی کا برسٹ تھا۔ ہماری دائیں جانب والی دیوار کا بہت سا پلاستر اُکھڑ کر نیچے جا گرا۔ المونیم کی ایک سیڑھی اُچھل کر دیوار کے ٹکرائی اور پھر راجا کے سر میں لگی۔ اس نے سیڑھی اور سیڑھی گرانے والوں کو گالیاں دیں۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے تین چار سرچ لائٹس روشن ہوگئیں۔ ان لائٹس نے اس چھوٹی سی بلڈنگ کو بقعہ نور بنادیا۔ ہم جہاں موجود تھے، یہ قریباً پندرہ ضرب تیس فٹ کا ایک ہال نما کمرا تھا۔ یہاں دواؤں کے خالی کارٹن پڑے تھے۔ دو آہنی الماریاں تھیں۔ دو تین المونیم کی کرسیاں تھیں۔

ہم آہنی الماریوں میں پیچھے پناہ لے سکتے تھے یا پھر دیوار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا جو ہمیں سامنے سے تحفظ فراہم کرسکتا تھا۔ یکا یک اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی۔ گولیاں مینہ کی طرح ہمارے اردگرد برسیں۔ یوں لگا کہ حملہ آور ہمارے سمیت اس پورے کمرے کو چھلنی کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ڈھائی تین فٹ چوڑی دیوار کے عقب میں دبک گئے اور ہال کمرے کا کباڑا ہوتے دیکھتے رہے۔

تین چار منٹ کی زوردار فائرنگ کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہوئے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے پورا ہال کمرا شیشے کی کرچیوں، پلاستر کے ٹکڑوں اور لکڑی کے پرخچوں سے بھر گیا۔ خاموشی ہوئی تو ہمیں لوگوں کی پکارتی ہوئی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی سائرن سنائی دیا۔ شدید فائرنگ کی آواز نے پولیس کو متوجہ کرلیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے دیکھا کہ دو موٹر سائیکلوں پر سوار چار پولیس والے سامنے سڑک پر نظر آئے۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے انہیں گنجے سر والے ایک موٹے شخص سے باتیں کرتے بھی دیکھا۔ ان کے قریب سلطان چٹا کی جھلک بھی نظر آئی۔ ہمیں یوں لگا کہ پولیس والے صورتِ حال کی سنگینی کو شدت سے محسوس نہیں کررہے۔ ان کی موجودگی میں ہی ہماری طرف آٹھ دس فائر مزید ہوئے۔ وہ ایک طرف کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ اسی دوران میں میری نظر ایک مووی کیمرے پر پڑی۔ سڑک کے پار وہ کیمرا ایک برآمدے کے ستون کی اوٹ میں تھا۔ اچانک میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! لگتا ہے یہاں ہمارے ساتھ وہی ڈرامہ ہورہا ہے جو ہم نے کچھ دن پہلے مال روڈ پر سلطان چٹے کے ساتھ کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''وہاں ہم شوٹنگ کی آڑ میں سرعام سلطان چٹے کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر گن پوائنٹ پر گاڑی میں لے آئے تھے۔ شاید اب یہاں شوٹنگ میں ہمارا کام تمام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔''

اسی دوران میں عمران کی نظر بھی مارکیٹ کے ستون کے ساتھ موجود مووی کیمرے پر پڑ

گئی۔ اس نے تشویش ناک انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ یہ ایک زبردست چال تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سلطان چٹا نے عمران ہی کی ایک زبردست چال کو اس پر اُلٹ دیا تھا۔ اس بھرے پُرے بازار میں ہم پر اندھا دھند فائرنگ کی جارہی تھی اور بیشتر لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ شوٹنگ ہورہی ہے۔ بڑے بڑے کیمرے، سرچ لائٹس، اسٹوڈیو کی گاڑیاں، یہ سب کچھ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے کافی تھا لیکن ایک بات حیرت کی بھی تھی۔ پولیس والے بھی دھوکے میں آگئے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''یہ کیا چکر ہے بھئی..... کیا پولیس والوں کو پتا نہیں چل رہا کہ فائرنگ اصلی ہے؟''

''یہ ہماری پولیس ہے۔ نقلی پولیس مقابلے کرکر کے اصلی نقلی کی پہچان کھو چکی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''مجھے تو یہ بھی چکر ہی لگ رہا ہے۔'' راجا نے ایک الماری کے پیچھے دبکے دبکے کہا۔ ''ہوسکتا ہے یہ پلسیے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔''

اس وقت تو ہم نے راجا کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن بعدازاں راجا کی بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔ چند مقامی اہلکاروں نے رشوت کھائی تھی اور جان بوجھ کر موقع سے دور رہے تھے۔

سرچ لائٹس کے زاویے درست ہوئے اور ایک بار پھر ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی۔ اب فائرنگ کا زاویہ بدل گیا تھا۔ بائیں طرف سے جو ترچھا فائر آرہا تھا، وہ ہم سے ڈھائی فٹ چوڑی دیوار والی پناہ گاہ بھی چھین رہا تھا۔ گولیاں سرسراتی ہوئی ہمارے پہلو سے گزر رہی تھیں۔ فائرنگ کا یہ دورانیہ قریباً چار منٹ کا تھا۔ لوہے کی الماریوں میں درجنوں سوراخ ہوچکے تھے اور ان میں سے چھ سوراخ آرپار بھی تھے۔ اس بار جب فائرنگ تھمی تو پولیس اہلکار موقع سے اوجھل نظر آئے۔ وہ اس ''دلچسپ ترین'' شوٹنگ کو اس کے حال پر چھوڑ کر کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

''موبائل ہے تمہارے پاس؟'' عمران نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے موبائل نکالا۔ اس کی چارجنگ آخری اسٹیج پر تھی۔ عمران نے جلدی جلدی ایس پی حمزہ صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ ابھی تین چار بار بیل ہی ہوئی تھی کہ چارجنگ ختم ہوگئی اور موبائل خاموش ہوگیا۔ ''اوہ شٹ!'' عمران نے موبائل میری طرف پھینکا جسے میں نے دبوچ لیا۔

''تمہارا موبائل کہاں ہے؟'' عمران نے راجا سے پوچھا۔

راجا نے شلوار کی جیب میں سے اپنا رنگ دار پھٹیچر موبائل نکالا۔ عمران نے اس پر نمبر پریس کیے اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''تم سے یہی امید تھی بھا راجا۔''

''کیا ہوا؟''

''وہی تمہاری کنجوسی اور غربت کا اشتہار چل رہا ہے۔ کال ملانے سے پہلے اپنا اکاؤنٹ ری چارج کر لیجیے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے، بھا راجا۔''

عمران کی تشویش درست تھی۔ اس وقت فوری ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم کسی طرح باہر رابطہ کریں اور اپنے لیے مدد طلب کریں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے ٹیلی فون کا موٹا سا کالا تار الماریوں کے عقب میں جاتا نظر آیا۔ میں نے اس تار کا تعاقب کیا اور سیڑھیوں کے قریب ایک سائیڈ بورڈ میں رکھے ہوئے فون سیٹ تک پہنچ گیا۔ فون کو تالے میں رکھا گیا تھا۔ عمران نے پستول کے دستے کی پے در پے ضربوں سے تالا توڑ دیا۔ میں نے ریسیور اُٹھایا، بار بار کریڈل دبایا لیکن فون بالکل بے جان تھا۔ اندازہ ہوا کہ اس کا تار شاید باہر سے کاٹ دیا گیا ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

''ہاں بھئی یہ تو باندھ کر مار رہے ہیں۔'' عمران نے پُرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

سائیڈ ٹیبل کے پیچھے سے چوں چوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ہم نے دیکھا، یہ رنگین طوطوں والا ایک درمیانے سائز کا پنجرہ تھا۔ معصوم پرندے صورتِ حال کی سنگینی سے بالکل بے خبر اپنی خوش الحانی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یکا یک میں چونک گیا۔ یہ خوش الحانی نہیں، نوحہ تھا شاید پنجرے کے قریب خون کی ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو کئی طوطے مرے پڑے تھے اور ایک زخمی حالت میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ یہ خون ریزی اس اندھا دھند فائرنگ کا نتیجہ تھی جو کچھ دیر پہلے تک ہم پر جاری رکھی گئی تھی۔

ٹیلی فون تک پہنچنے کی کوشش میں ہم اس آڑ سے آگے نکل آئے تھے جو ہمیں تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ دفعتاً پھر فائرنگ ہوئی۔ عمران کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹیلی فون سیٹ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرایا اور کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک گولی راجا کو لگی۔ وہ بازو پکڑ کر دہرا ہوا اور پھر فرش پر لیٹ گیا۔ ہم فرش پر رینگتے ہوئے پھر اس سامنے والی دیوار کے پاس پہنچ گئے جس کی ڈھائی فٹ چوڑائی ابھی تک ہماری زندگی کی ضمانت بنی ہوئی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''کچھ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو مارے جائیں گے۔''

میں نے پلٹ کر راجا کا بازو دیکھا۔ وہ لہولہان تھا۔ گولی اس کی کہنی کے پاس سے گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے اس کا خون بند کرنے کے لیے کس کر رومال باندھ دیا۔

''کتے کے بچے، چور...... نقال۔'' عمران غصے سے بڑبڑایا۔

''کون چور؟'' راجا نے پوچھا۔

''یار! یہی جاوا اور سلطان چٹا۔ یہ نقالی اور چربہ سازی نہیں تو اور کیا ہے۔ انہوں نے ہماری اجازت کے بغیر ہمارا طریقہ استعمال کیا ہے اور ہم پر ہی استعمال کیا ہے۔ یہ کاپی رائٹس کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں تو اس بارے میں شور مچاؤں گا اپنے چینل پر۔ ان پر کیس کروں گا۔ دیکھو کیسی دیدہ دلیری ہے۔ وہی کیمرے، وہی شوٹنگ کا بہانہ، وہی سب کچھ۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے بھی کچھ اصول ہوا کرتے تھے لیکن اب تو زمانہ ہی خراب آ گیا ہے۔''

''یہ طنز و مزاح کا وقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔

ہم دونوں فرش پر تقریباً رینگتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر دوسری منزل کی چھت پر آ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ اس مختصر بلڈنگ کی تیسری منزل بھی ہے۔ وہاں تک لوہے کی سیڑھی جاتی تھی۔ اوپر منڈیر وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ بس پانی کی ٹنکی رکھی تھی۔ ہم دونوں بڑی احتیاط سے چھت پر پہنچے۔ اوندھے منہ لیٹے لیٹے ہم نے اطراف کا جائزہ لیا۔ آس پاس ایسی کوئی چھت نہیں تھی جس پر کود کر اس جان لیوا گھیرے سے نکلا جا سکے۔ قریب ترین چھت کا فاصلہ بھی پچیس فٹ سے کم نہیں تھا۔ درمیان میں ایک سڑک تھی۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی یہ چاہتا کہ چھلانگ لگا کر اس خلا کو عبور کر لے تو یہ ممکن نہیں تھا۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں تھا۔ شاید میں اس کا دو تہائی فاصلہ بھی عبور نہ کر سکتا۔ عمران سرکس کا منجھا ہوا فنکار تھا اور ایک پروفیشنل بازیگر بھی لیکن میرے اندازے کے مطابق اس کے لیے بھی یہ کام ممکن نہیں تھا۔ چھت پر بھاگ کر چھلانگ لگانے اور پھر نا کام رہ جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ بھاگنے والا پینتیس چھتیس فٹ نیچے پختہ سڑک نما گلی میں گرتا۔ شدید زخمی ہوتا اور پھر جاوا کے غنڈوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔

عمران نے نگاہوں نگاہوں میں فاصلے کو بھانپا، اپنے جسم کو تولا مگر کوئی عملی قدم اُٹھانے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ وہ دلیر تھا مگر بے وقوف نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ہم میں

سے کم از کم کوئی ایک ساتھ والی بلڈنگ تک پہنچ جائے اور وہاں سے بذریعہ فون یا موبائل فون حمزہ صاحب سے رابطہ کرے۔ انہیں بتائے کہ یہاں مزنگ چونگی کے قریب کیسا سنگین ڈرامہ ہو رہا ہے۔

اسی دوران میں ایک بار پھر میڈیکل اسٹور والی بلڈنگ کی دوسری منزل کو اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ دیکھے بغیر گولیاں چلا رہے ہیں اور بلڈنگ سمیت ہر شے کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر نیچے والی چھت پر آ گئے۔ نیچے سے راجا کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''اوئے عمو! لگتا ہے کہ ہمارا آخری ویلا آ گیا ہے۔ بڑا ٹیٹ کام ہو گیا ہے۔ وہ ذلیل ہور پاس آ گئے ہیں۔ پورے کمرے وچ فائر آ رہا ہے۔''

''تم چھت پر آ جاؤ۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

جواب میں راجا نے کچھ کہا لیکن اس کی آواز ایک خوفناک دھماکے میں دب کر رہ گئی۔ یوں لگا کہ بلڈنگ کی ساری دیواریں ہل گئی ہیں۔ ''یہ دستی بم تھا۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راجا کو آوازیں دینے لگا۔ ''راجا...... راجا! کہاں ہو؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر چند سیکنڈ بعد راجا کی کھانستی ہوئی آواز آئی۔ وہ جاوے کی ماں بہن ایک کر رہا تھا اور دھوئیں میں سے راستہ بناتا ہوا چھت کی طرف آ رہا تھا۔ ایک لحاظ سے اس نے عمران کی ہدایت پر کمرا چھوڑ کر ٹھیک ہی کیا تھا۔ اب وہ پورا کمرا گولیوں کی زد میں تھا۔ میں نے ایک زخمی طوطے کو دیکھا جو اُڑنے کی کوشش میں چھت پر چلا آیا تھا اور اب جان کنی کے عالم میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''چھلانگ لگانی پڑے گی۔'' عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر زیر لب کہا۔

''لیکن کیسے؟''

''ایسے۔'' اس نے ایک چھتری پکڑ لی۔ ''جیمز بانڈ کی طرح اسے کھول کر نیچے کود جاتا ہوں۔''

''بکواس نہ کرو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی۔ اس نے مجھ سے اپنا پستول لیا اور پھر اس کے ذریعے اپنی نشانے بازی کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اس کی چلائی ہوئی دو گولیوں نے دو سرچ لائٹس کو چھناکوں کے ساتھ تاریک کر دیا۔ یہی لائٹس تھیں جو بالائی چھت کو روشن کر رہی تھیں۔ جونہی چھت تاریک ہوئی، عمران چھتری سمیت بالائی چھت پر پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ اب اسے روکنا فضول ہے۔

چھتری ابھی تک بند تھی۔ عمران نے اسے اُلٹا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھت پر دوڑتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ایک بار پھر اسی عمران کی جھلک نظر آئی جو اسٹار سرکس میں پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر کسی حفاظتی جال کے خطرناک آئٹمز کرتا تھا اور لوگوں کی سانسیں سینوں میں اٹک جاتی تھیں۔ اس نے بھرپور چھلانگ لگائی۔ اس کے سامنے بجلی کے تین عدد مین تار تھے۔ اس نے چھتری کا مڑا ہوا دستہ سب سے نیچے والی تار میں اٹکا دیا اور ایک ہی حرکت میں اپنے جسم کو جھلاتا ہوا دوسری چھت پر پہنچ گیا۔ اس کی یہ برق رفتاری موومنٹ بالکل اسی جست کی طرح تھی جو وہ سرکس میں لگاتا تھا۔ ایک جھولے سے چھلانگ لگا کر دوسرے جھولے کو پکڑنا اور پھر اپنے جسم کو جھلا کر تیسرے جھولے پر پہنچ جانا۔ پچاس فٹ کی بلندی پر دکھائے جانے والے اس کرتب کے دوران میں اس کے نیچے کوئی حفاظتی جال بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے کچھ ایسی ہی مہارت دکھائی تھی۔ اس چھلانگ کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ اس نیم تاریک چھت پر اس کی یہ ''موومنٹ'' بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

میں اور راجا اب چھت پر تھے۔ اس طرف فائرنگ کا زور کم تھا مگر اسے بتدریج بڑھنا تھا۔ ہم کسی جانب سے کود بھی نہیں سکتے تھے۔ دستی بم کے دھماکے کے سبب راجا کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا اور اس کے کان بند ہو گئے تھے۔ مجھے اس سے چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا زخمی بازو بھی مسلسل خون اُگل رہا تھا۔ وہ کراہا۔ ''ہمارے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں۔ وہ اوپر آ گئے تو ہمیں سیدھا ذبح ہونا پڑے گا۔''

''گھبراؤ نہیں یار! تمہارا عمو ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔''

اور واقعی اس نے کیا اور اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ مشکل سے چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ ہمیں فائرنگ کے شور کے بیچ میں کافی فاصلے پر ایک بار پھر سائرن کی آواز سنائی دی۔ ہم بجا طور پر توقع کر سکتے تھے کہ یہ پولیس گاڑیوں کے سائرن ہوں گے۔ نیچے فائرنگ میں بہت شدت آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ حملہ آور وحشت میں ہر شے کو اُڑا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دستی بم کا ایک اور دھماکہ ہوا اور اوپر والا ہال کمرا دھوئیں سے بھر گیا۔ کسی گوشے میں آگ بھی بھڑک اُٹھی تھی۔

آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب حملہ آور سیڑھیوں کے بالکل پاس پہنچ گئے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اوپر آنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ میں نے خود کو مارا ماری کے لیے تیار کر لیا۔ بدن میں عجیب سی ترنگ جاگ اُٹھی۔ اب ایسی صورت حال مجھے لرزہ براندام کرنے کے

بجائے جوش سے بھر دیتی تھی۔ بہرحال اس کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائرن کی آوازیں قریب آ گئیں۔ اندازہ ہوا کہ تین چار پولیس موبائلز آس پاس پہنچ گئی ہیں۔ یکا یک فائرنگ تھم گئی۔ میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلتا ہوا چھت کے سامنے والے حصے کی طرف گیا اور احتیاط سے نیچے جھانکا۔ سڑک پر افراتفری تھی۔ دو سرچ لائٹس تو عمران نے توڑ دی تھیں، باقی بھی بجھ گئی تھیں۔ ایس ایم فلمز والی گاڑی تیزی سے یوٹرن لے کر مین روڈ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ حملہ آوروں کی دیگر گاڑیاں بھی حرکت میں تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد دو پولیس موبائلز شور مچاتی ہوئی موقع پر پہنچ گئیں۔ پولیس اہلکار چھلانگیں لگا کر نیچے اُترنے لگے۔ میں اور راجا نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ اس حملے کا ڈراپ سین تھا۔

درحقیقت یہ عمران کی ایمرجنسی فون کال ہی تھی جس پر حمزہ صاحب فوراً حرکت میں آئے اور انہوں نے وائرلیس پر ہنگامی پیغام چلوایا۔ اس کے فوراً بعد علاقے میں موجود گاڑیاں ''خونی شوٹنگ'' کو ختم کرانے کے لیے موقع واردات کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔

O......❖......O

ہم نے سب سے پہلے راجا کے بازو کی مرہم پٹی ایک پرائیویٹ کلینک سے کروائی۔ اس کے بعد عمران کے اندرون شہر والے گھر میں پہنچ گئے۔ اس گنجان بازار میں عمران کے بہت سے پرستار تھے جو اس کی آمد پر خوشی سے کھل اُٹھتے تھے۔ وہ ان سب کا ہیرو بھائی تھا۔ بڑی عمر کے لوگ اسے ہیرو پتر یا عمران بیٹا کہہ کر پکارتے تھے لیکن جس وقت ہم محلے میں پہنچے، ہُو کا عالم تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سب سو چکے تھے۔

میری یاددہانی پر عمران نے سب سے پہلے اقبال کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ اور امتیاز، جاوا کے ساتھیوں کی نظر میں آ چکے ہیں، لہٰذا اپنے کسی بھی ٹھکانے سے دور رہیں۔ خاص طور سے ڈیفنس والے گھر تو بالکل بھی نہیں جائیں۔ میں نے ڈیفنس میں جیلانی کو فون کر کے یہی ہدایات دے دیں اور کوٹھی کی سیکیورٹی مزید سخت کرنے کے لیے بھی کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ میں نے ناشتے کے بعد عمران سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو راجا کے یار اشفاق رانا کی خبر لینی ہے۔ سنا ہے کہ صبح سویرے اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہوٹل میں گولی چلی ہے۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ایک تو ممکن ہے کہ راہی عدم ہو جائے۔''

''اچھا...... اس کے بعد؟''

''اس کے بعد سیدھا سیدھا چلتے ہیں شاربہ بائی کے پاس۔ اس کو دو لاکھ روپیہ دیتے ہیں اور ''چندو'' جی کے لیے اپنی بکنگ پکی کر لیتے ہیں۔ یار سچی بات ہے، کبھی کبھی تو میرے دل میں آتا ہے کہ اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھا ہی لوں۔ سلور اسکرین کے ایسے جگمگاتے ستارے کے ساتھ شب بسری کا موقع مل رہا ہے۔ اسے اپنی حماقت سے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یار! کیا رقص کرتی ہے وہ لگتا ہے، کہ کسی شعلے کو برف کے کپڑے پہنا دیئے گئے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے کہا۔

''یار! جب شعلے کو برف کے کپڑے پہنائیں گے تو وہ کم ہوتے جائیں گے نا۔ یہی کچھ ہماری اس ہیروئن کے رقص میں ہوتا ہے۔ ادھر کپڑے پگھلتے ہیں، ادھر لوگ پگھلتے ہیں۔ ایک دوبار تو ٹی وی پر اس کا جلوہ دیکھ کر میں نے بھی آہیں بھری ہیں۔''

''لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے تجزیے کے مطابق شاربہ بائی جس ''ہیروئن'' کی بکنگ کرے گی، وہ اصلی نہیں ہوگی۔ کرشمہ کپور اور ایشوریا رائے کی طرح ڈمی ہوگی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

عمران نے مغموم چہرہ بنا لیا۔ ''ہاں...... یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''لیکن یار! کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی دفعہ نقل، اصل سے بھی بڑھ جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تم صرف مسخری کر رہے ہو۔ اب تم شاربہ بائی کی طرف نہیں جا سکتے، نہ ہی میں یا اقبال جا سکتے ہیں۔ شاربہ بائی کے کوٹھے سے ہی تو یہ لوگ ہمارے پیچھے لگے تھے۔''

''لیکن جگر! اگر ہم وہاں نہیں جائیں گے تو تمہارے رقیب روسیاہ یوسف ثانی کے بارے میں ثبوت کیسے ملیں گے؟ اور جب ثبوت نہیں ملیں گے تو تم ثروت کا ذہن کیسے بدلو گے اور اگر تم اس کا ذہن نہیں بدلو گے تو وہ اپنی ''شوہر پرستی'' کے گھیرے سے کیسے نکلے گی؟ اور اگر وہ گھیرے سے نہیں نکلے گی تو تمہاری بانہوں کے گھیرے میں کیسے آئے گی...... اور اگر وہ تمہاری بانہوں کے گھیرے میں نہیں آئے گی تو...... تو مجھے ٹھنڈ کیسے پڑے گی۔''

''تمہیں ٹھنڈ پڑے نہ پڑے پھنڈ ضرور پڑ جائے گی۔'' میں نے اس کی طرف مکا تانا۔ وہ سہم جانے کی اداکاری کرتا ہوا چپ ہو گیا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے

کام کر رہا ہے۔ وہ یقیناً شار بہ بائی، یوسف اور فلمی ہیروئن کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور اس انوکھی ڈیل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک دن پہلے شار بہ بائی اور یوسف کے درمیان ہوئی تھی۔

ایس پی حمزہ صاحب بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن ڈاکٹر مہناز اور ڈاکٹر رسام کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ نہ ہی ابھی تک ڈاکٹر مہناز نے اپنی والدہ یعنی آنٹی جمیلہ سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ آنٹی ابھی تک ہماری حفاظتی تحویل میں تھیں۔ جیلانی رکشہ ڈرائیور گلو کی نگرانی بھی کروا رہا تھا کہ شاید اسی کی طرف سے مہناز کا کوئی سراغ لگ جائے۔ یقیناً مہناز شدید خطرے میں تھی۔ یہ بات اب کوئی بھید نہیں رہی تھی کہ وہ جلالی صاحب کے گھر سے بدھا کی مورتی آرا کوئے لے کر اوجھل ہو گئی ہے۔ اب درجنوں لوگ اور گروہ آرا کوئے کے پیچھے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کے ہتھے بھی چڑھ سکتی تھی۔ وہ اپنی ذات میں عجیب لڑکی تھی۔ اس نے ایک بوڑھے کی مسیحائی کی اور اس مسیحائی میں اتنا آگے چلی گئی کہ اس جاں بلب شخص کی بیوی تک بننا پسند کر لیا۔

جلالی صاحب بدستور کومے کی حالت میں تھے۔ حمزہ صاحب نے ان کی حفاظت کے لیے ہسپتال میں خصوصی گارڈ مہیا کر دیئے تھے۔ عمران کو بھی اس بات کا شبہ تھا کہ جلالی صاحب کے اردگرد پُراسرار سرگرمیاں جاری ہیں۔

عمران کی ہدایت کے مطابق جیلانی بدستور یوسف کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسی رات نو بجے کے قریب ہمیں جیلانی کی طرف سے ایک اہم کال موصول ہوئی۔ اس نے عمران کو بتایا کہ اس کے اندازے کے مطابق آج کی رات کافی اہم ہے۔ لگتا ہے کہ آج یوسف مشہور فلمی ہیروئن کے ہاں جائے گا اور شاید رات گئے تک وہاں رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ بتا رہا تھا کہ یوسف اور شار بہ بائی میں جو ڈیل ہوئی تھی، وہ آج پایہ تکمیل کو پہنچے گی۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”چلو بھئی تیار ہو جاؤ۔“

”کس لیے؟“

”اپنے رقیب روسیاہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے۔“

”نہیں عمران! میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس کی وجہ سے مجھ سے مزید بدظن ہو جائے۔ اگر یوسف غلط کاریاں کر رہا ہے تو وہ خود ہی ایکسپوز ہو جائے گا۔“

”یار! پھر وہی ہندی فلموں والے ڈائیلاگ......نہیں کرشنا! میں کوئی ایسا کرتے نہیں کروں گا جس کے کارن رادھا کے من میں میری طرف سے میل آ جائے۔ میں اپنا جیون

تیاگ دوں گا لیکن یہ ہرول بھرشاٹ مجھ سے نہیں ہو گا۔ خدا کے لیے یار! خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ حقیقت کو دیکھو۔ ہم ثروت کے شوہر پر کوئی جھوٹا سچا الزام تو نہیں لگا رہے، صرف اصلیت جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”لیکن اگر......“

”کچھ نہیں ہو گا یار! ہم جو کچھ کریں گے، ایک فاصلے پر رہ کر کریں گے۔ بڑے محتاط طریقے سے۔“

O......❖......O

دس بجے کے فوراً بعد ہم جیلانی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ گلبرگ کے نزدیک ایک پوش کالونی میں ایک کنال کی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے اردگرد درختوں کی بہتات تھی۔ جیلانی اپنی موٹر سائیکل پر یوسف کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ جونہی ہماری مہران گاڑی سڑک کے کنارے ایک سنسان نرسری کے قریب رُکی، ایک جانب تاریکی میں سے جیلانی برآمد ہوا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔

عمران اسے بے تکلفی سے شیخ یا ”یا شیخ“ کہتا تھا، وہ بولا۔ ”یا شیخ! کیا رپورٹ ہے؟“

جیلانی بولا۔ ”میرا اندازہ درست تھا۔ یوسف وہیں پر پہنچا ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر غیاث احمد جیونا کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہو گا۔ شار بہ بائی بھی اپنے نام کے ساتھ غیاث کا نام استعمال کرتی ہے۔ یہ یقیناً اس کا کوئی عاشق یا سابقہ شوہر وغیرہ ہے۔“

”یوسف اکیلا ہی آیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی......کافی بنا ٹھنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فلمی ہیروئن سے ملاقات ہے۔ اس کے پہنچتے ہی گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ گاڑی سیدھی پورچ میں لے گیا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ہم تینوں چونک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار کوٹھی کے قریب پہنچ کر آہستہ ہوئی اور گیٹ کی طرف مڑ گئی۔ کار کی پچھلی کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ پھر بھی سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کی روشنی کار کے اندر گئی تو ایک سیکنڈ کے لیے ہمیں اندرونی جھلک نظر آئی۔ پچھلی نشست پر کوئی جھلملاتی ہوئی حسینہ موجود تھی۔ ہم اس کے خدوخال نہیں دیکھ سکے۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ ایک خوبرو چہرہ وہاں موجود تھا۔

کار کے پہنچتے ہی باوردی گارڈ نے گیٹ کھول دیا اور کار کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ

بند کر دیا۔ چاروں طرف ایک بار پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ یہ خالص رہائشی علاقہ تھا۔ اس اندرونی سڑک پر بس کبھی کبھار ہی کسی گاڑی کی روشنی چمکتی تھی۔ ہماری بائیں جانب واقع نرسری میں سے ہلکی ہلکی خوشبو اُٹھ رہی تھی لیکن یہ خوشبو بھی تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی۔ کوٹھیوں کے دروازے بند تھے اور چار دیواریاں خاموش تھیں۔ یہ چار دیواریاں ہی جانتی تھیں کہ ان کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے یا شاید یہ چار دیواریاں بھی نہیں جانتی تھیں۔ ان کی حیثیت ان گارڈز اور دربانوں جیسی تھی جو پُرشکوہ کوٹھیوں اور محلات کے گرد موجود ہوتے ہیں۔ اندر آنے اور باہر جانے کی اصل مصروفیات کے بارے میں جان نہیں سکتے۔ بالکل جیسے ہم تینوں اندازے تو لگا رہے تھے اور شاید ٹھیک اندازے لگا رہے تھے لیکن چشم دید گواہ نہیں ہے۔

ہم جانتے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک پری چہرہ اندر داخل ہوئی ہے اور اس سے بھی تھوڑی دیر پہلے اس کا خریدار اندر داخل ہوا تھا۔ اب وہ دونوں کسی پُرتعیش کمرے میں موجود تھے۔ کسی نے اپنا ''وقت'' بیچنا تھا اور کسی نے اپنی ادائیگی کی قیمت وصول کرنا تھی۔

عمران نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ اچھا موقع ہے کہ ہم جان سکیں کہ ہیروئن اصلی ہے یا نقلی۔''

''کس طرح؟'' میں نے پوچھا۔

عمران نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر پریس کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوا تو اس نے فون کا سپیکر آن کر دیا تا کہ ہم بھی گفتگو سن سکیں۔ دوسری طرف اسٹار سرکس کے مالک اور عمران کے پُرانے محسن جان محمد صاحب تھے۔ علیک سلیک کے بعد عمران نے کہا۔ ''جان انکل! میں نے پرسوں ایک کام کہا تھا آپ سے۔''

''کون سا؟''

''وہی ہیروئن صاحبہ والا۔ ایک بار اس کی آواز سن لوں تو دل کو تسلی ہو۔ آج کل بڑا دل آیا ہوا ہے اس پر۔ اپنی نئی ٹی وی سیریل میں تو اس نے مجھ جیسے کنواروں کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔''

''تم بہت بڑے بدمعاش ہو۔ میں جانتا ہوں یہ کوئی اور چکر ہے۔'' جان صاحب نے کہا پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''کل میں نے رابطہ کیا تھا چندو سے۔ کسی میٹنگ میں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے سرکس کا سپر سٹار عمران دانش تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ تھوڑا بہت جانتی ہے تمہارے بارے میں۔ کم از کم نام تو سنا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ عمران آج کل زبردست ''اسٹنٹ'' کر رہا ہے۔ تمہاری اگلی فلم کے لیے شاندار کام کر سکتا ہے۔ وہ

بات کرنے کے لیے راضی تھی۔ یہ اس کا نمبر نوٹ کر لو۔''

اس کے بعد جان صاحب نے عمران کو ایک موبائل اور ایک پی ٹی سی ایل نمبر نوٹ کرایا۔ عمران نے شکریہ کہہ کر جان صاحب سے بات ختم کر دی اور پی ٹی سی ایل نمبر پر کال کی۔ کئی دفعہ کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ بس بیل جا رہی تھی۔ عمران نے موبائل نمبر ڈائل کیا۔ ہیروئن کی کسی سیکرٹری نے فون اُٹھایا۔ سیکرٹری کی آواز کے ساتھ بہت سا شور وغل بھی سنائی دے رہا تھا۔ عمران نے اپنا تعارف کرایا تو کچھ دیر بعد معروف ہیروئن خود لائن پر آ گئی۔ اس کی آواز ہم سب کے لیے جانی پہچانی تھی۔ آواز کے پس منظر میں سپورٹس کاروں اور موٹر بائیکس وغیرہ کا بہت سا شور سنائی دے رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ کوئی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ ہیروئن نے بتایا کہ وہ شوٹنگ پر ہے اور اس کا اگلا شاٹ تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ''جان صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا...... اس وقت تو میں مصروف ہوں۔ کسی دن شام کے وقت فون کر کے سٹوڈیو آ جائیں، آپ سے بات ہو گی۔''

''بہت مہربانی...... بہت شکریہ۔'' عمران نے ریشہ خطمی ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ضرور حاضر ہوں گا۔ اپنے اسٹنٹس کی ویڈیو بھی لاؤں گا۔''

''او کے۔'' ہیروئن صاحبہ نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نہ عمران کو وہاں جانا تھا، نہ اسے جانے کی ضرورت تھی۔ وہ فلمی نہیں اصلی ہیرو تھا۔ سلور اسکرین کے ہیرو، ہیروئن اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ہم جو جاننا چاہتے تھے، ہم نے جان لیا تھا۔ معروف فلمی ہیروئن اس کوٹھی میں نہیں کسی فلم کی لوکیشن پر تھی۔ یہاں یوسف فاروقی کے پاس دو نمبر مال تھا۔ پُرتعیش بیڈروم کی ریشمی نیم تیرگی میں غالباً، نشے میں ڈوب کر یوسف جن پسندیدہ خدوخال پر اپنی بے تابیاں نچھاور کر رہا تھا، وہ اصلی نہیں تھے۔ یقیناً یہ کوئی زبردست قسم کی مشابہت ہو گی، جس سے گھاگ ترین گاہکوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہو گا۔ مجھے کرشمہ کپور اور ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی لڑکیاں یاد آ گئیں۔ خاص طور سے سویٹی نامی لڑکی کی فلمسٹار ایشوریا رائے سے مشابہت تو حیرت انگیز تھی۔ راجا اس کا قرب حاصل کرنے کے بعد اس کا دیوانہ سا ہو رہا تھا۔

ہماری مہران ایک درخت تلے گرین بیلٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی ساتھ والی کوٹھی میں بطور مہمان آئے ہیں۔ خواتین شاید اندر گئی ہیں اور ہم باہر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دو تین بار گارڈ ہمارے قریب سے گزرا لیکن اس نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ یوسف کو کوٹھی کے اندر گئے اب قریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہونے والا تھا۔ ابھی اس کی واپسی

کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہم نے جیلانی کو وہیں چھوڑا اور خود لبرٹی مارکیٹ آ گئے۔ اگلے روز ایک تہواری چھٹی تھی، لہٰذا ویک اینڈ کا سا ماحول تھا۔ رات کا ایک بج چکا تھا مگر مارکیٹ میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ ٹی وی کے کسی غیر ملکی چینل پر فٹ بال کا ایک زبردست میچ جرمنی اور اسپین کے درمیان دکھایا جا رہا تھا۔ ہم چائے پیتے رہے اور دلچسپی سے میچ دیکھتے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا کب تین بج گئے۔ سیل فون پر جیلانی کی کال موصول ہوئی۔ اس نے عمران کو بتایا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ یہ لوگ اب یہاں سے جانے والے ہیں۔“

”کیسے اندازہ ہوا؟“ عمران نے پوچھا۔

”بس پورچ میں تھوڑی سی ہلچل نظر آ رہی ہے۔ ایک دو کمروں کی لائٹس بھی روشن ہوئی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر ہمارے پہنچنے سے پہلے لڑکی روانہ ہو جائے تو تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے۔“ عمران نے جیلانی کو ہدایت دی۔

ہم فوراً ریسٹورنٹ سے روانہ ہو گئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہم صرف پانچ منٹ کی ڈرائیونگ کر کے موقع پر پہنچ گئے۔ عین اس وقت کوٹھی کے پورچ میں کسی گاڑی کی روشنیاں آن ہوئیں۔ جیلانی درست ہی کہہ رہا تھا کہ اب یہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ جیلانی تاریکی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا۔ اسی دوران میں کوٹھی کا مین گیٹ کھل گیا۔ ایک گاڑی مین گیٹ کی طرف آئی۔ ہمارا خیال تھا کہ پہلے شاید ”ڈمی ہیروئن“ نکلے گی لیکن یہ یوسف فاروقی تھا۔ اس کی شاندار ٹویوٹا گاڑی گیٹ کی طرف آئی پھر تیزی سے موڑ کاٹ کر سڑک پر پہنچی لیکن موڑ کاٹتے ہوئے یوسف سے تھوڑی سی غفلت ہوئی۔ اس نے اپنی دائیں جانب ٹھیک سے نہیں دیکھا۔ ادھر سے ایک نیلی پجارو آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔

رات کے سناٹے میں پجارو کے بریک زور سے چرچرائے اور دور تک آواز گئی۔ پجارو والے نے کافی کوشش کی پھر بھی اس کی گاڑی لہراتی ہوئی یوسف کی گاڑی کی دائیں سائیڈ سے ٹکرائی۔ دونوں گاڑیاں ڈگمگاتی ہوئی رُک گئیں۔ پجارو کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔ یقیناً بائیں سائیڈ کا بھی نقصان ہوا تھا۔ غلطی یقیناً یوسف ہی کی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ نشے میں بھی تھا۔ پجارو میں سے تین چار لڑکے نکل آئے۔ دوسری طرف یوسف بھی گاڑی میں سے نکل آیا۔ تُو تکرار شروع ہوئی۔ قریبی کوٹھیوں کے دو تین چوکیدار بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم اپنی جگہ موجود رہے۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا، پجارو سے نکلنے والے نوجوان یوسف پر پل

پڑے۔ وہ امیر گھرانوں کے ہٹے کٹے لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک تو خاصا گرانڈیل تھا۔ شار بہ بائی کی کوٹھی سے نکلنے والے دو چوکیداروں نے لڑکوں کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے ان کو بھی پیٹ ڈالا۔ یوسف نیچے گر پڑا تھا اور دو لڑکے اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لو بھئی...... تمہارا کام نکلا ہے۔ ذرا اپنی کوالٹی دکھاؤ ان لونڈوں کو۔“

واقعی لگ رہا تھا کہ اگر ہم نہ پہنچتے تو یہ بپھرے ہوئے نوجوان یوسف صاحب کی ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔ میں آگے بڑھا۔ پہلے میں نے یوسف کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب میرے منہ پر بھی ایک زوردار گھونسہ پڑ گیا تو پھر میں نے جوابی کارروائی کی اور یہ کافی سخت کارروائی تھی۔ لڑکوں کو ایسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ایک لڑکے کے چہرے پر ٹکر رسید کی، وہ تیورا کر گرین بیلٹ پر جا گرا۔ ان کے گرانڈیل ساتھی نے عقب سے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ کافی سخت ہاتھ تھا۔ آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ میں نے سنبھل کر اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی اور ٹھوڑی پر گھونسا جڑا۔ وہ ڈگمگایا ضرور لیکن گرا نہیں۔ میں نے ایک اور گھونسا مارا، وہ پشت کے بل اپنی پجارو کے بونٹ سے ٹکرایا اور اس کا سائیڈ مرر توڑ دیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا لیکن ابھی اس کی گرفت مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ میری کہنی کی ضرب نے اس کے پہلو کو مہلک بوسہ دیا۔ میں نے اس کی پسلی چٹخنے کی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی اس کی کراہ بھی۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ گرانڈیل لڑکے کے اوپر جا گرا۔ میری شدید مزاحمت نے یقیناً بپھرے ہوئے لڑکوں کو ہلا دیا تھا۔ وہ یوسف سے توجہ ہٹا کر میری جانب آ گئے۔ یوسف سے بس ایک لڑکا برسرِ پیکار رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر عمران بھی لپکتا ہوا پہنچ جائے گا لیکن وہ ابھی تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ شاید میرا ٹیسٹ لے رہا تھا۔

مار دھاڑ کی وجہ سے اردگرد کی بیشتر کوٹھیوں کے مکین جاگ گئے تھے، کئی کھڑکیاں روشن نظر آنے لگی تھیں۔ ایک لڑکے نے گاڑی کے جیک کے ساتھ میرے سر پر زوردار وار کیا، میں نے خود کو بمشکل بچایا اور پھر اسے اپنے مکے کی طاقت کی پہچان کرائی۔ یہی وقت تھا جب ایک اور گاڑی موقع پر پہنچی۔ یہ ہنڈا سوک تھی۔ اس کے بریک چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی ہمارے بالکل سامنے رُک گئی۔ اس میں سے چار پانچ مزید لڑکے جارحانہ انداز میں اُترے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پجارو والوں کے ساتھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر پہلے سے برسرِ پیکار لڑکوں کا جوش دُگنا ہو گیا۔ انہوں نے للکارے مارے اور گالیاں دیں۔ ان کا نشانہ سب سے

پہلے میرا ساتھ دینے والا ایک پٹھان چوکیدار بنا۔ وہ کالی بھڑوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔ دوتین میری طرف بڑھے۔ان کے ہاتھوں میں کند آلات نظر آرہے تھے۔اب عمران کی شرکت فرمائی ضروری ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ دائیں طرف سے آرہا تھا۔اس کی دید ہمیشہ میرے حوصلوں کومہمیز کرتی تھی۔اب بھی ایسا ہی ہوا۔

اگلے تین چار منٹ میں رہائشی علاقے کی اس نیم تاریک سڑک پر گھمسان کا رن پڑا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اورلڑائی بھڑائی بھی جانتے تھے لیکن ان کا واسطہ اس میدان کے آزمودہ کھلاڑیوں سے پڑا تھا۔ پہلے ڈیڑھ دومنٹ کے اندر ہی پانسا پلٹ گیا۔ بپھرے ہوئے لڑکے جارحیت کے بجائے دفاع پر آگئے۔ان میں سے دوتین شدید زخمی ہوکر ''ریٹائرڈ ہرٹ'' ہو گئے۔ان میں پجارو سے نکلنے والا گرانڈیل تھا اور وہ زمین پر پڑالوٹ پوٹ ہورہا تھا۔ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر کوٹھیوں کے چوکیداروں نے بھی ہمت کی اوراس دست بدست لڑائی میں شریک ہوگئے۔ان میں پٹھان چوکیدار پیش پیش تھا۔میں نے دیکھا، جیلانی زخمی یوسف کوسہارا دیتا ہوا نرسری کی طرف لے جارہا تھا۔ یوسف کا لباس تار تار تھا اور وہ بُری طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میری کہنی کی ضرب سے جس دراز قد لڑکے کی پسلی ٹوٹی تھی، وہ جا کر ہنڈا سوک کی پچھلی نشست پر گر گیا تھا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ دولڑکوں کو میں نے مکوں اور ٹھڈوں پر رکھا ہوا تھا، ایک کوعمران نے۔عمران کی ہدایت پر جیلانی اس کارِخیر میں شریک نہیں ہوا تھا اور زخمی یوسف کے قریب موجود تھا۔ یہی وقت تھا جب سو ڈیڑھ سو میٹر کی دوری پر پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ پولیس تیزی سے موقع کی طرف آرہی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے تین چار لڑکے تو فوراً ہنڈا سوک میں بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے، باقی وہیں پر رہے۔ان میں ٹوٹے ہوئے بازو اور لہولہان چہرے والا گرانڈیل لڑکا بھی تھا۔وہ خود کو ایک بڑے سرکاری افسر کا بیٹا بتارہا تھا اور عمران کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔وہ بار بار اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملانے کی کوشش بھی کررہا تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔''لگتا ہے کہ یوسف زیادہ زخمی ہے، تم اسے لے کر نکل جاؤ۔ میں اور جیلانی یہاں کا معاملہ سنبھال لیں گے۔ یہ لو چابی۔'' اس نے گاڑی کی چابی میری طرف اُچھالی۔

پٹھان چوکیدار اور دیگر گارڈز بھی یہاں موجود تھے، میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔ میں جب مہران کی ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا، دور سڑک کے موڑ پر پولیس موبائل

کی نیلی بتی نظر آنا شروع ہوگئی تھی۔ یوسف کو جیلانی میری ساتھ والی سیٹ پر بٹھا چکا تھا۔ یوسف نے اپنی ران دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی اور تکلیف میں نظر آتا تھا۔لڑائی کے دوران میں ہی اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس حوالے سے اس کے چہرے پر خاصی حیرانی تھی۔

''ہیلو یوسف صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی نکیلی چیز لگی ہے یہاں گھٹنے سے اوپر...... گوشت پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔اس کی ڈینم کی نیلی پتلون ران پر سے لہولہان ہورہی تھی۔

''کیا خیال ہے؟ کسی پرائیویٹ کلینک چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے کہا۔اس کی ناک سے بھی خون رِس رہا تھا۔ وہ ذرا توقف کر کے بولا۔''یہ تو بڑا اچھا اتفاق ہوا ہے کہ آپ یہاں آگئے، ورنہ ان خبیثوں نے تو میرا بھرتہ بنا دینا تھا۔آپ نے مجھے دیکھا تھا، یا ویسے ہی رُک گئے تھے؟''

''ہم آگے نکل گئے تھے مگر جب گاڑیوں کے بریک زور سے لگے اور پھر ٹکر کی آواز آئی تو ہم ٹھہر گئے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ تین چار بندے ایک بندے کو گرا کر پیٹ رہے ہیں تو ہم گاڑی سے نکل آئے۔اس وقت تک ہمیں بالکل پتا نہیں تھا کہ یہ آپ ہیں۔''

''لیکن اس وقت آپ یہاں سے کیسے گزر رہے تھے؟''

''ہم تو ایک شادی میں شرکت کے بعد آئے ہیں۔ گھر کے اندر ہونے والا یہ فنکشن ڈھائی تین بجے تک جاری رہا ہے اور آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہاں دو چار دوستوں کی کمپنی میں تھا، بس وہاں دیر ہوگئی۔'' یوسف نے مبہم جواب دیا۔

ہم تیزی سے فیروز پور روڈ کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں پہنچ گئے۔ ران پر سے یوسف کی پتلون چر گئی تھی اور اس کا خون کسی طرح بند ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ مارا ماری میں گاڑی کا کوئی تیز دھار کنارہ یا کوئی ایسی ہی چیز لگی ہے جس نے گہرا گھاؤ ڈالا ہے۔ اندر کی نسیں کٹ گئی تھیں اور مسلز بھی متاثر ہوئے تھے۔ ہسپتال کی ایمرجنسی میں یوسف کو ابتدائی طبی امداد دی گئی۔اس کا خون بند کیا گیا اور انجکشن وغیرہ لگائے گئے۔اس کی حالت قدرے بہتر ہوگئی لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ ابھی اسے ہسپتال میں ہی رہنا پڑے گا۔صبح جب سینئر ڈاکٹر اسے دیکھے گا تو پھر ہی ٹانکے وغیرہ لگانے کا فیصلہ ہوگا۔

یوسف میرا بہت شکر گزار نظر آرہا تھا۔ وہ میرے دونوں ساتھیوں کے بارے میں بھی

پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ معاملے کو سنبھالنے کے لیے موقع پر ہی موجود ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ عمران کے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ صورت حال کو اچھی طرح ہینڈل کر لے گا۔

یوسف کے منہ سے الکحل کی ہلکی سی بُو اب بھی اُٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ایکسیڈنٹ سے پہلے ایک پُر نشاط شب گزاری ہے۔

اس کے سیل فون پر بیل ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھا اور قدرے متفکر نظر آنے لگا۔ بہر حال اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو یوسف نے مجھ سے کہا۔ ''گھر سے ثروت کا فون ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ دو ڈھائی بجے تک آ جاؤں گا لیکن اب پانچ بجنے والے ہیں۔ وہ پریشان ہو رہی ہے۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ثروت کا نمبر پریس کیا اور اس سے بات کی۔ اس کے لب و لہجے میں ناراضی اور روکھے پن کی جھلک تھی۔ وہ بولا۔ ''ہیلو...... یہاں ایک تھوڑا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں...... ویسے میں ٹھیک ہوں...... بس گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بعد میں جھگڑا ہو گیا۔ ٹانگ پر تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔'' دوسری طرف سے کچھ کہا گیا، جواب میں یوسف بولا۔ ''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں فیروز پور روڈ پر ایک دوست ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کی طرف آیا ہوا ہوں۔ دو چار اسٹیچ لگنے ہیں۔ اس کے بعد گھر آ جاؤں گا۔ نہیں...... نہیں اس کی ضرورت نہیں...... اور اچھی بات یہ ہے کہ تمہارے فرسٹ کزن صاحب میرے پاس ہیں۔ بھئی اپنے تابش صاحب اور کون؟ بلکہ انہوں نے بڑی مدد کی ہے میری۔ اس وقت بھی میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرشتہ سیرت بندے ہیں بھئی۔''

یوسف فاروقی سے ثروت نے غالباً پوچھا کہ وہ رات اتنی دیر تک کہاں تھا۔ جواب میں یوسف سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تمہیں بتایا تو تھا ایک چیریٹی شو ہے۔ شو سے نکلے تو دو تین پُرانے دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ انہیں کچھ وقت دینا پڑا۔ ان سے رخصت ہوا تو یہ جھگڑا ہو گیا۔''

وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے امپورٹڈ وسکی پی کر جس مہنگے ''چیریٹی شو'' میں شرکت کی تھی، اس کا صلہ اس نے آخرت کے بجائے یہیں وصول کر لیا تھا اور مطمئن تھا کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا ہے مگر ابھی قدرت کے کھاتوں میں حساب کتاب ہونا باقی تھا۔

کچھ دیر بات کرنے کے بعد یوسف نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون پر عمران سے بات کی اور اس سے صورتِ حال پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ

پولیس اسٹیشن میں ہے۔ دونوں گاڑیاں بھی پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ معاملہ طے ہو رہا ہے، کچھ دیر میں کام نمٹ جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ عمران ایسے کاموں میں ماسٹر ہے۔ اس کی مقناطیسی شخصیت کام کرتی تھی اور وہ بہت جلد ایسی گتھیاں سلجھا لیتا تھا۔ نہ صرف سلجھا لیتا تھا بلکہ نئے دوست بھی پیدا کر لیتا تھا۔

سویرے دس بجے کے قریب دو سینئر سرجنز نے یوسف کے زخم کا معائنہ کیا اور ماتحت ڈاکٹرز کو اسٹیچنگ اور مرہم پٹی وغیرہ کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ ان ہدایات میں ایک دو نسوں کو جوڑنے کا کام بھی شامل تھا۔ اسی دوران میں یوسف نے دو تین جگہ فون پر بھی بات کی۔ ان میں سے ایک کال وسیم احمد کے فون پر بھی تھی۔ یہ وسیم احمد وہی فلم ایڈیٹر تھا جس کے ذریعے شاربہ بائی کے بالا خانے پر ''شب بسری'' کا سودا ہوا تھا۔ وسیم سے گفتگو کے دوران میں یوسف مبہم زبان استعمال کر رہا تھا، لہٰذا اسے ''پرائیویسی'' فراہم کرنے کے لیے میں کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ بہر حال دور کھڑے ہو کر بھی میں یوسف کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی ''شب بسری'' سے مطمئن ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا اسے شک تو نہیں ہوا کہ اسے منہ مانگے داموں کے عوض دو نمبر مال فراہم کیا گیا۔

بغور جائزہ لینے کے باوجود میں یوسف کے تاثرات سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ یوسف بات ختم کر کے فون بند کر رہا تھا جب میں بُری طرح چونک گیا۔ مجھے ایمرجنسی وارڈ کے دروازے پر ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ یہ خود شاربہ بائی تھی لیکن اب وہ ایسے حلیے میں تھی کہ کوئی اس کے اصل پیشے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اونچے گھرانے کی بیگمات کی طرح اس نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ ایک قیمتی شال نے نہ صرف اس کا سراپا چھپا رکھا تھا بلکہ نصف چہرہ بھی اوجھل کر رکھا تھا۔ اس کے کندھے پر قیمتی بیگ تھا۔ میں پہلے ہی یوسف سے کافی فاصلے پر تھا، مزید احتیاط کے لیے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ شاربہ بائی یوں اپنے گاہک کی عیادت کے لیے اس پرائیویٹ ہسپتال میں چلی آئے گی۔ شاربہ کے ساتھ ایک ڈرائیور نما شخص تھا۔ دوسرا موٹی موٹی آنکھوں والا ایک پہلوان نما بندہ تھا۔ اس نے پتلون اور دھاری دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ شاربہ بائی کی طرح یہ بھی کوئی ''اچھی شخصیت'' نہیں۔ خاص طور سے اس کی آنکھوں میں ایک مجرمانہ سی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ تھوڑی دیر یوسف کے بستر کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہے۔ وہ اس سے رات کو پیش آنے

والے واقعے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔اس ساری گفتگو کے دوران میں میری نظر کئی بار دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف اُٹھی۔وہ مسلسل بڑے دھیان سے یوسف کا جائزہ لے رہا تھا۔جیسے نگاہوں میں اسے تول رہا ہو۔یوسف پہلے اِدھر اُدھر نگاہ گھما کر مجھے ڈھونڈتا رہا۔پھر اس نے سیل فون کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے سامنے آکر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتا تھا۔شاربہ بائی مجھے فوراً پہچان لیتی۔وہ اپنے بالا خانے پر مجھے ''چودھری عمران'' کے ساتھ اس کے ہمراہ دوست کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی۔یہ بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔کچھ دیر بعد شاربہ بائی اور اس کے دونوں ساتھی یوسف کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔میں نے پہلے کھڑکیوں میں سے جھانک کر یہ تسلی کی کہ وہ گاڑی پر بیٹھ کر رخصت ہو گئے ہیں، اس کے بعد یوسف کے پاس چلا گیا۔

سہ پہر کے وقت عمران ہسپتال آکر یوسف کی عیادت کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے فون پر منع کر دیا۔میں نے بتایا کہ شاربہ بائی یہاں آئی تھی، عین ممکن ہے کہ اس کا کوئی ساتھی یا ملازم اب بھی ہسپتال میں موجود ہو لہٰذا وہ فون پر ہی یوسف کی خیریت دریافت کر لے۔عمران نے ایسا ہی کیا۔اس کے علاوہ اس نے یوسف کو بتا دیا کہ جھگڑے والا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا ہے۔دونوں طرف کے افراد کو چوٹیں لگی ہیں اور دونوں گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔لہٰذا مخالف پارٹی قانونی کارروائی کے بجائے مک مکا پر تیار ہو گئی ہے۔امید ہے کہ کل تک راضی نامہ تحریر ہو جائے گا۔یوسف کی گاڑی بھی واپس اس کے گھر پہنچ چکی تھی۔

اس زبردست تعاون پر یوسف نے عمران کا بہت شکریہ ادا کیا۔اسی دوران میں یوسف کا دوست فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی پہنچ گیا۔اس کے آنے کے بعد میرے لیے گنجائش پیدا ہو گئی کہ میں گھر واپس جا سکوں اور کپڑے وغیرہ بدل سکوں۔میں نے یوسف سے شام تک واپسی کا وعدہ کیا اور عمران کے اندرون شہر والے گھر واپس آ گیا۔عمران اور جیلانی بھی وہیں موجود تھے۔میرے پہنچنے سے پہلے ہی صورتِ حال پر تبصرہ ہو رہا تھا۔یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ معروف فلمی اداکاراؤں کے ہم شکل ڈھونڈنے اور انہیں استعمال کرنے کا کام بڑے منظم طریقے سے کیا جا رہا ہے۔یہ کام جاوا اور اس کے گروپ کے لوگ کر رہے تھے۔اگر لالچ کی تھیوری پر عمل کرتے ہوئے جاوا آرا کوئے والے معاملے میں ہاتھ نہ ڈالتا اور یوں ہم اس کے مال روڈ والے ٹھکانے پر نہ پہنچتے تو ہمیں بھی ان ڈمی اداکاراؤں والے معاملے کا پتا نہ چلتا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ گھاگ قسم کے لوگ ''ٹیلنٹ ہنٹ'' طرز کی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ اشتہار بازی اور دیگر ذرائع سے معروف چہروں کے ہم شکل چہرے تلاش کرتے ہیں۔ان کی چھانٹی وغیرہ کی جاتی ہے اور آخر میں کچھ چہرے منتخب کر کے اگلے مرحلے میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔

میں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔خوب بھوک لگ رہی تھی۔عمران نے قریبی بازار سے گرم نان، مرغ چنے اور بریانی پر مشتمل ریڈی میڈ کھانا منگوایا۔سویٹ ڈش کے طور پر لاہوری فالودہ تھا۔کھانے سے فارغ ہو کر میں برتن سمیٹ رہا تھا جب میرے سیل فون پر نصرت کی کال آئی۔''ہیلو نصرت گڑیا! کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں بھائی جان! لیکن یہ آپ نے کیا چکر چلایا ہے۔باجی بتا رہی ہیں کہ یوسف کا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے اور چوٹ آئی ہے اسے......کیا واقعی؟''

''ہاں......ایسا ہوا تو ہے۔اس کی گاڑی کی ٹکر ہو گئی تھی جس کے بعد جھگڑا ہوا۔''

''گاڑی تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بندے گیراج میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ایک طرف سے پچکی ہوئی ہے لیکن......لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ وہاں کیسے پہنچے؟ کیا یہ اتفاق تھا یا آپ کو پہلے سے کچھ معلوم تھا؟''

''بس اتفاق ہی سمجھو۔''

''یعنی آپ کو تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ یوسف فلاں وقت پر فلاں جگہ موجود ہو گا۔کہیں آپ کا کوئی دوست اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟''

''اس بارے میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گا پیاری بہن! ابھی ایک دو اور ضروری کام کرنے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا صرف ایک بات بتا دیجیے تابش بھائی! کیا یوسف واقعی کوئی چیریٹی شو دیکھنے گیا ہوا تھا؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''مجھے تو اس سے ہرگز کسی اچھے کام کی توقع نہیں ہے۔وہ ضرور کسی اور چکر میں ہو گا۔''

''کم از کم مجھے اس چکر کا پتا نہیں۔میں وہی جانتا ہوں جو یوسف صاحب نے مجھے بتایا ہے۔''

''اس کا نام اتنی عزت سے مت لیں تابش بھائی! مجھے نفرت ہو گئی ہے اس بندے سے۔باجی اس کے لیے انسان نہیں ایک اثاثے کی طرح ہیں اور وہ اپنے اس اثاثے سے ہر قسم کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور......اور مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی مجھ سے بہت کچھ چھپا

رہے ہیں۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست اس کا پیچھا کر رہے تھے تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ رات کے اس پہر چیریٹی شو دیکھ کر آ رہا تھا یا کوئی اور کام دکھا رہا تھا۔''

''میں سچ کہتا ہوں نصرت! مجھے ابھی اتنا ہی معلوم ہے جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔''

میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔

میں نے نصرت سے بمشکل پیچھا چھڑایا۔

○....❖....○

مجھے ہسپتال سے آئے ہوئے اب تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ یوسف کو فون کر کے صورتِ حال دریافت کروں۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ بیل ہوتی رہی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ فون ہی بند ملا۔ میں وقفے وقفے سے قریباً آدھ گھنٹے تک فون کرتا رہا لیکن فون آف تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وسیم احمد، یوسف کے پاس ہی ہوگا مگر مجھے اس کا فون نمبر معلوم نہیں تھا۔''

اس دوران میں عمران نے ہسپتال کا نمبر معلوم کر لیا۔ میں نے اس نمبر کے ذریعے ایمرجنسی وارڈ میں رابطہ کیا۔ موقع پر موجود نرس نے بتایا کہ بیڈ نمبر 6 پر کوئی مریض موجود نہیں ہے۔

میں نے کہا۔''انہوں نے روم میں شفٹ ہونا تھا۔ آپ دیکھیں، وہ روم میں تو نہیں ہیں۔''

کاغذ کے اُلٹ پلٹ ہونے کی آوازیں آتی رہیں، پھر نرس نے بتایا۔''نہیں...... وہ کسی روم میں شفٹ نہیں ہوئے۔''

''تو کہاں جا سکتے ہیں وہ؟ واش روم وغیرہ میں تو نہیں گئے؟''

نرس کے بجائے ڈیوٹی ڈاکٹر کی مردانہ آواز سنائی دی۔''آپ بیڈ نمبر 6 کے یوسف فاروقی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ان کے کیا لگتے ہیں؟''

''میں ان کا دوست ہوں۔ میں ہی انہیں لے کر آیا تھا۔''

ڈیوٹی ڈاکٹر نے کہا۔''یوسف صاحب کچھ بھی بتائے بغیر چلے گئے ہیں اور ابھی واپس نہیں آئے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تو ہمیں معلوم نہیں جی! ان کے دو ساتھی آئے تھے۔ وہ انہیں وہیل چیئر پر باہر لے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اس حالت میں؟ کہنے لگے سامنے گاڑی تک جا رہا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں آ جاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ان کو اس حالت میں جانا نہیں چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مجبوری ہے۔ اب دو گھنٹے ہو گئے ہیں، ان کا کچھ پتا نہیں۔''

میں نے فون بند کیا اور عمران سے کہا۔''یہاں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یوسف ہسپتال سے کہیں چلا گیا ہے۔''

''کہاں جا سکتا ہے؟'' عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

جیلانی بولا۔''بعض لوگ ہسپتال تبدیل کرتے وقت بھی بتاتے نہیں اور بہانے سے نکل جاتے ہیں۔ یہ بھی تو یہی کیس نہیں؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اس معاملے میں شاربہ بائی کا عمل دخل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے یوسف کو کوئی مشورہ دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو دو بندے آئے، وہ بھی اسی کے بھیجے ہوئے ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اس میں ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ لوگ ڈاکٹر سے سیدھے سیدھے کہہ سکتے تھے کہ ہم ڈسچارج ہونا چاہتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

میں اور عمران فوراً ہسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ عمران نے اپنی مہران کار ہسپتال سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی۔ میں اندر چلا گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر تیس بتیس سال کا سنجیدہ سا شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک مریض کا کچھ پتا نہیں۔ نہ ہی کوئی فون وغیرہ آیا ہے۔ میں نے کہا۔''ڈاکٹر صاحب! آپ کو ان کی حالت کا پتا تھا۔ آپ نے انہیں اس طرح جانے کیوں دیا؟''

وہ بولا۔''محترم! ہم کسی کو زبردستی روک نہیں سکتے۔ آپ جانتے ہی ہیں، یہاں مریض کے داخل ہوتے ہی کچھ رقم ایڈوانس میں جمع کر لی جاتی ہے۔ اس ایڈوانس کے ہوتے ہوئے ہمارے پاس کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی مریض کو نقل و حرکت سے روکیں۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! مریض کی جسمانی حالت بھی تو ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں ابھی ان کے زخم کی اسٹیچنگ بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''نہیں اسٹیچنگ تو ہو چکی ہے۔ یہ دیکھیے یہ سب کچھ لکھا ہے فائل میں۔ اس کے باوجود میں نے انہیں باہر جانے سے منع کیا تھا۔''

اسی دوران میں مجھے ہسپتال کے مین دروازے پر یوسف کے دوست وسیم احمد کی صورت دکھائی دی۔ وہ حواس باختہ تھا اور اس کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ''کچھ پتا چلا یوسف کا؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے پاس تو تم تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں صرف آدھ گھنٹے کے لیے گیا تھا۔ مجھے اپنے بھتیجے کو کالج سے لے کر گھر چھوڑنا تھا۔ واپس آیا تو یوسف نہیں تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کوئی اور کہانی سنا رہے ہیں۔ یوسف کا فون بھی مسلسل بند جا رہا ہے۔''

''اب تم کہاں سے آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پاس ہی دو تین اور پرائیویٹ کلینکس بھی ہیں۔ دیکھ کر آیا ہوں کہ شاید وہ وہاں شفٹ ہوا ہو۔ اسٹچنگ کے باوجود اس کا خون رِس رہا تھا اور وہ پاؤں کو سن محسوس کر رہا تھا۔''

پھر وسیم احمد نے مجھے اشارے سے ایک طرف بلایا۔ ہم کچھ دور کوریڈور میں چلے گئے۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''کہیں یہ وہی کل رات کے پھڈے والا معاملہ تو نہیں۔ جن لوگوں سے یوسف کا جھگڑا ہوا تھا، وہ اسے ڈرا دھمکا کر یا بہلا پھسلا کر لے گئے ہوں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے چونک کر دیکھا لیکن یہ یوسف کا نہیں ثروت کا نمبر تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ثروت نے پریشان آواز میں کہا۔ ''کیا بات ہے، یوسف فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے؟ پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کر رہی ہوں۔''

''وہ دراصل پین محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پین کا انجکشن لگایا ہے اور ٹرنکولائزر دیا ہے۔ وہ سو گیا ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

''ہسپتال میں ہوں۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''میں پریشان ہوں۔ کہیں...... آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے۔ آخر...... آپ بتاتے کیوں نہیں کہ کس ہسپتال میں ہیں؟ اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے؟''

''چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ یوسف کا خیال تھا کہ دو چار گھنٹوں میں اسے گھر چلے ہی جانا ہے پھر تم لوگوں کو تکلیف دینے کا فائدہ۔ ابھی وہ جاگتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ

تمہیں فون کر لے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں...... میں انتظار کر رہی ہوں۔''

''اوکے......'' میں نے کہا۔

بات ختم ہو گئی تھی لیکن فون بند ہونے کی آواز نہیں آئی۔ میں نے فون کان سے لگائے رکھا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز اُبھری۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ ''تابش......''

''ہاں۔''

''مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت دُکھ دیئے ہیں۔''

''یہ دُکھ مجھے ہر سکھ سے زیادہ عزیز ہیں ثروت۔''

''میری ایک بات مان لیں تابش! آپ شادی کر لیں۔ میں نے آپ کے لیے بڑی دعائیں مانگی ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ کو بڑی اچھی لڑکی ملے گی۔ وہ آپ کے ہر دُکھ کو سکھ میں بدل دے گی۔ مجھے یقین ہے تابش۔''

''مجھے میرے حال پر رہنے دو ثروت! میں بالکل ٹھیک ہوں اور نصرت کی باتوں پر نہ جایا کرو۔ وہ جو کچھ کہتی ہے، وہ اس کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ جب تم پر کوئی دباؤ ڈالتی ہے تو خود مجھے بھی بُرا لگتا ہے۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک ہیں تو مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ کیوں میرا دل ہر وقت مجھے ملامت کرتا ہے۔ کیوں میں خود کو زنجیروں میں جکڑا محسوس کرتی ہوں۔ پلیز تابش...... پلیز...... مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آزاد کر دیں اور میں تب ہی آزاد ہوں گی، جب آپ ٹھیک ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر اپنے اردگرد میری موجودگی تمہیں پریشان کرتی ہے تو میں دور چلا جاتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں دکھائی نہ دوں۔''

اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے سسکنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے فون بند کر دیا۔

میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ثروت بے چینی سے یوسف کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یوسف سے رابطہ کراتا ہوں۔ لیکن یوسف کہیں نہیں تھا۔ وہ ہسپتال سے غائب ہو چکا تھا۔

وسیم احمد اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ میں جب فون پر عمران سے بات کر رہا تھا

وہ کہیں کھسک گیا۔ شاید اس نے جان لیا تھا کہ اب یہ معاملہ پولیس تک جانے والا ہے۔ وہ اس پھڈے سے بچنا چاہتا تھا۔ یقیناً اسے یہ ڈر بھی رہا ہوگا کہ یوسف کا بھید کھل جائے گا اور پتا چل جائے گا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔

میں عمران کے پاس گاڑی میں پہنچا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟''

''یار! میں اس سارے معاملے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ ثروت کو بتا چکا ہے کہ یوسف کے زخمی ہونے کے بعد اس کے ساتھ میں تھا۔ میں ہی اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ اب وہ یوسف کے بارے میں ہر بات مجھ سے پوچھ رہی ہے۔''

''تو کوئی بات نہیں جگر! ڈھونڈ لیتے ہیں اسے۔ امید ہے کہ مل جائے گا اور اگر نہ بھی ملا تو تمہارے لیے تو اچھا ہی ہے۔''

''اسی بات سے تو ڈر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کہیں ثروت کے ذہن میں کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ آ جائے۔''

O.....❖.....O

میں اور عمران ہسپتال کے سامنے سے یوسف کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اگلے قریباً چار گھنٹے ہم نے شہر کی سڑکیں ناپتے ہوئے گزارے۔ مختلف ہسپتالوں میں گئے۔ تھانوں وغیرہ میں پتا کرایا۔ قریباً وہ سب جگہیں دیکھیں جہاں یوسف کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وسیم احمد تو کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ہم نے یوسف کی ملازمہ حمیدن کے تعاون سے یوسف کے ایک اور دوست ابوبکر کا پتا چلایا اور پھر ابوبکر کے ذریعے ہم نے کئی ایسے ٹھکانے دیکھے جہاں یوسف کی موجودگی کا امکان تھا۔ اس ساری بھاگ دوڑ کے دوران میں ہمیں اپنی طرف سے بھی محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ صرف دو دن پہلے یہیں لاہور کی سڑکوں پر جاوا کے غنڈوں سے ہمارا بھرپور ٹکرا ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اب بھی آس پاس موجود ہو سکتے تھے۔ بہرحال اس وقت ہم بھی غافل نہیں تھے۔ مہران گاڑی کے خفیہ خانے میں ٹرپل ٹو رائفل اور ماؤزر موجود تھا۔ کافی ایمونیشن بھی تھا۔ ذہنی طور پر بھی ہم پوری طرح تیار تھے۔

حیران کن طور پر یوسف کا کوئی کھوج لگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا۔ اس دوران میں تین چار بار ثروت اور نصرت کی کالز میرے سیل فون پر آ چکی تھیں لیکن میں نے انہیں اٹینڈ نہیں کیا۔ میری یہ خاموشی میری پوزیشن کو مزید خراب کر رہی تھی۔ میرا دھیان بار بار شاریہ بائی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ہمارا جانا خطرے سے خالی تو نہیں تھا مگر اب خطرہ مول لیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ شاریہ بائی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے میں نے ثروت کو کال کر دینا ضروری سمجھا۔ رابطہ ہوا تو وہ پریشان آواز میں بولی۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیوں ہماری جان نکال رہے ہیں؟ آپ یوسف سے رابطہ کیوں نہیں کراتے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ثروت! میں تمہیں یوسف کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ وہ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے؟'' ایک مشرقی بیوی کی حیثیت سے ثروت کے لہجے میں سیکڑوں اندیشے سمٹ آئے۔

''وہ ہسپتال میں نہیں ہے میں کچھ دیر کے لیے کپڑے وغیرہ بدلنے گیا تھا۔ واپس آیا تو وہ جا چکا تھا۔''

''جا چکا تھا؟ آپ خود کہتے ہیں کہ وہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔'' ثروت نے قریباً چلا کر کہا۔

''ڈیوٹی ڈاکٹر بتا رہا ہے کہ دو بندے آئے تھے۔ وہ پہلے یوسف سے باتیں کرتے رہے۔ پھر یوسف ان کے ساتھ وہیل چیئر پر مین دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ابھی پانچ منٹ میں بیڈ پر واپس آ رہا ہے لیکن وہ آیا نہیں۔''

''او گاڈ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ یہ تو بتائیں کہ آپ ہیں کہاں؟ کس ہسپتال سے بات کر رہے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ثروت سے فون کسی اور نے لے لیا۔ یہ ایک بھرائی ہوئی سی مردانہ آواز تھی۔ پتا چلا کہ یہ یوسف کے والد فاروقی صاحب ہیں۔ وہ دمے کے مریض تھے اور آج کل شدید بیمار تھے۔ انہوں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں مجھ سے صورتِ حال دریافت کی۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس سے پہلے ثروت کو بتایا تھا۔ انہوں نے ہسپتال کا نام پوچھا۔ میں نے ہسپتال کا نام بھی بتا دیا۔ وہ بولے۔ ''ہم پندرہ بیس منٹ میں ہسپتال پہنچ رہے ہیں۔''

میں نے انہیں بتایا کہ میں ہسپتال میں نہیں ہوں۔ یوسف کے ایک دوست کے ساتھ ہی اس کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر انہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔

ثروت کے گھر والوں کو ہسپتال کا بتا کر میں نے خود کو قدرے ہلکا محسوس کیا۔ میرا دھیان بار بار شاربہ بائی کی طرف ہی جا رہا تھا۔ وہ یوسف کے لاپتا ہونے سے صرف دو ڈھائی گھنٹے پہلے اس سے ملنے ہسپتال آئی تھی۔ بظاہر وہ تیمارداری کے لیے آئی تھی لیکن یہ بات دل کو کچھ لگتی نہیں تھی۔ شاربہ اور یوسف کے درمیان صرف گاہک اور نائکا کا رشتہ تھا اور یہ رشتہ بھی فقط دو چار دن پہلے وسیم احمد کے ذریعے ہی استوار ہوا تھا۔ پھر مجھے بار بار وہ چمکیلی آنکھوں والا شخص بھی یاد آ رہا تھا جو شاربہ بائی کے ساتھ یوسف کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یوسف کے لیے غیر معمولی توجہ اور دلچسپی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ عمران کے گوش

گزار کیا۔

وہ بولا۔ ''بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ شاربہ بائی جیسے لوگ خوش شکل لڑکیوں کو تو غائب کر سکتے ہیں لیکن یوسف فاروقی جیسے چھبیس ستائیس سالہ بندے سے انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ بظاہر یہ کوئی اغوا اور تاوان والا معاملہ بھی نہیں لگ رہا۔ بس ایک ہی بات کی طرف دھیان جاتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہوسکتا ہے کہ کل رات شاربہ کی کوٹھی میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد یوسف کو معلوم ہو گیا ہو کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ جو لڑکی اس کو دی گئی ہے وہ فلمی ہیروئن نہیں بلکہ اس کی نقل ہے۔ ظاہر ہے کہ یوسف نے دس لاکھ روپیہ نقل کے لیے خرچ نہیں کیا تھا۔ اسی بات پر خریدار اور دکاندار میں جھگڑا ہوا ہوگا۔ دکاندار یعنی شاربہ نے اس خوف سے کہ راز طشت از بام ہو جائے گا اور دوسرے گاہک بھی متاثر ہوں گے۔ خریدار کو غائب کرا دیا ہو۔''

''تمہاری بات خارج از امکان نہیں عمران! لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ایسا نہیں لگتا۔ ہسپتال پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد یوسف نے فون پر اپنے ہم راز وسیم احمد سے فون پر بات کی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ میں بڑے غور سے یوسف کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بھی شک تھا کہ شاید وہ وسیم سے شاربہ بائی کی دھوکا دہی کے بارے میں کوئی بات کرے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہو۔''

میری اور عمران کی گفتگو کے بعد یہ ضروری محسوس ہوا کہ ہم ایک بار شاربہ بائی سے بات کریں اور اس واقعے کے بارے میں اس کا ردعمل معلوم کریں۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم سیدھے شاربہ بائی کے کوٹھے پر پہنچ جاتے لیکن پچھلی بار شاربہ بائی کے کوٹھے پر پہنچنا ہمارے لیے ایک لحاظ سے خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہاں جاوا کا کوئی گرگا موجود تھا اور اس نے ہمیں پہچان لیا تھا۔ وہیں سے لوگ ہمارے پیچھے لگے تھے جس کا نتیجہ ہوٹل لالہ زار کی زوردار لڑائی کی صورت میں نکلا تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ہم خود بازارِ حُسن میں جانے کے بجائے بذریعہ فون شاربہ بائی سے رابطہ کریں اور اس معاملے کی ٹوہ لیں۔ عمران کے پاس شاربہ بائی کے بالاخانے کا نمبر موجود تھا۔ وہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے کال ملانے کی کوشش کی۔ پہلے دو تین بار تو کسی نے فون اُٹھایا ہی نہیں پھر کسی دلال ٹائپ شخص نے کال اٹینڈ کی۔ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بول رہا تھا۔ عمران نے اس سے گاہک کی حیثیت سے بات کی اور اسے کہا کہ وہ شاربہ

بائی کو لائن پر بلائے۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور پھر روکھے پھیکے لہجے میں بولا کہ وہ دوا کھا کر سو رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ عمران کسی طرح کی ''آرگومینٹ'' کرتا، فون کھٹاک سے بند کر دیا گیا۔

عمران نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی تین چار منٹ بعد کال اٹینڈ ہوئی۔ بولنے والا پھر وہی غصیلا ایجنٹ تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی سے بولا اور فون بند کر دیا گیا۔
~~عمران نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی تین چار منٹ بعد کال اٹینڈ ہوئی۔ بولنے والا پھر وہی غصیلا ایجنٹ تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی سے بولا اور فون بند کر دیا۔~~

عمران نے اسے غائبانہ دو تین صلواتیں سنائیں، پھر علاقے کے انسپکٹر سے رابطہ کیا۔ یہ وہاں کا ایس ایچ او بھی تھا۔ عمران کے ساتھ اس کا تعارف راجا والے جھگڑے کے دوران میں ہوا تھا۔ عمران نے شوکت نامی اس انسپکٹر کو فون پر ہی ساری صورتِ حال بتائی اور اسے کہا کہ وہ شاربہ بائی کے کوٹھے پر جائے اور اندازہ لگانے کی کوشش کرے کہ شاربہ بائی کا ہاتھ یوسف کی گمشدگی والے معاملے میں ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں تک ہے۔ انسپکٹر شوکت ذہین بندہ لگتا تھا اور خاصا معاملہ فہم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ فیصل ٹاؤن سے ایک بندے کو گرفتار کرنے جا رہا تھا لیکن اب یہ کام ملتوی کر کے سیدھا ہیرا منڈی پہنچتا ہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں رپورٹ دیتا ہے۔''

ہم اندرون شہر والے گھر واپس آ گئے اور بے قراری سے انسپکٹر کے فون کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں ایک بار ثروت کی کال بھی آئی لیکن مجھے سننے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں قصوروار نہیں تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں پھر بھی خود کو قصوروار محسوس کر رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد انسپکٹر شوکت نے عمران کے موبائل پر کال کی۔ عمران نے سپیکر آن کر دیا تاکہ میں بھی انسپکٹر کے ساتھ ہونے والی گفتگو سن سکوں۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''عمران صاحب! شاربہ بائی واقعی دوا کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے مشکل سے جگایا۔ اسے اس بات کا افسوس ہے کہ اس کی گلبرگ والی کوٹھی کے عین سامنے کچھ لوگوں نے اس کے گاہک پر حملہ کر کے اسے زخمی کیا ہے۔ اسی لیے وہ یوسف فاروقی کی عیادت کے لیے ہسپتال بھی گئی تھی۔ بہرحال وہ تو اس بات سے بالکل انکاری ہے کہ یوسف کے گم ہونے میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہی کہیں گیا ہے۔ وہ یہاں اپنے علاج سے مطمئن نہیں تھا، ہوسکتا ہے کہ کسی اور ہسپتال میں داخل ہو گیا ہو۔ اسے امید ہے کہ دو چار گھنٹوں میں اس کی طرف سے کوئی فون وغیرہ آ جائے گا۔''

عمران نے پوچھا۔ ''وہ بندہ کون تھا جو عیادت کے وقت اس کے ساتھ تھا؟''

''اس کا نام بشیر احمد ہے۔ وہ بازار ہی کا بندہ ہے۔ اس نے ایک پلازا ٹھیکے پر لیا ہوا ہے۔ میں اس سے بھی ملا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو یونہی شاربہ بائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔''

''تمہارا اپنا اندازہ کیا ہے شاربہ بائی کے بارے میں؟'' عمران نے پوچھا۔

انسپکٹر شوکت بولا۔ ''میں اس عورت کو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ اپنے پیشے میں تو ایک دم ماسٹر ہے۔ بازار میں کافی ساکھ ہے اس کی۔ تھوڑا بہت تعلق فلم والوں سے بھی ہے اس کا۔ میرے اندازے کے مطابق تو یہ اپنے ہاتھ صاف رکھتی ہے۔ کسی پھڈے والے کام میں نہیں پڑتی۔ مجھے اس تھانے میں ڈیڑھ دو سال ہو گئے ہیں۔ بس دو تین بار ہی ایسا ہوا ہے کہ اس کی کوئی لڑکی تھانے آئی ہے۔ اس سے پہلے کا ریکارڈ بھی تقریباً صاف ہی ہے۔''

انسپکٹر شوکت سے عمران نے پندرہ بیس منٹ گفتگو کی۔ انسپکٹر کی گفتگو تو شاربہ بائی کے حق میں ہی تھی۔ عمران بولا۔ ''یا تو بائی واقعی اس معاملے میں ملوث نہیں یا پھر انسپکٹر نے حرام زدگی کی ہے۔ تھوڑا بہت مال کھا لیا ہے بائی سے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ فرما رہا ہے کہ شاربہ بائی اپنے ہاتھ صاف رکھتی ہے اور کسی پھڈے والے کام میں نہیں پڑتی لیکن یہاں تو یہ پھڈے والا کام کر رہی ہے۔ جاوے اور سلطان چٹے وغیرہ کی آلہ کار بنی ہوئی ہے۔ اصلی ڈبے میں نقلی مال بیچ رہی ہے۔''

''ہاں...... یہ بات تو ہے۔'' عمران نے سر ہلایا اور ایک بار پھر بذریعہ فون شاربہ بائی سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک بار پھر اسی زہریلے دلال سے واسطہ پڑا۔ عمران کی آواز پہچانتے ہی اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے کہا۔ ''کیوں نہ ایک بار بائی جی سے ملنے کا رسک لے ہی لیا جائے۔''

''تو ٹھیک ہے جگر! رسک کے لیے تو ہم ہر وقت تیار ہیں۔ رسک لینے کی ہمت اور جرأت ہمارے خاندان میں ٹوپی سے آئی ہے۔''

''ٹوپی؟ یہ کون تھا؟''

''یار وہی اپنا نپولین بونا پارٹ۔ دادا جی کا لنگوٹیا یار تھا وہ۔ دونوں نے اکٹھے ہی میٹرک کیا تھا پھر نپولین تو فوج میں چلا گیا، فرانس کو آزاد شزاد کرنے کے لیے اور دادا جی نے بادامی باغ میں اسپیئر پارٹس کی دکان کھول لی لیکن دونوں کی دوستی برقرار رہی۔ جب بھی موقع ملتا تھا،

وہ پیرس یا لاہور میں ملتے رہتے تھے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نپولین نے جاپان پر ایٹم بم گرانے کا جو خطرناک فیصلہ کیا تھا، وہ دادا جی کے مشورے سے ہی کیا تھا۔

''جاپان پر بم نپولین نے نہیں، امریکہ نے گرایا تھا اور اس وقت روز ویلٹ امریکہ کا صدر تھا۔''

''یہی تو وہ تاریخی غلطی ہے جو اب تک تاریخ دان کرتے رہے ہیں۔ میں عنقریب اپنے ''فساد پلس'' پر اس سلسلے میں ایک لمبا چوڑا شوشا...... مم میرا مطلب ہے، پروگرام چھوڑنے والا ہوں۔ اس کو ''ڈی بیٹ'' کرانا کہتے ہیں۔ دیکھنا یہ تاریخ کو بدل دے گا اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں جگر! تمہارا یہ خادم اس سے پہلے بھی تاریخ بدل چکا ہے۔'' میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ جان من! میں واقعی تاریخ بدل چکا ہوں۔ نصرت نویں کا امتحان دے رہی تھی۔ اس کا تاریخ کا پرچہ تھا۔ اس کی تاریخ کی کتاب اسٹڈی میں پڑی تھی۔ میں نے تاریخ بدل دی اور اس کی جگہ ایف اے کی تاریخ رکھ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس میں سر کھپاتی رہی اور بڑے اچھے نمبروں سے فیل ہو گئی۔''

''چینل والے اپنے اردگرد والوں کی مدد اسی طرح کرتے ہیں۔'' میں نے تائید کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بولنا شروع ہو گیا تھا اور اب یہی حل تھا سمع خراشی سے بچنے کا۔

○......❖......○
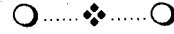
اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ یہ ایک اور ویک اینڈ کی رات تھی۔ خوشگوار اور بارونق۔ میں اور عمران جیلانی کی لائی ہوئی ایک سوئفٹ میں بیٹھے اور شاربہ بائی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم پورے انتظام کے ساتھ جا رہے تھے۔ گاڑی کے خفیہ خانے میں ٹرپل ٹو رائفل اور اس کا وافر ایمونیشن موجود تھا۔ ہم دونوں کے پاس بھرے ہوئے پسٹل بھی تھے۔ میرے پاس وہی کولٹ پسٹل تھا جو چند روز پہلے ہم نے سیکرٹری ندیم سے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور اہم ہتھیار تھا اور اس ہتھیار کو حاصل کرنے کے بعد میرے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ یہ وہی چاقو تھا جسے راجا خنجر کا نام دیتا تھا۔ یہ چاقو وہ ندیم سے حاصل کر چکا تھا لیکن اس نے ہمیں ابھی تک اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔ وہ اس چاقو کے حوالے سے کچھ رقم کھری کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے یہ رقم کھری کر دی تھی۔ عمران نے تین ہزار تو اسے پہلے دیئے تھے۔ مزید چار ہزار بھی دے دیئے تھے۔ ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بالکل وکھری ٹائپ کا بندہ ثابت ہو رہا تھا۔ آج کل وہ اچھرہ کے قریب ایک اور ہوٹل میں رہائش پذیر تھا اور ایشوریا رائے ثانی کا نام لے لے کر آہیں بھر رہا تھا۔

بازارِ حُسن ایک بار پھر جوبن پر تھا۔ جگمگاتی روشنیاں، کھڑکیوں میں لہراتے آنچل۔ سرخی پاؤڈر سے لتھڑے ہوئے نئے اور سیکنڈ ہینڈ چہرے، گھنگروؤں کی چھنا چھن، پکوانوں کی مہک، دلالوں کی آوازیں، ہیجڑوں کے ٹھٹے اور ان سب کے اندر موتیے کی پاکیزہ خوشبو...... جیسے گندی نالی میں کوئی ہیرا جگمگا رہا ہو۔

بازار کے اندر رش تھا۔ بغلی گلیوں میں تو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہم نے اپنی گاڑی شاربہ بائی کے پلازا نما بالا خانے سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی۔ کہیں پاس کے کوٹھے پر فلم امراؤ جان کا گیت گونج رہا تھا۔ جو بچا تھا وہ لٹانے کے لیے آئے ہیں۔

ابھی ہم گاڑی سے اُترنے اور شاربہ بائی کے ٹھکانے کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شاربہ کے پلازا نما بالا خانے کی طرف سے ایک نوخیز لڑکی تیزی کے ساتھ آئی۔ اس نے خود کو ایک لمبی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ بلکہ حواس باختہ دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی پیچھے لگا ہوا ہو لیکن بظاہر کوئی اس کے پیچھے بھی نہیں تھا۔ وہ ایک خوش پوش ہیجڑے سے ٹکرائی۔ ہیجڑے نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ لڑکی کی نگاہ ہماری کار پر پڑی۔ وہ کار کی طرف آئی۔ اس نے عقبی دروازہ کھولا اور غڑاپ سے اندر بیٹھ گئی۔ نہ صرف بیٹھ گئی بلکہ اس نے خود کو پچھلی نشست پر نیم دراز کر دیا۔ نیم تاریکی میں وہ ہمیں اچھی طرح دیکھ سکی تھی نہ ہم۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''پلیز! میری مدد کریں۔ وہ غنڈے میرے پیچھے ہیں...... پلیز۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے وہ کچھ اور بھی نیچے ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نشست پر دراز ہو گئی ہے۔ پرفیوم کی خوشبو ساری گاڑی میں بھر گئی تھی۔ ایک کھڑکی سے آنے والی روشنی سیدھی لڑکی کے چہرے اور گردن پر پڑ رہی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے قریب ہو گی۔ نقوش اچھے تھے۔ کانوں میں طلائی جھمکے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔

''کون لوگ ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''بازار کے ہی ہیں۔ مم...... مجھے زبردستی لے جانا چاہتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''اپنے مالک کے پاس۔ بہت بُرا بندہ ہے۔ مم...... میں اسے جانتی ہوں۔''

لڑکی کے لب و لہجے اور کسی حد تک حلیے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی بازار کی چیز ہے۔ ایک نوجوان طوائف جو کسی ڈر سے یہاں آ چھپی ہے لیکن پھر بھی یہ بازارِ حُسن تھا۔ یہاں ہر طرف گھاتیں لگی ہوئی تھیں اور پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ کیا کہا جا سکتا

تھا کہ یہ اس لڑکی کی کوئی چال ہی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے پھاڑ کر شور مچا دے کہ اسے اغوا کیا جا رہا ہے۔ یا دھمکی دے دے کہ وہ ایسا کرنے جا رہی ہے۔"

اچانک کچھ لوگ نظر آئے اور کم از کم اس بات کی تو تصدیق ہوگئی کہ لڑکی کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ یہ تین چار بندے تھے۔ ان کے حلیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی بازار کی کمائی سے پروان چڑھے ہیں۔ وہ ہم سے چالیس پچاس قدم کی دوری پر تھے اور کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لڑکی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور نشست پر کچھ اور دبک گئی۔ اس نے اپنی ٹانگیں موڑ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لیے تھے اور بالکل سکڑ گئی تھی۔ عمران نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اتفاقاً گاڑی کا غلاف دونوں نشستوں کے درمیانی خلا میں پڑا تھا۔ عمران نے تیزی سے یہ غلاف لڑکی کے اوپر پھیلا دیا۔ تلاش کرنے والے افراد اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ دکانوں کے اندر جھانک رہے تھے۔ انہوں نے کچھ دور کھڑی ایک کار کی کھڑکیوں سے آنکھیں لگا کر بھی دیکھا۔ انہیں جیسے یقین تھا کہ لڑکی آس پاس ہی کہیں ہے۔ تب میری نگاہ شاربہ کے بالا خانے کی طرف اُٹھی۔ میں نے دیکھا، وہاں بالکونی میں بھی ایک مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ بھی متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے۔

لڑکی غلاف کے نیچے سے بولی۔ "گاڑی چلا دو پلیز! مجھے یہاں سے آگے لے جاؤ۔"

"آگے کہاں لے جائیں؟ رستہ ہی نہیں ہے۔" عمران نے کہا۔

"تم بس چپکی لیٹی رہو۔" عمران نے اسے ہدایت کی۔

وہ سہم کر چپ ہوگئی۔ تلاش کرنے والے ہمارے دائیں بائیں گھوم رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا قریبی گلی میں چلا گیا۔ دو باتیں کرتے ہوئے ہماری گاڑی کی طرف آئے۔ ایک نے بازاری لہجے میں کہا۔ "زیادہ دور نہیں گئی ہوگی حرامزادی۔ یہیں کہیں گھس کے بیٹھی ہوگی۔"

"پر نظر آئے تو پھر ہے نا۔" دوسرے نے دانت پیسے۔

ایک نے بلاتکلف ہماری گاڑی کی کھڑکی سے چہرہ لگایا اور آنکھیں سکیڑ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

عمران نے کھڑکی کا شیشہ اُتار کر فوراً اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "کل گل اے پہلوان! کیا جھاتیاں مار رہے ہو؟"

"کوئی کڑی تو نہیں دیکھی تم نے؟" پہلوان نما شخص نے کہا۔

"کڑیاں ہی تو دیکھ رہے ہیں اور یہاں ہے کیا؟ پر تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟"

"لال پھولوں والی چادر لی ہوئی ہے اس نے۔ نیلی شلوار قمیص ہے۔ ابھی اس سامنے والے پلازے سے اُتری ہے۔"

"ہاں ہاں...... دیکھی ہے۔" عمران نے کہا۔

"کہاں؟"

"یہیں پر ہے یار! گاڑی کو غور سے دیکھو۔" عمران بولا۔

"کیا مطلب؟"

"گاڑی کے نیچے گھسی ہے یار!" عمران نے سرگوشی کی۔

پہلوان نے پہلے غیر یقینی نظروں سے عمران کو دیکھا پھر جھک کر گاڑی کے نیچے دیکھا۔ مزید تسلی کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔

عمران نے نشیلے انداز میں قہقہہ لگایا۔ پہلوان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔

لڑکی پچھلی نشست پر دم بخود پڑی تھی۔

اسی دوران میں سامنے سڑک پر پھنسے ہوئے ایک تانگے کو راستہ مل گیا اور سڑک پر رش کچھ کم ہوگیا۔ عمران نے کار سٹارٹ کر دی اور اسے دھیمی رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔ گاڑی انچ انچ سرکتی ہوئی کچھ آگے نکل گئی تو راستہ کچھ کشادہ ہوگیا۔ عمران نے چابک دستی سے ڈرائیونگ کی اور دو چار منٹ کے اندر گاڑی کو شاربہ بائی والے پلازا سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور لے آیا۔ یہ جگہ بھی بازارِ حُسن کا حصہ ہی تھی۔ تاہم یہاں بھیڑ کچھ کم تھی۔ زیادہ تر نچلے درجے کی طوائفیں تھیں۔ وہ کہیں کہیں دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی اپنی بوسیدہ چمڑی کے لیے خریدار ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہاں ایک بڑا سا چائے خانہ بھی تھا جہاں لکڑی کی بینچوں پر مزدور ٹائپ افراد بیٹھے وی سی آر پر انڈین ناچ گانا دیکھ رہے تھے۔ اپنے جسم کھجا رہے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔

عمران نے گاڑی ایک بغلی سڑک پر موڑی اور دو بند دکانوں کے سامنے کھڑی کر دی۔ یہاں روشنی بھی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے نوخیز طوائف کے اوپر سے غلاف ہٹایا اور اس سے کہا کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ جائے، اب خطرہ نہیں ہے۔

اس نے پہلے غلاف میں سے اپنا ڈرا ہوا چہرہ نکالا پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ صراحی دار گردن میں نسیں دھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟''

اس نے پہلی بار غور سے عمران کو اور مجھے دیکھا۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں میں شناسائی کے آثار نظر آئے۔ وہ قدرے حیرانی سے بولی۔ ''آپ تو وہی ہیں جو کچھ دن پہلے ہمارے کوٹھے پر آئے تھے۔ آ...... آپ کا نام عمران صاحب ہے نا؟''

عمران نے کہا۔ ''تو تم شاربہ کے پاس ہوتی ہو؟''

''جی ہاں...... شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اس دن آپ کے سامنے بھی آئی تھی۔''

''ہاں...... اب کچھ کچھ لگ تو رہا ہے کہ تمہیں دیکھا تھا۔'' عمران نے بات بنائی۔

''اب کیا معاملہ ہے تمہارے ساتھ؟ تم چھپ کیوں رہی ہو؟''

اس کا چہرہ ایک بار پھر زرد نظر آنے لگا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''وہ ایک گاہک ہے ہمارا...... بڑا خبیث بندہ ہے۔ اس نے مجھے بلوایا ہے۔ میں اس کے پاس جانا نہیں چاہتی۔''

عمران نے کہا۔ ''تم لوگوں کے گاہک تو ہوتے ہی خبیث ہیں۔ نیک شریف بندے کا اس بازار سے کیا تعلق؟''

''وہ پکا شرابی ہے۔ شراب میں پتا نہیں کیا کیا گولیاں گھول کر پیتا ہے۔ ایک دم جانور ہے۔ میں پہلے دو بار جا چکی ہوں اس کے پاس۔ یہ دیکھیں...... یہ دیکھیں۔'' اس نے اپنی کھلی آستینیں کندھوں تک چڑھا کر دکھائیں۔ کئی جگہ پرانے نیل سے نظر آ رہے تھے۔ لڑکی کے چہرے پر نفرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو تم نے شاربہ بائی سے کہنا تھا کہ تم جانا نہیں چاہتی ہو۔''

''لیکن وہ مجھے ہی بلا رہا ہے اور بڑی باجی (شاربہ) میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے انکار کر سکیں۔ شاید کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں۔ وہ جینا حرام کر دیتا ہے دوسروں کا۔'' طوائف زادی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''وہ ہے کون؟'' میں نے پوچھا۔

''مم...... مجھے نام کا تو ٹھیک سے پتا نہیں۔ اسے بھائی بھائی کہتے ہیں۔ بڑے بڑے کتے پال رکھے ہیں اس نے۔ یہیں صدر کے علاقے میں کئی کنال کی کوٹھی ہے اس کی۔''

''تو تم اس کے ڈر سے بھاگ آئی ہو لیکن آج کی رات تم بچ بھی گئیں تو کل پھر

تمہارے لیے مصیبت آ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' اس نے مری مری آواز میں جواب دیا۔ ''اس کے لیے تو ہر ایک گھڑے کی مچھلی کی طرح ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔''

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس؟''

لڑکی نے انکار میں سر ہلایا پھر کچھ دیر تک سوچ کر بولی۔ ''آپ کیا کرو گے؟''

''تم دیکھتی رہو کیا کرتے ہیں۔'' عمران نے کش لے کر کہا۔

''لل...... لیکن وہ بہت خطرناک ہے۔ آپ لوگوں کے اندازے سے زیادہ...... بڑی باجی...... یا کوئی بھی باجی اس سے دشمنی مول نہیں لے سکتی۔ سارا بازار ڈرتا ہے۔ آپ تو بس...... اتنا کریں...... کہ مجھے ان گلیوں سے باہر نکال دیں۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر میں کوئی ٹیکسی رکشہ لے لوں گی۔''

''پھر کیا کرو گی؟'' عمران نے پوچھا۔

اس کا کاجل پھیل رہا تھا۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اور کچھ نہ ہوا تو...... تو......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''تو کیا؟''

''تو کوئی زہریلی چیز کھا لوں گی۔ جان چھوٹ جائے گی۔ یا کم از کم کچھ دنوں کے لیے ہسپتال تو پہنچ جاؤں گی۔'' وہ باقاعدہ رو دی۔

عمران نے کہا۔ ''دیکھو تم ہماری پناہ میں آئی ہو۔ تم نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ جس کا ساتھ دیتے ہیں، اس کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ تم اس بندے کا اتا پتا بتاؤ۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تمہارا کوئی نقصان نہیں ہونے دیں گے۔ اگر کچھ ہوگا تو فائدہ ہی ہوگا۔''

وہ تذبذب میں تھی مگر وہ عمران ہی کیا جو کسی کے تذبذب کو اپنی جادو بیانی سے دور نہ کر دے۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دو تین منٹ بعد وہ نیم رضامند نظر آنے لگی۔ اس دوران میں اس نے اپنا نام نیلم بتایا۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔ آسمان شفاف تھا۔ ایک مست ہوا چل رہی تھی۔ یہ دوسرا پہر تھا لیکن ان گلی کوچوں کی رونق سرِ شام جیسی تھی۔ دور ایک کھڑکی کے ریشمی پردے کے پیچھے بار بار ایک رقاصہ کے لہراتے بازو نظر آتے تھے اور طبلے کی دھنا دھن سنائی دیتی تھی۔ رقاصہ ایک جانے پہچانے انڈین گانے پر ''لپ سنگ'' کر رہی تھی۔ موسم ہے عاشقانہ...... ایسے میں اے

دل کہیں سے ان کو ڈھونڈ لانا۔

ہماری گاڑی میں بیٹھی نوخیز طوائف نے اپنے چمکیلے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا خوبصورت فون انڈیکس نکال لیا۔ اس میں ایک نمبر ڈھونڈ کر اس نے عمران کو دکھایا۔ ''یہ ایک نمبر ہے جی اس کا۔'' وہ بولی۔

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے سیل فون پر نمبر پریس کیا۔ دوسری طرف سے ایک کرخت آواز اُبھری۔ ''کون ہے؟''

عمران نے کہا۔ ''شاربہ جی کے اڈے سے بول رہا ہوں۔ بھائی سے بات کراؤ۔''

''سلطان بھائی سے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''ہاں...... ہاں۔'' عمران نے کہا۔

سلطان کے نام پر میرے ساتھ ساتھ عمران بھی قدرے چونکا۔

قریباً ایک منٹ بعد ایک بھاری دبنگ آواز فون کے سپیکر پر اُبھری۔ سخت کڑوے لہجے میں پوچھا گیا۔ ''کون ہے؟''

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ سلطان چٹے کی ہی آواز تھی۔ مال روڈ والی کوٹھی میں عمران نے اس کی لو میں اپنی گولی سے سوراخ کر دیا تھا اور ایسا منظر نامہ ترتیب دیا تھا کہ ہم اس کی ''کچھار'' سے بچ کر صاف نکل آئے تھے۔ وہ اب تک سخت بھنایا پھرتا تھا۔

ایک بار پھر اس کی کرخت آواز فون پر اُبھری۔ ''بولتا کیوں نہیں...... کون ہے؟''

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''میں تمہارا قریبی رشتے دار ہوں۔ تمہاری والدہ کا خصم...... یعنی تمہارا باپ...... عمران دانش۔''

دوسری طرف چند لمحے سناٹا رہا۔ اس واقعے کے بعد سلطان چٹا بولا تو اس کی آواز میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ ''لگتا ہے عمران تیرا دانہ پانی اب پورا ہو چکا ہے۔ اب تجھے مرنا ہے لیکن یہ میرا وعدہ ہے، تیرے کفن میں لاش نہیں ہو گی۔ بس کچھ ٹکڑے ہوں گے جن کے بارے میں ڈی این اے ٹیسٹ والے بتائیں گے کہ یہ فلاں حرام زادے کے اسپیئر پارٹس ہیں۔''

''چلو اس کا فیصلہ وقت کر دے گا۔ ابھی تو یہ سب کچھ چلتے ہی رہنا ہے۔ فی الحال میں تم سے ایک اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک گزارش کرنی ہے تم سے۔'' عمران نے کہا۔

''میں تمہارے مسخرے پن پر ایک سو ایک بار لعنت بھیجتا ہوں۔ نادر کے قتل کے بعد تم

نے کھلی جنگ چھیڑی ہے۔ اس کا فیصلہ تمہاری موت پر ہونا ہے کتے۔ پرسوں رات تُو نے اور تیرے دونوں یاروں نے لالہ زار ہوٹل سے بھاگ کر جان بچائی ہے لیکن تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے اور گھسیٹ گھسیٹ کر تمہاری کھال اُتاریں گے۔''

''یار! میں نے کہا ہے کہ اس کا فیصلہ وقت آنے پر ہو جائے گا۔ فی الحال تم سے ایک بات کہنی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم یہ بات مان جاؤ۔''

''کیا بکنا چاہتے ہو؟'' سلطان نے زہر کا گھونٹ پی کر کہا۔

''ایک لڑکی ہے نیلم! وہ یہاں میرے پاس بیٹھی ہے۔ بیچاری بہت پریشان ہے اس وقت۔''

''نیلم...... کون نیلم؟'' سلطان کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''یار! وہی نیلم جس کے بازوؤں پر تم نے نیل ڈالے ہوئے ہیں۔ نیلو نیل کیا ہوا ہے۔ شاربہ کے کوٹھے پر ہوتی ہے۔''

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سلطان پھنکارا۔ ''وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس پر تھوڑا سا غور کر لو۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اس کو معاف کر دو یار! وہ بہت ڈری ہوئی ہے تم سے۔ کسی اور سے گزارہ کر لو۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ کیا لگتی ہے وہ تمہاری؟'' سلطان چٹے کا لہجہ سخت چبھتا ہوا تھا۔

''کچھ لگنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسانیت بھی ایک رشتہ ہے۔'' عمران بولا۔

''اچھا تو انسان صاحب! زبان بھی کوئی چیز ہے۔ جب سودا ہو جاتا ہے، پوری رقم گن کر وصول کر لی جاتی ہے تو پھر بیچی ہوئی چیز دینی پڑتی ہے۔ شاربہ بائی نے بھی دس راتوں کے پورے پانچ لاکھ وصول کیے ہوئے ہیں اس حرامزادی کے۔ اسے تو اب آنا ہی پڑے گا۔''

عمران نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''رقم واپس کرا دیتا ہوں تمہیں بلکہ اگر کوئی جرمانہ شرمانہ بھی ڈالنا چاہو تو ڈال لینا۔''

''تم بیچ میں دلال مت بنو۔ اگر وہ...... کتیا تمہارے پاس ہے تو اس سے بات کراؤ میری۔''

عمران کا چہرہ متغیر ہوا۔ ماتھے کی رگیں اُبھر گئیں۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سلطانے! ضد نہ کر۔ یہ لڑکی نہیں جائے گی۔ شاربہ کے پاس اور بھی بہت سا بکاؤ مال ہے۔ کسی اور سے منہ کالا کر لے آج کی رات۔''

"تُو......تُو بات کو بڑھا رہا ہے ہیرو۔"

"بات بڑھ چکی ہے سلطانے! اگر تُو نے ضد نہ چھوڑی تیری آج کی رات ہی نہیں، آنے والی بہت سی راتیں برباد ہو جائیں گی۔ بہت پچھتائے گا تُو۔ تیرا بیڑا غرق کر دوں گا۔"

عمران کا پارا چڑھ چکا تھا۔

"کیا کرلے گا تُو؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں کروں گا۔ تیرا کلیجا پھاڑ دوں گا، خون تھوکتا پھرے گا لاہور کی سڑکوں پر۔" عمران کی آواز میں دل ہلا دینے والی گھن گرج تھی۔ وہ ایک "بڑے بدمعاش" سے، بڑے بدمعاش کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ نیلم تھر تھر کانپنے لگی۔ میں بھی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

"ہوش سے بات کر ہیرو۔" سلطان چٹے کی آواز قدرے دھیمی پڑ گئی۔

"ہوش سے بات کر رہا ہوں اور تیرے ہوش بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔" عمران دھاڑا۔

"کسی اور کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن مجھے پتا ہے کہ تیری ایک پہلی شادی بھی تھی۔ اس میں سے دو بیٹیاں ہیں تیری۔ ایک شہناز جو یہاں موہنی روڈ کے ایک گھر میں اپنی پھوپی کے پاس رہتی ہے۔ دوسری عافیہ جو دبئی میں ہے اور وہیں کالج میں پڑھتی ہے۔ یہ جو شہناز ہے نا، اس کے پاس تو میرے بندے بس چار پانچ منٹ کے اندر پہنچ جائیں گے اور وہ جس کو تُو نے دبئی بھیجا ہوا ہے، اسے ڈھونڈنے میں بھی مجھے دو تین دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ اب خود سوچ لے تجھے کیا کرنا ہے۔"

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ چند سیکنڈ بعد سلطان چٹے کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔

"دیکھ ہیرو! تُو اس لڑائی کو گھر کی عورتوں تک پہنچا رہا ہے۔ یہ کسی کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

"فی الحال تو یہ تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ تُو جو کچھ اس نیلم کے ساتھ کرے گا نا، وہی کچھ میں شہناز کے ساتھ کروا دوں گا۔ یا پھر عافیہ کے ساتھ کروا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے اور تُو اچھی طرح جانتا ہے، میں جو کہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔"

"عمرانے...... عمرانے! زبان سنبھال کر بات کر۔" سلطان زخمی درندے کی طرح بلبلایا۔

"تُو بھی دماغ سنبھال کر بات کر۔ یہ لڑکی میری پناہ میں آئی ہے اور میں تجھے بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے پناہ دی ہے۔"

بھڑکے ہوئے سلطان چٹے نے فون بند کر دیا۔

عمران نے خود کو پُرسکون کرنے کے لیے طویل کش لیا اور دھواں کھڑکی سے باہر پھینکا۔ میں اور نیلم گم صم اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نیلم تو باقاعدہ لرز رہی تھی۔ ایک شرابی لڑکھڑاتا اور گنگناتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔

میں نے کہا۔ "اب کیا کرنا ہے عمران؟"

"کچھ نہیں۔ اس سؤر کے فون کا انتظار کرنا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی یہ دوبارہ فون کرے گا۔" عمران نے فون سیٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔

واقعی قریباً دو منٹ بعد فون کی بیل ہونے لگی۔ عمران نے سکرین پر نمبر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہیلو" اس نے کہا۔

دوسری طرف سے آواز اُبھری۔ "ہیلو! سلطان بول رہا ہوں۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے۔" سلطان کے لہجے کی اکڑفوں ختم ہو چکی تھی۔

"اچھا ہے یا بُرا تمہارے سامنے ہے۔"

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد سلطان نے کہا۔ "جو رقم میں نے شاربہ بائی کو دی ہے، وہ کل شام تک واپس مل جانی چاہیے۔"

"کل...... تو بینک بند ہے بھائی جان! ہاں پرسوں شام تک مل جائے گی۔ اور اگر نہ ملے گی تو میں اپنی جیب سے دوں گا۔"

"بہت جلد ملاقات ہوگی۔" سلطان چٹے نے معنی خیز لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

عمران کا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے دو کش لے کر سگریٹ باہر پھینکا اور لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "لے تیرا کام ہو گیا ہے۔ اب کم از کم یہ بھیڑیا تو تجھے پنجہ نہیں مارے گا۔"

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے روایتی فقرہ بولا۔ "میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"اگر کوئی دوسرا منہ نہیں ہے تو اسی سے کر دو۔" عمران نے کہا۔

"مم...... میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" وہ بڑی لجاجت سے بولی۔

عمران نے اسے سرتاپا دیکھا اور کھوپڑی سہلائی۔ پھر ذرا سوچ کر بولا۔ "اگر تم چاہو تو تھوڑا بہت کر بھی سکتی ہو۔"

وہ پتا نہیں کیا سمجھی۔ پلکیں جھکا کر بولی۔ "آپ جو کہیں۔"

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نیلم سے پوچھا۔ "تم کب سے ہو شاربہ بائی

کے پاس؟''

''کوئی ایک سال تو ہو گیا ہے۔''

''رات دن وہیں رہتی ہو؟''

''ہاں جی...... میرا ایک، ماموں بھی پانچ چھ سال سے بڑی باجی کے پاس ملازم ہے۔ سارنگی بجاتا ہے۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''نیلم! ہم جمعرات کے روز تمہارے پاس کوٹھے پر آئے تھے۔ اس روز ہم سے تھوڑی دیر پہلے دو اور بندے آئے تھے۔ ان میں سے ایک فلم اسٹوڈیو کا بندہ وسیم احمد تھا۔ دوسرا کھڑی ناک اور گورے چٹے رنگ والا یوسف فاروقی تھا۔ ان کے بارے میں کچھ جانتی ہو تم؟''

وہ بولی۔ ''بس اتنا ہی جی کہ انہوں نے بڑی باجی سے کسی فلمی لڑکی کی بات کی تھی اور ایڈوانس وغیرہ بھی دیا تھا۔''

''تمہیں پتا نہیں کہ وہ فلمی لڑکی کون تھی؟''

''نہیں جی! میں بالکل نہیں جانتی۔ ایسی باتیں بڑی باجی ہم لڑکیوں کو نہیں بتاتی اور اگر سن گن لینے کی کوشش کریں تو سخت غصے ہوتی ہے۔''

''اچھا...... تمہیں پتا ہے کہ کل رات وہ یوسف فاروقی نام کا بندہ ایک جھگڑے میں زخمی ہو گیا تھا؟''

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''ہاں جی! اتنا تو مجھے پتا ہے۔ گلبرگ میں اس کی گاڑی کا کسی دوسری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کے بعد جھگڑا ہوا اور وہ زخمی ہو گیا۔''

''تمہیں پتا ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی! بالکل نہیں۔ بڑی باجی سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔''

وہ اب ہسپتال میں نہیں ہے۔ اسے کسی نے وہاں سے اُٹھا لیا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ اس بارے میں تمہاری بڑی باجی (شاربہ بائی) کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔''

''مم...... مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں جی۔''

عمران نے غور سے نیلم کو دیکھا۔ نیلم کی کاجل لگی پلکیں بے ساختہ تھرا گئیں۔ عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم تم پر زور نہیں دیں گے نیلم! بس اتنا کہیں گے کہ اس سلسلے میں اگر تم ہماری تھوڑی بہت مدد کر سکتی ہو تو کر دو۔ ہمارا یہ وعدہ ہے کہ اس ''مدد'' کی وجہ سے تم پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔''

نیلم کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے پاؤں کو گھورتی رہی۔ اس نے زرق برق چپل پہن رکھی تھی۔ ناخنوں پر شوخ رنگ کی نیل پالش تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے گہری سانس لی اور بولی۔ ''کوٹھے کے اندر کی بات باہر بتانے پر بڑی باجی سخت ناراض ہوتی ہے۔ پورے بازار میں حقہ پانی بند کرا دیتی ہے۔ کچھ لڑکیوں کو تو تھانہ کچہری بھی بھگتنا پڑا ہے۔ للی...... لیکن...... آج رات آپ نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔ مم...... مجھے جو کچھ پتا ہے میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ لیکن...... یہاں مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ بھائی کے بندے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ وہ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''بھائی خبیث کی طرف سے اب تم بالکل تسلی رکھو۔ اس سے تمہاری جان چھوٹ چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنے بندے بھی واپس بلا لیے ہوں گے۔ تم جو کچھ بتانا چاہتی ہو۔ پورے اطمینان سے بتاؤ۔ یہاں تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔''

عمران کے لب و لہجے نے واقعی نیلم کی بے وجہ بے چینی دور کر دی۔ میں نے تھرماس سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ بعد ازاں نیلم نے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔ یوسف کے زخمی ہونے کی اطلاع شاربہ بائی کو کوٹھی کے ملازموں سے ملی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ وہ کس ہسپتال میں ہے۔ دن چڑھنے کے بعد دھاری دار شرٹ والا ایک شخص کوٹھے پر آیا تھا۔ اس شخص کو کوٹھے کی لڑکیوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی باتوں میں ایک دو ہندی لفظ بھی بولے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انڈین ہے۔ وہ شاربہ بائی کی گاڑی میں سوار ہو کر شاربہ بائی کے ساتھ یوسف کی عیادت کے لیے گیا۔ بعد میں جب شاربہ بائی واپس آئی تو کچھ بے چین سی تھی۔ کچھ دیر بعد اتفاقاً اس کی ایک فون کال نیلم نے سن لی۔ شاربہ اپنے سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے یوسف کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شور مچا سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے کوئی دوا پلا کر کچھ دیر کے لیے سلا دیا جائے۔ یہ الفاظ نیلم کے دماغ میں اٹک کر رہ گئے اور اسے احساس ہوا کہ یوسف نامی اس بندے کے بارے میں ضرور کچھ گڑ بڑ ہے۔ بہرحال اس نے اس بات کا ذکر کسی دوسری لڑکی سے نہیں کیا۔ اپنے ماموں کو بھی نہیں بتایا کیونکہ نشے کی حالت میں کوئی بات اس کے پیٹ میں نہیں رہتی اور وہ بک دیتا ہے۔

اس گاڑی کے اندر بیٹھ کر اپنے لرزتے کانپتے لہجے میں نیلم نے ہمیں جو بات بتائی، وہ خاصی اہم تھی۔ ہمیں ہمدردی کا صلہ ملا تھا اور ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ شاربہ بائی کے بارے میں ہمارے شکوک درست ثابت ہو رہے تھے۔ اب اس پر اعتماد کے ساتھ ہاتھ ڈالا جا

سکتا تھا۔

عمران نے ایک بار پھر نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اس حوالے سے اس پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آئے گی۔

وہ بولی۔ ”لیکن میں اب بڑی باجی کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلی جاؤں۔ فیصل آباد یا پھر ملتان کی طرف۔“

عمران نے کہا۔ ”تمہاری یہ سوچ مناسب نہیں۔ اس طرح تم خوامخواہ خود کو مشکوک بنا لو گی۔ ابھی تم پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں ہے۔ تم سلطان کے بندوں سے ڈر کر بھاگی اور اتفاقاً ہماری گاڑی میں گھس آئیں۔ یہ بات تم صاف صاف شاربہ بائی کو بتا دینا۔ وہ جہاندیدہ عورت ہے، سمجھ جائے گی کہ تم سچ بول رہی ہو۔ باقی سلطان کی طرف سے ہم تمہیں ایک بار پھر تسلی دیتے ہیں۔ وہ اب اپنے ہاتھ تم سے دور رکھے گا۔“

عمران کے سمجھانے بجھانے پر نیلم واپس جانے پر رضامند ہو گئی۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ کم از کم آج کی رات بازار سے باہر اپنی ایک سہیلی کے پاس گزارنا چاہتی ہے۔ اس کی سہیلی بھاٹی دروازے کی طرف رہتی تھی۔

اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ہم نیلم کو بھاٹی دروازے چھوڑ آئے۔ عمران نے کسی بھی ایمرجنسی کے لیے اسے اپنا فون نمبر دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک بار شاربہ بائی کو فون کر کے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کر دے۔

”ہاں...... اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب بائی جی سے دو دو ہاتھ کرتے ہیں۔“

”سوچ لو۔ بڑے زور والی عورت ہے۔“

”زور نکال دیتے ہیں اس کا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ اور...... ایس پی حمزہ صاحب کے نمبر پریس کرنے لگا۔ اس نے انہیں شاربہ بائی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا ہے۔

”کب؟“ حمزہ صاحب نے پوچھا۔

”ابھی بلکہ اسی وقت جناب! یوسف فاروقی کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہم اس کام کو لیٹ نہیں کر سکتے۔“

حمزہ صاحب نے غنودہ آواز میں کہا۔ ”دیکھ لو عمران! ٹیڑھی عورت ہے۔ ہاتھ پاؤں مارے گی۔ فون شون کرے گی۔“

”ہمارے پاس ثبوت ہیں سر! کچا ہاتھ نہیں ڈال رہے۔ وہ ملوث ہے یوسف کی گمشدگی میں۔“

”کیا ثبوت ہیں؟“

”سوری سر! میں آپ کو بتا نہیں سکتا لیکن یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ گلٹی ہے۔ آپ کو شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔“

”کتنی نفری ہونی چاہیے۔“ حمزہ صاحب نے پوچھا۔

”ایک انسپکٹر کے ساتھ پانچ چھ بندے بھیج دیں لیکن کچھ اہلکار آس پاس بھی رہیں تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو سنبھال سکیں۔“

تھوڑی دیر میں عمران اور حمزہ صاحب کے درمیان ساری بات طے ہو گئی۔ حمزہ صاحب نے کہا کہ پندرہ منٹ میں پولیس پہنچ رہی ہے۔

عمران نے کہا۔ ”سر! انسپکٹر شوکت سے کہیں کہ چھاپے کے وقت اپنی پاکٹ میں موبائل فون آن کر کے رکھے تاکہ ہمیں اندر کی صورتِ حال کا پتا چلتا رہے۔ ہم آس پاس ہی موجود ہیں۔“

ہم نے گاڑی واپس موڑی۔ رات کے اس پہر لاہور کا یہ گنجان علاقہ بھی تقریباً سنسان ہی تھا۔ صرف داتا دربار کے گرد تھوڑی بہت رونق نظر آتی تھی۔ ہم قریباً دس منٹ میں واپس وہیں پہنچ گئے جہاں نیلم نامی وہ طوائف ہانپی کانپی ہوئی ہماری گاڑی میں گھس آئی تھی۔ بازار کی رونق میں بس انیس بیس کا ہی فرق پڑا تھا۔ مختلف کھڑکیوں میں سے موسیقی کی تانیں نکل کر پھیل رہی تھیں۔ بے فکروں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ سامنے ساتھ ساتھ بنی ہوئی دو پان کی دکانوں پر اچھا خاصا رش تھا۔ ہم نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

اس کام میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ پانچ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ پولیس موبائل کی نیلی بتی نظر آئی اور سائرن سنائی دیا۔ چار پانچ ہیجڑے جو بیچ بازار میں کھڑے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں جھگڑا کر رہے تھے، بغلی گلیوں میں تتر بتر ہو گئے۔ پولیس موبائل شاربہ بائی والے پلازا کے عین سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اسی دوران میں عمران کے سیل فون پر انسپکٹر شوکت کی کال آ گئی۔ اس نے کہا۔ ”عمران صاحب! ہم ریڈ کرنے جا رہے ہیں۔ میں فون آن کر کے اپنی چیسٹ پاکٹ میں ڈال رہا ہوں۔“

”او کے...... ہم بھی آس پاس ہی ہیں۔“ عمران نے کہا۔

پولیس پلازا نما عمارت میں داخل ہوگئی۔ کچھ دیر بعد عمران کے سیل فون پر اندر کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ موسیقی تھی اور گھنگروؤں کی چھنا چھن تھی۔ تھا یقیں کہ آئے گی یہ راتاں کبھی۔

پھر یہ سارا شور تھم گیا۔ شاربہ بائی اور انسپکٹر وغیرہ کی آوازیں فون پر اُبھرنا شروع ہوئیں۔ کچھ فقرے سمجھ میں آ رہے تھے، کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد شاربہ بائی کا پارا چڑھ گیا۔ حسبِ توقع وہ غصے سے چلانے لگی۔ ''تمہارے منہ میں پورے ٹائم پر پوری ہڈی ڈالتے ہیں، پھر بھی چین نہیں لینے دیتے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟''

''آپ ذرا اکیلے میں آ کر میری بات سن لیں تو آپ کے لیے بہتر ہوگا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''کیوں اکیلے میں سنوں؟ میں نے کوئی چوری کی ہے..... ڈاکا ڈالا ہے؟ تمہیں جو کہنا ہے یہیں کہو۔''

''تو پھر آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ آپ کے خلاف رپورٹ ہوئی ہے۔''

''کہاں ہے رپورٹ کی نقل؟ مجھے بھی تو دکھاؤ۔ کوئی وارنٹ گرفتاری ہے تمہارے پاس..... کوئی تلاشی کا وارنٹ ہے۔''

''سب کچھ دکھائیں گے آپ کو لیکن ابھی آپ کو کچھ دیر کے لیے تھانے جانا ہوگا'' انسپکٹر نے کہا۔

ایک کرخت مردانہ آواز اُبھری۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند گھنٹے پہلے عمران سے فون پر بدتمیزی کے ساتھ بات کرتا رہا ہے۔ وہ بولا۔ ''انسپکٹر! یہ ہمارا کاروبار کا ٹائم ہے۔ اگر تمہاری جان زیادہ مصیبت میں آئی ہوئی ہے تو ہم تمہیں اوپر سے فون کرا دیتے ہیں۔''

''یہ آرڈر بھی اوپر سے ہی آئے ہیں۔ کافی اوپر سے۔ ابھی بائی جی کو جانا ہی پڑے گا۔''

''یہ کیا تماشہ ہے؟ کیا اندھیر نگری ہے؟'' کرخت مردانہ آواز اُبھری۔ پھر بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شور پڑ گیا۔ لڑکیوں کے چلانے کی سریلی آوازیں بھی سنائی دیں۔ تب ہم نے دیکھا کہ کچھ اور پولیس والے بھی دوڑتے ہوئے پلازا میں داخل ہو رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی ریزرو اہلکار تھے جن کے بارے میں عمران نے حمزہ صاحب سے کہا تھا۔

آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اوپر کچھ مار کٹائی بھی ہوئی ہے۔ پھر آوازیں کچھ مدھم پڑ گئیں۔ غالباً مزید نفری پہنچنے سے صورتِ حال کچھ سنبھل گئی تھی۔

اردگرد کے لوگ پوری طرح چونک گئے تھے۔ سب کی توجہ شاربہ بائی والے پلازا کی طرف ہو گئی تھی۔ لوگوں کا خیال غالباً یہ تھا کہ کسی اشتہاری وغیرہ کو پکڑنے کے لیے چھاپا مارا گیا ہے لیکن یہاں صورتِ حال کچھ اور تھی۔ خود ''کوٹھے والی'' پر آفت آئی تھی۔ عمران گاڑی سے نکل کر پان فروشوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں لوگ چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ دفعتاً میری نگاہ پلازا کی ایک بغلی کھڑکی کی طرف اُٹھ گئی۔ کوئی شخص دوسری منزل کی کھڑکی سے نکلا اور پھر چھلانگ لگا کر ساتھ والی چھت پر آ گیا۔ یہاں سے وہ چھجے پکڑ کر نیچے اُترا اور گلی میں کود گیا۔ وہ فرار ہو رہا تھا۔ عمران مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں گاڑی سے اُترا اور اس شخص کے پیچھے لپکا۔ تیس چالیس میٹر آگے جا کر میں نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ لیا۔ وہ بھاگتے قدموں کی آواز سن کر جان چکا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ جونہی میں نے اس کا کالر پکڑا، وہ چنگھاڑا اور پلٹ کر اندھا دھند اپنا دایاں ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی اور بے شک یہ تیز دھار آلے سے زیادہ خطرناک تھی۔ اس نے بوتل کو گردن کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے پھرتی سے خود کو بچایا پھر بھی بوتل کا نکیلا کنارہ میرے کندھے پر خراش ڈالتا گزر گیا۔ بوتل کا دوسرا وار میں نے جھک کر خالی جانے دیا اور اس کے ساتھ ہی حملہ آور کی کلائی پکڑ لی۔ وہ پکی عمر کا شخص تھا اور خاصا زور آور بھی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک ہمارے درمیان زبردست کشمکش ہوئی۔ پھر میں نے اس کا بوتل والا ہاتھ دو تین بار عقب میں پختہ دیوار سے ٹکرایا اور بوتل چکنا چُور کر دی۔ میرا ایک زوردار گھونسہ کھا کر وہ پیچھے کی طرف گیا اور ایک دروازے کو توڑتا ہوا ایک کمرے میں جا گرا۔ یہاں بالکل ناکافی لباس میں ایک لڑکی ڈری سہمی کھڑی تھی۔ ایک نوجوان بھی تھا۔ فرش کے قالین پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ میرے مدِمقابل نے اپنی لمبی قمیص کے نیچے سے کچھ نکالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میں نے اپنا پستول اس کی پیشانی سے لگا دیا۔ ''خبردار! گولی ماردوں گا۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

وہ اپنی جگہ ساکت لیٹا رہ گیا۔ ہمارے گرد بھی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ پھر پولیس والے بھی پہنچ گئے اور انہوں نے اس بندے کو کسٹڈی میں لے لیا۔ نہ صرف کسٹڈی میں لے لیا بلکہ اس سے پہلے اچھی طرح مارا پیٹا بھی۔ اس شخص کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی غصیلا دلال ہے جو فون پر عمران سے بدتمیزی کرتا رہا ہے۔ پتا چلا کہ اوپر کوٹھے پر باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی۔ اس حنیف نامی دلال نے شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل سے ایک پولیس والے کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔ اب شاربہ بائی اور حنیف سمیت

قریباً چھ افراد کو تھانے لے جایا جا رہا تھا۔

O.....❖.....O

تھانے پہنچ کر شاربہ بائی کی اکڑفوں کافی حد تک ختم ہوگئی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ اس نے ایک دو ٹیلی فون بھی کرائے تھے لیکن حمزہ صاحب کی ہدایت پر ایس ایچ او شوکت نے کسی طرح کا دباؤ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اب تو پولیس مقابلے کا کیس بھی بن رہا تھا۔ اس لیے رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ حمزہ صاحب نے بھی اپنے طور پر انتظامیہ کے ایک دو عہدیداروں سے بات کر لی تھی۔

تھانے میں شاربہ بائی نے اپنے وکیل کو بلایا لیکن وہ بھی بے بس تھا۔ سرکاری تعطیل تھی۔ شاربہ کو عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کی ضمانت ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ یقیناً اسے ریمانڈ پر پھر حوالات میں ہی بھیجا جانا تھا۔ اس کے غصیلے دلال حنیف کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا تھا۔

اب دن کا اُجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اور عمران تھانے پہنچے تو شاربہ بائی زرد چہرے کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھی نظر آئی۔ شعلہ مزاج حنیف حوالات کے گندے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نیلگوں گومڑ تھے اور ناک سے خون رِس رہا تھا۔ اس بدزبان کی یہ درگت دیکھ کر ہمیں گونا گوں تسلی ہوئی۔

ہمیں دیکھ کر شاربہ کے چہرے پر تردد اور کدورت کے آثار نمودار ہوئے۔ یقیناً ہماری یہاں آمد سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں عمران کا ہاتھ ہے۔ ہمیں آتے دیکھ کر انسپکٹر شوکت نے عمران کو آنکھ سے اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے دو کانسٹیبل بھی باہر چلے گئے۔ ایک طرح سے اس نے ہمیں شاربہ سے گفتگو کا موقع فراہم کیا تھا۔

عمران اور میں شاربہ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں میرے اور میری بچیوں کے پیچھے پڑے ہو؟''

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''تم نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا کیونکہ ابھی ہم نے تمہیں ہیروئن صاحبہ کا ایڈوانس ہی نہیں دیا تھا۔ اگر ہم تمہیں دو لاکھ روپیہ دے دیتے تو پھر ضرور پھنس جاتے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم دو نمبر کام کے اندر دو نمبر کام کر رہی ہو۔ دکھاتی کچھ اور ہو، سودا کچھ اور دیتی ہو۔

جیسا تم نے یوسف کے ساتھ کیا۔''

''پتا نہیں تم کیا بول رہے ہو۔ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس کے لیے تم سب کو پچھتانا پڑے گا۔''

''فی الحال تو تمہارے پچھتانے کی باری ہے۔ بہتر ہے کہ جو دھندا تم چلا رہی ہو اس کے بارے میں صاف بتا دو۔'' عمران نے کہا۔

وہ بھنا کر بولی۔ ''تم سب پر اللہ کی مار۔ مجھے تو اب تک یہ سمجھ ہی نہیں آئی کہ مجھ پر الزام کیا ہے؟''

عمران بولا۔ ''تفصیل سے تو تمہیں پولیس والے ہی بتائیں گے۔ ہمیں یہ پتا ہے کہ تم دو نمبری کے اندر دو نمبری کر رہی ہو۔ گاہکوں کو چند خاص فلمی پریوں کے چہرے دکھاتی ہو۔ ان کے ساتھ رات گزارنے کے لیے بھاری رقم وصول کرتی ہو اور ان کی جگہ ان کی ہم شکل لڑکیوں کو گاہکوں کے حوالے کر دیتی ہو۔''

شاربہ کا رنگ بدل گیا۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ ''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایسا...... کیسے ہو سکتا ہے؟ لوگ اندھے نہیں ہوتے...... کہ...... انہیں دکھایا کچھ اور جائے، دیا کچھ اور جائے۔''

''تم لوگ ایسا ماحول دیتے ہو کہ نقلی بھی اصلی معلوم ہوتا ہے۔ رہی سہی کسر امپورٹڈ شراب اور دیگر نشیلی چیزیں پوری کرتی ہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو تمہاری دو نمبری کا پتا چل جائے تو تم لوگ اسے ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیتے ہو یا پھر ویسے ہی غائب کرا دیتے ہو۔ یوسف فاروقی کی طرح۔''

میں جانتا تھا کہ عمران نے جو آخری جملہ کہا ہے۔ وہ دراصل اندھیرے میں تیر چھوڑا ہے۔ اسے ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ یوسف کو کیوں غائب کیا گیا ہے اور اس کا اصل اغوا کار کون ہے۔

''تت...... تم ہوش میں نہیں ہو۔ جو منہ میں آ رہا ہے، بکتے جا رہے ہو۔ میرا کسی ایسی فراڈ بازی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ میں یوسف کے بارے میں جانتی ہوں۔''

''تمہاری اس فراڈ بازی کے ہم چشم دید اور کان شنید گواہ ہیں بقلم خود۔'' عمران نے کہا۔ ''تم نے جمعرات کی رات اپنے کوٹھے پر ہم سے ٹاپ کلاس پاکستانی ہیروئن کی بات کی۔ اس کی بکنگ کے لیے دو لاکھ ایڈوانس لیے بلکہ ہمیں بکنگ کی ڈیٹ بھی بتا دی۔ وہ فلمی ہیروئن بھی کٹہرے میں آ کر تمہارے خلاف گواہی دے گی۔ تم نے اس کے نام کا گندہ ترین

استعمال کیا ہے۔"

"یہ سراسر الزام ہے، بہتان ہے۔ میں تم سب لوگوں کے خلاف عدالت میں جاؤں گی۔ تمہیں بتا دوں گی کہ ہم لوگ جب کسی سے ٹکر لیتے ہیں تو کس طرح لیتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر اکڑنے لگی۔ اس کی باچھوں سے پان کی لالی جھانک رہی تھی۔ تراشی ہوئی بھویں کمان کی طرح کس گئی تھیں۔

اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل پھر ہونے لگی۔ ایک بار پھر ثروت کا فون تھا۔ اس کی بے چینی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ یوسف کے غائب ہونے سے پہلے میں ہی اس کے آس پاس رہا تھا۔ دوسرا وسیم احمد تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اب اس کے سارے سوالوں اور تمام انکوائری کا رُخ میری طرف تھا۔ دوسری طرف میں خود ہوا میں لٹکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یوسف کہاں ہے اور کیسے غائب ہوا ہے؟

میں نے کال ریسیو نہیں کی اور اس وقت کو کوسنے لگا جب رات کے پچھلے پہر سڑک پر ہونے والی لڑائی کے بعد میں زخمی یوسف کو لے کر ہسپتال گیا تھا۔ میری جگہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔ جیلانی، اقبال یا پھر عمران کا کوئی اور ساتھی۔ میرے ہونے سے بہت فرق پڑا تھا۔ ایک بہت بڑا بوجھ آ گیا تھا مجھ پر۔

کچھ دیر بعد میرے فون پر نصرت کا میسج موصول ہو گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "تابش بھائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے یوسف کے گم ہونے کا زیادہ دُکھ نہیں، دُکھ اس بات کا ہے کہ باجی، اس کی گمشدگی سے پریشان ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کے لیے فکر مند ہو رہی ہیں جو ان کی زندگی خراب کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ اس واقعے کے سبب یوسف کے حوالے سے باجی کے رویے میں تبدیلی آئی ہے ورنہ وہ تو اس سے بات تک نہیں کر رہی تھیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ اس معاملے میں آپ کا نام آ رہا ہے۔ ہسپتال میں یوسف کے پاس آپ ہی موجود تھے۔ میری ناقص رائے میں آپ کو چاہیے تھا کہ آپ فوراً یوسف کے گھر والوں کو اطلاع دیتے اور یوسف کی تیمار داری ان کے سپرد کرتے۔ اب یہ مسئلہ بھی ہے کہ آپ فون کا جواب نہیں دے رہے۔ اس وجہ سے فاروقی صاحب کے دل میں شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ پلیز! آپ رابطہ کریں۔"

میں نے میسج بھیجا۔ "نصرت! تسلی رکھو، ثروت کو بھی تسلی دو۔ ہم یوسف کا کھوج ہی لگا رہے ہیں۔ اس وقت تھانے میں ہیں۔ ایک عورت سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ جونہی کوئی سرا

ہاتھ آتا ہے، میں تمہیں فون کرتا ہوں۔"

سہ پہر تین بجے کے قریب ایک ہٹی کٹی لیڈی سب انسپکٹر اپنی دو تین سپاہیوں کے ساتھ تھانے پہنچ گئی۔ شاربہ بائی ایک علیحدہ کمرے میں موجود تھی۔ لیڈی سب انسپکٹر نے آتے ساتھ ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ سب انسپکٹر ایسے کاموں میں ماہر نظر آتی تھی۔ اس کی ناک چپٹی اور ماتھے پر ایک طرف پھلبہری کا سفید نشان تھا۔ اسے حمزہ صاحب نے خاص طور پر بھیجا تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں تھے۔ تاہم ایک بند کھڑکی کے ذریعے اندر کی آوازیں ہم تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ انسپکٹر بھی ہمارے ساتھ تھا اور اپنی کرسی پر موجود تھا۔ سب انسپکٹر نے جاتے ساتھ ہی شاربہ سے کہا کہ وہ اپنے کپڑے اُتارے۔

شاربہ چلّانے لگی۔ سب انسپکٹر کو دھمکیاں دینے لگی۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ "اپنے کوٹھے پر ہر رات درجنوں لڑکیوں کے کپڑے اُترواتی ہو اور انہیں شرابی مردوں کے حوالے کرتی ہو۔ آج تمہارے کپڑے اُتر جائیں گے تو کون سی بڑی بات ہے؟"

شاربہ چلّائی۔ "میں وردیاں اُتروا دوں گی تمہاری، جیل میں سڑا دوں گی۔ میں کوئی کرائے کی کوٹھڑی میں دھندا کرنے والی کسبی نہیں ہوں، میں شاربہ بائی ہوں۔ بازار کی سب سے بڑی ڈانس اکیڈمی چلاتی ہوں۔ منتھلیاں دیتی ہوں تم لوگوں کو۔ رات دن تمہارے منہ میں ہڈیاں ڈالتی ہوں۔ تیس ہزار انکم ٹیکس ہے میرا۔ تمہارے تو وزیر مشیر اتنا ٹیکس نہیں دیتے اور......اور تم مجھے کپڑے اُتارنے کا کہہ رہی ہو؟"

سب انسپکٹر بولی۔ "ابھی اُتارنے کا کہہ رہی ہوں۔ خود نہ اُتارو گی تو پھٹ کر اُترے گا۔ کافی مہنگا سوٹ ہے۔"

"کتے کی بچی۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔" شاربہ چلّائی۔

جواب میں چٹاخ کی زوردار آواز اُبھری۔ شاربہ کو تھپڑ پڑا تھا۔ اس کے بعد شاربہ کے چلّانے کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ کمرے کے اندر ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ بازارِ حسن کی ایک بااثر آنٹی کی دھنائی ہو رہی ہے۔

ایک منٹ بعد سب انسپکٹر نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی صرف مارا ہے۔ اس کے بعد اُلٹا لٹکاؤں گی اور تب یہ کپڑے شپڑے نہیں ہوں گے تیرے پنڈے پر۔"

شاربہ کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ اس ہائے ہائے میں تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لیا جا سکتا ہے۔ وہ

کراہتی رہی اور ساتھ ساتھ خطرناک نتائج کا ذکر بھی کرتی رہی مگر اب اس کی آواز میں وہ دم خم نہیں تھا۔

سب انسپکٹر نے بے خوفی سے کہا۔ ''تُو جو کچھ کرے گی، وہ بعد کی بات ہے لیکن ابھی یہاں چمڑے کے چھتر کے ساتھ تیری جو نتھ اتروائی ہوگی۔ وہ کسی کی نہیں ہوئی ہوگی۔ بہتر ہے کہ جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے، بک دے۔''

''مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔ میں اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں صرف ہمدردی کی وجہ سے اس کا حال پوچھنے ہسپتال چلی گئی۔''

سب انسپکٹر نے اپنی کسی ساتھی سپاہن سے کچھ کہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ شاربہ بائی اچانک چلانے لگی۔ ''نہیں...... نہیں...... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں۔ سب کچھ تو بتا رہی ہوں۔''

سب انسپکٹر پھنکاری۔ ''میں نے بھی پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے تیری ہیرا منڈی پر۔ تُو بڑی پکی ہے۔ جتنی اوپر ہے، اس سے تین گنا زمین کے نیچے ہے۔ میں تجھے باہر نکالوں گی اور ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر نکالوں گی۔''

سب انسپکٹر کے خطرناک لب و لہجے اور ماہرانہ گفتگو نے شاربہ بائی کا پتا پانی کر دیا تھا۔ اس نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں وہ بالکل ڈھب پر آ گئی۔

انسپکٹر شوکت ہم دونوں کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو شاربہ بائی مطیع اور خاموش نظر آئی۔ کوٹھے پر اہلکاروں کو خطرناک دھمکیاں دینے والی شاربہ بائی اور اس شاربہ بائی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ماتھے اور ایک ہاتھ کی پشت پر چوٹ کا نشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے چربی دار جسم میں ہلکی سی لرزش محسوس کی جا سکتی تھی۔

ہم تینوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تنومند سب انسپکٹر ہمارے عقب میں مستعد کھڑی رہی۔ عمران نے سارے سوال انسپکٹر شوکت کو سمجھا دیئے تھے۔ انسپکٹر نے سب سے پہلا سوال ہی یہ پوچھا۔ ''یہ ہم شکل لڑکیوں والا کام کب سے ہو رہا ہے؟''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن ڈیڑھ دو سال تو ہو گئے ہیں۔'' وہ اپنے فربہ ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ کر بولی۔

''یہ کام کیسے شروع ہوا؟''

''میں قسم کھاتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ سلطان چیتے کا میرے کوٹھے پر آنا جانا تھا۔ ایک دن وہ ایک بڑے بدمعاش کو لے کر آیا۔ اس

نے بتایا کہ یہ ڈان جاوا ہے۔ انڈیا کی فلم لائن میں اس کا بڑا اثر رسوخ ہے۔ فلمی ہیروئنوں سے اس کے رابطے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کے کام کرا سکتا ہے۔ اب پاکستان کے فلمی لوگوں سے بھی اس کے تعلقات بڑھ رہے ہیں۔ وہ یہاں کی فلمی لڑکیوں کو انڈیا میں کام دلانے کی بات کرتا ہے اور لڑکیاں اس کے آس پاس رہتی ہیں۔ پھر ایک روز سلطان چیتے نے ہی مجھے بتایا کہ پاکستان کی ایک دو ٹاپ کلاس ہیروئنوں سے ہمارے پکے رابطے ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے کئی طرح کے کام سنبھال رہے ہیں۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اگر میرا کوئی گاہک اچھے پیسے خرچ کر سکے تو وہ ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے۔ شروع میں مجھے یقین نہیں آیا لیکن جب دو تین بار سلطان نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تو مجھے یقین کرنا پڑا۔ آپ سب جانتے ہو، میرا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ گاہک اور لڑکی کے درمیان رابطہ کرنا۔ اگر لڑکی بکنے پر راضی ہو تو پھر ہمارے پیشے میں سب جائز ہے۔''

''لیکن یہاں تو دو نمبر کام ہو رہا تھا۔ کیا تمہیں پتا نہیں تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں اسی طرف آ رہی ہوں۔ چار پانچ گاہک بھگتانے کے بعد میرے ملازم حنیف کو شک ہو گیا کہ یہ دو نمبر کام ہو رہا ہے۔ اس کی بات درست تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ لیکن جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جاوا ہمیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اگر ہم زبردستی پیچھے ہٹتے تو نقصان اُٹھاتے۔ جاوا نے ہمیں بس اتنی گارنٹی دی کہ اگر کبھی کوئی گاہک کسی طرح کا پھڈا ڈالے گا تو سلطان وغیرہ اس سے خود نمٹیں گے اور مجھ پر یا میری بچیوں پر کوئی زد نہیں آئے گی۔''

''بس اتنی سی گارنٹی لے کر تم نے یہ فراڈ بازی جاری رکھی، اچھا خاصا پیسہ بھی کماتی رہیں اور یوسف فاروقی جیسے موٹے مرغے پھانستی رہیں۔''

''میں نے بتایا ہے نا، میں جاوا جیسے بندے سے ٹکر نہیں لے سکتی تھی اور نہ اب لے سکتی ہوں۔''

''ہمیں پورا یقین ہے کہ یوسف کو تمہارے فراڈ کا پتا چل گیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے انسپکٹر اسے ایک آدھ گھنٹے کے لیے لیڈی پولیس کے حوالے کر ہی دینا چاہیے۔''

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" انسپکٹر نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ سب انسپکٹر مستعد انداز میں دوقدم آگے آگئی۔

شاربہ کا رنگ ہلدی ہوگیا۔ "میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں اور کچھ نہیں جانتی۔"

"لیکن ہم کچھ کچھ جانتے ہیں۔" عمران نے کہا۔ "یوسف کو ہسپتال سے کیسے اُٹھایا گیا، کہاں رکھا گیا، تمہیں سب معلوم ہے۔ تم پوری نگرانی کر رہی تھیں۔ تمہیں ڈر تھا کہ وہ شور مچائے گا۔ تمہارے ہی کہنے پر اغوا کرنے والوں نے اسے دوا پلائی تھی تاکہ وہ بیہوش پڑا رہے۔"

شاربہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ عمران کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ نیلم سے حاصل کی گئی معلومات یہاں ہمارے کام آرہی تھیں۔ انسپکٹر شوکت نے کہا۔ "تم کچھ بتاتی ہو یا ہم کمرے سے نکل جائیں اور سب انسپکٹر سمیرا کو کام کرنے دیں؟"

وہ ایک دم رونے لگی۔ دبنگ عورت تھی مگر حالات کے گھیرے میں آکر اس کی آن بان سارے پندار سمیت ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔ وہ بلکی۔ "جاوا بڑا ظالم شخص ہے، اس کے سامنے میری کوئی پیش نہیں چل سکتی۔ وہ جو کہتا ہے، مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اپنی اور اپنی بچیوں کی جان کے ڈر سے کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کے جال میں پھنس چکی ہوں۔ میں کدھر جاؤں؟ کیا کروں؟ اس کا کارندہ سلطان چٹا ہر وقت موت کے فرشتے کی طرح ہمارے سر پر سوار رہتا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "تمہارا یہ واویلا ہم بعد میں سن لیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یوسف کے ساتھ کیا کیا تم نے اور کیوں؟"

وہ بولی۔ "میں قسم کھاتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ اندر کی بات کیا ہے۔ بس انڈیا سے جاوا کا آرڈر تھا کہ یوسف کو ہسپتال سے اُٹھانا ہے۔ یوسف کو اُٹھانے سے پہلے میرے پاس کوٹھے پر ایک بندہ بھیجا گیا تھا۔ وہ انڈین تھا اور جاوا کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں اس کا نام تک نہیں جانتی۔ وہ میرے ساتھ ہسپتال گیا تھا اور اس نے یوسف کو دیکھا۔ جب اس کی تسلی ہوگئی تو سلطان چٹے کے لوگوں نے اگلا قدم اُٹھایا اور اسے ہسپتال سے لے گئے۔ وہ اسے وہیل چیئر پر اسٹیشن وین تک لائے اور پھر اسٹیشن وین میں ڈال کر نکل گئے۔"

"وہ آسانی سے کیسے چلا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ آسانی سے نہیں گیا۔ انہوں نے اس پر پستول تانا ہوا تھا یہ اور بات ہے کہ پستول

ایک کپڑے کے نیچے تھا اور کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے یوسف سے کہا تھا کہ اسٹیشن وین میں ایک بندہ ہے جو اس سے دو چار سوال پوچھنا چاہتا ہے اگر اس نے جواب دے دیئے تو وہ اس پندرہ منٹ میں اسے چھوڑ دیں گے لیکن یہ غلط تھا، وہ اسے وین میں ڈال کر لے گئے۔ راوی کے پل پر ناکا بندی کی وجہ سے اسے تین چار گھنٹوں کے لیے میری گلبرگ والی کوٹھی میں رکھا گیا، اس کے بعد آگے لے گئے۔"

"آگے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔"

"چلو جتنا پتا ہے، اتنا ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"وہ لوگ اتنا ہی بتاتے ہیں، جتنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میری بات کا یقین کرنا، میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ مم...... میں نے ان کی باتوں میں صرف فقیر والا کا نام سنا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ "فقیر والا" کوئی شہر ہے یا پنڈ شنڈ ہے۔ میں نے سلطان سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے بات پلٹ دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کچھ نہیں بتائے گا۔"

"تمہارا خیال ہے کہ وہ لوگ یوسف کو فقیر والا نامی جگہ لے کر گئے ہیں؟"

"مجھے یہی لگتا ہے لیکن اب اگر آپ لوگ چاہو کہ میں سلطان سے کوئی ٹوہ وغیرہ لوں تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ بہت خچرے لوگ ہیں، بہت ہی زیادہ ہوشیار۔ انہیں پتا چل چکا ہوگا کہ پولیس مجھے شک میں لے کر گئی ہے۔ اب وہ کچھ عرصہ تک مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ بازار کی کسی اور عورت سے وہی کام لینا شروع کر دیں جو میں کرتی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے تو ان کی طرف سے جان کا بھی خطرہ ہے۔"

عمران نے کہا۔ "تم تسلی رکھو۔ انسپکٹر صاحب تمہاری حفاظت کا پورا انتظام کریں گے۔ بڑے افسر بھی اس کیس میں پوری دلچسپی لے رہے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپاؤ مت۔"

وہ ایک بار پھر روہانسی ہوگئی۔ "میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے ہو...... کیوں نہیں...... مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔ اب میری جان بھی نکال لوگے تو مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکو گے۔ میرے پاس اب بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں۔"

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا...... چلو انسپکٹر صاحب کو یہی بتا دو کہ جاوا کے پاس کتنی ہیروئنوں کی ہم شکل لڑکیاں ہیں؟"

"مجھے صرف دو کا پتا ہے۔ ایک تو یہی جس کے لیے یوسف نے بات کی تھی اور تم لوگوں

نے بھی۔ دوسری وہ نئی ہیروئن سونو ہے۔''

''یہ لوگ ہم شکل چہرے تلاش کس طرح کرتے ہیں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل ہے شاید ''ٹوئنٹی فور'' نام ہے اس کا۔ اس میں ہر ہفتے میں چار دن ایک بڑا کامیڈی شو چلتا ہے۔ اس میں اہم اور مشہور لوگوں کے خاکے اُڑائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر فلمی لوگ ہی ہوتے ہیں۔ چینل والے اخبار میں بھی اشتہار دیتے ہیں کہ انہیں اہم شخصیات کے ہم شکل لوگوں کی ضرورت ہے۔ چینل پر بھی اشتہار چلتا ہے کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی صورت کسی مشہور چہرے (سیلیبریٹی) سے ملتی ہے تو ہم سے رابطہ کریں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جاوا وغیرہ کا رابطہ اس چینل سے ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ان کا کوئی طریقہ ہوسکتا ہے۔'' شاربہ بائی نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم شکل لڑکیوں سے اور کیا کام لیا جاتا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں......بس وہ......'' شاربہ کہتے کہتے اٹک گئی۔

انسپکٹر شوکت نے اسے پھر رواں کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کرے گی تو اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔ بلکہ اس معاملے میں اس کا نام ہی نہیں آئے گا۔ دوسری صورت میں اس کا رُخ حوالات سے سیدھا لاہور جیل کی طرف ہو جائے گا۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''پچھلے مہینے ان لوگوں نے مشہور بھارتی ایکٹرا ایشوریا رائے کی ایک ہم شکل لڑکی ڈھونڈی تھی۔ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ بس اس کے بال کچھ گھنگریالے تھے جو انہوں نے سیدھے کرالیے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کو یہ لوگ انڈیا لے جائیں گے یا ہوسکتا ہے کہ لے بھی گئے ہوں۔ وہاں اس سے کئی کام لیے جاسکتے ہیں۔ اسے کسی فلم کے سیٹوں میں اصل ہیروئن کی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے یا پھر اس طرح کے غلط کام کرائے جا سکتے ہیں جیسے یہاں ہوتے ہیں۔''

میرے تصور میں سویٹی نامی وہ لڑکی آ گئی جو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہمیں ملی تھی۔ شیخوپورہ کے نواحی ویرانے میں راجا کو اس لڑکی سے ''مستفید'' ہونے کا نادر موقع ملا تھا۔ اس سے پہلے یہ لڑکی سیکرٹری ندیم کی راتوں کو چمکاتی رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم و بیش نوے فیصد تک معروف فلم اسٹار سے ملتی تھی۔ اس کا رنگ ابھی کچھ سانولا تھا لیکن آج کل

رنگ گورا کرنا کون سا مشکل کام ہے۔

یہ ایک لمبا چوڑا تانا بانا تھا اور اس کی تفصیلات توجہ طلب تھیں۔ یقینی بات تھی کہ انڈیا میں بھی اس طرح کی مہم جوئی ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہاں بھی کسی ٹی وی چینل یا فلم کمپنی یا آرٹ اکیڈمی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہو۔

انسپکٹر شوکت کا اندازہ یہی تھا کہ ہم جو کچھ اس نائکا سے پوچھ سکتے ہیں، وہ پوچھ چکے ہیں۔ تاہم عمران کا خیال تھا کہ ہمیں تھوڑا بہت دلال حنیف کو بھی ٹٹولنا چاہیے۔ ہم لاک اَپ میں پہنچے۔ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ یہاں ہونے والی دھنائی کے بعد اس کی تن فن بھی ختم ہو چکی تھی۔ جس اے ایس آئی پر حنیف نے ٹوٹی ہوئی بوتل سے حملہ کیا تھا، وہ ہسپتال میں تھا۔ اہلکار پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں زیر دفعہ 333، حنیف کو بہ آسانی آٹھ دس سال قید کی سزا ہوسکتی تھی۔ اس وقت وہ بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ''استاد! جو کچھ ہوا ہے تیری بداخلاقی اور گندی زبان کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تو اس وقت میرا فون سن لیتا اور بائی سے میری بات کرا دیتا تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔''

وہ عمران سے معافی مانگنے لگا۔ وہ مجھے بھی سادہ لباس میں پولیس والا ہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی منت سماجت شروع کر دی۔ ہم نے اس سے دس پندرہ منٹ سر کھپایا لیکن اس کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہوسکا جو شاربہ ہمیں بتا چکی تھی۔

ایس پی حمزہ صاحب کے کہنے پر رات تک شاربہ کو شخصی ضمانت پر گھر بھیج دیا گیا اور اس کی حفاظت پر گارڈز بھی لگا دیئے گئے۔ حنیف کا جرم سنگین تھا، اس کے خلاف پولیس کی مدعیت میں ہی پرچہ کاٹ دیا گیا۔

O......❖......O

اب ہمارے پاس صرف ایک سراغ تھا، فقیر والا......لیکن یہ کہاں تھا؟ کوئی قصبہ تھا، گاؤں تھا یا کسی علاقے کا نام تھا؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس حوالے سے ہمیں سیکرٹری ندیم کچھ اتا پتا دے سکتا تھا مگر صرف دو دن پہلے سیکرٹری ندیم کے حوالے سے ہمیں ایک بُری خبر مل چکی تھی۔ عمران نے اسے جیلانی کے سپرد کیا تھا اور جیلانی نے اسے لاہور ہی میں کسی مکان میں محبوس رکھا ہوا تھا مگر دو دن پہلے ندیم کو وہاں سے بھاگنے کا ایک نادر موقع مل گیا تھا۔ ایک ساتھ والی بلڈنگ میں آگ لگی تھی جس کی وجہ سے اس مکان میں بھی دھواں بھر گیا جہاں ندیم بند تھا۔ موقع پر دو مسلح چوکیدار موجود تھے۔ انہوں نے اس خوف سے کہ کہیں ندیم کی موت نہ ہو جائے، اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور صحن میں لے جانا چاہا مگر اسی دوران میں ندیم کام

دکھا گیا۔اس نے ایک چوکیدار کے سر پر لوہے کی لٹھ ماری اور گہرے دھوئیں میں چھلانگ لگا دی۔یوں وہ عقبی دیوار پھاند گیا۔اس واقعے کے بعد عمران کو وہ مکان مقفل کرنا پڑا تھا۔

اگلے آٹھ دس گھنٹے میں عمران نے سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح سلطان چٹے کا کوئی بندہ ہاتھ آ جائے اور اس سے ”فقیر والا“ کا اسرار معلوم کیا جائے مگر ناکامی ہوئی۔شاربہ کا کہا درست نکلا تھا۔یہ لوگ ایک دم روپوش ہو گئے تھے۔سلطان چٹے کی وہ کوٹھی بھی خالی پڑی تھی جہاں ہم نے نادر ٹی کو شوٹ کیا تھا اور سلطان کے کان میں جھمکا ڈالنے کی جگہ بنائی تھی۔

عمران کی نگاہ میں ایک دو اور ٹھکانے بھی تھے۔اس نے جیلانی، اقبال اور امتیاز وغیرہ کو سرچ کے لیے بھیجا مگر مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔

دوسری طرف کبھی ثروت اور کبھی نصرت کا میسج آ رہا تھا۔وہ جلد از جلد مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔خاص طور سے ثروت بے چین تھی۔شام کے بعد میں عمران اور اقبال اندرون شہر یعنی راوی روڈ والے مکان میں سر جوڑ کر بیٹھے اور فقیر والا کا کھوج لگانا شروع کیا۔ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قصبہ یا گاؤں کس ضلع یا کس صوبے میں ہے۔نام سے بھی کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔پنجاب، جنوبی پنجاب اور سندھ میں بھی اس طرح کے نام پائے جاتے تھے۔عمران نے اپنے ایک تحصیل دار دوست سے رابطہ کیا اور اس کے ذریعے ایک ایسے سرکاری افسر سے بات کی جسے چھوٹے شہروں، قصبات اور دیہات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل تھیں اور ریکارڈ وغیرہ بھی موجود تھا۔یہ شخص دو دن کی چھٹی پر تھا اور اس کے بعد ہی تفصیل سے ریکارڈ وغیرہ دیکھ کر کچھ بتا سکتا تھا۔عمران کے کہنے پر اقبال کہیں سے دو بڑے بڑے نقشے لے آیا۔یہ پاکستان کے تفصیلی نقشے تھے لیکن ان میں بھی کہیں فقیر والا نظر نہیں آیا۔ایک جگہ دکھائی دی پر اس کا نام فقیراں پور تھا۔

ہم نقشوں میں مگن تھے جب دروازے پر بیل ہوئی۔عمران نے کہا۔”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ نسوانی بیل ہے۔کہیں شاہین ہی نہ ہو۔اگر وہ ہوئی تو آج ضرور مجھ سے طلاق لے لے گی۔“

”شادی سے پہلے طلاق کیسے ہو سکتی ہے؟“ اقبال نے کہا۔

”یہ سیل فون کا دور ہے، اس میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔

اقبال دروازے پر گیا اور چند سیکنڈ بعد ثروت کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ثروت کا اس طرح آنا میرے لیے تعجب خیز اور پریشان کن تھا۔اس کے ہاتھ میں چھتری تھی اور تب ہمیں اندازہ ہوا کہ باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔

ثروت کی خوبصورت آنکھوں میں اندوہ آمیز تھکن تھی۔بالوں کی دو لٹیں زرد رخساروں پر جھول رہی تھیں۔”سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ بولی اور شولڈر بیگ میز پر رکھ دیا۔

میں نے اسے کرسی دی اور کہا۔”سوری تو مجھے کہنا چاہیے۔میں تم سے رابطہ نہیں کر پا رہا تھا۔دراصل یوسف کے سلسلے میں ہی مصروف تھا۔یہ دیکھو اب بھی ہم یہ نقشے وغیرہ ہی دیکھ رہے تھے۔میں چاہتا تھا کہ کوئی ٹھوس اطلاع ہو تو تم سے رابطہ کروں۔“

”اور اگر دس دن تک ٹھوس اطلاع نہیں ملتی تو آپ رابطہ ہی نہیں کرتے؟“ وہ شکوہ کناں انداز میں بولی۔

”ایسی بات نہیں ثروت! میں اتنا ہی پریشان ہوں جتنی تم ہو یقین کرو، کل سے ایک لقمہ نہیں کھایا گیا مجھ سے۔بلکہ یہ عمران بھی اسی طرح بھوکا پیاسا میرے ساتھ پھر رہا ہے۔“

”ہاں ثروت! ہم مسلسل کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کیا کامیابی ہوئی ہے؟“ وہ سر جھکا کر آنسو بہانے لگی۔

عمران نے مجھے اشارہ کیا اور چائے لانے کا بہانہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔اس کے پیچھے اقبال بھی کھسک گیا۔میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔”ثروت! صورتِ حال اچھی نہیں لیکن اتنی بُری بھی نہیں کہ ہم اس طرح رونے لگیں اور ہمت ہار کر بیٹھ جائیں۔“

”آپ...... مجھے سچ بتائیں۔کیا انہیں اغوا کر لیا گیا ہے؟“

”ہم اسے اغوا تو نہیں کہہ سکتے ثروت! یوں لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ یوسف کا کوئی تنازع تھا۔وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔شاید اپنی کوئی بات منوانا چاہتے ہیں اس سے۔“

”آپ بات کی شدت کو کم کر رہے ہیں لیکن بات تو وہی ہے نا۔وہ لوگ یوسف کو لے گئے ہیں لیکن یوسف تو چیریٹی شو میں گئے تھے۔وہ فورٹریس کی طرف تھا۔پھر وہ گلبرگ کس لیے آئے۔جب ایکسیڈنٹ ہوا تو آپ وہاں کیسے پہنچ گئے؟“

ثروت کے لہجے میں اُلجھن تھی اور شک کی ہلکی سی بُو بھی تھی۔میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ فورٹریس نہیں گیا تھا، وہ تو گلبرگ میں تھا اور کسی کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا۔اگر میں بتاتا بھی تو شاید وہ یقین نہ کرتی اور اسے بھی میری رقابت قرار دیتی۔میں اس معاملے میں خاموش رہا۔ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچنے کے حوالے سے میں نے اسے بتایا کہ میں اور میرا دوست

عمران ایک شادی میں شرکت کے بعد آرہے تھے۔

"آخر وہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ کیا انہوں نے کوئی رابطہ کیا ہے؟" وہ ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر سوالیہ انداز میں بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "اور وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ آپ تھانے میں موجود تھے؟"

میں نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ "وہ یوسف کے ایک دفتری دوست کی جاننے والی ہے۔ اس سے تھوڑی بہت معلومات ملی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ وہ لوگ یوسف کو لاہور سے باہر لے گئے ہیں۔ کوئی فقیر والا نام کا قصبہ یا گاؤں ہے۔ اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان ہے کہ یوسف کو وہاں لے جایا گیا ہو۔ ہم فقیر والا کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ فقیراں پور کے نام سے ایک چھوٹے قصبے کا پتا تو چلا ہے لیکن فقیر والا کا نام کسی نقشے میں نظر نہیں آرہا۔ دراصل ایسے چھوٹے قصبوں یا دیہات کو اسی وقت ڈھونڈا جا سکتا ہے جب ان کے پاس کے کسی معروف شہر یا قصبے کا پتا ہو۔"

میرے اور ثروت کے درمیان اس موضوع پر آٹھ دس منٹ بات ہوئی، اچانک وہ چونک کر بولی۔ "میری ایک دوست مرینہ "پاکستان اسٹڈی" کی لیکچرار ہے۔ میں نے اس کے پاس ایک نقشہ دیکھا تھا بلکہ پورا اٹلس تھا۔ اردو کے اس اٹلس میں پاکستانی علاقوں کی بڑی تفصیل تھی۔ صوبوں کے نقشے تھے اور پھر صوبوں کے اندر کمشنریوں کے علیحدہ نقشے تھے۔ جیسے کمشنری لاہور، کمشنری گجرانوالہ وغیرہ...... چھوٹے چھوٹے ٹاؤنز کے نام بھی لکھے تھے۔ اگر...... اگر واقعی فقیر والا کوئی جگہ ہے تو ان نقشوں میں ضرور ہوگی۔"

"تمہارے پاس اپنی دوست کا فون نمبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سیل فون نکال کر اسے کال کرنے لگی۔ فون بند تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس نے اسی وقت شولڈر بیگ اُٹھایا، چھتری پکڑی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مرینہ کی طرف۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"کس میں آئی ہو تم؟"

"ٹیکسی میں۔ ٹیکسی ابھی باہر کھڑی ہے۔"

"نہیں ثروت! اگر تم ابھی جانا چاہتی ہو تو پھر میں گاڑی نکالتا ہوں۔"

اس نے انکار کیا لیکن میں نے اسے قائل کر لیا۔ اسی دوران میں عمران چائے وغیرہ

لے آیا۔ میں نے اقبال سے کہا کہ وہ باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کر دے۔ اس دوران میں ہم نے چائے پی اور عمران کو تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

دس منٹ بعد ثروت اور میں، عمران کی مہران گاڑی پر موجود تھے اور بازار سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ثروت میرے برابر بیٹھی تھی۔ یہ رات کے دس بجے کا وقت تھا، بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی نے ثروت کے اعصاب کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ مرینہ کے گھر تک کا فاصلہ ہم نے تقریباً خاموشی میں ہی طے کیا۔ یہ ساندہ روڈ تھا۔ میں نے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ ثروت چھتری تان کر اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ ایک کتابچہ سا اس کے ہاتھ میں تھا۔ گاڑی میں گھس کر اس نے چھتری بند کی اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر ہیجان سا تھا۔ وہ گاڑی کی اندرونی بتی جلا کر کتابچے کے صفحے اُلٹنے لگی۔ یہ ایک بغیر جلد کا اٹلس تھا۔ کچھ پُرانا لگتا تھا۔ اس میں واقعی پاکستان کی مختلف کمشنریوں کے تفصیلی نقشے تھے۔

اس نے ایک صفحہ نکالا اور بولی۔ "یہ دیکھیں...... یہ ہے کمشنری بہاولپور...... یہ ہے ہارون آباد اور یہ اس سے آگے بیس پچیس کلومیٹر...... فقیر والا۔ یہ دراصل فقیر والی ہے۔" مجھے یاد آیا کہ شاربہ بائی نے بھی اپنی گفتگو میں فقیر والا یا فقیر والی ہی کہا تھا۔ یعنی تلفظ میں تھوڑا سا شک تھا۔

فقیر والا کا لفظ میری نگاہوں میں چمکا اور اس کے ساتھ ہی ایک سنسنی خیز احساس بھی ہوا۔ یہ جگہ انڈین بارڈر کے بالکل قریب تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ فقیر والی ہے جس کا ذکر شاربہ بائی نے کیا ہے اور جس کا نام جاوا کے ساتھیوں کی گفتگو میں آیا ہے۔

ثروت دھیان سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زیادہ بڑا قصبہ نہیں ہے۔ ایسی جگہوں پر کسی باہر کے بندے کا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا...... مگر......"

"ایک اور بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔" ثروت نے جذباتی انداز میں کہا۔ "اپنے پیر احمد تھانوی صاحب بھی آج کل ہارون آباد میں ہیں۔ وہاں ان کے بہت سے مرید ہیں۔ ان میں ایک دو پولیس افسر بھی ہیں۔ تھانوی صاحب ہماری بہت مدد کر سکتے ہیں۔"

پیر احمد تھانوی وہی نیک خو بزرگ تھے جن کے آستانے پر میں نے پہلی بار نصرت کو دیکھا تھا اور پھر ثروت کو دیکھنے کی سبیل بھی پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایک روحانی شخصیت تھے اور

روحانی شعبدہ بازوں کی طرح عقیدت مندوں کو اُلو نہیں بناتے تھے۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش جاری تھی۔ کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ ثروت کے سراپا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ وہ بولی۔ ''تابش! ابو جان (فاروقی صاحب) تو بیمار ہیں۔ وہ کہیں آ جا نہیں سکتے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں سوچتی ہوں کیوں نہ میں ابھی ہارون آباد چلی جاؤں۔ احمد تھانوی صاحب کے وہاں ہوتے ہوئے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''کیا مطلب؟ تم اکیلی جاؤ گی اور اس وقت؟''

''تابش! ایسے کاموں میں جتنی دیر ہو، اتنا ہی معاملہ بگڑتا ہے۔ ہم پہلے ہی کافی دیر کر چکے ہیں۔''

''اگر ایسی بات ہے ثروت تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا لیکن...... ابھی نکلنے کے لیے وقت اچھا نہیں ہے۔ ہم صبح سویرے نکل سکتے ہیں۔ ڈرائیونگ آسان ہوگی اور شاید موسم بھی ٹھیک ہو جائے۔''

''مگر میں تو بس پر جانا چاہتی ہوں۔''

''چلو بس پر ہی چلے جائیں گے مگر صبح نکلنا بہتر رہے گا۔ اس دوران میں، مَیں ساتھیوں سے بھی مشورہ کر لیتا ہوں۔''

''نہیں تابش! کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ میں اکیلی چلی جاؤں۔ وہاں ہارون آباد میں مجھے ہر طرح کی سہولت مل جائے گی۔'' ایک مشرقی بیوی کی تمام تر بےقراری اور خلوص آمیز فکرمندی ثروت کے لہجے میں پائی جاتی تھی۔ اس کے لہجے کی یہ کیفیت میرے اندر تک ایک طرح کا کرب جگانے لگی۔ وہ کیا کر رہا تھا اس کے ساتھ اور یہ کس طرح ہلکان ہو رہی تھی اس کے لیے۔

''نہیں ثروت!'' میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا لیکن موسم خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت سفر مشکل ہوگا۔ چند گھنٹوں کی بات ہے بلکہ میں ابھی فون پر بس کی ٹائمنگ کا پتا کر لیتا ہوں اور بکنگ بھی کرا لیتا ہوں۔ ہمیں ڈائریکٹ ہارون آباد کی بس مل جائے تو بہت اچھا رہے گا۔''

میں نے اسی وقت بس اسٹینڈ پر فون کیا۔ پتا چلا کہ لاہور سے براہِ راست ہارون آباد کے لیے بس صبح گیارہ بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوگی۔ میں نے دو نشستیں ریزرو کرنے کے لیے کہہ دیا۔

ثروت کل جانے کے لیے نیم رضامند نظر آنے لگی مگر اس کے اندر بےقراری موجود رہی۔ اس کے پاس احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ کا فون نمبر موجود تھا لیکن وہ عشا کے کچھ ہی دیر بعد سو جاتے تھے۔ اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا ثروت نے مناسب نہیں سمجھا۔ ہم نے وہیں گاڑی میں چار پانچ منٹ گفتگو کی اور ہمارے درمیان کل دوپہر کا پروگرام تقریباً طے ہو گیا۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ثروت کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤں مگر اسی دوران میں ایک خالی ٹیکسی آ گئی۔

ثروت نے کہا۔ ''آپ کو بڑا لمبا چکر پڑے گا۔ میں آرام سے ٹیکسی پر چلی جاتی ہوں۔''

میرے روکنے کے باوجود وہ باہر نکل گئی۔ مجھے خدا حافظ کہا اور ٹیکسی پر سوار ہو کر چلی گئی۔ ٹیکسی قریباً سو میٹر دور گئی ہوگی جب میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ کہیں ثروت نے میرے ساتھ غلط بیانی تو نہیں کی تھی؟ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر میں مجھے ٹیکسی کی ''ٹیل لائٹ'' نظر آنے لگی۔ میں محفوظ فاصلے سے ٹیکسی کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد بارش پھر شروع ہو گئی۔ گرج چمک بھی ہونے لگی۔ موسم کے تیور پل پل بدل رہے تھے۔

یکایک میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ یتیم خانہ چوک سے سیدھا آگے نکل کر گارڈن ٹاؤن کا رُخ کرنے کے بجائے ٹیکسی دائیں طرف بند روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اس سڑک پر بسوں کے بہت سے اڈے تھے۔ میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ثروت نے میری بات نہیں مانی اور ابھی اسی وقت تنہا ہارون آباد روانہ ہو رہی تھی۔ یقیناً اس نے سیل فون کے ذریعے اپنے گھر والوں کو اپنی روانگی کی اطلاع پہنچا دی ہوگی۔ بارش زور پکڑتی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر پانی جمع ہو رہا تھا۔ ٹیکسی بس اسٹینڈ پر پہنچی۔ میں نے مہران کچھ فاصلے پر روک دی۔ ثروت رنگین چھتری تانتے ہوئے ٹیکسی میں سے نکلی اور تیزی سے بس اسٹینڈ کی انتظار گاہ میں داخل ہو گئی۔ اب شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ ابھی اور اسی وقت جا رہی تھی۔

میں نے بھی مہران لاک کی اور بارش سے بچنے کے لیے ایک مارکیٹ کے برآمدے میں چلتا ہوا بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ کوشش کے باوجود میرے جسم پر بارش کی بوچھاڑیں آئی تھیں اور میں جزوی طور پر بھیگ گیا تھا۔ میں بس اسٹینڈ پر پہنچا تو مجھے بکنگ آفس کے پاس ثروت نظر آئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ ٹکٹ لینے کے لیے کھڑکی کے سامنے کھڑی

تھی۔ میں اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور بکنگ کلرک سے بولی۔ ''ایک ٹکٹ بہاولنگر کا۔''

میں نے نوٹ اس کے ہاتھ سے اچک لیا اور ہزار کا نوٹ کلرک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک نہیں دو ٹکٹ۔''

وہ حیرت سے مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ بارش کے چھینٹوں سے اس کی چادر بھیگ گئی تھی اور بالوں کی نم لٹیں بائیں رُخسار سے چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں تعجب گریز اور اطمینان کے ملے جلے آثار نظر آئے۔ ایک ایسی کیفیت جسے کوئی بھی نام دینا مشکل تھا۔ ٹکٹ لے کر ہم بس میں آ گئے۔ بس درمیانے درجے کی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتی تھیں، میں تمہیں اکیلا جانے دوں گا؟''

''شکریہ۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔

''تم تو کہا کرتی تھیں کہ شکریہ بیگانوں کا ادا کیا جاتا ہے۔''

وہ خاموش رہی۔ چھتری کے باوجود اس کا لباس ایک طرف سے بھیگ گیا تھا۔ لان کی قمیص میں سے کندھے کا گلابی پن اور پہلو کے نشیب و فراز نظر آ رہے تھے۔ میں نے ہولے سے اس کی اوڑھنی درست کر دی۔ شاید اس نے پھر ''شکریہ'' کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس بار خاموش رہی۔

بس کی سواریاں تیزی سے پوری ہوئیں اور ڈرائیور نے نشست سنبھال لی۔ میں نے موبائل پر عمران کا نمبر ملایا۔ وہ بولا۔ ''ہیلو تابی! کہاں چلے گئے ہو؟ اتنے رومانی موسم میں نوجوان جوڑے بہک بھی سکتے ہیں۔''

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں بہاولنگر جا رہا ہوں۔ وہاں سے ہارون آباد جاؤں گا۔ ثروت میرے ساتھ ہے۔''

''ہارون آباد؟ وہ کیوں؟'' عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ بعد میں فون کروں گا۔''

''اوئے لگڑ بھگڑ! گاڑی کا موبل آئل بدلنے والا تھا۔ کہیں رستے میں ہی انجن چوک نہ ہو جائے۔''

''نہیں ہو گا چوک یار! وہ ادھر ہی کھڑی ہے۔ بس اسٹینڈ کے پاس۔ دوسری چابی تو ہے نا تمہارے پاس؟ آ کر لے جاؤ۔''

''اور تم کس پر جا رہے ہو؟''

''بس پر۔''

''یہ فقیر والا کہیں ہارون آباد کی طرف تو نہیں ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔ باقی باتیں پھر۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے فون بند کرنے سے ثروت کو اطمینان کا احساس ہوا۔ ثروت کے منع کرنے کے باوجود میں نے پانچ سو کا وہ نوٹ اس کے شولڈر بیگ میں ڈال دیا جو کھڑکی میں اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔

میرے ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ حالات مجھے اور عمران کو تنکے کی طرح اُڑا رہے تھے۔ چند دن پہلے اسی طرح ڈاکٹر مہناز غائب ہوئی تھی۔ وہ بدھا کی مورتی آرا کوئے والا معاملہ تھا اور وہ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ جلالی صاحب زندگی اور موت کی کشمکش میں تھے اور جاوا ایک ذاتی سانحے کا شکار ہو کر ممبئی جا چکا تھا۔ اب اسی سلسلے میں سے یہ یوسف کی گمشدگی والا چکر نکل آیا تھا۔

جلد ہی میرے خیالات کا دھارا پھر ثروت کی طرف مڑ گیا۔ اس کی دلکش شخصیت نے اس عام سی بس کو جیسے جگمگا دیا تھا۔ کئی حضرات کن انکھیوں سے دیکھ چکے تھے۔ وہ میرے پہلو میں سکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کے بھیگے بدن کی جانی پہچانی لیکن بھولی بسری خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی، مجھے ماضی کی بھول بھلیوں میں پہنچا رہی تھی۔ جب ہم ساون کی بارش میں بھیگتے تھے۔ ''برساتیوں'' میں چھپتے تھے اور ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے تھے۔ کتنے رسیلے آم تھے ان ساونوں کے اور ہونٹوں سے لگنے والی ہر چیز کتنی رسیلی تھی۔ ہم سپنے بُنتے تھے۔ آنے والے سہانے دنوں کے خواب دیکھتے تھے لیکن اب درمیان میں فاصلے تھے...... بے مہر فاصلے۔

وہ مجھ سے یوسف ہی کی باتیں کرتی رہی۔ ایکسیڈنٹ میں کس کا قصور تھا؟ لڑائی کیسے ہوئی؟ یوسف کو کتنا زخم آیا تھا؟ ہسپتال میں اس کی کیفیت کیا تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ آخر وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''ہر شخص میں خوبیاں خامیاں ہوتی ہیں۔ یوسف میں بھی تھیں لیکن میں نہیں سمجھتی تھی کہ ان کے معاملات کسی سے اتنے بگڑے ہوئے تھے کہ زبردستی ساتھ لے جانے کی نوبت آ گئی۔ یہ کوئی اور معاملہ لگتا ہے۔ اچھا، جب آپ کپڑے وغیرہ بدلنے کے لیے گھر جانے لگے تو انہوں نے آپ سے کیا بات کی تھی؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ''بس یہی کہ میں کتنے بجے آؤں گا۔ آتے ہوئے میں ایک گلاس پلیٹ اور تولیا لے آؤں۔ بس اس طرح کی بات ہوئی

تھی۔اس وقت وسیم احمد اس کے پاس تھا۔“

”کاش......اس بندے کا ہی کچھ پتا چل سکتا۔“ وہ بولی۔

بس ہموار سڑک پر رواں تھی۔ پھسلن کی وجہ سے رفتار زیادہ نہیں تھی۔ ڈرائیور نے میوزک آن کر دیا۔ فریدہ خانم کی مدھر آواز بس میں گونجنے لگی۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب اس کا حال بتائیں کیا۔

ثروت خاموشی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ باہر دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ تاریکی تھی اور اس میں درختوں کے بھاگتے سائے تھے۔ وہ بھی شاید صرف اپنے ”اندر“ سے دھیان ہٹانے کے لیے باہر جھانک رہی تھی۔

آواز گونج رہی تھی۔ اک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی۔ جب جسم ہی سارا جلتا ہو تو دامن دل کو بچائیں کیا۔

سینے میں عجیب سا دھواں بھر رہا تھا۔ بے کلی سی تھی۔ ہم کسی تفریحی ٹور پر نہیں جا رہے تھے۔ یہ سفر بڑی غیر یقینی صورتِ حال میں ہو رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں فقیر والی میں کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ ثروت کو احمد تھانوی صاحب کی طرف سے بڑا آسرا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یوسف کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔ یہ بہت بڑے مگرمچھوں کا بین الاقوامی گروہ تھا۔ پیر احمد تھانوی بیچارے یہاں کیا کر سکتے تھے۔ نہ ہی یہ کسی انسپکٹر، سب انسپکٹر کے بس کا روگ تھا۔ میں عمران سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ثروت اسے پسند نہیں کرے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سلسلے میں اپنے کسی دوست کو گھسیٹوں۔

صادق آباد کے قریب گاڑی کچھ دیر کے لیے رُکی تو میں ڈرنکس وغیرہ لینے کے لیے نیچے اُترا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں نے چپس، بسکٹس اور جوس وغیرہ لیے۔ اسی دوران میں، میں نے ایک اوٹ میں ہو کر عمران کو فون بھی کیا اور جلدی جلدی اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ فقیر والی کا قصبہ ہارون آباد سے تھوڑا آگے ہے اور انڈین بارڈر کے قریب ہے۔

انڈین بارڈر والی بات نے عمران کو بھی چونکا دیا۔ وہ بولا۔ ”یہ تو خطرناک بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یوسف کو کسی طرح انڈیا اسمگل کیا جا رہا ہو؟“

”میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی ہے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟ میں بھی آؤں۔“ عمران نے کہا۔

”آنا تو چاہیے لیکن ثروت کو پسند نہیں کہ میں اس سلسلے میں کسی کو کال کروں۔ وہ یہی

سمجھ رہی ہے کہ پیر احمد تھانوی صاحب وہاں موجود ہیں۔ ان کے بااثر مرید بھی ہیں، وہ مسئلہ حل کرا دیں گے۔“

عمران نے کہا۔ ”یا پھر یہ ہے کہ تم پہلے وہاں پہنچو اور صورتِ حال دیکھو۔ میں اس دوران میں اقبال کو فقیر والی روانہ کر دیتا ہوں۔ وہ تمہارے آس پاس رہے گا۔ اگر تم سمجھو کہ میرے آنے کی ضرورت ہے تو میں بھی پہنچ جاؤں گا۔“

”ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن پھر کوئی تماشہ نہ لگا دینا۔ جب بھی تم اکیلے پرواز کرتے ہو، اپنی چونچ سیدھی کسی رائفل کی نال میں گھسا دیتے ہو۔ شکاری کو بس ٹریگر دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

وہ انڈسٹریل ایریا میں پیش آنے والے واقعے کا اشارہ دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”پرندے والی مثال غلط ہے۔ گھوڑے اور گھڑ سوار کی مثال دو۔ وہ کیا کہتے ہیں، گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان میں...... اچھا خدا حافظ۔ وہ بس میں میرا انتظار کر رہی ہے۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ بس چلنے والی تھی۔ وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں دیکھنا مجھے اچھا لگا۔ ”اتنی دیر؟“ اس نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

”ہاں...... دیر تو واقعی بہت ہو گئی ہے۔“ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

میں نے پتلون کے ساتھ ذرا کھلے گھیرے کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کو پتلون کے اندر نہیں ڈالا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پتلون کی بیلٹ میں، مَیں نے کولٹ پسٹل اڑسا ہوا تھا۔ میں جب بیٹھتا تو شرٹ کے نیچے سے پسٹل کا ابھار نمایاں ہوتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ یہ اُبھار ثروت کی نظر میں نہ آئے۔ میرا دوسرا ہتھیار میرا چاقو تھا جو چمڑے کے بینڈ سے میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ میں اور ثروت ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ پیچھے جانے والی ایک تنومند عورت کو راستہ دینے کے لیے میں ثروت کی طرف سمٹا تو کولٹ پسٹل کا سخت اُبھار ثروت کے پہلو سے مس ہوا۔ اپنے جسم پر پسٹل کی چبھن محسوس ہوئی تو اس نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔

”یہ...... کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کک...... کچھ نہیں۔“ میں نے شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر پسٹل کو بیلٹ کے اندر گھسیڑا۔ وہ بچی نہیں تھی، سمجھ گئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی طرح باہر دیکھتے دیکھتے بولی۔ ”تابش! بہت بدل گئے ہیں آپ، بہت زیادہ۔“

”وقت نے بدلا ہے۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اور...... تم نے بدلا

ہے۔''

''میں نے؟'' وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

''ہاں ثروت! وہ رات مجھے کبھی بھولی نہیں جس نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کیا۔ وہ اوباش لڑکے...... وہ تمہاری بدنامی...... وہ ہماری بے بسی، وہ تھانیدار اشرف اور ایم پی اے گورایا جیسے لوگوں کی کمینگی اور وہ تمہارے گھر کی بربادی...... وہ سب میرے سینے پر انگاروں کی طرح دہک رہا ہے اور دہکتا رہے گا۔ مجھے اس بدنصیب وقت نے بدلا ہے ثروت جو ہمارا سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اب میں وہ تابش نہیں۔ کبھی کبھی تو میرے لیے خود کو پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔''

''کسی سے انتقام لینے کے لیے اپنی زندگی کو تباہ کر لینا کوئی اچھا وطیرہ نہیں تابش۔''

''اس زندگی کے تباہ ہونے سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا ثروت! میں اب اس سے کافی آگے نکل گیا ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہمیں اپنی ساری توجہ اس کام کی طرف رکھنی چاہیے جو ہم کرنے جا رہے ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔''

''لیکن...... پھر بھی میں چاہتی ہوں تابش کہ ہم جو کریں، قانون کے اندر رہ کر کریں۔ مم...... مجھے اس بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ آپ نے اپنے پاس ہتھیار رکھا ہوا ہے۔ اس کا لائسنس وغیرہ ہے آپ کے پاس؟''

''لائسنس بھی ہے۔ اس کے علاوہ صرف اپنے بچاؤ کے لیے ہے ثروت! اس کا کوئی غلط استعمال نہیں ہوگا۔''

''اللہ کرے اس کا کوئی استعمال ہی نہ ہو۔ ایک شریف شہری کے خلاف جرم ہوا ہے، اب مقامی پولیس کی ذمے داری ہے کہ اس کو بازیاب کرائے۔ ہم نے قانون ہاتھ میں نہیں لیا۔''

''ہاں...... ذمے داری تو پولیس ہی کی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ثروت! مجھے ایک بات سچ سچ بتانا...... پلیز۔''

''کک...... کیا؟''

''تمہارے دل میں کوئی شبہ تو نہیں میرے بارے میں؟''

''کس حوالے سے؟''

''یوسف کے حوالے سے۔ ہسپتال میں آخری وقت میں ہی اس کے پاس تھا۔''

اس نے شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''کیا میں آپ کو جانتی نہیں

ہوں؟''

''لیکن تم خود ہی تو کہتی ہو، میں بہت بدل چکا ہوں۔ جب بندہ بدل جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''اگر ایسی بات ہوتی تو پھر اس وقت میں آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔''

''میں تو زبردستی چل پڑا ہوں۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''آپ نے سچ بولنے کو کہا ہے۔ میں سچ ہی کہوں گی۔ مجھے آپ کی طرف سے نہیں لیکن آپ کے دوستوں کی طرف سے بدگمانی ضرور تھی۔ میں ان کو جانتی نہیں۔ نصرت نے بتایا تھا کہ وہ مار دھاڑ کرنے والے لوگ ہیں۔''

''اگر تم ان سے ملوگی تو تمہاری رائے بدل جائے گی ثروت۔''

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی تابش اور...... میں ایک بار پھر کہوں گی۔ ہماری میل ملاقات جتنی کم ہوگی، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ میں اب شادی شدہ ہوں تابش! کسی سے وابستہ ہو چکی ہوں۔ پلیز...... پلیز! آپ میرے لیے خود کو گناہوں میں نہ گھسیٹیں۔ میرے لیے وہ زندگی کا سب سے خوشگوار دن ہوگا، جب آپ شادی کریں گے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ ریشمی رُخساروں پر دو آنسو رینگ گئے۔ ''سوری'' اس نے بس اتنا کہا۔

بہاولنگر سے ہم نے ایک اور بس پکڑی۔ اس بس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اڈے سے نکلتے نکلتے بھی بس نے تقریباً ایک گھنٹہ لگایا۔ ایک دو بار عمران کی کال آئی لیکن میں نے ریسیو نہیں کی۔ میں ثروت کے سامنے اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار نصرت کی کال بھی آئی لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ ہم آٹھ بجے کے قریب ہارون آباد پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا شہر تھا۔ اس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ مرکزی جامع مسجد کے مینار دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ اس کا شمار بہاولنگر کے اہم شہروں میں ہوتا ہے۔ ہم ایک خوبصورت نہر کا نظارہ اپنی نگاہوں میں سموتے ہوئے منزل پر پہنچ گئے۔

بس اسٹینڈ پر اُترتے ہی ہم نے ایک قریبی ریستوران میں ہلکا پھلکا ناشتہ کیا۔ ثروت نے چائے کے ساتھ بسکٹ لیے۔ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ انڈے کا آملیٹ کھایا۔ بارش یہاں بھی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پنجاب میں دور دور تک مطلع ابر آلود ہے۔ ناشتے کے فوراً بعد ثروت نے پیر احمد تھانوی صاحب کے نمبر پر کال کی۔ کال ریسیو ہو گئی۔ ثروت نے احمد

تھانوی صاحب کواپنانام بتایا۔انہوں نے فوراً پہچان لیااور خوش دلی سے بات کی۔ثروت نے کہا۔''حضرت! ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔میرے شوہر یوسف کا معاملہ ہے۔ امید ہے آپ مدد فرمائیں گے۔ میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ کچھ دیر بعد آپ کے پاس حاضر ہو جاتی ہوں۔آپ اپنا ایڈریس بتا دیجیے۔''

دوسری طرف سے احمد تھانوی صاحب نے ایڈریس بتانا شروع کیا۔ یہ ایڈریس غالباً ثروت کی سمجھ میں نہیں آیا۔اس نے کہا۔''حضور! میرے ساتھ میرے کزن تابش ہیں۔آپ انہیں سمجھا دیجیے۔''اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

احمد تھانوی صاحب نے فوراً میری آواز پہچان لی۔ حال چال پوچھا۔عمران کی خیریت دریافت کی۔ پھر اپنا ایڈریس سمجھایا۔ یہ ہارون آباد کی ایک نئی رہائشی کالونی کا ایڈریس تھا۔ میں نے کوٹھی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ثروت کو تھوڑا سا تعجب ہوا کہ تھانوی صاحب مجھے بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

ناشتے کا بل میں نے زبردستی ادا کیا۔ایک ٹیکسی پکڑ کر ہم مطلوبہ کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ چھوٹے شہروں میں فاصلے زیادہ نہیں ہوتے۔ ہم جلد ہی منزل پر پہنچ گئے۔کوٹھی بھی جلد ہی نظر آ گئی۔ میں نے ٹیکسی رُکوائی ہی تھی جب ایک منظر دیکھ کر بُری طرح چونک گیا۔کوٹھی کے بڑے سے سیاہ گیٹ کے سامنے ایک قطار میں موٹر سائیکلیں اور کچھ گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ یہ تھانوی صاحب کے مریدین کی گاڑیاں تھیں۔ان گاڑیوں کے قریب ایک سیاہ کرولا کار رُکی اور اس میں سے ایک خوبصورت لڑکی ذرا لڑکھڑاتی ہوئی سی اُتری۔ایک شخص نے اسے بڑھ کر سہارا دیا۔لڑکی نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔لباس بھی اچھی تراش کا تھا۔اس کی ٹانگ میں نقص تھا اور چہرے پر بیماری کی جھلک۔ دور سے دیکھ کر بالکل یہی لگا کہ وہ معروف انڈین اداکارہ کرشمہ کپور ہے۔ وہ دو افراد کا سہارا لیتی ہوئی گیٹ میں داخل ہو گئی۔ میں ساکت و جامد بیٹھا رہا۔

''کیا ہوا تابش؟'' پچھلی نشست سے ثروت نے پوچھا۔

''کک...... کچھ نہیں لیکن ہم ابھی اندر نہیں جا سکتے۔''

''کیوں؟''

''یہ بعد میں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا پھر ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ٹیکسی واپس موڑ لے۔

ثروت خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔میری نگاہ میں وہ مناظر گھوم رہے

تھے۔ جب مال روڈ والی کوٹھی میں ہم نے سلطان چیتے کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔عمران نے دراز قد نادر ٹی ٹی کو شوٹ کر دیا تھا۔اس لڑائی کے دوران میں سلطان چیتے نے عمران پر گولی چلائی تھی مگر عمران کی بے مثال ''کک'' نے کام کیا اور سلطان کی چلائی ہوئی گولی اس کی ساتھی نیٹو عرف کرشمہ کپور کی برہنہ ٹانگ میں لگی تھی۔

آج وہی کرشمہ کپور اپنی زخمی ٹانگ اور بیمار چہرے کے ساتھ یہاں احمد تھانوی صاحب کے آستانے پر دکھائی دی تھی۔ غالباً وہ ایک مریض کی حیثیت سے یہاں پہنچی تھی۔ لاہور سے دور اس سرحدی علاقے میں اس کا پایا جانا بھی اپنی جگہ معنی خیز تھا۔

پیر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر لب سڑک ہمیں ایک ہوٹل کا بورڈ نظر آیا۔ اچھا ہوٹل لگتا تھا۔ ہم نے ٹیکسی ہوٹل کے عین سامنے رُکوائی اور اندر داخل ہو گئے۔ بارش ایک بار پھر زوّر پکڑ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ہوا بھی چلنے لگتی تھی۔ ایک ہی چھتری تلے سمٹ کر ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔

میں نے ثروت کو بتایا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے کچھ ایسے بندے نظر آئے ہیں جو مجھے جانتے ہیں اور میرے مخالفین میں سے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہی ہم حضرت صاحب کے پاس جا سکیں گے۔ غنیمت تھا کہ ثروت نے مجھ سے مخالفین کی تفصیل نہیں پوچھی۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ یہ انڈین ڈان جاوا کے لوگ ہیں اور درحقیقت یہی ہیں جنہوں نے یوسف کو اغوا کیا ہے تو یقیناً ثروت کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو جاتے۔

ہم برستے موسم میں چائے پیتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ میں نے ہوٹل کی دوسری منزل پر جا کر دیکھا۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ نظر آتی تھی۔ سیاہ گیٹ کے باہر سیاہ کرولا اب بھی موجود تھی۔ اوپر کی منزل سے ہی میں نے عمران کو فون بھی کیا اور مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ عمران نے بتایا کہ اقبال اور امتیاز فقیر والی کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں، مَیں نے تین چار بار بالائی منزل پر جا کر دیکھا۔ کرولا وہیں نظر آئی۔ ثروت بے چین ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں بہت تاخیر ہو چکی تھی، اب وہ اور تاخیر نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار اُبھرتا تھا کہ اگر کچھ لوگ یوسف کو زبردستی فقیر والی لے کر آئے ہیں تو کیوں؟ اور یہی لاینحل سوال میرے اور عمران کے ذہنوں میں بھی موجود تھا۔ اگر یہ کوئی تاوان وغیرہ کا چکر ہوتا تو اب تک ثروت یا فاروقی صاحب سے رابطہ کیا جا چکا ہوتا مگر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر جاوا جیسے امیر کبیر بدمعاش کو یوسف

سے تاوان لینے کیا ضرورت تھی؟ مجھے رہ رہ کر وہ منظر یاد آتا تھا جب شار بہ بائی کے ساتھ موٹی سفید آنکھوں والا شخص یوسف کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ وہ یوسف کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ جیسے کسی شاندار نسل کے گھوڑے یا کسی اور پالتو جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ پسند کیا جاتا ہے۔

دن کے تقریباً بارہ بجے تھے جب کرولا احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ سے اوجھل ہوئی۔ ثروت نے فوراً فون کیا لیکن اب وہاں ایک اور مصیبت منتظر تھی۔ احمد تھانوی صاحب کے مرید خاص فرید نے بتایا۔ ”حضرت صاحب تو چلے گئے ہیں۔“

”کہاں؟“ ثروت نے گھبرا کر پوچھا۔

”شہر سے باہر گئے ہیں کسی کام سے۔“

”کب تک آئیں گے؟“

”اب تو کل ہی آنا ہوگا۔ نو بجے کے قریب۔“ سیل فون کے سپیکر سے آواز اُبھری۔

”او گاڈ۔“ ثروت سٹپٹا گئی۔ ”ان کا سیل نمبر ہے؟“

”بی بی! آپ کو پتا ہوگا، حضرت موبائل وغیرہ نہیں رکھتے۔“

ثروت نے فون بند کیا اور ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اب ہمیں کل تک انتظار کرنا تھا۔ اس گرجتے برستے موسم میں ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور ہوٹل میں ہی ایک کمرا لے لیا۔ میں نے ثروت سے کہا۔ ”کمرا تم استعمال کرنا۔ میں لابی میں وقت گزار لوں گا۔“

”آپ...... دو کمرے لے لیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔

ہمارے عقب میں ایک میز پر تین نوجوان اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ پودینے کی چٹنی لگا کر گرم پکوڑے کھا رہے تھے ایک نے کہا۔ ”یار! میں نے اسے کار میں چڑھتے دیکھا ہے۔ صرف پندرہ بیس فٹ کے فاصلے سے۔ یہ وہی تھی...... کرشمہ کپور۔ اس کے ساتھ کوئی فلم ڈائریکٹر قسم کا بندہ تھا۔“

دوسرا بولا۔ ”یہ بات ماننے والی نہیں۔ اتنی بڑی بھارتی فلم اسٹار اور ہمارے اس چھوٹے سے شہر میں۔ یہاں اس نے گھاس چرنے آنا تھا۔“

تیسرا بولا۔ ”یار! شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ فلم اسٹار سے ملتی جلتی ہو یا پھر......“ وہ کہتے کہتے رُک گیا اور ذرا توقف سے بولا۔ ”ویسے اس طرح بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی جگہ چوری چھپے شوٹنگ کے لیے آجاتے ہیں۔“

میں ان کی باتیں سنتا رہا پھر ہم اُٹھ کر دوسری منزل پر آ گئے۔ ہم نے یہاں لابی میں ہی کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر رم جھم جاری تھی۔ اسی دوران میں نصرت کا بھی فون آ گیا۔ صورتِ حال جو بھی تھی، نصرت اس بات پر اندر سے بہت خوش تھی کہ میں اور ثروت ساتھ ہیں اور اگلے ایک دو دن ساتھ ہی رہیں گے۔ ہوٹل کی لابی میں ٹی وی موجود تھا۔ میں ٹی وی دیکھنے لگا۔ ثروت آرام کرنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ دروازہ اندر سے بند رکھے۔ وہیں صوفے پر لیٹے لیٹے مجھے نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو گہرا اندھیرا چھا چکا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی اور بارش بھی جاری تھی۔ ہوٹل کی بجلی چلی گئی تھی۔ مختلف جگہوں پر موم بتیاں روشن تھیں۔ میں نے لیٹے لیٹے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گھڑی سے پھسل کر میری نظر سامنے گئی اور میں سکتہ زدہ لیٹا رہ گیا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر وہی انڈین اداکارہ کرشمہ کپور کی ہم شکل لڑکی نیتو موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسٹک تھی اور وہ رُک رُک کر قدم اُٹھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند شخص تھا۔ اس شخص کو آج دوپہر بھی میں نے دیکھا تھا۔ نیتو نے اپنا نصف سے زائد چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ دونوں ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ شاید وہاں کھڑے ہو کر بارش کا نظارہ کرنا چاہتے تھے۔

شکر کا مقام تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ یہ بات عیاں تھی کہ یہ لوگ بھی شب بسری کے لیے اسی ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں لابی چھوڑ دوں اور کمرے میں چلا جاؤں لیکن وہاں ثروت تھی اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کمرے میں اس کا حصے دار بنوں۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ مجھے ثروت اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ ذرا پریشان تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ڈرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرے ساتھ کمرے میں آئیں۔ وہاں کچھ ہے۔“

”کیا ہے؟“

”آئیں نا۔“ اس نے تیز سرگوشی کی۔ میں خود بھی لابی میں مزید رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ یہاں بھی شمع روشن تھی۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔

”مجھے آواز آ رہی ہے...... کھرچ کھرچ کی...... اس الماری کے پیچھے سے۔“ اس نے انگلی اُٹھائی۔

میں کان لگا کر سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے بھی آواز آئی۔ کوئی جیسے لکڑی کو اپنے دانتوں

سے کاٹ رہا تھا اور پنجوں سے کھرچ رہا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ یہ کوئی چوہا ہے۔ ثروت نے ہراساں آواز میں کہا۔ ''میں یہاں نہیں رہوں گی۔ کوئی دوسرا کمرا خالی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم لابی میں رات گزار لیں گے۔'' وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی اس کا نسوانی خوف اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

''نہیں ثروت!'' میں نے اسے روکا۔ ''ہم باہر نہیں جا سکتے۔ وہی دوپہر والے لوگ اب یہاں ہوٹل میں آ گئے ہیں۔'' میں نے ثروت کو تفصیل بتائی۔ وہ اور پریشان ہو گئی۔

باہر کا خوف اندر کے خوف سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ میں نے ثروت کو صوفے پر بٹھایا اور خود الماری کے پیچھے تاک جھانک شروع کی۔ سیل فون کی ٹارچ سے احتیاط کے ساتھ ہر طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نظر نہیں آیا لیکن اسی دوران میں پھر کھرچنے کی سی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کسی نکیلی شے سے لکڑی وغیرہ کو کریدا جا رہا ہو۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز کمرے کے اندر سے نہیں، باہر سے آ رہی ہے۔ شاید کوئی دیوار کے ساتھ موجود تھا۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس کی چٹخنی بغیر آواز پیدا کیے اُتاری اور تیزی سے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ کوئی حرکت سی محسوس ہوئی جیسے کوئی شے پرچھائیں تیزی سے دائیں طرف اوجھل ہو گئی ہو۔

''کچھ نظر نہیں آیا؟'' ثروت نے پوچھا۔

ہیں...... کچھ بھی نہیں...... مجھے تو لگتا ہے کوئی بلی وغیرہ ہو گی۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر ہم موم بتی کی روشنی میں بیٹھے رہے۔ ثروت بولی۔ ''میں اِدھر بیڈ پر نہیں لیٹوں گی۔ آپ نے لیٹنا ہے تو لیٹ جائیں۔ میں یہاں صوفے پر ٹھیک ہوں۔''

''لیکن کھانا؟''

''مجھے تو بالکل بھی بھوک نہیں، آپ نے کھانا ہے تو یہیں منگوا لیں۔''

''نہیں...... بھوک تو مجھے بھی نہیں۔'' میں نے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ صوفے پر لیٹ گئی۔ آواز دوبارہ نہیں آئی لیکن مجھے یقین تھا کہ ثروت کے کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔ بارش کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ ثروت کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس ہوٹل میں ہمارے ساتھ کون لوگ موجود ہیں۔ یہ سفاک مجرم اور خطرناک قاتل تھے۔ یوسف کی گمشدگی سے بھی ان کا تعلق مسلمہ تھا۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرک رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس بند کمرے میں اپنی اور ثروت کی موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگا۔ دل چاہا کہ اس سے کوئی بات کروں۔ اس سے کہوں۔ ''ثروت! تم اتنے عرصے سے شادی شدہ ہو کر بھی شادی شدہ نہیں ہو۔ تمہارے شوہر نے سارے اختیارات رکھنے کے باوجود ابھی تک

تمہیں چھوا تک نہیں۔ کیا یہ قدرت کی طرف سے کوئی اشارہ ہے؟ کوئی کرشماتی رعایت ہے؟'' میں کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔ بس آنکھیں بند کیے سوچتا رہا۔ دفعتاً مجھے لگا کہ ثروت صوفے سے اُٹھی ہے۔ وہ تیزی سے آئی اور میرے بازو کے ساتھ چمٹ سی گئی۔ ''تابش! وہاں کوئی ہے۔ میں نے کھڑکی میں سایہ دیکھا ہے۔ وہ اندر جھانک رہا تھا۔'' وہ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''میں نے صاف دیکھا ہے تابش۔''

میں نے پھونک مار کر شمع بجھا دی اور پتلون کی بیلٹ سے بھرا ہوا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ میں اور ثروت وہاں پر ساکت و جامد بیٹھے رہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی آس پاس ہے لیکن کھڑکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ثروت اسی طرح میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ اس نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے گھنے نرم بالوں کی مہک میرے حواس میں سرایت کر رہی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کھڑکی کے آس پاس کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔ دھیرے دھیرے میرے بازو پر ثروت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، تاہم وہ اسی طرح میرے ساتھ لگی بیٹھی رہی۔ غیر یقینی حالات اسے مجھ سے دور ہونے نہیں دے رہے تھے۔ اس کا سر میرے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا کہ شاید وہ اونگھنے لگی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور اس کا ثبوت مجھے اس نمی کی صورت میں ملا۔ یہ نمی میں نے اپنے کندھے پر محسوس کی۔ یہ ثروت کی آنکھ کا پانی تھا۔ یہ ''میری'' ثروت کی آنکھ کا پانی تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے رو رہی تھی۔ باہر ہونے والی بے آواز بارش کی طرح۔

میں نے کولٹ پسٹل کو بائیں ہاتھ میں لیا اور دائیں ہاتھ سے ثروت کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''ثروت!'' میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

وہ سسکنے لگی۔ مجھے لگا کہ چار پانچ برس کی جدائی کے بعد وہ آج پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ اپنا دُکھ مجھے بتا رہی ہے۔

O......❖......O

میں نے اسے بہت کم روتے دیکھا تھا لیکن آج وہ رو رہی تھی۔ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔ یہ ''بے آواز رونا'' تھا تاہم اس کی شدت میں بآسانی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر مجھے لگا کہ اس وقت خاموشی ہی سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس نے بھی تو خاموشی کو ہی زبان بنایا ہوا تھا۔ اور یہ خاموشی واقعی فصیح و بلیغ زبان بن گئی تھی۔ ایک ایک زخم دکھا رہی تھی۔ ایک ایک دُکھ بیان کر رہی تھی۔ کب بچھڑے؟ کیا کیا گزری؟ کیسے امیدوں اور آسوں نے دامن

پکڑے رکھا، پھر کب زہر کے گھونٹ بھرنے پڑے، کب ہاتھوں پر مہندی رچی، کب شہنائی بجی اور کیونکر صبح وشام راہ دیکھنے والی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے پابند کرنا پڑا۔

اس کے خاموش آنسو ایک ایک بات بیان کر رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ وہ جیسے کہہ رہی تھی۔ ''آپ پر تو مجھے بڑا مان تھا تابش! میں سمجھتی تھی کہ آپ مجھے چھوڑ نہیں سکتے، دل میں یہ آس پلتی تھی کہ آپ مجھے کہیں چھپنے نہیں دیں گے۔ آپ مجھے ڈھونڈ لیں گے، شاید چھپی ہی اس لیے تھی کہ آپ مجھے تلاش کر لیں، ہر رکاوٹ عبور کر کے مجھ تک پہنچ جائیں۔ بڑا بھروسہ تھا آپ کی محبت پر۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنے کے لیے دن گنتے ہیں۔ ہم نے تو پل گنے تھے، لمحے شمار کیے تھے تابش! ایک دوسرے کے بغیر جینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا ہمارے ہاں...... پھر کیوں ہو گیا ایسا؟ اتنی آسانی سے آپ دستبردار ہو گئے مجھ سے۔ مجھے غیروں کو سونپ دیا......''

وہ سسکتی رہی اور خاموشی کی زبان بولتی رہی۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ثروت! تمہیں تھوڑا بہت تو پتا چل ہی چکا ہے کہ میرے ساتھ کیا گزری۔ وہ ایسے واقعات تھے جن پر میرا کوئی بس نہیں تھا۔ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ بھانڈیل اسٹیٹ اردگرد کی دنیا سے بالکل کٹی ہوئی جگہ تھی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو شاید میں اس جگہ سے نکل نہ سکتا۔ میں اپنے ہوش وحواس میں ہی نہیں تھا۔ نصرت نے تمہیں تھوڑا بہت بتایا تو ہوگا۔''

وہ خاموش رہی، بس اشک بہاتی رہی۔

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''امی کھڑکی سے نیچے گری تھیں اور شاید گرتے ہی ختم ہو گئی تھیں۔ میں انہیں دیکھنے کے لیے اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میں سیڑھیوں سے گرا تھا اور میرے سر پر بڑی سخت چوٹ آئی تھی۔ ثروت! اس چوٹ نے مجھے اگلے تقریباً دو ڈھائی سال تک اپنے اردگرد سے بالکل بیگانہ رکھا۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا، میں کون ہوں، کہاں ہوں۔ کچھ انجان لوگ میری دیکھ بھال کرتے تھے لیکن وہ انجان لوگ بتاتے ہیں کہ اس حالت میں بھی میں تمہارا نام پکارتا تھا۔ راتوں کو اُٹھ کر جنگل کی طرف بھاگتا تھا۔ تم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ مجھے پکڑ کر لاتے۔ مجھے حفاظت اور نگرانی میں رکھتے لیکن موقع ملتے ہی میں پھر نکل جاتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب میری یادداشت بحال ہو گئی۔ میری بے قراریاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ یہ غم مجھے دن رات ذبح کرنے لگا کہ ڈھائی تین سال پہلے میں تمہیں کس حال میں چھوڑ کر آیا تھا۔ میں وہاں سے کیسے اور

کیونکر نکل پایا، یہ ایک طویل داستان ہے ثروت! پاکستان پہنچتے ہی میں نے پوری شدت سے تمہاری تلاش شروع کر دی۔ میں جانتا تھا کہ تم نے جرمنی میں میرا بہت انتظار کیا ہوگا، میری بہت راہ دیکھی ہوگی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ تم کہاں اور کس حال میں ہو اور پھر ایک روز احمد تھانوی صاحب کے گھر پر مجھے نصرت نظر آئی۔ اس کے بعد کے واقعات تم جانتی ہی ہو۔''

نہایت بوجھل دل کے ساتھ میں خاموش ہو گیا۔

ہم کئی منٹ تک اسی طرح گم صم بیٹھے رہے۔ اب اس نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا اور ذرا پیچھے ہٹ گئی تھی، تاہم اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ ڈرا سہا ہوا سرد لمس۔

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''تابش! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ شاید یہ ہمارا مقدر تھا اور آدمی مقدر سے تو نہیں لڑ سکتا نا۔ اب...... میری زندگی یوسف سے جڑی ہوئی ہے۔ اب...... وہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں ایک بیوی کے ناتے اپنا ہر فرض نبھانا چاہتی ہوں تابش! میں ان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ اگر...... خدانخواستہ کسی نے انہیں تاوان کے لیے اغوا کیا ہے تو میں اپنا سب کچھ...... سب کچھ بیچ کر انہیں بچانا چاہوں گی۔ میں نے......''

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی اور پھر سسکنے لگی۔

میں نے تسلی بخش انداز میں اس کا ہاتھ دبایا۔ ''تم حوصلہ رکھو ثروت! یوسف ملے گا اور ضرور ملے گا۔ ہم اسے ڈھونڈنے کے لیے ہر حد تک جائیں گے۔''

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''ان کی کسی سے دشمنی نہیں۔ لین دین کے معاملے میں بھی وہ بالکل فیئر ہیں۔ چھوٹی موٹی خامیاں کس بندے میں نہیں ہوتیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان میں بھی تھیں مگر اب انہوں نے بہت حد تک ان پر قابو پا لیا ہے۔ بہت بدل گئے ہیں وہ...... جرمن بیوی سے بھی ان کا تعلق تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس نے ان سے ''ڈائی وورس'' مانگی تھی۔ وہ ڈائی وورس کے پیپر تیار کروا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ شک بھی ہوتا ہے کہ کہیں یہ وہی ڈائی وورس والا معاملہ نہ ہو۔ میرا مطلب ہے......''

''نہیں ثروت! یہ کوئی مقامی چکر ہے۔''

''مقامی کیا ہو سکتا ہے تابش! وہ بالکل صاف سیدھی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی کوئی مصروفیت ہم سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ صبح دفتر جانا اور شام کے فوراً بعد واپس آ جانا۔ اس کے بعد اگر کوئی تفریح ہوتی بھی تھی تو ہمارے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ پچھلے کچھ ہفتوں سے ہمارے درمیان تھوڑی سی ناراضگی چل رہی تھی۔ میں ان کے ساتھ کہیں آ جا نہیں رہی تھی۔ میں نہیں جاتی تھی تو وہ بھی نہیں جاتے تھے۔''

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہے۔ ٹین ایجر جرمن بیوی کے بعد یوسف نے ''تفریح'' کے کچھ اور راستے ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ منہ مانگی قیمت دے کر اپنی راتیں رنگین کر رہا تھا اور اس کی یہ گمشدگی بھی انہیں ''مصروفیات'' کا شاخسانہ ہے۔

میں نے بس اتنا کہا۔ ''ثروت! میرے حوالے سے اپنے دل میں کوئی شک نہ رکھنا۔ نصرت جو کچھ کہا کرتی ہے وہ صرف اس کے اپنے خیالات ہیں۔ میں اسے کئی بار سختی سے منع بھی کر چکا ہوں لیکن تم جانتی ہو کہ وہ بچپن سے ضدی ہے۔'' میری آواز دُکھ سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ منمنائی۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! میں سچے دل سے کہتا ہوں، اگر تم مجھے مل جاتیں تو میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا۔ لیکن اگر تم میری قسمت میں نہیں ہو تو پھر بھی میں اپنے رب کی مرضی پر راضی ہوں۔ کسی کو خاموشی سے چاہتے رہنا کوئی گناہ نہیں۔ لوگ اسے گناہ کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ میں یہ ''گناہ'' اب بھی کر رہا ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔ میں جب...... مر جاؤں گا ثروت...... تو مجھے...... غور سے دیکھنا...... میرے ہونٹوں پر غور سے دیکھنا...... تمہیں وہاں اپنا نام لکھا ہوا ملے گا۔ وہ کسی کو نظر آئے یا نہ آئے لیکن اگر تم نے دیکھا تو تمہیں ضرور نظر آئے گا۔ میں سچی محبت کے اس لفظ کو قبر میں بھی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

جذبات کے سبب میرا گلا رُندھ گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں آنکھیں نم نہ ہو جائیں، میں خاموش ہو گیا۔

اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، بس ساکت بیٹھی رہی۔ اچانک میں ٹھٹک گیا...... مجھے کھڑکی سے باہر پھر کوئی حرکت محسوس ہوئی تھی۔ ثروت نے سر جھکا رکھا تھا اس لیے وہ اس حرکت کو دیکھ نہیں پائی۔ میں نے ہولے سے اپنا ہاتھ ثروت کے ہاتھ سے الگ کیا۔ کولٹ پسٹل کو اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں میں منتقل کیا اور جسم کو حرکت دی۔ ثروت بُری طرح چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر میرا بازو جکڑ لیا۔ میں نے بہ آہستگی بازو چھڑایا اور اندھیرے میں جھک کر چلتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔

پچھلی دفعہ میں نے کھڑکی کی چٹخنی اس طرح لگائی تھی کہ وہ آسانی سے کھل سکے۔ میں نے چٹخنی پر ہاتھ رکھا۔ باہر یقیناً کوئی موجود تھا۔ میں نے ایک بار پھر ثروت کو خاموش رہنے کا

اشارہ کیا۔ پھر تیزی سے چٹخنی گرائی۔ پٹ کھولا۔ کھڑکی کے عین نیچے کوئی موجود تھا۔ وہ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پچھلی بار کی طرح تڑپ کر نگاہ سے اوجھل ہو جاتا، میں نے پھرتی سے اس کی توانا گردن دبوچ لی۔ پسٹل صوفے پر گرا کر میں نے اس کا منہ بھی دبوچ لیا تھا۔ ایک ہی زوردار جھٹکے سے میں نے اسے کھینچ کر کمرے میں کر لیا اور ٹانگ کی مدد سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ ثروت کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ سخت خوف زدہ تھی۔ مدِمقابل میں خاصی طاقت تھی، وہ خود کو چھڑانے کی اندھادھند کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک میلی کچیلی شلوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گلے میں منکوں کا ہار سا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح شور مچا سکے لیکن اس کے ہونٹوں پر میں نے بڑی مضبوطی سے ہتھیلی جما رکھی تھی۔ میرے کہنے پر ثروت نے میرے سیل فون کی ٹارچ روشن کی اور اس کو نووارد کے چہرے پر فوکس کیا۔ وہ بیس بائیس برس کا ہٹا کٹا سائیں نما لڑکا تھا۔ سر منڈا ہوا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''شور مچاؤ گے تو اسی طرح تمہارا سانس روک کر تمہیں مار ڈالوں گا۔ چپ رہو گے تو کچھ نہیں کہوں گا۔''

اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ میری مزاحمت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی حتمی نتیجے تک پہنچتے پہنچتے اس نے دو تین منٹ لگا دیئے۔ اس کی مزاحمت ختم ہوئی تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا جسے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو رہا تھا۔ ثروت بھی ایک گوشے میں سمٹی ہوئی حیرت سے اس میلے کچیلے ملنگ نما لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے عجیب انداز میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور ہمیں ڈرانے والے انداز میں بولا۔ ''چلے جاؤ یہاں سے...... واپس چلے جاؤ...... نہیں تو بڑا پچھتاؤ گے...... تمہارے پیچھے کالے سائے ہیں۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ وہ تمہیں کھا جائیں گے۔ تمہاری قبریں بھی نہیں بنیں گی۔ لاش ہی نہ ہو تو قبر کیسے بنتی ہے۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

وہ منہ سے رال بہاتے ہوئے بولا۔ ''میں جن زاد ہوں۔ میں اوپر ہوا میں اُڑتا ہوں۔ وہاں سے سب کچھ دیکھتا ہوں۔ مجھے سب نظر آتا ہے۔ تم دونوں غلط جگہ آ گئے ہو۔ یہاں کالے سائے تمہیں گھیریں گے۔ تمہاری قبریں بھی نہیں بنیں گی۔''

ثروت نے ہکلائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ شاید احمد صاحب (پیر احمد تھانوی) کی کوٹھی پر......''

وہ ثروت کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”سارا بکھیڑا تیرا ہے۔ پہلے پکڑی بھی تُو جائے گی۔ جیسے وڈے پیر صاحب پکڑے گئے۔ وہ تو شاید واپس آ جائیں گے پر تُو نہیں آ سکے گی۔ سات کنوؤں کا پانی پیا ہے انہوں نے۔ تُو نے تو ایک کا بھی نہیں پیا۔“

”بڑے پیر صاحب کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جن کے پاس تم کل اپنی لوڑ (ضرورت) کا پیالا لے کر گئے تھے۔ نہیں...... نہیں لوڑ کا دیگچا۔ نہیں نہیں لوڑ کی دیگ...... بہت وڈی دیگ...... اس دیگ کو کوئی نہیں بھر سکتا۔ شاید وڈے پیر صاحب بھی نہیں۔“

اس سائیں نما لڑکے کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ شاید اس کا تعلق کسی طور پیر احمد تھانوی صاحب سے ہے۔ لیکن میں نے اسے کبھی تھانوی صاحب کے آستانے پر نہیں دیکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق یہاں ہارون آباد سے ہی ہو اور وہ ایک آدھ بار لاہور گیا ہو جہاں ثروت نے اسے دیکھا ہو۔

وہ عجیب اُلجھی ہوئی سی باتیں کر رہا تھا۔ ہم کچھ پوچھتے، وہ جواب کچھ دیتا۔ پھر اس نے ایک دم رٹا ڈال دیا کہ وہ دودھ جلیبیاں کھانا چاہتا ہے اور اگر ہم نے اسے دودھ جلیبیاں نہیں کھلائیں تو وہ کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دے گا اور اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔

ہم نے اسے بمشکل سنبھالا۔ ثروت نے اپنے شولڈر بیگ میں سے چاکلیٹ نکال کر اسے دی۔ کافی بڑی چاکلیٹ تھی، وہ ایک ہی بار منہ میں ڈال کر ہڑپ کر گیا۔ میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح کی اداکاری تو نہیں کر رہا۔ بظاہر اس کے آثار نہیں تھے یا پھر وہ بہت اچھا اداکار تھا۔ پہلی بات ہی درست لگتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اعلان کیا کہ اسے پیشاب آ گیا ہے اور اتنے زور سے جتنے زور سے چناب میں پانی آتا ہے۔ میں نے اسے کمرے کے اٹیچ باتھ روم کا راستہ دکھایا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بند جگہ پر پیشاب نہیں کر سکتا اور اس کے لیے فی الوقت کھلی جگہ یہ کمرا ہی تھی۔

جب مجھے لگا کہ وہ سچ مچ یہاں پیشاب کر دے گا تو میں اسے کھڑکی میں سے گزار کر باہر لے آیا۔ یہاں کافی کشادہ بالکونی تھی۔ میں نے کہا۔ ”یہاں کر لو پیشاب۔“

وہ نیم آمادہ نظر آیا۔ لیکن پھر ایک دم اس نے مجھے دھکا دیا اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے اس کے پیچھے لپک کر اسے دوبارہ دبوچنا چاہا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ یقیناً ہوٹل میں شور شرابا ہو جاتا اور یہاں آج رات کچھ ایسے لوگ ہمارے ساتھ مقیم تھے جن کے سامنے میں ہرگز آنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ بھاگتا ہوا پتا نہیں کس جانب اوجھل ہو گیا۔

میں واپس کمرے میں آ گیا۔ کھڑکی کو اچھی طرح اندر سے بند کر دیا۔ کھڑکی سے باہر کی طرف دیوار پر آڑی ترچھی لکیریں تھیں جو کسی نکیلے پتھر سے کھینچی گئی تھیں۔ انہیں کھینچنے والا یہ سائیں لڑکا ہی تھا۔ کھرچ کھرچ کی آواز ان ناقابلِ فہم لکیروں کی ہی تھی۔ ثروت نے موم بتی دوبارہ روشن کر دی تھی۔ ہم اس اول جلول سائیں کی آمد پر حیران تھے۔ اس نے جو باتیں کہی تھیں، ان میں سے کچھ تشویش ناک بھی تھیں اور ہمیں سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس نے کالی پرچھائیوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ بے شک ہمارے اردگرد موجود تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں سائیں کا تکا لگ گیا ہو۔ [illegible] تھانوی صاحب کے بارے میں بھی کچھ پُرتشویش باتیں کر رہا تھا۔ [illegible] پیر صاحب [illegible] سکتے ہیں۔ پتا نہیں کہ اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا۔ پیر صاحب واقعی اپنی رہائش پر موجود نہیں تھے۔

ثروت صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ سائیں کی آمد سے پہلے میرے اور اس کے درمیان جو [illegible] ہوئی تھی، اس کے اثرات ابھی تک اس کے چہرے پر موجود تھے۔ آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ بہرحال اب ہمارے خیالات کا دھارا دوسری طرف مڑ چکا تھا۔ اس بات کا پتا تو کل صبح ہی چل سکتا تھا کہ احمد تھانوی صاحب کہاں ہیں اور کب تک واپس پلٹیں گے۔

سائیں کی باتوں سے یہ شک بھی ہو رہا تھا کہ شاید اس نے ہمیں کل دوپہر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ کے آس پاس دیکھا ہے اور وہیں سے ہمارے پیچھے لگ کر یہاں ہوٹل میں پہنچ گیا ہے۔ ہم نے طے کیا کہ کل نو بجے کے بعد پہلے فون پر احمد تھانوی صاحب سے رابطہ کریں گے۔ اس کے بعد ہی ان کی طرف جانے کے لیے نکلیں گے۔

بارش شاید تھم چکی تھی مگر ہلکے بادل بدستور موجود تھے۔ رات آخری پہر ثروت صوفے پر نیم دراز اونگھنے لگی۔ مجھے بھی کچھ دیر کے لیے اونگھ آ گئی۔ جسمانی اور اعصابی تھکاوٹ اتنی زیادہ تھی کہ میں سو گیا۔ جب جاگا تو دن چڑھ آیا تھا۔ بڑا چمکیلا اور روشن دن تھا۔ رات کو جب میں سائیں کو بالکونی میں لے کر گیا تو میری قمیص گیلی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے کرسی پر پھیلا دیا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ ثروت اسے دھو کر استری کر رہی تھی۔ استری اس نے بیرے سے منگوائی تھی۔ اسے یوں اپنی قمیص استری کرتے دیکھ کر ایک بھولا بسرا منظر نگاہوں میں تازہ ہو گیا۔ ہم سب کتنے خوش تھے ان دنوں۔ عید کا موقع تھا۔ بڑے ماموں کے گھر عید ملن پارٹی تھی۔ خاندان کے بہت سے لڑکے لڑکیاں بھی جمع تھے۔ خوب سجے سنورے ہوئے تھے۔

چھت پر ٹہلتے ہوئے میں نے ثروت سے کہا تھا۔ ''کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ تم میرے کپڑے استری کرو۔ میرے سامنے انہیں استری کر کے ہینگر پر لٹکاؤ۔''

وہ بولی۔ ''شادی کے بعد...... شادی سے پہلے ہرگز نہیں۔''

میں نے تلملائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ ہر کام شادی کے بعد...... ہر کام شادی کے بعد۔ بھئی یہ چھوٹے چھوٹے بے ضرر کام تو شادی سے پہلے ہو ہی سکتے ہیں اور لوگ کرتے بھی ہیں یار۔''

''آپ کے جو چھوٹے چھوٹے کام ہیں نا، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''اچھا استری کرنے سے تو تمہاری شرم وحیاء پر کوئی آفت نہیں آجائے گی۔ یہ تو بالکل ہی چھوٹا سا کام ہے لیکن اس سے مجھے جو خوشی ہوگی وہ بہت بڑی ہوگی۔''

''اس بڑی خوشی کو شادی کے بعد کے لیے سنبھال کر رکھ لیں نا...... اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔''

''یعنی تم استری نہیں کرو گی؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ ادا سے بولی۔

''میں ابھی نہ کرواؤں تو میرا نام نہیں۔'' میں نے کہا۔ وہاں پاس ہی چھوٹی ممانی کا شولڈر بیگ پڑا تھا۔ میں نے بیگ میں سے ہلکے سرخ شیڈ والی لپ اسٹک نکالی۔ اسے انگلی پر لگایا اور قمیص پر سینے کی طرف ہونٹوں کا نشان سا بنا دیا۔ پھر ایک مدھم سا نشان کندھے کی طرف بھی بنا دیا۔ ''اس کو کہتے ہیں بلیک میلنگ۔'' میں نے وضاحت کی تھی۔ ''اب میں اسی قمیص کے ساتھ سب میں گھوموں پھروں گا۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جان جائیں گے کہ یہ نشان کیسے ہیں اور ان کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ اب اندازہ لگا لو کہ تمہارے بارے میں کیا کیا سوچا جائے گا۔ لو میں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

ثروت نے جلدی سے میرا بازو پکڑ لیا تھا۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ثروت نے چھت پر ہی مجھے ایک کزن کی قمیص لا کر دی تھی جو میں نے پہنی تھی۔ اس نے میری قمیص کے داغ دھوئے تھے اور پھر اسے استری بھی کیا تھا۔

آج اسے اپنی قمیص پر استری پھیرتے دیکھ کر وہ سارا خوبصورت منظر تصور کے پردے پر ابھر آیا۔

''ناشتے میں کیا منگوائیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جو آپ کا جی چاہے۔ مجھے تو زیادہ بھوک نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''بھوک کیوں نہیں؟ رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اپنے لیے نہیں تو یوسف کے لیے کچھ کھاؤ۔ جسم میں طاقت ہوگی تو اس کے لیے کچھ کر سکیں گے نا۔''

میں نے بذریعہ انٹرکام کمرے کے اندر ہی ناشتہ منگوایا۔ ڈبل روٹی، جیم، انڈے، دودھ اور چائے سبھی کچھ شامل تھا۔ گاہے بگاہے، میں دروازے کی جھری میں سے باہر لابی کا جائزہ بھی لے لیتا تھا۔ ابھی تک کرشمہ کپور ثانی یا اس کے کسی ساتھی کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق کرشمہ کپور ایک کمرے میں تھی۔ اس کے دو یا تین ساتھی دوسرے کمرے میں تھے۔ نیچے ان کی سیاہ کرولا گاڑی بھی کھڑی تھی۔ اس پر بہاولپور کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

ناشتے کے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب ثروت نے اپنے سیل فون سے احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ پر فون کیا۔ فرید نامی ملازم خاص سے ہی بات ہوئی۔ اس نے بتایا۔ ''پیر صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔ شاید ان کی واپسی میں کچھ دیر ہو جائے گی۔''

''کیا مطلب آپ کا؟'' ثروت پریشان ہو کر بولی۔ ''ہم ان کے لیے لاہور سے آئے ہیں۔ یہاں ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ دوپہر تک ہمیں کمرا چھوڑنا ہے۔''

فرید نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ حضرت صاحب بھی بندہ بشر ہیں...... کوئی کام پڑ سکتا ہے بندے کو۔''

''تو پھر کیا کریں جی...... اب کتنے بجے تک فون کریں؟''

''کتنے بجے کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ شام کو دوبارہ ٹرائی کر لو...... خدا حافظ۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

گفتگو کے دوران میں ثروت نے سیل فون کا اسپیکر آن رکھا تھا۔ مجھے فرید احمد کی آواز میں پریشانی اور عجلت صاف محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خود بھی تھانوی صاحب کی واپسی میں تاخیر کے حوالے سے پریشان ہے۔

رات والے سائیں لڑکے کی رمزیہ گفتگو ایک بار پھر ہمارے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے تھانوی صاحب کو وڈے پیر کہا تھا اور ان کے حوالے سے کچھ اُلجھی ہوئی باتیں کہی تھیں۔ رات والے واقعے کے بعد وہ ننگ دھڑنگ دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔

ثروت پریشان لہجے میں بولی۔ ''جہاں تک میں جانتی ہوں حضرت صاحب کہیں بھی ہوں، کتنے بھی مصروف ہوں، اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لیے وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر وہ

آج نہیں آئے تو کوئی خاص وجہ ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں ثروت۔''

وہ گم صم ہوگئی۔ اسے تھانوی صاحب سے بڑی امید تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ یہاں یوسف کا کھوج لگانے میں ہماری خاطر خواہ مدد کریں گے اور مقامی پولیس بھی ہر طرح ہمارے ساتھ تعاون کرے گی۔ مگر یہاں یہ ماجرا ہوا تھا کہ حضرت صاحب خود ہی کہیں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہمیں یہاں ہارون آباد آئے اب چوبیس گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے لیکن ابھی تک حضرت صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوسکی تھی۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کی جھری میں سے دیکھا اور چونک گیا۔ مجھے کرشمہ کپور اور اس کا ایک ساتھی لابی میں نظر آئے۔ کرشمہ کپور حسب سابق لمبی چادر میں تھی اور اس چادر میں سے اس کی آنکھیں اور تھوڑی سی پیشانی ہی نظر آتی تھی۔ غالباً اپنی آنکھوں کو کرشمہ کپور کی آنکھوں سے ملانے کے لیے وہ نیلے لینس لگاتی تھی۔ یا اسے لگائے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ کچھ لاغر اور پژمردہ نظر آئی تھی۔ اس کے ساتھی نے اسے کوئی دوا لا کر دی، ساتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ کرشمہ کپور نے گولیاں منہ میں رکھ کر پانی پی لیا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی میں جا کر نیچے سڑک کی طرف دیکھا۔ گندمی رنگت والا ایک چوڑا چکلا شخص سیاہ کرولا کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ یہاں سے رخصت ہونے والے ہیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ان لوگوں کا پیچھا کرنے اور ان کا ٹھکانا جاننے کا یہ اچھا موقع تھا۔ درحقیقت میں رات کو ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر کل یہ لوگ روانہ ہوئے تو میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔

میں نے یہ بات ثروت سے کہی تو وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی اور بولی۔ ''تو میں یہاں اکیلی رہوں گی۔''

وہ بھول رہی تھی کہ وہ یہاں اکیلی ہی آنا چاہ رہی تھی۔ بہرحال، اس کی یہ پریشانی مجھے اچھی لگی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ زیادہ دور جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ فقیر والی تک جائیں گے۔ میری واپسی ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہو جائے گی۔ ویسے بھی میں موبائل پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔''

''لیکن یہ لوگ ہیں کون؟'' وہ جزبز ہو کر بولی۔

میں نے اس موقع پر مناسب سمجھا کہ ثروت کو تھوڑا بہت بتا دوں۔ ورنہ وہ سمجھتی کہ میں یوسف والا معاملہ بیچ میں ہی چھوڑ کر اپنے کسی کام میں لگ گیا ہوں۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! مجھے شک ہو رہا ہے کہ میں نے ان میں سے ایک بندے کو ہسپتال میں یوسف کے اردگرد

دیکھا تھا۔ وہی چوڑی ناک والا سانولا سا شخص۔ اب وہ یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے ذرا اس بارے میں اپنا شک دور کر لینے دو۔'' میں نے بات بنائی تھی۔

''تو پھر...... مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ میں اکیلی یہاں کیا کروں گی؟''

''نہیں ثروت! یہ مناسب نہیں۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ ٹی وی دیکھو اور دروازہ بند رکھو۔ میں نے کہا ہے نا کہ میں فون پر رابطہ رکھتا ہوں۔''

میں ثروت کو بمشکل راضی کر سکا۔ غالباً اس کے ذہن میں رات والے واقعات تھے جب ننگ دھڑنگ سائیں ہمارے کمرے کے گرد منڈلاتا رہا تھا۔

نیتو عرف کرشمہ کپور نے اب سن گلاسز لگا لیے تھے۔ وہ شاید کمرے میں کوئی چیز بھول گئی تھی۔ اپنی جگہ سے اُٹھی اور اسٹک کے سہارے چلتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ چوڑی ناک والے شخص کا رُخ دوسری جانب تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ میں کمرے سے نکلا اور اس کی نظر بچاتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا۔ میں نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔ دھوپ کی عینک بھی لگائی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ اگر ان تینوں افراد میں سے کسی نے مجھے دیکھا بھی ہے تو آسانی سے نہیں پہچان سکے گا۔ ہوٹل سے کچھ فاصلے پر دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک اچھی حالت کی مہران ٹیکسی منتخب کی۔ اس کا ڈرائیور ایک بالکل دُبلا پتلا شخص تھا۔ پیشانی سے کافی سارے بال اُڑے ہوئے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے کیلے کھا رہا تھا اور عیسیٰ خیلوی کے گانے سن رہا تھا۔ میں ٹیکسی میں عقبی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ''کہاں جانا ہے صاحب جی؟'' وہ شیریں لہجے میں بولا۔

''فقیر والی۔ کتنے پیسے لو گے؟''

''آپ خوشی سے جو دے دیں گے جی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اگر تم نے مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو پھر تمہیں ناراض نہیں کروں گا لیکن ابھی تھوڑی دیر رُکنا ہے۔ ہوٹل سے میرے کچھ ساتھی بھی آ رہے ہیں۔''

''ہمارے ساتھ بیٹھیں گے۔'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''نہیں وہ پیچھے جو کالی کرولا کھڑی ہے، اس میں جائیں گے۔ ہمیں ان کے ساتھ ہی جانا ہے۔''

ڈرائیور نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس نے مجھے کیلوں کی پیشکش کی۔ میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز تھوڑی سی اونچی کر دی تاکہ میں بھی پوری طرح موسیقی سے فیضیاب ہو سکوں۔ عیسیٰ خیلوی کی آواز ٹیکسی میں گونجنے لگی۔ چپنے

نال چانی تارے نال لو ماہیا...... توں پھل موتیے دا، میں تیری خوشبو ماہیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجھے لگا جیسے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی میں سے ثروت مجھے دیکھ رہی ہے اور میرے لیے دعا گو ہے۔

حسبِ توقع چار پانچ منٹ بعد چادر میں لپٹی ہوئی کرشمہ کپور واکنگ اسٹک کے سہارے چلتی ہوئی گاڑی کی اگلی نشست پر آبیٹھی۔ چوڑی ناک والے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ باقی دونوں افراد پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میرے اشارے پر ڈرائیور نے ٹیکسی بھی آگے بڑھا دی۔

جلد ہی ہم اندرونی سڑکوں سے نکل کر ہائی وے پر پہنچ گئے۔ میں نے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔ ''تمہارا نام؟''

''محمد یاسر جی۔''

''تو یاسر بات یہ ہے کہ میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔ سمجھتے ہو نا خفیہ پولیس؟''

''جج...... جی ہاں......'' وہ ایک دم چونک کر بولا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تمہیں پورا کرایہ ملے گا۔ بلکہ انعام بھی دوں گا۔ ہمیں اس گاڑی کا پیچھا کرنا ہے اور پوری احتیاط کرنی ہے کہ انہیں شک نہ ہو۔''

''ٹھ...... ٹھیک ہے جی۔ یہ کوئی مجرم وغیرہ ہیں؟'' اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجرم تو نہیں...... ابھی ملزم ہیں۔''

''ہتھیار وغیرہ بھی ہو گا ان کے پاس؟'' وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ہمیں احتیاط سے چلنا ہے۔''

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر کی ناب گھما کر عیسیٰ خیلوی کا گلا دبا دیا۔

''اسے چلتا رہنے دو۔ ہم پولیس والے اتنے پکے مسلمان نہیں ہوتے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اگلے آدھ گھنٹے تک ہم نے احتیاط سے کالی کرولا کا تعاقب جاری رکھا۔ ہائی ویز پر گاڑیاں اکثر گھنٹوں تک ایک دوسرے کے پیچھے چلتی رہتی ہیں۔ یعنی اس طرح سے چلنا ایک معمول کی بات ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم نے احتیاط کی۔ کرولا سے اپنا فاصلہ برقرار رکھا اور کبھی

کبھی کسی دوسری گاڑی کو بھی ٹیکسی اور کرولا کے درمیان آنے دیا۔

میرا خیال تھا کہ کرولا فقیر والی کی طرف جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ فقیر والی سے کافی پہلے ہی بائیں طرف ایک کچے پکے راستے پر مڑ گئی۔ یہ تارکول کے بجائے اینٹوں کی سڑک تھی اور کہیں کہیں سے ناہموار بھی تھی۔ اب ہمیں کرولا سے اپنا فاصلہ مزید بڑھانا پڑا۔ ہم نے کرولا کو دیکھنے کے بجائے اس دھول پر نظر رکھی جو کرولا کے ٹائروں سے اُڑ رہی تھی۔ یہ سفر پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک گاؤں پر جا کر ختم ہوا۔ یہ خالص دیہی علاقہ تھا۔ گاؤں ذرا نشیب میں تھا۔ دور سے مسجد کے سفید مینار نظر آرہے تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر کسی حویلی کے برج تھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ شاید انگریزوں کے دور میں بنی تھی۔ میں نے ٹیکسی گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر درختوں کی اوٹ میں رکوا دی۔ ڈرائیور یاسر سے کہا کہ وہ انجن کا کوئی تار وغیرہ اُتار دے اور بونٹ کھلا رکھے۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو اسے بتائے کہ گاڑی خراب ہے اور سواری گاؤں میں گئی ہے۔

اس کو سب کچھ سمجھا کر میں جوی کے اونچے کھیتوں میں پگڈنڈی پر چلتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ اب میں نے پی کیپ اُتار لی تھی اور عینک بھی جیب میں ڈال لی تھی۔ کولٹ پسٹل کو جیب سے نکال کر میں نے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا اور اسے چھپانے کے لیے شرٹ پتلون سے باہر نکال لی۔ اسی دوران میں ثروت کا فون آگیا۔

''ہیلو...... کہاں ہیں آپ؟'' اس نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''جہاں بھی ہوں بالکل خیریت سے ہوں۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''پلیز اپنا خیال رکھیں۔''

''خیال ہی تو اپنے بس میں نہیں ہے۔''

''اچھا کب تک آجائیں گے؟''

''ابھی تو جا رہا ہوں بھئی۔ ڈونٹ وری۔ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔''

گفتگو ختم ہو گئی۔ میں جلد ہی گاؤں کی بیرونی حدود میں پہنچ گیا۔ یہاں سے حویلی کی ایک سائیڈ کی جھلک نظر آتی تھی۔ کچے اور نیم کچے مکانوں کے درمیان وہ کسی چٹان کی طرح کھڑی تھی۔ اس کی بیرونی دیواریں ٹانک چندی اینٹوں کی تھیں اور کافی موٹی تھیں۔ ایک طرف پرچون کی دکان نظر آرہی تھی۔ لکھا تھا۔ ''لطیف دی ہٹی......''

میں لطیف دی ہٹی یعنی لطیف کی دکان پر چلا گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے اندر کی طرف لکڑی کا ایک سٹول رکھا تھا۔ میں تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا اور دکاندار سے کہا۔ ''بھائی صاحب!

ٹھنڈا پلا دو۔ کوئی کوک شوک۔"

اس نے کسی مقامی فیکٹری کی بنی ہوئی "سوڈا واٹر" نکالی اور بولا "میرے پاس تو یہی ہے جی۔"

"چلو جی...... یہی چلے گی۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" لطیف نے پوچھا۔ وہ تیس پینتیس برس کا بھلا مانس سا شخص تھا۔ اس نے لٹھے کی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دکان میں ایک طرف گولیوں، ٹافیوں والے ڈبوں کے اوپر تہ کی ہوئی "جانماز" بھی رکھی تھی۔ وہ میرے لباس کو ذرا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہارون آباد سے آیا ہوں۔ وہاں ہمارے ایک پیرو مرشد ہیں احمد تھانوی صاحب، ان کے نیاز حاصل کرنے تھے لیکن وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کل ان سے مل کر لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ اب تھوڑا سا وقت تھا میں نے سوچا اِدھر کا چکر لگا لوں۔"

"اِدھر کیسے؟" لطیف نے پوچھا۔

"فقیر والی میں ہمارے ایک دوست ہیں اکبر مہر صاحب! انہوں نے بتایا تھا کہ یہاں بارڈر کے ساتھ ساتھ رقبے کافی سستے مل جاتے ہیں۔ فارم وغیرہ بنانے کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میں نے سوچا چلو تھوڑا سا سروے کر آؤں۔ ٹیکسی پر آیا۔ وہ اُدھر کھیتوں کے پاس خراب ہو گئی ہے۔ ڈرائیور ٹھیک کر رہا ہے۔"

لطیف کے چہرے پر عجیب سی چمک نمودار ہو چکی تھی۔ اس نے دکان کے پچھلے حصے سے ایک گدی والی کرسی نکالی اور تپاک سے بولا۔ "آپ سٹول پر نہیں اِدھر کرسی پر بیٹھیں جی! آپ تو ہمارے اپنے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے ایک بار پھر مجھ سے مصافحہ کیا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ ہمارے پیر بھائی ہیں۔ ہم بڑے پُرانے عقیدت مند ہیں حضرت صاحب کے۔" وہ پُر جوش انداز میں بولا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے آٹھ دس سالہ بیٹے کو پکارا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ لطیف بولا۔ "اپنے چاچا کو سلام کرو۔" لڑکے نے فوراً ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "لو جی اب بتاؤ کیا کھاؤ پیو گے؟ کیا سیوا کریں آپ کی؟"

میں منع کرتا رہا لیکن اس نے دودھ پتی منگوا لی اور دکان کے اندر سے ہی بہت سے بسکٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ وہ بچھا جا رہا تھا۔

کہنے لگا۔ "لگتا ہے آپ پہلی بار اِدھر آئے ہیں؟"

"آیا تو پہلی بار ہوں لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"آپ کے کپڑوں سے۔" اس نے کہا۔

اسی دوران میں ایک جواں سال لڑکا تمباکو لینے لطیف کی دکان پر آیا۔ اس نے بھی بڑے تعجب سے میرے کپڑوں کو دیکھا جیسے میں نے پتلون قمیص نہیں پہنی، گھاگرا چولی یا کوئی اور زنانہ لباس پہن رکھا ہے۔

لڑکے کے جانے کے بعد میں نے لطیف سے پوچھا۔ "کیا یہاں پینٹ قمیص پہننا منع ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں جی۔ چودھری انور کو چنگا نہیں لگتا۔ وہ کہتا ہے اپنا پینڈو لباس پہنو۔ پینڈو کھاؤ، پینڈو پیو، پینڈو طریقے سے رہو۔ یہ سوڈا واٹر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے رکھا ہوا ہے۔ وہ تو ان چیزوں سے بھی منع کرتا ہے۔ بہت غصے والا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف علاقے میں کوئی نہیں چل سکتا۔"

ایک گلی میں حویلی کی ایک دیوار کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ حویلی کس کی ہے لطیف صاحب؟"

وہ بولا۔ "چودھری انور کی۔ یہ دراصل تین بھائی ہیں۔ چودھری انور بڑا ہے۔ اس سے چھوٹا چودھری اصغر ہے اور پھر نکا چودھری امجد۔ تینوں بڑے ڈھاڈے ہیں لیکن چودھری انور کچھ زیادہ ہی کوڑا (کڑوا) ہے جو اس نے کہہ دیا بس کہہ دیا۔ باقی دونوں بھائی بھی اس کی پوری حمایت کرتے ہیں اور پھر سارے علاقے کو اس پر عمل کرنا پڑتا ہے۔"

"چودھری انور، ویسے کیسا بندہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت چنگا...... اور بہت بُرا۔" لطیف دھیمی آواز میں بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ چنگا بھی اور بُرا بھی؟"

لطیف نے کہا۔ "جو لوگ اس کے کہنے کے مطابق چلتے ہیں ان کے لیے بہت چنگا ہے، دوسروں کے لیے بہت بُرا...... بلکہ بہت ہی بُرا۔ کھڑے کھڑے بندے کی جان نکال لیتا ہے۔"

اسی دوران میں سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا سائیکل پر کھاد کی دو بوریاں رکھے دکان کے

سامنے سے گزرا۔ اس نے پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔ کپڑوں کی طرح لڑکے کا اپنا حلیہ بھی خستہ تھا۔ میں نے لطیف سے کہا۔ ”آپ تو کہتے ہیں کہ یہاں شہری لباس کوئی نہیں پہنتا۔“

لطیف میرا اشارہ سمجھ کر بولا۔ ”یہ نوکر ہے حویلی کا۔ اس کی بات اور ہے۔“

”کیا مطلب؟ جو چیز عام لوگوں کے لیے منع ہے وہ اپنے نوکروں کے لیے جائز ہے۔“

”ہاں...... یہی تو چکر ہے۔ یہ لباس نوکر پہن سکتے ہیں جن کو ہر وقت حویلی والوں کی جھڑکیاں کھانی پڑتی ہیں۔ عام لوگ نہیں پہن سکتے۔ اب یہ منڈا جو یہاں سے گزرا ہے، پڑھا لکھا ہے۔ شاید بہاولپور کا رہنے والا ہے۔ بس چودھریوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ یہاں بھینسوں اور گایوں کا گوبر اُٹھا رہا ہے، کتوں کا راتب بنا رہا ہے اور اس طرح کے دوجے کام کر رہا ہے۔ اچھی تنخواہ بھی ملتی ہے لیکن ذلیل بھی رج کے ہوتا ہے۔ نوکری چھوڑنا چاہے تو آسانی سے چھوڑ بھی نہیں سکتا اور یہاں یہ کوئی ایک ہی شہری منڈا نہیں ہے، چھوٹی بڑی عمر کے چودہ پندرہ نوکر، نوکرانیاں حویلی میں ایسے ہی ہیں۔ یہ شہری ہیں اور یہاں ذلیل ہو رہے ہیں بلکہ......“ کریانہ فروش لطیف کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”آپ کچھ کہنے لگے تھے؟“ میں نے کہا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”آپ پیر بھائی نکل آئے ہیں، اس لیے آپ کو بتا رہا ہوں ورنہ یہ باتیں کرنے والی نہیں ہیں۔ چودھری انور کی تین بیویاں ہیں۔ پہلی گاؤں کی ہے، باقی دو شہری ہیں۔ ایک ویاہ تو چودھری نے پچھلے سال ہی کیا ہے۔ لاہور شہر کی کوئی کڑی ہے۔ چنگی بھلی پڑھی لکھی ہوئی۔ بس پھنس گئی ہے کسی طرح۔ چودھری کی اصل بیوی تو پہلے والی واجدہ بی بی ہی ہے۔ باقی دونوں تو بس رکھیلیں ہی ہیں۔ چودھری ان دونوں کو کوئی بچہ وغیرہ بھی نہیں ہونے دیتا۔ درمیان والی کو تو شاید دو چار مہینے میں طلاق ہو جائے۔ چودھری کا دل شاید بھر گیا ہے اس سے۔ مار کٹائی بھی کرنے لگا ہے اس کے ساتھ......“

اگلے ایک گھنٹے میں میرے اور لطیف کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ مجھے دکان کے پیچھے اپنے گھر میں لے گیا۔ کھانا کھلایا۔ کھانے کے دوران میں بھی ہم بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ ہم ایک دوسرے کو اپنائیت سے آپ کے بجائے تم کہہ رہے تھے۔ مجھے اس سرحدی گاؤں اور گاؤں کی حویلی کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، وہ اس طرح تھا۔ حویلی کو پیلی حویلی کہا جاتا تھا حالانکہ اس کا رنگ پیلا نہیں تھا۔ غالباً کسی زمانے میں اس کو پیلا رنگ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے نام پیلی حویلی پڑ گیا تھا۔ چودھری انور اور اس کے دونوں بھائیوں کی

دہشت پورے علاقے میں تھی۔ وہ ہر طرح کے ناجائز و غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے لیکن کوئی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بُرے کاموں کے لیے تینوں بھائیوں کا اتفاق مثالی تھا۔ غیر قانونی شراب سے لے کر طوائف بازی اور اسمگلنگ تک ہر کام وہ کرتے تھے۔ انہوں نے اچھی نسل کی بڑی تیز رفتار گھوڑیاں پال رکھی تھیں۔ ان گھوڑیوں پر سوار چودھریوں کے ہرکارے پورے علاقے پر نظر رکھتے تھے۔ لطیف کے بقول کبھی کبھار سکھ حضرات بھی چودھریوں سے ملنے کے لیے گاؤں میں آتے تھے۔

میرے اور لطیف کے درمیان ”پیر بھائی“ ہونے کی وجہ سے اعتماد اور یقین کی زبردست فضا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ احمد تھانوی صاحب کا نام لے لے کر جیتا تھا اور میں نے بھی احمد تھانوی صاحب سے اپنی زبردست محبت اور عقیدت ظاہر کر دی تھی۔ میں نے لطیف سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میرا تعلق اسپیشل پولیس سے ہے اور میں ایک بندے کی تلاش میں یہاں آیا ہوں تو وہ پریشان نظر آنے لگا۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”لطیف بھائی! فکر مند ہونے کی ذرا سی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے درمیان روحانی بھائی چارے کا رشتہ ہے اور یہ بالکل ایسے ہی رہے گا۔ اللہ نے چاہا تو میری طرف سے تمہیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہو گی۔ حضرت صاحب، تمہیں میری طرف سے ہر طرح کی ضمانت دے سکتے ہیں۔“

میری ان باتوں نے لطیف کی پریشانی کافی حد تک کم کر دی۔ وہ مجھ سے اس شخص کے بارے میں سوال جواب کرنے لگا جسے میں ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے یوسف فاروقی کا حلیہ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کب سے اوجھل ہے۔

لطیف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تابش بھائی! اگر تمہیں ٹوہ لگی ہے کہ تمہارا بندہ ان لوگوں کے پاس ہے تو یہ ٹوہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے سارے کام کرتے ہیں۔ اسمگلنگ کا مال تو بارڈر کے آر پار جاتا ہی رہتا ہے، کبھی کبھی یہ بندوں کو بھی بھیج دیتے ہیں۔ ابھی دو ڈھائی مہینے پہلے اس طرح کا ایک واقعہ ہوا ہے۔ ایک سکھ لڑکی انڈیا سے بھاگ کر ننکانہ صاحب آ گئی تھی۔ وہ یہاں اپنی پسند کے سکھ لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا بھائی اس کے پیچھے آیا اور پھر اسے پکڑ کر یہاں ہمارے پنڈ لے آیا۔ سنا ہے کہ یہیں سے وہ لڑکی واپس انڈیا پہنچا دی گئی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”جس بندے کے پیچھے میں یہاں آیا ہوں، اس کے بارے میں بھی کچھ اس طرح کا شک ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے انڈیا پہنچانا چاہتے ہوں۔“

اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ ثروت تھی۔ میں نے کال اٹینڈ کی۔ وہ پریشان آواز میں بولی۔ ''تابش! آپ کہاں ہیں؟ اتنی دیر کیوں لگا دی ہے؟''

''بس اب واپس روانہ ہو رہا ہوں۔ تم خیریت سے ہو نا؟''

''ہاں خیریت سے ہوں لیکن وہ سائیں لڑکا پھر نظر آیا ہے۔ بالکونی میں گھوم رہا تھا۔ کھڑکی سے چہرہ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔''

''ثروت! وہ بالکل بے ضرر ہے۔ کچھ نہیں کہے گا اور نہ ہی اندر آئے گا۔ میں بس تھوڑی دیر میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔''

ثروت کو تسلی دے کر میں نے فون بند کر دیا۔

لطیف سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کزن ہے میری۔ یوسف فاروقی کی بیوی ہے۔ اس کی تلاش میں ہی میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ہم ہارون آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' میں نے اسے تفصیل بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میری یہ کزن بھی حضرت صاحب کی بہت عقیدت مند ہے۔

اسی اثناء میں پردے کے پیچھے سے لطیف کی بیوی کی آواز سنائی دی۔ وہ لطیف کو ''عثمان کے ابا'' کہہ کر بلا رہی تھی۔ وہ اپنی آواز سے سنجیدہ طبیعت عورت لگتی تھی۔

میں نے بھی لطیف سے اجازت چاہی۔ لطیف مجھے اس بات کی آفر کر چکا تھا کہ مجھے یوسف کے حوالے سے کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے۔

جاتے وقت لطیف نے مجھ سے کہا۔ ''اگر تمہیں دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت پڑے تو بہتر ہے کہ دیہاتی لباس میں آؤ اور خود کو دیہاتی ہی ظاہر کرو۔ ورنہ کوئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو ایسا ہی کروں گا۔''

میں واپس ٹیکسی ڈرائیور یاسر کے پاس پہنچا۔ وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک گھوڑی سوار آیا تھا۔ وہ پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ یاسر نے وہی کچھ بتایا جو میں نے سمجھا دیا تھا۔ ہم فوراً ٹیکسی میں بیٹھے اور واپس روانہ ہو گئے۔ اس گاؤں کی فضا میں عجیب سا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں ثروت بے قراری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اس کی یہ بے قراری اچھی لگی۔ ثروت کی اس کیفیت نے مجھے گزرے دنوں کی یاد دلا دی۔ جب اسی طرح وہ میرے فون کا یا میری آمد کا انتظار کیا کرتی تھی۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر بھی

ہماری نگاہیں ایک دوسرے کو ہی ڈھونڈا کرتی تھیں اور ثروت تو کہا کرتی تھی کہ وہ ایسی تقریبات میں جاتی ہی میرے لیے ہے۔ ورنہ اس کی ''تنہائی پسندی'' بہت سی تقریبات سے دامن بچا جاتی۔

ثروت نے مجھے بتایا کہ سائیں لڑکا کوئی دو گھنٹے پہلے نظر آیا تھا، اس کے بعد دکھائی نہیں دیا۔

میں نے ثروت کو تسلی دی اور اسے سرحدی گاؤں اور پیلی حویلی کے حوالے سے اپنی ساری کارگزاری سنائی۔ میں نے اسے سکھ لڑکی والا واقعہ نہیں سنایا ورنہ وہ مزید پریشان ہو جاتی۔ ہاں...... یہ ضرور کہا کہ یوسف اس گاؤں میں یا پیلی حویلی میں موجود ہو سکتا ہے۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' وہ ماتھا پکڑ کر بولی۔ ''ان لوگوں کی یوسف سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے اور اگر...... خدانخواستہ یہ لوگ انہیں بارڈر پار لے جانا چاہتے ہیں تو کیوں؟''

''یہ سوال واقعی پریشان کرتا ہے۔'' میں نے تائید کی۔

وہ بولی۔ ''حضرت صاحب سے بھی ابھی کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ تین بار فون کر چکی ہوں۔ ہر بار یہی بتایا گیا ہے کہ حضرت صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔ میرا خیال ہے کہ اب تو وہ لوگ میرا فون بھی نہیں سنیں گے۔''

یہ بھی ایک تعجب خیز سوال تھا کہ حضرت صاحب کہاں ہیں؟ ذہن میں پھر سائیں کی رات والی باتیں گونجنے لگیں۔ اس نے حضرت صاحب کے حوالے سے کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ حضرت صاحب کسی مشکل میں ہیں یا پھر یہ کوئی روحانی کیفیت تھی، الہام قسم کی شے تھی۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! مجھے ایک دیہاتی لباس چاہیے اور دو تین دن کی مہلت چاہیے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ میں یوسف والا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کم از کم کوئی ٹھوس سراغ ضرور ڈھونڈ لوں گا۔''

''دیہاتی لباس؟ وہ کس لیے؟''

''اس کی بھی ضرورت ہے۔ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' پھر میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ثروت! میرا ایک مشورہ ہے، اگر تم مانو تو......''

''کہیں۔'' وہ لمبی پلکیں جھکا کر بولی۔

''تم لاہور واپس چلی جاؤ۔ میں تمہیں بس پر بٹھا دیتا ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا تمہارے لیے۔ مجھے صرف تین چار دن کی مہلت دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی

بہتری کی صورت نکلے گی۔"

اس نے پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ پلکیں جھکا لیں اور بولی۔" پلیز تابش! مجھے اس کے لیے مجبور نہ کریں۔ میں نے خود سے عہد کیا ہوا ہے۔ یوسف کے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔"

"اگر وہ یہاں موجود ہی نہ ہوا تو پھر؟"

"تو پھر ہم وہاں جائیں گے جہاں ان کے ہونے کی امید ہوگی۔"

"تم...... جان بوجھ کر خود کو خطروں میں ڈالنا چاہ رہی ہو۔"

"آپ...... کے ہوتے ہوئے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی اور پرسوں آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ ہمارا ایمان ہونا چاہیے جو رات قبر میں آنی ہے، وہ باہر نہیں آسکتی۔"

"اگر میں تمہاری بات حضرت صاحب سے کرادوں اور وہ بھی تمہیں یہ مشورہ دیں کہ تم واپس چلی جاؤ......تو پھر؟"

وہ عجیب لہجے میں بولی۔"میں ان سے بھی التجا کروں گی کہ وہ ایک بیوی کے طور پر مجھے اپنا فرض پورا کرنے دیں۔"

میں نے کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی اس لیے بھی ہارون آباد میں رہنا چاہتی ہے کہ اسے ایک آدھ دن میں حضرت صاحب سے ملاقات کی توقع ہے۔

میں ہوٹل میں علیحدہ کمرہ لینا چاہ رہا تھا مگر وہ اس پر بھی راضی نہیں تھی۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ چند روز پہلے تک وہ میرے ساتھ کسی علیحدہ کمرے میں رہنے کا تصور تک بھی نہ کر سکتی ہوگی مگر اب اس کی مجبوری تھی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہوٹل والوں کے نزدیک بھی ہم میاں بیوی ہی تھے۔ کھانے کے بعد بھی ہم میں تادیر گفتگو جاری رہی۔ احمد تھانوی صاحب کے بارے میں ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ثروت اب خود وہاں فون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی جگہ میں نے فون کیا۔ ملازم خاص فرید احمد نے بتایا کہ حضرت صاحب ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ایک دو روز تک نہیں آئیں گے۔ یہ صورتِ حال اس صورتِ حال سے مختلف تھی جو فون پر ثروت کو بتائی جاتی رہی تھی۔ مطلب تھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں ٹیکسی پر واپس آیا تھا تو میں نے حضرت صاحب کی قیام گاہ کے سامنے کافی گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو ان سے ملاقات کے لیے آئے تھے اور اب مایوسی کا شکار تھے۔

ثروت کا اصرار تھا کہ اب میں اسے اکیلا ہوٹل میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اب میں دوبارہ لطیف کے گاؤں جانا چاہتا ہوں اور ایک دو روز وہاں رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ زور دینے لگی کہ میں اسے بھی ساتھ لے کر جاؤں۔ ہماری طویل بحث کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت بھی میرے ساتھ گاؤں جائے گی۔ ہم دونوں ایک فیملی کی طرح ہوں گے اس لیے ہم پر کسی طرح کا شک کیے جانے کا امکان کم سے کم ہوگا۔

ثروت سے ایک گھنٹے کی رخصت لے کر میں بازار گیا اور وہاں سے دو جوڑے کپڑوں کے خرید لایا۔ ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ زنانہ جوڑے کے ساتھ دیہاتی طرز کی ایک چادر بھی تھی۔ میں نے ایک گالی بھی خرید لی جو دیہاتی ٹائپ کے کپڑوں کے ساتھ میچ کرتی تھی۔ مجھے قریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ ایک خوشگوار شام دھیرے دھیرے اپنے سارے پھیلا رہی تھی۔ ثروت ایک بار پھر بے چینی سے میری منتظر تھی۔ میں نے سلا سلایا جوڑا ثروت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"پہن کر دیکھ لو۔ مجھے لگتا ہے پورا آئے گا۔"

میرا یقینی انداز دیکھ کر اس کے چہرے پر حیا کا رنگ سا لہرا گیا۔ بہر حال وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ شلوار کی لمبائی میں معمولی سا فرق نکلا، باقی سب ٹھیک تھا۔ میں اپنی رنگ دار شلوار قمیص دکان پر ہی ٹرائی کر چکا تھا۔

اسی دوران میں لاہور سے عمران کا فون آ گیا۔ میں نے باہر لابی میں جا کر اس سے بات کی اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔"کہیں زیادہ بُری جگہ سینگ نہ پھنسا لینا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں بھی فوری طور پر تمہاری مدد کو نہ آسکوں گا۔"

"کیوں...... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"یار! میں امید سے ہوں۔"

"مبارک ہو۔ شاہین نے بُرا تو نہیں منایا؟"

"یار! پوری بات تو سن لیا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ گمشدہ ڈاکٹر مہناز کا کچھ کھوج کھرا ملنے والا ہے۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کی ایک فون کال پکڑی گئی ہے۔ اس وقت میں اور راجا لاہور سے باہر جا رہے ہیں، براستہ موٹروے۔"

میں نے کہا۔"موبائل فون کا اسپیکر تو آن نہیں ہے؟"

"نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔"یار! اس راجا کو اپنے ساتھ زیادہ نہ چھیڑو۔ یہ بڑا ٹیڑھا بندہ ہے۔ کوئی

پریشانی پیدا نہ کر دے۔''

عمران نے کہا۔ ''گھبراؤ نہ جگر! مائنس مائنس...... پلس ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے ساتھ رکھنا مجبوری ہے۔ باقی جیلانی اور اقبال فقیر والی پہنچ چکے ہیں۔ تم کسی بھی وقت ان سے رابطہ کر کے مدد کے لیے بلا سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو کال کرلوں گا لیکن تم نے بتایا نہیں کہ ڈاکٹر مہناز کا کیا کھوج ملا ہے؟''

''ابھی نہیں۔ پہلے مجھے کسی نتیجے پر پہنچ لینے دو۔'' عمران نے کہا۔ وہ جلدی میں نظر آتا تھا، اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ثروت کے ساتھ ایک کمرے میں رات گزارنے کا تصور بڑا عجیب اور محال تھا۔ یقیناً وہ بھی اس صورتِ حال کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے اس کے لیے یہ سب کچھ کہیں زیادہ مشکل تھا۔ میں رات گیارہ، بارہ بجے تک باہر لابی میں بیٹھا رہا اور ٹی وی دیکھتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔ وہ آج بھی بیڈ پر لیٹنے کو تیار نہیں تھی۔ میں بیڈ پر چلا گیا، وہ چادر اوڑھ کر صوفے پر دراز ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کی قربت اور دوری کو بڑی شدت سے محسوس کرتے رہے۔ نہ جانے رات کے کس پہر مجھے نیند آ گئی۔

O......❖......O

اگلے روز دوپہر کے وقت میں ایک بار پھر گاؤں میں لطیف کریانہ فروش کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ چادر میں لپٹی لپٹائی ثروت بھی تھی۔ ہم دونوں دیہاتی حلیے میں تھے۔ لطیف کے مہمان کی حیثیت سے میں نے کچھ پھل بھی ایک شاپر میں ڈالے ہوئے تھے۔ لطیف مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے یہ توقع تو تھی کہ میں دوبارہ آؤں گا لیکن یہ نہیں تھی کہ اتنی جلدی آؤں گا اور میرے ساتھ ''زنانہ ساتھ'' بھی ہو گا۔

اس نے خوشی اور فکرمندی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ وہ ثروت کو تو گھر کے اندر لے گیا، ہم دونوں باہر دکان پر ہی بیٹھ گئے۔ لطیف نے میرے حلیے پر اطمینان کا اظہار کیا اور بولا۔ ''میں ملنے جلنے والوں سے یہی کہوں گا کہ تم پیر بھائی ہو اور مجھ سے ملنے کسی دوسرے پنڈ سے آئے ہو۔ کس پنڈ کا نام لوں؟''

''میانوالی کہہ دینا۔ یہ میانوالی شہر نہیں...... پسرور کی طرف ایک گاؤں کا نام ہے۔''

''ٹھیک ہے...... اور ساتھ میں کون ہے؟''

''تمہیں بتایا ہے کہ کزن ہے لیکن مجبوری ہے، بیوی کہہ دینا۔''

''رات تو یہیں رہو گے نا؟'' لطیف نے پوچھا۔ لہجہ ایسا ہی تھا جیسے میرا جواب نفی میں سننا چاہتا ہو۔

میں نے کہا۔ ''ہاں...... ایک یا دو رات تو رہنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں لطیف...... تمہیں تکلیف دے رہا ہوں لیکن تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری وجہ سے کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔ بالکل بےفکر رہو۔''

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ یقیناً اس کے ذہن میں اندیشے موجود تھے۔ لیکن میرا پُراعتماد لہجہ اسے حوصلہ بھی دے رہا تھا۔ پھر میں نے اپنا تعلق خفیہ پولیس سے بتایا تھا۔ یہ چیز بھی اس کے لیے تسلی بخش تھی۔ وہ جیسے تیسے میری میزبانی پر آمادہ ہو گیا۔

گاؤں کے ماحول میں واقعی ایک عجیب طرح کی خاموشی اور ہراس کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ پیلی حویلی اور حویلی والوں کا خوف جیسے کسی جنس کی طرح عام لوگوں میں موجود تھا۔

حویلی کے کسی مکان کی کیچڑ آلود جیپ دکان کے سامنے سے گزری تو لطیف نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ ایک دو راہگیروں نے بھی رُک کر ہاتھ ماتھے پر رکھا۔ جیپ میں درمیانی عمر کا ایک بارُعب چودھری بیٹھا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہو گی۔ معلوم ہوا کہ یہ چودھری انور کا سب سے چھوٹا بھائی چودھری امجد ہے۔

ہم دکان میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ اکا دکا گاہک بھی آتے رہے۔ لطیف نے اپنی بیوی کو ہمارے بارے میں ساری حقیقت بتا دی تھی۔ یعنی وہ جانتی تھی کہ ثروت میری بیوی نہیں بلکہ رشتے دار ہے اور ہم اس کے شوہر کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ لطیف نے بتایا کہ اس کی بیوی تھوڑی سی پریشان ہے لیکن وہ جلد ہی اسے نارمل کر لے گا۔

اسی دوران میں پیچھے گھر کے اندر سے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ لطیف چونک گیا۔ پھر اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دکان کے اندر سے ہی اپنے گھر میں چلا گیا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہو سکی۔ اس نے تھوڑا سا چونا اور ہلدی وغیرہ لی اور پھر گھر کے اندر چلا گیا۔ اس نے بتایا کہ کسی کو چوٹ لگی ہے۔ اس دوران میں لطیف کا آٹھ دس سالہ بیٹا عثمان دکان پر بیٹھا رہا۔

دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو میں نے تفصیل پوچھی۔ عثمان کو گھر میں بھیجنے کے بعد لطیف نے بتایا۔ ''حویلی کی ایک نوکرانی رشیداں ہے۔ پنج وقت کی نمازی عورت ہے۔ بیچاری روتی جا رہی ہے۔ چودھری انور نے اسے ٹھڈے مارے ہیں۔ بیچاری کی پسلیاں ہل گئی ہیں۔ اس طرح کے واقعے یہاں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بہت سوں کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ یہ

میری گھر والی کی سہیلی ہے، اس لیے دُکھڑا سنانے آ گئی ہے۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''کچھ ہونا ضروری نہیں ہوتا بھائی تابش! یہاں کسی ویلے کسی کی بھی شامت آ سکتی ہے۔ بہرحال اس میں تو تھوڑا بہت قصور بھی ہے رشیداں کا۔''

''کیسا قصور؟'' میں نے پوچھا۔

''چودھری انور نے شہری نوکرانیاں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ کوئی جھاڑو پھیرتی ہے، کوئی کپڑے دھوتی ہے یا پسینے میں نہاتی ہے اور روٹیاں پکاتی ہے۔ باورچی خانے میں کام کرنے والی ایک نوکرانی کا نام روبی ہے۔ ملتان شہر کی رہنے والی ہے۔ چودھری انور کا سب سے چھوٹا پتر ست اٹھ سال کا ہے۔ بلال نام ہے اس کا۔ کبھی کبھی روبی اسے کوئی شہری کھانا پکا دیتی تھی۔ اب اسے عادت پڑ گئی ہے۔ اسی بات پر چودھری انور کو غصہ آیا ہے۔''

''شہری کھانا؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''بھائی تابش! وہی کھانے جو شہر کے ہوٹلوں شوٹلوں میں بنتے ہیں۔ مجھے تو ان کے نام بھی چنگی طرح نہیں آتے۔ وہ کیا کہتے ہیں چائنیز کھانے...... شاشلک...... سوپ اور بلیک پیپر شیپر۔ چودھری کو اس بات پر بھی روبی پر غصہ تھا۔ پرسوں بلال نے کسی کھانے کی ضد کی۔ اس کے لیے جو سامان چاہیے تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ ہارون آباد سے ہی مل سکتا تھا اور تمہیں پتا ہی ہے، پرسوں کتنی بارش ہو رہی تھی۔ لاڈلے پتر نے رٹا ڈال دیا۔ اسی بات سے تپ کر چودھری انور نے روبی کو بُری طرح مار لگا دی۔ اس کا بچہ ہونے والا تھا۔ پیٹ پر ٹھڈا لگنے سے اس کی حالت خراب ہو گئی۔ چودھری انور نے اسے فوراً ہارون آباد کے ہسپتال بھیج دیا۔ ساتھ میں روبی کا بندہ بھی گیا۔ بڑی مشکل سے وچاری کی جان بچی ہے۔''

''افسوس ناک بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس میں رشیداں کے ساتھ کیوں زیادتی ہوئی ہے؟''

''رشیداں دراصل روبی کے ساتھ ہی باورچی خانے میں کام کرتی تھی۔ جب روبی نے ایک دو بار چوری چوری بلال کو شہری کھانے پکا کر دیئے تو رشیداں نے بھی چودھری یا چودھرائن کو نہیں بتایا۔ چودھری کو اسی بات کا غصہ تھا۔ روبی کو مارتے ہوئے اس نے دو چار رشیداں کو بھی لگا دیں اور ساتھ ہی اسے نوکری سے بھی نکال دیا۔ ایک مہینے کی تنخواہ اس کے منہ پر ماری اور حویلی سے بھگا دیا۔''

لطیف نے ہر آنے جانے والے سے میرا تعارف اپنے پیر بھائی کے طور پر ہی کرایا اور

بتایا کہ میں ایک دو روز کے لیے یہاں مہمان ہوں۔ رات کا کھانا میں نے اور لطیف نے گھر کی بیٹھک میں کھایا۔ مرغی پکی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ثروت سے ایک بار بھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ لطیف کی بیوی سے حویلی اور حویلی والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ بہرحال ہمیں ابھی تک اپنی معلومات کے تبادلے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس آدھے گاؤں میں بجلی موجود تھی اور آدھے گاؤں میں نہیں۔ لطیف کا گھر بھی بجلی سے محروم حصے میں آتا تھا۔ سرِشام لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ میں نے لطیف سے کہا تو اس نے بیٹھک میں میری اور ثروت کی ملاقات کا موقع فراہم کر دیا۔

کچھ دیر بعد کچے کمرے میں لالٹین کی داستانی روشنی میں ثروت اور میں آمنے سامنے تھے۔ وہ رنگین پایوں والے نواڑی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے مونڈھا سنبھال لیا۔ دیہاتی لباس اس کے جسم پر خوب جچا تھا۔ اس نے بال بھی بیچ میں سے مانگ نکال کر دیہاتی انداز میں بنائے تھے۔ لطیف نے اپنی بیوی رضیہ کو ہمارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میاں بیوی میں سلوک تو ہے مگر مزاج میں بہت زیادہ ہم آہنگی نہیں ہے۔ ثروت نے کہا۔ ''توبہ یا اللہ...... آپ نے دیکھا اس بیچاری عورت کو کتنی بیدردی سے مارا گیا تھا۔ یہ میرے ہاتھ جتنے بڑے نیل پڑے ہوئے تھے اس کی پسلیوں پر۔''

''بس یہ اسی ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اصل قصور اس روبی نام کی ملازمہ کا تھا اور ساتھ میں کمبختی اس بیچاری کی بھی آ گئی اور اب پتا چلا ہے کہ کیا ہو رہا ہے وہاں، حویلی میں؟'' ثروت نے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''وہ بچہ بلال دو دن سے بھوکا ہے۔ ضد کر رہا ہے۔ اب یہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں کوئی اور ملازمہ جو اس کے لیے اس کی مرضی کی چیز پکا سکے۔ یہاں گاؤں میں تو سب دیسی عورتیں ہیں۔'' ثروت کی خوبصورت آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''میرے دل میں تو ایک اور بات آ رہی ہے۔ میں کیوں نا عارضی ملازمہ بن کر چلی جاؤں وہاں؟''

''خدا کا نام لو۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔''

''لیکن رشیداں یہ بھی بتا رہی تھی کہ چودھری انور کی پہلی بیوی وڈی چودھرائن کا بڑا ''ہولڈ'' ہے حویلی میں۔ حویلی کے اندر وہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہونے دیتی۔ ایسے کاموں کے لیے چودھریوں نے ''ڈیرا'' رکھا ہوا ہے اور باہر کی عورتیں آتی ہیں۔ وہ یہ بھی بتا رہی تھی کہ چودھری انور کی دو جوان بیٹیاں ہیں۔ چھوٹے چودھری اصغر کی ایک بیٹی کی عمر بھی پندرہ

سولہ سال ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے ثروت! یہ خطرناک کام ہوگا۔''

''مگر آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ حویلی کے اندر کا حال جاننا ضروری ہے۔''

''اس کے لیے میں ہوں نا۔ تم دیکھنا ایک دو دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''خطرہ تو آپ کے لیے بھی ہوگا۔ تو پھر کیوں نہ میں خطرہ مول لوں کیونکہ میری ذمے داری زیادہ ہے۔''

''میری ذمے داری بھی زیادہ ہے کیونکہ یوسف جب لاپتا ہوا تو میں ہی اس کے آس پاس تھا اور کچھ لوگوں کے نزدیک میں بھی مشتبہ ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا اشارہ یوسف کے والد فاروقی صاحب کی طرف ہے جنہوں نے یوسف کے لاپتا ہونے کے بعد فون پر مجھ سے خشک لہجے میں بات کی تھی اور اس وقت کسی حد تک ثروت کا لب ولہجہ بھی بیگانوں جیسا تھا۔

''اگر کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔'' وہ افسردگی سے بولی اور اس کی جھیل آنکھوں میں پانی کی چمک لالٹین کی روشنی میں نمایاں ہوگئی۔

''نہیں ثروت! شرمندہ تو میں ہوں۔ میں نے یوسف کے لاپتا ہونے کے بعد کئی گھنٹے تک تم سے رابطہ نہیں کیا اور تم سب کو سخت پریشانی میں مبتلا رکھا۔''

ثروت کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھپک جھپک کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔''اچھا...... احمد تھانوی صاحب سے رابطہ ہو سکا؟''

''نہیں...... ابھی شام سے پہلے فون کیا تھا۔ اب وہاں سے کوئی فون ہی نہیں اُٹھا رہا۔ کوئی مسئلہ ضرور ہے وہاں۔''

''میں نے بھی دوپہر کے وقت کال کی تھی۔ بیل جا رہی تھی۔ کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔''

وہ بولی۔''یہ لطیف صاحب بھی تو حضرت صاحب کے بہت عقیدت مند ہیں۔ ان سے پوچھنا تھا اس بارے میں۔''

''میں نے پوچھا تھا۔ وہ آخری بار پچھلے جمعے کو ہارون آباد گیا تھا۔ حضرت صاحب سے اپنے بچے عثمان کو دم کرایا تھا اس نے۔ حضرت صاحب اسی روز لاہور سے ہارون آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد سے لطیف کو کچھ پتا نہیں۔''

اسی دوران میں عثمان کھیلتا ہوا اندر آ گیا۔ ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے۔ عثمان، ثروت

کو بڑی محبت سے چاچی کہہ رہا تھا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہا تھا۔ ثروت اس کے ساتھ باہر چلی گئی تو لطیف دوبارہ بیٹھک میں آ گیا۔ وہ گرم گرم جلیبیاں اور دودھ لے کر آیا تھا۔ دودھ دو بڑے پیالوں میں تھا۔ جلیبیاں ایک تھالی میں رکھی تھیں۔''لو جی پنڈ کی خاص سوغات کھاؤ۔'' وہ چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بولا۔

ہم دودھ جلیبیاں کھانے لگے۔ خالص دودھ اور کڑکڑاتی جلیبیاں۔ ساتھ میں بیٹری والے ریڈیو پر پنجابی گانے۔ کہیں دور سے ڈیزل والے انجن کی مخصوص کوکو اور صحن میں بکریوں کی ممیاہٹ۔ سماں بندھ گیا۔ مجھے ہارون آباد کے ہوٹل والا ملنگ لڑکا یاد آ گیا۔ اس نے بھی تو ہم سے دودھ جلیبیوں کی فرمائش کی تھی۔

میں نے کہا۔''لطیف بھائی! کوئی ایسا بندہ ملنا چاہیے جو ہمیں پیلی حویلی کے اندر کے حالات کے بارے میں کچھ بتا سکے۔''

''یہی تو وڈی مصیبت ہے تابش بھائی! چودھری کے ڈر سے کوئی زبان نہیں کھولتا۔ بلکہ ایسے لگتا ہے کہ ہم سب لوگوں نے آنکھیں ہی بند کر رکھی ہیں کہ جو ہونا ہے ہوتا رہے۔ ہمیں کیا لینا دینا۔ سب جانتے ہیں کہ حویلی میں کالے دھندے ہوتے ہیں لیکن حویلی کے سامنے سے سب کان لپیٹ کر گزر جاتے ہیں۔''

لطیف نے ذرا توقف کیا پھر پُرسوچ لہجے میں بولا۔''ویسے تابش بھائی! ایک کام ہو سکتا ہے۔ پر اس میں تھوڑا سا ڈر بھی آتا ہے۔''

''تم بتاؤ تو سہی۔''

''ثروت بی بی یہ شہری ٹائپ کے کھانے تو پکا لیتی ہوگی۔''

''ہاں پکا تو لیتی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اس ویلے حویلی میں ایک ایسی ملازمہ کی سخت لوڑ ہے۔ چودھری کا لاڈلا پتر بلال کچھ کھا پی نہیں رہا۔ بڑا ضدی ہے۔ سخت وخت ڈالا ہوا ہے اس نے......''

''نہیں لطیف۔'' میں نے لطیف کی بات کاٹی۔''جو تم سوچ رہے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو جان بوجھ کر مصیبت کو دعوت دینے والی بات ہے کہ ہم ثروت کو حویلی بھیج دیں۔''

لطیف خاموش ہو گیا۔ پھر ڈھیلی آواز میں بولا۔''ہاں...... بات تو ڈر والی ہی ہے لیکن...... پھر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔''

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔''اچھا...... تم بتا رہے ہو کہ چودھری انور وغیرہ نے خاص نسل کی گھوڑیاں پال رکھی ہیں۔ شکاری کتے وغیرہ بھی ہیں۔''

"ہاں...... یہ تو ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک ایسا بندہ ہے جو جانوروں کو سدھانے میں ایک دم ماسٹر ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ یہاں آجائے اور چودھری انور سے مل کر اپنی خدمت پیش کرے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اسے جانوروں کی سدھائی کے لیے عارضی طور پر حویلی میں رکھ لیں؟"

اس بارے میں میرے اور لطیف کے درمیان کچھ دیر تک مزید بات ہوئی۔ لطیف نے بتایا۔ "کچھ ہفتے پہلے چھوٹے چودھری امجد نے کہیں سے چار پانچ بڑے بلڈاگ کتے منگوائے تھے۔ ان میں سے دو کتوں نے ایک ملازم کی تین چار سالہ بچی پر حملہ کر کے اسے سخت زخمی کر دیا۔ بعد میں وہ بچی بیچاری ہارون آباد ہسپتال میں فوت ہوگئی۔ امجد نے ان دونوں کتوں کو گولی ماردی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ گھوڑوں اور کتوں وغیرہ کی سدھائی کرنے والے کے لیے حویلی میں موقع بن سکتا ہے۔"

لطیف نے میرے خیال کی تائید کی۔

میں عمران سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ خود اسی کا فون آگیا۔ میں نے کہا۔ "سیانے لوگ کہہ گئے ہیں، شیطان کے بارے میں سوچو تو وہ حاضر ہو جاتا ہے۔"

وہ بولا۔ "لگتا ہے کہ آج کل شیاطین تمہیں بہت تنگ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے بھئی، ماحول ہی ایسا ہے۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ وہ رات دن تمہارے ساتھ ہے۔ ایک رومانی ایڈونچر کا سا ماحول بنا ہوا ہے۔"

"تمہاری آدھی بات درست ہے۔" میں نے نحیف لہجے میں کہا۔ "رومانی ایڈونچر کا نہیں، صرف ایڈونچر کا ماحول ہے۔ تم بتاؤ ڈاکٹر مہناز ہاتھ آئی یا نہیں؟"

"ہم اسی سلسلے میں یہاں گجرانوالہ میں ہیں۔ ایک مکان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اس کے دروازے پر تالا لگا ہے لیکن امید ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں یہ تالا ضرور کھلے گا اور ہم ڈاکٹر رسام یا مہناز میں سے کسی ایک کی صورت شریف دیکھ سکیں گے۔"

"جلالی صاحب کی کیا پوزیشن ہے؟"

"یار! وہ کوئی ون ڈے کے کھلاڑی نہیں جو آسانی سے اپنی وکٹ باؤلر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ بریڈ مین اور حنیف محمد وغیرہ کی طرح لمبی اننگز کھیلنے والے ہیں۔ کوے میں ہیں۔ لیکن ابھی تک وکٹ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ مہناز جیسی لڑکی یونہی تو ان کے بڑھاپے

پر عاشق نہیں ہوئی۔ اب ڈاکٹر بیچارے دن رات یہ کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ موصوف کی جان آخر جسم کے کس حصے میں اٹکی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ پرسوں انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو کچھ حرکت بھی دی ہے۔ شاید ہارمونیم پر کوئی پُرانا گانا گانے کی کوشش فرمائی ہے۔"

"اچھا بتاؤ۔ راجا کہاں ہے؟"

"اِدھر میرے ساتھ ہی ہے۔"

"اس کی فوری ضرورت پڑ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم تو مجھے بھی اجتناب فرمانے کے لیے کہہ رہے تھے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

میں نے مختصر الفاظ میں عمران کو ساری صورتِ حال بتائی اور اس سرحدی گاؤں روہی وال کا مکمل ایڈریس بھی اسے سمجھا دیا۔

عمران نے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔ "وہاں نیتو (کرشمہ کپور) کے ساتھ کوئی جانا پہچانا بندہ تو نظر نہیں آیا؟" میں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ وہ بولا۔ "لیکن اس کا امکان تو ہے نا جگر! ہوسکتا ہے کہ حویلی کے اندر سلطان یا جاوے کا کوئی ایسا بندہ ہو جو راجا کو پہچانتا ہو۔"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کرشمہ کپور کے علاوہ یہاں سارے نئے چہرے ہی نظر آئے ہیں۔"

وہ بولا۔ "ویسے تو راجا کا حلیہ بھی آج کل کافی بدلا ہوا ہے۔ لمبے بال کٹوا دیئے ہیں اس نے ...... بلکہ اس نے کیا میں نے ہی کٹوائے تھے۔ جوئیں پڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹی داڑھی مونچھ بھی رکھی ہوئی ہے۔ آسانی سے پہچانا تو نہیں جائے گا۔"

"تو پھر اللہ کا نام لے کر بھیج دو اسے۔"

عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ "موڈی بندہ ہے۔ انکار بھی کر سکتا ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ کل کسی وقت تم تک پہنچ جائے۔ تمہارے پاس اس کا سیل نمبر ہے نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور عمران سے کہا کہ وہ راجا کو ساری صورتِ حال سمجھا دے۔

کچھ مزید گفتگو کے بعد ہم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں راجا کو یہاں بلانے اور کسی طرح حویلی کے اندر پہنچانے کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن اگلے روز جو کچھ ہوا وہ میری پلاننگ سے بہت ہٹ کر تھا۔

رات کو میں اور لطیف دیر تک جاگتے رہے۔ ویرانے کی طرف گیدڑوں کی آوازیں آتی

تھیں اور کبھی کبھی ٹریکٹر کی گونج سنائی دیتی تھی۔ گاہے بگاہے دیہاتی چوکیدار کی صدیوں پُرانی صدا، جاگدے رہو، بھی کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ ہم ڈھائی بجے کے قریب سوئے۔ میں یہاں بھی سخت چٹائی پر سونا پسند کرتا تھا اور میری اس عادت پر لطیف کو حیرت بھی تھی۔

صبح جاگا تو دس بج چکے تھے۔ دھوپ گاؤں کے کچے در و دیوار اور سنہری کھیتوں پر چمک رہی تھی۔ لطیف اپنی ہٹی پر جا چکا تھا۔ اس کی بیوی صحن میں بکریوں کو نہلا رہی تھی۔ مجھے جاگتے دیکھ کر چھوٹے عثمان نے اپنے والد کو اطلاع دی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ میرے پاس آ گیا۔

وہ کچھ پریشان سا تھا۔ ''خیریت ہے لطیف؟'' میں نے پوچھا۔

''ہے بھی اور نہیں بھی۔''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''سویرے آٹھ بجے کے قریب میری گھر والی نے بتایا کہ ثروت اپنے بستر پر نہیں ہے۔ ہم نے یہاں وہاں دیکھا پر وہ نظر نہیں آئی۔ میری گھر والی نے کہا کہ کل وہ دیر تک ہمسائی برکتے سے باتیں کرتی رہی ہے۔ برکتے ہمارے پنڈ کی دائی ہے اور تھوڑا بہت دوا دارو بھی کرتی ہے۔ گھر والی نے کہا وہ کہیں اس کے ساتھ نہ گئی ہو۔ ہم نے برکتے کے گھر سے پتا کیا۔ اس کے بندے نور دین نے بتایا کہ برکتے بھی گھر میں نہیں ہے۔ ہمیں تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ میں تم کو جگانا چاہتا تھا، پھر سوچا کہ کوئی اچھی خبر مل جائے تو جگاتا ہوں۔ اتنے میں برکتے اور ثروت دونوں واپس آ گئیں۔ ثروت نے بتایا ہے کہ وہ حویلی میں گئی تھی۔ اس نے چودھرائن سے بات کی ہے اور اسے حویلی میں کچھ دنوں کے لیے کھانا پکانے کا کام مل گیا ہے۔ وہ اسی وقت اپنی کچھ چیزیں لے کر واپس حویلی چلی گئی۔''

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے رات ثروت کو منع بھی کیا تھا لیکن وہ وہی کر رہی تھی جو اس کی مرضی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے یوسف ہے اور اس کی بازیابی ہے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔

لطیف نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تابش بھائی! اتنا گھبرانے کی گل بھی نہیں ہے۔ وہ سیانی لگتی ہے۔ اس نے جو کیا ہے، دیکھ بھال کر ہی کیا ہوگا۔ ویسے بھی حویلی کے اندر زیادہ عمل دخل وڈی چودھرائن کا ہے۔ وہ گھر کے مردوں پر سخت نظر رکھتی ہے۔''

وہ سارا دن میں نے عجب بے قراری کے عالم میں گزارا۔ ایک دو بار موبائل پر ثروت سے رابطے کی کوشش بھی کی لیکن موبائل بند تھا۔ یہ بھی دُکھ کی بات تھی کہ اس نے کال یا میسج کے ذریعے بھی مجھے مطلع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ شام سے کچھ دیر پہلے راجا بھی گاؤں پہنچ

گیا۔ میں نے فون پر اسے لطیف دی ہٹی کا پتا بتا دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ہٹی یعنی دکان پر نہیں آئے بلکہ سیدھا گاؤں کی چوپال ٹیں چلا جائے، وہیں پر اسے سویلی کا کوئی نہ کوئی بندہ بھی مل جائے گا۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھایا تھا کہ اگر اس نے لطیف کی دکان پر آنا ہو تو عام گاہک کے طور پر آئے اور مجھ سے کسی صورت اپنی جان پہچان ظاہر نہ کرے۔ راجا، ثروت کو نہیں جانتا تھا اور نہ وہ راجا کو جانتی تھی۔ لہٰذا میں نے راجا کو بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اس سے پہلے ہماری طرف سے کوئی اور بھی حویلی کے اندر پہنچ چکا ہے۔

میں اور لطیف نے راجا کو تانگے سے اُترتے اور گاؤں میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے بھی دور سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ مکمل دیہاتی لباس یعنی دھوتی کُرتے میں تھا۔ اس کی آنکھ اب ٹھیک ہو چکی تھی۔ وائل کے کڑھائی دار کرتے میں سے اس کا مضبوط کسرتی جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے بازو کا زخم بھی غالباً اب بہتر تھا۔ چند دن پہلے تک اس کے گندے بال کندھوں تک پہنچتے تھے، اب وہ چھوٹے ہو چکے تھے۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ حلیہ کافی تبدیل نظر آتا تھا۔

وہ رات میں نے بے چینی میں ہی گزاری۔ رہ رہ کر ثروت کا خیال ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ پہلی حویلی میں تھی اور یہ وہ جگہ تھی جس کے بارے میں مقامی لوگ بالکل اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو کسی طرح کا شبہ ہو جاتا تو ثروت سخت مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھی۔ مجھے ثروت کی من مانی پر بھی افسوس تھا۔ اس نے مجھے بے خبر رکھ کر یہ قدم اُٹھایا تھا۔ شاید اسے پتا تھا کہ میں اسے کبھی بھی ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ دوسری طرف میں راجا کے بارے میں بھی فکر مند تھا۔ ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک؟

علی الصبح میں نے لطیف کو گاؤں کی چوپال کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ کوئی سن گن لے۔ لطیف کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تمہارا یہ ساتھی کافی ہوشیار ہے۔ اس نے کل شام کو ہی چودھری انور سے بات کر لی تھی۔ اسے حویلی میں تو نہیں رکھا گیا پر ڈیرے پر جگہ مل گئی ہے۔ ڈیرا گاؤں کی پچھلی طرف کھیتوں میں ہے۔ رات کو راجا ڈیرے پر ہی سویا ہے۔ آج وہ چودھری انور کو اپنی کاریگری دکھائے گا۔ لگتا ہے کہ وہ کام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''ثروت کے بارے میں کوئی خبر؟''

''نہیں......اس کے بارے میں تو کوئی پتا نہیں۔ حویلی کی دیواریں اتنی اُچی ہیں کہ ان

کے اندر کے معاملوں کو جاننا بڑا مشکل ہوتا ہے تابش بھائی!''

''دائی برکتے سے بات ہوئی تمہاری؟''

''ہاں...... وہ کہتی ہے کہ کل سویرے وڈی چودھرائن، ثروت کو باورچی خانے میں لے کر گئی تھی۔ اس نے ثروت سے کوئی کھانا پکوایا۔ چھوٹے کو وہ پسند آ گیا۔ چودھرائن نے اسے عارضی طور پر ایک ہفتے کے لیے باورچی خانے کا کام دیا ہے۔''

''لطیف بھائی! وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی اس کے لیے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''مجھے اندر کے حال کا کچھ کچھ پتا ہے۔ اگر تو وہ سیدھا سیدھا کام کرتی رہے گی تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مسئلہ تب ہی ہوگا جب اس سے کوئی اُلٹا پلٹا کام ہو جائے گا لیکن وہ مجھے سمجھ دار لگتی ہے۔ اس نے جاتے ساتھ ہی چودھرائن کو بتا دیا ہے کہ وہ خود تو پکی دیہاتن ہے، پر اس کی ایک شہری سہیلی ہے جس سے اس نے شہری کھانے پکانے سیکھے ہیں۔''

''ہاں...... سمجھدار تو بہت ہے لیکن اگر وہ کسی وجہ سے خود کو سنبھال نہ سکی تو؟ مثلاً اسے حویلی میں اچانک اس کا شوہر نظر آ گیا۔ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ عورت ذات ہے کوئی بھی جذباتی حرکت کر سکتی ہے۔''

''اسے کرنی تو نہیں چاہیے۔''

''ایک تو اس نے کی ہے نا۔ ہمیں بتائے بغیر خود ہی حویلی میں چلی گئی ہے۔'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لگتا ہے میاں بیوی میں بڑی محبت ہے۔ کوئی بچہ وچہ بھی ہے ان کا؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ ثروت تمہاری چچازاد ہے؟''

''نہیں...... خالہ زاد۔''

''جب تم اس کے بارے میں گل بات کرتے ہو تابش بھائی تو تمہاری آواز میں عجیب سی اُداسی آ جاتی ہے۔ میری بات کا بُرا نہ منانا۔ کیا اس کے علاوہ بھی تم دونوں کا کوئی رشتہ رہا ہے؟''

میرے اندر عجیب سی جھنجلاہٹ پیدا ہوئی۔ دل چاہا کہ اس ذاتی پوچھ گچھ کے جواب میں لطیف کو جھاڑ دوں لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ وہ میری بے لوث میزبانی میں مصروف تھا اور مجھے ''پیر بھائی'' سمجھ کر خود کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں...... ایسی کوئی بات

نہیں لطیف بھائی! یوسف کی گمشدگی نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ ایک بیمار بہن اور بوڑھے سسر کے سوا ثروت کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ جو کچھ کرنا ہے، مجھے ہی کرنا ہے۔ اسے سنبھالنا بھی ہے اور تلاش میں اس کی مدد بھی کرنی ہے۔''

''فرض کیا تابش بھائی! یوسف یہاں حویلی میں ہی مل جاتا ہے تو آپ کیا کریں گے؟''

''جو کچھ بھی کروں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھو لطیف بھائی! میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے تم پر یا تمہارے گھر والوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں پردے کے پیچھے سے اس کی بیوی نے آواز دی اور وہ اپنے بچے عثمان کو گدی پر بٹھا کر گھر کے اندر چلا گیا۔ آٹھ دس سالہ عثمان اپنی عمر سے زیادہ عقلمند تھا۔ بڑی چابک دستی سے دکان داری کر لیتا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی جو شاید کسی چاچی، تائی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

ثروت نے یوں اچانک حویلی میں جا کر مجھے عجیب ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے رات کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارا۔ صبح ناشتے کو بھی دل نہیں چاہا۔ لطیف اصرار کرتا رہا مگر میں نے دانت کے درد کا بہانہ بنایا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ کچھ اور نہیں تو وہ کہیں چھپ کر چھوٹا سا میسج ہی کر دیتی۔ بتا دیتی کہ خیریت سے ہے۔ میں آنکھیں بند کیے چٹائی پر نیم دراز تھا جب چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پہلو میں کھڑی تھی۔ دیہاتی لباس میں گاؤں کی کوئی دوشیزہ نظر آتی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''بھائی لطیف بتا رہے ہیں کہ آپ نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔''

''بس دل نہیں چاہا۔''

''آپ ناراض ہیں مجھ سے۔''

''میرا کوئی حق نہیں ناراض ہونے کا۔ ناراض تو تمہیں ہونا چاہیے کہ میں زبردستی تمہارے ساتھ چلا آیا ہوں۔ تمہارے معاملے میں مداخلت کر رہا ہوں۔''

''آپ کو غصہ ہے کہ میں آپ کو بتائے بغیر کیوں گئی۔ اگر میں بتاتی تو آپ کبھی جانے نہ دیتے۔ اور میں نہ جاتی تو یقین کریں بہت کچھ ہماری نظروں سے اوجھل رہتا۔'' وہ دبے

دبے جوش سے بولی۔

''کیا اوجھل رہتا؟''

''میں بتاتی ہوں سب کچھ۔ پہلے آپ ناشتہ کریں۔ میں دو منٹ میں آئی۔''

وہ میرے روکتے روکتے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ انڈا پراٹھا لے آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پراٹھا اس نے خود بنایا ہے۔ اس کے ہاتھ کا پراٹھا میں ہزاروں پراٹھوں میں سے پہچان سکتا ہوں۔ ایسی زبردست گولائی ہوتی تھی جیسے پرکار استعمال کی گئی ہو۔ لطیف کی بیوی رضیہ شاید تھکی ہوئی تھی یا پھر کسی دوسرے کام میں مصروف ہوگی۔

''تم بھی کھاؤ۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... میں کھا کے آئی ہوں۔ وہاں بھی پراٹھے اور انڈے ہی بنے ہیں۔ ساتھ میں مکئی کی میٹھی روٹی تھی اور سوجی کا حلوہ تھا۔ کافی ڈٹ کر ناشتہ کرتے ہیں یہ لوگ۔ چھوٹے بلال کو میں دلیا بنا کر دے آئی ہوں، وہ پراٹھا وغیرہ نہیں کھاتا۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ''ابھی دوپہر کے کھانے میں کافی ٹائم ہے۔ میں نے بڑی چودھرائن سے کہا۔ میں ایک چکر گھر کا لگا آؤں۔ سردرد کی دوا وہاں رکھی ہے، وہ لے آؤں۔''

''تمہیں کم از کم وہاں سے فون تو کر دینا چاہیے تھا۔ ایک میسج ہی بھیج دیتیں تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔''

''سوری تابش! دراصل میں فون لے کر ہی نہیں گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ فون کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا دیکھا تم نے وہاں؟''

اس نے اُٹھ کر دروازہ بھیڑا۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ''آپ کو پتا ہے حضرت تھانوی صاحب کہاں ہیں؟''

''کہاں ہیں؟''

''حویلی میں۔ میں نے خود دیکھا ہے انہیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکے۔ وہ ایک کمرے میں ہیں اور کوئی وظیفہ وغیرہ کر رہے ہیں بلکہ ان سے زبردستی کرایا جا رہا ہے۔''

''زبردستی؟''

''ہاں...... کوئی لمبا وظیفہ ہے شاید دو تین دن کا۔ پتا چلا ہے کہ حضرت صاحب یہ وظیفہ ہر چاند کی بائیسویں اور تیئسویں رات کو کرتے ہیں۔ کوئی خاص پڑھائی ہے جس کے لیے یہ دن وقف ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پڑھائی کا خاص اثر ہے۔ پرانی ضدی بیماری کے لیے یہ

وظیفہ بہت مفید سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کل خود دیکھا ہے، حضرت صاحب نے اپنے سامنے مٹی کا کورا پیالا رکھا ہوا ہے۔ اس میں پانی ہے۔ اس پر کچھ پڑھ رہے ہیں۔ بعد میں یہ پانی بوتل میں ڈال کر مریض کو دے دیا جائے گا۔''

''اور مریض کون ہے؟''

''وہی لڑکی جس کی ٹانگ کی چوٹ بگڑی ہوئی ہے۔ ہر وقت بخار میں رہتی ہے۔''

''تو وہ لڑکی ابھی یہیں ہے۔''

''ہاں تابش! وہ یہیں رہ رہی ہے۔ میں نے کل اسے پاس سے دیکھا ہے۔ اس کی شکل کچھ کچھ انڈین ایکٹریس سے ملتی ہے۔ اس نے آنکھوں پر نیلے لینس بھی لگا رکھے ہیں۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ حضرت صاحب جو پانی دم کر رہے ہیں وہ اس لڑکی کے لیے ہے؟''

''جی ہاں...... یہی پتا چلا ہے۔ حیرانی اور دُکھ کی بات یہ ہے کہ حضرت صاحب سے یہ سب کچھ زبردستی کرایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھیں کہ انہیں ڈرا دھمکا کر یہاں لایا گیا ہے۔ اور ان سے زبردستی وظیفہ پڑھوایا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کی عقل پر رونا آتا ہے۔ دم درود کا کام بھی بزورِ بازو کروا رہے ہیں۔''

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''میں نے سارا پتا کیا ہے۔'' وہ وثوق سے بولی۔ ''انڈین ایکٹریس کی شکل والی اس لڑکی کا نام نیتو ہے۔ کچھ عرصے پہلے اس کی ٹانگ میں کہیں گولی لگ گئی تھی جس سے ہڈی کو نقصان پہنچا تھا۔ یہ یہاں چودھری انور اور امجد وغیرہ کی خاص مہمان ہے۔ لاہور میں اس کی ٹانگ کے دو آپریشن ہوئے تھے لیکن چوٹ بگڑ گئی ہے۔ انفیکشن ہے جس کی وجہ سے بخار بھی ہو جاتا ہے۔ کسی نے انہیں حضرت صاحب کا بتایا اور یہ کہا کہ ان کا خاص وظیفہ ہڈی کے بگڑے ہوئے زخموں کے لیے بہت مفید سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بھی پتا چلا کہ یہ وظیفہ حضرت صاحب مہینے کی صرف خاص تاریخوں میں کرتے ہیں اور علاج کرانے والے بہت پہلے سے اس وظیفے کے لیے اپنے نام لکھوا لیتے ہیں۔ بہرحال یہ لڑکی اپنے ساتھیوں کے ساتھ تین چار دن پہلے یہاں سے ہارون آباد پہنچی ہے۔ ان لوگوں کے پاس چودھری انور کا ایک رقعہ بھی تھا جس میں چودھری انور نے کہا تھا کہ مریضہ ان کی خاص الخاص مہمان ہے اور جس طرح بھی ہو سکے اس کا کام پہلے کر دیا جائے۔''

ثروت نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ''آپ کو پتا ہی ہے۔ حضرت صاحب وظیفے یا دوا

دارو کے حوالے سے کسی کی سفارش یا مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے لڑکی اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ یہ وظیفہ مہینے میں صرف ایک بار ایک فرد کے لیے کرتے ہیں اور اس سے پہلے تین چار نام لکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ معذرت چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹری علاج جاری رکھا جائے، وہ ویسے اللہ کا کلام پڑھ کر پھونک دیتے ہیں، دعا بھی کرتے ہیں، ان شاء اللہ شفا ہو گی۔ لیکن اگر وہ لوگ ضرور یہی وظیفہ کروانا چاہتے ہیں تو پھر کچھ انتظار کر لیں۔ بس یہ معاملہ بحث اور تلخ کلامی میں بدل گیا۔ یہاں گاؤں سے ایک دو فون چودھری انور کے بھی گئے۔ حضرت صاحب اپنی اصولی بات پر قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے زبردستی کی گئی کچھ بندوں نے انہیں اسلحہ دکھا کر جیپ میں بٹھایا اور یہاں لے آئے۔"

میں حیرت سے سن رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح کا کام اس طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔ کسی سے گن پوائنٹ پر دعائے خیر کرائی جا سکتی ہے۔ اس سے پیلی حویلی کے چودھریوں کی عقل سمجھ کا اندازہ ہوتا تھا۔

ثروت نے کہا۔ "ویسے تو حضرت صاحب کو خوب عزت دی جا رہی ہے۔ نوکر چاکر کمرے کے پاس سے دبے پاؤں گزرتے ہیں۔ ان کے لیے اچھے سے اچھا کھانا پکوایا جا رہا ہے لیکن وہ وظیفہ مکمل کرنے سے پہلے یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے۔ میرا اندازہ ہے کہ آج شام یا کل صبح تک انہیں جیپ پر بٹھا کر احترام کے ساتھ ہارون آباد واپس چھوڑ آئیں گے۔"

"اور کوئی خاص بات نظر آئی وہاں؟"

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس زخمی لڑکی کی طرح ایک دو اور لڑکیاں بھی ہیں وہاں۔ ان کی حیثیت بھی وہاں مہمان کی سی ہے۔ لیکن میں ابھی تک انہیں دیکھ نہیں سکی۔ دراصل یہ کافی بڑی حویلی ہے۔ دو منزلیں ہیں۔ حویلی کے کچھ حصوں کی طرف ملازم جا ہی نہیں سکتے۔"

میں نے ثروت کو اس بارے میں تھوڑا بہت بتانا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا۔ "ثروت! یہ ایک بڑا فلمی قسم کا چکر چلا ہوا ہے یہاں۔ تمہیں پتا ہے آج کل ٹی وی وغیرہ پر بھی ہم شکل لوگوں سے پرفارمنس کرانے کا ٹرینڈ ہے۔ کھلاڑیوں، سیاست دانوں اور اداکاروں سے ملتی جلتی شکلوں والے لوگ ڈھونڈے جاتے ہیں اور وہ مزاحیہ پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمسایہ ملک انڈیا میں بھی یہ سلسلہ عرصے سے چل رہا ہے۔"

ثروت نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "ایک دو پرائیویٹ چینل ایسے بھی ہیں جو خاص طور سے ایسے پروگراموں

پر فوکس کرتے ہیں۔ ان میں سے ہی ایک چینل کے کچھ اہلکاروں کے ذریعے یہ دہرا گیم کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نام نہاد آرٹ اکیڈمیاں بھی اس میں ملوث ہیں۔ پھر انہیں شارٹ لسٹ کیا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے مزید چناؤ ہوتا ہے۔ اس عمل میں بعض اوقات کوئی حیرت انگیز مشابہت والا چہرہ بھی مل جاتا ہے۔ اس چہرے کو یہ لوگ اپنے مطلب کے لیے خاص طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ نیتو نامی لڑکی جو تم نے حویلی میں دیکھی ہے، وہ بھی ان منتخب چہروں میں سے ایک ہے۔ مجھے شک ہے کہ ایک اور انڈین ایکٹریس سے مشابہت رکھنے والی کم از کم ایک اور لڑکی ضرور یہاں موجود ہو گی۔ اس کا نام سویٹی ہے۔"

ثروت حیرت سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ روشن ماتھے پر اُلجھن کی پرچھائیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، آٹھ دس سالہ عثمان اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔ ہم چائے پینے لگے۔ عثمان ہمارے اردگرد ہی موجود رہا۔ لہٰذا ہم دوبارہ بات شروع نہ کر سکے۔ جب میں چائے میں چینی ہلا رہا تھا، ثروت بغور میرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔ "ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"پوچھو۔"

"یہ آپ کے ہاتھ پاؤں اتنے بدلے ہوئے سے کیوں ہیں؟ میرا مطلب ہے...... ان کی رنگت، ان کی جلد؟ بلکہ...... آپ...... سارے کے سارے بدلے ہوئے ہیں۔"

"تم بھی تو بدلی ہوئی ہو۔" میں نے چائے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں کسی اور حوالے سے بات کر رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ پچھلے عرصے سے بہت سخت زندگی گزار رہے ہیں آپ؟"

"تمہیں پتا ہی ہے، یہ دو چار برسوں کی بات نہیں۔ سکول کے زمانے سے شروع ہونے والا جنون ہے، وہی مارشل آرٹ۔"

"لیکن آپ میں تو اور کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ نصرت بتاتی تھی کہ آپ خود کو جان بوجھ کر تکلیف میں ڈالے رکھتے ہیں۔ زخم ہو تو اس کا علاج نہیں کرتے، درد ہو تو اس کی دوا نہیں کھاتے۔ بے وجہ سردی گرمی اور بھوک برداشت کرتے ہیں۔ یہاں بھی میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ نرم بستر چھوڑ کر چٹائی پر سو رہے ہیں۔ آپ کو کھانے پینے کی کوئی پروا نہیں۔"

"بھئی کھا پی تو رہا ہوں اور تم سے زیادہ کھا رہا ہوں۔ اور چٹائی پر سونا مارشل آرٹ کے کھلاڑیوں کے لیے...... بلکہ سب کھلاڑیوں کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ کمر میں درد نہیں ہوتا۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "آپ بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو عادت پڑ گئی ہے، خود

کو تکلیف دینے کی اور تکلیف دے کر خوش ہونے کی۔''

''تمہارے لیے یہ بات اطمینان کا باعث نہیں کہ میں خوش ہوں۔''

وہ لاجواب سی ہوگئی۔ اسی دوران میں عثمان باہر جاچکا تھا۔ میں دوبارہ اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے اسے وضاحت سے بتایا کہ کچھ جرائم پیشہ لوگ مشہور اداکاراؤں کی ہم شکل لڑکیاں ڈھونڈ رہے ہیں اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرنے میں مصروف ہیں۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ پُرتفکر انداز میں بولی۔

''تابش! اگر آپ اور آپ کے دوستوں نے چھان بین کی ہے تو ٹھیک ہی کی ہو گی لیکن...... یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پھر ان لڑکیوں کو اس دور دراز گاؤں میں کیوں لایا گیا ہے؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ثروت! یہ انسانی اسمگلنگ کا معاملہ لگتا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کو اس سرحدی گاؤں سے کسی طرح بارڈر پار پہنچا دیا جائے گا۔''

ایک دم ثروت کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ وہ بولی۔ ''تابش! تو پھر یوسف کیوں یہاں ہیں؟ ان کا اس معاملے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ کیا یہ لوگ...... انہیں بھی بارڈر پار پہنچانا چاہتے ہیں؟''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ثروت کے الفاظ پوری شدت سے میرے کانوں میں گونجے اور مجھے لگا کہ جس سوال کا جواب مجھے اور عمران کو پچھلے کئی دن سے نہیں مل رہا تھا، شاید آج مل گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اتفاقاً یوسف فاروقی کی شکل بھی کسی مشہور چہرے سے مل گئی ہو۔ جب یوسف نے پاکستانی فلمی ہیروئن کی ''نقل'' کے ساتھ رات گزاری تھی، اسے جاوا کے کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ ان پر انکشاف ہوا ہو کہ یوسف خود بھی ایک کام کی چیز ہے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' ثروت کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ نہیں، یونہی ایک خیال ذہن میں آیا ہے۔'' میں نے کہا اور ایک بار پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ جہاں تک میری معلومات تھیں، یوسف کی شکل کسی پاکستانی یا بھارتی فلمی اداکار سے تو ہرگز نہیں ملتی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی اور شعبے کی سیلیبریٹی سے اس کی مشابہت ہو۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب یوسف زخمی ہو کر ہسپتال میں تھا تو شاربہ بائی ایک خاص بندے کو عیادت کے بہانے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ بندہ صرف یوسف کا ملاحظہ کرنے کے لیے آیا

تھا۔ یہ ملاحظہ اسی خاص مشابہت کے حوالے سے ہوسکتا تھا۔ مجھے لگا کہ واقعات کی کڑیاں آپس میں مل رہی ہیں۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! نہ جانے کیوں میرا یہ یقین پکا ہوتا جا رہا ہے کہ یوسف کو بھی اسی حویلی میں لایا گیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ......'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

وہ اپنی خوبصورت ذہین آنکھوں سے مجھے دیکھتی جا رہی تھی، میری بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یوسف کو بھی یہاں سے سرحد پار پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔''

''ہاں ثروت! ایسا ہو بھی سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم کوشش کرو کہ اگلے چند گھنٹوں میں یوسف کے بارے میں کچھ پتا چل سکے۔ اگر کنفرم ہو جائے کہ وہ واقعی حویلی میں ہے تو پھر ہم ہر طرح کی کارروائی کر سکتے ہیں۔ پولیس اور دوسرے اداروں کی مدد بھی لی جاسکتی ہے۔''

ثروت نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے چین نظر آنے لگی۔ احمد تھانوی صاحب کے حوالے سے اسے جو ڈھارس تھی، وہ تو تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے تابش! میں واپس جاتی ہوں۔ جونہی کسی بات کا پتا چلا، میں آپ سے رابطہ کروں گی۔''

''کیسے؟''

''میں خود چکر لگالوں گی۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ثروت! بہت احتیاط سے۔ کسی طرح کا رسک نہیں لینا۔''

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی لاتعلقی نظر آئی۔ یہ لاتعلقی میری فکرمندی سے تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی زیادہ سے زیادہ مر ہی جاؤں گی۔

اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور باہر نکل گئی۔ ثروت [illegible] میری دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔ میں نے ثروت کو راجا کے بارے میں اور حویلی میں اس کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لطیف کی بیوی رضیہ کو بھی راجا کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔

لطیف دکان کا سودا لینے کسی قریبی قصبے تک گیا ہوا تھا۔ اس کا بیٹا عثمان، باپ کی جگہ دکان پر بیٹھا تھا۔ دوپہر کو مجھے چنے کھا کر گزارہ کرنا پڑا۔ پتا چلا کہ لطیف کی بیوی کی طبیعت

ٹھیک نہیں۔ سہ پہر کے وقت مجھے دور سے راجا آتا دکھائی دیا۔ اس کی دھوتی ہوا میں پھڑ پھڑ رہی تھی۔ وہ عام سے انداز میں دکان پر آ کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ کا پیکٹ خریدا۔ وہ شاید مجھ سے کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن لطیف کے بجائے اس کا بیٹا دکان پر بیٹھا تھا۔ پھر اسی دوران میں حویلی کا ایک عمر رسیدہ ملازم بھی دکان کے اندر آ کر بیٹھ گیا اور عثمان سے گپ شپ کرنے لگا۔ راجا کو کوئی بھی بات کیے بغیر واپس حویلی جانا پڑا۔

جس وقت وہ حویلی والی گلی میں داخل ہو رہا تھا، وہاں سے ایک جیپ نکلتی نظر آئی۔ یہ حویلی ہی کی کیچڑ آلود جیپ تھی۔ جیپ دکان کے سامنے سے گزری تو میں چونک گیا۔ اس میں مجھے احمد تھانوی صاحب کی جھلک نظر آئی۔ اندازہ ہوا کہ ان کا کام ختم ہو چکا ہے اور انہیں واپس ہارون آباد پہنچایا جا رہا ہے۔ وہ بہت خاموش بلکہ رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

میں موجودہ صورتِ حال پر عمران سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کئی فون کیے لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وہ پتا نہیں کس چکر میں پڑا ہوا تھا۔ لطیف کی واپسی شام کے فوراً بعد ہی ہو گئی۔ وہ اپنی سائیکل پر بہت سامان لاد کر لایا تھا۔ اس نے دوپہر کے کھانے کا پوچھا۔ میں نے بتایا کہ بھوک ہی نہیں تھی۔ تھوڑے سے چنے پھانک لیے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ دوپہر کو کھانا پکایا ہی نہیں گیا۔ اس نے پُرتکلف کھانا پکوایا۔ چھوٹا گوشت، چاول اور حلوہ وغیرہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم حسبِ معمول بیٹھک میں آ بیٹھے۔ لالٹین کی روشنی میں ریڈیو سنتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آج تیز ہوا چل رہی تھی۔ مطلع بھی ابر آلود تھا۔ شام سے پہلے دائی برکتے پیلی حویلی سے ہو کر آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ثروت وہاں خوش ہے۔ ایک ملازمہ آمنہ کے ساتھ مل کر اس نے باورچی خانے کا سارا کام سنبھالا ہوا ہے۔ لڑکا بلال بھی اس سے راضی ہے۔ وڈی چودھرائن نے ثروت کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو اسے یہاں مستقل بھی رکھا جا سکتا ہے۔

لطیف کو احمد تھانوی صاحب کی گاؤں میں آمد اور رخصتی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے بھی اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی دوران میں عمران کا فون آ گیا۔ یہ کال اس نے اپنے نمبر سے نہیں کی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کہاں غائب ہو، گدھے کے سینگوں کی طرح۔ میں نے کوئی دس بار فون کیا ہے تمہارا نمبر ہی بند ہے۔''

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''بس یار تنگ آ گیا ہوں ان دونوں لڑکیوں سے۔''

''کون لڑکیاں؟''

''ارے یہی نرگس اور ریما۔ بس جان کھا لیتی ہیں یہ۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ وہ لڑکیاں ہیں۔ شادیاں وقت پر ہو گئی ہوتیں تو تمہارے جتنے بچے ہوتے ان کے۔''

''بس تم جل جل کر کباب ہوتے رہنا۔ جب ایسی باتیں کرتے ہو تو شاہین کے سگے بھائی لگتے ہو۔''

''اچھا...... یہ فون بند کر کے کیوں بیٹھے ہو؟''

''تمہیں بتایا تو ہے یار! ان لڑکیوں نے جینا دوبھر کیا ہوا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی شوبز کی کچھ اور لڑکیوں کو بھی میرے اندر سرخاب کے پَر نظر آنے لگے ہیں۔ یار! سچ بتاؤ مجھ میں ہے کوئی ایسی بات؟ عام سا بندہ ہوں۔ اب اگر اللہ نے خوبصورتی یا ذہانت دی ہے تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔''

''تم تو پیدائشی نردوش ہو۔'' میں نے تائید کی۔

''یقین کرو تابی! میں تو کئی بار اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ مجھے بالکل عام سا شخص بنا دے...... جیسے تم ہو، جیسے یہ اپنا شیخ (جیلانی) ہے۔''

''اچھا...... تم نے کوئی کام کی بات کرنی ہے یا میں فون بند کر دوں؟''

''ار...... ررررے...... نہیں...... یہ غضب نہ کرنا۔ پھر پتا نہیں کال مل سکے یا نہیں۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ انسپکٹر شوکت کو میں نے مسلسل پیچھے لگایا ہوا ہے شاربہ بائی کے...... اور حنیف کے۔ حنیف نے تھوڑا بہت اور بتایا ہے یوسف کے بارے میں۔''

''کیا؟'' میرا تجسس اُبھر آیا۔

''حنیف کا کہنا ہے کہ اتفاق سے یوسف کی ایک بدقسمتی اس کے لیے مشکل کی وجہ بن گئی ہے ورنہ اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہونا تھا۔ اس نے شاربہ بائی کو دس لاکھ روپے دیئے تھے اور اس کے بدلے گلبرگ والی کوٹھی میں ''مزیدار'' رات گزاری تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے گھر چلے جانا تھا اور نقلی ہیروئن نے اپنے گھر۔ قصہ ختم...... مگر ہوا یوں کہ گلبرگ والی کوٹھی میں جاوا کے ایک دو بندوں نے یوسف کو دیکھا اور حیران رہ گئے۔ یوسف کی شکل انڈیا کے کسی مشہور بندے سے مل رہی تھی اور کافی زیادہ مل رہی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کوئی اداکار تھا، کھلاڑی تھا یا پھر سیاست دان یا سیاست دان کا بیٹا وغیرہ۔ جاوا کے لوگ اس کے لیے للچا گئے اور اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو ہمارے سامنے ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جو بات تم کہہ رہے ہو، وہ آج صبح میرے ذہن میں بھی آئی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے، انڈین اداکارہ کرشمہ کپور سے مشابہت رکھنے والی لڑکی نیتو بھی یہاں

اس گاؤں میں موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ اورلڑکی بھی یہاں ہو۔ آثار سے لگ رہا ہے کہ ان لوگوں کو سرحد پار پہنچایا جائے گا۔''

عمران بولا۔''سب سے پہلے تو تم یہ کنفرم کرو کہ یوسف یہاں حویلی میں ہے یا نہیں۔ اگر وہ موجود ہے تو پھر ہمیں فوری طور پر کوئی قدم اُٹھانا چاہیے۔''

''قدم تو اب بھی اُٹھایا جاسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اگر یوسف اندر موجود ہے تو پھر ہمیں احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ یہ نہ ہو کہ پولیس گھیرا ڈالے یا ہلا بولے اور وہ لوگ اندر والوں کو نقصان پہنچا دیں۔''

''میں نے ثروت سے کہا تو ہے کہ وہ جلد از جلد یوسف کی ٹوہ لگائے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی لطیف کسی کام سے اُٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ وہ بیوی سے کسی بات پر بول رہا ہے۔ جھگڑے کی سی صورتِ حال تھی۔ پھر یہ آواز مزید واضح ہوگئی۔ میں نے عمران سے بات مختصر کر کے فون بند کیا اور آوازوں پر کان لگا دیئے۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں بیٹھک سے اٹھا اور آوازوں کی سمت بڑھا۔ یہ ایک بند کمرے میں سے آرہی تھیں۔ کمرے سے باہر برآمدے میں چھوٹا عثمان مچھر دانی لگائے سو رہا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ آوازیں وضاحت سے سنائی دینے لگیں۔ لطیف لرزاں آواز میں کہہ رہا تھا۔''تم نے بہت بُرا کیا رضیہ! تم پر لعنت ہو، اللہ کی مار ہو تم پر۔ تمہیں ذرا خیال نہ آیا۔ وہ پیر بھائی ہے، مہمان ہے ہمارا۔ اوہ خدایا! اس عورت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اوہ خدایا......''

رضیہ تنک کر بولی۔''رونے کے بجائے شکر کر خدا کا۔ میں نے تجھے بچا لیا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے، یہ بات چودھریوں سے ڈھکی چھپی رہنی تھی۔ وہ اُڑتی چڑیوں کے پَر گنتے ہیں۔ ایک آدھ دن میں تیرا سارا پول کھل جانا تھا۔ پھر انہوں نے ننگا کر کے اُلٹا لٹکا دینا تھا تجھے اور ساتھ میں مجھے بھی۔ تیرے دماغ میں پتا نہیں کیا بھرا ہوا ہے۔ تجھے اتنی سمجھ نہیں آتی۔ ہم نے اس پانڈ میں رہنا ہے۔ یہاں جینا اور مرنا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہمارے۔''

''پر تو نے ان کا بھی سوچا ہے؟ اب ان کے ساتھ کیا ہوگا؟''

''وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔ ان سے کس حکیم نے کہا تھا کہ وہ یہاں آئیں اور بھیس بدل کر جاسوسیاں کریں۔ میں تجھے لکھ کر دے دیتی ہوں، اس کی یہ بات بھی جھوٹی ہے کہ وہ پولیس والا ہے۔ پولیس والا ہوتا تو اب تک کئی پولیس والے یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ بکواس کرتا ہے وہ۔ تجھے اُلو بنا رہا ہے۔''

''اوہ خدایا۔'' لطیف پھر کراہا۔

رضیہ نے کہا۔''اب کیے کرائے پر پانی نہ پھیرنا۔ میں نے یہی کہا ہے وڈی چودھرائن سے کہ مجھے لطیف نے بھیجا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا بات؟''

ابھی اس کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میری رگوں میں لہو نے اُچھالا مارا۔ لگتا تھا کہ حویلی سے لوگ پہنچ گئے ہیں۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ کمرے میں واپس آیا۔ لکڑی کی ایک ڈولی کے نیچے میں نے کولٹ پسٹل چھپا رکھا تھا۔ میں نے پسٹل نکالا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جو گھر اور دکان کو ملاتا تھا۔ دروازے میں سے گزر کر میں تاریک دکان میں داخل ہوا۔ گاجر کے مربے کا ایک مرتبان میرا گھٹنا لگنے سے کچے فرش پر گرا اور ٹوٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ لطیف دکان کو اندر کی طرف سے بس ایک تالا لگاتا ہے۔ میں نے تاریکی میں ٹٹول کر تالے کا سراغ لگایا۔ گلی میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ دروازے پر دستک دینے والے اب اندر آ گئے تھے۔ ان کی بلند غصیلی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے پسٹل کی نال تالے کے اوپر رکھ کر فائر کیا۔ اندھیرے میں دھماکے سے شعلہ چمکا۔ میرے دوسرے فائر سے تالا ٹوٹ گیا۔ میں نے لکڑی کے آٹھ نو فٹ چوڑے دروازے کی کنڈی کھولی مگر اس سے پہلے کہ میں دکان سے باہر قدم رکھتا، اندر آنے والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ میری طرف دو رائفلوں کی نالیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ سیدھا میرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔''خبردار اوئے! بھون کر رکھ دیں گے۔'' ایک کرخت آواز تاریکی میں گونجی۔ اسی دوران میں باہر کی طرف سے دکان کا دروازہ بھی ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ کئی افراد اس طرف بھی موجود تھے اور ان میں سے یقیناً کچھ مسلح بھی تھے۔ مزاحمت کرنے کو میں اب بھی کر سکتا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی۔ مرنے اور مار دینے کا وہی جذبہ تھا جس کے بیج عمران نے میرے اندر بو رکھے تھے اور جس کی آبیاری بھانڈیل اسٹیٹ میں جیکی کی کڑی تربیت نے کی تھی۔ لیکن پھر مجھے ثروت کا خیال آیا۔ ثروت اونچی دیواروں والی اس حویلی میں موجود تھی جہاں سے یہ لوگ دندناتے ہوئے آئے تھے۔ اگر اس مزاحمت کے دوران میں مجھے کچھ ہو جاتا تو وہ کم از کم آج کی رات کے لیے تو اس حویلی میں تنہا رہ جاتی۔ نہیں میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے دل سے آواز آئی۔

میں نے اپنا پسٹل جھکا لیا۔

''اس کو پھینک کر پیچھے ہٹو۔'' اندھیرے میں سے ایک گرج دار آواز نے کہا۔

میں نے پسٹل پھینک دیا۔ ایک شخص نے چمکدار میخوں والی لاٹھی گھما کر میرے کندھے

پر ماری۔ دو افراد نے مجھے عقب سے جکڑ لیا۔ میری گردن اور سر پر پستول کے دستے سے سخت چوٹیں لگائیں۔ میں چاول اور دالوں کی ادھ کھلی بوریوں پر گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے صفائی سے اپنا سیل فون دال کی ایک بوری میں گھسا دیا۔ انہوں نے ایک بڑے رومال سے میرے ہاتھ پشت پر کس کر باندھ دیئے۔ اس دوران میں وہ گالیوں کی بارش بھی کرتے رہے۔ اب میرے اردگرد لالٹینوں کی روشنی تھی۔ میں نے دیکھا لطیف دور ایک کونے میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ میں نے بھی اسے امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ چودھری کے کارندوں نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور پھر گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

اور اب میں اونچی دیواروں والی پیلی حویلی کے اندر تھا۔ یہ انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی پختہ عمارت تھی۔ اردگرد کے کچے مکانوں سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ دیواریں موٹی اور چھتیں اونچی تھیں۔ محرابی دروں میں پرانی لکڑی کے مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔ ان میں آہنی کیلیں قطار اندر قطار دور ہی سے دکھائی دیتی تھیں۔ حویلی گاؤں کے اس حصے میں تھی جہاں بجلی موجود تھی۔ مجھے وسیع و عریض بیٹھک نما جگہ پر پہنچایا گیا۔ بیٹھک کی آرائش خالص دیہاتی طرز کی تھی۔ بیٹھنے کے لیے صوفوں کی جگہ رنگین پایوں والے پلنگ تھے۔ ان پر کڑھائی دار گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ گھنی مونچھوں اور تمتمائے چہروں والے دو تین افراد یہاں موجود تھے اور شاندار قسم کے حقے گڑگڑا رہے تھے میں نے قمیص پتلون والے ایک دبلے پتلے نوجوان کو دیکھا جو ایک حقے کی چلم درست کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے لطیف نے بتایا تھا کہ یہاں نچلے درجے کے سارے کام شہر سے آئے ہوئے ملازم کرتے ہیں۔ اب اس کا ثبوت بھی مل رہا تھا۔ لیکن سوچنے کی بات تھی کہ کیا چودھری انور ازدواجی رشتے کو بھی نچلے درجے کا کام سمجھتا تھا جو اس نے دو شہری بیویاں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس نے انہیں اولاد سے بھی محروم رکھا ہوا تھا۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ میرے سامنے رنگین پلنگ پر بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا ہوا پینتیس چالیس سالہ شخص چودھری انور ہی ہے۔ چہرے کے رنگ کے مقابلے میں اس کے ہونٹ قدرے سیاہ تھے۔ یہ اس کی سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کی علتوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ چودھری انور کی دہشت قرب و جوار کے حاضرین پر مسلمہ تھی۔ اس کے عقب میں ایک خطرناک صورت شخص کندھے سے پستول لٹکائے چوکس کھڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک طرف لکڑی کی ڈھائی تین فٹ اونچی میز کے اوپر ایک دیہاتی نوجوان مرغا بنا ہوا تھا۔ قطرہ قطرہ پسینہ اس کے چہرے سے میز پر ٹپک رہا تھا۔ پتا نہیں بیچارے کو کس جرم کی سزا دی

گئی تھی۔ اگر وہ وہاں سے گر جاتا تو سخت چوٹ آتی۔

مجھے بھی کسی ملزم کی طرح چودھری کے سامنے پیش کیا گیا۔ میرے ہاتھ ابھی تک صافہ نما رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر ایک دو چوٹیں بھی آئی تھیں جن کی میٹھی میٹھی جلن میرے جسم میں تپش جگا رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک طرف سے چھوٹا چودھری امجد برآمد ہوا۔ اس نے ثروت کا بازو کندھے کے قریب سے پکڑ رکھا تھا۔ چہرے پر کرختگی تھی۔ وہ ثروت کو کھینچ کر لایا اور چودھری انور کے قریب کھڑا کر دیا۔ ثروت کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں اور اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ میرے تن بدن میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ تاہم ان چنگاریوں کی جلن میں عجیب طرح کی لذت بھی تھی۔ آج ایک طویل......طویل عرصے بعد میں اور ثروت اکٹھے ایک مشکل کا شکار تھے اور آج میں وہ پہلے والا تابش نہیں تھا۔ میرے اندر اور باہر بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ میرے سینے میں ایک پُر جوش دل دھڑک رہا تھا۔ وہ دل جو اپنی ہمت کو آزمانا چاہتا تھا۔ اور میری محبوب ترین ہستی میرے رُوبرو تھی۔ وہ جس کے سپنے میں نے دن رات آنکھوں میں سجائے تھے، جس کے لیے تکلیف سہنا اور جان دینا میرے لیے سعادت کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ ثروت کے لیے یوں تو ہمیشہ ہی سے سب کچھ فدا تھا لیکن اب ناقابلِ عبور فاصلوں نے شاید ان جذبوں میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں یہ حویلی اور اس حویلی کے لوگ مجھے حقیر محسوس ہوئے۔ ان کی تمام تر خونخواری کے باوجود مجھے لگا کہ میں ان کو چیر کر گزر سکتا ہوں۔ ہاں...... اگر ثروت میرے ساتھ تھی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ تو پھر کوئی مصیبت، مصیبت نہیں تھی۔ کوئی دیوار، دیوار نہیں تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کی سخت ترین آزمائش سے گزرنے کے بعد اور جارج گورا جیسے خطرناک ترین فائٹر سے ٹکرانے کے بعد میرے اندر ایک خاص طرح کا اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ بے شک پیلی حویلی کے یہ چودھری بہت سفاک تھے لیکن یہ میرے لیے پہلا موقع نہیں تھا کہ میں ایسے لوگوں کے رُوبرو تھا۔ جارج گورا کی ہزیمت کے مناظر میرے اندر ایک اضافی توانائی پیدا کرتے رہتے تھے اور اس کی شکست میرے جسم پر ایک تمغے کی طرح سجی ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تمغہ میرے سینے پر نہیں تھا، کہیں اور تھا۔ یہ تمغہ ایک چرمی کور کے ذریعے میری ران سے بندھا ہوا تھا۔ یہ وہی نادر چاقو تھا جس نے جارج کا پیٹ پھاڑا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے لطیف کی دکان میں میری جو سخت تلاشی ہوئی، اس میں یہ چاقو محفوظ رہا تھا۔

چودھری انور نے حقہ گڑگڑا کر مونچھوں کے اوپر سے گاڑھا سفید دھواں چھوڑا اور مجھے

گھورتے ہوئے بولا۔ ''اوئے بدبختا! کہاں سے آیا ہے تُو...... کس باغ کی مولی ہے؟''

میں خاموش کھڑا رہا۔

چودھری بولا۔ ''سنا ہے کہ تُو خود کو پلس والا بتاتا ہے اور کسی کو چھڑانے شڑانے کے لیے یہاں آیا ہے۔ کس پیوی کی کھچ تجھے لے آئی ہے یہاں؟''

ثروت نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''اوئے! یہ تو ہمیں بھی پتا ہے رات کی رانی کہ قصور تیرا ہی ہے۔ تیرا بندہ کسی طوائف کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔ کسی ہوٹل شوٹل میں دل پشوری کر رہا ہوگا اور تُو اپنے اس یار کے ساتھ آگئی ہے اسے ڈھونڈنے کے واسطے۔'' چودھری انور نے کہا۔ پھر اپنے عقب میں کھڑے شخص سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے! کیا کہتے ہیں مولا داد! انے کتے تے ہرناں دے شکاری۔''

مولا داد سمیت دو تین افراد نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔

اسی دوران میں ایک طرف سے نیتو عرف کرشمہ کپور لنگڑاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ اس نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

چودھری انور بھی کچھ ٹھٹک گیا۔ کرشمہ کپور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم اس کو جانتی ہو بی بی؟''

''اس کو نہیں جانوں گی تو اور کس کو جانوں گی۔'' وہ زہریلے انداز میں بولی۔ ''یہ اور اس کا ساتھی ہی تو تھا جنہوں نے میری زندگی حرام کی ہے۔ ان پر چلائی ہوئی گولی ہی لگی تھی مجھے۔ نادر کو مارنے والے اور اس کی لاش کی ویڈیو فلم بنانے والے بھی یہی ہیں۔ مم...... مجھے تو لگتا ہے چودھری جی کہ اس کا ساتھی بھی یہیں کہیں گاؤں میں ہی ہوگا۔''

چودھری انور اور چودھری امجد کے چہرے متغیر ہوگئے۔ لگتا تھا کہ وہ نادر کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ ماحول میں عجب سی سنسنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا، ثروت کا چہرہ زرد تر ہوگیا ہے، وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

چودھری انور نے حقے کا طویل کش لے کر کہا۔ ''نادر وہی ہے نا جو ڈانگ (لاٹھی) کی طرح لمبا سا تھا۔''

''جی چودھری جی۔'' کرشمہ کپور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ بڑا بہادر بندہ تھا جی۔ سلطان صاحب کے پسینے پر اپنا خون گراتا تھا۔ اس کی موت کا سلطان صاحب کو بڑا دُکھ ہوا۔ انہوں نے ان دونوں کو بڑا ڈھونڈا ہے لاہور شہر میں۔ یہ ایک دم کہیں غائب ہوگئے تھے۔

اب دیکھیں یہ ملا بھی ہے تو کہاں۔ آپ کسی طرح لاہور میں سلطان صاحب کو خبر پہنچائیں۔ ان کا دل باغ باغ ہو جائے گا اس اطلاع سے۔'' کرشمہ کپور کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

کرخت چہرے والے مولا داد نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور زور زور سے جھٹکے دیتا ہوا بولا۔ ''اوئے بتا، کہاں ہے وہ تیرا حرامی یار! کس ماں کی گود میں چھپا ہوا ہے۔ اسی پنڈ میں ہے یا کہیں اور ہے؟''

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے پیٹ میں گھٹنے کی زوردار ضرب لگائی۔ میں اس ضرب کے لیے تیار نہیں تھا۔ شدید چوٹ لگی اور میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ دو افراد مجھ پر پل پڑے۔ مجھے گھونسے اور لاتیں رسید کی گئیں۔ تکلیف ہو رہی تھی لیکن مزہ بھی آ رہا تھا۔ مزہ اور تکلیف میرے لیے اکثر اسی طرح گھل مل جاتے تھے۔

ثروت چلائی۔ ''خدا کے لیے خدا کے لیے ان کو نہ ماریں۔''

چودھری انور کے اشارے پر مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میری قمیص اور بنیان دونوں پھٹ گئی تھیں۔ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ چودھری انور نے وحشی نظروں سے ثروت کو گھورا۔ ''اس سوہنی کڑی کو بڑا دُکھ ہوا ہے۔''

چھوٹے چودھری امجد نے ثروت کے بال مٹھی میں جکڑے اور گرج کر بولا۔ ''سچ بتا...... یہ کیا لگتا ہے تیرا اور کس لیے اس کے ساتھ بھاگی پھر رہی ہے؟''

''مم...... میری کسی سے دشمنی نہیں۔ میں بس اپنے میاں کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اُف...... مجھے چھوڑ دو۔'' ثروت کراہی۔ اس کی گردن مڑی ہوئی تھی اور تکلیف کے سبب چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔

''چھوڑ دو اسے۔'' میں گرجا۔ ''اپنے ہاتھ دور رکھو اس سے۔ نہیں تو پچھتاؤ گے...... میں...... قبرستان بنا دوں گا اس حویلی کو۔''

چھوٹے چودھری امجد نے اپنی گرفت ذرا نرم کر دی۔ ثروت کے چہرے پر تکلیف کے آثار کم ہوگئے۔ بڑے چودھری انور نے بڑی تیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان نظروں میں زہر تھا اور آگ تھی۔ وہ سر ہلا کر بولا۔ ''واہ بھئی واہ...... بڑا پیار ہے مرجا صاحباں میں۔ ایک دوجے کے اندر جندڑی ہے بھئی ان کی۔ پیار واقعی بڑی چنگی چیز ہے۔ کئی کام اس کی وجہ سے سوکھے (آسان) بھی ہو جاتے ہیں۔ کیوں بھئی مولا داد؟'' اس نے معنی خیز نظروں سے پستول بردار مولا داد کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی خضاب لگی مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ''آہو جی! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔''

چودھری انور نے کہا۔ ”ویسے بھی تم کافی دنوں بعد جیل سے آئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس صاحباں کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ مرجا (مرزا) جب اس کا تماشہ دیکھے گا تو خود ہی فرفر بولنا شروع کر دے گا۔ جو پوچھیں گے وہ تو بتائے گا ہی، جو نہیں پوچھیں گے وہ بھی بتائے گا۔“

چھوٹے چودھری امجد نے ایک بار پھر ثروت کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ میرے ہاتھوں کو بہت مضبوطی سے نہیں باندھا گیا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر میں کوشش کروں تو اپنے ہاتھوں کو کپڑے کی گرفت سے نکال سکتا ہوں۔ یہی وقت تھا جب ایک موٹی تازی بارُعب عورت اندر آئی۔ اس کا بھاری چہرہ سیب کی طرح سرخ تھا۔ وہ چمکیلے لاچے کُرتے میں تھی۔ جسم پر گہنے بھی نظر آتے تھے۔ میں پہلی نظر میں پہچان گیا کہ وہ وڈی چودھرائن ہے۔ اس نے چودھری امجد سے کہا۔ ”وے امجدے! چھوڑ دے اس لسی مینی (کمزور بکری) کو۔ کہیں اس کی گردن کا کڑاکا ہی نہ نکل جائے۔“

امجد نے ایک بار پھر گرفت ذرا نرم کر دی۔ عورت، چودھری انور کے پاس پلنگ پر جا بیٹھی۔ اس کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔ اس نے چودھری کے کان میں ایک دو باتیں کیں۔ چودھری پہلے تذبذب میں رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور نیم رضامند نظر آنے لگا۔

کچھ دیر بعد چودھری اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے مرغا بنے لڑکے کی بقایا سزا معاف کی اور اسے دو چار گالیاں دے کر بیٹھک سے باہر بھیج دیا۔ پھر چھوٹے چودھری امجد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ابھی جا رہا ہوں۔ تم گڈی باہر نکلوا دو۔ اور ان دونوں کو بند کر دو۔ صبح دیکھیں گے کیا کرنا ہے ان کا۔“

میرے سر پر دو چار مزید دوہتڑ مارے گئے اور دھکیل کر ایک چھوٹے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرہ بھی کیا بس بیٹھک کے عقب میں ایک کوٹھڑی سی تھی۔ حیرت یہ ہوئی کہ ثروت کو بھی میرے ساتھ ہی کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا۔ مجھے کوٹھڑی میں بند کرتے وقت مجھ سے میرے موبائل فون کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ موبائل میرے پاس تھا لیکن اب نہیں ہے۔ شاید کہیں گر گیا ہے۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند ہوا تو وہ چٹائی پر بیٹھ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ میں لڑکپن سے اس کا رمز شناس تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس کی سسکیوں میں چھپی ہوئی آواز میں پڑھ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ کیا واقعی میں قاتل بن چکا ہوں؟ کیا واقعی میں نے اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر کسی شخص کو قتل کیا ہے؟ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں نے ایسا

کیا ہے اور ایک بار نہیں، کئی بار کیا ہے۔ ایک چیونٹی تک نہ مارنے والا تابش اب جان لینا اور دینا سیکھ چکا ہے۔ دنیا نے اسے سکھا دیا ہے۔

یہاں ایک دروازے اور روشن دان کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک میلا سا بلب کوٹھڑی میں روشنی بکھیر رہا تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ثروت نے ہاتھ کھول دیئے اور میری کلائیوں کو سہلایا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے۔

وہ بولی۔ ”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری طرف سے آپ کو ہمیشہ دُکھ ہی ملے ہیں۔“ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بڑی احتیاط سے بات کرنی ہوگی۔ مجھے شک ہے کہ یہ لوگ ہماری باتیں سننے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اسی لیے اکٹھے بند بھی کیا گیا ہو۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو اس کے شفاف رُخساروں پر لڑھک گئے۔ میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ”تمہیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟“

”نہیں......لیکن آپ کو تو آئی ہیں۔ کپڑے بھی پھٹ گئے ہیں۔“

میں نے کوٹھڑی کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ لکڑی کے دروازے میں ایک معمولی سی درز موجود تھی مگر اس درز سے کوٹھڑی کے بس ایک مختصر گوشے کو ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ کوئی روشندان میں سے ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتا تو ہمیں پتا چل سکتا تھا۔ لکڑی کی ایک خالی الماری، پلاسٹک کے ایک واٹر کولر اور دو تین جھوٹے برتنوں کے سوا یہاں اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ شاید ہم سے پہلے وہی معتوب لڑکا یہاں بند تھا جو باہر بیٹھک میں نظر آیا تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہم نے دو طرح کی گفتگو کی۔ جو باتیں عام تھیں وہ نارمل لہجے میں کہیں لیکن خاص بات سرگوشیوں کی صورت میں کہی۔ سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھے اپنے ہونٹ ثروت کے کان کے پاس لانے پڑتے تھے اور ایسا ہی ثروت بھی کرتی تھی۔ نہایت سنگین صورتِ حال کے باوجود اس کی یہ قربت مجھے بھا رہی تھی۔ اس کی سانسوں کا لمس میرے چہرے اور پورے جسم میں ایک سنسناہٹ جگاتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ مجھے ان پریشان کن حالات کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ پریشانی کی جگہ دل و دماغ میں عجیب سی ترنگ تھی۔ کچھ کر دکھانے کا عزم تھا۔

اچانک کچھ مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگا جیسے ایک مرد اور عورت کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ پھر مرد کا ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ مجھے لگا

کہ یہ اپنے راجا کا قہقہہ ہے۔ مرد، عورت کی آوازیں کبھی ذرا بلند ہو جاتیں، کبھی بالکل دھیمی پڑ جاتیں۔ حویلی میں کہیں پکوڑے تلے جا رہے تھے اور بیسن والی مچھلی تیار ہو رہی تھی۔ اس کی خوشبو ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ کسی وقت وڈی چودھرائن کی تحکمانہ آواز بھی ہمیں سنائی دیتی۔ وہ کسی نوکرانی کو ڈانٹتی یا کوئی ہدایت جاری کرتی تھی۔ گاہے بگاہے کسی کمرے سے برتن ٹکرانے کی آواز آتی یا پھر ایک چھوٹا بچہ ضدی انداز میں رونے لگتا۔ یہ چھوٹے چودھریوں میں سے کسی کا بچہ ہو سکتا تھا یا پھر ممکن تھا کہ کسی نوکرانی کا ہو۔

میرے ذہن میں شک پیدا ہو چکا تھا کہ راجا اب ڈیرے پر نہیں بلکہ کہیں ہمارے قریب ہی موجود ہے۔ میں نے اس پُرانی طرز کی کوٹھڑی کی دیوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی اونچائی سترہ اٹھارہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ روشندان چھت سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے تھا۔ لکڑی کی الماری میں خانے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ خانے سیڑھی کا کام دے سکتے تھے۔ اگر میں الماری کے اوپر پہنچ جاتا تو روشندان تک رسائی ہو سکتی تھی۔ میں نے سرگوشیوں میں ثروت کو اپنے ارادے کے بارے میں بتایا۔ وہ میری ہدایات پر بے چون و چرا عمل کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ الماری کو ذرا تھام کر رکھے اور ڈگمگانے سے بچائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں الماری کے خانوں میں پاؤں رکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا لیکن اب بھی روشن دان دو ڈھائی فٹ اوپر تھا۔ میں نے اشارہ کیا اور ثروت نے واٹر کولر مجھے تھما دیا۔ میں نے واٹر کولر پر پاؤں رکھے اور روشن دان سے ساتھ والے کمرے میں جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ عام سائز کا کمرہ تھا۔ میں کمرے کا قریباً نصف حصہ دیکھ سکتا تھا۔ یہاں بھی بلب کی مدھم روشنی موجود تھی۔ مجھے ایک شخص کی پشت نظر آئی۔ میں نے ایک سیکنڈ میں پہچان لیا۔ وہ راجا تھا۔ اس کے سامنے ایک پلیٹ تھی۔ وہ بڑی رغبت سے گرما گرم پکوڑے کھا رہا تھا۔ پاس ہی شیشے کا گلاس تھا جس میں وہسکی چمک رہی تھی۔ انڈین شراب کا آدھا بھی پاس ہی پڑا تھا۔ راجا سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک مشہور انڈین فلم اسٹار ایشوریا رائے موجود تھی۔ وہ اسی نوے فیصد سے زائد مشابہت رکھتی تھی۔ اب تو اس نے اپنے بال بھی ایشوریا رائے ہی کے انداز میں سیدھے کرا لیے تھے۔ اس نے انڈین اسٹائل کی کام دار سبز ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا کو میں نے آخری بار شکستہ حال جیپ میں دیکھا تھا۔ وہ لاہور کے مضافات میں ایک ویران جگہ تھی۔ میں اور راجا "ایشوریا" کو جیپ میں بند کر کے لاہور چلے گئے تھے۔

آج کئی ہفتوں بعد وہ پیلی حویلی کے اس آرام دہ کمرے میں موجود تھی۔ وہ ایک نواڑی پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھی اور ٹرانزسٹر ریڈیو سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ دونوں

دھیمی آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ زیادہ تر الفاظ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ سویٹی عرف ایشوریا نے ادا سے کہا۔ "راجا! تُو ایک نمبر کا فراڈیا ہے۔ اپنے پکے سے پکے دوست کو دھوکا دے سکتا ہے۔ اب وہ کیا سوچے گا تیرے بارے میں؟"

راجا نے غالباً آنکھ مار کر کہا۔ "سوہنیو! تے مکھنوں! تہاڈے جیسی ٹیٹ چھوری کے لیے تو راجا اپنے اصلی پیو کے تمباکو میں زہر ملا سکتا ہے۔ عمو کی تو کوئی گل ہی نہیں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑے کمینے پن سے ایشوریا کے پاؤں کے انگوٹھے پر ہلکی سی دندی کاٹی۔

اس نے "سی" کر کے پاؤں سمیٹا اور بولی۔ "ویسے تُو نے سب کچھ بتا دیا چودھری انور صاحب کو؟"

"اوہو نہیں میری سوہنی! میں نے کچھ نہیں بتایا اور نہ کسی کو دھوکا دیا ہے میں نے۔ دھوکا تو اس عورت رضیہ نے اور لطیف دکاندار نے دیا ہے۔ تابی ان کے گھر میں تھا۔ انہوں نے چودھرائن کے سامنے سارا پول کھول دیا تابی کا اور اس کڑی ثروت کا۔ جب پول ہی کھل گیا تھا تو پھر میں کیوں خود کو خوامخواہ خطرے میں ڈالتا۔ میں اس ویلے ڈیرے پر تھا۔ میں چاہتا تو یہاں سے بھاگ بھی سکتا تھا۔ لیکن یہ چودھری انور مجھے اپنے ٹائپ کا بندہ لگا ہے۔ اسے قدر بھی ہے کاریگر بندے کی۔ اپنی ساری گھوڑیاں میرے سپرد کرنا چاہتا ہے اور تین بلڈاگ بھی۔ میں نے چودھری کو سب کچھ بتا دیا اور ویسے ذرا سوچ رانی! میں نے چنگا ہی کیا نا؟ میں بھی یہاں تھا اور تُو بھی یہاں تھی۔ آج نہیں تو کل ہماری ملاقات ہو ہی جانی تھی اور تُو نے فٹا فٹ بتا دینا تھا چودھری کو یہ تابی اور راجا ایک ہی باغ کی مولیاں ہیں۔"

وہ ادا سے مسکرائی اور بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ میں نہ ہی بتاتی۔ پردہ رکھ لیتی تمہارا۔"

"بس تیری انہی باتوں پر تو کلیجا نکلتا ہے میرا۔" وہ اپنا سینہ مسل کر بولا۔

"ویسے ایک نمبر کا مطلبی حرصی ہے تُو۔ اب اپنے اس یار عمو کو پکڑوائے گا؟"

"یہ سارا تیرے حُسن کا لشکارا ہے میری دلبر جانی!" اس نے ایک بار پھر ایشوریا کا گورا چٹا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دم شوخ انداز میں سمٹ گئی۔

راجا ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "ویسے میری رانی! یہ یاری دوستی، یہ بھائی چارہ، یہ سب بول بچن ہے۔ کوئی کسی کا یار نہیں۔ یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ اب دیکھو نا اس عمو کو ہی۔ اس کو پتا بھی تھا کہ حویلی میں کوئی نہ کوئی ایسا ہو گا جو مجھے پہچان لے گا پر اس نے بھیج دیا مجھے یہاں کٹ کھانے کے لیے اور مرنے کے لیے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔"

اس نے پھر شراب کا طویل گھونٹ بھرا اور جب دھوتی کے پلو سے اپنے ہونٹ صاف کرنے کی کوشش کی تو اپنی ٹانگ کو دور تک ننگا کر لیا۔

اس کا نشہ پختہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا کرسی نما رنگین مونڈھا کھسکا کر ایشوریا کے قریب کر لیا۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ سینے پر سبز ساری کا پلو درست کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھ راجے! وہاں جنگل میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ چودھری انور کی حویلی ہے۔ یہاں خود کو ذرا سنبھال کر رکھ۔''

''اوئے ہیریئے! تیرے سامنے کون کافر کا پُتر خود کو سنبھال کر رکھ سکتا ہے۔ سچ کہتا ہوں، جس دن سے تُو وکھری ہوئی ہے نا، رات دن تیرے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ ایسی ایسی باتیں سوچتا ہوں کہ تجھے پتا چل جائے نا......''

''تو جوتی اُتار لوں تجھ پر۔'' ایشوریا نے شوخی سے فقرہ مکمل کیا۔

''جوتی کی بات نہ کر میرے ساتھ۔ گولی بندوق کی بات کر۔ مارنی ہے تو گولی مار۔ سیدھی میرے سینے میں۔ اپنی تھاں سے ذرا سا بھی ہل جاؤں تو تھوک دینا میرے مرے منہ پر۔'' راجا کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ اور نشیلا پن تھا۔

''یہ تو ساری باتیں ہیں۔ چھوٹا چودھری امجد کہتا ہے کہ کچھ کر کے دکھاؤ تو پھر ہے نا۔''

''کر کے بھی دکھاؤں گا، میری بادشاہ زادی بس ایک آدھ دن میں کڑاکا نکال دوں گا اس کا۔''

سویٹی عرف ایشوریا جب ہمیں پچھلی بار ملی تھی تو اس کا اردو لہجہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ اس میں پنجابی یا شاید لاہوری جھلک نمایاں تھی، لیکن اب وہ بہتر اردو بول رہی تھی۔ غالباً اس سلسلے میں اس پر محنت کی جا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''پر تیری ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی راجے! ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں تک سلطان چٹا بھی یہاں پہنچ جائے۔ اور تُو بھاگا ہوا ہے اس کی کوٹھی سے...... بلکہ تُو نے اس تابش کو بھی وہاں سے بھگایا ہوا ہے۔''

''او ہیریئے! یہ ساری گل بات ہو گئی ہے چودھری انور سے۔ چودھری انور نے وعدہ کیا ہے کہ سلطان چٹے سے میری صلح کرا دے گا اور ویسے بھی میں نے کون سا ایسا وڈا نقصان کیا تھا سلطان صاحب کا۔ بس معمولی سی بات تھی۔ یہاں تو وڈے وڈے زمینداروں اور چودھریوں پر بکری چوری کے مقدمے بن جاتے ہیں۔''

اس دوران میں ایشوریا رائے مسلسل ریڈیو کی ناب گھما رہی تھی۔ ایک اسٹیشن پر ایک پنجابی گانا لگ گیا۔ اکرم راہی گا رہا تھا۔ سوہنیاں توں دور دور رہنا چاہی دا......

ایشوریا ناز سے پاؤں کو حرکت دینے لگی۔ راجا نے ایک پیگ مزید چڑھایا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایشوریا کا نازک بازو پکڑ کر اسے بھی اُٹھایا پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پنجابی انداز میں ڈانس کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بھونڈے پن پر ایشوریا پہلے ہنستی رہی پھر وہ منجھے ہوئے انداز میں ٹھمکے لگانے لگی۔ کبھی وہ دونوں کمرے کے اس حصے میں چلے جاتے جو میری نظروں سے اوجھل تھا، کبھی میرے سامنے آ جاتے۔ میں بالکل بے حرکت تھا۔ یہ خدشہ بھی میرے ذہن میں موجود تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی اوپر روشندان میں جھانک نہ لے۔ ثروت نے نیچے الماری تھام رکھی تھی۔

ناچتے ناچتے راجا نے فلمی انداز میں خود کو جھکایا اور سبک بدن ایشوریا کو اپنے دائیں کندھے پر بٹھا لیا۔ ریڈیو پر بول گونج رہے تھے۔ اکھیاں ملاندے نیں۔ رونے گل پاندے نیں۔ انیاں دے کول نئیں، بہناں چاہی دا۔ (یہ آنکھیں ملاتے ہیں، آنسو دیتے ہیں ان کے پاس آنا ہی نہیں چاہیے) راجا اسی انداز میں ناچنے کی بھونڈی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ بھی تھا، سویٹی عرف ایشوریا کا وزن تھا۔ ایک جگہ راجا کے قدم لڑکھڑائے۔ ایشوریا کو سنبھالتے سنبھالتے وہ خود بھی پلنگ پر گرا۔ اس نے ایشوریا کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے حسین چہرے کو اپنی شرابی سانسوں سے لتھڑنے لگا۔ وہ ہنس رہی تھی اور راجا کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ پھر وہ ہانپی ہوئی سانسوں کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نقل تھی لیکن کئی زاویوں سے حیران کن حد تک اصل نظر آتی تھی۔ غالباً کڑی محنت سے اس کے جسم کو بھی فلمی ''اسمارٹنیس'' دے دی گئی تھی اور یہ محنت اس کے جسم پر ہی نہیں، اس کے طور اطوار اور ناز و انداز پر بھی کی گئی تھی۔ آواز کے فرق سے قطع نظر وہ کئی اعتبار سے ایشوریا رائے ہی دکھائی دیتی تھی۔

راجا اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ آنے والی نہیں، کم از کم آج تو نہیں اسی دوران میں ایشوریا کی مشکل آسان ہو گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ کسی نے راجا کو باہر بلا لیا۔ کچھ دیر بعد میں بھی نیچے اُتر آیا۔

راجا کے بارے میں میری رائے کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں جشن کی رات جب عمران نے مجھے اپنی طویل رُوداد سنائی تھی، اس میں بھی مجھے راجا کا کردار زیادہ بھایا نہیں تھا۔ اب بھی مجھے چند ہفتے پہلے کا وہ واقعہ بھولا نہیں تھا جب انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں راجا مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر بڑے روکھے پن سے نکل گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور اسے واپس آنا پڑ گیا تھا۔ عمران کے ساتھ بھی راجا کا رویہ مخلص

دوست والا نہیں تھا۔ اب یہاں بالکل اور طرح کی صورتِ حال سامنے آ رہی تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا نامی اس لڑکی کا کانٹا کافی دنوں سے راجا کے دل میں چبھا ہوا تھا۔ یہاں وہ اُسے پھر نظر آ گئی تھی اور وہ اپنی تمام تر گندی بھوک کے ساتھ اس پر قربان ہوا جا رہا تھا۔

”یہ کون لوگ تھے؟“ ثروت نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔

”ایک تو کتوں اور گھوڑوں کا بدمعاش ٹرینر ہے۔ دوسری مشہور انڈین ایکٹریس ایشوریا رائے۔“

”یعنی ایشوریا رائے کی کوئی ہم شکل؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دونوں رقص کر رہے تھے۔“

”کیا آپ جانوروں کے اس ٹرینر کو جانتے ہیں۔“

”تھوڑا بہت...... سمجھو بس معمولی شناسائی ہے۔“ میں نے بات گول کی۔

”مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تابش!“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر آہٹیں ہوئیں۔ پھر دروازہ کھلا۔ پہلے وہسکی کا بھبکا اندر آیا پھر راجا۔ ایک رائفل بردار نے راجا کے عقب میں کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

ثروت سہم کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ راجا کو چڑھی ہوئی تھی۔ اس کی لال لال آنکھوں میں مجھے سور کا بال نظر آیا۔ اس نے پہلے دزدیدہ نظروں سے ثروت کو گھورا پھر میرے قریب چٹائی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہنے لگا۔ ”تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہے ہو اور میں تمہیں دیکھ کر۔ پر میں زیادہ حیران بھی نہیں ہو رہا کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تم یہاں کیوں اور کیسے پہنچے ہو؟“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک بڑا نیک اور چنگا مشورہ دینے آیا ہوں تجھے۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ ”دیکھ...... میں تجھے اپنے دل کی گل بتاتا ہوں۔ عمو سے میری بڑی یاری رہی ہے۔ میں نے بڑا کچھ کیا ہے اس کے لیے۔ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔ پر یہ اوپر سے اور ہے اندر سے کچھ اور۔ تُو اس کا پکا یار ہے نا مگر تجھے بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں ہے۔ اس کا پورا ایک جتھا ہے۔ کیا کہتے ہیں اس کو انگریزی میں ”گینگ“ اس کے لوگ ہر

ویلے اس کے آس پاس رہتے ہیں۔ یہ ان سے ہر طرح کے کام لیتا ہے۔ تجھے اس کا کچھ اور روپ نظر آتا ہوگا، پر اس کا روپ کچھ اور ہے۔ اب دیکھ، یہی معاملہ دیکھ۔ سالا خود نہیں آیا اور ہمیں گھسا دیا ہے۔ اس کالے بھونڈوں کے چھتے میں۔ بڑے خطرناک لوگ ہیں یہ۔ بندے کو مکھی کی طرح مارتے ہیں۔“

”تو تم نے ان کو بتا دیا سب کچھ؟“

”میں نے نہیں بتایا، تمہارے اس یار لطیف اور اس کی زنانی نے بتایا ہے۔ سارا پول کھول کے رکھ دیا ان کمینوں نے اور تجھے بھی سب پتا ہے، اتنا بھولا نہ بن۔ میں نے سوچا، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیوں نہ اپنی سائیڈ بچاؤں۔ اور میں نے چنگا ہی کیا نا۔ نہیں تو شناخت تو میری بھی ہو جانی تھی۔ بال چھوٹے کرانے اور داڑھی مونچھ سے بندے کا تھوبڑا تو نہیں بدل جاتا۔ مجھے پتا تھا کہ یہاں بھی جاوے کا کوئی نہ کوئی بندہ ضرور ہوگا۔ اسے میرے تھوبڑے پر شک ضرور پڑے گا اور یہی ہوا۔ وہ چھمک چھلو ایشوریا رائے بھی یہاں ہے۔ اس نے حویلی میں گھستے ہی مجھے پہچان لیا۔ بالکل جیسے اس دوسری کڑی نیتو نے تجھے پہچانا ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ تم ہر جگہ ”اپنا“ کھیل شروع کر دیتے ہو راجا۔“

وہ بولا۔ ”یہاں سب اپنی اپنی کھیڈ ہی کھیڈتے ہیں بھولے بادشاہ! دیکھ میں اتنی دیر جیل میں سڑتا رہا۔ اس عمو نے پلٹ کر مجھے نہیں دیکھا۔ یہ تو ایسا کتے کا تخم ہے کہ کہیں مجھے دیکھ بھی لیتا تو نظر بچا کر نکل جاتا۔ وہ تو اتفاق سے میری تمہاری ملاقات ہو گئی اور عمو کو بھی مجھ سے ملنا پڑا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے ہی حساب میں رہا۔ بول...... ہاں یا نہیں؟ مجھے ہوٹل میں اکیلا چھوڑ کر خود تم دونوں چلے گئے اس بابے جلالی کے پاس۔ مجھ سے پچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ تو میں نے اس گندے انڈے ندیم کو پکڑا اور عمو پلٹ کر میری طرف آیا۔ میں سچ بتاتا ہوں تجھے یہاں ہر کوئی اپنی کھیڈ ہی کھیڈتا ہے۔“

میں بجھے دل کے ساتھ راجا کو دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ ”دیکھ تابی! میں اس کڑی کے سامنے یہ ساری گل بات کرنا نہیں چاہتا تھا پر مجبوری ہے۔ تُو نے عمو کے ساتھ مل کر نادر ٹی ٹی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، تجھے پتا ہے نا...... بول پتا ہے نا؟“

میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ”کل کسی وقت سلطان چٹا ناک سے زہریلا دھواں چھوڑتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔ نادر ٹی ٹی کے بدلے وہ پھاڑ ڈالے گا تجھے۔ اور تیرے ساتھ ”زنانہ ساتھ“ بھی ہے۔ یہ چودھری انور بھی کوئی چھوٹی موٹی بلا نہیں ہے۔ شہری کڑیوں کی تو بہت زیادہ ”بے عزتی“ خراب کرتا ہے یہ۔ اس ساری تباہی سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔

عمو کا خیال چھوڑ دے۔ اپنے بارے میں سوچ۔‘‘

’’کیا سوچوں؟‘‘ میں نے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، باہر سے کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دراصل یہ دو عورتیں تھیں جو آپس میں بُری طرح جھگڑ رہی تھیں۔ بول چال سے دونوں پڑھی لکھی لگتی تھیں، وہ ایک دوسرے کو کوس رہی تھیں۔

راجا نے کہا۔ ’’یہ دونوں شہری زنانیاں ہیں چودھری انور صاحب کی۔ ایک تو بالکل نئی نئی آئی ہے۔ سوکنیں ہیں۔ لڑیں گی نہیں تو اور کیا کریں گی۔‘‘

پھر ایک دم ایک عورت چلّانے لگی۔ ساتھ ہی چودھری انور کی گرج دار آواز بھی سنائی دی۔ پتا چلا کہ وہ ایک بیوی کو پیٹ رہا ہے۔ یقیناً یہ پُرانی بیوی تھی۔ وہ اسے گالیاں بھی دے رہا تھا۔ اس کی قہرناک آواز اُبھری۔ ’’کتے کی بچی، طلاق مانگتی ہے۔ لے لے طلاق...... کل کی لیتی آج ہی لے لے...... ابھی لے لے۔ پر پہلے وہ پنج لاکھ روپیہ دے دے جو تیرے بھکے ننگے پیو نے اپنی بیماری پر لگایا ہے۔‘‘

عورت نے جواب میں کچھ کہا۔ چودھری نے اسے مزید مارا۔ پھر شاید وڈی چودھرائن یعنی پہلی بیوی نے اس کی جان بچائی۔ ثروت بھی خوف زدہ سی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

راجا مسکرایا۔ ’’ایسے کنڈم تماشے ان حویلیوں میں روز ہی ہوتے ہیں۔ چھڈ ان کو۔ تُو اپنے بارے میں سوچ۔‘‘

’’پوچھ تو رہا ہوں کہ کیا سوچوں؟‘‘

’’سچ بتا...... موبائل کہاں ہے تیرا؟‘‘

’’میں نے چودھری کے بندوں کو بتایا ہے، مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہاں حویلی آتے ہوئے راستے میں ہی کہیں گرا ہے۔‘‘

’’یہ لوگ سب ڈھونڈ کر آئے ہیں۔ چپا چپا دیکھا ہے۔‘‘

’’کسی نے اُٹھا لیا ہو گا۔‘‘

’’اور اس کڑی کا کہاں ہے؟‘‘ راجا کا اشارہ ثروت کی طرف تھا۔

’’یہ لائی ہی نہیں تھی۔‘‘ میں نے کہا۔

راجا نے اپنی چھوٹی چھوٹی بدبودار داڑھی کھجائی۔ ’’اچھا...... یہ عمو فون کیوں نہیں اُٹھا رہا؟‘‘

’’کل میں خود بھی کرتا رہا ہوں۔ بہت دفعہ کوشش کی۔ اس نے نہیں اُٹھایا۔ پتا نہیں کیا

چکر ہے۔‘‘

’’تیرا کیا اندازہ ہے، اس ویلے وہ کہاں ہو گا؟‘‘

’’میں نجومی نہیں ہوں۔‘‘

’’پر میں نجومی ہوں۔‘‘ وہ ایک دم پھنکارا۔ ’’اور میں تجھے بتا رہا ہوں تابی! اگر تُو نے ان لوگوں کو عمران کا کھوج نہ دیا نا تو یہ کڑا کے نکال دیں گے تیرے اور تیری اس معشوق کے۔ تیرے پاس سوچنے کے لیے بس سویر تک کا ویلا ہے۔‘‘

میرا جی چاہا کہ راجا پر جھپٹ پڑوں اور کم از کم اس کی گردن کا کڑاکا تو ضرور نکال دوں۔ بعد میں جو کچھ بھی ہو، دیکھا جائے گا لیکن پھر خود پر ضبط کرنا پڑا۔ میرے ساتھ ثروت تھی اور مجھے اپنے سے پہلے اس کے بارے میں سوچنا تھا۔

لگتا تھا کہ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو چکی ہے۔ گیلی مٹی کی خوشبو نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور اس کے ساتھ کسی وقت بادلوں کی گرج بھی سنائی دیتی تھی۔ مچھلی، پکوڑوں اور روسٹ چکن کی خوشبو ساری حویلی میں پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ راجا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ’’تابی باؤ! یہ ویلا بڑا قیمتی ہے تیرے لیے۔ پھر پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ میں دو تین گھنٹے بعد پھر آؤں گا۔ تب تک کچھ ہور سوچ لے اور اپنی اس ’’زنانی‘‘ سے بھی مشورہ کر لے جس نے خود اپنی گردن پھنسائی ہے اس شکنجے میں۔ زیادہ مصیبت تو اس کی گوری چمڑی پر ہی آنی ہے نا۔‘‘

میں راجا کو کیسے بتاتا۔ ثروت کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کسی کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ثروت کو غلط نیت سے چھوتا بھی۔ اس سے پہلے ایک قیامت برپا ہونا تھی۔ ایک ایسا طوفان اُٹھنا تھا جس کے بارے میں اس حویلی کے چودھری سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ ایسا یقین تھا میرے اندر...... ایسا والہانہ بھروسہ جس نے مجھے پہاڑ کی طرح بلند اور مضبوط کر دیا تھا۔ میری خواہش تھی، بس میرے ہاتھ میں ثروت کا ہاتھ ہو۔ پھر جس جس آفت نے میرا راستہ روکنا ہے، وہ میرے سامنے آ جائے اور میں اس کے پرخچے اُڑا دوں۔

میں راجا سے یوسف فاروقی کے بارے میں کچھ سن گن لینا چاہتا تھا مگر آخر میں اس نے ایسی بدزبانی کی تھی کہ میں نے اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ الکحل کی بدبو سمیت باہر نکل گیا اور کوٹھڑی کا دروازہ پھر سے مقفل ہو گیا۔ باڑے کی طرف سے کتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے چوبی دروازے کی باریک مہین درز سے آنکھ لگا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ کافی دیر بعد ایک شہری لباس والی لڑکی نظر آئی۔ وہ اپنے ہاتھوں میں فروٹ سے

بھری ہوئی ٹرے اُٹھائے گزری۔ دو تین منٹ بعد دو اور آدمی گزرے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں بُری طرح چونکا۔ یہ یوسف فاروقی تھا۔ اس کی ٹانگ کا زخم اب غالباً ٹھیک تھا۔ معمولی لنگڑاہٹ کے سوا اسے کوئی مسئلہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم اس کا چہرہ زرد اور مرجھایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ وہ بس ایک یا دو سیکنڈ کے لیے میری نظروں کے سامنے رہا پھر آگے نکل گیا۔

اب یہ بات کنفرم ہوگئی تھی کہ وہ جس کی تلاش میں ہم مارے مارے پھر رہے ہیں، یہیں پر موجود ہے۔ میں نے فی الحال ثروت کو یوسف کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا، وہ جذباتی ہوسکتی تھی۔ باہر موسم مسلسل ابر آلود تھا۔ کسی وقت گرج چمک بھی ہونے لگتی تھی۔ میں اور ثروت دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ ثروت اب بالکل گم صم تھی۔ انجانے اندیشے اس کے چہرے پر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے کانوں میں شاید وہی سائیں کے کہے الفاظ گونج رہے ہیں۔ اس نے کالی پرچھائیوں کا ذکر کیا تھا اور ان سنگین ترین حالات کا ذکر کیا تھا جن کا اختتام کسی قبرستان میں ہوسکتا تھا۔ تو کیا کوئی مرنے والا تھا؟ کون مرنے والا تھا اور کس طرح؟

ہمارے اردگرد نقل وحرکت کی آوازیں اب معدوم ہوتی جارہی تھیں، کھانا کھا لیا گیا تھا۔ برتن سمیٹے جاچکے تھے، حقے بھی گڑگڑائے جاچکے تھے۔ اب حویلی کے مکین شاید سونے کی تیاری میں تھے۔ مسلسل روتے ہوئے بچے کی ریں ریں بھی اب ختم ہوچکی تھی۔ کسی کمرے میں بجتا ہوا ریڈیو خاموش ہوگیا۔ اردگرد کی لائٹس گل ہوگئیں۔ بارہ بج چکے تھے۔ راجا نے کہا تھا کہ وہ پھر آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ شاید اس نے زیادہ پی لی تھی۔ پھر یقیناً مرغن کھانے کی خماری بھی ہوگی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ کہیں پڑا سو رہا ہو اور اب سورج طلوع ہونے سے پہلے آنکھ نہ کھولے۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ چودھری انور وغیرہ سویٹی عرف ایشوریا کے ذریعے راجا کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ عمران کو پھنسانے میں ان کی مدد کرے۔ چودھریوں کو تو عمران سے کوئی دشمنی نہیں تھی، یقیناً وہ سلطان چٹے کی خواہش کے احترام میں یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

ڈیڑھ دو بجے تک حویلی میں مکمل سکوت ہوگیا۔ بس کسی قریبی کمرے سے کسی کے کراہنے کی مدھم آواز آتی رہی، یہ یقیناً کرشمہ کپور ہی تھی۔ غالباً درد کے سبب اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ کسی وقت اُٹھ کر ٹہلنے بھی لگتی تھی۔ اس کے ٹہلنے کا ثبوت ''واکنگ اسٹک'' کی ہلکی ٹھک ٹھک تھی۔

گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرکتی رہیں۔ وہ رات کے دو ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اب حویلی میں مکمل سکوت تھا۔ اس سکوت کو بس کسی وقت رکھوالی کے کتوں کی مدھم آواز ہی توڑتی تھی۔

''آئندہ کیا ہوتا ہے؟'' ہم دونوں کے ذہنوں میں بس یہی ایک سوال گڑا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کیا کسی طرح عمران کو خبر ہوسکے گی کہ یہاں ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے اور راجا نے کس کمینگی سے اپنی وفاداریاں بدلی ہیں؟ میرے ذہن میں بار بار اس سیل فون کا خیال بھی آرہا تھا جو میں لطیف کی دکان کے اندر دال کی بوری میں گھسا آیا تھا۔ اتفاقاً فون آن نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ دو چار دن تک ویسے ہی بوری میں پڑا رہتا مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل لطیف کی نظر میں آجاتا اور وہ اسے آن کرکے عمران یا پھر اقبال وغیرہ سے رابطہ کرپاتا۔ مگر جس طرح کے حالات ہوگئے تھے یا اس کی بیوی نے کردیئے تھے، یہ امکان نہیں تھا کہ لطیف کسی طرح کا رسک لے گا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ فون ویسے ہی کسی جوہڑ میں پھینک دیتا۔

اچانک دروازے پر مدھم آہٹ سنائی دی۔ کسی نے ہولے سے قفل کھولا اور دروازے کا ایک پٹ وا کیا۔ مجھے راجا کی صورت نظر آئی۔ اس نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میرے دل میں اُمید کی کرن جاگی۔ راجا کا رویہ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے اور ثروت کو باہر آنے کا کہا۔

میں چند سیکنڈ کے لیے تذبذب میں رہا۔ یہ اس کی کوئی چال تو نہیں تھی؟ جب اس نے دوبارہ سر کو حرکت دی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھ ثروت کو بھی اُٹھا لیا۔ ثروت کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ''آجاؤ'' راجا نے سرسراتی سرگوشی کی۔

میں نے گرگابی پہنی۔ ثروت کے پاؤں میں پہلے ہی چپل موجود تھی۔ ہم راجا کے پیچھے کوٹھڑی سے باہر آگئے۔ راجا کے ہاتھ میں ایک دیسی ساخت کا پستول نظر آرہا تھا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ بڑی احتیاط سے چلاتا ہوا ایک برآمدے میں پہنچا۔ یہاں بلب روشن تھا۔ ایک قریبی کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے خراٹوں کی مدھم آواز آرہی تھی۔ راجا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ وڈی چودھرائن سو رہی ہے۔ آرام سے گزرنا ہوگا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دبے پاؤں دروازے کے سامنے سے گزرے۔ برآمدے میں روشن بلب کی کچھ روشنی اندر کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی۔ لحیم شحیم چودھرانی پھیل کر پلنگ پر سو رہی تھی۔ یہ کافی بڑا چنیوٹی پلنگ تھا مگر چودھرانی کے نیچے مختصر محسوس ہوتا تھا۔ پلنگ کے ساتھ ہی چنیوٹی طرز کی سائیڈ ٹیبل بھی تھی۔ اس پر دو انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ یقیناً یہ چودھرائن کی ہوں گی۔ چودھرائن کے جسم پر طلائی کڑوں کے سوا کوئی اور گہنا بھی نظر نہیں آ

رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ سونے سے پہلے اس نے یہ گہنے اُتار دیئے ہوں گے۔

راجا ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ پھر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے دبے پاؤں کمرے میں پہنچا۔ اس نے دونوں انگوٹھیاں اُٹھائیں۔ بڑی احتیاط سے سائیڈ ٹیبل کی اوپر والی دراز کھولی۔ اس میں چودھرائن کے بھاری جھمکے اور وزنی کینٹھا موجود تھا۔ راجا نے بڑی چابک دستی سے یہ ساری چیزیں ایک رومال میں ڈالیں اور بلی کی چال چلتا ہوا باہر آ گیا۔ یقیناً وہ مضبوط اعصاب کا مالک شخص تھا اور اس کا لالچ بھی اس کے اعصاب ہی کی طرح تگڑا تھا۔

ہم ایک بار پھر راجا کے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے اپنا ازار بند بہت کس کر نہیں باندھا تھا۔ بوقت ضرورت ایک سیکنڈ کے اندر میں اپنا شاندار چاقو اپنے ہاتھ میں کر سکتا تھا۔ اندرونی عمارت سے باہر نکلنے کے لیے ہمیں ایک اور کمرے کے اندر سے دبے پاؤں گزرنا پڑا۔ میں ٹھٹک گیا۔ یہاں پختہ فرش پر نیتو عرف کرشمہ کپور بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اوندھی تھی اور ایک ٹانگ عجیب انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ ''کیا ہوا اسے؟'' میں نے راجا کے کان میں سرگوشی کی۔

''بے ہوش ہو گئی ہے۔ خانہ خراب جاگ رہی تھی۔ اس نے مجھے تاڑ لیا۔ میرے پیچھے آئی۔ میں نے پکڑ لیا۔ رولا ڈالنا (شور مچانا) چاہتی تھی، میں نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑی ڈھیٹ ہڈی نکلی۔ آخر تک ہتھ پیر چلاتی رہی۔''

میں نے جھک کر غور سے کرشمہ کپور کو دیکھا۔ وہ بیہوش نہیں تھی۔ مر چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مر چکی ہے۔ میں نے اس کی ملائم گردن پر ہاتھ رکھا۔ نبض کہیں نہیں تھی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر راجا کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بہرحال ثروت کے سامنے ہم نے کسی طرح کا تبصرہ مناسب نہیں سمجھا۔ اس کا پہلے ہی بُرا حال تھا۔ وہ بیچاری تو یہ سمجھ کر لاہور سے چلی تھی کہ سیدھی احمد تھانوی صاحب کے پاس پہنچے گی اور انہیں اپنا دکھڑا سنائے گی۔ وہ اس کو تسلی دے کر سب کچھ سنبھال لیں گے اور پولیس میں موجود ان کے مرید ایک آدھ روز میں یوسف کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ مگر یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ثروت کے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔

ہم راجا کے پیچھے چلتے ہوئے اندرونی دروازے سے نکلے اور حویلی کے احاطے میں آ گئے۔ کرشمہ کپور کی اچانک موت نے میری دھڑکنیں زیر و زبر کر دی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ زیادہ دیر تک دم گھٹا رہنے کی وجہ سے نیتو عرف کرشمہ کی موت ہوئی ہے۔

وہ سو فیصد مر چکی تھی۔ شاید یہ زبردستی ''دعائے خیر'' کرانے کا نتیجہ تھا۔ ہم احاطے سے گزرے۔ بیرونی پھاٹک کے پاس ''مالٹے'' کے پودوں میں ایک چوکیدار رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ میں ایک کپڑا بڑے اچھے طریقے سے ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ حرکت کر سکتا تھا نہ آواز نکال سکتا تھا۔ اس کے سر سے خون کا کچھ رِساؤ بھی نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہمیں کوٹھڑی سے نکالنے سے پہلے راجا نے خاصا ''ہوم ورک'' کیا ہے۔ اسی سنگین ہوم ورک میں کرشمہ کپور کی جان بھی گئی تھی۔ راجا کے حوالے سے میں ابھی تک تذبذب میں تھا، اس بندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

جونہی ہم پھاٹک سے باہر نکلے، رکھوالی کے دو کتے جارحانہ انداز میں ہماری طرف لپکے۔ یہ بھاری تھوبڑوں والے بلڈاگ تھے۔ ثروت کراہ کر میرے بازو سے لپٹ گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ راجا گھٹنے زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بار بار زمین پر مارے اور منہ سے پچ پچ کی آوازیں نکالیں۔ حیرت انگیز طور پر کتوں کا اشتعال کم ہو گیا۔ شاید وہ راجا سے مانوس ہو چکے تھے۔ دونوں کتے بے قراری سے اس کے گرد چکرانے لگے۔ اس کی ٹانگوں میں اپنے منہ گھسانے لگے۔ راجا تیز سرگوشی میں بولا۔ ''تابی! اس سامنے والی گاڑی میں بیٹھو۔ چابی اندر ہی ہے لیکن تم نے انجن اسٹارٹ نہیں کرنا۔''

میں نے راجا کی ہدایت پر عمل کیا اور ثروت کو لے کر چند میٹر دور کھڑی جیپ میں بیٹھ گیا۔ یہ کھلی چھت کی جیپ تھی۔ اس میں سے کچی مچھلی کی بُو آ رہی تھی۔ غالباً شام کو حویلی میں جو مچھلی پکائی گئی تھی، وہ اسی جیپ میں آئی تھی۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ راجا نے انجن اسٹارٹ نہ کرنے کا کیوں کہا ہے۔ جیپ ایک کچی ڈھلوان پر کھڑی تھی۔ یہ ڈھلوان ساٹھ ستر میٹر آگے تک چلی گئی تھی۔

کتوں کو رام کرنے کے بعد راجا بھاگتا ہوا جیپ کی طرف آیا۔ اس نے جیپ کو ذرا سا دھکا لگایا تو وہ ڈھلوان پر آ گئی اور لڑھکنا شروع ہو گئی۔ راجا بھی کود کر میرے ساتھ آ بیٹھا۔ ثروت پچھلی نشست پر تھی۔ جیپ ڈھلوان پر لڑھکتی چلی گئی۔ ڈھلوان ختم ہونے کے بعد بھی وہ کافی دور تک اپنے ہلارے میں آگے بڑھتی گئی۔

پھر میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور ہیڈ لائٹس جلائے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ ''کیسا ٹیٹ کام ہوا ہے؟'' وہ جوش سے بولا۔ ''دیکھو ایک گولی نہیں چلی اور ہم حویلی سے باہر ہیں۔''

''لیکن کرشمہ کپور تو گئی نا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''بس اس کی آئی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا منہ دبانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا اور وہ بھی

اس لیے دبایا تھا کہ وہ بس تڑفتی ہی جارہی تھی۔"

میں نے کہا۔ "وہاں حویلی میں تو تُو نے عمران کے بارے میں بڑی کڑوی باتیں کی تھیں۔"

"وہ اس لیے کہ کوٹھڑی کے آسے پاسے چودھری کے بندے موجود تھے۔ وہ اندر کی آوازیں سن سکتے تھے۔ پر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے عمو کے بارے میں جھوٹی باتیں کہیں۔ میں نے جو کہا وہ تقریباً سچ ہی تھا۔ وہ کمینہ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو سچ مچ بڑا زہر چڑھتا ہے اس پر...... لیکن کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، خبیث اپنا یار تو ہے۔"

"چابی کہاں سے ملی تجھے کوٹھڑی کی؟"

"اوئے...... خود اس شہدے چودھری نے دی تھی۔" راجا نے مڑ کر حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ حویلی اندھیرے میں گم ہوتی جارہی تھی۔

"مڑ مڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ وہ ایشوریا رائے کی شکل والی تو یاد نہیں آرہی؟"

"اوئے...... رَن مرید نہیں ہوں میں۔ وہ سؤر دی بچی چنگی تو لگتی ہے پر اتنی بھی نہیں کہ اس کے لیے اس کمینے عمو سے دغا کر جاؤں۔"

اچانک گاڑی کو دو تین جھٹکے لگے اور وہ رُک گئی۔ "بیڑا غرق...... یہ کیا ہوا؟" راجا نے کہا۔

"کہیں تیل تو ختم نہیں ہو گیا؟"

"نہیں یار! تیل تو چنگا بھلا ہے۔" اس نے میٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر کیا موت پڑ گئی ہے اس کو؟"

"یہ جس طرح جھٹکے کھا کر رُکی ہے، مجھے لگتا ہے کوئی چور سوئچ ہے اس کے اندر...... انجن کے اندر جو تیل ہوتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے تو گڈی رُک جاتی ہے۔"

مجھے لگا راجا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے ڈیش بورڈ میں سے ایک ٹارچ نکالی اور جیپ کا بونٹ کھول کر چیک کرنے لگا۔ وہ ان کاموں میں ماہر لگتا تھا۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی سے فرار ہوتے وقت اس نے جیپ کو جس طرح خراب اور پھر ٹھیک کرنے کا ڈراما کیا تھا، وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا، لیکن یہاں تو سچ مچ کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بڑی مخدوش صورت حال تھی۔ پیلی حویلی میں کسی بھی لمحے ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا اور موت کے ہرکارے ہمارے پیچھے دوڑ لگا سکتے تھے۔ ہم تینوں بار بار حویلی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ دور تاریکی میں بس اس کی دو بیرونی روشنیاں ہی دکھائی پڑتی تھیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ سب سے پہلے ثروت کو ہی اس کا علم ہوا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "دیکھیں کوئی آرہا ہے۔"

میں نے غور کیا۔ حویلی کی طرف سے کسی گاڑی کی دو اُچھلتی کودتی روشنیاں ہماری طرف بڑھ رہی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے ان میں پانچ چھ روشنیاں مزید شامل ہو گئیں۔ وہ لوگ آگاہ ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں راجا نے جیپ کے نشستوں کی نیچے سے ایک شاندار ایل ایم جی ڈھونڈ نکالی تھی۔ شاید اسے پہلے سے اس گن کا علم تھا۔ وہ یہ لوڈڈ گن میری طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "یہ لو۔ ضرورت پڑے تو گولی چلاؤ۔ میرا خیال ہے کہ میں دو تین منٹ میں اسے چالو کر لوں گا۔" اس کا اشارہ انجن کی طرف تھا۔

اس نے ٹارچ اپنے منہ میں ڈال لی اور تن دہی سے انجن پر جھک گیا۔ حویلی سے نکلنے والی روشنیاں تین حصوں میں تقسیم ہو گئیں اور ہچکولے کھاتی ہوئی مختلف اطراف میں بڑھیں۔ دو روشنیاں سیدھا ہماری طرف آئیں۔ میں نے وحشت زدہ ثروت کو گاڑی کی اوٹ میں بٹھا دیا اور خود اس کے پہلو میں پوزیشن لے لی۔

ہماری طرف آنے والی ایک لوڈر نما گاڑی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس پر سات آٹھ افراد موجود تھے۔ وہ سب کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دو تین بُوگیر کتے شور مچاتے آرہے تھے۔ ہماری خراب گاڑی کو دیکھنے کے بعد انہوں نے لوڈر کچھ فاصلے پر ہی درختوں کے درمیان روک لیا۔ میں نے ایک ہوائی فائر کیا تاکہ وہ سمجھ جائیں کہ ہمارے پاس ہتھیار موجود ہیں۔

اس ہوائی فائر کے جواب میں چند سیکنڈ بعد ہم پر سیدھا فائر ہوا۔ یہ فائر جیپ کی آہنی باڈی میں کہیں لگا۔ اس کے بعد دوطرفہ گولیاں چلنے لگیں۔ قریباً ایک منٹ بعد میں نے ایک کامیاب نشانہ لگایا اور لوڈر کا اگلا ٹائر برسٹ کر دیا۔ ثروت کے لیے یہ سچویشن بالکل اَن دیکھی اور وحشت ناک تھی۔ اس کا سانس جیسے سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ سر گھٹنوں میں دے کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور گاڑی کے پہیے کے پیچھے بالکل سمٹ سمٹا گئی تھی۔

دوسری طرف سے دو تین رائفلوں کا فائر آرہا تھا لیکن یہ سنگل فائر تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس کوئی آٹومیٹک رائفل نہیں ہے۔ فائرنگ شروع ہوئے دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ راجا نے نعرہ لگایا۔ "ہو گئی" اس کے ساتھ ہی وہ جھک کر آگے بڑھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ غالباً راجا نے اسے ڈائریکٹ کر دیا تھا۔ اس نے ہمیں جیپ پر بلا لیا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے دو تین برسٹ فائر کیے۔ ایک بوگیر کتا

کر بناک آواز میں چلا کر خاموش ہوگیا۔ حملہ آور تتر بتر ہو کر جھاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ شاید انہیں ہماری طرف سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ ایل ایم جی نے ان کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ میں نے ثروت کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ''سر نیچے رکھو اور پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ۔ اُٹھنے کی کوشش نہ کرنا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

اس نے لرزتی آواز میں ''اچھا جی'' کہا اور میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں راجا نے اپنے دیسی ساختہ پستول سے تین چار فائر کیے اور میں نے بھی دو گولیاں چلائیں۔ تب میں بھی جھک کر گاڑی میں بیٹھا اور نشست پر نیم دراز سا ہو گیا۔ راجا نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ راجا کی حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی تھی۔ وہ اپنے اعصاب پر بھی غیر معمولی کنٹرول رکھتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس قسم کے حالات میں وہ بہترین ساتھی ثابت ہو سکتا ہے۔ جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح حرکت میں آئی۔ راستہ اونچا نیچا تھا۔ پچاس ساٹھ فٹ آگے جا کر وہ بُری طرح اُچھلی۔ سامنے ڈیش بورڈ پر رکھی ہوئی کوئی شے اُچھل کر باہر گرگئی۔ یہ وہ رومال تھا جس میں راجا نے وڈی چودھرائن کے قیمتی گہنے باندھے تھے۔

راجا نے بریک لگا دیئے۔

''کیا کرتے ہو؟'' میں چلایا اور راجا کا بازو تھام لیا۔

''یار! ایک سیکنڈ۔'' وہ بولا۔

''خدا کا خوف کر راجا۔'' میں نے کہا۔

''اوئے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا اور بازو چھڑا کر گہنوں کی طرف بڑھا جو ایک ڈھلوان پر لڑھک کر آٹھ دس فٹ نیچے چلے گئے تھے۔

''راجا۔'' میں نے پھر پکارا۔

مگر اس کی آنکھوں میں لالچ کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک سیکنڈ میں واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آجائے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک سیکنڈ کا فاصلہ کبھی طے نہیں ہوگا۔ جونہی اس نے جھک کر رومال اُٹھایا۔ فائر ہوا اور گولی راجا کے عین سینے میں لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرا۔

میں نے لوڈر کی طرف اندھا دھند ایک برسٹ چلایا اور راجا کی طرف بڑھنا چاہا لیکن اسی وقت ایک اور فائر ہوا۔ گولی راجا کی گردن کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لوڈر کی ہیڈ لائٹس میں مجھے یہ سب کچھ واضح دکھائی دیا۔ میں نے بے تاب ہو کر نیچے اُترنا چاہا مگر ثروت نے بڑی

مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا ''نہیں تابش'' وہ چلائی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ نیچے جھکے جھکے میں نے کلچ دبا کر گیئر لگایا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ دو تین گولیاں پھر جیپ سے ٹکرائیں مگر؟میں کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام رہیں۔ لوڈر کا ٹائر چونکہ برسٹ تھا اس لیے وہ ہمارے پیچھے نہیں آسکتا تھا۔ میں اس کھلی چھت والی جیپ کو دوڑاتا چلا گیا۔ میں نے اب جیپ کی ہیڈ لائٹس آن کر لی تھیں۔ وہ تھوہر اور جنتر کی جھاڑیوں کے درمیان اونچے نیچے راستوں پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ ثروت، نشست پھلانگ کر میرے پہلو میں آگئی تھی۔ راجا کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اتنا آناً فاناً اور غیر متوقع تھا کہ میں سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ اس میں شک کی گنجائش بہت کم تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ پہلی گولی سینے میں بائیں طرف لگی تھی۔ دوسری یقیناً اس کی شہ رگ چیر کر نکل گئی تھی اور یہی شخص چند گھنٹے پہلے اکرم راہی کا گانا سن رہا تھا اور سویٹی عرف ایشوریا کو کندھے پر بٹھا کر ناچ رہا تھا۔ ثروت مسلسل سسک رہی تھی لیکن اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں بھی راجا کا تصور ذہن سے نکالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

ہمیں ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ ہمارا رُخ کس طرف ہے۔ ہم بس حویلی اور حویلی والوں سے دور نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بارش نہیں ہو رہی تھی مگر گرج چمک جاری تھی۔ کسی وقت آسمانی بجلی کا جھماکا ہوتا تو قرب و جوار روشن ہو جاتے۔ اس کے بعد پھر گہری تاریکی پھیل جاتی۔ اس تاریکی میں کبھی کبھی دور کہیں جگنو سے چمکتے نظر آتے تھے۔ یقیناً یہ وہ لوگ تھے جو موت کے ہرکارے بن کر ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ ہارون آباد کے ہوٹل میں سائیں لڑکے نے کہا تھا۔ تمہارے گرد موت کی پرچھائیاں ہیں اور اس نے قبروں والی منحوس بات بھی کی تھی۔ اس کے فقرے میری سماعت میں ایک مسلسل گونج بن کر رہ گئے تھے۔ میں موت سے ڈرتا نہیں تھا لیکن اس وقت مجھے موت کے بارے میں سوچنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ میں اکیلا نہیں تھا، میرے ساتھ ثروت بھی تھی۔

O.....❖.....O

دس بیس منٹ بعد بوندیں پڑنے لگیں۔ یہ ایک عجیب سفر تھا۔ انجانے راستے...... انجانا رُخ اور عقب میں موت کے فرستادے۔ ایسے ہی کچھ سفر میں نے پہلے بھی تو کیے تھے۔ ایسی ہی بارشی راتوں میں ایسے ہی پُرخطر ویرانوں میں، مَیں پہلے بھی تو دیوانہ وار بھاگا تھا۔ کوئی تڑپ تھی جو میری سانسوں کو ٹوٹنے نہیں دیا کرتی تھی۔ کوئی لگن تھی جو مجھے بے دم ہو کر گرنے نہیں دیتی تھی۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے بے آباد جنگل تھے، وہ ایسی ہی جان لیوا راتیں تھیں۔ میں کسی تک پہنچنے کے لیے بھاگا کرتا تھا۔ کسی کو پانے کے لیے اپنے پاؤں کو لہولہان کیا کرتا تھا۔ اور جس کے لیے میں ایسا کیا کرتا تھا آج وہ میرے پہلو میں تھی۔ اس کے بال کھل کر ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اس کے بدن کی مہک میری رگ جاں میں اُتر رہی تھی۔ یہ رات نہایت زہریلی تھی اور نہایت رنگین تھی۔ جان لیوا بھی تھی اور دل گداز بھی، یہ زندگی تھی اور موت بھی۔ میرے سینے میں ایک ایسا طوفان تھا جو ہر رکاوٹ کو بہا کر لے جا سکتا تھا۔

اور پھر بارش تیز ہوگئی۔ میں نے اپنے پہلو میں رکھی ہوئی ایل ایم جی کو نشست کے نیچے گھسا دیا۔ نشست کے نیچے کینوس کا ایک تھیلا بھی تھا جس میں ایل ایم جی کا ایک فالتو میگزین اور سو کے قریب راؤنڈ موجود تھے۔ یہ سارا انتظام یقیناً راجا نے ہی کیا تھا۔

ثروت منمنائی۔ ''تابش! آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔''

''کیسا وعدہ؟''

''کوئی غیر قانونی کام نہ کرنے کا۔'' وہ بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''کیا ہم کسی پولیس اسٹیشن تک نہیں پہنچ سکتے؟''

''پولیس اسٹیشن تو کیا یہاں کوئی آبادی بھی نظر نہیں آرہی۔''

''ہم کدھر جائیں گے؟'' اس کی آواز واضح طور پر کپکپا رہی تھی۔

''فی الحال تو بس چلتے جانا ہے۔ اللہ کرے کہیں کوئی آبادی نظر آجائے۔''

دائیں طرف چمکنے والی روشنیاں ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں۔ ثروت نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور یقیناً یہ تبدیلی اسے مزید ہراساں کر رہی تھی۔ ایک جگہ اچانک جیپ پھسلی اور اس کا اگلا ٹائر کھڈے میں چلا گیا۔ ثروت لڑھک کر اسٹیئرنگ وہیل کے اوپر گری۔ میرے گھٹنوں پر بھی ہلکی چوٹ آئی۔ اگلے دو تین منٹ میں، مَیں نے جیپ کو اس جگہ سے نکالنے کی کافی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی بلکہ یوں لگا کہ اس کا پہیہ زیادہ اندر دھنس گیا ہے۔ دائیں طرف چمکنے والی روشنیاں مزید قریب آگئی تھیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑیوں کے علاوہ کچھ گھڑسوار بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ لطیف نے بتایا تھا کہ یہ لوگ تیز رفتار گھوڑیاں پالتے ہیں اور پورے علاقے میں دندناتے ہیں۔ اب جیپ چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے ایمونیشن والا تھیلا اُٹھایا ٹارچ لی اور ایل ایم جی کندھے سے لٹکا لی۔ ثروت کا ہاتھ تھام کر میں کیکر کے درختوں اور جنتر کی جھاڑیوں میں دوڑتا چلا گیا۔

بارش کی بوندیں پتوں سے چھن چھن کر ہمیں بھگو رہی تھیں۔ زمین گو ریتلی تھی پھر بھی کہیں کہیں کافی پھسلن موجود تھی۔ مجھے گاہے بگاہے ایک یا دو سیکنڈ کے لیے ٹارچ بھی روشن کرنا پڑ رہی تھی۔ ثروت بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس نے جیسے سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دیا تھا۔ اپنا ہاتھ میرے حوالے کر دیا تھا اور میرے ساتھ کھنچتی چلی جا رہی تھی۔

ایک جگہ مجھے لگا کہ وہ بے دم ہو کر گر جائے گی۔ میں نے اسے بٹھا دیا اور خود بھی ایک تناور کیکر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ثروت کی سانسیں سینے میں نہیں سما رہی تھیں۔ میری سانس کی لَے بھی تیز تھی۔ اس دوران میں، مَیں نے گن سے نیا میگزین اٹیچ کر لیا۔ ثروت روہانسی آواز میں بولی۔ ''پلیز تابش! آپ کسی پر گولی نہ چلائیں۔ یہ غلط ہوگا۔''

''وہ ہمیں گولی مار دیں تو یہ صحیح ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم...... خود کو ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کوئی بہتر صورت نکل آئے۔'' وہ ہانپی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔

''یہ خطرناک قاتل ہیں ثروت! رحم کرنا نہیں جانتے۔ ہم ان کے ساتھ رعایت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بھی ہمارے ساتھ رعایت نہیں کریں گے۔''

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کسی گاڑی کے ڈیزل انجن کی آواز صاف سنائی دی۔ یقیناً تعاقب کرنے والی گاڑیاں نزدیک پہنچ چکی تھیں۔

''اُٹھو ثروت!'' میں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

ہم پھر روانہ ہو گئے۔ کبھی بھاگ رہے تھے، کبھی تیز چل رہے تھے۔ اچانک ثروت چلّائی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ میں نے اسے بمشکل اُٹھایا۔ اس کا پاؤں بُری طرح مڑ گیا تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کے ٹخنے کو ہاتھوں سے دبایا، وہ کراہنے لگی۔ اس کی چپل اُتر کر دور چلی گئی تھی۔ میں نے چپل اُٹھا کر اسے دی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے کہا کہ وہ چل سکتی ہے۔ ہم پھر آگے بڑھنے لگے لیکن اب رفتار بہت کم تھی۔ پہلے تو چوٹ گرم تھی اس لیے وہ کوشش کر کے چلتی رہی۔ آٹھ دس منٹ بعد اس کی ہمت بالکل جواب دے گئی۔ ''تابش! آہ مجھ سے نہیں چلا جاتا۔'' وہ لڑکھڑا کر کیچڑ میں بیٹھ گئی۔

بارش کی بوچھاڑیں ہمیں شرابور کر رہی تھیں۔ روشنیاں اب بالکل قریب آ گئی تھیں۔ شاید ان لوگوں نے ہماری گاڑی دیکھ لی تھی اور زمین پر پاؤں کے نشان بھی دیکھ لیے تھے۔ کچھ دور ایک کچے ٹیلے (تھے) پر درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ ہم وہاں تک پہنچ جاتے تو نسبتاً محفوظ ہو جاتے لیکن اب اس کے لیے وقت بہت کم تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ ثروت کا پاؤں سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ اسے میرے اندازے سے زیادہ چوٹ آئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فریکچر ہو چکا ہو۔

یہ بے بسی کا عروج تھا۔ میں نے جھک کر ثروت کو گود میں اُٹھا لیا۔ اس نے اپنے بازو میرے گلے میں حمائل کر دیئے تھے۔ ایل ایم جی اور ایمونیشن کا وزن بھی مجھ پر تھا مگر میں آگے بڑھنے کی بے پناہ ہمت رکھتا تھا۔ دو تین منٹ مزید گزرے۔ پھر عقب سے ایک فائر ہوا اور گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی گزر گئی۔ اس کے ساتھ ہی کڑک دار آواز آئی۔ ''رُک جاؤ۔''

اب رُکنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ گھڑی آ گئی تھی جس کا خدشہ تھا۔ میں نے ثروت کو دو تناور جڑواں درختوں کی اوٹ میں بٹھایا اور خود ساتھ والے درخت کی آڑ لے کر ایل ایم جی سنبھال لی۔

اگلے دو تین منٹ اس ویرانے میں تہلکہ خیز تھے۔ میں کوئی بہت اچھا نشانے باز نہیں تھا۔ رائفل چلانا بھی میں نے عمران سے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہی سیکھا تھا لیکن اس وقت میرے رگ و پے میں جو برق دوڑ رہی تھی، اس نے مجھے میری اصل صلاحیتوں سے کہیں اوپر اُبھار دیا تھا۔ بھیگے ہوئے جنگل میں دھماکے ہوئے، شعلے چمکے اور پگھلا ہوا سیسہ ہدف کی تلاش میں ہر طرف مہلک پرواز کرنے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق کم از کم تین افراد اور ایک گھوڑی ایل ایم جی کی مہلک فائرنگ کا شکار ہوئے۔ لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ قریب آتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک سیاہ پرچھائیں دائیں طرف سے مجھ پر جھپٹی۔ یہ لاچے کُرتے والا ایک قوی ہیکل شخص تھا۔ میں دھکا لگنے سے دور جا گرا۔ ایل ایم جی ایک درخت سے ٹکرائی اور اس کا نم دستہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ میں نہتا ہو گیا۔ ثروت کے چلّانے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ کم از کم چار پانچ افراد مجھ پر پل پڑے۔ وہ اس مرحلے میں مجھے جان سے مارنا چاہتے تو مار سکتے تھے لیکن وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ وہ رائفلوں کے کندھوں اور لاٹھیوں سے مجھے مارنے لگے۔ وہ وحشی ہو رہے تھے لیکن ایک بات سے وہ بے خبر تھے۔ میں مکمل طور پر نہتا نہیں تھا میری ٹانگ کے ساتھ وہ بے مثال چاقو بندھا ہوا تھا جس نے بھانڈیل اسٹیٹ میر جارج جیسے درندے کو چیرا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی توانا گردنوں کا خون چاٹا تھا۔

میں نے نیچے گرے گرے وہ چاقو اپنی ران سے جدا کیا۔ اس کا دستہ میرے ہاتھ میں آیا تو رگوں میں سیال آگ دہک اُٹھی۔ وہ ساری بے پناہ نفرتیں دل و دماغ میں تازہ ہو گئیں جنھوں نے میری ہنستی بستی زندگی کو برباد کیا تھا۔ آج سیٹھ سراج میرے سامنے نہیں تھا، واجی نہیں تھا، ایم پی اے گورایا اور تھانیدار اشرف بھی نہیں تھا، لیکن ان کے ہمزاد تو تھے۔ یہ سب اسی قبیل کے لوگ تھے۔ اسی لازوال سفاکی کے علمبردار تھے۔ میں نے پہلا وار ایک شخص کی گنبد نما توند پر کیا اور اسے اُفقی رُخ پر چیر کر رکھ دیا۔ نیچے جھکے جھکے دوسرا وار ایک رائفل بردار کی ناف پر کیا۔ چاقو چربی دار جلد کاٹ کر دستے تک اندر گھسا اور مضروب کی کربناک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے زور لگا کر چاقو کھینچا۔ گرم خون میرے ہاتھ پر گرا۔ ایک کلہاڑی کا قاتل وار بچاتے ہوئے میں نے کلہاڑی بردار کی گردن پر کاری زخم لگایا۔ وہ زیادہ تھے۔ مسلح تھے لیکن خود پر اچانک ٹوٹنے والی قیامت نے انہیں سکتہ زدہ کر دیا۔ ایک گولی چلی لیکن مجھے ایک دیوانہ سا بھروسہ تھا کہ آج کوئی گولی مجھے چھو نہیں سکے گی۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں اس جگہ ایک خون ریز ''معرکہ'' ہوا۔ میرے مقابل پانچ افراد آئے تھے۔ ان میں سے دو تو پہلے ہلے میں ہی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ باقی تین بھی میری وحشت کے آگے ٹھہر نہیں سکے۔ میرے قاتل چاقو نے انہیں اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ میں دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ ان کو زخم زخم کر رہا تھا۔ آخری ایک شخص دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ اوجھل ہو گیا۔ میں واپس پلٹا۔ ایک زخمی تڑپ رہا تھا اور کسی ہتھیار تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر چڑھ کر اس پر متعدد وار کیے اور اسے ٹھنڈا کر دیا۔

لیکن ابھی بلا ٹلی نہیں تھی۔ ایک اور گاڑی کی روشنیاں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔

"ثروت اُٹھو......" میں نے ثروت کو تھاما۔

وہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ میرے ذہن میں یہ خوفناک خیال آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی مگر اس کے پاؤں پر بالکل وزن نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکیاں نکلیں۔ میں نے ایل ایم جی پھر اپنے کندھے سے لٹکائی۔ چاقو دوبارہ چمڑے کے تسمے میں اُڑسا اور اسے گود میں اُٹھا لیا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ اس نے سہارے کے لیے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور اپنا سر نیم جان انداز میں میرے سینے سے ٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ رُخ ٹیلے کی طرف تھا۔ گاڑی کی آمد سے پہلے پہلے میں اس ٹیلے (تھے) تک پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ انڈسٹریل ایریا میں چند ہفتے پہلے زخمی ہونے والی ٹانگ سے مسلسل ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ شدید تھکن بھی کام دکھا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نچلا دھڑ بالکل سن ہو گیا ہے۔ ہمت جواب دے رہی تھی، بالکل جواب دے رہی تھی۔ مگر باروندا جیکی نے کہا تھا، جہاں برداشت ختم ہو جاتی ہے، ہمت جواب دے جاتی ہے، وہیں سے کامیابی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہیں سے معجزے آغاز ہوتے ہیں۔

میں پوری توانائیاں صرف کر کے بڑھتا رہا اور ٹیلے پر پہنچ گیا۔ یہاں پختہ اینٹوں سے بنا ہوا ایک پُرانا کوٹھا سا تھا۔ ایک طرف سے اس کی چھت گر چکی تھی اور اس نے جھونپڑے کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ اس جھونپڑا نما جگہ کے اندر کوئلے بکھرے ہوئے تھے اور سالن کی چند ہڈیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف بہت سی خشک ٹہنیاں رکھی تھیں۔ یوں لگا کہ دو چار دن پہلے یہاں کوئی مسافر یا شکاری وغیرہ رُکے ہیں اور انہوں نے چولہا بنا کر آگ جلائی ہے۔ ممکن تھا کہ یہ کمرہ کبھی فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ یا رینجرز وغیرہ کے استعمال میں رہا ہو۔ مگر آج اس بارشی رات میں یہ میری اور ثروت کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ میں ثروت کو اس جھونپڑا نما کمرے میں لے آیا۔ ہم بارش سے محفوظ ہو گئے لیکن پانی ہمارے کپڑوں سے مسلسل ٹپک رہا تھا۔ میں نے ثروت کو اُتار دیا۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی کو ہولے ہولے دبانے لگی۔ اس کا ٹخنہ کچھ اور سوج گیا تھا۔ وہ جب میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف نمودار ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی خوف کھانے لگی ہے۔ میرے کپڑوں پر تازہ خون کے دھبے بھی اسے دہشت زدہ کر رہے تھے۔ میں نے ایل ایم جی کو چیک کیا۔ کینوس کے تھیلے میں سے گولیاں نکال کر اضافی میگزین کو پورا لوڈ کیا اور تیار ہو گیا۔

گاڑی اب بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گاڑی کے سوار پہلی گاڑی کو نہیں دیکھ سکے اور نہ ان تین چار بدمعاشوں کو جنہیں میرے چاقو نے لاشوں میں تبدیل کیا تھا۔ وہ ٹیلے کے بالکل نزدیک پہنچ کر رُک گئے۔ شاید انہیں محسوس ہوا تھا کہ یہ ٹیلا کسی کے چھپنے کے لیے مناسب جگہ ہے۔ وہ یہاں نظر ڈالنا چاہتے تھے، پھر میں نے دیکھا کہ وہ اوپر آ رہے ہیں۔ اب میرے پاس دو راستے تھے۔ ایل ایم جی کا منہ کھول دیتا، مارتا اور مر جاتا یا پھر وہاں موجود ڈھینگریوں یعنی خشک ٹہنیوں کو پناہ کے لیے استعمال کرتا۔ یہ ڈھینگریاں ایک انبار کی صورت میں ایک طرف پڑی تھیں۔ میں نے یہی طریقہ مناسب سمجھا۔ میں یہ ڈھینگریاں گھسیٹ کر جھونپڑے میں لایا اور خود کو ثروت سمیت ان کے پیچھے کیموفلاج کر لیا۔ بس ایک کوشش تھی جو کامیاب ہو سکتی تھی اور ناکام بھی۔ ثروت کے لیے یہ سارا نظارہ ناقابل دید تھا۔ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگا لی اور سیاہ رنگ کی ایل ایم جی بالکل تیار حالت میں گود میں رکھ لی۔ آنے والے پہلے ٹیلے کے گرد چکراتے رہے پھر اوپر آ گئے۔ دو ٹارچوں کے روشن دائرے آس پاس چکرا رہے تھے۔ وہ لوگ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان باتوں میں گالیوں کی بہتات تھی۔ کوئی ڈھلوان پر پھسلا اور اس نے کیچڑ کو ماں بہن کی گالی دی۔ دوسرا بولا "منہ بند رکھ۔ وہ تیرے ماں پیو اِدھر ہوں گے بھی تو تیری آواز سن کر کسی طرف نکل بھاگیں گے۔"

یہ سنسنی اعصاب کو ریزہ ریزہ کر رہی تھی۔ یہ صورتِ حال سولی پر لٹکنے کے مترادف تھی۔ ہم ساکت و جامد بیٹھے رہے۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ وہ اندر آئے۔ انہوں نے ٹارچ کا دائرہ چاروں طرف گھمایا۔ یہ روشنی چند سیکنڈ کے لیے اس جھاڑ جھنکاڑ پر رُکی جس کے عقب میں ہم تھے۔ میں سمجھا کہ ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ میں نے ٹریگر پر رکھی انگلی کو حرکت دینا چاہی لیکن ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔ یہی لمحہ...... یہی ایک لمحہ ہمیں خوفناک تصادم سے بچا گیا۔ روشن دائرہ آگے بڑھ گیا، اِدھر اُدھر گردش کرنے لگا۔ وہ ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر تھے پھر وہ باہر نکل گئے۔ گہری تاریکی چھا گئی۔

○......❖......○

نیم خنک رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی، ہم فوری ٹکراؤ سے تو بچ گئے تھے لیکن خطرہ پوری طرح دور نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ اردگرد ہی موجود تھے۔ انہوں نے دوسری گاڑی ڈھونڈ لی تھی اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں بھی دیکھ لی تھیں۔ مجھے گاہے بگاہے دور کیکر اور ٹاہلی

کے درختوں میں کسی ٹارچ کی روشنی چمکتی نظر آ جاتی تھی۔ ہمارے گیلے کپڑے ہمارے جسموں پر ہی دھیرے دھیرے خشک ہو رہے تھے۔ انہیں اُتارنے کا موقع تھا اور نہ سکھانے کا۔ ثروت سکتہ زدہ سی بیٹھی تھی۔ وہ جب لاہور سے یوسف کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی اس کے تصور میں بھی نہ ہوگا کہ حالات ایسا سنگین رُخ اختیار کریں گے۔ مجھے لگا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوا، وہ تپ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کانپ بھی رہی تھی۔ میں نے اصرار کر کے اسے لٹا دیا اور اس کے سر کے نیچے کینوس کا تھیلا رکھ دیا۔ وہ بالکل گم صم تھی، ایک لفظ بھی نہیں بول رہی تھی۔ میں نے اس کی اوڑھنی نچوڑ کر ایک طرف پھیلا دی۔

رات کی تاریکی میں دھیرے دھیرے اُجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ ہمارے اردگرد صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ ثروت سو چکی تھی یا شاید مدہوشی کی سی حالت میں تھی۔ میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگا لی اور ترچھی چھت کو گھورنے لگا۔ ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ پہلے میں کرشمہ کپور اور راجا کو پیش آنے والے سانحات کے بارے میں سوچتا رہا پھر خیالات کا دھارا یوسف کی طرف مڑ گیا۔ یوسف کی گمشدگی ایک انوکھے اور بڑے اسکینڈل سے جڑی ہوئی تھی۔ انڈین ڈان جادا جیسا شخص اس میں ملوث تھا۔ یہ لوگ میڈیا کے ذریعے معروف شخصیات سے ملتے جلتے لوگ تلاش کرتے تھے۔ پھر ان میں سے بہترین کا انتخاب کر کے انہیں مختلف طریقوں سے استعمال کرتے تھے۔ یوسف کی شکل کم از کم میری معلومات کے مطابق کسی معروف اداکار سے نہیں ملتی تھی، لیکن امکان تھا کہ کسی کھلاڑی یا سیاست دان وغیرہ سے ملتی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ وہ شخص کسی شدید خطرے کی زد میں ہو اور اس کی نقل و حرکت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے یوسف فاروقی کو استعمال کیا جائے یا پھر اس طرح کی کوئی صورتِ حال ہو سکتی تھی۔ یوسف فاروقی ابھی پیلی حویلی میں تھا اور اسے کسی بھی وقت انڈین علاقے میں منتقل کیا جا سکتا تھا۔ اسے بچائے جانے کی ضرورت تھی لیکن ہم یہاں پھنس گئے تھے۔ مجھے عمران یاد آیا۔ اس کی جادوئی شخصیت اس کا ''دیواروں میں در بنانے کا ہنر'' کاش میرے پاس اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہوتا۔ وہ میری مشکل کو جانتا تو اُڑتا ہوا یہاں پہنچ جاتا۔ عمران کا ساتھی جیلانی اور اقبال بھی اسی علاقے میں موجود تھے لیکن ہمارے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ میرا سیل فون لطیف کی دکان میں دال کی ایک بوری کے اندر بے جان پڑا تھا۔

اچانک ثروت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ وہ چلّانے والے انداز میں بولی۔ ''نہیں تابش..... خدا کے لیے..... ایسا نہ کریں، مت ماریں، چاقو پھینک دیں۔''

''ثروت! ہوش کرو۔'' میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ پھر بدحواسی میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے اپنی لال آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ ان میں خوف تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ ''ثروت! سب ٹھیک ہے..... کچھ نہیں ہوا۔ میں یہاں ہوں، تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔''

وہ دھیرے دھیرے حواس میں آ گئی۔ غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے تپتے ہونٹوں سے اپنی ٹھنڈی ہتھیلی ہٹا لی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ پلکوں کے نیچے سے دو موتی سرخ رُخساروں کی طرح سرکنے لگے۔ اس نے کراہ کر پہلو بدلا اور کچھ دیر بعد پھر گہری غنودگی میں چلی گئی۔ اس کا بخار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

باہر دن کا اُجالا پھیل گیا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ نے نئے دن کا اعلان کر دیا۔ بارش رُک چکی تھی مگر مطلع اَبر آلود تھا۔ اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ پیلی حویلی کے ہرکارے پھر سے اس ٹیلے کی طرف آئیں۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔

کچھ دیر بعد ثروت نہایت تیز بخار کے زیرِ اثر پھر بڑبڑانے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ نصرت اس کے آس پاس موجود ہے۔ وہ کہہ رہی تھی نہیں نصرت..... نہیں..... پر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں کیوں سوچتی ہوں؟ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے..... یہ گناہ ہے..... وہ اب میرے لیے غیر ہیں..... مجھے پانی پلاؤ نصرت..... میرا گلا سوکھ گیا ہے..... میں یوسف کی بیوی ہوں۔ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں..... میرا جینا مرنا ہے ان کے ساتھ۔ میں کیا کروں..... مجھے پانی پلاؤ نصرت.....''

وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی۔ پھر وہ یوسف کا نام لینے لگی۔ ''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ آپ سب کچھ ہیں میرے لیے..... مجھے گناہ گار نہ کریں۔'' اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ خشک گلے کے باعث اسے شدید کھانسی ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔ اسے پانی چاہیے تھا لیکن صاف پانی کہیں نہیں تھا۔ میں نے اپنے گیلے رومال سے اس کے ہونٹ تر کیے۔

وہ ننگے سر تھی اور اوڑھنی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اسے اوڑھنی دی۔ اس کے پاؤں میں شدید درد تھا لیکن وہ غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ انگلیوں کو حرکت دے سکتی تھی۔ ٹخنہ بھی موڑ لیتی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ سخت قسم کی موچ آئی ہے۔ وہ میری طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ یقیناً میری شلوار قمیص پر خون کے بڑے بڑے دھبے اس کے خوف میں اضافہ کر رہے تھے۔ میرے پاس فی الحال ان دھبوں کا کوئی حل نہیں تھا۔

ہمارے اردگرد بظاہر سکون ہی تھا لیکن ابھی یہاں سے نکلنے کا فیصلہ ہرگز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رات کی بارش نے قدموں کے نشان مٹا دیئے تھے اور یہ بات کسی حد تک ہمارے حق میں جاتی تھی۔ یہ ایک ویران جگہ تھی اور ہمارے اردگرد ہمارے خون کے پیاسے تھے۔ مجھے مقامی پولیس کی طرف سے بھی کوئی امید یا خوش فہمی نہیں تھی۔ ظاہر تھا کہ یہاں لاشیں گری تھیں۔ عین ممکن تھا کہ پولیس بھی پیلی حویلی کے چودھریوں کے ساتھ مل کر ہمیں ڈھونڈنے اور مارنے کے درپے ہو۔

مجھے پاس ہی کسی گھوڑے کی مدھم ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں نے آگے بڑھ کر نشیب میں جھانکا۔ ڈھلوان پر نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ موجود تھے اور شاید محتاط طریقے سے اوپر آ رہے تھے۔ مجھے ایک نیلگوں پگڑی کی جھلک بھی نظر آئی۔ یوں لگا کہ آنے والوں میں کوئی سکھ بھی شامل ہے۔ ثروت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈرے ہوئے سوال تھے۔

ہم خشک ٹہنیوں کے انبار کے پیچھے بالکل بے حرکت ہو گئے۔ آنے والوں کی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ اس شکستہ کمرے کی طرف آنے کے بجائے اوپر چلے گئے۔ شاید وہ اس کھنڈر جگہ کو کلیئر قرار دے چکے تھے اور اب کسی اور مشتبہ جگہ پر تاک جھانک کرنا چاہتے تھے۔ ایل ایم جی میری گود میں تھی اور میری طرح ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار تھی۔ ثروت میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کا بخار میں پھنکتا ہوا جسم مجھے آنچ دے رہا تھا۔

''کون لوگ تھے یہ؟'' اس نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔''

''مجھے یہ حویلی کے لوگ نہیں لگتے کچھ اور طرح کی آوازیں تھیں ان کی۔'' ثروت نے کہا۔

اس نے میرے خیال کی تصدیق کی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی یہ شبہ ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو لوگ ہمارے سامنے سے گزرے ہیں، وہ پیلی حویلی کے ہرکارے نہیں تھے اور شاید...... رات کو بھی جن لوگوں نے اس شکستہ کمرے میں جھانکا تھا، ان کا تعلق پیلی حویلی سے نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ایک سکھ کی رنگین پگڑی بھی دکھائی دی تھی۔ اچانک میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ دماغ سنسنا اُٹھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کل بادو باراں والی تاریک رات میں ہم دونوں بھاگتے بھاگتے انڈین علاقے میں داخل ہو گئے ہوں؟

یہ بڑا سنسنی خیز خیال تھا مگر ابھی میرے سامنے اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جہاں تک پگڑی والے سکھ کی بات تھی، ایسے لوگ تو چودھری انور کی پیلی حویلی میں بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' ثروت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''کچھ نہیں...... مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ چودھری انور کے لوگ نہیں ہیں۔''

وہ سرسراتی سرگوشی میں بولی۔ ''اور کل رات جب آپ ان لوگوں سے لڑ رہے تھے، مجھے درختوں میں دو تین دفعہ تیز روشنی بھی نظر آئی تھی۔ یہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ یہ...... کچھ اور تھا۔ جیسے کوئی بڑی سرچ لائٹ ہو۔''

''سرچ لائٹس تو بارڈر پر ہوتی ہیں۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بارڈر کے بالکل پاس آ گئے ہیں؟'' ثروت بولی۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی دوران میں ہمیں اپنے اردگرد پھر قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہ لوگ جو اوپر گئے تھے، واپس آ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کا کوئی فقرہ ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا ہماری سماعتوں سے آ ٹکراتا۔

ایک شخص نے دوسرے کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''اوئے بدتخماں! تیری آنکھیں ہیں کہ کول ڈوڈے۔ یہ پاؤں کا نشان نہیں ہے۔ یہ دیکھ، یہ بھی ایسا ہی نشان ہے کوئی تین پیروں والا جانور بھی ہوتا ہے؟''

باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ کچھ آگے نکل گئے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن یہ اطمینان بالکل عارضی ثابت ہوا۔ ایک بار پھر دل شدت سے دھڑک اُٹھا۔ کوئی ہمارے بالکل قریب موجود تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس بتیس سال ہوگی۔ اس نے خاکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں چادر لٹکا رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے قمیص کے نیچے پستول وغیرہ لگا رکھا ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے شلوار کا ازار بند کھولا۔ قمیص تھوڑی اوپر اُٹھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگا۔ زردی مائل پیشاب اس کے قدموں کے پاس سے بہہ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ پیشاب کرنے کے بعد اس نے ازار بند باندھا اور ایک بار پھر کمرے میں طائرانہ نظر ڈالی۔ خشک ٹہنیوں کے انبار پر اس کی نگاہیں چند سیکنڈ کے لیے رُک گئیں۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس جواں سال سکھ کا ایک قدم اسے موت کی وادی میں دھکیل سکتا تھا اور شاید ہمیں بھی۔

وہ کچھ دیر ٹہنیوں کو گھورتا رہا پھر باہر چلا گیا۔اس وقت نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ شخص یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ اس نیم تاریک کمرے میں خشک ٹہنیوں کے انبار کے پیچھے کوئی ہے۔

معلوم نہیں میرا یہ احساس غلط تھا یا درست۔ مگر چند لمحوں کے اندر میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ مجھے ایک بار پھر رات والی صورتِ حال یاد آگئی۔ ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے میں حرکت کرتا رہا تھا اور پھر ایک جگہ ڈھینگریوں (خشک ٹہنیوں) کے ڈھیر پر رُک گیا تھا۔ کیا اس وقت بھی ٹارچ اسی شخص کے ہاتھ میں تھی؟ یہ کون تھا؟ اگر وہ واقعی یہاں ہماری موجودگی کے بارے میں شبہ کر رہا تھا تو اب تک خاموش کیوں تھا۔

وہ پورا دن عجیب تناؤ اور سخت ترین پریشانی کے عالم میں گزرا۔ ہم اس بارہ ضرب بارہ فٹ کے کمرے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں سیلن تھی، گھٹن تھی اور حشرات الارض بھی تھے۔ ثروت کے بازو پر کوئی نامعلوم کیڑا رینگ گیا تھا اور جلد سرخ ہو گئی تھی۔ بخار نے بھی اس کی بُری حالت کر رکھی تھی۔ اوپر سے ٹخنے کا درد تھا۔ وہ بے مثال برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہرحال وہ عورت تھی۔ گاہے بگاہے اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک درد بھری آہ نکل جاتی تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں؟ ہمارے اردگرد جو لوگ ہیں وہ کون ہیں؟ اور کل شب جو خون ریز ہنگامہ ہوا ہے اس کے نتائج ہمارے لیے کیا نکلنے والے ہیں؟ پریشانی میں انسان کی بھوک تو دب جاتی ہے مگر پیاس کی شدت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ بخار کی وجہ سے ثروت کو زیادہ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں دس بارہ قدم کے فاصلے پر خودرو پودوں کے درمیان مجھے ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس میں کل رات کی بارش کا پانی جمع تھا اور اب کافی نتھر چکا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ وہاں تک جاؤں اور پانی لے آؤں۔ لیکن دو مسئلے تھے۔ ایک تو پانی کے لیے کوئی برتن نہیں تھا۔ دوسرے نگاہ میں آ جانے کا شدید خطرہ تھا۔ اس گڑھے تک جانے کے لیے ضروری تھا کہ میں رات ہونے کا انتظار کروں۔

○……❖……○

کچھ مناظر بار بار نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ نیتو عرف کرشمہ کپور کا سرد بے جان جسم، راجا کی شہ رگ سے اُچھلنے والا خون، کیکر اور جنتر کے درختوں کے درمیان چودھری کے ہرکاروں سے میرا لہورنگ معرکہ۔ یوں لگتا تھا جیسے کل رات جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ جیسے تیسے یہ پہاڑ جیسا بھاری بھرکم دن گزر گیا۔ اردگرد پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دی اور شام کے سائے اس ویرانے پر طویل ہونے لگے۔ اندھیرا ایک چادر تھا

اور یہ چادر ہمارے بہت کام آ سکتی تھی۔ سب سے پہلے مجھے پانی لانا تھا، اس کے لیے میں نے ایمونیشن والے تھیلے کے اندر سے ایک چھوٹا سا شاپر ڈھونڈ لیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں ڈھینگریوں کے پیچھے سے نکلتا اور پانی کی طرف بڑھتا، ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک بار پھر ہمارے آس پاس قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس بار یہ آہٹ زیادہ قدموں کی نہیں تھی۔ کوئی شخص ہولے سے کھانسا اور پھر خستہ حال کمرے کے اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی نیلی پگڑی والا سکھ تھا جو دن کے وقت بھی یہاں آ چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گن کے ٹریگر پر انگلی رکھ لی اور سانس روک کر نو وارد کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا۔ ثروت میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی سانس تیزی سے آ جا رہی تھی۔ آنے والے کی آواز کمرے میں گونجی۔

''باہر نکل آؤ۔ میں جانتا ہوں تم یہاں ہو۔''

میں چند سیکنڈ ساکت و جامد رہا پھر شاخوں کو حرکت دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ آنے والا خالی ہاتھ تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا کہ اس کی خاکی قمیص کے نیچے ہتھیار موجود ہے۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر ڈالا اور پھر ڈھینگریوں پر اس جگہ روشنی کی جہاں ثروت دبکی ہوئی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''گن نیچے کر لو بھائی جی! میں دشمن نہیں سجن ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''جگت سنگھ! پاس کے پنڈ جوپور کا رہنے والا ہوں۔''

''یہاں...... پاکستانی علاقے میں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں ہندوستانی علاقے میں کیا کر رہے ہو؟''

''ہندوستانی علاقہ؟''

''ہاں......'' وہ دیوار سے پشت لگا کر بولا۔ ''تم اس ویلے (وقت) بارڈر پار کر چکے ہو اور ہندوستانی علاقے میں ہو۔ کسی بھی ویلے بی ایس ایف والے تم پر جھپٹا مار سکتے ہیں۔ بڑے زہریلے ہوتے ہیں یہ۔ تمہارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے یہاں سے نکلنے کے لیے۔''

میں سناٹے میں تھا۔ میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ کم از کم ابھی تو یہی لگ رہا تھا۔

اس نے ٹارچ نیچے جھکا لی اور پھر بجھا دی۔ میں نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ شکل سے سیدھا سادہ پینڈو لگتا تھا مگر آنکھوں میں ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے رویے میں مجھے ہمدردی کی لہر محسوس ہوئی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں انڈین علاقے میں ہوں۔''

وہ بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔''

''لیکن تم ہو کون؟''

''یارا! ابھی تو اتنا جانو کہ میں جگت سنگھ ہوں اور تمہیں بڑے سخت خطرے میں سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

''پر کیوں؟''

''بس سمجھ لو کہ دل آ گیا ہے تم پر۔'' وہ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ کل رات یہاں سے کچھ فاصلے پر میرے اور چودھری انور کے ہرکاروں میں جو خون ریز جھڑپ ہوئی تھی، وہ اس شخص نے کسی طور دیکھی ہے۔ میرے کہنے پر ثروت بھی شاخوں کے پیچھے سے نکل آئی۔ جگت سنگھ نے اسے بس ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف آنکھ نہیں اُٹھائی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جگت نامی شخص جو کہہ رہا ہے، درست ہے اور ہم پر واقعی کسی بھی وقت بی ایس ایف کا چھاپا پڑ سکتا ہے۔ جگت سنگھ کے لب و لہجے میں بہت اعتماد تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے اور ہمیں بہ آسانی اس جگہ سے نکال سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمیں انڈین علاقے کی طرف نکالنا چاہ رہا تھا جبکہ ہمارے لیے ضروری تھا کہ اپنا رُخ پاکستان کی طرف رکھیں۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر تم واقعی ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو پھر ہمیں پاکستانی علاقے کی طرف نکالو۔ تمہارے علاقے کی طرف جا کر تو ہم مزید پھنس جائیں گے۔''

وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''بھولے بادشاہ! کافی آگے آ گئے ہو تم۔ اب پاکستانی علاقے کی طرف جاؤ گے تو رینجرز والے بھون کر رکھ دیں گے۔ کل رات تو زور کی بارش تھی۔ تمہاری قسمت نے بھی ساتھ دیا اور تم گولی کھائے بغیر یہاں تک آ گئے۔ اب بہت مشکل ہے اور پھر دوسری گل کیوں بھول رہے ہو۔ تم نے وہاں پانچ چھ بندے پھڑکائے ہیں۔ ان کے وارث جنگلی کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس اور رینجرز والے بھی ان کے ساتھ مل کر تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔''

وہ بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کل رات جو کچھ ہوا، وہ میری توقع اور نیت سے بہت زیادہ

تھا۔ ثروت میرے ساتھ تھی اور اس کی حفاظت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ جب جارج کا چاقو میرے ہاتھ میں آیا تو مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بھانڈیل اسٹیٹ میں ''زرگاں قلعے'' کی خونی لڑائی میں ہوئی تھی۔

کمرے کی تاریکی میں میرے اور جگت سنگھ کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ فی الحال ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو یہ جگت نامی شخص کہہ رہا ہے۔ ہم وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ثروت پیاس کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے بارشی گڑھے میں سے کچھ پانی لیا اور ثروت کو چند گھونٹ پلائے۔

ثروت کے لیے چلنا محال تھا۔ میں نے اس کا بازو کندھے کے قریب سے تھاما اور اسے چلنے میں مدد دی۔ وہ بمشکل اپنے قدم آگے بڑھانے لگی۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ یہ احساس بڑا مختلف تھا کہ ہم پاکستان کے بجائے انڈیا کی سرزمین پر چل رہے ہیں۔ یکایک میں چونک گیا۔ درختوں کے اندر سے تیز روشنی کا ایک ترچھا ستون سا نظر آیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگا۔ اس کی زد میں آنے والی ہر چیز روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی تھی۔ یہ وہ طاقتور سرچ لائٹ تھی جو کل رات بھی متعدد بار چمکی تھی اور جس کا ذکر ثروت نے کیا تھا۔

کچھ دیر بعد لائٹ اوجھل ہو گئی اور ایک بار پھر ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ ہمارا راہنما جگت سنگھ بڑے اعتماد سے قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ بار بار سرگوشی کر رہا تھا۔ ''گھبرانا نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔''

کچھ دیر بعد ثروت کے لیے قدم اُٹھانا مشکل ہو گیا تو جگت سنگھ نے بڑی ہمدردی کے ساتھ اور پُرخلوص انداز میں ثروت کو دوسری طرف سے سہارا دینے کی پیشکش کی۔ اس پیشکش کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

اب ایک طرف سے جگت نے اور دوسری طرف سے میں نے ثروت کو تھاما ہوا تھا۔ وہ ہم دونوں کے کندھوں پر پورا دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر جگت سنگھ رُک گیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''لائٹ پھر جلنے والی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ گھومتی ہوئی ان سامنے والے کیکروں کے اوپر سے گزرے گی۔ جب وہ وہاں سے گزر جائے تو ہم کو فٹافٹ یہاں سے اُٹھنا ہوگا اور ان دائیں طرف والے جنتروں تک پہنچنا ہوگا۔ بس ایک منٹ کے اندر اندر۔''

''لیکن اس سے تو چلا نہیں جا رہا۔'' میرا اشارہ ثروت کی طرف تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ اگر نکلنے میں دیر کر دی تو پھر 'لائٹ' پکڑ لے گی۔"

میں نے دیکھا، بائیں طرف اندھیرے میں ایک اونچا مینار سا نظر آ رہا تھا جیسے سرو کا کوئی بلند و بالا درخت ہو۔ جگت میری اُلجھن بھانپ کر بولا۔ "یہ لکڑی کا ٹاور ہے۔ اس پر بی ایس ایف والے ہیں۔ مشین گن بھی ہوتی ہے اوپر۔ پر ڈرنے کی لوڑ نہیں ہے۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس جیسا کہتا ہوں، ویسا کرتے رہو۔"

"لیکن......"

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔"

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور بولا۔ "یہ دیکھو یہ ہمارے ہاتھوں سے ایک طرح کی کرسی بن گئی ہے۔ میری بھین (بہن) اس پر بیٹھ جائے گی۔ ہم دونوں طرف سے اس کا بازو پکڑ لیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

مشکل سے جگت کے الفاظ مکمل ہوئے تھے کہ طاقتور سرچ لائٹ کا ترچھا ستون پھر روشن ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ میرے سینے میں دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی۔ روشن ستون حرکت کرتا ہوا ہمارے سامنے کیکر کے درختوں کے اوپر سے گزر گیا تو جگت سنگھ نے تیز سرگوشی کی۔ "چلو آؤ۔"

ہم نے ثروت کو اپنے بازوؤں کی کرسی پر بٹھایا۔ دونوں طرف سے اس کے کندھے تھامے اور تیزی سے آگے بڑھے۔ ثروت نے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا تھا۔ واقعی جگت ان راستوں کا گہرا شناور تھا۔ تاریکی کے باوجود ہم کہیں ٹھوکر کھائے بغیر آگے بڑھ رہے تھے۔ "یہاں ایک کھالا ہے۔ دھیان سے۔" جگت نے تیز سرگوشی کی۔

کھالے کی مختصر گہرائی سے گزرنے کے فوراً بعد ہم جنتر کی محفوظ جھاڑیوں میں پہنچ گئے۔ جگت بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ تھوڑی بہت سانس مجھے بھی چڑھی تھی۔ ہمیں جنتروں میں پہنچے مشکل سے چند سیکنڈ ہوئے تھے کہ سرچ لائٹ کا خطرناک روشن دائرہ اس مقام سے گزرا جہاں سے ہم ابھی گزر کر آئے تھے۔

کچھ دیر تک سانسیں درست کرنے کے بعد جگت نے کہا۔ "ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ آگے بڑھنا ہوگا۔"

ہم نے ایک بار پھر ثروت کو دونوں طرف سے سہارا دیا اور وہ اپنے ایک پاؤں پر زور دیتے ہوئے ہمارے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ ایک جگہ پھر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے رُکنا پڑا۔ کسی سیکیورٹی اہلکار کی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی تھی۔ روشنی فاصلے پر چلی گئی تو ہم پھر اُٹھے اور

محتاط انداز میں چلتے ہوئے ایک گدھا گاڑی تک پہنچ گئے۔ گاڑی پر دودھ کے تین چار بڑے برتن رکھے تھے اور ایک طرف سبز چارے کا گٹھا پڑا تھا۔ جگت سنگھ نے ہمیں گاڑی پر بٹھایا اور گدھے کو ہانکنا شروع کر دیا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ثروت پیچھے تھی۔ وہ ثروت سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چھوٹی بھین! اگر کوئی تجھ سے کسی طرح کی کوئی بات پوچھے تو گونگی بن جانا۔ آپاں (ہم) کہیں گے کہ یہ بول نہیں سکتی۔ ٹھیک ہے؟" ثروت نے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب جگت مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہارا نام صادق محمد ہے۔ یہ تمہاری پتنی ہے۔ تم میرے بیلی ہو اور مجھ سے ملنے کھنڈوت پورہ سے آئے ہو۔ کھنڈوت پورہ ڈیک نالے کے پار سکھوں اور مسلمانوں کا پنڈ ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے کہا۔ "سمجھ تو رہا ہوں۔ پر اس گن کو اور گولیوں والے تھیلے کو کہاں چھپانا ہے اور میرے کپڑوں پر یہ خون کے بڑے بڑے داغ؟"

"اوہ...... میری بھی مت ماری گئی ہے۔" جگت نے کہا۔ پھر جلدی سے اپنے گلے کی چادر اُتار کر میری طرف بڑھائی۔ "لے یار! اس کی بکل مار لے اور بندوق کو گھسا دے اس چارے کے نیچے۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ چادر لپیٹ لی اور گن کے ساتھ ساتھ کینوس کا بیگ بھی چارے میں چھپا دیا۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے وہ کچا لیکن ہموار تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ ایک سرحدی گاؤں تھا۔ جگت نے بتایا کہ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ اس وقت ہماری دھڑکنیں بُری طرح زیر و زبر ہوئیں جب اندھیرے میں کسی نے فوجی انداز میں پکار کر کہا۔ "کون ہے؟"

جگت نے فوراً مسکین آواز میں کہا۔ "میں ہوں جی جگتا! دودھ دے کر آیا ہوں۔"

"یہ ساتھ کون ہے تیرے؟"

"میری بھین ہے جی اور اس کا بندہ صادق۔ کھنڈوت پورہ سے آئے ہیں، ملنے کے لیے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ یہ سنگین خاموشی تھی۔ ہماری تلاشی ہو جاتی تو قیامت آ جاتی۔ بہرحال، خیریت گزری۔ چند سیکنڈ بعد آواز آئی۔ "ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... نکلو...... ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔"

O......❖......O

جگت نے تخ تخ کر کے گدھے کی پشت پر چھڑی لگائی تو اس کی رفتار بڑھ گئی۔ قریباً دس منٹ بعد ہم اس سرحدی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ ابھی رات کے آٹھ نو ہی بجے تھے مگر گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔ کسی کسی گھر سے ٹی وی چلنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ چند راہ گیر ملے لیکن کسی نے بھی ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ ثروت نے اپنی اوڑھنی کو گھونگھٹ کی سی شکل دے دی تھی۔ ایک گلی میں ہینڈ پمپ نظر آیا۔ میں نے ابھی تک پانی نہیں پیا تھا۔ جی چاہا کہ اُتر کر پی لوں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوک پیاس برداشت کرنا میری عادت ثانیہ بنتی جا رہی تھی۔ خود کو تکلیف دینا اسے سہنا اور سہنے کی اس حد کو بڑھانا مجھے اچھا لگتا تھا۔

ثروت نے لطیف کے گھر میں مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اپنے آپ سے انتقام لے رہا ہوں لیکن یہ انتقام نہیں تھا، یہ اس سے جدا کوئی کیفیت تھی۔

جگت سنگھ ہمیں جس گھر میں لے کر گیا، وہ کچا تھا اور اس کا صحن خاصا کشادہ تھا۔ صحن کے آخر میں ایک برآمدہ تھا اور دو تین کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ برآمدے میں ایک میلا سا بلب روشن تھا۔ صحن کی ایک طرف دو چھپر تھے جن کے نیچے چار پانچ بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔

گھر میں صرف ایک عورت تھی۔ وہ پچیس چھبیس سال کی خاصی تگڑی دیہاتن تھی، شکل بھی اچھی تھی۔ جگت نے بے تکلفی سے عورت کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ آشا کور ہے۔ میری دھرم پتنی! بڑی چنگی زنانی ہے۔ اتنی چنگی ہے کہ جی کرتا ہے، اس جیسی ایک اور ہو۔“

”تو لے آنا۔ میں نے منع کیا ہے؟ مجھ سے تو تیرا کچھ ہوا نہیں۔ شاید کسی اور سے تیری نسل آگے چل جائے۔“

”اے لے پھر...... پھر وہی گل لے کر بیٹھ گئی ہے۔ اوئے بال بچہ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ دوسرا ویاہ کر لے اور ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ تین چار سال۔ اوئے تیرے جیسی تگڑی زنانیاں تو پچاس سال کی ہو کر بھی خوشخبری سنا دیتی ہیں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

آشا نے آگے بڑھ کر ثروت سے ہاتھ ملایا اور اسے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھنے لگی۔ جگت نے کہا۔ ”آشا...... یہ بیچارے...... دو دن سے بھوکے ہیں۔ ایک مرغی بھون لے اور دو چار پراٹھے پکا لے فٹافٹ۔“

میں منع کرتا رہ گیا لیکن آشا گھر کے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ جگت اس کے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے ہمارے بارے میں تفصیل بتانے گیا تھا۔ میں اور ثروت برآمدے میں

رکھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میرے کہنے پر ثروت نے اپنا مضروب پاؤں بھی چارپائی پر رکھ لیا۔ میری گن ابھی تک چارے کے نیچے پڑی تھی۔ میں اسے جلد از جلد نکال کر اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا۔ جگت بظاہر کھرا بندہ لگتا تھا پھر بھی اتنی جلدی اس پر مکمل اعتماد کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ جگت نے مجھے ایک صاف شلوار قمیص لا دی۔ میں نے کمرے میں جا کر اپنے خون آلود کپڑے تبدیل کر دیئے۔ جگت نے خون آلود کپڑے لے جا کر غسل خانے میں رکھ دیئے اور غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم جگت اور اس کے گھر کے بارے میں کافی کچھ جان چکے تھے۔ جگت سنگھ اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ اس کی تھوڑی سی زمین تھی اور وہ دودھ بھی بیچتا تھا۔ آج کل وہ بی ایس ایف والوں کی سرحدی پوسٹ پر بھی دودھ دے کر آتا تھا۔ جگت کا ایک ماموں فوج میں نائب صوبیدار تھا اور اسی علاقے میں تعینات تھا۔ جگت سنگھ خود بھی ایک جی دار شخص تھا اور لڑائی بھڑائی کے کاموں میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ چند سال پہلے وہ آشا کو بھی اپنے سسرالیوں سے بزور بازو چھین کر لایا تھا۔ جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی گوبند سنگھ قریبی شہر ”بیکانیر“ میں پڑھتا تھا اور بہت اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ وہ یہاں گاؤں میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس گاؤں کا نام جو پور معلوم ہوا۔

جگت نے مجھے اپنے بارے میں صاف صاف تو کچھ نہیں بتایا، تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بی ایس ایف والوں کا ”خبری“ یعنی مخبر ہو سکتا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ سرحدی علاقوں میں اکثر دیہات کے اندر ایسے خبری موجود رہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کی خبریں وردی والوں تک کون پہنچاتا ہے لیکن اگر وہ واقعی خبری تھا تو پھر اس نے ہماری مدد کیوں کی تھی؟ کیوں ہمیں سیکیورٹی فورس کے خطرناک گھیرے میں سے نکال کر یہاں اپنے گھر لایا تھا اور اب ہماری خاطر مدارات کر رہا تھا؟ وہاں کھنڈر کمرے میں، مَیں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا تو اس نے بے تکلفی سے کہا تھا، بس تم پر دل آ گیا ہے۔

میں نے ایک بار پھر یہی سوال اس سے کیا تو وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔ اس نے یہ بات تسلیم کی کہ پرسوں رات بارش کے دوران میں وہ پاکستانی علاقے میں موجود تھا۔ اس نے درختوں کے اندر سے وہ خون ریز جھڑپ دیکھی تھی جو میرے اور چودھری کے کارندوں کے درمیان ہوئی۔ وہ میری ہمت اور سخت جانی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ جس وقت میں لڑ رہا تھا وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اگر میں یہاں سے بچ نکلا تو وہ میری

اور میری ساتھی کی مدد ضرور کرے گا۔

اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''صادق محمد! میرا مطلب ہے تابش محمد! میں نے اب تک کے جیون میں بڑی لڑائی بھڑائی اور مار دھاڑ دیکھی ہے لیکن...... واہگرو کی سوگند، پرسوں رات جو کچھ دیکھا اس نے دو بوتل کا نشہ کر دیا۔ یہ مت سمجھو کہ منہ پر تمہاری تعریف کر کے تم سے کوئی فائدہ لینا چاہتا ہوں۔ آپاں (ہم) تو یاروں کے یار ہیں بادشاہ زادے! دلیری اور جوانمردی جہاں نظر آئے وہیں پر سیس جھکا دیتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا پارسی...... جو دلیر ہے، وہ سجن ہے، جو بھگوڑا ہے، وہ ویری دشمن ہے۔''

اس گفتگو کے دوران میں آشا باورچی خانے میں مصروف تھی۔ بھنی ہوئی دیسی مرغی کی خوشبو آ رہی تھی۔ جگت سنگھ نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ ''پرسوں رات تم نے جو مارا ماری کی ہے، اس کا آشا کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خوامخواہ میں ڈر جائے گی۔ اس کو میں نے بس یہی بتایا ہے کہ چوکی کے پاس کوئی جھگڑا ہو گیا تھا، جس میں ایک دو بندے زخمی ہوئے اور تم کو بھی چوٹیں لگیں۔ تمہاری بندوق اور گولیاں میں نے وہ سامنے چھپر میں بھینسوں کی کھرلی کے پیچھے رکھ دی ہیں۔ وہاں انہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔ ٹھیک ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ مجھ سے پوچھنا شروع ہو گیا کہ ہمارے پیچھے کون لوگ تھے اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ابھی میں اس شخص پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ ایک مقامی زمیندار سے میری پرانی دشمنی تھی۔ اس نے ہم میاں بیوی کو یہاں دیکھا اور اپنے بندے ہمارے پیچھے لگا دیئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان کے ہاتھ نہیں آئے ورنہ انہوں نے ہمیں بہت اذیت دے کر قتل کر دینا تھا۔

جگت سنگھ نے کہا۔ ''شاید ابھی تم پوری بات بتانا نہیں چاہتے۔ چلو ٹھیک ہے میں آشا کو بھی یہی کچھ بتا دوں گا جو تم نے بتایا ہے۔ پر جو قتل شتل ہوئے ہیں ان کی گل نہیں کروں گا۔''

پھر جگت سنگھ کی نگاہ میرے ہاتھوں پر مرکوز ہو گئی۔ وہ میرے ہاتھوں کی جلد کو غور سے دیکھنے لگا اور مسکرا کر بولا۔ ''لگتا ہے کہ میرے یار نے لڑائی مار کٹائی کی بڑی سخت ٹریننگ لی ہوئی ہے۔ لڑائی کا اسٹائل دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ کراٹے شراٹے کا ماسٹر بندہ ہے۔ اب تمہارے ہاتھ دیکھ کر وشواس ہو رہا ہے کہ تم نے ریت کے تھیلے کے ساتھ بڑی زبردست مارا ماری کی ہوئی ہے۔''

''تم کیا جانتے ہو ریت کے تھیلے کے بارے میں؟''

''بہت کچھ۔'' وہ مسکرایا۔ ''میرا چھوٹا بھرا گو بندر چمپئن ہے یارا۔''

''کس چیز کا؟''

''یہی کراٹے وغیرہ کا۔ بڑے مقابلے کیے ہوئے ہیں اس نے۔ وہ سامنے والے کمرے میں کئی ٹرافیاں اور کپ پڑے ہوئے ہیں اس کے۔''

''وہ خود کہاں ہے؟''

''شہر میں لیکن کل یا پرسوں اس کو آنا ہے۔ تم سے ملاقات کراؤں گا۔ بڑا خوش ہو گا تم سے مل کر۔ وہ ذرا غصے والا ہے، پر من کا برا نہیں ہے۔ میرے آگے تو بالکل چوں چرا نہیں کرتا۔ سچی گل ہے، پہلے میں بھی اس جوڈو کراٹے وغیرہ کو بیکار کا پنگا سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو دلیر ہوتا ہے وہ دلیر ہی ہوتا ہے۔ اس کراٹے شراٹے سے کوئی ''لڑاکا'' نہیں بن سکتا۔ پر اب پتا چلا ہے کہ ایسی ٹریننگ چاندی کو سونا اور سونے کو ہیرا بنا دیتی ہے۔ پر تم نے میری گل کا جواب نہیں دیا۔ کیا تم نے بھی یہ ٹریننگ لی ہوئی ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا آشا ہاتھوں میں ٹرے لیے چھم چھم کرتی نمودار ہو گئی۔ وہ کھانے سے پہلے ہمارے لیے دودھ پتی لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کھانا تیار ہونے میں کچھ دیر ہے۔ اندازہ ہوا کہ وہ چاول وغیرہ پکانے لگ گئی ہے۔ وہ جاتے ہوئے ثروت کو بھی اپنے ساتھ باورچی خانے میں لے گئی۔ ہم دودھ پتی کے گھونٹ لیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار! تم بارڈر کے آر پار آتے جاتے رہتے ہو۔ کیا کسی طرح ہمیں واپس پاکستان نہیں بھیج سکتے۔''

اس نے کہا۔ ''پھر وہی گل کر رہے ہو بادشاہ زادے! واہگرو کا لکھ لکھ شکر کرو کہ تم دونوں وردی والوں سے بچ کر نکل آئے ہو۔ میں نہ ملتا تمہیں تو اب تک ملٹری ہسپتال میں تمہاری لاشوں کی چیر پھاڑ بھی ہو چکی ہوتی۔ فی الحال اس طرف جانے کی گل نہ کر۔ ابھی دو چار دن یہاں چھپ کر گزارو۔ پھر دیکھتے ہیں تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے یہ سارا کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں۔''

کھانا مزیدار تھا لیکن ہماری اندرونی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ اس سے لطف اُٹھا سکتے۔ ثروت نے اپنے ٹخنے پر تیل کی مالش کی اور گرم پٹی باندھ لی۔ ہمیں سونے کے لیے گھر کا ایک پچھلا کمرہ دیا گیا۔ ہم دونوں دیر تک جاگتے رہے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔ حالات کی آندھی ہمیں اُڑا کر کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ ہم یوسف کو ڈھونڈنے نکلے تھے اور شاید یوسف سے پہلے ہی خود انڈیا پہنچ گئے تھے اور اس دوران میں کئی بندوں کا قتل بھی

میرے کھاتے میں پڑ گیا تھا۔ راجا کی شکل رہ رہ کر نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ مر چکا تھا یا زندگی کی کوئی رمق اس میں باقی تھی۔ نیتو عرف کرشمہ کپور کے بارے میں تو مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ زندگی کی سرحد پار کر چکی ہے۔ میں عمران کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں تھا اور اسے میرے حالات کی کہاں تک خبر ہو سکی تھی۔ ثروت بھی اپنے گھر والوں سے بس دو تین روز کی مہلت لے کر ہی نکلی تھی۔ یقیناً لاہور میں انہوں نے بھی اس کے بارے میں پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ میں جانتا تھا، مجھے اور ثروت کو فون کر کر کے نصرت نڈھال ہو چکی ہوگی۔ بظاہر تو یہ سارا کام لطیف کریانہ فروش کی بیوی کی وجہ سے خراب ہوا تھا لیکن تقدیر کے ''کردار'' کو اس حوالے سے کیسے نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔

اگلے روز سویرے جگت نے بڑا تگڑا ناشتہ ہمارے سامنے رکھا۔ مکئی کے میٹھے پراٹھے جن میں گھی کی جگہ دودھ کی ملائی استعمال کی گئی تھی۔ گاڑھی میٹھی لسی، ساگ اور چاول۔ آخر میں دودھ پتی۔ رات کی طرح اب بھی ہم اس کھانے سے انصاف نہیں کر سکے۔ ثروت تو بس چند نوالے ہی لے کر رہ گئی۔ اس کے ٹخنے پر ایک بڑا سا پٹا بندھا ہوا تھا۔ یہ مرہم پٹی آشا نے آج صبح کی تھی۔ کوئی گھریلو ٹوٹکا تھا۔ اس میں ہلدی، نمک اور آٹا وغیرہ استعمال ہوا تھا۔ آشا نے ثروت کو گلو اور جوائن سے بنی ہوئی کوئی دوا بھی کھلائی تھی اور اسے یقین تھا کہ ایک آدھ دن میں ثروت کا بخار رفوچکر ہو جائے گا۔

جگت نے مجھے اور ثروت کو گھر کا پچھلا کمرہ دیا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ہم ابھی برآمدے یا صحن میں نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں ہماری موجودگی دوسروں پر ظاہر ہو۔

ناشتے کے بعد ثروت دوسرے کمرے میں آشا کے پاس چلی گئی۔ میں اور جگت ادھر ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جگت نے مجھے گھر کے پچھواڑے ایک طویل نیم پختہ کمرہ بھی دکھایا۔ اسے وہ ڈھارا کہہ رہا تھا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ ڈھارے میں ورزش کا بہت سا سامان پڑا تھا۔ ویٹ لفٹنگ اور باڈی بلڈنگ کا انتظام بھی تھا۔ ایک طرف سینڈ بیگ لٹکا ہوا تھا۔ جگت نے بتایا کہ یہ اس کے چھوٹے بھائی گوبندر کا کراٹے کا اکھاڑا ہے۔ باتوں کے دوران میں جگت نے ایک بار پھر رات والا موضوع چھیڑ دیا۔ وہ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا جنہوں نے اس بارشی رات میں میرا خونی تعاقب کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک زمیندار کے بندے تھے۔ وہ زمیندار کا نام پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''سرحد پار کا ایک گاؤں ہے روہی وال...... وہاں کا چودھری ہے۔ انور نام ہے اس کا......''

جگت سنگھ کے چہرے پر خون کی سرخی دوڑی۔ وہ میری ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''اوئے سیدھی طرح بتا نا کہ پیلی حویلی کا چودھری گنجا انور......''

''تم اسے جانتے ہو؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس کی سات پشتوں کو جانتا ہوں۔ کئی بار واسطہ پڑ چکا ہے اس خانہ خراب سے۔ اب تو وہ بڑا پھنے خان بن گیا ہے۔ کچھ سال پہلے اس پر پاؤڈر اسمگل کرنے کا پرچہ ہوا تھا۔ زنانیوں کی طرح چھپتا پھرتا تھا پولیس والوں سے۔ میں اس کی ساری ہسٹری جانتا ہوں۔ ایک دفعہ لاہور کالج کی کسی کڑی سے عشق چلایا تھا اس نے۔ ون وے ٹکٹ کی طرح وہ ون وے عشق تھا۔ لڑکی کے بھائیوں نے اسے بڑا مارا تھا۔ یہ اس کڑی کا تو کچھ نہ کر سکا۔ پر کسی اور شہری کڑی سے ویاہ کر کے اسے اپنے پنڈ لے آیا۔ وہ کیا کہتے ہیں یار! ڈگا کھوتے توں تے غصہ کمہار تے۔ اب سنا ہے وہ بہت بڑا ''چودھرو'' بنا ہوا ہے۔ دہشت ڈال رکھی ہے اس نے علاقے میں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... ہے تو کچھ ایسا ہی۔''

''پر یار! تیرے ساتھ چودھری انور کا پھڈا کیسے ہو گیا؟ وڈے جھگڑے تو بس تین ہی ہوتے ہیں۔ زنانی، زمین اور زر۔ تیرے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟''

''کیا یہ بتانا ضروری ہے؟'' میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں یار نہیں...... تو اویں غصہ نہ کر۔ تُو تو اپنا جگر پارہ ہے۔ سچ بڑا مزہ آیا ہے تجھ سے مل کر۔ بس یوں سمجھ کہ اندر سے آتما خوش ہو گئی ہے۔''

اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ جگت نے ثروت کو آواز دی۔ ''چھوٹی بھین! تُو ادھر آ جا کمرے میں۔''

ثروت میرے پاس آ گئی۔ جگت نے ہمیں اندر ہی رہنے کی ہدایت کی اور خود باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ ''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ ایک بھینس کچھ بیمار ہے۔ ڈنگر ڈاکٹر آیا تھا اسے ٹیکا لگانے کے لیے۔''

''باہر کے کیا حالات ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''باہر جاتا ہوں تو پتا کرتا ہوں۔ یہاں بی ایس ایف والے پنڈ کے اندر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہر نئے آنے والے بندے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تلاشیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ تم کو ابھی باہر بالکل نہیں نکلنا۔ میں چوکی کی طرف جا رہا ہوں دودھ دینے۔ شاید تھوڑی

دیر ہو جائے۔ پر شام سے پہلے آ جاؤں گا۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ میں اپنی گن یہاں کمرے میں لے آؤں۔ ذرا اطمینان رہے گا۔‘‘

’’چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں خود ہی لا دیتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایل ایم جی کو ایک چٹائی میں لپیٹ کر اندر لے آیا۔ گولیوں والا تھیلا بھی ساتھ ہی تھا۔ میں نے لوڈ گن ایک الماری کے پیچھے رکھ دی۔

جگت کے جانے کے بعد ہمارے ساتھ بس آشا ہی رہ گئی۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا کھلایا اور دو تین بار دودھ پتی بھی پلائی۔ جگت نے کہا تھا کہ وہ شام تک واپس آ جائے گا مگر وہ نہیں آیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ ذہن میں کئی طرح کے اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ میں نے اس بارے میں آشا سے پوچھا تو اس نے تسلی دی۔ وہ بولی۔ ’’بھرا جی! پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ وہ کئی دفعہ دیر سے آتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو رات بھی وہیں گزار دیتے ہیں۔ کئی وردی والوں سے ان کی یاری دوستی ہے۔ وہاں شکار کا گوشت پکاتے ہیں اور پیتے پلاتے ہیں۔‘‘ آخری الفاظ اس نے ذرا مسکراتے ہوئے کہے۔

وہ بظاہر گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ اپنے مرد کی ہاں میں ہاں ملانے والی اور اس کی خامیوں کو نظر انداز کرنے والی۔ وہ ہمیں سارا دن کام کرتی ہوئی ہی نظر آئی۔ کبھی بھینسوں کا دودھ دھو رہی ہے، کبھی تندوری پر روٹیاں پکا رہی ہے، کبھی مکھن سے گھی نکال رہی ہے یا دودھ کو جاگ لگا رہی ہے۔ رات دس بجے کے قریب آشا نے اعلان کیا کہ اگر جگت اب تک نہیں آیا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ شاید دودھ دھونے کے وقت پہنچ جائے۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم آرام تسلی سے سو جائیں۔

مگر تسلی کہاں تھی۔ میرے ذہن میں مسلسل اندیشے سر اُٹھا رہے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ بی ایس ایف یا پھر پاکستانی رینجرز نے اسے پکڑ نہ لیا ہو۔ انہیں رات والی کارروائی کا شک نہ ہو گیا ہو۔ ثروت بھی بالکل گم صم تھی۔ اس کا بخار ہلکا ضرور ہوا تھا مگر اس نے مکمل جان نہیں چھوڑی تھی۔ میں آٹھ دس فقرے بولتا تھا تو وہ اس کے جواب میں بس ایک فقرہ بولتی تھی۔ تین روز پہلے جو خونی واقعہ ہوا تھا، اس کے اثرات بھی اس کے دل و دماغ کو کچوکے لگا رہے تھے۔ اس کے ذہن میں جو سب سے تکلیف دہ سوال تھا اور جو وہ کئی بار مجھ سے پوچھ بھی چکی تھی، یہ تھا کہ ہم واپس کیسے جائیں گے؟

میں اسے تسلی دے رہا تھا لیکن ٹھوس جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک تھا کہ ہم اس کی مزاحمت ہی نہیں کر سکے تھے اور اب یہاں انڈین علاقے میں موجود

تھے۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ ثروت کو نیند آ گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی سو گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد میں کسی تیز آواز کی وجہ سے جاگا۔ شاید کسی نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے سوچا کہیں جگت واپس تو نہیں آ گیا۔

بستر سے اُتر کر میں نے ہولے سے دروازہ کھولا اور برآمدے میں جھانکا۔ بلب کی مدھم روشنی میں برآمدے کے اندر ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ قریب ہی ہیلمٹ بھی دھرا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جگت نے بتایا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی شہر سے آنے والا ہے۔ لگتا تھا کہ وہ آ گیا ہے۔ مجھے کسی کمرے سے ایک قہقہے کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ مردانہ آواز تھی اور جگت کی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر دوبارہ بستر پر آ گیا۔ چند فٹ دور دوسرے بستر پر ثروت سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی ہوئی تھی اور شانوں تک چادر کھینچ رکھی تھی۔ سوتے میں بھی اوڑھنی اس کے سر پر تھی۔ میں کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی میں محویت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالوں اور اوڑھنی نے اس کا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا جیسے پوری شب کا چاند آدھا بادلوں میں چھپا ہوا ہو۔ وہ میرے پاس تھی اور بہت دور تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ کسی کمرے سے دبی دبی آوازیں آ رہی ہیں۔ شاید آشا اور جگت کا چھوٹا بھائی گوبندر ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ لیکن ابھی میں نے دیکھا تھا، صرف برآمدے میں روشنی تھی۔ تینوں کمرے مکمل طور پر تاریک تھے۔ تو کیا آشا اور جگت کا بھائی ایک ہی تاریک کمرے میں تھے؟

یہ کافی سنگین سوال تھا۔ میرے اندر تجسس جاگا اور میں ایک بار پھر اپنے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔ باورچی خانے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک صحت مند نوجوان کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں مٹھائی کا ادھ کھلا ڈبہ لیے باورچی خانے کی طرف سے آ رہا تھا۔ اس نے نیلی جینز اور دھاری دار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ ماتھے پر چوٹوں کے دو تین پُرانے داغ تھے۔ میں نے دیکھا اس کی قمیص کے سارے بٹن کھلے ہیں۔ میں اسے ایک سیکنڈ میں پہچان گیا۔ یہ جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی گوبندر ہی تھا۔ ٹرافیوں اور ایوارڈز وغیرہ والے کمرے میں، مَیں نے اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ مٹھائی لیے وہ ایک کمرے کے اندر اوجھل ہو گیا۔ باتوں کی آواز اسی کمرے سے آ رہی تھی اور یہ کمرہ تاریک تھا۔

میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔ آج رات جگت سنگھ گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں اور ثروت پچھواڑے والے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ جگت کا چھوٹا بھائی شہر سے آیا تھا اور اب جگت کی پتنی کے ساتھ کمرے میں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے میز سے ایک خالی گلاس اُٹھایا۔ چند سیکنڈ بعد میں ننگے پاؤں اپنے کمرے سے نکلا اور اس بند کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو واٹر کولر سے پانی لینے کا بہانہ نہایت معقول ثابت ہو سکتا تھا۔ میں ایک بند کھڑکی کے قریب پہنچا تو اندر سے اُبھرنے والی آوازیں واضح سنائی دینے لگیں۔ شاید اندر وہ پلنگ، کھڑکی کے بالکل پاس تھا جہاں آشا اور جگت موجود تھے۔ میں نے دلیری کی اور کھڑکی سے کان لگا دیئے۔ اندر ہونے والی مدھم گفتگو ہیجان خیز تھی۔ جگت اور آشا ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔ غالباً وہ اکٹھے ہی لیٹے تھے اور کھلی ڈلی گفتگو کر رہے تھے۔

آشا نے بے تکلف لہجے میں کہا۔ ''کچھ خیال کر گوبندے! وہ تیرے وڈے بھرا کے پروہنے (مہمان) ہیں۔ وہ کیا سوچے گا؟''

گوبندر بولا۔ ''اوئے چھڈ اس بات کو۔ وڈے بھرا کے جس طرح کے پروہنے یہاں آتے ہیں ان سب کا ہمیں پتا ہے۔ کوئی پوڈر فروش ہوتا ہے۔ کسی کے پیچھے پولیس لگی ہوتی ہے۔ کوئی زنانی کو بھگا کر لایا ہوتا ہے۔ کسی کو زنانی بھگا کر لائی ہوتی ہے۔ مجھے بھی یہ دونوں ایسے ہی بھگوڑے لگتے ہیں۔ ویسے یہ دونوں پینڈو ہیں کہ شہری؟''

آشا کی آواز آئی۔ ''کپڑوں اور گل بات سے تو کسی پنڈ کے ہی لگتے ہیں۔ پر یہ جو کڑی ثروت ہے نا، یہ کچھ پڑھی لکھی بھی لگتی ہے۔''

''پڑھی لکھی ہوتی تو اس طرح کے کام کرتی؟ یہ ساری دو نمبریاں ہیں۔ تمہیں نہیں پتا۔''

''کچھ بھی ہے گوبندے! میں تجھ کو یہ غلط کام نہیں کرنے دوں گی۔ تُو نے جو ٹھرک جھاڑنا ہے مجھ سے جھاڑ لے۔ میں ہوں نا تیرے پاس۔''

''اوئے میں کب کہتا ہوں کہ تُو نہیں ہے میرے پاس۔ پر کبھی کبھی منہ کا سواد بدلنے کو بھی تو من کرتا ہے نا...... کڑی سوہنی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ بندہ بھی کچھ زیادہ آکڑ شاکڑ نہیں دکھائے گا۔''

''کیوں نہیں دکھائے گا؟'' آشا نے پوچھا۔

''بس نہیں دکھائے گا۔ چور کے پاؤں نہیں ہوتے اور اس طرح بارڈر پار کرنے والے چور ہی تو ہوتے ہیں۔ تُو دیکھنا، میں کس طرح ان دونوں کو اپنے کینڈے میں لاتا ہوں۔ جو کہوں گا، وہی کریں گے اور دیکھنا ساتھ منت ترلا بھی کریں گے۔'' گوبندر کی آواز میں کچے

لمنڈوں جیسی کرختگی تھی۔

''نہیں گوبندے! یہ ٹھیک نہیں ہے اور...... اور اس کڑی کا پاؤں بھی زخمی ہے۔ اتنا بڑا پٹا باندھا ہوا ہے میں نے اس پر۔ بخار بھی ہے اسے۔''

''اوئے ہوئے۔ تو میں نے کون سا اس کو سیر سپاٹے کے لیے آگرے لے کر جانا ہے۔ آدھے پونے گھنٹے کی دل پشوری ہی تو کرنی ہے، کچھ نہیں ہوگا اسے۔''

''اور اگر وہ بندہ تیرے اندازے سے زیادہ ڈھاڈا (سخت) نکلا تو پھر؟''

''نہیں نکلے گا اور اگر نکلے گا تو اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔ تُو بے فکر رہ۔ بس شانتی سے لیٹ یہاں۔'' گوبندر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی گلاس اور بوتل ٹکرانے کی مدھم آواز بھی آئی۔ گوبندر شاید تھوڑی بہت پی بھی رہا تھا۔ بہرحال اس کی آواز میں شرابیوں جیسی لڑکھڑاہٹ بالکل نہیں تھی۔

میں نے چار پانچ منٹ مزید ان کی گفتگو سنی۔ یہ کافی معلوماتی گفتگو تھی۔ اس گفتگو سے میں نے یہ انکشاف انگیز نتیجہ نکالا کہ آشا، جگت سنگھ کی دھرم پتنی نہیں بلکہ محبوبہ ہے۔ وہ دو تین سال سے بغیر شادی کے ہی اس کے ساتھ اس سرحدی گاؤں میں رہ رہی ہے۔ جگت سنگھ کی اصل بیوی کہیں سورت نگر کے آس پاس رہتی تھی۔ جگت سنگھ، آشا کو بیاہ کر نہیں بلکہ کہیں سے بھگا کر لایا ہوا تھا۔ اب وہ جگت کے ساتھ ساتھ گوبندر کی راتیں بھی چمکا رہی تھی۔ معلوم نہیں کہ جگت کو اس کی خبر تھی...... یا وہ بے خبر تھا...... یا پھر باخبر ہو کر بھی بے خبر بنا ہوا تھا۔

جب مجھے اندازہ ہوا کہ گوبندر سنگھ کمرے سے نکلنے کی تیاری کر رہا ہے تو میں جلدی سے واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ثروت حالات کی سنگینی سے بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور گن الماری کے پیچھے سے نکال کر اپنی چارپائی کے نیچے اس طرح رکھ لی کہ نظر نہ آئے اور بآسانی پکڑی بھی جا سکے۔ تب میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔

دو تین منٹ بعد دروازے سے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ثروت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔'' گوبندر نے تیز لیکن دبی آواز میں کہا۔

ثروت ہراساں نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''تابش! دروازہ نہ کھولیں۔'' وہ بولی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی اور بلب آن کر کے دروازہ کھول دیا۔

گوبندر تیزی سے اندر آیا اور کرخت آواز میں بولا۔ ''خود مروگے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔ بند کرو یہ بلب۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب کا سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی ہی رہ گئی۔

''کون ہیں آپ؟'' میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''مالک ہوں اس گھر کا...... جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ پنڈ میں بی ایس ایف والے آئے ہیں۔ گھر گھر تلاشی لے رہے ہیں۔ انہیں کوئی شک ہے اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ تمہارا ہی شک ہے۔'' وہ خوفزدہ کرنے والے انداز میں بولا۔

تب اس نے سرتاپا ثروت کو گھورا۔ وہ اوڑھنی لپیٹے سمٹی سمٹائی کھڑی تھی۔ بالوں کی چند لٹیں رُخساروں پر جھول رہی تھیں۔ ''یہ کیا لگتی ہے تیری؟'' اس نے پوچھا۔

''بیوی ہے۔''

''منہ بولی لگتی ہے۔ بھاگ کر آئے ہو بارڈر پار سے؟'' اس نے پولیس والوں کے انداز میں پوچھا۔

''جگت سنگھ جانتا ہے سب کچھ۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھائی جانتا ہوتا سب کچھ تو اس طرح کا بھیڑا پنگا ہی نہ لیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے اسے بھی اُلو بنایا ہے۔ اچھا اب آواز شواز نہ نکالنا۔ دروازہ اندر سے بند کرو اور چپ چاپ پڑے رہو یہاں۔ ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ہماری چمڑی بھی اُدھڑ جائے گی۔ وہ لوگ گلی میں ہی کھڑے ہیں۔ میں جا کر بات کرتا ہوں ان سے۔''

وہ ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ یہ بات تو ٹھیک تھی کہ بارڈر سکیورٹی والے گاؤں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ لوگوں کو جمع کر کے باقاعدہ شناخت پریڈ اور گنتی وغیرہ بھی ہوتی تھی مگر فی الوقت گوبندر سراسر ڈراما کر رہا تھا۔

ثروت ہراساں تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ آرام سے بیٹھ جائے۔ اگر یہ بندہ واپس آئے اور کوئی اُلٹی سیدھی بات کرے تو تحمل سے سن لے۔

حسبِ توقع آٹھ دس منٹ بعد گوبندر پھر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ''گرو نے کرپا کی ہے تم پر۔ سمجھو بال بال بچے ہو لیکن ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ان کی جیپ گلی میں ہی کھڑی ہے۔ وہ خود نمبردار کی بیٹھک میں چا وغیرہ پی رہے ہیں۔ ان کو شک ہے کہ تم دونوں اس گلی کے ہی کسی گھر میں موجود ہو۔''

''ان کو شک کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ میں نے اپنا لب ولہجہ دیہاتی ہی رکھا تھا۔

''تمہاری وڈی پھوپھی نے جا کر بتایا ہے ان کو۔'' وہ سخت طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اوئے بےوقوفا! یہ لوگ تو اُڑتی چڑیا کے پَر گنتے ہیں۔ بندہ سامنے سے گزرے تو اس کی سات پشتوں کا ایکسرے اُتار لیتے ہیں۔''

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جگت کی اطلاع کے مطابق وہ واقعی غصیلا اور آتش پا شخص تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کی ہڈی بڑی سخت ہے اور لڑائی مار کٹائی اس کا پیشہ ہے۔ اس کی حرکات وسکنات میں چیتے کی سی تیزی تھی۔ وہ اپنی چمکیلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولا۔ ''وہ لوگ ایک پاکستانی جوڑے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اسی لیے تم دونوں کا ایک کمرے میں رہنا بالکل ٹھیک نہیں۔ اس کڑی کو وہاں بھیج دو بھابو کے پاس۔ اگر تمہیں لگے کہ کوئی کمرے کی طرف آ رہا ہے تو یہ پچھلی والی کھڑکی کھول کر باہر چھال مار دینا۔ ساتھ ہی پرالی والی کوٹھڑی ہے۔ پرالی کے پیچھے چھپ جانا۔ لیکن پہلے اس کمرے میں سے اپنی نشانیاں ختم کرو۔ کوئی ایسی ویسی چیز نظر نہیں آنی چاہیے۔''

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں جیسے ثروت کا اسکین کر رہی تھیں۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''چلو آجاؤ تمہیں بھابو کے پاس لے چلتا ہوں۔''

ثروت نے ڈری ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ ہرگز جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ ویسے شاید نہ مرے لیکن ڈر ڈر کر ضرور مر جائے گی۔ اسے میرے پاس ہی رہنے دیں یا پھر ہم دونوں کو لے چلیں۔''

''تیرے کھوپڑے میں دماغ ہے یا گوبر؟ سمجھ میں نہیں آ رہی میری بات۔ وہ چیر کر رکھ دیں گے تم دونوں کو۔ تمہارے ساتھ ساتھ ہمارا بھی حشر نشر ہو جائے گا۔ کرپا کرو ہمارے حال پر۔'' پھر وہ ثروت سے مخاطب ہوا۔ ''چل کڑیئے، مجھے پتا ہے یہ سارا پواڑا تیری وجہ سے ہی پڑا ہے۔''

''مجھے نہیں جانا۔'' ثروت نے لرزاں آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بیٹھی رہ یہاں اپنے اس یار کی گود میں...... بیٹھی رہ...... میں جاتا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سکیورٹی والوں کے پاس۔ وہ خود تمہیں پکڑیں گے تو ساتھ میں ہماری بھی کڑا کے نکال دیں گے۔ بہتر ہے کہ میں خود ہی ان کو انفارم کر دوں۔''

میں نے اس کا بازو تھاما۔ ''نہیں یار! ہم پروہنے (مہمان) ہیں تمہارے وڈے بھائی

کے۔ایسا نہ کرو ہمارے ساتھ۔''

''تو پھر ویسا کرو جیسا کہہ رہا ہوں۔اس کو بھیج دو میرے ساتھ۔اس کے نگینے نہیں اُتر جائیں گے۔اور اتنی چوچی نہیں ہے جتنی بن رہی ہے۔تیرے ساتھ بھاگی بھاگی پھر رہی ہے۔راتیں گزار رہی ہے۔ایسی کڑیاں بڑی کھوچل ہوتی ہیں۔'' گوبندر کا لہجہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔غالباً اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہم دونوں مفرور ہیں......اور ایک بھاگی ہوئی مفرور لڑکی سے مستفید ہونے کا اسے بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مجھے ہے۔

میری خاموشی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ بہت ہوشیار ہونے کے باوجود میرے بارے میں قطعی غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ ثروت کی طرف بڑھایا اور بولا۔''چلو۔''

میں نے اس کا راستہ روکا اور مستحکم انداز میں کہا۔''نہیں گوبندر! یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔''

''اگر یہ میرے ساتھ نہیں جائے گی تو پھر بی ایس ایف والوں کے ساتھ جائے گی۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔'' وہ آگے بڑھا۔

''چھوڑ دو۔'' میں نے کہا۔

''اگر نہ چھوڑوں تو؟'' وہ سرتاپا آتش تھا۔

میری نگاہوں میں کچھ بھولے بسرے منظر گھوم گئے۔ مجھے لگا کہ آج پھر میرے کالج کے زمانے کا غنڈا اوجی ایک نئی صورت میں میرے سامنے کھڑا ہے۔وہ پھر ثروت کو مجھ سے دور لے جانا چاہ رہا ہے لیکن آج میں بے بس نہیں تھا۔میں آگے بڑھنے والے کا راستہ روک سکتا تھا اور مارنے والے کے ہاتھ توڑ سکتا تھا۔ میں نے گوبندر کی توانا کلائی پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی گرفت ثروت پر سے ختم کر دی۔اس کی آنکھوں میں برق لہرا گئی۔اس نے اُلٹے ہاتھ کی زوردار ضرب میرے چہرے پر لگانی چاہی۔ میں نے اس کی دوسری کلائی بھی تھام لی۔اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت چمکی۔شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی تیزی دکھاؤں گا اور میری گرفت بھی اتنی سخت ہوگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر لڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے ''جم'' میں چلے چلو۔وہیں دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔''

وہ سنبھل کر پھنکارا۔''جانتے ہو میں کون ہوں؟''

''نہیں جانتا......اور تم بھی نہیں جانتے۔''

''میں لڑنے والے کی کم از کم ایک ہڈی ضرور توڑتا ہوں۔''

''چلو دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے اس کی کلائیاں چھوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر دھیان سے مجھے سرتاپا دیکھا۔غالباً پہلی بار اس کی نظر میرے ہاتھ پاؤں کی غیر معمولی جلد پر بھی پڑی۔ وہ میرے حوالے سے اُلجھن میں نظر آنے لگا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں جس حیثیت سے نظر آ رہا ہوں، وہ میری اصل حیثیت ہے یا نہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کوئی بھیس شیس بدلا ہوا ہے تم نے؟''

''اس دنیا میں تو ہر کوئی بہروپیا ہے۔تم کام کی بات کرو۔ ہماری جان چھوڑنی ہے یا لڑکی چھوڑنی ہے؟''

اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ پھر لمبی سانس لے کر بولا۔''لگتا ہے کہ اپنی فیلڈ کے ہی بندے ہو لیکن بے استاد ہو۔کہاں ٹریننگ کرتے رہے ہو؟''

''گلیوں میں اور سڑکوں پر اور ہر اس جگہ جہاں تم جیسے منہ زور دولتیاں جھاڑتے پھرتے ہیں۔''

''چلو آجاؤ......آجاؤ پھر۔'' اس نے فرطِ طیش میں میرا بازو پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جیسے اسے ڈر ہو کہ ثروت موقع سے فائدہ اُٹھا کر بھاگ جائے گی۔اس کا رُخ اپنے جم نما ڈھارے کی طرف تھا۔ وہ غالباً مجھے جان بوجھ کر اس کمرے کے اندر سے لایا جہاں اس کی ٹرافیاں اور لاتعداد کپ سجے ہوئے تھے۔ مارا ماری کی تصویریں بھی تھیں۔اس نے جیسے بزبان خاموشی مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

دو منٹ بعد ہم ڈھارے کے کچے فرش پر ایک دوسرے کے سامنے تھے۔گوبندر نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور بلب آن کر لیا تھا۔ اس نے بڑے گھمنڈی انداز میں اپنی دھاری دار شرٹ اُتار کر ایک طرف رکھی۔ وہ مجھے نگاہوں میں تول رہا تھا۔ غالباً یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ میں اتنے اعتماد سے اس کے مدِمقابل کیوں آ گیا ہوں۔ حالانکہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔

جب اس نے دیکھا کہ میں واقعی اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہوں تو اس نے جارحانہ انداز میں اپنی دونوں مٹھیاں بھینچیں اور میرے رُوبرو ہو گیا۔میرے ہاتھ پر بھی جیسے کھجلی ہو رہی تھی اور میں فائٹنگ کے موڈ میں تھا۔ میں نے باقاعدہ کھلاڑیوں کے انداز میں

اسے ''بو'' کیا، تاہم اس نے میرے سامنے جھکنے کی زحمت نہیں کی۔

پہلا وار اسی نے کیا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے ٹانگ چلائی۔ کراٹے کی زبان میں اسے ''اپر پام'' کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً مدِمقابل کی پسلیوں یا کنپٹی کو نشانہ بناتی ہے۔ گوبندر نے میری کنپٹی کو نشانہ بنایا تھا۔ میں نے اطمینان سے یہ وار روکا۔ اس کے فوراً بعد گوبندر نے گھوم کر بڑی مہارت سے بیک کک لگائی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا۔ اس وار نے مجھے سمجھا دیا کہ گوبندر واقعی ایک ماہر ''لڑاکا'' ہے اور میں اسے کسی صورت ''ایزی'' نہیں لے سکتا۔ اس کے اس وار کے بعد ہم دونوں میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ شروع میں، مَیں دھیما رہا لیکن پھر گوبندر کو کچھ کاری ضربیں لگائیں۔ اسے میرے معیار اور ''کیلیبر'' کا اندازہ ہوا اور اس کی حرکات میں جارحیت کے بجائے دفاعی انداز نمودار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ حیرت بھی تھی۔ وہ ذرا ہانپا ہوا نظر آیا تو میں نے مزید چڑھائی کی۔ پھر ایک زوردار لات کھا کر وہ سینڈ بیگ سے ٹکرایا اور گھومتا ہوا رننگ مشین پر جا گرا۔ میں نے اسے اُٹھنے کا موقع دیا اور ایک بار پھر سخت حملہ کیا۔

اس مرتبہ گوبندر کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور اس کی پشت کا دیوار سے شدید تصادم ہوا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ اس کے بال عقب سے گرد آلود تھے۔ میں نے پھر اسے اُٹھنے کی وافر مہلت دی۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر آیا۔ اس کا ہک پنچ یقیناً مہلک ثابت ہوتا لیکن میں خود کو بچا گیا۔ سزا کے طور پر میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ وہ سہہ نہ سکا اور چوٹ کھا کر گرا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے تیسری بار اسے اُٹھنے کی مہلت دی لیکن اس بار گوبندر نے لیٹے رہنا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے کہا۔ ''کپ اور ٹرافیاں ہر کسی کو ناک آؤٹ نہیں کر سکتیں۔ بعض لوگوں کے ساتھ لڑنا بھی پڑتا ہے۔''

وہ کراہتا رہا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اُٹھایا اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ پھر ایک تولیا دیا جس سے اس نے اپنا خون آلود منہ پونچھا۔ وہ ایک دم ٹھنڈا ٹھار نظر آ رہا تھا۔ باہر سے آشا نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کر رہے ہو تم دونوں؟''

گوبندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔''

وہ واپس چلی گئی۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور گوبندر گھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے اور

چینی کے پیالے میں دودھ پتی پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ گوبندر کی ایک آنکھ کے نیچے کافی بڑا نیل تھا۔ وہ جیسا بھی تھا لیکن اس نے اسپورٹ مین شپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہار تسلیم کی تھی اور باقاعدہ اپنے رویے کی معذرت بھی چاہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ گاؤں میں بی ایس ایف والے نہیں آئے اور اس حوالے سے خیریت ہی ہے۔ وہ نہ صرف ذہنی طور پر مجھ سے مرعوب ہو چکا تھا بلکہ جسمانی طور پر میری برتری بھی تسلیم کر چکا تھا۔

میرے ساتھ فائٹ شروع ہوتے ہی اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ ہوں اور اس شعبے میں اس سے کہیں آگے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ ہم نے دیہاتیوں کا بھیس بدل رکھا ہے ورنہ ہم دونوں پڑھے لکھے شہری ہیں۔ میں بھی اب اس سے بات کرتے ہوئے دیہاتی لب و لہجے کا اہتمام نہیں کر رہا تھا۔

اب وہ مارشل آرٹ کے حوالے سے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میں نے اس فیلڈ میں کب قدم رکھا اور کیسے یہاں تک پہنچا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے موقع محل کے لحاظ سے ان سوالوں کے جواب دیئے اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اب وہ مجھے احترام کے انداز میں صادق صاحب اور صادق بھائی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے بڑے بھائی جگت کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ بس نشے کی حالت میں اس سے غلطی ہوئی جس کے لیے وہ بہت شرمندہ ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس بارے میں، مَیں جگت کو بے خبر رکھوں گا۔ گوبندر نے اپنے بارے میں بھی کچھ باتیں بتائیں۔ اس نے امید ظاہر کی کہ وہ شاید اگلے ماہ انڈیا کے نیشنل کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے نئی دہلی جائے گا۔ وہ اب جان چکا تھا کہ میں اور ثروت کسی خاص مقصد کے تحت یہاں اس سرحدی گاؤں میں موجود ہیں مگر اس نے مجھے اس بارے میں زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

جگت سنگھ کی واپسی اگلے روز دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس کی جگہ آشا نے گوبندر کے ساتھ مل کر بھینسوں کا دودھ دھویا۔ جگت سنگھ نے چھوٹتے ساتھ ہی چھوٹے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے پوچھا کہ اس کے تھوبڑے پر نیل کیوں پڑے ہیں؟ اس نے کس کے ساتھ مار دھاڑ کی ہے۔ گوبندر نے معقول بہانہ بنایا کہ یہ کسی مار دھاڑ یا اسٹریٹ فائٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ٹریننگ باؤٹ یعنی تربیتی مقابلے کے دوران ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ جگت کو یقین آیا یا نہیں۔ بہرحال اس کے سوال جواب کا سلسلہ ضرور رُک گیا۔ آشا نے بھی گوبندر کی

چوٹوں کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یقیناً وہ اور گوبند ایک دوسرے کے ''راز دار'' بھی تھے۔

جگت سنگھ کے چہرے پر مجھے دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب بھینسوں کو چارا وغیرہ ڈالنے کے بعد جگت سنگھ میرے ساتھ علیحدہ کمرے میں آ بیٹھا۔ وہ دروازہ بند کر کے بولا۔ ''اس رات چودھری انور کا کافی ستیاناس کیا ہے تم نے...... پانچ بندوں کے ساتھ دو گھوڑیوں کے پران بھی گئے ہیں۔ دو تین بندے سخت پھٹل بھی ہیں۔ میں نے سب پتا کر لیا ہے۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''تم...... بارڈر پار گئے تھے؟''

''او نہیں یار! ہم پار نہ بھی جائیں تو وہاں کی خبریں اُڑ کر ہمارے پاس آ جاتی ہیں۔ مجھے جانکاری مل گئی ہے کہ چودھری انور کے ساتھ تمہارا کیا ٹنٹا ہوا ہے اور کیسے؟''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ ''یہ جو کڑی تیرے ساتھ ہے نا، اس کا پتی یوسف غائب ہوا ہے۔ تم دونوں اسے لبھتے لبھتے (ڈھونڈتے ڈھونڈتے) چودھری انور گنجے کی حویلی تک پہنچے ہو۔ وہاں تم پکڑے گئے ہو اور پھر بھاگے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں۔'' میں نے اپنے تعجب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''ایک اور اطلاع ہے اور مجھے وشواس ہے کہ اسے سن کر تمہیں ضرور پانچ ہزار وولٹ کا جھٹکا محسوس ہوگا۔ اور وہ یہ کہ...... اس کڑی کا پتی یوسف دو اور لڑکیوں کے ساتھ بارڈر پار کر کے انڈیا پہنچ چکا ہے۔ اسے پہنچانے والے چودھری انور گنجے کے لوگ ہی ہیں۔''

مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔

''تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے دوسری ساری باتیں کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔ ''اور اس بات کا وشواس رکھ، میں جو کہوں گا واہگرو کی کرپا سے ٹھیک ہی کہوں گا۔''

''تمہیں یہ باتیں کس کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں؟''

''سب باتیں، کسی کو کسی ذریعے سے ہی معلوم ہوتی ہیں یار! تم یہ بتاؤ۔ میں نے جو کچھ کہا ہے غلط تو نہیں ہے؟''

میں اثباتی انداز میں خاموش رہا۔ پھر میرا دھیان راجا کی طرف چلا گیا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اس لڑائی میں ایک بندہ پیلی حویلی کے قریب بھی زخمی ہوا

تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟''

جگت نے معاملہ فہم نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''وہ تمہارا ساتھی تھا؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے، پتا کرا لیتے ہیں اس کا بھی۔ کیا نام تھا اس کا؟''

''راجا۔'' میں نے کہا۔

''وہ تمہارے ساتھ ہی پیلی حویلی گیا تھا؟''

''نہیں...... بعد میں آیا تھا۔''

''اس یوسف نامی بندے کے سلسلے میں ہی؟''

''ہاں......'' میں نے کہا پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''یوسف کے بارے میں اور کیا پتا چلا ہے تمہیں؟''

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''لو سب کچھ ایسے ہی ایک دم پوچھ لو گے۔ نہیں بادشاہ زادے! یہ تو رُک رُک کر بتانے کا زمانہ ہے۔ اب دیکھ لو اخباروں، رسالوں میں جو کہانیاں شہانیاں آتی ہیں یا پھر ٹی وی پر دھڑا دھڑ جو زنانہ ڈرامے چلتے ہیں، سب رُک رُک کر بتاتے ہیں اور تو اور اب تو فلمیں بھی ٹوٹوں میں آنے لگی ہیں۔ پارٹ دو اور پارٹ تین وغیرہ وغیرہ۔''

''لیکن یہ کوئی فلم تو نہیں ہے یار! ایک بندے کی زندگی موت کا سوال ہے۔''

''ہاں...... یہ گل تو ٹھیک ہے۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے تہہ بند کی ڈب میں سے شراب کا پوا نکالا۔ ڈھکن کھول کر دو تین گھونٹ لیے اور اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی سے قطرے پونچھ کر بولا۔ ''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یوسف نام کا بندہ اصل میں ہے کون اور تمہارے ساتھ اس کا کیا سمبندھ ہے۔''

''سمجھ لو کہ میرا عزیز ہے۔ اسے ڈھونڈنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔''

وہ ہنسا اور اپنی گھنی مونچھیں سنوار کر بولا۔ ''چنگا تماشہ ہے۔ جس کو ڈھونڈا جاتا ہے وہ آگے ہوتا ہے، ڈھونڈنے والا پیچھے۔ پر یہاں تم پہلے ہمارے علاقے میں آ گئے ہو، جس کو ڈھونڈ رہے ہو وہ بعد میں آیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''ابھی پکا پتا تو نہیں چلا ہے مگر صرف یہ سنا ہے کہ وہ فاضلکا کے قریب کسی وڈیرے کے پاس پہنچایا گیا ہے۔''

"کس لیے؟"

"یہ بھی پتا نہیں۔ یہ باتیں تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ دو کڑیاں انڈیا آئی ہیں، ان کی شکلیں مشہور فلمی اداکاروں سے ملتی جلتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ یوسف نامی منڈا بھی کسی خاص بندے سے ملتا جلتا ہو اور اس سے ان لوگوں نے کوئی خاص کام لینا ہو۔ کسی کو چکر شکر میں ڈالنا ہو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ انڈیا میں پنجابی فلمیں بھی بہت بنتی ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ یوسف کی شکل پنجابی فلموں کے کسی اداکار سے ملتی ہو۔ جس کو ہم نہ جانتے ہوں یا پھر اس طرح کا کوئی اور معاملہ ہو سکتا تھا۔

جگت سنگھ بولا۔ "مجھے ایک اور گل کا بھی پتا چلا ہے۔ یہ تمہارا رشتے دار یوسف چنگی بھلی طوائف بازی بھی کرتا ہے۔ اپنی اسی طوائف بازی کی وجہ سے یہ ان لوگوں کے ہتھے بھی چڑھا ہے۔ سنا ہے کہ اس نے لاہور میں کسی بڑی مہنگی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منائی تھیں اور جب......"

"جگت سنگھ۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "آہستہ بول یار! اس کی بیوی بھی یہاں ہے۔"

"اچھا...... وہ وچاری بے خبر ہے۔ ویسے یہ پتنیاں عام طور پر بے خبر ہی ہوتی ہیں۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ شاید اسے اپنی پتنی کا خیال آ گیا تھا جو سورت نگر کے آس پاس کہیں رہتی تھی۔

"اچھا...... یہ باتیں تجھے بتائی کس نے ہیں؟"

"یار! تُو آم کھا درخت نہ گن...... مجھے تو یہ پتا بھی چلا ہے کہ وہ طوائف کسی فلمی ہیروئن سے بہت ملتی جلتی ہے اور سیدھی تیر کی طرح لگی ہے تیرے اس یار کے سینے میں۔ تیرے یار نے اس کو اپنے حق میں بٹھانے کی گل بھی کی ہے۔"

"حق میں بٹھانے کی؟"

"آہو یار! جب کسی طوائف کو کام سے روکا جاتا ہے اور اپنے لیے سنبھال لیا جاتا ہے تو اسے حق میں بٹھانا کہتے ہیں لیکن وہ کوئی معمولی طوائف نہیں ہے۔ اس نے کافی پیسہ مانگا ہے پابند ہونے کا۔ شاید ادھے سال کا کوئی ڈیڑھ کروڑ روپیہ۔ تیرے اس یار یوسف نے اس پر بھی تقریباً "ہاں" کر دی ہے۔ بازاری زنانی میں کرنٹ ہو تو بندہ ایسے ہی لوٹو پوٹو ہو جاتا ہے اور یہ ساری پکی خبریں ہیں بادشاہ زادے۔"

میں سناٹے میں تھا۔ بہر حال ابھی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"جگت سنگھ! میں نہیں چاہتا کہ یوسف کی بیوی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک بھی پڑے۔ وہ پہلے ہی بہت دُکھی ہے۔ ہمیں اس کا دُکھ کم کرنا ہے، بڑھانا نہیں۔"

جگت سنگھ نے مونچھیں مروڑ کر کہا۔ "آپاں (ہم) یاروں کے یار ہیں تاشیا! تُو چنتا نہ کر۔ تُو جو کہے گا ویسا ہی ہوگا۔ میں ایک آدھے دن میں پتا کراتا ہوں چھوٹی بھین کے اس وڑے تنگڑے پتی کا۔ اگر مجھے خود فاضلکا جانا پڑا تو خود بھی چلا جاؤں گا۔ تُو یہاں آرام کر اور کھا پی۔ چھوٹی کے پاؤں کو بھی مرہم پٹی کی لوڑ ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے تو پھر آگے کا سوچتے ہیں۔"

رات کو ثروت بہت خاموش اور اُداس نظر آئی۔ اس نے کھانے میں بھی چند لقمے ہی لیے تھے۔ اس کا بخار اُتر گیا تھا مگر کمزوری باقی تھی۔ میں نے بہت اصرار کر کے اسے تھوڑا سا دودھ پلایا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ وہ اپنے بیمار سسر کے لیے بہت پریشان تھی۔ وہ انہیں بس یہ بتا کر آئی تھی کہ ایک دو روز کے لیے پیر تھانوی صاحب کے پاس ہارون آباد جا رہی ہے۔ سسر فاروقی کو پہلے ہی بیٹے کی گمشدگی نے ہلکان کر رکھا تھا، اب بہو بھی لاپتا ہو گئی تھی۔ یقیناً ان پر قیامت گزر رہی تھی۔ ثروت، یوسف کے لیے بھی ازحد پریشان تھی۔ میں اس کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اسے یہ نہیں بتایا کہ جگت کی اطلاع کے مطابق یوسف کو بھی بارڈر پار کرا کے انڈیا پہنچا دیا گیا ہے۔

○......❖......○

مجھے طبیعت میں کسلمندی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید موسم میں تبدیلی کا اثر تھا۔ رات تک مجھے تیز بخار ہو گیا مگر میں ثروت کو بتا کر اس کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسپرین کی گولیاں کھا کر سو گیا۔ رات کسی وقت اُٹھا تو پورا جسم آگ کی طرح پھنک رہا تھا۔ گلا خشک تھا اور دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کولر سے پانی پیا۔ دروازہ بند کر کے واپس بستر پر آیا تو نظر ثروت پر پڑی۔ نیند کی حالت میں اس کا ملیح چہرہ معصومیت اور پاکیزگی کی تصویر تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اُٹھ کر اس کی چارپائی کے بازو پر جا بیٹھا۔ میں نے اس کے چہرے پر جھولنے والی دو ریشمی لٹیں پیچھے ہٹائیں اور عجب والہانہ پن سے اس کے چہرے کو سہلانے لگا۔ ایکا ایکی اس کی پلکوں میں جنبش نظر آئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے مجھے دیکھا۔ حسین آنکھوں کے شبستان کچھ دیر خالی خالی رہے پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر۔ اس کی لمبی پلکوں کے

نیچے سے دو موتی نکلے اور اس کے رُخساروں پر رینگنے لگے۔ اس نے میرا جلتا ہوا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما پھر میرے ہاتھ پر اپنی پیشانی ٹکائی اور سسکنے لگی۔ جیسے وہ کوئی پجارن تھی اور اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ بخار کی شدت میرے ہوش و حواس کو مختلف کر رہی تھی۔ میں جیسے بیٹھے بیٹھے جھکا۔ ثروت کی گردن کے نیچے سے اپنا بازو گزارا اور ایک بے ساختہ حرکت کے ساتھ اس کا بالائی دھڑ اُٹھا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ ناقابلِ بیان صورت حال تھی۔ وہ بھی جیسے نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے زخمی جذبوں کی شدت کے ساتھ اسے بھینچ لیا۔ اس کے نرم ریشمی بالوں پر بوسے دینے لگا۔ وہ جیسے میرے سینے میں سما گئی لیکن [illegible] سے اُٹھ کر اس کے چہرے کی طرف بڑھنا شروع [illegible] لگی۔ وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں بھی جیسے اپنے حواس میں لوٹ آیا۔ اُٹھ کر اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

رات کا باقی حصہ ہم نے جاگتے ہی گزارا۔ [illegible] دیر [illegible] اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلائی۔ ہم اپنے اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے پھر باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''تابش مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا کچھ میری وجہ سے ہی ہو رہا ہے۔ اللہ میری غلطیوں کو معاف کرے۔''

میں نے کہا۔ ''ثروت! تمہیں اپنی غلطیوں کی معافی تو ہر وقت مانگنی چاہیے لیکن تم جس انداز میں سوچ رہی ہو، وہ ٹھیک نہیں۔ تم زندگی میں آنے والی ہر مصیبت کو فوراً اپنی طرف منسوب کر لیتی ہو۔ اسے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ قرار دینے لگتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، کسی اور کے عمل کا نتیجہ ہو۔''

''نہیں تابش! میں قصور وار ہوں۔ میں نے جب پہلی بار غلط سوچا تو بھائی ناصر ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے۔ جب دوسری بار یوسف سے علیحدہ ہونے کا خیال میرے ذہن میں آیا تو نصرت بیمار ہو گئی اور جتنی بیمار وہ ہوئی ہے، آپ کو پتا ہی ہے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان ہے۔ وہ ایک ہی صورت میں صحت یاب ہو سکتی ہے۔ قدرت مجھے میری غلط روی پر معاف کر دے۔''

''تمہاری کوئی غلط روی نہیں ثروت! واہموں کے گھیرے سے نکلو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اپنا دل مضبوط رکھو۔ دیکھنا، ایک ایک کر کے ہر مشکل کا حل نکل آئے گا۔''

''ابھی تو کوئی حل نہیں نکل رہا تابش! آپ دیکھ رہے ہیں، مشکلوں میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ جب سے میں آسٹریا سے واپس آئی ہوں، یوسف سے میرا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ مجھے ایک بیوی کا حق دینا چاہتے تھے۔ مجھے اس گھر میں ایک مان تران دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ جب میں نصرت کے ساتھ آسٹریا میں تھی، انہوں نے بے چینی سے میرا انتظار کیا، گھر کو سجایا بنایا۔ ہر طرح سے میرے آرام و آسائش کا بندوبست کیا لیکن میں نے ان کا دل توڑا۔ یہ اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے۔''

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ اس کی بے رُخی کی سزا نہیں ہے بلکہ یوسف کی اپنی بداعمالیوں کا خمیازہ ہے لیکن اگر میں خود یہ بات کہتا تو ثروت اسے بھی میری رقابت پر محمول کرتی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حقیقت خود ہی اس کے سامنے کھل جائے گی۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ثیروت! توہمات سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں زندہ رہنا سیکھو اور اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی ہے تو میں بہت جلد تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ بہت دور چلا جاؤں گا۔''

اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ناک سرخ ہو گئی۔ وہ گھمبیر آواز میں بولی۔ ''تابش! مجھے اعتراف ہے کہ میں ماضی کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ نہیں سکی۔ لیکن وہ جو کچھ بھی ہے، میرے دل میں ہے۔ اور شاید ہمیشہ رہے گا لیکن...... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے راستے بدل چکے ہیں۔ میں...... میں یوسف سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرا اور ان کا رشتہ جیسے بھی بنا...... جو بھی تھا مگر اب وہ میرے اندر رچ بس چکا ہے۔ مجھے ہر صورت اسے نبھانا ہے۔''

میرے سینے پر جیسے کوہ ہمالیہ آ کر ٹھہر گیا۔ میں نے بے حد بوجھل دل کے ساتھ کہا۔ ''ثروت! میرا وعدہ ہے یہ یوسف والا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور ہم پاکستانی علاقے میں واپس چلے جاتے ہیں تو میں چلا جاؤں گا اور یہ بھی وعدہ ہے کہ آئندہ کبھی تم مجھے اپنے آس پاس نہیں دیکھو گی۔''

وہ چپ رہی۔ اس کے جسم میں بس اس کے آنسو ہی متحرک تھے جو رُخساروں پر سرک رہے تھے۔

O......❖......O

گوبندرا ایک دن کے لیے واپس بیکانیر جا چکا تھا۔ جگت کا بھی پچھلے چوبیس گھنٹوں سے

کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے بتایا تو نہیں تھا لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ کہیں یوسف کی ٹوہ لگانے ہی گیا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں آشا نہ صرف چار بھینسوں کا دودھ دھوتی تھی بلکہ دیگر امور بھی سرانجام دیتی تھی۔ اس کے دودھ مکھن سے پہلے جسم میں خاصی توانائی موجود تھی۔

جگت کی ہدایت کے مطابق میں اور ثروت اپنا زیادہ وقت پچھواڑے والے کمرے میں ہی گزار رہے تھے۔ اگر گھر میں کوئی ملاقاتی آتا تھا تو آشا وہ درمیانی دروازہ بند کر دیتی تھی جو گھر کے سامنے والے حصے کو پچھواڑے سے ملاتا تھا۔ آشا ہمارے کھانے کا بھی خوب خیال رکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑی ہمدردی سے ثروت کے پاؤں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھی۔ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ثروت اب بغیر سہارے کے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دیکھا جاتا تو اپنے ازدواجی معاملے کو چھوڑ کر آشا ایک بھلی عورت ہی تھی۔

بہت انتظار کے بعد جگت کی واپسی اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہوئی۔ وہ آتے ساتھ ہی مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ''بادشاہ زادے! تیرے بندے کا کھوج تو تقریباً لگ ہی گیا ہے۔''

''کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فاضلکا سے پندرہ بیس میل فرید کوٹ کی طرف ترشولا نام کا ایک پنڈ ہے...... بلکہ سمجھو کہ تین چار پنڈوں کی ایک چھوٹی سی جاگیر ہی ہے۔ یوسف کو وہاں پہنچایا گیا ہے۔ سردار اوتار سنگھ وہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ جہاں تک مجھے پتا چلا ہے، یوسف فی الوقت اوتار سنگھ کے گھر پر ہے۔''

''وہاں کس لیے؟''

''اس بارے میں کوئی جانکاری نہیں مل سکی۔''

''اور کیا پتا چلا ہے؟''

''سردار اوتار علاقے میں اپنی کچہری لگاتا ہے اور لوگوں کے فیصلے بھی کرتا ہے۔ لوگ اس کے فیصلے مانتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ پچھلی تین چار پیڑھیوں سے علاقے کے لوگوں کے جھگڑے سرداروں کی حویلی میں ہی نمٹائے جاتے ہیں۔ اوتار سنگھ کو تو خاص طور سے بڑا انصاف والا سمجھا جاتا ہے۔ پر اوتار سنگھ کا اپنا پتر کوئی چنگے کریکٹر کا مالک نہیں ہے۔ چار پانچ قتل اور دو تین اغوا بھی اس کے کھاتے میں ہیں۔ چار پانچ سال پہلے اس نے ایک پولیس سب انسپکٹر کو گولیوں سے چھاننی کر دیا تھا۔ تب سے وہ مفرور ہے۔ پر سردار کا چھوٹا پتر کچھ چنگا ہے۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سردار کے باپو کی عمر نوے سال کے قریب

ہے۔ اس کی ماتا بھی ابھی زندہ ہے۔ پچھلے مہینے اس کی ماتا کو سکتہ ہو گیا تھا۔ لوگوں نے سمجھا وہ سورگ باشی ہو گئی ہے۔ اس کا سیاپا ہو رہا تھا جب وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ علاقے میں یہ بات کافی مشہور ہے......''

میں نے کہا۔ ''جگت! تمہیں کتنے فیصد یقین ہے کہ یوسف سردار کی حویلی میں ہی ہے؟''

''ایک سو دس فیصد۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ مجھے جانکاریاں دینے والے میری ہی طرح اصیل ہیں۔ میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گا، ایک دم ٹھیک ہو گا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جگت! سردار اوتار کی مصروفیات کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟''

جگت نے کہا۔ ''مصروفی...... یات...... کا کیا مطلب؟''

''بھئی...... یہی کام کاج۔''

''سرداروں کا کیا کام کاج ہونا ہے؟ بس وہی زمینوں کی دیکھ بھال اور تاریخیں، پیشیاں وغیرہ بھگتانا۔ پنڈ سے چھ سات میل دور پکی سڑک پر سردار کا فارم ہے۔ اس کو بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ سردار دن میں ایک چکر وہاں کا ضرور لگاتا ہے۔ وہاں کوئی کام شام بھی کر رہا ہے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں خاموش رہا۔ میرے اندر عجیب سی ہلچل تھی۔ ثروت سے جو بات چیت ہوئی تھی، وہ میرے اندر گہرائی میں اُتری ہوئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں چلا جاؤں۔ تو مجھے چلے جانا چاہیے تھا لیکن اس وقت تو ہم منجدھار میں تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جب میں جاؤں تو وہ کنارے پر ہو۔ میں اس اطمینان کے ساتھ اسے الوداع کہوں کہ وہ محفوظ ہے اور اپنے معاملات ٹھیک کر سکتی ہے۔

○......❖......○
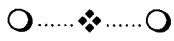
اگلے روز میں اور جگت صبح سویرے ہی اُٹھ گئے تھے۔ میں نے گوبندر کی ایک پتلون، شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہم نے پہلے دیہاتی تانگے پر چار پانچ کلومیٹر سفر کیا پھر پکی سڑک پر پہنچے۔ وہاں سے بس پکڑی اور فاضلکا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوپہر بارہ بجے سے پہلے ہم فاضلکا کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ ایک بار پھر تانگے کا طویل سفر ہوا۔ سڑک تنگ لیکن پختہ تھی۔ دونوں طرف حد نگاہ تک چاول اور گنے کے کھیت تھے۔ چمکیلی دھوپ میں جوہڑوں کا پانی چمک رہا تھا اور ان میں مویشیوں کے غول غوطے نظر آتے تھے۔ پگڈنڈیاں، ٹیوب ویل،

کنویں، کھیت مزدوروں کی ٹولیاں، سارے مناظر وہی تھے جو پاکستانی پنجاب کے دیہات میں نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں سکھ حضرات کی پگڑیاں دکھائی دیتی تھیں یا گردواروں اور مندروں پر نگاہ پڑتی تھی۔

فارم سے تقریباً دو فرلانگ پہلے ہی تانگوں کا اڈا تھا۔ پیپل کے تین چار گھنے درختوں کے نیچے کیچڑ میں لتھڑے دیہاتی تانگے اور ریڑھے وغیرہ کھڑے تھے۔ ایک طرف جانوروں کو پانی پلانے کے لیے اینٹوں کی حوضی بنی ہوئی تھی۔ دو کھوکھا نما دکانیں بھی یہاں تھیں۔ ایک ڈھارے کے پاس کیکر کے درخت کے ساتھ حجام نے اپنا چوکور آئینہ لٹکا رکھا تھا۔ ہم یہاں اُتر گئے۔

جگت سنگھ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''یار! آخر تم بتاتے کیوں نہیں، تمہیں کرنا کیا ہے؟ اگر مجھے کوئی اتا پتا ہوگا تو چنگی طرح تمہارا ساتھ دے سکوں گا نا؟''

''میں تمہیں اپنا ساتھ دینے کے لیے یہاں نہیں لایا جگت! یہاں جو کچھ کرنا ہے مجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہی جو تم نے سنا ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور اسے حل بھی میں خود ہی کروں گا۔ تم جتنا ساتھ دے رہے ہو، یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں کسی بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔''

جگت سنگھ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بسنتی رنگ کے کُرتے کے نیچے بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ وہ گردن اکڑا کر بولا۔ ''آیاں یاروں کے یار ہیں بادشاہ زادے! جس کے مونڈھے کے ساتھ مونڈھا ملاتے ہیں، اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑتے، بادشاہ زادے! تُو ہمارا مہمان بھی ہے۔ تُو نے یہ کیسے سوچ لیا؟''

پیپل کے اس درخت کے نیچے میرے اور جگت کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس نے بہت دلیلیں دیں لیکن میں نے کسی بھی صورت اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ جب جگت نے دیکھا کہ میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے بس اتنا کیا کہ اس سے اس کا پستول لے کر اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ اگر میں شام تک واپس نہ آؤں تو وہ واپس اپنے گاؤں جو پور چلا جائے۔

اس نے نکتہ اُٹھایا کہ شام پانچ بجے کے بعد تو کوئی بس نہیں ملے گی۔

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پھر صبح چلے جانا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ اگر میرے ساتھ

کوئی ایسا ویسا معاملہ ہو جائے تو ثروت اس کی ذمہ داری ہے۔ وہ اسے کسی بھی طرح پاکستان پہنچائے گا۔

جگت کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ بہرحال اس نے وعدہ کیا کہ گرو نہ کرے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ اپنی چھوٹی بھین کی پوری ذمے داری اُٹھائے گا۔ ہم نے کچھ دیگر تفصیلات بھی طے کیں۔ میں نے احتیاطاً جگت سے موبائل فون نمبر بھی لے لیا۔ یہ نمبر اس کے چھوٹے بھائی گوبندر کا تھا۔ بہرطور میں نے یہ نمبر کہیں لکھا نہیں بلکہ حافظے میں محفوظ کر لیا۔ جگت سنگھ سمجھ چکا تھا کہ میرے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں اور میں اپنے گمشدہ بندے کی بازیابی کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں۔

دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ میں پیدل ہی سردار اوتار سنگھ کے زرعی فارم کی طرف روانہ ہوا۔ میرے ذہن میں کوئی واضح نقشہ تو نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، بہرحال میں ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے قطعی تیار تھا۔ اگر میں اپنے دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے اس بات نے میری بہت ڈھارس بندھائی ہوئی تھی کہ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ میں جارج گورا جیسے شخص کو زیر کیا ہوا ہے۔ جارج کی موت ایک ایسا تمغہ تھا جو میرے جسم پر نہیں میری روح پر سجا ہوا تھا اور جس نے میرے اندر کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ اب یہی اعتماد مجھے کشاں کشاں اس سکھ جاگیردار کے ٹھکانے کی طرف بھی لے جا رہا تھا۔ اس فارم کو عرفِ عام میں ''بیٹھک'' بھی کہا جاتا تھا۔ بیٹھک کے آثار مجھے دور ہی سے نظر آ گئے۔ کھیتوں کے درمیان دور تک خاردار باڑ چلی گئی تھی۔ بائیں طرف سات آٹھ فٹ اونچی کچی چار دیواری تھی۔ سامنے کی طرف کچھ کمرے تھے جن کے سامنے دھول میں اٹی ہوئی چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو جیپیں تھیں۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی اور ایک کوئی لوڈر قسم کی شے۔ لاچے کُرتے والا ایک مسلح سکھ یہاں چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سیدھا سردار اوتار کے پاس پہنچوں اور ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس سے دوٹوک بات کروں۔ میرا صرف ایک ہی مقصد تھا، یوسف کی بازیابی۔ میں سیدھا چوکیدار کے پاس گیا۔ ''کس سے ملنا ہے؟'' چوکیدار نے مجھے سرتاپا گھور کر پوچھا۔ اس کا سر اس کے باقی جسم کے مقابلے میں چھوٹا لگتا تھا۔

''سردار جی سے۔'' میں نے ترت جواب دیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''فریدکوٹ سے۔''

''اچھا...... اچھا...... اکبر علی ہو تم...... پر تمہیں تو کل آنا تھا۔''

میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''سردار جی کہاں ہیں؟''

''وہ تو ابھی دس منٹ پہلے نکل گئے کسی کام سے...... پر تم بڑے ٹائم پر آئے ہو۔ تمہاری بڑی لوڑ ہے حویلی میں۔ باپو جی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا وضاحت کرتا فربہ اندام چوکیدار اپنی پاٹ دار آواز میں پکارنے لگا۔ ''اوئے کیدار ناتھ...... اوئے کیدار ناتھ...... آ بھئی...... بندہ آ گیا ہے۔ جلدی آ اسے لے جا اپنے ساتھ...... آ جا بھئی۔''

میں نے دیکھا، کچی چار دیواری کے قریب سے ایک نوجوان تیز تیز قدم اُٹھاتا ہماری طرف بڑھا۔ اس نے میلا سا پاجامہ کُرتہ پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر تلک تھا۔ وہ ہاتھ میں چابی گھماتا آ رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ وہ قریب کھڑی گاڑیوں میں سے کسی ایک کا ڈرائیور ہے۔ وہ غالباً مجھے حویلی لے جانے آ رہا تھا اور میں خود بھی حویلی جانا چاہتا تھا۔ چوکیدار نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارے ساتھ تو تمہاری پتنی نے بھی آنا تھا؟''

اب میں اپنا لائحہ عمل بنا چکا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ''میں آج آ گیا ہوں۔ وہ ابھی تیار نہیں تھی، تھوڑا سا کام بھی تھا اسے۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔''

چوکیدار بولا۔ ''تمہیں ہری جی نے بتایا ہی ہو گا جب باپو کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو ساتھ ہی ماتا جی کی بھی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک ہوتے ہیں تو دونوں ہو جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا، رونا، سونا جاگنا، کھانا پینا، سب ایک ساتھ ہے۔ وکھرے ٹائپ کی طبیعتیں ہیں دونوں کی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈرائیور کیدار ناتھ، سکھ چوکیدار سے بھی زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مجھے ایک گرد آلود جیپ میں بٹھایا اور آناً فاناً روانہ ہو گیا۔ راستہ کچا تھا، جیپ بھی ایسی نئی نہیں تھی۔ زبردست ہچکولے لگ رہے تھے۔ کیدار ناتھ قدرے باتونی شخص تھا اور یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ اسے میرے بارے میں جاننے یا کچھ پوچھنے کا وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے چوکیدار والا سوال ہی پوچھا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تمہارے ساتھ تو زنانہ نرس بھی آ رہی تھی۔ شاید پتنی تھی تمہاری؟''

''وہ نہیں آ سکی۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔''

''سردار صاحب ناراض ہوں گے۔ تم پہلے ہی کوئی اچھا سا بہانہ سوچ لو۔''

''نہیں...... میرا خیال ہے کہ میں ان کو ناراض نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے غیر محسوس

طور پر اپنی قمیص کے نیچے پستول کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

کیدار ناتھ کی باتوں سے پتا چلا کہ مجھے غلطی سے اکبر علی سمجھا جا رہا ہے جو بطور ملازم فرید کوٹ سے یہاں آنے والا تھا۔ اسے یہاں سردار اوتار کے نوے سالہ بیمار باپو کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ ساتھ میں اس کی بیوی ثریا بھی آ رہی تھی۔ ثریا بھی فرید کوٹ کے سول ہسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ اکبر علی بھی سول ہسپتال میں بطور میل نرس ملازمت کرتا رہا تھا مگر اب ملازمت چھوڑ چکا تھا اور پرائیویٹ کام کرتا تھا۔ اکبر اور اس کی بیوی ثریا کو یہاں ترشولا میں سردار اوتار کی حویلی میں ایک مہینہ گزارنا تھا اور اس کے بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اس کے لیے ثریا نے ہسپتال سے ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ ثریا کو اس کام کے لیے قریباً آٹھ ہزار اور اکبر کو دس ہزار معاوضہ ملنا تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ اکبر کو یہاں مستقل ملازمت مل جائے گی۔

یہ ساری معلومات میرے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھیں، لہٰذا میں نے انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے متوقع سوالوں کے جواب بھی تیار کر لیے تاہم حیرت انگیز طور پر اگلے قریباً اڑتالیس گھنٹے تک مجھے ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دینا پڑا۔

ترشولا نما گاؤں تھا۔ کچے پکے دونوں طرح کے مکانات موجود تھے۔ گردوارے کی عمارت اور اس پر لہراتے ہوئے جھنڈے دور ہی سے نظر آ جاتے تھے۔ جو دوسری چیز نظر آتی تھی، وہ سرداروں کی حویلی تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو مکمل گارے مٹی کا تھا۔ دوسرا جو یقیناً بعد میں بنایا گیا تھا اینٹوں کا تھا۔ اس کے پلاستر پر نقش و نگار بھی بنائے گئے تھے۔

حویلی کے سارے رنگ برنگے تانگے اور تازہ دم گھوڑے کھڑے تھے۔ کئی تانگوں کی نشستوں کے اردگرد ریشمی پردے بھی تنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ تانگے سرداروں کی باپردہ عورتوں کے لیے آنے جانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ حویلی کے پھاٹک سے باہر ایک بہت بڑی جہازی چارپائی پر چھ سات مسلح افراد بیٹھے آنے جانے والوں کو گھور رہے تھے اور چنے پھانک رہے تھے۔ یہ یہاں کے محافظ تھے۔

کیدار ناتھ کو دیکھ کر پھاٹک کھول دیا گیا۔ وہ مجھے ترت حویلی کے وسیع احاطے میں لے گیا۔ حویلی کے دو حصے تھے، ایک زنانہ دوسرا مردانہ۔ یہ مردانہ حصہ وہی تھا جو اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ کیدار ناتھ مجھے لے کر زنانہ حصے کی طرف گیا۔ تاہم میرے اندر جانے سے پہلے اس نے پردہ کروا دیا۔ ہم ایک طویل برآمدے میں سے گزر کر ایک کشادہ کمرے میں پہنچ گئے۔

کمرے میں فینائل اوراسپرٹ کی ہلکی سی بُو تھی۔ایک شاندار پلنگ پر ایک شاندار بوڑھا سردار چت لیٹا تھا۔اس کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھ کر ہی بتایا جاسکتا تھا کہ وہ اپنی عمر کا سفر تقریباً مکمل کر چکا ہے اوراب صبح کے دیے کی طرح کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔اس کا رنگ بے حد گورا چٹا اور آنکھیں سبزی مائل براؤن تھیں۔اس کا قد کاٹھ دیکھ کر اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ کسی وقت بڑا دبنگ شخص رہا ہوگا۔اس کے سرہانے ایک تپائی پر بہت سی انگریزی اور دیسی دوائیں پڑی تھیں۔ایک طرف حاجت وغیرہ کے لیے خاص طرح کی کرسی پڑی ہوئی تھی۔

کیدار ناتھ نے کہا۔''باپو جی کے سرہانے گھنٹی کا بٹن ہے،اس گھنٹی کا بہت دھیان رکھنا ہے۔باپو جی بہت دھیمی آواز میں بات کرتے ہیں۔کان لگا کر سننا پڑتی ہے۔''

پھر کیدار ناتھ نے ایک چھوٹا سا دروازہ کھولا اور بولا۔''یہ تمہارے آرام کرنے کا کمرہ ہے لیکن تمہیں رات کو دو ڈھائی بجے کے بعد سونا پڑے گا کیونکہ باپو جی بھی اسی وقت سوتے ہیں۔''

چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اور قریب المرگ سردار کو میرے حوالے کرنے کے بعد کیدار ناتھ باہر چلا گیا۔میں نے دھیان سے بزرگوار کو دیکھا۔انہوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ان کی بات سننے کے لیے مجھے اپنا کان ان کے دانتوں اور سفید براق داڑھی کے بالکل پاس کرنا پڑا۔یہ ضعیف افراد عموماً صاف نہیں ہوتے اوران کے جسم سے بُو وغیرہ بھی اُٹھتی ہے لیکن باپو سردار ایک صاف ستھرا شخص تھا۔انہوں نے تپائی پر رکھی ایک دوا کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک چمچ پلا دوں۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔دوا پینے کے بعد سردار نے اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کیا۔پاس ہی ایک صاف رومال رکھا تھا۔میں نے رومال سے باپو سردار کے ہونٹ پونچھے۔انہوں نے اثبات میں سر ہلایا جیسے میری معاملہ فہمی کی تعریف کررہے ہیں۔

دو تین گھنٹے کے اندر مجھے یہاں کے اکثر معمولات کا پتا چل گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے۔مجھ سے پہلے راج سنگھ نامی ایک ڈسپنسر باپو سردار کی خدمت پر معمور تھا۔اس کی کسی غفلت پر سردار اوتار نے اسے تین چار دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا اور پھر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔اس کے بعد ہی فرید کوٹ سے اکبر نامی شخص اوراس کی نرس بیوی کو یہاں بلایا گیا تھا۔

ابھی تک سردار اوتار سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی،تاہم اس کے چھوٹے بیٹے ہری سنگھ کو میں نے دیکھا تھا اوراس سے تھوڑی سی بات چیت بھی کی تھی۔اسے بھی یہ اندازہ نہیں

ہوا کہ اس کے ملازموں سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے اور وہ اکبر علی کے بجائے کسی اور شخص کو حویلی میں لے آئے ہیں۔ہری نے بھی بس اتنا ہی پوچھا۔''تمہاری بیوی ساتھ نہیں آئی؟''

میں اب تک اس کا جواب تیار کر چکا تھا۔میں نے کہا۔''چھوٹے سردار!اسے چھٹی نہیں مل سکی لیکن دو دن بعد وہ ہر صورت آجائے گی۔میں خود اسے لے کر آؤں گا۔''

''دو دن کا مطلب......دو دن ہی ہونا چاہیے۔یعنی بدھ کے روز۔''

''ان شاءاللہ جی!بدھ کو شام سے پہلے وہ یہاں ماتا جی کی سیوا پر ہوگی۔''

ہری سنگھ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔وہ تیکھے نقوش اور چھریرے جسم والا اونچا لمبا نوجوان تھا۔گورے چہرے پر بڑی نفیس مونچھیں تھیں۔

یہ خیال میرے لیے بڑا سنسنی خیز تھا کہ ثروت کا شوہر یوسف فاروقی یہاں انڈیا کے اس دور دراز گاؤں میں ایک نامی گرامی سردار کی حویلی میں ہے۔وہ یہاں کیوں تھا؟اسے یہاں پہنچائے جانے کا کیا مقصد تھا؟جاوا اوراس کے لوگ اسے پاکستان سے یہاں لاکر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟یہ سارے سوال مسلسل میرے دماغ کو کچوکے لگا رہے تھے۔

شروع میں میرا اور عمران کا خیال تھا کہ شاید یہ بھی کوئی فلمی چکر ہو۔جس طرح نیتو کی شکل کرشمہ کپور اور سویٹی کی شکل دوسری مشہور اداکارہ ایشوریا رائے سے ملتی تھی،شاید یوسف کی صورت بھی کسی فلمی بندے سے ملتی ہو اور اسے چودھری انور کے ذریعے کشاں کشاں بمبئی پہنچا دیا جائے لیکن یہاں صورتِ حال مختلف نظر آرہی تھی۔یوسف اردو فلموں کے مرکز بمبئی میں تھا،نہ پنجابی فلموں کے کسی مرکز میں۔وہ یہاں ایک خالص دیہاتی علاقے میں ایک جاگیردار نما شخص کے پاس تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے کیسے اور کب دیکھ پاؤں گا لیکن جو کچھ ہوا،وہ بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ڈرائیور کیدار ناتھ میرے پاس آیا۔وہ بڑی تیزی سے بات کرتا تھا۔اس کی بات سمجھنے کے لیے خوب توجہ دینا پڑتی تھی۔وہ بولا۔''اکبر بھائی!تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔تمہارے پاس دھاگے نکالنے والی چمٹی تو ہوگی۔''

''دھاگے نکالنے والی چمٹی؟''میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار!وہی جس سے زخم کے ٹانکے کا دھاگہ کھینچتے ہیں۔''

میں اس کی بات سمجھ گیا۔اس سے پہلے جو بندہ میری جگہ کام کررہا تھا،وہ اپنا میڈیکل باکس یہیں چھوڑ گیا تھا یا شاید یہ باکس حویلی ہی کا تھا۔اس میں بینڈیج وغیرہ کا سارا سامان موجود تھا۔میں نے اسپرٹ،روئی اور چمٹی لی اور ڈرائیور کیدار ناتھ کے ساتھ چل پڑا۔مجھے

مرہم پٹی کا ایسا زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن جو کام کیدار بتا رہا تھا وہ تو میں کر ہی سکتا تھا۔ مندمل ہو جانے والے زخم سے بچا کھچا دھاگا کھینچنا بہت مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں انجکشن وغیرہ بھی لگا لیتا تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ اُتارنے اور لگانے کا تجربہ بھی تھا۔

کیدار پندرہ بیس قدم چل کر ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے پہنچا اور رُک گیا۔ وہاں سے اس نے ایک چابی لی اور مجھے لے کر حویلی کے مردانے حصے میں آ گیا۔ یہاں پختہ فرش تھا اور اس پر رنگوں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کرپانوں اور رائفلوں والے مسلح سکھ ملازم بھی نظر آ رہے تھے۔ کیدار مجھے لے کر ایک برآمدے میں سے گزرا اور ایک الگ تھلگ کمرے کے سامنے آ گیا۔ اس نے چابی لگا کر دروازے کا ہضمی قفل کھولا۔ اندر داخل ہوا اور مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر گھسا اور دنگ رہ گیا۔ میرے سامنے ایک پلنگ پر یوسف ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی تاہم کپڑے صاف ستھرے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم چونکے۔ خاص طور سے یوسف تو بُری طرح چونکا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ خوش قسمتی سے یہ وہ لمحے تھے جب کیدار ناتھ گھوم کر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا رہا تھا۔ اس نے یوسف کے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔ میں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر یوسف کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

یوسف نے بھی بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ ابھی تک بدلا ہوا تھا۔ کیدار ناتھ نے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سردار جی کے خاص مہمان ہیں۔ کچھ دن پہلے غسل خانے میں پاؤں پھسل گیا تھا۔ کہنی اور منہ پر چوٹ آئی ہے۔''

میں نے دیکھا۔ یوسف کے رُخسار پر بائیں کنپٹی کے پاس انگریزی حرف ''سی'' کی طرح کا زخم تھا جس پر پانچ چھ ٹانکے لگائے گئے تھے۔ زخم مندمل ہو گیا تھا مگر ایک دو ٹانکوں کے دھاگے موجود تھے۔ چہرے پر زخم کا یہ نشان یوسف کی خوبصورتی کو گہنا رہا تھا۔ میں نے دیکھا، یوسف کا یہ کمرہ خوب سجا سنورا تھا۔ دیہات کی بڑی حویلیوں میں میسر آنے والی ساری آسائشیں موجود تھیں۔ ایک طرف ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ سائیڈ کی میز پر مجھے ایک ایسا گلاس بھی نظر آیا جس کے پیندے میں بچی کھچی شراب موجود تھی۔

کیدار ناتھ کی ہدایت کے مطابق میں یوسف کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے اس کے مندمل زخم میں سے دھاگے کھینچنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوسف کے ہاتھوں میں ابھی تک لرزش موجود ہے۔ میری اچانک آمد نے اسے اعصابی طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کیدار کی موجودگی میں ہم ایک دوسرے

سے کچھ کہہ سکیں۔

میں دھاگے کھینچ چکا تو کیدار نے کہا۔ ''صاحب جی کی کہنی کی پٹی بھی بدل دو۔'' پھر وہ سوالیہ نظروں سے یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

یوسف نے کہا۔ ''ہاں...... بدل ہی دو۔ تین دن تو ہو گئے ہیں۔''

میں نے یوسف کی کہنی کی پٹی کھولی۔ کھال بُری طرح چھلی ہوئی تھی۔ پٹی اُتارنے سے خون رِسنے لگا۔ ایک بات میں نے فوراً محسوس کی۔ چہرے کا زخم پُرانا جبکہ کہنی کا تازہ تھا۔ شاید یہ زخم دو تین دن پہلے ہی آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کیدار نے جھوٹ بولا ہے۔ چہرے اور کہنی کی چوٹیں ایک ہی واقعے کا نتیجہ نہیں تھیں۔ بہرحال ابھی ان باریکیوں میں پڑنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک دو دوائیں یوسف کے قریب ہی میز پر موجود تھیں۔ کاٹن کی پٹی بھی رکھی تھی۔ میں نے زخم کو روئی سے صاف کیا اور ''آئنٹ مینٹ'' لگا کر پٹی باندھ دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم حویلی کے مردانے حصے سے نکل کر واپس زنان خانے میں بوڑھے بیمار باپو کے پاس پہنچ چکے تھے۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یوسف نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ زخمی بھی تھا۔ اسے ایک کمرے میں باقاعدہ تالا لگا کر رکھا گیا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ دو چار خاص ملازموں کے سوا کسی کو اس کی موجودگی کا علم بھی نہیں۔ اس کی چوٹوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس پر کسی طرح کا تشدد کیا گیا ہو یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہو اور یہ چوٹیں اسے اسی سلسلے میں لگی ہوں۔

میں جلد از جلد یوسف سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کے لیے کوئی موقع نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ کل یا پرسوں پھر یوسف کی کہنی کی پٹی بدلنے کی ضرورت پیش آئے اور میں اس سے مل سکوں۔ لیکن یہ بات بھی یقینی تھی کہ کیدار ناتھ میرے سر پر کھڑا رہے گا اور مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔

میرے لیے فی الوقت سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کہیں میرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ کل کسی وقت دوپہر کے بعد فرید کوٹ سے اصلی اکبر علی اور اس کی نرس بیوی ثریا یہاں ترشولا پہنچ رہے تھے۔ اگر میں یہاں رہنا چاہتا تھا تو ضروری تھا کہ انہیں یہاں پہنچنے سے روکوں۔ لیکن ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ شاید اکبر علی کا یہاں حویلی سے ٹیلی فونک رابطہ بھی ہو۔ ایسے میں وہ یہاں کسی کو فون کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں فوراً مشکوک قرار پاتا اور پکڑا جاتا۔ بہرحال، اس طرح کے سارے رسک تو میں نے پہلے ہی ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔

میں نے کیدار ناتھ سے بات چیت جاری رکھی۔ معلوم ہوا کہ سردار اوتار موبائل فون

استعمال نہیں کرتا۔ ہاں حویلی میں ایک فون لائن موجود ہے لیکن وہ دو چار روز سے خراب پڑی ہے۔ میرے کریدنے پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ کیدار ناتھ کے پاس ایک موبائل فون موجود ہے۔ میں نے اس سے درخواست کی اور اس نے مجھے ایک کال کرنے کی اجازت دے دی۔

میں موبائل لے کر اس چھوٹے کمرے میں چلا گیا جو باپو کے کمرے کے ساتھ تھا اور میرے سونے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے جگت سنگھ کے چھوٹے بھائی گوبندر کا نمبر ملایا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ بڑے بھائی کے گھر میں ہی ہوگا۔ وہاں اسے دل لگی کے لیے بہت کچھ مل رہا تھا۔ دوسری، تیسری بیل پر کال ریسیو ہوگئی۔ ''ہیلو کون؟'' گوبندر کی آواز اُبھری۔ وہ قدرے، ہانپا ہوا تھا۔

''ہیلو گوبندر! میں صادق بول رہا ہوں۔'' میں نے دبی آواز میں کہا۔

''صادق بھائی! کہاں ہو تم؟ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔'' وہ گرمجوشی سے بولا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟''

''گاؤں میں ہی ہوں...... گھر میں۔'' وہ بدستور ہانپے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کے ہانپنے کی دو ہی وجوہ ہو سکتی تھیں۔ آشا اس کے آس پاس موجود تھی اور اپنے شباب سے اس کی تنہائی کو چمکا رہی تھی یا پھر وہ ڈھارے کے اندر اپنے ''دیہاتی جم'' میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میرا یہ دوسرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ جگت سنگھ بھی گھر ہی میں تھا۔ پس منظر میں جگت کی آواز سنائی دی۔ وہ گوبندر سے پوچھ رہا تھا کہ کس کا فون ہے۔ ''صادق بھائی کا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے بول رہے ہیں۔'' گوبندر نے جگت کو جواب دیا۔

میں نے تیزی سے کہا۔ ''گوبندر! میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم ذرا جگت بھائی کو فون دو۔''

چند سیکنڈ بعد موبائل فون پر جگت کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ میں نے کہا۔ ''جگت! میں سردار اوتار کی حویلی میں ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی فوری ضرورت ہے۔''

وہ بلاتوقف بولا۔ ''بادشاہ زادے! تجھے کہا تو ہے کہ آپاں یاروں کے یار ہیں...... بتا کس دریا میں چھال مارنی ہے اور کس اوکھلی میں سر دینا ہے؟''

''نہیں یار! ابھی کوئی بڑی چھال تو نہیں مارنی بس ایک چھوٹی چھلانگ لگانی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم لگا لو گے۔ کل دوپہر کے بعد فرید کوٹ سے ایک میاں بیوی بس پر بیٹھ کر آئیں گے اور ترشولا موڑ کے پاس نہر کے پل پر اُتریں گے۔ تم نے کسی طرح انہیں ترشولا

پہنچنے سے روکنا ہے۔''

جگت سنگھ دلیری سے بولا۔ ''لے بس اتنی سی گل ہے۔ میں سمجھا شاید کسی بندے کا منکا وغیرہ توڑنا ہے یا کوئی جنج (برات) لوٹنی ہے۔ تم بتاؤ وہ پتی پتنی ہیں کون؟ اور کیا کرنا ہے ان کے ساتھ؟''

میں نے جگت کو تفصیل بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ بس وہ کچھ ایسا کرے کہ یہ میاں بیوی تین چار دن کے لیے ترشولا نہ آسکیں اور نہ کسی سے رابطہ کر سکیں۔

وہ ہنس کر بولا۔ ''یار! تم کہو گے تو وہ قیامت تک ترشولا نہیں آسکیں گے۔ ایسی کون سی بات ہے۔ اپنے یار پرتاب سنگھ کے پاس پُرانی فوجی جیپ ہے۔ اس پر جائیں گے اور ان دونوں مہمانوں کو بڑے عزت اور پریم سے یہاں لے آئیں گے۔ تُو اس بارے میں کوئی فکر نہ کر۔ تُو یہ بتا کہ وہاں تیرا کوئی کام بنا ہے یا نہیں؟''

''بس سمجھو کہ تھوڑا تھوڑا بن رہا ہے۔ تم یہ گوبندر والا فون دو تین دن اپنے پاس رکھ سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں یار! تم جو کہو گے ویسا ہی ہوگا۔'' اس گفتگو کے آخر میں، مَیں نے جگت سنگھ سے ایک بار پھر راجا کے انجام کے بارے میں پوچھا۔ جگت نے بتایا کہ پوری کوشش کے باوجود اسے ابھی پتا نہیں چل سکا۔ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ ایک بندہ حویلی سے باہر درختوں میں سخت زخمی ہوا تھا جو کل ہارون آباد کے ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ یہ بالکل نامکمل اطلاع تھی جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

جگت کو کال کرنے کے بعد میں نے کال کا ریکارڈ ختم کر دیا اور موبائل فون کیدار کو واپس دے دیا۔

رات قریباً بارہ بجے تک میں بیماروں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ انہیں بڑھاپے کی کئی بیماریاں لاحق تھیں جن میں سب سے اہم جسم کے دائیں حصے کا فالج تھا۔ اس کے علاوہ شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور دل کی تکلیف بھی اس ''بیماری پیکیج'' کا حصہ تھی۔ باپو کے سونے کے بعد میں بھی ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ گھنٹی بالکل میرے سرہانے تھی۔ ایک بال پوائنٹ میں نے کل ہی حاصل کر لیا تھا۔ کاغذ بھی موجود تھا۔ بلب کی میلی سی روشنی میں، مَیں نے یوسف کے نام ایک مختصر رقعہ لکھا۔

''یوسف بھائی! بہت مشکلوں سے تمہارے پیچھے یہاں تک پہنچا ہوں۔ سمجھو کہ جان پر

کھیلنا پڑا ہے۔ ابھی تک کچھ پتا نہیں کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے اور یہ لوگ تم سے کیا چاہتے ہیں۔ مجھے جوابی رقعے کے ذریعے اپنے حالات سے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ میں تمہاری مدد کس طرح کر سکتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے ان لوگوں کی تعداد بھی بتاؤ جو یہاں تمہاری پہرے داری کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کس طرح کا اسلحہ ہے اور ان سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ میں یہ بال پوائنٹ تمہارے کمرے میں ہی چھوڑ آؤں گا۔ اگر تمہارے پاس کاغذ نہ ہو تو اسی رقعے کی پشت پر جواب لکھ دینا۔ امید ہے کہ کل کسی وقت ملاقات ہوگی۔'' رقعہ لکھ کر میں نے جیب میں رکھ لیا۔

اگلے کئی گھنٹے میں نے سخت سوچ بچار کی کیفیت میں گزارے۔ بالآخر میں نے یوسف کو ڈھونڈ لیا تھا۔ لیکن ابھی تک ثروت اور جگت سنگھ سمیت کسی کو خبر نہیں تھی کہ یوسف کا پتا چل گیا ہے۔ صرف میں جانتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اپنے دل کی کیفیت کھل کر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی قلبی واردات کے سلسلے میں کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھ میں بھی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میرا دل چاہا کہ سرداروں کو ان کی حویلی کو اور حویلی میں موجود یوسف فاروقی کو بھول کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں۔ یوسف کے ساتھ جو بھی ہونا ہے ہوتا رہے۔ اگر اس کی زندگی ہے تو اس نے بچ ہی جانا ہے۔ دوسری صورت میں کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

یہ سوچ اس تابش کی تھی جو لڑکپن سے ثروت کو چاہتا تھا، جس سے ملن کے لیے گھڑیاں اور پل گنا کرتا تھا اور اپنے دل کی گہرائیوں میں شاید اب بھی گنتا تھا۔ ہاں یہ وہی تابش تھا جس کو آج ایک رقیب کا سامنا تھا۔ ایک ایسا رقیب جو کسی طور بھی ثروت کے قابل نہیں تھا لیکن حالات نے جسے ثروت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا، آج وہ رقیب ایک بے بس شخص کی حیثیت سے یہاں اس حویلی میں موجود تھا۔

بہرحال میری اس سوچ کی عمر زیادہ طویل نہیں رہی۔ بہت جلد ایک دوسرا تابش میرے اندر اُبھر آیا۔ یہ تابش ثروت کو چاہتا تو تھا لیکن اس کے حصول کے لیے کوئی غلط راہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ، کوئی خود غرضی، کوئی چشم پوشی، کچھ نہیں۔ یہ تابش...... یوسف فاروقی کا مددگار بن کر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ثروت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ثروت کو اس کے شوہر سے ملانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ جیت اسی تابش کی ہوئی۔ میں اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ جگت سنگھ اور ثروت کو یہاں یوسف کی موجودگی سے آگاہ

کروں گا اور اس کے بعد وہ سب کچھ بھی کروں گا جو کرنا میرا فرض ہے اور اس کے لیے جان بھی خطرے میں ڈالنا پڑی تو ڈالوں گا۔

○……❖……○

اگلے دن میں نے بہت بے چینی سے جگت سنگھ کو کال کی۔ یہ کال پھر کیدار ناتھ کے موبائل سے ہی ہوئی۔ وقت سہ پہر چار بجے کا تھا۔ کال ریسیو ہوئی تو جگت سنگھ کی جوشیلی آواز سنائی دی۔ ''تیرا کام ہو گیا بادشاہ زادے! اکبر علی اور اس کی نک چڑھی زنانی، دونوں اس ویلے میرے پاس ہیں۔ آلو والے پراٹھے کھا رہے ہیں نمک مرچ والے دہی کے ساتھ۔''

''کہاں ہو تم؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اپنے یار پرتاب سنگھ کے پنڈ میں۔ زیادہ دور نہیں ہے ہمارے پنڈ سے۔ یہاں پر پرتاب سنگھ کا چھوٹا سا باغ ہے۔ باغ میں ایک ڈھارا ہے۔ دونوں ڈھارے میں ہیں۔ آٹھ دس دن شانتی سے یہاں گزار سکتے ہیں۔''

''کس طرح لائے ہو انہیں؟''

''بس یار! لے آئے جیسے بھی ہوا۔ پر اپنا وچن نہیں توڑا میں نے۔ کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوئی ہے دونوں کو۔''

میرے اصرار پر جگت سنگھ نے بتایا کہ جب وہ دونوں فرید کوٹ والی بس سے اُترے تو پرتاب سنگھ اور وہ تانگے کے اڈے پر موجود تھے۔ انہوں نے فوراً دونوں کو پہچان لیا۔ انہوں نے اکبر علی کو بتایا کہ وہ سردار اوتار کے ملازم ہیں اور ترشولا پنڈ سے ان دونوں کو لینے کے لیے آئے ہیں۔ وہ دونوں پرانی فوجی جیپ میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد جگت اور پرتاب کے لیے کوئی مسئلہ نہ رہا۔ جگت کے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا پستول موجود تھا۔ اس نے میاں بیوی کو خاموش رہنے کی دھمکی دی اور باآسانی منزل پر پہنچ گئے۔

جگت سنگھ کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔ مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ مجھے ایسی اجنبی جگہ پر ایسا بے لوث مددگار مل گیا ہے۔ کم از کم وہ ابھی تک تو بے لوث ہی تھا۔ میں نے جگت سے کہا۔ ''جگت پیارے! اب تجھے ایک اور کام کرنا ہے۔''

''اوئے بادشاہ زادے! تُو پوچھا نہ کر، بس کام بتایا کر۔'' وہ حسبِ معمول گرمجوشی سے بولا۔

''ثروت کو کسی طرح یہاں پہنچانا ہے لیکن وہ ثروت کے طور پر نہیں ثریا کے طور پر آئے، یعنی اکبر علی کی نرس بیوی بن کر۔''

"میں سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔ کب آنا ہے چھوٹی بہین کو وہاں؟"

"کل شام سے پہلے پہلے آجائے تو زیادہ اچھا ہے۔"

"اچھا تو ایسا کر بادشاہ زادے! چھوٹی بہین کو اپنی زبانی ساری بات سمجھا دے۔ اس نے کون سے کپڑے پہننے ہیں، اپنے ساتھ کیا لانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ باقی اسے وہاں پہنچانا میرا کام ہے۔ پر ایک بات ہے۔ وہ عورت ذات فرید کوٹ سے اکیلی آتی ہوئی کچھ اوپری (عجیب) نہیں لگے گی؟"

"تم ایک بات بھول رہے ہو کہ وہ عام عورت نہیں پڑھی لکھی نرس کے طور پر آئے گی۔ وہ جب بس سے اُترے گی تو میں تانگے کے اڈے سے اسے لے لوں گا۔ تم چاہو تو بس پر آگے چلے جانا۔ چاہو تو اُتر کر واپسی کی بس پر بیٹھ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" جگت نے کہا۔ "تم ایسے کرو کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد پھر کال کرو۔ میں اس ویلے گھر میں ہوں گا۔ تمہاری گل چھوٹی بہین سے کرادوں گا۔"

دو گھنٹے بعد فون پر میری بات پھر جگت سنگھ سے ہوئی۔ جگت سنگھ نے فوراً ثروت کو فون پر بلالیا۔ "ہیلو ثروت!" میں نے کہا۔

میری آواز پہچانتے ہی ثروت بے چین ہوگئی۔ "تابش! آپ کہاں ہیں؟ میں بہت پریشان ہوں آپ کے لیے۔ اس اجنبی جگہ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیں پلیز۔"

"گھبراؤ مت۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اپنا خیال رکھیں گے۔ تم میرے پاس آنے کی تیاری کرلو۔"

ثروت کو تھوڑا بہت تو جگت نے بتا دیا تھا۔ باقی میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ بڑی معاملہ فہم تھی۔ دو تین منٹ کے اندر ساری بات سمجھ گئی اور تفصیل بھی جان گئی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یوسف یہاں حویلی میں موجود ہے اور میں اس سے مل چکا ہوں تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آواز میں ایک مسرت آمیز لرزش نمودار ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں کسی دوسرے کے فون سے کال کر رہا ہوں۔ میں نے ثروت سے بات کرنے کے بعد پھر جگت سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ میرے لیے ایک موبائل فون کا انتظام کرے اور جب ثروت یہاں آئے تو موبائل ساتھ لے آئے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب ہی کیدار ناتھ نمودار ہوگیا۔ میں اس وقت ناشتے کے لیے

باپو کا منہ ہاتھ دھلوا رہا تھا۔ بابا نانک چند کی بہت بڑی تصویر کمرے میں لگی تھی۔ بیمار باپو جب بھی اس تصویر کی طرف دیکھتے تھے ان کی بجھی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی روشنی اُبھر آتی تھی۔ وہ گاہے بگاہے مجھ سے باتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ ان کی کسی پوتی یعنی سردار اوتار کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور یہ شادی چند روز میں ہی انجام پا جائے گی۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں نے خود بھی دیکھا تھا۔ حویلی کی ملازمائیں کمروں کی جھاڑ پونچھ اور آرائش میں مصروف رہتی تھیں۔ مردانے کی طرف پکی حویلی میں رنگ وغیرہ بھی ہو رہا تھا۔ گاہے بگاہے مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ کل رات مجھے ڈھولک کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

ایک بالٹی نما برتن میں باپو کے ہاتھ اور پاؤں دھلوا کر میں پانی گرانے غسل خانے کی طرف گیا تو کیدار نمودار ہوا اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں فارغ ہو کر سیدھا مردانے میں آؤں۔ مہمان کی پٹی بدلنی ہے۔ وہ یوسف کو مہمان ہی کہتا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے یوسف کے نام کا پتا نہیں۔

اندھا کیا چاہے...... دو آنکھیں۔ میں تو خود ہی کافی دیر سے اس بلاوے کے انتظار میں تھا۔ باپو کے ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے میڈیکل باکس اُٹھایا اور کیدار ناتھ کے ساتھ یوسف فاروقی کی طرف روانہ ہوگیا۔ حسبِ سابق کیدار نے ایک چابی کے ساتھ یوسف کے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ یوسف نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز ٹی وی یعنی دور درشن دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُٹھا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد صوفے پر آ بیٹھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ نے مجھے یاد دلایا کہ اس کی ٹانگ پر بھی زخم موجود ہے۔ یہی زخم تو تھا جس نے اسے پہلے ہسپتال میں اور پھر جاوا کے جال میں پھنسایا تھا۔ یہ زخم اسے روڈ ایکسیڈنٹ کے بعد ہونے والی لڑائی میں آیا تھا۔ بہرطور اب اس کی ٹانگ کی حالت سے لگتا تھا کہ یہ زخم بہتر ہو چکا ہے۔ اصل مسئلہ اسے کہنی کی تازہ چوٹ کا تھا۔ میں نے "ڈسٹل واٹر" لگا لگا کر آرام سے اس کی پٹی کھولی اور زخم صاف کر کے دوبارہ دوا لگا دی۔ زخم سے ابھی تک خون کا رِساؤ جاری تھا۔ میں نے پٹی ذرا زور سے باندھی اور اس سے کہا۔ "جناب! میں نے پٹی تھوڑی سی ٹائٹ باندھی ہے تاکہ "بلیڈنگ" رُک جائے۔ اگر پٹی تنگ کرے تو مجھے بتا دیجیے گا، میں اس کو ڈھیلا کر دوں گا۔"

مرہم پٹی کے دوران میں ہی میں نے کیدار کی نظر بچا کر رقعہ یوسف کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ ذرا سا چونکا لیکن پھر سنبھل گیا۔ جانے سے پہلے میں نے اپنا بال پوائنٹ بھی یوسف کی

جھولی میں گرادیا جس پر یوسف نے اخبار رکھ دیا۔

میں کیدار کے ساتھ دوبارہ زنان خانے میں بیمار باپو کے پاس آ گیا۔ راستے میں مجھے چند ملازمائیں نظر آئیں جو اسٹیل اور تانبے کے بڑے بڑے تھالوں میں مٹھائی وغیرہ لے کر اندرونی کمروں کی طرف جارہی تھیں۔

میں بے چینی سے یوسف کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ آتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ پٹی کس کر باندھ رہا ہوں تا کہ خون کا رِساؤ ختم ہو جائے۔ حالانکہ زخم میں خون کا رِساؤ روکنے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا۔ مجھے امید تھی کہ یوسف میرا اشارہ سمجھ جائے گا اور پٹی نرم کرانے کے بہانے مجھے پھر بلالے گا۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ قریباً دو گھنٹے بعد کیدار پھر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''یار! وہ تمہارے مریض صاحب تمہیں پھر یاد فرمارہے ہیں۔ ان کو درد ہو رہا ہے۔''

میں دوبارہ اس کے ساتھ چل دیا۔ مجھے امید تھی کہ یوسف نے میرے رقعے کا جواب لکھ لیا ہوگا۔ ہم مسلح پہرے داروں کے درمیان سے گزر کر مقفل دروازے تک پہنچے۔ حسبِ سابق کیدار نے دروازہ کھولا۔ یوسف چہرے پر تکلیف سجائے پلنگ پر دراز تھا۔ ''او بھئی ڈسپنسر صاحب! تم نے تو بازو کو شکنجہ لگا دیا ہے۔''

''سوری جی! شاید کچھ زیادہ ہی ٹائٹ ہوگئی ہے پٹی۔''

میں نے پٹی کھولی۔ کچھ مزید آئنٹ مینٹ لگائی اور روئی رکھ کر پھر بینڈیج کر دی۔ اسی دوران میں یوسف نے تہ شدہ رقعہ بھی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کام بالکل صفائی سے ہوا اور کیدار کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا اور دروازہ بند کر کے رقعہ پڑھنے لگا۔ یوسف نے اپنا کاغذ استعمال کیا تھا۔ کاپی سائز کے ایک صفحے پر لکھا تھا۔

''تابش بھائی! السلام علیکم...... تمہیں یہاں انڈیا کے اس گاؤں میں دیکھا تو اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ سچ پوچھو تو میں خودکشی کا سوچنے لگا تھا۔ تمہیں دیکھ کر پھر سے زندگی کی امید بندھ گئی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں ہسپتال سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو میں ہارون آباد سے کافی آگے آ چکا تھا اور یہاں بارڈر کے پاس ایک پنڈ میں تھا۔ پنڈ کے چودھری کا نام انور ہے اور اس کی پیلی حویلی پورے علاقے میں مشہور ہے۔ اس پیلی حویلی میں مجھے چار پانچ دن رکھا گیا۔ یہاں میں نے ایک دو ایسی لڑکیاں دیکھی ہیں جو انڈیا کی مشہور اداکاراؤں سے کافی

مشابہت رکھتی تھیں۔

یہاں چند دن پہلے میرے بازو کی نس میں پھر ایک انجکشن لگایا گیا جس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں مجھے اس دوسرے گاؤں پہنچا دیا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ میں پاکستان میں ہی ہوں لیکن یہاں اتنی کثرت سے سکھ نظر آئے کہ میں سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ بارڈر پار کر کے انڈین علاقے میں آ چکا ہوں۔ پتا نہیں کہ اب میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔

مجھے چودھری انور نے کچھ نہیں بتایا تھا، نہ یہ لوگ یہاں کچھ بتا رہے ہیں۔ چودھری انور کی حویلی میں ہی میرے چہرے پر یہ زخم بھی لگایا گیا جس کے ٹانکوں کے دو دھاگے تم نے کل نکالے ہیں۔ زخم لگانے والی بات پر تم حیران ہوئے ہو گے۔ ہاں، ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ زخم لگانے سے پہلے میری کھال کو سن کیا گیا اور پھر تیز چاقو کی نوک سے بڑی صفائی کے ساتھ کٹ لگایا گیا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ شاید یہ لوگ مجھ پر کوئی جادو ٹونا کر رہے ہیں۔ دو دن پہلے میں نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی ہے۔ کیدار ناتھ کھانا دینے کے لیے اندر آیا تو میں اسے دھکا دے کر بھاگ نکلا۔ رات کا وقت تھا۔ لائٹ بھی گئی ہوئی تھی مگر میں برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ دو ٹارچیں روشن ہو گئیں اور ایک بندے نے میری طرف رائفل سیدھی کر لی۔ اسی کھینچا تانی میں میری کہنی پر بھی یہ چوٹ آئی ہے۔ تب سے میرے کمرے کو باہر سے تالا بھی لگایا جانے لگا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ میرے کمرے کے آس پاس ہر وقت تین چار بندے موجود رہتے ہیں۔ رات کو بارہ بجے کے بعد بھی کم از کم دو بندے تو سامنے والے برآمدے میں ضرور ہوتے ہیں۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہر وقت جھگڑوں، مقدموں اور مارا ماری کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ حویلی اوتار سنگھ کی ہے۔ وہ علاقے میں لوگوں کے فیصلے کراتا ہے اور اس کی پنچایت کو پورے علاقے میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے لیکن وہ خود کوئی ایسا نیک پارسا نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کئی جرم اس کے کھاتے میں ہوں گے۔ اس کا ایک بیٹا بھی کافی بدنام ہے۔ اس پر سنگین مقدمے ہیں اور وہ کچھ عرصہ سے روپوش بھی ہے۔ اس کا نام اشوک سنگھ ہے۔ چھوٹا بیٹا ہری سنگھ کسی حد تک اچھا ہے اور لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ مگر حویلی کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شراب، گانجے اور عورت کا رسیا ہے۔ کل ہری سنگھ میرے پاس آیا تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہارا کہنی اور ٹانگ کا زخم کچھ اور ٹھیک ہو جائے تو پھر تم سے ایک چھوٹا سا کام لینا ہے۔ اس کے بعد تم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟ مجھے آزاد کر دیا جائے گا؟'' کہنے

لگا۔ ’’آزاد ہی نہیں کیا جائے گا، تمہیں پاکستان واپس بھی پہنچایا جائے گا۔ تم ہمارے مہمان ہو، دشمن نہیں ہو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر مہمان ہوں تو پھر مجھے کمرے میں بند کیوں رکھا ہوا ہے اور باہر پہرے دار ہیں۔‘‘ اس نے مسکرا کر کہا۔ ’’صرف اس ڈر سے کہ تم کہیں بھاگنے کی دوسری کوشش نہ کرو۔‘‘

’’میں بہت پوچھتا رہا کہ وہ کیا کام ہے جو انہوں نے مجھ سے لینا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔ یہ بالکل معمولی سا ٹاسک ہے۔ بس میں یوں سمجھوں کہ ایک بندے سے ملاقات کرائی جانی ہے میری۔ میرے اس رقعے کا جواب جلد از جلد لکھو تا کہ مجھے حالات سے کچھ آگاہی ہو۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟ مجھے ثروت کی خیر خیریت سے بھی آگاہ کرو۔ اپنی رائے بھی مجھے بتاؤ کہ مجھے اس سچویشن میں کیا کرنا چاہیے۔ کیا ہری سنگھ کی بات پر اعتبار کر کے انتظار کرنا چاہیے یا پھر یہاں سے از خود نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اگر نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو کیا تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟ تمہارے جواب کا شدت سے انتظار کروں گا۔ خط کو پڑھنے کے بعد فوراً ضائع کر دینا۔‘‘

یوسف کی اس تحریر میں ایک دو باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ سردار اوتار کے چھوٹے بیٹے ہری سنگھ نے کہا تھا کہ وہ لوگ یوسف سے ایک چھوٹا سا کام لینا چاہتے ہیں لیکن اس کام کی نوعیت کے بارے میں یوسف کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ شاید وہ کسی سے یوسف کی ملاقات کرانا چاہتے تھے لیکن اس ملاقات کے بعد کیا صورتِ حال ہوگی، اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ملاقات والی بات بس ڈھکوسلا ہی ہوتی۔ ایک اور خاص بات جو یوسف بتا رہا تھا، یہ تھی کہ اس کے چہرے پر زخم لگایا گیا تھا۔ اس زخم کے حوالے سے کیا ڈراما رچایا جانے والا تھا، اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ یوسف کے چہرے کی مشابہت کسی دوسرے چہرے سے بنائی جا رہی ہو اور اس کے خدوخال کو کسی دوسرے کے خدوخال سے قریب تر کیا جا رہا ہو لیکن یہ زخم لگائے جانے کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مثلاً یوسف کو کسی جرم میں ملوث کرنا وغیرہ۔

یہ سارا معاملہ خاصا اُلجھا ہوا تھا۔ ایک بات تو صاف تھی کہ یہ کوئی معمولی چکر نہیں ہے۔ یوسف کو کہاں سے کہاں پہنچایا گیا تھا اور اس سلسلے میں کئی خطرات مول لیے گئے تھے۔ اب وہ یہاں ایک بڑے سکھ سردار اوتار سنگھ کی عظیم الشان حویلی میں موجود تھا۔ کاش عمران میرے ساتھ ہوتا۔ اس کی سحر انگیز شخصیت ان سارے حالات کا احاطہ کر لیتی۔ وہ اپنے ناخن تدبیر سے مشکل ترین گتھیاں سلجھاتا تھا اور بڑے بڑے مرحلے ہنستے کھیلتے طے کر جاتا تھا۔ وہ خطروں

کا کھلاڑی تھا۔ اس نے مجھے بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سکھایا تھا لیکن میرے اور اس کے معیار میں ابھی بہت فرق تھا۔

پروگرام کے مطابق میں نے دو بجے کے قریب جگت سنگھ کو فون کیا۔ میری تیسری چوتھی کوشش کامیاب ہوئی اور اس سے رابطہ ہو گیا۔ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بس میں سوار ہے اور ترشولا کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے میری بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ثروت بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے ثروت سے میری بات کرائی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی لگتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ’’بس سٹاپ پر آپ اکیلے ہوں گے یا کوئی ساتھ ہوگا؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’اکیلا ہوں گا۔ لیکن اگر تانگے کے بجائے گاڑی پر آیا تو پھر ہندو ڈرائیور میرے ساتھ ہوگا۔ ہم دس پندرہ منٹ میں حویلی پہنچ جائیں گے۔ باقی باتیں تو تمہیں یاد ہی ہیں۔ تمہارا نام ثریا ہے۔ تم فرید کوٹ کے سول ہسپتال میں نرس کے طور پر کام کرتی ہو اور ایک مہینے کی چھٹی پر میرے ساتھ یہاں آئی ہو۔ ہم دونوں فرید کوٹ کے محلہ مندراں میں کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے۔‘‘

ثروت نے ذرا توقف کے بعد پوچھا۔ ’’اس سوال کا کیا جواب دینا ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں آ سکی تھی؟‘‘

’’یہی کہ ہسپتال میں ایمرجنسی ہو گئی تھی اور چھٹی نہیں مل سکی تھی۔‘‘

چند مزید ہدایات دینے کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور تانگا اڈے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حسبِ توقع عین موقع پر کیدار ناتھ موت کے فرشتے کی طرح میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔ ’’بھابی کو لینے جا رہے ہو؟‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ’’تو ٹھیک ہے گاڑی پر لے آتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میرا خیال تھا کہ تم باپو کے پاس رہو گے۔‘‘

وہ بولا۔ ’’اس کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔‘‘

پھر اس نے ایک اننت سنگھ نامی ملازم کو آوازیں دیں اور اسے ایک گھنٹے کے لیے باپو کی دیکھ بھال پر معمور کر دیا۔ باپو سو رہے تھے۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر ہم ثروت کو حویلی لے آئے۔ وہ کچھ ڈری سہمی تھی مگر میری باتوں سے جلد ہی اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا چرمی بیگ لائی تھی۔ اس میں وہ سامان تھا جو نرسنگ کے حوالے سے مطلوب ہو سکتا تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں اس کے اور

میرے کپڑے وغیرہ تھے۔ ثروت نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ بھی اس کے کریکٹر کے عین مطابق تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اسے کس انداز سے بات چیت کرنی ہے اور یہاں کیا کیا ڈیوٹیاں سرانجام دینی ہیں۔

حویلی میں پہنچ کر چند منٹ ہم نے تنہائی میں بھی بات چیت کی۔ یہ بات چیت اس چھوٹے کمرے میں ہوئی جو میرے زیر استعمال تھا۔ ''یوسف کہاں ہیں؟'' ثروت نے چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا۔

اس کے ایسے سوال میرے سینے میں دھواں سا بھر دیتے تھے۔ میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ مردانے حصے میں ہے۔ ایک کمرے میں بند ہے، وہاں کوئی آ جا نہیں سکتا۔ ہم نے جو کچھ کرنا ہے، بڑی احتیاط اور صبر تحمل سے کرنا ہے۔''

''آپ نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا ہے۔ یعنی انہیں پتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں؟''

''نہیں...... ابھی تو نہیں بتایا...... اور اس سلسلے میں تم سے مشورہ بھی کرنا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ خوامخواہ کسی طرح کے شبہے میں پڑ جائے۔''

''کیسا شبہ تابش۔''

''ثروت! جہاں تک میرا اندازہ ہے، یوسف ہمارے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ٹوہ لگا چکا ہے۔ نصرت کے علاج میں، مَیں نے جو دلچسپی لی ہے، اس نے بھی اسے چونکایا ہے۔ اب اگر اسے پتا چلے گا کہ ہم کئی دنوں سے اکٹھے سفر کر رہے ہیں، کئی جگہ ہم نے ایک ہی چھت تلے رات گزاری ہے تو اس کے دل میں یقیناً وسوسے پیدا ہوں گے۔''

ثروت کے ملیح چہرے پر گہری سنجیدگی پھیل گئی۔ وہ بولی۔ ''تابش! سچ سچ ہی ہوتا ہے اور اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یوسف کی سوچ ایسی پست نہیں ہو سکتی۔''

میں اس سلسلے میں مزید بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ثروت! اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد میں بولا۔ ''ثروت! اس رات کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ میں تیز بخار میں تھا۔ بس اسی مدہوشی میں وہ بات ہوئی۔'' وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھکائے کھڑی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد ثروت اپنی ڈیوٹی پر باپو کی پتنی یعنی وڈی بے بے کے پاس پہنچ گئی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی اوڑھنی کے نیچے سے موبائل فون نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

کیدار ناتھ اب میرے ساتھ کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ فارغ وقت میں ہم دونوں اکثر حویلی کی چھت پر چلے جاتے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کھلیانوں کا نظارہ کرتے اور اس کے ساتھ گفتگو بھی جاری رہتی۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ ڈھولک اور گیتوں کی آواز اکثر حویلی کے اندرونی حصوں سے اُبھرتی رہتی تھی۔ پتا چلا کہ سردار اوتار کی بیٹی سرنوں کی شادی علاقے کے ایک ہم پلہ سردار کے بیٹے سے ہو رہی ہے اور اس میں بہت ہلا گلا ہونے والا ہے۔

یوسف کے خط کا جواب ابھی مجھے لکھنا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا اور کوئی بھی میرے ساتھ یہاں آیا ہے یا میں اکیلا ہوں؟ اس کا جواب ''ہاں'' میں تھا۔ میرے ساتھ ثروت یہاں آئی تھی لیکن ابھی تک میں حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ یوسف کو ثروت کی آمد کے بارے میں بتاؤں یا نہیں۔ یوسف نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اسے ہری سنگھ کی بات کا اعتبار کر کے انتظار کرنا چاہیے یا یہاں سے فوری طور پر نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ فی الوقت مجھے یہی بہتر لگ رہا تھا کہ انتظار کیا جائے۔

مَیں نے ایک رقعہ لکھ کر جیب میں رکھ لیا اور کیدار کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میں جب بھی یوسف کی بینڈیج کے لیے جاتا تھا، کیدار ساتھ ہی ہوتا تھا، کیدار کی آمد سے پہلے ہی باپو نے مجھے آواز دی۔ میں حسبِ معمول ان کے چہرے کی طرف جھک گیا اور اپنا ایک کان ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ انہوں نے اپنی بیمار مدھم آواز میں کہا کہ میں بائیں طرف والی الماری کھول کر اس کی نچلی دراز سے تصویر والی کاپی (البم) نکالوں۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا، باپو نیم دراز تھے۔ مَیں نے البم ان کی جھولی میں رکھ دی اور موٹے شیشوں والی عینک ان کی آنکھوں سے لگا دی۔ وہ اپنے سلامت ہاتھ کو ہولے ہولے حرکت دینے لگے اور تصویریں دیکھنے لگے۔ یہ ان کے خاندان ہی کی تصاویر تھیں۔ کچھ بلیک اینڈ وائٹ، کچھ رنگین۔ پھر انہوں نے بڑے سائز کی ایک رنگین تصویر پر انگلی رکھی اور بہت مدھم آواز میں مجھے بتایا کہ یہ ان کی پوتی سرنوں کی تصویر ہے جس کی کچھ ہی دن بعد شادی ہو رہی ہے۔ تیکھے نقوش والی یہ لڑکی خوبصورت تھی۔ حالانکہ وہ دیہاتی لباس میں تھی اور اس کے عقب میں ایک گھوڑا بھی دکھائی دے رہا تھا پھر بھی یوں لگا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

اس تصویر کے ساتھ والے نسخے پر میری نظر ایک اور تصویر پر پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ یہ کھڑی ناک والا ایک پچیس چھبیس سالہ جوان تھا۔ اس کے رُخسار پر ایک ویسا ہی کٹ تھا جیسا یوسف کے رُخسار پر نظر آتا تھا۔ یہ نیم گول کٹ کنپٹی کی طرف سے شروع ہوتا تھا

اور رُخسار کے وسط تک جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کی شکل بھی یوسف سے ملتی جلتی نظر آئی۔ پھر اگلے صفحے پر میں نے اسی شخص کی ایک اور تصویر دیکھی اور حیران رہ گیا۔ اس کا سائیڈ پوز ستر اسی فیصد یوسف سے مل رہا تھا۔ ایک دم بہت سی بکھری ہوئی کڑیاں آپس میں مل گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یوسف واقعی اپنی شکل وصورت کی وجہ سے یہاں موجود تھا۔ کم از کم ان دو تصویروں کو دیکھنے کے بعد تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے مؤدب انداز میں باپو سے پوچھا۔ ''باپو جی! یہ کون ہے؟''

وہ بھرائی ہوئی بہت دھیمی آواز میں بولے۔ ''میرا بڑا پوترا اشوک سنگھ۔''

''ماشاء اللہ بڑے گبرو جوان ہیں یہ...... لیکن ان کو کبھی یہاں دیکھا نہیں۔''

''یہ باہر ہوتا ہے۔'' باپو کی طرف سے مختصر اور مبہم جواب ملا۔

میں ششدر تھا۔ کچھ دیر بعد کیدار ناتھ آیا تو میں نے اس کو اشوک کے حوالے سے تھوڑا سا کریدا۔

کیدار کی باتوں سے پتا چلا کہ مخالفوں نے سردار اشوک پر کچھ جھوٹے مقدمے بنائے ہوئے ہیں۔ دشمن داری بھی بہت بڑھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سردار اوتار سنگھ نے اشوک سنگھ کو یہاں نہ آنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔

''دشمن داری سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے کیدار سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''سردار اشوک کی سب سے بڑی دشمن تو یہ حرام خور پولیس ہی ہے۔ لاکھوں کھا بھی گئی ہے پھر بھی سردار اشوک کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اس کو گولی کا آرڈر دیا ہوا ہے بڑے افسروں نے۔'' کیدار نے آخری الفاظ دھیمی آواز میں سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہے۔

''کوئی خاص جرم کیا تھا اشوک صاحب نے؟''

''یہی سمجھ لو۔ ایک بڑا کرخت قسم کا پولیس افسر قتل ہو گیا تھا سردار اشوک سے۔ تب سے ان لوگوں نے اشوک کو اپنی ہٹ لسٹ پر رکھا ہوا ہے۔ پنجاب کا چپا چپا چھان چکے ہیں اور اب بھی چھان رہے ہیں۔ اپنے پیٹی بھائیوں کے لیے ان پولیس والوں کی بھاگ دوڑ بہت بڑھ جاتی ہے۔ عام قتل ہو تو ڈیڑھ دو سال بعد ہی فائل بند ہو جاتی ہے۔ یہاں چار پانچ سال گزر گئے ہیں مگر یہ لوگ اسے ابھی تک ڈھونڈ رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پولیس کو جہاں بھی سردار اشوک کا کھوج لگ گیا، اسے مقابلے میں پار کر دیا جائے گا۔''

''تو وہ پیش کیوں نہیں ہوتا؟''

''تو بھی سیدھی سیدھی پھانسی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کئی اہم سیاسی لوگ بھی سردار اشوک

کے قتل میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ انہوں نے پنجاب میں اور پنجاب سے باہر بھی اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ دو تین مہینے پہلے احمد آباد سے کسی مخبر نے یہ اطلاع دی تھی کہ کسی سینما کے گیٹ کیپر نے اشوک کو کسی سینما ہال سے نکلتے دیکھا ہے۔ بس اس طلاع پر پولیس کی دوڑیں لگ گئیں۔ یہاں فاضلکا اور بیکانیر وغیرہ سے بھی پولیس کی دو تین پارٹیاں بھاگم بھاگ احمد آباد پہنچ گئیں۔ کئی دن چھان بین ہوتی رہی پر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بعد میں یہ لوگ یہاں حویلی کے دو ملازموں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ ان سے مار پیٹ کا ارادہ رکھتے تھے مگر ایسے موقعوں پر سردار اوتار سنگھ کے تعلقات بہت کام آتے ہیں۔ دو تین گھنٹے کے اندر ملازم واپس آ گئے۔ ایسے سلسلے پہلے بھی چلتے رہے ہیں......''

کیدار باتیں کر رہا تھا اور میرے دماغ کی پھرکی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک اندیشہ بڑی تیزی سے سر اُٹھا رہا تھا۔ میرے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ سردار اشوک کی صورت سے ملتے جلتے یوسف فاروقی کو پاکستان سے اُٹھا کر یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ یہ لوگ اس سے کیا مطلب حاصل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے کیدار ناتھ سے پوچھا۔ ''تم نے سردار اشوک کو دیکھا ہوا ہے؟''

''نہیں یار! تمہیں بتایا ہے ناکہ وہ چار پانچ سال سے روپوش ہے۔''

''کہیں اس کی تصویر بھی نہیں دیکھی؟''

''تصویر شاید ایک آدھ بار دیکھی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ کیدار ناتھ کا ذہن اس طرف نہیں جا رہا جدھر میں نے لے جانا چاہ رہا ہوں۔ یوسف اور اشوک سنگھ کی صورتوں میں جو نمایاں مماثلت نظر آ رہی تھی، کیدار نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ خاص طور سے چہرے پر کٹ لگنے کے بعد تو یہ مماثلت اور بڑھ گئی تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ کیدار واقعی بے خبر تھا یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن مجھ سے چھپا رہا تھا۔

شام کے بعد میری اور ثروت کی ملاقات ہوئی۔ ثروت کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اوتار سنگھ کی بوڑھی ماتا جسے وڈی بے بے کہا جاتا تھا، خاموش طبع اور مذہبی عورت تھی۔ اس کی صحت بھی کچھ دنوں سے اچھی نہیں تھی۔ بڑھاپے کی دیگر بیماریوں کے علاوہ اس کی کمر کے مہروں میں بھی نقص تھا جس کے سبب وہ سارا وقت بستر پر ہی گزارتی تھی۔ چونکہ وہ بہت ہلکی پھلکی تھی اس لیے اسے اُٹھانے بٹھانے میں ثروت کو خاص دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ ثروت نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کسی وجہ سے اپنی پوتی کی شادی پر زیادہ خوش نہیں ہے۔ ڈھولک بجتی تھی تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کا کہہ دیتی تھی۔

میں اور ثروت تقریباً آدھ گھنٹہ ایک ساتھ رہے۔ ثروت جلد از جلد یوسف کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ بے تابی میرے دل پر چرکا سا لگاتی تھی۔ میں نے اسے یوسف سے ملنے میں جو مضمرات تھے، وہ بتا دیئے تھے۔ اب فیصلہ اسے ہی کرنا تھا اور اس کا فیصلہ یہی لگتا تھا کہ وہ یوسف سے ملے گی۔ میں نے یوسف کے لیے رقعہ لکھ رکھا تھا۔ اس میں چند لائنوں کا اضافہ کر دیا۔ ان لائنوں میں، مَیں نے یوسف کو بتا دیا کہ ثروت یہاں آ چکی ہے اور اس سے ملنا بھی چاہ رہی ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس سے ملنے آ جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ اسے اچانک دیکھ کر وہ چونکا ہوا نظر آئے......اور کیدار کو شک ہو۔

اس روز کیدار کے ساتھ میں یوسف کی بینڈیج کرنے گیا تو میں نے یہ رقعہ حسبِ سابق بڑی صفائی سے یوسف تک پہنچا دیا۔ یوسف کی کہنی کا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا۔ مزید مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ اگلے روز میں نے ثروت اور یوسف کے ملنے کا انتظام کر دیا۔ میں باپو کے پاس کمرے میں تھا اور بائیں ہاتھ سے ان کی لمبی سفید داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی کلائی پر میں نے پٹی باندھ رکھی تھی۔ میں نے باپو کو بتایا تھا کہ ان کے لیے پانی گرم کرتے ہوئے میرا پاؤں پھسلا ہے اور کلائی کا جوڑ مڑ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد جب کیدار ناتھ مجھے لینے کے لیے آیا تا کہ میں یوسف کی پٹی بدل سکوں تو میں نے اسے بتایا کہ آج تو میں خود بھی زخمی ہوں۔ میرے لیے دایاں ہاتھ ہلانا مشکل ہو رہا ہے۔

"تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ثریا کو لے جاؤ۔ وہ مجھ سے بہتر کرے گی۔"

"اس کے لیے سردار اوتار جی سے آگیا لینی پڑے گی۔"

"تو لے لو۔" میں نے کہا۔

کیدار چلا گیا اور اس روز ثروت اور یوسف کی ملاقات بھی ہو گئی۔ شام کو ثروت مجھ سے ملنے آئی تو اس نے اس ملاقات کی ساری تفصیل بتائی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اسے یوسف سے تفصیلی بات چیت کا موقع مل گیا تھا۔ جب وہ یوسف کی پٹی بدلنے کے لیے مردانے کے اس کمرے میں گئی تو دو تین منٹ بعد ہی کیدار ناتھ کو ہری سنگھ کی آواز پڑ گئی۔ وہ "جی چھوٹے سردار" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی۔ یہ موقع ان دونوں کے لیے غنیمت تھا۔ انہوں نے سرگوشیوں میں ہر طرح کے سوال جواب کیے۔ ثروت نے یوسف کو لاہور سے لے کر یہاں تک کی ساری رُوداد سنائی۔ کچھ بھی اس سے چھپا کر نہیں

رکھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے یہ بھی بتایا کہ ہم ہوٹل میں اور جگت سنگھ کے گھر میں اکٹھے رہتے رہے ہیں۔"

"ہاں تابش! اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یوسف کی سوچ بُری نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میاں بیوی کے طور پر سفر کرنا ہماری مجبوری تھی۔"

میں نے ثروت کی اس وضاحت کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بہرحال میرے ذہن میں یہ خدشہ بدستور موجود رہا کہ یوسف کے دل میں شکوک وشبہات کی کونپلیں کھلیں گی۔

رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ دل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ ثروت ایک بار پھر اپنی سوچوں کا رُخ یوسف کی طرف موڑ رہی تھی۔ وہ ملے تھے......انہوں نے طویل تبادلہ خیال کیا تھا۔ یقیناً ان کے درمیان وہ فاصلہ کم ہوا تھا جو لاہور میں اس وقت پیدا ہو گیا تھا جب ثروت آسٹریا سے آئی تھی اور اس نے یوسف کے گرم جوش استقبال کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ بہرحال یوسف جس قسم کے حالات میں پھنسا ہوا تھا اس کے لیے ہمدردی اور فکر مندی کے احساسات پیدا ہونا قدرتی بات تھی اور یہ احساسات ثروت میں بھی پیدا ہو رہے تھے۔

میں دیر تک جاگتا رہا پھر ہوا خوری کے لیے پچھلے صحن میں چلا گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اطمینان کر لیا کہ باپو سو رہے ہیں۔ نیند کی حالت میں یہ قریب المرگ باپو سردار کسی موہوم تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔ میں صحن میں آ گیا۔ تاریک آسمان پر ستاروں کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ انہی میں سے کوئی ایک ستارہ میری والدہ تھی اور کوئی ایک ستارہ شاید بھانڈیل اسٹیٹ کی سلطانہ بھی تھی اور سلطانہ نے مجھ سے کہا تھا۔ "مہروج! ایک دن وہ لڑکی تمہیں جرور ملے گی جس سے تم بہت جیادہ پریم کرت ہو۔ اور جب وہ تم سے ملے تو اس سے کہنا کہ ایک ور دیس میں تمہاری ایک بہن تھی جو بن دیکھے ہی تمہاری محبت میں گرفتار تھی اور پھر میرے بالو کو میری اس بہن کی گود میں ڈال دینا۔"

اس نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ امید اور محبت کے آمیزے میں لتھڑی ہوئی کئی باتیں کی تھیں لیکن ضروری تو نہیں ہوتا کہ انسان جو کچھ سوچے، وہ پورا بھی ہو۔ یہاں ثروت کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو ایک عجیب لیکن بڑے مضبوط ازدواجی رشتے میں باندھا ہوا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ سفیدے اور سرو کے طویل درخت چاند کی خنک روشنی میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے، جیسے دھیمے سُروں والے کسی گیت پر سر ہلا رہے ہوں۔ کبھی کسی کتے یا بلی کی آواز سناٹے میں ارتعاش پیدا کرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ دل میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کسی کا لکھا ہوا یہ فقرہ ذہن میں بار بار اُبھرنے لگا۔ اگر قسمت میں محرومیاں لکھی ہوں تو

حالات کی کروٹ بھی بے کار ہی ثابت ہوتی ہے۔ کیا میرے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہونے والا تھا......؟

ایک طرف چھوٹی سی برآمدہ نما جگہ تھی۔ یہاں دیوار پر اُپلے نظر آ رہے تھے اور چھت تلے پرالی کے بڑے بڑے گٹھے پڑے تھے۔ میں اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ایک گٹھے پر نیم دراز ہو گیا اور بادل کی ایک ٹکڑی میں ہولے ہولے حرکت کرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں حویلی کے زنان خانے میں پھر سے ڈھولک کی آواز اُبھرنے لگی۔ لڑکیوں نے کورس کی شکل میں گانا شروع کیا۔ تیرے باجرے دی راکھی منڈیا میں نئیں بیندی وے......(اے میرے محبوب میں تیرے باجرے کے کھیت کی رکھوالی کے لیے نہیں بیٹھ سکتی) گیت کی مدھم آواز میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ اچانک میں بُری طرح چونکا۔ دو سائے تیزی سے اس تنہا برآمدے کی طرف آئے اور خشک پرالی کے ڈھیر کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک ہانپی ہانپی سی آواز سنائی دی۔ ''میں سوگند کھاتی ہوں کیدار صاحب! میں آپ کی گڈی کے پاس بھی نہیں گئی۔ میں نے تو سارا دن باورچی خانے میں گزارا ہے۔''

چند سیکنڈ کے بعد کیدار پھنکارا۔ ''تو گڈی کی طرف نہیں گئی تو پھر تجھے یہ بٹوا ملا کیسے؟''

''یہ گڈی سے کافی دور کیاری میں پڑا ہوا تھا۔ مم...... مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ آپ کا ہے۔ نہیں تو اسی ویلے آپ کو واپس کر دیتی۔''

''اس میں پورے نو سو روپے تھے۔ اب پانچ سو سے بھی دس پندرہ کم ہیں۔ باقی کہاں گئے؟'' کیدار نے کرخت آواز میں پوچھا۔

''نو سو نہیں تھے جی۔ صرف سات سو تھے۔ دو سو روپیہ...... مم...... مجھ سے خرچ ہو گیا۔ میں وچن دیتی ہوں کہ آپ کو واپس کر دوں گی۔''

''چوری لکھ کی ہو یا ککھ کی، چوری ہی ہوتی ہے اور تُو نے کی ہے اور اگر آج کی ہے تو اس سے پہلے بھی کرتی رہی ہو گی۔ میں مالکوں کو بتاؤں گا تو تیرے اور بھی بہت سے پول کھل جائیں گے۔''

''میں سوگند کھاتی ہوں۔ واہگرو جانتا ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔''

''سردار اوتار جی کو بکوانا آتا ہے وہ بکوالیں گے تجھ سے۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔ ''میں آپ کے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔ میری ماں پہلے ہی بیمار ہے۔ وہ یہ نہیں جھیل سکے گی۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت لیٹا رہا۔ پھر تاریکی میں کیدار

ناتھ کی سرسراتی ہوئی سرگوشی اُبھری۔ ''کاکا کہاں ہے تیرا؟''

''وہ کوٹھڑی میں سو رہا ہے۔''

''تو پھر تھوڑا سا ٹائم گزار میرے ساتھ...... سوچتے ہیں تیرے بارے میں۔''

''میں...... سمجھی نہیں؟''

''تُو سب سمجھتی ہے۔ پر بھولی بن رہی ہے۔ یہ لے...... یہ لے باقی کے پیسے بھی اپنے پاس رکھ۔ پر کرنا وہی پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''لیکن......'' وہ منمنائی۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ صرف خشک پرالی کے سرکنے کی آواز آتی رہی۔ یقیناً کیدار لڑکی کو جال میں پھنسانے میں کامیاب رہا تھا۔ یقیناً وہ اس سے دست درازی کر رہا تھا اور وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

''اچھا اب مجھے جانے دیں۔ مجھے سویرے سویرے ناشتہ بھی بنانا ہے۔ چھوٹے سردار ہری جی نے تاریخ پر جانا ہے نا۔ پانچ بجے نکل جانا ہے انہوں نے۔''

کیدار ناتھ نے بھاری آواز میں کہا۔ ''ہاں ناشتے سے یاد آیا، وہ سردار جی کا لاڈلا پروہنا (مہمان) کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے انڈا گھول کر نہ بنایا کرو۔ فرائی کیا کرو انگریزی طریقے سے۔ سفیدی علیحدہ زردی علیحدہ اور دودھ پتی بھی نہ بھیجا کرو۔ چائے بنایا کرو تھوڑے مٹھے والی......''

لڑکی بولی۔ ''ایک تو جی اس پروہنے کی فرمائشیں ہی بہت ہیں۔ کل مکئی کا مٹھا پرانٹھا پکایا ہے اس کے لیے، پرسوں حلوے کی فرمائش تھی۔ پتا نہیں سردار جی اتنے نخرے کیوں دیکھ رہے ہیں اس کے......''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کیدار کی طنزیہ آواز اُبھری۔ ''یہ وہی نخرے ہیں جو مسلمان قربانی کے بکرے کے دیکھتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں...... بس سمجھ لے کہ اس پروہنے والی مصیبت ایک دو دن ہی کی ہے، یہ چلا جائے گا کہیں۔''

''پر یہ ہے کون؟ میں نے تو ابھی تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے تین چار دن پہلے اس نے یہاں سے نس جانے (بھاگ جانے) کی کوشش بھی کی تھی؟''

''پورا پتا تو مجھے بھی نہیں۔ سنا ہے کہیں پاکستانی پنجاب سے آیا ہے۔ پر تُو چھوڑ ان

باتوں کو۔ یہ بتا مجھ سے کب ملنے کے لیے آ رہی ہے کمرے میں؟"

"میں نہیں آؤں گی۔" ساتھ ہی چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی۔

"تو پھر یہ بٹوے والی ساری بات سردار جی تک پہنچے گی اور مجھے لگتا ہے کہ اور بھی کئی پول کھل جائیں گے تیرے۔ دو مہینے پہلے انگوٹھی گم ہو جانے والے معاملے میں بھی تیرا نام آیا تھا۔ اب لگ رہا ہے کہ وہ الزام بھی ٹھیک ہی تھا۔"

"میں سوگند کھاتی ہوں۔ میں نے وہ انگوٹھی کبھی دیکھی بھی نہیں۔ آپ..... اپنے مطلب کے لیے مجھے خوامخواہ پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تُو جو بھی سمجھ لے امرت...... میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر امرت کی آواز اُبھری۔ "آپ مجھے...... بار بار تنگ کرو گے۔"

"بار بار نہیں......بس ایک آدھ بار۔" کیدار کی شیطانی آواز اُبھری۔

اس دوران میں کسی اندرونی کمرے سے بچے کے رونے کی باریک آواز آئی۔ "ہائے میں مری۔" امرت نے کہا پھر پرالی میں ہلچل ہوئی اور ایک سایہ سا تیزی سے اندرونی حصے کی طرف اوجھل ہو گیا۔

یقیناً جانے والی امرت تھی۔ کیدار ناتھ وہیں لیٹا رہا۔ غالباً وہ چاہ رہا تھا کہ امرت اپنی جگہ پر پہنچ جائے اور بچہ چپ کر جائے تو پھر وہ بھی اپنے کمرے کا رُخ کرے۔

میں پرالی کے گٹھوں کی دوسری طرف کیدار ناتھ سے فقط دس پندرہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ کیدار ناتھ جان بوجھ کر انجان بنا رہتا ہے ورنہ اسے بہت کچھ معلوم ہے۔ آج اس کا اصلی چہرہ میرے سامنے آیا تھا اور یہ خاصا مکروہ تھا۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے ایک اہم فیصلہ کیا۔ یہ راست اقدام کا فیصلہ تھا اور اس کے لیے موقع بھی بہت اچھا تھا۔ شکار خود چل کر ایک نہایت مناسب جگہ پر آیا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پرالی کے گٹھوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا تہ خانہ ہے۔ یہ دراصل ایک زمین دوز کچا کمرہ تھا جس میں ایک بڑا ڈونکی پمپ لگایا گیا تھا۔ اب یہ پمپ بیکار ہو چکا تھا۔ یہاں بس تھوڑا بہت کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور پرانی مشینری کے پُرزے وغیرہ تھے۔ میں نے اپنا خم دار چاقو ہاتھ میں لیا۔ نیم تیرگی کے باوجود مجھے اندازہ تھا کہ کیدار ناتھ کہاں موجود ہے۔ درمیانی فاصلہ تیزی سے طے کر کے میں کیدار کے سر پر جا پہنچا۔ وہ نیم دراز تھا۔ اس نے بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ میں چمک دار چاقو اور میرے چہرے پر ہیجانی تاثرات

دیکھ کر وہ سکتہ زدہ رہ گیا۔ پھر اس نے چلانے کی کوشش کی لیکن میں پہلے سے تیار تھا۔ میں اس کے اوپر گرا۔ اپنے بائیں ہاتھ سے میں نے اس کا منہ ڈھانپا اور دائیں ہاتھ سے چاقو اس کی توانا گردن پر رکھ دیا۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ کیدار کی بلند آواز اس کے منہ کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اس نے دوسری آواز نکالنے کی جرأت نہیں کی کیونکہ چاقو اس کی شہ رگ صابن کی طرح کاٹ سکتا تھا۔ میں پھنکارا۔ "اگر آواز نکالو گے تو ذبح کر ڈالوں گا۔"

وہ میری گرفت کی سختی اور میری جسمانی برتری کو پوری طرح محسوس کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے اندر حیرت کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے یہ شخص باورچی خانے کی سکھ ملازمہ کو جنسی طور پر ہراساں کرنے میں مصروف تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو چکا تھا مگر اب وہ خود شدید خوف و ہراس کے نرغے میں تھا۔

اس بات سے مطمئن ہونے کے بعد کہ اب وہ مزاحمت نہیں کرے گا، میں نے اس کے ہونٹوں پر سے اپنی ہتھیلی ہٹالی۔ میں نے چاقو بدستور اس کی گردن پر رکھا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچتا ہوا لکڑی کی اس سیڑھی تک لے گیا جو نیچے ڈونکی پمپ والے زمین دوز کمرے میں جاتی تھی۔ کیدار ناتھ کو معاملے کی سنگینی کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آ رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اور تم بھی وہ نہیں ہو جو دکھائی دیتے ہو۔ تم سردار اوتار کے راز دار ملازموں میں سے ہو۔ ورنہ وہ درجنوں ملازموں میں سے صرف تمہیں ہی یوسف کی دیکھ بھال کے لیے نہ چنتا۔"

یوسف کے نام پر کیدار ناتھ نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے نام سے آگاہ ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہے۔ میں نے سب سے پہلے کیدار ناتھ کی تلاشی لی۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی جیبوں سے گاڑی کی چابی اور سگریٹ کا پیکٹ ملا۔ اس کے علاوہ وہ بٹوہ بھی نکلا جس کا ذکر وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈری سہمی امرت سے کر رہا تھا۔ اس کی جیب سے نکلنے والا موبائل فون میں نے فوراً آف کر دیا۔ یہ وہی موبائل تھا جس کے ذریعے میں جگت سے رابطہ کرتا رہا تھا۔ کیدار کے لباس سے ملنے والی سب سے اہم شے اس کمرے کی چابی تھی جہاں یوسف بند تھا۔

میں نے یہ چیزیں ایک طرف رکھ دیں۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سر کے بال پکڑے اور آتشیں لہجے میں کہا۔ "کیدار ناتھ! آج رات تیری جان صرف ایک ہی صورت

میں بچے گی۔ مجھے سچ سچ بتائے گا کہ یہاں یوسف فاروقی کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جانے والا ہے اور کس طرح؟ اب میری بات کے جواب میں یہ مت کہنا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم جانتے ہو۔ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے امرت سے کہا ہے کہ مہمان یعنی یوسف کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ تم نے اسے قربانی کا بکرا بتایا ہے۔ مجھے اس قربانی کی ساری تفصیل چاہیے۔''

کیدار بولا۔ ''میں...... بس رعب ڈال رہا تھا امرت پر۔ اسے...... بتانا چاہتا تھا کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ میرا وشواس کرو میں نے جو کچھ کہا، بس قیافے سے کہا۔''

میں نے ایک بار پھر اس کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کر چاقو کی نہایت تیز دھار اس کی گردن پر رکھ دی۔ ''کیدارے! میں نے کہا ہے نا کہ یہ صابن کی طرح کاٹے گا اور یہ ایسا ہی کرے گا۔ مجھے گولی مت دے ورنہ اسی جگہ تیرا ''بولو رام'' ہو جائے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ بس بہت تھوڑا تجھ سے جاننا ہے۔ اگر تُو نہیں بتائے گا تو کوئی اور بتا دے گا لیکن تُو یہاں سے کبھی زندہ نہیں نکل سکے گا۔''

''مم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا جانتے ہو تم؟''

''بہت کچھ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے سردار اوتار سنگھ کا بڑا بیٹا اشوکا سنگھ پانچ سال سے مفرور ہے۔ کئی صوبوں کی پولیس اسے اب بھی ڈھونڈ رہی ہے۔ اب سردار اوتار سنگھ کو اتفاق سے یوسف کی شکل میں ایک ایسا بندہ مل گیا ہے جو شکل صورت اور قد کاٹھ میں بہت حد تک اشوکا سنگھ سے ملتا ہے۔ اشوکا سنگھ کے گلے سے ساری بلائیں اُتارنے کے لیے یوسف کو بلی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ یوسف کو اس طرح سے مارا جائے گا کہ اس کی موت کو اشوکا کی موت سمجھا جائے اور یہ معاملہ چتا میں جل کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بڑی فلمی قسم کی پلاننگ کی ہے تم لوگوں نے اور اس پلاننگ کی اصل وجہ یہی ہے کہ جاوا نام کے ''فلم لائن بدمعاش'' نے تمہیں حیرت انگیز طور پر اشوکا سے ملتا جلتا بندہ دے دیا ہے۔ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے تمہارے سردار اوتار سنگھ کے لیے...... یقیناً بہت بڑا کام۔''

اچانک کیدار ناتھ نے زور مارا۔ اس نے مجھے زوردار دھکا دے کر سیڑھی کی طرف بڑھنا چاہا تھا۔ میں کسی ایسی حرکت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے سر کے قدرے لمبے بالوں پر میری گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ مجھے پیچھے ہٹانے میں ناکام ہوا۔ اس کا دھکا سہنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر اپنی ہتھیلی جمائی اور چاقو کا بھرپور وار کیا۔ چاقو کا تین چوتھائی پھل کیدار کی دائیں ران میں گھس گیا۔ وہ چلایا اور مچھلی کی طرح تڑپا لیکن اس کی

آواز میری ہتھیلی کے نیچے ہی گونج کر رہ گئی۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا۔ اس کی پتلون خون سے رنگین ہونے لگی اور جسم تکلیف سے لرزنے لگا۔ ''اگلا وار تمہارے پیٹ پر کروں گا اور ناف کے ساتھ ایک اور ناف بنا دوں گا۔'' میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔

وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے چاقو اسی کی پتلون سے صاف کیا اور اسے کچھ اور بھی دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میری ہتھیلی بدستور اس کے ہونٹوں پر تھی۔ کہیں دور حویلی کے اندرونی کمروں سے خواتین کا مدھم قہقہہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ڈھولک بجنے لگی۔ یہاں اس زمین دوز کمرے میں کیدار ناتھ سمجھ چکا تھا کہ صورتِ حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ سنگین ہے اور اگر اس نے میری بات نہیں مانی تو یہ سہانی شب اس کے جیون کی آخری شب ثابت ہو سکتی ہے۔

قریباً دس منٹ بعد کیدار ناتھ زنگ آلود ڈونکی پمپ سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی زخمی ران دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔ میں اس کے عین سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا اور میرے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے اس سے اپنے سوالوں کے ذریعے اُگلوایا۔ خاصا سنسنی خیز تھا۔ یوسف کو واقعی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا اور یہ کام بس اڑتالیس گھنٹے کے اندر ہی ہونے والا تھا۔

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں کیدار ناتھ نے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ مقامی پولیس کو ہمیشہ شک رہا تھا کہ حویلی میں ہونے والی کسی اہم تقریب میں اشوکا سنگھ چوری چھپے شریک ہوگا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ اشوکا کی اکلوتی بہن سرنوں کور کی شادی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ کل اس کی تیل وغیرہ کی رسم تھی۔ اس رسم کے فوراً بعد یوسف کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ پروگرام بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس پروگرام کے مطابق یوسف کو ایک چمکا دیا جا رہا تھا۔ اسے ایک گاڑی دی جا رہی تھی اور ''آزاد'' کیا جا رہا تھا۔ اس سے کہا جا رہا تھا کہ فاضلکا کی طرف چلا جائے۔ فاضلکا کے بڑے ڈاک خانے کے سامنے اسے ایک بندہ ملے گا۔ باقی کا کام وہ سنبھالے گا اور اسے پوری حفاظت سے بارڈر پار کرا کے پاکستان پہنچا دے گا۔ پروگرام کے مطابق یوسف کو کبھی فاضلکا کے قصبے تک نہیں پہنچنا تھا۔ راستے میں کم از کم تین جگہ پولیس ناکے موجود تھے، گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی تھی۔ ان میں سے ہی کسی ناکے پر یوسف کو بطور اشوکا سنگھ پہچان لیا جانا تھا یا اس پر نہایت تگڑا قسم کا شک ہو جانا تھا۔ دوسری طرف یوسف کو ہدایت تھی کہ اگر کہیں پولیس اسے روکنے کی کوشش کرے تو [illegible]

بہر صورت فاضلکا کی حدود میں پہنچے گا۔ اب اس سے آگے کا ڈرامہ اور بھی سنگین تھا۔ یوسف کی گاڑی کے نیچے قریباً چار کلو ٹی این ٹی والا ایک ریموٹ کنٹرول بم نصب کر دیا گیا تھا۔ جب سردار اوتار سنگھ کے اہلکار یہ دیکھتے کہ پولیس یوسف کے پیچھے لگ گئی ہے اور اسٹیج پوری طرح تیار ہو چکا ہے تو وہ یوسف کی گاڑی کو دھماکے سے اُڑا دیتے۔ ان اہلکاروں کو ایک دوسری گاڑی میں یوسف کے پیچھے پیچھے رہنا تھا۔

یہ ایک تفصیلی پلان تھا۔ اس میں بہت سی مزید جزئیات کا بھی خیال رکھا گیا تھا ممکن تھا کہ میں اس دو چار خامیاں بھی ہوں پھر بھی اس کی کامیابی کے امکان روشن تھے۔ یوسف اور اشوکا کی مشابہت سے دھوکا کھا کر ایک بار پولیس اس کے پیچھے لگ جاتی اور وہ مارا جاتا تو سرداروں کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اشوکا سنگھ کی جان قانون کے مسلسل تعاقب سے چھوٹ جاتی۔ وہ انڈیا میں یا پھر انڈیا سے باہر کسی جگہ کسی اور شناخت سے پُرسکون زندگی گزار سکتا۔

کیدار ناتھ کی زبانی یہ تفصیلات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لاہور میں یوسف ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح جاوا گروپ کے ہاتھ لگا تھا۔ جاوا کے کسی ایسے بندے نے یوسف کو دیکھا تھا جو اشوکا سنگھ کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اشوکا سے یوسف کی مشابہت دیکھ کر اس کے دماغ میں سوچ کے گھوڑے دوڑے تھے اور ان لوگوں نے یوسف کو ہسپتال سے اُٹھانے کا پروگرام بنایا تھا۔

صورت حال میری توقع سے کہیں زیادہ سنگین تھی۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ سردار اوتار سنگھ جو اپنے تئیں بہت بڑا منصف بنتا تھا۔ اپنے ذاتی مقصد کے لیے بڑی بے رحمی سے ایک بے گناہ کی جان لینے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جلد از جلد اس قاتل حویلی سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ کام اگر آج کی رات ہی ہو سکتا تو بہتر تھا۔ مجھے لگا کہ کیدار ناتھ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ پوری طرح میرے ٹرانس میں تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس سے کام لے سکوں گا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ میں ششدر رہ گیا۔ کیدار ناتھ نے میری توقع سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پمپ کے قریب بیٹھے بیٹھے پانی کے ڈیڑھ انچ موٹے جستی پائپ کا ڈھائی تین فٹ لمبا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اچانک بے حد تیزی سے اس نے میرے چاقو والے ہاتھ پر وار کیا۔ یہ سخت ضرب تھی۔ چاقو میرے ہاتھ سے نکلنے میں بس ذرا سی کسر ہی رہ گئی۔

دوسرا وار اس نے میرے سر پر کیا۔ یہ بھی مہلک وار تھا۔ میں نے جھک کر خود کو بچایا۔ تیسری دفعہ پائپ کا وزنی ٹکڑا میرے کان کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں چاقو سے بھی حملہ کر سکتا تھا

مگر میں نے اپنا سر استعمال کیا۔ میری دھواں دھار ٹکر کیدار ناتھ کی پیشانی پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُٹھے گا مگر وہ اُٹھا نہیں۔ اس کے گلے سے عجیب سی پُر درد آواز برآمد ہوئی۔ اس کے سینے پر سامنے کی طرف لہو کی سیاہی سی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹریکٹر کے بل کا ایک ٹوٹا ہوا حصہ اس کی پشت میں گھسا تھا اور سامنے کی طرف اس کی خمیدہ چونچ باہر نکل آئی تھی۔ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر کیدار ناتھ کا جسم ساکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں سکتہ زدہ سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر حرکت میں آ گیا۔ اب سب سے پہلا کام یہ تھا کہ کیدار ناتھ کے لہولہان جسم کو جو آناً فاناً لاش میں تبدیل ہو چکا تھا، کہیں چھپایا جائے۔ مرنے سے چند سیکنڈ پہلے مجھ پر حملے کے دوران میں کیدار ناتھ نے ایک چنگھاڑ بھی بلند کی تھی۔ اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ یہ بلند آواز کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

میں نے دو تین منٹ تک سن گن لی پھر سیڑھی چڑھ کر اوپر گیا اور بغیر آواز پیدا کیے کچھ پرالی اُتار کر نیچے لے آیا۔ یہ پرالی میں نے کیدار کی لاش پر اس طرح پھیلا دی کہ وہ اس میں کیموفلاج ہو کر رہ گیا۔ کچھ سڑی ہوئی سیاہی مائل پرالی پہلے ہی اس جگہ موجود تھی۔ جب تک کوئی نیچے نہ اُترتا اور اچھی طرح جائزہ نہ لیتا، کیدار ناتھ والے سانحے کا علم اسے نہیں ہو سکتا تھا۔ تہ خانے میں خون کے داغوں کو چھپانے پر میں نے خصوصی توجہ دی اور پھر کیدار کی جیب سے برآمد ہونے والی اشیاء کو اپنے لباس میں رکھ کر باہر نکل آیا۔ ان اشیاء میں یوسف کے کمرے کی چابی اہم ترین تھی۔

○……❖……○

دوپہر کو ثروت سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ رات والے خونی واقعے سے یکسر بے خبر تھی اور وہی کیا، حویلی میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک کسی کو کیدار ناتھ کی غیر موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

ثروت نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے یوسف کی پٹی بدلی ہے۔ ان سے دو چار باتیں بھی کی ہیں۔ وہ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ شاید آج رات تک کچھ ہونے والا ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یوسف کا خیال ہے کہ شاید آج کسی بندے سے ان کی ملاقات کرائی جائے گی اور اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ انہیں یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔''

''مطلب کہ آزاد کر دیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن ابھی وقت کا کوئی ٹھیک پتا نہیں ہے۔ یہ کام آج رات ہو سکتا ہے۔ یوسف کو کالے رنگ والی ٹویوٹا جیپ پر یہاں سے بھیجا جائے گا اور وہ خود ہی ڈرائیو کر کے جائیں گے۔ وہ فاضلکا میں کسی بندے سے ملیں گے جو انہیں سرحد پار کرائے گا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہو گا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن سردار اوتار تسلی تو پوری دے رہا ہے۔''

مجھے ثروت کا چہرہ اُترا ہوا سا نظر آیا تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک طرح کا روکھا پن بھی محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا؟

مجھے کل رات جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت سنگین تھا۔ میں اس بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ثروت! ہمیں بہت ہوشیار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اگلے دس بارہ گھنٹے بہت اہم ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کسی طرح یوسف کو یہاں سے نکالنا پڑے گا۔ ورنہ اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''کک...... کیا...... آپ کو کچھ معلوم ہوا ہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں کوئی خاص نہیں۔ بس میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''لیکن ہم کیا کریں گے؟''

''حویلی سے باہر میرے کچھ دوست موجود ہیں، جگت بھی شامل ہے ان میں۔ میں موبائل پر ان سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں ممکن ہے کہ وہ ہماری مدد کر سکیں۔ ان سے بات ہو جائے تو پھر میں تمہیں ساری صورتِ حال بتا دوں گا۔''

''لیکن تابش! میں نے بہت خون خرابا دیکھ لیا ہے۔ پلیز مجھے ایسا اور کچھ نہ دکھانا۔ کچھ ایسا سوچیں کہ بغیر کسی فساد کے یہ معاملہ حل ہو جائے۔''

''تم فکر نہ کرو ثروت! جو ہو گا اچھا ہی ہو گا۔ تم نے یوسف کو بارڈر والے واقعے کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟'' میرا اشارہ کم از کم پانچ افراد والے قتل سے تھا۔

میری توقع کے مطابق ثروت کا جواب نفی میں تھا۔

اسی دوران میں بیمار باپو مجھے پکارنے لگے۔ میں نے ثروت سے کہا کہ وہ تین بجے کے قریب کسی بہانے دوبارہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں اسے ساری صورتِ حال بتا دوں گا۔

ثروت کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ باپو دوا کھا کر سو چکے تھے۔ میں نے موبائل پر جگت سے رابطہ کیا اور اسے الف سے یے تک ساری صورتِ حال بے کم و کاست بتا دی۔ اس سنسنی خیز رُوداد نے جگت کو بھی حیران کیا۔ اپنے قاتل بیٹے کا پیچھا قانون سے چھڑانے کے لیے سردار اوتار کتنی عیاری سے ایک بے گناہ کی جان لے رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات سو فیصد یقینی نہیں تھی کہ اس طرح اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

میں نے کہا۔ ''جگت پیارے! میں نے کسی بھی طرح یوسف کو یہاں سے نکالنا ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''بادشاہ زادے! تُو مدد کی بات کر رہا ہے، آپا جان دینے کو تیار ہیں۔ گو بندر بھی ایک دم تیرا عاشق بنا ہوا ہے۔ اگر کہو تو اس پوری حویلی کو بارود سے اُڑا دیں گے۔ اپنے فوجی ماموں صاحب نے بہت سا بارودی سامان رکھا ہوا ہے اپنے گھر میں۔ ڈائنا میٹ، چھوٹی توپ کے پرانے گولے اور بارودی سرنگیں وغیرہ۔''

''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم اتنا کرو کہ دو چار چوکس بندے اور ایک فٹ گاڑی لے کر حویلی کے پاس پہنچ جاؤ اور تھوڑا سا ہلا گلا کر دو حویلی کے باہر۔''

''یار! تُو مجھے غصہ چڑھانے والی گل کر رہا ہے۔ مزہ نہیں آ رہا تیری باتوں کا۔''

''کیا مطلب؟''

''شیر سے چڑی مارنے کا مت کہو۔ کوئی سانڈ شانڈ شکار کرواؤ۔ تھوڑا سا ہلا گلا تو ہاں (ہم) سے نہیں ہو گا اگر ہو گا تو لمبا چوڑا ہو گا۔''

''لیکن پیارے! اتنا لمبا چوڑا ابھی نہیں چاہیے تا کہ کام ہی خراب ہو جائے۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ دس پندرہ منٹ کے لیے حویلی کے گارڈز کی توجہ حویلی کے بڑے گیٹ کی طرف ہو جائے۔ میں یوسف کو چھوٹے گیٹ کی طرف سے لے کر نکل جاؤں۔ چھوٹے گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تیری گاڑی کھڑی ہو، ہم اس میں سوار ہو جائیں۔''

جگت سنگھ دلیری سے بولا۔ ''میں ساری گل سمجھ گیا ہوں۔ کیا خیال ہے دو چار کالے انار چلا دیں بڑے پھاٹک کی طرف؟''

''کالے انار (دستی بم) ہیں تمہارے پاس؟''

''اوئے پورا ٹوکرا بھرا ہوا ہے بادشاہ زادے! تُو یہ باتیں نہ پوچھ۔ بس آرڈر کر آرڈر۔ تیرے لیے اور چھوٹی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں میں...... مگر پہلے مجھے اندر کا نقشہ تو بتا۔ کوئی بڑا ہتھیار بھی ہے تیرے پاس کہ نہیں؟''

''بڑا ہتھیار بھی مل جائے گا۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''باپو کی الماری میں انگریزوں کے زمانے کی ایک بڑی زبردست رائفل میں نے دیکھی ہے۔ کافی گولیاں بھی ہیں اور یہ تیری کالے اناروں والی بات بھی ٹھیک ہے۔ ایک دو انار پھینکے جا سکتے ہیں، پر خوامخواہ ان میں سے کسی کی جان نہیں جانی چاہیے۔ میری بات سمجھ رہا ہے نا تُو؟''

''بادشاہ زادے! تم پاکستانیوں نے ہم سرداروں پر خوامخواہ لطیفوں کے ڈھیر لگائے ہوئے ہیں۔ اتنے بھی کھوتے نہیں ہوتے ہم۔ ویسے یہ بتا میرے شیر ببر! تُو کرنا کیا چاہ رہا ہے؟'' جگت سنگھ جوشیلے انداز میں بولا۔ لگتا تھا کہ اس کے گرم خون نے ابھی سے اُبالے کھانے شروع کر دیئے ہیں۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو پچھلے آٹھ دس گھنٹوں میں اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا۔ بہرحال اس رُوداد میں سے کیدار ناتھ کی موت کا ذکر حذف کر دیا۔ ہم نے تفصیل سے بات کی اور چھوٹی بڑی ساری جزئیات پر غور کیا۔ موبائل فون پر ہماری یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ میرے موبائل کا بیلنس ختم ہو گیا تو جگت سنگھ نے کال کر لی۔ بہرحال ہم نے رات نو بجے کے لیے ایک مفصل پلان تیار کر لیا۔

میں پچھلے دو دن سے حویلی کی اندرونی صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ پہرے داروں کی تعداد، ان کے اوقات، ان کے پاس موجود اسلحہ اور اس طرح کی ساری معلومات مجھے مل چکی تھیں۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ میں نے بڑی احتیاط سے باپو کی آٹومیٹک رائفل بھی الماری سے نکال لی۔ یہ باپو ہی کی طرح نفیس اور صاف ستھری تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر شام کو سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو گیا تو ہم یوسف کو بآسانی یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ثروت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جب چاہتی ازخود یہاں سے نکل کر جوپور پہنچ سکتی تھی۔

ثروت کو سہ پہر تین بجے مجھ سے دوبارہ ملنے آنا تھا۔ لیکن وہ وقت پر نہیں آئی۔ شاید ''وڈی بے بے'' کو نہلانے دھلانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ چار بجے اور پھر پانچ بج گئے۔ اس کی شکل دکھائی نہیں دی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا جب اچانک میری نظر بستر کے نیچے ایک مڑے تڑے کاغذ پر پڑی۔ میں نے اسے اُٹھایا۔ یہ ایک تہ شدہ رقعہ تھا۔ ایسا ہی رقعہ جو یوسف مجھے لکھتا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ میرے نام لکھا ہوا کوئی پُرانا رقعہ ہے لیکن جب میں نے اسے کھولا تو پتا چلا کہ یہ ثروت کے نام تھا۔ غالباً یوسف نے کل کی ملاقات میں اسے تھمایا ہو گا۔ ثروت نے پڑھ کر

لباس میں رکھ لیا ہو گا لیکن وہ اتفاقاً یہاں گر گیا۔ یہ خطرناک سچویشن تھی۔ اگر رقعہ کہیں اور گرتا تو قیامت برپا ہو سکتی تھی۔

ثروت بے حد محتاط لڑکی تھی۔ اس سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن آج وہ مجھے اتنی ڈسٹرب نظر آئی تھی کہ پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور پڑھنا شروع کیا۔ سینے میں ایک بار پھر دھواں سا بھرنے لگا۔ رگوں میں کڑواہٹ اُتر گئی۔ یہاں ثروت سے ملنے کے بعد یوسف نے وہی ردِعمل دیا تھا جس کی توقع اس جیسے شخص سے کی جا سکتی تھی۔ یوسف نے ایک جگہ لکھا تھا۔ ''مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے ثروت! لیکن تمہارے اس کزن پر نہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں۔ یہ ہماری زندگی میں زہر گھولنے پر تلا ہوا ہے۔ ثروت! یہ تمہارے ساتھ اس لیے یہاں نہیں پہنچا کہ اسے میری سلامتی کی فکر ہے۔ صرف اس لیے آیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔''

خط میں ایک اور جگہ لکھا تھا۔ ''میرا دل بہت وسیع ہے ثروت! جس طرح کی باتیں یہ شخص تمہارے بارے میں کرتا ہے، یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ سن لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نصرت کے علاج میں بھی جو دلچسپی اس نے دکھائی ہے اور جس طرح بار بار تم دونوں سے رابطے کرتا رہا ہے، اس میں بھی اس کی بدنیتی کو ہی دخل ہے۔ بہرحال میں پھر کہتا ہوں، ماضی جو کچھ بھی تھا لیکن اب مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔ مجھے تو اردگرد کی کوئی خطر نہیں۔ تم دیکھنے اور سمجھنے کی بہتر پوزیشن میں ہو۔ فی الحال ہمیں ان ساری باتوں کو ایک طرف رکھ کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس سلسلے میں اگر تابش سے رابطہ رکھنا ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

سارا خط پڑھنے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ ثروت کے رویے میں اچانک تبدیلی کیوں آئی ہے۔ وہ بہت خاموش اور کھچی کھچی تھی۔ آج اس نے تین بجے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آئی نہیں تھی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔

اب شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ حویلی میں چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ حویلی کے باغیچے کی طرف دیگیں کھڑکھڑائے جانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اب کیدار ناتھ کی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ کیدار ناتھ بظاہر جیپ ڈرائیور تھا لیکن اصل میں سردار اوتار سنگھ کا خاص کارندہ تھا۔ دو تین بندے آ کر مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔ خود ہری سنگھ نے بھی بار بار اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فون

خاموش تھا۔اسے میں نے ہی بند کر کے کمرے میں چھپایا ہوا تھا۔موسم میں خنکی تھی۔سارا دن بھی ہلکے بادل رہے تھے۔مجھے توقع تھی کہ ابھی لاش سے بُو اٹھنا شروع نہیں ہوگی۔جب تک بُو نہ اُٹھتی، میرے اندازے کے مطابق لاش کا پتا چلنا مشکل ہی تھا۔احتیاطاً میں ایک دفعہ کنواں نما تہ خانے کی طرف گیا تھا اور جائزہ لیا تھا کہ کوئی مشکوک شے وہاں موجود نہ رہ گئی ہو۔

چھ بجے کے لگ بھگ میں نے خود ثروت سے ملنے کی کوشش کی۔ایک ملازمہ کے ہاتھ اسے پیغام بجھوایا لیکن وہ ملازمہ کسی اور کام میں لگ گئی یا پھر ویسے ہی بھول گئی۔اب میں پچھتا رہا تھا کہ میں نے دوپہر والی ملاقات میں ہی کیوں نہ ثروت کو صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کر دیا۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے حویلی کے ایک خواجہ سرا موہنا سنگھ کو ایک رقعہ دے کر بھیجا۔ موہنا سنگھ نے آ کر بتایا کہ وڈی بے بے کی طبیعت بہت خراب ہے۔نرس بی بی ابھی بہت مصروف ہے، آ نہیں سکتی۔

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔پروگرام کے عین مطابق آٹھ بجے کے لگ بھگ جگت سنگھ کا فون آ گیا۔حسبِ معمول اس کا لہجہ جوش اور حرارت سے بھرا ہوا تھا۔اس نے کہا۔"تگڑا ہو جا بادشاہ زادے! آپاں چل پڑے ہیں۔دو گڈیوں میں آ رہے ہیں۔ایک گڈی دور کھڑی رہے گی۔دوسری حویلی کے پاس چلی جائے گی۔ایک بار اپنی گھڑیاں پھر ملا لیتے ہیں۔بتا کیا ٹائم ہوا ہے تیرے پاس؟"

"آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ......" میں نے کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔میں بھی آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ کر لیتا ہوں۔تُو نے اپنا موبائل ہر ویلے آن رکھنا ہے۔بیٹری شیٹری پوری ہے نا۔"

"ہاں......بیٹری تو پوری ہے۔کسی وقت نہ اُٹھاؤں تو سمجھنا کہ کوئی پاس ہے۔" میں نے کہا۔جگت سنگھ نے مجھے بتایا کہ وہ میری والی ایل ایم جی اور اس کے ڈھیر سارے راؤنڈ بھی لے کر آ رہا ہے۔

اسی دوران میں باپو نے گھنٹی بجائی۔میں سلسلہ منقطع کرتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور باپو کے پاس آ گیا۔وہ آج کافی بے چین نظر آتے تھے۔میں نے کئی بار اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنی پوتی کی اس شادی پر خوش نہیں ہیں۔آج چونکہ شادی کی پندرہ روزہ تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا اس لیے وہ زیادہ اضطراب محسوس کر رہے تھے۔بہر حال یہ ان کا گھریلو معاملہ تھا، مجھے کرید کرنے کی ضرورت تھی اور نہ میرے کریدنے سے باپو نے کچھ بتانا تھا۔میں نے انہیں وہ

سکون بخش گولی وقت سے پہلے ہی دے دی جو وہ رات گئے کھاتے تھے۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں نے پھر جگت سنگھ سے رابطہ کیا لیکن اس مرتبہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ مجھے لگا کہ سگنل پورے نہیں آ رہے۔دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ رابطہ کیا تو ناکامی ہوئی۔اب میں ذرا چونکا۔مجھے جگت سنگھ سے کوئی دوسرا نمبر بھی لے لینا چاہیے تھا۔جگت خود بھی رابطہ نہیں کر رہا تھا۔"کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟" میرے ذہن میں وسوسے سر اُٹھانے لگے۔قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے پھر ٹرائی کی۔اس مرتبہ بیل جانے لگی لیکن دوسری طرف سے جو بھاری نشیلی آواز آئی وہ جگت کی نہیں تھی۔"کون ہے؟"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں جگت کا دوست ہوں اور تم؟"

"جگت کہاں ہے؟"

"اس کے ساتھ تھوڑا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔گاڑی لگ گئی ہے۔اسے چوٹ آئی ہے۔"

"چوٹ آئی ہے؟ اس کا چھوٹا بھائی گوبندر بھی ساتھ تھا، وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہیں کہیں ہے۔تم کون ہو؟" پھر پوچھا گیا۔

مجھے بیک گراؤنڈ سے آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔کچھ جھگڑا سا ہو رہا تھا۔کوئی شخص بڑی بلند اور کرخت آواز میں بول رہا تھا۔میں نے فون بند کر دیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ کیا واقعی کوئی حادثہ ہو گیا تھا یا پھر کسی ناکے وغیرہ پر ان کو روک لیا گیا تھا ان کی گاڑی میں اسلحہ موجود تھا اور یقیناً دو چار دستی بم بھی ہوں گے۔حادثے والی بات دل کو نہیں لگ رہی تھی۔دونوں گاڑیاں ایک ساتھ تو حادثے کا شکار نہیں ہو سکتی تھیں۔اگر ایک گاڑی کے ساتھ کچھ ہوا تھا تو دوسری گاڑی کے لوگ مجھ سے رابطہ کر کے صورتِ حال سے آگاہ کر سکتے تھے۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔وقت گزر رہا تھا اور ہمارے خلاف گزر رہا تھا۔ حویلی میں اب جشن کا سماں تھا۔جنریٹر جل رہا تھا اور آسائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔حویلی کے بڑے پھاٹک کے سامنے دو ڈھولچی مسلسل ڈھول پیٹ رہے تھے۔کبھی کبھی بھنگڑا ڈالنے والوں کی ایک پارٹی محوِ رقص بھی ہو جاتی تھی۔

زنان خانے کے جس حصے میں باپو موجود تھے اس حصے کو شور سے محفوظ رکھنے کے لیے درمیانی دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔اب میرے لیے یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ ثروت سے رابطہ کر سکتا۔وہ خود کوشش کرتی تو اور بات تھی۔اب میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں

رہا تھا کہ یوسف کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا اور اسے بتاتا کہ کتنا بڑا اور سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ دوسری طرف جگت سنگھ والا ''اَپ سیٹ'' ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر جگت سے رابطے کی کوشش کی۔ اس بار پھر وہی بھاری کرخت آواز سنائی دی جس پر مجھے شبہ تھا کہ یہ کسی پولیس والے کی ہے۔ ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔ یہاں ڈھول اور باجے گاجے کا شور تھا۔ یہ شور دوسری طرف بھی سنا جا سکتا تھا۔ اگر جگت واقعی پولیس یا بی ایس ایف کی تحویل میں تھا تو وہ لوگ جان سکتے تھے کہ میں کسی شادی والے گھر سے بول رہا ہوں اور اگر وہ آس پاس تھے تو پھر اس حویلی تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ اسی دوران میں دوسری طرف سے خود ہی فون بند ہو گیا۔ شاید سگنل کمزور پڑ گئے تھے۔ میں نے موبائل کے ماؤتھ پورشن پر انگلی رکھ کر کال ملائی لیکن کال نہیں ملی۔

اگلا قریباً ایک گھنٹہ قریباً اسی کشمکش میں گزر گیا۔ رسم اب آخری مراحل میں تھی۔ دس بجنے والے تھے۔ اب وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اگر سردار اوتار سنگھ کا پہلے والا پروگرام برقرار تھا تو اب کسی بھی وقت یوسف کو اس کے بندی خانے سے نکال کر موت کے سفر پر روانہ کیا جا سکتا تھا۔ اسے جس کالی گاڑی میں بھیجا جانا تھا، وہ چھوٹے گیٹ کے پاس درختوں میں کھڑی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس گاڑی کو پوری طرح تیار کیا جا چکا ہے۔ کیدار ناتھ نے بتایا تھا کہ گاڑی کے اگلے حصے میں انجن کے نیچے قریباً چار کلو وزنی بم نصب کر دیا جائے گا اور یقیناً اسے نصب کر دیا گیا تھا۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے میں نے اس گاڑی کے قریب اس کے ڈرائیور کو دیکھا تھا، وہ اس کا تیل پانی چیک کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ گاڑی موت کے سفر پر نکلنے کے لیے تیار ہے۔ میرے ذہن میں فوری خیال آیا کہ مجھے اس سیاہ ٹویوٹا گاڑی تک پہنچنا چاہیے۔ کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ گاڑی یہاں سے روانہ ہونے کے قابل نہ رہے۔

میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا بڑی احتیاط سے اس تنہا کھڑی گاڑیوں کی طرف بڑھا۔ کچھ آگے جا کر مجھے زمین پر اوندھا لیٹنا پڑا۔ دو ملازم مٹھائی کے بڑے بڑے ٹوکرے اُٹھائے ہوئے میرے سامنے سے گزرے۔ میں تقریباً رینگنے والے انداز میں گارڈینا کی اس باڑ تک پہنچ گیا اور پھر جھک کر اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ٹویوٹا جیپ کے پاس نکل آیا۔ حویلی کا یہ حصہ زیادہ روشن نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے دروازے چیک کیے۔ وہ لاک تھے، پچھلا دروازہ بھی مقفل تھا۔ اندر گھسنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں گاڑی کے نیچے رینگ گیا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے اپنے موبائل فون کی ٹارچ روشن کی اور میرا دل شدت سے دھڑک اُٹھا۔

گاڑی کے دو اگلے پہیوں کے درمیان ایک ایسی چیز نظر آ رہی تھی جو جیپ کا حصہ نہیں تھی۔ یہ ایک سیاہ شاپر تھا۔ اس شاپر میں کوئی وزنی چیز تھی جسے ایک رسی کے ساتھ جیپ سے باندھا گیا تھا۔ یہی وہ مہلک بم تھا جس کا علم مجھے کل رات کیدار ناتھ کی باتوں سے ہوا تھا۔ یہ گاڑی کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتی تھی۔ گاڑی کے نیچے بندھی ہوئی یہ خاموش موت ایک دھماکے کے ساتھ یوسف کے پرخچے اُڑا دیتی۔ ثروت اور یوسف سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی بات آئی کہ میں اس خاموش موت کو جیپ کی باڈی سے علیحدہ کر دوں۔ میں نے قمیص کے نیچے سے اپنا خم دار چاقو نکالا۔ اسے بغیر آواز پیدا کیے کھولا اور احتیاط سے وہ رسی کاٹ دی جس نے دھماکہ خیز مواد کو گاڑی سے پیوست کر رکھا تھا۔ یہ مواد ڈائنامیٹ کے ساتھ آٹھ شیلز کی شکل میں تھا جنہیں باہم باندھا گیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد کو یوں ہاتھوں میں تھامنا ایک سنسنی خیز تجربہ ہوتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ مواد لے کر باہر نکل ہی رہا تھا جب ایک کرخت آواز گونجی۔ ''کون ہے؟''

میں جہاں کا تہاں ساکت رہ گیا۔ تب ایک ٹارچ کا روشن دائرہ گاڑی پر مرکوز ہوا۔ میں ایک بار پھر گاڑی کے نیچے رینگ گیا۔ یکا یک بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں اُبھریں۔ کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ پھر میں نے سردار اوتار سنگھ کی بھاری بھرکم آواز سنی۔ ''کیا ہے؟''

انت سنگھ نامی ملازم نے پکار کر کہا۔ ''کوئی گڈی کے نیچے گھسا ہوا ہے۔''

ٹارچوں کے روشن دائرے گاڑی کے نیچے رینگنے لگے۔ اب مجھے واضح طور پر دیکھ لیا گیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد میرے ہاتھ میں تھا اور میں کچی زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ گاڑی کے نچلے حصے کی آئل کی بُو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ میں نے دیکھا تین چار مسلح افراد زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور انہوں نے اپنی ''رشین'' رائفلوں کے منہ میری طرف کر دیئے۔

''باہر نکلو۔'' ایک شخص دھاڑا۔ ''نہیں تو نیچے ہی بھون دیں گے۔''

اچانک ہی حویلی کا یہ حصہ روشن تر ہو گیا۔ اردگرد کئی بلب اور ٹیوب لائٹس روشن ہو گئیں۔ باجے گاجے کا شور تھم گیا۔ مہمانوں نے ہنگامے کی بُو سونگھی تو مصروفیات چھوڑ کر اردگرد جمع ہونے لگے۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ باہر نکل آتا لیکن اس سے پہلے کہ میں از خود باہر نکلتا، کسی نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب میں سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ کسی شخص نے چلا کر کہا۔ ''کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ اوپر کر لو۔''

میں نے اُٹھ کر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ سردار اوتار سنگھ مجھ سے بیس پچیس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں سب سے بلند اور نمایاں تھا۔ اس کی اونچی پگڑی کا زرتار شملہ ٹیوب لائٹس میں دمک رہا تھا۔ چاروں طرف لوگ تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں والی سکھ عورتیں بھی تھیں تاہم وہ موقع سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر مختلف چیزوں کی اوٹ میں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں ثروت بھی شامل ہو۔ میں نے دھماکہ خیز مواد نیچے رکھ دیا تھا۔ سردار اوتار سنگھ نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''اکبر علی! آگے آجاؤ۔''

میں اس کے حکم پر چند قدم آگے آگیا۔ مسلح گارڈ نے آگے بڑھ کر دھماکہ خیز مواد کو دیکھا اور مہمانوں کو سنانے کے لیے بولا۔ ''یہ کافی بڑا بم ہے۔ یہ تو گڈی کے پرزے کر سکتا تھا۔''

یکایک کسی نے ایک پیڑ کے پیچھے سے نکل کر عقب سے میرے سر پر رائفل کا وزنی کندا مارا۔ شدید چوٹ آئی۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ میں گھٹنوں کے بل گرا۔ ایک اور چوٹ لگی۔ مجھے لگا کہ میری آنکھوں کے سامنے سیاہ پردہ سا تن رہا ہے لیکن میں مکمل بے ہوش نہیں ہوا۔ یقیناً میری سخت جانی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ کئی افراد مجھ پر پل پڑے۔ مجھے اپنا چاقو نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ میرے کانوں میں ملی جلی کئی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ بس ٹھیٹ پنجابی کے اُڑتے اُڑتے سے فقرے تھے۔ ''کون ہے یہ؟ اس کے ساتھی بھی ہوں گے...... ہوا کیا ہے چودھری جی؟ گڈی کے نیچے بم لگا رہا تھا...... دوسری گاڑیاں بھی دیکھو بھئی...... پھاٹک بند کر دو...... مارو اس کو...... بم کے اوپر ریت ڈال دو۔ نہیں پانی میں پھینکو......'' کئی طرح کی آوازیں تھیں۔ میرے دل کے اندر سے کہیں آواز آئی۔ کہاں ہو عمران؟ دیکھو میں پھر پھنس گیا ہوں۔ مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ نہ آس پاس، نہ دور دور...... اس کے نہ ہونے سے میرے اندر ایک اضافی ہمت اور توانائی پیدا ہونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں جو کچھ کرنا ہے، مجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔ میں اوندھا پڑا تھا۔ میری نظر ایک چمکتی کرپان پر تھی۔ یہ کرپان ایک گارڈ کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگلے چند سیکنڈ میں بہت کچھ ہوگا۔ میری جان بھی جا سکتی تھی لیکن موت سے زیادہ خدشہ مجھے ایک اور بات کا تھا۔ کہیں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ثروت بھی تو یہ نہیں سمجھے گی کہ میں واقعی اس گاڑی کے نیچے بم لگا رہا تھا۔

O......❖......O

میری ٹانگ کے ساتھ میرا خم دار چاقو بھی بندھا ہوا تھا مگر وہ نسبتاً دور تھا اور کرپان نزدیک تھی۔ گارڈ کی کمر سے بندھی ہوئی یہ کرپان مجھ سے بمشکل ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔

میں نے نیچے گرے گرے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور پھرتی سے کرپان کھینچ لی۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا، میں اُٹھا اور تیزی سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھا۔ یہ ٹارگٹ میں پہلے ہی منتخب کر چکا تھا اور یہ اونچے زرتار شملے والا سردار اوتار سنگھ تھا۔ وہی پُرانی کہاوت والا معاملہ تھا۔ بھرے دربار میں بادشاہ نے بڑھیا سے کہا تھا جس چیز پر ہاتھ رکھو گی وہ تمہاری ہو جائے گی۔ بڑھیا نے بادشاہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور کہا تھا، جب تم میرے ہو تو سب کچھ میرا ہے۔

میں بھی سردار اوتار سنگھ پر کرپان رکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ میرے قبضے میں آجاتا تو سب کچھ آجاتا۔ اس کی شہ رگ پر کرپان آجانے کا مطلب یہ تھا کہ سب کی شہ رگ پر کرپان آگئی۔ میں تیزی سے اوتار سنگھ پر جھپٹا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا انسان چاہتا ہے۔ یہاں میرے ساتھ بھی قسمت نے تھوڑا سا دھوکا کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اوتار سنگھ تک پہنچتا اور اس کو عقب سے جکڑ کر کرپان اس کی توانا گردن پر رکھتا، ایک چمک دار لاٹھی لہرائی اور بڑے زور سے میرے چہرے پر لگی۔ میں اوتار سنگھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار پھر اوندھا گر گیا۔ پہلی دو چوٹوں کا اثر بھی ابھی دل و دماغ پر موجود تھا۔ اس تازہ ضرب نے مجھے چکرا ڈالا۔

سردار اوتار سنگھ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ساتھ کئی افراد دوبارہ مجھ پر پل پڑے۔ وہ مجھ پر لاٹھیاں اور رائفل کے کندے برسا رہے تھے۔ میرا پورا جسم بے رحم ضربات کی زد میں آگیا۔ خود کو شدید زخمی ہوانے سے بچانے کے لیے میں نے اپنا سر اور چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ میری پشت پر تواتر سے لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ بھی۔

''مارو، ہڈیاں توڑ دو اس نمک حرام کی۔'' کوئی گرجا۔

''کتے کی موت دو۔ فائر مارو اس کے سر میں۔'' ایک پاٹ دار آواز نے آتشیں مشورہ دیا۔

''نہیں...... نہیں...... گولی نہیں چلانی۔'' میرے اندازے کے مطابق یہ سردار اوتار کی آواز تھی۔

میرے چہرے سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر رہا تھا اور میرے منہ میں نمک کی طرح گھل رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے آئے اور اوندھے منہ رنگین پھول بوٹوں والے پختہ فرش پر پھینک دیا۔ شدید چوٹوں نے مجھے واقعی بے دم کر ڈالا تھا۔ ترشولا کے سردار بھی وہی غلطی کر رہے تھے جو معرکے کی رات چودھری انور کے کارندوں نے کی تھی۔ وہ تلاشی کے دوران میں میری ٹانگ سے بندھا ہوا چاقو چھوڑ گئے تھے۔ یہاں بھی

یہی ہوا تھا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ زندگی موت کی اس بازی میں ابھی مجھے اپنا یہ پتا استعمال کرنا چاہیے یا نہیں۔ میری طرف دو تین رائفلیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ چمکیلے کوکوں والی لاٹھیوں نے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ صورتِ حال کسی فوری مہم جوئی کے حق میں نہیں تھی۔

کچھ فاصلے سے سردار اوتار سنگھ کی گرج دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ اپنے بیٹے ہری سنگھ کو مخاطب کر کے بولا۔ ''اس کی پتنی کو دیکھو۔ وہ کہیں بھاگ نہ جائے پکڑو اس کو بھی۔''

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ وہ لوگ زنان خانے کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ ثروت کو بھی کھینچتے ہوئے وہاں لے آئے۔ ثروت کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ خوفناک صورت والے اننت سنگھ نے ثروت کو دھکیل کر میرے قریب فرش پر پھینک دیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئیں۔ سردار اوتار سنگھ کے اشارے پر اننت سنگھ نے بھرا ہوا پستول میرے سر سے لگا دیا اور کڑک کر بولا۔ ''کیا چکر چلا رہے ہو تم؟ کس کے کہنے پر کیا ہے یہ سب؟''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میرے موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ موبائل ہری سنگھ کے ہاتھ میں تھا، اسے میری تلاشی کے دوران میں ملا تھا۔ ہری سنگھ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا پھر کال ریسیو کی۔ میرے خدشے کے عین مطابق یہ میرے مددگار جگت سنگھ کی ہی کال تھی۔ جب میں سخت بے چینی سے اس کال کا انتظار کرتا رہا تھا، یہ نہیں آئی تھی اور اب جبکہ اسے نہیں آنا چاہیے تھا، یہ آ گئی تھی۔ ہری سنگھ نے اسپیکر آن کر دیا۔ ''ہیلو کون؟'' ہری سنگھ نے پوچھا۔

دوسری طرف جگت آواز پہچاننے میں ناکام رہا۔ وہ عجلت سے بولا۔ ''یار تابشے! یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کچھ بندوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے نکلے ہیں۔ اب کہاں ہو تم؟''

ہری سنگھ نے ذرا توقف کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہیں حویلی میں......''

اب دوسری طرف جگت سنگھ ذرا چونکا۔ ''ہیلو! کون بول رہا ہے......ہیلو۔''

ہری سنگھ نے فوراً بات بنائی۔ ''تابشے کا دوست! تابشا ذرا غسل خانے میں ہے۔''

''کون دوست؟'' جگت نے پھر چونکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''دلیپ سنگھ۔''

''کون دلیپ سنگھ؟'' جگت اب پوری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

ہری سنگھ نے اپنے باپ اوتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ اوتار سنگھ کی بھوری آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ بڑی پُرسوچ نظروں سے مجھے اور ثروت کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس منڈے پر پہلے ہی شک تھا۔ میرے خیال میں یہ اکبر علی نہیں، اس کے بھیس میں کمینے نہالوں کا کوئی بندہ ہے۔''

ہری سنگھ نے باپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ اکبر علی نہیں ہے تو پھر یہ نرس بھی ثریا نہیں ہوگی۔''

سردار اوتار سنگھ نے آگے بڑھ کر ثروت کے بال مٹھی میں جکڑے اور زور سے جھٹک کر بولا۔ ''کون ہو تم دونوں؟ کس چکر میں آئے ہو یہاں؟''

ثروت کی گردن مڑ گئی تھی، وہ بس کراہ کر رہ گئی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اس کی توہین مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی لیکن میں فوری اشتعال میں آ کر کوئی ایسا قدم بھی اُٹھانا نہیں چاہتا تھا جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ میں نے ضبط کیا۔ اننت سنگھ نے میرے سر پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔ میرے سر کا پچھلا حصہ دیوار سے لگ گیا۔ اننت سنگھ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پستول کو کسی چاقو یا نیزے کی طرح میری کنپٹی میں گھسا دے۔

''بولو......کون ہو تم؟'' وہ خطرناک لہجے میں پھنکارا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا یا ثروت کچھ بولتی، ایک شخص تقریباً دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہری سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ ہری سنگھ کا سرخ و سپید چہرہ بھی ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ سردار اوتار سنگھ کا سرخ و سپید چہرہ بھی ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ سردار اوتار سنگھ سوالیہ نظروں سے بیٹے اور ملازم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردار ہری سنگھ اپنے باپ سردار اوتار سنگھ کے پاس پہنچا اور اس کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ اوتار سنگھ کا چہرہ بھی متغیر ہوا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی کرپان کی طرف بڑھا۔ بہر حال اس نے کرپان نکالی نہیں۔ سخت اضطراب کے عالم میں وہ زنان خانے کی طرف بڑھا۔

ہری سنگھ ہماری طرف اشارہ کر کے کرخت لہجے میں ملازموں سے بولا۔ ''بند کر دو ان کو کمرے میں۔ ابھی لیتے ہیں ان کی خبر بھی۔''

ہمارے کمرے کا وزنی چوبی دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ باہر سے وزنی کنڈی چڑھا کر تالا لگا دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیشتر مسلح افراد اس کمرے کے سامنے سے اوجھل ہو گئے۔ میں گرل دار کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔ اردگرد کچھ افراتفری سی نظر آتی تھی۔

ملازم تیز رفتاری سے حرکت کر رہے تھے۔ دروازے بند ہو رہے تھے اور کھل رہے تھے۔ ایک دم ہی جیسے ہمارے والا اہم ترین معاملہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ کسی اور معاملے نے لے لی تھی۔ میں نے گرل دار کھڑکی میں سے دیکھا کہ حویلی کا بڑا پھاٹک بند کر دیا گیا تھا اور اس کے سامنے مسلح افراد کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

میں بے دم سا ہو کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میرے پورے جسم پر ضربات آئی تھیں۔ بازو میں سے مسلسل شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ کہیں فریکچر ہو گیا ہے۔ چہرے پر لگنے والی لاٹھی نے پیشانی کے قریب سے سر پھاڑ ڈالا تھا اور وہاں سے بہنے والا خون میرے پورے چہرے کو لتھڑ رہا تھا۔ میں نے پتلون کے اندر سے قمیص نکالی اور اس کے دامن سے چہرہ پونچھنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ثروت مجھ سے بالکل لاتعلق بیٹھی تھی۔ بلب کی زرد روشنی میں اس کے بال منتشر تھے اور کندھے پر سے قمیص اُدھڑی ہوئی تھی۔

''ثروت!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

میں حیران رہ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ چہ جائیکہ وہ میری چوٹوں پر پریشان ہوتی یا مجھے طبی امداد دینے کی کوشش کرتی۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! تم نے تین بجے آنے کا کہا تھا، تم آئی کیوں نہیں؟ تمہارے نہ آنے سے بہت کچھ گڑ بڑ ہوا۔ یہاں...... ایک...... بڑا خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے ثروت! یوسف کی زندگی کو خطرہ ہے۔''

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''جو خطرناک کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس کا ''اینڈ'' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

میرے جسم میں سرتاپا ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میرا اندیشہ حقیقت نکلا تھا۔ وہی ہو رہا تھا جس کا ڈر تھا۔ یہاں موجود بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ثروت بھی غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی اور یہ وہی غلط فہمی تھی جس کی داغ بیل ابھی کچھ دیر پہلے سردار اوتار اور اس کے بیٹے نے ڈالی تھی۔ انہوں نے حویلی میں آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے اپنے جرم کا سارا ملبہ مجھ پر ڈال دیا تھا اور صورتِ حال بھی ایسی بنی تھی کہ بہت سے لوگوں کو اس سفید جھوٹ پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں دھماکا خیز مواد تھا اور میں سیاہ ٹویوٹا جیپ کے نیچے سے برآمد ہوا تھا۔

میں نے ثروت کا شانہ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ثروت! کہیں تم بھی تو یہ نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں یوسف کی گاڑی کے نیچے بم لگا رہا تھا؟''

وہ عجیب بیگانے انداز میں بولی۔ ''میں کچھ نہیں سمجھ رہی...... میں کچھ نہیں سمجھ رہی......

پلیز چپ ہو جایئے۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور اپنا سر بے بسی کے انداز میں دیوار سے پٹخ دیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے یہاں ثروت اور یوسف کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا رکھی تھی، اپنے جسم کو زخم زخم کر رہا تھا اور یہاں ثروت مجھے ہی شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! تمہیں کچھ خبر نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ بڑی خطرناک سازش ہو رہی ہے۔ یوسف کو یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ اس کی شکل سردار اوتار سنگھ کے بیٹے سے بہت ملتی جلتی ہے اور اس بیٹے نے قتل کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یوسف کو مارنا چاہتے ہیں، اس طرح......''

''پلیز تابش! آپ چپ ہو جاؤ۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں سننا۔ شاید آپ وہ تابش ہو ہی نہیں جسے میں جانتی تھی۔ میں یوسف کی باتوں کو غلط سمجھتی تھی۔ میں انہیں سمجھاتی تھی کہ انہیں دھوکا ہوا ہے۔ تابش ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کا خون ایسے سفید نہیں ہو سکتا لیکن اب تو بہت کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔''

''تم کس دھوکے کی بات کر رہی ہو۔ میری وجہ سے یوسف کو کیا دھوکا ہونا تھا؟ کیا کیا ہے میں نے؟''

''آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ بے قصور ہیں۔ یہ سردار بھی بے قصور ہیں۔ جو لوگ انہیں لاہور سے پکڑ کر یہاں لائے ہیں، وہ بھی بے قصور ہیں۔ اصل مجرم میں ہی ہوں۔ آپ مجھے مار دیں۔ آپ کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور میری جان بھی چھوٹ جائے گی۔'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔

''ثروت! مجھے بتاؤ تو سہی، میں نے کیا کیا ہے؟''

''آپ سب جانتے ہیں۔ آپ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ آپ نے درد کی گولیوں کے نام پر یوسف کو ایسی گولیاں دیں۔ آپ ان کی زندگی سے کھیلے...... آپ......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں سناٹے میں تھا۔ وہ کوئی ایسی بات کہہ رہی تھی جس کی مجھے مطلق خبر نہیں تھی لیکن وہ بات موجود تھی۔ شاید ثروت اور یوسف کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا کہ شاید یوسف نے جان بوجھ کر ثروت کو کسی غلط فہمی کا شکار کیا ہے۔ اس کا رویہ تو اس کے لکھے ہوئے رُقعے سے ہی ظاہر ہو جاتا تھا۔ یقیناً کوئی سنگین بات تھی جس کے سبب ثروت کے رویے میں مجھے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اب عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ مجھے

محسوس ہوا کہ وہ جب مجھے دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں ایک ڈر سمٹ آتا ہے۔ جیسے وہ مجھے نہیں کسی خطرناک قاتل کو دیکھ رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس ڈر کا تعلق اس خون ریز لڑائی سے ہے جس میں چودھری انور کے پانچ بندے مارے گئے تھے۔ ثروت وہ واقعہ دیکھنے کے بعد ایک سکتے کی سی کیفیت میں چلی گئی تھی۔

میں دُکھ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔ میرا جی چاہا کہ اپنے سر پر دو ہتڑ رسید کروں۔ خود کو دیواروں سے ٹکراؤں۔ کچھ ایسا کروں کہ میرا زخمی جسم اور بھی لہولہان ہو جائے۔ وہ تو میری زندگی کا محور تھی اور وہی مجھ سے رُخ پھیر رہی تھی۔ مجھے محرم سے مجرم بنا رہی تھی۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”ثروت! میری بات سنو...... حقیقت وہ نہیں جو تمہیں نظر آ رہی ہے۔ تمہیں پتا نہیں، یوسف کتنے خطرے میں ہے۔ میں نے......“

میرے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ کھڑکی سے آٹھ دس فٹ دور کرسی پر پڑا ہوا ایک موبائل زور زور سے بجنے لگا۔ موبائل کا مالک کسی جانب سے برآمد ہوا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے اس کا کوئی ساتھی خشونت بول رہا تھا۔ خشونت نے پوچھا ہو گا کہ کیا ہوا ہے۔ کال ریسیو کرنے والے نے دبی آواز میں کہا۔ ”خشونت! بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ سرنوں بی بی اپنے کمرے وچ نہیں۔ کہیں بھی نہیں ہیں۔ سب انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ نہیں...... نہیں...... یہ تو نہیں ہو سکتا۔ دونوں پھاٹک بند تھے، پہرا بھی تھا...... اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے آوازیں پڑ رہی ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

میں ششدر کھڑا تھا۔ یہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔ سرنوں، سردار اوتار سنگھ کی اس بیٹی کا نام تھا جس کی شادی کا ہنگامہ برپا تھا اور وہ غائب تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار اوتار اور اس کے کارندے آناً فاناً ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ میری پیشانی سے ٹپ ٹپ لہو گر رہا تھا۔ ثروت نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔ جسم کی طرح میرے دل کے اندر سے بھی خون رِسنے لگا تھا۔

اچانک ایک زوردار آواز آئی اور اس نے ہماری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ آٹو میٹک رائفل کی خوفناک ”تڑتڑ“ تھی۔ یہ پورا ایک برسٹ تھا جو چھوٹے گیٹ کی طرف سے آیا اور کسی ایک قریبی کھڑکی سے ٹکرایا۔ شیشے ٹوٹنے اور گرنے کی آوازیں آئیں۔ جواب میں چند گولیاں چلیں اور پھر ایک دم اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ ثروت سمٹ کر دیوار سے جا لگی۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ کہیں باہر سے جگت سنگھ وغیرہ نے حملہ کر دیا ہے

لیکن اگر وہ کوئی ایسی کارروائی کرتے تو طے شدہ ٹائم کے مطابق کرتے اور مجھ سے رابطہ کرنے کے بعد کرتے۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی اور لوگ ہیں۔ اگلے دو تین منٹ میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ یہ غالباً وہی اوتار سنگھ کی لڑکی والا معاملہ ہے۔ یقیناً کچھ لوگ یہ شادی نہیں چاہتے تھے اور اب وہی مسلح حالت میں یہاں آن موجود ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک نہایت سنگین سلسلہ ہے۔ یہاں لوگ مر سکتے تھے اور زخمی یا اغوا وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔ یکا یک ایک اور آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی بھاری گاڑی حویلی کے بڑے پھاٹک سے ٹکرائی ہے اور اسے توڑ دیا ہے۔ فائرنگ میں ایک دم شدت آ گئی۔ میں نے ایک فربہ اندام شخص کو زمین پر گرتے اور لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ اسے شاید کرپان کا زخم آیا تھا۔ گرنے سے اس کی پگڑی کھل گئی تھی اور کیس بکھر گئے تھے۔

دو ہٹے کٹے سکھ اسلحہ لہراتے اور بڑھکیں مارتے بڑے پھاٹک کی طرف لپکے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس کمرے کا عقبی دروازہ بھی موجود ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ زیادہ مضبوط بھی نہیں ہے۔ میرا گھائل جسم مجھے کسی مہم جوئی کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن باروندا جیکی کا کہنا تھا کہ جسم سے اجازت مت لو، اس کو حکم دو۔ آنکھیں بند کر کے اسے تکلیف کی بھٹی میں جھونک دو اور پھر دیکھو کہ اس کے جلنے سے راحت کے کیسے پھول کھلتے ہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے چوٹوں کی پروا کیے بغیر خود کو اُٹھایا اور چند قدم دوڑ کر کندھے سے دروازے کو زوردار ٹکر رسید کی۔ میری دوسری ٹکر سے دروازے کی دونوں چٹخنیاں اُکھڑ گئیں اور پٹ باہر کی طرف کھل گئے۔ میں نے ٹانگ سے بندھا ہوا خم دار چاقو ہاتھ میں لے لیا۔ میرے جسم میں برق دوڑ رہی تھی۔ ”آؤ ثروت!“ میں نے کہا۔

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد میرے ساتھ آگے بڑھی۔ ہم دروازے میں سے نکلے اور عقبی برآمدے میں آ گئے۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ میں ایک دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ ثروت میرے پیچھے تھی۔ ہم حویلی کے کچے حصے، یعنی زنان خانے میں داخل ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ ہم زنان خانے کے پہلو سے گزرتے ہوئے چھوٹے گیٹ کے قریب پہنچ جائیں گے اور پھر باہر نکلنے کے لیے موقع کا انتظار کریں گے لیکن اچانک سامنے سے دو مسلح افراد آتے دکھائی دیئے۔ ان کی نظر سے بچنے کے لیے ہم زنان خانے کے اندر گھس گئے۔ سامنے ہی بیمار باپو والا کمرا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کمرے کو وقتی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کروں۔ میں چاقو قمیص کے نیچے چھپا کر باپو کے کمرے میں گیا اور ساتھ ہی ثروت بھی آ گئی۔

بیمار باپو تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔ ان کا مفلوج ہاتھ ان کی گود میں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مزید پریشان ہوئے پھر بہت دھیمی آواز میں بولے۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے اکبر علی؟''

میں نے کہا۔ ''شاید آپ کو پتا نہیں کہ کچھ لوگوں نے حویلی پر ہلا بول دیا ہے۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی ہیں اور سرنوں بی بی کا بھی کچھ پتا نہیں ہے۔''

یوں لگا کہ ہمارے باپو سرنوں کی گمشدگی کے بارے میں پہلے سے جانتے ہیں۔ وہ سرنوں کے بارے میں میری اطلاع کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ ''اور تمہیں کیا ہوا ہے؟ کہاں سے لگی ہیں تمہیں یہ چوٹیں؟''

''سیڑھیوں سے گر گیا ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔

باپو نے مجھے اکبر علی کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ اس واقعے سے بے خبر ہیں جس میں مجھے مارا پیٹا گیا تھا اور مجھ پر دھماکا خیز مواد والا الزام لگایا گیا تھا۔

ایک دم میں چونک گیا۔ میری نگاہ اچانک ہی اس چھوٹے کمرے کی طرف اُٹھ گئی تھی جو میں آرام کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اس کے پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی ہے۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اندر ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ اس کے ہاتھ پر مہندی رچی تھی۔ کانوں میں اور گلے میں پھولوں کا زیور تھا۔ وہ ڈری سہمی ہرنی کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں چند سیکنڈ میں پہچان گیا۔ میں نے سرداروں کے خاندانی البم میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ یہی سردار اوتار سنگھ کی بیٹی اور باپو کی پوتی سرنوں کور تھی۔ ساری حویلی میں لوگ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور وہ یہاں اپنے دادا کے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

باپو نے کہا۔ ''میری گل سنو اکبر علی! ادھر آؤ میرے پاس۔''

میں چھوٹے کمرے کا دروازہ بھیڑ کر باپو کے پاس چلا گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ میں نے کان ان کے ہونٹوں کے قریب تر کر دیا۔ وہ بولے۔ ''اکبر علی! سرنوں میری مرضی سے یہاں چھپی ہوئی ہے۔ اس وچاری کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے ماں پیو اس کا ویاہ اس کی مرضی کے خلاف کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا ہے لیکن یہ نہیں مانے۔ اب اس کا انت (انجام) ان کے سامنے آ گیا ہے۔ ساری آن عزت خاک میں مل رہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''باپو! حویلی پر ہلا بولنے والے کون ہیں؟''

''یہ نہالوں کے لوگ ہیں۔ نہالوں سے ہی سرنوں کے رشتے کا جھگڑا چل رہا ہے۔ میں

نے بڑا سمجھایا تھا پتروں کو، واہگرو کے واسطے دیئے تھے لیکن انہوں نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھو ان کی اپنی اولاد ہی ان کے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔'' بوڑھے باپو کا اشارہ یقیناً سرنوں کی طرف ہی تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے سردار اوتار کو مجھ پر ''نہالوں'' کا بندہ ہونے کا شک ہوا تھا۔

یکا یک بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ کچھ لوگ اندھا دھند گولیاں چلاتے ہوئے زنان خانے کے اس حصے کی طرف آ رہے تھے۔ باپو گھبرا کر بولے۔ ''دیکھو...... اگر اوتار سنگھ یا اس کا کوئی بندہ سرنوں کے بارے میں پوچھے تو اسے یہی بتانا ہے کہ وہ ادھر نہیں آئی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ثروت کے ساتھ تیزی سے اس چھوٹے کمرے میں چلا گیا جہاں سرنوں پہلے سے موجود تھی۔ سرنوں نے اب خود کو لکڑی کی الماری کے پیچھے تاریک خلا میں چھپا لیا تھا۔ میں نے ثروت کو بھی الماری کے پیچھے بھیج دیا۔ چاقو اب پھر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آوازوں سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ باپو کے کمرے میں داخل ہونے والے حویلی کے افراد نہیں بلکہ نہالوں کے لوگ ہیں۔ ایک اُدھیڑ عمر شخص ہانپی ہوئی بھاری آواز میں باپو سے کہہ رہا تھا۔ ''باپو جی! آپ کے پتر نے سرنوں کو کہیں چھپا دیا ہے...... یا پھر مار دیا ہے۔ وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

جواب میں باپو کی بہت مدھم آواز اُبھری۔ ''پالے! سرنوں یہیں ہے میرے پاس...... تم اسے لے جاؤ لیکن اگر اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی شما نہیں کروں گا۔''

پالے دوبارہ بولا تو اس کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''نہیں باپو جی! آپ کی پوتی ہے تو میری دھی ہے۔ میں اپنے پران دے دوں گا لیکن اپنی دھی کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں وچن دیتا ہوں آپ کو۔''

اسی دوران میں باہر ہونے والی فائرنگ کی آوازیں نزدیک آ گئیں۔ پالے کے ساتھ آنے والے افراد شاید برآمدے کی طرف چلے گئے اور فائرنگ میں شامل ہو گئے۔

باپو نے سرنوں کو آواز دینے کے لیے غالباً جسم کی ساری طاقت صرف کر دی تھی۔

''سرنوں...... سرنوں...... باہر آ جا۔'' باپو کی بھرائی ہوئی کمزور آواز اُبھری۔

سرنوں الماری کے پیچھے سے نکل آئی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ اپنے دادا کی بات ماننے کے لیے اور پالے نامی بندے کے ساتھ جانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ میں ثروت کے پاس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ سرنوں نے ذرا

ایڑیاں اُٹھا کر دروازے کی چٹخنی کھولی اور باہر نکل گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پالے نامی شخص اس لڑکے کا باپ یا چچا وغیرہ ہے جس سے سرنوں شادی کرنا چاہتی ہے۔ باہر جو بات ہو رہی تھی، اس میں مجھے ''ننکانہ صاحب'' کا نام بھی سنائی دیا۔ یقیناً یہ کوئی سنگین تنازعہ تھا جو بہت عرصے سے چل رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ باپو کی عمر رسیدہ بیوی بھی اپنے شوہر کے ہم خیال ہو۔ شاید ہم اس کہانی کا کلائمیکس سین دیکھ رہے تھے۔

سردار اوتار سنگھ ایک نامی گرامی چودھری کی حیثیت سے لوگوں کے فیصلے کرتا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی کو انصاف نہیں دے سکا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ خود کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھی جن کو اپنے گھر والوں سے زیادہ اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔

فائرنگ اب بالکل ہمارے آس پاس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور حویلی کے دائیں حصے میں آگ بھڑک اُٹھی۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا، سرخی مائل روشنی حویلی کے احاطے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک ٹریکٹر کی ڈیزل ٹینکی پھٹنے کا دھماکا تھا۔ پرالی کے بڑے بڑے ڈھیر پاس ہی پڑے تھے۔ انہوں نے بارود کی طرح آگ پکڑ لی۔ فائرنگ بھی مسلسل ہو رہی تھی لیکن اب اس کا زور بس ایک ہی جگہ نہیں تھا۔ حویلی میں ہر طرف افراتفری تھی۔ دھوئیں کے سیاہ مرغولے بڑی تیزی سے بلند ہوئے اور اس افراتفری میں اضافہ کرنے لگے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ سرداروں کی اس خونی حویلی سے نکلنے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ میں نے ثروت کا ہاتھ تھاما۔ میرے دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ ہم بڑے کمرے میں پہنچے تو بیمار باپو خون میں لت پت تھے۔ کسی جانب سے پرواز کر کے آنے والی کوئی گولی ان کے سر میں لگی تھی اور ان کے سفید کیس ''لہورنگ'' ہو رہے تھے۔ یقیناً اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔

ہمارے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں ان کے پاس رُکتا، ان کو دیکھتا۔ ہم باہر نکل کر دھوئیں کے مرغولوں میں سے گزرے۔ ثروت نے اپنے منہ کو اوڑھنی کی دہری تہ سے ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے بھی سانسیں روک لیں۔ جگہ جگہ گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے اور دیواروں پر گولیوں کے سوراخ تھے۔ برآمدہ نما جگہ پر مجھے بھیانک چہرے والے اننت سنگھ کی لاش نظر آئی۔ گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی۔ اس کے پاس ہی مجھے ٹرپل ٹو رائفل اور گولیوں والی بیلٹ نظر آئی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اُٹھا لیں، چاقو دوبارہ لباس میں رکھا اور رائفل کو تیار حالت میں کر لیا۔ رائفل کے وزن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے میگزین میں اب بھی گولیاں موجود ہیں۔ بڑا پھاٹک تو ٹوٹ چکا تھا۔ چھوٹا پھاٹک بھی چوپٹ کھلا ہوا

تھا۔ حیرت انگیز طور پر پھاٹک تک ہمارا سامنا کسی سے نہیں ہوا۔ ہم پھاٹک میں تھے جب اوتار سنگھ کے ایک کارندے نے ہمارا راستہ روکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میری چلائی ہوئی دو گولیاں اس کی چھاتی میں لگیں اور وہ پھاٹک کے ستون سے ٹکرا کر دھوئیں میں گم ہو گیا۔ ثروت بُری طرح کھانس رہی تھی۔ میرے سینے میں بھی سانس نہیں سما رہی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ جتنی جلدی یہاں سے دور ہو جائیں گے، اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہو گا۔ ہم درختوں کی طرف بھاگے۔ اچانک ایک دھواں چھوڑتی گاڑی میرے پاس آ کر رُکی۔ یہ ایک لوڈر تھا، اس کے عقب میں چارا وغیرہ لدا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر یوسف بیٹھا تھا۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں اس کے چہرے پر نیم گول زخم کا نشان نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر پکارا۔ ''اندر آ جاؤ''

میں اور ثروت لوڈر کی طرف لپکے۔ میرے دائیں ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفل تھی اور میں ٹریگر دبانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ یوسف نے گاڑی مکمل نہیں روکی۔ میں نے رینگتی گاڑی میں ثروت کو سوار کرایا مگر اس سے پہلے کہ میں بھی سوار ہوتا، یوسف نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اس کا دروازہ بھی کھلا ہی رہ گیا جو کچھ دور تک لہراتا رہا پھر ایک درخت سے ٹکرا کر بند ہو گیا۔

میں ششدر کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اگر یوسف جان بوجھ کر مجھے چھوڑ کر جا رہا تھا تو بہت بڑی غلطی کر رہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس خطرناک صورتِ حال میں ثروت کی حفاظت نہیں کر سکے گا بلکہ شاید اپنی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ طیش کی ایک لہر سی میرے اندر اُبھری۔ لوڈر مجھ سے پچیس تیس میٹر دور جا چکا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ دس پندرہ سیکنڈ میں، مَیں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ نہ جانے اس وقت کیوں مجھے عمران کی رُوداد کا ایک منظر یاد آ گیا۔ شاید وہ بدمعاش عورت ماجھاں بھی اسی طرح عمران اور راجا کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ دونوں چھکڑا لوڈر پر سوار تھے۔ پھر ماجھاں کے ہاتھ کا کڑا چلتے لوڈر کے کنڈے میں پھنس گیا تھا۔ بہرحال سچویشن کچھ مختلف تھی۔

یہاں کوئی بھی گاڑی کے عقبی حصے میں موجود نہیں تھا۔ بس چارے کے گٹھے جو جھٹکوں کے سبب زور زور سے ہل رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ یوسف عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ سکا یا نہیں۔ بہرحال میں نے لوڈر کا جنگلا پکڑ کر جست لگائی اور چارے کے گٹھوں کے اوپر گرا۔ لوڈر اب رفتار پکڑتا جا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ راستہ نسبتاً ہموار ہو گیا تھا۔ دائیں بائیں درخت تھے۔ عقب میں سرداروں کی حویلی سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھوئیں کے بادل گھٹا

کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں اب رُک رُک کر آ رہی تھیں۔ کچھ دور مجھے ایک دل خراش منظر نظر آیا۔ ایک گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اس کی چرمی زین کو آگ لگی ہوئی تھی۔ زین کے ساتھ ساتھ گھوڑے کی پشت کی چربی بھی جل رہی تھی۔ وہ درختوں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا میرے سامنے ایک جوہڑ میں جا گرا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے دو تین بھینسوں کو بھی دیکھا جو ڈکراتی ہوئی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں، یقیناً وہ بھی حویلی میں لگنے والی آگ سے متاثر تھیں۔ میں نے چارے کے گٹھوں پر اوندھے لیٹے لیٹے عقب میں دیکھا۔ کسی گاڑی کی روشنیاں دکھائی نہیں دیں، نہ ہی کوئی گھڑ سوار نظر آیا۔ مطلب یہ تھا کہ ہم تعاقب سے محفوظ رہے ہیں۔ وہاں اتنی افراتفری تھی کہ کسی کو کسی کا ہوش ہی نہیں تھا۔

میری پیشانی کی چوٹ سے اب بھی خون رِس رہا تھا۔ پورا بدن جیسے چوٹوں کے سبب پھوڑا بنا ہوا تھا۔ یہ اذیت تلخ تھی اور میٹھی بھی۔ درد کی ٹیسیں میرے اندر عجیب سی ترنگ بھر رہی تھیں۔ میں نے وہیں سبز چارے پر لیٹے لیٹے رائفل کو اچھی طرح چیک کیا۔ اس کے میگزین میں اب بھی چھ سات گولیاں موجود تھیں۔ میں نے میگزین فل کر لیا اور رائفل کو اُلٹ پلٹ کر اس کے میکنزم کو سمجھ لیا۔ میں جانتا تھا کہ آج رات کسی بھی وقت مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے گی۔ بہرحال یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی جلدی پڑ جائے گی۔

یوسف گاڑی کو بھگاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہاں جانا چاہ رہا تھا؟ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ وہی کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ وہ بس حویلی سے دور ہونا چاہ رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان اسے جدھر بھی بہتر راستہ نظر آتا، وہ اس طرف گاڑی گھما دیتا تھا۔ میں نے سوچا کیا مجھے ان دونوں کو اپنے بارے میں بتانا چاہیے؟ یہ ذرا مشکل سوال تھا۔ ابھی میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ ہم حویلی سے سات آٹھ میل دور آ چکے تھے۔ میں نے کیبن کی چھت کے اوپر سے دیکھا، آگے راستہ بند تھا۔ ایک بڑی جیپ اس طرح کھڑی تھی کہ پہلو سے نکلنا دشوار تھا۔ جیپ کی چھت پر کافی سازوسامان لدا نظر آ رہا تھا۔ لوڈر کی ہیڈ لائٹس میں، مَیں نے دیکھا۔ یہ مچھلیاں پکڑنے والے جال تھے اور کیمپنگ کے لوازمات تھے۔ دو تنومند سکھ جیپ سے باہر کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یوسف نے لوڈر روک لیا۔ دونوں تنومند سکھ یوسف والی کھڑکی کی طرف آئے۔ ایک نے کہا۔

''سوری بھرا جی! جیپ ذرا بند ہو گئی ہے۔ ابھی اسٹارٹ کر لیتے ہیں۔ کہاں جانا ہے آپ نے؟''

''بس تھوڑی ہی دور۔'' یوسف نے گول مول جواب دیا۔

''جناب عالی! تھوڑی دور کا کوئی نام شام تو ہو گا نا؟'' دوسرے شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں تیسرا شخص بھی جیپ سے نکل کر لوڈر کی طرف آ گیا۔ اس نے پتلون قمیص پہنی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کے ہونٹوں میں سگریٹ ہے اور وہ نشے کے سبب واضح طور پر لڑکھڑا رہا ہے۔ اس نے سب سے پہلے ثروت والی کھڑکی میں ہی دیکھا اور ہانک لگائی۔ ''او تینوں چین گے نصیباں والے...... نشے دیئے بند بوتلے...... ہو بند بوتلے۔''

اس دوران میں پہلے والے دونوں سکھوں نے یوسف سے چند اور سوال پوچھے جن کے وہ مناسب جواب نہ دے سکا۔ [illegible] آج رات رات بھولنا ہی بھولنا ہے۔ [illegible] ویسے آپ دونوں کہیں سے [illegible] کر تو نہیں آئے؟''

یوسف بولا۔ ''آپ کیسی باتیں کرتے ہو سردار جی! کیا ہم آپ کو ایسے لگتے ہیں؟''

شرابی بولا۔ ''ایسے نہیں لگتے تو [illegible] ہی ہیں۔ [illegible] عشق معشوقی کرنا کوئی اپرادھ تو نہیں ہے یار جی۔''

''آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔'' یوسف کی [illegible] آواز آئی۔

سرخ پگڑی والے نے کہا۔ ''پیار میں بھی کوئی بدتمیزی ہوتی ہے جن پیارے...... تم نے وہ گانا نہیں سنا۔ پیار کیا ہے کوئی چوری نہیں کی......''

یوسف نے دوبارہ لوڈر اسٹارٹ کیا۔ غالباً وہ چاہ رہا تھا کہ وہ لوڈر کو ریورس کر کے دوسری طرف سے نکل جائے۔ فوراً ہی انجن بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی چابی کی چھن چھن سنائی دی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نوواردوں میں سے کسی نے پھرتی سے اگنیشن میں سے چابی کھینچ لی ہے۔ معاملہ بگڑتا جا رہا تھا۔

شرابی نے لہک کر کہا۔ ''چپ چپ بیٹھے ہو ضرور کوئی بات ہے۔ لمبی ملاقات ہے جی لمبی ملاقات ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی میں سے ثروت کے ساتھ کوئی چھیڑ کی۔

میں نے چانٹے کی آواز بالکل صاف سنی۔ یقیناً یہ ثروت کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ توقع کے عین مطابق تھا۔ شرابی شخص نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ثروت کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ ''نہ کرا جو! اتنے سوہنے گال، مارنے کے لیے نہیں چومنے کے لیے ہوتے ہیں۔''

وہ ڈکرایا۔ ''اوئے چومتی ہے میری جتی۔ میں تو اس کا حشر نشر کر دوں گا۔''

یوسف جلدی سے آگے آیا اور لرزتی آواز میں بولا۔ ''ہمارے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔''

شرابی اجو بولا۔ ''منتیں بھی کرتے ہو اور چپیڑیں بھی مارتے ہو۔ تمہاری تو......'' اس نے یوسف کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لوڈر کی سائیڈ سے ٹکرایا اور کراہنے لگا۔ اس میں اتنا دم خم ہر گز نہیں تھا کہ ان ڈشکروں کی مزاحمت کر سکتا۔ وہ ٹائی لگا کر سارا دن کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنے والا شخص تھا۔ ان تینوں کی نیت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ان میں سے ایک سرخ پگڑی والا، قدرے بھلا مانس تھا لیکن باقی دونوں ایک دم حرصی غنڈے نظر آتے تھے۔ وہ شکار کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ لیکن مچھلی کے بجائے ایک خوبصورت لڑکی جال میں آ گئی تھی اور وہ اس صورتِ حال پر نہال نظر آ رہے تھے۔

اسی دوران میں ان میں سے ایک نے لوڈر کے عقب کا معائنہ شروع کر دیا۔ یقیناً وہ چارا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے پہلے میری ٹانگیں دیکھیں۔ پھر ٹارچ جلائی اور تیزی سے میری طرف آیا۔ ''اوئے...... یہ کون ہے؟'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ٹرپل ٹو رائفل کا کندا بڑی طاقت سے اس کے منہ پر مارا۔ وہ کسی ایسے حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اچھل کر ایک کیکر سے ٹکرایا اور پھر ثروت کے پاؤں کے پاس جا گرا۔

میں چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔ شرابی اجو خطرہ بھانپ کر جیپ کی طرف لپکا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتا ہے۔ میں نے بے دریغ اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی وہ چلایا اور تڑپ کر لمبی گھاس میں گرا۔ باقی دونوں افراد سکتے کی کیفیت سے نکلے اور مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے دیوانہ وار مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے ان کے چہروں پر ٹکریں رسید کیں اور ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ حوصلہ افزا صورتِ حال دیکھ کر یوسف نے ایک شخص کو عقب سے جکڑ لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر پانسا پلٹ گیا۔ میں نے ان دونوں افراد کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔ وہ با قاعدہ چلانے لگے۔ انہیں ایسی شدید مزاحمت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ان میں سے ایک تو خود کو چھڑا کر جنگل میں بھاگ گیا۔ دوسرا بھی اسی تاک میں تھا۔ جونہی موقع ملا، اس نے بھی دوڑ لگا دی۔ اتفاقاً ان دونوں بھگوڑوں کے رنگ برنگے موبائل فون وہیں پر گر گئے تھے۔

شرابی اجو سنگھ لمبی گھاس میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ٹرپل ٹو کی گولی، دہکے انگارے کی صورت اس کی فربہ ران میں گھس گئی تھی۔ میں نے اسے ٹھوکر رسید کی اور اوندھا کر کے اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ ایک بٹوا اور چند دیگر اشیا ملیں۔ پھر میں جیپ کی طرف آ گیا۔ جیپ میں سامانِ خورد و نوش موجود تھا۔ انڈین وہسکی کی دو بوتلیں اور سگریٹوں کے پیکٹ پچھلی نشست پر نظر آ رہے تھے۔ اگلی نشست کے نیچے سے ایک بھرا ہوا پستول بھی نکل آیا۔ اجو سنگھ یقیناً یہی پستول لینے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے پستول اپنی بیلٹ میں اڑس لیا اور وہ بیگ بھی اٹھایا جس میں قیمے والے پراٹھے، آلو کے تلے ہوئے قتلے اور کوک کے ٹن وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑے سائز کی گرم چادر بھی میں نے جیپ میں سے نکال لی۔

ثروت اور یوسف حیرت سے میری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ میری موجودگی سے ایک ہی وقت میں خوش بھی تھے اور پریشان بھی۔ میں نے ان سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ بس اتنا کہا۔ ''آگے راستہ بالکل نہیں۔ درخت ہی درخت ہیں۔ ہمیں گاڑی چھوڑنی پڑے گی۔''

یہ بات یقیناً یوسف کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ دو ہی آپشن تھے۔ گاڑی چھوڑ دی جائے یا پھر واپس پلٹا جائے۔ پلٹنے میں شدید خطرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یوسف کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ''ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے تمہارے پاس۔ یہاں ایک فائر ہو چکا ہے۔ کسی وقت کوئی بھی یہاں آ سکتا ہے۔ ہمیں جلدی نکلنا چاہیے اور بہتر ہے کہ ان کی جیپ پر سے تھوڑا بہت شکار کا سامان بھی اتار لیا جائے۔''

''وہ کس لیے؟'' یوسف نے پہلی بار زبان کھولی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے جب ان غنڈوں نے تم سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو تو تمہاری زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ ہمارے پاس شکار کا سامان ہو گا تو بتا سکیں گے کہ شکار پر نکلے ہیں۔''

میرے خشک لہجے کو محسوس کر کے یوسف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور جیپ کی چھت پر بندھے ہوئے سامان کو کھولنے میں مدد کی۔ ہم نے ایک جال اور کچھ کنڈیاں وغیرہ سامان سے علیحدہ کر لیں۔ زمین پر گرے ہوئے دونوں موبائل فون ثروت نے اٹھا کر مجھے دے دیئے۔ شرابی اجو سنگھ کو وہیں لوٹ پوٹ ہوتے چھوڑ کر ہم تیزی سے گھنے درختوں کی طرف بڑھ گئے۔ ٹرپل ٹو رائفل کو چھپانے کے لیے اس چادر نے بہت مدد کی جو مجھے جیپ سے ملی تھی۔ میں نے یہ چادر بکل کی طرح اپنے اردگرد لپیٹ لی۔

مجھے ایک گھنٹہ پہلے والا افسوس ناک تجربہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ یوسف مجھے چھوڑ کر آناً فاناً اوجھل ہوا تھا۔ اب وہ پھر کوئی ایسی حماقت کرسکتا تھا۔ میں یوسف اور ثروت کے پہلو میں چل رہا تھا مگر ہر وقت انہیں اپنی نظروں میں بھی رکھے ہوئے تھا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ ایک دو روز کے اندر ہی ہمارے تعلق میں کتنی دوری آگئی تھی۔ میں ثروت اور یوسف کے لیے لہولہو ہو رہا تھا اور اب وہ مجھے ہی اپنا دشمن سمجھ رہے تھے۔

یوسف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کیا کوئی لیگل طریقہ نہیں ہوسکتا؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

ثروت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم کسی پولیس اسٹیشن تک نہیں پہنچ سکتے؟''

''پہنچ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پھر وہاں سے نکل نہیں سکتے۔ وہ لوگ سب سے پہلے ہم سے پاسپورٹ اور ویزا مانگیں گے۔ اس کے بعد ہم جاسوس یا دہشت گرد ٹھہریں گے اور ہم سے بے رحم قسم کی تفتیش کا آغاز ہو جائے گا۔ فی الحال تو کسی جگہ کسی کے پاس پناہ ڈھونڈنی پڑے گی، پیار محبت سے یا زبردستی...... چار پانچ دن بعد جب یہ سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا پھر ہی کسی طرف نکل سکیں گے۔''

''جگت سنگھ سے مدد نہیں لی جاسکتی؟'' ثروت نے پوچھا۔

''لی جاسکتی ہے پر ابھی نہیں۔ ابھی ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔''

''فون کر کے دیکھ لیں۔'' ثروت منمنائی۔

''ابھی ٹرائی کی تھی۔ اس کا فون بند ہے۔ ویسے بھی کبھی سگنل آرہے ہیں کبھی نہیں۔''

سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میری ساری چوٹیں ٹھنڈی ہو کر زیادہ تکلیف دینے لگی تھیں۔ پیشانی کے عین اوپر سر سے بار بار خون رِسنے لگا تھا جسے میں ایک رومال سے پونچھتا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں پٹی بھی نہیں باندھی جاسکتی تھی۔

یوسف نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ مجھے سر کی یہ شدید چوٹ کیسے لگی ہے۔ ثروت نے بھی اس چوٹ کی کیفیت دریافت نہیں کی۔ یقیناً وہ دونوں اپنے طور پر خجالت بھی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے حویلی میں ایک خطرناک سچویشن میں مجھے تنہا چھوڑنے کی کوشش کی۔ خاص طور سے یوسف تو یقیناً خجل تھا اور اب اسے یہ بھی پتا تھا کہ میں دوبارہ اسے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنے دوں گا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں ہم لوڈر والی جگہ سے چار پانچ کلومیٹر آگے نکل آئے۔ ثروت بُری طرح تھک چکی تھی۔ آخر وہ ایک جگہ بے بس ہو کر بیٹھ گئی۔ ہم نے بھی بوجھ

اُتارا اور بیٹھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر موبائل آن کیا اور جگت سنگھ کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ میرے والا موبائل تو سرداروں کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ یہ موبائل ان دو میں سے ایک تھا جو اجو سنگھ کے ساتھی بھاگتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ ایک بار پھر جگت سے رابطہ نہیں ہوسکا۔

میرے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔ میں یوسف سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے بس ایک ہی بات پوچھی۔ میں نے کہا۔ ''یوسف! تم نے ثروت سے کہا ہے کہ میں نے تمہیں ''پین کلر'' کے نام پر زہریلی گولیاں کھلانے کی کوشش کی۔ یہ جھوٹ کیوں بولا تم نے؟''

یوسف چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''ان سوال جواب کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے تابش! کسی محفوظ جگہ پہنچ کر جو چاہو پوچھ لینا۔''

میں نے کہا۔ ''کون کہہ سکتا ہے کہ محفوظ جگہ پہنچنے تک تم میرے ساتھ ہوگے یا مجھے کہیں چھوڑ جاؤ گے۔ اگر تمہارے پاس میرے سوال کا جواب ہے تو ابھی دے دو۔''

یوسف میرا مصمم ارادہ دیکھ کر بولا۔ ''میں نے ثروت سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نے مجھے زہریلی گولیاں دی تھیں۔ میں نے بس یہ کہا ہے کہ ان کی ''ڈیٹ'' دو سال پہلے ایکسپائر ہو چکی تھی اور جس قسم کی وہ دوا تھی وہ ایکسپائر ہونے کی صورت میں بندے کی جان بھی لے سکتی ہے......''

میں نے کہا۔ ''مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے یوسف کہ تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے گولیوں کا جو پتا تمہیں دیا تھا، اس پر خود ڈیٹ پڑھی تھی۔ وہ ایکسپائر نہیں تھیں۔ مجھے ٹھیک سے یاد ہے۔''

''اب میں کیا کہوں۔'' یوسف کمزور آواز میں بولا۔ ''میں نے خود بھی ڈیٹ پڑھی ہے۔ بندے سے غلطی ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو۔''

''اور تم سے نہیں ہوسکتی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہوگا۔ وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ میری بدقسمتی تھی کہ اس سفید جھوٹ کو موجودہ صورتِ حال بھی سہارا دے رہی تھی۔ وہاں چند گھنٹے پہلے، حویلی میں جو کچھ ہوا، وہ سراسر یوسف کے حق میں جاتا تھا۔ سردار اوتار نے اپنے درجنوں مہمانوں کے سامنے اپنا جرم میرے سر تھوپا تھا۔ کالی جیپ کے نیچے سے نکلنے والے تقریباً چار کلو دھماکا

خیز مواد کا تعلق میرے ساتھ بنادیا گیا تھا۔

اچانک فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ وہی اجو سنگھ کے ساتھی والا رنگ برنگا فون تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ مجھے امید تھی کہ شاید دوسری طرف جگت سنگھ ہو لیکن ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! میں انسپکٹر انوپ سنگھ بول رہا ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو خود کو پولیس کے حوالے کردو۔ تمہارے حق میں بہت اچھا ہوگا۔ ہم تمہیں پوری سیکیورٹی دیں گے۔ جو کارروائی بھی ہوگی، قانون کے عین مطابق ہوگی۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ہمیں کیسے پتا چلے کہ تم واقعی پولیس والے ہو اور اگر ہو بھی تو پولیس والوں کی بات پر اعتبار کرنا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر آواز اُبھری۔ ''وشواس تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ تم نالے کا پل پار کر چکے ہو۔ نالے اور سوبا روڈ کے درمیان تین چار مربع کلومیٹر کے علاقے میں موجود ہو۔ ہمیں زیادہ دوڑاؤ گے تو پھر ہم سے رعایت کی آشا بھی نہ رکھنا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم سے پہلے کچھ اور لوگ تم تک پہنچ جائیں۔''

میں نے فون بند کردیا۔ مجھے شک ہورہا تھا کہ یہ پولیس والا نہیں ہے۔ یہ ان شکاریوں میں سے کوئی ہوسکتا تھا یا پھر ممکن تھا کہ سرداروں میں سے کچھ لوگ ان شکاریوں تک پہنچے ہوں اور ان سے فون نمبر لے کر کال کررہے ہوں۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں خطرات کے مہیب سائے رینگ رہے تھے۔ فون کرنے والے نے جو معلومات دی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے ایک برساتی نالے کا بوسیدہ پل پار کیا تھا۔

اپنی پیشانی کے اوپر سر میں سے بہنے والا خون بند کرنے کے لیے میں نے اس میں تھوڑی سی چکنی مٹی بھردی۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں یوسف کو بتانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ آج رات کیا ہونے جارہا تھا۔ اسے کس طرح دھماکے کا شکار بنایا جانا تھا اور کس طرح سردار اوتار کے مفرور بیٹے اشوکا سنگھ کی مشکلیں آسان ہونا تھیں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری کسی بات پر اعتبار نہیں کرے گا اور شاید ثروت بھی نہ کرے۔ میں جو بھی کہوں گا، یہ دونوں اسے کسی سازش کے زمرے میں لائیں گے۔

ہمیں وہاں بیٹھے آدھ پون گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ہم اُٹھنے کی تیاری ہی کررہے تھے جب اچانک مجھے جھاڑیوں میں ایک چمک سی نظر آئی۔ اس کے بعد سرسراہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی جانور تیزی سے گزرا ہو۔ یوسف اور ثروت بھی چونک گئے۔ ثروت نے ڈری ہوئی

نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اُٹھ کھڑا ہو۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی جاندار اردگرد موجود ہے۔ وہ کوئی جانور ہوسکتا تھا، کوئی جنگل واسی یا پھر ہمارا کوئی دشمن۔

دفعتاً ایک برسٹ سے قرب و جوار لرز اُٹھے۔ یہ برسٹ غالباً ہوا میں چلایا گیا تھا۔ گھونسلوں میں دبکے ہوئے بہت سے پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے محوِ پرواز ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نہایت کرخت آواز اُبھری۔ ''خبردار! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔''

میں ایک لحظے میں پہچان گیا۔ یہ وہی آواز تھی جو ایک گھنٹہ قبل موبائل فون پر سنائی دی تھی۔ یہ لوگ توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہم تک آن پہنچے تھے۔

''چلو نکلو۔'' میں نے ثروت اور یوسف سے کہا۔

وہ سامان اُٹھا کر جھاڑیوں کی طرف لپکے۔ میں انہیں ''کور'' دیتا ہوا اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ایک اور برسٹ چلا۔ میرے پاؤں کے اردگرد بھربھری مٹی کئی فٹ تک ہوا میں اُچھلی اور شاخیں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے جوابی برسٹ چلایا۔ رات کا سناٹا تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اُٹھا۔ کوئی چلایا اور زخمی ہوکر درختوں میں گرا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ بڑے قیامت خیز تھے۔ میں، یوسف اور ثروت کے پیچھے تھا۔ انہیں کور دیتا ہوا کبھی اُلٹے اور کبھی سیدھے قدموں بھاگ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چھوٹے برسٹ چلا رہا تھا۔ ہمارے اردگرد انگارے سے بکھر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اور شخص میری فائرنگ سے زخمی ہوکر گر گیا ہے۔ میگزین میں گولیاں کم تھیں۔ میں سنگل شاٹ چلانے لگا۔

یکا یک مجھے لگا کہ فائرنگ تھم گئی ہے۔ دو افراد زخمی ہوگئے تھے، تیسرا شاید اسے سنبھالنے میں لگ گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ تین ہی ہوں اور اگر زیادہ تھے تو پھر دو ٹولیوں میں ہوسکتے تھے۔ کوئی دوسری ٹولی ہمارے آس پاس نہیں تھی۔ فائرنگ تھم گئی تو ہم زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یوسف کی ٹانگ میں پرانے زخم کی وجہ سے ابھی تک ہلکی لنگڑاہٹ موجود تھی تاہم ثروت پاؤں کی موچ سے پوری طرح اُبھر چکی تھی اور تیزی سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹہ مسلسل چلنے کے بعد ہمیں رُکنے کے لیے ایک بڑی مناسب جگہ نظر آئی۔ غالباً تین چار ہفتے پہلے تیز آندھی کی وجہ سے یہاں دو تین درخت اوپر نیچے گرے تھے۔ ان تناور درختوں کے نیچے ایک خلا تھا۔ اس خلا کو اوپر سے زرد پتوں اور شاخوں نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اس خلا میں گھس کر خود کو پوری طرح کیموفلاج کیا جاسکتا تھا۔ یوسف اور

ثروت تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ ہم نے گھنے درختوں میں موجود اس قدرتی پناہ گاہ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی یہ جگہ قدرے بلاندی پر تھی۔ ہم ارد گرد نگاہ رکھ سکتے تھے۔ پہلے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل کر اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی مدد سے جگہ کا جائزہ لیا۔ یوں لگا جیسے میں انسانی کوشش سے بنائی گئی کسی جھونپڑی میں آ گیا ہوں۔ جگہ محفوظ تھی۔ یوسف اور ثروت بھی میرے ہی انداز میں اندر آ گئے۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔

ہم تینوں خاموش تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ چند گھنٹوں کے اندر جو کچھ بیتا تھا، وہ کسی ایکشن مووی کی طرح ذہن کے پردے پر متحرک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ثروت اور یوسف کی کیفیت بھی مختلف نہیں ہو گی۔ حویلی میں نہال برادری کے افراد بیمار باپو کی رضامندی سے اس کی پوتی کو کہیں لے گئے تھے۔ پتا نہیں کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ یقیناً سردار اوتار سنگھ جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا ہو گا۔ وہ اور اس کے ہرکارے پورے علاقے میں دندنا رہے ہوں گے۔ یقینی بات تھی کہ وہ سرنوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی تلاش کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ خاص طور سے یوسف ان کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ ان کے لیے منہ سے گر جانے والے نوالے کی طرح تھا اور یہ نوالہ یقیناً سونے کا تھا۔ یہ نوالہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے لازماً جاوا گروپ کو خطیر رقم ادا کی ہو گی۔ آج رات وہ اسے چبا جانا چاہتے تھے مگر ان کے دانتوں کے نیچے آنے سے ذرا پہلے وہ گر گیا تھا۔

میں، ثروت اور یوسف کو اندر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ شکار کا سامان، جال اور کنڈیاں وغیرہ باہر پڑی تھیں۔ میں نے سب چیزیں ایک ایک کر کے اندر بھیج دیں اور خود درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رائفل میری گود میں تھی۔ اس کے ٹھنڈے بیرل میں سے ابھی تک بارود کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے بیلٹ میں سے گولیاں نکال کر میگزین ایک بار پھر لوڈ کر لیا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ قیمے کے پراٹھوں والا چھوٹا بیگ باہر ہی پڑا رہ گیا ہے۔ میں نے وہ بیگ اُٹھایا اور ثروت سے کہا کہ وہ اندر رکھ لے۔

"کیا ہے اس میں؟" ثروت نے پوچھا۔

"کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔"

"لیکن اندر تو جگہ نہیں ہے۔ آپ باہر ہی رہنے دیں۔"

"نہیں...... ان کو اپنے پاس رکھو۔ زیادہ محفوظ رہیں گی۔" میں نے زخمی لہجے میں کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ گئی کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ یوسف نے مجھ پر یہ بھونڈا الزام لگایا تھا کہ میں نے اسے زہریلی گولیاں دینے کی کوشش کی ہے۔

میں باہر بیٹھا رہا۔ ٹھنڈ میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا تھا۔ بھاگ دوڑ میں تو جسم گرم تھا، اب پھر چوٹیں تکلیف دینے لگیں۔ اندر سے کبھی کبھی باتوں کی مدھم آواز آتی تھی۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے اندازہ ہوا کہ اندر انہوں نے پراٹھوں والا ٹفن کھولا ہے۔ کچھ دیر بعد خلا کے سرے پر ثروت کا ہیولا نظر آیا۔ وہ رومال پر رکھا ہوا پراٹھا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی کھا لیں۔"

"نہیں...... بھوک نہیں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"تھوڑا سا لے لیں۔"

"نہیں۔"

وہ بوجھل انداز میں واپس چلی گئی۔

پتا نہیں کیوں میری آنکھوں کے گوشے بے ساختہ نم ہو رہے تھے۔ میں خود کو ایک دم بیگانہ محسوس کر رہا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر دشمن...... ایک ایسا دشمن جس کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ جیب میں پستول اور وہ کسی بھی وقت یوسف کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ان لمحوں میں، مَیں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا، اگر اس قسم کے حالات پیدا ہوئے تھے تو پھر ثروت اتنی جلدی مجھے ملی ہی کیوں تھی؟ دل میں یہ آس تو رہتی کہ ابھی کسی موڑ پر اس نے پھر سے ملنا ہے، کوئی معجزہ ہونا ہے، کسی کرشمے نے جدائیوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے لیکن وہ مل گئی تھی اور پھر بچھڑ بھی رہی تھی۔ دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے۔ سرداروں کی حویلی میں، مَیں نے ثروت کی آنکھوں میں جو غیریت دیکھی تھی، اس نے سینہ چھلنی کر ڈالا تھا۔ ایک ایسا زخم دیا تھا جس نے بہت دیر تک لہو بہانا تھا۔

ثروت! میں ایسا تو نہیں تھا۔ میں تو کبھی ایسا نہیں تھا، پھر تم نے کیوں سوچا اس طرح؟ ساری دنیا مجھے ملزم ٹھہرا دیتی لیکن تم تو ایسا نہ کرتیں۔ تم تو کہہ دیتیں کہ نہیں، یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے پیار کیا ہے، بڑے صبر سے جدائیوں کا زہر پیا ہے اور آئندہ بھی پیئے گا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو محبت کرتے ہیں اور محبت کے نام پر بڑی خاموشی سے ذبح ہو جاتے ہیں۔ اُف تک نہیں کرتے۔ آہ تک نہیں بھرتے۔ یہ میری زندگی کو لہولہان کیسے کر سکتا ہے؟ یہ میرے شریکِ حیات کو مجھ سے کیسے چھین سکتا ہے؟ تم کو کہہ دینا تھا ایسے...... میں نے تصور میں اسے مخاطب کیا۔

ہوا چل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ تیز ہوتی گئی۔ پھر اس نے آندھی کی سی شکل اختیار کر لی مگر ایک دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اس لیے اس آندھی میں گرد نہیں تھی۔ ہوا کی شدت دیکھ کر یوسف نے خلا میں سے سر باہر نکالا اور بولا۔ ''تابش! اندر آ جاؤ۔ ہم نے جگہ بنا لی ہے۔''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی میرا باہر رہنا ضروری ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے دوبارہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر میرے تاثرات دیکھ کر خاموش رہ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بھی بس حجت ہی پوری کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ مجھے اندر بلانے کی اسے کچھ زیادہ چاہت نہیں تھی۔

ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کے ہیولے دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ خشک پتے اُڑتے ہوئے آتے اور میرے چہرے سے ٹکراتے۔ تیز ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے میں تھوڑا سا ترچھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اندر شاید یوسف اور ثروت تھک کر لیٹ گئے تھے۔ مجھے ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر حویلی کے خونی ہنگامے کی فلم سی چلنے لگی۔ یکا یک میں چونک سا گیا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب سرنوں چھوٹے کمرے میں چھپی ہوئی تھی اور اس کا دادا نہالوں کے ''پالے'' نامی شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس گفتگو میں ننکانہ صاحب کا نام بھی آیا تھا۔ مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ جب چند روز پہلے میں پاکستان میں تھا اور جو پور کے قریب کریانہ فروش لطیف کے گھر میں رہ رہا تھا تو لطیف نے مجھے چودھری انور گنجے کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔ ان باتوں میں اس نے کسی ایسی سکھ لڑکی کا ذکر بھی کیا تھا جس کا کسی پاکستانی سکھ سے رومانس چلا تھا اور وہ اس سے شادی کرنے کے لیے کسی طرح ننکانہ صاحب پہنچ گئی تھی۔ مگر بعد میں اس لڑکی کو زبردستی پھر سے اس کے والدین کے پاس انڈیا بھیج دیا گیا تھا۔ اس لڑکی کو چودھری انور کے ذریعے ہی دوبارہ بارڈر پار کرایا گیا تھا۔ تو کہیں یہ سرنوں وہی لڑکی تو نہیں؟ میں سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اگر یہ واقعی وہی سلسلہ تھا تو پھر اس کو کوئی بڑا ڈرامائی انجام ہونے والا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ سرنوں نامی لڑکی پھر سے ننکانہ صاحب پہنچ جاتی۔

رات آخری پہر میں غنودگی محسوس کرنے لگا لیکن رائفل پھر بھی میری گود میں رہی۔ میری سماعت اردگرد کی آوازوں اور آہٹوں پر لگی ہوئی تھی۔ احتیاطاً میں نے موبائل بھی آف

کر دیا تھا۔

○......❖......○

میں نیم غنودگی کی کیفیت میں درخت کے سہارے نیم دراز تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دن چڑھ آیا ہے اور درختوں پر لاتعداد پرندے چہچہا کر ایک نئی صبح کی آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔ اچانک مجھے لگا کہ پستول میری پتلون کی جیب میں نہیں ہے۔ مجھے اس کا وزن اور چبھن محسوس نہیں ہوئی۔ میرا ہاتھ بے ساختہ پتلون کی جیب پر آیا، جیب خالی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں آیا کہ پستول جیب سے پھسل کر گھاس پر گر گیا ہے۔ میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔

''خبردار!'' ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میرے سامنے یوسف فاروقی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں خوف آمیز طیش کے لشکارے تھے۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بیرل کا رُخ میرے سر کی طرف تھا۔ وہ جنونی انداز میں دھاڑا۔ ''خبردار! میں گولی چلا دوں گا...... میں گولی چلا دوں گا۔''

وہ اتنے سخت تناؤ میں تھا کہ گھبرا کر بھی ٹریگر دبا سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اس نے ٹانگ کی زوردار ٹھوکر سے رائفل کو مجھ سے سات آٹھ فٹ دور کر دیا۔ پھر اسے ہاتھ سے اُٹھا کر مزید کچھ پیچھے پھینک دیا۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی میرے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا رہا تھا۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ میں ہوا بن کر اُڑ جاؤں گا۔ پستول دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے عین میرے سر کا نشانہ لیا اور چلا کر بولا۔ ''ثروت! بڑا بیگ لے کر باہر آ جاؤ۔''

چند سیکنڈ بعد ثروت ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل کر خلا میں سے باہر نکل آئی۔ دن کی روشنی میں اس کے رنجیدہ چہرے پر کئی خراشیں اور نیل نظر آ رہے تھے۔ نیل تو یقیناً کل رات کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ تھے جو سرداروں کی حویلی میں اس سے ہوئی تھی۔ خراشیں رات کے وقت درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرتے وقت آئی تھیں۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ یوسف کے قریب کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''یوسف! تم وہی بے وقوفی کر رہے ہو جو تم نے رات کو کی تھی۔ تم اکیلے یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔''

وہ پھر چنگھاڑا۔ ''ہمیں تمہاری ضروت نہیں......نہیں ہے ہمیں تمہاری ضرورت...... تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ دفع ہو جاؤ۔''

''مجھے تمہارا پیچھا کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ثروت کی مجبوری دیکھ کر میں اس کے ساتھ یہاں آیا ہوں اور حالات نے ثابت کیا ہے کہ مجھے آنا چاہیے تھا۔''

''بکواس بند کرو۔ تم ثروت کی مجبوری دیکھ کر نہیں، اپنی مجبوری سے یہاں آئے ہو۔ اور تمہاری مجبوری کیا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور شاید یہ بھی جانتی ہے۔ تم...... تم صرف ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے کے لیے، ہمارے ساتھ چمٹے ہوئے ہو۔ میں اتنا اندھا نہیں ہوں کہ دیکھ نہ سکوں، سمجھ نہ سکوں۔ انسانی ہمدردی کا جو بھوت تمہارے سر پر چڑھا ہوا تھا، میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے نصرت کی بیماری کو سیڑھی بنایا ہوا تھا، ثروت تک پہنچنے کے لیے۔ تمہارے پیٹ میں رات دن نصرت کے علاج کا جو مروڑ اُٹھ رہا تھا، اس کی وجہ مجھے بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ تیرے جیسے خسیس کتے کسی کو دمڑی نہ دیں پر تُو اور تیرا وہ دوست نصرت کے لیے حاتم طائی کی قبر پر لاتیں مار رہے تھے۔ میں سب جانتا ہوں۔ ایک ٹکے کا روزگار نہیں ہے تمہارا۔ وہ اتنی بڑی بڑی رقمیں کہاں سے آ رہی تھیں؟ سب حرام کا مال تھا، کالے دھندوں کی کمائی تھی۔ بولو کمائی تھی یا نہیں؟'' اس نے جنونی انداز میں پستول کو میرے سر کے کچھ اور قریب کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ٹریگر دبا دے گا۔

میں نے کہا۔ ''تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔''

''کیوں بحث کرنا نہیں چاہتے؟'' وہ چلّایا۔ ''رات کو تو تم پورے وکیل بنے ہوئے تھے۔ اپنی صفائی میں دلیلیں دے رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ وہ گولیاں زہریلی نہیں تھیں۔ اب بتاؤ وہ تھیں زہریلی یا نہیں؟ بتاؤ تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی یا نہیں...... بتاؤ؟''

اس کا انداز ڈرانے والا تھا لیکن وہ مجھے ڈرا نہیں سکا۔ میں سکون سے بیٹھا رہا۔ ڈر صرف ایک بات کا ہی تھا کہ کہیں وہ خود ڈر کر گولی نہ چلا دے۔ میں نے کہا۔ ''یوسف! دو ہی باتیں ہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو یا پھر تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

اس نے پستول پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کی اور بولا۔ ''اور یہ بھی غلط فہمی ہی ہے کہ کل رات تم نے مجھے راستے سے ہٹانے کی پلاننگ کی۔ جب ثروت نے تمہیں بتایا کہ کالی ٹویوٹا گاڑی پر مجھے یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے تو تم نے اس گاڑی کو شکار بنا لیا۔ اس کے نیچے بارود لگانے کے لیے گھس گئے۔ وہ ریموٹ کنٹرول ڈیوائس تم نے لگائی یا نہیں؟''

''میں بارود لگانے کے لیے نہیں اُتارنے کے لیے گھسا تھا۔ تمہاری جان بچانے کے

لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں۔ سارا پتا تو تمہیں ہی ہے۔ ہمیں تو بس غلط فہمیاں ہی ہو رہی ہیں۔ غلط فہمیوں کا ٹھیکا لیا ہوا ہے ہم نے۔ اور یہ ثروت تو ایسی بے وقوف جاہل ہے کہ اپنا اچھا بُرا سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم اس کے سہاگ کو بچانے کے لیے اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے، اس کے ساتھ ہارون آباد جانے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔ پر یہ تمہیں بتائے بغیر بس اڈے چلی گئی۔ تم نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، اس کے پیچھے گئے۔ اس کے ساتھ دَر دَر کی ٹھوکریں کھائیں۔ ہوٹلوں کے کھانے زہر مار کیے، اپنی جان خطرے میں ڈالی، کس لیے؟ صرف اس لیے کہ اس کا سہاگ بچ جائے۔ تمہارے جیسے کزن تو سونے میں تولنے کے قابل ہوتے ہیں۔ چچا اور ماموں زاد بہنوں کی شادیاں خاندان سے باہر بھی ہو جائیں تو وہ پُرانی باتیں بھولتے نہیں۔ ان کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی زندگی کو گل و گلزار بنانے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے اعلیٰ پائے کے خدائی خدمت گار ہوتے ہیں یہ کزن۔''

میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''یوسف! تمہارے اندر ایک شکی شوہر بول رہا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔''

''شٹ اَپ...... آئی سے شٹ اَپ۔'' وہ دھاڑا۔ ''ایک لفظ اپنی گندی زبان سے نہ نکالنا اور نہ ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کبھی مکھی تک نہیں ماری لیکن...... لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو میں شوٹ کر دوں گا تمہیں۔ شوٹ کر دوں گا۔''

میں نے ثروت کی طرف دیکھا۔ سینے میں بھرتا ہوا دُکھ کا دھواں کچھ اور گہرا ہو گیا۔ ثروت کی آنکھوں میں بھی مجھے اپنائیت کم اور خوف زیادہ نظر آیا۔ وہ واضح طور پر مجھ سے ڈری ہوئی لگتی تھی۔

یوسف اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ اس نے ٹرپل ٹو رائفل اُٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکا لی۔ ایک بیگ اپنے گلے میں جھلا لیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نظریں مجھ پر سے نہیں ہٹائی تھیں۔ پستول اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔

''چلو ثروت۔'' اس نے کہا۔

ثروت نے ایک بار بے بسی سے میری طرف دیکھا اور پھر شوہر کی ہدایت پر عمل کیا۔

یوسف نے ایک بار پھر قہرناک نظروں سے مجھے دیکھا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ یہی وقت تھا جب اسے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ میں جھپٹا۔ اس نے لیٹے لیٹے گولی چلائی۔ دھماکے سے شعلہ نکلا۔ گولی میرے چہرے کو سینٹی میٹرز کے حساب سے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کر سکتا، میں اس کے اوپر تھا۔ میں نے سب سے پہلے، اس کے پستول ہی کو دبوچا۔ پورے زور سے اس کی کلائی مروڑ کر میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ میں نے چند زوردار گھونسے اس کے نہایت گورے چٹے چہرے پر رسید کیے۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور پیٹ میں لات رسید کی۔ پھر چہرے پر گھٹنے کی بھرپور ضرب لگا کر دور پھینک دیا۔ میرا دماغ انگارہ بنا ہوا تھا۔ میں نے مٹی میں لتھڑا ہوا پستول اُٹھایا۔ رائفل ابھی تک یوسف کے کندھے سے جھول رہی تھی لیکن اسے استعمال کرنے کا اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اسے اس کے سیفٹی کیچ کا ہی پتا نہیں تھا۔ میں نے پستول اس کی گردن میں دھنسا دیا، وہ لمبی زرد گھاس پر چت پڑا تھا۔

''پلیز تابش!'' ثروت لپک کر آگے آ گئی۔

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''کتے! اگر میں تیری جان ہی لینا چاہتا تو اب تک بہت سے موقع ملے تھے۔ میں...... اب بھی تجھے مار کر یہاں دفن کر سکتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ بتا مار دوں؟ چلا دوں گولی؟''

وہ سکتہ زدہ پڑا تھا۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں گہرے خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چہرہ خون سے لتھڑا چلا جا رہا تھا۔

ثروت تھر تھر کانپ رہی تھی اور بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے یوسف کی گردن پر سے پستول ہٹا لیا۔ اس کے کندھے سے رائفل بھی اُتار لی اور دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔ ''یوسف! تُو بہت بڑا احسان فراموش ہے۔ اس کی سزا تجھے ضرور ملے گی۔ میں نہیں دوں گا تو کوئی اور دے گا...... اور یہ بھی یاد رکھ...... تُو آج ثروت سے جو بھی کہہ لے لیکن سچ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو ظاہر کر کے رہتا ہے۔ تیرا سچ بھی ضرور ظاہر ہو گا...... اور شاید وہی تیری سزا بھی ہو گی۔''

اچانک میری جیب میں پڑے ہوئے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ فون میں نے دو گھنٹے

پہلے ہی پھر آن کیا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی اور دل دھڑک اُٹھا۔ یہ جگت سنگھ کا نمبر تھا۔ رات کو جب میں اس سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا، ایک مس کال اس تک پہنچی تھی۔ اب جگت ''کال بیک'' کر رہا تھا۔

میں نے اپنی نگاہ یوسف پر رکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ جگت کی آواز آئی۔ ''ہیلو...... کون؟''

میں نے تصدیق کے لیے کہا۔ ''ہیلو! آپ کون ہیں؟''

''آپ کی مس کال آئی تھی۔'' جگت فوری طور پر میری آواز نہیں پہچانا۔

اب تصدیق ہو چکی تھی کہ یہ جگت ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''جگت! میں تابش بول رہا ہوں۔ بندۂ خدا کہاں ہو تم؟ پچھلے دس بارہ گھنٹوں میں بہت کچھ ہو چکا ہے۔''

''یہاں بھی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے بادشاہ زادے! دماغ کی بینڈ بج گئی ہے۔ تیرا اپنا موبائل فون کہاں ہے؟''

''وہ سرداروں کی حویلی میں رہ گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟ تو خود نہیں ہے سرداروں کی حویلی میں؟''

''نہیں۔''

''یہ تو پھر بڑی چنگی گل ہے۔ وہاں تو بڑی تباہی مچی ہے۔ چھ سات بندے مرے ہیں۔ چودہ پندرہ زخمی ہوئے ہیں۔ ابھی تک آگ لگی ہوئی ہے وہاں۔ پر تم اس ویلے کہاں ہو اور چھوٹی تو خیر خیریت سے ہے نا؟''

''ہاں...... خیریت سے ہے۔ ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ سرداروں کے لوگ ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزار لی ہے ہم نے، پر دن نہیں گزرے گا۔ تم کسی طرح ہم تک پہنچو۔''

''لے بادشاہ زادے! تُو نے کہا اور سجن پہنچ گئے۔ تُو ذرا اپنے آلے دوالے کے بارے میں بتا...... اور اگر کوئی نشانی بھی آس پاس ہے تو اس کے بارے میں بھی ٹوہ دے مجھ کو۔''

ہم ذرا بلندی پر تھے۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ دور کچھ فاصلے پر ایک بھٹا خشت کا کھنڈر سا نظر آیا۔ میں نے اس بارے میں جگت سنگھ کو بتایا۔ وہ بولا۔ ''میرے خیال میں یہ ایک نہیں دو بھٹے ہوں گے۔ ذرا غور سے دیکھ میرے شہزادے۔'' میں نے انکار میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ''نہیں...... نہیں دو ہوں گے۔ ذرا آگے پیچھے ہو کے دیکھ۔''

میں نے تھوڑا سا دائیں بائیں ہو کر دیکھا۔ جگت سنگھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ دوسرے بھٹے کا مینارہ پہلے بھٹے کی بالکل اوٹ میں ہو گیا تھا۔ یہ دونوں بھٹے نہ جانے کتنی مدتوں سے بند پڑے تھے۔ میں نے جگت کو بتایا کہ میں نے دوسرا بھٹا بھی دیکھ لیا ہے۔

وہ جوش سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا لیکن اب ایک کام کرنا ہے تم نے۔ جہاں پر ہو، وہاں سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہلنا نہیں ہے۔ یہاں ہر جگہ سرداروں کے بندے گھوم رہے ہیں۔ روک روک کر لوگوں کی تلاشیاں لے رہے ہیں اور ان کو بے عزت کر رہے ہیں۔ ہم بڑے طریقے سے پہنچیں گے یہاں۔ بس تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور ایک گل تو میں بھول ہی گیا۔ چھوٹی کا پتی ملا ہے یا نہیں؟''

''ہاں مل گیا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں یوسف کو دیکھ کر کہا جو ابھی تک گھاس پر چت پڑا تھا۔

''مبارکاں...... بہت بہت ودھائیاں۔ واہگرو نے تم کو سپل کیا ہے۔ چھوٹی تو اب خوش ہے نا؟''

''ہاں...... ہاں خوش ہے...... بس اب تم آنے والی بات کرو۔''

''سمجھو کہ ہم چل پڑے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے تم تک۔''

○......❖......○

اگلا ڈیڑھ گھنٹہ بڑے اضطراب میں گزرا۔ یہاں بھی ایک گولی چل گئی تھی۔ ڈر تھا کہ اس گولی کی آواز جگت سنگھ سے پہلے ہی سرداروں کے ہرکاروں کو یہاں نہ پہنچا دے۔ میں نے یوسف اور ثروت کو دوبارہ درختوں کی قدرتی جھونپڑی میں بھیج دیا تھا اور خود باہر پہرا دے رہا تھا۔ ثروت اندر یوسف کا خون آلود چہرہ دھلا رہی تھی۔ دراصل یوسف رات ہی سے کسی موقع کی تاک میں تھا۔ تھکن کے سبب جب مجھے کچھ دیر کے لیے نیند آئی تو شکاری اجو سنگھ والا پستول میری پینٹ کی جیب سے پھسل کر گھاس پر گر گیا۔ تب تک اُجالا ہو چکا تھا۔ پستول یوسف کو نظر آ گیا۔ یہ موقع اس کے لیے بڑا غنیمت تھا۔ اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

قریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ جگت سنگھ ہمارے آس پاس پہنچ چکا ہے۔ درختوں میں کچھ لوگوں کے حرکت کرنے کے شواہد تھے۔ پھر جگت کی کال بھی آ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں ایک مختصر سا جلوس نظر آیا۔ دس پندرہ بندے تھے۔ دیکھنے میں یہ ارتھی کا جلوس تھا۔ چارپائی پر کوئی فربہ شخص بے سدھ لیٹا تھا۔ چھ سات افراد چارپائی کو کندھا دیتے ہوئے لا رہے تھے۔ ان میں چوڑا چکلا جگت سنگھ سب سے نمایاں نظر آیا۔ اس کا چھوٹا بھائی گوبندر بھی اس مختصر جلوس میں شریک تھا۔

وہ لوگ سیدھے ہمارے پاس پہنچے اور ذرا دم لینے والے انداز میں چارپائی درختوں کے نیچے رکھ دی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جگت سنگھ میرے پاس آیا۔ میرے چہرے کی چوٹوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ''اوئے! یہ کیا کیا ہے بادشاہ زادے! یار بیلی ہر چیز رل مل کر کھاتے ہیں، تم نے اکیلے اکیلے ہی مار کھا لی اور وہ بھی پیٹ بھر کے۔''

''بس ہو گیا تھا کچھ ایسا...... اور یہ چارپائی پر کون ہے؟''

''ہے ایک مریض...... ڈاکٹروں نے لاجواب کر کے ہسپتال سے واپس بھیج دیا ہے،

اس کو اس کے پنڈ پہنچانا ہے۔ پر تُو بتا، چھوٹی اور اس کا پتی کہاں ہیں؟''

''اندر......ان ٹہنیوں کے نیچے۔'' میں نے قدرتی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا پتی ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟ میرا مطلب ہے کوئی چوٹ شوٹ؟''

''نہیں......کوئی ایسی خاص نہیں۔''

''پھر تُو اتنا چپ چپ کیوں ہے؟ کوئی خوشی نہیں ہے تیرے چہرے پر؟''

''تیرا کیا خیال ہے؟ مجھے قہقہے لگانے چاہئیں...... یار! ہم جانی دشمنوں کے گھیرے میں ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے ہمارے ساتھ۔''

''اوہ......اب کچھ نہیں ہو گا میرے جگر کے ٹوٹے۔ آپاں (ہم) آ گئے ہیں نا۔ سب سنبھال لیں گے۔''

''یہ چارپائی پر واقعی کوئی مریض ہے یا ڈرامہ کیا ہے؟''

جگت دھیمی آواز میں بولا۔''مریض بھی ہے اور ڈرامہ بھی۔ یہ بندہ واقعی کینسر کا مریض ہے۔ دلی کے ڈاکٹروں نے لاعلاج کر کے بھیج دیا ہے۔ یہ لوگ اسے واپس پنڈ لے جا رہے ہیں چارپائی پر ڈال کر۔ ترشولا سے تین چار میل آگے تک ٹریکٹر ٹرالی پر آئے ہیں، اب پیدل جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بندہ گوبندر کا واقف نکل آیا ہے۔ دراصل یہ اسی پنڈ کے ہیں جہاں گوبندر کا رشتہ ہونے والا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ آپ لوگوں کی مدد بھی ہو جائے گی۔''

''اسلحہ وغیرہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

جگت سنگھ نے اپنی ڈبی دار سوتی چادر کی بکل ذرا سی کھولی۔''یہ دیکھ...... یہ ہے تیری لاڈلی ایل ایم جی۔ اس کی گولیاں وکھرے تھیلے میں ہیں فروٹ کے نیچے۔ دو اور رائفلیں بھی ہیں، وہ بھی اسی طرح بکلوں میں ہیں۔ دو تین پستول بھی ہیں یار لوگوں کے پاس۔ اس کے علاوہ آدھی درجن کالے انار ہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کتنے لوگ ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم گوبندر سمیت کل نو بندے ہیں۔ اگر کہیں سرداروں سے ٹاکرا ہو گیا تو دیکھنا چھکے چھڑا دیں گے۔ پر یارا! تُو نے بتایا نہیں تیرے موبائل پر رات کو بول کون رہا تھا؟''

''وہ اوتار کا بیٹا ہری سنگھ تھا۔ اس وقت انہوں نے مجھے پکڑا ہوا تھا۔''

''لگتا ہے کہ لمبی اسٹوری ہے۔ چل پھر پنڈ پہنچ کر ہی سنیں گے۔''

مریض کے وارثوں کے پاس کھانے پکانے کے برتن، بستر اور کپڑے وغیرہ بھی تھے۔

یہ سامان وہ ہسپتال میں قیام کے دوران میں استعمال کرتے رہے تھے۔ دور دراز دیہات میں رہنے والے لوگ اسی طرح بمع فیملی ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ میرے اور یوسف کے کپڑے بہت خستہ حال تھے۔ میری شرٹ پر خون کے بڑے بڑے داغ بھی تھے۔ گوبندر سنگھ نے مریض کے لواحقین کو بتایا کہ کچھ بدمعاشوں نے ہم دونوں کو مارا پیٹا ہے اور ہمارے حلیے خراب کیے ہیں۔ گوبندر کے کہنے پر ان لوگوں نے دو جوڑے ہمیں فراہم کر دیئے جو میں نے اور یوسف نے پہن لیے۔ یہ قریباً ہمارے ناپ ہی کے تھے۔ دراصل دھوتی کا تو کوئی ناپ ہی نہیں ہوتا، کُرتے ہمیں ٹھیک آئے۔ جگت نے ثروت کو ایک لمبی دیہاتی چادر فراہم کر دی جس نے اسے سرتاپا چھپا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم جگت اور گوبندر کے ہمراہ چارپائی کے پیچھے پیچھے روانہ ہو رہے تھے۔ جگت اور اس کے ساتھی باری باری چارپائی کو کندھا بھی دے رہے تھے۔ جگت نے کہا تھا کہ وہ گاؤں پہنچنے تک مجھ سے میری رُوداد نہیں سنے گا مگر وہ صبر نہیں کر سکا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔''یارا! وہاں حویلی میں تو بڑا کہرام مچا ہے۔ پتا چلا ہے کہ سردار اوتار سنگھ کی دھی کا معاملہ تھا۔ وہ کسی پاکستانی منڈے سے پریم کرتی تھی۔ کوئی سکھ منڈا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھاگ کر پاکستان بھی چلی گئی تھی۔ پر یہ لوگ اسے واپس لے آئے۔ اب زورازوری اس کا ویاہ کر رہے تھے۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی ننکانہ صاحب والا معاملہ تھا جس کا تھوڑا سا تذکرہ کریانہ فروش لطیف نے کیا تھا۔

میں نے کہا۔''ہاں جگت! کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ اب کیا حالات ہیں، کچھ پتا چلا ہے لڑکی کے بارے میں؟''

''بس یہی کہ نہال برادری کے لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب وہ کچھ دن اسے کہیں چھپا کر رکھیں گے، پھر ہو سکتا ہے، کسی طرح پاکستان بھیج دیں یا وہ منڈا یہاں آ جائے اور لڑکی کے ساتھ پھیرے کر لے۔ وہ نہال برادری کا ہی منڈا ہے۔ نہالوں کے کچھ رشتے دار یہاں انڈیا میں ہیں، کچھ پاکستان میں۔''

''اور کیا پتا چلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس وہی خون خرابے کی باتیں ہی ہیں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔''اس لڑائی میں نہالوں کے تین اور سرداروں کے چار بندے مارے گئے ہیں۔ مرنے والوں میں لڑکی کا دادا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ کس کی گولی سے مرا ہے۔ حویلی کا بھی کافی نقصان ہوا ہے۔ کچے حصے

میں چھتیں گر گئی ہیں۔ پکے حصے میں دیواروں میں تریڑیں پڑ گئی ہیں۔ دو تین تھانوں کی پولیس بھی آ گئی ہے وہاں۔ لیکن تم بتاؤ، تم کیسے نکلے وہاں سے؟''

''بس اسی بھگدڑ اور افراتفری میں ہمیں نکلنے کا موقع مل گیا۔''

''تم کہتے ہو کہ تمہیں سردار اوتار نے پکڑ لیا تھا؟''

''ہاں...... وہی یوسف والا چکر جو تمہیں کل بتایا تھا۔ ان کمینوں نے یوسف کی گاڑی کے نیچے بارود لگایا ہوا تھا۔ ڈائنامیٹ کے سات آٹھ ڈنڈے تھے۔ تمہارے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے سب کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ اب یوسف کی جان چلی جائے گی تو میں نے گاڑی کے نیچے گھس کر بارود اُتار لیا۔ اس دوران میں پہرے داروں نے مجھے دیکھ لیا اور پکڑ لیا۔ بہت سے مہمان موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ سردار اوتار نے بات بنائی کہ بارود ''میں نے'' گاڑی کے نیچے لگانے کی کوشش کی ہے۔ میرے بعد ثروت کو بھی پکڑ لیا گیا۔'' میں نے ساری بات جگت کو بتائی۔

وہ بڑی حیرت سے سنتا رہا۔ اس بات پر وہ سخت افسردہ نظر آیا کہ یوسف میرا احسان مند ہونے کے بجائے مجھے شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کچھ ناراض بھی ہے۔

جگت بڑا جہاندیدہ شخص تھا۔ وہ بہت پہلے سے جان چکا تھا کہ میرا ثروت کا جذباتی تعلق موجود ہے۔ اس نے جو پور میں مجھ سے اس کی تصدیق بھی کرنی چاہی تھی مگر میرے خشک جواب کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ اب بھی وہ ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جگت! یہ جو کچھ بھی ہے، ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بارے میں تم یوسف یا ثروت سے کوئی بات نہیں کرو گے اور اگر تم نے کی تو پھر میرا تمہارا تعلق بالکل ختم۔''

اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ تاہم وہ پُرتحمل انداز میں بولا۔ ''بادشاہ زادے! تجھے کہا ہے نا، آپاں یاروں کے یار ہیں۔ جو یار نے کہہ دیا، وہ پتھر پر لکیر ہو گیا۔ آپاں اس بارے میں جیتے جی زبان نہیں کھولیں گے۔ باقی تمہاری ساری کہانی بڑی چنگی طرح سمجھ میں آ گئی ہے اور کہانی بھی کون سی نئی ہے۔ وہی سدا کا رونا۔ پریم...... وچھوڑا...... شادی اور پھر وہی جیون کا روگ۔''

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''گوبندر کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔''

''نہیں بتاؤں گا۔''

''وچن ہے؟''

''وچن ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ایک جگہ ہمیں چند مسلح گھڑ سوار نظر آئے۔ ان کی رنگ برنگی پگڑیاں گھوڑوں کی چال کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ اندیشہ تھا کہ یہ سرداروں کے ہرکارے ہیں۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے مجھے اور یوسف کو اپنے درمیان کر لیا۔ یوسف کے حلیے کو مزید تقویت دینے کے لیے اس کے سر پر سامان کی ایک گٹھڑی بھی رکھ دی گئی۔ گھڑ سوار ہمارے قریب سے ہمیں گھورتے ہوئے گزرے۔ ایک شخص نے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''لنگڑی پورہ۔'' جگت سنگھ نے جواب دیا۔

''رستے میں کوئی شہری بندہ تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں جی۔'' جگت نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

''کوئی شہری کڑی؟''

''نہیں چودھری جی۔''

گھڑ سوار کچھ مزید قریب آ گئے۔ وہ شکلیں دیکھ رہے تھے۔ چادر کے نیچے میرے ہاتھ بے ساختہ رائفل کے دستے کی طرف رینگ گئے۔ یقیناً جگت وغیرہ بھی الرٹ ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں چارپائی پر لیٹا ہوا مریض بُری طرح کھانسنے اور اُبکائیاں لینے لگا۔ اسے اُٹھانے والوں نے چارپائی نیچے رکھ دی اور پانی وغیرہ پلانے میں مصروف ہو گئے۔ گھڑ سوار گھوڑے دوڑاتے اور مٹی اُڑاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

جگت سنگھ نے کہا۔ ''یہ سرداروں کے پالتو کتے تھے۔ مجھے پورا وشواس ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پولیس والے ہوں، سادہ کپڑوں میں۔''

''نہیں یار! پولیس یا بی ایس ایف والے کو میں ایک میل دور سے دیکھ کر پہچان لیتا ہوں۔''

''اور چھ میل دور سے اس کی بُو سونگھ لیتے ہیں بھا جی۔'' گوبندر نے بڑے بھائی کا فقرہ مکمل کیا اور من موجی انداز میں مسکرانے لگا۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ رات کو مجھ سے فون پر رابطہ کرنے والا بھی کوئی انسپکٹر نہیں سرداروں کا ہی کارندہ تھا۔

○......❖......○

ہم جس گاؤں میں پہنچے اس کا نام عجیب تھا۔ لنگڑی پورہ...... پنجاب کے دیہات میں

اکثر نام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہم جس گھر میں اُترے، وہ جگت کے چھوٹے بھائی گوبندر کا ہونے والا سسرال تھا۔ اس گھر میں گوبندر کی ہونے والی بیوی رجنی کور اور اس کی بوڑھی ماتا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ رجنی کور بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود شہری رنگ ڈھنگ کی لڑکی تھی۔ والدہ کی نظر خاصی کمزور تھی اور وہ دن کے وقت بھی بمشکل دیکھ پاتی تھی۔ میں نے جگت سے مشورہ کر کے ثروت اور یوسف کو گھر کا اندرونی کمرا دیا۔ آج سویرے والے واقعے کے بعد میں یوسف پر اعتبار کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں نے جگت سے بھی کہہ دیا تھا کہ گھر میں یوسف کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے۔

جگت کے باقی ساتھی جو صورتوں سے ہی مار دھاڑ کرنے والے لوگ نظر آتے تھے، ایک پڑوسی گاؤں میں چلے گئے تھے۔ یہاں ہمارے علاوہ صرف گوبندر اور جگت ہی تھے۔ پھر گوبندر بھی چلا گیا۔ میں نے جگت سے پوچھا۔ ''وہ کہاں گیا ہے؟''

جگت وہسکی کے پوے میں سے گھونٹ بھر کر بولا۔ ''جو پور۔ کل سویرے تک آجائے گا۔''

''خیریت ہے؟''

''آہو یار! وہ آشا کو لینے گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں آٹھ دس دن یہاں رہنا پڑے۔ گوبندر کی ہونے والی ووہٹی تو امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ ہماری روٹی شوٹی کون پکائے گا؟''

پتا نہیں کہ گوبندر کو اس طرح کے موقع ویسے ہی مل جاتے تھے یا جگت جان بوجھ کر دے دیتا تھا۔ اب جگت یہاں تھا اور گوبندر آشا کو لینے گیا ہوا تھا۔ رات کو ان دونوں نے اکیلے ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع ان دونوں ''چور پریمیوں'' کے لیے بڑے قیمتی تھے۔

مجھے یہ ساری فیملی ہی کچھ کھلی ڈلی لگتی تھی۔ کہنے کو یہ لوگ دیہاتی تھے لیکن شہریوں سے زیادہ ایڈوانس نظر آتے تھے۔ گاؤں میں اپلے تھاپنے والی لڑکیوں کے پاس بھی موبائل موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سیل فون اور اس سے وابستہ قباحتوں کے حوالے سے انڈیا، پاکستان سے بھی آگے ہے۔ رجنی کور قلانچیں بھرتی ہوئی آئی اور اپنا گورا چٹا کندھا جگت سنگھ کے سامنے عریاں کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو وڈے بھا...... آپ کے لاڈلے بھرا نے کیا کیا ہے؟''

کندھے پر گہرا نیل نظر آ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے رجو؟'' جگت نے پوچھا۔

یہ چونڈی کاٹی ہے آپ کے لاڈلے نے۔ مجھ سے کہتا تھا اوپر چھت پر آؤ۔ میں نہیں

مانی تو چونڈی وڈ کر چلا گیا۔''

جگت سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ وہ ٹھنک کر بولی۔ ''آپ ہنس کر ٹال دیتے ہیں، اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ پر اتنا ظلم کرتا ہے، بعد میں کیا کرے گا۔ پچھلی بار ایویں میں نے کہہ دیا تم اتنے بڑے کھلاڑی ہو، مجھے بھی تھوڑی سی جوڈو سکھا دو۔ چھت پر لے گیا اور ایسے شکنجہ لگایا مجھے کہ میرا ساہ رُکنے لگا۔ بے بے نے مشکل سے جان بچائی میری۔'' جگت ہنس ہنس کر سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بولتی جا رہی تھی۔ بڑی شوخ تھی۔ میرے دل سے ہوک سی اُٹھی۔ کوئی دن تھے کہ ثروت بھی ایسے ہی ہوا کرتی تھی۔

جگت نے بہت کہا کہ میں اپنے سر کی چوٹ کا کچھ کروں لیکن مجھے ان چوٹوں کی طرف سے غافل رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ رات کا کھانا رجنی اور ثروت نے مل کر بنایا۔ تاہم کھانا سرو کرنے کے لیے رجنی ہی آئی۔ ثروت اپنا اور یوسف کا کھانا کمرے میں لے گئی تھی۔ رجنی میرے سامنے ماش کی دال اور دیسی گھی کا پراٹھا رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ خاص آپ کے لیے ہے ویر جی! ثروت دیدی کہہ رہی تھیں کہ آپ شوق سے کھاتے ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ بھوک کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے جگت سنگھ اور رجنی کا ساتھ دینے کے لیے بس ایک دو لقمے زہر مار کیے۔ رجنی ٹھنک کر بولی۔ ''آپ کھا کیوں نہیں رہے؟ ثروت دیدی کہہ رہی تھیں، آپ نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

''ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ بھوک ہوئی تو خود کہہ دوں گا۔''

''کہیں آپ میں اور ثروت دیدی میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟ آپ ایک دوجے کی طرف دیکھ کر بات بھی نہیں کرتے۔''

جگت سنگھ نے ذرا گھور کر رجنی کو دیکھا تو وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے مزید سوال جواب سے بچنے کے لیے میں اُٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

حسبِ عادت بستر کے بجائے ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ جسم پھوڑا بنا ہوا تھا۔ اسے نرم بستر اور دوا دارو کی ضرورت تھی لیکن میں ایسی آسائشوں کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد جگت سنگھ بھی میرے پاس چلا آیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ''بادشاہ زادے! کچھ اور نہیں تو یہ اپنے سر کے پھٹ پر ہی کوئی مرہم پٹی کروالو۔''

''نہیں...... خود ہی ٹھیک ہو جائے گا اور دیکھنا جلدی ٹھیک ہوگا۔''

''تم دکھری ٹائپ کے بندے ہو۔ لگتا ہے کہ کوئی جنگل واسی آبادی میں آ کر رہنے لگا ہے۔ شاید تم جان بوجھ کر اپنے شریر کو تکلیف میں رکھتے ہو۔ شریر کو اور من کو بھی۔''

"کیا مطلب؟"

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر وہسکی کا ایک آتشیں گھونٹ لیا اور بولا۔ "بادشاہ زادے! تجھے بڑا پسند کرنے لگا ہوں میں۔ سمجھ لے تجھ سے کوئی عشق سا ہو گیا ہے۔ کسی بڑے کی طرح تیری عزت بھی کرتا ہوں۔ یار بیلی کی طرح تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں اور وڈے بھرا کی طرح تجھ پر لاڈ بھی آتا ہے۔ ایک گل کرنا چاہتا ہوں تجھ سے...... بُرا نہ ماننا۔"

میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "کہو۔"

"بادشاہ زادے! دنیا دیکھی ہے میں نے۔ جس دن میں نے تجھے اور چھوٹی کو دیکھا تھا، اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم پریمی ہو یا پھر کسی وقت پریمی رہے ہو۔ اب میں نے چھوٹی کے پتی دیو کو بھی دیکھ لیا ہے اور اس سے باتیں شاتیں بھی کر لی ہیں۔ اتنی جلدی کسی بندے کے بارے میں ٹھیک اندازہ تو نہیں لگایا جا سکتا پر میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ بندہ چنگی طبیعت کا نہیں ہے۔ میں نے جو پور میں بھی تجھے اس کے بارے میں بتایا تھا نا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"وہی اس کے لچھن، اس کا بڑی مہنگی طوائف کے ساتھ رات گزارنا اور پھر اس پر بالکل لاٹو ہو جانا۔ اسے منہ مانگی رقم پر اپنے حق میں بٹھانے کی گل کرنا اور یہ تو اس کا بس ایک ہی کارنامہ ہے نا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کئی اور بھی گل کھلار کھے ہوں......"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو جگت؟"

وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ "یارا! یہ چھوٹی بڑی معصوم ہے۔ بالکل کبوتری کی طرح ہے۔ یہ ایسے جنگلی بلے کے ساتھ جیون کیسے گزارے گی؟ ابھی تو ان کے ویاہ کو بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کوئی بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے ان کا۔ یہ اپنے اپنے رستے وکھرے کر سکتے ہیں۔"

"وہ عاقل بالغ ہے جگت! وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے۔"

"بادشاہ زادے! فیصلے تو وہ تب کرے گی نا جب اس کو کچھ پتا ہو گا۔ وہ تو انجان ہے۔ تمہیں پتا ہے اور تم کچھ بتاتے نہیں ہو۔ یہ تو کوئی گل نہیں یار! ایک سجن پیارا اندھے کھوہ میں گرنے والا ہو، ہمیں پتا بھی ہو اور ہم اسے کچھ بتائیں نہ...... اسے روکنے کی کوشش نہ کریں۔"

میں نے کہا۔ "یار! وہ اتنی انجان بھی نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ اندازہ ہے اسے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اسے سب کچھ پتا چل جائے تب بھی وہ شاید اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔ وہ شوہر پرستی میں بہت آگے نکلی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف سوچنے کو بھی گناہ سمجھتی ہے۔"

"لیکن میری بات کا بُرا نہ ماننا...... وہ تم سے پریم بھی کرتی ہے۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

"وقت نے ان دو آنکھوں کو بہت کچھ دکھایا ہے بادشاہ زادے! چہرے اور من کے کنکشن کی بڑی جانکاری ہے آپاں کو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ اس کے مضبوط دانت تھوڑا اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے جو اس کی سخت جانی اور جسمانی طاقت کے غماز تھے۔

"ہر بندے کے بارے میں ہر اندازہ درست ثابت نہیں ہوتا جگت سنگھ۔"

"پر کچھ بکھیڑے ایسے ہوتے ہی یارا جو ہر جگہ، ہر ملک میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ "پتی پتنی اور...... وہ" والا بکھیڑا بھی ایسا ہی ہے۔ بڑی پُرانی اسٹوری ہے۔ میں نے ان دو چار دنوں میں بڑا کچھ دیکھ لیا ہے یارا! یہ یوسف ان شوہروں میں سے ہے جو خود تو اپنے آپ کو ہر کام کے لیے آزاد سمجھتے ہیں لیکن اپنی پتنیوں کی ذرا ذرا سی بات پر شک کرتے ہیں اور جب شک کرنے کا چنگا بھلا کارن بھی ہو تو یہ شک اگ کا بھانبڑ بننے لگتا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو، تم نے لاہور سے انڈیا تک کا سفر "چھوٹی" کے ساتھ کیا ہے۔ کیا ہے یا نہیں؟ رات دن اس کے ساتھ رہے ہو۔ میرے گھر بھی اکٹھے ایک کمرے میں رہتے رہے ہو۔ یہ ساری باتیں چھوٹی نے اسے بتائی ہوئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ان باتوں کے لیے اسے شما کرے گا۔ ان کا جیون اور بھی کٹھنائی میں پڑنے والا ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "جگت! مجھے تمہاری عقل سمجھ پر شک نہیں۔ پر میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ اور طرح کا معاملہ ہے۔ تمہاری چھوٹی کے دماغ میں کچھ ایسے وہم بیٹھ گئے ہیں جن کو نکالنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ تم اس بارے میں سوچ کر خوامخواہ اپنا دماغ پولا مت کرو۔ تم اگر کر سکتے ہو تو کسی طرح میرے لیے ایک کام کر دو۔"

"میرے سوہنے! تُو ترلا منت کرتا ہے تو میں زمین میں دھنس جاتا ہوں۔ تُو ایسا مت کیا کر۔ بس آرڈر دیا کر مجھے۔ بتا کیا کرنا ہے؟"

"کسی طرح ہمیں پاکستان واپس بھیجنے کا وسیلہ کر دے۔ میں جانتا ہوں، بارڈر کے آر پار تیرے جاننے والے ہیں۔ بی ایس ایف والوں سے بھی تیرا لنک ہے۔ کچھ ایسا کر کہ ہم جس طرح آئے ہیں، اسی طرح واپس چلے جائیں۔"

وہ اُداس ہو گیا۔ "تو تُو واپس چلا جائے گا؟"

"اوئے تُو بھیجے گا تو جاؤں گا نا۔"

"اب تُو نے آرڈر کر دیا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

''لیکن جو کچھ کرنا دل سے کرنا۔'' میں نے کہا۔

''اوئے ظالماں! دل سے ہی کروں گا۔ پر ابھی نہیں۔ ابھی چھ سات دن ہمیں بالکل چپ چاپ رہنا پڑے گا۔ باہر والا معاملہ کچھ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر کچھ ہتھ پیر ہلاتے ہیں۔''

''اچھا یار! کسی طرح پاکستان سے کوئی ٹیلی فون کا رابطہ نہیں ہوسکتا؟''

''ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔ تھوڑا سا خرچے والا کام ہو گا لیکن کوئی گل نہیں۔ میں پتا کر لیتا ہوں۔'' جگت نے کہا۔

''ہاں...... میں نے تمہیں ایک اور کام کہا تھا جگت! راجا کا کچھ پتا چلا یا نہیں؟''

''یارا! ابھی تک کوئی ٹھوس بات تو معلوم نہیں ہوئی۔ یہ جانکاری ملی ہے کہ انور گنجے کی پیلی حویلی سے تین چار فرلانگ دور تم لوگوں کی جیپ بند ہو گئی تھی اور وہاں پر جھڑپ ہوئی تھی۔ وہاں دو بندے زیادہ پھٹڑ ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی حالت خراب تھی۔ اسے شاید ہارون آباد بھیجا گیا تھا۔ اب یہ پتا نہیں کہ وہ تمہارا بندہ تھا یا چودھریوں کا...... اگر میں اب تک جو پور میں ہوتا تو کوئی کھوج کھرا لگا چکا ہوتا لیکن اب میں یہاں آ گیا ہوں۔''

میں نے جگت کو ٹیلی فون کا انتظام کرنے کو کہا تھا۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کا حل نکال لے گا۔ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ وہ ایک موبائل سیٹ لے کر آ گیا۔ اس میں کافی بیلنس بھی موجود تھا۔ جگت نے بتایا کہ وہ میری خاطر سویرے چھ بجے کا یہاں سے نکلا ہوا ہے۔ ایک ساتھ والے گاؤں میں اس کا ایک شہری دوست رہتا ہے۔ یہ اسی کا موبائل ہے اور میں اس کے ذریعے پاکستان میں چھوٹی سی کال کر سکتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''یہ کال کسی اور ملک کے رستے پاکستان جائے گی۔ لمبا چکر کاٹے گی اس لیے کافی ''پیٹرول'' خرچ ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں۔ تم بس پرارتھنا کرو کہ رابطہ ہو جائے۔ رابطہ ہو گیا تو وہ لوگ مجھے خود ہی کال کر لیں گے۔''

میں نے عمران کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی دو کوششیں ناکام ہوئیں۔ تیسری کوشش کا رزلٹ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا منہ بولتا ثبوت تھا اور ایسے ثبوت اس اکیسویں صدی میں ہمیں اکثر ملتے ہی رہتے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے اس دور دراز گاؤں کے اس تاریک کمرے میں سے میں نے جو کال کی، وہ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتی اور کن سرحدوں کا چکر کاٹتی پاکستان پہنچی اور اس نے کروڑوں لوگوں میں سے اس شخص کو ڈھونڈ لیا جس کی آواز میں سننا چاہتا تھا۔ پہلے عمران کے نمبر کی مخصوص بیل ہوئی۔ اڈی اڈی جانواں ہوا دے نال۔ پھر کال ریسیو

ہوئی۔ شور سے ندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی میں ہے اور کسی سڑک پر رواں ہے۔ وہ عمران کی زندگی بخش آواز تھی۔ ''ہیلو! کون؟''

''میں تابش بول رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چلایا۔ ''او شاہین! ذرا میرے بازو پر چٹکی تو کاٹنا۔ کہیں میں کوئی سندر سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔''

اس کا مطلب تھا کہ وہ اور اس کی گرل فرینڈ شاہین کسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''عمران! میں اس وقت تمہاری مزاحیہ باتوں کا مزہ بالکل نہیں لے سکتا۔ بہت سیریس حالات ہیں۔ میں یہاں انڈیا میں فرید کوٹ کے قریب لنگڑی پورہ نام کے گاؤں میں ہوں۔ میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ اس نمبر پر مجھے فون کرو فوراً......''

میں نے اسے نمبر لکھوایا اور فون بند کر دیا۔

اس تھوڑی سی گفتگو میں ہی بیلنس کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ میں نے وہ موبائل فون آن کر لیا جو شکاری چھوڑ کر بھاگے تھے۔ اس کی سم ابھی تک بلاک نہیں ہوئی تھی۔ جعلی پولیس انسپکٹر کی کال کے علاوہ اس پر کوئی کال بھی نہیں آئی تھی۔ ابھی میں نے عمران کو اسی موبائل کا نمبر لکھوایا تھا۔

پانچ منٹ بعد ہی اس فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا اور دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ گئیں۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ اپنے پوسٹ پیڈ نمبر سے کال کر رہا تھا۔

''ہیلو تابی! کہاں ہو؟'' وہ بہت جذباتی لہجے میں بولا۔ ''تم نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔ شیخ (جیلانی) اور اقبال دیوانوں کی طرح تمہیں ہارون آباد اور فقیر والی میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تم خیر سے انڈیا میں بیٹھے ہو۔ ثروت اور راجا تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟''

''ثروت تو ٹھیک ہی ہے لیکن راجا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہاں پیلی حویلی سے نکلتے ہوئے ٹھیک ٹھاک فائرنگ ہوئی تھی۔ راجا زخمی ہو گیا تھا۔''

''اس فائرنگ کا تو ہمیں بھی پتا چل چکا ہے۔ کرشمہ کپور کی موت کی اطلاع بھی ہے لیکن تمہیں تو بھاگ کر ہارون آباد یا لاہور کی طرف آنا چاہیے تھا، تم ہنومان کے دیس کیسے جا پہنچے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے عمران۔ چودھری انور کے پالتو کتوں نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ ہم غلطی سے بارڈر کی طرف نکل گئے تھے۔ بارڈر کے پاس چودھری کے غنڈوں سے ہماری بڑی سخت جھڑپ بھی ہوئی۔ ان سے پیچھا چھڑا کر میں اور ثروت ایک جگہ چھپ گئے۔ صبح ہمیں پتا چلا

کہ ہم انڈیا میں ہیں۔ یہ طویل رُوداد ہے یار! اس میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو؟''

''یار! بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگا سکتا ہوں اور اس دوران میں تین قلابازیاں بھی کھا سکتا ہوں۔ ریوالور کے چیمبر میں ایک یا دو گولیاں رکھ کر اور چرخی گھما کر خود پر فائر بھی کر سکتا ہوں۔ اس جانبازی کے بڑے فائدے ہیں جگر! یہ شاہین اسی امید پر مجھ سے چمٹی رہتی ہے کہ میں نے کون سا زیادہ جینا ہے۔ کسی نہ کسی دن تو چرخی غلط گھومے گی اور گولی چلے گی۔ جونہی یہ بیوہ ہوگی، کروڑوں کی جائیداد اسے مل جائے گی اور ایک چلا چلایا نیوز چینل بھی۔''

شاہین کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ عمران کے لتے لے رہی تھی۔ عمران چہکا۔ ''سن لیا نا تم نے...... یہ ابھی سے نیوز چینل کی سینئر اینکر پرسن لگنے لگی ہے۔ نئے رواج کے مطابق اینکر پرسن بننے کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے، وہ ہے لمبی سانس۔ دراصل ٹاک شوز میں اصل مقابلہ تو لمبی سانس کا ہی ہوتا ہے۔ مخالف فریق کو بولنے کا موقع تب ہی ملتا ہے جب آپ کی سانس ٹوٹتی ہے۔ جب آپ سانس ہی نہیں لیں گے تو وہ بولے گا کیسے؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب لمبی سانس والے غوطہ خور بھی اینکر پرسن بن رہے ہیں اور ٹاک شوز میں مہمان آ رہے ہیں۔ ایک نجی ٹی وی کے شوز میں حصہ لینے والا ایک غوطہ خور مہمان اتنا مشہور ہوا ہے کہ لوگ اش اش کر رہے ہیں۔ وہ پروگرام شروع ہونے کے فوراً بعد بولنا شروع کرتا ہے اور چوتھے ''بریک'' سے پہلے سانس نہیں لیتا۔ اس کے بعد وہ اکثر بے ہوش ہو جاتا ہے اور باقی کا پروگرام اسے سنبھالنے میں گزر جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا...... اب تمہیں بھی بے ہوش ہونا ہے یا میری بات سننی ہے؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''واقعی جگر! چکر تو مجھے بھی آ گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کیا کر سکتے ہو؟ ہمیں پاکستان واپس لانے کے لیے؟''

''یار! تم پاکستان واپس لانے کی بات کرتے ہو، تم حکم کرو تو انڈیا کو ہی پاکستان بنا دوں۔ لیکن پہلے مکمل معلومات تو دو کہ میرا یار کس حال میں ہے۔ کیا واقعی شیر لوہے کے جال میں ہے؟''

''لوہے کے نہیں، فولاد کے جال میں۔ بڑے سخت لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ بڑی زہریلی قسم کی سردار فیملی ہے اوپر سے جاوا گروپ کا ڈر بھی ہے۔''

''یار! جاوا کا نام لے کر تم نے میرا خون گرما دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ للکارا مار کر انڈیا

کی فلم انڈسٹری میں گھس جاؤں اور امیتابھ بچن سمیت سارے ڈانوں کا صفایا کر دوں۔''

شاہین کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''خبردار! امیت کا نام لیا تو، وہ میرے فیورٹ ہیں
ویسے بھی وہ اصل نہیں فلمی ڈان تھے۔''

''گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے راج کماری۔ اس سنگل پسلی، لمبے بانس کو ک
نے کہا تھا کہ ڈان بنے۔ ڈان تو ہوتا ہے اپنے مصطفیٰ قریشی اور شفقت چیمہ جیسا یا پھر ا
تابش جیسا۔ شکل دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ قتل کیے ہیں اور عزتیں وغیرہ لوٹی ہوئی ہیں۔''

''کیا میں فون بند کر دوں؟''

دھمکی کارگر رہی۔ وہ پٹڑی پر آ گیا۔ میں نے اسے مختصر طور پر سارے واقعات سے آگ
کیا اور دیگر حالات بتائے۔ یہ جان کر وہ حیران ہوا کہ یوسف بھی انڈیا پہنچ چکا ہے۔ وہ بولا
''یار! کتنا اچھا ہوتا کہ تیرے اس رقیب روسیاہ کو گمشدگی راس آ جاتی۔ کہیں ایسا گم ہوتا کہ
تاریخ میں نام لکھوایا جاتا لیکن لگتا ہے کہ آج کل کے لونڈوں کو نام کمانے کا شوق ہی نہیں
ویسے مجھے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان حضرات کو انڈیا پہنچایا کیوں گیا ہے؟''

''اس کی شکل ایک ایسے بندے سے ملتی ہے جسے کئی علاقوں کی پولیس ڈھونڈ رہی ہے
تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

میں عمران کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خود بھی سوال کر رہا تھا
مجھے دوسری طرف کے حالات کا بھی علم ہو رہا تھا۔ عمران کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مہناز ابھی
تک لاپتا ہے۔ وہ آخری بار راولپنڈی میں دیکھی گئی تھی۔ کالے شیشوں والی ایک بہت مہنگ
گاڑی میں جا رہی تھی۔ عمران کے چند ساتھی پنڈی پہنچ چکے تھے اور اس کی ٹوہ میں تھے
دوسرے لفظوں میں اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ''جلالی صاحب کا کیا حال ہے؟''

''جلالی صاحب کے بارے میں بُری خبر ہے یار! بڑے بڑے سینئر ڈاکٹر ایک دوسر
کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان کے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ جلالی صاحب
زندہ بچ گئے ہیں۔''

''زندہ بچ گئے ہیں؟''

''ہاں یار! مجھے نہیں لگتا کہ اب امریکہ انہیں زندہ چھوڑے گا۔ ان کا کوئی تحقیقی ادار
ضرور انہیں اُٹھا کر لے جائے گا اور کھوج لگائے گا کہ حیات بعد الموت کے کتنے رُخ ہیں او
اس اڑیل بوڑھے نے عزرائیل کی آمد کے وقت اپنی جان کو اپنے جسد خاکی کے کس تہ خا

کہ ہم انڈیا میں ہیں۔ یہ طویل رُوداد ہے یار! اس میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو؟''

''یار! بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگا سکتا ہوں اور اس دوران میں تین قلابازیاں بھی کھا سکتا ہوں۔ ریوالور کے چیمبر میں ایک یا دو گولیاں رکھ کر اور چرخی گھما کر خود پر فائر بھی کر سکتا ہوں۔ اس جانبازی کے بڑے فائدے ہیں جگر! یہ شاہین اسی امید پر مجھ سے چمٹی رہتی ہے کہ میں نے کون سا زیادہ جینا ہے۔ کسی نہ کسی دن تو چرخی غلط گھومے گی اور گولی چلے گی۔ جونہی یہ بیوہ ہوگی، کروڑوں کی جائیداد اسے مل جائے گی اور ایک چلا چلایا نیوز چینل بھی۔''

شاہین کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ عمران کے لتے لے رہی تھی۔ عمران چہکا۔ ''سن لیا نا تم نے...... یہ ابھی سے نیوز چینل کی سینئر اینکر پرسن لگنے لگی ہے۔ نئے رواج کے مطابق اینکر پرسن بننے کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے، وہ ہے لمبی سانس۔ دراصل ٹاک شوز میں اصل مقابلہ تو لمبی سانس کا ہی ہوتا ہے۔ مخالف فریق کو بولنے کا موقع تب ہی ملتا ہے جب آپ کی سانس ٹوٹتی ہے۔ جب آپ سانس ہی نہیں لیں گے تو وہ بولے گا کیسے؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب لمبی سانس والے غوطہ خور بھی اینکر پرسن بن رہے ہیں اور ٹاک شوز میں مہمان آ رہے ہیں۔ ایک نجی ٹی وی کے شوز میں حصہ لینے والا ایک غوطہ خور مہمان اتنا مشہور ہوا ہے کہ لوگ اش اش کر رہے ہیں۔ وہ پروگرام شروع ہونے کے فوراً بعد بولنا شروع کرتا ہے اور چوتھے ''بریک'' سے پہلے سانس نہیں لیتا۔ اس کے بعد وہ اکثر بے ہوش ہو جاتا ہے اور باقی کا پروگرام اسے سنبھالنے میں گزر جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا...... اب تمہیں بھی بے ہوش ہونا ہے یا میری بات سننی ہے؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''واقعی جگر! چکر تو مجھے بھی آ گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کیا کر سکتے ہو؟ ہمیں پاکستان واپس لانے کے لیے؟''

''یار! تم پاکستان واپس لانے کی بات کرتے ہو، تم حکم کرو تو انڈیا کو ہی پاکستان بنا دوں۔ لیکن پہلے مکمل معلومات تو دو کہ میرا یار کس حال میں ہے۔ کیا واقعی شیر لوہے کے جال میں ہے؟''

''لوہے کے نہیں، فولاد کے جال میں۔ بڑے سخت لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ بڑی زہریلی قسم کی سردار فیملی ہے اوپر سے جاوا گروپ کا ڈر بھی ہے۔''

''یار! جاوا کا نام لے کر تم نے میرا خون گرما دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ للکارا مار کر انڈیا

کی فلم انڈسٹری میں گھس جاؤں اور امیتابھ بچن سمیت سارے ڈانوں کا صفایا کر دوں۔''

شاہین کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''خبردار! امیت کا نام لیا تو، وہ میرے فیورٹ ہیں۔ ویسے بھی وہ اصل نہیں فلمی ڈان تھے۔''

''گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے راج کماری۔ اس سنگل پسلی، لمبے بانس کو کس نے کہا تھا کہ ڈان بنے۔ ڈان تو ہوتا ہے اپنے مصطفیٰ قریشی اور شفقت چیمہ جیسا یا پھر اپنے تابش جیسا۔ شکل دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ قتل کیے ہیں اور عزتیں وغیرہ لوٹی ہوئی ہیں۔''

''کیا میں فون بند کر دوں؟''

دھمکی کارگر رہی۔ وہ پٹڑی پر آ گیا۔ میں نے اسے مختصر طور پر سارے واقعات سے آگاہ کیا اور دیگر حالات بتائے۔ یہ جان کر وہ حیران ہوا کہ یوسف بھی انڈیا پہنچ چکا ہے۔ وہ بولا۔ ''یار! کتنا اچھا ہوتا کہ تیرے اس رقیب روسیاہ کو گمشدگی راس آ جاتی۔ کہیں ایسا گم ہوتا کہ تاریخ میں نام لکھوایا جاتا لیکن لگتا ہے کہ آج کل کے لونڈوں کو نام کمانے کا شوق ہی نہیں۔ ویسے مجھے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان حضرات کو انڈیا پہنچایا کیوں گیا ہے؟''

''اس کی شکل ایک ایسے بندے سے ملتی ہے جسے کئی علاقوں کی پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

میں عمران کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خود بھی سوال کر رہا تھا۔ مجھے دوسری طرف کے حالات کا بھی علم ہو رہا تھا۔ عمران کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مہناز ابھی تک لاپتا ہے۔ وہ آخری بار راولپنڈی میں دیکھی گئی تھی۔ کالے شیشوں والی ایک بہت مہنگی گاڑی میں جا رہی تھی۔ عمران کے چند ساتھی پنڈی پہنچ چکے تھے اور اس کی ٹوہ میں تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ''جلالی صاحب کا کیا حال ہے؟''

''جلالی صاحب کے بارے میں بُری خبر ہے یار! بڑے بڑے سینئر ڈاکٹر ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان کے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ جلالی صاحب زندہ بچ گئے ہیں۔''

''زندہ بچ گئے ہیں؟''

''ہاں یار! مجھے نہیں لگتا کہ اب امریکہ انہیں زندہ چھوڑے گا۔ ان کا کوئی تحقیقی ادار
ضرور انہیں اُٹھا کر لے جائے گا اور کھوج لگائے گا کہ حیات بعد الموت کے کتنے رُخ ہیں او
اس اڑیل بوڑھے نے عزرائیل کی آمد کے وقت اپنی جان کو اپنے جسد خاکی کے کس تہ خانے

میں چھپایا تھا۔ اُف یار! عجیب آزاد مرد ہے۔ اپنے پاؤں پر چل کر ہسپتال سے نکلا ہے اور اپنی آثار قدیمہ مرسڈیز میں بیٹھا ہے۔ آج کل باقاعدگی سے ورزش کر رہا ہے اور لاہور سے حکیمی کشتے وغیرہ منگوا رہا ہے۔ پرسوں پتا چلا ہے کہ جناب نے اپنی ساس کو، جوان سے بارہ تیرہ سال چھوٹی ہے، لاہور سے شیخوپورہ بلایا ہے اور اس کو رام کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔''

''مہناز کے ساتھ جلالی کی شادی کی خبر تو ایک راز تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو راز ہی ہے لیکن لگتا نہیں کہ زیادہ دیر رہے گی۔ بزرگوار جوان بیوی کی فرقت میں بہت پریشان ہیں۔ خفیہ طور پر ہرکارے دوڑا رکھے ہیں تاکہ محترمہ کا کھوج مل سکے۔ دراصل جب انہوں نے آرا کوئے ڈاکٹر مہناز کے سپرد کیا تو اس وقت انہیں یقین تھا کہ وہ بچ نہیں پائیں گے لہٰذا ڈاکٹر صاحبہ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ اس مورتی کے ساتھ کہاں غرقاب ہوں گی۔ اب پچھتا رہے ہیں۔ دن رات اس انتظار میں ہیں کہ کہیں سے مہناز کا فون آئے۔ بہانے بہانے سے اس کا ذکر کرتے ہیں اور ذکر سننا پسند کرتے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے عمران! مہناز، جلالی صاحب کے ساتھ وفادار ہے؟''

''لگتا تو ایسے ہی ہے لیکن یاراں عورتوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ بندے بیچارے کاموں پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ٹی وی ڈرامے دیکھ دیکھ کر اتنی خچری ہو جاتی ہیں کہ مردوں کو تگنی کا ناچ نچا دیتی ہیں۔''

شاہین کے چلانے کی آواز آئی۔ ''تابش بھائی! ہم تو ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان جیسے حضرات ڈرامے کرتے ہیں۔ پتا نہیں باہر کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں صرف ایک عورت کو ہر وقت پتا ہوتا ہے کہ اس کا میاں کہاں ہے؟ اور وہ ہے بیوہ عورت۔''

''دیکھ لو تابی! مجھے شوہر بنانے سے پہلے ہی کیا کیا سوچ رہی ہے۔ بھئی اگر بیوہ بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے بیوی بننا پڑے گا۔''

''میں آپ جناب کی نہیں ایک جنرل بات کر رہی ہوں حضور۔''

''دیکھا نا، یہ بھی ایک خاتون رائٹر کے لکھے ہوئے ڈرامے کا فقرہ ہے۔ اُف یہ ڈرامے تو گھس گئے ہیں ان خواتین کے اندر۔''

مجھے راجا کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میں راجا کے لیے پریشان ہوں۔ اس کا کچھ پتا کرو۔''

وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''آج صبح اقبال سے فون پر میری بات ہوئی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ باقی طرف سے دھیان ہٹا کر راجا کا کھوج لگاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زخمی

حالت میں چودھری انور کی حویلی میں ہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ہارون آباد کے کسی پرائیویٹ ہسپتال میں بھیج دیا گیا ہو۔ سرکاری ہسپتالوں میں تو اقبال اور جیلانی اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔''

''بہرحال ان سے کہہ دو کہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کریں۔ چودھری انور خطرناک بند ہے اور اب تو اور بھی خطرناک ہو گیا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''میرے ساتھ لڑائی میں اس کے کچھ بندے مرے ہیں۔ تفصیل تمہیں پھر بتاؤں گا۔''

''اوئے خوش کیا ہے جگر پارے! شیر کا بچہ لگا ہے۔ تم سامنے ہوتے تو تمہارا منہ چوم لیتا۔ افسوس تم دور ہو۔ ہاں تم چاہو تو چوم سکتے ہو۔''

''وہ کس طرح؟''

''یار! شاہین سے کہو کہ تمہاری طرف سے میرا منہ چوم لے۔ یہ سامنے ہی تو دھرا ہے۔ آٹھ دس انچ کے فاصلے پر۔''

شاہین نے غالباً اسے کوئی پرس وغیرہ مارا تھا۔ اس نے منہ سے اوئی کی باریک آواز نکالی۔

میں نے کہا۔ ''کال بہت لمبی ہو رہی ہے۔ ہزاروں روپے بل آ جائے گا تمہارا۔''

وہ چہکا۔ ''تو یہ شاہین کس لیے ہے یار! بڑی موقع شناس لڑکی ہے۔ آج کل مجھے نرگس اور ریما کے چنگل سے نکالنے کے لیے بڑی کوشش کر رہی ہے۔ مالی، جانی، جسمانی، ہر طرح کی قربانی دے رہی ہے۔'' اس نے ''جسمانی'' پر زور دیا۔

شاید شاہین ایک بار پھر اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ چند سیکنڈ تک کشتی کی سی آوازیں آتی رہیں۔ غالباً وہ دونوں گاڑی کے اندر تھے اور گاڑی کسی تنہا جگہ پر پارک تھی۔ چند سیکنڈ بعد موبائل فون شاہین کے ہاتھ میں چلا گیا۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''السلام علیکم تابش بھائی! آپ کیسے ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں شاہین! ثروت بھی خیریت سے ہے۔ تم فرح اور عاطف کی سناؤ اور بالو کا کیا حال ہے؟''

''وہ تینوں ڈیفنس والے گھر میں ہیں، بالکل خیریت سے ہیں۔ یوں تو ہم سب ہی آپ کے بغیر اُداس ہیں لیکن فرح بہت زیادہ محسوس کرتی ہے۔''

''ثروت کی چھوٹی بہن کا کیا حال ہے؟''

"ہاں......نصرت کی طبیعت چند دن خراب رہی ہے۔ ثروت کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں آ رہی تھی نا۔ پرسوں عمران اس کی طرف گئے تھے۔ تسلی تشفی دے کر آئے ہیں۔ آپ ثروت سے بھی کہیں کہ ایک بار نصرت سے بات کر لے۔"

"اچھا...... میں کہوں گا۔"

"ثروت سے بات ہو سکتی ہے؟" شاہین نے پوچھا۔

"نہیں شاہین! اس وقت تو مشکل ہے۔ کل کوشش کروں گا مگر تم نے اسے نصرت کی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں تابش بھائی! اب نصرت کافی بہتر ہے۔ ہمیں زیادہ پریشانی آپ لوگوں کی طرف سے ہے۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیں۔ آپ کہاں پھنس گئے ہیں؟"

اسی دوران میں عمران نے پھر فون پکڑ لیا۔ میں نے عمران سے سنجیدہ ہونے کی پُرزور درخواست کی جسے اس نے قبول کیا۔ میں نے اسے جگت سنگھ والا فون نمبر بھی لکھوا دیا۔ عمران نے کہا کہ وہ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہے گا اور کل تک اپنا لائحہ عمل بتائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کل تک مجھے راجا کے بارے میں بھی حتمی رپورٹ دے گا۔

دوپہر کے فوراً بعد گوبند سنگھ پھر اپنی "جعلی" بھابو آشا کو لے کر لنگری پورہ پہنچ گیا۔ آشا بھی میرے چہرے کی چوٹوں اور سوجن کو دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اس نے آتے ساتھ ہی کچن سنبھال لیا اور کام کاج میں لگ گئی۔ گاہے بگاہے رجنی نے بھی اس کی مدد کی۔ ثروت یوسف فاروقی کے ساتھ کمرے میں تھی۔ جگت نے یوسف پر مسلسل نظر رکھی ہوئی تھی۔ رات کا کھانا پُرتکلف تھا۔ آشا نے دیسی مرغی کا پلاؤ بنایا تھا۔ ساتھ میں قورمہ اور میٹھی سویاں تھیں۔ ان ہوم میڈ سویوں کو پوٹوں کی سویاں کہا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد پھر وہی دودھ پتی تھی جو آشا خاص چاؤ سے بناتی تھی اور اس میں واقعی مٹھاس بھر دیتی تھی۔

جگت اور آشا کا دل رکھنے کے لیے میں نے چند لقمے لیے۔ آیا کو بھی اب پتا چل چکا تھا کہ ثروت کا پتی میں نہیں بلکہ یوسف ہے اور میں یوسف کی تلاش میں ثروت کی مدد کر رہا تھا۔ ثروت کے شوہر کے طور پر یوسف، آشا کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔

کھانے کے دوران میں بھی گوبند اور اس کی فیشن ایبل منگیتر رجنی کے درمیان چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ رجنی نے بڑی بے حجابی سے ہر کسی کو اپنے دودھیا بازو پر "چونڈی" کا نیلا نشان دکھایا۔ اس الہڑ لڑکی کے سراپا میں عجیب سی جنسی حرارت تھی۔

عمران نے کہا تھا کہ وہ کل فون کرے گا۔ تاہم اس کا فون رات دس بجے کے قریب ہی

آ گیا۔ یہ فون جگت والے نمبر پر آیا تھا۔ عمران کی آواز میں مجھے ہلکا بوجھل پن محسوس ہوا۔ "ہیلو عمران! خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "ویسے تو خیریت ہے لیکن ایک خبر اچھی نہیں۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "راجا ہمیں چھوڑ گیا تابش۔ وہ زخمی ہونے کے دو دن بعد ہارون آباد کے ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔"

میں کتنی ہی دیر سناٹے میں رہا۔ عمران بھی خاموش تھا۔ میری آنکھوں میں راجا کے آخری مناظر گھوم گئے۔ ہم اچھے بھلے چودھریوں کے چنگل سے نکل آئے تھے۔ ہم نے ان کی گاڑی کا ٹائر ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن راجا کا ایک معمولی لالچ اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ وہ زیور والا رومال اُٹھانے کے لیے جیپ سے اُترا اور اسے گولی لگ گئی۔ پتا نہیں کیوں اس وقت میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ اب ہم راجا کو پھر نہیں دیکھ سکیں گے۔

عمران کی آواز فون سیٹ پر اُبھری۔ "یہی زندگی ہے پیارے۔ اگلے موڑ پر کیا ہے، کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ دیکھو ہم جلالی کے بارے میں ناامید تھے لیکن وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہسپتال سے خود چل کر باہر آ گیا اور چنگا بھلا راجا چلا گیا۔ اب وہ اپنی ساری خامیوں، خوبیوں سمیت قبر میں لیٹا ہے۔"

میں نے کہا۔ "عمران! وہ جیسا بھی تھا لیکن اس کی آخری رات مجھے نہیں بھولے گی۔ سچ پوچھو تو اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اُس رات اس نے بہت تفریح بھی کی۔ کئی خطرے بھی مول لیے اور پھر موت کا سامنا بھی کیا۔ اس کی باتوں سے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ چودھریوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ تمہیں بھی پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن عین موقع پر اس نے اصل روپ دکھایا۔ ہمیں وہاں سے نکال لایا۔ اس نے ایک پہرے دار کو پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ رکھوالی والے خونخوار کتے بھی اسے دیکھ کر رام ہو گئے۔ اس نے زبردست پلاننگ کر رکھی تھی۔"

عمران بولا۔ "بس ہماری اپنی پلاننگ ہوتی ہے اور قدرت کی اپنی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ اس کے باوجود وہ شاید بچ جاتا مگر پہلے چودھریوں نے پھر پولیس نے اسے ہسپتال پہنچانے میں بہت دیر کی۔ قریباً ایک گھنٹہ تو وہ موقع پر ہی تڑپتا رہا۔"

"پولیس کو کیا بتایا گیا؟"

"وہی جو ایسے چودھری بتاتے ہیں۔ راجا پر ڈاکے اور قتل کا الزام لگا ہے۔ گھنوں والے رومال اور کرشمہ کی موت کو ثبوت بنایا گیا ہے۔ تم دونوں بھی شریک ملزمان کے طور پر نامزد ہو لیکن اس کی فکر نہ کرو۔ میں نمٹ لوں گا اس نامزدگی سے...... لیکن یہ بتاؤ کہ کیا واقعی نیتو عرف کرشمہ کو راجا نے مارا؟"

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ "شاید ایسا ہی ہے لیکن راجا کی نیت ایسی نہیں تھی۔ دراصل کرشمہ نے راجا کو تاڑ لیا تھا۔ وہ شور مچانا چاہتی تھی۔ راجا نے اسے دبوچ لیا اور اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ مزاحمت کرتی رہی اور اسی میں اس کا دم گھٹ گیا۔"

ہم نے چند منٹ تک راجا کے سوگوار موضوع پر بات کی پھر عمران نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے تابی! مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کمینہ جاوا ابھی بھارتی پنجاب میں ہی ہے۔ اپنے بھائی کے دو قاتلوں کو سرعام گولیاں مارنے کے بعد اس نے ان کی لاشوں کو انبالہ کی سڑکوں پر گھسیٹا ہے۔ اب وہ ان کے بچے کھچے ساتھیوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ جاوا اور ترشولا کے سردار اوتار سنگھ میں پُرانی واقف کاری ہے۔ سردار اوتار تو اپنی بیٹی کو بازیاب کرانے کے لیے رات دن بھاگا پھر رہا ہے۔ تمہاری اور یوسف کی تلاش کے لیے اس نے جاوا سے رابطہ کیا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال بن سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں احتیاط کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوشش کرو کہ اس گاؤں میں بھی کسی کو تمہاری اور یوسف کی موجودگی کا پتا نہ چلے۔"

"نہیں...... ابھی تک تو ہم کسی کے سامنے نہیں آئے۔"

عمران نے ذرا توقف سے کہا۔ "میں تمہاری واپسی کا انتظام کر رہا ہوں۔ اس کام میں تھوڑے دن تو لگیں گے لیکن کام پرفیکٹ ہوگا۔ پہلے مرحلے میں تمہیں حفاظت سے نئی دہلی یا میرٹھ پہنچایا جائے گا۔ وہاں نئی دہلی میں اپنے دو پکے جن موجود ہیں۔ ایک کا نام شہباز احمد ہے، دوسرا ڈاکٹر رتن سنگھ۔ یہ دونوں کل یا پرسوں ایک ایمبولینس گاڑی پر تم تک پہنچیں گے۔ آنے سے کم از کم چھ گھنٹے پہلے تمہیں فون کریں گے۔ اس کے بعد تمہیں تیار رہنا ہے۔ جس دیہاتی حلیے میں تم لوگ ہو، یہی آگے بھی کام دے گا۔ ہاں سفر کے دوران میں تم نے ایک اور ضروری بات ذہن میں رکھنی ہے۔ یہ بات میں شہباز اور ڈاکٹر رتن کو بھی بتا دوں گا۔"

"کیا؟"

"یہ بات تم ثابت کر چکے ہو کہ یوسف کو صرف اس لیے پکڑا گیا اور انڈیا پہنچایا گیا کہ

اس کی شکل سردار اوتار کے بیٹے، بدنام قاتل اشوکا سنگھ سے ملتی ہے۔ اشوکا سنگھ واقعی کئی صوبوں کی پولیس کو مطلوب ہے۔ پانچ سال ہوگئے ہیں پھر بھی اس کی تلاش کا کام رُکا نہیں۔ اب سفر کے دوران میں اگر کہیں چیکنگ وغیرہ ہوئی اور یوسف پولیس کی نظر میں آیا تو عین ممکن ہے کہ اسے واقعی اشوکا سمجھ لیا جائے۔"

"ہاں...... تمہارا یہ پوائنٹ واقعی غور کرنے والا ہے۔"

"کسی طرح کوشش کرنی ہے کہ یوسف، پولیس یا کسی بھی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی کی نظر میں نہ آئے۔ ورنہ وہ اشوکا کی جگہ نقصان اُٹھا سکتا ہے۔"

عمران نے مجھے میرے مددگاروں شہباز احمد اور ڈاکٹر رتن کے بارے میں کچھ مزید معلومات دیں اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کو ان دونوں افراد پر بھرپور اعتماد ہے۔

جگت کا چھوٹا بھائی گوبندر بے شک شراب سے پرہیز نہیں کرتا تھا اور عورتوں میں بھی دلچسپی رکھتا تھا، اس کے باوجود اس میں کھلاڑی والی عادتیں بھی تھیں۔ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا، خوراک کا خیال رکھتا تھا اور ورزش بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ وہاں جو پور گاؤں میں اس نے اپنا "جم" بنا رکھا تھا۔ اس جم میں میرا اور اس کا باقاعدہ مقابلہ ہوا تھا۔ اب وہ مجھے میرے اصلی نام تابش سے ہی بلاتا تھا۔ شام کو بولا۔ "آؤ تابش بھا جی...... ذرا جاگنگ کر کے آئیں۔"

اس کی منگیتر رجنی فوراً بولی۔ "یہ جس کو تھوڑی سی جاگنگ کہتا ہے، یہ دس پکے میل کی دوڑ ہوتی ہے۔ رستے میں کوئی سوہنی کڑی مل جائے تو اس کے چاروں طرف بھی چکر لگاتا ہے۔ اس طرح یہ دوڑ پندرہ سولہ میل کی ہو جاتی ہے۔"

گوبندر اس پر جھپٹا تو وہ بھاگ گئی۔ وہ بولا۔ "بھا جی! تسی آپ ہی سوچو، نیشنل کھیلوں میں حصہ لینا ہے میں نے...... کوئی چھوٹے مقابلے نہیں ہوتے دہلی میں...... بڑے بڑے سورما پڑے ہیں۔ کچھ کروں گا تو لڑوں گا نا...... آجائیں آپ بھی۔ پانچ چھ کلومیٹر کی دوڑ میں آپ کا کیا بگڑنا ہے۔"

"نہیں گوبندر! اس وقت موڈ نہیں۔ سوری یار۔"

وہ خود ہی چلا گیا۔ لیکن اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہی ہوگئی۔ میں اسے اتنی جلدی واپس دیکھ کر حیران ہوا۔ "کیا ہوا گوبندر؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "تابش بھائی! کچھ پتا ہے آپ کو۔

ایک بڑا ہی خطرناک بندہ ہمارے آس پاس ہے۔"

"خطرناک بندہ؟"

"جاوا کا نام سنا ہوا ہے آپ نے؟"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے کہا۔"نہیں......کون ہے یہ؟"

وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔"بہت وڈی بلا ہے بھاجی! بمبئی کے پانچ چھ بڑے ڈانوں میں سے ایک ہے۔ مہاراشٹر اور مدھیا پردیش وغیرہ میں لوگ کانپتے ہیں اس کے نام سے۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ یہاں ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے کہ وہ یہاں ہے؟" میں نے عام لہجے میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے بچے بچے کو پتا ہے۔ بڑی دہشت پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ ہم تو باہر نہیں نکلے، ہمیں جانکاری ہی نہیں۔ میں ابھی کھیتوں تک ہی پہنچا تھا کہ نمبردار صاحب مل گئے۔ کہنے لگے، اس ویلے پنڈ سے باہر نہ نکلو۔ حالات خراب ہیں۔ میں نے پوچھا کیا خراب ہیں، تو انہوں نے جاوا کا نام لیا۔ تو مجھے وشواس نہیں ہوا لیکن جب انہوں نے تفصیل بتائی تو وشواس کرنا پڑا۔ کہنے لگے کہ یہ بندہ اور اس کے ساتھی اپنی کوئی دشمنی چکانے کے لیے مہاراشٹر سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بندے کا نام بعد میں پوچھتے ہیں، پہلے گولی مار دیتے ہیں۔ لوکل پولیس ان کے نام سے کانپتی ہے۔ ایم پی اے تک کو کھڑے کھڑے ننگا کر دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے دو بڑے تگڑے بندوں کی ہتھیا کی ہے اور لاشوں کو انبالہ کی گلیوں میں گھسیٹا ہے۔ ساتھ ساتھ کئی پردہ دار ناریوں کو بھی ننگے سرگشت کرایا ہے۔"

عمران کی اطلاع درست ثابت ہو رہی تھی۔ دہشت کا نشان جاوا اس علاقے میں موجود تھا اور اپنا آپ دکھا رہا تھا۔ لاہور میں ہمیں پتا چلا تھا کہ جاوا کے چھوٹے بھائی کو کسی کرخت سکھ پولیس آفیسر نے قتل کر دیا ہے۔ یہ سارا وہی شاخسانہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے یوسف کو دیکھا۔ وہ مٹی کی بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی چھت پر جا رہا تھا۔ دیہاتی لباس تہ بند قمیص میں ہونے کے باوجود وہ "نیم شہری" سا لگتا تھا۔ جگت سنگھ نے ہر وقت اس پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ اوپر جا رہا ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ یوسف سے دو منٹ تنہائی میں بات کر سکوں۔ میں اوپر گیا تو وہ چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دیہات میں گھروں کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں۔ منڈیر بھی نہیں ہوتی۔ یہاں بھی دور تک نظر آ رہا تھا۔ گاؤں سے آگے کھیت اور

کھیتوں سے آگے درختوں اور جھاڑیوں کے سلسلے۔ مدھم چاندنی نشیب و فراز کو نمایاں کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گھر کے سامنے ہی گلی میں کوئی نشئی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اپنی بھونڈی آواز میں ہیر کی مٹی پلید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے میں نے کل بھی دیکھا تھا۔

میں یوسف کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔"یوسف! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں کسی طرح کا نقصان پہنچانے کے لیے نہیں، تمہاری مدد کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نے دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن سمجھا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، سردار اوتار سنگھ نے صرف تمہیں مہمان بنانے کے لیے اور تمہاری خاطر مدارات کرنے کے لیے تمہیں دہلی میں رکھا ہوا تھا۔"

یوسف روکھے لہجے میں بولا۔"اوتار سنگھ کا کہنا ہے کہ یہ ایک گہرا چکر ہے......"

"گہرا چکر ہے؟"

یوسف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔"تمہیں بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ لوگ معروف لوگوں کے ہم شکل یا ان سے ملتے جلتے چہرے ڈھونڈتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اسی طرح ڈھونڈا۔ ان کا کہنا ہے کہ میری شکل انڈیا کے ایک مقبول سنگر سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ وہ مجھے ایک بڑے ٹی وی چینل پر مستقل کام کرنے کی آفر کر رہے ہیں۔ جو معاوضہ وہ دے رہے ہیں، وہ بھی میری توقع سے بہت بڑھ کر ہے۔ دو دن پہلے چینل کے مینجنگ ڈائریکٹر سے میری ملاقات بھی کرائی گئی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے اس بات پر بہت معذرت بھی کی ہے کہ درمیان کے کچھ لوگوں نے مجھے یہاں تک لانے میں زبردستی کا رویہ اپنایا بلکہ ایسا تاثر ملا کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے۔ سردار اوتار بھی اس پر بہت شرمندہ تھا۔ اب یہ لوگ مجھے باعزت طریقے سے واپس پاکستان روانہ کر رہے تھے۔"

میں نے سر پکڑ لیا۔"یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے یوسف! تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ سراسر بکواس اور جھوٹ ہے۔ تمہاری شکل کسی انڈین گلوکار سے نہیں ملتی۔ تمہاری شکل اس خبیث اوتار سنگھ کے مفرور بیٹے اشوکا سے ملتی ہے۔ اس بیٹے کو انڈیا میں کئی برسوں سے ایجنسیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ اس کا نام "ای سی ایل" میں ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ یہ لوگ تمہیں مار کر اشوکا کا پیچھا قانون سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پوری پلاننگ کی ہوئی تھی۔ تمہیں پولیس ناکوں کے درمیان سے گزارا جانا تھا

اور جب پولیس تمہیں پہچان لیتی تو تمہاری گاڑی کو ریموٹ کنٹرول بم سے اُڑا دیا جانا تھا۔ تاثر یہی ملتا کہ شاید اشوکا نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خود کے پرخچے اُڑا لیے ہیں۔ اگر تم ایک بار اشوکا سنگھ کی تصویر دیکھ لو تو ساری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔“

میں نے اس سازش کا سارا تانا بانا یوسف کے گوش گزار کیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری کچھ باتیں اس کے دل کو لگ رہی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کل رات میں نے اسے اور ثروت کو بچانے کے لیے کس طرح اندھا دھند فائرنگ کا سامنا کیا۔ وہ سب کچھ جان رہا تھا، اس کے باوجود اس کے چہرے کی سختی اور کدورت کم نہیں ہو رہی تھی۔

آخر اس نے چارپائی پر پہلو بدلا اور مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تابش! میں ایک بات کہوں، بُرا نہ ماننا۔“

”جو کہنا چاہتے ہو، کھلے دل سے کہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”تابش! مجھے اندازہ ہے کہ تم دل کے بُرے نہیں ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کل رات تم نے ہمارا دفاع کیا اور سارا پریشر اپنے اوپر لیا۔ میں اپنی غلطی بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تم پر گولی چلائی۔ اس کے علاوہ اس میں بھی شک نہیں کہ تم نے مجھے ڈھونڈنے میں ثروت کا ساتھ دیا ہے لیکن...... لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اپنا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں پاتا۔ شاید...... اگر تم...... میری جگہ ہوتے تو تمہارا رویہ بھی یہی ہوتا۔ بات کڑوی ہے پر حقیقت ہے تابش۔ میرے اور تمہارے درمیان رقابت کا رشتہ بنا ہے اور یہ بڑا ظالم رشتہ ہوتا ہے۔ معاف کرنا، تم مجھے سونے کا بن کر بھی دکھا دو گے تو میرا دل تمہیں قبول نہیں کرے گا۔“

میں نے کہا۔ ”یوسف! تم ہر چیز پر رقابت کو حاوی کیوں کر رہے ہو؟ ہم انسان بھی تو ہیں اور مشکل حالات میں ہیں۔ اگر تم ماضی کو بنیاد بنا کر میری شکل دیکھنا نہیں چاہتے تو میں واقعی تم دونوں کو کبھی شکل نہیں دکھاؤں گا لیکن...... کم از کم موجودہ حالات کی مجبوری تو سمجھو۔ ہمیں مل جل کر اس گھیرے کو توڑنا ہے۔ جگت جیسے لوگ ہماری بے لوث مدد کر رہے ہیں۔ وہ کیا اثر لیں گے جب ہمیں آپس میں ہی لڑتا جھگڑتا دیکھیں گے؟“

”تو میں اب کیا کہہ رہا ہوں تم سے؟ جو غلطی پرسوں مجھ سے ہوئی ہے اس کے لیے تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ میں نے تم پر گولی چلائی، مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ روکھے لہجے میں بولا۔

”بات معافی کی نہیں یوسف! کل مجھ سے بھی زیادتی ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس وقت ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا ہوگا۔ یکجہتی دکھانی ہوگی۔ دل سے کدورت کو ختم کرنا ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”تابش! میں صاف گو بندہ ہوں۔ میں وہی بات دہراؤں گا۔ یہ بہت کڑوی حقیقت ہے۔ ہمارے درمیان کدورت وغیرہ کا نہیں، رقابت کا رشتہ ہے اور یہ بہت تلخ رشتہ ہوتا ہے۔ اپنے دل پر میرا بس نہیں...... میں تمہیں دیکھتا ہوں تو......“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”رُک کیوں گئے؟ تم سے کہا ہے نا، جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔“

وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر بولا۔ ”تم نے ثروت کے ساتھ سفر کیا ہے نا۔ دن رات اس کے ساتھ رہے ہو۔ تم ایک کمرے میں سوتے رہے ہو۔ جگت سنگھ کے گھر میں بھی خود کو میاں بیوی بتاتے رہے ہو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں وہ سارے نقشے پھرنے لگتے ہیں۔ تم نے کیا باتیں کی ہوں گی؟ کس طرح سوئے ہو گے؟ کس طرح جاگے ہو گے...... کس طرح ہنسے بولے ہو گے؟ مم...... میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ میں تمہیں سچ بتاتا ہوں تابش! تم جتنی بار میرے سامنے آؤ گے، یہی ہو گا۔ وہ میری بیوی ہے، اگر میری جگہ تم ہوتے تو تمہارے ساتھ بھی یہی ہوتا...... یہی ہوتا۔“

وہ تیزی سے اُٹھا اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلا گیا۔ اس نے آج وہی بات کہی تھی جس کا اندیشہ جگت سنگھ نے ظاہر کیا تھا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہم مرد کبھی کبھی بڑے اندرون بین ہو جاتے ہیں۔ بس اپنی ذات کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ یوسف بھی تو اپنی جرمن محبوبہ کو ثروت کی رقیب بنا کر گھر میں لایا تھا۔ تب اس نے رقابت کی تلخی اور شدید کڑواہٹ کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اب بھی وہ ایک خوبصورت لڑکی کو Keep رکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اب بھی اسے ثروت کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی۔

چند سال پہلے میرے سینے میں جدائی کے جو زخم لگے تھے، ان میں سے پھر خون رِسنے لگا۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس پہلی جدائی کو ہی آخری اور حتمی جدائی سمجھوں۔ جلد از جلد ثروت اور یوسف سے دور ہو جاؤں۔ یہاں میرے لیے توہین محبت اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ عمران نے کہا تھا کہ جلد ہی اس کے بھیجے ہوئے مددگار ہم تک پہنچ جائیں گے اور چند روز کے اندر ہمیں یہاں سے نکال لیں گے۔ میرا دل چاہا کہ یہ چند روز بس جلدی سے ختم ہو جائیں۔ میں ثروت کی طرف سے سرخرو ہو کر اسے الوداع کہہ دوں۔ میں اُٹھ کر مٹی کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو اچانک چونک گیا۔ کچھ فاصلے پر کھیتوں میں تین چار گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں جو تیزی سے اُچھلتی کودتی گاؤں کی طرف آ رہی تھیں۔ گاؤں کے نمبردار کے پاس تو گاڑی نہیں تھی۔ یہ کون لوگ تھے؟

میں نے جگت سنگھ کو آواز دی۔ ''جگت! اوپر آؤ۔''

جگت کے بجائے گوبندر اوپر آ گیا۔ ''کیا بات ہے جی؟ جگت بھاجی تو باہر گئے ہیں۔''

''یہ کون لوگ آ رہے ہیں یہاں؟'' میں نے روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں گاؤں میں داخل ہو گئیں۔ آوارہ کتے ان کے اردگرد شور مچا رہے تھے۔ ہیڈ لائٹس میں دھول کے بادل اُڑتے نظر آتے تھے۔ یہ کُل تین گاڑیاں تھیں۔ دو بڑے سائز کی شاندار جیپیں، ایک ہائی روف......

''کہیں یہ...... جاوا کے لوگ ہی نہ ہوں۔'' گوبندر نے سرسراتی آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی گاڑیاں عین اس مکان کے سامنے آن کھڑی ہوئیں جس میں ہم سب موجود تھے۔ ہمارے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج اُٹھیں۔ میری جیب میں پستول تھا۔ ایل ایم جی نیچے کمرے میں تھی۔ میرا چھیتا چاقو بھی وہیں تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ گوبندر میرے عقب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کمرے تک پہنچتا، کئی افراد اندر گھس آئے۔ انہوں نے میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے انہوں نے پانچ فٹ اونچی کچی چاردیواری پھلانگی تھی اور اندر آ دھمکے تھے۔ اندازہ ہوا کہ انہیں ہر چیز کی پہلے ہی خبر تھی۔ یہاں تک معلوم تھا کہ گھر میں کتنے افراد اور کہاں کہاں ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جدید آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور وہ شکلوں سے ہی خطرناک مجرم نظر آتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پستول نکالنا بیکار ہے۔ نصف درجن افراد مجھے بھون کر رکھ دیتے اور میرے ساتھ ہی یوسف، ثروت اور آشا وغیرہ کی زندگی بھی سخت خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

''ہینڈز اَپ...... ہینڈز اَپ۔'' کئی للکارے گونجے۔ میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

گوبندر اور یوسف نے بھی تقلید کی۔ ایک شخص نے بڑے کرخت انداز میں میری جیب سے پستول نکال لیا اور موبائل بھی......

''پکڑو جانے نہ پائیں۔'' اچانک ایک حملہ آور چلایا۔

حملہ آوروں کی توجہ ہماری طرف تھی۔ ثروت اور آشا چلاتی ہوئی باہر بھاگ گئی تھیں۔ حملہ آور ان کے پیچھے لپکے۔ تاریک صحن میں دو گولیاں بھی چلیں۔ دو رائفلوں کے بیرل میرے سر سے چھو رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ یہی کیفیت گوبندر اور یوسف کی تھی۔

چند سیکنڈ بعد اندازہ ہوا کہ حملہ آوروں نے انہیں دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ آشا کے رونے اور

بولنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

دو حملہ آور جو اپنے طور اطوار سے ماہر نشانہ باز لگتے تھے، ہمیں گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے کا موٹا چوبی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ ہم بُری طرح گھر گئے تھے۔ کم و بیش دو درجن افراد یہاں موجود تھے۔ میں نے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھا۔ دو رائفلیں اس جانب سے بھی ہمیں نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔

وہ لوگ آشا کور کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ساتھ والے برآمدہ نما کمرے میں لے آئے۔ وہ ممبئی اسٹائل کی اردو بول رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے رنگ سانولے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جاوا گروپ کے لوگ ہیں۔ گوبندر کا زرد رنگ بھی یہی گواہی دے رہا تھا۔ دو افراد نے آشا کو دونوں طرف سے دبوچ رکھا تھا اور اسے بار بار دھمکا کر خاموش کرا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ وہ ثروت کو نہیں پکڑ سکے۔ کم از کم وہ ابھی تو ان کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ بدترین صورتِ حال میں یہ ایک چھوٹی سی مثبت بات تھی۔ کیا وہ گاؤں والوں کی مدد حاصل کر سکے گی؟ کیا لوگ ہماری مدد کو آئیں گے؟ کیا پولیس متحرک ہو سکے گی؟ ایسے کئی سوالات تھے۔

میں، گوبندر اور یوسف جس کمرے میں تھے اس میں بند دروازے کے علاوہ فقط ایک کھڑکی تھی۔ اس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ کوشش کر کے بند دروازے کو شاید توڑا جا سکتا لیکن باہر پھر مسلح افراد موجود تھے۔ مزاحمت کا بہترین موقع وہی تھا جب ہم اس کمرے میں آئے تھے مگر اس وقت آشا اور ثروت بھی کمرے میں موجود تھیں۔ مزاحمت سے ان کی زندگی فوراً داؤ پر لگ جاتی۔

اچانک مجھے گوبندر کی منگیتر رجنی کا خیال آیا۔ وہ بھی گھر میں ہی تھی مگر ابھی تک اس کی آواز سنائی دی تھی اور نہ وہ یہاں سے بھاگی تھی۔ شاید وہ خود کو کہیں گھر کے اندر ہی چھپانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''یہ جاوا گینگ کے لوگ ہی ہیں۔'' گوبندر نے میرے کان میں لرزتی سرگوشی کی۔

''لیکن جاوا خود یہاں نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ نے اسے دیکھا ہوا ہے؟''

''ایک دفعہ تصویر دیکھی تھی۔'' میں نے بات بنائی۔

کھڑکی سے باہر برآمدے میں تین شاندار فولڈنگ کرسیاں اور ایک میز رکھ دی گئی۔ میز

پر منرل واٹر کی بوتل، سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر اور اس طرح کی ایک دو اشیا رکھ دی گئیں۔ یہ سارا سامان یہ لوگ یقیناً ہائی روف گاڑی میں اپنے ساتھ ہی لے کر آئے تھے۔ سرکاری دربانوں کی طرح دو مسلح گارڈ دیوار کے ساتھ اٹین شین کھڑے ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ جاوا آ رہا ہے۔ وہ غالباً ابھی تک گاڑی میں ہی بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کی آمد ہوئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا۔ اس کا نہایت گٹھا ہوا جسم پتلون قمیص میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی خونخوار سرخی تھی جو مجھے انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں نظر آئی تھی۔ اس نے سلاخ دار کھڑکی کے باہر سے مجھ پر ایک تمسخر بھری نظر ڈالی۔ پھر یوسف کو گھورا اور بڑے ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے قریباً ایک درجن مسلح ساتھی اس کے اردگرد موجود تھے اور اس کے کسی بھی اشارے کے منتظر تھے۔

تب میں ایک بار پھر چونکا۔ میری نظر اس دوسرے شخص پر پڑی جو جاوا کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ یہ بارڈر پار وہی والا گاؤں کا چودھری انور تھا۔ جسے جگت سنگھ چودھری انور گنجا بھی کہتا تھا۔ چودھری انور کلف لگے سفید شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی سفاکی اس کے چوڑے جبڑے اور اس کی سوجی ہوئی آنکھوں سے عیاں تھی۔

جاوا نے بے تکلفی سے چودھری انور کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''واہ بھئی واہ...... ایک بادام میں سے دو گریاں نکل آئی ہیں۔ اس کو کہتے ہیں کہ جب اوپر والا دیتا ہے تو چھت پھاڑ کر دیتا ہے۔''

''ایک بادام میں دو گریاں؟'' چودھری انور نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں بھئی...... دیکھو نا ایک ساتھ دو بچے مل گئے اور دونوں کی تلاش تھی ہمیں۔ ایک یہ سردار اوتار سنگھ کا بھگوڑا مہمان یوسف اور دوسرا یہ عمران کا جانگیا تابی...... ایک بادام میں دو گریاں۔'' اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

اسی دوران میں دو مسلح افراد پھٹے پُرانے کپڑوں والے ایک نشئی کو پکڑ کر اندر لے آئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے گلی میں گاتے دیکھا تھا لیکن اب یہ شخص ٹھیک ٹھاک ہوش میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا لب ولہجہ بھی قدرے بدلا ہوا تھا۔ اس نے جاوا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور لرزتی آواز میں بولا۔ ''مجھے بالکل پتا نہیں تھا جناب کہ اس بندے کا سمبندھ آپ سے ہے۔ میں سوگند کھاتا ہوں جی۔ بڑی سے بڑی سوگند کھاتا ہوں۔ مجھے پتا ہوتا کہ اس کی آپ کو ضرورت ہے تو کبھی تھانے نہ جاتا...... میں اتنی

جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا مائی باپ۔

جاوا بولا۔ ''لیکن اب تو جرأت ہو چکی میاں مٹھو! اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو معاملے کو ٹھیک کرنا ہی ہو گا نا۔''

سانولے رنگ والے دبلے پتلے شخص نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور جاوا کے پاؤں میں گر پڑا۔ اس کے پاؤں پکڑ کر بولا۔ ''میں بے خبر تھا جناب! مجھے ایک دفعہ شما کر دیں۔ میں وچن دیتا ہوں سرکار! آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ آپ جو کچھ کہیں گے کروں گا۔'' وہ جاوا کے پاؤں پر سر رگڑنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ نشئی کے روپ میں یہ بندہ شاید پولیس کا انفارمر تھا اور اس نے پولیس تک کوئی ایسی اطلاع پہنچائی جو نہیں پہنچانی چاہیے تھی۔

جاوا نے اطمینان سے کہا۔ ''میں مانتا ہوں میاں مٹھو کہ تم نے یہ غلطی نہیں کی لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ بندے کو اسی کرم کی سزا ملے جو اس نے کیا ہے۔ اسے اپنے کسی پہلے کارنامے کی سزا ابھی تو مل سکتی ہے۔''

''آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ مجھے بخش دیں۔'' وہ گھگیایا اور جاوا کے پاؤں سے چمٹ گیا۔

جاوا نے پریشانی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ کیسے ہو سکتا ہے میاں مٹھو! تُو انسپکٹر چاؤلہ کے بارے میں جان گیا ہے۔ اب تو لاکھ بھی قسمیں کھائے لیکن اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔ تُو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تُو مخبر ہے میاں مٹھو! تیرا تو کام ہی سننا اور ٹیں کرنا ہے۔''

''میری زبان کاٹ دیں سرکار! آپ کہیں تو میں اپنے ہاتھ سے کاٹ لیتا ہوں۔ میرا وشواس کریں سرکار۔'' وہ باقاعدہ بلکنے لگا۔ موت کے خوف سے اس کا پورا جسم لرزاں تھا۔

جاوا کے تمتمائے چہرے پر سوچ کی لکیریں نظر آئیں۔ اس نے دو گہرے کش لیے پھر اپنے ایک کارندے کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''چوپڑا! اسے ابھی لے جاؤ۔ اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔''

جاوا کے لہجے میں لچک محسوس کر کے مخبر کی حالت ذرا سنبھلی۔ اس نے اپنا سر ایک بار پھر جاوا کے پاؤں پر رکھا اور اس سے جان بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔ جاوا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا اور بولا۔ ''ابھی جاؤ...... کچھ سوچیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پاؤں کی حرکت سے مخبر کا سر پیچھے ہٹا دیا۔

دونوں مسلح افراد مخبر کو لے کر روانہ ہوئے۔ چند قدم دور جا کر ایک مسلح شخص نے مڑ کر دیکھا۔ جاوا نے اسے ایک خطرناک اشارہ کیا۔ یہ مار دینے کا اشارہ تھا۔ گلے پر انگلی سے خیالی چھری چلانے کا اشارہ کیا۔ مخبر یہ منظر نہیں دیکھ سکا اور مسلح افراد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

بمشکل ایک منٹ بعد کسی کمرے کے اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہ کوئی سائیلنسر لگے پستول سے چلائی گئی تھی۔ سب سمجھ گئے کہ مخبر کا کام تمام ہو چکا ہے۔

اس تماشے کے دوران میں ایک قریبی کمرے سے آشا کے پکارنے کی آواز آتی رہی تھی۔ وہ بار بار دروازہ بھی پیٹ رہی تھی۔ اسے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں ایک دم ہی بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید گوبندر بھی یہی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اسی دوران میں باہر ایک سکوٹر رُکنے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ نہ جانے کیوں اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے لگا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔ وہ بادامی رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔

''لو بھئی چاؤلہ! تمہاری پریشانی ختم ہوگئی۔ وہ میاں مٹھو گیا۔'' جاوا نے کہا۔

چاؤلہ نے ہاتھ جوڑ کر دھنیوار کہا اور جاوا کے سامنے مؤدب کھڑا ہوگیا۔ یقیناً یہی وہ مقامی تھانے دار تھا جس کا ذکر چند منٹ پہلے ہوا تھا۔

''بیٹھ جاؤ چاؤلے۔'' جاوا نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں جناب! یہ گستاخی نہ کروائیں۔'' تھانیدار چاؤلہ نے کہا اور اسی طرح کھڑا رہا۔

جاوا نے دو مسلح افراد کے سوا باقی سب کو باہر بھیج دیا۔

''اوتار سنگھ کے پتر کو نہیں دیکھو گے انسپکٹر؟'' چودھری انور نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کہاں ہے؟''

چودھری انور نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ تھانیدار چاؤلہ کی نگاہیں یوسف فاروقی پر جم کر رہ گئیں۔ چہرہ حیرت کی تصویر تھا۔ ''زبردست...... یہ تو چمتکار ہے جی! بس انیس بیس کا فرق ہوگا۔'' انسپکٹر چاؤلہ نے متحیر آواز میں کہا اور کھڑکی کے قریب آ گیا۔

''کیا خیال ہے، کام دے گا؟''

''ہنڈریڈ پرسنٹ دے گا جی! اس کے گال پر یہ گھاؤ......؟''

''یہ دستی کام ہے بھئی۔'' جاوا نے کہا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں تھانیدار چاؤلہ اور جاوا وغیرہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے ساری بات کا پتا چل گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جان کی بازی ہارنے والے پولیس کے انفارمر کا نام روہیل سنگھ تھا۔ ایسے انفارمرز کو عام طور پر شدید مطلوب افراد کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ بدقسمت روہیل کو بھی سردار اوتار کے مفرور بیٹے اشوکا سنگھ کے بارے میں علم تھا۔ دو دن پہلے جب ہم یہاں وارد ہوئے تو روہیل نے بھی کئی دوسرے لوگوں کی طرح یوسف کو دیکھا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے اسے اشوکا ہی سمجھا۔ اگلے روز اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ مقامی تھانیدار چاؤلہ سے اس کے گھر پر جا کر ملا اور اسے بتایا کہ سردار اوتار کا مفرور بیٹا کچھ دیگر افراد کے ساتھ گاؤں میں موجود ہے۔ تھانیدار چاؤلہ سے رابطہ کرنا روہیل کی بدقسمتی ثابت ہوا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ یہ ہندو تھانیدار، جاوا کے پُرانے نمک خواروں میں سے ہے اور محکمے سے زیادہ جاوا کا وفادار ہے۔ اسے یوسف کی ساری رُوداد معلوم تھی۔ جانتا تھا کہ یوسف اپنی شکل و شباہت کی وجہ سے جاوا اور سردار اوتار کے لیے بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ لہٰذا اپنے مخبر کی اطلاع پر تھانیدار چاؤلہ نے خود کوئی کارروائی کرنے کے بجائے جاوا کو اطلاع پہنچائی اور جاوا اپنے جانبازوں کے ساتھ آناً فاناً یہاں آدھمکا۔

یوسف بالکل گم صم کھڑا تھا۔ میں نے کوئی ایک گھنٹہ پہلے ساری صورتِ حال کھول کر اس کے سامنے بیان کر دی تھی۔ اب میرے سارے بیان کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ گلوکار سے مشابہت والی ساری بات ڈھونگ تھی۔ اصل چکر وہی اوتار سنگھ کے بیٹے والا تھا۔ تھانیدار چاؤلہ کھڑکی میں سے یوسف کو اسی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جس دلچسپی سے پنجرے میں بند جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ ''یہ تو کمال ہے جاوا صاحب!'' وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ''یہ گال والے نشان کے بعد تو یہ اشوکا بابو کی کاربن کاپی لگنے لگا ہے۔ بس آواز اور قد کاٹھ کا تھوڑا بہت فرق ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ جاوا جواب میں کچھ کہتا، ایک بندہ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے جاوا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''نہیں جاوا صاحب! ابھی کچھ پتا نہیں چلا حرامزادی کا...... لیکن ہے گاؤں کے اندر ہی۔ ہم آس پاس کے گھروں میں دیکھ رہے ہیں۔''

جاوا پھنکارا۔ ''اگر وہ نہ ملی تو میں کاٹ دوں گا تجھے نیچے سے۔ حرام کے جنے! تین تین کلو کڑاہی گوشت دس منٹ میں اندر ڈال لیتے ہو۔ ایک چھوکری نکل گئی تمہاری ٹانگوں کے نیچے سے۔ جاؤ ڈھونڈو اسے۔'' جاوا کے آخری الفاظ کسی دھاڑ کے مشابہ تھے۔ کارندے کا

رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بڑا جسیم اور رعب دار شخص تھا مگر جاوا کا غصہ دیکھ کر لڑکھڑا گیا۔ اپنے موٹے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

یقیناً یہ ثروت کا ذکر ہی ہوا تھا۔ رجنی کے بارے میں تو ابھی ان لوگوں کو علم ہی نہیں تھا۔

چودھری انور گنجے نے میری طرف کینہ توز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ہمیں پتا چلا ہے کہ ایک اور کنجر سنگھ بھی تیرے ساتھ تھا۔ وہ کس ماں کے پاس ہے؟'' چودھری انور کا اشارہ یقیناً جگت سنگھ کی طرف تھا۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ جگت سنگھ کو تھوڑا بہت جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے کسی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ جگت اپنے کسی کام سے نکلا تھا۔''

جاوا کا ایک کارندہ بولا۔ ''اور ایک اور چھوکری بھی تو تھی یہاں۔ گوبند رسنگھ کی منگیتر؟''

''وہ بھی جگت کے ساتھ ہی گئی تھی۔'' میں نے فوراً کہا۔

''یہی تو پوچھ رہے ہیں بچے کہ وہ دونوں گئے کہاں ہیں؟'' جاوا نے سفاک انداز میں پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔''

''تم جو کچھ نہیں جانتے، آج سب جان جاؤ گے۔ اگلی پچھلی ساری کسر نکلے گی۔ وہاں پاکستان میں تو وہ گندے گوشت کا پہاڑ ریان اپنی ماں کا ولیمہ کھانے پہنچ گیا اور تم بچ نکلے مگر اس بار نہیں بچو گے بچے! تم اپنے ہاتھوں سے نادر کے ہتھیارے (عمران) کو گولی نہ مارو تو پھر مجھ خاکسار کو جاوا کون کہے گا۔'' پھر وہ اپنے کارندے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چوپڑا! ذرا سردار اوتار کو فون لگاؤ۔''

میں نے پہلی بار اس چوپڑا نام کے کارندے کو دھیان سے دیکھا اور یوں لگا کہ میں کسی انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ یہ بندہ مشہور انڈین ولن پریم چوپڑا سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہی پھیلی ہوئی ناک، وہی اُبھرے ہوئے رُخسار...... زیادہ نہیں تو ستر اسّی فیصد تک ضرور وہ انڈین اداکار سے ملتا تھا۔ اس کا جسم تھوڑا سا فربہ ہوتا تو یہ مشابہت مزید بڑھ جاتی۔

اس نے قیمتی موبائل فون پر کال ملائی اور پھر فون جاوا کی طرف بڑھا دیا۔ جاوا مخصوص انداز میں بولا۔ ''ہاں سردار! کیا حال ہے تیرا...... بیٹی والا معاملہ کچھ ٹھیک ہوا کہ نہیں؟''

دوسری طرف سے سردار اوتار سنگھ نے جو کہا، وہ جاوا نے قدرے بے پروائی سے سنا۔ جاوا کے چہرے پر چیچک کے مدھم نشان تھے جو اس کی ہیبت میں اضافہ کرتے تھے۔ سردار اوتار کی بات سننے کے بعد جاوا نے کہا۔ ''چل کوئی نہیں، زیادہ نراش نہ ہو۔ یہ تیرا ایک لفڑا تو

حل ہو گیا ہے۔ وہ چھوکرا یوسف پکڑ لیا ہے ہم نے...... ساتھ میں وہ جعلی اکبر علی بھی ہے۔ اس ماسٹر پیس کا اصل نام تابش ہے۔ اس چندا کے ٹوٹے سے اپنی پُرانی واقف کاری نکل آئی ہے۔''

دوسری طرف سے یقیناً ثروت کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ جاوا نے کہا۔ ''وہ چھوکری بھی ساتھ ہی ہے لیکن ابھی کہیں کھسک گئی ہے۔ گاؤں کے اندر ہی ہے کہیں۔ لڑکے ڈھونڈ رہے ہیں۔ شکاری کتوں سے پالتو خرگوشنی کبھی بچ سکی ہے؟ یہ بھی نہیں بچے گی۔''

دوسری طرف سے سردار اوتار سنگھ نے کچھ کہا جسے جاوا نے غور سے سنا اور اپنے بھدے ہونٹ سکوڑے۔ ساتھ ہی مجھے بھی گھورا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''میرے بچے اور کتنے پنگے لے گا تُو؟ پنگے پر پنگا، دنگے پر دنگا...... وہاں سردار اوتار کے ایک بندے کو بھی ٹپکایا ہے تُو نے؟ حویلی کے اندر واٹر پمپ کے کھڈے سے اس کی لاش ملی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ سردار اوتار کے خاص ساتھی کیدار ناتھ کی بات کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ جاوا کچھ اور کہتا، ایک بار پھر آشا زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ جاوا نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے چودھری انور کو دیکھا۔ ''عورت زوردار ہے انورا۔ ذرا دیکھ تو جا کر کتنا ''زور'' ہے اس میں۔''

چودھری انور بس مسکرا کر رہ گیا۔ اس کے انداز سے پتا چلا کہ وہ رنگین مزاج ہونے کے باوجود فی الحال اس قسم کی مہم جوئی کا ارادہ نہیں رکھتا۔

جاوا نے سفاکی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''جاؤ لڑکو! تم میں سے ہی کوئی چپ کراؤ اس پنجابن مٹیار کو...... بلکہ تُو ہی جا چوپڑا۔ تُو کافی مہینوں بعد جیل سے نکلا ہے۔''

چوپڑا کی چوڑی ناک کچھ اور پھیل گئی۔ وہ واقعی فلمی ولن نظر آنے لگا۔ فرق صرف عمر کا تھا۔ اصلی پریم چوپڑا تو کافی بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہ اسّی کی دہائی کا پریم چوپڑا لگ رہا تھا۔

''جو حکم جاوا صاحب!'' چوپڑا نے ادب سے کہا اور واپس مڑا۔

میرے پہلو میں کھڑا گوبند رسنگھ چلّایا۔ ''رُک جاؤ...... خبردار جو اسے ہاتھ لگایا تو۔ میں...... میں ماردوں گا اور مر جاؤں گا۔''

جاوا زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ چودھری انور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو یہ کٹی گردن والا مرغا کہہ رہا ہے کہ ماردوں گا یا مر جاؤں گا...... اوئے گندی ماں کے بچے، مرتو تُو پہلے ہی چکا ہے، اب اور کیا مرے گا۔''

''دیکھو جاوا...... مم...... میں جانتا ہوں...... آپ بہت بڑے لوگ ہو۔ میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں لیکن ہمیں اس طرح ذلیل کرنے سے پہلے ہمارا دوش بتا دو۔ ہم نے کیا کیا ہے؟ آپ کی دشمنی اس تابش بھا جی سے ہوگی یا یوسف سے ہوگی۔''

''جو جاوا کے دشمن کو پناہ دے گا، وہ جاوا کا دشمن ہی ہوگا نا۔'' جاوا نے گلاس میں شراب اُنڈیلی اور کرسی پر کچھ اور بھی پھیل کر بیٹھ گیا۔ کرسی اس کے صحت مند بوجھ کے نیچے چرچرا رہی تھی۔

''میں سوگند کھاتا ہوں جی! اگر ہمیں شک بھی ہوتا کہ اس معاملے میں آپ کا نام آرہا ہے تو ہم ان کے قریب بھی نہ پھٹکتے۔ ہمیں بالکل جانکاری نہیں تھی۔'' گوبندر بولا۔

''مگر بچے! تُو تو اب بھی دشمنی فرما رہا ہے۔ تیرا بھائی جگت اس گھر میں تیرے ساتھ تھا یا نہیں؟ وہ جہاں گیا ہوگا تم لوگوں کو بتا کر ہی گیا ہوگا۔''

''میں واہگرو کی سوگند کھاتا ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اس بارے میں نردوش ہیں۔ ہم دونوں بھائی نردوش ہیں۔''

جاوا شراب پیتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ کاکے! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے بک چکا ہوں کہ بالکل نردوش ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بندے کو سزا ابھی نہ ملے۔ سزا تو بندے کو کسی بھی سمے کسی پُرانی غلطی کی وجہ سے مل سکتی ہے، جیسے ابھی اس سسرے مخبر کو ملی ہے۔ اور دیکھ بچے! سزا کی وجہ سے من چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ آتما کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہے۔''

پھر وہ چوپڑا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے کتے! تُو تو جا...... تُو کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟''

گوبندر چلایا۔ ''نہیں جاوا صاحب! ایسا نہ کرو۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ۔ رحم کرو ہم پر......'' اس نے کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

جاوا نے بڑے غور سے گوبندر کو دیکھا اور بولا۔ ''میرے بچے! یہ صرف تیری بھاوج ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ بڑا درد ہے تیری آواز میں۔ لگتا ہے سہگل صاحب تیری آواز میں گھس گیا ہے۔''

جاوا نے یہ بات نیم سنجیدگی سے کہی تھی لیکن یہ حقیقت بھی تھی۔ میں چند رات پہلے اس حقیقت کا گواہ بنا تھا۔ گوبندر اور اس کی جعلی بھاوج میں ایک اور تعلق بھی تھا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں گوبندر نے بہت منت سماجت کی۔ بیچ بیچ میں اس نے غضب ناک لہجے میں جاوا کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی لیکن جاوا تو جیسے ایک کالے پتھر کا نام تھا جس پر کوئی داد فریاد

اثر کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں کچھ بولا تو نہیں مگر میرے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ گہری نیلی آگ جو ارد گرد کی ہر شے کو جاوا سمیت راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ اس آگ کو نکلنے کے لیے راستہ چاہیے تھا مگر راستہ کہیں نہیں تھا۔ عقب میں پختہ لکڑی کا بھاری دروازہ تھا اور سامنے سلاخ دار کھڑکی۔

قریبی کمرے سے پہلے آشا کی منت سماجت کی آوازیں آتی رہیں پھر وہ رونے چلانے لگی اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی یہ پکار مدھم ہوگئی اور پھر بالکل گھٹ کر رہ گئی۔ یقیناً پریم چوپڑا نے اکیلے یا اپنے کسی ساتھی کی مدد سے آشا پر قابو پا لیا تھا۔

گوبندر بہت تڑپا مچلا لیکن ہم تینوں آشا کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ یہ ایک بھرا پُرا گاؤں تھا۔ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، یقیناً ارد گرد والوں کو اس کی خبر ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود کوئی مدد کے لیے نہیں آیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ثروت بھی یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ خوف کی وجہ سے کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی۔ اس نے یقیناً گاؤں والوں کو اندر کی صورتِ حال سے آگاہ کیا ہوگا۔ مگر ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ ہر کسی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ باقی رہی پولیس جس کو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا ہوتی ہے تو پولیس کا کرتا دھرتا چاوَلہ خود یہاں موجود تھا اور شراب پی رہا تھا۔ جاوا کے اصرار پر اب وہ اس کے پاس ہی مؤدب انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اگر خدانخواستہ ثروت پکڑی جاتی اور اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا تو کیا ہوتا؟ میں کیا جیتے جی یہ سب کچھ دیکھ سکتا اور جھیل سکتا؟ جب ثروت لاہور سے یوسف کی تلاش میں نکل رہی تھی، میں نے اسے بہت روکا تھا۔ ہارون آباد کے ہوٹل سے بھی میں نے اسے واپس لاہور بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہمارا پالا بُرے لوگوں سے پڑنے والا ہے مگر حالات اس درجہ سنگین ہوں گے، یہ میں نے تب بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ درندوں کا گروہ تھا، خونی قاتلوں کا جتھا تھا اور یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ یہ فلم نگری ممبئی سے وارد ہوئے تھے۔ ممبئی، رنگ و بو اور روشنیوں کا مرکز لیکن اس کے ساتھ ساتھ جرائم کا تاریک ترین گڑھا۔ ایشیا کے ناسوروں میں سے ایک ناسور اور مشرقی پنجاب کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ممبئی کا یہ کالا عفریت جاوا، ہمارے سامنے پھیل کر ایک فولڈنگ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور سرخ رنگ کی نہایت قیمتی شراب اپنے اندر اُنڈیل رہا تھا۔ شراب انسان کو جانور بناتی ہے اور جو پہلے ہی جانور اور درندہ ہو، اس کی بربریت کا کیا ٹھکانا ہوگا؟

جاوا، چودھری انور اور چاؤلہ کے سامنے اب دو فولڈنگ میزوں پر کئی لوازمات سجا دیئے گئے تھے جن میں ڈرائی فروٹ کے علاوہ تلے ہوئے آلو اور اس قسم کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ جاوا اور چودھری انور کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے یہ خوشگوار انکشاف ہو رہا تھا کہ سردار اوتار کی بیٹی سرلاں اپنے گھر والوں کے ہاتھ نہیں آسکی اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ کسی طرح سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ چکی ہو۔ یکا یک کہیں پاس سے ایک بار پھر چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے غور سے سنا اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ گوبندر کی منگیتر، چنچل رجنی کی آواز تھی۔ وہ ''بچاؤ بچاؤ'' پکار رہی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد جاوا کے کارندے اسے کھینچتے ہوئے جاوا کے سامنے لے آئے۔ رجنی کے تراشیدہ بالوں میں بھوسے کے بہت سے تنکے اٹکے ہوئے تھے۔ اس کے شوخ رنگوں والے لباس پر بھی تنکے تھے۔ جاوا کے کارندے نے رجنی کو سر کے بالوں سے دبوچا ہوا تھا۔ دوسرا کارندہ اسے عقب سے زوردار ٹھوکے دے رہا تھا۔ ان ٹھوکوں کے لیے وہ رائفل کا کندھا استعمال کر رہا تھا۔

کارندے نے کہا۔ ''جاوا صاحب! یہ وہاں کوٹھڑی میں پرالی کے اندر چھپی ہوئی تھی۔''

جاوا نے اسے سرتاپا گھورا اور بولا۔ ''کیا نام ہے تیرا؟''

وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔'' پھر اس کی نظر کھڑکی میں سے گزر کر گوبندر پر پڑی۔ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہ گوبندر کی طرف بڑھی۔ اس کے بال کارندے کی مٹھی میں تھے۔ اس نے بے رحمی سے جھٹکا دیا۔ رجنی کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ ایک بار پھر چلّانے لگی۔ ''بچاؤ...... رب کا واسطہ ہے بچاؤ۔'' اس کی آواز باریک تھی۔ خوف کی وجہ سے کچھ اور بھی باریک ہوگئی تھی۔

جاوا نے کہا۔ ''یہ چھوکری بول رہی ہے یا سیٹی بجا رہی ہے۔''

کارندے نے رجنی کی آواز بند کرنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تو جاوا زہریلے انداز میں بولا۔ ''بولنے دو اس کو۔ دیکھتے ہیں کہ کون آتا ہے اس کی سیٹی سن کر۔''

چودھری انور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''کوئی نہیں آئے گا جاوا صاحب! کسی کے کانوں تک آواز نہیں پہنچے گی اور اگر پہنچے گی تو وہ سنے گا نہیں۔ لگتا ہے کہ اس پنڈ میں بس ایک ہی جی دار بندہ ہے اور وہ یہ چاؤلہ صاحب ہمارے ساتھ بیٹھا ہے۔''

شاید انور ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اردگرد موجود سب لوگوں نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ یقیناً وہ پُرشکوہ گاڑیاں دیکھتے ہی جاوا کی آمد کے بارے میں جان گئے تھے۔ اس آمد کے بعد

یہاں کم از کم تین گولیاں بھی چلی تھیں۔ گولیوں کی آواز نے اہل دیہہ کو مزید سہما دیا تھا۔

میری نظر چودھری انور کے چہرے پر پڑی۔ وہ بھی جاوا کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا۔ اس کے سیاہی مائل ہونٹوں کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ رجنی کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کھینچا تانی میں رجنی کا دوپٹا اُتر چکا تھا اور وہ بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔

جاوا نے مخمور نظروں سے چودھری انور کو دیکھا۔ ''ہاں انور بھیا! یہ چھوکری چلے گی؟''

اس مرتبہ چودھری انور کے چہرے پر انکار نظر نہیں آیا۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی تھیں۔ ایک تو اب اسے شراب چڑھ چکی تھی، دوسرے وہ شہری لڑکیوں کا رسیا تھا۔ آشا دیہاتن تھی جبکہ رجنی گاؤں میں رہنے کے باوجود سرتاپا شہری نظر آتی تھی۔ چودھری انور نے تلے ہوئے آلو کے بہت سے قتلے ایک ساتھ اپنے منہ میں رکھے اور چاؤلہ کے کان میں کوئی بہکی ہوئی سرگوشی کی۔ چاؤلہ مؤدب انداز میں مسکرا دیا۔

جاوا نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ روتی چلّاتی رجنی کو کھینچ کر اسی طرف لے گئے جدھر تھوڑی دیر پہلے بدقسمت آشا گئی تھی۔ گوبندر اپنے سینے کی پوری قوت سے دھاڑنے لگا۔ ''جاوا صاحب! ایسا مت کرو۔ میں تمہارے گلے لگ کر مر جاؤں گا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جاوا صاحب......'' وہ سلاخوں پر مکے برسانے لگا۔ انہیں جھنجھوڑنے لگا۔ میں جانتا تھا، اس ساری تڑپ پھڑک سے اسے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔

چودھری انور گنجے کے چہرے پر شیطانی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر جاوا کی ''مہربان آفر'' قبول کر لی ہے۔ جگت سنگھ نے مجھے بتایا تھا، ماضی میں لاہور کی کسی شریف فیملی کی لڑکی نے چودھری انور کو دھتکارا تھا۔ اس دھتکار کا بدلہ اس نے کسی اور انداز میں لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے شہر سے تعلق رکھنے والی دو لڑکیوں کو رکھیلوں کے طور پر پیلی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ اس کی بیویاں کہلاتی تھیں۔

کچھ دیر بعد چودھری انور اُٹھا اور جھومتا ہوا سا ہماری نظروں کی رینج سے نکل گیا۔ گوبندر کا بُرا حال تھا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا اور خود کو دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اسی دوران میں پریم چوپڑا اپنا ''سیاہ کارنامہ'' انجام دے کر واپس آ گیا۔ اس کے چوڑے چہرے پر لعنت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔

جاوا نے جھومتی آواز میں پوچھا۔ ''ہاں چوپڑے! کتنا زور تھا؟'' اس سے پہلے کہ چوپڑا اپنی گندی زبان کو حرکت دے کر کچھ منحوس بولتا، دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی شیشے کی

چیز چھناکے سے ٹوٹی۔ اس کے بعد آشا کی آوازیں اُبھریں۔ وہ ایک بار پھر چلّا رہی تھی لیکن اب اس کے چلّانے کی نوعیت مختلف تھی۔ اندازہ ہوا کہ وہ جاوا کے کارندوں کو نوعمر رجنی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کا کہا ہوا کوئی کوئی فقرہ ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ بے توقیری اور ذلت کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد اس نے حجاب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ جاوا کے کارندوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے منہ کالا کر لیں لیکن رجنی کو چھوڑ دیں۔ پریم چوپڑا بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر آوازوں کی طرف لپک گیا۔ بے شک آشا بھی اخلاقی طور پر ایک گری ہوئی عورت تھی لیکن ان آفت کی گھڑیوں میں اس کا کردار قدرے مختلف نظر آ رہا تھا۔ وہ رجنی کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یوں لگا جیسے آشا کو پیٹا اور گھسیٹا جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر بے بسی کے عالم میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مزاحمت کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دل سینے میں سو ٹکڑے ہو رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد جاوا کے کارندے آشا کو کھینچتے ہوئے جاوا کے سامنے لے آئے۔ اس کا بالائی جسم نیم عریاں تھا اور اسے اس عریانی کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ سرخ انگارہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک درانتی تھی۔ تاہم درانتی والے ہاتھ کو ایک ہٹے کٹے شخص نے مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کا دوسرا بازو بھی ایک تنومند ڈشکرے کی گرفت میں تھا۔ ہم نے دیکھا، پریم چوپڑا کے کندھے پر ایک گہرا زخم تھا۔ اس نے کندھے کو ہاتھ سے دبایا ہوا تھا اور خون ہاتھ کی انگلیوں کے درزوں سے اُبل رہا تھا۔ چوپڑا کا چہرہ اذیت سے پیلا ہو رہا تھا۔

ایک کارندہ بولا۔ ''اس کتیا نے حملہ کیا ہے جی۔ اپن اس کو پکڑتا نہیں تو یہ اور نقصان کرتی۔''

جاوا کھڑا ہو گیا۔ جاوَلہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ رنگ میں بھنگ پڑ گئی تھی۔ چودھری انور گنجا بھی اندر سے آ گیا۔ جاوا کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ اس نے آشا کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور اس کی شکل کو بگاڑتے ہوئے بولا۔ ''بلیدان دے رہی ہو؟ اس چھوکری کے بدلے خود کو بھینٹ چڑھانا چاہتی ہو؟ لیکن تیرے کھوپڑے میں شاید بھس بھرا ہوا ہے۔ جوان ہرنی کی جگہ جوان ہرنی ہی بھینٹ چڑھائی جا سکتی ہے۔ بڈھی بھینس نہیں......''

آشا کو غم و غصے نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ اس نے درانتی سے جاوا پر حملے کی کوشش کی لیکن تنومند کارندوں نے اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہیں دیا۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر جاوا پر چلّانے لگی۔ اس کو گالیاں اور بددعائیں دینے لگی۔ پھر بے بسی کے عالم میں اس نے جاوا پر تھوک دیا۔ اس کا خون آلود تھوک ...... آخ تھو...... کی آواز کے ساتھ جاوا کے کندھے پر پڑا۔

جاوا چند سیکنڈ کے لیے ساکت و جامد رہ گیا۔ پھر اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں واقعی انگارے دہکنے لگے ہیں۔ جاوا کے کارندوں نے درانتی آشا کے ہاتھ سے نکال لی۔ وہ اسے بے رحمی سے مارنا پیٹنا چاہ رہے تھے مگر جاوا نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اس نے تھانیدار جاوَلہ کو بھی روک دیا جو خطرناک انداز میں آشا کی طرف بڑھا تھا۔

جاوا نے اپنے کُرتے کے نیچے سے پستول نکالا۔ اس نے آشا کی گردن پر ذرا دباؤ ڈالا تو آشا کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس نے پستول کا لمبا بیرل آشا کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ دو افراد نے دو اطراف سے آشا کا سر پکڑ رکھا تھا۔ جاوا کسی شیش ناگ کی طرح پھنکارا۔ ''بتا کہاں سے تھوکا تھا؟ یہاں سے یا کچھ اور آگے سے؟''

آشا پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن گلے سے بس غوں غاں کی آواز ہی نکال پا رہی تھی۔ کمرے میں گوبندر، جاوا سے رحم کی درخواستیں کر رہا تھا۔

جاوا کا دھیان فقط آشا کی طرف تھا۔ وہ دوبارہ جنونی آواز میں بولا۔ ''بتا کہاں سے تھوکا تھا؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کا بیرل کچھ اور بھی آشا کے گلے میں گھسیڑ دیا۔ وہ اُبکائیاں کرنے لگی۔ جاوا نے اوپر تلے دو فائر کیے اور پستول آشا کے منہ سے کھینچ لیا۔ وہ لہرا کر گری اور ساکت ہو گئی۔ ایک گولی غالباً اس کی گردن کے پچھلے حصے سے باہر نکل گئی تھی۔

''آخ تھو۔'' جاوا نے اس پر تھوکا اور پھر اپنے پستول کے لعاب آلود بیرل کو آشا کے کُرتے سے صاف کیا۔

کمرے کے اندر گوبندر سنگھ جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو کمرے کے چوبی دروازے سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ میں نے دو منٹ پہلے دیکھا تھا کہ گوبندر نے آہنی سریے کا ڈیڑھ دو فٹ لمبا ایک نکیلا ٹکڑا اپنی شرٹ کے نیچے چھپایا تھا۔ وہ ایک زبردست فائٹر تھا۔ وہ کسی طرح باہر نکل جاتا تو کھلبلی مچا سکتا تھا مگر یقینی بات تھی کہ وہ لوگ اسے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ اور پھر یہی ہوا، جاوا نے اسے بس ایک وارننگ دی پھر گولی چلا دی۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی، وہ گر کر تڑپنے لگا۔ دوسری گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور اس نے اسے فوراً ہی ساکت کر دیا۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ جاوا نے خونی نظروں سے مجھے اور یوسف کو دیکھا۔ موت جیسے سرد لہجے میں بولی۔ ''تم میں سے بھی کسی کو دروازے کے ساتھ زور آزمائی کرنی ہے؟''

یوسف نے چہرے کو ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ گوبندر دروازے کے قریب ہی گرا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون دروازے کی نچلی درز سے باہر کی طرف رینگنے لگا جیسے وہ بھی اس کمرے سے آزادی کا خواہاں ہو۔ سریے کا ٹکڑا اس کی شرٹ کے نیچے سے نکل کر فرش پر لڑھک گیا تھا۔

جاوا نے یہ ٹکڑا دیکھ لیا۔ اس نے جنونی لہجے میں مجھے حکم دیا کہ میں یہ ٹکڑا اُٹھا کر اسے دوں۔ میں نے ٹکڑا اُٹھا کر سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

بے شک گوبندر نے صدمے کے زیرِاثر سنگین غلطی کی تھی۔ اس وقت ہم کسی بھی طرح مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ جاوا گرجا۔ ''اگر تم دونوں کے پاس بھی کوئی ایسی شے ہے تو نکال دو۔''

''نہیں...... کچھ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلو وشواس کر لیتے ہیں۔ جو بندہ ایک دو گھنٹوں میں بھگوان کو پیارا ہونے والا ہو، اس کی بات پر وشواس کر لینا چاہیے۔''

پریم چوپڑا نے آشا کی لاش پر ایک کپڑا ڈالا پھر دو افراد اسے اُٹھا کر لے گئے۔ خون پر پہلے چولہے کی راکھ ڈالی گئی پھر جھاڑو سے صاف کر دیا گیا۔ گوبندر کی لاش اسی طرح پڑی رہی اور ماحول کی سراسیمگی میں اضافہ کرتی رہی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ زندگی سے بھرپور یہ نوجوان اپنے تمام تر ہنر اور زندگی کے سارے منصوبوں سمیت مٹی کا ڈھیر بن چکا ہے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ رجنی شاید وقتی طور پر بچ گئی ہے۔ چودھری انور اب جاوا اور تھانیدار چاؤلہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ یہاں آناً فاناً جو خون خرابا ہوا تھا، اس نے غالباً چودھری انور کا موڈ بھی بدل دیا تھا۔ اس کی توجہ اب رجنی کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ بہرحال توجہ ہٹنے کی ایک وجہ کچھ اور بھی تھی، جس کا پتا ہمیں تھوڑی دیر بعد چلا...... رجنی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ ہی گھر میں کسی جگہ سے جدوجہد کے شواہد مل رہے تھے۔ جاوا موبائل فون پر کسی فلمی بندے کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ اسے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ فلاں کیس کی پیروی سے باز نہ آیا تو ممبئی واپس پہنچتے ہی سب سے پہلے وہ اس کو اُلٹا لٹکائے گا۔ اس کی فلم ڈبوں میں بند ہو جائے گی اور اس کی فیملی کا کوئی بندہ کسی فلم سٹوڈیو میں کبھی قدم نہیں رکھ سکے گا۔

اسی دوران میں پینٹ شرٹ والا ایک سکھ نوجوان گھر میں داخل ہوا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا سٹیتھوسکوپ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس گاؤں کا کمپاؤنڈر یا ڈاکٹر ہے۔ بعدازاں پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر ہی تھا۔ اسے ایک مسلح شخص لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر کا

رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔ اس کا میڈیکل باکس بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ قریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر دوبارہ کھڑکی کے سامنے نظر آیا۔ تھانیدار چاؤلہ نے بارُعب آواز میں اس سے پوچھا۔ ''ہاں جسونت! کیا رپورٹ ہے؟''

ڈاکٹر لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں نے انجکشن دے دیا ہے جی، ہوش میں آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ چنتا کی کوئی بات نہیں جی۔''

اسی دوران میں دبلے پتلے ڈاکٹر کی نظر کھڑکی سے گزر کر اندر آئی اور گوبندر کی لاش پر پڑی۔ وہ کچھ اور بھی ہراساں دکھائی دیا۔

تھانیدار چاؤلہ نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''جسونتے! یہاں جو کچھ دیکھا ہے۔ اس کے بارے میں باہر کسی سے ایک شبد (لفظ) بھی نہیں بولنا۔ بہت تکلیف میں آ جاؤ گے۔''

''نن...... نہیں جی۔ بالکل نہیں۔''

جاوا نے کہا۔ ''جو لڑکی یہاں سے بھاگی ہے، اس کے بارے میں کوئی جانکاری ہے تمہیں؟''

''جی بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی لڑکی بھاگی ہے اور آپ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''دھیان رکھو کوئی جانکاری ملے تو فوراً بتاؤ۔'' تھانیدار نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور لڑکھڑاتا ہوا سا باہر نکل گیا۔ ایک مسلح شخص میڈیکل باکس کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا۔

بہت جلد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ بیہوش ہونے والی گوبندر کی منگیتر...... بلکہ ''سابقہ منگیتر'' رجنی کور ہے۔ وہ صورتِ حال کی سختی نہیں جھیل سکی تھی۔ اسے آوازوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آشا پر کیا بیتی ہے۔ وہ اس وقت بیہوش ہوئی تھی جب جاوا نے آشا پر دو فائر کیے تھے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ابھی اسے گوبندر کی موت کا پتا نہیں۔

جاوا کے قریب دو موبائل فون رکھے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون کی بیل ہونے لگتی تھی اور وہ گفتگو میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس کی یہ ساری گفتگو ممبئی کے ایک خطرناک ڈان کی ''شان'' کے عین مطابق تھی۔ اس کے اکثر فقروں میں گندی گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ ہمارے سامنے ہی ممبئی کی ایک معروف ہیروئن کی کال بھی آئی۔ جاوا نے اس سے قدرے بہتر انداز میں بات کی۔ تاہم گندی گالیوں سے مکمل پرہیز اس نے پھر بھی نہیں کیا۔ اس نے ہیروئن سے کہا کہ اگر اب اسے انکم ٹیکس آفیسر کا فون آئے تو وہ اسے بتائے۔ وہ اس کی پتلون

گیلی کرنے کا مکمل انتظام کردے گا۔

کچھ دیر بعد تھانیدار چاؤلہ تو جاوا سے اجازت لے کر اور اس کے پاؤں چھو کر واپس چلا گیا تاہم باقی افراد وہیں موجود رہے۔ وہ زرخرید غلاموں کی طرح جاوا کے اردگرد جدید رائفلیں اُٹھائے کھڑے تھے اور جاوا کی ابرو کے ایک اشارے پر کسی کو بھی چھلنی کر سکتے تھے۔ جاوا اور چودھری انور مسلسل شراب پی رہے تھے۔ گاہے بگاہے وہ مدھم آواز میں بات بھی کرنے لگتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس گفتگو کا محور میں ہوں۔

اسی دوران میں زخمی کندھے والا پریم چوپڑا اندر آیا۔ اس نے بڑے ادب سے جھک کر جاوا کے کان میں سرگوشی کی۔ جاوا نے سر اثبات میں ہلایا۔

پریم چوپڑا واپس چلا گیا اور چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے سکھ کو لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر پگڑی کے بجائے جوڑا تھا۔ وہ ڈرا ڈرا سا جاوا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟'' جاوا نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔ نووارد نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا جیسے دوسروں کی موجودگی میں بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ جاوا پھنکارا۔ ''جو بکنا ہے سب کے سامنے بک دے۔ سمجھ لے یہاں ہر جگہ میں ہی تیرا باپ کھڑا ہوں۔''

نووارد نے تھوک نگلا۔ ''جناب! مجھے پنڈ کے نمبردار چودھری گلاب نے بھیجا ہے۔ کڑی کا پتا چل گیا ہے جی۔''

''کہاں ہے؟'' جاوا کی بے قراری نمایاں تھی۔

''ہماری بیٹھک میں ہے جی۔ پناہ لینے کے لیے آئی تھی۔''

''تو پھر کیا خیال ہے؟ پناہ دینی ہے اس کو؟'' جاوا نے پوچھا۔

نووارد نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''نمبردار صاحب ایسا سوچ بھی نہیں سکتے جی! آپ کی دوشی کو چھپا کر ہم نے اپنی گردن اُتروانی ہے۔''

''تو پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟''

''نمبردار جی نے ایک بنتی کی ہے جی! اگر آپ مان لیں تو...... ان کا خیال ہے کہ وہ خود کڑی کو یہاں لائے تو پنڈ والے بعد میں باتیں بنائیں گے۔ آپ اپنے دو چار بندے بھیج کر کڑی کو پکڑ لیں۔''

میری دھڑکنیں زیروزبر ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا ہے۔ اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ نمبردار کا نمائندہ جاوا کو جو اطلاع دے رہا

ہے، وہ ثروت کے بارے میں ہی ہے۔ وہی ہو رہا تھا جس کا بدترین اندیشہ میرے دل میں موجود تھا۔ ثروت یہاں سے تو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن وہ گاؤں والوں کی بے حسی اور کم ہمتی کے جال سے نہیں نکل پائی تھی۔

باہر نمبردار کا نمائندہ خوف زدہ لہجے میں جاوا سے کہہ رہا تھا۔ ''جناب! آپ جیسا حکم کریں گے ویسا ہی ہوگا۔ لیکن اگر اس طرح ہو جائے تو ہماری تھوڑی سی عزت رہ جائے گی۔ آپ چاہیں تو ابھی آ جائیں۔ بے شک ایک دو گولیاں بھی چلا دیں۔ تھوڑا سا ماحول بن جائے گا۔''

جاوا سفاک مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ایک دو گولیاں مار ہی نہ دیں نمبردار کے ہیجڑوں کو؟''

نمائندے نے ہاتھ جوڑے۔ ''آپ مائی باپ ہیں جی! اپنے چاکروں پر کرپا ہی کریں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں بھیجتا ہوں بندے تھوڑی دیر میں...... اس دوران میں اس کا دھیان رکھو۔ وہ بھاگ گئی تو تم میں سے کسی کو اپنی چھوکری دینی پڑے گی۔''

نووارد نے بار بار جھک کر نمستے کیا اور اُلٹے قدموں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں اس نے بڑی نیازمندی سے اپنی گردن جھکائے رکھی تھی۔ نہ اس نے ہماری شکلیں دیکھی تھیں نہ کمرے کے فرش پر پڑی گوبندر کی لاش پر اس کی نظر پڑی تھی۔

جاوا نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لے بھئی آ گئی تیری پتنی بھی ہمارے اس بوچڑ خانے میں۔ لیکن تجھ سے زیادہ پریشانی تو تیرے اس یار تابش کو ہوگی۔ اس کا اصل پتی تو یہی ہے نا...... تُو تو بس کاغذی خاوند ہے چھوکری کا......''

لگتا تھا کہ میرے اور عمران کے بارے میں جاوا کافی معلومات حاصل کر چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماضی میں ثروت میری منگیتر رہی ہے۔

یوسف بالکل خاموش اور ساکت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس وقت اسے اپنی جان سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ وہ گوبندر کی لاش سے نگاہیں چرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گاہے بگاہے نگاہ لاش پر پڑ ہی جاتی تھی۔ اس صورت میں اس کے چہرے پر گہرا زرد سایہ لہرا جاتا تھا۔

چودھری انور نے کہا۔ ''جاوا صاحب! یہ تابشا اصل پتی بھی ہے اور پُرانا عاشق بھی۔ ہمارے پنڈ میں یہ دونوں ایک کریانہ فروش کے گھر میں میاں بیوی کی طرح اکٹھے رہتے رہے

ہیں۔ سنا ہے کہ اس کتے جگت سنگھ کے گھر میں بھی یہ پُرانے عاشق معشوق ایک ہی کمرے میں سوتے رہے ہیں۔''

جاوا نے شرابی انداز میں ہاتھ ہلایا اور بولا۔ ''ہاں بھئی ہاں وہ کیا گانا ہے اپنے کشور کمار کا جس کی دھن اس بنگلہ بھائی آر ڈی برمن نے بنائی تھی۔ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے۔ پرانی عاشقیاں ہیں بھئی، پرانی شراب کی طرح تیز اور پکے نشے والی۔ کوئی بات نہیں، اس عاشقی کا بھی حساب کتاب فرما لیتے ہیں۔ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ عاشق بچہ اپنی لیلیٰ کے لیے کتنی بڑی اوکھلی میں سر گھسیڑ سکتا ہے۔ ابھی دیکھتے ہیں۔''

ذرا توقف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اوئے پریم کپور! تُو بولتا کیوں نہیں؟ منہ میں کیا ایلفی لگائی ہوئی ہے؟''

چودھری انور نے کہا۔ ''جاوا صاحب! یہ جتنا اوپر ہے اس سے زیادہ نیچے ہے۔ بڑا خطرناک ہے۔ آپ کی طرح مجھ پر بھی ایک چڑھاوا چڑھایا ہوا ہے اس نے۔''

''کیسا چڑھاوا؟'' جاوا نے پوچھا۔

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ اس نے اپنی معشوق کے ساتھ مل کر جب بارڈر پار کیا تو میرے بندے اس کے پیچھے تھے۔ اس نے جگت کے ساتھ مل کر گھات لگائی اور میرے پانچ بندوں کی جان لی۔ ان کا خون میری چھاتی پر دھرا ہوا ہے جی۔''

''کوئی بات نہیں انورے! سارے حساب ایک جگہ جمع کر لیں گے۔ پورا بل بنا دیں گے اس کو۔ تم چنتا مت کرو۔ لیکن ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں۔ یہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے پیچھے ایک بڑا ہائی پاور انجن ہے جو اس کو چلاتا ہے۔ جب تک اس انجن کی ٹینکی میں چینی ڈال کر اس کا ''بولو رام'' نہیں کریں گے، کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس انجن کا نام شاید تم نے بھی سنا ہو۔ عمران...... عمران ہیرو۔ اصل کام یہی ہے کہ اس کو ہیرو بنانے والے اس کے سارے پوشیدہ تار کاٹ دیئے جائیں۔ اس کو ایک دم پاور لیس، ہیجڑا انجن بنا دیا جائے۔ نہ خود چلے، نہ اس بچے کو دھکا لگائے۔ اوہو ہو ہو...... ہیجڑا انجن۔'' جاوا نے اپنے فقرے پر خود ہی لطف لیا۔

میں نے دل ہی دل میں چودھری انور گنجے کے جھوٹ پر لعنت ارسال کی۔ اپنے پانچ بندوں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے میرے ساتھ جگت وغیرہ کو بھی نتھی کر دیا تھا۔ شاید اسے جاوا کو یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی تھی کہ میں نے اکیلے ہی اس کے پانچ بندوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔

ثروت کے حوالے سے اب امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ پھر بھی یہ آس ختم نہیں ہو رہی تھی کہ شاید وہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

کچھ دیر بعد جاوا اور چودھری انور اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ پریم چوپڑا اور اس کے مسلح خونخوار ساتھی ہمارے اردگرد موجود تھے۔ یوسف سر گھٹنوں میں دیئے یکسر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ صورتِ حال سے سخت خوف زدہ اور مایوس نظر آتا تھا۔ ان باتوں کی خجالت بھی اس کے چہرے پر موجود تھی جو تھوڑی دیر پہلے جاوا اور چودھری انور نے کی تھیں۔ چودھری انور نے بڑی بے شرمی سے یہ الزام عائد کر دیا تھا کہ میں اور ثروت ایک ہی کمرے میں اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ یقیناً ان باتوں نے یوسف کے دل و دماغ میں رقابت کے زہریلے نقش کچھ اور گہرے کیے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے کہا۔ ''یوسف! تم پر کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی ہے نا کہ تمہاری شکل کسی گلوکار وغیرہ سے نہیں اسی کتے سردار اوتار کے بیٹے سے ملتی ہے اور اسی لیے تمہارے لیے موت کا اسٹیج بھی تیار کیا جا رہا تھا۔'' اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سرگوشیوں میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی مگر اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

اسی دوران میں گھر سے باہر ایک گاڑی رُکنے کی آواز آئی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ثروت یہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس کے چلّانے کی گھٹی گھٹی آواز سنی پھر شاید کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی شخص گرج کر بولا۔ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ثروت کو کھینچ کر اندر لے آئے ہیں۔ بہرحال ہم اسے دیکھ نہیں سکے۔

میری بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں کسی طرح اس پنجرہ نما کمرے سے باہر نکل سکوں۔ ثروت کو بچا لوں یا خود ختم ہو جاؤں۔ میں نے جاوا کو پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میری پکار کا اتنی جلدی جواب ملے گا۔ زخمی پریم چوپڑا اندر سے آیا۔ اس نے مجھے خونی نظروں سے گھورا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''دو منٹ چھری کے نیچے سانس لو۔ بھیا صاحب (جاوا) خود تم سے بات کریں گے۔''

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد مجھے حیرت کا ڈھچکا لگا، جب واقعی مجھے اس منحوس کمرے سے باہر نکال لیا گیا۔ یوسف اندر ہی رہا۔ ایک رائفل کی نال میرے سر سے لگی ہوئی تھی۔ دو اور رائفلیں مجھے دائیں بائیں سے نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔ وہ لوگ ذرا سا رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ پریم چوپڑا بولا۔ ''تمہارے لیے بچت کی ایک راہ نکل رہی ہے۔ اپنی کسی بے

وقوفی سے اسے ضائع مت کر دینا۔ جو کہہ رہے ہیں، چپ چاپ کرتے جاؤ۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے ہاتھوں کو پشت پر ایک ہینڈ کف لگا دیا گیا اور پھر دو تین کمروں کے اندر سے گزار کر جاوا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جاوا ایک پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ایک کارندہ اس کے پاؤں دبانے میں مصروف تھا۔ میں پہنچا تو جاوا نے اسے بھی کمرے سے نکال دیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب اس بند کمرے میں جاوا اور میں تنہا تھے۔

جاوا بولا۔ ''میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا بچے! تیرا اور عمران ہیرو کا سارا حساب کتاب میں نے اس چٹ پر لکھ دیا ہے، ایک نظر ڈال لے۔'' اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے نظر دوڑائی۔ ایک فہرست سی بنائی گئی تھی۔ اوپر سے نیچے اس طرح لکھا تھا۔

مال روڈ لاہور والی کوٹھی میں نادر ٹی ٹی اور اس کے ایک ساتھی کی ہتھیا کی۔ سلطان چٹا کے کان میں گولی سے سوراخ کیا۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں دو بندوں کو زخمی کیا۔ شیخوپورہ کے قریب ایشوریا رائے کی عزت خراب کی۔ اندرون لاہور کے ہوٹل لالہ زار میں سیکرٹری ندیم کی ٹانگ توڑ کر اسے حبس بے جا میں رکھا اور اسی ہوٹل میں سلطان کے دو بندوں کو شوٹ کیا، دونوں کی موت ہوئی۔ چودھری انور کی پیلی حویلی میں نیتو عرف کرشمہ کپور کی جان لی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے جاوا کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''یہ صرف میرا حساب کتاب ہے۔ چودھری انور اور سردار اوتار وغیرہ کے بہی کھاتے اس کے علاوہ ہیں۔ اس میرے حساب کتاب کے مطابق ہی تمہیں دو تین دفعہ کتے کی موت مارا جا سکتا ہے اور تیری اس سندر معشوقہ پر اسی گاؤں میں بیس بیس روپے کا ٹکٹ لگایا جا سکتا ہے اور میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں وشواس دلاتا ہوں، یہاں دو دو کوس تک کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ پنچایت سے لے کر پولیس تک...... اور بی ایس ایف سے لے کر فوج تک کوئی نہیں۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''ایک سودا۔ میں اپنی سوگند واپس لے لوں گا۔ عمران ہیرو کی اور تمہاری زندگی بخش دوں گا اور ساتھ ساتھ تمہاری سندر معشوقہ کی بھی۔ چودھری انور اور سردار اوتار کو بھی سمجھا بجھا لوں گا۔ وہ لفڑا کریں گے لیکن سنبھال لوں گا۔''

''بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''اس گوشت کے پہاڑ حرامی ریان ولیم کے منہ میں شکست کا گوبر بھرنا ہوگا۔ اسے

یادگار مات دینا ہوگی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

جاوا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگلے مہینے ممبئی کے ایک بڑے جوا خانے میں ایک بہت بڑا گیم ہو رہا ہے۔ اس کو ''گریٹ گیم'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس میں دنیا کے مانے ہوئے قریباً دو درجن گیمبلر حصہ لیں گے۔ وہ چنے ہوئے نڈر لوگ جن کو اپنی (Luck) پر وشواس ہے اور قسمت کی دیوی جن پر اپنی مہربانیوں کی بوچھاڑ رکھتی ہے۔ گیم بھی کوئی ایسا انوکھا نہیں ہے۔ تمہارا ہیرو عمران قسمت کا دھنی ہے۔ ایک خلقت اس کی خوش بختی کو مانتی ہے۔ اور جو کچھ اس گریٹ گیم میں کیا جانا ہے، وہ بھی تمہارے ہیرو کے لیے نیا نہیں ہوگا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ریوالور میں گولی رکھ کر کنپٹی پر فائر کرنا لیکن اس میں رسک کچھ زیادہ ہوگا۔ ظاہر ہے اگر انعام بہت بڑا ہے تو رسک تو ہوگا نا۔''

''کیسا رسک؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''پانچ خانے میں گولی، ایک خانہ خالی۔ ہر بندے کو بس ایک فائر کرنا ہوگا۔ جو بچے گا، وہ دولت میں غرق ہو جائے گا۔''

''جاوا صاحب! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟ ایسا کون کر سکتا ہے...... ایسا کون کرے گا؟''

جاوا کی آنکھوں میں زہریلے ناگ پھن پھیلائے کھڑے تھے، وہ بولا۔ ''بہت سے لوگ کریں گے جیسے کہ تم......''

میں نے کہا۔ ''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا تم نے یہی کہا ہے کہ پانچ خانوں میں گولی ایک خانہ خالی؟''

''میں سنسکرت نہیں بول رہا'' جاوا نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''یہ بڑا مقابلہ ہے۔ انٹرنیشنل بازی ہے۔ اس پر بہت بڑی بڑی رقمیں لگیں گی۔ بہرحال، چوائس تو ہر پرکھشا (امتحان) میں ہوتی ہے۔ اس میں بھی تھوڑی بہت ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہر کھیلنے والے کے پاس ایک اختیار ہوگا۔ وہ پانچ خانوں میں گولی رکھ کر خود پر ایک دفعہ فائر کرے گا یا پھر چار خانوں میں گولی رکھ کر دو دفعہ فائر کرے گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ریوالور کے چار خانوں میں گولی اور کنپٹی پر نال رکھ کر دو دفعہ ٹریگر دبانا...... یہی کہہ رہے ہو تم؟''

''کیوں؟ یہ کم مہربانی ہے؟''

''نہیں جی...... اس سے بڑی مہربانی اور کیا ہو سکتی ہے...... کیا آپ نے کبھی اپنے بارے میں اس طرح کی بات سوچی ہے؟ چار خانوں میں گولی رکھی جائے اور آپ سے کہا جائے کہ دو نہیں چلیں ایک دفعہ ہی خود پر ٹریگر دبائیں۔''

''میں گیمبلر نہیں ہوں۔ جس کا کام اسی کو ساجے۔ ہاں میں کچھ اور قسم کے کام بڑی اچھی طرح سے کر سکتا ہوں۔ اب دیکھو نا، تم جیسے زہریلے سانپ کا سر میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ بس تم اپنی دُم ہلا سکتے ہو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ دُم بھی اگر زیادہ ہلاؤ گے تو کاٹ ڈالیں گے اور تمہاری وہ ناگن بھی ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہارے سامنے اس کا زہر نکالیں گے۔ زہر نکل جائے گا تو وہ ایک دم مچھلی بن جائے گی...... ناگ یا ناگن میں زہر نہ ہو تو وہ ایک دم مچھلی کی طرح کھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم اس ناگن کو کھانے کی میز پر سجائیں گے۔ ہر کوئی اسے چکھ سکے گا۔ اگر وہ کمینہ سپیرا عمران تمہارے پیچھے آیا تو اس کی تو ایسی بینڈ بجے گی کہ دیکھنے والے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ بڑی زبردست قسم کی نس بندی ہو گی اس کی۔''

○......❖......○

جاوا واقعی ایک بے رحم ڈان تھا۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی بھی جنونی قاتل میں ہو سکتی ہیں۔ وہ بندے کو مکھی کی طرح مارتا تھا۔ آج رات کے ایک پہر کے دوران میں ہماری آنکھوں کے سامنے اس نے تین جیتے جاگتے انسانوں کو لاشوں میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ تینوں لاشیں ابھی اسی چار دیواری میں ہی موجود تھیں۔ مخبر روہیل سنگھ اور جواں سال آشا کور کی لاشیں ایک پچھلے کمرے میں رکھی گئی تھیں۔ گوبندرا ابھی تک اس پنجرہ نما کمرے میں بے گور و کفن پڑا تھا۔

میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری ساری بات سمجھ گیا ہوں جاوا صاحب! مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔''

''سوچنے کی کیا بات ہے بچے۔ سب کچھ تو تیرے سامنے ہے۔ تو بھی یہیں ہے اور تیری معشوقہ بھی۔ انکار کی گنجائش تو تیرے پاس ہے ہی نہیں۔ انکار کرے گا تو ابھی اس چھوکری کے ساتھ میرے لونڈے کھیل تماشا شروع کر دیں گے۔ نہ وہ جی سکے گی، نہ مر سکے گی۔''

میرا جی چاہا، سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر جاوا پر جا پڑوں...... مار دوں، یا مر جاؤں لیکن میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور تھوڑے ہی فاصلے پر دو رائفل بردار چوکس

کھڑے تھے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ذرا سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جو شرط تم بتا رہے ہو وہ بہت کڑی ہے۔

بے شک عمران اس سے پہلے سرکس میں یہ ریوالور والا کھیل کھیلتا رہا ہے۔ اس میں گولی کنپٹی پر نہیں بلکہ پیٹ پر رکھ کر چلائی جاتی تھی اور چھ گولی والے چیمبر میں ایک یا دو گولیاں رکھی جاتی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی ہوش مند بندہ چیمبر میں چار گولیاں رکھ کر اپنی کنپٹی پر فائر کر سکتا ہے اور وہ بھی ایک نہیں دو دفعہ۔''

جاوا نے سگریٹ کا گاڑھا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بچے! اس ہیرو نے مرنا تو ویسے بھی ہے۔ تم سے بڑا بے وقوف پورے جگ میں کوئی نہیں ہو گا اگر تم یہ سمجھو کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا۔ لیکن جو طریقہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، اس میں اس کے بچنے کے امکانات ہیں، وہ بچ سکتا ہے، اس کی لک کام کر سکتی ہے اور بھگوان جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ کتا بچ جائے گا اور میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے زندہ رہے گا لیکن اگر وہ ہمارے لیے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر زندہ رہا تو میں اس کا جینا جیسے تیسے برداشت کر ہی لوں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ جو کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہو گا۔ اسے صرف مقابلے کے لیے ہی بلایا جائے گا؟''

''ہاں...... یہ تم نے کام کی بات کی ہے۔ اس طرح کی ڈیل میں اس طرح کی گارنٹی تو ہونی چاہیے۔ میں تمہیں جو گارنٹی دے سکتا ہوں، وہ میری زبان ہی ہے۔ پورے ممبئی میں بلکہ پورے انڈیا میں اس زبان کی گارنٹی مانی جاتی ہے۔ کھیل میں حصہ لینے کے بعد نہ صرف تمہاری اور ہیرو کی جان کی گارنٹی ہے بلکہ اتنا روکڑا بھی ملے گا کہ تمہاری سات پشتیں سونے چاندی میں دب جائیں گی۔''

''میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیا جائے۔''

''سوچ لو لیکن کوئی حرامزدگی نہیں چلے گی۔ کوئی ہیرو پن، کوئی بروسلی پن، کوئی جیمز بانڈ اسٹائل، کچھ نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو تمہیں تو شاید ابھی ہم کچھ نہ کہیں لیکن تمہاری اس معشوقہ کا بیڑا غرق و خانہ خراب ہو جائے گا۔''

میں خاموشی سے جاوا کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''میرے سامنے ایسے دیدے نہ پھاڑا کرو۔ میرا میٹر گھوم جاتا ہے۔ میں غلطی سے قتل کر دیا کرتا ہوں۔''

میں نے ناگواری سے رُخ پھیر لیا۔

وہ بولا۔ ''میں تمہارے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کر دیتا ہوں تا کہ تم تسلی سے سوچ سمجھ سکو...... بلکہ اگر تم چاہو تو تمہاری سہیلی کو بھی تمہارے پاس ہی بھیج دیتا ہوں۔مل کر سوچ لینا اور اپنا بُرا بھلا سمجھ لینا۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد میری اُلٹی ہتھکڑی کھول کر مجھے پھر اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میں یوسف اور گوبندر کے ساتھ بند تھا۔ لیکن اب وہاں یوسف موجود نہیں تھا۔گوبندر کی لاش بھی وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی۔ کچے فرش سے خون اچھی طرح صاف کر کے وہاں ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ثروت بھی اس کمرے میں پہنچ گئی۔اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔حسبِ توقع اس نے سب سے پہلے یوسف کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ یوسف بالکل خیریت سے ہے۔

''انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟'' ثروت نے دوسرا سوال پوچھا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا لیکن میں نے بتایا کہ وہ یہیں اسی گھر میں موجود ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں ایک بیگانگی آمیز خوف نظر آتا تھا۔اس خوف کا تعلق یقیناً میرے بدلے ہوئے لائف اسٹائل اور میرے اجنبی مزاج سے تھا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ان لوگوں نے بتایا ہے کہ انہوں نے آشا کو گولی مار دی ہے۔اگر ہم میں سے کوئی دوسرا بھی ان کی بات نہیں مانے گا تو وہ اس کے ساتھ بھی یہی کریں گے۔کیا واقعی آشا......؟''

میں خاموش رہا۔میری خاموشی نے اسے سمجھا دیا کہ یہ دل ہلا دینے والی اطلاع درست ہے۔اس کی خوبصورت آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔وہ بھیگی آواز میں بولی۔ ''اور رجنی کیسے بے ہوش ہوئی ہے؟ میں نے ابھی اسے ساتھ والے کمرے میں دیکھا ہے۔''

''آشا کو گولی لگی تو اس نے دیکھ لیا۔بس اسی صدمے سے وہ گر گئی۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اور گوبندر نظر نہیں آرہا...... وہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی یہیں ہے۔مگر تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تمہیں نمبردار کے گھر سے پکڑا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مم...... میرا خیال تھا کہ وہ لوگ مجھے پناہ دیں گے اور

آپ کی مدد کے لیے بھی باہر نکلیں گے۔مگر وہ بزدل نکلے اور دھوکے باز بھی۔انہوں نے یہاں اطلاع پہنچا دی۔ یہ لوگ مجھے پکڑ لائے۔ مجھے......لگتا ہے، یہ بہت خطرناک لوگ ہیں تابش! یہ کون ہیں؟ ہم سے ان کی کیا دشمنی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ثروت! یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے یوسف کو لاہور کے ہسپتال سے اُٹھایا اور یہاں پہنچایا۔ہم سردار اوتار کی حویلی سے تو نکل آئے لیکن ان لوگوں کے چنگل سے نہیں بچ سکے۔''

''مجھے اس بڑی آنکھوں والے سے بڑا خوف آرہا ہے۔جس کے چہرے پر ہلکے داغ سے ہیں۔وہ انسان نہیں کوئی جانور لگتا ہے۔''

''وہی ان کا سرغنہ ہے۔''

''مجھے یہ سوچ کر ہی ڈر آتا ہے کہ مجھے پھر اس کی شکل دیکھنا پڑے گی۔''

''جو کچھ بھی ہے ثروت! میرے ہوتے تمہیں اور یوسف کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔میں تم دونوں کو ان شاءاللہ حفاظت سے پاکستان پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

''آپ......اپنی بات بھی کریں۔ہم تینوں یہاں سے جائیں گے۔''

''تم دعا کرو کہ ایسا ہو سکے۔ان لوگوں سے ایک معاملے پر بات چل رہی ہے۔ یہ کچھ شرطیں بتا رہے ہیں۔میری کوشش ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم تمہارے اور یوسف کے لیے کچھ رعایت حاصل کر سکوں۔''

وہ ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''تابش! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں یوسف کی طرف سے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ یوسف یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہے۔انہوں نے راستے میں آپ پر گولی چلائی۔ مجھے اس کا بے حد رنج ہے۔انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اللہ نہ کرے ان کی گولی سے آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر سکتی۔''

''یوسف سے میری جان پہچان پُرانی نہیں ہے ثروت! بندہ ایک دوسرے کو زیادہ جانتا نہ ہو تو اس طرح کی بدگمانیاں ہو جاتی ہیں۔''

وہ میرے لہجے سے چونکی اور میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ''مم...... میں بہت شرمندہ ہوں تابش! میں بھی تو آپ کی طرف سے بدگمان ہوئی۔ میں نے وہاں سردار اوتار کی حویلی میں آپ سے غلط باتیں کہیں۔ میں نے بہت غلط کیا تابش! میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔میں کئی دن سے خود کو ملامت کر رہی ہوں۔ میں نے ایسا کیوں سوچا کہ آپ یوسف کا بُرا چاہیں گے۔

اپنی اس سوچ پر میں آپ سے معافی مانگتی ہوں تابش!'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ''میری عقل مار کھا گئی تھی تابش! آپ ہم دونوں کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ آپ نے زخم کھائے ہیں اور میں اتنا سخت بولی آپ کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''چلو پچھلی باتیں چھوڑو ثروت! تمہیں احساس ہو گیا، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔''

''مجھے یوسف کے بارے میں بہت فکر ہے تابش! وہ اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ اس قسم کے حالات سے کبھی ان کا واسطہ نہیں پڑا۔ یہاں پر ان لوگوں کا اصل شکار تو یوسف ہی ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''پانچ چھ دن پہلے تک مجھے بھی کچھ پتا نہیں تھا ثروت کہ اصل میں یہ چکر ہے؟ پھر میں نے سردار اوتار کے بیمار والد کے پاس ایک فوٹو البم دیکھا۔ اس میں گھر کے لوگوں کی تصویریں تھیں۔ انہی تصویروں میں مجھے سردار اوتار کے بڑے بیٹے اشوکا سنگھ کی تصویر بھی نظر آئی۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ شکل صورت میں بہت حد تک یوسف سے ملتا تھا۔ اس کے چہرے پر زخم کا نشان بھی تھا جیسا یوسف کے چہرے پر بنایا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سردار اوتار کے بیٹے کا کوئی چکر ہے۔ جس کی وجہ سے یوسف کو یہاں لایا گیا ہے۔ میں نے حویلی کے ایک خاص ملازم کو پکڑا اور اس سے ساری معلومات حاصل کیں۔ سردار اوتار کے قاتل بیٹے کا پیچھا پولیس سے چھڑانے کے لیے یہ لوگ یوسف کی جان لینا چاہ رہے تھے۔ یہ لوگ یوسف کو اس کالی جیپ پر بارڈر کی طرف بھیجتے۔ یوسف کو پولیس والے اشوکا کے طور پر پہچان لیتے اور اس کے فوراً بعد یوسف کی گاڑی کے ٹکڑے ہو جاتے۔ بڑا تفصیلی منصوبہ تھا اور یقیناً اس کے پیچھے جاوا کا دماغ ہی تھا۔ سردار اوتار سنگھ نے اس خونی ڈرامے کے لیے جاوا کو ایک بھاری رقم دی ہے۔''

''تو اب یہ لوگ یوسف کو کیسے چھوڑیں گے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''میں نے کہا ہے نا...... دعا کرو۔ کام مشکل ہے لیکن ایک سبب لگ رہا ہے۔''

''کیسا سبب؟''

''جاوا! میرے دوست عمران سے ایک خاص کام لینا چاہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بارگیننگ ہو گی۔ میں نے سوچا ہے کہ اس بارگیننگ میں یوسف والا معاملہ شامل کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔''

''آپ بتا رہے ہیں کہ یہ جاوا کوئی بہت بااثر شخص ہے۔ اس کو آپ کے دوست سے کیا کام ہو سکتا ہے؟''

''بس کوئی ایسا کام ہے جو عمران کر سکتا ہے۔''

اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو، آپ کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ کیسے لوگوں سے ناتے ہو گئے ہیں آپ کے۔''

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ جیسے کہنے کو کوئی بات ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت قریب رہنے کے بعد بچھڑ جانے والوں کے ساتھ شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کہیں قریب ہی کسی کچے راستے سے کوئی ٹریکٹر ٹرالی گزری۔ لاؤڈ اسپیکر پر اونچی آواز میں گانا چل رہا تھا۔ کسی بھارتی پنجابی فلم کا گانا تھا جس میں سردیوں کی چاندنی رات کا ذکر تھا اور چنبیلی کے پودوں میں گم ہو جانے والے دو پریمیوں کی بات تھی۔

کچھ چاندنی راتیں میرے تصور میں بھی گھوم گئیں۔ وہ پھولوں کے گہنے، وہ ہونٹوں کی نرم پنکھڑیاں، وہ ریشمی سرگوشیاں، دو پل میں ایک پورا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے چمک گیا۔

ثروت نے کہا۔ ''ایک بات کہوں، آپ بُرا نہ مانیے گا۔''

''میں تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مان سکتا ثروت۔''

''اگر میں آپ کے پاس اس کمرے میں رہوں گی تو میرے لیے مزید مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔''

''کیا مطلب؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''آپ جانتے ہیں تابش! یوسف میرے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مجھے یوسف کو نہیں بتانا چاہیے تھا کہ ہم اکٹھے سفر کرتے رہے ہیں اور اس سفر کے دوران میں رات دن ایک ساتھ رہے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھنے کے باوجود وہ شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید اس سلسلے میں انہیں اپنے دل پر بس نہیں۔''

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہیں میرے ساتھ نہ رکھا جائے۔ دوسرے کمرے میں یوسف کے پاس بھیج دیا جائے؟''

''اگر ایسا ممکن ہو تو پلیز...... ضرور کر لیجیے۔''

میں نے سلاخ دار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دو مسلح افراد چند میٹر دور کھڑے تھے اور ہمیں ہی گھور رہے تھے۔ جاوا اور چودھری انور مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نہ ہی ان کی آواز سنائی

دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کسی کو آواز دیتا، گھر سے باہر ایک بار پھر کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ دروازے بند ہونے کی آواز سے پتا چلا کہ یہ کوئی بھاری بھرکم لگژری گاڑی یا جیپ ہے۔ ایک منٹ بعد گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور دو تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ اس فربہ اندام عورت کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ وہی لاہور کے بازارِ حُسن والی نائیکا شاربہ بائی تھی۔ مجھے ہرگز اُمید نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ چودھری انور کو یہاں دیکھ کر بھی میری کچھ ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی۔

شاربہ بائی کے ٹھاٹ دیکھنے والے تھے۔ اس نے شوخ شلوار قمیص کے اوپر ایک ہلکی پھلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سینڈل وغیرہ کی جگہ جوگر شوز تھے۔ گھنگریالے بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں موبائل فون، دوسرے میں سگریٹ تھامے وہ بڑے طنطنے سے اندر داخل ہوئی۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے رُک کر ذرا دھیان سے مجھے دیکھا، پھر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ سلاخ دار کھڑکی کے ساتھ اپنا تھوبڑا ٹکا کر اس نے اپنی ناک کو غصیلے انداز میں پھلایا اور بولی۔ ''میرا دل کہتا تھا کہ تم سے ملاقات ہوگی اور جلد ہی ہوگی لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ تم یہاں ملو گے۔'' پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ان سے پوچھا۔ ''یہ خبیث کس طرح آیا ہے یہاں؟''

لمبی گردن والے ایک شخص نے کہا۔ ''یہ لمبی سٹوری ہے بائی جی! یہ لوگ اپنا بندہ چھڑانے کے لیے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔ پہلے سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں تھے......''

''وہ ساری رام کہانی جانتی ہوں میں لیکن یہ لوگ یہاں اس گاؤں میں کیسے آئے؟''

''سردار صاحب کی حویلی میں لمبا لفڑا ہو گیا تھا جی۔ سردار کی بیٹی کے رشتے کا جھگڑا تھا۔ کئی بندے مارے گئے ہیں۔ بس اسی لفڑے میں یہ لوگ بھی وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کے بُرے لیکھ کہ یہاں اس گاؤں کے تھانیدار صاحب اپن کے بھیا صاحب کے چاہنے والوں میں شامل ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ بھگوڑی اور دونوں بھگوڑے پکڑے گئے۔''

''دوسرا بھگوڑا کون؟''

''وہی لونڈا یوسف جس کا سارا ٹینٹا تھا۔ یہ اس کی پتنی ہے۔ کم از کم کہا تو یہی جاتا ہے۔''

شاربہ بائی نے جیسے آخری چند الفاظ سنے ہی نہیں۔ اس کی ساری کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا تھا۔ وہ شاید نشے میں بھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ

اگر درمیان میں آہنی سلاخیں نہ ہوں تو وہ جنگلی بلی کی طرح مجھ پر پل پڑے گی۔

میں اس کی اس کیفیت کا سبب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ لاہور کے تھانے میں عمران نے شاربہ بائی سے سچ اُگلوانے کے لیے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس نے لیڈی سب انسپکٹر سے شاربہ کی اچھی خاصی چھترول کروائی تھی۔ نہ اس کی کوئی سفارش چلنے دی تھی نہ چھٹکارے کا کوئی اور طریقہ استعمال کرنے دیا تھا۔ مجبوراً شاربہ بائی نے ہمیں یوسف کے اغوا اور روانگی کے بارے میں اہم معلومات مہیا کر دی تھیں، اس ساری کارروائی کے دوران میں، مَیں بھی عمران کے ساتھ رہا تھا۔

وہ دانت پیس کر بولی۔ ''وہ بھگیاڑ کی شکل والا دوسرا مردود کہاں ہے؟'' اس کا یہ ''مہربان'' اشارہ یقیناً عمران ہی کی طرف تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے شعلہ جوالا بن کر اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا پسٹل نکال لیا۔ وہ دھاڑی۔ ''میں مار دوں گی تمہیں، تمہاری کھوپڑی توڑ ڈالوں گی۔ بتاؤ کہاں ہے وہ ماں کا......''

اس کو جذباتی حالت میں دیکھ کر اس کے ایک ساتھی نے پسٹل اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ گالیاں بکتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی پڑی تھی۔ اس نے کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان سے مجھ پر کلہاڑی کا وار کرنے کی کوشش کی۔ یہ بالکل ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ وہ جھنجھلاہٹ میں کھڑکی کی سلاخوں کے اوپر ہی کلہاڑی کے وار کرنے لگی اور گالیاں بکنے لگی۔ اس کے پان سے رنگے ہونٹوں کے اندر سے پیک کے چھینٹے اُڑ رہے تھے۔ شور سن کر جاوا کا ملازم خاص پریم چوپڑا باہر نکل آیا۔ اس نے شاربہ کو کندھوں سے تھاما اور ذرا سختی سے بولا۔ ''بائی جی! یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ فی الحال جاوا صاحب کا مہمان ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اس نے بمشکل شاربہ کو سلاخ دار کھڑکی سے دور کیا۔ ثروت جو پہلے ہی خوف زدہ تھی، اس افتاد سے اور بھی سکڑ سمٹ کر رہ گئی۔

جاوا کا ملازم خاص پریم چوپڑا، شاربہ بائی کو سنبھالتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ چند منٹ بعد ہمارے اردگرد پھر سکون ہو گیا۔ لیکن اس سکون کے اندر کئی طرح کا تلاطم بھی تھا۔ یقیناً ثروت کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات اُبھر رہے تھے۔ شاید اسے یہ جان کر مایوسی بھی ہوئی تھی کہ میرے تعلقات شاربہ بائی جیسی عورتوں سے ہیں۔ اس بیچاری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شاربہ سے میرا تعلق یوسف کی وجہ سے ہی تھا۔ شاربہ میری نہیں یوسف کی ''واقف کار'' تھی۔

وہ میرے حوالے سے اتنا کچھ ''بُرا'' دیکھ چکی تھی کہ اس نے شاربہ والے معاملے کو بھی بہت اہم نہیں جانا اور اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بس سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں ابھی تک حیرت میں گم تھا۔ لاہور کی ہیرا منڈی سے انڈیا کے اس چھوٹے سے گاؤں تک کا سفر شاربہ بائی نے معلوم نہیں کیسے اور کیونکر طے کیا تھا؟

ثروت کی کمزور لیکن مترنم آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''آپ ابھی کسی ''کام'' کا ذکر کر رہے تھے جو لوگ آپ کے دوست سے لینا چاہ رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ ضرور کوئی خطرناک کام ہی ہوگا۔''

''ظاہر ہے ثروت! جن لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا ہے یہ سیدھے کام تو کرنے والے نہیں۔''

''کوئی...... غیر قانونی کام ہوگا؟''

''یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ثروت، غیر قانونی ہی ہے۔ یوسف کے گم ہونے سے لے کر اب تک کیا چیز قانون کے دائرے میں ہوئی ہے؟ راجا مارا گیا، کرشمہ کپور کی جان گئی۔ مجھ سے پانچ چھ بندوں کا خون ہوا اور سردار اوتار کی حویلی میں جو کچھ ہوا وہ کون سا قانونی تھا۔''

وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ان نظروں میں گم گشتہ محبت کی جھلک تھی، ایک خوف آمیز حیرت بھی تھی اور آنسوؤں کی چمک بھی۔ شاید اس کی حسین آنکھوں میں اب بھی وہ خونی منظر چھینٹے اُڑا رہا ہے جب میں چاقو بدست دیوانہ وار ان پانچ افراد سے بھڑ گیا تھا جنہوں نے بارڈر لائن کے قریب مجھے اور ثروت کو گھیرا تھا۔

وہ بولی۔ ''آپ کتنے بدل گئے ہیں تابش! کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں آپ کو پہچان ہی نہیں پاتی۔ میں آپ کے اندر اس تابش کو ڈھونڈتی رہتی ہوں جو چار پانچ سال پہلے تک ہماری فیملی کا حصہ تھا۔ بالکل ہمارے جیسا تھا۔''

''مجھے بھی وہ تابش اچھا لگتا تھا ثروت! لیکن ایک دن اس تابش نے زندہ رہنے کا حق کھو دیا۔ وہ جب تمہاری حفاظت نہ کر سکا، تمہیں اپنا نہ رکھ سکا، اپنی ماں کی جان نہ بچا سکا۔ پھر وہ کیوں زندہ رہتا؟ اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔''

''حالات اتنے بُرے تو نہیں تھے تابش! جتنے آپ نے کر دیئے ہیں۔ آپ تو وہ رہے ہی نہیں ہیں جو کبھی تھے۔''

''جب تم سے جدائی ہوگئی ثروت! تو پھر ہر چیز سے جدائی ہوگئی۔ پھر کچھ بھی اپنا نہ رہا۔''

''وہ...... جدائی بھی تو ایک حادثہ ہی تھی۔ اور اس حادثے کو بڑھاوا بھی آپ ہی کی طرف سے ملا تھا تابش! میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن آپ کے گھر والوں نے...... خاص طور سے خالہ جان نے مجھے قصوروار ٹھہرایا تابش! میں باعزت گھر واپس آ گئی تھی لیکن میرے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا گیا جو کسی لٹی پٹی لڑکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مجھے ہر قدم پر احساس دلایا گیا کہ میں اب آپ کے بلکہ شاید کسی کے قابل بھی نہیں رہی۔''

''ثروت! تم دوسروں کے بارے میں تو شاید ایسا کہہ سکو لیکن ہمارے گھر والوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی ہو، ہاں میں اتنی بات ضرور مانتا ہوں کہ اس واقعے کے بعد امی کچھ دن تک اُلجھن میں رہی تھیں اور ان کو اُلجھانے میں بھی زیادہ کردار دوسروں ہی کا تھا۔ میں نے اور فرح، عاطف نے مل کر انہیں بالکل ٹھیک کر لیا تھا۔ وہ تم سے ملنے آ رہی تھیں۔ ہم تینوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ تمہیں سینے سے لگا کر بہت بہت پیار کرنا چاہتی تھیں۔ تمہارے سارے شکوے دور کر دینا چاہتی تھیں لیکن جب ہم تمہارے گھر کے دروازے پر پہنچے ہم پر انکشاف ہوا کہ تم سب لوگ تو بڑی خاموشی سے ملک ہی چھوڑ کر جا چکے ہو......''

اس نے عجب شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اور آپ واپس چلے گئے......''

میری آواز بھرا گئی۔ ''میں کہاں واپس گیا تھا ثروت! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، میں ڈھائی تین سال کے لیے ایسے حالات میں جکڑا گیا تھا جن سے مفر کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ میری زندگی کا بدترین دور تھا ثروت......''

''اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ؟'' اس نے سر جھکایا اور دو آنسو اس کی آغوش میں گم ہو گئے۔

○......❖......○

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

للکار
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
8
طاہر جاوید مغل

اسی دوران میں شاربہ بائی پھر ہمارے کمرے کی طرف آتی دکھائی دی۔ غالباً اس نے کھانا کھایا تھا اور اپنے پان سے رنگے ہوئے دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔ وہ مستی میں آئی ہوئی نیل گائے کی طرح سلاخ دار کھڑکی کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ مجھ پر اتنا غور نہیں کر رہی تھی جتنا ثروت پر۔ اسے اوپر سے نیچے تک تاکتے ہوئے بولی۔

''تو یہ ہے وہ شریف زادی جو اپنے عیاش خصم کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ واہ بھئی واہ...... گھر گرہستن ہو تو ایسی۔ اپنی جوانی اور عزت ہتھیلی پر رکھ کر نکل پڑی ہے، اللہ کی بندی۔''

''کیا کیا ہے اس کے خصم نے؟'' پریم چوپڑا نے دریافت کیا۔

''یہ پوچھو، کیا نہیں کیا۔ اس جیسی نیک پروین زنانیاں گھروں میں بیٹھ کر آلو گوشت پکاتی رہتی ہیں اور ان کے خصم روسٹ، بٹیر اور مچھلی کباب کھاتے ہیں طوائف زادیوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ اس کا شوہر بھی یہی کرتا رہا ہے۔''

''تم اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔'' میں نے کڑے لہجے میں شاربہ بائی کو مخاطب کیا۔

''اوئے...... میں نے تو سنا ہے کہ تُو یار ہے اس شریف زادی کا۔ میں تو تیرے فائدے کی بات کر رہی ہوں۔ اس کے خصم کا کچا چٹھا بتا رہی ہوں اور کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہی ہوں نا۔ یہ کہے گی تو ثبوت بھی دے دوں گی۔''

پریم چوپڑا مسکرایا اور اس کی ناک کچھ اور بھی چوڑی ہو گئی۔ وہ بولا۔ ''بائی جی! کس بات کی دشمنی لے رہی ہو بے چاری سے؟ دیکھو رنگ کیسے پیلا پڑ گیا ہے اس کا۔''

''دشمنی تو مجھے ''ہے'' ایسی شریف زادیوں سے۔'' وہ شرابیوں کی طرح ہاتھ لہرا کر بولی۔

''کس بات کی دشمنی؟'' پریم چوپڑا نے پوچھا۔

''بس ہمارے پیٹ پر لات مارتی ہیں اس طرح کی خاوند پرست زنانیاں۔ چمٹی رہتی ہیں۔ گالیاں سنتی ہیں۔ اپنے گھر والوں سے جوتے کھاتی ہیں۔ سب کچھ پتا ہوتا ہے ان کو پھر بھی ذلیل ہو کر پڑی رہتی ہیں گھر میں۔ میں نے ایک ایسی عورت کو بھی دیکھا ہے جو فجر کی اذانوں تک اپنے خصم کے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ مجرا دیکھ کر آتا تھا اور آتے ہی گالی گلوچ شروع کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی اسے جوتا بھی دے مارتا تھا اور پھر اسی سے کہتا تھا کہ جوتا پکڑ کر لاؤ تا کہ مزید پٹائی کر سکوں۔ اور یہ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ گھروں کے گھر بھرے پڑے ہیں ایسی چمڑلیس زنانیوں سے۔''

پریم چوپڑا اپنا زخمی کندھا دباتے ہوئے بولا۔ ''تو بائی جی! تم چاہتی ہو کہ خصم اگر کہیں مجرا وغیرہ دیکھنے چلا جائے تو عورت طلاق لے لے اس سے۔''

''نہیں...... میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جو خصم پکے تماش بین اور طوائف باز بن جائیں، ان کی عورتوں کو لات ماردینی چاہیے ان کی تشریف پر۔ کہیں اور گھر بسا لینا چاہیے۔ وہ بھی سکھی ہو جائیں گی۔ ہمارا کاروبار بھی چمکے گا۔ اب دیکھو اس ستی ساوتری کو۔ کیسا نچوڑے لیموں کی طرح منہ ہو گیا ہے اس کا۔ پربھاگی پھر رہی ہے پتی دیو کے پیچھے اور ایک وہ ہے کہ طوائف کے ساتھ گھر بسانے کے لیے بھی تیار ہے۔ چھ مہینے کے لیے تو طوائف زادی کا گھر والا بن ہی گیا تھا وہ۔''

''وہ کس طرح؟'' پریم چوپڑا نے پوچھا۔

شاربہ بائی نے نشیلے انداز میں وہ سب کچھ پریم چوپڑا کے اور ہمارے گوش گزار کر دیا۔ ڈمی ہیروئن کے ساتھ یوسف کا ایک رنگین رات گزارنا، پھر مزید راتوں کی خواہش ظاہر کرنا۔ پھر چھ مہینے کے لیے ایک پیکیج ڈیل کرنا...... اور آئندہ کے لیے بھی نیت و ارادہ رکھنا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ثروت کو تکلیف پہنچا کر اسے راحت مل رہی ہے۔ میں سناٹے میں تھا۔ جو کچھ بھی تھا، میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یوسف کا کچا چٹھا اس طرح ثروت کے سامنے کھلے اور وہ بھی ایسے تضحیک آمیز انداز میں۔

پریم چوپڑا کے ایک سانولے ساتھی نے پوے میں سے انڈین وہسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''بائی جی! سچی بات پوچھو تو اپن کو تو وہ لمبی ناک والا چھوکرا ایسا نہیں لگتا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جب ہم نے گوبندر سنگھ کو ٹپکایا تو وہ سالا چھوکریوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگ گیا تھا۔''

ایک دم جیسے شاربہ بائی کو کچھ یاد آیا۔ وہ مخمور لہجے میں بولی۔ ''ٹھہرو، میں تم کو اس کا پکا ثبوت بھی دیتی ہوں۔ ایک منٹ ٹھہرو۔''

وہ گھوم کر اندرونی کمرے کی طرف گئی۔ اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ بتاتی تھی کہ وہ واقعی نشے میں ہے۔ اس کا چربیلا جسم اس کے چست لباس میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اپنا شولڈر بیگ تھامے واپس آئی۔ اس بیگ میں سے اس نے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا نکالا۔ ایک دو منٹ تک کیمرے سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ اس میں موجود تصویروں میں سے کوئی تصویر چھانٹ رہی تھی۔ آخر اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ کیمرے کی اسکرین کا رُخ ہماری طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''لو یہ دیکھو۔ یہ تصویر تو جھوٹ نہیں بول سکتی۔''

میں نے دیکھا۔ یہ یوسف ہی کی تصویر تھی۔ یہ کوئی ایسی ویسی تصویر نہیں تھی۔ پھر بھی یہ بات ثابت کرتی تھی کہ یوسف رنگ رلیوں کی غرض سے شاربہ بائی کے پاس جاتا رہا ہے۔ اس تصویر میں یوسف کا ہمراز دوست فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی نظر آ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نشہ تھا اور ان کے سامنے میز پر جن کی بوتل بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پس منظر میں دو نیم عریاں لڑکیوں کے دھندلے سے پوز تھے۔ یوسف بڑے نوٹوں کی ایک گڈی شاربہ کے ''دست مبارک'' میں تھما رہا تھا۔

ثروت نے بھی تصویر دیکھی۔ پھر ایک اور تصویر اسکرین پر آئی۔ یوسف صوفے پر تھا اور رقاصہ اس سے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ یوسف نے شاربہ کو نیلے نوٹوں کی جو گڈی دی تھی، وہ شیشے کی تپائی پر پڑی تھی۔

شاربہ گھاگ نائیکا کے انداز میں بولی۔ ''یہ نوٹ اس عیاش نے مجھے یتیم مسکین لڑکیوں کی شادی کے لیے نہیں دیئے تھے۔ خود دولہا بننے کے لیے دیئے تھے۔ ایک رات کا دولہا......''

ہمیں دکھانے کے بعد شاربہ بائی نے یہ تصویر پریم چوپڑا اور اس کے ساتھی کو بھی دکھائی۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر تک مزید ثروت کو کچوکے لگاتی لیکن اسی دوران میں ایک رائفل بردار تیزی سے اندر آیا اور شاربہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بائی جی! لونڈیا ہوش میں آ گئی ہے۔ بھیا صاحب کہہ رہے ہیں کہ آ کر دیکھ لو۔''

شاربہ نے ایک نگاہِ غلط انداز ثروت پر ڈالی اور ایک بار پھر اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔

کارندے کی بات چونکا دینے والی تھی۔ غالباً اس نے نوخیز رجنی کا ذکر کیا تھا۔ اور اب

یہ گھاگ نائیکا نہ جانے کس مقصد سے رجنی کو تاکنے کے لیے گئی تھی۔ شاید وہ یہاں اس گاؤں میں آئی ہی اس کام کے لیے تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آج کل یہ بدقماش عورت جاوا کے ساتھ نتھی ہو کر یہاں پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی ہے۔

ثروت نے اپنی پیشانی اپنے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر ٹکا دی تھی اور چہرہ چھپا لیا تھا، یقیناً اس کا چہرہ رنج والم کی تصویر تھا۔ چوپڑا اور اس کے دونوں ساتھی بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ میں نے نرمی سے ثروت کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ثروت! ان لوگوں کی باتوں پر نہ جاؤ۔ یہ بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف کہیں ایک آدھ بار اس فاحشہ عورت سے ملا ہو۔ ملنے کی وجہ کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ اس عورت کی نیت کی خرابی اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے یوسف کی تصویریں اُتاری ہوئی ہیں۔''

ثروت خاموش آنسو بہاتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کی گمبھیر آواز اُبھری اور میرے کانوں تک پہنچی۔ ''تابش! مجھے آپ کے دوست جگت سنگھ نے بھی کچھ باتیں بتائی تھیں لیکن اس وقت میں نے یقین نہیں کیا تھا۔''

جگت سنگھ کی صورت میری نظروں میں گھومی اور میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے سختی سے منع بھی کیا تھا کہ وہ ثروت سے ایسی کوئی بات نہیں کہے گا لیکن اس نے اپنی مرضی کی تھی۔

''کیا کہا تھا جگت نے؟''

''وہی سب کچھ جو ابھی اس عورت نے بتایا ہے اور جو شاید...... آپ بھی جانتے ہیں۔ مجھ سے چھپاتے رہے ہیں۔ یوسف اب کسی بہت خوبصورت بازاری عورت کے چکر میں ہے۔ اور اسی چکر کی وجہ سے ہی یہاں تک پہنچے، اس مصیبت میں بھی پھنسے ہیں۔'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا پورا جسم دہل رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں؟ اسے کس طرح دلاسا دوں؟

وہ عجیب رات تھی۔ دُکھ درد اور ناخوشگوار واقعات سے بھری ہوئی۔ کسی کمرے سے جاوا کے گونج دار قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ کسی وقت ان قہقہوں میں چودھری انور اور شاربہ بائی کی مدھم ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی۔ پھر میں نے ایک بہاری لڑکی کو دیکھا۔ عام بہاری لڑکیوں کی نسبت وہ خاصی خوش شکل تھی۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو چھن چھن کر رہے تھے۔ شاربہ بائی اس لڑکی کو لے کر جاوا اور چودھری انور والے کمرے میں چلی گئی۔

''کہاں کا مال ہے بائی؟'' جاوا کی بہکی آواز آئی۔

''مال تو یہیں کا ہے جی۔'' شاربہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پاکستان، ہندوستان بنا تو

یہ مشرقی پاکستان چلا گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو یہ پاکستان آ گیا۔ پاکستان سے یہ پھر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ آپ کی خدمت کے لیے۔''

جاوا نے بلند آواز میں کہا۔ ''مجھے کوئی خدمت شدمت نہیں کرانی لیکن یہ اپنا چودھری انور شہری کڑیوں کا شوقین ہے۔ اس کی رات ضائع نہیں ہونی چاہیے۔'' کچھ دیر بعد ٹیپ ریکارڈر پر گانا گونجنے لگا۔ ہائے ہائے ہائے مجبوری...... یہ موسم اور یہ دوری...... بہاری لڑکی اس گانے پر رقص کر رہی تھی اور گھنگروؤں کی چھن چھن دور تک پھیل رہی تھی۔ یقیناً اڑوس پڑوس کے لوگ بھی سب کچھ سن رہے ہوں گے اور جان رہے ہوں گے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ جاوا کی سفاکیت حیران کن تھی۔ اس چار دیواری میں کم از کم تین لاشیں موجود تھیں۔ تین جیتے جاگتے انسانوں کو قتل کیا گیا تھا اور جاوا رقص وسرور کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک طرح سے طمانچہ بھی تھا گاؤں والوں کے چہروں پر۔ ان میں کئی پھنے خان زمیندار، چودھری اور چودھری زادے موجود تھے۔ انہوں نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

مجھے رہ رہ کر جگت سنگھ کا خیال بھی آ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ اگر وہ ہوتا تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا۔ کم از کم شدید قسم کی مزاحمت تو ضرور ہوتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کب واپس آنا ہے اور آنے کے بعد اس کا ردِعمل کیا ہونا ہے۔ اس کے لیے یہاں دو بہت بڑے صدمے موجود تھے۔ اس کی محبوبہ آشا کو قتل ہو چکی تھی اور اس کا لاڈلا بھائی گوبندر بھی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

○......❖......○

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ ہمیں کمرے میں ہی ناشتہ دیا گیا۔ غالباً نمبردار کے گھر سے پراٹھے، حلوہ اور انڈے وغیرہ آئے تھے۔ ثروت نے ناشتے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میری نگاہوں میں بھی آشا اور گوبندر کی خونچکاں لاشیں گھوم رہی تھیں۔ اس ناشتے میں دودھ پتی دیکھ کر آشا کی ناگہانی موت کا دُکھ اور بڑھ گیا۔ میں نے بھی ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

دس بجے کے لگ بھگ میری اور جاوا کی ایک ملاقات اور ہوئی۔ یہ ملاقات جاوا کے کمرے میں ہوئی۔ ثروت کو مجبوراً وہیں سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں رہنا پڑا۔ یوسف اسی چاردیواری میں تھا لیکن مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے لگا کہ جاوا دوٹوک بات کرنے کے موڈ میں ہے۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے

پوچھا۔ ''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

''میں عمران سے بات کر کے ہی کچھ بتا سکوں گا۔''

''اور عمران سے بات تم کر سکتے ہو۔ لیکن یہ بات تمہیں ابھی کرنا پڑے گی۔''

''مجھے منظور ہے۔''

جاوا نے اپنے ایک کارندے کو آواز دی کہ وہ میرا موبائل فون لے کر آئے۔ یہ موبائل فون کچھ دیگر چیزوں سمیت میری تلاشی کے بعد قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ یہ دراصل شکاری اجو والا فون ہی تھا۔ میں نے تین چار بار عمران سے رابطے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ پہلے کسی طرح عمران خود مجھ سے رابطہ کرے۔

میں نے کہا۔ ''جاوا صاحب! میں تمہیں حتمی بات تو عمران سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی بتا سکوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک دو شرطیں میری بھی ہیں۔''

''شرطوں کی اتنی زیادہ گنجائش تو نہیں ہے لیکن چلو تم بتاؤ۔''

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ ڈیل آگے بڑھتی ہے تو اس کے لیے میری سب سے پہلی اور اہم شرط یوسف کے حوالے سے ہوگی۔ آپ کو یوسف کو چھوڑنا پڑے گا اور اسے اس کی بیوی سمیت حفاظت سے پاکستان واپس پہنچانا ہوگا۔''

وہ دھیان سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہندی کی پُرانی فلموں جیسے عاشق لگتے ہو تم۔ اچھا بھلا موقع مل رہا ہے تمہیں۔ محبوبہ کا پتی سورگ باشی ہونے جا رہا ہے اور تم اسے بچانے اور یہاں سے نکالنے کی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں مذاق نہیں کر رہا جاوا صاحب! میری پہلی شرط ہی یہ ہے کہ یوسف کو چھوڑنا ہوگا اور میاں بیوی کو اپنی گارنٹی کے ساتھ پاکستانی علاقے میں واپس پہنچانا ہوگا۔''

''میرے بچے! یہ تو کافی مشکل کام بتا رہے ہو تم۔ سردار اوتار سنگھ تو اُچھل اُچھل کر چھت کو لگے گا۔ اس کو بڑی مشکل سے ایسا گولڈن چانس ملا ہے اور اس کے لیے کافی روکڑا بھی خرچ کیا ہے اس نے۔ وہ نہیں مانے گا اس کے لیے۔ نہیں چھوڑے گا چھوکرے کو۔''

''تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا جاوا صاحب! سارا کھیل بگڑے گا۔ آپ ہماری جان تو شاید لے لیں لیکن کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔''

''دوسری شرط کیا ہے میرے بالکے؟''

''رجنی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر پہلے ہی بڑا ظلم ہو گیا ہے۔ اس کے منگیتر کو مار دیا ہے آپ لوگوں نے۔''

''چلو یہ رجنی والی شرط تو ہو جائے گی۔ حالانکہ شاربہ بائی کو لڑکی پسند آ گئی ہے۔ وہ اپنے ایک خاص گاہک کے لیے انڈیا کے مختلف حصوں سے پانچ چھ بڑے پچل قسم کے ''پیس'' پسند کر رہی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ اسے کوئی اور پنجابن مٹیار پسند کرا دیں گے۔ یہ سندر ناری کو ''مٹیار'' ہی کہتے ہیں نا پنجابی بھاشا میں؟''

میں نے سرد مہری سے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور بولو؟''

''میرے اور عمران کے بارے میں آپ کہہ ہی چکے ہو کہ اس کھیل میں حصہ لینے کے بعد ہم حفاظت سے پاکستان پہنچ سکیں گے۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' جاوا نے کہا اور اپنی انگلیوں سے اپنی زبان کو چھوا۔ ''یہ ممبئی کا سب سے مہنگا اور بھروسے والا اسٹامپ پیپر ہے بچے۔''

''یہ کھیل کب اور کہاں ہونا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ممبئی میں۔ اس کی فائنل ڈیٹ تو نہیں آئی لیکن اندازہ ہے کہ چند دن کے اندر ہی ہو گا۔''

''آپ اپنے پُرانے حریف ریان ولیم کی بات بھی کر رہے ہو۔ کیا وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے؟''

''وہ خبیث اس معاملے میں دلچسپی کیوں نہیں لے گا جس میں قریباً 100 ملین ڈالرز کا سرکل چلنا ہے۔ مجھے وشواس ہے وہ تمہارے ہیرو عمران کو اس کھیل پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی کوشش میں سپل (کامیاب) بھی ہو چکا ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے، تمہیں عمران کو یہاں لانا ہے اور اس کو اس کھیل کے لیے تیار کرنا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بھی ہوشمند بندہ کسی ایسے تماشے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ عمران بھی نہیں ہوگا۔ ہاں...... اگر تم کہو تو میں خود کو اس بازی کے لیے پیش کر سکتا ہوں؟''

قریباً وہی وقت تھا جب اس سیل فون کی بیل ہونے لگی جس پر عمران کی کال آتی تھی۔ میں نے اسکرین پر نظر دوڑائی۔ یہ عمران ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''جاوا صاحب! عمران کی کال ہے۔ میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور...... تم شانتی سے بات کرو۔ ہر اونچ نیچ اسے سمجھا دو۔ خاص طور پر اپنی شادی شدہ محبوبہ کے بارے میں۔''

وہ باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عمران کی توانا آواز ابھری۔ وہ سنجیدہ موڈ میں تھا۔ ''کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''حال بالکل ٹھیک نہیں ہے......''

وہ جلدی سے بولا۔ ''گھبراؤ نہ...... اب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری مدد کے لیے ڈاکٹر رتن اور شہباز احمد کل کسی وقت ایمبولینس لے کر گاؤں میں پہنچ جائیں گے۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔''

''نہیں عمران۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''اب ان کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر انہیں کہہ دیا ہے تو فوراً منع کر دو۔ یہاں معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ چونک گیا۔

''وہی جس کا اندیشہ تم نے ظاہر کیا تھا۔ جاوا اور اس کے ساتھی اسی علاقے میں موجود تھے اور ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے عمران۔ ہمارے میزبانوں میں آشا کور اور گوبند مارے جا چکے ہیں۔ ہم جاوا کے پاس ہیں۔ پورے گھر میں جاوا کے رائفل بردار دندنا رہے ہیں۔''

''او مائی گاڈ!''

میں نے کہا۔ ''جگت سنگھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ گاؤں میں نہیں ہے اور بہتر ہے کہ نہ ہی آئے ورنہ یہ لوگ اسے بھی دھر لیں گے۔ گاؤں میں جاوا کی اتنی دہشت ہے کہ کوئی اونچی آواز میں بولتا بھی نہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ یہ بدبخت اپنی من مرضی کر رہے ہیں۔''

''ثروت تو خیریت سے ہے۔''

''ہاں...... لیکن آئندہ کیا ہو گا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اسے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں اور اس کی جان بخشی کے لیے کچھ کڑی شرطیں رکھ رہے ہیں۔''

''دیکھو تابی! میں اس کتے جاوا کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بڑا بے رحم گینگ ہے۔ تم نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرنی۔ کوئی رسک نہیں لینا۔ مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔ یہاں کیا ہوا؟''

اگلے پانچ دس منٹ میں، مَیں نے تقریباً سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح یوسف کی شکل سے دھوکا کھا کر ایک مقامی مخبر نے پولیس کو بتایا

کہ گاؤں میں مفرور اشوکا سنگھ موجود ہے اور کس طرح پولیس والے کی اطلاع پر جاوا ہم تک آ پہنچا۔ پوری رُوداد سننے کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ آشا کو بہیمانہ طریقے سے قتل کیا گیا، عمران کا لب و لہجہ کچھ اور گمبھیر تھا۔ وہ ثروت کے حوالے سے بہت فکرمندی محسوس کر رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''تم نے ابھی کچھ شرطوں کی بات کی ہے۔ کیا کہہ رہا ہے جاوا؟''

''وہ جوئے کی ایک بڑی بازی کی بات کر رہا ہے عمران! اس کے ساتھ یہ بازی ممبئی کے ایک بڑے جوا خانے میں کھیلی جائے گی۔ جہاں دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے کھلاڑی بھی حصہ لیں گے۔''

''اوہ میں سمجھ گیا تم ''سیلف شوٹنگ'' کی بات کر رہے ہو۔ اس کا ایک مقابلہ ممبئی میں کسی جگہ ہونے والا ہے۔ بہت بڑی رقمیں داؤ پر لگائی جانے والی ہیں لیکن یہ کھیل نہیں ہے۔ یہ تو سیدھی سیدھی قتل و غارت ہے یار! کھیل تو وہ ہوتا ہے جس میں کھلاڑی اپنی مرضی سے حصہ لیتے ہیں۔ کھیل میں خطرہ اور تھرل ہوتا ہے لیکن سیدھی سیدھی موت تو نہیں ہوتی۔ یہ تو دیوانہ پن ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں لوگ اپنی مرضی سے حصہ لیں گے۔ اس میں ان کی مجبوریوں کو خریدا جائے گا۔''

''تمہیں کیسے پتا ہے اس مقابلے کے بارے میں؟''

''ریان ولیم نے دو تین دن پہلے بات کی ہے۔ وہ بھی اس کو خودکشی پروگرام بتا رہا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کی طرف سے اس ایونٹ میں حصہ لے۔ وہ باتوں باتوں میں مجھے ٹٹول رہا تھا کہ کیا میں یا میرا کوئی ساتھی اس کھیل میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کام میں تو وہی دلچسپی لے گا جس کی ٹانگ سے بم باندھ کر اسے کھیلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو یا وہ ویسے ہی خودکشی کا ارادہ کر چکا ہو۔ جاوا نے یہ بات کس حوالے سے کی ہے؟ کہیں وہ......''

''ہاں عمران! اس نے ثروت کی زندگی کی قیمت یہی بتائی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کی طرف سے چار چھ یا پانچ چھ والا کھیل کھیلو۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ وہ تمہاری جگہ مجھے قبول کر لے لیکن وہ نہیں مانتا۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے عمران! کچھ بھی نہیں۔ میں نے تمہیں پورے حالات بھی بتا دیئے ہیں۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ کیا کرنا ہے۔ میں لڑنے مرنے کے لیے بھی پوری طرح تیار ہوں اور تمہیں سچ بتاتا

ہوں عمران! اگر ثروت کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو اب تک میں جو بھی کر سکتا تھا، کر چکا ہوتا۔''

''یعنی وہ تمہیں اور ثروت کو چھوڑنے کے بدلے میں یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی طرف سے یہ بازی لگاؤں؟''

''ہاں عمران! بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی تمہاری ''لک'' پر بہت بھروسہ کر رہا ہے۔ لیکن میں تمہاری بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ یہ قسمت آزمائی نہیں، خودکشی ہے۔ چیمبر میں چار گولیاں رکھ کر دو دفعہ فائر کرنا یا پانچ گولیاں رکھ کر ایک دفعہ۔ اس مسئلے کا کوئی اور حل نکالنا چاہیے عمران۔''

دوسری طرف کئی سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ پھر عمران کی آواز آئی۔ ''حل اتنی دور بیٹھ کر نہیں نکل سکتا تابی! میں آرہا ہوں تمہارے پاس۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر۔''

''لیکن عمران......''

''باقی باتیں وہاں پہنچ کر ہوں گی۔ میں پہلے تم سے فون پر ہی رابطہ کروں گا۔ تمہیں یہ فون آن رکھنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم اس وقت ہو کہاں؟''

''لنگڑی پورہ گاؤں میں ہی ہیں۔ گوبندر کے سسرالی گھر میں۔ یہ کافی بڑا گھر ہے۔ سامنے کی طرف برآمدہ ہے......''

میری بات کو بریک لگ گئے۔ باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور پریم چوپڑا کی گرج دار آواز آئی۔ ''ہاں بھئی...... تمہاری بات ختم ہوئی یا نہیں؟''

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ لوگ اندر ہونے والی گفتگو سنیں گے تاکہ میں کوئی فالتو بات نہ کر سکوں۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے عمران! ہم پھر بات کریں گے۔ میرا فون کھلا ہے، اوکے...... خدا حافظ۔''

دس پندرہ منٹ بعد جاوا اپنے پورے کروفر کے ساتھ پھر آدھمکا۔ وہ واقعی ایک ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کی موجودگی جیسے اردگرد کی ہر جاندار شے کو سہما دیتی تھی۔ اس کے جسم سے ایک حیوانی سی بُو پھوٹتی رہتی تھی۔

میں نے جاوا کو یہی بتایا کہ عمران نیم رضامند ہے۔ وہ ایک ڈیڑھ روز میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ فون پر بات کرے گا۔ براہِ راست ملاقات سے پہلے اسے ایک دو یقین دہانیاں

چاہیے ہوں گی۔

جاوا بولا۔ ''بچے! ایک بار کہہ دیا ہے نا کہ اس زبان سے بڑی یقین دہانی پورے مہاراشٹر اور پورے انڈیا میں کوئی نہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''جاوا صاحب! ثروت اور یوسف کو کب چھوڑو گے؟''

''نہیں بچہ جی! ابھی تو اس چھوکری کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ تو کھیل پورا ہونے کے بعد ہی چھوٹے گی۔ اس لونڈے یوسف کی بات پر غور کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں بھی زبردست قسم کا لفڑا ہے۔ سردار اوتار کی دُم پر بڑے زور کا پاؤں آئے گا۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ اس کے ساتھ اپنا دس سال کا یارانہ بھاڑ میں چلا جائے گا۔''

''جاوا صاحب! آپ یہ کہہ رہے ہو کہ یوسف کو خدانخواستہ اشو کا سنگھ کی جگہ مرنا پڑے گا۔''

''خدانخواستہ کہہ لو یا بھگوان نہ کرے کہہ لو لیکن بات تو کچھ ایسی ہی ہے بچے۔''

''تو پھر یہ ڈیل نہیں ہو سکے گی۔ تم ہماری جان چاہتے ہو تو لے لو۔ بلکہ ابھی مار دو ہم سب کو۔'' میں نے دوٹوک حتمی لہجے میں کہا۔

میرے لہجے نے جاوا کو ذرا چونکایا۔ اس نے جگر پاش نظروں سے مجھے گھورا۔ ''جاوا کی دی ہوئی موت اتنی آسان نہیں ہوتی بچہ جی! اس کی تمنا نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ بہرحال میں اس بارے میں سردار اوتار سے بات کر کے دیکھوں گا۔ وچن کوئی نہیں دیتا اور نہ ہی دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر تم چاہو تو تمہیں ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں۔ کہو تو تمہیں پاکستان بھی پارسل کیا جا سکتا ہے تاکہ تم ہیرو کو جلد از جلد یہاں بھیج سکو۔ تمہارے علاوہ اس چھوکری رجنی کو بھی ابھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ بتاؤ پروگرام ہے رہا ہونے کا؟''

''نہیں...... میں ثروت اور یوسف کو یہاں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔''

''اوئے بلونگڑے! یوسف کا تو تُو بس یونہی نام لے رہا ہے۔ تیرا اصل مسئلہ تو وہ چھوکری ثروت ہے۔ مجھے پتا ہے، ہندی فلموں والا کلاسیکل عاشق ہے تُو۔ وہ مکیش کا گانا کیا تھا، جس کی دھن اپنے چاچا جے کشن نے بنائی تھی۔ جینا یہاں، مرنا یہاں اس کے سوا جانا کہاں۔ میرے چندا! تُو بھی اس چھوکری کے سوا کہیں نہیں جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مرے گا اور اس کے ساتھ ہی قبر میں لیٹنا پسند فرمائے گا۔ میں تاڑ گیا ہوں تیری آنکھوں میں دیکھ کر۔ چھوٹا موٹا ڈپلومہ نہیں ہے تیرے پاس، پوری پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے تُو نے عاشقی

میں۔"

"جو بھی آپ سمجھ لو۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ تم چھوڑ سکتے ہو تو ان دونوں کو چھوڑ دو۔"

"یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں رجنی کے بارے میں میری آفر اب بھی برقرار ہے۔"

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "کب چھوڑو گے اسے؟"

"کہو تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جہاں من چاہے، چلی جائے گی اور ہمارے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دے گی۔ وہ اس گاؤں کے جس گھر میں چاہے، جا سکتی ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے ضمانت دینا ہوگی کہ وہ گاؤں سے باہر نہیں جائے گی اور نہ اپنی زبان کھولے گی۔"

اس روز سہ پہر کے بعد جاوا نے وعدے کے مطابق رجنی کو چھوڑ دیا۔ وہ اس خطرناک چار دیواری سے نکل کر گاؤں میں ہی اپنے ایک ماموں کے گھر چلی گئی۔ میں نے بڑے پُرزور طریقے سے اسے اور اس کے ماموں کو زبان بندی کی ہدایت کر دی۔ آشا کور کی ہلاکت کا تو رجنی کو علم ہو چکا تھا، میں نے گوبندر کی ہلاکت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ اسی رات جاوا گروپ کے افراد نے آشا کور، گوبندر اور مخبر روہیل سنگھ کی لاشیں ایک بند گاڑی میں ڈالیں اور کسی نامعلوم جگہ غتربود کر دیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کام میں مقامی تھانے دار نے بھی جاوا کے کارندوں کی مدد کی۔ میرا یہ اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ تین جیتے جاگتے انسانوں کو مار کر ان کا مدعا غائب کر دینا جاوا کے لیے ایسا ہی تھا جیسے تین مکھیوں کو مار دینا۔ اس رات جاوا نے مجھے فون کی ایک نئی سم بھی دی تاکہ میں عمران سے رابطہ بحال رکھ سکوں۔

شام کو ایک اور اہم شخص کی آمد اس چار دیواری میں ہوئی۔ یہ اونچے زرتار شملے والا سردار اوتار سنگھ تھا لیکن آج اس کے شملے میں پہلے جیسا تناؤ اور لہراؤ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وجہ یقیناً سردار اوتار کی بیٹی ہی تھی۔ سردار اوتار سنگھ ترشولا کے علاقے کا سب سے باعزت شخص تھا اور وہ اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں بری طرح رسوا ہوا تھا۔ اس کی چودھریانہ اکڑ اور اس کے بے جا گھمنڈ نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ جاوا اور سردار اوتار سنگھ کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس کا کوئی کوئی فقرہ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ نہال برادری کے لوگوں نے ایک بار پھر سردار اوتار کی بیٹی کو پاکستان پہنچا دیا ہے اور اب وہ ننکانہ صاحب میں ہے۔ سردار اوتار سنگھ جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا۔ اس کی بے قراریاں عروج پر تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنی بیٹی کے ہاتھوں ہار چکا ہے۔

مجھے وہ خوب صورت لیکن بیمار باپو یاد آیا جس نے بستر مرگ پر ہوتے ہوئے بھی اپنی پوتی کی مدد کی تھی۔ اس نے اپنی پوتی کا یہ حق مانا تھا کہ وہ اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق گزارنے کے لیے آزاد ہے۔ وہ چلا گیا تھا لیکن جاتے جاتے اپنی پوتی کے راستے سیدھے کر گیا۔

جاوا نے شاید سردار اوتار سنگھ کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا، دھپ کی آواز آئی پھر جاوا بولا۔ "اب چھوڑ دے اوتارے! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب یہ بڑے والا پیگ پی اور دوسری باتوں کے بارے میں سوچ۔"

اس کے ساتھ ہی بوتل اور گلاس وغیرہ کی کھنک سنائی دی۔ جاوا، سردار اوتار کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سردار اوتار کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ "جاوا صاحب! اب تو من کرتا ہے کہ شراب کا تالاب ہو اور اس میں چھال مار دوں۔ اس میں ڈبکی لگا کر نیچے چلا جاؤں۔ نہ کسی کی شکل دیکھوں نہ کوئی آواز سنوں۔"

"اوئے تُو چل میرے ساتھ ممبئی، وہاں یہ انتظام بھی کر دیں گے۔ ساتھ تین چار فلمی پریاں بھی تیرے ساتھ تالاب میں اُتار دیں گے اور شراب بھی اصلی فرانسیسی ہوگی۔ سیدھی سورگ میں پہنچا دے گی تجھے۔"

"جاوا صاحب! سورگ نہ ہو لیکن یہ نرگ تو نہ ہو۔ لگتا ہے کہ پورا شریر آگ میں جل رہا ہے۔"

"تو آگ پر یہ پانی ڈال نا یار! کہتا ہے تو تیرے لیے کچھ چھن چھن کا انتظام بھی کر دیتے ہیں۔" جاوا کا اشارہ یقیناً اسی بہاری رقاصہ کی طرف تھا جو کل شاربہ بائی کے ساتھ یہاں آئی تھی اور رات کو چودھری انور کے پاس رہی تھی۔

میں اسی کمرے میں تھا جہاں آج صبح بھی جاوا سے میری بات ہوئی تھی۔ ثروت اسی سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جاوا اپنی گارنٹی پر پورا عمل کرے گا اور ثروت بالکل خیریت سے رہے گی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہم جاوا کی ہدایت پر چلتے رہیں گے۔ جب سے شاربہ بائی نے ثروت کے سامنے یوسف کے پول کھولے تھے، وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ بالکل گم صم تھی۔ آنکھوں کے کنارے گہرے سرخ تھے لیکن آنسو جیسے روٹھے ہوئے تھے۔

ثروت سے زیادہ فکر مجھے یوسف کی طرف سے تھی۔ یوسف بھی اسی چار دیواری میں

موجود تھا، تاہم کل رات سے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اب سردار اوتار سنگھ بھی یہاں آن موجود ہوا تھا۔ سردار اوتار سنگھ یقیناً یوسف کے لیے یہاں آیا تھا۔ یوسف سرداروں کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ اس کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مفرور بیٹے کی زندگی آسان کرنے کے لیے یوسف کی جان لینا چاہ رہے ہیں۔ ان کا ایک طریقہ ناکام ہو گیا تھا لیکن وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر سکتے تھے۔

یہ بڑے تناؤ والی صورتِ حال تھی۔ میں نے جاوا کو صاف بتا دیا تھا کہ وہ جو بھی ڈیل کرنا چاہتا ہے، اس میں یوسف کی جان بخشی پہلی شرط ہو گی۔ جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ سردار اوتار بلانوشی کر رہا ہے۔ جب وہ بالکل ٹن ہو گیا تو اس نے نہال برادری کے لوگوں کے لیے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ وہ ان کی ماؤں بہنوں سے ناجائز و شرمناک رشتے جوڑ رہا تھا۔ پھر یہ رشتے جوڑتے جوڑتے ہی وہ شاید سو گیا۔ میں نے ایک کارندے کے ہاتھ جاوا کو پیغام بھیجا کہ میں ثروت کے لیے فکرمند ہوں۔ وہ اسے میرے پاس بھیج دے۔

چند منٹ بعد پریم چوپڑا اس کا جواب لے کر آیا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ چھوکری اپنے اصلی پتی کے پاس بالکل خیریت سے ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ وڑی، تم اپنا مغز پلپلا مت کرو۔''

پریم چوپڑا نے جھوٹ بولا تھا۔ ثروت بالکل خیریت سے تھی لیکن یوسف کے کمرے میں نہیں تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں بعد میں ملا اور یہ خاصا حیران کرنے والا ثبوت تھا۔ ابھی صبح کا اُجالا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا کہ شور سے میں جاگ اُٹھا۔ ''بھاگو، دوڑو'' کی صدائیں آ رہی تھیں۔ پھر ایک فائر ہوا۔ پریم چوپڑا نے کسی کو للکارا۔ تب ایک دوسرے کارندے سورج کی آواز سنائی دی۔ ''ادھر سے نکلا ہے۔ دور نہیں گیا ہو گا۔''

تب اوپر تلے دو فائر مزید ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی۔ یہ جیپ بڑی تیزی سے کسی کے پیچھے گئی۔ پورے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ گئے تھے۔ ان میں جاوا اور سردار اوتار سنگھ بھی تھے۔ پھر جاوا کے گرجنے برسنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے کسی کارندے کو زوردار تھپڑ رسید کیا اور گندی گالیاں دیں۔ کارندے نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''بھیا صاحب! میں بس ایک منٹ کے لیے اندر آیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ چودھری انور صاحب آوازیں دے رہے تھے۔ بس اتنی دیر میں وہ نکل گیا۔''

جاوا نے کارندے کو ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ''ایک منٹ کم ہوتا ہے کتے کے بچے۔'' وہ دھاڑا۔ ''ایک منٹ میں انڈیا کے اندر تین درجن لوگوں کی ہتھیا ہوتی ہے۔ چار پانچ سو عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ تیرے جیسے بہت سے حرام خور ملازموں کو ان کے مالک زندہ جلا دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آج تیرے پر بھی پیٹرول پھینکنا پڑے گا۔''

کارندہ دہشت زدہ آواز میں فریادیں کرنے لگا۔ دو تین منٹ بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ یوسف کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ حیرت ناک انکشاف تھا۔ گوبندر کی موت کے بعد سے یوسف کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بالکل سکتہ زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی کوشش کرے گا۔ اب تک دو افراد اس جگہ سے بھاگے تھے اور دونوں پکڑے گئے تھے۔ یعنی ثروت اور رجنی۔ اب یوسف کا پتا نہیں کیا انجام ہونا تھا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ بچ نکلے گا۔ یہاں کوئی بھی جاوا کے مطلوب شخص کو پناہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پولیس بھی نہیں۔

سردار اوتار سنگھ سب سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جاوا کے کارندوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے تین چار بندے بھی یوسف کے پیچھے لگا دیئے تھے۔ یوسف کے بھاگنے کی تفصیل مجھے کچھ دیر بعد پریم چوپڑا سے ہی معلوم ہوئی۔ اب کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ پریم چوپڑا ابھی ابھی جیپ پر کہیں سے واپس آیا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

میرے پوچھنے پر پہلے تو اس نے ناک بھوں چڑھائی پھر بتایا کہ وہ لیٹرین کی طرف سے نکلا ہے۔ سویرے سویرے دہائی دے رہا تھا کہ اسے زور کی لگی ہے۔ نریندر اسے لیٹرین کی طرف لے کر گیا تھا۔

''نریندر تو باہر کھڑا رہا ہو گا۔'' میں نے تفصیل چاہی۔

''وہ بس ذرا دیر کے لیے اندر گیا تھا۔ چودھری آوازیں دے رہا تھا۔ اسی دوران میں اس کتے نے دیوار پھاندی اور باہر گلی میں کود گیا۔ لیکن جائے گا کہاں، چوہے کے مافق پکڑیں گے اور دُم کی طرف سے کھینچتے ہوئے واپس لائیں گے۔''

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یوسف ایسی جرأت کر چکا ہے۔ کبھی کبھی موت کا حد سے بڑھا ہوا خوف بھی انسان کو کچھ کر گزرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آگ کے ڈر سے لوگ بلند عمارتوں سے کود جاتے ہیں۔ اونچی سپاٹ دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ یوسف بھی شاید اسی طرح نریندر کی عقابی نظروں سے بچ نکلا تھا۔ یہ نریندر کوئی عام کارندہ نہیں تھا۔ پریم چوپڑا کے بعد جو

دو تین کارندے زیادہ اہم تھے، یہ ان میں سے ایک تھا۔ سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں گوبندر سنگھ کو اسی نے گولی سے اُڑایا تھا۔ اس سے پہلے پرسوں رات مخبر روہیل کو قتل کرنے کے لیے بھی جاوا نے اسی نریندر کے حوالے کیا تھا۔

میں دل ہی دل میں دعا گو ہو گیا کہ یوسف اس خونی گھیرے سے کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

سارا دن عجیب سی کشمکش میں گزرا۔ موبائل فون میری مٹھی میں تھا اور میں مسلسل عمران کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن کال ابھی نہیں آئی تھی۔ شام کے کچھ ہی دیر بعد پریم چوپڑا جھلایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے عقب میں دو خونخوار صورتوں والے رائفل بردار موجود تھے۔ ان لوگوں کی صورتیں ہی یہ بتا دیتی تھیں کہ درجنوں کے حساب سے قتل کر چکے ہیں۔ وہ جب دروازہ کھولتے تھے تو ان کی انگلیاں ٹریگر پر ہوتی تھیں اور وہ بڑی مہارت سے میرے اور اپنے درمیان ایک خاص فاصلہ برقرار رکھتے تھے۔ پریم چوپڑا بھی یقیناً اس طرح کی نقل و حرکت کا ماہر تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے اور رائفل برداروں کے درمیان نہیں آیا تھا۔

پریم چوپڑا نے دروازہ کھلوایا اور چڑھی ہوئی تیوریوں سے بولا۔ ''چلو...... وہ تمہاری سہیلی یاد کر رہی ہے تمہیں۔ بیچاری کی بھوک مری ہوئی ہے تمہارے بغیر۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ ثروت کی طرف ہے۔ یقیناً وہ یوسف کے جانے کے بعد اکیلی خوف کھا رہی تھی۔

وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر اسی کمرے میں لے آئے جہاں سلاخ دار کھڑکی کا منظر حوالات کی سی جھلک دکھاتا تھا۔

اسی ''حوالات'' میں گوبندر کا سفاکانہ قتل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، ثروت سکڑی سمٹی ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی چادر مضبوطی سے اپنے اردگرد لپیٹ رکھی تھی جیسے یہ اس کا آخری سہارا ہو۔ ان شرابیوں، سفاک بدمعاشوں کے نرغے میں وہ اس نازک آبگینے کی طرح تھی جو پتھروں کی بارش میں رکھا ہو۔ آشا کور کی جان تو مر کر یہاں سے چھوٹ گئی تھی۔ رجنی کو انہوں نے ویسے ہی آزاد کر دیا تھا۔ اب صرف ثروت یہاں موجود تھی۔

میں کمرے میں گیا تو چوپڑا نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ''بتی نہیں بجھے گی۔ ہاں پہرے دار کی نظر بچا کر چوما چاٹی کر سکتے ہو۔''

میں نے بمشکل ضبط کیا۔ ثروت چوبیس گھنٹے میں ہی کئی دنوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔

اس کے رُخساروں پر زردی کھنڈی تھی۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں جیسے مرجھا کر اپنا رنگ تبدیل کر چکی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کیوں ہے۔ شاربہ بائی نے اس کے سامنے جو کچھ یوسف کے بارے میں بولا تھا، اس نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ یوسف کی پچھلی غلطیاں معاف کر کے اس کے ساتھ نئے سرے سے زندگی کے سفر کا آغاز کرنا چاہ رہی تھی مگر یہاں اس کو پتا چلا تھا کہ وہ ''وفا کا پتلا'' تو نئی غلطیوں کا آغاز کر چکا ہے۔

میں ثروت سے دل جوئی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔ ''ابھی تک یوسف ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آیا۔ یہ اچھا شگون ہے۔'' وہ خاموش رہی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''کیا اس نے تمہیں تھوڑا بہت اشارہ دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''مجھے کیا پتا؟'' وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بولی۔

''وہ تمہارے ساتھ اسی کمرے میں تھا۔ تمہیں کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا؟''

''وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔'' ثروت نے مدھم آواز میں انکشاف کیا۔

''کیا مطلب؟ پریم چوپڑا وغیرہ تو بتا رہے ہیں کہ وہ رات کو تمہارے ساتھ یہاں تھا۔''

''جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہیں ساتھ والے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ میں رات کو یہاں اکیلی رہی ہوں۔''

''پھر انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''انہوں نے اور بھی کئی جھوٹ بولے ہیں تابش! پتا نہیں کیا چاہتے ہیں یہ؟''

''میں سمجھا نہیں ثروت؟''

ثروت نے ایک نظر کھڑکی سے باہر کھڑے پہرے داروں پر ڈالی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''یوسف خود یہاں سے نہیں نکلے تابش! ان لوگوں نے انہیں نکالا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''وہ کل رات ساتھ والے کمرے میں تھے۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب وہ چوڑی ناک والا کمرے میں آیا تھا جسے چوپڑا کہتے ہیں۔ اس نے یوسف سے کچھ باتیں کی تھیں۔ دو چار باتیں میرے کانوں میں بھی پڑیں۔ چوپڑا، یوسف کو یہاں سے نکلنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے یوسف سے کہا کہ وہ تیار رہے۔ تین چار گھنٹے میں اسے یہاں سے نکال لیا جائے گا۔''

''یوسف نے جواب میں کیا کہا؟''

''وہ تیار ہو گئے تھے۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔

"تو پھر یہ ڈراما کیوں رچایا گیا؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اچانک میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ جاوا اور سرداراوتار سنگھ میں یارانہ تھا۔ سرداراوتار کو ہرصورت میں یوسف درکار تھا جبکہ میں نے جاوا کو صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر یوسف کو نہیں چھوڑا جائے گا تو پھر کوئی ڈیل بھی نہیں ہو سکے گی۔ یوں لگتا تھا کہ عیار جاوا نے اس مسئلے کا ایک درمیانی راستہ نکالا ہے۔ اس نے ظاہر کیا ہے کہ یوسف بھاگ نکلا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ثروت نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو سوچ رہا تھا۔ یوسف کے حوالے سے یہ ایک اچھی صورتِ حال تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ ثروت کو اس کی کوئی خاص خوشی نہیں ہے۔ شاید اسے اس بات کا بھی دُکھ ہوا تھا کہ یوسف نے اپنی رہائی کے موقع پر اس کے بارے میں نہیں سوچا۔

ہم رائفلوں کی چھاؤں میں تھے۔ درجنوں نگاہیں ہمیں ہمہ وقت گھور رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ سرداراوتار سنگھ کے ساتھ جو ڈراما ہوا ہے، اس کا علم جاوا اور بس اس کے ایک دو قریبی ساتھیوں ہی کو ہے۔ سرداراوتار کا "غم" اور بڑھ گیا تھا لہٰذا "غم غلط کرنے کی رفتار" بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ سارا دن پیتا رہا اور کبھی کبھی بھڑکیں بھی لگاتا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بیچاری بہاری رقاصہ بھی اس کے "غم" کی زد میں آئی ہو۔ بیٹی کے فرار کے بعد یہ دوسری آفت تھی جو اوتار پر آئی تھی۔

رات کا کھانا ہمیں کمرے میں ہی پہنچایا گیا۔ میرے اصرار پر ثروت نے آج چند نوالے لیے۔ اس نے میرے لیے بھی پلیٹ میں کھانا نکالا اور میرے سر پر آنے والی چوٹ کا حال بھی دریافت کیا۔ وہ یوسف کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی اس نے یوسف کے متعلق شاربہ بائی کے انکشاف پر کوئی تبصرہ کیا تھا۔

رات تاریک اور نیم سرد تھی۔ نہ جانے کیوں ابھی تک عمران نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید اسے انڈیا پہنچنے میں ذرا تاخیر ہوئی تھی۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ جاوا اپنی لگژری جیپ پر اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا۔ سرداراوتار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ تاہم چودھری انور اور چوپڑا وغیرہ یہیں تھے۔ ہمارے اردگرد رائفلوں کی گردش بھی اسی طرح تھی۔ کمرے میں رنگین پایوں والی بس ایک چارپائی تھی۔ میں نے ثروت سے کہا کہ وہ

چارپائی پر لیٹ جائے لیکن وہ کسی صورت آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "بھئی...... میں تکلف کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ میں تو سوتا ہی نیچے ہوں۔"

"تو پھر میں بھی نیچے ہی لیٹ جاؤں گی۔" اس نے ایک طرف پڑی چٹائی کھول لی۔ اسے ایک کپڑے سے اچھی طرح صاف کیا۔ چٹائی لمبائی میں دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ثروت نے اس کے ایک سرے پر اپنا اور دوسرے پر میرا تکیہ رکھ دیا۔ رنگین پایوں والی چارپائی خالی پڑی رہی۔

چوپڑا کہہ رہا تھا کہ کمرے کی بتی حسبِ معمول جلتی رہے گی لیکن پھر لائٹ چلی گئی۔ گھر میں تین چار لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ ایک لالٹین کی مدھم روشنی سلاخ دار کھڑکی کے راستے ہمارے کمرے میں بھی آتی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ خاموش لیٹے رہے۔ مختصر سے فاصلے بھی کبھی کتنے طویل ہوتے ہیں۔ ہم سیدھے لیٹے تھے۔ پتھریلے مجسموں کی طرح ساکت۔ بے روح اور بے تعلق۔ کچھ دیر بعد سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ثروت نے کروٹ بدلی ہے۔ اپنا رُخ میری طرف کیا ہے۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "آپ نے مجھے ابھی تک اس کام کے بارے میں نہیں بتایا جو یہ لوگ آپ سے اور آپ کے دوست سے لینا چاہ رہے ہیں۔"

"ثروت! تم پہلے ہی بہت پریشان ہو۔ ان سوالوں میں خود کو نہ اُلجھاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے، ہم کرلیں گے۔"

"لیکن یہ جاننا تو میرا حق ہے نا کہ آپ ہمارے لیے کتنی بڑی قربانی دینا چاہ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوا تو میں، فرح اور عاطف کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا ثروت! ہم اس معاملے کو اچھی طرح ہینڈل کرلیں گے۔ ہمیں اس کا تجربہ ہے۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "تابش! آپ پہلے ہی بہت قانون شکنی کر چکے ہیں۔ کیا اب اور کریں گے؟ خود کو اور سزا کی دلدل میں دھنسائیں گے؟"

"یہ تو مقدر ہے ثروت اور مقدر سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔"

"لیکن یہ بھی تو کہتے ہیں کہ مقدر ہم خود بناتے ہیں۔"

"اب تو جو بننا تھا بن چکا ہے ثروت! اب اس کا اور کیا بگڑے گا۔"

"میرا بھی جو بننا تھا، بن چکا ہے تابش! اب میں وہ پہلے والی ثروت نہیں بن سکتی۔ آپ میرے لیے خود کو کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔"

"ایسی بات کیوں کرتی ہو۔ تمہارے سامنے ایک زندگی پڑی ہے۔ ایک صاف ستھری

خوبصورت گھریلو زندگی۔“

”نہیں تابش! پلیز آپ میرے لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ میں نے کل آپ کی باتیں بھی سنی ہیں۔ آپ پلیز مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ میں دب کر مر جاؤں۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”میں نے سب سنا ہے۔ یہ بدمعاش جس کو آپ جاوا کہتے ہیں، آپ کو چھوڑ رہا تھا۔ یہاں سے جانے کی اجازت دے رہا تھا لیکن آپ نے میرا نام لیا اور کہا کہ آپ مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اگر آپ کو آزادی مل رہی تھی تو آپ نے کیوں نہ لی؟ کیا پتا کہ باہر نکل کر آپ ہمارے لیے کچھ بہتر کر سکتے۔“

”بہتر کام کسی سے کسی بھی وقت ہو سکتا ہے ثروت! کیا پتا یوسف کے باہر جانے سے کوئی فائدہ ہو جائے۔“

اس نے مایوسی سے سر ہلایا لیکن بولی کچھ نہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یوسف کے یوں خاموشی کے ساتھ چلے جانے سے اسے رنج ہوا ہے۔ وہ یوسف کے جانے کا موازنہ میرے نہ جانے سے کر رہی تھی۔ اس موازنے سے اسے یوسف کا رویہ زیادہ بُری طرح کھٹک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ثروت کہ یوسف نے یہ پیشکش کچھ سوچ کر ہی قبول کی ہو۔ وہ سمجھ گیا ہو کہ یہ لوگ ابھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ یہاں رہ کر کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس نے باہر جا کر کوشش کرنے کا سوچا ہو۔“

”میں جانتی ہوں تابش! آپ مجھ سے باتیں چھپاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ یوسف کی باتوں پر بھی پردہ ڈالتے ہیں۔ جب لاہور میں یوسف ہسپتال پہنچے تو آپ بھی وہاں کیسے پہنچ گئے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ سب کچھ اتفاقیہ نہیں تھا۔ آپ شاید پہلے سے یوسف کے آس پاس تھے۔ اگر ایسا تھا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یوسف کی مصروفیات کیا ہیں۔ یوسف کے چیریٹی شو والے جھوٹ کا بھی آپ کو پتا چل گیا ہوگا پھر بھی آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”ثروت! میں نے کہا ہے نا، تم خود کو ان سوالوں میں جتنا اُلجھاؤ گی، اتنا ہی پریشان ہو گی۔ تم پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں ہو۔ یہاں آئینہ نہیں ہے ورنہ میں تمہیں صورت دیکھنے کا مشورہ دیتا۔ چہرہ ہلدی ہو گیا ہے۔ تم تو مجھے توانائی دیتی ہو ثروت! تم سے مجھے آگے بڑھنے کی ہمت ملتی ہے۔ اگر تمہارا یہ حال ہوگا تو میں کیا کر سکوں گا۔“

آخری دو تین جملے میں نے بے ساختہ ہی کہہ ڈالے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو ثروت! ہاں...... میں سچ کہتا

ہوں، میں تم سے توانائی پکڑتا ہوں۔ زندگی کی مصیبتیں جھیلنے کا حوصلہ پاتا ہوں۔ تم ہر ہر قدم پر میرے لیے ہمت اور ترنگ کا سرچشمہ ہو ثروت۔ اگر سرچشمے سوکھ جائیں تو بڑے بڑے دریا ریت کے ڈھیر بن جاتے ہیں، زندگیاں بنجر ہو جاتی ہیں۔“ میری آواز بھرا گئی۔

میں اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جذبات کے ریلے میں کچھ مزید بہہ جانا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میں، مَیں نے کیسے کیسے اسے یاد کیا ہے۔ کیسے کیسے تڑپا ہوں اس کے لیے۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ عشق کی آبرو خاموشی میں تھی۔ برداشت میں اور تسلیم و رضا میں تھی۔ عشق، ازل سے ”خود دار“ رہا ہے۔ ہاتھ پھیلا کر صلہ نہیں مانگتا، چپ رہ کر دل میں اُترتا ہے، سب کچھ پا جاتا ہے یا سب کچھ کھو دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں کامران ٹھہرتا ہے۔ میں نے پانچ برس پہلے ثروت کو بہت قریب آنے کے بعد کھویا تھا۔ آج وہ پھر میرے آس پاس تھی۔ شادی شدہ ہو کر بھی شادی شدہ نہیں تھی۔ اس کی اور میری زندگی کے راستے پھر سے ایک ہو سکتے تھے لیکن میں اس یکجائی کے لیے اپنی محبت کو لفظوں اور خواہشوں کے داغ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت نے مجھے اندر سے بڑا سیر چشم کر دیا تھا۔ میں اپنے دل کو ٹٹولتا تھا تو لگتا تھا کہ میرے اندر ثروت کو پھر سے کھونے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔

وہ خاموش لیٹی تھی۔ مجھے لگا کہ پھر یوسف کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ”ثروت! پریشان نہیں ہونا۔ یوسف جہاں بھی ہوگا، جاوا کی حفاظت میں ہوگا۔ میں صبح جاوا سے اس کے متعلق ساری تفصیل معلوم کروں گا۔“

”وہ مجھ سے ملے بغیر کیوں چلے گئے؟ میں ان کی بیوی ہوں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہوا ہے۔“

”ثروت! کئی سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں، وقت کے پاس ہوتا ہے۔ ہم خود کو خوانخواہ ہی سوچ سوچ کر ہلکان کرتے ہیں۔ بہر حال اتنا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، وہ ہم سے کہیں زیادہ محفوظ ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسے پاکستان ہی پہنچا دیا گیا ہو۔“

”مجھے نصرت کی بھی بہت فکر ہے تابش! وہ پہلے ہی تنی بیمار ہے کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے میری بات ہو سکے۔“

”میں اس بارے میں بھی کوئی کوشش کروں گا ثروت! مجھے امید ہے کہ جاوا ہماری بہت سی باتیں مانے گا۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔“

”جی......“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی اس ”جی“ نے مجھے گئے وقتوں کی

یاد دلا دی۔ جب ہر چیز پر بہار تھی۔ ساری خوبصورتیاں جوان تھیں۔ میں جب اسے ''ثروت'' کہہ کر بلاتا تھا، وہ اتنے پیار سے ''جی'' کہتی تھی کہ میں آگے کی ساری بات ہی بھول جاتا تھا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا۔ تم جان بوجھ کر ایسا کرتی ہو۔ عام باتوں کے جواب میں ''ہاں'' کہتی ہو لیکن جب تم تاڑ جاتی ہو کہ میں کوئی فرمائش کروں گا تو ''جی'' کہہ دیتی ہو۔ میری یادداشت کا فیوز اُڑ جاتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہو جاتی تھی۔

میں یادوں کی کھڑکی میں جھانکتا رہا۔ وہ اسی طرح میری طرف کروٹ بدلے بدلے سو گئی۔ دلنشین آنکھوں پر پلکوں کی چلمن تھی۔ اغیار کے نرغے میں، رائفلوں کی چھاؤں میں اگر وہ یوں سو رہی تھی تو یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہ مجھ پر اس کے بے پناہ بھروسے کا خاموش اظہار تھا۔ اس نے خود اصرار کر کے مجھے یہاں اس کمرے میں بلوایا تھا اور جب میں آ گیا تھا تو وہ اپنے اردگرد کے سارے حالات سے لاتعلق ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں، مَیں اس کا ملیح چہرہ دیکھتا رہا۔ دل چاہا اس کو سینے میں چھپا لوں۔ دنیا جہان کی رکاوٹوں اور آفتوں کو چیر کر نکلوں اور کسی ایسے بے آباد جزیرے میں جا بسوں جہاں میرے اور اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔

صبح نو بجے کے قریب جاوا سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ جب بھی مجھے جاوا سے ملاقات کے لیے لے جایا جاتا تھا، میرے ہاتھ عقب میں ''ہینڈ کف'' سے جکڑ دیئے جاتے تھے۔ یہ ملاقات اسی کمرے میں ہوئی جہاں اس سے پہلے ہوئی تھی۔ یہاں بڑے پلنگ پر جاوا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ الکحل کی بُو، سگریٹ کا دھواں اور خود جاوا کی حیوانی بُو باس، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ سردار اوتار سنگھ آج صبح سویرے یہاں سے واپس جا چکا ہے۔ چودھری انور گنجا بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ جاوا نے مجھ سے تنہائی میں بات چیت کی۔ اس بات چیت سے پہلے اس نے اپنے دونوں سیل فون بند کر دیئے۔ کھڑکی کو بھی بند کرا دیا۔

''ہاں بچے! بات ہوئی تمہاری ہیرو سے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی نہیں لیکن امید ہے کہ آج ضرور ہو جائے گی۔''

''دیر نہ کرو۔ یہاں بہت کچھ بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ سردار اوتار سنگھ بہت بے قرار ہے۔ وہ اس لونڈے یوسف کو ہر صورت یہاں سے لے کر جانا چاہتا تھا۔''

''اور یوسف کہاں ہے؟''

جاوا نے ایک گہری سانس لی اور قدرے دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس کے لیے ہمیں ناٹک رچانا پڑا ہے۔ اس کے فرار کا ناٹک۔ بہرحال وہ ہمارے پاس ہے اور بالکل محفوظ

ہے۔ اس وقت فرید کوٹ کے ایک گھر میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہو گا۔ کوئی ڈراما وراما ''ساس بھی تو خانہ خراب کبھی بہو تھی۔ لیکن بچہ جی! یہ بات تمہارے گلے کے نیچے رہنی چاہیے۔ گلے سے اوپر آئی تو گلا بھی نہیں رہے گا۔'' اس نے ہاتھ سے گردن کاٹنے کا اشارہ دیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

رات کو میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ جاوا نے اپنے مطلب کے لیے سردار اوتار سنگھ کو یادگار دھوکا دیا تھا۔ یقیناً جاوا ان لوگوں میں سے تھا جو آگے بڑھنے اور اوپر جانے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لاشوں کے زینے بنا سکتے ہیں۔

وہ بولا۔ ''میرے بارے میں کسی وہم کا شکار نہ ہونا۔ جو کچھ بھی ہوں، زبان کا پکا ہوں۔ میں جو جو وچن تمہیں دے رہا ہوں پورے کروں گا۔ تمہارا ہیرو کھیل پر آمادہ ہو جائے گا تو وہ چھوکری رجنی اور یوسف کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اور کھیل کے بعد تم تینوں بھی آزاد ہو جاؤ گے۔''

''یہ کیسی آزادی ہے جاوا صاحب! تم جسے کھیل کہہ رہے ہو، وہ موت ہے۔ تم میرے دوست کو مارنے کی بات کر رہے ہو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہماری آزادی کا کوئی مطلب نہیں ہو گا۔''

''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے میرے بچے، اپنی جانِ من کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دوست کے لیے تو کچھ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔''

''اس کو آپ ''کچھ خطرہ'' کہہ رہے ہو۔ یہ تو سراسر خودکشی ہے۔''

وہ سفاک انداز میں مسکرایا۔ ''خودکشیاں ناکام بھی تو ہو جاتی ہیں لیکن جس کو ہم قتل کرتے ہیں، اسے واقعی قتل ہونا پڑتا ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتا رہا۔ پھر گمبھیر انداز میں بولا۔ ''سنا ہے تمہیں درد نہیں ہوتا۔ سلطان چٹا کہہ رہا تھا، تم درد سے بچتے نہیں بلکہ درد کے پیچھے بھاگتے ہو۔ ایسے کام ڈھونڈتے ہو جن میں تمہیں شریر کا دُکھ سہنا پڑے؟''

میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ''جواب دو...... کیا میں درست کہہ رہا ہوں۔''

''میں خود سے کچھ نہیں کرتا۔ بس میرا مزاج ہی ایسا ہو چکا ہے۔''

''تمہارے جیسے مزاج والے کی ہمارے پاس بڑی ڈیمانڈ ہے۔ یہ کھیل والا معاملہ نمٹ جائے پھر میں تمہارے لیے ایک بڑا اچھا سا کام ڈھونڈوں گا ممبئی میں۔''

''کیا یہ بھی کوئی دھمکی ہے؟''

''نہیں میرے سونو! میرے چندے، یہ تو تمہاری اپنی اکھشا کی بات ہوگی۔ اگر چاہو تو مان لینا۔ ورنہ تمہارا اپنا راستہ ہماری اپنی پگڈنڈی۔ ویسے واقعی کیا تمہیں درد جھیلنے میں شانتی ملتی ہے؟''

''میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔''

اچانک اس نے جلتا ہوا سگریٹ میرے سینے پر عین بائیں چھاتی کے اوپر تھوپ دیا۔ قمیص اور بنیان فوراً جل گئی۔ پھر گوشت جلا، سگریٹ بجھ گیا۔ درد کی ایک ناقابلِ بیان لہر میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ میں بس خود کو تھوڑا سا پیچھے ہی ہٹا سکا۔

اس نے میرا چہرہ دیکھا۔ ''ہاں بھئی میری جانکاری غلط نہیں ہے۔ کچھ بات ہے تمہارے اندر۔''

میری پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا لیکن میں نے کوشش کر کے چہرے کے تاثرات کو نارمل ہی رکھا۔ وہ سفاک درندہ تھا اور میں کراہ کر اس کی سفاکی کو حظ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ ثروت کے پاس پہنچا دیا گیا۔ میرا اسٹیل کا ہینڈ کف کھول دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ثروت کے چہرے پر اطمینان کی ایک نمایاں لہر نظر آتی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں کوئی بات کرتے، میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ عجیب سا نمبر تھا۔ صرف تین ہندسوں کا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عمران کی زندگی بخش آواز اُبھری۔ ''ہیلو...... عمران بول رہا ہوں۔'' میرے پورے جسم میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔

''کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''آئی ایم ہیئر ان انڈیا...... تمہارے پاس...... تگڑے ہو جاؤ۔''

''یار! یہ کس نمبر سے بات کر رہے ہو، تین ہندسوں کا نمبر ہے؟''

''یہ ''پہیلی نمبر'' ہے اور اس کو سمجھنے میں تمہیں کافی وقت لگے گا۔ فی الحال کام کی بات کرتے ہیں۔ میں اس وقت فرید کوٹ پہنچ چکا ہوں۔ تم کہاں ہو؟''

''میں یہیں لنگڑی پورہ گاؤں میں۔ گوبندر کے سسرالی گھر میں۔'' میں نے عمران کو اس نئی سم کے بارے میں بھی بتایا جو اب میں اپنے فون سیٹ میں ڈالنے والا تھا۔ عمران نے میرا نیا نمبر نوٹ کر لیا۔

''جاوا سے بات ہوئی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس نے رجنی اور یوسف کو چھوڑ دیا ہے لیکن دونوں ابھی تک اس کی نگرانی میں ہیں۔ وہ کہتا ہے، جب ہماری ڈیل فائنل ہو جائے گی، وہ انہیں کہیں بھی جانے کی اجازت دے دے گا۔''

وہ بولا۔ ''تابی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ گیم کھیلوں گا۔ میں نے اس ایونٹ کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ تم جاوا سے میری براہِ راست بات کراؤ۔''

''لیکن عمران......''

''نہیں تابی! کوئی سوال جواب نہ کرنا، یہ میری درخواست ہے تم سے۔ بس جو کہتا ہوں، وہ کرتے جاؤ۔ ہمیں جاوا کی شرط قبول ہے۔ کیا تم ابھی اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟''

''ابھی تو وہ باہر نکلا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی وہ یہاں واپس آئے، تم اس سے رابطہ کراؤ۔''

''مگر عمران! یہ بھی تو دیکھو......''

''میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں جگر۔'' اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''جیسا کہتا ہوں، ویسا کرو۔ میں ابھی ایک گھنٹے بعد دوبارہ کال کروں گا۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

جاوا کہیں نہیں گیا تھا، وہ یہیں تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عمران کیا چاہ رہا ہے۔ وہ ایک ایسی شرط قبول کر رہا تھا جس میں اسّی سے پچاسی فیصد تک جان چلے جانے کا امکان تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ گلے میں جیسے کچھ اٹک کر رہ گیا تھا۔

ثروت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اچانک ثروت کی نظر میرے سینے پر پڑی۔ قمیص اور بنیان جلی ہوئی تھی۔ سینے پر داغے جانے کا تازہ نشان نظر آ رہا تھا۔ ''ہائے اللہ! یہ کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔

پھر میرے بتائے بغیر ہی وہ جان گئی کہ مجھے سگریٹ سے داغا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ اینٹی بایوٹک مرہم جو جاوا کے کارندے نے مجھے سر پر لگانے کے لیے دیا تھا، کمرے میں ہی پڑا تھا۔ رُوئی بھی تھی۔ ثروت جلدی سے گئی اور مرہم لے آئی۔

مجھے زخموں کو لا دوا رکھنا آ گیا تھا۔ زخم خود ہی لگتے تھے، خود ہی خراب ہو کر ٹھیک ہو جاتے تھے لیکن آج ثروت مجھے اپنے ہاتھ سے دوا لگا رہی تھی۔ ایسے علاج کے لیے تو میں اپنے پورے جسم کو زخم زخم کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی حنائی انگلی پر مرہم لگایا اور میری جلی ہوئی جلد پر رکھا۔ تاثیر زخم سے روح تک چلی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"درد ہو رہا ہے؟" اس نے مجھے پوچھا۔

"ہاں ثروت! بہت درد ہے۔ سر سے پاؤں تک درد میں ڈوبا ہوا ہوں لیکن مجھے پتا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہ درد...... مجھے اپنے ساتھ قبر میں لے کر جانا ہوگا۔"

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "آپ میرے دُکھ میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ میں آپ کو منع نہیں کروں گی۔ جو کہنا ہے کہہ لیں۔ میں سب کچھ سہنے کو تیار ہوں۔ میں نے آپ کو بہت دُکھ دیئے ہیں تابش۔ میں اس کا اعتراف کرتی ہوں۔ آپ جو بھی سزا دیں، میرے لیے کم ہے۔"

"دونوں ہی قصوروار ہیں ثروت اور دونوں ہی بے گناہ بھی۔ یہ جرم و سزا کی بات نہیں ہے ثروت! یہ تو وفا اور فنا کی کہانی ہے۔"

"تو پھر دعا کریں، میں فنا ہو جاؤں۔ آپ کے سامنے آپ کے ہاتھوں میں ختم ہو جاؤں۔ جینے میں تو کوئی خوشی نہیں مل سکی، شاید مرنے میں مل جائے۔"

"تم بس مرنے کی بات ہی کیوں کرتی ہو ثروت؟"

"مجھے جینے میں کچھ نظر نہیں آتا تابش! کچھ بھی نہیں۔ میری زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی۔ میری نہ پوری ہونے والی خواہشوں کا وبال میرے آس پاس والوں پر پڑا ہے۔ امی ابو چلے گئے۔ ناصر بھائی چلے گئے اور اب نصر...... نصرت میری زد میں ہے۔"

"نصرت تمہاری زد میں نہیں ہے ثروت! نہیں ہے۔ وہ اپنی بیماری کی زد میں ہے اور یہ بیماری بھی کوئی لاعلاج نہیں ہے۔ نصرت نے ٹھیک ہونا ہے پھر سے ہنسنا بولنا ہے لیکن تم شاید پھر بھی جینا نہ سیکھ سکو۔ پھر کوئی اور واہمہ تمہیں جکڑ لے گا۔ زندگی کی کسی اور دشواری کو تم اپنی طرف منسوب کر لو گی۔ اس گھیرے سے نکلو ثروت! اس جال کو توڑ دو۔ میاں بیوی کا رشتہ بہت مقدس رشتہ ہے۔ اس کا ٹوٹنا بڑی بدقسمتی ہے لیکن جب یہ رشتہ ایک ناقابلِ علاج ناسور بن جائے تو پھر اس کو کاٹ دینا بھی جائز ہے۔ مذہب، معاشرہ، اخلاقیات، سب میں اس کی اجازت موجود ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تابش!"

"نہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سب کچھ تمہارے سامنے واضح ہے۔ مجھے آج کہنے دو ثروت کہ یوسف نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ وہ جرمن بیوی کے عشق میں گرفتار رہا اور اس کی وجہ سے اس نے تم سے قطع تعلق رکھا۔ تمہیں کبھی بیوی سمجھا ہی نہیں۔

جب جرمن لڑکی والا بھوت سر سے اُترا تو اسے ہوش آیا لیکن تب بھی اس نے تم سے محبت نہیں کی، صرف تمہاری قربت کی خواہش کی۔ اسے احساس ہوا کہ ایک خاوند کی حیثیت سے اسے تم سے مستفید ہونا چاہیے۔ مگر اس کے لیے بھی اس نے تادیر انتظار کرنا گوارا نہیں کیا۔ جب تمہاری طرف سے سردمہری دیکھی تو وہ فوراً دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔"

وہ کراہی۔ "بے شک ان میں غلطیاں ہیں تابش! لیکن...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اتنا بڑا فیصلہ کر لیں۔ وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ جب خدا انسان سے مایوس نہیں تو ہم اتنی جلدی مایوس کیوں ہو جائیں۔ میں اپنی پوری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تم اپنی زندگی کو کانٹوں میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہی ہو ثروت! اور ساتھ یہ امید بھی رکھتی ہو کہ کانٹے تمہیں زخمی نہیں کریں گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی وقت ہے ثروت! کوئی اچھا فیصلہ کر لو۔"

ثروت نے اپنا سر گھٹنوں میں کر لیا اور نفی میں ہلانے لگی۔ وہ جیسے مجھے چپ رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں چپ ہو گیا۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح گٹھری بنی بیٹھی رہی پھر بولی۔ "میں نے آپ سے کہا تھا، آپ نصرت سے میری بات کروا دیں۔"

میں نے طویل سانس لی۔ "میں جاوا سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نہیں کی۔ ابھی ہمیں نصرت کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہیے۔ یہ بدترین لوگ ہیں ثروت! ہم نصرت کو ان کی نگاہوں میں کیوں لائیں۔"

وہ میری بات سمجھ گئی اور سر جھکا لیا۔

○......❖......○

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ عمران کوئی نہ کوئی درمیانی راستہ نکال لے گا۔ وہ کتنا بھی دلیر اور جوشیلا سہی، قسمت اس پر کتنی بھی مہربان سہی لیکن سامنے اندھا کنواں دیکھ کر آنکھیں بند کرنے والا وہ بھی نہیں تھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص پلاننگ تھی۔ پھر بیٹھے بٹھائے مجھے اچانک راجا یاد آ گیا۔ دل افسردہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ گزرنے والے آخری وقت کے مناظر فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلنے لگے۔ اس کی تیزی طراری، اس کا شاطر انداز اور ہر لمحے زندگی کے چھتے میں سے شہد نچوڑنے کی کوشش کرنا۔ مگر وہ بھول گیا تھا کہ زیادہ شہد کے ساتھ زیادہ زہر بھی ہوتا ہے۔ اسی دوران میں پھر عمران کا فون آ گیا۔ اور اس

نے تمہید میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور بولا۔ ''تابی! میں جاوا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''عمران! میں ایک بار پھر کہوں گا کہ......''

''تم جو کہنا چاہتے ہو، میں سمجھ رہا ہوں۔ تم اس سے میری بات کرواؤ۔''

میں نے جاوا کے کارندے کو آواز دی اور اسے سیل فون تھماتے ہوئے کہا۔ ''بھیا صاحب کے لیے کال ہے، ان کو دو۔''

کارندہ فون لے کر چلا گیا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ فون سیٹ گرم ہو رہا تھا۔ لمبی چوڑی بات ہوئی تھی جاوا کی۔ مجھے اس گفتگو کا کوئی لفظ سنائی نہیں دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی کسی قریبی کمرے سے جاوا کی گونج دار آواز کانوں میں پڑ جاتی تھی۔

اگلے دو تین گھنٹے میں صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہوئی۔ پریم چوپڑا نے ہمیں بتایا کہ ہم جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہمیں فرید کوٹ لے جایا جا رہا ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ ''جاوا صاحب سے میری بات کرواؤ۔''

وہ مجھے گھور کر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بات نہ کرائے لیکن قریباً پندرہ منٹ بعد جاوا ہماری کھڑکی کے سامنے آیا اور بولا۔ ''ہاں میرے چندا! کیا بات ہے۔ بڑی جلدی اُداس ہو جاتے ہو میرے بغیر۔''

''رجنی اور یوسف کا کیا بنا ہے؟''

''وہ دونوں خوشی کے ڈھول بجا رہے ہیں۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں۔ رجنی اپنے ماموں کے ساتھ کسی دوسرے گاؤں نکل گئی ہے۔ اس لونڈے یوسف کے بارے میں جانکاری ملی ہے کہ وہ دہلی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ وہاں اس کا کوئی مجسٹریٹ دوست رہتا ہے۔''

''ہمیں کیسے یقین آئے گا۔''

''تمہارا وہ لنگوٹیا عمران، ایک دم گرو ہے بلکہ گرو گھنٹال ہے۔ وہ سب جان لے گا اور شاید اب تک جان بھی چکا ہو۔ اس کے ہرکارے بڑے تیز ہیں۔ ایک دم بوگیر کتوں کے مافق۔ تم چنتا نہ کرو۔ وہ تمہیں فون پر ساری رام کہانی سنا دے گا۔ تم بس چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ زبردست قسم کا موج میلا کرائیں گے تمہیں۔''

○......❖......○

ہم اس مکان سے نکل کر ہائی روف گاڑی میں آ بیٹھے۔ یہ گاڑی باہر سے جتنی خوبصورت تھی، اندر سے بھی اتنی ہی آرام دہ تھی۔ مجھے ایک بار پھر اُلٹی ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔

اوپر سے چادر کی بکل مار دی گئی تا کہ ہتھکڑی نظر نہ آئے۔ ثروت بھی سرتاپا ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ فقط اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں گاڑی کی درمیانی نشستوں پر بٹھایا گیا۔ عقب میں دو مسلح افراد بالکل چوکس حالت میں موجود تھے۔ ہمارے سامنے فرنٹ سیٹ پر پریم چوپڑا خود موجود تھا اور وہ بھی مسلح تھا۔ مزاحمت کی گنجائش زیرو فیصد تھی۔ ہمارے آگے ایک کار تھی جس میں جاوا کے مسلح ڈشکرے بھرے ہوئے تھے۔ عقب میں لگژری جیپ تھی۔ اس جیپ میں جاوا کے علاوہ چودھری انور گنجا اور شاربہ بائی بھی موجود تھے۔

گاؤں میں ہُو کا عالم تھا۔ حالانکہ یہ سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا مگر کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند تھے، گلیاں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ گاڑیاں روانہ ہوئیں تو میں نے مڑ کر اس چار دیواری کو دیکھا جہاں ہم نے چند نہایت بُرے دن گزارے تھے۔ اسی چار دیواری میں آشا کور ہنستی کھیلتی داخل ہوئی اور لاش بن گئی۔ جواں سال کھلاڑی گوبندر بھی یہیں پر موت کے گھاٹ اُترا۔ ہم ابھی زندہ تھے لیکن یہ زندگی کب تک ساتھ دے گی، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جاوا اور اس کے کارندے میری توقع سے بڑھ کر خطرناک تھے۔ بندے کو چیونٹی کی طرح مسل دینے کا محاورہ میں نے کئی بار سنا تھا مگر اس محاورے کی عملی شکل پہلی بار یہاں دیکھی تھی۔

نہ جانے کیوں بار بار اس نوجوان سائیں کی شکل میری نگاہوں میں گھوم جاتی تھی جو ہمیں ہارون آباد کے ہوٹل میں ملا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ماورائی چمک ذہن میں آتی تھی اور اس کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ اس نے ثروت کو خاص طور پر نشانہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ ساری مصیبت کی شروعات اسی سے ہوئی ہے، اس نے موت کا اور قبروں کا ذکر کیا تھا۔

ہمارا قافلہ دھول اُڑاتا، لنگڑی پورہ سے ''انڈین پنجاب'' کے معروف شہر فرید کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ ہم کچے اور نیم پختہ راستوں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے اطراف میں کماد اور چاول کے کھیت تھے۔ باغ تھے اور پگڈنڈیاں تھیں۔ کہیں کہیں کاشت کار مرد و زن بھی دکھائی دیتے تھے۔ پس منظر میں مویشیوں کے ریوڑ تھے اور مغرب کی طرف جھکتا سورج تھا۔ دیہی زندگی اپنی مخصوص آہستہ روی کے ساتھ متحرک تھی۔ مگر اس ہائی روف گاڑی کے اندر کی دنیا بالکل مختلف تھی۔ یہاں خوف کے سائے تھے اور تناؤ کی حکمرانی تھی۔ ہم انڈیا کے کچھ خطرناک ترین لوگوں کے نرغے میں تھے۔ سفر بالکل خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوند گئی۔ ہمارے سامنے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ میں نے بہت سی مٹی فضا میں اُچھلتے دیکھی۔ دوسرا دھماکا سامنے جانے والی کار کے

عین سامنے ہوا۔ کار بُری طرح اُچھلی۔ میں نے اس کے بونٹ کو فضا میں اُڑتے اور انجن کو آگ پکڑتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی آٹو میٹک رائفل کا طویل برسٹ چلا۔ کار کی بائیں جانب کے شیشے چکنا چُور ہو گئے۔

ثروت چلا اُٹھی اور اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دونوں مسلح افراد ہمارے عقب میں چوکس بیٹھے رہے تاہم پریم چوپڑا اپنا مشین پسٹل نکالتا ہوا گاڑی سے اُتر آیا۔ اُترتے ساتھ ہی چوپڑا کو مچھلی کی طرح پٹ سے کچی زمین پر گرنا پڑا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی تھیں۔

اور یہی وقت تھا جب میں نے اپنے میزبان جگت سنگھ کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے نکلا۔ اس کا چوڑا سینہ دیوار نظر آرہا تھا۔ اس کی نیلی پگڑی کے نیچے اس کا چہرہ غیظ و غضب کی تصویر تھا۔ اس نے بالکل سامنے آکر ایک پورا برسٹ کار پر چلایا اور کم از کم دو کار سواروں کو چھلنی کر دیا۔ اس کی للکار گونجی۔ ''ماردوں گا...... فنا کردوں گا۔''

گاڑی میں بچ جانے والے افراد چھلانگیں لگا کر باہر نکلے اور مختلف درختوں کی آڑ لی۔

جگت کے ساتھیوں نے فلک شگاف نعرہ لگایا۔ ست سری اکال...... جو بولے سونہال۔

تب میں نے جگت سنگھ کو اپنا بازو فضا میں لہراتے دیکھا۔ ایک سیکنڈ بعد کار سے چند میٹر دور ایک اور زبردست دھماکا ہوا۔ گرد وغبار کے ساتھ ہی جاوا کا ایک اور کارندہ ہوا میں اُچھلا اور چاول کے ہرے کھیت میں گرا۔ میں سمجھ گیا کہ جگت سنگھ اور اس کے ساتھی وہی ''کالے انار'' چلا رہے ہیں جن کا ذکر جگت نے فون پر کیا تھا۔ جگت کی رکھیل محبوبہ آشا کو ماری جاچکی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی گوبندر بھی موت کے گھاٹ اُتر گیا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ جگت سنگھ ان اندوہناک خبروں سے آگاہ ہو چکا ہے اور اب سرتاپا قہر ہے۔

ان لوگوں نے ہماری گاڑی کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس گاڑی میں ہماری موجودگی کے بارے میں جانتے ہیں۔ میرے ہاتھ عقب میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اگر ثروت میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ضرور مزاحمت کرتا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ خودکشی کے زمرے میں آرہا تھا کم از کم ابھی تو یہ خودکشی ہی تھی۔ پھر میں نے اس پُرانی فوجی جیپ کو دیکھا جو لہراتی ہوئی ہماری گاڑی کے قریب آئی۔ اس میں اُبھرے رُخساروں اور گھنی مونچھوں والا ایک جواں سال شخص موجود تھا۔ یہی جگت سنگھ کا ساتھی پرتاب سنگھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ لوگ ہمیں یہاں سے چھڑا کر لے جانے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں۔ اب ضروری تھا کہ موقع محل دیکھ

کر ہم بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔

ایک گولی ہائی روف کی پچھلی اسکرین توڑتی ہوئی آئی اور ہمارے ایک نگراں کے کندھے میں لگی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ گالی نکلی اور وہ تکلیف کی شدت سے نیچے جھک گیا۔ ہم دونوں بھی جھک گئے تاکہ دوطرفہ فائرنگ کی زد سے محفوظ رہیں۔ نیچے جھکے جھکے میں نے دستی بم کے ایک اور دھماکے کا منظر دیکھا۔ کار کے اگلے حصے کے پرخچے اُڑ گئے اور وہ پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آگئی۔

تیسری گاڑی یعنی جاوا والی لگژری جیپ ہمارے پیچھے کچھ فاصلے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ آگے کا حال دیکھ کر یہ جیپ دور ہی رُک جائے گی۔ اس میں جاوا، چودھری انور اور شاربہ بائی تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ جیپ سیدھی آگے بڑھتی آئی۔ پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مجھے حیرت کا دوسرا دھچکا لگا۔ جیپ کی کھڑکیاں محفوظ رہیں۔ یہ بلٹ پروف جیپ تھی۔ بکتر بند کی طرح اس کی باڈی کو شاک پروف بھی بنایا گیا تھا۔ اس کا ثبوت ''کالے انار'' کے ایک اور دھماکے سے ہوا۔ یہ دھماکا جیپ کے بالکل نزدیک ہونے کے باوجود اسے آگ لگانے یا کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام ہوا۔

جیپ دندناتی ہوئی ان دو افراد پر چڑھ دوڑی جو کاندھے سے کندھا ملائے فائرنگ کر رہے تھے۔ جیپ انہیں روندتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی چھت کا چوکور خلا یعنی سلائیڈنگ سن روف اوپن ہوا۔ اس میں سے ایک شخص کا بالائی دھڑ نمودار ہوا۔ میں نے گرد وغبار میں دیکھا۔ یہ جاوا کا سب سے خطرناک رائفل بردار نریندر کمار ہی تھا۔ اس نے جگت کے ساتھیوں پر آٹو میٹک رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ نریندر بہترین پوزیشن میں تھا۔ پلک جھپکتے میں جگت کے دو ساتھی شدید زخمی ہو کر گر گئے۔ تیسرا زخمی ہو کر بھاگا لیکن کسی اور طرف سے آنے والی گولیوں نے اسے بھی اوندھے منہ گرا دیا۔

ایک دم ہی پانسا پلٹتا ہوا نظر آیا۔ جاوا کی بلٹ پروف گاڑی کی آڑ لے کر اس کے ساتھیوں نے اندھا دھند فائرنگ کی۔ جگت کے ساتھی بے حد پُرجوش ہونے کے باوجود اس ہلے کو جھیل نہیں سکے۔ میں نے جگت کے ایک اور ساتھی کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ جگت سنگھ نے خود بھی پسپائی اختیار کی۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر بھاگا۔ جاوا کی جیپ نے اس کا پیچھا کیا۔ شاید وہ لوگ اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ غالباً ان کی یہی خواہش جگت سنگھ کی زندگی کا بہانہ بن گئی۔ وہ اکا دُکا فائر کرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اس کی سفید دھوتی ہوا میں پھڑ پھڑاتی نظر آرہی تھی۔ پھر وہ برق رفتاری سے درختوں اور جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ

میں داخل ہوگیا۔ جاوا کی جیپ رُک گئی۔ پیچھا کرنے والے پیادے بھی رُک گئے۔ وہ جھنڈ میں داخل نہیں ہو رہے تھے۔ بس فاصلے سے فائرنگ کر رہے تھے۔ جھنڈ ایک ڈیک نالے کے عین کنارے پر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جگت جھنڈ میں نہیں ہے۔ وہ شام کی نیم تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر نالے میں کود چکا ہے۔ میرے دل کی گواہی بعد میں بالکل درست ثابت ہوئی۔ جگت رواں دواں نالے میں کودا تھا۔ زخمی حالت میں۔

اس زوردار اور خونی جھڑپ نے اردگرد کے کاشت کاروں اور راہ گیروں کو موقع پر جمع کر دیا تھا مگر وہ دور دور کھڑے رہے۔ قریب آنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ یقیناً یہ مقامی لوگ آج کل جاوا گروپ کی گاڑیوں کو اچھی طرح جان پہچان رہے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ گاڑیاں آج کل یہاں کیا گل کھلا رہی ہیں۔

جتنے زوردار دھماکے یہاں ہوئے اور جتنی شدید فائرنگ ہوئی تھی، پولیس کو بھی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن پولیس تو اسی وقت آسکتی تھی جب جاوا کی اجازت ہوتی...... عین ممکن تھا کہ جاوا نے فون پر ہی انہیں ''دخل در معقولات'' سے منع کر دیا ہو۔

ثروت دم بخود بیٹھی تھی۔ آج کل وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ رہی تھی اور وہ بھی ایسے انداز میں جس کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس خون ریز لڑائی میں جاوا گروپ کے دو بندے جان سے چلے گئے تھے۔ دو تین کو زخم آئے تھے۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا زیادہ نقصان ہوا تھا۔ دو افراد کی لاشیں ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر پڑی تھیں۔ تین چار افراد شدید زخمی حالت میں فرار ہوئے۔ جیپ کے نیچے کچلے جانے والے ایک نیم مردہ شخص کو اس کے ساتھی اُٹھا کر درختوں میں غائب ہوئے تھے۔

بالکل آخر میں زخمی ہونے والے شخص کو پکڑ لیا گیا۔ اس کی ٹانگ میں شاٹ گن کے موٹے چھرے لگے تھے۔ یہ چوڑے چہرے والا جگت کا قریبی ساتھی پرتاب تھا۔ ایک اور نوجوان لڑکے کو بھی پکڑا گیا، اس کی عمر بمشکل انیس بیس سال رہی ہوگی۔ اس کی باریک مونچھیں اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے بسنتی رنگ کا چولا پہن رکھا تھا۔ ''جو بولے سونہال'' کا نعرہ لگانے والوں میں وہ پیش پیش تھا۔

اپنے ساتھیوں کی لاش دیکھنے کے بعد جاوا غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر نوجوان لڑکے کے سر پر رکھ دیا اور دو تین منٹ کے اندر اس سے پوچھ لیا کہ حملہ کرنے والے کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا۔ نوجوان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے جگت سنگھ کا نام بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ جگت کے چھوٹے بھائی گوبندر سنگھ اور اس کی

بیوی آشا کی ہتھیا کا بدلہ لینے کے لیے حملہ آور ہوئے تھے۔ نوجوان کا نام دیپک سنگھ تھا۔ جاوا کی قہرناک صورت دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر دیپک کا مورال ڈاؤن سے ڈاؤن ہوتا چلا جا رہا تھا۔ غالباً اس نے اس مشہور ڈان کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب وہ اس کے رُوبرو تھا اور اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ جاوا کے حکم پر زخمی پرتاب کو ہمارے والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا جبکہ نوجوان دیپک کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف رسّی سے باندھ دیئے گئے۔ سرخ نائلون کی یہ رسّی پندرہ بیس فٹ لمبی تھی۔ اس کا دوسرا سرا جاوا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ زہرخند انداز میں بولا۔ ''میرے چندا! گاڑیوں کے اندر جگہ کم ہے۔ تمہیں ذرا کٹھنائی (دشواری) تو ہوگی لیکن تمہیں ہمارے ساتھ بھاگ کر جانا پڑے گا۔''

اس نے رسّی کا دوسرا سرا اپنی جیپ کے عقب میں موجود آہنی حلقے میں بندھوا دیا۔

نوجوان نے منت کے انداز میں کہا۔ ''میرا دوش نہیں ہے۔ میں جگت سنگھ کے دوست کا دوست ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کھل کر کچھ نہیں بتایا جی۔ بس اتنا کہا کہ ایک پُن کا کام ہے۔''

''تو ہم کون سا پاپ کا کام کر رہے ہیں بچے! یہ بھی پن کا کام ہی ہے۔ فرید کوٹ پہنچ کر تمہاری خاطر داری کریں گے۔ بڑا موج میلا ہونا ہے وہاں۔ پر شرط یہی ہے کہ تم فرید کوٹ پہنچ جاؤ۔'' جاوا کا لہجہ سفاک تھا۔

اسی دوران میں پریم چوپڑا جو موبائل فون سن رہا تھا، جاوا کے قریب آ کر بولا۔ ''بھیا جی! انسپکٹر چاؤلہ کا فون آیا ہے۔ پولیس موقع پر آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ دو تین لڑکے بھی ساتھ ہی رکھو۔ ہم جا رہے ہیں۔''

نوجوان نے ایک بار پھر منت سماجت کی مگر جاوا اپنے کان بند کر چکا تھا۔ وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ چودھری انور اور شار بہ بائی بھی بیٹھ گئے۔ جیپ روانہ ہوگئی۔ نوجوان دیپک جیپ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہماری ہائی روف، جیپ کے عقب میں تھی۔ جاوا کے خونخوار کارندوں نے زخمی پرتاب کے ہاتھ عقب میں باندھ دیئے تھے اور اسے ہائی روف کی پچھلی سیٹوں کے درمیانی خلا میں کسی بھیڑ بکری کی طرح ٹھونس دیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے اسے گالیاں دے رہے تھے اور اس کی پیٹھ پر تھپڑ بھی رسید کر رہے تھے۔ وہ پوری طرح اس پر حاوی ہو چکے تھے۔

دونوں گاڑیاں گہری تاریکی میں اونچے نیچے راستوں پر چلتی رہیں۔ رفتار زیادہ نہیں تھی۔ دیپک اب ہانپنا شروع ہوگیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شاید اسے اچھی طرح تھکانے کے

بعداس کی سزا موقوف کردی جائے گی اوراسے ہمارے والی گاڑی میں بٹھالیا جائے گا لیکن اگلے آدھ گھنٹے کے اندر جاوا کی سفاکی بالکل کھل کر سامنے آگئی۔ جیپ نہیں روکی گئی۔ دیپک اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔اس کے بھاگنے کا انداز صاف بتارہا تھا کہ وہ بُری طرح ہانپ چکا ہے اوراس کی ٹانگیں شل ہوتی جارہی ہیں۔ وہ بھاگتے بھاگتے کچھ بول بھی رہا تھا۔شاید خودکو باندھنے والوں سے رحم کی درخواست کررہا تھا۔ یااس قسم کی کوئی اور بات کررہا تھا۔مگر اس کی آواز جیپ سواروں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے کھڑکیاں چڑھا رکھی تھیں۔ مظلوموں کی آہ وبکا کے لیے یہ کھڑکیاں ہمیشہ سے چڑھی رہتی ہیں۔ زندگی کے لیے بھاگنے والے، ہانپتے ہوئے اور زخموں سے چُور لوگ پکارتے رہتے ہیں، چلّا چلّا کر بتاتے رہتے ہیں کہ وہ موت کی دہلیز پر ہیں، وہ مرجائیں گے مگر یہ کھڑکیاں نہیں کھلتیں۔ اندر بیٹھے ہوئے فرعون اپنے ماحول میں مست رہتے ہیں۔اندراور باہر کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق اس دنیا کو بدصورت بنارہا ہے۔ اُجاڑرہا ہے۔

دیپک بھی بھاگتا رہا،لڑکھڑاتا رہا۔شاید اب وہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ایک ہلکی سی...... معمولی سی ٹھوکر بھی اسے گراسکتی تھی۔ نائیلون کی سرخ رسی کو لگنے والا ایک ذراسا جھٹکا بھی اسے زمین بوس کرسکتا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔اس کے ہاتھوں کی رسی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ گرگیا۔ طاقتور جیپ نے اسے کھینچنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔وہ اسے کھینچتی گئی، گھسیٹتی گئی۔ ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں دیپک کا المناک انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دھول اورخون میں لتھڑتا چلا جارہا تھا۔ وہ کس وقت مرا؟ اس کا اندازہ نہیں ہوا لیکن یقیناً اس کی موت المناک تھی۔ کچھ دیر بعد جیپ کی ایک عقبی کھڑکی کھلی، کسی نے ہاتھ باہر نکالا۔ ہاتھ میں کوئی تیز دھار چیز تھی۔ چلتی گاڑی میں سے ہی نائیلون کی رسی کاٹ کردیپک کو ''آزاد'' کردیا گیا۔

ان لوگوں کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ انہوں نے ایک جیتے جاگتے شخص کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا اوراس کی لاش کو سرِراہ پھینک کرجارہے تھے۔انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

○......❖......○

فرید کوٹ انڈین پنجاب کا ایک درمیانے سائز کا قصبہ ہے۔اس کی آبادی لگ بھگ چھ لاکھ ہوگی۔ اس کا نام بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مجھے جگت سنگھ سے معلوم ہوا تھا کہ سکھوں کی مذہبی کتابوں میں بابا فرید کے صوفیانہ اشعار موجود ہیں۔ فرید

کوٹ کی سڑکیں زیادہ کشادہ نہیں تھیں۔ ہمیں سفر کے دوران میں بلند وبالا عمارتیں بھی دکھائی نہیں دیں۔ ہمیں شہر کے مضافات میں ایک ایسی کوٹھی میں لایا گیا جس کی چاردیواری دس فٹ سے زیادہ اونچی تھی اوراس کے اوپر خاردارتار کے چھلے تھے۔کوٹھی کا رقبہ دوکنال کے لگ بھگ تھا۔ دوسری منزل کی چھت پرایک بہت بڑی سرچ لائٹ دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگا جیسے ہم کسی رہائشی عمارت کے بجائے کسی سفارت خانے کی بلڈنگ میں گھس رہے ہیں۔ دو باوردی مسلح افراد نے آہنی گیٹ کھولا اور ہم ڈرائیو وے سے گزر کر وسیع پورچ میں رُک گئے۔ یہ عمارت باہر سے تو عام ہی لگ رہی تھی لیکن اندر سے اسے جدید انداز میں سجایا گیا تھا اور خوب سجایا گیا تھا۔کئی کمروں کی دیواریں اورفرش بھی شیشے کے تھے۔ایک راہداری کے بلوری فرش کے نیچے ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ اس میں نارنجی اور زرد رنگ کی مچھلیاں شفاف پانی میں تیرتی نظرآرہی تھیں۔

ایک نہایت فربہ اندام شخص نے جاوا کا استقبال کیا۔اس شخص نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک اور کانوں میں طلائی بالیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس درمیانی عمر کے شخص کی کمر کا گھیرا کسی صورت بھی سات آٹھ فٹ سے کم نہیں تھا۔اسے دیکھ کر مجھے سفید گوشت کا پہاڑ ریان ولیم یاد آگیا۔ تاہم ریان ولیم اتنا ہی موٹا ہونے کے باوجود قدرے چست اور تندرست نظرآتا تھا۔اس شخص کے ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں۔ چوبیس پچیس سال کی ایک دبلی پتلی اسمارٹ لڑکی اس دیو کے پہلو میں تھی۔ جیسے کے بعد میں معلوم ہوا یہ اس کی دھرم پتنی امریتا سنگھ تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ دولت سے بہت کچھ خریدا جاسکتا ہے۔

فربہ اندام شخص نے ہاتھ جوڑ کر جاوا کو نمستے کیا پھر ہاتھ ملایا۔ وہ بڑے غور سے مجھے اور ثروت کو گھوررہا تھا۔''تو یہ ہیں ہمارے مہمان۔''اس نے قدرے باریک آواز میں کہا۔

''ہاں لیکن اتنا مت گھورو۔ یہ تین چار ہفتے یہاں رہیں گے۔شانتی سے دیکھتے رہنا۔'' جاوانے کہا۔

ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوکور کمرا اسی طرح لوگوں کو بند کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔اس کا اسٹیل کا دروازہ بڑا مضبوط تھا اور سلائیڈ کر کے کھلتا تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں فقط ایک راستہ اورتھا۔ یہ ایک فٹ ضرب دوڈھائی فٹ کی ایک مختصر سی کھڑکی تھی۔ یہ بھی سلائیڈنگ تھی۔ اس میں سے ''بندافراد'' کو کھانا وغیرہ پہنچایا جاتا تھا۔ کمرے میں ایک ہی بڑا بیڈ موجود تھا۔فرش پر قالین اور ایک الماری بھی تھی۔ اٹیچ باتھ

روم کا دروازہ الماری کے بالکل ساتھ تھا۔ دروازے کے اوپر ایک مائیک کی جالی نظر آتی تھی۔

ہمیں کمرے میں پہنچا کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مختصر کھڑکی کھلی۔ نریندر نے چابی اندر پھینکی اور ثروت سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔ ”اس کی کڑی کھول دو۔“

ثروت نے تھوڑی سی کوشش کے بعد میری ہتھکڑی کھول دی۔ مختصر کھڑکی نما خلا بلند ہو گیا۔

ثروت نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ یہاں مائیکروفون بلکہ کیمرا وغیرہ بھی موجود ہو۔ میں نے بڑی احتیاط سے کمرے کا جائزہ لیا۔ تاہم مائیک کی جالی کے علاوہ کوئی شے نظر نہیں آئی۔ فقط دو انچ قطر کا ایک سوراخ دکھائی دیا جس میں شیشہ لگا تھا۔ غالباً اس شیشے کا مقصد وقتاً فوقتاً کمرے میں جھانکتے رہنا تھا۔

اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ راستے میں دیکھے جانے والے خونی مناظر کی وجہ سے ثروت بالکل گم صم نظر آتی تھی۔ ابھی اس نے نوجوان دیپک کے جیپ کے پیچھے گھسٹنے اور مرنے کا منظر نہیں دیکھا تھا ورنہ اس کے اعصاب پر مزید بُرا اثر پڑتا۔ اچانک موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ وہی تین فگرز والا نمبر تھا۔

عمران کی توانا آواز اُبھری۔ ”ہیلو جگر! کیا رومانی سین چل رہا ہے؟“

”بکواس بند کرو۔ راستے میں بڑی مارا ماری ہوئی ہے۔ ابھی تک آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ثروت کے ساتھ مارا ماری ہوئی ہے لیکن وہ تو ایسی نہیں لگتی۔ تم نے ضرور کوئی بے ہودگی کی ہوگی۔“

”عمران! میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔ تمہیں بالکل بے وقت کی شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔ راستے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی ہے۔ دستی بم پھینکے گئے ہیں۔ آٹو میٹک رائفلوں سے دس پندرہ منٹ فائرنگ ہوئی ہے۔ کم از کم پانچ بندے جان سے گئے ہیں۔“

وہ بے پروائی سے بولا۔ ”یار! پتا ہے مجھے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جہاں یہ جاوا صاحب تشریف فرما ہوتے ہیں، وہاں اس طرح کے کرنتو شالے یعنی لفڑے ہوتے رہوت ہیں۔ آگے آگے دیکھنا ہووت ہے کیا؟“

”یار! میں جگت کی طرف سے پریشان ہوں۔ یہ لوگ اس کو مار ڈالیں گے۔ تم کچھ کر سکتے ہو؟“

”فی الحال تو دعا ہی کر سکت ہوں بھیا! میرا سارا گیان دھیان تمہاری اور ثروت کی طرف ہے۔ پہلے تمہیں اس جالو بھر شاٹ سے نکال لوں۔ جالو بھر شاٹ سمجھت ہو نا تم؟ پرانی ہندی کا شبد (لفظ) ہے۔“

اس پر پھر خود ساختہ ہندی کا بھوت سوار تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! میری ایک بات دھیان سے سنو۔ تم نے کہا تھا کہ ہم اس کا کوئی حل نکالیں گے۔ میرا مطلب ہے اس ریوالور والے منحوس کھیل کا۔ لیکن اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم یہ کھیل کھیلنے کے لیے تیار ہو۔ یہ دیوانے پن کے سوا کچھ نہیں عمران۔ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔“

”اور میں تمہیں اس بارے میں کوئی بحث نہیں کرنے دوں گا۔ میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس بارے میں تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گے۔ ورنہ میں تمہیں فون نہیں کروں گا اور میں تمہاری ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔“

عمران کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور حتمی تھا۔ شاید اس کے پیچھے کوئی راز تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے کہا۔ ”عمران! ثروت کئی دن سے نصرت کے لیے بہت پریشان ہے۔ کیا کسی طرح نصرت سے اس کی بات نہیں ہو سکتی؟“

”ہاں...... اس طرح کی فرمائش کرو جو میں پوری بھی کر سکوں۔ اپنا شیخ لاہور میں ہی ہے۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گا۔“

”کیا تم یہاں نہیں آؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں لیکن گھبراؤ مت، تمہارے آس پاس ہی رہوں گا اور وقتاً فوقتاً تم سے فون پر رابطہ بھی رکھوں گا۔“

”ہمیں کتنے دن یہاں اور رہنا پڑے گا؟“

”ایک نمبر کے چغد ہو تم۔“ وہ آواز دبا کر بولا۔ ”دیکھو قدرت نے کتنا نرالا موقع فراہم کیا ہے تمہارے لیے۔ ثروت اور تم ایک جگہ ہو بلکہ ایک ہی کمرے میں۔ یہ پچویشن شریف ترین ہیرو شاہ رخ کو بھی جوہی چاولہ یا کاجل وغیرہ کے ساتھ ملی ہوتی تو انڈیا کی فلمی تاریخ کیا سے کیا ہو گئی ہوتی۔ تم پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔“

موبائل کے اسپیکر سے ہلکی سی آواز نکل کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ آواز ثروت کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے کہا۔ ”اول نمبر کے خبیث ہو تم۔“ اور فون بند کر دیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ نصرت سے رابطہ کرانے والا وعدہ عمران دو تین دن سے پہلے

پورا کر سکے گا۔ وہ خود بھی انڈیا میں تھا مگر اس کے ہاتھ واقعی لمبے تھے۔ اپنے ذرائع سے وہ بہت جلد اپنے مقررہ ہدف تک پہنچ جاتا تھا۔ شاید سلطان، چٹا وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ عمران کا قریبی دوست ہونے کے باوجود میں کئی پہلوؤں سے اسے نہیں جانتا تھا۔ اس کی زندگی کے کئی تاریک گوشے بھی موجود تھے۔

اگلے ہی روز دوپہر سے پہلے ایک کال موصول ہوئی۔ یہ پاکستان کا نمبر تھا۔ پہلے جیلانی (شیخ) کی آواز اُبھری۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور رسمی کلمات ادا کیے پھر بولا۔

''لو تابش صاحب! نصرت بہن سے بات کرو۔''

''ہیلو تابش بھائی!'' نصرت بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہیلو نصرت! تم ٹھیک ہو نا؟''

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں آپ لوگ؟ اور باجی کہاں ہیں؟ میں دن رات ان کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میرے ساتھ۔''

''ہم بالکل خیریت سے ہیں نصرت اور ثروت بھی بالکل خیریت سے ہے۔ بس ایک معاملے میں پھنس گئے تھے ہم۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ بہت جلد تم ہمیں اپنے پاس دیکھو گی۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف ہم سے پہلے ہی تم تک پہنچ جائے۔''

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''وہ پہنچ چکا ہے تابش بھائی! وہ پرسوں شام ہی آ گیا تھا۔'' نصرت کے لہجے میں یوسف کے لیے بیگانگی اور تلخی تھی۔

''وہ خیریت سے ہے نا؟''

''وہ تو خیریت سے ہے لیکن...... وہ دوسروں کی خیریت کو برباد کر رہا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''بس کچھ نہیں۔ آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔''

''نہیں نصرت! مجھے بتاؤ۔ میں نے اسی لیے تو تم سے فون کرایا ہے۔ ہم تمہارے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں؟''

ذرا توقف کے بعد نصرت بولی۔ ''تابش بھائی! یہاں وہی کچھ ہو رہا ہے جو میں بار بار باجی سے کہہ چکی ہوں۔ آپ باجی کو نہ بتایئے گا لیکن یہاں یوسف نے وہی کیا ہے جس کی اس سے توقع تھی۔''

''کھل کر بتاؤ نصرت۔''

وہ سسکنے لگی۔ ''تابش بھائی! چند روز سے گھر کے نمبر پر پھر اسی خبیث جرمن، گریس کے فون آ رہے ہیں۔ کل رات پھر فون آیا ہوا تھا۔ یوسف اس سے بڑی دیر باتیں کرتا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں میں پھر صلح ہو رہی ہے۔ میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان دونوں کی کچھ باتیں سنی ہیں۔ یوسف کو شک ہوا۔ اس نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھ لیا۔ سخت بُرا بھلا کہا۔ اسی وقت گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میں قدرت اللہ صاحب کے آستانے پر آ گئی ہوں۔ اس وقت وہیں سے بول رہی ہوں۔ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا گھر۔''

میں حیران رہ گیا۔ یوسف کے حوالے سے ایسی خبر کی توقع مجھے نہیں تھی۔ جرمن بیوی کے پھر سے رابطے والی بات بھی غیر متوقع ہی تھی لیکن نصرت جو بتا رہی تھی، وہ یقیناً سچ تھا۔

نصرت سسکتے ہوئے بولی۔ ''تابش بھائی! آپ لوگ جلدی آ جائیں۔ آپ جسے ڈھونڈنے نکلے تھے، وہ تو یہاں دندنا رہا ہے اور آپ ابھی تک نہ جانے کہاں ہیں۔ یہ ٹھیک بندہ نہیں ہے تابش بھائی! اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے کل رات بڑی بدتمیزی کی ہے۔ باجی کے لیے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ وہ سن لیں تو رو رو کر بُرا حال کر لیں۔ اسے باجی پر بالکل بھروسہ نہیں۔ وہ آپ کے لیے بھی بہت غلط سوچ رکھتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اگر اب بھی باجی کی آنکھیں نہیں کھلیں گی تو کب کھلیں گی۔ آپ انہیں سمجھائیں تابش بھائی! اب تو ہوش میں آ جائیں۔''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا نصرت۔''

''آپ باجی کو فون دیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''لیکن تم کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرو گی۔''

میں نے فون ثروت کو تھما دیا۔ ان کی گفتگو شروع ہوئی تو طویل ہوتی چلی گئی۔ نصرت نے گو مجھ سے کہا تھا کہ وہ ثروت کو مزید پریشان نہیں کرے گی لیکن جب دونوں بہنوں نے دُکھ سکھ شروع کیا تو وہ کچھ بھی چھپا نہیں سکی۔ میں نے ثروت کی آنکھوں سے آنسو رِستے دیکھے اور اس کے چہرے کو رنج والم کے رنگ اوڑھتے دیکھا۔ یہ اطلاع ثروت کے لیے یقیناً تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی کہ یوسف اسے نہ صرف یہاں چھوڑ کر پاکستان واپس جا چکا ہے بلکہ نصرت سے سخت جھگڑا بھی کر چکا ہے۔

کچھ دیر بعد نامعلوم وجہ سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ثروت کچھ دیر ہیلو ہیلو کرتی رہی پھر فون مجھے تھما کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس نے بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

○......❖......○

ہم اسی کمرے میں بند تھے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ فرید کوٹ کی اس رہائشی عمارت کے اندر اور عمارت سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس چھوٹے سے خلا کے ذریعے تھے۔ اسی میں سے کھانے کی ٹرے اندر آتی تھی اور دیگر ضروریات بشمول لباس وغیرہ ہمیں مہیا ہوتی تھیں۔ جاوا سمیت کسی نے بھی ہم سے رابطہ نہیں کیا۔ پچھلے قریباً اڑتالیس گھنٹے پہلے عمران کا فون آیا تھا اور نہ نصرت کی طرف سے کال ہوئی تھی۔ میں جگت کے لیے پریشان تھا مگر اس کی طرف سے کوئی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس نے ایک سچے خالصے کی طرح بڑی بے جگری سے جاوا کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔ اس کی دلیری اور ہمت پر کوئی شک نہیں تھا لیکن جاوا جیسے بدنام زمانہ بدمعاش کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چل سکی تھی۔

یہ دوسری تیسری رات کا واقعہ ہے۔ ثروت نے میرے سینے کے زخم کی مرہم پٹی کی اور اصرار کر کے اینٹی بائیوٹک دوا بھی کھلائی۔ پھر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے اسے بہت کہا تھا کہ وہ بستر پر سو جایا کرے لیکن گاؤں کی طرح وہ یہاں بھی نہیں مانی تھی۔ وہ قالین پر ہی سوتی تھی۔ ہاں ہم دونوں کے درمیان چھ سات فٹ کا فاصلہ رہتا تھا۔ چھ سات فٹ کا فاصلہ جو درحقیقت چھ سات صدیوں کا فاصلہ بن چکا تھا۔ دل کے تار نہ مل رہے ہوں تو جسموں کا قرب کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی، سناٹا، مکمل تنہائی، درغنودگی مل جل کر انسان پر جادو سا کر دیتے ہیں۔ وہ کہیں سپنوں اور بیداری کے درمیان بھٹک رہا ہوتا ہے اور اس کی ساری کیمسٹری بدل جاتی ہے۔ اس رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ میرا چہرہ ایک خوشبو میں دھنسا ہوا ہے۔ اپنی ناک کے قریب مجھے ریشمی سرسراہٹ محسوس ہوئی، یہ ثروت کی چوٹی تھی۔ میں نہ جانے کب کروٹ بدلتا ہوا ثروت کے قریب چلا آیا تھا۔ کچھ شرارت اس کی چوٹی نے کی تھی اور میری طرف بڑھ آئی تھی۔ اب اس کے ریشمی بال عین میری ناک اور ہونٹوں سے چھو رہے تھے۔ ایک بے نام سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان بالوں کے لمس اور ان کی مہک نے بہت سی حسین یادوں کے در کھول دیئے۔ کئی دل گداز ملاقاتوں کا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے کھلتا چلا گیا۔

میں نے دیکھا، زیادہ قصور میرا ہی تھا۔ میں نیند کی حالت میں اپنے تکیے سے کافی دور چلا آیا تھا۔ میں نے پلٹنا چاہا لیکن جیسے کسی جادوئی گرفت نے مجھے جکڑ لیا۔ ہاں یہ تاریکی اور تنہائی کا جادو تھا۔ میں ثروت کے کچھ اور قریب چلا گیا۔ عجیب والہانہ پن سے اس کے چہرے کے نشیب و فراز کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگا۔ اس کی پیشانی، ناک اور رُخسار جو کبھی میرے بہت قریب تھے، میرے اپنے تھے۔ اپنی گردن آگے بڑھا کر جب میں نے اس کے

رُخسار کو چوما تو وہ ایک دم بیدار ہو گئی۔

''تابش!'' گہری تاریکی میں اس کی ٹھٹکی ہوئی آواز اُبھری۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی انگلیوں کے ساتھ تیزی سے میرے چہرے کو چھوا۔ جیسے اپنی انگلیوں سے مجھے دیکھنا چاہ رہی ہو پھر وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں بس اس کا مدھم ہیولا ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے میری طرف سے رُخ ذرا سا پھیرا ہوا تھا۔ وہ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔

ایک عجب سی دلیری میرے سینے میں آتشیں لہر کی طرح دوڑ گئی۔ میں نے عقب سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی صراحی دار گردن کا عقبی حصہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اس کی گردن کے ریشم پر اپنے جلتے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے کو اس کے کان کی لو کو اس کی گردن کو بوسے دینے لگا۔

اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ ''پلیز تابش! پلیز تابش!'' وہ کراہ رہی تھی۔

پھر وہ جلدی سے اُٹھی اور میرے ہاتھ پیچھے ہٹاتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی۔ ''آپ ایسا نہ کریں تابش!'' وہ کراہی۔ ''آپ مجھے کمزور کر رہے ہیں۔ مجھے توڑ رہے ہیں۔ پلیز ایسا نہ کریں۔''

''س...... سوری ثروت! میں بھی تو اتنا مضبوط نہیں ہوں اور تمہارے حوالے سے تو بالکل نہیں۔ میں...... معافی مانگتا ہوں ثروت۔'' میں نے تہ دل سے کہا۔ میں واقعی بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ جیسے میری کیفیت کو سمجھ رہی ہو اور کسی حد تک میرے ساتھ ہمدردی بھی محسوس کر رہی۔ کتنی ہی دیر تک ہمارے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی۔

آخر میں نے کہا۔ ''ثروت! اگر تم چاہو تو میں جاوا سے بات کرتا ہوں۔''

''کس بارے میں؟''

''ثروت! جاوا تمہاری سلامتی اور حفاظت کی ضمانت دے چکا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ اپنی زبان سے پھرے گا نہیں۔ اگر...... تم چاہو...... تو میں اپنے لیے کسی دوسرے کمرے کا انتظام کرا لیتا ہوں۔''

''نہیں تابش! میں ایسا نہیں چاہتی لیکن......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن کیا؟''

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

''ہاں......کہو ثروت! میں سن رہا ہوں۔''

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر عجیب لہجے میں بولی۔ ''تابش! میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ میں کبھی آپ کے بارے میں نہیں سوچوں گی۔ کبھی آپ کے......قریب نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں ثروت! کیوں؟''

''بس تابش! میرے دل میں کچھ خوف جم گئے ہیں۔ میں جتنی بھی کوشش کرلوں لیکن اپنے خیالات کو اپنے ذہن سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنا عہد توڑا تو نصرت کی زندگی اذیت اور دُکھ کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ اس نے سو سال بھی عمر پائی تو اپنی بیماری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے گی۔ یہ بیماری اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے اس سلسلے میں سمجھانے کی کوشش کریں۔ اسے میرا واہمہ اور کمزور عقیدہ قرار دیں لیکن میں کیا کروں تابش! آپ کی قربت کو اور اس وہم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ خدا کے لیے تابش! مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈالیں۔ میں اس آزمائش پر پوری نہ اُتر سکی۔ کمزور پڑ گئی تو ساری زندگی خود کو معاف نہ کرسکوں گی۔''

میں اس کا ہیولا دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنی پیشانی ان ہاتھوں پر رکھ کر سسکتی چلی گئی۔

کتنی ہی دیر تک ایک گمبھیر سناٹا بیڈروم پر طاری رہا۔ اس سناٹے میں بس وال کلاک کی ٹک ٹک تھی یا میرے زخمی دل کی مایوس دھڑکن۔ آخر میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''ثروت! میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ کبھی تمہیں کسی کام پر مجبور نہیں کروں گا۔ آج کے بعد میری طرف سے ہر طرح کا اطمینان رکھو۔ میں کوئی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

میں نے اپنا تکیہ اُٹھایا اور کچھ مزید پیچھے ہٹا کر دیوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ چادر بھی دور کھینچ لی اور لیٹ گیا۔ ثروت نے اپنا تکیہ اُٹھا کر بستر پر رکھ لیا اور لیٹ گئی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ کمرا اگر مکمل نہیں تو کافی حد تک ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے ہلکی سی نمی محسوس کی۔ محبت میں انسان کیوں اتنا بے بس ہو جاتا ہے؟ وہ اپنے سامنے بند گلی دیکھتا ہے پھر بھی رُکتا نہیں، مڑتا نہیں، آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن بند گلیوں سے راستے کہاں پھوٹتے ہیں۔

اب ثروت بستر پر تھی اور میں نیچے تھا۔ مجھے لگا کہ آج اس نے وہ ''احترام'' واپس لے لیا ہے جو وہ مجھے دے رہی تھی۔ آج اس نے بستر پر سونا مناسب سمجھا ہے۔ اس صورتِ حال کا ذمے دار خود میں ہی تھا۔

میں لیٹا رہا۔ خود کو ملامت کرتا رہا۔ زخمی دل کچھ اور زخمی ہوتا رہا۔ سینے کے زخم کچھ اور لَو دیتے رہے۔ توہین کا احساس رگوں کو کاٹتا رہا۔ میں نے خود سے کہا۔ تم نے بند گلی کو دیکھ لیا ہے۔ پھر کیوں رُک نہیں جاتے؟ کیوں پتھروں سے ٹکرا کر خود کو لہولہان کرنا چاہتے ہو؟ ان لوگوں میں خود کو شامل کرنا چاہتے ہو جو عشق کے دُکھ جھیلتے جھیلتے بے نیل و مرام دنیا سے چلے گئے۔ یہ گلی کسی کو رستہ نہیں دیتی۔ تمہیں کیسے دے گی؟ رُک سکتے ہو تو رُک جاؤ۔ پلٹ سکتے ہو تو پلٹ جاؤ۔ دل نے کہا، رُکنا ہوتا تو بہت پہلے رُک جاتا، پلٹنا ہوتا تو بہت پہلے پلٹ جاتا۔ میں عشق ہوں۔ میں دلیل کو نہیں مانتا۔ میں کچے گھڑے پر تیرتا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ کر زہر پیتا ہوں۔ میں نے مرتے دم تک آس کا دامن چھوڑنا نہیں سیکھا۔ اپنے یقین کے بل بوتے پر میں نے پتھر موم کیے ہیں، گہرے پانیوں میں دیے جلا کر دکھائے ہیں۔ موت ملے یا زندگی، میں ہر حال میں سرخرو ہوتا ہوں۔

میں لیٹا رہا، سوچتا رہا۔ سینے میں درد کی ایک لہر سی چلتی رہی۔ چار پانچ منٹ بعد میں نے گہری تاریکی میں محسوس کیا کہ کوئی میرے پاؤں کی طرف موجود ہے۔ یہ ثروت کا ہیولا تھا۔ اچانک اس نے میرے پاؤں پکڑے اور اپنی پیشانی ان پر رکھ دی۔

''ثروت! کیا کرتی ہو؟'' میں نے پاؤں چھڑانا چاہے اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے پاؤں نہیں چھوڑے۔ ان پر اپنا چہرہ جھکائے رکھا۔

اس کے گرم بھیگے چہرے کا سارا گداز میرے پاؤں میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں میرے تلوؤں سے چھو رہی تھیں۔

میں نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا۔ وہ نہیں ہٹی۔ میرے پاؤں سے چمٹی رہی، سسکتی رہی۔ مجھے پاؤں کی انگلیوں پر گرم سیال کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ ثروت کے آنسو تھے۔ میں تڑپ اُٹھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کا کندھا تھام کر نرمی سے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ بہت مشکل سے اس نے اپنی گرفت ختم کی اور پھر تیزی سے اُٹھ کر بیڈ پر چلی گئی۔

اگلے روز دوپہر کے بعد جب ثروت واش روم میں باتھ لے رہی تھی۔ اسپیکر پر جاوا کی بھاری بھرکم منحوس آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! بچہ، بچی! کیا کر رہے ہو تم دونوں؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کچھ خاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج شام تم ایک زبردست پارٹی میں شریک ہو رہے ہو۔ خوب موج میلا ہوگا۔''

''کس قسم کی پارٹی ہے؟''

''بچے! جس قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ شراب، کباب، ڈانس، گانا بجانا۔ ڈانس آتا ہے تمہیں؟''

''نہیں۔''

''چلو دیکھنا تو آتا ہوگا نا۔ بڑی اچھی فلمی ڈانسر ہے۔ ممبئی سے خاص ہم لوگوں کی تفریح کے لیے یہاں پدھاری ہے۔ مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔ تم دونوں میاں بیوی کو دعوت ہے اور شرکت لازمی ہے۔'' وہ ثروت کو بڑے یقین کے ساتھ میری بیوی قرار دے رہا تھا۔ شکر تھا کہ وہ کمرے میں نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''جاوا صاحب! ہم نہیں آسکیں گے۔''

''نہیں...... یہ تو نہیں ہو سکتا۔ اگر دونوں نہیں تو ایک کو تو ضرور آنا ہوگا۔''

میں نے کوشش کی کہ اس پارٹی سے پیچھا چھڑا سکوں لیکن جاوا بضد تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ اپنی رعایت واپس نہ لے لے۔ یعنی دونوں کی شرکت ضروری قرار نہ دے دے۔ ہماری حیثیت اس کے قیدیوں کی تھی۔ وہ کوئی بھی حکم لاگو کر سکتا تھا۔

شام کے وقت میں ثروت کو بمشکل سمجھانے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ میں اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔ وہ ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتی تھی کہ میں کتنے بجے واپس آؤں گا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا، اسے کیا بتاتا۔

میں جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔ ''پلیز تابش! اپنا خیال رکھیے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ حسبِ دستور پہلے ایک ضرب ڈھائی فٹ کی مختصر کھڑکی کھلی۔ اس میں سے پریم چوپڑا نے جھانکا اور ثروت سے مخاطب ہو کر تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''کڑی لگا ؤ اسے۔ اُلٹی کڑی۔''

اسٹیل کے ہینڈ کف الماری کے اوپر رکھے تھے۔ میں نے ثروت کو اشارہ کیا۔ اس نے ہینڈ کف اُتارے۔ میں نے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑے۔ ثروت نے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑ دیئے۔ چابی ثروت کے پاس ہی رہی۔ دروازہ کھول کر مجھے باہر نکال لیا گیا۔ ثروت کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید ''پارٹی'' کے

حوالے سے جھوٹ بولا جا رہا ہے اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے مجھے باہر نکالا گیا ہے۔

ثروت کا اندیشہ غلط ثابت ہوا اور میرا یقین درست نکلا۔ ایک طویل راہداری سے گزار کر مجھے ایک خم دار راہداری میں لایا گیا۔ یہ وہی خوبصورت راہداری تھی جس کے شیشے کے فرش کے نیچے پانی تھا اور رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ راہداری کا اختتام ایک محرابی دروازے پر ہوا۔ دروازے کی دوسری جانب سے بہت سے مرد و زن کی طربیہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہلکے پھلکے قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ میں ایک کیبن نما جگہ پر پہنچا۔ یہاں دو نیم عریاں لڑکیاں میرے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھیں اور ہر ''مہربانی'' پر مائل نظر آتی تھیں۔ [illegible] میرے سامنے گول دائرے کی شکل کا ایک [illegible] کا سارا شیشے کا بنا ہوا تھا۔ یہاں موجود بیشتر فرنیچر بھی شیشے ہی کا تھا۔ مضبوط اور چمک دار شیشہ۔ فرش راہداری جیسا تھا۔ نیچے پانی تھا اور رنگین مچھلیاں، چھوٹے کچھوے اور اس طرح کی دیگر آبی مخلوقات۔ پورے ہال میں خوشبوؤں، رنگوں اور روشنیوں کی بہار تھی۔ بہت بڑے ڈانسنگ فلور پر کوئی دو تین درجن مرد و زن رقص کے لیے تیار تھے۔ پھر آرکسٹرا دھن بکھیرنے لگا اور رقاص جوڑے متحرک ہو گئے۔

ایک لڑکی نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''کوئی خدمت جناب؟''

''میرے ہاتھ کھول دو۔''

وہ دلنشیں انداز میں مسکرائی۔ ''کوئی ایسی خدمت جو آپ کی یہ خادمائیں انجام دے سکیں۔ کوئی ڈرنک، کھانا، سگریٹ یا جو بھی آپ چاہیں۔''

میں نے دیکھا۔ ایک طرف میز پر شراب خانہ خراب سمیت بہت سے ڈرنکس رکھے تھے۔ مہنگے ترین امپورٹڈ سگریٹ اور سگار وغیرہ بھی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''نہیں ابھی ضرورت نہیں۔''

وہ دونوں میرے دائیں بائیں اسٹائل سے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ وہ پہلے تو جھجکتی رہیں پھر مسکراتی ہوئی ایک ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ موسیقی کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں موجود مہمان کھانے سے پہلے ہلکے پھلکے ڈرنکس لے رہے تھے اور سموکنگ کر رہے تھے۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور حیران ہوا۔ مہمانوں میں انڈین فلم سکرین کے دو چار جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے۔ ایک معروف ہیرو کی دید نے تو مجھے واقعی حیران کیا۔ اس کے گرد چلبلی لڑکیوں کا گھیرا تھا اور آٹوگراف وغیرہ لیے جا رہے تھے۔ صورتِ حال سے

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ نقلی نہیں۔ واقعی اصلی ہیرو ہے۔ جاوا کے قریب چودھری انور کی جھلک بھی دکھائی دی۔

میں نے سوچا کتنا اچھا ہو کہ یہاں کہیں عمران بھی موجود ہو۔ میں اس کی صورت دیکھنے کو ترسا ہوا تھا۔ میں اردگرد نگاہ دوڑانے لگا لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔

اسی دوران میں موسیقی تھم گئی۔ رقص ختم ہو گیا۔ جوڑے میزوں پر واپس آ گئے۔ ایک طرف بنے ہوئے بلوری اسٹیج پر ورائٹی شو پیش کیا جانے لگا۔ انڈیا کے چند ٹی وی اسٹارز اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں کے ذریعے حاضرین کو ہنسانے کی کوشش کرتے رہے اور کہیں کہیں واقعی کامیاب بھی ہوتے رہے۔

اسی دوران میں کھانے کا دور شروع ہو گیا۔ میرے سامنے بھی شیشے کی دیدہ زیب تپائی پر شاندار کھانا چن دیا گیا۔ بائیں جانب بیٹھی حسینہ نے پوچھا۔ ''کیا کھائیے گا اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں پتا ہے آپ مسلمان ہیں۔ یہ سارا حلال کھانا ہے۔''

''کھانے کے علاوہ تو سب کچھ حرام ہے نا۔'' میں نے اس کے سراپا پر اچٹتی نظر ڈالی۔

''آپ معزز مہمان ہیں۔ جو چاہے کہہ سکتے ہیں مگر حرام حرام میں فرق تو ہوتا ہے نا'' بائیں طرف والی لڑکی ادا سے مسکرائی۔

وہ مجھے اپنے ہاتھ سے لقمے کھلانا چاہتی تھی لیکن میں کھانے سمیت کسی چیز میں رغبت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد بلوری ہال کی تیز روشنیاں بجھا دی گئیں۔ بس ہلکی نیلگوں اور سرخ روشنیاں رہ گئیں۔ ڈانسنگ فلور پر ایک قتالہ نمودار ہوئی۔ اس کی شکل بھی کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اسے فلموں میں رقص کرتے دیکھا تھا لیکن اس کے نام سے آگاہی نہیں تھی۔ کوئی دوسرے درجے کی ایکٹریس تھی لیکن ''جسم'' پہلے درجے کا تھا۔ کچھ روشنیوں کے زاویے ایسے تھے کہ وہ قیامت اُٹھا رہی تھی۔ تہ در تہ لباس میں بھی اس کا شباب اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ ہال کے شاندار آڈیو سسٹم پر گانا گونجنے لگا۔ کچھ اس طرح کے بول تھے۔ رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا...... جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا......

اور واقعی رقاصہ کے رقص کا نشہ پوری محفل پر چھانے لگا۔ پیمانوں کی گردش تیز ہو گئی۔ دھوئیں کے مرغولے کثیف ہوتے گئے۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے جسم سے کپڑوں کا بوجھ کم کرتی گئی۔ اس کے انداز میں فنکارانہ چابک دستی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں رُکے گی۔ لیکن وہ کہیں نہیں رُکی۔ وہ مادر پدر آزاد ہو گئی۔ روشنیوں نے اس کے جسم کو دہکا دیا۔

سرتاپا شعلہ بنا دیا۔ موسیقی کی لے بھی تیز تر ہوتی چلی گئی۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ بہت سے معروف لوگ یہاں موجود تھے جن میں ایک بہت بڑا انڈین فلم اسٹار بھی تھا۔ ان کی موجودگی میں یہ برہنہ تماشا جاری تھا۔

پہلے گانے کے بعد ایک دوسرا ہیجان خیز گانا پلے ہونے لگا اور وہ اس گانے سے بھی پورا انصاف کرنے لگی۔ چند منٹ بعد کئی اور باڈی بلڈر نوجوان بھی اس شرمناک تماشے میں شامل ہو گئے۔ یہ وحشی جنگلیوں کے روپ میں تھے۔ یہ بھی عریاں تھے۔ بس اتنا فرق تھا کہ ان کے زیریں جسموں کو چند سبز پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ حسین ترشے جسم والی رقاصہ کے گرد ہیجان خیز انداز میں منڈلانے لگے اور ''ٹیبلو'' کے انداز میں اپنی جنسی پیاس کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے سنا تھا کہ انڈیا میں فار ایسٹ اور یورپ کی طرح نائٹ کلبوں میں لائیو سیکس شوز ہوتے ہیں۔ آج ان کی دید بھی ہو رہی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس محفل میں بہت سی خواتین بھی موجود تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر اپنی نسوانی جھجک کو الکحل میں ڈبو چکی تھیں اور ساتھی مردوں کے ساتھ قہقہے بکھیر رہی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ اچانک ایک شرابی کے دھکے سے شراب کی ایک ٹرالی اُلٹ گئی۔ کسی کا سگریٹ بھی گرا اور ایک دم آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ چلانے کی آوازیں آئیں۔ مرد و زن ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھاگے۔ کوئی آگ کی لپیٹ میں تو نہیں آیا لیکن خوف و ہراس بہت شدید تھا۔ میں نے نائیکا شاربہ بائی کو دیکھا۔ وہ نیچے گری دو عورتوں کو پاؤں تلے روندتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی اور دھوئیں کے مرغولوں میں گم ہو گئی۔ میرے اردگرد بیٹھی دونوں لڑکیاں بھی باہر لپکیں۔ دھواں تیزی سے کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مجھے وہ افراتفری یاد آ گئی جو سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں پھیلی تھی اور جس سے فائدہ اُٹھا کر میں اور ثروت سردار کی حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کیا آج بھی کچھ ایسا ہو سکے گا؟ میرے ذہن سے سوال اُبھرا۔

میں اُٹھا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ شیشے کے فرش والی راہداری میں بھی دھواں بھر رہا تھا اور کوئی محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک ٹن شرابی خوف زدہ انداز میں اپنی ساتھی کو پکار رہا تھا۔ ''کامنی...... کہاں ہو...... کامنی۔''

میں اس کے پہلو سے گزرتا ہوا بڑی راہداری میں آ گیا۔ یہ بالکل سیدھی تھی اور عمارت کے اسی حصے میں جاتی تھی جہاں ثروت موجود تھی۔ میں اس کمرے کی طرف لپکا لیکن ابھی دس پندرہ قدم آگے ہی گیا تھا کہ پریم چوپڑا نظر آیا۔ اس کے عقب میں دو رائفل بردار تھے۔ ان

کی نظر سے بچنے کے لیے میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر نیچے جانا چاہا، لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر مسلح محافظ موجود تھے۔

اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ بھگدڑ میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ نچلی منزل پر شعلے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں گاڑھا دھواں پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ جدید Fire Extinguishers کے ذریعے ہال کمرے کی آگ پر کنٹرول حاصل کرلیا گیا ہے اور اب اسے بالکل ختم کیا جارہا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی ہلکی سی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ میرے عقب کی کسی راہداری میں بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک اُبھری۔ میں ایک قریبی دروازہ کھول کر جلدی سے اس میں داخل ہوگیا۔ چند قدم آگے ایک اور دروازہ تھا۔ اس کے ہضمی تالے میں چابی لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ چابی افراتفری میں یہاں لگی رہ گئی تھی۔ دروازے پر OX کے نامکمل الفاظ لکھے تھے۔

میں نے یونہی تجسس کے تحت چابی گھمائی اور اندر چلا گیا۔ اس مستطیل کمرے کی دیواریں سفید تھیں۔ ایک طرف دو بڑے فریزر نظر آ رہے تھے۔ پوری ایک دیوار ان فریزرز نے گھیری ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جس طرح ہاتھ موڑ کر میں نے قفل میں چابی گھمائی تھی، اسی طرح ایک فریزر کا ڈھکنا اُٹھایا اور اندر جھانکا۔ اندرونی لائٹ کی روشنی میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ مجھے سکتہ زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسہ ہی نہیں ہوا۔ فریزر میں گوشت محفوظ کیا گیا تھا لیکن یہ کسی جانور کا گوشت نہیں تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آشا کور کو دیکھا اور گوبندر سنگھ کو دیکھا۔ ہاں میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ نیم برہنہ منجمد لاشیں ان دونوں ہی کی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے لکڑی کی طرح سخت نظر آتے تھے۔ پھر میری نگاہ ایک اور لاش پر پڑی۔ یہ آشا کور اور گوبندر کی لاش کے نیچے اُلٹی پڑی تھی۔ چہرے کی صرف ایک سائیڈ نظر آرہی تھی۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ پولیس کے مخبر روہیل سنگھ کی لاش تھی، جسے جاوا قتل سے پہلے میاں مٹھو کہہ کر پکارتا رہا تھا۔ چہروں کے نقوش دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے یہ تینوں افراد ابھی ابھی مرے ہیں۔

تب میری نگاہ ایک اور منظر پر پڑی اور اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ جواں سال کھلاڑی گوبندر کی لاش کا ایک بازو کندھے سمیت غائب تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تیز دھار چھری سے بڑی صفائی کے ساتھ بازو کو جسم سے علیحدہ کیا گیا ہو۔ گوبندر کے جسم پر فقط ایک زیر جامہ تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے جسم پر برف کے ذرات تھے۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے

دیکھا، خوبرو آشا کور کا منہ خوفناک انداز میں کھلا پڑا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اسے گولی مارنے کے بعد پسٹل کی نال اس کے منہ میں سے نکالی گئی ہو۔ یہ سب کچھ بہت ہولناک تھا۔ میں نے جلدی سے فریزر کا دروازہ بند کیا اور واپس پلٹا۔

یہی وقت تھا جب مجھے کسی قریبی کمرے سے بڑی عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ در و دیوار کو چیرتی ہوئی سی تیز آواز کسی انسان کی تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ کسی درندے کی آواز تھی لیکن کس درندے کی؟ شیر، ہاتھی، چیتے وغیرہ کی آواز میں نے سنی ہوئی تھی۔ کسی اور آواز کا تجربہ نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ آواز کا ماخذ عمارت کے اندر ہی تھا لیکن کچھ فاصلے پر تھا۔ غالباً کئی دیواروں نے اس آواز کو ملفوف کر رکھا تھا۔

اب سامنے والی راہداری میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں دروازے کھولے اور باہر آ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن دھواں راہداریوں میں پھیلا ہوا تھا۔ دھوئیں کے سبب لوگ کھانس رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔ میں سیڑھیوں تک ہی پہنچا تھا کہ نریندر کمار کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”وہ ہے...... وہ سامنے۔“

دو مسلح افراد لپک کر میرے پاس آ گئے اور مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اتنے میں چوڑی ناک والا پریم چوپڑا بھی پہنچ گیا۔ ”تم اوپر کیسے آ گئے؟“

”جیسے کئی دوسرے لوگ آئے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک ہو؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے ہینڈکف چیک کرنے کے بعد وہ لوگ مجھے نیچے لے آئے۔ بیرونی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے گئے تھے، ایگزاسٹ چل رہے تھے۔ دھواں تیزی سے چھٹنا شروع ہوگیا تھا۔ گول ہال میں شیشے کی قیمتی کرسیاں اور میزیں الٹی پڑی تھیں۔ کافی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ رقص گاہ والی سائیڈ جل گئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس آتشزدگی میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دو تین افراد معمولی زخمی ہوئے۔ ان میں شاربہ بائی بھی تھی۔ اس کا ایک بازو، کہنی کے پاس سے جل گیا تھا۔ معروف فلمی اداکار اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ واپس جا چکا تھا۔ بیشتر مہمان بھی کچھ بدمزہ سے ہوگئے تھے۔

تاہم جاوا نے اعلانیہ انداز میں کہا۔ ”دوستو! پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ پارٹی جاری ہے۔ ہم دوسرے ہال میں انتظام کر رہے ہیں۔ چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا آپ کو۔ بہت سے مزیدار تماشے آپ کے منتظر ہیں۔“

مجھے واپس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مجھے دیکھ کر ثروت کا چہرہ کھل اُٹھا۔ کمرے کا سلائیڈنگ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ پھر مختصر کھڑکی کھلی اور پریم چوپڑا نے اس میں سے جھانک کر ثروت کو مخاطب کیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا ''اس کی کڑی کھول دو۔'' ثروت نے میرے ہاتھ کھول دیئے۔ مختصر کھڑکی بند ہوگئی۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ......اور یہ بھاگ دوڑ کی آوازیں کیسی تھیں؟'' وہ شکوہ کناں آواز میں بولی۔

''اوپر ہال کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ جہاں شراب کی بدمستیاں زیادہ ہوں وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''مجھے بھی دھوئیں کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟''

''ہو جاتا تو اچھا تھا لیکن......پھر ہم تم بھی خطرے میں پڑ سکتے تھے۔''

''آپ......مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جایا کریں۔'' وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

میں بغور اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ہولے سے کہا۔ ''میں زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی آس چاہتا ہوں ثروت بس امید کی ایک کر ......جو مجھے......اس اندھے رستے پر نظر آتی ہے۔ میں کچھ اور نہیں چاہتا۔ بس میری اتنی سی بات مان لو۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! تم نے کہا ہے کہ تمہارے دل و دماغ میں نصرت کی بیماری کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ مجھے اپنے رب سے پوری امید ہے کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ جب وہ بالکل اچھی ہو جائے، پہلے کی طرح ہنسنے بولنے لگے تو پھر تمہاری سوچ کا رُخ کیا ہوگا ثروت! کیا پھر بھی تم مجھے اسی طرح سے Avoid کرتی رہوگی۔ ایک خطرہ سمجھتی رہوگی؟''

وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ ہونٹوں پر چپ کی مہر تھی۔

میں نے جواب پر اصرار کیا تو وہ بولی۔ ''تابش! آپ ایسے سوال کیوں کرتے ہیں جو مجھے اندر سے زخمی کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں جو کچھ بھی ہے، میں یوسف کی بیوی ہوں۔ قانونی، شرعی، اخلاقی ہر لحاظ سے پابند ہوں تابش۔''

''کم از کم ''اخلاق'' کی بات تو نہ کرو ثروت! وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے بعد اخلاق کے حوالے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے اور اب تو وہ بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے۔ گریس اپنی تمام بے راہ روی کے باوجود پھر اس کی زندگی میں گھس رہی ہے اور کامیاب بھی ہو رہی ہے۔''

''لیکن آئندہ کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں تابش؟ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر

حالات بہتر نہیں ہوتے اور بھی خراب ہو جاتے ہیں تب بھی مجھے یقین ہے کہ یوسف اتنی آسانی سے......مجھے......آزاد نہیں کریں گے۔''

''ہاں......حقِ ملکیت کا احساس تو اس بندے میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن تم نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ کل کے بارے میں ہم آج کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا پتا کل کسی اور کے اصرار پر وہ تمہیں آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے۔'' میرا اشارہ گریس کی طرف تھا۔

ثروت کی خوبصورت پیشانی پر اُلجھن کی لکیریں اور گہری ہوگئیں۔ ''پلیز تابش! آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ پاکستان سے کال تھی۔ نصرت والا نمبر تھا۔ ''ہیلو نصرت! کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ پیر صاحب کے گھر پر ہوں۔ وہ سگی بیٹیوں کی طرح میرا خیال رکھ رہے ہیں۔ اگر کسی نے انسان کے روپ میں فرشتہ دیکھنا ہو تو انہیں دیکھ لے۔ اتفاق سے ڈاکٹر رضوان جو میرا ٹریٹ منٹ کر رہے ہیں، وہ بھی پیر صاحب کے عقیدت مندوں میں سے نکل آئے ہیں۔ وہ اب مجھے زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔''

دو منٹ کی گفتگو کے بعد وہ پھر یوسف والے موضوع پر آگئی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے تابش بھائی! وہ خبیث گریس پھر پاکستان میں ہے۔ اسلام آباد کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ اپنا کتا یہیں چھوڑ گئی تھی نا۔ یوسف ''اس کتے'' سمیت اس سے ملنے گیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ یوسف کو اور اس کے علاوہ اپنے کتے کو یہاں سے لے جانے کے لیے آئی ہے۔ یقیناً اسلام آباد میں دونوں اس کے آگے پیچھے دُم ہلا رہے ہوں گے۔ پلیز تابش بھائی! باجی کو سمجھائیں۔ ان سے کہیں کہ اب تو اپنی آنکھیں کھول لیں۔ آپ کوشش تو کریں تابی بھائی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، ان کے دل میں اب بھی آپ کے لیے بے پناہ محبت ہے۔ بس اس محبت پر لوہے کے خول چڑھائے ہوئے ہیں انہوں نے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا۔''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں اور کن حالات میں ہیں لیکن یہ تو ہے نا کہ قدرت نے آپ کو ایک بہترین موقع دیا ہوا ہے۔ یوسف پاکستان میں ہے اور آپ دونوں وہاں اکٹھے ہیں۔ آپ اس قربت سے فائدہ اُٹھائیں۔ کسی وقت......سارے اندیشے ایک طرف رکھ کر باجی کا ہاتھ پکڑ لیں۔ ان سے کہہ دیں کہ آپ انہیں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ آپ انہیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

''آپ کو پتا ہے...... پرسوں کون سا دن ہے؟''

''کون سا؟''

''آپ مرد حضرات بھول جاتے ہیں لیکن ہم خواتین نہیں بھولتیں۔ پرسوں کے دن آپ کی اور باجی کی منگنی ہوئی تھی۔ مجھے اس دن کی ایک ایک گھڑی یاد ہے۔ایک ایک واقعہ۔ مجھے پتا ہے اس دن باجی بہت اُداس ہو جاتی ہیں۔خود کو کسی کمرے میں بند کر لیتی ہیں۔ اپنی آنکھیں بھگوتی رہتی ہیں۔ پرسوں آپ ضرور اس بارے میں ان سے بات کرنا۔''

''ٹھیک ہے نصرت...... یوسف کی طرف سے پھر تو کوئی رابطہ نہیں ہوا تمہارے ساتھ؟''

''نہیں تابی بھائی! اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔صرف ایک بار فاروقی انکل کا فون آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ پیر قدرت اللہ کے گھر پر ہوں۔ بس یہی جاننے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔انہوں نے دوسری بار پوچھنے کی زحمت نہیں ہی نہیں کی کہ زندہ ہے یا مر گئی۔''

میں نے کہا۔''لو باجی سے بات کرو۔'' اور فون ثروت کو تھما دیا۔ دونوں بہنیں باتیں کرنے لگیں۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔اوپر خاص کمرے کے اندر دیکھا ہوا منظر جیسے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ نظر جیتی جاگتی زندگی کا حصہ ہی نہیں ہے، میں نے کسی ڈراؤنی فلم کا سین دیکھا ہے۔ وہ سب کیا تھا؟ ان لاشوں کو کیوں محفوظ کیا گیا تھا؟ یہ سفاکی اور درندگی کی انتہا تھی اور پھر وہ آواز جو بالائی منزل کے کسی حصے سے اُبھری تھی۔ایک خون آشام آواز۔ کیا ان منجمد لاشوں کا اور اس آواز کا کوئی تعلق تھا؟ جاوا جیسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا اور اپنی حیرت میں اضافہ کرتا رہا۔

مجھے عمران کے فون کا شدت سے انتظار تھا لیکن فون نہیں آ رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار فون سیٹ کی طرف اُٹھ جاتی تھی۔ ثروت اپنی گفتگو ختم کر چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری ہدایت کے مطابق نصرت نے اسے پریشان کن خبروں سے دور رکھا ہوا ہے۔ ثروت نے زیادہ تر نصرت کی طبیعت اور اس کے علاج معالجے کی بات ہی کی تھی۔ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ نصرت نے پیر قدرت اللہ سے بھی ثروت کی تھوڑی سی بات کرا دی تھی۔ ان پر ثروت کو بہت یقین تھا۔ ان کی گفتگو سے اس پر اچھے اثرات پڑے تھے۔

اگلے روز سویرے میں اپنے فرشی بستر سے اُٹھا تو سب سے پہلے رات والے بھیانک

مناظر ہی ذہن میں آئے۔ ثروت بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ میں نے دیکھا، وہ بے چین سی ٹہل رہی تھی۔''کیا بات ہے ثروت؟''میں نے پوچھا۔

''دم سا گھٹ رہا ہے۔ پتا نہیں یہ کیسی بُو ہے۔ رات کو بھی پریشان کرتی رہی ہے۔''

بُو واقعی موجود تھی۔ یہ دھوئیں اور آگ بجھانے والی گیسوں کی ملی جلی بُو تھی۔ کمرا چونکہ بالکل بند تھا، یہ بُو یہاں ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ میں نے بیل بجا کر گارڈ کو طلب کیا۔

مختصر کھڑکی کے پینل نے سلائیڈ کیا اور نریندر کا کرخت چہرہ نظر آیا۔''ہاں جی! کیا پرابلم ہے؟''اس نے پوچھا۔

میں نے اسے بُو کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔''ایگزاسٹ فین چلا دو۔''

میں نے کہا۔''وہ کل سے چل نہیں رہا۔ اسے ٹھیک کراؤ لیکن اس سے پہلے کچھ دیر کے لیے دروازہ کھول دو۔''

''دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ہاں...... یہ کھڑکی مَیں کھلی رہنے دیتا ہوں۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

مختصر کھڑکی کھلی رہی۔ اس سے تھوڑا بہت فرق پڑ گیا۔ اسی دوران میں ناشتہ بھی آ گیا۔ میں واش روم سے نکلا تو ثروت ناشتہ میز پر سجا چکی تھی۔ میری پسند ناپسند کا اسے بہت عرصے سے پتا تھا۔ اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ دو سلائس، دونوں پر آدھا مکھن آدھا ایپل جیم۔ میں اس کے کومل ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ چوڑیوں کی ہلکی کھنک سنائی دیتی رہی۔ ایک بھولا بسرا منظر پردۂ تصور پر چمک گیا۔ وہ ہمارے گھر میں تھی۔ کچن میں کھڑی اسی طرح سلائس پر چھری سے مکھن لگا رہی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور میری نیت بھانپ کر چھری سیدھی کر لی۔''خبردار! میں شریف لڑکی ہوں، میرے قریب نہ آنا۔ میں قتل کر دیا کرتی ہوں۔''

''شریف لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہروں کو چھری سے نہیں اداؤں سے قتل کرتی ہیں۔ تھوڑی سی بات پر خون خرابا اچھا نہیں ہوتا۔''

''میں جانتی ہوں آپ کی تھوڑی سی باتیں۔''وہ شوخی سے بولی۔

''ارے آگ ہے پیچھے۔''میں نے ایک دم کہا۔

وہ پلٹی اور میں نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ اس کی چھری والی کلائی میری گرفت میں تھی۔''اب بتاؤ تھانے جانا ہے یا یہیں پر مک مکا کرنا ہے۔''میں نے کہا۔

''رشوت لینے اور دینے والا دونوں آگ میں جلتے ہیں۔''

"رشوت لینے والا تو ویسے بھی آگ میں جل رہا ہے۔ فائر بریگیڈ والی کو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔" دست درازی روکنے کے لیے اس نے آخری حربہ آزمایا اور فرح کو آوازیں دینے لگی۔ حربہ کامیاب رہا اور مجھے موقع سے کھسکنا پڑا۔

ایسے بھولے بسرے مناظر ہر وقت میرے ذہن پر یلغار کرتے رہتے تھے اور میرے بے پناہ آتشیں درد کو ہوا دیتے تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے اُٹھ کر مختصر خلا میں سے جھانکا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک بار پھر مجھے لگا کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے مختصر کھڑکی سے صرف چھ سات فٹ کی دوری پر دو عدد بہت بھاری بھرکم ریچھ دیکھے۔ ان کی جسامت ناقابلِ یقین تھی۔ ان کے رنگ براؤن تھے، وہ مست ہاتھیوں کی طرح ہال کمرے میں چکرا رہے تھے۔ ان کی ایک ایک پچھلی ٹانگ سے اسٹیل کی نہایت مضبوط زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ فرش پر گھسٹنے سے یہ زنجیر رگڑ کی زوردار آواز پیدا کرتی تھی۔ سفید پولر ریچھوں کے برعکس ان کے دانت زیادہ بڑے اور خوفناک تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کل شب میں نے بالائی منزل پر جو نامانوس آواز سنی، وہ ان میں سے ہی کسی خوفناک درندے کی تھی۔ ان جانوروں کا قوی ہیکل سیاہ فام رکھوالا بھی ان کے قریب موجود تھا۔ تاہم وہ ان سے معقول فاصلہ رکھے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی ان سرخ انگارہ آنکھوں والے جسیم جانوروں پر پوری طرح بھروسا نہیں کر پا رہا تھا۔ جانوروں کو غالباً چہل قدمی کے لیے اس وسیع مستطیل ہال میں لایا گیا تھا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ آیا۔ ثروت بستر کی سلوٹیں درست کر رہی تھی۔ وہ اس ساری صورتِ حال سے بے خبر تھی اور بے خبر ہی رہتی تو اچھا تھا۔

وہ آج قدرے بہتر موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے تھوڑی سی توجہ اپنے ابتر حلیے پر بھی دی تھی۔ بالوں میں برش کیا ہوا تھا۔ تین چار دن بعد اس نے لباس بھی تبدیل کیا تھا۔ سرخ پھولوں والی کالی شلوار قمیص اس کے جسم پر بہت سج رہی تھی۔ شانوں پر دوپٹا تھا۔ وہ جھاڑ پونچھ کرتی ہوئی مختصر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ میری خواہش تھی کہ وہ کھڑکی سے باہر نہ جھانکے لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کچھ کرتا، اس نے جھانک لیا اور یہی وقت تھا جب دونوں میں سے ایک جانور اپنی مخصوص آواز نکالتا ہوا تیزی سے کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے بڑی وحشت سے اپنا چہرہ کھڑکی کے ایک فٹ چوڑے خلا میں گھسانے کی کوشش کی تھی۔ یوں لگا کہ اس نے پوری دیوار ہلا دی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوا مگر ثروت کی آواز لرزہ خیز تھی۔ وہ چلّا کر میری طرف پلٹی اور مجھ سے

چمٹ گئی۔ "تابش...... تابش!" وہ پکار رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ میری چھاتی میں گھسیڑ دیا۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے میں اسے کھڑکی سے دور لے آیا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اس کی معصوم نسوانیت دل لبھانے والی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی حسین ساتھی کی "قربت" کے لیے شاعر حضرات، بجلی کڑکنے یا طوفان اُچھلنے کی تمنا کرتے ہیں۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود میں ان لمحوں سے محظوظ ہوا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے خود سے جدا کیا تو وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "پلیز تابش! اسے بند کرائیں۔ ابھی بند کرائیں۔" اس کا اشارہ کھڑکی کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "ثروت! گھبراؤ مت۔ وہ جانور کمرے میں نہیں آ سکتے۔ ان کا رکھوالا بھی ساتھ ہے۔"

"پہلے آپ کھڑکی بند کرائیں۔" وہ ذرا غصے سے بولی۔

میں نے نریندر کو پکارا اور اس سے کہا کہ وہ کھڑکی بند کر دے۔ وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے آیا اور بولا۔ "شاید تمہاری سندر پتنی جانوروں کو دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ چلو سندر لڑکیوں کو زیادہ ڈرانا نہیں چاہیے لیکن اپن کی ایک بات یاد رکھنا۔ ہم جس بٹن کو دبا کر یہ کھڑکی کھولتے ہیں، اسی بٹن کو تین دفعہ دبانے سے یہ دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔" اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ میں ثروت کے قریب بیٹھ گیا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ میں اس کے سامنے نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ذہن میں کھلبلی سی تھی۔ اس چھت تلے آنے کے بعد کچھ انوکھے مناظر دیکھنے میں آئے تھے۔ فریزر میں منجمد انسانی لاشیں اور یہ دیو ہیکل بھورے ریچھ۔ یہ سوچ بار بار دماغ میں آتی تھی کہ منجمد لاشوں اور ان جانوروں میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ شاید انسانی لاشیں ان کی خوراک کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ جاوا جیسے لوگ اپنی ہیبت میں اضافہ کرنے کے لیے اکثر اس قسم کے شوق پالا کرتے ہیں۔ شیر، شکاری چیتے، خونخوار عقاب اور کتے وغیرہ ان لوگوں کے اردگرد نظر آتے ہیں اور خوف و ہراس کی فضا قائم کرتے ہیں لیکن ریچھوں کے اس جوڑے کی دید تو ناقابلِ یقین تھی۔ ایسے دیو ہیکل جانور اور اتنی خونخوار شکلیں...... میں نے اتنے بڑے ریچھ کبھی دیکھے تھے، نہ ان کے بارے میں سنا تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہولناک چنگھاڑ سنائی دی۔ یوں لگا کہ

ہمارے کمرے کے دھاتی دروازے سے کوئی بم آ ٹکرایا ہے۔ پورا دروازہ ہل کر رہ گیا۔ ثروت ایک بار پھر چلا کر میرے بازو سے لپٹ گئی۔ دوسرا دھماکا ہوا اور سلائیڈنگ دروازہ ٹیڑھا ہو گیا۔ یہ وحشی جانور تھا جو دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے ثروت کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ محسوس ہوا کہ جانور کسی بھی لمحے اندر گھس آئے گا۔ میرے اندر مزاحمت کی حس پوری شدت سے بیدار ہوگئی۔ میں ثروت کو اپنے ساتھ لگائے لگائے واش روم تک لایا، واش روم کا دروازہ کھولا۔ ثروت کو اندر دھکیل کر دروازے کو باہر سے بولٹ لگا دیا۔

ہلاکت خیز آوازیں اب ہال کمرے کے وسط سے آرہی تھیں۔ ٹیڑھے ہو جانے والے سلائیڈنگ ڈور کی جانب ڈیڑھ دو انچ چوڑی اور تین چار فٹ لمبی جھری سی بن گئی تھی۔ میں نے آنکھ لگا کر دیکھا۔ کسی وجہ سے دونوں ریچھوں میں سے ایک مشتعل ہو گیا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس ریچھ نے وحشت کے عالم میں اپنے پاؤں کی وزنی زنجیر توڑ ڈالی تھی۔ زنجیر کا قریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا ریچھ کے ساتھ ساتھ فرش پر پھسل رہا تھا۔ یہ دیوہیکل جانور اپنے سامنے آنے والی ہر شے پر دیوانہ وار جھپٹ رہا تھا۔ اس نے لوہے کی ایک الماری پر پنجہ رسید کیا اور اسے کھلونے کی طرح دور لڑھکا دیا۔ الماری کے ساتھ ہی شیشے کی ایک دیوار بھی دھماکے سے چکنا چور ہوگئی اور تب میں نے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ ریچھوں کا رکھوالا چوڑا چکلا شخص ہال کے عین وسط میں اوندھا پڑا تھا۔ خدا کی پناہ...... اس کے پہلو پر سے قریباً دو کلو گوشت غائب تھا۔ اس گوشت کے ساتھ ہی بدقسمت شخص کے اندرونی اعضا بھی غائب تھے۔ اس بہت بڑے زخم میں سے بہنے والا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ابھی دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اس چاق و چوبند بندے کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھا تھا، اب وہ یقیناً زندگی کی سرحد پار کر چکا تھا۔ اس ہال کمرے میں اندر کی طرف تین سائیڈز پر ایک گیلری سی تھی۔ اس گیلری پر کئی افراد موجود تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں موجود تھیں لیکن وہ گولی نہیں چلا رہے تھے۔ یقیناً انہیں اس کا حکم نہیں تھا۔ وہ نیچے ایک گوشے میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے غور کیا اور ایک بار پھر پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ گیلری کے بالکل نیچے ایک اور خونچکاں جسم نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بہاری رقاصہ تھی جسے ہم نے لنگڑی پورہ گاؤں میں دیکھا تھا۔ اسے شاربہ بائی جاوا اور اس کے ساتھیوں کی تفریح طبع کے لیے وہاں لائی تھی۔ اب یہ رقاصہ پہلو کے بل فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا تاہم جسم میں حرکت موجود تھی۔ وہ زندہ تھی۔ مگر شدید خطرے میں تھی۔ وحشی جانور کسی بھی وقت اس پر جھپٹ سکتا تھا۔ وہ جتنا طاقتور تھا، پلک جھپکتے میں اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتا تھا۔ گیلری

میں موجود افراد اس پر مختلف اشیا پھینک رہے تھے تاکہ وہ لڑکی کی طرف آنے سے باز رہے۔

پھر میں نے پریم چوپڑا کو دیکھا۔ اس نے اپنے مشین پسٹل سے کئی ہوائی فائر کیے اور پکار کر بولا۔ ''فائر نہیں کرنا...... کسی نے سیدھا فائر نہیں کرنا۔''

بدمست جانور نے فرش پر پڑی ایک رائفل کو پنجوں سے بھنبھوڑا اور یوں توڑ موڑ دیا جیسے وہ کاغذ کی بنی ہوئی ہے۔ طاقت کا ایسا مظاہرہ میں نے زندگی میں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کا تصور کیا تھا۔ وہ پلٹ کر بہاری لڑکی کی طرف آیا، گیلری میں کھڑے افراد نے اس پر شیشے کی بوتلیں اور چھوٹے گملے پھینکے، وہ غضبناک انداز میں چلاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر گیلری کی سیڑھیوں کی طرف آیا۔ یہ منظر دیکھ کر گیلری میں موجود افراد بھی دہشت زدہ ہو گئے۔ وہ نکاسی کے دروازوں کی طرف سمٹنے لگے۔

''گولی نہیں چلانی...... گولی نہیں۔'' پریم چوپڑا پھر دھاڑا۔

یہی وقت تھا جب دو افراد تیزی سے گیلری میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک جاوا تھا اور دوسرا وہی شخص جو شاید پیدائشی طور پر خطروں کا کھلاڑی تھا۔ وہ موت کے پیچھے بھاگتا تھا اور زندگی اپنی تمام تر خوش بختیوں کے ساتھ اس پر عاشق تھی۔ وہ عمران تھا۔ میں اسے جاوا کے ساتھ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں لگا کہ وہ اسی عمارت میں موجود تھا۔

وحشی ریچھ (جس کا وزن بعد ازاں 1400 پاؤنڈ یعنی چودہ پندرہ من کے قریب معلوم ہوا) سیڑھیوں کی ریلنگ کو لکڑی کی تیلیوں کی طرح بکھیر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دوسرا ریچھ بھی موجود تھا۔ وہ بندھا ہوا تھا لیکن وہ بھی اضطراب کی حالت میں تھا۔

''عمران...... عمران!'' میں نے بے ساختہ پکارا لیکن اس قیامت کے شور میں میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔

وحشی جانور سیڑھیاں اُتر کر پھر خون آلود فرش پر آ گیا۔ اب وہ کسی بھی وقت پھر لڑکی کی طرف بڑھنے والا تھا۔ لڑکی کے جسم میں موجود حرکت اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی اور پھر میں نے عمران کو موقعہ کی طرف لپکتے دیکھا۔ ہیرو...... جو واقعی ہیرو تھا۔ چوڑا سینہ، روشن پیشانی، آنکھوں میں ذہانت اور دلیری کی بجلیاں چمکتی ہوئی۔ وہ دیواروں میں در بنانا جانتا تھا۔ پانی میں دیے جلانے کا ہنر اسے آتا تھا اور وہ یہاں تھا۔ اپنی تمام تر غیر معمولی توانائیوں کے ساتھ۔ میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں فقط ایک رول کیا ہوا اخبار ہے۔ وہ ناقابلِ یقین دلیری کے ساتھ دیوہیکل ریچھ کے رُوبرو آیا۔ دل دھڑکنا بھول گئے، سانسیں رُک گئیں۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں خود کو جھکایا اور اخبار کو فرش پر مارتے ہوئے آواز پیدا کی۔ ساتھ

ساتھ اس نے ہاتھوں کے خاص اشاروں سے جانور کو ”کول ڈاؤن“ کرنا چاہا۔ جانور نے چنگھاڑ جیسی آواز نکالی لیکن حملہ آور نہیں ہوا۔ ایک قدم پیچھے ہٹا پھر دو قدم...... عمران کا طلسم کام کر رہا تھا۔ وہ جانور جو سرتاپا وحشت تھا خود کو جیسے کسی نادیدہ حصار میں محسوس کر رہا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ حصار ٹوٹ گیا۔ جانور بے پناہ درندگی سے عمران پر جھپٹا۔ اگر اسے سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی تاخیر ہوتی تو ”کوڈیاک براؤن“ ریچھ اپنے پنجے سے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جاتا۔ میرا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں سلائیڈنگ دروازہ توڑ کر نکلوں اور عمران کے ساتھ اس خطرے میں کود پڑوں۔ میں اب اسے پکارنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ مبادا عمران کی توجہ اپنے خونخوار دشمن سے ہٹے اور وہ اسے شدید زخمی کر دے۔ واش روم کے اندر ثروت مسلسل پکار رہی تھی۔ ”تابش! کیا ہو رہا ہے؟ تابش دروازہ کھولیں۔“ ساتھ ساتھ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی۔

ریچھ اب ایک بار پھر وحشت کے جوبن پر تھا۔ عمران پر حملہ کرنے کے بعد وہ پھر زخمی بہاری لڑکی کی طرف بڑھا۔ عمران تڑپ کر لڑکی اور ریچھ کے درمیان آ گیا۔ ہاں وہ ہیرو تھا۔ حقیقی زندگی کے حقیقی خطروں سے کھیلنے والا۔ فلمی اور کتابی دنیا کے ہیرو اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ریچھ نے اپنے سامنے رکاوٹ دیکھی تو اس کی وحشت مہمیز ہوئی، اس کی درندگی میں اُبال آیا۔ وہ طاقت سے عمران پر جھپٹا۔ عمران اس کے پنجے سے تو بچ گیا مگر اس کے فولادی کندھے کی ضرب لگنے سے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ جدوجہد آنکھوں کو پتھرا دینے کے لیے کافی تھی۔ جہاں عمران گرا، وہاں ایک طویل جھاڑن پڑا تھا۔ عمران نے اس جھاڑن کو اُلٹی طرف سے پکڑا اور اس کے چوبی دستے سے ریچھ کی تھوتھنی پر ضربیں لگانے لگا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ کوڈیاک ریچھ کی توجہ بے ہوش لڑکی کی طرف سے ہٹ جائے اور وہ کامیاب ہوا۔ عمران کے لیے ریچھ کے اشتعال میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی طرف لپکتا چلا گیا۔ عمران اُلٹے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیوہیکل جانور کو گیلری میں لے آیا۔ گیلری میں موجود افراد دروازوں میں اوجھل ہو گئے تھے۔ ہال کے عین درمیان چھت سے ایک بڑا فانوس جھول رہا تھا۔ سرکس کی تربیت عمران کے کام آئی۔ وہ جست لگا کر اس فانوس پر چڑھ گیا۔ طویل جھاڑن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس جھاڑن سے مسلسل ریچھ کی تھوتھنی پر ضربیں لگا رہا تھا۔ یہ ضربیں اس عفریت کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ بس اس کے اشتعال میں اضافہ کر رہی تھیں۔ پریم چوپڑا اور اس کے دو ساتھیوں کو موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترے اور بے ہوش بہارن کو گھسیٹ کر ایک دروازے میں اوجھل ہو گئے۔

جاوا پکار رہا تھا۔ ”انجکشن لاؤ۔ کہاں مر گئے ہو؟ جلدی کرو۔“

نریندر کمار نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بے ہوشی کا انجکشن تھرو کرنے والی ٹرنکولائزر ڈارٹ گن تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عام گن کی طرح اس گن کے استعمال میں بھی خاص مہارت رکھتا ہے۔ اس نے قریباً پچیس فٹ کی دوری سے گن چلائی۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ انجکشن ریچھ کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ اس دوران میں شہ زور جانور گیلری کا طویل جنگلا اُکھاڑ کر نیچے فرش پر پھینک چکا تھا۔ ٹرنکولائزر کا اثر ہونے میں قریباً پانچ منٹ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں ہال کمرے کے اندر دہشت کا راج رہا اور توڑ پھوڑ ہوتی رہی۔

میں عمران کو آوازیں دیتا رہا تھا لیکن میری آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ وہ واپس جا چکا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ پچھلے دو تین منٹ سے ثروت کی آواز سنائی نہیں دی۔ میں جلدی سے واش روم کی طرف آیا اور اس کا بولٹ گرا کر دروازہ کھولا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ثروت واش روم کے قالین پر گری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے تڑپ کر اسے اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ ”ثروت...... ثروت...... آنکھیں کھولو۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔

وہ بے ہوش تھی۔ زرد رنگ اور بھی زرد ہو رہا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ اب بھی واش روم کے قالین پر تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اُٹھایا اور بستر پر لے آیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ سانسوں کی آمدورفت کا جائزہ لیا۔ شدید صدمے نے اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ میں نے سلائیڈنگ دروازے کی سلائیڈ میں بن جانے والی جھری سے منہ لگایا اور سینے کی پوری طاقت سے پکارنے لگا۔ ”دروازہ کھولو۔ چوپڑا! دروازہ کھولو۔“

دو افراد ریچھوں کے رکھوالے کی لاش کو اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ فرش پر خون کی ایک لکیر سی بنتی جا رہی تھی۔ میری آواز کسی نے نہیں سنی اور اگر سنی تو توجہ نہیں دی۔ اسی دوران میں، مَیں نے محسوس کیا کہ ثروت نے اپنے ہاتھ کو تھوڑی سی حرکت دی ہے۔ میں واپس اس کی طرف پلٹ آیا۔

میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ ساتھ ساتھ میں اسے پکار رہا تھا۔ ”ثروت! آنکھیں کھولو۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے ثروت۔“

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کا چہرہ بدستور ہلدی رہا۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں خشک تھیں۔ تاہم سانسوں کی آمدورفت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اسے ہولے ہولے پکارتا بھی جا رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ پھر

اس میں ہوش کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کمرے کے باہر جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، ان سے پتا چل رہا تھا کہ دوسرے ریچھ کو بھی بے ہوش کیا گیا ہے اور اب دونوں کو مکمل طور پر ”کنٹرول“ میں رکھنے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ وزنی زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے پریم چوپڑا کی پاٹ دار آواز بھی گونجتی تھی۔ وہ کام کرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

میں نے ثروت کے چہرے پر پھر پانی کا چھینٹا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کیں۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، تب اس کے چہرے پر ایک دم کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اسے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ میں اس پر جھکا ہوا ہوں۔ ایک خوف آمیز مدہوشی کے عالم میں وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ سسکنے لگی۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ میں اس سے دور ہٹ جاؤں گا۔ میں اس کے بال سہلاتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس میں اپنے سینے پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتا رہا۔ وہ ابھی مکمل طور پر ہوش میں نہیں آئی تھی۔ تاہم اس کے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اسی طرح سو گئی۔ میں نے اسے خود سے جدا کیا اور آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ اس کے بال چہرے سے ہٹائے اور چادر اس کے سینے تک کھینچ دی۔ وہ نقاہت، مایوسی اور افسردگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی تھی، میرے چاروں طرف تاریکیاں ہیں، میں اپنے اردگرد دور دور تک زندگی اور خوشی کی کوئی کرن نہیں دیکھتی اور جس طرح کی یہ زندگی ہے، مجھے زندہ رہ کر کرنا بھی کیا ہے۔

میرا دل سینے میں کٹ کر رہ گیا۔ نہ جانے کیوں سائیں لڑکے کی پُراندیش آواز پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

میں ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ دیوار سے ٹیک لگا لی۔ حالات کتنے بھی بُرے سہی لیکن میرے سینے میں امید کی ایک توانا کرن روشن ہو چکی تھی۔ عمران یہاں تھا اور جب وہ یہاں تھا تو پھر یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہر طرح کے روشن امکانات یہاں موجود تھے۔ ہر طرح کی انہونیوں کے لیے در وا ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ جاوا کے ساتھ اس کی زبردست انڈر اسٹینڈنگ بھی نظر آ رہی تھی۔ بس اس حوالے سے ایک پھانس میرے سینے میں چبھی ہوئی تھی۔ ”گریٹ گیم“ والی بات کسی طرح مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عمران کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کسی صورت نہیں۔ یہ سوچ ہی میرے پسینے چھڑا دیتی تھی کہ عمران

ریوالور کے پانچ خانوں میں گولی ڈال کر اس کا بیرل اپنی کنپٹی پر رکھ رہا ہے اور ٹریگر دبا رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں ہر قیمت پر اسے روکوں لیکن وہ مجھے اس سلسلے میں کوئی بات ہی کرنے نہیں دے رہا تھا۔ کیا وہ اندر خانے کوئی خاص پلاننگ کر چکا تھا یا پھر اس اندھے اعتماد کا سہارا لے رہا تھا جو وہ اپنے اوپر رکھتا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ یہ عمران ہی تھا۔ ”ہیلو جگر پیارے! کیا حال ہے؟“

”تمہارا کیا حال ہے؟ کہاں ہو تم؟“

”سمجھو تمہارے آس پاس ہی ہوں۔“

”یہ بکواس نہیں کرتے کہ یہیں پر ہمارے ساتھ ہو۔ جاوا کے ساتھ اسی گھر میں۔“

”تو تمہیں پتا چل گیا ہے۔“

”پتا چل گیا ہے اور ابھی سارا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہے۔“

”زبردست...... اب تو میری ذات پر تمہارا اعتماد کچھ اور بڑھ جانا چاہیے۔ میں جو کچھ کہوں تمہیں اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینا چاہیے۔ یار! میں ہوں ہی اس قابل۔ ریما، نرگس کو کتے نے نہیں کاٹا ہوا کہ یوں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ پوری دنیا میں میرے جیسے بس دو تین ”پیس“ ہی اور ہوں گے۔ ایک اپنا وہ ٹام کروز، دوسرا جان ریمبو اور تیسرا جیکی چن...... بلکہ جیکی چن بھی اب کچھ ماٹھا ہی ہو چکا ہے۔“

”تم اپنی بکواس بند کرو تو کچھ کہوں؟“

”یار! میں بہت جلدی میں ہوں۔ تم ابھی کچھ نہ کہو۔ بس تیار ہو جاؤ۔ ایک زبردست ایکشن پیک، سنسنی خیز، سچے ڈرامے کے لیے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے، کیسے یار سے پالا پڑا تھا۔“

”یاد تو میں کر ہی رہا ہوں۔“

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”دو دن اچھی طرح ڈنڈ بیٹھکیں لگا لو۔ پرسوں رات کو کام شروع ہو رہا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

○......❖......○

عمران ایکشن پیک، سچے ڈرامے کی بات کر رہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اگر اس کا مطلب ریوالور والے ہلاکت خیز کھیل سے تھا تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی۔ وہ مجھے اور ثروت کو جاوا کے چنگل سے نکالنے کے لئے ایک ایسی شرط قبول کرنے جا رہا تھا جس میں موت کا پلڑا ناقابلِ یقین حد تک بھاری تھا۔

رات گئے ثروت جاگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے اب بھی

موجود تھے۔ اس نے باتھ روم کے اندر رہتے ہوئے دیوہیکل جانور کی خوفناک چنگھاڑیں سنی تھیں اور اس ساری ٹوٹ پھوٹ کی صدائیں بھی اس تک پہنچی تھیں جو ہال کمرے میں ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مسلسل سوالات پوچھ رہی تھی۔ ریچھ کہاں ہے؟ اسے مار دیا گیا ہے؟ اس نے کسی کی جان تو نہیں لی؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے ان سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے اور اسے بتایا کہ جانور کسی وجہ سے بپھر گیا تھا۔ اسے بے ہوش کر کے یہاں سے ہٹا لیا گیا ہے اور کسی دوسری جگہ حفاظت سے بند کر دیا گیا ہے۔ میں نے اصرار کر کے ثروت کو تھوڑا سا کھانا کھلایا اور چائے بھی پلائی۔ اس کا دھیان بٹانے کے لئے میں نے کمرے میں موجود ٹی وی آن کیا۔ ہم کچھ دیر تک مزاحیہ خاکوں کا ایک پروگرام دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہمارے کمرے کا وہ سلائیڈنگ دروازہ مرمت کر دیا گیا جو بھورے ریچھ کی خوفناک ٹکر سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ دونوں ریچھ یقیناً اب بھی اسی عمارت میں موجود تھے۔ ایک دو بار مجھے ان میں سے کسی ایک کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز یقیناً بالائی منزل کے کسی دور افتادہ کمرے سے آئی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ثروت کے کانوں تک یہ مدھم آواز نہیں پہنچی۔

ثروت بالکل گم صم تھی۔ مجھے یاد آیا کہ آج وہی دن ہے جس کے بارے میں نصرت نے مجھے بتایا تھا۔ چند برس پہلے آج ہی کے دن ہماری منگنی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ آنکھوں میں روشن سپنے سجائے تھے...... اور مرادوں والی رات تک پہنچنے کے لئے ایک ایک پل گننا شروع کیا تھا۔ ''کیا بات ہے ثروت! تم کوئی بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ خالی خالی نظروں سے سلائیڈنگ دروازے کو دیکھتی رہی۔ ہولے سے بولی۔ ''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں...... بس...... کل والی بات ذہن سے نہیں نکل رہی۔ اگر وہ جانور یہ دروازہ توڑ دیتا تو پھر؟''

''میرا خیال ہے، تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ آج کوئی اور بات ہے جو تم دل سے لگائے ہوئے ہو۔''

''نہیں تابش! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی اور یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

دوپہر کو میرے اصرار کے باوجود اس نے ایک لقمہ نہیں لیا۔ بس طبیعت کی خرابی کا بہانہ

کرتی رہی۔ چادر اوڑھ کر لیٹی رہی۔ سہ پہر کے وقت اٹھی تو آنکھیں سرخ تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ روتی رہی ہے۔ میرے دل کے زخموں سے جیسے خون رسنے لگا۔ اس نے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ آنکھوں کی سرخی کم تو ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی۔

میں نے پوچھا۔ ''ثروت! تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی۔ ''شاید الرجی سی ہے۔''

میں کہنا چاہتا تھا...... یہ الرجی نہیں ہے ثروت! یہ وہ روگ ہے جو میری، تمہاری جان کو ایک زمانے سے لگا ہوا ہے۔ جس کا کوئی علاج نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو تم اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو، میں کہنا چاہتا تھا، یہ الرجی نہیں ہے ثروت...... یہ آنسوؤں کی یلغار ہے۔ یہ اس دن کی یادیں ہیں جب ہماری نسبت ٹھہری تھی...... جب ہمارے دل میں پنپنے والی آس، امیدوں کو ایک شکل ملی تھی۔ منزل کا تعین ہوا تھا اور منزل تک پہنچنے والے راستے پر قدم اٹھنا شروع ہوئے تھے۔ تمہاری طرح مجھے بھی سب یاد ہے ثروت! ایک ایک بات، ایک ایک جملہ، ایک ایک منظر...... لیکن میں یہ سب کچھ اس سے کہہ نہ سکا۔ کہہ دیتا تو شاید وہ اپنے خول میں چھپ جاتی۔ میں اس کے چہرے پر اور اس کی سرخ آنکھوں میں اپنی محبت کے جو شواہد دیکھ رہا تھا، وہ معدوم ہو جاتے اور میں انہیں معدوم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

O......❖......O

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں بے چینی سے عمران کی فون کال کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسی عمارت میں موجود تھا لیکن اب تک اس نے صرف ایک بار مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ وہ کن چکروں میں ہے۔ میں پریم چوپڑا سے بھی دو تین بار کہہ چکا تھا کہ وہ عمران سے رابطہ کرائے لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی تھی۔ اوپر کی منزل پر فریزر میں پڑی ہوئی لاشوں کا منظر بھی ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔ ابھی تک وہاں ان لاشوں کی موجودگی کی ''وجہ'' کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ شاید وہ انسانی لاشیں کوڈیاک ریچھوں کی خوراک کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

مجھے پتا تھا کہ جب عمران ملے گا تو بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔ میں عمران ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا جب کمرے میں لگے ہوئے اسپیکر میں سرسراہٹ جاگی پھر جاوا کی بھاری بھرکم نشیلی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بچے! کیا کر رہے ہو؟''

''آپ کی اور اپنی جان کو رو رہا ہوں۔'' میں نے ترت جواب دیا۔

''بکواس نہیں۔'' وہ پھنکارا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر بعد نیٹ آن کرنا۔ وہاں تمہارے لئے زبردست تماشا موجود ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہی ریوالور کا کھیل۔ مزہ آئے گا تمہیں۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ پس منظر میں بہت سے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ موسیقی کی دھما دھم بھی تھی۔

''عمران کہاں ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

میرے فقرے سے پہلے ہی اسپیکر خاموش ہو چکا تھا۔ میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ میں نے اسپیکر کی طرف منہ اٹھا کر کئی بار ''ہیلو...... ہیلو'' کہا مگر جواب نہیں آیا۔

اسی دوران میں مختصر کھڑکی کے پینل نے سلائیڈ کیا۔ مستطیل خلا میں پریم چوپڑا کا تمتمایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے حسبِ معمول ثروت کو حکم دیا کہ وہ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے۔ میرے اشارے پر ثروت نے اس حکم پر عمل کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ شاید مجھے پھر باہر لے کر جائیں گے لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ ہتھکڑی لگ چکی تو پریم چوپڑا خود اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک کارندہ تھا۔ کارندے کے پاس ایک سی پی یو (کمپیوٹر اور مانیٹر) موجود تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں میز پر سیٹ کر دیں اور تار وغیرہ لگا دیئے۔ نیٹ آن ہو گیا۔ کارندہ کچھ دیر کی بورڈ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تب اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ پریم چوپڑا اور یہ کارندہ باہر چلے گئے اور دروازہ مقفل کر دیا۔ چوپڑا کی ہدایت پر ثروت نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جاتے جاتے پریم چوپڑا مجھ کو ایک بٹن دکھا گیا تھا اور بتا گیا تھا کہ اسے پریس کر کے میں ''آن لائن'' تماشا دیکھ سکوں گا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ثروت کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ جاوا اور چوپڑا وغیرہ نے جس تماشے کا ذکر کیا ہے، وہ ریوالور والے کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ممبئی میں کسی خاص مقام پر یہ مہلک کھیل کھیلا جا رہا تھا اور اسے انٹرنیٹ کے ذریعے دکھایا بھی جا رہا تھا۔ تو کیا آج میں عمران کو مرتے ہوئے دیکھوں گا؟ یہ سوال ایک دہکے ہوئے نیزے کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں یہ آہنی دروازہ توڑ کر نکل جاؤں۔ عمران تک پہنچوں اور اسے کسی بھی صورت اس جنونی عمل سے روک لوں۔

میں کافی دیر اسی طرح بے دم سا بستر پر پڑا رہا۔ ثروت بھی الجھی الجھی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں آن لائن کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہ رہا۔ قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا...... آخر بہت ہمت کر کے میں نے بٹن پش کیا۔ مانیٹر کی اسکرین پر وہی منظر ابھرا جس کے اندیشے میرے دل و دماغ کو بے طرح جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بڑا ہال دیکھا۔ ہال میں کم از کم ڈھائی تین سو تماشائی موجود ہوں گے لیکن ان سب کے چہرے تاریکی میں تھے۔ صرف ان کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک بڑے اسٹیج کے رُوبرو بیٹھے تھے۔ اسٹیج روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ میری نظر سب سے پہلے عمران پر ہی پڑی۔ وہ اسٹیج پر موجود تھا۔ اس کے جسم پر وہی چست ٹراؤزر تھا جو وہ سرکس میں استعمال کیا کرتا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا...... اور روشنیوں میں دمک رہا تھا۔ ثروت نے عمران کو فوراً ہی پہچان لیا۔ ''یہ آپ کا دوست عمران ہی ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری تمام تر توجہ اسکرین پر تھی۔ دل، سینے میں وحشی گھوڑے کی طرح بھاگ رہا تھا۔ یہاں ریوالور کا کھیل ہونا تھا لیکن ابھی اس کھیل کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں، اسٹیج پر کچھ اور طرح کی مصروفیت تھی۔ عمران کے علاوہ...... دیگر افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ سائیکل کے پہیے جیسا ایک ''رِنگ'' ایک بڑے راڈ میں نصب کیا جا رہا تھا۔ اس ''رِنگ'' کے اندر کی طرف کئی تیز دھار برچھیاں لگی ہوئی تھیں۔ سرکس میں بازی گر ایسے ''رِنگ'' کے اندر سے جست لگا کر گزرتے ہیں۔ عام طور پر ''رِنگ'' کو آگ بھی لگائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں آگ کے بجائے برچھیاں تھیں۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک اس اسٹیج پر اس طرح کے اور بھی خطرناک مظاہرے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے فرش پر ایک جانب خون کے دھبے صاف کئے جانے کے نشان نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد تماشا شروع ہو گیا۔ عمران نے تیز دھار برچھیوں والے اس ''رنگ'' میں سے جست لگا کر گزرنا تھا۔ ذرا سی غلطی اس کا پیٹ چاک کر سکتی تھی یا جسم کے کسی بھی حصے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لیکن وہ عمران تھا۔ خطرات کو بڑی خوش دلی سے گلے لگانے والا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ورزشی جسم یقیناً ہر نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پھر وہ نپے تلے انداز میں اپنی جگہ سے بھاگا۔ اس نے جست کی اور کسی سبک بدن مچھلی کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا خطرناک رِنگ کے اندر سے گزر گیا۔ نیم تاریک ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ بعد اس کھیل کا دوسرا مرحلہ ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا اور یہ زیادہ

خطرناک تھا۔ برچھیوں والا ''رِنگ'' پہلے سے چھوٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں بمشکل عمران کے جسم کے گزرنے کی جگہ ہی موجود ہے۔ تیز دھار نکیلی برچھیاں اب پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک لگ رہی تھیں۔ اندازے کی ذرا سی غلطی جست لگانے والے کو جان لیوا طور پر زخمی کر سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چند ہی لمحوں میں سب کے سامنے جان سے ہار جاتا۔

عمران نے سرکس کے پروفیشنل انداز میں اپنا سر اور کندھے اس خطرناک رِنگ کے اندر گھسائے اور ناظرین کو دکھایا کہ ان برچھیوں اور اس کے جسم کے درمیان کتنا مختصر فاصلہ ہے۔ ایک کیمرے نے زوم اِن کیا اور یہ فاصلہ دکھایا۔ یہ جان لیوا مارجن تھا۔

''یہ کیا کر رہا ہے؟'' ثروت لرزاں آواز میں بولی۔

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یقیناً کسی کے پاس نہیں تھا۔ ہال میں مکمل سناٹا تھا۔ یقیناً دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔ عمران بڑے اعتماد سے اپنے اسٹارٹنگ پوائنٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گھوم کر رِنگ کی طرف دیکھا۔ چند گہری سانسیں لیں...... اور پھر رِنگ کی طرف بھاگا۔ اس کا انداز دیدنی تھا...... خاص پوائنٹ پر پہنچ کر اس نے زقند لگائی۔ اس کا چیتے جیسا جسم کسی چیتے ہی کی طرح صاف، رِنگ کے اندر سے گزر گیا۔ وہ دوسری طرف فوم کے گدے پر سر کے بل گرا اور پھر قلابازی لگا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ داد طلب انداز میں...... دونوں طرف پھیلا دیئے تھے۔ ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس بار دیر تک تالیاں بجتی رہیں لیکن تماشا یہاں ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی کھیل باقی تھا۔ ابھی ایک شیر دل نے اپنی دیوانی جرأت سے دیکھنے والوں کو کچھ اور ششدر کرنا تھا۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو گا۔ ایک خوب صورت نیم برہنہ لڑکی نے ایک سیاہ پٹی عمران کو تھما دی۔ عمران کی زندگی بخش، مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔ ''محترم حاضرین میں سے کوئی ایک شخص اسٹیج پر تشریف لے آئے۔'' اس نے یہ الفاظ انگریزی میں ادا کئے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص اسٹیج پر آ گیا۔ وہ اپنی شکل وصورت سے ایرانی یا ترک لگتا تھا۔ عمران نے سیاہ پٹی اس کی آنکھوں پر باندھی اور اس سے تصدیق کروائی کہ اس پٹی میں سے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بعدازاں عمران کے کہنے پر اس شخص نے یہی پٹی عمران کی آنکھوں پر باندھ دی۔ اس کے بعد حاضرین سے ہی کسی شخص کا رومال لیا گیا...... اور مزید احتیاط کے طور پر یہ رومال بھی پٹی پر باندھ دیا گیا۔ اب یقیناً عمران دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس کے سامنے پھر وہی رِنگ تھا۔

وہ جو کچھ کرنے جا رہا تھا، اس کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا لیکن اسے کون روک سکتا تھا؟ وہ جو ٹھان لیتا تھا، وہ کر کے رہتا تھا۔ دیکھنے والوں کی سانسیں روک دینا، ان کی دھڑکنوں کو منجمد کر دینا، اس کا مشغلہ تھا۔ وہ بڑے اعتماد اور وجدانی جوش کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا اور اسے شکست دیتا تھا۔ ایک لڑکی سے جدا ہونے کے بعد وہ شاید ہمیشہ کے لئے شکست اور موت کے خوف سے بھی جدا ہو گیا تھا...... اندر کے کرب نے اسے کچھ ایسی توانائیاں بخش دی تھیں جو دیکھنے والوں کو انگشت بدنداں کر دیتی تھیں۔ میں حیرت اور صدمے سے دوچار تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا وہ آج رات بھی شکست کو شکست دے سکے گا۔ میں نے اسے بڑے بڑے معرکے سر کرتے دیکھا تھا...... اور وہ شعبدہ بازی نہیں تھی، جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر کسی حفاظتی جال کے جھولے پر خطرناک کرتب دکھانا، ریوالور کا کھیل کھیلنا، ایک جیتے جاگتے انسان کے سر پر سیب یا مالٹا وغیرہ رکھ کر پستول اور چاقو سے ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانا (جہاں ہدف ہوتا ہے) وہ یہ سب کچھ کرتا تھا اور آج پھر ایک ناقابلِ یقین مظاہرہ کرنے جا رہا تھا۔

ثروت کراہی۔ ''تابش! یہ سب کیا ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو پلیز اسے بند کر دو۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بیٹھا رہا۔ مجھے دیکھنا تھا۔ یہ بھی عمران نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ موت سے آنکھیں چار کیسے کی جاتی ہیں اور اب میں آنکھیں چار کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی جسمانی تکلیف کی طرح بدترین خطرات اور اندیشوں کو بھی جھیلنا آ گیا تھا۔

ثروت چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں دیکھتا رہا۔ عمران کی آنکھوں پر دہری پٹی تھی۔ اس نے آہنی برچھیوں والے ''رِنگ'' کو اپنے ہاتھوں سے چھوا پھر نہایت نپے تلے دس بارہ قدم اٹھائے۔ اسٹارٹنگ پوائنٹ پر نشانی کے طور پر کوئی چیز رکھی۔ ایک بار وہ ٹرائی کے طور پر بھاگا اور برق رفتاری سے ''رِنگ'' کو اپنے دائیں ہاتھ سے چھوتا ہوا گزر گیا۔

اب فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ وہ اسٹارٹنگ پوائنٹ پر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس نے حسبِ سابق چند گہری سانسیں لیں۔ اپنے دونوں پاؤں جوڑے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں اٹک گئی تھیں۔ دل سینوں میں ٹھہر گئے تھے۔ موسیقی کی لہریں بھی اضطرابی کیفیت کو ابھار رہی تھیں۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی پُرسکون تھا تو وہ عمران تھا...... اس کا قول تھا...... اگر ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور اگر مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ وہ اپنی جگہ سے بھاگا...... مخصوص جگہ پر پہنچ کر ہوا میں اچھلا۔ اس نے اپنا قول سچ کر دکھایا۔ وہ اتنی صفائی سے برچھیوں کے درمیان سے گزرا

کہ کسی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے فوم کے گدے پر قلابازی کھائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیئے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لوگ یقیناً اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تاریکی میں ان کے ہیولے بتا رہے تھے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ عمران کے ایک کندھے پر ایک معمولی خراش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میری آنکھوں میں نمی تھی...... لیکن میرا سینہ ابھی اندیشوں سے خالی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا، ابھی جنونی لوگوں کا یہ دیوانہ شو ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس شو کا اہم ترین مرحلہ یعنی ریوالور والا کھیل باقی تھا۔ ریوالور والا کھیل میں پہلے لاہور میں بھی دو تین بار دیکھ چکا تھا لیکن یہاں اس کی شرائط کچھ اور تھیں۔

O......❖......O

قریباً ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد اس شو کا اہم ترین کھیل شروع ہوا۔ ثروت منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ثروت کو پریشانی سے بچانے کے لئے مانیٹر کی آواز بہت کم کر دی تھی۔ اس کھیل کے آغاز میں ہی میری ہتھیلیوں پر پسینا آ گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ میں نیٹ بند کر دوں۔ مگر بدترین مناظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا حوصلہ بھی مجھے عمران نے ہی دے رکھا تھا۔

اسٹیج پر ایک گول میز لا کر رکھ دی گئی۔ اس پر ایک شاندار کولٹ ریوالور رکھا تھا۔ ساتھ میں بہت سی گولیاں بھی شیشے کے ایک جار میں پڑی تھیں۔ مائیک پر کئی طرح کے اعلانات ہوئے۔ اعلانات میں کھیل کے قواعد اور کھلاڑی پر لگائی جانے والی ملین ڈالرز کی شرطوں کی تفصیل تھی۔ شرطیں باندھنے والوں میں مجھے فربہ اندام ریان ولیم کا نام بھی سنائی دیا۔ ممکن تھا کہ وہ بھی حاضرین میں موجود ہو لیکن نیم تاریکی کی وجہ سے کسی تماشائی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

سنسنی اور تناؤ کی شدید ترین کیفیت کے دوران میں پہلا کھلاڑی اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور لباس پر سامنے کی طرف نمبر 1 لکھا ہوا تھا۔ کھلاڑی کا چہرہ بھی مکمل نقاب میں تھا، فقط آنکھیں نظر آتی تھیں۔ یعنی اس کھیل میں کھلاڑی کی شناخت صرف اس کا نمبر تھا۔ نمبر 1 اپنی زندگی کی بازی لگانے کے لئے میدان میں آ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، جلدی سے ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھول کر اس میں گولیاں چیک کیں۔ چند گہری سانسیں لیں۔ ریوالور کی چرخی کو کئی بار گھمایا اور پھر بیرل عین اپنی دائیں کنپٹی پر رکھ لیا۔ مائیک پر اعلان ہوا۔

''کھلاڑی نمبر ایک، ریوالور کے چار خانوں میں گولی رکھ کر دو دفعہ ٹریگر دبائیں گے۔''

وہ موت کا سناٹا تھا۔ وہ ناقابلِ فراموش مناظر تھے۔ اس صورتِ حال کی تصویر کشی کے لئے شاید کئی صفحات بھی ناکافی ہوں۔ ایک جیتا جاگتا شخص ہمارے سامنے بیٹھا تھا اور غالب امکان یہی تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں وہ موت کی وادی میں اتر چکا ہو گا۔ اس نے ٹریگر دبایا۔ چار خانوں میں گولی تھی، صرف دو خانے خالی تھے...... پھر بھی ''ٹرچ'' کی مخصوص آواز ابھری۔ گولی نہیں چلی تھی۔ شور بلند ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی حاضرین تھے جنہوں نے کھلاڑی نمبر ایک کے زندہ رہنے پر شرط لگائی تھی۔ کھلاڑی نے اپنا سر میز پر ڈال دیا اور کئی لمحے بالکل ساکت رہا۔ وہ موت کو چھو کر آیا تھا لیکن ابھی اس کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی، اسے چرخی گھما کر دوسری دفعہ ٹریگر دبانا تھا......

میں بغور اس کھلاڑی کو دیکھ رہا تھا اور مسلسل یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عمران ہے یا کوئی اور؟ جسامت اور قد کاٹھ سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا پھر بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمران نہیں ہے۔

دو تین منٹ بعد شدید ترین سنسنی کی دوسری لہر آئی۔ کھلاڑی نمبر ایک نے چرخی گھمائی اور بیرل کنپٹی پر رکھ لیا...... اس دفعہ دھماکا ہوا۔ کھلاڑی نمبر ایک کا سر ایک بے ساختہ جھٹکے سے بائیں طرف گیا اور کولٹ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر میز پر گرا۔ وہ خود بھی مردہ چھپکلی کی طرح بائیں طرف لڑھک گیا۔ خون کی لکیر اسٹیج کے سفید فرش پر رینگتی ہوئی نظر آئی۔

ہال سے ایک دفعہ پھر آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں یقیناً ان لوگوں کی تھیں جنہوں نے کھلاڑی نمبر ایک کی موت پر شرط باندھ رکھی تھی۔ ایک انسان کی ایسی آناً فاناً موت پر نعرہ ہائے تحسین بلند کرنا بے شک نہایت سنگ دل لوگوں کا کام تھا۔

ایک طرف سے چاق و چوبند باوردی ملازم برآمد ہوئے۔ چار ملازمین نے مرنے والے کی لاش اٹھائی۔ باقیوں نے پھرتی سے فرش کی صفائی کی اور اسے پہلے کی طرح چمکا دیا۔ کچھ خونی چھینٹے گول میز پر بھی پڑے تھے، اسے بھی پہلے کی طرح صاف ستھرا کر دیا گیا۔ ریوالور میں پھر سے گولیاں بھر دی گئیں۔

اسپیکر پر آواز ابھری۔ ''حاضرین و ناظرین! اب کھلاڑی نمبر دو آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہ پانچ چھ کا کھیل کھیلیں گے۔ یعنی پانچ خانوں میں گولی، ایک خانہ خالی۔ قاعدے کے مطابق ان کو صرف ایک دفعہ ٹریگر دبانا ہو گا۔''

دوسرا کھلاڑی اسٹیج پر آ گیا۔ میری سانس سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ بہر حال، کھلاڑی کا قد

کاٹھ دیکھ کر میرے شدید اضطراب میں وقتی کمی آئی۔ کھلاڑی کا قد عمران کے قد سے کم تھا، اس کی چال بھی واضح اشارہ دے رہی تھی کہ وہ عمران نہیں ہے۔ یہ کھلاڑی بھی چست لباس میں تھا اور نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ صورتِ حال کی سنگینی کھلاڑی کے جسم و جان پر پوری طرح عیاں تھی۔ چست لباس کے اندر سے اس کے کشادہ سینے کا زیر و بم صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سر کو جھکایا۔ یوں لگا جیسے کچھ پڑھ رہا ہے، اس شدید ترین خطرے میں کسی اور روحانی عمل کا سہارا لے رہا ہے۔

پھر اس نے چرخی گھمائی اور نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔ پانچ خانوں میں موت...... صرف ایک میں زندگی تھی اور معجزے تو کبھی کبھی ہی رُونما ہوتے ہیں۔ شعلہ چمکا، دھماکا ہوا اور کھلاڑی نمبر دو بھی کرسی سے لڑھک کر اوندھے منہ سفید فرش پر جا گرا۔ اس کے سر سے بڑی تیزی سے خون نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین مربع فٹ میں فرش رنگین ہو گیا۔ گولی چلتے ہی ہال کا سکتہ ٹوٹا تھا اور ملا جلا شور بلند ہوا تھا...... مرنے کے بعد بھی ریوالور اس بدنصیب شخص کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ باوردی ملازمین نے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکالا اور باقی کے امور انجام دیئے۔ پانچ دس منٹ میں ''موقعہ واردات'' کو پھر سے صاف ستھرا کر کے چمکا دیا گیا۔

یہ دل دہلا دینے والا کھیل تھا۔ میں اسے اسکرین پر دیکھ رہا تھا پھر بھی یوں لگ رہا تھا کہ میرے جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہے۔ کیا اگلا شکار عمران ہوگا؟ یہ سوال دہکتے ہوئے نیزے کی طرح میرے سینے میں اترا اور مجھے پوری جان سے تڑپانے لگا۔

پسِ پردہ موسیقی کے ساتھ مختلف اعلانات کئے جا رہے تھے جن میں شرطوں کے بھاؤ تاؤ بتائے جا رہے تھے۔ یہ لاکھوں ڈالرز کی شرطیں تھیں۔ شرطیں باندھنے والوں میں حاضرین کے ساتھ ساتھ ناظرین بھی شامل تھے۔ مختلف ممالک سے بڑے بڑے جواری اپنے اصلی یا نقلی ناموں کے ساتھ اس ''گریٹ گیم'' میں حصہ لے رہے تھے۔ اس کھیل میں ''زندگی'' کے لئے چانس بہت کم تھا مگر ''زندگی'' پر شرط لگانے والوں کو کامیابی کی صورت میں لامتناہی فائدہ ملنا تھا۔ یہ لالچ بڑی بڑی تجوریوں کے منہ کھول رہا تھا۔ بڑے بڑے بینک اکاؤنٹس سے چیک ڈرا ہو رہے تھے۔ یہ ایک نہایت منظم سیٹ اَپ تھا اور اس کی تیاری یقیناً مہینوں پہلے سے کرلی گئی تھی۔

اسپیکر پر تیسرے کھلاڑی کے لئے اعلان ہوا۔ انگلش میں کہا گیا۔ ''کھلاڑی نمبر تین اسٹیج پر آ رہا ہے۔ کھلاڑی نمبر تین چار چھ کا آپشن استعمال کرے گا۔ ریوالور کے چار خانوں میں

گولی ہے۔ کھلاڑی نمبر تین کو خود پر دو دفعہ ٹریگر دبانا ہوگا۔''

کھلاڑی نمبر تین اسٹیج پر وارد ہوا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ زیادہ تر کھلاڑی اس مہلک کھیل میں اپنی مرضی سے حصہ نہیں لے رہے۔ انہیں مختلف طریقوں سے مجبور کر کے یہاں لایا گیا ہے اور اگر کوئی اپنی مرضی سے کھیل رہا ہے تو بھی وہ اپنے حالات سے ہی مجبور رہا ہوگا...... کوئی ایسا شخص جو واقعی مرنے کی حد تک زندگی سے تنگ آ چکا ہو۔ کھلاڑی نمبر تین اچھے قد کاٹھ کا مالک تھا۔ مجھے اس پر عمران کا قوی شبہ ہو سکتا تھا لیکن وہ بڑے بے ڈھنگے طریقے سے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ یہی لگا جیسے اسے بیک اسٹیج سے دھکیل کر اسٹیج پر پہنچایا گیا ہو۔ وہ چند سیکنڈ تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ وہ ہانپا ہوا تھا۔ اس کا چست کاسٹیوم بھی درہم برہم نظر آتا تھا۔ پھر اس نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ اس نے پلٹ کر اپنا رخ بیک اسٹیج کی طرف کیا اور کسی غیر ملکی زبان میں چلّا کر کچھ کہا۔ تب وہ تیزی سے مڑا اور گول میز پر رکھے ریوالور کی طرف لپکا۔ اس کے انداز میں غم وغصہ، خوف، جھنجلاہٹ، سب کچھ یک جاں ہو گئے تھے۔

اسپیکر پر ایک تیز تحکمانہ آواز گونجی۔ ''رک جاؤ...... رک جاؤ''

اس کے ساتھ ہی دھماکے سے گولی چلی۔ یہ رائفل کا فائر تھا۔ میں نے دیکھا، سنہری لباس میں ملبوس، کھلاڑی نمبر تین اپنی ٹانگ پکڑ کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کی سنہری پتلون ران کے اوپر سے رنگین ہوئی جا رہی تھی۔ تب وہ ایک دم اٹھا اور دوبارہ کولٹ ریوالور کی طرف بڑھا۔ اس دفعہ گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ کسی کیچوے کی طرح دہرا ہو گیا۔ رائفل اسٹیج کے بالکل پاس سے چل رہی تھی...... لیکن کہاں سے، یہ پتا نہیں چل رہا تھا۔ غالباً اسٹیج کی دائیں جانب دیوار کے پیچھے ایک یا دو رائفل مین تیار حالت میں موجود تھے۔

زخمی ایک بار پھر کسی غیر ملکی زبان میں دہاڑا۔ یقیناً وہ فائر کرنے والوں کو بدترین گالیوں سے نواز رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ غالباً تماشائیوں میں گھسنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سیڑھیوں سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ خفیہ مقام سے چلنے والی تیسری گولی اس کی کھوپڑی میں لگی۔ وہ سفید فرش پر گر کر بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کا خون فرش کی سفیدی پر گل کاریاں کرنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد باوردی ملازم نمودار ہوئے۔ انہوں نے مردہ شخص کو ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے بیک اسٹیج پر لے گئے۔

ہال میں خاموشی تھی۔ صفائی ستھرائی کا عمل دہرایا گیا۔ مختلف اعلانات ہوئے اور قریباً پندرہ منٹ بعد چوتھا کھلاڑی اسٹیج پر نمودار ہو گیا۔ وہ مردہ سی چال چلتا ہوا موت کی کرسی پر آن

بیٹھا۔ اس کے بارے میں اعلان ہوا تھا کہ وہ چار چھ کا کھیل کھیلے گا۔ یعنی چھ خانوں والے چیمبر میں چار گولیاں رکھے گا اور دو دفعہ خود پر فائر کرے گا۔ دوسری دفعہ فائر کی نوبت ہی نہیں آئی پہلی بار ہی گولی اس کے بھیجے میں گھس گئی اور وہ آناً فاناً ایک جیتے جاگتے انسان سے لاش میں تبدیل ہو گیا۔

......اگلا تقریباً ڈیڑھ گھنٹا میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں اپنی آنکھوں کو پتھر محسوس کر رہا تھا۔ جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ دل گاہے بگاہے وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں، مَیں نے صرف دو بار اپنی جگہ سے حرکت کی جب نیٹ بند ہوا اور میں نے اسے پھر سے آن کیا۔

ثروت نے ایک بار بھی اسکرین کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی تھی۔ وہ چادر اوڑھ کر دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ اسی طرح لیٹے لیٹے اس نے دو تین بار مجھے روہانسی آواز میں مخاطب کیا تھا اور کہا تھا۔ ''تابش! بند کر دیں اسے۔ کیوں تکلیف دے رہے ہیں خود کو؟''

میں بند نہیں کر سکتا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود دیکھنے پر مجبور تھا۔ یہاں میرا یار تھا اور موت کے منہ میں تھا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں مزید 14 کھلاڑیوں نے اس خونی کھیل میں حصہ لیا۔ ان کھلاڑیوں میں سے کئی ایسے تھے جن پر مجھے عمران کا شبہ ہوا اور ان کی موت پر میری رگوں میں خون منجمد ہوا۔ میرے دل نے کام کرنا چھوڑا۔ درندگی کے اس تماشے میں جو پہلا کھلاڑی زندہ بچا، اس کا نمبر نواں تھا۔ اس نے چار خانوں میں گولی رکھ کر دو بار ٹریگر دبانے والا آپشن استعمال کیا تھا۔ دونوں دفعہ ریوالور کے اندر سے ''ٹرچ'' کی آواز آئی۔ ہال میں ایسا قیامت خیز شور بلند ہوا کہ کئی منٹ تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔ زندہ بچ جانے والا خود بھی خوشی سے رقصاں تھا۔ وہ گاہے بگاہے فرش پر دو زانو بیٹھ جاتا تھا اور مسرت کے عالم میں اپنے ہاتھ فرش پر مارتا تھا۔ اس کی جیت نے بے شمار لوگوں کو کنگال کر دیا تھا اور بہت سوں کو دولت میں غرق بھی کر ڈالا تھا۔ وہ خود بھی پلک جھپکتے میں نہ جانے کتنی دولت سمیٹ چکا تھا۔

''کیا یہ عمران ہے؟'' میرے دل کی آس میرے اندر کی آواز بن کر ابھری۔

میں نقاب پوش کی ایک ایک ادا کا جائزہ لینے لگا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اناؤنسر نے کامیاب ہونے والے کھلاڑی نمبر 9 کو اسٹیج کے وسط میں کھڑا کیا اور اس کی نقاب کشائی کی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا کہ وہ عمران ہے یا نہیں؟ وہ عمران نہیں تھا۔ یہ ایک سیاہ فام تھا۔ اناؤنسر نے پکار کر کہا۔ ''اسٹیفن ڈورے...... فرام برازیل......''

ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ دیر تک گونجتا رہا تھا۔ ٹوٹل اٹھارہ کھلاڑیوں میں سے جو دوسرا خوش قسمت موت کے بے رحم پنجوں سے محفوظ رہا، وہ کھلاڑی نمبر 19 تھا...... یعنی اس کھیل کا آخری کھلاڑی۔ (اس کھلاڑی کا اصل نمبر تو اٹھارہ تھا لیکن تیرہ نمبر کو منحوس خیال کر کے اسے نمبروں کی فہرست میں رکھا ہی نہیں گیا تھا)۔

اس آخری کھلاڑی کو پانچ خانوں میں گولی رکھ کر صرف ایک دفعہ ٹریگر دبانا تھا۔ اس نے تین چار منٹ کے نہایت سنسنی خیز و جاں گسل مرحلوں کے بعد ٹریگر دبایا۔ ریوالور میں سے 'ٹرچ'' کی زندگی بخش آواز نکلی اور اس نے سارے ہال کو گھما کر رکھ دیا۔ جیتنے والوں کے فلک شگاف نعروں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ باقی سب اعلانات اور انکشافات بھی ویسے ہی تھے جیسے کھلاڑی نمبر نو کے زندہ بچ جانے کے بعد ہوئے تھے۔

میرا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ لگتا تھا کہ جان میری آنکھوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ بچ جانے والا کھلاڑی کون تھا؟ اس کی جسامت عمران جیسی ہی تھی۔ یہ عمران تھا...... یہ عمران تھا۔ اگر یہ عمران نہیں تھا؟ تو پھر کیا تھا؟ اس ''کیا'' کے آگے ایک ایسی گہری تاریکی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کا تو پھر یہی مطلب تھا کہ جن سولہ عدد خونچکاں مردہ کھلاڑیوں کو یہاں سے اٹھا کر لے جایا گیا ہے، ان میں سے ہی کوئی ایک عمران تھا۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اب کھلاڑی...... خوش بخت کھلاڑی کی نقاب کشائی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ یہ انتظار بالکل، سولی پر لٹکنے جیسا تھا۔ میری ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ میری پتھرائی ہوئی نگاہ سنہری نقاب کے پیچھے عمران کے سوا کسی کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور پھر اس دوسرے خوش قسمت ترین شخص کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا...... راکیش کمار فرام انڈیا......''

اناؤنسر کی آواز ہال میں ایک زہریلی پھنکار کی طرح گونجی۔ میری بے جان آنکھوں کے سامنے گھنگریالے بالوں اور لمبے پتلے چہرے والا ایک سانولا نوجوان کھڑا تھا۔ ہال تالیوں اور نعروں کے بے پناہ شور سے گونجا۔ میری نگاہوں میں اردگرد کی ہر شے دھندلا سی گئی۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ مجھے جیسے آس پاس کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ثروت نے ہی کال ریسیو کی۔ ''ہیلو کون؟'' اس نے پوچھا۔

دوسری طرف سے عمران کی چہکتی ہوئی آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔ وہ پاٹ دار لہجے میں بولا۔ ''رشتے میں تو میں آپ کا بھائی ہوں...... لوگ مجھے شہنشاہ کہتے ہیں۔''

''کیا؟'' ثروت سٹپٹائی۔

''دسس......سوری میری بہن! تابی کہاں ہے؟''

میں نے جھپٹ کر فون ثروت کے ہاتھ سے لیا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ''ہیلو عمران! کہاں ہو تم؟'' میں نے چلاّ کر کہا۔

وہ بولا۔ ''عالمِ بالا میں بھی ہوتا تو تمہاری یہ چنگھاڑ سن کر بدک جاتا۔ آہستہ بولو یار! میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ بس یہیں ذرا ممبئی تک آیا ہوا ہوں۔ یہ سلمان خان ہے نا...... وہی کالے ہرن کا شکاری۔ اس نے ڈنر پر بلایا ہوا تھا۔ وہی اپنے پرانے قصے سنا رہا تھا۔ اس کی پہلی محبت کون سی تھی اور ایشوریا رائے سے اس کی کیسے بگڑی وغیرہ وغیرہ......''

''عمران! تم میرے سامنے ہوتے نا تو سچ مچ تمہارا سر توڑ دیتا۔ جان سے مار دیتا تمہیں۔ تم نے مجھے ختم کر دیا تھا۔ جان کھینچ لی تھی میری......'' میری آواز بھرا گئی۔

''اچھا سمجھ گیا......تم انٹرنیٹ پر وہ تھرڈ کلاس قتل پروگرام دیکھ رہے ہو...... چار خانوں میں گولی اور پانچ خانوں میں گولی......''

''میں سمجھ رہا تھا کہ تم اس کھیل میں شریک ہو۔'' میں نے کانپتی آواز میں کہا۔

''شریک تو تھا لیکن وہاں تک جہاں تک تم نے دیکھا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر برچھیوں والے ''رِنگ'' میں سے گزرا تھا۔ اس کے بعد وہ آ گیا......''

''وہ کون؟''

''وہی جو بہت تیز آتا ہے۔ کبھی کبھی پتلون کی زپ کھولنی بھی مشکل ہو جاوت ہے۔ میں باتھ روم میں چلا گیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو سامنے سلو بھائی کھڑا تھا۔ وہی اپنا سلمان خان۔ کہنے لگا چھوڑو یار اس گندے ناٹک کو۔ آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں اور اپنی ایک منہ بولی گھر والی بھی۔ اب میں اسی کے بنگلے سے بات کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''عمران! دل چاہتا ہے کہ تمہیں جان سے مار ڈالوں یا پھر تم مجھے مار ڈالو۔ تم بہت دکھ دینے والے شخص ہو۔ اگر تم اس کھیل میں شامل نہیں تھے تو تمہیں مجھے بتانا تو چاہئے تھا۔ تمہیں کیا پتا میں نے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کس طرح گزارے ہیں۔'' میری آواز غصے سے لرزنے لگی۔

''میں ممبئی سے واپس فرید کوٹ آ رہا ہوں۔ کل تم سنے ملاقات ہو گی...... پھر ساری بات بتاؤں گا۔ اس وقت میری پیاری بہن (ثروت) کے سامنے مجھے اس طرح ذلیل نہ کرو۔''

دو تین منٹ کی مزید گفتگو کے بعد ہمارا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ شدید ترین کرب سے گزرنے کے بعد جب

سکون کا سانس آتا ہے تو بندہ نڈھال سا ہو جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ عمران موت کے اس گھیرے سے کس طرح بچ پایا ہے۔ بدبخت جاوا کی تو پہلی شرط ہی یہ تھی کہ عمران اس کی طرف سے ریوالور والے کھیل میں حصہ لے گا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ عمران نے میری اور ثروت کی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس شرط سے چھٹکارا حاصل کیا ہو۔ پھر کیا صورتِ حال بنی تھی؟ یہ بات تو طے تھی کہ عمران بدترین مشکلات میں سے رستہ نکالنے کا خداداد ہنر رکھتا ہے مگر جاوا جیسے شخص کو شیشے میں اتارنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اگر عمران نے اس سے کچھ حاصل کیا تھا تو یقیناً کچھ دیا بھی ہو گا یا دینے کا پختہ وعدہ کیا ہو گا......

میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ اس کھیل میں حصہ لینے کی شرط پر انڈین ڈان نے کئی ناقابلِ فراموش باتوں کو فراموش کیا تھا جن میں نادرٹی ٹی کا قتل، سیکرٹری ندیم کی معذوری اور ہوٹل لالہ زار کا خونی ہنگامہ شامل تھا۔ اب اس شرط سے پیچھے ہٹنا اس کے لئے ہرگز آسان نہیں تھا۔

ثروت جانتی تھی کہ پچھلے ڈھائی تین گھنٹے میں، مَیں شدید ترین ہیجان سے گزرا ہوں لیکن اس ہیجان کی تفصیل پوچھ کر وہ مجھے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے دل جوئی کی باتیں کیں پھر اس نے مجھ پر چادر کھینچ دی۔ لائٹ آف کر دی اور مجھے سونے کا مشورہ دیا۔ میری آنکھوں میں مسلسل ممبئی کے جواخانے کے خونی مناظر گھوم رہے تھے۔

O......❖......O

اگلے روز دوپہر کے بعد جب ثروت اور میں اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش بیٹھے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ اس بوجھل خاموشی کو کیسے توڑا جائے تو مختصر کھڑکی کا تختہ سلائیڈ کر کے کھلا۔ میرا خیال تھا کہ حسبِ معمول دوسری طرف پریم چوپڑا کی چوڑی ناک اپنا جلوہ دکھائے گی......لیکن دوسری طرف عمران کا مسکراتا چہرہ تھا۔ ''ہیلو تابی، ہیلو ثروت!'' وہ بولا۔ ''کیسے ہیں آپ دونوں؟''

ثروت نے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں منہ پھلائے کھڑا رہا۔ اس وقت میں اندر اور وہ باہر نہ ہوتا تو ہم دونوں میں یقیناً زبردست قسم کی کشتی ہو جاتی جس میں ہم دونوں کو چھوٹی بڑی چوٹیں آتیں۔

ثروت اور عمران میں یہ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چند فٹ کی دوری سے دیکھ رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر حیرت جلوہ گر ہوئی۔ وہ ہکلایا۔ ''میری نگاہیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں......آپ ثروت ہی ہیں نا؟''

ثروت تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے تمہیں؟''

وہ بولا۔ ''آج ان کو دیکھا ہے اور اتنے قریب سے اور سکون سے دیکھا ہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے اپنی چھوٹی بہن غزال یاد آ گئی ہے۔ ان کی شکل بڑی ملتی ہے غزال سے۔ بس تھوڑا سا آنکھوں کا...... اور قد کاٹھ کا فرق ہے۔ وہ کافی صحت مند تھی۔ وہ مجھے بڑے پیار سے عمو بھائی جان کہا کرتی تھی...... آہ......'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

وہ یک ٹک ثروت کو گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ ثروت خاموش رہی لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔ ''آپ کی بہن کہاں ہے عمران صاحب؟''

''جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ تیرہ، چودہ سال کی تھی جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ بس چند دن بخار رہا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ بچپن میں وہ مجھے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔''

ثروت نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے چھوٹی تھی۔''

''ہاں...... چھوٹی تھی...... لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ وہ کافی صحت مند تھی۔ میں اس کے سامنے چھوٹا سا لگتا تھا...... بچونگڑا سا......'' اس نے ٹھنڈی ٹھار سانس بھری۔

میں جانتا تھا کہ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ وہ عادت کے مطابق ثروت کو گولی دے رہا تھا۔ اگلے دو تین منٹ تک وہ ثروت کے ساتھ بڑی سنجیدگی اور روانی سے اپنی بہن غزال کی ہی باتیں کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ زبردست اداکار تھا۔ میں بڑی مشکل سے اسے ٹریک پر واپس لایا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہ ساری گفتگو تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ فی الحال میں تم سے دو چار بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضروری باتیں تو مجھے بھی کرنی ہیں تابی! چلو میں کوشش کرتا ہوں کہ ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکیں۔''

''کتنی دیر میں؟''

''بس دس پندرہ منٹ میں۔'' اس نے کہا اور تب ایک بار پھر بڑی محویت سے ثروت کو دیکھنے لگا۔ ثروت گڑبڑا گئی۔

وہ بولا۔ ''ثروت! پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے...... میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں ثروت کے بجائے ثروال کہہ کر پکاروں۔''

''ثروال؟ اس کا کیا مطلب؟'' ثروت نے پوچھا۔

''ثروت اور غزال کی جمع، ثروال۔ سچ، مجھے لگ رہا ہے کہ میری کھوئی ہوئی بہن مجھے مل گئی ہے۔''

رسمی کلمات ادا کر کے وہ کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔

''یہ کس طرح کے آدمی ہیں؟'' ثروت نے کہا۔

''بہت عجیب ہے...... اور بہت انوکھا۔ میں سچ کہتا ہوں ثروت! تم سے دور ہونے کے بعد میں مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ سیٹھ سراج کے غنڈوں سے لڑائی ہوئی۔ میں اپنی جان لینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس وقت یہ بندہ رحمت کے فرشتے کی طرح میرے سامنے آیا۔ اس نے مجھ میں جینے کا، حالات سے ٹکرانے کا اور پھر جیتنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اس نے اب تک کی مشکلات میں قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے ثروت...... اور صرف میں ہی نہیں، وہ ہر مصیبت زدہ کے کندھے سے کندھا ملانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ وہ بہت خوش بخت بھی ہے ثروت! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ خطرے خود اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ روپیا پیسا اس کے ہاتھ کا میل ہے۔ لاہور شہر میں درجنوں نہیں، سیکڑوں ضرورت مند ہوں گے جن کے گھروں کے چولہے اس کی مدد سے جلتے ہیں۔ اس کا سینہ انسان دوستی اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے ثروت! وہ اب بھی ہمارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔ جاوا جیسے شخص کو شیشے میں اتارنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پتا نہیں، اس کے لئے وہ کیا قیمت دے رہا ہے۔''

''ان کے والدین؟''

''والد اس کی کم عمری میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ والدہ بچھڑ گئی جسے آج تک ڈھونڈ رہا ہے۔ کبھی ایک لڑکی سے محبت ہوئی۔ دونوں نے ایک دوجے کو ٹوٹ کر چاہا مگر ایک دوجے کے ہو نہ سکے۔ لڑکی کی شادی ہو گئی پھر وہ اپنے شوہر کی گولی سے زخمی ہو کر مر گئی۔''

''شادی نہیں کی انہوں نے؟''

''شادی تو نہیں کی لیکن اب برسوں بعد ایک لڑکی اس کی زندگی میں آ چکی ہے۔ شاہین نام ہے اس کا۔ جس سرکس میں عمران پرفارم کرتا تھا، وہیں وہ بھی تھی۔ دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو چکے ہیں۔ آپس میں لڑتے بھی بہت ہیں لیکن ایک دوجے کو چاہتے بھی ہیں۔ خاص طور سے شاہین تو ہزار جان سے فدا ہے اس پر۔''

''ہاں، نصرت نے مجھے بتایا تھا کہ فرح اور عاطف کے ساتھ ایک شوخ سی لڑکی بھی رہتی ہے۔ وہ آپ کے ایک دوست کی گرل فرینڈ ہے۔''

''ہاں، یہ وہی ہے...... بہت اچھی فن کارہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ امورِ خانہ داری بھی خوب جانتی ہے۔ باتوں باتوں میں دل موہ لیتی ہے۔''

اسی دوران میں مختصر کھڑکی کی دوسری طرف کھٹ پٹ ہوئی۔ کھڑکی کھلی...... وہی

ناپسندیدہ چوڑی ناک نظر آئی۔ چوپڑا نے حسبِ معمول پھنکار کر احکامات جاری کئے۔ یہ سارا عمل ہم کئی بار دہرا چکے تھے۔ ثروت نے میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے۔ سلائیڈنگ دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ میں چوپڑا کے ساتھ عمران سے ملنے چل دیا۔

عمران اس خوب صورت عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ فرید کوٹ کوئی جدید شہر نہیں تھا لیکن اس عمارت پر جدید شہروں سے بڑھ کر سرمایہ خرچ کیا گیا تھا۔ یہ جاوا کے ایک امیر کبیر مقامی شخص کی رہائش گاہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ فربہ اندام شخص کپاس کا ایک بڑا تاجر تھا...... میں عمارت کی بالائی منزل پر پہنچا تو مجھے وہ منحوس فریزرز یاد آئے اور ان میں پڑی ہوئی انسانی لاشیں بھی۔ جی مالش کرنے لگا۔ چند راہداریوں سے گزر کر ہم ایک سلائیڈنگ دروزے کے سامنے پہنچے۔ چوپڑا کے ساتھی نے ایک بٹن دبایا۔ اسٹیل کا دروازہ بے آواز کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے تعجب خیز منظر دیکھا۔ ایک مضبوط جنگلے کی دوسری جانب دونوں دیوہیکل ریچھ نظر آ رہے تھے۔ حیوانی گوشت کے پہاڑ جنہیں دیکھ کر دل و دماغ پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ ایک ریچھ کشادہ پنجرے کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ دوسرا جنگلے کے قریب تھا۔ پنجرے میں مختلف سبزیوں اور گوشت کے بچے کھچے ٹکڑے پڑے تھے۔ سارے چیمبر میں عجب سی حیوانی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے سے باہر دو تین آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر عمران نیم دراز تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔

''آؤ جگر آؤ...... تمہارا ہی انتظار تھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ وہ چپ تھا۔ میری آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی آ گئی۔ یہ نمی اپنے ساتھی راجا کے لئے تھی۔ راجا جو کل تک ہمارے کندھے سے کندھا ملائے مشکلات کا مقابلہ کر رہا تھا، آج ہماری دشمنی کا شکار ہو کر منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا۔

ہم نے جدا ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ راجا کے دکھ نے ہمیں کچھ دیر کے لئے خاموش کر دیا۔ آخر عمران نے گہری سانس لی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''راجا اب ماضی کی کہانی ہے تابی! حال اور مستقبل کی مشکلیں ہمارے سامنے کھڑی ہیں۔ اب ہمیں ان کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''راجا کے ساتھ جو ہوا، وہ میری اور ثروت کی وجہ سے ہوا نا۔ ہم یوسف کو ڈھونڈنا چاہتے تھے۔''

''کس کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور کیوں؟ اس کا معاملہ قدرت بہتر جانتی ہے۔ بہرحال، وہ ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہا تھا۔ ہم اسے یاد رکھیں گے۔''

''اس کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔''

''تمہارے میزبانوں گوبندر سنگھ اور آشا کور کے مرنے کی عمر بھی کہاں تھی۔ یہاں عمر کا کوئی حساب نہیں ہے تابی! نہ ہی دنیا سے جانے کی کوئی ترتیب ہے...... تم سناؤ ثروت کیسی ہے؟''

گوبندر اور آشا کے ذکر پر مجھے پھر وہ منحوس فریزر یاد آ گیا جس میں، میں نے گوبندر، آشا اور روہیل سنگھ کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہاں اس کوٹھی میں بہت کچھ عجیب و غریب ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً ان جانوروں کو ہی دیکھو۔ اتنے بڑے ریچھ میں نے کبھی نہیں دیکھے اور نہ ہی اتنے خونخوار۔ یہ یہاں کیوں ہیں؟ کیا یہ جاوا کے پالتو ہیں؟''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''ایسی بری چیزیں کسی برے بندے کی پالتو ہی ہو سکتی ہیں۔ پرسوں انہوں نے اپنے رکھوالے کو مار ڈالا ہے لیکن وہ جونیئر رکھوالا تھا۔ اصل رکھوالا کہیں گیا ہوا تھا...... اور وہ بہاری لڑکی بھی بے چاری زخمی ہوئی ہے۔''

''میں نے سب دیکھا تھا عمران! اس کی جان تمہاری کوشش سے ہی بچی ہے۔ لیکن تم خود بھی تو مرتے مرتے بچے ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو یار! اپنی زندگی کو اس طرح ارزاں نہ کرو۔ کم از کم آج کل تو کچھ احتیاط کر لو۔ یہی سوچ لو کہ ہمیں ثروت کو یہاں سے زندہ سلامت نکالنا ہے۔''

''تو میں کیا کر رہا ہوں؟'' وہ سگریٹ کے دھوئیں کا چھلا بنا کر بولا۔

''تم وہ سب کچھ کر رہے ہو جو تمہارا وتیرہ بن چکا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ خوش بختی تمہارے کندھوں پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی ہے اور تمہارے لئے لگاتار معجزے اور کرشمے ہوتے چلے جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوتا عمران! یہ دنیا دلیل اور سبب پر چلتی ہے۔ میں نے وہ ممبئی والا شو دیکھا ہے۔ سیلف شوٹنگ (ریوالور والے کھیل) سے پہلے تم نے جو تماشا کیا، وہ بھی خودکشی کے قریب قریب ہی تھا۔ برچھیوں والے 'رِنگ' میں سے تم آنکھیں باندھ کر گزرے۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''یار! تم ٹی وی اینکرز کی طرح بس ایک یہی بات کو پکڑ کر دھوبی پٹکے مارتے رہتے ہو۔ دوسرا پہلو بھی تو دیکھو نا۔ میں نے 'رِنگ' والا آئٹم دکھایا لیکن ریوالور والے آئٹم سے خود کو بچا لیا۔ وہ تو سیدھا سیدھا قبر میں لیٹنے کا پروگرام تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا۔ اٹھارہ میں سے فقط دو کی جان بخشی ہوئی ہے۔''

میں نے غور سے عمران کو دیکھا۔ ''لیکن عمران! جاوا کی تو پہلی شرط ہی یہی تھی کہ تم کھیلو گے۔''

''اور میں نے کہا تھا کہ میں کوئی رستہ نکال لوں گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

تب اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور جنگلے کی سلاخوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ دیوہیکل ریچھ تیزی سے سلاخوں پر جھپٹا۔ اس کو قریب سے دیکھنا ہیبت ناک تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ اس نے سلاخوں پر اپنے دانت آزمائے اور انہیں جیسے اکھاڑ پھینکنا چاہا۔

عمران نے کہا۔ ''یہ نر ہے۔ پندرہ من کے قریب وزن ہے اس کا.... مادہ وہ سو رہی ہے۔ اس کا وزن اس نر سے کچھ زیادہ ہی ہوگا...... اس نسل کے براؤن ریچھوں کا ریکارڈ وزن اس سے بھی زیادہ ہے۔ شاید بائیس تیئس سو پونڈ تک یعنی بائیس تیئس من کے قریب۔ ہے نا ناقابلِ یقین بات۔ بہت وزنی ہونے کے باوجود یہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ پریم چوپڑا بتا رہا تھا۔ یہ چالیس پینتالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگ سکتے ہیں۔''

''عمران! میں تم سے، کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔ تم نے جاوا کی شرط یہ چھٹکارا کیسے حاصل کیا؟''

عمران مسکرایا۔ اس نے قریب رکھے ایک بڑے باکس کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں سے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکال کر پنجرے میں پھینکا۔ یہ بھیڑ کا گوشت تھا۔ ریچھ کی حسِ شامہ حرکت میں آئی۔ اس کی آنکھوں میں بھوک ابھری اور وہ گوشت کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی دوران میں عمران نے ایک بار پھر باکس میں ہاتھ ڈالا اور تین چار کلو وزن کی ایک مچھلی دُم سے پکڑ کر باہر نکالی۔ اس نے اسے آہنی سلاخوں کے سامنے لہرایا۔ ریچھ نے بو سونگھی اور گوشت کو چھوڑ کر تیزی سے مچھلی کی طرف آیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم تھوتھنی سلاخوں کے خلا میں گھسیڑتا چلا جا رہا تھا۔ عمران نے مچھلی اندر پھینک دی۔ ریچھ اس پر جھپٹ پڑا۔

عمران پست آواز میں بولا۔ ''ریچھ کے لئے مچھلی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اس لئے وہ بھیڑ کے گوشت کو بھول گیا۔ ہر جاندار اسی طرح اپنی ترجیح مقرر کرتا ہے۔ جاوا نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ممبئی میں وہ ریوالور والا کھیل اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ لاکھوں ڈالرز کی لاٹری تھی...... لیکن...... جب جاوا کو اس سے بھی زیادہ فائدہ بخش کام نظر آیا تو وہ یہ لاٹری بھول گیا۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ سیدھی بات کرو عمران۔''

عمران نے کہا۔ ''فاسٹنگ بدھا کی مورتی...... آرا کوئے۔''

''آرا کوئے؟'' میں حیرت زدہ تھا۔

''ہاں، میں نے جاوا سے آرا کوئے کا وعدہ کیا ہے۔''

''آرا کوئے؟ آرا کوئے تمہارے پاس ہے؟''

''پاس ہوتا تو اس وقت سر کے بل ناچ نہ رہا ہوتا۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اسے حاصل کر لیں گے۔ میں نے جاوا کو اس کی ضمانت دی ہے۔''

میں سناٹے میں تھا۔ ''آرا کوئے ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر مہناز کے پاس۔''

''اور ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟''

''ہمارے آس پاس ہی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہاں فرید کوٹ میں؟''

''نہیں یار! انڈیا میں۔'' عمران نے کہا اور سگرٹ کا گہرا کش لے کر پُرسوچ انداز میں چھت کو گھورنے لگا۔

''اس سے میں کیا سمجھوں؟ کیا تم جانتے ہو کہ مہناز اس وقت کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم جاوا کو اتنی بڑی گارنٹی دے رہے ہو۔''

''پتا تو نہیں لیکن پتا چلنے والا ہے۔'' وہ وثوق سے بولا۔

''کس طرح؟''

''انگلینڈ میں رہنے والے ایک ہمدرد کے ذریعے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ ابھی تم اپنا سارا دھیان ثروت پر رکھو۔ یار! تم اب بھی اسے اپنا نہ سکے تو پھر یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔''

''سمجھو میں...... میں ڈوب چکا ہوں عمران۔'' میں نے یاسیت سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ وہ بہت دور جا چکی ہے مجھ سے۔''

''اوئے پھر وہی ہندی فلمیں۔ پھر وہی دلیپ کماری اور راج کپوری۔ میں سر توڑ دوں گا تمہارا۔ تم دونوں کے سامنے خود کو باقاعدہ آگ لگا لوں گا۔''

''پھر بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک بند گلی ہے یار...... اور یہاں سفر ختم ہو جاتے

ہیں۔''

وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تم یہ بتاؤ، ڈنڈ بیٹھکیں وغیرہ لگائی ہیں نا...... تیل شیل مل لیا ہے؟''

''لیکن کس لئے؟''

''یار! ڈنڈ بیٹھکیں کس لئے لگائی جاتی ہیں؟ شادی کے لئے یا لڑائی کے لئے۔ اور شادی کا ابھی دور دور تک پتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ لڑائی کے لئے ہی کہہ رہا ہوں۔''

''کیا کرنا ہے؟''

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ آراکوئے تک پہنچنے کے لئے۔''

''اور ثروت؟''

''ثروت تو یہیں رہے گی۔ جیسے ٹیپو سلطان کے بیٹے رہے تھے انگریزوں کے پاس یرغمالی کے طور پر۔''

''یعنی ہمیں آراکوئے کے بدلے ثروت کی رہائی ملے گی؟''

''ہاں، یہی طے ہوا ہے۔'' عمران نے گہرا کش لے کر کہا۔

''اور اگر ہم ناکام ہوئے تو؟''

''ناکامی کی گنجائش نہیں ہے۔ داداجی فرماتے تھے۔ دنیا میں دو کاموں کے علاوہ ہر کام ممکن ہے۔ میزبانوں کے سامنے باعزت طریقے سے آم چوسنا اور سخت گرمی میں کھوئے ملائی والی قلفی کو گرنے سے بچانا۔ یہ اپنے نوپی کا جو مشہور قول ہے، وہ دراصل داداجی نے ہی نوپی کے منہ میں دیا تھا۔ نوپی سمجھتے ہو نا۔ نپولین بونا پارٹ، داداجی کا لنگوٹیا تھا۔ دونوں اکٹھے بیٹھ کر لڑکیوں کو لو لیٹر لکھتے تھے۔ نپولین نے کہا تھا کہ میری ڈکشنری میں ناممکن کا لفظ ہے ہی نہیں۔ ہمیں بھی یہی سوچ کر آگے بڑھنا ہوگا۔''

''لیکن کرنا کیا ہے؟''

''وقت سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ دیکھو، منو بھائی سے لے کر امجد اسلام امجد تک اور محی الدین نواب سے لے کر احمد اقبال تک کسی نے بھی وقت سے پہلے کچھ بتایا ہے؟ قبل از قسط کچھ پتا نہیں چلتا، کچھ نہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''جن رائٹر لوگوں کا تم نے نام لیا ہے، ان کے بارے میں جانتے ہو؟''

''کسی کے بارے میں بات کرنے کے لئے اس کے بارے میں جاننا ضروری نہیں

ہوتا۔ یار! لوگ تو بغیر جانے کسی شخص پر پوری کتاب لکھ مارتے ہیں۔ ایسے ایسے خفیہ گوشوں سے نقاب اٹھاتے ہیں کہ شخصیت بے چاری تڑپ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ کئی شخصیات تو صدمے سے اسپتال کے سی سی یو وغیرہ میں جا پہنچتی ہیں۔ داداجی کا وصال بھی تو ایک ایسی حرکت کی وجہ سے ہوا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ان پر کس نے کتاب لکھی تھی؟''

''ان پر نہیں لکھی تھی، انہوں نے لکھی تھی۔ گوجرانوالہ کے ایک مشہور پہلوان کے بارے میں۔''

''کون سا پہلوان؟''

''نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کے پوتے بھی بڑے غصیلے پہلوان ہیں اور لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ کیا تم مجھے بھی داداجی کے پاس پہنچانا چاہتے ہو؟''

وہ پٹڑی سے اتر چکا تھا۔ ایک بار اس کی قوتِ گویائی حرکت میں آئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ پنجرے کے اندر خوں خوار ریچھ اب مچھلی کے بعد بھیڑ کے گوشت کا ٹکڑا بھی کھا چکا تھا اور ایک بار پھر بھوکی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

O......❖......O

ثروت ابھی تک اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی جس نے اسے پرسوں بے ہوش کیا تھا۔ اس کے بالکل سفید رنگ میں ایک نقاہت زدہ زردی گھلی ہوئی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں دو چار روز کے لئے اسے یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں تو وہ دہل گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں ایک دم کھنڈرات کی طرح ویران ہو گئیں۔

''نہیں تابش! میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کہیں گے وہاں خطرہ ہے لیکن مجھے وہ خطرہ منظور ہے۔''

''ثروت! جس طرح میں اور عمران سچویشن کو سمجھ رہے ہیں، تم نہیں سمجھ رہی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں ثروت کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں ایک یرغمالی کے طور پر موجود ہے۔

وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھی۔ آخر میں نے اسے بتایا۔ ''جاوا ہم سے جو کام لینا چاہ رہا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمہیں کسی طرح کا کوئی گزند نہ پہنچائے۔ اس نے گارنٹی دی ہے اور جاوا جیسے لوگ ایسی گارنٹیوں کا پاس کرتے ہیں۔''

وہ بڑی زود فہم تھی۔ سمجھ گئی کہ میری بات کے پیچھے کیا ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے بولی۔ ''میرا یہ اندازہ درست ہے کہ یہ شخص مجھے اپنے پاس رکھ کر آپ کو کسی بہت خطرناک کام کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ پلیز تابش! آپ اس کے چکر میں نہ آئیں۔ اگر آپ کو کوئی خطرہ ہی مول لینا ہے تو پھر اس بندے کے چنگل سے نکلنے کے لئے مول لیں۔''

''ثروت! ہم نے سب کچھ ناپ تول لیا ہے۔ جو رسک ہم لے رہے ہیں، وہ اس رسک سے بہت چھوٹا ہے جو ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش میں لیں گے۔ تم اپنے دماغ کو ان سوچوں سے تکلیف مت دو۔ تم بس دعا کرو اور حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جانا ہے اور یہ بھی مت سمجھو کہ تم یہاں بالکل اکیلی رہو گی۔ عمران نے تمہاری کمپنی کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ ایک دبنگ خاتون یہاں تمہارے ساتھ رہے گی۔ بہت ہوشیار اور بہت جی دار۔ تمہارا وقت اچھا گزرے گا اس کے ساتھ۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''میڈم صفورا۔ وہ بھی آرا کوئے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں شامل رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں وہ ہمارے ساتھ ہی تھی۔ اب بھی وہ عمران کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ یہاں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ ویسے بھی میں اور تم ہر وقت رابطے میں رہیں گے۔ جاوا سے بات ہو گئی ہے۔ میڈم صفورا اپنا سیل فون اپنے ساتھ رکھ سکے گی۔ میں اس پر وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔''

کافی دیر کی بحث کے بعد آخر میں ثروت کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میڈم صفورا اسی بلڈنگ میں عمران کے ساتھ موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق وہ ثروت کے پاس پہنچ گئی۔ وہ حسبِ معمول پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا لیکن اب ہمیشہ کی طرح بوائے کٹ بال اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اپنی چھوٹی بہن کی موت کی وجہ سے وہ عمران کی جانی دشمن رہی تھی مگر اب دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی عمران کی گرویدہ تھی۔ زرگاں میں عمران نے جس طرح اس کے زخم پر ہونٹ رکھ کر سانپ کا زہر چوسا تھا اور اس کی جان بچائی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھا۔

میڈم صفورا مجھ سے باقاعدہ گلے ملی اور پھر ثروت کو بھی گلے سے لگا کر اس کا سر چوما۔ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر بولی۔ ''بالکل وری نہیں کرنا ڈیئر...... سمجھو تابش کہیں نہیں جا رہا، وہ یہیں تمہارے پاس ہے۔ ہم بہت اچھا وقت گزاریں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اب یہاں کھڑے کیوں ہو؟ کیا پرابلم ہے...... کیا جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''بس چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ثروت کو بغور دیکھ کر بولی۔ ''مجھے نہیں پتا ثروت ڈیئر کہ تم دونوں میں اب کیا تعلق ہے...... لیکن جب میں بھانڈیل اسٹیٹ میں تھی تو تمہارے ساتھ ایک زبردست قسم کا غائبانہ انٹروڈکشن ہو چکا تھا۔ تابش سب کچھ بھول چکا تھا لیکن تمہارا نام نہیں بھولا تھا۔ یہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر جنگل میں بھاگتا تھا اور تمہارا نام لیتا تھا۔ سلطانہ اس کو پکڑ پکڑ کر لاتی تھی......''

میں دہل گیا۔ سلطانہ کے بارے میں ثروت کو ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ ثروت بھی جیسے سوالیہ نظروں سے میڈم صفورا کو دیکھنے لگی۔ وہ اطمینان سے بولی۔ ''سلطانہ پگوڈا کی ایک بوڑھی ملازمہ کا نام تھا۔ بڑا خیال رکھتی تھی اس کا۔''

میں سمجھ گیا کہ صفورا نے مجھے جان کر پریشان کیا ہے، ورنہ عمران اسے سب کچھ سمجھا چکا تھا کہ ثروت کے سامنے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔

میں نے ابھی تک ثروت کو اپنی اس شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو میری ''مکمل خودفراموشی'' کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک میرے بیٹے بالو کی موجودگی سے بھی بے خبر تھی۔ میں یہ سب کچھ ثروت سے چھپانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے چھپانا تھا لیکن ابھی تک تیز رفتار حالات اور پریشانیوں نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

جاوا کے اہلکار مجھے لے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ حسبِ معمول دروازہ سلائیڈ کر کے کھل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں نہیں جکڑے گئے۔ میں ثروت کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا، وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہ کسی مرئی چیز کی طرح میرے جسم پر سرسرا رہی تھی۔ مجھے چھو رہی تھی۔ اس نگاہ کو جیسے زبان مل گئی تھی اور یہ کہہ رہی تھی...... اس دیارِ غیر میں...... دنیا کے بدترین دشمنوں کے درمیان خدا کے اور تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ اس بات کو بھول مت جانا۔

O......❖......O

کافی دنوں بعد میں نے نیلا آسمان دیکھا اور کھلی فضا میں سانس لیا۔ عمران میرے ساتھ تھا۔ ہم نے نہا دھو کر شیو کیا تھا اور پریم چوپڑا کے فراہم کردہ نئے کپڑے پہنے تھے۔ ہم دونوں ایک ہلمین کار پر سوار تھے۔ جاوا کی طرف سے ہمیں بیس پچیس ہزار روپے کیش دیا گیا تھا۔ اپنے کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے ہمیں تین فون نمبرز دیئے گئے تھے۔ دو موبائل، ایک لینڈ لائن۔ یہ نمبرز ہمارے لئے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ ہم اس رابطے کے ذریعے جاوا سے کچھ بھی طلب کر سکتے تھے اور کسی بھی مشکل میں مدد حاصل کر سکتے تھے اور یہ سہولت صرف فرید کوٹ یا پنجاب تک محدود نہیں تھی۔ اس کا دائرہ انڈیا کے ہر شہر تک پھیلا ہوا تھا۔ جاوا نے عمران کو ہدایت کی تھی کہ پولیس یا قانون نافذ کرنے والی کسی بھی ایجنسی کی مداخلت پر ہم کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ فون پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ دن روشن اور قدرے خشک تھا۔ ہم فرید کوٹ کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے رہے اور شہر کا نظارہ کرتے رہے۔ یہاں گوردوارے کثرت سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں سائیکل رکشا بھی نظر آئے۔ ہر طرف رنگ برنگی پگڑیوں کی بہار تھی۔ عمران ایک بار پھر سخاوت کے موڈ میں تھا۔ وہ کئی جگہ رکا اور اس نے بڑی خاموشی سے، محتاج دکھائی دینے والوں کی مدد کی۔

کچھ دیر بعد ہم ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ ہم نے ''ہائی ٹی'' لی اور عمران نے آتی جاتی سکھ خواتین کو تاڑا اور ٹھنڈی آہیں بھریں۔ اس قسم کی حرکات وہ صرف تفریحِ طبع کے لئے کرتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اداکاری چھوڑو اور حقیقت نگاری کی طرف آ جاؤ۔ اب منہ سے کچھ پھوٹو کہ کرنا کیا ہے؟''

خلافِ توقع اس نے بے پر کی نہیں اڑائی اور چائے کے کپ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تابی! آراکوئے ڈاکٹر مہناز کے پاس ہے...... اور کھوج ملا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس وقت انڈیا

میں ہے۔ شاید رتناگری شہر کے آس پاس۔''

''یہ کھوج ملا کیسے ہے؟''

''پھر ایک فون کال۔ یہ فون کال، سیل فون کے ذریعے کوئی دو ہفتے پہلے انڈیا سے انگلینڈ میں کی گئی ہے۔ نوٹنگھم کے ایک پروفیسر ڈاکٹر اولیس چوہان کے نمبر پر۔ ان ڈاکٹر صاحب نے بابے جلالی کو اطلاع دی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ڈاکٹر مہناز، جلالی کے فارم میں رہ رہی ہے اور اس کا علاج معالجہ کر رہی ہے۔''

''کال کس نے کی؟''

''ڈاکٹر مہناز نے۔ پروفیسر ڈاکٹر چوہان پاکستانی ہیں اور اس میڈیکل کالج میں پڑھاتے رہے ہیں جہاں سے ڈاکٹر مہناز نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔''

''کیا بات ہوئی دونوں میں؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ بات ہو نہیں سکی۔ ڈاکٹر مہناز بس چند فقرے ہی بول پائی...... سلسلہ منقطع ہو گیا۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''یہی کہ وہ رتناگری میں ہے۔ بڑی مشکل میں ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے...... پروفیسر چوہان نے اس سے پوچھا کہ وہ کس جگہ ہے۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکی۔ وہ جلالی صاحب کی صحت کے بارے میں پوچھ رہی تھی جب فون بند ہو گیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر مہناز کے ساتھ اس کا ایک کلاس فیلو ڈاکٹر بھی تو تھا؟''

''ہاں ڈاکٹر رسام۔ لیکن اس کے بارے میں مہناز نے کوئی بات نہیں کی۔''

''حیرانی کی بات ہے۔ تم ڈاکٹر مہناز کو لاہور اور راولپنڈی وغیرہ میں ڈھونڈتے رہے ہو اور وہ یہاں رتناگری میں پائی جا رہی ہے۔ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے؟''

''وہ کچھ نہیں کر رہی۔ شاید کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔''

''کون لوگ ہو سکتے ہیں؟''

''زیادہ امکان یہ ہے کہ ان کا تعلق بھی آراکوئے والے معاملے سے ہی ہو گا۔''

''اگر ایسا ہے تو...... پھر مہناز کو پکڑ کر رکھنے کا مطلب کیا ہے؟''

''یہی کہ آراکوئے اب مہناز کے پاس نہیں ہے۔ وہ اسے کہیں کھو چکی ہے یا پھر اس نے اسے کہیں محفوظ کر دیا ہے۔ اب اسے پکڑنے والے اس کے ذریعے مورتی تک پہنچنا

چاہتے ہیں لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہوسکتا ہے اور یہ رخ زیادہ خطرناک ہے.....''
عمران کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔
''کیسا رخ؟''
اس نے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔''پروفیسر چوہان جنھوں نے مہناز کی کال سنی ہے، ایک خاص بات بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اندازے کے مطابق مہناز کسی ایسی جگہ سے فون کر رہی تھی جہاں بیک گراؤنڈ میں ڈھول وغیرہ بجنے کی آواز آ رہی تھی اور یہ ایسے ڈھول نہیں تھے جو آرکسٹرا میں بجائے جاتے ہیں بلکہ یہ نقارے کی طرح تھے۔''
''نقارے کی طرح؟''
''میرا ذہن تو اس سلسلے میں پگوڈا کی طرف ہی جاتا ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ مہناز ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہو جو اس سے پہلے بھی آرا کوئے کو پاکستان سے برآمد کر کے بھانڈیل اسٹیٹ لے گئے تھے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا، وہاں عبادت گاہوں میں کس طرح کے ڈھول پیٹے جاتے تھے۔''
عمران بڑی سنسنی خیز بات کہہ رہا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ بات قابلِ غور تھی۔ یہ ممکن تھا کہ مہناز اس وقت کسی پگوڈا کے بھکشوؤں کے پاس ہو اور اسے پگوڈا کے اندر ہی کہیں چھپا دیا گیا ہو لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ یہاں تک پہنچی کیسے؟''
میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا۔''عمران! پھر تو ایک اور بات بھی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آرا کوئے اور مہناز دونوں بھکشوؤں کے قبضے میں ہوں۔''
''کیا کہنا چاہتے ہو؟''
''پہلے بھی تو ایسا ہو چکا ہے۔ بھکشوؤں نے نہ صرف آرا کوئے برآمد کیا بلکہ آرا کوئے کے ساتھ ساتھ مجھے، میڈم صفورا اور دیگر لوگوں کو بھی مجرم گردان کر اپنے ساتھ پاکستان سے بھانڈیل لے گئے۔ بھانڈیل میں ہمیں آرا کوئے چرانے کی سزا دی گئی۔ پگوڈا کا جبری خادم بنا دیا گیا۔ ممکن ہے کہ مہناز کو بھی کسی سزا کے لئے ہی کہیں بند رکھا گیا ہو۔''
''اس پہلو سے میں نے نہیں سوچا تھا۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ موتی اور مہناز دونوں ان لوگوں کے پاس ہوں۔''
میں نے گہری سانس لی۔''پتا نہیں کیا شے ہے یہ مہناز۔ بوڑھے جلالی کے علاج میں اتنا آگے چلی گئی کہ اس سے شادی کر بیٹھی۔ اب ایک بیوی کی حیثیت سے اس کی بات

نبھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ موتی کے لئے جان جوکھم میں ڈال رہی ہے بلکہ جان گنوا رہی ہے۔ مجھے تو کم ہی امید ہے کہ بچ پائے گی۔''
''صنف نازک کی بغاوت اسی طرح کی ہوتی ہے پیارے۔ انوکھے سے انوکھا کام کیا جاتا ہے اور پھر اسے پورا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ مرنے سے پہلے بابے جلالی نے مہناز سے یہی فرمایا ہوگا کہ اس کا عہد نبھانا ہے۔ موتی کو اس کے اصل مالک تک پہنچانا ہے۔ چوروں کے ہاتھ نہیں آنے دینا۔ اس نے کہا ہوگا جو حکم میرے بزرگ سرتاج۔ اب ہوا یہ ہے کہ بابا جلالی بستر مرگ سے اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ اب عاشق شیخوپورہ میں اور محبوبہ رتنا گری میں پائی جا رہی ہے۔ کم از کم اب تک تو پائی جا رہی ہے۔ بابا جلالی اپنے پرانے گراموفون پر آج کل یقیناً یہی غزل سن رہا ہوگا، کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں......اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''
''اچھا چھوڑو ان باتوں کو......اب مہناز کو ڈھونڈنا کیسے ہے؟''
''ظاہر ہے، اگر وہ رتنا گری میں ہے تو اسے جہلم یا خانیوال میں تو نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ ہمیں رتنا گری ہی چلنا ہوگا۔ وہ اچھا خاصا شہر ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ بدھ مت کی عبادت گاہیں زیادہ نہ ہوں۔ اگر ہمارا اندازہ درست ہے اور فون کال کے پیچھے سنائی دینے والے ڈھول کسی پگوڈا ہی کے تھے تو پھر ہمیں اپنی تلاش رتنا گری کے پگوڈوں سے شروع کرنی ہوگی۔''
''یہ رتنا گری ہے کس طرف؟''
''بات تو ایسے کر رہے تھے جیسے رتنا گری میں تمہارا ننھیال ہے۔ اب پوچھ رہے ہو ہے کس طرف؟''
''معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔
''ہم میڈیا والے ہیں۔ ہم نے تو ہِن چینل پر بڑوں بڑوں سے معافی منگوائی ہے۔'' وہ مسکرایا پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔''یہ مہاراشٹر کا ایک ساحلی شہر ہے۔ ممبئی سے بس کے ذریعے چھ ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ وہاں ایئرپورٹ نہیں ہے۔ بائی روڈ ہی جانا پڑے گا۔ ممبئی میں اتریں گے، وہاں سے بس پکڑیں گے۔''
میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔''جاوا کو پتا ہے کہ تمہیں آرا کوئے کے حوالے سے کلیو ہاتھ آیا ہے؟''
''کبھی کبھی بالکل گھامڑ ہو جاتے ہو۔ جاوا کو بتا دیا تو پھر اپنے ہاتھ کیا رہ جائے گا۔ اسے کچھ نہیں بتایا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ آرا کوئے ڈھونڈیں گے اور اس کے منہ پر ماریں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ اگر مہناز کو اس علاقے سے کہیں اور پہنچا دیا گیا تو کام اور مشکل ہو جائے گا۔''

''میں دیر نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان میں دیر کرنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ ہم ہر کام میں جلدی کرتے ہیں بلکہ میرے ایک تایا تو اتنے پھرتیلے تھے کہ رکشے میں ہی پیدا ہو گئے تھے۔''

''زبردست...... انہوں نے اپنی شادی کا بھی انتظار کیا تھا یا نہیں؟''

''بکواس نہ کرو۔ دراصل ان پر اپنے یار نپولین کے خیالات کا بڑا اثر تھا۔ وہ بھی ہر کام میں بڑی چھیتی کرتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نپولین اپنے بڑے بھائی سے پہلے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے، دونوں بھائیوں میں آخر تک جھگڑا رہا۔ جھگڑا بڑھ جاتا تھا تو دادا جی ان کی صلح کراتے تھے۔ اس صلح کی خوشی میں اکثر نرالے کی مٹھائی کھائی جاتی تھی۔''

''یعنی اس زمانے میں بھی نرالے کی مٹھائی تھی؟''

''کھوتے! جو لوگ وقت سے آگے ہوتے ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تم نے خود ہی تو ذکر کیا تھا ابن صفی صاحب کا۔ دیکھو، محترم نے میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی مجھ سے ملتا جلتا کردار تخلیق کر لیا تھا نا۔ چلو اٹھو، اب تم خود دیر کر رہے ہو۔''

اس نے ویٹر کو فراخ دلی سے ایک ہزار روپے کی ٹپ دی اور ہم اٹھ کر باہر گاڑی میں آ بیٹھے۔

○.....❖.....○

اگلے روز ہمارا سفر فرید کوٹ سے شروع ہوا۔ بذریعہ سڑک ہم دہلی پہنچے۔ پریم چوپڑا بنفسِ نفیس ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ہمیں ہر قسم کی لاجسٹک سہولت فراہم کر رہا تھا۔ ہمارے ٹکٹ تیار تھے۔ چوپڑا نے ہمیں سی آف کیا۔ ہمارے بس میں ہوتا تو ''اسے'' سی آف کرتے اور عدم آباد کے لئے کرتے۔ اس خبیث نے آشا کور کو بے آبرو کیا تھا۔ بعدازاں وہ جاوا کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔ لیکن ابھی ہم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چوپڑا پر اکثر لوگوں کو فلمی پریم چوپڑا کا ہی شبہ ہوتا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تھے اور شاید حیران بھی ہوتے تھے کہ یہ بوڑھا ولن پھر سے جوان کیسے ہو گیا۔ وہ اس صورتِ حال سے لطف اٹھاتا تھا۔

''ہم دہلی ایئرپورٹ سے سہ پہر کے وقت اڑے اور ممبئی میں پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ فضا سے ممبئی کا نظارہ دلفریب تھا۔ بحر ہند کے کنارے دور تک یہ روشنیوں اور رنگوں کا شہر پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر میں سب رنگ تھے۔ غلیظ بستیاں بھی تھیں اور عالی شان محلات بھی۔

یہاں گندی نالیوں میں کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے لوگ بھی تھے اور شان و شوکت کی اونچی مسندوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے سپر اسٹار بھی۔ یہ انڈیا کی فلم نگری تھی۔ تضادات سے بھری ہوئی اور گلیمر میں لتھڑی ہوئی اور ہم یہاں لینڈ کر رہے تھے۔ میں اور عمران دانش۔ ایک ایسا مشن ہمارے سپرد تھا جو کچھ لوگوں کو آرا کوئے کی صورت میں بے انتہا دولت دے سکتا تھا اور جس کی کامیابی کئی بین الاقوامی طالع آزماؤں میں تہلکہ مچا سکتی تھی۔ گوشت کے پہاڑ ریان ولیم جیسے وہ سب لوگ جو آرا کوئے کے پیچھے تھے...... اور سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ڈان، گینگسٹر، جواری اور فتنہ ساز۔ یہ لوگ آرٹ کے اس نادر نمونے کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ اس نمونے کی خاص شہرت اس کی طلب میں مزید شدت پیدا کر رہی تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ آرا کوئے کا مطلب وہ مورتی ہے۔ جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں کی حفاظت بھی کرتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دوسری جنگ عظیم کے چھ واقعات بھی بڑے وثوق سے بیان کئے جاتے تھے۔

عمران سارے راستے، چمکیلی ساڑھی والی انڈین ایئر ہوسٹس سے آنکھیں لڑاتا رہا اور مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہا کہ وہ سخت ڈانٹ کھائے گا لیکن خیریت گزری۔ ممبئی کے چتراپتی ایئرپورٹ پر ہمارا استقبال جاوا ہی کے ایک سوٹڈ بوٹڈ کارندے نے کیا۔ ہمیں ایک شاندار گاڑی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔

ہوٹل کے شاندار سوئٹ میں پہنچ کر عمران نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکی اور قمیص کے بٹن کھول کر گداز بستر پر گر پڑا۔

یہاں ہماری سہولت کا ہر سامان موجود تھا۔ وارڈ روب میں کپڑوں کے کئی جوڑے اور سلیپنگ گاؤن وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک طرف دو بڑے شولڈر بیگ رکھے تھے۔ میں نے ایک بیگ کی زپ کھولی۔ سب سے پہلے نگاہ ایک زبردست پسٹل اور اس کے میگزینز پر پڑی۔ پسٹل کا ایک شاندار سائلنسر بھی دکھائی دیا۔ فالتو ایمونیشن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں تھیں۔ دستانے، دھوپ کا چشمہ، پی کیپس، ٹارچ، ٹیلی اسکوپ، ڈیجیٹل کیمرا وغیرہ۔

عمران نے اپنے پسندیدہ برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ''سچ بتاؤ جگر! اس وقت ہم جیمز بانڈ نہیں لگ رہے۔ ایک خطرناک مشن پر ممبئی میں وارد ہوئے ہیں۔''

''جیمز بانڈ واحد ہے جمع نہیں۔'' میں نے کہا۔

''یار! واحد ہی سمجھو۔ تم تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہو۔ بس تمہاری عزت بڑھانے کے لئے تمہیں ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارر...... رے یہ غضب نہ کرنا۔ یہ ممبئی ہے پیارے۔ بچے راستہ بھول جاتے ہیں بلکہ جوان اور بوڑھے بھی بھول جاتے ہیں۔ ایسی ایسی کافر حسینائیں ہیں یہاں جو بندے کو چٹکیوں میں اڑاتی ہیں اور منٹوں میں اس کی مت مار کر اسے بیڈ روم تک پہنچا دیتی ہیں۔ خبردار، ہوشیار، یہ ممبئی ہے میرے جگر پارے...... ممبئی۔''

''لیکن جیمز بانڈ جی! ہم ممبئی میں تو نہیں آئے۔ رتنا گری جانا ہے ہمیں۔''

''مگر آج کی رات تو ممبئی میں ہی گزرے گی۔ مستقبل کے بجائے حال پر...... بلکہ کسی اچھے ڈانسنگ ہال پر نظر رکھنی چاہئے۔''

''تم رکھو نظر۔ میں تو سونے لگا ہوں۔ بشرطیکہ تم مزید بکواس نہ کرو۔''

''میرا خیال ہے کہ ثروت کی یاد ستانے لگی ہے۔ اس شہر کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ چلو فون کرلو اسے۔''

''نہیں، اب صبح ہی کروں گا۔''

''اچھا تو میں کرلوں۔''

''کس کو؟''

''یار چند ایک فرشتے ہیں یہاں۔ تم ان کو میرے موکل بھی کہہ سکتے ہو۔ ان کو ذرا حرکت میں لانا ہے۔''

اس کے بعد وہ فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ممبئی میں اور رتنا گری میں چار پانچ بندوں کو فون کیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہم سے پہلے ہی رتنا گری پہنچ چکے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بندے کا نام شیکھر بھی تھا اور یقیناً یہ مقامی ہی ہو گا۔ عمران نے شیکھر کے ساتھ بھی بے تکلفی سے بات چیت کی اور اندازہ ہوا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔

اس نے گفتگو ختم کی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! آج مجھے ایک بات بتاؤ۔ مجھے اتنا عرصہ ہو گیا تمہارے ساتھ رہتے ہوئے لیکن مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ تمہارے لئے کون لوگ کام کرتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ یہ تمہارے موکل کہاں کہاں پائے جاتے ہیں؟ میں تو ان میں سے صرف دو چار کو ہی جانتا ہوں۔ ایک یہ جیلانی۔ اس کے علاوہ اقبال، امتیاز اور شاہین وغیرہ۔''

''شاید تمہارا خیال ہے کہ میں نے اپنی کوئی خفیہ ایجنسی وغیرہ بنا رکھی ہے۔ کوئی ایسی خفیہ سروس جو منہ پر نقاب چڑھا کر مجرموں کا پیچھا کرتی ہے اور ان کو چھاپتی ہے، وطن دشمنوں کی ناک میں نکیل ڈالتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کچھ نہیں ہے یار، بس اپنے یار دوست ہیں، تعلق والے ہیں جو ضرورت پڑنے پر میری مدد کرتے ہیں۔ میں وقت پڑنے پر ان کی مدد کرتا ہوں۔''

''لیکن یہ لوگ تو ہر جگہ موجود ہیں۔ آسٹریا میں، انگلینڈ میں اور اب پتا چل رہا ہے کہ انڈیا میں بھی۔ یہ ہر بڑے شہر میں تمہاری آواز پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سسٹم کی طرح ہے۔''

''سسٹم یہی ہے جو میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔ تم دوسروں کی مدد کرو، وہ تمہاری مدد کریں گے۔ مجھے دوستیاں بنانا اور انہیں قائم رکھنا اچھا لگتا ہے۔ زندگی میں اور رکھا بھی کیا ہے یار؟''

مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا غلط...... لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔

ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی تھی جس میں مار دھاڑ اور قتل و غارت کے مناظر تھے۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر انٹرنیٹ پر دیکھے ہوئے خونی سین گھومنے لگے۔ 16 افراد کا قتل اور وہ بھی ایسے سنسنی خیز انداز میں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے خود کو گولی ماری۔ صرف ایک بندے نے مزاحمت کی اور وہ اسٹیج کے بالکل پاس سے چلنے والی رائفل کی گولیوں کا شکار ہوا۔ میں ان میں سے بس ان دو بندوں کے چہرے ہی دیکھ پایا تھا جو بچ گئے تھے۔ میں اس بارے میں عمران سے مزید تفصیلات پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ہر بار طرح دے گیا...... اسی دوران میں اچانک میری نگاہ کھڑکی سے نیچے ہوٹل کے صحن میں گئی۔ ایک گاڑی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ اس میں پچھلی نشست پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو تین ماڈرن لڑکیاں کچھ فاصلے پر کھڑی بڑے اشتیاق سے گاڑی میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں اور چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ میں نے دھیان سے کار سوار لڑکی کو دیکھا اور چونک گیا۔ وہ مشہور ایکٹریس ایشوریا رائے تھی۔ ایشوریا رائے یا پھر اس کی ہم شکل۔ تب میری نگاہ اس کی سبز ساڑھی پر پڑی۔ یہ خوب صورت ساڑھی میں نے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ سرحدی گاؤں میں جب چودھری انور کی پیلی حویلی میں ایشوریا، راجا کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی، یہی شاندار ساڑھی اس کے جسم پر تھی۔ اسی دوران

میں کار سوار ایشوریا رائے کسی بات پر مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بھی میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ اصلی ایشوریا والی مسکراہٹ سے کچھ مختلف تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی سویٹی عرف ایشوریا ہے جسے ہم پہلے شیخوپورہ میں اور پھر انڈین بارڈر کے قریب چودھری انور کے گاؤں میں دیکھ چکے ہیں۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی لڑکی کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی۔ یہ وہی لڑکی ہے ایشوریا کی ہم شکل۔ یہ پاکستان سے یہاں آئی ہے۔''

عمران نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا، اس میں سے ٹیلی اسکوپ نکالی۔ وہ بڑے دھیان سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ٹیلی اسکوپ میری طرف بڑھائی۔ میں نے فوکس درست کر کے دیکھا، وہ اب موبائل فون سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چمک تھی۔ مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ وہی سویٹی ہے جو جاوا اور سلطان چٹے کے ساتھ تھی۔ میں نے عمران کو اس بارے میں بتایا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ کندھے سے لٹکایا اور بولا۔ ''آؤ اس کا پتا کریں۔''

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میرا بازو پکڑا اور قریباً کھینچتا ہوا سوئٹ میں سے نکل آیا۔ ہم فرسٹ فلور کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے پہنچے۔ جس گاڑی میں ہمیں ہوٹل پہنچایا گیا تھا، وہ یہیں پارکنگ میں موجود تھی اور اس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ ہم گاڑی تک پہنچے اور اسے کچھ آگے لے آئے۔ سویٹی عرف ایشوریا والی سفید گاڑی اب حرکت میں آ چکی تھی۔ تاہم خوش قسمتی سے زیادہ دور نہیں گئی تھی...... سفید گاڑی سڑک پر پہنچی اور پھر ٹریفک کے سیلِ رواں میں شامل ہو گئی۔ ہم اس کے پیچھے تھے اور اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں ہو رہا۔ بس ایک خطرہ تھا کہ ہم رش میں سفید گاڑی کو کہیں کھو دیں گے۔ لیکن تعاقب کرنے والا عمران تھا۔ اس کی عقابی نظر اور ڈرائیونگ میں اس کی چابک دستی سے بچنا آسان نہیں تھا۔ نہایت مشکل ٹریفک کے باوجود ہم کسی نہ کسی طرح سفید گاڑی کے پیچھے لگے رہے۔ گاڑی ایک نیم رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور ایک عمارت کے گیٹ میں چلی گئی۔

ہم نے اپنی گاڑی عمارت کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک منی مارکیٹ کے سامنے روک دی۔ مارکیٹ میں خریداروں کی آمد و رفت تھی۔ کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر تک گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہم باہر نکلے۔ ٹہلتے ہوئے عمارت کے سامنے سے گزرے۔ کسی سرکاری ٹھیکیدار انیل مہرہ کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے پورچ میں روشنی تھی۔ گیٹ کے نچلے حصے سے ایک کتا حرکت کرتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔

ہم نے ایک شاپ سے ناریل پانی پیا۔ پھر ایک اسنیک بار سے سبزی کے رول لئے اور وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے کھائے۔ اس تمام وقت میں ہماری نگاہیں کوٹھی کے گیٹ پر ہی لگی رہیں۔ عمران کو شاید توقع تھی کہ سویٹی عرف ایشوریا جلد ہی کوٹھی سے نکلے گی اور ہم دوبارہ اس کا پیچھا کر سکیں گے لیکن عملاً ایسا ہوا نہیں۔ ہم دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھے۔

آخر میں نے کہا۔ ''عمران! یار، ہم اپنی لائن سے ہٹ رہے ہیں۔ ہمیں صبح رتنا گری کے لئے نکلنا ہے۔ وہاں اس سے کہیں زیادہ ضروری کام ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''یار! اتنی خوب صورت پاکستانی لڑکی یہاں بدنیت اجنبیوں کے درمیان ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں جاننے کا حق ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کے پاکستانی ہونے سے زیادہ اس کا خوب صورت ہونا تمہارے لئے زیادہ اہم ہے۔''

''جو بھی سمجھو لیکن جستجو کرنا ہمارا حق ہے۔''

''یہ حق استعمال کرتے ہوئے ہمیں اب دو گھنٹے ہونے والے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اس حق کو استعمال کرتے کرتے ہم اپنے رتنا گری والے فرض سے غافل ہو جائیں۔ یہ کوئی بھولی بھالی دیہاتی مٹیار نہیں ہے۔ ہوشیار، چالاک لڑکی ہے اور ممبئی میں قسمت آزمائی کے لئے اپنی مرضی سے جاوا وغیرہ کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بارے میں اگر تمہیں زیادہ ہی تجسس ہے تو بعد میں جاوا سے معلوم کر لینا......''

دو چار منٹ میں، مَیں نے عمران کو نیم رضامند کر لیا۔ ہم کوٹھی کے سامنے سے روانہ ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ کوٹھی کا گیٹ کھل گیا۔ ہم الرٹ ہو گئے۔ ہمیں توقع تھی کہ سویٹی عرف ایشوریا اپنی گاڑی پر باہر آ رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کوئی گاڑی کوٹھی سے نہیں نکلی۔ ہاں، ایک گاڑی داخل ضرور ہوئی۔ وہ تیزی سے آئی تھی اور سیدھی اندر چلی گئی تھی۔ غالباً گاڑی کی آمد سے پہلے ہی گیٹ کیپر کو علم تھا کہ گاڑی آ رہی ہے۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ گاڑی جب گیٹ میں داخل ہو رہی تھی...... ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے ہمیں ایک منظر کی جھلک نظر آئی۔ یہ جھلک شاید کسی اور نے نہ دیکھی ہو لیکن ہم دونوں چونکہ گہری نظروں سے گاڑی کو تاڑ رہے تھے، اس لئے ہم دیکھ پائے۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ تیزی سے کھلا...... مگر تھوڑا سا کھل کر دوبارہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کے درمیان ہم نے گلابی کپڑوں والی کسی عورت کی جھلک دیکھی۔ وہ جیسے گاڑی

سے باہر نکلنا چاہ رہی تھی۔ لیکن کسی نے دروازہ بند کر کے اسے زبردستی روک دیا تھا۔

''ہائیں...... یہ کیا تھا؟'' عمران نے دیدے گھمائے۔

''کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''اب تو یہاں رکنا ضروری ہو گیا ہے۔ یقیناً کوئی چکر چل رہا ہے یہاں۔''

''رکنے سے کیا ہوگا؟''

''تو پھر اندر چلتے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی راستہ۔''

میں نے کہا۔ ''تم بھی جانتے ہو عمران کہ ایشوریا اور دوسری لڑکیوں کو یہاں لانے والا جاوا ہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، جاوا کی زیرِ نگرانی ہو رہا ہے۔ اگر ہم مداخلت کریں گے تو جاوا کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ اس نے تو ہمیں رتنا گری جانے کے لئے روانہ کیا تھا۔''

''جاوا صاحب کمینے کو کچھ پتا چلے گا تو پھر ہے نا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب بھی تمہیں بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے اس کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگانے دو۔''

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک بغلی سڑک سے گزر کر ہم کوٹھی کے عقب میں آ گئے۔ یہاں تکون کی شکل کا ایک چلڈرن پارک تھا۔ پارک میں لائٹس کا انتظام نہیں تھا اور وہ سنسان پڑا تھا۔ کوٹھی کی عقبی دیوار پارک کی دیوار سے ملتی تھی۔ عمران نے اچھی طرح جائزہ لیا پھر بولا۔ ''چلو اندر گھستے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''سلیمانی ٹوپی پہن کر۔ ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔'' اس نے شولڈر بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں سے جدید پسٹل نکالا۔ اس پر سائلنسر فٹ کیا اور دو فالتو میگزین جیب میں رکھ لئے۔ تب اس نے بیگ کے اندر ہی سے دو نقاب نکالے۔ ایسے نقاب میں سے فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی ہیں اور یہ چہرے کو گردن تک ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ اسکائی ماسک بڑے باریک میٹریل کے بنے ہوئے تھے ان میں تین سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ عمران نے بتایا تھا کہ انہیں ''تھری ہول بالاک لاوا'' بھی کہا جاتا ہے۔

عمران نے نقاب چڑھایا اور پھر میرے چہرے پر بھی چڑھا دیا۔ یہ تجربہ زندگی میں پہلی

بار ہو رہا تھا۔ ہم کار کو لاک کر کے اترے۔ دیوار دس فٹ کے قریب بلند تھی۔ عمران کو اس پر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے پہلے مجھے ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر چڑھایا پھر خود چڑھ آیا۔ ہم بے آواز اندر کے گراسی لان میں کود ے۔ اچانک اندھیرے میں ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ ہم کوٹھی میں موجود السیشین کتے کو فراموش کر چکے تھے۔ کم از کم میں تو فراموش کر چکا تھا۔ میری نگاہوں میں وہ ہیجان خیز منظر گھوم گیا جب کچھ عرصے پہلے میں اور فتح محمد شیخوپورہ کے قریب انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے اور سلطان چٹا کے خوں خوار کتوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔

کتا تیزی سے ہمارے پاس آیا۔ اس کی آواز بلند اور انداز جارحانہ تھا لیکن پھر ایک دم ہی اس کے تیور بدل گئے۔ میں نے دیکھا، عمران اسے پچکار رہا ہے پھر وہ کتے کے بالکل قریب چلا گیا۔ اس کی گردن کو سہلانے لگا۔ اس کی تھوتنی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے ''جادو'' نے کام دکھایا۔ چند ہی سیکنڈ بعد کتا بالکل نارمل نظر آنے لگا۔ اس کی اوپر کو اُٹھی ہوئی دُم لٹک گئی پھر وہ کسی نادیدہ چیز کا پیچھا کرتا ہوا لان کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لیکن میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

ہم عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ایک سنسان کوریڈور سے گزر کر ہم ایک ایسے کمرے کے سامنے پہنچے جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ ایک عام رہائشی کوٹھی تھی۔ گرد و پیش سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکین خاصا خوش حال ہے لیکن زیادہ اعلیٰ ذوق نہیں رکھتا۔ نہایت قیمتی اشیاء بے ترتیبی سے یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

غالب گمان یہی تھا کہ سویٹی عرف ایشوریا رائے کو یہاں عیاشی کے لئے لایا گیا ہے۔ شاید نیم پلیٹ والا سرکاری ٹھیکیدار انیل مہرہ بھی آج کی رات سویٹی سے مستفید ہونے والا تھا...... بالکل جیسے کچھ عرصے پہلے یوسف فاروقی لاہور میں ''چندو'' کے شباب سے ''فیض یاب'' ہوا تھا۔ ہم ایک ایسی روشن کھڑکی کے سامنے پہنچے جس کا اندرونی پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ عمران نے اندر جھانکا۔ سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ عمران کے بعد میں نے کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ اندر کوٹھی کے ڈائننگ ہال میں ایک شاندار کلاس روم کا منظر تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ حقیقی کلاس روم نہیں بلکہ کلاس روم کا ''سیٹ'' ہے۔ بہت سی لائٹس اور دو تین جدید مووی کیمرے نظر آ رہے تھے۔ بچوں کی شاندار کرسیاں، ڈیسک، بلیک بورڈ، پروجیکٹر، اسکرین اور کمپیوٹرز وغیرہ سب کچھ اس کلاس روم میں موجود تھا۔ دو افراد اس سیٹ پر چکرا رہے تھے تاہم اداکار وغیرہ کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"یہ تو اور معاملہ نکل آیا۔ کسی فلم کے سین شوٹ ہو رہے ہیں۔" عمران نے سرگوشی کی۔

"لیکن وہ عورت کون تھی جس نے کار سے نکلنے کی کوشش کی؟" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"ہوسکتا ہے ہمیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ دروازہ اتفاق سے کھلا ہو۔"

مگر دو تین منٹ بعد عمران کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا۔ ہمیں سویٹی عرف ایشوریا نظر آئی۔ اس نے ایک ٹائٹ ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ سیٹ پر لانے سے پہلے اس کا مناسب میک اَپ بھی کیا گیا تھا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے جب ہم نے سویٹی عرف ایشوریا کو ہوٹل کی پارکنگ میں دیکھا تو وہ کافی خوش وخرم تھی مگر اب صورتِ حال بالکل برعکس نظر آتی تھی۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں میں پریشانی اور ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بہت مجبور کر کے یہاں تک پہنچایا گیا ہے۔ گول چہرے والا ایک فربہ اندام گنجا پائپ پی رہا تھا اور کیمرا مین کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ دیگر دو تین افراد بھی اس کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص اس فلم کا ہدایت کار ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے سویٹی عرف ایشوریا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اپنا اسکرپٹ سمجھ رہی ہو نا تم؟ یہ ممبئی کا ہائی فائی انگلش میڈیم اسکول ہے۔ شہر کے باحیثیت ترین لوگوں کے بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ تم یعنی ایشوریا رائے اپنی ایک دوست کے بچے کے داخلے کے لئے یہاں آئی ہو...... پرنسپل کا شوہر جو دراصل اس "اسکول چین" کا مالک بھی ہے، شراب کے نشے میں دھت دفتر میں بیٹھا ہے۔ وہ دفتر کا اندرونی دروازہ کھول کر تمہیں اس خالی کلاس روم میں لے آتا ہے۔ سب کچھ بڑے نیچرل انداز میں شوٹ ہوگا۔ بے حد نیچرل انداز میں۔ جیسے یہ کسی خفیہ کیمرے سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے کبھی کبھی تم دونوں جزوی طور پر فریم سے آؤٹ بھی ہو جاؤ گے...... یعنی صرف تمہارا بالائی یا نیچے کا دھڑ کیمرے میں نظر آئے گا۔ ہم باہر سے ابھرنے والی بے ڈھنگی آوازوں کو بھی "ڈبنگ" میں شامل کریں گے۔ بات سمجھ رہی ہو نا تم؟"

سویٹی عرف ایشوریا خاموش تھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ ڈائریکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر گرج کر بولا۔ "اے آنسو کیوں بہا رہی ہے؟ کس کا دیہانت ہوگیا ہے تیرے خاندان میں؟"

سویٹی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ڈائریکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "پلیز راج صاحب...... پلیز...... مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ میں نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتی...... حرام زادی! کیوں نہیں؟ فلموں میں کام کرنے کے لئے نہیں آئی تھی یہاں؟ تجھے فلم میں ہی لے رہے ہیں نا۔"

"ایسی فلموں کے لئے نہیں آئی تھی۔ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔"

"کتے کی بچی! بات تو ایسے کر رہی ہے جیسے کسی مندر کی پوتر گوپی ہو۔ کیا کیا نہیں ہوا تیرے ساتھ؟ کتنے لوگ تیرے شریر کو شرابی کتوں کی طرح بھنبھوڑتے رہے ہیں۔ اب یہ کیمرے کے سامنے ہو جائے گا تو کون سا آسمان ڈھے جائے گا۔"

"مم...... میرے لئے تو آسمان ہی ڈھے جائے گا جی۔ میری بدنامی کے اشتہار لگ جائیں گے۔ مم...... میں کیسے جاؤں گی پاکستان؟"

"تُو نے اب وہاں جا کر کرنا بھی کیا ہے۔ یہیں پر تیری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں جانے والا ہے۔ تیرے لیکھ چمکنے والے ہیں چندر مکھی۔" ڈائریکٹر راج نے دانت پیس کر کہا پھر میک اَپ مین سے بولا۔ "چلو دوبارہ کرو اس کی ٹچنگ۔ بیڑا غرق کر لیا ہے آنکھوں کا ٹسوے بہا کر۔"

اب سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ سویٹی عرف ایشوریا کو یہاں کسی عیاش کی شب رنگین کرنے کے لئے نہیں لایا گیا تھا۔ یہ اور ہی چکر تھا۔ اب وہ رو پیٹ رہی تھی اور ٹھیک ہی رو پیٹ رہی تھی۔ وہ دوسری لڑکی جو کار میں یہاں لائی گئی تھی اور جس نے کار میں سے نکلنے کی کوشش کی تھی، یقیناً اس کا معاملہ بھی یہی تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

"کچھ بھی ہے، پاکستانی ہے۔ اس کو بچانا ہے۔" عمران بولا۔

اس سے پہلے کہ ہم مزید کچھ سوچتے یا کرتے، اندر کا منظر کچھ تبدیل ہوا۔ ڈائریکٹر راج کے سیل فون پر کال آئی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی آواز ہم تک صاف پہنچ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

پھر وہ ایک دم اٹین شین اور مؤدب ہوگیا۔ "جی سارو صاحب! میں بول رہا ہوں...... جی جی...... اوہ، یہ کیسے ہوا؟......" راج کے چہرے پر تاریکی سی پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا، تب پریشان لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے سارو صاحب! میں پیک اَپ کرواتا ہوں۔ او کے جی۔"

فون بند کر کے اس نے کھا جانے والی نظروں سے سویٹی کو دیکھا۔ تب اپنے کارندوں

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پولیس کے چھاپے کی اطلاع ہے۔ جلدی نکلنا ہوگا یہاں سے، پندر
منٹ کے اندر اندر سامان سمیٹو فٹافٹ، گاڑیوں میں رکھو۔''

ایک دم کھلبلی سی نظر آئی۔ تمام کارندے مصروف ہو گئے۔ کلاس روم کا ''سیٹ'' آناً فاناً
ختم کر دیا گیا۔ لائٹس، کیمرے، ساؤنڈ سسٹم سب کچھ اٹھا لیا گیا۔ چند ہی منٹ میں کلاس روم
پھر سے ڈرائنگ روم نظر آنے لگا۔ سویٹی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ خوش قسمتی سے ہم
اپنی جگہ پر محفوظ کھڑے رہے۔ پورچ کی طرف سے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں
آئیں۔

''میرا خیال ہے یہ راج یہیں رہے گا۔''

عمران ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ راج ابھی تک کمرے میں موجود تھا اور اطمینان سے ٹی وی
لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک ہٹا کٹا ملازم بھی اس کے آس پاس ہی موجود تھا۔

......گاڑیوں کی روانگی کے آٹھ دس منٹ بعد ہی پولیس اس کوٹھی میں آن موجود ہوئی۔
اندیشہ تھا کہ کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے پولیس والے اس طرف بھی آ جائیں۔ ایسی صورت میں
ہم پیچھے ہٹ کر کوٹھی کے پائیں باغ کی طرف نکل سکتے تھے۔ پولیس کے آنے کے فوراً بعد
فربہ اندام راج اٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے سے پولیس والوں اور راج
کی مدھم آوازیں ہم تک پہنچتی رہیں۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہم پر انکشاف ہوا کہ پولیس
کوٹھی سے واپس جا رہی ہے۔ غالباً راج وغیرہ پولیس پارٹی کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہے
تھے۔ پولیس کی گاڑی واپس چلی گئی۔ بیرونی گیٹ بند ہونے کی آواز آئی۔ فربہ اندام گنجا راج
پھر سے ڈرائنگ روم میں آن موجود ہوا۔ وہ اب کافی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

اس نے ولایتی شراب کی بوتل کھولی۔ گلاس نکالا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر
کوئی تامل فلم چل رہی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں راج کے سوا بھی ایک دو ملازم ہی
ہیں۔ عمران نے دبی آواز میں کہا۔ ''چلو آؤ، ہدایت کار صاحب سے ہیلو ہیلو کریں۔''

ہم کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور گھوم کر اس حصے میں آئے جہاں سے ایک راہداری
اندرونی حصے میں جاتی تھی۔ السیشئین کتا برآمدے کی جالی کی دوسری جانب موجود تھا۔ اس
نے ہمیں دیکھا لیکن شور مچانے کی کوشش نہیں کی۔ بس دوستانہ انداز میں دُم ہلاتا رہا۔ سنی سنائی
پر شک وشبہ ہو سکتا ہے لیکن آنکھوں دیکھی کو کیونکر جھٹلایا جائے۔ ایرانی بلیوں کے بعد یہ کتا
بھی عمران کی خداداد صلاحیت کا ٹھوس ثبوت فراہم کر رہا تھا۔

پستول عمران کے ہاتھ میں تھا۔ تاہم ہم دونوں چوکس تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ کچن میں

کوئی موجود ہے۔ وہ دروازے کے بالکل پاس تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ
کیا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہوا اور ملازم پر جھپٹا۔ یہ وہی ہٹا کٹا شخص تھا جسے ہم نے کچھ دیر
پہلے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔ میری کامیابی یہی تھی کہ میں اس شخص کو آواز نکالنے کا موقع نہ
دوں اور میں کامیاب رہا۔ میں نے اس کی توانا گردن اپنے بازو میں جکڑی اور دوسرے ہاتھ
سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ اس نے چار پانچ سیکنڈ کے لئے بہت زور مارا پھر اسے پتا چل گیا
کہ ''کام بھاری'' ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور ڈری ڈری نظروں سے عمران کو
دیکھا۔ عمران نے پستول اس کے سر سے لگا دیا اور خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ کچن کا دروازہ
عمران پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد جب اس شخص نے دوبارہ مزاحمت
شروع کی تو عمران نے گھٹنے کی دو تین شدید ضربیں اس تنومند شخص کے پیٹ میں لگائیں اور
اس کا دم خم ختم کر دیا۔

اگلے دو تین منٹ میں اس شخص نے وہی کیا جو ہم نے کہا۔ اس نے بتایا کہ پولیس
واپس جا چکی ہے۔ کوٹھی میں راج صاحب اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ یہاں کچن میں
راج صاحب کے لئے تکا بوٹی مائیکرو اوون میں تیار کر رہا تھا۔ اس کا نام نجیب تھا۔

ہمارے کہنے پر اس نے اوون بند کیا اور تکا بوٹی پلیٹ میں نکال لی۔ وہ ابھی کچی تھی۔
ہم اس پلیٹ سمیت راج کے پاس ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ پلیٹ ملازم کے ہاتھ میں تھی۔
عمران پستول بدست اس کے پیچھے تھا۔ ہمارے اندر پہنچنے کے باوجود راج ہماری آمد سے باخبر
نہیں ہوا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ لرزتے کانپتے ملازم نے
پلیٹ راج کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ گوشت تقریباً کچا تھا۔

راج نے پہلے حیرت سے گوشت کی طرف اور پھر ملازم کی طرف دیکھا۔ ''اوئے، یہ
اپنی ماں کا سر لایا ہے؟''

اچانک اسے احساس ہوا کہ گڑبڑ ہے۔ اس نے رخ پھیرا۔ عقب میں ہم تھے۔ راج کا
چہرہ تاریک ہو گیا اور شراب کا گلاس اس کے ہاتھ میں ڈگمگا گیا...... ہمارے چہرے نقاب
کے پیچھے گم تھے۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے سنبھل کر پوچھا۔

عمران قدرے بھاری آواز میں بولا۔ ''تمہاری پھوپی کا اکلوتا بھائی ہوں۔ اب سمجھ لو کہ
تمہارا کون ہوں...... اور خبردار ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو۔ ورنہ گولی سیدھی سر میں جائے
گی۔'' وہ آخر میں پھنکارا۔

''ہاتھ سر سے اوپر کرو۔'' میں نے حکم دیا۔

ملازم نجیب نے تو فوراً عمل کیا مگر راج کام دکھا گیا۔ اس نے تیزی سے شیشے کی وزنی میز عمران پر الٹ دی۔ وہ شاید دو تین گنا تیزی بھی دکھاتا تو اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتا۔ عمران نے بہ آسانی خود کو میز کی زد سے بچایا۔ فربہ اندام راج نے کافی پھرتی دکھائی اور عمران پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی اس کی ٹھوکر کھا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے نجیب اور عمران نے راج کو سنبھال لیا۔ پہلے ایک آدھ منٹ میں دونوں نے مزاحمت کی لیکن پھر ان کی وہ دھنائی ہوئی جو اب تک نہیں ہوئی ہوگی۔ راج کی کلائی ٹوٹ گئی اور ملازم نجیب کے ناک منہ سے پرنالے کی طرح خون بہنے لگا۔ وہ دونوں فرش پر گرے پڑے تھے۔ ٹی وی کی اسکرین بھی چکنا چور ہو چکی تھی۔ عمران نے راج کو گریبان سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ پھر نجیب کو حکم دیا کہ وہ فرش پر بکھری ہوئی تکا بوٹی اکٹھی کر کے پلیٹ میں رکھے۔ چاروناچار نجیب نے ہدایت پر عمل کیا۔ نجیب کا بالائی لباس مکمل طور پر تار تار ہو چکا تھا۔ اس کے ورزشی جسم پر بڑے بے ہودہ ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ یہ ٹیٹو ان لوگوں کے کاروبار سے مکمل میل کھاتے تھے۔

عمران نے تکا بوٹی راج کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''کھاؤ اسے۔''

راج کراہت کا اظہار کرتا رہا لیکن جب عمران نے پستول اس کے سر پر رکھا تو اس نے عمران کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک بوٹی منہ میں رکھی۔ عمران نے دانت پیس کر کہا۔ ''کچا گوشت تو تمہیں بڑا پسند ہے۔ ہر وقت اس گوشت میں دھنسے رہتے ہو۔ اب ایسے برے منہ کیوں بنا رہے ہو؟ لڑکیوں کو نوچ سکتے ہو تو یہ گوشت بھی کھا سکتے ہو۔ کھاؤ ورنہ کھوپڑا توڑ دوں گا۔''

وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس نے بوٹی تھوک دی اور دیوانہ وار عمران پر جھپٹا۔ اس نے عمران کے سینے پر ٹکر رسید کی پھر اس کے ہاتھوں سے پستول چھیننا چاہا۔ عمران نے یہ کوشش ناکام بنائی اور اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''ٹھنڈے ہو جاؤ ورنہ بالکل ٹھنڈا کر دوں گا۔'' عمران گرجا۔

لیکن وہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ مغلظات بکتا رہا اور بڑی شدت سے ہاتھ پاؤں چلاتا رہا۔ عمران نے ایک بار پھر اسے وارننگ دی......اور پھر گولی چلا دی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ ایک سیکنڈ میں راج نے ہاتھ پاؤں پھینک دیئے۔ اس کی دیوانی مزاحمت یوں ختم ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سائلنسر لگے پستول سے زیادہ آواز بھی نہیں آئی تھی۔ عمران نے بے پروائی سے اس کی لاش فرش پر پھینکی اور اب پستول ملازم نجیب کے سر پر رکھ دیا۔ ''ہاں تمہیں بھی ٹھنڈا

ہونا ہے یا کچھ بکنا ہے؟''

نجیب کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی نظریں اپنے باس ہدایت کار راج کی لاش پر مرکوز تھیں۔ ساری زندگی ایکشن اور کٹ کہنے والے کی اپنی زندگی کا سین پہلے ہی ٹیک میں او کے ہو چکا تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں اس نجیب نامی ملازم نے وہ سب کچھ بتایا جو ہم نے پوچھا اور جو اسے معلوم تھا۔ اس کی باتوں سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ وہ ایک بنگلہ دیشی مفرور ہے اور پچھلے دس بارہ برس سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ بہرحال اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔

عمران نے اس سے پوچھا۔ ''ایشوریا کی ہم شکل پاکستانی لڑکی اب کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے اسے اب گولڈن بلڈنگ لے گئے ہیں۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ سارو صاحب کا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ ٹی وی ڈراموں اور ٹیلی فلموں وغیرہ کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ وہاں سے ایکسٹرا بھی سپلائی کیئے جاتے ہیں۔''

''یہ سارو کون ہے؟''

''بڑے باس ہیں۔ فلمیں بناتے ہیں۔''

''ایسی ہی فلمیں جیسی یہاں بننے لگی تھی؟''

''ہر طرح کا کام ہوتا ہے گولڈن بلڈنگ میں۔''

''تم بھی جاتے ہو گولڈن بلڈنگ؟''

''نہیں، وہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی خاص کام ہو تو پھر ہی بلایا جاتا ہے۔ میں بس ایک دو بار ہی گیا ہوں لیکن اندر کی جانکاری مجھے بالکل نہیں۔''

''یہ سارو صاحب اس وقت کہاں ہو گا؟''

''میرا آئیڈیا ہے کہ گولڈن بلڈنگ میں ہی ہوں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے راج صاحب کو ان کا فون وہیں سے آیا تھا۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے نجیب نے ایک بار پھر ڈری ڈری نظروں سے راج کی لاش دیکھی۔ لاش کے سر سے بہنے والا خون کمرے کی دہلیز تک جا رہا تھا۔

''اگر ہم گولڈن بلڈنگ میں جانا چاہیں تو پھر؟''

''اگر آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہاں کی طرح وہاں بھی گھسنا چاہتے ہیں تو یہ کافی مشکل ہے۔ وہاں بہت سے گارڈز ہوتے ہیں، سی سی ٹی وی کیمرے بھی لگے ہوئے ہیں۔ راج صاحب کی ہتھیا کے بعد تو وہاں بالکل ریڈ الرٹ ہو جائے گا۔''

"اس کی فکر نہ کرو۔ راج کی اور تمہاری موت کا پتا ابھی کسی کو نہیں چلے گا۔"

نجیب کے چہرے پر پھر ہلدی پھر گئی۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "میں بس ایک نوکر ہوں۔ جو حکم ملتا ہے، وہی کرتا ہوں۔ اس دھندے میں پھنس چکا ہوں۔ نکلنا چاہوں تو بھی نکل نہیں سکتا۔"

"ان فلموں میں کام بھی کرتے ہو؟" میں نے اس کے کسرتی جسم پر بنے ٹیٹوز دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ "جج...... جی ہاں...... کبھی کبھی۔"

"اچھی نوکری ہے۔ عیش کے لئے پیسا اور پیسے کے لئے عیش۔ تمہیں، تمہارے ہدایت کار کے پاس پہنچا کر ہمیں یقیناً کوئی دکھ نہیں ہوگا۔" عمران نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

نجیب کا دم خم بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر دی...... "مم...... میں مرنا نہیں چاہتا۔ آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔"

"سارو کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سنا ہے وہ چندی گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ سکھ ہیں لیکن داڑھی پگڑی وغیرہ نہیں ہے۔ ممبئی کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ ان میں فلمی لوگ بھی شامل ہیں اور فلموں سے باہر کے بھی۔ وہ چار پانچ سال پہلے ممبئی آئے تھے اور اب زیادہ تر یہیں رہتے ہیں۔ عام لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ میں نے بھی پچھلے چار پانچ سالوں میں انہیں تین چار بار ہی دیکھا ہوگا۔"

"جاوا کو جانتے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ "انہیں کون نہیں جانتا جی۔"

"جاوا اور اس سارو صاحب میں کیا تعلق ہے؟"

"جاوا صاحب، ممبئی کے چند بڑے ڈانوں میں سے ایک ہیں۔ سارو صاحب ایسے تمام 'بھائی لوگوں' سے بنا کر رکھتے ہیں۔ جاوا صاحب سے بھی ان کا ملنا جلنا ہے۔"

"ملنا جلنا ہے یا کاروبار میں ساجے داری ہے؟" عمران نے زور دے کر پوچھا۔

"میں ایک چھوٹا ملازم ہوں۔ مم...... مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں۔ ہاں...... کبھی کبھی کوئی لڑکی جاوا صاحب کے ذریعے بھی سارو صاحب تک پہنچتی ہے۔ یہ عام طور پر بڑی ایکٹرسوں کی ہم شکل لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

"یہ ایشوریا رائے کی ہم شکل، کس کے ذریعے آئی ہے؟"

"مجھے اس کا بھی پتا نہیں۔ بس راج صاحب نے اتنا بتایا تھا کہ یہ پاکستانی مال ہے۔"

راج کا ذکر کرتے ہوئے نجیب نے ایک بار پھر ڈری ڈری نگاہ اس کی خونچکاں لاش پر ڈالی۔

"اس لڑکی کے علاوہ کوئی اور پاکستانی بھی یہاں ہے؟"

"پہلے تو کوئی نہیں تھی، آج کل کا پتا نہیں۔ سنا ہے کہ انڈین فلموں میں کام ملنے کا جھانسا کھا کر کئی پاکستانی اور بنگلہ دیشی فنکارائیں یہاں پہنچ رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو تو واقعی کام مل جائے گا۔ باقی خراب ہو جائیں گی۔"

عمران نے سگریٹ سلگانے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں کے چہروں پر ماسک تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے نجیب سے مخاطب ہوا۔ "ہم آج رات اس گولڈن بلڈنگ کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے...... یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اگر تو آپ کی فلم لائن کے کسی بڑے سے واقفیت ہے تو کوئی طریقہ نکل سکتا ہے......"

"ہماری کسی بڑے چھوٹے سے واقفیت نہیں۔" میں نے کہا۔

عمران بولا۔ "اچھا، اس بات کو ایک اور طریقے سے کرتے ہیں۔ میں تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں تمہارے اس کمینے ڈائریکٹر کے ساتھ لمبا لٹا کر یہاں سے جاؤں گا اور یہ بات سو فیصد طے ہے۔ تمہیں صرف ایک صورت میں رعایت مل سکتی ہے۔ تم ہمیں کسی طرح اس گولڈن بلڈنگ کے اندر پہنچا دو۔ بہتر ہے کہ تم یوں سمجھو کہ تمہیں خود اس بلڈنگ میں گھسنا ہے اور اپنی جان بچانی ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں......"

"قسم کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔" عمران نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں تمہیں سوچنے کے لئے صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد بغیر کسی وارننگ کے تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" عمران نے دھکا دے کر باڈی بلڈر نجیب کو کمرے کے باتھ روم میں پھینک دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ نجیب کی اچھی طرح تلاشی لی جا چکی تھی۔ اس کے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جس سے وہ کسی سے رابطہ کر سکتا۔

"کیا تم واقعی اسے مار دو گے؟"

"اگر مدد کر سکنے کے باوجود اس نے مدد نہیں کی تو مار بھی دیں گے۔ خس کم جہاں پاک۔ اس کے پنڈے پر بنے ہوئے ٹیٹو دیکھیں ہیں تم نے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ وہ اپنی جان

بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''یار چھٹی حس بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور میرے پاس دو ڈھائی حسیں اور بھی ہیں۔ آخر چڑیلا ہوں میں...... اور وہ بھی ٹی وی چینل کا۔ ہم اُڑتی چڑیا کے پَر گنتے ہیں...... ویسے یار! ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ اُڑتی چڑیا کے پَر کیوں گنے جاتے ہیں، اڑتے چڑے کے کیوں نہیں گنے جاتے۔ جل بن مچھلی ہی کیوں ہوتی ہے، مچھلا کیوں نہیں ہوتا۔ اللہ میاں کی گائے ہی کیوں ہوتی ہے، اللہ میاں کا بیل کیوں نہیں ہوتا۔ محاورے بنانے والوں کا زیادہ زور بھی صنفِ نازک پر ہی چلا ہے......'' ہم باتیں کر رہے تھے اور ماسک بدستور ہمارے چہروں پر موجود تھے۔

اسی دوران میں کتے کی آواز آئی۔ وہی السیشین جسے عمران نے پلک جھپکتے میں رام کر لیا تھا۔ وہ کسی طرح اندر آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں آ گیا اور ڈائریکٹر راج کی لاش کے خوفناک منظر پر توجہ دیئے بغیر عمران کے قدموں میں لوٹ لگانے لگا۔ عمران بولا۔ ''دیکھا نا میری ساڑھے آٹھ حسیات کا کمال۔ اس کو کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا...... لو دیکھو اس محاورے میں پھر صنف نازک آ گئی...... آرسی۔''

''آرسی شیشے کو یعنی آئینے کو کہتے ہیں۔''

''تو یار آئینے سے زیادہ نازک اور کون ہوگا؟ آرسی کی بوتل کو ہی دیکھو، ایک سیکنڈ میں ٹوٹتی ہے......'' وہ بے تکی ہانک رہا تھا۔

اسی دوران میں اندر سے نجیب دروازہ کھٹکھٹانے لگا اور عمران کو چپ ہونا پڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ عمران نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔ نجیب کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ ایک دم ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنا خون آلود منہ اچھی طرح دھو لیا تھا پھر بھی نتھنوں اور ہونٹوں سے خون کا رساؤ موجود تھا۔

اس نے عمران سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عمران نے صرف ایک وارننگ کے بعد راج کو گولی مار دی تھی اور نجیب کو ایک وارننگ مل چکی تھی۔ وہ عمران کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''یہ جگہ پولیس کی نظروں میں آ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب یہاں شوٹنگ نہیں ہوگی۔ سارو صاحب کو کوٹھیوں کی کون سی کمی ہے۔ شوٹنگ کا کچھ سامان ابھی یہیں پڑا ہے۔ کچھ دیر میں پروڈکشن ہاؤس...... میرا مطلب ہے گولڈن بلڈنگ سے لوڈر سامان چھوڑ کر واپس آئے گا اور باقی کا سامان لے جائے گا۔ یہ کلاس روم کا فرنیچر اور دوسری

چیزیں ہیں۔ آپ کسی طرح اس لوڈر میں سوار ہو جائیں، گولڈن بلڈنگ میں پہنچ جائیں گے۔''

اسی دوران میں ڈائریکٹر راج کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ موبائل چھوٹی میز پر دھرا تھا۔ عمران نے نجیب کو اشارہ کیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''جی ہاں...... جی ہاں...... وہ ذرا باتھ روم میں ہیں۔ ٹھیک ہے...... آپ بھیج دیں۔ ہم یہیں ہیں۔ اوکے...... اوکے......''

''کون تھا'' عمران نے پوچھا۔

''گولڈن بلڈنگ کے گودام کا منیجر۔ کہہ رہا تھا کہ لوڈر واپس آ رہا ہے۔''

''کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟''

''زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہمیں کچھ اسلحہ چاہئے۔ کوئی چیز مل جائے گی یہاں سے؟''

نجیب کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''یہ کوٹھی راج صاحب کے بہنوئی کی ہے۔ وہ آج کل انڈیا سے باہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم ایک رائفل آپ کو یہاں سے ضرور مل جائے گی۔''

نجیب کی مدد سے ہم نے کوشش کی اور ایک بیڈروم کی الماری میں سے ایک کے بجائے دو رائفلیں برآمد ہو گئیں۔ دونوں چھوٹی نال والی رشین رائفلیں تھیں۔ ایک آٹومیٹک دوسری سیمی آٹومیٹک۔ فالتو راؤنڈز بھی موجود تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مین گیٹ کی طرف سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ ہم سب کچھ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ نجیب نے اندر ہی سے بٹن دبا کر مین گیٹ کھول دیا۔ ہم نے کھڑکی میں سے دیکھا، لوڈر اندر آ کر پورچ میں رک گیا۔ تنومند ڈرائیور اترا۔ وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ ممبئی کی جرم زدہ گلیوں کا مخصوص چہرہ۔ رنگ سانولا، کانوں میں مرکیاں، ٹیکنی کلر شرٹ۔ نجیب نے کھڑکی میں سے اسے آواز دی۔ ''اندر آ جاؤ موہن۔''

''کہاں ہو؟'' اس نے کہا اور جھومتا ہوا سا کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ بے خبر تھا کہ یہاں ایک بڑی مصیبت اس کا انتظار کر رہی ہے اور اس کی آج کی رات سخت تکلیف اور اذیت کا شکار ہونے والی ہے۔ وہ کمرے میں آیا اور منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ نجیب دیوار کے ساتھ لرزہ براندام کھڑا تھا۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل تھی اور فرش پر راج کی بے گور و کفن لاش پڑی تھی۔

لاش دیکھ کر موہن بری طرح بدکا اور اضطراری کیفیت میں واپس بھاگا۔ میں راستے

میں تھا۔ میں نے اسے اڑنگا لگایا اور وہ لڑھک کر کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کی توانا گردن گرفت میں لے لی۔ اس نے پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں ہی گھٹ گئی۔ اگلے پندرہ بیس سیکنڈ میں اس نے بہت زور لگایا لیکن میں نے اسے ٹس سے مس نہیں ہونے دیا۔ بندہ سمجھ دار تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ یہاں اس کی کوئی پیش نہیں چلنے والی۔ زیادہ پھڑکے گا تو کوئی ہڈی تڑوا بیٹھے گا۔ اس نے ہار مان لی۔ میں نے اسے گریبان سے کھینچ کر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ اس نے کھل نائیک کے انداز میں لمبے بال رکھے ہوئے تھے بلکہ پورا حلیہ ہی ویسا بنا رکھا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو یار! اس کی چولی کے پیچھے کیا ہے؟''

میں نے اس کی تلاشی لی۔ کچھ دیگر اشیاء کے علاوہ ایک شکاری چاقو بھی برآمد ہوا۔ یہ شخص اب وحشت زدہ نظروں سے بار بار ڈائریکٹر راج کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ عمران نے رائفل اس کے سر سے لگاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''دیکھ پیارے...... ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ آج رات دو بندے اس ڈائریکٹر صاحب کے علاوہ بھی ٹپکا چکے ہیں۔ جو کہتے ہیں چپ چاپ کرتا جا ورنہ کھل نائیک کے بجائے کل نائیک ہو جائے گا۔ یعنی ماضی کا حصہ بن جائے گا......''

بندہ واقعی معاملہ فہم تھا۔ سمجھ گیا کہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو کہنے کے مطابق کر گزرتے ہیں...... قریباً دس منٹ بعد ہم نجیب بنگالی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے باتھ روم میں بند کر چکے تھے اور دیگر سامان کے ساتھ لوڈر کے عقبی حصے میں بیٹھے تھے۔ لوڈر کے کیبن اور پچھلے حصے کے درمیان ایک مستطیل شیشہ تھا اور اس میں سے ہمیں ڈرائیور موہن کی ہر حرکت نظر آ رہی تھی۔ موہن جانتا تھا کہ آٹو میٹک رائفل کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی ہے اور اس کی کوئی مزاحمتی کوشش اس کے جیون کا چراغ گل کر سکتی ہے۔ کوٹھی کا گیٹ ہم پہلے ہی کھول چکے تھے۔ عمران نے موہن سے کہا۔ ''انجن اسٹارٹ کر...... اور چل نائیک۔''

لوڈر کوٹھی میں سے نکل آیا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گیٹ بند کر دیا۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ممبئی کی سڑکوں پر رونق تھی۔ بازاروں میں آمد و رفت تھی۔ سینماؤں کے بڑے بڑے ہورڈنگز جگمگا رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے ایک نم ہوا چل رہی تھی۔ یہ کراچی سے ملتی جلتی ایک شب تھی...... اور اس شب کے سینے میں ایک ہلچل پروان چڑھ رہی تھی۔

قریباً بیس منٹ بعد ہم مین روڈ سے ایک بغلی سڑک پر مڑے۔ دور ہی سے ہمیں گولڈن

بلڈنگ نظر آ گئی۔ اس کی پیشانی پر ''سارو پروڈکشن'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس جگمگاہٹ کے پیچھے جو کچھ تھا، وہ ہمیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہونے والا تھا۔ ہم دو جگہ گارڈز کے درمیان سے گزرے اور عمارت کے وسیع احاطے میں پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر ہم عمارت کے پچھواڑے آئے اور گودام کے اونچے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ہم نے لوڈر کے اندر سے ہی دیکھ لیا۔ گودام میں گیٹ کیپر کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی موجود تھا۔ اور یہ کوئی عام گارڈ نہیں تھا۔ ''خطرناک'' اس کے کرخت چہرے پر درج تھی۔ عمران نے سرگوشی کی۔ ''گیٹ کیپر تمہارا...... گارڈ میرا...... لیکن پہلے اس کھل نائیک کو ٹل نائیک بنانا ہے، یعنی اس کا ٹل کھڑکانا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لوڈر رک چکا تھا۔ عمران نے کیبن کی مستطیل کھڑکی کا شیشہ ہٹایا اور پستول کی ایسی جچی تلی ضرب موہن کی کنپٹی پر لگائی کہ میں ششدر رہ گیا...... جیسے کوئی جادو ہوا تھا۔ موہن بے آواز ڈھے گیا۔ عمران نے اسے پھر سے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ گارڈ گھوم کر کھڑکی کی طرف آیا۔ غالباً وہ ڈرائیور موہن سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک لوڈر سے نیچے اتر چکا تھا۔ جب گارڈ قدرے حیرت سے ڈرائیور موہن کو دیکھ رہا تھا میں نے عقب سے اسے چھاپ لیا۔ دوسری طرف عمران نے دراز قد گیٹ کیپر کو دبوچ لیا۔ یہ مختصر جدوجہد چند سیکنڈ ہی جاری رہی۔ میں نے تنومند گارڈ کا سر زور سے ایک ستون سے ٹکرا دیا۔ اس نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ستون کی دوسری ضرب نے اسے میرے ہاتھوں میں لٹکا دیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔ خلافِ توقع گیٹ کیپر نے زیادہ مزاحمت کی مگر عمران جیسے مدِمقابل سے چھٹکارا پانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ عمران نے اس کی گردن یوں اپنے بازو میں جکڑی تھی کہ اس کے لئے آواز نکالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ عمران اسے گھسیٹ کر لوڈر کے اندر لے آیا۔

میں نے گودام کا گیٹ اندر سے بند کر دیا تھا۔ میں لوڈر کے اندر گیا تو عمران نے گیٹ کیپر کو فرش پر بٹھا رکھا تھا اور اس کے سر پر سائلنسر لگا پستول تان رکھا تھا۔ گیٹ کیپر نے اپنا نام سرجیت کمار بتایا۔ وہ گیٹ کیپر اور اسٹور کیپر ہونے کے علاوہ گولڈن بلڈنگ کے گارڈز کا انچارج بھی تھا۔ اس کے مطابق بگ باس سارو صاحب گولڈن بلڈنگ میں ہی موجود تھے۔ وہ آج شام ہی دبئی سے یہاں تشریف لائے تھے۔ سرجیت سے ہماری گفتگو کے دوران میں اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ عمران کے اشارے پر سرجیت نے کال سنی۔ اس کا انداز مؤدب تھا۔ اس سے کچھ کہا گیا جس کے جواب میں اس نے کہا کہ وہ روی صاحب کو

گارڈ کے ساتھ چھوٹے ڈرائنگ روم میں بھیجتا ہے......

اس نے فون بند کیا تو عمران نے اسٹور کیپر سرجیت سے پوچھا۔ ''یہ روی صاحب کون ہے؟''

وہ بولا۔ ''ایک بڑا پروڈیوسر ہے۔ آج کل سخت مشکل میں ہے۔ اسی سلسلے میں سارو صاحب سے ملنے آیا ہے۔ سارو صاحب نے اسے چھوٹے ڈرائنگ روم میں بلایا ہے۔''

اس کے بعد عمران کی اجازت سے اسٹور کیپر سرجیت نے کسی گارڈ ارشد کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ سیٹھ روی پرشاد صاحب کو چھوٹے ڈرائنگ روم میں باس کے پاس پہنچائے۔ اس نے فون بند کیا تو عمران نے پوچھا۔ ''کیا موت پڑی ہوئی ہے اس سیٹھ روی پرشاد کو؟''

''بس لین دین کا معاملہ ہے۔ سیٹھ روی صاحب نے باس سے کوئی لڑکی منگوائی تھی شوٹنگ کے لئے۔ اس لڑکی کو حفاظت سے واپس بھیجنا سیٹھ ہی کی ذمے داری تھی لیکن وہ لڑکی کہیں نکل گئی۔ اب اسی کا لفڑا ہے۔''

''کیا لفڑا ہے؟''

''باس لڑکی مانگ رہا ہے یا اس کے بدلے میں روکڑا۔ جاوا صاحب کو تو جانتے ہوں گے آپ۔ فلم لائن کے ایسے سارے لفڑے ٹینٹے وہی ''سیٹل'' کرواتے ہیں۔ باس نے جاوا صاحب سے شکایت کر رکھی ہے اسی لئے سیٹھ روی صاحب بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔''

''لڑکی کون تھی؟'' میں نے پوچھا۔

اس کے جواب میں اسٹور کیپر سرجیت نے جو کچھ بتایا، اس سے سارا واقعہ سامنے آ گیا۔

ہمارے اندازے کے عین مطابق سارو پروڈکشن سے فلم اسٹوڈیوز والوں کو ایکسٹرا بھی سپلائی کئے جاتے تھے۔ ''سارو پروڈکشن'' سے ایک خاص کام بھی کیا جاتا تھا اور وہ یہ کہ فلم میکرز کی ڈیمانڈ کے مطابق انہیں بہ وقتِ ضرورت مشہور اداکاروں کے ہم شکل بھی مہیا کئے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو مشکل مناظر میں ڈپلی کیٹس کے طور پر استعمال کرنے کا رواج ہمیشہ سے موجود ہے۔ کچھ دنوں پہلے ایک معروف ہیروئن کو اپنے ہیرو کمل ہاسن کے ساتھ کچھ جذباتی رومانی مناظر فلمانے تھے۔ ایک دو شارٹس ایسے تھے جن کے لئے ہیروئن بالکل تیار نہیں تھی۔ اس مسئلے کے حل کے لئے سارو صاحب سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے ایک ایسی لڑکی سیٹھ روی کو دی جو اسی نوے فیصد ہیروئن سے ملتی تھی اور بیڈ روم کی نیم تاریکی میں فلمائے

جانے والے مناظر کے لئے بالکل فٹ تھی۔ معقول معاوضہ طے ہو گیا لیکن شوٹنگ کے فوراً بعد وہ لڑکی کہیں فرار ہو گئی۔ اب یہ اسی کا چکر چل رہا تھا۔

سرجیت نے ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ اعتراف بھی کیا کہ گولڈن بلڈنگ میں دیگر دھندوں کے علاوہ فحش فلموں کی میکنگ بھی ہوتی ہے۔

ہم دونوں بڑے خطرناک موڈ میں تھے، خاص طور سے عمران...... اگلے پانچ دس منٹ کے اندر عمران نے سرجیت کا وہی حال کیا جو نجیب بنگالی کا کیا تھا۔ سرجیت کے تھوبڑے پر نیل پڑ چکے تھے اور پیٹ میں شدید ضربیں آئی تھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح ہمارا ہر کہا ماننے کو تیار تھا۔ اس کے پاس ایک ایسے دروازے کی چابی تھی جو گودام کے اندر سے اندرونی عمارت کے پچھواڑے میں کھلتا تھا۔ سرجیت ہمیں اس دروازے سے گزار کر ایک خالی کوریڈور میں لے آیا۔ میرے ہاتھوں میں رائفل اور عمران کے پاس سائلنسر والا پستول تھا۔ عمران والی رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ ہمارے چہروں پر ماسک تھے اور ہم ہر طرح کی صورتِ حال کے لئے یکسر تیار تھے۔ سرجیت جانتا تھا کہ وہ ہر لحظہ عمران کے پستول کی زد میں ہے۔

خیریت گزری کہ ہمیں اس طویل کوریڈور میں ایک بالکل ٹن شخص کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا، ورنہ ہمیں گولی چلانا پڑتی۔ ٹن شرابی نے ہمارا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہم ایک ہال نما کمرے سے گزرے۔ یہاں ایک لڑکا، لڑکی گٹار تھامے میوزک ترتیب دے رہے تھے۔ ہم ان سے کچھ فاصلے سے گزرے۔ انہوں نے یا تو ہمارے ماسک والے چہروں کو دیکھا ہی نہیں یا یہ سمجھے کہ ہم یہاں کسی سیٹ پر شوٹنگ میں مصروف ہیں۔

سرجیت ہمیں ایک وسیع دفتر میں لے آیا۔ دفتر کی شان و شوکت مرعوب کر دینے والی تھی۔ یہاں مدھو بالا سے لے کر کرشمہ کپور تک اور بھارت بھوشن سے لے کر سنجے دت تک بہت سے اداکاروں کے پورٹریٹ سجے ہوئے تھے۔ حالانکہ جس قسم کے کام یہاں ہوتے تھے، ان اداکاروں سے اس پروڈکشن ہاؤس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ دفتر کے ایک حصے میں بار اور دوسرے میں سی سی ٹی وی کیمروں کے مانیٹرز تھے۔ غالباً کروڑوں روپیا اس دفتر کی آرائش پر ہی صرف کر دیا گیا تھا...... اور یہ چندی گڑھ کے سردار سارو کا مسکن تھا جس نے شکلوں کی مشابہت کو ایک بڑے کاروبار کی شکل دے رکھی تھی۔ سارو اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔

سرجیت کمار ہماری دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ ہم شیر کی کچھار میں

گھس آئے ہیں اور اپنے انجام سے قطعی بے خبر ہیں۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کسی کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ ''بکواس نہ کر روی! میں سوگند کھاتا ہوں۔ میری کُڑی نہ ملی تو تیری دس سال کی چھوکری کو ایتھے لے کر آؤں گا۔ اپنے پیو کا نہیں جو اس کو گھنگھرو نہ پہنا دوں تو...... روپا سوسائٹی کے ولایتی انگلش اسکول وچ پڑھتی ہے ناوہ؟ بس وہاں سے گھر واپس نہیں جائے گی۔ سیدھی ایتھے آئے گی۔''

وہ پتا نہیں کس کس کا نام لے کر گالیاں بکنے لگا۔ کسی دوسرے شخص نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے سر کو جیسے ہوا چڑھی ہوئی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' عمران نے سرگوشی میں سرجیت سے پوچھا۔

''یہی سارو صاحب ہیں۔ سیٹھ روی پرشاد پر برس رہے ہیں۔ وہی لین دین کا جھگڑا ہے......''

ایک اور آواز ابھری۔ ''سارو بھائی! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ مجھے جاوا صاحب کا خیال ہے۔ میں لڑنا نہیں چاہتا......''

''جاوا صاحب کو رکھو ایک طرف۔ تم نے جو توپ چلانی ہے چلاؤ۔ میں ویکھدا (دیکھتا) ہوں کون مائی دا لال یہاں سے پیسے دیئے بغیر جاندا ہے۔ لاتیں چیر دوں گا۔''

''پیسے نہ دینے کی بات کون کر رہا ہے۔ دے تو رہا ہوں پیسے۔'' دوسرے شخص نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔ یقیناً یہی روی پرشاد تھا۔ وہ بھی کوئی معمولی شخص نہیں ہوگا لیکن یہاں بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

''مجھے ابھی کے ابھی چاہی دے نے...... اسی تھاں پر۔'' سارو گرجا۔

پتا نہیں کیوں اس کی آواز مجھے کچھ سنی ہوئی سی لگی۔ شاید یہ لہجہ کسی کے لہجے سے ملتا تھا۔

لین دین کا یہ جھگڑا دس پندرہ منٹ مزید رہا۔ اس دوران میں ہم پوری طرح الرٹ رہے۔ عمران نہ صرف الرٹ رہا بلکہ سرجیت سے سوال جواب بھی کرتا رہا۔ سرجیت ہمارے خوں خوار موڈ کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اسے اندزہ ہو گیا تھا کہ ہم بڑے خطرناک ارادوں سے یہاں گھسے ہیں اور جہاں کوئی کام ہماری مرضی کے خلاف ہوگا ہم گولی چلا دیں گے۔ سرجیت یہاں کے سیٹ اَپ کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے تک جاوا کا چھوٹا بھائی اور سارو صاحب اس کالے کاروبار میں پارٹنرز تھے۔ یہ لوگ ہم شکل چہرے تلاش کرتے تھے اور پھر انہیں مختلف طریقوں سے استعمال کرتے تھے۔ کوئی دو سال پہلے دونوں صلح صفائی سے علیحدہ ہو گئے۔ اب تھوڑا عرصہ پہلے جاوا کا چھوٹا بھائی

مارا گیا اور اس سارے کاروبار کا کرتا دھرتا پھر سارو ہی رہ گیا ہے۔

عمران اور سرجیت کمار کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ فیصلہ کن لمحہ پہنچ گیا۔ ساتھ والے کمرے میں معاملہ طے ہو گیا اور روی پرشاد وغیرہ چلے گئے۔ دروازہ کھلا اور لحیم شحیم سارو صاحب اپنی تمام تر ہیبت کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر صفاچٹ تھا اور اس پر تیل چپڑا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور بدمعاش تھا۔ سارو نے دو رائفلیں اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں اور دنگ رہ گیا۔ اس کے عقب میں موجود سیاہی مائل بدمعاش نے اپنا ہاتھ تیزی سے اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھانا چاہا۔

''خبردار'' عمران پھنکارا۔ ''سیدھی ماتھے پر گولی ماروں گا۔''

دونوں ٹھٹک گئے۔ میں سارو کو دیکھ رہا تھا اور میرے دل و دماغ شدید ترین حیرت کی زد میں تھے۔ میری بصارت دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ صفاچٹ سر والا جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا، میں اسے پہلے سے جانتا تھا۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی کو کانٹوں سے بھری راہ پر گھسیٹنے اور لہولہان کرنے میں اس شخص کا اہم کردار تھا۔ یہ سارو نہیں تھا۔ سراج تھا...... سیٹھ سراج...... جس کے بیٹے واجی نے اپنے یاروں کے ساتھ مل کر ثروت کو بس اسٹاپ سے اٹھایا تھا اور میرے شب و روز کو ایک نئے رخ پر ڈالا تھا۔

میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیٹھ سراج کو یہاں اور اس روپ میں دیکھوں گا۔ سیٹھ کے بارے میں مجھے جو آخری اطلاع ملی، وہ یہ تھی کہ وہ بیرونِ ملک ہے اور کبھی کبھار کراچی میں دیکھا جاتا ہے۔

اپنی طرف اٹھی ہوئی آٹو میٹک رائفلیں اور اپنے خاص ملازم کا زخمی تھوبڑا دیکھ کر سارو یعنی سیٹھ سراج سب کچھ سمجھ گیا۔ لیکن وہ گھبرایا بالکل نہیں۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بھاری آواز میں پوچھا۔

''فرشتے، تمہارا حساب کتاب کرنے کے لئے آئے ہیں۔'' عمران بھی سکون سے بولا۔

''فرشتے تو مرنے کے بعد آندے ہیں۔''

''تو تم خود کو زندہ کیوں سمجھ رہے ہو۔ تم مر چکے ہو۔ بس تمہارا جنازہ اٹھنا باقی ہے۔''

پھر عمران مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں جگر! اس کا جنازہ اٹھنا ہی باقی ہے نا؟''

ماسک کی وجہ سے میں عمران کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ میری طرح وہ بھی اس پرانے دشمن کو پہچان چکا ہے۔ سیٹھ سراج سے عمران کا تعارف پانچ سال

پہلے اس وقت ہوا تھا جب عمران نے لاہور کی ایک سڑک پر سیٹھ کی شاندار گاڑی کو اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور پھر اس بہانے اس کی ٹھکائی کی تھی۔ اس وقت سیٹھ سراج ایک نسبتاً چھوٹا بدمعاش تھا لیکن آج وہ ایک بہت بڑا ''جرائم پیشہ'' بن چکا تھا۔ گناہوں کے نگر ممبئی میں وہ جاوا جیسے کرائم کنگز کے ساتھ رابطے رکھتا تھا اور اس کے اردگرد لٹیروں اور قاتلوں کی فوج تھی۔

سراج بڑے سکون سے بولا۔ ''تم جنازے کی گل کیوں کر رہے ہو۔ میں تو سکھ ہوں اور خالصوں کا جنازہ نہیں ہوندا...... ارتھی ہوندی ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں پورا وشواس دلاتا ہوں، تمہارا جنازہ ہی اٹھے گا کیونکہ تم سکھ ہو ہی نہیں۔ تم لاہور کی نالیوں میں گندے کیڑے کی طرح رینگتے رہے ہو اور اب یہاں آ کر سارو صاحب بن بیٹھے ہو۔''

میں نے سیٹھ سراج کے چہرے پر پہلی بار رنگ سا گزرتے دیکھا۔ اس نے اپنی شفاف ٹنڈ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''کون ہو تم...... اور یہاں وڑنے کی بے وقوفی تم نے کس اُلو دے پٹھے کے کہنے پر کیتی ہے؟''

''تمہارے اس چھوٹے سے کھوپڑے میں شاید گوبر بھرا ہوا ہے۔ تمہیں بتایا تو ہے کہ ہم فرشتے ہیں اور تمہارا حساب کتاب کرنے آئے ہیں۔''

سیٹھ سراج کے عقب میں موجود شخص نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ اس بار عمران نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا۔ ''ٹھک'' کی آواز آئی اور گولی عین اس بدقسمت شخص کی پیشانی پر لگی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے سیٹھ سراج کے پاؤں میں گرا اور ساکت ہو گیا۔ خون کی پتلی سی لکیر اس کے چہرے پر رینگنے لگی تھی۔

سیٹھ سراج نے اپنا ہاتھ دائیں طرف میز کی جانب بڑھانے کی کوشش کی۔ ''خبردار۔'' عمران دہاڑا۔

سیٹھ ساکت ہو گیا۔ عمران نے سیٹھ کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ میز کے نیچے ایمرجنسی کال کا بٹن موجود تھا۔ عمران نے سیٹھ کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ ماتھے کے درمیان گولی ماروں گا۔ فیتا ہے تو ناپ کر دیکھ لو دونوں طرف سے۔ ایک ملی میٹر کا فرق بھی نکلے تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔''

سیٹھ سراج اب اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کا پالا آج رات کچھ غیرمعمولی لوگوں سے پڑ گیا ہے۔ اس کے ساتھی کو بے دریغ شوٹ کر دیا گیا تھا اور اس کا خاص ملازم سرجیت جو خود بھی ایک کڑک شخص تھا، بالکل بے دست و پا کھڑا تھا۔ ہم نے دفتر کے دروازے اندر سے

لاک کر لئے تھے اور سی سی ٹی وی کیمروں کے تار کھینچ دیئے تھے۔

میں نے چوڑے چکلے سیٹھ سراج کی تلاشی لی اور اس کے دونوں موبائل فونز اپنے قبضے میں لے کر آف کر دیئے۔ سیٹھ سراج کی شاندار میز کی دراز میں ایک جدید پسٹل موجود تھا، وہ بھی سیٹھ کی دسترس سے دور کر دیا گیا۔

''شانتی سے بیٹھ جاؤ...... اور بات کرو۔'' عمران نے اسے حکم دیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کیا میں تمہارے منہ دیکھ سکدا ہوں؟''

''وقت آئے گا تو وہ بھی دکھا دیں گے۔ فی الحال حساب کتاب کی بات کرو۔''

''کیسا حساب کتاب؟'' وہ ساتھی کی لاش سے نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

''کیا لینا ہے اپنی اس دکان کا؟''

''کس دکان کی گل کر رہے ہو؟''

''یہ تمہاری گولڈن بلڈنگ اور اس میں ہونے والا دھندا۔ اور اس کے علاوہ بھی جو دو تین چھوٹے موٹے ٹھکانے ہیں تمہارے۔''

''میں تمہاری گل نئیں سمجھا۔''

''تمہارا یہ کاروبار خریدنا چاہتے ہیں ہم۔ سارے اسٹاک اور لائیو اسٹاک (زندہ سامان) سمیت۔''

''تم ہوش وچ ہو؟'' سراج نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔

''بارہ بج چکے ہیں لیکن تمہاری طرح ہم بھی سکھ نہیں ہیں۔ تم قیمت بولو۔ اور کسی بہت بڑی انٹرنیشنل کمپنی کے مالک نہیں ہو تم۔ بس ممبئی میں بیٹھ کر یہ ہٹی چلا رہے ہو۔ زیادہ لمبا چوڑا حساب کتاب نہیں کرنا پڑے گا تمہیں۔ دس پندرہ منٹ میں ٹوٹل جوڑ لو گے۔''

سراج کے چہرے پر اب پریشانی کے ساتھ ساتھ دلچسپی کے آثار بھی نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے بھینسے کی طرح سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو تم گولڈن بلڈنگ خریدنا چاہندے ہو؟''

''ہاں...... اور اس کے سارے سیٹ اَپ...... اور چھوکرے چھوکریوں سمیت۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دوں۔ پہلے پوری پے منٹ کریں گے پھر تمہاری تشریف پر لات ماریں گے۔''

سیٹھ سراج اُلجھی اُلجھی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''اگر تم کسی طرح کا مذاق کر رہے ہو تو یہ تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔''

''اگر تم کہتے ہو تو تمہارے اس دوسرے کتے کو بھی گولی مار کر اپنی سنجیدگی کا ثبوت دے سکتا ہوں۔'' عمران نے پستول کا رخ سرجیت کمار کی طرف کیا۔ اس کا چہرہ ٹوٹی پلیٹ جیسا ہو گیا۔ ہونٹ بے ساختہ پھڑکنے لگے۔

''کیا دے سکتے ہو؟'' سیٹھ سراج نے کہا۔ انداز ٹائم پاس کرنے والا تھا۔

''جو بھی تم شرافت کے دائرے میں رہ کر مانگو۔ اس ہٹی کی اصل قیمت سے دگنا بھی...... یا جو تم چاہو۔''

''لیکن تم ہو کون؟''

''دیکھو تم گندا کام کر رہے ہو۔ گندا کام کرنے والیاں یا کرنے والے گاہک کا نام پتا نہیں پوچھا کرتے۔ بس رقم وصول کرتے ہیں۔ تم بھی اپنی اس ہٹی کی قیمت بتاؤ۔ بیس کروڑ...... پچیس کروڑ...... بولو۔''

سیٹھ سراج کے چہرے پر اب حیرت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گلابی اردو میں بولا۔

''ماردھاڑ کے علاوہ تمہارے پاس ہور کیا ثبوت ہے کہ تم سنجیدہ ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''انٹرنیٹ ہے تمہارے پاس؟'' سیٹھ نے گھڑا سا سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ عمران بولا۔ ''اپنا کوئی پڑھا لکھا بندہ بلاؤ جو ایک اکاؤنٹ چیک کر سکے...... اور خبردار! کوئی فالتو بات نہیں۔ ورنہ وہ جنازے والی بات سچ ہو جائے گی۔''

سیٹھ سراج نے انٹرکام اٹھایا اور کسی انوپم نامی ملازم کو اندر آنے کی ہدایت کی۔ دو تین منٹ بعد ہی تیس بتیس سال کا ایک اسمارٹ سا شخص اندر آ گیا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ دفتر کا ماحول دیکھ کر وہ گھبرایا۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ واپس پلٹ جائے گا لیکن پھر سراج کے کہنے پر رک گیا اور اندر آ گیا۔ میں نے دروازہ لاک کر دیا۔

عمران نے اس سے کہا۔ ''نیٹ آن کرو۔''

وہ ایک کونے میں رکھے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا اور کانپتے ہاتھوں سے نیٹ آن کر دیا۔ عمران اس کے پاس جا بیٹھا...... اور چار پانچ منٹ تک مصروف رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسے کسی غیر ملکی بینک میں ایک بڑے اکاؤنٹ کی تفصیلات بتا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے انوپم نامی اس شخص کے چہرے پر تعجب اور مرعوبیت کے آثار نظر آئے۔ اس نے سراج سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جی سر! یہ ایک سوئس بینک اکاؤنٹ ہے۔ کسی جی جی تھری نام کی کمپنی کا ٹائٹل ہے۔ کافی بڑا اماؤنٹ موجود ہے اس میں۔''

''کتنا بڑا؟''

''کوئی ساڑھے نو ملین ڈالرز۔''

''روپے کتنے بنتے ہیں؟'' سیٹھ سراج چیخ کر بولا۔

انوپم نے انڈین روپوں میں حساب کر کے بتایا۔ ظاہر ہے رقم کروڑوں میں تھی۔ اس سے پہلے کہ سیٹھ سراج کچھ مزید پوچھتا، عمران بولا۔ ''تم نے رقم دیکھ لی۔ اب ذرا مال کے درشن بھی کراؤ۔''

''کی مطلب اے؟''

''مطلب کھوتی کا سر۔ گولڈن بلڈنگ کا سودا ہو گا۔ گولڈن بلڈنگ کی جھلکیاں تو دکھاؤ۔''

''گولڈن بلڈنگ تمہارے سامنے ہے لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں کہ تم واقعی کوئی سودا کرنا چاہندے ہو...... یہ جس کمپنی کے نام اکاؤنٹ ہے، یہ کرتی کیا ہے؟''

''آلو والے نان بیچتی ہے...... تم کو اس سے کیا۔ تم ''دھندے والیوں'' والا کام کر رہے ہو۔ وہ بس نوٹ ڈالتی ہیں اپنے گریبان میں...... سوال جواب نہیں کرتیں۔''

سیٹھ سراج کا چہرہ پہلی بار سرخ ہوا۔ لگا کہ وہ غصے سے پھٹ پڑے گا مگر وہ ابھی ایک لاش گرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے تحمل سے کام لیا۔ عمران نے انوپم نامی شخص سے کہا کہ وہ سی سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے ہمیں گولڈن بلڈنگ کے مناظر دکھائے۔

انوپم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر باس سراج کی طرف دیکھا۔ سراج کچھ دیر برے برے منہ بناتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ انوپم نے کلوز سرکٹ ٹی وی کے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے۔ تین قطاروں میں بارہ اسکرینیں روشن ہو گئیں۔ گولڈن بلڈنگ کے مختلف حصوں کے مناظر بڑی وضاحت سے نظر آنے لگے۔ یہ واقعی شاندار بلڈنگ تھی۔ وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہال نما کمرے میں کسی کلب کا سیٹ لگا ہوا تھا اور تیز روشنی میں دو نیم عریاں لڑکیاں ایک پولیس والے کو شراب پلانے اور رجھانے میں مصروف تھیں۔ ایک جگہ کوئی میٹنگ چل رہی تھی۔ گنجے اور نیم گنجے سروں والے کئی افراد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ طویل میز پر کاغذ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک نہایت آرام دہ لاؤنج میں دو نوجوان اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ گداز صوفوں پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے شراب کی بوتل کھلی پڑی تھی اور گلاس رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میں چونکا اور مجھے اپنے جسم کا خون سر کو چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اور نہیں...... واجد عرف واجی تھا۔ سراج کا وہی اوباش بیٹا جس نے چند برس پہلے اپنی ہوس ناک نظروں سے ثروت کو دیکھا تھا اور پھر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ وہی واجی تھا۔ اب یہ پہلے سے فربہ ہو چکا تھا۔ اس نے

فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ گلے میں کسی قیمتی دھات کی زنجیر تھی۔ بال بھی عجیب انداز سے بنے ہوئے تھے۔

میں دیر تک اس پر سے اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ سینے میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے کچھ اور بلند ہو گئے۔

ایک بہت بڑے ہال کمرے کے مناظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہاں کم و بیش پچاس لڑکیاں نہایت مختصر لباس میں موجود تھیں۔ ایک کوریوگرافر انہیں کسی ہیجان خیز ڈانس کی ریہرسل کروا رہا تھا۔ یہاں آرکسٹرا بھی موجود تھا۔ لڑکیاں بار بار ہیجان خیز انداز میں اپنے جسم کو حرکت دیتی تھیں اور پھر سوالیہ نظروں سے کوریوگرافر کو دیکھنے لگتی تھیں۔ ایک دوسری اسکرین پر چار خوبرو لڑکیاں کھانے کی میز پر کھانا کھاتی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شکل واضح طور پر معروف انڈین ہیروئن کاجل سے ملتی تھی۔ دیگر تین بھی غالباً اسی طرح کسی نہ کسی سیلیبریٹی کی ہم شکل تھیں۔ عین ممکن تھا کہ پاکستان سے لائی جانے والی سویٹی عرف ایشوریا بھی یہیں کہیں بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہو۔ مجھے وہ مناظر یاد آ گئے جب وہ کچھ دیر پہلے ٹھیکیدار انیل کی کوٹھی میں ڈائریکٹر راج کی منت سماجت کر رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چالبازوں کے جال میں پھنسی ہوئی کئی اور پاکستانی لڑکیاں بھی یہاں موجود ہیں۔

انوپم، کنٹرول پینل پر مختلف بٹن دبا رہا تھا۔ ایک اسکرین روشن ہوئی تو اس پر گودام کا منظر نظر آیا۔ لوڈر اسی طرح کھڑا تھا۔ لوڈر کے دروازے کے پاس بے ہوش گارڈ کا بے حرکت جسم پڑا تھا۔

عمران نے اوپر والی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’اس میٹنگ میں کیا چل رہا ہے اور کون بندے ہیں یہ؟‘‘

’’اپنے بندے ہی ہیں۔‘‘ سراج نے اجڈ انداز میں کہا۔

’’میں نے سوالیہ نظروں سے انوپم کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ’’اپنی کمپنی کے لوگ ہی ہیں۔ نئی بھرتی کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں۔‘‘

’’نئی بھرتی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں...... ہم شکل لوگوں کی تلاش کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ اب ہم پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش اور نیپال وغیرہ میں بھی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے نئے ورکروں کی ضرورت ہے۔ اسی کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔‘‘

اسی دوران میں میٹنگ ہال میں سے موٹی توند والے ایک مہاشے نے انٹرکام پر کال

کی۔ یہ کال سراج کے دفتر میں ہی آئی۔ میرے اشارے پر سراج نے ریسیور اٹھایا...... ’’کی گل اے؟‘‘

اندازہ ہوا کہ اسے میٹنگ ہال میں بلایا جا رہا ہے۔ سراج نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ’’میرا او ہاں جانا ضروری ہے۔‘‘

’’پر تمہارا یہاں رہنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔‘‘ عمران نے کہا۔

سیٹھ سراج کچھ دیر پھاڑ کھانے والی نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور کال کرنے والے سے بولا۔ ’’میں ابھی نہیں آسکدا۔ ضروری کام ہے۔ واجد کو بھیج رہا ہوں۔‘‘

انٹرکام بند کر کے اس نے دوسرا بٹن دبایا۔ اسکرین نمبر 4 پر واجد اپنی ساتھی لڑکی اور دوست کے ساتھ بیٹھا بدستور فلم دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سراج نے بیٹے کو میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے کہا اور انٹرکام بند کر دیا۔

میں نے اس دوران میں آفس کی ایک الماری کھولی تھی اور فائلوں کی ورق گردانی بھی کی تھی۔ ایک فائل مجھے اہم معلوم ہوئی۔ اس میں سارو پروڈکشن کے اہم لوگوں کے نام بھی موجود تھے۔ آٹھ دس نام تھے۔ یہ تقریباً سارے ہی ممبئی کے جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ان میں سے فقط ایک اپنے نام کے اعتبار سے سکھ معلوم ہوتا تھا، باقی ہندو تھے۔ میٹنگ میں بھی پگڑی والا ایک سیٹھ نما سکھ موجود تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہی لوگ ہیں جو اس پروڈکشن کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

میں نے یہ فائل عمران کو دکھائی اور اپنا تجزیہ بھی بیان کیا۔ عمران نے مجھے پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کی اور انوپم کو گن پوائنٹ پر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ فائل بھی اس کے پاس تھی۔

عمران اور میں بات چیت کرتے ہوئے دانستہ ہندی کے لفظ بھی استعمال کر رہے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ ہماری پہچان کے بارے میں ان لوگوں کو غلط فہمی رہے۔

سیٹھ سراج اب بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذرا سا موقع ملنے پر بھی کوئی کارروائی ڈال دے گا۔ میں اسے یہ ذرا سا موقع دینے پر ہرگز تیار نہیں تھا...... دوسرے کمرے میں انوپم کے بری طرح چلانے کی آوازیں آئیں۔ سیٹھ سراج مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ میں نے رائفل سے اس کے سر کا نشانہ لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی تو وہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ اس کی نگاہیں میرے ماسک کے پار دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ جاننا چاہ

ہم کون ہیں؟ میں بھی اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں۔ لیکن ابھی شاید اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ بہت دبنگ بدمعاش بن چکا تھا تو میں بھی وہ کم ہمت تابش نہیں رہا تھا جسے سراج اور اس کے ساتھیوں نے لاہور کے ایک پارک میں روئی کی طرح دھنک دیا تھا۔ میری جون بدل چکی تھی۔ میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے انسان کو چیونٹی کی طرح مسلنا آ گیا تھا اور آج میں سیٹھ سراج کو بتانا چاہتا تھا کہ جب اس جیسے سفاک، میرے جیسے عام لوگوں پر باعزت زندگی کے دروازے بند کرتے ہیں تو پھر ان کے لئے کیسے کیسے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ کسی انجان سمت کا رخ کر لیتے ہیں، نشوں میں ڈوب جاتے ہیں، خودکشیاں کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی میری طرح انہیں کوئی عمران مل جاتا ہے۔ وہ اپنی [illegible] اٹھاتے ہیں، ہتھیار تولتے ہیں، آنکھوں میں چنگاریاں جلاتے ہیں اور ظالموں کے سر پر موت کی بجلی بن کر چمک جاتے ہیں...... ہاں، میں آج سیٹھ سراج کو بتانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں سائڈ والے [illegible] کا دروازہ کھلا اور انوپم لڑکھڑاتا ہوا سا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر نیلگوں نشان تھے اور ایک آنکھ [illegible] سوجتی جا رہی تھی۔ عینک کا کہیں پتا نہیں تھا۔

عمران نے اسے سرجیت کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بے چون و چرا بیٹھ گیا۔ عمران نے سراج کو مخاطب کر [illegible] بات ہے سیٹھ سراج کہ تمہارے قریبی ساتھی بھی اس وقت یہیں تمہارے ساتھ موجود ہیں، میٹنگ ہال میں۔"

اپنے لئے سیٹھ سراج کا لقب سن کر سیٹھ بری طرح چونکا۔ "کون سیٹھ سراج؟" اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"تم سیٹھ سراج! مالک سراج پلازا۔ سکنہ لاہور...... لاہور کے ماتھے کا بدنما داغ ہو تم۔ تم جیسوں کی کوئی قومیت ہوتی ہی نہیں۔ تم بس مال زادے ہو۔ سونے کی چمک دیکھ کر ہر طرح کی غلاظت میں ڈبکی لگاتے ہو اور اس کا حصہ بن جاتے ہو۔"

"پتا نہیں تم کیا بک رہے ہو؟"

"میں جو بک رہا ہوں تمہاری کھوپڑی میں اچھی طرح آ رہا ہے لیکن تم مان نہیں رہے ہو...... نہ مانو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہمیں بس سودا کرنا ہے۔ اچھی بات ہے کہ تمہارے ساجھے دار بھی یہاں موجود ہیں۔ بس دو کی کمی ہے، ان کو بھی بلا لو۔"

"کیا کروں گا ان کو بلا کر؟"

"سودے کی بات چیت۔"

"اتنی جلدی کوئی سودا شودا نئیں ہوسکدا۔" سراج نے منہ بنایا۔

"چلو شروع کی گل بات تو ہو ہی سکتی ہے نا۔ پرسوں ایک میٹنگ اور رکھ لیں گے۔ تمہارا سودا ہمیں پسند آیا ہے۔ آشا ہے کہ تمہاری ڈیمانڈ بھی پسند آ جائے گی۔"

سیٹھ نے کہا۔ "اگر ہم نے یہ سودا نہ کرنا ہوئے تو پھر؟"

"پھر تم گھاٹے میں رہو گے۔ ہم پہلے سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں پھر دوسرے طریقے برتتے ہیں۔"

"دھمکیاں دے رہے ہو؟"

"کہو تو ابھی عمل کر کے بھی دکھا دیتا ہوں اور عمل کی شروعات تمہارے ان دونوں بندوں سے کر دیتا ہوں۔" عمران نے پستول سرجیت کمار کی طرف سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ پھر ٹوٹی پلیٹ جیسا ہو گیا اور اس دفعہ پلیٹ واقعی ٹوٹ بھی گئی۔ عمران نے بغیر کسی وارننگ کے گولی چلائی جو سیدھی سرجیت کمار کے منہ میں لگی اور اس کے دانت توڑتی ہوئی اس کے تالو میں گھس گئی۔ وہ بیٹھا بیٹھا "دھپ" سے قالین پر گرا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خم دار چاقو دبا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ اس نے کہاں چھپا رکھا تھا جو تلاشی میں بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ چند سیکنڈ میں سرجیت کی بے جان مٹھی کھل گئی اور چاقو کا سرخ دستہ نظر آنے لگ۔ سراج اب سکتہ زدہ تھا۔ میں نے چاقو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ "یہ کافی ہے یا دوسرا ثبوت دوں؟"

انوپم کے زخمی چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ سراج نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیا چاہندے ہو تم؟"

عمران نے فائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "امرناتھ کو بلاؤ جو ساؤتھ ممبئی میں نائٹ کلب چلاتا ہے اور سارو پروڈکشن میں آٹھ فیصد کا حصے دار ہے۔ اور ٹرانسپورٹر تیواری کو بلاؤ جس نے تمہیں پچھلے سال کولکتہ سے ہیروئنی ڈیول کا سو فیصد ہم شکل لا کر دیا تھا اور جس کے صلے میں تم نے اسے اپنا منیجر بنا رکھا ہے۔"

عمران کو یہ معلومات یقیناً انوپم سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ سراج ان دونوں افراد کو بلانے میں متذبذب تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ عمران کا ارادہ اٹل ہے اور وہ اس کام میں تاخیر نہیں چاہتا تو اس نے فون پر یکے بعد دیگرے دونوں افراد سے رابطہ کیا اور انہیں فوراً گولڈن بلڈنگ پہنچنے کے لئے کہہ دیا۔

سراج نے اس ہدایت پر اس لئے بھی عمل کیا کہ شاید اسے کسی بہتری کی توقع تھی۔ اس

کا خیال تھا کہ شاید نئے آنے والوں میں سے کوئی موجودہ صورتِ حال کا پانسا پلٹ سکے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، ان دونوں افراد میں سے تیواری بڑا خطرناک شخص تھا۔ اس نے کولکتہ کی دو بنگالی بہنوں کو زبردستی گھر میں ڈالا ہوا تھا اور انہیں گھر میں ڈالنے کے لئے اس نے اڑیسہ کے علاقے میں ایک ہی خاندان کے دس افراد کو آگ میں زندہ جلا ڈالا تھا۔ اپنے مزید پیاروں کو موت سے بچانے کے لئے ان دونوں بہنوں نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ وہ تیواری کے ساتھ اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے، دوسری سالی کی حیثیت سے۔ دونوں نے اپنا مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں بھی بیان دیا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد تیواری بھی میٹنگ ہال میں پہنچ گیا۔ وہ شکل سے ہی ایک بدبودار جانور لگتا تھا۔ دوسرے شخص امرناتھ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ نشے میں اتنا دھت ہے کہ گھر سے باہر نکلنے میں ناکام رہا ہے۔

اب کورم تقریباً پورا تھا۔ مجھے عمران کے ارادے بڑے خطرناک لگ رہے تھے۔ خود میرے سینے میں بھی ایک ایسی آگ روشن تھی جس نے مجھے سرتاپا ڈھانپ لیا تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنے پرانے ''خیرخواہ'' سیٹھ سراج کو یہاں اس روپ میں دیکھوں گا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا اور میرے سارے پرانے زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ ثروت کی بربادی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ خالو عثمان اور خالہ صفیہ کے مردہ چہرے...... اور پھر اپنی ماں کا مرنا۔ اذیت کی انتہا کو چھوکر ان کا کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگانا۔ کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔ سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں سلگتے انگاروں کی طرح دبا ہوا تھا...... ایک ہوا کا منتظر تھا اور وہ ہوا آج چلی تھی۔

عمران نے کمپیوٹر انجینئر انوپم کو ہدایات دیں اور اس نے کانفرنس ہال کے کیمروں کا رابطہ کنٹرول پینل سے مکمل طور پر منقطع کر دیا۔ اس دوران میں، مَیں الماریوں کی تلاشی لیتا رہا۔ ایک الماری سے جدید قسم کی چابیوں کے دو بڑے گچھے ملے۔ عمران نے سیٹھ سراج سے معلومات حاصل کیں کہ کانفرنس ہال سے باہر کتنے گارڈز ہیں اور ان کے پاس کیا اسلحہ ہے۔ اس کے بعد ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

ہم نے سیٹھ سراج اور انوپم کو گن پوائنٹس پر رکھا اور دفتر سے نکل کر ایک کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ تیس چالیس قدم چلنے کے بعد ہم اس ہال کے مین دروازے کے سامنے پہنچ گئے جہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ سیٹھ سراج کے بیان کے عین مطابق یہاں دو باوردی گارڈز مسل لنک الکا ،ازی موڈ میں کھڑے تھے۔ مجھے ان کو ہینڈز اَپ

کرانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ ہکا بکا رہ گئے۔ ''چلو، تم دونوں بھی اندر چلو۔'' عمران نے کہا۔

ہم میٹنگ ہال میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئے۔ سب سے آگے سیٹھ سراج اور انوپم تھے۔ ان کے پیچھے میں تھا، عقب میں عمران تھا۔ اس نے دونوں گارڈز کو کور کیا ہوا تھا۔ یہ گارڈز شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ہم میٹنگ ہال میں پہنچے تو طویل میز کے گرد بیٹھے افراد کے چہرے تصویرِ حیرت بن گئے۔ چند لمحے کے لئے وہ جیسے سکتے میں آ گئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے بس یہی لگا کہ میرے پیچھے ایک جھماکے کے ساتھ تیز حرکت ہوئی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مجھے اپنے پیچھے شیشے کی ایک دیوار سی نظر آئی۔ یہ دیوار فرش سے لے کر قریباً نو فٹ اونچی چھت تک چلی گئی تھی۔ عمران اور ایک گارڈ اس دیوار کے پیچھے تھے۔ گارڈ کا ایک پاؤں اس موٹی بلوری دیوار کے نیچے آ گیا تھا اور وہ زمین پر گرا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ میں ایک سیکنڈ کے لئے چکرا گیا۔ اچانک ایک پرچھائیں سی میری طرف آئی۔ ایک پتھریلا جسم مجھ سے ٹکرایا، میں دور تک لڑھک گیا۔ میری رائفل سے ایک برسٹ چلا اور چھت میں کئی سوراخ ہو گئے۔ کوئی زورآور شخص مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں پر اچھالنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں دو تین مزید افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں جانتا تھا کہ ان لمحوں میں میرے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ میں رائفل اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہ دوں۔ میں اپنی انگلی ٹریگر پر نہیں رکھ سکا تھا مگر دستہ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے پوری جان سے اسے تھام لیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ کرنے والے بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے ہیں۔ میرا پورا جسم شدید ضربوں کی زد میں آ گیا۔ پھر رائفل بھی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے لگا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلتا جا رہا ہے۔ میں مزاحمت کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ میری قمیص کے ساتھ ساتھ میرے چہرے کا ماسک بھی چیتھڑوں میں بدل چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ادھ موا کر کے چھوڑ دیا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے ساتھ آنے والا تنومند گارڈ رائفل تانے میرے سر پر کھڑا ہے۔ چکنے فرش پر اوندھے پڑے پڑے میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ شیشے کی موٹی دیوار کے دوسری طرف سے عمران نے برسٹ چلایا لیکن یہ مکمل بلٹ پروف شیشہ تھا۔ عقبی دروازہ بھی آٹومیٹک طریقے سے لاک ہو چکا تھا۔ اب عمران اور گارڈ، ہال کے قریباً 16 فٹ

ضرب 10 فٹ کے ایک مختصر حصے میں بند تھے۔ چھت بھی کافی نیچے تھی، یعنی صرف ساڑھے آٹھ نو فٹ کے قریب۔ گارڈ کا پاؤں بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور پھنسا ہوا تھا۔ جب دیوار تیزی سے نیچے آئی تھی تو یہ پاؤں اس کی زد میں آیا تھا۔ اگر گارڈ خود آ جاتا تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوتا۔ میں نے دیکھا، سیٹھ سراج عرف سارو اس آٹومیٹک بلوری دیوار کو اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سائیڈ پر ایک چھوٹا سا پینل تھا۔ اس پر لاک کا سوراخ تھا۔ سیٹھ نے اس میں تین چار انچ لمبی ایک چابی داخل کی ہوئی تھی۔ پینل پر ایک بلب بار بار اپنا رنگ بدلتا تھا، کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو جاتا تھا۔ سیٹھ سراج بار بار چابی گھما رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے ایک سبز بٹن دبا رہا تھا لیکن دیوار اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ گارڈ کا پاؤں پھنس جانے سے اس میں یقیناً کوئی خرابی واقع ہو گئی تھی۔

ان لوگوں نے مجھے ادھ موا سمجھ لیا تھا اور یہ ان کی غلطی تھی...... یا شاید ان کی غلطی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اتنی شدید چوٹیں لگائی تھیں کہ وہ مجھے مردہ یا نیم جان سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ میرے سر کو رائفل کے کندوں کی ضربوں سے پلپلا کر دیا گیا تھا۔ میرا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور ایک بازو شدید چوٹ کی وجہ سے بالکل سن ہو چکا تھا۔ مجھے ٹھیک سے علم نہیں تھا کہ اس کا کیا حال ہے۔ اگر میں یہ تمام تشدد سہہ گیا تھا اور ابھی تک پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا تو اس کی وجہ میری وہ غیر معمولی سخت جانی تھی جو میں نے پچھلے کچھ عرصے میں بتدریج حاصل کی تھی۔ پہلے اس بے مثال کردار بارونداجیکی کے ذریعے اور پھر اپنی مسلسل نفس کشی کے ذریعے۔ ہاں، میں وہ سب کچھ سہہ گیا تھا اور مجھے مارنے والے مجھے اس قابل نہیں سمجھ رہے تھے کہ میں مزاحمت کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح تھے، میں اپنی جگہ صحیح تھا۔ میرے سینے میں جو آگ بھڑک رہی تھی، اس کی حدت کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ آج برسوں بعد مجھے وہ چہرے دکھائی دیئے تھے جن کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھوں کے اندر آتشیں زخم بن گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ایک پہاڑ جیسا قرض میرے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ آج مجھے یہ قرض اتارنا تھا، یا مرنا تھا۔ مجھے یہ ''ابھی یا پھر کبھی نہیں'' والا معاملہ نظر آ رہا تھا۔

اسی دوران میں سیٹھ سراج شیشے کی دیوار کو حرکت دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے سبز بٹن دبا کر دیوار کو تین چار انچ بلند کیا۔ گارڈ نے اپنا پاؤں اندر کھینچ لیا۔ اس کے پاؤں کی ہڈیاں چُور ہو گئی تھیں اور انگلیاں باقی پاؤں سے برائے نام ہی جڑی رہ گئی تھیں۔ اس کا خون تیزی سے چکنے فرش پر پھیلنے لگا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

یہی وقت تھا جب میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی تمام تر بچی کھچی

طاقت کو جمع کیا۔ گارڈ کی رائفل کی نال میری طرف جھکی ہوئی تھی...... مجھ سے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گارڈ اتنا چوکس نہیں تھا جتنا اسے ہونا چاہئے تھا۔ اس کی چالیس پچاس فیصد توجہ شیشے کے پار اپنے تڑپتے ہوئے ساتھی پر تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنی جگہ سے جست کی اور رائفل کے بیرل پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گارڈ کی انگلی ٹریگر پر بے ساختہ دب جائے گی۔ یہی ہوا۔ رائفل سے گولی نکلی۔ میں نے بیرل کا رخ سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی رکھا تھا۔ گولی کا نشانہ سیٹھ سراج کا بیٹا واجد عرف واجی بنا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی اور وہ کندھا پکڑ کر جھک گیا۔ میں نے زوردار لات گارڈ کے سینے پر ماری۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ چکنے فرش پر دور تک لڑھک گیا۔

ایک شخص نے مجھ پر پستول کی گولی چلائی۔ میں زمین پر گرا۔ فائر خالی گیا۔ اس دوران میں، مَیں رائفل کو پوزیشن دے چکا تھا۔ میں نے پستول بردار پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ ایک گولی سیدھی اس کے سر میں لگی۔

''خبردار...... مار دوں گا۔'' میں چنگھاڑا اور اس کے ساتھ ہی رائفل کو برسٹ پر کر لیا۔

ایک اور شخص نے میز پر سے رائفل اٹھانا چاہی۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ کم وبیش پانچ گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ ''خبردار۔'' میں نے پھر وارننگ دی اور اس کے ساتھ ہی حاضرین کے پاؤں میں وارننگ برسٹ مارا۔ لکڑی کے چکنے ملائم فرش پر کئی سوراخ ہو گئے۔ زبردست تڑتڑاہٹ نے دیواریں لرزا دیں۔ میں جانتا تھا کہ اس مکمل ساؤنڈ پروف اور ''باپردہ'' کانفرنس ہال میں سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی اور کوئی نظر اندر نہیں آ سکتی۔ یہاں قیامت کا منظر تھا۔ ممبئی کے نو دس چھٹے ہوئے دولت مند بدمعاش یہاں میرے سامنے موجود تھے۔ میرے قہرناک انداز نے ان کے چہرے دھواں کر دیئے تھے۔ ''ہاتھ کھڑے کرو۔'' میں دھاڑا اور حرکت کر کے ہال کی سب سے مناسب جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہ لمبوتری طویل میز تھی جس پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سے میں ہر فرد پر بہ آسانی نگاہ رکھ سکتا تھا اور اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ ہال کمرے میں اب دو لاشیں تھیں اور سراج کا سوہنا پتر واجی اپنے لہولہان کندھے کو پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے۔ تاہم چہرہ خون میں بری طرح لتھڑا ہوا تھا اور یہ خون بار بار میری آنکھوں میں بھر کر میری بصارت کو دھندلا رہا تھا۔ میرا بالائی جسم تقریباً عریاں تھا۔

میں نے سیٹھ سراج کو حکم دیا کہ وہ شیشے کی دیوار کو اوپر اٹھائے۔

سیٹھ نے تذبذب دکھایا تو میں نے بے دریغ اس کے بیٹے کو نشانہ بنایا۔ میں نے سنگل شاٹ چلایا اور گولی واجی کے دوسرے کندھے میں اتر گئی۔ اس بار وہ لکڑی کے فرش پر ڈھے گیا اور درد سے ڈکرانے لگا۔

میرے تیور دیکھ کر سیٹھ سراج آگے بڑھا۔ اس نے لاک کے سوراخ میں قریباً چار انچ لمبی چمک دار چابی داخل کی۔ سبز بٹن دبایا اور شیشے کی دیوار اوپر اٹھا دی۔ عمران باہر آ گیا......

میرا ماسک پہلے ہی اتر چکا تھا، عمران نے بھی اپنا ماسک نوچ کر اتار دیا۔ اب ایک کی جگہ دو آٹومیٹک رائفلیں سراج اینڈ کمپنی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ ہم ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھ گئے۔ عمران نے گرج کر کہا۔ ''چلو اندر......سب اندر چلو۔''

وہ انہیں شیشے کی دیوار کی دوسری جانب بھیج رہا تھا۔

سیٹھ سراج کے چھوٹے سے ماتھے پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ تڑخ کر بولا۔ ''اوئے، کیا چاہندے ہو تم؟''

''پہلے تمہاری اس ہٹی کا سودا چاہتے تھے، اب کچھ نہیں۔ اب وہاں دیوار کے پیچھے جاؤ۔ ورنہ تیسری گولی ولی عہد واجد صاحب کے پیٹ شریف میں لگے گی۔'' عمران کی آواز میں لرزا دینے والی سفاکی تھی۔

دو تین بندے اندر چلے گئے مگر باقی وہیں کھڑے رہے۔ ان میں مکروہ چہرہ تیواری بھی شامل تھا۔ یہی خطرناک شخص تھا جس نے بٹن دبا کر شیشے کی دیوار نیچے گرائی تھی۔ بعد میں مجھ پر جست کرنے والا بھی یہی تھا۔ عمران نے کہا۔ ''دوستو! میں صرف پانچ تک گنوں گا۔ اگر تم لوگ دوسری طرف نہیں گئے تو گولی چلاؤں گا۔''

اس نے گنتی شروع کی۔ وہ چار تک پہنچا تھا جب سیٹھ سراج نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ یقیناً ''آرگو'' کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کسی گفت وشنید کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تیواری پر برسٹ چلایا اور اسے بھون کر رکھ دیا۔ لیکن وہ نصف بھونا گیا تھا۔ چار پانچ گولیوں کا برسٹ بس اس کی ٹانگوں میں لگا تھا۔ وہ تڑپ کر گرا اور پھر رینگتا ہوا سب سے پہلے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں کچھ دیر پہلے عمران موجود تھا۔ باقی افراد بھی آناً فاناً اندر گھس گئے۔ انہوں نے جیسے موت کے فرشتوں کو اپنے رُوبرو دیکھ لیا تھا۔ اب صرف سیٹھ سراج اور اس کا زخمی بیٹا واجی باہر تھے۔ عمران نے رائفل ان دونوں کی طرف سیدھی کی اور دہاڑا۔ ''تم دونوں بھی۔ آخری وارننگ دے رہا ہوں۔''

سیٹھ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ ''ٹھہرو عمران!'' میں نے کہا۔ ''اگر یہ نہیں جانا چاہتا تو رہنے دو۔''

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں میں اسے آمادہ کر لیا۔ عمران نے اپنے پہلو میں کھڑے انوپم سے کہا۔ ''شیشہ نیچے گراؤ۔'' انوپم طویل میز کے پیچھے گیا۔ اس نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی کھٹکا دبایا۔ بلٹ پروف شیشہ بمشکل ایک سیکنڈ کے اندر چھت سے نو فٹ نیچے فرش تک آ گیا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ زبردست تکنیک تھی۔ اب سراج اور اس کے بیٹے کے علاوہ سب لوگ شیشے کے دوسری جانب تھے۔ یہ ایک طرح سے 16 فٹ ضرب 10 فٹ کا کیبن سا بن گیا تھا۔ کیبن نما جگہ کی چھت پر سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں نہ صرف لوگوں کو آناً فاناً بند کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کی ایذا رسانی کا سامان بھی موجود ہے۔

میں ایذا پسند ہرگز نہیں تھا لیکن آج پتا نہیں کیوں مجھے ایذا رسانی بُری نہیں لگ رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو مار دینا چاہتا تھا جس طرح اس نے میری ماں کو مارا تھا۔ عمران نے انوپم سے پوچھا۔ ''یہ چھت پر چھوٹے سوراخ کیسے ہیں؟''

اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''وہ دائیں طرف والے سوراخ تو مائیک کے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے کیول مائیک کے ذریعے ہی بات کر سکتے ہیں۔''

''اوپر چھت والے سوراخ؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''یہ ایئر کنڈیشننگ کے سوراخ ہیں۔ کیبن کے ٹمپریچر کو باہر سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا رینج ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ مردہ لہجے میں بولا۔ ''مائنس پچاس سے لے کر پلس 250 تک۔''

''250 سینٹی گریڈ پر تو آگ لگ جاتی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''جی ہاں۔'' انوپم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ٹھیک ہے بھئی، لگا دو آگ۔'' عمران نے کہا۔ ''اور مائیک کھول دو پورا۔''

اگلے سات آٹھ منٹ بڑے لرزہ خیز تھے۔ عمران کے حکم پر انوپم کو وہ ناب گھمانا پڑی جو کیبن کے ٹمپریچر کو تیزی سے بڑھاتی تھی۔ مائیک کھلے ہوئے تھے۔ اندر موجود افراد دہائی مچانے لگے تھے۔ زخمی تیواری کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''سارو! روکو ان کو......بھگوان کے لئے روکو۔''

سارو یعنی سراج کیا کر سکتا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف اور واجی کی طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ایک لمحے میں ان کے جسم چھلنی ہو جائیں گے۔ اندر ٹمپریچر بڑھتا جا رہا تھا۔ تیواری پھر چلایا۔ ''سارو''

عمران نے مائیک میں کہا۔ ''لگتا ہے تیواری صاحب، تمہیں بڑی گرمی لگ رہی ہے۔ گرمی تو یقیناً ان نردوش لوگوں کو بھی لگی ہوگی جنہیں تم نے زندہ جلایا تھا اور ان کے علاوہ بھی پتا نہیں کتنے لوگوں کو تم نے آگ میں جھونک رکھا ہوگا۔''

اب وہ سب چلا رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ ان کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ ان کے چہرے پسینے سے تر ہوتے جا رہے تھے۔ پھر بات پسینے سے آگے نکل گئی۔ حدت سے ان کی جلد جھلسنے لگی۔ وہ شیشے کی بُلٹ پروف دیوار سے ٹکرانے لگے۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ یہ سب زندہ انسانی گوشت کے بیوپاری تھے۔ انہوں نے بس آرٹ اور فلم میکنگ کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ وہ بے رحم قصاب تھے اور آج خود کند چھری کے نیچے آ گئے تھے۔ وہ تڑپ رہے تھے اور اذیت کی شدت سے ان کی آوازیں پھٹنا شروع ہوگئی تھیں۔ عمران کے کہنے پر انوپم نے مائیک آف کر دیئے۔ پھر ایک دوسرا بٹن دبا کر شیشے کے سامنے ایک کرٹن کھینچ دیا۔ سراج سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا، شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد انوپم نے عمران کی ہدایت پر پردہ ہٹایا تو شیشے کی دوسری جانب وہ سب ختم ہو چکے تھے۔ ٹمپریچر جب ایک حد سے بڑھا تھا تو ان کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ یقیناً اس مرحلے کے بعد وہ دس پندرہ سیکنڈ کے اندر مر گئے تھے۔ وہ سب مادرزاد برہنہ پڑے تھے۔ بس کسی کسی کے جسم پر کوئی چیتھڑا رہ گیا تھا۔ یہ بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ عمران کے کہنے پر انوپم نے ایک بار پھر شیشے کے سامنے کرٹن کھینچ دیا۔

سیٹھ سراج کا پتا پانی ہو چکا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب لرزتی سی آواز میں بولا۔

''کون ہو تم؟''

میں نے اپنی پھٹی ہوئی شرٹ سے اپنا خون آلود چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ ''تم مجھے کافی حد تک پہچان چکے ہو سراج۔''

''تم...... عثمان کے بھانجے ہونا...... تابش!''

''اور خالو عثمان کے علاوہ میری والدہ کو بھی تم نے ہی مرنے پر مجبور کیا۔ میں نے تم سے کہا ہے نا کہ آج حساب کتاب کا دن ہے۔''

سیٹھ سراج کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ زندگی کی فلم میں من مانیوں کے طویل ''سیکوئنس'' کے بعد یہ وہی وقت ہے جو ہر ولن پر آتا ہے۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اب بچنے کا امکان بہت کم ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''عمران! تم اس ولی عہد واجد کا دھیان رکھو۔ میں بادشاہ سلامت سے دو دو ہاتھ کر لوں۔''

واجد کے دونوں کندھے زخمی تھے اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال بیٹھا تھا...... وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر وہ اپنی کوئی مدد کر سکتا ہے اور نہ اپنے باپ کی۔ وہ آنکھیں بند کئے بس کراہ رہا تھا۔ بلاشبہ سراج کی طرح اس نے بھی مجھے اور کسی حد تک عمران کو پہچان لیا تھا۔ ممکن تھا کہ پانچ سال پہلے کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنا شروع ہو گئے ہوں۔

ایک جانب شیشے کے ایک خوب صورت شوکیس میں دو جدید بیکال رائفلیں آویزاں تھیں ان کے نیچے اسٹیل کی ایک چمک دار کلہاڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کلہاڑی سیٹھ سراج کا خاص شوق ہے۔ اس نے جس کسی کو بری طرح دھمکانا ہوتا تھا، اسے کہتا تھا کہ...... کلہاڑی سے تیرا گاٹا اتاروں گا۔ وہ کلہاڑی کو پنجابی لہجے میں گواڑی کہتا تھا اور یہ بات ہے بھی حقیقت۔ کلہاڑی سے مرنا یقیناً مرنے والوں کے لئے بہت اذیت ناک ثابت ہوتا ہے۔ کلہاڑی کے زخم نہ تو ہتھوڑے کی طرح کند ہوتے ہیں اور نہ ہی خنجر وغیرہ کی طرح تیز دھار۔

میں نے رائفل کے کندے سے ضرب لگائی اور خوب صورت شوکیس کا شیشہ توڑ کر کلہاڑی نکال لی۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن پہلے تم ایک کام کرو۔ یہاں جو باقی گارڈز ہیں، ان کو کسی ایک جگہ جمع کر لو۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' عمران نے کہا۔ اس نے انوپم کمار سے اس بارے میں پہلے ہی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔

عمران کے حکم پر انوپم کمار نے کانفرنس ہال کے اندر سے ہی اسپیکر پر بلڈنگ کے گارڈز سے رابطہ کیا۔ اس کی آواز چھوٹے مائیکس کے ذریعے بلڈنگ کے ہر حصے میں سنی گئی، وہ بولا۔

''ہیلو گارڈز...... ہیلو گارڈز...... ایمرجنسی ہے۔ آپ سب لوگ کمرا نمبر تین میں جمع ہو جائیں۔ اعلان سارے گارڈز کے لئے ہے۔ کمرا نمبر تین میں جمع ہو جائیں...... فوراً، یہ ایمرجنسی ہے۔''

اس نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اس نے سیل فون پر ایک سینئر سکھ گارڈ سے رابطہ کیا اور تصدیق چاہی کہ تمام گارڈز کمرے میں موجود ہیں...... کانفرنس روم کے اندر ہی موجود ''کنٹرول'' کے ذریعے اس نے کمرا نمبر تین کو لاک کر دیا۔ عمران نے اپنی پتلون کی جیب میں سے دو اور اسکائی ماسک نکال لئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس ہال سے باہر جانا چاہ رہا ہوں۔ اس نے ایک ماسک میرے چہرے پر چڑھا دیا اور دوسرا اپنے لئے رکھ لیا۔ کانفرنس ہال کے ایک گوشے سے ایک چھوٹی سی جدید کیپسول لفٹ اوپر جا رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو گن پوائنٹ پر اس لفٹ میں لے آیا۔ وہ اڑیل ٹٹو کی طرح آسانی سے نہیں اٹھا لیکن جب میں نے اس کے پاؤں کے قریب رائفل سے فائر کئے تو اس کو لفٹ میں آتے ہی بنی۔ لفٹ چند سیکنڈ میں ہمیں گولڈن بلڈنگ کی چھت پر لے آئی۔ یہ چوتھی منزل کی چھت تھی۔ ہم دونوں باہر نکلے۔ چھت بالکل خالی تھی۔ بس ایک طرف تھوڑی سی آگ جل رہی تھی اور چائے کے دو کپ اور سگریٹ کے ٹوٹے وغیرہ پڑے تھے۔ اندازہ ہوا کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں ایک دو گارڈز موجود تھے۔ میرے جسم پر نیل ہی نیل تھے۔ ایک ہاتھ کا انگوٹھا شاید ٹوٹ گیا تھا۔ سر میں درد سے دھماکے ہو رہے تھے۔ لیکن یہ ساری اذیت مجھے مزہ دے رہی تھی۔

خنک ہوا نے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ میں نے رائفل ایک طرف رکھی اور کلہاڑی کا پہلا بے رحم وار سیٹھ سراج کے کندھے پر کیا۔ یہ کاری ضرب تھی۔ سیٹھ سراج کا تنومند جسم دہل گیا۔ کھڑکھڑاتی سفید قمیص کے نیچے چربی دار گوشت بھی کٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو سراج...... گواڑی کی مار واقعی بُری ہوتی ہے۔''

موت کو سامنے دیکھ کر سراج نے آخری کوشش کی۔ وہ دیوانہ وار میری طرف آیا لیکن اس کے بھاری جسم میں وہ تیزی نہیں تھی جو اس قسم کی صورتِ حال میں اس کی مدد کر سکتی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ قریباً پانچ فٹ لمبے دستے والی کلہاڑی ایک بار پھر گھومی۔ اس بار سیٹھ سراج کی کلائی پر زخم لگا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور خون فوارے کی طرح بہہ نکلا۔ یہ اتنی تکلیف دہ چوٹ تھی کہ سیٹھ چلا اٹھا اور کلائی پکڑ کر دہرا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''سراج! یہ تو ''شروع اسٹارٹ'' ہے۔ ابھی ایسے بہت سے پھٹ تجھے لگنے ہیں۔ تُو واقعی ''سائنس داں'' ہے۔ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ گواڑی سے مرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گولی سوراخ کر دیتی ہے، چاقو چیر دیتا ہے لیکن یہ مارتی بھی ہے اور رولتی بھی ہے۔''

سیٹھ کی آنکھوں میں اب اذیت اور خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسے اپنا انجام ۲ فیصد نظر آ گیا تھا۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت بھی دیکھ لی تھی۔ میں

نے کہا۔ ''سراج! بندہ جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ اس میں کچھ دیر ضرور لگ سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔''

میں نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ اس مرتبہ سراج نے وار ہاتھ پر روکنے کی کوشش کی۔ اس کی ہتھیلی پر گہرا گھاؤ آیا۔

میں نے کہا۔ ''سراج! اگر گواڑی کی موت سے بچنا چاہتے ہو تو پھر نیچے چھلانگ لگا دو۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں اٹل ارادے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں اب چھت کی منڈیر سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ نیچے گولڈن بلڈنگ کا عقبی صحن تھا۔ پتھر کا فرش دودھیا لائٹ میں چمک رہا تھا۔ یہ چوتھی منزل کی چھت تھی...... سیٹھ نے میری کلہاڑی کی طرف دیکھا...... پھر نیچے دیکھا...... پھر کلہاڑی کی طرف دیکھا۔ میں بالکل ساکت کھڑا تھا۔ سیٹھ سراج کے دونوں طرف موت تھی لیکن ایک موت زیادہ اذیت ناک تھی اور سیٹھ جان چکا تھا، اب اسے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔

''جلدی کرو سراج! مجھے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔'' میں نے کلہاڑی کو ہاتھ میں گھمایا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

سیٹھ سراج نے پھر نیچے دیکھا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یہ بات تھی کہ سیٹھ کی تنگ پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ اس نے آخری بار میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر وہاں کوئی رعایت نہ پا کر دو فٹ اونچی منڈیر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ زندگی آخر تک ''جینے'' کی خواہش رکھتی ہے۔ شاید سیٹھ سراج کے ذہن میں بھی ہو کہ ممکن ہے وہ گر کر بچ جائے۔ قریباً تین من وزن کے ساتھ پچاس پچپن فٹ کی بلندی سے گرنا اور بچنا کرشمہ ہی کہلاتا۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے رائفل اٹھائی اور نیچے جھانکا۔ دودھیا روشنی میں سیٹھ کا سر دولخت نظر آیا۔ خون فرش کو رنگین کرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بلی ''مردہ سیٹھ'' سے چند فٹ کے فاصلے پر حیرت زدہ سی کھڑی تھی۔

بلندی سے اس طرح گر کر مرنے کا ''ایک منظر'' میں پانچ سال پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ''ماں جی!'' میں نے کہا اور میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

چار پانچ منٹ بعد میں کیپسول لفٹ کے ذریعے پھر ساؤنڈ پروف کانفرنس ہال میں تھا۔ یہاں میرے آنے تک ایک اور معرکہ ہو چکا تھا۔ عمران کی چلائی ہوئی گولی سیدھی واجد عرف واجی کے رخسار پر لگی تھی اور کھوپڑی توڑ کر گدی کی طرف سے نکل گئی تھی۔ واجی کی لاش

لکڑی کے فرش پر چت پڑی تھی۔ انوپم کمار سہا ہوا، دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔

''سوری شارق مجھے اسے مارنا پڑا۔'' عمران بولا۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے، یہ جب سے زخمی ہوا ہے ایک ہی جگہ بیٹھا رہا ہے۔''

''ہاں۔''

''اس کے نیچے یہ پسٹل دبا ہوا تھا۔ عمران نے مجھے ایک چھوٹا لیکن طاقتور پسٹل دکھایا۔ یہ سراج کے ساتھیوں میں سے ہی کسی کا تھا اور ہنگامے کے دوران میں گر گیا تھا۔'' عمران نے بتایا۔ ''اس نے ایک دم مجھ پر فائر کیا۔ یہ دیکھو گولی کتنے قریب سے گزری ہے۔'' عمران کی قمیص کی ایک آستین میں گولی کا سوراخ تھا۔

''بہت اچھا کیا۔'' میں نے واجی کی لاش پر نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ خون اس کی فرنچ کٹ داڑھی کو بھگو رہا تھا اور اس کے گلے میں حمائل پلاٹینیم کی زنجیر کو داغ دار کر رہا تھا۔

یہ وہ امیر زادہ تھا، عیش و قانون شکنی جس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن میری دانست میں اس سے بڑا مجرم اس کا باپ تھا جو اس کا پشت پناہ اور مربی تھا۔ جس نے اسے اپنے سے بڑا قاتل اور ہوس کار بنانے کی پلاننگ کر رکھی تھی۔

ہم کچھ دیر تک واجی کی اس اچانک موت پر بات کرتے رہے پھر عمران نے انوپم سے کہا۔ ''تم نے ہماری کافی مدد کی ہے لیکن افسوس کہ تم ہمیں ماسک کے بغیر دیکھ چکے ہو۔ دوسروں کی طرح اب تمہیں بھی مرنا پڑے گا انوپم۔''

انوپم کے چہرے کا سارا خون نچڑ گیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔''

''بس ہم یہی کہتے ہیں کہ تم مر جاؤ۔'' عمران نے اسپاٹ آواز میں کہا..... اور..... اس کی موت آسان بنا دی۔ عمران کی چلائی ہوئی گولی اس کی عین کنپٹی پر لگی اور وہ پٹ سے چوبی فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس معقول شخص کو زندہ رکھا جا سکتا تھا لیکن ہماری مجبوریاں آڑے آ رہی تھیں۔ ہمارے سامنے بدترین حالات تھے..... اسی دوران میں کانفرنس روم کے اندر تیز الارم بجنا شروع ہو گیا۔

O.....❖.....O

اب اس کانفرنس ہال میں، عمران اور میں اکیلے تھے۔ ہمارے چاروں طرف خون کے چھینٹے تھے، گولیوں کے خول تھے اور لاشیں تھیں۔ ان میں سے دس لاشیں تو اس عارضی کیبن

کے اندر تھیں جہاں ٹمپریچر آناً فاناً 250 سینٹی گریڈ تک پہنچا تھا اور ان دس افراد کو جھلسا کر مار گیا تھا۔ ان لاشوں میں اس گارڈ کی لاش بھی تھی جس کے پاؤں کا پنجہ شیشے کی بلٹ پروف دیوار کے نیچے آ کر کٹا تھا۔ ان لاشوں پر آبلے تھے اور جلے گوشت کی سڑاند اٹھ کر پورے ہال میں پھیل رہی تھی۔

طویل میز کے اردگرد پڑی لاشوں میں سراج کے بیٹے واجی کی لاش سب سے اہم تھی۔ وہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ مزے سے بیٹھا موومی دیکھ رہا تھا۔ اب وہ خود ایک دردناک کہانی کے ''انجام'' کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت یہاں یہ سب کچھ آناً فاناً شروع ہو کر آناً فاناً ہی ختم ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ یہاں ثروت موجود ہوتی اور وہ واجی کی اس خونچکاں لاش کو دیکھتی۔

الارم مسلسل بج رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یہ تو دروازہ کھول کر ہی پتا چلے گا۔ تم تیار ہو جاؤ۔'' عمران نے کہا اور اپنے چہرے پر اسکائی ماسک چڑھا لیا۔

میرے چہرے پر ماسک پہلے ہی موجود تھا۔ ہم نے ہال میں موجود تین رائفلیں، دو پستول اور کلہاڑی ایک جگہ جمع کیں اور انہیں ایک الماری کے اندر چھپا دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں بالکل تیار حالت میں موجود تھیں۔ احتیاط کے طور پر میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ نکاسی کے دروازے کے پاس ہی ایک چھوٹا کنٹرول پینل موجود تھا۔ عمران نے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے، آخر مطلوبہ بٹن ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس بٹن کے دبتے ہی ہال کے مین دروازے میں تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی۔ عمران نے بڑی احتیاط سے بٹن دبایا اور اس سلائیڈنگ ڈور کو فقط چار پانچ انچ تک ہی کھولا۔ چار پانچ انچ کی اس درز میں ڈرے ہوئے دو تین چہرے نظر آئے۔ یہ گارڈ نہیں تھے۔ یہ گولڈن بلڈنگ میں مختلف کام کرنے والے ملازم پیشہ لوگ تھے۔ عمران درز کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا تھا اس لئے یہ لوگ اندر کے مناظر وضاحت سے نہیں دیکھ سکے۔ یقیناً عمران کے چہرے پر ماسک دیکھ کر وہ چونکے ہوں گے لیکن کسی نے بھی اس ماسک کو خاص اہمیت نہیں دی۔ عینک والا ایک شخص چلا کر بولا۔

''غضب ہو گیا ہے۔ بڑے باس..... گر پڑے ہیں۔ وہ چھت سے گرے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''پچھلے صحن میں..... واجی صاحب کہاں ہیں؟ تیواری صاحب کہاں ہیں؟'' عینک والا

بری طرح ہکلا رہا تھا۔

عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ پھر پینل پر بٹن دبا کر دروازہ پورا کھول دیا۔ باہر تقریباً چھ ہراساں افراد موجود تھے۔ ان میں سے کوئی مسلح نہیں تھا۔ ”ہینڈز اَپ۔“ عمران گرجا۔ ان میں سے ایک بھاگ گیا، باقی پانچوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

ہال کے اندر کے مناظر دیکھ کر یہ پانچوں افراد ششدر تھے۔ عمران نے انہیں دھکیل کر ایک اسٹور نما کمرے میں لاک کر دیا۔

کہیں پاس ہی دھڑا دھڑ دروازہ بجایا جا رہا تھا۔ یہ کمرا نمبر تین کا دروازہ تھا۔ یہی کمرا تھا جس میں ہم نے انوپم کے مشورے سے گارڈز کو بند کیا تھا۔ گارڈز کو اب گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ ممکن تھا کہ باہر سے کسی نے انہیں سیل فون پر بتا دیا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب وہ دروازہ کھولنا چاہ رہے تھے لیکن یہ دروازہ باہر سے لگنے والی چابی ہی کھول سکتی تھی اور یہ چابی ان دو گچھوں کے اندر تھی جو ہمارے پاس تھے۔ پھر اندر سے فائرنگ کی مدھم آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ دروازے کے لاک پر فائر کر رہے ہیں۔

”یہ تو خطرناک ہے۔ یہ باہر نکل آئیں گے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے نہیں لگتا، ایسا ہو گا۔ انوپم نے کہا تھا کہ یہ دروازہ بالکل محفوظ ہے۔“

کچھ دیر تک کمرا نمبر تین کے اندر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجتی رہی، تب ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ انوپم نے ٹھیک کہا تھا۔ گارڈز دروازہ نہیں توڑ پائے تھے۔

اچانک ایک طرف سے نیلی وردی والے دو گارڈز نمودار ہوئے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ عمران نے ان کا خطرناک انداز دیکھ کر سائلنسر لگے پستول سے گولی چلائی اور وہ دونوں سر میں گولیاں کھا کر ڈھیر ہو گئیں اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اس موقع پر کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔ گارڈز کے پیچھے تین اور افراد تھے، یہ وہی لوگ تھے جو ایک سیٹ پر شوٹنگ میں مصروف تھے۔ وہ پولیس والا بھی تھا جسے نیم عریاں لڑکیاں شراب پلانے اور گناہ پر آمادہ کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ پولیس والا بھی یقیناً کوئی اداکار ہی تھا۔ دونوں گارڈز کا انجام دیکھنے کے بعد یہ تمام اراد سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

”یہاں کا منیجر کہاں ہے؟“ عمران نے پولیس کی وردی والے سے پوچھا۔

”مم...... مجھے نہیں پتا۔ میں تو یہاں ریکارڈنگ میں حصہ لینے آیا ہوں۔“ وہ ہراساں آواز میں بولا۔

اس کے ساتھی، موٹی توند والے نے کہا۔ ”منیجر تو تیواری صاحب ہیں۔ وہ اس سے

اپنے گھر پر ہوں گے۔“ اسے پتا نہیں تھا کہ تیواری اپنے جرموں کا حساب دینے کے لئے عالمِ بالا کی طرف پرواز کر چکا ہے۔

عمران بولا۔ ”میں چھوٹے منیجر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، شاید سروش نام ہے اس کا۔“

”وہ...... لاک اَپ کی طرف گئے تھے جی۔“ تیسرا بندہ بولا۔

”چلو اس کے پاس۔“ عمران نے سفاک لہجے میں کہا اور رائفل کو حرکت دی۔

ان تینوں افراد کا وہی حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ شاید انہیں ابھی تک اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ دو سیکنڈ کے اندر دونوں گارڈز موت کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ گولڈن بلڈنگ میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ہم ان تینوں افراد کو ہانک کر ایک تنگ کوریڈور میں پہنچے۔ یہاں قالین بچھے ہوئے تھے اور چھت خاصی نیچی تھی۔ موٹی توند والا سب سے آگے تھا۔ کوریڈور کے آخری سرے پر ایک کمرا نظر آیا۔ کمرے کے اندر سے کسی کے گرجنے برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

توند والے شخص نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ یہی لاک اَپ ہے۔

عمران نے کوریڈور میں نظر آنے والا ایک دروازہ کھولا۔ اس طرح کے دروازے سارے کوریڈور میں موجود تھے۔ یہ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ یہاں مساج کے لئے استعمال ہونے والے دو فٹ چوڑے کئی بیڈ پڑے تھے۔ مساج کے دیگر لوازمات بھی نظر آ رہے تھے لیکن کوئی بندی بندہ موجود نہیں تھا۔ عمران نے تینوں افراد کو کمرے میں دھکیلا۔ ”چلو ایک دوجے کا مساج کرو۔ اگر نہیں کرنا تو بس چپ چاپ لیٹے رہو۔ آواز باہر آئی تو گولی اندر آئے گی۔“

تینوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور کمرے میں چلے گئے۔ عمران نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

جو شخص لاک اَپ میں گرج برس رہا تھا، اس کی آواز اب کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ وہ کسی پر دہاڑا۔ ”دے گالی...... اب دے...... اب دے۔“

ایک بیٹھی ہوئی سی آواز صاف سنائی دی۔ ”تو کتے دا پتر......“

طمانچوں اور گھونسوں کی آوازیں آئیں۔ کسی کو بری طرح پیٹا جا رہا تھا، چند سیکنڈ بعد گرجنے والا پھر گرجا۔ ”دے گالی...... دے گالی۔“

بھرائی ہوئی آواز پھر ابھری۔ ”کتے دا پتر......“

اس بار طمانچوں اور گھونسوں کے بجائے شڑاپ شڑاپ کی آواز ابھری۔ مجھے لگا کہ یہ چرمی کوڑے کی آواز ہے۔ قریباً نصف منٹ تک کوڑا پھنکارتا رہا پھر مارنے والا دانت پیس کر پھنکارا۔ ''نکال گالی...... پھر نکال۔''

اس مرتبہ گالی دینے والے کی آواز پہلے سے بھی بلند تھی۔ وہ زہرناک لہجے میں بولا۔ ''وڈے کتے دا پتر......''

یعنی اب اس نے اپنی گالی میں وڈے کے لفظ کا اضافہ کرلیا تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ یقیناً یہ تعریف اندر والے اس شخص کے لئے تھی جو سخت مار کھانے کے باوجود بھرائی ہوئی آواز میں، مارنے والوں کو مغلظات سنا رہا تھا۔

مجھے ساگوان کے چوڑے دروازے میں کی ہول نظر آیا میں نے ذرا جھک کر ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر کے منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں اپنے میزبان جگت سنگھ کو یہاں دیکھوں گا۔ جگت سنگھ کے جسم پر کئی چوٹیں تھیں اور اس کے لباس پر خون کے پرانے اور تازہ دھبے تھے۔ اس کی پگڑی غائب تھی، کیس کھلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے اور انہیں آہنی کڑوں میں کس دیا گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں بھی دونوں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بھی کڑوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ جگت سنگھ کی طرح ایک اُور جواں سال بندہ بھی لاک اَپ میں بند تھا۔ اس نے بھی جگت کی طرح خون کے دھبوں والی خاکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

جگت کے سامنے ایک سوکھا سڑا لمبا سا شخص کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے باقی جسم کے مقابلے میں کافی بڑا اور کرخت بھی تھا۔ جسے ہم نے چمڑے کا کوڑا سمجھا تھا، وہ ربر کا ایک پائپ تھا جس کے گرد لوہے کا تار لپیٹ کر اسے مزید اذیت ناک بنا دیا گیا تھا۔

سوکھے سڑے شخص نے تیسری بار جگت سنگھ سے گندی گالی سنی تھی۔ وہ غصے سے شعلہ جوالا بن گیا۔ ربر کے پائپ سے جگت کو بے دریغ پیٹنے لگا۔ جگت کی برداشت قابلِ ذکر تھی۔ وہ تکلیف کے سبب کراہ تو رہا تھا لیکن ہار ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ مارنے والا مار کر ہانپ گیا تو چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ پھنکارا۔ ''دے گالی...... حرام کے جنے دے گالی۔''

جگت نے بے خوف پھر وہی گالی دہرائی اور اس کے ساتھ ہی مارنے والے کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو کر ایک بار پھر جگت پر پل پڑا لیکن اس دفعہ بس ایک دو ضربیں لگا کر ہی رک گیا۔ اس کی اونچی ناک چمکنے لگی اور آنکھوں میں قہر کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''کرتا ہوں تیرا علاج...... بہت گرمی ہے نا تیرے دماغ

میں...... کرتا ہوں تیرا علاج...... بلکہ تم دونوں کا۔''

اس نے پینٹ کی جیب سے سیل فون نکالا۔ اس پر نمبر پریس کیا۔ پھر ممبئی کے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''کالیے! ادھر ذرا لفڑا ہو گیا نی...... ایک بھینسے کی دُم کے نیچے آگ لگ گئی ہے۔ اس کو ذرا ٹھنڈا کرنا ہے۔ ڈاکٹر ہری کو بھیجو یہاں لاک اَپ میں اور اس سے کہو ذرا سرجری کا سامان بھی لے کر آئے...... ہاں ہاں...... بس کہہ دو تم۔ وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔''

تب اس نے جواباً جگت سنگھ کے منہ پر تھوکا اور جنونی انداز میں بولا۔ ''ابھی بتاتا ہوں تجھے...... ابھی بتاتا ہوں۔''

جگت سنگھ کو ہم نے آخری بار کوئی دس دن پہلے فرید کوٹ کے راستے میں دیکھا تھا۔ جگت نے اپنی محبوبہ آشا اور لاڈلے بھائی گوبندر کی موت کا بدلہ لینے کے لئے بڑی بہادری سے جاوا کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔ جگت اور اس کے ساتھی بے جگری سے لڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں جاوا کے چنگل سے نکالنے کی سرتوڑ کوشش بھی کی لیکن ان کی کوئی پیش نہ چلی سکی۔ جگت کے کئی ساتھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اس کا ساتھی پرتاپ سنگھ گرفتار ہوا اور جگت نے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ اور اب یہ جگت سنگھ یہاں ممبئی کی اس گولڈن بلڈنگ میں پایا جا رہا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ جاوا کے ہتھے چڑھا ہے اور پھر اس کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہاں گولڈن بلڈنگ یعنی سراج عرف سارو کے پاس پہنچ گیا ہے۔ بالکل جیسے ایشوریا رائے پہنچی تھی اور اگر کرشمہ کپور (نیتو) زندہ ہوتی تو وہ بھی پہنچتی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ تو خوب صورت لڑکیاں تھیں، جگت سنگھ جیسے شخص کا یہاں کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

میں اور عمران باری باری کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد سفید کوٹ اور عینک والا ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا میڈیکل باکس تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چھوٹے منیجر سروش کمار کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا کرنا ہے اور کیوں؟

سروش کمار زہرناک لہجے میں بولا۔ ''ہمیں یہاں کچھ ہیجڑوں کی ضرورت بھی ہے۔ سکھوں کو جب ہیجڑا بنایا جائے تو بڑے پیارے ہیجڑے بنتے ہیں۔ بال تو ان کے پہلے ہی بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ہاتھوں میں کڑے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ داڑھی مونچھ مونڈ کر جب ان کو سرخی پاؤڈر لگا دیا جائے تو ایک دم قیامت ڈھانے لگتے ہیں۔''

''کن کو ہیجڑا بنانا چاہتے ہیں آپ؟'' ڈاکٹر ہری نے پوچھا۔ ڈاکٹر ہری کو یقیناً اس خونی

ہنگامے کی کچھ خبر نہیں تھی جو اسی گولڈن بلڈنگ کے ایک حصے میں برپا ہو چکا تھا۔ وہ عام انداز میں بول رہا تھا۔

منیجر سروش نے ڈاکٹر ہری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں بندے تمہارے سامنے کھڑے تو ہیں۔''

ڈاکٹر ہری نے ذرا حیرت سے کہا۔ ''لیکن ان کو تو ''چابک والی'' میں کام کرنا تھا۔''

''چابک والی؟ وہ کون بنا رہا ہے؟''

''ڈائریکٹر ملہوترا تین نمبر میں اس کا سیٹ بھی لگا ہوا ہے۔ کاسٹ بھی ہو چکی ہے......''

دونوں میں جو مختصر بات ہوئی اس سے پتا چلا کہ ''چابک والی'' گھنٹے سوا گھنٹے کی کسی ''شارٹ فلم'' کا نام ہے جس میں ایک امیرزادی، دو شریف سکھ مزدوروں کو گناہ کی طرف مائل کرتی ہے اور ان کے نہ ماننے پر مار مار کر ان کی کھال ادھیڑتی ہے اور انہیں مجبور کر دیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہاں کمرے کے اندر صورتِ حال بدل چکی تھی۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھی نے منیجر سروش کمار کو اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ وہ انہیں ناقابلِ تلافی جانی نقصان پہنچانے پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اس نے بے رحم لہجے میں ڈاکٹر ہری کو کہا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ ڈاکٹر ہری نے اپنا میڈیکل باکس کھولا۔ منیجر سروش کا ایک کالا بھجنگ ساتھی جگت سنگھ کو بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ عمران نے دروازہ کھلوانے کے لئے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ غیر متوقع طور پر یہ ایک آسان کام ثابت ہوا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے والا کالا بھجنگ شخص ہی تھا۔ عمران کا دھکا کھا کر وہ ڈاکٹر پر گرا اور دونوں ماربل کے فرش پر دور تک لڑھک گئے۔ میڈیکل باکس بھی الٹ گیا اور سرجری کے اوزار بکھرے نظر آئے۔ منیجر نے لپک کر میز پر سے رائفل اٹھانا چاہی۔ میری چلائی ہوئی گولی سیدھی اس کے سینے میں دل کے مقام پر لگی۔ وہ چاروں شانے چت گر گیا۔ ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ وہ دہائی مچانے لگا۔ اس کی عینک دور جا گری تھی اور وہ عینک کے بغیر قریباً اندھا نظر آ رہا تھا۔ ''بھگوان کے لئے نہیں۔'' اس نے عمران کے اگلے فائر سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

میں نے اسے دھکا دے کر کمرے کے واش روم میں گرایا۔ ''اگر آواز نکالی تو مارے جاؤ گے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

یہی وقت تھا جب کہیں پاس ہی سے بہت سی عورتوں کے چلانے کی آوازیں آنے

لگیں...... ساتھ ساتھ دروازے بھی پیٹے جا رہے تھے۔ یوں لگا کہ یہ عورتیں کہیں پر بند ہیں۔ شاید انہوں نے یہاں اس کمرے کا منظر دیکھا تھا اور اب مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔

گہری رنگت والا شخص دہشت زدہ کھڑا تھا۔ اس کے قدموں میں ''منیجر صاحب'' کی خون اگلتی لاش تھی۔ میں نے میز پر رکھی رائفل اٹھا کر کندھے سے لٹکالی۔

جگت سنگھ ہمارے سامنے کھڑا تھا اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم جب سے اس گولڈن بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے، قدرے بھاری آوازوں میں بول رہے تھے۔ ہمیں آوازوں سے پہچاننا ہرگز آسان نہیں تھا۔ جگت سنگھ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے یہ خدائی مددگار کون ہیں۔ دوسری طرف عمران بھی جگت سنگھ کی صورت سے ناآشنا تھا۔ لہٰذا جب میں نے کالے بھجنگ شخص پر رائفل تانی اور اس سے کہا کہ وہ دونوں ''سرداروں'' کے ہاتھ پاؤں کھولے تو عمران نے ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ خاکی قمیص والا جگت سنگھ ہے۔''

عمران کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

اگلے دو منٹ میں جگت سنگھ اور اس کا ساتھی آہنی کڑوں کی بندش سے آزاد ہو چکے تھے۔ قریبی کمرے سے بلند ہونے والا عورتوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دروازے پیٹ رہی تھیں۔ عمران نے کالے ملازم کو آگے لگایا اور اس دروازے کے سامنے لے آیا جس کے عقب سے زبردست شور بلند ہو رہا تھا۔ ''اسے کھولو۔'' عمران نے ملازم کو حکم دیا۔

''اپن کے پاس اس کی چابی ناہیں ہے۔''

''کس کے پاس ہے؟''

''وڑی یہ چابیاں بڑے باس کے پاس ہوتی ہیں۔''

عمران نے اپنی جیب سے چابیوں کے وہ اسٹائلش گچھے نکالے جو سراج کے آفس کی الماری سے ہمیں ملے تھے۔ ''دیکھو ان میں ہے چابی؟'' عمران نے ملازم کو گچھا دکھاتے ہوئے کہا۔

اس نے چابیوں کو الٹ پلٹ کیا اور ایک چابی تھام لی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خلا بھی موجود تھا۔ یہ ویسی ہی مختصر کھڑکی تھی جو میں اس سے پہلے فرید کوٹ کی کوٹھی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس میں سے کمرے میں جھانکا جا سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہم نے کمرے میں جھانکا۔ ہمیں یہاں بیس کے قریب لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ قریباً سب ہی اسمارٹ اور قبول صورت تھیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ انہیں یہاں بڑے سکون آرام میں رکھا گیا ہے مگر وہ

ایک دم بے چین تھیں اور باہر نکلنا چاہ رہی تھیں۔

عمران نے ان سے پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں کیوں ہو؟“

ان میں سے ایک احتجاجی لہجے میں بولی۔ ”ہمیں فلم میں چانس کا کہہ کر دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ تیواری صاحب نے ہم سے جھوٹ بولا ہے۔“

ایک اور بولی۔ ”ہمیں چار دن سے یہاں بندی بنایا ہوا ہے۔ ہمارے گھر والوں کو مارنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری تصویریں کھینچیں گے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نا ہیں چھوڑیں گے......“ وہ سسکنے لگی۔

”تم میں سے کوئی پاکستانی بھی ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں، یہاں تو نہیں ہے۔ لیکن اسی جگہ دو تین دیکھی ہیں ہم نے۔ ایک وہی ایشوریا رائے کی شکل والی ہے۔ اسے آج بہت مارا ہے انہوں نے۔ وہاں شیشے والے کمرے میں بند کیا ہے۔“

”شیشے والا کمرا؟“ عمران نے پوچھا۔

عمران کو لڑکیوں سے باتیں کرتا چھوڑ کر میں جگت کو لے کر ذرا دور ہٹ گیا۔ رائفل بدستور میرے ہاتھ میں تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں جگت سے کہا۔

”مجھے پہچانا؟“ میں اپنی اصل آواز میں بولا تھا پھر بھی جگت مجھے فوری طور پر پہچاننے میں ناکام رہا۔

”تابش ہوں میں۔“

جگت جیسے اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کے زخمی چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ میں نے کہا۔ ”بالکل شانت رہو۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہئے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہلکا سا شک بھی نہیں ہونا چاہئے۔“

اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی فالتو رائفل اتار کر میں نے جگت سنگھ کو تھما دی...... اس کی سوجی سوجی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمکنے لگیں۔

عمران نے مختصر کھڑکی کے خلا سے لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”ہم تمہاری مدد کے لئے ہی آئے ہیں۔ تمہیں ضرور یہاں سے مکتی دلائیں گے لیکن تھوڑا دھیرج رکھنا پڑے گا۔ شور ہو گا تو تمہارا کام مشکل ہو جائے گا۔“

”بھگوان کے لئے دروازہ کھول دیں۔ ہم بالکل چپ رہیں گے۔“ ایک بنگالی لڑکی فریادی انداز میں۔

”سب کچھ ہو گا لیکن تھوڑا سا انتظار۔“ عمران نے ذرا تحکم سے کہا اور کھڑکی کا سلائیڈنگ پینل بند کر دیا۔

میرے کہنے پر عمران نے اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی فالتو رائفل اتاری اور جگت سنگھ کے چوڑے چکلے ساتھی کو دے دی۔ وہ بھی ہتھیار شناس بندہ تھا اور یقیناً سینے میں مار دھاڑ کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔

”یہ شیشے والا کمرا کہاں ہے؟“ عمران نے سیاہ رنگت والے ملازم سے پوچھا، وہ بدستور میری رائفل کے نشانے پر تھا۔

اس نے اپنے موٹے کالے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ہمیں ساتھ لے کر ایک کوریڈور میں آگے بڑھنے لگا۔ فائرنگ کی آواز کے بعد گولڈن بلڈنگ میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔ یقیناً سراج کی لاش بھی بہت سے لوگوں نے دیکھ لی تھی اور اب ہر طرف خوف کی لہریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ مجھے درجنوں لڑکیوں کے چلانے کی سریلی آوازیں آئیں۔ یہ لڑکیاں کسی ڈرے ہوئے ریوڑ کی طرح بیرونی حصے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ یہ وہی ڈانسرز تھیں جو ایک بڑے ہال میں کسی عریاں ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔ ہمیں اپنے اردگرد ایک بھی مسلح گارڈ دکھائی نہیں دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گولڈن بلڈنگ کے گارڈ اپنے ”آہنی پنجرے“ سے باہر نہیں نکل سکے۔

عمارت کے عین بیچوں بیچ جہاں کئی کوریڈورز ایک گول ہال کمرے میں کھلتے تھے، ایک چوراہا سا بن گیا تھا۔ یہاں ہمیں شیشے کا بنا ہوا ایک چوکور کمرا نظر آیا۔ قریباً بارہ فٹ ضرب بارہ فٹ کا یہ کمرا مکمل طور پر مضبوط شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں دو لڑکیاں بند تھیں۔ دونوں کے بدن پر لباس کا ایک تار تک نہیں تھا۔ وہ سکڑی سمٹی دو کونوں میں بیٹھی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ واقعی چوراہے میں ہوں اور ہر آتا جاتا انہیں دیکھ سکتا ہو...... ان میں سے ایک سویٹی عرف ایشوریا رائے تھی۔ اس کے دودھیا بدن پر مار پیٹ کے کئی نیلگوں نشان نظر آ رہے تھے۔ دوسری لڑکی کوئی ہندو تھی۔ اس کے ماتھے پر تلک نمایاں تھا۔ اس پر بھی تھوڑا بہت تشدد ہوا تھا۔

کیبن نما کمرے کی ایک بلوری دیوار پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا۔ اس پر انگریزی کا فقرہ لکھا تھا۔ فقرے کا مطلب کچھ یوں تھا۔ ”جو خود کو چھپاتے ہیں، ان کی جھجک دور کرنے کے لئے۔“ شیشے کے اس کمرے کا دروازہ بھی لاک تھا۔ تاہم عمران کے حکم پر سیاہ فام ملازم نے چابیوں کے ایک گچھے میں سے اس کی چابی بھی ڈھونڈ لی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن لڑکیاں بیٹھی رہیں۔ جگت سنگھ نے کہیں سے دو چادریں ڈھونڈ لی تھیں۔ اس نے یہ چادریں

لڑکیوں کو تن ڈھانپنے کے لئے دیں۔

عمران نے بدلی ہوئی آواز میں سویٹی عرف ایشوریا سے پوچھا۔ ''تم پاکستانی ہو؟'' ایشوریا ذرا جھجکی پھر اثبات میں جواب دیا۔ ''کوئی اور پاکستانی بھی ہے یہاں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''صرف دو ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے وہ دس نمبر فلور پر ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔''

اس کا مطلب تھا کہ حواس باختہ لڑکیوں کے غول کے ساتھ وہ لڑکیاں بھی یہاں سے نکل چکی ہیں۔ اچانک میری نظر ایک طرف تنگ زینوں پر پڑی۔ یہ زینے کے نیچے جا رہے تھے۔ آخر میں ایک آہنی دروازہ تھا جس پر ''نو انٹری'' کے الفاظ لکھے تھے۔ ہم کوئی جگہ بن دیکھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں زینے اتر کر نیچے دروازے تک گیا۔ یہ اسٹیل کا عام سا دروازہ تھا۔ میں اس کی چابی ڈھونڈنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کچھ دور ہٹ کر لاک پر برسٹ مارا۔ پھر آگے جا کر لات رسید کی۔ دروازہ کھل گیا۔ یہاں ایک نیچی چھت والا چیمبر تھا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اوپر گراؤنڈ فلور پر مسلسل بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پوری گولڈن بلڈنگ میں ہراس کا عالم تھا۔ سائرن بھی لگا تار بج رہے تھے۔ میں نے ایک اور دروازے کا تالا توڑا...... یہ ایک چھوٹا سا اسلحہ گودام تھا۔ بہت سی چھوٹی بڑی رائفلیں، پسٹل اور مشین پسٹل نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کی پیٹیوں میں دستی بم تھے اور ڈائنامائٹ کی اسٹکس بھی۔ یہ بدمعاشی کا اڈا تھا اور یہ سارے بدمعاشی اور دہشت گردی کے لوازمات تھے۔ ایک طرف بیکار رائفلوں کو ایک بنڈل کی شکل میں رکھا گیا تھا۔ اس بنڈل پر کینوس کا ایک بڑا بیگ پڑا تھا جس میں رائفلوں کا ایمونیشن تھا۔ میرے دماغ میں آگ سی بھڑک رہی تھی اور اس کی تپش پورے جسم کو تڑخا رہی تھی۔ یہ میرے بدترین دشمن سیٹھ سراج کا ٹھکانا تھا۔ مجھے یہاں کی ہر دیوار پر سیٹھ سراج عرف سارو کی منحوس چھاپ نظر آ رہی تھی۔ میں نے بیگ پلٹ کر اسے ایمونیشن سے خالی کیا اور ان میں ڈائنامائٹ کی ایسی اسٹکس بھرنا شروع کر دیں جن پر چھوٹی چھوٹی گھڑیاں لگی ہوئی تھیں...... عمران نے اب مجھے کافی حد تک اسلحہ شناس بنا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسٹکس کے یہ چھوٹے چھوٹے بنڈل ''ٹائم بم'' کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں ذرا سی کوشش سے Active کیا جا سکتا ہے۔ پانچ چھ دستی بم بھی میں نے کینوس کے بیگ میں رکھ لئے۔ میں

تیزی سے واپس پلٹا۔ اس وقت تک جگت سنگھ اور اس کا ساتھی گلاب سنگھ...... عمران کی ہدایت پر لاک اَپ میں موجود لڑکیوں کو آزاد کر چکے تھے۔ وہ گرتی پڑتی اور چلاتی ہوئی مین ایگزٹ کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ ان تین افراد کو بھی نکال دیا گیا تھا جنہیں ہم نے شروع میں اسٹور روم میں بند کیا تھا۔

''یہ دیکھو۔'' میں نے عمران کو ڈائنامائٹ کا ایک بنڈل دکھایا۔

''زبردست، نپولین اور دادا جی کا ایک مشترکہ قول ہے، برائی کو جڑ سے اکھاڑنا چاہئے۔ ہم بھی اس گولڈن بلڈنگ کو جڑ سے اکھاڑ سکتے ہیں۔''

عمران نے کمال مہارت اور تیزی سے سات آٹھ بنڈلوں پر دس منٹ کا ٹائم سیٹ کر دیا اور گھڑیاں آن کر دیں۔ بڑی پھرتی سے ہم نے یہ بنڈل گولڈن بلڈنگ کے وسطی حصے میں مختلف جگہوں پر چھپا دیئے۔ گولڈن بلڈنگ تقریباً خالی نظر آ رہی تھی۔ ہم ایشوریا اور مقامی لڑکی کو لے کر گولڈن بلڈنگ کے ایک بغلی دروازے کی طرف دوڑے۔ ایک راہداری میں اناؤنس منٹ والا مائیک موجود تھا۔ عمران نے مائیک آن کیا اور بدلی ہوئی آواز میں بولا۔ ''بلڈنگ دھماکے سے اُڑنے والی ہے۔ جو کوئی بھی یہاں موجود ہے، نکل جائے۔ میں اعلان دہراتا ہوں......''

اس نے اعلان دہرایا۔ اب صرف تین چار منٹ ہی بچے تھے۔ ہم چار دیواری سے چالیس پچاس قدم دور تھے جب سراج یا تیواری کا کوئی وفادار تیزی سے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دبا پاتا، جگت سنگھ نے ایک للکار کے ساتھ برسٹ چلایا اور اسے ڈھیر کر دیا۔ ہم کسی کو بھی مارنے کے لئے تیار تھے۔ ہم بیرونی دروازے سے چند قدم دور تھے جب عمران ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''گارڈ وہیں بند رہ گئے ہیں۔''

میں بھی ٹپٹا گیا۔ ان کی موت یقینی تھی۔ بلاسٹ میں اب بمشکل دو ڈھائی منٹ تھے۔

''میں جاتا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''نہیں عمران۔'' میں نے اسے پکڑ لیا۔ ''اب مرنے دو انہیں۔''

''نہیں...... تم نکلو ان کو لے کر۔'' عمران نے کہا اور خود کو چھڑا کر واپس بھاگا۔

میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ وہ احاطہ پار کر کے راہداری میں گم ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اس کے پیچھے لپک جاؤں۔ جگت سنگھ نے بڑی مضبوطی سے میری کلائی پکڑ لی اور باہر

کی طرف کھینچا۔ ہم گولڈن بلڈنگ کی چار دیواری سے باہر آ گئے۔ یہاں بھی افراتفری تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہیں مسلسل اس دروازے پر لگی تھیں جہاں سے عمران کو واپس نکلنا تھا۔ وہ نہیں نکلا...... اور تب پہلا دھماکا ہوا...... پھر دوسرا...... آگ کے شعلے اوپر تک جاتے نظر آئے۔ ڈائنامائٹ پھٹ رہے تھے اور پھر ہمیں اندھا دھند بھاگتے ہوئے گارڈز دکھائی دیئے۔ وہ بچ کر نکل آئے تھے۔ بالکل کسی فلم کا سا منظر تھا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ عمران سب سے پیچھے تھا۔ اس نے کسی کو کندھے پر لادا ہوا تھا۔ وہ کوئی بے ہوش شخص تھا۔

مجھے اس پر غصہ آیا۔ وہ ہر جگہ خدائی فوجدار بن جاتا تھا۔ کیا ضرورت تھی اس مشکل کو مزید مشکل بنانے کی۔ یکا یک ایک ساتھ کئی ڈائنامائٹ پھٹے۔ اندرونی کمروں کی کھڑکیاں اور چھتیں ہوا میں اڑتی نظر آئیں۔ عمران سب سے پیچھے تھا۔ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ کندھے پر لدے شخص کو اچھی طرح تھاما اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

میں اور جگت سنگھ لپک کر آگے گئے اور بے ہوش شخص کو سنبھال لیا۔ وہ دبلا پتلا تھا۔ اس کے جسم پر ڈرائیور کی سفید وردی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گاڑھے دھوئیں میں دم گھٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہے۔ ہم اسے لے کر سڑک پر پہنچے۔ یہی وقت تھا جب ایک نیلی اسٹیٹ کار دھوئیں میں سے نکلی اور ہمارے سامنے آ کر رکی۔ کار کو دیکھتے ہی عمران نے ہمیں اشارہ کیا۔ ہم کار کی طرف لپکے اور سوار ہو گئے۔ چادر میں لپٹی ہوئی ایشوریا رائے پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔ میں جگت اور اس کا ساتھ اگلی سیٹ پر۔ عمران گھوم کر ڈرائیور کی عین پیچھے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی نیلی اسٹیٹ کار کے پہیے چرچرائے اور وہ دھوئیں کے مرغولوں میں راستہ بناتی ہوئی تیزی سے ایک طرف بڑھی۔ گولڈن بلڈنگ کے اندرونی حصوں میں اب بھی دھماکے ہو رہے تھے اور دھواں اردگرد کے علاقے کو ڈھانپ رہا تھا۔ قریبی عمارتوں کے مکین نکل نکل کر بھاگ رہے تھے۔ ایک جگہ دو تین گاڑیاں آپس میں ٹکرائی ہوئی تھیں۔ یہ افراتفری ہمارے حق میں تھی...... ہم نکلتے چلے گئے۔ تب میں نے غور کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص تو مقامی تھا لیکن اس کے برابر بیٹھا ہوا شخص میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جیلانی تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عمران کی ہدایت پر بلڈنگ کے آس پاس ہی موجود تھا اور عین وقت پر موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ہمارے چہروں پر ابھی تک ماسک تھے۔ ایشوریا رائے وحشت زدہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ کوئی اور سچویشن ہوتی تو وہ اس طرح ہرگز ہمارے ساتھ نہ بیٹھتی لیکن ہم اسے بدترین

حالات سے نکال رہے تھے، لہٰذا وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔

میرے اور جگت کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ہم بالکل تیار تھے۔ تاہم بڑی سڑک تک کوئی ہمارے راستے میں نہیں آیا اور نہ کسی نے پیچھا کیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

عمران نے جیلانی سے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے یا شیخ؟''

''زیادہ دور نہیں۔ بس پانچ منٹ کا راستہ ہے۔''

ایک ایمبولنس اور فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں شور مچاتی ہوئی ہمارے قریب سے گزریں۔ ان کا رخ گولڈن بلڈنگ کی طرف تھا۔

بے ہوش شخص کو ہم تینوں نے ابھی تک اپنے زانو پر لٹا رکھا تھا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا تھا۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی مگر گاڑی کے نیم اندھیرے میں ہم اس کے چہرے پر صرف پانی کے چھینٹے ہی دے سکتے تھے اور یہ ہم نے دیئے۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یار! یہ کافی نہیں کہ یہ ایک انسان ہے؟ اگر میں اسے وہیں گیراج میں چھوڑ آتا تو یہ اب تک اللہ بیلی ہو گیا ہوتا۔''

راستے میں ایک جگہ پولیس کا ناکا نظر آیا۔ بہرحال ہم بخیریت گزر گئے۔ اگر روکا جاتا تو ہم فوراً مشکوک ٹھہر جاتے...... بلکہ مشکوک ترین۔ ہمارے ساتھ فقط ایک چادر میں لپٹی ہوئی ایشوریا رائے تھی۔ اس کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ ہم نے زانو پر ایک بے ہوش بندہ لٹایا ہوا تھا۔ میرا بالائی جسم زخمی اور لباس سے عاری تھا۔ جگت سنگھ اور اس کا ساتھی گلاب سنگھ عرف گوگا بھی زخمی تھے۔ ہمیں روکا جاتا تو یقیناً ہمیں اپنی رائفلوں کے منہ کھولنے پڑتے اور یہ سنگین رات کچھ اور بھی سنگین ہو جاتی۔

یہ رات کے چار بجے کا وقت تھا۔ ممبئی کی سڑکوں پر اب ٹریفک بہت کم رہ گیا تھا۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔ اردگرد کی ہر شے اونگھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ قریباً پانچ چھ منٹ میں ہم ایک چھوٹی سی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔

''یہ...... آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟'' ایشوریا ہکلائی۔

عمران بھنا کر بولا۔ ''یہ چڑیا گھر ہے۔ یہاں تمہیں ریچھ کے ساتھ بند کریں گے۔ تم دونوں کی محبت سے جو بچہ پیدا ہوگا، وہ ہالی وڈ کی ''اینی میٹڈ'' فلموں میں کام کرے گا۔''

''خدا کے لئے مجھے......''

"خاموش ہو جاؤ۔" عمران گرجا۔ "تمہیں جہاں سے نکال کر لائے ہیں، وہاں سے بری جگہ تمہارے لئے اور کوئی نہیں ہوگی۔ چلو نکلو گاڑی سے۔"

وہ سہم کر نکل آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم کوٹھی کے اندر تھے۔ ہم نے بے ہوش بندے کو ایک بستر پر لٹا دیا۔ وہ یرقان زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال بالکل صاف تھے۔ گردن کے قریب جلنے کا پرانا نشان تھا جس کا کچھ حصہ نظر آتا تھا، کچھ قمیص کے نیچے تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے بعد کسی چیز پر گرا تھا۔ اس کا پہلو زخمی تھا اور یہاں) سے اس کی سفید وردی پھٹی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی شکل کچھ پہچانی ہوئی سی لگی۔

میں نے اور عمران نے اپنے ماسک اتار دیئے۔ میری صورت دیکھ کر ایشوریا رائے بھونچکی رہ گئی۔ "تت...... تم...... یہاں؟" وہ ہکلائی۔

عمران بولا۔ "بعد میں تسلی سے حیران ہو لینا اور "ہک ہک ہک لا" بھی لینا۔ یہ دیکھو تمہارے کندھوں سے چادر کھسک رہی ہے۔ ابھی جا کر کپڑے پہن لو، جلدی سے۔" پھر اس نے جیلانی سے کہا۔ "یا شیخ! اس شیطان کی چیلی کو ذرا انسان کی چیلی بناؤ۔ کپڑے دوا سے۔"

جیلانی باہر گیا اور فوراً ہی ایک دو زنانہ جوڑے لے آیا۔ سویٹی عرف ایشوریا یہ کپڑے لے کر ایک قریبی واش روم میں گھس گئی۔ وہ بار بار مڑ کر میری طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ عمران نے بے ہوش شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یار! اس کا زخم دیکھو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک گری ہوئی موٹر سائیکل کے اوپر گرا ہے۔ یہاں پسلیوں میں پائدان وغیرہ لگا ہے۔"

میں نے جگت کے ساتھی گوگے کے ساتھ مل کر بے ہوش شخص کی قمیص کے بٹن کھولے پھر بنیان اتاری۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اس کے پورے جسم پر جلنے کے پرانے داغ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اس کے جسم کو بار بار بڑی بیدردی سے داغا گیا ہے۔ شروع میں ہمیں گردن کے پاس صرف ایک داغ نظر آیا تھا۔ ایسے بیسیوں داغ اس کے پورے جسم پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نیم گول دھاتی چیز سے اس کو جگہ جگہ سے جلایا گیا تھا۔

پسلیوں کے قریب کٹ کا تازہ نشان تھا اور مسلسل خون رِس رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ بہرحال مجبوری تھی۔ ہم نے وہیں پر اس کا خون بند کیا اور اچھی طرح مرہم پٹی کر کے قمیص دوبارہ پہنا دی۔ میری نگاہ بار بار بے ساختہ اس کے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے کچھ پہچانا سا لگ رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یار! لگتا ہے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔"

"تمہاری نظر بڑی تیز ہے، ذرا اندازہ تو لگاؤ۔"

میں نے غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ڈرامائی انداز میں بولا۔ "یہ ابرار صدیقی ہے۔ جسے ہم مولانا ابرار صدیقی بھی کہتے تھے۔"

وہ دنگ رہ گیا۔ ایک بار پھر بڑے دھیان سے میں نے اس کے کمزور چہرے کو دیکھا۔ ہم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شاید عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ شخص ابرار صدیقی ہو سکتا تھا۔ لیکن کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ابرار صدیقی تو ایک تنومند، سرخ و سپید شخص کا نام تھا۔ سیاہ داڑھی، آنکھوں میں چمک، گھنے بال...... لیکن جو بندہ میرے سامنے تھا وہ بس ابرار صدیقی کا خلاصہ ہی نظر آتا تھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا۔" میں نے کہا۔

"یار! یہ یہاں انڈیا میں کیسے؟ مجھے لگتا ہے کہ اس کہانی کے سارے کردار یہاں انڈیا میں ہی سمٹ آئے ہیں۔"

"اسی کو کہتے ہیں، کرلو تماشا۔"

"ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلا تھا اور پاکستان پہنچ گیا تھا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ ہم ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔ یہ پاکستان چلا گیا تھا۔ شاید وہاں سے پھر واپس آیا ہے۔ اصل حقیقت تو یہ ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکتا ہے۔"

"مگر اس کے ساتھ ہوا کیا ہے......؟ یہ تو وہ رہا ہی نہیں۔" میں حیرت زدہ تھا۔

ایسی ہی حیرت عمران کی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔

اس کی بے ہوشی اب غنودگی میں بدلتی جا رہی تھی اور امید تھی کہ وہ جلد ہی ہوش میں آ جائے گا۔ اسی دوران میں ایشوریا کپڑے پہن کر باہر نکل آئی۔ یہ ایک نارنجی ساڑھی تھی۔ اسے ساڑھی باندھنے کا سلیقہ بڑی اچھی طرح سکھایا گیا تھا...... لیکن اتارنے کا سلیقہ شاید وہ پوری طرح نہیں سیکھ سکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اپنے چہرے پر کئی نیل لے کر اب وہ یہاں ہمارے ساتھ موجود تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا اور رو دینے والے انداز میں بولی۔ "پلیز مجھ پر رحم کریں۔ مجھے کسی طرح واپس پاکستان پہنچا دیں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ بہت

دھوکا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔''تم نے آنکھوں دیکھ کر مکھی نگلی تھی۔ اب دوسروں کو الزام نہیں دے سکتی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو اب تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔''

''میں بہت بھگت چکی ہوں۔ اب میں واپس اپنے بہن بھائیوں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس کی ٹھوڑی پر بھی ایک نیل تھا۔ یہ مار پیٹ یقیناً اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس نے انیل کی کوٹھی میں ڈائریکٹر راج کو مطلوبہ شاٹس دینے سے انکار کیا تھا۔

میں نے ایشوریا سے کہا۔''وہاں دو اور پاکستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ اب کہاں ہوں گی؟''

''مم...... مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''لیکن پتا چلانا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔''ہم انہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتے...... اگر تم پاکستان واپس پہنچو گی تو وہ بھی پہنچیں گی۔'' عمران نے میری تائید کی اور لڑکیوں کے حوالے سے ایشوریا کو پوری تسلی دی۔

وہ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔''ان میں سے ایک کا نمبر میرے پاس ہے۔ آپ لوگ فون کر کے دیکھ لیں۔''

عمران نے جیلانی کے سیل فون سے کال کی۔ فوراً جواب آیا۔ عمران نے اسپیکر آن کر دیا تا کہ ہم بھی سن سکیں۔ ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔''کون ہے؟''

عمران نے فون ایشوریا کو تھما دیا۔ ایشوریا نے کہا۔''ہیلو فاخرہ! میں سویٹی بول رہی ہوں۔ کہاں ہو تم؟''

''مم...... میں اور کنول یہاں ایک بس اسٹینڈ میں بیٹھے ہوئے ہیں چھپ کے...... تم کہاں ہو؟''

''یہاں کچھ پاکستانی ہیں، میں ان کے پاس آ گئی ہوں۔ اچھے لوگ ہیں۔ یہ ہمیں واپس پاکستان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے پاس اگر کوئی اور ٹھکانا نہیں تو یہاں پہنچ جاؤ کسی طرح۔''

''لیکن کہاں؟''

عمران نے سویٹی عرف ایشوریا رائے سے فون لے کر بات کی۔ اس نے فاخرہ نامی لڑکی سے معلوم کر لیا کہ وہ کس بس اسٹینڈ پر ہیں۔ اس نے ان سے کہا۔

''ابھی بیس پچیس منٹ تک نیلی گاڑی میں دو بندے آئیں گے۔ تم ان کے ساتھ یہاں پہنچ جاؤ۔ ہم تمہیں حفاظت سے سفارت خانے تک پہنچا سکتے ہیں۔''

عمران کے بعد پھر ایشوریا نے بات کی اور دونوں لڑکیوں کو پوری تسلی دی۔

میں بار بار حیرت کے عالم میں ابرار صدیقی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ پتا نہیں اس پر کیا کیا بیتی تھی؟ وہ کس طرح یہاں انڈیا پہنچا اور اس کے داغ داغ جسم پر یہ ڈرائیور کی سفید وردی کیسے سجی تھی؟

ابرار صدیقی کے بارے میں ہمیں جو آخری معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ ہم سے پہلے ہی بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہ مصدقہ اطلاع بھی موجود تھی کہ وہ زرگاں کے بڑے پگوڈا میں سے آرا کوئے چرا کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بعدازاں آرا کوئے بھانڈیل اسٹیٹ سے کوئی ڈیڑھ ہزار میل دور شیخوپورہ کے ایک نواحی جنگل میں پائی گئی تھی۔ بابا جلالی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ ایک جیپ پر اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کچھ گاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جیپ والوں یا جیپ والے نے بھاگتے بھاگتے یہ نادر مورتی درختوں میں پھینک دی تھی تا کہ وہ پیچھا کرنے والوں سے محفوظ رہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ گر گئی ہو۔ جلالی نے اس مورتی کو ایک امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر جتنا کمزور تھا، ارادے کا اتنا ہی پکا تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس مورتی آرا کوئے کو اس کے اصل مالک کے سوا کسی کے حوالے نہیں کرے گا۔ اور وہ قریب المرگ بڈھا اب تک اپنے اس ارادے پر قائم تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس رات مورتی پھینک کر بھاگنے والا یہ ابرار صدیقی ہی تھا۔ ہم نے ابرار صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا...... اور پھر تھک ہار کر یہ سوچ لیا تھا کہ وہ کہیں مر گیا ہو گا۔ لیکن آج بالکل اچانک...... اور بالکل غیر متوقع جگہ پر وہ ہمارے سامنے تھا۔

عمران نے مجھے ساتھ والے کمرے میں بلایا اور بولا۔''یہ ابرار صدیقی والی کہانی تو اس کے مکمل ہوش میں آنے کے بعد ہی کھل سکے گی۔ فی الحال ہم دونوں کو جلد از جلد ہوٹل واپس پہنچنا چاہئے۔ جاوا کے ذہن میں ہلکا سا شک بھی نہیں جاگنا چاہئے کہ آج گولڈن بلڈنگ میں جو ہوا ہے اس میں ہمارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

''یہاں کے معاملات کون سنبھالے گا؟''

''یار! جیلانی یہاں موجود ہے اور اس گھر کا مالک نصیر احمد بھی۔ وہ سب کچھ آسانی سے سنبھال سکتے ہیں۔ ہم کل موقع دیکھ کر پھر یہاں آئیں گے۔''

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہم نے اچھی طرح منہ دھویا اور لباس تبدیل کر لئے۔ یہ سب سامان یہاں جیلانی کے پاس موجود تھا۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ سے حاصل ہونے والی رائفلیں بھی یہیں رہنے دیں اور کینوس کا وہ بڑا بیگ بھی جس میں دستی بم اور کچھ دیگر اشیاء موجود تھیں۔ یہ اشیاء میں نے جگت سنگھ کو سونپ دیں اور اسے تھوڑی بہت صورتِ حال سمجھا دی...... جگت سنگھ کی پُر درد کہانی ابھی سننا باقی تھی لیکن فی الحال وقت کم تھا۔ میں نے اسے گلے لگا کر بس گو بندر سنگھ اور آشا کور کا پُرسہ ہی دیا اور چند گھنٹوں بعد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے باہر آ گیا۔ یہاں سے ہم ایک چھوٹی جیپ میں بیٹھے۔ یہ جیپ جیلانی کا ایک ساتھی ہی چلا رہا تھا۔ نیلی اسٹیٹ کار گیراج میں موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ ایشوریا کی ساتھی لڑکیوں کو لینے بس اسٹینڈ کی طرف جا چکی تھی۔ ہماری منزل گولڈن بلڈنگ کی وہ قریبی گلی تھی جہاں ہم نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ عمران ہوٹل سے جو بیگ لے کر نکلا تھا، وہ بھی اسی گاڑی میں موجود تھا۔ اس گاڑی کو گولڈن بلڈنگ کے پاس سے ہٹایا جانا ضروری تھا۔ دوبارہ اس علاقے میں جانے میں تھوڑا سا رسک تو تھا مگر یہ رسک لینے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ گولڈن بلڈنگ کا عقبی علاقہ تھا۔ ہم اندرونی گلیوں سے ہوتے ہوئے مطلوبہ جگہ تک پہنچے۔ پارک کے قریب پہنچ کر ہم نے دور ہی سے گولڈن بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ اب بھی دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں بھی گشت کر رہی تھیں۔ تاہم زیادہ سرگرمی بلڈنگ کے سامنے کی جانب تھی۔ یہاں بس اِکا دُکا لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور رات کے اس آخری حصے میں گولڈن بلڈنگ کی مصیبت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

میرے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے، میں تو وہیں نصیر احمد کے ساتھ جیپ میں بیٹھا رہا۔ عمران آگے گیا۔ اس نے چند تماشائیوں سے باتیں بھی کیں۔ ان میں سے اس ''حادثے'' کا حال احوال پوچھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں جو آفت...... مچی ہے، اس کا اہم ترین کردار ان کے درمیان موجود ہے اور آفت کا حال احوال دریافت کر رہا ہے۔ عمران ٹہلنے والے انداز میں بائیں طرف چلا گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے اور بھی کئی گاڑیاں پارک تھیں۔ عمران ان گاڑیوں کے درمیان سے گزرا۔ دو پولیس والے یہاں موجود تھے مگر انہوں نے عمران پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ بڑے اعتماد سے گاڑی میں بیٹھا اور اسے ڈرائیو کر کے ہمارے پاس آ گیا۔

میں عمران والی گاڑی میں چلا گیا۔ نصیر احمد جیپ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ گاڑی میں

ہمارا سامان پورا تھا۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ یہ برائی کا گڑھ تھا اور آج کی رات اس پر بڑی بھاری ثابت ہوئی تھی۔ گولڈن بلڈنگ گو جزوی طور پر تباہ ہوئی تھی لیکن اس کا سارا ڈھانچا ہل گیا تھا۔ بلڈنگ کے چاروں طرف وسیع احاطہ تھا اس لئے بلڈنگ کے اندرونی حصے میں ہونے والے دھماکوں کی وجہ سے اردگرد کی عمارتیں قریباً محفوظ ہی رہی تھیں۔ ہم واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے تھے، اہلِ محلّہ؟''

''وہی جو انہیں کہنا چاہئے۔ دل ہی دل میں خوش ہیں۔ ان کی کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ ضرور ٹوٹے ہیں لیکن ان کے دل جڑ گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی یہ سب جانتے تھے کہ گولڈن بلڈنگ کے اندر پروڈکشن ہاؤس کی آڑ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ لیکن آواز اٹھانے اور لڑائی مول لینے کی ہمت کوئی نہیں رکھتا تھا۔''

جلد ہی ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور بیگ سمیت کمرے میں آ گئے۔ کسی نے وہاں اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم گئے دوسرے لباس میں تھے، آئے دوسرے میں ہیں۔ میرے چہرے کے ایک دو نیل بھی کسی کے نوٹس میں نہیں آئے۔

...... صبح دس بجے کے لگ بھگ عمران نے ٹی وی آن کیا تو وہاں نیوز چینلز پر گولڈن بلڈنگ والے خونی ہنگامے کی خبر چل رہی تھی۔ خبر کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا تھا۔ بتایا جا رہا تھا کہ دو خطرناک گروپوں میں خوفناک تصادم ہوا ہے۔ درجنوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں۔ گولڈن بلڈنگ کا بڑا حصہ تباہ ہو چکا ہے۔ دھماکوں سے اردگرد کی عمارتوں کو نقصان پہنچا ہے۔ ابھی تک گولڈن بلڈنگ میں کہیں کہیں آگ لگی ہوئی ہے۔ سارو اور تیواری وغیرہ کی ہلاکت کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی تھی۔ سراج کی ہلاکت کی خبر میرے دل و دماغ پر عجیب اثر کر رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ رہی تھی۔ جب بوڑھی ماؤں پر ظلم ہوتا ہے تو جوان بیٹے ظالموں کے گریبان پکڑتے ہیں، بدلہ چکاتے ہیں۔ دیر سے ہی سہی لیکن میں نے بھی آج اپنی مظلوم ماں کا بدلہ چکا دیا تھا۔

ثروت سے رابطہ ہوئے قریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اسے فون کرنا ضروری سمجھا۔ میڈم صفورا کے نمبر پر کال کی۔ فوراً ہی میڈم صفورا کی قدرے بھاری آواز سنائی دی۔

''ہیلو بوائز! کہاں ہو تم دونوں؟''

''بس ممبئی سے نکل رہے ہیں۔''

"کہاں کے لئے؟"

"ابھی یہ نہیں بتا سکتے۔"

"وہ......عمران کدھر ہے؟"

عمران شیو کرنے کے بعد ٹھوڑی پر تولیا رگڑ رہا تھا۔ اس نے انگلی ہلا کر مجھے "نہ" کا اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ "وہ ابھی باہر نکلا ہے۔ آ جاتا ہے تھوڑی دیر میں۔"

"سنا ہے رات کو کوئی ہنگامہ بھی ہوا ہے ساؤتھ ممبئی میں۔ دو گروپس میں "کلیش" کی نیوز آ رہی تھی۔"

"یہ تو شہر ہی ہنگاموں کا ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ثروت تمہارے لئے بڑی پریشان تھی۔ بار بار سیل فون کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لو بات کرو اس سے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

چند سیکنڈ بعد ثروت کی آواز ابھری۔ "ہیلو تابش! آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں، اور تم؟ کسی طرح کی پریشانی تو نہیں؟"

"نہیں، بس آپ کی اور......عمران صاحب کی طرف سے فکر ہے۔ آپ کب تک لوٹیں گے؟"

"ابھی تو نکلے ہی ہیں ثروت! کچھ دن تو لگنے ہیں۔"

"آپ کہتے تھے کہ میں جلد جلد فون کروں گا۔ لیکن اب دیکھ لیں کتنی دیر کی ہے۔ میں نصرت کی طرف سے بھی پریشان ہوں۔ رات کو اس کا فون آیا تھا۔ وہ بتا نہیں رہی تھی لیکن آواز سے کمزور لگ رہی تھی......وہ بتا رہی تھی کہ پرسوں یوسف آئے تھے۔"

"یوسف......کہاں؟"

"احمد تھانوی صاحب کے آستانے پر......نصرت سے ملنے۔ انہوں نے نصرت سے معافی مانگی ہے اور اسے منا کر واپس گھر لے آئے ہیں۔ لیکن نصرت وہاں زیادہ خوش نہیں ہے۔" تھانوی صاحب کو کچھ لوگ قدرت اللہ بھی کہتے تھے۔

یوسف کا فریبی چہرہ میری نگاہوں میں آیا اور دماغ میں چنگاریاں سی چمک گئیں۔ یہ بندہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لئے ہاتھ جوڑنے سے لے کر پاؤں پڑنے تک سب کچھ کر سکتا تھا۔ مطلب نکلنے کی صورت میں بے رحمی سے آنکھیں پھیر لینا بھی اس کا شیوہ تھا۔

میں نے کہا۔ "اور وہ گریس والا معاملہ ثروت؟ یہ بھی تو پتا چلا ہے کہ وہ پھر اس سے مل رہی ہے۔"

چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد ثروت بولی۔ "تابش! اصل حقیقت تو مجھے وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ نصرت بے چاری بھی تو بس اندازے ہی لگا رہی ہے۔"

میرا دل چاہا فون بند کر دوں۔ شوہر پرستی میں ثروت کبھی کبھی ہر حد سے گزری محسوس ہوتی تھی۔ چند روز پہلے اس نے یوسف کے بارے میں سب کچھ اچھی طرح جان لیا تھا۔ نائیکا شاربہ بائی کی زبانی اسے یوسف کا سارا کچا چٹھا معلوم ہوا تھا۔ پھر ثروت نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ کس طرح اسے یہاں تنہا چھوڑ کر پاکستان جا پہنچا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کے لئے دل میں نرم گوشے رکھتی تھی۔ کیوں تھے یہ نرم گوشے؟ یہ نرم گوشے شاید یوسف کے لئے نہیں تھے، یہ ان واہموں کے لئے تھے جو ثروت نے دل و دماغ میں پال رکھے تھے۔ اس نے چھوٹی بہن کی بیماری کو یوسف سے علیحدگی کے ساتھ منسوب کر رکھا تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس کے گرد خوف نے ایک ایسا حصار بنا رکھا تھا جس سے نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی وقت ہمت ضرور کرتی تھی لیکن پھر جلد ہی ہتھیار پھینک دیتی تھی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "پلیز تابش! آپ جلدی آنے کی کوشش کریں۔ میں نے ساری رات ڈر میں گزاری ہے۔ وہ ریچھ ابھی یہیں ہیں جو ہم نے دیکھے تھے۔ اوپر والی منزل سے ان کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ ایک ملازم نے بتایا ہے کہ یہ آدم خور جانور ہیں۔ مجھے میڈم کا حوصلہ ہے۔ ورنہ میں تو شاید اب تک مر ہی گئی ہوتی۔"

میں نے کہا۔ "ثروت! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تم یہاں اتنی ہی محفوظ ہو، جتنی لاہور میں اپنے گھر میں ہوتیں۔ اور اس بات کا بھی یقین رکھو کہ ہم جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں نے ابھی ٹی وی پر ایک خبر دیکھی تھی۔ ممبئی میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے۔ میرا دل ہول رہا تھا۔"

"نہیں ثروت! ہم شہر کے دوسرے حصے میں ہیں اور اب تو ہم ویسے ہی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں......"

ثروت سے تسلی تشفی کی چند باتیں کر کے میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ یوسف کے حوالے سے دل پر عجیب بوجھ سا تھا۔ ہم اس شخص کی خاطر یہاں انڈیا آئے تھے اور موجودہ حالات میں پھنسے تھے۔ وہ خود لاہور جا پہنچا تھا اور وہاں اپنی خباثت دکھانے میں مصروف تھا۔ عین

ممکن تھا کہ وہ ایک دو روز میں فون پر ثروت کو بتاتا کہ انڈیا سے اس کا جانا ایک پلاننگ کے تحت تھا اور وہ وہاں لاہور میں رہ کر اس کی رہائی اور واپسی کے لئے بھرپور کوششیں کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

''خبیث۔'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

عمران فوراً بولا۔ ''بہت بری بات ہے تابی...... ثروت تم سے محبت کرتی ہے اور جو محبت کرتے ہیں ان کو خبیث نہیں کہا جاتا۔''

''میں اِس بدذات کے لئے کہہ رہا ہوں...... یوسف کے لئے۔''

''اب کیا کیا ہے اس نے؟''

''جلیبی کی طرح گول مول بندہ ہے یہ۔ پہلے نصرت سے جھگڑا کیا، اسے برا بھلا کہا ہے۔ ثروت کے بارے میں بدزبانی کی ہے۔ اب ٹسوے بہا رہا ہے۔ نصرت کو احمد تھانوی صاحب کے گھر سے منا کر اور معافی مانگ کر واپس لے گیا ہے۔''

''جگر پارے! تُو فکر نہ کر۔ یوسف نے یہاں سے چپ چاپ راہِ فرار اختیار کر کے ہمیں اور ثروت کو اپنی اصلیت دکھا دی ہے۔ ثروت مانے یا نہ مانے لیکن وہ اپنے عمل سے ثروت کی نظروں میں گرا ہے۔''

''تم ثروت کو نہیں جانتے عمران! وہ ارادے کی بڑی پکی ہے اور اس کے وہم اس سے بھی پکے ہیں۔ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے پھر بھی اس پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یوسف کا فون دوبارہ آ گیا اور اس نے معافی تلافی کی تو ثروت پھر اس کے سامنے جی جی کرنے لگے گی۔''

عمران نے عجیب انداز میں کہا۔ ''لیکن جگر! وہ تجھ سے محبت بھی تو کرتی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ اور میری بات یاد رکھ پیارے! وہم کی اپنی طاقت ہوتی ہے تو محبت کی بھی اپنی طاقت ہوتی ہے...... اور محبت کی طاقت بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ دیر ہو جاتی ہے لیکن ارادہ پکا ہو تو اندھیر نہیں ہوتا۔ تُو غم نہ کر...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تیرے بچوں کا چاچو بنوں گا بلکہ شاید میں اور شاہین چاچو چاچی بنیں گے۔''

بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور روانہ ہو گئے۔ ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی۔ ہمارے بیگ ہمارے ساتھ تھے۔ جو بندہ ہمیں ایئرپورٹ سے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل آیا تھا، اس نے ہمیں سی آف کیا۔ عمران اور جاوا کے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کے

مطابق ممبئی پہنچنے کے بعد ہم بالکل آزاد تھے اور اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکتے تھے۔ جاوا نے یقین دلایا تھا کہ کسی بھی طرح ہماری نگرانی نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ ثروت ضمانت کے طور پر اس کے پاس تھی۔ ہاں...... اگر ہمیں کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہوتی تو ہم دیئے گئے فون نمبرز پر جاوا سے رابطہ کر سکتے تھے۔

ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد ہم کافی دیر تک ممبئی کی سڑکوں پر چکراتے رہے۔ مقصد یہ دیکھنا ہی تھا کہ ہمارا تعاقب وغیرہ تو نہیں ہو رہا۔ غالباً جاوا وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ ہمیں نگرانی کے کوئی شواہد نہیں ملے۔ ممبئی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کے دوران میں ہم ایک بار پھر گولڈن بلڈنگ کے پاس سے گزرے۔ کہیں کہیں ابھی تک ملبا سلگ رہا تھا۔ بہت سے لوگ یہاں وہاں ٹولیوں میں کھڑے بلڈنگ کا بچا کھچا ڈھانچا دیکھ رہے تھے۔ اخبار میں جو خبریں آئی تھیں، ان میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ بلڈنگ کے اندر دو بڑے گروپوں میں لڑائی ہوئی ہے۔ درجنوں مسلح نقاب پوش بلڈنگ میں گھسے اور انہوں نے تہلکہ مچا دیا۔

ہم اس مکان سے کچھ فاصلے پر اتر گئے جہاں جیلانی موجود تھا اور اس کے ساتھ ایشوریا، ابرار صدیقی اور جگت بھی موجود تھے۔ ہم پیدل چل کر مکان تک آئے۔ جیلانی نے خود ہی دروازہ کھولا۔ ''یا شیخ! کیا حال ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے۔ ابرار صدیقی ہوش میں آ چکا ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

جیلانی بولا۔ ''ہوش میں آتے ہی اس نے واویلا شروع کر دیا۔ ہمارے سامنے ہاتھ جوڑنے اور معافیاں مانگنے لگا۔ پھر رونا شروع کر دیا۔ کہنے لگا کہ ہم اسے تکلیف دینے کے بجائے جان سے مار دیں، وہ ہمیں کچھ نہیں بتا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سکون بخش دوا دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتایا ہے اس نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تو نہیں۔''

''وہ لڑکیاں پہنچ گئی ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

جیلانی نے اثبات میں جواب دیا اور ہمیں اندر لے آیا۔ ایشوریا سمیت تینوں لڑکیاں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے چائے کے کپ تھے۔ تینوں ڈری سہمی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام فاخرہ اور دوسری کا عروج تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں باقاعدہ رونے لگیں۔ عروج ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لئے ہمیں کسی طرح ہمارے گھر پہنچا دیں۔ ہم

سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پیسے اور شہرت کے لالچ میں ہم نے بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہمیں اب کچھ نہیں چاہیے۔ بس اپنے گھر پہنچ جائیں۔''

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔''اب یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تم ایک غیر ملک میں ہو۔ تمہارے پاس کوئی سفری کاغذات نہیں ہے۔ بہرحال، ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے اور تم ضرور اپنے گھر بھی پہنچو گی لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

عروج نے الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے۔ اس کی شکل زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت فلمی ہیروئن ''تبو'' سے ملتی تھی۔ وہ پاکستان میں ٹی وی اور اسٹیج پر بھی چھوٹے موٹے رول کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ ایک اسٹیج ڈرامے میں نائیکا شاربہ بائی نے اسے دیکھا اور شیشے میں اتار لیا۔ اس نے کہا کہ وہ تو بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔ اوپر سے اس کی شکل بھی ''تبو'' سے بہت ملتی ہے۔ وہ کسی طرح انڈیا چلی جائے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ وہ اس کی باتوں میں آ گئی اور پھر مختلف ہاتھوں سے گزرتی ہوئی یہاں ممبئی آ پہنچی۔ گولڈن بلڈنگ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ بدترین حالات کا شکار ہے اور غلیظ ترین لوگوں میں ہے۔ جو کیمرا اس کا ''عشق'' تھا اسی کیمرے سے اسے گھن آنے لگی۔ اس نے ایک بار بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اسے شرابی غنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ایشوریا رائے یعنی سویٹی کی کہانی بھی عروج کی کہانی سے بہت مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی نائیکا شاربہ کے ہتھے چڑھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ سویٹی کی شکل مشہور ہیروئن ایشوریا رائے سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ اسے شاربہ اور سلطان چٹا وغیرہ کی طرف سے زبردست پذیرائی ملی۔ سویٹی کو بنانے سنوارنے میں بہت زیادہ روپیا بھی خرچ کیا گیا اسے ڈانس اور بول چال کی خصوصی تربیت دی گئی۔ وہ اب ایشوریا رائے کی شخصیت سے اتنی قریب تھی کہ بڑے ''تیز نگاہ'' لوگوں کو بھی دھوکا دے سکتی تھی تیسری لڑکی فاخرہ کا تعلق بھی عروج کی طرح ''اس بازار'' سے تھا۔ وہ بھی کئی جگہ خراب ہو چکی تھی اور اب گولڈن بلڈنگ کے بدترین حالات کا شکار تھی۔

اس دوران میں جیلانی نے اطلاع دی کہ ابرار صدیقی جاگ گیا ہے۔ عمران نے لڑکیوں کو تسلی تشفی دی اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں ابرار صدیقی کے پاس آ گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ابرار صدیقی ہے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا...... پہچانا...... حیرت زدہ ہوا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ اسے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں یہاں دیکھ رہا ہے۔

وہ بار بار کہہ رہا تھا۔''میں تباہ ہو گیا...... ختم ہو گیا...... میں نے اپنی زندگی خود برباد کر لی۔''

کچھ دیر بعد جب جذبات کا چڑھا ہوا طوفان اتر گیا تو وہ بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔ میں نے کہا۔''ابرار صاحب! آپ کی چوٹ اب کیسی ہے؟''

وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔''یہ چوٹ تو اب ٹھیک ہے لیکن دل پر جو چوٹیں لگی ہیں ان کا کوئی علاج نہیں...... کوئی نہیں۔ اس...... مورتی کے چکر نے مجھے فنا کر دیا۔'' اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''میں نے کہا۔''آپ شاید آرا کوئے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ اب کہاں ہے؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں...... کچھ خبر نہیں۔'' اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''کچھ اندازہ تو ہوگا؟'' عمران نے کہا۔

''مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ بہت برباد کرنے والی چیز ہے۔ وہ جس کے پاس بھی ہوگی، اسے زندہ درگور کر دے گی۔ بہت خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔ وہ ہر جگہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ سایوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وہ مجھے مار دیں گے...... تمہیں بھی مار دیں گے۔ ان کی دی ہوئی موت سے بہتر ہے کہ بندہ خود کو اپنے ہاتھوں سے مار لے۔'' ابرار صدیقی کسی بچے کی طرح سسکنے لگا۔

میں اور عمران ششدر تھے۔ اس ابرار صدیقی کو ہم نے جہلم شہر میں بڑے طمطراق میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی پانچ برس پہلے کی بات تھی۔ اس وقت ابرار صدیقی کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اب وہ پینتالیس پچاس کا نظر آ رہا تھا۔ وہ خاصا تنومند ہوا کرتا تھا۔ ہر وقت اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح نظر آتی تھی۔ تسبیح گھمانے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے تواتر سے نوادرات اور ان کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے وکالت کی ہوئی تھی اور ضرورت مندوں کو قانونی امداد فراہم کرنے کے لئے کوئی ادارہ وغیرہ بھی بنایا ہوا تھا۔ لیکن اب تو وہ خود سرتاپا امداد کا مستحق نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نادیدہ شے کا خوف جم کر رہ گیا تھا۔

ہم دیر تک اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے دل کا غبار آنکھوں کے راستے نکلتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ ہم نے اس کے ساتھ چار

بجے کی چائے پی۔ وہ ہم سے جاننا چاہتا تھا کہ ہم یہاں ممبئی میں کیسے پائے جا رہے ہیں۔ وہ میڈم صفورا اور دیگر لوگوں کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔ ہم نے اسے مختصر لیکن تسلی بخش جواب دیئے۔ وہ یہ جان کر قدرے حیران ہوا کہ گندھارا آرٹ کا نادر نمونہ آراکوئے اس وقت انڈیا میں موجود ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ابرار صدیقی کو پچھلے کچھ عرصے سے آراکوئے کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ جیسے اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو چکا تھا۔ ہم نے جتنی بار بھی آراکوئے کا نام لیا، ابرار کے چہرے پر زردی سی بکھر گئی۔

پھر وہ بھانڈیل اسٹیٹ کی باتیں کرنے لگا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پانچ سال پہلے آراکوئے پر ہاتھ ڈالنے کے جرم میں میڈم صفورا اور میں بھی بطور سزا بھانڈیل اسٹیٹ پہنچائے گئے تھے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں جو جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں زیادہ تر باتیں ابرار کو معلوم تھیں۔

آخر میں ابرار سے پوچھا۔ ''ابرار صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ چند مہینے پہلے آپ ایک بار پھر آراکوئے کو بھانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟''

ابرار پہلے خاموش رہا۔ پھر اس نے اس بات کو گول کرنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اس نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔ ایک طرح سے ہم نے کل رات اس کی جان بچائی تھی اور اب بھی اسے ایک محفوظ ٹھکانا مہیا کئے ہوئے تھے پھر میڈم صفورا کا حوالہ بھی موجود تھا۔ نوادرات کے حوالے سے میڈم اور ابرار صدیقی ایک دوسرے سے کاروباری تعاون کرتے رہے تھے۔ ان کا یہ تعلق پرانا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ ابرار صدیقی کو میڈم صفورا کی آواز سنا سکوں۔ میں نے سیل فون پر میڈم سے رابطہ کیا اور رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا مقصد صرف ابرار کو میڈم کی آواز سنانا تھا۔

اب ابرار صدیقی کو ثبوت مل چکا تھا کہ میڈم صفورا بھی یہاں ہمارے ساتھ ہی انڈیا میں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ چند ماہ پہلے اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لئے چہرے اور سر کے بال صاف کروا دیئے تھے، اب وہ یہاں دلجیت کے نام سے ایک میراٹھی سیٹھ کا ڈرائیور ہے اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔ آج وہ وہاں اپنے سیٹھ کو گولڈن بلڈنگ لے کر آیا تھا۔

''لیکن آپ یہاں انڈیا کیوں آئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں آیا نہیں مجھے لایا گیا۔ وہ لوگ مجھے لے آئے۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وہ بندے کو دنیا کے کسی کونے سے بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے

بھی ڈھونڈ لینا ہے۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں۔ میں نے آراکوئے کو دوبارہ بھانڈیل اسٹیٹ سے نکال کر بڑی غلطی کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے سمجھ جانا چاہئے تھا کہ وہ لوگ آراکوئے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہر حد تک جا سکتے ہیں۔ یہ بات...... تم لوگوں کو بھی سمجھ لینی چاہئے۔ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے یا پھر...... میری طرح سسک سسک کر جیو گے۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

مجھے اس کے جسم کے داغ نظر آئے اور دل کانپ گیا۔

عمران نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ابرار صاحب! ہم ان لوگوں کو پہلے بھی شکست دے چکے ہیں۔ اب دوبارہ دیں گے۔ ہم میں اتنا حوصلہ ہے۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے آپ ہمیں اپنے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ اگر آپ شروع سے بتائیں تو ہمارے لئے آسانی ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں اتنا تو معلوم ہے ابرار صاحب جب زرگاں میں لڑائی زوروں پر تھی اور ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی، آپ کو آراکوئے سمیت وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا اور آپ پاکستان بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟''

ابرار نے رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں جو رُوداد سنائی، وہ مختصر الفاظ میں کچھ یوں تھی۔

چند ماہ پہلے ابرار صدیقی مجسمے سمیت یہاں پہنچ گیا تھا۔ نوادرات کی بھوک ابرار کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ خطرناک ترین حالات کے باوجود وہ خود کو اس ''ماسٹر پیس'' سے دور نہ رکھ سکا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے ہرکارے پھر آندھی اور طوفان کی طرح اس ماسٹر پیس یعنی آراکوئے کے پیچھے آئے۔ اس مرتبہ ان کی تلاش کی شدت اور سنگینی ابرار صدیقی کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے خطرناک ترین لوگ تھے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح ابرار صدیقی کی بو سونگھتے ہوئے پاکستان میں داخل ہو گئے...... اور ان میں سے ہر ایک کی ناک بے حد تیز تھی۔ ان میں ایک ایسا بھکشو بھی شامل تھا جسے یہ دعویٰ تھا کہ وہ فاصلے سے آراکوئے کی دھات کی بو سونگھ سکتا ہے۔ ان لوگوں نے کراچی میں ابرار صدیقی کے دو ساتھیوں کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ ابرار کسی طرح جان بچا کر بھاگا۔ وہ اس کے پیچھے تھے۔ ملتان اور پھر ساہیوال میں بھی وہ ان لوگوں سے بال بال بچا۔ ملتان میں اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد ان لوگوں نے ابرار صدیقی کی تین رشتے دار خواتین کو بیدردی سے ذبح کر دیا اور کسی ''روحانی عمل'' کے لئے ان تینوں کی انگلیاں کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مارنے سے پہلے ان خواتین کو بیدردی سے داغا بھی گیا۔

ابرار صدیقی بہت خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے ساہیوال میں ہی ہڑپہ کے نزدیک آراکوئے اپنے قریبی ساتھی عنایت کے حوالے کر دیا۔ یہی کوتاہ قامت شخص تھا جس کے ذریعے ہم ایک دفعہ نوادر کے بیوپاری بن کر ابرار صدیقی تک پہنچے تھے۔ عنایت نامی یہ شخص ایک جیپ پر سوار ہو کر لاہور کی طرف نکل گیا اور ابرار صدیقی نے خود کو ساہیوال میں ہی روپوش کر لیا۔ عنایت بھی بھانڈیل اسٹیٹ کے خطرناک ہرکاروں سے بچ نہیں سکا۔ ان کے ایک مقامی مخبر نے عنایت کو لاہور کے نواح میں پہچان لیا۔ بھانڈیل کے ہرکارے ایک بار پھر اس کے پیچھے لگ گئے۔ عنایت لاہور سے ہوتا ہوا پہلے گوجرانوالہ کی طرف گیا پھر شیخوپورہ کی طرف بھاگ گیا۔ وہ جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اس کے بارے میں ابرار کو جو آخری اطلاع ملی، وہ یہی تھی کہ وہ شیخوپورہ کے آس پاس کہیں ہے۔

تیسرے دن ابرار صدیقی کو معلوم ہوا کہ عنایت کی لاش ایک خشک برساتی نالے کے اندر سے ملی ہے۔ اس نے نالے کے اونچے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ ان سے بچنے کے لئے پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے کود گیا۔ عنایت کی لاش وزیر آباد کے قریب سے ملی تھی۔ اس کی جیپ بھی گکھڑ کے پاس گھنے درختوں کے اندر سے مل گئی تھی۔

اس واقعے کے صرف دو دن بعد ابرار صدیقی بھی ساہیوال سے پکڑا گیا۔ یہ ابرار کے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ وہ جان بچانے کے لئے آراکوئے پر لعنت بھیج چکا تھا لیکن اب آراکوئے بھی نہیں تھا اور ابرار کی سلامتی بھی نہیں تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے وحشی ہرکاروں کو عنایت والی جیپ کے اندر سے ہی ایک ایسا ثبوت مل گیا تھا جو انہیں سیدھا ابرار صدیقی کی پناہ گاہ تک لے آیا تھا۔ ابرار کی اس بدقسمتی نے اسے زندہ درگور کر کے رکھ دیا...... اگلے ڈیڑھ مہینے میں ابرار صدیقی پر جو کچھ بیتی، اسے بیان کرنے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ لوگ بہاولپور میں اسے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر لے گئے اور تشدد کی انتہا کر دی۔ ان کے پاس لوہے کا ایک خاص سانچہ سا تھا جسے وہ لوگ انگاروں پر دہکاتے تھے اور پھر اس کے جسم کو داغتے تھے۔ وہ اس سے آراکوئے کے بارے میں پوچھتے تھے اور ابرار کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ آراکوئے عنایت کے پاس تھا۔ اس نے جیپ کے اندر سیٹ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے ہرکاروں اور بھکشوؤں کو عنایت کی جیپ کے اندر سے کچھ نہیں ملا تھا۔ صرف عنایت بتا سکتا تھا کہ آراکوئے کہاں ہے اور وہ مر چکا تھا۔ بہاولپور میں تقریباً پندرہ روز تک اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد یہ لوگ اسے بہاولپور سے لے

جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے کسی خاص طریقے سے اس پر لمبی بے ہوشی طاری کی اور نہ جانے کس طرح انڈیا لے آئے۔ ابرار کے اندازے کے مطابق وہ اسے کسی خاص روحانی عمل سے گزارنے کے لئے کسی بڑے پگوڈا میں لے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں بالکل غیر متوقع طور پر ابرار کی قسمت نے یاوری کی۔ ایک طوفانی رات میں نہایت تیز بارش کے دوران میں اس کنٹینر کو حادثہ پیش آیا جس میں ابرار صدیقی کو لے جایا جا رہا تھا۔ ایک کار سے ٹکرانے کے بعد یہ کنٹینر ''جیسلمیر'' کے قریب الٹ گیا۔ اس خوفناک حادثے میں ایک بھکشو سمیت چار افراد ہلاک ہوئے۔ ابرار صدیقی معجزانہ طور پر بچ گیا۔ شدید زخمی حالت میں اس نے جنگل کے اندر تیس چالیس میل کا سفر طے کیا اور پھر ریل کا طویل سفر کر کے ممبئی کے مضافات میں پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اب بھی اس کے پیچھے ہیں اور کسی بھی وقت اسے پھر پکڑ لیں گے۔ اس نے اپنے چہرے اور سر کے بال منڈوا دیئے۔ اپنا پورا حلیہ تبدیل کر لیا اور ایک ہندو کی حیثیت سے انسانوں کے اس سمندر میں گم ہو گیا جسے ممبئی کہتے ہیں۔

یہ تھی ابرار صدیقی کی ساری رُوداد۔ پچھلے کئی ماہ سے ابرار کو کچھ پتا نہیں تھا کہ آراکوئے کے حوالے سے کیا تہلکہ مچا ہوا ہے اور کیا کیا پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ اسے یہ خبر بھی نہیں تھی کہ آراکوئے عنایت کی جیپ سے کیسے غائب ہوا۔ وہ لاعلم تھا کہ عنایت نے نادر مجسمے کو چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا تھا۔ یہ مجسمہ سنکی بڈھے جلالی کے ہاتھ آ گیا۔ لیکن عنایت دوبارہ اس جگہ نہ پہنچ سکا جہاں اس نے مجسمہ پھینکا تھا۔ وہ موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے، آراکوئے اب کہاں ہو سکتا ہے؟'' میں نے ابرار صدیقی سے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''یہ وہ سوال ہے جس کے بارے میں، مَیں نے ہزار بار سوچا ہے اور کبھی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ بس اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ عنایت سے وہ مجسمہ کسی دوسرے گروپ نے چھین لیا ہو...... یا پھر اس نے خود ہی راستے میں کسی کو تھما دیا ہو...... یا پھر کہیں پھینک دیا ہو تا کہ وہ بھکشوؤں کے ہاتھ نہ آئے اور اگر وہ زندہ بچ جائے تو بعد میں آ کر اسے ڈھونڈ لے۔ لیکن ہڑپہ سے شیخوپورہ اور پھر وزیر آباد کئی سو میل کا سفر ہے۔ پتا نہیں کہ وہ مجسمہ کب اور کہاں عنایت سے علیحدہ ہوا۔''

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لافنگ بدھا کا مجسمہ مل چکا ہے اور اب ایک بار پھر اس کی تلاش کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور یہ سو فیصد تصدیق شدہ خبر ہے۔''

ابرار ایک دم گم صم ہوگیا۔ اس کے چہرے سے جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے ابرار صاحب! آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مجسمہ وہاں پہنچ جائے جاں اسے پہنچنا چاہیے۔''

''کیوں چاہتے ہو تم؟ کیوں چاہتے ہو؟'' وہ چلّا اٹھا۔ ''خدا کے لئے بھول جاؤ اسے۔ لعنت بھیج دو اس پر۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ اتنے زور سے بولا تھا کہ اسے کھانسی ہونے لگی۔ وہ کتنی دیر تک کھانستا رہا۔ کھانسنے سے اس کے پہلو کا زخم تکلیف دیتا تھا اور وہ دہرا ہو جاتا تھا۔

ہم نے بمشکل اسے پُرسکون کیا۔ پانی وغیرہ پلایا۔ وہ آراکوئے کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں پوچھ رہا تھا کہ اگر مجسمہ واقعی مل چکا ہے تو کب اور کیسے ملا؟ وہ یقیناً دل ہی دل میں ہمارے ''لالچ'' کو بھی کوس رہا تھا۔

عمران نے اسے بتایا۔ ''ابرار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم آپ کی طرح ''نوادرات'' کے دیوانے نہیں ہیں۔ آراکوئے میں ہماری دلچسپی کی وجہ کچھ اور ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ ہماری ایک بہت قریبی عزیزہ ایک بڑے انڈین بدمعاش کے حبس بے جا میں ہے۔ اسے چھڑانے کا ہمارے پاس بس ایک ہی راستہ ہے۔ ہم کسی طرح آراکوئے تک پہنچ جائیں......اس کے لئے۔''

''مم...... میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ بہت زیادہ مہربانی ہوگی۔ مجھ سے اس بارے میں بات نہ کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' اس کے پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

میں نے عمران کو اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ فی الحال ہم یہ موضوع نہ چھیڑیں۔ غالباً عمران بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ہم نے موضوع بدل دیا۔

ٹی وی اور اخبارات میں گولڈن بلڈنگ کے حوالے سے کافی کچھ آ رہا تھا۔ یہ بات بار بار دہرائی جا رہی تھی کہ وہاں دو ''گروپوں'' میں تصادم ہوا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ رہا تھا کہ فقط دو بندے وہاں گھسے تھے اور انہوں نے گولڈن بلڈنگ کی ایسی تیسی کر دی تھی۔ گولڈن بلڈنگ میں فلم اور آرٹ کے پردے کے پیچھے جو دھندا ہو رہا تھا، اس پر بھی کھل کر بات کی جا رہی تھی۔ جرنلسٹ اسے بڑے وثوق سے فحاشی کا اڈا قرار دے رہے تھے۔ سارو یعنی سراج اور تیواری کی موت کو بھی خبروں میں ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ خبروں اور تبصروں میں یہ بات بھی وضاحت سے کہی جا رہی تھی کہ گولڈن بلڈنگ والے، فلم ٹی وی کی مشہور اداکاراؤں کے ہم

شکل چہرے ڈھونڈتے تھے۔ پھر ان چہروں کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عیاش امرا کو خطیر رقوم کے عوض ان سلیبریٹیز کی جعلی قربت فراہم کی جاتی تھی، اور اکثر کیسوں میں یہ ڈراما کامیاب رہتا تھا۔

عمران چاہتا تھا کہ تینوں پاکستانی لڑکیوں کو پاکستانی ایمبیسی کے ذریعے پاکستان واپس بھجوا دیا جائے۔ اس کے لئے اس نے جیلانی اور اس کے مقامی دوست نصیر احمد کو ضروری ہدایات دیں اور ان سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں معلومات حاصل کریں۔ بہرحال یہ کام فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہ تینوں لڑکیاں ہمیں دیکھ چکی تھیں اور یہ بھی جان چکی تھیں کہ گولڈن بلڈنگ کا بیڑا غرق ہم نے کیا ہے۔ جب تک ہم آراکوئے کی بازیابی اور ثروت کی رہائی کا کام مکمل نہ کر لیتے، ان لڑکیوں کو سامنے نہیں لایا جا سکتا تھا۔

ایشوریا رائے اپنے حالات اور فیصلوں پر بڑی نادم تھی۔ وہ جلد از جلد پاکستان واپس پہنچنا چاہتی تھی۔ ایشوریا رائے کو بھی راجا کی موت کا علم ہو چکا تھا اور وہ اس پر کچھ افسردہ بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ راجا ایک بار اس کی قربت حاصل کرنے کے بعد بار بار اس کے قریب آنے کا خواہش مند تھا مگر اپنی کئی دوسری خواہشوں کی طرح وہ یہ خواہش بھی لے کر مٹی کے نیچے چلا گیا تھا۔

ایشوریا کا دل نائیکا شاربہ کی طرف سے بھی بہت کھٹا تھا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ایک بڑا کام کیا ہے مگر ایک چھوٹا کام اب بھی باقی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''شاربہ بائی...... وہ بہت خبیث عورت ہے۔ شریف لڑکیوں کو اپنے چنگل میں پھنساتی ہے۔ ان کو برباد کر کے اسے خوشی ہوتی ہے۔ اب تو وہ کہیں چھپ چھپا گئی ہوگی اور ہو سکتا ہے کئی مہینوں کے لئے کہیں نظر ہی نہ آئے۔ مگر وہ بڑی ڈھیٹ ہے۔ جب معاملے ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو وہ پھر کسی بلا کی طرح نکل پڑے گی۔''

''کوئی بات نہیں، نمٹ لیں گے اس سے بھی اور اچھی طرح نمٹیں گے۔'' عمران نے کہا۔

ہم نے سویٹی عرف ایشوریا رائے اور دونوں لڑکیوں کو پوری تسلی دی کہ وہ جب تک یہاں رہیں گی، پوری حفاظت اور آرام کے ساتھ رہیں گی۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ یہاں اپنی موجودگی کو مکمل طور پر راز میں رکھیں۔

پلان کے مطابق اب ہمیں رتنا گری جانا تھا اور علاقے کے پگوڈاؤں کا جائزہ لینا تھا مگر ابرار صدیقی کا مل جانا بھی ایک بڑی مثبت پیش رفت تھی۔ وہ ابھی کچھ بتا نہیں رہا تھا لیکن

امید تھی کہ ہم کوشش کرتے رہے تو وہ کسی حد تک اپنی زبان ضرور کھولے گا۔اس کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے جو اس کے پیچھے پاکستان پہنچے اور پھر اسے وہاں سے اٹھا کر یہاں انڈیا لائے۔ وہ بار بار ان کی بے پناہ خطرناکی کا ذکر کرتا تھا اور یہ بھی بتاتا تھا کہ چند ماہ پہلے وہ اسے کسی روحانی عمل سے گزارنے کے لئے یہاں انڈیا میں لے کر آئے تھے۔

جب سے ہم جاوا سے رخصت ہوئے تھے اس سے ہمارا رابطہ نہیں ہوا تھا اور ہم کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جاوا سے ٹیلی فونک رابطے میں خطرات موجود تھے۔ عین ممکن تھا کہ موبائل کال کی صورت میں ہماری لوکیشن ڈھونڈ لی جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کل میڈم صفورا سے بات کرنے کے بعد ہم دونوں نے اپنے سیل فون بند کر دیئے تھے۔ابرار صدیقی کے حوالے سے بھی ہمارے ذہنوں میں شکوک موجود تھے۔ میں نے کہا۔''عمران! ہمیں ابرار کا دھیان رکھنا ہوگا۔ یہ غائب بھی ہو سکتا ہے۔''

''ابھی تو خیر یہ بہت ڈرا ہوا ہے۔ یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بہر حال میں کسی کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔''

اگلے روز ہم نے ابرار کو اچھا ماحول فراہم کیا اور اس سے پھر بات چیت شروع کی۔ عمران کی زبان دانی نے کام دکھایا۔ وہ بڑی مہارت سے ابرار کو شیشے میں اتارتا چلا گیا۔ابرار پہلے تو آرا کوئے کے حوالے سے بات ہی نہیں کرتا تھا مگر اب وہ تھوڑا بہت کہنے اور سننے لگا۔ بہر حال اس کا خوف اپنی جگہ برقرار تھا۔ گفتگو کے دوران میں ابرار صدیقی نے دواری پگوڈا کا نام لیا۔

''یہ کیا جگہ ہے؟''عمران نے پوچھا۔

ابرار صدیقی چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد کمزور آواز میں بولا۔''میرا خیال ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ لوگ مجھے لے جانا چاہ رہے تھے۔اگر اس رات کنٹینر نہ الٹتا تو یقیناً میں وہاں پہنچ چکا ہوتا۔اور لگتا تو یہی ہے کہ اب تک ختم بھی ہو چکا ہوتا۔''

''یہ دواری پگوڈا ہے کہاں؟''عمران نے پوچھا۔

''ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن جو کچھ میرے کانوں تک پہنچا اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رتنا گریا اس کے آس پاس کا کوئی بودھ مندر ہے۔ سمندر کے کنارے بالکل ویران علاقے میں ہے۔''

رتنا گری کے نام پر میں اور عمران دونوں چونکے۔ بہر حال ہم نے اپنے تاثرات ابرار صدیقی پر ظاہر نہیں ہونے دیئے۔

''آپ کا کیا خیال ہے، وہ لوگ آپ کو وہاں کیوں لے کر جا رہے تھے؟''میں نے پوچھا۔

ابرار نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔''میں جو بھی برے سے برا خیال کر سکوں، وہ شاید ٹھیک ہی ہوگا۔ وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔آپ دونوں نے میرے جسم پر جلنے کے نشان تو دیکھے ہی ہوں گے۔ یوں سمجھیں کہ وہ اس سے کہیں آگے تک جا سکتے ہیں۔ زندہ بندے کی کھال کھینچ سکتے ہیں۔اس کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ کہنے کو تو وہ بودھ بھکشو ہیں لیکن بھکشوؤں والی کوئی بات ان میں نہیں ہے یا پھر شاید انہوں نے بھکشوؤں کا روپ دھار رکھا ہے۔''

ابرار صدیقی کے چہرے پر ایک بار پھر بے پناہ خوف کے سائے امڈ آئے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہم آرا کوئے کی تلاش میں ہیں۔ ہمارے ارادے اسے دل و جان سے دہلا رہے تھے۔ یہ سوچ ہی اس کے لئے سوہان روح تھی کہ آرا کوئے کو ڈھونڈا جائے۔ وہ اس معاملے میں بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا کہا ہوا کوئی لفظ اس کے لئے مصیبت بن جائے۔

وہ روہانسی آواز میں بولا۔''میرے دوستو! میں اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو چکا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھوں مرنا پسند کر لوں گا لیکن یہ پسند نہیں کروں گا کہ تم اس مصیبت میں مجھے پھر سے گھسیٹو۔ بلکہ میرا ہمدردانہ مشورہ تمہیں اور صفورا کو بھی یہی ہے کہ آگ اور موت کے اس کھیل کو بھول جاؤ۔ وہ جنونی لوگ ہیں۔انہوں نے مجسمے کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔''ابرار بھائی! ہم جانتے ہیں آپ نے اس سلسلے میں بہت تکلیف سہی ہے۔ ہم آپ کو مزید مصیبت میں ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔لیکن آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ہمیں ان حالات کے بارے میں بتائیں جن سے آپ گزرے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو جن سے آپ کا واسطہ پڑا۔''

ابرار صدیقی کی باتوں سے یہی معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ بھکشو لگتے تھے اور کچھ کٹر قسم کے ہندو تھے۔ ان کے ساتھ کچھ مقامی لوگ بھی تھے۔ یہ مقامی بھی خطرناک غنڈے ہی تھے۔ یقیناً انہیں بھاری معاوضے دے کر اپنے ساتھ ملایا گیا تھا۔ بھکشو بھی صرف اپنے منڈے ہوئے سروں کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے تھے ورنہ ان کا لباس اور حلیہ بھی عام انڈین اور پاکستانیوں جیسا ہی تھا۔ وہ بار بار جان سے مارنے کی دھمکی دیتے تھے اور خون کی ندیاں بہانے کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحے کے علاوہ دندانوں والے تیز دھار

چھرے تھے۔ آنکھوں سے ہر وقت چنگاریاں سی چھوٹتی تھیں۔ پاکستان اور انڈیا میں عام مقامی لوگ ان کے لئے کیڑے مکوڑوں کی طرح حقیر تھے۔ وہ کسی کو بھی چیونٹی کی طرح مسل دیتے تھے۔ ابرار کے مطابق پاکستانی اور انڈین علاقے میں کم وبیش پندرہ افراد انہوں نے معمولی وجوہات پر قتل کئے۔

ابرار صدیقی سے بات چیت کے بعد میں اور عمران دوسرے کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ ابرار کی باتوں میں رتنا گری کا ذکر آیا تھا۔ اس سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کو بھی کہیں رتنا گری کے آس پاس ہی لے جایا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ رتنا گری کا وہ کون سا معبد ہوگا جہاں ڈاکٹر مہناز پائی جائے گی۔ اب ایک نام ہمارے سامنے آگیا تھا۔ اور وہ تھا دواری پگوڈا کا۔ اس بات کی امید کی جاسکتی تھی کہ ڈاکٹر مہناز بھی اسی پگوڈا میں لے جائی گئی ہوگی۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھا، راستوں سے کیسے راستے نکلتے ہیں۔ ہم نے سویٹی کی مدد کرنے کی کوشش کی اور قدرت نے ہماری مدد کر دی۔ ہم رتنا گری جا کر زیادہ خجل خوار ہونے سے بچ گئے۔ اب ہمارے پاس دواری پگوڈا کا نام ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ نام ہمیں بڑا فائدہ پہنچائے گا۔“

”تم ایک دم جینئس ہو بلکہ جینئس بھی تمہارے لئے چھوٹا لفظ ہے۔“ میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

”تم مذاق کر رہے ہو لیکن یار! تمہیں تمہارے بار وندا جیکی کی قسم...... سچ بتاؤ جب میں پینٹ کوٹ پہنتا ہوں اور اس طرح ایک دم گھوم کر دیکھتا ہوں تو سین کونری نہیں لگتا، جیمز بانڈ والا۔“

”اچھا بکواس بند کرو۔“

”یار! تم اسے بکواس کہہ رہے ہو، مجھے فکر پڑی ہوئی ہے۔ یہ ممبئی ہے۔ یہاں بڑی بڑی شکاری آنکھوں والے ڈائریکٹر اور فلمساز ہیں۔ کھٹاک سے بندے کو کاسٹ کر لیتے ہیں فلم میں۔ اگر کسی نے مجھے کاجل یا پریتی زنٹا وغیرہ کے ساتھ کاسٹ کر لیا تو وہ بے چاری شاہین تو بے موت ماری جائے گی۔“

”نہیں ماری جائے گی۔ وہاں وہ دو بے وقوف خواتین ریما اور نرگس بھی تو تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔“

”یار! ان کی اور بات ہے، یہ بالی وڈ ہے۔ یہاں کی ہیروئنیں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں۔

اکثر اپنے ساتھی ہیرو کی عزت لوٹ لیتی ہیں۔ مجھے تو بڑی شرم آئے گی یار! میرا تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے ایسی بے عزتی کا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ کیا منہ دکھاؤں گا شاہین کو۔ میرے کردار کو داغ لگ گیا تو کون قبول کرے گا مجھے؟ ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر پڑا رہوں گا۔“

”دوراندیشی یہی ہے کہ ابھی خودکشی کر لو۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”ویسے ایک حل اور بھی ہے۔ میں کوٹ پینٹ ہی نہیں پہنتا۔“

”بہت بڑا احسان ہوگا یہ فلمی دنیا پر اور برصغیر کی ہیروئنوں پر۔“

اسی دوران میں جیلانی اندر داخل ہوگیا۔ وہ عمران کے بلاوے پر ہی آیا تھا۔ عمران فوراً سنجیدہ ہوگیا۔ ”یا شیخ! مجھے ایک جگہ کے بارے میں ارجنٹ رپورٹ چاہئے۔ بس دس پندرہ گھنٹے کے اندر اندر۔“

”بتایئے جی۔“

”دواری پگوڈا یا دواری بودھ مندر۔“ عمران نے کہا۔

”یہ کس علاقے میں ہے؟“

”رتنا گری اور اس کے آس پاس کہیں۔“

”ٹھیک ہے عمران بھائی۔“

”تفصیل مکمل ہونی چاہئے پیارے۔ جگہ کا جغرافیہ، تاریخ اور حساب وغیرہ۔ نصیر احمد کو اپنے ساتھ لے لو اور ابھی کام شروع کر دو۔“

رات بخیریت گزری۔ اگلے روز بارہ بجے کے قریب جیلانی نے تفصیلی رپورٹ ہمیں دے دی۔ اس وقت جگت سنگھ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھا تھا۔ رتنا گری سے آگے بالکل سنسان علاقے میں دواری نام کا ایک پرانا پگوڈا واقع تھا۔ یہ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن بڑا مضبوط سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دیواریں پتھریلی تھیں اور ایک سائیڈ گھاٹ کی طرف تھی۔ یہ دراصل سمندر ہی کا پانی تھا جو جھیل کی صورت میں کافی آگے تک آیا ہوا تھا۔ دواری پگوڈا کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بودھوں کے ایک تندمزاج فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ عام طور پر بودھ مت کو ماننے والوں کو امن پسند اور رقیق القلب سمجھا جاتا ہے لیکن یہ فرقہ خاصا مختلف تھا۔ ان لوگوں کا یقین تھا کہ حد سے بڑھی ہوئی نرمی اور منکسر المزاجی ان کو دھیرے دھیرے ختم کر دے گی اور دوسرے مذاہب ان پر غالب آجائیں گے۔ جیسے بنگال اور بہار میں پال سلطنت کے خاتمے سے بودھ برباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ تشدد اور خوں ریزی سے پرہیز نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں سے کئی تو ایسے تھے جو

اپنے مزاج کے اعتبار سے خونی قاتل کہلائے جاسکتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس فرقے کا بانی کوئی ہندو تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کی کچھ رسوم میں ہندوانہ جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ اس فرقے کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی تھی اور یہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جتنا محدود ہوا تھا، اتنا ہی کٹر اور جنونی ہو گیا تھا۔ دواری بودھ مندر ان لوگوں کا ہی ٹھکانا تھا۔ یہ پُر اسرار جگہ تھی۔ عام لوگ اس طرف جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔

عمران نے کہا۔ ''اگر وہاں گھسنا ہو تو کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ بڑا مشکل کام ہے۔'' جیلانی نے لمبی سانس لی۔ ''وہاں یہ لوگ بڑا سخت پہرا رکھتے ہیں اور یہ پہرا ایک جگہ نہیں، کم از کم تین جگہ ہے۔ اندرونی عمارت کے گرد پتھروں کی ایک اونچی فصیل ہے۔ یہاں صرف ایک پھاٹک ہے اور وہ بھی سخت نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ......''

''یار! تم ہماری طرف ہو یا ان کی طرف؟'' عمران نے جیلانی کی بات کاٹی۔ ''کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے ہمیں آگے بڑھنے کی راہ ملے۔''

''اب وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' جیلانی مسکرایا۔ ''آپ کی توقع سے زیادہ بھاگ دوڑ کی ہے ہم نے۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں ایک بندہ ہے جسے ممبئی کا چور بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا نام موہن بجلی ہے۔ لڑکپن میں، یہ ہاکی کا زبردست کھلاڑی تھا پھر چور اور ڈکیت بن گیا۔ اب جیل میں لمبی قید بھگت رہا ہے۔''

''ہاں، اس بندے کا نام تو میں نے بھی سنا ہوا ہے۔'' جگت سنگھ بولا۔

''اس کے بارے میں ہمیں ایک خاص بات کا پتا چلا ہے۔'' جیلانی نے کہا۔ ''یہ شخص چھ سات سال پہلے اسی بودھ مندر میں ایک زبردست واردات کر چکا ہے۔ یہ پانی والی طرف سے بودھ مندر کی ایک سرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ سرنگ پرانے وقتوں میں پانی کے نکاس کے لئے استعمال ہوتی تھی لیکن پھر پانی چڑھ جانے کی وجہ سے بند ہو گئی۔ موہن بجلی نے یہی راستہ استعمال کیا اور مندر کے بالکل اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے تقریباً بیس کلو سونا چرایا جو مورتیوں اور مقدس باکسز کی شکل میں تھا۔ بعد میں وہ پکڑا بھی گیا اور اس سے تھوڑی بہت چیزیں واپس بھی حاصل کر لی گئیں۔ پھر وہ بھاگ بھی گیا۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ موہن نامی بندہ بودھ مندر میں گھسنے کا خفیہ راستہ جانتا ہے۔''

''تو کیا یہ راستہ اب تک ویسے ہی کھلا پڑا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... واردات کے بعد وہاں لوہے کی جالیاں لگا دی گئی تھیں لیکن وہ جالیاں

برسوں سے پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یقیناً خستہ ہو چکی ہوں گی۔ ان دو تین جالیوں کو کاٹنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ مشکل صرف یہ بات ہے کہ سمندری پانی کے نیچے اس خفیہ راستے کی لوکیشن معلوم ہو اور یہ کام صرف اور صرف موہن کر سکتا ہے۔''

''اور وہ جیل میں ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کوئی طاقتور بندہ ہو تو اسے پیرول پر یا کسی اور طریقے سے عارضی رہائی بھی دلا سکتا ہے...... مثلاً جاوا۔'' جیلانی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

عمران نے چونک کر جیلانی کو دیکھا پھر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ جاوا نے اس ''مشن'' کے دوران میں ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے ہمیں دو تین فون نمبرز بھی دے رکھے تھے جن کے ذریعے ہم جاوا اور اس کے قریبی ساتھیوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔ خطرہ بس یہی تھا کہ کہیں فون کرنے سے ہماری لوکیشن کا پتا نہ چل جائے۔

اس مسئلے کا حل یہ نکلا کہ عمران اور جیلانی ہائی روف میں سوار ہو کر نکلے اور انہوں نے ڈھائی تین کلومیٹر دور جا کر جاوا سے رابطہ کیا۔ جاوا کے ساتھ عمران کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ عمران نے جاوا کو اپنی ڈیمانڈ بتائی۔ جاوا نے کسی خاص تردد کے بغیر ہامی بھر لی۔ ہاں، یہ کہا کہ اس کام میں تین چار روز لگ سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ ہم اس دوران میں تیاری کر سکتے تھے اور مزید معلومات بھی جمع ہو سکتی تھیں۔

O......❖......O

جگت سنگھ بالکل آگ بگولا تھا۔ اس کے سینے میں انتقام کے انگارے دہک رہے تھے۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جاوا بہت بڑا ڈان ہے مگر اس کے اندر وہی دیوانگی تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور چیونٹی کو ہاتھی سے لڑا دیتی ہے۔ اسے پتا تھا کہ اس کی محبوبہ آشا کور کو کس طرح مارا گیا اور اس کے لاڈلے بھائی کے جوان جسم سے زندگی کس طرح چھینی گئی۔ جگت سنگھ پنجاب کا نڈر منچلا تھا۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر اس کے بازوؤں میں بجلیاں کوند جاتی تھیں۔ اب یہ بجلیاں کسی کو بھسم کرنے کے لئے بے تاب تھیں۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ اندھا دھند شراب پیتا تھا اور اپنی کرپان کی دھار پر انگلی پھیرتا رہتا تھا۔ جاوا کے لوگوں نے چند روز پہلے اسے لنگڑی پورہ گاؤں کے نواح سے پکڑا تھا۔ اسے فرید کوٹ لائے، وہاں بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کے منہ پر گوبر باندھ کر اسے الٹا لٹکائے رکھا۔ پھر ممبئی لے آئے۔ جاوا کے دست راست پریم چوپڑا نے اسے تیواری لال کے حوالے کیا جس نے اسے گولڈن بلڈنگ کے بندی خانے میں پہنچا دیا۔ یہاں اس کی اکڑ توڑنے کی بھرپور کوشش

کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تلملا کر یہ لوگ اسے مردانہ صفات سے محروم کرنے کا سوچ رہے تھے جب ہم وہاں پہنچے اور اسے رہائی دلائی۔

جاوا نے تین چار دن کا وقت مانگا تھا لیکن غیر متوقع طور پر دوسرے ہی روز رات گیارہ بجے کے قریب مطلوبہ شخص ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اسے لانے کے لئے میں، عمران اور جیلانی کا دوست نصیر احمد ساحل پر گئے اور ایک نائٹ کلب کے سامنے پریم چوپڑا نے اس بندے کو ہمارے حوالے کیا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال رہی ہوگی۔ شکل سے ہی پرلے درجے کا خرانٹ اور موقع پرست لگتا تھا۔ اسے نہلا دھلا کر لایا گیا تھا پھر بھی اس کے جسم سے بو اٹھ رہی تھی۔
پریم چوپڑا نے اسے ہماری گاڑی میں دھکیلا اور بولا۔ ''اب یہ تم لوگوں کی ذمے داری ہے۔''

''بالکل بے فکر رہو۔'' عمران نے کہا۔

ہم ہائی روف گاڑی میں واپس روانہ ہوئے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی تھی...... ہم اپنے عقب سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ بہرحال خیریت گزری، ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا۔ لیکن نئے آنے والے شخص کی طرف سے خیریت نہیں گزری۔ وہ واقعی بلا کا پھرتیلا اور عیار تھا۔ ایک سنسان سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی ذرا آہستہ ہوئی تو اس نے اچانک کام دکھایا۔ ہائی روف کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اس نے اسے تیزی سے سلائیڈ کیا اور اسے پورا کھول دیا۔ عمران کو ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو وہ کسی چھلاوے کی طرح باہر چھلانگ لگا چکا ہوتا۔ عمران کے ہاتھ میں اس کی ڈبی دار شرٹ کا کالر ہی آیا۔ عمران نے جھٹکے سے اسے پیچھے کی طرف کھینچا۔ اس نے عمران کے سینے پر ٹکر رسید کی اور مچھلی کی طرح تڑپ کر عمران کی گرفت سے نکلا۔ میں سب سے پچھلی نشست پر تھا۔ میں نے اسے باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے ہی جست لگائی۔ اس دفعہ عمران نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈالا۔ دونوں اوپر نیچے سڑک کے کنارے کچی زمین پر گرے۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنا چاہ رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک دونوں میں زبردست کشمکش ہوئی۔ پھر عمران نے اپنا پستول نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا۔
عمران کے تیور دیکھ کر اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اس دوران میں، مَیں اور نصیر احمد بھی گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ عمران اسے گھسیٹتا ہوا واپس گاڑی میں لے آیا۔ اکا دکا موٹر سائیکل سوار اس منظر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرے۔ غالباً یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کوئی واردات ہو رہی ہے۔ کسی نے رکنے یا اپنی رفتار دھیمی کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دو منٹ بعد ہم پھر اپنے اس مہمان موہن بجلی کے ساتھ اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی تک تو وہ واقعی ''بجلی'' ثابت ہوا تھا۔ اس کے چھریرے بدن میں قابلِ ذکر تیزی تھی

مگر اس کا واسطہ بھی کسی کم پھرتیلے شخص سے نہیں پڑا تھا۔ عمران نے اسے گریبان سے دبوچ دبوچ ایک زوردار جھانپڑ اس کے سر پر لگایا۔ ''ماں کے شکم میں کیسے ٹکا رہا تو؟''
اس نے خونی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ تُو نا ہیں، تیرا یہ کتا پستول بولت ہے۔ اگر ماتا کا دودھ پیا ہے تو اس کے بغیر بات کر۔''
عمران نے ایک اور جھانپڑ لگایا۔ ''اس کے بغیر بھی بات کر لیں گے لیکن پہلے کسی ٹھکانے پر تو پہنچنے دے۔''
اس نے اپنے منہ میں جمع ہونے والا خون غصیلے انداز میں گاڑی کے فرش پر تھوک دیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم نصیر احمد کے گھر پر تھے۔ موہن بدستور غصیلے موڈ میں تھا۔ عمران کا ایک گھونسا اس کے منہ پر پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد عمران نے موہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اب بتاؤ، کیا ارادے ہیں؟''
وہ خاموش رہا۔ بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے اسے اپنی تیزی پھرتی پر مان ہے۔ ہاکی شاکی اور باکسنگ بھی کھیلتا رہا ہے نا۔ سنا ہے کئی بار پولیس کی حراست سے بھی بھاگا ہے۔''
''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' عمران نے کہا پھر قمیص کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر دراز میں رکھ دیا۔ موہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''لو بھیا! پستول نہیں ہے میرے پاس۔ اب اپنی کوئی حسرت نکالنی ہے تو نکال لو۔''

موہن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔

''چل اٹھ، تجھے مطلب بتاتا ہوں۔'' عمران نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گھر کے عقبی لان میں تھے۔ ایک گیٹ اس طرف بھی موجود تھا۔ یہ گراسی لان کوئی پچاس فٹ چوڑا اور ساٹھ ستر فٹ لمبا ہوگا۔ ایک ٹیوب لائٹ یہاں مدھم روشنی بکھیر رہی تھی۔ عمران نے گیٹ کا کھٹکا ہٹا دیا اور موہن سے بولا۔ ''لو بھیا! اب بھاگ سکتے ہو تو بھاگ لو۔''
موہن کمار، عمران کا اشارہ سمجھ گیا۔ عمران اسے بہ زور بازو بھاگ جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ ہم یعنی میں، جگت سنگھ، جیلانی اور نصیر احمد وغیرہ تماشائی کی حیثیت سے یہاں موجود تھے۔

''اپنی زبان پر قائم رہو گے یا پھر پستول نکال لو گے؟'' موہن نے پوچھا۔

''نہیں...... پستول نہیں نکالوں گا...... بلکہ یہ وچن بھی دیتا ہوں، گیٹ سے آگے نکل

جاؤ گے تو تیرا پیچھا بھی نہیں کروں گا...... بلکہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرے گا۔''

موہن کی سیاہ آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کا سانولا چہرہ تمتما سا گیا۔ اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے ہمارے چہرے دیکھے جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ ہم کسی طرح کا مذاق تو نہیں کر رہے۔

وہ بہت تیز طرار تھا اور عیار بھی لیکن میں جانتا تھا کہ عمران اسے سنبھال لے گا۔ بالکل اچانک ہی ممبئی کے اس چور نے دوڑ لگا دی۔ اس کا رخ سیدھا گیٹ کی طرف تھا۔ عمران پہلے سے تیار تھا۔ وہ اس کے راستے میں آیا۔ ممبئی کے چور یعنی موہن نے بڑی تیزی سے اسے چکما دیا۔ وہ جھکائی دے کر بائیں طرف سے نکلا۔ عمران نے جست لگا کر اس کی کمر پکڑ لی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انسان نہ ہو کوئی چکنی مچھلی ہو۔ جس طرح مگرمچھ تیزی سے پانی کے اندر پلٹنیاں کھاتا ہے، موہن نے بھی کھائیں اور نکل گیا۔ مگر اس کا ٹخنہ پھر بھی عمران کے ہاتھ میں رہا۔ ٹخنہ چھڑانے کے لئے موہن نے دوسری ٹانگ سے عمران کے چہرے پر ضرب لگانا چاہی۔ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس برق رفتار وار سے خود کو نہ بچا سکتا۔ عمران نے جھک کر خود کو بچایا اور موہن کی دوسری ٹانگ بھی تھام لی۔ تب عمران نے گھما کر اسے دور پھینکا اور پھر جست لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ موہن نے عمران سمیت خود کو گیٹ کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت عمران کی گرفت سے نکل جائے گا۔ اس کے جسم میں بے پناہ لچک تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کو چھڑانے اور بھاگ جانے کی خصوصی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر واسطہ عمران سے تھا۔ اس نے موہن کو فرشی لاک لگایا اور بے بس کر دیا۔ اس نے عمران کو گھونسا جڑا تو عمران نے جوابی طور پر تین گھونسے جڑے اور اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ اب بالکل شکنجے میں تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے ہار مان لی۔

عمران اس کے اوپر سے اٹھ گیا۔ ''دیکھ لو، پستول کے بغیر ہی تمہیں 'لائن حاضر' کیا ہے۔''

وہ شکست خوردہ نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے گھاس کی ہریالی پکڑ چکے تھے۔ قمیص سامنے سے دو ٹکڑے ہو گئی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''چلو ایک اور چانس دیتا ہوں اور یہ بھی پستول کے بغیر۔ ایک دفعہ اور زور مار کر دیکھ لو۔''

وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا، فوراً لپک پڑا۔ اس مرتبہ اس نے اتنی تیزی سے عمران کے سینے پر ٹکر ماری کہ عمران لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ عمران اس کے پیچھے گیا۔ یہ مختصر سی دوڑ عمران نے ہی جیتی۔ اس نے بھاگتے بھاگتے جست کی

اور گیٹ سے فقط آٹھ دس فٹ کی دوری پر موہن کو چھاپ لیا۔ پندرہ بیس سیکنڈ تک زبردست کشمکش ہوئی۔ آخر عمران نے اس کی پشت کی طرف آ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے ہوا میں اٹھا لیا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں چلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ عمران اسے اسی طرح اٹھائے اٹھائے برآمدے کی طرف لے آیا اور پھر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔

''بند کر دو گیٹ۔'' عمران نے پھنکار کر کہا۔

موہن اسی طرح فرش پر پڑا ہانپتا رہا۔ عمران کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ اس نے موہن کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''اب بھاگو گے تو پستول سے روکوں گا اور سیدھی تیرے ناریل میں گولی ماروں گا۔''

○......❖......○

اگلے دس بارہ گھنٹے میں یہ موہن نامی شخص غیر متوقع طور پر نارمل نظر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر اپنی ہار مان لی ہے اور اب مزید کوئی چکما نہیں دے گا۔ ناشتے کے بعد اس نے عمران سے طویل مشورہ بھی کیا۔ یہ مشورہ دواری مندر کے اندر جانے کے حوالے سے ہی تھا۔ بعد میں، مَیں اور جیلانی بھی اس مشورے میں شریک ہو گئے۔ موہن نے تصدیق کی کہ اس بودھ مندر کے اندر گھسنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے پانی کے راستے سے۔ اس نے کہا کہ اس کے لئے پانی میں اترنے والوں کو ایک طویل ڈبکی لگانا ہوگی۔ اس کے لئے غوطہ خوری والا سلنڈر اور ماسک ضروری ہے۔ اس کے علاوہ واٹر پروف تھیلے جن میں اسلحہ اور ایمونیشن وغیرہ محفوظ رہ سکے۔ مندر کا اندرونی نقشہ موہن کے ذہن میں کسی فوٹو اسٹیٹ کی طرح محفوظ تھا۔ ہم نے اس حوالے سے بھی تفصیلی بات کی اور پلان ترتیب دیا۔

آخر میں موہن کمار بولا۔ ''یہ خطرناک کام ہے۔ اس میں ہم مارے بھی جا سکت ہیں۔ تم لوگوں کا تو اپنا لوبھ (لالچ) ہے۔ میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟''

''جن لوگوں نے تمہیں جیل سے نکالا ہے، انہوں نے کچھ نہ کچھ فائدہ تو بتایا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''صرف اتنا کہ اگر میں مدد کروں گا تو میری قید میں سے دو چار سال کم کر دیئے جاویں گے۔ لیکن مجھے اس سے کچھ زیادہ فائدہ ہونے والا ناہیں۔ میری قید تیس سال سے چند مہینے زیادہ ہی ہے۔''

عمران بولا۔ ''تمہارے لئے مزید کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ جیل میں تمہاری مشقت ختم کرا دیں یا تمہیں بی کلاس وغیرہ دے دی جائے اور اس سے زیادہ بھی

کچھ ہو سکتا ہے۔''

''مثلاً کیا؟''

''تم یہ کام ختم ہونے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے لیکن فی الحال مجھے کیا مل سکتا ہے؟ میں کم از کم چوبیس گھنٹے اچھی طرح آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اگر تمہاری ڈیمانڈ ہے تو اس کا انتظام ہو جاتا ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں کی طرح موہن کمار بھی شراب اور عورت کا رسیا تھا۔ جیلانی کے مقامی دوست نصیر احمد نے اس کے لئے یہ سہولتیں فراہم کر دیں۔ گھر کی بالائی منزل کا ایک کمرا اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ وہ ایک نوخیز پارسی طوائف اور شراب کباب کے ساتھ وہاں موجود رہا۔ تاہم ہم اس کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت نہیں برت سکتے تھے۔ میں خود بھی بالائی منزل پر رہا اور مسلسل اس کی نگرانی کی۔

O.....❖.....O

اگلے روز دوپہر کے وقت ہم رتنا گری جانے کے لئے تیار تھے۔ عمران، میں، جگت سنگھ اور موہن کمار عرف موہن بجلی۔ جیلانی اور اس کے دوست نصیر احمد نے ہمارے لئے پانی میں ایک مختصر غوطہ مارنے کا انتظام کر دیا تھا۔ اس مختصر غوطے کے لئے ہمیں کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اچھی طرح تیراکی جانتے تھے حتیٰ کہ جگت سنگھ بھی اپنے گاؤں کی نہر میں لمبی ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ اس کی پشت پر سلنڈر نہ باندھا جائے۔ وہ پانچ چھ منٹ آسانی سے پانی کے نیچے گزار سکتا ہے لیکن یہ خطرہ مول لینا درست نہیں تھا۔

روانگی سے دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اپنا سیل فون آن کیا اور ثروت کو کال کی۔ حسبِ سابق پہلے میڈم صفورا ہی بولی۔ وہ بڑے مزے میں تھی۔ شاید امپورٹڈ سگریٹ پھونک رہی تھی اور اس کا ہلکا سا سرور اس کی آواز میں موجود تھا۔ اس نے اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ کوڈیاک ریچھوں کی آوازیں اکثر رات کو پریشان کرتی ہیں۔ ''وہ جوکر کدھر ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اشارہ یقیناً عمران کی طرف ہی تھا۔

''ہم ممبئی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ سامان وغیرہ باندھ رہا ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''تم دونوں ایک نمبر کے جھوٹے ہو، ایک دم لائرز۔''

''ایک نمبر کا جھوٹا تو ایک ہی ہو سکتا ہے میڈم اور وہ عمران ہی ہو گا۔''

''یعنی تم دو نمبر بھی ہو اور جھوٹے بھی۔'' میڈم نے فقرہ چست کیا۔ ''چلو اس ایک نمبر یے

کو بتانا کہ اب دس نمبریا نہ بنے۔ اس نے مجھ سے فون پر بات کرتے رہنے کا پرامس کیا تھا۔''

''او کے، میں کہہ دوں گا۔''

''لو بات کرو، ثروت سے۔'' اس نے کہا۔

چند سکنڈ بعد ثروت کی مدھم پریشان آواز ابھری۔ ''ہیلو تابش! کیسے ہیں آپ؟ اتنی دیر بعد فون کیوں کیا؟''

''بس ایک مجبوری آڑے آئی ہوئی ہے۔ میں آ کر تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''تو کب آ رہے ہیں؟''

''ابھی تو جا رہے ہیں ثروت! بس دعا کرنا۔''

وہ گم صم سی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ ''تابش! نصرت کا فون آیا تھا...... اسے آج کل ہلکا بخار ہو رہا ہے۔ اسی کے فون سے...... یوسف نے بھی بات کی۔'' وہ ذرا اٹک کر بولی۔

میرے سینے پر گھونسا سا لگا۔ مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ وہ ضرور ثروت کو منانے کی کوشش کرے گا۔ ''اب کیا کہہ رہے ہیں یوسف صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، وہ اس بات پر بڑے شرمندہ ہیں کہ انہوں نے نصرت کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ...... انہوں نے معافی مانگی ہے نصرت سے۔ وہ...... مجھ سے بھی...... معافی مانگ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں تھے۔ پتا نہیں غصے میں کیا کیا کہہ دیا۔ آپ پر...... گولی چلانے کا پچھتاوا بھی ہر وقت ان کے دماغ میں رہتا ہے۔''

''چلو کسی بات پر تو پچھتاوا ہوا اس کو۔'' میں نے کہا۔

جواب میں ثروت بالکل خاموش رہی۔ میں نے کہا۔ ''یہاں سے اچانک چلے جانے کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے؟'' میرے لہجے میں چبھن تھی۔

''وہ کہتے ہیں، میں اس لئے گیا تھا کہ پاکستان جا کر زیادہ اچھے طریقے سے تم دونوں کے لئے کچھ کر سکوں۔''

''تم دونوں...... کون؟''

''میں اور آپ...... وہ وہاں ایمبیسی کے ذریعے کوشش کر رہے ہیں۔ انٹرپول کا ایک بڑا جرمن افسر بھی ان کا قریبی دوست ہے...... برلن میں ان کا ہمسایہ تھا۔ وہ مسلسل یوسف سے رابطے میں ہے۔ آج کل انڈیا میں ہی موجود ہے۔ اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ ایک ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔''

''پوچھو۔''

"یوسف...... کہہ رہے تھے کہ کسی طرح ہماری لوکیشن کا پتا چل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے...... میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میڈم کو کچھ اندازہ ہے لیکن وہ اصرار کر رہے تھے۔"

"نہیں ثروت! یہ غلطی نہ کرنا۔ میں نے شروع میں ہی تاکید کر دی تھی۔ اس میں فائدے کی امید ایک فیصد بھی نہیں۔ نقصان کا خطرہ ایک سو دس فیصد ہے...... جاوا کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ بڑا زہریلا ناگ ہے۔ اس نے جو کہا ہے، کر دکھائے گا۔"

"ٹھیک ہے تابش! آپ جیسا کہتے ہیں...... آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔"

میں نے قریباً پانچ منٹ مزید لگائے اور ثروت کو قائل کیا کہ وہ اس طرح کی سوچ بھی ذہن میں نہ لائے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ جاوا نے فون کی سہولت دیتے وقت پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ صفورا اور ثروت کسی کو اپنی لوکیشن سے آگاہ نہیں کریں گی۔ اگر ایسا ہوا تو ان کی جان کی ضمانت یکسر ختم ہو جائے گی۔

ثروت سے بات ختم کر کے میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ یوسف وہی کچھ کر رہا تھا جس کے اندیشے میرے ذہن میں موجود تھے۔ یہاں انڈیا سے اپنے بزدلانہ فرار کا جواز پیش کرنے کے لئے اس نے ثروت کے سامنے بہانہ گھڑا تھا کہ وہ وہاں لاہور میں بیٹھ کر اپنی ڈوریاں ہلا رہا ہے اور ثروت کو بہ حفاظت پاکستان لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہا اور اگر کچھ تھوڑا بہت کر بھی رہا تھا تو اس کا نقصان ہی ہونا تھا، فائدہ نہیں۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ "اٹھ جا جگر! وہ کیا کہتے ہیں شیکسپیر صاحب اپنے پنجابی شعر میں...... اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔"

ہم ممبئی سے نکلے اور ہائی روف گاڑی کے ذریعے بذریعہ سڑک رتنا گری کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی کے پچھلے شیشوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ نصیر احمد کر رہا تھا۔ ہمارے پاس وہ اسلحہ موجود تھا جو گولڈن بلڈنگ سے حاصل ہوا تھا۔ ان میں رائفلوں کے علاوہ دستی بم بھی موجود تھے۔ جگت سنگھ انہیں کالے انار کہتا تھا اور ان کالے اناروں سے اسے خاصی رغبت تھی۔ جگت سنگھ پہلے بھی ایک نڈر شخص ہی تھا لیکن اب اپنی محبوبہ اور چھوٹے بھائی کے قتل کے بعد وہ شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک آگ سی دہکی رہتی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ہم جاوا کی شان اور دہشت کے سامنے جھکیں گے نہیں اور اس سے بدلہ چکانے کی اپنی سی پوری کوشش کریں گے اور میں نے صدقِ دل سے یہ وعدہ کیا تھا۔

راستے میں جے گڑھ کے قریب ایک جگہ ہمیں روکا گیا۔ یہ پولیس ناکا تھا۔ گاڑی کے

کاغذات پورے تھے۔ تلاشی میں کچھ برآمد نہیں ہوا کیونکہ اسلحہ سیٹوں کے نیچے محفوظ خانے میں تھا۔ کہیں، بریٹا پسٹل کی ایک گولی سیٹوں کے نیچے پڑی رہ گئی تھی۔ ناکے والوں نے سوال جواب شروع کر دیئے اور ہم سے شناختی کارڈز طلب کئے۔ نصیر اور جگت سنگھ کے پاس تو شناختی کارڈ تھے لیکن میرے، عمران اور موہن کے پاس نہیں۔ یہاں پر جاوا کے دیئے ہوئے فون نمبرز میں سے ایک نمبر کام آیا۔ میں نے فون کیا۔ کسی نامعلوم شخص نے ریسیو کیا اور فون بند کرنے کو کہا۔ دو تین منٹ بعد میرے فون پر بارعب آواز والا کوئی شخص بولا اور ناکے کے انچارج انسپکٹر سے بات کرانے کو کہا۔ انچارج نے بات کی اور اس کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے فوراً ہم سے معذرت کی اور بڑی عاجزی کے ساتھ جانے کی اجازت بھی دی۔

"راستے میں، مَیں نے عمران سے کہا۔" جاوا کو اب کم از کم یہ پتا تو چل ہی گیا ہوگا کہ ہم رتنا گری یا اس کے قریب کہیں جا رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ انڈیا دل کے لحاظ سے چھوٹا لیکن رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ اس رخ پر ہم سیکڑوں میل آگے تک سفر کر سکتے ہیں۔"

"پھر بھی تعاقب کی طرف سے مسلسل ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"تو ہوشیار رہو نا تم۔ میں ذرا شاہین سے لڑائی کر لوں۔" اس نے آنکھیں بند کیں اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

"یہ لڑائی کا کون سا طریقہ ہے؟"

"اس کو تصوراتی طریقہ کہتے ہیں اور اس طریقے سے لڑ کر میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہوں۔ ہر منگیتر اور شوہر وغیرہ کو اسی طرح لڑنا چاہئے۔"

O......❖......O

وہ رتنا گری اور اس کے آس پاس کہیں ایک ویران علاقہ تھا۔ سمندر یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن سمندری پانی ایک چھوٹی کھاڑی کی شکل میں کافی آگے تک آ چکا تھا۔ چاروں طرف کھجور، پام اور دیگر خودرو درخت تھے۔ درختوں کے نیچے زرد جنگلی گھاس حدِ نگاہ تک نظر آتی تھی۔ اس گھاس کے درمیان ایک نیم پختہ راستہ کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگے تک جاتا تھا۔ اس راستے کے آخری سرے پر اونچے پیڑوں کے درمیان ایک پرانا بودھ مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مندر کو حصار میں لینے والی بلند پتھریلی دیوار بہت دور سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ عمران نے اپنا بیگ کھولا اور طاقتور ٹیلی اسکوپ نکال لی۔ اس ٹیلی اسکوپ نے ہمیں مندر کے مناظر وضاحت سے دکھائے۔ بلند پتھریلی دیوار کے اوپر زرد کپڑوں والے بھکشو

چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مندر کے اکلوتے دروازے کا کچھ حصہ بھی نظر آرہا تھا۔ یہاں یقیناً کڑا پہرا تھا۔ یہ جگہ مندر سے زیادہ ایک چھوٹے قلعے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

اپنے پلان کے مطابق ہم نے قرب وجوار کا جائزہ لیا اور درختوں کے ایک جھنڈ میں اپنا فالتو سامان چھپا دیا۔ ہم کل چار افراد تھے۔ موہن کے سوا ہم تینوں کے پاس چھوٹی نال کی رائفلیں تھیں۔ موہن کے پاس شکاری چاقو تھا۔ بوقتِ ضرورت اسے پستول بھی مہیا کیا جاسکتا تھا۔ میرے پاس بھی ایک چاقو تھا جس کی پشت پر آری کی طرح دندانے تھے۔ عمران کے پاس سائلنسر لگا پستول بھی موجود تھا۔ راشن کے طور پر ہمارے تھیلوں میں بسکٹ، چنے اور پانی موجود تھا۔

اپنا اپنا ایمونیشن پلاسٹک کے تھیلوں میں ہمارے پاس تھا۔ اس کے علاوہ آٹھ دستی بم تھے۔ چار جگت سنگھ کے پاس اور دو دو میرے اور عمران کے پاس۔ موہن کے پاس ریگزین کا ایک لمبوترا بیگ تھا۔ اس میں پانی کے اندر کام دینے والی واٹر لائٹ، لوہا کاٹنے والا مشینی کٹر، چند چھوٹے اوزار اور تالا کھولنے کے لئے دو مڑے تڑے تار موجود تھے۔ ہمیں تاریکی پھیلنے کا انتظار تھا۔ جونہی تاریکی گہری ہوئی اور درختوں کی بلند شاخوں سے اوپر تاریک آسمان پر تارے اپنی چمک دکھانے لگے، ہم اپنی جگہ سے حرکت میں آگئے۔ ہم نے مکمل ریہرسل پہلے ہی کر رکھی تھی۔ پشت پر سلنڈر باندھ کر ہم نے ماسک چہروں پر چڑھائے اور کھاڑے کے پانی کے ساتھ ساتھ بودھ مندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا...... سانپ کی طرح بل کھاتے راستے پر چلنے کے بجائے ہم نے درختوں کے نیچے چلنا مناسب سمجھا۔ یہاں زمین کیچڑ زدہ تھی۔ ہم سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ میرے پاس ایک بڑی ٹارچ موجود تھی لیکن ٹارچ کا استعمال خطرے سے خالی نہیں تھا۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا اور ہم سب کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ قریباً دو کلو میٹر سے زائد فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم بودھ مندر کے کافی قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں پانی کی دوسری جانب بودھ مندر کی زرد روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کبھی کبھی اندر سے ڈھول بجنے کی مدھم صدا بھی سنائی دے جاتی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے مندر کی بیرونی دیوار کا فاصلہ سو فٹ سے زائد نہیں تھا۔ درمیان میں کھاڑی کا تاریک پانی تھا جس میں نباتات کی موجودگی بھی نظر آتی تھی۔

موہن کمار نے سرگوشی کی۔ ''شروع میں پانی اتھلا ہے، ہم چل کر جاسکتے ہیں۔ آخری بیس تیس فٹ ایک دم گہرا پانی ہووے گا۔ ہم کو ایک دوجے کا ہاتھ پکڑ کر ڈبکی لگانا ہووے گی

اور ہم دیوار کی طرف بڑھیں گے۔''

ہم نے اثبات میں سر ہلائے۔ بہت آہستہ سے ہم پانی میں داخل ہوئے اور بغیر آواز پیدا کئے آگے بڑھنے لگے۔ پانی سرد اور بے حرکت تھا۔ کہیں کہیں کوئی زیر آب پودا بھی ٹانگوں سے ٹکراتا تھا۔ پہلے پانی پنڈلیوں تک تھا پھر گھٹنوں تک آیا اور دھیرے دھیرے اونچا ہونے لگا۔ ہم نے گیس ماسک چڑھا لئے۔ عمران نے اپنا پستول واٹر پروف تھیلی میں ڈال لیا۔ موہن نے لمبوترے تھیلے میں سے اسپیشل واٹر لائٹ نکال لی۔ اس کی روشنی کسی سرچ لائٹ کی طرح تھی۔ پتھریلی دیوار اب ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ اس کے اوپر گھومنے پھرنے والوں کی مدھم آواز بھی ہم تک پہنچتی تھی۔ یہ نازک صورتِ حال تھی۔ کوئی نیچے جھانک لیتا اور ہمیں دیکھ لیتا تو تہلکہ مچ جاتا۔ ہم اس وقت نہتے تھے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہوتا کہ خود کو پانی میں چھپانے کی کوشش کرتے۔ بہر حال خیریت گزری۔ ہم اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ہمیں ڈبکی لگانا تھی۔ اب پانی ہماری ٹھوڑیوں کو چھو رہا تھا۔ ڈبکی لگانا بالکل مشکل نہیں تھا۔ سلنڈرز کا وزن ہمیں بہ آسانی نیچے لے جاسکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ہم گہرے تاریک پانی میں اترتے چلے گئے۔ ہمارے جسموں پر عام لباس تھے اس لئے پانی کی ٹھنڈک پوری شدت سے محسوس ہوئی۔ شروع میں ہم نے سانس باہر نکال دیئے تھے، سلنڈرز کا وزن ہمیں بتدریج نیچے لیتا چلا گیا۔ موہن سب سے آگے تھا۔ عمران نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عمران کا ہاتھ میں نے اور میرا ہاتھ جگت نے پکڑا ہوا تھا۔ واٹر لائٹ کی تیز روشنی راہنمائی کر رہی تھی۔ اچانک مجھے لگا کہ جگت کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ میں نے عمران کے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس نے موہن کو روکا۔ ہم پلٹے، جگت سنگھ کی ایک ٹانگ بری طرح ایک بیل میں الجھی ہوئی تھی۔ میں نے شکاری چاقو کی مدد سے یہ بیل کاٹی اور جگت کی ٹانگ آزاد کی۔ اگلے تین چار منٹ خاصے دشوار تھے۔ موہن کمار پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ سرک رہا تھا اور اس راستے کو تلاش کر رہا تھا جو چند برس قبل اسے اس بودھ مندر کے اندر لے گیا تھا۔ آخر وہ کامیاب ہوا۔ یہاں تقریباً تین فٹ قطر کا ایک سرنگ نما راستہ موجود تھا۔ راستے پر ایک زنگ آلود گول جالی تھی۔ یہ گرل نما جالی کئی جگہ سے زنگ آلود تھی۔ موہن نے پھرتی سے وہ کٹر نکالا جو طاقتور بیٹری سے کام کرتا تھا۔ کٹر آن ہوتے ہی جالی کٹنا شروع ہو گئی۔ ہمیں کٹر کا بہت زیادہ استعمال نہیں کرنا پڑا۔ کافی کام نمکین سمندری پانی اور زنگ کی وجہ سے ہو چکا تھا۔ صرف دو تین منٹ کے اندر موہن نے گول جالی راستے کے دہانے سے علیحدہ کر دی۔ ہم ترتیب وار اندر داخل ہوئے۔ راستے کی گول دیوار کھردری تھی۔ اسے پکڑ پکڑ کر آگے بڑھنے میں ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں سب

سے پیچھے تھا۔ میرے آگے جگت سنگھ تھا۔ اب مندر کا فرش ہمارے اوپر تھا۔ ہم اس مندر میں آراکوئے کی کھوج میں جا رہے تھے اور ڈاکٹر مہناز کی تلاش میں جا رہے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں چیزیں یہاں موجود ہیں یا نہیں...... یا کون سی موجود ہے اور کون سی غیر موجود۔

ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ مزید آگے جا کر ہمیں اندازہ ہوا کہ موہن کا ساتھ کتنا ضروری تھا۔ یہاں سرنگ نما گول راستے میں سے کئی دیگر راستے پھوٹ رہے تھے۔ کچھ تنگ تھے، کچھ اسی قطر کے تھے۔ موہن اپنی یادداشت کے زور پر آگے بڑھتا رہا۔ آخر ہم ایک اور جالی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جالی ایک قفل کے ذریعے بند تھی۔ قفل کاٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور ہم پانی سے نکل کر ایک ایسی جگہ پر آ گئے جسے چھوٹا سا تہ خانہ کہا جا سکتا تھا۔ یہاں زبردست سیلن تھی۔ مختلف جگہوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور وہی بو تھی جو زیر زمین بند رہنے والی جگہوں پر ہوتی ہے۔

موہن کمار نے ماسک اتارتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”اب ہمیں یہ سلنڈر اتارنے ہوویں گے۔“

ہم نے سلنڈر اور ماسک اتار دیئے۔ عمران نے کہا۔ ”کہیں چھپا دینا چاہئے انہیں۔“

”ایک جگہ ہے یہاں۔“ موہن بولا۔

ایک تاریک کونے میں ایک پانچ چھ فٹ اونچا پتھر پڑا تھا۔ اس کے عقب میں خلا سا بن گیا تھا۔ ہم نے سلنڈر، ماسک، واٹر لائٹ اور کٹر وغیرہ یہاں چھپا دیئے۔ ہمارے کپڑے گیلے تھے۔ ہم نے رائفلیں، واٹر پروف تھیلوں سے نکال لیں اور چھوٹے بیگ کمر کے پیچھے فکس کر لئے۔

موہن کمار نے کہا۔ ”اب ایک پستول مجھے دو۔ ہو سکت ہے کہ اس کی ضرورت پڑ جاوے۔“

”ابھی نہیں پہلے گراؤنڈ فلور پر پہنچ جائیں۔“ عمران نے کہا۔

سامنے ہی ایک پتھریلی سیڑھی کے آٹھ دس زینے تھے جن پر بڑے سائز کے تین چار مینڈک پھدک رہے تھے۔ زینوں کے آخری سرے پر ایک چوکور آہنی تختہ تھا۔ یہ زنگ آلود تختہ دراصل باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ اس میں ایک ہضمی قفل کا سوراخ تھا...... موہن کے لبوترے بیگ میں موجود مڑے تڑے تار یہاں کام آئے۔ ممبئی کے اس چور نے تار نکالے اور بیس تیس سیکنڈ کی کوشش میں ہی تالا کھول لیا۔

ہم نے فوراً پلان بنایا۔ پلان کے مطابق مجھے اور عمران کو باہر جانا تھا۔ جگت سنگھ کو یہیں

رہنا تھا اور موہن کی نگرانی بھی کرنا تھی۔ موہن کو یہ پلان پسند نہیں آیا لیکن وہ کوئی رکاوٹ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مندر کے اندر کا نقشہ ہم پہلے ہی اس سے اچھی طرح معلوم کر چکے تھے اور سمجھ بھی چکے تھے۔ جگت سنگھ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور ہمیں اس کی ہوشیاری پر پورا بھروسا تھا......

سیڑھیاں چڑھ کر عمران نے آہنی ڈھکنے کو ذرا سا اٹھایا۔ یہ پتھریلی دیواروں والا ایک طویل کمرا تھا۔ یہاں لوبان سلگ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک بھکشو کے گیروا رنگ کے کپڑے نظر آ رہے تھے۔ اس کی قسمت بری تھی کہ اس نے مڑ کر ہماری طرف رخ کر لیا۔ اس کی نظر ڈھکنے پر پڑی جو ایک دو انچ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ وہ ذرا چونکا اور ہماری طرف آیا۔ ہم بالکل ساکت رہے اور ڈھکنے کو بھی ساکت رہنے دیا۔ وہ نوجوان شخص تھا، تجسس کے عالم میں ہمارے بالکل قریب چلا آیا۔ اس نے جھک کر ڈھکنے کو دیکھا، اس سے پہلے کہ اسے کسی خطرے کا احساس ہوتا اور وہ پکارتا یا شور مچاتا، میں نے تیزی سے ڈھکنا اٹھایا اور پلک جھپکتے میں اس کا بازو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ وہ ایک ”اوہ“ کے سوا کوئی آواز نہیں نکال پایا اور سر کے بل زینوں پر لڑھکتا ہوا جگت سنگھ کے قدموں میں جا گرا۔ اس کو اندر کھینچتے ہی ہم نے ڈھکن بند کر دیا تھا۔ مضروب بھکشو کو مزید کوئی چوٹ لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

”اس کا بھی دھیان رکھو۔“ میں نے جگت سے کہا۔

”آپ فکر ہی نہ کرو بادشاہ زادے۔ یہاں سب کچھ ایک دم بھلا چنگا رہے گا۔“

ہم نے ایک بار پھر ڈھکنا اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آئے۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا اور میرے ہاتھ میں شکاری چاقو۔ رائفلیں ہمارے کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ہم کسی بھی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ بودھ مندر کے اندر کی مخصوص خوشبوؤں نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ہم مندر کے مرکزی حصے کی طرف جانا چاہ رہے تھے۔ جب بھکشوؤں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ وہ بڑے بڑے تھالوں میں کچھ لئے آ رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے ہم تیزی سے ایک دروازے میں داخل ہو گئے...... یہ بھی ایک لاؤنج نما جگہ تھی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ مہاتما بدھ کے ایک پتھریلے مجسمے کے سامنے موم بتیاں اور دیے وغیرہ ٹمٹما رہے تھے۔ ہم چند سیکنڈ یہاں رکے۔ یہاں چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ بھکشوؤں کی وہ ٹولی اسی جگہ آ جاتی۔ یہاں ایک اور دروازہ بھی نظر آ رہا تھا، ہم نے

اسے کھولا اور ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرا بھی خالی تھا۔ یہ کسی شخص کا بیڈ روم لگتا تھا۔ لکڑی کا چوڑا پلنگ، شیشم کی بہت بڑی الماری، شمع دان...... پتھر کی دو تین مورتیاں، مٹی کا مٹکا جس کے منہ پر باریک کپڑا باندھا گیا تھا اور ایسی بہت سی اشیاء یہاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک ایسی چیز بھی تھی جو عام طور پر بودھوں کے رہن سہن کا حصہ نہیں ہوتی۔ یہ ایک تلوار تھی جو پتھریلی دیوار پر ایک کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ تلوار کے ساتھ ہی خشک لکڑی کا ایک پانچ چھ فٹ چوڑا مجسمہ تھا۔

اس کمرے میں پہنچتے ہی ہمیں کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سے لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہوں۔ یہ آوازیں کسی قریبی کمرے سے آرہی تھیں۔ ہم جس کمرے میں گھسے تھے، اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور آوازوں پر کان لگا دیئے۔ گرما گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی وقت بہت سے افراد ایک دم بولنے لگتے تھے۔ تب ایک دو افراد بارعب لہجے میں بول کر انہیں چپ کراتے تھے۔ گفتگو میں تھوڑی دیر دھیما پن رہتا تھا تب ایک بار پھر غصیلی آوازیں بلند ہونے لگتی تھیں۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے پھر یہ آوازیں تھم گئیں۔ اندازہ ہوا کہ بحث کرنے والے اب تتر بتر ہو رہے ہیں۔ قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ ہم دونوں نے خود کو الماری کے ساتھ رکھے گئے چوڑے چکلے چوبی مجسمے کے پیچھے چھپا لیا۔ یہ ایک بالکل تاریک گوشہ تھا۔ جب تک کوئی اس جانب آکر مجسمے کے پیچھے نہ جھانکتا، ہم محفوظ ہی تھے۔

چند سیکنڈ بعد تیس بتیس سال کا ایک تنومند بھکشو ایک جواں سال لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور صفاچٹ چہرے پر پسینا تھا۔ سر کے بال بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

بھکشو نے غصیلے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بے وقوف اپالی سب کو لے ڈوبے گا۔ سب کچھ ملیا میٹ ہو جاوے گا۔ اس میں اتنی بدھی ناہیں کہ حالات کو سمجھ سکے اور نہ ہی اتنی شکتی ہے کہ دھرم کو بچا سکے۔ یہ بس ہر مشکل کے سامنے لمبا لیٹ جانا جانت ہے اور دوسروں سے بھی کہوت ہے کہ لمبے لیٹ جاویں۔ آنکھیں بند کر لیں...... بس کیچوے بن جاویں۔ جس کا من چاہے پاؤں کے نیچے مسل دے۔ جس کے جی میں آئے کاٹ کر ٹکڑے کر دے لیکن ہم یہ ناہیں ہونے دیویں گے۔ اگر ان کو دوسروں نے مارنا اور کاٹنا ہے تو پھر ہم اپنے ہاتھوں سے کاٹ دیویں گے......''

جواں سال لڑکی نے بھکشو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دھیرج رکھیں

سوامی! خوامخواہ اپنا خون نہ جلائیں۔ یہ لوگن بولنے اور بحث کرنے کے سوا اور کچھ ناہیں کر سکتے۔ آخر میں تو وہی ہونا ہے جو ہم چاہیں گے۔ آپ اپنی پوری تیاری رکھیں۔''

بھکشو نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دو جوں کی تو کوئی پروا ناہیں۔ لیکن یہ اپالی بڑا انچرہ بندہ ہے۔ یہ عین موقع پر بھی کوئی چال چل سکت ہے۔ اس نے چبوترے پر کوئی حرکت کی تو سب کچھ برباد ہو جاوے گا۔''

''ناہیں سوامی! میں ناہیں سمجھتی کہ اپالی یا اس کے ساتھی کوئی ایسی جرأت کر سکت ہیں۔''

بھکشو بھنا کر بولا۔ ''تمہیں ناہیں پتا۔ جرأت آتے آتے آ بھی جاوت ہے۔ یہ تو ہم کو بھی معلوم ہے کہ ان کی گنتی زیادہ ہے۔ گنتی کا زیادہ ہونا بھی جرأت پیدا کر دیوت ہے۔''

''اچھا آپ اس بارے میں سوچنا بند کر دیں۔ پرسوں تک سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ بیٹھ جاویں، میں آپ کے سر پر استرا چلا دوں۔''

سوامی بھکشو ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑے پر سے کپڑا ہٹا کر پانی کا ایک کٹورا بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تکیے پر ٹیک لگا لی۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ بستر کے نیچے ایک سفید بلی بھی خاموش بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے دودھ کی پلیٹ تھی۔ اس دوران میں جواں سال عورت پیتل کے ایک کٹورے میں پانی اور صابن وغیرہ لے کر اس کے قریب بیٹھ چکی تھی۔ سوامی یا گرو بھکشو نے آنکھیں بند کر لیں۔ لڑکی نما عورت نے بے تکلفی سے اس کے چہرے پر صابن ملا اور استرے کی مدد سے اس کی شیو کرنے لگی۔

پتا نہیں دونوں کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ یہاں بہت کچھ بھکشوؤں کے عام رہن سہن سے مختلف نظر آرہا تھا۔ ان میں یہ قبول صورت جوان عورت بھی شامل تھی۔ وہ جس طرح گرو بھکشو کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ چلا رہی تھی، واضح ہو رہا تھا کہ دونوں میں کوئی قریبی تعلق موجود ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ چہرے کے بعد عورت نے گرو بھکشو کا سر مونڈنا شروع کیا۔ اسی دوران میں بھکشو کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے عورت کو آغوش میں کھینچ لیا۔ اس کے چہرے اور سر پر لگا ہوا کچھ صابن عورت کے چہرے پر بھی لگ گیا۔ بھکشو نے اسے چھوڑا تو وہ مسکرانے لگی۔ اس نے کپڑے سے اپنا منہ صاف کیا اور بولی۔ ''آپ کو ایسا ناہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''کیوں دھرم کے لحاظ سے تم میری پتنی ناہیں ہو؟''

''وہ تو ہوں لیکن...... آپ کے سر [illegible] حیرا آ گرا [illegible]'' وہ پھر مسکرائی۔

گروبھکشو کا آدھا منڈا ہوا سر ایک طرف سے خون آلود ہو رہا تھا۔عورت نے اپنی چادر سے اس کا خون صاف کیا پھر لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی۔اس نے الماری کھولی، ہم اس سے صرف چھ سات فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ہم نے اپنی سانس تک روک لی۔عورت نے الماری سے سبز پتھر جیسی ایک چیز نکالی۔یہ پتھر ایک طرف سے گھسا ہوا اور ملائم تھا۔اس نے پتھر کو دو تین بار بھکشو کے سر کے کٹ پر رگڑا...... اور پھر واپس الماری میں رکھ دیا۔بھکشو نے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔خون بالکل بند ہو چکا تھا۔''یہ واقعی کمال کی چیز ہے۔'' بھکشو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''جی ہاں، بالکل چمتکار جیسی۔'' عورت نے کہا اور ایک بار پھر بھکشو کا سر مونڈنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر مونڈ کر استرا ایک طرف رکھ دیا۔

ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ہم نے آنکھوں آنکھوں میں حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔عمران نے میرے کان کے اندر مدھم سرگوشی کی۔''تم عورت کی طرف جانا، ہو سکتا ہے وہ شور مچا دے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا۔''خبردار! آواز نہ نکالنا'' عمران پھنکارا۔

بھکشو نے پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔عورت کے چہرے پہ بھی ایک دم دہشت نے یلغار کی۔اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا۔میں عین اس کے عقب میں موجود تھا۔میں نے اس کا منہ ہاتھ سے ڈھانپ کر اس کو جکڑ لیا۔اس نے زور مارا لیکن صرف اپنی ٹانگیں ہی چلا سکی۔بھکشو سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔اسے جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ''آؤٹ سائڈر'' اس طرح اس کے بیڈروم میں آ پہنچے گا۔

عمران نے پستول بھکشو کے تازہ منڈے ہوئے چمکدار سر سے لگا دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔''اس میں سے گولی چلے گی اور آواز بھی نہیں آئے گی۔بس خاموشی سے ایک سوراخ ہو جائے گا تمہارے کھوپڑے میں۔''

بھکشو جو شاید قریب ہی لٹکی ہوئی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا، ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔عمران کے پاس منہ پر چپکانے والی کیمیکل ٹیپ موجود تھی۔اس نے ٹیپ کا قریباً چھ انچ لمبا پیس بھکشو کے موٹے ہونٹوں پر چپکا کر اس کی بولتی بند کر دی۔

میں نے اپنا ہاتھ بدستور عورت کے منہ پر جمایا ہوا تھا۔اس کی کمر بھی مکمل طور پر میری گرفت میں تھی۔اس کی نازک گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔اچانک مجھے وہ حادثہ یاد آ گیا

جو چودھری انور گنجے کی حویلی میں پیش آیا تھا۔راجا نے نیتو عرف کرشمہ کپور کو صرف خاموش رکھنے کے لئے اس کا منہ دبایا تھا اور وہ دم گھٹ کر سورگ باشی ہو گئی تھی۔

میں نے ایک فٹ لمبا شکاری چاقو عورت کی گردن پر رکھا اور سرگوشی کی۔''اگر آواز نکالی تو یہیں لٹا کر بکری کی طرح کاٹ ڈالوں گا۔'' وہ اب تھر تھر کانپ رہی تھی۔چہرے سے خون نچڑ کر رہ گیا تھا۔کچھ دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گی۔میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔عمران پہلے ہی تیار تھا۔اس نے پھرتی سے ٹیپ عورت کے ہونٹوں پر چپکا دیا۔

گروبھکشو کے تاثرات اب بھی اچھے نہیں تھے۔لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت کچھ کر سکتا ہے۔عین ممکن تھا کہ اس کے تکیے کے نیچے ہی کوئی پستول وغیرہ ہوتا۔میں نے عورت کو گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا۔وہ فوراً بیٹھ گئی۔عمران نے لکڑی کی دیوہیکل الماری میں سے سوت کی ایک مضبوط ڈوری ڈھونڈ لی۔اس نے اس ڈوری سے پہلے بھکشو کے ہاتھ پشت پر باندھے پھر عورت کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔اب وہ دونوں مکمل طور پر ہمارے بس میں تھے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔شمع دان میں موجود چار عدد شمعیں کمرے میں ایک پُراسراری روشنی بکھیر رہی تھیں۔یوں لگتا تھا کہ اب بھکشو اور بھکشن کو ڈسٹرب کرنے اس کمرے کی طرف کوئی نہیں آئے گا۔اگر کوئی آتا بھی تو ہم دروازہ کھولنے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ہم دونوں نے بھکشو سے بازپُرس شروع کی۔عام بھکشوؤں کے برعکس یہ شخص کرخت اور ہٹ کا بڑا پکا تھا۔اس کا نام وستھا تھا اور یہ اس دواری مندر کے بیس بڑے بھکشوؤں میں سے ایک تھا۔شروع میں تو اس نے ہمیں کچھ بتا کر نہیں دیا۔عمران نے دو تین بار اس کے منہ پر ٹیپ لگایا اور اتارا۔آخر عمران کا پارا چڑھ گیا۔وہ بولا۔''دیکھو وستھا! میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں۔مجھے آرا کوئے کا پتا چاہئے اور اس لڑکی کا جو آرا کوئے کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔وہ ایک ڈاکٹر ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ بھی آرا کوئے کے ساتھ یہاں موجود ہے۔''

''میں بڑی سے بڑی سوگند کھا سکت ہوں۔مجھے اس بارے میں کچھ معلوم ناہیں۔''

''یہ بھی معلوم نہیں کہ آرا کوئے یہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جھوٹ ناہیں بولوں گا۔مجھے اتنی سی جانکاری ضرور ہے کہ آرا کوئے کو ڈھونڈنے میں کوئی تھوڑی سی سپلتا (کامیابی) ملی ہے لیکن کیسے اور کیا، یہ میں ناہیں جانت اور نہ اوشا کو کچھ معلوم ہے۔'' اوشا، وستھا کی ساتھی عورت کا نام تھا اور وہ اسے پتنی بتا رہا تھا۔

''تو پھر کون جانتا ہے؟''

''مہا پجاری صاحب ہی جانت ہوں گے۔'' وہ ڈھیٹ لہجے میں بولا۔

''اور مہا پجاری کون ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مم...... میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہاں کسی کو پتا ناہیں کہ مہا پجاری کون ہیں۔ وہ دراصل ہم بیس بڑے بھکشوؤں میں سے ہی کوئی ایک ہیں لیکن وہ سامنے ناہیں آتے۔ بس ہم کو پرچوں پر ان کے حکم لکھے ہوئے ملتے ہیں، ان کی مہر کے ساتھ۔''

''پرچے کون دیتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی بھی ناہیں۔ ہر روز صبح کی پوجا کے بعد ہم سب بیس بڑے بھکشو گیان والے کمرے میں جاوت ہیں اور مقدس چوکی کی لکڑی پر ایک ایک سفید لفافہ دیکھتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک لفافے پر سارے دن کے لئے ہدایتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی مہا پجاری کا لفافہ ہووت ہے۔''

''یہ کون ہوسکتا ہے، تمہیں کچھ اندازہ تو ہوگا؟''

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''میں تو ناہیں ہوں۔ کون ہے؟ یہ مہاتما جانتے ہوں گے یا پھر وہ جو اس سنسار کو چلاوت ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اچھا، یہاں تھوڑی دیر پہلے جو جھگڑا ہو رہا تھا وہ کس بات پر تھا؟''

گرو بھکشو پہلے تو اس موضوع پر بات کرنے سے کترایا، میرے اصرار پر بولا۔ ''یہ ہمارا آپس کا ہی تنازعہ تھا۔ بس سمجھو کہ پوجا پاٹ کا طریقہ ہے۔ کچھ ایک طرح سے کرنا چاہت ہیں، کچھ دوسری طرح سے۔ اس سے کوئی فرق ناہیں پڑتا۔ راستہ کوئی بھی ہو منزل تو نروان ہی ہے اور شریر کی شانتی ہی ہے۔''

''تم کسی چبوترے کی بات کر رہے تھے اور کسی ایسے کام کی جو پرسوں یہاں اس پگوڈے میں ہونا ہے۔''

بڑے بھکشو نے ایک بار پھر آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی لیکن جب عمران کا لب و لہجہ سخت ہوا تو اس نے بتایا کہ پرسوں چاند کی چودھویں رات ہے۔ خاص پرارتھنا ہوگی جس میں باہر کے کچھ لوگ بھی حصہ لیں گے۔ اب پتا نہیں کہ وہ درست کہہ رہا تھا یا غلط۔ اس کی بات کی تصدیق فی الحال ممکن نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں میرے ساتھ ساتھ عمران کو بھی یہ شک ہو رہا تھا کہ یہ خرانٹ بھکشو بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسے آرا کوئے اور ڈاکٹر مہناز کے بارے میں بھی معلوم ہو۔ لیکن وہ سارا وزن مہا پجاری پر ڈال رہا تھا...... اور مہا پجاری کے بارے میں اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ ان کے درمیان رہتا ہے لیکن اس کے بارے

میں کوئی جانتا نہیں۔

اس کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوئے عمران نے تازہ ٹیپ اس کے ہونٹوں پر چپکا دی اور وہی استرا تھام لیا جس سے تھوڑی دیر پہلے جواں سال اوشا اس کی شیو بنا رہی تھی۔ عمران نے استرا بھکشو وستھا کے بائیں کان پر رکھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ شاید کسی کو نہیں تھی۔ عمران نے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے بھکشو وستھا کا کان اس کی کنپٹی سے علیحدہ کر دیا۔ وستھا کربناک آواز میں چلایا لیکن ہونٹوں پر ٹیپ تھی۔ آواز اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ یقیناً اوشا بھی چلانے میں پیچھے نہیں رہی ہوگی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی کیمیکل ٹیپ تھی۔ وہ بری طرح مچلی۔ وستھا بھی پھڑک رہا تھا۔ کان والی جگہ خون سے بھر گئی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے نہ ہوتے تو وہ پتا نہیں کیا کر گزرتا۔ عمران نے بڑی بے رحمی سے کٹا ہوا خون آلود کان پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ کونے میں بیٹھی ہوئی سفید بلی حرکت میں آئی۔ چند سیکنڈ تک خون آلود کان کو سونگھتی رہی پھر اسے منہ میں دبا کر پلنگ کے نیچے تاریکی میں گم ہوگئی۔ یہ بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ وستھا کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ کرب کے عالم میں بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ عمران نے بلا تردد تیز دھار استرا اس کے دوسرے کان پر رکھ دیا۔ ''ہاں، کچھ بتاؤ گے یا تمہارے تھوبڑے کی دونوں سائڈیں ایک جیسی کر دوں۔''

گرو بھکشو نے منہ سے غوں غاں کی زوردار آوازیں نکالیں۔ یوں لگا کہ وہ کچھ بتانا چاہتا ہے۔ عمران نے استرا پیچھے ہٹا لیا۔ الماری سے وہی سبز رنگ کا ملائم پتھر نکالا۔ یہ واقعی خاص قسم کی چیز تھی۔ پتھر کے بجائے اسے سخت قسم کی مٹی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے ایک صاف کپڑے سے وستھا کے زخم کا خون صاف کیا۔ عمران نے یہ سبزی مائل ڈلی کچھ دیر تک زخم پر رگڑی۔ ایک چمکیلی تہہ سی بن گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس کاری زخم سے خون کا اخراج فوراً ہی رک گیا۔

عمران نے وستھا کے منہ سے ٹیپ اتار دی۔ عمران کا سوال وہی تھا۔ ''آرا کوئے کہاں ہے اور ڈاکٹر مہناز سے کیسے ملا جا سکتا ہے؟''

اندازہ ہوا کہ شدید جسمانی نقصان اٹھانے کے باوجود اس ''گرو'' کی ڈھٹائی ختم نہیں ہوئی۔ وہ ایک بار پھر وہی رام کہانی دہرانے لگا۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ کوئی اس کی مدد کو آ جائے گا یا پھر کوئی اور کرشمہ رُونما ہو جائے گا۔ اس کی بے پناہ ڈھٹائی پر عمران کو ایک بار پھر تاؤ آ گیا۔ اس نے گرو کو ایک آخری وارننگ دی اور ایک بار پھر اس کے منہ پر ٹیپ چڑھا دی۔ وہ عجیب انداز سے اپنے سر کو ہلانے لگا اور بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہمیں قدرت کے عذاب سے ڈرا رہا ہو۔

وہ ہندو نہیں تھا کیونکہ اس نے گیروا کپڑے پہن رکھے تھے اور پگوڈا میں بیٹھا تھا...... اور وہ پورا بودھی بھکشو بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے کمرے میں تلوار لٹکا رکھی تھی اور ایک کٹار جیسی عورت اس کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھی۔ آفت کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے دھرم یاد آ گیا تھا۔ عمران نے پھر استرا تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں سفاک چمک بتا رہی تھی کہ دواری مندر کا یہ گرو بھکشو اپنے دوسرے کان سے بھی محروم ہونے والا ہے۔ عمران کے اشارے پر میں ایک دو لمحے تو تذبذب میں رہا پھر میں نے وستھا کا سر اور گردن کا بالائی حصہ اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ وستھا اب اپنے سر کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لیکن اس حال میں بھی اس کے چہرے پر طیش دلانے والی ضد تھی۔ عمران کے استرے نے پھر حرکت کی اور کان وستھا کی کنپٹی سے علیحدہ ہو گیا۔ خون تیزی سے اُمڈا اور وستھا کی گردن کو بھگونے لگا۔ وستھا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ عمران نے انگلیوں میں دبے ہوئے زرد کان کو دیکھا۔ یہ کچھ ہی دیر پہلے گرو بھکشو کے جسم کا حصہ تھا۔ بے پروائی سے عمران نے پھر یہ کان پلنگ کی طرف پھینک دیا۔ اس مرتبہ سفید بلی نے بھی کوئی جھجک نہیں دکھائی اور خون آلود کان منہ میں دبا کر پلنگ کے نیچے لپک گئی۔ اوشا جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

سبزی مائل ڈلی ایک بار پھر وستھا کے کاری زخم پر رگڑی گئی۔ یہ جادوئی خاصیت رکھتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وستھا کے زخم سے بہنے والا خون بس معمولی رساؤ میں بدل گیا......

اپنے دونوں کانوں سے محروم ہونے کے بعد وستھا کی حالت دیدنی تھی۔ کبھی اس کی آنکھوں سے طیش کی چنگاریاں چھوٹنے لگتیں، کبھی دہشت اور اذیت سے اس کا صفاچٹ چہرہ زرد رنگ اوڑھ لیتا۔ گرو وستھا کے چہرے پر سب سے نمایاں تاثر ڈھٹائی کا ہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بندہ ہٹ کا چمپئن ہے اور بنا ہی ''ڈھیٹ پنے'' کے لئے ہے۔ اس کے چہرے کا یہی تاثر مجھے اور عمران کو مشتعل بھی کر رہا تھا۔

عمران نے اس کے ہونٹوں کے ایک حصے سے ٹیپ ہٹائی تو وہ کچھ بتانے کے بجائے گالی گلوچ کرنے لگا۔ عمران نے فوراً ٹیپ چڑھا کر اس کی بولتی بند کی اور اسے فرش پر گرا کر اپنا گھٹنا اس کی چربی دار گردن پر رکھا اور استرا ناک پر رکھ دیا۔ ''تمہاری بلی کو آج کافی گوشت ملنے والا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

اوشا نے زور زور سے سر ہلایا۔ ایسے لگا کہ وہ کچھ بتانا چاہ رہی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی سوال جواب کئے تھے لیکن اپنے گرو کی طرح وہ بھی بس گول مول جواب ہی دیتی رہی تھی۔ لیکن اب لگتا تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر اس نے اپنے رویے پر نظرِ ثانی کی ہے۔

عمران کے اشارے پر میں نے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ اتار دی۔ اس کے دودھیا رخساروں پر ٹیپ نے گہرا نشان چھوڑا تھا۔ اس کے نازک ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔ میں نے اپنا شکاری چاقو اس کی ملائم گردن پر رکھ دیا تھا تا کہ وہ اچانک شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''آپ وچن دیں کہ مجھے اور گرو کو کچھ ناہیں کہیں گے......مم میں......آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔

زخمی گرو ایک بار پھر مچلنے لگا۔ وہ منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اوشا کو لب کشائی سے روکنا چاہتا ہے۔ اوشا اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً وہ جنونی گرو وستھا کی نسبت عقل مندی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''ہاں بتاؤ، آرا کوئے کہاں ہے؟''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''میں ساکھیہ منی کی سوگند کھاوت ہوں، ہمیں اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں ہے۔ اس کی جانکاری اگر ہووے گی تو صرف مہا پجاری کو ہووے گی۔''

''اور مہا پجاری کون ہے؟''

''میں سوگند کھاوت ہوں، وہ بیس گروؤں میں سے ہی کوئی ایک ہے۔''

''اور تمہیں اس کا پتا نہیں؟'' عمران کا لہجہ پھر سفاک ہو گیا۔

''میں جھوٹ ناہیں بول رہی۔'' وہ پوری جان سے لرز گئی۔

''اچھا بتاؤ وہ ڈاکٹر کہاں ہے جو آرا کوئے کے ساتھ یہاں لائی گئی ہے؟'' میں نے اوشا سے پوچھا۔

''ہاں......میں اس کے بارے میں آپ کو بتا سکت ہوں۔ وہ یہیں اس مندر میں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔''

''کیا تم اس سے ملا سکتی ہو؟''

وہ ذرا جھجکی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں آپ کو دکھا سکت ہوں لیکن اس سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہووے گا۔ آپ کسی کی نظر میں آ گئے تو بہت خون خرابا ہو جاوے یہاں۔''

''چلو، تم اس سے ملواؤ پھر ہم دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم نے ہاتھوں کے علاوہ گرو وستھا کے پاؤں بھی اچھی طرح باندھ دیئے۔ اسے صاف بتا دیا کہ اس نے کوئی بھی حرکت کی تو مزید کوئی موقع دیئے بغیر اسے فوراً گولی مار دیں گے۔ کن کٹے گرو کی حالت پتلی تھی۔ وہ کسی مزاحمت کے قابلِ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس آنکھیں بند

کر کے ناک کے راستے کراہتا رہا۔

عمران اور میں اوشا کے ساتھ چل دیئے۔ تیز دھار چاقو میری جیکٹ کی جیب میں تھا اور میں نے اوشا کو سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو یہ چاقو اس کے پہلو میں گھس جائے گا۔ وہ ہمیں لے کر کمرے سے باہر آئی۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر ہم ایک اور کمرے میں آ گئے۔ راہداری کی طرح یہ کمرا بھی خالی تھا۔ فرش پر آہنی چادر کا ایک ڈھکنا سا تھا۔ اوشا کی گہری گلابی چادر کے پلو سے دو تین چابیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چابی کی مدد سے ڈھکنے کا وزنی قفل کھولا اور ڈھکنا جو زیادہ وزنی نہیں تھا، اوپر اٹھا دیا۔ نیچے لکڑی کے خوب صورت زینے تھے۔ ہم زینے اتر کر ایک تہ خانے میں پہنچے۔ یہاں اگربتیوں کی ہلکی مہک تھی اور قالین بچھا ہوا تھا۔ تاہم روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اوشا ہمیں ایک روشن کھڑکی کے سامنے لے گئی۔ کھڑکی کے اندر پردہ سرکا ہوا تھا۔ ہم اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ ایک نہایت آرام دہ کمرا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کو دیکھا۔ وہ ایک گلابی گاؤن پہنے ایک پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ خوش نظر آتی تھی۔ بودھ مندر کی تین داسیاں بھی یہاں موجود تھیں۔ انہوں نے گہری گیروا ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک داسی ڈاکٹر مہناز کے بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھی۔ دوسری اس کے پاؤں پر کسی ہربل آئل کی مالش کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک تپائی پر تر و تازہ موسمی پھل رکھے تھے۔ ظاہر ہوتا تھا کہ مہناز یہاں بہت عیش آرام سے ہے۔ ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں وہ معمول سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر مہناز کو کہاں کہاں تلاش نہیں کیا گیا تھا۔ اب بھی جلالی صاحب اور دیگر لوگ مہناز کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور وہ یہاں لاہور اور شیخوپورہ سے سیکڑوں میل دور بحرِ ہند کے کنارے اس بودھ مندر کے کمرے میں موجود تھی۔

مہناز کو دیکھنے کے بعد ہم زینے طے کر کے اوپر آئے اور پھر اسی کمرے میں پہنچ گئے جہاں گرو بھکشو نیم بسمل پڑا تھا۔ کانوں کے بغیر اس کی شکل عجیب ہولناک ہو چکی تھی۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا اور یقیناً عمران بھی میری ہی طرح سوچ رہا تھا۔ ہم نے مہناز کو یہاں خوش و خرم دیکھا تھا۔ اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ ان لوگوں کی حبس بے جا میں تھی تو ایسا کیوں تھا؟ کہیں وہی افواہیں تو درست نہیں تھیں کہ ڈاکٹر مہناز خود چاہتی تھی کہ وہ آرا کوئے سمیت کہیں غائب ہو جائے...... اور اس نے جلالی صاحب کو بھی دھوکے میں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن پھر فوراً یہ بات ذہن میں آئی کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر پروفیسر اولیس کو نوٹنگھم میں ڈاکٹر مہناز کی فون کال کیوں موصول ہوئی؟ وہ فون کال غالباً ڈاکٹر مہناز نے اسی

بودھ مندر کے اندر سے کی تھی۔ اس نے انہیں اور جلالی صاحب کو مدد کے لئے بلایا تھا۔

اگلے آٹھ دس منٹ میں اوشا کے ساتھ کافی محنت کرنا پڑی۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ جو کچھ بتا رہی ہے، اس سے کہیں زیادہ چھپا رہی ہے۔ جب گرو وستھا کی طرح تیز دھار استرا اوشا کے اپنے کان پر آیا تو اس کا پتا پانی ہو گیا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی۔ وہ گھگیائی۔

''میرے لوگن مجھے زندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ میری ہتھیا بڑی دردناک ہووے گی۔''

عمران نے کہا۔ ''خود ان لوگوں کے ساتھ بہت کچھ دردناک ہونے والا ہے۔ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہمارے سوالوں کے جواب دو یا اگلے دس پندرہ منٹ کے اندر کن کٹی اور نک کٹی کہلانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

''مم...... میں نے سب کچھ تو بتا دیا۔ اب کیا رہ گیا ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر مہناز کو یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

وہ سسک کر بولی۔ ''اس کو...... مار دیا جاوے گا...... اس کی بلی دے دی جاوے گی۔''

''کب؟''

''پرسوں......''

''اچھا تو تم لوگ پرسوں کی جس پوجا پاٹ کی بات کر رہے ہو وہ یہی خون خرابا ہے؟''

اوشا نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیسے دی جائے گی بلی؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی ساری انگلیاں کاٹ دی جاویں گی۔ اس کا خون آرا کوئے پر چھڑکا جاوے گا۔ ہمارا دھرم کہوت ہے کہ آرا کوئے کو چرانے والے کا خون اگر اس پر چھڑک دیا جاوے تو وہ ہمیشہ کے لئے سلکھشت (محفوظ) ہو جاوے گا۔''

''لیکن پانچ سال پہلے بھانڈیل اسٹیٹ والے واقعے میں تو ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ مورتی چرانے والوں کو صرف بندی بنایا گیا تھا اور انہیں بگوڈے میں مشقت کی سزا دی گئی تھی؟'' میں نے کہا۔

''گرو کہوت ہیں اسی لئے تو مورتی (آرا کوئے) دوبارہ چوری ہوئی۔ اگر تب من کڑا کر کے یہ سزا دے دی جاتی تو یہ آفت نہ پڑتی۔''

''کیا یہاں سب لوگ اس سزا پر...... میرا مطلب ہے اس بلی پر اتفاق کر رہے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ چند لمحے چپ رہ کر بولی۔ ''ناہیں...... یہاں یہی تو جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ دوسرے سنگھ

(گروہ) کے کھیا گرواپالی ہیں۔ یہ لوگن ناہیں چاہتے کہ آراکوئے کی حفاظت کے لئے کسی کی ہتھیا کر دی جاوے۔ ان لوگوں کا وچار ہے کہ لڑکی کی ہتھیا ضروری ناہیں۔ اس کے لہو کی بس دو تین بوندیں ہی آراکوئے پر ڈال دی جاویں اور خاص پوجا کر لی جاوے تو مطلب پورا ہو سکت ہے۔"

"پھر ان لوگوں کی بات مانی جائے گی یا تمہاری؟" عمران نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو وہ لوگن اپنی بات ناہیں منوا سکیں گے۔ وہ گنتی میں تو زیادہ ضرور ہیں لیکن بیس گروؤں کے پاس شکتی زیادہ ہے۔ بیس گرو اور ان کے دھرمی ساتھی اپنے زور سے سب کچھ کر سکت ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پرسوں جو پوجا ہوگی، اس میں ڈاکٹر کی انگلیاں کاٹ کر اس کا خون آراکوئے پر بہایا جائے گا اور ڈاکٹر کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا؟"

"ایسا ہی ہووے گا۔" اوشا نے کہا اور سر جھکا لیا۔

میں نے کہا۔ "لیکن ابھی ہم نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر کو بڑے آرام اور سکون سے رکھا گیا ہے اور وہ خوش بھی بہت ہے۔"

"وہ انجان ہے۔ اس کو جانکاری ناہیں۔ اس کو یہی بتایا گیا ہے کہ پرسوں اس کو مکتی مل جاوے گی۔ اسے رہا کر دیا جاوے گا۔ وہ آج اپنی رہائی کے خیال سے خوش ہے ورنہ تو اس کا حال اچھا ناہیں تھا۔"

"پوجا پرسوں کس وقت ہوگی؟" میں نے دریافت کیا۔

"پرسوں سے مطلب یہ ہے کہ آدھی رات کے فوراً بعد۔ ہم یہ کہہ سکت ہیں کہ کل رات۔"

"کیا گرو وستھا کا پوجا میں شریک ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں جی، یہ ضروری ہے۔ رسم کے مطابق بلیدان دینے والے کی بیس انگلیاں کاٹی جاوت ہیں۔ بیسوں گرو ایک ایک انگلی کو پوتر اگنی کے اوپر رکھتے ہیں جلنے کے لئے۔"

"اگر کسی وجہ سے کوئی گرو رسم میں شامل نہ ہو سکے تو پھر؟"

"مم...... مجھے اس کے بارے میں جانکاری ناہیں۔ میں کسی سے پوچھ کر بتا سکت ہوں۔"

ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ پھر چالاکی دکھا رہی ہے۔ عمران نے شکاری چاقو پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اوشا پر کچھ اور دباؤ ڈالا گیا تو وہ پھر سے رونے لگی اور سچ بولنے لگی۔

اس نے بتایا۔ "اگر کوئی گرو کسی رسم کے سمے بیمار ہو جاوے یا اسے کوئی بہت ضروری کام ہووے تو اس کی جگہ اس کی ماتا یا دھرم پتنی رسم میں حصہ لے سکت ہے۔"

"یعنی کل رات، تم اس کن کٹے گرو کی خالی جگہ پُر کر سکتی ہو؟" عمران نے کہا۔

"لیکن یہ تو تب ہو سکت ہے جب یہ بہت بیمار ہوں یا کہیں گئے ہوں۔"

"تم سمجھو کہ یہ کہیں گیا ہوا ہے۔ چار پانچ دن سے پہلے نہیں آ سکتا۔" عمران نے سکون سے کہا۔

اگلے ایک گھنٹے میں عمران نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اوشا کو اپنے ڈھب پر کر لیا۔ اب وہ پوری طرح تعاون پر آمادہ تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ گرو کی جان وہ ایک ہی صورت میں بچا سکتی ہے۔ ہماری بات مانے اور ہماری مدد کرے۔

گرو بڑا ڈھیٹ تھا لیکن اوشا کسی نہ کسی طرح اسے بھی سمجھانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے گرو سے ایک خط لکھوایا۔ اس خط میں گرو نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اسے سنگھ (جماعت) کے ہی ایک خاص کام سے مندر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اگر وہ فوری طور پر نہ جاتا تو اپالی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو جاتی۔ وہ فی الحال تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اسے پوری آشا ہے کہ وہ چار پانچ دن تک لوٹ آئے گا۔ اس دوران میں بلیدان کی رسم ادا کر لی جائے۔ اس کی جگہ اس کی دھرم پتنی اوشا رسم میں حصہ لے گی۔ خط کے نیچے گرو وستھا نے اپنی چھوٹی سی گول مہر بھی لگائی۔

ہم گرو کو مارنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے لیکن عمران نے چونکہ اوشا سے گرو کی جان بخشی کا وعدہ کیا تھا، اس لئے گرو کے واسطے سوچنا پڑ رہا تھا۔ رات کو تو خیریت تھی، کسی نے اس طرف آنا نہیں تھا لیکن صبح کی عبادت میں گرو کی غیر حاضری محسوس کی جا سکتی تھی۔ ہم نے زخمی گرو کے ہاتھ پاؤں بڑی اچھی طرح باندھے۔ اس کے دونوں زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کمرے کے اندر سے ہی مل گیا۔ مرہم پٹی کے بعد اس کو شوربا پلایا گیا اور خاص طرح کی مقامی کھیر کھلائی گئی۔ افیم کی گولیاں جن میں کوئی کشتہ وغیرہ بھی ملایا گیا تھا الماری میں موجود تھیں۔ ہم نے یہ گولیاں اتنی مقدار میں گرو کو کھلا دیں کہ وہ سات آٹھ پہر کے لئے مکمل سکون میں رہے اور سو جائے۔ اس کے بعد اس کے منہ پر اچھی طرح ٹیپ لگائی گئی اور الماری کے ایک بڑے خانے میں اس طرح ٹھونس دیا گیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکتا تھا۔ عمران نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا کہ کل آدھی رات تک کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو اس کا خمیازہ سب سے پہلے اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ اس کی جان چلی جائے گی۔

بری طرح زخمی ہونے کے بعد گرو کا ابال اب کافی کم ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں، وہ کر بھی سکتے ہیں۔ اسے یہیں پر لٹا کر ذبح بھی کیا جا سکتا ہے۔ آنکھوں میں چنگاریاں رکھنے کے باوجود اب وہ ہماری بات مان رہا تھا۔ گرو کو جہازی سائز کے خانے میں پیک کرنے کے بعد الماری کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ بلی بڑی محبت سے عمران کے اردگرد گھوم رہی تھی۔

ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ عمران واپس، جگت اور موہن کے پاس چلا گیا۔ میں اس کشادہ کمرے میں جواں سال اوشا کے ساتھ موجود رہا۔ بے پناہ خوف نے اسے ہمارے ساتھ مکمل تعاون پر آمادہ کر دیا تھا۔

میں نے اوشا سے کہا۔ ''تم کہہ رہی ہو کہ صبح کی عبادت کے فوراً بعد کوئی نہ کوئی شخص یہاں آئے گا اور پوچھے گا کہ گرو عبادت میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟''

''ہاں، ایسا تو ہوگا ہی۔''

''تم کیا جواب دو گی؟''

''میں وہی کروں گی جو تم کہو گے اور تم نے وچن دیا ہے کہ تم میری اور گرو کی جان نہیں لو گے۔'' وہ اپنی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں دوبارہ وچن دے رہا ہوں۔ تمہیں ہماری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ''میں پوجا کے بڑے کمرے میں جاؤں گی اور گرو جی کا یہ پتر (خط) چھوٹے پجاری کو دوں گی۔ وہ باقی گروؤں تک پہنچا دیں گے۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ گرو وستھا مجھے بھی بتا کر ناہیں گئے۔ میں سوئی ہوئی تھی، وہ اٹھ کر چلے گئے اور جاتے جاتے پتر میرے سرہانے رکھ گئے۔ مجھے وشواس ہے کہ کسی کو شک ناہیں ہووے گا۔ اس طرح رات کے سمے اپنے گھر والوں کے پاس سے اچانک اٹھ کر کسی دھرمی کام سے چلے جانا ہمارے ہاں برا ناہیں سمجھا جاوت۔ اور یہ سمجھا جاوت ہے کہ اس طرح جانے سے ساکھیہ منی (مہاتما بدھ) کی آشیرباد، جانے والے کا ہاتھ تھام لیوت ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ کوئی اس کمرے میں آکر چھان بین کرے۔''

''ناہیں، ایسا تو تب ہوسکت ہے جب کسی کو شک ہو۔ اور مجھے ناہیں لگتا کہ ایسا ہووے گا۔ ہاں، وہ لوگن حیران ضرور ہوں گے کہ ایسا کیا ضروری کام آن پڑا تھا۔''

وہ بڑی دھیمی آواز میں بات کرتی تھی۔ چہرے کی طرح اس کی آواز میں بھی کشش تھی۔

ہمارے حساب سے وہ اپنے گرو شوہر سے زیادہ عقل مند اور معاملہ فہم تھی۔ اسی کی وجہ سے گرو ابھی تک زندہ تھا۔ رات بخیریت گزر گئی۔ اوشا نے مجھے کھانا کھلایا اور آرام کرنے کے لئے پلنگ پیش کیا۔ لیکن میں نے رات کا باقی حصہ چٹائی پر گزارنا مناسب سمجھا۔ اوشا کو میں نے پلنگ پر لٹا دیا۔ آج اس ریشمی رات کا آغاز اوشا اور اس کے گرو پتی نے بڑے محبت بھرے انداز میں کیا تھا۔ محبت کی یہ گرماگرمی ابھی کافی آگے بڑھنا تھی لیکن بیچ میں ہم کود پڑے تھے اور اب اوشا پلنگ پر اور پتی دیوالماری میں تھے۔

میں لیٹا رہا اور حالات کی ستم ظریفی پر غور کرتا رہا۔ گولڈن بلڈنگ کے واقعات بار بار نگاہوں میں آرہے تھے۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کا انجام کم از کم میرے لئے تو بہت تسلی بخش ہوا تھا۔ درحقیقت چند ماہ پہلے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنے کے فوراً بعد ہی میں نے سیٹھ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹھ کے ایک دو پرانے گرگوں سے ہماری مڈبھیڑ بھی ہوئی تھی۔ تاہم سیٹھ کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک ماڈل گرل کے ہمراہ کراچی میں دیکھا گیا ہے۔ جاننے والوں نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان سے باہر ہے اور کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیٹھ سراج انڈیا میں ہے اور انڈیا کے دل ممبئی میں اس سے ایک طوفانی ملاقات ہوگی۔ اس ملاقات کے اختتام پر ایک لہو رنگ کلہاڑی ہوگی ایک اونچی منڈیر ہوگی، اور ان دونوں چیزوں کے درمیان سیٹھ سراج ہوگا...... اسے دو ہلاکتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

اوشا پلنگ پر لیٹی رہی اور میں چٹائی پر۔ گرو الماری میں مدہوش پڑا رہا...... اپنے جسمانی درد اور اپنے حالات کے کرب سے بے خبر۔ ثروت کا خیال بار بار میرے ذہن میں آنے لگا۔ کیا وہ پھر مجھ سے دور جا رہی تھی؟ کیا میرے اور اس کے درمیان سے یوسف کی دیوار کو ہٹانا ناممکن تھا؟ بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ یوسف سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس کے اثر سے آزاد بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فرسودہ روایتوں کی بلند دیوار کو توڑ نہیں پائے گی۔ یہ بڑا تکلیف دہ احساس تھا...... بودھ مندروں میں صبح بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ اجالا پھیلنے سے بہت پہلے ڈھول بجنے لگتا ہے۔ صبح سب کچھ ہماری پلاننگ کے مطابق ہوا۔ اوشا کمرے سے نکل کر مندر کے مرکزی حصے کی طرف گئی۔ گرو کی مہر شدہ تحریر بھی اس کے پاس تھی۔ اس دوران میں، میں رائفل بدست چوڑے چکلے چوبی مجسمے کے عقب میں موجود رہا۔ ایسی امید تو نہیں تھی لیکن اگر اوشا کوئی حرکت کرتی تو میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کم از کم گرو وستھا کو تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری چلائی ہوئی گولیاں بند الماری کے اندر ہی اسے چھلنی کر سکتی تھیں۔

اوشا تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے کمرا اندر سے بند کیا اور مجھے بتایا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ لوگ حیران ضرور ہیں مگر کسی کو شک نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''ہاں ایک اور مسئلہ ضرور ہے۔ ادھر برآمدے والے کمروں کی طرف سے ایک چوب دار غائب ہے...... اس کو ڈھونڈا جا رہا ہے لیکن ابھی تک پتا ناہیں چلا۔ اس کے پاس تلوار تھی، وہ بھی برآمدے میں ہی پڑی ہے۔ شک کیا جا رہا ہے کہ کوئی باہر کا بندہ مندر میں گھسا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی چوب دار کی بات ہے جسے ہم نے لوہے کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر اندر کھینچ لیا تھا۔ اوشا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''وہ چوب دار ہمارے پاس ہی ہے...... تم یہ بتاؤ کہ پوجا کا پروگرام تو آگے پیچھے نہیں ہوا؟''

''ناہیں...... ابھی تک تو ناہیں ہوا۔ باہر سے جو مہمان آنا تھے، وہ بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ پچیس تیس پجاری تو ضرور آویں گے۔''

سیل فون کے سگنل رات کو نہیں آ رہے تھے لیکن اب آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے عمران کو کال کی۔ رابطہ ہو گیا۔ وہ دبی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ ''یہاں سب خیریت ہے۔ ہم تمہارے فون کا انتظار ہی کر رہے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں بھی خیریت ہے۔ پروگرام کے مطابق اوشا نے گرو کا رقعہ متعلقہ بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ پوجا بھی آدھی رات کے فوراً بعد پروگرام کے مطابق ہی ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم بھی تیار ہیں۔ رات کو پوجا شروع ہونے سے پہلے ہم بھی یہاں سے نکلیں گے۔ پروگرام کے مطابق ہم میں سے کسی ایک کو گرو والی الماری کے سامنے ہی رہنا ہو گا۔ یہی ایک طریقہ ہے اوشا پر دباؤ برقرار رکھنے گا۔''

''اور تم چاہتے ہو کہ میں یہاں رہوں؟''

''صورتِ حال کے مطابق تو یہ تمہاری ذمے داری ہی بن رہی ہے۔''

''بالکل نہیں، میں بارہویں کھلاڑی کی طرح باہر نہیں بیٹھوں گا۔ ہم یہ کام جگت سنگھ کو سونپ دیتے ہیں۔''

ہم دونوں میں تھوڑی سی بات ہوئی پھر یہ طے ہو گیا کہ پوجا کے وقت جب ہم کارروائی شروع کریں گے تو میری جگہ جگت سنگھ گرو کی نگرانی کرے گا۔

''موہن کو پستول دے دیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''ہاں...... بلکہ رائفل ہی دے دی ہے۔ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' عمران

نے کہا۔

میرا اندازہ تھا کہ عمران نے اسے شیشے میں اتار لیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس سے مکمل رہائی کا وعدہ بھی کیا ہو یا پھر مندر میں موجود سونے چاندی کی جھلک دکھائی ہو۔ وہ بندے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس سے کام لینے کا ہنر جانتا تھا۔

اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔ ہمیں یہ تو پتا چل گیا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کہاں ہے لیکن یہ پتا نہیں چلا تھا کہ آرا کوئے کہاں ہے۔ اس شخص کا بھی کچھ علم نہیں ہو سکا تھا جس نے آرا کوئے کو اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق ان بیس عدد گروؤں میں سے ہی کوئی مہا پجاری تھا اور آرا کوئے اس کے پاس تھا۔ شاید ہم خود آرا کوئے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے تو یہ ایک دشوار کام ثابت ہوتا لیکن یہاں صورتِ حال کچھ ایسی بنی تھی کہ آرا کوئے کا مجسمہ از خود سامنے آ رہا تھا۔ رسم کے موقع پر اس کو پجاریوں کے سامنے آنا ہی تھا اور یہ سنہری موقع تھا اس پر ہاتھ ڈالنے کا۔ اندیشہ صرف ایک ہی تھا کہ کہیں مخالف گروپ کی وجہ سے آج آدھی رات کو ہونے والی رسم ملتوی نہ ہو جائے۔

یہاں ہم نے جو اندازہ لگایا تھا اور جو کچھ اوشا سے معلوم ہوا، اس سے پتا چلتا تھا کہ بیس گروؤں والا گروہ بھکشوؤں کا سب سے خطرناک گروہ ہے۔ یہ ایک ایسا خونی فرقہ ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے آخری حد تک جاتا ہے۔ اغوا، قتل، خوں ریزی، ایذا رسانی یہ سب کچھ ان کے نزدیک جائز ہے۔ ابرار صدیقی کی حالتِ زار گواہ تھی۔ اس فرقے کے لوگ عام بودھ بھکشوؤں کو ناکارہ اور کمزور قرار دیتے تھے اور ہر جگہ ان پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس فرقے پر ہندوازم کے نمایاں اثرات بھی موجود تھے۔ بے شک یہ بھی سر منڈواتے تھے اور گیروا کپڑے پہنتے تھے لیکن ان میں سے اکثر اپنے سر کے پیچھے بالوں کی ایک چھوٹی سی لکیر چھوڑ دیتے تھے۔ ان کے کپڑوں کا رنگ بھی عام بھکشوؤں کے رنگ سے کچھ گہرا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تارک الدنیا بھی نہیں تھے۔ یہ لوگ آج کل اس بات پر بہت برہم تھے کہ آرا کوئے بار بار چوراُچکوں کے ہتھے کیوں چڑھ رہا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر آرا کوئے کے لئے ''حفاظت کی رسم'' ادا کر دی جائے تو یہ طویل عرصے کے لئے محفوظ و مامون ہو جائے گا...... ہاں، اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔

O......❖......O

وہ ایک سرد رات تھی۔ اوشا کی زبانی مجھے پتا چلا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ اوشا ایک پتنی کی حیثیت سے یقیناً گرو سے محبت کرتی تھی۔ اس کی جان بچانے کے لئے وہ مکمل تعاون کر رہی تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے کھانا کھلایا تھا بلکہ عمران اور جگت وغیرہ کو بھی کھانا پہنچانے کی پیشکش کی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس میں خطرہ ہے۔ ویسے بھی وہ تینوں، چنے اور بسکٹ کھا کر گزارہ کر چکے تھے۔

ہم نے الماری کھول کر گرو کو چیک کر لیا تھا۔ وہ مدہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کی سانس کی آمدورفت بالکل درست تھی۔ پچھلے سترہ اٹھارہ گھنٹوں میں اوشا کے کمرے میں صرف دو بار ملازمہ آئی تھی۔ دونوں بار وہ دروازے کی دہلیز سے ہی واپس چلی گئی تھی۔ میں اس دوران میں بڑے مجسمے کی اوٹ میں رہا تھا۔

اب رات اپنے نصف کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اوشا، اپنے پتی کی جگہ پوجا پر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی ایک سوتی ساڑھی پہن لی تھی۔ اس سادہ سی ساڑھی پر سامنے سینے کی طرف سنسکرت کے کچھ باریک الفاظ لکھے تھے۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ ہمارے تین مامن ہیں۔ یہ ہمارے دھرم کا سب سے اٹوٹ انگ ہیں۔ پہلا مامن ہے...... میں بدھ میں پناہ لیوت ہوں، دوسرا مامن، میں قانون میں پناہ لیوت ہوں...... تیسرا میں سنگھ میں پناہ لیوت ہوں۔“

وہ تفصیل بتانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ تیار بھی ہو رہی تھی۔ بدھ مت میں سونے چاندی کے زیورات کا استعمال ممنوع ہے لیکن میں نے دیکھا کہ اوشا نے کانوں میں خاص طرز کی چھوٹی چھوٹی بالیاں پہنیں اور گلے میں موٹے منکوں کی ایک مالا ڈال لی۔ وہ خوب صورت

تھی۔ اپنے پتی گرو دستھا کے لئے اس کی محبت بھی واضح ہو چکی تھی۔ گرو کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے لئے بہت دکھی تھی۔ تاہم وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ گرو کی ہٹ دھرمی کے کارن ہوا ہے۔ اب وہ گرو کی جان بچانے کے لئے ہر کوشش کر رہی تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ اوشا پوجا پاٹ پر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر روہانسی آواز میں بولی۔ ”اپنا وچن یاد رکھئے گا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جانے سے پہلے اس نے دیوہیکل الماری کھول کر اس میں پھر گرو دستھا کو دیکھا۔ وہ خانے میں یوں پڑا تھا جیسے بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے۔ وہ صحت مند اور سرخ وسپید رنگ کا مالک تھا۔ اس پر افیم کی گولیوں کا اثر پوری طرح موجود تھا۔ اس کے چہرے کو ہاتھ سے چھو کر اوشا جلدی سے باہر نکل گئی۔

پروگرام کے مطابق دس پندرہ منٹ بعد عمران جگت سنگھ اور موہن بجلی، گرو دستھا کے کمرے میں آن موجود ہوئے۔ جگت کی ایک آستین پر خون کے تازہ چھینٹے تھے۔ معلوم ہوا کہ راستے میں انہیں ایک خطرناک چیلے کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے ہیں۔ وہ نہ صرف ان کے راستے میں حائل ہوا بلکہ اس نے شور مچا کر مدد طلب کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ جگت نے اس کے دل کے مقام پر کرپان پیوست کی۔ پھر جگت اور عمران نے اس کی لاش گھسیٹ کر ایک اسٹور کے کاٹھ کباڑ کے نیچے ڈال دی تھی۔ مقتول کا خون فرش پر گرنے ہی نہیں دیا گیا۔

میں نے وسیع الماری کھول کر جگت سنگھ کو کن کٹے گرو کا دیدار کرایا اور اسے ساری صورتِ حال سمجھا دی۔ وہ بولا۔ ”فکر ہی نہ کرو بادشاہ زادے۔ آپاں تے نوکر ہیں آپ کے۔ جہاں کھڑا کر دو گے، لوہے پتھر کی طرح کھڑے رہیں گے۔“ اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور تیار ہو گیا۔

میں، عمران اور موہن کمرے سے نکل آئے۔ ہم میں سے ہر ایک کی پشت پر ریگزین کا بیگ تھا اور رائفل ہاتھ میں تھی۔ عمران کے پاس رائفل کی جگہ سائلنسر لگا پستول تھا۔ اوشا نے اس خاص راستے کی نشاندہی کل ہی کر دی تھی جس پر سے گزر کر ہم سیدھے پوجا والے بڑے ہال کے نزدیک پہنچ سکتے تھے۔ عام بھکشو یہ راستہ بہت کم استعمال کرتے تھے اور اس کی چابی اوشا اور اس کے پتی گرو دستھا کے پاس ہی ہوتی تھی۔ ہم اس راستے میں داخل ہوئے۔ یہ پتھریلی دیواروں والی ایک طویل راہداری تھی۔ یہاں ہمیں کچھ ایسے مناظر نظر آئے جن سے بھکشوؤں کے اس فرقے کی بے رحمی واضح ہوتی تھی۔ جگہ جگہ ہمیں ہڈیوں کے ہار نظر آئے۔ یہ دراصل انسانی انگلیوں کی ہڈیاں تھیں جنہیں سوت کی باریک ڈوری میں پرویا گیا تھا۔ کہیں

کہیں کسی جانور کی ہڈی بھی آویزاں نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ سب کچھ سفلی اعمال اور دیگر شعبدہ بازیوں کا حصہ تھا۔ ایک جگہ تانبے کے بہت بڑے تختے پر ایک ایسی تصویر کندہ نظر آئی جس میں کسی قدیم روایت کی منظر کشی تھی۔ دلائی لاما کے ایک محل کا منظر تھا۔ ایک تنومند بھکشو دو خوب صورت کنیزوں کے ساتھ کھل کھیلنے میں مصروف تھا۔ یہ کیسا بدھ مت تھا؟ یقیناً یہاں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا، بدھ مت کی بگڑی ہوئی بدترین شکل تھی۔ ابرار صدیقی کے دل میں بیٹھی ہوئی دہشت بجا ہی تھی۔

ہم راہداری سے تو بخیریت گزرے لیکن جب آگے نکلے تو فوراً مزاحمت کا سامنا ہوا۔ یہ نیچی چھت والا ایک چیمبر تھا۔ یہاں گہرے گیروا کپڑوں والے تین بھکشو موجود تھے۔ یہ چوب دار بھکشو تھے۔ ان میں سے دو کے پاس چمک دار تلواریں تھیں اور ایک کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر چونکے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتے، عمران کے سائلنسر لگے پستول نے تین بار شعلہ اگلا۔ دو بھکشو سر میں گولی کھا کر ڈھیر ہوئے، تیسرے کو میں نے دبوچ لیا۔ شکاری چاقو نے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ پستول کی آواز بہت مدھم تھی، اس کے باوجود وہ باہر تک گئی۔ ایک حیران شخص نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اسے موہن نے جھپٹ لیا اور اپنا چاقو دستے تک اس کے دل کے مقام پر اتار دیا۔ موہن اور میں نے اپنے اپنے مضروب کو تھوڑی دیر تھامے رکھا پھر فرش پر ڈال دیا۔

دروازہ کھول کر ہم نے باہر جھانکا اور چونک گئے۔ ہم پوجا والے وسیع ہال کے عین سامنے پہنچ چکے تھے۔ یہاں بہت سے افراد جمع تھے اور باتوں کی بھنبھناہٹ گونج کی طرح سنائی دیتی تھی۔ عمران نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ بھنبھناہٹ معدوم ہوگئی۔ ہم نے اس کمرے کے دونوں دروازوں کو اندر سے مقفل کر دیا۔ اب ہم چاروں لاشوں سمیت اس کمرے میں بند تھے۔ ایک جالی دار محرابی کھڑکی ہمیں ہال میں دیکھنے کا راستہ فراہم کر رہی تھی۔ اندر کا منظر دیدنی تھا۔ اس منظر نے ہمیں نل پانی کے مندر میں ہونے والے ہنگامے کی یاد دلا دی۔ ڈیڑھ دو سو بھکشو یہاں موجود تھے۔ ان میں گیروا اور گہرے گیروا کپڑوں والے بھکشو تھے۔ سامنے سرخ پتھروں کے ایک چبوترے پر انیس عدد گرو ایک قطار میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، بیسویں اوشا تھی۔ اوشا کی طرح تمام گروؤں کے گلے میں موٹے منکوں والی مالائیں تھیں۔ ان کے کپڑوں پر سامنے کی طرف بدھ مت کے تین مامن درج تھے۔ یہ سب مرد و زن ساکت و جامد تھے۔ ان کے رُوبرو ساگوان کی پالش شدہ لکڑی کا ایک خوب صورت بکس پڑا تھا۔ اس بکس کو دیکھ کر میرا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ یقیناً عمران کی کیفیت

بھی یہی رہی ہوگی۔ اس بکس کی لمبائی چوڑائی اشارہ دے رہی تھی کہ اس کے اندر وہی موجود ہے جس نے ایک خلقت کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ جاوا اور ریان ولیم جیسے نہ جانے کتنے دبنگ لوگ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اس کے لئے لڑائیاں ہو رہی تھیں اور جانیں لی جا رہی تھیں۔ لاہور، شیخوپورہ، ممبئی، دہلی، کھٹمنڈو نہ جانے کہاں کہاں اس کے متلاشی سرگرم تھے۔ اور یہ یہاں اس غیر معروف قدیم بودھ مندر کے اندر اس سرخ پتھریلے چبوترے پر اس ساگوانی بکس کے اندر موجود تھی۔ جلالی صاحب نے اسے اپنی جواں سال بیوی ڈاکٹر مہناز کے سپرد کیا تھا...... اور وہ اس امانت کی ذمے داری کو نبھاتے نبھاتے آج یہاں ان بے رحم قاتلوں تک آن پہنچی تھی۔ وہ آراکوئے چرانے کی مجرم ٹھہری تھی اور اب آراکوئے کو اس کے جسم کے تازہ خون سے اشنان دیا جانا تھا اور خود جواں سال ڈاکٹر مہناز کو لہو سے خالی ہو کر موت کی وادی میں اتر جانا تھا۔ یہی ''حفاظت کی رسم'' تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کمپیوٹر، میزائل اور سیل فون کے اس جدید دور میں، انہی جدتوں کے درمیان رہتے ہوئے کچھ لوگ ایسی دقیانوسیت اور توہم پرستی کے اسیر ہو سکتے ہیں۔

ایک طرف ایک بڑی انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ اس آگ کے قریب جو نِنگ دھڑنگ بھکشو بیٹھا تھا، وہ یقیناً چھوٹا پجاری ہی تھا۔ اوشا نے بتایا تھا کہ آگ میں کٹی ہوئی انگلیاں ڈالی جاتی ہیں۔ یقیناً یہ وہی آگ تھی۔ مخروطی کھڑکیوں کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی ہے۔ انیس گرو چبوترے پر موجود تھے۔ وہ سب تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ منڈے ہوئے سر، صحت مند جسم، گہرے گیروا کپڑے، گلے میں لکڑی کے منکوں کی طویل مالائیں، ان میں سے ہی کوئی مہا پجاری تھا۔ اس کا علم ان گروؤں کو تو شاید تھا لیکن اور کسی کو نہیں تھا۔ بہرحال، ہمیں اب اس سے غرض نہیں تھی کہ مہا پجاری کون ہے۔ مورتی آراکوئے ہمارے سامنے آ چکی تھی اور یہی ہمارا ٹارگٹ تھی۔

بہت بڑے بڑے ڈھول بجنا شروع ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ بہت سے بھکشو ایک نیم دائرے کی شکل میں چکرانے لگے۔ ان کے گلوں میں نمائشی کشکول لٹک رہے تھے اور ہاتھوں میں عصا تھے جن پر چمک دار میخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان عصا نما لاٹھیوں کو بار بار ہوا میں لہراتے تھے اور نعرہ زنی کرتے تھے۔ جیسے کسی نادیدہ دشمن کو للکار رہے ہوں۔ دھیرے دھیرے ان کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں اور انداز میں جارحانہ پن آ گیا۔ باقی حاضرین یکسر خاموش تھے اور آنکھیں بند کر کے پرارتھنا کر رہے تھے۔ ہال کے دروازوں پر گہرے گیروا لباس والوں کا چوکس پہرا تھا، اس کی وجہ غالباً تھ

سے مندر میں سے چند افراد غائب ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد ہم نے ایک
دیکھا۔ مشعل بردار بھکشوؤں کی دو طویل قطاریں تھیں۔ دونوں قطاروں کے آخر
افراد نے لکڑی کا ایک بڑا تختہ اٹھا رکھا تھا۔ اس تختے پر ایک جسم رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔
ہمیں یہ جاننے میں مطلق دشواری نہیں ہوئی کہ یہ ڈاکٹر مہناز تھی۔ اسے اتنی مضبوطی کے ساتھ
باندھا گیا تھا کہ وہ اپنے سر سمیت جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کی آواز بھی
نہیں آ رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس کے منہ میں ایک سفید سوتی کپڑا ٹھونس کر اوپر
سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ صلیب کے سے انداز میں اس کے دونوں بازو اطراف میں کھول کر
ان کی مضبوط رسی سے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کے دونوں پاؤں کے درمیان بھی کافی جگہ
تھی۔ مہناز کے بال جُوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور اس جُوڑے میں رجنی گندھا
کے پھول مہک رہے تھے۔

کل رات ہم نے اس بودھ مندر کے تہ خانے میں ڈاکٹر مہناز کو بڑی آسائش میں اور
بہت خوش و خرم دیکھا تھا لیکن آج اس کی وہ ساری کیفیت یقیناً اندوہناک تکلیف اور دہشت
میں ڈھل چکی تھی۔ اسے مکتی ملنے والی تھی لیکن کسی اور طریقے سے...... اس کی بیسوں انگلیاں
کاٹ کر اسے کسی تاریک کمرے میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ جہاں یقیناً دو تین گھنٹوں
میں اس کی موت واقع ہو جاتی۔

اسٹریچر نما تختے کو چبوترے کے درمیان لا کر رکھ دیا گیا۔ ہم جس کمرے میں لاشوں
سمیت مقفل تھے، اس کا عقبی دروازہ دھڑا دھڑ بجایا جا رہا تھا۔ ہم خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد
یہ دستک تھم گئی۔ شاید دستک دینے والے تھک ہار کر کسی اور راستے سے پوجا والے ہال کی
طرف چلے گئے تھے۔ انہوں نے اسے ''معمولی واقعہ'' سمجھا ہوگا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس
بند کمرے میں چار لاشوں کے ساتھ تین مسلح دشمن بھی موجود ہیں۔

اُنیس گروؤں کی قطار میں اوشا سب سے بائیں جانب بیٹھی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی
تھی کہ اس نے کوئی غلط حرکت کی تو الماری میں بند بے ہوش گرو وستھا کی جان چلی جائے گی۔
میں اور عمران اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ گروؤں کی قطار میں سب
سے دائیں جانب بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے لکڑی کا بکس کھول کر مورتی نکال
لی۔ یہ آرا کوئے تھی۔ وہی نادر فاسٹنگ بدھا جس کے ساتھ زمانے سے اَن گنت کہانیاں
منسوب تھیں اور جو نوادارات کی دنیا میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ گندھاری مجسمہ ٹیوب
لائٹس کی دودھیا روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس کی دید نے حاضرین پر ایک وجد آمیز ہیبت طاری

کر دی۔ نقاروں کے فلک شگاف شور میں وہ آرا کوئے کے سامنے جھک گئے۔ ان کی
مناجات سے بام و در گونج اٹھے۔ گہرے گیروا کپڑوں والے بھکشو دوسرے بھکشوؤں سے
زیادہ پُر جوش دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ آج یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، ان کی مرضی کے
مطابق ہو رہا تھا۔ ایک انسانی جان لے کر وہ اس نادر مجسمے کو ہمیشہ کے لئے ''محفوظ'' بنانے
والے تھے۔

لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ انسانی جان لینا ان کے لئے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ کوئی
ان کے حصار توڑ کر ان کے قلب میں گھس چکا تھا۔ ان کی شہ رگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان تین
عدد آتشیں ہتھیاروں سے بے خبر تھے جو ان پر آگ برسانے کے لئے بالکل تیار تھے۔

نادر مجسمے کی دید، پذیرائی اور عبادت کا مرحلہ گزرا تو ڈاکٹر مہناز والا تختہ اٹھا کر مجسمے کے
بالکل قریب کر دیا گیا۔ پتھر کا ایک بڑا پیالہ، ایک بڑا گول طشت جو غالباً لکڑی کا ہی بنا ہوا تھا
اور ایک تیز دھار کٹار نما خنجر چبوترے پر لایا گیا۔ یقیناً ڈاکٹر مہناز کی مصیبت کا آغاز ہونے
والا تھا۔

پروگرام کے مطابق مجھے اور عمران کو دوڑتے ہوئے ہال میں داخل ہونا تھا۔ سب سے
پہلے ہمیں ان تین مسلح افراد (چوب داروں) کو نشانہ بنانا تھا جو آرا کوئے کے بالکل قریب
موجود تھے۔ اس کے بعد آرا کوئے کو حاصل کرنا اور بڑے گروؤں میں سے کچھ کو ڈھال کے
طور پر استعمال کرتے ہوئے بغلی دروازے کی طرف بڑھنا ہمارے پلان میں شامل تھا۔

لیکن جو کچھ ہوا، وہ ہمارے پلان سے خاصا مختلف تھا۔ ایک دم ہال کی ساری روشنیاں
گل ہو گئیں۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ زبردست شور بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ ہم دونوں نے ایک
ساتھ اپنے پشتی تھیلوں سے ٹارچیں نکالیں اور ان کے روشن دائرے چبوترے کی طرف
پھینکے۔ وہاں اژدھام تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پل پڑے تھے۔ تلواریں چمک رہی تھیں پھر
گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ ہم نے دروازہ کھولا اور تیزی سے چبوترے کی طرف لپکے۔ میں
اور عمران آگے تھے۔ موہن عقب میں تھا۔ لوگوں سے ٹکراتے، راستہ بناتے، ہم چبوترے پر
پہنچے۔ حسب اندیشہ آرا کوئے والی جگہ خالی تھی۔ وہاں سرخ اور گہرے سرخ کپڑوں والے
بہت سے بھکشو گتھم گتھا تھے۔ تیز دھار آلے استعمال ہو رہے تھے۔ رائفلوں کے شعلے چمک
رہے تھے...... جہاں ڈاکٹر مہناز والا تختہ پڑا تھا وہ جگہ بھی اب خالی تھی۔ کیا آرا کوئے کی طرح
مہناز بھی منظر سے غائب کر دی گئی ہے؟ یہ سوال تیر کی طرح دماغ میں پیوست ہو گیا۔
خود پر تلوار سے حملہ کرنے والے ایک خونخوار ''بھکشو'' کے سینے پر میں نے رائفل کا فائر

کیا اور اندھا دھند چلنے والی گولیوں سے بچنے کے لئے زمین پر لیٹ گیا۔ عمران اور موہن نے بھی ایسا ہی کیا تھا ہم فرش پر پیچھے کی طرف رینگتے چلے گئے تاکہ گولیوں کی بارش سے بچ سکیں۔ آخر ہمیں دو جڑے ہوئے بڑے بڑے ستونوں کی آڑ میسر آ گئی۔ ہم نے وہاں پوزیشن لے لی۔

کچھ ہی دیر پہلے جہاں اُنیس گرو بیٹھے تھے، وہاں اب دو گروؤں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اوشا سمیت اور کسی گرو کا پتا نہیں تھا۔ کھڑکیوں سے باہر زور سے بجلی چمکی۔ روشنی کے جھماکے میں ہال کا منظر تہلکہ خیز دکھائی دیا۔ یہاں کئی لاشیں اور زخمی موجود تھے۔ دونوں طرف کے گن مینوں نے مختلف جگہوں پر پوزیشن لے لی تھی اور دیوانہ وار فائرنگ کر رہے تھے...... شیشہ، لکڑی، دھات، سب کچھ چھلنی ہو رہا تھا۔ اور تب ہماری نگاہ مہناز پر پڑی۔ اس کا اسٹریچر نما تختہ چبوترے کی سیڑھیوں کے پاس اوندھا پڑا تھا۔ مہناز تختے کے نیچے تھی اور گولیوں کی بارش میں تھی۔ غالباً ہنگامہ شروع ہونے کے بعد اسے بچانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پھر راستے میں ہی چھوڑ کر اپنی جان بچائی گئی تھی۔

مہناز کو کسی بھی وقت گولی چاٹ سکتی تھی۔ اس کی زندگی تیز ترین ہوا میں پھڑپھڑاتے چراغ کی طرح تھی۔ اسے اس کی جگہ سے ہٹانا موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جیسا تھا...... لیکن ایسی چھلانگیں ہم پہلے بھی لگاتے رہے تھے۔ ایسی سربکف دیوانگی ہمیں پہلے بھی بھاتی رہی تھی۔ جب موت پھنکارتی ہے، دھاڑتی ہے، سینے شق کرتی ہے اور جگر پھاڑ ڈالتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا اور اس کے سامنے خم ٹھونکنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے...... جدا ہی نشہ ہوتا ہے۔ میں اور عمران کندھے سے کندھا ملا کر پہلے بھی کئی بار ایسے جاں گسل مرحلوں سے گزر چکے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... ایک ساتھ اٹھے اور ایک ساتھ ڈاکٹر مہناز کی طرف دوڑے۔ ہم رکوع کے بل جھکے ہوئے تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ موت بن کر ہر طرف لپک رہا تھا...... کئی گولیاں ہمارے بہت پاس سے گزریں۔ سچ کہتے ہیں، جب بے خوفی سے موت کا سامنا کیا جاتا ہے تو وہ دھند کی طرح تحلیل ہونے لگتی ہے۔ ہم نے مہناز والا تختہ سیدھا کیا، اسے اٹھایا اور لاشوں کو پھلانگتے ہوئے ایک بغلی دروازے سے ٹکرائے اور اسے توڑتے ہوئے ایک تاریک برآمدے میں نکل آئے۔ یہاں بھی کئی افراد گتھم گتھا تھے۔ بارش کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ مہناز کے چہرے پر پھینکا۔ وہ زندہ تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں دہشت منجمد تھی۔

گہرے گیروا اور ہلکے گیروا کپڑوں والی دو ٹولیاں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھیں۔ ہم

ان کے قریب سے گزرتے ہوئے گول ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھے۔ جگت سنگھ کو یہیں پر ملنا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ موہن بجلی کہیں نہیں تھا۔

''لگتا ہے موہن نکل گیا ہے۔'' میں نے چلّا کر کہا۔

''وہ کمینہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا انتظام کیا ہوا ہے۔'' عمران نے بھی چلّا کر جواب دیا۔

کسی طرف سے ہم پر آٹومیٹک رائفل کا برسٹ چلایا گیا۔ ہم بھاگتے بھاگتے اسٹریچر نما تختے سمیت گر گئے......

گولیاں ہمارے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ ہم نے ایک بار پھر مہناز والا اسٹریچر نما تختہ اٹھایا اور گول ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھے۔ ہر طرف شعلے چمک رہے تھے اور فائرنگ کی گونج دار آوازیں تھیں۔ بائیں طرف سے برآمد ہونے والے ایک تنومند بھکشو نے عمران پر تلوار کا وار کرنا چاہا۔ میں نے اس کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ مارا اور عمران تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر کر دیا۔

ہم گول ستونوں والے برآمدے میں پہنچے۔ جگت سنگھ اپنی مقررہ جگہ پر موجود نہیں تھا۔

''کہاں دفع ہو گیا؟'' عمران نے بلند آواز سے کہا۔

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران نے اسٹریچر نما تختے کو ایک تاریک گوشے میں رکھا اور بولا۔ ''میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔''

میں اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ کسی کی کب سنتا تھا۔ وہ اس کمرے کی طرف لپک گیا جہاں زخمی گرو دستھا ایک الماری کے خانے میں بند تھا اور جگت کو اس کا پہرا دینا تھا۔

عمران کی واپسی دو منٹ کے اندر ہی ہو گئی۔ ''ملا؟'' میں نے چلّا کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بھی چلّا کر جواب دیا...... اور اسٹریچر نما تختہ اٹھا لیا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ایک دھواں دھواں راہداری میں گھس گئے۔ عمران آگے تھا، میں پیچھے اور ہمارے درمیان تختے پر بندھی ہوئی ڈاکٹر مہناز تھی۔ کبھی کبھی ہمیں فائر کرنے کے لئے اپنا ایک ہاتھ تختے سے الگ بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ ہمارا رخ پگوڈا یعنی اس بودھ مندر کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ عمران صرف جگت سنگھ کو دیکھنے گرو دستھا کے کمرے کی طرف نہیں گیا تھا، اس کا کچھ اور مقصد بھی تھا۔ لیکن کیا؟ اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

مندر کے وسیع احاطے میں بھی گھمسان کا رَن پڑا ہوا تھا۔ دونوں فرقوں کے بھکشو آمنے

سامنے تھے۔تلواروں اور کلہاڑیوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔آرا کوئی کی ملکیت کا جھگڑا اس عبادت گاہ کو خوں رنگ کر رہا تھا۔ہمیں ایک لوڈر نما گاڑی نظر آئی۔اس پر ''سیوا دواری مندر'' لکھا ہوا تھا۔یعنی یہ مندر میں خدمت انجام دینے والی گاڑی تھی۔گاڑی اسٹارٹ تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور انجن ریس میں تھا۔اس کے بھکشو ڈرائیور کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ مر چکا تھا۔مرتے وقت ڈرائیور کا پاؤں چونکہ ایکسلریٹر پر تھا، اس لئے انجن نے زبردست شور مچایا ہوا تھا۔

عمران نے فائر مار کر لوڈر کے عقبی دروازے کا لاک توڑا۔ہم نے پھرتی سے مہناز والا تختہ لوڈر میں پہنچا دیا۔میں نے لوڈر کا اگلا دروازہ کھول کر مردہ ڈرائیور کو نیچے پھینکا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی عمران بائیں طرف والا دروازہ کھول کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔یہ سارا عمل بمشکل ایک منٹ کے اندر مکمل ہو گیا میں نے لوڈر کو گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا تو گھرے گیروا کپڑوں والے دو جنونی بھکشو سامنے آئے۔درحقیقت ان کی موت ہی انہیں لوڈر کے سامنے لائی تھی عمران بڑے خطرناک موڈ میں تھا اس نے رائفل کا طویل برسٹ مارا اور دونوں کو ڈھیر کر دیا۔ان میں سے ایک کی لاش لوڈر کے نیچے آئی لوڈر اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔یہ دواری مندر بڑے سخت حفاظتی حصار کے اندر تھا مگر اس وقت سارے حصار ٹوٹے ہوئے تھے۔ہر طرف افراتفری تھی۔

لوڈر کو تیزی سے آتے دیکھ کر کچھ افراد نے آہنی گیٹ بند کرنے کی کوشش کی۔مجھے ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی تو گیٹ بند ہو جاتا اور شاید یہ لوڈر اسے توڑ نہ سکتا۔مگر گیٹ بند نہیں ہوا اور لوڈر اسے دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور دو عقبی کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔مجھے لگا جیسے ڈاکٹر مہناز کو گولی لگ گئی ہے لیکن اس کی آواز نہیں آئی۔آواز آ بھی نہیں سکتی تھیں اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔میں نے مڑ کر دیکھا۔کچھ نظر نہیں آیا۔وہ عقبی حصے میں بے حرکت لیٹی تھی۔

''کدھر جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جدھر منہ ہے۔بس بھگاتے چلے جاؤ'' عمران نے کہا۔

اور میں واقعی بھگاتا چلا گیا۔یہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔سڑک کے دونوں طرف تھوڑی بہت آبادی تھی۔پام کے پیڑوں کے درمیان کہیں کہیں دو تین منزلہ گھر بھی نظر آ رہے تھے لیکن انسان کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔عقب میں سڑک پر مدھم روشنیاں تو نظر آ رہی تھیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی عام گاڑی کی روشنی ہے یا

کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔''مہناز کو دیکھو یار! کہیں وہ زخمی نہ ہو گئی ہو؟''

''ابھی بھگاتے جاؤ۔آگے کوئی مناسب جگہ نظر آتی ہے تو روکتے ہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

قریباً چھ سات میل تک ہم سمندر کے ساتھ ساتھ اسی طرح لوڈر بھگاتے گئے۔پھر سڑک سے ذرا ہٹ کر درختوں کا ایک بڑا جھنڈ نظر آیا۔موسلا دھار بارش میں کھجور، پام اور تاڑ وغیرہ کے بہت سے درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔عمران نے کہا۔''اس کے اندر گھسا دو۔''

میں نے یہی کیا۔گاڑی کو سڑک سے اتارا اور جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔انجن بند کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔عمران نے اپنی پشت پر لٹکے بیگ میں سے بڑے سائز کی ٹارچ نکال لی۔ہم گھوم کر لوڈر کے عقب میں آئے۔ٹارچ کی روشنی مہناز پر ڈالی۔وہ بے سُدھ پڑی تھی۔یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے۔شیشے کی کرچیاں لگنے سے اس کا بازو معمولی زخمی ہوا تھا۔اس کے چہرے پر بھی نیل نظر آ رہے تھے۔یقیناً یہ چوٹیں اسے تب لگی تھیں، جب مندر میں بھگدڑ مچنے کے بعد اس کا یہ اسٹریچر نما تختہ سیڑھیوں کے قریب الٹ گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔وہ اب تک ہمیں بڑی اچھی طرح پہچان چکی تھی۔میں نے اس کے منہ میں سے سوتی کپڑا نکالا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔میں نے اور عمران نے اسے بمشکل چپ کرایا۔یہ دکھ سکھ بیان کرنے کا وقت نہیں تھا۔میری خاکی پتلون خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔یہ دراصل اس بدقسمت ڈرائیور کا خون تھا جو لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر کسی اندھی گولی کا شکار ہوا تھا۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''سب سے پہلے ہمیں اس لوڈر سے جان چھڑانا ہوگی۔''

''لیکن کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' عمران بولا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔کچھ ہی دیر بعد وہ شیکھر نامی شخص سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔یہ وہی مقامی شخص تھا جو رتنا گری میں رہائش رکھتا تھا اور عمران نے ممبئی کے ہوٹل سے بھی اس سے رابطہ کیا تھا۔مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس مشن میں شریک نہ ہونے کے باوجود ہمارے آس پاس موجود رہا ہے۔

فقط دس منٹ کے اندر شیکھر ایک ایمبولینس گاڑی میں آن موجود ہوا۔عمران نے ٹارچ کے روشن دائرے سے اس کی راہنمائی کی اور وہ ایمبولینس کو سیدھا درختوں کے جھنڈ میں لے

آیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں اور عمران بھاگ کر ایمبولینس میں سوار ہو گئے۔ شیکھر نامی اس نوجوان کی عمر پچیس چھبیس سال ہو گی۔ اس کے ساتھ اس کی عمر اور حلیے والا ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اس کا نام پورب معلوم ہوا۔ وہ شکل اور لباس سے نچلی ذات کا ہندو نظر آتا تھا۔

’’جی سر! کیا پروگرام ہے؟‘‘ شیکھر نے عمران سے پوچھا۔

’’یہاں سے نکلنا ہے فوراً۔ فیول وغیرہ ہے نا گاڑی میں؟‘‘

’’بالکل جی، ٹینکی فل ہے۔ لیکن آپ کے باقی دونوں ساتھی نظر نہیں آ رہے؟‘‘

’’ایک بھاگ گیا ہے، ایک [illegible]۔‘‘ عمران نے [illegible] جانے والے سے اس کی مراد موہن بجلی اور گم ہونے والے سے [illegible] تھی۔

’’لوڈر کے اندر کون ہے جی؟‘‘ پورب کمار نے پوچھا۔

’’وہی ڈاکٹر ہے...... اب تم لوگوں نے فوراً ایک کام کرنا ہے۔ اس بھگوڑے موہن بجلی کو پکڑنا ہے۔‘‘ عمران نے کہا اور جیب سے ایک ماچس جیسی ذرا سی چیز نکال کر پورب کو تھما دی۔ یہ دراصل سگنل وصول کرنے والی ایک الیکٹرانک ڈیوائس تھی۔

عمران نے ڈیوائس کو آن کیا۔ اسکرین پر ایک روشن سا ابھرا اور سبز رنگ کا ایک نقطہ اسپارک کرنے لگا۔ پورب کمار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ عمران بولا۔ ’’موہن کے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل ہے۔ ٹرانسمیٹر اسی کے اندر ’’انسٹال‘‘ ہے۔ وہ رائفل ہاتھ سے کھونا پسند نہیں کرے گا۔ امید ہے تم ایک دو گھنٹوں میں ہی اسے ڈھونڈ لو گے۔‘‘

پورب کمار نے اثبات میں سر ہلایا...... اور ایمبولینس سے اتر کر درختوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب مجھ پر یہ واضح ہوا کہ عمران نے موہن کو پستول کے بجائے رائفل کیوں دی تھی۔

عمران نے شیکھر سے کہا۔ ’’مجھے دواری مندر کے اندر کی رپورٹ بھی چاہئے ہو گی اور اگر جگت سنگھ کے بارے میں کچھ پتا چل سکے تو اور اچھی بات ہے۔‘‘

’’میں ابھی انتظام کرتا ہوں جی۔‘‘ شیکھر نے کہا اور موبائل فون پر کسی کا نمبر پریس کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں اور عمران ایمبولینس سے نکلے اور لوڈر کی طرف بڑھے۔ اب ہمیں مہناز کو تختے سے علیحدہ کرنا تھا اور ایمبولینس میں پہنچانا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’عمران! تم بالکل جلیبی کی طرح گول گول ہو۔ مجھے تم نے یہی بتایا تھا کہ اس کارروائی میں ہمارے ساتھ صرف جگت سنگھ اور موہن

ہی شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہارے کچھ اور مؤکل بھی آس پاس موجود ہیں۔‘‘

’’یار! یہ کارروائی میں شریک تھوڑے تھے۔ یہ تو میرے بلاوے پر آ گئے ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہ مقامی دوست ہیں۔ میں ان کے کام آتا ہوں، یہ میرے کام آتے ہیں۔‘‘

’’یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں کہاں، کب کب اور کس کس کے کام آتے ہو؟‘‘

’’ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ دادا جی فرمایا کرتے تھے، نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔‘‘

میں خاموش ہو گیا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کی مضبوط بندشیں کھولیں۔ بے چاری کی کلائیوں اور پنڈلیوں پر سن کی رسی نے گہرے نشان ڈال دیئے تھے۔ وہ سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔ ’’میں کہاں ہوں تابش؟ کہیں وہ لوگ پھر تو نہیں آ جائیں گے۔ پلیز مجھے یہاں سے جلدی لے چلو۔‘‘ اس نے اپنا لرزاں ہاتھ میری کلائی پر رکھ دیا۔

’’اب کچھ نہیں ہو گا مہناز۔ ہم یہاں ہیں تمہارے پاس۔‘‘ میں نے اسے تسلی دی۔

’’یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بھکشو نہیں ہیں۔ یہ تو جانور، درندے ہیں۔ درندوں سے بھی برے...... انہوں نے...... انہوں نے جلالی صاحب کو تو کچھ نہیں کہا؟ پلیز مجھے سچ بتائیں۔ جلالی صاحب تو ٹھیک ہیں نا؟‘‘

’’بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کہیں گی تو ان سے بات بھی کرا دیں گے۔‘‘

’’کب...... ؟ پلیز...... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں وہ نہیں کر سکی جو وہ چاہتے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس امانت کی حفاظت نہیں کر سکی۔‘‘ وہ سسکتی چلی گئی۔

امانت سے اس کی مراد یقیناً آرا کوئے ہی تھا۔ آج وہ سارے خیال بالکل غلط ثابت ہو گئے تھے جو جلالی فارم سے ڈاکٹر مہناز کے غائب ہونے کے بعد لوگوں کے ذہن میں آئے تھے۔ بابے طفیل جیسے گھریلو ملازموں اور دیگر لوگوں نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نے جلالی صاحب کو دھوکا دیا ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اسے اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کو مورتی سمیت غائب ہو جانے کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ’’مہناز...... آپ کے ساتھ ڈاکٹر رسام بھی تو تھا؟‘‘

وہ ہچکیوں سے رو دی۔ ’’انہوں نے اسے مار دیا۔ بڑی تکلیف دے کر مارا۔ اس کے سارے جسم کو لوہے سے داغ داغ کر سیاہ کر دیا۔‘‘

آیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں اور عمران بھاگ کر ایمبولینس میں سوار ہو گئے۔ شیکھر نامی اس نوجوان کی عمر پچیس چھبیس سال ہو گی۔ اس کے ساتھ اس کی عمر اور حلیے والا ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اس کا نام پورب معلوم ہوا۔ وہ شکل اور لباس سے نچلی ذات کا ہندو نظر آتا تھا۔

''جی سر! کیا پروگرام ہے؟'' شیکھر نے عمران سے پوچھا۔

''یہاں سے نکلنا ہے فوراً۔ فیول وغیرہ ہے نا گاڑی میں؟''

''بالکل جی، ٹینکی فل ہے۔ لیکن آپ کے باقی دونوں ساتھی نظر نہیں آ رہے؟''

''ایک بھاگ گیا ہے، ایک گم ہو گیا ہے۔'' عمران نے کہا۔ بھاگنے والے سے اس کی مراد موہن بجلی اور گم ہونے والے سے جگت سنگھ تھی۔

''لوڈر کے اندر کون ہے جی؟'' پورب کمار نے پوچھا۔

''وہی ڈاکٹر ہے...... اب تم لوگوں نے فوراً ایک کام کرنا ہے، اس بھگوڑے موہن بجلی کو پکڑنا ہے۔'' عمران نے کہا اور جیب سے ایک موبائل فون نما چیز نکال کر پورب کو تھما دی۔ یہ دراصل سگنل وصول کرنے والی ایک الیکٹرانک ڈیوائس تھی۔

عمران نے ڈیوائس کو آن کیا۔ اسکرین پر ایک روڈ میپ سا ابھرا اور سبز رنگ کا ایک نقطہ اسپارک کرنے لگا۔ پورب کمار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ عمران بولا۔ ''موہن کے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل ہے۔ ٹرانسمیٹر اسی کے اندر ''انسٹال'' ہے۔ وہ رائفل ہاتھ سے کھونا پسند نہیں کرے گا۔ امید ہے تم ایک دو گھنٹوں میں ہی اسے ڈھونڈ لو گے۔''

پورب کمار نے اثبات میں سر ہلایا...... اور ایمبولینس سے اتر کر درختوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب مجھ پر یہ واضح ہوا کہ عمران نے موہن کو پستول کے بجائے رائفل کیوں دی تھی۔

عمران نے شیکھر سے کہا۔ ''مجھے دواری مندر کے اندر کی رپورٹ بھی چاہئے ہو گی اور اگر جگت سنگھ کے بارے میں کچھ پتا چل سکے تو اور اچھی بات ہے۔''

''میں ابھی انتظام کرتا ہوں جی۔'' شیکھر نے کہا اور موبائل فون پر کسی کا نمبر پریس کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں اور عمران ایمبولینس سے نکلے اور لوڈر کی طرف بڑھے۔ اب ہمیں مہناز کو تختے سے علیحدہ کرنا تھا اور ایمبولینس میں پہنچانا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! تم بالکل جلیبی کی طرح گول گول ہو۔ مجھے تم نے یہی بتایا تھا کہ اس کارروائی میں ہمارے ساتھ صرف جگت سنگھ اور موہن

ہی شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہارے کچھ اور مؤکل بھی آس پاس موجود ہیں۔''

''یار! یہ کارروائی میں شریک تھوڑے تھے۔ یہ تو میرے بلاوے پر آ گئے ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہ مقامی دوست ہیں۔ میں ان کے کام آتا ہوں، یہ میرے کام آتے ہیں۔''

''یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں کہاں، کب کب اور کس کس کے کام آتے ہو؟''

''ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ دادا جی فرمایا کرتے تھے، نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کی مضبوط بندشیں کھولیں۔ بے چاری کی کلائیوں اور پنڈلیوں پر سن کی رسّی نے گہرے نشان ڈال دیئے تھے۔ وہ سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔ ''میں کہاں ہوں تابش؟ کہیں وہ لوگ پھر تو نہیں آ جائیں گے۔ پلیز مجھے یہاں سے جلدی لے چلو۔'' اس نے اپنا لرزاں ہاتھ میری کلائی پر رکھ دیا۔

''اب کچھ نہیں ہو گا مہناز۔ ہم یہاں ہیں تمہارے پاس۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بھکشو نہیں ہیں۔ یہ تو جانور، درندے ہیں۔ درندوں سے بھی برے...... انہوں نے...... انہوں نے جلالی صاحب کو تو کچھ نہیں کہا؟ پلیز مجھے سچ بتائیں۔ جلالی صاحب تو ٹھیک ہیں نا؟''

''بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کہیں گی تو ان سے بات بھی کرا دیں گے۔''

''کب......؟ پلیز...... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں وہ نہیں کر سکی جو وہ چاہتے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس امانت کی حفاظت نہیں کر سکی۔'' وہ سسکتی چلی گئی۔

امانت سے اس کی مراد یقیناً آرا کوئے ہی تھا۔ آج وہ سارے خیال بالکل غلط ثابت ہو گئے تھے جو جلالی فارم سے ڈاکٹر مہناز کے غائب ہونے کے بعد لوگوں کے ذہن میں آئے تھے۔ بابے طفیل جیسے گھریلو ملازموں اور دیگر لوگوں نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نے جلالی صاحب کو دھوکا دیا ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اسے اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کو مورتی سمیت غائب ہو جانے کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''مہناز...... آپ کے ساتھ ڈاکٹر رسام بھی تو تھا؟''

وہ ہچکیوں سے رو دی۔ ''انہوں نے اسے مار دیا۔ بڑی تکلیف دے کر مارا۔ اس کے سارے جسم کو لوہے سے داغ داغ کر سیاہ کر دیا۔''

ہم نے غلط موضوع چھیڑ دیا تھا۔ فی الوقت ضرورت اس امر کی تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس پر ایک پولی تھین ڈالا اور اسے بارش میں چلا کر ایمبولینس کے اندر لے آئے۔ ہمارے کہنے پر اس نے جُوڑا کھول دیا۔ رجنی گندھا کے پھول اتار کر پھینک دیئے اور پیشانی پر سے ایک تلک نما نشانی مٹا دی۔ عمران نے اسے ایمبولینس کے اسٹریچر پر لٹا دیا اور ایک سفید چادر ٹھوڑی تک اس کے اوپر کھینچ دی۔ اپنے چہرے کی چوٹوں اور نیلوں کی وجہ سے وہ کوئی زخمی مریضہ ہی نظر آتی تھی۔ ہماری پشت پر موجود تھیلوں میں فالتو جوڑے موجود تھے۔ ہم نے لوڈر میں جا کر لباس تبدیل کر لیا۔ مجھے بھی خون آلود پتلون سے نجات مل گئی۔ شیکھر کے پاس اپنے اور گاڑی کے مکمل کاغذات موجود تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہمیں طویل سفر میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

ہماری امید درست ثابت ہوئی۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہائی وے سنسان تھی۔ تیز بارش نے اس سنسانی کو مزید بڑھایا تھا۔ ہمیں دن چڑھے تک کہیں بھی روکا نہیں گیا۔ ڈرائیونگ شیکھر کر رہا تھا۔ وہ خاصی رفتار سے جا رہا تھا۔ جب ہم کسی آبادی یا قصبے کے اندر سے گزرتے تو وہ ایمبولنس کا ہوٹر بھی آن کر دیتا۔ اگر ہمیں کسی ناکے وغیرہ پر روکا جاتا تو ہمیں یہی بتانا تھا کہ ہم روڈ ایکسیڈنٹ میں گھائل ہونے والی ایک عزیزہ کو رتناگری کے اسپتال لے جا رہے ہیں۔ بہرحال، اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی۔ راستے میں ہم نے کئی بار جگت سنگھ کے موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں ہماری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش میں سفر کرتے ہوئے ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ ایک بار پھر ممبئی پہنچ گئے۔ بارش میں بھیگا ہوا ممبئی قدرے خاموش نظر آ رہا تھا۔ ویسے بھی یہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم سیدھے نصیر احمد کے گھر پہنچے۔ ایمبولینس کو گیراج میں کھڑا کرنے کے بعد ہم نے ڈاکٹر مہناز کو نکال کر آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا۔ ایشوریا رائے سمیت تینوں لڑکیاں یہیں موجود تھیں۔ وہ ہمیں واپس دیکھ کر خوش ہوئیں...... اور ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر حیران۔

جیلانی اور نصیر سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً جاننا چاہتے تھے کہ ہمیں آرا کوئے کے حوالے سے کامیابی ہوئی ہے یا نہیں؟ ان کے سوال کا جواب نفی میں تھا۔ ہماری خاموشی سے انہوں نے بھانپ لیا کہ جواب کیا ہے۔

اسی دوران میں عمران کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف وہی پورب کمار تھا جس فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف وہی پورب کمار تھا جس کے ذمے عمران اور شیکھر

نے موہن بجلی کو ”ٹریس“ کرنے کا کام لگایا تھا۔

پورب کی آواز موبائل کے اسپیکر پر ابھری۔ ”جی جناب! اچھی سما چار ہے۔ ہم نے موہن کو دھر لیا ہے۔ پہلے تو اس کے سگنل ہی نا ہیں مل رہے تھے پھر اس کے سگنل ملنے شروع ہوئے لیکن وہ کسی جگہ ٹک ہی ناہیں رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسٹیشن کے قریب سے پکڑا ہے اسے۔“

”کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟“ عمران نے پوچھا۔

”ناہیں جی، اپن کا ایک بندہ معمولی گھائل ہوا ہے۔ بازو پر گولی لگی ہے۔ اب آپ بتائیں اس کا کیا کرنا ہے۔ اپن نے اسے ایک اسٹیشن وین میں ڈالا ہوا ہے اور وین تھانے کے قریب کھڑی ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے تھانے میں ہی جمع کرانا ہے لیکن کسی عام افسر کو نہیں دینا۔ اس خبیث کے لئے اسپیشل پروٹوکول ہوگا۔ کوئی بڑا افسر اسے وصول کرے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“

”سر! یہ بڑی بک بک کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے اسے وچن دیا گیا تھا۔ مندر میں سے جو مال لوٹا گیا ہے، اس میں سے اسے حصہ ملنا چاہئے۔“

عمران بولا۔ ”اس سے کہو حصے کی جگہ تمہاری تشریف پر چار پانچ لاتیں مار کر تمہیں کسی چکی میں بند کر دینا چاہئے۔ تم نے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔“

”سر! وہ کہہ رہا ہے...... میں بھاگا ناہیں ہوں۔ خود کو بھکشوؤں سے چھپا رہا تھا۔“

”اس کمزور دلیل کی پاداش میں اس کی مزید چھترول ہونی چاہئے۔ بہرحال، اس سے کہو کہ اس سے شروع میں جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ ضرور پورا ہوگا۔ اس کی قید میں زیادہ نہیں تو تین چار سال کی رعایت ضرور ہوگی۔“

اس کے فوراً بعد عمران نے جیلانی کو ساتھ لیا اور نیلی اسٹیٹ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ ڈیڑھ دو میل آگے جا کر گاڑی رکوالے گا اور جادا سے رابطہ کرے گا۔ ہم اس مکان سے جادا کو کال نہیں کرتے تھے کہیں لوکیشن ٹریس نہ ہو۔

عمران کی واپسی آدھ گھنٹے کے اندر ہوگئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ”جادا سے تو رابطہ نہیں ہوا لیکن چوپڑا سے بات ہوگئی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ موہن رتناگری میں ہے اور وہ اسے وصول کرنے کا انتظام کرے۔“

”جادا خود کدھر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

"چوپڑا نے بتایا نہیں۔ بس گول مول بات کی ہے۔"

"آراکوئے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا؟"

"چوپڑا نے تو نہیں پوچھا۔"

میں نے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "عمران! ہم پھر وہیں کھڑے ہیں جہاں کل رات سے پہلے تھے...... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پیچھے چلے گئے ہیں۔"

"جگر! وقتی طور پر مایوسی تو ہوئی ہے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ اگلے ایک دو دن میں پھر کوئی سراغ مل جائے گا۔ مورتی اپنی جگہ سے ہل چکی ہے اور اسے تلاش کرنے والے ہر طرف موجود ہیں۔"

"ان تلاش کرنے والوں میں تمہارے بندے...... میرا مطلب ہے تمہارے مؤکل بھی شامل ہیں؟" میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار! اتنے زیادہ مؤکل نہیں ہیں میرے...... کوئی بابا جنوں والا نہیں ہوں میں۔ بس تمہاری طرح کے دو چار خیر خواہ دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو تمہارے سامنے ہی ہیں۔"

"تم بہت کچھ چھپاتے ہو عمران......"

میری بات ادھوری رہ گئی۔ نصیر احمد کے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ جگت سنگھ تھا۔ ہمارے درمیان یہ بات کل ہی طے ہوگئی تھی کہ اگر ہم نے آپس میں رابطہ کرنا ہوگا تو نصیر احمد کے ذریعے کریں گے۔

اسکرین پر جگت سنگھ کا نمبر دیکھ کر ہم بری طرح چونکے۔ میں نے ہی فون ریسیو کیا۔

"ہیلو بادشاہ زادے! کہاں ہو؟" جگت نے مجھ سے پوچھا۔ وہ ہانپا ہوا سا تھا۔

"تم بتاؤ کہاں ہو؟ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہوئے ہو۔"

"ایویں ہی غائب نہیں ہوا بادشاہ زادے۔ بڑی زبردست سماچار ہے آپ سب کے لئے۔"

اس سے پہلے کہ جگت سنگھ کچھ اور بتاتا، رابطہ منقطع ہوگیا۔ یہ کمزور سگنلز کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہم نصیر کے فون سے بار بار جگت سنگھ کو کال ملانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکامی ہوئی۔ امید تھی کہ جگت سنگھ خود ہی دوبارہ کال کرے گا۔

اب پتا نہیں کہ اس کے پاس کیا زبردست خبر تھی۔ ہمارے لئے تو اس وقت اہم ترین خبر آراکوئے کے حوالے سے ہی ہوسکتی تھی۔

جاوا نے ثروت کی رہائی اور محفوظ واپسی کے بدلے صرف ایک ہی شرط رکھی تھی اور وہ تھی آراکوئے کی حوالگی۔ یقینی بات تھی کہ وہ اس شرط کے سوا کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر مہناز والے سراغ کے ذریعے ہم آراکوئے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے لیکن پھر اچانک وہ سب کچھ ہوگیا جس نے آراکوئے کو بڑے ڈرامائی انداز میں اوجھل کر دیا تھا۔ اب ہم پھر مکمل اندھیرے میں کھڑے تھے۔

اسی دوران میں جگت سنگھ کی کال پھر آگئی۔ میں نے ہی کال ریسیو کی۔ جگت نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ بولا۔ "آپ کو پتا ہے، میں اس ویلے کہاں ہوں؟"

"میں کیسے اندازہ لگا سکتا ہوں؟"

"میں اس ویلے ممبئی میں ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"ہم بھی ممبئی میں ہیں۔"

"یہ تو پھر بڑی چنگی بات ہوگئی۔ آپ کے لئے زبردست سماچار یہ ہے کہ آپاں (ہم) جس مورتی کے پیچھے رتنا گری گئے تھے، وہ اس ویلے میرے بالکل پاس ہے۔ بس یوں سمجھو بادشاہ زادے کہ پندرہ وی فٹ کی دوری پر۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عمران کی آنکھوں میں بھی چمک نمودار ہوگئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو...... کہیں مذاق تو نہیں کر رہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"مذاق کا تو یہ موقع ہی نہیں ہے بادشاہ زادے! میں نے جان خطرے میں ڈالی ہے اور بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مندر میں جب ہاہا کار مچی اور لوگوں نے دوڑنا شروع کیا تو میں گرو کے کمرے میں تھا، الماری کے پاس۔ مجھے چار بھکشو نظر آئے۔ وہ مورتی لے کر دوڑے جا رہے تھے۔ میں نے گرو پر لعنت بھیجی اور ان کا پچھا کیا۔ وہ سامنے والے برآنڈے کی طرف آگئے۔ برآنڈے میں ان میں سے ایک کو گولی لگ گئی اور وہ گر پڑا، باقی تینوں احاطے میں آئے اور ایک ٹرک میں وڑ گئے۔ ان کے وڑتے ہی ٹرک فوراً چل پڑا۔ میں ٹرک کے پچھے لٹک گیا۔ ٹرک میں کھمبی کی جڑیں لدی ہوئی تھیں۔ کھمبی کا پتا ہے نا آپ کو، ترکاری کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بودھ شوق سے کھاندے ہیں۔ میں کھمبی کی جڑوں میں وڑ کر بیٹھ گیا۔" جگت نے ایک لحہ توقف کیا اور بولا۔

"بادشاہ زادے! میرا خیال ہے کہ یہ گل کافی لمبی ہو جائے گی۔ اس ویلے تو لوڑ اس گل کی ہے کہ آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔"

''میں بھی یہی کہنے لگا تھا۔'' میں نے کہا۔''اب بتاؤ کہ تم ہو کہاں؟''

''یہاں کا مشہور علاقہ کا جو پاڑا ہے۔ وہاں سے ہرے کرشنا کی طرف جاتے ہوئے بڑے چوک پر پہنچیں تو دائیں طرف سفید رنگ کا ایک ہوٹل ہے۔ اسے بودھ ہوٹل کہتے ہیں۔ تین منزلہ بلڈنگ ہے۔ کھمبی والا ٹرک اس ویلے ہوٹل کی پارکنگ وچ ہے۔ خود تینوں بھکشو پہلی منزل کے کمرے وچ ہیں۔ مورتی بھی ان کے پاس ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بڑی چھیتی یہاں سے نکلنے والے ہیں۔ ہوسکدا ہے کہ انہوں نے یہاں سے ہوائی اڈے کی طرف ہی جانا ہو۔''

''ان تینوں کے علاوہ کوئی اور بندہ بھی ہے کمرے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... ایک بندہ ہور ہے۔ دراصل ایک کار بھی ٹرک کے نال نال ہی رتنا گری سے یہاں پہنچی ہے۔ اس کار میں بھی تین چار بندے سوار تھے۔ یہ کار بھی اس ویلے پارکنگ میں کھڑی ہے۔''

''اسلحہ وغیرہ کیا ہے ان لوگوں کے پاس؟''

''آپاں کو تو کوئی اسلحہ شسلحہ نظر نہیں آیا سجن جی...... میری سمجھ کے مطابق یہ بھکشوؤں کا وہ دوسرا ٹولہ ہے جو مارا ماری کو بڑا وڈا پاپ سمجھتا ہے۔ مندر کے اندر بھی ان لوگوں نے کوئی گولی شولی نہیں چلائی۔ باقی دل کا حال تو واہگرو ہی جانتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جگت سنگھ! تم چوکس رہو۔ ہم جلد سے جلد پہنچ رہے ہیں۔''

''میں ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس ہی صوفے پر بکل مار کر بیٹھا ہوا ہوں۔''

''رائفل پاس ہی ہے نا؟''

''اوآہو یار! رائفل اور کرپان کے بغیر خالصہ بھلا کس کام کا؟''

میں نے سلسلہ منقطع کیا۔ عمران نے نصیر سے بودھ ہوٹل اور کا جو پاڑا وغیرہ کا حدود اربعہ پوچھا۔ ہم نے اپنا اسلحہ چیک کیا۔ ڈاکٹر مہناز بھی سب کچھ سن چکی تھی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے بھی وہی کچھ کہا جو دو دن پہلے اسی کمرے میں ابرار صدیقی نے کہا تھا......

وہ عمران اور مجھ سے مشترکہ طور پر مخاطب ہو کر بولی۔''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ دونوں اس برے چکر سے نکل جائیں؟ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ بالکل جنونی...... اور کٹر۔ یہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔''

عمران نے کہا۔''ڈاکٹر! آپ ہمارے لئے پریشان نہ ہوں۔ بس اپنا دھیان رکھیں۔ ہم ان لوگوں سے نمٹ لیں گے۔ ویسے بھی یہ وہ خونی ٹولہ نہیں ہے۔ یہ دوسرے لوگ ہیں۔''

ڈاکٹر مہناز شاید اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے تسلی دیتے ہوئے ہم باہر نکلے اور نصیر احمد کے ساتھ دوڑتے ہوئے نیلی گاڑی میں آ بیٹھے۔ اب دن کے قریباً گیارہ بج چکے تھے، تاہم تعطیل کے سبب سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔ نصیر احمد اچھا ڈرائیور تھا۔ وہ بیس پچیس منٹ میں ہمیں کا جو پاڑا کے علاقے میں لے آیا۔ دور ہی سے ہمیں تین منزلہ ہوٹل کی سفید اور گیروا عمارت نظر آگئی لیکن اس کے ساتھ ہی کسی گڑبڑ کا احساس بھی ہوا۔ پولیس کی دو موبائلز اپنے ہوٹر بجاتی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے پاس سے گزریں۔ ان کا رخ بودھ ہوٹل کی طرف ہی تھا۔ ہمیں کچھ ایسی گاڑیاں نظر آئیں جو یوٹرن لے کر واپس آرہی تھیں۔ ایسی ہی ایک گاڑی کے سوار نے بتایا۔''آگے گڑبڑ ہے۔ گولی چل رہی ہے۔ دوسرے رستے سے جائیں۔''

ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ہمیں اسی رخ پر آگے بڑھنا تھا۔ ہم پولیس موبائلز کے پیچھے ہی پیچھے ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ہوٹل میں ایک بڑا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ پارکنگ کے سامنے مین دروازے کے آس پاس بہت سے شیشے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ہلمین کار تیزی سے موڑ کاٹنے کی کوشش میں ایک دیوار کے اندر ٹھکی ہوئی تھی۔ اس کا بونٹ مڑ تڑ چکا تھا۔ کھڑکیاں چکنا چور تھیں اور گاڑی کی ایک سائیڈ مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ اس گاڑی کو جیسے کسی دھماکے سے تباہ کیا گیا تھا۔ گاڑی کے پنجر میں دو لاشیں ابھی تک پھنسی ہوئی تھیں۔

نصیر کو ہوٹل کے مین گیٹ کے قریب ہی اپنی پہچان والا ایک شخص نظر آ گیا۔ یہاں اور بھی بہت سے تماشائی ہراساں چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

''یہ کیا ہوا ہے عبداللہ؟'' نصیر نے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ بودھوں کا ہوٹل ہے۔ اندر ایک پگوڈا بھی ہے۔ یہاں کبھی ایسا ہنگامہ نہیں ہوا۔''

ہم نے ایک بار پھر دھیان سے تباہ شدہ کار کو دیکھا۔ اس کے اندر موجود لاشیں ممبئی کے سکہ بند بدمعاشوں کی لگتی تھیں۔ سانولے رنگ، شرابی چہرے، دھاری دار شرٹیں۔ جگت سنگھ اردگرد کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں اس کار کو تباہ کرنے والا دستی بم جگت سنگھ نے تو نہیں پھینکا تھا؟ اس کے پاس دستی بم موجود تھے اور وہ انہیں استعمال کرنے کے لئے بے قرار بھی بہت تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ یہاں ہوا کیا ہے کیا مارے جانے والے وہی بھکشو ہیں جن کے پاس مورتی تھی...... اور مارنے والے کون تھے؟

اچانک نصیر کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کا رنگ بدل گیا۔ فون بند کر کے نصیر نے کہا۔ ''آ جائیں عمران صاحب! یہ جگت کی کال تھی۔ ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے۔''

یہ سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ ہم نصیر کے ساتھ واپس نیلی کار میں جا بیٹھے۔ کار تیزی سے روانہ ہوئی۔ ''کہاں ہے بُلت؟'' میں نے نصیر سے پوچھا۔

''یہاں آس پاس ہی ہے جی۔'' نصیر نے کہا۔ وہ اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے اس نے کار روک دی۔ ایک طرف سے چادر کی بکل میں لپٹا ہوا ایک شخص برآمد ہوا اور کار میں آ بیٹھا۔ ''ست سری اکال جی۔'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ یہ جگت سنگھ ہی تھا۔

''یہ کیا ہوا ہے جگت؟'' میں نے کار کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

''رتنا گری والے تینوں بھکشو مارے گئے ہیں۔ مورتی نکل گئی ہے۔ اسے وہ کتا جاوا نکال کر لے گیا ہے۔'' جگت نے پورے وثوق سے کہا۔

''جاوا؟ کیا تم نے دیکھا ہے اسے؟'' عمران حیرت سے بولا۔

''نہیں، جاوا کو تو نہیں دیکھا...... پر اس کے ایک کمینے کارندے کو ضرور پہچان لیا ہے۔ وہی جسے آپ پریم چوپڑا کہتے ہیں۔ وہ کتے دا پتر...... چوڑی نک والا۔''

''پر یہ سب ہوا کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بادشاہ زادے! تمہیں کال کرنے کے بعد میں نے چائے کا آدھا کپ ہی پیا تھا کہ ایک دم پانچ چھ لڑکے فراٹے بھرتے اندر وڑ آئے۔ وہ سیدھے اس کمرے میں گئے جہاں تینوں بھکشو اپنے ساتھی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک دم ہی کڑا کے کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ مجھے لگتا ہے کہ بس پانچ چھ سیکنڈ کے اندر جاوا کے لڑکوں نے تینوں بھکشو مار دیئے۔ ان کا چوتھا ساتھی سخت زخمی ہے۔ ان تینوں چاروں نے بڑے آرام سے خود کو مروایا ہے۔ میں بھاگتا ہوا کمرے تک پہنچا تو لڑکے بھکشوؤں کو مارنے اور مورتی چھیننے کے بعد کھڑکی توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔ میں نے ان پر گولی چلائی...... پر وہ نکل گئے۔ اس ویلے مجھے ان میں وہ پریم چوپڑا بھی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں...... فلالین کے گلابی کپڑے میں لپٹی ہوئی مورتی تھی۔ میں ان کے پیچھے دوڑا۔ ابھی کھڑکی سے کودا ہی تھا کہ مجھ پر گولیاں چلیں۔ یہ پارکنگ کی طرف سے آئی تھیں۔ میں سڑک پر لیٹ گیا...... اور ایک چھوٹی گڈی کے پیچھے چلا گیا۔ مجھ پر یہ گولیاں ایک لال کار سے چلائی گئی تھیں......''

''وہی لال ہلمین جو مین گیٹ کے پاس دیوار میں لگی ہے؟'' نصیر نے پوچھا۔

''ہاں وہی...... میں نے بھی اس پر گولیاں چلائیں۔ دو تین منٹ فائرنگ ہوئی پھر کار نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ یہ جاوا کے بندے تھے۔ میرے من میں ان کے لئے وردوھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ان پر کالا انار پھینک دیا...... مر گئے کتے دے پلے......''

جگت سنگھ کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں غضب کی چنگاریاں تھیں۔

میں اور عمران سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سب کچھ گڑبڑ ہو رہا تھا۔ ساری پلاننگ، ساری سوچ بچار دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اب اگر جگت سنگھ کے بیان کے مطابق آرا کوئے واقعی جاوا کے پاس پہنچ چکی تھی تو پھر ہم تو اس کے لئے بے مصرف ہو گئے تھے۔ آرا کوئے کا کھوج لگانے والے اور اسے دواری مندر سے ہلانے والے ہم ہی تھے لیکن یہاں ستم یہ ہوا تھا کہ دواری مندر سے ہلنے کے بعد وہ خود ہی جاوا گروپ کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس بودھ ہوٹل میں جاوا کے مخبر ہوں۔ انہوں نے تینوں خوف زدہ بھکشوؤں کو اور ان کے کھمبیوں والے ٹرک کو دیکھا ہو اور چونک گئے ہوں۔ اس کے بعد انہیں آرا کوئے کی موجودگی کا پتا بھی چل گیا ہو۔

ہم پندرہ بیس منٹ کے اندر واپس نصیر کے مکان پر پہنچ گئے۔ جو ہوا تھا، بہت برا ہوا تھا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہم دوسری بار آرا کوئے کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد اسے حاصل نہیں کر سکے تھے۔ جگت سنگھ بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ثروت کو بڑے پیار سے ''چھوٹی'' کہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جاوا جیسے کنگ ڈان سے ''چھوٹی'' کی بحفاظت واپسی کے لئے آرا کوئے کا حصول ہمارے لئے کتنا ضروری تھا۔

بودھ ہوٹل سے واپسی کے وقت نصیر احمد اپنے ایک ساتھی کو موقعہ واردات پر چھوڑ آیا تھا تاکہ وہاں کی صورتِ حال کا تفصیلی پتا چل سکے۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی اس بندے کی کال نصیر کے فون پر آ گئی۔ اس کا نام توفیق احمد تھا۔

توفیق نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''نصیر بھائی! زخمی ہونے والا چوتھا بھکشو بھی قریبی اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ چار پانچ بندے زخمی بھی ہیں۔ یہاں بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کئی بڑی بڑی گاڑیاں موقع پر پہنچی ہیں۔ کئی سرکاری افسر اور عہدے دار بھی ہیں۔ کہاں جا رہا ہے کہ نہتے بھکشوؤں کو بیدردی سے قتل کرنے والے لوگ یہاں سے کوئی بہت قیمتی چیز چھین کر

لے گئے ہیں۔''

''مثلاً کیا؟''

''اس حوالے سے کوئی بات سامنے نہیں آ رہی۔ ہاں، کچھ لوگ یہ ضرور کہہ رہے ہیں کہ کل رات رتنا گری کی طرف ایک پرانے بودھ مندر میں بھی زوردار ہنگامہ ہوا ہے اور کچھ لوگوں کی ہتھیا ہوئی ہے۔''

عمران نے نصیر کے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔''توفیق احمد! اس حملے کے لئے کسی پر شک کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے؟''

''بالکل کیا جا رہا ہے جی۔'' توفیق احمد نے جواب دیا۔''دبے لفظوں میں جاوا گروپ کی بات کی جا رہی ہے۔ موقع پر موجود ایک دو لوگوں نے جاوا کے بندوں کو پہچانا ہے لیکن گواہی کے طور پر پولیس کے سامنے آنے کو کوئی تیار نہیں اور یقینی بات ہے کہ کوئی آئے گا بھی نہیں۔''

''جوابی فائرنگ اور دستی بم کے دھماکے کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ بھکشو نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی سردار تھا جس نے اپنا چہرہ نیلی پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا اور چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے ہوٹل میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس اسے بھی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کچھ لوگوں کو شک ہے کہ شاید یہ بندہ ابھی ہوٹل میں ہی چھپا ہوا ہے۔''

توفیق سے بات چیت ختم ہوئی تو میں اور عمران علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔''یہ تو سب کچھ چوپٹ ہو گیا عمران! اس سے تو اچھا تھا کہ یہ منحوس آرا کوئے گمشدہ ہی رہتا۔''

''جاوا کو کچھ نہ کچھ کریڈٹ تو ہمیں دینا ہی پڑے گا۔ ہم مورتی تک پہنچ گئے تھے اور مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ اگر ہم دس منٹ پہلے پہنچ جاتے تو مورتی ہمارے پاس ہوتی۔''

''کیا خیال ہے...... ہم کہیں گے اور وہ ہماری بات مان لے گا؟ ثروت کو ہمارے حوالے کر دے گا؟'' عمران خاموش رہا۔ میں نے کہا۔''جاوا جتنا بڑا شیطان ہے، وہ میں جانتا ہوں اور تم مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہو۔ اگر واقعی آرا کوئے اس کے پاس پہنچ چکا ہے تو اب وہ اپنی من مانی کے لئے آزاد ہے۔ وہ...... ثروت کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے عمران...... ثروت کے ذریعے وہ ہمیں بڑی سے بڑی مجبوری کے نیچے دبا سکتا ہے۔''

''ایسا نہیں ہو گا...... تم فکر نہ کرو۔'' عمران نے گھمبیر

سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا وہ بولا۔''آؤ میرے ساتھ۔''

ہم ایک بار پھر کلرڈ شیشوں والی نیلی اسٹیٹ کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کہیں بھی نہیں۔ بس گھر سے تھوڑی دور جا کر جاوا سے فون پر رابطہ کرنا ہے۔''

نصیر کے گھر سے دو ڈھائی کلومیٹر آگے آ کر عمران نے ایک جگہ کار روک لی۔ یہ دو بجے کا وقت تھا۔ عمران نے جاوا کے ذاتی فون پر رابطہ کیا...... لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ مایوس ہو کر عمران نے ان نمبروں کو ٹرائی کیا جو جاوا نے ہمیں لاجسٹک سہولتوں کے لئے دیئے تھے۔ ایک موبائل پر کال ریسیو ہو گئی۔''کون ہے؟'' کھردرے لہجے میں پوچھا گیا۔

عمران نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔''میں جاوا صاحب یا چوپڑا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

چند لمحے کے لئے دوسری طرف مائیک پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔ بولنے والا شاید کسی سے ہدایات طلب کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز اسپیکر پر ابھری۔''بھیا صاحب (جاوا) اس وقت شہر سے باہر ہیں...... چوپڑا صاحب بھی رابطے میں نہیں ہیں۔ بعد میں فون کر لو۔''

''لیکن......'' عمران کی بات پوری نہیں ہوئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عمران نے دوبارہ کال ملائی...... تینوں نمبروں پر سات آٹھ دفعہ کوشش کی مگر کہیں رابطہ نہیں ہوا۔

وہی ہو رہا تھا جس کا بدترین اندیشہ ہمارے ذہنوں میں موجود تھا۔ جاوا جیسے لوگ کسی کے دوست ہوتے ہیں اور نہ ان میں اخلاق مروت نام کی کوئی شے ہوتی ہے۔ ان کے ہر فیصلے اور اصول کے پیچھے زبردست قسم کے ذاتی اور گروہی مقاصد ہوتے ہیں۔ ثروت کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ کر جاوا نے ایک زبردست پوائنٹ اسکور کر لیا تھا۔ اب ثروت کو بحفاظت چھڑانے کے لئے ہمیں بھی ایک زبردست پوائنٹ اسکور کرنے کی ضرورت تھی اور وہ پوائنٹ یہ تھا کہ ہم آرا کوئے ڈھونڈ کر اسے جاوا کے حوالے کر دیتے۔ یہاں بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ آرا کوئے ایک غیر معمولی اتفاق کے تحت خود بخود جاوا کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب جاوا کے ساتھ ہمارا ''ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو'' والا معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب اس کی طرف سے زبردست قسم کی سردمہری سامنے آ رہی تھی۔

میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میں جانتا ہوں، یہ بہت بڑا ڈان ہے اور شاید یہ بھی سچ ہے کہ ہم یہاں ممبئی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے......لیکن اگر اس نے ثروت کے معاملے میں کوئی حرامزدگی دکھائی تو میں اس کے گلے لگ کر مر جاؤں گا۔ مجھے ثروت واپس چاہئے۔ بس......آج رات سے پہلے پہلے۔'' جذبات کی شدت سے میرا سارا وجود لرزنے لگا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''میرے جگر پارے! میں ہوں نا یہاں......سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ثروت کو چھوڑے گا......ضرور چھوڑے گا۔''

''پر کیسے؟''

''گھبراؤ نہ۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا۔''

ہم وہیں موجود رہے۔ عمران بار بار سیل فون کے ذریعے جاوا یا چوپڑا سے رابطے کی کوشش کرتا رہا۔ بات چیت دور کی بات تھی، کسی ذمے دار بندے سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ لوگ جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر رہے ہیں اور ان کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔

دو دن پہلے نصیر احمد نے مجھے بتایا تھا......جاوا کے ممبئی میں بے شمار ہاتھ ہیں اور شاید بہت سے سر بھی۔ اسے بے شمار ہاتھوں اور بہت سے سروں والی ایک ایسی بلا کہا جا سکتا ہے جس نے شہر کے بیشتر حصے کو جکڑ رکھا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔

ایک سنگین ترین اتفاق کے تحت میں اور عمران اس ''بلا'' کے رُوبرو آ گئے تھے اور میری وہ عزیز ترین ہستی داؤ پر لگ گئی تھی جس کے لئے میں ایک بار نہیں، کئی بار اپنی جان لٹا سکتا تھا۔ ثروت اپنی تمام تر دلکشی اور محبوبیت سمیت میرے تصور میں آ گئی۔ بے شک اس نے میرے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ بے شک وہ اپنے ازدواجی رشتے کے خاردار حصار کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی......لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں اسے زندہ سلامت اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اپنی جان پر ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتا تھا۔ محبت میں شرطیں نہیں ہوتیں۔ یہ نفع نقصان نہیں دیکھتی۔ یہ بس ہوتی ہے......یا نہیں ہوتی۔

جاوا سے رابطہ کرنے میں ناکام ہونے کے بعد ہم نے میڈم صفورا اور ثروت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ میڈم صفورا کا فون بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا سے فون کی سہولت واپس لے لی گئی ہے۔

عمران نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ......عالی جناب جاوا صاحب سے بنفسِ نفیس ملتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''کسی بھی اچھی سی جگہ پر یار! یہاں ممبئی میں درجنوں ''لو اسپاٹ'' ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جو ہمارا فون سننا بھی گوارا نہیں کر رہا، وہ ہمارے بلانے پر کسی جگہ چلا آئے گا۔''

''آئے گا جگر......سر کے بل آئے گا۔'' عمران کی آنکھوں میں تپش تھی۔

یہ اس کا وہی روپ تھا جو اسے اس کے کھلنڈرے روپ سے بالکل جدا کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے ہم دواری مندر سے نکلے تھے، مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ عمران مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ ہنگامے کے دوران میں جب ہمیں جگت سنگھ مقررہ جگہ پر نہیں ملا تھا تو عمران نے کہا تھا کہ وہ ابھی اسے دیکھ کر آتا ہے۔ واپسی میں اس نے تھوڑی سی تاخیر کر دی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال جواب کرتا، عمران نے موبائل فون پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے جاوا اور اس کے اہلکاروں کے نمبرز پر کوئی ایس ایم ایس کیا ہے۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''جاوا کو بلا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی پانچ دس منٹ کے اندر جاوا یا چوپڑا کا فون آ جائے گا۔''

''کوئی منتر شنتر پڑھا ہے؟''

''منتر ہی سمجھو۔ بس دعا کرو یہ منتر سیدھا پڑ جائے۔''

''تم ہر وقت سسپنس میں کیوں رکھتے ہو؟''

''ہم میڈیا والوں کا کام ہی یہی ہے جگر! یورپ میں تو میڈیا والے پیدائشی طور پر سسپنس اور تھرل کے رسیا ہوتے ہیں۔ پہلا شکار اپنی والدہ کو ہی بناتے ہیں۔ اس بے چاری کو پتا ہی نہیں چلتا کہ نومولود کو کب پیدا ہونا ہے۔ وہ تین تین بار اسپتال کے چکر لگاتی ہے۔ ڈاکٹروں کے اندازے بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ایک بار سسپنس کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے تو زندگی بھر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ ازدواجی حیثیت سسپنس......بیوی اور شوہر کی وفاداری سسپنس، سلسلۂ نسب سسپنس، یہاں تک کہ موت بھی سسپنس......اسپتالوں

میں نالیاں لگا لگا کر مہینوں تک مُردے کو زندہ رکھتے ہیں۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے......"

وہ اپنی زبان کو مسلسل حرکت دیتا چلا گیا۔ میں بری طرح چونکا جب میں نے دیکھا کہ عمران کے سیل فون پر کال موصول ہوئی۔ اسکرین پر ممبئی کے خطرناک ترین شخص کا نمبر چمک رہا تھا۔ یہ جاوا کا نمبر تھا۔ عمران کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ "ہیلو، کون؟ کیا عمران ہیرو بول رہا ہے؟"

"ہاں، میں ہی ہوں۔" عمران نے جواب دیا۔

"ابھی تمہارا ایک میسیج ملا ہے لیکن مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ یہ کیا ہے؟"

"جاوا صاحب! سمجھ آپ کو آ گئی ہے۔ اسی لئے آپ نے فون بھی کیا ہے۔ ورنہ آپ تو ہماری کال کا جواب ہی نہیں دے رہے تھے۔"

"تم...... کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ میں تو تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا...... کہ تم آرا کوئے کے بارے میں کوئی اچھی سماچار سناؤ گے۔"

"اچھی سماچار آپ جناب کو سنا تو دی ہے میں نے...... وہ آپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے آپ کے منحوس گرگوں نے بودھ ہوٹل میں چار بھکشو مارے ہیں اور آرا کوئے کو اُڑا کر آپ کی خدمت میں پہنچا دیا ہے۔ لیکن میں ایک بات آپ کو بتا دوں اور وہ آپ اپنی سمجھ دانی میں بڑی اچھی طرح بٹھا لیں۔ بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ بات وہی ہے جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ آپ کے پاس کافی کاریگر بندے ہوں گے۔ خود آپ کا کھوپڑا بھی کافی بڑا ہے۔ آپ اچھی طرح تصدیق کر لیں...... یا کسی کاریگر سے کروا لیں۔ اس کے بعد مجھے فون کریں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو...... سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور...... تم اس سمے ہو کس جگہ؟"

"اس چکر میں نہ پڑیں جاوا جی۔ آپ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ فی الحال ہمارا رابطہ بس فون کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور فون کی لوکیشن ڈھونڈنا بھی بالکل بیکار ہو گا۔ میں اگلی کال کا انتظار کر رہا ہوں...... گڈ بائے۔"

عمران نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیا پلٹی ماری تھی کہ جاوا جو ہمیں یکسر نظر انداز کر رہا تھا، چند منٹ کے اندر اندر فون کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں وہ پھر کال کرے گا۔

عمران نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ "اب کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔

"فی الحال تو کہیں نہیں جانا۔ بس اپنی جگہ ہی تبدیل کرنی ہے۔" اس نے کہا۔ اس نے جبڑے بھینچ رکھے تھے اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر گہری سنجیدگی تیر رہی تھی۔ بے حد گہری اور سرد۔

ہم نے ساؤتھ ممبئی کا ایک طویل چکر کاٹا اور قریباً پانچ چھ کلومیٹر دور ایک بلند و بالا سینما کی وسیع پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی۔ اس دوران میں ہم نے اپنے تعاقب کا بھی خاص خیال رکھا تھا۔ "ناریل پانی پیو گے؟" عمران نے پوچھا۔

"یار! مجھے بھی کچھ بتاؤ۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟" میں نے اس کی آفر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہی جو جاوا جیسے بندے کے ساتھ ہونا چاہئے۔" اس نے نشست کو اسٹریچ کیا اور ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا لی۔

"تمہارا خیال ہے، وہ دوبارہ فون کرے گا؟"

"اس کا باپ بھی کرے گا اور سو بار بھی کرنا پڑا تو کرے گا۔"

"لیکن کیوں؟ تم نے کوئی دھمکی دی ہے اسے؟"

"ممبئی کے اس خونی سانڈ کو دھمکی کون دے سکتا ہے۔ بس ایک حقیقت بتائی ہے اسے۔"

"حقیقت کیا ہے؟"

"ضرور پوچھنی ہے؟" اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"اگر بتانے میں تمہارا کوئی بڑا نقصان ہو جائے گا تو نہ بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"ناراض ہو گئے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرایا پھر سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑ کر بولا۔ "انڈیا کی اس فلم نگری کے اندر بڑی فلمی سے صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس آرا کوئے نے سب کو گھما کر رکھ دیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کل رات دواری کے مندر میں بڑی "ٹینشن" تھی۔ تمہیں پتا ہی ہے، وہاں دو گروپ تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جو ڈاکٹر مہناز کی جان لے کر "حفاظت کی رسم" ادا کرنا چاہتے تھے...... دوسرا گروپ اصل بھکشوؤں کا تھا۔ وہ دھرم کے نام پر اس خون ریزی کو سخت گناہ سمجھ رہے تھے

اور چاہتے تھے کہ آرا کوئے کی ''حفاظت کی رسم'' کسی کی جان لئے بغیر ادا کی جائے۔ جنوبی گروپ جانتا تھا کہ رسم کے وقت کوئی بھی غیر متوقع صورتِ حال پیش آجائے گی۔ انہیں کچھ پکی اطلاعات بھی مل چکی تھیں۔ انہوں نے اس کا توڑ کیا......''

''کیسا توڑ؟''

''تم خود سوچو۔ انہوں نے کیا کیا ہوگا؟ آرا کوئے ان کے لئے بہت قیمتی ہے۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ عمران۔'' اس کی باتوں سے میں زچ ہو چکا تھا۔

عمران نے ایک گہرا کش لیا اور نتھنوں سے دھواں چھوڑ کر بولا۔ ''کل رات رسم کے وقت چبوترے پر اصل مورتی نہیں تھی۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں جگر! وہ اصل کی ہوبہو نقل تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بھکشو جو مورتی لے کر بھاگے اور جو کچھ دیر پہلے جاوا کے پاس پہنچی ہے، وہ اصل نہیں ہے۔'' عمران نے بڑے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ''تو اصل کہاں ہے؟''

''اصل آرا کوئے مہا پجاری کے پاس تھی اور مہا پجاری ان بیس گروؤں میں سے ہی کوئی ایک تھا۔''

''تمہیں اس کا پتا ہے؟''

''تم سب کچھ آج ہی پوچھنے کا ارادہ رکھتے ہو...... کیا کل کا دن نہیں چڑھے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ آج کا دن بہت زیادہ اہم ہے۔'' میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر مسکرایا اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''جگر پارے! یہ بڑا زبردست اتفاق ہے کہ کل رات ہم نے جس گرو وستھا کے کان کاٹے، اصل میں وہی مہا پجاری یعنی بڑا گرو تھا۔ مجھے اس بات کا پتا اس وقت چلا جب وستھا نے ہمارے مجبور کرنے پر تحریر لکھی اور پھر اس پر اپنی گول مہر لگائی۔ اس نے یہ مہر اپنی دیوہیکل الماری کی دراز سے نکالی تھی۔ اس دراز میں ایک اور مہر پڑی ہوئی تھی۔ میری نظر اس مہر پر پڑ گئی۔ یہ مہا پجاری کی مہر تھی۔''

میں سوچنے لگا۔ اگر عمران کے بیان کے مطابق مہا پجاری گرو وستھا ہی تھا تو پھر یقینی بات تھی کہ اصل مورتی بھی گرو وستھا کے پاس ہی ہوگی۔ مجھے پھر یاد آیا کہ ہنگامے کے وقت جب ہم دواری مندر سے نکل رہے تھے تو عمران مجھے اور مہناز کو چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے گرو

وستھا کے کمرے کی طرف لپک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جگت سنگھ کو دیکھنے جا رہا ہے۔ کہیں وہ مورتی کے لئے تو نہیں گیا تھا؟ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ بات ایسی ہی تھی...... وہ آرا کوئے کے لئے گیا تھا۔

میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! اصل آرا کوئے تمہارے پاس ہے نا؟''

مجھے حیرت ہوئی جب عمران نے فوراً اقرار کرلیا۔ شاید وہ مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ ''تابی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج کا دن بڑا اہم ہے ہمارے لئے...... اور جاوا کے لئے بھی۔ آرا کوئے ہمارے پاس ہے اور ثروت جاوا کے پاس۔ آرا کوئے کے ساتھ ثروت کا تبادلہ ہوگا اور یہ سب کچھ ہمیں بہت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ جاوا جیسا زہریلا سانپ کسی بھی وقت ڈنک مار سکتا ہے۔''

''کہاں ہے آرا کوئے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''اس پشتی بیگ میں جس میں، مَیں، اسے دواری مندر سے لے کر آیا ہوں۔'' عمران نے انکشاف کیا۔

عمران کا پشتی بیگ اس وقت نصیر احمد کے گھر پڑا تھا۔ عمران نے اسے تالے میں رکھا تھا۔ مجھ سمیت کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس عام سے ریگزین کے تھیلے میں وہ نادر ''پیس آف آرٹ'' موجود ہے جس نے ایک خلقت کو دیوانہ کر رکھا ہے۔ جس کی تلاش میں کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہیں...... بہترین دماغ استعمال ہوئے ہیں اور قتل و غارت سمیت ہر طرح کی قانون شکنی کی گئی ہے۔ وہ دو فٹ لمبا دھات کا قدیم مجسمہ اس وقت نصیر احمد کے گھر میں موجود تھا۔

گھڑی کی سوئیاں اب سہ پہر چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا جاوا کو پتا چل جائے گا کہ اس کے پاس نقلی آرا کوئے ہے؟''

''کیوں نہیں چلے گا...... وہ ممبئی کے تین چار کھوچل ترین بدمعاشوں میں سے ایک ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس ہر صورتِ حال سے نمٹنے والے ''کاریگر'' بندے موجود ہوتے ہیں۔ تم دیکھنا، دس پندرہ منٹ کے اندر اس کا فون آئے گا۔''

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ رسم کے موقع پر نقلی آرا کوئے رکھا جائے گا اور اصلی کہاں ہے؟ اس کا پتا کیسے چلا تمہیں؟''

''جس بھکشو کو ہم نے بالکل شروع میں آبدوز سرنگ سے نکلتے ہی پکڑا تھا، وہ گرو وستھا کا

خاص الخاص آدمی نکلا۔ وہ پتھر کے کلیجے والا ہے۔ اس نے ہمیں کچھ بتا کر نہیں دینا تھا لیکن جب میں نے اسے چکما دیا کہ مہا پجاری کے بارے میں ہم سب کچھ جان چکے ہیں اور مہا پجاری یعنی گرو وستھا نے ہمیں از خود بہت سی باتیں بتا دی ہیں تو وہ چکر میں آ گیا۔ ویسے بھی اندرونی چوٹوں کی وجہ سے اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں بہت سی باتیں بتا دیں۔''

عمران نے مجھے اس بارے میں تفصیل بتائی۔ اندازہ ہوا کہ وہ اس بارے میں کافی حد تک سچ بیانی کر رہا ہے۔ عمران کا پندرہ منٹ والا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ آٹھ دس منٹ بعد ہی اس کے فون کی بیل ہوگئی۔ یہ جاوا ہی تھا۔ اس کی گھمبیر آواز فون کے ننھے منے اسپیکر پر ابھری...... ''میں جاوا بول رہا ہوں۔''

''آپ کے علاوہ اور کون بول سکتا ہے اس وقت۔'' عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''مجھے ابھی ابھی جانکاری ملی ہے کہ میرے بندے کسی بودھ ہوٹل سے ایک مجسمہ لے کر آئے ہیں۔ وہ اسے آرا کوئے سمجھ رہے ہیں لیکن وہ نقلی ہے۔ تم نے جو اطلاع دی، وہ درست تھی۔''

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ بہت بڑے لعنتی ہو جاوا۔ آپ کو ابھی ابھی جانکاری نہیں ملی۔ اصلی نقلی کی بات تو اب معلوم ہوئی ہے لیکن باقی آپ کو سب کچھ بہت پہلے سے معلوم تھا اور بودھ ہوٹل میں بھی سب کچھ آپ کے حکم سے ہی ہوا۔ نقلی آرا کوئے کو بغل میں دبا کر آپ پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ میری کالیں سن کر بھی نہیں سن رہے تھے۔''

''تم منہ سنبھال کر بات کرو ہیرو۔ مجھ سے اس طرح بات کرنے والے موت کی بھیک مانگا کرتے ہیں۔ پورا ممبئی جانتا ہے ایسے بدقسمت بھکاریوں کو۔''

''آپ جناب نے اپنی عزت کو اپنے ہاتھوں سے غارت کیا ہے۔ آپ پرلے درجے کے کمینے ہیں جاوا صاحب! آپ نے سوچا کہ آرا کوئے اب آپ کے ہاتھ آ گیا ہے۔ لہٰذا آپ نے ہمارے منہ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کیا۔ آپ نے اپنے کمینے لونڈوں کو بھی ہدایت فرما دی کہ کوئی ہم سے رابطہ کرے اور نہ ہماری کال اٹھائی جائے۔ پیشہ کرنے والیوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ مجھے تو آپ اس سے بھی گئے گزرے لگے ہو۔''

''بکواس نہیں۔'' جاوا اتنے زور سے چلایا کہ لگا، فون کے اسپیکر میں سے باہر نکل پڑے گا۔ اس نے عمران پر غلیظ گالیوں اور بدترین دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر میں وہ دہاڑا۔

''میں دیکھ لیتا ہوں تجھے۔ کتے! میں دیکھ لیتا ہوں۔ تیرے لئے آج قیامت نہ لے آؤں تو سمجھ لینا جاوا اپنے باپ کا نہیں تھا...... نہیں تھا باپ کا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

اس شخص کے غصے سے ممبئی پناہ مانگتا تھا۔ اس کی دھمکی کو فرشتۂ اجل کی دھمکی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دھمکی پتھر کو پگھلاتی تھی اور لوہے کو پانی کرتی تھی۔ شوبز کے بڑے بڑے جن اور سلور اسکرین کی کسی کو خاطر میں نہ لانے والی پریاں...... جاوا کے ایک بلاوے پر سر کے بل دوڑے چلے آتے تھے۔ وہ غضب کا دیوتا تھا۔ عمران نے جان بوجھ کر اس کے غضب کو زبردست اچھال دیا تھا اور ایسا کرنے کے باوجود عمران کے چہرے پر اطمینان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سجا کر بولا۔

''پریشانی کی بات نہیں جگر! یہ ابھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ موٹی سوئی والا ٹیکا لگا ہے نا اس لئے ''اوئی اوئی'' کر رہا ہے۔''

میں حیرت سے عمران کی صورت دیکھ رہا تھا۔

بمشکل آٹھ دس منٹ بعد پھر فون آ گیا۔ جاوا کا نمبر ہی تھا لیکن جاوا خود نہیں بول رہا تھا۔ اسپیکر پر جاوا کے قریبی ساتھی پریم چوپڑا کی منحوس آواز ابھری۔ اس بندے کی شکل تو مشہور فلمی ولن سے ملتی ہی تھی، اس نے اپنی آواز کو بھی مشہور ولن کی آواز کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ پریم چوپڑا نے نہایت گھمبیر لہجے میں عمران کو بتایا کہ عمران نے اپنی غیر محتاط گفتگو سے جاوا صاحب کو سخت برہم کر دیا ہے اور ایسا کر کے اس نے اپنی مشکلات میں جو اضافہ کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔

عمران نے کہا۔ ''بس کیا یہی خوش خبری سنانے کے لئے تم نے فون کیا ہے؟''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی تب چوپڑا بھاری آواز میں بولا۔ ''اس معاملے کا حل اگر لڑائی نکالو گے تو اتنا خون خرابا ہوگا کہ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر لو۔''

''اب بیٹھ کر نہیں، کھڑے ہو کر بات ہوگی اور درمیان میں کافی ساری رائفلیں بھی ہوں گی۔ تمہارے مالک نے اپنا ظرف دکھا دیا ہے۔ اب دوسری بار اس کم ظرف سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ اور اگر اس کی طرف سے کوشش ہوئی تو واقعی بڑا خون خرابا ہوگا...... انڈیا کی بڑی سے بڑی ایکشن فلم بھی اس خون خرابے کے سامنے مکی ماؤس کا کارٹون نظر آئے گی۔''

"کس طرح کی گارنٹی چاہتے ہو؟" چوپڑا نے پوچھا۔

"اب کوئی گارنٹی نہیں چلے گی۔ صرف کھلا میدان ہوگا اور اسلحے کی گارنٹی ہوگی۔ لیکن یہ تمہارا ملک ہے...... تمہارا شہر ہے...... ہمیں یہاں سے حفاظت کے ساتھ واپس نکلنے کے لئے ایک گارنٹی ضرور چاہئے ہوگی۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک یرغمالی...... لیکن تم کرائے کے ٹٹو ہو۔ میں تم سے تفصیلی بات کر کے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے "باپ" سے کہو، اگر وہ کوئی ڈیل چاہتا ہے تو خود بات کرے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

عمران نے فون بند کر دیا۔

وہ جاوا اور چوپڑا سے جس طرح کا رویہ روا رکھے ہوئے تھا، وہ مجھے اندر سے لرزا رہا تھا۔ مجھے ہر گھڑی یہی دھڑکا تھا کہ کہیں جاوا مشتعل ہو کر ثروت کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ کوئی ایسی بات ہو جاتی تو میرے زندہ رہنے کا ہر جواز ختم ہو جاتا لیکن عمران بالکل اطمینان سے تھا۔ اسے یقین تھا کہ ثروت کو کچھ نہیں ہوگا۔ جاوا اس کا بال بھی بیکا نہیں کرے گا۔ وہ مجھے بھی پورے اعتماد سے یہ تسلی دے رہا تھا کہ ثروت، جاوا کے پاس بالکل محفوظ ہے۔

میں نے کہا۔ "تم کسی یرغمالی کی بات کر رہے تھے۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"بس ہے ایک چکر۔ وقت آنے پر بتا دوں گا۔" اس نے کہا اور کسی کا بھیجا ہوا ایس ایم ایس پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ جاوا کے فون کے انتظار میں گزرنے والا ہر پل ایک صدی کی طرح تھا۔ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ثروت اور صفورا ہیں کہاں؟ ہم نے انہیں فرید کوٹ میں چھوڑا تھا اور اب ہم ممبئی میں تھے۔ آٹھ دس منٹ مزید گزر گئے تو میں نے عمران سے کہا۔ "یار! کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ تم خود فون کر لو۔"

"وہی کتا کرے گا...... یہ اعصاب کی لڑائی ہے۔ دل مضبوط رکھو۔" ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جاوا کی کال تھی۔ عمران نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اعصابی تناؤ سے بچانا چاہتا تھا۔ میری بے چینی اس پر بھی اثر انداز ہوتی تھی اور وہ اطمینان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔

جاوا اور عمران کے درمیان قریباً بیس منٹ تک دھواں دھار گفتگو ہوئی۔ گفتگو کی سنگینی عمران کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ پارکنگ کے ایک خالی گوشے میں املی کے درخت سے

ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آخر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کچھ باتیں طے ہو گئی ہیں۔ کچھ دیر بعد عمران فون بند کر کے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں جارحانہ چمک تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

عمران نے رسٹ واچ دیکھی۔ "رات گیارہ بجے۔"

"کیا، رات گیارہ بجے؟"

"ثروت اور آرا کوئے کا ایکسچینج ہوگا۔ ثروت اور صفورا یہاں ممبئی میں پہنچ چکی ہیں۔ اب یہ ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو والا معاملہ ہے۔ ہرادیوی ساحل کے پاس کوئی کالی جھاڑ جگہ ہے۔ جاوا اپنے بندوں کے ساتھ آئے گا۔ ہم بھی اپنے بندوں کے ساتھ جائیں گے۔"

"کتنے بندے ہوں گے؟"

"چار چار گاڑیاں ہوں گی۔ سمجھو بیس بائیس بندے ہمارے...... بیس بائیس ان کے۔"

"اور اگر کچھ ہو گیا تو؟ جو ایسے موقعوں پر ہو جاتا ہے۔"

"یار تابی! اس طرح کیوں سوچ رہا ہے؟ تُو بزدل تو نہیں ہے۔ میں چنگی طرح جانتا ہوں، پھر یہ سب باتیں؟"

"یار! مجھے اس نے بزدل بنا دیا ہے۔ وہ بیچ میں نہ ہوتی تو میں تم سے دو قدم آگے نظر آتا۔ تم نے مجھے موت کے آگے بھاگنے کے بجائے موت کے پیچھے بھاگنا سکھا دیا ہے اور موت سے ڈرنا بھی۔ مر تو شاید میں اسی دن جاتا...... جب پانچ سال پہلے مجھے سیٹھ سراج نے لاچار کیا تھا اور میں نے خودکشی کرنا چاہی تھی۔ اب یہ ساری زندگی تو بونس کی طرح ہی لگتی ہے عمران۔ مجھے صرف ثروت کا خیال آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں...... وہ...... کسی بھی طرح حالت سے واپس پاکستان پہنچ جائے۔ اپنی بہن کے پاس، اپنے شوہر کے پاس...... وہ زندہ رہے...... اور خوش رہے۔"

"وہ زندہ رہے گی...... خوش رہے گی...... اور رہے گی بھی تمہارے ساتھ۔" تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو تو میرا دل چاہتا ہے تمہارا تھوبڑا توڑ دوں یا کوئی وزنی شے مار کر اپنا سر ٹکڑے کر لوں...... خدا کے لئے...... یار خدا کے لئے...... وہ کمزور عورت ہے۔ دنیا سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ یہ ہمت اسے تم نے ہی دینی ہے، تمہاری محبت نے ہی دینی ہے۔ جتنی ہمت دکھاؤ گے، اتنا صلہ پاؤ گے۔ وہ کیا کہہ گئے ہیں مولانا سر سیّد۔ "عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی......"

اس نے حسبِ عادت جان بوجھ کر اقبال کے شعر کو...... سرسیّد سے جوڑ دیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے جھپٹ کر میرا منہ ہاتھ سے بند کر دیا۔ ''بس اب چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لئے...... تمہیں پیر احمد تھانوی صاحب کا واسطہ۔ نہیں تو میں ریوالور کا کھیل شروع کر دوں گا۔ سارے خانوں میں گولی رکھ کر خود پر ٹریگر دبا دوں گا۔ ہنڈرڈ پرسنٹ ڈیتھ۔''

اسی دوران میں اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ ایک بار پھر گہری سنجیدگی نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رتنا گری والا ششیکھر تھا۔ لیکن اب وہ ممبئی سے بول رہا تھا۔ ''ہمارے لئے کیا آرڈر ہے جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''آرڈر بہت تگڑا ہے۔ اپنے بندوں کو تیار کر دو۔ پورب وغیرہ کو بھی خبر کرو۔ رات گیارہ بجے جاوا کے ساتھ ڈیل فائنل ہو رہی ہے۔ ''ہرا دیوی'' بیچ پر کالی جھاڑ نامی جگہ کا طے ہوا ہے۔ ہمیں بھی پاور سے جانا ہوگا۔ پچیس کے قریب بندے ہونے چاہئیں۔ دس میرے پاس ہیں۔ چودہ پندرہ تم نے کرنے ہیں لیکن ایک بھی کچا بندہ نہیں ہونا چاہئے، میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب! پورے پکے بندے ہیں، چنے ہوئے شوٹرز۔ آپ تقریباً سب کو جانتے ہیں۔ ایک انچ پیچھے ہٹنے والے نا ہیں...... بلکہ اگر آپ چاہیں تو زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔''

''نہیں، زیادہ نہیں۔ بس چوبیس پچیس کافی ہیں۔ گاڑیاں اور اسلحہ بھی بالکل فٹ ہونا چاہئے۔ کسی ہیلپ کی ضرورت ہو تو نصیر سے رابطہ کرو۔''

''دو گھنٹے کے اندر سب تیار ہو گا جی۔ اگر آپ کہیں تو کچھ بندوں کو اسٹینڈ بائی بھی رکھ لوں۔''

''ضرورت تو نہیں پڑے گی قربان علی۔ لیکن اگر چاہتے ہو تو رکھ لو۔''

عمران نے فون بند کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یہ آواز تو ششیکھر کی تھی اور تم اسے قربان علی کہہ رہے تھے؟''

''قربان علی کہہ رہا تھا؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''شاید پریشانی میں پتا ہی نہیں چلا۔''

''عمران! تم سیدھی بات کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی تمہارا ہرکارہ ہے اور ششیکھر کے روپ میں کوئی قربان علی ہے۔''

''ہرکارہ کا لفظ تم غلط استعمال کر رہے ہو۔ تم اسے دوست کہہ سکتے ہو۔''

''نہیں عمران! تم بہت کچھ چھپاتے ہو مجھ سے...... دوسری طرف اپنا سب سے قریبی

دوست بھی کہتے ہو۔ قریبی دوستیاں اس طرح پردے رکھنے سے آگے نہیں چلتیں۔ کبھی کبھی میں اپنے آپ کو تمہارے لئے بالکل غیر سمجھنے لگتا ہوں۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ یہ کون لوگ ہیں جو تمہارے لئے کام کرتے ہیں؟ یہ خاص طور پر انڈیا میں تمہارے اردگرد موجود ہیں۔ سلطان چٹا اور ندیم جیسے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم وہ نہیں ہو جو اوپر سے نظر آتے ہو۔''

عمران نے ایک گہری سانس لی اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''یہی کہ یہ سب تمہارے حکم مانتے ہیں اور سر دھڑ کی بازی بھی لگاتے ہیں؟''

''تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے؟'' عمران نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ گہرے پانیوں کی طرح خاموش تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا یہ کوئی آرگنائزیشن ہے؟''

عمران نے اپنی نیم سرخ آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر بولا۔ ''تم نوے فیصد درست نتیجے پر پہنچے ہو۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی تسلیم کر لے گا۔

''کس طرح کی آرگنائزیشن؟ سرکاری یا پرائیویٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''پرائیویٹ۔''

''کیا کام کرتی ہے؟''

''وہی جواب کر رہی ہے۔ وہی جو دو سال پہلے بھانڈیل میں کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''دوسرے ملکوں، خاص طور سے انڈیا میں پھنسے ہوئے بے گناہ پاکستانیوں کو حبس بے جا اور قید و بند سے نجات دلانا۔ قانونی طریقے سے یا پھر کسی بھی طریقے سے۔''

عمران بے حد سنجیدہ تھا۔ میں اس کا یہ موڈ پہچانتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اس وقت وہ جو کہہ رہا ہے، درست کہہ رہا ہے۔ میں بہت پیچھے تک سوچنے لگا۔ عمران مجھے آج بتا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں بہت پہلے سے مجھے لگتا تھا کہ عمران کسی خاص نظم کے ساتھ کام کرتا ہے اور کچھ خاص لوگوں کے ساتھ اس کی ورکنگ ریلیشن شپ موجود ہے۔ چند ماہ پہلے بھانڈیل سے نکلنے کے بعد جب ہم الٰہ آباد پہنچے تھے تو وہاں بھی کچھ مقامی لوگوں سے عمران کا واسطہ پڑا تھا۔ دیگر لوگوں کے علاوہ یہ پتا بھی چلا تھا کہ عمران اپنی سرکس کمپنی کے ساتھ انڈیا آیا تھا جہاں وہ ایک بڑے جھگڑے میں ملوث ہو گیا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اپنے سرکس والے کا... کو بھی

خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ میرے اور عمران کے درمیان اس موضوع پر چند منٹ گفتگو ہوئی۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ ''اس کا مطلب ہے عمران، جب تم مجھے ڈھونڈتے ہوئے بھانڈیل اسٹیٹ پہنچے تو وہ بھی صرف میری دوستی کے لئے نہیں تھا بلکہ تمہارے کام کا ایک حصہ تھا۔ تمہیں میرے علاوہ میڈم صفورا اور ابرار وغیرہ کو بھی ڈھونڈنا تھا اور آج تم سویٹی عرف ایشوریا اور دوسری لڑکیوں کو واپس پاکستان لے جانے کے لئے میرے ساتھ ہو۔''

اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مدہم مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ ''جگر! جب کام کے ساتھ محبت بھی شامل ہو جائے تو ہر چوٹی سر ہو جاتی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں تمہاری محبت پہلے تھی، کام اس کے بعد تھا۔''

''اور اب؟''

''اب بھی تمہاری محبت اور دوستی پہلے ہے، کام بعد میں۔ اگر تمہارے اور ثروت کے ساتھ ساتھ میں سویٹی، فاخرہ، مہناز وغیرہ کو بھی پاکستان واپس لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو یہ میرے لئے بونس ہوگا۔''

''جیلانی، اقبال، امتیاز اور صفورا وغیرہ بھی سب جانتے ہیں؟''

''صرف جیلانی، اقبال اور امتیاز...... ہم بہت عرصے سے اکٹھے کام کر رہے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں۔''

''یہ آرگنائزیشن یا جو کچھ بھی یہ ہے، تم چلاتے ہو؟''

''نہیں یار! میں تو بس اس کا ایک حصہ ہوں۔ یہ ایک بڑا ادارہ ہے۔''

''کون چلا رہا ہے؟''

''سمجھو اوپر والا ہی چلا رہا ہے۔ تم سمجھ ہی گئے ہو گے، یہ کتنا خطرناک کام ہے۔''

''تم بات پھر گول کر رہے ہو۔''

''تم سے کچھ بھی چھپانا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔''

''لیکن تم چھپا رہے ہو عمران۔ اب تو کسی وقت مجھے یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ تم نے مجھے اپنی جوانی اور لڑکپن کی جو رُوداد سنا رکھی ہے، شاید اس میں بھی کچھ ہیر پھیر ہو۔''

''نہیں تابش۔'' عمران نے بڑی متانت سے کہا۔ ''وہ سب کچھ سچ ہے۔ تمہارے سر کی قسم۔'' اس نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''اس رُوداد میں کچھ بھی جھوٹ نہیں۔ ہاں

صرف...... صرف ایک بات ایسی ہے جس کی میں نے تم سے پوری وضاحت نہیں کی۔ اس کا تعلق والدہ سے ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بھانڈیل اسٹیٹ سے آنے کے بعد تم نے کئی بار مجھ سے پوچھا ہے کہ میں والدہ کو ڈھونڈ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے کہا ہے، ہاں میں کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے تابی کہ میں نے والدہ کو ڈھونڈنا ترک کر دیا ہے۔ قریباً تین سال پہلے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر بھی اس بات کو اپنی زبان سے کہنے کی ہمت مجھے کبھی نہیں ہوئی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیا تمہیں کچھ پتا چلا تھا؟''

اس نے آنکھیں بند کئے کئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انڈیا سے رہا ہو کر آنے والے ایک پاکستانی کاشت کار کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اس نے میری والدہ کو چندی گڑھ کی زنانہ جیل میں دیکھا تھا۔ والدہ نے اسے میرا ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کسی طرح مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس شریف بندے نے اپنا وعدہ نبھایا اور کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ لیا۔ اس کی زبانی پتا چلا کہ بیمار والدہ کو میری تلاش نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں کہاں ماری ماری پھرا کرتی تھیں۔ کسی ایسی ہی کیفیت میں وہ سرحدی علاقے کی طرف چلی گئیں اور وہاں بی ایس ایف والوں نے انہیں پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے بدنصیب لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ مہینوں اور سالوں تک بغیر کسی مقدمے کے جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ کاشت کار عباس علی نے انہیں چندی گڑھ جیل میں دیکھا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ انہیں چند ہفتوں بعد امرتسر جیل منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان دنوں تک سرکس میں میری اچھی جگہ بن چکی تھی۔ مالک جان محمد صاحب نے میرا ویزا لگوایا اور میں انڈیا پہنچ گیا۔ میں نے امرتسر اور چندی گڑھ وغیرہ میں ایک مہینہ زبردست خجل خرابی جھیلی لیکن والدہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جیل والوں کے پاس بھی کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کا رویہ سخت حوصلہ شکنی کا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک سرحد پار سے آنے والا ہر شخص دہشت گرد یا خطرناک جاسوس ٹھہرتا ہے۔

''اگلے ایک برس میں، مَیں نے قریباً چھ دفعہ انڈیا کا سفر کیا۔ جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ مجھے انڈیا کی سیکیورٹی ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا اصل چہرہ دیکھنے کو ملا۔ مجھے اس اندرونی نفرت اور عداوت کا اندازہ ہوا جو یہ لوگ مصیبت زدہ غیر ملکیوں اور خصوصاً

پاکستانیوں سے رکھتے ہیں۔ اپنی والدہ کا سراغ لگاتے لگاتے میں راجستھان میں بیکانیر کی ایک دور دراز جیل میں پہنچا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے سے چار پانچ دن پہلے ہی وہاں ایک بڑا سانحہ رُونما ہو چکا تھا۔ جیل کے زنانہ حصے میں ایک بڑی آگ لگی تھی جس میں چالیس پچاس قیدی عورتیں اور زنانہ عملے کی بہت سی ارکان جل کر خاکستر ہو گئی تھیں۔''

عمران کی آنکھوں میں، مَیں نے پہلی بار نمی دیکھی۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندیں تو دو بوندیں اس کے ابھرے ہوئے رخساروں پر لڑھک گئیں۔

''میری ماں مر چکی ہے تابی! لیکن وہ اَن گنت لوگ ابھی زندہ ہیں جو بدقسمتی سے بھارتی جیلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ غلطی سے سرحد پار کر جانے والے چرواہے، ماہی گیر، سیاحت کے لئے جانے والے اور غائب ہو جانے والے بے گناہ...... اور اس قسم کے اور بہت سے لوگ۔ چند سال پہلے ہی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے لئے کام کروں گا۔ ان کا کھوج لگاؤں گا، ان کے پیاروں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ والدہ کی تلاش کے دوران میں کچھ لوگوں کے لئے میرے اندر بڑی نفرت نے جنم لیا تھا۔ اس کا نتیجہ انڈین سرکار کے تین چار اہلکاروں کی موت کی صورت میں نکلا۔ انڈین پولیس میرے پیچھے پڑ گئی۔ اسی دوران میں مجھے ایک پرائیویٹ تنظیم کا پتا چلا۔ اسے ایک سابق پاکستانی فوجی افسر چلا رہا تھا۔ اس تنظیم کے مقاصد وہی تھے جو میرے دل و دماغ میں بھی جگہ بنا چکے تھے۔ میں اس میں شامل ہو گیا۔ اب میں اس کا ایک حصہ ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اس بارے میں مجھ سے مزید سوالات نہیں کرو گے۔ پلیز! میری مجبوری سمجھنا۔ میں نے کچھ چیزوں کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔''

میں حیران تھا۔ عمران کی زندگی کا یہ پہلو اب تک میری نظر سے بالکل اوجھل رہا تھا۔ اس بات کا علم تو مجھے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلتے ہی ہو گیا تھا کہ عمران کا انڈیا میں آنا جانا ہے اور یہاں اس کے دوست اور دشمن موجود ہیں۔ سجاد موہل جیسے خوں خوار پولیس آفیسر نے ہمیں گرفتار کیا تھا اور پھر مجھے پتا چلا تھا کہ اس گرفتاری کی وجہ منوج نامی ایک آوارہ شخص ہے جو کچھ عرصہ پہلے عمران کی فائرنگ سے شدید زخمی اور پھر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس طرح کے کئی معاملات عمران کے ساتھ منسلک تھے۔

اس سے پہلے کہ سینما کی پارکنگ میں ہماری گفتگو مزید آگے بڑھتی، ایک طرف سے ایک سانولا سا بندہ نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک پرچی عمران کی گود میں پھینک دی۔ انگلش میں ایک دو جملے لکھے تھے۔ عمران نے پرچی پر نظر دوڑائی اور

سگریٹ بجھا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''کیا بات ہے؟''

''خطرہ ہے، ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' اس نے کہا۔

وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا مین روڈ پر آیا۔ گاہے بگاہے اس کی نگاہیں عقب نما آئینے میں بھی اٹھ رہی تھیں۔ بہرطور خیریت گزری۔ ہم دس پندرہ منٹ کے اندر نصیر احمد کے گھر تک پہنچ گئے۔ راستے میں عمران نے کوئی بات کی اور نہ میں نے کچھ پوچھا۔ پتا نہیں وہ ایک دم سے کچھ غیر سا لگنے لگا تھا۔

یوں تو میری اور عمران کی پہلی ملاقات کو پانچ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن حقیقت میں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ مجھے تقریباً چار سال بھانڈیل اسٹیٹ میں کاٹنا پڑے تھے۔ بھانڈیل میں کچھ عرصہ عمران بھی میرے ساتھ رہا تھا لیکن وہاں اس کا یہ پُراسرار روپ میرے سامنے نہیں آ سکا تھا۔ اب ہم جب سے انڈیا آئے تھے، میں اس کے حوالے سے مسلسل الجھن کا شکار تھا۔ وہ کئی رفاعی کام کرتا تھا لیکن آج مجھے اس کے خاص الخاص رفاعی کام کا پتا چلا تھا۔

رات ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ پچھلے چھتیس گھنٹے میں واقعات بڑی تیزی سے رُونما ہوئے تھے۔ ہم، موہن بجلی کی مدد سے دواری مندر میں آرا کوئے تک پہنچے۔ ہم نے اسے کھویا۔ ہم مہناز کو بچا کر ممبئی لائے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ آرا کوئے جاوا گروپ کے پاس پہنچ چکا ہے اور اب تازہ ترین و حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ آرا کوئے عمران کے پاس ہے اور ہم آج رات گیارہ بجے ثروت اور صفورا سے آرا کوئے کا تبادلہ کر رہے ہیں۔

اس حوالے سے عمران کسی ضامن یعنی یرغمالی کا ذکر بھی کر رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ جاوا جیسا ڈان اس کی بات مانے گا اور ثروت، صفورا کے علاوہ یہ ضامن بھی اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ لیکن کیا؟ میں ابھی پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔

میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ عمران نے اپنی والدہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ان سے بس غائبانہ تعارف تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنا بچھڑ گیا ہے۔ کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لئے...... پھر ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ڈاکٹر رسام کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ اس مورتی کے سفر میں بے موت مارا گیا تھا...... عمران کمرے سے جا چکا تھا۔ شاید اس

نے سوچا تھا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے سو گیا ہوں لیکن میں جاگ رہا تھا اور میری ساری حسیات بھی بیدار تھیں۔ کچھ دیر بعد مجھے چھت پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ اس چاپ کے انداز نے گواہی دی کہ یہ عمران ہے۔ وہ چھت پر کیا کرنے گیا تھا؟ میں تجسس سے مجبور ہو کر اٹھا اور چپل پہن کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کامن روم میں ڈاکٹر مہناز خود ہی اپنے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا اس کی مدد کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں ڈاکٹر مہناز کے قریب رکا تو وہ پھر وہی سوال کرے گی کہ جلالی صاحب سے اس کا رابطہ کب ممکن ہو سکے گا۔ میں مہناز سے پہلو بچاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور بہ آہستگی اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ممبئی میں ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ یہ وسیع و عریض سلسلہ مغرب میں سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کے تاریک سینے پر بھی ان گنت روشن نکتے ٹمٹما رہے تھے۔ ایک طویل برآمدے سے گزر کر میں دو روشن کمروں کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران کی حسیات بڑی تیز ہیں۔ میں نے چپل اتار دی اور ننگے پاؤں بے آواز چلتا ہوا کمروں کی عقبی سمت میں چلا گیا۔ یہاں جنریٹر کے لئے تیل کا ایک ڈرم رکھا تھا۔ فی الوقت یہ ڈرم خالی تھا۔ میں نیا سے بے آواز طریقے سے گھما کر دیوار کے پاس رکھ دیا۔ اس ڈرم پر کھڑے ہو کر میں ایک روزن سے کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ جیلانی آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ عمران کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''نہیں جناب! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ ہم آپ کی توقع سے بڑھ کر کام کریں گے۔ کوئی بندہ ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ جانیں دے دیں گے۔ وہی کریں گے جو آپ نے کرنا ہے لیکن آپ سامنے نہ آئیں۔ معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ وہ لوگ موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''نہیں شیخ! کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں سوچ لیتا۔ لیکن یہاں تابی کا اور اس کی عزیزہ کا معاملہ ہے۔ وہ دونوں میری ذمے داری ہیں۔ میں یہ ذمے داری کسی اور پر نہیں ڈال سکتا۔ جو کچھ بھی ہے، وہاں مجھے ہی جانا ہوگا۔ جہاں اتنی بار رسک لیا ہے، ایک بار اور سہی۔''

''آپ پہلے بھی اس طرح کی بات کر چکے ہیں جناب! آپ نے یہاں آتے ہوئے کہا تھا کہ چار پانچ دن سے زیادہ نہیں رکیں گے انڈیا میں۔ اب دیکھیں، تین ہفتے ہو چکے ہیں۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا وہاں ہمارے بعد۔ اب آپ خود کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالتے جا رہے ہیں۔''

''میں نے کہا ہے نا، یہ آخری رسک ہمیں لینا ہی ہوگا۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم کامیاب ہوں گے۔''

''وہ بہت کمینہ ہے عمران صاحب! اب تو ثبوت مل چکا ہے کہ وہ سب کچھ جان چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اطلاع دے سکتا ہے۔ پولیس، بی ایس ایف، فوج، سب بھوکے جانوروں کی طرح آپ کی طرف لپک آئیں گے۔ وہ بس اتنا کرے گا کہ......''

''وہ کچھ نہیں کرے گا۔'' عمران نے ٹھوس لہجے میں جیلانی کی بات کاٹی۔ ''میری بات یاد رکھنا، جب تک آرا کوئے ہمارے پاس ہے وہ کسی کو اطلاع دینے کی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ آرا کوئے کے اور دعوے دار پیدا ہو جائیں۔ وہ کوئی بھی حرکت تب کرے گا، جب آرا کوئے اس کے ہاتھ آ چکا ہوگا لیکن آرا کوئے تب اس کے ہاتھ آئے گا جب ریغمالی ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ اور تم جانتے ہو اس ریغمالی کے ہوتے ہوئے جاوا کو اپنی زبان پر تالا لگانا پڑے گا۔ یہ تالا اس وقت کھلے گا جب ریغمالی اسے واپس ملے گا اور ہم پاکستان میں ہوں گے۔''

''وہ کیسے اسے ریغمالی کے طور پر ہمارے حوالے کرے گا؟ یہ اس کے لئے بڑا مشکل کام ہوگا عمران صاحب۔''

''ہم نے بھی تو مشکل کام کئے ہیں۔ ثروت اور صفورا کو اس کے پاس بطور ضمانت نہیں رکھا؟ اسے بھی کرنا پڑے گا۔ آرا کوئے والا کھیل اتنا بڑا ہے کہ اسے یہ داؤ لگانا ہی پڑے گا۔ ہمارے درمیان فون پر بڑی لمبی بحث ہوئی ہے۔ آخر اسے آمادہ ہونا پڑا ہے۔ ایسا گولڈن چانس اسے پوری زندگی میں پھر نہیں مل سکتا۔ اس نے سب کچھ ناپ تول لیا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں شیخ! یہ بات طے ہے کہ مجھے خود وہاں جانا ہے۔ تم بس تیاری کرو۔ تم دیکھنا، ہم جاوا کو اس کی ساری عیاریوں سمیت جکڑ کر رکھ دیں گے۔ مدتوں تک زخم چاٹے گا۔ ہم ایک بار ثروت کو اس کے چنگل سے نکال لیں پھر سارے حساب برابر کر دیں گے۔''

اب وہ لوگ باہر نکلنے والے تھے۔ میں جلدی سے ڈرم پر سے اترا اور دبے پاؤں چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں نے آج پہلی بار جیلانی جیسے مضبوط شخص کو آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ یقیناً یہ کوئی نہایت سیریس معاملہ تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ گھمبیر۔ وہ پتا نہیں کس حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ کیا خاص بات تھی جس کا پتا ڈان کو چل چکا تھا اور اب اس کے توڑ کے لئے عمران اس سے کوئی خاص ضامن یعنی

یرغمالی مانگ رہا تھا؟ اور وہ مانگ ہی نہیں رہا تھا، ڈان جاوا دینے کے لئے تیار بھی ہو گیا تھا۔ اس سے آرا کوئے کی بے پناہ قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ بین الاقوامی سطح پر لاکھوں نہیں، کروڑوں ڈالرز کی ''چیز'' ہے۔

میں پہلے کی طرح بستر پر خاموش لیٹا رہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عمران کمرے میں آیا۔ کچھ دیر مجھے دیکھا پھر باہر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نصیر کے ساتھ نیلی کار پر کہیں گیا ہے۔ یہ میرے لئے اچھا موقع تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اوپر چھت والے کمرے کی ایک ''ڈپلی کیٹ'' چابی بھی موجود ہے۔ یہ چابی نصیر احمد کے کمرے میں تھی اور نصیر بھی عمران کے ساتھ گیا تھا۔ میں نصیر کے کمرے میں پہنچا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے میں نے مطلوبہ چابی ایک دراز میں سے ڈھونڈ لی۔ اس چابی کے ساتھ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ راستے میں جیلانی ملا۔ اس سے ایک دو باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ عمران ذرا سپر مارکیٹ تک گیا ہے۔ جیلانی بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آنکھوں کی سرخی کچھ اور بتا رہی تھی۔ جیلانی نے ایک فون سننا شروع کیا تو میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت والے کمرے کی طرف آ گیا۔ اس کمرے میں نصیر کا کمپیوٹر پڑا رہتا تھا اور لینڈ لائن فون بھی یہیں تھا۔ میں نے عمران کو دو تین بار اس کمرے میں گھسے ہوئے پایا تھا۔ منگل کی رات بھی وہ کافی دیر اس کمرے میں رہا تھا۔

میں نے تالا کھولا اور کمرے میں پہنچا لیکن لائٹ آن نہیں کی۔ میرے پاس ایک پنسل ٹارچ موجود تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کئے اور کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نیٹ آن تھا۔ میں نے سی پی یو آن کیا۔ مانیٹر پر تفصیلات ظاہر ہونے لگیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نصیر کے ای میل باکس میں پہنچ گیا، پاس ورڈ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ یہاں ایک ای میل نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ دو روز پہلے آئی تھی۔ میں دم بخود دیکھتا رہ گیا۔

اس ای میل میں عمران اور جیلانی کو بتایا گیا تھا کہ اقبال کی لاش مل گئی ہے۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ درندگی کی انتہا کر دی گئی ہے۔ لاش کے سینے پر پرچہ رکھا ہوا ملا ہے۔ اس پر لکھا ہے۔ ''نادر ٹی ٹی کے دوستوں کی طرف سے بڑی عید کا تحفہ۔'' اندازہ ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے اقبال کو خاص قسم کے نشہ آور انجکشن دیئے ہیں اور ان انجکشنوں کے زیر اثر اس سے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ عین ممکن ہے بلکہ یقینی بات ہے کہ اب انڈیا میں آپ لوگوں کی شناخت راز نہیں رہی۔ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ جاوا گروپ کی کارروائی ہے۔ انہوں نے اس طرح نادر ٹی ٹی کے قتل، لالہ زار ہوٹل اور انڈسٹریل ایریا والی کارروائی کا بدلہ لیا ہے۔ ہم وقتی طور پر روپوش ہیں۔ آپ کی ہدایات کا انتظار ہے۔

میں یہ ای میل پڑھ کر سکتے میں رہ گیا۔ عمران نے مجھے مکمل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ اقبال کی موت والا سنگین ترین واقعہ رُونما ہو چکا تھا اور اس نے مجھے بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی حوادث کو جھیلنے اور مسائل کا سامنا کرنے کا اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ صدمات کو اپنے تک محدود رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا لیکن یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ وہ اتنی سنگین اطلاعات بھی مجھ سے چھپا کر رکھتا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ اقبال کا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کی کمی کو بری طرح محسوس کرتے تھے۔ اقبال ہمارے ساتھ انڈیا نہیں آ سکا تھا لیکن اس کا خیال تو ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا۔ اور اب مجھے پتا چل رہا تھا کہ وہ لاہور کے کسی قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے۔ غالباً یہی وہ اہم واقعہ تھا جس کا ذکر جیلانی نے عمران کے ساتھ گفتگو میں بڑے درد سے کیا تھا۔

تب ایک اور ای میل نے میری نگاہوں کو پکڑ لیا۔ یہ ای میل چار پانچ روز پہلے کی تھی اور اقبال نے خود کی تھی۔ اس میں اقبال نے سلطان چٹا کی پُراسرار سرگرمیوں کی بات کرنے کے بعد ثروت کی چھوٹی بہن نصرت کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ ایک طویل ای میل تھی۔ اس کے اندراجات سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ لاہور میں نصرت کی حالت بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ اسے پھر سے آسٹریا منتقل کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اب جگر کی پیوند کاری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اور یہ پیوند کاری دو چار ہفتوں کے اندر ہو جانی چاہئے ورنہ نصرت کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم تھا اور وہ خود ہی ان معاملوں کو ہینڈل کر رہا تھا۔ ایک دوسری ای میل کے اندراجات سے پتا چلا کہ عمران نے آسٹریا میں کسی ایسے ادارے سے رابطہ کیا ہے جو ضرورت مند لوگوں کے لئے گردوں اور جگر وغیرہ کے عطیات فراہم کرتا ہے۔ عمران کا ایک سرجن دوست بھی اس میں کردار ادا کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ عمران ایک دو ہفتوں میں اس ادارے کے لئے ایک بڑے ڈونیشن کا انتظام بھی کرنے والا ہے۔

نصرت کی تشویش ناک حالت کا جان کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے عمران پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس بندے نے جیسے ہر مصیبت اپنے سر پر لینے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ بعض اوقات مشورے کی حد تک بھی کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ کبھی کبھی اس بے جا رازداری کی وجہ سے نقصان بھی ہوتا ہو گا۔ میرا دل چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو اور میں اس کا گریبان پکڑ لوں۔ اسے جھنجوڑوں اور اس رویے کی وجہ پوچھوں۔

میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں نے نیٹ بند کیا اور اپنی آمد کی نشانیاں ختم کر کے کمرے سے نکل آیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے چند درازوں کی تلاشی بھی لی۔ ایک دو کاغذات میں مجھے کسی میجر صاحب کا تذکرہ بھی ملا۔ شاید یہ وہی سابق فوجی آفیسر تھا جس کا ذکر عمران نے کیا تھا۔ ایک جگہ حمزہ احسان کے نام کی ایک رسید بھی ملی۔ یہ حمزہ صاحب وہی پولیس آفیسر تھے جو پاکستان میں گاہے بگاہے عمران کی مدد کرتے رہتے تھے۔

میں نیچے آیا۔ اب رات نے اپنے تاریک پَر پھیلا لئے تھے۔ قریباً ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ عمران تاحال واپس نہیں آیا تھا۔ جیلانی اور نصیر مختلف تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان تیاریوں کو ابرار صدیقی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے تابش! مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ ایک اور خطرناک کھیل کھیلنے جا رہے ہو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ ایسا مت کرو...... یہ منحوس مورتی ہے۔ سب کو برباد کر کے رکھ دے گی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ابرار صاحب! لوگ تو کہتے ہیں اس سے بڑی برکت والی چیز ہی اور کوئی نہیں۔ یہ اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں کو بھی ہر بلا سے محفوظ کر دیتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے۔''

''سب کچھ اس کے الٹ ہے۔'' ابرار کراہا۔ ''یہ اپنی حفاظت نہیں کرتی اور ان لوگوں کو بھی برباد کر رہی ہے جو اس کے آس پاس ہیں۔ کم از کم ہمارے لئے تو یہ ایسی ہی ثابت ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔''

میرے فون کی بیل ہوئی۔ یہ عمران تھا۔ ''کہاں ہو؟'' میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس یار! تھوڑی سی ریہرسل کرنا تھی، رات گیارہ بجے کے لئے بس آدھ پون گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں تمہارے پاس۔''

''جلدی آؤ، کچھ باتیں کرنی ہیں مجھے بھی۔'' میں نے گھمبیر آواز میں کہا۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ نو بج چکے تھے۔ اب صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ اس شہر خوں رنگ کے ایک ساحل پر چند نہایت خطرناک لوگوں میں ملاقات ہونے والی تھی۔ قربان علی عرف شیکھر نے عمران کو بتایا تھا کہ وہ انڈیا کے چنے ہوئے شوٹرز کو لے کر آ رہا ہے......

دوسری طرف جاوا گروپ کے پاس بھی یقیناً خوں خوار ترین قسم کے قاتل موجود تھے۔ قریباً پچاس عدد خطرناک ترین لوگوں کے سائے میں ایک ڈیل فائنل ہونا تھی۔ اسی دوران میں پورچ کے سامنے دو ڈبل کیبن گاڑیاں رکیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اترے۔ یہ سب کے سب مسلح تھے اور ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ زبردست قسم کے فائٹر اور اسلحہ شناس بندے ہیں۔ ان میں چھریرے بدن کا ایک دراز قد نوجوان سب سے نمایاں تھا۔

جیلانی نے کہا۔ ''قربان علی آ گیا ہے۔'' فضا میں سنسنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ فیصلہ کن گھڑیاں قریب آ رہی تھیں۔

گاڑیوں سے اترنے والوں میں بس ایک بندہ قدرے مختلف نظر آیا۔ یہ شکل سے مار دھاڑ کرنے والا شخص نہیں لگتا تھا۔ اس جواں سال شخص نے ماتھے پہ سفید قشقہ کھینچا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور ہندو پجاریوں کی طرح سادہ سا دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ خاموش طبع تھا اور اس سارے ماحول کو جیسے ڈری ہوئی سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کون ہے؟'' میں نے جیلانی سے پوچھا۔

''ماسٹر جواہر۔ ڈھائی تین سال پہلے تک یہ جاوا کا ملازم تھا۔ ملازم بھی کیا تھا، بس اس کی کوٹھی میں اس کے بھتیجے کو ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا۔ وہیں سے بے چارے کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔''

''کیا ہوا؟''

''دردناک قصہ ہے۔ جواہر کی بیوی سریتا خاصی خوب صورت تھی۔ دو سالہ بچی کی ماں بھی تھی۔ کسی ٹی وی چینل پر انگریزی کی خبریں بھی پڑھتی تھی۔ بری قسمت کہ کہیں جاوا کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ جاوا جیسا بندہ کسی کو حاصل کرنا چاہے اور نہ کر سکے، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نے پہلے پیار محبت اور حیلے سے کوشش کی پھر زبردستی سریتا کو اپنے گھر میں ڈال لیا۔ ساتھ میں بچی بھی رکھ لی۔ کچھ کہتے ہیں کہ جاوا نے سریتا سے شادی کی ہوئی ہے، کچھ کے خیال میں ویسے ہی رکھا ہوا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ اب بھی اس پر فدا ہے۔''

''اور یہ جواہر؟''

''یہ رو پیٹ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کوئی ایک سال بعد دوبارہ نظر آیا لیکن اب یہ بالکل بدل چکا ہے۔ پوجا پاٹ اور مندر تیرتھ کا ہو کر رہ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے جوگ لیا ہوا ہے۔''

"لیکن یہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"پتا نہیں، عمران صاحب نے ہی بلایا ہوگا۔"

○……❖……○

میں عمران سے بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا لیکن وہ ایسے وقت آیا جب روانگی بالکل قریب تھی۔ سوا دس بج چکے تھے اور کالی جھاڑ تک چالیس پینتالیس منٹ کا راستہ ہی تھا۔

عمران بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔ اس کی شوخی نہ جانے کن پردوں میں جا چھپی تھی۔ وہ اپنے بندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا اور ان کی تیاری وغیرہ پر بھی نگاہ ڈال رہا تھا۔ میں اور جگت سنگھ بھی تیار تھے۔ جگت سنگھ نڈر اور جی دار بندہ تھا۔ یہ جان کر کہ ہمارا سامنا جاوا سے ہونے والا ہے، جگت سنگھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔ اس نے عمران سے اصرار کر کے چار پانچ دستی بم بھی ساتھ رکھ لئے تھے۔ بہرحال، عمران نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نہایت نازک معاملہ ہے اور کسی ہدایت کے بغیر وہ کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ اس حوالے سے میں نے بھی جگت سنگھ کو پابند کر دیا تھا۔

میں عمران کے چہرے پر اقبال کی موت کا غم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ دل فگار غم شاید کہیں گہرائی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ویسے بھی عمران کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔

ہم چار گاڑیوں میں بڑی برق رفتاری سے روانہ ہوئے۔ میں عمران کے ساتھ دو ہزار آٹھ ماڈل کی ایک لینڈ روور جیپ میں تھا۔ جگت سنگھ اور جیلانی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ نصیر احمد، قربان علی کے ساتھ دوسری گاڑی میں تھا۔ پون گھنٹے کے اندر ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ ایک تاروں بھری رات تھی۔ آٹھویں نویں رات کا چاند بھی موجود تھا۔ سمندر پُرسکون اور خاموش تھا۔ ہوا اور لہروں کی مدھم سرگوشیاں جاری تھیں۔

ہم نے مقررہ جگہ پر گاڑیاں روکیں۔ تقریباً یہی وقت تھا جب ممبئی کا خوں خوار جانور جاوا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موقع پر پہنچا۔ ان کی گاڑیاں ہماری گاڑیوں سے قریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ عمران کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف حسبِ توقع جاوا ہی تھا۔

"ہیرو! میں جاوا ہوں۔ سامان لے آئے ہو؟"

"لے آیا ہوں جناب عالی……اور آپ؟"

"میں بھی لے آیا ہوں۔"

"اور ضامن؟"

"وہ بھی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، ان کو روانہ کرو۔ میں ادھر سے مورتی بھیجتا ہوں۔"

"لیکن پہلے میں چیک کرنا چاہوں گا۔"

"ٹھیک ہے، بندہ بھیج دو۔"

قریباً تین منٹ بعد دو بندے ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک تو جاوا کا کوئی گھاگ شوٹر تھا، دوسرا ایک کھچڑی بالوں والا ادھیڑ عمر بندہ تھا۔ قریب پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ اس نے عینک لگا رکھی ہے۔ یقیناً یہ کوئی ماہر نوادرات تھا اور آراکوئے کی صحت جانچنے کے لئے آیا تھا۔ عمران نے لینڈ روور کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر آراکوئے نکالا۔ اسے بڑی احتیاط سے فوم کی باریک تہ میں لپیٹا گیا تھا۔ اس کے اوپر ریگزین کا کور تھا۔ شوٹر اور ادھیڑ عمر شخص لینڈ روور کے اندر ہی آ گئے۔ ان کے چہروں کو گہری سنجیدگی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کس قدر گھمبیر صورتِ حال ہے۔ چاروں طرف آتشیں ہتھیار بالکل تیار حالت میں موجود تھے۔

عمران نے آراکوئے کو اس کے کورز میں سے نکالا۔ دو فٹ کا دھاتی مجسمہ جیپ کی اندرونی روشنیوں میں چمکنے لگا۔ اس کی دید متاثر کن تھی۔ ادھیڑ عمر شخص کے پاس نیلگوں روشنی والی ایک خاص قسم کی ٹارچ موجود تھی۔ اس نے ایک آنکھ پر محدب شیشہ چڑھایا……ٹارچ جلائی اور آراکوئے کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے آراکوئے کی پشت پر کندہ برمی زبان کے چند قدیم حروف کا بھی معائنہ کیا۔ اس کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں مطمئن ہوں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ جیب سے مارکر نکالا اور آراکوئے کی پشت پر سرخ مارکر سے اپنے سائن کر دیئے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

عمران نے سرد آنکھوں والے شوٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جاوا سے کہو کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔"

دونوں افراد واپس چلے گئے۔ قریباً پانچ منٹ بعد عمران کے فون پر جاوا کی آواز ابھری۔ "کیا کہنا ہے؟"

"آواز سننا چاہتا ہوں میڈم صفورا اور ثروت کی اور ضامن کی بھی۔"

"او کے……دو منٹ ہولڈ کرو۔"

کچھ دیر بعد فون کے اسپیکر پر میڈم صفورا کی آواز ابھری۔ "ہیلو عمران!"

''ہیلو میڈم! کہاں ہیں آپ؟''

''سامنے سرخ ہائی روف گاڑی میں۔ثروت بھی میرے ساتھ ہے۔''

''ٹھیک ہے،ثروت سے بات کرائیں۔''

چند سیکنڈ بعد ثروت کی دبی ہوئی آواز سنائی دی۔''ہیلو!''

عمران نے فون میری طرف بڑھا دیا۔''ہیلو ثروت! تم کیسی ہو؟''

''مم...... میں بالکل ٹھیک ہوں تابش۔'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔''لیکن یہاں ہو کیا رہا ہے؟ یہاں بہت سے رائفلوں والے ہیں۔آپ کہاں ہیں؟''

''پاس ہی ہیں۔تمہیں لینے آئے ہیں۔سمجھو پریشانی ختم ہوگئی ہے ثروت۔''

وہ سسک پڑی۔کسی نے موبائل اس سے لے لیا۔پھر جاوا کی منحوس آواز سنائی دی۔''بس یا کچھ اور؟''

عمران نے کڑے لہجے میں کہا۔''ضامن سے بات کروائیے جاوا صاحب۔''

''یہ شرط تم بڑی کڑی رکھ رہے ہو ہیرو بچے! کیا اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا؟''

''نہیں ہوسکتا جاوا حضور! اگر ہم ثروت کے سلسلے میں آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں اور آپ اس اعتماد پر پورے بھی اتر سکتے ہیں تو پھر اس سلسلے میں بے اعتمادی کیوں؟ ضامن...... ضامن ہے۔جس حالت میں لیں گے،اسی حالت میں واپس کریں گے...... پوری حفاظت کے ساتھ۔''

چند سیکنڈ بعد جاوا کی گھمبیر آواز ابھری۔''لو سریتا سے بات کرو۔''

سریتا کا نام سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔یہ تو وہ جاوا کی رکھیل تھی جس پر وہ بری طرح فدا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ......آرا کوئے کے لئے وہ اپنی بہت پیاری شے عارضی طور پر عمران کے حوالے کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ٹھہری ہوئی سی باریک آواز سنائی دی۔''میں سریتا بول رہی ہوں۔''

''کہاں ہیں آپ؟'' عمران نے پوچھا۔

''سامنے گرے گاڑی کے اندر۔''

یہ گرے گاڑی وہی شاندار بلٹ پروف اور دھماکا پروف جیپ نما کار تھی جو لنگڑی پورہ سے فرید کوٹ آتے ہوئے جاوا کے پاس تھی۔لڑائی کے دوران میں اس جیپ پر شدید فائرنگ کے علاوہ جگت سنگھ کے پھینکے ہوئے ''کالے اناروں'' کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ مجہول سا جوگی نما شخص ہماری گاڑی سے باہر کھڑا تھا جس کا نام جیلانی نے جواہر بتایا

تھا اور جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ سریتا کا سابق پتی ہے۔وہ ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

عمران نے جیلانی سے کہا۔''اسے اندر لاؤ۔''

ڈرا سہا جواہر ہماری گاڑی کے اندر آ گیا۔عمران نے سریتا سے ایک دو سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون کے مائیک کو انگلی سے ڈھانپ کر جواہر سے پوچھا۔''یہ سریتا ہی کی آواز ہے؟''

جواہر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب دونوں طرف سے پوری تسلی کر لی گئی تھی،اس لئے تبادلے کا عمل شروع ہوا۔ممبئی کے ماہر ترین گن مینوں نے گاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھال لیں۔قریباً چار سوفٹ دور یقیناً جاوا کے لوگ بھی پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔ہماری طرف سے عمران کا ساتھی قربان علی عرف شیکھر آرا کوئے کے ساتھ آگے بڑھا۔دوسری طرف سے ثروت اور میڈم صفورا نمودار ہوئیں۔ان کے ساتھ ایک تیسری عورت بھی تھی جو یقیناً جاوا کا رکھیل سریتا تھی۔مدھم چاندنی میں تینوں ہیولے آگے بڑھنے لگے۔میں نے ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لیا۔ثروت کی دید نے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ہوا کی وجہ سے اس کے ریشمی بال بار بار چہرے پر منتشر ہو رہے تھے،وہ انہیں پیچھے ہٹا رہی تھی۔میڈم صفورا نے تسلی بخش انداز میں ثروت کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔میڈم صفورا کی بائیں جانب متناسب جسم والی وہ جواں سال لڑکی تھی جسے جاوا کی قربت کا شرف حاصل تھا اور جس کا نام سریتا بتایا جا رہا تھا۔اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ناک میں کوکے کی چمک تھی۔کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔اس کے لمبے بال کسی فلمی سین کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ثروت کی طرح وہ بھی ڈری سہمی نظر آتی تھی۔ان تینوں کے پیچھے جاوا کا قریبی ساتھی پریم چوپڑا تھا اور کھچڑی بالوں والا تھا۔

عمران دوسری ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لینے لگا۔چند سیکنڈ بعد اس نے مطمئن ہو کر ٹیلی اسکوپ رکھ دی اور رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ہم نے ایک جیپ کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔جگت سنگھ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا تھا۔اس کے ہاتھوں میں ٹرپل ٹو رائفل تھی اور وہ جوش سے بھرا ہوا تھا۔ہمارے دائیں بائیں شوٹر بالکل چوکس تھے۔انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی گئی تھیں اور فضا میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔قربان علی آرا کوئے کے ساتھ وسط میں پہنچا تو پریم چوپڑا بھی تینوں عورتوں کے ساتھ وسط میں پہنچ گیا۔قربان علی نے آرا کوئے پریم چوپڑا کو تھمایا۔ٹارچ کی روشنی چمکی۔میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا۔کھچڑی بالوں والے نے

آگے بڑھ کر آرا کوئے کی پشت پر اپنے دستخط دیکھے اور آرا کوئے وصول کر لیا۔

قربان علی نے ثروت، صفورا اور ضامن سریتا کو وصول کر لیا۔ اب آگے کا مرحلہ شروع ہوا۔ آرا کوئے جاوا کی طرف بڑھا اور ثروت وغیرہ ہماری طرف۔ یہ نازک لمحے تھے۔ کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ دل دھڑک رہے تھے۔ عقابی نگاہیں گردش کر رہی تھیں...... بہرطور خیریت گزری۔ قربان علی تینوں خواتین کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ گیا اور پریم چوپڑا آرا کوئے کے ساتھ جاوا گروپ کے پاس۔ ثروت لپک کر میرے بازو سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ جگت سنگھ نے اسے پچکار کر کہا۔ ''اب کیوں روتی ہے چھوٹی! اب تو سب کچھ چنگا ہو گیا، واہگرو کی کرپا ہے۔''

عمران نے بھی پیار سے ثروت کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میڈم صفورا نے سریتا کو عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو بھئی سنبھالو اپنی ''گارنٹی'' کو۔''

سریتا ایک بھرپور جواں سال عورت تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھی۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

میں نے دیکھا کہ جواہر نے اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری نگاہ نہیں ڈالی...... وہ بالکل لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ کبھی اس کی پتنی تھی، اس کی بچی کی ماں تھی۔ جواہر کے کانوں میں جوگ کی بالیاں چمک رہی تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

جیلانی نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور تصویر سے موازنہ کر کے تصدیق کی کہ یہ سریتا ہی ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم وعدے کی پوری پابندی کریں گے۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اپنی بچی کے پاس واپس پہنچ جاؤ گی۔''

پروگرام کے مطابق ہم تیزی سے روانہ ہو گئے۔ اب ہمیں ممبئی واپس نہیں جانا تھا بلکہ ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے صوبہ گجرات کی حدود میں داخل ہونا تھا اور پھر بھڑوچ اور احمد آباد سے ہوتے ہوئے تھرپارکر کے سرحدی علاقے کی طرف جانا تھا۔ یہ ایک لمبا سفر تھا لیکن امید تھی کہ ہم صبح دس بجے تک منزل کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔

تینوں گاڑیاں ہمارے ساتھ رہیں۔ سب سے آگے ایک ڈبل کیبن تھی جسے قربان علی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ پورب کمار اور جیلانی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد ہماری جیپ تھی۔ اس میں سب سے پچھلی نشست پر میں، ثروت اور میڈم صفورا بیٹھے تھے...... لیکن پھر میڈم صفورا اٹھ کر درمیانی نشست پر سریتا کے پاس چلی گئی کیونکہ سریتا کچھ گھبرا رہی تھی۔

عمران، سریتا کی بائیں جانب بیٹھا تھا۔ سائیلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بالکل چوکس تھا۔ تاہم اس خیال سے کہ پستول کی دید سریتا کو ٹینشن میں مبتلا نہ رکھے، عمران نے اس پر ایک چھوٹا تولیا ڈال دیا تھا۔ جگت سنگھ اگلی نشست پر نصیر احمد کے ساتھ موجود تھا۔ ڈرائیونگ نصیر احمد کے ذمے تھی۔ جگت سنگھ کی عقابی نگاہیں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ عمران نے موبائل فون پر پچھلی گاڑیوں سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ ہم سے پیچھے جو گاڑی آ رہی تھی، اس میں غمزدہ آنکھوں والا، جوگی نما جواہر بھی موجود تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے ہم نے احمد آباد کے قریب اپنے قافلے سے علیحدہ کر دینا تھا۔ وہ وہاں کے ایک تیرتھ میں جانا چاہتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ سریتا سمیت ہر چیز سے لاتعلق ہو چکا ہے...... لاتعلق اور خوف زدہ...... وہ ہماری رائفلوں وغیرہ کو دیکھتا تھا تو اس کے چہرے پر ہلدی سی بکھر جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ ماضی قریب میں وہ بہت مشکل مراحل سے گزر چکا ہے۔ سریتا کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی نظر آتی تھی۔

آگے بھی جو کچھ ہوا، ہمارے پروگرام کے مطابق ہوا۔ ہم ایک چوراہے پر پہنچے تو بائیں طرف سے ایک ٹیوٹا جیپ نمودار ہوئی اور ہمارے قافلے میں شامل ہو گئی۔ اس جیپ میں زخمی ابرار صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر مہناز، آہو چشم ایشوریا اور دونوں پاکستانی لڑکیاں موجود تھیں۔ ان لوگوں کو نصیر احمد کے گھر سے لانے والے قربان علی کے ساتھی ہی تھے۔ یہ وہی بندے تھے جنہیں اس نے ''اسٹینڈ بائی'' رکھا ہوا تھا۔ اس جیپ کے قافلے میں شامل ہوتے ہی ایک جیپ قافلے سے علیحدہ ہو گئی...... یوں گاڑیوں کی کل تعداد چار ہی رہی۔

اب ہم تیزی سے ہائی وے پر رواں تھے...... ہمارا رخ سورت شہر کی طرف تھا۔ رات نیم روشن اور خنک تھی۔ ثروت مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ اس کا قرب اور قرب کی خوشبو مجھے بھولی بسری باتیں یاد دلا رہی تھیں۔ پچھلی گاڑی میں سے کسی نے عمران کے فون پر اطلاع دی۔ ''ایک گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے جناب! گرے رنگ کی جیپ ہے۔ جاوا کی گاڑیوں میں سے ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' عمران نے کہا۔ ''یہ پروگرام کے مطابق ہی ہے۔'' چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ ابھری۔ ''لیکن جناب! شک پڑ رہا ہے کہ اس کے پیچھے بھی ایک یا دو گاڑیاں آ رہی ہیں۔''

''غلط فہمی ہوئی ہوگی تمہیں۔ بس ایک گاڑی کی بات ہوئی تھی۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں چیک کرتا ہوں'' میں نے رفتار آہستہ کر دی

"او کے۔" عمران نے کہا اور پھر ایک دوسرا نمبر پریس کیا۔ یہ جاوا ہی کا تھا۔ بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ دوسری کوشش میں بھی یہی ہوا۔ اس دوران میں پچھلی گاڑی والے بندے کی کال پھر آ گئی۔ اس نے کہا۔ "کم از کم تین گاڑیاں مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی ہیں جی۔ دو جیپیں ہیں، ایک ہاسین کار۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ تینوں میں مسلح بندے ٹھنسے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم لوگ چوکس رہو۔ مسلسل رابطہ رکھو۔" عمران نے کہا اور فون بند کر کے دوبارہ جاوا سے رابطے کی کوشش کی۔ رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے پریم چوپڑا کا نمبر پریس کیا۔ کال مل گئی لیکن ابھی پریم چوپڑا نے ہیلو ہی کہا تھا کہ رابطہ منقطع ہو گیا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

عمران کے بجائے نصیر احمد نے جواب دیا۔ "گڑبڑ کیوں ہونی ہے جی۔ جب تک یہ بی بی سریتا ہمارے پاس ہے، کچھ نہیں ہو گا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

سریتا سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

عمران نے قربان علی کو فون پر ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی کو ذرا آہستہ کر کے پیچھے لے جائے اور دیکھے کہ کیا صورتِ حال ہے۔

قربان علی نے اس ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ ہم قربان علی اور پورب کمار والی گاڑی کو اوورٹیک کر کے آگے نکل گئے۔ دو تین منٹ بعد قربان علی کی کال آ گئی۔ اس کی آواز سے پریشانی مترشح تھی۔ "عمران صاحب! لگتا ہے جاوا کے ساتھی معاہدہ توڑ رہے ہیں۔ صرف ایک گاڑی کی بات ہوئی تھی لیکن تین چار گاڑیاں اپن کے پیچھے ہیں۔ یہ لوگ نزدیک آ رہے ہیں۔ ان کے ارادے ٹھیک ناہیں لگتے۔"

عمران جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔ اس نے پستول کا سائیلنسر اتار کر پستول کو اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا اور گن نکال لی۔ ہم بھی چوکس ہو گئے۔ سریتا کا چہرہ اب خوف و ہراس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب سے پہلے اس کی ہی زندگی داؤ پر لگے گی۔

نصیر احمد نے سریتا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے نہیں لگتا عمران صاحب کہ اس بی بی کے ہوتے ہوئے جاوا کسی حماقت کا سوچ بھی سکتا ہے۔ کہیں یہ کوئی اور گروپ تو نہیں؟"

"قربان علی پورے یقین سے کہہ رہا ہے کہ یہ جاوا کی گاڑیاں ہیں اور اس کے بندے ہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اس بی بی سریتا والا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا۔" پھر وہ سریتا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم کیا کہتی ہو...... یہ کیا ہے سب؟"

"مجھے کوئی جانکاری نہیں...... کوئی نہیں۔" وہ گردن جھکا کر سسک پڑی۔

اس دوران میں قربان علی کی چلاتی ہوئی سی آواز موبائل فون پر ابھری۔ "سر! یہ لوگ کوئی کارروائی کرنے والے ہیں۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں میں مجھے بی ایس ایف کی ایک گاڑی بھی دکھائی دے رہی ہے۔"

"او گاڈ!" نصیر احمد نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

عمران نے جبڑے بھینچ رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی ابھر آئی تھی۔

"یہ بی ایس ایف والا کیا معاملہ ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے نصیر سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں رک کر دیکھ لینا چاہئے کہ مسئلہ ہے؟"

"رکنے کے لئے ایک بڑی مناسب سی جگہ تو ہے یہاں۔" نصیر احمد نے کہا۔

اب ہم سورت کے قریب پہنچنے والے تھے۔ دور سے شہر کی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم ایک مضافات سے گزر رہے تھے۔ نصیر احمد نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی تیز ہو گئیں۔ عمران نے فون پر قربان علی وغیرہ کو ہدایت دی۔ "ہم آگے جا کر کچھ دیر کے لئے رک رہے ہیں۔ تم سب نے بھی ہمارے ساتھ ہی رک جانا ہے۔ ہمیں فالو کرتے رہو۔"

"جی سر!" قربان علی نے کہا۔

"لڑکیوں والی جیپ کا خاص دھیان رکھو۔" عمران نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔" قربان نے جواب دیا۔

نصیر احمد بڑی برق رفتاری سے ایک بغلی سڑک پر مڑا اور پھر قریباً ایک کلومیٹر آگے جا کر ایک پارک نما جگہ پر رک گیا۔ یہاں کافی درخت تھے۔ یہ جگہ قدرے اونچائی پر تھی۔ اسٹریٹ لائٹس میں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ کوئی اسپورٹ کمپلیکس قسم کی شے تھی لیکن فی الوقت بالکل ویران پڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر سورت شہر کی روشنیاں بھی یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ نصیر احمد اس جگہ کا محل وقوع بڑی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ وہ جیپ کو فراٹے سے ایک ڈرائیو وے پر لے گیا اور پھر ایک ادھ کھلے گیٹ سے گزر کر ایک احاطے میں رک گیا۔ ہماری باقی گاڑیاں بھی تیز رفتاری سے احاطے

میں پہنچ گئیں۔ ہماری آخری گاڑی وہ تھی جس میں قربان علی تھا۔ قربان علی نے اپنی گاڑی احاطے میں داخل نہیں کی بلکہ کچھ فاصلے پر ہی روک لی۔ یقیناً وہ بلندی سے عقب کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عمران سے مسلسل رابطے میں تھا اور گاہے بگاہے رننگ کمنٹری کے انداز میں بول رہا تھا۔ ''جی سر! گاڑیاں پہنچ گئی ہیں...... یہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ او گاڈ...... یہ چھ سات کے قریب ہیں۔ یہ پھیل کر آگے آ رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے جی...... کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''ہاں ہاں قربان...... کھل کر بتاؤ۔''

''مجھے لگ رہا ہے جی کہ وہ گھیر رہے ہیں ہم کو۔ شاید آپ بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ دو گاڑیاں بائیں طرف سے گھوم کر آ رہی ہیں۔''

''ہاں...... مجھے نظر آ رہا ہے۔'' عمران نے تائید کی۔

''یہ لیں جی...... نئی خبر۔'' قربان کی سنسناتی آواز ابھری۔ ''ان دو گاڑیوں میں ایک وہی جاوا کی گرے جیپ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ان کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔ تم لوگ پوزیشنیں لے لو۔ ہم بھی لے رہے ہیں۔''

''اس چھوکری سریتا کا خاص دھیان رکھیں سر! اس وقت ہمارے ہاتھ میں وہی سب سے اہم پتا ہے۔''

''بے فکر رہو۔'' عمران نے کہا۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد عمران نے ایک بار پھر جاوا اور پریم چوپڑا کو فون کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اب صاف ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر رابطہ نہیں کر رہے۔ یہ وہی صورتِ حال ہو گئی تھی جو ممبئی میں سامنے آئی تھی۔ لیکن تب تو ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا، اب تو سریتا تھی۔

''اب یہ کیوں ہو رہا ہے عمران؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ...ت تو کنفرم ہے کہ یہ کتا جاوا اس سریتا کے ہوتے ہوئے کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔''

''ہو سکتا ہے، بی ایف ایس والوں نے اسے مجبور کر دیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن بی ایف ایس کو خبر کس نے کی؟ جاوا کے سوا اور کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ ہم ہائی وے پر [illegible] اور سورت کی طرف جا رہے ہیں۔''

سرخ اینٹوں والی عمارت میں بس ایک سرکاری چوکیدار موجود تھا۔ وہ نیند سے جاگا تھا اور یہ ہنگامہ دیکھ کر ہکا بکا ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو فون کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اس سے فون چھین کر اسے ایک باتھ روم میں بند کر دیا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جگت سنگھ میرے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یہ صورتِ حال اس کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ وہ جاوا گروپ سے ٹکرانے کی شدید خواہش رکھتا تھا...... اسے جاوا کی طرف سے آشا اور گوبندر سنگھ کی موت کی صورت میں دو کاری زخم لگے تھے۔ وہ ان زخموں کا مداوا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھ سے بھی بہت متاثر تھا۔ اس نے بارڈر ایریا میں میرے ہاتھوں انور گنجے کے پانچ خوں خوار کارندوں کو ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اس لڑائی نے اسے میرا گرویدا بنا دیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ آج اسے میرے کندھے سے کندھا ملا کر مشترکہ دشمن سے لڑنے کا موقع مل رہا ہے۔

عمران نے سریتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تابی! تم اس حرامزادی کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔ ہمارے ساتھ کچھ ہوا تو پہلے اس کے ساتھ ہو گا۔''

''بے فکر رہو۔'' میں نے کہا اور سریتا کو چوٹی سے پکڑ کر نیچے فرش پر گرا دیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں چلا کر رہ گئی۔

اس کی آواز سن کر کچھ دور بیٹھا ماسٹر جواہر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں جتنے لوگ موجود تھے، ان میں سب سے خوف زدہ وہی تھا۔ وہ جیسے موت کے فرشتے کو اپنے رُوبرو دیکھ رہا تھا۔ سریتا کبھی اس کی بیوی تھی، اس کی محبوب ہستی تھی لیکن آج وہ اس کی طرف سے بھی لاتعلق ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑتا تھا اور منہ میں کچھ پڑھنے لگتا تھا۔

ہم سرخ اینٹوں والی عمارت کی دوسری منزل پر تھے۔ یہ بیڈمنٹن کا ایک ہال تھا۔ ہم اس ہال میں سے فاصلے تک دیکھ سکتے تھے۔ جاوا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں تین اطراف سے گھیر لیا تھا اور اب چوتھی طرف بھی ان کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ نصیر احمد پھر بڑبڑایا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ اس پر جان دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں اس بات کو۔''

قربان علی نے تائید کی۔ ''یہ واقعی انہونی ہو رہی ہے۔''

یکا یک مین گیٹ کی طرف سے چند فائر ہوئے۔ یہ فائر یقیناً جاوا کے لوگوں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ جواب میں پورب کمار اور جگت سنگھ نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں اور شعلوں سے رات کا سناٹا چکنا چور ہو گیا۔ ہم نے جبھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو

تین منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ دائیں طرف سے جاوا کے ساتھی مختلف چیزوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے آگئے۔ اب ہمارے گرد ان کا گھیرا اور خطرناک ہو گیا تھا۔

کچھ دیر کے لئے فائرنگ تھم گئی۔ مجھے ماسٹر جواہر کے رونے کی آواز آئی۔ وہ ایک آہنی الماری کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔

میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ ”جواہر! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ دل فگار آواز میں بولا۔ ”یہ ماردیں گے۔ تم سب کو ماردیں گے۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔ ہم سب کی ہتھیا ہو جائے گی۔ یہ لڑکی کسی کو نہیں بچا سکتی۔“

”کون لڑکی؟“

”یہی جسے تم...... سریتا...... سمجھ رہے ہو۔“

”سریتا سمجھ رہے ہو؟ یہ سریتا نہیں ہے؟“

”نہیں ہے...... یہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مم...... میں...... تم سب کا دوشی ہوں...... مم...... میں نے جھوٹ بولا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر سکا کہ تمہیں سچ بتاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے، یہ تمہاری پتنی سریتا نہیں ہے؟“

”نہیں ہے، مجھے اسی سے پتا چل گیا تھا جب تم لوگوں نے مجھے فون پر اس کی آواز سنائی تھی مگر میں چپ رہا۔ میں سریتا کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔“

عمران بھی اب ہمارے پاس پہنچ چکا تھا اور ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جیب سے سریتا کی وہی تصویر نکالی اور اسے دھیان سے دیکھنے لگا۔ لڑکی سے موازنہ کرنے لگا۔

جواہر کراہا۔ ”تم لوگوں سے دھوکا ہوا ہے۔ جاوا نے دھوکا کیا ہے۔ اس کی شکل سریتا سے ملتی ہے لیکن یہ سریتا نہیں ہے۔“

میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ عمران کی آنکھوں میں بھی حیرت کی یلغار ہوئی۔ مجھے لگا جیسے اردگرد کی ہر شے نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ ہم ایک بات بالکل فراموش کر گئے تھے۔ جاوا ڈان ہی نہیں تھا۔ شوبز سے بھی گہرا تعلق رکھتا تھا۔ وہ بہت سے کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ملتے جلتے چہروں کا بیوپاری بھی تھا۔

تو کیا اس نے اپنی رکھیل معروف نیوز کاسٹر سے ملتا جلتا چہرہ بھی ڈھونڈ رکھا تھا؟

عمران گم صم تھا۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے اور عمران بھی انسان تھا۔ ہم سب اسی

زمرے میں آتے تھے...... کیا واقعی ہم سے غلطی ہو چکی تھی؟

یکا یک پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ ہم پر چلنے والی گولیوں کا زاویہ زیادہ خطرناک تھا۔ چند گولیاں عین اس دیوار پر لگیں جس کی اوٹ میں ہم موجود تھے۔ ایک گولی پورب کمار کے کندھے پر لگی اور دوسری گردن میں پیوست ہو گئی۔ وہ پشت کے بل بیڈمنٹن کی کورٹ میں گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی رائفل دور لڑھک گئی تھی۔

ہم نے پوزیشنیں سنبھال لیں اور فائرنگ کا بھرپور جواب دینے لگے۔ دوسری منزل کی بیشتر کھڑکیاں چکنا چور ہو گئیں۔ ہر طرف شیشے کی کرچیاں بکھر گئیں۔ نصیر کے ایک جواں سال ساتھی کے سینے پر پورا برسٹ لگا اور وہ کھڑکی میں سے تیرہ چودہ فٹ نیچے پختہ فرش پر جا گرا۔

میگا فون پر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ”تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ بھاگ نہیں سکتے ہو۔ قانون ہاتھ میں مت لو۔ بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔ یہ بی ایس ایف ہے۔ میں اعلان دہراتا ہوں......“ پُرتحکم آواز نے اعلان دہرایا۔ لب و لہجے سے یہ بارڈر فورس کا اہلکار ہی لگتا تھا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی اور اس سنگینی کی وجہ بھی اب ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جن پتوں پر تکیہ تھا، وہی ہوا دینے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد فائرنگ میں وقفہ آ گیا۔ یہ وقفہ پھر ایک اناؤنسمنٹ کے لئے تھا۔ اس مرتبہ اناؤنسمنٹ سورت کے کسی ڈی ایس پی کی طرف سے کی گئی۔ اس نے بھی تقریباً وہی الفاظ دہرائے جو اس سے پہلے بی ایس ایف کے کمانڈر نے کہے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہم بہت جلد اپنی جانیں بچانے کا سوچیں گے اور ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں گے۔

پورب کمار کی موت کے بعد قربان علی کا پارا ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے ماسٹر جواہر کا گریبان پکڑ لیا اور اس پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ وہ پھنکار رہا تھا۔ ”حرامزادے! ہم تجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر لائے تھے لیکن تُو آستین کا سانپ نکلا۔ جاوا سے بڑھ کر دھوکا دیا تُو نے ہمیں۔ کیوں کیا...... کیوں کیا ایسا؟“

عمران نے آگے بڑھ کر قربان علی کو بمشکل جواہر سے علیحدہ کیا۔ ماسٹر جواہر کے ناک منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ...... کیچوے کی طرح فرش پر پڑا تھا۔

عمران اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون پونچھنے کے لئے عمران نے اپنا رومال والا ہاتھ آگے بڑھایا تو جواہر بدک گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید عمران بھی اسے مارنے لگا ہے۔

عمران نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''جواہر! تیری وجہ سے ہم سب پھنس گئے ہیں۔ تُو نے کیوں کیا ایسا؟''

وہ بس ہچکیوں سے روتا چلا جا رہا تھا۔ عمران کے اصرار پر اس نے ٹکڑوں میں جو کچھ بتایا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، وہ اس طرح تھا۔ جواہر اپنی بیوی اور بچی کو کھو چکا تھا...... لیکن اس کے دل میں اب بھی ان کی محبت موجزن تھی۔ سریتا جہاں بھی تھی، وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ عمران اور نصیر...... جواہر کو اس لئے لے کر آئے تھے کہ وہ فون پر سریتا کی آواز پہچان کر تصدیق کرے گا کہ جس لڑکی کو ضامن کے طور پر ہماری طرف بھیجا جانے والا ہے، وہ سریتا ہی ہے۔ دوسری طرف جواہر کے دل و دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ یہاں دو نہایت خطرناک گروہوں کے درمیان خوفناک قسم کے حالات پیدا ہونے والے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ سریتا یرغمالی کے طور پر اس معاملے میں شامل ہو۔ اس لئے جب اس نے فون پر سریتا کے بجائے اس لڑکی کی آواز سنی تو فوراً ''تصدیق'' کر دی کہ یہی سریتا ہے۔ جواہر کو یقین تھا کہ جاوا جیسے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بے شک وہ سریتا کے بجائے کسی اور لڑکی کو ضامن کے طور پر بھیج رہا تھا لیکن اگر اس کی یہ چال ناکام ہو جاتی تو وہ اپنے لالچ کی خاطر اصل سریتا کو بھی داؤ پر لگا سکتا تھا۔ لالچ کا جذبہ جاوا کے دیگر سارے کمزور اور قوی جذبوں پر حاوی تھا۔ یہی سبب تھا کہ جواہر نے فون پر سریتا کے بجائے کسی اور کی آواز سننے کے باوجود یہ کہہ دیا کہ یہ سریتا ہی کی آواز ہے۔ بعد میں شکلوں کی مماثلت نے کام دکھایا۔

پورب کمار کا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے اس کی لاش اٹھا کر آڑ میں کر دی اور جگت سنگھ نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔ پولیس کی طرف سے ہونے والی اناؤنسمنٹ میں ہمیں پانچ منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ اس وقت کے ختم ہوتے ہی ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم نے پانچوں لڑکیوں کو میڈم صفورا سمیت ایک محفوظ کمرے میں پہنچا دیا اور خود سینہ سپر ہو گئے۔ مخالفین کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری تعداد بیس کے قریب تھی جبکہ وہ دگنا سے بھی زیادہ تھے۔ پھر ان کو ایمونیشن کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

ابرار صدیقی ایک چوڑے ستون کی اوٹ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے گاہے بگاہے شدید کھانسی ہونے لگتی تھی۔ وہ کھانستے کھانستے ہی بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا، یہ منحوس مورتی ہے۔ یہ خون خرابے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہ ماسٹر جواہر ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ سب کو مار دیں گے۔''

''تو کیا کریں پھر؟'' میں نے چڑ کر کہا۔

جواہر بولا۔ ''یہ لوگ جو کہتے ہیں مان لو۔ کم از کم جیون تو بچ جائے گا۔ تمہارے ساتھ نردوش عورتیں ہیں۔ وہ مفت میں ماری جائیں گی۔''

ابرار صدیقی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ میں سمجھتا ہوں، جواہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

ابھی ابرار کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ عمران کے شوٹر بھی بھرپور جواب دینے لگے۔ چند گولیوں نے اس ستون کے پلاسٹر کو ادھیڑ دیا جس کے عقب میں ابرار صدیقی موجود تھا۔ وہ مزید خوف زدہ ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ ستون کی محفوظ آڑ چھوڑ کر کسی اور طرف جانا چاہ رہا ہے۔

میں نے چلّا کر کہا۔ ''نہیں صدیقی صاحب! پیچھے ہی رہو۔''

وہ رک گیا۔

لیکن جب دوسرا برسٹ ستون پر اسی جگہ لگا تو وہ ایک دم ٹوٹ گیا۔ اس نے پچھلے کمرے کی طرف جانا چاہا جہاں لڑکیاں موجود تھیں...... کم از کم چار گولیاں اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان لگیں اور وہ پٹ سے پختہ فرش پر گرا۔ اس کے گرنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ پھر بھی جیلانی نے اس تک پہنچنے کی کوشش کی، وہ اس کے ساکت جسم کو کھینچ کر کسی اوٹ میں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر ایک برسٹ آیا، جیلانی کے بازو میں دو گولیاں لگیں اور وہ تڑپ کر واپس اپنی پوزیشن پر چلا گیا۔ اگلے چند سیکنڈ میں گولیوں کی ایک باڑ نے ابرار صدیقی کو بھون کر رکھ دیا۔ اس کا جسم کئی بار فرش پر سے اچھل کر ساکت ہو گیا۔ نوادرات کے اس پاکستانی بیوپاری کی رُوداد کئی موڑ مڑنے کے بعد ایک دم اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جاوا کے خطرناک شوٹر اور سرکاری اہلکار گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں اچانک میرے پردۂ تصور پر اسی نوجوان ملنگ کا چہرہ ابھر آیا جس سے ہماری ملاقات ہارون آباد کے ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اس کا ہونق چہرہ، اس کا چربی دار برہنہ جسم، اس کی چمکیلی آنکھیں...... سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ اس کے پُراندیش الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم مرنے جا رہے ہو...... واپس چلے جاؤ تو تمہارے لئے بڑا چنگا ہے۔ یہ لڑکی مصیبت میں ہے۔ تم سب مصیبت میں آ جاؤ گے۔ تمہارے پیچھے کالے پر چھانوے ہیں۔ یہ تم کو مار دیں گے۔ تمہاری قبریں بنیں گی اور پتا نہیں قبریں بھی بنیں گی یا نہیں......'' اس نے اسی طرح کی بے سروپا

باتیں کی تھیں۔

مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرا دل چاہا، میں ثروت کو اپنے بازوؤں میں چھپاؤں اور اپنی جان پر کھیل کر اسے ہر آفت سے دور لے جاؤں۔ اگر مجھے موت بھی آئے تو اس اطمینان کے ساتھ آئے کہ ثروت محفوظ ہے اور اپنوں میں ہے۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ عمران اور اس کے ساتھی بھرپور جواب دے رہے تھے۔ زخمی جیلانی سمیت یہ سب کے سب بے حد تربیت یافتہ اور نڈر لوگ تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے، عمران جیسا بندہ ان کو کمانڈ کر رہا تھا۔ وہ تو مردہ دلوں میں جان ڈال دیتا تھا، یہ تو جوش سے بھرے ہوئے ٹرینڈ شوٹرز تھے۔

دائیں طرف سے وہ لوگ خاصے قریب آ گئے تھے۔ ایک ٹولی ہم سے صرف پندرہ بیس میٹر کی دوری پر تھی۔ ان لوگوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے ہی ابرار صدیقی ''ہٹ'' ہوا تھا۔ دفعتاً ایک زوردار دھماکا ہوا۔ مختلف اشیاء کے پرخچے ہوا میں اڑتے نظر آئے۔

یہ جگت سنگھ نے اپنا ''کالا انار'' استعمال کیا تھا۔ اب وہ دوسرے کالے انار یعنی دستی بم کی پن کھینچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے روکوں یا اس کی حوصلہ افزائی کروں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ یہ بم بھی نشیب میں پھینک دیا۔ ساعت شکن دھماکے سے شعلہ نکلا اور ایک انسانی جسم ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ جگت سنگھ جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے آٹومیٹک رائفل مضبوطی سے تھامی اور اٹھنا چاہا۔ وہ سارے اندیشے ایک طرف رکھ کر حملہ آوروں کی طرف لپکنا چاہ رہا تھا۔ یہ دلیری نہیں حماقت تھی...... دیوانہ پن تھا۔ میں نے جگت کا بازو جکڑ لیا۔ ''نہیں جگت! نیچے بیٹھو...... نیچے بیٹھو۔'' میں دہاڑا۔

ایک گولی آئی اور جگت کے سر کے پاس سے گزر گئی۔ میں نے کھینچ کر جگت کو نیچے بٹھا دیا۔ وہ سینے کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا، للکار رہا تھا۔ ''مار دوں گا...... فنا کر دوں گا...... فنا کر دوں گا۔''

اس کا جوش دیدنی تھا۔ پھر اس غیر معمولی جوش کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ جگت کے پھینکے ہوئے دوسرے دستی بم کے دھماکے میں، مَیں نے جس انسانی جسم کو ہوا میں اچھلتے دیکھا، وہ اب ایک لاش کی صورت ہم سے دس بارہ میٹر کی دوری پر پڑا تھا۔ اس لاش کی گردن پر سے کوئی آدھ کلو گوشت غائب تھا۔ انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اس کی غیر معمولی چوڑی ناک سے پہچانا۔ یہ پریم چوپڑا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے لنگڑی پورہ میں آشا کور کو کمرے میں لے جا کر بے آبرو کیا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر وہ اس کی مجبوری سے کھیلا تھا

اور بعدازاں وہ جاوا کی فائرنگ سے جان کی بازی ہار گئی تھی۔

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ جگت سنگھ نے اچانک اوپر تلے دو دستی بم کیوں پھینک دیئے تھے۔ اس نے آشا کی عزت اور جان کے ہتھیارے کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ برداشت نہیں کر پایا تھا۔ ابھی تو میں نے اسے پکڑ کر روک لیا تھا ورنہ وہ پتا نہیں مزید کیا کر گزرتا۔

''اچھا کیا جگت سنگھ۔'' میں نے رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب ذرا تحمل سے کام لو۔ ممکن ہے کہ کچھ دیر بعد ان دستی بموں کی اور زیادہ ضرورت ہو۔''

میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور ہمیں اپنی پوزیشنوں پر دبکنا پڑا۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ فائرنگ کا زاویہ اب بدل گیا ہے اور پہلے کی طرح ہمارے لئے زیادہ خطرناک نہیں رہا۔ اس کی وجہ جگت کے پھینکے ہوئے دو دستی بم ہی تھے۔ ان دو دھماکوں کے بعد آگے بڑھ آنے والے مدِمقابلوں کو اب کافی پیچھے ہٹنا پڑ گیا تھا۔ تاہم انہوں نے ہمارے گرد اپنا گھیرا ٹوٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اردگرد کی سب روشنیاں آن کر دی تھیں اور اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے بھی مدد لے رہے تھے......

یقیناً دو تین منٹ بعد یہ لوگ نئی صف بندی کے ساتھ پھر زوردار حملہ کرنے والے تھے۔ اپنے قریبی ساتھی کی موت نے یقیناً جاوا کو بھی شعلہ جوالا بنا دیا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے نصیر احمد کی طرف دیکھا۔

''ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں جی۔ ہم نکل جائیں گے۔''

''کیسے؟''

''ایک راستہ ہے یہاں۔ یہ پیچھے آپ جو پیالا سا دیکھ رہے ہیں نا، یہ سائیکل ریس کا اسٹیڈیم ہے۔ میں کالج کے زمانے سے جانتا ہوں اس جگہ کو۔ اس اسٹیڈیم میں داخل ہونے کے لئے ''سائیکلسٹ'' ایک سرنگ میں سے گزر کر آتے ہیں۔ یہ سرنگ آج کل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور بند پڑی ہے۔ یہ ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع دے سکتی ہے۔''

''کتنی لمبی ہے؟ میرا مطلب ہے گھیرے سے نکل سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ضرور نکال دے گی جی۔ لیکن ایک مسئلہ ہوگا۔ ہماری گاڑیاں تو یہاں احاطے میں ہیں۔''

ہم بڑی پلاننگ سے پیچھے ہٹے۔ تین چار رائفل بردار پوزیشن بدل بدل کر زوردار فائرنگ کرتے رہے۔ ہم نیچے آ گئے۔ پورب کمار اور ابرار صدیقی کی لاشوں کو وہیں پر چھوڑنا

دل و دماغ پر بہت گراں گزرا لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ عورتوں کو اپنے درمیان رکھتے ہوئے ہم اسٹیڈیم کی سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ عمران کے ساتھ اپنی گاڑیوں میں سے کچھ ایمونیشن نکالنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

عمران نے موبائل پر جگت سنگھ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ''دو گرینیڈ پھینکو اور پوزیشنیں چھوڑ کر نیچے بھاگ آؤ۔''

''جو حکم سرکار۔'' جگت سنگھ کی آواز ابھری۔

چند ہی سیکنڈ بعد دو کے بجائے تین زوردار دھماکے ہوئے جنہوں نے گھیرا ڈالنے والوں میں کھلبلی سی مچا دی۔ جگت سنگھ نے ایک بم اضافی پھینکا تھا۔ دستی بم تو اس کے ہاتھ میں آ کر جیسے خود ہی بلاسٹ کے لئے مچلنے لگتا تھا۔ میں نے اسپورٹ کمپلکس کی ایک کھڑکی میں سے دیکھا، جاوا گروپ کی ایک جیپ کو آگ لگی ہوئی تھی۔ جگت سنگھ اور باقی شوٹر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے اور ہمارے ساتھ اس تاریک زمین دوز راستے میں داخل ہو گئے۔ اس راستے کو ڈھلوان بنایا گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ سائیکلسٹ اسٹیڈیم میں داخل ہوتے وقت رفتار پکڑ سکیں۔ راستے کی چھت کئی جگہ سے بیٹھ چکی تھی۔ یہاں جھاڑ جھنکار تھا اور آوارہ جانوروں کی غلاظت تھی۔ عمران کے پشتی تھیلے میں سے ایک بڑی ٹارچ نکل آئی تھی۔ ایک ٹارچ قربان علی کے پاس بھی تھی۔ ہم ان کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔

میڈم صفورا کو عمران نے ایک پستول دے دیا تھا۔ خواتین میں وہ سب سے زیادہ حوصلے میں تھی۔ وہ بار بار ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''صدیقی کہاں ہے تابش؟''

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ زخمی ہو گیا ہے میڈم...... اسے ہم نے پہلے ہی یہاں سے نکال دیا ہے۔''

''کہاں؟''

''قربان کے بندے لے گئے ہیں۔'' عمران نے بات گول کی۔

میڈم صفورا جہاندیدہ عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بہر حال، اس نازک موقعِ پر اس نے عمران سے یا مجھ سے سوال جواب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جب ہم اس زمین دوز راستے سے باہر نکلیں گے تو صورتِ حال کیا ہو گی۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں بالکل تیار حالت میں موجود تھیں۔ ہمارا واسطہ ممبئی کے ظالم ترین لوگوں سے تھا۔

ہم اس زمین دوز راستے سے باہر نکلے تو قربان علی کی فہم و فراست پر یقین کرنا پڑا۔ ہم

گھیرے سے باہر ایک محفوظ جگہ پر تھے۔ غالباً اس زمین دوز راستے والا آپشن قربان علی کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ اسی لئے یہاں رکتے وقت اس نے کہا تھا کہ رکنے کے لئے ایک بہت مناسب جگہ اس کے ذہن میں ہے۔

درختوں کے درمیان سے سامنے ایک سڑک کے آثار نظر آ رہے تھے۔ قربان علی اور نصیر کی راہنمائی میں ہم اس سڑک کی طرف بڑھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم یہاں سے گزرنے والی ایک دو گاڑیوں کو روکیں گے۔ مگر اس سے پہلے ہی میری نظر ایک بس پر پڑ گئی۔ یہ بس سڑک کے کنارے درختوں میں کھڑی تھی۔ اس اسٹائلش بس پر ایک بینر لگا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ یہ احمد آباد یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو تفریحی دورے پر لے کر سورت آئی ہوئی ہے۔

میں نے عمران کو بتایا۔ ہم نے فوری مشورہ کیا۔ ہم سب درختوں میں دبکے رہے۔ میڈم صفورا اس بس کی طرف گئی۔ اس کی شال کے نیچے پستول موجود تھا۔

اس نے بس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر موجود افراد سے کچھ بات کی۔ دروازہ کھلا تو میڈم نے پستول نکال لیا۔ میں اور نصیر احمد بھی جھپٹ کر موقع پر پہنچ گئے۔ بس میں صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر موجود تھے۔ دونوں نیند سے جاگے تھے اور ہکا بکا ہو کر ہمارے آتشیں ہتھیاروں کو دیکھ رہے تھے۔ فربہ اندام ڈرائیور کا تعلق یقیناً ممبئی سے تھا اور لگتا تھا کہ اس نے چرس کا سوٹا وغیرہ بھی لگا رکھا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے ان کی تلاشی لی پھر ان کی مشکیں کس دیں۔ اس دوران میں لڑکیوں سمیت سب اندر داخل ہو چکے تھے۔ نصیر احمد نے ڈرائیور سے چابی لے کر بس کا انجن اسٹارٹ کر دیا لیکن لائٹس آن نہیں کیں۔ اسپورٹس کمپلیکس کی طرف تباہ ہونے والی کار کے شعلے نظر آ رہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اب اسپورٹس کمپلیکس کے اندر گھس گئے ہیں۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ وہ کسی بھی وقت ہماری جانب آ سکتے تھے۔ نصیر نے ماہرانہ انداز میں بس کو حرکت دی اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

○......❖......○

بس برق رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں ہو چکی تھی۔ یہ ایک اچھی ''رشیئن'' بس تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ، آرام دہ اور پاور فل۔

اچانک عمران کے فون پر سگنل آئے۔ اسکرین پر جاوا کا ذاتی نمبر چمکا۔ یہ الٹی گنگا بہنا شروع ہوئی تھی۔ پہلے ہم جاوا کو فون کر رہے تھے اور وہ ہمیں گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔

عمران نے کال ریسیو کی۔ جاوا بغیر کسی تمہید کے چنگھاڑا۔ ''ہیرو کے بچے! کہاں ہے

تُو؟''

''تیرا کیا خیال ہے...... مجھے کہاں ہونا چاہئے؟''

وہ دہاڑا۔''ایک بات میں تجھے بتا دوں۔ زمین کی ساتویں تہ میں بھی چلے جاؤ گے نا حرامزادو تو وہاں سے بھی کھینچ لوں گا تم سب کو۔ تمہارے لئے بڑا اچھا ہے کہ اپنے ہاتھ سے خود کو گولیاں مار لو۔ ختم کر لو جیون اپنا...... ختم کر لو...... نہیں تو موت کی بھیک مانگنا پڑے گی اور وہ ملے گی نہیں تمہیں۔'' طیش کی شدت سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

عمران نے کہا۔''ہم آتما ہتھیا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ تُو اپنی خیر منا جاداو۔ تیرا سورج غروب ہونے والا ہے۔ اگر پیچھے نہیں ہٹے گا تو پریم چوپڑے سے بری موت آئے گی تیرے حصے میں۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے فون بند کر دیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ جاداو اسے باتوں میں لگائے اور اس طرح ہماری لوکیشن کے بارے میں کوئی اشارہ اسے ملے۔

یہ تو یقینی بات تھی کہ وہ لوگ بوگیر کتوں کی طرح چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور ہماری تلاش پوری شدت سے شروع ہو گئی ہے۔ ہمارے حق میں صرف ایک ہی بات جاتی تھی، ہم پہلے والی گاڑیاں چھوڑ چکے تھے...... اور جس نئی گاڑی میں ہم تھے، اس کے بارے میں ابھی تک جاداو اور اس کے حواریوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ دن چڑھ جاتا تو یقیناً وہ قدموں کے نشان ڈھونڈتے اور اس وقت تک شاید کسی کو یہ پتا بھی چلتا کہ یونیورسٹی کی بس یہاں درختوں میں کھڑی تھی اور اب وہ اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ سورت شہر سے تین بڑی سڑکیں مختلف اطراف میں نکلتی تھیں۔ ابھی تو جاداو وغیرہ کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ہم کس رخ پر گئے ہیں۔ پندرہ بیس کلو میٹر مزید آگے جا کر ہم نے ایک اور کام کیا اور وہ یہ کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو نکالنے کے لئے بس روکی۔ ان دونوں کی مشکیں بڑی اچھی طرح کسی ہوئی تھیں اور منہ میں کپڑے ٹھسے تھے۔

ہم نے سڑک سے کافی ہٹ کر انہیں درختوں کے ایک جھنڈ میں پھینک دیا۔ قوی امید تھی کہ وہ صبح تک یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔

سب سے پہلے ہمیں بھڑوچ کے قریب ایک پولیس ناکے پر روکا گیا۔ یہاں نصیر احمد نے گاڑی کے کاغذات دکھائے۔ روٹ پرمٹ وغیرہ چیک کرایا اور بتایا کہ وہ روٹین کے مطابق سواریاں لے کر احمد آباد جا رہا ہے۔ ہمیں آگے جانے دیا گیا۔ تاہم ناکے پر غیر معمولی نفری دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ چاروں طرف گھنٹیاں کھڑک چکی ہیں اور پولیس ہائی الرٹ ہے۔

ہم تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے۔ نصیر احمد کی ڈرائیونگ زبردست تھی۔ ثروت میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بالکل چپ تھی اور اداسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ کوئی بات کرے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جب بھی کچھ کہے گی، نصرت یا پھر یوسف کے بارے میں ہی کہے گی۔ اس کے دل میں جو کچھ بھی تھا، وہ مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ چہرے سے یہی لگتا تھا کہ وہ مجھ سے اور میرے پیار سے لاتعلق ہو چکی ہے۔ اسے کوئی گناہ سمجھنے لگی ہے......

کچھ دیر بعد وہ بولی۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس نے نصرت کے بارے میں ہی پوچھا۔

''تابش! نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ کچھ پتا چلا آپ کو؟''

''نہیں ثروت! تمہیں آخری فون کب آیا تھا؟''

''آپ کے جانے کے دوسرے دن۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ہم سے فون ہی واپس لے لیا۔''

''شاید عمران کو کچھ پتا ہو۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر عمران کے پاس آ گیا۔

وہ پورب کمار کی موت پر قربان علی کو تسلی دے رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔''کیا بات ہے تابی؟'' اس نے میرے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔

''کیا کیا چھپاؤ گے عمران؟'' میں نے گھمبیر آواز میں کہا۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

میں نے قربان علی کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اٹھ کر اگلی نشستوں پر چلا گیا۔ میں نے کہا۔''عمران! نصرت کے بارے میں کیا اطلاع ہے تمہارے پاس؟''

''وہی جو تمہارے پاس ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔''بے وقوف بنا رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ساری دنیا کی عقل سمٹ کر تمہارے ہی دماغ میں آ گئی ہے...... ہر چیز کے ٹھیکیدار بن جاتے ہو تم...... تم نے بتایا کیوں نہیں کہ نصرت کی حالت اتنی خراب ہے۔ کہاں ہے وہ؟ پاکستان میں یا آسٹریا میں؟''

اس نے پلکیں جھپکا کر ذرا تعجب سے مجھے دیکھا پھر گہری سانس لی۔''مجھے لگتا ہے کہ تم نے نصیر کے کمپیوٹر سے چھیڑ چھاڑ کی ہے یا پھر......''

''کچھ بھی ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔''کہاں ہے نصرت؟''

''ابھی لاہور میں ہی ہے۔ پرسوں اسے آسٹریا شفٹ کیا جائے گا۔''

''تم نے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟''

''تم پہلے ہی ثروت کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ میں تمہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر تم کر بھی کیا سکتے تھے۔ میرے ذہن تھا کہ نصرت آسٹریا پہنچ جائے اور اس کی ٹریٹ منٹ شروع ہو جائے تو پھر تم دونوں کو بتاؤں۔''

''دیکھو، اتنی بڑی بات ہوگئی۔ اس کے جگر کی ٹرانسپلانٹیشن تک نوبت آ گئی ہے اور تم نے مجھے اور ثروت کو بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے؟''

''بے خبر نہیں رکھا ہوا...... باخبر کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو جب سے رتنا گری کے لئے روانہ ہوئے ہیں، کہیں ایک پل کی فرصت نہیں ملی۔''

''اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ یہ بتا دیتے...... اقبال اب ہم میں نہیں ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ویری سوری تابی!...... مجھے پتا ہے...... تمہیں بھی اس کا اتنا ہی خیال تھا جتنا مجھے...... بس اس کا اور ہمارا ساتھ اتنا ہی تھا۔'' عمران نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بہت گہری سنجیدگی نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

مجھے کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہم دونوں چند سیکنڈ تک بالکل گم صم بیٹھے رہے۔ اندر سے خالی اور ویران۔ آخر میں نے کہا۔ ''ایک طرف دوست بھی کہتے ہو...... دوسری طرف اتنی اہم باتیں چھپاتے ہو۔ پتا نہیں کیا مجبوریاں ہیں تمہاری یا پھر مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے ہو۔''

''نہیں تابی! بس سمجھو کہ ٹائمنگ کی تھوڑی سی گڑبڑ ہوئی ہے۔''

''یہ گڑبڑ تو اب بھی ہو رہی ہے۔ تم اب بھی مجھے اندھیرے میں رکھ رہے ہو۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری وہ کون سی بات ہے جس کا پتا جاوا کو چلا ہے...... اور جس کے بعد...... وہ ہاتھ دھو کر تمہارے بھی پیچھے پڑ گیا ہے...... اور جاوا کے ساتھ پولیس اور بی ایس ایف بھی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہو گی؟''

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، پولیس موبائل کا ہوٹر سنائی دیا۔ ہم نے مڑ کر

دیکھا۔ ریوالونگ لائٹ والی ایک موبائل برق رفتاری سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ ہوٹر کا مطلب یہی تھا کہ ہمیں رکنے کے لئے کہا جا رہا تھا۔

''ہاں جی، کیا کرنا ہے؟'' نصیر احمد نے ڈرائیونگ کرتے کرتے عمران سے پوچھا۔

''رکنا پڑے گا۔ ورنہ یہ لوگ مزید پیٹی بھائیوں کو بلا لیں گے۔'' عمران نے کہا۔

پولیس موبائل ہمارے پہلو میں آ چکی تھی۔ بائیں طرف بیٹھا ہوا باوردی آفیسر رکنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ عمران کے کہنے پر نصیر نے بس کی رفتار آہستہ کر دی اور اسے کنارے کی طرف لے آیا۔ جیلانی نے اپنا زخمی بازو چادر میں چھپا لیا۔ اسلحہ نشستوں وغیرہ کے نیچے اور دیگر محفوظ جگہوں پر چھپا دیا گیا۔ عمران نے اپنے سینے پر اخبار پھیلا لیا اور سائیلنسر لگا پسٹل اس کے نیچے رکھ لیا۔ دو مزید رائفلیں بھی پولیس والوں کا استقبال کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھیں لیکن وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔

بس رک گئی۔ نصیر احمد نے نیچے اتر کر پولیس والوں کو کاغذات چیک کرائے...... اور ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔ یہ کل تین اہلکار تھا۔ انسپکٹر ابھی تک موبائل کی اگلی نشست پر براجمان تھا۔ یہ رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی، پولیس موبائل کی اندرونی روشنی میں انسپکٹر کے کندھے کے تین پھول دمک رہے تھے۔

پلاننگ کے مطابق نصیر نے پولیس والوں کے سوالوں کے جواب دیئے اور انہیں بتایا کہ وہ سورت سے روٹین کی سواریاں لے کر براستہ بھڑوچ، احمد آباد جا رہا ہے۔

سواریوں والا دروازہ کھلوا کر دونوں پولیس والے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے ہی پیچھے فربہ اندام انسپکٹر بھی چلا آیا۔ وہ بس کی تلاشی لینے لگے۔ ان کے حکم پر نصیر نے بس کی اندرونی روشنیاں جلا دیں۔ وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے اور سوال پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے جگت سنگھ پر خصوصی توجہ دی۔ ''کہاں سے آئے ہو؟'' انسپکٹر نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''سورت سے۔ میں مزدوری کردا ہوں جی۔ وہاں احمد آباد میں میرا چھوٹا بھرا کرشنا گڈیوں کی مرمت شرمت کرتا ہے۔ اس کے گھر کا کاہوا ہے۔ ودھائی دینے جا رہا ہوں......''

''شناختی کارڈ''

''شناختی کارڈ تو نہیں ہے جی اس ویلے۔ لائسنس ہے۔'' جگت سنگھ نے ایک پھٹا پرانا لائسنس دکھایا۔ یہ ڈرائیونگ لائسنس تھا اور یقیناً جگت کا اپنا نہیں تھا۔ پولیس والا پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا، بہرحال اس نے جامہ تلاشی کے بعد جگت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میڈم صفورا سے بھی سوال جواب کئے گئے۔ باقی لڑکیاں اپنے منہ، لپیٹے بیٹھی تھیں۔ ان

کے چہروں کا بہت تھوڑا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایشوریا رائے کی تو بس آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ تلاشی اور پوچھ گچھ کے بعد پولیس والے گاڑی سے اتر گئے لیکن انسپکٹر اترتے اترتے رک گیا۔ اسے عمران پر کچھ شک ہوا تھا۔ وہ واپس آیا۔ عمران نے اخبار گود میں رکھ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''تمہارا شبھ نام؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''وجے کمار۔''

انسپکٹر نے مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے اپنا موبائل فون نکالا اور ذرا رخ پھیر کر اس میں کچھ دیکھنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کیمرے کے آپشن میں جا کر فوٹو البم چیک کر رہا ہے۔ شاید اس البم میں عمران کی تصویر موجود تھی۔ چند سیکنڈ بعد انسپکٹر نے پلٹ کر عمران کو دیکھا...... تب پھر سے موبائل فون کی اسکرین کو گھورا۔ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ میں نے دیکھا، انسپکٹر نے اپنا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھایا ہے......

ایک سیکنڈ بعد سرکاری پستول اس کے ہاتھ میں آنے والا تھا...... لیکن یہ سیکنڈ انسپکٹر کے لئے بہت طویل ثابت ہوا۔ اخبار کے نیچے سے عمران کے سائیلنسر لگے پسٹل نے ٹھک سے گولی اگلی اور انسپکٹر اپنے دل کو تھامتا ہوا زخمی جیلانی کے اوپر گرا۔ عمران کی چلائی ہوئی دوسری گولی نے اے ایس آئی کی پیشانی پر موت کی سرخ بندیا لگا دی۔ دوسرا شخص جو رائفل مین تھا اور بالکل نوجوان تھا، بس کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے پھرتی سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ صفورا نے اس کے راستے میں ٹانگ اڑائی اور وہ اوندھے منہ نشستوں کے درمیانی راستے میں گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ عمران نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا۔ ''بھگوان کے لئے نہیں...... مجھے مت مارو۔'' وہ ہکلایا۔

''تم جھوٹے پولیس مقابلوں میں بے گناہوں کو مار دیتے ہو، یہ تو سچا مقابلہ ہے۔'' عمران نے بے رحم لہجے میں کہا اور دو دفعہ ٹریگر دبا کر اس تیسرے اہلکار کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔

ثروت قتل و غارت کی اس صورتِ حال پر ششدر تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں تھا لیکن آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سرتاپا خوف کے نرغے میں ہے۔ ایشوریا سمیت تینوں لڑکیوں کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

''کیا خیال ہے عمران! ان کی لاشیں ان کی گاڑی میں ہی نہ ڈال دی جائیں؟'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''مناسب خیال ہے۔'' وہ بولا۔ اس نے نصیر سے کہا کہ وہ بس چلا کر چالیس پچاس میٹر آگے درختوں میں لے جائے۔

نصیر نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ میں بس سے نیچے اترا اور پولیس موبائل کو اسٹارٹ کر کے بس کے قریب لے گیا۔ تاریکی ہماری مدد کر رہی تھی۔ ہم نے تینوں لاشیں بس سے نکال کر پولیس کار میں رکھ دیں۔ ہم نے انہیں نشستوں پر اس طرح بٹھا دیا کہ وہ کار کے اندر ہی آرام کرتے نظر آ رہے تھے۔ عموماً پیٹرولنگ پولیس اسی طرح گاڑی کسی کنارے پر لگا کر ستا لیا کرتی ہے۔ خاص طور سے انسپکٹر کو دیکھ کر تو بعین یہی لگ رہا تھا کہ اخبار پڑھتے پڑھتے اسے چہرے پر پھیلا کر سو گیا ہے۔

بس آگے روانہ ہو گئی۔ عمران کے ساتھیوں نے بڑی تیزی کے ساتھ بس کے فرش کو خونی آلائشوں سے صاف کر دیا۔ انسپکٹر کا موبائل فون اور سب انسپکٹر کا وائرلیس سیٹ ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وائرلیس پر مسلسل پیغامات نشر ہو رہے تھے۔ ان پیغامات سے ہمیں کچھ مدد بھی ملی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ احمد آباد کے قریب مین روڈ پر ایک دو سخت ناکے لگے ہوئے ہیں۔ نصیر احمد اور قربان علی نے مشورہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ ہم ایک دوسرا راستہ استعمال کریں گے۔ یہ سڑک ذرا طویل تھی لیکن یہاں خطرہ کم تھا۔ اس راستے پر پہنچنے کے بعد ہم نے پولیس والوں کا وائرلیس اور موبائل سیٹ دونوں بند کر دیئے۔

میں قریب سے گزرا تو ثروت نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''نصرت کا کچھ پتا چلا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے پھر آسٹریا لے جانا پڑے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ثروت! عمران بتا رہا ہے کہ وہ کھا پی رہی ہے اور خود چل کر واش روم تک جاتی ہے...... اور......''

''او گاڈ۔'' ثروت نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ ''میرا دل کہتا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر اسے آسٹریا لے جا رہے ہیں تو پھر...... وہ ٹھیک تو نہ ہوئی۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں خود پوچھتی ہوں عمران صاحب سے۔''

عمران، قربان علی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مشورے میں مصروف تھا۔ میں نے ثروت کو کھینچ کر واپس بٹھا لیا۔ ''پلیز ثروت! ذرا حوصلے سے کام لو۔ ہمیں سب سے پہلے تو خود موت کے اس گھیرے سے نکلنا ہے، تب ہی نصرت یا کسی دوسرے کے لئے کچھ کر پائیں گے۔''

ایک بار پھر پولیس کی موبائل کاروں کے منحوس ہوٹر سنائی دیئے۔ ہم سب چونک کر عقب میں دیکھنے لگے۔ نیلے اور سرخ رنگ کی ریوالونگ لائٹس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ دو

کاریں ہیں۔

''لگتا ہے، کار میں پولیس والوں کی لاشیں دیکھ لی گئی ہیں۔'' جیلانی نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال، اب رکنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر یہ لوگ فائرنگ کر کے ہمیں روکنا چاہیں تو فوراً جوابی فائرنگ کی جائے۔'' عمران نے کہا۔

''اور بڑی کڑاکے کی فائرنگ ہونی چاہئے۔'' جگت سنگھ نے لقمہ دیا۔ ''چھاننی کردو ان کتوں کی گڈیاں۔''

''جگت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بس کا ٹائر برسٹ ہوگیا تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' عمران نے تائید کی۔

لڑکیاں سہم گئی تھیں۔ صرف میڈم صفورا اور ڈاکٹر مہناز کچھ حوصلے میں تھیں۔ عمران نے انہیں ہدایت کی کہ اگر فائرنگ شروع ہوجائے تو وہ نشستوں پر نہ رہیں بلکہ بس کے فرش پر بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں۔ ثروت نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ناخن جیسے میرے بازو کے گوشت میں پیوست ہوتے چلے جارہے تھے۔ میں نے اسے دلاسا دے کر خود سے جدا کیا اور بس کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ یہاں عمران کے شوٹر ہر صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ یہ زبردست پروفیشنل لوگ تھے۔ ان کے چہرے چٹانوں کی طرح سخت نظر آ رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیاں شور مچاتی ہوئی بالکل قریب پہنچ گئیں۔ جگت سنگھ فائرنگ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے اسے روکا۔ غالباً عمران بھی یہی چاہتا تھا کہ فائرنگ میں پہل نہ کی جائے۔ ہم نے تحمل سے کام لیا۔ ہمارا یہ تحمل سودمند رہا۔ گاڑیاں شور مچاتی بس کے پہلو میں پہنچ چکی تھیں۔ ہم نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں اور نگاہیں گاڑیوں پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً ہمیں اندازہ ہوا کہ پولیس کی یہ گاڑیاں ہمیں اوورٹیک کر کے آگے جارہی ہیں...... اور ہم سے انہیں کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔

اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں صورتِ حال مزید واضح ہوگئی۔ پولیس کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ جگت سنگھ نے بلند آواز میں کہا۔ ''سجن جی! لگتا ہے یہ شکاری کتے تو کسی ہور شکار کے پیچھے ہیں۔''

''چلو بچ گئے بے موت مرنے سے۔'' قربان علی نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''کبھی کبھی انتظار کرنے میں فائدہ ہوتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

گاڑیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکی تھیں۔ میڈم صفورا کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ بار بار ٹشو سے ان کی نیم صاف کرنے لگتی تھی۔ ابرار صدیقی کی موت کا دکھ تو ہم سب کو ہی تھا

لیکن صفورا نے اس دکھ کو زیادہ محسوس کیا تھا۔ ابرار صدیقی سے میڈم کا پرانا تعلق تھا اور وہ اس کا ہم مزاج کاروباری پارٹنر رہا تھا۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ سے چند ماہ پہلے ہماری ہی طرح بچ کر نکل آیا تھا لیکن مورتی کی نحوست اپنے ساتھ لے آیا تھا اور آج رات یہی نحوست اس کی جان لے گئی تھی۔ ہمیں افسوس تھا کہ ہم ابرار اور پورب کمار کی لاشوں کو اسپورٹس کمپلیکس میں چھوڑ آنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

جیلانی درد سے کراہ رہا تھا۔ مہناز تندہی سے اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ وہ ایک ہمدرد لڑکی تھی۔ اپنے مریض کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھنے لگی تھی۔ بابے جلالی کی مثال ہمارے سامنے تھی۔ بابے جلالی جیسے بوڑھے اور غصیلے شخص کے لئے ڈاکٹر مہناز نے بے مثال وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا اور اس سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لئے بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ اب پھر اسے امید تھی کہ وہ اپنے شوہر سہراب جلالی سے مل سکے گی۔ اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ گو مطلع گردآلود تھا اور جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ہم گاندھی نگر کی وسیع آبادی کو ہائی پاس کرتے ہوئے شمال مغرب کی طرف بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ہماری منزل تھرپارکر کا سرحدی علاقہ تھا۔ عمران کا کہنا تھا کہ ہم بارڈر کے ایک خاص پوائنٹ سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں اور پاکستانی علاقے میں داخل ہوسکتے ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی اسی طرح کئی مصیبت زدہ پاکستانیوں کو انڈیا کی حدود سے نکال کر حفاظت سے پاکستانی سرزمین تک پہنچا چکا تھا۔ تھرپارکر کا یہ راستہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا دیکھا بھالا تھا۔ عمران نے مجھے وضاحت سے نہیں بتایا تھا لیکن یہاں اس کے کچھ ایسے سورسز موجود تھے جو اس کی مدد کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ میں نے عمران سے جتنی بار پوچھا، اس نے یہی کہا۔ ''ہم بارڈر کے قریب پہنچ گئے تو پھر یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' اس کے لہجے میں ہر بار بلا کا اعتماد نظر آیا تھا۔

سڑک زیادہ اچھی نہیں تھی مگر نصیر احمد نے پھر بھی اسپیڈومیٹر کی سوئی ستر اسّی کلومیٹر فی گھنٹا سے نیچے نہیں آنے دی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمیت چاروں لڑکیاں بار بار عمران سے سوال کرتی تھیں کہ بس کب تک پاکستانی علاقے میں پہنچ جائے گی۔ عمران ہر بار بڑی تسلی سے انہیں جواب دیتا تھا اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اندرونی طور پر وہ بھی بے حد تناؤ میں ہے۔ جاوا جیسا شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور اسے قانون نافذ کرنے والوں کی پوری آشیرباد بھی حاصل تھی۔ یہ یک طرفہ تماشا تھا۔ انڈیا کا بدنام زمانہ قانون شکن جاوا...... قانون کے محافظوں کے کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

ڈاکٹر مہناز اپنے ساتھ کچھ سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ ممبئی سے ہی لے کر آئی تھی......

ظاہر ہے ان اشیاء کا انتظام نصیر احمد نے ہی کیا ہوگا۔ ابرار صدیقی چونکہ سبزی خور ہوگیا تھا اس لئے اس کے واسطے چکن کے بجائے ویجی ٹیبل رول تھے لیکن یہ رول کھانے کے لئے ابرار ہمارے ساتھ موجود نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس وقت اس کی لاش کی نمائش ممبئی کے مختلف ٹی وی چینلز پر کی جارہی ہو۔

اپنا انرجی لیول برقرار رکھنے کے لئے ہم نے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر مہناز کے اصرار پر لڑکیوں نے بھی چند نوالے لئے لیکن ثروت کچھ نہیں لے سکی۔ نصرت کی شدید علالت کی خبر نے اسے بالکل نیم جان کر ڈالا تھا۔ میرے ڈانٹنے پر اس نے بس ایک جوس کے چند گھونٹ لئے۔ میں اسے جوس پلانے میں کامیاب ہوا تو عمران نے ثروت کی نظر بچا کر اپنا انگوٹھا کھڑا کیا اور مجھے ویلڈن کا اشارہ دیا۔

ہم سائل پور کے قریب پہنچنے والے تھے جب ہمیں ایک اور ناکے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کافی بڑا ناکا تھا اور ایک موڑ مڑنے کے بعد اچانک ہی ہمارے سامنے آگیا تھا۔ اب ہمارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ بس کا روٹ پرمٹ ہماری موجودہ لوکیشن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس پرمٹ کے مطابق ہمیں احمد آباد سے آگے نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس ناکے پر باقاعدہ بانس کی رکاوٹ تھی اور اردگرد پولیس اور بی ایس ایف والوں نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ کسی بھی مفرور کا تعاقب کرنے کے لئے ایک چوکس گاڑی بھی موقع پر موجود تھی۔ اس پر لگی ہوئی M16 ٹائپ مشین گن ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا آرڈر ہے جی! رکنا ہے یا نہیں؟'' نصیر احمد نے پوچھا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد عمران نے کہا۔ ''روکو۔''

نصیر احمد نے گاڑی روک دی۔ اہلکار عقابی نظروں سے جائزہ لینے لگے۔ کچھ اہلکار ایک دوسری کار کے اندر گھس کر اکھاڑ پچھاڑ کر رہے تھے۔ ایک آفیسر کے اشارے پر نصیر احمد نیچے اترا اور کاغذات چیک کرائے۔ وہی مسئلہ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آفیسر نے روٹ پرمٹ طلب کیا۔ ظاہر ہے پرمٹ نہیں تھا۔

عمران کے اشارے پر قربان علی نیچے اترا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ آفیسر سے بات کی اور اس سے اپنا تعارف مہاراشٹر کی ایک معروف سیاسی شخصیت کے سیکرٹری کے طور پر کرایا۔ اس نے آفیسر کو کوئی کارڈ بھی دکھایا۔ آفیسر نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پوچھا ''کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟''

''کھنہ شوگر مل جناب! کھنہ صاحب کو فوری بھرتی چاہئے۔ یہ بندے مل کی ملازمت کے

لئے جارہے ہیں۔ آج سہ پہر تین بجے انٹرویوز ہیں جی ان کے۔ ان میں سات ناریاں ہیں، باقی مرد ہیں۔ بس ایمرجنسی سمجھیں جی......''

''اچھا، آپ گوپال کھنہ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو اپنے بھی بڑے اچھے سجن ہیں، ان سے بات کر لیتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی انہوں نے مجھے اپنا سیل نمبر عنایت فرمایا ہے۔''

قربان علی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کنکھیوں سے نصیر کی طرف دیکھا۔ بی ایس ایف کے آفیسر نے جیب سے سیل فون نکال کر کال ملانا شروع کر دی۔ اب کسی بھی وقت ہمارا پول کھل سکتا تھا۔

کافی دیر بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ آفیسر نے دوسری دفعہ ٹرائی کی۔ ہمارے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے۔ یہ دوسری کوشش بھی ناکام رہی۔ ''شاید فون ان کے پاس نہیں ہے۔'' آفیسر نے کہا اور اپنا فون یونیفارم کی چیسٹ پاکٹ میں رکھ لیا۔

ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس اطمینان کی عمر زیادہ طویل نہیں تھی۔ اچانک آفیسر کی پاکٹ میں رکھا ہوا موبائل بول اٹھا۔ گوپال کھنہ نامی شخص نے ''کال بیک'' کی تھی۔

''ہیلو کھنہ صاحب! کیا حال ہے...... کہاں تھے جناب؟''

جواب میں کچھ کہا گیا جسے سننے کے بعد آفیسر نے کہا۔ ''کچھ مہمان آرہے ہیں جی آپ کے پاس...... احمد آباد سے۔''

دوسری طرف سے غالباً حیرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اب مزید تاخیر نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ نصیر احمد پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ قربان علی بھی گھوم کر بس کے اندر آ گیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ نصیر نے کلچ چھوڑ کر ایکسلریٹر دبایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ٹائر گھومے اور چرچراہٹ کی بلند آواز پیدا ہوئی۔ فون سننے والا آفیسر چلایا۔ ''روکو، ان کو روکو۔''

میں نے دیکھا، سیکیورٹی فورس کے دو اہلکاروں نے بس کے ٹائروں کی طرف رائفلیں سیدھی کیں۔ میں نے اندھا دھند برسٹ چلایا۔ بس کے شیشے چکنا چور ہوئے اور دونوں اہلکار شدید زخمی ہو کر گرے۔ دوسری طرف عمران نے اس کیپٹن کو نشانہ بنایا جو نصیر پر اپنے سروس پسٹل سے فائر کرنا ہی چاہ رہا تھا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور وہ اپنے سارے کروفر سمیت اپنی جیپ کے بونٹ سے ٹکراتا ہوا زمین پر گرا۔

''فرش پر لیٹ جاؤ۔'' میں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر چلایا اور ثروت کو اپنے ہاتھ سے فرش پر گرا دیا۔

ناکے والوں نے بانس نیچے گرا دیا تھا اور بڑی پھرتی سے تین چار تارکول سے بھرے ڈرم بھی آگے کر دیئے تھے۔ نصیر رکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اس نے اپنا ارادہ پورا کر دکھایا۔ وہ خود تو نیچے جھک گیا مگر اسٹیئرنگ کو سیدھا رکھ کر رفتار بڑھاتا چلا گیا...... ہم پر رائفلیں سیدھی ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک اور برسٹ چلایا اور پھر خود کو اوندھے منہ بس کے فرش پر گرا دیا۔

بس رکاوٹوں سے ٹکراتی اور انہیں توڑتی ہوئی نکل گئی۔ درجنوں گولیاں اس کی باڈی میں پیوست ہوئیں۔ کئی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے۔ ہم میں سے ایک کے سوا باقی سب فرش پر لیٹ گئے تھے۔ یہ شخص بدستور کھڑا رہا تھا اور اس نے جوابی برسٹ بھی چلائے تھے۔ یہ جگت سنگھ تھا۔ وہ جاوا اور اس کی سات پشتوں کو پنجابی کی چنی ہوئی کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس بس میں ہمارے ساتھ خواتین بھی موجود ہیں۔ اس کا جوش اور غیظ وغضب دیدنی تھا۔

بس میں عجیب سی تھرتھراہٹ جاگ گئی تھی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے نصیر سے پوچھا۔

''لگتا ہے کہ پچھلے ٹائر میں گولی لگ گئی ہے۔'' اس نے بری خبر سنائی۔

کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ ٹائروں کے جوڑے میں سے گولی ایک ٹائر میں لگی ہے...... دوسرا محفوظ ہے اور گاڑی کو رواں رکھے ہوئے ہے۔ میں التحیات کے انداز میں فرش پر بیٹھا تھا۔ آٹومیٹک رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ثروت تعجب سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھی...... آپ کتنے بدل گئے تابش۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے ہاتھوں میں پھولوں، نظموں اور تصویروں کے بجائے رائفل ہوگی اور آپ اپنے ہی جیسے انسانوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں گے۔

ہمارے پیچھے دو گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ وہ تیزی سے درمیانی فاصلہ کم کر رہی تھیں۔ ان کا نزدیک آنا ٹھیک نہیں تھا۔ بس کی پچھلی اسکرین ٹوٹ چکی تھی۔ عمران نے تین شوٹرز کو وہاں مقرر کر دیا۔ ان میں سے ایک کے پاس اسنیپر گن بھی موجود تھی۔ عمران نے انہیں ہدایت کی۔ ''گاڑیوں کو جتنی دور رکھ سکتے ہو رکھو۔''

شوٹرز نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ وہ مسلسل فائرنگ کرنے لگے۔ اسنیپر گن نے کام دکھایا۔ بی ایس ایف کی اگلی جیپ نشانہ بنی۔ ہم نے اسے سڑک سے اترتے اور پھر کسی درخت سے ٹکرا کر آگ پکڑتے دیکھا۔ یہ منظر ہم نے کافی فاصلے سے دیکھا...... شاید ایک کلو

میٹر دور سے۔ اس دوران میں ہماری بس تک کوئی گولی نہیں پہنچی۔ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کے پاس فی الوقت کوئی دور مار ہتھیار نہیں ہے۔ اگر انہوں نے اکا دکا فائر کیئے بھی تھے تو وہ ہمیں نقصان پہنچانے میں بالکل ناکام رہے تھے۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ نصیر احمد بس ڈرائیو کرتے ہوئے ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ میں نشستوں کے درمیان سے گزر کر اس کے پاس پہنچا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نصیر؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ آواز میں تکلیف کا اظہار تھا۔

میں نے آگے جھک کر دیکھا، اس کا دایاں پہلو خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ جس وقت اس نے ناکے کی رکاوٹوں کو توڑا تھا، اسے گولی لگ گئی تھی۔ ''عمران۔'' میں نے پکار کر کہا۔

عمران اور ڈاکٹر مہناز دونوں میری طرف لپک آئے۔ ''نصیر زخمی ہے۔'' میں نے اطلاع دی۔

''کوئی بات نہیں سر! میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

وہ کہہ تو رہا تھا لیکن اس کی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی۔ دوسری طرف ہم بس روکنے اور ڈرائیور تبدیل کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارا تعاقب ہو رہا تھا اور تعاقب کرنے والے لحہ بہ لحہ قریب پہنچ رہے تھے۔ انہیں دور رکھنے کے لئے عمران کا شوٹر گاہے بگاہے اسنیپر گن سے فائر کر رہا تھا۔ مگر ایمونیشن محدود تھا، وہ بہت زیادہ فائر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ''مہناز! آپ نصیر کے پاس ہی بیٹھ جائیں۔ فی الحال اس کا خون روکنے کی کوشش کریں۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

مہناز اپنا سامان لے کر نصیر احمد کے پاس بیٹھ گئی اور قینچی سے اس کی قمیص کاٹ کر زخم کو دیکھنے لگی۔ گولی نصیر کے پیٹ میں گئی تھی اور وہ شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

''کتنے راؤنڈ رہ گئے ہیں؟'' عمران نے اسنیپر گن والے سے پوچھا۔

''بس آٹھ جی۔''

''ٹھیک ہے، دھیان سے استعمال کرو۔''

یہ اسنیپر بہت فائدہ دے رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے ہم سے فاصلہ رکھنے پر مجبور تھے۔ وہ قریب آجاتے تو بہ آسانی بس کے ٹائروں کو نشانہ بناتے۔ ٹائر نشانہ بنتے تو اتنی رفتار سے چلتی بس کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ وہ یقیناً کسی خوفناک حادثے کا شکار ہوتی۔

گردآلود جھکڑ چل رہے تھے۔ ہمارے اردگرد جوار اور باجرے کے کھیت تھے۔ کہیں کہیں دور کھیتوں میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ کوئی اونٹ بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ ہم بتدریج بارڈر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ جگت سنگھ بدستور کھڑا تھا۔ جب سے بس روانہ ہوئی تھی، وہ ایک لمحے کے لئے بھی بیٹھا نہیں تھا۔ سامنے دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چلا اٹھا ''بادشاہ زادے! آگے دیکھ کتوں نے رستہ بند کیتا ہویا ہے۔''

میں نے دیکھا، تقریباً 300 میٹر دور ایک بیل گاڑی اور ایک جیپ کو سڑک کے درمیان لاکر راستہ بلاک کردیا گیا تھا۔ اردگرد بی ایس ایف والوں کی وردیاں نظر آ رہی تھیں۔

''جانے دو۔'' عمران نے کہا۔

عمران نہ بھی کہتا تو نصیر رکنے والا نہیں تھا۔ اس نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ ہم نیچے جھک گئے اور مختلف چیزوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ میں نے ثروت کو اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ بس کو زوردار جھٹکا لگا۔ وہ ایک دھماکے کے ساتھ رکاوٹوں سے ٹکرائی۔ ونڈ اسکرین چکنا چور ہوگئی۔ میں نے چارے سے لدی ہوئی بیل گاڑی کو الٹ کر کھیتوں میں گرتے دیکھا...... گاڑی پر فائرنگ ہوئی، جواب میں عمران کے شوٹرز نے بھی بھرپور جواب دیا۔ کوشش کے باوجود نصیر گاڑی کو سڑک پر نہ رکھ سکا۔ وہ کچے میں اتر گئی اور بے تحاشا اچھلنے لگی۔ عمران نے نصیر کی مدد کرتے ہوئے بمشکل گاڑی کو دوبارہ سڑک پر چڑھایا۔ نصیر کا زخم ایک دم کھل گیا اور خون تیزی سے بہنے لگا۔ مہناز نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''قاسم! تم گاڑی ڈرائیو کرو۔'' عمران نے ایک شوٹر کو ہدایت جاری کی۔

''یس سر۔'' وہ سینہ تان کر بولا۔

گاڑی کو روکے بغیر نصیر کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹایا گیا اور قاسم نامی نوجوان کو بٹھا دیا گیا۔ آندھی کے جھکڑ اب آزادانہ گاڑی کے اندر گھس رہے تھے۔ بیشتر کھڑکیوں کے علاوہ ونڈ اسکرین بھی تقریباً ناپید تھی۔

ڈاکٹر مہناز کے کہنے پر زخمی نصیر احمد کو نشستوں کے درمیانی راستے پر لٹا دیا گیا۔ اس کے جسم کا خون نچڑتا چلا جا رہا تھا۔ قربان علی نے آنکھوں سے ٹیلی اسکوپ لگا رکھی تھی۔ وہ بولا۔ ''کم از کم چار گاڑیاں پیچھے آ رہی ہیں۔ دو پولیس کی ہیں، دو بی ایس ایف کی۔''

''اسنیپر گن کی وجہ سے وہ دور ہیں۔ اسنیپر کے کتنے راؤنڈ رہ گئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''صرف چار جی۔''

''اب ذرا وقفہ دو۔ ہمیں ان گولیوں کی سخت ضرورت ہے۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن وہ قریب آتے جائیں گے۔'' گن مین نے کہا۔

''یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔''

اگلا آدھ گھنٹا کافی اعصاب شکن تھا۔ تعاقب والی گاڑیاں قریب آ جاتی تھیں تو اسنیپر گن سے راؤنڈ چلانا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک فائر میں بی ایس ایف کی ایک اور جیپ نشانہ بنی اور سڑک سے اتر کر کپاس کے کھیتوں میں گھس گئی۔ سارے راؤنڈ فائر ہوگئے تو تعاقب کرنے والوں کو زیادہ فاصلے پر رکھنا ناممکن ہوگیا۔ گن مین کے حساب سے ایک راؤنڈ باقی تھا لیکن وہ فائر ہوگیا تھا یا پھر کہیں لڑھک کر نشستوں کے نیچے چلا گیا تھا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ اب ہم نے آٹومیٹک رائفلوں سے فائرنگ شروع کی لیکن یہ فائرنگ بھی کفایت شعاری سے ہی کرنا پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف سے اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک مجھے لگا کہ ہماری بس بری طرح لہرا رہی ہے۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ''تابی! قاسم کو دیکھو۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور قاسم اسٹیئرنگ وہیل پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان قمیص سرخ ہو چکی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ سے زیادہ دور نہیں تھا، میں نے لپک کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میڈم صفورا اور جگت سنگھ میری مدد کو آئے۔ ہم نے بس کو مکمل طور پر روکے بغیر مُردہ قاسم کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا لیا...... اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ڈرائیونگ سنبھال لوں۔ میں اس خون آلود سیٹ پر بیٹھا اور بس ڈرائیو کرنے لگا۔ اتنی بھاری گاڑی چلانے کا مجھے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مگر جو حالات تھے، ان میں کسی منصوبہ بندی کے بغیر ہی سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ثروت کا چہرہ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ڈرائیونگ سیٹ ''خونی سیٹ'' بنی ہوئی ہے۔ پہلے نصیر احمد گولی کا شکار ہوکر یہاں سے اٹھا تھا پھر قاسم کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ اب میں یہاں بیٹھا تھا۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ تعاقب کرنے والی گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ کافی نزدیک بھی آ گئے تھے۔ ہم سائل پور کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب رخ بارڈر کی طرف تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ مسلسل ہمیں کچوکے لگا رہا تھا۔ بس کے پچھلے حصے میں گولیوں کی ایک بوچھاڑ لگی۔ پہلے دائیں طرف کے ٹائر دھماکے سے پھٹے۔ اس کے بعد سارا بوجھ بائیں جانب کے اکلوتے ٹائر پر پڑا اور وہ بھی برسٹ ہوگیا۔ ثروت سمیت لڑکیاں چلا اٹھیں۔ اب بس کو بری طرح دھچکے لگ رہے تھے۔ میں بس کو اسی طرح دوڑاتا چلا جا رہا تھا

مگر رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ اس بدترین صورتِ حال میں مثبت پہلو صرف یہی تھا کہ دونوں عقبی ٹائر برسٹ ہوئے تھے اور بس کے الٹنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ بہرحال اس طرح زیادہ دور تک جایا نہیں جا سکتا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''وہ دائیں طرف کچھ نظر آ رہا ہے۔ کیا ہے یہ؟'' عمران نے کہا۔

''جیلانی نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا...... ''کوئی پرانا ڈاک بنگلہ سا ہے...... شاید ریسٹ ہاؤس۔'' جیلانی نے اطلاع دی۔

''ادھر موڑ لو۔'' عمران نے کہا۔

گاڑی کے ٹائر کٹ چکے تھے اور اب وہ لوہے کے رموں پر دوڑ رہی تھی۔ دوڑ بھی کیا رہی تھی، بس اچھل رہی تھی۔ کسی بھی وقت اس کا ٹائی راڈ وغیرہ ٹوٹ سکتا تھا اور اسے فل اسٹاپ لگ سکتا تھا۔ عمران نے سب کو گاڑی کے فرش پر لٹا دیا تھا اور خود بھی لیٹ کر ہی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔ فقط جگت سنگھ نے یہ ہدایت تسلیم نہیں کی تھی اور بس ایک گھٹنا زمین پر ٹیکنے پر اکتفا کیا تھا۔ اب ہم ریتیلی زمین پر تھے۔ راستہ نیم پختہ تھا۔ عقبی گاڑیاں تیزی سے پاس آ رہی تھیں۔ ہم ان کے پہنچنے سے پہلے اس ریسٹ ہاؤس نما عمارت میں گھس جاتے تو یہ ہماری کامیابی تھی۔ بس کو لگنے والے شدید جھٹکوں کی وجہ سے اسٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک گولی آئی اور اسٹیئرنگ کے نچلے حصے کو توڑ گئی۔ کرچیوں نے میرے ہاتھوں کو لہولہان کر دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح گاڑی کو اس کھنڈر عمارت تک لے آیا۔ لکڑی کا پھاٹک دھماکے سے توڑتی ہوئی بس احاطے میں گھس گئی۔ یہاں لمبی گھاس تھی اور ویرانیوں کے ڈیرے تھے۔

عمران کی ہدایت پر سب گاڑی میں سے نکل آئے۔ میڈم صفورا لڑکیوں کو لے کر اندرونی کمروں کی طرف لپک گئی۔ سریتا کے نام پر ہمیں جو ڈمی لڑکی ملی تھی، وہ بھی ساتھ تھی۔ ہم نے بس کے پیچھے اور اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قربان علی زخمی نصیر احمد کو لے کر قریبی کمرے کی طرف چلا گیا۔

عقبی گاڑیاں برق رفتاری سے دھول اُڑاتی آئیں اور محفوظ فاصلے پر رک گئیں۔ یہ نصف درجن کے قریب گاڑیاں تھیں۔ کچھ جیپیں اور کچھ کاریں۔ ایک کھلی جیپ پر M16 ٹائپ کی مشین گن صاف دکھائی دے رہی تھی۔

جگت سنگھ کے گلے کی رگیں جوش سے پھولی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بادشاہ زادے! اگر تمہارا آرڈر ہو تو میں ان سامنے والی جھاڑیوں میں جا کر اس بڑی گن

والی جیپ کا کچومر بنا سکدا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''کالا انار پھینکوں گا اس پر۔ پندرہ سو ٹوٹے ہو جائیں گے۔''

''نہیں، ابھی نہیں۔ عمران سے مشورے کے بعد۔'' میں نے کہا۔

ادھر اکا دکا فائر آنے شروع ہو گئے تھے۔ عمران کے شوٹر بھی جواب دینے لگے تھے۔ عمران نے انگلی سے اس پھاٹک کی طرف اشارہ کیا جسے ہم نے بس کی ٹکر سے ابھی توڑا تھا۔ پھاٹک کے خستہ حال تختوں کے ساتھ دو بڑی بڑی ہڈیاں بلکہ ہڈ لال ڈوری کے ساتھ جھول رہے تھے۔ نہ جانے کیوں لگا کہ یہ انسانی ہڈیاں ہیں۔

''یہ تو کوئی ٹونا لگتا ہے۔ وہ نیچے کچھ تعویذ وغیرہ بھی بندھے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اسی دوران میں اندر سے ایک دم لڑکیوں کے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ پھر ثروت، ایشوریا اور دیگر لڑکیاں بھرّا مار باہر نکل آئیں۔ میڈم صفورا بھی ساتھ ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پھر اس نے ہمت کی اور کمرے کی طرف رخ کر کے گولی چلائی۔ میں دوڑ کر ان کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا۔ ٹوٹے پھوٹے کمرے کے فرش پر ایک بڑے خارپشت کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ ایسے ہی دو تین مزید خارپشت پچھلے کمرے کی باہر والی دہلیز پر نظر آ رہے تھے۔ ایک ''جسیم'' کالا بلّا کمرے کے گوشے میں کھڑا خارپشت کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

میڈم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہاں اور بھی جانور ہیں۔ ابھی وہاں برآمدے میں دو بڑے ٹرٹلز (کچھوے) بھی دیکھے ہیں میں نے۔ کئی کیٹس بھی ہیں۔''

کالا بلّا یقیناً جنگلی تھا۔ اس کا انداز خطرناک تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ہم پر جھپٹ پڑے گا۔ یہ دوطرفہ مصیبت تھی۔ باہر گھیرا ڈال کر فائرنگ شروع کر دی گئی تھی اور اندر یہ کریہہ المنظر جانور تھے۔ اسی دوران میں ایک اور کالے بلّے یا بلی نے ایک روشن دان میں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا خارپشت کی لاش پر گرا۔ اس بھوکے جنگلی بلّے نے خارپشت کی لاش کو گھسیٹنا چاہا مگر ہمارے دھمکانے پر دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہوئی تھیں اور انداز خطرناک تھا۔ بہت جارح ہو رہا تھا وہ۔

شاید میں یا میڈم صفورا اس پر بھی گولی چلا دیتے لیکن عمران لپک کر اندر آ گیا۔

''نہیں نہیں...... ہمارے پاس فالتو گولیاں نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔ تم لوگ باہر جاؤ...... بی ایس ایف والے آگے آنے کی کوشش میں ہیں۔ سب سے کہو پوزیشن لے لیں۔'' عمران بولا۔ پھر بلاتردد کالے جنگلی بلّے کی طرف بڑھا۔ اس نے اسے شُشکارا تو وہ

ایک دم خارپشت کی لاش سے دھیان ہٹا کر باہر نکل گیا۔

''یہ کیا چکر ہے تابش؟'' میڈم صفورا نے پوچھا۔

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ کسی جادو ٹونے کے سلسلے میں یہاں جان بوجھ کر یہ جانور چھوڑے گئے ہیں۔''

''مم...... میں اندر نہیں جاؤں گی۔'' ثروت نے گھبراتے ہوئے کہا۔

اپنی اس بات کا جواب اسے فوراً ہی مل گیا۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور لڑکیوں کے سروں پر سے گزر گئی۔ ایشوریا رائے کو دو گولیاں لگیں۔ ایک گردن میں دوسری سینے میں۔ وہ پٹ سے ٹوٹے پھوٹے فرش پر گری اور خون تیزی سے اس کی گردن کو سرخ کرنے لگا۔

''اندر جاؤ۔'' میں نے چلّا کر کہا۔ لڑکیاں میڈم صفورا سمیت ایک تاریک کمرے میں گھس گئیں۔ حسن و نزاکت کا مجسمہ سویٹی عرف ایشوریا رائے جو ایک فلم اسٹار بننے کے لئے گھر سے نکلی تھی، آج اس سرحدی علاقے کے اس خستہ حال کمرے میں فرش پر شدید زخمی پڑی تھی۔ اس نے اپنی دلکش آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''مجھے بچاؤ، میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اپنے لاہور...... اپنے بہن بھائیوں کے درمیان...... میں نے اپنے کیئے کی کافی سزا پالی ہے......''

میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھایا اور قریبی کمرے میں لے جا کر گرد آلود فرش پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر مہناز شدید فائرنگ کی پروانہ کرتی ہوئی تیزی سے ایشوریا رائے کی طرف لپکی۔ اس نے قینچی کی مدد سے بلاؤز کاٹ کر اس کا دودھیا سینہ عریاں کر دیا اور گولی کا مہلک زخم دیکھنے لگی۔ زخم دل کے مقام سے تھوڑا ہٹ کر آیا تھا لیکن بے حد کاری نظر آتا تھا۔ مہناز اور میڈم صفورا کو ایشوریا رائے کے پاس چھوڑ کر میں احاطے کی طرف بڑھا۔ یہاں دیواروں سے مردہ بیلیں چمٹی ہوئی تھیں اور اونچی خودرو گھاس ویرانی کا عجب نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جس شخص کے جھوٹ کی وجہ سے ہم یہاں بری طرح پھنسے تھے (یعنی ماسٹر جواہر) وہ ایک ستون کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دونوں طرف سے زوردار فائرنگ جاری تھی۔ عمران نے پھاٹک کے پاس سب سے خطرناک جگہ پر پوزیشن لی ہوئی تھی اور ٹرپل ٹو چلا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے کے لمس نے میرے سینے میں عجیب سا ولولہ بھر دیا۔ مرنے اور مار دینے کا جوش۔ آخری سانس تک لڑنے اور فتح پانے کا جنون۔ ''پیچھے چلا جا تابی۔'' عمران کرخت لہجے میں بولا۔

''بکواس بند کر۔ یہاں کوئی باس نہیں ہے۔''

''لیکن تابی۔''

''میں جھانپڑ مار دوں گا۔ سامنے دھیان رکھ۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے پانچ گولی کا برسٹ چلایا اور ایک پلسیے کو بھون کر رکھ دیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے قریب درختوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم تاک تاک کر نشانے لگانے لگے۔ ہم سب پر سب سے زیادہ فائرنگ M16 مشین گن سے ہو رہی تھی۔ فی الحال اس کا کوئی توڑ ہمارے پاس نہیں تھا۔

''کیا خیال ہے...... جاوا بھی ہے ان لوگوں میں؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔ میری نگاہ سامنے تھی۔

''نہیں، ابھی تو وہ نظر نہیں آ رہا۔ لیکن لگتا ہے کہ جلد ہی پہنچ جائے گا۔'' عمران بھی سامنے نگاہ رکھتے ہوئے بولا۔

''بارڈر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''اب بھی پانچ چھ میل سے کم نہیں ہے۔''

''تو کیسے نکل سکیں گے یہاں سے؟ یہ تو سخت سیکیورٹی والا ایریا ہوگا۔''

''امید پر دنیا قائم ہے۔'' عمران نے کہا اور دو سنگل شاٹ چلائے۔ ایک جیپ کی ونڈ اسکرین چُور ہو گئی۔ دور فاصلے پر دھول اُڑ رہی تھی۔ یہ اس امر کی نشانی تھی کہ کچھ اور لوگ پہنچ رہے ہیں۔

میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ یہ ریسٹ ہاؤس پرانا تو تھا لیکن اتنا زیادہ بھی ہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں اسے یوں ویران چھوڑ دیا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ماضی قریب میں شکاری اور سرکاری اہلکار اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ پھاٹک سے جھولتی ہوئی ہڈیاں اور رنگ برنگے تعویذ ایک طرح کی پُراسراریت پیدا کر رہے تھے۔

اندر سے لڑکیوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے جگت سنگھ سے کہا۔ ''دیکھو، اب کیا ہوا ہے انہیں۔''

جگت سنگھ جھک کر بھاگتا ہوا اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس اپنی پوزیشن پر آ بیٹھا۔ ''بتایا نہیں تم نے...... کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ ''وہ بی بی...... جسے ہم ایشوریا رائے کہندے ہیں......''

وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا لیکن میں اور عمران سمجھ گئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایشوریا رائے ختم ہو گئی تھی۔ اس کی حالت ہی بتا رہی تھی کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔ دل و دماغ میں دکھ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

گھیرا ڈالنے والوں کو نئی کمک مل گئی تھی۔ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی گولیاں اب زیادہ خطرناک زاویے سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، میں ایک بار ثروت کو جی بھر کر دیکھوں۔ اسے چھوؤں...... اور اس سے کہوں۔ ''ثروت! میں نے تمہیں دنیا میں ہر چیز سے زیادہ چاہا ہے...... اور چاہتا رہوں گا۔'' میں اِکا دُکا فائر کرتا ہوا پیچھے کی طرف جانے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ثروت کو دیکھا۔ وہ کمرے کے بجائے برآمدے میں تھی۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں...... یہ بڑے نازک لمحے تھے۔

کسی بھی وقت کوئی گولی ثروت کو لگ سکتی تھی۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے میں اس کی طرف جانا چاہ رہا تھا، وہ میری طرف آنا چاہ رہی تھی۔ وہ ایسا کرتی تو اس کے لئے زبردست رسک ہوتا۔ یہ رسک مجھے لینا چاہئے تھا۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور جھک کر بھاگتا ہوا برآمدے کی طرف گیا۔ گولیوں کی سنسناہٹ موت کی سرگوشیوں کی طرح تھی اور یہ سرگوشیاں ہرطرف بکھری ہوئی تھیں۔ میں ثروت کے پاس پہنچا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

گولیوں کی باڑ آئی۔ ہم کچے فرش پر گرے۔ ثروت میری بانہوں میں تھی۔ میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ مجھے لگا اسے گولی لگ گئی ہے۔ میں نے تیزی سے اس کے جسم کو ٹٹولا۔ ''تم ٹھیک ہونا؟''

اس نے آنکھیں بند کئے کئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے شفاف رخساروں پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چومی۔ ''حوصلہ کرو ثروت! سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''......اگر مجھے کچھ ہوگیا تو آپ نصرت کا خیال رکھیں گے نا؟'' اس نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

''ایسی باتیں مت کرو۔ نصرت کا خیال تم رکھو گی اور دیکھنا وہ ٹھیک بھی ہوگی۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا...... لیکن...... اب تم کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔ جب تک میں نہ کہوں۔ تمہیں اندر ہی رہنا ہے میڈم صفورا کے ساتھ۔''

وہ چپ رہی۔ تاہم چہرے سے عیاں تھا کہ وہ آمادگی ظاہر کر رہی ہے۔

ہمارے اردگرد ہونے والی فائرنگ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میرا عمران کے پاس فوراً پہنچنا ضروری تھا۔ میں ثروت سے علیحدہ ہو کر واپس احاطے کی طرف جانے کے لئے

اٹھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور سسک کر بولی۔ ''تابش! آپ اور عمران صاحب میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے ہیں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میری نگاہ ثروت کے عقب میں گئی۔ یہاں نیم تاریکی میں اس لڑکی کی لاش پڑی تھی جو جاوا نے دھوکے سے ہمیں سونپی تھی۔ یہ اس کی رکھیل سریتا نہیں تھی مگر ہم نے اسے سریتا سمجھ کر جاوا سے وصول کیا تھا۔ کوئی اندھی گولی اسے چاٹ گئی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف زخم تھا۔ ثروت کی نگاہ ابھی تک اس لاش پر نہیں پڑی تھی۔

میں نے ثروت کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیا اور اس طرح اسے کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچایا کہ اس تازہ لاش پر اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ اس دوسرے کمرے میں میڈم صفورا لڑکیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے انہیں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک محفوظ آڑ میں بٹھایا ہوا تھا۔ وہ خود لوڈڈ پستول کے ساتھ ان کی نگہبانی میں مصروف تھی۔ گولیوں والی ایک بیلٹ اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ سویٹی، ایشوریا رائے کی لاش پر ایک اوڑھنی ڈال دی گئی تھی۔ اوڑھنی پر خون کے دو بڑے دھبے نمودار ہو چکے تھے۔ ثروت کو میڈم کے سپرد کر کے میں واپس احاطے کی طرف بڑھا۔ عمران کے شوٹرز میں سے چار پانچ بندے اب تک راستے میں اور یہاں کام آ چکے تھے لیکن سترہ اٹھارہ اب بھی پوری طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر بڑی اچھی پوزیشنیں لے لی تھیں۔ کچھ چھت پر چلے گئے تھے۔ ان میں اسنیپر گن والا بھی شامل تھا۔ لیکن اب وہ ایک ایل ایم جی چلا رہا تھا۔ اس کی اسنیپر گن، راؤنڈز ختم ہونے کے سبب بیکار ہوگئی تھی۔

میں عمران کے پاس پہنچا۔ ہم اس ریسٹ ہاؤس کے ایک سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ یہ خالی کوارٹر پھاٹک کے بالکل قریب واقع تھا۔ اس کی خستہ دیوار میں رخنے موجود تھے اور یہ جگہ فائرنگ کرنے کے لئے بالکل ایک مورچے جیسی ہوگئی تھی۔ عمران کے اردگرد گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر آٹومیٹک رائفل کا بٹ اپنے کندھے سے لگایا ہوا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے جن گاڑیوں کی دھول دیکھی تھی، وہ اب قریب پہنچ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں جاوا کی دیوہیکل گرے جیپ صاف نظر آ رہی تھی تین چار گاڑیاں مزید تھیں۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے جاوا بھی آ گیا۔''

''دعا کرو کہ واپس نہ جائے۔'' عمران نے ایک سنگل شاٹ فائر کرتے ہوئے کہا۔

''ہم کب تک ان کی فائرنگ کا جواب دے سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ایمونیشن احتیاط سے استعمال ہو تو چوبیس گھنٹے تو بہ آسانی گزر سکتے ہیں۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''جنگ میں یہ نہیں سوچا جاتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ سوچا جاتا ہے کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن عمران! یہ جنگ لگی کیوں ہے؟ جاوا کے ساتھ ہمارا معاملہ تو صرف گندھارا مورتی کا تھا۔ مورتی اسے مل گئی ہے۔ اب کیوں وہ تمہارے پیچھے ہے؟ پولیس اور بی ایس ایف بھی اس کا پورا ساتھ دے رہی ہے۔''

''تمہیں سب کچھ بتایا تو ہے جان۔ جاوا کا اور ہمارا معاملہ صرف مورتی کا تھا لیکن گڑبڑ یہ ہوئی کہ ادھر پاکستان میں اقبال بدقسمتی سے جاوا گروپ کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے تشدد اور پوچھ گچھ کے جدید طریقے اختیار کر کے یہ معلوم کر لیا کہ ہم انڈیا کے اندر کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان کارروائیوں میں پاکستانیوں کو یہاں کی ایجنسیوں سے رہائی دلا کر وطن واپس پہنچایا جاتا رہا ہے۔ ہماری اس نئی شناخت سے جاوا نے ایجنسیوں کو باخبر کر دیا ہے......''

''عمران! تم اب بھی پوری بات نہیں بتا رہے ہو...... تمہیں اچھا لگے یا برا لیکن آج میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ممبئی میں بند کمرے کے اندر تمہاری اور جیلانی کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔''

عمران نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ''جیلانی تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے بہت برا ہوا ہے۔ اب کم از کم تمہیں تو کسی صورت جاوا کے سامنے نہیں جانا چاہئے۔ جتنی جلدی ہو سکے انڈیا سے نکل جانا چاہئے۔ اس نے رو رو کر درخواست کی لیکن تم نے اس کی بات نہیں مانی۔''

''بس یہی وجہ تھی جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔ ان لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ میں اور میرے ساتھی یہاں کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔''

بائیں جانب سے گھیرا ڈالنے والی گاڑیاں اب آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھیں۔ ان کے عقب میں مسلح افراد اوٹ لئے ہوئے تھے۔ عمران کے شوٹر انہیں ٹارگٹ کرنے لگے۔ کچھ دیر تک یہ زوردار کشمکش جاری رہی۔ پھر آگے بڑھنے والی گاڑیاں درختوں کے جھنڈ تک پہنچنے میں

کامیاب ہو گئیں۔ اب وہ بہتر طریقے سے ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ عمران نے قربان علی سے کہا کہ وہ سیڑھیوں پر اپنی پوزیشن ختم کر کے چھت پر چلا جائے۔ اگر وہ سیڑھیوں میں رہتا تو وہ اور اس کے دو ساتھی بہ آسانی نشانہ بن سکتے تھے۔

کچھ دیر کے لئے فائرنگ میں وقفہ آیا۔ شوٹرز نئے میگزین رائفلوں سے اٹیچ کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، میڈم صفورا میگزین بھرنے میں جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی مدد کر رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''عمران! کوئی کمک ملنے کا چانس بھی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''تمہارے دیگر ساتھی اور...... اور وہ سابق میجر صاحب...... جن کو تم انچارج کہتے ہو، کیا وہ یہاں تک پہنچ سکیں گے؟''

''یہ تو حالات پر ہے تابی! ان کو خبر تو بہرحال ہو چکی ہے۔ اب دیکھیں کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کرتے ہیں تو کتنی دیر میں؟''

''اگر میجر صاحب یہاں پہنچ جائیں اور اچانک باہر سے حملہ کریں تو ہم اندر سے زور مار کر ان کا گھیرا توڑ سکتے ہیں۔''

''ہوں۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔ رائفل پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن...... مجھے نہیں لگتا عمران کہ تمہارے وہ میجر صاحب کچھ کر پائیں گے۔''

''اتنی مایوسی کیوں؟''

''شاید میجر کا انتظار بیکار ہی ثابت ہو۔''

''کیوں؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لئے...... کہ مجھے ایک شک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ...... تم خود ہی وہ میجر ہو۔''

''میرے آخری الفاظ نے اسے جیسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ متحیر نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''...... عمران! تمہارے ساتھ رہ رہ کر مجھے بھی اندھیرے میں دیکھنا آ گیا ہے۔ تم کچھ بھی کہو میرا دل کہتا ہے کہ تم اب بھی صاف بات نہیں بتا رہے ہو۔ جس آرگنائزیشن کا تم نے ذکر کیا ہے، اگر وہ واقعی ہے تو پھر یہ تمہاری ہی بنائی ہوئی

ہے اور اس کے ہیڈ بھی تم خود ہی ہو۔''

دو گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔ ایک عمران کے سر پر سے گزر گئی۔ دوسری نے اس کے کندھے کو بوسہ دیا۔ وہ اس کی قمیص جلاتی ہوئی اور کندھے پر سرخ لکیر ڈالتی ہوئی نکل گئی۔

ہم نیچے جھک گئے اور دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔

میں نے جلدی سے عمران کا کندھا دیکھا۔ اسے صحیح معنوں میں گولی کا بوسہ کہنا چاہئے تھا۔ وہ بس ایک گہری خراش ڈالتی ہوئی گزر گئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا۔'' عمران مسکرایا۔ ''میں بلٹ پروف ہوں۔ سیدھی گولی بھی لگے گی تو اندر نہیں گھس سکے گی۔ ویسے بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہمیں۔ گھبراؤ مت، آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔''

اسی دوران میں جیلانی بھی ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا بازو زخمی تھا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''عمران صاحب! وہ لوگ گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو گاڑیاں درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئی ہیں، وہ نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان میں موجود بندے بڑے خطرناک زاویے سے گولی چلا رہے ہیں۔''

اگلے ایک گھنٹے تک مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔ بہرحال ہم نے ان گاڑیوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

جگت سنگھ نے مجھے اشارے سے پاس بلایا۔ میں اس کی پوزیشن پر پہنچا تو وہ بولا۔ ''بادشاہ زادے! مجھے عمران صاحب سے آگیا (اجازت) لے دو۔ میں اس ماں دی سالی کا بولو رام کرنا چاہندا ہوں۔''

''کون ماں دی سالی؟''

''او یار! یہی مشین گن۔ مجھے آگیا دو۔ میں ابھی اس کے پندرہ سو ٹوٹے نہ کروں تو جگت سنگھ نام نہیں۔ دو کالے اناروں کی مار ہے۔''

''اور تم کتنی گولیوں کی مار ہو؟''

''واہگرو کی سوگند ہے، مجھے اپنی کوئی پروا نہیں۔ اس جاوا نے میرا پتروں جیسا بھرا مارا ہے، آشا کور کی جندگی لی ہے۔ تم لوگ میرے شریر سے بم باندھ دو، میں اپنے پیو کا نہیں اگر اس کتے جاوا کے اندر پہنچ کے خود کو نہ اڑا لوں۔''

''پر یہ لوگ تمہیں جاوا تک پہنچنے دیں گے تو پھر ہے نا؟''

''نہ پہنچنے دیں۔ میں کوشش تو کروں گا نا۔ اگر میں اس کے آس پاس بھی پہنچ گیا اور میں

نے اس ذلیل کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کی ماں بہن ایک کر دی اور خود کو اڑا لیا تو یہ بھی معمولی گل نہیں ہو گی۔ اسے یہ پتا تو چل جائے گا نا کہ موت ہولے ہولے اس کے کول آ رہی ہے۔'' جگت سنگھ کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے اور داڑھی کے بال جیسے کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر کچھ کرنا ہے تو پھر تم اکیلے نہیں، ہم دونوں کریں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ اندھیرا ہونے دو۔''

''ٹھیک ہے بادشاہ زادے! پر ایک وچن تم ابھی دو۔ اگے جا کر جیپ پر کالے انار میں خود پھینکوں گا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا اور میں نہ پھینک سکا تو پھر تم کوشش کر لینا۔ پر میں تمہیں بتا دوں، مجھے ناکام نہیں ہونا ہے۔ میرے اندر اس بندے کے لئے جتنی آگ ہے، میں مر بھی گیا تو میری لاش تڑپ پھڑک کر اس کی چھاتی تک پہنچ جائے گی۔''

○......❖......○

ہم محاصرے میں تھے۔ اس ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دوسری طرف ہم بھی ان لوگوں کو آگے آنے نہیں دے رہے تھے۔ سہ پہر سے ذرا دیر بعد جھنڈ میں موجود گاڑیوں نے آگے کھسکنے کی کوشش کی۔ سیکیورٹی فورس کے باوردی افراد ان گاڑیوں کو دھکیلتے ہوئے اور ان کی آڑ لیتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ ہم نے بھرپور جواب دیا۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر موجود ماہر شوٹرز نے بڑی مؤثر فائرنگ کی۔ سیکیورٹی فورس کے کم از کم دو بندے زخمی ہوئے اور وہ لوگ واپس جھنڈ میں گھسنے پر مجبور ہو گئے۔ اب رات کے تاریک سائے پھیل چکے تھے۔ آندھی کے جھکڑ بھی کم ہو گئے تھے لیکن تیز ہوا بدستور موجود تھی۔ ہم نے سویٹی کی لاش کو ریسٹ ہاؤس کے عقبی صحن میں تالاب کے پاس خودرَو گھاس میں امانتاً دفنا دیا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں ہلاک ہونے والے شوٹر قاسم کی لاش کو بھی اسی طرح دفنایا گیا۔ نصیر احمد کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ ڈاکٹر مہناز تندہی سے اس کو طبی امداد دے رہی تھی۔ نصیر کے جسم سے ایک گولی تو مہناز نے بس کے اندر ہی نکال دی تھی۔ دوسری گولی پسلی توڑ کر اس کے پھیپھڑے میں لگی تھی۔ نصیر کو اندرونی بلیڈنگ کا سامنا تھا۔

وقتی طور پر فائرنگ بالکل رکی ہوئی تھی۔ تاہم دونوں طرف کے رائفل بردار پوری طرح چوکس تھے۔ بس کے اندر کھلاڑیوں کے اٹیچی کیسز میں سے ہی کھانے کی اشیاء بھی ہمیں مل گئیں۔ ان میں بسکٹ کے ڈبے......نمکو......چپس اور دودھ کے پیکٹ بھی تھے۔ کچھ سامان خورد و نوش ڈاکٹر مہناز ممبئی سے ہی لے کر آئی تھی۔ اگر احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو یہ راشن

ہمارے لئے تین چار دن کے لئے کافی تھا۔

میں اور عمران ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اپنے حصے کا راشن میں نے زبردستی جگت سنگھ اور قربان علی کو دے دیا تھا۔ دیگر تکالیف کی طرح مجھے بھوک اور پیاس برداشت کرنے کا ہنر بھی آ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑی تو میں ایک ہفتے تک بغیر کچھ کھائے صرف پانی پر گزارہ کرسکوں گا۔

قربان علی رائفل کندھے سے لٹکائے سرونٹ کوارٹر میں ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا۔

''عمران صاحب! اب ریسٹ ہاؤس تقریباً صاف ہے۔ شاید ہی ایک آدھ بلی یا دو چار چوہے موجود ہوں......''

''کیا کچھ نکلا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''بہت کچھ جی۔ لگتا ہے پورا چڑیا گھر تھا۔ پکی بات ہے کہ یہ سارے جانور جان بوجھ کر یہاں چھوڑے گئے تھے۔ تین چار جنگلی بلے تھے...... اتنے ہی خار پشت بھی تھے...... نیولے تھے۔ کچھوے تو آپ نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک دو شاید اب بھی وہاں باؤلی (تالاب) میں ہوں۔''

''کچھ پتا چلا کہ یہ چکر ہے کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ دیکھیں...... یہ پوٹلیاں اندر چوکھٹوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔'' قربان نے رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں عمران کو دکھائیں۔

یہ دراصل ریشمی رومال تھے۔ ان میں خشک ناریل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، بادام، پتاشے اور اس طرح کی دیگر چیزیں باندھی گئی تھیں۔ کچھ پوٹلیوں میں تعویذ بھی تھے۔ قربان علی نے ایک پوٹلی دکھائی۔ اس میں تعویذ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ہڈیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ یہ انسانی ہڈیاں تھیں۔ ایک جبڑے کی ہڈی لگتی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ پھاٹک پر جو بڑی ہڈیاں لٹک رہی تھیں، وہ بھی انسانی ہی تھیں۔ یہ ہڈیاں غالباً کسی قبر سے نکالی گئی تھیں۔

قربان علی نے ایک بڑے تعویذ کی تہیں کھولیں۔ ایک سفید موٹے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر تھی۔ سرکنڈے کے قلم سے لکھی گئی یہ تحریر سنسکرت زبان میں تھی۔

''اب اسے پڑھے گا کون؟'' عمران نے کہا۔

قربان بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ماسٹر جواہر پڑھ لے گا۔''

''اسے بلاؤ۔''

کچھ ہی دیر بعد جاوا کی رکھیل کا سابق پتی، جوگی نما جواہر ہمارے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف نقش ہو چکا تھا اور چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔ اس وقت جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا تھا، اسی شخص کی وجہ سے تھا۔ سریتا اس کی نہیں رہی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کا تھا۔ وہ اب بھی اس کی بھلائی اور زندگی چاہتا تھا۔ اسے خطرناک حالات سے بچانے کے لئے اس نے ہم سب کو موت کے منہ میں جھونک دیا تھا اور ہمارے ساتھ ساتھ خود کو بھی...... اور اپنے نقطۂ نظر سے اس نے جو کچھ کیا تھا، درست ثابت ہو چکا تھا۔ سریتا کی جگہ جو لڑکی ہمارے حوالے کی گئی تھی، وہ ماری جا چکی تھی۔ بہر حال اس سب کے باوجود پتہ نہیں کیوں مجھے اس پر غصہ نہیں آ رہا تھا اور شاید عمران کو بھی نہیں۔ ہم اس کی مجبوری سمجھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ماسٹر جواہر! پڑھو یہ کیا لکھا ہے۔ لیکن اس مرتبہ گمراہ مت کرنا ہمیں۔''

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پڑھنا شروع کیا۔ یہ تقریباً پندرہ سطریں تھیں۔ خوش خط لکھا گیا تھا۔ ماسٹر جواہر نے دو مرتبہ پڑھا اور پھر ترجمہ کرنا شروع کیا۔

''...... بے شک یہ ثابت ہوا کہ سن 1999ء جولائی کی دس تاریخ کو یہاں راجستھان کے کچھ مہمان آ کر ٹھہرے۔ ان کے ساتھ پانچ نہایت خوب صورت چھوٹے رشین کتے تھے۔ یہ کتے انہوں نے اپنی بڑی جیپ میں لادے ہوئے تھے۔ ان کو غلطی لگی اور اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا اپرادھ ان سے ہوگیا۔ وہ گاڑی کو احاطے میں چھایا میں کھڑا کر کے فوراً کار پر نکل گئے۔ وہ بھول گئے کہ چھایا چلی جائے گی اور سورج اوپر آتے ہی دھوپ پھیل جائے گی۔ گاڑی سارا دن دھوپ میں جلتی رہی۔ اس کے اندر گرمی انتہا کو پہنچ گئی۔ کتے سسک سسک کر مر گئے۔ ان کی آتمائیں اب اس جگہ پر قابض ہیں۔ وہ یہاں آنے والے کا جیون چھین لیتی ہیں۔ وہ یہاں سے باہر نکل کر بھی لوگوں کے پران لے سکتی ہیں۔ ان کے من بہلاوے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں جانوروں کو رکھا جائے۔ اس کے سوا اور کوئی حل نا ہیں ہے۔ ہو ہی نا ہیں سکتا۔ ایسا نہ کیا گیا تو اردگرد کا علاقہ بھی ان آتماؤں کی زد میں آئے گا۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھوں سے بچائے۔ ہم نیچے لکھے ہوئے اشلوکوں کو اپنی رکھشا کے لئے یہاں لٹکا رہے ہیں۔''

اس کے نیچے کچھ اشلوک تھے اور کچھ دیگر ہدایات وغیرہ تھیں۔

اس تحریر کو مکمل طور پر دیکھنے اور سمجھنے سے اندازہ ہوا کہ چند سال پہلے یہاں کچھ جانوروں کی اذیت ناک موت کا حادثہ ہوا اور اس کے بعد کچھ ایسے واقعات یہاں پیش آئے کہ جس کے بعد اس ریسٹ ہاؤس کو آسیب زدہ قرار دیا گیا۔ علاقے کے لوگوں نے اس

طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ یہاں مختلف جانور پکڑ کر رکھے گئے اور دیگر ٹونے ٹوٹکے کئے گئے۔

ایسے دور دراز علاقوں میں اس قسم کی توہمات کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ عمران نے ماسٹر جواہر کو سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو کچھ تم نے یہاں ہمارے سامنے پڑھا ہے، بس تم تک ہی رہنا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ باقی ساتھیوں میں سے کسی میں کسی طرح کا کوئی ڈر پیدا ہو۔ یہ سب کمزور عقیدے والی باتیں ہیں۔ کیا تم ان پر یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں جی۔'' ماسٹر جواہر نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں یہ باتیں میرے دھرم کا حصہ ناہیں ہیں۔ یہ راکھشس کے پیدا کئے ہوئے وچار ہیں جو منش کے ذہن کو بکھیرتے ہیں۔''

''تو پھر یہ وچن دیتے ہو کہ کسی سے ان کا ذکر نہیں کرو گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، وچن دیتا ہوں...... میں جانتا ہوں میرے کارن پہلے ہی آپ ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوئے ہیں۔ اس کے لئے میں جتنی بھی شما چاہوں، وہ کم ہے۔ مم...... میں مجبور تھا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

عمران نے کہا۔ ''خیر، جو کچھ بھی تھا ہماری قسمت میں لکھا تھا لیکن اب اس میں سے نکلنے کے لئے ہمیں اپنی قسمت کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت پر بھی بھروسا کرنا ہوگا۔ میں تم سب سے یہ امید رکھتا ہوں کہ ہمت سے کام لوگے اور ساتھ دو گے۔''

جواب میں وہ بس آنسو بہاتا رہا۔ ماسٹر جواہر اور قربان علی وغیرہ چلے گئے تو ہم پھر سرونٹ کوارٹر میں تنہا رہ گئے۔ سامنے دیوار کے رخنے میں ہم نے فوجیوں کی طرح اپنی آٹومیٹک رائفلیں رکھی ہوئی تھیں اور نگاہیں اندھیرے میں دشمن کی حرکت کو تلاش کر رہی تھیں۔

ہوا تیز تھی لیکن مطلع صاف تھا۔ مدھم چاندنی میں اردگرد کا احوال دکھائی دے رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے باہر جو بھی نقل و حرکت ہوتی، ہمیں نظر آسکتی تھی۔ ہمیں اپنے سامنے کم از کم سات گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ سیکیورٹی فورس کی چند موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ ہم سے ان کا فاصلہ 300 میٹر کے قریب تھا۔ ان گاڑیوں کے اندر اور عقب میں مسلح لوگ موجود تھے اور کسی بھی وقت ہم پر ہلا بول سکتے تھے۔ کچھ یہی صورتِ حال باقی اطراف میں بھی تھی۔ بہرحال ہمیں دو ایڈوانٹیج حاصل تھے۔ ایک تو ہم کھلی جگہ کے بجائے ریسٹ ہاؤس کے اندر

تھے۔ دوسرے ہم قدرے بلندی پر بھی تھے۔ خاص طور سے جو نشانے باز چھت پر تھے، وہ کافی دور تک دیکھ سکتے تھے اور بڑی کارگر فائرنگ کر سکتے تھے۔

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ یہ لوگ کمک کا انتظار کر رہے ہیں؟'' عمران نے کہا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا میرا ذہن دراصل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ آج صبح میرے اور عمران کے درمیان جو چونکا دینے والی گفتگو ہوئی تھی، اس کو شدید فائرنگ کے سبب بریک لگ گئے تھے۔ میں اس گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑنا چاہتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! تو تم تسلیم کرتے ہو؟''

''کیا؟''

''یہی کہ وہ آرمی آفیسر تم ہی ہو...... جو اس آرگنائزیشن کو چلا رہا ہے، وہ جو بھی ہے کیپٹن ہے یا میجر ہے، تم ہی ہو؟''

''اگر میں کہوں ''ہوں'' تو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو جائے گا اور اگر نہ کہوں تو کیا بگڑ جائے گا؟ ان سوالوں کے جواب بعد میں بھی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ فی الحال ہمارا فوری مسئلہ تو یہاں موت کے اس گھیرے سے نکلنے کا ہے۔''

''اگر نہ نکل سکے تو میرے سینے میں میرا یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح اٹکا رہ جائے گا۔ شاید میں مرنے کے بعد بھی اس کی چبھن محسوس کروں۔''

''تمہیں کیوں یہ شبہ ہوا ہے کہ میں اس آرگنائزیشن کو چلا رہا ہوں؟''

''شبہ اب نہیں ہوا، اس وقت ہو گیا تھا جب میں نے تمہاری اور جیلانی کی گفتگو سنی تھی اور تمہارے لئے آئی ہوئی ای میلز پڑھی تھیں۔ مجھے وہاں درازوں سے کچھ ایسے پیپر ملے جن میں بار بار کسی میجر کا ذکر تھا مگر نام کہیں نہیں تھا۔ زیادہ شک بلکہ قوی شک مجھے آج ہوا ہے۔ شاید تم نے غور نہیں کیا۔ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی کسی نے نہیں کیا...... لیکن آج تمہیں تمہارے ایک قریبی بندے نے بے دھیانی میں میجر کہہ کر پکارا...... یہ اس وقت ہوا جب بی ایس ایف کی گاڑیاں جھنڈ میں پہنچ گئیں اور زوردار فائرنگ ہوئی۔ تمہیں پتا ہی ہے، یوں لگ رہا تھا کہ شاید وہ لوگ اندر گھس آئیں گے۔ تمہارے شیخ (جیلانی) نے تمہیں کہا تھا...... شوکت کو گولی لگ گئی میجر! میں اس کی جگہ چھت پر جا رہا ہوں...... اس مار دھاڑ میں اس کا مخاطب تمہارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔''

وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا۔ اپنا نچلا ہونٹ ہولے ہولے دانتوں سے دباتا رہا۔

اس کی ٹھوڑی کا گڑھا مدھم روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ذات کی طرح اس کے خدوخال بھی اپنے اندر کی روشنی اور تاریکی باہر نہیں آنے دیتے تھے۔

”میں نے تم سے کہا نا تابی! میں نے کچھ حلف دیئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے خلاف نہیں جا سکتا۔“

”لیکن تم ہی تو کہا کرتے ہو، ہم دو نہیں ایک ہیں تو پھر اس ایک کو وہ سب کچھ معلوم ہونا چاہئے جو تمہیں معلوم ہے، مجھے معلوم ہے۔ اور میں جانتا ہوں...... میرا خدا بھی جانتا ہے، میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں چھپایا۔“

”میں نے بھی کچھ نہیں چھپایا [illegible]“

”لیکن کچھ نہیں عمران۔“ میرا لہجہ تحت تھا۔ ”آج تمہارے رویے سے فیصلہ ہو جائے گا کہ ہم واقعی ایک ہیں یا نہیں۔“ میری آواز آخر میں بھرا گئی۔

وہ جیسے اندر سے پگھل گیا۔ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کچھ دیر خاموش رہا...... پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”تابی! میرا تعلق [illegible] اسپیشل فورسز سے ہے۔ میری شومین کی حیثیت اور دیگر مصروفیات دکھاوے کی تھیں۔ سمجھ لو کہ میرے کام کے حوالے سے میری مجبوریاں تھیں۔ مجھے لیفٹیننٹ سے [illegible] میجر تک کا سفر میں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا اور [illegible]۔ [illegible] دن تھے جب میں نے والدہ کی تلاش میں ذاتی حیثیت سے انڈیا کے دو چکر لگائے تھے۔ وہاں کچھ ایسے لوگوں سے میرا ٹکراؤ ہوا جن کو جہنم واصل کرنا میرے لئے ضروری تھا۔ میں نے یہ کیا لیکن اس سے آگے کا سفر مشکل تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میری یونیفارم میرے راستے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ میں ان حرامزادے انڈین ایجنٹس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ ایک حاضر سروس فوجی کی حیثیت سے نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوج چھوڑ دی اور وہ سب کچھ کیا جو کر سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو چن چن کر مارا ہے تابی جنہوں نے میرے اندر نفرت اور عداوت کا پہاڑ کھڑا کیا تھا۔ اپنی والدہ کی تلاش کے دوران میں میرا واسطہ ان کی بے حسی، بے رحمی سے کچھ اس طرح پڑا تھا کہ میرے اندر ان کے خون کی پیاس پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے ممبئی، الہ آباد، جودھ پور اور دہلی کے گلی کوچوں میں ان لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنی ہٹ لسٹ میں تقریباً تیس نام رکھے تھے۔ ان میں دو جیل سپرنٹنڈنٹ اور دو تین بڑے پولیس آفیسر بھی تھے۔ ان میں سے کم از کم بیس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا۔ پانچ اپنی باہمی لڑائیوں میں مارے گئے اور پانچ کے قریب ایسے ہیں جو زیر

زمین چلے گئے۔ یہ لوگ مجھے کبھی پکڑ نہیں سکے۔ میرے ساتھی بھی وفاداری میں اپنی مثال آپ ہیں تابی۔ انہوں نے عہد کر رکھا ہے کہ اگر کبھی کوئی بھارتیوں کی گرفت میں آ جائے تو اپنی زبان کھولنے کے بجائے اپنی جان ختم کر لے گا۔ میرے ایک شہزاد نامی ساتھی نے یہ کر کے بھی دکھایا ہے۔ پچھلے برس اس نے نئی دہلی میں اپنی جان دے دی اور ملک سے وفاداری نبھا کر ہمارے سیٹ اَپ کو بچایا۔ مگر افسوس کہ چند دن پہلے اقبال یہ نہ کر سکا۔ یہ نہیں کہ اس نے حلف کے مطابق کوشش نہیں کی۔ جب انڈین ایجنسی نے سلطان چٹا کے ساتھ مل کر اسے لالہ زار ہوٹل سے پکڑا تو اس نے خود کو شوٹ کرنے کی کوشش کی۔ گولی اس کے سر کے بجائے اس کے جبڑے میں لگی اور پستول اس سے چھین لیا گیا۔ بعدازاں شدید تشدد اور مخصوص نشہ آور انجکشنوں کی مدد سے اس سے بہت سی باتیں اگلوا لی گئیں۔ اب یہ لوگ چاروں طرف سے سمٹ کر مجھ پر جھپٹ پڑے ہیں۔ میری بدقسمتی صرف اور صرف یہ ہے کہ اس وقت تم اور ثروت میرے ساتھ ہو اور وہ بے گناہ لڑکیاں اور میڈم صفورا وغیرہ بھی یہاں ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ ہوتیں تو میں اور میرے ساتھی بہتر طریقے سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ سچ پوچھو تابی! میں اس وقت خود کو تم سب کے لئے ذمے دار محسوس کر رہا ہوں۔“

میں سکتے کی سی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ آج عمران کا وہ روپ میرے سامنے آ گیا تھا جس کا شبہ ایک عرصے سے میرے دل و دماغ میں موجود تھا۔

میں نے کہا۔ ”عمران...... بلکہ محترم میجر عمران! تم یہ ذمے داری کیوں محسوس کر رہے ہو؟ کیا تم یہ بھول گئے ہو کہ تم میرے بلانے پر میرے اور ثروت کے لئے انڈیا آئے تھے؟ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہاں تمہارے لئے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ جیلانی وغیرہ نے بھی تمہیں انڈیا آنے سے روکا تھا۔“

”جو کچھ بھی ہے، مجھے یہ نہیں بھولنا چاہئے تھا کہ میں تمہارے لئے کسی بڑی مشکل کا سبب بن سکتا ہوں۔“

”اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ اس بات کا فیصلہ ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں کہ تم نے ہمیں پھنسایا یا ہم نے تمہیں۔ اس وقت تو حقیقت پر غور کرنا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب پھنسے ہوئے ہیں۔“

وہ خاموش رہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تمہاری اس حقیقت کا پتا شاہین کو بھی ہے؟“

”نہیں، تمہیں بتایا ہے نا کہ جیلانی، اقبال اور امتیاز وغیرہ کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔“

''یہ جیلانی، امتیاز وغیرہ بھی کیا فوج کے بندے ہیں؟''

''ہیں نہیں، تھے...... میری وردی کی طرح ان کی وردی بھی کام میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ انہوں نے فوج چھوڑ دی۔ وردی اتار دی۔ ریزائن کر دیا۔''

''ان کے عہدے کیا تھے؟''

''امتیاز لیفٹیننٹ تھا۔ جیلانی اور اقبال کیپٹن۔''

مجھ پر حیرت ناک انکشافات ہو رہے تھے۔

اس دوران میں عمران کے فون پر بیل ہوئی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز نے ہمیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جلالی صاحب کی بوڑھی لیکن پُرجلال آواز تھی۔ آج ایک عرصے بعد ہم انہیں سن رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ عمران فون بند کر دے گا لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ علیک سلیک کے دو تین فقروں کے بعد جلالی صاحب بجلی کی طرح لپک کر اصل موضوع پر آ گئے۔ ''کہاں ہو تم دونوں؟ تم نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ رات دن تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج بڑی مشکل سے اس بی بی سے یہ فون نمبر ملا ہے۔''

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ ہمارا انتظار کر رہے ہیں یا ڈاکٹر مہناز صاحبہ کا؟''

''اس کا بھی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ ممبئی سے آگے رتناگری میں کہیں ہے اور تم دونوں بھی وہیں ہو۔ کوئی کھوج ملا ہے اس کا یا نہیں؟ مجھے جو بتانا سچ بتانا۔''

''بس اتنا کھوج ملا ہے...... کہ وہ رتناگری میں ہی کسی پگوڈے میں ہے اور خیر خیریت سے ہے۔ کچھ بھکشوؤں نے اسے اپنے پاس روکا ہوا ہے۔''

''کون بھکشو ہیں؟ وہ کیا بیچتے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں وہ مہناز سے؟'' جلالی صاحب کڑکے۔

''آپ پریشان نہ ہوں جناب! آپ جانتے ہی ہیں یہ بھکشو لوگ اکثر بالکل بے ضرر ہوتے ہیں۔ مچھی مکھر تک نہیں مارتے۔ میرا مطلب ہے مکھی مچھر تک۔''

''اوپر سے سارے ہی بے ضرر نظر آتے ہیں۔ تم دونوں بھی تو باورچی بن کر گھسے تھے میرے گھر میں۔ ہانڈی بھونتے بھونتے مجھے ہی بھوننے لگ پڑے۔ لیکن میں ایک بات بتا دوں تمہیں عمران...... میں بڑی سخت ہڈی کا ہوں۔''

''اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جناب! آپ بے فکر رہیں۔ ہم آج بھی آپ کے پوری طرح وفادار ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ڈاکٹر مہناز خیر خیریت سے آپ کے پاس پہنچیں گی اور پھر

سے آپ کا ''علاج معالجہ'' شروع کریں گی۔'' عمران نے علاج معالجے پر زور دیا۔

''بکواس بند کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں بیمار ہوں۔ چل چلاؤ ہے میرا؟'' وہ اتنے زور سے بولے کہ کھانسی شروع ہو گئی۔

''توبہ نعوذ باللہ۔ ہم ایسا سوچ سکتے ہیں؟'' عمران نے کہا۔

کھانسی ذرا سنبھلی تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''مورتی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

''ہمیں لگتا ہے جی کہ مورتی تو ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ بہرحال اصل بات تو آپ کو ڈاکٹر صاحبہ ہی آ کر بتائیں گی۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ دو چار دن تک انہیں آپ کی بانہوں...... مم، میرا مطلب ہے نگاہوں میں لے آئیں۔''

''کوئی ڈراما تو نہیں ہو رہا میرے ساتھ؟'' وہ گرجے۔

''ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں جناب! ہمیں پاکستان میں رہنا ہے۔ ہماری اگلی نسلوں نے پاکستان میں رہنا ہے۔ آپ کے زیرِ سایہ زندگی گزارنی ہے۔''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ...... اور دیکھو، تم دونوں میرے ساتھ رابطے میں رہو۔ کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بلکہ کہو تو میں خود بھی آ سکتا ہوں۔''

''اللہ نہ کرے جی کہ اتنا برا وقت آئے۔ آپ فارم ہاؤس میں اطمینان سے بیٹھیں۔ آپ کے یہ خادم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر مہناز کو بہت جلد آپ کے حضور پیش کریں گے۔''

جلالی صاحب نے کہا۔ ''اور وہ تابش کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔'' میں نے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔

عمران بولا۔ ''وہ لوٹا لے کر نکلا ہے کھیتوں کی طرف۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' وہ بیزاری سے بولے۔ ''اچھا یہ اس بی بی سے بات کرو۔'' انہوں نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد فون پر جو آواز ابھری، وہ بھی ہمارے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ شاہین تھی۔ اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب نے شاہین ہی سے عمران کا یہ فون نمبر حاصل کیا ہے۔

''ہیلو عمران! کہاں ہو؟''

عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ ''وہاں جہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''پھر تو ضرور ریما یا نرگس میں سے کوئی ایک تمہارے ساتھ ہوگی۔''

''ایک نہیں دونوں۔ ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ باجی ریکھا بھی ایک چھوٹا سا رول کر رہی ہے اس میں۔ لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب تمہارے پاس ہیں؟''

''نہیں، ذرا لان تک گئے ہیں، سانسیں درست کرنے۔ تم سے بات کر کے ہانپ رہے تھے۔''

''یہ حضرت تمہارے پاس آئے ہوئے ہیں یا تم ان کے پاس گئی ہو؟''

''یہ خود نازل ہوئے ہیں۔ ایک بہت پرانی مرسیڈیز پر ہیں۔ دو تین ملازم بھی ساتھ ہیں۔ پتا نہیں کہاں سے کھوج لگاتے ہوئے پہنچے ہیں۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بے ہودہ پھونک ماری ہے کہ میں تمہاری منگیتر ہوں اور تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ حالانکہ تمہارے بارے میں تو تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ کہاں ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے جانم! لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے بے ہودہ پھونک کیوں کہا؟ کیا تم میری منگیتر نہیں ہو؟''

''اللہ مجھ پر اتنا برا وقت نہ لائے۔ شو بز کی ایک آفت ہی کم نہیں ہوتی تمہیں تو دو دو چمٹی ہوئی ہیں۔''

یکا یک چند فائر ہوئے۔ یہ گولیاں جھنڈ میں سے چلائی گئی تھیں۔ ایک گولی ہمارے عین سامنے دیوار پر لگی۔

''اوہ، یہ فائرنگ کیسی ہے؟'' شاہین کی پُرتشویش آواز ابھری۔

''تمہیں میری کسی بات پر یقین ہی نہیں آتا۔ یہ شوٹنگ ہو رہی ہے بھئی۔ مجھ پر اور ریما پر گولیاں چل رہی ہیں اور تمہیں پتا ہی ہے فلموں میں ہیرو، ہیروئن پر گولیاں کیوں چلائی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ کسی بہت ہی تنگ جگہ پر گھس کر بیٹھ جائیں بلکہ لیٹ جائیں۔ ایک دوسرے سے جڑ کر۔ سنسر والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ ہم بھی اس وقت سیوریج کے ایک خالی پائپ میں گھسے ہوئے ہیں۔''

''خالی تو تم یونہی کہہ رہے ہو۔ ورنہ یہ گند سے بھرا ہوا پائپ ہوگا۔ تمہارے دماغ کی طرح۔''

ایک بار پھر دونوں طرف سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں۔ شاہین چند سیکنڈ کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر اس کی سنجیدہ آواز آئی۔ ''عمران! تم کسی مشکل میں ہو؟''

''اس سے بڑی مشکل اور کیا ہوگی کہ تم سے بات کر رہا ہوں۔'' وہ مخصوص انداز میں

بولا۔

''عمران!'' شاہین نے احتجاجی لہجے میں کہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''پتا نہیں کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ ہمیں تمہارے دوست اقبال والے واقعے کا پتا چلا ہے۔ بہت زیادہ دکھ ہوا ہے۔''

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اقبال دیر سے آتے ہیں اور کبھی کبھی جلدی چلے جاتے ہیں۔ اس بارے میں پھر بات کریں گے۔''

''اچھا تابش صاحب کہاں ہیں؟ عاطف اور فرح ان کے لئے بڑے پریشان ہیں۔''

''وہ میرے ساتھ ہی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ ہو سکا تو میں اس سے ان لوگوں کی بات کراؤں گا۔''

سامنے جھنڈ میں نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ مشین گن والی جیپ بھی کچھ آگے آ گئی تھی۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''اچھا ڈیئر! اگلا شاٹ تیار ہو گیا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں، خدا حافظ۔''

اس نے شاہین کا جوابی خدا حافظ سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔

جگت سنگھ کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''یہ لوگ آگے آ رہے ہیں۔ ان کی ماتا کی......'' اس کے ساتھ ہی اس نے گولیوں کی بوچھاڑ کی۔ دوسری طرف سے تند و تیز جواب آیا۔ ایک بار پھر دو طرفہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ قریباً پانچ منٹ تک تاریکی میں شعلے لپکے اور دھماکے ہوئے۔ پھر میگا فون پر کسی فوجی کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''بچ نہیں سکتے ہو تم لوگ۔ مفت میں جیون گنوانے سے بہتر ہے کہ گرفتاری دے دو۔ تمہارے ساتھ قانون کے مطابق برتاؤ ہوگا۔''

چند سیکنڈ کے وقفے سے اعلان دہرایا گیا۔ آخر میں کہا گیا۔ ''اگر تمہیں سرنڈر کی آفر منظور ہے تو ہوا میں ایک ساتھ تین سنگل شاٹ چلاؤ...... تین سنگل شاٹ۔''

سرنڈر کی آفر کسی کو قبول نہیں تھی۔ درحقیقت ہم مرنے کے لئے آمادہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

O.....❖.....O

یہ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ بادلوں کے ٹکڑوں نے مدھم چاندنی کو ڈھانپ لیا تھا۔ پروگرام کے مطابق، میں اور جگت سنگھ بڑی خاموشی سے تاریکی میں رینگ گئے۔ دو دستی بم جگت کے پاس اور دو میرے پاس تھے۔

میں نے شام ہی کو جگت سنگھ سے دستی بم اچھالنے کا میکنزم اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ میں

نے مڑ کر اندرونی کمروں کی طرف دیکھا...... وہاں ثروت موجود تھی۔ اگر اسے پتا چلتا کہ میں ایسی خطرناک حرکت کرنے جا رہا ہوں تو اس پر بہت برا اثر پڑتا۔ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی جس طرح فرید کوٹ میں ریچھوں کی یلغار کے بعد ہوئی تھی۔

ہم ریسٹ ہاؤس سے نکلے۔ کچھ دور تک جھک کر چلتے رہے پھر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھے۔ ہمارے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ زمین ٹھنڈی اور قدرے ریتیلی تھی۔ پیٹ اور کہنیوں کے بل اس طرح رینگنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خاص طور سے ایسے افراد کے لئے جو اس کا تجربہ نہ رکھتے ہوں۔ کہنیوں اور گھٹنوں سے باقاعدہ خون رِسنے لگتا ہے۔ حسبِ پروگرام جگت آگے تھا، میں دو تین فٹ پیچھے۔ رائفلیں افقی رخ سے ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔

قریباً ساٹھ میٹر کا فاصلہ ہم نے اسی طرح طے کیا۔ درختوں کے قریب پہنچے تو باتوں کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ ہم بے آواز رینگتے چلے گئے۔ آوازیں واضح ہو گئیں۔ یہ بی ایس ایف کے دو جوان تھے۔ ان کی باتوں میں جاوا کا نام آیا...... وہ جاوا کے بارے میں ہی باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے کہا۔ ''اوئے، کون سی ایسی ہیروئن ہے جو جاوا صاحب نے چھوڑی ہوگی۔ اسٹوڈیو کا رستہ جاوا صاحب کے بیڈروم سے ہو کر گزرتا ہے پیارے۔''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ ہم لوگ اپنے دل سے ہی قصوں کے طوطے چڑیاں بنا لیتے ہیں۔ کم از کم...... کم از کم پونم کے بارے میں تو میں یہ بات ماننے کو بالکل تیار نہیں۔ تم کو پتا ہی ہے اس کا چاچا پرکاش پاٹل خود اچھا بھلا ڈان ہے۔''

''اوئے تم کو آئیڈیا نہیں۔ ایسے 70 سی سی ڈان جاوا صاحب کی سو ہارس پاور کے سامنے ایک دم ٹھس ہو جاتے ہیں۔ میں نے سنا ہے جن دنوں جاوا نے پونم کو چکھا تھا، ان دنوں وہ پرکاش بھائی دبئی چلا گیا تھا کوئی لوکیشن دیکھنے کے بہانے......'' وہ دبی آواز میں ہنسا۔

ان دونوں افراد نے ایک خستہ دیوار کے اوپر رائفلیں پوزیشن کر رکھی تھیں۔ ہم ان کے پہلو کی طرف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جگت نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا۔ درمیانی فاصلہ چند فٹ کے قریب تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور جھپٹے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اپنی وزنی رائفلوں کا رخ تبدیل کر سکتے یا کچھ اور کرتے، میں نے اپنی وزنی رائفل گھما کر ایک شخص کی کنپٹی پر ماری۔ یہ اتنی بھرپور اور ''جچی تلی'' ضرب تھی کہ یہ شخص بغیر آواز نکالے کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ دوسری طرف جگت سنگھ نے بھی اپنے

حریف کو اچھی چوٹ لگائی تھی۔ وہ گر گیا لیکن بے ہوش نہیں ہوا۔ مجھے لگا کہ وہ آواز نکالنے جا رہا ہے۔ میں نے جھپٹ کر اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ دیا۔ اس دوران میں جگت نے اپنی کرپان دستے تک اس کے سینے میں پیوست کر دی۔ وہ چند بار پھڑک کر ساکت ہو گیا۔

ہم اپنی جگہ دبکے رہے اور اردگرد کی سن گن لیتے رہے۔ گاڑیاں اب بھی تقریباً تین میٹر کے فاصلے پر تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہماری اس کارروائی کی خبر گاڑی سواروں کو نہیں ہوئی۔ اب ہم اگلے مرحلے کے لئے تیار ہوئے۔ ہم نے ایک ایک دستی بم اپنی بیلٹس سے علیحدہ کیا اور مٹھی میں دبا لیا۔ مشین گن والی جیپ کا ہیولا ہمیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''جگت سنگھ! ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔''

''کیا مطلب بادشاہ زادے؟''

''یہ دیکھو، بدلیاں آگے جا رہی ہیں۔ یہ تمہارا چندا ماموں کسی بھی وقت مکھڑا دکھا دے گا۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' جگت بولا۔

ہم ایک بار پھر کرالنگ کے انداز میں گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ دو افراد کو لمبا لٹانے کے بعد ہمارا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی ڈر تھا اور یہ ڈر کچھ دیر بعد سامنے بھی آ گیا۔ ہم پہلو کی طرف سے تھوڑا سا کلاوا کاٹ کر بڑھ رہے تھے۔ کوشش تھی کہ ہلکی سے ہلکی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ جوں جوں مشین گن سے فاصلہ کم ہو رہا تھا، دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ اب ہم اس دوری پر پہنچنے والے تھے جہاں سے جگت سنگھ کے بقول مشین گن والی گڈی کو پندرہ سولہ ٹوٹوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا یعنی تباہ کیا جا سکتا تھا۔ جگت سنگھ مجھ سے پانچ چھ فٹ آگے نکل گیا تھا۔ دستی بم جیسے اس کے ہاتھ میں بے طرح مچل رہا تھا۔

یکا یک ایک جھماکا ہوا۔ اتنی تیز روشنی ہوئی کہ ہمیں زمین پر گھاس کے تنکے اور ریت کے ذرے تک نظر آئے۔ یہی وہ اندیشہ تھا جو بار بار میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ ہم سرچ لائٹ کی زد میں تھے۔ اس لائٹ نے ہمارے اردگرد موت کا چمکیلا ہالا سا بنا دیا تھا۔ ہم ایک ساتھ اٹھے...... کسی بھی وقت ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منبع کس طرح ہے۔

پھر گولیاں چلیں لیکن یہ ہمارے سامنے سے نہیں، عقب سے چلی تھیں اور انہوں نے براہ راست سرچ لائٹ کو نشانہ بنایا تھا۔ یکا یک پھر ہمیں تاریکی نے چھپا لیا۔ ہم نے پوری

رفتار سے بھاگتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑی عقب سے عمران کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''واپس آ جاؤ۔''

اب شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ عمران ہی تھا جو ہمارے پیچھے آیا تھا اور جس نے سرچ لائٹ کو اندھا کر کے ہماری مدد کی تھی لیکن اب ہم اتنا آگے آ گئے تھے کہ بغیر کچھ کئے واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ شاید جا ہی نہیں سکتے تھے۔ جگت نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ مشین گن والی گاڑی پر دستی بم پھینکا۔ زبردست شعلے کے ساتھ سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس روشنی میں مجھے نظر آیا کہ اس گاڑی کے ساتھ ایک اور گاڑی بھی ہے۔ اس پر بھی ہیوی گن نصب تھی۔ میں نے Ring میں انگلی ڈال کر پن کھینچی اور اس دوسری گاڑی کو نشانہ بنایا۔ میرا پھینکا ہوا بم گاڑی کے پچھلے حصے میں گرا۔ گاڑی اگلی طرف سے اچھلی اور ایک سائیڈ پر الٹ گئی۔ اس میں غالباً کچھ دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ اس نے زوردار آواز کے ساتھ آگ پکڑ لی اور پوری گاڑی دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ اس دوران میں جگت دوسرا بم بھی پھینک چکا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گرا لیکن اس نے بھی یقیناً قرار واقعی نقصان پہنچایا۔ ہم پلٹ کر بھاگے۔ ہم نیچے جھکے ہوئے تھے۔ عقب سے گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ فائرنگ کے رخ سے اندازہ ہوا کہ یہ اندھی فائرنگ ہے۔ وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں پا رہے۔ عمران سامنے سے ہمیں کور دے رہا تھا۔ اس کی فائرنگ مؤثر تھی کیونکہ وہ گاڑیوں کے ہیولے دیکھ سکتا تھا اور اندازہ ہوا کہ وہ اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ کم از کم دو شوٹرز موجود تھے۔

ہم ان درختوں کے پاس سے گزرے جہاں دو بے حرکت جسم پڑے تھے۔ ان میں سے ایک زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے سینے میں جگت نے اپنی کرپان گھونپی تھی۔ ہم انہیں کراس کر گئے اور آگے نکل گئے۔ عمران نے ہماری راہنمائی کی۔ ہم ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں چلے گئے۔ اب ہم محفوظ دوری پر تھے۔

O......❖......O

عمران بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے گھورا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... نہیں باز آئے نا۔

ہم نے بھرپور جوابی فائرنگ کی۔ دو گاڑیاں جل رہی تھیں۔ یہ وہی تھیں جو میرے اور جگت سنگھ کے نشانے پر آئی تھیں۔ یقیناً مشین گنوں کے ساتھ ساتھ دو چار اہلکار بھی ہٹ ہوئے تھے۔ ایک شخص کو آگ کا لباس پہن کر رقصِ بسمل کرتے تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے اندر سے بھی ہمیں پوری سپورٹ مل رہی تھی۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے ''ری ٹریٹ'' ہونے لگے اور واپس ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ اچانک مجھے ان دو رائفلوں کا خیال آیا جو ہم میدان میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ ان دو اہلکاروں کی رائفلیں تھیں جنہیں ہم نے جھنڈ کے درختوں میں لمبا لٹایا تھا اور جن میں سے ایک کے سینے میں جگت سنگھ نے کرپان گھونپی تھی۔ وہ دو رائفلیں ہمارے لئے مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتی تھیں اور ہمیں ان کی ضرورت بھی تھی۔

عمران نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔ ''ان رائفلوں کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے؟''

میں نے دیکھا، وہ دونوں رائفلیں عمران کے پاس تھیں۔ یہ پوری طرح لوڈڈ تھیں۔ رائفل مینوں کو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا ہم نے۔ گولیوں کے تین چار طویل اسٹریپس بھی عمران کے ایک شوٹر کے ہاتھ میں تھے۔ تین چار سو گولیاں تو یقیناً ہوں گی۔ یہ ایمونیشن اس وقت ہمارے لئے انرجی ٹانک کی حیثیت رکھتا تھا۔

''ویل ڈن۔'' میں نے بے ساختہ عمران کی تعریف کی۔

''تم نے بھی اچھا کیا لیکن شورہ کر لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔'' عمران نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ تم اجازت نہ دیتے۔'' میں نے کہا۔

جگت بولا۔''بادشاہو! آپ واقعی کمال کے بندے ہو۔لگتا ہے کہ واہگرو کی خاص کرپا ہے آپ پر۔شاید آپ خطرے کو سونگھ لیتے ہو۔آپ ہمارے پیچھے آ کر اس سرچ لائٹ کا کونڈا نہ کرتے تو پکی گل ہے ہمارا کونڈا ہو جانا تھا۔بہت بہت دھنیواد آپ کا۔''

فائرنگ میں ایک بار پھر وقفہ آ گیا تھا۔دور سے انڈین سپاہیوں کے بولنے اور چلاّنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔یوں لگتا تھا کہ وہ ریت سے گاڑیوں کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ایک گاڑی بڑی تیزی سے واپس جاتی دکھائی دی۔یقیناً وہ زخمیوں کو لے کر گئی تھی۔ہماری یہ کارروائی بڑی کامیاب رہی تھی۔میرے اور جگت سنگھ سمیت کسی بندے کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ہم نے دو مشین گنیں ناکارہ کر دی تھیں۔کم از کم ایک دو بندوں کو تو یقیناً ہلاک کیا تھا۔ایمونیشن سمیت دو ہیوی رائفلیں بھی ہاتھ آئی تھیں۔

جگت سنگھ کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ باقی دو دستی بم بھی لے کر نکلتا اور گھیرا ڈالنے والوں میں گھس جاتا۔مجھے وہ گالیاں یاد آئیں جو اس نے دستی بم پھینکتے ہوئے انڈین سپاہیوں در جاوا کے غنڈوں کو دی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں اور عمران پھر اپنی پوزیشنوں پر تھے۔میں نے کہا۔''یہ کیا جادو ہے تمہارے پاس...... میں جب بھی تمہیں بتائے بغیر کہیں نکلتا ہوں، تمہیں پتا چل جاتا ہے؟''

''اسی کو تو کہتے ہیں خبردار جرنلسٹ۔''

''کچھ آگے کی بھی خبر ہے جرنلسٹ صاحب؟ یہاں سے نکل سکیں گے یا نہیں؟''

''شام تک میں مایوس تھا لیکن اب نہیں ہوں۔یہاں مجھے ایک ایسی چیز نظر آ گئی ہے جو مجھے یقین دلا رہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکیں گے۔نہ صرف نکل سکیں گے بلکہ عنقریب ثروت اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ کے ساتھ مل کر بدین کے کسی اچھے سے ریسٹوران میں مزیدار سا ڈنر بھی کریں گے اور ابرار صدیقی اور ایشوریا رائے کی موت کا دکھ بھلانے کی کامیاب کوشش کریں گے۔اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام تک پہنچانے کی پلاننگ بھی ہوگی۔''

''ایشوریا کا مجھے بھی صدمہ ہوا ہے۔اس نے کافی سزا پا لی تھی۔اب وہ اپنے گلی کوچوں کے لئے ترس رہی تھی۔لیکن تم بات کو کسی اور طرف لے گئے ہو۔کون سی شے تمہیں ایسی نظر آئی ہے جو تمہاری امید بندھا رہی ہے؟''

وہ دور تاریکی میں دیکھتے ہوئے بولا۔''ابھی مجھے خود کسی نتیجے پر پہنچ لینے دو پھر بتاؤں گا۔''

''کیوں، کوئی خطرہ ہے مجھ سے؟''

''خطرہ تو ہونا چاہئے۔تم اب من مانیاں کرنے لگے ہو۔''

ہمارے سامنے جھنڈ کے اندر اور ارد گرد نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔نقصان اٹھانے کے بعد وہ لوگ یقیناً پیچ و تاب کھا رہے تھے۔''مجھے لگتا ہے کہ اب یہ لوگ حملہ کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''اور زوردار کریں گے۔''

''تو پھر تیار ہو جانا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھیوں کو ہدایات دینے کے لئے سرونٹ کوارٹر سے باہر نکل گیا۔میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔آج میں اسے کسی اور نظر سے دیکھ رہا تھا۔یہ نظر نئی تھی اور وہ خود بھی نیا تھا۔سینہ تان کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ان لمحوں میں وہ واقعی ایک فوجی افسر ہی نظر آیا۔پتا نہیں کتنے روپ تھے اس کے؟ عمو...... موت کے کنوئیں میں زندگی کو داؤ پر لگانے والا بازی گر...... ریوالور کا کھیل کھیلنے والا نڈر طالع آزما، درد دل رکھنے والا ایک سماجی کارکن، جانوروں کا ٹرینر...... اور اب ایک سابق فوجی...... پیاز کی طرح اس کی بہت سی پرتیں تھیں۔ہر پرت کے نیچے ایک اور پرت ظاہر ہوتی تھی۔ساتھیوں کو ہدایات دینے کے بعد عمران واپس آ گیا۔

سویٹی کی موت کے بعد اس کی ساتھی دونوں لڑکیاں بہت دہشت زدہ تھیں۔ان میں سے ایک پر تو بار بار غشی سی طاری ہو رہی تھی۔سویٹی کی طرح یہ دونوں لڑکیاں بھی عمران پر بہت بھروسا کر رہی تھیں۔جب وہ عمران کی طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں امید اور حوصلے کی چمک پیدا ہو جاتی تھی لیکن جب وہ دور ہو جاتا تو ان کی آنکھوں میں بھی تیرگی پھیل جاتی تھی۔جگت سنگھ جھک کر چلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بادشاہو! آپ کا بڑا آسرا ہے ان دونوں کڑیوں کو۔آپ ایک بار ان کو شکل دکھا دیں اور تسلی کے دو چار بول بول دیں۔نہیں تو رو رو کر مر جائیں گی وہ۔''

عمران نے مجھے پوزیشن پر چوکس بیٹھنے کو کہا اور خود جگت سنگھ کے ساتھ اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی جیلانی میرے پاس آ بیٹھا۔اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔دوسرا پٹیوں میں لپٹا ہوا اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔وہ کچھ دیر

خاموش اور گم صم بیٹھا رہا...... پھر اچانک بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تابش بھائی! آپ عمران صاحب کے بہت قریب ہیں، آپ ہی کچھ کریں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں دکھ کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ وہ کوئی بہت گھمبیر بات چھپا رہا تھا۔

''جیلانی! کیا بات ہے...... تم بتاتے کیوں نہیں؟''

اس نے عقب میں دیکھا، جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ عمران کی واپسی کے آثار تو نہیں۔ پھر بہت دھیمی آوار میں بولا۔ ''تابش بھائی! آپ عمران صاحب کو روکیں...... مجھے یقین ہے وہ بہت غلط کام کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے......'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

''جیلانی! تم پریشان کر رہے ہو۔ جو بات ہے، جلدی کہو۔''

اس نے ایک لمبی آہ بھری اور جیسے حوصلہ جمع کرنے لگا۔ ہمارا گھیرا مزید سخت ہو رہا تھا۔ کچھ اور گاڑیاں موقع پر پہنچ رہی تھیں۔ ان کی متحرک روشنیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جیلانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ عمران صاحب ایک بہت غلط قدم اٹھانے جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں موبائل پر بات کرتے سنا ہے۔ وہ کسی انڈین کرنل سے بات کر رہے تھے۔''

''انڈین کرنل سے؟''

''جی ہاں، مجھے لگتا ہے وہ یہاں موجود ہے۔ وہ کمینہ جاوا بھی شاید اس کے پاس ہی ہے۔ عمران صاحب ان کو اپنی حوالگی کی آفر کر رہے ہیں...... اس شرط پر کہ باقی سب افراد کو حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل جانے دیا جائے......'' جیلانی کی آواز پھر بھرا گئی۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے عمران کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا اسے ایک خاص طریقہ نظر آ رہا ہے اور اس کی وجہ سے سب کے لئے امید کی کرن پیدا ہو گئی ہے۔ تو کیا یہی وہ طریقہ تھا؟ وہ اپنی جان کو اتنا ارزاں کیوں سمجھتا تھا؟ کیوں ہر جگہ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا تھا؟ مجھے اس کے دیوانے پن پر تاؤ آنے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، جیلانی دھیمی آواز میں بولا۔ ''انہوں نے جو ارادہ کر لیا ہے پورا کریں گے۔ ہم انہیں روک نہیں سکیں گے۔ ہماری خاطر اور ان لڑکیوں کی خاطر وہ خود کو بڑی تکلیف دہ موت کے حوالے کر دیں گے۔ میری سمجھ میں تو اس کا ایک ہی طریقہ

ہے......''

''وہ کیا؟''

اس نے ایک بار پھر عقب میں دیکھا اور بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ''ہمارا یہ پکا ارادہ ہونا چاہئے کہ آخری گولی اور آخری بندے تک لڑیں گے۔ اکٹھے جینے مرنے کا یہی تو مطلب ہوتا ہے۔ ہمیں عمران صاحب کو کسی ڈھنگ سے روکنا پڑے گا۔ وہ رک جائیں اور تھوڑا وقت گزر جائے تو پھر ہو سکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے کوئی مدد بھی آ جائے۔''

''ایسی کسی مدد کی توقع ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑی بہت ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی سائل پور تک آ چکے ہیں۔ انہوں نے دو سرکاری ٹرک بھی حاصل کر لئے ہیں۔ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔'' جیلانی کہہ تو رہا تھا لیکن اس کی آواز میں کوئی خاص دم خم نہیں تھا۔

میں نے جیلانی سے پوچھا۔ ''تم نے عمران کو انڈین کرنل سے بات کرتے کب سنا؟''

''یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔ آپ اس وقت اندر کے کمروں میں ٹارچ ڈھونڈ رہے تھے۔''

''تم نے عمران کو روکنے کے لئے ابھی کسی طریقے کی بات کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

جیلانی نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر جیب میں سے تین چار گولیاں نکالیں...... یہ ہائی پوٹینسی ٹرنکولائزر تھیں۔ وہ بولا۔ ''ابھی لڑکیاں چائے بنائیں گی، میں ہی لے کر آؤں گا۔ عمران صاحب کے کپ میں دو گولیاں ڈال دیتے ہیں۔''

اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ عمران جیسے شخص کو اس کے کسی ارادے سے روکنا تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے اور جیلانی نے جو کچھ بتایا تھا...... اور یقیناً درست ہی بتایا تھا، وہ از حد خطرناک تھا۔ مجھے خود بھی بار بار اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا...... پچھلے دو تین گھنٹوں میں عمران نے کئی بار کہا تھا کہ اس ساری سچویشن کا ذمے دار وہ خود ہے۔ اس نے یہاں جو دشمن پال رکھے تھے، وہ سب سمٹ کر سامنے آ گئے ہیں اور وہ خود تو پھنسا ہی ہے، ہم سب بھی پھنس گئے ہیں۔

میں نے جیلانی سے پوچھا۔ ''اس ڈوز کا اثر کب تک رہے گا؟''

''کم از کم صبح تک تو چلے گا ہی۔ تب تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔''

ہم نے اس بارے میں چار پانچ منٹ بات کی اور پھر فیصلہ کیا کہ اب رات کا باقی حصہ عمران کو ''آرام'' کرنے کا موقع دیا جائے۔

عمران واپس آ گیا تھا۔ ہماری گفتگو کا رخ بدل گیا۔

ڈاکٹر مہناز کے پاس چائے کے لوازمات موجود تھے۔ فاخرہ اور ثروت نے اندرونی کمرے میں عارضی چولہا بنا کر چائے تیار کی۔ اس کے لئے ایک بڑی کیتلی بھی بس کے اندر سے ہی مل گئی۔ پروگرام کے مطابق جیلانی ہی چائے لے کر آیا۔ وہ صرف جیلانی نہیں، کیپٹن جیلانی تھا اور آج وہ اپنے افسر کو ایک نہایت خطرناک ارادے سے باز رکھنے کے لئے ایک قدم اٹھا رہا تھا۔ اس قدم کے لئے اسے میری پوری حمایت حاصل تھی۔

عمران والا کپ عمران کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹیلی اسکوپ تھی اور وہ گاہے بگاہے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک گھونٹ لیا اور پھر دوبارہ ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ اس نے کپ کو دیکھا۔ اس کی حسیات بلا کی تھیں۔ وہ کچھ چونکا ہوا نظر آیا۔ اسی دوران میں اس کے موبائل کی بیل ہوئی۔ وہ کال ریسیو کرتا ہوا احاطے کی طرف چلا گیا۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے علیحدہ میں جا کر بات کی تھی۔ یہ سب کچھ جیلانی والی اطلاع کی تصدیق کر رہا تھا۔ آدھ منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔

''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ چائے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر ایک چھوٹا سا ''سپ'' لیا اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا یا اپنا سوال دہراتا، اس نے میرے ہاتھ سے کپ لے کر ایک گھونٹ لیا اور ہمیں گہری نظروں سے دیکھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

''کک...... کیا ہوا جی؟'' جیلانی نے پوچھا۔

''وہی جو تم نے کیا ہے۔ بلکہ شاید...... تم دونوں نے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''اس میں Bromazepam ہے...... کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟'' عمران نے پوچھا۔

جیلانی گنگ سا ہو گیا۔ میں بھی سٹپٹا گیا۔ عمران کی غیر معمولی زود فہمی کا تجربہ میں اس سے پہلے بھی دو چار بار کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کی بوجھل خاموشی کے بعد میں نے بھنائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم ایسا اس لئے کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارے دیوانے پن سے روکنا چاہتے تھے۔ تم سمجھتے ہو کہ دنیا جہان کی عقل اکٹھی ہو کر تمہارے دماغ میں گھس گئی ہے۔ تم جو فیصلہ بھی کرو گے، سو فیصد درست ہو گا اور اس فیصلے کے لئے تمہیں کسی اُلو کے پٹھے سے مشورے کی

ضرورت بھی نہیں۔ تمہارے ارد گرد نرے گدھے اور پیدائشی احمق ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارا موبائل فون اس بات کی گواہی دے گا کہ تم انڈین کرنل سے بات چیت کر رہے ہو۔ خود کو اس کے حوالے کر کے ایک تاریخی احسان کرنا چاہ رہے ہو ہم سب پر۔ ہماری زندگیاں بچانے کے لئے ایک عظیم الشان قربانی دے رہے ہو۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری اس سوچ پر...... اور تمہارے اس احسان پر۔ ہم سب تمہاری طرح جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ہمیں بھی اللہ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، دماغ دیا ہے۔ تم اکیلے ہی آسمانوں سے ہمدردی اور قربانی کے دیوتا بن کر نازل نہیں ہوئے ہو۔''

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''ہم اکٹھے جائیں گے اور اکٹھے مریں گے۔ قربانی ہو گی تو سب کی ہو گی۔ لاشیں اٹھیں گی تو سب کی اٹھیں گی۔ اپنی عقل پر اتنا ہی گھمنڈ کرو جتنا بنتا ہے۔ تم بھی دھوکا کھا سکتے ہو۔ ابھی ایک دن پہلے کھایا ہے کہ نہیں تم نے، ہم سب...... ایک عام لڑکی کو جاوا کی رکھیل سمجھ کر لئے پھرے ہیں اپنے ساتھ۔''

وہ خاموش تھا۔ اچانک کہیں سے مشین پسٹل کے دو فائر ہوئے۔ پھر تابڑ توڑ گولیاں چلنے لگیں۔ دونوں طرف کے رائفل مین تواتر سے ٹریگر دبانے لگے۔ میں نے دیکھا، دو افراد کسی کو کھینچتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف لا رہے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد یہ ہمارے سامنے سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ یہ جگت سنگھ اور قربان علی تھے۔ انہوں نے ایک مخالف شوٹر کو دبوچا ہوا تھا اور گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ اس بندے کے کندھے میں گولی لگی تھی اور اس کی دھاری دار شرٹ اور جینز کی پینٹ خوں رنگ ہو رہی تھی۔

''لگتا ہے یہ جاوا کا گرگا ہے۔'' قربان نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیسے پکڑا؟'' عمران نے پوچھا۔

جگت بولا۔ ''آپاں کو شک ہوا تھا جی۔ پہلے آپاں دونوں سمجھے کہ اندھیرے میں کوئی کتا ہل جل کر رہا ہے۔ پھر اندازہ ہوا کہ یہ چار نہیں دو لاتوں والا کتا ہے۔ یہ ڈڈھ کے بل رڑ کر (کرالنگ کر کے) ٹیلے سے آگے نکل آیا تھا۔ پتا نہیں کیا ارادہ تھا اس کا۔ ہم نے آگے جا کر گولی چلائی اور پکڑ لیا۔ یہ دیکھیں، تین دستی بم نکلے ہیں اس کے پاس سے۔''

ابھی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے بھی پوزیشن سنبھال لی۔ مخالفین کی ''فائرنگ پاور'' زیادہ تھی اور تعداد بھی۔ میں نے اندازہ لگایا

کہ ان کی تقریباً چار گولیوں کے جواب میں ہم ایک گولی چلا رہے ہیں۔ بہر حال ہم انہیں آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب تھے۔ پانچ چھ منٹ بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اس دوران میں مخالفین نے جھنڈ میں اپنی پوزیشن کچھ اور مضبوط کر لی تھی۔

جگت سنگھ نے پکڑے جانے والے شخص کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی تھیں..... 38 بور کی گولی اس بندے کے کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر مہناز اپنے طبی سامان کے ساتھ آئی اور اس نے مضروب کا خون بند کرنے کے لئے مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔ اس دوران میں وہ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ یہ تیس بتیس سال کا بندہ تھا۔ سکھ نہیں تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ پنجاب یا ہماچل پردیش وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے کراہنے کے لئے منہ کھولا تو جگت سنگھ نے رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسا دی اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ ''آپاں جو کچھ پوچھیں گے، سچ بتانا پڑے گا۔ نہیں تو گولی وہاں وہاں سے گزرے گی جہاں جہاں سے تیرا بھوجن گزرتا ہے۔''

وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ بے پروائی سے جگت کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے مہرے سے وہ بڑا کرخت بندہ لگتا تھا۔ ظاہر جاوا جیسے ڈان کا قریبی ساتھی تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں یقین ہو گیا کہ وہ آسانی سے زبان کھولنے والا بندہ نہیں۔ وہ الٹا ہمیں ڈرا رہا تھا کہ ہم بہت بری طرح پھنس چکے ہیں اور بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر اپنی جانیں بچائیں۔

دفعتاً فرانس نامی یہ بندہ کچھ چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے بغور عمران کو دیکھا اور بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہاری آواز کہیں سنی ہے۔ یہ زیادہ دن پہلے کی بات بھی نہیں ہے۔'' اس کی نیم گنجی پیشانی پر الجھن کی لکیریں تھیں۔

تب یکا یک وہ اپنے زخمی کندھے کو تھامتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس نے عمران کا بازو دیکھا۔ عمران نے کلائی پر سے آستین اڑسی ہوئی تھی۔ ہم نے دیکھا، جاوا کا یہ عیسائی گرگا بڑے دھیان سے عمران کی کلائی دیکھ رہا ہے۔ عمران کی سرخ و سپید کلائی پر گولی لگنے کا ایک پرانا نشان تھا۔ یہ قریباً پانچ سال پرانی بات تھی جب ایک تاریک رات میں ایک پُرشور نالے کے اوپر سراج کے کارندے شیرے نے عمران پر گولی کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ جیکٹ کی وجہ سے بچا تھا تاہم چند گولیاں اسے لگ گئی تھیں۔ یہ کلائی کا چار پانچ انچ لمبا سیاہی مائل نشان بھی اسی خونی واقعے کی یادگار تھا۔

فرانس نے اس نشان کو دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے لگا وہ سخت

حیران ہوا ہے اور اس کے ساتھ وہ ساری کرختگی اور عداوت اس کے چہرے سے دور ہو رہی ہے جو کچھ دیر پہلے تک اس کے نقوش کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ اس نے ایک بار پھر عمران کو سر تا پا دیکھا اور بولا۔ ''مجھے یاد آ گیا...... آپ کو میں نے گولڈن بلڈنگ میں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ آپ ہی تھے۔ آپ کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں ہے...... اور آپ کے ہاتھ کا یہ نشان...... اسی ہاتھ سے آپ نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ آپ دھوئیں کی وجہ سے بری طرح کھانس رہے تھے۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔''

''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''لیکن مجھے سب کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔ میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ یہ آپ ہی تھے، آپ ہی نے ہمیں بچایا تھا۔ اس وقت آپ کے چہرے پر نقاب تھا لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ ایک بڑی خواہش پوری ہوئی ہے میری۔'' وہ عمران کے سامنے آ گیا۔ اس کا انداز مؤدب اور عقیدت مندی کا تھا۔

''کون ہو تم؟'' عمران نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف کیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''سر! میں گولڈن بلڈنگ کے ان گارڈز میں سے ہوں جو کمرا نمبر تین میں لاک رہ گئے تھے۔ پوری بلڈنگ میں دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ ہمیں اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ آپ آگ اور دھوئیں میں سے گزر کر ہم تک پہنچے تھے۔ دروازہ کھول کر ہمیں نکالا۔ میں ان گارڈز کا سیکنڈ انچارج فرانس جوزف ہوں۔ مجھے وہ سارا واقعہ معلوم ہے۔ آپ ہمیں بلڈنگ میں بھول گئے تھے لیکن پھر ہمارا جیون بچانے کے لئے آپ نے اپنے جیون کو شدید خطرے میں ڈالا...... میں...... بہت بڑا اپرادھی ہوں لیکن یہ ایک ایسا احسان ہے جو مجھ جیسا بندہ بھی بھلا نہیں سکتا۔ آپ...... بتائیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ آپ وہی ہیں نا؟''

عمران خاموش تھا، ہم سب خاموش تھے۔ یہ عجیب ٹوئسٹ آیا تھا۔ اگلے دس پندرہ منٹ کافی اہم اور انکشاف انگیز تھے۔ فرانس نامی یہ انچارج گارڈ جاوا کے کارندوں میں سے تھا۔ ہم نے کچھ دیر پہلے بی ایس ایف کی گاڑیوں پر جو تین دستی بم پھینکے تھے، ان سے جہاں گنتیں برباد ہوئی تھیں، وہیں چار بندے بھی شدید زخمی ہوئے تھے جن میں دو کچھ ہی دیر بعد ہلاک ہو گئے تھے۔ جاوا کا یہ کارندہ ان دستی بموں کا جواب دستی بموں سے دینے کے لئے ہماری طرف آیا تھا لیکن دھر لیا گیا۔ اب وہ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ایک بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا اور اس تبدیلی کی وجہ وہ بڑے جذباتی انداز میں گولڈن بلڈنگ والے واقعے سے جوڑ رہا تھا

جسے ہم تقریباً بھول چکے تھے۔

پتا نہیں کہ جاوا سے فرانسس کا تعلق کتنی دیر سے تھا اور اس میں کتنی گہرائی تھی مگر عمران کے ایک عمل نے اسے اس طرح متاثر کیا تھا کہ اس کی ساری کیمسٹری ہی بدلی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ یوں لگا جیسے پتھر اشک بار ہے...... وہ عمران کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''میں اس احسان کے بدلے آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟''

عمران نے کہا۔ ''میں تمہاری احسان شناسی کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر تم ہمیں ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دو تو یہی بہت ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ان معلومات کے لئے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

عمران کے کہنے پر مہناز نے فرانسس نامی اس بندے کی مرہم پٹی ایک بار پھر زیادہ اچھے طریقے سے کی۔ اسے چائے وغیرہ پلائی گئی۔ اس نے کئی اہم باتیں بتائیں۔ اس نے انکشاف کرنے والے لہجے میں کہا۔ ''شاید آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ بی ایس ایف اور ہمارے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگ آپ پر ہلا بول کر ریسٹ ہاؤس میں گھسنا نہیں چاہتے۔''

''اس کی وجہ؟''

''وہی جو آپ نے بتائی ہے اور جو میں نے بھی بتائی ہے۔ علاقے میں یہ جگہ آسیب زدہ مشہور ہے۔ کوئی پاس سے بھی نہیں گزرتا۔ بی ایس ایف کے لوگ بھی یہاں نہیں گھسیں گے اور نہ ہم گھسیں گے۔''

''تو پھر؟''

''دیکھیں جی، یہ لوگ اس چکر میں ہیں کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ فائرنگ میں الجھایا جائے اور آپ پر یہ ظاہر کیا جائے کہ کسی بھی وقت ریسٹ ہاؤس پر چڑھائی ہو سکتی ہے۔ یوں آپ کا ایمونیشن بالکل ختم کر دیا جائے۔''

''ایمونیشن ختم ہو جائے گا تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر بھی یہ لوگ اندر نہیں گھسیں گے۔ یہ آپ ہی کو باہر آنے اور گرفتاری دینے کا کہیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم یہاں جم کر بیٹھے رہیں تو کوئی ہمیں یہاں پکڑنے نہیں

آئے گا۔''

''نہیں، خیر ایسا تو نہیں ہو گا...... اگر آپ خود نہ نکلے تو پھر آپ کو کسی اور طریقے سے باہر نکالا جائے گا۔ خاص طور پر میجر صاحب کو تو یہ لوگ ہر صورت پکڑنا چاہتے ہیں۔''

''مثلاً کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟''

''شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ آپ کو باہر نکالنے کے لئے آپ کو ایک دم ڈرا دیا جائے گا۔ دراصل علاقے کے لوگ بھی اس بات کو بالکل پسند نہیں کر رہے کہ آپ لوگوں کو پکڑنے کے لئے بی ایس ایف، پولیس یا ہم اندر گھسیں۔ انہوں نے مل جل کر کچھ عجیب سا ماحول بنا دیا ہے۔ مقامی بی ایس ایف تو پہلے ہی اس جگہ کو آسیب زدہ سمجھتی تھی، اب باقی لوگ بھی ڈرے ہوئے ہیں جن میں ہم بھی شامل ہیں۔ بھیا جاوا صاحب کے ساتھیوں میں واحد میں ہوں جو ان باتوں کو بکواس سمجھ رہا ہے۔''

''اور شاید اسی لئے تمہیں تین دستی بم دے کر یہاں بھیجا بھی گیا۔'' عمران نے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔''

''تم نے ابھی کہا ہے کہ شاید ہمیں ڈرا کر یہاں سے نکالا جائے گا...... اس کا کیا مطلب ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''دراصل شام سے ہی مختلف طریقوں پر غور ہو رہا ہے۔ جاوا صاحب نے کرنل صاحب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ گھیرا برقرار رکھا جائے۔ جب کھانا پانی اندر نہیں جا سکے گا تو آپ لوگ خود ہی ہمت ہار کر باہر آ جائیں گے۔ پر کرنل صاحب کا کہنا تھا کہ اس میں کافی وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے چار پانچ دن۔ اوپر سے سخت آرڈر ہیں کہ جلد سے جلد گرفتاری ہو۔ اوپر بیٹھے ہوئے افسر اس آسیب واسیب کی بات سے بے خبر ہیں اور انہیں خبر ہو بھی تو شاید وہ اس کو اتنی اہمیت نہ دیں۔''

''تو پھر ہمیں نکالنے کے لئے کیا پلاننگ ہے ان کی؟''

فرانسس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''شاید آپ کو پتا ہی ہو بھیا جی (جاوا) کے پاس بہت سے پالتو ریچھ ہیں۔ وہ جگہ جگہ سے ہر طرح کے ریچھ اکٹھے کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ممبئی میں رکھے گئے ہیں، کچھ بھڑوچ اور کھمبات وغیرہ میں۔ یہ سارے بڑے خوں خوار جانور ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک بڑا کنٹینر پہنچا ہے۔ وہ دیکھیں...... وہ دیکھیں...... جھنڈ کے پاس، گاڑیوں کے پیچھے۔ وہ اونچی چھت والا سفید کنٹینر۔''

میں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد لی اور مجھے وہ کنٹینر صاف نظر آیا۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر پہلے

ہی یہاں پہنچا تھا۔ عمران اور جیلانی نے بھی ٹیلی اسکوپ سے کنٹینرز کو دیکھا۔ خالی آنکھ سے بھی اس کی سفیدی مائل چھت دکھائی دیتی تھی۔

''اس میں کیا ہے؟'' کیپٹن جیلانی نے پوچھا۔

''اس میں پالتو ریچھ ہیں جی۔ سات کے قریب۔''

''ان کا کیا کیا جائے گا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ایمونیشن ختم ہونے کے بعد بھی اگر آپ لوگ ریسٹ ہاؤس میں ڈٹے رہے اور باہر نہیں آئے تو ان ریچھوں کو ریسٹ ہاؤس کی طرف ہانک دیا جائے گا۔ اس کام کے لئے شکاری کتے بھی استعمال ہو سکتے تھے اور بی ایس ایف والوں نے وہ منگوا بھی لئے تھے لیکن مقامی لوگوں نے سختی سے منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پالتو کتے بلیاں اور گھوڑے یہاں داخل نہیں کئے جا سکتے۔ اس سلسلے میں پنڈتوں نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ بہرحال، بھیا جی کو امید ہے کہ شاید ریچھ چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔ آپ کو کسی اور طریقے سے باہر نکال لیا جائے۔''

میرے جسم میں پھریری دوڑ گئی۔ جاوا کے وہ خوں خوار ریچھ نگاہوں کے سامنے آئے جنہوں نے اپنے ٹریز کو مارا تھا اور کوٹھی میں زبردست توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ثروت کا خیال آیا۔ وہ بدترین حالات سے گزر رہی تھی لیکن اگر وہ جاوا کے ریچھ بھی یہاں دیکھ لیتی تو شاید اس کا دل ہی کام کرنا بند کر دیتا۔

عمران نے بی ایس ایف کی ٹوٹل نفری اور اسلحے وغیرہ کے بارے میں بھی فرانسس سے معلومات حاصل کیں۔ گاڑیوں کی کل تعداد کا پتا چلایا اور ان کی لوکیشنز معلوم کیں۔ فرانسس نے یہ بھی بتایا کہ جاوا گروپ کی پانچ گاڑیاں اور قریباً 30 شوٹرز یہاں موجود ہیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران کی نگاہیں گاہے بگاہے اس سمت میں اٹھ جاتی تھیں جہاں فرانسس نے سفید کنٹینرز کی نشاندہی کی تھی۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہا تھا...... فرانسس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ہماری آپس کی تلخ کلامی اور لڑائی پس منظر میں چلی گئی تھی۔

قربان وغیرہ فرانسس کو باہر لے گئے۔ ایک طرح سے اب وہ ہماری حفاظتی تحویل میں تھا۔

فرانسس جو کچھ بتا رہا تھا، بڑا حیران کن تھا۔ ہمیں پہلے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ صرف گھیرا ڈالے ہوئے ہیں ورنہ جتنی ان کی نفری تھی اور فائر پاور تھی، وہ دو تین گھنٹے پہلے اس قابل ہو گئے تھے کہ ہم پر ہلا بول کر ریسٹ ہاؤس میں گھسنے کی کوشش کرتے۔ توہمات کہاں نہیں ہوتے، یہاں بھی موجود تھے اور ایک طرح سے یہ ہمارے حق میں بھی تھے۔

علاقے کے لوگ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ بی ایس ایف یا پولیس وغیرہ ریسٹ ہاؤس میں گھسے اور یوں عاملوں اور دو تین بڑے پنڈتوں کے مطابق بدآتمائیں اس چار دیواری سے باہر نکل آئیں۔

ریچھوں کی یہاں آمد کا سن کر میرا دھیان بار بار ثروت کی طرف جا رہا تھا۔ وہ قریب سے کسی ریچھ کی آواز بھی سن لیتی تو شاید ہوش کھو دیتی۔ وہ کسی ایسی صورتِ حال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ پرانے واقعے کے اثرات اس کے ذہن پر بڑے گہرے تھے۔

اس دوران میں جگت سنگھ نے آ کر مجھے بتایا۔ ''بادشاہ زادے! چھوٹی تمہیں بلا رہی ہے۔''

میں خود بھی ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔ اپنی پوزیشن جگت سنگھ کو سونپ کر میں اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ راستے میں مجھے ڈاکٹر مہناز ملی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ قربان علی بھی ایک دم غمزدہ کھڑا تھا۔ میں چونک گیا۔ میرا دھیان سیدھا نصیر احمد کی طرف گیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔

''نصیر احمد تو ٹھیک ہے؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کی خوب صورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

قربان علی بولا۔ ''نصیر احمد ہمیں چھوڑ گیا ہے تابش صاحب۔''

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر مہناز ہولے سے بولی۔ ''لیکن آپ لڑکیوں کو کچھ نہ بتائیں۔ خاص طور سے ثروت کو۔ وہ پہلے ہی ڈپریشن میں ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خود کو سنبھالتا ہوا ثروت کی طرف بڑھا۔ ثروت ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے ثروت؟''

''بیٹھ جائیں۔'' وہ عجیب انداز میں بولی۔

میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ انہی کپڑوں میں تھی جن میں ممبئی سے چلی تھی۔ سرخ پھولوں والی شلوار قمیص تھی جس پر اس نے شال اوڑھ رکھی تھی۔ شال کندھوں پر تھی اور ریشمی بال بکھرے بکھرے نظر آتے تھے۔ ایک چھوٹے جھمکے کا سایہ اس کے رخسار پر حرکت کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ بولے گی لیکن کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر ایک دم اس نے جذباتی انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور انہیں میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ قریباً ایک منٹ ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں نے کہا۔ ''کچھ بولو نا

ثروت!''

اس کی روشن پیشانی پر ایک رگ ابھری ہوئی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت نہیں دی۔ ہونٹ جو خشک اور بے رنگ ہونے کے باوجود میرے لئے بہت دلنشین تھے۔

''کچھ بولنا نہیں؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ دلربا انداز تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ بدستور میرے ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھے۔

اس دوران میں ڈاکٹر مہناز نے کمرے میں جھانکا۔ ثروت نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔ دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر متحرک ہوئے۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''اسے پڑھ لیجئے گا۔''

ڈاکٹر مہناز اب اندر آ گئی تھی۔ میں اٹھ کر واپس اپنی پوزیشن پر پہنچ گیا۔ عمران ٹیلی اسکوپ میں اردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

میں نے کاغذ کھولا اور ٹارچ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا۔ ''تابش! میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں اور آپ نے بڑے حوصلے سے برداشت کئے ہیں۔ میرے لئے شدید رنج کی بات یہی ہے کہ آپ کی ان اذیتوں کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ میں اپنی سوچوں کا شکار ہوں تابش! میں وہی بات کہوں گی۔ میں اس خیال کو اپنے دل سے نکال ہی نہیں سکتی کہ آپ کا اور میرا ملاپ نصرت کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوگا۔ پتا نہیں کیوں اب بھی میرا دل بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ نصرت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی بڑی مصیبت کا شکار ہے اور اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ میں اس وقت اپنے شوہر سے دور ہوں اور آپ کے قریب......

''ہم جس طرح کے حالات میں ہیں، ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے تابش! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کے دوست نصیر کو دیکھا ہے۔ مجھے نہیں لگتا، ڈاکٹر مہناز اسے بچا پائے گی۔ شاید اگلی باری میری ہو یا خود ڈاکٹر مہناز کی ہو۔ تابش! اگر مجھے کچھ ہو گیا...... تو آپ نصرت کا بہت خیال رکھئے گا۔ وہ بن ماں باپ کے ہے۔ بالکل بے آسرا ہے۔ اس نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اسے میری کمی محسوس نہ ہونے دیجئے گا۔ اور ایک آخری بات آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ اسے ہمیشہ یاد رکھئے گا...... میں آج بھی آپ سے پیار کرتی ہوں اور اس

پیار کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ میرے پاس اس کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ میں اس اظہار کے لئے خود کو بالکل بے بس محسوس کرتی ہوں۔ میری دوسری خطاؤں کی طرح میری اس بے بسی کو بھی معاف کر دیجئے گا۔ اگر ہم زندہ رہے تو آج کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔ خدا حافظ۔''

میں نے کاغذ اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ عمران نے آخری بار ٹیلی اسکوپ کو نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور بولا۔ ''بھانڈیل اسٹیٹ کی قلعے والی لڑائی یاد ہے تابی! آج پھر ویسی ہی پوزیشن نظر آ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس وقت تو نل پانی سے چھوٹے سرکار کی کمک آ گئی تھی لیکن یہاں ایسی کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جو کچھ کرنا ہے، شاید ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ کوئی خاص بات آتی ہے تمہارے ذہن میں؟''

وہ ٹیلی اسکوپ کو ایک طرف رکھ کر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''بھانڈیل میں کمک کا اصل فائدہ یہی ہوا کہ گھیرا ڈالنے والوں میں کھلبلی مچی تھی۔ اس کھلبلی کا فائدہ اٹھا کر ہم قلعے سے نکل کر حکم کی فوج پر ٹوٹ پڑے تھے۔ نوجوان طلال، بھرت کمار، سناتن وغیرہ نے بھی ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر بے مثال جرأت دکھائی تھی اور حکم اور اینڈرسن وغیرہ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ اگر یہاں بھی کوئی اس طرح کی کھلبلی مچ سکے تو ہم باہر نکل کر بھرپور حملہ کر سکتے ہیں، اندھیرے میں گھیرا توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ابھی ان کے پاس سرچ لائٹس نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی لائٹ تھی جو ہم نے توڑ دی ہے۔''

''لیکن کھلبلی ہو کس طرح؟''

''یہی مسئلہ ہے۔ اب تو جھکڑ بھی تھم گئے ہیں۔ اگر شدید جھکڑ ہی آ جائیں تو ایسی سچویشن میں ہیلپ مل سکتی ہے۔ پچھلے سال اسی علاقے میں اسی طرح کی صورتِ حال میں تیز آندھی نے شہزاد، اقبال اور جیلانی کی مدد کی تھی۔''

جیلانی بھی ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہماری باتیں بھی سن رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔

عمران نے پوچھا۔ ''کوئی تجویز ہے تمہارے ذہن میں؟''

وہ بولا۔ ''تجویز تو نہیں لیکن آپ کی یہ بات درست لگتی ہے کہ کوئی ہلچل ہمیں ان کا گھیرا توڑنے کا موقع دے سکتی ہے اور وہ بھی صبح ہونے سے پہلے پہلے۔''

عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں تھا وہ جیسے کسی نتیجے

پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر ٹیلی اسکوپ سے کسی خاص منظر کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جیسے تذبذب میں تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ایم جی فور گن کس کے پاس ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے شوٹر صدیق کے پاس ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''سیڑھیوں کے پاس۔'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔

ہم جھک کر احتیاط سے چلتے ہوئے اس شوٹر کے پاس پہنچے۔ اس نے سیڑھیوں کے قریب پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے چاروں طرف گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی صورتِ حال کی سنگینی کو دیکھ رہا تھا اور غالباً نصیر کی موت سے بھی باخبر ہو چکا تھا پھر بھی اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور مورال ہائی تھا۔ عمران نے اس سے ایم جی فور آٹو میٹک لے لی اور اپنی ٹرپل ٹو اسے تھما دی۔ ایک میگزین گن کے ساتھ اٹیچ تھا۔ ایک اور فل لوڈڈ میگزین بھی عمران نے لے لی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر احتیاط سے سیڑھیاں چڑھا اور بالائی منزل پر آ گیا۔ یہاں کھڑکیوں اور دیواروں میں گولیوں کے بے شمار سوراخ تھے۔ قربان کے ایک ساتھی کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس پر ایک پولیتھین پھیلا دیا گیا تھا۔ ہم ایک چھوٹا زینہ طے کر کے بالائی منزل کی چھت پر آ گئے۔ یہاں سیڑھیوں کی ایک ڈھلوان چھت کے سوا کوئی آڑ نہیں تھی۔ اس چھوٹی سی آڑ میں ایک گن مین چوکس بیٹھا تھا۔ عمران نے اس کا کندھا تھپکا اور گن سمیت نیچے جانے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ قربان علی اور دیگر ساتھیوں کو بالکل چوکس کر دے، ہر کوئی اپنی پوزیشن پر موجود رہے۔

''ایم جی فور گن'' خاصی طاقتور ہوتی ہے۔ کل دوپہر شوٹر صدیق نے بتایا تھا کہ اس ایک میٹر لمبی گن کا وزن قریباً نو کلوگرام کے لگ بھگ ہے۔ یہ لمبی رینج تک مار کرتی ہے اور ایک منٹ کے اندر 800 سے لے کر 885 راؤنڈ تک فائر کر دیتی ہے۔ یعنی ایک سیکنڈ میں تقریباً 15 راؤنڈ۔

عمران نے گن کے دستے کو مضبوطی کے ساتھ کندھے سے لگایا اور کسی شے کا نشانہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کچھ بتاؤ گے بھی؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے ٹیلی اسکوپ میں جھانکتے ہوئے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ شاید کوئی اہم فرد اس کے نشانے پر ہے۔ مثلاً جاوا یا اسٹین کرنل...... یا پھر کوئی اور اہم بندہ۔ کچھ دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور بولا ''میں سفید کنٹینر کو ہٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''فاصلہ تو کافی ہے اور زاویہ بھی خاصا مشکل ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کامیابی ہو جائے۔''

وہ اب رسک لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور بڑی یکسوئی سے اپنا نشانہ لے رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاید کنٹینر کی فیول ٹنکی کو نشانہ بنانا چاہ رہا ہے۔

''یار کھڑے ہونے کا رسک نہ لو'' میں نے اسے تنبیہ کی۔

''کس کس رسک سے روکو گے جگر! یہاں تو رسک کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔''

وہ بلا کا نشانے باز تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے اس کے لئے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ وہ سرتاپا ساکت ہو گیا جیسے سنگی مجسمہ ہو۔ اور پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ گن کو زوردار جھٹکے لگے۔ ''ریٹ ٹیٹ'' کی مخصوص تہلکہ خیز آواز سے ایک برسٹ چلا...... پھر دوسرا۔ تیسرے برسٹ سے پہلے دوسری طرف سے برسٹ آیا۔ عمران اس کے لئے پہلے سے تیار تھا اس لئے جھک گیا تھا۔ ڈھلوان چھت اور چمنی کے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ہم دبکے ہوئے تھے۔ عمران کو ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک اور برسٹ چلانا چاہ رہا تھا اور یہ ازحد خطرناک تھا۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ اور پھر فائرنگ میں چند سیکنڈ کے وقفے کے دوران میں وہ کھڑا ہوا اور پوری یکسوئی سے ایک اور برسٹ چلایا۔ بے شک وہ نشانے باز تھا لیکن قسمت کی دیوی بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس بار عمران کے چلائے ہوئے برسٹ کا نتیجہ اس کی مراد کے مطابق تھا۔ ایک شعلہ نکلا اور دھماکے کے ساتھ ہی کنٹینر کے اگلے حصے نے آگ پکڑ لی۔ میں طاقتور دوربین کی مدد سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کنٹینر شعلوں میں گھرا تو اردگرد افراتفری نظر آئی۔ کئی ہیولے دوڑتے بھاگتے دکھائی دیئے۔ شاید یہی وہ افراتفری تھی جو عمران دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں...... وہ اس کے سوا بھی کچھ چاہتا تھا۔ اور جو وہ چاہتا تھا پھر ہمارے سامنے بھی آیا۔ کچھ افراد نے گھبراہٹ کے عالم میں کنٹینر کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر موجود ریچھوں کو بچانا چاہتے تھے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا اور لرز گیا۔ بڑے بڑے ریچھ جست لگاتے ہوئے کنٹینر کے دھوئیں میں

سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا، دروازہ کھولنے والے افراتفری میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مدھم چاندنی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ریچھ بی ایس ایف کے کسی اہلکار کی گولی سے زخمی ہوا۔ وہ ایک بار لوٹ پوٹ ہوکر گاڑیوں کی طرف لپکا۔ دو تین گاڑیاں اس کے سامنے ریورس ہوتی چلی گئیں۔ دائیں طرف بھی کچھ ایسی ہی سچویشن نظر آئی۔ اوپر تلے کئی فائر بھی ہوئے۔ دوسری طرف کنٹینرز کو لگنے والی آگ ایک ٹرک نما گاڑی تک چلی گئی اور وہ بھی ایک دھماکے سے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔

عمران اور میں سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ عمران ساتھ ساتھ اپنے شوٹرز کو پکار رہا تھا۔ وہ بھی جیسے پہلے ہی سے تیار تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ عمران نے ان کو پہلے سے بریف کیا ہوا ہے۔ میں نے قربان علی، صدیق اور جیلانی وغیرہ کے ہاتھ میں دستی بم دیکھے لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ دستی بم نہیں تھے۔ یہ گیس بم تھے جو تیزی سے دھواں پھیلاتے تھے۔ ہم تیزی سے فائرنگ کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلے۔ میں نے دیکھا، بھاگتے بھاگتے عمران نے جگت سنگھ سے اس کی کرپان بھی لے لی ہے۔ یہی وقت تھا جب میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ایک براؤن کوڈیاک ریچھ پر پڑی۔ یہ خون خوار ریچھ پھنکارتا ہوا ریسٹ ہاؤس کا جنوبی دروازہ توڑ کر اندر آ رہا تھا اور اندر عورتیں تھیں۔ فقط میڈم صفورا کے پاس ایک چھوٹا پسٹل موجود تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں واپس پلٹا۔ میں نے ریچھ پر دو سنگل شاٹ فائر کیے۔ اس دوران میں وہ چنگھاڑتا اور پھنکارتا ہوا اندرونی کمروں میں گھس گیا۔ اندر سے لڑکیوں کے چلّانے کی دردناک آوازیں آئیں۔ یقیناً ان میں ثروت کی آواز بھی شامل تھی۔ میں اندر جھپٹا۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ میں نیچے گر گیا۔ ایک گولی میری کلائی کو زخمی کرتی ہوئی گئی...... دیگر ایک دو گولیاں رائفل پر لگیں اور وہ میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ میں نے اس کا میگزین چکنا چُور دیکھا۔ میں نے قمیص کے نیچے سے دندانے دار شکاری چاقو نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ ایشوریا اور نصیر احمد کی چادر پوش لاشوں کو پھلانگتا ہوا میں کمرے میں پہنچا تو منظر لرزہ خیز تھا۔ لڑکیاں ساتھ والے کمرے کے ایک کونے میں دبکی ہوئی تھیں۔ میڈم صفورا قریباً آٹھ فٹ اونچے ریچھ کے سامنے تھی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک فائر وہ ریچھ پر پہلے کر چکی تھی۔ دوسرا اس نے میرے سامنے کیا۔ لیکن اس سے پہلے میڈم کو شدید نقصان پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا میڈم کی گردن کے نیچے والے حصے اور کندھے کے اوپری حصے کا سارا گوشت غائب تھا۔ خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ یقیناً یہاں ریچھ کے بھاری پنجے نے کاری ضرب لگائی تھی۔ دو گولیاں کھا کر بھی ریچھ پر زیادہ اثر نہیں

ہوا۔ اس نے میڈم پر جھپٹا مارا۔ کئی کلو وزنی تھپڑ میڈم کے چہرے پڑا۔ میڈم ایک جسیم اور دبنگ خاتون تھی لیکن کسی ہلکی پھلکی شے کی طرح اڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی، اس [illegible] سے پستول نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

میں نے پہلو کی طرف سے جسیم ریچھ کی پسلیوں پر وار کیا...... وہ تڑپ کر میری طرف متوجہ ہوا۔ حیوان اور انسان رُوبرو تھے۔ اس کے بالوں بھرے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ وہ کسی بپھرے ہوئے پہلوان کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہ میری غیر معمولی قوت برداشت ہی تھی جس نے مجھے اس موقع پر زندہ رکھا۔ ریچھ کی تھوتھنی چھوٹی لیکن سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ بالوں بھرا متعفن سر مجھ سے فقط چند انچ کی دوری پر تھا۔ وہ شاید میری گردن نوچنا چاہ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی قاتل تھوتھنی کو خود سے دور رکھا اور دائیں ہاتھ سے شکاری چاقو کا ایک اور وار اس کے پیٹ پر کیا۔ اس مرتبہ چاقو دستے تک اس کے اندر گیا۔ میں نے اسے واپس کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ نکلا نہیں۔ ریچھ نے ایک پھنکار کے ساتھ مجھے گھمایا۔ میں اڑتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرایا۔ میڈم صفورا میرے قریب ہی گری ہوئی تھی۔ وہ بری طرح زخمی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے دکھایا کہ اس کا پسٹل کہاں ہے۔ میں نے پسٹل پر جست لگائی اور گھوم کر اوپر تلے تین فائر موذی جانور پر کیے۔ ایک عین اس کی آنکھوں کے درمیان لگا اور وہ ایک دیوار گیر کھڑکی توڑتا ہوا اوندھے منہ گرا۔ مجھے باہر سے شدید ترین فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ہر رائفل اور ہر آتشیں ہتھیار کا دہانہ کھل گیا ہے۔ ثروت سمیت دونوں لڑکیاں دوڑتی ہوئی کسی اور کمرے میں گھس گئیں۔ مجھے وہاں ایک رائفل پڑی نظر آ گئی...... میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ابھی تک حرکت کرتے ہوئے ریچھ پر ایک برسٹ مار کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔

اب میں باہر کی طرف لپکا۔ مجھے ریسٹ ہاؤس سے آگے اور جھنڈ کی طرف ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آیا۔ یقیناً یہ وہی اسموک بم تھے جو عمران کے ساتھیوں نے پھینکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے فقط آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر قربان علی کھڑا تھا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور قربان علی کو چھلنی کر گئی۔ اس کی رائفل دور لڑھک گئی تھیں وہ ایک اچھی آٹھ ایم ایم رائفل تھی لیکن میں اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو شاید خود بھی قربان علی کے پاس پہنچ جاتا۔ میں نے دیکھا، صدیق اس بس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے جس پر ہم یہاں پہنچے تھے۔ اس بس میں تین چار فالتو

ٹائر [illegible] تھے جو ناکارہ ٹائروں کی جگہ لے چکے تھے۔ صدیق فائرنگ کی زد سے بچنے کے لئے [illegible] جھک کر بیٹھا تھا۔ اس نے بس کو ٹرن کیا اور اندرونی کمروں کی طرف لایا۔ غالباً عمران کی ہدایت تھی کہ اندر موجود لڑکیوں کو ڈاکٹر مہناز سمیت سوار کرایا جائے اور آس پاس موجود شوٹرز کو بھی بٹھا لیا جائے۔ شاید وہ گھیرا توڑ کر نکلنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ابھی بس احاطے کے آخری سرے تک ہی پہنچی تھی کہ اس کی باڈی میں کئی برسٹ لگے۔ غالباً اس کی فیول لائن کو نقصان پہنچا۔ اگلے پہیوں کے قریب سے شعلے نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے دروازے والا حصہ جلنا شروع ہوگیا۔

''صدیق...... چھلانگ لگاؤ؟'' میں نے پکار کر کہا۔

صدیق نے چھلانگ لگائی مگر یہ موت کی چھلانگ ثابت ہوئی۔ دو گولیاں اس کے سینے سے پار ہوگئیں۔ گولیاں ریسٹ ہاؤس پر مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔

جیلانی دھوئیں میں سے برآمد ہوا۔ اس نے جلتی ہوئی بس کو دیکھا اور تاسف سے بولا۔

''بہت برا ہوا...... بہت برا۔ اب نکلنا مشکل ہوگا۔'' اس دوران میں دھماکے سے پوری بس نے آگ پکڑ لی اور رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔

ہم نے پلٹ کر پھاٹک کے پاس پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ شروع کر دی۔ قربان کا بے جان جسم میرے سامنے ہی پڑا تھا۔ لاش گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ اس کی رائفل اب بھی ہماری دسترس سے دور تھی۔

''ایمونیشن دو۔'' جیلانی نے چلا کر کہا۔

ایک شوٹر تین چار بھرے ہوئے میگزین لے کر آیا۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا ہم سے دس بارہ فٹ دور پہنچا تھا کہ اوندھے منہ گر گیا۔ کوئی گولی اسے چاٹ گئی تھی۔ بہرحال دو میگزین لڑھکتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ دھوئیں میں سے ایک ریچھ برآمد ہوا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس کی ٹانگ خون آلود تھی۔ شاید زخمی ہو کر وہ مزید مشتعل ہوگیا تھا۔ اس کا وزن آٹھ دس من سے کم نہیں ہوگا۔ وہ ہمیں روند کر ہی گزر جاتا تو شاید ہم اٹھ نہ سکتے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اس پر فائرنگ کی اور اسے ختم کر دیا۔

یہی وقت تھا جب ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح دھوئیں کی چادر کو چیر کر ہماری طرف آئی۔ یہ وہی گرے جیپ تھی جو جاوا کے خاص استعمال میں ہوتی تھی۔ یہ خاصے بڑے سائز کی تھی اور اس کی نادر خصوصیات ہم دیکھ ہی چکے تھے۔ میں نے گن اس کی طرف سیدھی کی مگر اس پر فائر اثر نہیں کرتا تھا۔ فائر تو رہی دور کی بات، اس پر جگت کے ساتھیوں نے

میرے سامنے کئی دستی بم پھینکے تھے۔ یہ واقعہ فرید کوٹ کے راستے میں رُونما ہوا تھا۔ زوردار دھماکوں کے باوجود جیپ کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہنچا تھا۔

یکا یک مجھے اور جیلانی کو اندازہ ہوا کہ ہمیں جیپ پر فائر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر جاوا یا اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ خود عمران تھا۔ اس نے بریک لگائے اور آٹو میٹک دروازے کھول دیئے۔ وہ ہمیں اندر بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ہم اندر داخل ہوگئے۔ نشستوں پر خون کے دھبے تھے۔ عمران اندرونی کمروں کی طرف بھاگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ اور جگت سنگھ لڑکیوں کو لئے ہوئے نمودار ہوئے۔ عمران نے گرے جیپ اس طرح کھڑی کی تھی کہ لڑکیوں کو زیادہ فاصلہ نہ طے کرنا پڑے۔ پھر بھی رسک تو موجود تھا۔ عمران کے علاوہ دو شوٹرز نے بھی لڑکیوں کو کور دیا ہوا تھا۔ وہ کبھی جھک کر چلتی اور کبھی گھٹنوں کے بل رینگتی گرے جیپ تک پہنچ گئیں۔ ثروت اور مہناز بھی شامل تھیں لیکن میڈم صفورا نظر نہیں آ رہی تھی۔

''میڈم صفورا؟'' جیلانی نے پوچھا۔

عمران نے نفی میں سر ہلا کر اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ ہم نے میڈم کو لڑکیوں کا نگہبان مقرر کیا تھا اور اس نے نگہبانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ آخری وقت تک شیرنی کی طرح حالات کے سامنے اور خوں خوار بھورے ریچھ کے سامنے ڈٹی رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے آخری بار دیکھوں لیکن اس کا موقع کہاں تھا۔ نصیر اور قربان علی کے چہرے دیکھنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ ہمارے اردگرد لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ عمران نے گرے جیپ اسٹارٹ کی تو وہ ہوئی نہیں۔ اندازہ ہوا کہ اس کے اندر کوئی آٹو میٹک سوئچ تھا جو آف ہوگیا ہے۔ قربان علی کا ایک ساتھی غالباً ایسے کام کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ بونٹ اٹھا کر کوشش کرنے لگا۔

جیلانی نے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھئے جی...... وہ لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔''

ہم نے جیپ کی کھڑکیوں میں سے دیکھا۔ جیلانی درست کہہ رہا تھا۔ پھاٹک سے قریباً پچاس میٹر آگے ہمارے چار شوٹرز گھیرے میں تھے۔ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہاں کی مدھم جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی چھوٹا سا ٹیلا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے بھی پوزیشن لی تھی۔ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ دو شوٹرز زخمی ہیں اور دو انہیں سہارا دے کر واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف آنا چاہتے ہیں لیکن تابڑ توڑ گولیوں میں یہ ممکن نہیں تھا۔ ان چاروں کی جان کسی بھی وقت جا سکتی تھی۔ انہیں مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے اور عمران نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا۔ ایسے دیوانے فیصلے ہم پہلے بھی کر[illegible]ہے تھے۔ جب ہم دونوں کے کندھے آپس میں چھوتے تھے اور نگاہیں اپنے ہدف پر جمی ہیں...... اور سانسوں کی لے تیز ہوتی تھی...... اور سینے میں دھڑکن کا نقارہ بجتا تھا تو وہ لازوال فقرہ ایک بازگشت کی طرح ہمارے کانوں میں گونجنے لگتا تھا...... جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو ڈرنا کیا......

...... ہاں، موت تو ایک ہی بار آنی ہوتی ہے۔ جان نے تو ایک ہی بار نکلنا ہوتا ہے اور ہم اس فلسفے کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ عمران نے جیلانی سے کہا۔ ''یا شیخ! تم ادھر کا دھیان رکھو۔ ہم انہیں نکال کر لاتے ہیں۔''

جیلانی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن ہمارے سامنے بولنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔ ثروت کا چہرہ بھی خوف سے زرد تھا۔ یہ بڑی خطرناک کوشش تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ ہم اپنے ان چار شوٹرز کو یہاں موت کے منہ میں چھوڑ کر فرار نہیں ہوں گے۔

رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ ہم ایک ساتھ جھک کر بھاگے اور گولیوں کی بارش میں ٹیلے کی طرف لپکے۔ موت کی طرف لپکنے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ جان کو ہتھیلی پر رکھنے کی اپنی ایک ترنگ ہوتی ہے۔ ایک گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ایک عمران کے بازو میں لگی۔ میں نے گولی کے گوشت میں گھسنے کی آواز صاف سنی۔ وہ ایسے زخموں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ ہم ٹیلے کے عقب میں اپنے ساتھیوں کے پاس اوندھے منہ گر گئے۔

ہماری کمک نے ان کے حوصلے جوان کر دیئے۔ ایک شخص عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔
''سر! یہ دونوں زخمی ہیں۔ آپ ان کو پیچھے لے جانے کی کوشش کریں، ہم انہیں روکتے ہیں۔''
''نہیں...... تم انہیں پیچھے لے جاؤ۔ ہم روکتے ہیں۔'' عمران نے حکم دیا۔

شوٹر کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ عمران کی بات مانتا۔ تب ہم نے دیکھا کہ زخمی ہونے والے دونوں ''شوٹرز'' نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ماسٹر جواہر تھا۔ اس کی ٹانگ میں ران کے اوپری حصے پر گولی لگی تھی۔ زخم کاری تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کراہ رہا تھا۔ دوسرا شخص بے ہوش تھا۔ عمران کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دونوں شوٹرز نے دونوں زخمی ساتھیوں کو دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ حتی الامکان خود کو زمین سے قریب رکھ رہے تھے تاکہ گولیوں کی زد سے بچ سکیں۔ میں اور عمران ڈٹ کر فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ انڈین سپاہی تین اطراف سے اس چھوٹے سے ٹیلے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ایک طرف کی کوشش تو اس فائرنگ کی وجہ سے ناکام ہو رہی تھی جو جیلانی

اور جگت سنگھ وغیرہ بلٹ پروف گرے جیپ کے اندر سے کر رہے تھے۔ مگر باقی دو طرف سے انہیں سخت مزاحمت دیئے جانے کی ضرورت تھی۔

یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہم اپنی پوری فائر پاور استعمال کرنے لگے تاکہ دونوں زخمی اور دونوں شوٹرز ''ری ٹریٹ'' کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ جائیں اور جیپ میں سوار ہو جائیں۔ بعد میں ہم بھی یہ مورچا چھوڑ کر جیپ کی طرف دوڑ لگا سکتے تھے۔ لیکن انڈین سپاہی قریب آتے جا رہے تھے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ قریباً بیس میٹر پیچھے سے ایک شوٹر کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''سر! عباس کو گولی لگ گئی ہے۔''

عمران نے دانت پیس کر منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ وہ رشین AEK999 چلا رہا تھا۔ وہ اس مورچے میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ اس میں میگزین کی جگہ گولیوں کے طویل اسٹرپس استعمال ہو رہے تھے۔ بھرپور حملہ روکنے کے لئے ایسی گنز مفید ثابت ہوتی ہیں۔ عمران نے کہا۔ ''تابی! تم جاؤ، ان کی مدد کرو۔ میں یہاں روکتا ہوں انہیں۔''
''نہیں عمران! تم ہر جگہ حکم چلاتے ہو۔ تم جاؤ، میں روکتا ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔
''یار! میرا بازو زخمی ہے۔ میں کھینچ نہیں سکوں گا۔ انہیں۔'' اس کا اشارہ زخمیوں کی طرف تھا۔

اس کی دلیل میں وزن تھا۔ ایسی وزنی دلیلیں ہر وقت اس کے پاس موجود رہتی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ وہ یہ جگہ چھوڑنے پر تیار ہو جائے لیکن ناکامی ہوئی۔

میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا واپس آیا۔ شوٹر عباس کے سر کا ایک حصہ اڑ چکا تھا۔ مغز بکھرا پڑا تھا۔ میں نے دوسرے شوٹر کی مدد کی اور دونوں زخمیوں کو دھیرے دھیرے پھاٹک کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ماسٹر جواہر تو خود بھی تھوڑا بہت آسرا کر رہا تھا مگر دوسرا ساتھی مکمل بے ہوش تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ ہم ٹیلے کے بالکل آڑ میں تھے اور ٹیلے پر عمران نے مورچا سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ہمیں پورا کور دے رہا تھا۔ ہم دونوں زخمیوں کو ریتیلی زمین پر کھینچتے ہوئے پھاٹک تک لے گئے۔ گرے جیپ کی عقبی لائٹس روشن تھیں لیکن وہ ابھی تک اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور عمران کی طرف دیکھا۔ پچاس ساٹھ میٹر دور وہ کسی چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا۔ انڈین سپاہی ٹیلے پر چڑھنے اور اسے پکڑنے میں ناکام تھے۔ پھر میں نے دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا...... ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر...... جیسے جنگلی

کتوں میں گھرا ہوا شیر ہو۔ اس کی للکار دل ہلا دینے والی تھی۔ پچاس ساٹھ میٹر کی دوری سے بھی [illegible] کی گونج میرے کانوں میں محسوس ہوئی۔ اس نے گن کو اس کے اسٹینڈ سے اٹھا لیا تھا اور تین اطراف میں حرکت دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے مثال جارحیت تھی۔ چاروں طرف دھماکے اور شعلے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں واپس اس کی طرف لپکتا، میں نے دیکھا کہ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا ہے۔ وہ اپنی نہایت مؤثر فائرنگ سے انڈین سپاہیوں کو تتر بتر...... بلکہ شاید دہشت زدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اور میرا ساتھی شوٹر بھی ریسٹ ہاؤس کے پھاٹک سے تھوڑا آگے چلے گئے۔ ہم نے عمران کو بھرپور کور دیا لیکن ہمارے کور سے زیادہ عمران کی اپنی فائرنگ کارگر تھی۔ قریباً ایک منٹ کے اندر وہ پھاٹک کی آڑ میں ہمارے ساتھ تھا۔ یہی وقت تھا جب گرے جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی فرحت بخش آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ قربان کا ساتھی اس کے انجن کو پھر سے حرکت میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''تابی! تم جیپ ڈرائیو کرو۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

ہم فائرنگ کرتے ہوئے الٹے قدموں جیپ کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے دونوں زخمی جیپ میں گئے۔ پھر جیلانی...... پھر میں...... عمران اب بھی باہر تھا اور وزنی گن کو اسٹینڈ سمیت اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک آخری برسٹ چلایا اور جیپ میں آ گیا۔ دروازے بند ہو گئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یہ آٹومیٹک اور جدید ترین گاڑی تھی۔ کلچ دبانے اور گیئر لگانے کی ضرورت سے بے نیاز۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کی عقبی جانب سے نکلنا تھا۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ چھ فٹ اونچی ایک خستہ حال دیوار تھی جس کے بالائی کنارے سے تعویذوں کی پوٹلیاں سی لٹک رہی تھیں۔ گاڑیاں دیواروں میں سے نہیں گزر سکتیں مگر یہ مختلف گاڑی تھی۔ انڈیا کا نامی گرامی ڈان اس کا مالک تھا۔ اس نے اسے اپنے لئے محفوظ ترین بنا رکھا تھا۔ یہ بلٹ پروف تھی اور بارودی دھماکے بھی اس پر اثر نہیں کرتے تھے اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں تھی میری ہدایت پر سب نے خود کو زوردار شاک کے لئے تیار کر لیا۔ قریباً چالیس کلومیٹر کی رفتار سے جیپ اور چاردیواری کا تصادم ہوا۔ ہم راستہ بناتے ہوئے آگے نکلتے چلے گئے۔ ہیوی جیپ نے دیوار توڑ ڈالی تھی۔

یہ سڑک نہیں تھی کھلا میدان تھا اور جھاڑ جھنکاڑ بھی تھا۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔ مغرب جہاں سرحد تھی۔ جہاں پاکستان کی مٹی تھی۔ اور ہمارے جسموں پر خون کے چھینٹے

تھے۔ ہم نے اپنے دشمنوں کو ایک نہایت کاری ضرب لگا کر ان کا گھیرا توڑا تھا اور اب اپنی مٹی کی طرف جا رہے تھے۔

یہ ہمارے دشمنوں کے لئے بہت بڑی شکست تھی اور وہ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے پاس موقع تھا کہ وہ بارڈر تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہمیں روک لیں۔ ہمیں اور ہماری عورتوں کو اپنے انتقام کے شکنجے میں جکڑیں اور ان جسموں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑیں جنہوں نے ممبئی سے بھڑوچ تک اور سائل پور سے ریسٹ ہاؤس تک ان کی اَن گنت لاشیں بچھائی تھیں۔ وہ خاص طور سے عمران کو اپنی گرفت میں لانا چاہتے تھے۔ اسے اس کے ''جرائم'' کی پاداش میں مثالِ عبرت بنانا چاہتے تھے۔

وہ آندھی اور طوفان کی طرح ہمارے پیچھے آئے۔ درجنوں ہیڈ لائٹس تھیں جو اچھلتی کودتی ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ دائیں بائیں بھی بہت سی متحرک روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ لوگ ہم پر فائر بھی کر رہے تھے لیکن اب ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہم ایک محفوظ گاڑی پر سوار تھے۔ قدرت نے دشمن کا سارا انتظام اسی پر الٹ دیا تھا۔ انڈر ورلڈ کے سپر اسٹار جاوا نے نہ جانے کتنے ملین بلین خرچ کر کے اپنے لئے یہ نادر روزگار گاڑی بنوائی تھی اور یہ اب ہمارے استعمال میں تھی۔ یہ عمران کے پاس کیسے اور کیونکر پہنچی، یہ ابھی مجھے معلوم نہیں تھا مگر لگتا تھا کہ جب ریچھوں کی وجہ سے گھیرا ڈالنے والوں میں افراتفری پھیلی اور گاڑیوں کو لگنے والی آگ نے اس افراتفری کو بڑھایا تو عمران اور اس کے ساتھیوں نے اپنے مورچے چھوڑ کر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے دھوئیں والے گیس بم پھینکے تھے۔ یقیناً انہی لمحوں میں عمران نے اس گاڑی کو ٹارگٹ بنایا تھا یا ممکن تھا کہ وہ خود ہی اس کے نشانے پر آ گئی ہو۔ اس لگژری گاڑی کی نشستوں پر خون کے دھبے موجود تھے۔ پتا نہیں یہ کس کا خون تھا؟

میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران اس دیوہیکل جیپ کی درمیانی نشستوں پر موجود تھا...... اس کے بازو میں گولی لگی تھی ڈاکٹر مہناز لرزتے ہاتھوں سے پٹی باندھ کر اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں پاکستانی لڑکیاں ذہنی طور پر عمران کو اور مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھتی تھیں۔ خاص طور سے عمران پر تو وہ دونوں والہانہ یقین کرنے لگی تھیں۔ وہ دونوں اب بھی عمران کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ آنکھیں بند کر کے سسک رہی تھیں۔ عمران نے انہیں اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا اور تسلی بخش انداز میں تھپک رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اپنی عمر اور اپنے چلبلے پن سے کہیں آگے اور جدا نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ خود ''پاکستان'' تھا اور ان لڑکیوں کو پناہ دے رہا تھا۔

''گولی اندر ہی ہے؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

''ہاں......لیکن تقریباً آر پار ہے۔تھوڑا سا چیرا دے کر نکالی جا سکے گی۔''

ظاہر ہے کہ یہ کام گاڑی رکنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔فی الحال ہمارے پیچھے بلا کی رفتار سے موت لپک رہی تھی۔گاہے بگاہے گولیاں جیپ کی باڈی اور کھڑکیوں سے ٹکراتیں اور چنگاریاں چھوڑتی تھیں۔جگت سنگھ کی آنکھوں میں شعلے تھے۔میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔وہ سن روف سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔غالباً چاہتا تھا کہ چھت کے چور کو خلا میں سے باہر نکل کر جوابی فائرنگ کرے۔میں نے کہا۔''جگت سنگھ! بیٹھے رہو۔کوئی ضرورت نہیں،ان کی فائرنگ سے کچھ نہیں بگڑ رہا ہمارا۔''

''پر بادشاہ زادے! یہ ٹائر پھاڑ دیں گے۔''

''نہیں پھٹیں گے ٹائر بھی۔'' عمران نے کہا۔

چند منٹ کی زبردست اچھل کود کے بعد ہم پختہ سڑک پر آ گئے۔یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن ہموار تھی۔میں تین ہارس پاور کی طاقتور جیپ کا ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔وہ کمان سے نکلا ہوا تیر بن گئی۔عقب میں آنے والی ان گنت گاڑیاں بدستور ہمارے پیچھے تھیں لیکن اب ہمیں ایک فائدہ تھا۔اب ہم سڑک پر تھے۔وہ ہمارے دائیں بائیں سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔صرف پیچھے آ سکتی تھیں۔گولیوں کی بوچھاڑ گاہے بگاہے گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکراتی تھی۔یہ سارا بارڈر ایریا تھا۔

''شاید چیک پوسٹ ہے آگے۔'' میں نے کہا۔

''راستہ بھی بلاک ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

ایک فوجی جیپ سڑک پر آڑی کھڑی تھی۔میں نے رفتار کم کرنے کے بجائے کچھ بڑھا دی۔جیپ نے پہلے چیک پوسٹ کا بانس توڑا۔پھر فوجی جیپ کے بونٹ کو ٹکر مار کر اسے ایک طرف لڑھکایا پھر ایک موٹر سائیکل کو روندتی ہوئی نکل گئی۔ہم پر فائر بھی ہوئے لیکن یہ بے اثر تھے۔

اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔درختوں کے ہیولے اور زمین کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ہوا چل رہی تھیں وہ بند گاڑی میں ہم سے ٹکرا نہیں رہی تھی لیکن یہ سوچنا بھی خوش گوار تھا کہ یہ پاکستان سے آنے والی ہوا ہے۔

میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے میں عمران کو دیکھا۔اس نے آخر میں ناقابلِ بیان معرکہ لڑا تھا۔ٹیلے کے عقب میں تقریباً پانچ منٹ تک اس نے تن تنہا انڈین فوجیوں اور جاوا

کے خطرناک گرگوں کو روکا تھا۔میں نے وہ ہر ہر منظر دیکھا تھا۔ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب لگا تھا کہ وہ لوگ ٹیلے پر آ جائیں گے اور عمران کو پکڑ لیں گے۔مگر اسی وقت عمران کی شدید مزاحمت نے ان کے قدم روک دیئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہم بھی صحیح سلامت جیپ تک پہنچ پائے۔

عمران نے فاخرہ نامی لڑکی کو اب بھی اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔وہ اس کی چھاتی پر سر رکھے بند آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔مجھے یہ سب کچھ ذرا مختلف لگا۔عمران نے اس طرح اسے اپنے ساتھ کیوں لگا رکھا تھا؟ صرف وہی تو خوف زدہ نہیں تھی۔سب ڈری ہوئی تھیں۔یہاں تک کہ ڈاکٹر مہناز کے ہونٹ بھی بالکل خشک ہو رہے تھے۔ہم نے ایک چیک پوسٹ تو پار کر لی تھی۔آگے کیا کیا ہونا ہے،اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

یکایک میں نے ڈاکٹر مہناز کو چونکتے دیکھا۔عمران کے بازو کی پٹی کرنے کے بعد وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں''یہ بلڈ کہاں سے آ رہا ہے؟'' مہناز نے تیزی سے پوچھا۔

تب وہ آگے جھک کر دیکھنے لگی۔اس نے فاخرہ نامی لڑکی کو پیچھے ہٹایا۔''اوہ گاڈ!'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

جیلانی اور جگت سنگھ بھی عمران کی طرف جھک گئے۔میں نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے عقب نما آئینے میں دیکھا اور لرز گیا۔عمران کے سینے پر گولی کا ایک بڑا زخم تھا۔خون سے اس کی قمیص سرخ ہو رہی تھی۔غالباً اسی زخم کو چھپانے کے لئے اس نے فاخرہ کو مسلسل اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

مہناز نے قینچی سے عمران کی قمیص کاٹی اور اس پر جھک گئی۔اس کے چہرے پر گہری تشویش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔یہ بڑے ''کیلیبر'' کی گولی تھی۔تھوڑا دائیں جانب لگی تھی مگر پتا نہیں اس نے اندر سے کیا کیا زخمی کیا تھا۔

عمران نے مجھے عقب نما میں گھورتے ہوئے پایا تو زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔''گھبراؤ نہیں جگر! میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں اور وہ بھی صرف ایک گولی سے۔بس ذرا فاٹافٹ پاکستان پہنچا دو۔''

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔اب روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔میں ڈاکٹر مہناز سے مسلسل عمران کے زخم کی نوعیت پوچھ رہا تھا۔وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی اور پورے انہماک سے عمران پر جھکی ہوئی تھی۔میں نے عمران کے چہرے پر کرب کے ہلکے سے آثار دیکھے۔

جیلانی مسلسل پچھلی اسکرین سے عقب میں آنے والی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی اسکوپ اس کی آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک بڑی فوجی گاڑی سب سے آگے ہے۔ اس پر لانچنگ سسٹم ہے۔ میرے خیال میں دو بڑے راکٹ ہیں...... نہیں تین بڑے راکٹ ہیں۔''

''اوہ، یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' عمران کے لہجے میں تشویش تھی۔

''لیکن یہ جیپ بم پروف ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہے مگر اتنی رفتار سے چلتی ہوئی گاڑی راکٹ لگنے سے الٹ جائے گی اور شاید وہ یہی چاہتے ہیں۔''

''بارڈر کتنی دور رہ گیا ہے اندازاً؟'' جیلانی نے پوچھا۔

''قریباً تین کلومیٹر۔'' عمران نے جواب دیا۔ آواز میں تکلیف کا عنصر تھا۔

جیلانی نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے رکھی۔ وہ بولا۔ ''مجھے لانچرز کے آس پاس حرکت نظر آرہی ہے جی۔ لگتا ہے وہ لوگ کچھ کرنے والے ہیں۔''

عمران نے ڈاکٹر مہناز کو پیچھے ہٹایا اور گھوم کر عقب میں دیکھا۔ میں اندر تک کانپ گیا۔ عقب نما آئینے میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ میرا دل خون کرنے کے لئے کافی تھا۔ سینے پر لگنے والی گولی شاید عمران کی کمر کی طرف سے نکل گئی تھی۔ دونوں کندھوں کے قریباً درمیان زخم دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ لوہے کا انسان تھا۔ جب کچھ کرنے پر آتا تھا تو کر گزرتا تھا۔ اپنے زخم کی پروا کئے بغیر وہ پورا گھوما۔ اس نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور سپاٹ آواز میں بولا۔ ''وہ جان بوجھ کر فاصلہ رکھے ہوئے ہیں تا کہ ہم عام ہتھیاروں سے انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔''

''ظاہر ہے، ان کے راکٹ کی Reach تو ہم تک ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

عمران کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جیلانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شیخ! مجھے اسنیپر گن دو۔''

''کیا کریں گے اس سے؟''

''یار گن دو۔'' وہ اٹل انداز میں بولا۔

جیلانی نے ایک نشست کے نیچے سے گن نکال کر عمران کے حوالے کر دی۔

''کیا کرو گے اس سے؟'' میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''گن کا کیا کرتے ہیں؟'' وہ اس کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے بولا۔

''لیکن اس کے راؤنڈ نہیں ہیں۔''

عمران نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے جیلانی کو اشارہ کیا۔ جیلانی نے ایک کھٹکا دبا کر ایک لیور کھینچا اور سن روف کھل گیا۔ یہ قریباً دو فٹ مربع کا خلا تھا۔ تیز ہوا اندر آنے لگی۔ ہمارے لباس پھڑ پھڑانے لگے۔ میں نے دیکھا، ثروت کے بال اُڑ اُڑ کر اس کے زرد چہرے کو ڈھانپ رہے ہیں۔

عمران نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے خالی اسنیپر کندھے سے لگائی اور اس کی طاقتور ٹیلی اسکوپ میں سے پیچھے کا منظر دیکھا۔ گاڑی کم وبیش سو کلومیٹر کی رفتار سے جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ پیچھے والی گاڑیوں کی رفتار بھی یہی تھی۔

''میں اس لانچر والی گاڑی پر ایک فائر کرنا چاہ رہا ہوں۔'' عمران نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ ''گولی کے بغیر فائر کرنے کا کون سا طریقہ ایجاد کیا ہے تم نے؟''

''ایک گولی ہے میرے پاس۔'' اس نے انکشاف کیا اور اپنی کاٹرائے کی پتلون کا پائنچا اٹھا کر جراب کے اندر سے اسنیپر گن کی گولی نکال لی۔

میں حیران رہ گیا۔ ایک دم ساری بات سمجھ میں آگئی۔ جب احمد آباد سے آگے چلتی بس میں جاوا کے لوگ بی ایس ایف کے ساتھ مل کر ہمارا تعاقب کر رہے تھے تو اسی طاقتور اسنیپر کی مدد سے ہم نے انہیں بس سے دور رکھا ہوا تھا۔ آخری مرحلے میں گن مین کو اسنیپر کی ایک گولی نہیں ملی تھی۔ خیال تھا کہ وہ فائر ہو گئی ہے یا شاید نشستوں کے نیچے کہیں لڑھک گئی ہے۔ اب وہی چمکتی ہوئی گولی عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اکثر اس طرح کی حرکات کرتا تھا اور کبھی کبھی ایسی حرکات حیرت انگیز طور پر سودمند ثابت ہوتی تھیں۔

''میں نے اس وقت یہ ایک گولی سنبھال لی تھی ورنہ اس نے بھی چل ہی جانا تھا۔ اب ہو سکتا ہے کام آجائے۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا اور قریباً چار انچ لمبی گولی کو گن میں ایڈجسٹ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ سن روف کے خلا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس میں کھڑا ہو کر فائر کرنا چاہتا تھا شاید۔

ڈاکٹر مہناز کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کے زخم کی نوعیت دیکھ لی تھی۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جگت سنگھ، جیلانی، قربان کے ساتھی شوٹرز سب پریشان تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''پلیز عمران صاحب! آپ کچھ نہ کریں، آپ کا خون تیزی سے نکلنے لگا ہے۔''

ساتھ ہی ڈاکٹر مہناز نے جگت سنگھ اور جیلانی وغیرہ کو اشارہ کیا کہ وہ عمران کو کوئی بھی حرکت کرنے سے روکیں۔ جگت اور جیلانی نے کوشش کی لیکن عمران نے انہیں بری طرح جھڑک کر روک دیا۔ میں نے پہلی بار اسے اس طرح اپنا تحمل کھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ خون بہنے کی رفتار واقعی تیز ہوگئی تھی۔ وہ پوری نشست کو بھگو رہا تھا۔

''شیخ! مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔'' عمران نے کہا۔

جیلانی نے سوالیہ نظروں سے مہناز کی طرف دیکھا۔

''یہ میرا حکم ہے شیخ! مجھے اٹھاؤ۔ میں فائر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے سہارا دو۔ جلدی کرو۔'' وہ تحکم سے بولا۔

اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس کا دیرینہ ساتھی جانتا تھا کہ اسے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ جیلانی اور جگت نے مل کر عمران کو سہارا دیا۔ اس نے اپنا ایک گھٹنا نشست کے ہتھے پر ٹکایا اور اپنا بالائی دھڑ سن روف کے چوکور خلا میں سے باہر نکال دیا۔ میں ایک سائیڈ مرر سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس آٹومیٹک سائیڈ مرر کو ایڈجسٹ کیا۔ اب جیپ کی چھت نظر آرہی تھی۔ عمران کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے طاقتور اسنیپر گن کو چھت پر رکھ کر اس کا دستہ اپنے کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ ٹیلی اسکوپ میں دیکھ کر نشانہ لے رہا تھا۔ وہ بلا کا نشانے باز تھا۔ میں نے اسے سرکس میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر درست نشانہ لگاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ وہ ایک تیز رفتار گاڑی پر سوار تھا اور وہ جس ہدف کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا، وہ بھی متحرک تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس صرف ایک موقع تھا۔ اس دور مار رائفل کا صرف ایک راؤنڈ۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ میں اگر یہ راؤنڈ درست فائر ہو جاتا تو ہم ایک بھیانک خطرے سے بچ سکتے تھے۔

دفعتاً میں نے دیکھا کہ ہماری تیز رفتار، جیپ کے سامنے ذرا دائیں جانب دس پندرہ فٹ کی دوری پر چمک کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا۔ ایک اونچے قد کی خودرو جھاڑی اپنی جڑوں سے اکھڑ کر فضا میں بلند ہوئی۔ اس جھاڑی کے ساتھ شاید کئی من مٹی بھی اچھلی ہوگی۔ جیپ جیسے لہرا کر رہ گئی۔ میں نے اسے بمشکل سڑک پر رکھا۔ جیپ کے اندر لڑکیاں بری طرح چلائیں۔ جیپ کے اچانک لہراؤ کے سبب جیلانی نشستوں کے درمیان گرا۔

یہ راکٹ فائر ہوا تھا۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگلا نشانہ سیدھا جیپ پر لگ سکتا تھا۔ یہ اب منٹوں کا نہیں، سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے سائیڈ مرر میں دیکھا۔ عمران بدستور نشانہ لے رہا تھا۔ ان لمحوں میں اس کا جسم بالکل ساکت ہو گیا تھا جیسے وہ پتھر کا مجسمہ ہو۔ یہ نشانہ

درست لگتا تو اس کی زندگی کا یادگار نشانہ ہوتا اور اگر خطا ہو جاتا تو پھر شاید زندگی ہی نہ رہتی، اس کی نہ ہماری۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گاڑی کے ڈرائیور کو نشانہ بنا رہا تھا۔

......صرف ایک موقع تھا، صرف چند سیکنڈ تھے...... ایک بہترین نشانے باز تھا اور ایک مشکل ترین ہدف تھا...... کسی بھی وقت دوسرا راکٹ ہماری اس بلٹ پروف جیپ سے ٹکرا سکتا تھا اور اسے درجنوں قلابازیاں دے سکتا تھا۔ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اب چند سومیٹر کے فاصلے پر مجھے بارڈر کے آثار نظر آرہے تھے۔ دو جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک جھنڈا یقیناً میرا سبز ہلالی پرچم تھا۔ مجھے اس جھنڈے تک پہنچنا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اگر ہم مریں تو اس جھنڈے کے سائے میں مریں۔ ہمارا خون ہماری مٹی میں جذب ہو۔ اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ اس بارڈر کے پار ایک ماں کی آغوش ہے۔ مادرِ وطن کی آغوش ہم اس تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیں چھپا لے...... ہمارے زخمی جسموں کو ڈھانپ لے اور ہماری سرخروئی پر فخر سے ہماری پیشانیاں چوم لے۔

اور زخمی عمران نشانہ لے رہا تھا۔ ہوا عقب سے آرہی تھی اور اس کے بال آگے کی طرف اُڑ رہے تھے...... پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ وہ بلا کا نشانے باز تھا...... لیکن...... وہ قسمت کا دھنی بھی تھا۔ بخت کا فرشتہ بھی تو اس کے سر پر سایہ فگن رہتا تھا۔ اس کی بانٹی ہوئی محبتیں اور چاہتیں مشکل میں اس کے لئے ایک نورانی توانائی بن جاتی تھیں۔ میں دیکھ نہیں سکا لیکن جیلانی اور جگت سنگھ نے ٹیلی اسکوپس آنکھوں سے لگا رکھی تھیں۔ ''ویل ڈن...... ویل ڈن۔'' جیلانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

عقب میں کسی خوفناک دھماکے کی آواز آئی اور بہت فاصلے پر کچھ شعلے سے چمکتے دکھائی دیئے۔

''کیا ہوا جیلانی؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

جیلانی سے پہلے ہی جگت بولا۔ ''الٹ گیا جی لانچر...... آگ لگ گئی۔ پچھلی ایک گڈی بھی وجی (ٹکرائی) ہے اس میں۔ وہ بھی درختوں میں وڑ گئی۔ آگ لگ گئی ہے اسے بھی۔ دوسری گڈیاں کچے میں اتر کر آگے آرہی ہیں...... پر اب وہ دور ہیں......'' وہ رواں تبصرے کے انداز میں بول رہا تھا۔ آواز جوش سے کانپ رہی تھی۔

عمران نڈھال سا ہو کر واپس اپنی نشست پر ڈھے گیا۔ کرب کے ساتھ اس کے چہرے پر ایک اطمینان سا بھی تھا۔ خون سے اس کی شرٹ اور کاٹرائے کی براؤن پینٹ سرخ تھی۔

جیلانی نے سن روف کا خلا بند کر دیا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر عمران کے پاس پہنچوں اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لوں۔ میں نے اسٹیئرنگ تھام رکھا تھا اور میری نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔ مجھے آخری تین چار سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اور یہ کوئی عام فاصلہ نہیں تھا۔ یہ بھی موت کا گھیرا تھا۔ بارڈر پر موجود بی ایس ایف اہلکار جان چکے تھے کہ جو گرے جیپ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی ہے، اسے روکنا ہے۔ ہر قیمت پر روکنا ہے لیکن اس جیپ کو روکنے کے لئے ان کے پاس پوری تیاری نہیں تھی۔ ان کے پاس چھوٹی بڑی گنیں تھیں اور وہ انہیں مسلسل چلا رہے تھے۔ گرے جیپ کی باڈی اور اسکرینز پر مسلسل چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں اور شدید تھرتھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جب کوئی بڑا برسٹ لگتا تھا تو دیوہیکل جیپ جیسے لہرا سی جاتی تھی۔

میں رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ سامنے چیک پوسٹ کا ترنگا نظر آ رہا تھا۔ انڈین فوجی بھاگ بھاگ کر ریت کی بوریوں کے پیچھے پوزیشنیں لے رہے تھے۔ انہوں نے لوہے کے بڑے بڑے، دو پھاٹک بند کر دیئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جیپ ان مضبوط پھاٹکوں کو توڑ سکے گی یا نہیں اور ٹکرانے کے بعد میں اسے سنبھال پاؤں گا یا نہیں...... مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اگر ان آخری دو تین سو میٹرز میں کوئی راکٹ یا آرٹلری کا گولہ گاڑی سے آ ٹکرایا تو وہ ہمارا تحفظ کر سکے گی یا نہیں...... یا اپنے پہیوں پر رہ سکے گی یا نہیں۔ میں بس اسے بھگاتا جا رہا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔

لوہے کے گیٹ پچاس ساٹھ میٹر دور رہ گئے تھے تو میں نے اچانک فیصلہ بدلا اور جیپ کو سڑک سے اتار دیا۔ اتنی رفتار سے دوڑتی جیپ کو ناہموار جگہ پر سنبھال کر رکھنا آسان نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری صلاحیت صرف کر دی۔ جیپ کے اندر فاخرہ، مہناز اور ثروت وغیرہ کی آوازوں نے کہرام سا مچا دیا۔ ہر آن یہی لگا کہ جیپ الٹ جائے گی۔ کئی مواقع پر وہ کئی کئی فٹ زمین سے اچھلی اب سامنے پھاٹک نہیں تھے۔ خاردار باڑ تھی، تارکول کے ڈرم وغیرہ تھے اور مسلح سنتری تھے۔ عقب میں بی ایس ایف اور جاوا کی گاڑیاں تھیں اور بے رحم فائرنگ تھی...... پھر فیصلے کا لمحہ آیا۔ جیپ گولی کی رفتار سے خاردار باڑ اور دیگر رکاوٹوں سے ٹکرائی۔ ان کے پرخچے اُڑاتی ہوئی وہ پار ہوئی اور قریباً چالیس پچاس میٹر کے ''نو مین لینڈ'' کو پار کر کے پاکستانی علاقے میں داخل ہو گئی۔

ہمارے پاکستانی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی پاکستانی پوسٹ کی طرف سے کراس فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ یہ فائرنگ ہم پر نہیں بلکہ انڈین فوجیوں پر ہو رہی تھی۔ ظاہر

ہے کہ بھارتیوں کی طرف سے جو فائر آ رہا تھا، وہ پاکستانی علاقے کی طرف آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، پاکستانی فوجیوں کو خاص ذرائع سے یہ اطلاع بھی ہو چکی تھی کہ گرے جیپ میں اپنے لوگ آ رہے ہیں۔

دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھی۔ ہم پاکستانی علاقے میں یوں داخل ہوئے جیسے کبڈی کا کوئی ماسٹر کھلاڑی، مخالف کھلاڑیوں سے لڑنے بھڑنے اور انہیں پچھاڑنے کے بعد فاتحانہ ہاتھ اٹھاتا ہوا اپنی حدود میں پہنچ جاتا ہے...... میں جیپ کو قریباً نصف کلومیٹر تک اسی طرح بھگاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پاکستانی فوجیوں اور رینجرز نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔

کیپٹن رینک کے ایک آفیسر نے اندر جھانکا۔ جیلانی نے باہر نکل کر سرگوشیوں میں آفیسر سے بات کی۔ آفیسر نے فوراً ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دی اور اس کے ساتھ ہی وائرلیس پر آگے والی پوسٹوں کو ہمارے لئے ہدایات دینے لگا۔

گرے جیپ پھر روانہ ہوئی۔ اردگرد کے پاکستان فوجی اور رینجرز اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ہم آگے بڑھتے گئے۔ یہ اپنی زمین تھی، یہ اپنی ہوا تھی، اپنے کھیت، اپنے درخت اور ہم زخموں سے چُور...... اور ہم سب سے زیادہ چُور ہمارا ہیرو...... ہمارا عمران۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''گھبراؤ نہ یارو...... اتنی جلدی نہیں مروں گا۔ لیکن اگر تم نے ایسے چہرے بنائے رکھے تو پھر ضرور کچھ سوچنا پڑے گا۔''

مہناز نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تابش صاحب! نزدیک ترین اسپتال کون سا ہے؟''

جیلانی نے کہا۔ ''ہم اسپتال کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ وہ دیکھیں سامنے ایمبولینس کھڑی ہے۔ وہ ہمیں گائیڈ کرے گی۔''

یہ ایک فوجی ایمبولینس تھی۔ ہماری جیپ قریب پہنچی تو ایمبولینس نے ہماری راہنمائی شروع کر دی۔ اس کا سائرن پوری آواز سے بج رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر ڈاکٹر مہناز میری طرف آئی اور میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''تابش! عمران صاحب کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ انہیں ایمبولینس میں شفٹ کرنا چاہئے وہاں آکسیجن وغیرہ بھی ہو گی۔''

ہم نے ایمبولینس کے قریب پہنچ کر اسے روکا۔ یہ ایک بڑی گاڑی تھی۔ ہم نے عمران

کے علاوہ زخمی شوٹر کو بھی اس ایمبولینس میں منتقل کر دیا۔ میں عمران کے ساتھ تھا۔ عمران کا چہرہ خون کے بہاؤ کے سبب زرد ہو گیا تھا لیکن اس کا حوصلہ اسی طرح جوان تھا۔ اسے ایمبولینس کے اسٹریچر پر لٹایا گیا تو کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ لیٹ گیا۔ میں نے اس کا زخمی بازو والا ہاتھ تھام لیا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ وہ بولا۔ ''زیادہ بیوی بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ بابا جلالی دیکھو کہاں پہنچ کر واپس آ گیا ہے۔ مجھے تو پھر ایک گولی لگی ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ بھینچ لیا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو پہلے مجھے ہوگا۔''

وہ مسکرایا۔ ''ساری بیویاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ بعد میں رنگ برنگے کپڑے پہنتی ہیں اور برسی کا دن بھی بھول جاتی ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں ایسے کمینے پن کا موقع دینے والا نہیں ہوں۔ خاطر جمع رکھو۔''

''جاوا بچ گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں...... لیکن تمہارے لئے ایک چیز رکھی ہوئی ہے میں نے۔ جاوا کی جیپ میں ہی پڑی ہے۔ آخری سیٹ کے نیچے، بائیں طرف۔ ابھی اسے نکال لینا۔ مجھے تو اب شاید دو چار دن اسپتال کی دال روٹی کھانی پڑے گی۔''

''آٹھ دس دن کھا لینا مگر ٹھیک ہو جانا۔'' میں نے اس کے گہرے زخم سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔

ایک فوجی مسلسل عمران کو آکسیجن ماسک لگانا چاہ رہا تھا لیکن عمران نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ دوسری طرف ڈاکٹر مہناز، زخمی شوٹر رفیع کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا اور اس کی سانس بھی اکھڑ رہی تھی۔ آکسیجن اسے لگا دی گئی۔

ہم ایک عارضی فوجی اسپتال میں پہنچے۔ ایک سرجن نے ہنگامی طور پر جیپ کے اندر ہی عمران کا معائنہ کیا۔ اسے کچھ طبی امداد دی گئی۔ اسے خون کی فوری ضرورت تھی۔ یہ خون مہیا ہو گیا اور ایمبولینس کے اندر ہی عمران کو لگا بھی دیا گیا۔

اس دوران میں عمران نے ایک فون کال بھی موصول کی۔ پتا نہیں وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جی جناب! ٹارگٹس تقریباً اچیو ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کو واپس لے آئے ہیں۔ تابش اور اس کی کزن ثروت بھی بخیریت آ گئے ہیں۔ ثروت کا شوہر یوسف پہلے ہی ایک ڈیل کے ذریعے پاکستان آ چکا ہے...... یس سر...... یس سر۔ دو لڑکیاں بھی ہیں۔ فاخرہ اور اس کی سہیلی۔ ممبئی کے فلمی مافیا کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ایک تیسری بھی تھی

سویٹی...... ایشوریا کے نام سے جانی جاتی تھی۔ وہ نہیں آ سکی۔ اسے ریسٹ ہاؤس میں گولی لگ گئی تھی......''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ غالباً عمران اور اس کی ٹیم کی کارکردگی کو سراہا جا رہا تھا۔ عمران نے جواب میں دو بار تھینکس کہا اور کال ختم ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے اصرار کر کے عمران کو آکسیجن ماسک چڑھا دیا۔

گرے جیپ ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ اس میں سے بھی زخمیوں کو نکال کر اس عارضی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ باقی مرد وزن کو آرمی والوں نے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ ان میں جگت سنگھ بھی شامل تھا۔ اس دوران میں مجھے عمران کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ جیپ میں میرے لئے ایک چیز ہے۔

میں نے جیلانی کو اس بارے میں بتایا۔ وہ بولا۔ ''مجھے بھی کہہ رہے تھے کہ جاوا تو انڈیا میں رہ گیا ہے لیکن میں اس کی ایک خاص چیز لے آیا ہوں۔ اس کے بغیر وہ بیکار ہی ہے۔''

ہم دونوں جیپ میں پہنچے۔ جیپ کی باڈی پر ان گنت گولیوں کے نشان تھے۔ لیکن یہ گولیاں جیپ کے اندر ''پینی ٹریٹ'' نہیں کر سکی تھیں۔ ڈان نے اپنے لئے جو سخت ترین حفاظتی انتظام کر رکھا تھا، وہ آج ہماری زندگیاں بچنے کا سبب بنا تھا۔ اس یونیک جیپ کو آرمی والوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جیپ کے اندر زخمیوں کے خون کے دھبے تھے۔ سب سے زیادہ خون اس نشست پر تھا جہاں عمران بیٹھا تھا۔ میں اس خون سے نگاہ چراتا ہوا، پچھلی نشستوں تک پہنچا۔ ہم دونوں نے نیچے جھانکا۔ شروع میں تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ایک فٹ بال سا نظر آیا۔ جیلانی نے اسے باہر نکالا۔ ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ یہ جاوا کا سر تھا۔ اسے ٹھوڑی کے بالکل نیچے سے کاٹا گیا تھا۔ سیاہی مائل رگیں لٹک رہی تھیں۔

''او گاڈ!'' جیلانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میرے جسم میں بھی سرد لہر دوڑ گئی۔ تاہم اس لہر میں خوشی اور اطمینان کا ایک بے مثل احساس بھی تھا۔ جاوا کی منحوس آنکھیں کھلی تھیں۔ چربی دار جبڑا ذرا لٹکا ہوا تھا۔ سانولے سفاک چہرے پر کئی گہری خراشیں تھیں۔ لگتا تھا کہ آخری وقت میں اس نے کافی مزاحمت کی۔ پاکستانی ہیرو اور بھارتی ولن کا یہ مقابلہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا مگر نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ لگتا تھا کہ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا اور انڈیا کے اس نامی گرامی ڈان کو چند سیکنڈ کے اندر موت سے ہمکنار کر دیا گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا، یہ واقعی کسی خون خوار ریچھ کا سر ہے جو ان گنت دوشیزاؤں کی رگِ عصمت سے خون پی چکا ہے اور گوبند سنگھ جیسے بے شمار کڑیل جوان اس کی بربریت

کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اب اس کا سر خاک وخون میں لتھڑا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں اقبال، ابرار صدیقی، پورب کمار، قربان علی اور میڈم صفورا وغیرہ کے چہرے نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہم نے ان کے خون کا بدلہ لے لیا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ دھوئیں والے بموں سے حملہ کرنے سے تھوڑی دیر پہلے عمران نے جگت سے اس کی نہایت تیز دھار کرپان بھی مانگی تھی۔ یہی لگتا تھا کہ یہ اُس وزنی کرپان کی کارروائی ہے۔

پاس ہی ریگزین کا ایک بیگ تھا جس میں آٹومیٹک رائفلوں کا بچا کھچا ایمونیشن تھا۔ جیلانی نے یہ ایمونیشن جیپ کے فرش پر الٹا اور انڈیا کے خطرناک ڈان کا خون آلود سر اس بیگ میں ڈال کر زپ کھینچ دی۔

''ویل ڈن میرے یار!'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کلیجا ٹھنڈا کیا تُو نے۔ اب زندگی کی طرف بھی واپس آ جانا۔ ہر مصیبت کو شکست دیتا ہے تُو، اب اسے بھی دے دینا۔ ہمیں مایوس نہ کرنا۔ ہمیں بڑا مان ہے تجھ پر۔''

باہر کھڑے فوجی آفیسر دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ریگزین کے بیگ میں کیا رکھا ہے۔ جیلانی نے ایک طرف جا کر ان سے چند سرگوشیاں کیں اور بیگ ان کے حوالے کر دیا۔ دیکھنے میں بالکل یہی لگتا تھا کہ بیگ میں کوئی فٹ بال یا پھر تربوز قسم کی شے ہے جو ہم تحفے کے طور پر سرحد پار سے لائے ہیں۔

سنگین ترین صورتِ حال کے باوجود میں عمران کے فقرے سے محظوظ ہوا۔ اس نے کیپٹن جیلانی سے کہا تھا۔ ''جاوا، انڈیا میں ہی رہ گیا ہے لیکن اس کی ایک شے میں لے آیا ہوں۔ اس کے بغیر وہ تقریباً بیکار رہی ہے۔''

''ویل ڈن میرے یار!'' میں نے ایک بار پھر دل ہی دل میں کہا۔

ایک خوش شکل پاکستانی فوجی آفیسر میرے پاس آیا۔ وہ مکمل یونیفارم میں تھا۔ اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''کیپٹن ڈاکٹر شرجیل احمد۔''

''جی میں تابش ہوں۔ عمران صاحب کا ساتھی۔''

''مجھے معلوم ہے بلکہ ہم نے سب کچھ دیکھا ہے۔ گرے جیپ آپ ہی ڈرائیو کر رہے تھے نا؟''

''جی ہاں۔''

''آپ نے کمال کیا مسٹر تابش! ویری ویل ڈن۔ ہماری نظریں ٹیلی اسکوپ کے ذریعے آپ پر ہی جمی تھیں۔ آپ نے بڑے مشکل حالات میں جیپ کو سنبھالے رکھا۔ خاص طور پر کچے پر اترنے کے بعد۔ وہ بہت رفتار تھی۔''

''شکریہ۔''

''اور کچے پر اترنے کا آپ کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ وہ دو پھاٹک تھے اور آپ انہیں توڑ نہیں سکتے تھے۔ فرض کیا ایک ٹوٹ بھی جاتا تو آپ کی رفتار اتنی کم ہو جاتی کہ دوسرا آپ کا راستہ روک لیتا۔''

''عمران صاحب کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عمران صاحب ایمبولینس میں ہیں۔ لیکن اب ان کے بارے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوئی ہے۔ ہم ہیلی کاپٹر منگوا رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''ان کی حالت اتنی اچھی نہیں۔ انہیں جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہئے۔ باقی دونوں زخمیوں کو بھی ارجنٹ ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔''

ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ عمران کے لئے میری تشویش بڑھ رہی تھی اور کچھ یہی کیفیت باقی ساتھیوں کی بھی تھی۔

○……❖……○

ہم گیارہ بجے کے لگ بھگ کراچی پہنچ گئے۔ ہیلی کاپٹر سے عمران اور دیگر دونوں زخمیوں کو جدید ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور سر آغا خان اسپتال پہنچایا گیا۔ میں اس تمام عرصہ عمران کے ساتھ رہا۔ وہ ہوش میں تھا اور ہمیشہ کی طرح حوصلہ مند بھی۔ بہر حال اس کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا تھا اور بلڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ اب بھی باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنا چاہ رہا ہے مگر فی الحال حالت اجازت نہیں دے رہی تھی۔

جب وہ لوگ اسے اسٹریچر پر بھگاتے ہوئے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جا رہے تھے، میں بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر مجھے روک دیا گیا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا گیا۔ وہ اسٹریچر کو دوڑاتے ہوئے بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ میں وہیں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''عمران! مجھے چھوڑ نا مت...... مجھے چھوڑ نا مت۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے دکھ کے عالم میں زیر لب کہا اور میری آنکھوں سے گرم پانی کے سوتے پھوٹ نکلے۔

شام چار بجے کے قریب ہمارے باقی ساتھی بھی بذریعہ سڑک کراچی پہنچ گئے۔ فوجی حکام کی ہدایت پر انہیں کلفٹن میں ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور وہاں ان کی سیکیورٹی رینجرز کو سونپ دی گئی۔ میں ہوٹل پہنچا تو مین گیٹ پر میڈیا کے لوگوں کا ہجوم نظر آیا لیکن انہیں اندر نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں ہی میری ملاقات جگت سنگھ سے ہوگئی۔ اس کے ایک ہاتھ اور چہرے پر معمولی زخم تھے۔ ان کی بینڈیج ہو چکی تھی۔ اس نے سب سے پہلے مجھ سے عمران کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا۔ ''اس کا دوسرا آپریشن ہو رہا ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کے لئے دعا کرو۔''

''آپاں کا تو رواں رواں اس کے لئے دعا کرتا ہے بادشاہ زادے۔ وہ شیر مرد ہے۔ گیدڑوں کے کاٹنے سے اسے کچھ نہیں ہوگا۔ واہگرو کی کرپا ہوگی۔''

''ثروت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوٹی وہ سامنے اٹھارہ نمبر کے کمرے میں ہے۔ بہت رو رہی ہے اس نے ابھی کہیں فون کیتا ہے۔ اس کو پتا لگیا ہے کہ اس کی نکی بہن کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور اسے کسی باہر کے ملک لے جایا گیا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ ثروت کو نصرت کی حالت کا پتا چل گیا ہے۔ یقیناً یہ اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ یعنی ایک بہت بڑی مصیبت سے نکلنے کے فوراً بعد وہ ایک اور بڑے صدمے کا شکار ہوگئی تھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ ڈاکٹر مہناز نے دروازہ کھولا۔ مہناز کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ اس کے ہاتھ میں خالی سرنج تھی۔ غالباً اس نے ابھی ثروت کو کوئی انجکشن دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر مہناز باہر نکل گئی تاکہ میں اکیلے میں ثروت سے بات کرسکوں۔

ثروت صوفے پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا ماتھا صوفے کے ہتھے پر ٹیک رکھا تھا۔ وہ ہولے ہولے رو رہی تھی۔

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ جیسے میں نے اسے چھوا نہ ہو، اس کے کندھے پر انگارہ رکھ دیا ہو۔

''کیا بات ہے ثروت؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے...... آپ کی نیت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔ وہ مر رہی ہے۔ اس کا کچھ نہیں ہو سکے گا۔ کچھ نہیں۔'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

''ثروت! خود کو سنبھالو۔ یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ ہوٹل ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ اسے پھر آسٹریا لے گئے ہیں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے...... ابھی جانا ہے۔''

''سب کچھ ہو جائے گا ثروت! تم حوصلہ رکھو۔''

''بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔ پلیز، میرے کمرے سے چلے جائیں۔''

پھر میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ خود اٹھی اور بھاگ کر اٹیچ کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کرلیا۔

میں سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر مردہ قدموں سے باہر آگیا۔

سامنے جیلانی آتا نظر آیا۔ اس کا زخمی بازو اب اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس نے بھی سب سے پہلے عمران کے بارے میں پوچھا۔ میں نے وہی بتایا جو ابھی جگت کو بتایا تھا۔ جیلانی بھی میرے ساتھ ہی اسپتال میں جانا چاہتا تھا مگر یہاں مقامی حکام کی ایک ہنگامی میٹنگ ہو رہی تھی۔ دو تین فوجی افسران بھی اس میں شریک تھے۔ جیلانی کو یہاں سارے واقعے کی رپورٹ دینا تھی۔ جیلانی نے مجھے ایک اخبار بھی دکھایا۔ شام کے اس اخبار میں دو خبریں اہم تھیں۔ پہلی، انڈین ڈان جاوا کے قتل کی خبر تھی۔ لکھا گیا تھا کہ جاوا کے قتل پر ممبئی میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ وہاں کی انڈر ورلڈ ہل کر رہ گئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ جاوا کو بہیمانہ طریقے سے قتل کرنے والا وہی میجر کا گروپ ہے جو اس سے پہلے بھی انڈیا میں کئی اہم لوگوں اور خاص طور سے حساس ادارے کے افراد کو قتل کر چکا ہے۔ اس قتل کے بعد انڈیا کے نیوز چینلز پر بہت ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔

دوسری خبر کھوکھراپار بارڈر پر دوطرفہ فائرنگ کی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ یہ فائرنگ قریباً دس منٹ جاری رہی۔ اشتعال انگیزی انڈین فورسز کی طرف سے ہی ہوئی۔ پاکستانی فوجیوں نے اس کا جواب دیا۔ کسی Casualty کی اطلاع نہیں تھی۔ ہاں، خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس فائرنگ کے دوران میں ایک گاڑی انڈین فائرنگ سے بچتی بچاتی پاکستانی علاقے میں داخل ہوگئی۔ اس مکمل بلٹ پروف گاڑی کو قبضے میں لے لیا گیا ہے۔ گاڑی یا گاڑی سواروں کے

بارے میں کوئی تفصیل نہیں تھی۔

میں نے کہا۔'' جیلانی! میں دوبارہ اسپتال جارہا ہوں۔تم ذرا ثروت کا خیال رکھو۔وہ بہت تناؤ میں ہے۔''

''ہاں، مجھے بھی لگ رہا ہے لیکن ابھی ان کے شوہر بھی تو پہنچ رہے ہیں۔'' جیلانی نے اطلاع دی۔

''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر مہناز بتا رہی تھیں کہ ان کے شوہر یوسف صاحب سے رابطہ ہو گیا ہے۔ وہ لاہور سے آنے والی فلائٹ پر آرہے ہیں۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

جیلانی میٹنگ میں چلا گیا۔ میں اسپتال روانہ ہوا تو جگت سنگھ بھی ساتھ ہولیا۔ ہم سب کے دل عمران کی حالت کے لئے دھڑک رہے تھے۔ اسپتال میں کافی لوگ آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے۔ یہ سب عمران سے تعلق رکھتے تھے۔ آرمی کے کچھ لوگ بھی دکھائی دیئے۔ پتا چلا کہ عمران کا دوسرا آپریشن مکمل ہوگیا ہے اور اسے ''آئی سی یو'' میں منتقل کیا جانے والا ہے۔

کیپٹن شرجیل بھی یہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں جو بالکل پاس پاس لگی تھیں۔ ایک گولی زیادہ آگے نہیں جاسکی اور ایک ٹوٹی ہوئی پسلی کے قریب سے نکال لی گئی۔ دوسری گولی نے زیادہ نقصان کیا۔ اس نے ایک پھیپھڑے کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اگلے پندرہ بیس گھنٹے عمران کی صحت یابی کے لئے بہت اہم ہیں۔

''وہ ہوش میں ہے کیپٹن؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، انہیں ٹرنکولائزرز کے زیر اثر رکھا گیا ہے۔ یہی ان کے لئے بہتر ہے۔''

جیلانی بھی میٹنگ سے فارغ ہو کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہم سب عمران کے لئے بے چین تھے۔

رات دس بجے کے قریب کیپٹن شرجیل ہمیں زبردستی ہوٹل واپس لے آیا تاکہ ہم کچھ کھا پی سکیں اور ذرا آرام کر لیں۔ ہوٹل کے برآمدے میں ہی میری ملاقات اس شخص سے ہوگئی جس کا سامنا کرنا میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ یہ یوسف تھا۔

انڈیا سے رفوچکر ہونے کے بعد وہ پہلی بار اپنی صورت دکھا رہا تھا۔ بہرحال، اس کے چہرے پر کسی طرح کی ندامت یا جھجک نہیں تھی۔ اس کی اونچی لمبی ناک لشکارے مار رہی تھی اور وہ بہترین تراش کے لباس میں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔'' کیا حال ہے آپ

کے دوست عمران صاحب کا؟'' وہ مصنوعی تفکر سے بولا۔

''آپریشن ہو چکا ہے، حالت بہتر ہو رہی ہے۔'' میں نے رسمی جواب دیا۔

''آپ کے ساتھیوں اور میڈم صفورا وغیرہ کا سن کر بہت بہت افسوس ہوا۔ شکر ہے کہ اللہ نے آپ کی جان بچالی اور آپ پھر سے ہمارے درمیان ہیں۔''

''ہم تو پہلے بھی سب کے درمیان ہی تھے۔ آپ کی خاطر نکلنا پڑا۔''

''بس اللہ حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔''

''بے شک...... مگر اپنے بچاؤ کے لئے آپ نے خود بھی زبردست کوشش کی۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔'' میں مسلسل پاکستانی سفارت خانے سے ان ٹچ رہا ہوں۔ پرسوں میں خود انڈیا جانے والا تھا۔ بہرحال تھینکس گاڈ! آپ لوگ سلامتی سے واپس آ گئے۔ میں اور ثروت خاص طور سے آپ کے بہت زیادہ ممنون ہیں۔ کاش وہاں وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہے گا۔''

وہ بہروپیا اس واقعے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جب اس نے باقاعدہ مجھ پر گولی چلائی تھی۔

مجھے اندیشہ تھا کہ میں کہیں طیش میں اس سے کچھ کہہ نہ بیٹھوں۔ میری مشکل ایک خوش پوش لڑکی نے آسان کی۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی۔ وہ عمران کی ساتھی شاہین تھی۔ وہ آتے ساتھ ہی میرے بازو سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ رونے والی کوئی بات نہیں۔ بس دعا کرو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

''میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں تابش بھائی! پلیز مجھے وہاں چلیں۔''

''ابھی تو میں بھی اس سے نہیں مل سکا۔ لیکن امید ہے کہ کل صبح تک ہم اسے دیکھ سکیں گے اور شاید بات بھی کر سکیں گے۔ کیپٹن شرجیل بتا رہا تھا کہ اس کے دونوں آپریشن کامیاب رہے ہیں۔''

اسی دوران میں مجھے سرکس کے مالک جان محمد صاحب اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر بھینچا اور تھپکی دی۔ میرے شانے تھام کر بولے۔'' تم لوگوں نے انڈین ایجنسیوں کو یادگار سبق سکھایا ہے۔ وہاں کے ٹی وی چینلز پر کہرام مچا ہوا ہے۔ جاوا کی موت کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی ہے۔ انڈین فوج کے ذرائع اپنے اصل نقصان کو چھپا رہے ہیں پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ درجنوں مرے ہیں۔ کئی گاڑیاں تباہ ہوئی ہیں۔''

تب انہوں نے عمران کی حالت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ آپریشنز کے بعد وہ بہتر ہے۔ میں نے شاہین سے فرح اور عاطف کے بارے میں پوچھا۔ شاہین ایک دم چپ ہو کر جان محمد صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے ذہن میں اَن گنت اندیشے کلبلائے اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ''کیا ہوا؟ کہاں ہیں وہ؟''

''پریشانی کی بات نہیں۔ وہ خیریت سے ہیں۔'' جان صاحب نے کہا۔ ''لیکن...... پاکستان میں نہیں ہیں۔''

''نہیں ہیں؟''

''میں نے پانچ دن پہلے ان دونوں کو تمہارے بچے سمیت دبئی بھجوا دیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا ہے ان کے حق میں۔ اقبال کے قتل کے بعد یہاں جاوا کے بندوں کے حوصلے بڑے بڑھ گئے تھے۔ وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ سلطان چٹا نے ایک روز عاطف کو مال روڈ کے ایک جم سے نکلتے دیکھ لیا اور اسے للکارا۔ عاطف بڑی مشکل سے بچ کر نکلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب تمہارے بھائی بہن کا یہاں رہنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ میں نے بالو سمیت انہیں دبئی بھجوا دیا ہے۔ بالو کی آیا صفیہ اور زری بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔ ہو گے تو کل تمہاری ان سے بات بھی کروا دوں گا۔''

اس دوران میں جان محمد صاحب کے فون پر بیل ہوئی۔ انہوں نے اسکرین دیکھی اور ہولے سے بولے۔ ''لو بھئی، بڑی لمبی عمر ہے ان دونوں کی۔ انہی کی کال ہے۔''

پہلے جان صاحب نے خود تھوڑی سی بات کی۔ اس کے بعد فون میری طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو۔'' مجھے عاطف کی آواز سنائی دی۔

''میں تابش ہوں عاطف...... کیسے ہو تم؟''

''تابش بھائی جان! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ ہم تو بہت پریشان تھے۔ ٹی وی پر بڑی بری خبریں آ رہی تھیں۔ عمران بھائی کے بارے میں انڈیا کے ٹی وی چینلز پر کہا جا رہا ہے کہ ان کا تعلق فوج سے رہا ہے اور وہ ایک گروہ بنا کر انڈیا میں لوگوں کو ٹارگٹ کرتے رہے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ فرح کا تو رو رو کر برا حال ہے۔ بس اس کو اپنی آواز سنائیں۔''

دو سیکنڈ بعد فرح کی سسکتی ہوئی صدا اُبھری۔ ''بھائی جان! آپ سچ بتائیں آپ پاکستان میں ہیں نا؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟ زخمی تو نہیں ہیں آپ؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کوئی درجن بھر سوال کر دیئے۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں خیریت سے پاکستان پہنچ گیا ہوں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر میرے پاس پہنچ جائے اور مجھ سے لپٹ کر اپنے دل کی بھڑاس آنکھوں کے راستے نکال دے۔ میں اسے کسی بچی کی طرح پچکارتا رہا، سمجھاتا رہا۔ اس نے مجھے چھوٹے بالو کی آواز سنائی۔ اس کی توتلی زبان...... اس کی پیاری سی کلکاری۔ وہ سلطانہ کا جگر گوشہ تھا۔ اس کے جسم کا حصہ تھا۔ میں جب بھی اس کی آواز سنتا تھا، میرے سارے بھولے بسرے زخم لو دینے لگتے تھے۔

عاطف اور فرح نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں دبئی میں خود کو بالکل محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ جان محمد صاحب نے ان کے لئے اچھی سیکیورٹی بھی مہیا کر رکھی ہے۔ ان دونوں کو عمران کے زخمی ہونے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس کے لئے بے حد فکرمند تھے۔ عمران بھائی...... عمران بھائی کہتے ان کی زبان نہیں سوکھتی تھی۔ میں نے ان کو عمران کے بارے میں حتی الامکان تسلی دی اور یہ بھی کہا کہ یہاں کے معاملات سے فارغ ہو کر میں بہت جلد ان سے ملنے کے لئے آ رہا ہوں۔

...... شاہین تو فوراً اسپتال جانا چاہ رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے اور جیلانی نے متعلقہ ڈاکٹرز سے فون پر رابطہ رکھا ہوا ہے۔ وہ صورتِ حال سے آگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

وہ جو ہمہ وقت عمران سے دست و گریباں رہتی تھی اس وقت یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ جیسے اُڑ کر اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ہم نے جیسے تیسے رات گزاری۔ اس دوران میں بھی ڈاکٹر شرجیل سے میری بات ہوتی رہی۔ آخری دو گھنٹوں میں ڈاکٹر بھی شاید کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ ہم چھ بجے ہی ہوٹل سے نکل کر اسپتال روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں میرے ساتھ جگت، جان محمد صاحب اور شاہین بھی تھے۔ شاہین کی خوب صورت آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ وہ غمزدہ حسن کا نمونہ نظر آتی تھی۔ پچھلے تین چار ماہ میں اس کے نقوش میں کچھ اور بھی نکھار آیا تھا۔ شبنم سے دھلے دھلائے پھول جیسا چہرہ اور نہایت متناسب جسم...... ترشے ہوئے نفیس بال اس کے چہرے پر بہت جچتے تھے۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ Arcobat والا جاب مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی۔ یوں اس کی شخصیت میں سنجیدگی اور وقار کا تناسب کچھ بڑھا تھا۔

ہم اسپتال پہنچے تو سب سے پہلے جیلانی ہی نظر آیا۔ اس کا اڑا اڑا سا رنگ دیکھ کر میرا کلیجا جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ''خیریت ہے جیلانی؟'' میں نے تڑپ کر پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے جی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہم سے بہت کچھ چھپایا گیا

ہے۔عمران صاحب کی حالت کل شام سے ہی اچھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے راتوں رات انتظام کیا ہے اور انہیں پاکستان سے لے گئے ہیں۔''

''پاکستان سے لے گئے ہیں؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔

''جی ہاں، انہیں اسپیشل انتظام کے ذریعے میونخ روانہ کر دیا گیا ہے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ رات نو بجے ہی سرجنز نے کہہ دیا تھا کہ ان کی زندگی بچانے کے لئے انہیں فوراً بیرونِ ملک بھیجنا پڑے گا۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ کراچی ایئر پورٹ سے امارات کی پرواز کے ذریعے روانہ ہو گئے ہیں۔ دو ڈاکٹروں کی ٹیم بھی یہاں سے ان کے ساتھ گئی ہے۔''

میں بے دم سا ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہوئی۔ ایک دم شور سا اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شاہین ایک تپائی سے ٹکرانے کے بعد فرش پر گری تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''شاہین......شاہین!'' میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند اور چہرہ ہلدی تھا۔

دو نرسیں بھاگی ہوئی آئیں۔ ایک ملازم اسٹریچر لایا۔ شاہین کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔

میرا اپنا سر گھوم رہا تھا۔ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ شام کے بعد تو ہمیں کچھ اور صورتِ حال بتائی گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ آپریشنز کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی دوران میں پژمردہ ڈاکٹر شرجیل بھی نظر آ گیا۔ میں نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ ''یہ ہم کیا سن رہے ہیں ڈاکٹر......عمران کہاں ہے؟''

''آپ ٹھیک سن رہے ہیں تابش صاحب! انہیں ایمرجنسی میں باہر بھیجا گیا ہے اور یہ شکر کا مقام ہے کہ راتوں رات اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بہت بروقت فیصلہ کیا ہے۔ یہاں علاج بہت مشکل تھا۔ بیس تیس گھنٹوں کے اندر زندگی داؤ پر لگ سکتی تھی۔ ان کے اسپائنل میرو میں سوزش پیدا ہو رہی تھی۔''

''لیکن آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ انہیں لے جایا جا رہا ہے؟ ہم انہیں مل لیتے، ایک بار دیکھ لیتے۔''

''یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ وہ بے ہوش تھے۔ ویسے بھی سب کچھ آناً فاناً ہوا، یہ ایک عام فلائٹ تھی۔ اس میں ہنگامی طور پر خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہو گا، دو سینئر

ڈاکٹرز بھی ساتھ گئے ہیں۔ اب امید ہے کہ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں تابش صاحب! ہی از اے لکی مین۔ ورنہ اتنی جلدی یہ سب کچھ ہونا ممکن نہیں تھا۔''

اسی اثنا میں مزید ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ سب اس ڈرامائی تبدیلی پر ششدر تھے۔ پندرہ بیس منٹ بعد شاہین کو ہوش آ گیا۔ وہ ایمرجنسی وارڈ کے بستر پر تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک نیلگوں گومڑ نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ تھام کر سسکنے لگی۔ ''وہ بچ جائے گا نا تابش بھائی؟''

''اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''وہ ایک فائٹر ہے۔ لڑنا جانتا ہے۔ وہ اپنی تکلیف سے بھی لڑے گا اور شکست دے گا۔''

''یہاں اس کا علاج کیوں نہیں ہو سکا؟ اس کا مطلب ہے، اس کی حالت سیریس ہے؟''

''میری بات کیپٹن ڈاکٹر شرجیل سے ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فی الحال حالت سیریس نہیں تھی۔ لیکن ڈر تھا کہ اگلے ایک دو دن میں ہو سکتی ہے۔ کیپٹن کا کہنا ہے کہ عمران کا باہر جانا اس کے لئے بہت اچھا ثابت ہو گا۔ علاج کے بعد اس کی بحالی میں بھی زبردست مدد ملے گی۔''

''میں تو اسے دیکھ بھی نہ سکی۔ سوری بھی نہ کہہ سکی۔ کتنی بری ہوں میں۔ آخری بار کتنا لڑی ہوں اس سے۔ یہ جانے بغیر کہ وہ زخمی ہے، انڈینز کے گھیرے میں ہے، لڑ رہا ہے۔''

میں زبردستی مسکرایا۔ ''تمہیں سوری کہنے اور پھر سے لڑنے کا پورا موقع ملے گا۔ اب خود کو سنبھالو۔ ورنہ ہم دوہری مشکل کا شکار ہو جائیں گے۔''

اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر سسکیاں روکنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ مڑے تڑے نیلے نوٹ نکالے۔ یہ سات آٹھ ہزار روپے تھے۔ شاید اس نے اپنے روزمرہ رچ سے بچائے ہوئے تھے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے یہ میرے حوالے کئے اور بولی۔ ''پلیز آپ اس کے لئے کوئی صدقہ وغیرہ دے دیں۔ ابھی اسی وقت۔ خود جائیں یا کسی کے ذمے لگا دیں......پلیز۔''

میں نے روپے اس سے لے کر جیب میں رکھ لئے۔ دل کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ پیار کی اصل حقیقت کا پتا، مشکل اور تکلیف کے وقت چلتا ہے۔ جذبوں کی پرکھ آزمائش کی کسوٹی پر ہی ہوا کرتی ہے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اُڑ کر عمران کے پاس پہنچ جاؤں لیکن یہ سب کچھ اتنا

آسان نہیں تھا۔سفری کاغذات کی تیاری میں ہی کئی دن لگ سکتے تھے۔اب کراچی میں رکنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ہمیں لاہور جانا تھا۔اسپتال چھوڑنے سے پہلے ہم نے ان دو افراد کی تیمارداری کی جو عمران کے ساتھ ہی زخمی ہوئے تھے اور اب اسی اسپتال میں زیر علاج تھے۔وہ دونوں اب رُوبہ صحت تھے۔ان میں سے ایک تو وہی ماسٹر جواہر تھا۔ممبئی چھوڑنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا،اس کا اصل ذمے دار تو یہی شخص تھا۔اس نے اپنی محبوب بیوی سریتا کو بتانے کے لئے ہمیں ایک ایسا دھوکا دیا جس نے ہم سب کو جاوا اور بی ایس ایف کے خونی چنگل میں پھنسا دیا۔ابرار صدیقی،قربان علی،سویٹی اور میڈم صفورا سمیت کئی ساتھیوں کی جان گئی اور عمران بھی شدید زخمی ہوا اس سب کے باوجود مجھے یا عمران کو اس شخص سے کوئی گلہ نہیں تھا۔اس نے اپنے نقطۂ نظر سے شاید ٹھیک ہی کیا تھا۔اس نے سریتا کو اس ساری خونی کشمکش سے بچانے کی کوشش کی......اور یہ ثابت بھی ہو گیا کہ اس نے جو کیا درست کیا۔سریتا کی جگہ جولڑکی اس خونی کشمکش میں شامل ہوئی،وہ ریسٹ ہاؤس میں ماری گئی تھی۔

ماسٹر جواہر بستر پر لیٹا تھا اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو رِس رہے تھے۔اس کی ایک ٹانگ اور بازو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

”مجھے شما کر دیں۔“وہ بھرائی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا اور کہا۔”جواہر!جب تم انڈیا جاؤ گے تو تمہیں بہت کچھ بدلا ہوا ملے گا......اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری قسمت زور مارے اور تمہیں تمہاری بیوی اور بچی بھی واپس مل جائیں۔“

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔میں نے تہ کیا ہوا تازہ اخبار کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔اس میں جاوا کی موت کی خبر جلی حروف میں موجود تھی۔جاوا کی ایک مدھم سی تصویر بھی چھاپی گئی تھی۔خبر کی تفصیل میں کافی کچھ لکھا تھا جس میں یہ بات بھی موجود تھی کہ جاوا،پریم چوپڑا اور ان کے کئی قریبی ساتھیوں کی موت کے بعد اس گروہ کے خلاف پورے ”مہاراشٹر“ میں کریک ڈاؤن ہوا ہے۔بہت سی گرفتاریاں ہوئی ہیں اور کئی لوگ زیر زمین چلے گئے ہیں۔بہت سی لڑکیوں کو حبس بے جا سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ہے۔جاوا کے ایک ٹھکانے سے فاسٹنگ بدھا کی وہ نادر مورتی بھی سرکاری تحویل میں لے لی گئی ہے جس کی قیمت کروڑوں ڈالرز میں ہے اور جس کی تلاش میں کئی گروپ انڈیا میں سرگرم عمل تھے۔

ماسٹر جواہر خبر پڑھ رہا تھا اور اس کی بھیگی آنکھوں میں آس کی ایک مدھم سی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔میں اسے اخبار اور اس مدھم روشنی کے ساتھ چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔

میں،شاہین اور جگت سنگھ بارہ بجے واپس ہوٹل پہنچے تو وہاں ایک نئی اطلاع میری منتظر تھی۔میں نے ثروت اور یوسف والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھائی۔دروازہ کھلا تھا اور باوردی ملازم صفائی کر رہا تھا۔جیلانی نے کہا۔”ثروت صاحبہ اور ان کے شوہر چلے گئے۔“

”کہاں؟“میں نے پوچھا۔

”ابھی تو لاہور گئے ہیں۔وہاں سے انہیں آج رات آسٹریا کے لیے فلائٹ پکڑنی ہے۔یوسف صاحب ہی بتا رہے تھے۔“

پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ آج میں نے ثروت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا ہے۔آس کی ہر روشنی آج بجھ گئی ہے۔میرا دل چاہا کہ آج آخری بار ثروت کے پیچھے جاؤں۔اس کو شانوں سے تھام کر اس سے پوچھوں......ثروت!تمہاری اور یوسف کی خاطر میں تمہارے ساتھ دربدر ہوا۔عمران انڈیا پہنچا،اس کے ساتھی پہنچے،اب ہم سب زخموں سے چور مختلف اسپتالوں میں پڑے ہیں۔تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جاتے ہوئے رسمی شکریہ ہی ادا کر دیتیں......بتا ہی دیتیں کہ میں جا رہی ہوں۔کیا تم بھی یوسف کی طرح ہی بالکل بے حس ہو چکی ہو؟

لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا......نہ ثروت کے پیچھے جانے میں کچھ حاصل تھا۔لگتا تھا وہ بے مروتی اور لاتعلقی کی ہر حد پار کر چکی ہے اور جو لوگ اس طرح آگے چلے جاتے ہیں،انہیں روکنا یا آواز دینا بیکار ہوتا ہے۔وہ نہیں رکتے۔انہیں چھوڑ دینا چاہئے،آزاد کر دینا چاہئے۔ان کے تصور کی پیشانی پر ایک الوداعی بوسہ دے کر ان کے خیال کی پلکوں کو آخری بار چوم کر انہیں رخصت کر دینا چاہئے۔یہی محبت کا چلن ہے،یہی عشق کا وطیرہ ہے۔پیار میں جبر نہیں ہے۔یہ تو شیشے سے پتھر کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔کسی کرشمے کے سبب کامیاب ہو جائے تو سربسجود ہوتا ہے،ناکام ہو جائے تو گلہ نہیں کرتا۔وہ جانتا ہے کہ کچھ بھی نہ ملا تو ”درد کی دولت“ تو اسی کی ہے۔محبوب کے شیریں ہونٹ نہ پائے لیکن زہر کا پیالا تو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔کسی کا ریشمی پیکر گلے سے نہ لگا لیکن تختۂ دار کا پھندا تو اسی کا ہے۔کانٹے،زخم،کرب کے کوڑے،انگارے،زہر میں بجھے تیر......انتظار کی زہریلی برچھیاں،سب......ہاں سب کے سب اس کی ملکیت ہیں......اس کی جاگیر ہیں۔

میں ثروت کے خالی کمرے کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

O......❖......O

ہم لاہور پہنچے۔لاہور کیا تھا میرے لئے ایک ویرانہ تھا۔گلیوں میں جیسے خاک اڑ رہی

تھی۔ یہاں ثروت نہیں تھی۔ فرح اور عاطف نہیں تھے...... یہاں عمران نہیں تھا۔ وہ ہزاروں میل دور میونخ کے ایک اسپتال میں آنکھیں بند کئے ایک سفید بستر پر پڑا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ہر پل اس کی خبر ملتی رہے۔ ساتھ ساتھ میں اپنے سفری کاغذ بھی تیار کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو اپنی انگلی سے چھو کر کہنا چاہتا تھا، میں آ گیا ہوں عمران۔ اب اپنے سارے دکھ اور تکلیف مجھے سونپ دو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مسکرائے گا اور کہے گا۔'' دیکھ لے، اب پھر بول رہا ہے نا کسی بیوی کی طرح۔''

لاہور پہنچنے کے اگلے روز میں نے اپنی اور شاہین کی طرف سے اس کا صدقہ وغیرہ دیا۔ پھر میں میانی صاحب قبرستان گیا۔ وہاں ہمارا پیارا دوست اقبال ایک قبر میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا آنکھیں بھگوتا رہا۔ جیلانی اور امتیاز بھی میرے ساتھ تھے۔ جیلانی کے تین چار مسلح ساتھی ہمارے قریب ہی اندرونی سڑک پر ایک گاڑی میں بیٹھے تھے۔ امتیاز نے ہمیں بتا دیا تھا کہ لاہور میں باہر نکلتے ہوئے ہمیں بہت احتیاط کرنا پڑے گی۔

عمران کے اندرونِ شہر والے گھر کی چابی امتیاز کے پاس ہی تھی۔ ہم اسی گھر میں شفٹ ہوئے۔ شاہین کو جان محمد صاحب اپنے ساتھ لے گئے۔ عمران کی طرح وہ شاہین سے بھی بہت شفقت رکھتے تھے۔ وہ اسے لاہور ہی میں کسی محفوظ جگہ پر ٹھہرانا چاہتے تھے۔ میں نے شاہین سے کہا کہ میں جان صاحب کو اور اسے ہر وقت صورتِ حال سے باخبر رکھوں گا۔

ہم اندرونِ شہر والے گھر پہنچے تو ساتھ ہی لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہیں عمران کے زخمی ہونے کا علم ہو چکا تھا اور وہ اس کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ یہ سب عام لوگ تھے۔ کوئی خوانچہ فروش تھا، کوئی کریانہ فروش...... دودھ دہی والا بالا پہلوان، پان سگریٹ والا توفیق...... پڑوسی زاہد حسین، چاچا رفیق، پھل فروش عبدالکریم اور کئی دوسرے۔ وہ رسمی طور پر نہیں آئے تھے۔ ان کے چہروں پر وہی پریشانی تھی جو اپنے کسی قریبی عزیز کی تکلیف پر ہوتی ہے۔

ہیرو بھائی کس شہر میں ہیں؟ کس اسپتال میں ہیں؟ ہیرو پتر کب تک ٹھیک ہو گا؟ وہ کب واپس آئے گا؟ اس قسم کے بہت سے سوال ہم سے پوچھے جا رہے تھے۔

اس دوران میں بہرا چاچا نذیر آیا۔ وہ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔'' کہاں چھوڑ آئے ہو ہمارے ہیرو پتر کو...... کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟''

میں نے اسے دلاسا دیا۔ اس کے کان کے پاس بلند آواز سے کہا۔'' آپ کا ہیرو پتر

بالکل ٹھیک ہے چاچا! آپ کی دعائیں اسے بالکل بھلا چنگا کر دیں گی۔ وہ پھر سے ہمارے درمیان ہو گا۔''

'' کب آئے گا؟ تمہیں اسے ساتھ لے کر آنا تھا۔ اسے کہنا تھا، میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ وہاں سب تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تیری دید کو ترسے ہوئے ہیں۔'' چاچے کی ادھیڑ عمر لیکن نو بیاہتا بیوی بھی ساتھ تھی اور غم کی تصویر نظر آتی تھی۔

لوگوں میں سے کچھ رو رہے تھے، کچھ مشتعل تھے۔'' ہم ماریں گے اسے جس نے ہیرو بھائی پر گولی چلائی ہے۔'' ایک مزدور ٹائپ شخص نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے جذباتی انداز سے دو چار اور افراد بھی اشک بار ہو گئے۔

قاری حبیب اللہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔'' یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں عمران بھائی کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ ان کے لئے پڑھنا چاہئے تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔''

اسی دوران میں جیلانی کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آ کر کہا۔'' ایس پی حمزہ صاحب کا فون تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ لوگ وہاں میو اسپتال کے باہر جمع ہو گئے ہیں۔ کسی نے جھوٹی خبر اڑائی ہے کہ عمران صاحب یہاں اس اسپتال میں لائے گئے ہیں۔ یہ لوگ اندر جانا چاہ رہے ہیں اور ڈاکٹروں سے بدتمیزی کر رہے ہیں۔''

'' یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

'' حمزہ صاحب نے ہم دونوں کو بلایا ہے تا کہ لوگوں کو حقیقت بتائیں اور سنبھالیں۔ وہ اپنی گاڑی بھی بھیج رہے ہیں۔''

قریباً بیس منٹ بعد پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دیئے۔ یہ دو گاڑیاں تھیں۔ میں اور جیلانی پولیس جیپ میں اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ جیلانی کے اپنے مسلح ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ ہم اسپتال پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ وہاں عجیب نقشہ نظر آیا۔ کم و بیش تین سو افراد یہاں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سارا ہجوم لاہور کے گلی کوچوں کا سرمایہ تھا...... یہ عام شخص تھا جو فٹ پاتھوں پر سوتا ہے، چمکتی دھوپ میں پسینا بہاتا ہے، رکشا یا تانگا چلاتا ہے۔ مختلف ضرورتوں کے لئے لمبی قطاروں میں لگتا ہے اور رات کو اکثر صبر کے نوالے کھا کر امید کا پانی پی لیتا ہے۔

یہ سب عمران کے پرستار تھے۔ اس کی تکلیف کا سن کر اس اسپتال کے گرد امڈ آئے تھے۔ وہ اپنے زخمی ہیرو کو دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ جذباتی افراد نے زبردستی ایمرجنسی میں جانے کی

کوشش کی تھی، عملے نے انہیں زدوکوب کیا۔ اس کے بعد اور لوگ یہاں جمع ہو گئے اور اچھا خاصا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اب بھی ہجوم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

حمزہ صاحب خود وہاں موجود تھے۔ صلاح مشورے کے بعد انہوں نے میگا فون پر لوگوں کو پُرسکون رہنے کے لئے کہا اور بتایا کہ عمران کے دو قریبی دوست یہاں موجود ہیں۔ وہ اصل حقیقت آپ لوگوں کو بتائیں گے۔

حمزہ صاحب کے کہنے پر میں ایک ایمبولینس کی چھت پر کھڑا ہو گیا اور میگا فون کے ذریعے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں عمران کا ساتھی تابش آپ کے سامنے ہوں۔ آپ میں سے کئی لوگ مجھے جانتے ہوں گے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عمران بالکل خیریت سے ہے اور اس کا بہترین علاج ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اس اسپتال میں موجود نہیں ہے۔ میں آپ کو پوری ذمے داری کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ وہ اس اسپتال میں نہیں ہے۔ وہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ اسے کل رات کراچی سے جرمنی پہنچایا گیا ہے۔ وہاں کے بہترین اسپتال میں اس کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے اس کے ڈاکٹروں سے میں نے خود بات کی ہے۔ آپ لوگ اس کے لئے دعائے خیر کریں۔ اللہ کرے وہ چند دن میں پھر سے ہم سب کے درمیان موجود ہو۔“

کچھ احتجاجی آوازیں ابھریں جن سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ اب بھی یقین نہیں کر رہے۔ میرے ساتھ کیپٹن جیلانی بھی چھت پر چڑھ آیا۔ اس نے بھی میری تائید کی۔ آخر میں، میں نے ایک دو فقرے کہے۔ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ عمران ہیرو کے ساتھ اصل میں کیا ہوا ہے۔ انڈیا میں کن لوگوں نے اسے زخمی کیا اور وہ کیونکر یہاں پہنچ سکا، وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی عمران کی اس حیثیت سے آگاہ نہیں تھا جو مجھے بھی بس چند دن پہلے ہی معلوم ہوئی تھی۔ وہ خفیہ طور پر ایک ایسی مسلح آرگنائزیشن چلا رہا تھا جس نے انڈین ایجنسیوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے اور ان کے ملک میں گھس کر ان کے پنجوں سے بے گناہ پاکستانیوں کو رہائی دلائی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یاد آتا تھا کہ جب میں بھانڈیل اسٹیٹ میں پھنسا تھا تو مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ کوئی انڈیا آئے گا اور اس دور دراز گمنام جگہ پر مجھ تک پہنچے گا۔ عمران پہنچا تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس کا ایک سیٹ اَپ تھا اور وہ ایک عرصے سے اسی طرح کی کارروائیاں کر رہا تھا۔

ہم سارے ہجوم کو تو عمران کی صحت کے حوالے سے تفصیل نہیں بتا سکتے تھے۔ ہم نے چند لوگوں کو منتخب کیا اور انہیں ایک علیحدہ کمرے میں لے جا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کچھ

دیر بعد ہجوم منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن اگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ لوگ مکمل طور پر تتر بتر ہو جائیں گے تو یہ غلط تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ٹولیوں کی شکل میں اندرونِ شہر کی طرف چل پڑے۔ اندازہ ہوا کہ وہ عمران کی رہائش گاہ کے بارے میں جانتے ہیں اور وہاں جا رہے ہیں۔

رات تک عمران کی رہائش گاہ کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ کئی سو کا مجمع تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جن پر وہ اپنی محبتیں اور چاہتیں نچھاور کرتا تھا۔ راتوں کے اندھیرے میں اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر نکلتا تھا اور چپکے سے ان کی مدد کرتا تھا، مصیبت میں ان کے کام آتا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے اپنے اہم ترین کام پسِ پشت ڈال دیتا تھا۔ یہ بے لوث تعلق تھا اور اس تعلق کی بدولت آج سیکڑوں آنسو اس کی صحت یابی کے لئے گر رہے تھے۔ اَن گنت ہاتھ اس کو دعا دینے کے لئے اٹھائے گئے تھے۔ بوڑھے، نادار، معذور، مفلس سب طرح کے لوگ اس ہجوم میں شامل تھے۔ اس کی کھٹارا موٹر سائیکل گھر کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں نے ایک ملنگ نما بوڑھے کو دیکھا، اس نے موٹر سائیکل کو باقاعدہ چوما اور پھر اپنی گدڑی سے اسے صاف کرنے لگا۔

قاری حبیب اللہ نے قریبی مسجد میں سورۃ یٰسین کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں مدرسے کے بچے اور بہت سے دیگر افراد جمع تھے۔ کوئی شخص چاول کی تین چار دیگیں پکوا کر لے آیا تھا جو لوگوں میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔

رات نو بجے کے قریب پھر شاہین نے فون کال کی۔ ”تابش بھائی! کوئی فون آیا میونخ سے؟“

”ہاں، ابھی پندرہ منٹ پہلے آیا ہے۔ اس کی حالت اب بہتر ہے۔“

”وہ تو کہہ رہے تھے کہ خطرے سے باہر نہیں۔“

”نہیں، اب ایسی بات نہیں۔“

اسی دوران میں جگت سنگھ اندر آیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ جیلانی صاحب باہر گاڑی میں بلا رہے ہیں۔

میں شاہین سے بات ختم کر کے باہر نکلا۔ گھر کے دروازے سے باہر پہنچا تو ہجوم میری طرف امڈ آیا۔ وہ مجھ سے عمران کی حالت کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آس و امید کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے بمشکل ان کے درمیان سے راستہ بنایا اور بتایا کہ ابھی کچھ دیر میں فون آنے والا ہے پھر آپ کو تازہ صورتِ حال بتائیں گے۔

میں جگت سنگھ کے ساتھ باہر سڑک پر پہنچا۔ یہاں ٹی وی چینلز کی چند گاڑیاں بھی کھڑی

نظر آئیں۔ان سے پہلو بچاتے ہوئے میں اور جگت ملحقہ سڑک پر گئے۔ یہاں جیلانی اسٹیشن
ویگن میں موجود تھا۔جگت باہر رہا، میں اندر گیا۔ جیلانی بالکل گم صم بیٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ
تھیں۔

''کیا اطلاع ہے جیلانی؟''

''عمران صاحب کی حالت ٹھیک نہیں......ابھی فون آیا ہے......ان کی ریڑھ کی چوٹ
انہیں سنبھلنے نہیں دے رہی۔ وہ...... بہت...... نازک حالت میں ہیں۔'' جیلانی کی آواز ٹوٹ
رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔اردگرد کی ہر
شے گردش کرتی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑا۔اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
''جیلانی......کہاں ہے عمران؟ سچ بتاؤ......جھوٹ نہ بولنا۔''

جیلانی نے یکا یک مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔کرب کی انتہا کو چُھو کر بآواز میں
بولا۔''وہ چلا گیا...... وہ چلا گیا تابش صاحب...... چھوڑ گیا ہم سب کو۔ وہ مر گیا تابش
صاحب......وہ مر گیا......''

جیلانی کی دردناک پکار اسٹیشن وین کے خلا میں گونجنے لگی۔ میرا ذہن جیسے ماؤف ہو
گیا۔ مجھے لگا میرے کان بند ہو گئے ہیں۔ حسیات دم توڑ گئی ہیں۔ جیلانی چلا رہا تھا، رو رہا
تھا، بول رہا تھا لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پوری شدت سے اس کے
بازوؤں کا حلقہ توڑا اور اتنے زور سے اسے دھکا دیا کہ وہ وین کی درمیانی نشست پر جا گرا اور
کھڑکی ٹوٹ گئی۔ ''بکواس بند کرو۔'' میں سینے کی پوری قوت سے دھاڑا۔ ''تمہیں کسی نے غلط
بتایا ہے، وہ نہیں مر سکتا......وہ نہیں مر سکتا۔''

جیلانی ایک بار پھر میری طرف آیا اور مجھے سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا منہ
اپنی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ ''خبردار، اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو......تمہیں کسی نے غلط بتایا
ہے۔کس نے بتایا ہے؟ کس نے بتایا ہے؟''

کوئی چیز لگنے سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ہماری آوازیں باہر جا رہی تھیں۔لوگ
اسٹیشن وین کی طرف لپکے۔ میڈیا والے بھی دوڑے آئے۔ کیمرے حرکت کرنے لگے۔
لائٹیں چمکنے لگیں۔

یہی وقت تھا جب میں نے جان محمد صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی روتے ہوئے ہماری
طرف آ رہے تھے۔ان کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ جو بھیانک ترین خبر ہم تک پہنچی ہے، وہ

درست ہے۔جس قیامت کا ڈر تھا، وہ ہم پر ٹوٹ چکی ہے۔

میں نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔لیکن مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ مجھے اس پستول
کو کیا کرنا ہے۔خود کو گولی مارنی ہے، خبر سنانے والے کو مارنی ہے یا پھر کسی ایسے دشمن کو جو اس خبر
کا ذمے دار ہے۔ دل کے کسی گوشے میں یہ آس بھی سر اٹھا رہی تھی کہ کاش یہ سب کچھ جاگتی
آنکھوں کا خواب ہو۔ ابھی میں اٹھ بیٹھوں اور یہ سب کچھ بکھر جائے۔ اردگرد کی ہر چیز دھندلا
رہی تھی۔ چہرے، آوازیں، روشنیاں، سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں سر
تھاما اور زمین کی طرف جھکتا چلا گیا۔ میرے اردگرد آہ و بکا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

O......❖......O
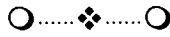
عمران مر گیا۔ ایک روشن ستارہ بجھ گیا۔ ایک مسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔
دعائیں، التجائیں، تمنائیں، سسکیاں، کچھ بھی اسے جانے سے نہ روک سکا۔ یہی قدرت کا
اصول ہے۔ وہ اوپر والا جب کسی کو لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر دنیا کے بہترین دماغ،
جدید ترین طبی سہولتیں اور تمام مادی قوتیں مل کر بھی اسے روک نہیں سکتیں۔ وہ لے جاتا ہے
اور کہتا ہے، یقین کرو میری قدرت پر۔

بے شک موت اٹل ہے اور سب کے لئے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی کس طرح
مرتا ہے۔ بقول شاعر......جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے۔

جس بانکپن سے کوئی اجل کو گلے سے لگاتا ہے، وہ بانکپن زندہ لوگوں کے لئے امر ہو
جاتا ہے اور ان کو جینے مرنے کی راہیں دکھاتا ہے۔

وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ ہر روز موت سے اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ بارڈر ایریا کے
ریسٹ ہاؤس کے سامنے اس ٹیلے پر جہاں اس نے قریباً پانچ منٹ تک تن تنہا درجنوں بھارتی
فوجیوں کا راستہ روکا تھا۔ وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹ گیا تھا۔ گرے جیپ اور گولیوں کی
بوچھاڑوں کے درمیان ایک دیوار بن گیا تھا۔ یوں لڑا تھا کہ چشم فلک نے بھی مرحبا کہا ہو گا۔
وہ منظر ایسا نہیں تھا کہ کبھی اسے فراموش کیا جا سکتا۔

سب کچھ ہو چکا تھا۔ مصدقہ خبریں آ چکی تھیں۔ پھر بھی نہ جانے دیوانہ دل مانتا کیوں
نہیں تھا۔ یہی لگتا تھا کہ ابھی میرے فون کی بیل ہو گی۔ اس کی مسکراتی آواز سنائی دے گی۔
''جگر! چکر دے دیا نا سب کو۔ یہاں میونخ میں ریما اور نرگس کے ساتھ شوٹنگ فرما رہا
ہوں......سوئمنگ کر رہا ہوں اور فائیو اسٹار بوفے کھا رہا ہوں۔ بس جلدی سے آ جاؤ تم بھی۔
بڑی لمبی چوڑی پلاننگ کرنی ہے......ایک دو کڑاکے دار پروگرام بنانے ہیں۔''

لیکن فون خاموش تھا۔ اب اس پر ایسی کوئی کال نہیں آنا تھی، نہ ہی اس کی اسکرین پر کبھی عمران کا نام چمکنا تھا۔ رو رو کر میرے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے کے الاؤ مدھم نہیں ہو رہے تھے اور نہ ہی یقین آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے...... یہاں تک کہ دو دن بعد اس کا تابوت لاہور پہنچ گیا۔ میں نے اس کی شکل دیکھ لی۔ تابوت کے شیشے میں اس کی ٹھوڑی کا گڑھا کسی نگینے کی طرح چمکتا تھا۔ بند آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے شرارت کر رہا ہو۔ بے شمار سوگوار اس کے اردگرد موجود تھے۔ اس کے تابوت سے لپٹ رہے تھے، دھاڑیں مار رہے تھے۔ وہ ان کا غم خوار اور مسیحا تھا...... اور شاید محافظ بھی۔ وہ ان کے لئے دشمن کے قلب میں گھستا تھا۔ دشمن کی پناہ گاہوں میں گھس کر ان کو مارتا تھا۔ وہ برسوں اپنی بچھڑی ماں کو ڈھونڈتا رہا پر وہ انڈین جیلوں کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔ وہ تو اسے نہ مل سکی لیکن اس نے اور بہت سی ماؤں، بہنوں اور بھائیوں، بیٹوں کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے انہیں انڈین ایجنسیوں کے بے رحم چنگل سے نکالا، ان کی جیلیں توڑیں اور انہیں پاکستان کی آزاد فضاؤں میں پہنچایا۔ وہ وطن کا بیٹا تھا۔ اس کی ساری دشمنیاں اپنے وطن کے حوالے سے تھیں۔ وہ کسی اور روپ میں جیتا تھا۔ لوگ اسے سرکس کے نڈر شو مین کے طور پر جانتے تھے۔ وہ ریوالور کے نہایت خطرناک کھیل کھیلتا تھا۔ ایسے شوز کے لئے وہ انڈیا بھی جاتا تھا مگر اس کا اصل روپ تو یہی تھا۔ دشمن کے ملک میں گھس کر اس کو مات دینا اور اس کے سینے پر اپنی برتری کا جھنڈا گاڑنا۔ اس نے اَن گنت جھنڈے گاڑے اور جب ایک رات وہ گھیر لیا گیا، اس خونی ٹیلے کے گرد اس کے سارے دشمن یکجا ہو کر اس پر پل پڑے تو اس نے وہی کیا جو شیر کرتا ہے اور شیر دل کرتے ہیں۔ اس نے انہیں للکارا اور فقط ''پانچ چھ منٹ'' کے اندر ان کو عذاب اور ہلاکت کی پانچ چھ صدیوں میں سے گزار دیا۔ چاروں طرف ان کی لاشیں بکھیر دیں۔ بتا دیا ان کو کہ کس طمطراق سے جیا جاتا ہے اور جب وقت آن پڑے تو کس شان سے مرا جاتا ہے۔

میری حسیات جیسے کند ہو چکی تھیں۔ میرے اردگرد سب کچھ دھندلا دھندلا سا تھا۔ آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ میرے یار کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا تھا۔ چاہنے والوں نے اسے پھولوں سے لاد دیا تھا، دولہا بنا دیا تھا۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ میں ایک حقیر تنکے کی طرح اس سمندر میں بہا جا رہا تھا...... تم بہت آگے نکل گئے عمران! میں بہت پیچھے رہ گیا۔ تم ہر جگہ جیت جاتے تھے، تم آج بھی جیت گئے...... یار! ایک بار تو مجھے جیتنے کا موقع دے دیتے۔ از راہِ مروت ہی سہی...... اخلاقاً ہی سہی، اس وقت کہہ دیتے...... اس ٹیلے پر اس وقت کہہ دیتے، تم فائرنگ کرو۔ میں زخمیوں کو پیچھے لے کر جاتا ہوں۔ تم اس

وقت بھی خطروں کے ٹھیکیدار بنے...... تم نے اس وقت بھی سب کچھ اپنے سینے پر جھیلا...... بڑی ناانصافی کی تم نے میرے ساتھ۔ بہت برا کیا...... اب کیا کروں گا میں؟ کہاں ڈھونڈوں گا تمہیں؟ اس شہر کی گلیاں مجھے کھانے کو آئیں گی۔ اس کے ریستوران، اس کے باغ، اس کے بازار...... اور تیری وہ کھٹارا موٹر سائیکل...... کیا یہ سارے منظر جینے دیں گے مجھے؟ یہ نہیں جینے دیں گے۔ اب مجھے بھی مر جانا چاہئے۔ اب یہاں کچھ نہیں میرے لئے۔

میں نے روتے روتے سوچا...... ہاں ٹھیک ہے۔ میں اپنے اس دولہے کو دفن کر لوں۔ پھر میں بھی نکلوں گا، میں بھی مر جاؤں گا۔ مجھ سے اب نہیں جیا جائے گا۔

عمران میانی صاحب میں سپردِ خاک ہو گیا۔ اپنی ساری مسکراہٹوں، چہکاروں اور قہقہوں سمیت نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنے دیرینہ دوست اقبال کے پہلو میں اس کی قبر بنی۔ راوی روڈ بازار کے ایک لڑکے نے اس کی گل پوش قبر کے نزدیک ایک کتبہ لگا دیا۔ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے۔

میری سماعت میں وہی بول گونجنے لگے جو ہر شہیدِ وطن کی رحلت پر فضاؤں میں سرایت کرتے ہیں۔ اے راہِ حق کے شہیدو...... وفا کی تصویرو، وطن کی ہوائیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔

میرا دولہا دوست پہلے مٹی اور پھر پھولوں میں چھپ گیا۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر جیلانی سائے کی طرح ساتھ لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم سب کی سیکیورٹی کے مسائل ہیں۔ وہ مجھے پھر سے عمران کے گھر لے آیا۔ دس مرلے کا وہ گھر جس میں اس نے اپنی زندگی کے اہم سال گزارے تھے۔ میں ان درودیوار کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی میرے ساتھ لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہ شاہین تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑتی رہی۔ میرے پاس کہنے کو کیا تھا جو اس سے کہتا۔ میرے پاس تو شاید آنسو بھی نہیں بچے تھے۔ میں بس خاموشی کی زبان میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ ایک فوجی آگے آیا۔ یہ کیپٹن ڈاکٹر شرجیل تھا۔ اس نے ایک لفافہ شاہین کے حوالے کیا۔ اس میں عمران کی ذاتی اشیاء تھیں۔ یہ اشیاء کراچی میں آپریشن تھیٹر میں لے جاتے ہوئے عمران سے علیحدہ کی گئی تھیں۔ اس کا چرمی پرس، اس کی رسٹ واچ، سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر، ایک رنگ اور اس طرح کی کچھ چیزیں۔ کیپٹن ڈاکٹر شرجیل نے کہا۔ ''میڈم! عمران صاحب نے کہا تھا، یہ آپ کو دی جائیں۔''

شاہین نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اپنی اوڑھنی کے پلو میں باندھ کر اسے گرہ لگائی اور اس گرہ کو سینے سے لگا کر ہجوم میں گم ہو گئی۔

نہ جانے کیوں اس وقت عمران کے وہ آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے جو اس نے فون پر شاہین سے کہے تھے۔ ہم اس وقت ریسٹ ہاؤس کے سامنے بی ایس ایف والوں سے برسرِ پیکار تھے۔ فائرنگ ہو رہی تھی۔ عمران نے حسبِ معمول مذاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ شوٹنگ کی فائرنگ ہے۔ آخر میں وہ بولا تھا...... اچھا ڈیئر! اگلا شاٹ تیار ہو گیا ہے...... ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں...... خدا حافظ۔ اگلا شاٹ اس کی موت کا شاٹ تھا۔

جیلانی اور امتیاز کو بھی عمران کے غم نے نڈھال کر رکھا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم تینوں میں سے کس کا غم زیادہ ہے۔ رات کو میں نیم جان سا چٹائی پر لیٹ گیا۔ جگت سنگھ میرے قریب ہی صوفے پر سویا ہوا تھا۔ جیلانی اور امتیاز کچھ فاصلے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شاید انہوں نے سمجھا کہ میں سو گیا ہوں۔ جیلانی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''اس کا بچنا محال تھا۔ منگل کے روز ہی اس کی حالت بڑی نازک تھی، بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی نالیاں اور دوسرے ہیلپنگ انسٹرومنٹس اتار دیئے تھے۔ بے چاری کی بدقسمتی یہ رہی کہ عمران صاحب خود زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے، ورنہ لگتا تھا کہ وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ کریں گے۔ وہ ڈونیشن کے لئے بھاری رقم کا انتظام بھی کر چکے تھے۔ بس سارے قدرت کے کھیل ہیں۔''

میں جان گیا کہ یہ گفتگو ثروت کی بہن نصرت کے بارے میں ہو رہی ہے۔ اسے نہایت نازک حالت میں ویانا پہنچایا گیا تھا۔ ثروت اور یوسف بھی اس کے پیچھے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہم انسان کو کھا جاتے ہیں۔ کیا نصرت کو بھی واہمو نے ہی کھایا تھا؟ بہرحال پتا نہیں کیوں اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ ثروت کا خیال بھی اب ذہن سے کہیں بہت دور جا چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اور یوسف کے حالات سے مجھے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ باروندا جیکی نے کبھی کہا تھا...... ہر کہانی کا انجام مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ مگر ہر انجام میں زندگی موجود ہوتی ہے اور اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ اپنا رستہ خود ڈھونڈتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ زندگی دکھ ہے اور خود ہی اس کا مداوا بھی ہے۔

رات پچھلے پہر ہم چاروں جاگ گئے۔ دیر تک بیٹھے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ میں بہت کم سگریٹ پیتا تھا لیکن اب پی رہا تھا...... بالکل کسی ''چین اسموکر'' کی طرح۔ اور یہ سگریٹ بھی عمران ہی کے تھے۔ ہمارے سینوں میں ایک آگ روشن تھی۔ غیظ و غضب کی ایک لہر تھی جو جسم کے ہر حصے میں پھیلتی تھی اور سر ٹکراتی تھی۔ صبح تین بجے کے قریب ہمیں وہ فون کال آئی جس کا انتظار تھا۔ جیلانی کے ایک ساتھی نے ایک خاص اطلاع دی۔ یہ اطلاع سلطان چٹا،

سیکرٹری ندیم اور ان کے دو خاص ساتھیوں کے بارے میں تھی۔ عمران کی موت کے فوراً بعد سے یہ لوگ اپنے ٹھکانوں سے غائب تھے۔ آج تیسرے روز ہمیں یہ کامیابی ملی تھی۔ ہم پہلے ہی پوری طرح تیار تھے۔ ایک تاریک شیشوں والی کرولا میں بیٹھ کر نکل گئے۔ ہمیں لاہور سے باہر جانا پڑا۔ قلعہ ستار شاہ کے قریب چاولوں کا ایک بہت بڑا گودام تھا اور ساتھ میں شیلر بھی تھا۔ یہ جگہ ایک سیاسی پارٹی کے اہم رکن کی ملکیت تھی۔ ہماری اطلاع کے مطابق سلطان چٹا یہیں موجود تھا۔ ہم نے تیزی سے کارروائی کر کے دو چوکیداروں کو رسیوں سے باندھ دیا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے۔ اس کے بعد ہم اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ عمران کا سائیلنسر لگا پستول اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ پستول میرے ہاتھ میں جیسے اس کی نمائندگی کر رہا تھا۔ گودام کے ساتھ ہی ایک انیکسی نما عمارت تھی۔ اس عمارت میں بڑی بڑی خوفناک مونچھوں والا ایک مسلح شخص ہمارے سامنے آیا۔ وہ بہت خطرناک نظر آتا تھا مگر اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ جو بندے اس کے سامنے آئے ہیں وہ اس وقت کس آگ میں جل رہے ہیں اور کتنے جان لیوا ثابت ہوں گے۔ میرے سائیلنسر لگے پستول سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں اور وہ رائفل سیدھی کرنے کی حسرت دل میں ہی لے کر فرش بوس ہو گیا۔

ہم ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ یہاں سیکرٹری ندیم سے ملاقات ہو گئی۔ بظاہر نفیس نظر آنے والا یہ شخص پرلے درجے کا رنگ باز تھا۔ شروع شروع میں سویٹی عرف ایشوریا رائے کے حسن سے اسی نے شب و روز خراج وصول کیا تھا۔ اب بھی اس کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے کسی بنت حوا کے قرب سے حظ اٹھاتا رہا ہے۔ ایک بڑی ٹرے میں چکن کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور شراب کی تقریباً خالی بوتل پڑی تھی۔ گلاس فرش پر لڑھکا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی لڑکی موجود نہیں تھی لیکن نسوانی پرفیوم کی خوشبو موجود تھی۔ سیکرٹری ندیم بستر پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ عریاں تھا۔ فقط اس کے جسم کے درمیانی حصے پر ایک تولیا نما کپڑا پڑا تھا۔ جیلانی نے آگے بڑھ کر پستول کے بیرل سے یہ کپڑا ہٹا دیا۔ وہ سرتاپا عریاں ہو گیا۔ لیکن اسی طرح مدہوش پڑا رہا۔ اس نے سمجھا، شاید یہ اس کی ساتھی لڑکی ہے۔ مدہوشی میں ہی بولا۔ ''اوئے کیا کرتی ہے بدبختے! اب ذرا دو گھنٹے ٹھونکا لگانے دے (آرام کرنے دے)۔''

میں نے اس کی پشت پر زوردار لات رسید کی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔ ''تجھے ٹھونکا لگوانے کے لئے ہی آئے ہیں۔ بڑا لمبا ٹھونکا ہو گا اس دفعہ۔'' میں نے کہا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پھر وہ تولیا ڈھونڈا جس نے اس کا ستر چھپا رکھا تھا۔ تولیا جیلانی کے پستول کے بیرل سے جھول رہا تھا۔ عینک کے بغیر

بھی اس نے کم از کم تولیا تو دیکھ ہی لیا۔ تب اس نے مڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ یہاں ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ اس کی ٹانگ کچھ عرصہ پہلے راجا نے توڑی تھی۔ پہلی گولی اسے میں نے ماری اور یہ اسی جگہ تھی جہاں اس نے کچھ دیر پہلے تولیا رکھا ہوا تھا۔ دوسری گولی جیلانی نے چلائی۔ یہ بھی سائیلنسر لگا پستول تھا اور صرف ''ٹھک'' کی آواز پیدا کرتا تھا۔ یہ گولی ندیم کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی اور دانت توڑ کر منہ کی طرف سے نکل آئی۔ مزید تسلی کے لئے میں نے تیسری گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

لڑکی کمرے میں ہی موجود تھی۔ وہ واش روم میں تھی۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر دروازہ بند کیا اور مدد کے لئے چلّانے لگی۔ بند واش روم سے اس کی آواز بھلا کس کے کانوں تک پہنچنی تھی۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی تھی۔ ہم نے باہر سے بھی لگا دی اور اس دوسرے کمرے کی طرف بڑھے جہاں سلطان چٹا کی موجودگی کا امکان تھا۔ سلطان چٹا بھی جہازی سائز کے بیڈ پر مدہوش پڑا تھا۔ یہاں کسی عورت کے آثار نہیں تھے، تاہم سلطان چٹا کا بالائی جسم عریاں تھا۔ اس کے بازوؤں کی توانا مچھلیوں پر بے ہودہ ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ وہ گونج دار خراٹے لے رہا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں سائیڈ ٹیبل پر دو پاسپورٹ پڑے نظر آئے۔ جیلانی نے پاسپورٹ اٹھائے۔ ایک سلطان چٹا کا تھا، دوسرا ایک معروف پاکستانی ایکٹرس کا۔ پاسپورٹس پر ترکی کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں او کے ٹکٹ بھی تھے، ان پر روانگی کی تاریخ کل دوپہر کی تھی۔ ہم نے دیکھا، کمرے میں دو تین تیار اٹیچی کیس بھی پڑے ہیں۔

جیلانی نے ہولے سے کہا۔ ''لگتا ہے جناب چٹا صاحب فرار ہو رہے ہیں...... استنبول میں موجیں کرنے کے لئے۔''

''اور نقلی نہیں اصلی ایکٹریس کے ساتھ۔'' امتیاز نے کہا۔

جگت سنگھ نے اپنی مونچھ کو مروڑا دیا۔ ''دوجوں کے لئے نقلی مال اپنے لئے اصلی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی کرپان چبھو کر سلطان چٹا کو جگایا۔ وہ چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر یہی لگا جیسے اس نے موت کے فرشتوں کو رُوبرو دیکھا ہے۔ اس کا رنگ لیموں سے زیادہ زرد ہو گیا۔ اس کے کان میں گولی کا سوراخ عمران کے باکمال نشانے کی یادگار تھا۔

''کک...... کیا بات ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''تمہیں جہاز پر بٹھانے کے لئے آئے ہیں۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

جگت بولا۔ ''پر یہ جہاز جب اُڈے گا تو اوپر ہی اوپر جائے گا...... سیدھا رب سوہنے

کے سامنے جا کر اتارے گا تجھے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کرپان کا ایک وار سلطان کے پہلو میں کیا۔ سلطان تڑپا۔ میں نے امتیاز کے ہاتھ سے آٹومیٹک رائفل لی اور سلطان کو بھون کر رکھ دیا۔ سلطان اور اس کے بستر میں درجنوں سوراخ ہو گئے ہوں گے۔ جیلانی نے اس کے منہ پر تھوکا اور ایک گولی عین اس کی پیشانی میں اتاری۔ وہ اپنے جہازی سائز کے بستر کو لہو رنگ کرنے لگا۔ یہ اقبال کی موت کا بدلہ بھی تھا۔

یہی وقت تھا جب بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ جگت نے لات مار کر دروازہ کھولا اور امتیاز نے رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ جگت سنگھ کے پاس اب تک دو کالے انار (دستی بم) موجود تھے۔ پتا نہیں اس نے کیسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اسے عشق تھا ان ''اناروں'' سے۔ یہاں بھی وہ یہ بم استعمال کرنے سے نہیں چُوکا اور اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ ورنہ جتنے لوگ یکایک گودام کی طرف سے آئے تھے، ان سے نمٹنا مشکل ہو جاتا۔ دھماکوں اور شعلوں سے قرب و جوار لرز اُٹھے۔ گودام کے ایک حصے میں آگ لگ گئی۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے واپس اپنی گاڑی کی طرف بھاگے...... اور نکلنے میں کامیاب رہے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ یہ دو تین گاڑیاں تھیں۔ ہم نے تیز رفتاری سے شیخوپورہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ ان گاڑیوں کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ ان کی نیلی بتیاں، دکھائی دے رہی تھیں اور ہوٹرز بھی سنائی دیتے تھے۔ یقیناً وائرلیس پر پیغام چل گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پولیس والے اس سیاسی لیڈر کے زیر اثر ہوں جس کے ڈیرے پر سلطان چٹا نے پناہ لے رکھی تھی۔ میں نے چلتی گاڑی سے حمزہ صاحب کو فون کرنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ فون بند کر کے سو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جاگتے بھی ہوتے تو خاطر خواہ مدد نہ کر سکتے۔ مخالف پارٹی کا اثر و رسوخ تو ظاہر ہونا ہی تھا، خاص طور سے جب اتنی بڑی واردات ہو چکی تھی۔

گاڑی جیلانی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آٹھ دس میل آگے جا کر اچانک گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے۔ ''اوگاڈ!'' جیلانی نے کہا۔ ''پٹرول ختم۔''

ہم نے گاڑی کو درختوں میں گھسا دیا اور روشنیاں بجھا دیں۔ وہ کافی آگے تک چلی گئی۔ جونہی وہ رکی، ہم چھلانگیں لگا کر نکلے۔ جیلانی نے کہا۔ ''ہمیں دو ٹولیوں میں نکلنا چاہئے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اور جگت شمال کی طرف گئے جبکہ جیلانی اور امتیاز جنوب مشرق کی طرف نکلے۔ درختوں میں بہت سی ہیڈ لائٹس چمکنا شروع ہو گئیں۔ ٹارچیں بھی تھیں۔

وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جگت سنگھ پاؤں دبا کر چل رہا ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی اور یہ گولی گودام والی جھڑپ میں ہی لگی تھی۔

O......❖......O

رات کے پچھلے پہر کی خنکی میں یہ ایک طویل تعاقب ثابت ہوا۔ ہم کیچڑ میں لت پت تھے، گاہے بگاہے میں جگت کو سہارا بھی دے رہا تھا۔ اچانک ایک سُوئے (چھوٹی نہر) کے کنارے مجھے ایک لوڈر اور ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ میں اور جگت جیپ کی طرف بڑھے۔ یہ دو تین شکاری تھے جو سحری کے وقت یہاں مچھلیوں کی تاک میں بیٹھے تھے۔ میرا ارادہ ان پر پستول تاننے اور گاڑی حاصل کرنے کا تھا لیکن پھر ایک شخص کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا یہ سہراب جلالی صاحب تھے...... جنہیں عمران بابا جلالی کہتا تھا۔ بابے جلالی نے بھی مجھے پہچان لیا اور اپنی بیکال شکاری رائفل نیچے رکھ دی۔ ''اوہ تابش باورچی تم؟'' وہ حسبِ عادت بولا۔

''جلالی صاحب! ہمارے پیچھے لوگ ہیں۔ ہم یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں فوراً۔''

ضعیف ہونے کے باوجود جلالی کمال کا باہمت شخص تھا۔ ''اسٹینڈ'' لینا جانتا تھا۔

اس نے چھوٹے لوڈر پر فوراً ہمیں اپنے دو کارندوں کے ساتھ روانہ کر دیا اور خود پیچھے آنے والوں کے سوال جواب کے لئے تیار ہو گیا۔ بوڑھے جلالی سے یہ ملاقات کسی کرشمے سے کم نہیں تھیں ورنہ زخمی جگت کی وجہ سے مجھے لگ رہا تھا کہ شاید ریسٹ ہاؤس کی طرح ہم آج یہاں بھی نرغے میں آ جائیں گے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہم بھاگ دوڑ میں جلالی فارم ہاؤس کے قریب آ چکے ہیں۔ صرف بیس منٹ کے سفر کے بعد ہمیں فارم ہاؤس کے آثار نظر آ گئے...... کچھ ہی دیر بعد جلالی کے نجی چڑیا گھر کے جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ دس منٹ بعد ہم فارم ہاؤس کے اندر رہائشی حصے میں موجود تھے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر مہناز کی شکل بھی نظر آ گئی۔ اسے بابے طفیل نے نیند سے جگایا تھا۔ ڈاکٹر مہناز بھی ہمیں یہاں دیکھ کر ششدر ہوئی۔ اس نے فوری طور پر جگت سنگھ کا معائنہ کیا۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیر کر نکلی تھی۔ چربیلے جسم کی وجہ سے بہت خون بھی نہیں بہا تھا۔ مہناز نے اچھی طرح اس کی مرہم پٹی کر دی اور درد کش گولیاں بھی دے دیں۔ دیگر افراد کے سامنے اس نے ہم سے زیادہ سوال جواب نہیں کئے۔ بابے جلالی کی آمد صبح سات بجے کے قریب ہوئی۔ انہوں نے حسبِ عادت نیکر پہن رکھی تھی جس میں ان کی سوکھی سڑی ٹانگیں دو بیساکھیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ سر پر سرخ پی کیپ تھی۔ جلالی صاحب نے ہمیں تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے۔ خوش قسمتی سے، ہمارا

تعاقب کرنے والے اس جگہ پہنچے ہی نہیں تھے جہاں بابا جلالی موجود تھے۔

بابے جلالی کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ یہ بندہ اپنی ظاہری حالت سے کہیں زیادہ مضبوط تھا اور اس سے زیادہ اس کا ارادہ مضبوط تھا۔ وہ جس بات پر اَڑ جاتا تھا، بس لوہے پتھر کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر مہناز سے کہا کہ وہ کمرے میں رکھا ہوا ٹی وی آن کرے۔ مہناز نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے کچھ دیر پہلے کوئی خبر دیکھی ہے جو اب ہمیں بھی دکھانا چاہتا ہے۔ یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ ایک نیوز چینل پر رات آخری پہر والے واقعے کی دھواں دھار نیوز چل رہی تھی۔ سابق ایم این اے مشتاق گورایا کے شیلر پر خوفناک واردات ہوئی تھی۔ اس واردات میں سلطان چٹا اور سیکرٹری ندیم کے علاوہ گورایا کے جواں سال بیٹے کی موت کی خبر بھی تھی۔ بتایا جا رہا تھا کہ حملہ کرنے والوں نے خودکار رائفلیں اور دستی بم استعمال کئے اور تباہی مچا دی۔ اس واردات کے ڈانڈے بڑے وثوق سے عمران دانش کی موت سے جوڑے جا رہے تھے۔ واضح طور پر میرا، جیلانی اور امتیاز وغیرہ کا نام لیا جا رہا تھا۔

آخر میں جلتے ہوئے گودام اور سر پیٹتے گورایا کی ویڈیو بھی دکھائی گئی اور بتایا گیا کہ پورے شہر کی پولیس حرکت میں ہے اور ملزمان کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ رات کی واردات کے بعد میرے سینے میں فروزاں شعلوں پر چند چھینٹے پڑے تھے۔ ایم این اے کا نام سن کر کچھ چھینٹے اور پڑے۔ یہ مجھے ایک بونس کی طرح لگا۔ یہ مشتاق گورایا وہی تھا...... جس نے پانچ سال قبل ثروت کی گمشدگی کے موقع پر سیٹھ سراج وغیرہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی تھی۔

ٹی وی بند کرنے کے بعد جلالی نے بڑے جوش سے میری پیٹھ تھپکی۔ ''بہت خوب...... سینہ ٹھنڈا کیا تم نے۔ میرے بس میں ہو تو اس چٹے کی لاش کو شیخوپورہ کی سڑکوں پر گھسیٹوں۔''

جلالی صاحب غصے سے ہانپنے لگے۔ مہناز نے جھٹ ایک چھوٹی سی گولی نکال کر میز پر رکھ دی تاکہ اگر کام زیادہ بگڑے تو وہ گولی نگل سکیں۔

میں جلالی صاحب کے اس جوش کی وجہ سمجھتا تھا۔ قریباً پانچ ماہ پہلے یہ سلطان چٹا ہی تھا جس نے نادر ٹی ٹی کو فارم ہاؤس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

جلالی صاحب نے اپنی نیکر کے گیلوز سیدھے کئے۔ پھر اپنے استخوانی ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ میرے دونوں شانے جکڑے اور بولے۔ ''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تم دونوں کو پناہ دی ہے...... اور جب پناہ دی ہے تو بس دی ہے۔ اب جان

بھی چلی جائے گی تو تمہاری حفاظت کروں گا۔ دیکھوں گا کون مائی کا لال یہاں پہنچتا ہے اور تمہیں گرفتار کرتا ہے یہاں سے۔'' عمر رسیدہ سہراب جلالی کا وجود جوش اور غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ گلے کی رگیں دھڑا دھڑ بج رہی تھیں اور نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر مہناز نے جلدی سے گولی اور پانی کا گلاس جلالی کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گولی نگل لی اور اپنی غصیلی گفتگو جاری رکھی۔ ہم نے جو کچھ جاوا اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا تھا، اس کی تفصیل انہیں ڈاکٹر مہناز سے معلوم ہو ہی چکی تھی۔ وہ بار بار میرے شانے تھپکتے تھے اور تعریفی کلمات ادا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے کہا کہ فی الحال میں ان کی کسی بات پر اختلاف نہ کروں اور خاموش رہوں۔

کچھ دیر بعد جلالی صاحب ہمیں پوری حفاظت کا یقین دلا کر چلے گئے تو جگت سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔ ''بادشاہ زادے! یہ بابا جی سچ مچ کے ہیں یا بجلی وغیرہ سے چلتے ہیں؟''

میں بابے جلالی کے مزاج کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ جس طرح کچھ عرصے پہلے جلالی صاحب کو آرا کوئے موتی ملی تھی اور انہوں نے اس کے تحفظ کی قسم کھالی تھی، اسی طرح آج انہوں نے ہمیں پناہ دی تھی اور اس پناہ کی خاطر ہر خطرہ مول لینے کا برملا اظہار کر دیا تھا لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس بوڑھے کمزور لیکن نہایت باہمت شخص کو کسی اور آزمائش میں نہیں ڈالوں گا...... ہرگز نہیں۔

جلالی صاحب کے پاس ایک بہترین کمپنی کے سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ انہوں نے شام تک کچھ مزید گارڈز منگوا لئے۔ انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ ہمیں لمبے عرصے تک یہاں چھپانے اور ٹھہرانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے لیکن میری دلی کیفیت کچھ اور تھی۔ میں ہر اس چیز اور منظر سے دور چلا جانا چاہتا تھا جس کا تعلق کسی بھی صورت عمران سے ہو۔ وہ مجھے ہر شے میں اپنی جھلک دکھاتا تھا، مسکراتا تھا اور میرا دل خون کرتا تھا۔ یہاں اس فارم ہاؤس میں بھی ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

رات کو جب سب سو گئے تو میں نے ڈاکٹر مہناز کے نام ایک مختصر خط لکھا۔ میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر! میں آپ کی محبتوں کا متحمل نہیں ہوں۔ میں ان در و دیوار میں گھٹ کر مر جاؤں گا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کیجئے گا اور جلالی صاحب کو بھی اس سے باز رکھیے گا۔ میرا ساتھی جگت سنگھ ابھی زخمی ہے۔ یہ بھی یہاں سے ننکانہ صاحب جانا چاہتا ہے لیکن امید ہے کہ آپ چار پانچ دن اس کی میزبانی کر لیں گے تاکہ یہ ٹھیک سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے۔ آپ کو زندگی کا نیا سفر مبارک۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں

(یہ مہناز اور جلالی صاحب کی شادی کی طرف اشارہ تھا) خدا حافظ۔''

یہ خط میں نے مہناز کے میڈیکل باکس میں ایسی جگہ رکھ دیا جہاں اس کی نظر کا پڑنا لازمی تھا۔ جگت سنگھ وہسکی کا کوارٹر پی کر چت لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کے خراٹوں کی گونج تھی۔ وہ ایک دلیر اور بے لوث ساتھی تھا۔ لڑنا مرنا جانتا تھا اور مرنے والوں کا بدلہ لینا بھی۔ اس نے آشا کور اور گوبندر کی موت کا قرار واقعی بدلہ لیا تھا۔ ''خدا حافظ جگت سنگھ!'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور جلتی ہوئی نم آنکھوں کے ساتھ نکل آیا۔ فارم ہاؤس کے گارڈز کو علم تھا کہ میری نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی۔ موسم سرد تھا۔ میرے پاس ایک پستول اور شکاری چاقو تھا۔ میں نے جا رکی بکل مار رکھی تھی اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی تیرگی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہر خطرے سے بے نیاز۔

○......❖......○

میرے لئے زندگی میں اب کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا کہ میں دماغی طور پر مر چکا ہوں۔ ارد گرد کے ہر منظر میں اجنبیت اور ویرانی تھی۔ پتا نہیں میں کن کن راستوں پر چلتا، کن کن سواریوں پر سفر کرتا اور کہاں کہاں رکتا، لاہور اور شیخوپورہ سے بہت دور نکل آیا۔ میں بس چلتا ہی جا رہا تھا۔ کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی منزل۔ پیٹ کا دوزخ، ایندھن مانگتا تھا تو جو ملتا تھا کھا لیتا تھا۔ ایک روز میں نے خود کو اس جگہ پایا جو دنیا میں جنت کا نمونہ تھی۔ یہ دریائے کنہار کی گزرگاہ تھی۔ کاغان سے آگے ناران کے بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھے۔ یہ جنت ارضی تھی لیکن مجھے اس میں بھی ذرہ بھر کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن میرے موبائل فون پر بیل ہوئی۔ یہ جیلانی کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی لیکن پھر بات کرنے کا ارادہ بدل دیا اور موبائل توڑ کر دریائے کنہار کے پُرشور پانی میں پھینک دیا۔ میں جب تک زندہ تھا، اپنے ماضی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

ناران کے مضافات میں ایک کھٹارا بس کے سفر کے دوران میں ایک مشفق بزرگ سے میری جان پہچان ہو گئی۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔

انہوں نے ناران کی آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک شاندار باغ لگا رکھا تھا۔ وہیں پر مکان بھی تعمیر کیا ہوا تھا۔ ہر طرح کے پھل یہاں موجود تھے۔ انہوں نے دو گائے اور کچھ بکریاں پال رکھی تھیں۔ گھر میں ان کی بیوی اور چوبیس پچیس سال کے ایک معذور بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ نوجوان ذہنی طور پر پسماندہ تھا اور اُسے چلنے پھرنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔

میں عبدالغفور نامی ان بزرگ کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ میری موجودگی سے انہیں ایک عجیب سے تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں اور کان ماضی کی طرف سے بالکل بند کر لئے تھے۔ فرح اور عاطف کی آوازیں، بالو کی کلکاریاں، ثروت کی مسکراہٹ اور سب سے بڑھ کر عمران کا چہرہ...... میں کچھ یاد رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں یہ سب کچھ کھو چکا تھا اور جو میرا نہیں تھا، وہ میرے دل و دماغ کو کیوں اتنی بے رحمی سے زخمی کرتا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میرے جسم کو محنت مشقت اور اذیت سہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ سردی گرمی مجھ پر بہت کم اثر کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے یخ بستہ سردیوں نے ناران کی فضاؤں کو ڈھانپ لیا۔ میں اس موسم میں بھی اکثر بغیر کسی گرم لباس کے گھومتا تھا۔ عبدالغفور صاحب اور ان کی بیوی کے بہت منع کرنے کے باوجود میں باغبانی میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھنٹوں اور پہروں کی جان توڑ مشقت مجھے پسینے میں شرابور کر دیتی۔ میں اپنی جان لیوا سوچوں سے دور رہنے کے لئے اپنے جسم کو بالکل نڈھال کر لیتا۔ وہ بوڑھے میاں بیوی مجھے روکتے ہی رہ جاتے۔

دن گزرتے رہے...... اندھیرے اور اجالے کے پنچھی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے۔ سورج پہاڑوں کی چوٹیوں پر ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔ یخ بستہ ہوائیں وادیوں کو تہ و بالا کرتی رہیں۔ میں ان ویرانوں میں گھومتا رہا۔ عمران کی یادوں سے پیچھا چھڑاتا رہا اور اپنے لئے قبر کی کوئی اچھی سی جگہ تلاش کرتا رہا۔ مجھے اب موت کے سوا کسی کا انتظار نہیں تھا۔ میں کبھی کبھی شام کے وقت ڈائری میں کچھ لکھنے بھی بیٹھ جاتا۔ چند دن پہلے کا لکھا ہوا ایک صفحہ میرے سامنے تھا۔

''مجھے یہاں آئے ہوئے اب آٹھ مہینے سے اوپر ہو چکے ہیں۔ مجھے پیچھے کی کچھ خبر نہیں اور نہ ہی میں رکھنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ یہیں کہیں میری سانس پوری ہو جائے اور میں چیڑ اور دیودار کے بلند درختوں کے نیچے کسی قبر میں سو جاؤں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو شاید میں یہاں سے واپس نہ جا سکوں۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی کا نظام چلتا ہی رہتا ہے۔ بالو بھی پروان چڑھ جائے گا۔ عاطف اور فرح کی زندگیاں بھی اپنی ڈگر پر چلنے لگیں گی۔ میں ان کے لئے زندگی گزارنے کے لئے بہت کچھ چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا عمران نہیں ہے...... اس کا چوڑا سینہ اور روشن آنکھیں نہیں ہیں۔ میرے پاس ثروت نہیں ہے، اس بے وفا کی آس نہیں ہے۔ مجھے اب یہیں پر مرنا زیادہ اچھا لگتا ہے......

''جیکی نے کہا تھا، سب کہانیوں کا انجام مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر انجام میں زندگی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے موقع دیا جائے تو اپنے رستے خود ڈھونڈ لیتی ہے لیکن کبھی کبھی زندگی کو موقع دینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

''آہ سلطانہ! تم نے مجھ سے زندگی کا وعدہ لیا تھا لیکن اب یہ وعدہ نبھانا میرے لئے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ میں تمہارے بچے کے لئے بھی شرمندہ ہوں۔ بے شک بالو محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن میں اسے وہ محبت اور وہ زندگی نہیں دے سکا جو تم چاہتی تھیں۔ یہ سب کچھ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ اے بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دور دراز قبرستان میں ابدی نیند سونے والی...... مجھے معاف کر دینا۔''

میں نے ڈائری بند کی اور کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا۔ ایک آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ یہ عبدالغفور صاحب کی بیوی کی آواز تھی۔ میں انہیں خالہ کہتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''بیٹے! ایک موٹر آئی ہے۔ مہمان ہیں، تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ٹٹولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوما تو میری نگاہ ساکت رہ گئی۔ میں نے ایک خوش پوش لڑکی کو دیکھا...... یہ نصرت تھی۔ ہاں نصرت تھی، اور زندہ تھی۔ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ وہ پھولوں کے تختوں کے درمیان نیم پختہ سیڑھیاں اترتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ اس کی ساڑھی اور شال دھیرے دھیرے ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ آگے آئی اور تابش بھائی کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے شانوں سے ٹٹولا اور خود کو یقین دلایا کہ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب نہیں۔ تب میری نگاہ اوپر گئی اور میں کیپٹن جیلانی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ بھی سیڑھیاں اتر کر میرے پاس آ گیا اور بغلگیر ہو گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خود کو جیلانی سے چھڑاؤں، اسے دھکا دوں اور بھاگتا ہوا باغ کے ملگجے اندھیرے میں گم ہو جاؤں۔ یہ دونوں میرا ماضی تھے اور میں ماضی کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔

''بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے آپ کو۔ بہت گھمایا ہے آپ نے ان پہاڑوں میں۔'' جیلانی کی آواز شکوہ کناں تھی۔

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے نصرت کو دیکھا۔ ''میں نے تو سنا تھا کہ...... کہ......''

اپنی موت سے چار پانچ گھنٹے پہلے اس نے پھر پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اس کا جگر ضرور نصرت کے ساتھ میچ کرے گا۔ بصورتِ دیگر اس نے اپنا یہ باڈی پارٹ کسی بھی ضرورت مند کو لگانے کی اجازت دی تھی۔ چار پانچ گھنٹے بعد وہ چلا گیا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ شاید دنیا کے چند خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ایک تھا جو پانسا پھینکتا تھا، سیدھا پڑتا تھا۔ اس نے جو آخری پانسا پھینکا، وہ بھی سیدھا پڑا۔ ڈاکٹر اور سرجن ششدر رہ گئے۔ سب کچھ تقریباً ویسا ہی ہوا جیسا اس نے چاہا تھا۔ آؤٹ آف فیملی ہونے کے باوجود ساری کراس میچنگ پازیٹو رہیں۔ عمران کا جگر، نصرت کے لئے بہترین ثابت ہو رہا تھا۔ اسے تمام ٹریٹمنٹوں سے گزارا گیا اور پھر دم توڑتی نصرت کے جسم کا حصہ بنا دیا گیا۔ وہ لکی مین کا جگر تھا اور ''لک'' کہاں اپنی جگہ نہیں بناتی۔ اس نے نصرت کے جسم کے اندر بھی جگہ بنائی۔ اس کے اعضا نے اس ٹرانسپلانٹیشن کو کمال خوبی سے قبول کیا اور دو تین ماہ کے اندر ہی وہ تیزی سے رُو بہ صحت ہونے لگی اور آج وہ یہاں تھی، میرے سامنے...... میرے عمران کے جگر کے ساتھ۔

رات کو باقی لوگ تو سو گئے، میں بالو کو گود میں لے کر بیٹھا رہا اور انگیٹھی کے سامنے جیلانی سے باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ جیلانی کو میرا سراغ اس ایک فون کال سے ملا تھا جس کو سنے بغیر میں نے فون توڑ ڈالا تھا۔ جیلانی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی کال فلاں علاقے سے ریسیو ہوئی تھی۔ اس نے بہت سے دیہات اور قصبوں کی خاک چھانی اور آخر مجھ تک آن پہنچا۔ اس سے پہلے وہ لوگ دبئی بھی گئے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید میں وہاں فرح اور عاطف کے پاس موجود ہوں۔ لیکن ناکامی ہوئی۔ وہاں فرح اور ثروت کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کے دوران میں فرح نے اپنی صاف گو فطرت کے عین مطابق ثروت سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ یہاں تک کہ سلطانہ اور بالو کے بارے میں بھی سب کچھ ثروت کے گوش گزار کر دیا۔ اس نے ثروت کو بتایا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کی سلطانہ سے میری شادی کیسے اور کن حالات میں ہوئی تھی اور سلطانہ کی موت کے بعد بالو کس طرح پاکستان پہنچا......

میں نے جیلانی سے کہا۔ ''یوسف کہاں ہے؟''

''کون یوسف؟''

''ثروت کا شوہر۔''

''وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے...... اور نہ ہی اب پاکستان میں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ثروت اس سے خلع حاصل کر چکی ہے اور یہ کام کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یوسف پیش ہی نہیں ہوا۔ یوسف کی جرمن بیوی نے بھی اس سے طلاق حاصل کر لی ہے۔ نہ صرف جرمنی میں اس کی ساری پراپرٹی وہ لڑکی کورٹ کے ذریعے ہڑپ کر گئی ہے بلکہ اب وہ وہاں جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔''

''او گاڈ......'' میں نے سر تھام لیا۔

یہ زندگی مجھے مار کر پھر کیوں زندہ کر رہی تھی۔ میں اب لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ میں نے کہا۔ ''جیلانی! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ ثروت نے یوسف سے خلع حاصل کر لیا ہے؟''

اس نے انگیٹھی کے انگاروں کو گھورا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ''ہاں تابش صاحب! آپ نے خود ہی بتایا تھا کہ ثروت صاحبہ واہموں میں جکڑی ہوئی ہیں...... واہموں کو توڑنے کے لئے پیغمبر اور ولی آئے ہیں یا پھر ہم جیسے عام انسانوں میں کبھی کبھی عمران اور دانش جیسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی محبت اور خداداد صلاحیتوں سے فرسودہ عقیدوں کے بتوں کو پاش پاش کرتے ہیں۔ یہ بس انہی باکمال لوگوں کے بس کا کام ہوتا ہے ورنہ ان عقیدوں اور واہموں سے ڈھیٹ اور سخت شے دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتی۔''

میں نے جیلانی کو پہلی بار اس طرح بولتے دیکھا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ''ثروت کے وہم کو توڑنے کی جنگ'' میں آپ کو عمران کا ساتھ ملا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں یہ کر دکھایا۔ ثروت کو اس خوف نے جکڑا ہوا تھا کہ آپ سے ملاپ اس کی بہن کو زندگی سے دور لے جائے گا مگر جب وہ واقعی مر رہی تھی تو آپ...... یعنی آپ اور عمران کی وجہ سے اسے زندگی مل گئی۔ اور یہی وہ موڑ تھا جہاں اس وہم کا بت چکنا چُور ہوا اور ملیامیٹ ہوا۔''

رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں کمرے میں جا کر اوندھے منہ چٹائی پر گر گیا اور عمران کے لئے ٹوٹ کر روتا رہا۔ وہ میرے اندر یوں رچ بس گیا تھا کہ نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ عجب شخص تھا۔ وہ آخر تک دوسروں کے لئے جیتا رہا اور مر کر بھی ایثار اور قربانی کا ٹھیکیدار خود ہی بنا۔ وہ مجھے جگر کہتا تھا اور میرے لئے ہی جگر دے گیا۔ مجھے پتا نہیں کہ کب تک ویسے ہی پڑا رہ سکتا رہا۔ آج کے انکشاف نے میرے کندھوں پر عمران کے احسانوں کا بوجھ کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ میرا چہرہ تکیئے پر تھا۔ آنکھوں میں جلن اور سینے میں شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ سردی عروج پر تھی لیکن میں ننگی چٹائی پر بغیر کسی لحاف کے پڑا تھا۔ آگ

تو میرے اندر تھی جو بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی......

اچانک مجھے اپنی کمر پر کسی کے لمس کا احساس ہوا۔ کسی نے ایک نرم کمبل میری پشت پر ڈال دیا اور پھر خود بھی اس کمبل کے ساتھ لگ گیا۔ یہ ثروت تھی۔ میں دیکھے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ وہ ثروت ہے۔ اس کے جسم کا گداز کمبل میں اور پھر میرے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔ وہ عقب سے میرے ساتھ لگ گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ خاموشی کی زبان سب سے طاقتور ہوتی ہے۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی ظاہر کر سکتی تھی۔ اپنے کہے ہوئے پر پشیمانیوں کا اظہار کر سکتی تھی، مجھ سے معافی مانگ سکتی تھی۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس میرے ساتھ لگ کر، میرے اوپر ڈھے کر ہولے ہولے سسکتی رہی۔ یہ خاموشی اس کے ہر اظہار پر حاوی تھی۔ ہر فقرے سے زیادہ متاثر کن۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر اسی طرح گزری۔ پھر اس نے میرا رخ اپنی طرف پلٹا۔ میں نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ سرتاپا محبت تھی۔

محبت میں ہارے ہوئے لوگوں کی باتوں میں بہت گہرائی ہوتی ہے۔ باروندا جیکی کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ہر کہانی کا انجام بندے کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر کہانی کے برے سے برے انجام میں بھی زندگی موجود ہوتی ہے۔ اس زندگی کو موقع دیا جائے تو وہ اپنے رستے خود ڈھونڈتی ہے۔ شاید میری زندگی نے بھی رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

ان لمحوں میں مجھے لگا کہ ٹھوڑی کے گڑھے والا وہ خوب صورت عمران کہیں میرے آس پاس ہے۔ مجھے دیکھ رہا ہے...... اور مسکرا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے...... کوئی بات نہیں تابی! اداس مت ہونا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں تمہارے اندر رچ بس چکا ہوں۔ میں تم سب کے اندر رچ بس چکا ہوں۔ تم لوگ جب جب محبت کرو گے، جب جب سکھ بانٹو گے، ایثار کرو گے اور قربانی دو گے، مجھے اپنے بالکل قریب پاؤ گے اور جب بہار کی سہانی شاموں میں اور سرما کی نرم گرم راتوں میں تم زندگی کے گہرے دکھ سینے میں چھپا کر مسکراؤ گے، ہنسو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہنسوں گا۔ تمہارے بالکل پاس آ جاؤں گا۔ ہاں میرے دوست، اداس مت ہونا۔

○......ختم شد......○